لست ۱۹۸۷ء

دوروپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کو بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا۔
یہ اعزاز راشٹر پتی بھون میں ۱۴ اگست ۱۹۸۷ء کو منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن سے قریش سرحدی گاندھی کے صاحبزادے شری ولی خان نے قبول کیا۔

121850
11.12.89

خوراک اور رسد کے مرکزی وزیر مملکت شری غلام نبی آزاد کی قیادت میں ایک حج وفد ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو نئی دہلی سے سعودی عرب کے لیے روانہ ہوا۔

ایڈیٹر:
راج نرائن راز

جلد : ۴۶ | شمارہ : ۱ | اگست ۱۹۸۷ء
قیمت : دو روپے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | شراون ـ بھادر شک سمت ۱۹۰۹

ترتیب

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن : آر ـ ایس ـ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۲۰ روپے ـ دو سال کے لیے ۳۶ روپے ـ تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

بچّوں کے حقوق

بچّوں کے حقوق کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں ترقی پذیر ممالک کی دلچسپی اور شرکت نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔

آج صرف اقوام متحدہ کے ۲۰ نومبر ۱۹۵۹ء کو بچّوں کے حقوق سے متعلق منظور ہونے اعلانیہ کو بچّوں کے حقوق کا بین الاقوامی خلاصہ شمار کیا گیا ہے۔

اعلانیہ اور قرار دادیں:

افسوس کی بات یہ ہے کہ عالمی برادری ان سبھی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی، جن کا اس اعلانیہ میں ذکر ہے۔ ۸۰ سے زائد معاہدوں، اعلانیوں اور دیگر لازمی اور غیر لازمی دستاویزوں میں ایسی دفعات موجود ہیں جو واضح اور غیر واضح طور پر بچّوں پر لاگو ہوتی ہیں۔ یہ مختلف النوع مجموعے بے ربط اور نامکمل ہونے کے سبب بچّوں کے حقوق کی اطمینان بخش تفسیر پیش نہیں کرتے۔

اسی لیے ۱۹۷۹ء میں بچوں کے عالمی سال کے موقع پر بچّوں کے حقوق وضع کرنے کی پولینڈ کی پہل قابل پذیرائی تھی۔

مغربی تصوّر سے آگے

جب متذکرہ اعلانیہ منظر عام پر آیا تب اقوام متحدہ کے طبعی حالات آج سے بہت مختلف تھے۔ اس وقت تعداد کے اعتبار سے اقوام متحدہ پر صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کا غلبہ تھا۔ جیسے جیسے افریقی اور ایشیائی ممالک کو آزادی حاصل ہوئی اور انہوں نے اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کی، ان کی آواز با اثر ہوتی گئی۔ اب ان کے پاس یہ منوانے کا موقع تھا کہ بچوں کے حقوق کو مغرب کے زیر اثر تیار کردہ اعلانیہ کے بجائے عالمی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سے متعلق کمیشن نے قرار داد کا مسودہ تیار کرنے کی غرض سے ایک ورکنگ گروپ کی تشکیل کی۔ ۱۹۷۹ء سے ہر ہفتہ اس گروپ کا جلسہ ہوتا ہے۔ یہ گروپ کمیشن کے ۴۳ اراکین کے علاوہ نمائندگی کے خواہش مند ممالک کے مبصرین سرکاری اداروں، بچّوں کے تعلیمی فنڈ اور منصوبے سے متعلق اقوام متحدہ کی عالمی تنظیموں اور غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ کام کی تکمیل کے بعد اہم دفعات کی تعداد تقریباً ۳۰ ہوگی اور یہ کام ۱۹۸۰ء تک مکمل ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد اس پر عمل درآمد کے طریقوں پر بحث ہوگی۔ امید ہے کہ ۱۹۸۸ء یا ۱۹۸۹ء تک مسودہ کی نظر ثانی کا کام بھی مکمل ہو جائے گا اور اس کے بعد اس کو انسانی حقوق سے متعلق کمیشن، اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل اور جنرل اسمبلی کو پیش کیا جا سکے گا۔ اگر اسے منظور کر لیا گیا تو اس پر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔ مسودہ کی تیاری کے کام کو ترجیح دینے کی جنرل اسمبلی کی اپیل کے باوجود مسودے کی تیاری کے کام کی جلد تکمیل کی راہ میں تین اہم خطرات لاحق ہیں۔

پہلا خطرہ موجودہ معیاروں کی جانب کم توجہی ہے۔ ڈیفینس فار چلڈرن انٹرنیشنل اور بچّوں کے تعلیمی فنڈ سے متعلق عالمی تنظیم کی جانب سے کیے جانے والے مشترکہ مطالعے میں مسودے کی بہت سی ایسی مثالوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے جو دیگر عالمی دستاویزوں کے معیاروں کے مقابلوں میں کمتر ہیں یا انہیں نظر انداز کرتی ہیں۔

دوسرا خطرہ عمل درآمد کے طریقۂ کار پر ہوئی گفتگو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ آئندہ کنونشن میں نہ صرف تمام زیادہ سیاسی اور شہری حقوق بلکہ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق بھی شامل ہوں گے۔

تیسرا خطرہ مجوزہ کنونشن میں ترقی پذیر ممالک کی عدم شرکت سے لاحق ہوتا ہے۔ حالانکہ ان علاقوں میں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ لوگ رہتے ہیں۔ اور جہاں بچوں کے وجود اور نشو و نما کے بنیادی مسائل بہت سنگین ہیں۔ یہ ممالک اس سلسلے میں عالمی تعاون سے سب سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے مسودہ کی تیاری کے کام میں ترقی پذیر ممالک کی شرکت کی توقع لازمی ہے تا کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی آواز سنی جا سکے۔

۱۹۸۵ء کے اجلاس میں جو جوش و خروش پیدا ہوا تھا، وہ عارضی ثابت ہوا۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی شرکت پہلے کی نسبت کم ہوئی۔ ان برّاعظموں سے کل ۱۵ نمائندے آئے۔ جن میں سے نصف نے ہی باقاعدہ شرکت کی اور ان میں سے بھی چند ہی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

مسودہ کی تیاری کی موجودہ حالت میں اور پچھلے ریکارڈ کی بنا پر ترقی پذیر ممالک کی واپسی کی توقع کم ہے۔ ان ممالک کے پاس وسائل کی کمی کی دلیل اس کام کے لیے درکار سرمایہ کاری کے اندازہ کے پیش نظر عذر بے جا معلوم ہوتا ہے۔

بہت سے ترقی پذیر ممالک نے اقوام متحدہ کی بیشتر قرار دادوں کی مغربی عصبیت کی بنا پر مخالفت

آگے صفحہ پر

م۔ک۔ مہتاب

آزادی اور ترقی کے چالیس برس
کامیابیاں

ابرِ کرم

ہندوستان مون سون کی ہواؤں کے خطے کا ایک بڑا مُلک ہے جو روزِ اوّل سے ہی اپنی اقتصادی خوشحالی کے لیے مون سون کی بارشوں پر منحصر رہا ہے۔ بارشیں بروقت اور اچھی ہوئیں تو اقتصادیات کا چہرہ چمک اُٹھا۔ کم یا زیادہ ہوئیں تو قحط یا سیلابوں نے مُلک کو آ گھیرا۔ ہندوستان ایک کرشی پردھان یعنی زراعت پر انحصار رکھنے والا مُلک ہے، جس کی معیشت، خوشحالی، صنعت اور روزگار کا تعلق مئی سے اگست تک مُلک کے وسیع خطوں پر برسنے والے بادلوں کی نظرِ کرم پر رہا ہے۔

لیکن اگر ہم آزادی کے بعد مُلک کی منصوبہ بند ترقی کے عمل پر نظر دوڑائیں تو دکھائی دے گا کہ مُلک کے سیاسی رہنماؤں اور منصوبہ کاروں نے اپنی مسلسل کوششوں سے مُلک کی اقتصادی ترقی کے بارے میں مذکورہ قدیم تصور کو تبدیل کرنے میں بھاری کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ ہندوستان اب بھی زیادہ تر انحصار زراعت پر رکھتا ہے اور مُلک کی ۷۰ فی صد آبادی دیہات میں مقیم ہے۔ کسان اب بھی اپنی خوشحالی کے لیے جون جولائی کی گھنگھور گھٹاؤں کی جانب دیکھتے ہیں۔ لیکن زرعی اقتصادیات مون سون کی محتاج نہیں رہی۔ مُلک میں زمین پر اور زمین کے نیچے پانی نہروں اور نل دار کنوؤں کے ذریعے استعمال کرنے کی بے مثال کوششیں اربوں روپے کے مصارف سے کی گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مُلک میں زمینوں کا آب پاش رقبہ جو ۱۹۵۰-۵۱ء میں صرف ۲ کروڑ ۲۶ لاکھ ہیکٹر تھا وہ بڑھ کر وہاں ۱۹۸۶-۸۷ء میں آب پاشی کی صلاحیت بڑھ کر ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ہیکٹر ہے، جس سے ۶ کروڑ ۴۱ لاکھ ہیکٹر صلاحیت کام میں لائی جا رہی ہے۔ مُلک میں پانی کے دستیاب وسیلوں سے کُل ۱۱ کروڑ ۳۵ لاکھ ہیکٹر زمین کو آب پاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آئندہ پندرہ برس کے لیے آبی وسیلوں کے استعمال کا جو قومی منصوبہ بنایا جا رہا ہے اُس سے نہ صرف پوری کی پوری دستیاب صلاحیت کو استعمال کیا جائے گا بلکہ آبپاشی کی صلاحیت بڑھا کر ۱۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہیکٹیر کر دی جائے گی۔ مُلک کا کُل جغرافیائی رقبہ ۳۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ہیکٹر ہے، جس میں سے قابلِ کاشت رقبہ ۱۷ کروڑ پچاس لاکھ ہیکٹر اور زیرِ کاشت رقبہ ۱۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ہیکٹر ہے۔ یعنی اگر ہم ۲۰۱۰ء تک کے قومی منصوبے کے مطابق آبپاشی کے وسیلے پیدا کرنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں تو مُلک کی تمام زیرِ کاشت زمین مون سون کی محتاج نہیں رہے گی۔ اور کسان کندھوں پر ہل اُٹھائے زمین جوتنے کے لیے گھٹاؤں کے اُترنے اور برسنے کے لیے آسمان کی جانب نہیں دیکھتے رہیں گے۔

آبپاشی کے میدان میں اب تک جو کامیابیاں ہو چکی ہیں اور اس کے ساتھ ہی زراعت کی نئی تکنیک اور زیادہ فصل دینے والے بیجوں اور کیمیاوی کھاد کے استعمال پر جو زور دیا گیا ہے۔ اس کی بدولت گندم کی پیداوار ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۶۴ لاکھ ٹن تھی، بڑھ کر ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۴ کروڑ ۶۹ لاکھ ٹن اور چاول کی پیداوار ۲ کروڑ ۴ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۶ کروڑ ۴۱ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ اناجوں کی مجموعی پیداوار جو منصوبہ بند ترقی کے آغاز یعنی ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵ کروڑ آٹھ لاکھ ٹن تھی ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۱۵ کروڑ ۴ لاکھ ٹن ہو گئی۔

نہ صرف یہ کہ ہر پانچسالہ منصوبے میں زرِ کثیر کے صرفہ سے آبپاشی کی سہولیات میں توسیع اور پیداوار میں لگاتار اضافہ ہوا ہے بلکہ قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ مُلک کی زراعت میں ایک قوّتِ برداشت پیدا ہو گئی ہے۔ لگاتار تین برس کی مون سون کی ناکامی زرعی پیداوار پر کوئی بُرا دباؤ نہیں ڈال سکی۔ ایسی صورت میں پیداوار اگر حسبِ توقع بڑھتی نہیں تو برقرار ضرور رہتی ہے۔ انہیں کوششوں کی بدولت مُلک میں ایک بڑا انقلاب آیا ہے۔ مُلک آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا سے آ رہے گیہوں کے جہازوں کا محتاج نہیں

۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ء میں ملک میں فاضل اناج کا ۲ کروڑ ۳۶ لاکھ ٹن کا ذخیرہ موجود تھا۔ جس کا مطلب ہے ملک اناج کی ضروریات کے لحاظ سے نہ صرف خود کفیل ہو چکا ہے بلکہ اڑوس پڑوس کے ملکوں کی کچھ ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔ اب یہاں قبل از آزادی کے ادوار کے بنگال، راجستھان اور اوریال سیما جیسے جان لیوا قحط نہیں پڑتے۔ ملک بھر میں اناج اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تقسیم کا ایک موثر نظام قائم ہے اور ملک کے ہر کونے اور ہر خطے میں اناج یکساں قیمتوں پر مہیا کیا جاتا ہے — ملک نے مون سون اور قدرت کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کی بہت حد تک صلاحیت حاصل کر لی ہے، لیکن اب بھی آبادی کے بہت بڑے حصّے کی روزی روٹی کا انحصار کھیتی پر ہے۔ آبادی میں اضافے سے زمینوں پر بوجھ بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ ملک کے منصوبہ کاروں نے زمین کا یہ بوجھ ہلکا کرنے اور آمدنی و روزگار کے متبادل ذرائع مہیا کرنے کیلیے گزشتہ پینتیس برس میں صنعتوں اور روزگار پیدا کرنے والے دیگر وسیلوں اور حرفتوں پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے جتنا کہ زراعت کی ترقی پر دیا گیا ہے۔

اقتصادی پالیسیاں :

اس سلسلے میں ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک اقتصادی پالیسی جواہر لال نہرو کے دور میں مرتب کی گئی۔ جس میں وقتاً فوقتاً حالات کی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں شری راجیو گاندھی نے ایک اقتصادی پالیسی کا اعلان کیا، جس کا مقصد معیشت کو غیر ضروری پابندیوں سے آزاد کرنا اور آمدنی کے ساتھ ساتھ معیشت کی رفتار ترقی میں اضافہ کرنا تھا۔ نئی پالیسی کا ایک اور مقصد ٹیکسوں، صنعتی لائسنسوں کے اجرا، درآمدات، ٹیکنالوجی کے استعمال اور غیر ملکی سرمایہ حصص میں سہولیات مہیا کرنا ہے۔ جس سے ملک میں صنعتیں ترقی کر سکیں۔

شری جواہر لال نہرو نے ملک کے لیے ایک اقتصادی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے جو اب تک بھی ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے ہدایات کی مشعل خیال کی جاتی ہے، کہا تھا :

”ہمیں دولت پیدا کر کے اُس کی یکساں تقسیم کرنی چاہیے۔ ہم دولت کے بغیر ایک فلاحی ملک کیسے قائم کر سکتے ہیں۔ دولت سے مراد صرف سونا یا چاندی ہی نہیں بلکہ مال اور خدمتیں بھی ہیں۔ لہٰذا ہماری اقتصادی پالیسی کا لازمی نصب العین اشیاء کی بہتات اور کثرت ہونا چاہیے۔ اب تک جو اقتصادی پالیسیاں بنتی آئی ہیں۔ اُن کا نصب العین قلت دُور کرنا رہا ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں قلت کی اقتصادیات کے کوئی معنی نہیں رہے۔

صرف پیداوار ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ایک شخص محنت کر کے کوئی چیز تیار کرتا ہے تو وہ یہ توقع کرتا ہے کہ بہت لوگ موجود ہیں جو اس کی مصنوعات کے استعمال کے منتظر ہیں۔ لہٰذا کوئی کارخانہ ہو یا گھریلو صنعت یہ دھیان رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے مال کی کھپت ہو۔ کیونکہ اگر کھپت نہ ہو تو مال تیار کرنے والا شخص کام بند کر دے گا۔ بڑے پیمانے پر اشیاء کی پیداوار کا مطلب ہے بڑے پیمانے پر اشیاء کی کھپت جو کھپت کاروں کی قوّتِ خرید میں اضافے کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا منصوبہ بندی کے عمل کو یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ خریدار کی قوّتِ خرید میں اُجرتوں اور تنخواہوں کی صورت میں اضافہ ہو۔ لہٰذا قوتِ خرید پیدا کرنے کے لیے بڑی مقدار میں سرمایہ مہیا کیا جانا چاہیے — جس سے پیداوار اور کھپت کا چکر مکمل کیا جا سکے۔ اس طرح آپ زیادہ پیدا کریں گے، زیادہ صرف کریں گے اور اس کے نتیجے کے طور پر معیارِ زندگی بلند ہوگا۔“

جواہر لال نہرو کے اقتصادی ترقی کے اس اندازِ فکر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زرعی کے علاوہ صنعتی پیداوار میں اضافے کرنے، لوگوں کی قوّتِ خرید بڑھانے اور لوگوں کو مختلف امدادی اسکیموں کے ذریعے غربت کی سطح سے اوپر لانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے — ملک کی تمام غریب آبادی کو ۲۰۰۰ء تک غریبی کے خط سے اوپر لانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

شری نہرو اقتصادی طاقت کے چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے کے بھی مخالف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اجارہ داریوں کو بھی ختم کرنے کے بہت سے اقدامات کیے۔ اُن کی اقتصادی پالیسی کا نصب العین پیداوار میں اضافہ کرنا اور زیادہ سے زیادہ پیداوار اور روزگار مہیا کرنا تھا۔ انہوں نے ہی ملک کو سماجی انصاف کے ساتھ اقتصادی ترقی کا نعرہ مہیا کیا تھا۔ اگرچہ ہندوستان نے اقتصادی منصوبہ بندی میں روس، چین اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کے خاکے کو اپنایا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ جہاں ان مملکتوں میں تمام فیصلے حکومت کرتی ہے۔ وہاں ہندوستان میں حکومت معیشت کے بہت کم حصّے میں اپنے فیصلے نافذ کر سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کے بارے میں جو تصوّرات باندھے جاتے ہیں، وہ پورے نہیں ہوتے۔ مثلاً نجی دائرۂ کار صرف اُن شعبوں میں سرمایہ لگاتا ہے، جہاں اُسے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹیکنالوجی بھی منصوبوں کی خواہشات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف نجی نامے کے لیے درآمد اور استعمال کی جاتی ہیں۔ ملی جُلی معیشت میں سوچا یہ گیا ہے کہ روز افزوں سرکاری دائرۂ کار بالآخر نجی دائرۂ کار کو بے حقیقت بنا کر رکھ دے گا۔ اسی طرح یہ بھی فرض کیا گیا ہے کہ زراعت کے شعبے میں

مفاد پرست آہستہ آہستہ بے دست و پا ہو جائیں گے نجی دائرۂ کار نے صنعتوں کے قیام، ضروری شعبوں میں سرمایہ کاری اور روزگار کی بہم رسانی میں وہ کردار نہیں نبھایا جس کی اس سے توقع تھی، لیکن سرکاری دائرۂ کار جس میں حکومت کی پالیسیاں حسب خواہش لاگو کی جا سکتی ہیں، اقتصادی خوشحالی میں اپنا حصہ ادا کرتا آیا ہے۔

آزادی کے بعد اقتصادی منصوبہ بندی کی دو اہم کامیابیاں گندم اور خام تیل کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہے۔ جہاں تک صنعتی پیداوار کا سوال ہے، درآمدات کے نعم البدل تیار کرنے، بھاری اور درمیانے سامان کی تیاری اور پیداوار کی گوناگونی کے لحاظ سے ہندوستان کو ایک بڑا صنعتی ملک شمار کیا جانے لگا ہے۔ ملک میں مجموعی اقتصادی ترقی کا تناسب ۵ فی صد کی سطح پر برقرار رکھا جا رہا ہے۔ وہاں صنعتی پیداوار کی ترقی کی شرح ۱۹۸۰ء کے دہے میں ۸ سے ۱۰ فی صد کی شرح کو چھوتی رہی ہے۔

سائنسی اور ٹیکنیکل عملے، مختلف مدارج میں طلبا کے داخلے اور مختلف اقسام کی سماجی خدمتوں میں طلبا کے داخلے میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ریلوں، جہاز رانی، ہوائی جہازوں اور سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل کی سہولیات میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاک خانوں، تار اور ٹیلی فون جیسی مواصلاتی خدمتوں میں بھی بھاری اضافہ ہوا ہے۔

تحقیق اور ترقی کے میدان میں بھی خاص طور پر نیوکلیائی اور خلائی تحقیق میں ہندوستان نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ ایٹمی دھماکے کرنے کی صلاحیت اور ملک میں تیار کردہ راکٹ کو خلا میں داغنے کی صلاحیت پیدا کرنا اس میدان میں ملک کی ترقی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔

قومی آمدنی میں اوسطاً ۳٫۵ فی صد کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے اور فی کس آمدنی میں سے ہر سال قریب ایک فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ حفظانِ صحت کے شعبے میں جو کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں اُن کی بدولت زیادہ سے زیادہ عمر کی اوسط میں ۷۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اور طوالتِ عمر کا تناسب بڑھ کر مردوں کے لیے ۵۱ اور خواتین کے لیے ۵۰ برس ہو گیا ہے۔

حقیقی آمدنی اور دولت کی تقسیم میں خلا کو کم کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے گئے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم اور زیادہ سے زیادہ آمدنی میں ایک اور پانچ کا تناسب قائم کیا جا سکے۔

گزشتہ قریب ایک دہے سے ترقی اور پیش رفت کے لیے کم از کم ضروریات پوری کرنے اور غریبی دُور کرنے کے لیے بیس نکاتی پروگرام کے نظریات اپنائے گئے ہیں۔ کم از کم ضروریات پوری کرنے کے نظریہ کا مقصد غریب سے غریب لوگوں کو اتنی قوتِ خرید مہیا کرنا ہے جس سے وہ بازار یا سرکاری نظامِ تقسیم سے اپنی ضروریات خرید سکیں۔ سرکاری تقسیم کی دکانوں پر اناج، تیل، چینی، مٹی کا تیل اور بعض اقسام کا کپڑا مقررہ قیمتوں پر تقسیم کے لیے مہیا کیا جاتا ہے۔

اس طرح اقتصادی ترقی کا ایک دوسرا نظریہ اپنایا گیا ہے یعنی صنعت اور زراعت میں تیز رفتار ترقی کے لیے سرمایہ کاری کے نظریے کو اپنایا گیا ہے اور دوسرے یہ سرمایہ کاری، ادارہ جاتی اصلاحات اور فلاحی اخراجات کے ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں، جن کو کھپت کے معیاروں پر اُن کے اثرات کے لحاظ سے برحق قرار دیا جا سکے۔

روزگار اور تعلیم :

ہر تندرست بالغ کو روزگار، زندگی کے معیار کے نشانے کی کم از کم سطح مقرر کیا گیا ہے حالانکہ ہمارے آئین میں کام کرنے کے حق کو بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ دیہات اور شہروں میں روزگار کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ابھی بے روزگاری کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے بہت بڑی کوششوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ بہت سے پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق روزگار نہیں مل رہا ہے۔ بعض ایسے شعبے ہیں، جہاں افرادی قوت دستیاب نہیں اور بعض ایسے شعبے ہیں جہاں افرادی قوت ضرورت سے زیادہ ہے اور بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ملک میں ثانوی درجے تک تعلیم مفت دی جا رہی ہے۔ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن یہ محسوس کیا گیا ہے کہ اس تعلیم میں کاروباری یا روزگار کے پہلو پر زور نہیں دیا گیا اس لیے گزشتہ برس سے ایک نئی تعلیمی پالیسی ملک میں رائج کی گئی ہے، جس کا مقصد ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق تعلیم کے مواقع مہیا کرنا ہے۔

ملک کے تازہ ترین اقتصادی جائزے کے مطابق بجلی کی پیداوار، ریلوں کی نقل و حمل اور کوئلے کی پیداوار میں لگاتار اضافے کے سبب بنیادی سہولیات میں صحت مندانہ اضافہ ہوا ہے، جس سے صنعتی ترقی کی بہت سی رکاوٹیں دور ہوئی ہیں

جہاں معیشت کے دیگر شعبے منصوبوں کے نصب العین کے مطابق کام کرتے رہے ہیں، وہاں غیر ملکی تجارت میں اضافے کے باوجود حوصلہ افزا کارکردگی کا مظاہرہ نہیں ہوا جس کے سبب ادائیگیوں کے توازن کا مسئلہ قابو میں نہیں آ رہا۔ حکومت درآمد میں کمی اور برآمدات میں اضافے کے لئے مسلسل کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔ گزشتہ برس برآمدات میں ۱۷٫۳ فی صد کا اضافہ ہوا، جب کہ درآمدات میں ۱۴ فی صد کا اضافہ ہوا۔ لیکن یہ اضافہ اور کمی کسی خوش فہمی کی وجہ سے نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ہمارا تجارتی خسارہ بہت زیادہ ہے اور آئندہ کچھ برسوں میں ادائیگیوں کے توازن کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت سی اصلاحی کوششوں کی ضرورت ہے

قیمتیں اور افراطِ زر :

ایک ترقی پذیر معاشرے میں جہاں ہر شخص کے

فقدان اور اہل لوگ یہ ترقیاتی کاموں میں لگایا جا رہا ہو، مگر پیداوار اور خدمتوں میں اس شرح سے ساتھ ساتھ اضافہ نہ ہو رہا ہو۔ قیمتوں میں اضافہ ہونا قدرتی امر ہے۔ اس لیے آزادی کے بعد ہندوستان میں بھی کم و بیش ہر چیز کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے — حکومت نے قیمتوں پر قابو رکھنے کے بہت سے اقدامات بھی جاری رکھے ہیں۔ نیز معاشی طور پر کمزور طبقوں کو مقررہ داموں پر اشیائے ضروریہ مہیا کی ہیں۔ اس کے باوجود قیمتیں بڑھی ہیں، جن سے افراطِ زر کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں تھوک قیمتوں کے مطابق افراطِ زر کی شرح ۵٫۶ فی صد رہنے کا امکان ہے۔ گزشتہ دہے میں یہ شرح ۸ فی صد کے قریب رہی۔ جس سے ظاہر ہے ملک میں قیمتوں کی صورتِ حال قابو میں ہے۔

اس طرح ملک کی آزادی کے بعد ملک کی اقتصادی ترقی کا جو منصوبہ بند عمل شروع ہوا، اس کا قافلہ راہ کی دشواریوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ جہاں ملک کے پہلے منصوبے میں ترقیات کے لیے چند سو کروڑ روپے وقف کیے گئے تھے، وہاں ملک کے ساتویں منصوبے کے لیے ایک سو اسی ہزار کروڑ روپے صرف سرکاری دائرۂ کار کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔

نجی دائرۂ کار کو بازار سے سرمائے کی فراہمی کے لیے نیز قواعد و ضوابط میں بندشوں کو ختم کر کے ترقی کے کافی مواقع مہیا کیے گئے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ منصوبہ بند عمل سے ملک کی اقتصادی حالت سدھارنے کا جو سلسلہ آج سے سینتیس برس پہلے شروع کیا گیا تھا۔ وہ بعض خامیوں کے باوجود بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ آبادی میں بھاری اضافے نے ترقی کے بہت سے روشن پہلو ابھرنے نہیں دیے۔ پھر بھی ملکی معیشت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جہاں ترقی نہ ہوئی ہو اور آگے بڑھنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا جا رہا ہو۔ یہی تمنا اور ترقی کی چاہ اقتصادی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

●●

بقیہ: ملاحظات

کی ہے۔ اگر ترقی پذیر ممالک اقوامِ متحدہ کی قرارداد کی تیاری میں جس کا تعلق ان ممالک کے آدھے سے زیادہ باشندوں سے ہے، عدم شرکت کرتے رہیں گے۔ تو بچوں کے بارے میں قرارداد کی منظوری کے بعد کوئی ان کی بات سننے کو تیار نہیں ہوگا۔

اس قرارداد کے مسودے سے صرف ترقی پذیر ممالک کو ہی مسائل درپیش نہیں ہیں بلکہ بعض ترقی یافتہ ممالک جن میں انگلستان اور مغربی جرمنی بھی شامل ہیں، اس قرارداد کے بعض نکات سے مطمئن نہیں ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر ممالک نے گفت و شنید میں حصہ لیا ہے اور اگر ان کی رائے جماعتِ عاملہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتی تو وہ گروپ کے فیصلوں کے خلاف جو کہ اتفاقِ رائے سے لیے جاتے ہیں — رائے زنی کر سکتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی جماعتِ عاملہ میں جنوب مشرقی ایشیا کی نمائندگی بہت کم ہے۔ ذیلی صحارا کے افریقہ کا ریکارڈ بھی ہمیشہ خراب رہا ہے۔ جنوب ایشیائی ممالک میں بنگلہ دیش نے سب سے زیادہ دلچسپی دکھائی ہے۔ اس کے علاوہ بھارت اور سری لنکا نے بھی مسودہ کی تیاری کے کام میں سنجیدگی سے حصہ لیا ہے۔

مختلف قانونی نظاموں میں بچوں کے حقوق کا تصور خاندانی قانون کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "خاندان" کا تصور مختلف قانونی نظاموں اور مختلف تہذیبوں میں الگ الگ ہے۔ مسلم ممالک جو کہ جدید دنیا کے ایک اہم قانونی نظام یعنی اسلامی قانون کی نمائندگی کرتے ہیں، خاندان اور اس کے دائرہ میں بچوں کے حقوق کا اپنا الگ تصور رکھتے ہیں۔ یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی ممالک جو کہ عالمی برادری میں ممالک کا سب سے بڑے مجموعہ ہیں، ان کے لیے بھی مسودہ قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

اب تک ترقی پذیر ممالک کے نقطۂ نظر کا چند ممالک نے ہی اظہار کیا ہے، جن میں خاص طور پر الجیریا ارجنٹینا، چین، سینیگال اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔ انہیں اپنے بہت سے ساتھیوں کی حمایت ملی ہے، جن میں خاص طور پر لاطینی امریکہ کے ممالک شامل ہیں۔

اس وقت پریشانی کا عالم ہے۔ ایک جانب "شمالی ممالک" کے ذریعہ تیار کردہ قرارداد کا مسودہ تقریباً مکمل ہے۔ جس کی تکمیل میں دس برس لگے ہیں۔ دوسری جانب وہ ممالک ہیں جو اس مسودہ کے مخالف ہیں اور جنہوں نے اس کی تیاری میں حصہ نہیں لیا۔ اب یہ ممالک ترقی پذیر ممالک کی ضرورتوں کے پیشِ نظر بہت سی ترامیم پیش کریں گے۔ اگر یہ ترامیم پیش ہو گئیں تو نظرِ ثانی کے بجائے مسودے کو دوبارہ تیار کرنے کا دیرطلب کام شروع ہو جائے گا۔

ایک راستہ یہ ہے کہ موجودہ مسودہ پر غور کرنے کے لیے علاقائی سطح پر تبادلۂ خیال کیا جائے۔ تاکہ اس مسودے پر — افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی سرکاروں کے نقطۂ نظر سے نظرِ ثانی ہو سکے۔ اور وہ نکات جو ان سرکاروں کو قطعی ناقابلِ قبول ہوں، ان کی نشاندہی ہو سکے۔

مندرجہ بالا طریقۂ کار تجویز کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک بچوں کے حقوق کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر مسودہ کی تیاری کے موجودہ مرحلہ میں پیش کر سکیں۔ حالانکہ ایسے مرحلے میں کوئی بڑی تبدیلی لانا صحیح نہیں ہوگا۔

غیر سرکاری ادارے اور بچوں کے تعلیمی فنڈ سے متعلق اقوامِ متحدہ کا عالمی ادارہ یقینی طور پر اس سمت میں تبادلۂ خیال کے لیے نہ تو دباؤ ڈال سکتے ہیں اور نہ ہی از خود یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ عدم شرکت کے لیے معذرت کافی نہیں ہے۔ شرکت کے لیے دعوتِ عام ہے۔

●●

پرہلاد سنگھ

بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کے معمار

ستیّہ مورتی

ستیّہ مورتی کا شمار جدید بھارت کے معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کے جنم داتا تھے۔ پارلیمانی جمہوریت کی تشکیل میں انھوں نے لائقِ رشک خدمات انجام دیں۔ آج بھارت اپنی پارلیمانی زندگی کے لیے بنیادی طور پر ستیہ مورتی کی انتھک مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

ایک چمک دار ستارہ

بھارت کے سیاسی افق پر ستیہ مورتی کا ظہور اس وقت ہوا جب بھارت میں انگریزی حکومت کے خلاف بے چینی پھیل رہی تھی اور عوام کی امنگوں کو کچلنے کے لیے سارج کی طرف سے ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے۔

رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی سختی کا دور دورہ شروع ہو گیا اور پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس دوران جلیانوالہ باغ کا سانحہ ظہور میں آیا جس میں جنرل ڈائر نے ہزاروں کی تعداد میں پُرامن اور نہتے بھارتیوں پر بے تحاشہ گولیاں چلا کر انھیں ہلاک و مجروح کر دیا۔

ستیہ مورتی جو مہاتما گاندھی کی مقناطیسی شخصیت سے مسحور ہو کر کانگرس میں شامل ہو چکے تھے، اس وقت انگلینڈ میں تھے۔ وہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیرِ قیادت ایک وفد کے ممبر کے طور پر کانگرس کے موقف کے بارے میں برطانوی عوام کو آگاہ کرنے کے لیے گئے تھے۔ واضح رہے کہ وہ وکالت کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر چکے تھے۔ ایک جادو اثر مقرر تھے۔ ایک اعلیٰ پایہ کے مناظر کی حیثیت سے ان کی بڑی دھاک تھی۔ یہ ان کا سمندر پار کا پہلا دورہ تھا۔ وہ چند ہفتوں کے بعد بھارت آنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن انھیں مزید رُکنے کو کہا گیا۔ ستیہ مورتی نے چھ ماہ تک انگلینڈ میں قیام کیا۔ اس عرصے کے دوران انھوں نے تمام انگلینڈ کا دورہ کیا اور ساٹھ سے زیادہ جلسوں کو خطاب کیا۔ کوئی ساٹھ ستر ہزار لوگوں نے انھیں سُنا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھیں برطانیہ میں بھارت اور بھارتیوں کے خلاف پھیلے ہوئے خدشات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

انگلینڈ کے کامیاب دورے سے واپسی پر ستیہ مورتی کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پیشہ وکالت کو واپس نہیں جائیں گے بلکہ کانگرس کے لیے کام کریں گے۔

چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۰ء کے تمام تر سال میں مدراس پریذیڈنسی (جو اُس وقت تامل علاقوں کے علاوہ آندھر، مالابار اور مغربی ساحل کے چند اضلاع پر مشتمل تھی) میں رات دن ایک کر کے کانگرس کا پرچار کیا۔ کوئی ایسا ضلع نہیں تھا جہاں وہ گئے نہیں۔ تامل اضلاع کا کوئی ایسا اہم گاؤں نہیں تھا جہاں انھوں نے کانگرس کا پیغام نہ پہونچایا ہو۔ انھوں نے کوئی چھ سو جلسوں کو خطاب کیا جبکہ اُن دنوں میں کوئی لاؤڈ سپیکر اور مائیکروفون بھی نہیں تھے اور جلسے کھلے میدانوں میں ہوتے تھے۔ ان کی اس دوڑ دھوپ اور زبردست کوششوں سے مدراس پریذیڈنسی میں کانگرس کی تنظیم زور پکڑ گئی۔

جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو ستیہ مورتی نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ انھوں نے عدم تعاون کی تحریک میں شرکت نہیں کی لیکن انھیں ڈسپلن کا بڑا احساس تھا اور وہ کانگرس کے وفادار سپاہی بنے رہے اس میں رہے اور اس کے لیے کام کرتے رہے۔ گو وہ عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کے بارے میں گاندھی جی سے متفق نہیں تھے۔ تاہم جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس عظیم قومی جدوجہد میں شامل ہو جائیں تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا پیشہ وکالت ترک کر کے خود کو کانگرس کے کام میں لگا دیں گے۔ ... لیکن وہ اس امر پر زور دیتے رہے کہ ہمیں عدم تعاون کا راستہ اختیار کرتے ہوئے لیجسلیچروں میں جانا چاہئے۔ اور

۹۰۵/۱۰، گیتا کالونی، نئی دہلی

دیش کو آزادی کے لیے لڑنا چاہیے"۔ اس کے باوجود وہ کانگرس کے عہد کے پابند رہے۔ جب ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے بعد گاندھی جی نے ساتھیوں سے ستیہ گرہ کے لیے کہا تو ستیہ گرہ کے حلف نامہ پر دستخط کرنے والے اولین کانگرسی لیڈروں میں اولین ستیہ مورتی تھے۔

کونسل میں

ستیہ مورتی یونیورسٹی حلقے سے مدراس لیجسلیٹو کونسل میں پہونچے اس کے بعد سے انھوں نے تقریباً تن تنہا ہی لڑائی جاری رکھی۔ لیجسلیٹو کونسل میں داخل ہونے والے سب سے کم عمر سیاست داں تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی تقریروں، سوالوں اور سرگرمیوں سے بیشتر سیاست دانوں کو ماند کر دیا۔

پہلے روز سے ہی ان کی آواز کونسل میں دوسروں پر چھا گئی۔ ستیہ مورتی نے صوبائی لیجسلیٹو کونسل اور بعد میں سنٹرل اسمبلی میں اپنی جس قابلیت کا مظاہرہ کیا اس میں گاندھی جی کے اعتماد کو انھوں نے حق بجانب ثابت کر دیا۔ واضح ہو کہ ایک موقع پر تو گاندھی جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر ہمارے لیجسلیچروں میں دس ستیہ مورتی ہوتے تو انگریز کب کے بھارت چھوڑ گئے ہوتے"۔

ایسا نہیں تھا کہ ستیہ مورتی کو سول نافرمانی تحریک سے کوئی چڑ تھی۔ اگرچہ وہ اس کے خلاف تھے تاہم جب بھی کانگرس کی طرف سے تحریک شروع کی جاتی ستیہ مورتی ایک وفادار سپاہی کی مانند پیش پیش ہوتے۔ کانگرس نے مکمل آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگرسیوں کے مطالبات کے جواب میں لارڈ ارون نے ۲۵ جنوری اور بعد میں ۲۹ جنوری کو سینٹرل اسمبلی میں جو رویہ اختیار کیا اس سے قومی رہنماؤں کو مایوسی ہوئی۔ فروری کے وسط میں کانگرسی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس سابرمتی میں ہوا، اور ایک قرارداد کے ذریعہ مہاتما گاندھی کو اختیار دیا گیا کہ جب وہ چاہیں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں چنانچہ گاندھی جی نے نمک تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ آزادی میں یہ تحریک "ڈانڈی مارچ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک پر انھیں ۵ مئی کو صبح کے ایک بجے گرفتار کر لیا گیا۔

گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو گرفتار کر لیا گیا اب عباس طیب جی نے "نمک ستیہ گرہ" میں گاندھی جی کی جگہ لی۔ لہٰذا انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ تمام ملک میں "ایکشن کونسلوں" کا قیام ہو گیا۔ مدراس میں بھی کونسل آف ایکشن بن گئی۔ ٹی پرکاشم اور راج گوپال آچاریہ کی گرفتاری کے بعد ستیہ مورتی "کونسل آف ایکشن" کے صدر بن گئے۔ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے مکان کے گرد تریلی لین مندر کے سامنے کانگرس کا جھنڈا لہرانے کا اعلان کیا۔ انھیں ڈپٹی کمشنر آف پولیس نے قومی جھنڈا لہرانے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ مجسٹریٹ نے دس روپے جرمانہ کر کے چھوڑ دیا۔ ستیہ مورتی نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ بعد میں پولیس نے ان کی رہائش گاہ سے ایک میز دو کرسیاں اور ایک آرام کرسی قرق کر لی۔ اس کے بعد ستیہ مورتی نے مدراس کے جارج ٹاؤن میں ایک بدیشی کپڑے کی دکان پر پکٹنگ کرنے کا اعلان کیا۔ اس کوشش میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور چھ ماہ کے لیے ویلور سنٹرل جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ بعد ازاں ۱۲ مارچ ۱۹۳۱ء کو ویلور جیل سے رہا ہوئے۔

ستیہ مورتی نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ بدیشی کپڑے، برطانوی مال اور برطانوی جہازی ایجنسیوں کا بائیکاٹ کریں۔ ۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو انھوں نے راجگوپال آچاری کے ساتھ بدیشی مال کی دکانوں پر جا کر پکٹنگ شروع کر دی۔ دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ستیہ مورتی کو ۱۸ ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی جبکہ راجہ جی کو چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

۱۹۳۴ء کے آخر میں مونٹ فورڈ اصلاحات (۱۹۱۹ء) کے تحت پانچویں سینٹرل اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس کے بعد ۲۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو اسمبلی کا پہلا اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ اسمبلی اس لحاظ سے بے نظیر تھی کہ اس میں ملک کی ممتاز ترین ہستیاں سرکاری اور اپوزیشن بنچوں پر جلوہ گر تھیں۔ تاہم ستیہ مورتی ایک اعلیٰ مقرر کے طور پر اسمبلی کو منور فشاں کر رہے تھے۔ بھولا بھائی ڈیسائی کانگرس کے لیڈر اور گووند ولبھ پنت ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ نوعمر ستیہ مورتی ایک جنرل سکریٹری کے طور پر چنے گئے۔

ان کا ایک شاندار کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو اسمبلی میں آئین ساز اسمبلی بلانے کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی۔ اس میں گورنر جنرل سے کہا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ پر واضح کر دیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بھارتی قوم کے محسوسات و جذبات کی نمائندگی نہیں کرتا اور کہ اس کی جگہ ایک آئین ساز اسمبلی بلائی جائے جو بالغوں کی رائے دہندگی کی بنا پر منتخب کی جائے۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بعد میں حکومت برطانیہ نے یہی کچھ کیا۔

سفرِ آخرت

ستیہ مورتی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد بمبئی سے مدراس جا رہے تھے کہ ۱۱ اگست کو "ارکونام" میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور انھیں ویلور جیل لے جایا گیا وہاں انھیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظربند کر دیا گیا۔ عمر بھر انتھک محنت کرنے اور جیلوں میں بند رہنے سے اُن کی صحت بگڑ گئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو انھیں جنرل ہسپتال میں علاج کے لیے داخل کرایا گیا۔ وہ ابھی نظربند ہی تھے کہ ان کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر انھیں ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو رہا کر دیا گیا۔ بعد ازاں علاج معالجے سے ان کی حالت میں کچھ سدھار ہوا لیکن چند ہفتوں کے بعد طبیعت پھر بگڑ گئی۔ اور آخر ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو صبح ۸ بجے انھوں نے آخری سانس لیا۔

ستیہ مورتی کی زندگی گوناگوں سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ ان کا جنم ۱۹ اگست ۱۸۸۷ء کو جنوبی ہند کے ایک برہمن کنبے میں ہوا تھا۔ وہ اپنے والد سندر شاستریار کے ۹ بچوں میں تیسرے تھے۔ انھیں بچپن میں سنسکرت اور

(بقیہ صفحہ ... پر)

کالی داس گپتا رضاؔ

غالبؔ کی زندگی میں

کلامِ غالبؔ (اردو) کی اشاعت پر ایک نظر

غالبؔ کی زندگی میں دیوانِ غالبؔ (اُردو) کے پانچ ایڈیشن چھپے[۱]۔ ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن نہایت اہم ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کم یاب ہے (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) نیز یہ غالبؔ کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالبؔ نے اپنے قلم سے درست اور نظرِ ثانی کرکے اشاعت کے لیے دیا تھا۔ ذیل میں ان تمام ایڈیشنوں کی ضروری تفصیل دی گئی ہے، مگر ان کوائف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو قاری کو عام طور پر معلوم ہیں۔

۱۔ پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء)

غالبؔ، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو مطبع سید الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے ایک خط[۱] میں لکھتے ہیں:

"... دیوانِ ریختہ کہ در ناتمامی تمام است، عجب نیست
کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی وانگاہ بہ نظرگاہ سامی رسد..."

ترجمہ: (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے مکمل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہِ عالی سے گزرے.....

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں اوّل یہ کہ یہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوم[۲] یہ کہ یہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یا منتخب ہے۔

سرورق کے مطابق بالآخر، دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء کو چھپ گیا۔ دیوان کے صفحہ ۱۰۴ پر ایک رباعی درج ہے

---

[۱] : پنج آہنگ طبع اوّل ۱۸۴۹ء صفحہ ۲۸۸

[۲] دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی اشاعت دوم مقدمہ ص۱۲۷

(عرشی صاحب کا بیان جس کا یہ حوالہ ہے اگلے صفحہ پر دیکھیے؛

---

[۱] ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے دیوانوں کا ایک انتخاب "نگارستانِ سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دیوانِ غالبؔ کی تقریباً تمام غزلیں اس میں شامل ہیں۔ غالبؔ کا کہا ہوا سہرا پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں چھپا۔ قصیدے اور قطعے بھی ہیں۔ اگرچہ تمام کے تمام نہیں۔ مگر کوئی رباعی درج نہیں کی گئی۔

غرضیکہ غالبؔ کا پورا دیوان تو اس میں نہیں تاہم کلام کا وافر حصہ اس میں آ گیا ہے، اس لیے اسے دیوانِ غالبؔ کا چھٹا ایڈیشن (سالِ اشاعت کی رو سے پانچواں) کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا۔ قوی قیاس ہے کہ یہ مجموعہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوقؔ نے ترتیب دیا تھا۔ کتاب بہت غلط چھپی ہے۔ کل صفحات ۱۷۶ ہیں مگر اس کے صفحہ ۱۶۴ پر "تمام شد" لکھ کر یہ عبارت درج کی گئی ہے:

"الحمد للہ.... انتخاب دیوان ہر سہ شعراء ..... ذوقؔ.... غالبؔ
... مومنؔ دریں چند اوراق حسب فرمائش لالہ جے زرین صاحب سوداگر کتب
در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی بحسن اہتمام میرزا امو جان حلیۂ
انطباع پوشید۔ بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری (۲۴ اگست ۱۸۶۲ء)
تمام شد۔"

صفحہ ۱۷۶ پر خاتمے میں مزید اطلاع دی گئی ہے:

"در خدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ سہ جزو کتاب ہذا از جانب شرع در مطبع دیگر اولاً طبع شدہ بود و بعد از سہ جزو تا تمام در مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط الراقم بندہ امو جان مہتمم مطبع احمدی۔"

اتفاق سے میرے غالبؔ کلکشن میں یہ چھیوں ایڈیشن موجود ہیں۔

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم آثارِ جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں اسافل و عالی باہم ہے اب کے شبِ قدر و دِوالی باہم

مگر : دونوں دلیلیں ضعیف ہیں۔ دیوان کے سرورق پر یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ اکتوبر ۱۸۴۱ء طباعتِ دیوان کی تاریخِ آغاز ہے۔ اگر تاریخ آغاز کی نشان دہی منظور ہوتی تو دن کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح رباعی سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شبِ قدر اور دیوالی کے اجتماع کی تاریخ گزر چکی ہے۔ اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے بڑے آپس میں اس لیے خوش (ہو کر گلے مل رہے) ہیں کہ اب کے شبِ قدر اور دیوالی بھی ایک ہی تاریخ گویا ہم (بغل گیر ہونے والی) ہیں۔ رباعی یقیناً ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر سے پہلے لکھی گئی ہوگی۔ ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو دور از قیاس ضرور ہے کہ طباعت سے مہینوں پہلے مسودے کی کتابت کروائی گئی ہو اور طباعت کے دوران میں یکایک ایک رُباعی کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ چھپے ہوئے دیوان میں یہ رُباعی جس مقام پر ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام مسودہ ایک ہی قلم سے سلسلہ وار لکھا گیا تھا۔

دیوان میں درج شعروں کی تفصیل یہ ہے :

غزلیات کے اشعار	۹۹۸
۲ مصرعے جو غزل میں چھپنے سے رہ گئے، مگر غلط نامہ میں موجود ہیں[۱]	۱
قصیدوں، قطعوں، رباعیوں کے اشعار	۹۷
	۱۰۹۶

ص ۵۹ پر چھپے تین شعر حقیقت میں اس قطعے کے ہیں جو ص ۱۰۰ پر درج ہے اور دو بار شامل ہو گئے ہیں[۲]۔ اس طرح مجموعی تعداد اشعار ۱۰۹۳ رہ جاتی ہے۔

بقیہ حوالہ صفحہ گزشتہ : عرشی صاحب مرحوم اس رباعی کے پیشِ نظر لکھتے ہیں :

"... شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں میرزا صاحب کا دیوان اس مطبع (سید الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا اور ۲۷ رمضان (۱۲ نومبر) تک زیرِ طبع رہا۔ تاریخ آغاز سرورق پر مذکور ہے اور ۲۷ رمضان تک اختتام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ رباعی بھی شامل ہے :

ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

اور از روئے حساب دیوالی اور شبِ قدر کا اجتماع اسی تاریخ کو ہوا تھا۔"

۱ دیوانِ غالب ص۱۹۔ غزل کا پہلا مصرعہ یہ ہے "یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا"

۲ "کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں" معلوم ہوتا ہے اس شعر کو قطعے سے الگ کر کے باقی تین شعروں کو غالب نے عمداً غزلوں میں درج کیا تھا، بعد میں مکمل قطعہ بھی شامل کر لیا۔ مگر غزلوں میں سے تین شعر خارج کرنا بھول گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ غلطی درست کر لی گئی۔

آج کل نئی دہلی

اب اگر معلوم ہو کہ یہ ۱۰۹۳ اشعار کم از کم ۲۹۵۴ اشعار سے منتخب کیے گئے ہیں[۳] تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ غالب نے اپنے "دیوانِ ریختہ" کو "در ناتمامی، تمام" کیوں کہا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ دیوان صرف چھاپنے کی حد تک مکمل ہے حقیقت میں مکمل نہیں کیوں کہ منتخب ہے۔

غالب کے دیوانِ ریختہ کے پانچوں ایڈیشنوں میں ان کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ شامل ہے، مگر اس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ دیوانِ غالب (نظامی بدایونی طبع ثانی)[۴] میں پہلی بار یہ تاریخ درج کی گئی ہے۔ نظامی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے، جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے، اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بہ زبانِ فارسی مصنف نے لکھا ہے کہ جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہ درج کیا گیا ہے...."

اس ایڈیشن میں غالب کے دیباچے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے

"دیباچہ جو خود مصنف نے وقتِ ترتیبِ دیوانِ ہٰذا بزبان فارسی لکھا۔"

آخر میں تاریخِ دیباچہ[۵] اس طرح درج کی ہے :

"بست و چہارم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۸ھ"

جو مطابق ہے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کے۔

نظامی مرحوم کو وہ دیوان جس میں یہ دیباچہ معہ تاریخِ تحریر درج ہے — کہاں سے ملا تھا؟ اس کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی کتاب میں شائع شدہ ایک خط کے ذریعے ملتی ہے۔ جو نظامی مرحوم نے سر اکبر حیدری کے نام ۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا[۶]۔ نظامی فرماتے ہیں :-

---

۳ دیکھیے میرے مرتبہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۳۳ء تک کے اشعار۔

۴ اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء ص ۵۷ اور متنِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔

۵ اردو دیوانِ غالب مع شرحِ نظامی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء ص : ۵۷ اور متنِ دیوانِ غالب سے ایک صفحہ پہلے۔

۶۔ غالب از ڈاکٹر سید عبد اللطیف (انگریزی سے ترجمہ) مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۳۲ء ص : ۱۳۵

"قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے ...... ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعے سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا..."

چند لفظی ترامیم[۶] سے قطع نظر نظامی بدایونی کا نقل کردہ دیباچہ وہی ہے جو آٹھ سال کے بعد (۱۸۴۱ء) سے شائع ہونے والے پانچوں ایڈیشنوں میں شامل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ دیوانِ غالب لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے میں طباعت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو اس کا دیباچہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کرنا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا — دیباچہ تو لکھا گیا مگر مسودہ کاتب کے حوالے نہیں کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ ابھی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرّ و رخشاں نے اس کی تقریظ مکمل نہیں کی تھی۔ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ[۱] (۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء تک ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس میں غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی ملا کر کل اشعار "یک ہزار و ہفتاد و اند" تھے[۲] یعنی ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر (۱، ۲، ۳ سے ۹ تک کچھ بھی) لیکن جب دیوان، دیباچہ و تقریظ کے ساتھ چھپنے کے لیے دیا گیا تو اس میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ۱۰۹۶ شعر[۳] چھپے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء تک دیوان کے اشعار ۱۰۷۱ تھے[۴]۔ بعد میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا[۵]۔

یہ ۲۷ شعروں میں سے لیے گئے تھے۔ تقریظ مشمولۂ دیوانِ مطبوعہ میں لفظی تغیر و تبدل بھی ہوا اور مختلف ایڈیشنوں میں سنین اور تعدادِ اشعار میں ترامیم[۶] بھی ہوئیں۔

۱۸۳۳ء کے بعد جن ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں:

دیوانِ غالب ص ۵۳	دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو	۹ شعر نسخہ بدایون ۱۸۳۸ء	
ص ۵۸	تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۲ شعر حاشیہ ایضاً بعد از ۱۸۳۸ء	
ص ۶۵	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب	۱ شعر گلشن بے خار اپریل ۱۸۳۵ء	
ص ۸۴	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۳ شعر نسخہ بدایوں حاشیہ بعد از ۱۸۳۸ء	
ص ۸۶	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۴ شعر۔ ایضاً	
ص ۱۰۰	گئے وہ دن کہ ناداستہ غیروں کی وفاداری	۲ شعر۔ ایضاً	
ص ۱۰۴	بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال	۲ شعر۔ ایضاً	
ص ۱۰۴	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	شعر شب قدر و دو الیٰ باہم	

۲۵ شعر ۱۸۴۱ء

مندرجہ بالا سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ دیوانِ غالب اوّلین طباعت کے لیے لگ بھگ ۱۸۳۳ء کے پہلے سہ ماہے تک مکمل ہو چکا تھا

۲۔ اس میں ۱۰۷۱ اشعار تھے۔

میرے ترتیب دیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے "بابِ تعارف" میں ۱۸۳۳ء تک متداول دیوان کے لیے منتخب اشعار کی تعداد ۱۰۷۳ آتی ہے تاہم دیوانِ غالب پہلے ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ۱۸۳۳ء تک ۱۰۷۱ اشعار ہی شامل کیے گئے تھے۔ "جمع خرچ" کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

۱۸۳۳ء تک دیوان کے لیے منتخب اشعار ۱۰۷۳

---

۱ مثلاً طباعت کے وقت 'در خاکسترِ خویش' کو 'بہ خاکسترِ خویش'، 'کم مایہ' کو 'اندک مایہ' لکھا ہے۔

۲ آثار الصنادید: مطبوعہ نول کشور جون ۱۸۷۶ء باب چوتھا ص ۸۵ "سنہ مقدسہ ہجریہ نبویہ یک ہزار و دویست و پنجاہ و چار..."

۳ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ۸۶

۴ دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) تقریظ میں تعدادِ اشعار "ہزار و نود و ہشت اند" لکھا ہے، جو غلط ہے۔

۵ و ۶ دیکھیے میرے مرتبہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ۱۸۰۷ء سے ۱۸۴۱ء تک کے ت نشان والے اشعار۔

۷ ایک شعری ترمیم دلچسپ ہے۔ تقریظ میں شامل مثنوی کا تیسرا شعر آثار الصنادید میں اس طرح ہے: "ہیں فرزندِ آبائے علوی، ہیں شاگردِ روح القدس عالی" اس کے مصرعِ ثانی کو دیوانِ غالب (پہلا ایڈیشن) میں یوں کر دیا ہے ؎ "دم روح القدس در کشتِ معنی" پھر بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شکل دے دی ہے۔ ؎ "ہیں شاگردِ عقلِ کلِ عالی"

۸
بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پانو

یہ شعر بعد میں متداول دیوان سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اب متداول دیوان میں اس غزل کے ۹ کے بجائے ۸ شعر شامل ہیں۔

متداول دیوان میں قصیدہ " ساز یک ذرہ ... کے
۳۸ شعر ہیں مگر پہلے ایڈیشن سے ۳ شعر محذوف ہیں — ۳ / ۱۰۷۰

ع خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۲۹/۳۰) میں نہیں — ۱ / ۱۰۶۹

ع سیاہی جیسے گرجائے دمِ تحریر کاغذ پر!
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

یہ دو شعر بھی پہلے ایڈیشن میں نہیں — ۲ / ۱۰۶۷

ع ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم
ہر موجِ گردِ راہ، مرے سر کو دوش ہے

یہ شعر پہلے ایڈیشن (ص ۲۷) میں ہے بعد میں حذف ہوا — ۱+ / ۱۰۶۸

قطعے کے شعر جو پہلے ایڈیشن میں ص ۵۹ اور
ص ۱۰۰ پر دوبارہ چھپ گئے " کلکتہ کا جو ذکر ..." میزان — ۳± / ۱۰۷۱

۳۔ یہ اشعار ۴۲۹۵ اشعار میں سے منتخب ہوئے تھے (بعد میں ۱۸۴۱ء تک فکر کردہ) ۲۷ اشعار میں سے ۲۵ اشعار مزید منتخب ہوئے۔ ان ۲۷ شعروں کے اضافے سے اس وقت تک کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد ۱۸ ۲۹ ہو گئی

۴۔ اس کا دیباچہ غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو ختم کیا۔

۵۔ تقریظ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں نے ۲۸ مارچ ۱۸۳۸ء اور ۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت لکھی۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ ۱۸۳۸ء ہی میں لکھی۔

۶۔ طباعتِ دیوان کے وقت اس میں ۲۵ اشعار کا اضافہ ہوا اور کل شعر ۱۰۹۶ ہو گئے۔ (کاتب نے ایک غزل کے دو مصرعے حذف کر دیے تھے، جس کی وضاحت "غلط نامہ" میں موجود ہے۔ اس طرح اشعار جو متن میں موجود ہیں، شمار میں ۱۰۹۵ ہیں۔ مگر حقیقت میں ۱۰۹۶ ہیں۔ ۳ شعر دو بار درج ہوئے۔ وہ کم کیے تو دیوان کا مواد ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل رہ گیا)

۷۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء کو " دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ" (مطبع سید الاخبار) میں چھپا۔

دیوانِ غالب (طبع اوّل) بہت کم یاب ہے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں[۱]۔

---

[۱] ذکرِ غالب طبع پنجم ص ۱۶۶

"ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ خدا معلوم اب کہاں ہے۔ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کا نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ میں آگیا ہے۔ ایک مکمل نسخہ صولت پبلک لائبریری، رام پور میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے کتب خانے میں ہے۔"

جنابِ عرشی مرحوم صولت پبلک لائبریری رام پور کے نسخے کے بارے میں لکھتے ہیں[۱]:

"سرورق کی پہلی سطر کے آخر میں لفظ تخلص کے اوپر سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔"

میرے کتب خانہ میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رام پور والے نسخے کا عکس بھی موجود ہے۔ جب تک میں نے عرشی صاحب کا بیان نہیں پڑھا تھا اور صولت پبلک لائبریری والے نسخے کا عکس نہیں دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سرورق کے لفظ 'تخلص' پر بے معنی سا نشان حقیقت میں سید محمد خاں کے دستخط ہیں۔ بہرحال مجھے یہ بتاتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ میرے دو نسخوں میں سے ایک پر بعینہٖ یہی دستخط اسی جگہ موجود ہیں۔ وجہ نامعلوم۔

دیوان ۱۰۹ صفحوں کو محیط ہے۔ پہلا صفحہ سرورق کا ہے۔ دوسرا صفحہ خالی ہے۔ صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آگیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے۔ اس طرح پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔

یہ ایڈیشن نہایت کم یاب ہیں۔ اب (۱۹۸۶ء میں) میں نے اس کا عکسی ایڈیشن شائع کر کے اُسے عام کر دیا ہے[۲]

۲۔ دوسرا ایڈیشن (۱۸۴۷ء)

جنابِ عرشی مرحوم دیوانِ غالب اردو (پہلی بار) ۱۹۵۸ء ص ۹۷ (دیباچہ) میں دوسرے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

نیّر کی تقریظ میں تاریخ ۱۲۵۴ھ ہی ہے مگر اشعار کی تعداد 'یک ہزار و یک صد واند' بنا دی گئی ہے گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کُل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں (پہلے اور

---

[۱] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۱۲۸ مقدمہ

[۲] میں نے "دیوانِ غالب عکسی مطبوعہ ۱۸۴۱ء" یعنی دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن کو شائع کرتے وقت جو پیش لفظ لکھا تھا اس کے ص (ر) پر نئی معلومات کی روشنی میں اعداد و شمار کی حد تک کچھ رد و بدل کیا ہے، اس لیے ان سے جن کے پاس میرے شائع کردہ ایڈیشن کا نسخہ ہو، گزارش ہے کہ وہ اس دیباچے کے پیشِ نظر اپنے نسخہ میں ترمیم کر لیں۔

دوسرے) کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نواب
تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے جس کے
۱۴ شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۹۶ پر عرشی صاحب کہہ چکے ہیں کہ پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۹۸ یا (۳ شعر جو دوبارہ چھپ گئے ہیں کم کر کے) ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں (۱۰۹۸ + ۱۴) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۵ + ۱۴) ۱۱۰۹ شعر ہوئے۔

پھر اسی دیوان کی اشاعت دوم (۱۹۸۲ء ص ۱۳۲ مقدمہ) میں وہی بات دہراتے ہیں۔ صرف یہ ترمیم کرتے ہیں کہ "۱۴ شعر" کی جگہ "۱۶ شعر" بنا دیتے ہیں۔ جس کا سبب بیسنی روٹی والا دو شعر کا قطعہ ہے جو پہلے ان سے گنتی میں چھوٹ گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کے اشعار کے شمار میں جو سہو ہو گیا تھا وہ بھی دیباچے کے ص ۱۳۱ پر درست کر لیا گیا ہے۔ اب شعر ۱۰۹۶ یا (۳ شعر کم کر کے) ۱۰۹۳ دیے گئے ہیں۔ جو قطعی درست ہے، مگر عرشی صاحب کی اس ترمیم کے باوجود دوسرے ایڈیشن میں اب بھی تعدادِ اشعار وہی رہی یعنی (۱۰۹۶ + ۱۶) ۱۱۱۲ یا (۱۰۹۳ + ۱۶) ۱۱۰۹ شعر۔

جناب مالک رام بھی دیوانِ غالب (تاریخ اشاعت فروری ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر 'تعارف' میں دوسرے ایڈیشن کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۱ بتاتے ہیں پھر دیوانِ غالب صدی ایڈیشن (جو ظاہر ہے ۱۹۶۹ء ہی کی تالیف ہے) کے ص ۱۹ پر رقم طراز ہیں:

"اس نسخے میں (۱۱۱۱) شعر ہیں یعنی طبع اوّل سے ۱۶ زیادہ
ایک تو وہی بیسنی روٹی والا دو شعروں کا قطعہ ہے۔ دوسری
"جاں کے لیے" کی زمین کی آخری غزل، جس میں نواب
تجمل حسین خاں کی مدح کا قطعہ ملتا ہے۔ اس میں چودہ
شعر ہیں۔"

اس سے پہلے ص ۱۶ پر جناب مالک رام بھی پہلے ایڈیشن میں (۱۰۹۸-۳) ۱۰۹۵ اشعر ہی بتاتے ہیں اس طرح اس تعداد میں ۱۶ اشعار کا اضافہ کر کے میزان (۱۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بھی جناب مالک رام "گفتارِ غالب" (ص ۱۶۷ اور ۱۶۹) میں یہی بات دہراتے ہیں۔

عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کی دونوں اشاعتوں میں دعوا کیا ہے کہ وہ دیوانِ غالب کے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے ایڈیشنوں کے مقابلے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی تعدادِ اشعار ۱۱۱۲ یا ۱۱۰۹ ہے یعنی پہلے ایڈیشن کے تمام کے تمام ۱۰۹۶ یا ۱۰۹۳ اشعار اور ۱۶ مزید اشعار مل کر دوسرے ایڈیشن کا کل اثاثہ بنتے ہیں۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "چھے برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل سولہ شعر کہے تھے"۔

عرشی صاحب معتبر ترین محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں، اس لیے جناب مالک رام نے عرشی صاحب کے دعوے کو من و عن تسلیم کر لیا، مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عرشی صاحب دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی بڑی چوک کیونکر کر گئے۔
اب حقیقتِ حال ملاحظہ فرمائیے:

- پہلے ایڈیشن کے کل شعر ۱۰۹۶
- "ساکنۂ کاجوزکی . . ." والے قطعے کے شعر جو سہواً دوبارہ چھپ گئے — ۳
۱۰۹۳

- یہ دو شعر پہلے ایڈیشن میں ہیں مگر دوسرے میں نہیں

ع دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں (ص ۴۹)

لے جا رہے کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں (ص ۵۳) — ۲
۱۰۹۱

گویا دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے ۱۰۹۶ نہیں بلکہ ۱۰۹۱ اشعار ضم ہوئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ دوسرے ایڈیشن میں نئے شعر کتنے لیے گئے۔

- قطعہ ع نہ پوچھ اس کی حقیقت . . . بیسن کی روغنی روٹی
- غزل ع نویدِ امن ہے بیدادِ دوست، جاں کے لیے
- غزل ع کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
- غزل ع ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں۔
- غزل ع ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
- غزل ع کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
- پہلا ایڈیشن ص ۲۵۔ غزل۔ ایک شعر کا اضافہ ہوا

ع محابا کیا ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!

- پہلا ایڈیشن ص ۲۹۔ غزل میں ایک شعر کا اضافہ

ع خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

- یہ شعر دیوان میں بڑھایا گیا ع

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

(دوسرے ایڈیشن میں سہواً ہجراں کی جگہ بجاں چھپ گیا ہے)

- پہلا ایڈیشن ص ۹۵ "منتخب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام"۔ اس سے تین شعر حذف کر دیے گئے تھے، اب وہ دوسرے ایڈیشن میں بحال کر دیے گئے ہیں۔ محذوف اشعار کے شروع کے لفظ یہ ہیں:

۱۔ وہ شہنشاہ ۲۔ فلک العرش ۳۔ سبزہ نہ چمن

میزانِ اشعارِ نو جو داخلِ دیوان ہوئے ۳/۶۷

میزانِ اشعار (پہلا ایڈیشن) ۱۰۹۱

دیوانِ غالب (دوسرا ایڈیشن) کے کل اشعار ۱۱۵۸

کل صفحات ۹۸ ہیں۔ دیوان "بہ تصحیح و مقابلہ جناب صدر المدح (یعنی مرزا اسداللہ خاں بہا در المتخلص بہ غالب و اسد) در مطبع دار السلام واقع محلہ حوض قاضی مبینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین لکھنوی طبع ہوا۔

مطبع دار السلام کو مطبع صادق الاخبار بھی کہتے تھے کیوں کہ اس نام کا ایک اخبار اس میں چھپتا تھا۔ اسی مطبع سے ۱۸۴۵ میں مرزا کا دیوانِ فارسی کا پہلا ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔

۳۔ تیسرا ایڈیشن (۱۸۶۱ء)

دیوانِ غالب کا یہ ایڈیشن ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو مطبع احمدی میں واقع دلہائی امو جان کے اہتمام سے ... طبع ہوا۔" یہ دیوان بہت غلط چھپا۔ چنانچہ غالب اپنے خط مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۶۱ء بنام میر مہدی مجروح لکھتے ہیں :

" دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا ....
دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت!
صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ بہرحال نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا امو جان مطبع شاہدرے میں محمد حسین خاں دلی شہر رائے مان کے کوچے میں مصوروں کی حویلی کے پاس قیمت کتاب ۶ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمے ـــــ"

اس ایڈیشن میں ۱۷۹۶ شعر ہیں۔ گویا ۱۸۴۸ تا ۱۸۶۱ء غالب نے ۶۳۸ اشعار مزید منتخب کر کے اس میں شامل کیے۔ یہ وقفہ چودہ سال کا ہوا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ یہ تمام (۶۳۸) اشعار اُن اشعار میں سے ملتخب ہوئے ہیں جو ۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی عرصے یعنی ۸ سال میں کہے گئے۔ اس کی تفصیل میرے مرتب کیے ہوئے "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۴۔ چوتھا ایڈیشن (۱۸۶۲ء)

غالب تیسرے ایڈیشن سے غیر مطمئن تو تھے ہی چنانچہ اُنہوں نے اس ایڈیشن کے ایک نسخے کو اپنے ہاتھ سے "دو رات دن کی محنت میں" صحیح کیا[1] اور محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی دہلی کے سپرد کیا تاکہ وہ اب ایک طرح کے اس نئے مسودے کو کیوں کہ اس میں ۶ شعر کا اضافہ بھی کر دیا تھا، کسی دوسرے چھاپہ خانہ سے طبع کرا دیں۔ چنانچہ چوتھے ایڈیشن کے ص ۱۰۴ پر "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے یہ تحریر درج ہے :

"بخدمت اربابِ سخن عرض کرتا ہے .... محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں .... کہ اس سے پہلے دیوان ....
جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا، لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا .... اس لیے جناب .... محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظرِ ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی' ایک نسخہ میرے پاس بھیجا .... میں نے .... مطابق اس نسخے کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ھ (جون/جولائی ۱۸۶۲ء) مطبع نظامی واقع شہر کان پور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھپایا ....."

مگر باوجود حزم و احتیاط کے دعوے کے کتاب میں متعدد غلطیاں راہ پا گئیں۔ جن سے کئی مقامات پر املا اور مطلب میں اُلجھاؤ پیدا ہو گیا، جس سے ظاہر ہے کہ پروف اور کاپیاں ٹھیک سے نہیں دیکھی گئی تھیں۔ جیسے :

ـــــ خوناب کو ہر جگہ خونناب لکھا گیا ہے (ص ۷، ۱۱، ۲۰ وغیرہ)

ـــــ ننگ سجدے بجائے ننگِ سجدہ (ص ۱۸)

ـــــ پہلو اندیشہ اصل پہلوے اندیشہ (ص ۸)

ـــــ حق ناسپاس بجائے حق ناشناس (ص ۴۶)

ـــــ پھر بھر رہا ہے ۔ بھر رہا ہوں ہونا چاہیے (ص ۸۲)

ـــــ گدا سمجھ کے وہ خوش تھا مری خوشامد سے ۔ مری جو شامت آئے کی جگہ (ص ۸۴)

ـــــ بھر کے بھیجیں ہیں ۔ بھیجے ہیں کی جگہ (ص ۹۳)

ـــــ میرے ایہام بجائے ابہام (ص ۹۵)

ـــــ قاصر ہے شکایت میں ۔ ستائش کی جگہ (ص ۹۸)

اس ایڈیشن میں وہ تمام (۱۷۹۶) شعر لیے گئے ہیں جو تیسرے ایڈیشن میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ چھ شعروں کا اضافہ بھی کر دیا۔ تین شعر ص ۷۷ پر درج

---

[1] یہ الگ ایک داستان ہے جو بہت جگہ دہرائی جا چکی ہے اس لیے یہاں اسے حذف کیا جاتا ہے۔

ہیں ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

جو ۱۸۵۷ء میں کہے گئے تھے اور سات اشعار کی ایک غزل سے انتخاب کیے گئے تھے۔
اور تین شعر ص ۲۷ پر ہیں ؎

کیوں کہ اس بت سے رکھوں جان عزیز

جو ۱۸۶۲ء میں کہے گئے تھے۔ ان میں مطلع اور مقطع دونوں موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کے اس ایڈیشن کی اشاعت تک اس غزل کے یہی تین شعر تخلیق ہوئے ہوں گے۔ اس طرح اس ایڈیشن کے کُل اشعار ۱۸۰۲ ہو گئے اور غالب کا یہی کلام، کلام متداول ہے۔

۵۔ پانچواں ایڈیشن (۱۸۶۳ء)

یہ ایڈیشن محض سالِ اشاعت (۱۸۶۳ء) کی وجہ سے پانچواں ایڈیشن ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے تیسرا یا چوتھا ایڈیشن کہنا چاہیے کیوں کہ اس کا مسودہ غالب نے ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو شیو نارائن کو بھیج دیا تھا اور تیسرے ایڈیشن (جولائی ۱۸۶۱ء) کے بعد اور (قیاس ہے کہ) دسمبر ۱۸۶۱ء تک یہ چھپنا بھی شروع ہو چکا تھا، جس کا ثبوت وہ خط ہے جو غالب نے شیو نرائن آرام کو ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو معذرت نامے کے طور پر بھیجا تھا۔ اب جب کہ دیوانِ غالب کے پے در پے دو ایڈیشن (۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء) شائع ہو چکے تھے، منشی شیو نرائن (آرام تلمیذ غالب) کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اس دیوان کی اشاعت کو چندے اور روک لیتے۔ آخر کار یہ ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"العلم قوۃ

دیوانِ غالب ۱۸۶۳ء

مطبع مفید خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیو نرائن کے چھپا۔"

اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں یعنی تیسرے ایڈیشن سے ایک شعر کم۔ وہ شعر یہ ہے ؎

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اس ایڈیشن کو اعلیٰ طباعت اور جدید املا کے التزام کے سبب باقی سب ایڈیشنوں پر برتری حاصل ہے۔

غالب کے متداول اُردو کلام میں ۱۷۹۶ شعر وہ ہیں، جو انہوں نے ۱۸۵۵ء تک کے کہے ہوئے اشعار سے منتخب کیے تھے۔ اس کے بعد دمِ آخر تک اُنہوں نے مزید ۳۰۴ ۱۴۰ اشعار تخلیق کیے[1] ان میں سے چھ شعر وہ جو ۱۸۶۲ء میں چھپے ہوئے دیوانِ غالب (چوتھا ایڈیشن۔ نظامی کانپور) میں شامل کیے گئے اور ۱۳۳ اشعار قادرنامے کے اور مُہا کر دیکھیے، جو ۱۸۵۶ء میں مطبع سلطانی دہلی سے چھپا تھا۔ اس طرح باقی ۲۶۴ اشعار بچے جو غیر مطبوعہ رہے ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۱	قطعے	۶۶ شعر
۴	قصیدے	۱۱۰ شعر
۵	غزلیں	۵۳
	متفرق/غزلیات	۱۵
۳	رباعیاں	۶
	مرثیہ	۹
	مثنوی	۳
	سہرا	۲

میزان ۲۶۴ شعر

اگر غالب چاہتے تو ۱۸۶۳ء کے بعد اپنی آخری عمر میں ان ۲۶۴ اشعار میں سے مزید دو سو شعر منتخب کر کے دو ہزار اشعار پر مشتمل اپنے اردو دیوان کا چھٹا ایڈیشن بھی نکال سکتے تھے لیکن تب دیوانِ اردو کے بجائے اُنھوں نے اپنے دوسرے اردو فارسی کلام نظم و نثر کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ مئی جون ۱۸۶۳ء میں دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں مثنوی ابرِ گہر بار اکمل المطابع دلّی سے شائع ہوئی۔ اسی سال مجلس پریس دلّی سے "قادر نامہ" دوسری بار چھپا۔ اسی سال 'لطائف غیبی' ظہور میں آئی۔ ۱۸۶۵ء میں سوالاتِ عبدالکریم، اگست ۱۸۶۵ء میں نامۂ غالب اسی سال 'دستنبو' کا دوسرا ایڈیشن مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی سے اور دسمبر ۱۸۶۵ء میں 'قاطع برہان' کی طبع ثانی بعنوان 'درفش کاویانی' کی اشاعت ہوئی۔ تقریباً ۱۸۶۷ء میں 'دعائے صباح' کا منظوم ترجمہ فارسی مطبع نولکشور لکھنؤ سے اور فروری ۱۸۶۷ء میں نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب مطبع سراجی دلّی سے اور اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی دلّی سے 'سبد چیں' چھپی۔ جنوری ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے 'کلیاتِ نثر فارسی' اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو 'عودِ ہندی' (مجموعۂ مکاتیبِ غالب) مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

بڑھاپا، برہان قاطع کا قضیہ، مقدمۂ ازالۂ حیثیتِ عرفی، مالی بدحالی جیسی جان لیوا پریشانیاں اور اس پر کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا یہ زبردست اشاعتی پروگرام اب یہ توقع رکھنا کہ وہ دیوانِ غالب اردو کا چھٹا ایڈیشن بھی شائع کرا دیتے، ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ تمنا کرنا کہ:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

"نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ نواب محمد اسد اللہ بیگ خاں بہادر عرف میرزا نوشہ المتخلص بہ اسد و غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء روز دوشنبہ دوپہر ڈھلے انتقال فرمایا ؎ "ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک" ●●

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مرتب کیا ہوا "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے"

مرزا اکبر علی بیگ

شاہ نصیر دہلوی اور حیدرآباد

شاہ نصیر اردو میں اپنے رنگ کے منفرد غزل گو شاعر ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر گوئی، مشکل سے مشکل ردیف و قوافی میں طبع آزمائی ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ زبان کی درستی و اصلاح کی طرف شاہ نصیر نے خاص توجہ کی۔ اسی وجہ سے شاہ نصیر کو "دہلی کا ناسخ" بھی کہا جاتا ہے۔

شاہ نصیر کا پورا نام محمد نصیر الدین تھا چونکہ ان کی رنگت بہت سیاہ تھی اس لیے خاندان کے افراد ان کو "میاں کلو" کہتے تھے۔ قد لمبا تھا۔ قدرت اللہ قاسم کے الفاظ میں :

> "چہرے بشرے سے وہ نہ ہی شاعر نظر آتے تھے اور نہ —
> پڑھے لکھے انسان معلوم ہوتے تھے۔"[1]

شاہ نصیر کے والد شاہ غریب اللہ ایک نیک سیرت بزرگ تھے "شاہ" جو اُن کے نام کا جزو بن گیا سلسلۂ سادات سے ان کی نسبت اور تصوف سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ شاہ غریب اللہ، شاہ صدر جہاں کے فرزند تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد شاہ غریب اللہ اُن کی درگاہ کے سجادہ نشیں ہوئے۔

شاہ نصیر کی تاریخ پیدائش کا قطعی طور پر تعین نہیں ہو سکا۔ انتخاب شاہ نصیر کے مرتب حافظ اکبر میرٹھی نے انھیں مہاراجہ چندو لال شاداں کا ہم عمر قرار دیا ہے[2] شاداں ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں شاہ نصیر کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں جن سے ان کی عمر کا اندازہ ہوتا ہے :

> " از شصت سال بہ مشق سخن می پردازد "[3]

تذکرۂ گلشن بے خار کا زمانۂ تالیف ۱۲۴۸-۵۰ ہجری ہے۔ اس وقت شیفتہ کی معلومات کی بنا پر شاہ نصیر کو شاعری کا آغاز کیے ہوئے ۶۰ سال گزر چکے تھے۔ اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہ نصیر نے ۱۱۹۰-۹۲ھ کے مابین شاعری شروع کی اگر اس وقت اُن کی عمر پندرہ اور بیس سال کے درمیان تسلیم کی جائے تو ان کی تاریخ پیدائش ۱۱۷۰ھ م ۱۷۵۷ء اور ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء کا درمیانی زمانہ ہوگا۔ ان قیاس آرائیوں کے سوا تلاش و تحقیق کے باوجود راقم الحروف کو ایسا مواد دستیاب نہیں ہو سکا جس سے شاہ نصیر کی تاریخ پیدائش کا قطعی طور پر تعین ہو سکے۔

شاہ نصیر کا وطن مالوف دلی تھا۔ وہ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے اس لیے ان کی پرورش بہت لاڈ و پیار سے ہوئی تھی۔ شاہ نصیر کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ان کے والد نے خصوصی توجہ دی۔ ابتدائے عمر سے وہ شاعری کی طرف مائل تھے۔ اس لیے تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ وہ ایک خوشحال اور آسودہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ممکن ہے کہ والد کی بے وقت موت نے تحصیل علم کی طرف سے توجہ ہٹا دی ہو اور پھر وہ شعر و سخن کی طرف مائل ہو گئے ہوں۔ ان کے والد نے ہر چند تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا لیکن سوائے شاعری کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شاہ نصیر شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے[4] مائل، قائم کے شاگرد تھے۔ قائم نے درد اور سودا سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح شاہ نصیر کا سلسلہ درد اور سودا تک پہنچتا ہے وہ سودا کی طرح واہ کے شاعر تھے، میر کی طرح آہ کے شاعر نہیں تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ خواجہ میر درد کا رنگ اپناتے، اس کے لئے

---

[1] مجموعہ نغز، لاہور ۱۹۳۳ء ص ۲۷۲

[2] انتخاب شاہ نصیر، میرٹھ ۱۲۹۴ھ ص ۳

[3] تذکرۂ گلشن بے خار، دہلی ۱۸۳۸ء ص ۲۲۲

[4] مجموعہ نغز لاہور ۱۹۳۳ء ص ۲۷۲

● مکان نمبر ۲/۱۰۳۲-۹-۵، حیدر گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

ایک معقول وجہ یہ تھی کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں تصوف اور پیری مریدی کا سلسلہ رائج تھا۔ مگر افتادِ طبع کے اعتبار سے وہ شاید سوداؔ سے قریب تھے۔ سوداؔ اور دردؔ کی وساطت سے انھوں نے شاہ عالم کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ شاہ عالم ہی کے دور میں ان کی شاعری کو فروغ ہوا تھا پھر وہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے استاد بھی مقرر ہوئے[1] یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلیہ خاندان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دہلی میں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی شاہ عالم کی سلطنت کے بارے میں یہ ضرب المثل خاص و عام کی زبان پر تھی "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم"۔ امرا اور اعلیٰ عہدہ دار سازشوں میں مصروف تھے ان پر آشوب حالات نے خواص اور عوام کو پریشان کر رکھا تھا۔ شاہ نصیر ان پر آشوب حالات میں بھی ایک عرصہ تک دلی میں رہے۔ ان کو دربار دہلی اور شاہ عالم سے بڑی محبت تھی، لیکن بالآخر انھوں نے دلی کو خیرباد کہنے کا تصفیہ کر لیا۔ محمد حسین آزادؔ نے شاہ نصیر کے ایک قطعہ حسنِ طلب کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے شاہ عالم کے دربار میں پیش کیا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا شاہ نصیر کو ایک گرم دوشالے کی شدید ضرورت تھی۔ حسن طلب ملاحظہ ہو:

بچائے گا تو ہی اب میرے اللہ   کہ جاڑے سے بڑا بے ڈھب ہے پالا
پناہ آفتاب اب مجھ کو بس ہے   کہ وہ مجھ کو اڑھادے گا دوشالا

اس میں لطف یہ ہے کہ آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا۔ اگرچہ شاہ نصیر کو دربار شاہی سے باقاعدہ "ملک الشعرا" کا خطاب نہیں ملا تھا لیکن خیراتی لال جگرؔ لکھتے ہیں کہ:

"بندگانِ حضور سلطانی او را مخاطب بہ ملک الشعرا فرمودہ اند"[2]

جب شاہ نصیر نے ترکِ وطن کا تہیہ کیا تو اس وقت لکھنؤ اور حیدرآباد ہی علم و فن اور دولت و حکومت کے ایسے دو مرکز تھے کہ جو کوئی دلی سے نکلتا ان ہی دو مقاموں میں سے کسی ایک کا رخ اختیار کرتا۔ یہ بات قطعی طور سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کس سنہ میں دہلی سے حیدرآباد آئے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ چار دفعہ حیدرآباد آئے تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے شاہ نصیر کی حیدرآباد میں آمد کے بارے میں لکھا ہے:

"شاہ نصیر نواب اکبر علی خاں آصف جاہ ثالث کے عہد میں سنہ ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۴ء) کے قریب آئے"[3]

ڈاکٹر زورؔ سے پہلے محمد حسین آزادؔ نے شاہ نصیر کی حیدرآباد میں پہلی بار آمد کے تعلق سے لکھا ہے۔ "جب عمل داری انگریزی ہوئی تو انھیں دکن کا

[1] آب حیات لاہور ۱۸۸۰ء ص ۴۱۷
[2] تذکرہ بے جگر (مخطوطہ) ورق ۱۹۳ الف (انڈیا آفس لائبریری)
[3] نقوش "شاہ نصیر دہلوی" لاہور ۱۹۵۹ ص ۶

کا سفر کرنا پڑا"۔[1]

محمد حسین آزادؔ کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب شاہ نصیر نے پہلی بار حیدرآباد کا سفر کیا تو دہلی میں انگریزی عمل داری قائم ہو چکی تھی۔ انگریزوں نے ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۳ء میں دہلی کو فتح کیا۔ ۱۲۱۹ھ م ۱۸۰۴ء میں مرہٹوں کے حملے کی پسپائی کے بعد ان کی باقاعدہ عمل داری قائم ہوئی۔ ڈاکٹر زورؔ نے شاہ نصیر کی آمد کا سنہ ۱۲۴۰ھ م ۱۸۲۴ء بتایا ہے جو کہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ پہلی بار حیدرآباد آنے کے بعد یہاں کچھ عرصہ قیام کرکے وہ دہلی واپس ہو گئے۔ شاہ نصیر کے معاصر غلام حسین جوہر کے مطابق سنہ ۱۲۲۴ھ تک شاہ نصیر دو دفعہ حیدرآباد آئے۔[2] تیسری بار وہ کب حیدرآباد آئے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ چوتھی بار وہ مہاراجہ چندو لال شاداںؔ کی طلب پر ۱۲۴۵ھ م ۱۸۲۹ء میں حیدرآباد آئے تھے۔ مہاراجہ نے زادِ راہ کے لیے سات ہزار روپے بھیجے تھے۔[3]

مہاراجہ چندو لال شاداںؔ شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ شعرا کے مربی اور سرپرست تھے۔ دہلی کے شعرا پر مہاراجہ کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ محمد حسین آزادؔ لکھتے ہیں:

"کمال کی قدردانی اور سخاوت ان کی عام تھی مگر دلی والوں پر نظر پرورش خاص رکھتے تھے۔ اور بہت مروت سے پیش آتے تھے۔"[4]

شاہ نصیر دہلوی اور شاہ حفیظ دہلوی مہاراجہ بہادر ہی کی طلب پر حیدرآباد آئے تھے۔ خاقانیٔ ہند ذوقؔ اور ناسخؔ کو بھی مہاراجہ نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی۔ ذوقؔ حیدرآباد نہیں آسکے مگر معذرت کے طور پر اپنی ایک غزل مہاراجہ کی خدمت میں بھیجی تھی، جس کا مقطع بہت مشہور ہوا

گرچہ ہے ملکِ دکن میں آج کل قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

چوتھے سفر کے بارے میں صاحب گل رعنا نے لکھا ہے:

"چوتھی بار جانے کو تھے کہ چندو لال نے سات ہزار بھیج کر طلب کیا یہ جب وہاں پہنچے تو پچیس روپے یومیہ ان کا مقرر ہوا"۔[5]

[1] آب حیات ص ۴۱۷
[2] گلزار آصفیہ ص ۴۱۵
[3] گلزار آصفیہ ص ۵۰۱
[4] آب حیات ص ۴۹۸
[5] تذکرہ گل رعنا (عبدالحئی) اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء ص ۲۷۵

عبدالجبار ملکاپوری[1]، اور محمد عبداللہ[2] خاں ضیغم دونوں نے متفقہ طور پر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ شاہ نصیر چار مرتبہ حیدرآباد آئے تھے۔ تین مرتبہ حیدرآباد آنے کے باوجود شاہ نصیر حیدرآباد میں مستقل قیام نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ دہلی ہی کے شاعر حفیظ دہلوی اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے ملک الشعرا تھے۔ اس لیے ان کے مقابلے میں شاہ نصیر کی وہ قدر و منزلت نہ ہوسکی جس کے وہ خواہشمند تھے۔ ۱۲۴۷ھ م ۱۸۳۱ء میں حفیظ دہلوی نے وفات پائی۔ مہاراجہ کو حفیظ دہلوی کے مرتبہ کے استاد سخن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے شاہ نصیر کو طلب کیا۔ حیدرآباد آنے سے قبل شاہ نصیر دو مرتبہ لکھنؤ بھی گئے تھے اور وہاں کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ یہ آتش و ناسخ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی شاہ نصیر کے معرکے دوسرے شعرا کے ساتھ رہے۔ بیشتر شعرا نے شاہ نصیر کی آزمائش کے لیے مشکل طرحیں ان کے پاس بھیجیں۔ شاہ نصیر باوجود کہ بیمار تھے تاہم دم خم نوجوانوں کا تھا ان طرحوں پر غزلیں لکھیں اور مشاعروں میں سنائیں۔

حیدرآباد میں اس وقت قیس کی شاعری کا بڑا شہرہ تھا۔ اس عہد کے اکثر شعرا نے شاہ نصیر کی تقلید کی۔ ان کے رنگ کو اپنایا۔ صرف قیس ہی ایسے شاعر تھے جن کا کلام درباری رنگ سے پاک تھا۔ قیس، خواجہ میر درد کے رنگ میں لکھتے تھے۔ حیدرآباد کے شعرا و امرا شاہ نصیر کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کے سلسلۂ تلامذہ میں حیدرآباد کے شعرا بھی شامل تھے۔ دلی اور لکھنؤ سے زیادہ شاہ نصیر کے شاگرد حیدرآباد میں تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں کے یہاں اکثر مشہور و معروف شعرا جمع ہوتے تھے۔ شاہ نصیر اور حفیظ دہلوی کی نوک جھونک بعض مرتبہ مباحثے کا رنگ بھی اختیار کرلیتی[3]

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ چوتھی بار جب وہ حیدرآباد جارہے تھے تو کافی سن رسیدہ ہوچکے تھے۔ اس لیے ان کے شاگرد ذوق نے انھیں اس دور دراز سفر پر جانے سے منع کرنا چاہا لیکن شاہ نصیر نے اس کا جو جواب دیا اس سے حیدرآباد دکن کے ساتھ ان کی وابستگی اور لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے شاہ نصیر نے اس موقعہ پر کہا تھا:

" میاں ابراہیم وہ بہشت ہے بہشت میں جاتا ہوں چلو
تم بھی چلو "[4]

محمد حسین آزاد نے دکن جانے کے سلسلے میں ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ دلی سے روانہ ہوئے تو راستہ میں نواب جھجر کے یہاں کچھ دن قیام کیا۔ نواب صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ روانہ ہونے لگے تو نواب صاحب نے ان سے وعدہ لینا چاہا کہ جھجر کب آئیں گے۔ شاہ نصیر نے ہنس کر کہا تھا " جھجر کی چاہ تو دہی گرمی میں"[1]

جھجر شاہ نصیر نے ذو معنی استعمال کیا، جھجر کے ایک معنی ہیں مقام کے، دوسرے معنی ہیں مٹی کی ایک بڑی صراحی جس میں پانی ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔

شاہ نصیر کے حیدرآباد قیام کے دوران ان کے ہم عصر شعرا میں ماہ لقابائی چندا، محمد صدیق قیس، غلام مصطفےٰ خاں سخن، حامد علی بیگ ظہور، عباس علی خاں کافی، شیخ محمد حفیظ دہلوی، ذوالفقار علی صفا لکھنوی، ہمت علی خاں ہمت، تاج الدین مشتاق، مرزا علی لطف، میر احمد علی خاں شہید دہلوی اور غلام حسین جوہر قابل ذکر ہیں۔

شاہ نصیر کے شاگردوں میں قابل ذکر ذوق، مومن، اعظم، امیر، بیقرار عزیز، پریشان، رقم، شہوار، ذکار، سرور، کاظم، وفا، اور خود ان کے بیٹے شاہ وجیہہ الدین منیر ہیں۔

گارساں دتاسی کے مطابق خوب چند ذکا نے اپنے استاد شاہ نصیر کی فرمائش پر تذکرہ عیار الشعرا لکھا[2] اس تذکرہ میں سعادت مند شاگرد نے اپنے استاد کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ شاہ نصیر کے شاگرد میر احمد علی خاں شہید دہلوی راقم الحروف کے حقیقی نانا حکیم میر نادر علی زعدم مرحوم کے دادا ہوتے تھے۔ شہید دہلوی شاہ نصیر سے بے حد عقیدت رکھتے تھے دیوان شہید[3] میں اس سعادت مند لائق شاگرد نے جگہ جگہ اپنے استاد کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میں یہاں صرف دو اشعار نقل کررہا ہوں ؎

شہ نصیر استاد کامل ہے جو میرا اے شہید
شاعروں میں مرتبہ مجھ کو ہے شاہنشاہ کا

(ص۔ ۳)

میرے استاد نصیر اونکا میں شاگرد رشید
کیوں شہید اہلِ سخن سمجھیں نہ استاد مجھے

(ص ۱۳۲)

شہید دہلوی کے بڑے پوتے حکیم سید نوازش علی لمعہ نے جو دیوانِ شہید کے مرتب ہیں، ایک قطعہ تاریخ اشاعت نکالی جو درج کی جاتی ہے ؎

---

۱ تذکرہ شعرائے ہند حصہ دوم ص ۱۰۶۷
۲ یادگار ضیغم (مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو) ص ۶۴۲
۳ یادگار ضیغم (" ") ص ۲۰۸
۴ آب حیات۔ ص ۵۰۱

---

۱ آب حیات ص ۵۱۲
۲ خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ص ۹۱
۳ نظم شہید، فخر نظامی پریس، حیدرآباد، ۱۳۰۹ھ

شکرِ خدا چھپا ہے مرے جد کا اب کلام
ہند و دکن میں شہرت نام شہید ہے
میں نے بھی سال ختم لکھا لمعہ حسبِ حال
مطبوع خلق کا یہ کلام شہید ہے

۱۳۱۸ھ

شاہ نصیر کو آخری عمر میں تصوف اور بزرگانِ دین کی درگاہوں پر حاضری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بات ان کو ورا ثتاً ملی تھی۔ قیام حیدر آباد کے دوران وہ حضرت سید موسیٰ قادری کے مرید ہوئے جن کا مزار آج بھی محلہ حسینی علم (پُرانا پُل) کے قریب مرجع خلائق ہے۔ مرشد کی خاطر شاہ نصیر نے درگاہِ حضرت میں اپنی قبر کے لیے جگہ منتخب کر لی۔ اور وصیت کر دی کہ انتقال کے بعد مجھ کو اسی جگہ دفن کیا جائے۔ مرشد کی توصیف میں شاہ نصیر یوں رقم طراز ہیں :

حضرت شاہ غلام علی پیر و مرشد — ایک ہے عالم معنی میں تمھاری صورت
رخ وہ ہے اہلِ وظیفہ کہے سبحان اللہ — قد وہ ہے صاحبِ تکبیر کہے قد قامت
ثم باللہ اگر خلق میں دیکھے تم کو — تو یہ عارف کہے کثرت میں ہے ظاہر وحدت
مشک سے دھوئے جب تک کہ زباں اپنی نصیر — کیا دہن ہے جو کرے آپ کی تعریف و صفت[1]

مہاراجہ چندو لال شاداں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام اپنے محل میں کیا تھا جس میں دکن اور ایران کے بہت سارے باکمال شعرا موجود تھے۔ شعرائے ایران نے مہاراجہ کی شان میں اس مشاعرے میں ایسے قصیدے سنائے کہ محفل واہ واہ کی آواز سے گونج اٹھی۔ محمد حسین آزاد کے مطابق شاہ نصیر کی باری آنے کو تھی تب ایک خواص نے ہاتھ میں سونے کا عصا ہاتھ میں لیے بارہ سو کا دوشالہ کندھے پر ڈالے کھڑا تھا کان میں جھک کر کہا آج آپ غزل نہ پڑھیں تو بہتر ہے۔ شاہ نصیر بگڑ کر بولے " ایسا تو میں خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ یہ نہیں تو پھر میں ہوں کس کام کا۔ اسی تیل و قال میں شمع بھی سامنے آگئی پھر جو غزل سنائی تو سب کو لٹا دیا۔"[2]

محمد عبد الجبار ملکاپوری کے مطابق جب طبیعت میں مذہبی رنگ زیادہ ہو گیا تو کچھ زیادہ ہی خوش اعتقاد ہو گئے تھے۔ جہاں کہیں راستہ میں کسی جگہ قبر پہ پھول پڑے ہوئے پاتے وہیں جوتے اتار کر فاتحہ پڑھنے لگتے۔ ایک دن اپنے شاگردوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں طاق پر پھولوں کا سہرا لٹکا ہوا نظر آیا، شاہ نصیر کھڑے ہو گئے اور فاتحہ پڑھ دی۔ ایک منچلے شاگرد نے کہا۔ حضرت یہ مہترانی کا گھر ہے اس نے اپنے پیر لال بیگ کا طوق بنا رکھا ہے۔ اُس وقت شاہ نصیر ہنس پڑے اور کہا میں نے خدا کا کلام پڑھا اس کا ثواب کہیں نہیں جائے گا۔ جہاں اس کا موقعہ ہے وہاں پہنچے گا۔[1]

جس طرح علامہ اقبال نے اپنے وصال سے پہلے ارشاد فرمایا تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اسی طرح شاہ صاحب یہ شعر گنگنایا کرتے تھے ؎

بیاباں مرگ ہے مجنون خاک آلودہ تن کس کا
سیے ہے سوزنِ خارِ مغیلاں تو کفن کس کا[2]

تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں شاہ نصیر نے حیدر آباد ہی میں ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء انتقال کیا۔ انتخاب کلیات شاہ نصیر کے مرتب کے بیان کے مطابق ان کی تاریخ وفات ۱۲۵۴ھ ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" تاریخ بست و پنجم ماہ شعبان ۱۲۵۴ھ روز پنجشنبہ کو اِس جہان فانی سے وفات پائی۔"[3]

" چراغ گل" کے الفاظ سے کسی شاگرد نے تاریخ وفات نکالی ہے۔ شاہ نصیر کے فرزند شاہ نجم الدین نے اس قطعہ میں تاریخ وفات نکالی ہے :

حیف صد حیف امام شعرا رشاہ نصیر
عازم خلدِ بریں گشت ازیں دارِ محن
بہر تاریخ وفاتش، بحروف منقوط
ہاتفے کرد ندا خسروِ اربابِ سخن

۱۲۵۴ھ

شاہ نجم الدین کے نبیرہ شاہ بہاء الدین بشیر، میر تراب علی زور، شاگرد شہید دہلوی، سید احمد حسن، عبد الحکیم جوش، حافظ محمد اکبر نے بھی شاہ نصیر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے قطعات تاریخ وفات لکھے ہیں۔

اردو کے بعض نامور شاعروں داغ، امیر مینائی، فانی، جلیل کی طرح شاہ نصیر کو بھی سرزمین حیدر آباد نے ہمیشہ کے لیے اپنے آغوش میں لے لیا۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ شاہ نصیر کے انتقال کے بعد لوگ بھول گئے کہ وہ کہاں مدفون ہیں۔ ڈاکٹر زور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے شاہ نصیر کی آخری آرام گاہ کا پتا چلایا۔ پرانا پل کے قریب درگاہ حضرت موسیٰ قادری میں ان کی قبر کا پتا چلا کر ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے سنگ مرمر کا ایک کتبہ بھی لگا دیا تھا جس پر شاہ نصیر کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ درج تھی۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق اس وقت قبر پر سے وہ کتبہ بھی غائب ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

---

[1] ارشادات مولانا عارف موسوم بہ " کلام عارف " حیدر آباد۔ ص ۴۴
[2] آب حیات صفحات ۵۱۱، ۵۱۲

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن (حصہ دوم) حیدر آباد ۱۳۲۹ھ ص ۱۰۶۷
[2] آب حیات ص ۴۲۱
[3] انتخاب شاہ نصیر ص ۴

شاہ نصیر نے اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا تھا۔ جو غزلیں کہتے تھے انہیں ایک تھیلے میں ڈال دیتے اور گھر میں احتیاط سے رکھ چھوڑتے۔ میر حسین تسکین کے بیٹے سید عبدالرحمن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ نواب رام پور نے معقول رقم دے کر یہ نسخہ اپنے ہاں منگوا لیا۔

شاہ نصیر کے دواوین کے جو بھی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ ترقیموں سے محروم ہیں جس کی وجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا مرتب کون ہے اور انھیں کب ترتیب دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مطابق سب سے قدیم نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ نسخۂ آصفیہ کے علاوہ سالار جنگ میوزیم کے کتب خانہ، ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ اور کتب خانہ رام پور (جس کا ذکر ہو چکا ہے) میں شاہ نصیر کے دیوان کے نسخے موجود ہیں۔

شاہ نصیر کی وفات کے بعد ان کا پہلا مختصر مجموعہ "انتخاب کلیات شاہ نصیر" کے نام سے (۱۸۷۷ء) میں شائع ہوا۔ اس کے مرتب حافظ محمد اکبر ہیں۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"دریں زمانِ فرخ اختراں بہ یمن خالق دوجہاں نسخۂ بے نظیر انتخاب کلیات شاہ نصیر بہ اعلیٰ پریس میرٹھ باہتمام حافظ فضل محمد اکبر طبع گردید۔"

اس میں تین قطعاتِ تاریخ طباعت بھی درج ہیں جن میں خود مرتب کا قطعہ بھی شامل ہے۔ مرتب کا قطعہ ملاحظہ ہو:

اکبر نے یہ انتخاب پایا عنوانِ مثال بے مثالی
تاریخ اگر تم اس کی پوچھو ہے منتخب کلام عالی

۱۲۹۴ھ

مولوی سید حسین بلگرامی نے "مختار اشعار" کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شاہ نصیر کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ محترمہ لئیق صلاح نے "میر شمس الدین فیض۔ حیات اور ادبی کارنامے" کے عنوان سے ایم۔فل کے لیے ایک مقالہ لکھا جو جنوری ۱۹۸۰ء کو شائع ہوا اس میں محترمہ لئیق صلاح نے مذکورہ بالا دونوں انتخاباتِ شاہ نصیر کا ذکر کیا ہے لیکن "چمنستانِ سخن" کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ راقم الحروف کے حقیقی نانا حکیم میر نادر علی رعد مرحوم نے ۱۳۱۴ھ مطابق (۱۸۹۷ء) میں شاہ نصیر کا مکمل مجموعہ "چمنستان سخن" کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد صدیقی نے "چمنستان سخن" کی اشاعت کی تفصیل ان الفاظ میں لکھی ہے:

"انتخابِ مذکور (مرتب حافظ محمد اکبر) کی اشاعت کے پورے بیس برس بعد شاہ نصیر کے دیوان غزلیات کا نسبتاً ایک زیادہ مکمل مجموعہ "چمنستانِ سخن" حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ حکیم میر نادر علی رعد نبیرۂ میر احمد علی خاں شہید دہلوی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود نسخے سے نقل کیا گیا اور مطبع فخر نظامی حیدرآباد نے اسے شائع کیا۔" [1]

اس کے سرورق پر روشنی ڈالنے سے بات اور واضح ہو جاتی ہے سرورق پر لکھا ہے:

"بعون صانع مکین و مکان و فضل خلاق زمین و زماں، دیوان فصاحت ملک الشعرا جہاں فخر ہندوستان، رشک سودا و میر حضرت شاہ نصیر دہلوی مرحوم الموسوم باسم تاریخی "چمنستانِ سخن" ۱۳۱۴ھ

منقول از کتاب خانہ حکیم میر نادر علی رعد نبیرہ میر الشعراء امیر احمد علی خان شہید دہلوی مرحوم شاگرد مصنف دیوانِ ہذا، بتصحیح حکیم صاحب معز، در مطبع نامی گرامی فخر نظامی مطبوع و مقبول اہل جہاں شد۔" اس دیوان کے صفحات کی تعداد ۲۴۴ ہے۔

چمنستانِ سخن کی تاریخ اشاعت کے موقع پر کئی شعراء نے قطعہ تاریخ کہا تھا جس میں میر تراب علی زور شاگرد شہید دہلوی، داغ دہلوی، سید نوازش علی لمعہ، حکیم میر نادر علی رعد، میر احمد علی خاں شہید دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ داغ دہلوی نے کہا تھا:

یہ سال طبع کہا داغ دہلوی نے بھی کلام شاہ نصیر اوستاد اہل ہند ۱۳۱۴ھ

میرے نانا کے بڑے بھائی سید نوازش علی لمعہ نے کہا تھا:

لمعہ ہاتفِ غیبی بگفت تاریخش
شہ کلام یقیناً کلام شاہ نصیر ۱۳۱۴ھ

حضرت رعد مرحوم نے یہ قطعہ تاریخ لکھا:

چوں دیوان نصیر استاد جدم طبع شد اے رعد
چہ دیوانے کہ شد رشکِ کلامِ میر و ہم سودا
بود ورد زبان اہل دہلی مصرع سالش
زسعی رعد شد مطبوع دیوان نصیر ما ۱۳۱۴ھ

اس دیوان کو شہید دہلوی نے مرتب کیا۔ پروف کی تصحیح رعد مرحوم نے کی۔

میں اپنا مقالہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے ان الفاظ پر ختم کروں گا وہ لکھتے ہیں:

"حیدرآباد کی ادبی تاریخ اس پر ہمیشہ فخر کرے گی کہ شاہ نصیر نے اپنی عمر کے آخری دس سال اس شہر میں آرام و اطمینان اور عزت و آبرو سے گزارے جو چیز ان کو دلی اور لکھنؤ میں نہ مل سکی، اس کو حیدرآباد ہی نے فراہم کیا اور یہاں وہ اتنے آسودہ حال رہے کہ پھر اپنے وطن کا رُخ نہ کیا۔" [2]

---

[1] کلیات شاہ نصیر (حصہ اول) مجلس ترقی اردو، لاہور ص ۱۲۶
[2] سب رس "شاہ نصیر دہلوی" حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۵۹ء ص ۷

بہ خطِ شاعر

طالب چکوالی

غزل

اُٹھا کر طاق پر دُنیا کے غم رکھ!
نہ بھولے سے بھی فکرِ بیش و کم رکھ!

حصارِ ذات کا قیدی نہیں تُو
حصارِ ذات سے باہر قدم رکھ!

نئے ماحول کی تازہ ہوا کھا
ہواخواہوں سے ٹکرانے کا دم رکھ!

کسی سے بھی نہ عرضِ مدعا کر
کسی سے بھی نہ اُمیدِ کرم رکھ!

قلم کا وار جڑ تک کاٹتا ہے
ہمیشہ تیز یہ تیغِ دو دم رکھ!

یہی منزل پہ لے جائیں گے تجھ کو
نظر میں راستے کے پیچ و خم رکھ!

ہے لامحدود جولاں گاہ تیری
حدِ امکاں سے کچھ آگے قدم رکھ!

زمانے کی نہ سُن، سُن اپنے دل کی
زمانے کا نہ رکھ، اپنا بھرم رکھ!

تجھے باطل کا سینہ چھیدنا ہے
سناں سے تیز تر نوکِ قلم رکھ!

کیے جا پرورش لوح و قلم کی
لہو پینے کو اور کھانے کو غم رکھ!

نجانے کب ضرورت اس کی پڑ جائے
سدا اسپِ قلم کو تازہ دم رکھ!

یہی ہے وقت کی آواز طالب
ہم آہنگ اس سے لے کا زیر و بم رکھ!

طالب چکوالی
18 جولائی 1987ء

موسم بہار کی ایک نظم

مخمور سعیدی

پھر موسمِ نو بہار آیا
اِک کیفِ نمو فضا پہ چھایا
سوئی ہوئی روحِ ارض جاگی
مُردہ ذرّات کسمسانے
مدفون سمن بروں کے پیکر
شاید تہہ خاک رسمسائے
بے جان زمین کے بدن میں
آثارِ حیات لوٹ آئے

سبزے کی نقاب رُخ پہ ڈالے
تیرہ زندانِ خاک سے، یہ
کس نے باہر قدم نکالے!
لہروں پہ ہوا کی گامزن ہیں
رنگینی و روشنی کے ہالے

پیڑوں پہ شگفتگی کا عالم
اس دل کے بھی سارے داغ تازہ
یادوں کی تمازتیں سنبھالے
سایہ سایہ بھٹک رہا ہوں
ان برگ و گل و ثمر میں شاید
اسلم کہیں لہلہا رہا ہو!
سیما کہیں مسکرا رہی ہو!!
یا آصفہ تتلیاں پکڑتے
آئی ہو، کہیں مچل رہی ہو!!!

اسلم، سیما، آصفہ: شاعر کا مرحوم لڑکا، لڑکی اور بھتیجی

۳۲۰۷ - پھاٹک تیلیان، ترکمان گیٹ، دہلی ۶ ۱۱۰۰۰

غزلیں

علی احمد جلیلی

درد کی دین سہی، غم کی ودیعت ہی سہی
کچھ نشانی تو ملے زخم کی صورت ہی سہی

یہ عبارت بھی پڑھی جاتی ہے کس لذت سے
زندگی کربِ مسلسل سے عبارت ہی سہی

سخنِ تلخ بھی اے دوست گوارا لیکن
کم سے کم کچھ ترے لہجے کی لطافت ہی سہی

کس کے ہونٹوں سے چُرا لاؤں تجھے یہ تو بتا
اے ہنسی تُو مرے ہونٹوں کی ضرورت ہی سہی

کچھ تو اے وقت سُنا وقت گزاری کے لیے
کسی برباد کے لُٹنے کی حکایت ہی سہی

تیرا دیدار بہر حال عبادت ہے مری
اس میں حائل مری آنکھوں کی شریعت ہی سہی

مشغلہ کوئی تو ہو جی کے بہلنے کا علیؔ
عشرتِ غم نہ سہی، ماتمِ عشرت ہی سہی

• جلیل منزل، ہاؤس نمبر ۳۴، ۱-۲۲، سلطان پورہ، حیدرآباد
۵۰۰۰۲۴

سعادت نظیر

کبھی پھولوں، کبھی کانٹوں پہ سُلا دیتا ہے
دل مجھے جینے کا ہر ڈھنگ سکھا دیتا ہے

کیسا سنسان ہے یہ دشتِ تمنا پھر بھی
کون ہے؟ جو مجھے رہ رہ کے صدا دیتا ہے

کچھ تو ہے بات، سمجھ میں نہیں آتا، قاتل!
تیرا گھائل جو تجھے دل سے دعا دیتا ہے

جس سے تسکینِ دلِ زار کی تھی کچھ اُمید
وہی بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے

جادۂ شوق میں ہر آبلۂ پا اپنا
یوں چمکتا ہے کہ منزل کا پتا دیتا ہے

ہائے جس سے تھی کبھی آس نگہبانی کی
میرے گھر کو وہی اب آگ لگا دیتا ہے

یہ ادا تیری پسند آئی بہت ہم کو نظیرؔ!
دل میں جو بات ہے تیرے، وہ سُنا دیتا ہے

• بلاک نمبر ۱، فلیٹ نمبر ۵، چندو لال بیلا کالونی، حیدرآباد
۵۰۰۲۶۵ (اے پی)

مہدی پرتاپگڈھی

کس لیے اپنی ہی آشفتہ بیانی لکھو
کبھی اُس عارضِ گلگوں کی کہانی لکھو

جس نے اِک بار بھی کھولی نہ تمدن کی کتاب
وہ مُصِر ہے اُسے تہذیب کا بانی لکھو

ٹوٹتے رشتوں کے اِس دَور میں اُن آنکھوں میں
اب بھی کچھ کچھ ہے شناسائی پرانی لکھو

اب حصارِ لب و رُخسار سے باہر ہے غزل
رنگ کی، تتلی کی، غنچے کی کہانی لکھو

اپنے احساس کو محبس سے نکلنے بھی نہ دو
اُس کے جذبات کو دریا کی روانی لکھو

اپنے اعمال ہیں موسم کی نہیں ہے اُفتاد
یہ جو ماحول پہ چھائی ہے گرانی لکھو

مہدی اب آنکھوں سے خوابوں کا بھی رشتہ ٹوٹا
اپنی معذوری کی اِک اور کہانی لکھو

معرفت ایگزیکیٹو انجنیئر، اریگیشن ڈیپارٹمنٹ، پرتاپ گڈھ (یو۔پی)

عمران عظیم

کسی بھی لمحہ مکیں بے خطر نہیں ہوتے
کہ اب مکان میں دیوار و در نہیں ہوتے

تمام عمر سفر میں گزر گئی اپنی
ہم اپنے شہر میں ہو کر بھی گھر نہیں ہوتے

پڑھے لکھے تو بہت ہو مگر عجیب ہو تم
کسی بھی بات پہ سینہ سپر نہیں ہوتے

تھکن بدن کی کہیں بھی اُتار لیتے ہیں
کہ آہوؤں کا ٹھکانہ شجر نہیں ہوتے

نئے سفر کی ہمیں بھی تلاش رہتی ہے
کسی بھی بات سے ہم بے خبر نہیں ہوتے

عظیم حُسن سے واقف نہیں جو یہ کہہ دے
ہمارے شہر میں اہلِ ہُنر نہیں ہوتے

• شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

حُسینی کرہانی

اندھیری رات میں عکسِ رُخِ قمر ہے بہت
کڑکتی دھوپ میں اک سایۂ شجر ہے بہت

شکن جبیں پہ نہ گردِ ملال چہرے پر
جو خوش رہے تو یہی ایک ہمسفر ہے بہت

قدم سنبھال کے رکھنا ذرا سمندر میں
سکوتِ آب میں پوشیدہ شور و شر ہے بہت

ہٹا کے چہرہ جو دیکھو تو حال کھُل جائے
لگا کے چہرہ جو دیکھو تو کرّ و فر ہے بہت

تمام رات بدلتے ہی کروٹیں گزری
سحر جب آئی تو خاموشیٔ سحر ہے بہت

نہ زادِ راہ ہے، منزل ہے اور نہ جادہ ہے
ہمارے عہد میں دشواریٔ سفر ہے بہت

حسینی شہر کو یہ گاؤں چھوڑ کر کیوں جائیں
مرے لیے اُسی کافر کا سنگِ در ہے بہت

• بمبئی مرکنٹائل بینک، نیتاجی سبھاش مارگ، دریاگنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جوئے لدّاخ (۴)

آریائی لدّاخ ۔ دارچِک*

ستیش بترا

لدّاخ کے شکن در شکن پہاڑ ۔ قدرتی عناصر نے جیسے پہاڑوں کے اجسام سے فالتو مٹی اُڑا اُڑا کر، لافانی نقش کندہ کر دیے ہوں۔

پچھلے دو تین روز میں، میں نے سنیل کو کرنل بھل کے ساتھ آتے جاتے اور میس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے دیکھا۔ دو ایک بار گھر میں سنیل کو کرنل صاحب سے دبے لفظوں میں باتیں کرتے ہوئے بھی پایا۔ کچھ گمان سا ہوا کہ شاید ادھر محاذ پر کچھ پاکستانی یا چینی فوجوں سے کچھ جھڑپیں ہوئی ہوں یا پھر فوجی تیاری یا تحفظ کے پلان بنائے جا رہے ہوں۔ سرحدوں پر اکا دُکا جھڑپوں کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں اور پھر اِدھر چند ماہ پہلے ہی ہماری فوجوں نے سائی چن گلیشئر پر اپنے پاؤں مضبوطی سے جمائے تھے۔ اور سنیل نے مناسب جگہوں کا انتخاب کر کے وہاں توپ خانہ کی چوکیاں پلان کرنے اور قائم کرنے میں بہت ہی نمایاں کام کیا تھا، جس کی تعریف اِدھر اُدھر سننے کو مل جاتی تھی۔

سائی چن شمالی لدّاخ میں فوجی نقطۂ نگاہ سے ایک بہت اہم گلیشئر ہے۔ اس گلیشئر کی سرحدیں چین اور پاکستان دونوں سے ملتی ہیں۔ اور اس پر تسلط جما لینے سے دونوں ملکوں کی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ اور اب کسی بھی اچانک حملے کے امکان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ پاکستان سے جنگ بندی کے بعد گلیشروں کے علاوہ باقی محاذ کی حدیں متعین کر دی گئی تھیں۔ اُس وقت یہ بعید از خیال تھا کہ گلیشروں پر کسی طرح کا قبضہ ممکن ہے؛ کیوں کہ سال کے بارہ مہینے ایسے مقامات پر رسد یا گولہ بارود پہنچانا موسم اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ پاکستان نے سائی چن پر قبضہ کیے بغیر اُسے مقبوضہ علاقہ دکھانے کے لیے غیر فوجی حربوں کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ایک صورت کوہ پیمائی مہموں کو اپنے مقبوضہ علاقہ میں سے سائی چن کے راستے ہمالیائی چوٹیوں پر چڑھائی کرنے کی اجازت دینا تھا۔ اس طرح کوہ پیمائی کے نقشوں میں غیر متعین سائی چن پاکستانی مقبوضہ علاقہ دکھایا جانے لگا۔ کچھ برسوں بعد عالمی اداروں کے توسط سے پاکستان اس علاقہ پر اپنا قبضہ جتا سکتا تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے چُپ چاپ بیٹھنا اس علاقہ کو خوب صورت طشتری میں سجا کر پاکستان کی نذر کرنے کے مترادف تھا۔

اگرچہ ہندوستان بھی کوہ پیمائی مہموں کو لدّاخ میں اپنے علاقے کی طرف سے اجازت دے کر اس گلیشئر پر اپنا حق جتانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن عالمی عدالتوں میں ایسے متنازع امور کے فیصلوں کے انجام سے ہندوستان کو کافی تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے سامنے صرف ایک چارہ تھا۔ اور وہ یہ کہ قبضہ ۱۰/۹ حصہ قانون ہے۔ اور پھر قبضہ بھی اُس علاقے کا جو ہندوستان میں واقع لدّاخ کا اپنا حصہ ہے! اور پھر ہندوستانی فوج نے غیر ممکن کو ممکن کر دکھایا۔ بیشتر اس کے کہ پاکستان کے کانوں میں جوں تک رینگتی، ہندوستان کی فوجوں نے صدہا مشکلات کے باوجود اس علاقے کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیا اور اپنے لیے رسد، گولہ بارود پہنچانے کے راستے بنا لیے۔ ہمارے ہیلی کاپٹروں نے دن رات ایک کر کے، فوجوں کو مکمل تعاون دے کر اُن کے اڈوں اور چوکیوں کو مضبوط کر دیا۔ اب بھی پاکستان

دارچک کی کوہ قاف جیسی پریاں رقص کے لیے تیار

* کچھ لوگوں کے مطابق صحیح تلفظ دِرچِک ہے۔

اور چین کی طرف سے ان چوکیوں پر گاہے گاہے حملے ہوتے ہیں، لیکن ہماری چوکسی اور تیاری اُن کے ناپاک ارادوں کو ہمیشہ ناکام بنا دیتی ہے۔

ایسے نازک حالات کی وجہ سے یہ جھڑپیں کبھی شدید لڑائی میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا ہمہ وقت تیاری ہی اس کا واحد حل ہے۔ اُس دن ہمیں سخت حیرانی ہوئی جب کرنل سہل نے اچانک ہم سے کہا :

"بھئی وہ آپ کے دارچک جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ آپ کو وہاں آریائی لدّاخ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ چند ضروری کاموں کی وجہ سے آپ کے ساتھ جانا ممکن نہ ہوگا —— لہٰذا آپ میری عدم موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔ مجھے یقین ہے۔ آپ کو دارچک بہت پسند آئے گا!"

اب ہم پر انکشاف ہوا کہ پچھلے دنوں کی کھسر پھسر آپریشن سائی چن نہیں، بلکہ یہ اچانک دارچک سے متعلق تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران سائی چن کا مسئلہ بھی پس منظر میں اُبھر رہا ہو۔ بہرحال یہ دو الگ الگ امور بھی تو ہو سکتے تھے۔

سنیل نے ہمیں بتایا کہ دارچک کا علاقہ کرگل سے سو کلومیٹر دور اندرونی لدّاخ میں پہاڑوں کی گود میں سندھ ندی کے کنارے واقع ہے۔ دارچک اور اس کے آس پاس بسے دو چار گاؤں کوہ قراقرم سے پار آئے ہوئے آریائی قبیلوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں کے لوگ خالص آریائی نسل ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ ان قبیلوں کے لوگ آپس کے گاؤں ہی میں شادیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کی گود میں محفوظ یہ قبیلے دنیا سے بالکل کٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے گاؤں ہمیشہ سے اُن کی دنیا رہے ہیں۔ اُن کی کُل جائداد بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں۔ جنہیں وہ آس پاس کی ڈھلانوں پر چرا کر واپس اپنے گاؤں لوٹ جاتے ہیں۔ سندھ ندی، کھُلا آسمان سورج چاند اور چاروں طرف پہاڑ اُن کی کائنات رہے ہیں۔ یہ تو لدّاخ میں ہندوستانی فوج کی آمد تھی۔ جس نے اُنہیں اپنے چھُپے مسکنوں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔

ورنہ وہ شاید ہمیشہ کے لیے باقی دنیا کے لیے ایک عجوبہ بنے رہتے۔ فوج نے ان لوگوں کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی لائے بغیر اُن سے دوستی قائم کر لی ہے۔

ایسے اندرونی علاقہ میں جہاں کوئی بس یا سواری کا انتظام نہیں، فوج کے علاوہ کسی دوسرے کے پہنچنے کا کوئی سوال نہیں اُٹھتا، اس لیے ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں ایسی جگہ جانے کا ایک نادر موقع مل رہا تھا اور اس طرح سے آریائی لدّاخ کو اتنے قریب سے دیکھنے کا بھی۔

اگلی صبح سویرے کرگل سے روانہ ہوتے وقت جونگوں میں ہم سواریوں کے علاوہ دو خوش نما رنگین کاغذوں میں لپٹے ہوئے دو بڑے ٹوکرے بھی لاد دیے گئے۔ ہمارے پوچھنے پر سنیل نے ہمیں بتایا کہ ان ٹوکروں میں ان قبیلوں کے لیے فوج کی طرف سے نذرانہ بھیجا جا رہا تھا۔ ایک ٹوکرا مردانہ اور دوسرا زنانہ تھا۔ "سیل بند" ہونے کی وجہ سے ان تحفوں کی نوعیت کے بارے میں قیاس ہی لگایا جا سکتا تھا۔ پریم بھائی صاحب کے قیاس کے مطابق مردانہ ٹوکرے میں سوم رس ضرور رہا تھا۔ تربت اور کرشنا جی اپنے اندازے سے زنانہ ٹوکرے میں گوٹا کناری لگے کپڑوں، چاندی اور پتھروں کی مالاؤں کا اندازہ لگا رہے تھے۔ لیکن فوج کے بھید جاننا اتنا آسان کام نہیں۔ اور پھر کم سے کم میرے نزدیک عورتوں کے تحفوں میں زیادہ اہم باتیں اور بھی تھیں! بہرحال ہمارے جونگے ان تحفوں کے ٹوکروں اور ہمیں لیے گولف کورس کا احاطہ کرتی ہوئی سڑک پر شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ اکثر پہاڑی سڑکوں پر ہوتا ہے۔ اس بار بھی ایک ندی سڑک کے ہمراہ تھی۔ ایک شخص سے جب شہر اور دیہات کا فرق بتانے کے لیے کہا گیا تو اس نے جواب دیا تھا: شہر میں حدِ نظر تک وہ سب دکھائی دیتا ہے جو انسان نے خود تعمیر کیا ہے جب کہ دیہات میں حدِ نظر تک وہ سب دکھائی دیتا ہے جسے خدا نے بنایا ہے۔

اور پھر لدّاخ تو خدا کا اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہوا معلوم ہوتا ہے اس تخلیقی عمل میں خدا نے اپنی تمام فطری قوتوں سے بھرپور کام لیا ہے۔ سورج کی تیز عمودی کرنوں نے پہاڑوں میں جگہ جگہ دراڑیں اور شگاف پیدا کر دیے ہیں۔ قدرت کی تیز ہواؤں کی پھونکنی نے ان پہاڑوں سے سنگ ریزے اور فالتو مٹی اڑا اڑا کر ایک ماہر نقاش کی طرح کسی بھی ہتھوڑے چھینی کے بغیر اُن کے سینوں پر ایسے ایسے نقش کندہ کر دیے ہیں کہ ہر نقش کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ ندی کے کنارے انہی پہاڑوں کے سینے پر اپنی طرز کے خوب صورت مندر کھڑے ہیں۔ وہی کلس، گرپ، محرابیں، چوکور دروازے جن میں سے ندی کے پوتر پانی سے نہا کر تھالیوں میں پھول اور دیے سجائے ہوئے پجارنیں مندروں میں داخل ہو گئیں۔

پھر ان پہاڑوں پر ہاتھی کے بے ڈول پاؤں کے نقش اُبھرتے ہیں۔ اور سڑک اچانک ندی کے کنارے سے ہٹ کر دور آ جاتی ہے اور اس کے اور اونچے پہاڑوں کے درمیان لمبا چٹیل میدان سا بچھ جاتا ہے۔ پھر ان وسعتوں میں اچانک ایک ٹیلہ اسٹیج کی سی شکل بے نمودار ہوتا ہے۔ سارے ماحول سے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بھی پل دیوداسیوں کا رقص شروع ہونے والا ہو۔ ہمارا جونگا اس ٹیلہ نما اسٹیج کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور پھیلے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ کسی قلعے کی فصیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں فصیلوں کے کنگورے بھی ہیں اور ان دیواروں میں ابھرے ہوئے فصیل کے ستون بھی۔ اور پھر اچانک ان اونچائیوں کے بیچوں بیچ ایک بالکونی سی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتے لگتا ہے جیسے ابھی کوئی شاہ عالم اپنی ملکہ سمیت اس بالکونی پر رونق افروز ہوں گے اور اُن کا اشارہ پاتے ہی اس وسیع میدان میں ہاتھی اور شیر کی جنگ شروع ہو جائے گی اور یہ لال قلعہ جیسا منظر کبھی چتوڑ گڑھ اور کبھی گوالیار کا ناقابلِ تسخیر قلعہ بن جاتا ہے۔ کنگورے دار فصیل میں جگہ جگہ چوکیاں نظر آتی ہیں۔ اور کہیں ان توپوں کے دہانے جو ان کنگوروں میں پھنسائے گئے ہیں اور جو کسی وقت بھی گولہ برسانا اور آگ اُگلنا شروع کر سکتے ہیں۔ ایسا ایک منظر شیلانگ سے چراپونجی

جانے والی سڑک کے ساتھ پہاڑوں کے سلسلے کی یاد دلاتا جہاں یہ ایک مضبوط ٹیل فصیل کی مانند آپ کے ہمراہ رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سلسلہ یک رنگی، بے رونق فصیل کا روپ لیے ہوتا ہے۔ جب کہ موجودہ منظر میں پہاڑوں کی دیواروں پر کھُدے ہوئے نشیب نہ فراز اسے حقیقت کا رنگ دے رہے ہیں۔ آسمان کی وسعتوں پر تیرتے سفید بادل جب سورج کو ڈھانپ لیتے تو روشنی اور سایوں کا امتزاج اس فصیل کو اور بھی عالی شان اور پُرشکوہ بنا دیتا۔

ایسے رنگا رنگ نظاروں میں ایک منظر ایسا بھی تھا جسے میں بھلائے نہیں بھُلا سکتا۔ یہاں کسی کسی پہاڑ کے سر پہ برف کی ٹوپی بھی نظر آجاتی تھی، لیکن پگھلتی ہوئی برف کی دھار نیچے آتے آتے کہیں بھربھرے میں جذب ہو کر رہ جاتی تھی۔ دور سے یوں معلوم ہوتا گویا یہ دھار نہ ہو بلکہ کسی مجبور، بے کس، بیوہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہو!

کرگل سے روانہ ہوتے ہی ہمیں بتدریج پہاڑ پر چڑھتے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس دوران پہاڑیوں پر کھُدے نقش اور قدرت کے شاہکار ہمارے ہم سفر رہے تھے۔ اچانک چوٹی پر پہنچ کر ہمارے ڈرائیور نے جونگا روک دیا۔ ہم ۴۰۰ ۴ میٹر کی بلندی پر ٹنگلا درّے پر پہنچ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر ہم دونوں طرف کی پہاڑیوں کے سلسلے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ یہاں ایک سلسلہ ختم ہو کر ہم سے رخصت چاہ رہا تھا جب کہ ایک نیا سلسلہ ہمارا سواگت کر رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی، لیکن سورج کی تیز کرنوں کی وجہ سے کچھ زیادہ سردی کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ جو عموماً اتنی اونچائی پر ہوا کرتا ہے۔ اب اتنی چڑھائی کے بعد دُور تک اُترائی نظر آ رہی تھی۔ پریم بھائی صاحب نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں گھُٹی ٹانگوں کو راحت پہنچانے کی غرض سے نیچے جاتی پگڈنڈی کی طرف چل دیے۔ ہم نے تریت اور کرشنا بھابی کو بھی ساتھ آنے کی دعوت دی، لیکن وہ جونگے سے اترنے کے لیے

دیچک کے آریائی قبیلوں کا چار سازوں پر مشتمل آرکسٹرا ــــ کچھ طبلے، شہنائی، ڈھول، نقارے جیسے ساز

رضامند دکھائی نہ دیتی تھیں اور پھر مجبوراً سنیل کو بھی اُن کا ساتھ دینے کے لیے جونگے میں رہنا پڑا۔ بھلا وہ اپنی دونوں ساسوں کو چھوڑ کر اس بداخلاقی کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم نے سنیل کو اشارہ کیا کہ وہ جونگے کو چلائے۔ سڑک کا راستہ کافی لمبا تھا اور پگڈنڈی کے ذریعے ہم بہت جلد اُس مقام پر پہنچ سکتے تھے، جہاں سڑک پگڈنڈی سے دوبارہ آن ملتی تھی۔

سڑک اور پگڈنڈی کے سنگم پر ہم پھر جونگے میں جا بیٹھے۔ سڑک پہاڑی کے دامن کے سہارے دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔ اور ہر موڑ کے ساتھ دُور ایک گاؤں کے نقش واضح ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ان ویران پہاڑوں کے بیچ گاؤں کے سامنے پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے پاس بہتا کوئی ندی نالہ اس شادابی کا سبب تھا۔ کھیتوں میں پتھروں سے کی ہوئی حدبندی ایک واضح ثبوت تھا کہ گاؤں کے لوگ پانی کے ایک ایک قطرے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ گاؤں کے مکان پتھروں کو جمع کر کے کسی گارے سیمنٹ کے بغیر بنائے گئے تھے۔ ان سے ہٹ کر پہاڑ میں بنی غاریں آباد تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے گمان ہوا جیسے ہم پتھر کے زمانے میں لوٹ آئے ہوں اور زندگی ارتقا کی منزلیں عبور کرنے میں لگی ہو۔ ہمارا جونگا گزرتے وقت کے ایک تھپیڑے کی طرح کھُردرے پتھروں سے اٹی گلیوں سے ہوتا، گاؤں کی سرحدوں سے گزر گیا۔ شاید گاؤں کے مکینوں کے لیے ہمارے جونگے کا گزرنا اتنا ہی حیرت انگیز ہو گا جتنا ہماری زمین پر سے ہوائی طشتریوں کا گزرنا ہمیں کھڑکی دروازوں میں سے اس غیر متوقع نظارے کو دیکھنے کے لیے کئی چھوٹے بڑے سر جھانکتے نظر آئے اسی خوف و ہراس کے ساتھ کہ کہیں کوئی ناگہانی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔

کچھ دُور جانے پر ہم سندھ ندی پہنچ گئے جہاں پُل پر ایک فوجی چوکی میں کچھ لوگ ہمارے جونگے کے منتظر تھے۔ اُنہوں نے ہمیں اپنی قیادت میں لے لیا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ اب ہمیں پہاڑ کی ڈھلانوں پر عورت، مرد، بچے اپنی رنگا رنگ پوشاکوں میں ملبوس اُترتے ہوئے نظر آئے۔ جیسے وہ کسی میلے میں شامل ہونے جا رہے ہوں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب ہم منزلِ مقصود کے بہت قریب ہیں۔ ندی کے کنارے اونچائی پہ ایک ڈاک بنگلہ سا بنا معلوم ہو رہا تھا جہاں لگا ہوا شامیانہ کسی ہونے والی تقریب کا اعلان کر رہا تھا اور پھر اس ڈاک بنگلے کے قریب پہنچتے ہی ہمارے

استقبال میں یکایک ڈھول اور طوطیاں بج اٹھیں اور بگلے میں مختصر بھیڑ ہمیں خیر مقدم کہنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید انہیں فوج کی طرف سے بتایا گیا تھا کہ اس تقریب میں شرکت کے لیے چند خصوصی مہمان آ رہے ہیں ایسا استقبال غالباً فوج کے جنرلوں کے لیے مخصوص تھا۔ اور ہم ان توقعات پر کہیں پورے نہیں اُترتے تھے۔

سفید بھیڑوں کی کھالیں اوڑھے، بالوں اور ٹوپیوں میں جنگلی پھول سجائے، رنگین واسکٹوں اور کُرتوں میں ملبوس، کمر میں پٹکا باندھے دوشیزاؤں اور بانکے نوجوانوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اُن کے شاداب چہرے، اُجلی رنگت اور تیکھے نقش آریائی حُسن کا عمدہ نمونہ تھے۔ پچھلے زمانے کی کوہِ قاف کی پریاں اپنی خوب صورتی کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اب وہی خوب صورتی یہاں موجود دوشیزاؤں کے انگ انگ میں رچی معلوم ہوتی تھی۔

ان جیالے مردوں نے رنگین کُرتے اور تنگ مُہری کے پاجامے پہن رکھے تھے جب کہ بزرگ لوگوں نے قبا اوڑھ رکھی تھی۔ پٹکے اور کمر بند کا استعمال عورت اور مرد دونوں میں مشترک تھا۔ فرق اتنا تھا کہ عورتیں تو غالباً کمر کے خم کو نمایاں کرنے کے لیے اُسے پہنتی ہوں گی۔ جب کہ کمر بند کو شانے سے گزار کر اسے کمر کے گرد باندھے ہوئے تھے۔ کوئی عورت یا مرد ننگے سر نہ تھا اور اُن کی ٹوپیوں میں پھولوں اور خوشوں کی موجودگی عام بات تھی۔ عورتیں عموماً اپنے کپڑوں کے اوپر اونی کھال اوڑھ کر آگا پیچھا دونوں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اُن کے سروں پر چاندی کا پھیلا ہوا جھرمٹ نما زیور ضرور رہتا ہے۔ جس کی لڑیاں ناچ کے درمیان جھنجھناتی رہتی ہیں۔ اس طرح پھولوں اور زیوروں سے چوٹی کو سجانا عام بات تھی۔ اُن کے گلے میں رنگین منکے یا پتھروں کی مالا موجود تھی۔ کلائیوں میں ہاتھی دانت یا ایسی ہی اشیاء کی بنی ہوئی چوڑیوں اور کڑوں کا رواج بھی عام معلوم ہوتا تھا۔

اُن کے شگفتہ چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ موج مستی کرنے والے بے فکرے لوگ تھے، جن کے چہروں پر نہ کرب کے آثار تھے اور نہ ہی فکر کی لکیریں۔ زندگی جینا تو کوئی ان سے سیکھے۔ اُن کے عمر رسیدہ لوگوں کے چہرے بھی وقت کے تھپیڑوں سے بے نیاز تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں اور مردوں کی الگ الگ ٹولیاں بن گئیں۔ چار سازندوں پر مشتمل ان کا چھوٹا سا آرکسٹرا فضا میں نغمے بکھیرنے لگا۔ ان میں سے ایک ڈھول اور ایک نقارے جیسا تھا۔ اس کے علاوہ دو طوطیاں تھیں۔ یہ سازندے مختلف دُھنوں پر اپنے ساز بجا رہے تھے۔ کبھی تیز، کبھی آہستہ۔

یہ حیرانی کی بات ہے کہ آپ پہاڑوں میں کہیں بھی چلے جائیں کلو ہو یا کمایوں، میگھالیہ ہو یا منی پور اُن کا گیت سنگیت لگ بھگ ملتا جلتا ہے۔ شاید اس کی وجہ تھوڑے سے ساز ہوں گے۔ یا آسانی سے گائی جانے والی لہروں کی طرح اُبھرتی ڈوبتی آوازیں پھر بھی یہ دھنیں اور مل کر گائے جانے والی آوازیں ایک عجب جادو جگا دیتی ہیں۔ اور کوئی بھی انہیں سُن کر جھومے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان سازوں میں البتہ بانسری کی کمی ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ یہ رقص کرتی ہوئی عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں کبھی آمنے سامنے کبھی گھیروں میں اور کبھی مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھرک رہی تھیں۔ علیحدہ ٹولیوں کی صورت میں عورتوں کی ٹولی کا مردوں کی ٹولی میں گھُس جانا اور مردوں کی ٹولی کا جوابی حملہ ناچ میں اور بھی دل کشی پیدا کر رہا تھا۔

اچانک عورتوں نے بڑھ کر تربیت اور کرشنا بھابی کو اپنی تحویل میں لے کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ اور انہیں ناچ کے طرز و ادائیں سکھانے لگیں۔ مردوں کی ٹولی بھلا کب پیچھے رہنے والی تھی۔ اُنہوں نے پریم بھائی صاحب، سنیل اور مجھے گھیر کر اپنے رقص میں شامل کر لیا۔ اور ہم بھی اُن کی ہر حرکت کی نقل کرنے لگے۔ اگرچہ ہماری حرکتیں اور اشارے ناتراشیدہ ہیروں کی طرح تھے۔ (جی کے بہلانے کو اپنے بھونڈے، بے ڈھنگے عمل کو ایسا نام تو دے ہی سکتے ہیں!)

پریم بھائی صاحب کو بحریہ میں رہ کر دنیا بھر کے رقص سیکھنے اور کرنے کے مواقع تو حاصل ہوتے رہے تھے، لہٰذا اُن کی حرکات و سکنات میں کسی حد تک نفاست اور پختگی جھلکتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ رقص کی محفل ایک آدھ گھنٹہ اور جاری رہتی تو وہ مزید ایک تراشا ہوا ہیرا ثابت ہوتے۔ ہماری تراش خراش میں تو خیر بہت دیر لگ جاتی۔ جہاں تک تربیت اور کرشنا بھابی کا سوال تھا۔ بھلا مچھلی کو کون تیرنا سکھاتا ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ناچ تو عورت کی فطرت میں رچا ہوا

(آگے صفحہ ۴۳ پر)

آریائی مردانہ حسن کا نمونہ

آریائی قبیلے کا سردار

جانور بے چارے تو ہوتے ہی بے زبان ہیں۔ اس لیے وہ اپنی پریشانیاں کسی سے کہہ نہیں پاتے تھے یوں پریشان وہ سبھی تھے۔ کیا گائے۔ کیا بھینسیں۔ کیا بھیڑیں۔ کیا بکریاں اور ان سب کے بچھڑے، میمنے، میمنیاں بھی۔

اور ایسا نہیں کہ وہ اپنی پریشانیوں کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اُن میں سے کبھی کوئی باڑے کے کھونٹے سے رسہ تڑا کر بھاگتا تو سب سے نزدیک پڑنے والے کھیت میں گھس کر جو کچھ ملتا چٹ کر جاتا۔ اس سے دو فائدے ہوتے۔ ایک تو یہ کہ اُنہیں پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا اور اُنہیں لگتا جیسے زندگی میں ایک خواہش پوری ہو گئی ہو۔ دوسرے یہ کہ مالک کا نقصان ہوتا تو اُسے بھی کُڑھتے ہوئے یا غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے دیکھ کر اُنہیں اندر ہی اندر کچھ اچھا لگتا۔ جیسے انہیں اپنی طاقت کا احساس ہو رہا ہو۔

لیکن اس قسم کی حرکتیں اُنہیں بڑی مہنگی پڑتیں۔ پکڑے جانے پر لاٹھیوں کی مار کھانی پڑتی سو الگ۔ اور پھر کئی مرتبہ تو انہیں دو دو دن بھوکا رہنا پڑتا۔ کھیت میں نقصان زیادہ ہوتے پر تو اُنہیں چراگاہ تک میں جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے ہی کھونٹے سے بندھے ہوئے حسرت بھری نظروں سے اپنے ساتھیوں کو چراگاہ کی طرف جاتے دیکھ کر خون کے آنسو بہایا کرتے۔

کئی بار تو مالک، اُن کے بچھڑے بچھڑیوں کو بھی چراگاہ جانے سے روک کر اُنہیں بھی اُن کی نظروں کے سامنے بھوکا رکھتے۔

اپنے گناہ کے لیے اپنے بچوں کو بھی دُکھ اُٹھاتا دیکھ کر اُن کا اپنا دکھ ہزار گنا بڑھ جاتا اور انہیں لگتا جیسے اُن کی جان اندر ہی اندر ٹوٹ رہی ہے۔

جس باڑے میں اُنہیں رکھا گیا تھا، اُسے باڑا کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ باڑا چاروں طرف سے کھلا تھا، اس لیے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈی یخ ہوائیں اُن کے جسموں کو کاٹتی رہتیں۔ چاروں طرف لکڑی کی بلیاں گاڑ کر پرانے ٹوٹے ہوئے ٹینوں کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ بارش میں چھت ٹپکتی بلکہ کہنا چاہیے کہ برسا کرتی اور جب بارش نہ ہوتی تو خود آسمان اُن کی خستہ حالت پر آنسو بہاتا رہتا۔

رہی اُن کے پاؤں کے نیچے کی زمین۔ اُسے تو زمین کہنا، زمین کی توہین کرنا ہے — گوبر، پیشاب اور جگہ جگہ ٹھہرے ہوئے پانی کی وجہ سے وہ اچھی خاصی دلدل سی لگتی تھی، جس میں مکھیاں اور مچھر ہر وقت بھنبھنایا کرتے۔

ایسے میں باڑے کے جانوروں کی پریشانیوں کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

چراگاہ میں جو وقت گزر جاتا وہ اُسے غنیمت سمجھتے۔ چاہے وہاں گھاس کھانے کو ملتی یا نہ ملتی۔ باڑے میں واپس آنے پر تو اُنہیں ایسا لگتا جیسے وہ نرک میں آ پڑے ہوں۔ تھوڑا بہت سوکھا بھوسا اُن کے سامنے کُھرلیوں میں ڈال دیا جاتا۔ جو اُن کا پیٹ بھرنے کے لیے ہمیشہ ناکافی ہوتا۔

ہاں صبح شام دودھ دوہنے کے وقت مالک اور اُس کے کارندے بڑے مہربان ہوتے۔ دودھ دینے والے جانوروں کے سامنے دانہ ملے ہوئے بھوسے یا پھر ہرے چارے کی ٹوکری لاکر رکھی جاتی۔ جانور لالچ میں آکر بڑا بڑا منھ مار کر زیادہ سے زیادہ کھاتا ہوا دودھ اُتار دیتا۔ مگر جیسے ہی پورا دودھ دوہ لیا جاتا، ویسے ہی مالک کے کارندے عمدہ چارے والی ٹوکری اُٹھا کر دوسری بھینس یا گائے کے سامنے رکھ کر اُس کے تھنوں سے دودھ اُتارنے کے لیے جلدی جلدی اُنگلیوں سے اُنہیں ملنے لگتا۔

• ایم-۴۵ - پوسی پتھر کالونی، گواری گھاٹ روڈ جبل پور (ایم - پی)

اس طرح باڑے کے مالک کا گھناؤنا کھیل چلتا رہا۔

مالک باڑے کے جانوروں کا دودھ دوہ کر خود تو چین کی بنسری بجاتا رہتا۔ اُن کے دودھ کو بیچ کر اس کے سُکھوں اور آسائشوں میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا، جانوروں کی تکلیفیں بھی اُسی رفتار سے بڑھتی رہتیں۔

متواتر دُکھوں اور تکلیفوں کو جھیلتے رہنے پر سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جہاں جسمانی طاقت بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے، وہاں دماغ کے خانے بھی آہستہ آہستہ بند ہونے لگتے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب دماغ یکسر کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ لیکن دُکھوں کی انتہا تک پہنچتے پہنچتے جس طرح بجھنے والے چراغ کی لو ایک بار پوری کی پوری چمک اُٹھتی ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دُکھ اور غم دماغی صلاحیتوں کو ایک مرتبہ پھر پوری طرح اُجاگر کر دیتے ہیں تاکہ زندگی اگر چاہے تو اس آخری لو کی روشنی میں اپنی نجات کی منزل کو جانے والی راہ تلاش کر لے۔

ان جانوروں میں سے ایک بھینس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

دو دن پہلے اُسے کسی گناہ کے جرم میں بڑی لاٹھیاں کھانی پڑی تھیں۔ اُسے دو دن سے بھوکا رکھا گیا تھا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بھوکا رہنے والا جانور چراگاہ میں پہنچتے ہی اچھا بُرا سب کچھ جلدی جلدی مُنھ چلا کر پیٹ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس بھینس نے ایسا کچھ نہیں کیا —— وہ چراگاہ میں پہنچ کر ایک طرف ہو کر پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔ گھاس کا ایک بھی تنکا اُس نے اپنے منھ میں نہیں ڈالا۔ وہ منھ بند کیے ہوئے سارا دن سامنے چرتے ہوئے اپنے باڑے کے جانوروں کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سب کی ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ سب کے چہروں پر بھوک اور مایوسی لکھی ہوئی ہے —— پھر بھی وہ سب کی سب ڈھیٹوں کی طرح جیے جا رہی ہیں۔

اُس بھینس کو جیسے اس زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی: "اس زندگی سے تو مر جانا بہتر ہے۔"

یوں بھی موت اس پر دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔ بھوک کے مارے اندر سے اُسے اپنی جان ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بے چینی کے عالم میں اُسے یہ پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ اس کے پل پل کمزور ہوتے ہوئے نڈھال جسم میں دماغ نے کب چپکے چپکے کام کرنا شروع کر دیا تھا؟ زندگی اپنا جلوہ دکھانے کے لیے کب چمک اُٹھی تھی۔

مر جانے کی بات سوچتے سوچتے پتہ نہیں کب اُس بھینس کی آنکھوں میں روشنیاں سی جگمگانے لگی تھیں۔ تبھی تو وہ اپنے ساتھ ساتھ تمام جانوروں کے دُکھوں کی بات سوچ رہی تھی۔

شام ہوتے ہوتے جب اُس بھینس کے قریب ہی چرنے والے جانوروں نے دیکھا کہ اُس نے سارے دن میں ایک تنکا بھی منھ میں نہیں ڈالا۔ اور وہ ایسے ہی منھ اُٹھائے اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتی رہی ہے تو اُن میں سے کچھ جانور اپنی خاموش سے ہمدردی جتانے کے لیے اُس کے گرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے جانوروں کو کھڑے دیکھ کر باقی نے سوچا کہ شاید واپس باڑے میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ بھی آہستہ آہستہ وہیں آ کر جمع ہوتے گئے۔

دیکھتے دیکھتے سارے کا سارا جھُنڈ جمع ہو گیا۔

چرواہے اپنی جگہ حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ ابھی تو سورج ڈھلنے میں کافی دیر تھی۔ جانے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اُن کا یہ سوچنا مناسب تھا کہ آخر سارے جانور ایک جگہ کیوں اکٹھا ہو گئے ہیں۔

اس لیے وہ بھی چاروں طرف سے آ کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور ان میں سے ایک نے دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

دوسرے نے تیسرے کی۔

تیسرے نے چوتھے کی۔

چوتھے کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا۔ وہ بھی خاموش کھڑا رہ گیا۔

لیکن خاموشی بھی کبھی کبھی زبان بن جاتی ہے۔

اب ان چاروں چرواہوں کی حالت بھی اُن گائے بھینسوں سے بہتر نہیں تھی۔ روٹی اُن کو بھی روکھی سوکھی آدھا پیٹ بھر ہی ملتی تھی۔ اُن کے تن کے کپڑے بھی پھٹے پھٹائے اور میلے کچیلے تھے۔ جُوتا تو جنم سے آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہاں پھر بھی یہ تھا کہ دماغ پوری طرح شل نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے چاروں ایک کے سادے سے سوال کے جواب میں خاموش رہ گئے تو پہلے نے خود ہی اپنے سوال کا حل پیش کرنے کی کوشش کی۔

"آؤ وہاں چل کر دیکھیں۔"

اب سب کے دماغوں نے کچھ کام کرنا شروع کیا۔ اس لیے دوسرے نے کہا:

"ہمیں کیا پڑی ہے کہ چل کر دیکھیں۔"

تیسرے نے کہا: "ہمیں جانور چرانے کے لیے روٹی روزی ملتی ہے۔ یہ دیکھنے کی نہیں کہ جانور اکٹھے ہو کر کیا کر رہے ہیں۔ یا کیوں اکٹھے ہوئے ہیں۔"

چوتھے نے کہا: "یہاں کھڑے کھڑے بھی ہم کون سے بڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ چل کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

جب وہ چاروں وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بھینس جو دن بھر چراگاہ میں پیڑ کے نیچے ایک جگہ بیٹھی رہی تھی، اب اپنی جگہ پر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور گردن گھما کر اپنے چاروں طرف کھڑے جانوروں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے خاموش زبان میں وہ اُن سے اپنے یا سب کے دل کا درد بیان کر رہی ہو۔

چاروں کے چاروں چرواہے کچھ دیر تو بھونچکے

آگے صفحہ ۳۰

سرلا جگموہن

پنّالال پٹیل : گجراتی ادب کا کرشمہ

گجرات کے عظیم ادیبوں کی فہرست میں مقام پانے والے پنّالال پٹیل کے لیے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اُس دن اُن کے شہرت یافتہ ناول "مان وینی بھوائی" کے لیے اُنہیں ۱۹۸۵ء کے بھارتیہ گیان پیٹھ انعام سے سرفراز کیا گیا۔ گجرات کے بیشتر قارئین اور نقادوں کی تحسین و تکریم کے یکساں طور پر مستحق ادیب کی زندگی رومانی اور رنگین ہے۔

پنّالال پٹیل راجستھان کے ڈونگر پور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں مانڈلی میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد تھے نانا شاخو پٹیل جو اُس گاؤں میں معزز کسان مانے جاتے تھے اور اُن کی والدہ تھیں ایرشا جی۔ وہ چھوٹے پنّالال کو ماں کے پیار سے ہمیشہ نہال کرتی رہیں۔ پنّالال کا اپنی ماں سے لگاؤ بہت زیادہ تھا۔ بچپن میں وہ اُس کے آس پاس ہی گھومتے رہتے یا اس کی گود میں بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ چھ سات برس کے ہوں گے کہ سادھو جے شنکرانند کے پیچھے چل دیے۔ کچھ عرصے کے بعد اُس سادھو ہی نے اُنہیں مانڈلی سے کچھ دور ایڈر گاؤں کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ پنّالال نے آٹھویں جماعت تک تعلیم اسی اسکول میں پائی۔ وہیں عظیم اوماشنکر جوشی سے اُن کی دوستی ہوئی جو اُن کے ہم جماعت تھے۔ بعد میں کچھ برسوں تک الگ ہو جانے کے باوجود اُن میں عمر بھر دوستی رہی۔

پانچ برس تک پنّالال اور اوما شنکر ایڈر کے اسکول میں ساتھ رہے۔ بعد میں اوماشنکر مزید پڑھائی کے لیے باہر چلے گئے۔ پنّالال کی بھی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں اور علم حاصل کریں۔ لیکن ان دنوں اُن کا خاندان مالی مشکلات سے دوچار تھا۔ چنانچہ پنّالال کے دل میں اسکول اور کالج کی تعلیم پانے کی حسرت ہی رہی۔ اور تیرہ چودہ برس کی عمر میں کنبے کی ذمہ داری کا بوجھ کندھوں پر آ پڑا۔ ناموافق حالات کے باوجود وہ گجرات کے معزز ادیب بن گئے۔ تب سے پنّالال پٹیل نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے؟ کھیتی کی۔ وہ دھرتی کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہے۔ اس کے علاوہ اپنے مانڈلی گاؤں سے کچھ دور ڈونگر پور میں شراب کے گودام میں کام کیا۔ اور دُکان داری بھی کی۔ بہتر روزگار کی تلاش میں وہ احمدآباد آئے۔ وہاں الیکٹرک کمپنی میں پہلے آئیل مین اور بعد میں کلرک کا کام کیا۔ کمپنی کا آٹھ گھنٹے کا کام ختم کرنے کے بعد جن سیٹھ کے گھر میں اُن کے رہنے اور کھانے کا انتظام تھا وہاں گھر کی صفائی کرنا، مردوں کے کپڑے دھونا، باغیچے میں پودوں کو پانی دینا، بازار سے چیزیں لانا، کبھی سب کے لیے کھانا پکانا اور دو گھنٹے سیٹھ کے بچوں کو پڑھانا وغیرہ کچھ برسوں تک اُن کا کام رہا۔ دوسرے لفظوں میں احمدآباد میں اُنہوں نے کئی برس تقریباً سولہ گھنٹے کڑی محنت کا کام کرتے ہوئے گزارے۔ لیکن کڑی مشقت کے اُن دنوں میں پنّالال پٹیل کا گانا کبھی رُکا نہیں اور نہ ہی اُن کے بلند آہنگ قہقہے ہی غائب ہوئے۔ شاید اُن کے گلے سے نکلنے والے گانے اور دل کھول کر ہنسنے کے سبب ہی وہ ذمہ داری کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ گئے تھے۔

پنّالال پٹیل کے دل میں ایک تمنا تھی جو اُنہیں روزمرہ کی زندگی کی سطح سے اوپر رکھتی تھی۔ اُن کا دل کل کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جو مشقت کی زندگی وہ بسر کر رہے تھے، اُس کے باہر بھی اُن کی کچھ ہستی تھی۔ ایسا وہ ہمیشہ محسوس کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات واضح نہیں تھی۔ ایک دن وہ پریم چند کی طرح قلم کے سپاہی بنیں گے۔ ایسا تو شاید خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

لیکن ۱۹۳۵ء کے برس نے اُنہیں زندگی کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ اُس برس احمدآباد میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں گجراتی ساہتیہ پریشد کا جلسہ ہونے والا تھا۔ پنّالال پٹیل اُن دنوں احمدآباد میں الیکٹرک کمپنی میں کام کر رہے

۹۶/۱ - A، صفدر جنگ انکلیو، نئی دہلی ۲۹-۱۱۰۰

تھے۔ انہوں نے سنا کہ اُن کے پرانے ہم جماعت اوماشنکر جوشی (جو تب تک گجرات کے ہونہار نوجوان شاعر سمجھے جاتے تھے) پرلیشد کے لیے بمبئی سے احمد آباد آ رہے تھے۔ پنا لال پٹیل کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اُنہوں نے اوماشنکر جوشی کو ایک خط لکھا اور پرانی دوستی کی یاد دلائی۔ اوماشنکر جوشی نے فوراً جواب دیا اور احمد آباد آنے پر پنا لال پٹیل سے تپاک سے ملے۔

اوماشنکر جوشی نے پنا لال پٹیل کا اپنے دوست سندرم کے ساتھ تعارف کرایا جو اوماشنکر جوشی کی طرح اُبھرتے ہوئے ہونہار نوجوان شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اُن دونوں شاعروں نے چاہا کہ پنا لال پٹیل کچھ لکھے۔ اس تحریک نے پنا لال پٹیل کی قوتِ پرواز کو مہمیز کیا۔

تاہم ایک بڑا سوال تھا جس سے پنا لال پٹیل سوچ میں پڑ گئے۔ مڈل اسکول تک تعلیم یافتہ — وہ ادبی تخلیق کے میدان میں کودنے کی جسارت کیسے کر سکتے تھے؟ لیکن اُن کے ذہن و فکر میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اور آخر کار پنا لال پٹیل نے قلم ہاتھ میں لیا، جو پچاس برس تک اُن کے ہاتھ میں رہا اور آج بھی ہے۔

پنا لال پٹیل نے شروعات شاعری سے کی۔ کچھ تخلیقات لے کر وہ سندرم کے پاس گئے، جنہوں نے اوماشنکر جوشی کے کہنے پر اُن کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی تھی۔ تذبذب کے باوجود اُن کے دل میں اُمید کی رمق تھی۔ اُنہیں اُمید تھی کہ سندرم کو اِن کی نظمیں پسند آئیں گی۔ لیکن سندرم نے کچھ بھی نہ کہا۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پنا لال پٹیل اپنی نظمیں پڑھتے اور سندرم چپ چاپ سُن لیتے، لیکن ردِ عمل میں اُن کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار نہ ہوتا۔

پنا لال سمجھ گئے کہ کہیں کچھ غلط ہو رہا تھا۔ شاید شعر کہنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے ایک دن اُنہوں نے سندرم سے پوچھا: "کہانی لکھیں؟" سندرم نے کہا "لکھو۔" اور تب پنا لال پٹیل نے اپنی پہلی کہانی "شیٹھنی شاردا" (سیٹھ جی کی شاردا) لکھی جو سندرم کو اچھی لگی۔ وہ سوریہ چند مگھیانی جنہیں گاندھی جی نے قومی شاعر کا لقب عطا کیا تھا اُن دنوں گجرات کے مشہور ہفتہ وار "پھول چھاب" کے مدیر تھے۔ "شیٹھنی شاردا" کہانی "پھول چھاب" میں چھپی۔ اُس کی بڑی تعریف ہوئی۔ شاید اس سے پہلے اُن کی کہانی 'ذن بالا' بھی کسی دوسرے رسالے "پرجا بندھو" میں چھپی تھی۔

اب تو پنا لال پٹیل کا کہانی لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سندرم نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ یہی نہیں، اُنہوں نے اس نوجوان ادیب کو گجرات کے فاضل نقاد، زبان داں، شاعر اور افسانہ نگار رام نارائن پاٹھک کے پاس بھیجا۔ جو اُس زمانے میں مشہور ادبی ماہ نامہ "پرستھان" کی ادارت کر رہے تھے۔ پہلی بار وہ اپنی کہانی "کنکو" لے کر اُن کے پاس گئے جو اُن

نام ور ادیب کو کمزور لگی۔ تاہم اُنہوں نے پنا لال پٹیل کی افسانہ نگاری کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ پھر آہستہ آہستہ پرستھان میں بھی اُن کی کہانیوں کو جگہ ملنے لگی۔ اس سے ان میں خود اعتمادی آ گئی۔ ادبی تخلیق کے میدان میں پنا لال پٹیل کے قدم آگے بڑھنے لگے اور کئی رسالوں اور ماہناموں اور اخباروں کے ادبی سیکشنوں میں اُن کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ گجراتی ادب کے میدان میں ایک نیا ستارہ چمکنے لگا۔ جس کی روشنی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اور "پرستھان" میں اُن کی "کھینیوں ناک" "سکھ دکھ ناں ساتھی" وغیرہ کہانیاں چھپیں تو اُن کی شہرت اور بڑھ گئی۔

اس طرح پنا لال پٹیل گجرات کے ایک نامی کہانی کار بن گئے لیکن اُن کے دل میں جو ارمان اُمڈ رہے تھے اور جو تخلیقی جوش بڑھتا جا رہا تھا اُس کے اظہار کے لیے اُنہیں اُفق کے پار وسیع تر آسمان کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اور اُنہوں نے اپنا پہلا ناول 'کنامنی' (کنیا کی بدائی) لکھا۔ سوریہ چند مگھیانی نے اس ناول کی بڑی تعریف کی۔ اس ناول میں مصنف نے دیہاتی سماجی زندگی کی جھلک دکھائی — جس سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ اس ناول کے نوجوان اور بالغ مرد اور نسوانی کرداروں کے جذبات کا دردانگیز نقشہ کھینچا ہے۔ نقاد بھی اس ناول کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس کا ہمدردانہ استقبال کیا گیا۔

سوریہ چند مگھیانی نے اپنے "پھول چھاب" کے لیے بطور نذرانہ ایک ناول لکھنے کے لیے اُنہیں مدعو کیا۔ اس بہانے اُن کا دوسرا ناول "مھیلا جیو" (ملن دو دلوں کا) لکھا گیا۔ محبت و الفت کے جذبات سے بھرپور اس ناول نے پنا لال پٹیل کی تخلیقی عظمت کو گجرات سے متعارف کرایا۔ اس کے بعد تو گجراتی صاحبِ ذوق قاری ایسے متاثر اور محظوظ ہوئے کہ بڑی بے تابی سے اُن کی ہر نئی تخلیق کا انتظار کرنے لگے۔ حالانکہ اس ناول پر فلمائی گئی "الجھن" کو نسبتاً زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ لیکن جب ساہتیہ اکادمی نے بھارتی ساہتیہ کی اہم تخلیقات کو پیش کرنے کے مقصد سے مختلف زبانوں میں ترجمے کروانے کا سلسلہ شروع کیا تو پہلے پہل جن دس کتابوں کو منتخب کیا گیا اُن میں "مھیلا جیو" بھی شامل کی گئی۔ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے اس ناول کا ہندی ترجمہ 'جی جی' کے عنوان سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد اس ناول کے تراجم دوسری اور زبانوں میں بھی ہوئے۔ جیسے کہ اُس ناول کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اس میں مصنف کے بستی جیون کا نچوڑ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سیدھے سادھے اور سچے جذبات کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

"مھیلا جیو" کی فلم بن رہی تھی۔ اس سلسلے میں پنا لال پٹیل کو بمبئی میں رہنے کا موقع ملا۔ وہاں وہ بمبئی کی فلمی دنیا اور ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ وہ چار برس بمبئی میں رہے۔ بمبئی میں قیام کے دوران امرت لال ناگر جیسے مشہور

ہندی مصنف کے ساتھ اُن کے اچھے تعلقات قائم ہوئے - اس کے علاوہ خاص طور پر مشہور گجراتی روزنامہ 'جنم بھومی' کے دفتر میں شاعر اور اخبار نویس کرسن داس مانک، قلم کار دلیپ کوٹھاری (جو بعد میں برسوں تک فلم سینسر بورڈ کے چیرمین رہے) مشہور کہانی کار گلاب داس بروکر اور دیگر کئی گجراتی ادیبوں کے ساتھ اُن کے تعلقات استوار ہوئے - اسی دوران اُنہوں نے شہری زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے "جیون'، سور بھ' وغیرہ ناول لکھے - لیکن کہانیاں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا -

کہنا پڑے گا کہ جس جابک دستی اور شہرت کے ساتھ پنالال پٹیل نے دیہاتی زندگی کا اور دھرتی کے ساتھ اٹوٹ رشتہ نبھانے والے لوگوں کا تخلیقی ڈھنگ سے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں نقشہ کھینچا ہے ———— اسی شدت کے ساتھ ویسے محسوسات کی عکاسی اُن کی شہری زندگی میں نہیں ملتی ہے ——

اس کے بعد پنالال پٹیل نے ایک دوسرا ناول 'نہ چھوٹکے' (کوئی چارہ نہیں) شروع کیا - لیکن نہ جانے کیوں، اُسے ادھورا چھوڑ کر اپنے ادھورے ناول 'مان وینی بھوائی' پر پھر توجہ مرکوز کی - اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ 'مان وینی بھوائی' کی کہانی حد سے زیادہ طویل ہوتی جا رہی تھی - اور اُسے ایک ہی جلد میں ختم ہونے کی غرض سے دوبارہ لکھنا ضروری تھا - رم جھم بارش میں اپنے مکئی کے کھیتوں کے بیچ اونچے مچان پر بیٹھے بیٹھے اور کوّوں کو اُڑاتے اُڑاتے وہ یہ ناول لکھتے رہے تھے لیکن اس بار بھی بجائے مختصر ہونے کے، وہ ناول طول ہی کھینچتا جا رہا تھا - آخر کار اُنہوں نے کہانی کو تین حصّوں میں بانٹنے کا فیصلہ کیا - 'مان وینی بھوائی' جلد مکمل کر لی .... تو فوراً ہی بمبئی کے بڑے گجراتی ناشر آر - آر - شیٹھ کو چھاپنے کے لیے دے دی -

'مان وینی بھوائی' کی اشاعت سے پہلے ہی پنالال پٹیل کو تپ دق کی بیماری لاحق ہو گئی - سندرم نے جو اب تک پوری طرح شری اروند کے یوگ درشن کے زیر اثر آ چکے تھے، پنالال پٹیل کو شری ماتاجی کے آشیرواد کے ساتھ خط بھیجا - تب سے پنالال پٹیل بھی شری اروند اور شری ماتاجی کے اثر میں آگئے - اور آج تک اُن کی 'شبد سادھنا' اُنہیں یوگ سادھنوں سے منسوب ہے - پنالال پٹیل کے اپنے لفظوں میں 'اُنہیں شری اروند کے پورن یوگ کی سنجیونی مل گئی - اور یوگ کی لگن لگ گئی'

اُسی برس بمبئی میں پنالال پٹیل کا تپ دق کا علاج چل رہا تھا، تبھی ناشر نے 'مان وینی بھوائی' ناول کی پہلی کاپی اُنہیں پیش کی - اُسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے - گیان پیٹھ انعام پانے کے موقع پر اپنے خطبہ میں اُنہوں نے بتایا کہ "میں خود تو یہ نہیں جانتا کہ میرے ہاتھوں سے ایک نرالے شاہ کار کی تخلیق ہو گئی تھی" لیکن گجراتی ساہتیہ کی دنیا میں اس ناول کا بڑی گرم جوشی سے استقبال ہوا - کچھ برس پہلے نیشنل بک ٹرسٹ نے اس کا ہندی ترجمہ "جیون کا ناٹک" کے عنوان سے شائع کیا تھا -

بعد میں اُنہوں نے 'مان وینی بھوائی' کی کہانی کو "بھانگیانا بھیرو" (آفت کی بیلا میں) اور "گھر ملیو نیں" (منتھن) کے دو حصّوں میں آگے بڑھایا - ان میں بھی پنالال پٹیل کی قوتِ تخلیق بہ احسن ظاہر ہوتی ہے - لیکن 'مان وینی بھوائی' میں موجزن جذبات و احساسات اور افسانہ گوئی کے فن کی کمی محسوس نہیں ہوتی - اُنہوں نے کہانی کو مکمل کرنے کی غرض سے اگر یہ دو حصّے نہ لکھے ہوتے تو بھی صرف "مان وینی بھوائی" اُن کو گجراتی کے سربلند مستند ناول نگار کا مقام دلوا سکتا تھا -

یہ ناول اُن کی دوسری تخلیقات کی طرح ناکام محبّت کی کہانی ہے، لیکن اس کے علاوہ اس میں اور بھی بہت کچھ ہے - گجرات کے پہ شکل بہ گھروں کی بستی والے چھوٹے سے گاؤں میں اس ناول کے تمام واقعات جُڑے ہوئے ہیں - اس گاؤں میں بسر ہونے والی زندگی کو جذباتی انداز سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس ناول میں قحط کے دنوں میں انسان کے خود اپنی انسانیت بھلا دینے والی مجبوری کا ذکر ہے، جو ایک طرف پیٹ کی بھوک کے آگے حیوان بن جانے والے آدمی کی قابلِ رحم حالت کی تصویر پیش کرتا ہے تو دوسری طرف اس سے رحم دلی کا جذبہ بھی متحرک کرتا ہے -

"مان وینی بھوائی" میں پنالال پٹیل نے کرداروں کے جذبات کا جس گہرائی میں جا کر سوجھ بوجھ اور ہمدردی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے - انسان کی کم ظرفی کا اور ساتھ ہی اُس کی عظمت کا، محبت اور نفرت کا - اور کمینگی کا اور انسان کی بالآخر فتح کا جس دلیرانہ انداز سے ذکر کیا ہے - اس میں ان کی قوتِ تخلیق دھنک کے رنگوں کی طرح نکھر کر سامنے آتی ہے - یہ ناول اُس چھوٹے سے گاؤں کے پس منظر میں ساری دنیا کا اور وہاں کے اَن پڑھ لیکن زندگی کے آسان فلسفہ کو لے کر جینے والے لوگوں کے تناظر میں تمام بنی نوعِ انسان کا احاطہ کرتا ہے -

"مان وینی بھوائی" انسان کے حالاتِ زندگی کا ناول ہے، جس میں انسان اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اپنی اندرونی طاقت کے بل پر فخر کے ساتھ اُبھرتا ہے - چھوٹے گاؤں میں رہنے والے لوگوں کی داستان ہے - جن کا اس دھرتی کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے - اس ناول میں اور دیہاتی پس منظر میں لکھے گئے اُن کے دیگر ناولوں اور کہانیوں میں بھی دھرتی کی بو باس ہے - کسانوں کے پسینے کی سگندھ ہے - بارش کی محبت انگیز دھارا ہے اور تپتے سورج کی تپش ہے - اس میں دیہاتی سماج کے میلوں ٹھیلوں کی سرمستیوں کا ذکر ہے - میلوں کی رنگ رلیاں ہیں - بانسری کے سُر ہیں - مویشیوں کی دنیا ہے، گیتوں کی گونج ہے سبے ضرر ہنسی مذاق ہے - زندگی ہے اور ساتھ ہی سایۂ مرگ - المختصر انسان کی زندگی میں جتنے جذبات اور احساسات کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ تمام پنالال پٹیل کی تخلیقات

میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ "مان بنی جوائی" میں بالخصوص نمایاں ہیں۔

پنالال پٹیل کو اُن کی ادبی خدمات کے لیے ۱۹۵۰ میں رنجیت رام سنہری تمغہ عطا کیا گیا جو گجرات کی سطح پر کسی بھی ادیب کے لیے سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے۔ اس کے بعد گجرات سرکار کی جانب سے یکے بعد دیگرے انعامات حاصل ہوتے رہے یہ اور بات کہ انعاموں سے زیادہ وہ اُس پیار محبت کو اہمیت دیتے ہیں جو انہیں اپنے قارئین اور نقادوں کی طرف سے ملا ہے اور یہ پیار و احترام انہیں انعام واکرام پانے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ مختلف اعزازات پانے پر گجراتی ادب کے قارئین کی نگاہ میں اُن کا وقار مزید بڑھ گیا۔ لیکن پنالال پٹیل کی نظر میں قارئین کی محبت اور نیک خواہشات ہی اُن کی زندگی کی سب سے بڑی کمائی ہیں۔

کئی بار پنالال پٹیل کی اہمیت دکھانے کی غرض سے ان کا نام گجراتی کے بابا اور سرسوتی چندر ناول کے مصنف گووردھن رام ترپاٹھی اور مستند ناول نگار کنہیا لال منشی کے ساتھ لیا جاتا ہے، لیکن اس نظریے کو زیادہ تر بڑھاوا نقادوں نے دیا ہے۔ تاہم ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ کسی مصنف کی اہمیت خود اس کی تصنیفات کی بنا پر ہوتی ہے اور مختلف قسم کے کاروں سے اُس کا موازنہ کرنا بالکل ناگزیر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہ تینوں عظیم ناول نگار ہیں۔ تینوں کا اپنا الگ مزاج ہے، الگ موضوع، الگ اپنا ایک جداگانہ تاثر ہے۔ ہر باشعور کے نزدیک پنالال پٹیل کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ اُن کی تخلیقات کو پڑھتے وقت دوسرے مصنف کا اسکے دل میں خیال آتا ہی نہیں۔

گجراتی ادب میں پنالال پٹیل کی تخلیقات کو ایک کرشمہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اور وہ واقعی کرشمہ ہیں۔ سولہ گھنٹے نوکری کرنے والا مزدور معمولی تعلیم کے باوجود عظیم ناول نگار اور کہانی کار بنا۔ اس واقعہ کو کرشمہ کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۶ سے لے کر آج تک کی تقریباً پچاس برس کی تخلیقی سادھنا کسی بھی مصنف کے لیے فخر کی بات ہے۔ اس طویل تخلیقی سفر میں اُن کی کہانیوں کے ۲۹ مجموعے، ۵۹ ناول اور ناٹک شائع ہوئے ہیں۔ بچوں کے ادب میں بھی اُن کا حصہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ "پار بھتے کہو جڑھاوے بان" (کرو پارتھ سر سندھان) چار جلدوں میں بچوں کے لیے ناول کی شکل میں مہابھارت کی کہانی ہے۔ اس میں پنالال پٹیل کا ایک اور پہلو نظر آتا ہے۔ پورانی ادب کی تحصیل میں اُنہوں نے اپنی زندگی کا کافی وقت صرف کیا۔

موجودہ دور کے تقاضوں کی روشنی میں پورانوں میں موجود مواد کو ادبی رنگ دے کر گجراتی ادب میں اُنہوں نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ خود اپنی پورانک تخلیقات کو اہم سمجھتے ہیں حالانکہ ادب میں اس ادب کو مکمل طور پر قبولیت کی سند حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس بات کا اُنہیں افسوس بھی ہے۔

جس مصنف نے اتنے لمبے عرصے تک تخلیقی خدمات انجام دی ہوں اور جس کی تصنیفات کی تعداد اتنی زیادہ ہو، اس کے لیے ہمیشہ یکساں بلند معیار کو بنائے رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ بلاشبہ پنالال پٹیل کی ساری تصنیفات بلند پایہ نہیں ہیں۔ اگر اُن کے یہاں موضوعات اسلوب اور الفاظ کی تکرار پائی جاتی ہے۔ تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کے باوجود اُن کی معمولی تخلیقات میں بھی اُن کی منفرد تخلیقیت کی جھلک ضرور ملتی ہے۔

آج بھی اُن کے قلم میں وہی دم خم ہے، جس دم خم کے ساتھ اُنہوں نے اپنی پہلی کہانی "سیٹھ کی شاردا" لکھی تھی اور یہ اس لیے ہے کہ ۵۰ برس گزرنے پر بھی اُن کے اندر کا تخلیق کار زندہ و فعال ہے۔

گیان پیٹھ انعام پاتے وقت اُنہوں نے کہا تھا: "جتنا میں رجائیت پسند ہوں اتنا ہی میں پُر اُمید ہوں"۔ وہ مکمل یقین کے ساتھ یہ مانتے ہیں کہ تخلیقی قوت آدمی کی کوشش سے پرے ہے۔ ایشور کی کرپا سے ہی اُسے حاصل کیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔"

ظاہر ہے اُن کے دل میں اس خیال نے گھر کر رکھا ہے کہ وہ ایک کامیاب اور مستند مصنف ہیں۔ اسی تقریب کے موقع پر اپنے لیکچر میں اُنہوں نے کہا تھا کہ جس لفظ کی عظمت کے گیت دنیا بھر کے تخلیق کاروں نے گائے ہیں، اُس لفظ کا مجھے بھی کئی بار احساس ہوا ہے۔ اپنے پچاس برس کے تخلیقی سفر میں، میں نے اس لفظ کو پانے، اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس لفظ کو پا نہیں سکا ہوں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ لفظ کہاں سے اُمڈ کر تخلیق کار کے خیال میں ظاہر ہو جاتا ہے۔" یہ پنالال پٹیل کے دلی محسوسات و جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ کامیابی کے باوجود جو مصنف فطری طور پر منکسر رہ سکے، وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ گیان پیٹھ انعام نے اُن کو بھارت کی دوسری زبانوں کے اُن مسلّم عظیم المرتبت تخلیق کاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جن سے ہندوستانی قارئین کو بہت پہلے متعارف ہو جانا چاہیے تھا۔

●●

بقیہ: خاموشی

بھینس کی چاروں طرف گھومتی ہوئی آنکھوں اور اُس کی آنکھوں کی چمک اور اُس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے باقی جانوروں کو دیکھتے رہے۔

پھر اُنہوں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس طرح دوسروں کی آنکھوں میں اُنہوں نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اپنے افلاس کو دوسروں کے چہرے پر چھائی ہوئی مُردنی میں دیکھا۔ دوسروں کے پھٹے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں میں اپنے اپنے جسم کے ننگے پن کو دیکھا اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا اُن کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ اُن پر بھی وہی خاموشی چھا گئی جو اس وقت اُن جانوروں پر چھائی ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بھی اُن جانوروں کے پیچھے گردنیں جھکا کر بُت کے بُت بنے یوں کھڑے ہو گئے جیسے وہ بھی گائے بھینس یا بھیڑ بکریاں ہوں۔

پنالال پٹیل / نریندر شیپل

کنکو

"نہ کرے نارائن، پر اگر میں مرجاؤں تو تو اپنا جیون مت بگاڑنا۔ کسی اچھے آدمی کا گھر ڈھونڈ لینا"۔ جیون کے کنارے کھڑے کھما نے اندر دھنسی آنکھوں سے کھاٹ کے پاس بیٹھی اپنی بیوی کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنی کے سہارے ذرا اُٹھا۔ کنکو کی گود میں کھیلتے ہوئے چار یا پانچ مہینے کے بچے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اور ہیرا..... وہ تو تیری گود میں ہے۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" دونوں پر نظر ڈالتے ہوئے کھما کی روح پچیس برس پہلے جس طرح آئی تھی، کچھ ویسے ہی چلی گئی۔

کنکو کا بین ایسا تھا کہ راہ جاتے ہوئے کو رُلا دے۔ جوان گبرو کھما کی موت دشمن کو بھی رُلا دیتی۔ سبھی کے تسلی دینے پر کنکو کی آنکھیں ادھ سوکھ گئیں۔

گھر کا سب کچھ لگا کر اور قرضہ لے کر کنکو نے کھما کی تیرھویں کی۔ سب کی زبان پر کنکو کا نام تھا۔ اُس کے بعد تو وہ رویا ہی کرتی۔ کنویں کا پانی سوکھ سکتا ہے لیکن کنکو کی آنکھیں خشک نہیں ہو سکتیں۔ اب اُسے گھر کی غریبی، آنے والی مصیبت کا احساس کرانے لگی۔ بڑے بوڑھے کہتے بھی کہ "اس طرح رو رو کر اُدھ کھو دے گی تو بچہ کیا پیئے گا؟" لیکن بچے کی خاطر کنکو نے اس دکھ کے پہاڑ کو اپنے چھوٹے لیکن طاقتور دل میں دبا لیا۔

کنکو اور کھما کی جوڑی سارے گاؤں میں بے جوڑ تھی۔ جب کنکو سسرال آئی تب کھما پر قرض کا پہاڑ تھا۔ دونوں نے کڑی محنت کر کے کافی قرضہ اُتار دیا تھا، تبھی بوڑھے بڑھیا کے کریا کرم کے خرچ میں اتنا اور چڑھ گیا۔ لیکن جوان کھما کی مشقت اور کنکو کی ہوشیاری دیکھ کر ملک چند سیٹھ اور اُدھار دینے کو تیار رہتا۔ وہی کھما دغا دے گیا۔ ملک چند کا حساب اُلٹا ہوتا جان پڑا۔

قریبی رشتہ داروں نے کنکو کو کسی عزت دار کا گھر بسانے کا مشورہ دیا۔ لیکن کنکو نہیں مانی۔ کنواروں کی تو جانے دو۔ ایک بیوی ہوتے ہوئے بھی بہت سے نوجوانوں نے اُسے سونے سے لاد دینے اور گھر کی رانی بنانے کا لالچ دیا۔ لیکن کنکو نہ مانی تو نہ ہی مانی۔ وہ اتنا ہی کہتی "بھگوان نے راج کنور جیسا بیٹا دیا ہے پھر کسی دیا کی روٹی کھانے کی کیا ضرورت؟" اور بچے کو چوم کر کہہ اُٹھتی: "کل بڑا ہوگا اور تمہارے آگے سے کھیل کر گھر آئے گا۔" آنے والے اپنا سا منھ لے کر واپس چلے جاتے۔

کوئی اُس کے ہاتھ کا کھانا کھانے تو کوئی میٹھی نظر پانے کو، کوئی ترس کھا کر تو کوئی ہمدردی سے اُس کے کھیتوں کو بو دیتا اور کنکو بچے کی طرح کھیتوں کی دیکھ بھال کر کے اپنے دن کاٹتی۔

کھما کے ساتھ جو کام پلک جھپکتے ہو جاتا تھا، وہ اب اُسے مشکل لگتا۔ گوڑتے گوڑتے کئی بار اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اور وہ گھاس کی جگہ دھان کے پودوں کو اکھاڑ ڈالتی۔ جب کھما کو دو چار روز کو باہر جانا پڑتا تو کنکو کے لیے جدائی ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ تو یہ عمر بھر کی تنہائی کیسے برداشت ہوتی۔

گاؤں کے نوجوانوں میں وہ رنگیلا جوان گنا جاتا تھا۔ اُس کے پہناوے کی نزاکت دیکھ نوجوان عورتیں خود کو کم نصیب گنتیں اور جوان رشک کرتے۔ مزید برآں اُسے کنکو جیسی چھبیلی بیوی ملی۔

کنکو کھما کو بھی مات دے، ایسی تھی وہ۔ اُس کی جوانی کے پیچھے گاؤں کے نوجوان پاگل تھے۔ ادھیڑ جوان ہونے کی کوشش کرتے، جب کہ بوڑھے اپنی جوانی یاد کرتے۔ کھما کو اپنے پہناوے کے اونچے چھور کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ مگر اُس نے کبھی کنکو کی پوری کے ریشمی کپڑے کا رنگ پھیکا نہیں ہونے دیا تھا۔ دیوانے کھما کو کنکو میں روز کچھ نہ کچھ نیا دکھائی دیتا۔ کبھی اُس کے گلے میں لہراتے ہوئے موتیوں کے ہار کو دیکھتا رہتا۔ کسی وقت پیٹھ پر جھول رہے پھندنے کے موتی گنتا۔ تو کبھی پاؤں کے کڑوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ کھما کی اس دیوانگی نے

• ۱۵-پرگیہ سوسائٹی، نورنگ پورہ، احمدآباد، گجرات۔

کنکو کو اور بھی پاگل کر دیا تھا۔ پاگل پن سے بھرپور
اُن پانچ برسوں کی باتوں کو یاد کر کے کنکو آج سب
کچھ بھول کر کبھی ہنس پڑتی تو کبھی پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگتی۔ جس طرح بھری دوپہری میں ریگستان
میں چلنے والا مسافر کچھ فاصلے پر چھاؤں دیکھ کر جلدی
جلدی قدم اٹھاتا ہے اسی طرح اپنے بیٹے کی طرف
دیکھ کر کنکو میں ہمت بندھ جاتی "کل بڑا ہوگا اور یہ
دُکھ کے دن سکھ میں بدل جائیں گے۔ کنکو سوچتی۔

سیٹھ ملک چند گاؤں میں آتے تو کنکو کی خیر خبر
پوچھنا نہیں بھولتے۔ اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہتے۔
" دھنیہ ہے کنکو' دھنیہ ہیں تیرے ماتا پتا۔ تُو نے
سسرال اور میکے دونوں کی عزت بڑھائی۔ جس
جاتی میں ودھوا استری دوسرا گھر کر لیتی ہے وہاں تُو
بنہا براہمنی کی طرح ودھوا جیون سویکار کرتا ہے۔ جو
چاہے سو ہو جاتا۔ کل ہیریا بڑا ہو جائے گا۔ سُکھ دُکھ
کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"ملک چند کاکا، تم تو دیوتا آدمی ہو۔ نہیں
تو اتنے قرض کے بعد کون عورت جات کو اور قرض دیتا ہے؟"
کنکو رُندھے گلے سے بولی۔

اتنے دُکھوں میں بھی کنکو پہلے کی طرح ہنسی۔
لیکن پہلے کا ہنسنا روتوں کو ہنساتا تھا اور اب
ہنستے ہوئے کو رُلا دیتا۔ تیر جیسے خاوند کے جیتے جی جو
نوجوان مذاق کرنے کی ہمت کرتے تھے، وہی آج آنکھ
اونچی بھی نہیں کر پاتے۔ سبھی ڈرتے۔ کنکو سے نہیں، کنکو
کی تیاگ مورتی سے۔

برساتی جھرنے کی طرح بہنے والا وقت کنکو کے
لیے تو شنکر کی جٹا دھارا کے مثال تھا۔ لیکن جیسے تیسے
بن پڑا گزار لیا۔ دس برس بیت گئے۔

ایک بار کنکو سیٹھ کے یہاں پیسہ لینے گئی۔ انہیں
خوش دیکھ کر بات نکالی "ملک چند کاکا، بیلوں کے
لیے پیسے دو تو، اگلے برس ہل بساتا ہے۔"

"تو منع کون کرتا ہے؟ تجھ سے زیادہ تو مجھے
جلدی ہے کہ میرے گاہک کا گھر سب لوگوں کے برابر آجائے۔"
اور ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "آج بساتا ہو تو
ابھی دے دوں؟" کچھ دینے کا سوانگ بھرتے ہوئے تختے
سے ہوا کھانے لگے۔

کنکو احسان بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بول پڑی۔
"تمہاری تو پوری مہربانی رہی ہے۔"

"پر تم لوگوں کو اس کی کہاں فکر ہے۔" سیٹھ
مسکراتے ہوئے کنکو کی طرف تکنے لگے۔ کنکو کی نظر ملتے ہی
دوسری طرف دیکھنے لگے۔ تختے سے ہوا کھانے لگے لیکن
کان کنکو کی طرف ہی لگے رہے۔

"تمہارا خیال نہیں کرتے ایسا کب ہوتا ہے
ملک چند کاکا۔ تم نے تو بُرے وقت میں ہماری لاج
رکھی ہے۔" کنکو بولی۔

"اب لاج باج تو ٹھیک ہے۔ سب میٹھے
کے لالچ میں جھوٹا کھاتے ہیں۔" کنکو کا دوبارہ لفظ
"لاج" زبان پر لانا سیٹھ کو اچھا نہیں لگا۔

کنکو کو سیٹھ چھوٹے ہوتے ہوئے محسوس
ہوئے۔ وہ بولی۔ "تم کچھ بھی کہو۔ لیکن کیا میں
تمہارا احسان بھول سکتی ہوں؟"

سیٹھ کچھ بولنے والے ہی تھے کہ سامنے کی دکان
سے کپڑے کی پوٹلی باندھے ہوئے ایک آدمی نے
آواز دی "کنکو بہن، گاؤں چل رہی ہو؟"

کنکو نے 'ہاں' میں جواب دیتے ہوئے
پوٹلی اُٹھائی اور "چلتی ہوں ملک چند کاکا!"
کہہ کر سیڑھیاں اُترنے لگی۔ سیٹھ کچھ بڑبڑائے مگر
کنکو نے اُدھر دھیان نہیں دیا۔ کنکو کو آج سیٹھ کا
برتاؤ عجیب لگا۔ وہ سارا راستہ اسی احساس سے
پریشان رہی۔ نہیں نہیں، ایسا آدمی تو نہیں ہے۔
.... ہو بھی تو مجھے کیا ہے؟" اس طرح سیٹھ کو بھولنے
کی کوشش کرتی اور انہیں خیالوں میں اُلجھی گھر آگئی۔

سیٹھ کی عمر تو چالیس کی تھی، لیکن لگتے پینتالیس
کے تھے۔ توند کے علاوہ مزاج بھی بزرگانہ ہو رہا تھا۔
اُن کی عمر کے گاہک انہیں کاکا ہی کہتے تھے۔ گاؤں
کی غریب بستی کو چوس چوس کر دس دس ہزار خرچ
کر کے انہوں نے دو بار شادی کی، لیکن پہلی بیوی نو
برس اور دوسری بیوی چار برس بعد ملک چند کو اکیلا
چھوڑ گئی۔ گویا اپنا قرض لینے آئی ہوں۔ دیگر جات میں
بات پھیل گئی کہ ملک چند بیوی کھور ہیں۔ ایسی بات
پھیل جانے پر بیس ہزار خرچ کرنے پر بھی کون اپنی
لڑکی دیتا ہے؟ ملک چند نے بھی یہ خیال دل سے نکال
دیا۔ اُن کی ۶۵ برس کی ماں بھی بہو کی اُمید چھوڑ کر
کام کرتے ہوئے موت کا انتظار کرنے لگیں۔

دوسرے برس کنکو نے ہل بسا لیا۔ ہل چلانے
کے علاوہ وہ سارے کام بڑے شوق سے کرتی۔
دو برس میں تو اس نے دس برس کی بیوگی کے دنوں
کا قرض چکا دیا۔ سیٹھ دوسروں کے سامنے کنکو کی
مثال دیتا: "دیکھو، کنکو نے دو برس میں ایک سو بیس
روپے چکا دیے۔ تم تو حقہ گڑگڑاتے رہو۔ تم سے
کچھ نہیں ہو سکتا۔"

کنکو کو لڑکے کے ہاتھ پیلے کرنے کی لگن لگ گئی
ایک دن تڑکے ہی سیٹھ کے گاؤں پہنچ گئی اور یہ بات
کہی۔

کسانوں کی روزمرّہ زندگی چلانے والے ساہوکار
نہیں ہوتے تو کسان طبقے کی نہ جانے کیا حالت ہوتی
سیٹھ ملک چند خوش ہوا۔ "واہ! پھر تو کنکو کھاٹ پر
بیٹھ کر بہو پہ راج چلانے گی؟" سیٹھ ہنسا لیکن اس
کی ہنسی میں مٹھاس کی جگہ کسیلا پن تھا۔ اُسے اپنی
زندگی کا کسیلا پن یاد آگیا۔

"تمہاری کرپا ہو تبھی ایسا ہو سکتا ہے۔"
اُمید بھری نظروں سے کنکو تاکتی رہی۔

"کتنے دینے ہوں گے؟" اپنے خیال میں کھوئے
ہوئے سیٹھ نے پوچھنے کی خاطر پوچھ لیا۔ "تمہیں کیا پتہ
نہیں۔ کل صبح تو گلا ڈھامور کے لڑکے کا بیاہ کرایا ہے!"

"پھر بھی؟" سیٹھ نے پوچھا اور گہری سانس
لے کر کنکو کی طرف تکنے لگے۔

"ایک من گڑ۔ ایک سو بیس نقد۔ دھان تو
گھر سے نکل آئے گا، گھی اُدھار مل جائے گا....
پر کپڑے....؟"

سیٹھ بیچ میں بول پڑا کوئی بات نہیں۔ ایک من
گڑ، تیس چالیس کے کپڑے اور ایک سو بیس نقد۔ بس

اتنا ہی تو؟ اور گھی کے لیے دوسری جگہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ..... پر ایک بار تو ہیریا کی سگائی توکر۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کنکو کے لڑکے کی سگائی ہوا در میں اُدھار نہیں دوں؟" یہ کہتے ہوئے وہ کنکو کا منہ تاکنے لگا۔ جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو اور کچھ دیر بعد تھوڑے نیچے نظریں گاڑ دیں۔

نظریں کہاں لگی ہیں! یہ جان کر کنکو بے تاب ہو گئی اور ساڑھی کے پلو کو ٹھیک کر لیا۔ سیٹھ جھینپ گئے۔ تکیہ پر ڈھلکا ہوا جسم سیدھا کیا اور منہ سے کرشن کرشن کرنے لگے۔ "اچھا لے جانا!" کہہ کر سیٹھ کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں دوسرا گاہک آیا اور انہیں پھر بیٹھنا پڑا۔

کنکو نے اپنی پوٹلی اٹھائی۔ لیکن اُس گاہک نے تھوڑا رک کر ساتھ ہی چلنے کو کہا۔ کنکو رکی تو سہی۔ پر دُکان کے باہر دالان میں بیٹھ گئی۔

گھنٹہ بھر میں تو اس آدمی کی خریداری پوری ہو پائی۔ کنکو کھڑی ہوئی تو سیٹھ کہے بغیر نہیں رہ سکے۔ "کنکو، کھانے کا وقت ہو گیا ہے تو کھا کر ہی جا۔"

کنکو نے دل میں بھرے غصّے کو چھپا کر کہا۔ "نہیں ملک چند کاکا، پاس تک کا ساتھ ملا ہے۔ دوپہر تک تو گھر بھی پہنچ جاؤں گی۔"

"گھر جا کر تو کھاؤ گی ہی۔ لیکن یہ گھرے کر کیوں بیٹھے ہیں؟" چوانی کے کنارے کھڑے اُس آدمی نے کہا اور سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "وہ ہمارے ہاں کھائے گی۔ گاؤں سے نکلے گی تو کہیں بھوکا جانے دیں گے؟" اور اپنا سامان اُٹھا کر چل دیا۔

سیٹھ جو کھٹ پکڑ کر ٹولی میں الگ نظر آتی ہوئی کنکو کو تاکتے رہے۔ کنکو مڑ گئی تو سیٹھ کی آنکھیں سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائیں۔ یکایک اُنہیں ہوش آیا اور دُکان کی طرف مُڑ کر 'کرشن کرشن' بولنے لگے۔

راستہ بھر کنکو بے چین رہی۔ ساتھ والے سیٹھ کی تعریف کیے جا رہے تھے۔ "کنکو بائی چاہے کچھ بھی ہو، لیکن ملک چند کاکا نے تمہاری بڑی لاج رکھی ہے۔"

دوسرا بولنے لگا۔ "ہاں، ایسے سمے میں تو خاص سگے بھی اُدھار نہیں دیتے۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنے سگوں کے کڑوے تجربے کی مثال دے۔ تیسرے نے کہا "ارے بھائی، ملک چند تو دیوتا آدمی ہے۔ بھگوان کے بھروسے کام کرتا ہے۔" پھر وہ بوڑھا ان پچاس برسوں میں بدلے بے شمار ساہوکاروں کی مثالیں دینے لگا۔ "وہ ہر گوبند! ارے اُس کا بیاج تو راجہ جی کے گھوڑے سے بھی تیز چلتا ہے۔"

ان باتوں میں کنکو کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے برعکس اُسے شبہ ہوا کہ اُس کے آگے سیٹھ کی تعریف کرنے کا کہیں دوسرا مطلب تو نہیں۔ اُس کا دل سیٹھ کے سلوک کا تجزیہ کرنے لگا۔ سیٹھ ویسے تو بھلا لگتا ہے ..... ! نہیں نہیں! اُس نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اُلٹا اپنا دیکھے اُدھار دیے جا رہا ہے ..... نہیں تو اُسے کیا لاج؟ لڑکا کنوارا ہے تو میرا ہے، اُس کا تو نہیں ہے؟" کنکو نے ایک گہری سانس لی۔ بے چارے نے دو بار شادی کی پھر بھی روٹی کا دُکھ ویسے کا ویسا ہے۔ ذات کا بنیا! اور دُکھ سہن ہو سکتے ہیں لیکن روٹی کا نہیں۔ کہیں اُس کی طرح اپنی جاتی میں بھی کنیا کا یہ سوال رہتا تو ہم جیسوں کے لڑکوں کو کون پوچھتا۔ اس طرح سوچتی ہوئی کنکو کھانے کے لیے اُس گاؤں میں نہ رُک کر سیدھی اپنے گھر آ گئی۔

کنکو کی اپنی برادری میں بہت عزت تھی۔ بیوہ تھی۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں تھا۔ پھر بھی سب کے برابر سبھی کاموں میں حصّہ لیتی۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں بھی اُس نے ذرا فرق نہ پڑنے دیا تھا۔ اس لیے لڑکے کی سگائی میں ذرا بھی دقت نہ آئی۔

کنکو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ "ہیریا کی بہو کو اپنے کپڑے دوں گی۔" اُس نے دس بارہ برس پہلے ساڑھی میں باندھ کر رکھی ہوئی مالا، انگوٹھی، چوڑی وغیرہ گہنے اور موتی جڑی چپلی پھر یا بہو کے لیے نکال لیے تھے۔ "آئے گی تو چولہا اُسے ہی سونپوں گی۔" بہت دن مزدوری کی ہے۔ اب تو یہ دونوں اپنا سنبھالیں۔" آج سے اٹھارہ برس پہلے خود بہو بن کر آئی تھی۔ اُس جگہ ہیریا کی بہو کو بٹھانے کی اُمنگ میں وہ خود کو بھول گئی۔

کنکو بیاہ کے انتظام کے سلسلے میں سیٹھ کے یہاں جانے والی تھی کہ اُدھار وصول کرنے نکلے سیٹھ اُس کے گھر آ پہنچے۔ اُنہوں نے کنکو سے گہنوں اور دیگر خرچ کے بارے میں ویسے ہی پوچھا۔ جیسے سبھی گاہکوں سے پوچھتے تھے۔ لیکن اس لہجے میں تھوڑا سا فرق تھا۔ بیٹھے ہوئے گاؤں والے سیٹھ کی فراخ دلی سے مسحور ہو گئے۔ کسی کسی کو اس عورت کے سلوک سلیقے پر رشک آیا۔ کنکو احسان کے بوجھ تلے دبتی ہوئی بولی "ملک چند کاکا، میں تو تمہارے ہی بل بوتے پر لڑکے کا بیاہ رچا رہی ہوں۔"

سیٹھ کا تو ایک نیا گاہک بنے گا۔ ایسے وقت پر مدد لینے کے لیے ہی تو بُرا سیٹھ دیکھا جاتا ہے۔ ان کے باپ میری بارات میں آئے تھے۔ وہ تو مجھے ابھی یاد ہے۔ لڑکے تو متھرا کاکا کے ہی ہیں"——
گملا ڈھامور نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"غلط کیوں بولیں۔ کنکو بہو کو بُری گھڑی میں اُنہوں نے بہت سہارا دیا ہے۔" کنکو کے خاندان کا ایک بوڑھا بولا۔

"کنکو نے بھی برابر ادائیگی کی ہے۔ وعدہ نبھایا ہے۔ مجھ سے انکار کیسے ہو۔" سیٹھ نے بھنویں کھینچتے ہوئے کہا۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی تعریف میں کچھ کہے، گھوڑی پر سوار ہو کر بولے "روپے تو بارات کے ایک دن پہلے لے جانا اور گڑ گھی جب آؤ گی تب تول دوں گا۔" اتنا کہہ کر گھوڑی کی لگام کھینچ کر ڈھیلی چھوڑ دی۔

سیٹھ کو خیر باد کہہ کر آنگن میں کھڑے لوگ ابھی سیٹھ کی تعریف کر رہے تھے، لیکن کنکو یہ تعریف سن کر شش و پنج میں پڑ گئی تھی۔ اس لیے وہ گھر کے اندر چلی گئی۔
دو دن بعد کنکو گڑ، گھی اور کپڑا لینے گئی۔ سیٹھ

نے اُس کی پسند کے کپڑے نکال دیے اور کنکو کے لیے ساڑھی اُس کے انکار کرنے پر بھی باندھ دی جو خاصی مہنگی تھی۔

"سوچے سمجھے بغیر لے جا چپ چاپ! مہنگی لگ رہی ہو تو لاگت کے دام دے دینا اور میری طرف سے پہنے گی تو سمجھوں گا کہ نقد پر آدھے آنے کا ہی بیاج لیا تھا۔" جذبات کی رَو میں سیٹھ کے منھ سے نکل گیا۔ وہ یک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ "گودام سے گُڑ تول دے اور دُکان کی کُنڈی چڑھا آنا۔" چابی لے کر نیچے اُترتے ہوئے بولا۔

گودام کا تالا کھولتے ہوئے سیٹھ کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بچھو کی دُم ایسی لمبی چابی کنکو کو دیتے ہوئے بولے۔ "لے، کھول تو سہی، اور سامنے کونے میں سے گُڑ کی بھیلی ترازو میں رکھنا، میں تب تک پانی پی آؤں۔" کہہ کر اس طرح بغل کے اپنے گھر کی طرف چلے جیسے کسی بھیانک جگہ سے بچ کر آئے ہوں۔

کنکو اندھیرے گودام میں گھُسی۔ اندر کے کونے میں گُڑ کی بھیلیوں کی تہہ کے پاس گئی۔ دو بھیلیوں کو نیچے کو گرایا لیکن نہ تو الگ کر سکی اور نہ اُٹھا کر ترازو کے پاس لا سکی۔ کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں سیٹھ آ گئے۔

"کیا کر رہی ہو اب تک؟"

"یہ تو اُکھڑتی ہی نہیں؟" کنکو نے جھنجھلا کر کہا

"اری تیرا کھایا پیا سب بیکار گیا۔" کہہ کر سیٹھ نے کیلے سے دو بار میں بھیلیوں کو الگ کر دیا۔ سیدھا کھڑا ہو کر کنکو کو فاتحانہ نظر سے دیکھا۔

"مرد کی بات اور ہے۔" کہہ کر کنکو بھیلی اُٹھانے کے لیے جھکی تھوڑی سی کوشش کرنے کے بعد بولی۔ "یہ تو اُٹھائے نہیں بنتی۔" سیٹھ نے مدد کی۔ اُن کا ہاتھ کنکو کے ہاتھ سے چھو گیا۔ سیٹھ کو پسینہ آ گیا۔ بھیلی مشکل سے اُتروائی۔ سیدھا دروازے کی چوکھٹ پر جا بیٹھے۔ "کرشن، کرشن!.... شریر اکڑ گیا...." اور دھوتی کا کنارا پکڑ کر دل کی بے قراری کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

کنکو نے دوسرے پلڑے میں باٹ رکھے اور دونوں پلڑے برابر ہو گئے تو بولی۔ "دیکھو، ملک چند کا کا!"

سیٹھ نے باٹوں کا دو تین بار جوڑ کیا تب کہیں صحیح تول لکھ پایا۔ لیکن اُس کے بعد نہ تو اُنھوں نے خالی بوریوں کو ہٹایا اور نہ پیسے ہی گنے۔ وہ تو باٹ اُٹھاتی کنکو کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔

"کنکو ایک بات پوچھوں؟" ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ کنکو نے سیٹھ کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس نے منع کرنے کی سوچی، مگر منع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ "کیا؟" پوچھ کر وہ بھیلی پر چپکے ہوئے بھُوس کو اُکھاڑنے لگی۔

"تُو نے دوسرا گھر کیوں نہیں کیا؟" سیٹھ کی آواز سنجیدگی اور جذبات سے بھری تھی۔ بجلی کے لپکے کی طرح کنکو کو اپنی خوش بختی کے دن یاد آئے اور چلے گئے۔ سنبھل کر بولی۔ "ہیریا کو چھوڑنے کا من نہیں ہوا۔"

"اب تو وہ اپنا سنبھال سکتا ہے؛ میری مان تُو دوسرا گھر کر لے۔ ابھی کیا بگڑا ہے۔" آخری فقرہ پورا کرتے ہوئے سیٹھ کی نظریں کنکو پر رُک گئیں۔ گویا کہتی ہوں: پندرہ برس پہلے جیسی تھی، اب بھی ویسی ہے۔ اس جوانی کو تُو کیسے دباتی ہے۔

"کہیں پاگل تو نہیں ہوئے ہو۔ اب کتنے سمے کے لیے یہ سب کروں؟ لو، اُٹھواؤ دن تو چھُپنے کو ہوا۔"

سیٹھ گہری گہری سانس چھوڑ کر کھڑے ہوئے۔ پل بھر کے لیے اُسے دیکھتے رہے، لیکن کنکو اُن کے دل کی بات جان گئی تھی۔ نیچے جھک کر بھیلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "لو اُٹھواؤ۔" سیٹھ کو جھکنا پڑا۔ بھیلی اُٹھا کر باہر نکلتی ہوئی کنکو کی لچکتی کمر نے تو اُنھیں بے حال کر دیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ کان سُرخ ہو گئے اور تمام جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ اُنھوں نے اسی حالت میں گودام کا تالا بند کیا۔

کنکو گاؤں سے آئی ہوئی گاڑی میں گُڑ کی بھیلی رکھ کر کپڑے کی پوٹلی لینے آئی۔ گدّی پر بیٹھے سیٹھ کا اُڑا اُڑا رنگ اُس سے چھپا نہیں رہا۔ لیکن اُدھر دھیان نہ دے کر پوٹلی بغل میں دبا کر بولی۔ "آج سے پانچویں دن روپے لینے آؤں گی ملک چند کا کا۔"

ملک چند نے اپنے معمول کے لہجے میں کہا۔
"اچھا، چاہے تب لے جانا۔" اور آنکھ بند کر کے پانچ دس منٹ پہلے آئے ہوئے بھیانک طوفان سے بچا لینے کے لیے شری کرشن کا بہت اُپکار ماننے لگے۔

سر پر پوٹلی رکھے ہوئے آج کنکو کے من میں راستے میں بے شمار خیال آنے لگے۔ پانچ دن بعد پیٹ کا جایا لڑکا پرایا ہو جائے گا۔ جتنا بہو کا ہوگا، ماں کا تھوڑا رہے گا۔ اور رہے گا بھی تو کتنے دن! جانے کیوں آج پہلی بار کنکو کو اکیلے پن کا احساس ہوا! جیسے خود اپنا فرض نبھا کر بے کام ہو گئی ہو۔

لڑکے کی شادی پر دیوتا پوجا کی گئی۔ اس موقع کے آنند کے باعث یا کسی اور وجہ سے کنکو اور دنوں کی نسبت آج زیادہ گمبھیر تھی۔ دولہے کے لباس میں سجے ہیریا کو وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ وہ بیاہنے آئے تھے تب وہ ایسے ہی لگتے تھے۔ گویا ایک کو اٹھا کر دوسرے کو بٹھا دو۔ وہ ہیریا کے لال صافے کا کنارا ٹھیک کرنے لگی۔ اس صافے میں بھی اُس نے گھُما کی نزاکت ہی کو دیکھا۔

گاؤں والوں نے بھی اس آنند میں حصّہ لیا۔ جوان لڑکیوں نے آنگن میں بیٹھ کر گانے گائے — برسوں سے سُونے آنگن میں گہما گہمی ہوئی۔ سب کو گُڑ پرساد دیا گیا۔ گیت گا کر اُٹھی عورتوں نے خوشی سے جھُوم کر کنکو کو سواگت کی یاد دلائی۔ "پاگل کنکو! پانی کا گھڑا بھر لا۔ پیاسی مر رہی ہیں —" کنکو ہاتھ میں پانی کا گھڑا لیے اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہاتی ہوئی باہر آئی۔ برابر کی عورتوں نے اُسے پھر الاہنا دیا۔ "ذرا دھیرے سے پیر رکھ.... دھیرے سے...."

بارات جانے سے ایک دن پہلے کنکو روپے لینے گئی۔ سیٹھ نے دوسرے گاہکوں کو نپٹایا اور کنکو کے کھاتے میں ایک سو بیس روپے نقد اور ساڑھے سات روپے آڑھت کے لکھ کر کنکو کا انگوٹھا لگوایا۔ گواہی کے طور پر دو گاہکوں کے انگوٹھے بھی لگوا لیے۔ بہی کھاتہ بند

کر کے بولے "چل، گھر سے روپے دوں" اور کھڑے ہو گئے۔

گھر میں بوڑھی ماں برتنوں کو اکٹھا کر کے رسوئی گھر کو صاف کر رہی تھی۔ کنکو نے بنا کہے ہی برتن مانجھ دیے۔

"کنکو اسی روپے سے کام نہیں چلے گا؟ تھوڑے کم پڑتے ہیں" کمرے سے باہر آتے ہوئے سیٹھ نے کہا۔

"ملک چند کاکا! مجھے کہاں پانچ سات لڑکے بیاہنے ہیں؟ اکیلا ہے اُس میں بھی کسر رکھوں تو لوگ کیا کہیں گے! ویسے تو اس سے کم میں چل جائے..."

ملک چند بیچ میں بولنے لگے "تجھے منع کون کرتا ہے۔ یہ تو پوچھ رہا ہوں۔ ذرا ہرگوبند کے یہاں ہو کر آتا ہوں" اور باہر نکل گئے۔ بوڑھی ماں اور کنکو باتیں کرنے لگیں۔ بوڑھی نے اپنے بیٹے کے دکھ سے دُکھی ہو کر کہا "دیکھ، تیرا راج کنور کی طرح لڑکا تو ہے۔ میرا پیسہ کس کام کا؟ تجھ سے کچھ چھُپا ہے۔ اس ملک چند کا تو دو بار بیاہ کیا، لیکن ایک بھی راس نہیں آیا۔ ایسی گھڑی دیکھنے سے تو بھگوان موت دے دے تو اچھا ہے" بڑھیا کی اندر دھنسی آنکھیں چھلک گئیں۔

کنکو کو بھی دُکھ ہوا "ارے اماں! یہ سب کہاں اپنے ہاتھ کی بات ہے۔ بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ اب آنسو مت بہا، یہ سب کس کام کے ہیں؟"

اتنے میں ملک چند اندر آئے۔ لگتا تھا کسی شش و پنج میں ہیں۔ بولے "کیا سالگ نکلے ہیں جہاں دیکھو وہاں روپے کی کمی"

کنکو اداس ہو گئی "ملک چند کاکا! چاہے کچھ کرو، میری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔ تمہارے روپے سونے کے ہیں" کنکو نے پاؤں سے زمین کریدتے ہوئے کہا "ایک ایک پائی چُکا دوں گی" اُسے ملک چند بہانہ بازی کرتا ہوا معلوم ہوا۔

"گھر ہیں سے نکال دے، کہیں دو پیسے کو کمنا را رکھا جاتا ہے؟" بوڑھی ماں بولی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ کسی دوسرے کا ہو تو اور بات ہے۔ یہ تو کنکو کا لاڈلا بیٹا ہے" کہہ کر سیٹھ ہنسے "اچھا چل، سب سامان ہٹانا پڑے گا" کہتے ہوئے ملک چند دروازے کے اندر گئے۔

کمرے کے اندر کمرہ اور اس کے اندر بھی ایک کمرہ تھا۔ دروازہ بند ہو تو گھُسنے والا دن میں بھی دیوار سے ٹکرائے بغیر نہ رہے۔ سیٹھ نے ایک کونڈی کی طرف اشارہ کیا "اس میں سب سامان اُتارنا پڑے گا" کنکو دوسری چھوٹی کونڈی پر چڑھ کر گاگر، کلسا، ایک ایک کر کے سیٹھ کو پکڑانے لگی۔ اور اُس کا ڈھکن کھول دیا۔

"بس رک" کہہ کر سیٹھ کنکو والی کونڈی پر چڑھ گئے۔ جیسے بگلا مچھلی کو پکڑ لیتا ہے اسی طرح اندھیرے میں گیہوں کے اندر سے پوٹلی نکالی۔ لیکن نیچے اُترتے وقت سیٹھ لڑکھڑا گئے۔ اگر کنکو کے کندھے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو دونوں نیچے گر جاتے۔ وہ بھی بے ہوشی میں نیچے اُتری۔

کھپریل کے بیچ سے آتی ہوئی روشنی میں سیٹھ نے پوٹلی کھولی۔ سیٹھ کا پس و پیش دیکھ کر گویا پوٹلی کے سبھی روپے ہنس پڑے ہوں، ایسا اُنہیں لگا۔ سیٹھ نے روپے گن گن کر کنکو کے پلو میں ڈالے —

"زیادہ لینے ہیں" ایک سو گننے کے بعد پوچھا۔

سیٹھ کی پیار بھری نظروں اور پوچھنے کے انداز نے کنکو کو بے تاب کر دیا۔ ترچھی نظروں سے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی کچھ کہنے کو ہوئی تو کم بخت وہ کہاوت ہونٹوں پر آگئی "سہارا ہے تو کنیا کی کمر پہ۔ قرض تو مجھ پر چڑھے گا۔ تمہیں کیا....؟" اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ دونوں اپنے آپ میں رہے۔ برسوں پہلے دبی چنگاری شعلہ بن گئی۔

کنکو روپے لے کر باہر نکلی۔ پاگل کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ گھبراہٹ میں مشکل سے گاؤں پار کیا۔ مغرب کا سورج اُسے لعنت بھیج رہا تھا۔ راستے کے پیڑ گویا اُس کو شک و شبہے دیکھ رہے ہوں "تُو وہی عورت ہے جو صبح گئی تھی؟" تنہائی پا کر ایک جگہ تو کنکو رو پڑی۔ اچھا ہوا کہ گاؤں پہنچنے تک اندھیرا ہو گیا تھا۔ نہیں تو دن کی روشنی میں جانے کی اُس کی ہمت نہیں ہوتی۔ اندھیرے میں بھی اُس نے اپنا منھ چھُپا لیا تھا۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے نہا دھو کر بھگوان کی آرتی کی کھیت سے ملے بھر کی بیڈول مورتی والے بھگوان کے آگے معافی مانگی۔ بہت روئی، لیکن اندر کی جلن کم نہ ہوئی۔ بارہ تیرہ برس کی یوگی کو ہی نہیں بلکہ پورے جیون کو ایک چنگاری نے آگ لگا دی تھی۔

ہیریا کی بارات چڑھی۔ لیکن کنکو کو ذرا بھی خوشی نہیں تھی۔ لوگ دوسرے ہی قیاس لگاتے —

"ایسے موقع پر مرے ہوئے کی کمی محسوس ہوتی ہی ہے"۔

بارات کے واپس آنے پر عورتوں نے گایا:

"ماتا کے بول بھائی بھول گئے
ساس کے بول میٹھے لاگے
ہیرا بھائی، ویرا محلوں میں رہنا"

یہ گیت سُن کر کنکو خیالوں میں ڈوب گئی۔ کتھا کی یاد آئی "اور کیا ہیریا جتنا بیوی کا رہے گا اُتنا اُن کا تھوڑا رہنے والا ہے۔ یہ تو دنیا کی ریت ہے"۔

اور وہ زار زار رو پڑی۔

جانے کیوں کنکو میں اب کوئی اُمنگ، جوش نہیں رہا۔ گویا اس کی زندگی کا کام پورا ہو گیا ہو۔ اب تو وہ مر بھی نہیں سکتی تھی۔ سانسان کی چھوڑیے وہ اس کے سائے سے بھی دُور رہنے لگی۔ دن شین گن کی گولی کی طرح گزرنے لگے۔

گاؤں کی گھاگ بڑی بوڑھیوں کو کنکو کی چال میں تبدیلی نظر آئی۔ تنہائی میں بات پوچھی مگر کنکو نے صاف انکار کر دیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو کاکی! بھری دوپہری میں ریگستان پار کیا اور اب ڈھلتی سانجھ میں...." کہہ کر کنکو ہنس دی — لیکن اس ہنسی میں بڑی بوڑھیوں کو اس کے ماں بننے کی پرچھائیں اور واضح نظر آئی۔

گلاڑھا مور کی بیوی نے سوچتے ہوئے کہا۔

تو صحیح کہہ رہی ہے لیکن میں نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔" پھر بھی کنکو نے کچے دل سے انکار کیا۔ تب گلا ڈھامور کی بیوی نے اپنی اندر دھنسی آنکھیں غصے میں پھاڑ کر کہا۔ "تو مجھے بناتی ہے۔ تو بول تو مہینہ بتا دوں۔ بول جو تھا پورا کیا ہے اور پانچواں بیٹھا ہو تو؟" وہیں کنکو کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پیر سے زمین کریدتی ہوئی مشکل سے بولی۔ "کاکی، میرے لیے زہر لے دے۔ مجھ کلموہی نے..."

گلا ڈھامور کی بیوی خوش ہو گئی۔ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "زہر کھائے تیری جوتی۔ بندھی مٹھی لاکھ کی ہے۔ سبھی پیڑوں کو تھوڑی بہت ہوا لگتی ہے۔ لیکن اُس کلموہے کا نام....؟" کنکو کے پاس آکر دھیرے سے پوچھا۔

کنکو چپ رہی۔ دوسری بوڑھی نے بھی اُسے بہت سمجھایا۔ "ذات برادری کا ہو تو اس ناس پیٹے کے ساتھ تیرا بیاہ کرا دیں۔" وغیرہ پھسلاوے دیے، لیکن کنکو نے اُنہیں اُس کا نام تو کیا اُس کی بُو سے بھی بہت دُور رکھا۔

اُسی اندھیری رات کو گاؤں کے بوڑھے اکٹھے ہوئے اور کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔

"دیکھو دھنا ڈھامور! ذات برادری میں پتہ چلے گا تو پورے محلے کی عزت جائے گی اور روٹی بیٹی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔" چاروں میں سب سے بوڑھے گلا ڈھامور نے بات شروع کی۔

"حد ہو گئی، ابھی تو بات دبانے ہی میں بھلا ہے۔" دھنا ڈھامور نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"پر اُس حرام خور کا نام تو معلوم....." تیسرے نے کہا۔

"کیا کرو گے؟ ناگ ناتھ نہیں تو سانپ ناتھ ہو گا۔ میری عورت نے بہت پوچھا۔ بولی "مجھے مار ڈالو پر نام نہیں بتاؤں گی۔ تیرے ہٹ کے آگے کس کی چلی ہے؟" تینوں چپ رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد تھوڑا گھس پھس کرنے کے بعد انہی بلدری کے ایک رنڈوے کو بلایا اور دھنا ڈھامور نے بات کی۔ "دیکھ کالیا! تیرا گھر بس سکتا ہے، جو تو دوسرے کی آبرو رکھ لے تو؟"

"اُو تو ہو گا جو منع کرے گا!" گلا ڈھامور بولا "کتنی ہی عورتیں بچے کے نہیں آتیں۔ تھوڑا پاؤں اُکھڑ گیا۔ نہیں تو تیری قسمت ایسی کہاں تھی؟"

کالو کنکو کی جاتی کا تھا۔ پینتیس کے اوپر کا نہیں تھا۔ پچیس برس کا تھا تو بہو مر گئی۔ ایک تو غریب اور اوپر سے کم رسیا ہونے کی وجہ سے رنڈوا تھا۔ عورت کا نام سن کر اُس کی رال ٹپکنے لگی۔ دل دھڑکنے لگا۔ بول پڑا، "کاکا! منع کون کر رہا ہے؟"

"تو منظور ہے؟" موتی بولا۔

کالو ذرا ہچکچایا۔ گلا ڈھامور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کاکا! کوئی نام ٹھام...؟"

"اب ایک بار تو ہاں کہہ دے۔ ہم تیرا کچھ خراب کریں گے، بھلا۔ وہ تو تیرے باپ کا بھی دھیان آ گیا۔ اب تو عزت دار ہے۔ لیکن اگر تیری مرضی نہ ہو، تو...؟"

کالو جلدی سے بولا۔ "تم مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ جو تم کرو، وہ منظور ہے۔ بس؟" موتی کو لگا کہ کالو ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ہے۔ اس لیے پھر پوچھا "تو سمجھ تو گیا؟ مانک ویسے تو لاکھ کا ہے، پر ہے تھوڑا....."

اس پر گلا ڈھامور چڑ گئے "تم بھی موتی..." اور کالو کی طرف دیکھ کر بولے "ویسے تو کوئی کسی کے ساتھ ہو جائے پر تھوڑا جوڑا اچھا ہو تو ٹھیک ہے۔ پر تیری مرضی نہیں...."

کالو پھر بولا "میں نہیں جانتا جو تم کرو، وہ منظور ہے۔"

گلا ڈھامور نے گھر جا کر تیاری کرنے کو کہا۔ کالو گھر کی طرف جانے لگا۔ اندھیری رات میں اُس کے سامنے لال ساڑھی پہنے دُلہن کی صورت کوند گئی۔ یہ اچھا تھا کہ وہ نام نہیں جانتا تھا۔ نہیں تو البیلی کنکو کا تصور ہی اُسے پاگل کر دیتا۔

صبح ہوتے ہی بات گاؤں میں پھیل گئی۔ کنکو نے کالو کا گھر بسا لیا ہے۔ دو دن تک پنہاریوں میں کانا پھوسی ہوئی۔ آس پاس کے گاؤں میں تیزی سے بات پھیل گئی۔ ویسے گلا ڈھامور جیسے بڑے بوڑھے کہتے رہے۔ اُس نے اپنا لڑکا ٹرا کر دیا ہے، اُسے بیاہ دیا۔ چاہے کتنا ہی کنکو اُس گھر کو اپنا مانے پر اب تو گھر پر بہو کا حق زیادہ ہے۔ اُس سے یہ کیا بُرا ہوا؟ چاہے کچھ بھی ہو، اُس نے اپنے لڑکے کو بڑا کر کے اپنا فرض پورا کر دیا۔" اور سب سننے والوں نے سامنے نہیں تو پیچھے اس بات کو قبول کیا۔

پھر بھی تین دن تک گھر سے باہر نکلنے کی کنکو کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے وہ من ہی من میں گاؤں کے گھر گھر سے لڑ چکی تھی اور سان کی سات پیڑیوں کے کلنکوں کو گنوا چکی تھی۔ اُس اکیلی نے ہی یہ گناہ نہیں کیا۔ ایسے من کو سمجھا کر چوتھے دن گھر سے باہر قدم رکھا۔ مویشی باہر باندھے اور گھڑا لے کر پانی بھرنے گئی۔ گاؤں والوں نے بھی پہلے ہی کی طرح باتیں کیں۔ مہینے بعد تو کنکو اپنے پاؤں پھسلنے کی بات کو بھول گئی۔

ایک رات کو کالو کے گھر کے پاس رہنے والی ایک بوڑھی نے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کو جگایا۔ "چلو، کنکو کے 'درد' ہو رہا ہے۔"

بڑی بوڑھیوں نے، خاص کر گلا ڈھامور کی بیوی نے بڑی ہوشیاری سے بچے کا جنم کروایا۔

کالو نے سبھی عورتوں میں لڑکے کی پیدائش کی خوشی میں گُڑ بانٹا۔ سب چلے گئے۔ صرف گلا ڈھامور کی بیوی رہ گئی۔ ابھی وہ نہائی بھی نہیں تھی، جس طرح مصور کا ماہر پارکھ تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے، ویسے ہی وہ کنکو کے نوزائیدہ بچے کو دیکھ رہی تھی۔

یکایک بڑھیا کی جھرّیاں تن گئیں۔ ہونٹ بُدبُدانے لگے۔ "ناس پیٹے ملک...؟ اور اس کی آنکھوں میں آئی ہوئی چمک بجھ گئی۔ "اب کیا ہو؟ ارے ملک! اس رانڈ نے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نہیں تو تجھے پکتے ہوئے بیر کی طرح جھنجھوڑ ڈالتی۔" اسے اتنی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ نہانے دھونے کے لیے بھی وہ کنکو کے یہاں نہیں رُکی۔

آگے [illegible] پر

پنّالال پٹیل / نریندر پٹیل*

زمیں دار صاحب کا کُتّا

ولایت سے لوٹنے کے بعد زمیندار صاحب کی سواری آج پہلی بار اکاڑیا گاؤں میں آ رہی تھی۔ اس پچیس ہزاری جاگیردار کی راہ دیکھی جا رہی تھی۔ دکھائی جا رہی تھی۔

پٹواری نے آج کل کرتے کرتے پچھلے آٹھ دس دن میں دودھ کے برتن بھروا کر رکھوانے شروع کر دیے تھے۔ زمیندار صاحب کا بھلا پوچھا کس گھڑی آ ٹپکیں؟ ... چارپائیوں اور گدّوں کا انبار لگا دیا تھا۔ گاؤں کے مُکھیا کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ ان دنوں وہ کہیں باہر نہ جائے۔ دھنکر، چمار، نائی اور گاؤں کے دو تین چوکیدار چوبیس گھنٹے پہرہ دینے کو کمر کسے کھڑے رہتے۔ کھانا کھانے کے لیے گھر جاتے تو اپنی جگہ کسی دوسرے کو کھڑا کر جاتے۔

لیکن آج تو زمیندار صاحب کی رسوئی کرنے کے لیے ایک کمہار، دو سپاہیوں اور تین نوکروں کا پورا کا پورا رسالہ مویشیوں کو جنگل میں بھیجتے وقت تک آ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں گاؤں میں ایک طرح کا خوف سا طاری تھا۔

کمہار نے رسوئی گھر سنبھالا۔ چار آدمی اس کی مدد کے لیے تعینات کر دیے گئے ــــ دو چوکیدار ـــ ایک کمہار اور ایک نائی ـــ جب کہ مکھیا تو اُس کمہار، اُن سپاہیوں اور ان نوکروں کی حاضری میں کمر کسے کھڑے تھے۔ رسوئی کے برتن اور دہی وغیرہ اکٹھا کرنے کے لیے آنے والے، سپاہی، چوکیداروں کو ساتھ لیے گاؤں میں گھوم رہے تھے۔ سامان تو سیدھا بنیے کے یہاں سے گاؤں کے نام اُدھار آنے والا تھا۔

نوکروں نے بچھونا، پانی اور گاگروں وغیرہ کا بندوبست اس طرح کروایا کہ لگا جیسے ٹھاکر صاحب کی غیر حاضری میں ان سب نے ان کا چارج سنبھال لیا ہو۔

پٹواری نے پانچ برس پہلے نتّا درزی سے سلوا کر رکھی خاکی برجس کے اوپر چوکیدار سے دُھلوایا ہوا کوٹ پہنا اور گلابی رنگ کا صافہ باندھ کر زمیندار صاحب کے رستے پر چہل قدمی کرنے لگا۔

کسی نے آواز دی: "لگتا ہے موٹر آ رہی ہے۔" گاؤں کے وسط میں چوپال سراپا کان بن گئی۔ ناکے پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ آئے ....
وہ دُھول اُڑی ..... دیکھو، وہ نکلے۔"

تب تک سپاہی بھیڑ کے آ دھمکے "ارے گدھو! بیچ راستے پر کیوں کھڑے ہو؟ ... چلو، سب قرینے سے ایک قطار میں کھڑے ہو جاؤ، ارے، چھوکرو سالو، کسی نے چوں چاں کی تو ..... چلو۔ پیچھے ہٹو قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ ٹھاکر صاحب آئیں تو سبھی ..... ارے او جانگلی سنائی نہیں دیتا؟ جھک کر سلام کرنا، سمجھے،

اور زمیندار صاحب کی موٹر سلام کے لیے جھکے ہوئے سروں پر دُھول اُڑاتی ہوئی پنچایت گھر کے پاس پہنچ کر رُک گئی۔

پھٹاک سے آگے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ٹوپی پہنے ہوئے زمیندار صاحب اُترے۔ ساتھ ہی گھنے بالوں، لمبے کانوں اور چھوٹے چھوٹے پیروں والا، برف جیسا سفید ایک جاندار بھی کود پڑا۔ پچھلی سیٹ سے کارندے اُترے۔

ٹھاکر صاحب کی عمر لگ بھگ اٹھائیس برس کی ہو گی۔ جسم مضبوط تھا لیکن خدوخال دلکش نہیں تھے۔ البتہ کپڑے اپ ٹو ڈیٹ۔ ہیٹ، موزے، بوٹ، گھڑی، دھوپ چشمہ اور چھوٹی انگلی میں چھلّا ایک ہاتھ میں بید۔ دوسرے میں کچھ زنجیر جیسا ــــ سیدھے اسٹیمر سے اُتر کر چلے آ رہے ہوں

تاہم وہاں جمع ہوئے لوگوں میں سے کسی کا بھی دھیان ٹھاکر صاحب کی جانب نہ تھا۔ سلامی دیتے ہوئے بھی لوگوں کی نظر تو ٹھاکر صاحب کی ٹانگوں

* 16A/12، ویسٹرن ایکس ٹینشن ایریا، قرول باغ، نئی دہلی

میں اُلجھے ہوئے اُس جانور پر ٹکی ہوئی تھیں۔

لوگوں میں یہ چرچا تھا کہ ٹھاکر صاحب ولایت جاکر کتنے بدل گئے ہیں۔ بلکہ بات اُس جانور کی چل رہی تھی۔

"ہاں" کسی نے کہا — "ولایتی خرگوش ہے تو کسی کو اس پر کتا ہونے کا گمان گزرا کسی کو شبہ ہو رہا تھا کون جانے ولایت میں چیتا ایسا ہوتا۔ کسی کسی کو تو کتا، بلی یا خرگوش کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کسی الگ قسم کے جانور ہونے کے قیاس لگائے جا رہے تھے۔ خوب چرچا ہوتا رہا۔ کچھ تو شرط باندھنے پر آمادہ ہوگئے۔ جیسے جیسے لوگوں کو معلوم ہوا بھیڑ بڑھتی گئی۔ ہر نیا آنے والا یہی سوال کرتا۔ سالا، یہ جانور ہے کیا؟" بہتوں کو ڈر لگ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب اس کو باندھ دیں تو اچھا ہو۔ نہیں تو یہ کسی کو پھاڑ کر کھا جائے گا:

تب تک کچھ نوجوان جان گئے تھے کہ یہ کتا ہے۔ کسی نے سپاہی سے پوچھا تھا کسی نے نوکر سے معلومات حاصل کرلی تھی۔ نام بھی جان لیا تھا۔ لیکن اس میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ کسی نے 'شولر' کہا، تو سننے والے کسی دوسرے کی زبان پر چڑھ کر وہ کچھ سدھرا اور وہ شولا بن گیا۔ کسی اور نے تو اُسے 'شلو فلو' ہی کہہ ڈالا۔ نام کی ماتھا پچی چھوڑکر کچھ لوگ کتے کے حلیے کی باتیں کرنے لگے۔ "کیا کتا ہے۔ چار چار اُنگلی کے پاؤں اور کان تو زمین تک پہنچتے ہیں۔ بالوں کا تو بھائی کیا کہنا؟ کتنے لمبے ہیں جیسے کوئی جٹا دھاری ہو گی! سفید بھی کتنا!"

کسی کسی کو تو شبہ تھا کہ اس کے بال کہیں چاندی کے تو نہیں ہیں؟' اُس دن اپنے سیٹھ نہیں کہہ رہے تھے کہ میڈم کے بال سونے کے ہوتے ہیں، تو اس کتے کے بھی ...... ولایت کی بات بھلی چلائی وہاں تو جو کچھ ہو تھوڑا ہے"۔

حالانکہ اس بات پر سب لوگ ہنس دیے۔ لیکن بہتوں کے دل میں شبہ بنا رہا۔ کون جانے! ٹھاکر صاحب ایسا ویسا کتا تو لائیں گے نہیں۔

کھپریل کے نیچے کھڑے لوگوں کے علاوہ پنچایت گھر کے اُس طرف عورتوں کی زبان پر بھی کتے ہی کی بات تھی۔ بات کرتے کرتے کچھ عورتیں مذاق کرنے پر اُتر آئیں۔ تبھی گاؤں کے مُکھیا کی ہدایت وہاں پہنچ گئی۔ "سب کچھ کرنا مگر ٹھاکر صاحب کے کتے کا مذاق مت اُڑانا۔ اس بات کا دھیان رکھنا کہ وہ کُتے کو کنور سے بھی زیادہ چاہتے ہیں"۔

کتے کا نام جان لینے والے نوجوانوں نے بھی تائید کی۔ "بات سچ ہے۔ جانو میاں بھی یہی کہتے ہیں"۔

زمیندار کی سخت مزاجی سے آگاہ کچھ لوگوں نے اپنی عقل کے مطابق مشورہ دیا۔ "یہ بھی سمجھ لو کُتا کُتا مت کہتے پھرنا۔ چاہے جو ہو آخر ہے تو زمیندار صاحب کا کُتا"۔

زمیندار صاحب کے پیچھے کتا لگا ہوا تھا اور کتے کے پیچھے سینکڑوں لوگوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔

وہ پلنگ پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک چھلانگ میں کتا بھی آگیا۔ زمیندار صاحب نے سِٹ ڈاؤن یا کچھ ایسا ہی حکم دیا، جس کو سنتے ہی وہ ولایتی کتا پائنتی پر بیٹھ گیا۔

لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کسی کسی نے "سِٹ ڈاؤن" کو کتے کا نام سمجھا۔ کسی کسی نے یہ بھی مطلب نکالا کہ یہ بیٹھ جانے حکم تھا۔

جو بھی ہو لوگ اتنا تو سمجھ ہی گئے کہ اس کتے — سیلو بھائی (اب تک لوگوں نے اُس کا اصل نام بھی جان لیا تھا) کی عزت کا رندوں یا کہیے کہ خود ان کے کنور سے بھی زیادہ تھی۔ تین برس پہلے ٹھاکر صاحب کے ساتھ کنور آیا تھا۔ اُسے بھی زمیندار صاحب کے پلنگ پر بیٹھنے کی اتنی آزادی نہ تھی۔

گاؤں کے لوگوں کے دل میں سیلو کا (سِل ور پورا نام تھا' سیلو بلانے کا نام) مرتبہ بڑھ گیا تھا۔ اس پر بھی جب سُنا کہ اس کی قیمت پانچ سو روپے ہے۔ تو کسی نے اُسے دس جوڑی بیلوں اور کسی نے اُسے پانچ جوڑی بیلوں کے برابر قیمتی مانا۔ وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اُس کی قیمت ہاتھی کے برابر لگا رہے تھے۔ لوگوں کی حیرت کی انتہا نہیں تھی۔ چاندی کے مول سے رتی بھر کم نہیں، کیا کہو گے اسے۔ اب تو لوگوں کے دل میں اس کتے کی عزت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

لیکن گاؤں کے کتوں کے دل میں اس کی عزت کہاں؟ وہ تو جیسے دوسرے — دیسی کتوں پر بھونکتے تھے۔ اسی طرح سیلو پر بھی بھونکنے لگے۔ پانچ منٹوں میں تو اس چوپال کے پاس کتوں کے بھونکنے کا ایک شور بپا ہوگیا۔ اُدھر "سیلو" بھی غرّایا۔ کاؤں کاؤں، کاؤں، لوگوں میں ایک طرح کی سنسنی پھیل گئی۔ ہائے باپ! کیسی بلند آواز ہے۔ جیسے شیر دہاڑ رہا ہو"۔

"ارے، کاہے کا شیر!" ایک نوجوان نے مخالفت کی۔ "جانے دو اسے محلے کے کتوں کے پاس، چبا کر کھا جاتے ہیں کہ نہیں۔ یہ تو دیکھنے کے لیے ہیں۔ ان سے تو اپنے جم دولا کے کتے — اور بنجاروں کے کتوں کو تو ابھی دیکھا ہی کہاں ہے!"

گاؤں کے لوگ چاہتے تھے کہ زمیندار صاحب اس سیلو بھائی کو ذرا چھوڑیں تو سہی تاکہ گیدڑ جیسے ان کتوں کو اپنا کرتب دکھلائے۔ اسی لیے تو گاؤں کے لوگ کتوں کو بھگا نہیں رہے تھے۔ کسی نے جانو میاں کی بھی خوشامد کی۔ جانو بھائی' ذرا دیکھنے بھی تو دو بھلے آدمی! سیلو بھائی کو ذرا باہر تو نکالو! یہ کتے تو ایسے دُم دبا کر بھاگیں گے... بڑا مزا آئے گا"۔

اتنے میں ٹھاکر صاحب گرج کر بولے! کیا دیکھ رہے ہو' ڈیم' مارو' بلڈی ان کتوں کو!"

اور اس کے ساتھ کتوں سے زیادہ کتوں کو مارنے والے آگئے۔ پتھروں کے گولے چھوٹنے لگے۔ کسی کسی نے ٹھاکر صاحب کی رسوئی کے لیے اکٹھی کی ہوئی لکڑیاں اُٹھائیں۔

کتوں کو گلی تو چھوڑنا پڑی، لیکن انہوں نے بھونکنا بند نہ کیا۔ گاؤں کے دوسرے محلّے کے کتوں نے بھی بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ کتوں میں گھر سے ـــ محلّوں سے وابستہ ہونے کا جذبہ انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ مارنے والے نے پیٹھ پھیری کہ وہ واپس لوٹ آئے۔ دوسرے محلّوں کے کتّے بھی آنے لگے۔

دس منٹ کے بعد دوبارہ چاروں جانب مورچہ شدید تر ہو گیا۔ مُکھیا نے تو گاؤں کے لوگوں کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ٹھاکر صاحب سے التجا کی "ٹھاکر صاحب! ذرا سیلو بھائی کو تو چھوڑیے اس کی ایک ہی للکار سُن کر ان میں سے ایک بھی یہاں دکھائی نہیں دے گا۔"

"ارے نہیں، یہ بیچارا تو کسی کے ہاتھ میں تھوڑا رہے گا۔ یہ تو اپنی موج میں بیٹھا ہوا ہے۔" ٹھاکر صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ مُکھیا کے ساتھ دو تین دوسرے لوگ بھی بول اُٹھے۔ "موج میں تو ہے ہی صاحب ـــ نہیں تو بھلا ایسا جانور۔" ایک نے چاپلوسی والے انداز میں ہنستے ہوئے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "صاحب! راستے میں شیر ملے تو یہ اُس کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جائے گا نا؟"

ایک بوڑھے نے اُس کی پھوہڑ زبان سنواری بولا: "کون؟ سیلو بھائی نا! ارے اپنے جنگل کے چیتے (چیتے) تو سیلو بھائی کو دیکھتے ہی گھاٹیوں میں سر چھپاتے پھریں۔"

لیکن وہ بوڑھا تو گویا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا تھا۔ "ٹھاکر صاحب! کیا یہ بات سچ ہے؟"

"ایک چیتا لے آؤ۔ تب معلوم ہو۔" ٹھاکر صاحب نے اپنی سنگین آنکھوں میں قدرے خوشی کی چمک لاتے ہوئے کہا۔ اچانک اُن کا دھیان برابر بھونکتے ہوئے گاؤں کے کتوں کی طرف گیا۔

بے چارے سیلو بھائی تو کب کے اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ لیکن کرتے کیا؟ ٹھاکر صاحب کی شرم میں بندھے ہوئے تھے۔

ٹھاکر صاحب نے گویا شرم سے چھٹکارا دینے کے لیے اُسے زنجیر سے باندھ رکھا تھا۔ وہ اُسے لے کر اُٹھ ہی رہے تھے کہ چائے کا پیالہ لے کر مکھیا آ پہنچے۔ "تھوڑی دیر اور بیٹھ! کتّے کو حکم دیتے ہوئے انہوں نے چائے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن پھر جیسے ارادہ بدل گیا۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ "مکھیا، ٹیبل وغیرہ کچھ نہیں ہے؟"

مکھیا فکر مند ہو گئے۔ "یہ ٹیبل کیا بلا ہوتی ہے؟" یہ سوچنے کے ساتھ ہی اُن کی نظر کے سامنے ٹھاکر صاحب کے گاؤں ـــ رامدھانی میں ہوٹل میں دیکھی ہوئی شئے اُبھر آئی۔ انہوں نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "ٹھاکر صاحب، کرسی نا؟ ... وہ تو ..."

"کیا تم بالکل ای ڈی اٹ ہے؟ کرسی کا کیا ہو گا؟ ارے یہاں کپ رکھنے کے لیے۔"

سنتے ہی اب تک ایک دوسرے کا مونہہ دیکھنے والے آدمیوں میں سے آٹھ دس کھڑے ہو گئے۔ جیسے چڑیاں اُڑی ہوں۔ اِدھر اُدھر بہت بھٹکے لیکن لاتے کیا؟ ٹوکری اوندھی رکھتے تو وہ چھوٹی رہتی۔ اتنا بڑا پتھر بھی تو نہیں تھا۔ ورنہ دس آدمی مل کر اُسے اُٹھا لاتے۔

اچانک اُس بوڑھے کے دماغ نے کام کیا۔ ارے کہیں ڈھول نہیں ہے؟

مکھیا اُس بوڑھے کی تجویز سے جل بھن گئے۔ اپنے آپ پر غصہ آیا۔ "یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی۔ سامنے ہی تو لٹک رہا تھا یہ ڈھول!"

ایک آدمی ہوتا تو ایک ہی منٹ میں کھول لاتا۔ مگر وہاں تو تین آدمی تھے۔ تب بھلا چھ منٹ کیوں نہیں لگتے۔

مُکھیا ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھے گئے ڈھول پر کپ رکھنے گئے تو ٹھاکر صاحب پھر بگڑ اُٹھے۔ "سالو، کیا سبھی گنوار ہو؟ کوئی اسے صاف تو کر دو۔"

سامنے بیٹھے لوگوں میں سے پانچ سات پھر مل دیے۔ اُن میں سے ایک نوجوان جیت گیا۔ کندھے سے پچھورا لے کر ڈھول جھاڑنے لگا۔

ٹھاکر صاحب کے چہرے اور آنکھوں کے رنگ سے وہ بوڑھا بھانپ گیا۔ بولا: "ارے، ارے دیکھو تو سہی سیلو بھائی کے اوپر دھول آ رہی ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے بھی اس کا ثبوت دیا۔ "ای ڈی اٹ!"

ڈھول رکھنے کے بعد بگڑی بازی سُدھارنے کی اُمید سے یا سیلو بھائی کے اوپر ہاتھ پھیرنے کا فخر حاصل کرنے کے مقصد سے اُس نوجوان نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا۔ "سیلو بھائی کو ذرا پونچھ دوں ٹھاکر صاحب؟"

"کیوں؟ اپنا پچھورا صاف کرنے کے لیے؟"

ٹھاکر صاحب کو اس پر ہنسی آ گئی۔

پہلے تو یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن جب سمجھ میں آئی تو وہ بوڑھا بھی کہہ اُٹھا۔ "تیرے پچھورے سے تو سیلو بھائی زیادہ اُجلے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ پوری چوپال اُس نوجوان پر ہنس پڑی۔

نوجوان گھبرا گیا۔ اُسے غصہ بھی آ گیا۔ "چاہے جیسا اُجلا ہوئے ہے تو کتا ہی۔"

ٹھاکر صاحب کے سامنے کپ رکھتے ہوئے مُکھیا کی دقّت پھر نمایاں ہوئی۔

"اب سیلو بھائی کے لیے چائے کا کیا کیا جائے؟"

"کیوں؟ کیا چائے نہیں ہے؟" ٹھاکر صاحب کا لہجہ کڑا تھا۔

اسی کڑے لہجے کے سبب مکھیا کے پیچھے چائے کا کپ لے کر کھڑا آدمی آگے بڑھ آیا۔ "اَن داتا! چائے تو حاضر ہے!"

مُکھیا دوسرا ڈھول منگوانے کی تجویز کرنے لگا۔ "نائی سے کہا۔ "تو کپ مجھے دے دے اور کبیر کُمہارا کے ہاں سے ایک اور ڈھولک اُٹھا لا۔"

ٹھاکر صاحب بول اُٹھے۔ "ارے تو گدھا تو نہیں؟ یہ ڈھول کیا کرے گا؟ ارے یہ کہیں کپ

پلیٹ میں چائے پیے گا؟" ٹھاکر صاحب نے گرج کر کہا۔ "کہاں مر گئے سبھی نوکر چاکر؟"

اندر سے گرما گرم چائے پیتے ہوئے چاکروں اور سپاہیوں میں دہشت پھیل گئی..... لیکن وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اس سے پہلے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔

سیلو بھائی کے لیے زمین پر گدا بچھا دیا گیا۔ ایک تھالی بھی لائی گئی تھی۔

لیکن سچ پوچھو تو سیلو بھائی میں لوگوں کی دلچسپی آدھی رہ گئی تھی۔ اب اُن کا تجسس بھی سرد پڑ گیا تھا۔ "یوں چائے کیا اپنے کتے نہیں پیتے؟"

اُدھر گاؤں کے کتے بھی سیلو کی نقل و حرکت پا کی بہ وجہ سے قدرے زیادہ جوش میں آ گئے تھے ــــ چوکیدار سیلو بھائی کو چائے پیتے ہوئے دیکھنے میں محو تھے۔ موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کتے بڑھ کر کچھ اور نزدیک آ گئے۔ ان میں سے کالیا تو چوپال تک آ پہنچا تھا۔

مقابلہ کرنے کو تیار سیلو کو ٹھاکر صاحب نے حکم دیا۔ "سِٹ ڈاؤن!" تو پہلے ایک بار چائے پی لے۔ پھر ہم ان سب کی خبر لیں گے۔"

"لوگ اور بھی بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔ اب چوکیداروں نے بھی گاؤں کے کتوں کو بھگانا بند کر دیا۔ چند ایک تو چاہتے تھے ــــ کہیں ہمارے محلے کا وہ کنٹیا کتا آ جاتا اور ہمارے محلے کی وہ کبری کتیا کیا کچھ کم ہے؟"

اور پیشتر اس کے کہ سیلو بھائی چائے ختم کرے ٹھاکر صاحب اپنی ٹائی، بوٹ اور موزے اُتاریں۔ کنٹیا اور کبری آ گئے۔

ٹھاکر صاحب پالش کیے ہوئے پٹے میں چاندی سی چمک دار زنجیر لگانے کے لیے چوپال سے باہر نکلے۔ گاؤں کے تقریباً تمام لوگ آس پاس کے گھروں کے سامنے جمع ہو کر اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مداری آیا ہو۔

ٹھاکر صاحب نے گاؤں کے کتے بھگانے والے لوگوں کو روکا۔ "ارے او بُدھو! آنے دے آگے۔ ایک طرف ہٹ جا!" اور پھر سیلو کو حکم دیا۔ "گو آن سیلو!"

سیلو سامنے کھڑی غرّاتی ہوئی کبری کی طرف بڑھا۔ کبری دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ٹھاکر صاحب قدرے ہنسے۔ "بھاگ کیوں رہی ہے؟ ذرا آگے آ!"

اُسی دوران اُن کی نظر پیچھے سے آنے والے کالے کتے پر پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے اُس کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کتا دو دو انگلی لمبے دانت نکالے اپنی جگہ پر ہی ڈٹا رہا۔ ٹھاکر صاحب کے ہاتھ میں سے چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے سیلو نے بھونک کر، غرّا کر اُسے سمجھانے کی جیسے خوب کوشش کی۔

"میں کہتا ہوں اب بھی پیچھے ہٹ جا۔" لیکن پیچھے کھڑے ہوئے کتوں کی شہ پا کر یا سامنے کھڑے ہوئے کتوں کے پانی چڑھانے کے باعث وہ کنٹیا تو ..... کہ اچانک کوئی چلّایا۔ "ٹھاکر صاحب! وہ کبری!"

لیکن تب تک تو کبری ٹھاکر صاحب کے پاؤں کو کاٹ کر واپس چلی گئی تھی۔ زخمی ٹھاکر صاحب کے ہاتھ سے سیلو بھی چھوٹ گیا۔ کھلبلی مچ گئی۔ گھبراہٹ پھیل گئی۔ کچھ لوگ ٹھاکر صاحب کا پاؤں دیکھنے لگے۔ تو کچھ لوگ گاؤں کے کتوں سے گھرے سیلو کو بچانے لگے۔

سیلو کو بچانے کا کام مشکل ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لگ بھگ پچیس کتوں کے بیچ گھرا سیلو دکھائی تک نہیں دے رہا تھا۔ بہت پتھر پھینکے ــــ کچھ لوگوں نے تو بلّیاں کھینچیں اور دوڑ پڑے۔ لیکن وہ کتے تو ..... دو ایک تو چکر کھا کر گر پڑے۔ دو ایک بھاگے بھی سہی۔ لیکن پھر بھی سیلو کے اُڑتے بالوں کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا جب کہ اُن کا شور شرابا کان تو کیا، ٹھاکر صاحب کے کلیجے کو بھی پھاڑے دے رہا تھا۔ "ارے سب کے سب کہاں مر گئے۔ میری بندوق لاؤ۔"

لوگ کپکپانے لگے۔

کوئی دوڑا بندوق لے کر۔ ٹھاکر صاحب بڑبڑائے۔ "یہ نہیں۔ ابے سالے، گدھے بارہ نمبر والی۔"

اور وہ بارہ نمبر کی بندوق جب تک غلاف میں سے باہر نکالی جائے یا جب تک پیٹی میں سے کارتوس نکلیں، تب تک تو نہ جانے کتنی ہی بلّیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ دو تین کتوں کی تو لاشیں بھی پڑی تھیں۔ بھگدڑ میں مارنے والوں میں سے بھی کسی کے پاؤں میں تو کسی کے ہاتھ میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔

پل بھر کے لیے تو ٹھاکر صاحب بندوق اُٹھائے کھڑے رہے۔ کس پر نشانہ لگائیں۔ سفید سے سرخ رنگ میں بدل جانے والا سیلو تو چھٹپٹاتا ہوا آخری سانسیں بھر رہا تھا۔ اور نشانہ بھی کس پر لگاتے۔ کتے تو کب کے یہ جا وہ جا۔ انہیں کاٹنے والی کبری کتیا تو اُن کے سامنے پڑی چیچیا رہی تھی۔

ٹھاکر صاحب کی خشک آنکھیں اُن کی دونالی سے بھی زیادہ خوف ناک نظر آ رہی تھیں۔ وہاں پر چھایا ہوا سکوت تو اور بھی بھیانک تھا۔ اور اس سکوت میں مخل ہونے والی دم توڑتے ہوئے کتوں کی کراہنے کی آواز تو اتنی بھیانک محسوس ہو رہی تھی کہ آس پاس کھڑے گاؤں کے لوگ بھی وہاں سے کھسکنے لگے۔ ٹھاکر صاحب کے آس پاس کھڑے تیرہ بیس پچیس آدمی بھی اب تک رفو چکر ہو گئے ہوتے۔ لیکن اُن کو اپنے پاؤں اُٹھانا یا اپنی جگہ سے ہلنا بھی وہاں کھڑا رہنے کی نسبت زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب گرجے۔ "ارے تم سب کے سب ای ڈی اٹ ہو۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ گاؤں کا ایک ایک کتا سامنے والی گلی میں ہانک لاؤ اور گاؤں میں سب سے کہہ دو کہ اس طرف کوئی پھٹکے نہیں۔ پھٹکے گا اور مرے گا اور مرے گا تو وہ جانے۔ جاؤ جلدی کرو۔"

سبھی کو وہاں سے چلے جانے میں اپنا فائدہ معلوم ہوا۔ دو منٹ کے بعد وہاں ٹھاکر صاحب کے علاوہ نہ کوئی آدمی رہا نہ آدم زاد۔

گاؤں کے بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس کر بیٹھ لیے۔ اور جو لوگ ان سپاہیوں اور چاکروں کی آنکھوں کے سامنے تھے، وہ بھی جہاں تک ہوتا، کتوں کو ہانک لانے کی نسبت انہیں بھٹکانے ہی میں لگے ہوئے تھے۔ خود سپاہیوں اور نوکروں کی تمنا بھی یہی تھی۔ دیگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی اور طرح ٹھاکر صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا — گاؤں۔ یہ لوگوں کو بھی سمجھا با "ارے کچھ کتے ہانک لاؤ۔ تبھی گاؤں کا برا وقت ٹلے گا۔"

بات غلط بھی نہیں تھی۔ گاؤں پر آئی ہوئی منحوس گھڑی ٹالنے کے لیے آٹھ دس کتے گھیرنے پڑے اور ان میں سے کل پانچ کتوں کو اس گلی لے سامنے لایا جاسکا۔ تاہم گاؤں کے لوگوں کا اب بھی خیال تھا کہ ٹھاکر صاحب کتوں کو یوں نہیں مار ڈالیں گے — لیکن ٹھاکر صاحب نے تو ان پانچوں کو موت لے گھاٹ اتار دیا۔ ساتھ ہی چلائے "اور دوسرے کہاں ہیں؟ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

کس کی ماں نے سوا سیر سونٹھ کھائی تھی کہ جواب دیتا۔ بالآخر جانو میاں نے ہمت کی۔

"لیکن صاحب، کتے یہاں سے وہاں تک کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ تو کب کے گاؤں چھوڑ کر . . . . "

"ارے ان حرامیوں نے گھروں میں چھپا لیے ہوں گے۔ تلاشی لو، کسی کے گھر میں مل جائیں تو گھر کے مالک کو بھی لاکر سامنے کھڑا کر دو۔" ٹھاکر صاحب نے حکم دیا۔

جانو میاں، نوکر چاکر اور گاؤں کے آٹھ دس آدمی پیچھے لوٹے۔

لیکن تب تک ٹھاکر صاحب اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ "جانو، سیلو کو کسی کپڑے میں لپیٹ کر گاڑی میں رکھ دو۔" چوپال کی جانب پلیھڑ کرتے ہوئے بڑبڑائے "کتے تم لا چکے۔"

نمٹنے کے لیے جانو میاں کے ہاتھ میں وہی نوجوان آگیا۔ دوسروں کے پاس (کسی کسی کا کندھا خالی بھی تھا) میلے اور پھٹے ہوئے چھیچھڑے تھے یا جو بھی رہا ہو۔ جس چھیچھڑے سے سیلو کے گندا ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا، وہی سیلو کا کفن بن گیا۔

وہ نوجوان سوچ رہا تھا۔ ہے بھگوان! میں نے کیا اپرادھ کیا کہ جرمانہ میں چھیچھڑا دینا پڑا۔ موٹر چلی، تب بھی اس کے دماغ میں یہی سوال گھوم رہا تھا سہمے ہوئے، ادھر ادھر چھپ کر بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کتے کے پانچ سو تو زمیندار صاحب اسی گاؤں سے وصول کریں گے۔ لیکن اس سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ جو مزاج میں آئے کریں۔ فی الحال نحوست تو ٹلے۔

جب موٹر — ٹھاکر صاحب کا نحوس تارہ — گھرر۔ گھرر۔ فک۔ فک کی آواز کے ساتھ نکلی تو لوگوں کے مردہ جسموں میں قدرے جان آگئی۔ دل کی دھڑکن باقاعدہ ہوگئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد جانو میاں اور کہار وغیرہ جو سامان لائے تھے، اسے لے کر جس راستے آئے تھے، اسی راستے سے لوٹ گئے۔

مکھیا کے محلے میں ان اوندھے منہ پڑے آٹھ کتوں کے علاوہ دوسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ کوؤں کے اڑنے یا مرتے ہوؤں کی چھٹپٹاہٹ کے علاوہ اور کسی قسم کی سرگرمی وہاں نہیں رہ گئی تھی۔ مرنے والے کتوں کی آخری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سارے محلے میں جیسے سناٹا چھا گیا ہو۔

چیلم پھونکتا ہوا وہاں جا پہنچنے والا گاؤں کا بھنگی چیختے چلاتے کتوں کی موت کے انتظار میں شمشان میں چکر کاٹنے والے بھوت کی طرح گھوم رہا تھا۔ (اشاعت برس: ۱۹۵۶ء)

بقیہ : کنکو

بلی کے ہاتھ سے چوہا چھوٹ گیا ہو، کچھ اس طرح کا افسوس کرتے ہوئے راستے میں بڑبڑانے لگی، "یہ تو لاکھوں میں ایک کنکو جیسی عورت ملی، نہیں تو . . . . . "

اشاعت سن: ۱۹۶۶

بقیہ : جولے لستانخ

ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ عورت خود تو ناچتی ہی ہے، لیکن اسے مردوں کو اپنے اشاروں پر نچانے میں بھی فطری مہارت حاصل ہے! اب معلوم نہیں کہ اپنے میرا اور آپ کا تجربہ کوئی مختلف تھوڑا ہی ہوگا۔

ناچ کے بعد تحفے کے طور پر ساتھ لائے گئے دونوں ٹوکروں کو قبیلے کے سردار کی نذر کیا گیا، جسے پورے قبیلے نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں بخوشی قبول کر لیا۔ قبیلے کے عورت مرد ہم سب سے اس کم عرصے میں گھل مل گئے تھے۔ ان سب نے ہم سے خلوص و محبت سے اجازت چاہی اور پھر یہ میلہ ختم ہوگیا۔ پگڈنڈیوں پر چڑھتے ہوئے عورت مرد ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں دیر تک خداحافظ کہتے رہے۔ ادھر ہمارے میزبان جن کی قیادت میں ہم لوگ یہاں آئے تھے، ہمیں اس لنچ کی یاد دہانی کرانے لگے جو ان کے میس میں ہمارا انتظار کر رہا تھا کرگل میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ آریائی نسل کے لوگ شاذ و نادر ہی نہاتے ہیں۔ اس لیے ان کے جسموں میں سے بدبو کے بھبکے آتے ہیں اور ان سے ہاتھ ملانے کے بعد کی بدبو کو دور کرنے کے لیے شاید صابن کی پوری ٹکیہ درکار تھی، لیکن ہم حیران تھے کہ ہمیں اس بدبو کا ذرا بھر بھی احساس نہ ہوا تھا بلکہ ان کے مہکتے حسن کی خوشبو اور مسکراتے خوش گوار چہرے ہماری زندگی اور تجربے کا قیمتی اثاثہ بن گئے تھے۔

اس سوال پر غور کرتے ہوئے اچانک تریپت بول اٹھیں: "مجھے یقین ہے کہ تحفوں کے ان ٹوکروں میں صابن کی ٹکیاں ضرور ہوں گی۔ کیوں بھئی سنیل؟"

اور سنیل کچھ ایسے پراسرار انداز میں مسکرا دیا جس میں تردید کی بجائے تائید کی کہیں زیادہ جھلک تھی!

کہانیاں: "کنکو" اور "زمیندار صاحب کا کتا"
بشکریہ: بھارتیہ گیان پیٹھ، نئی دہلی

رابندرناتھ ٹیگور
○ ترجمہ: ریحان ثروت

اُپاگپت

اُپاگپت، گوتم بدھ کا پیرو، متھرا شہر کی فصیل کے قریب خاک پر پڑا سو رہا تھا
ہر سو چراغ گل ہو چکے تھے، سبھی دروازے بند کیے جا چکے تھے اور تمام ستاروں کو
اگست کے تاریک آسمان نے اپنی تاریکی میں چھپا لیا تھا۔
وہ کس کے پاؤں تھے جن سے پازیب کی جھنکار پیدا ہوئی اور جو معاً
اُس کے سینے سے مَس ہوئے؟
وہ چونک کر بیدار ہوا اور ایک عورت کے چراغ کی روشنی
اُس کی درگزر کرنے والی آنکھوں سے ٹکرائی۔
یہ ایک رقاصہ تھی، زیورات سے آراستہ
زرد نیلے غرغل میں ملبوس، شرابِ شباب کے نشے میں مخمور
اس نے اپنا چراغ نیچے کیا اور اس نوجوان کے
سخت حسین چہرے کو دیکھا۔
"معاف کرنا" اے جوان سنیاسی" عورت نے کہا
"براہِ کرم میرے گھر چلو۔ یہ خاک کا بستر تمہارے لائق نہیں۔"
سنیاسی نے جواب دیا: "اے عورت، تو اپنی راہ لے۔ جب
صحیح وقت آئے گا تب میں تیرے پاس پہنچوں گا۔"
یکایک شبِ دیجور نے برق کی ایک کوند میں اپنے دانت ظاہر کیے۔
آسمان کے ایک کنارے سے طوفان اُٹھا اور وہ عورت
خوف سے کانپ گئی
راستے کے کنارے لگے ہوئے درختوں کی شاخیں
درد سے کراہ رہی تھیں
کہیں دُور سے بہار کی نیم گرم ہوا کے دوش پر
بانسری کی سُریلی آواز آ رہی تھی۔
شہر کے باشندے پھولوں کا تہوار منانے
جنگل گئے ہوئے تھے
آسمان کے وسط سے چودھویں کے چاند نے خاموش شہر کے سایوں کو
ٹکٹکی لگا کر دیکھا
وہ جوان سنیاسی سنسان کوچے میں ٹہل رہا تھا
جب کہ بیمارِ محبت کوئل آم کے باغوں سے
اپنی بے خوابی کا شکوہ کر رہی تھی۔
اُپاگپت شہر کے پھاٹک سے گزرا
اور شہر پناہ کے نیچے کھڑا ہو گیا
وہ عورت کون تھی جو دیوار کے سائے میں اس کے پاؤں پر
طاعون کی شکار پڑی تھی۔ اس کے جسم پر زخموں کے داغ تھے
اور اُسے تیزی سے شہر سے باہر نکال دیا گیا تھا؟
وہ سنیاسی اس کے بازو میں بیٹھ گیا۔ اُس نے اس عورت کے سر کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر
اس کے لبوں کو پانی سے تر کیا اور اس کے جسم پر مرہم لگایا۔
"تم کون ہو اے رحم دل انسان؟" عورت نے دریافت کیا۔
"تم سے ملنے کا وقت بالآخر آپہنچا اور میں یہاں ہوں۔" جوان سنیاسی نے جواب دیا۔

○ کاغذی محلہ، بہار شریف، (نالندہ) بہار
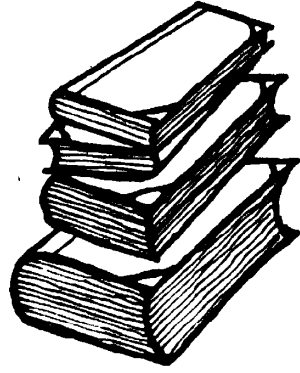
بیدی نامہ
مصنف: شمس الحق عثمانی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت: ایک سو پچاس روپے

اُردو کہانی کا یکا اتہ پتہ قائم کرنے میں جو چند کہانی کار پیش پیش رہے ہیں، راجندر سنگھ بیدی ان میں ایک نہایت اہم نام ہے۔ چونکہ بیدی کی عمر کہانی کی گرہستی سنبھالتے ہوئے ہی بیتی، اس لیے وہ اپنے ہم عصروں کو اپنا ہی پتہ دیا کرتے تھے، اور جیسا کہ انھوں نے "شاعر" کے "گوشۂ بیدی" کے انٹرویو میں شکایت کی تھی، انھیں اس بات کا بڑا قلق تھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی ملاقات کے لیے ان کے یہاں نہیں آتا۔ لہٰذا اپنے بیشتر ترقی پسند رفقا سے انھیں باہری میل ملاپ ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بیدی کی بھرپور شناخت اس وقت تک نہ ہو پائی جب تک نئی نسلیں یک بیک ان کی جانب والہانہ متوجہ نہ ہونے لگیں۔ شمس الحق عثمانی کی ضخیم کتاب "بیدی نامہ" (۱۹۸۶ء) بھی بیدی کی ادبی پرکھ کے سلسلے میں نئی نسل کے ایک نہایت ہونہار نمایندے کی ایک ایسی ہی اعلیٰ پیش کش ہے۔ یہ کتاب مصنف کی صرف سوجھ بوجھ کے باعث نہیں، ان کے انہماک اور تپاک کے باعث بھی دل میں گھر کر لیتی ہے۔ شاید اسی نوع کی صورت حال کا مشاہدہ ادب میں اس بیان کا محرک ہے کہ بڑے ادبا کو اپنے معاصرین مستقبل میں میسر آتے ہیں، جب نئے لوگ بالغ تر انسان کی نمایندگی کے اہل ہو چکے ہوتے ہیں۔

"بیدی نامہ"، شمس الحق عثمانی کے پیش لفظ "مطلع عرض ہے" کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے: "مطلع عرض ہے" اس لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں عثمانی نے چھوٹتے ہی وہ بات کہہ دی ہے جس کی ٹٹول کا احساس ہمیں ساری کتاب میں ہوتا ہے۔ بیدی کے تمام افسانوں میں ایک فکری ربط کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس تخلیق کار کی کائنات کو چاند سے تعبیر کیا ہے۔ "اسے گھٹا ہے ما بڑھے دیکھیں تو حصہ حصہ نظر آتا ہے؛ مگر ہمیشہ ایک کل کا جزو ہوتا ہے اور اپنے کل سے پیوستہ بھی"۔

اس ابتدائیہ کے بعد پہلا باب بیدی کی شخصیت اور تشکیلی عناصر کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے میں بیدی کو بحیثیت افسانہ نگار بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ تیسرا "ایک چادر میلی سی" پر تفصیلی بحث کرتا ہے، جسے عثمانی نے بجا طور پر 'چاند' کا پونم کا روپ قرار دیا ہے اور چوتھے میں بیدی کے افسانوں کے مانند ان کے ڈراموں کے موضوعاتی اسرار پر بڑی ہمدردانہ فہم سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں شاید قاری کی یہ خواہش بے جا نہ ہو کہ عثمانی ان ڈراموں پر ترجیحاً ڈرامائی تکنیک کے ذیل میں نقد و نظر کے حدود کا تعین کرتے۔ ان کے ایسا نہ کرنے کا جواز یہ ہو سکتا ہے کہ افسانے کے باب میں بھی اس امر کی طرف دھیان جاتا ہے کہ مصنف نے پھیلاؤ کے ڈر سے اپنے تجسس کی حد بیدی موضوعاتی برتاؤ تک ہی کر لی ہے۔ بہر حال جیسے بھی ہے، انھوں نے بیدی کی تحقیقی منطق پر پوری نظر رکھتے ہوئے ان کے موضوعاتی برتاؤ کو شخصی حسیات سے اجاگر کیا ہے، کچھ اس طرح کہ بیدی کی باریکیاں قاری کے تلازموں میں رچنے بسنے لگیں اور یوں وہ آپ ہی آپ ان کے فکری تناؤ میں بے تحفظ شریک ہونے پر آمادہ ہو جائے۔ تنقید اپنے اسی منصب کی بدولت ان عوامل کی دعوے دار ہے، جن سے فن پاروں میں تاکید اور اصرار کی کیفیات ابھر آتی ہیں اور قاری کو ان پر اپنی ہی وارداتوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

میرے خیال میں شمس الحق عثمانی نے تنقید کا مندرجہ بالا منصب بڑی ذہانت اور ذمہ داری سے انجام دیا ہے اور ان کی رسائیوں کے اس معیار میں بیدی سے ان کی فطری عقیدت مندی کارفرما رہی ہے۔ کتاب کے آخر میں شمیم حنفی کا ایک خیال افروز نوٹ بھی شامل ہے۔ شمیم حنفی کا یہ تاثر عین مناسب ہے کہ "اس (عثمانی) نے بیدی کو سمجھنے کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے وہ کسی بیرونی جبر کا نہیں، بلکہ بیدی کی کہانی اور "بیدی نامہ" کے مصنف کی بصیرت میں ایک حیران کر دینے والی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے"۔ اس نوعیت کی ہم آہنگی تنقید میں خارجی معلومات اور طے شدہ اصطلاحات کو سجا لینے سے وقوع پذیر نہیں ہو پاتی۔ جب شناسائی کا مسئلہ درپیش ہو تو نقاد کو اپنی نجی حسیت کو کام میں لا لا کے عبادت کے وسیلے پیدا کرنے ہوتے ہیں۔ اصطلاحوں کے سہولتی اسباب میں طے شدہ نتائج تک پہنچنے کی ترغیب نقاد کو تخلیق میں اترنے اور اترا اترا کر اپنے طور پر معانی جھیلنے سے روکے رکھتی ہے جس باعث تخلیق و تنقید کی ہم آہنگی کا سدباب ہونے لگتا ہے۔ عثمانی نے بلاشبہ بیدی کے معانی جھیل جھیل کر ان کی صورت گری کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر بے جا ناقدانہ الجھاؤ سے پاک ہے۔ اور وہ بیدی سے راست

پیشتر پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ "بیدی نامہ" کا اس قدر قابل مطالعہ ہونا دراصل ان کے اسی رابطے کی دین ہے۔

"مطلع عرض ہے" میں مصنف کا یہ بیان بہت حوصلہ افزا ہے کہ "یہ کتاب میری اک تمنا کا پہلا قدم ہے"۔ محبت و عقیدت سے رابطہ کا سماں تو بندھتا ہی ہے جو عثمانی نے خوب باندھا ہے، مگر رابطہ ایک عمر پاکر اور گہرا ہونے لگے تو مزید استفسار کی راہیں کھلنے لگتی ہیں۔ "بیدی نامہ" کے مصنف کی بے چین جستجو گواہی دیتی ہے کہ وہ شناسائی کی اگلی منزلوں پر بھی بدستور رواں دواں رہیں گے اور اسی تخلیقی سرگرمی سے بعض وہ مسائل بھی سلجھائیں گے جو اس کتاب کے تھیسس کے اسکوپ سے باہر تھے۔ چونکہ یہ کتاب ان کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے مواد پر مشتمل ہے، شاید اس لیے وہ بعض مکتبی مطالبات کے پابند رہے حالانکہ انھوں نے ان حدود میں بھی وسعتوں کی تدبیر کی، پھر بھی ان کے آباد کار تنقیدی رویوں کے پیش نظر ان کی ریڈر شپ کی خواہش رہے گی کہ وہ بیدی پر ہمیں ایک اور کھلی کھلی کتاب دیں۔ بیدی کے کسی ایسے ہی مداح کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے فن کے ہر گوشے پر بات چیت کا مناسب ماحول پیدا کرے۔ مثلاً بیدی کے آخری دنوں کی ایک بڑی پسندیدہ کہانی "چشمہ بد دور" فنی برتاؤ کے ضمن میں کہانی پن کی ان امتیازی سطحوں کی جارحانہ نفی کرتی ہے جو اس سے پیشتر انھیں بے حد عزیز رہیں — کیا بیدی کو اپنے آیندہ اظہار کے لیے اپنا یہ پرانا معیار ناکافی معلوم ہونے لگا تھا؟ — یا پھر، اس میں شک نہیں کہ جنس کی باریکیوں کو فنی گولائیوں میں اس قدر خوبی سے سمو پانا کرشمہ سازی سے کم نہیں، مگر ہمارے اتنے اچھے فنکار نے اپنی اتنی مؤثر تخلیقی مہم جوئی میں اکثر و بیشتر اپنے آپ کو جنسی لوازم کے موضوعات تک کیوں محدود رکھا؟ — یا پھر یہ، اس میں شک نہیں کہ بیدی نے ہماری کہانی کی فنی ٹھوکا ٹھا کی بہت کی ہے مگر اس باب میں بیدی کے ہمہ وقت صانعتی کھچاؤ کے اعلان پر کیا قاری کی یہ خواہش بجا نہیں کہ ان کا فنی تناؤ اسے محسوس نہ ہو، بلکہ یہ لگے کہ کہانی زندگی کے مانند برجستہ ہوگئی ہے؟ — ظاہر ہے کہ فن ایک شعوری عمل سے عبارت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس شعوری عمل کا احساس قاری کو کیوں ہو؟ اس تعلق سے غور کیا جاسکتا ہے کہ عالمی افسانے کا دیو، چیخوف کیوں کر اس مخصوص تناظر میں بیدی سے مختلف اور بہتر ہے۔ عین ممکن ہے کہ عثمانی کو مجھ سے اتفاق نہ ہو، تاہم یہ مسائل اور کئی دوسرے مسائل صرف اساتذہ کی فنی شرکتوں کی چھان بین پر ہی زیادہ وثوق سے حل ہو پاتے ہیں، اسی باعث میں ایک جیالے فنکار کے جیالے نقاد کو اس طرف متوجہ کرنا چاہ رہا ہوں۔

قرۃ العین حیدر اور مسعود حسین خاں غالباً شمس الحق عثمانی کے اس پی ایچ ڈی مقالے کے ممتحن تھے۔ میں ان کی ان آرا سے اتفاق کرتا ہوں کہ "مقالہ نگار نے اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں اور تمام جہتوں پر اپنی بصیرت اور گرفت کی مہریں ثبت کردی ہیں" اور کہ "پورا مقالہ ایک ایسے محسوساتی اسلوب میں لکھا گیا ہے جو اس کی تنقیحات کے مزاج کے عین مطابق ہے"۔

جوگندر پال

عالمی اردو ادب - ۱۹۸۶ء

ترتیب و تہذیب : نند کشور وِکرم

پبلشرس اینڈ ایڈورٹائزرس، جے ۶، کرشن نگر، دہلی ۵۱

صفحات ۳۹۲ - قیمت ۸۰ روپے

اگر کسی کو سال میں صرف ایک اردو کتاب خریدنی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہمت کرکے عالمی ادب اردو - ۱۹۸۶ء خرید لے۔ یہ کتاب ایک ادبی انتخاب ہے جس میں تخلیق و تحقیق دونوں سے انصاف کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایسی معلومات کا ایک دفتر ہے جسے حاصل کرنے کے لیے بار بار کتب خانے کھنگالنے پڑتے ہیں اور جو طالب علم اور عالم دونوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

افسانوں میں احمد ندیم قاسمی، اقبال مجید، انتظار حسین، بشریٰ رحمٰن، دیوندر اسر، سلیم اختر، راجندر سنگھ بیدی، غیاث احمد گدی، مشتاق احمد یوسفی، منیر احمد شیخ، واجدہ تبسم، ہرچرن چاؤلہ (ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے) کی تخلیقات شامل ہیں۔ یہ افسانے روایتی بھی ہیں اور تجریدی بھی۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، دیوندر اسر اور سلیم اختر کے افسانے ایک دیرپا تاثر چھوڑتے ہیں۔

غزلیات کے حصے میں جذبی، حسن نعیم، بانی، بشیر بدر، جمیل الدین عالی، راج نرائن راز، رئیس امروہوی، بانو داراب وفا، تاباں، مخمور سعیدی، وامق جونپوری، نازش پرتاپ گڈھی، ناصر زیدی، ندا فاضلی، وزیر آغا کی غزلیں شامل ہیں۔ اور یہ سبھی ہماری شاعری کے معتبر نام ہیں۔

حصہ نظم میں احمد فراز، اختر الایمان، افتخار عارف، حبیب جالب، حکیم منظور، زہرہ نگاہ، شاذ تمکنت، عادل منصوری، عزیز قیسی، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، قاسمی، قتیل شفائی، کشور ناہید، مہندر سنگھ بیدی سحر اور کیفی اعظمی کے سال کے دوران شائع ہونے والے کلام کا انتخاب شامل ہے۔

"خراج عقیدت" کا باب گراں قدر ہے، اس میں اندرا گاندھی، نازش پرتاپ گڑھی، ساغر نظامی، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، بیدی کا فن اور فیض پر مضامین ایسے ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اندرا گاندھی کا حصہ تخلیقی لحاظ سے اعلیٰ نہ سہی لیکن حوالہ جاتی اعتبار سے ضرور اہم ہے۔ ساغر نظامی کی ذات کی تہیں کھولنے کے لیے شاید ظ انصاری سے بہتر شخص نہیں مل سکتا تھا۔ یوں بھی راقم کی رائے میں ظ انصاری اردو کے بہترین انشا پردازوں میں سے ہیں۔ جہاں انھوں نے "شکنتلا" اور "نہرو نامہ" کی جائز تعریف کی ہے اور ساغر کی نثر نگاری کی طرف بجا طور پر توجہ دلائی ہے، وہاں "مشعل آزادی" کے

بارے میں ظ انصاری کی اس رائے سے اختلاف مشکل ہوگا :

" اگر ساغر نے غم گر، وقفے وقفے دے کر اس صہبائے تند کو آبگینے میں ڈھالا ہوتا تو اس پر دوستوں، دشمنوں کے طعنے، آوازے اور تقاضے کچھ کام آتے لیکن ہونی انہونی میں اگر مگر کا دخل نہیں، اب یہ متلاطم تاریخ آزادی جیسی ہے ساغر صاحب کا سید جیں ہے، جاتی فصل کا آخری پھل پھول۔ ارمغان قیمت آنکنے کے لیے نہیں۔ ایک ایسی بیش قیمت یادگار ماننے کے لیے جس تک پہنچانے والی پگڈنڈی سبزے سے ڈھکی رہے گی۔"

قاضی عبدالودود، بیر عابد رضا بیدار، اور کلیم الدین احمد پر عبدالمغنی کے مضمون بھی ہیرو ورشپ سے مبرا اور متوازن ہیں۔ بیدی کے فن پر ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون اپنی جگہ پر ایک بھرپور چیز ہے لیکن یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب بیدی زندہ تھے۔ محمد صفدر میر کا مضمون " فیض کا نظریہ سخن " اس سلسلے کی ایک کمزور کڑی ہے۔

اس کے بعد کتاب کا حوالہ جاتی اور معلوماتی حصہ شروع ہوتا ہے جس میں " ادبی خبرنامہ " سوانحی اشارے " " ہند کے اردو ناشر و کتب فروش " " پاکستان کے اہم ناشر و کتب فروش " " وفیات " " کتابیات ۱۹۸۵ " " اردو اخبارات و جرائد " اور " انعامات و اعزازات " کی فہرست شامل ہے۔

نند کشور وکرم ادارہ " آج کل " سے ایک مدت تک وابستہ رہے ہیں، لہٰذا ان کا ذوق ستھرا ہے اور نظر گہری۔ کتاب کی طباعت، کاغذ، جلد بلکہ ورق ورق سے وکرم صاحب کا سلیقہ نمایاں ہے۔

(مہدی عباس حسینی)

نام کتاب : سمٹتے دائرے
مصنف : نور الحسنین
ناشر : المصنفین ۷۶۔۱/۷۰۰ موتا بلڈنگ گھاٹی، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱
قیمت : پندرہ روپے

" سمٹتے دائرے " اردو کے نوجوان افسانہ نگار نور الحسنین (اورنگ آباد) کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی ہر کہانی ایک نفسیاتی پہلو لیے ہوئے ہے۔ جو زندگی کی تلخیوں اور ناآسودگیوں کا احاطہ کرتی ہے۔

نور الحسنین کے ان افسانوں کا موضوع نیا ہونے کے باوجود بالکل نیا نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے کیف وکم سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لیے ان میں بڑی گہرائی کے ساتھ مشاہدے کی خوشبو ملتی ہے۔ بعض غیر اہم واقعات پر بھی ان کی گہری نظر دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ نگار نے شہری زندگی کا شاید بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا پرتو " سمٹتے دائرے " " مٹی " " باہر کا منظر " " بازیگر " " ورثہ " میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں ناآسودہ زندگیوں کی عکاسی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

گو آج کا جدید افسانہ علامتوں سے ملو نظر آتا ہے لیکن " سمٹتے دائرے " میں افسانہ نگار نے ایسے واقعات سے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا ہے کہ وہ حقیقت نگاری کی سرحدوں کو چھو رہا ہے جن میں متوسط طبقے کے افراد کی معاشرت، رشتے اور پس دیوار کے واقعات کو خاص رنگ اور نفسیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں " بھوت " " سورج سے پہلے " اور " واپسی " قابل ذکر ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تقسیم ملک کے بعد اردو افسانے میں کسی حد تک انحطاط آنے لگا تھا۔ لیکن جوں جوں نور الحسنین جیسے افسانہ نگار ابھرنے لگے یہ آس بندھ چلی ہے کہ وہ پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عمدہ افسانوں کی ٹکر کے لکھ سکیں گے۔

(سری نیواس لاہوٹی)

بقیہ : ستیہ مورتی

تامل میں ابتدائی تعلیم دی گئی۔ بعد میں انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے تینوں زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ سیاست کے علاوہ تعلیم، آرٹ، سنگیت اور سماجی و تعمیری سرگرمیوں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

تعلیم کے شعبے میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا۔ وہ کئی برس تک مدراس یونیورسٹی کی سینٹ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے اور آخر میں یونیورسٹی کے انتظام اور تعلیمی کام سے وابستہ ہو گئے۔ انا ملائی یونیورسٹی کے قیام میں بھی ان کا اہم حصہ ہے وہ سنسکرت یونیورسٹی کے بھی ایک بڑے ستون تھے۔

جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے وہ چاہتے تھے کہ عورتیں تعلیم حاصل کریں۔ لیکن وہ اس بات کے خلاف تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ انھیں شہری اور میونسپل امور میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ برسوں تک مدراس میونسپل کارپوریشن کے رکن رہے اور آخر میں اس کے میئر بھی منتخب ہوئے۔

انھوں نے ۱۹۳۹ء میں بمبئی میں منعقدہ آل انڈیا موشن پکچرز کانفرنس کی بھی صدارت کی۔ وہ جنوبی ہند کے فلم چیمبر آف کامرس کے اولین صدر تھے۔ کھادی کی ترقی بھی ان کی تعمیری سرگرمیوں کا ایک حصہ تھی۔

وہ مظلوموں اور ناانصافی کے شکار ہونے والوں کا ساتھ دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ قدامت پسند ہندو ہونے پر بھی وہ دقیانوسی نہیں تھے۔ انھوں نے چھوت چھات کے خاتمے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مدراس لیجسلیٹو کونسل اور بعد میں سینٹرل اسمبلی میں ہریجنوں کے مفاد میں آواز اٹھائی۔ وہ مدراس کونسل میں شراب بندی کے حق میں بھی خوب لڑے۔

وہ ایک مذہبی آدمی تھے لیکن ان کا مذہب دوسرے مذہب کے لوگوں سے ساتھ میل جول بڑھانے میں حارج نہیں تھا۔ وہ ایشور میں گہرا اعتقاد رکھتے تھے اور اپنی روزمرہ کی زندگی کا آغاز پوجا پاٹ سے کرتے تھے۔

اُردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر
راج نرائن راز
سب ایڈیٹر:
خورشید اکرم

جلد : ۴۶ | شمارہ : ۲ | ستمبر ۱۹۸۷ء

قیمت : دو روپے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | بھادر۔ آشون شک سمبت ۱۹۰۹

ترتیب

اسسٹنٹ ڈائرکٹر پروڈکشن : آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۲۰ روپے - دو سال کے لیے : ۳۶ روپے - تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

ملاحظات

ترقّی کا عمل صرف شہروں تک ہی محدود نہیں ہے

ہماری سورگیہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سماج کے غریب اور پسماندہ لوگوں کی سب سے بڑی ہمدرد اور رہنما تھیں ۔ انہوں نے غریبی سے لڑنے کے لیے حتی الامکان کوششیں کیں ۔ اس کے باوجود انہیں یہ کہنا پڑا کہ "بھارت کی بیشتر آبادی گاؤوں میں رہتی ہے ۔ چنانچہ ہماری ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کس حد تک غریبی کو دُور کر سکتے ہیں ۔ اور اپنے دیہی عوام کو نظر انداز کیے جانے کو کس حد تک ختم کر سکتے ہیں ۔ ہل چلانے والے ایک کسان اور برتن بنانے والے ایک کمہار کو اس قابل بنایا جانا چاہیے کہ وہ اپنی پیداوار اور دستکاری پر فخر محسوس کر سکے اور عزت و شان کے ساتھ زندگی گزار سکے ۔"

گزشتہ چالیس برس سے ہماری تمام تر مربوط کوششوں کے باوجود ہمارے دیہی عوام کی غریبی ایک تلخ حقیقت ہے ۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ تشویش کا باعث ہے ۔ اگرچہ دیہی عوام اب اتنے غریب نہیں ہیں جتنا کہ ماضی میں تھے تاہم ان کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے ۔ بڑے پیمانے پر بڑھتی ہوئی دیہی غریبی کا سب سے خطرناک نتیجہ روزگار کی تلاش میں دیہی غربا کی شہروں کی طرف کثیر تعداد میں منتقلی ہے ۔ یہ اب ایک بہت اہم مسئلہ بنتا جا رہا ہے ۔ اور جب تک دیہات کے باسیوں کے حالات میں نمایاں بہتری نہیں لائی جاتی ، اُس وقت تک یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاتھوں پر ایک بہت ہی طاقت ور ایٹم بم رکھا ہو ۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دیہی عوام کی ترقی اور بہبود کے پروگرام تیار کیے جاتے ہیں ۔ ملک بھی اقتصادی طور پر ترقی کر سکتا ہے ، جب ساتھ ساتھ دیہی علاقوں کی ترقی کی جائے اور دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھایا جائے ۔ اس مقصد کے لیے سب سے اہم کام دیہی علاقوں میں مزید آمدنی کے مواقع فراہم کرنا اور ان علاقوں میں روزگار مہیا کرنا ہے ۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے ان تمام لوگوں کو متعدد رعایات اور راحتیں مہیا کی ہیں جو دیہی علاقوں میں صنعتیں قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ حکومت صارفین کے مراکز اور دیگر کاروباری مراکز کے ساتھ دیہی علاقوں کا رابطہ قائم کرنے کے لیے سڑکوں نیز مواصلات کی دیگر سہولیات فراہم کرنے میں کوشاں ہے ۔ دیہی علاقوں میں کم اُجرتوں پر دستیاب مزدوروں کو اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ ان مزدوروں کو اجرتیں جزوی طور اناج کی شکل میں اور بقیہ نقدی کی شکل میں دی جاتی ہیں ۔

حکومت نے دیہی علاقوں میں غریبی کے اسباب اور اس کے تدارک کے طریقے دریافت کرنے کی غرض سے متعدد کمیٹیاں مقرر کی ہیں ۔ اتر پردیش کے ضلع للت پور میں کیے گئے ایک جائزے سے پتہ چلا ہے کہ مذکورہ رعایتوں اور راحتوں سے مستفید ہونے والے ۱۷ فی صد لوگوں کو روزگار کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے ہیں ۔ لیکن بدقسمتی سے بحالی کا مجموعی کام قابلِ اطمینان نہیں ہے کیوں کہ یہ کام صرف ۳۹ فی صد انجام دیا گیا ہے ۔ اس مطالعے کے خاص مقاصد یہ ہیں کہ آمدنی روزگار اور اثاثوں پر غریبی ختم کرنے کے پروگرام کے اثرات کا جائزہ لیا جائے اور پروگرام پر عملدرآمد کی اثر پذیری کا اندازہ لگایا جائے ، پروگرام کے سہل عمل درآمد میں پیش آنے والی مشکلات کی نشاندہی کی جائے اور اس سلسلے میں اصلاحی اقدامات کیے جائیں ۔

اس شعبے میں بینکوں کا ایک بہت اہم رول ہے ۔ اس سے قبل دیہی علاقوں میں بے اثاثہ غریب لوگوں کے لیے بینکنگ کے مروجہ اداروں سے قرض لینا ایک بہت ہی مشکل مرحلہ تھا ۔ چنانچہ وہ بینکوں کی بجائے ساہوکاروں سے حد سے زیادہ شرح سود پر روپیہ قرض لیتے تھے ۔ اور اس طریقِ عمل میں ان کی حالت بندھوا مزدوروں جیسی ہو جاتی تھی ۔ لیکن بینکوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد سماج کے کمزور طبقوں کو بینکوں سے سود کی کم شرحوں پر قرض ملنے لگا ۔ بعد میں حکومت نے قرضوں سے متعلق متعدد میلوں کا اہتمام کیا ۔ غریب کسانوں اور کاریگروں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ان کو قرضے تقسیم کیے ۔

اب زیادہ سے زیادہ ترقی پذیر ممالک بھارت کے اس طریقِ کار کی پیروی کر رہے ہیں ۔ نومبر ۱۹۸۶ء میں بین الاقوامی محنت تنظیم کی جاری کردہ ایک پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ دیہی غریبی کو ختم کرنے کی خواہش مند بہت سے ترقی پذیر ممالک نے آخر کار قرض دینے کے جدید پروگرام شروع کر دیے ہیں ۔ بین الاقوامی محنت تنظیم کی مذکورہ پریس ریلیز میں اس سلسلے میں صرف بھارت کی تعریف کی گئی ہے ۔ اس ریلیز میں

کہا گیا ہے کہ بھارت، بنگلہ دیش، نیپال اور زمبابوے جیسے ممالک میں قرض دینے کی اسکیموں سے لاکھوں غریبوں کو آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔

بین الاقوامی محنت تنظیم کے ایک ماہر ظلیپ ایگرنے بین الاقوامی محنت سے متعلق جائزے میں لکھا ہے کہ ''صحیح معنوں میں قرض سے غریب لوگ اپنی آمدنی اور روزگار میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ غریبی کو ختم کرنے کے لیے یہ ایک مؤثر آلۂ کار ہے''۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی کی صورت حال میں کافی بہتری آئی ہے۔ قرض سے مستفید ہونے والے افراد، جن میں ناخواندہ افراد بھی شامل ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت اور اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں کہ قرضوں کی ادائیگی وقت پر کی جائے اور اپنے اعتبار کو قائم رکھا جائے کیوں کہ یہ چیز خود ان کے اپنے مفاد میں ہے۔

مرکزی حکومت نے غریبی کو ختم کرنے کے پروگراموں سے مستفید ہونے والوں کو بیدار اور منظم کرنے کی غرض سے ایک اسکیم پر عمل درآمد کی منظوری دے دی ہے۔ اس اسکیم میں عوام میں ان کے حقوق کے لیے بیداری پیدا کرنے کے متعلق کیمپ کا اہتمام کرنا بھی شامل ہے۔ مذکورہ اسکیم پر عملدرآمد کا کام رضاکار اداروں کے سپرد کیا جائے گا۔ عوامی کارروائی اور دیہی ٹیکنولوجی کو فروغ دینے سے متعلق کونسل حکومت ہند کی جانب سے مذکورہ اسکیم کا انتظام سنبھالے گی۔ مؤثر کارروائی کے لیے دیہی ترقیات کے مرکزی سیکریٹری نے ریاستوں کے چیف سیکریٹریوں کو خطوط بھیجے ہیں۔ جن میں ان سے کہا گیا ہے کہ وہ اس اسکیم پر عملدرآمد کرنے والی ایجنسیوں اور گروپوں کو ضروری امداد فراہم کرنے کی غرض سے مناسب ہدایات جاری کریں۔ مذکورہ اسکیم پر عمل درآمد کے لیے ابتداً تجرباتی طور پر دو سال کے لیے دو کروڑ روپیہ مختص کیا جائے گا۔ رواں سال کے لیے ۲۵ء۱ کروڑ روپے کی رقم جاری کی جا چکی ہے۔ قومی سطح پر ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو مذکورہ اسکیم کے عمل درآمد کی نگرانی کرے گی، اس کی پیش رفت کا جائزہ لے گی اور اگر ضروری ہوا تو اصلاحی اقدامات تجویز کرے گی۔

ساتویں پنج سالہ منصوبے (۹۰-۱۹۸۵ء) کے دوران مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، جس کے لیے ۱۱۷۴ء۹۰ کروڑ روپے مختص کیا گیا ہے، جس کے تحت دو کروڑ کنبوں کو خود کفیل بننے میں مدد دینے کی تجویز ہے۔ اس کے لیے مجوزہ کل اخراجات ۲۳۵۸ء۸۱ کروڑ روپے ہیں، جس میں مجوزہ مرکزی حصہ ۱۱۸۶ کروڑ روپے ہے۔ اس کے علاوہ ۴۰۰۰ کروڑ روپے کا ادارہ جاتی قرضہ جمع ہو جانے کی توقع ہے۔

دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت بڑی اسکیموں میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچوں کی ترقی، قحط سے متاثر ہونے والے علاقوں سے متعلق پروگرام، ریگستان کو بہتر بنانے کا پروگرام، قومی دیہی روزگار پروگرام، دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام، گاؤں میں پانی کی فراہمی نیز صفائی ستھرائی کی اسکیمیں، دیہی گوداموں سمیت زرعی منڈیاں اور قبائلی علاقوں میں سڑکوں سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔

بہر حال دیہی ترقیات کے ضمن میں شاید سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی ہے کہ قرضوں اور مالی امداد کے لیے حکومت کی ترغیبات پر لوگوں کے سوچنے کے انداز میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔

اب دیہی عوام نے یہ بات بخوبی سمجھ لی ہے کہ اس قسم کی اسکیمیں خیرات دینے کے لیے نہیں بلکہ انہیں خود کفیل بنانے کے لیے ہیں۔ ●●

وفیات

شاد عظیم آبادی کے شاگرد اور اردو کے بزرگ ادیب و شاعر سید محمود علی خاں صبا عظیم آبادی کا اسی سال کی عمر میں ۱۰ جولائی ۱۹۸۷ء بروز جمعہ پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی پیدائش ۲۳ اگست ۱۹۰۷ء کو ہوئی تھی۔

مرحوم ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر کے علاوہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ابتدائی زندگی خاندانی جائداد کی دیکھ بھال اور سیاسی و ادبی سرگرمیوں میں گزار دی۔ پھر پروفیسر کلیم الدین احمد کے مشورے سے پٹنہ یونی ورسٹی لائبریری کے شعبۂ تحقیقات سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۵۷ء تا ۱۹۸۳ء علمی و ادبی موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھنے والے اسکالروں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ ایک کتاب ۱۹۵۳ء میں ''سفر نامۂ صبا'' کے نام سے لکھی۔

آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں ''موجِ صبا'' کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں ''ریاض الانصاف'' اور ۱۹۵۶ء میں ''بادۂ عرفان'' کے نام سے دوسرا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہم عصر دوستوں کے کلام کا مجموعہ ۱۹۵۷ء میں ''یارانِ میکدہ'' کے نام سے شائع کیا۔ ایک کتاب ''شاد کے نورتن'' زیر طبع ہے اور کئی نثری و شعری کتابوں کے مسودے تشنۂ اشاعت ہیں۔

ستم بر ستم گر

ستمبر اس برس بھی ستم گر ثابت ہوا۔ اردو، ہندی دنیا سوگوار ہے۔ ہندی کی مشہور شاعرہ ساہتیہ اکادمی اور بھارتیہ گیان پیٹھ انعام یافتہ مہادیوی ورما کا ۱۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ مہادیوی ورما ایک طویل عرصہ سے علیل چلی آ رہی تھیں۔

(آگے صفحہ پر)

محمد خلیل

آزادی و ترقی کے چالیس برس

کامیابیاں

خلائی سائنس کی شاندار ترقی

دُنیا میں خلائی پیش رفت کا آغاز تقریباً ۳۰ سال قبل ہوا تھا، جب روس کا پہلا خلائی راکٹ ۴ اکتوبر، ۱۹۵۷ء کو خلا میں بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو دنیا کا پہلا شخص روسی خلا باز یوری گگارن جسے آج سب بخوبی جانتے ہیں، خلا میں پہنچا تھا۔ اُسی سال یعنی ۱۹۶۱ء میں بھارت میں خلائی تحقیق کا ایک پروگرام تیار کیا گیا۔ اُس وقت ہمارے ذرائع محدود تھے۔ ۱۹۶۲ء میں تریوندرم (کیرالہ) کے پاس تھمبا راکٹ سینٹر کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱ نومبر ۱۹۶۳ء کو اسی مرکز سے پہلی مرتبہ ایک چھوٹا راکٹ خلا میں داغا گیا۔ اس اہم تاریخی موقع پر مُلک کی بین الاقوامی شخصیت آنجہانی ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا اور ڈاکٹر وکرم سارا بھائی جیسے عظیم سائنس داں موجود تھے۔ یہ مُلک میں خلائی تحقیق کی پہلی پیش رفت تھی۔ اسکے بعد تریوندرم کے قریب ہندوستانی راکٹ کی تیاری کے لیے ایک نیا مرکز قائم کیا گیا۔ اس مرکز میں پہلے چھوٹے قسم کے راکٹ تیار کیے گئے۔ پھر روہنی جیسے بڑے راکٹ بھی تیار ہونے لگے۔ ہندوستان میں تیار کردہ راکٹ روہنی ۷۵، ۲۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو تھمبا سے چھوڑا گیا تھا۔ اس کے بعد روہنی سلسلے کے دوسرے راکٹ کی تیاری عمل میں آئی۔

اس دوران ایس ایل وی ۳ یعنی "سیٹیلائٹ لانچنگ وہیکل" کی تعمیر شروع ہوئی، جس سے روہنی تارے داغے گئے۔ ہمارے ملک کے راکٹوں کی تیاری تھمبا میں ہوتی ہے۔ اور اس کا ایندھن بھی وہیں پر تیار کیا جاتا ہے۔ تھمبا راکٹ سینٹر کو ترقی دینے میں ڈاکٹر سارا بھائی کی کوششوں کو دخل ہے۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں اُن کی موت ہو جانے کے بعد اس کا نام وکرم سارا بھائی اسپیس سینٹر (وکرم سارا بھائی خلائی مرکز) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سارا بھائی نے ۱۹۷۰ء میں بنگلور میں سیٹیلائٹ سینٹر قائم کیا، جس میں روس کی مدد شامل تھی اور ہمارے سائنس دانوں نے روسی تعاون سے اپنا پہلا سیارہ آریہ بھٹ تیار کیا۔ اسے خلا میں چھوڑنے کے لیے ہندوستان نے ایک طاقت ور راکٹ روس سے حاصل کیا تھا جس کی مدد سے ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو خلا میں اس سیارے کو داغا گیا تھا۔ اس تارے کا وزن تقریباً ۳۶۰ کیلوگرام تھا۔ آریہ بھٹ سیارے کے کامیاب تجربے کے بعد ہمارے سائنس دانوں نے روس کے تعاون سے بھاسکر۔ اوّل نامی سیارہ تیار کیا، جسے ۷ جون ۱۹۷۹ء کو روس کے کاسموڈروم کی مدد سے خلائی مدار میں بھیجا گیا۔ سائنس دان بھاسکر اوّل کے ذریعے پانی، جنگلات اور موسم وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو ہندوستان نے اپنا ارضیاتی مصنوعی سیارہ روہنی، راکٹ ایس۔ ایل۔ وی تھری کے ذریعے سری ہری کوٹا خلائی مرکز سے داغا تھا۔ روہنی سیارے کا وزن ۳۵ کلوگرام تھا۔ اس سے قبل کسی بھی ملک نے اتنا کم وزن والا سیارہ پہلے نہیں چھوڑا تھا۔ مثلاً روسی سیارے کا وزن ۸۵ کیلوگرام تھا، جب کہ خلا میں چھوڑے گئے امریکی سیارے کا وزن روسی سیارے سے زیادہ تھا۔ اس طرح چین کا سیارہ ۳۰۰ کیلوگرام تھا۔ اس قدر وزنی سیارہ کسی اور ملک نے نہیں چھوڑا تھا۔ اس طرح دنیا میں سیارہ چھوڑنے والے ملکوں میں ہندوستان چھٹا ملک بن گیا تھا۔ اس سیارے کا راکٹ ایس۔ ایل۔ وی تھری ملک ہی میں تیار کیا گیا۔ یہ چار منزلہ ہے اور اس پر ایک کروڑ کی لاگت آئی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق روہنی سیارہ داغے جانے کے آٹھ منٹ بعد مدار میں داخل ہو گیا تھا اور زمین کا چکر لگا رہا تھا۔ یہ ہندوستان کا پہلا سیارہ تھا جسے ملکی سائنس دانوں نے خود تیار کردہ راکٹ کے ساتھ داغا تھا۔ اس مصنوعی سیارے سے قبل ہندوستان کے تیار کردہ دو مصنوعی سیارے آریہ بھٹ اور بھاسکر بھی مدار میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ روس کے راکٹوں کے ذریعے داغے گئے تھے۔ چار منزلہ راکٹ ایس۔ ایل۔ وی۔ ۳ کا وزن ۱۷ ٹن تھا اور اس کی اونچائی ۷۵ فٹ ۸ انچ تھی۔ اس کی ہر منزل پر ایک کنٹرول کرنے والا نظام تھا۔ اس میں ۴۴ بڑے طریقے اور ۲۵۰ چھوٹے طریقے استعمال میں لائے گئے تھے۔ یہ ذکر بھی یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سیارہ روہنی سری ہری کوٹا کے اوپر سے بھی گزرا، جس مقام

سے اُسے داغا گیا تھا۔ سیارے نے جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں وہ تسلی بخش ہیں۔ اس طرح روہنی ہمارے سائنس دانوں کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ روہنی آر۔ ایس۔ ڈی۔۲ کو ۳۱ مئی ۱۹۸۱ء کو ہندوستانی خلائی گاڑی ایس ایل وی۔۳ کے ذریعے خلا میں داغا گیا تھا، جو مکمل طور پر ہندوستانی سیارہ تھا، لیکن یہ سیارہ خلا میں صرف آٹھ دن رہنے کے بعد ۹ جون ۱۹۸۱ کو کچھ آلاتی خرابی کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔

بھاسکر دوئم کو ۲۰ نومبر ۱۹۸۱ء میں داغا گیا تھا۔ اس سیارے کا وزن ۴۴۴ کیلوگرام تھا۔ اور یہ بھاسکر اوّل کے مقابلے میں ہلکا تھا۔ یہ سیارہ زمین کا چکر لگانے میں ۹۵ منٹ لیتا تھا۔ اس کی اونچائی زمین سے زیادہ سے زیادہ ۵۵۷ کیلومیٹر اور زمین سے کم سے کم اونچائی ۵۱۲ کیلومیٹر تھی۔ اس مصنوعی سیارے کے ذریعے تیل، گیس اور کوئلے کے نئے ذخائر کی تلاش میں مدد حاصل کرنا تھا۔ اس سیارے کو اپنے خلائی مشاہدات کے دوران سیارے میں لگے ٹی وی کیمرے کے ذریعے تصویریں بھی کھینچنا تھا تاکہ تصویروں کی مدد سے معدنیاتی اور دوسرے ذخائر کو دریافت کیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ بھاسکر سیارے کی وجہ سے ہندوستان کو متعدد فائدے ہوئے۔ خاص طور پر سیارے سے حاصل شدہ اعداد و شمار اور تصویروں کی مدد سے سائنس دانوں کو تحقیق میں بڑی مدد ملی ہے۔

ہندوستان کا پہلا مواصلاتی سیارہ ایپل

۱۹ جون ۱۹۸۱ء کو یوروپین خلائی ایجنسی: "ایریان" نامی راکٹ کے ذریعے روس سے خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ اسے خطِ استوا سے ۳۶ ہزار کیلومیٹر دوری کے نئے مدار میں پہنچانے کے لیے موٹر داغی گئی تھی۔ ایرین کڑی کا یہ تیسرا راکٹ تھا۔ پہلا ایرین راکٹ ۱۹۷۹ء میں کامیابی کے ساتھ داغا گیا تھا۔ دوسرا ۱۹۸۰ء میں داغا گیا، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اور داغے جانے کے کچھ دیر بعد یہ بحرِ ہند میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ایپل مدار میں گھومتے ہوئے ہر ساڑھے دس گھنٹے میں زمین کا ایک چکر پورا کر لیتا تھا۔ اصل کامیابی سیارہ چھوڑے جانے کے ۲۸ دن بعد ایپل کے نقطۂ ساکن پر پہنچ کر حاصل ہوئی۔ اس سے قبل یہ اسی رفتار سے گردش کر رہا تھا۔ جس رفتار سے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے اور نقطۂ ساکن پر پہنچ کر بھی یہ زمینی گردش کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اس وقت زمین سے مصنوعی سیارے ایپل کی دوری تقریباً ۳۶ ہزار کیلومیٹر تھی۔ یہ جگہ انڈونیشیا کے سُماترا جزیرے کے اوپر ہے۔ ایپل کا "سی بینڈ" مواصلاتی آلہ اُس وقت کھول دیا گیا تھا۔ اور اس کے ۹۰ سینٹی میٹر اینٹینا کا رُخ ناگپور کی جانب موڑ دیا گیا تھا۔ اس طرح سارا ملک اس کے دائرے میں آگیا تھا۔ اس سیارے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوا تھا جب ۱۵ اگست ۱۹۸۱ء کے دن یومِ آزادی کے موقع پر وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کی تقریر اور یومِ آزادی کی تقریبات کو ملک کے مختلف علاقوں میں ایپل کے ذریعے ٹی وی پر دیکھا گیا تھا۔ یہ تصویریں نہایت صاف اور واضح تھیں۔ اس طرح اس مواصلاتی سیارے کے ذریعے مواصلاتی تجربات کا شاندار آغاز ہو گیا تھا۔ اس طرح ہم اس سیارے کے ذریعے ملک کے دشوار گزار علاقوں میں جہاں مواصلاتی نظام قائم نہیں ہے، ایک ایسا مواصلاتی نظام قائم کیا جا سکا جس کے تحت اُن علاقوں سے ٹیلی فون رابطہ قائم ہو گیا تھا —— ایک اندازے کے مطابق ایپل تقریباً دو سال تک کام کرتا رہا، لیکن اس کے بعد ملکی مواصلاتی ضروریات کے مدِ نظر ہمارے سائنس داں ایک ایسا مواصلاتی سیارہ تیار کرنے میں مصروف تھے جو پورے ملک میں ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام دکھا اور سُنا سکے۔ اور موسمیاتی معلومات فراہم کر سکے۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہمارے سائنس دانوں نے انسیٹ I اے کو امریکی خلائی مرکز سے داغنے کا منصوبہ تیار کیا اور ۸ اپریل ۱۹۸۲ء کو اُسے داغا گیا۔ اس سیارے کا وزن تقریباً ۱۱۸۰ کیلوگرام تھا۔ اب تک خلا میں داغے گئے سبھی سیاروں سے اس کا وزن زیادہ تھا۔ اسے امریکہ سے داغا گیا تھا، لیکن تمام خرچ حکومتِ ہند نے برداشت کیا تھا۔ اس کی لمبائی تقریباً ۲۰ میٹر تھی۔ اسے بحرِ ہند کے اوپر مدار میں پہنچایا گیا، لیکن کچھ ماہ بعد اس سیارے میں خرابی پیدا ہو گئی۔ اور اس سیارے نے کام کرنا بند کر دیا۔ اس لیے اس سیارے کے تباہ ہو جانے پر ہمارے سائنس دانوں نے انسیٹ I-بی دوسرا سیارہ امریکی چیلنجر کے ذریعے ۳۰ اگست ۱۹۸۳ء کو خلا میں داغا۔ یہ سیارہ بحرِ ہند کے ۳۶۰۰۰ کیلومیٹر اوپر مدار میں پہنچایا گیا ہے۔ یہ سیارہ آج بھی ہمیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو نشر کرنے میں مدد دیتا ہے اور ٹیلی فون سے رابطہ قائم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ موسمیاتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ انسیٹ I-بی تقریباً سات سال تک کام کرتا رہے گا۔

سوزٹی ۱۱ ہندوسوویت خلائی جہاز میں روسی خلا بازکے ساتھ مسٹر راکیش شرما کی خلائی اُڑان اب تاریخ کا ایک اہم باب بن چکی ہے اور یہ تجربہ آئندہ مُلک کی خلائی تحقیق میں مددگار ثابت ہوگا۔

ایک اطلاع کے مطابق نیا انسیٹ I-سی سیارہ تیاری کے قریب ہے۔ ملکی سائنس داں اسے راکٹ سے داغنے کا پروگرام بنانے میں مصروف ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی ہمارے مُلک میں کوئی طاقت ور راکٹ نہیں بنایا گیا ہے جو

ایک بڑے سیارے کو مدار میں بھیج سکے، لیکن ملک
میں اب ایک ایسا راکٹ تیار کر لیا گیا ہے جو
ایک چھوٹے سیارے کو تقریباً ۴۰۰ کیلومیٹر تک
اوپر مدار میں پہنچا سکتا ہے۔ اس راکٹ نے
۸۲ - ۱۹۸۰ء کے دوران ۴۰ کیلوگرام وزن کا
روہنی سیارہ خلا میں پہنچایا تھا۔ اس کے بعد
اسی اے ایس ایل وی - ۳ راکٹ سے ۲۴
مارچ ۱۹۸۷ء کو ۱۵۰ کیلوگرام وزن کا سیارہ
داغے جانے کے کچھ ہی سیکنڈ کے بعد سمندر میں گر کر
تباہ ہو گیا۔ یہ ایک افسوس ناک حادثہ ہے
لیکن اسے ہندوستانی خلائی تحقیقی پروگرام
کی ناکامی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ
خلائی تحقیق اب بھی ایک نامعلوم میدان کی حیثیت
رکھتی ہے اور یہ حیثیت ابھی کافی عرصہ تک تجرباتی
رہے گی۔ اس طرح اس سے حاصل ہونے والی
کامیابیوں میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس
حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گزشتہ
پچیس برسوں میں ہندوستان نے خلائی میدان
میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے اور مستقبل میں
خلائی تحقیق کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں تیل کی کھوج

م۔ک۔ مہتاب

زمین کی گہرائیوں سے حاصل ہونے والا خام
تیل اور مصنوعات ۱۹ویں صدی کا وہ عجوبہ ہے جس
نے نہ صرف زندگی کے دل کی دھڑکن تیز کر دی ہے۔
بلکہ دنیا کی ہر شے کی شکل تبدیل کر ڈالی ہے۔ ہندوستان
کا شمار دنیا کے اُن ملکوں میں ہوتا ہے جہاں
یہ زیر زمین سیال مادہ سب سے پہلے برآمد ہوا۔
جو تیل کبھی یہاں قطرہ قطرہ ٹپکتا تھا وہ آج یہاں
دریا کی مانند بہہ رہا ہے۔ نہ صرف تیل کی دستیابی
بلکہ تیل کی کھوج اور اس کی مصنوعات تیار کرنے
کی مہارت کے لحاظ سے بھی ہندوستان کو دنیا
بھر کے ممالک میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

دنیا میں تیل کی دریافت سب سے پہلے ۱۸۵۹ء
میں امریکہ کی ریاست پنسلوینیا میں ہوئی تھی اور
اس کے صرف بارہ برس بعد آسام ریلوے اینڈ
ٹریڈنگ کمپنی کے افراد نے ڈگبوئی (آسام) کے مقام
میں ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلے میں کھدائی کرتے
ہوئے تیل ڈھونڈ نکالا۔ آج ایک سو سولہ برس بعد
بھی تیل کا ڈگبوئی چشمہ خشک نہیں ہوا۔ بلکہ یہاں
سے ہر روز چند سو بیرل تیل نکالا جا رہا ہے ——
ہندوستان میں پہلی بار تیل کی باقاعدہ کھدائی کا کام
۱۸۹۰ء میں شروع ہوا۔ اس کام کے لیے آسام آئل
کمپنی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس نے
۱۸۹۳ء میں ہندوستان کا تیل صاف کرنے کا پہلا
کارخانہ ڈگبوئی میں لگایا بعد ازاں یہ کام برما آئل
کمپنی نے سنبھال لیا جس نے ڈگبوئی سے خام تیل کی
پیداوار بڑھا کر ۶ ہزار بیرل یومیہ کر دی۔

حصول آزادی یعنی ۱۹۴۷ء تک ہندوستان
میں تیل کی کھوج آسام تک محدود تھی، جہاں تیل
برآمد کرنے کے لیے زیادہ گہرائی تک کام نہیں ہوتا
تھا، لیکن اس وقت تک ملک میں مختلف کاموں
اور نقل و حمل کے لیے تیل کا استعمال عام ہو چکا تھا۔
۴۷ - ۱۹۴۶ء میں ملک میں تیل کی کھپت ۲۶ لاکھ ٹن
تک پہنچ چکی تھی، جب کہ پیداوار محض ڈھائی لاکھ
ٹن تھی۔ باقی ماندہ ضروریات درآمد سے پوری کی
جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ غیر ملکی کمپنیاں ہندوستان
کی وسیع منڈی کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہی تھیں اور
تیل کے عوض ہندوستانی معیشت کا خون کشید کر کے
لیے جا رہی تھیں۔

ملک کی آزادی کے بعد نقل و حمل کے ذرائع
صنعت اور زراعت کی ترقی پر جو زور دیا گیا —
اس کے نتیجے کے طور پر ملک میں پٹرولیم اور اس کی مصنوعات
میں اور بھی اضافہ ہو گیا چونکہ وسط ایشیا میں تیل
کے بہت بڑے ذخیرے دستیاب ہو چکے تھے، جہاں
سے بہت کم قیمت پر بے حساب تیل دستیاب تھا، اس
لیے کسی غیر ملکی کمپنی نے ہندوستان میں تیل کے مزید ذخیروں
تلاش کرنے پر توجہ نہیں دی۔

ملک کے اندر نہ تو اس مقصد کے لیے مہارت
تھی نہ زرمبادلہ۔ پھر بھی چونکہ ملک کی ترقی اور
خاص طور پر صنعتی ترقی کے لیے توانائی کے اس اہم ذریعہ
سے حکومت آگاہ تھی، اس لیے اس نے ملک میں
تیل کی کھوج کے کام کو اولین ترجیحات میں شامل
کیا۔

اگست ۱۹۵۶ء میں حکومت میں تیل و قدرتی
گیس کا ایک ڈویژن قائم کیا گیا۔ ملک کے ایسے تمام
حصوں میں جہاں ہزارہا سال قبل نباتات دب کر
خام تیل کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ وہاں تیل
تلاش کرنے کے لیے ۱۹۵۹ء میں اس ڈویژن کو ایک
خود مختار کمیشن کی شکل دے دی گئی۔ اس دوران
میں برما آئل کمپنی نے بھی برہم پتر وادی میں تیل کی
تلاش کی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا اور آسام میں کئی
اور مقامات پر تیل ڈھونڈ نکالا۔ چنانچہ تیل و قدرتی
گیس کمیشن کا کام سائنسی طریقوں سے ارضیاتی
جانچ کرنا اور باکفایت طریقوں سے تیل کے لیے
کھدائی کرنا تھا۔ آئل انڈیا کمپنی کے نام سے آسام
میں تیل کی تلاش کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا
گیا جس نے بعد ازاں اپنے کام کو نئے علاقے میں
توسیع کر دی۔ لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی تک تیل کی
یہ تلاش زمینی علاقوں تک محدود رہی۔ اس دوران
میں تیل و قدرتی گیس کمیشن نے جدید ترین تکنیک
کے استعمال اور روسی مدد سے گجرات میں کھمبے
کے طاس اور آسام کے بہت سے دیگر علاقوں میں
تیل کے بیش قیمت ذخیرے ڈھونڈ نکالے۔

سمندر میں تیل کی تلاش:

۱۹۷۰ء کی دہائی میں پہلی بار ملک کے ساحلوں

کے قریب تیل کی تلاش کی کوشش کی گئی۔ کیوں کہ ارضیاتی جانچ کرکے ماہروں کو یقین تھا کہ زمین کی بہ نسبت اس سمندر کے نیچے زیادہ تیل موجود ہونے کا امکان ہے۔ پہلا کنواں کیمبے کے قریب سمندر میں کھودا گیا۔ اگرچہ کھدائی کامیاب رہی، لیکن تیل کی مقدار کاروباری لحاظ سے کافی نہیں تھی۔ اس کے بعد کمیشن نے غیر ممالک سے کھدائی کے برمے حاصل کیے۔ اور بحیرۂ عرب میں تاراپور بمبئی ہائی کے علاقے میں کھدائی شروع کی۔

۱۹ فروری ۱۹۷۴ء کا دن ہندوستان میں تیل کی پیداوار کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کھدائی کرنے والوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انہوں نے بحیرۂ عرب میں بمبئی ہائی کے علاقے میں تیل کا ایک بڑا کنواں کھود نکالا تھا بلکہ تیل والے ایک بڑے علاقے کا پتہ لگا لیا تھا جہاں تیل و قدرتی گیس کے کئی دفینے موجود تھے۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیل و قدرتی گیس کمیشن نے نہ صرف مغربی ساحل بلکہ ساحل کے سمندروں میں بھی تیل کی تلاش شروع کر دی۔ آئل انڈیا لمیٹیڈ نے جو ایک سرکاری ادارہ ہے خلیج بنگال میں مہاندی ڈیلٹا کے سمندر اور انڈمان کے سمندر میں تیل کی تلاش شروع کی۔

۱۹۵۵ء ——— ۱۹۸۰ء کے پچیس برسوں میں ملک میں خام تیل کی پیداوار ساڑھے چار لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ پانچ لاکھ ٹن سالانہ ہو گئی جس کا زیادہ تر حصہ بمبے ہائی سے حاصل ہوتا تھا، لیکن ان برسوں میں تیل اور تیل کی مصنوعات کی کھپت ۵۲ لاکھ ٹن سے بڑھ کر نو کروڑ ۹۶ لاکھ ٹن ہو گئی — لیکن پیداوار اور کھپت کا یہ خلا باعثِ تشویش نہیں تھا۔ کیونکہ وسط مشرق سے بہت کم داموں پر تیل دستیاب تھا، لیکن ۱۹۸۰ء تک وسط مشرق کے حالات اتنے بگڑ گئے کہ تیل پیدا اور برآمد کرنے والے ممالک نے خام تیل کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ یہ بوجھ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ممالک کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ملک کے تیل درآمد کرنے کے مصارف ۱۹۷۰ء میں ۱۳۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۰ء میں ۵۲۶ کروڑ روپے سالانہ ہو گئے۔

ان بڑھتے ہوئے مصارف کو دیکھتے ہوئے تیل و قدرتی گیس کمیشن نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کیا اور خاص طور پر بمبئی ہائی کے وسیلوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں خام تیل کی پیداوار ایک کروڑ ۵ لاکھ ٹن تھی جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اندازہ یہ ہے کہ پیداوار کی اس سطح کو سترہ برس برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد تیل کی قیمتوں میں اضافے کا جو کرائسس پیدا ہوا' ہندوستان بمبئی ہائی کے چشموں کی بدولت اس پر قابو پا سکا ہے۔ گجرات اور آسام نے بھی اس میں کافی مدد کی ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے اندازے کے مطابق موجودہ چشموں میں ابھی ۵۵ کروڑ ۴۸ لاکھ ٹن تیل موجود ہے۔ تیل کے ساتھ ساتھ قدرتی گیس کے بھی بہت بڑے ذخیرے ملے ہیں۔ جن میں ۴۹۷ ارب مکعب فٹ گیس موجود ہے۔

لیکن تیل کی کھپت بھی بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن سالانہ ہو گئی ہے۔ اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں کھپت ۹ کروڑ ٹن اور پیداوار ۴ کروڑ ٹن سالانہ ہوگی۔ جس پر ملک کو غیر معمولی بڑی رقم صرف کرنی ہوگی۔ اس لیے ملک تیل کی تلاش کے کام میں کسی خوش فہمی یا تساہل سے کام نہیں لے سکتا اور اسے موجودہ منصوبے میں تیل کے اور بڑے ذخیرے دریافت کرنے ہوں گے۔ ملک میں کل ۲۶ تیل بردار خطے ہیں، جن میں سے ۱۹ میں جانچ کی جا چکی ہے۔ ساتویں منصوبے میں مزید دو لاکھ ۸۰ ہزار میٹر گہری کھدائی کی جائے گی۔ کاویری کیمبے اور مغربی بنگال میں کھدائی کے لیے روس سے مدد لی جا رہی ہے۔ سمندری کھوج کے لیے ۲۷ بلاک غیر ملکی کمپنیوں کو دیے جا رہے ہیں۔ جس طرح ہر محاذ پر سرگرمی جاری ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان تیل کی ضروریات میں کسی حد تک خود کفیل ہو جائے گا۔

●●

بقیہ: وفیات

مہادیوی ورما کو ہندی شاعری کا میر کہا جاتا ہے۔ مرحومہ کو ۱۹۵۶ء میں پدم بھوشن ایوارڈ دیا گیا تھا۔

اگلے روز ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار فکر تونسوی کا نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۹ برس کے تھے۔

فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ بعد میں وہ صحافتی زندگی سے اس طرح جڑے کہ آخر دم تک اس سے وابستہ رہے۔ اردو صحافت میں بہ حیثیت کالم نگار فکر تونسوی مرحوم کا نام ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے گا۔ اردو کالم نگاری کو فکر نے جو وقار اور مرتبہ عطا کیا' وہ انہیں کا حصہ تھا۔

سترہ کتابوں کے مصنف فکر تونسوی کو متعدد سرکاری ریاستوں اور اکادمیوں نے اعزاز، اکرام' انعام سے نوازا تھا۔ فکر تونسوی کے انتقال سے اردو کالم نگاری میں وہ خلا پیدا ہوا ہے' جو شاید ہی پُر ہو سکے۔ مرحوم 'آج کل' کے دیرینہ کرم فرما تھے۔ فکر صاحب کا تحریر کیا ہوا 'من کہ...!' 'آج کل' مئی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔

شروع ستمبر میں اردو کے ایک اور شاعر اور صحافی جناب سریندر پنڈت سوز کا چنڈی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ عرصہ سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ مرحوم ۵۲ برس کے تھے۔ اردو شاعری اور انگریزی اردو صحافت سے اُن کا رشتہ گہرا تھا۔ کس خوبی سے اپنی زندگی کا تجزیہ کیا ہے ؎

سُرخرو ہیں دوستوں اور دشمنوں سے آج ہم
تم سے ممکن ہو تو مرگِ ناگہانی بھیجنا

ادارہ 'آج کل' ان مرحومین کے غم میں سوگوار ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ متعلقین کو صبر و سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

✱✱✱✱✱

پنڈت گووند بلبھ پنت

آزاد بھارت کے جن چند سپوتوں کا نام سدا سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا، ان میں ایک نام پنڈت گووند بلبھ پنت بھی ہے۔ یہ عظیم مجاہد آزادی اب سے تقریبًا ایک سو برس قبل ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کو ریاست اتر پردیش میں الموڑا کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں کھونٹ میں پیدا ہوئے تھے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں اُنہوں نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ دیگر کامیابیوں کے علاوہ قانون (ایل۔ ایل۔ بی) کے امتحان میں یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے، جس پر اُنہیں سونے کے تمغے سے نوازا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اُنہوں نے وکالت شروع کی اور جلد ہی اُن کا شمار اُتر پردیش کے چیدہ وکیلوں میں ہونے لگا۔ لیکن اُن کے اندر بیٹھا ہوا محبِ وطن کالے گاؤن کے نیچے زیادہ دن تک دبا نہ رہ سکا۔ اور بڑے جوش و خروش سے باہر نکل آیا۔ اور آزادی کے گیت گانے لگا۔ یہ وہ جُرم تھا جس کی سزا دار و رسن اور جس کا حاصل اذیتیں اور صعوبتیں تھیں۔ مگر آزادی کا سودا سر میں کچھ ایسا سمایا کہ اس کے سوا کچھ بھی نہ بھایا۔ وہ حب الوطنی کے جذبے سے اس قدر سرشار تھے کہ انگریزی حکومت کے ظلم و ستم برداشت کیے۔ لیکن اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹے اور مقصد ان کا صرف ایک تھا ـــــ بھارت کو آزادی دلانا۔ ان کے جوش و جذبے کی صداقت اور جرأت کو دیکھ کر اس وقت حصولِ آزادی کے لیے کوشاں رہنمایانِ قوم نے اُنہیں تحریکِ آزادی میں شامل کر لیا۔ یہاں بھی ان کی قائدانہ صلاحیتیں کچھ اس طرح نکھر کر سامنے آئیں کہ ۱۹۲۷ء میں ہی اُنہیں اُتر پردیش کانگریس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس سے پہلے وہ صوبائی اسمبلی اور پھر بعد میں مرکزی اسمبلی کے رُکن منتخب کیے گئے ـــ

وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء اور پھر ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۴ء تک اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔ اس دوران اُنہوں نے اتر پردیش کی ترقی کے لیے بہت سارے اقدامات کیے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ جدید اور ترقی یافتہ اتر پردیش کے بانی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم مدبّر اور سیاست داں بھی ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ اس اعتراف کے طور پر اُنہوں نے پنت جی کو ۱۹۵۴ء میں مرکزی کابینہ میں شامل کیا۔ اور وزیرِ داخلہ کے اہم عہدے پر مامور کیا۔ یہاں بھی اُنہوں نے اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کی مہر ثبت کی۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک بھارت میں ہونے والی تمام اہم کامیابیوں اور کارناموں میں ان کے حسنِ تدبر کے واضح نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عرصے میں اُنہوں نے بہت اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ ریاستوں کی نو تشکیل کی سفارش کو منظور کیا۔

۷ مارچ ۱۹۶۱ء کو جب کہ وہ بھارت کے وزیرِ داخلہ کے عہدے پر مامور تھے، کروڑوں عوام کو سوگوار چھوڑ کر وہ اس دیار کو چل دیے، جہاں سے مادّی انسانوں کے قدم واپس نہیں آتے۔

ان کی ذات گوناگوں صفات کی حامل تھی جہاں وہ ایک عظیم مجاہدِ آزادی اور عمدہ منتظم تھے۔ وہاں وہ ایک زبردست سماجی مصلح بھی تھے۔ چھوت چھات کے خلاف گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُنہوں نے بھی تحریک چلائی۔ بطور سماج سدھارک ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کمایوں میں رائج دیو داسی رواج کو ختم کرا دیا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں اس طرح مذہب کی آڑ میں غریب عورتوں کا استحصال ہو رہا تھا اور وہ کسی بھی صورت کسی انسان کا استحصال ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہ فرقہ پرستی کے بھی سخت مخالف تھے اور محسوس کرتے تھے کہ انگریزی حکومت ہندوستانیوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے فرقہ واریت کو ہوا دیتی ہے۔ اس خیال کا اظہار اُنہوں نے بڑی بے باکی سے ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی میں کیا تھا۔

وہ بدعنوانیوں کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بدعنوانیوں کے خاتمے کے لیے بھی بڑی کوششیں کیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی ان کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ اس بات کے حامی تھے کہ بھارت کا ہر شہری تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو وہ ناپسند فرماتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو ہندوستانی زبانوں ہی میں تعلیم دی جائے تو اس کے زیادہ بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

تقریبًا نصف صدی پر محیط اُن کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر ۱۹۵۷ء میں بھارت کے اعلیٰ ترین اعزاز "بھارت رتن" سے نوازا گیا۔

سید مظفر حسین برنی•

عربی زبان و ادب میں ہندوستانی علماء کا حصہ

ہندوستان اور عرب دنیا کے تجارتی، تہذیبی اور علمی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ اور ان پر خاصی دادِ تحقیق دی جا چکی ہے۔ میں اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا۔ قدیم ثقافتی روابط پر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب عرب و ہند کے تعلقات میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر ابھی تک کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی آمد و رفت ہندوستان کے مغربی ساحل پر تھی۔ اور یہ تعلقات زیادہ تر تجارتی نوعیت کے تھے۔ پہلی اسلامی صدی کے آخر میں عربوں کے قدم سندھ کی سرزمین تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستانی پنڈت خصوصاً طب، فلسفہ اور ہیئت و نجوم کے ماہرین ہندوستان سے عرب دنیا میں جاتے تھے۔ بہت سی ہندوستانی تصانیف بھی وہاں پہنچ گئی تھیں اور ان کے عربی میں تراجم بھی ہو گئے تھے۔ اس حرکت کا نکتۂ عروج عباسی خلافت کے اس اولین دور میں آیا جب برامکہ مسندِ وزارت پر فائز تھے۔ برمکیوں کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ ہندوستانی الاصل تھے۔ اور برمک دراصل ہندی لفظ "پرمکھ" کی عربی شکل ہے لیکن عربی و اسلامی علوم سے ہندوستان کا رابطہ خراسان اور وسط ایشیا کی راہ سے قائم ہوا۔ اس وقت تک عرب دنیا میں قرآنِ کریم سے متعلق موضوعات پر بہت کام ہو چکا تھا۔ حدیث کی جمع و ترتیب ہو چکی تھی۔ فقہی احکام کے لیے اصول بن چکے تھے اور چار بڑے فقہی مکاتب وجود میں آ چکے تھے۔ یونانی فلسفہ و منطق سے تصادم کے بعد ایک نیا توازن پیدا ہو گیا تھا جس نے علم العقائد اور علم الکلام کی نشو و نما کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور طب میں بھی خاصی پیش رفت ہو چکی تھی۔ تاریخ کا فن جمعِ روایات کے بعد عہدِ مدونین سے گزر کر حولیات Annals وقائع Chronicles تک پہنچ گیا تھا۔ یہ سب علمی سرمایہ ساتھ لے کر مسلمان علماء کے قافلے وسط ایشیا، خراسان، ایران، عراق و حجاز سے ہندوستان آ رہے تھے۔ یہاں کے حکمرانوں کی مادری زبان ترکی تھی، مگر دفتری کاروبار فارسی میں ہوتا تھا۔ کیوں کہ عباسی خلافت کے زمانے سے ایرانی دفتروں پر چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے انتظامی معاملات سے نپٹنے کے لیے فارسی زبان کو خاصا مالدار بنا دیا تھا، لیکن حکمرانوں کا اور اس زمانے کے طبقۂ اشراف کا اور عوام کا مذہب اسلام تھا۔ اس لیے تمام مذہبی امور میں عربی کی بالادستی ہر زمانے میں قائم رہی۔ عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے صوفیا نے انہیں کی زبان میں تلقین کا راستہ کھول کر ابلاغ کے خلا Communication Gap کو پُر کر دیا تھا، اس لیے مقامی زبانیں اور بولیاں بھی مالدار ہوتی رہیں۔ غرض یہ کہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں ہم اس طرح کے لسانی مسئلوں سے دوچار نہیں ہوتے جیسے آج کی مہذب دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔

عربی علوم کا پہلا مرکز ملتان میں قائم ہوا۔ ٹھٹھہ اور دیبل میں بھی ابتدائی علمی سرگرمیوں کے سراغ ملتے ہیں۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور مرکز بن گیا تھا اور جب غوری سلاطین نے دہلی اور آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا تو دہلی کو بھی علمی اعتبار سے وہی مقام حاصل ہو گیا۔ جو بغداد یا مصر یا بخارا یا سمرقند کو حاصل تھا۔ یہاں علم کا ایسا چرچا تھا کہ خراسان، ایران، ترکی، عراق، یمن اور حجاز سے علماء یہاں کھنچے چلے آتے تھے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ جیسے گجرات میں بدر دمامینی، خطیب گازرونی اور عماد طارمی کے نام ملتے ہیں جو شیراز

• گورنر ہریانہ، راج بھون، چنڈی گڑھ

حجاز و یمن سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ قلقشندی نے صُبح الاعشیٰ میں لکھا ہے کہ عہدِ تغلق میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے، لیکن علم کی رفتارِ ترقی بھی سیاسی انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ تاتاریوں کے فتنہ نے بغداد اور وسط ایشیا کے علماء کو ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا اور یہ فتنہ ہندوستان کی علمی و تہذیبی زندگی کے حق میں ایک نعمت بن گیا تھا۔ مگر یہاں بھی کسی ایک علاقے میں زیادہ عرصے تک امن و استحکام نہیں رہ سکا۔ پہلی بڑی ہجرت تو اس وقت ہوئی جب ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسایا اور ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی سے بہت سے علماء، صوفیا، فن کار اور صنّاع دکن کی طرف آ گئے۔ انہوں نے یہاں کی علمی زندگی میں ایک نئی حرکت اور چہل پہل شروع کر دی۔ مگر یہ بھی ایک اور انتشار کا پیش خیمہ تھا کیوں کہ دارالخلافہ پھر دہلی کو منتقل ہوا اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں علمی کاموں کے لیے جو سکون و فراغ درکار ہے وہ غارت ہو گیا۔ نویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک بار پھر یہاں کی بساط الٹ گئی اور علماء و صوفیا نقلِ مکانی پر مجبور ہو گئے۔ اس خلفشار میں حضرت گیسو درازؒ نے دہلی سے پہلے گجرات اور بہمنی سلطنت کے دارالخلافہ گلبرگہ کا رخ کیا تھا۔ ادھر گجرات میں مظفر شاہ نے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تھی، جو مرکز کے غیر یقینی حالات کے مقابلے میں بہت پُر امن تھی۔ شاہانِ گجرات کی یہ حکومت ایک سو چوراسی سال تک قائم رہی اور اس مدت میں یہاں علومِ شرقیہ جو فروغ نصیب ہوا وہ اتنی کم مدت میں ہندوستان کے کسی اور خطے میں میسر نہیں آیا۔ یہاں دکن میں بہمنی، عادل شاہی، برید شاہی، احمد شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے عربی، فارسی اور اسلامیات اور خود ملکی زبان و ادب کی جو سرپرستی کی ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے۔ جس کا احاطہ اس مختصر وقت میں نہیں کیا جا سکتا۔ اترپردیش کے مشرقی علاقے میں شاہانِ شرقی نے علومِ مشرقیہ کی سرپرستی کی۔ قاضی شہاب دولت آبادی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی کے پوتے مولانا ابوالفتح اور مولانا احمد بن محمد تھانیسری ایسے کتنے ہی نمایاں نام ہیں جو جونپور کی تاریخ میں ملتے ہیں، جن کی بدولت جونپور کو "شیرازِ ہند" کہا جاتا تھا۔ جس طرح گجرات سے علم کی شعاعیں دکن اور مالوہ میں پھیلیں۔ اسی طرح جونپور سے یہ انوار لکھنؤ کو منتقل ہوئے جہاں سلطنتِ مغلیہ کے آخری زمانہ میں مولانا نظام الدین سہالوی نے معقولات کا وہ مدرسہ قائم کیا جسے فرنگی محل کہا جاتا ہے اور ان مدارس میں پڑھانے کے لیے ایک ایسا جامع نصاب تیار کیا جو آج بھی اُن کے نام سے منسوب ہو کر درسِ نظامی کہلاتا ہے۔ ہمارے علماء نے اس کو بھی جامد بنا دیا۔ اگر وقت اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہ کر وہ اس نصاب پر نظرِ ثانی کرتے رہتے تو یہ ہماری اس زمانے کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا اور اس عہد کے چیلنجوں کا جواب بھی دے سکتا تھا۔ کسی حد تک ندوۃ العلماء نے اس نصاب میں کچھ ردوبدل کیا ہے۔ ورنہ روایتی مدارس میں آج بھی بطلیموس کا نظامِ ہیئت پڑھایا جاتا ہے اور منطق کی اُن کتابوں کا درس دیا جاتا ہے، جن کی حیثیت اب محض آثارِ قدیمہ کی رہ گئی ہے۔

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی کیا خدمت ہوئی ہے اس کا اگر عہد بہ عہد جائزہ لیا جائے تو ایک دفتر بھی ناکافی ہے ؎

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

غزنوی، غوری، غلامان، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل خاندان کے حکمرانوں سے لے کر آج آزاد ہندوستان کے سیکولر نظامِ زندگی تک، ہر دور اور ہر علاقہ میں اس کی تاریخ تلاش کی جا سکتی ہے۔ وقت کی ضرورت اور رجحانات کے اعتبار سے یہ فرق ضرور ہوگا کہ کہیں کسی موضوع پر زور رہا ہوگا، کہیں کسی پر لیکن اس روایت کے تسلسل میں فرق نہیں آیا ہے۔ آخر عہدِ مغلیہ میں ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے قصبات میں علوم و ثقافت کے مرکز قائم ہو گئے تھے اور یہاں بیٹھ کر علماء خاموشی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ ان مراکز کی سرسری فہرست بھی خاصی طویل ہوگی۔ اور اس میں امروہہ، بلگرام، ہرگام، جائس، نیوتنی، گوپامئو، امیٹھی، سندیلہ، کاکوری، خیرآباد، ٹونک، رام پور، بھوپال، بیدر، بیجاپور، گلبرگہ، برہان پور، اورنگ آباد، مرشد آباد، لکھنؤ اور ایسے دوسرے درجنوں نام سامنے آئیں گے، جن میں سے ہر علاقے کی مستقل تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔

یہ ہندوستان میں علومِ عربیہ کے مراکز کا ایک بہت ہی سرسری خاکہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مرکزوں میں کن موضوعات پر کیا کام ہوئے ہیں۔ اسلامی دنیا میں علوم کو دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی منقولات اور معقولات۔ کچھ علوم ایسے ہیں جو روایت سے نسلوں کو منتقل ہوئے۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ، اور تاریخ و سیرت بھی آ جاتے ہیں اور دوسری شق کے علوم فکرِ انسانی کے نمائندہ ہیں، جنہیں عقل اور منطقی تاویل و تحقیق سے مدوّن کیا گیا ہے۔ ان میں فلسفہ، منطق، طب، ریاضی وغیرہ آتے ہیں۔ بعض علوم یا ان کی شاخوں میں منقول و معقول دونوں ایک خاص تناسب سے حصہ لیتے ہیں۔ ہندوستانی علماء نے ان کی ہر شاخ میں اپنی ذہانتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہاں عربی زبان کی لغت اور صرف و نحو پر بھی کام ہوا ہے۔ لغت میں رضی الدین حسن صغانی کی نہایت ضخیم کتاب "العُبابُ الزّاخِر" بیس[2] جلدوں میں صرف ب + ک + م = "بکم" تک پہنچی تھی۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو ۵۰۔۶۰ جلدوں سے کم میں نہ سماتی۔ یہ ساتویں صدی ہجری میں مرتب ہوئی اور

بعد کو مرتب ہونے والی تمام اہم لغات کا ماخذ بنی رہی ہے۔ اب اس کو جدید ترتیب کے ساتھ بغداد میں چھاپا جا رہا ہے۔ یہ رضی الدین صغانی ہندستانی تھے اور بقول حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں سے حجاز، یمن، عراق وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے علمی حلقوں میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ حتیٰ کہ خلیفۂ بغداد کی جانب سے سفیر بنا کر سلطنتِ دلی کے دربار میں بھیجے گئے۔ ان کی تصانیف دو درجن سے بھی زیادہ ہیں، جن میں سے ابھی دو چار ہی چھپی ہیں۔ ان کا ایک اور زندۂ جاوید کارنامہ حدیثِ نبویؐ کا مجموعہ "مشارق الانوار" ہے، جو صدیوں تک ہمارے مدارس میں پڑھائی گئی ہے۔ اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی دوسری اہم کتاب جو ہندوستان میں مدوّن ہوئی: "کنزُ العمّال" ہے، جس کے مرتب شیخ علاؤ الدین علی متقی برہان پوری ہیں۔ یہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ فنِ حدیث میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، نواب صدیق حسن خاں حضرت عبداللہ شاہ نقشبندی اور ہمارے زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی یہ چند نام بغیر کسی اہتمام کے لکھے ہیں۔ ان کی خدمات کسی طرح علمائے خطۂ عرب سے کم نہیں ہیں۔

لغت میں ایک اور کارنامہ "تاج العروس شرحِ قاموس" حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے شاگرد اور قصبۂ بلگرام کے باشندے سید مرتضیٰ بلگرامی کا ہے۔ انہیں عام طور سے مرتضیٰ زَبیدی کہا جاتا ہے اور عرب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبید یمن کے رہنے والے تھے، مگر فی الواقع وہ ہندوستانی تھے۔ یہاں سے ہجرت کر کے یمن اور پھر حجاز گئے، وہاں سے مصر پہنچے اور وہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی بہت سی کتابیں چھپی ہیں اور بہت سی ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ہندوستان کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ اس کے ایک باشندے کو زبان و لغت کے معاملے میں عرب دنیا میں بھی سند مانا جاتا ہے۔

ہندی علماء کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ "کشّاف اصطلاحات الفنون" ہے۔ اس میں مختلف علوم کی اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے اور یہ علماء کے لیے حوالے کی ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کا مؤلف بھی ایک ہندی قاضی محمد اعلیٰ تھانوی ہے جس کا مزار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔

فقہ اسلامی میں بھی ہندی علماء نے بہت سی کلاسیکی کتابوں کی شرحیں لکھی ہیں اور فتاویٰ کی بھی متعدد جلدیں مرتب ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک قدیم مجموعہ "فتاویٰ تاتارخانیہ" ابھی وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کے تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اسے قاضی سجاد حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ دوسرا موضوع تصوف و سلوک ہے۔ اس میں بھی متعدد کتابیں عربی میں لکھی گئیں۔ میں صرف حضرت گیسو درازؒ کی "شرحِ عوارف" کا ذکر کروں گا، جس کا قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، جسے غالباً عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی ہی میں مرتب و مدوّن کیا جا رہا ہے۔

یہ علوم معقول و منقول کی طرف ہلکے اشارے تھے۔ اب آخر میں تھوڑا سا ذکر شعر و ادب کا بھی ہو جائے۔ عربی میں شعر کہنے والے یہاں ہر دور میں ہوئے ہیں۔ امیر خسروؒ بھی عربی میں شعر موزوں کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ قاضی عبدالمقتدر دہلوی کا "قصیدۂ لامیہ" ایک معروف قصیدہ ہے، لیکن علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی شخصیت ایسی ہے کہ اُن کے عربی میں ایک مجموعہ سات دیوان ہیں جنہیں وہ "سبعہ سیّارہ" کہتے ہیں۔ ان دواوین کا صرف انتخاب ہی چھپا ہے۔ ان کے سوا ہندوستان میں عربی کا اور کوئی صاحبِ دیوان شاعر نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا نام لے سکتے ہیں مگر ان کا شعری مجموعہ بھی دیوان کے طور پر مرتب نہیں ہوا ہے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا ایک اور حیرت انگیز کارنامہ "شفاء العلیل" ہے جس کا قلمی نسخہ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ابو الطیب المتنبیؔ عربی کا کتنا عظیم شاعر ہے۔ اس کے کلام پر بعض متقدمین نے نحو اور قواعد کی پابندیوں سے انحراف کرنے کا الزام لگایا ہے۔ آزاد بلگرامی نے عملاً اس کے لیے سقیم اشعار پر اصلاح کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اگر المتنبیؔ اس شعر کو یوں کہتا تو غلطی سے محفوظ رہتا۔ ایک ہندوستانی کی یہ جرأتِ رندانہ قابلِ داد ہے اور تقریباً سب مواقع پر آزاد بلگرامی کی رائے قرینِ انصاف ہے۔ یہ قیمتی مخطوطہ حال ہی میں ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے اور اسے عربی مجلہ "ثقافت الہند" میں چھاپا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ دونوں بزرگ عربی کے شاعر بھی تھے۔ مگر ان کی خدمات کا دائرہ عملاً ایسا وسیع ہوا ہے کہ برّصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے عربی دینی مدارس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح اسی خانوادہ سے جا کر متصل ہوتا ہے۔

عہدِ حاضر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب قبلہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان کا اسلامی دنیا میں ایک ممتاز اور اعلیٰ مقام ہے۔ اسی سلسلہ میں یہاں مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی کا بھی تذکرہ کروں گا جو صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں اور جنہوں نے عربی نثر و نظم میں یکساں قدرت کے ساتھ لکھا ہے۔ عربی علوم پر کرناٹک، اراکاٹ، کیرلا، آندھرا اور مہاراشٹر سبھی علاقوں میں بہت وقیع کام ہوا ہے۔ اراکاٹ کی حد تک تو محمد یوسف کوکن صاحب نے انگریزی میں ایک مبسوط کتاب لکھ کر بہت سے کاموں کا احاطہ کر لیا ہے، مگر اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہر علاقہ میں ہونے والے کاموں کا تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ ابھی تو کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں موجود عربی مخطوطات کی ہی کوئی جامع فہرست نہیں بن سکی ہے۔

حکومتِ ہند نے عربی اور فارسی کو کلاسیکی زبان کے زمرے میں رکھا ہے اور ان زبانوں [illegible]

گیان چند

ترانۂ ہندی کی کہانی

سب سے پہلے اس نظم کی پہلی اشاعت کے سنہ کے بارے میں دو غلط بیانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کے۔ اے۔ وحید اپنی انگریزی کتابیاتِ اقبال میں لکھتے ہیں کہ نظم "ہمارا دیس" مخزن لاہور، جلد ۸، شمارہ ۱، اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ص ۵۰-۴۹ پر شائع ہوئی ہے[1]

واضح ہو کہ اس نظم کا قدیم نام "ہمارا دیس" ہی ہے۔ "ترانۂ ہندی" بانگ درا سے پہلے نہیں ملتا۔ وحید صاحب نے سہواً ۱۹۰۴ء کے بجائے ۱۹۰۱ء لکھ دیا ہے۔ رسالہ مخزن اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چھ شماروں کی ایک جلد بنائی جاتی تھی۔ اس طرح جلد ۸، نمبر ۱ کے معنی ہوئے اکتوبر ۱۹۰۴ء کا شمارہ۔ مجھے عبد الصمد خاں مالک اردو ریسرچ سینٹر نے اس کے ص ۴۹ کا عکس فراہم کیا ہے۔ نظم ص ۴۹ پر مکمل ہو گئی ہے۔ ممکن ہے ص ۵۰ پر اس سے متعلق کوئی نوٹ رہا ہو۔

عبد اللطیف اعظمی نے اپنی کتاب "اقبال 'دانائے راز'" (دہلی ۱۹۷۸ء) کے آخر میں حیاتِ اقبال کی اہم تاریخیں دی ہیں۔ اس میں ص ۲۱۷ پر اکتوبر کے تحت لکھتے ہیں:

> "مخزن" میں مشہور نظم "ہمارا دیس" (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) شائع ہوئی (ببلیوگرافی آف اقبال صفحہ ۶)"

لیکن اسی صفحہ پر نیچے فٹ نوٹ میں تصحیح کرتے ہیں:

> • عین طباعت کے وقت معلوم ہوا کہ یہ سن غلط ہے، صحیح ۱۹۰۴ء ہے۔ "مخزن" سے پہلے "زمانہ" کانپور میں ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۷ء میں رسالہ "اصلاحِ سخن" لاہور کی طرح "ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ۱۹۰۷ء میں یہ نظم طرح میں کہی گئی تھی۔"

اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے اپریل ۱۹۸۶ء میں عالمی اقبال سیمنار کیا۔ اس موقع پر ایک سووینیر شائع کیا، جس میں دائیں طرف سے اردو حصہ ہے، بائیں طرف سے انگریزی۔ انگریزی حصے کے ص: ۲۵ پر ایک انگریزی تحریر چھپی ہے۔ جس کا عنوان "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ لاہور کی ینگ مینس ایسوسی ایشن Youngmen's Association نے پہلی سال گرہ Anniversary ۱۹۰۳ء میں منائی۔ اسے ہندوستان کے مشہور محبِ وطن انقلابی مرحوم ہردیال نے منعقد کیا۔ انہوں نے اس موقع کے لیے پنجاب کے سنت شاعر سوامی رام تیرتھ سے، جو اُن دنوں امریکہ میں تھے، ایک مضمون "ہندوستان کا مسئلہ" بھی حاصل کر لیا۔ محمد اقبال سے درخواست کی کہ وہ اردو میں ایک نظم لکھ کر افتتاحی جلسے میں پڑھیں۔ اقبال نے اس موقع کے لیے "ہندوستاں ہمارا" لکھی، جو ریمزے میکڈانلڈ کی رائے میں ۱۹۱۰ء تک پورے ہندوستان کے قومی ترانے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔"

"اینی ورسری" عموماً کسی واقعے کی تاریخ کی سالانہ تقریب کو کہتے ہیں۔

---

[1] K.A.WAHEED: A Bibliography of Iqbal (Iqbal Academy, Karachi, Ist Ed. 1965) P-6

• شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی تھرلیٹ ہولڈ نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

جب وہ واقعہ پہلی بار ہوا ہو تو اسے 'اپنی ورسری' نہیں کہتے۔ پہلی اینی ورسری واقعے کے ایک سال بعد ہوتی ہے۔ اگر ۱۹۰۳ء میں پہلی اینی ورسری ہوئی ہو تو اوّل انعقاد ۱۹۰۲ء میں ہوا ہوگا، لیکن مصنف کا یہ منشا نہیں۔ وہ افتتاحی جلسے ہی کو اینی ورسری کہہ رہا ہے۔ انگریزی عبارت دراصل ایک تعارفی نوٹ ہے۔ جس کے بعد کے صفحے پر 'ہمارا دیس' کے عنوان سے یہ نظم بخطِ اقبالؔ درج ہے اور اس پر ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کی تاریخ پڑی ہے۔ ان دونوں صفحات کا ماخذ کیا ہے۔ اس کے بارے میں' میں نے اقبالؔ اکیڈیمی کے ارباب سے بارہا پوچھا لیکن وہ نہ بتاسکے۔ انگریزی عبارت میں ایک صریح غلطی ہے کہ جلسے کی تاریخ ۱۹۰۴ء کے بجائے ۱۹۰۳ء دی ہے۔ نظم بخطِ اقبالؔ کے بارے میں مجھے ڈاکٹر اکبر حیدری نے لکھا کہ اُسے جگن ناتھ آزاد صاحب نے رسالہ آج کل نئی دہلی "اقبالؔ نمبر" ۱۹۷۷ء میں ص ۵ پر شائع کیا ہے، لیکن اپنا ماخذ درج نہیں کیا۔

رسالہ آج کل دہلی بابت یکم جنوری ۱۹۴۶ء* میں محمد عمر (نورالٰہی) صاحب کا ایک مضمون "ہندوستاں ہمارا کی شانِ نزول" کے عنوان سے ص: ۳۶-۳۷ پر شائع ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ص ۳۶ کے اوپر شمارے کی تاریخ یکم جنوری ۱۹۴۶ء درج ہے۔ اور ص ۳۷ پر ۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے دونوں صفحات کا عکس عبدالصمد خاں نے کلکتے سے مجھے بھیجا۔ اس مضمون کا طویل خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

مشہور انقلابی ہردیال ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کے طالب علم[1] تھے۔ یہ عجیب خصلت کا انسان عجائباتِ قدرت میں شمار ہوتا تھا۔ اگر کسی اور زمانے میں ہوتا تو کیا تعجب ہے کہ رِشی یا مُنی کا دعویٰ کرتا۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی ایک نظر پڑھ لیتا تو پھر وہ کبھی حافظے سے باہر نہ جاسکتا۔ لاہور میں ۱۹۰۴ء میں صرف ایک کلب ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن تھا۔ ہردیال بھی اس کے ممبر تھے۔ ایک دن سکریٹری کلب سے کچھ جھڑپ ہوگئی۔ بات نے طول پکڑا اور ہردیال نے اس کلب کو چھوڑ کر ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن قائم کر دی۔ اقبالؔ گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھے۔ ہردیال سے آپ کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اب ہردیال کے کلب کا افتتاحی جلسہ ہوا تو علامہ نے اس کی صدارت قبول کرلی۔

تین بجے شام یہ طے ہوا اور چھ بجے جلسہ شروع ہوا۔ تاریخ اور مدت کا لحاظ رکھیے۔ اقبالؔ نے جلسے میں صدارتی خطبہ پڑھنے کے بجائے نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پڑھنا "سوءِ ادب معاف" گانا شروع کیا۔ ہم جو روزانہ بلاناغہ شام کو حاضرِ خدمت ہوا کرتے تھے، حیران تھے کہ یہ نظم کب کہی گئی۔

محمد عمر نے پنسل سے یہ نظم لکھ لی۔ اس زمانے میں شررؔ اپنے رسالہ 'اتحاد' میں ہندو مسلم اتحاد پر وعظ کیا کرتے تھے۔ محمد عمر نے یہ نظم انہیں بھیج دی کہ ادارتی نوٹ میں ان کا نام بھی چھپ جائے۔ شررؔ نے نظم چھاپی۔ لیکن محمد عمر کا نام نہ دیا۔ ایک روز محمد عمر علامہ کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ کسی لڑکے نے اس نظم کو رسالہ اتحاد میں شائع کر دیا۔ اس میں لڑکے کی حماقت سے بہت سی غلطیاں وارد ہوگئیں اور ان غلطیوں کو سامنے رکھ کر حسن موہانی (کذا۔ صحیح حسرت موہانی۔ گیان چند) نے اپنے رسالہ اُردوئے معلّٰی میں اہلِ پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ تلاش ہوئی کہ اس لڑکے کا سُراغ لگایا جائے۔ ایک قل اعوذیے نے کہا کہ خود مولانا شررؔ ہی سے پوچھا جائے کہ یہ نظم انہیں کس نے بھیجی ہے۔ سب نے اس کی تائید کی۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ اور فورمن کرسچین کالجوں کے طلبا ارسٹوکریٹ' اسلامیہ کالج کے قل اعوذیے اور ڈی اے وی کالج کے مدر دیشی کہلاتے تھے۔ مولانا شررؔ کے نام چھٹی لکھی گئی اور اُسے ڈاک میں ڈالنے کا کام محمد عمر ہی کو سونپا گیا۔

محمد عمر بڑی اُلجھن میں تھے۔ لفافہ ڈاک میں ڈال دیا لیکن ساتھ ہی علیحدہ سے شررؔ کو ایک خط لکھ دیا کہ اُن کا نام نہ بتایا جائے۔ مولانا شررؔ نے شیخ صاحب کو جواب لکھ دیا کہ کسی نے لاہور سے نظم بھیجی تھی، اب مسودہ نہیں مل رہا ہے، بھیجنے والے کا نام یاد نہیں۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں اقبالؔ سری نگر آئے، وہاں منشی نورالٰہی چند دیگر اصحاب اور محمد عمر علامہ کے پاس ہاؤس بوٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک شکارا پاس سے گزرا جس میں دو تین بچے یہی نظم گا رہے تھے۔ علامہ نے بیان کیا کہ اس نظم کے شائع ہونے پر کس طرح ادبی طوفان بپا ہوا تھا، لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ یہ نظم کس نے شائع کرائی تھی۔ منشی نورالٰہی نے مسکرا کر محمد عمر کی طرف دیکھا۔ یہ کھو گئے۔ حال نے بتا دیا کہ سب کارستانی محمد عمر کی تھی۔ سب ہنس پڑے۔ جس میں علامہ مغفور بھی شریک غالب تھے۔

صاحبزادہ محمد عمر کے بیان کا طویل اقتباس ختم ہوا۔ سری نگر میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے مجھے ان سے ملایا۔ ان کا تعارف یہ کہہ کر کرایا۔ "یہ محمد عمر نورالٰہی ہیں"۔ مجھے منشی نورالٰہی کے انتقال کی خبر نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ "دونوں میں سے کون ہیں، محمد عمر یا نورالٰہی؟" سروری صاحب نے جواب دیا۔ "محمد عمر"۔ اس زمانے میں' میں اُن کے اس مضمون سے واقف نہ تھا، ورنہ اس کے بارے میں کچھ دریافت کرتا۔ سوونیر کی انگریزی عبارت میں لکھا تھا کہ ہردیال نے اقبالؔ سے صرف ایک نظم پڑھنے کی فرمائش کی۔ محمد عمر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ اقبالؔ

---

* مضمون ۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۳۶ پر تاریخ یکم جنوری ۱۹۴۶ء کا اندراج سہوِ کتابت ہے۔ (ادارہ)

[1] یہ وہی مشہور لالہ ہردیال ہیں جنہوں نے امریکہ میں جلا وطنی میں غدر پارٹی قائم کی۔

سے صدارت کی درخواست کی گئی لیکن انھوں نے کسی خطبۂ صدارت کے بجائے محض نظم پڑھی۔ اس سے لگتا ہے کہ اقبال سے جلسے کی صدارت کی درخواست نہیں کی گئی ہوگی۔ بلکہ اس موقع کے لیے ایک قوم پرستانہ نظم پڑھنے کی فرمائش ہی کی گئی ہوگی۔

میرے سامنے رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء کا متن بھی موجود ہے اور نظم کا ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کا بخطِ اقبال بھی۔ دونوں میں وہ اسقام موجود ہیں جن کی بنا پر شرر اور حسرت موہانی نے اعتراضات کیے۔ بعض اوقات مصنف اپنی غلطیوں کو سہوِ کاتب کے سر منڈھ دیتا ہے۔ اگر محمد عمر کا بیان صحیح ہے تو اقبال نے بھی اپنی لغزشوں کو راوی کی گردن پر ڈال دیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے دو باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ کسی رسالے کے شمارے پر جو مہینہ اور تاریخ درج ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ پرچہ واقعی اس مہینے میں آگیا ہو۔ بعض اوقات کئی ماہ شاذ ایک سال سے زیادہ تک کی تعویق ہو سکتی ہے۔

۲۔ اشاعت کی اس دیری کی وجہ سے یہ ضروری نہیں کہ مختلف رسالوں اور مجموعوں میں اشاعت کی تاریخوں کی ترتیب، تخلیق میں ترمیم و ارتقا کی صحیح عکاسی کرے۔ بہت ممکن ہے کہ بعد کے مہینے کے شمارے میں تخلیق کا جو متن چھپا ہے، وہ کسی دوسرے رسالے کے پیشتر کے شمارے سے فرسودہ تر ہو۔ تاریخ کے اعتبار سے ترانۂ ہندی کی یہ ترتیب ہے۔

۱۔ نظم کا متن بخطِ اقبال مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۴ء
۲۔ خبر کا رسالہ اتحاد بابت ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء
۳۔ زمانہ کان پور بابت ستمبر ۱۹۰۴ء
۴۔ مخزن جلد ۸ نمبر ا یعنی اکتوبر ۱۹۰۴ء
۵۔ اصلاحِ سخن لاہور بابت ستمبر ۱۹۰۷ء
۶۔ کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق حیدرآباد جون ۱۹۲۴ء
۷۔ بانگِ درا ستمبر ۱۹۲۴ء

اصلاحِ سخن کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے نظر انداز کر دیا جائے تو نظم کے متن کی منازلِ ارتقا اشاعت کی تاریخوں سے بالکل مختلف یوں ہیں:

۱۔ زمانہ کان پور ستمبر ۱۹۰۴ء کا متن۔
۲۔ اتحاد ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء کا متن۔
۳۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کا متن بخطِ اقبال۔
۴۔ مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء کا متن۔
۵۔ حیدرآبادی کلیات کا متن۔
۶۔ بانگِ درا ۱۹۲۴ء کا متن۔

ہر ایک کی تفصیل دینے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ میں سب کے اختلافاتِ نسخ پیش کر دوں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ میں بانگِ درا سے متداول متن درج کر رہا ہوں۔ جن الفاظ میں اختلافِ نسخ ملتا ہے، ان پر نمبر ڈال کر بعد میں اختلافات واضح کرتا ہوں:

ترانۂ ہندی[۱]

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اختلافاتِ نسخ۔ کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق کے لیے ذیل میں 'رزاق' کا لفظ لکھا جائے گا۔ معلوم نہیں۔ اقبال کا خطی متن آج کل ۱۹۷۷ء سے پہلے کہیں شائع ہوا کہ نہیں۔ اس کے لیے لفظ "آج کل" لکھا جائے گا۔ رسالہ زمانہ میں اشعار کی ترتیب بدلی ہے۔ بقیہ سب متون میں جو شعر نمبر ۶ پر ہے زمانے میں تیسرے نمبر پر درج کیا ہے۔ اور کسی شعر کی ترتیب میں فرق نہیں تو ملاحظہ ہو اختلافاتِ نسخ کی تفصیل۔

۱۔ زمانہ، آج کل، مخزن اور رزاق میں عنوان 'ہمارا دیس' ہے۔ اتحاد میں کوئی عنوان نہیں۔ بانگِ درا میں 'ترانۂ ہندی' ہے۔ محمد عمر نے اپنے مضمون میں 'ہندوستان ہمارا' عنوان درج کیا ہے۔ ممکن ہے 'اصلاحِ سخن'، ۱۹۰۷ء میں بھی یہی عنوان ہو۔
۲۔ زمانہ، اتحاد، رزاق : وہ — آج کل، مخزن، بانگ : یہ
۳۔ اتحاد : سمجھیں — بقیہ سب : سمجھو
۴۔ صرف رزاق : ہیں ہم بھی — بقیہ سب : ہمیں بھی
۵۔ زمانہ، آج کل : اس کے — بقیہ سب : اس کی
۶۔ صرف بانگ : ہیں — بقیہ سب : ہے
۷۔ زمانہ میں یہ شعر تیسرے نمبر پر ہے۔ وہاں مصرعِ اولیٰ یہ ہے :

ع پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا

حاشیے میں ن لکھ کر ترمیم شدہ متن لکھا ہے۔

ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اس کے معنی یہ ہیں کہ ترمیم شدہ متن نظم کی پہلی کتابت کے بعد بھیجا گیا، جسے حاشیے میں لکھ دیا گیا۔

۸۔ زمانہ، اتحاد، آج کل میں یہ مصرع یوں ہے :

ع صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

مخزن، رزاق، بانگ ۔ :

ع صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

۹۔ صرف اتحاد : اپنا کوئی محرم ۔ بقیہ سب مع زمانہ : کوئی محرم اپنا

۱۰۔ زمانہ، اتحاد، آج کل : ہے ہمیں بقیہ سب : کیا کسی

اب مختلف متون کے بارے میں کچھ مشاہدات :

رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء میری نظر سے نہیں گزرا ۔ مجھے اس کا متن ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے لکھ کر بھیجا۔ ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ زمانے کا متن اقبال کے خطی متن مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء پر مقدم ہے۔ اس کے دو دلائل ہیں :

أ۔ 'زمانہ' میں جس مصرع کا متن ہے : ع پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا — ۱۰ اگست کے خطی متن میں ہے ۔ ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔ زمانہ میں یہ متن حاشیے میں دیا ہے ۔

ب۔ 'زمانہ' میں اس شعر کو تیسرے نمبر پر دیا ہے ۔ بقیہ سب میں چھٹے نمبر پر ہے ۔ ترتیب کی تبدیلی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بانگ درا کے پانچویں شعر میں آبِ رودِ گنگا کا ذکر آیا ہے ۔ چونکہ ہندو مذہب میں اس ندی کو مقدس مانا گیا ہے ۔ اس لیے اس سے فوراً بعد یہ شعر رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوا ہوگا کہ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

چونکہ 'زمانہ' کا متن ۱۰ اگست کی تاریخ کے متن سے فرسودہ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اسے رسالہ 'زمانہ' کو جولائی ۱۹۰۴ء یا زیادہ سے زیادہ اگست کے پہلے ہفتے میں بھیجا ہوگا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرحِ بانگ درا میں لکھتے ہیں کہ اقبال نے یہ ترانہ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو ایڈیٹر زمانہ کو بھیجا تھا[1]۔ دونوں کے متون کے اختلاف کے پیشِ نظر یہ کہنا درست نہیں ۔ اقبال نے 'زمانہ' کو یہ نظم بہرحال ۱۰ اگست سے پہلے بھیجی تھی ۔ ہاں ایک مصرع کی اصلاح شدہ شکل ۱۰ اگست کے فوراً بعد یا ایک دو دن پہلے بھیجی ہوگی ۔ نظم سے پہلے ایڈیٹر 'زمانہ' نے ایک طویل سا ایک نوٹ شائع کیا تھا جو ڈاکٹر اکبر حیدری کے ایک مضمون سے نقل کیا جاتا ہے ۔

" ہندوستانی زبانوں میں، اور خصوصاً اردو میں، حب الوطنی اور جوشِ ملکی کے متعلق ایسی نظمیں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہوں گی، جن میں اس ملک کی خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبۂ حب الوطنی کا لحاظ ہو۔

انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان پر ہوتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کے دلوں پر ان کا ایک خاص اثر ہوتا ہے ۔ جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانے میں غرض ہمیشہ ان گیتوں کی بدولت ان کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے اور اس کی عظمت اور شان قائم رکھنے کا خیال جما رہتا ہے ۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انہوں نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے، ملک بھر میں ہر دل عزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں، خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونے کی مستحق ہے ۔"[2]

یہ نظم رسالہ " اتحاد" مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء میں ص ۴ پر شائع ہوئی ۔ اس میں دو کالم ہیں ۔ پہلے کالم میں ایک نثری نوٹ ہے، جس کا سلسلہ ص ۳ سے چلا آ رہا ہے ۔ مجھے اس صفحہ کا عکس عبدالصمد خاں نے فراہم کیا ۔ ص ۳ ان کے پاس بھی نہیں ہے ۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ص ۴ سے پہلے دو ایک الفاظ یا ایک ڈیڑھ جملہ ہی رہا ہوگا ۔ نوٹ یہ ہے :

" ایک کلب قائم ہوا ہے جس کے سب سے اہم فرائض یہ ہیں کہ ہندوستان کی کل اقوام میں میل جول کرایا جائے ۔ اور وہ سب بالاتفاق و ہمدردی، ترقی و بہبودیِ ملک کی جانب راغب کی جائیں ۔ اس کے ایک جلسہ میں پنجاب کے مشہور و نازک خیال شاعر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے نے ایک مختصر و پرجوش نظم پڑھی، جس نے حاضرین پر اتنا اچھا اثر کیا کہ سب کے اصرار سے جلسہ کے افتتاح و اختتام دونوں اوقات میں گا کے سُنائی گئی ۔ اُس نظم سے چونکہ اتحاد کو اپنے مشن میں مدد ملی ہے ۔ لہٰذا ہم اپنے پرانے دوست مولوی محمد اقبال صاحب کا شکریہ ادا کر کے درجِ اتحاد کرتے ہیں ۔"

اس کے نیچے نظم درج ہے ۔ چونکہ کالم میں ایک ہی مصرع آسکتا تھا اس لیے مصرعے اوپر نیچے درج کیے گئے ہیں ۔ نظم کے آخری تین مصرعے دوسرے کالم میں چلے گئے ہیں ۔ اس کے بعد اکبر الٰہ آبادی کی کچھ رُباعیاں اور ایک قطعہ درج ہے، جن کا موضوع بھی ہندو مسلم اتحاد ہے ۔ ص ۴ کے مندرجہ بالا نوٹ سے پہلے، ممکن ہے ص ۳ پر محض دو الفاظ 'لاہور میں' رہے ہوں ۔ ظاہر ہے کہ یہاں

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرحِ بانگِ درا (سلطانیہ بک ڈپو، دہلی، بارِ اوّل سنہ ندارد) ص ۱۳۳ ۔

[2] " اقبال کا سفرِ لکھنؤ، حقیقت یا افسانہ" مشمولہ ہماری زبان، ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء ص ۳

لالہ ہردیال کی ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن کا ذکر ہے۔

چونکہ یہ نظم ۱۶ اگست کے پرچے میں شائع ہوئی اور اس زمانے میں لاہور سے لکھنؤ تک چٹھی پہنچنے میں کئی دن لگتے ہوں گے، اس لیے یہ یقینی ہے کہ اسے ۱۰ اگست سے پہلے ہی لاہور میں سپردِ ڈاک کر دیا گیا ہوگا۔ اس طرح یہ ۱۰ اگست کے خطی متن پر مقدم ہو جاتی ہے۔ اختلافاتِ نسخ پر نظر کریں تو بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ 'آج کل' کے مقابلے میں 'اتحاد' کا متن نمبر ۲، ۳، ۹، ۱۰ میں فرسودہ تر ہے۔ 'آج کل' کا متن صرف ۵ میں پچھڑتا ہے یعنی اس میں 'کے' ہے جب کہ 'اتحاد' میں 'مخزن' اور 'بانگ' کی طرح 'کی' ہے جو چنداں اہم نہیں۔ ان اختلافات کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ 'اتحاد' کے بعد 'آج کل' میں قدرے اصلاح ہوئی ہے۔ مقطع کا معاملہ قدرے پریشان کن ہے۔ اس کے پہلے مصرع میں 'زمانہ' میں "کوئی محرم اپنا" لکھا۔ 'اتحاد' میں اسے بدل کر "اپنا کوئی محرم" کر دیا۔ لیکن پھر رجوع کر کے مخزن اور بانگِ درا میں 'کوئی محرم اپنا' ہی بنا دیا۔ 'اتحاد' میں شائع متن کے نتائج اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ محمد عمر نے جلسے میں سن کر نظم کو لفظ بہ لفظ صحیح قلم بند کیا ہوگا۔ اگر ان کے سننے اور نقل کرنے میں کوئی سہو در آگیا ہو تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

محمد عمر یہ سمجھتے ہیں کہ نظم اسی دن سہ پہر تین اور چھ بجے کے درمیان تخلیق کی گئی۔ چونکہ جلسہ میں پڑھی ہوئی نظم کا متن 'اتحاد' میں محفوظ ہے اور 'زمانہ' کا متن بالیقین اس سے فرسودہ تر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظم جلسے سے کئی دن پہلے تصنیف کر کے رسالہ زمانہ کو بھیج دی گئی تھی۔ بعد میں اصلاح کر کے جلسہ میں پڑھی گئی۔ اگر اس پر اصرار ہو کہ یہ نظم بالخصوص ایسوسی ایشن کے افتتاحی اجلاس کے لیے لکھی گئی تھی تو یہ تقریب کی تاریخ سے چند روز قبل، ممکن ہے ایک ہی دن پہلے، مکمل کر کے زمانہ کو بھیج دی گئی اور بعد میں نظرِ ثانی کر کے جلسہ میں پڑھی گئی۔ افسوس صاحبزادہ محمد عمر نے جلسہ کی تاریخ نہیں لکھی۔ معاصر اخبارات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے۔ لالہ ہردیال کی کوئی سوانح عمری ملتی ہو تو اس میں بھی تاریخ کا ملنا ممکن ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں اقبال کی زبان پر بہت سے اعتراضات کیے گئے۔ یہ نہ صرف حسرت موہانی، شرر، اور چکبست کی طرف سے ہوئے بلکہ پنجاب کے کئی اخباروں اور رسالوں کی طرف سے بھی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے مجھے اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ جون ۱۹۸۶ء میں لکھا کہ حسرت کی ناراضی کی شانِ نزول یہ تھی کہ مولوی ممتاز علی والدِ سید امتیاز علی تاج نے لکھ دیا تھا:

"نظم میں چودھری خوشی محمد ناظر اور اقبال کا کلام جس پایہ کا ہے وہ سخن شناسوں پر بخوبی ظاہر ہے۔ کیا ایسے نامور اہلِ قلم کی موجودگی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ پنجاب کی ایک بھی اردو تصنیف ایسی نہیں ہے جسے کوئی اہلِ زبان پڑھ کر خوبیٔ زبان کا قائل ہو۔"

اس پر حسرت موہانی نے 'اردوئے معلّٰی' اگست ۱۹۰۲ء میں 'تنقید ہمدرد' کے فرضی نام سے ایک مضمون "اردو زبان پنجاب میں" لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"رسالہ 'مخزن' میں جب سے اقبال کی نظمیں شائع ہونے لگی ہیں اس وقت سے اہلِ پنجاب کا دماغ اور بھی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ جس کو دیکھیے اقبال و ناظر کا حوالہ دے کر اپنی زبان کو بھی مستند قرار دیتا ہے..... اقبال کا کلام ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر کچھ کمی رہ جاتی ہے تو صحتِ زبان جس کی وجہ سے اکثر ان کے کلام کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔"

اس کے آگے اقبال کی نظم "ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" کے بعض اشعار اور چند دوسرے اشعار کی زبان پر اعتراض کیے۔ اس کے جواب میں اقبال نے 'مخزن' اکتوبر ۱۹۰۲ء میں جوابی مضمون "اردو زبان پنجاب میں" ہی کے عنوان سے لکھا۔ ڈاکٹر عبدالغفار[5] شکیل اور جناب عبداللہ[6] قریشی نے جو اس مضمون کی تاریخ اکتوبر ۱۹۰۲ء لکھی ہے، وہ صحیح نہیں۔ ۱۹۰۳ء ہونا چاہیے۔ تنقید ہمدرد نے فروری ۱۹۰۴ء کے اردوئے معلّٰی میں 'اصلاحِ زبانِ پنجاب' کے عنوان سے جواب الجواب لکھا۔ ...... اپریل ۱۹۰۴ء کے اردوئے معلّٰی میں چکبست کا مضمون 'کلامِ اقبال' شائع ہوا۔ یہ بھی تنقیدی تھا۔

معرکہ آرائی کے اس ماحول میں 'اتحاد' میں اقبال کی نظم (ترانۂ ہندی) شائع ہوئی۔ شرر نے اپنے رسالہ 'دلگداز' نمبر ۸ جلد ۸ بابت ماہِ اگست ۱۹۰۴ء میں ص ۲۴-۲۳ پر رسالہ اردوئے معلّٰی کا تعارف یا تبصرہ شائع کیا۔ اسی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"۱۶ اگست کے 'اتحاد' میں ہمارے قدیم دوست مولوی محمد اقبال صاحب کی ایک مختصر نظم چھپی ہے، جو ہندو مسلمان کے اتفاق پر ہے۔ اس کے آخری دو شعروں میں ردیف بگڑ گئی ہے۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

اس میں "ہمارا" کی جگہ 'ہم پر' یا 'ہمارے حال پر' چاہیے۔

---

[5] اقبال کے نثری افکار انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ مارچ ۱۹۷۷ء ص ۳۲

[6] قریشی، "اقبال کے ادبی معرکے" نقوش ادبی معرکے (نمبر ۲) ستمبر ۱۹۸۱ء۔ ص ۲۱۴

اقبال اپنا کوئی محرم نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا
اس شعر میں 'ہمارا' کی جگہ 'اپنا' چاہیے۔

میں مانتا ہوں کہ 'اقبال' صاحب ملک کے نہایت ہی نازک خیال اور باکمال شعرا میں ہیں۔ اور ایسی دو چار فروگذاشتوں سے ان کا کمال مٹ نہیں سکتا اور نہ یہ کسی کی کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے کمالوں پر خاک ڈالے۔ لیکن ان غلطیوں کو بتانا چاہیے تاکہ خود اقبال صاحب اور دیگر شعرا کو ایسی فروگذاشتوں سے بچنے کا موقع ملے۔"

اس کے آگے انہوں نے حسرت موہانی کے اہلِ پنجاب کی زبان پر اعتراضات کو بہت قابلِ قدر قرار دیا ہے[1]

دلگداز کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ ترانۂ ہندی پر اعتراضات حسرت موہانی نے نہیں خود شرر نے کیے تھے۔ چونکہ ان کا ذکر اردوئے معلیٰ کے تعارف میں ہے۔ اس سے اقبال نے انہیں اپنے پرانے دشمن حسرت موہانی ہی سے منسوب کر دیا۔ ان کی بنا پر وہ حسرت سے خفا ہوتے تو کوئی بات نہ تھی لیکن اگر محمد عمر کی بات مان لی جائے تو اس لڑکے پر خفگی کا کوئی جواز نہ تھا جس نے وہ نظم مبینہ اغلاط کے ساتھ 'اتحاد' کو بھیجی تھی۔ ردیف کی یہ کوتاہی تو زمانہ اور اقبال کے خطی متن دونوں میں ہے، بہر حال ان دونوں اغلاط کو رفع کر کے نظم مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ میرے پاس مخزن جلد ۸ نمبر ۱ (یعنی اکتوبر ۱۹۰۴ء) کے ص ۴۹ کا عکس ہے۔ اس میں نظم کا عنوان 'ہمارا دیس' ہے۔ اس سے پہلے ایڈیٹر کا نوٹ ہے۔

"جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔ (عبد القادر)"

اس کے بعد اسی صفحہ پر ترمیم شدہ نظم مکمل ہو گئی ہے۔ اعتراض والے مصرعوں کو یوں بدل دیا ہے۔ ع صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا اور ع معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا۔

نومبر ۱۹۰۴ء کے اردوئے معلیٰ میں حسرت نے ادارے کی جانب سے مخزن کے اس شمارے پر تنقید کی، جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

" اکتوبر کا پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں سے قطع نظر کر کے جو نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں اہلِ پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینیوں کی نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں 'ہمارا' کے بجائے 'اپنا' چاہیے۔ اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوایا: ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

حضرتِ اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں، ویسی ہی نثر میں بھی کرتے۔"

اور اس کے بعد اقبال کے مضمون 'قومی زندگی' میں زبان کی اغلاط گنائی ہیں۔ ترانۂ زندگی کی اشاعت کی اگلی منزل اصلاحِ سخن ہے۔ عبد اللطیف اعظمی "اقبال، دانائے راز" میں توقیت کے نوٹ میں لکھتے ہیں۔

" اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۷ء میں رسالہ اصلاحِ سخن لاہور کی طرح " ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ۱۹۰۷ء میں یہ نظم طرح میں کہی گئی تھی۔"

معلوم نہیں یہ مصرع "ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" کس کا ہے، لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ اقبال کے مصرع "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ہندی کا لفظ زبان کے لیے مخصوص ہو گیا ہے، اس لیے کسی نے اس میں اصلاح کی 'ہندوستان کے ہم ہیں'۔ ممکن ہے رسالے کے مدیر ہی نے ایسا کیا ہو۔ شمارہ دیکھا جائے تو کچھ مفید معلومات مل سکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ۱۹۰۷ء میں لاہور کے ادبی حلقوں میں قوم پرستی ابال پر تھی کہ اس مصرع پر نظمیں یا غزلیں لکھی گئیں۔ مصرعِ طرح غزل کا ہوتا ہے، نظم کا نہیں۔ اقبال کا ترانہ نظم ہے یا غزل؟ اس میں غزل کی طرح مطلع موجود ہے۔ ہر شعر

(آگے [illegible])

---

[1] مجھے کلکتے سے عبد الصمد خاں نے 'اتحاد'، 'دلگداز'، 'مخزن'، 'اردوئے معلیٰ' نومبر ۱۹۰۴ء نیز آج کل ۱۹۴۶ء کے متعلقہ صفحات کا عکس بھیجا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے رسالہ 'برہان' دہلی۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۶۱ء سے اپنے مضمون حسرت کے ان اوراق کا عکس عنایت کیا، جن میں اردوئے معلیٰ میں اقبال پر اعتراضات کے اقتباسات تھے۔ دونوں کا مشکور ہوں۔

عابد سہیل

تین مائیں، ایک بچّہ — ایک مطالعہ

خواجہ احمد عباس کے اس افسانے میں دس کردار ہیں — چار ہمہ وقت موجود، دو تھوڑی دیر کے لئے موجود اور باقی چار یکسر غائب۔ کہانی کو آگے بڑھانے میں یہ سارے ہی کردار حصہ لیتے ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جن کرداروں کے نام ہیں، چہرے مہرے ہیں، جن کی مشغولیات اور پسندیدگیوں کا ذکر ہے، وہ ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور باقی رہ جاتے ہیں وہ جو بے نام ہیں، نہ جن کے گھر بار ہیں، نہ ٹھور ٹھکانے اور جو افسانہ کے آخری حصہ میں تھوڑی دیر کے لئے سامنے آتے ہیں۔

یہ دو بے نام کردار ہیں بھکارن اور چار پانچ برس کا بچہ جسے گوپال نام بھی دیا گیا ہے اور حامد بھی، لیکن افسانہ ختم ہوتے ہوتے وہ اپنی شخصیت پر سے یہ دونوں نام گرد کی طرح جھٹک کر دوبارہ بے نام بن جاتا ہے اور ہمارے ذہن میں اسی "بے نام" حالت میں زندہ رہتا ہے۔

نہ اس بچّے نے کبھی ٹیلی ویژن دیکھا ہے نہ بھکارن نے لیکن وہ جو روزانہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں ان میں سے دو خواتین کو وہ اپنا بچہ نظر آتا ہے۔ ایک کو گمشدہ گوپال اور دوسرے کو گمشدہ حامد۔ یہ دونوں خواتین کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان ان چند سو یا زیادہ سے زیادہ چند ہزار خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو "کامیاب" افراد پر مشتمل ہیں اور اس کامیابی کے مظاہر ہیں بے پناہ دولت، اس کے لوازمات، کلبوں اور شاندار پارٹیوں میں مصروف زندگی سجی سجائی کوٹھیاں۔ ان سب کے حصول میں اقدار پر کیا بیتی، یہ ایک الگ کہانی ہے۔

پورے افسانے میں مصنف نے، ایک پیراگراف سے قطع نظر، نہ ان کرداروں کے بارے میں اپنی کوئی رائے ظاہر کی ہے، نہ ان کو بُرا کہا ہے نہ اچھا۔ واقعات اور حالات پڑھنے والوں پر خود ہی کوئی رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیں تو بات دوسری ہے۔

مسٹر جے سوریہ بمبئی میں پانی کے جہاز بنانے والی ایک کمپنی میں انجینئر ہیں۔ کمپنی کو لاکھوں روپے کا ناجائز فائدہ پہونچانے کے الزام میں سرکاری نوکری سے معطل اور پھر مستعفی ہو جانے کے بعد اب وہ اسی کمپنی میں ایک بڑی تنخواہ پر ملازم ہیں۔ سمندر کے کنارے ایک سجا سجایا مکان اور کار کمپنی کی طرف سے مفت ملی ہیں۔ ان کی بیوی مسز لکشمی جے سوریہ ٹیلی ویژن پر گمشدہ بچوں میں سے ایک بچّے کو اپنا بچّہ گوپال سمجھ بیٹھتی ہیں۔

دلی میں ان کی ہم عمر بیگم شہناز مغل مرزا کو بھی کچھ اسی قسم کا دھوکہ ہوتا ہے اور اس بچہ کو اپنا اغوا کیا ہوا بچّہ حامد سمجھ کر اسے حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتی ہیں۔ ان کے شوہر مرزا مغل بیگ یا نواب مرزا مغل دہلوی اپنا سلسلۂ نسب آخری مغل تاجدار سے جوڑتے ہیں۔ لیکن دراصل ان کے جدِامجد بہادر شاہ ظفر کے حقہ بردار تھے۔ جنھیں انگریزوں نے وفاداری کے صلہ میں گڈّو بیگ سے گل گل بیگ پھر گل بیگ بنا دیا تھا اور انعام و اکرام اور جائدادوں سے اس قدر نوازا تھا کہ اب مرزا مغل بیگ لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور ان کا شمار دلی کے صاحبان ثروت اور شرفا میں ہوتا ہے۔

اس بچّے کے ان دونوں دعویداروں میں سے ایک کی دولت و ثروت کا راز آباو اجداد کی غداری میں پنہاں ہے اور دوسرے کی امارت کا راز خود ان کی بے ایمانی میں۔

ان دونوں کی بیویوں کی بھی اپنی اپنی کہانیاں ہیں۔ مسز جے سوریہ کا جو بچّہ کھو گیا ہے وہ "ذرا جلدی ہو گیا تھا" یعنی شادی کے چھ سات ماہ بعد ہی۔ مسز شہناز مغل مرزا کی یہ دوسری شادی ہے۔ ان کے پہلے شوہر مغل مرزا کے ہوٹل میں نانبائی تھے، جن کی موت تندور میں گر جانے سے

• معرفت نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

ہوئی تھی۔ پولیس میں درج کی جانے والی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے دھکا دے کر ان کو تندور میں گرا دیا تھا۔ ان کے دوسرے شوہر جن سے ان کی شادی دوران عدت ہی ہوگئی تھی پانچ چھ ماہ بعد ہی باپ بن گئے تھے۔ عدالت نے انھیں ننھے میاں کی موت کے سلسلے میں شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا تھا۔

مہالکشمی کے پُل کے اس پار رہنے والوں میں چند مماثلتیں اور بھی ہیں ان چاروں کے پاس اپنے گمشدہ بچوں کے لئے وقت نہ تھا۔ مرزا مغل بیگ کلب میں رمی کھیلتے تھے اور یہ پسند نہ کرتے تھے کہ جب لاکھوں کی بازی لگی ہو ان کی بیگم انھیں ٹیلی فون بھی کریں۔ مسٹر جے سوریہ بھی بے حد مصروف انسان ہیں۔ ان کی مصروفیات میں گورنیس سے "دلچسپی" بھی شامل ہے اور اس دلچسپی کے پیش نظر اس کے خلاف رپورٹ بھی نہیں لکھائی گئی جب وہ ان کے بچہ کو لے کر انگلینڈ فرار ہوگئی اس میں بدنامی کا بھی ڈر تھا۔ مسز شہناز مرزا کے بچہ کا زیادہ تر وقت مس ولیم کے پاس نرسری میں گزرتا تھا اور انھیں جب وقت ملتا تھا نرسری ہو آتی تھیں۔ مسز لکشمی جے سوریہ نیو ایئر ڈانس میں مصروف تھیں جب گورنیس ان کے بچہ کو لے کر بھاگ گئی تھی۔ انھوں نے اپنے بچے کو دودھ بھی نہیں پلایا تھا کیونکہ وہ ان خواتین میں تھیں "جو ہائی سوسائٹی کو Belong کرتی ہیں"۔

ان کے علاوہ ایک اہم مماثلت اور بھی ہے۔ لیکن اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

یہاں تک کہانی شطرنج کی اس بساط کی طرح ہے جس کے دونوں طرف سیاہ ہی سیاہ مہرے ہوں۔ اخلاقی گراوٹ میں کم و بیش یکساں، قانون کی نظر میں ان میں سے ہر ایک مشکوک۔ افسانہ کے لئے یہ کوئی اچھی بساط نہیں۔ "یک رُخے" یک رنگی کردار افسانہ نہیں بناتے، کشمکش نہیں پیدا کرتے، کشش سے محروم ہوتے ہیں، مصنوعی سے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار کی انگلیوں کی جنبش پر رقص کرنے والی کٹھ پتلیوں کی طرح۔ ان میں تصادم کے امکانات تو ہوتے ہیں لیکن ان کے پس پشت اقدار کی آویزش نہیں ہوتی۔ چنانچہ فن کو بصارت تو مل جاتی ہے لیکن وہ بصیرت نہیں جو اقدار کی کشمکش کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اتنے بہت سے یک رُخے کرداروں میں زندگی کی رمق ان کے اندر سے پھوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا۔

صناعی سے کسی قدر قریب اور فن کاری سے خاصی دور، کہانی کے اس مقام تک پہونچتے پہونچتے جہاں ان چاروں کرداروں نے خود کو منکشف کر دیا ہے، بساط پر ایک اور مہرہ نمودار ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی بظاہر سیاہ ہے اور پہلی نظر میں تو ایسا لگتا ہے کہ امکانات کی اس وسیع دنیا کے تعلق سے جس کی پشت پناہی افسانوی ادب کو حاصل ہوتی ہے خواجہ احمد عباس نے آخری بازی بھی ہار دی ہے اور یہ افسانہ سارے امکانات سے محروم ہوگیا ہے۔

لیکن یہ ساری مماثلتیں تصادم اور کشمکش کے بیج لئے ہوئے ہیں۔ جو حالات اور واقعات کی حدت سے پک کر ہی نمو پاتے ہیں۔ نواب مرزا اور ان کی بیگم اور جے سوریہ اور ان کی اہلیہ اسٹیج پر داخل ہوتے وقت کچھ ایسے سیاہ کردار نہیں ہیں۔ خوبصورت فلیٹ، گھروں پر ہر قسم کا بیش قیمت سامان، جاپانی گڑیاں، گل گل محل جو مغل پیلس لگتا ہے، ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز کے سفر، کلبوں کی زندگی، عیش و آرام ـــ ایسی زندگی پر کس کی رال نہ ٹپک جائے گی۔ وہ تو واقعات جیسے جیسے ظاہر ہوتے ہیں، عدالت کے کٹہرے میں سوال و جواب کے دوران راز جیسے جیسے کھلتے ہیں، سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا کسی نامعلوم سمت سے نمودار ہوتا ہے اور ان کے چہروں پر کالک پوت کر غائب ہو جاتا ہے۔

اسی لمحہ افسانہ کے آخری حصہ میں ایک اور کردار داخل ہوتا ہے۔ ایک بھکارن جو نیم پاگل بھی ہے۔ میلی پھٹی ساڑی پہنے ہے۔ اس کے جسم سے میلے کپڑوں اور پسینہ کے بھبکے اُٹھ رہے ہیں۔ اس کردار کو بھی سیاہ قرار دینے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ وہ مروّجہ اقدار کی نہ صرف نفی کرتی ہے بلکہ اپنے اس عمل پر فخر بھی کرتی ہے۔ شرم و حیا تو اسے چھو کر بھی نہیں گئی ورنہ وہ بھری عدالت میں اس سوال کے جواب میں کہ "بچہ تمہارے پاس کیسے آیا؟" بھلا یہ جواب دیتی۔ "بچّہ جیسے آتا ہے جو ر ویسے ہی آیا۔ میرے پیٹ سے نکلا": مسز سوریہ اور بیگم شہناز مغل مرزا کی نظریں تو یہ جواب سن کر زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئی ہوں گی۔ اسے اخلاقی اقدار کا ذرا بھی پاس نہیں۔ وہ لنگے میں دھت خوبصورت سے صاحب سے یہ کہنے میں شرم نہیں محسوس کرتی کہ اسے ایک بچّہ چاہیئے۔ بعد میں وہ اس کو تلاش کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتی، یہ بھی جانتی ہے کہ ملاقات ہو جائے تو وہ اسے پہچانے گا بھی نہیں لیکن پھر بھی اس کی آبھاری ہے کہ اس نے اسے ادھوری سے پوری کر دیا۔

اس کے کردار کے سیاہ ہونے میں بھی کیا کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے؟

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جہاں باقی کرداروں کے چہروں کی سیاہی گہری ہوتی جاتی ہے اس کردار کے چہرے پر سے سیاہی کا ایک ایک داغ دھیرے دھیرے غائب ہوتا جاتا ہے اور وہ ایک ماں کی جملہ جبلتوں کی تکمیل کرتی ہوئی اپنے جسم کے پسینہ کی بو کو فرانسیسی سینٹ اور عطر حنا سے زیادہ دل پسند بنا دیتی ہے، صرف بچّہ کے لئے نہیں کہانی پڑھنے والوں کے لئے بھی۔

جنسی بھوک اسے چھو کر نہیں گئی ہے، حصولِ زر کے لئے نسوانیت کا استعمال اس نے جانا ہی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ پاک باز عورت کا تصور، اس افسانے کے جو کھٹے میں، مرزا اور سوریہ خاندان کے افراد کے تقابل میں، ممکن ہی نہیں۔

تھوڑی دیر قبل میں ایک اور مماثلت کا ذکر کرتے کرتے رُک گیا تھا۔ آیئے اب اس پر بھی غور کریں۔

مرزا اور سوریہ خاندان کے دونوں بچے جنھیں گوپال اور حامد کا نام دیا گیا ہے عرفِ عام میں ناجائز اولادیں ہیں۔ یہی حال اس بچّہ کا بھی ہے جو بھکارن کی گود میں پناہ لے کر اسے 'ماں' پکارتا ہے۔ لیکن کیا یہ تینوں بچے ایک ہی سطح کی ناجائز اولادیں ہیں؟ اول الذکر دونوں بچوں کے پس پشت جنسی بے راہ روی اور دولت کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے لیکن بھکارن کے بچے کے وجود میں آنے میں جذبۂ شہوانیت کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ اس نے تو روپیہ پیسہ کی پیش کش تک کو مسترد کر دیا تھا۔

خواجہ احمد عباس نے اس افسانہ میں مماثلتوں سے آویزش اور تضاد پیدا کئے ہیں۔ بھکارن ہو یا اس کا بچّہ، نواب مرزا ہوں یا سیٹھ سوریہ یا ان کی بیویاں، گورنسیں ہوں یا دولت کی ریل پیل یا واقعات کا اتار چڑھاؤ، ہر جگہ مماثلتوں کی کارفرمائی دیکھ کر بطور افسانہ نگار میں حیران تھا کہ ان سے تضاد کہاں اور کیسے اُبھرے گا، آویزش کیسے جنم لے گی۔ لیکن افسانہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے مماثلتوں کے تضادات سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ یہ خواجہ احمد عباس کی فن کاری کا کمال ہے۔

"تین مائیں، ایک بچّہ" کوئی شاہکار افسانہ نہیں لیکن بالکل معمولی بھی نہیں، خاص طور سے ان لوگوں کے لئے جن کے نزدیک فکر کے بغیر ادبی اظہار ممکن نہیں، جو زبان کو قدرِ اول یا قدرِ آخر کے بجائے اقدار اور خیالات کی ترسیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اور جن کے نزدیک مواد کی حمایت کے بغیر ہیئت کی حیثیت بس افلاطون کے اس عینی تصور کی ہوتی ہے جو فکر کی آنچ پا کر ہو تو بہت کچھ سکتا ہے لیکن اس کے بغیر ہے کچھ بھی نہیں، فارم کے سوا۔

اور خواجہ احمد عباس خود ہی کہتے ہیں۔

"میں اپنی کہانی کے ذریعہ بہتر انسان کی "تخلیق" کرنا چاہتا ہوں۔

"تخلیق تو میرے بس کی بات نہیں۔

"آپ لاکھ مجھ پر "پرچارک" ہونے کا الزام لگایئے میں باز نہیں آؤں گا۔ اگر آپ نے یہ کتاب خرید ہی لی ہے یا کسی لائبریری سے لاکر پڑھ رہے ہیں یا کسی دوست سے اُدھار لی ہے تو میری عرض ہے کہ اس کی کہانیوں کو پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ شاید آپ کے لئے ہی کوئی کہانی لکھی گئی ہو۔"

خواجہ احمد عباس نے ساری ہی کہانیاں پڑھنے والوں کے لئے لکھیں، دوسروں کے لئے، صرف اپنے لئے کوئی کہانی نہیں لکھی۔ یہی سبب ہے کہ قاری ان کی کہانیوں میں خوب خوب شریک ہوتا ہے۔

اس افسانہ میں فنی سقم بھی ہیں اور کرافٹ کی کمی بھی۔ ابتدا میں ایک طویل پیراگراف اور آخر کی چار سطریں اگر نہ ہوتیں تو افسانہ کی اثر انگیزی میں اضافہ ہو جاتا لیکن افسانوی ادب میں ان کے اکتسابات کا جائزہ لینے کے بعد مجموعی طور سے یہ ضرور کہا جائے گا کہ وہ لوحِ افسانہ پر حرفِ مکرر نہیں تھے۔ ●●

بقیہ: ترانۂ ہندی کی کہانی

معنوی اعتبار سے آزاد ہے۔ تخلص والا مقطع بھی ہے اور یہ تو بقیہ اشعار سے الگ ہی بات کرتا ہے۔ شرر نے دل گداز بابت اگست ۱۹۰۴ء میں اُسے نظم کہا جب کہ حسرت موہانی نے اُردوئے معلّٰی نومبر ۱۹۰۴ء میں غزل۔ خود اقبال نے اُسے بانگِ درا میں نظموں میں جگہ دی ہے، غزلوں میں نہیں۔ اگر یہ نظم ہے تو اسے قطعہ کہنا چاہیے۔ قطعے میں مطلع نہیں ہوتا، لایا جائے تو مستحسن نہیں، لیکن اقبال نے مطلع دار قطعے لکھنے کی طرح ڈالی۔ چونکہ اس کا موضوع غزل کے روایتی مضامین سے مختلف ہے، اس لیے اسے مسلسل غزل کہنے کے بجائے غزل نما قطعہ کہنا بہتر ہوگا۔

عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال کے دیباچے پر جون ۱۹۲۴ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اس میں نظم کا عنوان 'ہمارا دیس' ہی ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کہاں سے نقل کی ہے۔ اس میں مخزن کے متن سے صرف دو اختلاف ہیں۔ پہلے شعر میں "یہ گلستاں" کی جگہ زمانہ اور اتحاد کی طرح "وہ گلستاں" ہے۔ دوسرا بڑا اختلاف دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں ہے، جہاں لکھا ہے "سمجھو وہیں ہیں ہم بھی" جب کہ ماقبل اور مابعد کے جملہ متون میں ہے "سمجھو وہیں ہمیں بھی"۔ بانگِ درا میں نظم کا عنوان بدل کر "ترانۂ ہندی" کر دیا گیا ہے۔ اس تبدیلی کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اب اقبال دیس اور وطنیت کے قائل نہیں رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے بعد میں ترانۂ ملّی لکھ دیا تھا۔ اس کے وزن پر پہلے ترانے کا نام "ترانۂ ہندی" کر دیا۔ مخزن کے متن میں صرف ایک تبدیلی کی گئی۔ تمام متون میں پانچویں شعر میں ہے "وہ دن ہے یاد تجھ کو" بانگِ درا میں 'ہے' کو بدل کر 'ہیں' کر دیا۔

اخبار 'پارس' لاہور میں ہر ہفتے 'اقبال کی خامیاں' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں کتابی شکل میں "اقبال کی خامیاں" کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ مصنف کا نام تھا: جرّاح، جس کے پردے میں جوش ملسیانی تھے ۱۹۷۷ء میں عرش ملسیانی نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن مصنف جوش ملسیانی کے نام سے چھاپ دیا۔ اس کے ص ۲۳ پر جوش نے ترانے کے چوتھے شعر میں 'ندیاں' پر اعتراض کیا ہے کہ اس کی دال مشدّد چاہیے۔ اعتراض کرنے والے گرفت کیا کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ "ترانۂ ہندی" اقبال کی سب سے مقبول نظم ہے، کم از کم ہندوستان میں۔

کرشن بہاری نورؔ

لفظوں کے یہ نگینے تو نکلے کمال کے
غزلوں نے خود پہن لیے زیور خیال کے

اب کھوٹے اور کھرے میں زیادہ نہیں ہے فرق
سودا جو کرنا، کرنا بہت دیکھ بھال کے

موسم میں دو ہی عشق کے یہ دونوں اُن کے نام
مطلب نہ ہم سے پوچھیے ہجر و وصال کے

ایسا نہ ہو گناہ کی دلدل میں جا پھنسوں
اے میری آرزو مجھے لے چل سنبھال کے

کس بھاشا میں پکاریں اُسے اور کس طرح
ہیں جتنے دھرم اتنے جواب اک سوال کے

اب کیلنڈر 'ارتھ ہین' سی پستک ہے زندگی
جیون سے لے گیا وہ کوئی دن نکال کے

یوں زندگی سے کٹتا رہا جُڑتا بھی رہا
بچّہ کھلائے جیسے کوئی ماں اُچھال کے

● ۹۷۔ عزت نگر، لکھنؤ

فاروق شفقؔ

کسی اور کی بات میں کیا کہوں یہاں سر سے آندھی گزر گئی
بڑی تیز شب کو ہوا چلی مری شاخ شاخ بکھر گئی

نہ کہیں دریچہ کھلا کوئی نہ وہ ملگجے کہیں سائے ہیں
جو اُداس یادوں کی شام تھی کہیں جنگلوں میں ٹھہر گئی

کہیں ماہ و سال کی گرد میں میں چُھپا ہوا تھا زمانے سے
پڑیں ننھی ننھی جو بوندیاں مری شکل جیسے نکھر گئی

ہوئیں بے چراغ حویلیاں اسی بے خیالی کی دھند میں
نہ خیال تم نے اِدھر کیا نہ اُدھر ہماری نظر گئی

ہے سکوں سا دونوں کناروں پر کہیں خار و خس کا نشاں نہیں
جو چڑھی ہوئی تھی ندی شفق سُنا ہے وہ رات اُتر گئی

● G-185، دھان کھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

نظیر باقری

دھوپ نے کتنے پیڑ جلائے چھوڑو اب دُہرائے کون؟
دیکھنا یہ ہے وقت پڑا تو دھوپ کو دے گا سائے کون؟

کیسی اُمیدیں، کیسی چاہت، کیسی حسرت، کیسا پیار
یہ سب گرتی دیواریں ہیں ان سے سر ٹکرائے کون؟

جس کو کسی آتے جاتے کی آہٹ کا احساس نہ ہو
ایسے گھر کے دروازے پر دستک دینے جائے کون؟

اُن لوگوں سے شکوہ کیسا فرصت جن کے پاس نہیں
ہم تو خالی تھے مل آئے ہم سے ملنے آئے کون؟

جو دنیا پر خاک اُڑا کر خود کو صاف بتاتے ہیں
ڈھول تھے اُن کے چہروں کو آئینے دکھلائے کون؟

سب کے ہاتھوں میں پتھر ہیں پھول کسی کے پاس نہیں
دنیا والو! یہ مت پوچھو اپنے کون پرائے کون؟

ہاتھ ٹیکے کر چلنے والے ہوتے ہیں مجبور نظیرؔ
جن کے دونوں پیر سلامت اُن کو گھر پہنچائے کون؟

● ۱۶۴۔ وال کیشور روڈ، بمبئی ۶

جلیل ساز

رقص، نغمہ، رنگ، خوشبو، روشنی ہم کو ملی
کیسی کیسی شے بنامِ زندگی ہم کو ملی

دل کے داغوں کا چمکنا بھی مقدر کی ہے بات
اپنے گھر بیٹھے بٹھائے چاندنی ہم کو ملی

وہ بھی اپنے پاؤں کے چھالوں کا پانی پی گئی
رہ گزر جو بھی ملی، کانٹوں بھری ہم کو ملی

وحشتِ دل نے کہیں رکنے کی مہلت ہی نہ دی
چھاؤں بھی ہم کو ملی اور دھوپ بھی ہم کو ملی

یہ جہانِ رنج و غم یہ زندگی یہ روز و شب
ایک لغزش کی سزا کتنی کڑی ہم کو ملی

ہر طرف طاری ہے دل پر ایک انجانا سا خوف
آج کی دنیا ڈری سہمی ہوئی ہم کو ملی

لوگ اذانوں کے اثر کو بھی نہیں کرتے قبول
کیا ہوا اے سازؔ اگر خوش نغمگی ہم کو ملی

• مومن پورہ، ناگ پور ۴۴۰۰۱۸

مدحت الاختر

تھا میں ہی تیری راہ کا جلتا ہوا دیا
تو نے ہوا کے ڈر سے مجھی کو بجھا دیا

ہم جانتے نہیں تھے کہ کیا شے ہے انتقام
یاروں نے یہ کمال ہمیں بھی سکھا دیا

دنیا بہت بری ہے مگر بے ہنر نہیں
ظالم نے جو فریب دیا خوش نما دیا

اب میں ہوں اور ہر کس و ناکس کی دوستی
آخر تری جدائی نے یہ دن دکھا دیا

• نیا گورلیم، پوسٹ کامٹی ۴۴۱۰۰۲ منگلی پور

ظفر الاسلام ظفر

شانوں پہ پڑی زلف تھی مہکی مہکی
تھی آتشِ جذبات بھی لہکی لہکی
کیا کہیے کہ کیا عالمِ مدہوشی تھا
وہ بات بھی کرتا تھا تو بہکی بہکی

ہر رشتے کی ہر ناطے کی یاد آتی ہے
بچپن کی جوانی کی بھی یاد آتی ہے
وہ تیری صباحت، وہ تری رعنائی
اے صبحِ بنارس تری یاد آتی ہے

تہذیب کا اک نقش جلی ہے کاشی
سانچے میں تمدن کے ڈھلی ہے کاشی
یہ رنگ یہ روپ اس کا فقط یوں ہی نہیں
آغوش میں گنگا کے پلی ہے کاشی

ہے سلسلۂ دار و رسن دور تلک
ہے خونِ شہیدانِ وطن دور تلک
چوٹی سے ہمالہ کی ذرا دیکھو تو
گل رنگ ہے بھارت کا چمن دور تلک

• گل مہر اپارٹمنٹس، ونجاری پٹی ناکہ، بمبئی آگرہ روڈ، بھیونڈی (ضلع تھانہ) ۴۲۱۳۰۲

غلام ربانی تاباں

مَن کہ...

غلام ربّانی تاباں

نام: غلام ربّانی تاباں
والد کا نام: جانِ عالم خاں
مقامِ ولادت: پتورا، تحصیل قائم گنج، ضلع فرخ آباد (اتر پردیش)
تاریخِ ولادت: ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء
تعلیم: کرسچین ہائی اسکول فرخ آباد سے میٹرک، سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ اے اور آگرہ کالج آگرہ سے ایل۔ ایل۔ بی۔
۱۹۴۰ء سے فتح گڑھ میں وکالت شروع کی۔ اسی زمانے میں عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۹ء میں چھ مہینے کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد سیاسی اختلافات کی بنا پر گھر چھوڑ دیا اور وکالت کا پیشہ ترک کر دیا۔ کچھ دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد دہلی پہنچا اور مکتبہ جامعہ میں ملازمت کر لی۔ جامعہ کا ماحول ایسا راس آیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ مکتبہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آج کل ذاکر نگر میں رہتا ہوں۔

تصنیفات:

۱۔ سازِ لرزاں (نظموں کا انتخاب) ۱۹۵۰ء
۲۔ حدیثِ دل (غزلوں کا انتخاب) ۱۹۶۰ء
۳۔ ذوقِ سفر (غزلوں اور نظموں کا انتخاب) ۱۹۷۰ء
۴۔ نوائے آوارہ (غزلوں کا انتخاب) ۱۹۷۶ء
۵۔ ہوا کے دوش پر (ریڈیائی تقریروں اور خاکوں کا مجموعہ) ۱۹۷۴ء
۶۔ Poetics to Politics (انگریزی کے مضامین کا انتخاب) زیرِ طبع

اِس کے علاوہ تقریباً ایک درجن اہم کتابوں کا ترجمہ کر چکا ہوں۔

۱۔ جدوجہدِ آزادی
۲۔ جدوجہدِ آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول۔ از ڈاکٹر رنجن جھا
۳۔ ہندوستان میں معاشی قوم پرستی کی ابتدا اور ارتقا۔ از ڈاکٹر بپن چندر
۴۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد اوّل از آر۔ سی۔ دت
۵۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد دو از آر۔ سی۔ دت
۶۔ گزیٹیر آف انڈیا جلد دوم
۷۔ مسلم نظم و نسق کے کچھ پہلو از ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی
۸۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ (جلد دوم) از ڈاکٹر تارا چند
۹۔ افغانستان زوال سے عروج تک از ایس بکرجی
۱۰۔ لینن اور مارکسواد

اعزازات:

۱۔ ۱۹۷۱ء میں صدرِ جمہوریہ ہند نے پدم شری کے ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا، جس کے تعلق سے اُس زمانے کی حکومت نے منفی رویّہ اختیار کیا۔ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر پدم شری کا ایوارڈ واپس کر دیا۔
۲۔ ۱۹۷۲ء میں ذوقِ سفر پر یو پی اردو اکیڈمی کا پہلا انعام۔
۳۔ ۱۹۷۳ء میں ذوقِ سفر پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ۔
۴۔ ۱۹۷۶ء میں نوائے آوارہ پر یو پی اردو اکیڈمی کا پہلا انعام۔
۵۔ ۱۹۷۹ء میں نوائے آوارہ پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔
۶۔ ۱۹۸۱ء میں مجموعی خدمات پر مودی غالب ایوارڈ۔
۷۔ ۱۹۸۲ء میں مجموعی خدمات پر یو پی اردو اکیڈمی کا اسپیشل ایوارڈ۔
۸۔ ۱۹۸۶ء میں مجموعی خدمات پر دہلی اردو اکیڈمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ۔

عہدے:

۱۔ نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز کے پریسیڈیم کا چیرمین۔
۲۔ آل انڈیا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (اردو) کے پریسیڈیم کا ممبر۔
۳۔ انڈین نیشنل ایسوسی ایشن آف افرو ایشین رائٹرز کے پریسیڈیم کا ممبر۔
۴۔ تین سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کا ممبر رہا۔

ستیش بترا

جُولے لدّاخ (۵) کرگل سے لیہہ تک

ہمیں کرگل آئے دس روز ہو چکے تھے ۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں ۱۴ر جون کو لیہہ پہنچ جانا چاہیے تھا کیوں کہ ۱۸ر جون کے لیے ہماری سیٹیں بذریعہ ہوائی جہاز چنڈی گڑھ کے لیے بک تھیں ۔ پریم بھائی صاحب اور ہم چنڈی گڑھ میں دو ایک روز کے لیے اپنے بزرگ رشتہ داروں سے ملنے کے لیے رُکنا چاہتے تھے ۔ اس کے بعد انھیں شملہ جانا تھا جب کہ ہمیں واپس فریدآباد پہنچنا تھا ۔ چنڈی گڑھ تک ہمارا سفر مشترکہ تھا اور ہم حالیہ سفر کی ہر گھڑی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے ۔

کرگل سے لیہہ جانے کے لیے کرنل بہل نے ہماری سیٹیں آرمی بس میں ریزرو کرا دی تھیں ۔ سری نگر سے چلی ہوئی یہ بس رات کرگل میں رُکنے کے بعد اگلے دن فوجی ریسٹ ہاؤس سے صبح سات بجے ہی روانہ ہو جاتی ہے ۔

صبح جونکہ کچھ معمولی خرابی ہونے کی وجہ سے دیر سے پہنچا اور جب اس میں سامان رکھا گیا تو ہر بار کی طرح ہماری روانگی کے وقت کبھی کرشنا بھابی کبھی تریپت کو کوئی نہ کوئی چیز یاد آجاتی ۔ کبھی کسی کا چشمہ ہوتا تو کبھی کسی کا کیمرہ یا کتاب ۔ سوئے ہوئے بچوں پہ ایک پیار بھری نگاہ ڈال کر اشیما اور سنیل کے ہمراہ جب ہم بھاگ دوڑ کرتے پونے سات بجے کے کچھ بعد ریسٹ ہاؤس پہنچے تو کرنل بہل اور ان کے اسٹاف کے کچھ ممبران کو دیگر لوگوں کے ساتھ بس میں بیٹھا ہوا پایا ۔ بس میں جانے والوں کی ایک خاصی تعداد سیٹیں نہ ملنے کی وجہ سے بس کے باہر کھڑی تھی اور غالباً ہمارا انتظار کر رہی تھی ۔

"تو آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں کرنل بہل !" پریم بھائی صاحب نے بس میں داخل ہوتے ہوئے ازراہِ مذاق سوال کیا ۔

"آپ نے ہمیں پہلے بتایا ہوتا ۔"

"یہ تو آپ کو کرنل صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو وہ آپ کے لیے بس کی سیٹیں سنبھالے بیٹھے ہیں ۔" سنیل نے کرنل بہل کو فوجی سلام کے بعد مسکراتے ہوئے کہا ۔

"آج تو وہی مذاق ہو جاتا چھوڑنے والوں کا !" کرنل بہل نے ہنستے ہوئے کہا ۔ "وہ آپ نے سنا ہی ہوگا ۔ کچھ دوست اپنے احباب کو گاڑی پر رخصت کرنے کے لیے گئے ۔ اتفاق سے جب وہ پہنچے تو گاڑی پلیٹ فارم پر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی ۔ بھاگم بھاگ بدحواسی کے عالم میں رخصت کرنے والوں نے تو لپک کر گاڑی پکڑ لی لیکن سفر پر جانے والے احباب پلیٹ فارم پر ہی رہ گئے ۔ اب جانے کا پروگرام تو آپ لوگوں کا تھا ۔ لیکن کچھ عجب نہ ہوتا اگر آپ کی بجائے ہم ہی لیہہ پہنچ گئے ہوتے !"

بشمول دوسرے مسافر بس میں سوار فوجی افسران اور ہم ایک شائستہ انداز میں قہقہہ لگا کر ہنس دیے ۔ کرنل بہل اور اُن کے ساتھی ہم لوگوں کے لیے سیٹیں خالی کرتے ہوئے بس سے اُتر گئے ۔

"ہم سب آپ کی ، مسز بہل کی اور آپ کے سارے یونٹ کی مہمان نوازی کی جتنی بھی تعریف کریں ، کم ہوگی !" میں نے اور پریم بھائی صاحب نے کرنل بہل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ۔

"یونٹ کے لوگوں کے لیے ہم سب کا یہ ایک معمولی سا تحفہ ہے !" ہم نے یونٹ ویلفیئر فنڈ کے لیے ایک چیک پیش کرتے ہوئے کہا ۔ "اسے قبول کیجیے ۔" یہ فنڈ عموماً بیاہ شادی ، موت یا کسی اور ناگہانی مصیبت کے وقت جوانوں کی مدد کرنے میں کام آتا ہے ۔

کرنل بہل نے چیک قبول کیا ۔ "میں یونٹ کے تمام افسران اور جوانوں کی طرف سے آپ کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ لیکن آپ کو یہ زحمت نہ اُٹھانی چاہیے تھی !"

"کرنل صاحب ، یہ تو ہمارا فرض تھا !" اور ہم نے کرنل صاحب اور دیگر افسران سے مصافحہ کرتے ہوئے رخصت چاہی ۔

آئندہ ملاقاتوں کا پروگرام بناتے ہوئے اور 'بائی بائی'، 'ٹاٹا' کے شور میں بس دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ بس ملٹری کیمپ کی سڑکوں سے ہوتی ہوئی سری نگر لیہہ شاہراہ پر پہنچ گئی۔ سڑک کے کنارے ہر طرح کے گودام تھے۔ کہیں پٹرول کہیں کولتار، کہیں سڑکیں بنانے کے لئے سامان، کہیں مٹی کا تیل اور کہیں ڈیزل! اب بھی کچھ ٹرک شہد کی مکھیوں کی طرح اس چھتوں کو بھرنے کی کوشش میں اپنا سامان اُتار رہے تھے۔ کیوں کہ سردیوں کا موسم آتے ہی لداخ کو باقی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر نہ صرف زندہ رہنا تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر جنگ کے لیے تیاری بھی لازمی تھی۔ اور اس کے لیے 'کل' سے زیادہ 'آج' اہم تھا۔ کیوں کہ آنے والے کل پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہم اب کرگل کی سب سے بلند چوٹی کے پاس سے گزر رہے تھے، جسے دور درشن کے ٹرانسمیٹر کو پرچم کی طرح لہرانے کا فخر حاصل تھا۔ اس پہاڑی کے موڑ کے ساتھ ہی ہمارے سامنے پھیلا ہوا گولف کورس' ہوائی پٹی' کرگل شہر' اور ملٹری کیمپ' سب کے سب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے پہاڑیوں اور وادیوں کے کئی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے بسیں اور ٹرک جا رہے تھے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ شاہراہ ایک دفعہ پھر جاگ اُٹھی تھی۔ بس کی مسلسل حرکت اور شور اب مسافروں کو لوریاں دینے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب ہماری آنکھ کھُلی تو ہم کرگل سے ۲۵ کلومیٹر دور مُلبخ پہنچ گئے تھے۔ بس ٹھیک اُس مقام پر رُکی تھی جہاں سڑک کے عین سامنے ایک بہت بڑی چٹان پر ایک دیوقامت بودھی مجسمہ کھُدا ہوا تھا۔ میتری بدھا اوتار کا۔ اسے دیکھتے ہی بیشتر نے اپنے اپنے کیمرے سنبھال لیے اور مجسمہ کو دیکھنے کے لیے ہم سب بس سے اُتر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مجسمہ پہلی صدی عیسوی کے زمانے کا ہے، جب بُدھ مت لداخ میں داخل ہوا تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس مجسمے میں تبت کی تہذیب سے زیادہ بھارتی تہذیب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ میتری بدھ جو مہاتما بدھ کے اوتار مانے جاتے ہیں' بالکل وشنو دیوتا جیسے انداز میں کھڑے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہندو دھرم کی مضبوط روایتوں نے تبت سے آئے ہوئے بدھ دھرم کو اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اس کا مزید ثبوت ہمیں بعد میں بودھی تہذیب میں جگہ جگہ پر ملا۔ یہاں تک کہ لداخ کے لاما لوگ وشنوی لاما ہی کہلانے جاتے ہیں۔

ملبخ پہنچ کر اچانک احساس ہوا کہ ہم مسلم لداخ کو چھوڑ کر بودھی لداخ میں داخل ہو گئے تھے۔ تصدیق کے طور پر اب بودھیوں کا گورو منتر' اوم منی پدمی ہوم (کنول کے پھول میں نواس کرتا ہیرا) جگہ جگہ لکھا دکھائی دینے لگا۔ اس کے علاوہ ہر مقدس جگہ پر اونچے اونچے سفید جھنڈے لہراتے نظر آ رہے تھے۔ یہ جھنڈے کچھ تعظیم کی خاطر اور کچھ بطور شُکرانہ نصب کیے جاتے تھے۔

ہم ابھی چائے پینے کے بعد سستا ہی رہے تھے کہ بس نے ہارن بجا کر روانگی کا اعلان کر دیا۔ یہاں سے درّہ نمی کلا (اونچائی ۱۲,۲۰۰ فٹ) کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے — درّہ پار کرنے کے بعد تھوڑی سی اُترائی کے بعد بودھ کھربو نامی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں سے پھر درّہ فوتولا کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ فوتولا اس شاہراہ میں سب سے اونچا درّہ ہے جو تقریباً ۱۶ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ اس درّہ پر پہنچتے ہی سنسناتی تیز ہواؤں نے ہمارا سواگت کیا۔ درّہ کے آس پاس کے کوہستانوں کا منظر رُوح لرزانے کے لیے کافی تھا۔ اونچی اونچی نوکیلی چوٹیاں، برف، سبزے سے بے نیاز، ہو کے عالم میں بھیانک نظارہ پیش کرتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس نظارے کا بھی اپنا انفرادی حُسن ہے۔ بدلتی روشنی میں یہ چوٹیاں اور پہاڑ کئی رنگ جھلکاتے ہیں۔ زردی مائل، خاکی، بادامی، سُرمئی، اودے، گیروے اور نہ جانے کون کون سے — روشنی تو صرف سات رنگوں کا مرکب ہے۔ لیکن یہاں کتنے ہی نئے نئے ملے جُلے رنگ دیکھنے کو مل رہے تھے۔ خدایا! یہ منظر تھا کہ چھلاوا! انسان ایک بار تو خود اپنے حواس پر شک کرنے لگتا ہے!

درّے کی چڑھائی اُترتے ہوئے اس سحر زدہ ماحول میں ایک انوکھی بس نظر آئی۔ یہ بس عام بسوں کے مقابلے میں کافی بڑی ہے۔ اس کے چاروں طرف شفاف پلاسٹک کا خول ہے، جس کے آر پار بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی چھت پر بڑے بڑے روشن دان ہیں۔ جو کھولے اور بند کیے جا سکتے ہیں۔ اس دو منزلہ بس کی . . . . لمبائی میں سیٹیں اس طرح سے نصب ہیں کہ ہر سیٹ کے لوگ اپنی طرف کا بے روک ٹوک مکمل نظارہ کر سکتے ہیں۔ سیٹیں بیٹھنے اور سونے دونوں کے کام آ سکتی ہیں اور اس کے نیچے یا پھر بس کی تہوں میں سامان رکھنے کا پورا انتظام ہے۔ بس میں بیٹھے نیم برہنہ عورت مرد ایک دوسرے سے چپکے جوڑے نہ صرف باہر کے نظاروں کا بھرپور لُطف لے رہے ہیں بلکہ باہر والوں کو دعوتِ نظارہ بھی دے رہے ہیں۔ بس کے اطراف پر نام لکھا ہے: The Exodus، بہ معنی ہجرت!

یہ بس لندن سے نیپال جا رہی ہے۔ اس میں مغربی ممالک کے بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ جو اُن کے لباس، وضع قطع سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ہیں سب مغربی کلچر کی پیداوار۔ مغرب مشرق کی طرف 'ہجرت' کرنا چاہ رہا ہے۔ من کی شانتی کی کھوج میں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کھلے ننگے کلچر کو بھی نہیں چھوڑ پاتا۔ ان میں سے اکثر بیئر پی رہے ہیں۔ کچھ نشے کی پینک میں ہیں۔ کچھ اپنے نسوانی پارٹنرز سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہیں۔

شاید ایسے کلچر کی پیداوار ہے ہپّی ازم، جس کا گھناؤنا روپ گوا، نیپال، کشمیر کے بعض حصّوں کو اپنی زد میں لے چکا ہے۔ اور جس کے جبڑے اب لدّاخ جیسے پُرسکون اور مقدّس ماحول کو ہڑپ کرنے کے لیے کھل رہے ہیں۔ کاش یہ ہجرت کا درد اور راس کا صحیح مفہوم جان سکتے۔ ہجرت نے تو زندگیاں بدل ڈالی ہیں۔ زندگی کو نئے عنوان دیے ہیں۔ ہمت، استقلال اور لگن کا نیا سبق پڑھایا ہے

کچھ منٹوں کے بعد یہ انوکھی بس شاہراہ سے اُتر کر لامایارو کی بودھی خانقاہ جانے والے راستے پر مُڑ جاتی ہے۔ بدھ بھکشو ان زندگی کا صحیح مفہوم جاننے میں ان کی مدد کریں۔ لدّاخ کی تہذیب و تمدّن کو بُرے اثرات سے بچائیں ——— یہ دعا میرے لبوں پر بے اختیار آجاتی ہے

شاہراہ سے ہزار فٹ نیچے ہم لامایارو کا گاؤں اور لدّاخ کی سب سے پرانی خانقاہ دیکھ سکتے ہیں، جو دسویں صدی کی یادگار ہے کہا جاتا ہے کہ اس خانقاہ میں قدیم تبّت کا سامان بیش قیمتی علم اور تھنگڑے، قالین اور دیواروں پر منقش عظیم تصویریں ہیں۔ یہاں بودھی آرکیٹیکچر کے دیوقامت مجسّمے کے سامنے آج بھی سینکڑوں راہب عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں۔

ہماری بھی یہی خواہش تھی کہ اس خانقاہ کی زیارت کریں لیکن تنگیٔ وقت حائل تھی۔ ویسے بھی سنیل کا کہنا تھا کہ لیہہ کی دو چار بڑی بڑی خانقاہیں دیکھنے کے بعد ہم عام طور پر بودھی خانقاہوں کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوجائیں گے۔ اس لیے ہر خانقاہ کو دیکھنا اتنا ضروری نہ تھا۔ پھر بھی لامایارو کی خانقاہ کی بودھ حکمت میں بہت اہمیت ہے۔ اسے وہ بھی تسلیم کرتا تھا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ لدّاخ کے کس حصّے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا تو میں بلاتامّل کہوں گا کہ وہ لامایارو سے خالصی تک کے کوہستانوں کا سلسلہ تھا۔ جو دنیا بھر کے پہاڑوں میں یکتا اور بے مثال تھا۔ لامایارو سے خالصی بلکہ اس سے بھی آگے لگاتار ڈھلان ہے۔ حدِّ نظر تک کُھردُرے، ویران، اُجاڑ پہاڑ، قوی ہیکل جسیم ڈراونے! ان بھاری بھرکم پہاڑوں کے سینے پر ہماری بس کی حیثیت کسی دیا سلائی کی ڈبیا سے بھی کم کی ہوگی۔ یکایک ہمارے دائیں طرف نشیب میں پیالے کی شکل میں تراشی سنہری ریت اور ریتیلیں چمکتی نظر آئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے توپ کے گولوں نے جگہ جگہ ریت میں شگاف کیے ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے چاند کی تصویروں میں نظر آتے ہیں! کہتے ہیں اگر زمین پر چاند کی دھرتی کا صحیح نظارہ کرنا مقصود ہو تو اس کرۂ ارض پر اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ سُنا ہے کہ اس جگہ کی ریت کے نمونے چاند کی ریت سے بے حد مشابہت رکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے لدّاخ کی سرزمین کو کبھی کبھی Moonland بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ چاند سے مشابہت رکھنے والا یہ تھوڑا سا ٹکڑا ہی ہے۔

چلتی بس میں بیٹھے بیٹھے ہم دیر تک اس نظارے سے لُطف اندوز ہوتے رہے بلکہ گمان ہوا کہ ہم چاند پر ہی پہنچ گئے ہیں۔ اس نشیب کا رقبہ چند مربع کلومیٹر ہی ہوسکتا ہے جب کہ چاند کی کل زمین اسی طرح کی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد یہ نظارہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، لیکن ذہن سے چپک گیا۔ کچھ دیر بعد جب ہم نے دائیں کھڑکی کا رُخ کیا تو قدرت اپنے دوسرے خزانے کھولے بیٹھی تھی۔ خوب صورت لہریے دار رنگین پہاڑ جو ہم میں پہلے کسی نے بھی نہ دیکھے تھے۔ ایسے پہاڑ جن کی چوٹی اگر ایک رنگ کی تھی تو پہاڑ کے بدن پر دو تین طرح کے واضح شیڈ دیکھے جاسکتے تھے۔

کرشنا بھابی ان نظاروں کو دیکھتے ہوئے بولیں: "یہ کمبخت ٹی شرٹیں بنانے والے یہیں سے ڈیزائن چُراتے ہوں گے!"

"دیکھا تم نے ستیش۔ نسوانی ذہن کو کپڑوں سے متعلق ہی استعارہ سوجھتا ہے۔" پریم بھائی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اور ہماری نظروں سے کئی ایسے پہاڑ پھسل گئے۔ کسی کے آرپار کوئی سبز سی لکیر تھی۔ کسی پہاڑ پر دو تین رنگوں میں افقی دھاریاں تھیں۔ کچھ موٹی کچھ پتلی! ایک پہاڑی کو تو چیت کبرے دھبّوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ دیکھا! یہ جنگل یونی فارم!" پریم بھائی صاحب کے منہ سے اچانک نکلا "اس میں واقعی ہلکے اور گہرے سبز رنگ کے چکتے سے تھے جو فوجی جنگل مہموں میں استعمال کرتے ہیں تاکہ دشمن کو ان کی موجودگی کی خبر تک نہ ہوسکے۔ اور وہ جنگل کے رنگوں کا فائدہ اُٹھاکر پیش قدمی کرتے رہیں۔

"دیکھا ستیش بھائی صاحب! یہ فوجی دماغ!" یہ کرشنا بھابی کا پریم بھائی صاحب پر جوابی حملہ تھا۔ تربت اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہماری بس اب تیزی سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اچانک پریم بھائی صاحب چلّا اُٹھے۔

"وہ دیکھو کتنے ہیرپن موڑ ہیں۔" اور ہمارے سامنے موڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اتنے اکٹھے ہیرپن موڑ ہم میں سے کسی نے نہ دیکھے تھے۔ بھائی صاحب کے مونہہ سے یہ اصطلاح فطری گفتگو کے طور پر نکلی تھی۔

اب تو بھائی صاحب بھی نسوانی استعارے استعمال کرنے لگے ہیں۔ تربت بول اُٹھیں۔

"ہیرپن۔" بھائی صاحب غور کرنے لگے۔

"ہاں بھئی نسوانی جُوڑے کے پن جیسے موڑ۔"

میں نے بھائی صاحب کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ہم سب ایک ساتھ ہنس دیے۔

عموماً پہاڑی سڑکوں پر ہیرپن موڑوں کا ہونا کوئی زیادہ حیران کن بات نہ تھی، لیکن ان موڑوں کا لگاتار سلسلہ اور اس کثیر تعداد میں یقینی طور پر ایک معمّہ تھا۔ ایسے موڑوں کی ضرورت اُس وقت

ہوتی ہے۔ جب تھوڑے سے فاصلے میں ہی زیادہ اترائی چڑھائی مقصود ہو۔ اس وقت ان موڑوں کے ذریعے دو ایک ہزار فٹ اترنے کا مسئلہ اس طرح سے حل کیا گیا معلوم ہوتا تھا۔

دور نظر ڈالنے پر دو پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک گہری گھاٹی میں سندھ ندی کبھی کبھی ایک چاندی کے تار کی طرح دکھائی دے جاتی۔ میرا قیاس تھا کہ سڑک کم و بیش تین ہزار فٹ نیچے اتر کر سندھ دریا کی سطح تک پہنچتی تھی۔ اترتے اترتے ہم نے حساب لگایا کہ ۱۶ کلو میٹر کی مسافت طے کرنے میں ہم بیس ہیئر پن موڑوں سے گزرے تھے۔ اچانک ہمیں سندھ ندی کے کنارے خالصی میں جموں کے ڈوگرہ وزیر زورآور سنگھ کے قلعے کے کھنڈر دکھائی دینے لگے۔ اس نے یہ قلعہ ۱۸۳۳ء میں لیہہ کے محاصرے کے لیے تیار کروایا تھا اور بعد ازاں اس نے اسی قلعے کو صدر کیمپ بنا کر تبت پر حملہ کیا تھا۔ اور جس میں اسے اپنی جان گنوانی پڑی تھی۔

خالصی پہنچتے پہنچتے ہم سب کو بھوک لگ چکی تھی۔ بس ایک انوکھے وضع کے ڈھابے کے پاس رک گئی۔ اس ڈھابے میں اور اس کے آس پاس کافی کھلی جگہ تھی۔ جہاں گاہک بیٹھ سکتے تھے۔ ڈھابے کی دیواریں اور اس میں بیٹھنے کی جگہ کو کولتار کے ناکارہ ڈرموں سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہی ڈرم میز کا کام بھی دیتے تھے اور اس کے آدھے کٹے ہوئے حصے نشستوں کا۔ انہی ڈرموں میں بیل بوٹے اگائے گئے تھے۔ ان سب کو بڑی خوبصورتی سے روغن اور سفیدی سے پوتا گیا تھا۔ یہ ڈھابہ جنوبی ہند کے فوجی نے ریٹائر ہونے کے بعد کھولا تھا۔ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والا لداخ کے دور دراز علاقے میں بسنا پسند کرے گا، انہونی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں کی خوب صورتی اور سکون اگر کسی پر کمندیں ڈال دے تو یہ بھی عین ممکن ہو سکتا ہے۔ لوگ تو سات سمندر پار بھی انجانی جگہوں پر جا کر بس جاتے ہیں۔ پھر یہ تو اپنا دیش تھا۔ اس فوجی کے ذوقِ نفاست کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ وہ اس لحاظ سے چنڈی گڑھ کے راک گارڈن کے خالق نیک رام کا شاگرد معلوم ہوتا تھا۔ سڑک بحال رکھنے کے لیے کولتار کا استعمال ضروری ہے۔ اور ادھر ادھر پھینکے ہوئے ناکارہ ڈرم اس خوبصورت ماحول میں بدنما داغ ہی دکھائی دیتے۔ اس فوجی نے ان ڈرموں کو اکٹھا کر کے اپنے ڈھابے کو نہایت سلیقے سے سجا لیا تھا۔

یہاں جنوبی ہند کی روایت کے مطابق کھانے میں اڈلی، ڈوسہ، سانبھر، وڑے سبھی موجود تھے۔ اگرچہ یہ کھانے مقامی لوگوں کی ضرورتوں کو تو پورا نہ کر پاتے تھے، لیکن فوج اور سیاح اس ڈھابے کی سرپرستی کرنے سے نہ چوکتے ــــ ہم لوگوں نے بھی اڈلی ڈوسے بڑے مزے سے کھائے۔ پریم بھائی صاحب اور کرشنا بھابی جو کہ چین میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ایک عرصہ تک رہے تھے اور جنہیں جنوبی ہند کے کھانوں کی پرکھ تھی، کا کہنا تھا کہ ایک مدت کے بعد انہیں اتنا لذیذ کھانا نصیب ہوا تھا۔

اس ناشتے کے بعد ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب ہم کوہستانوں کے سلسلے کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی وادی میں پہنچ گئے تھے۔ یہ پہاڑیاں بھی نہایت دل چسپ تھیں اور ان کا تنوع حیرت انگیز تھا۔ کہیں باریک کنکریوں کا ڈھیر تھا۔ کہیں بڑے بڑے پتھروں کا۔ کہیں کوئی پہاڑی سلیٹ کے پتھروں کا ڈھیر تھا۔ کہیں بجری رکھی تھی اور کہیں سرخی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ٹھیکیدار نے فرمائش کے مطابق یہ تعمیر کا سارا سامان رکھوا دیا ہے اور مزدوروں کے آتے ہی کام شروع ہو جائے گا۔

اگر آپ کو دہلی سے فرید آباد آنے کا اتفاق ہوا ہو تو بدرپور کے پاس مختلف گریڈوں اور رنگوں کی سرخی اور پتھروں کے ڈھیر دکھائی دیے ہوں گے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ڈھیر یا انبار رکھے گئے ہیں، جب کہ یہاں یہ ڈھیر بڑی بڑی پہاڑیوں کی شکل میں تھے۔ قدرت کے ان نرالے مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے ہم لیہہ کے ہموار حصے میں پہنچ گئے تھے۔ ویسے تو وادیٔ لیہہ کا سلسلہ خالصی سے ہی شروع ہو جاتا ہے، لیکن الچی کے پاس تو میدانوں جیسے کھیت دکھائی دینے لگے تھے۔ حالانکہ پس منظر میں پہاڑیوں کا سلسلہ بھی پھیلا ہوا تھا ــــ سندھ ندی سے جہاں جہاں بھی پانی پہنچایا جا سکتا ہے وہاں ہریالی نظر آنے لگتی ہے۔ یہاں اخروٹ، خوبانی کے پیڑ بھی نظر آ رہے تھے۔

یہاں سے خانقاہوں کا بھی ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گیارہویں صدی میں بنائی گئی الچی کی خانقاہ تبت کے حکمرانوں کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ حالانکہ اس خانقاہ میں تبت کے آرٹ سے متعلق قیمتی مجسمے، تصویریں اور پوشاکیں ہیں، لیکن یہاں ہندوستانی اور مغل آرٹ کے توسط سے بودھی آرٹ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

الچی کے بعد لی کر، فیانگ اور ریسی ٹک خانقاہیں ہیں جو سب کی سب پانچ چھ سو سال پرانی ہیں اور جنہیں لیہہ کے حکمرانوں نے اپنے اپنے عہد میں بنوایا تھا۔ کچھ ایسے معلوم ہوتا ہے (جیسے مغل بادشاہوں کی عمارتیں، مسجدیں اور باغات بنوانے کے خبط کی طرح) نمگیال خاندان کے حکمرانوں کو بھی خانقاہیں بنوا کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا خبط سوار تھا۔

آخر الذکر ریسی ٹک خانقاہ جو ساڑھے پانچ سو سال پرانی ہے ان دنوں لداخ کے ہیڈ لاما نے آباد کی ہوئی ہے۔ اس میں بجلی کا سامان اور دیگر جدید سہولتیں مہیا ہیں۔ یہاں وہ بودھی مقدس جھنڈے اور نادر سامان ہیں جو تبت پر چینی حملے کے بعد وہاں کے لاما اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسی خانقاہ میں بودھی مورتیوں کے ساتھ کالی دیوی کا دیو قامت مجسمہ بھی موجود ہے اور جسے اسی عقیدت کے ساتھ پوجا جاتا ہے۔ 'برائی پر اچھائی کی فتح' بودھ مت کا

(آگے ملاحظہ)

کشمیری لال ذاکر

آؤ ہم دوست بن جائیں

بینڈ ونگ کے ہوٹل پانگے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے اسے چار سال پہلے کی بات یاد آگئی۔

وہ دارالسلام کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اُسے اپنے سفر کے بارے میں کچھ ضروری نوٹس لینے تھے۔ تاکہ بعد میں وہ افریقی ملکوں کے سفر کے بارے میں ایک سفر نامہ لکھ سکے۔ سفر نامے لکھنا اس کے جی کو لگتا تھا۔ اس لیے کہ وہ یادوں کی حسین دستاویز بن جاتے ہیں۔ ہوٹل سے متعلق جو ضروری معلومات اُسے اپنے کمرے کی چابی لیتے وقت ملی تھیں، اس کے مطابق ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو مقابلتاً تھوڑے معاوضہ پر اسٹینو کی سہولت بھی مل سکتی تھی۔ اس کے پاس وقت کم تھا، اس لیے وہ خود زیادہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ہوٹل کے ری سیپشن سے کہا کہ وہ اس کے لیے کسی اسٹینو کا انتظام کر دے۔ وہ ابھی کاغذ کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر لکھے نوٹس کو ڈکٹیشن دینے کے لیے ترتیب دے رہا تھا کہ کمرے کی گھنٹی بجی۔

"پلیز کم اِن" اُس نے کہا۔

اور لمحہ بھر میں ایک قبول صورت لڑکی اپنے ہاتھ میں نوٹ بک لیے اندر آگئی۔

"مارننگ سر۔"

"مارننگ۔ پلیز۔ سٹ۔"

وہ لڑکی بیٹھ گئی۔

"ڈو یو بی لانگ ٹو تنزانیا؟"

"یس سر۔"

"یور نیم؟"

"مارگریٹ۔"

اس مختصر سی ابتدائی گفتگو کے بعد گر بچن نے اسے اپنے سفر کے نوٹس لکھوانے شروع کر دیے۔ ابتدا میں مارگریٹ کو ڈکٹیشن لینے میں دقت ہوئی۔ کچھ اس کے بولنے کا لہجہ، کچھ ڈکٹیشن دینے کی رفتار اور کچھ نئے الفاظ جو عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے تھے مگر کچھ ہی وقت میں اُس نے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔ اور مارگریٹ بڑے انہماک سے نوٹس لینے لگی۔

کوئی آدھ گھنٹہ ڈکٹیشن دینے کے بعد گر بچن نے چائے منگوائی۔

"میرے لیے دودھ اور شکر نہیں۔" مارگریٹ بولی۔

"آپ تو اچھی خاصی ہندوستانی بول لیتی ہیں۔"

"ہم جس ایریا میں رہتے ہیں، وہ خالص ہندوستانی آبادی والا علاقہ ہے۔ اس لیے ہندوستانی بولنا سیکھ گئی ہوں۔"

"آپ کے پیرنٹس؟"

"وہ موانزا میں رہتے ہیں۔ یہاں سے کوئی دو سو کلو میٹر دور۔ میرے فادر ہندوستانی ہیں اور مدر افریقی۔"

"یہ کیسے؟"

"میرے دادا بزنس کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ پھر ہندوستان واپس نہیں گئے، یہیں بس گئے۔"

"تو آپ کے خاندان کی جڑیں ہندوستان کی دھرتی میں ہیں۔"

"اور ہمیں اس پر فخر ہے۔" وہ زور سے ہنسی اور پھر اس نے چائے کی خالی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر الگ میز پر رکھ دیں۔

جب ڈکٹیشن کا کام ختم ہو گیا تو مارگریٹ نے کہا —

"اگر آپ کہیں گھومنا پھرنا چاہیں تو میں شام کو آوف (OFF) ہوں۔ آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں۔"

"اس کے لیے شکریہ۔ میں تو دارالسلام میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"تو آپ چار بجے لاؤنج میں آجائیے۔ میں وہیں ملوں گی۔"

شام کو چار بجے جب گر بچن تیار ہو کر نیچے آیا تو مارگریٹ کی خلوص بھری مسکراہٹ اس کا استقبال کر رہی تھی۔

● ہاؤس نمبر ۲۶، سیکٹر ۱۵۔ اے، چنڈی گڑھ

"آپ کچھ شاپنگ کرنا چاہیں گے؟"

"تھوڑی سی بہت شاپنگ تو کرنی ہی پڑے گی۔"

"دکانیں تو اب پانچ بجے کھلیں گی۔ ایک سے پانچ بجے تک مارکیٹ بند رہتی ہے۔"

"یہاں واقعی لوگ لائف کو انجوائے کرتے ہیں۔"

"جی ہاں"۔ مارگریٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ہم تب تک کیا کریں گے؟"

"دو ڈھائی گھنٹے میں آپ کو یہاں کی کچھ جگہیں دکھا دیتی ہوں۔ خاص طور سے سمندر کا ساحل۔"

"ٹھیک ہے۔"

گوربچن اور مارگریٹ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مارگریٹ اُسے شہر کے مختلف حصّے دکھاتے ہوئے آخر سمندر کے ساحل پر لے گئی۔ مختلف ملکوں سے آتے ہوئے لوگوں کا ٹھٹھ لگا تھا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی سفید ریت پر وہ مارگریٹ کے پہلو میں کھڑا اُفق تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھتا رہا۔ جس کی لہروں پر دُور دُور تک مچھیرے اپنی کشتیاں لیے مچھلیوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

جو سات دن گوربچن نے دار السلام میں گزارے، اُن میں سے آخری چار دن وہ مارگریٹ کے ساتھ ہی رہا۔ وہ اس کے لیے نوٹس بھی ٹائپ کرتی رہی۔ اُسے گھماتی بھی رہی۔ شاپنگ بھی کراتی رہی۔ اور نیپالی زبان بھی سکھاتی رہی۔ ان آخری چار دنوں میں گوربچن نے جانا کہ پچھڑے ہوئے لیکن آزادی اور ترقی کی جدوجہد میں مصروف سبھی ملکوں کی داستان لگ بھگ ایک جیسی ہے۔ دنیا کا عام آدمی چاہے وہ افریقی ہو، چاہے تھائی، چاہے ہندوستانی ہو، بنیادی طور پر امن پسند اور شریف ہے اور انسان کے لیے ایک حسین مستقبل پر یقین رکھتا ہے۔

جس دن گوربچن کو دار السلام سے جانا تھا، مارگریٹ تمام دن اس کے ساتھ رہی۔ وہ اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے بھی آئی اور جب ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے گوربچن نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میرے وطن کو میرا سلام کہیے گوربچن صاحب"

یہ کہتے ہوئے مارگریٹ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ یوڈی کلون کی خوشبو میں بسے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرا کر بولی۔

"سلام رفیقی۔"

"سلام"۔ گوربچن نے جواب دیا اور پھر اپنا بورڈنگ کارڈ چیک کرواتے ہوئے ہوائی جہاز کی طرف بڑھ گیا۔

اور اس وقت گوربچن بینڈونگ کے ہوٹل پانگے لاؤنج میں بیٹھا پرمادی کا انتظار کر رہا تھا۔

پرمادی اُسے دو دن پہلے جکارتا میں ملی تھی۔ وہ ایک بک شاپ میں انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں سے متعلق کوئی کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ سیلز گرل اس کی بات نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اُس نے گوربچن کے سامنے انڈونیشیا سے متعلق یوں تو ڈھیر ساری کتابیں جمع کر دی تھیں، لیکن جو کتاب اسے چاہیے تھی وہ نہیں مل رہی تھی۔ جب وہ سیلز گرل کو اپنی بات ٹھیک سے نہ سمجھا پانے کی کوفت میں کُڑھ رہا تھا، ٹھیک اسی لمحہ پرمادی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور مسکرا کر بولی:

"مے آئی ہیلپ یو؟"

"پلیز۔"

گوربچن کی بات سمجھنے میں اُسے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اور جب اُس نے مقامی زبان میں سیلز گرل کو سمجھایا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"اوہو، سوری سر۔"

پھر وہ جھٹ سے انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں پر دو تین کتابیں لے آئی۔ لیکن وہ سب انڈونیشیا کی زبان میں تھیں۔ کتابوں کو دیکھ کر گوربچن دھیرے سے مسکرایا اور پھر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ پرمادی اس کی اُلجھن جان گئی۔ اُس نے سیلز گرل سے دوبارہ بات کی۔ اور خود بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ سیلز گرل کے ساتھ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں سے متعلق انگریزی میں ایک کتاب تھی۔

اگر پرمادی گوربچن سے نہ ملتی تو اُسے انڈونیشیا کی لوک کتھاؤں کی کوئی کتاب شاید ہی مل پاتی۔ وہ اپنے من میں کُڑھتے ہوئے واپس اپنے ہوٹل چلا جاتا۔ اور بنا شکر اور دودھ کے کڑوی کافی پیتا رہتا۔ کتابیں خرید چکنے کے بعد گوربچن دیر تک پرمادی کے ساتھ بات چیت کرتا رہا۔ اُسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ایک شاعرہ ہے۔ اس کا خاوند ڈاکٹر ہے اور اُن کے دو بچے ہیں۔ بُک شاپ سے نکلنے کے بعد پرمادی گوربچن کو اپنی کار میں بٹھا کر قریب کے ایک ریستوراں میں لے گئی۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر پرمادی اُسے انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے بارے میں تفصیل سے بتاتی رہی۔ وہ اگلے روز گوربچن کو موناز کے زمین دوز وسیع ہال میں بھی لے جانا چاہتی تھی، جہاں تصویروں کے ذریعے انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی تمام داستان بیان کی گئی تھی۔ وہیں ریستوراں میں بیٹھے ہوئے پرمادی نے اُسے اپنی ایک نظم بھی سنائی۔

سمندر کی لہروں کی طرح
تم میرے قریب آتے ہو
چند لمحے ساحل کی خشک ریت کو
اپنی ٹھنڈک کا احساس دلاتے ہو
اور پھر اچانک بنا میری آنکھوں میں جھانکے
لوٹ جاتے ہو
تم شاید نہیں جانتے کہ ساحل کی خشک ریت
لمحوں کی مضبوط چٹان پر کھڑی ہو کر
دن رات سمندر کی لہروں کا انتظار کرتی ہے

گوربچن نظم کے مرکزی خیال سے بے حد متاثر ہوا۔

دل کی دھڑکنوں کی زبان ایک ہی ہے - یہ زبان ہر کوئی سمجھ سکتا ہے چاہے وہ کسی بھی مُلک کا رہنے والا ہو۔ اُسے سمجھنے کے لیے کسی انٹرپریٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُس نے اپنا ہاتھ پرمادی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مسکرا کر بولا۔

"تریما کاسی" (بے حد شکریہ)

"تریما کاسی"۔ بڑی احسان مند نظروں سے اُس نے کہا تھا۔

اس سمے بینڈونگ کے ایک ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا گوربچن اپنی دوست پرمادی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جکارتا سے اسی ٹرین سے آنے والی تھی۔ جس ٹرین سے وہ کل خود آیا تھا۔ اسی کے کہنے پر تو وہ ٹرین سے آیا تھا ورنہ ٹیکسی سے آتا۔ ٹرین کے سفر کا اُسے ویسا ہی لطف آیا تھا جیسا کہ پرمادی نے اُسے بتایا تھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ آنے ہی والی ہوگی۔ اور اُس نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے پرمادی کھڑی تھی۔

"سلامت دا تنگ (خوش آمدید)"۔

"تریما کاسی"۔

وہ اس سے ہاتھ ملا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اور دیر سے آنے کے لیے معذرت چاہتی رہی۔ پھر وہ دونوں ریستوراں میں چلے گئے۔ گوربچن نے کھانا نہیں کھایا تھا کیوں کہ وہ اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد وہ کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر پرمادی اُسے بینڈونگ میں گھمانے لے گئی۔ اُس نے گوربچن کو وہ عمارت بھی دکھائی، جہاں لگ بھگ تیس برس پہلے ایشیائی کانفرنس ہوئی تھی اور پنچ شیل کے اصولوں پر عالمی امن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ وہ دونوں دیر تک اس عمارت کے احاطے کے اندر خاموش کھڑے رہے۔ پھر پرمادی نے قریب کے ایک پودے سے ایک پھول توڑ کر گوربچن کے کوٹ کے بٹن ہول میں لگا دیا۔

"تریما کاسی"۔ گوربچن نے کہا۔

اور پرمادی جواب میں مسکرا دی۔

پرمادی اُسے کئی رات تک گھماتی رہی۔ پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں وہ اس کی شفیق بوڑھی ماں سے ملا جو اُسے دیر تک دعائیں دیتی رہی۔ اور پھر پرمادی اُسے سڑک تک چھوڑنے آئی اور جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو بولی: "مان گا (خدا حافظ)"۔

جب وہ ہوٹل پہنچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھا وہ سوچتا رہا کہ مائیں چاہے دنیا کے کسی بھی حصے سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے بچوں سے ایک جیسا پیار کرتی ہیں۔ بے غرض۔ الوٹ اور بے پناہ!

اگلے روز پرمادی اُسے ماؤنٹ تینگ کا بان پیراہو دکھانے لے گئی جو مغربی جاوا کا ایک بہت بڑا آتش فشاں پہاڑ تھا۔ اگرچہ وہ ۱۹۵۶ء کے بعد سے خاموش تھا۔ لیکن وہ کس وقت پھوٹ پڑے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پہاڑ کے ایک طرف کھڑے ہو کر پرمادی اُسے بے حد گہرا اور چوڑا کریٹر دکھا رہی تھی۔ جس کی تہہ میں اب بھی گندھک بھرا پانی تھا۔ اور آس پاس گندھک کی تیز بو پھیلی تھی۔ یہ بدبو تو پہاڑ سے کوئی دو کلومیٹر پہلے ہی فضا میں رچ رہی تھی۔ پرمادی نے اُسے بتایا کہ انڈونیشیا میں ہر سال تقریباً چار سو زلزلے آتے ہیں، جن میں سے کچھ تو بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ ابھی دو سال پہلے ارین جیا بالی اور مغربی سماٹرا کے جزیروں میں بڑے ہولناک زلزلے آئے تھے۔ ان میں ہزاروں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ گوربچن اسے وہیں چھوڑ کر کریٹر میں اُتر کر لاوے کے بکھرے ہوئے پتھر اور راکھ کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے جمع کرنے لگا۔ اس نے دیکھا ایک خوب صورت سا لڑکا پکچر پوسٹ کارڈ لیے پرمادی کے قریب کھڑا تھا اور وہ اس سے کارڈ خرید رہی تھی۔

اس کے پہاڑ پر واپس آنے تک پرمادی نے تین چار کارڈوں پر اپنی نظموں کے دو دو تین تین ٹکڑے لکھ ڈالے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے تین پکچر پوسٹ کارڈ گوربچن کو پیش کیے۔ گوربچن نے "تریما کاسی" کہہ کر کارڈ لے لیے۔ اور ان پر لکھی سطور پڑھنے لگا۔

"زندگی آتش فشاں پہاڑ بھی ہے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ بھی"۔

"جن لمحوں میں کوئی اچھا آدمی ملے وہ لمحے امر ہو جاتے ہیں"۔

"جب آدمی کے پاس کچھ نہیں رہتا تو حسین یادیں اُسے سہارا دیتی ہیں"۔ اور اُس نے جب نظریں اُٹھا کر پرمادی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک آگئی۔ اُس نے انڈونیشیائی لہجے میں انگریزی میں بولتے ہوئے کہا۔ "دوستی کی جڑیں دھرتی میں بہت دُور تک جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم اُنہیں سینچتے رہیں۔ کبھی جذبات سے، کبھی گرم آنسوؤں سے۔ اور کبھی دل نواز مسکراہٹوں سے۔"

گوربچن کو پرمادی نے کتنی بڑی حقیقت کہہ ڈالی تھی۔ اُس نے قریب ہو کر پرمادی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہ اس کے گلے سے لگ گئی۔ ان دونوں کی نگاہیں پہاڑ کے سامنے والی چوٹی پر جمی تھیں، جیسے گھٹاؤں کے ریلے اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ گوربچن اُسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے ہوئے کہہ رہا تھا:

"پرمادی، آؤ ہم کوشش کریں کہ ہماری دوستی کی جڑیں زیادہ گہری اور زیادہ مضبوط ہوں۔"

اور پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کو آتی ہوئی گھٹائیں تیزی سے اُن کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اُنہیں اپنی دعاؤں کے نذرانے پیش کرنے کے لیے۔ ●

شین مظفر پوری

جھٹکا
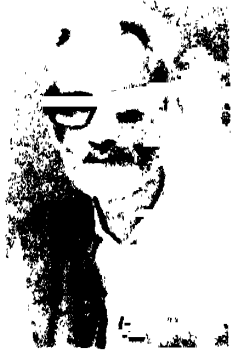
کالو کا چہرہ کریہہ یا بھیانک تو نہیں تھا۔ پھر بھی دیکھنے میں کچھ پُراسرار سا ضرور لگتا تھا۔ سانولے چہرے پر ذرا کرختگی تھی۔ لوگ اس سے کچھ گھبراتے بھی تھے۔ ویسے طبیعت اور مزاج کا وہ بُرا نہیں تھا — اُس کی حسین و جمیل بیوی رجنی بھی ٹھنڈے مزاج اور نرم دل کی عورت تھی۔ کسی کیڑے کو بھی خواہ مخواہ مارنا وہ بُرا سمجھتی تھی۔ کالو کی سُستی اور کام چوری سے وہ ضرور نالاں رہتی تھی، مگر شوہر سے کبھی نفرت یا بیزاری محسوس نہیں کرتی تھی۔ خانگی اور ازدواجی زندگی اچھی ہی گزر رہی تھی بلکہ پڑوسیوں کو حیرت تھی کہ میاں بیوی کی کبھی ٹِک ٹِک جھک جھک تک نہیں سُنی گئی۔ البتہ اُن کے دونوں بچے بڑے شرارتی اور جھگڑالو تھے۔ باہر کے بچوں سے آئے دن مار پیٹ اور گالی گلوچ کرتے رہتے۔ یہ بچے باپ کے چہرے کی سنجیدگی اور کرختگی سے تو کچھ ڈرتے بھی تھے مگر ماں کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سارے دن گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے۔

ایک دن چھوٹے لڑکے کی ایک بات نے رجنی کو چونکا دیا۔ اُس نے پوچھا۔ "ماں جلاّد کس کو کہتے ہیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"گلی کی نالی میں میری گیند جا پڑی۔ رامو کے پتا پر چھینٹا پڑ گیا تو اُس نے دانت پیس کر مجھے سالا جلاّد کا بچہ کہہ دیا۔ ایسی گالی تو میں نے کبھی نہیں سُنی۔ جلاّد کیا ہوتا ہے؟"

رجنی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی۔ اُس نے بچے کو بہلایا "ایک طرح کی گالی ہی سمجھو۔ جو لڑکے بہت شرارت کرتے ہیں، اُن کو لوگ غصے میں جلاّد کا بچہ کہہ دیا کرتے ہیں۔"

اور جب یہ واقعہ رجنی نے کالو کو سنایا تو وہ کچھ کہے بغیر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ دوسرے ہی دن بڑے لڑکے نے بھی ایک سوال کر دیا۔ "کیوں ماں، بابو جی کوئی اور کام بھی کرتے ہیں کیا؟"

اس بار رجنی کی پیشانی پر دو شکنیں ابھریں "نہیں بیٹے۔ تمہارے بابو جی بس ٹھیلے پر تالہ چاقو ہی بیچتے ہیں۔ کچھ اور نہیں کرتے۔ مگر تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

"گلی میں ایک آدمی بول رہا تھا کہ کالو کا کام ایسا ہے کہ اُس کا دل پتھر ہو چکا ہوگا۔"

"لوگ دشمنی سے خواہ مخواہ کی باتیں کرتے ہیں۔ ایسی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو۔"

رجنی نے اس بات کا ذکر بھی کالو سے کر دیا۔

اس بار کالو کے چہرے پر ہلکا پسینہ آ گیا۔ رجنی کہنے لگی "اب ہمیں محلہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اتنے برسوں میں سب جان گئے ہیں کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ لوگ کس کس نظر سے ہمیں دیکھتے ہیں!"

کالو نے گہری سانس کے ساتھ صرف "اچھا" کہا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ رجنی اس کے کام سے خود بھی شرم محسوس کرتی تھی۔ احساسِ حقارت میں مبتلا رہتی۔ دل ہی دل میں ماں باپ کو کوسا کرتی کہ کیسے کے پلے باندھ دیا۔ ویسے تو ٹھیک ہی ہے، مگر آدمی محنت سے جی چُرانے والا ہے۔ ورنہ ایسے کاموں میں پھنسنا ہی کیوں۔ کبھی کبھی وہ کالو پر دباؤ بھی ڈالتی رہتی "کمانے کھانے کے اور بھی بہت سارے دھندے ہیں۔ مگر تم محنت سے گھبراتے ہو۔ اسی لیے اس کٹھور کام کو نہیں چھوڑتے۔"

مگر کالو نے بظاہر اس کی بات کا کبھی کوئی اثر نہ لیا۔ رجنی یہ دیکھ کر اور بھی پریشان رہنے لگی تھی کہ اب دونوں بچوں پر بھی بھید کھلنے والا تھا۔ بچوں کے دماغ پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایک دن کالو نے اس کو گہری سوچ میں دیکھ کر پوچھا "اِدھر تم بہت چُپ چُپ اور اُداس نظر آنے لگی ہو۔ میں تم کو بہت بُرا لگتا ہوں کیا؟ یا کوئی اور بات ہے؟"

● نواب لاج، مراد پور، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

"بس ایک ہی بات ہے۔" وہ اُبل پڑی۔
" ایک بار تم نے ایسا کام پکڑا کہ مجھے تم سے گھن آتی رہی ۔ اور اب تم دوسرا کام بھی ایسا کر رہے ہو کہ تم سے ڈر لگتا ہے ۔ تم کچھ اور کام کیوں نہیں کر لیتے ۔ بچوں کی سمجھ میں آ گیا تو وہ کیا کیا سوچنے لگیں گے۔"

کسی ناگواری کے بغیر کالو نے دھیمے لہجے میں کہا" کیا کروں ۔ مجبوری ہے ۔ روزی روٹی کا سوال ہے ۔ پہلا کام تو اس سے بھی بھیانک تھا۔ تمہارے کہنے سے اس کو چھوڑا ۔ اب یہ کام بھی چھوڑ دوں تو پھر کروں گا کیا ۔ تین چار کلاسیں اور پڑھ لیا ہوتا تو کہیں بابو گیری مل جاتی۔"

" تم کچھ بھی کر لو ۔ مگر اس کو چھوڑ دو ۔ ٹھیلے والے ہی کام کو سچ مچ جم کر کرو ۔"

" اچھا دیکھوں گا۔"

کالو نے محض ٹالنے کے لیے یہ بات کہہ دی ۔ ورنہ اس کو اپنا موجودہ کام چھوڑنے کی ہمت نہیں تھی ۔ اتنا آسان کام پھر کہاں ملنے والا تھا ۔ سال بھر میں ذرا دیر کے لیے دو چار بار کی ڈیوٹی ۔ باقی گویا سال بھر کی تنخواہ مفت! ــــ اور یہ ٹھیلے والا کام تو بڑا گھٹیا ہے ۔ کڑی محنت چاہتا ہے ۔ اس طرح کا بہلاوا وہ رجنی کو پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا ۔ رجنی اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنے نصیب کو رو لیتی ۔

قصہ یوں تھا کہ آٹھ نو سال پہلے سانچے میں ڈھلی ہوئی رجنی پر جب شباب آیا تو گویا وہ دیوار پر لگا ہوا پوسٹر بن گئی ۔ عاشقوں اور اُمیدواروں کے جوڑ توڑ شروع ہو گئے ۔ انہیں میں سے اس کے باپ کو برادری کا ایک ہٹا کٹا نوجوان کالو پسند آ گیا ۔ اس سے زیادہ اس کے باپ نے کچھ اور نہ دیکھا ۔ شادی ہو گئی ۔ تب سمجھ میں آیا کہ لڑکا بے فکرا اور کام چور ہے ۔ ڈیڑھ دو سال گزرے تو رجنی کے سپنے ٹوٹنے لگے ۔ بیٹی کو اداس اور مایوس دیکھ کر بیچارہ باپ بھی گھٹنے لگا ۔

رجنی کا باپ شہر کے بڑے ہسپتال کے مُردہ گھر میں لاشوں کو چیرنے پھاڑنے کی ملازمت کرتا تھا ۔ یہ کوئی پسندیدہ کام نہیں تھا پھر بھی روزگار کی مجبوریوں کے تحت اس نے اس کو گوارا کر لیا تھا ۔ کچھ اس لیے بھی کہ یہ کام کسی رشوت اور سفارش کے بغیر اس کو آسانی سے مل گیا تھا ۔ شروع شروع میں کچھ وحشت تو ہوئی ۔ مگر دھیرے دھیرے وہ اس قبیح کام سے مانوس ہوتا گیا ۔ پھر بھی دارو پیے بغیر وہ اس کام کو نہیں کر پاتا تھا ۔ اس کام میں وہ برسوں سے لگا ہوا تھا اور جب کالو کو ہر کام سے کتراتے پایا تو رجنی کے باپ نے داماد کو بھی دھر پکڑ کے اس کام میں لگا لیا ۔

دو چار دن تو کالو نے بڑے نخرے دکھائے ۔ طرح طرح کی لاشوں کے ڈھیر کو دیکھ کر اس کا جی الٹ پلٹ ہونے لگتا ۔ مُردہ خانے کے ماحول میں ایک نہایت ہی مکروہ زہریلی بو بسی ہوتی تھی جو کالو کو پریشان کر دیتی ۔ حادثات، قتل اور طرح طرح کے فسادات کی لاشیں ۔ فطری موت کی لاشیں کم بھیانک ہوتیں ۔ مگر قتل اور حادثات کی بگڑی ہوئی لاشوں کو تو دیکھ دیکھ کر جی ہولنے لگتا تھا ۔ کٹی پھٹی پھولی ہوئی اور کبھی کبھی سڑی گلی لاشوں سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ۔ رسمی پوسٹ مارٹم کے لیے ان لاشوں کو بھی چیرنا اور ٹکڑے کرنا لازمی تھا ۔ کالو کی حالت اُس وقت زیادہ غیر ہوتی جب کسی پھولی ہوئی متعفن لاش کا پیٹ چاک کرنا ہوتا ۔ چاقو چھوتے ہی ایک بڑے غبارے کے پھٹنے جیسی آواز ہوتی اور زہریلی بدبو کا ایسا بھبکا نکلتا کہ آدمی اگر نشہ کیے ہوئے نہ ہو تو بے ہوش ہو جائے ۔

اس غلیظ کام نے کالو کو بدلا یا تو بہت، مگر رجنی کے باپ کی سخت دھمکی اُس کو یاد آتی رہتی ۔ " اگر کام سے بھاگے تو رجنی بھی تمہارے گھر سے بھاگ آئے گی ۔" عورت تو پھر کوئی نہ کوئی اس کو مل ہی جاتی ۔ مگر رجنی جیسی موہنی اور انمول عورت سے وہ کسی قیمت پر ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا ۔ اس لیے دل پر جبر کر کے اس کام کی کراہیتوں کو جھیلتا رہا ۔

مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ اپنے کام کی ساری تفصیلات رجنی کو آئے دن سناتا رہتا ۔ جب کہ اپنے باپ کے بارے میں رجنی کو صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ لاشوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا ۔ کالو دراصل یہ جتانا چاہتا تھا کہ دیکھو تمہاری خاطر میں یہ بھی کر سکتا ہوں ـــ مگر تھوڑے ہی دن بعد یہ ہوا کہ رجنی کو کالو سے گھن آنے لگی ۔ اس کو کالو کے جسم میں لاشوں کی بدبو محسوس ہوا کرتی ۔ حالانکہ وہ اچھی طرح نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر مُردہ گھر سے آیا کرتا تھا ۔

ایک سال گزرتے گزرتے رجنی ایک بستر پر سونے سے کترانے لگی ۔ کالو کے احتجاج کرنے پر اُس نے صاف صاف کہہ دیا " مجھے اُبکائی آنے لگتی ہے ۔ لگتا ہے کسی لاش کے ساتھ لیٹی ہوئی ہوں ۔ خراب خراب بُو سی لگتی رہتی ہے۔"

رجنی کے اس کھنچاؤ پر کالو کو سکتہ سا لگ گیا ۔ وہ دل ہی دل میں اپنے کام اور اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا ۔ رجنی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی بات سے کالو کو دُکھ پہنچے ۔ مگر مجبوری ایسی تھی کہ دل کی بات زبان پر لانی ہی پڑی ۔ ساری زندگی تو اندر ہی اندر گھن اور کھنچاؤ کے ساتھ نہیں گزاری جا سکتی تھی ۔ وہ بڑی نرمی اور لگاوٹ کے ساتھ پھر بولی :" بھگوان کے لیے کوئی اور دھندا پکڑ لو ۔ یہ کام چھوڑ دو ۔ مجھے بڑی گھن لگتی ہے ۔"

ایسا نہیں کہ خود کالو کے اندر ایسا سوال نہ اُٹھا ہو ۔ کسی متبادل روزگار کے لیے وہ بھی سوچتے سوچتے تھک چکا تھا ۔ ایک بار شیطان نے اس کے دماغ کو کسی اور ڈھنگ سے ورغلایا تھا ۔ آج ڈرتے ڈرتے وہی بات کالو کی زبان پر آئی ۔" تم ٹھیک کہتی ہو ۔ مگر دوسرا کوئی کام ملتا بھی تو نہیں ۔ لوگ میرے چہرے سے خوف کھاتے ہیں اور ڈیل ڈول سے دھونس میں رہتے ہیں ۔ اگر دادا گیری شروع کر دوں تو کیسا رہے ؟ غنڈہ گردی بھی تو آمدنی ہی کا ایک پیشہ ہے ۔"

" دھت! " رجنی فوراً بھڑکی ۔" یہ تو تاڑ سے

گر کر گھور میں اٹکنے والی بات ہوئی۔ کوئی اچھی بات۔ اچھا کام سوچو۔"

"وہ تو میں سوچوں گا۔ مگر رجنی، تمہارے باپ نے مجھے دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر تم نے کام چھوڑا تو رجنی بھی تمہیں چھوڑ دے گی۔"

"نہیں۔ میں ساری زندگی تم کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

کالو اطمینان کی سانس لے کر چپ ہو گیا۔

اور پھر دوسرے ہی دن کالو نے سسر کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر مُردہ خانے کی نوکری چھوڑ دی۔ دو تین ماہ تو کالو کے ٹھیک ٹھاک گزرے، مگر اس کے بعد چُولہے چکی کے بھی لالے پڑنے لگے۔ اس کو کوئی ہُنر تو آتا نہیں تھا۔ پڑھا لکھا بھی یوں ہی سا تھا۔ محنت مشقت اور کڑی ڈیوٹی کے کام سے وہ ہمیشہ سے ہی جی چُراتا آیا تھا۔ کوئی ہلکا پھلکا آسان کام مل نہیں رہا تھا۔ بے کاری کا وقت تنگ دستی میں گزارنا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ وہ بس اِدھر اُدھر مارا پھرتا۔

اس کا ایک دوست تین سال کی قید بھگت رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ جیل خانہ جا کر اس سے ملتا رہا تھا۔ ایک دن پھر وہ اس سے ملاقات کرنے پہنچا۔ وہاں باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ سرکار کو ایک جلّاد کی ضرورت تھی۔ پرانا جلّاد ریٹائر ہو رہا تھا۔ مگر اس اسامی کے لیے کوئی نیا آدمی مل نہیں رہا تھا۔ پوشیدہ طور پر تلاش جاری تھی۔

کالو کے دوست نے بتایا "یار کام تو کچھ بھی نہیں، مُفت کی تنخواہ ملتی ہے۔ سال میں دو چار پھانسیاں ہی تو ہوتی ہوں گی۔ چند منٹ کا معاملہ ہوتا ہے۔ آدمی کلیجے کا مضبوط ہو تو کام کتنا آسان ہے۔ کوئی ہو تو جیلر صاحب سے ملا دینا۔ وہ سارا بندوبست کر دیں گے۔"

"مگر یار اس کام کے لیے تو پتھر کا کلیجہ چاہیے۔"

"سو تو ہے۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ جلّاد سے زیادہ کٹھور قاتل ہوتا ہے۔ قاتل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جلّاد تو صرف اپنی ڈیوٹی پوری کرتا ہے۔"

دوست کی بات کالو کی سمجھ میں ٹھیک ٹھیک آ گئی۔ رجنی سے اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ کئی دن کی سخت کشمکش کے بعد کالو نے خود اپنے آپ ہی کو اس کام کے لیے تیار کر لیا اور جیلر سے ملنے پہنچ گیا۔ بات ہو گئی۔ پرانے جیلر کے ریٹائر ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے تب تک کالو کا معاملہ ضابطے کی کارروائیوں سے گزرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ رجنی اس کام کو کبھی ہرگز پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے معاملے کو اس سے پوشیدہ ہی رکھا۔ ویسے بھی جلّاد کی شناخت کو عام لوگوں میں مشتہر نہیں ہونے دیا جاتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پھانسی دینے سے پہلے دل مضبوط کرنے کے لیے کچھ نشہ وشہ کی ضرورت بھی پڑتی ہو گی۔

کچھ دن بعد کالو کی تقرری ہو گئی۔ تب بھی اس نے رجنی کو اندھیرے ہی میں رکھا۔ مگر تنخواہ والی آمدنی کے لیے دکھاوے کا کوئی بہانہ تو تلاش کرنا ہی تھا۔ جب اس کو پہلی تنخواہ ملی تو اس نے تالہ، چاقو، چھری، قینچی، کنگھی وغیرہ کچھ سامان خریدا۔ قرض اُدھار سے ایک ٹھیلہ بنوایا اور اس طرح فرصت کے اوقات میں محلّے کے آس پاس ہی جہاں تہاں ٹھیلہ لگا کر دفع الوقتی کرنے لگا۔

رجنی خوش تھی کہ چلو کالو نے ایک اچھا دھندا پکڑ لیا۔ خود کالو بھی مگن تھا، مگر چار پانچ ماہ بعد ایک دن جب وہ اپنی خفیہ حاضری سے واپس آیا تو اس کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا اور رہ رہ کر اس کو پسینہ آ رہا تھا۔ اس کے کلیجے کے امتحان کا پہلا موقع آ گیا تھا۔ تین دن بعد اس کو پہلی پھانسی دینی تھی۔ وہ ایک عجیب کرب سے گزرتا رہا۔ ایک ہچکچاہٹ سی ہوتی رہی۔ وہ بار بار دارو پی کر اپنی الٹ پلٹ کیفیت پر قابو پاتا رہا۔ رجنی اس کی پُراسرار کیفیتوں پر حیران تو رہی مگر کچھ سمجھ نہ پائی۔ پہلے تو کبھی بھولے بھٹکے ہی کالو نشہ پانی کر لیتا تھا۔ مگر اس بار یہ لگاتار سلسلہ دیکھ کر رجنی کو کچھ پریشانی ہوئی۔ ایک بار اس نے ٹوکا بھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔"

کچھ کہنے کی بجائے کالو اس کی طرف صرف دیکھ کر رہ گیا۔

مگر رجنی پھر بولی۔ "تم نے جو یہ شروع کیا ہے سو اچھا نہیں ہے۔ ایسا مت کرو۔ صحت، عزت، گھر گرہستی ...."

کالو ذرا جھنجھلا گیا۔ "چھوڑو۔ تم نہ سمجھو گی۔ کھانا لاؤ۔"

اس کا موڈ اچھا نہ پا کر رجنی نے زیادہ کرید نہ کی۔

دوسرے دن منہ اندھیرے ہی کالو باہر نکل گیا۔ دوپہر کو وہ گھر آیا تو نشے میں دُھت تھا۔ آج چہرہ واقعی بھیانک ہو رہا تھا۔ رجنی گھبرا کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں چار کرتے ہوئے بلبلا اٹھی۔ "تم ایسے کیوں لگ رہے ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں۔ سچ سچ بتاؤ۔"

"کچھ بھی نہیں۔" کہتے ہوئے جب کالو کی نگاہ رجنی کی موہنی صورت پر جمی تو اس کی آنکھوں سے دنیا اور زندگی کی ساری بدصورتیاں اچانک غائب ہو گئیں اور اس نے بے اختیار رجنی کو اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔ اور پھر بستر پر گرتے ہی اُسے گہری نیند آ گئی۔ اور رجنی اس عجیب حرکت کی بھول بھلیاں میں گُم ہو گئی۔

رات گئے آنکھ کھلی تو کالو نے خمار اور خستگی دُور کرنے کے لیے اشنان کیا۔ تھیلے سے پھر دارو کا اَدھا نکالا۔ رجنی نے بڑی کوفت کے ساتھ کہا۔ "کچھ کھاؤ گے بھی یا دارو ہی پیتے رہو گے؟"

"ہاں۔ کھاؤں گا بھی۔ لاؤ۔"

دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک دو بار تو کالو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ہی جاتی تھی۔ مگر اِدھر چار دن سے رجنی نے ایک بار بھی اس کو مسکراتے نہیں پایا تھا۔ پینے اور کھانے کے شغل کے دوران رجنی نے اس کو چھیڑا۔ "کوئی بات ضرور ہے۔ جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"ہاں!" کالو کی زبان سے فوراً نکلا۔ گویا دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو وہ خود ہی تیار بیٹھا تھا۔ رجنی ذرا چونکی۔

اور تب کالو نے ساری بات بتا دی۔ رجنی نے سر پیٹ لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر دارو کے آخری گھونٹ کے بعد جب وہ بولا "اور آج میں نے پہلی پھانسی دی ہے۔" تو رجنی رو پڑی۔

"تمہارے نصیب میں کیا ایسے ہی خراب کام لکھے ہیں۔ تم سے تو ڈر لگنے لگا ہے۔" وہ گویا کراہ اٹھی۔

"مگر رجنی یہ کوئی پاپ نہیں ہے۔ اپرادھ نہیں ہے۔"

"پھر بھی یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ بڑا بھیانک لگتا ہے۔"

"سو تو ہے۔ پھانسی کے پھندے میں جھولتی ہوئی لاش میری نظر سے ابھی تک اوجھل نہیں ہو پائی ہے۔ میرا برا حال ہو رہا ہے۔ "کیا کروں ڈیوٹی، ڈیوٹی ہے۔"

رجنی پھر بلبلا اٹھی "نہیں نہیں، بھگوان کے لیے تم یہ کام چھوڑ دو۔ آج ہی چھوڑ دو۔"

مگر کالو خاموش رہا۔ کسی متبادل کام کے بغیر موجودہ کام چھوڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بار بار نیم فاقہ کشی کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا —— کوئی اور دھندا تو اس کو سوجھتا نہیں تھا۔ بس لے دے کر ایک شیطانی اکساہٹ کبھی کبھی اس کے دماغ کو مس کر جایا کرتی —— داداگیری! ایک آزاد اور خود مختار پیشہ! مگر دل اس پر بھی کچھ خاص جمتا نہیں تھا۔ کیوں کہ کہیں دور سے "نہیں نہیں" کی آواز آنے لگتی۔

اس کشمکش اور پس و پیش میں دن گزرتے رہے —— کئی سال گزر گئے۔ تب تک کالو بارہ پھانسیاں دے چکا تھا۔ پہلی بار میں اس پر جو کیفیات گزری تھیں اس کا اعادہ پھر کبھی نہ ہوا۔ اگرچہ ہر بار اس کو شراب کا سہارا لینا پڑا۔ رجنی اس کے اس کٹھور کام سے کبھی سمجھوتہ نہ کر پائی۔ وہ قتل اور پھانسی کے فرق کو ٹھیک ٹھیک محسوس نہیں کر پاتی تھی۔ وہ بس "جان لینے" والی بات ہی کو اصل بات مانتی تھی۔ ہوتے ہوتے بہت سارے لوگ جان چکے تھے کہ کالو "جلاد" تھا۔ اور یہ ٹھیلہ ویلہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ مگر کالو سے کبھی اشارتاً بھی کسی نے ایسی کوئی بات نہ پوچھی نہ کہی پھر جب بچوں پر بھید کھلنے اور طعنوں کی نوبت آ گئی تو رجنی نہ صرف کام چھوڑنے بلکہ محلہ چھوڑنے پر بھی اڑ گئی۔ کالو پھر بھی ٹال مٹول ہی کرتا رہا۔ آخر وہ محلہ چھوڑ کر کہاں جاتا؟ اور نوکری سے تو وہ خوگر ہو ہی چکا تھا۔

پھر اچانک ایک دن ایسی بات ہو گئی۔ جس پر بہت دن تک رجنی کو یقین اور اعتبار نہ آیا۔ کالو کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ رجنی نے پہلی ہی بار جانا کہ کالو کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ قبل ازیں کہ رجنی کچھ پوچھے کالو نے گمبھیر آواز میں کہا "رجنی، تم کب سے محلہ چھوڑنے کی ضد کر رہی ہو مگر اب ہم تمہیں چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔ نوکری کی بھی ایسی تیسی۔"

رجنی چونک پڑی۔ "کیوں؟ ایک دم ایسا کیا ہو گیا!"

"لوگ مجھے پیشہ ور قاتل اور قصائی سمجھنے لگے ہیں۔" کالو کی سانس تیز ہو گئی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

"ہاں!" کالو کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "میں ابھی ایک بڑے آدمی کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہ ایک مہینے سے مجھ پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ آج اس نے کہا۔ "کالو، پورے بیس ہزار کا انعام ہے۔ دس ہزار ایڈوانس۔ ایک دشمن کو ٹھکانے لگانا ہے —— اور بھی بہت کچھ کہا۔ اف، میں تو پسینے پسینے ہو گیا . . . ."

رجنی پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ آنکھوں میں آنسو! ●●

بقیہ: گواہ

منی کے بال سہلانے کے بعد اس نے جب منی کی جانب دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ اب تک جاگ رہی تھی۔ نانی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بولی "نانی ماں! کیا وہ لوگ باپ کو بھی ویسے ہی آگ میں جلائیں گے۔ جیسے انھوں نے ماں کو جلا دیا تھا؟"

سومترا کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، اسے روتا دیکھ منی خاموش ہو گئی اور کچھ حد تک غلطی کے احساس نے بھی اسے گھیر لیا۔

اپنی ننھی ہتھیلیوں سے نانی کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ معذرت کے انداز میں بولی "نانی ماں! مت روؤ۔ اب ہم آپ سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔"

سومترا نے رونا بھول اسے اپنے قریب کھینچ لیا، اور بولی "کہانی سنو گی منی؟" منی نے فوراً ہاں کہہ دی۔ سومترا کہنے لگی،

"ایک راجہ تھا اس کی ایک رانی تھی، اس کے کوئی اولاد نہ تھی . . .

اچانک ہی منی بول اٹھی، "اچھا ہوا نانی؟"

"کیا؟" سومترا نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔" منی بولی۔ "نہیں تو جب راجہ رانی کو مارتا تو اسے بھی میری طرح کچہری میں جانا پڑتا اور وکیلوں کی باتوں کا جواب دینا پڑتا۔"

سومترا کا چہرہ اداس ہو گیا۔ اس نے اندھیرے میں اپنے پاس لیٹی منی کے معصوم چہرے پر بچپن کی لکیریں تلاش کرنے کی بیکار کوشش کی! لیکن اسے لگا بچپن اس بچی سے کہیں بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا، سومترا کا دل کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھا، دور آسمان میں بگولوں کا ایک جھنڈ تیز آواز کرتا ہوا اڑتا جا رہا تھا۔ ●●

شفیع مشہدی

پھیر سمے کا

"قیامت کی صور پھونکنے کو مجھے زندہ رہنا ہے" دلہن بیگم نے بیزاری سے کہا اور ان کے چہرے پر پڑی شکنیں اور گہری ہو گئیں — صحن میں بچھے تخت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے خاصدان سے گلوری کھائی - انگلی پر چونا لیا، گاؤ تکیے پر ٹیک لگا کر پہلو بدلا اور خالی خالی نظروں سے خان بہادر کی طرف دیکھنے لگیں، جو آرام کرسی پر نیم دراز آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔

دبلی پتلی نازک سی دلہن بیگم اب بھی سیدے کی لوئی کی طرح سفید تھیں - پان کی سرخی اُن کے لبوں پر پھیل رہی تھی - اور وہ کرسی پر دراز خان بہادر کی طرف ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں - خان بہادر کی مونچھیں اب سفید ہو گئی تھیں - کمر خمیدہ اور چہرے پر ماہ و سال کے ان گنت نقوش شکنوں کی شکل میں بکھرے ہوئے تھے - ایک لمحے کے لیے خان بہادر کی جوانی، چھریرا جسم، تنی ہوئی مونچھیں اور سارا بانکپن دلہن بیگم کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

"دادی جان، ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کے معدے میں السر ہے، اس لیے چنے کا ستو استعمال کریں۔" راشد نے دادی کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا - پوتے کی بات سن کر دلہن بیگم نے نگاہیں اٹھائیں اور بڑی متانت سے بولیں — "بیٹے، میں چنے کھاؤں گی تو خان بہادر کے گھوڑے کیا کھائیں گے؟"

خان بہادر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور دلہن بیگم کی طرف دیکھنے لگے - تخت پر بیٹھی دلہن بیگم کی شبیہ بدلنے لگی اور چالیس سال پہلے کی نئی نویلی دلہن بیگم جن کا نام عابدہ تھا، اُن کی نگاہوں میں گھوم گئیں - کتنی شان و شوکت سے بیاہ کر لائے تھے انہیں - کیسا جشن ہوا تھا - سارے علاقے میں شادی کی دھوم تھی - شجاعت علی تعلقدار کے اکلوتے بیٹے وجاہت علی کی شادی میں ایسی دھوم ہونی بھی چاہیے تھی - دلہن لاکھوں میں ایک تھی۔ جو دیکھتا نگاہیں اس پر جم کر رہ جاتیں - وجاہت علی تو جیسے دیوانے ہو گئے تھے - جب دیکھو کسی نہ کسی بہانے سے زنان خانے کا چکر لگا رہے ہیں - ماں دیکھ کر مسکرا دیتیں - مغلانی بی نے ہنس کر کہا تھا - ان دونوں کو کچھ دنوں کو کہیں بھیج دیجیے بڑی بیگم - ذیشان نواب کے صاحبزادے شادی کے بعد دلہن کو لے کر کچھ دنوں کے لیے وہاں گئے تھے — وہ کیا کہتے ہیں کہ پہاڑ پر - بیس پچیس دن رہ کر آئے - گھر میں تو مہمان بھرے ہیں - اللہ رکھے اتنی بڑی حویلی ہے پھر بھی ..... اور اماں نے کہا - "تم تو سٹھیا گئی ہو مغلانی بی - پہلے پھیرے کی دلہن اور کالے کوسوں بھیج دوں؟ ذیشان نواب کی بات اور ہے - لندن رہ کر کیا آئے ہیں، آدھے انگریز بن گئے ہیں - پھر مسکرا کر بولیں - "اتنے ارمانوں سے بیاہ کر لائی ہوں گڑیا جیسی دلہن کو - اتنی جلدی الگ نہیں کروں گی - ابھی تو ساری رسمیں باقی ہیں - گھومنے کو تو عمر پڑی ہے، اللہ رکھے۔" وجاہت علی شرما کر باہر چلے گئے۔

بھاری غراروں اور روپہلی دوپٹوں میں روپہلی عابدہ کا حسن کچھ اور نکھر گیا تھا - ساس دل و جان سے فدا تھیں اور شوہر صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ نواب شجاعت علی جن کے رعب و دبدبے سے علاقہ تھرّاتا تھا، صبح کو جب حویلی میں تشریف لاتے تو ہر طرف باادب با ملاحظہ کا سماں ہوتا - نوکر چاکر یا تو کام میں لگے ہوتے یا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ تخت پر بیٹھی مغلانی بی سر پر سفید آنچل کو سنبھال کر پان لگانے لگتیں - بڑی بیگم بھی سنبھل کر بیٹھ جاتیں۔ اور نواب صاحب اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے۔ دلہن بیگم اپنے کپڑے سنبھالے، آنچل کو چہرے پر گرائے بڑے ادب سے آتیں اور مہندی لگے گورے گورے ہاتھوں سے جھک کر سلام کرتیں - نواب صاحب

سی - ۳۱۰، نیو آفیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ (بہار)

کی نگاہیں اٹھتیں اور دبیتی رہیے کہہ کر جھک جاتیں مغلانی بی دلہن کے ہاتھ میں چاندی کا خاصدان دے دیتیں اور وہ دھیرے دھیرے قدموں سے بڑھ کر خاصدان نواب صاحب کے سامنے رکھ کر ساس کے پہلو میں بیٹھ جاتیں۔ یہ سب کچھ روزانہ بڑے میکانیکی انداز میں ہوتا اور اکثر عابدہ کو اس رکھ رکھاؤ سے الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ صدیق احمد اسکول ماسٹر کی بیٹی عابدہ کو تو باپ کے گلے میں جھول جانے کی عادت تھی۔ آم کے باغ میں جھولا جھولنے اور کچی امبریاں کھانے کی عادت تھی۔ اسے یہ سب کچھ انتہائی مصنوعی دکھائی دیتا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے وہ اس کی عادی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ نواب شجاعت علی کی اکلوتی بہو بننا مذاق تھوڑے ہی تھا۔ اسی لیے اسے جب اپنی شادی کا پتہ چلا تو مارے گھبراہٹ کے پسینے آنے لگے تھے۔ شادی کے بعد ریشمی اوہار سے سجی بنی پالکی نواب صاحب کے آنگن میں کہاروں نے رکھی تھی تو اس کا دل سینے سے باہر آنے کو اچھلنے لگا تھا۔ اس پر گھبراہٹ کے مارے غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ ریشمی اوہار میں لگی چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جھنجھنا اٹھی تھیں۔ اور ایک چہرہ پالکی کے اندر جھانکنے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے کانوں میں ہزاروں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور اسی کے درمیان اسے آواز سنائی دی تھی۔ دلہن تو چاند کا ٹکڑا ہے مبارک ہو بیگم صاحبہ۔ آپ کے آنگن میں چودھویں کا چاند اتر آیا ہے۔" ذرا میں بھی تو دیکھوں۔" ایک رعب دار آواز گونجی، جو شاید بیگم صاحبہ کی تھی اور عابدہ اور سمٹ گئی تھی۔ پھر دلہن کو اتار لیا گیا۔ چاندی کے جلتے ہوئے چراغوں کی لو پر پان گرم کر کے اس کے گال سینکے گئے۔ چاول اور چاندی کے سکے اس پر نچھاور کیے گئے۔ کسی نے گود میں اٹھا کر اسے سجے سجائے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ مراثنیں گلا پھاڑ پھاڑ کر گیت گا رہی تھیں۔ پھر اس کی ہتھیلیاں کھول کر اس میں میوے اور میٹھی بوندیاں بھر دی گئیں۔ اور کسی نے کہا "ہاتھ بڑھا کر ساس کو دو۔" کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ نرم گداز ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر بیگم صاحبہ نے دعائیں دی تھیں —— "جگ جگ جیو —— دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو ——" اور اس کے ہاتھ میں پانچ اشرفیاں رکھ دی تھیں۔ رسومات کا سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہتا کہ اچانک محفل میں زلزلہ سا آگیا —— نواب صاحب محفل میں تشریف لا رہے ہیں کی سرگوشیاں ایسی گونجیں کہ ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ کسی نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ اوپر کی طرف اٹھا دیا تھا۔ سلام کرو۔ نواب صاحب ہیں۔ آنکھیں بند کیے کیے ہی اس کے مہندی رچے ہاتھ اٹھ گئے تھے۔

"ماشاء اللہ۔ چشم بد دور —— جیتی رہیے۔" بھاری بھرکم آواز گونجی تھی۔ اور نواب صاحب نے ہیروں کے جڑاؤ سیٹ کا ڈبہ سامنے رکھ دیا تھا۔ تب سے یہ معمول تھا کہ ہر صبح نواب صاحب تشریف لاتے۔ عابدہ سلام کر کے خاصدان پیش کرتی۔ جیتی رہو کی دعا لیتی اور ساس کے پہلو میں بیٹھ جاتی۔

کیا سوچ رہے ہیں یہ؟ دلہن بیگم نے جو اس معمول کے ساتھ اب بوڑھی ہو چکی تھیں شوہر کے نحیف چہرے پر نظر ڈالی۔ چہرہ جو عمارت کی گزشتہ عظمت کی کہانی دوہراتا ہوا کھنڈر تھا، سہانی رات کو مخملی بستر پر پھولوں سے لدی مسہری پر ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے والا یہ چہرہ —— انہوں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ اب بھی وہی نوجوان دلہن تھیں —— لیکن اب —— اب کیا رہ گیا تھا۔ اس سارے تام جھام، شان و شوکت کے بعد —— انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے پھر شوہر کی طرف دیکھا جو کرسی پر نیم دراز تھے۔ وہ خود بھی خیالات میں گم ہو گئیں۔

دیکھتے دیکھتے زمانہ بدل گیا۔ شجاعت علی کے ساتھ نوابی بھی چلی گئی۔ بچ گیا صرف وجاہت علی کو دلوایا ہوا خان بہادر کا خطاب۔ شجاعت علی املاک پر قرض چھوڑ گئے تھے، لیکن بڑی بیگم صاحبہ پرانی آن بان شان میں ایک پیسے کی کمی کی روادار نہیں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد تو نہ نوکروں کا ہجوم رہا، نہ گھوڑے تھے اور نہ مصاحب۔ حویلی کی رونق رخصت ہو چکی تھی اور باقی رہ گیا تھا ایک اداس سناٹا۔ وجاہت علی اگر بیگم کے پاس ہوتے بھی تو سوائے بلڈ پریشر، کمر کے درد اور مہنگائی کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع گفتگو نہ تھا۔ بیٹے اپنی اپنی بیویوں کے پاس مگن تھے۔ بوڑھوں کے پاس کون رہتا۔ البتہ ان کا چھوٹا پوتا راشد دادی دادا سے بہت ہلا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بار بار دلہن بیگم کے پاس آتا رہتا تھا۔ ورنہ دلہن بیگم اور پرانی وفادار مغلانی بوا، جو اب بوڑھی پھوس ہو چکی تھیں۔ پان بنا بنا کر خاصدان سجاتی رہتیں۔

راشد کی آواز نے ایک بار پھر خیالات کا سناٹا توڑا۔" دادی جان! آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ آپ کو چنے کا ستو کھانا چاہیے۔ ابا جانی سے کہوں کیا کہ وہ ستو منگوا دیں؟"

"میں نہیں کھاتی" دلہن بیگم نے جھڑک کر کہا اور خان بہادر کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھا —— گھبرا کر خان بہادر نے کرسی پر پہلو بدلا اور آنکھیں بند کر لیں —— شکار سے واپس آتے ہوئے ان کا سمندی گھوڑا دوڑتا ہوا جیسے ہی حویلی کے پھاٹک پر آیا، رامو نے بڑھ کر راس تھام لی اور وجاہت علی ایک ہی جست میں گھوڑے سے کود کر زمین پر آ گئے۔ برجس، شکاری ٹوپی، کندھے پر رائفل اور ہاتھ میں ہنٹر لیے وجاہت علی کی قابل رشک جوانی دلہن کے دیدار کے لیے بے چین تھی۔ نئی نئی شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ تین دنوں تک دلہن سے الگ رہے تھے۔ رائفل رامو کو تھما کر وہ تیز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ مخملی بستر پر نیم دراز دلہن بیگم دنیا و مافیہا سے بے خبر چاندی کی طشتری میں رکھے بھنے ہوئے چنے

کھا رہی تھیں۔ بھُنے ہوئے چنے ان کی کمزوری تھے — جس گھر میں میووں کی فراوانی تھی، وہاں دُلہن کو بھُنے ہوئے چنوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے عشق تھا۔ پھر کرڑ کرڑ دانت کے نیچے آکر جب چنے ٹوٹتے تو پورے منھ میں ایک عجیب سی مسرت آمیز لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ ایک ایک دانہ مونہہ میں ڈال کر وہ چنوں کا لُطف لے رہی تھیں کہ وجاہت علی اچانک کمرے میں داخل ہوئے اور دلہن کے ہاتھ سے طشتری چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ گھبرا کر اُنھوں نے طشتری نیچے رکھ دی تھی۔ وہ بے حد شرمندہ سی ہوگئی تھیں۔ نواب شجاعت علی تعلقدار کے اکلوتے بیٹے کی دُلہن اور چنے کھائے — وجاہت علی کی پیشانی پر شکن اُبھر آئی .... عابدہ کے بے پناہ حُسن نے تو وجاہت علی کا دل جیت لیا تھا اور اُنھوں نے اپنے والدین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک معمولی گھرانے کی بیٹی عابدہ کو بہو بنانے پر راضی ہو جائیں، مگر اب تو وہ معمولی گھرانے کی عابدہ نہیں رہی تھی بلکہ نواب شجاعت علی کی بہو تھی۔ پھر یہ چنے ..... وجاہت علی کو جیسے جھٹکا لگا۔

"کیا گھر میں پستہ بادام اور میووں کی کمی ہے بیگم جو آپ چنے کھا رہی ہیں۔" وجاہت علی کی آواز میں سختی تھی۔ عابدہ گھبرا گئی۔

"نہیں تو — مجھے اچھے لگتے ہیں چنے۔" عابدہ نے سہم کر کہا تھا۔

"مگر اب تو آپ نواب وجاہت علی کی بیگم ہیں۔ صدیق احمد ماسٹر کی بیٹی نہیں جو آپ کو چنے کھانے پڑیں۔" وجاہت علی کی آواز میں طنز تھا۔ باپ کا نام سُن کر عابدہ کو شدید صدمہ ہوا اور اُسے ایسا لگا جیسے اُس کی عزت کے منھ پر کسی نے طمانچہ مار دیا ہو۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ابھی وہ کچھ بولنا ہی چاہ رہی تھی کہ وجاہت علی نے دوسرا وار کر دیا۔

"آپ سارے چنے کھا جائیں گی تو ہمارے گھوڑے کیا کھائیں گے۔"

عابدہ نے آنسو ضبط کیے اور پیروں کے پاس پڑی چاندی کی طشتری کو ایک زبردست ٹھوکر لگائی۔ طشتری سیدھی دیوار سے ٹکرائی اور چنے فرش پر بکھر گئے۔

چالیس سال پہلے کی یہ بات عابدہ کو جو عرفِ عام میں دُلہن بیگم اور بڑی بیگم کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ کہلانے لگی تھی، اچھی طرح یاد تھی۔ اُس دن کے بعد سے اس نے آج تک چنے کو چھُوا نہ تھا۔ حتیٰ کہ اگر کبھی چنے کا حلوہ بنتا اور خان بہادر اصرار بھی کرتے تو وہ دھیرے سے کہہ دیتی۔ میں چنے کھاؤں گی تو آپ کے گھوڑوں کا کیا ہوگا؟

خان بہادر کی بات اس کے دل کو چھید گئی تھی۔ اور اب بھی جب کہ سب کچھ بدل چکا تھا، شان و شوکت مونہہ موڑ چکی تھی، حویلی میں دھول اُڑ رہی تھی اور وجاہت علی کے خان بہادر والی دستاویز پر گرد کی تہیں جم چکی تھیں، عابدہ کو وہ بات یاد تھی۔ پیٹ میں السر ہونے کے باعث ڈاکٹر اُسے چنے کے استعمال کا مشورہ دیتے تھے، وجاہت علی اصرار کرتے تھے، مگر بیگم کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں چنے کا استعمال نہیں کریں گی۔ اُن کی ایک ہی رٹ تھی، میں چنے کھاؤں گی تو خان بہادر کے گھوڑے کیا کھائیں گے؟

کرسی پر نیم دراز خان بہادر تلملا اُٹھے — اُنھوں نے دھیرے سے کہا "بیگم اب ضد چھوڑیے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، اس لیے کھانا ضروری ہے۔

میں خان بہادر وجاہت علی کی بیگم ہوں ماسٹر صدیق احمد کی بیٹی نہیں ہوں کہ چنے کھاؤں گی۔ ان کا لہجہ انتہائی سفاک تھا۔ خان بہادر اس چوٹ کی تاب نہ لا سکے اور باہر چلے گئے — دُلہن بیگم کے اندر سہمی رہنے والی عابدہ مسکرا پڑی۔

بقیہ: جوئے لدّاخ

ایک اٹوٹ عقیدہ ہے اور ہندوؤں کی کالی دیوی بھی اسی عقیدے کی نمائندگی کرتی ہے۔

ہم بس میں بیٹھے ہوئے ان خانقاہوں کے خدوخال دیکھتے ہوئے لیہہ کے فوجی ٹرانزٹ کیمپ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ فوجی کیمپ شہر سے پانچ چھ کلو میٹر دُور ہے۔ یہاں سے شہر جانے کے لیے کوئی باقاعدہ سواری کا انتظام نہیں ہے۔ اس لیے سنیل نے ہمیں شہر میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی رائے دی تھی۔ اتفاق سے ہمیں ٹیکسی مل جاتی ہے اور ہم اپنا سامان ٹیکسی میں منتقل کر دیتے ہیں۔

ہم ابھی تک کوہستانوں کے انوکھے روح پرور نظاروں میں محو ہیں جو ہم سب کے دل و دماغ پر اَن مٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔ ●

یتا منوچا/زین اللہ صدیقی

گواہ

سومترا نے اپنے لمبے بالوں کو جوڑے میں باندھنے کے بعد ماتھے پر سندور کا ٹیکا لگانے کے لئے جیسے ہی آئینہ میں دیکھا تو وہ چونک اٹھی، ایک ہی رات میں اس کا چہرہ جیسے جھرّیوں سے ڈھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے پکارا " مِنّی ! مِنّی اس کی پانچ سالہ نواسی تھی اور آج کچہری میں اس کی پیشی تھی۔ بچی کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے باپ کو نشے کی حالت میں اپنی بے ہوش ماں کے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑکنے کے بعد سگریٹ لائٹر سے آگ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ مِنّی اس بات کی اکیلا جیتا جاگتا ثبوت تھی کہ کس طرح ایک زندہ انسان آگ کی لپٹوں میں جھلس کر ایک مٹھی راکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اسی لیے انصاف کے محافظوں کے لیے اس کی جج کے سامنے گواہی ضروری ہو اٹھی تھی۔ سومترا اپنی بیٹی کی اچانک مرنے کے دکھ میں بھی اتنی بے چین نہیں ہوئی تھی جتنی آج یہ سوچ کر ہو رہی تھی کہ یہ معصوم بچی وکیلوں کی بحث کس طرح جھیل پائے گی۔

مِنّی کے لیے آج کا دن کسی جشن سے کم نہیں تھا۔ آج اسے اس کی پسند کا پھول دار فراک پہنا کر اس کے بالوں میں رنگین ربن کے پھول ٹانکے گئے تھے۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ عدالت میں اس سے جو پوچھا جائے اس کا جواب وہ اتنا ہی دے، جتنا اس کو معلوم ہو، اور پھر اس کی فراک کی جیب میں ڈھیری ٹافیاں بھر دی گئی تھیں۔ سومترا نے ننھی مِنّی کے حوصلے سے بھرے چہرے کو دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام باہر کی طرف چل دی۔

عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، کہیں وکیلوں کی بھیڑ تو کہیں مقدموں کے لیے آئے لوگوں کا جمگھٹ مِنّی نے سومترا کا ہاتھ کس کر تھام لیا، اس کی ننھی ہتھیلی پسینے سے تر ہو گئی تھی، تبھی سومترا کے ذریعہ رکھا گیا وکیل تیزی سے اس کے پاس آیا اور بولا ——— پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ مرنے سے پہلے زبردستی کی گئی تھی۔ اس کے پورے بدن پر کھروچوں کے نشان ملے ہیں۔ سومترا ہچکیوں میں رو اٹھی، " ہاں وکیل صاحب، جہیز میں بہت زیادہ دولت نہیں مل پانے کی وجہ سے اس کا وحشی پتی اپنا خود کا کاروبار نہیں کر پایا تھا، اسی لئے اپنے آفس میں ترقی کے لئے وہ اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لئے میری بیٹی کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات میری بیٹی نے مجھے بتائی تھی، وہ ہمیشہ اپنے پتی کی اسی وجہ سے مخالفت کرتی رہتی تھی، وکیل کا سر سنجیدگی سے ہلنے لگا، تو شاید اس رات اس پر عصمت دری کی کوشش ہوئی ہو اور بدلے کی بنا پر ہی اس کی یہ حالت کر دی گئی ہو۔ مِنّی اب تک نہ سمجھ میں آنے والے اس تمام بات چیت کو بہت غور سے سُن رہی تھی، اس نے نانی کی طرف گردن موڑ کر بہت سنجیدگی کے ساتھ پوچھا، " نانی ماں ! عصمت دری کیا ہوتی ہے ؟ " سومترا اور وکیل دونوں کے سر شرم سے جُھک گئے۔ مِنّی نے حالات کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے اپنا سوال نہیں دُہرایا بس سومترا کے ہاتھ کو اور بھی مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے وہ کوئی ننھی بچی ہو اور مِنّی سے ہاتھ چھوٹنے پر اس کا بھیڑ میں کھو جانے کا ڈر ہو۔ اور تبھی اس کا مقدمہ شروع ہو گیا، سومترا مِنّی کو لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ مِنّی اونچی کُرسی پر بیٹھے آدمی کی طرف اشارہ کر کے بولی، " نانی ماں ! وہ کون ہے؟ " سومترا نے کہا " اسے جج کہتے ہیں " اور مِنّی کو گواہ کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا، حفاظتی وکیل نے پوچھا " کیا تم نے اپنے باپ کو اپنی ماں کے کپڑوں میں آگ لگاتے دیکھا تھا ؟ " مِنّی نے ایک بار سومترا کی طرف دیکھا اور جواب دیا " ہاں "۔

" تمہاری ماں اور باپ کے آپسی تعلقات کیسے تھے ؟ " وکیل نے اپنا اگلا سوال کیا، مِنّی نے پوری معصومیت کے ساتھ اپنی پلکیں جھپکا دیں، وکیل نے اپنا سوال دُہرایا، کیا تمہارے باپ تمہاری ماں سے لڑتے تھے ؟ " اور اسی وقت مِنّی کا باپ اس

• آفس ایگزیکیٹو انجینئر، ٹمپوریری ڈویژن نمبر ۱ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی، ضلع بستی (یو۔ پی)

رے میں داخل ہوا، منّی باپ کی جانب کچھ لمحہ تک
ھتی رہی اور پھر اچانک چلّا اٹھی، "اُسے روکو! وہ
یطان ہے! اس نے میری ماں کو مار ڈالا اور اب
ہ نانی ماں کو مارنے آیا ہے۔" اور پھر ننھی ہتھیلیوں
 اپنا چہرہ چھپا، وہ سسکنے لگی۔ جج نے اُسے
اں سے لے جانے کا حکم دیا، سومترا روتی ہوئی بچی
 باہوں میں بھر کر کمرے سے باہر لے آئی۔

گھر آنے پر منّی کا دل کسی کھیل میں نہیں لگ
، اُسے یاد آ رہا تھا کہ کیسے اس کا باپ روزانہ
ی رات میں شراب پی کر گھر لوٹتا تھا اور اس
 ساتھ سوئی ماں کو اُٹھا کر زبردستی دوسرے
رے میں لے جاتا تھا، پھر وہاں دیر تک ان کے
ڑنے اور پھر ماں کے رونے کی آوازیں آتی
 تھیں، منّی کا شراب کی بُو سے تعارف بہت
ین سے ہی ہو گیا تھا، اسے معلوم ہو گیا تھا کہ
اب پی کر آدمی لڑکھڑانے لگتا ہے اور مار پیٹ
 کرتا ہے، ماں اسے ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی تھی
 لئے عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ماں کے
ہ ہمدردی اور باپ کے لئے غصہ برابر بنیتا
 تھا، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ باپ کو اس
سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جانے کو کہہ دے،
 کے لائے فراک اور کھلونے بھی اسے کبھی خوش
 کر پاتے تھے، ماں کو اس بے رحم آدمی کے
 سے بچائے رکھنے کے لئے وہ زیادہ تر ماں
 ساتھ ساتھ رہتی، کیونکہ اس کی موجودگی میں
، ماں سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ اپنے باپ کا چہرہ
 کر اسے کہانیوں کے اس جادوگر شیطان
د آ جاتی جو ایک رانی کو اس کے محل سے اُٹھا
نا اور اسے طاقت کے زور پر اپنی بیوی بنا
ں پر من مانے ظلم کرتا تھا، منّی کی ماں نے اپنے
ب کی مرضی کے خلاف منّی کے باپ سے شادی
ا، اسی لئے عرصہ تک چپ رہ کر وہ یہ سب
شت کر رہی تھی، آخری کچھ دنوں میں اس کی
ی ختم ہو گئی تھی اور اس نے اپنی ماں کو اپنے
باپ کے ظلموں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔
اتنے پر بھی اس خوددار نے اپنی ماں سے دولت کی
مدد لینا منظور نہیں کیا تھا اور آخر کار اس خوش حال
گھرانے کا یہ المناک نتیجہ دیکھ سبھی ششدر رہ گئے
تھے۔ اس روز اچانک ہی ایسا ہو گیا تھا کہ کچھ گرنے
کی آواز سے اُٹھی منّی اپنے باپ کے کمرے سے نکل
کر ماں کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی اور اس نے اپنے
باپ کو نیچے زمین پر پڑی ماں کے جسم پر مٹی کا تیل
ڈالتے دیکھ لیا تھا۔ ابھی وہ خوفناک حالات کو سمجھ بھی
نہ پائی تھی کہ باپ نے لائٹر جلا کر ماں کے کپڑوں میں
آگ لگا دی تھی۔ منّی آگ کے شعلوں کو دیکھ کر گھبرا
اٹھی اور ماں کی جانب بھاگی، لیکن تبھی دو مضبوط ہاتھوں
کی گرفت نے اسے روک دیا اور وہ چھٹپٹا کر رہ
گئی۔ اس کا منہ باپ نے اپنے ہاتھ سے بند کر دیا
اور دوسرے کمرے میں لے آئے۔ اگلی صبح گھر میں
منّی اکیلی تھی اور سسک سسک کر پاس پڑوس سے
اکٹھا ہوئے لوگوں کو اپنے باپ کے ظلم کے بارے
میں بتا رہی تھی۔ فرار باپ کو جلد ہی پولیس نے ڈھونڈ
نکالا۔ تبھی سومترا منّی کو اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے اپنے یہاں لے آئی تھی۔ منی ماں کے ساتھ رہ کر
اپنے بچپن کے اخلاق کو پیچھے چھوڑ آئی تھی اور ماں
کی طرح ہی اس کا اخلاق قدرتی طور سے سنجیدہ ہوتا
چلا گیا تھا۔ کسی معمولی سے واقعہ پر بھی وہ ضرورت
سے زیادہ وقت تک خیال کرتی رہتی تھی۔ آج بھی
عدالت سے لوٹنے کے بعد کتنے ہی سوال اسے کرید
رہے تھے۔ "جج کون ہوتا ہے؟" باپ ابھی تک آزاد
کیوں گھوم رہے ہیں؟ وکیل نے اس سے یہ کیوں کہا
کہ سچ بولنا؟ کیا اسے نہیں معلوم کہ اچھے بچے جھوٹ
نہیں بولتے؟ عصمت دری کیا ہوتی ہے؟ جیسے کئی
ایک سوال منّی کے دماغ میں اُبھر رہے تھے جن کا جواب
ملنا اسے ضروری معلوم ہو رہا تھا۔ وہ جواب پانے
کی خواہش نہ کرتے ہوئے، نانی کے پاس چلی آئی لیکن
نانی کا اُداس چہرہ دیکھ کر اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا
وہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ کل اسکول میں اپنی پیاری ٹیچر سے
ہی یہ سب پوچھے گی۔ یہ سوچنے کے بعد اس کے دل
کو تھوڑا سکون ہو گیا اور وہ آ کر باغیچے میں بیٹھ گئی۔ سامنے
پارک میں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ منّی اضطرابی سے ان
کی طرف دیکھنے لگی۔

تبھی پڑوس کے گھر کی ایک لڑکی اسے کھیلنے
کے لئے دعوت دینے آئی۔ "چلو ہم بھی کھیلیں گے"۔
منّی نے سیدھے انداز میں اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔
اور اس کے ساتھ چلی گئی۔ تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد
اچانک ہی اس لڑکی کی ماں نے اسے پکارا "چلو
شالو، تمہارا دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے۔" شالو نے
منّی سے کہا "میں اب نہیں کھیلوں گی، میری ماں بلا رہی
ہے۔" منّی نے آواز کی سمت میں دیکھتے ہوئے جیسے اپنے
آپ سے پوچھا، کیا تمہارے باپ بھی ماں کو مارتے ہیں؟
شالو نے کافی عقلمندی سے سر ہلا دیا۔ "چھی،
گندی بات، باپ بھی کبھی ماں کو مارتے ہیں، وہ تو اُن
سے پیار کرتے ہیں۔" اور وہ اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔
منّی خاموش اپنے گھر میں آئی اور سومترا کی گود میں منہ چھپا کر
سسکنے لگی۔ سومترا نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا،
"کیا ہوا؟" آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر وہ بولی —
"نانی ماں! کیا تم ہمیں پیار کرنے والے اچھے ماں باپ
دلا دو گی؟" سومترا کا دل سخت زمین پر گرے کانچ سا
چٹخ گیا۔

اس دن رات کو گھر کے سب کام سے چھٹکارا
پا کر سومترا منّی کے لئے دودھ کا گلاس لے کر اس کے
پاس آ بیٹھی، دودھ گرم تھا، منّی نے گلاس تھام کر اسے
واپس رکھ دیا۔ سومترا کے پوچھنے پر بولی "ابھی گرم
ہے" اور پھر کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد
اچانک پوچھا "نانی ماں! جب ماں آگ میں جلی تھی تب
کیا اسے اتنا ہی گرم لگا ہو گا؟"

سومترا نے منّی کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا
اور بولی "نہیں منّی بے ہوشی میں کچھ بھی گرم ٹھنڈا نہیں
لگتا، تمہاری ماں بے ہوش تھی نا!" منّی نے خاموش
دودھ پی لیا۔

سومترا وہیں اس کے ساتھ لیٹ گئی، دیر تک

(آگے صفحہ ۳۶ پر)

نام کتاب: میری بیوی
مصنف: فکر تونسوی
صفحات: ۲۶۴ — قیمت: ۳۰ روپے (پبلشر کی مرضی پر)
ناشر: آہلو والیہ بک ڈپو، روہتک روڈ، نئی دہلی ۵

فکر تونسوی بھی عجیب آدمی ہیں۔ جتنا ہنسا رہے ہیں، اتنے ہی تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ تازہ کتاب انہوں نے خود لکھی بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے ہندوستان میں اور ہماری اردو زبان میں اتنی تیز رفتاری اور خلوص سے لکھنے والے ادیبوں میں شاید دو ہی نام لیے جا سکتے ہیں۔ سنجیدہ نگاروں میں خواجہ احمد عباس اور طنز نگاروں میں یہ فکر تونسوی۔ بیماری کے معاملے میں بھی مقابلہ کڑا ہی رہا۔ فکر تونسوی کی 'میری بیوی'، غالباً بیسویں کتاب ہوگی۔ خواجہ صاحب ہفتہ وار کالم لکھتے تھے، لیکن فکر نے برسوں یہ کام روزانہ کیا ——— روزانہ کے کالم کو تو میں کوہِ غم سمجھتا ہوں، جو فکر تونسوی پر مسلسل ٹوٹتا رہا۔ پھر ان کی مضمون نگاری اور تصنیفات۔

فکر اپنی کتابوں کے نام بھی کچھ ایسے ڈھونڈتے ہیں کہ پیار تو آتا ہی ہے، غصہ بھی آتا ہے۔ 'بدنام کتاب' بھی کوئی نام ہے لیکن یہ واقعی بہت بدنام ہوئی۔ 'فکر نامہ'، 'فکر بانی'، 'بات میں گھات' یہ بھی کوئی نام ہوئے اور پھر مضامین کے عنوانات تو اور بھی بے ڈھنگے۔ مثلاً 'خاوندوں کی قلت'، 'چوہڑ تال کریں گے'، 'لاش کا کیش میمو' وغیرہ وغیرہ۔ اب ان کی کتاب آئی ہے تو نام رکھا گیا ہے "میری بیوی"

ہمارے ہندوستان میں اور ہماری اردو میں بہتوں کی بیویاں مشہور ہیں بلکہ شہرۂ آفاق ہیں، لیکن "میری بیوی" یعنی فکر کی بیوی کی شہرت کی گرد کو بھی یہ شہرۂ آفاق بیویاں پہنچ نہیں پائیں گی۔ (اس جملے میں تھوڑی سی تعقید ہے۔ جو نثر نگار شاعری کرے گا، اس کے جملوں میں تعقید تو ہوگی ہی)

"میری بیوی"، کوئی مزاحیہ ناول نہیں ہے بے حد طنزیہ ہے۔ اس میں غضب کی جھنجھلاہٹ، درد، غم، آنسو، پچھتاوا اور اس قسم کی دیگر اشیاء موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فکر تونسوی نے ان سب پر مونا لیزا کی غیر محسوس مسکراہٹ بکھیر دی ہے۔ ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر آدمی مسکراتا نہیں، سوچتا ہے۔ "میری بیوی" تقسیمِ ہند کے واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور گو موضوع نیا نہیں ہے، فکر کی تحریر نئی ہے۔ اچھے اور بامعنی جملوں کی فکر کے یہاں کبھی کمی نہیں رہی۔

"ضرورت پوری ہو گئی کیوں کہ ان دنوں ہر ضرورت جھوٹ سے پوری ہوتی ہے۔"

"عجیب زمانہ چل رہا تھا۔ لوگ جھوٹ بھی بولتے تھے اور اپنا ایک اصول بھی رکھتے تھے۔ کیا جانے جھوٹ بولنا بھی ایک اصول ہو" ———

تقسیمِ ہند کے بعد جب ریفیوجیوں نے اپنے کلیم (مطالبات) بنائے تو اس اصول کو سامنے رکھا۔

فکر نے یہی بات بار بار کہی ہے۔ "سچے دشمن جھوٹے دوست" میں فکر کی بے بسی اس طرح ہوئی کہ ایک چندہ مانگنے والے شخص نے اُن سے کہہ دیا:

"رکھیے یہ ایک روپیہ اپنے پاس۔ میں کل آکر بی بی جی سے لے جاؤں گا۔ آپ خاوند ہوں گے مگر وہ آپ سے زیادہ فراخ دل ہیں۔ پانچ روپے سے کم نہیں دیتیں۔"

فکر کو گیراج والے دوکان دار کے آگے بھی شرمندہ ہونا پڑا لیکن فکر شرمندہ کب ہوتے ہیں۔ (یہ کام انہوں نے سیکھا ہی نہیں)

وہ بولا ——— "تو یوں کہیے نا میم بی بی کا آرڈر ہے۔ لے جائیے صابن کی ٹکیاں۔ اچھا تو آپ ان کے خاوند ہیں؟"

فکر بولے: "جی ہاں' میں ہی اس مصیبت میں مبتلا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر گھر کی طرف باقاعدہ بھاگ گیا۔ دو ٹکیاں دے کر بیوی سے کہا۔ "اچھا تو یہ ہے گیراج والا دوکان دار۔ بڑا نیک نفس انسان ہے۔ تمہیں تو خیر جانتا ہے۔ مگر مجھے تم سے زیادہ جانتا ہے بصرف جانتا ہے بلکہ احترام بھی کرتا ہے۔"

ناول میں اس قسم کے مکالمے نہ ہوتے تو یہ راشد الخیری کا ناول ہوتا۔ فکر نے بہرحال جہاں جہاں بھی 'ترکِ وطن' کا حال لکھا ہے، کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا ہے۔

کوشلیا دھوبن کی پیش گوئی'، اور میں ہندو بنا'، کیمپ کا دوزخ، بیٹی کی قاتل ماں'، ناول کے یہ حصے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ فکر نے یہ سب کیسے لکھ لیا۔ بیدی صاحب نے یہ سب کچھ لکھا ہے لیکن اُن کی بات اور تھی۔ وہ تھے ہی آنسوؤں کے بنے ہوئے۔ فکر تونسوی کی شہرت ہے کہ یہ قہقہے بکھیرتے ہیں۔ یہ مرثیہ انہوں نے کیسے لکھ لیا۔ مگر کہیں کہیں بہت زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں۔ اور ان کی تحریر میں بیان کرنے سے

زیادہ "بین کرنے" کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور اس کا سبب شاید یہ ہوگا کہ انہوں نے سب کچھ کہا ہے قاری نے صرف سُنا ہے۔

ناول میں کئی جانے پہچانے، شناسا اور مانوس نام آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ آپ بیتی ہے کوئی کہانی نہیں۔ اچھی خاصی آرٹ گیلری ہے۔ جس میں سبھی شاعروں ادیبوں صحافیوں اور سیاست دانوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کے رنگ مدھم ہیں اور کسی کے بے تحاشہ بولتے ہوئے۔ مصنّف نے ۸۰ سال کے شب و روز کو ڈھائی سَو صفحات میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ نہیں بھولے ہیں کہ ہر تحریر پر مصنف کی چھاپ ہونی ہی چاہیے۔

یہ کتاب ذرا اچھی چھپنی چاہیے تھی۔ جس کاغذ پر ایک طرف کی تحریر دوسری طرف سے نظر آئے اُسے اُس چلمن کے لیے استعمال کرنا چاہیے جس کے پیچھے بیٹھی ہوئی پردہ نشین خاتون نصف بہتر نظر آئے — پبلشر نے شاید اسی لیے کتاب کی قیمت بتائی نہیں۔ مصنّف کے لیے بہر حال ایک مشورہ کہ اب اُنہیں بیمار نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بیمار پڑے بغیر بھی تو لکھ سکتے ہیں۔

نام کتاب: **نگاہ**
شاعر: اختر سعید خاں
صفحات: ۱۷۶ قیمت: ۲۰ روپے
ناشر: مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، بھوپال

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اپنے دوسرے کاموں کے علاوہ ایک اشاعتی منصوبہ بنایا ہے اور اتفاق سے اچھی کتابیں شائع کر رہی ہے۔ اب جو کتاب میرے ہاتھ لگی — "نگاہ" وہ تو اتنی خوبصورت ہے (اندرونی و بیرونی حُسن و جمال کے ساتھ) کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی ہے۔ شہناز عمرانی کا بنایا ہوا سرورق، کم سے کم چار منٹ تک تو آپ کو روکے ہی رکھتا ہے۔ اس کے بعد آپ کتاب کھولتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں — کیا بتاؤں کیا محسوس کرتے ہیں۔ وہ جو غالب کی غزل ہے نا جس کے قافیے میں منظر، خاور اور ردیف ہے کُھلا۔ بس یوں سمجھیے وہی غزل کُھل کر سامنے آجاتی ہے۔ میری عمر اگر ۲۰-۲۵ سال کم ہوتی تو شاید میں اس مجموعۂ کلام کی جلد کو 'بندِ قبا' ہی کہتا — غزلوں کی شاعری کے لیے یہ لفظ زیب بھی دیتا ہے۔

اختر سعید خاں اردو کے ان ۴، ۲ شاعروں میں ہیں، جنہوں نے اپنی شاعری کو پھلنے پھولنے تو دیا لیکن پھیلنے نہیں دیا۔ آج سے ۴۰، ۴۵ سال پہلے تک فضا اچھی تھی۔ ہوا نرم و سُبک تھی اور بہت سی چیزیں ہوا کے دوش پر دُور دُور سفر کر لیتی تھیں اب ہوا میں آلودگی ہے، اس لیے شاعری کو پھیلانے کے لیے باضابطہ بندوبست کرنا پڑتا ہے اور اس 'بندوبست' میں بہت سی باتیں 'بہ رنگِ دِگر' قسم کی آجاتیں۔ اختر سعید خاں کو یہ سب کچھ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ یا ہو سکتا ہے ان کی طبیعت ہی ادھر نہ آئی ہو۔ رسائل میں وہ کم چھپے۔ مشاعروں سے بہت زیادہ چھپے۔ طویل عرصے سے شاعری کر رہے ہیں، لیکن اب کوئی ۳۰، ۴۰ سال بعد اپنے مجموعۂ کلام کی ترتیب اشاعت کا اُنہیں خیال آیا۔ وہ بھی دوستوں کے سمجھانے بُجھانے پر۔ وکالت ہے ہی بڑا ظالم پیشہ۔ اگر وہ اس وقت بھی اپنا مجموعہ نہ چھپواتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا، لیکن اتنے سارے اچھے، عمدہ اور نفیس اشعار (جو اس مجموعے میں موجود ہیں) اُن کے کسی موکل کے خارج شدہ مقدمے کی مثل کی طرح کہیں پڑے رہتے۔ کہا گیا ہے کہ وکیلوں کو فیصلے سننے نہیں چاہئیں کبھی کبھی خود بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہئیے۔ "نگاہ" کی اشاعت نہایت معقول فیصلہ ہے — اور یہ وہ 'نگاہ' نہیں ہے، جو کم از نگاہ' ہوتی ہے۔ یہ نگاہ صحیح انداز ہے۔

اختر سعید خاں کی باقاعدہ شعری تربیت ہوئی ہے۔ وہ فنِ شاعری کے رموز و نکات سے واقف ہیں (واقف تو بہت سے شاعر ہوتے ہیں، لیکن ان سے ردگردانی میں اُنہیں مزا آتا ہے) اپنی غزل کو اُنہوں نے بڑے ڈھنگ سے سجایا ہے۔ اس کی آرائش تو نہیں کی لیکن اُسے آلائشوں سے بہر حال بچایا اور جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، انہوں نے ۱۹۳۶ء کے بعد کے رجحانات کو تنگنائے غزل میں جگہ دے کر اُسے سب کے لیے قابلِ قبول بنایا۔

اُن کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جعفری صاحب نے اپنے دیباچے میں اگر یہ لکھا ہے کہ اختر سعید خاں کا موضوعِ سخن پوری کتابِ زندگی ہے تو کیا غلط لکھا ہے اس کتاب کے آخری صفحے پر ایک شعر درج ہے جو واقعی کتاب کو خاتمہ بالخیر کی منزل پر پہنچاتا ہے۔

شبنمی یادیں، سلگتے خواب، لَو دیتے خیال
دل کے سب قصّے تری چاہت کا عنواں ہوگئے

اور مجموعہ کا پہلا شعر یعنی پہلی غزل کا مطلع:

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات اُن کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

اس رجائیت کی نشان دہی کرتا ہے جس کے سہارے انسانی زندگی کا 'جہاں دراز' کے سفر پر رواں دواں ہے:

ہر خوابِ اعتبار شکستوں سے چُور ہے
دل میں مگر غرورِ تمنّا عجیب ہے
سارا بدن ہے دھوپ میں جُھلسا ہوا مگر
دل پر جو پڑ رہا ہے وہ سایہ عجیب ہے

لوگ ڈھونڈا کیے آئینوں میں چہرے اپنے
ہم نے پتھر میں بھی جھانکا تو صنم جاگ اُٹھے
آبلہ پا سہی لیکن مری رفتار تو دیکھ
گرد میں سوتے ہوئے نقشِ قدم جاگ اُٹھے

اختر سعید خاں حقیقت، خواب اور اُمید کے شاعر ہیں۔ افسردگی میں آسودگی کا عکس دیکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں آبلہ پائی سفر کی دعوت دیتی ہے۔ غم خوشی کا پیش خیمہ ہے۔ کہیں کہیں مایوسی کی جھلک ضرور ہے، لیکن اُسے وہ کھیل کا حصّہ .... (Part of the game) سمجھتے ہیں — خواب تو ان کے یہاں ہیں، لیکن حقیقت اور اُمید

کے رنگ زیادہ نکھرے ہوئے ہیں۔

شاعر نے جہاں غمِ روزگار کی دھوپ کھائی ہے وہیں غمِ جاناں کے سائے میں بھی سر چھپایا ہے۔ خالص غزل کے شعر کہنا اختر سعید خاں کے لیے غالباً زیادہ آسان ہے۔ یہ دو شعر دیکھیے:

قریب و دُور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمہاری یاد کے سائے ہیں یا تم ہو

بدل جاتے ہیں چہرے نام تو بدلا نہیں کرتے
تم اختر کو نہیں پہچانتے، اچھا تو جانے دو

لفظ "تو" کو باندھنا اور برتنا مشکل تو نہیں لیکن اس کے لیے سلیقہ ضرور چاہیے۔ اختر سعید خاں تو اس لفظ کو ردیف بنا کر نباہ لے جاتے ہیں۔

سرسری گزرو نہ شہرِ دل سے نا پُرسانِ غم
بات بھی کرتی مجھے آتی ہے پُوچھو تو سہی

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اُٹھ کے دیکھو تو سہی

میں سمجھا تھا اختر سعید خاں کی نگاہ تیز ہے۔ معلوم ہوا کان بھی تیز ہیں، لیکن میں قائل اُن کی نگاہ کا ہوں جو یقیناً دور رس ہوگی۔

نام کتاب : آہ سے واہ تک

شاعر : جی۔ ایم۔ نعمی
ضخامت : ڈیمائی سائز کے ۲۵۶ صفحات
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : مرکزِ ادب، بھوپال

کمال ہے جی۔ ایم۔ نعمی جیسا زندہ دل، پُرگو، فعال اور وغیرہ وغیرہ قسم کا مزاح گو شاعر ہندوستان میں موجود ہے اور ہندوستان میں اِدھر اُدھر مسلسل متواتر اور بالالتزام برپا ہونے والے مزاحیہ مشاعرے اس شاعر کی آواز سے محروم ہیں۔ کم سے کم میں نے تو اُنہیں کسی مشاعرے میں نہیں پایا۔ یہ شاید بھوپال سے باہر جانا ہی نہیں چاہتے۔ سوچتے ہوں گے اگر مشاعروں میں آنا جانا شروع کر دیا تو شعر کب کہیں گے۔ ڈھائی سو صفحے کی شاعری اور وہ بھی مزاحیہ (اس کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نکتہ ہونا ضروری ہوتا ہے) اس پر مستزاد لوگوں کو سترپوش اور خوش پوش رہنے کی ذمہ داری۔ مزید برآں صحافت کا کاروبار۔ اس پر طرفہ سیاست کے کاروبار میں دخل اور پھر دوستوں کی مزاج پرسی معمولی بات نہیں۔ جی۔ ایم۔ نعمی کے مجموعۂ کلام میں مصطفےٰ تاج کا انشائیہ "خلوص کا امام باڑہ" شامل ہے۔ یہی اُن کا تعارف ہے۔ شاعر شریف آدمی ہے، اس لیے مصطفےٰ تاج بچ گئے۔ ان کی شاعری کے بارے میں جن زعمائے ادب کی رائیں اس مجموعے کی زینت ہیں ان سب نے نعمی کو توجہ سے پڑھا ہے، اُنہیں سُنا ہے اور اُن کے ساتھ اُٹھے بیٹھے ہیں، لیکن اتفاق سے اس خاکسار کی رائے بھی (جو ان سے کبھی نہیں ملا) ان سب رایوں سے ملتی جلتی ہے۔

مزاحیہ شاعری مشکل نہیں بہت مشکل کام ہے۔ اس میں دُور کی کوڑی لانی پڑتی ہے۔ صرف قافیہ پیمائی اور شعر سازی سے کام نہیں بن جاتا۔ سنجیدہ شاعری کا معاملہ الگ ہے۔ غزل کے کسی کمزور شعر سے سامع (یا قاری) کی طبیعت مکدر نہیں ہوتی، لیکن مزاحیہ شاعری میں اگر کوئی شعر کسی نکتے کو پیش نہیں کرتا ہے یا سطح پر نہیں رہتا تو اُسے سُن کر سامع کی طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے ہمارے یہاں اونچے معیار کے مزاح گو شاعر ایک ہیں یا دو یا تین۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچھے اور قابلِ قبول مزاح گو شاعروں سے اردو محروم ہے۔ انہی اچھے شاعروں میں "آہ سے واہ" تک کے خالق (جو تصویر سے کافی بھاری بھرکم نظر آتے ہیں) شامل ہیں۔ مجموعے کا پہلا شعر ہی "گھریلو" واقعات پر مبنی ہے۔

حسینوں پر نگاہِ کارگر کچھ اور ہوتی ہے
جو گھر والی پہ پڑتی ہے نظر کچھ اور ہوتی ہے

(شاعر اپنے شہر بھوپال میں اپنی عرفیت "گھروتیاں" سے پہچانا جاتا ہے۔ مجموعے کا یہ اوّلین شعر انہیں اسم بامسمّیٰ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے)

جاں نثار اختر (جن کی رائے بھی اس مجموعے میں شامل ہے) کی زمین میں کہا ہے۔

آزمائش کی مری جان لمٹ بھی ہے کوئی
پیس ڈالا ہے ہمیں آپ نے دالوں کی طرح

مجھے تو ماش کی دال یاد آ گئی جو اختر بھائی کے گھر کی خاص ڈش تھی۔

اور مجروح کی زمین بھی اُنھوں نے چھوڑی نہیں۔

اتنی کتر بتر نہ کرو سوشل ازم میں
یہ چل رہا ہے سکۂ کلدار کی طرح

کلدار اس سکے کو کہتے تھے جو انگریز بادشاہ کی تصویر کے ساتھ ہندوستان میں چلتا تھا اور یہ لفظ یہاں یعنی اس شعر میں یوں اچھا معلوم ہوا کہ میرے (ناقص) مطالعے کے لحاظ سے سوشلزم کے بانی مبانی بھی شاید انگریز ہی تھے۔ نام بھی مجھے یاد ہیں لیکن بتاؤں گا نہیں —— اب انگریز کا ذکر آ گیا ہے تو ایک شعر یہ بھی دیکھ لیجیے۔ (دیکھنے سے مراد پڑھنا ہے)

کچھ ایسا اپنا طرزِ حکومت ہے آج کل
انگریز سے بھی ہم کو ندامت ہے آج کل

اس شعر کو پڑھنے کے بعد تصدیق کے لیے یہ شعر پڑھنا ضروری ہے۔

میں نے جن ہاتھوں کو مہندی سے رچایا تھا کبھی
اب اُنہیں ہاتھوں میں رہتی ہے چھری میرے لیے

(قافیے نے مجبور کر دیا ورنہ ہاتھوں میں رہتا تو چھرا ہے)

میں کب سے منتظر بیٹھا ہوں میخانے کی چوکھٹ پر
کہ آئے اور فری میں کوئی میرا جام بھر جائے

نعمی صاحب اس شعر کی ولادت سے پہلے اگر غالب کا شعر (وہی قافیہ مستی والا) دُہرا لیتے تو اپنا جام فری میں بھروانے کی آرزو نہ کرتے۔ جنہوں نے ایسا کیا اُن کا حال دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھانے کی بات نعمی نے بھی اپنے ڈھنگ سے اس طرح کہی ہے:

یہی ہے اشتراکیت حکومت کی نگاہوں میں
کہ ٹیبل پر پلیٹیں اُن کی ہوں اور مُرغیاں اپنی

نعمیؔ صاحب! عرض یہ ہے کہ اب بلیٹیں
سبھی عزائم کم فنی پڑتی ہیں کیونکہ
چوری تو کب کے ہو چکے بے کار
چوریاں کر رہے ہیں پہرے دار

نعمیؔ صرف غزلوں ہی کے نہیں، قطعات اور نظموں کے بھی شاعر ہیں۔ روزانہ ایک قطعہ کی پیدائش اتنی ہی مشکل ہے جتنی ایک قطعۂ اراضی کی کاشت۔ اپنے قطعات میں وہ کوئی نرمی نہیں برتتے (ہیں بھی تو پٹھان) مثلاً کہا ہے۔

کارخانے چلتے ہیں فصلیں لہلہاتی ہیں
موٹریں بھی ڈھل ڈھل کر مارکٹ میں جاتی ہیں
ہم کو کچھ نہیں معلوم کوئی ہم کو بتلائے
یہ ہماری اولادیں کس کے کام آتی ہیں

سردار جعفری کی نظم "نوالہ" یاد آگئی لیکن جعفری صاحب پٹھان کہاں ہیں۔

مجموعے میں ایک حصہ پوسٹ مارٹم کا بھی ہے غنیمت ہے شاعر نے اس کا عنوان Morgue نہیں رکھا۔ یہ اُن کی شخصیات سے متعلق ہے، جن سے شاعر کو ربط ضبط رہا ہے وہ بھی گہرا ۔۔۔ "یادِ رفتگاں" میں شاعر نے اپنے محبوب دوستوں کو یاد کیا ہے اور یہ حصہ چونکہ اس مجموعے کا آخری باب ہے اس لیے مجموعۂ کلام "آہ سے واہ تک" واہ سے آہ تک کی تصویر ہو گیا ہے۔ بہر حال شاعر آہ اور واہ دونوں پر دسترس رکھتا ہے ۔۔۔ تعلّی اور خود شناسی میں جو ہلکا سا فرق ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہے

ہلکے پھلکے شعر ہیں میری زباں بھی ہے سرل
لیکن ایسا بھی نہیں ہرگز کہ گہرائی نہ ہو

اور شاعر کی یہ شکایت بھی شاید بجا ہے کہ

طنز و مزاح کھیل نہیں پھر بھی دوستو!
نعمیؔ یہ شاعروں کی نظر سرسری رہی

کتاب بے حد خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ تو اتنا دبیز ہے کہ ڈھائی سو صفحات کی کتاب ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کا عکس ضخیم ہے۔ ہماری بمبئی میں ایک شاعرہ ہیں رو بابۂ نغمہ۔ وہ اتنی دُبلی پتلی ہیں کہ مشاعروں میں آتی ہیں تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آئی ہیں۔ نعمیؔ تو ان کا تخلص ہونا چاہیے تھا ۔۔۔ ہمارے نعمیؔ صاحب نے بس یہیں گڑ بڑ کر دی۔

نام کتاب: گلِ خنداں

شاعر: کشن لال خنداں دہلوی
ضخامت: ۲۵۶ صفحات۔ قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: خنداں دہلوی، ۶۷، بیبل مہادیو، حوض قاضی دہلی ۱۱۰۰۰۶

میں پہلے بھی تحریری طور پر بیان دے چکا ہوں کہ مزاحیہ شاعری بہت مشکل کام ہے۔ یہ کام اکبر الٰہ آبادی کرتے تھے اور بہت نفیس کرتے تھے۔ اُنہوں نے بہت کہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پاس ابھی کہنے کو بہت کچھ تھا۔ اُن کا انتقال ہو گیا ورنہ اگر وہ زندہ رہتے تو یہی کاروبار ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کے بعد اردو مزاحیہ شاعری کی در بندی ہو گئی۔ اُن کے معیار کا درولبست شاید نظر نہ آیا ہو لیکن معیاری شاعری ضرور ہوئی ۔۔۔ ظریف لکھنوی، ظریف جبلپوری، مجید لاہوری، ضمیر جعفری، دلاور فگار۔ یہ چند نام اور ان کے علاوہ بھی کچھ نام ایسے ہیں، جن سے مزاحیہ شاعری کو تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ سانحہ بھی ہوا کہ کچھ اچھے مشاعروں کو مزاحیہ شاعروں نے بگاڑ دیا۔ مزاحیہ شاعری ہوہا کی چیز نہیں ہے۔ اسے قہقہہ بر دوش تو ہونا ہی چاہیے لیکن ساتھ ہی ساتھ فکر انگیز بھی۔ اس میں بشاشت اور بشارت دونوں ہم وزن ہوں تو ٹھیک ہے۔ صرف بشاشت بھی مفید ہے بشرطیکہ وہ اسی سطح پر رہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں 'سطح' کے تعلق سے صرف ادب ہی میں نہیں پورے معاشرے میں گڑبڑ ہے۔ 'نچلی سطح' ہمارے یہاں عام لفظ ہے مثلاً لوئر ڈویژن کلرک، لوانکم گروپ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ریلوں میں تو ہم تھرڈ کلاس ڈبے پسند نہیں کرتے، لیکن مکانوں میں یہ رویّہ برقرار ہے۔ اسی لیے ہمارا ادب بھی متاثر ہوتا ہے اور خاص طور پر مزاحیہ شاعری کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ کیوں کہ مزاحیہ شاعری کانچ کا سامان ہے۔ اس میں وہ شیشہ استعمال نہیں ہوتا جس کے دروازے بنتے ہیں یا جو بُلٹ پروف ہوتا ہے۔ یہ تو وہ کانچ ہوتا ہے۔ جس کا بنا ہوا گلاس ہاتھ میں لیجیے تو معلوم ہو کوئی پھول ہاتھ میں آگیا ۔۔۔ "گلِ خنداں" کے سرورق پر ایک ایسا ہی خوب صورت پھول بنا ہوا ہے ۔۔۔ سبز زمین ہے، سُرخ پھول اور سفید تحریر۔ حیرت ہے کہ گلِ خنداں کی ترتیب اور اشاعت کا کام اُس وقت ہوا جب شاعر نے عمر کے بہتر سال پورے کر لیے اتنی تاخیر شاید ہی کسی شاعر نے اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں برداشت کی ہو۔ یہ صبر کی حد نہیں، سرحد ہے۔ خنداں صاحب تو مجسّم میر کے بہتر نشتر ہو گئے۔ کتاب کا پیش لفظ گوپی ناتھ امن نے لکھا ہے جو شاعر کے اُستاد بھی رہے ہیں۔ ایک انتہا سے زیادہ ثقہ اور سنجیدہ شاعر کا اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر نے مقدمہ نگار کے امن میں خلل ڈالا۔ کشن لال خنداں کی شاعری کو میں پُر سکون ہلچل کا نام دوں گا۔ ان کی شاعری کوئی ہنگامہ پیدا نہیں کرتی۔ موجوں کا خوش گوار زیر و بم ان کی شاعری کا وصف ہے۔ یوں سمجھیے کلی کم کم کھلتے ہوئے گلِ خنداں بنتی ہے۔ خود شاعر کے چند جملے شاعر کی منکسر المزاجی اور خوش طبعی کے مظہر ہیں۔ مجھے انہیں سننے کا بھی موقع ملا ہے اور شکر ہے کہ وہ مشاعرے کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ زبان، تلازمات، رعایت لفظی اور اس قسم کی دیگر اشیا کے شاعر ہیں۔ ایک غزل کے دو چار شعر دیکھیے اور پھر مجھ سے کہیے کہ میں نے کیا غلط کہا ہے۔ مکرِ شاعرانہ تک اُن کے اشعار میں موجود ہے:

میں بھول نہ جاؤں کہ بھلائی ہے تری یاد
یاد اس کی مجھے روز دلانے کے لیے، آ
میں مُرغِ حرم اُڑا لایا تری تیرے یہاں سے
تو میرے یہاں مُرغا بنانے کے لیے، آ

(شاعر نے یہ نہیں کہا کہ مُرغا کیسے بنایا جائے، لیکن یہ تو ظاہر ہی ہے کہ مُرغی میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی۔ محبوب آیا تو مُرغا کسی اور ہی کو بنائے گا۔)

شانے پہ بکھیری ہے ترے زُلف ہوا نے
کاشانے میں شانے سے بنانے کے لیے آ
میں شرطیہ کہتا ہوں کہ آئے گا تو اِک دن
کچھ زعم ہے تو شرط لگانے کے لیے آ

اور پھر کہا ہے بلکہ خبردار کیا ہے کہ

جو رونا رُلانا ہے تو پھر غیر کا گھر دیکھ
خنداںؔ کے یہاں ہنسنے ہنسانے کے لیے آ

شاعر کافی شریف النفس شخص ہے، لیکن ہے تو مزاح گو، چوٹ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

نشہ بندی میں دستیاب بہت
چاہیے جتنی پیو، شراب بہت

اِس بات پر یاد آیا کہ گلزارؔ دہلوی نے بھی تو شاعر کی مزاح گوئی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مجھے یہاں تک یاد پڑتا ہے۔ یہ واقعہ (بطور لطیفہ) خود گلزارؔ دہلوی نے سنایا تھا کہ دِلّی میں شراب بندی کے موضوع پر مشاعرہ ہوا۔ انتظام گلزارؔ دہلوی کو کرنا پڑا۔ ناظمِ مشاعرہ نے منتظمینِ مشاعرہ کو متنبہ کر دیا کہ جب تک شعراء صاحبان کے لیے "معقول انتظام" نہیں ہوگا، شراب کی مذمت میں کوئی شریف آدمی شعر نہیں سُنائے گا۔

کشن لال خنداںؔ نے اپنے شعر میں یہی بات تو کہی ہے:

وصل کی شب ہے وہ ہیں پہلو میں
ہم نے دیکھے ہیں ایسے خواب بہت

ہم نے سُنا تھا کہ عاشق جب قتل ہونے کے شوق میں مقتل کی طرف جاتا ہے تو اس پر کچھ عجب نشاط کا عالم طاری ہوتا ہے اور اُس کا سر اُس کے سائے سے دو قدم آگے ہوتا ہے۔ خنداںؔ بھی قتل ہونے گئے تھے، لیکن مندرجہ ذیل طریقے پر:

ہم نے اُن کے سامنے پہلے تو ریوالور رکھ دیا
کس کے ہلمیٹ باندھ کر پھر بے خطر سر رکھ دیا

شاعر بینکنگ کے بھی رازہائے سربستہ سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ کہا ہے

ایک لیڈی ٹائپسٹ اک بینک میں کرتی تھی کام
دل چُرا کر اس نے لاکر میں چھپا کر رکھ دیا

اور

ہائی فیور عشق کا خنداںؔ چڑھا تو یار نے
جھٹ سے لاکر میرے منہ میں تھرمامیٹر رکھ دیا

خنداںؔ ہمہ جہتی شاعر ہیں۔ اس مجموعۂ کلام میں نعت، منقبت اور مستزاد بھی موجود ہیں۔

خنداںؔ دہلوی اگر اپنے ایسے شعر جو طبیعت پر گراں گزرتے ہیں، اس مجموعے میں شامل نہ کرتے تو یہ مجموعۂ "گلِ خنداں" ہی نہیں چمنستاں ہوتا۔ اپنے سرورق کے لیے شاعر نے گلاب کا انتخاب کیا ہے۔ اور گلاب کا مسئلہ یہ ہے کہ کانٹے تو اس کے ساتھ ہوں گے ہی۔

نام کتاب: پھل پھول اناج

مصنف: اندرجیت لال
ضخامت: ۹۴ صفحات (مجلّد باتصویر)
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: سلوچنہ پرکاشن، گُل مُہر پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

اندرجیت لال کوئی نئے مصنف تو ہیں نہیں کہ ان کے بارے میں تعریفی توصیفی جملے لکھے جائیں۔ یہ ان سب مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، زیرِ نظر کتاب مصنف کی پندرہویں کتاب ہے اور جس لگن اور رفتار سے وہ کتابیں لکھتے رہے ہیں، اس کی بنا پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس بیسویں صدی کو وہ اپنی تیس کتابیں تو دیں گے ہی۔

اندرجیت لال اصل میں (مہدی افادی نہ ہونے کے باوجود) بے حد افادی مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں کے لیے جو موضوعات چُنے ہیں وہ سائنسی، زراعتی، تاریخی، سوانحی اور جغرافیائی ہیں۔ "ہم اور ہمارے بچے" "ہمارے قومی ہیرو" "ہمارے سائنس داں" "قلم اور آواز" ان کی وہ کتابیں ہیں، جن میں موضوع سے متعلق نہایت مفید اور کارآمد معلومات آسان اور دلچسپ پیرائے میں قلم بند کی گئی ہیں۔

"پھل پھول اناج" بھی اندرجیت لال کی زرخیز کتابوں میں سے ایک "سرسبز و شاداب" کتاب ہے۔ سرسبز و شاداب اس لیے کہ اس میں ایک تو اناج کا ذکر ہے جو ہماری زیست کا سہارا ہے۔ دوسرے پھلوں کا تذکرہ ہے جو بے حد پیارا ہے اور تیسرے پھولوں کی باتیں ہیں، جو مشامِ جاں کو معطّر کرتے ہیں۔ اندرجیت لال کی اس مہارت کا میں دل سے قائل ہوں کہ وہ خشک اور غیر ادبی موضوع کو دل آویز پیرائے میں بیان کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ (بے پناہ سے مراد یہ نہیں کہ پناہ مانگی جائے) زیرِ نظر کتاب میں پھلوں کا راجا آم بے حد رسیلا اور پُر لطف مضمون ہے اور اگر میں اس مضمون کو 'رشکِ دسہری' اور "نازشِ فجری" کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کتاب کے تینوں مضامین میں اسے اعلم الثمر سمجھتا ہوں (مصنف نے اپنے بیان میں کہا بھی ہے کہ "پھل پھول اناج میری ۲۰ سالہ لگن، جستجو اور تحقیق کا ثمرہ ہے) دوسرا مضمون ہے: "پھولوں کی ملکہ: گلاب"

مصنف نے اس پھول کو مؤنث بنا دیا ہے۔ (ممکن ہے گلاب کی کلی ان کے پیشِ نظر رہی ہو) لیکن یوں دیکھا جائے تو پھولوں کی کوئی صنف نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو وہ پھولوں کی نزاکت و نفاست کی بنا پر صنفِ نازک ہی ہو سکتی ہے۔ اوّل الذکر مضمون میں امیر خسروؒ کا حوالہ ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ موجود ہیں اور مرزا غالبؔ تشریف فرما ہیں۔ جس کی وجہ سے مضمون نہایت شاعرانہ ہو گیا ہے تو گلاب سے متعلق مضمون نہایت ماہرانہ مضمون ہے۔

تیسرا مضمون ہے اناجوں کا بادشاہ گیہوں۔ یہ لقب بھی صحیح ہے اور گیہوں جیسے اناج کو جچتا ہے۔ صرف گیہوں ہی نہیں مشہور اس کا رنگ بھی اتنی ہی شہرت رکھتا ہے اور گیہواں رنگ کی تعریف عام طور پر سنی گئی ہے۔ مصنف نے کہاوتوں، اشعار اور ضرب الامثال کو صرف زیبِ داستان کے طور پر استعمال

کیا ہے تاکہ مضمون بوجھل نہ ہو جائے اور ہم جیسے نا واقفیت کے شاکی قارئین بھی اسے دلچسپی سے پڑھیں ورنہ تینوں مضامین دراصل معلوماتی مضامین ہیں، جن میں پھلوں، پھولوں اور اناج کی کاشت اور نگہداشت کی بنیادی اور جزوی تفصیلات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ مصنف کی یادداشت کی داد دینی پڑتی ہے۔ کیا مجال جو کہیں بھی کوئی فروگذاشت ہوئی ہو۔

ڈاکٹر بی۔ پی۔ پال (سابق ڈائریکٹر جنرل انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ) کے پیش نظر کے ساتھ یہ کتاب ایک خوش ذائقہ خوشبودار اور غذائیت سے بھرپور تحفہ ہے اور جیسا کہ فاضل مقدمہ نگار نے توقع ظاہر کی ہے۔ یہ کتاب یقیناً اردو حلقوں میں اپنا مقام پائے گی۔ مصنف نے سچ مچ اچھی کتاب لکھی ہے۔ ایسی اشتہا انگیز کتابیں اردو میں ہیں ہی کتنی ؟!

یوسف ناظم

نام کتاب **فرازِ شہر**
مصنف : ظفر مرادآبادی
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ : ایم سلیم الدین (سکریٹری بزم شیراز)
۱۸۵۳۔ لال دروازہ، سرکیوالان، دہلی ۶

اس افراط و تفریط میں ظفر مرادآبادی کی غزلیں سنجیدہ مطالعے کی مقتضی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں کا شاعر اپنے تخلیقی اظہار کے لیے پرانے اور نئے کے درمیان ایک الگ راہ نکالنے کی سعی میں ہے۔ اس سعی میں شعور کی کارفرمائی شامل ہے۔

ظفر اپنی شعری روایات سے آگاہ ہے، لیکن وہ روایت پسند نہیں۔ وہ کثرتِ استعمال کے نتیجے میں نئے مفاہیم و معانی سے عاری نیز پرانی شاعری کے سکہ بند اظہارات، الفاظ، علامتوں سے شعوری گریز کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں پرانی شاعری کے کسی نقص، کسی نقش، کسی عکس کی چھوٹ دکھائی نہیں دے گی۔ وہ جدّت اور بدعت میں بھی شعوری فرق کرتا ہے۔ اس کی شعری کائنات میں نئے کے معنی نامانوس نہیں لہٰذا نارو ابھی نہیں۔ وہ مختلف ہے اور یہی کوائف اسے اس کے ہم عصروں میں ممیز کرتے ہیں۔

نئے اور پرانے کے درمیان ایک الگ راہ نکالنے کی سعی میں وہ اکثر اس المیے سے دوچار ہوتا ہے جو پرانے کی مقبولیت اور نئے کی محض چونکانے والی کیفیات کی نفی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ سخن کی بزم میں وہ اپنا کھانہ کھلنے پر متاسف کو ہوتا ہے، لیکن اپنے تخلیقی سفر کا راستہ کھوٹا نہیں کرتا۔ اُسے بنتی، بدلتی، بگڑتی اقدار میں ممکنہ زیاں کا احساس تو ہے لیکن افسوس نہیں۔ وہ ڈرتا ہے، بینا ہے، وہ گاہ بند آنکھوں ہی میں اپنے تحفظ کو یقینی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آنکھ کھلنے میں خوابوں کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔ فرار کی یہ صورت فطری ہے۔ لیکن بغیر کسی کرب، کسک کے نہیں۔ اس کے یہاں اپنے ہونے کا احساس قوی ہے۔ زوال تک 'زوال' معتبر ہے۔ جو ایک نئے عروج کا اشاریہ ہے۔ یہی وہ عوامل اور اثرات ہیں جو اس کے مشاہدے کی سطح کے مختلف ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے مختلف ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ الفاظ و قوافی کا موہ نہیں کرتا۔ اس کا مقصد اپنے قاری کو اپنے محسوسات اور تجربوں میں شریک کرنا ہے، جن کی ترسیل پر وہ پوری طرح قادر ہے۔ اس کے کیسۂ تخلیق میں "کچھ" ہے اور یہ بات اپنی جگہ کم اہم نہیں۔

راج نرائن راز

●●

بقیہ: عربی زبان و ادب

کی ترقی سے حکومت کو دلچسپی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً ۲۰ جامعات میں عربی کا شعبہ موجود ہے۔ کالجوں کی تعداد تو یقیناً کئی درجن ہوگی۔ پھر اس ملک میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد اور مدرسۃ الاصلاح جیسے بڑے بڑے مدارس بھی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ایک درجن سے زائد اخبار و مجلات عربی میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں عربی مجلہ "ثقافتہ الہند" بھی شامل ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں آج سے ۲۶ سال قبل شروع کرایا تھا۔ یہ ہندوستانی سفارت خانوں کے ذریعے تمام عالم اسلام میں جاتا ہے اور آج کل اس کو پروفیسر نثار احمد فاروقی ایڈٹ کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے دن میں اور رات کو دو بار نشریات ہوتی ہیں، جن کا وقت حال ہی میں بڑھا بھی دیا گیا ہے۔ ریڈیو پر عربی کا پورا یونٹ قائم ہے — وزارتِ تعلیم عربی مدارس کو معقول مالی امداد بھی دیتی ہے اور مدارس میں جو اساتذہ یا طلبہ کسی عربی مخطوطہ کو ایڈٹ کرنا چاہیں یا کسی خاص موضوع پر ریسرچ کرنا چاہیں، انہیں تین سو روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ دو سال تک کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس سے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ عربی اور فارسی کے دو دو ممتاز عالموں کو حکومت ہر سال سندِ امتیاز دیتی ہے۔ جو صدرِ جمہوریہ اپنے مبارک ہاتھوں سے عنایت فرماتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سال یہ سندِ امتیاز پانے والوں میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر مولانا . . . . . عبدالستار خاں صاحب بھی ہیں۔ اس کے لیے وہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ عربی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ۱۵ ر تا ۱۹ ر اپریل ۱۹۸۷ء تک منعقدہ کل ہند سیمینار کے خطبۂ افتتاحیہ کا اقتباس)

تشنہ

مئی ۱۹۸۷ء کا آج کل نظر سے گزرا۔ شارب ردولوی صاحب کا مقالہ تشنہ ہے۔ New Criticism کا ترجمہ 'نو تنقید' مضحکہ خیز پہلو رکھتا ہے۔

شارب صاحب نے نئی تنقید کے سلسلے میں زیادہ بحث مغربی ناقدین سے کی ہے۔ اردو ناقدوں میں صرف ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے نام لیے ہیں۔ اس ذیل میں کلیم الدین احمد کا ذکر کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ نئی تنقید کے جو خواص اُنہوں نے بتائے ہیں وہ کلیم صاحب کی تنقیدوں میں پوری طرح موجود ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس اور جناب ارتضیٰ کریم کے مقالے وقیع ہیں۔ اردو میں داستانوں کی تنقید کا جو حال رہا ہے اس کا نہایت معروضی تجزیہ ارتضیٰ کریم صاحب نے کیا ہے۔ مطالعہ اور تنقید کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ خاص خاص کتابوں سے متعلق اردو تنقید کے احوال سے اردو دنیا کو متعارف کرایا جائے۔

مشرف عالم ذوقی کا افسانہ فنی اور فکری لحاظ سے زیادہ کامیاب ہے۔ انشائیہ بھی پُر لطف ہے۔ نئی کتابوں پر تبصرے بھی وقیع ہیں۔ مگر غزلوں میں جانِ غزل نہیں۔

سلسلہ "من کہ"۔۔۔ ادبی، تاریخی اور تحقیقی لحاظ سے زبردست افادیت رکھتا ہے۔ اس اختصار میں ادیبوں اور شاعروں کا Bio-data یہاں ملے گا۔ کچھ اور "من کہ"۔۔۔ حاصل ہو جائیں تو اُنہیں یک جا کر کے کتابی شکل میں اسی نام سے شائع کر دیجیے۔

منصور عالم، آرہ

مجبوری

جون کا آج کل مِلا۔ سرورق بہت خوبصورت ہے۔ آرٹسٹ کی خدمت میں مبارک باد پیش کر دیں۔

نظم کا حصّہ جان دار ہونا چاہیے اور ایسا ہی کتابوں پر تبصرہ۔ تبصرہ برائے تبصرہ نہ ہو بلکہ قاری تبصرہ پڑھنے کے بعد کتاب خریدنے یا نہ خریدنے کا فیصلہ کر سکے۔ کیوں کہ آج کل کتابیں بہت سستی ہو گئی ہیں۔

افسانے بھی پھیکے ہیں اور "شاخِ نازک" جیسے مضامین کے لیے وقت کس کے پاس ہے۔ البتہ آپ کی مجبوری ظاہر ہے۔

حکیم سید محمود بخاری، محل (ضلع چتور)

بے لاگ

آج کل کا تازہ شمارہ ملا۔ سرورق بے حد عمدہ ہے

آپ نے ایک بار مجھ سے 'آج کل' کی مقبولیت میں کمی کا سبب دریافت کیا تھا۔ میں نے پرچہ کی اشاعت میں تاخیر کے سر ساری ذمہ داری ڈال دی تھی۔ وہ فوری ردِ عمل تھا، لیکن میرے خیال میں معاملہ صرف تاخیر کا نہیں۔

میری رائے میں آج کل کی کمی کے دوسرے اسباب یہ بھی ہیں:

۱۔ ادبی نقطۂ نظر سے unconsequential تحقیقی مضامین اور کھتونیوں کی اشاعت جنہیں سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی نہیں پڑھتے اور جن کے مطالعہ سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا۔

۲۔ افسانوں کی تعداد میں کمی۔

پچھلے شمارے میں شارب صاحب کا مضمون بہت اچھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کو خط لکھ دوں، لیکن نئی تنقید کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا تھا۔ یادداشت تازہ کرنے کے لیے دو تین چیزیں دیکھنا تھیں۔ افسوس اس کا موقع مل سکا۔

عابد سہیل، لکھنؤ

قابلِ مطالعہ

ماہنامہ "آج کل" کا جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ "آج کل" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اردو کا واحد معیاری رسالہ ہے اور اردو کے سرکاری اور غیر سرکاری رسائل میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

تازہ شمارے میں سلام بن رزاق کا مضمون: مراٹھی مختصر افسانہ — ابتدا و مراٹھی افسانے کا بھرپور جائزہ ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

عبد القوی دسنوی کا 'زلیخا بیگم کی کہانی' اور عبد المغنی کا: "عبد الغفور شہباز ایک معمارِ اردو" مقالے پسند آئے۔ "من کہ۔۔" کی کمی کا احساس ہوا۔ شعری حصہ کم کر دیا۔ یہ شاعروں پر بہت زیادتی ہے۔ محسن زیدی اور ظہیر ناشاد کی غزلیں معیاری ہیں۔ سرورق بہت خوبصورت ہے۔

اطہر نیّر دربھنگوی، پھلائی

اردو کا مقبول عام معتبر ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر: راج نرائن راز
سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد : ۴۶	شمارہ : ۳	اکتوبر ۱۹۸۷ء
قیمت : دو روپے	فون : ۳۸۷۰۶۹	اشون کارتک شک سمت ۱۹۰۹

ترتیب

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن: آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرون ملک: زر سالانہ: ۲۰ روپے۔ دو سال کے لیے ۳۶ روپے۔ تین سال کے لیے ۴۸ روپے

ملاحظات

زراعت میں پیش رفت

بھارت نے جب آزادی کے بعد اپنی زندگی شروع کی تو اس وقت اس کی ایک بڑی آبادی کو ایک وقت کا بھی کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں بھارت میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی تھیں۔ اس سرزمین کا انگریزوں نے تجارتی مقاصد کے لیے اتنی بے دردی سے استعمال کیا کہ وہ اپنے تمام وسائل سے محروم ہو گئی۔ کھیتی باڑی ایک معدوم پیشہ بن گیا تھا۔ ہزارہا لوگ کھیتی باڑی چھوڑ کر اپنی گزر بسر کے لیے شہروں میں جا بسے۔

ایسی خطرناک اور مایوس کن صورت حال کو مکمل طور پر سمجھتے ہوئے ہمارے منصوبہ سازوں نے زراعت اور متعلقہ شعبے آب پاشی کو پہلے منصوبے میں سب سے زیادہ اہمیت دی۔ پہلا منصوبہ بہت زیادہ کامیاب رہا اور اناج کی کل پیداوار ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۵۰۸ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۸۲۰ لاکھ ٹن ہو گئی۔

اس کے باوجود بھارت کو ایک ایسے دور کا سامنا کرنا پڑا جب اسے چاول اور گیہوں جیسی لازمی اشیا بھی درآمد کرنی پڑیں لیکن ۶۸-۱۹۶۷ء کے سبز انقلاب کے زمانے میں چاول کی اعلیٰ قسموں اور بہت زیادہ پیدا ہونے والے میکسیکی گیہوں کی کاشت کاری شروع ہوئی۔ چنانچہ اس سبز انقلاب کی وجہ سے بھارت اتنا خود کفیل ہو گیا کہ آج ایشیا اور افریقہ کے قحط سے متاثرہ عوام کی مدد کر سکتا ہے۔ پہلا سبز انقلاب خاص طور پر پنجاب، ہریانہ اور مغربی اترپردیش تک محدود تھا لیکن ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوسرے سبز انقلاب کے فوائد مغربی بنگال، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش اور اترپردیش کو بھی حاصل ہوئے جو اس معاملے میں کافی پیچھے چل رہے تھے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۶۱۰ لاکھ ٹن چاول اور ۴۶۰ لاکھ ٹن گیہوں کی ریکارڈ پیداوار ہونے کی وجہ سے بھارت میں کھیتی باڑی کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

کسان اپنے کھیتوں کی آب پاشی کے لیے مکمل طور سے بارشوں پر انحصار کرتے ہیں، بیج خریدنے کی غرض سے روپے پیسے کے لیے وہ اکثر سود پر قرض دینے والے ساہوکاروں کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے کسان بڑی تنگی ترشی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

۸۴-۱۹۸۳ء میں حکومت نے زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کے لیے امداد کی ایک خصوصی اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم میں مربوط دیہی ترقیات کے لیے فی بلاک کے حساب سے پانچ لاکھ روپے کا سالانہ بجٹ شامل ہے جو آبپاشی، تلہنوں، دالوں اور موٹے اناج کے لیے بیجوں کی فراہمی نیز زمین کو بہتر بنانے کے سلسلے میں صرف کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ اسکیم کے آغاز سے لے کر اب تک دالوں اور تلہنوں کے لیے بیجوں کی تقریباً ۱۲۲ لاکھ چھوٹی تھیلیاں چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو تقسیم کی جا چکی ہیں۔ اس پروگرام کی وجہ سے مہاراشٹر میں سورج مکھی، مدھیہ پردیش، اترپردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش میں سویابین نیز اترپردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں مونگ پھلی جیسی فصلوں کی زبردست پیداوار ممکن ہو سکی۔

مذکورہ اسکیم کی وجہ سے دالوں اور تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے جن کی پیداوار چاول اور گیہوں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہے۔

۵۱-۱۹۵۰ء میں دالوں کی کاشت ۱۹۰ لاکھ ہکٹیر رقبہ پر کی جا رہی تھی اور جن کی پیداوار صرف ۸۴،۱۱ لاکھ ٹن تھی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں دالوں کی کاشت کا رقبہ ۲،۲۳۸ لاکھ ہکٹیر تھا اور پیداوار ۶،۱۲۹ لاکھ ٹن تھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں تلہنوں کی کاشت ۱۰۷ لاکھ ہکٹیر رقبے پر کی جا رہی تھی اور جس کی پیداوار ۵،۱۵۸ لاکھ ٹن تھی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں تلہنوں کی کاشت کا رقبہ ۷،۱۸۸ لاکھ ہکٹیر تھا اور پیداوار ۱۱۵ لاکھ ٹن تھی۔ ایندھن اور پھلوں کے درخت لگانے کی اسکیم کے تحت ۸۵،۴۳۶ لاکھ پودے ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران تقسیم کیے گئے اور ۸۷،۲۷۰۳ لاکھ پودے ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران تقسیم کیے گئے۔

فصلوں کے لیے پانی

مذکورہ اسکیم کی سب سے اہم خصوصیت پانی کی یقینی فراہمی کا اہتمام ہے جس سے کسانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک تقریباً چار لاکھ کنوئیں اور ٹیوب ویل تعمیر کیے جا چکے ہیں اور ۴ لاکھ پمپ سیٹ، ڈیزل انجن اور بجلی کے موٹر لگائے جا چکے ہیں۔ زرعی پیداوار کے فروغ کے لیے تقریباً ۸ لاکھ ہکٹیر رقبہ پر آب پاشی کرنے کی مزید صلاحیت تیار کی جا چکی ہے۔

زمین کو بہتر بنانا زراعت کا ایک بہت ہی پیچیدہ شعبہ ہے کیوں کہ ایک زمین کی پیداواری صلاحیت اس بات پر منحصر ہے کہ اس کو کتنے موثر طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ زمین کو بہتر بنانے کے کاموں میں نمی برقرار رکھنے کے لیے زمین کو ہموار بنانا، زمین کو کٹاؤ سے روکنے کے لیے احتیاطی اقدامات کرنا وغیرہ شامل ہے۔ اس طرح سے اب تک تقریباً ۱۱،۳۱ لاکھ ہکٹیر رقبہ زمین کو بہتر بنایا جا چکا ہے۔

سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں متعدد امدادی پروگرام شروع ہوئے جن میں مشرقی ریاستوں میں چاول کی زیادہ پیداوار کا پروگرام بھی شامل ہے۔ مذکورہ اسکیم کے تحت کسانوں کو ان کے ہی کھیتوں پر تجربے کی غرض سے کیمیاوی کھاد، پودوں کے تحفظ کے لیے سامان، کیڑے مار دوائیں، کھیتی باڑی کا سامان وغیرہ امدادی قیمتوں پر فراہم کیا جاتا ہے۔

تلہنوں کی ترقی و فروغ کے قومی پراجیکٹ سے کسانوں کو بہتر ساز و سامان حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پٹ سن کے ریشوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور ان کے معیار کو بہتر بنانے کی غرض سے سرکار ۸۷-۱۹۸۶ء سے پٹ سن کی ترقی و فروغ کے جامع پروگرام کے تحت چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو ضروری سامان کی چھوٹی تھیلیاں تقسیم کرنے اور پکے ریٹنگ ٹینک تعمیر کرنے کے لیے امداد فراہم کر رہی ہے۔

بیشتر چھوٹے اور بہت چھوٹے کسان زراعت کے کام کاج کے لیے انسانوں اور جانوروں کی طاقت پر انحصار کرتے ہیں اور ان کاموں کی اثر پذیری کا زیادہ تر دستی اوزاروں اور ساز و سامان پر منحصر ہے حالانکہ ملک میں زرعی اوزاروں اور ساز و سامان کی تیاری اور فراہمی میں کافی بہتری آئی ہے تاہم یہ زیادہ تر ہریانہ، پنجاب اور اتر پردیش تک ہی محدود ہے۔ مویشیوں کے ذریعہ کھینچے جانے والے ساز و سامان اور اوزاروں کے مقابلے میں مشینوں کے استعمال کو بڑھاوا دینے کی غرض سے حکومت ہند نے دسمبر ۱۹۸۳ء سے ایک مرکزی اسکیم شروع کی ہے۔

مذکورہ اسکیم چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو دو طرح سے مستفید کرتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ مویشیوں کے ذریعہ کھینچے جانے والے بہتر ساز و سامان اور دستی اوزاروں کو امدادی قیمتوں پر فراہم کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کسٹم ہائیرنگ سینٹروں کے ذریعہ ان ساز و سامان کی سروسنگ مہیا کرتی ہے۔ ان ساز و سامان کے استعمال سے نہ صرف کھیتی باڑی کے کام کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی بلکہ پانی، بیج اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کی بچت کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

منصوبہ بند ترقی کے سبب پچھلی تین دہائیوں میں ہندوستان کیمیاوی کھاد تیار کرنے والا صف اول کا ملک بن گیا ہے۔ گو کہ ملک کے بیشتر حصوں میں کھاد تیار کرنے کے روایتی طریقے جاری ہیں تاہم حکومت کی طرف سے مسلسل تشہیر کیے جانے کی وجہ سے کیمیاوی کھادوں کے استعمال میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں کیمیاوی کھادوں کی کھپت ۰.۶۹ لاکھ ٹن تھی جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۹۰ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی۔

ہندوستان میں آزادی سے قبل کیڑے مار دواؤں کے استعمال کے بارے میں کوئی جانتا نہیں تھا جس کی وجہ سے کئی ٹن زرعی پیداوار کا نقصان ہو جاتا تھا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ان دواؤں کی کھپت محض ۲.۳۵ ہزار ٹن تھی۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں حکومت نے کیڑوں اور بیماریوں کی روک تھام اور ان کے خاتمے کی غرض سے ایک اسکیم شروع کی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں کیڑے مار دواؤں کی کھپت ۶۰,۰۰۰ ٹن تک پہنچ گئی۔

کسانوں کو بیج اور کیمیاوی کھاد وغیرہ خریدنے کے لیے ساہوکاروں سے حد سے زیادہ شرح سود پر قرض نہ لینا پڑے، اس کے لیے حکومت نے زرعی قرضوں کی فراہمی کے لیے مختلف اسکیمیں شروع کی ہیں جن کا بنیادی مقصد کمزور طبقے کے کسانوں کو بر وقت اور مناسب قرض فراہم کرنا ہے۔ کل ادارہ جاتی قرضوں میں کمزور طبقوں کا حصہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں تقریباً ۱۰ فیصد تھا جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھا کر ۴۵ فیصد کر دیا گیا۔ یہ حصہ ساتویں منصوبہ کے اختتام تک بڑھا کر کم سے کم ۵۰ فیصد کر دیا جائے گا۔

چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں نیز دیہی آبادی کے دیگر کمزور طبقوں کے لیے قرض کی فراہمی میں اضافہ کی غرض سے جو خصوصی اقدام کیے گئے ہیں ان اقدامات میں دیگر ممبروں کے مقابلے میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں سمیت کمزور طبقوں کو مزید رعایت شادی بیاہ، تعلیم وغیرہ جیسی خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے بے زمین لوگوں یا ۵ ایکڑ زمین رکھنے والوں کو کھیتی قرضہ، زمین کی ضمانت کے بغیر ضمنی کاموں کے لیے قرضہ، طویل مدتی قرضوں کی آسان قسطوں پر ادائیگی، طویل مدتی قرضوں کی ادائیگی کے لیے زیادہ مدت وغیرہ شامل ہیں۔

تجارتی بینک اب کمزور طبقوں کو قرض دینے کی جانب زیادہ توجہ دیں گے۔ براہ راست قرض لینے میں کمزور طبقوں کا حصہ ۵۰ فیصد سے کم نہیں ہوگا۔ مذکورہ تمام اقدامات پر عمل در آمد ایک ایسے ملک میں شاید کافی آسان اور تیز تر ہو جہاں پیچیدگیاں اور طول و عرض کم ہو لیکن بھارت نے اس چیلنج کا مقابلہ کیا ہے۔ کھیتی باڑی کے ہمارے شعبے کی پیش رفت کو بین الاقوامی ماہرین اور عالمی انجمنوں نے سراہا ہے۔ یہ کام آنے والے برسوں میں زیادہ محنت سے انجام دیا جاتا ہے تاکہ قدرتی آفات کے باوجود قلتوں اور استحصال کی یہ صورت حال پھر کبھی پیدا نہ ہو۔

بقیہ : بہار کیسری

کتابیں موجود تھیں جن میں سے بیشتر کتابیں نادر و کم یاب تھیں۔ یہ کتابیں تا ہنوز شری کرشن سیوا سدن مونگیر میں محفوظ ہیں۔

شری کرشن سنہا بہت نرم دل اور حساس واقع ہوئے تھے۔ دراصل وہ مہاتما بدھ کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔

ابھی اہل ہند اور بالخصوص اہل بہار موصوف کی خدمات سے فیض یاب ہو رہے تھے کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کا وہ منحوس دن آیا جب وہ ہمیں سوگوار چھوڑ کر اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ ان کے کارنامے آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ●●

ملک فردوس

آزادی اور ترقی کے چالیس برس

کامیابیاں

اُن کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

۱۹۷۸ کی بات ہے بہار کے ایک گاؤں بیلچی میں ۲۲ ہریجنوں کو اُن کے جھونپڑوں میں ہی زندہ جلا دیا گیا۔ زمینداروں اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کے اس مکروہ فعل پر سارا ہندوستان کانپ اُٹھا۔ شریمتی اندرا گاندھی جو اس وقت لوک سبھا میں حزبِ مخالف کی رہنما تھیں اس دشوار گذار علاقے میں ایک ہاتھی پر سوار ہو کر پہنچیں اُن مظلوم لوگوں کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ لیکن بہار کے ہی جنتا پارٹی کے ایک لوک سبھا رکن کا کہنا تھا کہ سماج کے ایک طبقے پر ظلم و ستم کی داستان اُتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ ہندوستان کی تاریخ۔ آئے دن سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقے پر بہار میں ہی نہیں ملک کے ہر حصے میں ظلم کرتا ہے۔ اس میں ذات دھرم یا چھوا چھات کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا معاشی عناصر کو ہے۔ سیاست داں بھلے ہی اس صورت حال سے سیاسی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہماری آبادی کا ایک طبقہ خصوصاً دیہات میں دوسرے طبقے کو اوپر اُٹھنے نہیں دینا چاہتا۔ وہ کمزور طبقے کو جو صدیوں سے مجبور و مقہور رہے عدم مساوات کا شکار رہے کسی نہ کسی طرح غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے جس سے اس کی اقتصادی ضروریات پوری ہو سکیں اُسے مُفت یا بہت کم داموں پر بے گار یا مزدوری حاصل ہو سکے۔ اور اسی لئے اس کی کوشش رہتی ہے کہ حکومت ان لوگوں کے لئے بہتری اور ترقی کے جو بھی اقدام کرے اُنہیں ناکام کر دیا جائے تاکہ اس طبقے سے ان کی جو اغراض وابستہ ہیں وہ پوری ہوتی رہیں۔ ایسے واقعات کو طبقاتی جنگ بھی کہا جا سکتا ہے جس میں زمیندار اور جاگیردار طبقہ ایک طرف ہے اور پسماندہ درج فہرست ذاتوں کے افراد دوسری طرف ہیں۔ حکومت نے ان ذاتوں کے افراد میں ان کے مساوی حقوق کے بارے میں بیداری پیدا کر دی ہے جو ان کے لئے مہنگی ثابت ہو رہی ہے کیوں کہ فرعون مزاج بالادست طبقہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ صدیوں سے اُن کا محتاج اور اُن کی دہلیز پر دانے دانے کے لئے ناک رگڑنے والا طبقہ اُن کے مقابل آ کھڑا ہو۔ ان کے ہی کنوئیں سے پانی لے اور ان کی طرح ہی اپنی زمین کاشت کرے۔ حالانکہ یہ لوگ بھی ہاتھ پاؤں رکھنے والی خدا کی ویسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ ٹھاکر اور براہمن اور دیگر اعلیٰ ذاتوں کے لوگ۔ ان کے سینوں میں اُتر کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے احساسات اور جذبات کو مدِ نظر رکھتے ہی مہاتما گاندھی نے اُنہیں ہری جن یعنی خدا کے بندوں کا نام دیا تھا۔ انہیں سماج میں نئی بیداری کا آلہ کار بنایا تھا۔ اُن کے لئے انصاف اور مساوات کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اُن سے چھوت چھات ختم کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ آبادی کے اس قریب ۲۰ فیصد طبقے میں بیداری پیدا کئے بغیر آزادی کا حصول ناممکن ہے اور اُن کے لئے سماجی انصاف حاصل کئے بغیر آزادی کا حصول بے معنی ہے۔

ذِلت کی انتہا

ان اچھوتوں اور ہریجنوں کے ساتھ جنہیں آئین میں درج فہرست ذاتوں کا نام دیا گیا ہے کتنا غیر انسانی سلوک ہوتا آیا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج بھی بہار مدھیہ پردیش اور اُتر پردیش کے بعض اضلاع میں "گوبر یا مزدور" کی روایت موجود ہے

درج فہرست ذاتوں کے یہ لوگ زمینداروں کے ہاں کھیتوں میں مزدوری کرتے اُٹھتے اور اس کے عوض انہیں زمینداروں کے مویشیوں کا گوبر اُٹھا کر لے جانے کی اجازت تھی جسے دھو کر اس میں سے وہ اناج کے دانے اکٹھے کرتے اور کھایا کرتے تھے۔ کیا ایک انسان کے ساتھ اس سے شرم ناک کوئی اور سلوک ہو سکتا ہے۔ کیا یہ غیر انسانی فعل ہریجنوں کو زندہ جلا دینے سے کم گھناؤنا جرم ہے ان لوگوں کا اصل جرم صرف جرمِ ضعیفی ہے یا یہ کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہندو سماج نے شودر کا نام دے رکھا ہے۔ ان لوگوں کی مزدوری یا گندے پیشے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں وہ شہروں، قصبوں یا دیہات میں باقی آبادی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ان کے جھونپڑے باقی آبادی سے دور ہیں۔ کبھی وقت تھا کہ انہیں دیکھنا ایک ہولناک جرم تھا اور اس کی سزا بھی متعلقہ شودر کو زمیندار کے کھیت یا کارخانے میں کچھ دن بلا اُجرت مزدوری کر کے چکانی پڑتی تھی۔

ملک کی تاریخ میں بے شک بہت سے ایسے مصلح یا ریفارمر پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستانی سماج کے اس طبقے کی حالتِ زار پر آنسو بہائے اور بالائی طبقے سے انہیں بھی انسان سمجھنے کے لئے کہا لیکن کبھی کسی نے اُن کے لئے سماجی انصاف کی مانگ نہیں کی اور انہیں اُن کے جائز حقوق دلانے کے لئے جد وجہد نہیں کی گئی۔ یہ لوگ جو جاتی کے لحاظ سے ہندو دھرم کے چوتھے ورن یعنی شودر کے زمرے میں آتے تھے زیادہ تر پیشے کے اعتبار سے بھنگی چمار، نائی جمعدار دھوبی قصاب ڈوم اور کہار کہلاتے تھے اور اُن کا فرض سماج کے باقی ورنوں کی خدمت کرنا تھا۔ ملک کی حکومتوں نے اس تقسیم اور ظلم کو خداداد سمجھ کر کبھی اس مظلوم طبقے کی حالت سدھارنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں برطانوی دور میں انہیں ڈپریسڈ کلاسز کا نام دے کر بعض اداروں میں نمائندگی دی گئی۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے مہاتما گاندھی کی ہدایات اور ان ذاتوں کے تئیں ان کی ترقیاتی حکمت عملی کو شمع ہدایت کا درجہ دیا اور ان کے اصولوں کے مطابق ہی سماج کے اس طبقے کی ترقی اور ان سے سماجی انصاف کے لئے کام شروع کر دیا۔ نہ صرف چھوا چھات کا قانونی اور آئینی طور پر خاتمہ کیا گیا بلکہ آئین میں آبادی کے اس زمرے کا جس کی تعداد ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے لحاظ سے ۱۰ کروڑ ۵۰ لاکھ یعنی کل آبادی کا قریب ۱۶ فی صد تھی خصوصی اہتمام کئے گئے جن کے مطابق ان کی ترقی اور بہتری کے لئے متعدد اقدامات کئے گئے۔

آئین میں ملک کے تمام باشندوں کی یکساں حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں یکساں مواقع کا یقین دلایا گیا۔ آئین کی دفعہ ۱۷ کے تحت چھوا چھات ایک قابلِ سزا جرم قرار دی گئی اور دفعہ ۴۶ کے تحت حکومت ہند پارلیمنٹ ریاستی اسمبلیوں، مرکزی علاقوں اور بلدیاتی اداروں پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ آئین کے جدول میں درج ذاتوں کا سماجی بے انصافی اور استحصال سے تحفظ کریں۔ درج فہرست ذاتوں میں احساس کمتری دُور کرنے کے لئے لوک سبھا میں اُن کے لئے پارلیمنٹ میں ۸۵ اور ریاستی اسمبلیوں میں قریب ساڑھے پانچ سو نشستیں مخصوص کی ہیں جن میں ان کی آبادی کے لحاظ سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح پنچایتی اور ضلع پریشد کے نظام میں بھی اُن کے لئے نشستیں مخصوص کی جا چکی ہیں۔

سرکاری ملازمتوں میں درج فہرست ذاتوں کے لیے حکومت ہند کی انتظامیہ خدمتوں میں ان کے لئے ساڑھے سولہ فی صد حصہ مخصوص کیا گیا ہے۔ جب کہ کل ہند بنا پر مرکزی پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ بھرتی کے لئے یہ تناسب ۱۵ فی صد رکھا گیا ہے۔

آئینی تحفظات کے ساتھ ساتھ درج فہرست ذاتوں کی اقتصادی پسماندگی دور کرنا بھی لازم تھا جس کے لئے حکومت ہند نے سب سے زیادہ زور اس مظلوم طبقے کی تعلیمی ترقی پر دیا ہے۔ ہر سال کروڑوں روپیہ انہیں قبل از میٹرک اور بعد از میٹرک تعلیم کے لئے وظیفوں اور دیگر سہولیات کے لئے صرف کیا جا رہا ہے تاکہ وہ تعلیم پا کر اعلیٰ روزگار حاصل کر سکیں اور اُن کے لئے ملازمتوں کے مخصوص کوٹے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

حکومت نے ایک مقررہ مدت کے اندر گندے پیشوں سے درج فہرست ذاتوں کو نجات دلانے کے لئے سر پر کوڑا اُٹھانے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے اور شہروں و قصبات میں سیوریج سسٹم قائم کیا جا رہا ہے جو خاکروب ان کاموں سے فارغ ہو جائیں گے انہیں متبادل روزگار یا دیگر پیشوں کی تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام

چونکہ ان تمام اقدامات پر عمل کے باوجود درج فہرست ذاتوں کی ترقی کی رفتار مطلوبہ رفتار سے سست تھی اس لئے وزیر اعظم سورگیہ شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے

آج کل نئی دہلی

[illegible] میں ایک بیس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا اور وزیر اعظم راجیو گاندھی نے موجودہ حالات کے مطابق اس میں اصلاح کرکے نئے بیس نکاتی پروگرام کی تشکیل کی جسے اپریل ۱۹۸۷ سے نافذ کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کے نکتہ ۱۱ کے تحت اس امر کے یقینی اہتمامات کیے جارہے ہیں کہ دیہات میں فاضل قرار دی گئی زمینوں کا قبضہ انہیں دلایا جائے۔ گندگی اُٹھانے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ ترقیاتی منصوبوں میں ان ذاتوں کے لیے جو رقوم مخصوص کی گئی ہیں انہیں پوری طرح کام میں لایا جائے۔ ریاستوں اور مرکزی علاقوں کو ہدایات جاری کی گئیں ہیں کہ وہ درج فہرست ذاتوں کے افراد کے خلاف ظلم کی وارداتوں کو روکنے کے لیے سخت اقدامات کریں اور نقصان کی صورت میں انہیں پورا معاوضہ دلایا جائے۔ جس میں مرکز موزوں حصہ ادا کرے گا۔ نئے بیس نکاتی پروگرام میں درج فہرست ذاتوں کی غریبی ختم کرنے ان کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے دوسرے طبقوں کے مقابلے میں آمدنی میں نابرابری کو ختم کرنے، سماجی و اقتصادی عدم مساوات کو ختم کرنے اور اُن کا معیار زندگی کو بلند کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں روزگار دلانے کی مختلف سکیموں کے علاوہ زمینی اصلاحات، گھر کے ایک فرد کے لیے سال بھر کام کی ضمانت بندھوا مزدوروں کی بحالی اور ان کو انصاف دلانے کے پروگرام شامل ہیں۔ انہیں تعمیر مکانات کے لیے زمین اور قرضے دئے جا رہے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۶ سے لے کر فروری ۱۹۸۷ تک ۸۷ ہزار ایکڑ فاضل الاضی درج فہرست ذاتوں کے افراد کو تقسیم کی گئی۔ اسی عرصے میں ۱۹ لاکھ ۱۰ ہزار کنبوں کی روزگار یا دوسرے کاموں کے لئے مدد کی گئی۔ ۳ لاکھ ۶۰ ہزار کنبوں کو مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین دی گئی۔ ۸۶-۱۹۸۵ میں ملک کے دیہات میں غریب طبقوں کے لئے جن میں زیادہ تر درج فہرست ذاتوں کے افراد ہیں مربوط دیہی ترقی کے پروگراموں پر ۱۴۴ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس میں ۲۰.٦ کروڑ روپیہ مرکزی حکومت نے خرچ کیا۔ ان پروگراموں سے ۳۰ لاکھ ۶۰ ہزار غریب کنبے مستفید ہوئے۔

غریبی سے نجات

مرکزی اور ریاستی سرکاریں درج فہرست ذاتوں کی سماجی و اقتصادی ترقی کے عہد کی پابند ہیں اور اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ ہر ریاست میں شیڈولڈ کاست ڈویلپمنٹ کارپوریشن قائم کی گئی ہیں جو ان ذاتوں کے کنبوں کی اقتصادی ترقی ان کے لئے گھریلو صنعتوں کے قیام وغیرہ کے لیے ان کے اور اُنہیں قرض دینے والے اداروں کے درمیان تال میل کا کام کرتی ہیں۔ چھٹے منصوبے میں ۸٦ لاکھ ۵۰ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے بلند کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جب کہ ۸۵-۱۹۸۴ تک ۸۷ لاکھ ۱۰ ہزار کنبے غریبی کی سطح سے اوپر اٹھائے جا چکے ہیں۔ اس طبقے کے باقی ماندہ ۵۰ فی صد کنبوں کو ساتویں منصوبے میں غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے میں اُن کی ترقی کے لئے مخصوص پروگراموں پر مرکزی سطح پر ٦۳۰۳ کروڑ روپیہ اور مرکزی امداد کے پروگرام پر ۹۳۰ کروڑ روپیہ خرچ کیا جارہا ہے۔ چھٹے منصوبے میں یہ رقوم بالترتیب ۳۵۳۳ کروڑ اور ۵۹۵ کروڑ روپیہ تھیں۔

سپیشل کمپوننٹ پلان

عام بجٹ میں درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص پروگراموں کے لیے تخصیص زر کے لئے سپیشل کمپوننٹ پلان مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ منصوبے ملک کی بیس ریاستوں اور چار مرکزی علاقوں میں زیرِ عمل ہیں۔ ان منصوبوں کا بڑا مقصد درج فہرست ذاتوں کے کنبوں کو اقتصادی ترقی کے مختلف پروگراموں کے ذریعہ غریبی کی سطح سے اوپر لانا ہے۔

خصوصی مرکزی امداد

یہ مرکزی امداد جس پر ساتویں منصوبے میں ۹۳۰ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا ریاستی سرکاروں کی امداد کے لئے ہے تاکہ وہ درجِ فہرست ذاتوں کی فلاح کے لئے ریاستی شعبے میں مخصوص پروگراموں پر عمل کریں۔

وظائف اور تربیت

درج فہرست ذاتوں کے طلباء کو بعد از میٹرک تعلیم کے لئے وظائف دینے کی سکیم پر کئی برس سے عمل جاری ہے ۸۷-۱۹۸۶ میں اس سکیم کے تحت ۱۱ لاکھ طلباء کو وظائف دیئے گئے۔ چونکہ ان ذاتوں کے طلبا امتحانات میں اعلیٰ ذاتوں کے طلباء کا مقابلہ نہیں کرپاتے اس لیے ملک میں اسّی مقامات پر ایسے مراکز قائم کئے گئے ہیں جہاں ان ذاتوں کے طلباء کو مختلف امتحانوں میں بیٹھنے کی تیاری کرائی جاتی ہے۔

گندے کام کرنے والے درج فہرست ذاتوں کے کنبوں کے بچوں کو میٹرک سے پہلے تعلیم کے لئے بھی وظائف دئے جاتے ہیں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک وظیفے کی

ماہانہ رقم ۲۰۰ روپے اور بعد از میٹرک تعلیم کے لئے ۲۵۰ روپے ماہانہ مقرر کی گئی ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ میں مرکزی سرکار نے اس مقصد کے لئے ریاستی سرکاروں کو اپنے نصف حصے کے طور پر ۲۵ لاکھ ۲۸ ہزار روپے کی رقم دی ۸۷-۱۹۸۶ میں یہ رقم بڑھا کر ایک کروڑ ۸۲ لاکھ روپے کر دی گئی۔

بک بینک سکیم

درج فہرست ذاتوں کے طالب علموں کے لئے انجینیرنگ اور میڈیکل کی تعلیم میں مدد دینے کی غرض سے بک بینک قائم کئے گئے ہیں۔ اس سکیم کے تحت طالب علموں کو پانچ ہزار روپے کی مالیت نصابی کتابوں کا ایک ایک سیٹ مطالعہ کے لئے دیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں تین سال کے لئے ہوتی ہیں ۸۶-۱۹۸۵ میں ۱۶۸۲۲ طلبا نے اس سکیم سے فائدہ اٹھایا۔ ۸۵-۱۹۸۶ میں سکیم پر ۵۰ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔

طالبات کے لئے ہوسٹل

شہروں اور قصبات میں دیہات سے آئی درج فہرست ذاتوں کی طالبات کی رہائش کے لئے ہوسٹل تعمیر کئے گئے ہیں۔ مرکز ان ہوسٹلوں کے اخراجات کا نصف حصہ اپنی گرہ سے ادا کرتا ہے ۸۶-۱۹۸۵ میں مرکزی سرکار نے ایسے ۱۶۲ ہوسٹلوں کی تعمیر کے لئے ایک کروڑ ۶۷ لاکھ روپیہ کی گرانٹ منظور کی۔ اور ۸۷-۱۹۸۶ میں اس مقصد کے لئے ۳ کروڑ ۱۵ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔

رضا کار اداروں کی امداد

جو رضا کار ادارے درج فہرست ذاتوں کی فلاح کے لئے کام کرتے ہیں انہیں مالی گرانٹ دی جاتی ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ میں ایسے ۱۱۲ اداروں کو ایک کروڑ روپے کی گرانٹ دی گئی۔

شہری حقوق

شہری حقوق کے تحفظ کے قانون ۱۹۵۵ کی دفعہ ۱۵ الف کے تحت مرکز ریاستی سرکاروں کو درج فہرست ذاتوں کے حقوق کے تحفظ کی غرض سے اپنے عملے کو مضبوط کرنے کے لئے مالی مدد دیتا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ میں اس مقصد کے لیے ۸ کروڑ ۷۵ لاکھ روپیہ دیا گیا۔

درج فہرست ذاتوں کیلئے کمیشن

ملک کی اتنی بڑی آبادی کے تحفظ کے مسائل سے عہدہ برا ہونے کے لئے جولائی ۱۹۷۸ میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا یہ کمیشن مختلف قوانین پر عمل درآمد کے سلسلے میں اب تک اپنی چھ رپورٹیں صدر جمہوریہ کو بھیج چکا ہے آئین کے تحت درج فہرست ذاتوں کے تحفظات کی نگرانی کے لئے ایک کمشنر بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ کمشنر اب تک ۲۷ سالانہ رپورٹیں صدر جمہوریہ کو بھیج چکا ہے جو پارلیمنٹ میں پیش کی جا چکی ہیں۔ آئین میں شامل درج فہرست ذاتوں پر نظر ثانی کرنے کا سوال بھی زیر غور ہے۔

مذکورہ انتظامات اور تحفظات سے ظاہر ہے کہ حکومت ہند نے ہزاروں برس سے کچلے ہوئے ان لوگوں کے دُکھ درد کو پہچانا ہے انہیں اوپر اٹھانے کے لئے اُن کا ہاتھ پکڑا ہے۔ لیکن سماج کے دوسرے طبقوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اوپر اٹھائے ان طبقوں کو اپنا حریف خیال نہ کریں بلکہ انہیں سماج میں مساوی حقوق حاصل کرنے میں مدد دیں۔ آج کل اس طبقے سے زیادتی کی جو شکایات موصول ہوتی ہیں اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دیگر طبقے اُن سے کئے جا رہے انصاف کو اُن سے امتیازی سلوک سمجھنے لگے ہیں۔

■■

بہار کیسری : شری کرشن سنہا

آج جب کہ ہم اپنی آزادی کی چالیسویں سال گرہ منا رہے ہیں، ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ان رہنمایانِ قوم کی خدمات اور قربانیوں کو یاد کریں، انہیں خراجِ عقیدت پیش کریں، جنہوں نے ہمیں انگریزوں کے ناپاک شکنجوں سے آزاد کرایا اور اپنی زندگی ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ ایسے لوگوں میں بہار کیسری شری کرشن سنہا کا نام سرِ فہرست ہے۔

شری کرشن سنہا کا جنم ریاست بہار کے ضلع مونگھیر میں ایک کسان خاندان میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو ہوا۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ بچپن ہی سے انقلابی طبیعت کے مالک تھے اور انگریزی سامراج سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں ایک بنگالی ماسٹر نے، جن کا تعلق انقلابیوں سے تھا، ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے سینے میں حب الوطنی اور قوم پروری کی وہ آگ لگائی کہ اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے گنگا کے کنارے ایک ہاتھ میں گیتا اور دوسرے ہاتھ میں کرپان لے کر عہد کیا کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے ملک و قوم کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اپنے اس عہد پر وہ تادمِ آخر قائم رہے۔

ابتدائی تعلیم مونگھیر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ۱۹۰۸ء میں پٹنہ چلے آئے اور پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہیں سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ انقلابِ فرانس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ دورانِ تعلیم ان کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ بعد میں انہوں نے قانون کا امتحان پاس کیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن حصولِ آزادی کا جذبہ ہمیشہ اس پیشے پر غالب رہا۔ بالآخر اس کشمکش کا اختتام اس وقت ہوا جب گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے ۱۹۲۱ء میں انہوں نے وکالت کا پیشہ ترک کیا۔ اور پوری طرح جنگِ آزادی میں شامل ہو گئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں قدم قدم پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے دل میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ ان پرخار راہوں سے گزر کر ہی اس منزل تک پہنچا جا سکتا ہے، جہاں ہمارے جذبات و احساسات کسی اور کے تابع نہ ہوں گے۔ جہاں ہم پابند ہوں گے تو صرف اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کے۔ اس تحریک کا ساتھ دینے کے جرم میں انہیں پہلی بار گرفتار کیا گیا۔

وہ گاندھی جی کے بڑے مداح تھے اور جنگِ آزادی میں انہیں اپنا آئیڈیل مانتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کے اصولوں پر چلتے رہے۔ ان کے اندر زبردست قائدانہ صلاحیت موجود تھی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ صوبائی کونسل میں سوراج پارٹی کے نمائندہ منتخب ہوئے۔ لیکن نمک ستیہ گرہ تحریک میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے انہوں نے صوبائی کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ نتیجہ کے طور پر ایک بار پھر گرفتار کر لیے گئے۔ مگر ان کے حوصلے قید و بند کی صعوبتوں سے پست نہیں ہوئے۔ رہائی کے بعد پھر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۳۴ء میں امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب کیے گئے۔ اس کے بعد جب ۱۹۳۷ء میں بہار میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو وہ وزیر اعلیٰ کے عہدے پر مامور ہوئے، لیکن انگریز گورنروں کے سخت رویّے کے خلاف انہوں نے اس عہدے سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دوبارہ بہار کے وزیرِ اعلیٰ بنے اور تاحیات اسی عہدے پر فائز رہے۔

ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وہ تقریباً ۱۸ برسوں تک بہار کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔ اس دَوران انہوں نے ریاست بہار کی ترقی کے لیے بہت سے مفید کارنامے انجام دیے۔ کسانوں کے مفاد کے پیشِ نظر انہوں نے بہت سے منصوبے بنائے۔ زمین داری نظام کو ختم کرنے کی شروعات بھی ان کے عہد میں ہوئی تھی۔ صنعتی اعتبار سے بھی وہ ریاست بہار کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے کوشاں رہے۔

وہ بڑی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ا

—— ایک شعلہ بیان مقرر، ایک غیر معمولی منتظم

—— ایک عظیم مجاہدِ آزادی اور بے لوث قومی خدمتگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے علم دوست بھی تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں تقریباً ساٹھ ہزار

(آگے صـ۲ پر)

ظ۔انصاری

قیصر زیدی : نفیس گلدان میں کیکٹس کا پھول

اے ہوش مند لوگو، اگر تمہاری ہوش مندی میں قبل از وقت فتور نہیں آگیا ہے تو بچو قیصر زیدی کو اپنا آئیڈیل بنانے سے —— ورنہ زندگی بھر ارمانوں کا عاشورہ مناتے رہوگے اور اگر مالکِ یوم الحساب نے تمہارے حواسِ خمسہ میں کسی ایک غیر معمولی حس کی پُٹ لگا رکھی ہے تو ملو اور ملتے رہو قیصر زیدی سے ؛ اُن کی مصاحبت کرو، حاشیہ برداری کرو، چلم یا چائے دانی بھرو۔ کیوں کہ ان کی صحبت سے اب تک جتنے اُٹھے (اور جو اس ہالے سے نکل بھاگے) وہ زندگی بھر ان کے احسانمند رہیں گے۔ جب جب اور جہاں جہاں چمکیں گے، متانت، ذہانت، خلوص، وضعداری اور کیموس کے اس پرانے مٹکے سے، جس کا نام ابوالکاظم قیصر ہے، اپنے دیے میں تیل ٹپکاتے پائے جائیں گے۔
اُن کی صحبت ایک نعمت ہے اور اُن کی تقلید یا نقل ایک کلفت۔

قیصر صاحب کو میں نے اس زمانے میں دیکھا، جب اُنہیں ایک جھلک دیکھنے کے لیے سرِ راہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کڑی کمان کے تیر کی طرح جاتے تھے۔ وہ اُس وقت بھی ایک عجوبۂ روزگار تھے، جب پریشاں روزگار تھے۔ اور جب شکم سیر ہوئے تب بھی اپنی ٹیڑھ (یا اوریجنلٹی) کے سبب عجوبہ ہی رہے۔ جن برسوں وہ میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا پڑھا کر آ رہے ہیں اور فلسفے کے مطالعہ گھر میں پھر گم ہو جائیں گے۔ ان کی تھاہ نہیں ملنے والی۔

اور پھر جب پڑھانے کے کام میں لگ گئے تو شاعری طاق پر رکھ دی اور ایسے سدھ گئے جیسے ہرن نے گھاس لادنے کا اور ہاتھی نے نیلگری بن کے گٹھے ڈھونے کا کام خوشی خوشی قبول کر لیا ہو۔

اللہ میاں کے سکریٹریٹ میں ایک سے ایک کائیاں فرشتہ پڑا ہے۔
پروردگار نے ابوالکاظم کو ٹیڑھا پیدا کیا۔ کیا لباس، کیا گھنے بال، کیا چال، کیا گفتگو، کیا انداز، کیا طور طریق سب میں وہ اوروں سے نرالے تھے۔ نرالے پن کو بڑی صفت شمار کرنے میں اپنی ذہانت اور اُپج کا ٹیکس ادا کرنا بھول گئے۔ کائیاں فرشتے نے لال قلم سے ٹک مارک کر دیا۔ یعنی ایک پیخ لگا دی جائے کہ زیادہ اُڑنے نہ پائیں۔ سو یہ صاحب جنہیں شاہینی قوتِ پرواز میسر تھی، آنگن میں ہی مٹک مٹک کر دانہ دُنکا چگنے لگے۔ یہاں تک کہ آنگن اہل و عیال سے بھر گیا اور گردن سفید ایال سے۔
خود شیفتگی نے اُن سے سُود در سُود حساب بے باق کرایا اور ان کے چاہنے والے مُنھ تکتے رہ گئے۔

مجھے نہیں معلوم، وہ پیدا کب ہوئے اور سرکاری رجسٹر میں بڑوں نے کیا عمر لکھوائی، لیکن نوجوانی (۱۹۳۸ء - ۴۰) سے ہی ان میں گہرے مطالعے، حق بینی اور حق پرستی کے آثار رہے ہوں گے۔ کیوں کہ ان کے ہمسائے اور اساتذہ تبھی سے اُن کا لحاظ کرتے تھے، وضع ان کی ایسی رہی کہ نہ چاہو، تب بھی آنکھوں میں کُھب جائیں۔ کھدر کا کُرتا، کھدر کا

● ۳۲ 'شیریں' کولابا، بمبئی ۴۰۰۰۰۵ (مہاراشٹر)

پاجامہ، نفیس چشمہ، نفیس گھڑی، قیمتی قلم، چوڑا خوش وضع چہرہ، تیکھا ناک نقشہ، قد و قامت اور چال میں ایک تناسب، گفتگو میں ایک خوش گوار متانت، آداب میں بڑے بوڑھوں کی سی وضع داری، ایک ایک جملہ دھرم کانٹے میں تول کر زبان پر لانے کی احتیاط، کسی کی مدح ہو یا قدح کبھی احتیاط اور مروّت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ عاشق وہ کئی بار ہوئے، لیکن کسی کو پتہ نہ چلنے دیا کہ کب کب؟ کس پر؟ اور کب تک؟؟

غالب انہیں اوّل سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا — ٹھیک اسی طرح جیسے غالب کو بیدل نے پہلی جست میں پکڑ لیا تھا۔ جنہوں نے بیدل کا کلام نہیں پڑھا۔ وہ بھی غالب کی معرفت اُس کے قائل ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم میں سے کوئی بھی قیصر زیدی کی معرفت غالب تک نہیں پہنچا۔ وہ ذوق جگاتے، تلاش اُبھارتے اور پھر صاحبِ ذوق کو اُلجھا کر وہیں چھوڑ دیتے۔ زمانے کی بد ذوقی کو طرح طرح سے نکو بناتے اور خود کوئی ذمّہ داری اپنے سر نہ لیتے —— کہ دنیا داری کے جھمیلے میں کون پڑے۔

وہ میرٹھ سے جامعہ ملّیہ اسلامیہ ۱۹۴۵ء میں پہنچے تھے (اور اب تک وہیں رہتے ہیں) پہنچتے ہی اُنہیں احساس ہوا کہ گھر گئے ہیں۔ کس میں گھر گئے؟ کتابی کیڑوں میں؟ دانشوروں میں؟ قاعدوں قرینوں میں، نمازیوں کی صفوں میں؟ وہ خود نہ تو رندِ مے خوار تھے نہ طالبِ پیکار۔ سچ پوچھیے تو اپنے روزمرّہ کے بیوہار میں صاف ستھرے ایک پاکباز آدمی تھے۔ گھُل مِل جاتے ——، مگر اہلِ مسواک و مصلّے سے دل نہ لگایا۔

اپنا مصلّے الگ بچھایا اور یہاں بھی الگ تھلگ سے رہے۔ گلدان میں کانٹے سجا کر چائے دانیوں کی قدامت جتا کر، قدیم کتابوں کے حوالے حاشیے سُنا کر اور اپنی دریافت کو سینے سے لگا کر۔

ایسے کردار خود بھی گلدان میں سجا دیے جاتے ہیں اور دور و نزدیک کے لوگ اُن کی بازیافت بھول جاتے ہیں۔

اُن کی فطرت میں جو گہری درد مندی رچی ہوئی تھی، شاید اس کا اور اپنے تدریسی پیشے کا تقاضا ہو گا کہ "اولڈ بوائز لاج" ہاسٹل کے اوپر والے مکان کے اندر اُن کی دلچسپی بڑھتی گئی اور تمام تر صلاحیتوں کو اُنھوں نے بال بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کرنا باقی زندگی کا مقصد بنالیا۔ یہاں واقعی وہ کامیاب رہے۔ اچھے رہے۔

کم و بیش ستّر سال صاف ستھری، بے داغ، بے ریا زندگی گزار کر اب اُنہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شاید دل میں کھٹک ہوئی کہ اوّل قدم سے آخر قدم تک فاصلہ اتنا بھی نہیں کہ اُسے فاصلہ کہہ سکیں جسمانی اور ذہنی سفر اُنہوں نے نہیں، زمانے کی دھوپ چھاؤں نے طے کرایا ہے۔ خدا کی پناہ! زمانے کی دھوپ چھاؤں بھی کیا کھلواڑ کرتی ہے آدمی سے کہ وہ سمجھے چل رہا ہے، اور دوسری صبح دیکھے تو پھر وہیں کا وہیں۔

قیصر زیدی، غیر معمولی مگر خوابیدہ ادبی صلاحیتوں کے امانت دار نے سیدھے سبھاؤ عمر تیر کر دی؟ یہ کرشمہ تن آسانی کا ہے یا دنیا کے اطوار پر ایک معصوم بچّے کی حیرانی کا؟ میں تو پوچھ رہا ہوں کوئی بتائے —— اُنہیں نہیں۔ ہم کو، کہ اُن پر حیران ہیں۔

■■

(یہ مضمون قیصر صاحب مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا)

بقیہ: کہ چلے ہم

اسٹیٹ خاص خاص اور پھر عام عام موقعوں پر درشن دیا کرتے اور شاید رعایا کو سچی جھوٹی تسلّی بھی۔ برج کے دونوں طرف سیڑھیاں جن کا سلسلۂ نسب رومن ایمپائر سے چل کر بھارت بھون، یعنی ماڈرن ایج تک آملا ہے۔ اب یہ پبلک تھیئٹر کا کام دیتی ہے۔ پہلے یہاں راجہ کے حوالی موالی براجمان ہوا کرتے تھے اب امراد فقرا کے۔ سڑک پار والے وسیع و عریض اسٹیج پر پریڈ ہوتی ہے۔ تھیئٹر ہوتے ہیں۔ ناچ گانے مشاعرے، شیو راتری اور دسہرہ میں بھجن کیرتن اور رام لیلا۔ اور موسم بے موسم الکیشن کے بھاشن۔

بس چلتے چلاتے آخری بات۔ جس مکان کی بالکونی سے وقتاً فوقتاً نظارہ کر کے ہم آپ رن اینگ کمینٹری دے رہے ہیں۔ وہ شمالی پہاڑ خاصی اونچائی پر بنا ہے۔ یہاں سے ہم پہرہ بھی دے سکتے ہیں۔ اور چاہیں تو سارے شہر کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔ پورا شہر ہماری نظروں کے حلقے میں ہے۔ تو بات ہمارے ذہن میں یہ آئی کہ ہر شہر کی حفاظت کے تمام طریقے فیل ہو چکے ہیں۔ کہیں انتہا پسند کہیں ابتدا پسند۔ جسے دیکھیے آ آ کے اپنے ارمان نکال رہے ہیں۔ اور دھڑاکے سے چھکّے چوکے مار رہے ہیں۔ چور سپاہی کا کھیل جاری ہے۔ بس شہر کے چاروں طرف پہاڑ اُٹھا کے شہریوں کو بیچ میں لا کے چھوڑ دیا جائے۔ جان و مال کی سلامتی کے لیے کسی یکساں لباس والے انبوہ کو پالنے سے پہاڑ کا بنانا آسان ہو گا۔ کم خرچ اور بالا نشین بھی۔ پھر کسی چاند ماری کا کوئی خطرہ نہیں۔

صاحبو! اب آپ سے کلو میں ملاقات ہو گی کہ ہم نے پتہ لگا لیا ہے کہ شرق کی اور کلو ہے اور یہ کہ مندی کے ادب دوستوں کے متعلق اگلی قسط میں گل افشانیاں کی جائیں گی —— زندگی شرط ہے (قلم کی —!)

انور صدیقی

کچھ قیصر بھائی کے بارے میں

• قیصر زیدی

غالباً ۱۹۵۷ء کی بات ہے دہلی کے تعمیر پسند ادیبوں کی انجمن نے مجھے علی گڑھ سے ایک ادبی نشست میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ اتفاق سے یہ نشست جامعہ ملیہ میں ہوئی تھی۔ اس نشست میں جو لوگ شریک ہوئے، ان میں ڈاکٹر عابد حسین مرحوم اور روش صدیقی مرحوم کے علاوہ ایک اور صاحب تھے، جن سے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا، مگر جنہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی اور اساطیری قسم کی شخصیت رکھنے والے بزرگ ہیں۔ ان کے لباس اور گفتار میں مجھے ایک طرح کی ندرت محسوس ہوئی۔ پہلی نظر میں ان پر مجھے ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن پنت کا دھوکا ہوا کہ میں انہیں الہ آباد میں کئی مرتبہ دور سے دیکھ چکا تھا۔ ان کا بھی ہو بہو یہی حلیہ تھا۔ کھدر کا کرتا، کھدر کا پاجامہ اور کھدر کی جواہر جیکٹ۔ آنکھوں پر سنہری عینک چڑھی ہوئی، بالوں کی وضع قطع بھی ایک جیسی۔ روش صدیقی مرحوم نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ میں فریبِ نظر میں مبتلا تھا۔ یہ تو قیصر زیدی صاحب ہیں۔ جامعہ کالج میں اردو کے استاد، باکمال شاعر اور دیدہ ور نقاد۔ اس تعارف کا نقش اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا، جب قیصر صاحب نے اپنی نظم سنائی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے محفل پر چھا گئے۔ میں نے اس سے پہلے تحت اللفظ میں اُن سے اچھا پڑھنے والا نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھی قیصر صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

پھر کوئی سات سال بعد اس وقت دوبارہ ملاقات ہوئی، جب میں جامعہ کالج میں قیصر صاحب کا رفیقِ کار بنا۔ قیصر صاحب نے تو غالباً مجھے نہیں پہچانا، مگر میں اُنہیں دیکھتے ہی پہچان گیا اور اپنی قسمت پر نازاں ہوا کہ اب ایسوں کا ساتھ رہے گا۔ جن سے واقعی کچھ سیکھ سکوں گا۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب ان کی شخصیت کے اور بہت سے ایسے گوشے سامنے آئے جو مجھ سے پوشیدہ تھے۔ دھیرے دھیرے ان کی وہ شخصیت جو مجھے پہلی ملاقات میں اساطیری کُہر میں لپٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی، ایک اچھے اور تہ دار شعر کی طرح بڑی حد تک واضح اور شفاف نظر آنے لگی۔ یہی وہ منزل تھی، جب عمر، صلاحیت اور تجربے میں تفاوت کے باوجود قیصر زیدی صاحب میرے لیے قیصر بھائی بنے۔ ان سے ہر ملاقات اب میرے لیے ایک تجربہ تھی۔ میں عرصہ سے اس وہم میں مبتلا تھا کہ اردو معاشرے میں گفتگو کا فن زوال پذیر ہے۔ قیصر بھائی کی باتیں سنیں تو معلوم ہوا کہ قصور میرا ہی تھا، میں ہی ان جیسوں سے نہیں مل پایا تھا، اور غلط اندیشی کا شکار رہا۔ لفظ شعر ہی میں زندگی نہیں پاتا، اچھی گفتگو بھی اسے نئے اظہاری امکانات سے آشنا کرتی ہے۔ یہ احساس مجھے فراق صاحب کے بعد قیصر بھائی کی گفتگو سن کر ہوا میرے تجربے میں ان دونوں جیسا گفتگو کا ساحر آج تک نہیں آیا۔ میں نے انگریزی کے رومانی شاعر کولرج کی Table Talk کا ذکر پڑھا ہے۔ کولرج میں اپنے بوڑھے ملاح کی طرح اپنے سننے والوں کو سحر زدہ کر دینے کی صلاحیت تھی۔ معلوم نہیں، کیوں مجھے گفتگو ہی میں نہیں بلکہ اپنے اسلوبِ حیات میں بھی قیصر بھائی کولرج سے خاصے مشابہ نظر آتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اور ہر گفتگو کے بعد محسوس کیا ہے کہ قیصر بھائی کی گفتگو میں جو کچھ ہے اس کا چوتھائی حصہ بھی ان کی تحریروں میں منتقل نہیں ہو سکا ہے۔ اچھی اور موثر گفتگو کرنے والوں کا اکثر یہی المیہ رہا ہے کہ وہ بقول آسکر وائلڈ اپنی فطانت کا اظہار تو اپنی گفتگو اور زندگی میں کرتے ہیں، مگر فن میں

• شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صرف اپنی مہارت کا مظاہرہ کر پاتے ہیں۔ قیصر صہبائی نے بہت سی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ مضامین لکھے ہیں۔ ترجمے کیے ہیں۔ تفہیم شعر کے جوہر دکھاتے ہیں۔ مگر ان کی گفتگو میں جس فعال تخلیقی ذہانت کا ہر لمحہ احساس ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ اردو شعر و ادب کو دے سکتے تھے، پورے طور پر نہیں دے پائے ہیں۔

ان کے ادبی کارنامے ان کی ذہانت کا عکس ہیں اور صرف عکس۔ قیصر صہبائی سے باتیں کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ عظیم ادب کے رمز شناس ہیں۔ شعری تجربے کی تمام گہرائیوں اور پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ لفظوں کے چہرے ہی نہیں پہچانتے بلکہ ان کی شخصیت اور مزاج سے بھی آگاہی رکھتے ہیں، وہ کلاسیکی ادب کو بھی اسی شغف سے پڑھتے اور سمجھتے ہیں، جس توجہ سے جدید شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں روایت اور انفرادی تجربے کے تمام رشتوں کا علم ہے۔ وہ شعر میں لفظوں اور پیکروں کی جدلیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ آواز اور لہجے کے خفیف ترین ارتعاشات کو ان کا سمعی تخیل محسوس کر لیتا ہے۔ غالب کے بعض مشکل اشعار کو ان کے بنیادی لہجے کی شناخت کے بعد وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ معنی روشن ہو جاتے ہیں۔ غالب کے طرفدار میں نے بہت دیکھے ہیں، غالب فہمی کے دعویداروں کی بھی کمی نہیں ہے، مگر غالب فہمی کا حق قیصر صہبائی جس طرح ادا کرتے ہیں، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے غالب کے سلسلے میں اپنی بصیرت طالب علموں اور دوستوں میں تو عام کی، مگر باضابطہ طور پر غالب پر لکھنے سے گریز کیا۔ اس گریز سے انہیں بھی نقصان پہنچا ہے اور غالب شناسی کو بھی۔

کولرج کی طرح قیصر صہبائی بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں مگر نہ جانے کون سی کمزوری انہیں منصوبوں کو عملی شکل نہیں دینے دیتی۔ کولرج کے ساتھ افیون لگی ہوئی تھی اور قوتِ ارادی بھی کمزور تھی، مگر قیصر صہبائی کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ قیصر صہبائی Perfectionist ہوں اور خود جو کچھ لکھتے ہوں اس سے مطمئن نہ ہوتے ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گفتگو کا نشہ زنجیر بن جاتا ہے۔ کہیں قیصر صہبائی اسی نشے کے قیدی ہو کر نہ رہ گئے ہوں۔ تحریر کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ اس میں زندہ آواز کی گونج نہیں ہوتی۔ قیصر صہبائی مجھے اس اعتبار سے Oral Tradition کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گفتگو کو فنونِ لطیفہ میں شامل کر لیا جائے تو اس فن لطیف کے اچھے اور بڑے فن کاروں میں قیصر صہبائی کا نام ضرور آئے گا۔

قیصر صہبائی تحریر کے معاملے میں خاصے چور ہیں، کم لکھنے کی شکایت دوستوں ہی کو نہیں گھر والوں کو بھی ہے۔ ایک مرتبہ نہ جانے کہاں سے وہ ایک خوب صورت وکٹوریائی انداز کی Writing Table خرید کر لے آئے۔ انہیں دنیا کی خوب صورت اور عجیب چیزیں جمع کرنے کا بے پناہ شوق ہے اور جب بھی کوئی نادر چیز ہاتھ آتی ہے تو دوستوں کو ضرور دکھاتے ہیں۔ اور اپنے ذوقِ انتخاب کی داد چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب Writing Table لائے تو مجھے بلا کر دکھایا مگر ساتھ میں اپنی بیگم کا یہ فقرہ بھی سنایا کہ "لکھنے کی میز تو لائے ہو، لکھنے والا بھی لائے ہوتے"۔ اس حسرت آمیز شکایت میں ان کے سب ہی جاننے والے ارادتمند شریک ہیں۔

قیصر صہبائی نے ایک زمانے میں بھرپور تخلیقی زندگی گزاری تھی — اور کیوں نہ گزارتے کہ وہ بنیادی طور پر تخلیقی آدمی ہیں۔ ان کا تعلق اس دور کے بڑے تخلیقی فن کاروں سے رہا ہے۔ مثلاً: جگر بسوانی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، احسن مارہروی، بیخود دہلوی، بہزاد لکھنوی، سراج لکھنوی، نوح ناروی، قدیر لکھنوی، جگر مرادآبادی، جاں نثار، جذبی، مجاز، روش، اختر جمال، فراق، جوش، اختر الایمان وغیرہ۔ میرٹھ کالج میں طالب علمی کے زمانے میں حسن عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد ان کے خوشہ چینوں میں تھے۔ ساغر نظامی صاحب کے ساتھ ایشیا کے ادارتی عملے میں شامل تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ ادبی جلسوں میں ادب لطیف کے نمونے سناتے تھے۔ اور مشاعروں کی سی داد پاتے تھے۔ میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کو ان سے نیاز مندانہ ملتے دیکھا ہے اور اکثر نے تو ان سے کسبِ فیض کا مجھ سے اعتراف بھی کیا ہے۔ اگر یہ بات مبالغے پر محمول نہ کی جائے تو میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے ایک پوری ادبی نسل کو معنی خیز طور پر متاثر کیا ہے۔ مصطفٰے زیدی (تیغ الہ آبادی) نے قیصر صہبائی سے کسبِ فیض کیا تھا۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اپنی تخلیقی زندگی کے تشکیلی دور میں مصطفٰے زیدی پر سب سے زیادہ اثر قیصر صہبائی کا تھا۔ اس اعتبار سے ان کی تصانیف کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے نام نظر آئیں گے۔ بعض لوگ خود کو چراغِ تہِ داماں بنائے رکھنے میں لطف محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کے چراغوں کی لَو کو اونچا رکھنے میں سرگرم رہتے ہیں — ساری عمر قیصر صہبائی یہی کرتے رہے۔ انہوں نے خود کم لکھا مگر دوسروں کو لکھنے اور اپنا ادبی مقدر بنانے پر آمادہ کیا۔ اس طرح ان کی حیثیت ایک طرح کی ادبی God Father کی رہی ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسے ادیبوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ مغرب میں ایسوں کے اعتراف میں بخل نہیں برتا جاتا۔ ہمارا ادبی معاشرہ ابھی اس فراخدلی

سے محروم ہے ۔

قیصر صبائی دراصل ایسے تخلیقی فن کاروں میں ہیں جو کسی تحریک کا دامن تھام کر نہیں چلتے، کسی بیساکھی کے محتاج نہیں ہوتے ۔ اُنہوں نے نہ تو ترقی پسند تحریک کا سہارا لیا اور نہ ہی وہ حلقۂ اربابِ ذوق میں شامل ہوئے ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دونوں حلقوں نے ان کا وزن محسوس تو کیا، مگر اس کے اعتراف میں انہیں اپنی شکست نظر آئی ۔ چنانچہ قیصر صبائی خاموشی کی سازش کا شکار ہو گئے ۔ وہ اس صورتِ حال سے نکلنے کی راہ نکال سکتے تھے، مگر یہ راہ تخلیقی آدمی کی راہ نہ ہوتی ؛ مثلاً وہ خود پرستی کی راہ اپنا سکتے تھے ۔ اپنا [illegible] تیار کرنے کے لیے کچھ نقاد نما ادبی ڈفالیوں کا سہارا لے سکتے تھے، مگر اُنہوں نے یہ سب کچھ گوارا نہ کیا ۔ اور اپنے آپ کو ادبی منظر نامے سے بتدریج ہٹاتے چلے گئے ۔ یورپ کے جمالیاتی انسان کی سی خود نگری بے نیازی کے ساتھ اُنہوں نے اپنی الگ دنیا بنالی، اپنی ہی آواز کے دیار میں رہ کر اُنہیں تسکین محسوس ہونے لگی ۔ میں جب اُن سے ملا تو وہ اسی دیار کے باسی ہو چکے تھے ۔ ان میں کسی قسم کی شکست خوردگی نہیں تھی بلکہ اپنے احساس کے شعلے کی تندی پر نازاں تھا ۔ اُنہیں یہ یقین تھا کہ ایک دن ہجوم زدہ ادبی تنقید سے اردو شعر و ادب آزاد ہوگا اور وہ جو کچھ کر چکے ہیں اس کا اعتراف کیا جائے گا ۔ اگرچہ ابھی وہ دن نہیں آیا ہے ۔ پھر بھی اس یقین سے ان کا سینہ معمور رہا ۔

قیصر صبائی نے مجھے اپنی ایسی بہت سی نظمیں سُنائی ہیں جو ایک زمانے میں خاصی مقبول تھیں ۔ ان نظموں کو سُن کر احساس ہوا کہ یہ ایک ایسے اچھے اور سچے شاعر کی نظمیں ہیں، جسے اپنی شعری روایت کا پورا شعور رہے اور جو اس شعور کی حدود میں رہ کر اپنے انفرادی تجربے کے اظہار کی راہیں تلاش کر رہا ہے ۔ اسے اپنے زمانے کی وہ برہنہ نگاری پسند نہیں ہے جسے ترقی پسندی عام کر رہی ہے، اسے اس بات کا یقین ہے کہ حقیقی شعری اظہار ایک طرح کی بالواسطگی کا طالب ہوتا ہے، مگر بالواسطگی اور ابہام میں فرق ہے ۔ اس طرح وہ ترقی پسندی اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں کے شعری طریقِ کار سے ناآسودہ تھے ۔ وہ دونوں کے درمیان ایک طرح کی مفاہمت کے متلاشی تھے ۔ اس مفاہمت میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ۔ اس کا ثبوت ان کی کئی نظموں میں نظر آتا ہے ۔ اُنہیں حلقۂ اربابِ ذوق والوں کا ابہام پسند نہیں تھا، مگر وہ اظہار و آہنگ میں ان کے تجربوں کو پسند کرتے تھے ۔ ان کی نظموں کا مواد انقلابی رومانیت کی وجہ سے ترقی پسند طرزِ فکر سے قریب ہے ۔ نوجوان ذہن کی اپنے ماحول سے ناآسودگی ایک بہتر زندگی کے خواب، سامراج دشمنی، مشرق کی بیداری، فرض اور عیش کے درمیان دل خراش کشمکش ایسے موضوعات اور رویے ہیں جو قیصر صبائی کی بیشتر نظموں میں ہمیں نظر آتے ہیں ۔ ان موضوعات بیان کا اظہار شعری تجربے کی صداقت بھی رکھتا ہے اور رعنائی بھی ۔ ان کے شعری محاورے میں رومانی اسالیب احساس و اظہار کی بھی کارفرمائی ہے اور اس غیر رومانی رویے کی بھی، جسے ترقی پسندی عام کر رہی تھی ۔ چنانچہ کئی نظموں کا آہنگ موضوعات کی مناسبت سے درشت اور گفتگو کی زبان کا آہنگ لیے ہوئے ہے ۔ ان کی چند نظموں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ۔

تو سوچتا ہوں کہ دفتر میں نوکری کر لوں
اُٹھا سکوں گا پلندوں کا بارِ روح شکن ! ؟
اٹھے گی بربطِ خود دار سے نوائے شکست
شرارِ غیرتِ آبا رہے بجھنے کی آواز
نہ اُٹھ سکے گا پلندوں کا بارِ روح شکن !!
اٹھاؤں اپنے نفس سے حجابِ خاکستر
فسردہ شعلوں کو اک بار بے نقاب کروں !

(شکست)

غیر رومانی مکالماتی انداز دیکھیے :

مری تخلیق کا منشا مجھے معلوم تو ہو
مری سرکار کو کچھ میری ضرورت تو نہیں
اور سرکار نے اک موٹی سی گالی دے کر
تلملاتے ہوئے غصے سے کہا "اے مردود
ایسا گستاخ کہ محتاج سمجھتا ہے ہمیں
یاں تو بھگوان کی کرپا سے ہے سب کچھ موجود"

(رقصِ بسمل)

یوں مجھے آپ کی اُلفت سے تو انکار نہ تھا
ہاں مگر میں نے یہ چاہا تھا کہ آسودہ رہو
ایک آوارہ مسافر سے محبت کا مآل !؟
ریل آتی بھی ہے اور آ کے چلی جاتی ہے
اور انجن کا دُھواں
اک سیہ پوش کی، قرطاسِ فضا پر تصویر
آن کی آن میں بنتی ہے بگڑ جاتی ہے ۔

(معذرت)

قیصر صبائی کی نظموں کے ان اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس فن کاری سے اپنے شعری تجربوں کی تجسیم کرتے ہیں ۔ میں شعر کے

آہنگ میں ڈرامائی اور مکالماتی لب ولہجہ کے ذریعے تخلیقِ معنی کو ان کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

ارسطو نے اچھے شاعر کی بڑائی کا ایک معیار قائم کیا تھا اور وہ معیار تھا استعارے کی تخلیق کی استعداد۔ یہ ایک ایسا معیار ہے جسے آج تک کوئی مسترد نہیں کر سکا ہے کہ استعارہ شعری ادراک و اظہار کی جان ہے۔ اس معیار پر قیصر سہائی کی نظموں کو پرکھتا ہوں تو بڑی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔ اب ان کی نظموں کے چند ایسے نمونے دیکھیے جن میں استعارے کا عمل شباب پر ہے:

دُور صحراؤں کی آغوش میں شمعوں کی قطار
شعلۂ حُسن فروزاں ہے بیابانوں میں
قمقمے دیدۂ حیراں کی طرح تکتے ہیں

(دَلدَل)

کون سمجھائے کہ اُمیدِ بہاراں ہے عبث
ہل کی پھالی پہ لگا زنگ، اُبھر آئے ببول

(انتظار)

قلبِ خود بیں وخود آرا کے بخاراتِ مہیب
خود ستائی کے پہاڑوں سے جو ٹکراتے ہیں
سبز پتّوں سے ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیں

(مشعل)

نیند!!
خود فراموشیِ آبار کے خماریں پرتو
جاگتی آنکھوں کے ساغر بھر دے!!

(نیند)

شعری پیکروں اور استعاروں کی ان نظموں میں جو منظم فراوانی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بے پناہ اور غیر معمولی شعری صلاحیت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تمام نظمیں ایک ایسے فن کارانہ شعور کا پتہ دیتی ہیں جو انتہائی چوکس ہے اور حُسنِ تعمیر سے آگاہ! قیصر سہائی نظموں کی تعمیر کا بڑا رچا ہوا شعور رکھتے تھے۔ یہ شعور ہمارے کم شعرا میں نظر آتا ہے۔ عام طور پر رومانی حسیت رکھنے والے شعرا نظم کی تنظیم اور تعمیر پر کم توجہ دے پاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جذبے کے وفور ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قیصر سہائی کی ان نظموں میں بھی جن میں وہ رسم و رہِ رومانیت سے قریب ہیں، بڑا فن کارانہ انتظام و انصرام ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنی شعری زندگی کی ابتدا ہی سے جذبہ کو اہمیت دیتے ہوئے بھی جذباتیت سے گریز کرتے رہے تھے۔ ان کے جذبات نے ہمیشہ شعور کی رہ نمائی میں سفر کیا۔ شعور کی اس رہ نمائی کی وجہ سے ان کی نظموں میں ایک طرح کا کلاسیکی نظم و ضبط ملتا ہے۔

قیصر سہائی کی نظموں کو اگر ان کے مخصوص تاریخی تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں روایت اور تجربہ کا کیسا خوش گوار توازن ہے۔ ان کا اجتہاد بھی روایت کے ایک زندہ اور توانا شعور کی کوکھ سے اُبھرا ہے۔ ان کی شاعری نے ایک زمانے میں بہت سے امکانات کی خبر دی تھی۔ آج جب میں ان کی نظموں کو پڑھتا ہوں تو ان میں باسی پن کی مہک نہیں محسوس ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری فکر و احساس کے ایسے جہانوں کی سیر کراتی ہے، جو ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ اچھی شاعری یوں بھی اپنے مخصوص تاریخی سیاق میں پیوست رہتے ہوئے ہمیشہ لازماں اور معاصر رہتی ہے۔

ہماری ادبی تنقید نے قیصر سہائی کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ ہماری گروہ بند تنقید نے جس مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا ہے، اس کا کچھ ازالہ ہو؛ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری جدید شاعری اپنی روایت کی زنجیر کی ایک اہم اور مضبوط کڑی کے وجود کے احساس سے محروم رہے گی۔!

●●

عبداللطیف اعظمی

ابوالکلام آزاد: تاریخی غلطیاں*

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی اور مذہبی و سیاسی خدمات پر متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان میں تازہ ترین ہے۔ اس لیے اس سے یہ توقع کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ اب تک مولانا پر جس قدر لکھا گیا ہے، ان سے یقیناً استفادہ کیا گیا ہوگا۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے مؤلف اردو کے ایک مشہور مصنف اور دانشور ہیں، جنہیں حکومتِ ہند سے مولانائے مرحوم پر کام کرنے کے لیے دو یا تین سال تک گراں قدر فیلوشپ ملی ہے۔ اس لیے اُمید ہے کہ اُنہوں نے مُلک کا دَورہ کرکے ان تمام کتابوں اور مضامین سے جو مولانا کے بارے میں ان کے ابتدائی دَور سے اب تک لکھے گئے ہیں، استفادہ کیا ہوگا اور ان مشہور اداروں اور انجمنوں کی رودادوں کا یقیناً براہِ راست مطالعہ کیا ہوگا، جن میں مولانا نے شرکت کی تھی۔ اگرچہ حکومت کی فیلوشپ کے سلسلے میں اُنہوں نے جو کتاب لکھی ہے، سُنا ہے کہ بہت ضخیم ہے اور غالباً پریس میں ہے مگر یہ مختصر کتاب بھی بہرحال ان ہی کے قلم سے ہے، اس لیے ان کے وسیع مطالعہ اور ان کی گراں قدر تحقیق کا یقیناً نچوڑ ہوگی۔

کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے: ۱۔ پس منظر ۲۔ حیات ۳۔ خدمات۔ پس منظر صرف دو صفحے کا ہے اور تیسرے باب میں صحافتی، سیاسی، مذہبی اور علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مؤلف کو مولانا سے محبت اور عقیدت ہے، اس لیے اُنہوں نے پورے خلوص کے ساتھ ان کی شخصیت اور خدمات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور متنازع فیہ مسائل سے احتراز کیا ہے۔ ویسے اس مختصر کتاب میں متنازع مسائل کو چھیڑنے کی گنجائش بھی نہیں تھی اور نہ ہی ایسی کتاب میں مناسب تھا جو ساہتیہ اکادمی جیسے سرکاری ادارے سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مولانائے مرحوم کی دل کش شخصیت اور ان کی شاندار خدمات کو بڑی خوبی کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب قابلِ قدر اور قابلِ مطالعہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ افسوسناک حقیقت بھی ہے کہ اس میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں ہیں، جن کی فاضل مؤلف جیسے مشہور ادیب اور مصنف سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ یہ کتاب مولانا آزاد پر ہے اور ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئی ہے، جو اس قسم کی کتابوں کو ملک کی دوسری تسلیم شدہ زبانوں میں ترجمہ کرا کر شائع کرتی ہے، اس لیے اس کتاب کے مطالعے کے دَوران جو خامیاں اور غلطیاں سامنے آئی ہیں اُنہیں نظرانداز کرنا انصاف کے منافی ہوگا۔

• ۲۴۹۔ ذاکر نگر، پوسٹ آفس جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

* نام کتاب: ابوالکلام آزاد
مؤلف: عبدالقوی دسنوی
سائز: ۱۸ × ۲۲/۸۔ حجم: ۱۸۳ صفحات۔ مطبوعہ: ۱۹۸۷ء
پیپربیک۔ قیمت: بیس روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، ۳۵ فیروزشاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

حوالہ جات اور کتابیات :

کسی کتاب کی حیثیت اور معیار متعین کرنے کے لیے ایک پیمانہ اس کی کتابیات اور اس کے حوالہ جات بھی ہیں ۔ ان کو غور سے دیکھنے کے بعد بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی بنیاد کتنی مستحکم اور عمارت کتنی پائدار ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے جب حوالوں اور کتابیات پر غور کیا تو بڑی مایوسی ہوئی ۔ زیادہ تر ان میں وہی کتابیں شامل ہیں جو بہت عام اور متداول ہیں ۔ صرف ایک کتاب : "مولانا آزاد اور ان کے ناقد" نئی ہے، جو کراچی سے فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے ۔ ایسی متعدد کتابوں کے نام ان میں شامل نہیں ہیں ۔ جن کے بغیر مولانا آزاد کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً "مسلمانوں کا روشن مستقبل" (سید طفیل احمد منگلوری) اس دور کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے، جس سے مولانا آزاد کا تعلق رہا ہے ' اس عہد کے تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی حالات و کوائف اس سے بہتر اور مستند کہیں اور نہیں مل سکتے ۔ خاص طور پر اس میں واقعات اور تاریخوں کی صحت کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے ۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے : "میں تمام مسلمانوں کو جو ملک کی سیاسی صورتِ حال صحت کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں، مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور منگوا لیں "۔۔۔ (روشن مستقبل صفحہ ۶۰۰) دوسری اہم کتاب : "تحریکِ خلافت" ہے (قاضی محمد عدیل عباسی) مولانا آزاد کا اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رہا ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس کتاب سے بیش از بیش مدد مل سکتی ہے ۔ اس سلسلے میں "ذکرِ آزاد" کا بھی نام لیا جا سکتا ہے جس کے فاضل مصنف نے مولانا آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال بسر کیے ہیں ۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اس میں بہت سی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو کہیں اور نہ ملیں ۔ "الندوۃ" (لکھنؤ) جیسے اہم رسالے کا ان میں ذکر نہیں، جس کا مولانا کی ابتدائی شہرت میں بڑا قیمتی حصہ ہے ۔ اسی طرح مولانا کے ابتدائی افکار و خیالات کو سمجھنے کے لیے آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ان سالانہ اجلاسوں کی روداد کے براہِ راست مطالعے کی ضرورت ہے، جن میں مولانا نے شرکت کی تھی ۔ اس کتاب میں بعض خامیاں صرف اس لیے پیدا ہو گئی ہیں کہ ان رودادوں کو براہِ راست دیکھنے کے بجائے ثانوی ماخذ پر بھروسہ کر لیا گیا ۔

مولانا آزاد کی سیاسی خدمات کو سمجھنے اور اہم واقعات اور صحیح تاریخوں کو معلوم کرنے کے لیے انگریزی کتابوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کتاب کے حوالوں اور کتابیات میں صرف ایک انگریزی کتاب : "دی ہسٹری آف دی کانگریس" (ڈاکٹر بی پٹا بھی سیتارامیہ) کا ذکر ہے ۔ حالانکہ کم از کم دستور ساز اسمبلی کی آفیشل رپورٹوں اور پارلیمنٹ کی مطبوعہ کارروائیوں کا مطالعہ بے حد ضروری تھا ۔ اسی طرح صحیح واقعات اور صحیح تاریخیں معلوم کرنے کے لیے اینول رجسٹر بہت کار آمد ہیں ۔ اگر ان سے مدد لی جاتی تو اس کتاب میں تاریخی غلطیاں نہ ہوتیں ۔ مولانا آزاد کی انگریزی تقریروں کا مجموعہ بھی ۱۹۵۶ء میں چھپ چکا ہے، مگر اسے بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا ۔

مولانا آزاد جیسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اخبارات کی بڑی اہمیت ہے، مگر سوائے مولانا آزاد کے اخبارات کے فاضل مؤلف نے کسی اخبار کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی کے مشہور روزنامہ "ھمدرد" (دہلی) کو بھی ناقابلِ التفات سمجھا گیا ۔ غرض کہ زیرِ تبصرہ کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے اور غلطیوں سے بچنے کے لیے جن احتیاطوں اور کوششوں کی ضرورت تھی ' اس کی بھرپور کوشش نہیں کی گئی ۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے متعدد خامیوں اور بہت سی غلطیوں کی صورت میں نکلا ۔ جس کی تفصیلات آگے آئیں گی ۔

متضاد تاریخیں اور بیانات :

اس کتاب کی ایک خامی یہ ہے کہ متعدد مقامات پر دو متضاد تاریخیں یا بیانات درج کر دیے گئے ۔ اور ان میں نہ تو تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی تحقیق کر کے ان میں سے کسی ایک کی تردید یا تغلیط کی گئی ۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہوں :

۱۔ صفحہ ۸۴ اور ۸۵ پر درج ہے : "گاندھی جی بھی ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے بے حد فکرمند تھے ۔ اسی جذبے سے وہ ۹ ستمبر ۱۹۲۴ء کو دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری کے یہاں قیام کیا' جہاں ۔۔۔۔ ۲۱ دن کا برت شروع کیا" حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"ہسٹری آف دی کانگریس" بی پٹا بھی سیتا رمیا جلد اوّل ص: ۲۷۶ پر قیام کی جگہ مولانا محمد علی کا مکان تحریر ہے" ۔ موصوف نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ پہلا بیان جسے انہوں نے متن میں درج کیا ہے کس کا ہے ۔ بہرحال تحریکِ آزادی کا یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اگر موصوف کوشش کرتے تو صحیح تاریخ اور صحیح صورتِ حال بہت آسانی سے معلوم ہو جاتی ۔ مختصراً واقعہ یوں ہے کہ گاندھی جی ۹ ستمبر کو نہیں، ۱۳ ستمبر ۱۹۲۴ء کو دہلی آئے اور مولانا محمد علی کے مکان پر قیام کیا ۔ ۱۸ ستمبر کو ۲۱ دن کا برت رکھا اور ۸ اکتوبر کو ۱۲ بجے برت توڑا [1]

۱۔ عبداللطیف اعظمی : گاندھی جی اور ان کے خیالات صفحہ ۱۴۷

جگدیش شرما : انڈین نیشنل کانگریس ۔۔ ببلیوگرافی، صفحات : ۴۹۷ - ۴۹۸

مولانا عبدالماجد دریا آبادی : محمد علی ۔۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اوّل) صفحات ۱۳۹ تا ۱۵۱

۲۔ صفحہ ۱۰۹ پر مولانا آزاد کی پانچویں گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے دسنوی صاحب نے لکھا ہے کہ "مولانا آزاد حالات کا جائزہ لینے کے لیے پنجاب گئے۔ واپسی پر "پرشوتم داس پارک" الہ آباد میں ۳/ دسمبر ۱۹۴۰ء کی تقریر کے جرم میں پانچویں بار گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں ۱۸ مہینے کی سزا دی گئی۔" اس بیان کے لیے "ہسٹری آف دی کانگریس" جلد دوم صفحہ ۲۸۶ کا حوالہ دیا گیا ہے اور حاشیہ میں انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ: "مولانا آزاد نے قید کی مدت دو سال بتائی ہے۔" اگلے صفحے ۱۱۰ پر مولانا کی رہائی کے بارے میں ارشاد ہے: "۴/ دسمبر ۱۹۴۱ء کو مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو ۱۴ مہینے کی گرفتاری کے بعد قید سے رہا کیے گئے۔" اسی صفحے پر حاشیے میں درج ہے:

"معلوم نہیں چودہ مہینے کس طرح لکھا اور "غبارِ خاطر" ——— مرتبہ مالک رام صفحہ ۱۹ پر ۴/ دسمبر درج ہے۔" یہ تمام شبہات اور غیر واضح صورتِ حال صرف اس لیے ہے کہ خود فاضل مؤلف نے ذاتی طور پر تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی، جو کچھ دوسروں نے لکھا ہے، اسے جوں کا توں نقل کر دیا۔ موصوف نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ مولانا کو کب گرفتار کیا گیا۔ اس لیے ظاہر ہے وہ یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کتنے عرصہ کے بعد رہا کیے گئے۔ بہرحال میری تحقیق کے مطابق صحیح صورتِ حال یوں ہے: ۳/ جنوری ۱۹۴۱ء کو صدر کانگریس مولانا آزاد دہلی سے کلکتہ جا رہے تھے۔ الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر انہیں گرفتار کر لیا گیا[۵] ۸/ جنوری کو الہ آباد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۱۸ ماہ کی سزا دی[۶]، مگر اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی حکومتِ ہند کے ایک اعلانیہ مورخہ ۳/ دسمبر ۱۹۴۱ء کے مطابق رہا کر دیا گیا[۷] اس طرح مولانا کی مدتِ گرفتاری تقریباً ایک سال ہے اور مدتِ سزا چند روز کم۔ "غبارِ خاطر" میں مولانا آزاد نے رہائی کی جو تاریخ (۴/ دسمبر ۱۹۴۱ء) لکھی ہے وہ اس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ حکومت کے اعلانیہ کے دوسرے روز مولانا رہا کیے گئے ہوں گے۔ مولانا آزاد کی رہائی کے ساتھ دسنوی صاحب نے خواہ مخواہ کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا ذکر کر دیا اور اس طرح کہ چودہ ماہ کی مدت میں وہ بھی شریک ہو گئے ہیں حالانکہ پنڈت جی ۳۱/ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو گرفتار کیے گئے تھے۔ گویا مولانا آزاد سے دو ماہ پہلے، ایسی صورت میں دونوں رہنماؤں کی مدتِ گرفتاری ایک کیسے ہو سکتی ہے؟ ایک ساتھ ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ حکومت کے اعلانیہ میں مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی رہائی کا ایک ساتھ ذکر ہے۔

۳۔ اس سلسلے کی تیسری اور آخری مثال: سر اسٹیفرڈ کرپس کی مولانا آزاد سے ملاقات کے سلسلے میں فاضل مؤلف نے صفحہ ۱۱۲ پر لکھا ہے کہ ۲۹/ مارچ ۱۹۴۲ء کو دہلی میں ہوئی۔ حاشیہ میں "ہسٹری آف دی کانگریس (مؤلفہ پتابی سیتا رامیہ) کے حوالے سے ملاقات کی تاریخ ۲۵/ مارچ لکھی ہے۔ حسبِ معمول نہ تو ۲۹/ مارچ کے لیے کوئی حوالہ دیا گیا ہے اور نہ ہی ان مختلف تاریخوں میں سے کسی کی تصدیق کی گئی ہے اور نہ ہی کسی کی تردید۔ بہرحال ملاقات کی صحیح تاریخ ۲۵/ مارچ ہے ——— جیسا کہ پتابی سیتا رامیہ نے لکھا ہے:

تاریخی غلطیاں:

اُن خامیوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تاریخی اغلاط کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ذیل میں چند موٹی موٹی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ صفحہ ۲۷ پر ایک ثانوی ماخذ کی بنیاد پر مولانا شبلی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات کی تاریخ کلکتہ میں دسمبر ۱۸۹۹ء لکھی گئی ہے۔ جب کہ خود مولانا آزاد کے بیان کے مطابق اس کے چار پانچ سال کے بعد ہوئی۔ مولانا لکھتے ہیں: "۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا۔ . . . . .

وہاں سے واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی[۸] راقم الحروف کے نزدیک مولانا کی واپسی ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی اس لحاظ سے پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "۱۹۰۵ء میں وہ (مولانا آزاد) مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابو الکلام کو مولانا ابو الکلام بنا دیا[۹]۔" مالک رام صاحب نے نہ صرف ۱۹۰۵ء لکھا ہے، بلکہ تھوڑی سی اور وضاحت کر دی ہے۔ لکھتے ہیں: "جن سے (مولانا شبلی سے) مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔" پروفیسر دسنوی صاحب نے مولانا شبلی سے پہلی ملاقات کے سلسلے میں پاکستان کی ایک کتاب کی بنیاد پر آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے تیرھویں اجلاس مورخہ دسمبر ۱۸۹۹ء منعقدہ کلکتہ کا حوالہ دیا ہے، مگر مولانا

۲۔ نری پندر ناتھ مترا: دی انڈین اینوئل رجسٹر۔ جنوری۔ جون ۱۹۴۱ء۔ جلد اوّل صفحہ ۲۶ ـــ نیز جگدیش شرما: انڈین نیشنل کانگریس ببلیوگرافی، صفحہ ۶۱۹۔

۳۔ ایضاً صفحہ ۶۲۰

۴۔ ایضاً صفحہ ۶۲۴

۵ے جگدیش شرما: انڈین نیشنل کانگریس۔ ببلیوگرافی۔ صفحہ ۶۲۷

۶ے مولانا آزاد: آزاد کی کہانی (دوسرا ایڈیشن) صفحہ ۲۷۵

۷ے مولانا سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی۔ صفحہ ۴۴۴

آزاد لکھتے ہیں کہ: "۱۸۹۹ء میں جب کلکتہ میں علی گڑھ کانفرنس کا جلسہ ہوا تو ہم لوگ بمبئی میں تھے، اس لیے اس کو دیکھنے کا موقع نہ ملا"[9] ظاہر ہے مولانا آزاد کے اس بیان کے بعد دسمبر ۱۸۹۹ء کی ملاقات کی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

۲۔ دوسری غلطی رانچی کی نظربندی کی "تاریخِ رہائی" سے متعلق ہے۔ صفحہ ۷۶ پر موصوف نے تاریخ رہائی، ۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء لکھی ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ موصوف نے یہ غلطی آج سے تقریباً ڈھائی سال پہلے بھی کی تھی۔ ماہ نامہ "آج کل" (نئی دہلی) بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء میں موصوف کا ایک مضمون: ہفتہ وار پیغام (کلکتہ) کے بارے میں شائع ہوا تھا، جس میں مولانا کی رہائی کی یہی تاریخ درج تھی۔ اس غلطی کی نشاندہی میں نے ایک خط کے ذریعے کی تھی، جو مارچ ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ (صفحات: ۴۷-۴۸) اس کے بعد کی اشاعتوں میں موصوف کا جواب اور میرا جواب الجواب شائع ہوا ہے۔ چونکہ یہ تمام خطوط ماہ نامہ "آج کل" ہی میں شائع ہوئے ہیں، اس لیے غالباً تفصیل سے ان دلائل کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں، جو میں پیش کر چکا ہوں۔ بس اس قدر عرض کر دوں کہ خود مولانا آزاد نے اپنی دو تحریروں میں رہائی کی تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۰ء لکھی ہے۔ مولانا کی ایک عبارت سے دسنوی صاحب کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ مولانا رہا تو ہو گئے تھے، ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو مگر سامان وغیرہ سمیٹنے میں دیر ہوئی اور وہ رانچی سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو نکلے۔ مگر مولانا نے اپنی آخری کتاب: "انڈیا ونس فریڈم" میں غلط فہمی کی اس گنجائش کو بھی ختم کر دیا۔ انہوں نے لکھا ہے: "میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء میں دوسرے نظربندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلان کے ماتحت رہا کر دیا گیا۔"[10] اس کے علاوہ مولانا کے دو ممتاز معاصرین مولانا سید طفیل احمد منگلوری اور قاضی محمد عدیل عباسی نے بھی رہائی کی تاریخ یہی لکھی ہے۔ اور مختلف اخبارات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ صفحہ ۸۸ و ۸۹ پر درج ہے: "کل ہند کانگریس کا ہنگامی جلسہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتہ میں ہوا، اس کی صدارت شری نواس آینگر نے کی۔ . . . چونکہ شری نواس آینگر کی صحت اچھی نہ تھی اس لیے وہ جلد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد صدارت کی ذمہ داری مولانا آزاد کو سونپی گئی۔" اس عبارت میں واقعاتی اور تاریخی دونوں طرح کی غلطیاں ہیں۔

---

[9] مولانا آزاد: آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۳۰۰

[10] مولانا آزاد: ہماری آزادی (ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب) صفحہ ۲۳

[11] نری پسندر ناتھ مترا: دی انڈین کوارٹرلی رجسٹر۔ جولائی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء جلد دوم۔ صفحہ ۳۲

پہلی بات یہ ہے کہ جلسہ صرف ۲۹ر اکتوبر کو نہیں، ۲۸ر سے ۳۰ر اکتوبر تک مسلسل تین روز رہا اور پہلے دونوں جلسوں کی صدارت سری نواس آینگر نے کی۔ البتہ تیسرے روز یعنی ۳۰ر اکتوبر کو خرابیِ صحت کی وجہ سے نہ آسکے اس لیے اس سیشن کی صدارت مولانا آزاد نے کی[11]

۴۔ چوتھی اور آخری مثال: صفحہ ۱۲۶ پر تحریر ہے: "۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز کی پہلی نشست ہوئی۔ صدارت کے لیے جواہر لال اور ولبھ بھائی پٹیل نے مولانا آزاد کا نام پیش کیا اور پر زور طریقے سے ان سے اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے کہا، لیکن مولانا آزاد تیار نہیں ہوئے۔ تو ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صدر بنایا گیا۔" چونکہ اس بیان کے لیے مولانا آزاد کی مترجمہ کتاب "ہماری آزادی" کا حوالہ دیا گیا ہے (صفحہ ۲۵۱) اس لیے جن قاریوں کو صحیح واقعات کا علم نہیں ہے، وہ اسے صحیح سمجھ لیں گے۔ حالانکہ صورتِ حال اس طرح نہیں ہے۔ جس طرح بیان کی گئی ہے۔ بہ ظاہر دسنوی صاحب کو بھی اردو کی اس عبارت کو سمجھنے میں غالباً اسی لیے غلط فہمی ہوئی کہ واقعات کی رفتار پر ان کی پوری طرح نظر نہیں تھی۔ بہرحال صحیح صورتِ حال یوں ہے کہ: ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کی پہلی نشست میں صرف ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام پیش ہوا۔ اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اس تاریخ سے دو روز قبل یعنی ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، جس میں دستور ساز اسمبلی کی صدارت کے مسئلے پر غور و خوض کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ مولانا آزاد کا نام اسی جلسہ میں پیش کیا گیا ہو اور وہ تیار نہیں ہوئے، اس لیے دوسرے ناموں پر غور کیا گیا، مگر کسی پر اتفاق نہ ہو سکا، اس لیے بالآخر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ مولانا آزاد نے لکھا ہے: "کئی اور نام تجویز ہوئے لیکن کسی پر اتفاق رائے نہ ہو سکا، آخر کار ڈاکٹر راجندر پرشاد کو منتخب کیا گیا۔"[12] مولانا نے راجن بابو کی صلاحیت اور خدمات کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے: "یہ بہت مناسب انتخاب ثابت ہوا، کیونکہ انہوں نے بہت امتیاز کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے اور کئی نازک معاملوں میں بہت قیمتی مشورے دیے۔"[13]

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد پر سب سے پہلے نظر کیوں نہیں پڑی؟ اور اگر مولانا آزاد کو کسی وجہ سے ترجیح دی گئی تھی تو ان کے انکار کے بعد تو بہرحال کسی اور نام پر غور کرنے کے بجائے ان پر نظر پڑنی چاہیے تھی۔ مولانا آزاد نے اس کی وضاحت کر دی ہے — انہوں نے لکھا ہے: "جواہر لال اور پٹیل چاہتے تھے کہ کسی ایسے آدمی کو صدر (آگے ملاحظہ)

---

[12]-[13] مولانا آزاد: ہماری آزادی (ترجمہ: پروفیسر محمد مجیب) صفحہ ۲۵۱

ایم قمرالدین

رہتی ہے مرے سر پہ جو تلوار ہمیشہ
رہتا ہے اسی سے مرا معیار ہمیشہ

اقرار اگر چاہو، سوالات ہوں منفی
مثبت ہوں تو وہ کرتا ہے انکار ہمیشہ

اب اس کو نہیں اور کسی چیز سے نسبت
ہے آپ کا دست آپ کی دستار ہمیشہ

باہر تو وہ گنبد ہے حقیقت کے مطابق
ثابت ہے عدالت میں جو مینار ہمیشہ

ہاں! روز کھُلے رکھتا ہے دروازہ در و دریچے
اور اُن میں وہ خود بنتا ہے دیوار ہمیشہ

لہو لگا کے شہیدوں میں خود بھی شامل ہے
وہ اُن کا یار، جو دراصل اُن کا قاتل ہے

کبھی اُٹھا کوئی سقراط یا کوئی فرعون
غرض کہ شہر پہ اندیشہ ایک، نازل ہے

یقین کی اُسے آخر پڑے ضرورت کیا
گمان ہی میں جسے، اطمینان حاصل ہے

مرے حروف جو حق بھی ہیں، لوح پر ہیں، مگر
چمک رہا ہے، ترا حرف ہی، جو باطل ہے

بس اتنا فرق ہے، اب منصف اور ملزم میں
یہ ہے کٹہرے کے باہر، وہ اس میں داخل ہے

ہرگز، کسی طرح بھی نہ آئی حساب میں
وہ روشنی جو مجھ کو ملی، اُس کتاب میں

برداشت خشک سالی کرو، کیا خبر نہیں؟
امسال بجلیاں ہی فقط ہیں سحاب میں

دیکھو کہ خود بخود نکل آئی وہ بات۔ جو
اس کے سوال میں تھی نہ اُس کے جواب میں

ضد ایک یعنی، پاؤں وہ رکھیں گے باگ پر
ضد ایک اور، ہاتھ بھی ہوں گے رکاب میں

اپنے نصیب میں ہے وہی اب قدم قدم
مضمون جو کبھی نہ تھا، اپنے نصاب میں

• ۱۲۰ - لائرس چیمبرز، سپریم کورٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مرزا جعفر حسین

من کہ ...

مرزا جعفر حسین

نام : مرزا جعفر حسین۔ ابتدائے عربی تعلیم کے زمانہ تک نواب مرزا محمد جعفر حسین خاں۔ انگریزی اسکول میں مرزا محمد جعفر حسین خاں اسکول لیونگ کا امتحان فارم بھرتے وقت 'خاں' حذف کیا، ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد سے اب تک مرزا جعفر حسین نام ہے۔

والد کا نام : نواب مرزا دلاور حسین خاں۔

خاندان : والد کی طرف سے خانوادۂ خان علامہ نواب تفضل حسین کی فرد ہوں۔ تفضل حسین خاں اُن چند عالموں میں تھے جن کو سلطنت مغلیہ سے خان علامہ موروثی خطاب تھا، اور نواب آصف الدولہ فرمانروائے اودھ کے نائب سلطنت تھے۔

والدہ کی طرف سے نواب حکیم شفاء الدولہ کا نواسہ ہوں۔ اُن کا نام فضل علی تھا۔ اپنے وقت کے طبیب حاذق تھے۔ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کی ذات سے متعلق تھے۔ اُن کے خطابات کا ایک فقرہ شفاء الدولہ بھی تھا۔ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مقامِ ولادت : نواب حکیم شفاء الدولہ کے محل موسومہ موتی مسجد محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد۔ بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء

وفات : والد مرحوم ۱۹۳۵ء بہ عمر تخمیناً ۷۸ برس بمقام فیض آباد۔

تعلیم : والدین کی خواہش تھی کہ اعلا عربی تعلیم دلوا کے اجتہاد کی سند کے لئے عراق بھیجیں گے لہٰذا عربی مدرسہ وثیقہ اسکول فیض آباد میں نام لکھوایا گیا۔ دوران تعلیم انگریزی پڑھنے کی طرف جو اس زمانہ میں بہت بُرا بلکہ جس کا پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا طبیعت راغب ہوئی۔ ملاّ کا امتحان پاس کرنے کے بعد والدین سے بغاوت کر کے انگریزی اسکول میں نام لکھوایا۔ تین برسوں کے بعد والدہ مرحومہ کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔ اُنہیں سے زیادہ مانوس تھا اور اُنہیں کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ بعض حالات ایسے پیدا ہوئے کہ گھر سے بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہوا۔ مستقل طور سے ہجرت کر کے لکھنؤ آیا اور اسلامیہ اسکول میں نام لکھوالیا۔ از خود تمام تعلیمی مدارج طے کئے۔ دن بھر پڑھنے میں صرف ہوتا۔ شام کو مٹی کا تیل فروخت کر کے یا کچھ دنوں بعد ٹیوشن کر کے اخراجات کے ضروریات فراہم کرتا۔ ۱۹۱۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کا اسکول لیونگ سرٹیفکٹ امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور آگے تعلیم برقرار رکھنے کا تہیہ کیا

۱۹۲۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے الٰہ آباد یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کیا بعد ازاں لکھنؤ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اسی یونیورسٹی کا بی اے امتحان اسی کیننگ کالج سے ۱۹۲۳ء میں پاس کیا۔

یونیورسٹی میں تعلیم ہی کے دوران اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے بی اے پاس کرنے کے بعد ایم اے کلاس میں انگریزی ادب کا مضمون لے کر داخلہ حاصل کیا اور ایک مدت تک تعلیم جاری رکھی لیکن والد مرحوم کی خوشنودی اور بعض دیگر قریبی اعزا کے شدید اصرار پر شادی کرنا منظور کیا۔ اب ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا اور کسبِ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ مجبوراً اور قہراً ایم اے پاس کرنے کا خیال ترک کیا۔ وکالت کی طرف توجہ ہوئی دو برس میں ایل ایل بی کا امتحان ۱۹۲۳ء میں پاس کر کے اس پیشہ میں داخل ہو گیا۔

پیشہ وکالت : وکالت میں ابتدا ہی سے کامیابی نصیب ہوئی۔ بہت جلد چیف کورٹ آف اودھ میں مقدمے کرنے لگا اور کامیابی حاصل کرنے سے اچھی شہرت ہو گئی تھی کامیاب وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔ اسی دوران بلند پایہ کانگرسی رہنماؤں بالخصوص مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ ہم سے نیاز مندانہ قربت نے سیاست سے زیادہ شغف پیدا کرایا۔ ۱۹۳۰ء سے انڈین نیشنل

کانگریس کے پروگراموں کو کامیاب کرانے
میں عملاً دلچسپی لینے لگا تھا۔ جس کے نتیجہ
میں ۱۹۴۳ء میں وارنٹ گرفتاری جاری
ہوا۔ خانگی حالات کے تحت جیل جانا ممکن
نہ تھا اس لیئے ۱۹ ماہ تک انڈر گراؤنڈ رہا
راجہ صاحب سلیم پور اور مسٹر علی ظہیر کی
کوششوں سے وارنٹ کی مصیبت دور
ہوئی اور پھر اپنی جگہ پر آگیا لیکن اب
وکالت کی بجائے کانگریس کے ذریعہ ملک و
قوم کی خدمت کا جذبہ دل پر پوری طرح
قابو پاچکا تھا۔ برائے نام کچہری میں کام
کرلیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مشغلہ ختم
ہوگیا۔

ملازمت: مہاراجہ سر محمد علی محمد خان والی
ریاست محمود آباد کی نظر شفقت و عنایات
نے اُن کی ملازمت کی طرف ۱۹۳۰ء میں
آمادہ کیا۔ مہاراجہ کے تاحیات نیز چند ماہ
بعد تک ریاست کی ملازمت کی۔ مہاراجہ کے
پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا
تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد چند ماہ تک
اقبال منزل سے منسلک رہا اُس کے بعد
پھر اپنی جگہ پر واپس آگیا اور وکالت کے
پیشہ میں جگہ حاصل کرلی۔ اس ملازمت
کی بدولت ملک کے قریب قریب تمام
بلند پایہ مسلم لیڈروں سے جن میں مسٹر
محمد علی جناح بھی تھے قربت و ملاقات کے
مواقع حاصل ہوئے لیکن میں اپنی کم نصیبی
یا خوش بختی سے کبھی کسی کا قائل نہیں ہوسکا
اور نہ ان حضرات کے اصولوں سے متاثر
ہوا۔ کانگریسی رہنماؤں سے دل کو جو عقیدت
اور کانگریسی اصولوں پر جو ایمان و ایقان
تھا وہ بدستور برقرار رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب
آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کی سربراہی
مجھے میسر ہوئی تو اس ادارہ کا کانگریسی مسلک
متعین ہوا اور ہمیشہ برقرار رہا۔

ابتدائی ادبی مشاغل: عربی، فارسی اور اردو میں
قابلیت و صلاحیت کی بدولت ادبی
مشاغل کا سلسلہ اوائل عمر ہی سے شروع
ہوگیا تھا۔ ۱۹۱۰ء لغایتہ ۱۹۳۰ء بیشمار
غزلیں اور قصائد تصنیف کرکے مشاعروں
اور مقاصدوں میں پڑھے تھے جن میں اکثر
اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔
۱۹۳۰ء میں نثر نگاری پر زیادہ توجہ ہوئی
بکثرت انگریزی نظموں اور مضامین کے
تراجم کئے۔ جن میں ملٹن کی نظموں "کومس"
اور "لسی ڈس" کے تراجم بہت مقبول
ہوئے تھے۔ تراجم اور اصل ادبی مضامین
پنجاب کے متعدد رسالوں میں شائع ہوتے
تھے جن میں شباب اردو لاہور میں
بکثرت مضامین اور تراجم نکلے تھے۔
۱۹۳۰ء میں سیاسیات سے اتنا زیادہ شغف
بڑھا کہ نظم و نثر نگاری کا سارا ابتدائی
ادبی مشغلہ ختم ہوگیا۔ لیکن ذوق علم و ادب
کبھی کم نہیں ہوا۔

سیاسی اور ثقافتی خدمات:
۱۹۳۰ء سے کانگریس کی ہر تحریک اور ہر
پروگرام کی قلمی اور عملی معاونت کی آل انڈیا
شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے
تائیدی کارروائیاں کیں۔ انتخابات کے
مواقع پر ہر کانگریسی امیدوار کی جس جس
حلقے میں ممکن ہوسکا تائید کی۔ انتخابات
جداگانہ کے دور میں، رفیع احمد قدوائی
مرحوم کی قیادت میں لکھنؤ، فیض آباد،
سلطانپور، بستی اور اعظم گڑھ کے متعدد
حلقوں میں میری تعنیاتی رہتی تھی بمبئی
میں مسٹر جناح کے خلاف حسین بھائی لالجی کا
الیکشن بمبئی میں ایک ماہ قیام کرکے میں
نے لڑا تھا۔ متعدد اخبارات میں بالخصوص
نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز میں ان جرائد کے
اصرار کے بعد میرے بکثرت بیانات و
مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میدان
کو چھوٹا اور کم اثر دیکھ کر خود ہی
اخبارات نکالے اور ادارت کے فرائض
انجام دیئے چنانچہ انگریزی میں نیشن
اور مون لائٹ اور اردو میں پرچم اور
پیام نو آزادی وطن کی حمایت میں
جاری کئے تھے۔ مون لائٹ ۱۹۳۹ء
میں جاری ہوا اور ۱۸ برسوں کے بعد
اُس کی جگہ پہ پیام نو نکلا۔ میری بصارت
پر کبرسنی اور علالت کے باعث زوال
آیا تو پیام نو ۱۹۷۰ء میں بند کرنا پڑا
اس طرح میری ثقافتی زندگی ۱۹۳۹ء
سے شروع ہوکر ۱۹۷۰ء میں ختم ہوگئی
سیاسی زندگی صرف کانگریسی اور نیشنلسٹ
ہونے تک محدود رہی۔ عملاً طاقت ختم
ہوگئی۔

تصنیفات و تالیفات: یوں تو ادبی تصنیفات و
تالیفات کا یہ دوسرا اور آخری دور
۱۹۵۰ء میں شروع ہوگیا تھا لیکن مخلص
اور دیرینہ دوست لال بہادر شاستری
کی وفات کے بعد سیاسیات سے علیحدگی
اختیار کرکے اب صرف اسی ایک ادبی
مشغلہ کو عین مقصد حیات بنالیا ہے۔
بیماریوں کی شدت جتنی مہلت دیتی ہے
وہ سب کتابیں پڑھنے اور تصنیف و
تالیف میں صرف ہوتی ہے۔ چنانچہ اب
تک بے شمار مضامین سرکاری اور غیرسرکاری
ماہناموں میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان
ماہناموں میں نیا دور لکھنؤ آج کل دلی
اور آندھرا پردیش حیدرآباد کے نام
سرفہرست ہیں۔ ان بیشمار مضامین کے
علاوہ حسب ذیل کتابیں طبع ہوکر قبولیت

علاوہ کا شرف حاصل کرچکی ہیں

(۱)، ہماری ترکاریاں جو ہندی رسم الخط میں پروفیسر کیلاش ناتھ کول کے دیباچہ کے ساتھ اتم ترکاریاں کیسے پیدا کریں کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب فن باغبانی پر ہے اور اترپردیش محکمۂ زراعت کے ڈائریکٹر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔

(۲) **متاعِ غالب** : مرزا غالب کے فارسی غزلیات کا انتخاب، نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل کی ہم طرح غزلوں کے منتخب اشعار کے ساتھ۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے پسند فرما کے اپنے نام نامی پر معنون کرنے کی اجازت دی تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ نے پسند فرما کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا۔

(۳) ؛ **بیسویں صدی کے بعض شاعر اور ادیب** اپنے سماجی پسِ منظر میں یہ کتاب اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے لکھوائی اور اپنے انتظام سے شائع کی۔ دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوچکا ہے۔

(۴) **لکھنؤ کا دسترخوان** : یہ کتاب کھانوں کے اقسام اور ان کے پکانے کے طریقوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی یوپی اردو اکاڈمی نے لکھوائی اور اپنے انتظام سے شائع کی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوچکا ہے۔

(۵) **مسعود حسن رضوی۔ حیات وخدمات** شائع کردہ آل انڈیا میرا کاڈمی لکھنؤ۔

(۶) **ادبیات وشخصیات** : ادبی مضامین کا مجموعہ۔ یہ کتاب یوپی اردو اکاڈمی کے تعاون سے شائع ہوئی۔

(۷)۔ **قدیم لکھنؤ کی آخری بہار**۔ شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، دلی

(۸)۔ **کشمکش حیات** : مصنف کے خودنوشت سوانح حیات۔ یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے تعاون سے شائع ہوئی۔

(۹)۔ **دبستان لکھنؤ کے ہندو شعراء**۔ لکھنؤ کے تقریباً تین سَو ہندو شعراء کا تذکرہ۔ جو سنہ ۱۹۳۰ء تک پیدا ہوئے۔ یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے تعاون سے زیرِ طبع ہے۔

دو کتابیں ابھی نامکمل ہیں۔ بہت تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے۔ لیکن مصنف کی صحت نے بالکل جواب دے دیا ہے۔ شاید ہی مکمل ہوسکیں۔

اعزازات وانعامات :

(۱) جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ سوشل کانفرنس ـــــ ۱۹۲۲ء لغایتہ سنہ ۱۹۳۲ء

(۲) جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس ۱۹۴۸ - ۱۹۳۱ء۔

(۳) جنرل سکریٹری یوپی شیعہ پولیٹکل کانفرنس ۱۹۵۱ - ۱۹۴۹ء (یہ ادارہ مسٹر علی ظہیر نے پنڈت گووند بلبھ پنت چیف منسٹر اترپردیش کے ایماء پر قائم کیا تھا۔)

(۴) نامزد ممبر لکھنؤ یونیورسٹی کورٹ۔ دوبار نامزدگی ہوئی۔

(۵) نامزد ممبر لکھنؤ امپرومنٹ ٹرسٹ دوبار نامزدگی ہوئی۔

(۶) ایکٹو ممبر انڈین نیشنل کانگرس۔ ۱۹۳۰ء نعاتیہ ۱۹۴۸ء۔

(۷)، عربی وشیقہ اسکول فیض آباد میں ملا کا امتحان اوّل نمبر پہ پاس کرنے پر مینیجنگ کمیٹی کے صدر حکیم سید ابراہیم مرحوم نے مرحمت فرمائی۔ طلائی جیبی گھڑی

(۸) مسعود حسن رضوی۔ حیات وخدمات کی اشاعت کے بعد یوپی اردو اکاڈمی سے ایوارڈ ملا۔

(۹) کشمکش حیات کی اشاعت کے بعد اودھ کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ نے مخصوص تقریب منعقد کر کے ایوارڈ دیا۔

(۱۰) مجموعی خدمات پر آل انڈیا میر اکاڈمی سے امتیاز میر کی سند اور ایوارڈ حاصل کیا سنہ ۱۹۸۶ء۔

●●

بقیہ : ابوالکلام آزاد

بنایا جائے جو وزارت میں نہ ہو" اور چونکہ اہم رہنماؤں میں صرف مولانا آزاد ہی کی شخصیت ایسی تھی جنہوں نے وزارت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے ان پر نظر پڑنا ایک قدرتی بات تھی۔ ان کے انکار کرنے کے بعد چونکہ کسی اور نام پر اتفاق نہ ہو سکا، اس لیے مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا کہ کسی وزیر کو یہ عہدۂ جلیلہ تفویض نہ کیا جائے۔

اگر مزید چھان بین کی جائے تو ممکن ہے زیرِ تبصرہ کتاب میں کچھ اور غلطیوں کی مثالیں مل جائیں۔ مگر تبصرے کے صفحات بہرحال محدود ہوتے ہیں، اس لیے اس تبصرے کو یہیں پر ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مگر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تبصرے میں جن غلطیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کی اصلاح اس ایڈیشن میں تو ہونے سے رہی اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہ جانے کب آئے۔ اس لیے گزارش ہے کہ اگر اس کتاب کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کا ارادہ ہو تو براہِ کرم مکمل نظرِ ثانی کے بعد اس کا ترجمہ کیا جائے۔ یا تو اس تبصرے کی روشنی میں خود فاضل مؤلف اس کی نظرِ ثانی کی زحمت فرمائیں یا کسی ایسے شخص کو یہ کام سپرد کیا جائے جس کی نہ صرف مولانا کی ادبی ومذہبی خدمات اور ان کی سیاسی سرگرمیوں سے بخوبی واقفیت ہو، بلکہ اس پورے دور پر جس سے مولانا کا تعلق رہا ہے اس کی وسیع اور گہری نظر ہو۔

●●

ایک۔ مہتاب

وہ جو مر چکے ہیں

میں اودے پور کے ریلوے پلیٹ فارم پر دہلی جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد میں مال گودام کے سائڈنگ تک چلا گیا، جہاں مال گاڑیوں سے اناج کی بوریاں اُتاری جا رہی تھیں۔ خشک چارے کے ویگن خالی کیے جا رہے تھے۔ یہ سارا مال راجستھان کے خشک سالی سے متاثرہ علاقے میں راحت کے طور پر تقسیم کرنے کی غرض سے یہاں لایا گیا تھا۔

میں گجرات کے خشک سالی سے متاثرہ علاقے کے دورے کے بعد ایک دو دن کے لیے راجستھان میں رُک گیا تھا اور اودے پور کے ایک گاؤں سورج گڑھ کے بارے میں اخبار میں شائع ہوئی ایک اطلاع کی چشم دید تصدیق کرنے کے لیے چلا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ وہاں ایک آدی باسی نے بھوک سے تنگ آکر اپنے افرادِ کنبہ کو مار ڈالا تھا اور خودکشی کر لی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اطلاع سیاست پر مبنی یا مبالغہ آمیز ہو، لیکن راستے میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ دل ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ کئی علاقوں میں تو حالت گجرات سے بدتر تھی۔ خاص طور پر اُن علاقوں کی جہاں مونگ پھلی کی فصل تباہ ہو گئی تھی اور دھرتی کا سینہ چاک چاک ہو گیا تھا۔

میں گندم کی بوریوں پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ خشک سالی اور قحط تو ایک خدائی قہر ہیں۔ انسان یا سرکار تو اسے روک نہیں سکتے۔ بس اس کے اثرات ہی کم کر سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے، جو مال گودام کے پلیٹ فارم پر لگے ہوئے اناج اور چارے کے اس انبار سے ظاہر ہے۔ ریلوے کا ایک کرمچاری جو مال اُتروانے کی نگرانی کر رہا تھا، مجھے بتا رہا تھا کہ صرف سرکاری مدد سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک انسان انسان کی مدد کو نہیں آتا، قدرت کا مقابلہ ناممکن ہے۔ لیکن یہاں تو آدمی آدمی کو کھا رہا ہے۔ ایک کی موت دوسرے کی چاندی بن رہی ہے۔ جمع خوری اور چور بازاری کا چکر چل رہا ہے۔ ضروری اشیاء کے ذخیرے غیر سماجی اور سماج دشمن عناصر نے چھپا لیے ہیں اور لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ اُسے شکایت تھی کہ اناج اور چارہ حاجت مندوں تک پورا نہیں پہنچتا بلکہ ایک حصہ راستے ہی میں خورد برد ہو جاتا ہے۔

اور اس قسم کی شکایتیں میں نے راستے میں بھی کئی جگہ سُنی تھیں۔ دیہات میں قحط اور خشک سالی سے متاثرہ لوگوں کو کام کے عوض اناج دیا جا رہا ہے۔ روزگار اور خوراک مہیا کرنے کا یہ ایک بہت بڑا پروگرام ہے۔ لیکن بے ایمان لوگ یہاں بھی باز نہیں آتے۔ جھوٹے ماسٹر رول تیار کر کے اناج وصول کر لیا جاتا ہے جسے کالے بازار میں فروخت کیا جاتا ہے۔ ان پڑھ دیہاتیوں اور آدی واسیوں سے دھوکا کیا جاتا ہے۔ اُن کے کام کی پیمائش غلط کی جاتی ہے پھر عوض میں جو اناج دیا جاتا ہے، اُسے کم تولا جاتا ہے۔ لوگوں کی مزدوری کئی کئی روز تک روک لی جاتی ہے۔ مجبور اور بے کس لوگ ایسی حالت میں جو کچھ ملے، اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ پھر کہیں کوئی ایسا رضاکار ادارہ یا آدمی نظر نہیں آتا جو ان سماج دشمن عناصر پر نگاہ رکھ سکے اور لوگوں کو اُن کے استحصال سے بچائے۔

ایسی باتیں سُن کر دل کو بہت دُکھ پہنچا تھا۔ ایک تو خشک سالی نے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے۔ خریف کی فصل یا ہریالی کا کہیں نام و نشان تک باقی نہیں۔ اس پر بھی آدمی آدمی کو کھائے جا رہا ہے۔ اگر ان حالات سے تنگ آکر لوگ دیہات چھوڑ کر شہروں کی طرف رُخ کر لیں، اپنے مویشیوں کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں یا اونے پونے فروخت کر دیں یا

● ٨٧/١ - A ، پشچم وہار، نئی دہلی

کچھ لوگ خودکشی کرلیں تو اسے ناممکن یا غیر فطری فعل نہیں کہا جاسکتا۔

میں گندم کے ایک بورے پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس برس خشک سالی نے جو ضرب لگائی ہے، اس کی تاریخ میں اور کوئی مثال نظر نہیں آتی اور اس کا اندازہ کسی بڑے شہر کے آرام دہ ریستوراں کی ٹھنڈی فضا میں گرم کافی کا لطف اٹھاتے ہوئے یا اخبار نویس دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے نہیں کیا جاسکتا۔ راجستھان کے خشک سالی سے متاثرہ اس علاقے میں میلوں تک کہیں سبزہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جگہ جگہ زمین ایسے پھٹی ہوئی تھی، گویا کسی پیاسے انسان کی زبان تشنگی کے سبب پھٹ گئی ہو۔ راستے میں جگہ جگہ خشک سالی کے مارے مویشیوں کے پنجر پڑے تھے۔ گدھوں کی موج بن آئی تھی۔ جو اُڑتے ہوئے ایک سے دوسری لاش پر جا بیٹھتے تھے۔ نیم خشک درختوں کے پتے گدھوں کی بیٹھ سے سفید ہو رہے تھے۔ اُن پر گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ بیٹھے تھے، جیسے موت کے دیوتا نے اس علاقے میں جا بجا ڈیرے ڈال دیے ہوں۔ متعدد گاؤں بے چراغ ہو گئے تھے۔ اگر کہیں کوئی اِکّا دُکّا آدمی نظر بھی آتا تھا تو وہ بھی المناک داستان سُناتا تھا کہ لوگوں نے مجبور ہو کر اپنے قیمتی مویشی اَدنے پونے فروخت کردیے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے جو نہ جانے غلط تھا یا صحیح کہ لوگ بچّے فروخت کرنے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ یہ مبالغہ آمیزی ہی کیوں نہ ہو مگر دیہات کے یہ مناظر دل ہلا دینے والے تھے۔

راحت کے کاموں میں مصروف اہلکاروں کا کہنا تھا کہ گجرات ہو یا مہاراشٹر خشک سالی کی داستان ایک جیسی ہے۔ خریف کی فصل پوری طرح تباہ ہو گئی ہے۔ کروڑوں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ کسی کے پاس مویشیوں کے لیے چارہ خریدنے کی ہمت نہیں اور اُن دیہات کی زبوں حالی ناقابلِ بیان ہے، جہاں کنوئیں خشک ہو گئے ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی سڑک یا راستہ نہیں۔ حکومت اُن تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ایسے میں لوگ اگر مجبور ہو کر نہروں یا دریاؤں کے کناروں یا قریبی قصبوں کی طرف کوچ کرنے لگیں تو کیا عجب۔

اناج کے اس ڈھیر پر بیٹھا میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی اور سرزمین پر بیٹھا ہوں۔ گویا شہروں اور دیہات کی دنیا الگ الگ ہے۔ گویا یہ سب لوگ ایک ہی مُلک کے باشندے نہیں ہیں۔ شہروں میں تو دیہات جیسے یہ سیاہ سائے کہیں نظر نہیں آتے۔ دہلی میں تو میں نے چند روز پہلے وہی موج میلہ اور رنگا رنگی دیکھی تھی۔ سینما گھروں پر ٹکٹ خریدنے والوں کی قطاریں تھیں۔ شراب کی دُکانوں پر خریداروں کی بھیڑ لگی تھی۔ کناٹ پلیس کے ریستورانوں میں کھانا کھانے کے لیے آدھ آدھ گھنٹہ سیٹ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ خوش پوش نوجوان سجی سنوری دوشیزاؤں کے سامنے بیٹھے چہکتے ہوئے کافی ہاؤسوں میں اُن پر دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو علم نہیں کہ دھرتی کی چھاتی کیسے پھٹ جاتی ہے۔ گدھ کیا ہوتا ہے۔ قحط کس چڑیا کا نام ہے۔ مرے ہوئے جانوروں کی بدبو کافی کی خوشبو سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ کوئی عورت جس کے پستانوں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے کس طرح اپنے جگر کے ٹکڑوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

گاڑی آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر ہمیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ یہ شہر اور دیہات کا فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا کیوں جا رہا ہے؟ شہر میں بسنے والا انسان کیوں بے رحمی کی حد تک بے حس ہوتا جا رہا ہے؟ ایک وقت تھا جب بنگال، اُڑیسہ، مدھیہ پردیش، مشرقی اتر پردیش، راجستھان یا مُلک کے کسی حصے میں قحط پڑتا تھا یا سیلاب کی آفت نازل ہوتی تھی تو پنجاب کے لوگ تڑپ اُٹھتے تھے۔ آسام اور مہاراشٹر میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی تھی، دلّی میں ہاہاکار مچ جاتی تھی۔ لوگ جھولیاں پھیلا کر گلی بازاروں میں آجاتے تھے۔ آٹے، کپڑے، چارے کے ڈھیر لگ جاتے تھے اور انہیں متاثرہ علاقوں تک پہنچانا ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا گویا کسی گاؤں میں اُس کا اپنا بھائی بھوک سے جاں بلب ہو۔ اس کی بہن کپڑے کی محتاج ہو یا اُس کا اپنا بچّہ دودھ کے لیے بلک رہا ہو۔ گلی گلی میں ریلیف کمیٹیاں قائم ہونے لگتی تھیں۔ عوام کا ہر ہمدرد اور رہنما ان کاموں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ اسکول اور کالجوں کے نوجوان راحت کا سامان لے کر دیہات کی جانب چل نکلتے تھے۔ بمبئی کے بازاروں میں ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے جلوس ٹرکوں پر نکلتے تھے، جو کروڑوں روپے کا سامان اکٹھا کرلاتے تھے۔ لوگ اُنہیں اپنی گھڑیاں اور زیور تک خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کی مدد کے لیے اُتار کر دے دیتے تھے۔

یہ لوگ اب کہاں چلے گئے ہیں۔ عوام کے خادموں اور رہنماؤں کا یہ ہمدردی کا جذبہ کیسے ختم ہو گیا ہے۔ اُنہیں معلوم نہیں کہ دیہات پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں گویا خشک سالی کا مقابلہ کرنا صرف سرکار کا فرض ہے اور یہی اس کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ سرکار ہر حاجت مند کی حاجت روا نہیں کرسکتی اور نہ ہر شخص تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کو قدرت کے اس قہر سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہ دی جائے یہ فرض تو لوگ ہی پورا کرسکتے ہیں، لیکن عوام کو خاص طور پر بڑے شہروں اور قصبوں میں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہاں فضا کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔

میں دَورے کے بعد دہلی لوٹ آیا ہوں۔ اخبار میں اپنی رپورٹ کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ اخبار پڑھنے والے جو ڈیڑھ روپے کا اخبار خرید سکتے ہیں وہ ایسی خبریں چھوتے بھی نہیں۔ وہ سب سے پہلے سیاسی تبدیلیوں پھ

بازار حصص کی خبروں اور اُس کے بعد سنیما، فیشن اور آرام و آسائش کی نئی ایجادات کے کالم دیکھتے ہیں۔ کیا لوگ اپنے پرانے فیشن کے کپڑے قحط زدہ لوگوں کو نہیں دے سکتے۔ لیکن اُنہیں معلوم تو ہو کہ دیہات کے لوگوں پر کیا گزر رہی ہے۔ میں کہیں پر یہ دل کا غبار نکالنا چاہتا ہوں۔

کچھ روز ہوئے میرے ایک دوست نے جن کی رِنگ روڈ پر کوٹھی اور فرید آباد میں کارخانہ ہے، مجھے رات کے کھانے پر بلایا۔ ہم بہت دنوں بعد مل رہے تھے۔ بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ایک اور دوست بھی کھانے پر مدعو تھے۔ نہایت اچھا ماحول تھا۔ نہ کوئی گِدھ دکھائی دے رہا تھا نہ مُرجھائی ہوئی کھیتی نہ پچکے ہوئے گال نہ کوئی ہاتھ پھیلائے بھکاری۔

ہلکے اور بھاری مشروبات کے کچھ دَور چلے، جس کے بعد ہم کوٹھی کے نہایت عمدہ آراستہ ڈائننگ ہال میں آ بیٹھے۔ کمرے میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر مناظر سے مرصّع پردے لٹک رہے تھے۔ کمرہ جس میں نہایت عمدہ فرنیچر لگا ہوا تھا۔ تندوری مرغ، تلی ہوئی مچھلی، بریانی اور انواع و اقسام کی سبزیوں کی اشتہا آور خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ ہم بڑی سی میز کے گرد کُل چھ افراد بیٹھے تھے، لیکن میز پر اتنا کھانا لگایا گیا تھا کہ کم از کم تیس لوگ بخوبی کام و دہن کی آزمائش کر سکتے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک بڑا رنگین ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ اس پر اتفاق سے اُس وقت مُلک کے قحط سالی سے متاثرہ علاقوں کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔

ہمارے میزبان ان مناظر سے بہت پریشان تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کا نتیجہ آخر کیا ہوگا۔ بھوک اور پیاس کے مارے یہ لوگ جو خاک اُڑاتے ہوئے ..... دیہات سے نکل رہے ہیں۔ آخر شہروں کی جانب کوچ کریں گے۔ یہاں بھیڑ بڑھے گی۔ بے کاری، چوری اور رہزنی میں اضافہ ہوگا۔ سڑکوں پر پہلے ہی کار چلانا مشکل ہو رہا ہے، اب ناممکن ہو جائے گا۔

لیکن اُن کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ ان لوگوں کے آنے سے مزدوری تو سستی ہوگی، کام کرنے والے تو کم داموں پر ملیں گے۔ یہاں تو ملازموں کا دماغ آسمان کو جا لگا ہے۔ آج رکھو کل کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کئی بار خود کھانا بنانا پڑتا ہے۔ ادھر ٹی وی کی اسکرین پر گِدھ، مُردہ مویشیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ آسمان گِدھوں کے سیاہ پنکھوں سے کالا ہو رہا تھا۔ عورتیں دُور دُور سے پانی کے مٹکے سروں پر اُٹھائے ہوئے لا رہی تھیں۔ کتے جانوروں کی ہڈیاں نوچ رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ کھانے کے بعد جب کافی کا دَور چلا تو ان شریمتی جی کو سورج گڑھ کی کہانی سناؤں گا کہ ایک آدمی واسی کس طرح بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیوی کو مائیکے بھیج دیتا ہے۔ پھر کس طرح اپنے چار بچوں کو گولی مار دیتا ہے اور اس مکروہ فعل پر شرمندہ ہو کر بالآخر خودکشی کر لیتا ہے۔

"لیکن ٹی وی اسکرین ان گِدھوں کے مناظر سے تو خالی ہو" میرے دوست کی جوان لڑکی مُرغ کی ٹانگ چباتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"اِن ٹی وی والوں کو کیا ہو گیا ہے — لاشیں دکھا دکھا کر کھانے کا مزا کِرکرا کر دیتے ہیں"

اور اُس کے بھائی نے اُٹھ کر ٹی وی کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ فریج میں سے آئس کریم کا بہت بڑا پیالہ اُٹھا لایا اور سب کے پیالوں میں ہلکے سبز رنگ کی خوشبودار آئس کریم ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں کل دُوردرشن کو خط لکھوں گا کہ ایسے گندے مناظر کم از کم کھانے کے وقت تو نہ دکھائے جائیں۔"

میں نے سوچا تھا کہ انھیں کان بھیل کی کہانی سناؤں گا، لیکن یہ دل ہلا دینے والی داستان کسے سناؤں۔ یہ لوگ تو گویا کھانے کی میز پر مرے پڑے ہیں اور اُن کی زبانیں آئس کریم کے پیالوں کے اندر گھوم رہی ہیں۔

●●

بقیہ : نئی کتابیں

جذبات نگاری کو جانچا ہے۔ منظر نگاری کی عکاسی کی ہے۔ ماحول نگاری کو پیش کیا ہے اور قطب مشتری کے اصل اہم پہلو جس کی تاریخی اہمیت ہے یعنی سراپا نگاری کا بہت ہی دقیق مطالعہ پیش کیا ہے اور اس کے طرز بیان سے بحث کی ہے۔

ڈاکٹر ابوالبرکات نے "مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ" میں اس مثنوی کے تکنیکی، فنی اور تنقیدی جائزے کے بعد دکن میں مثنوی نگاری کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے اور حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سے ولی دکنی تک، دکن میں زندہ و تابندہ مثنوی گوئی کی مستحکم روایت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد اردو مثنوی کے ارتقاء پر باضابطہ ایک باب ہے جو شمال میں افضل جھنجھانوی کی "بکٹ کہانی" گجرات میں خوب محمد چشتی کی "خوب ترنگ" اور فخرِ دین نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" سے لے کر محسن کاکوروی کی "صبحِ تجلی" "چراغِ کعبہ" "شفاعت و نجات"، شاد عظیم آبادی کی "مادرِ ہند" حفیظ جالندھری کی "شاہنامۂ اسلام" اور کیفی اعظمی کی "خانہ جنگی" تک ابتدا سے دورِ حاضر تک کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر ابوالبرکات نے "مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ" میں وجہی اور "قطب مشتری" سے متعلق تمام تاریخی اور تنقیدی مباحث اور مواد کو یک جا کر دیا ہے۔ اس طور پر یونیورسٹیوں کے اردو ادب کے طلباء کے علاوہ ادب، تنقید اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے دانشور طبقے کے لیے بھی یہ ادبی تحفہ ہے، جس سے قطب مشتری اور مثنوی کے علمی، معلوماتی، ادبی ذخیرے میں مفید اضافہ ہوا ہے، جس کی پذیرائی اور قدر کرنی چاہیے۔

(احمد جمال پاشا)

●●

ظفر پیامی

واپسی

دھرتی میا کی مانند انت یگوں سے جیون بھوگنے والی ماں نے راجہ جنک کی بیٹی سیتا کے صبر کے ساتھ اپنے گبرو پتر کی فرمائش کو سنا اور پھر ان سنا کر دیا۔

مگر شیشم سے لمبے قد اور دیودار کے شہتیر ایسی چوڑی چھاتی والے سوہنے سجیلے جوان نے اپنی رٹ لگائے رکھی ۔ "ماں میرا رنگ دے بسنتی چولا[1]"۔

آہستہ آہستہ "ماں میرا رنگ دے بسنتی چولا" کی آواز میں پراکرتی کے ساتوں سُروں کا وہ سرگم پیدا ہو گیا، جو سارے آکاش میں نغمۂ سرمدی بن کر گونجنے لگا اور پھر پورنیما کے چاند لیے شیتل چہرے والی ماں اپنے "جوانیاں مان[2]" بیٹے کی "اِک واک" فرمائش پوری کرنے لگی۔

ممتا کے نور میں نہائی ہوئی ماں نے ستے نوٹوں کی طرح کرکراتے ہوئے کورے لٹھے کی دودھ رنگی چادر خریدی۔ گوروکی باؤلی کے کنارے اُگے بنفشہ کے پھولوں کا ایک بھنڈار اس نے اکٹھا کیا۔ پھولوں سے نکلنے والے رنگ بسنتی میں ڈبو کر ماں نے چادر کو پہلے بسنتی روپ دیا۔ پھر پیار کی پنکھی جھلا کر اُسے سکھایا۔ اپنی موتیوں بھری آنکھوں سے لگایا اور دے دیا۔ چاندنی ایسی پوتر بیٹی کو سینے اور سنوارنے کے لیے لال مٹی کی بنی نئی نکور صراحی جیسی گردن اور سرسوں کے پھولوں ایسی رنگت رکھنے والی مٹیار تب بسنتی چادر کو چولے کا روپ دینے لگی، اپنی بادام سی آنکھوں سے گرے موتی اس نے چولے کے چاروں طرف مڑھ دیے۔

"دھیے نی دھیے[3] سل گیا بسنتی چولا میرے لال کا"

"مائیں نی مائیں چولا سل گیا میرے سوہنے ویر کا"

"تو دے مجھے کہ دولہا بناؤں اپنے جگ جگ جیون جوگ[4] نت کھٹ نیاڑیں[5] کو"

"مائیں نی مائیں کسر باقی ہے بس دو چار ٹانکوں کی"

"تو جلدی کر پتر کہ لگن بیت نہ جائے۔ گھوڑی چڑھ کر اُسے جانا ہے بہت جلدی ۔ اور سفر ہے اس کا بڑا لمبا"

اور پھر بسنتی چولا سینے والے بنفشے کے پھول ایسی مٹیار نے اپنے سالونے سجیلے ویر کی گھوڑی کی باگیں پکڑیں۔ پوری کی پوری گلاب کی پنکھڑیوں سے بنی بھابیوں نے سونے کی سرمہ دانی میں چاندی کی سلائی ڈال کر سرمہ سجایا۔ اپنے دیور کی آنکھوں میں۔ کڑیوں چڑیوں نے سہاگ گایا۔ نائی، پروہت، دھوبی، کمہار اور بڑھئی نے اپنا اپنا لاگ پایا — سفید ملائم دودھ ایسی داڑھی والے باپ نے چاندی کے چھماتے روپوں کی "چھوٹ" کی۔ گاؤں کے بچوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں میں ڈھیروں شیرینی بھری ۔ لڑکیوں نے چھن چھن کرتے ہوئے نقرئی قہقہے بکھیرے اور لڑکوں نے پرانے تیزاب اور تازہ پھٹکری کے بنے پٹاخے چھوڑے ۔ لمبو آتش باز نے "اناروں اور ہوائیوں سے ساتوں آسمان" لالوں لال کر دیے۔ بونے بازی گر نے لوٹن کبوتر کی طرح قلابازیاں کھائیں۔ میراثنوں نے سمدھیوں کو "سٹھنیاں[6]" سنائیں۔ میراثیوں نے مہمانوں کی "استتی" کی "مچھر" ڈھولکیے نے چم چم کرتی چمکتی ہوئی پیتل سے مڑھا اور پھندنوں سے سجا ڈھول ہفتوں تیل پلائے بید سے پیٹنا شروع کیا۔

19۔A گل مہر پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

[1] چولا : جبّہ

[2] جوانیاں مان : فخرِ شباب

[3] دھیے نی دھیے : بٹیا او بٹیا

[4] جیون جوگ : جیالا پورکھ

[5] نیاڑیں : ننھے بچے

[6] سٹھنیاں : کوسنے (گالیاں)

تب گاؤں کے سارے گبرؤوں نے مل کر ایسا بھنگڑا ڈالا کہ بڑے بوڑھوں نے کبھی دیکھا نہ سُنا۔ ساری دھرتی اور سارے آسمان سات سُروں کے سچے سرگم میں مدہوش ہو گئے اور ساری فضا میں "میرا رنگ دے بسنتی چولا" کا الوہی نغمہ گونجنے لگا۔

"تب کیا ہوا؟" جاڑے کی دھوپ ایسے چہروں والے بچوں نے جاڑوں کی چاندنی ایسی صورت والی دادی سے پوچھا۔
"گبرو لوٹ کر کبھی آیا یا نہیں؟"
"وہ چلا گیا اس من چاہی ان دیکھی مٹیار کی کھوج میں جو گورے مونہہ اور کالی کرتوتوں والے جن کی قید میں تھی۔ اس جن کا بندی خانہ اتنا بڑا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کہیں نہ کہیں سورج اس پر ضرور چمکتا رہتا، مگر صبح اُس بندی خانے میں کبھی نہ ہوتی۔"
"گبرو "سلفے کی لاٹ" ایسی بانکی نار کی کھوج میں ان پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا جہاں اندھیروں کے سوائے، اور کچھ کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بندی خانہ ایک ایسا قبرستان تھا، جہاں مُردے خود اپنی قبریں کھودتے، خود اپنے آپ پر مٹی، گارا اور اینٹیں رکھتے، خود ہی ان میں دُبک کر کالی اندھیاری رات کی چادر اوڑھ کر سو جاتے۔"
بچے یہ سب کچھ سُن کر ڈر جاتے۔ کوئی ماں کی آغوش ایسا گرم نرم لحاف منہ پر ڈال لیتا اور کوئی یوں ہی آنکھیں بند کر لیتا۔ "بے بے" کو مگر نہ جانے کیوں بُری عادت تھی یہی بھیانک کہانی سُنانے کی جسے سیکڑوں ہزاروں بچوں نے سیکڑوں ہزاروں بار سُنا اور دوبارہ سُننے کی ضد جاری رکھی۔
اور بے بے بولتی رہی: "ہاں بچو، یہی دستور تھا۔ اُن دنوں کا۔ بانکے سجیلے گبرو گھوڑی چڑھنے کے بعد اندھیروں میں کھو جایا کرتے۔ کبھی کبھی یہ نوجوان کسی کو کہیں مل بھی جاتے، کسی بندی خانے کی کالی کوٹھری میں، کسی کچہری کے کٹہرے میں، کبھی سارے جسم پر ڈنڈا بیڑی چڑھائے سفید بھوتوں کو للکارتے ہوئے اور کبھی کسی سُولی کی سواری کرتے ہوئے۔"
"سُولی کی سواری؟ وہ کیسے بے بے؟"
"ایسا ہی ہوتا تھا اُن دنوں۔ بچے ایسی باتیں نہیں پُوچھتے۔ بڑے ہونے پر تم اپنے آپ سمجھ جاؤ گے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔"
"اور اس طرح لاکھوں دلبر اور دلیر گبرو گورے جنوں کے بندی خانے کی دیواروں کو ڈھانے میں دن رات لگے رہے۔ گورے جنوں کے کالے جلّاد ان کے سنہرے جسموں کے ٹکڑے کرتے رہے۔ موت ایسی مٹیالی رنگت والے گیدڑ ان کی بوٹیاں نوچتے رہے اور اُن کی ہڈیاں کالے سورج کی اندھیری روشنی میں لہو کے دریا کے کناروں پر بکھیر دی جاتیں۔"
"پھر اس دریا میں طوفان آ گیا۔ گبرو کی ہڈیاں طوفان میں بہہ جانے کی بجائے بندی خانے کی فصیلوں کے نیچے دھنستی چلی گئیں اور بندی خانے کی دیواریں شورے کا شکار ہو کر ڈگمگانے لگیں۔ راکشسوں کے راجہ کا سنگھاسن بھی ڈولنے لگا اور ایک دن یہ دیواریں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ سنگھاسن اُن کے نیچے دب گیا۔ یہ کہانی ہے اُس عجیب و غریب زمانے کی جب مائیں بیٹوں کو سولیوں کی سواری کے لیے دُلہنوں کی طرح سجاتیں اور جب بیٹے "میرا رنگ دے بسنتی چولا" کے سرمدی سرگم میں گُم اپنی من چاہی مٹیار کی طلب میں کہیں دُور نکل جاتے۔" اور برسوں تک دادی ماں عرف بے بے یہ کہانی سناتی کھانستی رہی۔ اس شہر کے اپنے گبرو کی امر کہانی اس شہر میں اس گاؤں میں اس قصبے میں۔ یوں بھی کہ اُس بستی میں۔ مگر وہ گبرو سال میں ایک بار ضرور آتا۔ جاڑوں میں "پوس ماگھ" کی ہر پورن[1] ماشی کو۔ ساری فضا میں پھر وہی سرمدی سرگم گونجنے لگتا۔ شہادت کی اس رات۔ سہاگوں بھری رات کو۔ رات کی رانی کی مہک پوری پر کرتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ سہاگ رات میں دولہا دلہن کے ملن کی طرح۔ بند کواڑوں اور چیخنی لگی کھڑکیوں سے نکل کر سرسر کرتی ہوئی خوشبو ہر ایک دل کے دریچے پر اس طرح دستک دیتی جیسے خود کائنات کی کوکھ میں کوئی نئی پیاری اور پوتر آتما داخل ہو رہی ہو۔

مگر یہ باتیں ہیں پچھلے وقتوں کی اور پچھلے وقت اب بالوں میں بھی یاد نہیں آتے۔ یہ باتیں ہیں اُن دنوں کی جب سورج کی روشنی سے اندھیرا اور چاند کی چاندنی سے لو نہیں برستی تھی۔ جب انسانوں کی بستی میں انسان بستے تھے۔ اب بڑی تیزی کے ساتھ سب کچھ ٹوٹنے، بدلنے اور بگڑنے لگا تھا۔ اب سرمدی سرگم کے سالوں سُر چیخوں میں اور چیخیں شمشان کی خاموشی میں بدل گئی تھیں۔ اب کے دریاؤں میں جب باڑھ آئی تو لوگوں کے حلق پانی کے لیے ترس گئے کہ انسان کے لہو سے انسان کی پیاس نہیں بجھتی۔
اس شہر میں اب ہر شخص قیدی تھا۔
قیدی اس شک شبہے اور دہشت کا جس کی بیڑیوں نے ہر ایک دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ ہر شخص ڈرتا تھا شاید کسی اور سے نہیں اپنے آپ سے۔ ہر شخص مجبور تھا۔ قاتل و مقتول کا کھیل بیک وقت کھیلنے کے لیے کہ وقت ہی کچھ ایسا آیا تھا۔ لوگ بھول گئے کہ "پوس ماگھ" کی پورن ماشی میں خوشبوؤں کے کسی کارواں کا انتظار بھی وہ کبھی کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو یاد نہ رہا کہ پوس ماگھ کی پورنیما کو شہیدوں

---

[1] پورن ماشی (پورنیما)

کے چوک کے چاروں طرف نور کا ایک ریلا آتا جو ہر ایک کے گھر کے در و دیوار کو روشن کرتا ہوا چلا جاتا۔ لوگ اب لمحوں اور گھڑیوں میں جی رہے تھے۔ لوگ اب ماہ و سال کا حساب بھول گئے تھے۔ شہر والے شہید کو بھی فراموش کر چکے تھے اور شہادت کی رات کو بھی۔

پھر ایک دھچکے کے ساتھ سب کچھ تازہ ہو گیا۔ ایک صبح جب شہر والے اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ چوک شہیداں کا بت غائب تھا۔ اونچا سا چبوترا اب خالی پڑا تھا۔ شہر والوں کے دلوں کی طرح وہ بت سارے شہر کی آبرو تھا، وہ بت سارے شہر کی شان تھا۔ اور اسی بت کے کارن لوگ اس شہر کو دلیروں اور دلبروں کا شہر کہتے تھے۔

اس پراسرار گمشدگی کے بعد طرح طرح کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بت یقیناً ان لوگوں نے چرایا ہوگا جنہوں نے پچھلے دنوں وہیں پر یہ ہنگامہ کیا تھا کہ بت کے سر پر ہیٹ نہیں، پگڑی ہونی چاہیے۔ وہ پگڑی پوشوں کا بیٹا تھا، ٹوپی پوشوں کا نہیں۔ ٹوپی پوشوں نے بھی اسی شام کافی ہنگامہ کیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ جب گبرو نے بسنتی چولا پہنا تھا تو اس کے سر پر پگڑی نہیں، ٹوپی تھی۔

اگلے روز ہیٹ توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ہیٹ تو خیر ٹوٹ نہیں پائی، لیکن ہتھوڑے سے بت کی ایک آنکھ ضرور جاتی رہی۔ اسی دوران اخباروں کے اداریوں میں، جلسوں میں دیے گئے بھاشنوں میں اور جلوسوں کے دوران لگائے گئے نعروں سے ایک نئی اور آتشیں بحث کا آغاز ہو گیا۔ بحث یہ تھی کہ شہید کے سر پر پگڑی ہونی چاہیے یا ٹوپی۔ دونوں طرف سے کئی تاریخی حوالے بھی پیش کیے گئے، دھارمک دلیلیں بھی دی گئیں اور خطرناک دھمکیاں بھی۔

چوک شہیداں کے آس پاس ہر روز مظاہرے ہونے لگے۔ کبھی شہید کو پگڑی والا ثابت کیا جاتا اور کبھی ٹوپی والا۔ اس دوران مار پیٹ بھی ہو جاتی۔ پولیس کو اکثر لاٹھی چارج کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار دو چار فائر بھی ہوا میں کرنے پڑتے۔

پگڑی پوشوں نے اعلان کیا کہ خالی چبوترے پر وہ ایک پگڑی کی استھاپنا کریں گے۔ بت نہیں رہا تو نہ سہی، لیکن اس کی پگڑی کی استھاپنا تو کر دی جائے تاکہ آئندہ کے لیے "کلیم" بنا رہے۔ جواب میں ٹوپی پوشوں نے اعلان کیا کہ عین اسی جگہ اسی دن اور اسی وقت ٹوپی دِوس منایا جائے گا۔ خالی پلیٹ فارم پر ایک ٹوپی رکھی جائے گی تاکہ شہید کی آتما شانت رہے اور پگڑی والے اس پر اپنا قبضہ نہ جتا سکیں۔

کچھ دن بعد جم کر لڑائی ہوئی۔ چوک شہیداں کے آس پاس کی کئی دکانیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ پگڑی ٹوپی کی اس جنگ میں مصیبت سروں کی آئی۔ جب سر ہی نہ رہے تو کیا ٹوپی اور کیا پگڑی۔ اور اس طرح اس نگری میں جہاں کبھی فساد نہیں ہوا تھا، اتنے زوروں کی لڑائی ہوئی کہ چوک شہیداں چوک فسادیاں اور شہر خوباں، شہر خموشاں بن کر رہ گیا۔ چوک شہیداں کے اس فساد کے بعد لوگ صرف "ان لوگوں" اور "ان لوگوں" کے مظالم کی داستانیں بیان کرتے اور "خون کا بدلہ خون" کی قسمیں کھاتے رہتے۔

شہر کے شہید کی بے شمار باتیں جو کبھی بچے بچے کو زبانی یاد تھیں، اب ایک ایسی داستان بن گئی تھی، جسے ہر شخص بھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ کہانی جو کل تک ہر نگر باسی کا نام و ناموس تھی، آج ہر ایک کے لیے گالی بن کر رہ گئی تھی۔ اسی لیے شہر میں کسی نے اس واردات کی جانب دھیان نہیں دیا۔ جو فساد کے بعد ایک کرفیو زدہ رات کو چوک شہیداں میں گم شدہ بت کے پلیٹ فارم کے پاس دیکھنے میں آئی۔

وہاں پر ایک نوجوان کی لاش پائی گئی۔ لاش کا سر غائب تھا اور جب سر ہی نہ ہو تو لاش کی شناخت کس طرح ہو؟

اتنے میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی اور اس سر بریدہ لاش کو گود میں لیے صبح ہونے تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ یہ کوئی اہم واقعہ نہ تھا۔ ایسے واقعات آج کل عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ وہ کس نوجوان کی لاش تھی، وہ بڑھیا کون تھی اور وہ کیوں اس سر بریدہ لاش کو گود میں لیے اس طرح سہلا رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے پہلوٹھی کے لال کو بسنتی چولا پہنانے سے پہلے پیار کر رہی ہو۔

●●

تیش بترا

جوئے لداخ - ٦

قدیم لیہہ
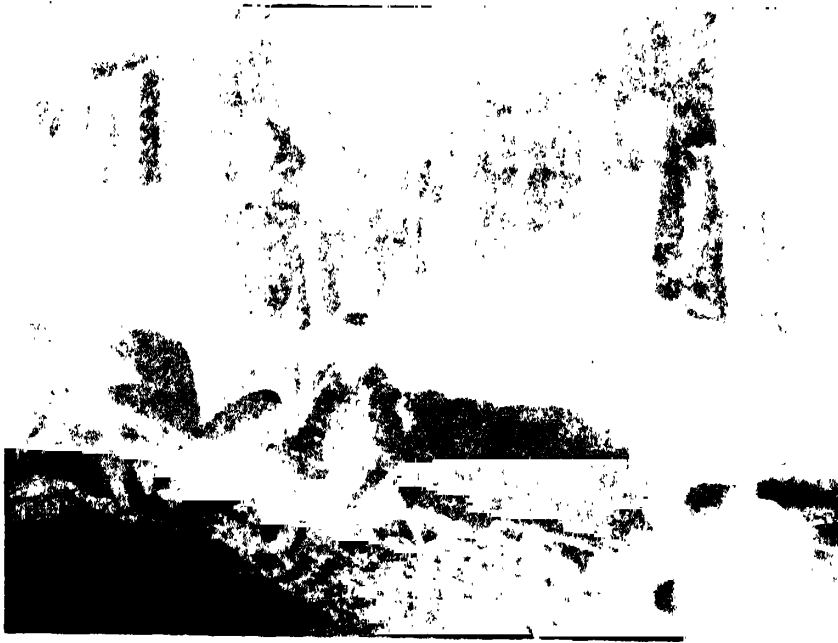
• لیہہ کے بازار کا ایک منظر

ہماری ٹیکسی لیہہ ایرپورٹ کا احاطہ کرتی شہر کی طرف جارہی تھی۔ سامنے ایک بلند پہاڑی پر لیہہ کا قدیم شاہی محل کسی مشفق ناگ کی طرح پھن اٹھائے، اس چھوٹے سے شہر پر اپنا سایہ کیے ہوئے تھا۔ یہ محل لیہہ شہر کی پہچان بن گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لندن کے ساتھ ٹاور برج، پیرس کے ساتھ آئیفل ٹاور یا دلی کے ساتھ قطب مینار جیسی عمارتوں کی وابستگی طے شدہ امر ہے۔ پڑوسی ملک تبت کی راجدھانی 'لہاسہ' کے ساتھ بھی اسی طرح کا پوٹلہ محل جڑا ہوا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جب تبت میں پوٹلہ محل کی تعمیر ہو رہی تھی، ٹھیک اسی زمانے میں یعنی ۱۵۵۳ء کے لگ بھگ لیہہ میں اسی طرح کا محل بن رہا تھا۔ غالباً ایسے محلوں کی تعمیر کا خیال مشترک رہا ہوگا۔ بہر حال ان دونوں محلوں کی اہمیت ان دونوں شہروں کے لیے ایک جیسی ہے اور پھر بودھ مذہب کے یہ دونوں مرکز بھی ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔

گزشتہ زمانے میں لیہہ دنیا کے ریشمی (تجارتی) راستے پر واقع تھا، جس کا ایک سرا تبت سے ہوتے ہوئے چین، اور دوسرا ہندوستان یا پھر وسط ایشیا سے گزرتا، یورپ میں جاکر ختم ہوتا تھا۔ لیہہ سے ایک اور راستہ افغانستان، ایران، عراق اور عرب سے ناتا جوڑے ہوئے تھا۔ اس لحاظ سے لیہہ شہر کو ہمیشہ ایک تاریخی اور تجارتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شاید جس سڑک پر ہم جارہے تھے، اس پر بھی کسی زمانے میں ساز و سامان سے لدے قافلے، اس تجارتی مرکز کی طرف رواں دواں رہتے ہوں گے اور شہر میں داخل ہونے سے پہلے منزل پر صحیح سلامت پہنچنے کی خوشی میں، ان قافلوں کے تاجر، سرحد پر چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی دیوار میں جو منی دیوار کہلاتی ہے، ایک ایک پتھر کا شکرانے کے طور پر اضافہ کرتے رہے ہوں گے! ایسی دیواریں لداخ کے ہر قصبے کے باہر موجود ہیں اور وہاں آج بھی مسافر عقیدے کے طور پر ایک ایک پتھر رکھ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان دیواروں کے پاس گھمائے جانے والے ڈرموں کی صورت میں پیار تھنا چکر موجود ہیں، جن پر 'ادم منی پدم ہوم'، یا ایسا ہی کوئی مقدس منتر لکھا رہتا ہے، شاید کسی تسبیح کے دانوں کی طرح ان ڈرموں کو گھمانے سے بھی اتنی بار ان منتروں کا جاپ کرنے کا ثواب ملتا ہوگا! غور کیجیے انسانی دماغ اپنی سہل پسندی کی خاطر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی ترکیبیں نکال لیتا ہے۔

ہماری ٹیکسی اب چوگان کے میدان کے پاس ہوتی ہوئی شہر کی مارکیٹ میں سے گزر رہی تھی۔ ہمارے علم کے مطابق یہ مارکیٹ لداخ پر ڈوگرہ حملے کے بعد ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ وجود میں آئی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں برٹش جائنٹ کمشنر کیپٹن ٹرینچ Captain Trench نے اسے از سر نو بنوایا تھا۔ اور یہ اسی شکل میں آج بھی محفوظ ہے۔ مارکیٹ میں ایک ہی وضع اور رقبہ کی دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ جنہیں آج لداخی، تبتی، کشمیری اور پنجابی آباد کیے ہوئے ہیں۔ اس مارکیٹ کے بائیں طرف ڈھلوان راستہ ہمیں اپنے ہوٹل کھانگڑی کی طرف لے گیا۔ اس سڑک پر پانی کے نلوں پر لمبی لمبی قطاریں دکھائی دیں جس سے شہر میں پانی کی کمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ٹیکسی کے رُکتے ہی ہوٹل کے مالک لے آگے بڑھ کر ہمیں خوش آمدید کہا اور خود اپنی نگرانی میں ہمارا سامان اُتروانے لگا۔ میں سیاحت سیاحت کے ملکوں میں گھومتا رہا ہوں اور مجھے کسی بھی ہوٹل کے مالک کا یہ اسلوب ہمیشہ پسند آیا ہے۔ ایسے انداز سے اپنے پن کی خوشبو آتی ہے اور ایک مسافر کے لیے اجنبیت کا احساس مٹ جاتا ہے۔

ہوٹل کے رجسٹر میں اندراج کرتے وقت جب انہوں نے میرا نام پڑھا تو اُن کے چہرے پر اشتیاق کی لہریں پھیل گئیں۔ "آپ ---- آپ تو مشہور افسانہ نگار ہیں نا؟"

جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اُن کی باچھیں کھل گئیں ---- میرا نام سجاد حسین ہے! میں تو ---- آپ کو پچھلے تیس سال سے پڑھتا آیا ہوں ---- آخر آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

میرے لیے اپنے کسی قاری سے کسی انجانی جگہ پر ملنے کا تجربہ نیا تو نہ تھا۔ لیکن ہمیشہ ہر بار ایک خوشی کا احساس ضرور ہوا ہے! چاہے وہ ناروے کا سرد علاقہ تھا یا لاس اینجلز کا معتدل خطہ، ماٹریل تھا یا نیو یارک!

مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ محنت رائیگاں نہیں گئی اور میری تحریر کتنی انجان آنکھوں کے لیے باعث راحت و دلکشی رہی ہے۔

سجاد حسین صاحب نے رعایتی شرحوں پر اپنے بہترین کمرے ہمارے لیے کھول دیے اور پھر انہوں نے ہمارے کمرے ہی میں پرتکلف اعزازی چائے بھجوا دی۔ میز بان کے بنا یہ چائے ادھوری تھی۔ لہٰذا ہم نے انہیں کمرے میں بلوا بھیجا اور ہم سب نے مل کر چائے پی۔

سجاد حسین صاحب کی بیوی نہ ہونے کی وجہ سے ہوٹل کی تمام نگرانی اُن کی شادی شدہ لڑکی کرتی تھی۔ اس کا شوہر شری نگر میڈیکل کالج میں مزید تعلیم کے لیے گیا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی لڑکی اور ہوٹل کے تمام ملازمین کو ہماری اچھی طرح سے دیکھ بھال کے لیے تاکید کر دی۔ انہوں نے ہمارے قیام کو یادگار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سجاد حسین صاحب خود لداخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اُن سے لداخی اور بودھی تہذیب کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ انہوں نے اپنے ہوٹل کی لائبریری میں سے لداخی تہذیب کے بارے میں کچھ نادر کتابیں بھی ہمیں بھجوا دیں۔

لیہہ میں جہاں پانی کی کمی تھی، وہاں بجلی سپلائی کے بھی مقررہ اوقات تھے۔ تمام شہر میں بجلی ایک ڈیزل جنریٹر سیٹ کے توسط سے سپلائی کی جاتی جو ہر شام کو تین چار گھنٹے چلا کرتا۔ ہوٹل کے کمرے میں مٹی کے تیل کے الٰہ دین نما لیمپ تھے۔ لیکن کرشمے سے عاری! ان چراغوں میں کوئی قیدی جن موجود نہ تھا، جو ہماری فرمائشیں بجا لاتا۔ لیکن سجاد حسین صاحب کی نوکروں کی ایک فوج نے کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

لیہہ کی کل آبادی صرف آٹھ ہزار ہے۔ یہاں کے ۹۰ فی صد لوگ بودھی ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ شہر چودھویں صدی میں بسایا گیا تھا۔ اس کا حقیقی نام 'سلیہ' یا 'گلیہ' تھا، جو بگڑتے بگڑتے لیہہ بن گیا۔ یہ شہر لداخ کے حکمرانوں کی اولاد کے لیے مبارک ثابت ہوا اور پھر روایت کے طور پر یہ طے ہو گیا کہ شاہی بچے صرف اسی شہر میں پیدا ہوں گے۔ نتیجتاً رفتہ رفتہ یہ شہر محلوں اور خانقاہوں کا شہر بن گیا۔ سولہویں صدی کے شروع میں یارقند اور کشمیر سے آنے والے کچھ مسلمان یہاں آکر بس گئے۔ ان تاجروں کے سربراہ رزاق جو تھے۔ ۱۵۶۵ء میں جم یانگ نمگیال نے اپنے عہد میں چند مصلحتوں کی بنا پر جب اسکار دو کی مسلم شہزادی اور گیال خاتون سے شادی کی تو لداخ میں اسلام کا دور باقاعدہ شروع ہو گیا۔ حکمران نے اپنی بیگم کی خاطر لیہہ میں جامع مسجد بنوائی اور پھر اس کے عہد کے بعد رفتہ رفتہ امام باڑہ اور ایک شیعہ مسجد کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی کچھ زیادہ نہیں ---- لیکن انہیں اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی مکمل آزادی رہی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان جہاں بدھ مت نے جنم لیا اور جہاں سے سمراٹ اشوک اور اس کی اولاد اور پیروکاروں نے لنکا، برما، چین تک بدھ مت کا پیغام پہنچایا' آج بدھ دھرم کا زیادہ مضبوط مرکز نہیں ہے۔ آج دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی بودھی ہے جب کہ ہندوستان میں اس کی تعداد آبادی کے ایک فی صد سے بھی کم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بدھ مت نے ہندوستان سے باہر فروغ پایا۔ وہیں اپنی جڑیں مضبوط کیں اور پھر ایک نو وارد کی طرح براستہ تبت دوبارہ داخل ہوا۔ لداخ میں بھی بدھ دھرم تبت سے آیا ہے۔ اور تبت کے لاموں نے لداخ، بھوٹان، نیپال اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں اسے دوبارہ زندگی دی ہے۔

اگرچہ بنیادی عقیدے وہی ہیں، لیکن باہر پروان چڑھنے کے باعث اس میں کئی نمایاں تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب کو مقامی رسوم رواج، رہن سہن کے مطابق کچھ سمجھوتے کرنے پڑے ہیں۔ مذہب کا کٹرپن کئی بار اس کے فروغ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ جن مذاہب نے بدلتے وقت اور ماحول کی نزاکت کو سمجھا ہے وہی روبہ ترقی رہے ہیں۔ بدھ مت کی دو شاخیں مہایانا اور ہن یانا ہیں۔ ہن یانا کا بنیادی نظریہ شخصی نجات پانا ہے۔ جب کہ مہایانا بھی نجات کے علاوہ دنیا کے دوسرے لوگوں کو بھی روشنی دکھانے اور اُن کی مصیبتیں اور دُکھ درد بانٹنے میں اعتقاد رکھتا ہے۔ مہایانا شاخ کے پیروکار چین، جاپان اور تبت کے لوگ ہیں۔ جب کہ ہن یانا کے مرید لنکا، برما، ویٹ نام جیسے ملکوں میں بکثرت ہیں۔

مہایانا شاخ کے عقیدوں میں بھی اصلاح ہوتی رہی ہے اور اس میں بھی دو فریقین موجود ہیں۔

سُرخ ٹوپی والے اور پیلی ٹوپی والے تبت میں بودھ مذہب کے ایک مشہور اور نامی مصلح سونگ پا TSONG KPA گزرے ہیں۔ بودھ خانقاہوں میں برسوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی راہب لاما کا درجہ حاصل کر پاتے ہیں۔ لاما بناتے وقت انہیں امتیاز کے طور پر سرخ ٹوپی دیے جانے کا رواج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سونگ پا لاما کا درجہ حاصل کرنے والوں کی قطار میں آخری شخص تھے۔ جب اُن کی باری آئی، سُرخ ٹوپیوں کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا جو ٹوپی بھی فوری طور پر دستیاب ہو سکی، وہ انہیں پہنا دی گئی۔ اتفاق سے یہ ٹوپی پیلے رنگ کی تھی جو سونگ پا نے ہمیشہ کے لیے اپنالی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں بدھ مت کے لیے کئی اصلاحی قدم اٹھائے۔ لہٰذا اُن کے پیرو کاروں کو پیلی ٹوپی کے گروپ کا نام دے دیا گیا اور انہوں نے اسی رنگ کی ٹوپیاں پہننی شروع کر دیں۔ بعد میں یہی گروپ تبت میں حاوی ہو گیا۔ موجودہ دلائی لامہ جنہوں نے تبت چھوڑنے کے بعد ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، دستور کے مطابق مذہبی تقریبوں میں وہ پیلی ٹوپی پہنتے ہیں۔ لیہہ میں تھکسے خانقاہ پیلی ٹوپیوں والوں کا مرکز ہے جب کہ ہیمس سُرخ ٹوپی والوں کا۔ ہمارا پروگرام ان دونوں خانقاہوں کو دیکھنے کا تھا۔

لیہہ میں یہ ہمارا تیسرا دن تھا۔ پہلے دن ہم نے لیہہ شہر کا ایک سرسری طور پر جائزہ لیا۔ سجاد حسین صاحب نے ہمیں اردو کے مقامی افسانہ نگار عبدالغنی شیخ صاحب سے ملوایا تھا۔ شیخ صاحب نے اپنی تصانیف مجھے پڑھنے کو دیں۔ جن میں اُن کا افسانوی مجموعہ "زوجیلا کے آرپار" ناول "دل ہی تو ہے" اور "صنم نرلیہ" کے عنوان سے جو لداخ کے ایک مایۂ ناز سپوت کی سوانح عمری ہے، شامل تھیں۔ شام کو جب ہم مقامی ریڈیو اسٹیشن کی محترمہ انگ مو سے ملاقات کرنے گئے تو

نئے گومپھا میں میتری بُدھ کی عظیم مورتی جو ۶۰ فٹ اونچی ہے۔ اور جسے عمارت کی دو منزلیں گھیرے ہوئے۔ یہ تصویر بالائی منزل کی ہے مورتی کی جسامت کا اندازہ پاس کھڑی ہوئی عورتوں کے قد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ◄

▲ نئے گومپھا میں اس عمارت کا بیرونی منظر، جس کے اندر میتری بدھ کی عظیم مورتی رکھی گئی ہے۔

شیخ صاحب کو بھی اُنہوں نے ہمیں ملوانے کے لیے مدعو کیا ہوا تھا۔ یقینی طور پر شیخ صاحب کا شمار لیہہ کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے ہے۔

ہم اُس صبح ناشتہ ختم کر کے ٹیکسی منگوانے کے چکر میں تھے کہ اچانک ہمیں سنیل، اشیما بچوں سمیت کھانے کے کمرے میں آتے دکھائی دیئے۔ ہم سب اُن کو ایکا ایک دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیوں کہ کرگل میں اس کے اس پروگرام کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ سنیل نے ہمیں بتایا کہ اچانک ایک سگنل ملنے پر اُسے اشد ضروری فوجی کام سے لیہہ کے قریب ہی واقع برگیڈ ہیڈ کوارٹر آنا پڑا تھا۔ چونکہ وہ جیپ میں آ رہا تھا لہٰذا اشیما اور بچے بھی بخوبی ساتھ آسکتے تھے۔

"میں جانتی تھی تم ہمیں ہوائی جہاز پر چڑھا کر ہی دم لوگے!" کرشنا بھابھی نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آنٹی! آپ کا جہاز تو ابھی دو دن میں جائے گا جبکہ ہمیں تو کل صبح ہی کرگل لوٹ جانا ہوگا!"

"ایک طرح سے تو تمہارا آنا مبارک ہے!" ترپت نے کہا۔ "اب ہمیں کسی گائیڈ کی یا ٹیکسی کی ڈھونڈنے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے ممی —— لیکن اس سے پہلے ہمیں ناشتہ تو کرواؤ نا!" سنیل نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی سب بیٹھو تو!" کرسیاں کھسکائی گئیں۔ اور ناشتہ کا آرڈر دے دیا گیا۔

ناشتے کے بعد یہ طے پایا کہ سنیل اور اشیما ہمیں ٹھکسے خانقاہ چھوڑتے ہوئے برگیڈ ہیڈ کوارٹر جو کارو (KARU) میں واقع ہے، چلے جائیں گے، جہاں سنیل اپنے کام سے فارغ ہو کر ہمیں وہیں مل جائے گا اور پھر ہم ہمیس خانقاہ اکٹھے چلے جائیں گے۔ جہاں تک اشیما اور بچوں کا پروگرام تھا، وہ کارو میں اپنی چند سہیلیوں کو مل لیں گے۔ اُس نے یہ تمام خانقاہیں پہلے سے دیکھ رکھی تھیں اور پھر بچوں کا ان خانقاہوں میں وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔ لوٹتی بار ہم انہیں کارو سے لے جاسکتے تھے۔

ہمارا پہلا پڑاؤ ٹھکسے خانقاہ تھا۔ ان خانقاہوں کو گھمپا کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ میرا قیاس ہے گھمپا غالباً گپھا (غار) کی بگڑی ہوئی شکل ہے زمانہ قدیم میں اکثر خانقاہیں کسی نہ کسی گپھا میں بنائی جاتی تھیں۔ جیسے اپنے یہاں اجنتا کی گپھائیں ہیں۔ رفتہ رفتہ انسان گپھاؤں سے نکل کر کھلے میں عمارتیں بنانے لگا تو ہر خانقاہ کو گھمپا کا ہی نام دیا جانے لگا ہوگا۔

ہوٹل سے ایرپورٹ تک تو وہی سڑک تھی۔ جس سے ہم کرگل سے آئے تھے، لیکن ایرپورٹ پہنچتے ہی ہمارا جونگا بائیں طرف کی ایک سڑک پر گھوم گیا۔ سنیل نے بتایا کہ یہ سڑک کاروہوتی ہوئی نیرا اور پھر لداخ چین سرحد پر پہنچ جاتی ہے۔ اور جہاں سے مقبوضہ علاقہ اور پھر تبت کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر کھردونگلا درہ ہے اور اس طرح سے سڑک کو دنیا بھر کی سب سے اونچی سڑک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ایسی اونچائی جس پر انسان خدا سے باتیں کرتا محسوس کرتا ہے۔

تقریباً سولہ کلومیٹر جانے پر ہمیں ایک پہاڑی پر محل سا دکھائی دیا۔ اس کے قریب ہی لداخ کا وجے مینار کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ محل اور وجے مینار نامور راجہ سنگے نم گیال نے ۱۶۴۵ء میں بنوایا تھا۔ اس کے قریب ہی ٹھکسے گمپھا ہے جس میں میتری بدھ کا عالی شان ۴۰ فٹ اونچا دیوقامت مجسمہ ہے جسے دو منزلہ عمارت گھیرے ہوئے ہے۔ اس مجسمہ کا سر ۸ فٹ چوڑا ہے۔ یہ مجسمہ لیہہ کی سبھی گمپھاؤں میں نصب مجسمے کا بیش قیمت اعلیٰ نمونہ ہے۔ راجہ سنگے نم گیال کی ہر تعمیر خوب کو خوب تر بنانے کی کوشش رہی ہے۔ پیتل اور تانبے میں ڈھلا یہ مجسمہ جگہ جگہ سونے چاندی کی پرتوں سے منڈھا ہے۔ اس کی نفاست دیکھتے ہی بنتی ہے۔ اس کی خوب صورت ساخت کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ اس مجسمے کے سر پر بنے تاج پر ہندو دیوی دیوتاؤں کے نقش ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ بدھ دھرم نے بھی ہندو دھرم کے اثرات قبول کیے ہیں۔ اگرچہ شو کا تصور آریہ کلچر سے کہیں پہلے دراوڑی تہذیب میں ملتا ہے، لیکن برہما، شو، پاربتی اور گنیش غالباً ہندوستان کے ہر مذہب میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں مل جاتے ہیں۔

ہم نے اس عمارت اور مجسمے کے کچھ فوٹو کھینچے کرشنا بھابی اور ترپت کو اس دیوقامت مجسمے کے پاس کھڑے ہونے کے لیے رضامند کیا تاکہ اس مجسمے کی قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ہم اس عالی شان مجسمے کے بارے میں غور کرتے ہوئے اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف چل دیے۔ اس سے تھوڑی دور اونچی پہاڑی کی چوٹی پر قبضہ جمائے ہمیس گمپھا اپنے سامنے پھیلی ہوئی وادی سندھ پر بھرپور نظر ڈالتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ گمپھا زینہ بہ زینہ سر اٹھاتی چلی جاتی ہے۔ اس گمپھا میں دس مندر ہیں، جن میں ساٹھ سے زیادہ لاما اور کچھ راہبیں۔ مرد راہبوں کی طرح سر منڈائے ہوئے رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لڑکے راہب بننے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ہم اس بڑے سے ہال میں بھی گئے، جہاں لاما لوگ جاپ اور گیان دھیان میں محو نظر آتے تھے۔ اس ہال میں کئی کھلے خانے والی الماریاں ہیں، جہاں تبتی زبان میں لکھا، بدھ دھرم کا انمول سرمایہ صدیوں پرانی کتابوں اور مسودوں کی شکل میں محفوظ رکھا ہے۔ ان سب خانقاہوں میں یاک کے گھی کی بدبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یاک 'YAK' بھینس کی قسم کا سینگ دار جانور ہے، جس کا دودھ پینے اور گھی بنانے کے کام آتا ہے۔ یہی گھی اکثر دیپوں میں جلتا ہے۔ اس دودھ اور گھی کی انوکھی بو کو جس سے

ہم لوگ جو مانوس نہیں ہیں، بدبو ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جانور بار برداری کے لیے بھی کارآمد ہے ــــ

اسی گمپھا میں تبت سے لایا گیا پیتل میں ڈھلا ایک بلند ستون ہے جس کے چاروں طرف تبتی زبان میں بدھ کے فرمان کندہ ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ خانقاہ آٹھ سو سال پرانی ہے۔ اسی خانقاہ کے سربراہ پیلی ٹوپی والے فریق کا درگیاہ رن پوشے ہے۔ اور اسے بودھی دنیا میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہیمنا اور خانقاہوں کے سربراہ بھی رن پوشے کہلاتے ہیں۔ بودھی رن پوشے کو بدھ کا اوتار تسلیم کرتے ہیں اور وہ پیدائشی علامتوں کی بنا پر نہ کہ پڑھائی یا لیاقت کے اعتبار سے یہ مرتبہ حاصل کرتا ہے۔

عموماً ہر خانقاہ کے نائب صدر کو جیلانگ کہتے ہیں۔ جسے کم سے کم بیس سال تک تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے اور جسے بارہا منطق کے کئی امتحانی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں لہراتی بجلی جیسا ہتھیار جو کہ مرکزی علامت ہے اور بائیں ہاتھ میں ایک گھنٹی رہتی ہے جو موت کی علامت ہے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان موقعوں پر وہ اپنے دُبلے دبلے ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں سے کسی کنسرٹ Concert کے کنڈکٹر کی طرح اشارے کرتا رہتا ہے۔ گھنٹے بجانے والا نظریں اٹھائے بغیر، اس کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ ہر اشارہ پُر معنی اور ایک خاص اسلوب کا حامل ہوتا ہے۔

لاما لوگ حساب، سیارہ شناسی نجوم اور جیوتش کے علوم میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہر قسم کے لوگ اپنی اپنی مشکلات کے سلسلے میں اُن سے اکثر مشورہ لیتے ہیں۔ وہ کٹر ہندوؤں کی طرح روانگی سفر سے پہلے شبھ دن اور گھڑی کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ بودھ دھرم جو ہندو دھرم کے توہمات سے نجات دلانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ آج خود توہمات اور رسم و رواج میں جکڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آج یہ بھی ذات پات، اونچ نیچ، امیری غریبی کے پھیر میں پھنس گیا ہے۔ ہر خانقاہ بُرے بدروحوں کو دور رکھنے کے لیے جھنڈوں رنگوں آوازوں تک کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تانترک علم اب بودھی دھرم کا حصہ ہی نہیں بلکہ پوری طرح سے اس پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

زنانہ راہبوں کو سوم میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مذہبی شاستر پڑھ سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے آج کے زمانے میں بودھی دھرم کچھ بچھڑا سا معلوم پڑتا ہے

ہم تھلے خانقاہ دیکھ کر اتر ہی رہے تھے جب سنیل نے ہمیں جونگاے کا آنا دکھائی دیا ـــ ہم جونگے میں بیٹھ کر ہیمس گمپھا کی طرف روانہ ہو گئے ـــ تھکے سے کچھ ہی دور ہمیں کچھ سمادھی نما تعمیرات دکھائی دیں۔ سنیل نے ہمیں بتایا کہ ایسی تعمیرات کو 'چورٹن' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ داہ سنسکار کی بھٹی بھی ہے۔ اور سمادھی بھی۔ لداخ بھر میں ایندھن کی سخت کمی کے باعث اس خاص ساخت کی بھٹی میں داہ سنسکار کے لیے بہت ایندھن کا استعمال ہوتا ہے۔ اور ہوا کی رو کے مناسب استعمال سے داہ سنسکار مکمل ہو جاتا ہے۔ لاش کی راکھ کو مٹی میں گوندھ کر بدھ کی چھوٹی سی مورتی بنائی جاتی ہے اور پھر اسے سمادھی کا روپ دے دیا جاتا ہے۔ پھر اس چوکور سی تعمیر پر خوبصورت نقش و نگار اور رنگین بیل بوٹے بنا دیے جاتے ہیں۔

▲ ہیمس گمپھا کی چھت کے اوپر لگے ہوئے کلس جو بدروحوں کو دور رکھنے کے لیے لگائے گئے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں سڑک سندھ ندی کے کنارے کنارے ہو لیتی ہے۔ سندھ ندی پر اب باندھ بنا کر اس کا پانی بجلی تیار کرنے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پانی پمپوں کے ذریعے نکال کر آبپاشی کے کام میں بھی لایا جا رہا ہے۔ ندی کے دونوں طرف پروجیکٹ کی تکمیل کا کام جاری تھا اور پھر ایک پل کے ذریعے ہمارا جو نگا دریا پار کر کے گمپھا کی سڑک پر ہو لیتا ہے۔

لیہہ سے چالیس کلومیٹر دور ہیمس گمپھا کی عمارت پہاڑی کے درمیان تھوڑی سی جھانکتی نظر آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مزید اونچائی پر جانے سے پہاڑی کی چوٹی پر گمپھا کی وسیع پھیلی ہوئی عمارت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔

مسلم ماں کے بطن سے پیدا ہوا راجہ سنگے نم گیال بودھ دھرم کا مشہور سرپرست اور پیروکار تھا۔ اس خانقاہ میں تبت اور دوسری دور دراز جگہوں سے لائے ٹنکا (عَلم) درجنوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ہر سال اس میں سے کوئی نہ کوئی ٹنکا خانقاہ کی دیواروں سے خاص تہواروں پر عقیدتمندوں کی زیارت کے لیے پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس خانقاہ میں دنیا بھر کا سب سے بڑا ٹنکا رکھا ہوا ہے، جسے اٹھانے کے لیے پچاس راہب درکار ہیں۔ اس ٹنکا کی ریشمی سطح پر کتنے ہی دیوی دیوتاؤں کی مقدس تصویریں شوخ ترین رنگوں میں بنی ہوئی ہیں۔ جب یہ ٹنکا لٹکایا جاتا ہے تو راہبوں کا ایک جلوس رنگ برنگی پوشاکیں پہنے، چہروں پر نقاب چڑھائے ڈھولوں کی ہلکی تھاپ کے ساتھ مٹکتا رہتا ہے

ہم ماہ مئی میں لیہہ گئے تھے۔ جب کہ جون کے شروع میں گورو پدم سمبھو کے یوم پیدائش پر یہاں ہر سال ایک عالی شان میلہ لگتا ہے۔ ہم اس میلے میں تو شریک نہ ہو سکے۔ لیکن ہم نے گمپھا کے وسیع دالان میں راہبوں کو اونچے اونچے جھنڈوں کی چھایا میں ڈھول اور موسیقی کی تھاپ پر مشق کرتے ضرور دیکھا تھا۔ میلے کے موقع پر بے انتہا روشنیوں کی وجہ سے ساری عمارت ایک بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ بد روحیں خوفناک نقاب سیاہ کپڑے پہنے، جن پر کبھی کبھی انسانی پنجر کے نشان بنے رہتے ہیں، اچھی روحوں سے لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں اترتی ہیں۔ سفید، سرخ اور پیلے رنگ اچھی روحوں کے لیے مخصوص ہیں جب کہ سیاہ رنگ سیاہ کاروں کے لیے! ہر مذہبی روایت کے مطابق یہاں بھی نیکی، بدی پر غالب آتی ہے۔

ہیمس گمپھا کی چھت پر بھی بد روحوں کو دور رکھنے کے لیے جھنڈوں کے علاوہ تانبے پیتل میں ڈھلے سنہرے رنگ کے کلس کئی جگہوں پر لگے ہوئے ہیں۔ بہر حال ان خانقاہوں میں یقینی طور پر ایک روحانی سکون میسر تھا۔

ہیمس خانقاہ کے پاس ہی سندھ ندی کی ایک چھوٹی معاون ندی ہے۔ اس ندی کے پاٹ میں پانی کے قریب کچھ خیمے لگے تھے۔ ان خیموں میں برہنہ بدن غیر ملکی عورتیں اور مردوں کی گہما گہمی تھی۔ کچھ جوڑے کمر میں ہاتھ ڈالے، جسم سے جسم لپٹائے ہوئے تھے۔ کچھ بیئر کے ٹینوں کو خالی کر کے پتھروں پر پھینک کر شوخ دہاتی آوازوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے

قریب ہی ایک نہایت خوب صورت فارن بس کھڑی تھی۔ جس کی پیشانی پر لکھا تھا: "THE RXODUS"

●

▲ پہاڑی کی گود میں ہیمس گومپھا میں لگے ہوئے آسمان کو چھوتے عَلم

شفیقہ فرحت

کہ چلے ہم

حسرت ہی رہ گئی کہ ہمارا کوئی فیصلہ بھولے بھٹکے صحیح ثابت ہو جائے۔ دوراہے پہ کھڑے ہیں۔ دائیں مڑیں تو معلوم ہوتا ہے (مڑنے کے بعد — !) کہ بائیں مڑنا چاہیے تھا اور جو بائیں مڑے تو یقین ہے کہ وہ راہ بھی غلط ہوتی۔ زندگی سرتاپا رانگ نمبر بن کے رہ گئی ہے۔ اب تو سوچا ہے کہ کوئی کام ہی نہ کریں۔ جب کام ہی نہ ہوگا تو رائٹ رانگ کا جھگڑا ختم۔

خیر گھریلو اور حالاتِ حاضرہ سے تنگ آکر ہم نے حرکت کا ارادہ کیا کہ حرکت میں برکت ہے۔ حالانکہ نصف صدی کے تجربات کے بعد دیگر رموز کی طرح یہ راز بھی ہم پر منکشف ہو چکا تھا کہ ٪۹۰ خوب صورت الفاظ (مع معنی کے — !) ہمارے لیے تخلیق نہیں کیے گئے۔ حق اور حق دار کے تعلقات کا زاویہ نظریہ سب بدل چکا ہے۔ چلیے حرکت نہ سہی سفر کہہ لیجیے۔ کہ اردو کے ساتھ انگریزی کا — Buzzer مل ملا کے ہر جگہ اپنا حساب برابر کر لیتا ہے۔ (صوتی یک جہتی کا نادر نمونہ — !) تو ارادے بلند اور نیک — یعنی جرمنی، فرانس، اٹلی، ناروے وغیرہ وغیرہ — اور وغیرہ کے تھے۔ مگر لڑھکتے لڑھکتے اٹھے آکر کلو منالی پہ۔

وہ لطیفہ تو سب کو ازبر ہے کہ طمنچہ چاہیے تو توپ مانگو — ٹارگٹ ہمارا توپ تھی۔ مگر امکانات طمنچے سے زیادہ کے نہ تھے۔ سو اب ہم ان 'بی طمنچہ جان' کو پوری طاقت سے پکڑے رہنے کے چکر میں تھے — لیکن بی جان کا ہاتھ لگنا مشکل معلوم ہو رہا تھا کہ شعرا کچھ اس قسم کے الہامی اور سدا بہار اشعار بھی تخلیق کر گئے ہیں۔ کہ

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

خیر سہرے وہرے کی بات چھوڑیے — کہ دولہے کے رخ پر ہی نظر آجائے تو غنیمت کہ سیکڑوں ایرے غیرے سر اس کے لیے حاضر رہتے ہیں — ! اور جب جنگل میں آگ لگی ہو، کیا خبر شہر بھی جل رہے ہوں۔ ایسے میں صحرا کو کون پوچھے۔

ہر شخص نت نئے مشورے نوکِ زبان پہ رکھے اور طرح طرح کے تازہ ترین اخبار بغل میں دبائے چلا آرہا ہے۔

"دیکھو اس میں کیا لکھا ہے — شملہ میں برف باری —"

"میرٹھ میں چاند ماری"

پنجاب میں دہشت

دلی میں وحشت

بھئی خودکشی ہی کرنی ہے تو اپنے چھوٹے بڑے تالاب کیا برے ہیں۔ چلو بھیگی بھاگی پھولی پھالی لاش پسند نہیں تو وہ آپ کا فلک نما ہوا محل کس گھڑی کام آئے گا۔ خریدتے وقت آٹھویں منزل کے لاتعداد فوائد گنواتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ خودکشی کے لیے ادھر ادھر نہیں بھٹکنا پڑے گا۔ دیارِ غیر کا احسان اٹھانے سے بچ جائیں گی اور پھر تیر بہ ہدف تو اس سے استفادہ کیجیے۔ آٹھ برس ہو گئے ایک تجربہ بھی نہیں کیا۔ اب وقتِ امتحان ہے تو بزدلوں کی طرح بھاگ رہی ہیں کلو منالی کی طرف۔ شہر کے شہر کا معاملہ ہے بلکہ گھر سے گھر لگا سمجھو۔ ہر قسم کی زحمت سے بھی ہم لوگ بچ جائیں گے۔"

کسی نے کہا۔

"بھئی سب سے کہا سنا معاف کر والو — یاد کر کے لیے دیے کا حساب چکا دو۔"

غرض یہ کہ ہزار زبان تو صد ہزار باتیں۔

اور زبان بھی — زبانِ غیر اور پرائی۔

ایسے میں شرحِ آرزو کیا کرتے۔

ہمارے ارادے ڈگمگانے لگے — سینڈل کی ایڑی بھی غلطی سے ذرا اونچی آگئی تھی۔ کچھ ادھر ادھر کے اشاروں کا انتظار کرنے لگے۔ دلی بدلیے

• ای ۲/۱۸۶ ودیا وہار، بھوپال (مدھیہ پردیش)

ہاتھوں کی تلاش ہوئی مگر سب بے کار ـــــ

ایسے موقعوں پر معصوم بچے بہت کام آتے ہیں۔ ٹی وی کے طفیل یہ قسم یعنی معصوم بچے اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ مگر خیر کچھ تھوڑی بہت معصومیت تو ہر کسی میں کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی ہے۔

سات سالہ جینو بیگم کو بصد اصرار بلایا اور غیر معمولی عزت و تکریم کے ساتھ بٹھایا "فروٹی" اور "ڈبل ڈیکر" سے خاطر مدارات کی۔ انہوں نے مزید بھاؤ بتائے اور تاؤ دکھلائے۔ وہ بھی سہے۔ ان سے کہا کہ ہمارا مرنا جینا تمہارے ہاتھ ـــ جو فیصلہ سناؤ سر آنکھوں پر۔

فلموں کے سہارے اُن کی جنرل نالج قابلِ تعریف ہو چکی تھی۔ فرمایا۔

"خالائی (خالہ کا ماڈرن تلفظ) ٹاس کر لیتے ہیں۔ ہیڈ جانا۔ ٹیل رکنا"

ہم نے ہر شریف سادہ پوش کی طرح ہاتھ جوڑ کے سر جھکا دیا۔ جو حکم سرکار کا۔

فلم "شعلے" اُس نے دیکھا اور سُنا تو اتنی بار تھا کہ ایک ایک ڈائیلاگ ازبر ہو چکا تھا۔ مگر اس غریب کو کیا پتہ تھا کہ گھاسی رام کوتوال کی طرح کبھی مقدمے کا فیصلہ اسے بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ دونوں طرف ہیڈ والے سکے کا انتظام بھی کر لیتی۔ بے خبری میں ماری گئی ورنہ آج کا ہر سکہ خاص و رائج الوقت ایسا ہی ہے۔!

(ویسے اُسے چیف جسٹس کا رول ادا کرتے ہوئے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ انصاف ابھی محفوظ ہے۔ مگر ایسے ہی ہاتھوں میں ـــ!)

پہلی مرتبہ ہیڈ آیا۔ اُس نے بچوں کی روایات کے مطابق دھاندلی پہ کمر باندھی۔

"تین بار کا ریزلٹ دیکھیں گے خالائی"

اور جب دوسری بار بھی نتیجہ گزشتہ پیوستہ نکلا تو وہ مزید بے ایمانی کی ہمت نہ کر سکی۔ بچی ـــ عقل کی کچی جو تھی۔

ادھر سے مایوس ہو کر موسمیات کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح کمزور ثابت ہوا۔ بادل گھر آئے تھے۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور برکھا بہار کی آمد کے شادیانے بج رہے تھے۔ ہم نے اس پر داؤ لگایا ـــ بارش ہو جائے تو سفر ملتوی۔

اب جو فلکِ ناہنجار کی طرف دیکھتے ہیں تو سناٹا۔ ہواؤں نے رُخ بدل لیا اور بادل اس تیزی سے ہٹ گئے جیسے کرفیو کی خبر سے فٹ پاتھ پر کی دکانیں۔

کسی سٹنٹ پکچر کا کلائمکس ـــ ہر طرف سے ناامید ہیروئن کسی کٹے بلی گھوڑے گدھے کے آگے سر جھکائے گا رہی ہے اور رو رہی ہے۔

ایک نے دوسرے ـــ ہم۔ ریل گاڑی کے آگے گڑگڑائے یعنی اگر ٹرین لیٹ تو ہم گول اور ہمارا گول بستر فلیٹ ـــ جب دکشن ایکسپریس کے رائٹ ٹائم آنے کی بشارت ملی تو باعزت طریقے سے شکست قبول کی۔ اس معجزے سے مستفید ہونے کی خاطر ہم نے آٹو رکشا میں سامان پھینکا اور خدا کی امان کی چادر تھام لی۔

نظام الدین ـــ نئی دہلی ـــ کشمیری گیٹ۔

شور و غل ـــ گہما گہمی ـــ چھلکوں کے ڈھیر ـــ اُبلتی نالیاں ـــ بلا ضرورت بہتا گندہ پانی ـــ اُڑتی دھول کے مرغولے ـــ سب کچھ بمبئی جیسا تھا۔ جانا پہچانا۔ مانوس مانوس۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ کہیں بھی بھیانک خبروں کی جھلک نہ تھی۔ لگتا تھا شہر کے ایک حصے کا دوسرے سے تعلق ہی نہیں ـــ کیا ضرورت ہے۔ خدا کی مملکت میں بھی تو جنت اور جہنم ایک ساتھ پہلو بہ پہلو بسے ہیں۔ اور بڑے حسن و خوبی سے دونوں کے کاروبار چل رہے ہیں۔

دہلی سے منڈی (کہ جو ہمارا پہلا پڑاؤ تھا) تک کا سفر ایسے ہی ہوا۔ جیسا کہ بس کا سفر ہوا کرتا ہے۔ کبھی اونگھنا۔ کبھی سونا۔ کبھی آگے لڑھکنا۔ کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں بازو جھک جاتا، کبھی بائیں کا سہارا لینا۔ سو ہم بھی یہی کرتب دیکھتے دکھاتے منڈی پہنچے۔

مشرق و مغرب ـــ دائیں بائیں ـــ چاروں طرف سرسبز، سربلند پہاڑوں کا سلسلہ نظر نہ اس پار جا سکے نہ اُس پار۔ بس سامنے والی برف سے ڈھکی سفید چوٹی پر ٹکی رہے۔ سفید برف جو ہیرے کی طرح چمک رہی ہے۔ ہیرے کی کنی نے چمک یہیں سے لی ہوگی۔ مگر صدیوں تک دبے ڈھکے چھُپے رہنے سے اور تراش خراش کے دُکھ جھیلنے سے ٹکڑے کیے جانے کے کرب سے اُس کی چمک تو دمک بن گئی۔ دائمی اور ابدی ـــ دیدہ ور کی نگاہ پڑی تو قیمت سر چڑھ کے بولنے لگی۔

اور دوسری چمک پگھل پگھل کے آنسو بن کے بہہ گئی۔

ہر عروجے را زوال ـــ

اقبال نے تو ایک گلہری کے ہاتھوں (یا باتوں سے) پہاڑ کو شکست دلوا دی تھی۔ یوں روایتوں رواجوں اور حقیقتوں کے آگے ہار تو تقدیر ٹھہری۔ مگر وہ تھے غضب کے ریفری ـــ!

مگر سربلند ہارتے کب ہیں۔ اس پہاڑ کی سفیدی کو مٹتے تو کسی نے دیکھا نہیں ـــ ویسے بھی آج کل دیکھنے کی زحمت نظروں کو دیتا کون ہے۔ کچھ دیکھنا ہے تو ٹی وی نہ دیکھیں ـــ وی سی آر پر فلمیں نہ دیکھیں۔

اصل کو بھی نقل کے واسطے سے دیکھیے اور بھی چشمِ غیر سے دیکھنے میں الزام اگر آتا ہے تو وہ بھی غیروں کے سر آئے گا۔ ہم اپنا سر کھپانے کی بجائے سر بچانے کی فکر کریں۔

قربات سلسلہ ہائے کوہ کی ہو رہی تھی اور حسبِ عادت یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ تو ہمالیہ کا یہ حصہ ـــ

ٹھہریے ٹھہریے یعنی ساودھان خبردار۔ ایک سورج مغرب میں چمکا۔ ایسی غیر متوقع لمحاتی چمک سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے۔ پہاڑ کے

سیدھے سچے لوگوں کی بات نہیں ۔ ہم خطرناک شہر میں
سے آئے ۔ خطرناک حد تک باعلم اور ہوشیار خبردار
قسم کے باشندے تو پٹاخے اور غبارے سے بھی چونک
چونک پڑتے ہیں۔ انگیٹھی سے اُٹھتے دھوئیں کو
دیکھ کر آیتہ الکرسی پڑھنے لگتے ہیں۔ یا اللہ یا اللہ
کرنے لگتے ہیں۔

پھر وہی پوائنٹ آف آرڈر ــــ کہ نہ بانس
نہ بانسری۔ سب پر ڈیپارٹمنٹ آف کلچر کا قبضہ جائز و
ناجائز ہے۔ یعنی نہ انگیٹھی نہ انگیٹھی کا دھواں۔ نہ
جلنے جلانے کے لئے لکڑی نہ کوئلہ۔ ریلیں بھی ڈیزل
سے چلنے لگیں سو جڑ لئے ہوئے پتھر کے کوئلے کی
گنجائش بھی کم ہو گئی۔ سارے محاوروں میں ترمیمات
کرنی پڑیں گی کانسٹی ٹیوشن کی طرح ــــ!

ہاں صاحبان ــــ پھر واپسی اُسی نکتہ کی
طرف کہ جہاں سے ہم چند لمحے پہلے چلے تھے۔ کہ
سمتِ مغرب سورج دیوتا کی سی چمک نے آنکھوں
کو خیرہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر سورج ہے کہاں۔
وہ تو خراماں خراماں طلوع ہوئے، جلوہ دکھانے
کی کوشش کر رہے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے کوئی
بانو بھوپالی طلوع ہوتی ہیں۔ پہلے آڑے ٹیڑھے
سازندے ۔ اور ٹوٹے پھوٹے ساز۔ پھر لپی پتی
پلاسٹر چڑھی والدہ پھر کچنار کی کلی (بہ اعتبارِ
جسامت) سی بیٹی بہن (سمجھ سمجھ کی بات ہے)
پھر جھومر ٹیکے جڑی۔ سرخ انگارہ بنی۔ کرن کرن
لپیٹے سمیٹے۔ جھلمل جھلمل۔ سورج سے گولے سی خود
وہ ــــ

تو اسی طرح یہ اصل سورج بھی آہستہ آہستہ
طلوع ہو رہا ہے اور اس کی کرنوں سے مغرب کی پہاڑی
سڑک پر اُبھرتی ڈوبتی بس ایک دم لشکارے مارنے
لگی تھی۔

ہاں مظلومو۔ اطمینان کا سانس لو کہ یہ خنجر
کی چمک نہیں، بس کا ٹین کا ٹپر ہے ــ!
بس نکل گئی۔ اب ہم لکیر پیٹ رہے ہیں ــــ
سب سے اونچی سڑک کے پیچ و خم میں گم ہو کر اُس نے
اپنا رُخِ روشن دوبارہ دکھلایا۔ اور اب درمیانی سڑک
پر آگئی ہے۔

بلندی سے پستی تک آنے میں بس تک کو دیر
نہیں لگتی۔ ایسے ویسوں کی کیا بات ہے۔
ہر عروج را زوال ــــ!
مغربی پہاڑ کے اُس پار ــــ نرچوک ہے ــ
سندر نگر ہے۔ بلاسپور ہے اور چنڈی گڑھ ہے ــــ
(قلم میں لرزش ـــ!)
مشرق کی اور خدا جانے سورج کے علاوہ کیا
ہے۔ ویسے جب سورج ہے تو کسی اور کی گنجائش
کہاں ــــ سورج سے لوہا کون لے سکتا ہے؟ ۔
ایک کچھار میں دو شیر (علاوہ نیشنل پارک کے) ایک
میان میں دو تلواریں کیسے؟ اور جب سورج ہے
تو ہو سکتا ہے دونوں جہانوں کا مشترکہ دارالخلافہ۔
بارگاہِ الٰہی خانۂ خدا بھی اِدھر ہو اور سورج اُسی کا
دوارپال۔ نظرِ عقل کو اس تک پہنچنے سے روکنے والا۔
اور اسی کی طرف کھینچنے والا۔ صحرائی جادوگر کی طرح۔
تو خیر جانب مشرق کل علم کا قلم (اور الم بھی)
ہاتھ میں لے کے یلغار کی جائے گی۔ یک روزہ تجربے کے
سہارے تحقیقات (پولیس والی) اور ریسرچ (سائنسی
والی) کی جائے گی۔ تب دوستوں اور دشمنوں
کے سامنے رپورٹ پیش کی جائے گی، جس سے
ہماری طرح کم علم حیران اور آپ کی طرح اہلِ
علم پریشان ہوں گے۔

بارہ بجنے والے تھے ــ اب بج چکے۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے یہاں 'بارہ' کو ترپ
کی دگی سے اہمیت کیوں حاصل ہے کہ جسے چاہا
اس سے کاٹ دیا۔ کہیں صورت پہ بارہ بجتے
ہیں تو کہیں عقل میں۔

گھڑی میں بارہ بجنے والے تھے۔ ہم
بھاگے بھاگے یعنی تیز تیز چلتے ہوئے کہ عمر
کے ایک حصہ میں چلنا دوڑنے کے مترادف اور
دوسرے میں دوڑ نا گج گامی سی چال سمجھا جاتا ہے۔
وقت وقت کی بات ہے اور رداتا کے
ہاتھ ہے۔

سو ہم پہنچے اوپر ــــ ہاں صاحب اس
سات آٹھ ہزار فٹ کی اونچائی کا بھی اوپر ہے اور
اس اوپر کا بھی اوپر ــــ اچھا ہے جتنی بلندی
ہوگی خدا سے گفت و شنید بات چیت میں آسانی
اور رازداری کہ آج کل سارے مسئلوں کا حل
ہائی کمان ہی کے پاس ہے جسے اُلجھنا سلجھنا
ہے۔ وہیں اُلجھتا سلجھتا اور لوٹتا ہے۔

تو چھت پہ ہم اس سورج کو دیکھنے گئے
تھے جو مہر نیم روز نظارہ سوز تھا۔ یعنی سوا نیزے
پہ آچکا تھا۔ مگر پہاڑ کی برف ذرا نہ پگھلی
تھی۔ جوں کی توں جمی چمک رہی تھی۔ ہم شہر
والے ان رموز کو کیا جانیں۔ ہمارے یہاں تو
فرج کی برف ذرا میں پگھل کے پانی پانی ہو جاتی
ہے ــــ

یہاں نہیں پگھلتا تو امیر کبیر شریف کا
دل ــــ

دوسرے دن سورج اپنے وقت پر طلوع ہو گیا
اور دھند سارے میں پھیل گئی۔ اس کے نکلنے سے
پہلے ہر چیز صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔
سلیٹ کے چپٹے کویلوں کی ڈھلواں اور پیگوڈا
ٹائپ چھت والے گھر۔ کوئی کھلونے سے ننھے منے
اور کوئی بڑے۔

چکنے چکنے، ہرے ہرے درخت، شاید امرود
پلم اور ناشپاتی کے جن میں ابھی تک نہ پھل
آئے تھے نہ پھول۔ گلاب کی جنگلی خودرو جھاڑیاں
جن میں اتنے چھوٹے، اتنے نازک اور اتنے ہلکے رنگ
کے پھول کھلے تھے کہ پتوں کے ہجوم میں چھپ
چھپ جاتے تھے۔ اچھے اور باصلاحیت لوگوں کی
طرح۔

تو ان سب کو دیکھنے کے لیے دیدہ ور کی وی۔
آئی۔ پی نظر بھی کافی نہیں تھی۔ عام آنکھوں سے
بلکہ کچھ کمزور آنکھوں سے بھی سب کچھ دکھ رہا تھا۔
مگر سورج نے جلوہ دکھایا اور دھند میں سب کچھ

چھپ گیا۔ پکا ڈپلومیٹ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان (مہذب پڑھے لکھے) نے سورج سے یہ ادا سیکھی کہ عروج و اقتدار کے بعد دھند پھیلا دو۔ یا سورج نے انسان سے۔

بھئی صدیوں کا ساتھ ہے۔ کچھ نیچے سے بھی لیا ہوگا۔ کب تک اوپر یعنی خدا کے اشاروں پہ ایک ہی محور پہ گردش کرتا رہتا۔

لیجیے۔ ہم بکواس کرتے رہے۔ بے پر کی ہانکتے رہے۔ اور سورج اپنے سفر پر روانہ ہو چکا۔ جانے کتنوں نے نمسکار کیا ہوگا۔ کتنوں نے پوجا۔ کتنوں نے سجدہ اور سلام۔ کہ چڑھتے سورج کی پوجا ہر عقل مند کرتا ہے اور ہر ہوش مند کو کرنی بھی چاہیے۔

اور اب وہ ایسی بلندی پر آگیا ہے کہ کوئی نظر تو ملالے ــــــ!

بھونپو بجا ــــــ مگر دس بجے کا۔ یہ اس سے زیادہ نہیں بجاتے۔

یہ سیدھے سچے معصوم لوگ ہیں۔ کسی حد تک بھولے بھالے۔ بلندیوں پر رہتے ہیں۔ مگر باتیں زمین کی کرتے ہیں۔ رشتہ۔ بنیادوں سے کچی، نرم اور نم مٹی سے جوڑے رکھتے ہیں۔

ان کی ضروریات محدود اور تمناؤں آرزوؤں کی اڑان نیچی ــــــ بلکہ زمین پہ رینگتی ہوئی۔

سارے آسمانی سلطانی بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ان کی کمر جھکی جھکی سی رہتی ہے۔ آسمان قریب تر ہے نا ــــــ دنیا پہ برسائے جانے والے تمام ستم انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پہ، انہیں درختوں کی شاخوں پہ آکے ٹک جاتے ہیں اور یہ بارانِ رحمت سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں۔ جھاڑ پونچھ کر اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں۔ کھردرے اون کے کمبل کے ساتھ۔ رنگ برنگے کشیدہ کے پھول میں کاڑھ کے، ٹانک کے ــــــ اور ایسا کرنے میں ان کی نظریں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں۔ گردنیں جھکی رہتی ہیں۔ ہمیشہ ٹوپی جو پہنے رہتے ہیں۔ یہ ٹوپی بڑی خطرناک شے ہے۔ شریف کو چار چوٹ کی مار دینے والی۔ اسے گرنے سے بچانے کے لیے بے چارہ نہ سر اٹھا کے بلندی پہ دیکھ سکتا ہے نہ پستیوں میں لوٹیں لگا سکتا ہے۔ نہ اچھل کود مچا سکتا ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت یا رب!

بلکہ حیف اس سر کی قسمت کہ جس پہ چار گرہ کپڑا ٹوپی بن کے سجتا ہے! ان پہاڑیوں کے پاس ٹوپیاں بے تحاشا ہوتی ہیں (کپڑے کم ٹوپی زیادہ) گول ٹوپی۔ لمبی ٹوپی۔ نوکیلی ٹوپی۔ سادی۔ کڑھی۔ گرم۔ ٹھنڈی۔ ایک ٹوپی سنبھالنا۔ تھامنا۔ بچانا مشکل۔ اتنی ساری رکھنے کا اس کے علاوہ کیا انجام ہو سکتا ہے۔ شرافت میں عافیت اور عاقبت دونوں خطرے میں ــــــ!

ویسے عافیت اور عاقبت کے مسائل یہ سمجھتا بھی کم ہے۔

تعلیم اس چڑھائی پہ کم ہی چڑھ پائی ہے۔ علم کے پاؤں بھی زخمی ہو ہو جاتے تھے۔ ریڈیو ٹی وی اس کمی کو دور کر رہا ہے۔ مگر صدیوں کا خسارہ ہے۔ دو چار سال میں پورا تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔

صاف ہوا کی طرح یہاں سب کچھ صاف ہے۔ دل۔ دماغ۔ ذہن۔ تو دھلے دھلائے اجلے چمکیلے دل والے پہاڑیوں کے یہاں دس بجے ہی بارہ بج جاتے ہیں۔

ہیں بھی تو چڑیوں کی طرح سحر خیز۔ ویسے ہی معصوم۔ ننھے دھڑکتے دل کے۔ سو چڑیا کی چہکار کے ساتھ، شبنم کی پھوہار کے ساتھ۔ کنولوں کے نکھار کے ساتھ اٹھ جاتے ہیں۔ سب کے سب۔ گاؤں کا گاؤں (جو اب شہر بنتا جا رہا ہے) سارے کام میدانی چکر سے پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ سات ساڑھے سات بجے اسکول۔ دس بجے دفتر، عدالت۔ تین بجے تک زندگی کے پہیے کی رفتار میں دھیما پن آنے لگتا ہے اور چار بجے تک سب بند۔ چکا جام ــ لوگ سر جھکائے (کہ پہاڑی راستوں پر چلنے کے لیے سر کو جھکانا ہی پڑتا ہے) لوٹ آتے ہیں۔

مگر زندگی سونی نہیں ہوتی۔ شہر اداس نہیں ہوتا۔ غنودگی کے بعد ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے۔ تر و تازہ، نکھرا سنورا، رنگین، معطر۔ چھ بجتے بجتے سرکیولر بازار حسن و نور کے طوفان سے جھلملا کر جگمگا جاتا ہے۔ نازک بدن۔ اجلی اجلی رنگت، حسین نین نقش، کچھ تیکھے کچھ میٹھے۔ چمکیلے بھڑکیلے۔ رنگ برنگے۔ نئے فیشن، نئی تراش خراش کے کپڑے۔

چوڑی سرکیولر سڑک کی ریلنگ پر۔ ہر نکڑ پر اور بیچ بیچ میں بنے خالی میدانوں میں۔ ہر کیفے اور ریستوران میں۔ خوشبودار پان کھاتے ــــــ سگریٹ کے کش لیتے۔ آئس کریم کھاتے۔ اسمارٹ مہذب نوجوان۔ جدید ترین فیشن سے باخبر۔ بے فکری سے باتیں کرتے۔ اونچے اونچے قہقہے لگاتے جگمگاتی دکانیں، کپڑے، جوتے، ریڈیو، ٹی وی، کاسمیٹکس، اخبار، رسالے، تلی مچھلی، بھنے مرغ، ابلے انڈے، رسیلے پھل مگر شراب کم۔ اس لیے لوگوں کو ڈولتے جھومتے دیکھا ــ لڑکھڑاتے گرتے نہیں۔

نو بجتے بجتے بازار بند، گلیاں اداس شہر سونا، لوگ جانی پہچانی اندھیری تنگ چڑھائیاں چڑھ چڑھ کے جو بقول ان کے انہیں زبانی یاد ہیں، واپس گھروں کو۔

شہر خاموش ہے تاریک نہیں۔ روشنیاں جھلملاتی رہتی ہیں۔ جیسے ہتھیلی پہ ان گنت ستاروں والا آسمان اتر آیا ہو۔

یہاں کے باسیوں کی آوازیں پہاڑ کی طرح گونج کیوں نہیں۔ پہاڑی جھولوں اور دریائے بیاس کو یہ منڈی والے روز ہنستے مسکراتے کھلکھلاتے، شور مچاتے، کلکاریاں مارتے، دیکھتے

سنتے ہیں۔ مگر اس سے ذرا جوائز فتول کریں۔ اچھا ہی ہے کہ یہ سب برسات کے بعد غائب ہونے لگتی ہیں۔ صرف گول گول سفید پتھروں اور خشک چٹانوں کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ شاید عام پہاڑی ندیاں بیاس کے پانی کی طرح بیچ بیچ میں سوکھنا نہیں چاہتا — ہر دم بہتے رہنا چاہتا ہے۔ موجود رہنا چاہتا ہے۔ کم کم ہی سہی۔ بجھا بجھا ہی سہی۔ اس لیے اس کا وجود زیر و بالا رکا بلب ہے۔

نہ تڑک۔ نہ بھڑک۔ نہ پھڑک!

کبھی وہ آپ کے آگے نہیں چلے گا۔ دو قدم پیچھے ہو کر آپ سے آگے چلنے کی التجا کرے گا۔ لاکھ خوشامد کرو — "بھائی"، "ہم انجان"، "بے خبر"، اجنبی۔ اپنے میدانوں کے سپاٹ راستوں پر تو سیدھے اور بغیر بھٹکے چل ہی نہیں پاتے۔ ان راستوں پہ کیا چلیں گے۔ ایک ٹھوکر لگی اور گرے کھڈ میں۔ اس پر وہ بڑے اعتماد سے مسکراتے ہیں کہ ہمیں کھڈ میں گرنے سے بچا بھی لیں گے اور بھٹکنے بھی نہیں دیں گے۔

ہیں نا آسمانی دیوتاؤں کی طرح بھولے اور شریف۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جو دوسروں کو چکمہ دینے کی خاطر اچھے بھلے راستوں کو اندھی گلی بنا کر خود بھی بھٹکتا رہے اور دوسروں کی ٹانگ کھینچنے اور گرانے کے چکر میں خود لڑھکتا رہتا ہے، اسے وہ کھڈ میں گرنے سے کیسے محفوظ رکھے گا؟

مگر شاید رکھ لے کہ یہ واقعی سچ مچ کی قدرتی کھڈ ہیں، انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔

درختوں سے گھرے، جھاڑیوں سے بھرے اس علاقے میں جانور بہت کم نظر آئے۔ نہ آوارہ کتے نہ لاوارث بلیاں نہ اِدھر اُدھر منھ مارتی بکریاں نہ چوراہوں پہ دھرنا دے کر بیٹھی سوکھی مریل گائیں۔ یہ سب تو شہروں کی دین ہیں۔ مہذب علاقوں کی تہذیب و تمدن کی نشانیاں۔ ان کی اہمیت اور ضرورت شہر ہی میں ہے۔ اسی لیے یہاں اندھیرے اُجالے تیزی سے، بے خوفی سے سکون سے، پہاڑی پگڈنڈیاں، کچے راستے طے کر لیتے ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے اُترتے ہیں۔

رینگتے ہوئے سانپ بھی نہیں ملتے۔ وہ بھی آستینوں میں جا بسے۔

ایک اہم انکشاف: ابھی یہاں ٹورسٹس اور جدیدیت کے باوجود ۱۰۰٪ ایمان داری ہے کہ ہم شہریوں کے خواب میں بھی نہیں۔ خیال میں بھی نہیں۔ سنتے ہیں مملکتِ اسلامیہ میں گری پڑی اشیاء کوئی نہیں اُٹھاتا کہ چور کے ہاتھ قلم کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز کھلی پڑی رہتی ہے۔ کوئی ہاتھ نہیں لگاتا اور سب کے سر بھی سلامت ہیں اور ہاتھ بھی۔

ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر اس کا نام منڈی کیوں رکھا گیا۔ آخر ہے کاہے کی منڈی۔ دال منڈی، آٹا منڈی، پھل منڈی، کپڑا منڈی — کوئی چیز بھی تو بازار میں اس افراط سے نظر نہیں آئی۔ کیا انسانوں کی منڈی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی شاید نہیں۔ چھوٹا سا شہر۔ محلے ڈیڑھ محلے کے برابر۔ اس سے زیادہ آبادی تو دلی کے منڈی ہاؤس کی ہے۔ (ٹی وی دفتر کی وجہ سے)

خیر تھوڑی سی سرچ اور ریسرچ سے وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی۔

منڈو نامی رشی، گیانی دھیانی اس ویرانے میں یعنی جب یہ شہر نہیں بسا تھا۔ ایک کٹیا میں عبادت کیا کرتے تھے۔

پھولس کی کٹیا۔ مٹی کا حرم

ویرانہ — عبادت۔ ریاضت۔ سچائی۔ خلوص اور خدا۔

یہ خدا بھی عجیب ہستی ہے۔ ہمیشہ ویرانوں میں ملتا ہے۔ ویرانہ آباد اور وہ غائب۔

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

خدا اسکائی اسکریپرس والے بڑے شہروں میں نہیں — وہاں دوسرے خدا قابض ہیں۔ وہ ہمالیہ کی برفانی چوٹی میں ملتا ہے۔ کوہِ طور پر اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ عجب آدم بیزار ہے۔

پھر پھولس کی کٹیا سے۔ راج محل کی کہانی کوئی انوکھی اور نئی نہیں۔ جنگل کٹے اور عمارتیں تنیں۔ جنگل کاٹنے کا شوق صدیوں اور یگوں پُرانا ہے۔ اور مشقِ ناز آج بھی جاری ہے۔ فطرت تو نہیں بدلی جا سکتی۔

راج محل اب راج محل ہوٹل ہے۔

ہر راج محل کا یہی نیا منظر نامہ ہے۔ نیو ٹیسٹی منٹ — وہ بھوپال ہو یا میسور یا جے پور۔ مگر کسی محل کی سرِ فلک پیشانی پہ ہوٹل کے بجائے یتیم خانے کا لفظ کیوں نہیں لکھا جاتا۔

یتیم خانہ کیسے بنے؟ راج محل ہاتھی ہے مرا ہوا۔ سوا لاکھ کا۔ اور ہاتھی کی ٹریجڈی ہے کہ وہ سوا سو کی بکری نہیں بن سکتا۔

بس اب اس قصباتی شہر کو خدا حافظ کہہ دیں۔ . . . مگر ٹھہرے بینڈ باجا بجنے لگا۔ فی الحال تقریب اس کی خانہ آبادی ہے۔ ہمیں اس بینڈ باجے اور تخریبی تقریب سے دلچسپی نہیں کہ یہ تو ہر گھڑی کا معمول ہے۔ نوکِ قلم کو روکا اور رُخ موڑا۔ پتھر کے سولہ ستونوں والے اس برج نے جو ہے چوکور، مگر دُور سے نظر آتا ہے گول — اور اس کے مقابل سڑک پار ہے ایک لمبا چوڑا رنگین سنگین اسٹیج اور اس پہ بج رہا ہے باجا۔ یہ ایک طرح سے شہر کا چوک چوراہا ہے۔ لال قلعہ ہے۔ وجے چوک ہے۔ بوٹ کلب ہے۔ پرگتی میدان ہے اور زیادہ اونچا گریڈ دینے کا موڈ ہو تو سین اسکوئر کہہ لیجئے۔

راج محل سے لگی ہوئی پگوڈا سی چھت والی بارہ دری یا برج سلامی منچ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ جھنڈا تو بہر طور سال میں دو مرتبہ لہرا کے ملک کو جھنڈے پہ چڑھایا جاتا ہے۔

کبھی یہ درشن جھروکا بھی تھا۔ راجہ منڈی (آگرے والی نہیں) بلکہ مہاراج کمار آف منڈی

(آگے صفحہ پر)

وید راہی

نام موتی، رنگ کالا یعنی کالا موتی۔ عمر چار سال، مگر قد قامت، چال ڈھال ہاؤ بھاؤ دیکھ کر اتنی چھوٹی عمر کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ دور دور تک بچھے ہوئے گھاس کے میدانوں پر وہ یوں دوڑتا جیسے ہوا کے دریا میں کوئی اگنی بوٹ چل رہی ہو۔ یا سنطور میں سے کوئی دُرت لَے کی سرگم پھوٹ رہی ہو، یا کسی کا خیال دل میں آرہا ہو، جارہا ہو۔

میں نے ایک فلم دیکھی تھی "بلیک سٹے لین"۔ ڈوب رہے ایک جہاز میں سے ایک منہ زور گھوڑا اور ایک چھوٹا بچہ زندہ بچ جاتے ہیں۔ بچے کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر وہ کالا گھوڑا تیرتے تیرتے ایک ویران جزیرے میں پہنچ جاتا ہے۔ اُس جزیرے پر کوئی انسان نہیں رہتا۔ پانی سے نکل کر سمندر کے کنارے دوڑتا ہوا وہ "بلیک سٹے لین" قدرت کی لَے کا خوب صورت پیکر نظر آتا ہے۔ یہ کالا موتی مجھے اُسی "بلیک سٹے لین" کی یاد دلاتا تھا۔

میں اپنی فلم شوٹنگ کے لئے اُس کالے موتی کو خاص انتظامات کرکے بمبئی سے کشمیر لے گیا تھا۔ ساتھ ہی دو گھوڑے اور بھی تھے۔

اس میں اور اُن میں اُتنا ہی فرق تھا جتنا کوئل اور کوّے میں ہوتا ہے۔ بمبئی سے جموں تک اِن کے لئے ریل کے خاص ڈبّے بُک کئے گئے تھے۔ جموں سے تین ٹرک ان کو لے کر سرینگر پہنچے۔ وہاں کی سردی سے بچنے کے لئے اِن کی خاطر برانڈی اور انڈوں کا خاص انتظام کیا گیا برانڈی پی کر دوسرے دو گھوڑے مستی میں آگئے تھے۔ مگر موتی نے کوئی بے جا حرکت نہیں کی۔ بہت سیدھا اور سمجھ دار تھا۔ لیکن جب دوڑتا ہوا ڈھونڈتی رہ جاتی تھی۔

سرینگر پہنچتے ہی سب سے پہلے میں اُس جگہ پہنچا جہاں ایک خیمہ کے اندر اُن گھوڑوں کو رکھا گیا تھا۔ اُن کی خیر خبر معلوم کرکے اطمینان ہوا۔ کیوں کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد ہمیں جو شوٹنگ کرنی تھی، اُس میں ان گھوڑوں کا بہت کام تھا۔ خاص طور پر موتی کا۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو اندر ہی اندر اُس کے پٹھے یوں کانپے جیسے ایک سمندر کانپا ہو۔ باہر سے وہ ہلا بھی نہیں۔

دوسرے دن، یعنی شوٹنگ کے پہلے دن کام کا لوکیشن شو پیاں کے اُوپر آہربل آبشار کی طرف تھا۔ گھوڑوں کے تینوں ٹرک سب سے پہلے اُدھر روانہ کرنے پڑے۔ میں جب اُس مقام پر پہنچا تو گھوڑوں کا مالک حاجی تینوں گھوڑوں کو باری باری سے یہاں وہاں دوڑا رہا تھا تاکہ وہ سب اس جگہ کو پہچان لیں۔

پہاڑ کی چوٹی پر وہ ایک خوب صورت میدان تھا۔ دور دور تک سبزے کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف چیل اور دیودار کے گھنے جنگل اُن کے پیچھے اونچے اونچے برف کے ڈھیر۔ ان کے اوپر بھلے مانسوں کی طرح چپ چاپ کھڑے بادل، اور اُن کے اوپر آسمان کی چمکتی ہوئی نیلاہٹیں۔ نیم گرم دھوپ چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ مگر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے شرارتی بچوں کی طرح اُس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اُسے چڑھا رہے تھے اور گھنے جنگلوں میں سیٹیاں بجاتے ہوئے کھیل رہے تھے۔

قدرت کی اُس بے حساب، بے داغ خوبصورتی میں ہمارا فلم یونٹ بڑا ہی بے تکا اور بے ہنگم لگ رہا تھا۔ کاریں، بسیں اور ٹرک ایک طرف کھڑے تھے۔ اُن کے ڈرائیوروں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹے کارکن دو تین اسٹو جلا کر چائے تیار کر رہے تھے۔ ڈریس مین ہیرو اور ہیروئن کے کپڑے اٹھائے کھڑے تھے۔ ہیرو اور ہیروئین اپنا اپنا

بی۔ ۳۵، سروُتم ہاؤسنگ سوسائٹی، ارلا برج اندھیری، بمبئی ۴۰۰۰۵۸

میک اپ ٹھیک کر رہے تھے۔ کیمرے والے اسٹینڈ پر کیمرہ فِٹ کر رہے تھے۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ مائیک صاف کر رہا تھا۔ لائٹ مین لائٹیں، بروٹ اور ری فلیک ٹر کھول رہے تھے اور صاف کر رہے تھے۔ فائیٹ ماسٹر اپنے ڈپلی کیٹوں کے ساتھ بحث بازی میں اُلجھا ہوا تھا۔

جیسے کوئی آدمی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں گھُس جائے، کچھ اُسی طرح کا احساس مجھے اپنے اُس یونٹ کے ساتھ اُس پہاڑ کی چوٹی پر ہو رہا تھا۔

اچانک میری نظر کالے موتی پر پڑی۔ حاجی اُس کے اوپر بیٹھا اُسے دوڑا رہا تھا۔ بہت ہی شان دار قلابازیں بھر رہا تھا وہ "بلیک سٹےلین" قدرت کے اُس نظارے میں بالکل فِٹ بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی ابھی میرے اندر جو احساسِ کمتری پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ ہوا کی موسیقی پر اس کے سُم زمین کو چھُو نہیں رہے تھے، تال دے رہے تھے۔ مجھے لگا وہ زمین اُس کے لئے ہے، آسمان اُس کے لئے ہے، ہَوا اُس کے لئے دھوپ اُس کے لئے ہے۔ دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ قدرت کی اُس سرگم میں ہمارا بھی ایک سُر مل گیا تھا۔ کوئی نیا مِشر راگ اُبھر رہا تھا۔

شوٹنگ شروع ہوئی۔ تینوں گھوڑوں کی ایک ساتھ ریس تھی۔ ایک پر ہیرو، دوسرے پر ہیروئن اور تیسرے پر وِلین نے بیٹھنا تھا۔ پہلے ڈپلی کیٹوں کو گھوڑوں پر بٹھا کر لانگ شاٹ لینے تھے۔ ہیروئن کا ڈپلی کیٹ بھی ایک مرد ہی تھا۔ اُس نے بڑے بڑے بالوں والی وِگ پہنی ہوئی تھی اور ہیروئن جیسے ہی کپڑے پہنے ہوتے تھا۔ کالا رنگ تھا اس لئے منہ پر کافی پوڈر پتا ہوا تھا۔ عجیب سی شکل نظر آ رہی تھی، لیکن لانگ شاٹ میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ موتی پر بیٹھا ہوا تھا۔

ڈپلی کیٹ لوگ بڑے اُستاد ہوتے ہیں۔ جانوروں سے دوستی بنا کر رکھتے ہیں۔ اُس لوکیشن پر اُن کے شاٹ لینے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ موسم بھی ساتھ دے رہا تھا۔ چُستی پھُرتی بھی کم نہیں تھی۔ جہاں جہاں ڈپلی کیٹوں کے لانگ شاٹ لئے گئے تھے۔ ٹھیک وہاں اب اصلی آرٹسٹوں کے کلوز شاٹ لینے ضروری تھے۔ میں نے سوچا پہلے مشکل شاٹ لے لیتے ہیں۔ موتی کو آگے لایا گیا اور ہیروئن کو اس پر بیٹھنے کیلئے کہا گیا۔ وہ ہچکچانے لگی۔ کچھ نخرہ تھا، کچھ اصلیت۔ باتوں باتوں میں اس کا حوصلہ بڑھایا گیا۔ موتی معصوم بچّے کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔ ہیروئن نے اس پر ہاتھ رکھا تو ہلا تک نہیں۔ کان بھی نہیں ہلائے۔ گویا اُسے اپنے فرض کا احساس تھا۔ آخر حاجی نے اپنے ہاتھ پر ہیروئن کا پیر رکھ کر اُسے زِین پر بٹھا دیا۔ کافی دیر تک حاجی نے موتی کی لگام تھامے رکھی۔ پھر دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر چلاتا رہا۔ میرا اشارہ پا کر اُس نے چپکے سے لگام چھوڑ دی۔ ہیروئن اپنے آپ اُسے یہاں وہاں چلاتی رہی۔ شاید اب اُسے مزا آنے لگا تھا۔ لگام اُس کے ہاتھوں میں تھی اور تن کر بیٹھی تھی۔ اچانک اُسے پتہ نہیں کیا سوجھا موتی کی لگام ذرا ڈھیلی چھوڑی اور آہستہ سے اس کے پیٹ پر ایڑ لگا دی۔ میں سوچ رہا تھا اب شاٹ لے لینے چاہئیں۔ کیمرہ مین کو بُلا کر میں اُسے شاٹ سمجھانے لگا۔ اُسی وقت شور سا سُنائی دیا۔ اُدھر دیکھا۔ موتی ہیروئن کو تیزی کے ساتھ میدان کے دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اندر کا سانس اندر باہر کا باہر۔ ہیروئن کی چیخیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ جیسے جیسے موتی اُسے دُور لے جا رہا تھا، میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا میں نے حاجی کی طرف دیکھا وہ بھی منہ کھولے کھڑا تھا۔

میدان کے دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ موتی اُسی طرف دوڑتا دوڑتا اب ایک نقطہ کے برابر ہوتا جا رہا تھا۔ ہیروئن کی چیخیں بھی بڑی دھیمی سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا وہ کالا نقطہ میدان کے دوسرے سِرے سے مُڑ کر واپس آ رہا ہے۔ میری جان میں جان آئی۔ میں آگے بڑھ کر حاجی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا "حاجی تُو دوسرا گھوڑا لے کر جا" میں نے کہا۔ اُس نے ایک ٹک اُسی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ گھبرائیے مت۔ اللہ کارساز ہے۔ وہ ٹھیک ٹھاک یہاں پہنچ جائے گا"

موتی اُسی تیزی سے بھاگتا آ رہا تھا۔ سب اُسی طرح پتھر بنے دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے ہمارے پاس آتا جا رہا تھا، میں اپنی رگوں میں دوبارہ خون کی گردش محسوس کرنے لگا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں موتی ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہیروئن بے ہوش ہو چکی تھی۔ بے ہوشی میں بھی اُس نے مضبوطی سے گھوڑے کے بال پکڑ رکھے تھے۔ نیچے اُتار کر اُسے ہوش میں لایا گیا وہ دوبارہ کسی گھوڑے پر بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ اُسے اس بات کا عِلم نہیں تھا کہ موتی کی وجہ سے ہی اُس کی جان بچ گئی تھی۔ کوئی اور گھوڑا ہوتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔

ہیروئن کو بس کی چھت پر بٹھا کر اُس کے کلوز شاٹ لے لئے گئے۔ اُس کے بعد لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ میں نے فائیٹ ماسٹر سے کہا کہ کھانا کھانے کے فوراً بعد تینوں گھوڑوں کے سمرسالٹ (قلابازی) کے شاٹ لے لیں گے۔ کھانا کھاتے ہی اُس کی تیاری ہونے لگی۔ سب سے مشکل کام یہی تھا۔ پہلے ایک سفید گھوڑے کو تیار کیا گیا۔ ایک ہموار جگہ دیکھ کر وہاں بیس۲۰ بیس میٹر

ائیں بائیں نرم نرم مٹی لاکر بچھا دی گئی۔ پھر س پر سبز گھاس لاکر بچھا دی گئی۔ وہاں سے دئی سو میٹر کی دوری پر ایک کھونٹا گاڑا گیا۔ ُس کے ساتھ پورا سو میٹر لمبا لوہے کا پتلا مگر ضبوط تار باندھا گیا۔ اُس تار کا دوسرا سرا یک خاص ڈھنگ سے گھوڑے کے اگلے پیر سے باندھا گیا۔ ڈپلی کیٹ کو اُس پر بٹھا کر ھونٹے کے پاس سے گھوڑے کو بھگایا گیا۔ اُس ھاس والی جگہ کے پاس پہنچ کر اگلا پاؤں پیچھے لی طرف کھچا۔ اور گھوڑے نے قلابازی کھائی۔ پلی کیٹ اُس سے پہلے ہی چھلانگ مار کر الگ ہو گیا۔ اُدھر گھوڑا گرتے ہی جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھا اجی نے بھاگ کر فوراً اُس کے پاؤں سے بندھا تار کاٹ دیا اور وہ آزادی سے ایک طرف جا کر گھاس کھانے لگا۔ دوسرے سفید گھوڑے نے بھی اسی طرح اپنا کام پورا کیا۔ پھر باری ائی موتی کے سُرخرو ہونے کی۔

سورج اُس وقت مغرب کی ڈھلان پہ پاؤں رکھ چکا تھا۔ ہوا جو تھوڑی دیر پہلے گرم تھی، اب ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ شمال کی طرف بادلوں کے کچھ ٹکڑے اکٹھا ہونے لگے تھے۔ وہ بتدریج پھیل رہے تھے۔ میں کیمرے کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دُور جہاں کھونٹا گڑا ہوا تھا، حاجی وہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ موتی کا اگلا ایک سُم اوپر اُٹھا کر اس میں ایک کڑا ڈالنے اور کڑے میں لوہے کا تار پھنسانے میں لگا ہوا تھا۔ کافی دیر ہوتے دیکھ کر میں اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ موتی مستعد تھا۔ کھنچی ہوئی کمان کے تیر کی طرح۔ مگر کڑے اور تار کے بارے میں اُسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اگر پتہ ہوتا تو بھی اُس نے کہاں ڈرنا تھا فرض سے کوتاہی اُس کی سرشت میں نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس آزمائش سے گذر چکا تھا۔ میں اُس کے مُنہ کے پاس کھڑا اُس کے سانسوں کی آواز سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کے کان ہلے۔ اس کے اندر کی حرارت محسوس کرنے والی چیز تھی۔

لوہے کا تار جیسے ہی بندھا، سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈپلی کیٹ چھلانگ مار کر موتی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ میں بھی دوبارہ کیمرے کے پیچھے آ گیا۔ کیمرے والے، ری فلیکٹروں والے، ساؤنڈ ریکاڈسٹ — ہر شخص اپنی اپنی جگہ ہوشیاری سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے فائیٹ ماسٹر اور کیمرہ مین کو اشارہ کیا۔ حاجی نے ڈپلی کیٹ سے چلنے کے لئے کہا۔ ڈپلی کیٹ نے لگام ڈھیلی چھوڑی اور ایڑ لگائی۔ موتی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اُسے علم نہیں تھا کہ اس کے اگلے پیر میں تار بندھا ہوا ہے — مین اُسی جگہ آ کر تار کھچا۔ ڈپلی کیٹ چھلانگ لگا کر الگ ہو گیا۔ موتی کی پچھلی ٹانگیں اُوپر اُٹھیں۔ وہ اُلٹا ہوا۔ لگا کہ وہ ہوا میں تیر رہا ہے۔ پھر قلابازی کھا کر اُس کی کمر کا پچھلا حصّہ زمین سے لگا۔ ایک زور کی آواز آئی۔ اُس کے پیر سے بندھا ہوا تار ٹوٹ گیا۔ اور اس نے ایک اور قلابازی کھائی ایسا شاندار شاٹ ہوا کہ سوچا بھی نہیں گیا تھا — ڈبل سمرسالٹ ہو گیا۔ جب کیمرہ بند ہوا تو کیمرہ مین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا۔ میں نے بھی "ونڈر فل" کہہ کر اپنی خوشی ظاہر کی۔

اُدھر موتی دوسری قلابازی کے بعد سیدھا ہوا تو سب سے پہلے اُس نے اپنی گردن اُوپر اُٹھائی۔ اُسے ایک دو جھٹکے دئے۔ اور پھر اپنی ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑا ہونے لگا۔ مگر ایکا ایک گر گیا۔ فائیٹ ماسٹر حاجی اور اُس کے ساتھی ادھر بھاگے۔ موتی تڑپ رہا تھا۔ سب اُس کے پیٹھ سہلانے میں لگ گئے۔ اُس کے منہ میں گھاس ڈالی گئی۔ وہ اسے چبانے لگا۔ اُسے اُٹھانے کی پھر کوشش کی گئی۔ سب نے اُسے سہارا دیا۔ زور لگایا۔ اُس نے تڑپتے ہوئے اُٹھنا چاہا مگر نہیں اُٹھ سکا۔ یوں گرا جیسے انجن فیل ہونے سے کوئی ہوائی جہاز نیچے گرتا ہے۔ تب اس کے نیچے رسہ ڈال کر اُسے دوسری کروٹ لایا گیا۔ تب بھی کچھ نہیں ہوا تو دوبارہ پہلے والی کروٹ لے آیا گیا۔ ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لئے اُس پر پانچ سات خالی بورے ڈال دئے گئے۔ پھر حاجی نے اپنے سامان میں سے ایک بڑی سرنج نکالی۔ اُس میں ایک پوری بوتل دوائی کی بھری۔ اور اس کی دائیں ٹانگ کے اوپر والے پٹھے میں انجکشن دیا۔ انجکشن والی جگہ کو اچھی طرح ملا گیا۔ پانچ منٹ بیت گئے۔ اُسے پھر اُٹھانے کی کوشش کی گئی، مگر کچھ نہیں ہوا۔ حاجی بولا "کسی نازک جگہ چوٹ لگی ہے گاؤں قصبے سے ڈاکٹر بلوانا پڑے گا۔" پروڈکشن منیجر کار لے کر گاؤں کی طرف بھاگا۔

میں آہستہ آہستہ وہاں سے دُور ہٹ گیا۔ اس کا تڑپنا مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ دل میں اُداسی بھرتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں ایک جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دُعا کرنے لگا۔ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے۔ لگ رہا تھا کوئی سُر کوئی تال ٹوٹ گیا ہے۔ گویا ہاتھ سے کوئی بہت قیمتی چیز گر کر چُور چُور ہو گئی ہے۔ کوئی اسکول جاتا ہوا بچہ کار کے نیچے آ کر زخمی ہو گیا ہے۔ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا تھا۔ مگر میرے پاس اُس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر چل پھر کر میں پھر وہاں آ کھڑا ہوا۔ جہاں موتی میرے جرم میرے احساسِ جرم سے بے خبر زندگی اور موت کی سرحد پہ لڑائی لڑ رہا تھا۔ حاجی اور اُس کے ساتھی اس کی گردن پیٹ اور ٹانگوں پہ مالش کر رہے تھے۔

ٹانگوں کو لگاتار موڑتے اور سیدھا کرتے جا رہے تھے۔ تاکہ گھٹنوں کے جوڑ سردی سے اکڑ نہ جائیں۔

بوروں کے علاوہ اب اُس کے اوپر ایک موٹا گدّا بھی ڈال دیا گیا تھا۔ اُس کے کان بے حس و حرکت تھے۔ منہ میں پڑے ہوئے گھاس کے تنکوں کو کبھی کبھی چبانے کی کوشش کرتا، مگر وہ چبائے نہیں جا رہے تھے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا روشنی بجھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی نظر وہاں سے ہٹا لی۔

تبھی ڈاکٹر آ پہنچا۔ اُس نے موتی کی آنکھیں بار بار نیچے اوپر کھول کھول کر دیکھیں۔ اُس کے کان ہلائے۔ منہ اور ناک کے اندر معائنہ کیا۔ پھر سٹیتھس کوپ نکال کر دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا ——— پٹھے ہلا ہلا کر دیکھے۔ پیٹ کی پسلیوں کی جانچ کی۔ کولہے ٹٹولے۔ پھر اُس نے ایک سفید دوائی کی شیشیاں نکال کر حاجی کو دیں۔ تاکہ موتی کے جسم پر مالش کی جا سکے۔ موتی کی آنکھوں پر اُس نے پٹیاں بھگو بھگو کر رکھنے کو کہا۔

مالش ہونے لگی۔ آنکھوں پر گیلی پٹیاں بھی رکھی جانے لگیں۔ ڈاکٹر نے ناک کے دونوں طرف کپڑا ڈال ڈال کر صفائی کرنا شروع کی۔ ایک بڑی سرنج اور دوائی کی بڑی بڑی تین چار بوتلیں نکالیں اور موتی کو انجکشن دینے لگا۔ پھر مجھ سے بولا "اگر اسے اُٹھنا ہو گا تو آدھے گھنٹے میں اُٹھ کھڑا ہو گا، ورنہ سمجھئے اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ وہ ہڈی کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ اگر ٹھیک ہو گی بھی تو معمول کی طرح دوڑ نہیں سکے گا۔"

دل اور بھاری ہو گیا۔ شوٹنگ کا دوسرا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ موتی پر دوبارہ بورے اور گدّا ڈال دیا گیا۔ تب تک سرد ہوا کچھ اور سرد ہو چکی تھی، چبھ رہی تھی۔ کافی لوگ گاڑیوں کے اندر دُبک گئے۔ میں بھی کار کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے چائے لا کر دی۔ پہلے تو پینے کو جی نہیں چاہا۔ پھر دھیرے دھیرے پی لی۔

آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کو اُسی طرف جاتے دیکھ میں بھی کار سے باہر نکل آیا۔ موتی اب بے جان ہو چکا تھا۔ اُس کی جیبھ ایک طرف لٹک رہی تھی۔ اُس پر گھاس کے اَن چبائے تنکے چپکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اُس کی ٹانگوں کو اُٹھایا تو وہ ایسے اُٹھیں اور یوں دائیں بائیں مڑیں جیسے ربڑ کی بنی ہوئی ہوں۔ اس کے کولہے پر بڑی بڑی سوئیاں چبھو کر دیکھا گیا۔ وہاں حرکت نہیں ہوئی۔ تب ڈاکٹر نے اعلان کر دیا "یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اندر ہی اندر اسے کافی تکلیف ہو رہی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اِسے ختم کر دینا چاہیے۔"

سب چُپ تھے۔

میرا دل بیٹھ رہا تھا۔

"آپ کے پاس پسٹل تو ہو گا؟" ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"ہے تو۔" میں نے کہا "مگر میں اِسے اپنے ہاتھوں نہیں مار سکتا۔ آپ اِسے زہر کا انجکشن کیوں نہیں دے دیتے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اُس میں کتنی دیر لگے گی؟"

"پانچ سے دس منٹ کے اندر ختم ہو جائے گا۔ اگر کچھ زیادہ مضبوط دل کا ہوا تو پندرہ منٹ لگ سکتے ہیں۔"

موتی کی طرف دیکھنے کی میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اُس دن اور شوٹنگ نہ کرنے کے لئے کہہ کر میں کار میں بیٹھا اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ رات کو فائیٹ ماسٹر نے آ کر بتایا کہ انجکشن لگنے کے پندرہ منٹ بعد موتی کے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ اور ایک گڑھا کھود کر اُسے اُس میں دبا دیا گیا ہے۔

اب پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کے لئے مصیبت بن گئی۔ رات بھر میں کالا گھوڑا کہاں سے آئے؟ اس کے بغیر شوٹنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ سرینگر کے تمام تانگے والوں کے گھر ڈھونڈے گئے۔ ٹنگمرگ جیسے کئی مقامات پر آدمی دوڑائے گئے۔ پر کسی کالے گھوڑے کا اَتا پتا نہیں ملا۔ آخر کسی نے سُراغ دیا کہ ایک کانونٹ اسکول والوں کے پاس بچوں کو گھوڑ سواری سکھلانے کے لئے ایک کالا گھوڑا ہے۔ آدھی رات کو جا کر اُن کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ معلوم ہوا اُس گھوڑے کی عمر تیرہ سال ہے اور وہ بچوں کو بھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر راضی نہیں۔ سب طرف سے مایوسی ہاتھ لگی تو مجھ کو جگا کر صلاح مشورہ شروع ہوا۔ فیصلہ ہوا کہ کل بازار سے جتنی بھی کالے پالش کی ڈبیاں مل سکیں وہ خرید لی جائیں اور ایک سفید گھوڑے کو پالش کر کے کالا کر لیا جائے۔

دوسرے دن پھر اسی جگہ شوٹنگ ہو رہی تھی میدانوں میں سبزہ بچھا ہوا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں ویسے ہی برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ آسمان ویسے ہی نیلا تھا۔ دھوپ اسی طرح چمکیلی تھی، اور ٹھنڈی ہوا ویسے ہی گھنے جنگلوں میں سے سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ پالش کے ساتھ کالا کیا گیا سفید گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ اُس کے پسینے سے پالش گھُل گھُل کر اُتر رہی تھی۔ اور اُس کا اصلی رنگ ——— سفید دھبوں کی طرح اُبھر رہا تھا۔ سارا منظر بڑا ہی بدصورت تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قدرت کی سرگم بے سُری ہوتی جا رہی ہے۔

ایک حسین لینڈ سکیپ پر قطرہ قطرہ سیاہی گرتی جا رہی تھی۔

(طبع زاد ترجمہ از مصنف)

م کتاب: **مصرعِ ثانی** (مجموعۂ کلام)
اعر: شجاع خاور
ت: ۵۰ روپے
نے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شجاع خاور کے اشعار کی پہلی کتاب
اوین' میں غزلوں کے ساتھ کچھ نظمیں بھی تھیں —
لیقی بصیرت اور ہُنرمندی غیر منقسم ہوتی ہے
ر اگر اس کی بنیادیں یک رُخی اور کم زور نہیں
ں تو وہ کسی بھی سطح پر اپنے اظہار میں کام یاب ہو سکتی
ے 'مگر واوین' کو دیکھنے کے بعد میں نے یہ بات
ساختہ طور پر محسوس کی تھی کہ اس مجموعے کے شاعر
مناسبت نظم سے زیادہ غزل سے ہے۔ اس کی
ہ یہ نہیں کہ شجاع خاور غزلیہ شاعری کی روایت
اسیروں میں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ معاملہ اس کے
کس ہے اور ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ
جاع خاور نے غزل کے میدان میں بھی اپنی ایک
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی ہے۔ نہ تو اُن کا
زِ احساس عمومیت شیوہ ہے نہ اُن کا طرزِ
ہار — بہ ظاہر اُن کی شاعری کے عناصرِ غزل
روایت کے مقبول و مطبوع عناصر کی ضد کے طور
اُبھرتے ہیں۔ پڑھنے والے پر ایک نئے ذائقے کا
شاف کرتے ہیں اور اُسے رسمی غزل گوئی کے دائرے
سے ہر آن باہر کھینچ نکالنے کی سعی کرتے ہیں، لیکن
غزل کے مانوس معیاروں سے ایک سوچے سمجھے
انحراف کے باوجود یہی صنف شجاع خاور کے شعری
وجدان اور استعداد سے فطری ربط رکھتی ہے۔ میں
اپنے اس تاثر کا تجزیہ کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ
شجاع خاور کے وجدان کی تختی پر ان کے تجربے تیزی
کے ساتھ اُبھرتے ہیں اور مٹتے جاتے ہیں۔ اُن کی
حسیت تیز رو، اُن کا ادراک ایک شرارے کی
طرح مضطرب اور اُن کا لہجہ گہری فن کارانہ
تربیت اور تعمیر و تزئین کا حاصل ہونے کے باوجود
بے تکلف ہے۔ یہ ساری باتیں غزل کے شاعر کو بہت
راس آتی ہیں۔

ہمارے یہاں بے تکلف شعر کہنے کی روایت
ایک عرصہ سے کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اب چلن
ہے معمولی سے معمولی نکتہ کو اس طرح پیش کرتے
کا کہ اس نکتے پر کسی بہت بڑے رمز کا گمان ہو۔
اس رویّے میں شاعری میں ایک ناگوار تصنّع کو
راہ دی ہے۔ ہر ایک اپنے قد سے اونچا دکھائی
دیتا ہے اور صاف سیدھے لہجے میں بات کرنے سے
کتراتا ہے۔ مجھے اس مجموعے کی جو خوبی سب سے
زیادہ قابلِ قدر نظر آئی، یہی ہے کہ ان اشعار
میں شاعر کسی تصنّع کے بغیر بھی ہمیں متوجّہ کرنے کی
صلاحیت رکھتا ہے۔ تشبیہ، علامت اور استعارے
کے عمل میں اُس کی بصیرت گم نہیں ہوتی۔ چنانچہ
وہ لسانی کرتب بھی دکھاتا ہے تو اس طرح کہ اُس
پر کسی کرتب کا شک نہیں گزرتا۔ اس کے اشعار
ہمارے حواس کے گرد جو ہالہ بناتے ہیں، اُس سے
باہر آنے کے بعد جو احساس ہوتا ہے کہ اس ہالے کے
ساتھ شاعر کے زبان و بیان کا جادو بھی سرگرمِ
طواف تھا۔

شاید اسی لیے اس کتاب کے بہت سے اشعار
جو بظاہر ہلکے پھلکے ہیں، دیر تک ہمارے ساتھ
رہتے ہیں اور اپنی معنویت سے پردہ ایک جست
میں نہیں اُٹھاتے۔ ریشم کی ڈور کی طرح یہ گتھی
دھیرے دھیرے کھلتی ہے اور ہمیں ایک دیرپا
تجربے سے دوچار کرتی ہے۔

شجاع خاور کی شاعری کے اسی پہلو سے
یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ
کی تفریق کو روا نہیں رکھتے۔ کہیں کہیں تو "دل محیط
گریہ و لب آشنائے خندہ" والی کیفیت پیدا
ہو گئی ہے۔ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ آپ اپنی ہنسی
بھی اُڑاتے ہیں۔ اور اس "رسوائی" سے خوف
نہیں کھاتے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اُن کے لہجے
میں اور آواز میں ایک طرح کی دبازت کا پتہ
چلتا ہے۔ اُن کا تجربہ اور احساس بھی کئی پرتوں
کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مجھے ان اشعار کی
اس خوبی نے خاص طور پر متاثر کیا ہے کہ یہاں
شاعر کے اخلاقی ملال یا زندگی کی بعض ناپسندیدہ
حقیقتوں کے تئیں افسردگی اور اضمحلال کا رویّہ
ہر طرح کے دانشورانہ پوز سے عاری ہے۔ درد
کی ٹیسوں کے اُبھرنے کے احساس ہمیں ہوا کے
اُس خوش گوار جھونکے کے گزر جانے کے بعد ہوتا ہے۔
اس کتاب کے کئی شعر ہمارا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔
ان میں سے چند شعر یہ ہیں؛

بات سب ترکِ تعلق کی کیا کرتے ہیں
سوچتا کوئی نہیں ہے کہ یہ ہوگا کیسے

کائنات اور ذات میں کچھ چل رہی ہے آج کل
جب سے اندر شور ہے باہر ہے سناٹا بہت

معروف جو رہتے ہیں اُنہیں کچھ نہیں ملتا
بیکار پھرو گے تو کوئی کام ملے گا

حالانکہ اُس کے بعد ملاقات بھی ہوئی
دل سے تری جُدائی کا منظر نہیں گیا

یہ کیسا وقت مجھ پر آگیا ہے
سفر باقی ہے اور گھر آگیا ہے

تمہارا ذکر تو دو چار دن سے نکلا ہے
مرے دماغ میں ہے انتشار برسوں سے

خموشیوں نے سماعت کو کر دیا بے کار
سکوت چیخ رہا ہو تو کیا سُنائی دے

گھر بھی محفل بھی بستی بھی
تنہائی کے نام بہت ہیں

اندر اندر بے کاری ہے
باہر باہر کام بہت ہیں

کچھ نہیں ہوتا کتابوں پہ کتابیں لکھ دو
اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے

شُکر کی بات ہے کہ اس دورِ کم عیار میں جب لفظوں کی باڑھ سی آئی ہوئی ہو، شجاع خاور نے اگلے وقتوں کا وہ دو لفظوں کے اثر والا نسخہ یاد رکھا ہے۔ (شمیم حنفی)

نام کتاب : کتھا نگر
مصنف : جوگندر پال
قیمت : ۳۶ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

جوگندر پال مجتہد فن کار ہیں۔ ان کا تاریخی ناول "نادید" گزشتہ چند سال کا سب سے اہم اور خوش گوار ادبی واقعہ ہے۔ اُن کے ناولٹ طویل افسانے اور افسانے اُن کے غیر معمولی فکر و فن کے تکبیری اظہار (Macro Expression) تو اُن کے افسانچے درحقیقت تصغیری اظہار (Micro expression) ہیں۔ جوگندر پال کی منفرد نو وجودی فکر اور دل نشین تہہ دار اسلوب کا یہ امتیازی وصف ہے کہ اس کی اثر انگیزی جوگندر پال سے شروع ہو کر جوگندر پال پر ہی ختم ہوتی ہے۔

آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لفظ کی موت ہو گئی ہے۔ لفظ جو کائنات تھا، وہ سمٹ کر نوکر شاہی کا بھونپو بن گیا ہے۔ جوگندر پال نے ادارہ گزیدہ مُردہ لفظ کو حتی الامکان نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے، اُس میں "آدم نو" پیدا کی ہے۔ جس صداقت کو آج تک ہم شاعری میں دیکھتے آئے تھے وہ اچانک جوگندر پال کی نثر میں روشن ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اوّل و آخر ٹھیٹ نثر بھی ہے۔

اردو فکشن میں منٹو کے "سیاہ حاشیے" کے بعد پہلی بار جوگندر پال نے اعلیٰ سنجیدگی سے اس مختصر ترین صنف کو اپنے بہترین تخلیقی لمحات ایک خاص تخلیقی رویّہ اور برتاؤ کے ساتھ نذر کئے ہیں۔ جوگندر پال کے افسانچوں میں مابعد آزادی کی پوری زندگی اور دنیا کے مشاہدات تجربات اور واردات ایک خاص باطنی بصیرت کے ساتھ بے اختیار در آئے ہیں۔ جوگندر پال ظاہر کی آنکھ سے دیکھتے لیکن باطن کے قلم سے لکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہستی (Being) ہی آفاق (Becoming) ہے۔ جوگندر پال کے طویل افسانے ہوں یا افسانچے اُردو افسانہ کی تیسری آنکھ ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانچوں کی بُناوٹ Texture اور بناوٹ ...... (Structure) میں اپنی زندہ اور دھڑکتی ہوئی سوچ کے عنصر کو شامل کیا ہے اور ایک نئی تخلیقی معنویت اور فکری اہمیت بھر دی ہے۔ ان کے طویل افسانوں کے مانند یہ افسانچے بھی بیشتر "داخلی نو حقیقت پسندی" (Interior neo-realism) کے امین ہیں۔

اس مختصر ترین صنف میں بھی جوگندر پال اپنی فطری اپج کے باعث زندگی کی پُرتضاد پیچیدگی میں روحانی سمادھی لگا کر اچھے اور سچے تجربے پر قادر ہیں، جو نتھے سے ناخن پر "حاضرات" دکھانے یا ننھے منے تاج محل تخلیق کرنے کے مترادف ہے۔ اس فنی مینا کاری میں ان کی افسانوی بصیرت سانس لیتی ہے۔ ایک حقیقی فن کار کی شخصیت اور بصیرت میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ صحیح فکری اور فنی تناسب اور توازن کی تلاش میں بہ یک وقت بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہو سکتا ہے۔ افسانوی کرشن لیلا ایسے ہی میں زندہ اور بیدار ہوتی ہے۔ اس کا احساس و عرفان حسبِ توفیق قاری کو "کتھا نگر" کے دو سطری تعارف نامہ سے ہو سکتا ہے۔ جو اُن کی روح کا وزیٹنگ کارڈ ہے۔

"بہ حیثیت ادیب میں اپنی ذات میں بے شناخت ہوں یا میری شناخت کے نقوش کائنات کے سبھی مظاہر ہیں۔ میں جو کچھ "دیکھتا" ہوں، وہی بن جاتا ہوں۔ یہی میری شناخت ہے"

یہ فلاسفی سے کہیں زیادہ فلوزیا (Philosis) ہے جو فکر (Thinking) نہیں دید (Seeing) ہے۔ یہ نچلی سطح پر حافظہ اور خواب و خیال کا بھی پروردگار ہے اور علوی سطح پر صداقت کا کاشف بھی بشرطیکہ فکر سے معرا ہو ــــ کہیں کہیں جوگندر پال کی کہانیوں میں یہ بُعد بھی نمایاں ہوا ہے۔ "کتھا نگر" کے افسانچے اپنی ننھی سی جان میں دونوں جہان کی وسعتیں سمیٹے ہوئے ہیں۔

اُن کا معجز نما ارتکاز متوازن ایما اور ہلیم روشن اخفا قاری کو تخلیقی رفاقتوں اور معنیاتی بلاغتوں کی گہرائیوں میں اُترنے اور سمانے کے حسین اور رفیع مواقع فراہم کرتا ہے۔

"کتھا نگر" موضوعاتی، اسلوبیاتی اور ساختیاتی بوقلمونی کا جاگتا اور جگمگاتا ہوا آئینہ خانہ ہے۔ موضوعاتی سطح پر بھی (۱) انسانی بصیرت (۲) تخلیقی ترسیلیت (۳) نقطۂ نظر کی میکانکیت (۴) لاحاصلی (۵) بیجگی کا المیہ اور (۶) تجرید کے سمندری تلاطم کو مندرجہ ذیل چند افسانوی بلوریں آبگینوں میں مقید اور منور دیکھ کر یک گونہ حیرت ہوتی ہے۔ اوّل بہ یک وقت جمالیاتی مسرت اور اعلیٰ بصیرت بھی نصیب ہوئی ہے) "کتھا نگر" مختلف نوعیت کے موضوعاتی طرفگی کے حامل افسانچوں کا حیرت سرا ہے بشرطیکہ قطرہ میں دجلہ دیکھنے کی بصیرت نصیب ہو۔

..... اندھیری رات تھی اور میں اپنی موٹر گاڑی کو ایک بل کھاتی ہوئی انجانی سڑک پر لیے جا رہا تھا اور مجھے ایک وقت پر صرف وہیں تک نظر آ رہا تھا، جہاں تک ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میرے آگے آگے دوڑتی ہوئی کوئی تین ساڑھے تین سو گز کی روشنی ——— اور یوں میں اندھیرے میں بڑھتا جا رہا تھا ——— اچانک مجھے خیال آیا کہ ہماری زندگی کے سفر میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے.........

(ہیڈ لائٹس)

"ایک بات بتائیے بھگوان! گنگا آپ کے سر سے کیوں پھوٹتی ہے؟"

شیوجی مسکرانے لگے ——— "میرے پیروں کے بھی سر ہوتا تو وہاں سے بھی پھوٹتی۔"

"اور بھگوان! سر سے پھوٹ کر پیروں کی طرف کیوں بہہ جاتی ہے؟"

شیوجی بدستور مسکراتے رہے ———

"نہ بہے تو نیچے بستیاں کیوں کر سیراب ہوں۔"

(ترسیل)

نقطۂ نظر، تلاش، ظروف، تجرید، کچا پن وغیرہ اس سلسلے کی دیگر اچھی مثالیں ہیں۔

محولا بالا افسانچوں کے مانند اس افسانچے میں ذرا تلاش کی بے معنویت اور Philosis خالص دید، درشن یا عرفان کی گہری معنویت ملاحظہ کیجیے جو بگولہ کے مرکز کی طرف اشارہ کناں ہے جس میں ایک عارفانہ سکوت کی سی کیفیت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ آدمی کربِ جستجو کی وجہ سے اس کو مس کرتا ہے اور نفیس حیرانیوں کی گم شدہ فردوس کی بازیافت نہیں کرتا۔ اس افسانچے میں بھی ایک حد تک ایسی محتاط حقیقت پسندانہ سطح کی تکنیک کارفرما ہے، جس میں داخلی تمازت، سوز اور روشنی موجود ہے۔

ان معنی خیز اور بصیرت افروز افسانچوں میں حسیاتی تاثیر، فکری گہرائی اور فنی گیرائی کی وجہ سے افسانوی حسن اور معنویت کے ابدی نشان ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے افسانچوں میں جوگندر پال نے کہیں ساری زمین کا گداز انڈیل دیا ہے کہیں زندگی کے درد و داغ کہیں اپنے دور کے سوز و ساز کو گہرے نشتروں کے ذریعے منکشف کیا ہے۔ اُن میں آج کی رُوح کا ماجرا ہے۔ انسانیت کے کرب، تضادات کی دھوپ چھاؤں، زندگی کی بے معنویت کے ساتھ اس کی معنویت اور عظمت کا انکشاف ہے۔ ان افسانچوں میں جہاں بھی زمین و آسمان ملتے ہیں وہیں حساس اور ہوش مند قاری کو اپنا دل دکھائی دیتا ہے۔ یہ مختصر ترین کہانیاں (جو بذاتِ خود ایک مکمل کہانی نہیں ہوتیں۔ ان میں بہت سی ابتدائی اور اختتامی باتیں اَن کہی ہوتی ہیں) ایک اچھے اور سچے قاری کے وجدان، شعور اور خواب و خیال کی گہرائیوں اور اونچائیوں میں تکمیل پذیر ہوتی ہیں اور قاری اُفق تا اُفق اُن کی خوشبو اور معنویت میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ واقعتاً جوگندر پال کے تخلیقی شعور و وجدان میں آسمان کی روشنی اور زمین کا نمک بیک وقت نہایت متوازن طور پر کارفرما ہے جس کی وجہ سے اُن کی اصغری تحریروں کا یہ "کتھا نگر" بھی اُن کی اکبری تحریروں کا ایک زندہ اور دھڑکتا ہوا حصہ ہے۔ یہ نیو کلاسک کی گہرائی اور عظمت کا حامل ہے۔

(نظام صدیقی)

نام کتاب: مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ
مصنف: ابوالبرکات کربلائی
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ ۱۸

"قطب مشتری" مُلّا وجہی کی معرکۃ الآرا مثنوی ہے جس کا شمار دکنی ادب اور اُردو شاعری کی کلاسیک میں ہے اور برِ صغیر کی یونیورسٹیوں کے خصوصی قدیم شعریات مطالعہ میں شامل ہے۔ یہ ۱۶ ویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، جس میں قطب شاہی دور کی تہذیبی اور معاشرتی جھلکیاں دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر ابوالبرکات نے مُلّا وجہی کی پیدائش، انتقال اور زندگی کے کوائف سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کی پیدائش قطب شاہی درباروں میں ہوئی۔ سرپرستی اور تاریخِ وفات کا تعین بڑے عالمانہ انداز سے کیا گیا ہے۔ مُلّا وجہی پر اس سے پہلے جو کچھ بھی لکھا گیا تھا اس پر انہوں نے خاصی متوازن تحقیقی بحث کر کے حقائق کو چھان بین کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ" کا دوسرا حصہ تنقیدی اعتبار سے بڑی معنویت اور اہمیت کا حامل ہے کہ پہلی بار مصنف نے خاصی تفصیل سے مثنوی قطب مشتری کا فنی جائزہ لیا ہے، اس کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس کے پلاٹ سے بحث کی ہے۔ اس کی کردار نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔

(آگے ملاحظہ ۲۶ پر)

چومکھی

جولائی ۱۹۸۷ء کا شمارہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تین مقالات میں سے ایک تحقیق، دوسرا تنقید اور تیسرا ذاتی تاثرات کا اچھا نمونہ ہے۔ افسانوں میں سلام بن رزاق کا افسانہ دل کو چھو گیا۔ آج کل نہ جانے کتنے شروَن کمار راجہ دسرتھ کے تیر کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر نجات کا یہ راستہ بھی گویا مسدود ہو چکا ہے۔

ستیش بترا کا سفرنامہ حسبِ معمول معلوماتی ہے اور مسرت افزا بھی۔ نریندر لوتھر کے "فٹ نوٹس" نے طبیعت خوش کر دی۔ وہ بڑی معصومیت سے چومکھی لڑتے ہیں۔ محسن جلگانوی اور اظہر عنایتی کی غزلیں اچھی ہیں۔

اعجاز علی ارشد، پٹنہ

شجرہ

"آج کل" جون ۱۹۸۷ء میں عبدالقوی دسنوی صاحب کا مضمون: "زلیخا بیگم کی کہانی" میں موصوف نے لکھا ہے کہ ابوالکلام آزاد کے خسر (آفتاب الدین) کا سلسلۂ نسب صدیق اکبرؓ (ابوبکر صدیقؓ) سے ملتا ہے۔ میں موصوف سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے آفتاب الدین کا سلسلۂ نسب آج سے چودہ صدی پہلے کے صدیق اکبرؓ سے جو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اوّل تھے، کس طرح ملایا ہے۔ وہ اس بات کا حوالہ دیں کہ انہوں نے کس کتاب میں دیکھا ہے اور کس طرح سے ملتا ہے۔ وہ اس کا شجرۂ نسب بیان کریں۔

سہیل احمد انصاری، اعظم گڑھ

تضاد

جون ۱۹۸۷ء کے "آج کل" کے شمارے میں عبدالقوی دسنوی کے مضمون میں زلیخا بیگم کی موت پر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور ڈاکٹر مجمدار کے بیانات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگیں، آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ "اُن" سے کہنا کہ تمہارے ہی نام پر مر رہی ہوں۔ مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا۔ ہاتھ بُری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں۔ "مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"۔ ہچکی آئی۔ اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر مجمدار جو معالج تھے، اُن کا بیان ہے کہ زلیخا بیگم نے دروازے کی طرف دیکھا اور دریافت کیا کہ کیا مولانا صاحب آئے ہیں؟ جب جواب نفی میں ملا تو وہ آنکھیں بند کیے خاموشی کے ساتھ بیٹھی رہیں۔ ملازموں کی امداد کا وعدہ کیا۔ انہوں نے قرآن کی تلاوت کی فرمائش کی۔ تلاوت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جمعہ کی صبح ۶ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔

عبدالرزاق ملیح آبادی کی تحریر کے مطابق زلیخا بیگم مولانا آزاد کو یاد کرتی ہوئی اور اُن کا نام لیتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ ڈاکٹر مجمدار نے بیان دیا ہے کہ زلیخا بیگم کو مولانا کا انتظار تھا، اُن کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

یہ پتہ نہیں چلتا کہ زلیخا بیگم کے انتقال کی صحیح تاریخ کیا ہے:

۹ اپریل یا ۱۹ اپریل وضاحت ہونی چاہیے۔

سیّد علی رضا، بمبئی

علامتی انداز

جولائی ۱۹۸۷ء کے شمارے میں حنیف نقوی کا مقالہ "دیوانِ ناسخ ——" اعلیٰ اور محققانہ ذہن والوں کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ لیکن مجھ جیسے نوخیز ذہن کی گرفت سے یہ بالاتر چیز ہے۔ اسی طرح علی امام نقوی کا افسانہ "تاریل" علامتی انداز کا حامل ہے۔ علامتی طرز میرے لیے ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کا آخری حصہ مجھے سسپنس میں چھوڑ کر سر کے اوپر سے نکل گیا۔ عظیم امروہوی کا مقالہ بڑی کاوش اور سنجیدگی سے لکھا گیا ہے۔ محترم نسیم امروہوی مرحوم کی شخصیت اور فن سے روشناس کرا کے موصوف نے ہم لوگوں پر احسان کیا ہے۔

نند کشور وکرم نے محمد طفیل مرحوم پر مضمون لکھ کر ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلام بن رزاق کا افسانہ اپنی معنویت کے ساتھ نچلے متوسط طبقے میں بسنے والے سیکڑوں شروَن کمار کی زندگی کی عکاسی ہے۔ ستیش بترا کے سفرنامہ سے قاری کو ہمسفری کا گمان ہوتا ہے۔ اظہر عنایتی کے یہ اشعار ہم جیسے سیلابی دنوں کی توجہ اور کچھ کا اس وقت مرکز ہیں: ؎

عجیب سا ہے بہانہ مگر تم آ جانا ہمارے گاؤں کا سیلاب دیکھنے کے لیے
کسی نظر میں تو رہ جائے آخری منظر کوئی تو ہو مجھے غرقاب دیکھنے کے لیے

مرغوب زماں، پورنیہ

اُردو کا مقبول عام مصور ماہ نامہ

آجکل

ایڈیٹر
راج نرائن راز
سب ایڈیٹر:
خورشید اکرم

جلد : ۴۶ | شمارہ : ۴ | نومبر ۱۹۸۷ء
قیمت : دو روپے | فون : ۳۸۷۰۶۹ | کارتک اگرہائن شک سمت ۱۹۰۹

ترتیب

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن : آر۔ ایس۔ مینجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرون ملک : زرِ سالانہ: ۲۰ روپے ۔ دو سال کے لیے : ۳۶ روپے۔ تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

ملاحظات

بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانا

شجر کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے چھٹے پنجسالہ منصوبے میں متعدد اقدامات کیے جا چکے ہیں۔ اور ساتویں پنجسالہ منصوبے میں اُنہیں جاری رکھنے کی تجویز ہے۔ چالو پراجیکٹوں کے ذریعے شجر کاری کی سرگرمی میں کسانوں کی بڑے پیمانے پر شمولیت کے منصوبے میں قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے لیے روزگار ضمانتی پروگرام شامل ہیں۔ عمارتی لکڑی اور ایندھن کی لکڑی کی فصل کاٹنے، چھوٹی جنگلاتی پیداوار اکٹھا کرنے اور اسے بروئے کار لانے کے کاموں میں جنگل کے باشندوں اور سرحدی آبادی کی شمولیت کو بھی منصوبے میں شامل کیا گیا ہے۔ جنگل اُگانا، مٹی کا کٹاؤ سے تحفظ اور اُن کی دیکھ بھال سے متعلق سبھی ترقیاتی سرگرمیوں میں جنگلاتی علاقوں اور جنگلات کی سرحدوں کے دیہی غریب افراد اور قبائلی عوام کو روزگار مہیا کرنا بھی منصوبے میں شامل ہے۔

ریاستوں میں سماجی جنگل بانی کے چالو پراجیکٹوں کے تحت کنارے اور آس پاس واقع زرعی زمینوں پر درخت اُگانے کا طریقہ اپنانے کے سلسلے میں دیہی کسانوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

معیشتِ حیوانات کے ترقیاتی کیمپوں کی تنظیم کا اہتمام کیا جائے گا جس میں نوجوانوں اور طلباء کو شامل کرتے ہوئے ماحولیاتی سرگرمیوں اور مقاصد پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔ حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ وہ پودکاری اور جنگل بانی کی وسیع و جامع کوششوں میں عوام کو شامل کرے گی۔

زمین کے استعمال اور بنجر زمین کو بہتر بنانے سے متعلق قومی کونسل کے ایک جلسہ میں ریاستوں نے بنجر زمینوں کی قطعہ بہ قطعہ نشاندہی کرنے کے سلسلے میں اقدامات کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا، خواہ وہ زمینیں حکومت کے جنگلات اور محصول کے محکموں کی ہوں یا کسی فرد کی ملکیت ہوں۔

عوامی نرسریوں کے ذریعے جنگل بانی کے لیے درکار مزید پودے مہیا کرنے اور اس عظیم کام میں کسانوں، دیہی خواتین اور نوجوانوں کو شامل کرنے پر بھی ریاستی حکومتیں رضامند ہو گئی ہیں۔

ریاستی حکومتوں نے اس بات پر بھی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ شجر کاری کے لیے گاؤں سے باہر کی بنجر زمینوں اور جنگلات کو استعمال کرنے کے سلسلے میں جنگلات پر مبنی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کریں گی۔

توقع کی گئی ہے کہ اس اقدام سے اس صدی کے اختتام تک بنجر زمینوں کے تقریباً ۲۴۰ لاکھ ہیکٹیئر علاقے کو قابلِ کاشت بنانے میں مدد ملے گی۔

زیادہ تر ریاستوں نے شجر کاری کے سلسلے میں غریب اور بے زمین کسانوں کو بنجر زمینیں پٹّہ پر دینے کے لیے "ٹری پٹّہ" (TREE PATTA) اسکیم کا خیر مقدم کیا ہے۔ اُنہوں نے زمینیں پٹّہ پر دیے جانے کے ضابطے کو آسان بنانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ غریب اور بے زمین افراد کی ایک بڑی تعداد بنجر زمینوں پر درختوں کی فصل اُگانے کے کام میں لگ جائے۔ ان کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ ان درختوں کو نقصان پہنچائے بغیر ان سے فائدہ اُٹھائیں۔

حکومت نے ملک میں معیشتِ حیوانات کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ معیشتِ حیوانات کے لحاظ سے کمزور علاقے اور حیوانات سے پُر علاقے، قومی پارکوں، جانوروں کی پناہ گاہوں وغیرہ کے طور پر محفوظ کیے جا رہے ہیں۔ جانوروں اور پودوں کی مختلف اقسام کے تحفظ کے لیے ۵۲ قومی پارک اور جانوروں کی ۲۴۷ پناہ گاہیں قائم کی جا چکی ہیں۔

۸۵-۱۹۸۲ء کے دوران تقریباً ۱۴۷ کروڑ پودے فارم جنگل بانی اور بلاک شجر کاری کے لیے تقسیم کیے گئے۔ سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کے تحت ۱۴ لاکھ ہیکٹیئر زمین میں جنگل بانی کی گئی۔ جنگلات کے تحفظ سے متعلق قانون مجریہ ۱۹۸۰ء کے نفاذ سے غیر جنگلاتی مقاصد کے لیے جنگلاتی زمینوں کو استعمال کرنے کے عمل میں کافی کمی آئی ہے۔ مذکورہ قانون پر عمل درآمد سے غیر جنگلاتی مقاصد کے لیے جنگلاتی زمین کو استعمال کرنے کی شرح ۱.۵ لاکھ ہیکٹیئر سے گھٹ کر اوسطاً ۶۵۰۰ ہیکٹیئر سالانہ ہو گئی۔ مرکز میں ماحولیات کے شعبے نیز ۱۸ ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ماحولیات کے شعبے، منجملہ دیگر چیزوں کے ماحولیاتی نقطۂ نظر سے ترقیاتی پروجیکٹوں کا جائزہ لیتے ہیں اور مضر اثرات کی روک تھام کے لیے ضروری اقدامات تجویز کرتے ہیں۔

جنگلاتی درختوں کا کثرت سے گرنا، گھاس کی بکثرت چرائی، صنعتی و دیگر ترقیات کے لیے جنگلات اور زرخیز زمینوں کا بلا امتیاز استعمال، غیر مناسب زرعی طریقے وغیرہ ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے بنجر زمینیں وجود میں آتی ہیں۔ جس سے بنی نوعِ انسان کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ حکومت اب پروگرام

ٹائیگر اور دیگر اسکیموں کے ذریعے جنگلی جانوروں کی متعدد اقسام جیسے شیر وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے مسلسل کوشش کر رہی ہے۔

سائنسی علم کے مطابق پانی کے جمع ہونے، ہوا سے مٹی کے کٹاؤ، دریا و ندی سے مٹی کے کٹاؤ، کھارے پن، جھوم کاشت کاری، ریت کے ٹیلوں سے اُڑے ذرّات کا زرخیز زمین پر جم جانا جیسے عوامل بنجر زمینوں کے وجود میں آنے کے اہم اسباب ہیں۔ اور یہ سارے عوامل انسانوں کے پیدا کردہ ہیں۔

راجستھان اور اس کی سرحد سے ملنے والی مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کی ریاستوں میں ملک کی سب سے زیادہ بنجر زمینیں واقع ہیں۔ بھارت کے مرکزی اور مغربی حصّے میں مذکورہ تینوں ریاستوں میں سے ہر ایک ریاست میں سرکاری تخمینہ کے مطابق ایک کروڑ ہیکٹیئر سے زائد بنجر زمینیں ہیں۔ کرناٹک، آندھرا پردیش، گجرات اور اُتّر پردیش کی ریاستوں میں سے ہر ایک ریاست میں پچاس لاکھ ہیکٹیئر کے رقبہ پر بنجر زمینیں ہیں۔ اس کے علاوہ کیرالہ، تامل ناڈو، اڑیسہ، بہار، مغربی بنگال، شمال مشرقی اور شمالی ریاستوں میں سے ہر ایک ریاست میں پچاس لاکھ ہیکٹیئر سے کم رقبہ پر بنجر زمینیں پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ مسئلے پر قابو پانے کے لیے آبی وسائل کی وزارت کے زمینی پانی سے متعلق مرکزی بورڈ نے ساتویں منصوبے کے دوران ملک میں ہائیڈرو گراف کے نظام پر مبنی تقریباً ۸۰۰۰ مزید اسٹیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ پانی کے اکھٹا ہونے، زمین کے کھارے پن اور دیگر متعلقہ مسائل پر قابو رکھا جا سکے۔

اس کے علاوہ مذکورہ بورڈ اس وقت بہار، مغربی بنگال اور کسائی اور سبرنا ریکھا ندی کی وادیوں میں ایک پروجیکٹ پر عمل درآمد کر رہا ہے۔ تاکہ زمینی اور زیرِ زمین آبی وسائل کا باہمی استعمال کیا جا سکے۔ جو توقع ہے کہ پانی کے جمع ہونے اور کھارے پن کے مسائل میں کمی لائے گا۔

پانی کا اکھٹا ہونا :

گزشتہ چند برسوں میں مذکورہ بورڈ نے آبپاشی کے بڑے بڑے پراجیکٹوں کے اطراف پانی اکھٹا ہونے کے مسائل اور ان کی کارکردگیوں کے مطالعہ پر کافی توجّہ دی —— اس مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی کہ مذکورہ مسائل پر اب تک خاطر خواہ توجّہ نہیں دی گئی ہے۔

بورڈ نے جنگل بانی کے موجودہ پروگراموں کے تحت یا ان پروگراموں کے علاوہ بھی درخت اُگانے والوں کی کوآپریٹوز کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چھوٹے اور معمولی کسان نیز وہ بے زمین افراد جنہیں زمینیں پٹّہ پر دی گئی ہیں، ان ہی کو آپریٹوز کے رکن بن سکتے ہیں۔ جو ضروری اشیا اور رہنمائی فراہم کریں گی نیز فصل کی کٹائی اور ان کی فروخت کے لیے انتظامات کریں گی۔ درخت اُگانے والوں کی انتہائی کامیاب متعدد کوآپریٹوز گجرات اور مہاراشٹر میں پہلے ہی ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔

بورڈ نے بنجر زمینوں کو بہتر بنانے کے کام میں حصّہ لینے کی غرض سے عوام کو متحرک بنانے میں رضاکار ایجنسیوں کی سرگرم شمولیت کے لیے ایک اسکیم تیار کی ہے۔ ملک کے گھاٹ والے علاقوں میں جنگل بانی کا کام کامیابی کے ساتھ اس صورت میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ اگر ریاستی حکومتیں مہاراشٹر کے ضلع سنگم نیر میں پونا، ناسک، شاہراہ پر کارہے گھاٹ کے علاقے میں گراؤنڈ واٹر سروسیز اینڈ ڈیولپمنٹ ایجنسی کے ڈپٹی ڈائریکٹر شری بی۔ جی دھوکریکر کے ایک تجربہ پر ریاستی حکومتیں عمل درآمد کریں گی۔

مذکورہ تجربہ سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ چٹانی سطح کو بارود سے اُڑا کر اور ڈھلانوں و کھائیوں میں گڑھے بنا کر پہاڑوں کے ڈھلانوں پر بڑی کامیابی کے ساتھ پودے اُگائے جا سکتے ہیں۔ چار چار میٹر کی دوری پر یہ ڈھلانیں اور کھائیاں بارش کے پانی کو جذب کریں گی۔ بصورتِ دیگر یہ پانی بیکار ہو کر نیچے بہہ جائے گا۔ ٹپکتے ہوئے اس پانی سے آبپاشی ہو گی اور صحت مند درخت اُگیں گے۔

(آر۔ کے۔ نائیک)

وفیات

فکر تونسوی کی وفات کا غم ابھی ذرا کم بھی نہ ہوا تھا کہ اردو کے ایک اور صفِ اوّل کے طنز و مزاح نگار احمد جمال پاشا کے انتقال کی غم ناک خبر ملی۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۷ء کو وہ سیوان (جہاں وہ مستقل سکونت پذیر تھے) سے پٹنہ تشریف لے گئے تھے، ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو انہیں دل کا دورہ پڑا اور بقول شخصے ان کا کینہ و کدورت سے پاک دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

احمد جمال پاشا (جن کا اصلی نام آغا محمد نزہت پاشا تھا) اصل میں لکھنؤ کے باشندے تھے اور اپنی مختصر مگر پُر اثر زندگی کے زیادہ تر دن انہوں نے لکھنؤ میں گزارے تھے۔ ادھر دس بارہ برس قبل وہ ترکِ سکونت کر کے سیوان جا بسے تھے۔ لکھنؤ سے کر سیوان (بہار) تک اُن کی زندگی نے کتنی ہی کروٹیں لیں، لیکن ان کا قلم ہمیشہ ننت نئے شگوفے چھوڑتا رہا۔ ہنسنا ہنسانا اُن کی سرشت تھی۔

تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف مرحوم پاشا بڑے خلیق، ایثار پسند اور دردمند دل کے مالک تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ طنز و مزاح کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف تنقید و تحقیق اور شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے تھے۔

احمد جمال پاشا کی موت سے اردو ادب بالخصوص طنز و مزاح کو جو نقصان پہنچا ہے وہ مدّتوں پورا نہ کیا جا سکے گا۔ مرحوم "آج کل" کے دیرینہ کرم فرما تھے۔

ہم دست بہ دعا ہیں کہ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ـزادی اور ترقی کے چالیس برس

ـامیابیاں

کرگھے سے کمپیوٹر تک

اگرچہ کمہار کا چکا صنعت کے میدان میں سب سے پہلی مشین کہا جاتا ہے، لیکن حقیقی معنوں میں مشین کی ایجاد اس وقت ہوئی جب انسان نے سوت کاتنے کے لیے تکلا اور کپڑا بننے کے لیے کرگھا ایجاد کیا۔ ان دو ایجادات کے لحاظ سے ہندوستان بھی دنیا کے دیگر ممالک سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ ہندوستان کے ظروف ساز اور بنکر اپنی مصنوعات کے لحاظ سے دنیا کی منڈیوں پر چھائے رہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہماری برآمدات کا انحصار کرگھے پر ہی تھا، جسے دیہی معیشت کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد غیر ملکی حکمرانوں اور تاجروں نے ہندوستان کی منڈیاں اپنے ارزاں مشینی مال سے بھر دیں اور ہندوستانی دستکاروں کی ہر طرح حوصلہ شکنی کی۔ جس سے ہندوستان کی صنعت کے مختلف زمرے جنہیں دستکاریوں کا نام دیا جاتا تھا، دم توڑ گئے۔ عوام کے روزگار کے وسیلوں کو زبردست دھکا لگا اور دیہی معیشت کی بنیادیں ہل گئیں خوشحالی ختم ہو گئی۔

اگر غیر ملکی حکمرانوں اور اُن کے اشتراک سے ہندوستان کے بڑے بڑے تاجروں، راجواڑوں اور صنعت کاروں نے مُلک کے مختلف حصوں، خاص طور پر بڑے بڑے شہروں میں جہاں بجلی اور توانائی کے دیگر ذرائع حاصل تھے مشینیں اور کارخانے لگائے بھی تو وہ ہندوستان کے خام مال اور کم قیمت محنت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تھے۔ کپڑے پٹ سن، سیمنٹ، لوہے، غذائی مصنوعات اور خوردنی تیلوں جیسی یہ صنعتیں دیہات کی خوشحالی واپس نہیں لا سکیں۔ بلکہ دیہات کے بے کار لوگ بھاگ کر شہروں میں آنے لگے، جس سے شہروں کی آبادی، گندی بستیوں کی تعداد اور آبادی کی مشکلات میں دھڑا دھڑ اضافہ ہونے لگا۔ دیہات کی خوشحالی پر مبنی ہندوستان کا صنعتی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے آزادی کے بعد ملک میں منصوبہ بند ترقی کا پروگرام مرتب کیا گیا جس میں ایک طرف یہ دھیان رکھا گیا کہ جدید دور کی ترقی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ملک میں بنیادی اور بھاری سازوسامان کی ساخت کے لیے بڑی بڑی صنعتیں قائم کی جائیں وہاں دیہات اور قصبات کے عوام کی روزگار اور روٹی کپڑے کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر بھی اتنی ہی توجہ دی جائے۔

چنانچہ ہمارے منصوبہ سازوں نے مصنوعات کے بڑے بڑے زمرے بھاری اور بنیادی صنعتوں کے لیے مخصوص کر دیے جہاں سے دیگر صنعتوں کو خام مال اور توانائی حاصل ہو سکے۔ وہاں بہت سی مصنوعات کی تیاری دیہی اور چھوٹے پیمانے کے لیے وقف کر دی گئی۔ جہاں بڑی صنعتوں کے لیے گزشتہ چھ پانچ سالہ منصوبوں میں خاص طور پر سرکاری دائرہ کار میں ہزاروں ارب روپے کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ وہاں ملک کی صنعتی پالیسیوں کے تحت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں سرمایہ کاری اور امداد کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے تاکہ دیہی معیشت میں پھر سے خوشحالی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

بڑی صنعتیں:

خود کفالت ہندوستان کی صنعتی پالیسی کا بنیادی پتھر کہی جا سکتی ہے۔ اس پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صنعت کے ہر میدان میں روایتی معیشت کو صنعتی معیشت میں تبدیل کرنے کی پُر زور کوششیں کی گئی ہیں، جن کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملک جو آزادی سے قبل کرگھے کی سوئیاں تک انگلستان سے درآمد کرتا تھا۔ آج تیل کی کھُدائی کے برموں سے لے کر کمپیوٹروں اور سمندری جہازوں سے لے کر جدید قسم کے مصنوعی سیاروں تک کی ساخت میں خود کفیل ہو چکا ہے — بے شک ہندوستان کا شمار ابھی صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں نہیں ہوتا لیکن ترقی پذیر دنیا میں صنعتی لحاظ سے وہ سب سے آگے ہے۔

منصوبہ بند ترقی کے پہلے ۳۵ برسوں میں صنعتی لحاظ سے ہم نے مجموعی طور پر ۳٫۵ فی صد سالانہ کی رفتار سے ترقی کی جو حالیہ برسوں میں بڑھ کر ۵ فی صد ہو گئی ہے۔ اس مدت میں سرمائے کی تشکیل

ا تناسب دس فی صد سے بڑھ کر ۱۳ فی صد ہو گیا ہے۔
بمیائی کھادوں کی کھپت ٦ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۸۰ لاکھ
ن ہو گئی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر غلے کی پیداوار
ساڑھے پانچ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ ٹن ہو گئی۔
بجلی کی پیداوار پانچ اعشاریہ تین ارب کلو واٹ گھنٹے
سے بڑھ کر ۱۷۰ ارب کلو واٹ گھنٹے ہو گئی۔ فولادی
بلوں کی پیداوار ۱۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ
۱ لاکھ ٹن ہو گئی۔ منظم سیکٹر میں روزگار پانے والوں
ی تعداد ایک کروڑ ۲۰ لاکھ افراد سے بڑھ کر دو کروڑ
۴ لاکھ ہو گئی — چھٹے منصوبے میں صنعتی ترقی کے
ناسب کا نشانہ ۷ فی صد مقرر کیا گیا، جو حاصل
۔ نہیں ہو سکا، لیکن اس منصوبے میں صنعتی ڈھانچے
ا بنیاد اتنی مضبوط ہو گئی کہ ساتویں منصوبے میں
رقی کے تناسب کا نشانہ ۸ فی صد مقرر کیا گیا۔

منظم صنعتوں اور معدنیاتی سیکٹر میں مختلف
منصوبوں میں سرمایہ کاری میں بھی بتدریج اضافہ
یا جا رہا ہے، جہاں پہلے منصوبے میں یہ سرمایہ صرف
۵ کروڑ روپے تھا۔ وہاں تیسرے منصوبے
ے سرمایہ کاری کا نشانہ ۱۵۱۰ کروڑ روپے ہو چکا
ھا۔ اور چھٹے منصوبے کے لیے ۲۷٦٦۷ کروڑ روپے
ـ پہنچ گیا تھا۔ ساتویں منصوبے میں ایک اور
ی چھلانگ لگائی گئی ہے۔ اور بڑی صنعتوں کی
قی کے لیے ۲۹۷۳٦ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے
ں۔ معیشت کی تیز رفتار ترقی میں معاون سہولیات
، بجلی، ٹرانسپورٹ، بھاری انجنیئرنگ سامان کی
منعتیں، فولاد، کیمیاوی کھاد، صنعتی کیمیکلز، مفرد
دویات اور مصنوعی ریشے بنانے والی صنعتیں شامل
ں۔ چنانچہ ۵۱-۱۹۵۰ سے ۸۵-۱۹۸۴ء تک
کوئلے کی پیداوار ۳ کروڑ ۲۸ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۵
کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن، فولاد کی پیداوار ۱۹ لاکھ ٹن سے بڑھ
۸۷ لاکھ ٹن ایلومنیم کی پیداوار ۴ ہزار ٹن سے بڑھ
۲ لاکھ ٦۷ ہزار ٹن، سیمنٹ کی پیداوار ۲۷ لاکھ ٹن
بڑھ کر تین کروڑ ٹن کپڑے کی پیداوار ٦ ارب
کروڑ میٹر سے بڑھ کر ۱۱ ارب ۹۵ کروڑ میٹر اور

چینی کی پیداوار ۱۱ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ٦۱ لاکھ ٹن ہو گئی۔
اسی مدت میں سیمنٹ اور کاغذ بنانے کے کارخانے
کے لیے درکار مشینیں بنانے کے کارخانے بھی لگائے
گئے۔

چھٹے منصوبے میں ترقی کی مطلوبہ شرح تناسب
حاصل نہیں ہو سکی۔ اس لیے انجنیئرنگ کی بعض صنعتوں
میں ٹیکنالوجی کی ترقی کی اہمیت پر زور دیا گیا —
مشینی آلات، کنزیومر الیکٹرانکس اور مواصلاتی
ساز و سامان سے متعلق متعدد صنعتوں کے نشانے
حاصل کر لیے گئے۔

ساتویں منصوبے میں نہ صرف صنعتی ترقی کی رفتار
تیز کرنے کی ضرورت بلکہ ایسی اہم تبدیلیاں لانے
کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے جن سے پیداواریت
میں اضافہ ہو سکے۔ اور ایسا لچک دار صنعتی ڈھانچہ
تشکیل دیا جا سکے۔ جو دنیا میں ہو رہی تبدیلیوں کے
ساتھ قدم ملا کر چل سکے۔ ملک کے لیے جو نئی صنعتی
پالیسی بنائی گئی ہے اس کا مقصد ٹیکنالوجی اور انتظامیہ
کا درجہ بلند کرنا، کفایت شعاری کرنا، زیادہ اہم
مصنوعات کی تیاری اور برآمدات میں اضافہ کرنا ہے۔
اس پالیسی میں پبلک سیکٹر کو محرک کا کردار سونپا گیا ہے۔
اور چھوٹی و نجی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔
اس پالیسی کا مقصد جہاں کیمیاوی کھاد پلاسٹک کی
مصنوعات، الیکٹرانکس، ٹیلی مواصلات کے ساز و
سامان کی صنعتوں کی تجدید سے اُن کی پیداوار میں
اضافہ کرنا ہے — وہاں عوام کی کھپت کے لیے
درکار اشیا کی پیداوار میں بھی اضافہ کرنا ہے۔
اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ
صنعتی اور اقتصادی ترقی کا عمل سائنس اور ٹیکنالوجی
کے عمل سے وابستہ ہے۔ چنانچہ ہر منصوبے میں سائنس
اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر پہلے سے کہیں زیادہ زور
دیا جا رہا ہے۔ آزادی سے قبل جو صنعتیں ہمارے
یہاں قائم تھیں وہ خوراک اور کپڑے جیسے روائتی
شعبوں تک محدود تھیں۔ اب ملک کی مجموعی پیداوار
میں روائتی شعبے کا حصہ کم ہو گیا ہے اور کیمیکلز اور

انجنیئرنگ کی صنعتوں پر مبنی صنعتوں کے حصے میں اضافہ
ہو گیا ہے۔

۸۵-۱۹۸۴ء میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر
اخراجات مجموعی قومی آمدنی کے ایک فی صد کے برابر تھے۔
جو ۵۹-۱۹۵۸ء کی نسبت پانچ گنا تھے۔ لیکن عالمی
اوسط کے مقابلے میں جو تین فی صد ہے یہ اخراجات اب
بھی بہت کم ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں متعدد صنعتوں میں
جدید تحقیق و ترقی کے ادارے قائم کیے گئے ہیں، جہاں
ہزاروں سائنس دان تحقیق کے عمل میں ہی مصروف
نہیں بلکہ تربیت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی تحقیق
کے نتائج کے اطلاق سے ملک کی بھاری صنعتوں کی
پیداوار میں ہی اضافہ نہیں ہو رہا بلکہ ملک بہت
سی بڑی بڑی مشینوں، مشینی آلات، سامان حرب
اور خام مال کی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل
ہو گیا ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اور دیہی ترقی :

آبادی میں اضافہ، شہروں کی طرف نقل مکانی
اور بھیڑ بھاڑ دنیا کے ہر ملک کی معیشت کی جہاں
ترقی کا عمل جاری ہے، ایک خصوصیت رہی ہے۔ اس
لیے یہ مسئلہ صرف ہندوستان کو ہی درپیش نہیں ہے۔
اس لیے ماہرین اقتصادیات اور منصوبہ سازوں کا
یہ خیال درست ہے کہ ان مسائل کا علاج صرف یہی
ہے کہ دیہات کے عوام کے لیے دیہات میں ہی روزگار
مہیا کیا جائے۔ اس لیے اگر سماجی و اقتصادی زاویہ
نگاہ سے دیکھا جائے تو چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا کردار
بہت اہم ہے۔

چنانچہ آزادی کے بعد چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی
اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے ان کی تیز تر
ترقی کے لیے ٹھوس بنیاد رکھی گئی۔ جدید ہندوستان
کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو نے اس امر کا واضح
تصور کرتے ہوئے کہا تھا۔ دیہی اور چھوٹے پیمانے کی
صنعتوں کی ہندوستان میں خصوصی اہمیت ہے۔ اگر ہمارے

پاس سرمائے کی کمی ہے تو افرادی قوت کی تو کمی نہیں۔ اور ہمیں ملک کی اس دولت کو بے روزگاری کم کرنے کے لیے کام میں لانا چاہیئے۔ تاہم یہ ضروری ہے۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں جدید ٹیکنیک کا استعمال کریں اور ان صنعتوں کا بڑی صنعتوں سے قریبی تال میل ہو۔ ۱۹۴۸ اور ۱۹۵۶ کی صنعتی قرار داد میں چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کی سماجی اور اقتصادی صلاحیت پر زور دیا گیا تاکہ روزگار کا فوری مسئلہ حل کیا جاسکے۔ قومی آمدنی کی منصفانہ تقسیم ہو اور صنعتی سرگرمیاں ملک بھر میں پھیلائی جاسکیں۔

ترقی :

صنعتی پالیسی کی منظوری اور اس پر عمل کے فوراً بعد اس شعبے میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں ملک میں چھوٹی صنعتوں کی تعداد ۳۵،۲۸ تھی جو ۱۹۶۹ء میں بڑھ کر ۸۰،۰۰۰ ہو گئی۔ چھٹے منصوبے کے دوران تو چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں بے حساب ترقی ہوئی۔ ان پانچ برسوں میں ان صنعتوں کی تعداد ۸ لاکھ ۴۰ ہزار سے بڑھ کر ۱۳ لاکھ ۵۳ ہزار ہو گئی اور ان کے مال کی پیداوار ۲۸۰۶۰ کروڑ سے بڑھ کر ۶۱۱۰۰ کروڑ روپے ہو گئی۔ روزگار پانے والوں کی تعداد ۷۱ لاکھ سے بڑھ کر ۹۱ لاکھ ہو گئی۔ اور برآمدات اضافے کے بعد ۲۵۴۴ کروڑ روپے ہو گئیں۔

ملک کی مجموعی پیداوار کا ۳۵ فی صد حصہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے حاصل ہوتا ہے جو زیادہ تر چھوٹے قصبوں اور دیہات میں لگائی گئی ہیں۔ ان صنعتوں سے دیہات کے عوام کو روزگار اور جزوی روزگار کے بھی بے حساب مواقع حاصل ہو رہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے بڑی صنعتوں کی نسبت تیز تر ترقی کی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا شعبہ دائرہ از پانچ ہزار اقسام کی مصنوعات تیار کر رہا ہے اور ملک کے کھپت کاروں کی بہت سی ضروریات پوری کر کے بیش قیمت زرِ مبادلہ کی بچت میں اہم حصہ ادا کر رہا ہے۔

اب ملک میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کے شعبے میں جدید ترین ٹیکنیک کام میں لائی جا رہی ہے۔ اور یہ شعبہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کو درکار نہایت پیچیدہ قسم کے آلات اور حصے پرزے تیار کر کے فراہم کر رہا ہے۔ برآمدات کے شعبے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی کارکردگی بھی ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ ملک سے برآمد ہونے والے ۹۰ فی صد سلے سلائے کپڑے، ۸۰ فی صد اونی کپڑے، ۴۷ فی صد چمڑے کا سامان اور ۳۱ فی صد انجنیئرنگ کا سامان چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ہی تیار کرتی ہیں۔ جن کی روزگار مہیا کرنے کی صلاحیت نے ہماری دیہی معیشت میں ایک انقلابی تبدیلی لانی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ حکومت کی مختلف سکیموں کے تحت دیہات میں کام کرنے والی چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کو کوآپریٹو بنیادوں پر منظم کیا جا رہا ہے۔ انہیں درکار ضروری سرمایہ اور تکنیکی رہنمائی مہیا کی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی اُن کی پیداوار کی فروخت کا بھی اہتمام کیا جا رہا ہے۔ شہروں سے دیہات میں جا کر چھوٹی صنعتیں لگانے والوں کو خصوصی مراعات بھی دی جا رہی ہیں۔ جن پر محاصل پر چھوٹ اور ادارہ جاتی کم شرح سود پر قرضے بھی شامل ہیں۔

ایک ترقی پذیر معاشرے میں سرمائے کی قلّت کے باوجود روزگار کے نئے مواقع مہیا کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر چھوٹے پیمانے کی صنعت پر ایک روپے کے خرچ سے ایک شخص کے لیے روزگار فراہم کیا جاسکتا ہے تو بڑی صنعت میں اُسی کام پر آٹھ روپے خرچ آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیہات کے ماحول کو جہاں بنیادی سہولیات بڑے پیمانے پر دستیاب نہیں ہیں۔ خاص طور پر اپنے لیے خود روزگار پیدا کرنے والے افراد کے لیے بہتر طور پر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ چھٹے منصوبے میں اضلاعی صنعتی مراکز کے پروگرام کے تحت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور کاریگروں کی امدادی اسکیموں کے ذریعے جو روزگار پیدا کیا گیا۔ اس کا ۶۵ فی صد حصہ ایسے دیہات یا قصبوں میں تھا۔ جن کی آبادی ۲۵ ہزار سے کم تھی۔ چھوٹے پیمانے کے صنعت کاروں اور دستکاروں اور ہنرمندوں کو کام کے انتخاب سے لے کر مال کی فروخت تک ہر قسم کی مدد دینے کا ایک جامع نظام ملک بھر میں قائم کیا جا چکا ہے جسے دنیا میں بہترین کہا جاسکتا ہے۔ خصوصی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ جو خام مال، سستی شرح سود پر قرض، خرید یا اُدھار پر مشینیں، تکنیکی مشورے اور معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ہندوستان اس شعبے میں جو مہارت حاصل کر چکا ہے اس سے دوسرے ترقی پذیر ممالک بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

جدید کاری :

جدید کاری کا عمل دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ کیوں کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا بڑے پیمانے کی صنعتوں سے مقابلہ بڑھ گیا ہے۔ جن کے پاس سرمائے اور نئی ٹیکنالوجی کی کمی نہیں، اس مقابلے میں پورا اُترنے کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بھی اپنی ٹیکنالوجی بہتر بنانے، اہلیت کار اور پیداواریت میں اضافہ کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ چنانچہ مُلک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقیاتی تنظیم کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ یہ تنظیم اب ٹول روم ترقیاتی مراکز، علاقائی آزمائشی مراکز، موقع پر جا کر مال کی جانچ پرکھ کرنے کے سٹیشن اور پیچیدہ صنعتوں کی تجدید کا اہتمام کر رہی ہے۔

یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے مال کی برآمد کو ابھی بہت بڑھایا جاسکتا ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ صرف وہی مال برآمد نہ کیا جائے جو انسانی محنت سے تیار ہوتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے تیار ہونے والے مال کی برآمد پر زور دیا جائے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقیاتی تنظیم نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے کچھ اور شعبے بھی تجویز کیے ہیں۔ ان میں الیکٹرانکس کے سامان کی تیاری ـــــ

(آگے صفحہ ۳۷ پر)

کاظم علی خاں

مؤثّراتِ کلامِ شرف

آغا حجو شرف کی ادبی زندگی کی مدت تقریباً ۱۲۶۱ھ سے ۱۳۰۰ھ تک کم و بیش چالیس برس کے عرصے کو ضرور محیط رہی ہے جیسا کہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا تالیف ۶۲ - ۱۲۶۱ھ نیز گلدستۂ نتیجۂ سخن کلکتہ شمارہ جنوری ۱۸۸۳ء مطابق ربیع الاول ۱۳۰۰ھ میں کلام شرف کی شمولیت سے ظاہر ہوتا ہے[1]۔ شرف اپنی اس ادبی زندگی میں جن شاعروں سے متاثر ہوئے ہوں گے ان کی صحیح تعداد بتانا یا ان کی کوئی جامع فہرست بنانا آسان نہیں۔ کلام شرف میں مجھے کہیں کہیں ان کے بعض معاصرین کے اثرات ملتے ہیں۔ شرف نے کہیں تو ان معاصرین کے مضامین سے اپنے نگارخانۂ شعر و سخن میں رنگ و روغن بھرا ہے اور کہیں ان کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ شرف کے اس طرزِ عمل کو ہم نہ توارد کہیں گے اور نہ سرقہ! یہ چراغ سے چراغ روشن کرنے کی روایت ہے جس کی پیروی میر، غالب اور اقبال جیسے صفِ اول کے شاعروں نے بھی کی ہے۔ کلام شرف میں ان کے جن معاصرین کے اثرات ملتے ہیں ان میں فقیر محمد خاں گویا، منوّر خاں غافل ہوس لکھنوی، خواجہ حیدر علی آتش، رند لکھنوی، میر صبا لکھنوی اور غالب کے نام شامل ہیں۔

شرف، گویا اور غافل

فقیر محمد خاں گویا (متوفی ۱۲۶۸ھ) بلند خاں کے فرزند، ناسخ کے شاگرد اور شرف کے بزرگ معاصرین میں تھے۔ گویا، ناسخ کے شاگرد ہونے کے باوجود اپنے استاد کے حریف آتش کی قدر کرتے تھے[2]۔ شرف نے اپنے استاد آتش کے قدرداں گویا کی ایک غزل کی زمین میں جو غزل کہی اس میں یہ شعر بھی شامل ہے: ؎

بے نیازی پہ انھیں ناز مرے دم تک تھا
لن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد

(دیوان شرف طبع اول ص ۱۰۶)

شرف کا یہ شعر گویا کے درج ذیل شعر کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے: ؎

منھ دکھانا تو کہاں، باتیں تھیں اس کی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

گویا و شرف کی ان ہم زمین غزلوں کے بعض ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں مجھے باہمی مماثلت محسوس ہوتی ہے:

گویا: ؎ کتنے دن یار نے شانہ نہ کیا میرے بعد
کیا پریشان رہی زلفِ دوتا میرے بعد

شرف: ؎ اس قدر اس کو ہوا رنج مرے مرنے کا
رہ گئی غم سے دوتا، زلفِ دوتا میرے بعد

گویا: ؎ نہ رہی بعد مرے نامہ و پیغام کی رسم
خاک اڑاتی پھری گلیوں میں صبا میرے بعد

شرف: ؎ قدرداں مجھ سا نہ پائے گی جو بوئے گُل کا
سر کو گلزار میں پٹکے گی صبا میرے بعد

گویا: ؎ ولولہ جوشِ جنوں کا تھا مجھ ہی تک گویا
نظر آیا نہ کوئی آبلہ پا میرے بعد

شرف: ؎ منزلوں خون سے سیراب کیا کانٹوں کو
مجھ سا کیا ہوگا کوئی آبلہ پا میرے بعد

(دیکھیے: (۱) گویا صاحب سیف و قلم ص ص ۱۱۱ تا ۲۱۲ (۲) دیوان شرف۔ مطبع جعفری لکھنؤ مطبوعہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء ص ص ۱۰۶-۱۰۷)

مجھے اسی زمین میں متعدد اور شاعروں کی غزلیں بھی ملی ہیں جن میں منوّر خاں غافل، خواجہ آتش (استاد شرف) شاگرد مصحفی مرزا محمد تقی خاں ہوس لکھنوی نواب سید محمد خاں رند لکھنوی (شاگرد آتش) شیخ امداد علی بحر لکھنوی (شاگرد ناسخ)

● ۲۰۱۔ وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

لطافت لکھنوی اور فصاحت لکھنوی کے نام شامل ہیں۔

منوّر علی خاں غافلؔ صلابت خاں یوسف زئی کے فرزند، مصحفی کے صاحب دیوان شاگرد، احاطہ مُعتبر محمد خاں لکھنؤ کے باشندے اور نواب فقیر محمد خاں گویاؔ کے مُعتمدوں میں تھے۔ غافلؔ کے بیٹے جمّو خاں مطبع نول کشور میں نوکر تھے۔ انھیں کی تحریک سے غافلؔ کا دیوان نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا۔[٤] غافلؔ کے فرزند تو شاعر نہ تھے لیکن ان کے پوتے عبداللہ خاں عظمتؔ اور امجد علی خاں واجدؔ شاعر تھے۔ غافلؔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کی تکمیل ۱۲۶۳ھ ۴۷-۱۸۴۶ء سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے۔[٥] شرفؔ و گویاؔ کی محولۂ بالا زمین میں منور علی خاں غافلؔ کی غزل کے بعض منتخب اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

(۱) آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

(۲) منہ پہ لے دامنِ گل، روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

(۳) چاک اسی غم سے گریبان کیا ہے میں نے
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد

(۴) اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن
خوں رُلائے گا اسے رنگِ حنا میرے بعد

(۵) وہ ہوا خواہِ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں آتا ہوں اور بادِ صبا میرے بعد

(۶) شرطِ یاری یہی ہوتی ہے کہ تو نے غافلؔ
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا میرے بعد

منوّر علی خاں غافلؔ کی یہ غزل اٹھارہ اشعار کی حامل ہے اور یہ دیوانِ غافلؔ (ص ص ۲۵ تا ۲۶) میں شامل ہے مگر امانتؔ لکھنوی نے غافلؔ کی اس غزل کے منقولۂ بالا ابتدائی پانچ اشعار کو میر تقی میرؔ سے منسوب کر کے اس پر آٹھ بند کا مخمّس کہا ہے۔[٦] امانت کے آٹھ بند کے مخمّس میں غافلؔ کے پانچ اشعار معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ شامل ہیں اور تین اشعار جو دیوانِ غافلؔ میں موجود نہیں وہ بقول آلِ احمد سرورؔ ہوسؔ وغیرہ کا کلام ہیں۔ امانت نے اپنے مخمّس کے آٹھوں اشعار کو میر تقی میر کا کلام قرار دیا ہے مگر کلیاتِ میر دیکھنے پر انکشاف ہوا کہ امانت نے جس غزل کو میر کا کلام بتایا ہے وہ میرؔ کے کلیات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔[٧] شرفؔ، گویاؔ و غافلؔ کی غزل کی زمین میں مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ لکھنوی (تلمیذ مصحفیؔ) کی محولۂ بالا غزل کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں: ؎

(۱) تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

(۲) کیا عجب مدفنِ لیلےٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد

(۳) جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

(۴) اٹھ گیا میں جو جہانِ گزراں سے تو ہوسؔ
خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد

مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ لکھنوی (متولد ۱۱۸۰ھ / ۱۸۰۶ء و متوفی ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء) کی یہ غزل انتخابِ کلامِ ہوسؔ، مرتبہ سید سلیمان حسین۔ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۳ء ص ۴۲ میں موجود ہے اور اس کے منقولۂ بالا پہلے اور دوسرے شعر کو امانتؔ نے اپنے مخمّس میں معمولی اختلاف کے ساتھ میرؔ کے کلام کے طور پر شامل کیا ہے۔ اس طرح امانت لکھنوی کے مخمّس کے ابتدائی پانچ بند تو غافلؔ کے اشعار پر مبنی ہیں، نیز چھٹے اور ساتویں بند میں ہوسؔ کے محولۂ بالا دو اشعار شامل ہیں۔ آٹھویں بند میں کس کا شعر آیا ہے اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

اس زمین میں مصحفیؔ کے دو شاگردوں یعنی منور علی خاں غافلؔ اور مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ لکھنوی کی غزلوں کے منتخب اشعار کے بعد اب مصحفیؔ کے تیسرے شاگرد خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی (متوفیٰ ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ) کی غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

(۱) قبر پر یار نے قرآن پڑھا میرے بعد
شرطِ الفت کی ملی مجھ کو جزا میرے بعد

(۲) ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم
نازنین بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

(۳) رنگِ رخسارِ گل و لالہ دگرگوں ہوگا
نہ رہے گی یہ گلستاں کی ہوا میرے بعد

(۴) قبر پر فاتحہ کو آئے وہ شوخ اے آتشؔ
نیک توفیق دے اس بت کو خدا میرے بعد[٩]

زیرِ بحث زمین میں نواب سید محمد خاں رندؔ لکھنوی شاگردِ آتشؔ (یعنی آغا حجو شرفؔ کے استاد بھائی) کی بھی غزل موجود ہے جس کے بعض شعر حاضر ہیں: ؎

(۱) کچھ فقط غم ہی نہ دنیا سے گیا میرے بعد
عشق بازی کا بھی چرچا نہ رہا میرے بعد

(۲) بعد مجنوں کے میں دیوانہ گیا صحرا کو
پھر نہ آیا کوئی زنجیر بپا میرے بعد

(۳) سب نکل جائے گا دعوائے خدائی دل سے
بندگی کرنے لگو گے یہ خدا میرے بعد

(۴) کون بندھوائے گا پٹکا لیے ہاتھوں میں کمر
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد[١٠]

(۵) رندؔ کی ہے یہ وصیت اسے سب سن رکھیں
پاس تربت میں رہے خاکِ شفا میرے بعد[١١]

غزل شاگردِ ناسخ شیخ امداد علی بحر لکھنوی (متوفی ۱۲۹۵ھ)[12]

(۱) تیرے گلشن کی رہے گی نہ ہوا میرے بعد
خار ہوں گے یہ گلِ ناز و ادا میرے بعد

(۲) بعد مجنوں کے میں دیوانہ گیا صحرا کو
پھر نہ آیا کوئی زنجیر بپا میرے بعد

(۳) سب نکل جائے گا دعوائے خدائی دل سے
بندگی کرنے لگو گے یہ خدا میرے بعد

(۴) کون بندھوائے گا پٹکا پسے ہاتھوں میں کمر
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد[10]

(۵) رند کی ہے یہ وصیت اسے سب سن رکھیں
پاس تربت میں رہے خاکِ شفا میرے بعد[11]

غزل شاگردِ ناسخ شیخ امداد علی بحر لکھنوی (متوفی ۱۲۹۵ھ)[12]

(۱) تیرے گلشن کی رہے گی نہ ہوا میرے بعد
خار ہوں گے یہ گلِ ناز و ادا میرے بعد

(۲) دیکھ کر آئنہ، تیمھر سا لگے گا دل کو
اپنی صورت سے رہے گا تو خفا میرے بعد

(۳) ناز بردار کوئی مجھ سا نہ پیدا ہوگا
یاد آئے گی بہت میری وفا میرے بعد

(۴) یادِ خاطر رہے اس بحرِ جگر سوز کی بات
داغ ہو جاؤ گے اے ماہ لقا میرے بعد[13]

غزل فرزندِ امانت سید حسن لطافت لکھنوی

(متولد ۱۲۴۹ھ - متوفی ۲۱ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ)[14]

(۱) کوہکن کوہ پہ پہنچا مری جا میرے بعد
جانشیں تو مرا شاگرد ہوا میرے بعد

(۲) کرلے کانٹوں کی زباں، خوب سی سیراب اے دشت
مجھ سا آئے گا نہ پھر آبلہ پا میرے بعد

(۳) زیست کہتی ہے لطافت سے کہ کر نیک اعمال
جز پریشانی و افسوس ہے کیا میرے بعد[15]

غزل فرزندِ امانت و شاگردِ لطافت لکھنوی سید حسن فصاحت لکھنوی

(متولد ۱۲ شعبان ۱۲۷۳ھ - متوفی ۳ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ)[16]

(۱) کوئی بھی جب متحمل نہ ہوا میرے بعد
کی حسینوں نے کسی پہ نہ جفا میرے بعد

(۲) فاتحہ پڑھنے کو آئیں گے سرِ قبر ضرور
مجھ کو بھولیں گے نہ اربابِ وفا میرے بعد

(۳) قبر کے توے میں چھپ جائے گا کاتا بن کر
در پہ یہ آپ کا نقشِ کفِ پا میرے بعد

(۴) اے فصاحت، کبھی اخوانِ جہاں نے افسوس
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا میرے بعد

(دیوان بے مثال ص ۱۲۸)

فصاحت لکھنوی کے مقطعے کا دوسرا مصرع منور خاں غافل کی منقولۂ بالا غزل کے مقطعے کے مصرعۂ آخر سے پوری طرح مل رہا ہے۔ شرف، گویا، غافل، ہوس، آتش، رند، بحر لکھنوی، لطافت اور فصاحت کی ان ہم زمین غزلوں میں سے عجب نہیں کہ بعض غزلیں شاید کسی طرحی مشاعرے کے لیے ایک ہی زمانے میں کہی گئی ہوں۔ ان تمام ہم زمین غزلوں میں شرف کی غزل مضامین اور قوافی کے اعتبار سے گویا کی غزل سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی زمین میں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی بھی ایک غزل ملتی ہے جو اپنی ابتدائی شکل میں ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (مطابق نومبر ۱۸۲۱ء) تک کہی جا چکی تھی کیوں کہ یہ دیوانِ غالب کے اس مخطوطۂ بھوپال میں شامل ہے جو ۵ صفر ۱۲۳۷ھ کا مکتوبہ ہے[17]

شرف و میر انیس (متوفی ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ)

شرف کی مثنوی افسانۂ لکھنؤ میں میر انیس کا ذکر متعدد اشعار میں آیا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار درج ذیل ہیں:-

(۱) جو ہیں مرثیہ گو جنابِ انیس — زباں شستہ و رفتہ بندش نفیس
(۲) یہ فردوسیِ وقت ہیں انتخاب — نہیں ان کا خوش گوئی میں بھی جواب
(۳) جبیں مثلِ خورشید تابندہ ہے — نہ خوش گو ہے ایسا، نہ خوانندہ ہے
(۴) جو ہیں نورِ چشمِ جنابِ انیس — کلامِ نفیس اور تخلص نفیس
(۵) جنابِ انیس و جنابِ دبیر — نہ اِن کا ہے ثانی نہ ان کا نظیر
(۶) کلام ان کے بے مثل و نایاب ہیں — یہ اب آفتاب اور مہتاب ہیں

(مثنوی افسانۂ لکھنؤ: آغا حجو شرف لکھنوی قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ سبطین آباد ٹرسٹ مٹیا برج کلکتہ مکتوبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ مطابق جمعہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۴ء ص ص ۱۸۲ تا ۱۸۳)

مثنوی افسانۂ لکھنؤ (قلمی نسخہ مٹیا برج کلکتہ ص ۱۹۰) کے یہ اشعار بھی دیکھیے:

جو عباس مرزا یہ ہیں نوجواں — یہ طفلی سے ہیں ذاکرِ خوش بیاں
خدا نے جو دی ہے طبیعت نفیس — بہت جانتے ہیں جنابِ انیس
(جانتے کذا؛ چاہتے)
یہ شاگرد ہیں، مثلِ فرزند ہیں — جنابِ انیس ان سے خورسند ہیں
یہ ہیں شاعرِ بامزہ (با) تمیز — جواں مرد و با مرد و ہر دل عزیز
خدا عمرِ طبعی عنایت کرے — عطا غیب سے مال و دولت کرے

ان اشعار میں شرف نے میر انیس کے جن شاگرد عباس مرزا کا ذکر کیا ہے

...مرزا محمد عباس وکیل معلوم ہوتے ہیں جو لکھنؤ سے مٹیا برج کلکتہ منتقل ہوئے تھے۔ مثنوی افسانۂ لکھنؤ (قلمی نسخہ مٹیا برج ص ص ۱۸۳ تا ۱۸۴) میں شرف نے علی حسن اور میر آغا کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں نام بھی شاگردانِ انیس (ص ۲۵۷ نیز ص ۲۶۰) میں مل جاتے ہیں۔ گویا شرف کی مثنوی افسانۂ لکھنؤ میر انیس کے شاگردوں کے سلسلے میں بھی مفید مطلب ماخذ ہے اور ان امور سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شرف نہ صرف میر انیس بلکہ ان کے کئی شاگردوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

دیوان شرف مطبوعہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء (ص ۳۶۳) میں میر انیس کی وفات پر شرف کے دو عدد قطعاتِ تاریخ موجود ہیں جن میں سے ایک ملاحظہ ہو: ؎

(۱)	شبیر کی ولا سے جنابِ انیس کو	فردوس میں ملا ہے عجب گلشنِ نفیس
(۲)	دنیا میں ان کو عشقِ دلی تھا حسین سے	مدّاح تھے یہ معتقد ان کے تھے سب رئیس
(۳)	منبرِ ملاحناں میں تو رضواں نے یہ کہا	تم ہو خطیبِ عرشِ الٰہی کے ہم جلیس
(۴)	ان کے بیاں پہ وجد میں روح القدس ہوئے	کہنے لگے سنی نہیں ایسی زبان سلیس
(۵)	عالم نے کی دعا سنہ رحلت میں اے شرف	روح امین عرش مبارک ہو اے انیس

(۱۲۹۱ھ)

شرف نے یہاں نفیس، رئیس اور سلیس کے الفاظ اس رعایت سے رکھے ہیں کہ یہ میر انیس کے تین فرزندوں کے تخلص تھے اور جلیس میر انیس کے پوتے یعنی سلیس کے فرزند تھے[19]

کلام شرف پر میر انیس کے اثرات کے سلسلے میں دونوں شاعروں کے درج ذیل اشعار توجہ کے طالب ہیں:[20] ؎

انیس: ؎ نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

شرف: ؎ ہمیں تو عہدِ جوانی سے یاس ہوتی ہے
جب آفتاب کبھی دوپہر کو دیکھتے ہیں

انیس: ؎ کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

شرف: ؎ کیوں کر نہ یاس ہو مجھے اپنے شباب سے
احوال آفتاب کا ہے دوپہر سے کیا

ناسخ نے اس مضمون سے مماثل خیال کو انیس و شرف سے قبل اپنے دیوانِ اول (سال تکمیل ۱۲۳۲ھ) میں یوں پیش کیا ہے: ؎

رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا

(کلیات شیخ امام بخش ناسخ۔ مطبع محمدی لکھنؤ طبع اول مطبوعہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ مطابق دوشنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء۔ دیوانِ اوّل ص ۳۱)

انیس (رباعی): ؎ مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھیرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

شرف: ؎ حسرت سے اس لیے میں اترتا ہوں قبر میں
ملتی ہے جان دے کے یہ دو گز زمیں مجھے

شرف اور میر صبا لکھنوی (متوفی ۲۷ رمضان ۱۲۷۱ھ / ۱۳ جون ۱۸۵۵ء)[21]

شرف و صبا آپس میں استاد بھائی تھے مگر شاگردانِ آتش میں صبا کا درجہ شرف سے بلند تھا۔ مثنوی "افسانۂ لکھنؤ" (قلمی نسخہ ص ص ۱۹۲ تا ۱۹۳) میں شرف نے صبا کا ذکر جس محبت اور عقیدت سے کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرف صبا سے بہت متاثر تھے۔ شرف نے صبا کی زمینوں میں متعدد غزلیں کہی ہیں۔

یہاں ان دونوں کے بعض مماثل اشعار پیش کیے جاتے ہیں: ؎

صبا: ؎ باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر (انتخابِ صبا ص ۴۲)

شرف: ؎ خاک بلبل کی تو اڑ اڑ کے بہت پیٹا کی
پیرہن گل کا وہ ستھرا تھا کہ میلا نہ ہوا (دیوانِ شرف ص ۱۹)

شرف: ؎ خاک برسوں چمنستاں میں اڑی بلبل کی
پیرہن غنچہ و گل کا کبھی میلا نہ ہوا (دیوانِ شرف ص ۸۱)

صبا: ؎ نزع میں ہیں، نہ ادھر آیئے گا
ابھی کچھ سن نہیں، ڈر جایئے گا (انتخابِ صبا ص ۳۲)

شرف: ؎ یہ دھیان تھا کہ وہ کم سن ہے ڈر نہ جائے کہیں
بس اس لیے نظر اس کی بچا کے دم نکلا (دیوانِ شرف ص ۲۱)

آخری شعر کے مضمون پر تلامذۂ صبا میں آغا حسن آغا اور رضا حسین تسہا نے بھی طبع آزمائی کی ہے:[22] ؎

آغا: ؎ ہٹا دو ان کو بالیں سے مری، وہ خوف کھائیں گے
سنا ہے دم نکلتا ہے بڑی مشکل سے عاشق کا

تسہا: ؎ شدائدِ موت کے ہرگز نہ دیکھے جائیں گے تم سے
سرہانے سے مرے اٹھو کہ میرا دم نکلتا ہے

تسہا: ؎ بہت کم سن ہیں وہ، ڈر جائیں گے، ان کو نہ آنے دو
بڑی مشکل سے عاشق کا سنا ہے دم نکلتا ہے[23]

ان ہم مضمون اشعار میں شرف، آغا اور تسہا پر صبا کی برتری ظاہر ہے۔ دیوانِ شرف ص ۲۶۸ نیز ص ۲۸۰ کی غزلیات نمبر ۲۴۹ نیز ۳۶۲ میر صبا کی زمینوں میں ہیں[24] ان غزلوں میں بھی شرف پر صبا کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔

شرف اور خواجہ حیدر علی آتش

تذکرۂ نادر (ص ص ۸۸) میں شرف کو ناسخ کا شاگرد بتایا گیا ہے جو تصدیق طلب ہے۔ خوش معرکۂ زیبا، سراپا سخن، سخن شعرا نیز گلدستۂ شعرائے لکھنؤ جیسے معاصر

معاصر شرف کو آتش ہی کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کا یہ اندراج نظرِ ثانی کا طالب ہے کہ آغا حجو شرف کو ناسخ نے ناسخ کا شاگرد بتایا ہے (عرضِ ہنر: ڈاکٹر محمد حسن طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۷۴) ناسخ کے تذکرے سخن شعرا (ص ۲۴۴) میں شرف کو آتش ہی کا شاگرد لکھا گیا ہے اور ناسخ نے شرف کے حال میں ناسخ کا نام تک نہیں لیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے نظر بظاہر نادر کی جگہ ناسخ تحریر فرمادیا ہے۔ مثنوی افسانہ، لکھنؤ میں شرف نے آتش کے متعلق لکھا ہے: ؎

(۱) مزہ دل کو ہے ذوق پر غش ہوں میں — ہمیشہ سے شاگردِ آتش ہوں میں
(۲) وہ آتش جو تھے خواجہ حیدر علی — خدا بخشے ان کو وہ تھے اک ولی
(۳) وہ فردوسیِ وقت تھے لاجواب — خدا نے کیا تھا انہیں انتخاب
(۴) ہمیشہ ہی اشعار وہ وہ کہے — جنہوں نے سنے وجد میں وہ رہے
(۵) وہ خوش گوئی کی فکر ان کو رہی — کہ افسوں ہوئی وہ غزل جو کہی[25]

شرف نے اپنے اور بھی اشعار میں آتش کو یاد کیا ہے: ؎

(۱) چراغِ شاعری آتش کے سامنے گُل تھا
بس ایک گلشنِ ایجاد میں وہ بُلبُل تھا (دیوانِ شرف ص ۶)

(۲) مرے استاد کے جو نام سے دنیا میں جلتے ہیں
نکالے ان پہ یارب آتشِ دوزخ بخار اپنا (ص ۲۷)

(۳) کھب کھب گئے زمانے کے دل میں، کہے وہ شعر
نیرنگِ شاعری مرے استاد سے ہوا (ص ۶۴)

(۴) ہوئے لاریب اپنے وقت کے آتش بھی فردوسی
خدا بخشے زباں دھوئی ہوئی تھی آبِ کوثر سے (ص ۲۲۱)

یہاں اس سوال پر بھی غور کرنا مناسب ہوگا کہ شرف کب آتش کے شاگرد ہوئے تھے؟ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ (ص ۳۴۴) میں شرف کے متعلق ناصر کا بیان ہے: "۔۔۔۔ بعد کشمکش رجوع بہ آتش۔۔۔۔"

خوش معرکۂ زیبا ۱۲۶۱ھ سے ۱۲۶۲ھ تک لکھا جاتا رہا تھا۔ گویا شرف ۱۲۶۱ھ یا ۱۲۶۲ھ سے قبل آتش کے شاگرد ہو چکے تھے مگر تذکرے کی تحریر کے زمانے میں شرف شاید آتش کی شاگردی میں نئے نئے آئے ہوں گے۔ "بعد کشمکش" کے فقرے سے یہی گمان ہوتا ہے۔ یہ آتش کی زندگی کا آخری دور تھا کیوں کہ آتش نے ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ کو وفات پائی تھی۔ شرف نے وفاتِ آتش پر یہ تاریخ کہی تھی: ؎

تاریخ رحلتِ استادی جناب خواجہ حیدر علی آتش مغفور (دیوانِ شرف ص ۳۴۸)

(۱) خواجۂ صبر و رضا و بندۂ خاصِ خدا — تارکِ دنیا و لذت، قانع و گوشہ نشیں
(۲) بے ریا، بے نفس، بے پروا، بے حرص و ہوس — نازبردارِ توکل، باخدا عشرت گزیں
(۳) پاک دامن، پاک طینت، پاک باز و پاک صاف — محوِ محبوبِ خدا، جویائے ربّ العالمیں
(۴) عارف و مجذوب، سالک، چلّہ کش و روشن ضمیر — خاکسار و بوترابی، عاشقِ حبل المتیں
(۵) کربلا میں روح رہتی ہے، ہوئے ہیں گھر میں دفن — زندہ دل تھے زندۂ جاوید ہیں زیرِ زمیں
(۶) شاعرِ بے مثل و یکتا تھے وہ فردوسیِ عصر — چل بسے افسوس دنیا سے سوئے خلدِ بریں
(۷) آتش ان کا تھا تخلص، نام تھا حیدر علی — تھے خدا رس، تھا انہیں دنیا سے کچھ مطلب نہیں
(۸) اے شرف تھے جلوہ فرما، بوریائے فقر پر — کرتے تھے ہر وقت تعظیم و ادب ہمنشیں
(۹) سالِ رحلت سے دو عالم میں ہیں شہرت یافتہ — حیدری مدّاح و فردوسِ بریں (۱۲۶۳ھ)

مصرع آخر سے سالِ وفاتِ آتش ۱۲۶۳ھ نکلتا ہے۔ دبستانِ آتش میں مصرع آخر کی یہ شکل محلِ نظر ہے: ؎

"حیدری مدّاح و فردوشِ فردکس بریں"

(دبستانِ آتش: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام دہلی طبع ۱۹۷۷ء ص ۱۴۷)

اس مصرع سے مطلوبہ سال ۱۲۶۳ھ کے بجائے ۱۴۹۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہاں "فردوکش" دراصل "فردوسی" کی تصحیف ہے۔ شرف کا یہ قطعۂ تاریخ آتش کی سیرت و شخصیت، اُفتادِ طبع، مذہبی عقائد نیز آتش کے مدفن کے متعلق جو معلومات فراہم کرتا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ گوئی میں شرف اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ آتش کے مطبوعہ کلیات میں تاریخ گوئی کا کوئی بھی نمونہ سرے سے ملتا ہی نہیں لہٰذا شرف کی تاریخ گوئی میں آتش کے فیضِ تربیت کا کوئی مثبت ثبوت نہیں دستیاب ہوتا لیکن شرف کی شاعری موضوع و اسلوب دونوں ہی لحاظ سے آتش کے اثرات سے خالی نہیں۔ شرف کے یہاں تصوف اور صاف ٹکسالی زبان آتش کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہ اثرات آتش کی ایک غزل (مشمولہ کلیاتِ آتش طبع ۱۸۰۸ء ص ۱۱۱ تا ۱۱۲) پر شرف کے پندرہ بند کے اس مخمس میں بھی محسوس ہوتے ہیں جس کے چند بند دیوانِ شرف طبع مارچ ۱۸۹۶ء (ص ص ۳۳۵ تا ۳۳۷) سے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں: ؎

(۱) وہ کشتہ ہوں، مرا ماتم ستم ایجاد کرتے ہیں — وہ روتے ہیں مجھے، جو روز و شب بیداد کرتے ہیں
جنہوں نے جان لی ہے، روح کو وہ شاد کرتے ہیں — "خدا بخشے"، بہ صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں
دعائے مغفرت میرے لیے جلّاد کرتے ہیں

(۲) بیابانوں سے بھی ساماں ہیں بدتر گلستاں کے — رہے ہیں گلخن افروز آ کے قریب ردِ گلستاں کے
اڑے جاتے ہیں مرغانِ چمن باہر گلستاں کے — کمر باندھی ہے گل چینوں نے غارت پر گلستاں کے
اجارہ بُلبُلوں کے خون کا صیاد کرتے ہیں

(۳) دل آزاری یہاں تک کی، بھلا دی ان کی سب پوتھی — پشیمانی ہوئی اتنی پرستش جس قدر کی تھی
نہ پوچھی بات بھی ان کی کبھی، ایسی ہے چپ نادھی[26] — بتوں کے عشق نے ایسا دکھایا دل کو ان کے بھی
برہمن پردۂ ناقوس میں فریاد کرتے ہیں

(۴) ہماری نظم (بھی) اک دلکشا املاکِ مضموں ہے — کہیں لیلیٰ فردوکش ہے، کہیں افتادہ مجنوں ہے
جو اس میں حسنِ بندش ہے پرستانے سے وہ افزوں ہے — مکیں ہر معنیِ رنگیں، مکاں ہر بیتِ موزوں ہے
غزل کہتے نہیں ہم چند گھر آباد کرتے ہیں

(منقولہ بالا بند ۴ کا دوسرا مصرع لفظ "فردوکش" کے استعمال کی وجہ سے لغات نویسوں کے لیے خاصا اہم ہے۔ مہذب اللغات جلد ہشتم ص ۴۰۲ میں لفظ "فردوکش" کی دبیر کے کلام سے محض ایک سند پیش کی گئی ہے۔ شرف کا یہ مصرع بھی اس لفظ کی اچھی سند ثابت ہوگا)

۵) ہے یہ عالم و سنجاب کا جھگڑا بھئے آتش — دل اب پیراہنِ ہستی اسے) اپنا تنگ ہے آتش

شرف پہ کہتے ہیں، ہمیں اسے ہم تابکے آتش — پہنتے ہیں، کفن میلا ہوا جاتا ہے اے آتش

سرائے گور ہے ویراں، اسے آباد کرتے ہیں

شرف، مولانا نظم طباطبائی (متولد صفر، ۱۲۷۰ھ) کے ہم سن تو نہ تھے مگر بزرگ ہم عصر ضرور تھے (دیکھیے نظم طباطبائی؛ ڈاکٹر اشرف رفیع ،حیدرآباد طبع دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۵۵ نیز ص ۲۰)۔ نظم طباطبائی نے شرف سے اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شرف نے ان سے اپنے استاد کے اس شعر پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا:[۲۵]

چپ ہو گیوں، کچھ منہ سے فریاد خدا کے واسطے

آدمی سے بُت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے[۲۷]

شرف اس شعر کو اپنے استاد یعنی آتش کا کلام بتاتے ہیں مگر کلیاتِ آتش میں یہ شعر مجھے تلاش کرنے کے باوجود نہ مل سکا۔ یہ آتش کا غیر متداول شعر ہے۔ شرف کے منقولہ بالا مخمس کے تیسرے بند کا تیسرا اور چوتھا مصرع محوّلہ بالا شعر سے کسی قدر مشابہ ہے۔ یہ امور شرف پر ان کے استاد آتش کے اثرات کے مظہر ہیں۔

دیوانِ شرف میں آتش کی زمینوں میں متعدد غزلیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ آتش و شرف کی بعض ہم زمین غزلوں کے چند اشعار کا تقابلی مطالعہ شرف پر آتش کے اثرات کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔ دیوانِ شرف ص ص ۲۳۱ تا ۲۳۲ کی غزل ۲۰۲ سولہ اشعار پر مشتمل ہے اور یہ آتش کی زمین میں ہے۔ آتش کی غزل میں پندرہ اشعار ہیں اور یہ کلیاتِ آتش ص ص ۲۵۰ تا ۲۵۱ میں موجود ہے۔

آتش: ؎ مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

شرف: ؎ مبارک ہو وہ پلوائیں گے شربت عشق بازوں کو
صراحی مینے کی یاقوت کا پیمانہ آتا ہے

آتش: ؎ سمجھتے ہیں مرے دل کی، وہ کیا نافہم و ناداں ہیں
حضورِ شمع بے مطلب نہیں پروانہ آتا ہے

شرف: ؎ ہمارا دل تری محفل میں یوں دیوانہ آتا ہے
کہ جیسے جان پر کھیلے ہوئے پروانہ آتا ہے

آتش: ؎ ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے

شرف: ؎ نہیں پھر یاد رہتی کچھ کہانی دین و دنیا کی
کسی شب کو جو سننے میں ترا افسانہ آتا ہے

آتش: ؎ بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

شرف: ؎ نیا سودا ہے، میں برخاستہ دل ہوں گلستاں سے
دل آبادی سے گھبراتا ہے، خوش ویرانہ آتا ہے

آتش: ؎ خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

شرف: ؎ تشفی بھی کرے گی قیس کی لیلیٰ تو کیا ہوگا
کہیں سمجھانے سے بھی ہوش میں دیوانہ آتا ہے

ان ہم زمین و ہم قافیہ اشعار میں شرف اپنے استاد آتش کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی میں اپنی بھی چال بھولتے نظر آتے ہیں۔ شاگرد ہر قافیے کو دوڑ کر پکڑتے میں استاد سے کوسوں پیچھے رہ گیا ہے۔ دیوانِ شرف ص ص ۲۷ تا ۲۸ کی غزل نمبر ۴۱ بھی آتش کی زمین میں ہے (کلیاتِ آتش ص ۸)۔ ان ہم زمین غزلوں کے بعض ہم قافیہ اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

آتش: ؎ (یار) شعر کو میں نے، مجھے یار نے سونے نہ دیا[۲۸]
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

شرف: ؎ شب کو نظارۂ دلدار نے سونے نہ دیا
شادیِ طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

آتش: ؎ خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

شرف: ؎ دور رہ کر میں ترے قصر سے شب بھر تڑپا
حسرتِ پہلوئے دیوار نے سونے نہ دیا

شرف اور غالب

مرزا غالب اپنی شاعرانہ عظمت کا شدید احساس رکھنے کے باوجود شرف کے استاد آتش کے کلام کو پسند کرتے تھے۔ غالب نے ایک خط میں آتش کی یوں تعریف کی ہے: "ناسخ کے ہاں کم تر اور آتش کے ہاں بیش تر یہ تیر نشتر ہیں"۔[۲۹] شرف نے بھی اپنے استاد کے مدّاح غالب کی ستایش مثنوی شکوۂ فرنگ کے ان اشعار میں کی ہے: ؎

جو دہلی میں یہ مرزا نوشاہ ہیں — یہ شاعر عمائد ہیں، ذی جاہ ہیں
تخلص ہے غالب، بڑے نام ور — عجب زندہ دل، عالم و خوش سیر
یہ بے شک ہیں استاد اہلِ زباں — سمندر طبیعت ہے، ہر علم داں
ہوئی گفتگو ان سے جب غدر میں — جگہ پائی حکّام سے صدر میں
کلام ان کا لندن روانہ ہوا — عجائب وہ افسوں فسانہ ہوا
مؤثر جو تھی نظم اثر کر گئی — جہاں کے دلوں میں وہ گھر کر گئی
ہوا حکم ملکہ کے دربار سے — کہ پنشن ملے ان کو سرکار سے
عمائد تو تھے اور نامی ہوئے — ہوئی پنشن ان کی وہ نامی ہوئے
یہ نامی تو تھے نام ور رہ گئے — جو دشمن تھے منہ دیکھ کر رہ گئے[۳۰]

ان اشعار میں شرف نے غالب کی جس پنشن کی بحالی کا ذکر کیا ہے وہ مئی ۱۸۶۰ء میں بحال ہوئی تھی[۳۱] گویا شرف کے یہ اشعار ۱۸۶۰ء کے آس پاس کے

قیاس کیے جاسکتے ہیں اور ان کی روشنی میں ۱۸۶۰ء تک غالب کے حالات و کلام سے شرف کی دلچسپی ثابت ہوتی ہے۔ یکم جنوری ۱۸۶۰ء سے ۱۵ جنوری ۱۸۶۰ء تک کی درمیانی مدت میں لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرے کے لیے شرف نے جو غزل کہی تھی اس میں یہ شعر بھی شامل ہے : ؎

ملتیں نہ خاک میں جو پری زاد صورتیں نشو و نما گلوں کا یہ ہوتا زمیں سے کب[۳۲]

۱۸۶۰ء کے اوائل میں کہا جانے والا شرف کا یہ شعر غالب کے اس مشہور مطلعے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے : ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں[۳۳]

غالب کی یہ غزل ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء کے آس پاس کا کلام ہے[۳۴] شرف نے جنوری ۱۸۶۰ء میں کہی جانے والی اپنی محوّلہ بالا غزل میں شاید غالب کے اسی مطلعے سے مضمون لیا ہو۔ یہ مضمون شرف نے معمولی تغیّر کے ساتھ اپنے متعدد اشعار میں بہ تکرار پیش کیا ہے : ؎

(۱) پری سی صورتیں تم جو نہ پیوندِ زمیں کرتے
گلوں کا خاک سے ہرگز نہ پھر نشو و نما ہوتا (دیوانِ شرف ص ۴۵)

(۲) خاک سے لالہ و گل کی جو ہوئی افزائش
خون اِن میں ترے کشتوں کا میں شامل سمجھا (ایضاً ص ۱۲)

(۳) خاک میں ملتیں نہ شکلیں جو ترے کشتوں کی
لالہ و گل کا مُرقّع نہ نمایاں ہوتا (ص ۲۲)

(۴) خاک سے گُل ہو کے اس کے خون نے کی ہے نمود
کون کہتا ہے شہیدِ نازِ گُل در گُل نہ تھا (ص ۴۵)

(۵) تیرے کُشتوں کی نمایش ہوئی گُل ہو ہو کر
خون اس خاک سے کس کس کا ہویدا نہ ہوا (ص ۱۸)

(۶) خاک سے کُشتوں کی تیرے، ہر چمن کی ہے سرشت
کون سے گُل میں شہیدوں کا لہو شامل نہیں (ص ۱۶۸)

(۷) زمینِ کوئے جاناں سے نمایش گُل جو کرتے ہیں
سپردِ خاک وہ کرتا ہے کس کس خوب صورت کو (ص ۲۱۰)

(۸) گلشن کی بنا ہے ترے کُشتوں کے لہو سے
پہلے نہ کہیں گُل تھے نہ بنیاد کسی کی (ص: ۲۶۵)

یہی مضمون مرزا سلامت علی دبیر کے ایک سلام کے اس شعر میں بھی آیا ہے : ؎

کیوں نہ گل چاک گریباں ہوں زمیں سے پیدا
خاک میں فاطمہ زہرا کا جو گلزار ملے[۳۵]

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب سے قبل یہ مضمون ناسخ پیش کر چکے تھے : ؎

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گُل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا[۳۶]

یہ شعر ناسخ کے دیوانِ اوّل میں ہے جو ۱۲۳۲ھ (۱۷-۱۸۱۶ء) تک مرتب ہو چکا تھا گویا ناسخ کا یہ شعر ۱۲۳۲ھ سے بھی قبل کا کلام ہے۔ ناسخ کے اس قدیم شعر کے مقابلے میں غالب کا شعر ۱۸۵۲ء کے آس پاس کا کلام ہے۔ لہٰذا یہ مضمون غالب سے بہت پہلے ناسخ (متوفی ۴ جمادی الاوّل ۱۲۵۴ھ مطابق پنج شنبہ ۱۶ اگست ۱۸۳۸ء) پیش کر چکے تھے مگر ناسخ کے شعر کے مقابلے میں غالب کا شعر زیادہ مشہور ہو گیا اور شاید شرف نے اس مضمون کو غالب سے ہی لیا ہو۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون فارسی شاعری میں بھی بہت پہلے سے بہ تکرار پیش ہوتا رہا ہے۔

تتمۂ دہلی اردو اخبار مورخہ ۷ رجب ۱۲۶۹ھ (مطابق یکشنبہ ۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء) میں بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل پر غالب کا جو مخمس چھپا تھا اس کا پہلا بند یہ ہے : ؎

گھِستے گھِستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھنا، کاش کیوں تکبیر آدھی رہ گئی کھینچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی[۳۷]

شرف کے درج ذیل مطلعے کا پہلا مصرع غالب کے اسی بند سے ماخوذ ہے : ؎

گھِستے گھِستے پاؤں کی زنجیر آدھی رہ گئی آدمی چھٹنے کی ہوئی تدبیر آدھی رہ گئی
(دیوان شرف ص ۲۲۷)

شرف نے غالب کی زمین میں متعدد غزلیں کہی ہیں۔ غالب کی تین شعر کی ایک غزل (جو مئی ۱۸۴۷ء کے فوری بعد کا کلام بتائی جاتی ہے) کا مطلع ہے : ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
(دیوانِ غالب طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۱۳)

غالب کی اس تین شعر کی مختصر مگر مشہور غزل کی زمین میں شرف نے ایک طویل دو غزلہ کہا ہے جو دیوانِ شرف (ص ص ۴۴ تا ۴۵ نیز ص ص ۵۲ تا ۵۴) میں غزل نمبر ۶۵ نیز غزل نمبر ۷۰ کی شکل میں موجود ہے۔ دیوان میں ان دونوں غزلوں میں فصل ترتیب کی خامی ہے۔ غالب کی زمین میں شرف کی اس غزل کے چند اشعار پیش ہیں : ؎

تصور سے غش آیا، سامنا ہوتا تو کیا ہوتا وہی جانے جو وہ جلوہ نما ہوتا تو کیا ہوتا
ذرا سے حُسنِ انساں پر ہزاروں جان دیتے ہیں خدائی میں اگر ظاہر خدا ہوتا تو کیا ہوتا
قیامت پر قیامت ڈھائی جس کی پردہ پوشی نے جو مشتاقوں میں وہ جلوہ نما ہوتا تو کیا ہوتا

دیوانِ شرف ص ۱۰۶ کی غزل ۱۴۲ "بے کسی کا مری صدمہ جو ہوا میرے بعد" بھی غالب کی ایک اہم غزل "حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد" (مشمولہ دیوانِ غالب طبع ۱۸۸۲ء ص ۲۱) کی ہم زمین ہے۔ شرف کی اس غزل پر ہم اس مقالے کے ابتدائی حصے میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

دیوانِ غالب مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ص ۳۴ تا ۳۵ کی غزلیات نمبر ۹۱ نیز نمبر ۹۲ غالب کے ایک طویل دو غزلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ دو غزلہ پہلی بار دیوانِ غالب طبع ثانی مطبوعہ مئی ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا (بہ حوالۂ دیوان غالب

...نسخہ عرشی متن ص ص ۲۳۴ تا ۲۳۶ نیز مقدمہ ص ص ۱۳۱ تا ۱۳۲) گویا غالب کا یہ دوغزلہ دیوانِ غالب طبع اوّل مطبوعہ ماہ اکتوبر و نومبر ۱۸۴۱ء کے بعد مگر طبع دوم مطبوعہ مئی ۱۸۴۷ء سے قبل کہا گیا ہوگا۔ دیوانِ شرف ص ۱۵۹ کی غزل ۲۱۱ غالب کے اسی دوغزلے کی زمین میں ہے۔ میرے نزدیک شرف نے اپنی یہ غزل دیوانِ غالب طبع مئی ۱۸۴۷ء میں غالب کی غزل کی اشاعت کے بعد کہی ہوگی۔ غالب و شرف کی ان ہم زمین غزلوں کی زمین میں مولوی کرامت علی شہیدی (متوفی چہارم ماہ صفر ۱۲۵۶ھ[۳] مطابق سہ شنبہ ہفتم اپریل ۱۸۴۰ء شاگردِ مصحفی و نصیر دہلوی) کی بھی ۱۸ اشعار پر مشتمل ایک غزل ملتی ہے[۳۹] جو ظاہر ہے کہ ۷ اپریل ۱۸۴۰ء سے قبل کا کلام ہوگی۔ مولوی کرامت علی شہیدی شیخ مصحفی کے شاگرد ہونے کے باعث شرف کے استاد آتش کے استاد بھائی ضرور تھے لیکن شہیدی کی مذکورہ بالا غزل سے متاثر ہو کر شرف کا یہ غزل کہنا بعید از قیاس ہے۔ بہر حال غالب، شرف اور شہیدی کی ان تینوں ہم زمین غزلوں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ تینوں شاعروں کی ان ہم زمین غزلوں کے مطلعے درج ذیل ہیں: ؎

غالب: ؎ ملتی ہے خوئے یار سے، نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

غالب: ؎ کل کے لیے کر، آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے، ساقیِ کوثر کے باب میں

شرف: ؎ چونکا ہوں جب سے دیکھ کے اس گل کو خواب میں
بینائی بے قرار ہے چشمِ پُر آب میں

شہیدی: خوشبوئے پاں سے درد ملا قندِ ناب میں
گھولا مسی نے مشکِ شفق گوں شراب میں

غزلیاتِ غالب کی زمینوں میں شرف کی یہ تمام گام فرسائی شرف پر غالب کے اثرات کی غماز ہے۔ مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے عینی شاہد کی حیثیت سے آغا حجو شرف کا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

... "اسی زمانے میں مرزا غالب کا دیوان پہلی دفعہ لکھنؤ سے چھپ کر نکلا تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ شرف تڑپ رہے ہیں اور بے چین ہوئے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے: بھئی! مرزا نوشہ نے ایک شعر کہا ہے کہ میں نے کلیجہ پکڑ لیا ہے: ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کے   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں[۴۱]

غالب کی اس غزل (مشمولہ دیوانِ غالب مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۴۸) کی زمین میں بھی شرف کی ایک غزل دیوانِ شرف (ص ۱۸۱) میں موجود ہے جس کے چند شعر حاضر ہیں: ؎

(۱) خدا ہی جانے اسے غم ہے کس مسافر کا   ہمیشہ چاک گریباں سحر کو دیکھتے ہیں
(۲) ہمیں تو عہدِ جوانی سے یاس ہوتی ہے   جب آفتاب کبھی دوپہر کو دیکھتے ہیں
(۳) مرا تو کام ہوا ہے، انہیں تماشا ہے   جو دم بدم مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

شرف نے منقولہ بالا تیسرے شعر کے مضمون کو ایک اور غزل میں بھی پیش کیا ہے: ؎

کیا مرا زخمِ جگر دیکھتے ہو جھک جھک کر   ہو گیا کام مرا تم کو تماشا ٹھہرا (دیوانِ شرف ص ۶)

شرف کے ان دونوں ہم مضمون شعروں میں غالب کے محولہ بالا شعر کے اثرات کی جلوہ گری محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان تمام شہادتوں کی بنیاد پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شرف نے اپنے بعض اشعار کے لیے غالب، آتش، صبا، انیس اور گویا جیسے معاصرین سے بعض مضامین مستعار لیے ہیں یا ان میں سے بعض شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ شرف کی غزلیہ شاعری کے نگار خانے کی آرائش میں اور کن کن شاعروں کے ادبی ایوانوں کا ساز و سامان یا رنگ و روغن صرف ہوا ہے، اس سوال کا جواب شاید ہمارے اہلِ قلم آئندہ کبھی فراہم فرما سکیں گے۔

حواشی

۱؎ رجوع کیجیے: (۱) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (جلد دوم) مؤلفہ سعادت علی خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ۔ مجلس ترقی ادب لاہور طبع مارچ ۱۹۷۲ء ص ص ۷۴ تا ۷۷)
(۱) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا: سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی نسیم بک ڈپو لکھنؤ طبع جولائی ۱۹۷۱ء ص ص ۳۴۴ تا ۳۴۵
(۳) گلدستۂ نتیجۂ سخن کلکتہ ۱۵ جنوری ۱۸۸۳ء (مطابق ربیع الاول ۱۳۰۰ھ) ص ص ۲۷ تا ۲۸ میں۔ شرف کی زندگی کے دوران منعقد ہونے والے کلکتے کے ایک طرحی مشاعرے کی طرح میں شرف کی جو تازہ غزل چھپی ہے اس کا مطلع یہ ہے: ؎

یوں ہجومِ داغ حسرت ہے ہمارے دل کے پاس
جیسے لخطے خون کے جم جاتے ہیں بسمل کے پاس

۲؎ گویا کو ناسخ، نادر، کلیم، سلیم، محسن و ابن طوفان وغیرہم نے خواجہ وزیر کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ مگر شیفتہ، ناصر، کلیم و سلیم کے بیانات کی بنیاد پر گویا تلامذۂ ناسخ میں بھی شامل ہیں۔ دیکھیے:
(۱) سخن شعرا: عبدالغفور نساخ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۴۰۳
(۲) تذکرۂ نادر: کلب حسین نادر۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء ص ۱۳۴
(۳) بزمِ سخن: علی حسن خاں سلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ طبع ۱۸۸۱ء ص ۱۰۰
(۴) طورِ کلیم: نور الحسن خاں کلیم۔ مطبع مفید عام آگرہ طبع ۱۲۹۸ھ فروغ اول ص ۸۶
(۵) سراپا سخن: محسن علی محسن۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۷۵ء ص ۱۰
(۶) تذکرۂ شعرا: مصنفہ ابن امین اللہ طوفان۔ مرتبہ قاضی عبدالودود۔ پٹنہ طبع مئی ۱۹۵۴ء ص ۸ (احوال وزیر)
(۷) گلشنِ بے خار: مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۷۴ء ص ۱۶۵
(۸) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ ص ۵۱۲

(۹) شاعر بمبئی شمارہ ۹ سال ۱۹۸۲ء ص ۱۱ نیز ص ۱۳ (مقالہ ڈاکٹر انصار اللہ)
(۱۰) گویا — صاحبِ سیف و قلم: جعفر ملیح آبادی۔ لکھنؤ طبع ۱۹۸۰ء ص ۱۳۱
(۱۱) تحقیقی نوادر: ڈاکٹر اکبر حیدری طبع اول ص ۵۴۳ و بہ بعد

۳ے بہ حوالہ ترجمہ حدائق البلاغت: صہبائی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ (سنہ اشاعت ندارد) ص ۱۰۲

۴ے دیوانِ غافل: منور خاں غافل۔ مطبع نول کشور کانپور طبع دسمبر ۱۸۹۰ء ص ص ۲۵ تا ۲۶

۵ے احوالِ غافل کے لیے دیکھیے:
(۱) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا طبع لکھنؤ ص ص ۳۳۹ تا ۳۴۳
(۲) ریاض الفصحا: مصحفی۔ دہلی طبع ۱۹۳۴ء ص ص ۲۳۳ تا ۲۴۰
(۳) دیوانِ غافل ص ص ۱۲۶ تا ۱۲۷
(۴) سخن شعرا ص ۳۴۲
(۵) بزم سخن ص ۸۹
(۶) تذکرۂ نادر ص ۱۱۶
(۷) سراپا سخن ص ۱۰۷
(۸) تذکرۂ روز روشن: صبا گوپاموی۔ تلخیص و ترجمہ عطا کاکوی طبع ۱۹۶۸ء ص ۴۸
(۹) تلامذۂ مصحفی۔ افسر صدیقی کراچی طبع ۱۹۷۹ء ص ص ۲۳۷ تا ۲۴۱

۶ے گلدستۂ امانت: امانت لکھنوی۔ مطبع احمدی دہلی طبع ۱۸۸۶ء ص ص ۷ تا ۸

۷ے ورک: (۱) کلیاتِ میر: مرتبہ عبد الباری آسی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع ۱۹۴۱ء
(۲) کلیاتِ میر (جلد اول): مرتبہ پروفیسر احتشام حسین۔ الہ آباد طبع ۱۹۷۲ء

۸ے شیعہ کالج میگزین لکھنؤ۔ صبا نمبر۔ بابت ۸۲-۱۹۸۱ء مرتبہ کاظم علی خاں ص ۲۴

۹ے کلیاتِ آتش۔ مطبع نول کشور کانپور، طبع اپریل ۱۸۸۸ء ص ص ۳ تا ۴

۱۰ے یہ مصرع منور علی خاں غافل کی غزل میں بھی آیا ہے۔

۱۱ے دیوانِ رند۔ مطبع نول کشور کانپور، طبع جولائی ۱۸۸۴ء (دیوانِ دوم) ص ۱۷۷

۱۲ے بہ حوالہ زبان اور قواعد: رشید حسن خاں۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی طبع ۱۹۷۶ء ص ۲۸۴

۱۳ے ریاض البحر: بحر لکھنوی۔ مطبع مصطفائی (لکھنؤ طبع ۱۲۸۵ھ) ص ص ۸۴ تا ۸۵

۱۴ے بہ حوالہ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج: سید مسعود حسن ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۶۸ء ص ۴۲

۱۵ے ریاضِ لطافت: سید حسن لطافت۔ مطبع شوکت جعفری (گولہ گنج) لکھنؤ طبع ۱۳۰۵ھ ص ۱۴۰ تا ۱۴۱

۱۶ے بہ حوالہ: (۱) دیوانِ بے مثال: فصاحت لکھنوی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع مئی ۱۹۲۵ء ص ۴۹۴ (۲) لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ص ۲۲

۱۷ے دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی): مرتبہ مولانا عرشی طبع ۱۹۸۲ء متن ص ۴۰ نیز ص ۱۹۹

۱۸ے شاگردانِ انیس: ڈاکٹر مقام حسین جعفری۔ کراچی طبع نومبر ۱۹۷۹ء ص ۲۵۹

۱۹ے دیکھیے: (۱) انتخابِ نفیس: مرتبہ کاظم علی خاں۔ لکھنؤ طبع اپریل ۱۹۶۵ء
(۲) حیاتِ انیس: امجد علی اشہری۔ طبع ۱۹۰۷ء ص ۸
(۳) ماہِ نو کراچی انیس نمبر ۱۹۷۴ء ص ص ۸۱ تا ۸۲ (مقالہ ضمیر اختر نقوی)

۲۰ے دیکھیے: (۱) روحِ انیس: مرتبہ مسعود حسن ادیب طبع اول ص ص ۲۴۳، ۲۶۴، ۲ نیز ص ۲۵۶ (۲) انیس کے سلام: مرتبہ علی جواد زیدی۔ نئی دہلی طبع ۱۹۸۱ء ص ۷۷، نیز ص ۸۴ (۳) دیوانِ شرف۔ مطبع جعفری نخاس جدید لکھنؤ طبع اول مطبوعہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء ص ۳، ص ۱۸۱ نیز ص ۲۵۷

۲۱ے انتخابِ صبا: مرتبہ کاظم علی خاں۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۲ء ص ۵

۲۲ے بہ حوالہ مقالہ "تلامذۂ صبا لکھنوی" از کاظم علی خاں مشمولہ اکادمی لکھنؤ مئی ۱۹۸۲ء۔ ص ۱۳ نیز ص ۳۵۔

۲۳ے صبا لکھنوی کے دونوں اشعار رسالہ پیامِ یار لکھنؤ ماہ نومبر ۱۸۸۵ء ص ۷ سے ماخوذ ہیں۔

۲۴ے غنچۂ آرزو: میرزا وزیر علی صبا لکھنوی۔ مطبع محمدی لکھنؤ اول مطبوعہ ۲۵ رجب ۱۲۷۲ھ مطابق ۲ اپریل ۱۸۵۶ء) غزلیات ص ۱۵۳ نیز ص ۲۲۰

۲۵ے مثنوی افسانۂ لکھنؤ: آغا حجو شرف لکھنوی قلمی نسخہ محزونہ کتب خانہ سبطین آباد ٹرسٹ مٹیا برج کلکتہ مکتوبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ (مطابق جمعہ ۳۰ جنوری ۱۸۷۴ء) ص ۴

۲۶ے مہذب اللغات جلد ۱۳ ص ۱۵۹ میں لفظ "ناندھنا" (بہ معنی اختیار کرنا) کے متعلق قول فیصل میں بتایا گیا ہے کہ "اہلِ لکھنؤ نہیں بولتے۔ یہ دہلی کا صرفہ ہے"۔ آغا حجو شرف لکھنوی کا یہ مصرع اس قول کے علی الرغم اس لفظ کو لکھنؤ میں بھی مستعمل بتاتا ہے۔

۲۷ے بہ حوالہ شرحِ دیوانِ اردوے غالب: نظم طباطبائی لکھنؤ طبع ۱۹۶۱ء ص ص ۲۹۲ تا ۲۹۳

۲۸ے ماخذ میں یہاں "رات" ہے، شاید سہو کاتب ہو۔ "یار" قیاسی تصحیح۔

۲۹ے دیکھیے: (۱) عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی میرٹھ طبع اول مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) ص ۲
(۲) اردوے معلی (حصہ اول): غالب۔ اکمل المطابع دہلی طبع اول مطبوعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۵

۳۰ے مثنوی شکوہ فرنگ: مصنفہ آغا حجو شرف۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ لاہور طبع اول ص ص ۹۵ تا ۹۶

۳۱ے خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ: کاظم علی خاں۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ستمبر ۱۹۸۱ء ص ص ۲۴ تا ۲۵

۳۲ے گلدستۂ شعرا لکھنؤ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۶۰ء ص ۳

۳۳ے دیوانِ غالب۔ مطبع صدر مجلس لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۳۹

۳۴ے بہ حوالہ دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) طبع ۱۹۸۲ء متن ۲۳۸

۳۵ے شیعہ کالج میگزین لکھنؤ (بابت ۱۹۸۲ء): مرتبہ کاظم علی خاں ص ۵۶

۳۶ے کلیاتِ شیخ امام بخش ناسخ۔ مطبع محمدی لکھنؤ طبع اول مطبوعہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ (مطابق ۲۳ جنوری ۱۸۴۳ء) دیوانِ اول ص ۳

۳۷ے دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) ص ۲۹۵

۳۸ے بہ حوالہ سخن شعرا ص ۲۶۱

۳۹ے دیوانِ شہیدی: کرامت علی شہیدی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ طبع چہارم مطبوعہ نومبر ۱۹۱۳ء ص ۵۷ غزل نمبر ۱۴۲

۴۰ے لکھنؤ سے دیوانِ غالب پہلی بار کس سال چھپا تھا؟ یہ سوال تحقیق کا طالب ہے۔

۴۱ے خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ (نمبر ۷ نیز ۸) ص ۳

مظفر اعظمی

اٹھارہویں صدی میں اردو کے بعض ادبی رویّے

اردو ادب میں اٹھارہویں صدی بڑی اہم صدی ہے۔ اس میں کئی سنگ میل بنے اور اردو کی داخلی اور خارجی سطحوں پر کئی چھوٹے بڑے ادبی دائرے نمایاں ہوئے۔ قدروں کی شکست و ریخت اور مختلف ذہنی رویّوں کی آمیزش سے کئی شاخیں پھوٹیں۔ سماجی اور تہذیبی سطح پر ذہنی تضاد کا شکار افراد اور معاشرہ دونوں ہی تھے۔ ایک طرف سیاسی اور سماجی زوال اور اقتصادی بدحالی نے عوام اور خواص دونوں کو مایوس، بزدل اور تقدیر پرست بنا کر انہیں مسجدوں اور خانقاہوں کی طرف دھکیل دیا تھا تو دوسری طرف عیاشی، فحاشی اور پھکڑپن بھی تہذیبی علامت بن گئے تھے۔ رنڈی بازی اور امرد پرستی نہ صرف معیوب نہیں تھے بلکہ تمدنی مظاہر میں شامل تھے۔ مذہبیت اور اوباشی کا یہ ملاپ بڑا حیرت انگیز تھا۔ شاعروں کے لئے چھوٹے بڑے دربار ہی روزی روٹی کے وسیلے تھے اور ان درباروں میں بھی ہزل، فحاشی اور تمسخر کے بار پانے کے سبب شاعروں کے لئے اس میں بھی طاق ہونا ضروری تھا۔ درباروں کی ملازمت کے سلسلے میں نہ صرف مسابقت کا زور ہوا بلکہ دوسروں کے قد کو کم کر کے خود نمایاں ہونے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ انفرادی سطح پر ان کوششوں نے ہجو کی شکل اختیار کر لی۔ جس میں کہیں کہیں ذاتی رنجش اور چپقلش بھی شامل ہوتی تھی۔ ادبی معرکے انہی کوششوں کے رہنِ منت تھے۔ اجتماعی سطح پر یہ شہر آشوبوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس وقت کی اقتصادی بدحالی اور سیاسی ابتری کی سب سے نمایاں مثال خود دلّی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دلّی کا شاید ہی کوئی نامور شاعر ہو جس نے اپنے اور حالات کے بیان میں خون کے آنسو نہ روئے ہوں۔ شہر آشوبوں کی کثرت اس وقت کے ادبی رویّے کو ظاہر کرتی ہے۔ ان شہر آشوبوں میں جہاں ایک طرف بیان کی رقت اور حزن کی شدت ملتی ہے وہیں حالات کی ستم ظریفی کی کڑواہٹ اور تلخی بھی نمایاں ہے۔

شہر آشوب اور اس کی کثرت

شہر آشوب کی تعریف اگرچہ اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ "اردو کی کلاسیکی صنفِ سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے عوام و خواص کی بربادی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔"[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صنف سخن اپنے زمانے کے حالات کی پیداوار اور اٹھارہویں صدی کے اردو ادب کا اہم ادبی رویہ تھی۔ اس صنف کے مطالعے سے نہ صرف اس کے ادبی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس عہد کے شعراء کا انفرادی اور اجتماعی ماحول بھی سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً اس صنف کے سب سے پہلے اور منفرد انداز سے کہنے والے شاعر میر جعفر زٹلی کے شہر آشوبوں میں زٹلی کا اپنا مزاج اور ماحول اور اس عہد کی اجتماعی فضا گھل مل کر سامنے

● شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں توی ۱۸۰۰۰۱

[1] شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، از ڈاکٹر نعیم احمد ص ۳۶

آتی ہے۔

نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اُتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دَور آیا ہے

ہنرمندان ہرجائی پھریں در در بہ رسوائی
رجل قومے کی بن آئی، عجب یہ دَور آیا ہے

ناجی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں" اس وقت دربار دہلی کا رنگ شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور نازپروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔"[1] اس نظم کے صرف دو بند ملتے ہیں مگر کیفیت کے اعتبار سے یہی اس وقت کی دلّی کی سیاسی اور معاشی صورت حال کا بھرپور آئینہ ہیں۔

لڑے ہوئے نہ برس بیں ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلائی تال
قضا سے بچ گیا، مرنا نہیں تو سٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکان نہ غلّہ و بقال[2]

درگاہ قلی خاں، شیخ ظہور الدین حاتم، اشرف علی فغاں اور قیام الدین قائم وغیرہ نے مختلف ہیئتوں میں جو شہرآشوب لکھے ہیں وہ بھی اسی خاص رویّے کے غمّاز اور اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ مثلاً قائم کے مخمس کے یہ دو بند دیکھیے۔

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
یعنی ایک آپ ساتھ لٹیری سپاہ ہے
ناموس خلق سایہ میں اس کی تباہ ہے

شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِ الٰہ ہے
دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا
کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلہ
دول دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن اون کا ترا عذرخواہ ہے

رنگین کی مثنوی جو اصل میں شہرآشوب ہے۔ اس میں ایک درجن پیشوں اور ان پیشے والوں کی بدحالی کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح سودا نے جو چار شہرآشوب لکھے ہیں۔ وہ اس عہد کے ہندوستان کی سماجی پستی اور معاشی بدحالی کی دستاویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک مخمس، دوسرا قصیدے کی صورت میں تیسرا مثنوی اور چوتھا قطعات کی شکل میں ہے۔ مخمس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ دے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے ہے جو ہم ایسے چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

میر تقی میر کے شہرآشوب میں ان کے مخصوص انداز کے ساتھ ساتھ پستیِ حالات کا زہر بھی گھلا ہوا ہے۔

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اِک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش
چار رکھے ہیں مستعدِ کار

دس تلنگے جو ہوں تو ہو دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار

لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار
سو بھی قند سیاہ ہے یا ماش

جرأت اور نظیر اکبرآبادی نے بھی شہرآشوب لکھے۔ نظیر کے ایک شہرآشوب کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

حجام پر بھی یاں نہیں ہے مفلسی کا زور
پیسہ کہاں جو سان پہ ہوا استروں کا شور

---

[1] آبحیات، ص ۱۰۵ [2] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۵۸

کاپنے ہے سر سگوتے ہوئے اس کی پور پور
کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے نور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند

اسی طرح مختلف اور شاعروں نے بھی جن میں بہار کے شاہ آیت اللہ جوہری اور راسخ عظیم آبادی لکھنؤ کے میر یار علی جان اور طالب علی عیشی اور اورنگ آباد کے لچھمی نرائن شفیق وغیرہ شامل ہیں اس عہد کے ماحول اور افراتفری کی عکاسی کے ذریعے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ شہر آشوبوں کا یہ سلسلہ غلام حسین ہدایت، حکیم کبیر احمد کبیر، جعفر علی حسرت، شاہ کمال الدین کمال، میر احسان علی خاں احسان، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، محمد جعفر خاں راغب، میاں حاجی تجلی، بہادر شاہ ظفر، امان علی سحر اور مرزا محمد رضا برق وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے۔

اگرچہ ان میں سے کچھ ۱۹ ویں صدی کے نصف اول کے بھی شاعر ہیں مگر 'غدر' کے سلسلے میں 'فغان دہلی' اور دوسری نظموں سے بھی اس رویّے کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مراختے اور مشاعرے

اٹھارہویں صدی میں چھاپہ خانوں کے نہ ہونے کے سبب شعرا کے پاس مشاعروں، ادبی محفلوں اور نجی نشستوں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا جس کے واسطے سے وہ اپنا کلام دوسروں تک پہنچاتے۔ ابتدا میں یہ اگرچہ محدود تھے مگر شعرا اور ان کے شاگردوں کی بتدریج کثرت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔ یہ جہاں ادبی صلاحیت اور استعداد کے اظہار کا میدان تھے وہیں گرمی محفل، لطف صحبت اور انبساط خاطر کا ذریعہ بھی تھے۔ شروع میں مبتدی شعرا پڑھنے کی ہمت بھی نہیں کر پاتے تھے۔ اس لیے کہ ان صحبتوں میں داد و تحسین کے ساتھ ساتھ تنقید و تنقیص بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس سے یہ ہوا کہ ایک طرف تو بغیر کسی استاد کے کسی شاعر کا گزارا مشکل تھا دوسری طرف شاعروں کو نہ صرف اپنی اصلاح کا موقعہ ملتا بلکہ وہ ان محفلوں میں بغیر اچھی تیاری کے شرکت بھی نہ کرتے۔ کبھی کبھار یہی مشاعرے مناظروں اور مجادلوں کی شکل بھی اختیار کر لیتے۔ اس طرح ان مشاعروں نے دو اہم صورتیں پیدا کیں۔ ایک یہ کہ استادی شاگردی کے رشتے کو اتنا ضروری قرار دے دیا کہ وہ ایک ادارہ بن گیا اور بہت سے بڑے شاعروں نے اپنے دبستان قائم کر دیے۔ دوسرے جب یہ درباروں اور دیوان خانوں سے گزر کر عوامی ربط میں آیا تو اردو کلچر کی اہم علامت بن گیا۔

دراصل درباروں میں مختلف شعرا کی قصیدہ خوانی، مسابقت اور ممدوح کی خوشی حاصل کرنے کی خاطر اپنی بھرپور صلاحیتوں کے اظہار اور پھر ایک دوسرے پر فقرے چست کرنے، جواب سننے اور جواب دینے کی روایت نے مشاعروں کی صورت گری کی جس سے ادبی معرکوں کی بھی شاخ پھوٹی۔ عہد مغلیہ کے مشاعروں کی روایت کے سلسلے میں اپنے مقالے میں ا۔ و۔ نسیم صاحب کا کہنا ہے کہ "اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں کے درباروں میں ایرانی اور دیسی علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کی مجالس کا رنگ شاہانہ ہوا کرتا تھا۔ مغلیہ دربار کے فارسی شعرا کے حالات و کوائف پر مشتمل تذکروں میں دہلی کی شاعرانہ مجالس کا کئی جگہ ذکر ملتا ہے۔ مولف تذکرۂ حسینی نے نواب ظفر خاں امیر عہد شاہجہانی کے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں مرزا صائب، ابوطالب کلیم، مرزا محمد ابراہیم فارغ جیسے عظیم المرتبت فارسی شاعر شریک ہوتے تھے۔ مرزا محمد افضل نے تذکرۂ کلمات الشعراء میں قطب الدین مائل اور دانش مند خاں کے مشاعروں کا حال لکھا ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے تذکرہ مجمع النفائس اور لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرۂ گل رعنا میں فارسی مشاعروں کی بعض کلی اور جزوی مجلسوں کا ذکر کئی جگہ کیا ہے۔ جن میں سے عرس مرزا عبدالقادر بیدل، مجلس میر افضل ثابت اور مرزا عبدالقادر وابستہ کے مشاعرے تو محمد شاہی عہد تک بڑے آب و تاب کے ساتھ ہوتے تھے۔"[1]

عہد محمد شاہ میں جب ریختہ گوئی کا رجحان بڑھا اور فارسیت کی تحریک کے زیر اثر اردو کی صورت نکھری تو شاعروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرے بھی زیادہ ہونے لگے۔ اور چونکہ اس وقت اردو کو عموماً ریختہ ہی کہتے تھے ساتھ ہی فارسی مشاعروں سے ان کو ممیز کرنے کے لئے بھی ایسی محفلوں کو 'مراختہ' کہنے لگے۔ دلی کے مراختے عموماً نجی مجلسیں ہوتی تھیں جو مختلف بزرگوں کے گھروں، تکیوں یا خانقاہوں میں برپا ہوتی تھیں تکیہ شاہ بادل اور شاہ تسلیم کے تکیے کا ذکر مختلف تذکروں میں

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، ساتویں جلد، طبع اول لاہور ۱۹۷۱ء ص۱۵

ملتا ہے شاہ تسلیم کے تکیے میں شاہ ظہورالدین حاتم اوران کے شاگرد اکٹھا ہوتے تھے جہاں شعر و شاعری کا ذکر چلتا۔ ان میں رنگین اور مصحفی کی بھی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ اس عہد میں مختلف مراختوں اور مشاعروں کا ذکر مختلف اہلِ علم نے کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے بقول "دربار کے باہر بھی ایک مخصوص اور منفرد تہذیبی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ یہ فضا دربار کی دست نگر نہ تھی اور اس فضا کی تشکیل، تزئین و ترویج میں اس دور کے شہری عوام کا ہاتھ تھا۔ اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ میلے ٹھیلے، مشاعرے، مراختے، خانقاہیں، عرس اور قوالیاں ان میں سے کوئی بھی ایسا ادارہ نہ تھا جو دربار کا مرہونِ منت ہو" عہ۱

مشاعروں اور مراختوں میں غیر شاعروں کی شرکت مشکوک ہے البتہ خانقاہوں، تکیوں اور عرسوں میں شاعروں کے علاوہ عوام کی شرکت بھی ہوتی ہوگی۔

مختلف تذکروں میں گھروں میں ہونے والے مراختوں کا ذکر ملتا ہے۔ میر تقی میر نے نکات الشعرا، میں اپنے اور خواجہ میر درد کے گھروں میں ہونے والے مراختوں کا تذکرہ کیا ہے عہ۲ خواجہ میر درد کے گھر کے مراختے کا ذکر احد علی یکتا اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے بھی کیا ہے۔ 'ریاض الفصحا' میں مصحفی جعفر کے بیان میں کہتے ہیں۔

"پسر کلاں ایں بزرگ مجلس مشاعرہ ترتیب دادہ، نظم ریختہ خود را بہ سمع مبارک اشاں می رسانید" عہ۳ محمد داؤد رہبر صاحب نے اپنے مضمون "مشاعرے کا ارتقا" عہ۴ میں دلی کے تقریباً دس اجتماعی مراختوں کا ذکر کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔ مراختے مشاعرے ہو گئے تھے دلی کے علاوہ لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کا مشاعرہ، مشاعرہ رضا علی بیگ آشفتہ، مشاعرہ مرزا حیدر علی، مشاعرہ حسین علی خاں اثر، مشاعرہ لالہ موتی لال، مشاعرہ قمر اللہ قمر، مشاعرہ مرزا جعفر، مشاعرہ نواب آغا میر، مشاعرہ سید محمد رند وغیرہ مشہور مشاعرے تھے جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور دوسرے شہروں میں اسی طرح کے مشاعرے ہونے لگے۔ اس طرح سے مشاعروں نے کم و بیش ایک رجحان کی صورت اختیار کرلی۔

بیاض اور تذکرے

اس صدی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اسی زمانے میں اُستادانِ فن نے شاعروں کے جواہر ریزوں کو محفوظ اور باقی رکھنے کے لئے پہلے اپنی بیاضوں میں ان کو درج کیا اور ترتیب و تدوین کے ذریعہ اور شعرا کے حالات کا اضافہ کر کے انہی سے تذکروں کو رواج دیا۔

تذکرہ عربی لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں یادداشت، نصیحت اور دستاویز وغیرہ کے۔ اصطلاح میں اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں شعرا کے مختصر حالات اور ان کا مختصر کلام درج کیا گیا ہو۔ یہ اصطلاح گیارہویں صدی ہجری میں فارسی ادیبوں نے استعمال کی۔ شیخ فریدالدین عطار کی تصنیف 'تذکرۃ الاولیا'، اسی مفہوم میں سب سے پہلے استعمال کیا گیا۔ دولت شاہ سمرقندی کا تذکرہ، 'تذکرۃ الشعرا' پہلا دستیاب فارسی تذکرہ ہے جو ۱۴۸۷ء بمطابق ۸۹۲ھ میں مرتب ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولوی عبدالحق نے میر کے 'نکات الشعرا' کو اردو کا سب سے پہلا تذکرہ کہا ہے۔ جو ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے۔ اسی سال حمید اورنگ آبادی کا 'گلشن گفتار'، بھی تصنیف ہوا۔ مخزنِ نکات از قایم، تذکرہ ریختہ گویاں، از فتح علی گر   ، تذکرہ ہندی از عنایت اللہ فتوت اور تذکرۂ خاکسار اردو کے ابتدائی تذکرے ہیں جو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں مرتب ہوئے۔ ان کی تعداد بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۸ویں صدی کے ختم اور ۱۹ویں صدی کی ابتدا تک اور بھی بہت سے تذکرے سامنے آگئے۔ جن میں تذکرہ شعرائے اردو، از میر حسن، تذکرۂ ہندی اور 'ریاض الفصحا'، از مصحفی، طبقات الشعرا، از قدرت اللہ شوق، گلشن بے خار، از شیفتہ، چمنستانِ شعرا از لچھمی نرائن شفیق اور عمدۂ منتخبہ، از اعظم الدولہ سرور اہم تذکرے ہیں۔ ۱۹ویں صدی میں بھی کئی اہم تذکرے لکھے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین سو سے اوپر ہو گئی۔ ان کے لکھنے میں شاعر اور شعر کی حفاظت کے علاوہ اور بھی کئی جذبے کارفرما تھے۔ کسی تذکرے میں کسی کی تنقیص کے جواب میں دوسرا تذکرہ لکھا گیا اور اس میں پہلے کے محبوب شعرا کی تنقید و تنقیص کی گئی۔ کہیں کسی خاص علاقے کے شعرا کے

عہ۱ 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر'، ص۲۹
عہ۲ 'نکات الشعرا'، ص۱۰ : عہ۳ 'ریاض الفصحا'، ص۶۹
عہ۴ ملاحظہ ہو "مشاعرے کا ارتقا" از محمد داؤد رہبر مشمولہ رسالہ 'اردو' اپریل ۱۹۴۵ء جلد ۲۵ شمارہ ۲ ص ۱۲۷

کرشن شرما

اُودے سنگھ شائق

اُودے سنگھ شائق

آزادی سے قبل کے متحدہ پنجاب کے مایۂ ناز اردو شاعر سردار اودے سنگھ شائق گزشتہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُنہوں نے ۹۲ سال کی عمر پائی۔

آج کل بہت کم لوگ اودے سنگھ شائق کے نام سے واقف ہوں گے۔ لیکن اگلے وقتوں کے لوگ اُنہیں نہیں بھول سکتے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، ہری چند اختر، حفیظ جالندھری، پنڈت میلا رام وفا، مولانا عبد المجید سالک، راج نرائن ارمان دہلوی، محمد دین تاثیر کے سلسلۂ شعراء کی آخری کڑی شائق تھے۔ دیکھیے، ممتاز شعراء ان کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں:

"اگر کسی کو سکھ قوم کی اردو شاعری سے انکار ہو تو وہ
اودے سنگھ شائق کا کلام دیکھے۔"

مولانا تاجور نجیب آبادی

"پنجاب میں دو تین ہی سکھ اردو شاعر ایسے ہیں، جن
کی خوش بیانی، تر زبانی اور ریختہ گوئی اردو ادب
کے لیے مایۂ ناز ہے۔ ان میں سے ایک مشفقی شائق
ہیں۔"

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

"نواب اثر لکھنوی نے (ایک خصوصی ملاقات میں)
شائق کا کلام سن کر فرمایا کہ پنجاب میں آپ کا دم غنیمت
ہے۔ رات کو مشاعرہ میں بھی اثر صاحب جھوم جھوم کر
شائق کے اشعار پر داد دیتے رہے۔"

منشی تلوک چند محروم

کسی شاعر کی قادر الکلامی کے متعلق اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن ان کہنہ مشق شعراء کے خراجِ تحسین میں اُودے سنگھ کے جوانی کے دنوں کے اُس واقعے کا ذکر نہیں آیا جب اُنہوں نے لاہور کے ایک جلسۂ عام میں علامہ اقبال کے کلام پر تنقید کی تھی۔ یہ قصہ تقسیم وطن سے بیس پچیس برس پہلے کا ہے۔ ان دنوں لاہور کے ادبی حلقوں میں شائق کا بڑا نام تھا۔ وہاں سرکلر روڈ پر شہر کے لاہوری اور موری دروازوں کے درمیان "ایس پی ایس کے (S.P.S.K.) ہال ہوا کرتا تھا (یہ نام میری واقفیت کے مطابق Society for Promotion of Scientific Knowledge کا مخفف تھا) جو ادبی مجلسوں کے لئے مشہور تھا۔ اقبال کی شاعری پر تنقید اودے سنگھ نے اسی ہال میں کی تھی۔ جلسے میں سر عبد القادر موجود تھے اور اقبال بھی بہ نفسِ نفیس تشریف رکھتے تھے۔ ان دونوں حضرات کا پنجاب میں اور خصوصاً لاہور میں بڑا شہرہ تھا۔ لاہور کالجوں کا شہر کہلاتا تھا۔ اور کالجوں کے طلباء کو اقبال کے ترنم نے لوٹ لیا تھا۔ چنانچہ اودے سنگھ نے اپنی تقریر کے آغاز ہی میں کہا کہ کلامِ اقبال پر تنقید کرنا بڑا کٹھن اور جوکھم کا کام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس جلسے میں بیشتر حاضری کالج کے طلباء کی ہے جو ایک ہاتھ میں "بانگِ درا" اور دوسرے میں مولا بخش یعنی ڈنڈا لے کر آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یا تو اس یعنی بانگِ درا پر ایمان لاؤ ورنہ یہ (یعنی ڈنڈا) موجود ہے۔ اس تمہید سے جلسے کا رنگ جم گیا تھا۔

اس کے بعد شائق نے اپنی تنقید شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ اودے سنگھ کی تقریر بڑی مدلل اور اقبال کے کلام کے محاسن اور خامیوں کی امثال سے پُر تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اقبال کے خیالات نہایت بلند اور فلسفۂ حیات بڑا عمیق ہے، لیکن ان کی زبان بڑی خام ہے۔ اردو فارسی محاورے پر

ای-۶۸- مارگ ۱۶، ساکیت، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ان کی گرفت کمزور ہے۔ اقبال کے معائب گنواتے ہوئے شائق نے مثالیں
پیش کیں اور کہا کہ اقبال اپنی نظم "رات اور شاعر" میں لکھتے ہیں ؎

دریا کی تہہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے

اس میں شاعر نے ایک اچھوتی تشبیہ پیش کی ہے۔ بھنور کو چشمِ گرداب قرار دیا ہے جو سطحِ آب سے نشیب میں چلا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ع دریا کی تہہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے۔ لیکن زبان کے اعتبار سے آنکھ لگنا تو محاورہ ہے۔ 'چشم سونا' کوئی محاورہ نہیں ہے۔ نہ جانے اقبال نے چشم سونا کی ترکیب کہاں سے نکال لی ہے!

تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے شائق نے کہا کہ اپنی نظم 'شمع' میں اقبال نے پہلے یہ مطلع کہا ؎

تیری طرح سے میں بھی ہوں اے شمع دردمند
فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند

اس میں زبان کا نقص بیان کرتے ہوئے شائق نے کہا کہ 'طرح' کے بعد 'سے' لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ 'تیری طرح' ہی کافی ہے۔ شاعر نے محض وزن پورا کرنے کے لیے 'تیری طرح سے' لکھ دیا ہے (بعدازاں اقبال نے مصرعِ اول کو بدل کر یوں کر دیا:

بزمِ جہاں میں، میں بھی ہوں اے شمع دردمند

اور 'بانگِ درا' میں یہ مصرع اسی تبدیلی کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ لیکن ۱۹۷۳ء میں ایک ملاقات کے دوران سردار اودے سنگھ نے مجھ سے کہا کہ اس ترمیم کے بعد شعر میں وہ پہلے جیسا مزہ نہ رہا، جہاں شاعر شمع سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ جس طرح تو دردمند ہے اسی طرح میں بھی دردمند ہوں)

اسی طرح 'رات اور شاعر' میں رات شاعر سے کہتی ہے۔ ؎

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورتِ گل، مانندِ بو پریشاں

شائق نے کہا کہ رات نے چاندنی کو "میری" کیسے بنا لیا؟ چاندنی تو چاند کی ہوتی ہے نہ کہ رات کی۔

اس پر اقبال نے اٹھ کر کہا تھا کہ سردار صاحب! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ بات مجھے ایک بزرگ نے بتائی تھی جو جلسے میں موجود تھے۔

آگے چل کر شائق نے کہا کہ 'دریوزۂ خلافت' والی نظم میں بے وفائی۔ گدائی کے قوافی کے ساتھ بادشاہی کا قافیہ ملا دیا گیا ہے۔ 'خلافت کی کرنے لگا تو گدائی' اور 'مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی' بعدازاں اقبال نے بادشاہی کو بدل کر پادشائی کر دیا۔ حالانکہ پادشائی کوئی لفظ نہیں ہے، اصل لفظ بادشاہی ہے۔

لاہور کے اس واقعے کا ذکر بھی میں نے اپنے خاندان کے ایک اردو دوست بزرگ سے سنا تھا جو ان دنوں خود لاہور میں موجود تھے۔ لیکن اس تنقید سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اودے سنگھ کو اقبال سے کوئی مخاصمت تھی بلکہ جن دنوں (۱۹۱۰ء میں) اودے سنگھ ایف۔سی کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ شیخ محمد اقبال کی عقابی نظر نے اس ہونہار طالب علم کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا اور ایک انٹر کالج مشاعرہ میں ان کی غزل کو اول ٹھہرایا تھا۔ شائق کے لیے اس سے بڑھ کر کیا حوصلہ افزائی ہو سکتی تھی کہ حکیم مشرق ان کے کلام کو پسند کرے۔ انہیں جس غزل پر اول انعام دیا گیا اس کا مطلع تھا: ؎

زاہدانِ خشک بھی ہیں رونقِ میخانہ آج
دیکھیے تر دامنوں تک آئے کب پیمانہ آج

اس واقعہ سے اقبال اور شائق کے باہمی تعلقات کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ کئی سال تک جاری رہا۔ علامہ کے سامنے حاضری سے شائق جو فیضان حاصل کرتے رہے اسے تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

ہے یہ سب علامہ اقبال کی صحبت کا فیض
ورنہ مجھ کو اپنا اندازِ بیاں معلوم ہے

سردار اودے سنگھ میرے والد کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ اور وکیل ہونے کے ناطے دونوں کے باہمی تعلقات بہت گہرے تھے شائق کا شمار فیروزپور کے شرفا میں تھا، جہاں انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ذہن میں یہ تاثر بیٹھ جاتا تھا کہ ع

آدمی خوش وضع، خوش اوقات، خوش پوشاک ہے

اودے سنگھ ۱۸۹۵ء میں سابقہ ریاست فریدکوٹ کے ممتاز و مکرم مہاجاتی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سردار نرائن سنگھ تھا، جو اپنے وقت کے آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مراد علی شاہ مراد سے حاصل کی جو پنجابی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ انہیں کی دیکھا دیکھی اودے سنگھ کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف ہونے لگا اور لاہور میں کالج کے زمانے میں آپ اچھے شعر کہنے لگے۔ ذیل کا دلنواز شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ؎

مآلِ گل پہ تو گریاں ہے قطرۂ شبنم
مآلِ قطرۂ شبنم پہ اشکبار ہوں میں

لاہور ہی میں شائق کی ملاقات پنڈت میلا رام وفا سے ہوئی۔ انہی

دنوں لاہور میں مولانا تاجور نجیب آبادی دیال سنگھ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے۔ ایک مشاعرے میں مولانا کو شائق کی ایک نظم "شاعر اور دیوانے کا مکالمہ" اس قدر پسند آئی کہ آپ انہیں تلاش کرتے کرتے ہوسٹل جا پہنچے اور شائق سے نظم حاصل کر کے رسالہ مخزن میں شائع کی، جس کی ادارت ان دنوں آپ کے ہاتھوں میں تھی۔

شائق کو لوگ "اتحادِ ثلاثہ والے" بھی کہتے تھے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب تاجور، شائق اور وفا کے باہمی تعلقات بڑھے تو انہوں نے سخنور اور سخن سنج حضرات کو یکجا کرنے کے لیے انجمن ارباب علم پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کی ادبی خدمات کو اپنے ایک مضمون میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سر عبدالقادر نے علامہ تاجور (مسلمان) سردار اودے سنگھ شائق (سکھ) اور پنڈت میلا رام وفا (ہندو) کی رفاقت کو "اتحادِ ثلاثہ" کا نام دیا۔

بعدازاں ۱۹۲۱ء میں شائق کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں 'لسان الاعجاز' کا خطاب بھی دیا گیا۔

حالانکہ شائق لاء کالج لاہور سے بی اے ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد فیروزپور واپس آگئے تھے۔ لیکن تعطیل کے روز لاہور جا کر اقبال سے مل آتے تھے۔ غالباً اسی میل جول کا اثر ہے کہ شائق کے مجموعہ کلام میں ان بحور و قوافی میں بھی غزلیں ملتی ہیں جن میں کہ اقبال مستند غزلیں فرما چکے ہیں۔ مثلاً شائق کہتے ہیں ؎

نہ کر برباد اے برقِ تپاں کچھ اور مہلت دے
ابھی ہم نے ادا کرنی ہے رسمِ آشیاں بندی
خراباتِ محبت میں مئے الہام پیتا ہوں
مرے ساغر کی لہروں سے ابھرتی ہے خداوندی
زمانہ آگیا شائق بزرگوں سے بغاوت کا
کہاں اب ابنِ آدم کی رگوں میں خونِ فرزندی

(آخری شعر میں حالاتِ حاضرہ کا کیسا عمدہ نقشہ کھینچا ہے)

یا پھر: ؎

یہ میری ضبط کوشی سعیٔ لاحاصل نہ بن جائے
نظر اس انجمن میں داستانِ دل نہ بن جائے
نشیمن پھونک دے لیکن نشیمن پھونکنے والے
جنوں پختہ نہ ہو جائے جنوں کامل نہ بن جائے

شائق لاہور کے 'اردو مرکز' کے بھی سرگرم کارکن رہے، جسے مولانا تاجور نے فروغِ اردو کی خاطر قائم کیا تھا۔ الٰہ چھایا پبلشر تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑی رقم بینک میں اس غرض سے جمع کرا دی تھی کہ مرثیۂ بہادر [illegible] سیاسی نظموں اور غزلوں کے مجموعے تیار کرائے جائیں۔ اس غرض سے [illegible] جگر، اصغر گونڈوی، یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ شعراء کو لاہور میں بلوایا گیا۔ "اردو مرکز" نے ۴۳ کتابیں شائع کیں۔

شائق کی زندگی کا ناقابلِ فراموش کارنامہ امرتسر میں ۱۹۴۳ء میں ایک ایسا مشاعرہ منعقد کرانا تھا، جس کی نظیر آج تک پنجاب تو کیا ہندوستان بھر میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان دنوں اودے سنگھ سرکاری وکیل تھے۔ اس یادگاری مشاعرے نے مغلیہ عہد کے شاہی مشاعروں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہی شان و شوکت وہی آرائش و زیبائش وہی شعراء کا ایشیائی لباس و نشست حتیٰ کہ ڈپٹی کمشنر مسٹر ہینڈرل مون بھی کھڑا بی اچکن اور سلمی ستارے والی جوتی پہن کر مشاعرے میں آئے تھے۔ سر عبدالقادر چیف جج عدالتِ عالیہ لاہور صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تمثیلی طور پر شمع بھی گردش کر رہی تھی۔ شاعر جب مائیکروفون کے سامنے اپنا کلام سناتا تھا تو حاضرین کی داد کے موقع پر اس پر پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔

شائق نے کم و بیش پچھتر برس تک مشقِ سخن کی۔ ان کا مجموعۂ کلام "حیرت کدہ" کے عنوان سے ۱۹۶۸ء میں چھپ گیا تھا، جو میرے سامنے ہے۔ اب سنا ہے کہ دوسرا مجموعہ بھی منظرِ عام پر آگیا ہے۔ ان کا کلام بڑی دلآویزی شان اور عظمت کا حامل ہے۔ پامال زمینوں میں عمدہ شعر نکالنا ان کا خاصہ ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر تو بے حد مشہور ہے، ؎

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی زمین میں حالی نے کہا تھا ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اور پھر آغا حشر کاشمیری کا یہ بے مثل شعر ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اب اسی ردیف و قافیہ میں شائق کے اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

اٹھنے لگے ہیں ہاتھ مرے پھر دعا کے بعد
کوئی خدا ہے اور بھی شاید خدا کے بعد
ہر اک سے پوچھتا ہوں محبت کی راہ میں
ہے اور راہزن بھی کوئی رہنما کے بعد
ہم نے تو اے خدا تری دنیا بھی دیکھ لی
کیا اور بھی سزا ہے کوئی اس سزا کے بعد

بیگم اختر کی گائی ہوئی اس غزل : ع
اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا
کی زمین میں شائق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قطرے شبنم کے تو گریاں ہیں مآلِ گل پر
مجھ کو ان قطروں کے انجام پہ رونا آیا

دیکھ کر رہبرِ منزل کو سراسر گمراہ
رہروِ عشق کو ہر گام پہ رونا آیا

آج پھر مست گھٹا جھوم کے اٹھی شاید
کہ مجھے اپنے ہی جام پہ رونا آیا

معلوم ہوتا ہے شائق شروع ہی سے سمجھ گئے تھے کہ شعر وہی ہے جو دلوں پر راست اثر کرے۔ چنانچہ ان کا کوئی شعر دقیق و گنجلک نہیں۔ ان کا کلام سہل نگاری کا مرقع ہے:

کوئی کافر ادا جب ناز سے آئے گا محفل میں
لرزتا کانپتا ایمانِ یزداں کون دیکھے گا

کوئی دیکھے مرا حسنِ عقیدت بزمِ ساقی میں
لگا لیتا ہوں آنکھوں سے جو لب تک جام آتا ہے

بےخودی میں کوئی آواز تو سنتا ہوں ضرور
دیکھتا ہوں تو کوئی صاحبِ آواز نہیں

دونوں جہان چھان چکا ذوقِ جستجو
لیکن نہ کھل سکا وہ کہاں ہے کہاں نہیں

شائق جہاں نہ دیر و حرم میں ہو امتیاز
اُس دہر کی تلاش کیے جا رہا ہوں میں

جن کے نیازِ فکر نے توڑا غرورِ سروری
ایسے بھی ہیں کئی گدا ایسے بھی ہیں کئی فقیر

بھری بہار میں یہ اتفاق تو دیکھو
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

مری زباں پہ شائق ہے خلق کی آواز   خدا کرے کہ یہ آواز کوئی پہچانے

جہاں ہیں کاشفِ اسرار ہیں فقط ہم لوگ
سنو گے راز کی باتیں نہ پھر زمانے میں

سفرِ عشق کا درمیاں چھوڑ آئے
بہت سخت تھا امتحاں چھوڑ آئے

مصرعِ ثانی کی ردیف خود بولتی ہے:

ہمیں تو چمن کی بس اتنی خبر ہے
کہ جلتا ہوا آشیاں چھوڑ آئے

اس شعر کا گداز ان لوگوں سے پوچھیے جو ۱۹۴۷ء میں اپنا گھر بار نذرِ آتش ہوتا دیکھ کر ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تھے۔

دل میں طوفان تھے وہ آئے تو آنسو نہ گرا
ایک قطرے کو میں ترسا کیا دریا ہو کر

ہماری موت کی جھوٹی خبر اڑی شاید
ادھر سے آج وہ کچھ سوگوار سے گزرے

جمالِ دہر کے جلوے جو سامنے آئے
مری نگاہ پہ کچھ ناگوار سے گزرے

خمریات پر چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہاں ترا وعظ بھی سنتا ہوں مگر اے واعظ
آ ذرا پہلے پلا کر تجھے انساں کر لوں

صراحی سے ذرا دو گھونٹ پی کر شیخ فرمائیں
کہ جنت بادہ خواروں کی ہے یا پرہیزگاروں کی

گردِ آلام جو دل پر مرے جم جاتی ہے
آبِ انگور سے ہر شام کو دھو لیتا ہوں

آ گئے ہیں کسی مسجد میں بہک کر شاید
لب پہ آنے لگا اللہ کا نام اے ساقی
آ کہ پی کر کریں تعمیر کوئی تازہ بہشت
باغِ جنت تو ہے اک کہنہ مقام اے ساقی
جس سے شائق کو میسر ہو مقامِ حافظ
تیرے قربان عطا ہو وہی جام اے ساقی

(آگے شکریہ)
نومبر ۱۹۷۸ء

خطِ شاعر :

غزل

روشنی کی جھیل سے جب پر فشاں نکلے گی دھوپ
سارے منظر میں نئی رنگینیاں بھر دے گی دھوپ

نیم کی شاخوں پہ بیٹھی پر سکھاتی ہے ابھی
اک ذرا سا دن چڑھے تو چھت میں اترے گی دھوپ

کھل اٹھیں گے مست ہو کر ہر طرف بیلے کے پھول
جب حسیں کلیوں کو آ کر پیار سے چومے گی دھوپ

بوڑھے پرندے، گھنی چھاؤں میں رک کر تھوڑی دیر
زندگی کے فلسفے پر روشنی ڈالے گی دھوپ

سرد موسم میں، دلوں کو گدگداتی ہے مگر
گرمیوں کی دوپہر میں کاٹنے دوڑے گی دھوپ

جب تلک چاہت کا موسم ہے منالے جشن تو
ورنہ ویران جھونپڑوں کے لمس کو ترسے گی دھوپ

ہے یقیں ٹوٹے گا اک دن تیرگی کا یہ طلسم
قریۂ جاں میں بھی شاہین ایک دن چمکے گی دھوپ

شاہین سہرامی

شاہین سہرامی

"سارا"

نسیم سیّد

یہ شب و روز جو گزرے میرے ہوٹل[۱] ڈیو میں
کتنے بھرپور ہیں سب ان گنت افسانوں سے
کتنی ویرانی ہے، تنہائی ہے، خاموشی ہے
صرف آتی ہے صدا موت کے ویرانوں سے

یوں تو ادراک میں محفوظ ہیں کتنے ہی نقوش
پر وہ خاموش حزیں سوچتی حیراں آنکھیں
زرد چہرہ تنِ تنہا سادہ بیمار وجود
ایک ہی غم مرے اپنے مجھے قرباں دیکھیں

یہ وہ "سارا" تھی مقید تھی جو ہوٹل ڈیو میں
نام "سارا" تھا، تو معصوم تھی مریم کی طرح
خون روتی ہوئی آنکھوں میں تھا بس ایک سوال
کوئی تو آکے ملے مجھ سے بھی ہمدم کی طرح

اس کے بستر کے تھیں اطراف کئی تصویریں
باپ کی، ماں کی، بہن بھائی کی اور جیکی[۲] کی
اُس کا کہنا تھا اسی شہر میں سب رہتے ہیں
پر کسی نے بھی نہ آنے کی کبھی نیکی کی

صبح کو آس کہ شام آئے، تو آئے گا کوئی
شام کو دُکھ ۔ کہ، نہیں کوئی نہیں آئے گا
کس کو معلوم ہے تنہائی کے پتھراؤ کی چوٹ
کب تلک کتبوں سے رشتہ کوئی رکھ پائے گا

راہ تکتے یونہی پتھرا گئیں اُس کی آنکھیں
منتظر آنکھ کواڑوں سے مگر اٹکی تھی
زندگی بھر نہ کبھی ڈھونڈ سکی اپنا پتہ
اپنی تنہائی کے ویرانے میں یوں بھٹکی تھی

کتنی سارا ہیں مرے شہر کے ہوٹل ڈیو میں
ہر گھڑی جو کسی آہٹ کی دُعا کرتی ہیں
رات دن زندگی و موت کے دوراہے پر
ٹھنڈے ویران و راندے کو تکا کرتی ہیں

سانس اس آس سے آتی ہے کہ شاید کبھی دن
کوئی آجائے، سنبھالے، کہے تم کیسی ہو
کوئی پوچھے کہ بدن کی ہے کہ یادوں کی جلن
خود کو کس وجہ سے ہلکان کیے لیتی ہو

سوچتے سوچتے ٹھنڈک سی اُتر آتی ہے
ڈھونڈتے ڈھونڈتے جھک جاتی ہیں نظریں مغموم
ٹوٹتے ٹوٹتے ہر سانس بکھر جاتی ہے
ڈوبتے ڈوبتے ہو جاتی ہیں نبضیں معدوم

کسی سفاک تمدن کی حقیقت بن کر
یہ وہ رُوحیں ہیں جو جسموں میں اُتر آتی ہیں
اور پھر سلسلہ در سلسلہ ہوتا ہے یونہی
کتنی "سارا" یونہی تاریخ کو دُہراتی ہیں

[۱] اسپتال کا نام [۲] کتے کا نام

606-Counter Street
Kingston, Ontario
KANADA K7M 3L6

جینت پرمار

چاند تاروں کو سلامت رکھنا
خواب گاہوں کو سلامت رکھنا

آتشِ جاں کبھی بجھنے نہیں پائے
سرد جھونکوں کو سلامت رکھنا

پھر بھٹکنے کا مزہ کیا ہوگا
ریگزاروں کو سلامت رکھنا

گھر کی چھت لوٹ گئی ہے یارب
آسمانوں کو سلامت رکھنا

دُکھ کے موسم ہوں مگر میرے خدا
صبر پھولوں کو سلامت رکھنا

کون آیا مرے خراباں وِچ
مہکے پھول سرایاں وِچ
کیا کیا رنگ سجے گوہر میں
جس کو چُوما خواباں وِچ
اور اندھیرے میں چمکے
سبز حروف کتاباں وِچ
بہہ گئے، نیند کے دریا میں
کیا تھے جزیرے خواباں وِچ
جانا پہچانا سا تھا
اک چہرہ تہاباں وِچ
کھڑکی کھول کے دیکھ ذرا
سویا چاند گلاباں وِچ

A/300 امبالی فالیا، سرکی واڑہ، شاہ پور، احمد آباد (گجرات)

محبوب راہی

اجنبی، دشوار، گن اندھے سفر کا مسئلہ
ہر قدم پر اک نئے خوف و خطر کا مسئلہ

سر اٹھائے گا کہاں سے کوئی گھر کا مسئلہ
میں نے رکھا ہی نہیں دیوار و در کا مسئلہ

چھاؤں میں جس کی مرے اسلاف آسودہ رہے
سامنے میرے ہے اس سوکھے شجر کا مسئلہ

جس کے حل کی جستجو میں عمر ساری کٹ گئی
زندگی تھی ورنہ کیا، اک لمحہ بھر کا مسئلہ

مانگنے کو مانگ بھی لیتے خدا سے ہم مگر
پیش آتا ہے دعا میں بھی اثر کا مسئلہ

میری غزلوں میں ہے کیا یہ مسئلہ میرا نہیں
یہ تو ہے ہر صاحبِ نقد و نظر کا مسئلہ

چلتا ہے محبوب راہی آپ اپنی راہ پہ
سامنے اس کے نہیں ہے راہبر کا مسئلہ

• برسی ٹاکلی ۴۴۳ ڈسٹرکٹ اکولہ (ایم۔ایس)

خورشید طلب

صحن، دیوار، سائباں لکھیں!
خود کو ہم پھر بھی بے اماں لکھیں!

انتہا سے ہوا ابتدا جس کی
آؤ اِک ایسی داستاں لکھیں!

میں کہ آنگن لکھوں فلک کو بھی
وہ ہتھیلی کو آسماں لکھیں!

موسلا دھار بارشوں میں بھی
ڈھیر ہوتے رہے مکاں لکھیں!

اُس کا کردار کچھ بھی ہو لیکن
ہم اُسے زیبِ داستاں لکھیں!

یوں ضرر سے اُسے رکھیں محفوظ
اپنے کھاتے میں سب زیاں لکھیں!

ہم طلب چاند اور تاروں کو
اپنے دامن کی دھجیاں لکھیں!

• معرفت ایم۔ آئی۔ خان، ای۔ای آفس
کرگلی (برمو) گرڈیہہ

عنبر بہرائچی

گلاب تھا، کنول پھر بدن وہ کیسا تھا
کہ جس کا لمس، بہاروں میں رنگ بھرتا تھا

جہاں پہ سادہ دلی کے مکیں تھے کچھ پیکر
وہ جھونپڑا تھا مگر پُر شکوہ کتنا تھا

مشامِ جاں سے گزرتی رہی ہے تازہ ہوا
ترا خیال کھلے آسمان جیسا تھا

اُسی کے ہاتھ میں تیغے ہیں کل جو میداں میں
ہماری چھاؤں میں اپنا بچاؤ کرتا تھا

یہ سچ ہے رنگ بدلتا تھا وہ ہر اک لمحہ
مگر وہی تو بہت کامیاب چہرا تھا

ہر اک ندی سے کڑی پیاس لے کے وہ گزرا
یہ اور بات کہ وہ خود بھی ایک دریا تھا

وہ ایک جست میں نظروں سے دور تھا عنبر
خلا میں صرف سنہرا غبار پھیلا تھا

• بی۔ ۵، آفیسرز کالونی، اناؤ (یوپی)

جوگندر پال

اے مالک

نہیں، صاحبو، میں بھلا کون سا کہانی کار ہوں۔ فوجی آدمی ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنی ایک ہی ٹانگ پر گھنٹوں لیفٹ رائٹ کرتا چلا جاؤں، پر مجھے سیدھی سادی باتوں کی کہانی بنا لینے کو مت کہیے ——— نہیں، مجھے تو انہیں بنانا بھی نہیں آتا ——— ہاں، صاحبو، منھ کا ناپ تول جھوٹا جو ہوا۔ مجھے لگاتار بولنا پڑ جائے تو باتیں حلق میں پھنسی رہ جاتی ہیں اور میری گھگی سی بندھ جاتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں کسی کتے کے مانند ریں ریں کیے جا رہا ہوں ——— ہاں، سنیئے میری ساری بات کتوں ہی کے بارے میں ہے۔

میرے لڑکپن کے دنوں کا ذکر ہے کہ ہم غریبوں کے محلے میں کتے، بلیاں، چوہے، چیونٹے اور انسان ——— سبھی مل جل کر رہا کرتے تھے۔ کوئی کسی سے بڑا تھا نہ چھوٹا ——— وہ کیا لفظ ہے؟ ——— ہاں، اشرف المخلوقات ——— اس لفظ کا ذکر صرف ہماری اسکول کی کتابوں میں آتا تھا۔ ماسٹر جی کی چھڑی کے خوف کے باوجود اتنا موٹا لفظ کسی بھی لڑکے کے منھ پر نہیں چڑھ پاتا تھا ——— نہیں، صاحبو، چڑھ بھی پاتا تھا تو ہمیں اس کا معنی بھول جاتا تھا یا پھر نہ بھی بھولتا تو ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بلیاں اگر ہماری خالائیں ہیں اور کتے ہماری ماؤں کے سسر، تو پھر ہم ——— وہ کیا کہتے ہیں؟ ——— اشرف المخلوقات کیسے ہوئے؟ سچ پوچھیے تو ہمارے ماسٹر جی کو بھی اس کا یقین نہ تھا۔ ایک مریل کتے کو وہ اپنا باپ کہا کرتے تھے۔ ہر روز اسکول کی آدھی چھٹی پر ان کا یہ باپ ان کے سر پہ آ کھڑا ہوتا اور وہ اپنے کھانے کے ڈبے سے پہلی روٹی اسے کھلا چکتے تو دوسری سے نوالہ کاٹ کر اپنے منھ میں ڈالتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ جانے کیوں نہ آیا۔ ہمارے ماسٹر جی اتنے فکر مند ہوئے کہ اس دن انہوں نے اپنا کھانا چھوا بھی نہیں۔

کہانی؟ ——— نہیں، میں بھلا کون سا کہانی کار ہوں۔ جیسے بھی سنا رہا ہوں، سنتے جائیے ——— ہمارے محلے میں بھانت بھانت کے جاندار تھے۔ اور تو اور، کئی بار سانپ بھی دیکھنے میں آ جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوٹھڑیوں میں سبھی جیو باہوں میں باہیں ڈالے ہوں تو وہ بھی دھرتی کی انتڑیوں سے باہر آ کے ذرا سا کیوں نہ لہرا لیتے؟ ——— شیر ہوا کرتے؟ ——— ہاں، وہ بھی تھے۔ ہمارا بھورا تاؤ کسی شیر سے کیا کم تھا؟ مگر تائی کے سامنے وہ بھیگی بلی بن کر بیٹھ جاتا تھا ——— نہیں، مجھے کسی کا نام یاد نہیں ——— بس جو نام بھی جسے سارے محلے والے دے دیتے تھے۔ مجھے میری ماں نے بہت ترس ترس کر پایا تھا۔ سو میرا نام 'ڈھونڈا' پڑ گیا۔ پتہ نہیں میرے بڑا ہونے پر مجھے کاکا کیوں کہنے لگے ——— ہاں، فوج میں بھرتی ہونے کے بعد میں کاکا رام ہو گیا ——— ہاں، اب تو لالہ کاکا رام ہوں، مگر بعض اوقات یہ نام سن کر میں بھی ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں جیسے کسی اور کو پکارا گیا ہو۔ ناموں کی یہی ایک مصیبت ہے کہ آدمی اپنا آپ کھو دیتا ہے ——— ہاں، بے چارہ اپنا نام ہو کے رہ جاتا ہے ——— نہیں، صاحبو، ہمارے محلے میں تو ہر کسی کا نام اس کے بیج ہی سے اگتا تھا۔ بھورے تاؤ کا بیٹا لال مالٹا میرا یار تھا۔ وہ تھا ہی لال مالٹا ———

نہیں، صاحبو، ہم فروٹ کہاں کھاتے تھے؟ ——— نہیں، صرف اس وقت کھاتے تھے، جب کھانا پڑ جاتا۔ بیمار پڑنے پر بڑے ڈاکٹر سے دوائی لیتے ہوئے اس سے پوچھتے، 'خوراک کیا کھائیں، بڑے ڈاکٹر؟' وہ جواب دیتا، 'آلو بخارا، سیب، انگور، مالٹا' ——— اس طرح [illegible] بخار میں ہم اپنی فروٹ کھانے کی ہوس [illegible]۔ ایک بات بتاؤں، صاحبو؟ میرا تو آج کل یہ حال

● ۲۰۴۔ منداکنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

ہے کہ پھل کھاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے میعادی بخار میں مبتلا ہوں ـــــ ہمارا بڑا ڈاکٹر ـــــ اُس نے ڈاکٹری تو پاس نہیں کر رکھی تھی پر اُس کے ہاتھ میں بہت شِفا تھی۔ اسی لیے ہم اُسے بڑا ڈاکٹر کہا کرتے تھے۔ جب وہ کمیٹی کے اسپتال میں کمپاؤنڈر تھا تو ڈاکٹر کی بجائے وہی سارے مریض دیکھا کرتا تھا۔ ہماری طرح سیدھا سادہ غریب آدمی تھا۔ نوکری سے ریٹائر ہو کر اُس نے گھر میں ہی دواخانہ کھول لیا۔ جس بیمار کے پاس پیسے ہوتے وہ اُسے پیسے دے دیتا اور جس کے پاس کچھ نہ ہوتا وہ دُعائیں۔

نہیں، صاحبو، ایسا مت کہو۔ دعائیں انسان کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ ہمارے محلے کی مسجد کے دروازے پر ہی ہماری کانی نانی کی جھونپڑی تھی، جب بھی کسی کے سر پہ کوئی آفت آکھڑی ہوتی تو وہ بھاگا بھاگا کانی نانی کے سر پہ آکھڑا ہوتا۔ کانی نانی سبھوں کو اپنی ایک ہی محبت بھری کمزور آنکھ سے دیکھتی تھی اور اُس کی دُعاؤں سے ہر کسی کی بڑی سے بڑی آفت بھی ٹل جاتی تھی۔ بڑا ڈاکٹر بلا ناغہ کانی نانی کی آنکھ میں دوا ٹپکانے اُس کی جھونپڑی میں آ پہنچتا تھا ـــــ "مجھ کھوسٹ کے لیے کیوں اتنا پریشان رہتے ہو بیٹا؟ ـــــ اس لیے نانی، کہ میں تو صرف نام کا ہی بڑا ڈاکٹر ہوں۔ جب میں اپنے کام میں اٹک جاتا ہوں تو تمہاری دعاؤں کے بغیر میری مشکل حل ہونے میں نہیں آتی ـــــ یہ جھوٹ بھی نہ تھا۔ بڑا ڈاکٹر اپنے بعض مریضوں کو کچھ اس بھروسے پر کانی نانی کے پاس بھیجا کرتا تھا جیسے کوئی عام ڈاکٹر اپنے کام سے مایوس ہو کر انہیں اسپیشلسٹ کے پاس بھیجتا ہے۔

ہاں، صاحبو، میں نے خواہ مخواہ یہ لمبا چوڑا قصہ چھیڑ دیا ہے۔ میری اصل بات تو کتوں کے بارے میں ہے۔ کتے ہمارے یہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے۔ اتنے کہ دونوں کبھی اکٹھے ہو جاتے تو یہی معلوم ہوتا کہ کتے ہی کتے جمع ہو گئے ہیں ـــــ نہیں نہیں، صاحبو، کتے بلیوں کے بھی کوئی نام ہوتے ہیں؟ ـــــ ہاں، کیا انسان، کیا کتا۔ پہچان تو تبھی گاڑھی ہوتی ہے جب شکلیں آنکھوں میں کھنچی رہیں ـــــ آج کل؟ ـــــ آج کل تو محبت کے دعوے دار اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اُن کا کبھی آپس میں ملنا ہی نہیں ہوتا اور ایک دوسرے کی شکلیں اُن کے دل و دماغ سے نکل چکی ہوتی ہیں ـــــ ہاں، انہوں نے نام ضرور اپنی خوب صورت کاروباری ڈائریوں میں نوٹ کر رکھے ہوتے ہیں جنہیں ٹیلی فون پر دُہرا دُہرا کر اُنہیں یقین آجاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں ـــــ کاروباری حساب کتاب چھوڑ کر مجھے اور کسی معاملے پر غور کرنے کی عادت نہیں ـــــ پھر بھی ناموں کے معاملے پر میں کئی طرح سے وچار کرتا رہتا ہوں۔ سوچ کر بتلائیے، کیا ناموں کو کوئی بازوؤں میں بھینچ سکتا ہے؟ ہمارے الگ الگ نام ہی ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کرتے ہیں۔ صاحبو، ناموں کی کھینچا تانی ہی میں ہم چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں، اس حالت میں کوئی کسی سے کھُل کر کیسے ملے؟

ہاں، صاحبو، کہانی میں یہ سہولت تو ضرور ہوتی ہے کہ اپنے پکّے اور سیدھے راستے پر نہایت اسپیڈ سے چلتی جاتی ہے ـــــ ہاں، باتوں میں یہی مصیبت رہتی ہے کہ آدمی بار بار کچّے میں اُتر آتا ہے۔ کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ ہمارے محلے میں کتے اور انسان بڑی موٹی "رشتہ داریوں" میں گتھے ہوئے تھے۔ ایک گوری چٹّی جوان جہان کُتیا تو ہماری گول مُمانی کی بہو تھی۔ گول مُمانی اپنی بہو پر واری نیاری جاتی۔ کیا مجال، اُسے کبھی سُوجھا بھی ہو کہ اُس کی بہو آدم جات ہوتی؟ قصہ اصل میں یہ تھا کہ گول ممانی کو خارش بہت ہوتی تھی اور اس کی بہو اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اونچی کر کے اتنے پیار سے اُس کی پیٹھ پر پنجے جھاڑتی تھی کہ مستی سے اُس کی آنکھیں مُندنے لگتیں۔ اور پھر جب وہ خرّاٹے بھرنے لگتی تو گول ممانی کی بہو کا دُولہا اپنے پنگوڑے میں سے آنکھ مار کر اُسے اپنی جانب بُلا لیتا۔ اور اُس کے قریب پہنچتے ہی غوں غاں کرتے ہوئے اُس سے بے اختیار لپٹ جاتا۔

نہیں، صاحبو، میں جھوٹ موٹ کا قصہ نہیں گھڑ رہا ـــــ میں بھلا کون سا کہانی کار ہوں۔ میرے سادہ لوح حلوائی! باپ کو بھی قصے گھڑنا نہ آتا تھا۔ آپ ہی بتائیے، لڈو بنانے والا لڈو بنائے یا قصے گھڑے؟ سو یہ ہوا کہ ایک دفعہ انگریز بہادر کی کچہری میں جب باپو نے پورا سچ بول دیا تو انگریز بہادر نے اُسے ڈیم فول کہہ کر کچہری سے باہر نکلوا دیا۔ گھر لوٹ کر باپو بڑی فکر مندی سے ہر ایک سے یہی پوچھتا پھرتا تھا کہ یہ ڈیم فول کیا ہوتا ہے؟ جب کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا تو چند لوگ اُسے ہمارے مشکل تو ڑ بیر کے پاس لے آئے کہ اب وہی یہ معاملہ سلجھائے تو سلجھائے۔ ہمارا مشکل تو ڑ بیر ایک نہایت پرانا کتا تھا، اتنا پرانا، کہ اُس کی اپنی ذات کو ڈھئے ایک مدت بیت چکی تھی۔ اب وہ اپنے آس پاس کسی بھی وجود میں ڈیرے ڈال کر بسر کر لیتا تھا۔ میرے باپو نے اُس کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے آگے لڈو رکھ کر اپنی بات سُنائی تو جواب میں پیپل کے درخت کے پیچھے سے ایک ہلکی سی پھونک سُنائی دی۔ اس کا مطلب یہ تھا، گھبراؤ نہیں، انگریز بہادر نے کہا ہے، ابھی بھاگ جاؤ، تمہارا بیٹا ذرا بڑا ہو لے تو ہم اُسے فوج میں بھرتی کر لیں گے ـــــ تو صاحبو، میرا باپو تو پھول کر کُپا ہو گیا اور کئی سال بعد مجھے انگریز بہادر کی فوج میں بھرتی کروا کے ہی دَم لیا۔

نہیں، صاحبو، پہلے مجھے اپنی پہلی بات پوری کر لینے دو، پھر بتاؤں گا میرے فوج میں بھرتی ہونے کے بعد کیا ہوا۔ میری باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ سارے محلے والے ایک جیسا کھاتے پیتے اور پہنتے اور سوچتے تھے۔ میرا مطلب ہے کم یا زیادہ جتنا اور جیسا بھی وہ سوچتے تھے۔ ہاں، اتنے لوگوں میں ایک آدھ مورکھ تو ہوتا ہی ہے جو کُل جہان کی نعمتوں کو ایک اپنے ہی پیٹ میں ڈال لینا چاہتا ہے۔ ہمارے بھی ایک ایسا قصاب ہوا کرتا تھا۔ بس وہی ایک تھا جسے صرف اپنی فکر لگی رہتی تھی۔ اُس نے ہمارے اینٹ کے چھوٹے موٹے گھروں کے بیچ اپنی سفید سیمنٹ کی اتنی

رہائش گاہ بنوا رکھی تھی گویا مرنے کے بعد بھی اُسے یہیں رہنا ہو۔ ہمارا پگلا چاچا جب پرلوک سدھار گیا تو اُس کا بارہ چودہ سالہ چھوکرا گھر میں اکیلا رہ گیا۔ ماں بے چارے کی کئی سال پہلے ہی مرکھپ چکی تھی۔ قصاب نے کیا سوچی کہ وہ پگلے چاچا کے چھوکرے کی تنخواہ اور روٹی کپڑا باندھ کر اپنے گھر اُٹھا لایا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایک محلّے والے نے دوسرے کو نوکر بنا لیا ہو۔ ہم سبھی تلملا اُٹھے اور قصاب سے کہا' خدا نے تمہیں اگر اس غریب چھوکرے کو گھر میں رکھنے کی توفیق دی ہے تو اُسے اپنا بیٹا بنا کے رکھو ——— نہیں، صاحبو، مجھے نوکر نہیں۔ گھر میں گھر والے ہوتے ہیں۔ نوکر چاکر نہیں ہوتے۔ ہمارا محلّہ کوئی بازار تھوڑا ہی تھا۔ سٹے ہوئے گھروں کا جھرمٹ تھا۔ گھروں میں ہم اپنی خوشی اور مرضی سے ایک دوسرے کو بھوگتے ہیں اور ایک دوسرے کو بھوگتے ہوئے دراصل اپنے آپ کو ہی بھوگ رہے ہوتے ہیں ——— نہیں، صاحبو، نہیں! گھروں میں بھی نوکر چاکر ہوں تو کہیں ماں باپ نوکر بنے ہوتے ہیں اور کہیں اُن کے بچے۔

کیا؟ ——— مجھے آخر کہنا کیا ہے؟ — کیوں، یہی جو کہہ رہا ہوں ——— نہیں، آپ کی سمجھ میں کمی نہیں، مجھے ہی ڈھب سے بات کرنا نہیں آتا۔ ہاں، اسی لیے سننے والوں کو اپنے باپو کی طرح ڈیم فول لگنے لگتا ہوں۔ اصل میں سچائی کسی قرینے میں بیٹھنے ہی میں نہیں آتی۔ جدھر منہ اُٹھے بدحواسی میں اُدھر ہی کو ہو لیتی ہے۔ خاک سمجھ میں آئے۔ کہاں پہنچ کر دم لے گی ——— نہیں، میں آپ کو ذرا اور کھول کے سمجھاتا ہوں: میری کوٹھی کے پڑوس میں ——— ہاں، صاحبو، فوج سے لوٹ کر میں نے محبت کرنے کی بجائے کام سے کام رکھا اور میرے پاس ڈھیروں پیسہ جمع ہو گیا ——— ہاں، اسی لیے تو دو کوٹھیوں کا مالک ہوں۔ ایک کا کرایہ کھاتا ہوں اور ایک میں رہتا ہوں۔ میں بتا رہا تھا کہ میرے پڑوسی کے بچے کی آیا تین چار ہفتے کام سے غیر حاضر رہی۔ جس سے وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اُس سے بڑی لجاجت سے کہنے لگی، 'میری مانو بٹیا' تو اس آیا کو بھول جاؤ۔ ——— اُسے بھول جاؤں ماں، تو دوسری کہاں سے لاؤں؟ ——— میں جو ہوں بٹیا۔ مجھے اُس کی تنخواہ کا آدھا بھی دے دیا کرو گے تو چلے گا ——— ارے ماں، تم کتنی اچھی ہو! پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ——— ذرا سوچیے صاحبو، رشتوں کی تنخواہ بندی کر کے جب ہم اپنے رونے کا حق بیچ دیتے ہیں تو ہماری ہنسی کتنی کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں پیشہ وروں کے لطیفوں کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آپ خوب ہنس لیتے ہیں۔ میں بھی آج کل یہی کرتا ہوں۔ مگر ٹھٹھا مار کر ہنس لینے پر بھی میری ہنسی کی خواہش ادھوری رہ جاتی ہے ——— نہیں، صاحبو، ہنسنے کی خواہش آلسی خوشیوں کی ٹوہ اور چاہ کے بغیر کیسے پوری ہو؟ ——— ہاں، اسی لیے اُن دنوں ہم سبھی اپنی بے سروسامانی کے باوجود جی بھر کے خوش تھے۔

ہاں، آگے کی کہانی تو دھری رہ گئی ———

ہاں، صاحبو، میں بھلا کون سا کہانی کار ہوں؟ میری باتیں ہمیشہ آگے پیچھے ہو جاتی ہیں۔ میری بیوی بھی کہتی ہے، دھنی ہو گئے ہو تو کیا؟ بات کرنا تو تمہیں آتا نہیں۔ ——— مگر سچ پوچھیے تو یہ اچھا ہی ہے۔ اچھی باتیں کر پانے والے شرمندگی کا موقع بھی کھو دیتے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ جیسا بھی ہوں، شرمندہ تو ہوں، مگر پہلے آپ آگے کی سن لیجیے۔

میں دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے بڑا جوان نکل آیا تھا ——— نہیں، جوانی پر ٹکٹ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ——— ہاں، جو چیز مفت ہاتھ آتی ہے، وہ غریبوں کو زیادہ نصیب ہوتی ہے۔ میں واقعی بڑا تگڑا نکل آیا۔ اُس زمانے میں جب دوسری جنگِ عظیم کی خبریں عام ہونے لگیں تو ہمارا محلّہ بھی سرکاری گانے بجانے والوں کے سُروں سے گونجنے لگا ——— بھرتی ہو جا ماہیا! ——— میرا مرحوم باپ انہی دنوں کے انتظار میں تو جی رہا تھا، سو ماہیا بھرتی ہو گیا۔ جس روز مجھے ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کرنا تھا اُسی صبح کو باپو مجھے کانی نانی کے پاس لایا۔ وہاں ہم سے پہلے برکت والی اپنے بیمار پلّوں کو لیے پہنچی ہوئی تھی۔ میری روانگی کی خبر سن کر وہ اپنے پلّوں کی بیماری بھول گئی ——— تمہیں جانا ہے کاکے، تو میرے کہنے سے رُکو گے تھوڑا ہی ——— تم بولتی ہو تو رُک جاتا ہوں برکت والی ——— نہیں، کاکے، رُک کر کیا کرو گے؟ جاؤ، پر خط پتر لکھتے رہنا۔ ——— اور سُنو، بندوق وندوق سے بچ کے رہنا۔ ——— بندوق سے بچوں گا تو لڑوں گا کیسے؟ ——— برکت والی میرا جواب سُن کر بھونکنے لگی اور اُس کے پلّے ریں ریں کرنے لگے اور کانی نانی نے میرا ماتھا چوما اور ہمارے جھونپڑی سے نکل آنے پر بھی مجھے لگا تا دعائیں دیتی رہی ——— میں، میرے ماں نہیں تھی ——— نہیں، صاحبو، یہ غلط ہے کہ میرے ماں نہیں تھی۔ نہ ہوتی تو میں اونچا کیسے ہوتا؟ ہمارے محلّے کی ساری مائیں میری ہی تو تھیں۔ محلّے سے باہر نکلنے سے پہلے باپو نے مجھے ساری گلی میں گھمایا اور گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر اپنے آگے پیچھے آبدیدہ چہروں کے جھنڈ دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ میرا جانا کیا واقعی ضروری ہے؟ ——— شاید باپو بھی یہی سوچ رہا تھا مگر اُس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ جب انگریز بہادر نے خود آپ مجھے ڈیم فول کہا اور مشکل تو ڑ پیر نے حامی بھر لی تو ہم کون ہوتے کاکے کو روک لیں؟ چھٹی پر وردی پہن کر گھر آیا کرے گا، تو سب ہی کہیں گے' اچھا ہی ہوا جو چلا گیا تھا۔ سارے محلّے میں ایک تو ہی تو سپاہی بنا ——— باپو نے ایک بار پھر سر جھٹکا ——— آؤ کاکے، آؤ اب اسٹیشن چلیں۔ ہجوم میں سے بلّا باہر کود آیا ——— میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا کاکے ——— بستی سے اسٹیشن بہت دور تھا۔ نہیں بلّے! ——— مگر بلّا بھلا کسی کی مانتا تھا؟ وہ ہمارے آگے آگے ہو لیا۔

ٹھہرو، بلّے! ہمارے ساتھ چلو!

بلّا رُک کر ہمارے ساتھ چلنے لگا۔ وہ فطرت کا بلّا تھا اور ذات کا کتا۔ محبت کا بندہ تھا، مگر کبھی غصے میں آ جاتا تو بڑے بڑے سہاگ کھوٹے ہوتے۔

کالکے، کیا میں بھی سپاہی نہیں بن سکتا؟
تم تو ہو ہی سپاہی بچے۔
تو پھر مجھے بھی ساتھ لے جاؤ، کالکے!
تم ساتھ آگئے تو اِدھر کی لڑائی کون لڑیگا؟
ادھر کی لڑائی کوئی لڑائی ہے کالکے؟ میں اب
کوئی بڑی لڑائی لڑنا چاہتا ہوں۔
کیا، صاحبو؟ ——— ہاں! ——— نہیں،
بول بول کے نہیں بولتے، کر کرکے بولتے ہیں، اس لیے
صاف سمجھ میں آجاتے ہیں ——— جیسی، صاحبو، کتوں
کی باتیں سمجھنے لگتا میں بھی کتا ہوں ———
نہیں، سب آدمی ہوسکتے میں کوئی بھید بھاؤ نہیں
ہوتا۔ کھلا کھلا جینا مل جائے تو دونوں کسی لاٹ
صاحب سے کم نہیں ہوتے اور نہ ملے تو دونوں کتے
ہوسکتے۔

ہاں، صاحبو، میں بھی یہی چاہتا ہوں
کہ اپنی ساری رام کہانی ایک ہی سُر میں گا جاؤں
مگر میں بھلا کون سا کہانی کار ہوں؟ ———
ہاں کھوپڑی ہوتی تو شاید کام بن جاتا ——— دھن
دولت؟ ——— ہاں، دھن دولت تو میں نے
بہت کمایا ہے مگر دھن دولت سے بھی کام نہیں
بنتا۔ سچ پوچھیے تو کھوپڑی سے کام بگڑتا ہی ہے۔
——— ہاں، آج کل کی کہانیوں سے کھوپڑی کی
خوب ورزش ہو جاتی ہے، لیکن آپ مجھ پر ہنسئے
نہیں۔ مجھے تو کوئی کہانی سوجھتی ہے تو مجھے محسوس
ہوتا ہے میرے کھوپڑی ہے ہی نہیں - اور مجھے
بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خیر، آگے سُنیے۔

ڈیوٹی پر حاضر ہوتے ہی میری بڑی سخت
قواعد شروع ہوگئی۔ اور چند ہی ماہ بعد مجھے اپنے
محلے کی ستائی ستائی زندگی پچھلے جنم کی مانند
بھول سی گئی۔ اب میرا یہ حال تھا کہ ایک ذرا سا
اشارہ پاکر میں فوراً تن کر کھڑا ہو جاتا، سلام
بجالاتا یا کودنا شروع کر دیتا، یا پھر ناک کی سیدھ
میں مارچ کرتے کرتے اشارہ ملتے ہی دائیں یا
بائیں مڑ جاتا۔ اصل کر چھوڑیے، خود مجھے اپنی
اس کرتب بازی پر حیرت ہونے لگتی۔ اس طرح خوب
سدھ جانے کے بعد مجھے کئی محاذوں پر بھیجا گیا ———
میرا کام؟ ——— جی قواعد اور کرتب اور پہرہ۔
——— انہی محاذوں پر میں نے پہلی بار دیکھا کہ ہمارے
افسروں کے بنگلوں میں سدھے ہوئے کتے حیرت انگیز
کرتب دکھاتے ہیں۔ اور جب افسر آرام فرما رہے
ہوتے ہیں تو وہ اُن کے دروازوں پر پہرہ دیتے
ہیں اور ——— اور میں نے دیکھا کہ اُن دُھلے
دُھلے کتوں میں سے ہر ایک کے گلے میں پٹا بندھا
ہوتا ہے اور ——— اور صاحبو، انہیں دیکھتے ہوئے
میرے بے تاب ہاتھ بے اختیار میرے گلے کی طرف
اُٹھ آتے۔

نہیں، صاحبو، میں ایک بار بھی چھٹی پر گھر
نہ جاسکا۔ نچلے رینکوں میں میری طرح خواندہ جوان
بہت کم تھے اور افسروں کو میرا کام بہت پسند
تھا۔ اس لیے کوئی ڈیڑھ سال ہی میں ترقی کرکے
میں حوالدار بن گیا ——— ہاں، صاحبو، باپو کی چٹھیاں
مجھے ملتی رہتی تھیں اور میں بھی اُسے لکھا کرتا تھا۔
مگر چٹھیاں لکھ لکھ کر کوئی گلے ملنا تھوڑا ہی
ہو جاتا ہے۔ ہاں گلے نہ ملنا ہو تو گلے ملنے کی خواہش
بھی ماند پڑ جاتی ہے ——— نہیں، چھٹی کیسے ملتی؟
لڑائی کی حالت جو بگڑتی جا رہی تھی ——— نہیں،
میری چھٹی ایک دفعہ منظور تو ہوگئی، مگر عین
وقت پر فرنٹ پر سنگاپور جانے کا آرڈر آگیا۔
——— نہیں، صاحبو، مجھے کیا پتہ تھا، میں کیوں
لڑ رہا ہوں، اور جن سے لڑ رہا ہوں وہ کون
ہیں اور وہ مجھ سے کیوں لڑ رہے ہیں؟ مگر ہم
لڑے جا رہے تھے۔ بس اس لیے کہ ہم نے انہیں
نہ مارا تو وہ ہمیں مار دیں گے۔ ہمیں جیسا حکم
ملتا، ہم ویسے ہی اچھل کود میں جُٹ جاتے ———
ہاں سنسان جنگلوں میں چپ چاپ پہرہ دیتے ہوئے
میرا جی چاہتا کہ بے وجہ زور زور سے بھونکنا
شروع کردوں جس سے میرے افسروں کی نیند میں
خلل واقع ہو جائے اور وہ بدحواسی میں اپنے خیموں
سے بھاگتے ہوئے باہر نکل آئیں اور اندھا دھند
ایک دوسرے پر گولیاں برسانے لگیں۔ نہیں، سدھے
ہوئے کتے اپنی مرضی سے کہاں بھونکتے ہیں؟ ———
اور کیا؟ اپنی خواہش کو سانسوں میں دبا کر میں چپ
چاپ پہرہ دیے جاتا ——— میری یہ ٹانگ؟ ———
اسے میں نے اسی جنگ میں کھویا تھا۔ بہت بُری طرح
زخمی ہو گیا تھا اور اسی حالت میں دشمن نے مجھے حراست
میں لے لیا تھا۔

ہاں، جنگ ختم ہوئے کئی ماہ بیت گئے تو ہم
سبھی جنگی قیدی واپس دیش میں پہنچ گئے۔ یہاں
پہنچ کر مجھے ایک اور ترقی ملی اور مجھے جمعدار
بنا کر اور میری جیبوں میں کافی پیسہ ٹھونس کر مجھے
فوج سے ڈسچارج کر دیا گیا تاکہ اب باقی دن میں
اپنے گھر کا پہرہ دوں، مگر میرا اپنا گھر کہاں رہ گیا
تھا جو پہرہ دیتا اور وہ بھی جاتا تو کیا مجھے کھٹکا ہونے
لگا تھا کہ میرے محلے والے مجھ پر دھاوا بول دیں گے؟

ہاں، صاحبو، یہ جھوٹ نہیں کہ اب میں کسی
پر بھروسہ نہیں کرتا ——— اور کیا؟ ——— اب
بیوی بھی مجھ سے بغلگیر ہونے کے لیے میری طرف بڑھ
رہی ہوتی ہے تو نہ معلوم کیا شک گزرنے پر میں
گویا اُس کے وار سے بچنے کے لیے جھٹ ایک طرف
ہٹ جاتا ہوں اور پھر اپنی اس حرکت پر ہنسنے لگتا
ہوں ——— ہاں، میں پاگل سا ہو گیا ہوں۔ مجھے
اپنے آپ پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ کبھی کوئی اچھی اور
میٹھی سوچ آتی ہے تو ٹھٹھک جاتا ہوں۔ گویا
اپنے آپ کو اپنی تباہی کا جال بچھاتے ہوئے پکڑ لیا
ہو۔ اپنے بچاؤ کے سوا مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

ہاں، سنگاپور کے جنگلوں میں خندقوں میں
پڑے پڑے مجھے ساری دنیا بھولی ہوئی تھی ———
اور کیا؟ باپو بھی۔ بس ہر لحظہ اپنی حفاظت کا ہی
دھیان لگا رہتا تھا۔ اسی دوران ایک میلی سی صبح کو
جانے کیوں مجھے اپنی خندق سے ایک بوڑھے سپاہی
پر اپنے باپو کا گمان ہوا۔ میں ابھی اُسے اچھی طرح دیکھ
بھی نہ پایا تھا کہ مجھے لگا کہ اُس نے میری بھنک پالی

ہے اور مجھ پر وہ اپنی بندوق باندھ رہا ہے۔ میں نے بدحواس ہو کر سُرعت سے اپنی بندوق کی لبلبی دبادی اور اس کے گرنے کے بعد بھی گولیاں چھوڑتا رہا۔
ہاں، صاحبو، مجھے پتہ چلا کہ باپو کی موت بھی اُسی دن ہوئی تھی ـــــ ہاں، یقین کیجیے، عین اُسی وقت۔

ہمارا محلّہ؟ ـــــ ان چار پانچ برسوں ہی میں ہمارے محلّے کا سارا نقشہ بدل گیا تھا۔ ہمارے محلّے کا قصاب تو اب شہر کی کارپوریشن کا چیرمین بن گیا تھا۔ آرمی کو گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکہ حاصل کر کے اس نے خوب ہاتھ رنگے تھے۔ اور محلّے والوں کو دُوگنے دام دے کر ساری گلی خرید لی تھی اور اُن کے گھروں کا ملبہ ہٹوا کر وہاں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں کا جنگل کھڑا کر دیا تھا ـــــ ہاں، بعض پرانے لوگ اب انہی فلیٹوں میں رہ رہے تھے اور ان میں سے بیشتر نے قصاب کے ذبح خانے میں نوکری کر لی تھی ـــــ دوسرے؟ ـــــ کیا پتہ، دوسرے کہاں مرکھپ گئے تھے؟ ـــــ ہاں، کانی نانی بھی واپسی پر مجھے کہیں نہ دکھی ـــــ نہیں، صاحبو، میرے باپو کو شراب کی لت پڑ گئی تھی۔ ہاں، اپنے باپ کی موت کی خبر پا کر کسے دُکھ نہیں ہوتا؟ لیکن وہ زندہ رہتا تو میں اپنی ایک ٹانگ پر اپنا کام کاج سنبھالتا، یا اُسے؟

محلّے کے کتّوں کی مت پوچھیے۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ میونسپلٹی والے بہت سخت ہو گئے تھے اور بے پٹّا کتّوں کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتے تھے، جو اُن سے بچ گئے ہوں گے، قصاب نے انہیں آرمی کی سپلائی میں ٹھیل دیا ہوگا ـــــ ہاں، ہمارے فوجی افسر تو ہر طرح کا گوشت بڑی رغبت سے کھا لیتے تھے۔

نہیں، ایک قصاب ہی کیا، جسے بھی موقع ملا اُس نے خوب ہاتھ رنگے ـــــ ہاں، میں نے بھی۔ میری وار سروس اور کھوئی ہوئی ٹانگ کی سند میرے بہت کام آئی۔ یہ دکھا کر پہلے تو میں نے کئی چھوٹے چھوٹے آرمی ڈسپوزل کاونے پونے داموں پر حاصل کیے۔ اور پھر رمزشناس ہوا تو مجھے بڑے بڑے ڈسپوزل ملنے لگے ـــــ ہاں، صاحبو، چند ہی دنوں میں میرے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ سنبھلنے میں نہ آتی تھی۔ اتنی تھوڑی مدت میں اس قدر مال دار ہو جانے پر آدمی جسے بھی دیکھتا ہے، وہ اُسے چور معلوم ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک دن مجھے اچانک اپنا پرانا بلاّ مل گیا۔
نہیں، صاحبو، اب وہ ویسا کہاں رہا تھا؟ میری طرف بے اختیار اُچھل آنے کی بجائے وہ جھجک جھجک کر میرے قدموں کی طرف بڑھا اور جھک کر دُم ہلانے لگا۔ بےچارہ بہت ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ میں نے سوچا کھا پی کر پھر تن جائے گا، سو اُس کے گلے میں پٹّا باندھ کر میں نے اُسے اپنی کوٹھی کے گیٹ پر چھوڑ دیا کہ پہرہ دے اور کوئی چور اُچکا دھاوا بول دے تو اپنی کوئی بڑی لڑائی لڑنے کی پرانی خواہش پوری کر لے۔

میری شادی، صاحبو؟ ـــــ وہ دو ایک سال میں نے آپ ہی روکے رکھی۔ اتنا پیسہ ہو تو ایک ٹانگ والا بھی سب سے آگے آگے دوڑتا ہے ـــــ نہیں، ہمارے کوئی بچہ نہیں۔ ہماری احتیاط کے باوجود دو بار خطرہ لاحق ہوا تھا مگر ہمارا ڈاکٹر بڑا ایکسپرٹ ہے ـــــ نہیں، صاحبو، یہ دشمنوں کی اُڑائی ہوئی ہے ـــــ ہاں، دوست کون ہوتا ہے؟ آرمی کی طرح سول میں بھی کیموفلاج کے بغیر کسی کی بن نہیں پڑتی ـــــ نہیں، میری بیوی کا میرے کاروباری ساجھے دار سے کوئی اُلٹا سیدھا سمبندھ نہیں ـــــ نہیں، صاحبو، وہ دونوں تو بھائی بہن بنے ہوئے ہیں۔ اس بار عین وقت پر میں بازار سے راکھی نہ لا سکا۔ بس پھر کیا تھا۔ میری بیوی مجھ سے لڑ کر اپنے اس بھائی کے پاس رہنے کو چلی گئی، مگر یہ چھوٹے موٹے جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے؟

میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں آمنے سامنے کوٹھیوں کی لمبی قطاریں ہیں اور سبھوں کے دروازوں پر پلے ہوئے پٹّے دار کتّے دن رات پہرہ دیتے رہتے ہیں ـــــ نہیں، ہم پڑوسی ایک دوسرے کو قطعاً نہیں جانتے، اس کے باوجود ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کرتے رہتے ہیں ـــــ کیوں؟ ـــــ بس اس لیے کہ جس نے موقع کھویا وہی نشانہ بن جائے گا ـــــ ہمیں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں مگر جب کبھی ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہم شکایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے ملتے کیوں نہیں، اور یوں ہماری سردجنگ سدا جاری رہتی ہے۔

نہیں، صاحبو، ڈر کیسا؟ میرا بلاّ بڑی کڑی قواعد کے بعد اب خوب سدھ گیا ہے اور گلے میں میرا پٹّا لٹکائے رَن بھومی میں ڈٹ کر پہرہ دیتا رہتا ہے۔

ـــــ نہیں، صاحبو، میں تو اب اپنے پرانے انگریز افسروں کی طرح شراب پی کر سویا پڑا رہتا ہوں ـــــ نہیں، بُرے خوابوں کا کیا ہے؟ وہ تو آتے ہی رہتے ہیں ـــــ ہاں، پل کا پل دم تو ضرور رُک رُک سا ہو جاتا ہے۔ آج سویرے جب میں ہڑبڑا کر اُٹھا تو اپنے گلے میں پٹّا ٹٹول رہا تھا۔ ذرا ہوش میں آکے یہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ میں کتّا نہیں ہوں۔ میونسپل کارپوریشن کے آدمی بندوقیں لیے میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں انہیں سمجھا نہیں پا رہا تھا کہ میں آوارہ کتّا نہیں ہوں۔ ـــــ یہ دیکھو! ـــــ یہ میرا پٹّا! ـــــ کہاں؟ ـــــ یہ! ـــــ ٹھہرو، گولی مت چلاؤ! ـــــ سچ مچ میری جان میں جان آگئی کہ میں کتّا نہیں ہوں۔

میری جان میں جان تو آگئی، صاحبو، مگر اپنے اندر ہی اندر مجھے لگتا ہے، ہوں تو میں کتّا ہی، مگر پالتو ہو کر کے اپنی اصلیت کھو بیٹھا ہوں ـــــ مگر میرا پٹّا، صاحبو؟ میرا مالک میرے گلے میں پٹّا کیوں نہیں باندھے رکھتا؟ ـــــ نہیں، ڈرپوک نہیں، میں پاگل نہیں، صرف خوف زدہ ہوں ـــــ میرے مالک نے مجھے چھوڑ دیا ہے، صاحبو۔ کوئی بتاؤ، میرا مالک کون ہے؟ ●

ذکیہ مشہدی

میراث

"سیدھے بیٹھو — ٹرین میں بھی وہی ہڑدنگا پن۔"

سکینہ نے طیب کو ڈانٹا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تو آفرین نے اپنا ایک بازو کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ بالکل ڈینے کی طرح پھیلا کر اور سامنے رخ سے آتی ہوا کے دباؤ کو ہاتھ پر محسوس کر کے کھلکھلا کر ہنسی۔

"کتنی بار کہا چلتی گاڑی سے اس طرح ہاتھ باہر مت نکالا کرو۔ لیکن کیا مجال جو کان پر جوں رینگے۔" سکینہ پھر بگڑی۔

"امی، اس کی ساری جوئیں اس کی سر کی کھال سے چپکی رہتی ہیں۔ اس لیے کان پر کم ہی آتی ہیں۔" طیب نے بندر کی طرح اچھل کر اوپر کی برتھ پر رکھی ٹوکری پر ہاتھ مارا اور امرود نکالا۔

آفرین نے ہاتھ اندر رکھ کے طیب کی پیٹھ پر ایک دھپ رسید کیا "گندا کہیں کا۔ جوئیں تیرے ہی سر میں ہوں گی۔" طیب نے امرود ہاتھ سے پھینک دیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

سکینہ نے سر پہ ہاتھ مار لیا۔ "کم از کم باہر تو عزت رکھ لیا کرو۔ گھر میں تو لڑتے ہی کتے کوؤں کی طرح۔"

کنارے والی برتھ پر نیم دراز سفید ریش بزرگ مسکرانے لگے تھے۔ "بڑے پیارے بچے ہیں آپ کے۔" انہوں نے ہاتھ سے اخبار رکھ دیا۔ اور سکینہ کی طرف مخاطب ہوئے۔

سکینہ کا جی جل گیا۔ "آپ انہیں پیارا کہتے ہیں۔ حرکتیں نہیں دیکھ رہے ہیں ان کی۔"

"ارے بٹیا، یہ تو عمر ہی ہے ان کی لڑنے اور شرارتیں کرنے کی۔"

"دیکھا انکل کیا کہہ رہے ہیں اور امی ہیں کہ ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں۔" طیب نے امرود میں دانت گڑاتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟" ان صاحب نے پوچھا۔ وہ تنہا سفر کر رہے تھے، اس لیے بوریت سے بچنے کے لیے بڑی دلچسپی سے بچوں کی باتیں سن رہے تھے۔

"مور، مور، مور۔" اچانک آفرین اتنی زور سے چلائی کہ سکینہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ چہرے پر زچ ہو جانے کا تاثر لیے وہ ان صاحب کی طرف متوجہ ہو گئی جو دراصل طیب سے سوال کر رہے تھے۔

طیب نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا تھا اور چلا رہا تھا "ارے ایک اور مور، ایک اور مور، کھیت میں اتنے سارے مور۔ یہاں موروں کی کھیتی ہوتی ہے کیا —!"

"ہم لوگ جون پور جا رہے ہیں۔" سکینہ نے بزرگ صاحب سے کہا۔

"رشتہ دار ہوں گے وہاں؟" وہ اب باقاعدہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"کبھی تھے —" سکینہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تھے —؟ کیا معنی — یعنی کہ اب؟" وہ ذرا سٹپٹا کر بولے۔

"کچھ پاکستان چلے گئے۔ جو بچے تھے، وہ یہیں مر گئے۔"

"چچ چچ چچ —" اُن کے چہرے پر قلبی دُکھ کے آثار نمودار ہوئے۔ "ہم بھی لاہور سے بھاگ کر آئے تھے۔ کوئی مرا تو نہیں واہگورو کی کرپا سے لیکن سب تباہ ہو گیا تھا۔ کیا پاگل پن تھا اُس وقت۔" اُن کی آنکھوں میں کرب کے آثار گہرے ہو گئے۔ "آپ تو بٹیا شاید . . . . .؟"

"جی ہاں، میں اس کے بعد پیدا ہوئی خوش قسمتی سے۔ مگر آپ کچھ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے یہاں بھی دنگوں میں کوئی مارا نہیں گیا۔"

"پھر — پھر۔" وہ صاحب ہڑبڑا گئے —

"آپ نے کہا تا پاکستان . . . ."

سکینہ ہنس پڑی۔ ایک اذیت ناک ہنسی —

"میری مرحومہ ماں کہا کرتی تھیں۔ میرے نزدیک پاکستان گیا اور مرا برابر ہے اور وہ سچ ہی کہتی تھیں۔ میرے زیادہ

٭ ۳۱۰-C، ایما فیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ بہار

عزیز اسی طرح مَرے "۔

"پھپھو — جو زندہ ہیں، اُن کے لیے ایسا نہ کہیے"۔

سکینہ خاموش ہوگئی۔ ایک گہری خاموشی۔ جس نے بچّوں کی تیز تیز باتوں کے شور کو بھی اپنے اندر سمو لیا تھا۔ وہ دونوں بچے اب سارے اختلافات بھلا کر ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر کوئی کھیل، کھیل رہے تھے۔

سفید ریش بزرگ نے کچھ کہنے کے لیے مونہہ کھولا۔ لیکن شاید اپنی حدود کا خیال کر کے چپ ہوگئے۔ شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ اس اندھے کنوئیں کی گہرائی میں پائی جانے والی خاموشی کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کے سارے عزیز ان کے ساتھ لاہور سے بخیریت دلّی آگئے تھے۔ لیکن پھر بھی عزیزوں سے دُور ہو جانے پر جو محسوس ہوتا ہے وہ اُسے بخوبی سمجھتے ہیں۔ کیا وہ سب جو وہاں رہ گئے — جو ان کے وطن اور سارے ماحول کا ایک حصہ تھے۔ جہاں ان کا بچپن گزرا تھا اور جوانی کا ایک حصہ — ان کے عزیز نہیں تھے؟ کیا لاہور کی مٹی سے ان کی قرابت داری نہیں تھی۔ کوئی وہاں سے آیا یا یہاں سے گیا۔ بات تو وہی ہوئی۔ لوگ کٹے مرے دونوں طرف، لیکن جن کے گھر بٹ گئے۔ لوگ تتر بتر ہوگئے۔ جذباتی نقصان شاید اُنہیں زیادہ اٹھانا پڑا۔ اب اس لڑکی کو لے لو۔ کہتی ہے آدھے پاکستان کی نذر ہوگئے اور وہ جو قرول باغ میں بازو والے مکان میں رہتے ہیں میاں عبدالکریم۔ ان کا داماد ان کی نئی بیاہی بیٹی کو لے کر چلا گیا تھا۔ شروع میں تو کبھی کبھار بیٹی آ گئی بھی۔ اب برسوں سے نہیں آسکی ہے۔ اس کی ماں تو اللہ کو پیاری ہوئیں۔ میاں عبدالکریم اپنے دن گن رہے ہیں۔ ایک ہی خواہش ہے بیٹی کو دیکھ لیں۔ اور ان نواسے نواسیوں کو جو اجنبی دھرتی پر بڑھے ہوئے اور نانا کو بھی اجنبی لگنے لگے۔ میاں عبدالکریم کو دیکھ کر اُنہیں ایک طمانیت کا احساس بھی ہوا کرتا تھا۔ ان کی اپنی بیٹیوں میں سے ایک حیدرآباد میں تھی۔ اور ایک کا شوہر انڈمان میں بڑا افسر تھا۔ دونوں کالے کوسوں دُور — لیکن پھر بھی یہ اطمینان تھا کہ جب چاہیں گی، آجائیں گی۔ نہ آسکیں گی تو وہ خود آکر مل آئیں گے۔ یہ لڑکی جو سامنے سیٹ پر بیٹھی ہے بالکل ان کی چھوٹی لڑکی کی ہم عمر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بچے بھی اتنے ہی بڑے ہیں۔ اب کی بار وہ خود کو باز نہ رکھ سکے۔

"جون پور میں کوئی تو ہوگا؟ میرا مطلب ہے آپ جو وہاں جا رہی ہیں"؟

"کراچی سے میری پھوپھی آرہی ہیں۔ بیس برس بعد"، سکینہ نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اوہ!"

"مجھ سے بہت زیادہ بڑی نہیں تھیں — ساتھ کھیلتی تھیں۔ بہت پیار تھا ہم دونوں میں"۔

سکینہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ سفید ریش بزرگ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"امّی — امّی —" اچانک آفرین چلّائی۔

"امّی ہم بھول گئے کون پور میں کون رہتا ہے؟"

"کون پور نہیں عقل سے پیدل — جون پور"۔

طیّب نے ٹوکا۔ "اور وہاں کوئی نہیں رہتا۔ وہاں سب مر گئے — بس کچھ دن رہنے کو امّی کی پھوپھی آرہی ہیں کہیں سے"۔

"امّی آپ کی پھوپھی ہماری کون ہوئیں؟"

آفرین نے سوال کیا۔

"میری پھوپھی تمہاری نانی ہوئیں"۔ سکینہ اب مسکرانے لگی۔ دُبلی پتلی درمیانے قد کی بیس اکیس سالہ عالیہ پھوپھی کی شبیہہ ذہن میں کھنچ گئی۔ نازک بدن ہونے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بھی کم نظر آتی تھیں۔ ان کے جانے سے کچھ سال قبل تک سکینہ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی اور وہ اُسے گڑیا بنا کر دیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی گڑیوں کی شادی میں شریک بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ بارات کے لیے ناشتہ اور کھانا تیار کرنا، گڑیا گھر کی سجاوٹ اور دُلہن کے کپڑے سینے ٹانکنے کا کام اُن کے ذمّہ ہوتا تھا۔

دادی ہنسا کرتی تھیں —" لو اور سُنو۔ یہ عالیہ بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہوگئی"۔

امّاں نند کی طرف داری کرتی تھیں "بھلا بڑی ہی کتنی ہے وہ سکینہ سے۔ اُس کے بھی کھیلنے کے دن ہیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر لڑکیاں کھانا پکانے میں لگ جاتی ہیں۔ یوں ہی سیکھیں گی۔ سب کچھ۔ کل سکینہ کی گڑیا کے غرارے میں ایسا اُچھپال جال بنایا چٹکی کا —"

گھر کے آگے بڑے سے احاطے میں لگے چھتنار برگد کے نیچے گڑیا کی وہ تاریخی شادی۔ شادی کے دوسرے دن عابد چچا سے جھگڑا ہو گیا تھا سکینہ کا۔ وہ عالیہ پھوپھی سے چھوٹے تھے اور سکینہ سے بس دو برس بڑے۔ چچا بھتیجی میں جم کر لڑائی ہوئی۔ بڑے شریر تھے عابد چچا۔ جو بھی لڑتے تھے۔ ایک طرف عالیہ پھوپھی سے جو اُن کی بڑی بہن تھیں۔ دوسری طرف سکینہ، شبینہ، رفّن اور گڈّو سے — جو ان کے بھتیجے بھتیجیاں تھے۔ نالائقوں نے کبھی چچا نہیں کہا اتنے سے تو تھے پدی بھر کے چچا۔ کبھی چچا کے تصوّر پر پر پورے نہیں اُترے۔

شادی میں وہ دُلہن کی طرف سے تھے۔ گڈّا سکینہ کا تھا۔ جھگڑا ہوا تو تھا گڑ کے سیو کی تقسیم پر۔ لیکن دوسرے دن اُنہوں نے گڈّے کے ہاتھ پیر توڑ دیے۔ اور اُسے برگد تلے دفن کر دیا۔ جہاں صرف ایک دن پہلے برات نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔

سکینہ نے رو رو کر آنکھیں سُجا لیں۔ خوب ڈانٹ پڑی عابد چچا کو۔ عالیہ پھوپھی نے کان مروڑے۔ دادی نے دو ہاتھ رسید کیے۔ بچّی کو رُلانے کی پاداش میں۔ پھوپھی نے سکینہ کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ دوپٹے کے چھور سے آنکھیں پونچھیں۔ دوسرا گڈّا جلد بنا کر دینے کا وعدہ کیا۔

بطور تاوان عابد چچا نے گڈّے کی باقاعدہ قبر بنا کر اس پر عرس کا اعلان کر دیا۔ چادر چڑھائی گئی — — — برگد تلے خود رَو اُگے مکو کے پیڑوں سے ننھے ننھے سفید پھول توڑ کر قبر پر ڈالے

گئے۔ عابد چچا نے ٹین پیٹ پیٹ کر قوالی گائی۔ ایک ٹھیکرے پر "گڈے شاہ کا مزار" لکھ کر ٹھیکرا قبر کے سرہانے کھڑا کیا گیا۔ سکینہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔ دوسرا گڈا تو عالیہ پھوپی بنا ہی رہی تھیں۔ گڑیا پھر سے سہاگن ہو جائے گی۔ یہ تماشا مفت میں ہاتھ آیا — چار دن تک عرس چلتا رہا۔ گڈے شاہ کی قبر پر قوالی ہوتی رہی۔ پانچویں دن قوالی کے دوران عابد چچا کا جھگڑا خود عالیہ پھوپھی سے ہو گیا۔ انہوں نے قبر پر ایک لات ماری۔ کھڑے ہو کر وہیں پیشاب کیا اور باہر بھاگ گئے۔ شام پڑے گھر لوٹے۔ اس وقت تک عالیہ پھوپھی کا غصہ ختم ہو گیا تھا اور غصے کی جگہ فکر نے لے لی تھی۔ یہ عابد کہاں گیا۔ کمبختی کا مارا۔ اب اماں میری خبر لیں گی کہ کیوں لڑائی کی تھی۔ سکینہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو پھوپھی نے پاس بٹھا لیا۔ میرے پاس رہو سکینہ، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ شام کا دھندلکا بڑھا تو کھنڈروں سے برآمد ہونے والی کسی آوارہ روح کی طرح عابد چچا نمودار ہوئے۔ ابھی دادی کو ان کے غائب ہونے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ عالیہ پھوپھی نے چین کی سانس لی۔ پھر اچھی طرح کن انیٹھی کی ان کی۔ مٹی لوٹے سؤر جیسا جو حلیہ ہو رہا تھا ان کا۔

پھوپھی ملیں تو پوچھوں۔ انہیں یاد آتا ہے وہ سب کہ نہیں۔ وہ تو نہ جانے کتنی بار ان واقعات کو یاد کر کے ہنس ہنس کر دوہری ہو چکی ہے اور پھر اچانک چپ چھا گئی ہے اس پر۔ شام کے دھندلکے میں دور سے نظر آتے اٹالہ مسجد کے مینار۔ ان کے پیچھے سے ڈوبتا نکلتا چاند۔ کبھی ناخن کی طرح باریک اور کبھی تھالی جیسا گول۔ جاڑوں کی راتوں میں کسی جادوگر کے افسوں کی طرح بچھی چاندنی۔ تخت پر بیٹھی ہرے ہرے پالک کے پتوں کی گڈی بناتی اور پھر انہیں کترتی دادی۔ دوپٹوں کو دھنک رنگ سے رنگ کر اور کلف لگا کر — پھر انہیں چنتی اماں۔ اس سارے پس منظر میں وہ اور عالیہ پھوپھی۔

جب وہ کچھ اور بڑی ہوئی تو پھوپھی کی راز دار بھی بن گئی۔ بستر میں گھنٹوں دونوں کھسر پھسر کرتیں۔ عمر کے ایک بڑے نازک دور میں جب لڑکیاں اکثر گھبرا جایا کرتی ہیں۔ عالیہ پھوپھی نے اسے زندگی کے بہت سے اسرار و رموز سے واقف کرایا تھا ورنہ وہ تو نری بے وقوف تھی۔ دادی سے تو اس کا دم نکلتا تھا ڈر کے مارے۔ اور اماں سے بڑی شرم آتی تھی۔

وہ اور پھوپھی — پھوپھی اور وہ۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتی، دو لانبی چوٹیاں گوندھتی۔ عالیہ پھوپھی اس کے دوپٹے کاڑھتیں، غراروں پر گوٹا ٹانکتیں۔ عید پر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں پر مہندی سے گل بوٹے بناتیں چھوٹی بڑی بہنیں لگتیں۔ پھر اس کی الہڑ ناتجربہ کار آنکھوں نے پھوپھی میں ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ اکیلے میں گنگنانے کی۔ وقت بے وقت مسکرانے کی اور اکثر اس کی باتیں سن کر بھی نہ سننے کی۔ تنہا ہوتیں تو ان کی آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈتی نظر آتیں۔ کبھی کبھار وہ ایسی جگہ جا نکلتیں کہ سکینہ کو ان کا پتہ نہ چلتا۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس بڑے سے کمروں در کمروں والے مکان، باغیچے اور احاطے میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں پھوپی جاتیں اور سکینہ ان کے پیچھے نہ ہوتی، لیکن اب وہ اسے غچہ دے جاتی تھیں۔ گھنٹہ بھر بعد (کہ یہ ایک محفوظ وقفہ ہوتا ہے) پھوپی کہیں سے نمودار ہوتیں تو سکینہ ان سے ٹھنک کر سوال کرتی۔ "کہاں تھیں پھوپو —" کبھی کبھی وہ ڈانٹ بھی کھا جاتی۔ "کیوں پیرِ تسمہ پا بنی ہوئی ہو سکینہ۔ کبھی تو جان چھوڑ دیا کرو —"

سکینہ اب اٹھارہویں برس میں تھی۔ ایک دن ایسا کہنے پر اس نے بہت غور سے عالیہ پھوپی کو دیکھا اس کی تیز نظریں جیسے ان کے آر پار نکل گئی تھیں۔ پھوپی نے کمزور لہجے میں کہا۔ "سکینہ تُو تو واقعی بڑی ہو گئی ہے۔ بہت بڑی۔" اس رات کھسر پھسر کرتے ہوئے مولسری، نیبو کے پھولوں اور مٹی کی ملی جلی ایسی خوشبو کے درمیان جسے دنیا کا کوئی عطار نقل نہیں کر سکتا۔ عالیہ پھوپھی نے اس راز سے اسے آگاہ کیا، جو سکینہ اور ان کے درمیان دیوار بنا رہا تھا اور بے چین سکینہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھومتی رہی تھی۔

"کون ہے وہ —؟" پھوپھی کے اعتراف کے بعد سکینہ نے سوال کیا تھا۔ اسے ڈر بھی لگا تھا اور سارے جسم میں ایک خوش گوار جھرجھری بھی دوڑی تھی بعد میں سکینہ نے بڑی ڈھٹائی سے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ اسے پھوپی پر رشک بھی آیا تھا۔

"اب یہ بھی بتاؤں؟" پھوپھی نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا تھا۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد بولی تھیں۔

"عامر —"

بڑی روایتی سچویشن تھی۔ پڑوسیوں کا لکھنؤ سے پڑھ کر آنے والا لڑکا۔ مقامی انٹرمیڈیٹ کالج میں انگریزی کا لیکچرر۔ ملی ہوئی چھت پر جہاں سناٹا بکھیرتی دوپہر میں کوئی نہ جاتا۔ جاڑوں میں نحوست برستی اور گرمیوں میں سرسراتی لو بہتی۔ وہیں پھوپی گھنٹہ بھر کو غائب ہو جایا کرتی تھیں۔ نہ انہیں لو لگتی نہ نحوست اثر کرتی۔ نہ جون پور کے بلا اطلاع آدھمکنے والے بندروں سے ڈر لگتا۔ اسی چھت پر پروان چڑھ رہا تھا وہ روایتی رومان جو لڑکے کی ماں کے ویمپ کی صورت اختیار کر لینے پر روایتی ڈھنگ سے ختم بھی ہو گیا۔ عامر کی ماں عامر کے لیے اپنے بھائی کی لڑکی بیاہ لائیں۔ اس سے بچپن ہی سے انہوں نے عامر کی نسبت طے کر رکھی تھی۔ اور وہ اپنے اس فیصلے سے ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھیں۔

سکینہ عالیہ پھوپی کے گلے میں بانہیں ڈال کے اتنا روئی کہ پھوپی اسے تسلی دینے میں اپنا دکھ بھول گئیں۔ انہیں دنوں پاکستان سے ایک عزیز نے پھوپی کے لیے پیغام بھجوایا۔ پھوپھی خاصی چوبیس برس کی ہو رہی تھیں۔ زیادہ تر عزیز پاکستان جا چکے تھے۔ بس دادا اڑے ہوئے تھے ضد پر کہ نہیں جائیں گے۔ شاید لوگ زیادہ زور دے کر لے جائیں، اس لیے وہ چپکے سے ایک دن مر گئے اور اپنے اجداد کے پہلوؤں میں جا کر دفن ہو گئے۔

بیوہ دادی پھپو کو دیکھ دیکھ کر ہولنے لگیں

تھیں۔ یہاں اب کون رہ گیا ہے جو پیغام آمیں گے۔ پاکستان سے پیغام آیا تو اُنہیں چُپ لگ گئی۔ بڑے چچا اپنے کنبے سمیت پہلے ہی سدھار گئے تھے۔ شبینہ، گڈّو اور رونق کے ساتھ گھر کی رونق چلی گئی تھی۔ اب عالیہ بھی ــــ؟ کس کے سہارے جیوں گی میں۔ دادی نے ضرور سوچا ہوگا۔ لیکن دو تین ہفتوں کی چُپ کے بعد اُنہوں نے ہاں کہہ دی۔ اگلے چند ماہ کے اندر، ایک ایک در، ایک ایک دیوار، ایک ایک کھڑکی، ایک ایک پودے اور ایک ایک انسان کو چھو کر، روتی بلکتی پھوپو رخصت ہو گئیں ــــ سکینہ اکیلی رہ گئی۔ آوارہ ہوا کے کسی بھٹکے جھونکے کی طرح۔ عابد چچا بھی بالکل خاموش رہنے لگے تھے۔ لڑنا جھگڑنا بند کر دیا تھا۔

پہلے تو پھوپو کے خط ہر ہفتے آئے پھر ان کی مدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دادی نے اُنہیں بلانے کی بات کی۔ وہ اور ان کے شوہر آنے کی بات لکھ ہی رہے تھے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ ہو گئی۔ پھوپی کا آنا ملتوی ہو گیا۔ خط و کتابت تک بند ہو گئی۔ عابد چچا اُنہیں دنوں ایک عزیز سے ملنے ڈھاکہ گئے۔ پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ دادی کو گھن لگ گیا اور ابا کو بھی۔ وہ سب وقت سے پہلے ختم ہو گئے۔ پہلے دادی پھر ابا۔ اور سب سے آخر میں اماں ــــ اماں سکینہ کی شادی کر کے مری تھیں۔ طیب کو اُنہوں نے گود کھلا لیا تھا۔ آفرین کے پیدا ہونے کی اطلاع بھی اُنہیں مل گئی تھی۔ گرچہ وہ اُسے دیکھ نہیں سکی تھیں۔ اس لیے جو بڑے مکان میں جو کبھی ایسا بھرا پُرا تھا، اماں کو تنہا رہتے ہوئے کیسا لگا ہوگا؟ زندگی کے باقی دنوں اور پھر موت کی گھڑی کو اکیلے جھیلتے ہوئے اُنہیں کیا محسوس ہوا ہوگا؟ اماں کی صحت اچھی تھی صرف تنہائی نے اُنہیں کھا لیا۔ سکینہ نے بہت چاہا کہ وہ اس کے پاس آ کر رہیں لیکن وہ آنے کو رضا مند نہیں ہوئیں۔

"ان سب کو کیسے چھوڑ دوں؟ اماں قبروں کا ذکر ایسے کیا کرتی تھیں جیسے وہ زندہ انسان ہوں۔ یا پھر ان میں دفن مُردوں کو ان کی ضرورت ہو۔ آخر وہ اتنی دوری بھی برداشت نہ کر سکیں جو گھر اور قبرستان کے بیچ تھی۔ خود بھی وہیں چلی گئیں۔ اب چین سے ہوں گی۔ سکینہ نے آنسو پونچھے جو گنگا جمنا کی طرح آنکھوں سے رواں تھے۔

گھر سجائیں سجائیں کر رہا تھا۔ الگ تھلگ ٹیلے پر ایستادہ۔ "اونچے پر کا مکان" کہلانے والا گھر۔ کیا ویرانی تھی اور کیا سناٹا۔ اندھا کنواں پانی بھرے اور قبرستان ٹھہر کر سو جائے۔ اُس نے کنڈی کھٹکھٹائی تو لنگڑے ناٹھے چچا عبدالکریم، جنہیں اماں گھر کی پاسبانی کے لیے چھوڑ گئی تھیں، کسی بوڑھے جن کی طرح برآمد ہوئے۔ ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھا اور اُسے پہچان کر دھاروں دھار رونا شروع کیا۔

"عالیہ بٹیا تو سویرے ہی پہنچ گئی تھیں۔ دو کمرے ہم نے صاف کرا دیے ہیں"، آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے اُنہوں نے اطلاع دی۔

سکینہ ہڑبڑا کر دوڑی ــــ "پھوپی ــــ پھوپی ــــ میری عالیہ پھوپی"۔

چھت کی کڑیوں میں جالے بھرے تھے ــــ چمگادڑوں نے بیٹ سے برآمدہ پاٹ دیا تھا۔ خودرَو جنگلی بیلوں نے آنگن میں رسیاں بٹ رکھی تھیں ــــ دیواریں کائی سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ اس سارے پس منظر میں وہ اس طرح کھڑی تھیں جیسے اندھے کنویں میں قید سبز پری۔ فرنچ شفان کی سبز ساڑی۔ گلے میں سچے موتیوں کی لڑی۔ چہرے پر سلیقے سے کیا گیا مکمل میک اپ۔ بڑا سا اونچا جوڑا، تازہ ترین فیشن کے قیمتی جوتے۔ بس جیسے کسی پارٹی میں جانے کو تیار ہوں۔ بڑی متانت کے ساتھ بڑی مدھم اور باوقار چال کے ساتھ وہ آگے بڑھیں۔ سکینہ کی آندھی طوفان جیسی رفتار میں جیسے بریک لگ گیا۔

ایک ہاتھ سے اُنہوں نے ناک پر نفیس لیس کا رومال رکھا ہوا تھا۔ دوسرا ہاتھ سکینہ کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھی تو ہو؟"

سکینہ کی آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے آنسو رُک گئے۔ وہ حیرت سے اُنہیں دیکھنے لگی۔ یہ عالیہ پھوپی ہیں۔ اُس نے تو سوچا تھا وہ دوڑ کر اُسے لپٹا لیں گی۔ زار و زار دھار روتی ہوئی، بلکتی ہوئی، اماں ابا کو یاد کرتی ہوئی، اس گھر کی ویرانی کا ماتم کرتی ہوئی۔ یہ تو کوئی اور عورت تھی۔ سکینہ کے ساتھ کھیلی، سکینہ کے باپ کی ماں جائی عالیہ نہیں۔

اُنہوں نے رومال ناک سے ذرا کی ذرا ہٹایا اور مسکارا زدہ پلکوں پر ہلکے سے پھیرا۔ ناک سے ننھی کی شوں کی آواز نکالی پھر بولیں۔ کتنے دن بعد ملاقات ہوئی تم سے۔ چلو۔ اندر چلو۔ یہاں تو ناک نہیں دی جا رہی۔

جذبات سکینہ کی ناک پر حاوی تھے۔ اُسے کسی خوشبو یا بدبو کا مطلق احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں اماں بیٹھتی تھیں اور دادی۔ اُدھر ابا کا کمرہ تھا۔ باہر کے کمرے میں ابا کا آفس تھا۔

اُس نے دیکھا باورچی خانے کی چھت بیٹھ رہی تھی۔ سامنے بڑی سی سِل گڑی تھی، جس پر خوشبودار مسالے پِستے تھے۔ ایک سِل سکینہ کی چھاتی میں گڑی ہوئی تھی۔ جس پر ماضی کے خوشبودار مسالے پس رہے تھے اور وہ بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ بوجھل ہو کر آنگن کی کائی میں دھنس رہی تھی۔

عالیہ پھوپی کا سامان ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ کمرہ واقعی عبدالکریم چچا نے اچھی طرح صاف کرا دیا تھا ــــ لیکن اس کی خستہ حالی کا وہ کیا کرتے۔ پھوپی نے اپنا بیش قیمت چمڑے کا سوٹ کیس کھولا۔ ایک ملائم اور نفیس چادر نکال کر سکینہ کو دی۔ لو یہ اپنے بستر پر بچھا لینا۔ چادر صاف تو تھی، لیکن واہیات تھی۔ میں نے اسے ہٹا کر اپنی چادر بچھائی ہے۔ پھر بھی اس بستر پر نیند شاید ہی آ سکے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

پھوپی نے جو چادر اُتاری تھی، وہ تہہ کی ہوئی سامنے کرسی کی پُشت پر پڑی تھی۔ اماں کی چادروں، دُلائیوں اور تکیہ کے غلافوں سے بڑا والا اسٹیل کا ٹرنک بھرا ہوا تھا۔ چچا نے اسی میں سے تکیے کے غلاف اور چادریں نکالی تھیں۔ اماں کے ہاتھ کی کشیدہ کاری دیکھ کر

سکینہ کا دل بیٹھنے لگا۔

"یہی نانی ہیں ــــ؟" طیب ماں سے پوچھ رہا تھا۔

"نانی ــــ؟" یہ کیا خرافات ہے۔ بھئی میں تمہاری ماں کی پھوپی ضرور ہوں ــــ مگر نانی؟ ــــ لاحول ولاقوۃ۔" عالیہ پھوپی ذرا سٹپٹا گئیں۔

"مگر ممی نے تو کہا تھا کہ وہ جو آرہی ہیں جن سے ملنے ہم جا رہے ہیں۔ وہ تمہاری نانی ہیں ــ نانی ــ نانی ــــ" آٹھ سال کے طیب کا انداز ذرا چڑانے والا تھا۔

"بڑے بدتمیز ہیں تمہارے بچے۔ بھئی برا مت ماننا۔ اب یہ کوئی طریقہ ہے۔ بڑوں سے بات کرنے کا۔ سکینہ کو برا تو لگا، لیکن وہ خاموش رہی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف نظر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اُسے لگا کہ عالیہ پھوپھی تو اس گھر میں لگی کائی کی تہوں میں کہیں پوشیدہ ہیں۔ ابھی برآمد ہوں گی اور کہیں گی۔ "اری سکینہ' یہ تیرے بچے ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے؟ پھر اُنہیں لپٹا لیں گی۔ اور بڑی بڑی آنکھیں گھما کر کہیں گی بچو! میں تمہاری نانی ہوں۔ پتہ بھی ہے؟

تمہاری ماں کے ساتھ کی کھیلی اور کھلکھلا کر ہنسیں گی۔ مگر ویسا کچھ تو کہیں نہیں ہو رہا ہے۔ ماحول کے تناؤ کو بھانپ کر بچے بھی خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر عالیہ پھوپی نے کہا۔ یہاں دل بالکل نہیں لگ رہا۔ پندرہ دن کے ویزا پر آئی ہوں۔ کیسے کٹے گا یہ وقت۔ پھر ذرا نزاکت سے ہنس کر بولیں۔" بھئی ایک تو مکان ہو بہی رہا ہے ایسا ویسا۔ یہاں تو شاید ہی کسی کا دل لگے۔ دوسرے عادت ہو گئی ہے ایرکنڈیشنڈ مکان میں رہنے کی۔ اور اپنی موٹر گاڑی میں چڑھنے کی۔ اسٹیشن سے یہاں تک رکشا میں آنے میں دل ہولنے لگا تھا۔ اور ابھی اسی رکشا میں بیٹھ کر فاطمہ کے یہاں جانا ہے۔ چلیے گا؟ سکینہ نے ذرا چڑ کر کہا۔

"فاطمہ یہیں ہے؟"

"جی ہاں" سکینہ نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر دوبارہ مشکوک لہجے میں پوچھا۔ "چلیں گی؟"

"ہاں کہیں نہ کہیں تو ضرور نکلنا ہے۔ دم گھٹ جائے گا ورنہ۔

ناشتے کے بعد وہ بڑے انہماک سے میک اَپ میں جُٹ گئیں۔ دو گھنٹے لگا دیے۔ انتہائی بیش قیمت ساڑی زیب تن کی۔ پھر سکینہ کی طرف دیکھا اور بڑی حیرت سے کہا۔ "ہو گئیں تیار؟" اُس نے خاموشی سے پرس اُٹھا لیا۔ فاطمہ غریب کے یہاں جانے کے لیے اس قدر لیس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم ہو کہ محل میں شہزادی کے ساتھ لنچ لینا ہے۔ لیکن سکینہ کچھ بولی نہیں۔ صرف سوچ کر رہ گئی۔ کل سے وہ صرف سوچے جا رہی تھی۔

فاطمہ کے یہاں پھوپھو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کے شوہر کا بہت بڑا بزنس ہے کراچی میں۔ پھر اُنہوں نے دُبئی میں بھی برانچ کھول لی ہے ــ چار لڑکے ہیں ان کے۔ چاروں بہترین انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ بزنس مینجمنٹ کے لیے امریکہ بھیجنے کا ارادہ ہے۔ لانبی لانبی امپورٹیڈ گاڑیاں ہیں ان کے پاس۔ فاطمہ منھ کھول کر سنتی رہی اور مرعوب ہو کر سر ہلاتی رہی۔

واپسی میں پھپھو نے کہا۔" چھی! یہ جون پور۔ ذرا نہیں بدلا۔ ویسا ہی ہے جیسا بیس برس پہلے تھا۔ بازار میں بوروں پر رکھے ہری مٹر کے ڈھیر ــــ اچار والی لال مرچیں ــــ تنگ گلیاں اور گندی نالیاں۔ کراچی میں تو۔۔۔"

کراچی کا مقابلہ بمبئی، کلکتہ، دلّی سے کیجیے عالیہ پھوپی۔ دماغ صحیح ہو جائے گا۔ سکینہ چڑ گئی تھی ــ جون پور کے لیے تو آپ کا ٹنڈوا اللہ داد یار ہی ــــ مگر پھر وہ کچھ نہ بول سکی۔ پھوپھی کے رنگ ڈھنگ دیکھتی رہی خاموشی سے۔ راہ چلتے لوگ بھی پلٹ پلٹ کر اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

"کیسے گنوار لوگ ہیں۔ کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی کیا۔" پھوپی نے تبصرہ کیا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے سکینہ نے بڑی حسرت سے چھتنار برگد کو دیکھا، جس کے نیچے گڈے کی قبر پر قوالیاں ہوئی تھیں اور جس کی شاخوں سے بندھے جھولے سے اُس نے عالیہ پھوپی کے ساتھ اونچی اونچی پینگیں لی تھیں۔ اُس نے تیز تیز قدموں کے ساتھ جا کر برگد کو چھُوا۔ جیسے وہ کوئی زیارت گاہ ہو۔

ادھر کہاں جا رہی ہو سکینہ۔ بہت کائی ہے۔ پھوپھی نے کہا۔ ان کے چہرے پر بیزاری تھی۔

رات کو بچے جلدی سو گئے تھے۔ سکینہ دیر تک پھوپھی کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا تھا۔ پھپھو کہیں گی: الگ کمرے میں کیوں سو رہی ہو سکینہ۔ تمہارا بستر بھی یہیں ڈلوا لیتے ہیں۔ اتنا کشادہ کمرہ ہے۔ کوئی پریشانی تھوڑی ہوگی۔ بچے بھی یہیں رہیں گے مگر ایسی کوئی بات پھوپی نے نہیں کہی تھی۔

بیس سالوں میں سکینہ کی چھاتی میں نہ جانے کیا کچھ بھر دیا تھا پھوپی کے سامنے اُگلنے کو۔ مگر دو دن سے وہ ان ساری باتوں کو اوپر آنے سے روکتی رہی تھی۔ پھر بھی اس وقت ایک سوال پوچھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔

"عامر یاد ہیں آپ کو؟ ننگے پیر، جلتی دھوپ، تیسری منزل کی کھلی سپاٹ چھت اور عامر۔

پھوپی زور سے ہنسیں۔ ہاں وہ بچپنا یاد ہے اپنا۔ یہ سب تو لڑکوں لڑکیوں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں شامل ہوتا ہے۔ کیسی بے وقوف تھی اس وقت میں۔ کہیں اس بھیلچر ماسٹر سے شادی ہو جاتی تو آج میں بھی اس گندے سے اونگھتے ہوئے شہر میں مقید ہوتی۔ پھر وہ چوتھی مرتبہ پاکستان اور دبئی میں پھیلے ہوئے بزنس، لمبی لمبی کاروں، پبلک اسکولوں میں پڑھتے بچوں اور ایرکنڈیشنڈ کوٹھی کا ذکر کرنے لگیں۔ گئی رات تک وہ یک طرفہ بولتی رہیں اور سکینہ سنتی رہی۔ اُس کو آخری بار احساس ہوا ایک قطعیت کے ساتھ پیدا ہونے والا احساس۔ پھوپی کے اور اس کے

درمیان اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی کھا گیا تھا وہ سب کچھ۔ وقت یا پاکستان یا محض ناقابلِ عبور فاصلوں کی کھائی؟ جو بھی ہو اب کچھ نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ واقعی دن بوجھل ہو اُٹھے تھے اور راتیں بھاری ــــ چوتھے دن سکینہ نے بالکل اماں کے لہجے میں کہا۔ "اُن لوگوں سے ملنے نہیں چلنا ہے کیا؟"

"کن لوگوں سے؟"

"اماں، دادی، دادا، ابّا اور ان سے بھی پہلے گزر جانے والے وہ سارے عزیز۔"

"اوہ ہاں! فاتحہ تو پڑھنا ہی ہے۔ میں سوچ رہی تھی جانے سے پہلے ایک بار ضرور جاؤں گی۔ چلو آج ہی چلیں۔ میں شاید ویزا کی مدت پوری ہونے تک نہ رک سکوں۔"

پھوپھی نے غسل کے بعد سوٹ کیس کھولا۔ ایک سیاہ بارڈر والی سفید سلک کی ساڑی نکالی۔ میک اپ ذرا ہلکا کیا۔ کوئی فرانسیسی خوشبو چھڑکی۔

شہرِ خموشاں کے مُردے بھی شاید عالیہ پھوپی کی غم زدہ سج دھج کو دیکھ کر چونک گئے ہوں گے اور گردنیں گھما گھما کر اُن کی طرف دیکھنے لگے ہوں گے۔

پھاٹک کے پاس کے پیلے پھولوں سے بھری کنٹیلی جھاڑیوں کے ایک ادھ ننگی لڑکی بکریاں چرا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر بھاگی۔ شاید قبرستان میں اُس نے بدروحوں کی توقع کی تھی۔ عالیہ پھوپی کی نہیں۔ اوبڑ کھابڑ زمین کہیں کہیں کسی قبر نے بھاڑ جیسا منھ کھول دیا تھا۔ ایک جگہ کھوپڑی لُڑھکی پڑی تھی۔ ایک جگہ جبڑے کی ہڈیاں دانتوں سمیت۔ یہ سب بھی گوشت پوست کے انسان تھے۔ کسی کے پیارے، کسی کے عزیز، کسی کی ماں، باپ، بھائی، بہن، محبوب۔

سکینہ اندر سے ہل گئی۔ اُس نے عالیہ پھوپی کی طرف دیکھا۔ جی چاہا پوچھے۔ پھوپی آپ کے سسرال والوں کی قبریں بھی ایئر کنڈیشنڈ ہیں کیا؟ اُس نے پھوپھی کی طرف نظر ڈالی۔ دیکھا ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا ہے ایک جا رہا ہے۔

"سکینہ، ہم لوگوں کا آبائی گورستان تو اُس طرف ہے۔ اُدھر۔ وہ آموں کے جھرمٹ کی طرف۔"

"چلئے آپ کو یاد تو ہے۔" سکینہ نے دانت کٹکٹا کر کہا۔

دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے لوگ آتے تھے تو میں ضد کر کے آتی تھی۔ گرچہ لڑکیوں کا قبرستان آنا منع تھا۔ میں اپنے دادا کی بہت پیاری تھی۔ سکینہ تم نے اُنہیں دیکھا تو تھا لیکن تمہیں یاد نہیں ہوں گے۔ تم بہت چھوٹی تھیں تب ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میرے دادا۔ یعنی تمہارے پر دادا سمجھیں؟"

آموں کا جھرمٹ قریب آ گیا تھا۔

"یہ رہی دادی کی قبر۔" سکینہ نے کہا۔ "میری دادی یعنی آپ کی اماں۔"

"اماں"۔ پھوپی نے ہولے سے کہا۔

"جی ہاں، آپ کی اماں اور یہ رہیں میری اماں۔"

"بھابی؟" پھوپی نے نظریں اُٹھائیں

"ہاں، آپ کی بھابی۔ اور یہ رہے ابّا۔"

چھ فٹ چار انچ کے قد آور ابّا کی قبر بھی سب سے بڑی معلوم ہو رہی تھی۔

"بھیا!" پھوپی پر چڑھا ہوا غیر ضروری متانت اور جذبات پر قابو کا مصنوعی خول یکایک تڑخ کر کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ انہوں نے بلک کر چیخ ماری اور قبر سے لپٹ گئیں۔ بھیا ــــ میرے گھنے سایہ دار درخت جیسے بھیا۔ تم بھی چلے گئے۔ یوں چپکے سے میرا انتظار تو کیا ہوتا۔ ابھی تو تم بیس برس اور جی سکتے تھے۔"

پھوپھی اب باقاعدہ بین کر رہی تھیں۔ "بھابی کو بھی لے گئے۔ اماں کا بدلہ بھی نہ چھوڑا کہ میرے آنسو پونچھ۔ ہائے بھیا ــــ

اور عابد چچا کی قبر کا تو نام و نشان تک نہیں۔ اُن کی لاش میگھنا کے پانیوں کی مچھلیوں نے کھائی یا ڈھاکہ کی گلیوں کی خاک میں رُلی۔ کس کو پتہ ــــ" سکینہ کا لہجہ انتہائی سفاک اور بے رحم تھا۔

"میرا جوانمرگ بھائی عابد۔" پھوپی اپنی قیمتی سیاہ بارڈر والی دودھ کے جھاگ جیسی سفید اور ملائم ساڑی کو بھول کر قبروں کی خاک پر لوٹنے لگی تھیں۔

میں یہاں رہتی تو آپ لوگوں سے ملنے تو آتی رہتی۔ میرے ابّا۔ میرے دادا، میرے بھائی بھاوج، میرے بزرگ ـــ اور

"ـــ اور میرے باقی ماندہ عزیز جو یہاں باری باری ابھی اور آئیں گے۔" سکینہ نے لقمہ دیا۔

پھوپی ہچکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ ان کے قیمتی شیمپو سے دُھلے اور نفاست سے سنوارے ہوئے بال میں قبروں پر اُگی گھاس کے تنکے اُلجھ گئے تھے۔ آنکھوں کا میک اپ بہہ کر گالوں پر آ گیا تھا اور اب وہ اس سارے منظر کا ایک حصہ معلوم ہونے لگی تھیں۔

"عالیہ پھوپھی اُٹھو ــــ میرا خیال غلط تھا۔ ابھی میرے اور تمہارے درمیان بہت کچھ باقی ہے۔ ہمارے اجداد کی قبروں کی میراث ــــ ہمارے ماضی کی قبروں کی مٹی۔ اس پر نہ زمانہ حاوی ہوا ہے نہ فاصلے۔ چلو اُٹھو۔

بقیہ: کرگھے سے کمپیوٹر تک

کمپیوٹر اور کمپیوٹروں کے حصے پُرزے، پلاسٹک اور شیشے کے ریشے، طبّی اور جراحی آلات، زراعت اور آبپاشی میں کام آنے والا سامان اور رنگ روغن وغیرہ شامل ہیں۔

اگرچہ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں دیہات میں لگانے پر زور دیا گیا ہے تاکہ وہاں غریبی کم کی جاسکے، لیکن بعض حلقے یہ صنعتیں شہروں میں لگانے پر زور دیتے ہیں۔ اس نئے رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ صنعتیں دیہی اور پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے استعمال میں لائی جاسکیں۔ صرف اسی طرح سب کو روزگار دینے، سرمائے کی منصفانہ تقسیم اور صنعت کاری کے پھیلاؤ کے وہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں جو ہماری منصوبہ بندی کا بنیادی نصب العین ہیں۔

●●

ویریندر پٹواری

قیمت

برجو کو دیکھتے ہی جیلر کے قدم رُک گئے۔

برجو بھی جیلر کو دیکھ کر چونک پڑا۔

تین دن متواتر برجو کا تعاقب کرتے کرتے جیلر کے پاؤں میں چھالے پڑ چکے ہیں۔ اس کے جوتے، پتلون یہاں تک کہ اس کی قمیض بھی کیچڑ سے لت پت ہے۔ نوکیلے کانٹوں سے لہو لہان ٹانگیں اُس کو چند پل رُک جانے کی صدائیں دے دے کر اب پتھروں کی طرح بے جان سی لگ رہی ہیں۔ مگر وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں کے پیچھے چھُپ چھُپ کر چلتے چلتے اب برجو کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ایک طویل دشوار سفر طے کرتے ہوئے برجو اور جیلر نے پہلے بھی کئی بار ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا تھا۔ مگر ہر بار برجو یوں چکمہ دے کر بھاگ نکلا گویا ایک چالاک چوہا بلی کے قدموں کو روک کر کسی نامعلوم کونے میں غائب ہو گیا ہو۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جیلر دھوکا کھا کر آگے بڑھتا رہا اور برجو اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ایک بار برجو نے پیچھے سے ایک نوکیلا پتھر بھی اس کے سر پر مارا تھا۔ جیلر زخمی ہو کر تڑپتا ہوا زمین پر گر گیا تھا۔ اور برجو چکمہ دے کر جنگل کے اندھیروں میں کھو گیا تھا۔ لیکن آج سائے کی طرح نہایت ہوشیاری سے برجو کا تعاقب کرتا ہوا جب وہ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا تب یہ دیکھ کر اُس کو تعجب ہو رہا تھا کہ وہ آس پاس بکھری پڑی لاشوں کو بالکل ہی نظر انداز کرتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف یوں جا رہا تھا جیسے ایک فوجی چھٹیاں کاٹنے کے لیے اپنے گھر جا رہا ہو۔ حالانکہ جیلر کے لیے گلی سڑی لاشوں سے بچ بچا کر چلنا دشوار تھا اور اذیت ناک بھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ زہریلی گیس کے آخری گھونٹ پی کر انسان تو کیا جانور بھی ابدی نیند سو چکے تھے۔

برجو ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ بار بار قریب آتی ہوئی ریل گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ تب جیلر کو یقین ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ برجو کو دبوچ سکے یا اپنے پستول کی رینج میں فائر کر سکے برجو اس بار بھی چکمہ دے کر بھاگ جائے گا۔ اور ایک مجرم ایک قابل ترین جیلر کو شکست دے کر جانے کہاں جرم کی نئی داستانیں دُہرائے گا۔

برجو ایک قاتل ہے اور اپنے خاندان کے نصف درجن افراد کو نہایت بے رحمی سے قتل کر چکا ہے حالانکہ وہ پھانسی کا مستحق تھا، مگر اس کی کم عمری کی وجہ سے وہ عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ ۲۱ سال کے اس خطرناک مجرم کی کالی کرتوت اور وحشیانہ حرکتوں سے تنگ آ کر جیل کے ملازم تو کیا قیدی بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ کاش برجو کو پھانسی دے دی گئی ہوتی۔ اس کے بارے میں جیلر کی بھی یہی رائے ہے۔ مگر جب زہریلی گیس سے مرنے والوں کی لاشیں نکالنے کے لیے اس کو اپنے ساتھ قیدی لینے جانے پڑے تھے تب اُس نے بہت چاہا تھا کہ اس خبیث کو بیڑیوں میں جکڑ کر جیل کی کسی اندھیری کوٹھری میں بند کر دے مگر وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً وہ اس شیطان پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ بار بار اس کو آوازیں دے کر اس کی موجودگی کی تصدیق کرتا رہا، اس پر بھی جب وہ بھاگنے میں کامیاب ہوا تو جیلر کے لیے یہ معمہ کم اور صدمہ زیادہ تھا۔

برجو شکل و صورت سے ایک دہشت پسند نظر آتا ہے۔ ہٹا کٹا جسم، گول چہرے پر لمبی داڑھی موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں کے درمیان شکاری کتوں کے مانند نوکیلے دانت جنہیں وہ بلا وجہ ہر وقت پیستا رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن سے ہر وقت انگارے برستے رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسا حیوان ہے جس نے خون کے رشتوں کو اپنے فطری تقاضوں کے بھاری وزن کے نیچے دفن کر دیا ہے۔ گالی گلوچ، کھوکھلی گفتگو، بے وجہ

• پریم کنج، ہلدی تالاب، تلو، جموں ۱۸۰۰۰۲ (جموں کشمیر)

تکرار، لڑائی جھگڑا اس کے لچھن تھے۔ اس قتلِ عام سے پہلے بھی وہ پولیس والوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے مسلمان پڑوسی سے وہ مذہب کی آڑ لے کر لڑتا رہتا تھا۔ ہندو پڑوسی کو وہ ذات پات کی چکی میں ناحق پیستا تھا۔ جب کبھی اس کو لوہا پہنایا جاتا ہے تب وہ اپنے چہرے پر معصومیت کا نقاب پہن کر جیلر کو یوں دیکھتا رہتا ہے گویا پنجرے میں پھنسا ہوا چوہا۔ مگر جیلر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اس کے دل میں اتر کر اس کے من کی بات بھانپ لیتا تھا یعنی اس کو اس بات کا علم تھا کہ معصومیت کے پردے کے پیچھے اس کی فطرت کا ورک شاپ فرار ہونے کی ترکیبیں بنا رہا ہے۔ جیلر کی نگہبانی برجو کی ناکامی کا باعث ہوا کرتی تھی۔ مگر اس بار وہ جیلر کو خون کے آنسو رُلا گیا۔

برجو کا کوئی دوست ہے یا نہیں! یہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس کے بدترین دشمنوں میں ایک تو جیلر ہے اور دوسرا اُس کے خاندان کا واحد زندہ فرد ارجن ہے۔

ارجن برجو کا چچازاد بھائی ہے۔ اُس بھیانک رات وہ کیسے بچ گیا تھا۔ یہ واقعی برجو کے لیے ایک معمہ ہے۔ حالانکہ کلہاڑی چلنے کے بعد اُس نے چیخ بھی سُن لی تھی اور خون کا فوارہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اپنے لکھ پتی دادا کی جائیداد کا دوسرا وارث کب تک زندہ رہے گا۔ بلکہ وہ زندہ کیوں ہے؟ یہ خیال آتے ہی وہ چلاّ چلاّ کر کہتا کہ جیل سے فرار ہو کر وہ پہلے ارجن کو ختم کرے گا۔ وہ جیلر کو بیڑیاں پہنا کر گھسیٹ گھسیٹ کر اُس کا وجود ختم کر دینا چاہتا ہے اور جب کوئی اس کو ٹوکتا ہے تب وہ ایک پاگل ہاتھی کی طرح جیل میں تہلکہ مچا دیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گویا زلزلہ آ جاتا ہے، مگر اُس روز جب جیلر نے اُس کو گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا، تب وہ کچھ بڑبڑانے کی بجائے خاموشی سے لاشیں نکالنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

غالباً اُس وقت جیلر نے پہلا دھوکا کھایا۔ وہ شاید یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ انگولی مال کو مہاتما بدھ مل گیا تھا۔ قہرِ خدا دیکھ کر فطرت نے کروٹ لی تھی — اندھیرا دب گیا تھا اور روشنی اچھائی کا پیغام دے چکی تھی۔ جب قیدی لاشیں اُٹھا کر جا رہے تھے یا دفن کر رہے تھے، تب جیلر ایک رشی منی کی طرح ایک ایک سے کہتا پھر رہا تھا کہ یہ قہرِ خدا ہے۔ قہر تب ٹوٹ پڑتا ہے جب ہمارے گناہوں کی گنتی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہم اچھے کرم کریں گے۔ گناہوں سے توبہ کریں گے۔ خدمتِ خلق کریں گے۔ اور عبادت کر کے اُن کی مہربانیوں کے طلب گار ہو سکتے ہیں۔ میں سرکار سے سفارش کروں گا کہ آپ لوگوں کی سزا کی میعاد کم کر دی جائے۔

"کتنی سزا کم ہو گی؟" فرار ہونے سے پہلے جب برجو نے جیلر سے یہ سوال کیا تھا تو اس وقت اُس کا چہرہ موسم کی طرح رنگ بدل چکا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ ایک سال۔" جیلر نے فوراً جواب دیا تھا۔

"ہونہہ!" نہیں چاہیے ہمیں یہ رعایت۔ نہیں اُٹھاؤں گا میں یہ گلی سڑی لاشیں — کہاں ہیں ان کے رشتہ دار؟"

"کوئی بچ گیا ہو گا تو ضرور آئے گا۔"

جیلر کی بھرّائی ہوئی آواز ٹوٹ گئی تھی۔ مگر برجو اوٹ پٹانگ بکتا ہوا اس وقت جیلر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، جب کسی نے یہ افواہ پھیلا کر کہ گیس پھر لیک ہو رہی ہے، افراتفری پھیلا دی تھی اُس کے بعد کب وہ سانپ کی طرح رینگ کر جھاڑیوں سے نکل کر بھاگتا رہا اور کب جیلر شکاری کتوں کی طرح اُس کے پیچھے لگا۔ یہ کسی کو معلوم ہوتا بھی تو کیسے۔ افراتفری میں فقط موت کا بھیانک چہرہ ہی نظر آ رہا تھا اور کچھ نہیں۔

مگر آج دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا تھا برجو جب گاؤں کی طرف دوڑنے لگا تب جیلر بھی اُس کا پیچھا کرتا ہوا اُس عالی شان مکان میں داخل ہوا جو برجو کا اپنا گھر ہے۔

یہ گھر ویران ہے۔ حالانکہ ہر چیز اپنی جگہ ہے۔ قیمتی قالین، قیمتی فرنیچر، فریج، الماریاں، تجوری، تجوری میں رکھے نوٹ، زیورات، وصیت کے کاغذات، دیوار پر آویزاں تصویریں برجو کے دادا کی تصویر، اُس کے باپ کی تصویر، برجو کی اپنی تصویر، ارجن کی تصویر۔ تصویروں کو دیکھ کر برجو ایک خون خوار وحشی درندے کی طرح حرکتیں کرتا رہا۔ تصویروں کو دیوار سے اُتار کر پاؤں سے روندتا رہا۔ اور پھر اچانک جب اُس نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر ارجن کی جھلک دیکھ لی تب وہ اُس پر ٹوٹ پڑا — ارجن کا بے جان جسم دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ سو دروازہ کھولتے ہی سگریٹ کی راکھ کی طرح ایک ہی جھٹکے میں گر گیا۔ برجو نے جب غصے سے لاش کو کچلنا چاہا تب اس کی نظر برجو کی ادھ کٹی ٹانگ پر رُک گئی۔ وہ چونک پڑا۔ دراصل اُس رات کلہاڑی سے ارجن کی ٹانگ کٹ گئی تھی، سر نہیں۔

برجو سکتے میں آ گیا تب جیلر نے آہستہ سے کہا۔ "اُس گاؤں میں زہر کا اثر بہت زیادہ نہیں تھا۔ بھاگ نہیں سکا بے چارہ — ورنہ شاید بچ گیا ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے جب جیلر نے برجو کو دبوچ کر ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کی تو برجو نے ایک جھٹکا دے کر اس کو دُور گرا دیا، مگر اس سے پہلے کہ جیلر اپنے پستول کا گھوڑا دبا دیتا برجو ارجن کے جسم سے لپٹ کر بے ساختہ رو پڑا۔

"کوئی تو بچاؤ میرے ارجن کو!" وہ چلاّتا رہا اور اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر بین کرتا رہا۔ لاش کو کندھے پر اُٹھا کر جب وہ باہر جانے لگا تو جیلر کو یقین تھا کہ وہ نوحہ خوانی کی آڑ میں بھاگ جانا چاہتا ہے اور ہوا بھی وہی — برجو دوڑتا رہا اور جیلر اُس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہ منظر دیکھنے

والا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ شمشان میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔

شمشان گھاٹ پر چند مُردوں کی چتاؤں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور وہیں کہیں برجو بھی ارجن کا انتم سنسکار کرکے خود ہی جیلر کے قریب آ رہا تھا۔ جیلر کا پاؤں جھاڑیوں میں پھنس گیا تھا اور برجو نے جب اُس کا پاؤں آزاد کرنے کی کوشش کی تو جیلر تذبذب میں پڑ گیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کا خدشہ غلط ثابت ہوا اور برجو نے خود ہی اپنے آپ کو جیلر کے حوالے کر دیا۔

چند ماہ گزر جانے کے بعد جیل کے ایک کونے میں چُپ چاپ بیٹھے ہوئے برجو کو جب یہ بتایا گیا کہ اس کو ارجن کی موت کا معاوضہ لینے کی خاطر بلایا گیا ہے، تب وہ چونک پڑا۔ ایک گیند کی طرح اُچھل کر وہ جیل کی دیواروں سے ٹکراتا رہا اور نہایت درد بھری آواز میں کہتا رہا۔

"جیلر صاحب، کیا آپ مجھے ارجن کے پاس نہیں بھیج سکتے؟ کیا میری عمر قید کی سزا پھانسی میں نہیں بدلی جا سکتی؟"

یہ کہہ کر اس نے شاید اور بھی کچھ بتا دینا چاہا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سُوکھی ٹہنی کی طرح فرش پر گر گیا اور پھر اُٹھ نہیں پایا۔

جیلر یہ دیکھ کر ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اچانک ایک بزرگ اور بہت ہی اچھے چال چلن والے قیدی کی آواز نے اُس کے احساسات و محسوسات کا سلسلہ توڑ ڈالا۔

"جیلر صاحب۔ میری بات کبھی تو سُن لیں کب سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے سالے اور اس کی بیوی کا معاوضہ تو مل گیا، مگر اُن کے چار بچّوں کا نہیں۔ مجھے اپنا حق دلا دیجئے نا! ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ آپ جیسا دیوتا آدمی بھی قہرِ خدا سے نہیں ڈرتا ہے۔"

جیلر نے کچھ کہنا چاہا مگر شاید اُس کے ہونٹوں پر تالا لگ چکا تھا۔

●●

بقیہ: بعض ادبی رویّے

حالات اور اشعار لکھ کر ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ تذکروں میں کسی خاص شہر کے شعرا کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا۔ کسی کسی میں ایک خاص مذہبی طبقے کے شعرا یا خواتین شعرا کو پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا خیال ہے کہ "تذکرہ نویسی کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ شعرا اس کثرت سے پیدا ہو گئے تھے اور شعر و شاعری کا چرچا اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ استادانِ فن نے محسوس کیا کہ اگر یہ جواہر ریزے محفوظ نہ کر لئے گئے تو ضرور تلف ہو جائیں گے۔ تذکروں کی تالیف کی دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جو صاحب دیوان شعرا تھے ان کا کلام تعداد میں بہت ہوتا تھا اور لوگ منتخب شعر چاہتے تھے جو اچھے بھی ہوں اور جن سے شاعر کے کلام کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو سکے۔ جن شاعروں کے دیوان مرتب نہیں ہوتے تھے ان کا کلام ملنا اور بھی مشکل تھا۔ اس لئے فارسی اور اردو دونوں کے اشعار اکثر بیاضوں میں لکھ لیا کرتے تھے انہی بیاضوں کی مرتب صورت تذکروں کی شکل میں نمودار ہوئی"[1] تاریخ اور تنقید کے پیش رو کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلّم۔ لیکن جیسا کہ بیان ہوا ایک خاص دور میں کثرت سے تذکرہ نویسی اس دور کے ادبی رویّے ہی کی صورت ہو گی اور اس لحاظ سے ۱۸ ویں صدی اردو ادب کی تشکیل و تعمیر اور بعض اصناف کے مقتدر شعرا کی شاہکار تخلیقات کی پیدائش کے ساتھ ساتھ اہم ادبی رویّوں کی بھی امین ہے۔

[1] دلّی کا دبستانِ شاعری، ۸۸ - ۸۷ ص

بقیہ: اودے سنگھ شائق

۱۹۷۰ء میں پنجاب سرکار نے انہیں سرکردہ اردو ادیب قرار دے کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ اُنہیں ۵۱۰۰ روپے کی تھیلی، ایک عدد تمغہ اور خلعت سے نوازا گیا۔ سردار اودے سنگھ پنجاب کے فروغِ اردو بورڈ کے ممبر اور اقبال میموریل ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ انجمن ترقی اردو پنجاب کے سرپرست کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

سردار اودے سنگھ نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے بعد فریدکوٹ میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

بعد میرے مرے اشعار کو پڑھ کر شائق
مجھ کو ڈھونڈے گی مجھے یاد کرے گی دنیا

ستیش بترا

جُوئے لدّاخ (۷)

جدید لیہہ

"کاش! ہندوستانی فوج چالیس سال
لے یہاں آگئی ہوتی!" آکاش وانی لیہہ کی محترمہ
گمو نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں "تو لدّاخ کا نقشہ
اور ہوتا۔"

یہ سرکاری ادارے سے منسلک کسی افسر کا نظریہ
تھا بلکہ لدّاخ کے ہر ذی ہوش، روشن خیال اور دانا
س کا خیال تھا۔ اس نظریے کے پیچھے برسوں سال
سیتی اور محرومیوں کی داستان تھی۔

"ہندوستانی فوج تو یوم آزادی سے ہی لدّاخ
موجود رہی ہے۔ اُس وقت سے جب قبائلیوں
نمیر پر حملہ کر دیا تھا اور گلگت اسکاؤٹس نے پاکستانی
افسروں کی قیادت میں لدّاخ کی طرف پیش قدمی
وع کر دی تھی۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں!" محترمہ انگمو نے اپنی
ی ڈھلی ہوئی آواز میں کہا۔ کچھ خاص وصف رہتا
ان ریڈیو والوں کی آواز میں۔ آپ یقینی طور پر آواز
اُن کی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتے! محترمہ اگرچہ
یڑ عمر میں پہنچ چکی تھیں، لیکن اُن کی آواز کی شوخی
طرح اب بھی برقرار تھی۔

"میں تو یہ کہنا چاہتی تھی کہ فوج کے آنے کے بعد
نے صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کر لی ہے۔
فوج پہلے آگئی ہوتی تو ہم نے یقیناً مزید ترقی کی ہوتی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ لدّاخ میں ترقی کا
باب فوج کے آنے کے بعد شروع ہوا۔ عام طور پر
فوج کا نام تباہی و بربادی سے جُڑا ہوتا ہے، لیکن
کسی نئی تہذیب کی طرح کبھی کبھی فوج کی آمد بھی سُودمند
ثابت ہو جاتی ہے۔ کوئی نئی تہذیب ترقی کا سبق دینے
نہیں آتی بلکہ صرف اپنی غرض پوری کرنے کے لیے اُسے
یہ کام مقامی لوگوں کے مفاد کے لیے سرانجام دینا پڑتا ہے۔
اور پھر فوج کی بھی ایک اپنی تہذیب ہوتی ہے۔

کسی بھی فوج کے لیے سب سے اہم ضرورت آمد و رفت
کے بھروسہ مند ذرائع اور مقامی رسد کی فراہمی رہتی ہے۔
مقامی لوگوں کا بھرپور تعاون اس کی طاقت ہے۔

آمد و رفت کے ذرائع اور سڑکوں کے بننے
سے پہلے لدّاخ مُلک سے الگ تھلگ' پہاڑوں سے
گھرا ایک 'برّی جزیرہ' بن کر رہ گیا تھا۔ فوج کی آمد
نے اُسے صحیح معنوں میں کشمیر اور مُلک کے باقی حصّوں
سے جوڑ دیا۔ آج بھی اگرچہ سری نگر۔ لیہہ سڑک سال
کے چھ ماہ سے زیادہ بند رہتی ہے۔ مگر باقی کے چھ ماہ کی آمد و
رفت اور دیش کے دوسرے حصّوں سے لائے گئے غذا
اور ایندھن کے اسٹاک نے یہاں کی زندگی کی ہیئت بدل
کر رکھ دی ہے۔ زندگی کا یہ بدلتا معیار کسی اندھے کے
لیے آنکھیں پانے کے مترادف ہے۔

مرحوم صنم نربو کا شمار جدید لدّاخ کے معماروں میں
میں ہوتا ہے۔ ایک ذمہ دار انجنیئر کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء
کے کشمیر پر پاکستانی حملے کے دوران اُنہوں نے لیہہ کا ہوائی
اڈہ تعمیر کرنے میں نمایاں کام کیا۔ کرگل۔ لیہہ جیسی دشوار
گزار سڑک بنانے کا سہرا بھی اُنہیں کے سر ہے۔ خصوصاً
خلسی۔ لامایارو حصّہ میں اُن کی بنائی ہوئی جلیبی نُما
سڑک کو دیکھ کر بڑے بڑے غیر مُلکی انجنیئر دانتوں میں
اُنگلیاں داب لیتے ہیں — ۱۹۶۲ء میں کرگل۔ لیہہ
شاہراہ مکمل ہونے کی خوشی میں منعقدہ تقریب میں اُنہوں
نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس سڑک کی تکمیل کے بعد آج میں آپ کو
منھ دکھانے کے قابل ہوا ہوں۔ ہم نے اس سڑک کی
تعمیر میں بڑے مصائب برداشت کیے۔ مشکل ترین حالات
کا سامنا کیا۔ کئی روز وقت پر کھانا نہیں ملا۔ بھوک
پیاس سہنی پڑی۔ مجھے خوشی ہے کہ آج ہماری آرزوئیں
پوری ہوئی ہیں۔ سڑک کی تعمیر سے لدّاخی عوام خاص
طور پر غریبوں کو فائدہ ہوگا۔"

دراصل یہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اُنہوں نے
بڑی کسرِ نفسی سے کام لیا تھا کیوں کہ اس سڑک کی تعمیر میں
وہ جن ذاتی جوکھموں سے گزرے اور جس ہمت، لگن اور
استقلال کا ثبوت دیا، وہ لدّاخ کیا کسی بھی قوم و مُلک
کے لیے باعثِ فخر ہے۔ بعد میں صنم نربو، لدّاخ کے چیف
انجنیئر اور پھر ڈیولپمنٹ کمشنر کے عہدوں پر رہے۔ پھر

وہ کشمیر کے وزیر بنے اور بعد میں منگولیا میں بھارت کے سفیر بھی رہے۔ اُن کی سوانح حیات[1] اُن کے عزم اور لگن کی جیتی جاگتی داستان ہے اور پڑھنے والے کو بے حد مرعوب کرتی ہے۔

صنم نربو نے ایک کتاب :

Laddakh, The Moon Land

کے پیش لفظ میں لکھا ہے :

"زمانۂ سلف کا دشوار گزار اور مخفی سرزمینِ لداخ اب پُراسرار 'شنگریلا[2]' نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں سماجی اور معاشی انقلاب کے لیے عظیم کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیہہ سری نگر کے مابین ۴۳۴ کلومیٹر لمبی سڑک نے ترقی کی راہیں کھول دی ہیں اور یہ لداخیوں کی زندگی میں نئی تبدیلیاں لانے میں ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہو رہی ہے۔"

اس کا ایک ثبوت تو ہر سال سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ آج لداخ میں ہر اچھی کوٹھی، مکان و حویلی، ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں تبدیل ہو چکی ہے — یہاں بڑھیا فور اسٹار ہوٹل بھی ہیں جو سیزن کے دوران چار پانچ سو روپے فی دن کمرے کے لیے چارج کرتے ہیں اور کچھ خاطر خواہ گیسٹ ہاؤس بھی جہاں آج بھی دس پندرہ روپے میں رات بسر کرنے کے لیے جگہ مل جاتی ہے۔ اتنے سستے کرائے کے ہوٹل تو ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں ایک 'خواب' بن چکے ہیں۔ عموماً چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ہوٹلوں تک میں لداخی ماحول اور بود و باش کے نمایاں پہلوؤں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ہر ایسی جگہ پر لداخی قالینوں کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ فرش پر نمدے اور قالین تو ہر جگہ ہیں۔ بعض اوقات تختوں اور نشستوں پر بھی قالینوں کی نمائش سی دکھائی دیتی ہے۔ آرائش کے لیے مکھوٹوں رسیوں کا استعمال بھی عام ہے۔

لیہہ میں اکثر کوہ پیمائی کرنے والے غیر ملکی لوگوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ جدھر نظر دوڑائیے۔ یہ شوقین پیٹھ پر Haver-Sack میں اپنی زندگی کا تمام اثاثہ باندھے گھومتے نظر آتے ہیں گویا وہ اپنے قافلے کے کوچ کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہوں۔ آپ کو وہی لوگ اگلے روز اور اُس سے بھی اگلے روز اُسی طرح چاق و چوبند حالت میں مل جائیں گے۔ آپ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ یہ کیسے قافلے ہیں جو اپنی منزل کی طرف کبھی روانہ نہیں ہوتے۔ شاید اپنی اپنی پیٹھ پر ان بھاری بھر کم Haversacks کو لے کر گھومنا بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔ (میں یہ نہیں کہتا کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی مہم باز نہیں بلکہ اکثریت انہی لوگوں کی ہوگی۔ پھر بھی .....) یہ لوگ ہاف پینٹ یا جینز پہن کر گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان دنوں نیلے رنگ کی جینز قدرے سفیدی مائل نیلگوں جینز میں تبدیل ہو گئی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جس جینز کا رنگ جتنا زیادہ داغِ مفارقت دیتا معلوم پڑے، وہ جینز اتنی ہی بڑھیا قرار دی جاتی ہے۔ اب ان فیشنوں کا حال نہ پوچھیے۔ ہمارے گورنمنٹ کالج لاہور کے دنوں میں بدقسمتی سے ہمارے ایک پروفیسر صاحب کے کوٹ کی کہنیوں کا کپڑا مسک گیا۔ دوسری جنگ کا زمانہ تھا۔ بچت، قلت اور ہر ممکن حد تک کفائت کا دَور دَورہ تھا۔ انہوں نے ان کہنیوں کو ڈھانپنے کے لیے کوٹ میں چمڑے کے پیوند لگوا لیے۔ پھر کیا تھا ہم میں سے شوقین مزاج طالب علموں نے اپنے اچھے بھلے کوٹوں بلکہ نئے سلوائے جانے والے کوٹوں میں بھی چمڑے کے ایسے پیوند لگوانے پر اصرار کیا۔ کہنیوں پر پیوند لگوانے کا فیشن ایک سیلاب کی طرح سب کو بہا کر لے گیا۔ اب ان جینز میں سننے میں آیا ہے کہ نیا کپڑا یا نئی سلی سلائی جینز کو خریدتے ہی اسے "گھسانے" کا غیر فطری عمل شروع ہو جاتا ہے اور پھر ان دنوں تو ملوں سے نیا کپڑا ہی ایسا آنے لگا ہے، جس سے اس کے پرانے اور گھسے ہوئے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے اپنی تمام گھسی پرانی پینٹیں ان فیشن زدہ لوگوں کے سپرد کر دوں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ یہ جینز نہیں ہیں۔ ورنہ اچھی خاصی رقم ہاتھ لگ گئی ہوتی۔

خیر صاحب بات ہو رہی تھی ہوٹلوں کی لداخی فضا کی۔ اب ان ہوٹلوں کے نام بھی سن لیجیے۔ 'یاک ٹیل' (یاک کی دم) IBEX ، DRAGON کھانگری (لداخی زبان میں کھانگری بمعنی پہاڑ) استعمال ہوتا ہے) اب یہ نام ہی لداخی فضا طاری کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہوٹلوں میں یورپی، چینی، ہندوستانی کھانوں کے علاوہ لداخی کھانے کی بھی فرمائش کی جا سکتی ہے، لیکن اتفاق سے ان میں کچھ زیادہ تنوع نہیں اور شاید عام لوگوں کو بہت پسند بھی نہ آئیں۔ اسلامی ملکوں کی طرح یہاں بازار میں نان بائی کی اپنی اہمیت ہے اور تقریباً ایسے ملکوں میں ملنے والے تمام اقسام کے نان بہ آسانی میسر ہیں۔

ہوٹل سے باہر نکلنے پر دو منظر دکھائی دیتے ہیں۔ بازار یا پھر نلوں پر پانی کے انتظار میں ٹین، المونیم، کانسی یا پیتل کے ہر وضع کے برتنوں کی لمبی قطاریں یہ منظر کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے دہلی میں کسی دودھ کے ڈپو کے کھلنے سے پہلے خالی بوتلوں کی قطاریں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ آج کل تو خیر دودھ پلاسٹک کی تھیلیوں میں ملنے لگا ہے۔ اس زمانے میں ان بوتلوں کے مالک لائن سے ہٹ کر دُور گپیں لڑایا کرتے تھے۔ ڈپو کھلتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی بوتلوں، برتنوں کو سنبھالتا اور دوبارہ لائن میں اپنی جگہ بنا لیتا تھا۔ یہاں بھی نل ذرا چھینکا تو منتظر لوگوں کی بھیڑ واپس قطار میں اپنے اپنے برتنوں کے پاس حاضر! اُن کی پھُرتی دیکھتے ہی بنتی ہے۔

دوسرا بازار کا منظر کچھ ویسے ہی ہے جیسے دہلی کے جن پتھ اور امپیریل ہوٹل (اب تیل بھون کے قریب) لگی ہوئی تبتی لوگوں کی پتھروں، منکوں، مالاؤں اور کانسی پیتل کی مختلف اشیاء سے سجی دُکانیں! حیرت تو ہمیں تب ہوئی جب ہم نے جن پتھ کے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی دُکانوں کے کچھ مالکوں کو یہاں بھی یہی دھندا کرتے پہچان لیا۔ سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ رئیس زادوں کی طرح گرمیاں بتانے لیہہ چلے آتے ہیں اور سردیوں میں جن پتھ پر دُکانیں سجاتے ہیں۔ دراصل اُن کا دھندا تو سیاح

۱۔ صنم نربو از: عبدالغنی شیخ (۱۹۸۰ء)

۲۔ "شنگریلا" مشہور ناول The Lost Horizon میں ایک تصوری شہر ہے جو پہاڑوں کی گود میں واقع ہے اور مکمل امن و خوشحالی کا مرقع ہے۔

گاہکوں کا بھجوایا کرتا ہے۔ چاہے وہ لداخ ہو یا دہلی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہاں ان کے مال کی نوعیت قدرے بدل جاتی ہے۔ لداخ میں فیروزہ پتھر افراط سے ملتا ہے اس لیے اس پتھر سے جڑا ہوا سامان بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ تبت اور چین پاس ہونے کی وجہ سے اکثر چین کے بنے اور اسمگل کیے ہوئے سامان کی بھی بہتات ہوتی ہے — ملنے کو تو یہ سامان ایسی دکانوں پر دہلی میں بھی مل جاتا ہے، لیکن وہاں ایسی بھرمار نہیں۔ لدھیانہ میں تیار کی ہوئی ہوزری بھی یہاں مقامی شال، سوئٹروں کے دھوکے میں بک جاتی ہے —— بڑی دکانوں پر قالین اور طرح طرح کے بھیانک مکھوٹے توجہ کا مرکز بنتے ہیں —

لیہہ میں کوئی باقاعدہ سنیما گھر نہیں ہے، لیکن جگہ جگہ ویڈیو پارلر موجود ہیں۔ جہاں دن کے چار پانچ شو میں مختلف ہندوستانی، انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ باقی جگہوں پر ویڈیو اب سنیما گھروں کو بند کروا رہے ہیں۔ یہاں ویڈیو دور نے سنیما گھروں کو کھلنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ اس کی ایک وجہ تو لیہہ اپنی آٹھ ہزار کی محدود سی آبادی ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ لداخی لوگ سنیما کے شوقین نہیں، لیکن بنیادی طور پر ویڈیو شو بہت سستے ہیں اور ان میں تنوع کے امکانات لامحدود۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ اگر دس ویڈیو پارلر روزانہ اپنے پانچ شو میں پانچ مختلف فلمیں دکھائیں تو ان پچاس فلموں میں کوئی نہ کوئی فلم تو آپ کی پسند کے مطابق مل ہی جائے گی اور پھر اگر آپ کو اپنی پسند کی کوئی فلم دیکھنا مقصود ہو تو یہ پارلر والے وہی فلم دکھانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

بشرطیکہ آپ ان کے لیے تھوڑے سے فلم بین اور مہیا کر دیں۔ اور پھر ویڈیو فلموں کی لائبریری کس مرض کی دوا ہے۔ اگر آپ مطلوبہ فلم حاصل نہ کر سکیں۔

ان پارلروں میں سے دو ایک کے ہال بھی کافی کشادہ ہیں۔ جن میں بہ یک وقت سو پچاس آدمی فلم دیکھ سکتے ہیں۔ جس ہال میں ہمیں جانے کا اتفاق ہوا وہاں پانچ روپے کے عوض فلم دیکھتے ہوئے ایک مفت کولڈ ڈرنک کا اہتمام بھی ٹکٹ کی شرح میں شامل تھا۔

کرگل کی طرح یہاں بھی دہلی سے نشر کیا ہوا دوردرشن کا پروگرام ویران شاموں کو کسی حد تک دلچسپ بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

فلموں کی دنیا سے آپ باہر آئیں۔ لیہہ کے دربار روڈ سے لگتی چھنگ گلی آپ کی منتظر ہے۔ جہاں چھنگ تیار کرنے والی دکانوں کی بھیڑ ہے۔ "چھنگ" لداخ کا قومی مشروب ہے۔ جوار، چاول اور نہ جانے کن کن چیزوں سے خمیر اٹھایا ہوا یہ مشروب یاک کے مکھن اور گھی سے تر آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جیسے نووارد اس کے ذائقے سے محظوظ نہ ہوں، لیکن پینے والے تو اسے بیئر یا وہسکی کی طرح ہی قدرت کی انمول نعمت سمجھتے ہیں۔ چھنگ بنانا بھی ایک فن ہے اور ہر مشروب کی طرح اس کے بھی الگ الگ فارمولے ہیں ہلکی تیز مختلف ذائقے لیے ہوئے، سرور کے مختلف معیاروں کے مطابق، شادی بیاہ، خوشی، غمی، چھنگ کے بنا ہر دعوت ہر اجتماع ادھورا ہے۔ کسی لڑکی یا لڑکے کی شادی کا پیغام چھنگ کی صورت میں بھیجا جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا میں زندگی کئی سطحوں اور معیاروں پر جی جاتی ہے۔ یہاں سب سے نچلی سطح پر زندگی بسر کرنے کے بھی کئی مسئلے ہیں۔ ذرائع آمدورفت (جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں) کے علاوہ یہاں زندگی کے تین اور بنیادی مسئلے ہیں۔ قہر کا جاڑا، آبپاشی اور پینے کے لیے پانی اور کھانا تک بنانے کے لیے ایندھن کی شدید کمی۔ یہ مشکلات فوج اور اہلِ لداخ دونوں کے لیے مشترکہ ہیں۔ کیوں کہ ہندوستانی فوج زندگی کے بہتر معیاروں سے واقف ہے لہٰذا اُن کی فراہمی کی تگ و دو لداخ کے لوگوں کے لیے خوشحالی کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔

لیہہ میں آبپاشی کا حل قریب ہی بہتی ہوئی سندھ ندی کے پانی کے ذریعے کیا گیا ہے۔ جہاں ندی کی سطح زمین کی سطح سے نیچی ہے، وہاں پانی ڈیزل پمپوں کی مدد سے نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی جگہوں پر چھوٹی چھوٹی نہریں اور نالے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ لیہہ کے قریب ہی اس کے پانی کی مدد سے بجلی بھی پیدا کی جانے لگی ہے۔ اب تو لیہہ سے کارو جانے والی سڑک پر خوبانیوں اور دوسرے پھلوں کے اتنے درخت اُگ آئے ہیں کہ کہیں کہیں سری نگر جیسی ہریالی نظر آنے لگی ہے۔ صرف سڑک کے کنارے ہی کہیں کہیں صدیوں سے پھیلی ریت کی جھلکی کھاتے ہیں۔ لیکن ابھی منزل کافی دور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شروعات ہو چکی ہے۔

ستکنسا ہائیڈل پروجیکٹ ہفتال آبپاشی پروجیکٹ، کھیاتھنگ نہر، اُلبتی، سینچائی پروجیکٹ گرگرتھنگ نہر، کھرباتھنگ سینچائی پروجیکٹ، آرمی جھنجو تھنگ نہر وغیرہ واضح ثبوت ہیں کہ آبپاشی کے لیے تگ و دو شروع ہو چکی ہے۔ لداخ کے میدانی علاقوں کی زمین کنواری ہے۔ آبپاشی کے ذرائع وجود میں آتے ہی یہاں کی دھرتی مسکرانے لگے گی۔

فوج کے زراعتی محکمہ نے اپنی تجربہ گاہ میں پھل، سبزیاں اور فصلوں کے لیے مقامی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے نئی نئی اقسام اور اُن کے بیج بنانے شروع کر دیے ہیں، جن کی مانگ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انہوں نے اپنی تجربہ گاہ میں Ultra Voilet شعاعوں کی مدد سے چودہ کلو وزنی بند گوبھی، سترہ کلو کی مولی، ڈیڑھ کلو وزن کا ایک ایک آلو اور پانچ کلو وزنی شلغم تک اُگائے ہیں۔ یہاں ایک مسئلہ شدید برف باری اور سردیوں میں سورج کی روشنی کی کمی بھی ہے۔

ممکن ہے ان سہولیات کی فراہمی عام کسان کے لیے ناممکن ہو، لیکن اُسے امید کی کرن دکھائی دینے لگی ہے۔ ہم نے خود ان تجربہ گاہوں میں جا کر مختلف تجربے ہوتے دیکھے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ لداخ میں جلد ہی خوشحالی کا نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اسی تجربہ گاہ سے جڑے ہوئے ایک ادارے میں بھیڑ بکریوں، مویشیوں اور پولٹری کی نسلوں کی

افزائش کے لیے بھی تجربے کیے جا رہے ہیں تاکہ بہتر نسلوں کے ذریعے جو مقامی آب و ہوا سے مانوس ہوں ۔ زیادہ دودھ، اُون، گوشت اور انڈے حاصل کیے جا سکیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے ۔ یہاں سورج کی کرنیں عمودی پڑنے کی وجہ سے زیادہ گرم ہیں ۔ اس کا فائدہ سورج کی شعاعوں سے کھانا پکانے اور پانی گرم کرنے والے آلات کی صورت میں ہونا شروع ہو گیا ہے ۔ ایندھن کی کمی سورج کی کرنوں سے کسی حد تک پوری کی جا سکتی ہے ۔ یوں تو یہ شعاعیں ملک کے کچھ حصوں میں بجلی پیدا کرنے اور پمپوں کے ذریعے پانی نکالنے کے کام میں لائی جانے لگی ہیں ۔ لیکن ان حالات میں جہاں موسم سرما بہت لمبا ہو ۔ شاید ان سے اس قدر زیادہ استفادہ نہ کیا جا سکے ۔ پھر بھی ان دشوار حالات میں کسی حد تک یہ طریقے کچھ راحت تو ضرور پہنچا سکتے ہیں ۔ چند ہوٹلوں میں تو ایسے آلات کا استعمال شروع ہو گیا ہے ۔

لداخ کے پہاڑوں میں نہایت قیمتی معدنیات کے ذخیرے ہیں ۔ اکثر پہاڑوں کا خوش نما رنگ انہی معدنیات کی دین ہے ۔ ان معدنیات میں تانبا، گندھک، چونا، بورکس کرومائیٹ وغیرہ شامل ہیں شائی آک دریا کی ریت میں سونے کے ذرّات بھی ملتے ہیں ۔ یہ ذخیرے آمد و رفت کے ناکافی ذرائع اور کھدائی کی جدید ترین مشینیں نہ ہونے کی وجہ سے دفن پڑے ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی ضروریات کے حصول کے بعد سرکار اور لوگوں کی توجّہ ان پر بھی ضرور جائے گی، لیکن یہ بھی ممکن ہے جب زندگی نچلی سطح سے اٹھ کر اوپر کی سطح کی طرف کروٹ لے گی ۔

اس کا کیا کیا جائے کہ جہاں نعمتیں موجود ہوں گی وہاں اُن کی قیمت چند لعنتوں سے بھی چکانی پڑتی ہے ۔ اس کا ایک تازہ ثبوت لیہہ کی تاریخ میں پہلی بار ایک جیل خانے کی صورت میں تشکیل پا رہا ہے ۔

★★

بقیہ: نئی کتابیں

ظلم، نفرت، تشدد، فرقہ پرستی یا چھوت چھات کا سلسلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا ۔ اور آخر کار حق کی جیت ہوتی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کتنی ہی تکلیف دہ ہو، مگر حسین ہے اور زندگی کے حسن کا جتنا شدید احساس ڈاکٹر ارمان کو ہے، وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں خال خال نظر آتا ہے ۔

مضطرب صحرائی نے ان کے افسانوں سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے بیشتر صحیح ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اودے سرن ارمان کے یہاں ہر قدم پر سماجی حقیقت پسندی کے نمونے ملتے ہیں ۔ لیکن انہیں اشتراکی کہنا یا کسی ازم سے وابستہ کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا ۔ ان کے افسانے تو بس ان کے افسانے ہیں ۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی مگر اہم حقیقتوں سے لبریز اپنے سادہ اور دل نشین لب و لہجے کے ساتھ قاری کے دل میں اتر جانے والے ۔

ڈاکٹر ارمان ایک وسیع تخلیقی ذہن کے مالک ہیں ۔ جس کے نمونے ان کی پیش کردہ' اپنے ماحول میں پیوست، خوب صورت اور نادر تشبیہات میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر ارمان کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر عام قاری کچھ کرنے پر نہ سہی' سوچنے پر ضرور آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس دورِ بے حسی میں کسی فن کار کو اتنی بھی کامیابی مل جائے تو بہت ہے ۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

بقیہ: مکتوبات

زیب مرحوم کے پورے سفرِ شعری کا اندازہ کر سکیں ۔ زیب غوری کی شاعرانہ حیثیت کا تعین "زرد زرخیز" کے ساتھ ساتھ "چاک" میں شامل ان کی نئی غزلوں کے مطالعہ کے بعد کیا جانا چاہیے ۔ "چاک" کی نئی غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فن کی نئی جہتوں کو چھونے لگے تھے ۔ اور "زرد زرخیز" کے محدود دائرے کو انہوں نے توڑ دیا تھا ۔ "چاک" کی نئی غزلوں کے مطالعہ کے بعد اقبال کرشن صاحب کا یہ الزام بھی مہمل نظر آنے لگے گا کہ زیب مرحوم کے پاس بیٹھنے والے ناپختہ ذہن لوگوں کی واہ واہ نے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا ۔

حسن عزیز کان پور

سبق آموز:

اگست ۱۹۸۷ء کا شمارہ بے حد معلوماتی اور باصلاحیت قلم کاروں کی بہترین تخلیقات سے پُر ہے ۔ جناب م ۔ ک ۔ مہتاب کا "ابرِ کرم" حالاتِ حاضرہ کے تحت کامیاب نہیں کہا جا سکتا ۔ بہرحال ان کا مضمون معلوماتی اور اہم ہے ۔ جناب پرہلاد سنگھ کا ستیہ مورتی، جناب کالی داس گپتا رضا کا "غالب کی زندگی میں کلامِ غالب کی اشاعت" اور بیگ صاحب کا "شاہ نصیر الدین دہلوی" نے بے حد متاثر کیا ۔ ان حضرات کی صلاحیت، یادداشت اور محنت قابلِ داد ہیں ۔ مخمور سعیدی کی نظم موسمِ برسات بڑی اچھی ہے ۔ دیگر حضرات کی غزلیں بھی اچھی ہی کہی جائیں گی ــــــ پنا لال پٹیل جی کے بارے میں سرلا جگموہن اور نریندر شیل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی ــــــ پٹیل جی کی جیونی سنگھرش سے بھری ہوئی ہے اور سبق آموز ہے ۔ نئی کتابوں پر تبصرے خوب ہیں ۔ عالمی اردو ادب ۱۹۸۶ء کے لیے شری نند کشور وکرم جی قابلِ مبارک باد ہیں ۔

ناشاد اورنگ آبادی، سمستی پور

نام کتاب: کشتِ جاں (مجموعۂ کلام)
مصنف: عمر انصاری
صفحات: ۲۰۸ **قیمت:** ۵۱ روپے (پہلا ایڈیشن)
ملنے کا پتہ: مکتبۂ فردوسِ ادب، ۲۰۔ امین آباد پارک، لکھنؤ

عمر انصاری لکھنؤ کے اساتذہ اور اردو کے کہنہ مشق شاعروں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں وہ آٹھ شعری مجموعے شائع کر چکے ہیں۔ انہوں نے کئی رسالوں اور اخباروں کی ادارت کی ہے۔ نثر میں افسانے، ڈرامے، انشائیے وغیرہ لکھے ہیں۔ فلمی دنیا میں بھی رہ چکے ہیں۔ غرض انہوں نے بڑی فعال زندگی گزاری ہے۔ اردو ادب، خصوصاً شاعری کے مختلف موسموں اور مد و جزر کا مشاہدہ کیا ہے اور اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے، اپنی شاعری کو بدلتے ہوئے زمانوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی رکھا ہے۔ نوجوانی میں وہ مولانا عبدالباری آسی اور اُن کے معاصروں کے حاشیہ نشین رہ چکے ہیں۔ اور اب دبستانِ لکھنؤ کے بزرگ ترین استاد کا درجہ حاصل کر لینے کے باوجود شمس الرحمٰن فاروقی، عرفان صدیقی بلکہ ان کے بعد تک کی نسل کے جدید شاعروں اور ادیبوں کے بھی ہم نشین ہیں اور یہ نوجوان انہیں بزرگ سے زیادہ برابر کا دوست سمجھتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عمر انصاری کی شخصیت کیسی رنگا رنگ اور ان کی زندگی کتنے تجربوں سے عبارت ہوگی۔ اُن کے کلام میں اسی شخصیت اور اسی زندگی کا انعکاس ہوتا ہے۔

"کشتِ جاں"، عمر انصاری کا آٹھواں اور تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے، جس میں سب سے پہلے نظر اُس منظوم دیباچے پر ٹھہرتی ہے جو خود انہوں نے "مزدِ سخن" کے عنوان سے لکھا ہے۔ کسی ناقد سے مقدمہ لکھوانے یا خود نثر میں اپنی شاعری کا تعارف کرانے سے بہتر یہی ہے کہ شاعر اپنی اظہاری زبان میں اپنے تخلیقی تجربے کا بیان کرے۔ اس لحاظ سے عمر انصاری کا یہ دیباچہ خاصے کی چیز ہے۔ اس کے چند شعر دیکھیے:

خیال ذہن میں یوں کروٹیں بدلنے لگے
کہ جیسے شام ہوئی اور چراغ جلنے لگے

زمینیں گنبدِ افلاک سے اُترنے لگیں
ردیفیں سجنے لگیں قافیے سنبھلنے لگے

بنے ہوئے تھے مضامیں جو راہ کے پتھر
کسی غریب کے دل کی طرح پگھلنے لگے

وہ سانپ ہاتھ لگاتے بھی جن کو ڈرتا تھا
مری جناب میں آ آ کے مَن اُگلنے لگے

"کشتِ جاں" میں لہجوں، ردیفوں اور مضامین کا جو تنوع ہے وہ حالیہ شعری مجموعوں میں کم نظر آتا ہے۔ یہاں ایک طرف کلاسیکی انداز کے ایسے استادانہ شعر ہیں:

چل اشکِ رواں، تو ہی اب یار بھی ہمدم بھی
گھر پھونک کے نکلے ہیں تیری ہی طرح ہم بھی

دوسری طرف منیر نیازی کی زمین اور ایسے شعر بھی ملتے ہیں:

آئی تھی دیہات سے کل، آج ٹھہری ہو گئی
کس قدر چالاک دو دن میں گلہری ہو گئی

اس تنوع کا مزید اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے کیجیے۔

اب تو غالب بھی نہیں، کون ترا جام سفال
ٹوٹ جائے گا تو بازار سے پھر لا دے گا

بچہ بھی اک وہیں تھا بڑی دیر سے کھڑا
جس جا سجے ہوئے تھے کھلونے دکان میں

پھر گھر کے اٹھا ابر بھی دریا بھی چڑھ آیا
پھر بہہ گیا وہ بھی کہ جو جلنے سے بچا تھا

اے ہوا، شمع بجھانا تو نظر کر لینا
دیکھتا ہو نہ کہیں شمع جلانے والا

آج ترے کوچے سے گزرے
ہم بھی اک رہگیر کی صورت

اس کی یادوں کا تو یارو ہے جدا ہی انداز
دے کے آواز کبھی آئیں، نہ جائیں کہہ کے

ستاروں پر قدم تو رکھ دیا ہے
جدھر لے جائیں اب ہم کو یہ زینے

ہو گئی کھل کے لڑائی جو اٹھا رکھی تھی
وہ بھی لٹنے میں تھا میں نے بھی لگا رکھی تھی

اب لکھنؤ میں ڈھونڈتے ہیں لکھنؤ کو ہم
لیلیٰ کی انگلیاں ہیں نہ مجنوں کی پسلیاں

"کشیدِ جاں" کے مطالعے سے یہ
ِش گوار احساس ہوتا ہے کہ شاعر کے فن پر سن
سیدگی کا کوئی انحطاطی اثر نہیں پڑا ہے، اگرچہ
دِ شاعر کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ بہت
ِندگی گزار چکا۔ اس موضوع پر عمر انصاری نے
ئی دل کش اور پُر اثر شعر کہے ہیں۔ مثلاً :

تم کہاں جاتے ہو، مجھ کو بھی اُڑا کر لے چلو
اے ہواؤں کے خنک جھونکو، مجھے گھر لے چلو

کسے کسے میں پکاروں کدھر کدھر جاؤں
سفید بال لیے سر پہ یہ کفن جیسے

نام کس کس کے یہ خاک اور ہوا میں لکھ دوں
آخری وقت ہے کس کس کے لیے کیا میں لکھ دوں

میرے ہر ہر گام پہ مجھ کو ٹوکنے والے ہوئے کیا
اک دن کوئی کچھ نہ کہے گا، یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا

وقت کی چیرہ دستی اور مرورِ زماں کا احساس شاعر کی فکر کو مضمحل بھی کر سکتا ہے اور اس کی شاعری کا نیا انگیزہ بھی بن سکتا ہے۔ عمر انصاری کے یہاں دوسری صورت نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کا یہ مجموعہ ایک قدم آگے محسوس ہوتا ہے۔

نیر مسعود

نام کتاب: **صحرا کی دھوپ** (شاعری)
شاعر: ساحر شیوی
صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ارضِ کوکن نے اردو شعر و ادب کو کئی نامور شخصیتیں دی ہیں۔ اس فہرست میں اب ساحر شیوی کا نام بھی بہ آسانی شامل کیا جا سکتا ہے۔ شاعری ان کا پیشہ نہیں، شوق ہے۔ پیشے سے وہ تاجر ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کا قیام برسوں سے کینیا میں ہے۔ جہاں ان کے شوق کو مہمیز کرنے والے خارجی اسباب اگر ہوں گے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ یہ ان کی داخلی لگن ہی ہے جو اُن سے شعر کہلوا رہی ہے اور یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ قائم ہے۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کے دو مجموعے "نیم شگفتہ" اور "وقت کا سورج" کے نام سے شائع ہو کر اہلِ ذوق کے ہاتھوں تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ جسے انہوں نے اپنے ہم پیشہ شاعر، ادیب اور محقق جناب کالی داس گپتا رضا کے نام معنون کیا ہے۔ انتساب کے اگلے صفحہ پر انہوں نے رضا صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے جو موصوف سے ان کے تعلقِ خاطر کو بھی ظاہر کرتا ہے اور رضا صاحب کی ذات و صفات کا بھی آئینہ دار ہے۔

ساحر شیوی شاعری کی اکثر مروج اصناف سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ ان کے سابقہ مجموعوں میں نظم و غزل کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی قابلِ لحاظ تعداد میں شامل تھے۔ اس مجموعے میں بھی یہی صورت ہے۔ اس سے ان کی پُر گوئی اور قدرت کلام کا احساس ہوتا ہے۔

ساحر صاحب جس عہد میں جی رہے ہیں اس کے حالات و کوائف سے بخوبی واقف ہیں۔ اور ان کی شاعری میں جا بجا اس کا اظہار ملتا ہے۔ زندگی کے بعض ایسے حقائق کو بھی اُنھوں نے موضوعِ سخن بنایا ہے جو زمان و مکان سے ماورا ہیں اور ہر دور میں ہر حلقہ کے انسان کو ان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ معاملاتِ حسن و محبت سے بھی وہ شناسا لگتے ہیں۔ مگر یہ شناسائی کچھ سرسری سی ہے۔ میر نے کہا تھا :

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ساحر صاحب اگر عشق کے کوچے سے گزرے بھی ہیں تو غالباً اسی انداز میں اس لیے وہ کسک ان کے عشقیہ اشعار کا حصہ نہ بن سکی۔ جو اس جذبے کی لازمی دین ہوا کرتی ہے۔

ساحر صاحب کی زبان سلیس اور ان کا اسلوب سادہ ہے۔ اپنی شعری روایت پر ان کی نظر ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام زیادہ شاعرانہ محاسن کا حامل چاہے نہ ہو لیکن معائب سے بڑی حد تک پاک ہے۔

ساحر صاحب کے اس مجموعے میں کچھ آزاد غزلیں بھی شامل ہیں۔ اب یہ بدعت خاصی راسخ ہوتی جا رہی ہے لیکن اسے بدعتِ حسنہ کی حیثیت شاید ہی کبھی حاصل ہو سکے۔

کتاب بہت سلیقے سے چھاپی گئی ہے۔ کتابت و طباعت دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

مخمور سعیدی

نام کتاب: **کُہرے کی دھول**
شاعر: ظہیر غازی پوری
قیمت: بیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۶

ظہیر غازی پوری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جن کے متعدد شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ جو زیادہ تر آزاد نظموں پر مشتمل ہے، فخر الدین میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس کے فلیپ پر ڈاکٹر سلیم اختر نے ان کی نظموں سے متعلق دو باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے جدید شاعروں کی طرح ویسے تو ظہیر بھی عام طور پر ذات کا کرب ہی اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ مگر بہت فن کاری سے اس کرب کو عصری آگہی کا استعارہ بنا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس عمل کے دوران ان کے اسلوب کا ایجاز و اختصار قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ میں اس رائے کے پہلے حصے سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظہیر کی نظموں میں وجودی طرزِ فکر کے بیشتر عناصر موجود ہیں اور یہ نظمیں

دورِ حاضر کے اس انسان کا المیہ بن کر سامنے آتی
ہیں جو حیات و کائنات کے تجزیہ و تو مسائل کے
علاوہ خود اپنی ذات کی الجھنوں سے دست و گریبان
رہتا ہے، لیکن ان نظموں کا اسلوب نہ تو فصاحت
کا قابلِ تقلید نمونہ ہے نہ بلاغت کا۔ اس کے برعکس
آٹھ، دس یا پندرہ سطروں پر مشتمل متعدد ایسی نظمیں
مجھے ملیں جن کا مفہوم صرف دو مصرعوں پر مشتمل
کسی شعر میں زیادہ خوب صورتی سے بیان ہو چکا
ہے یا ہو سکتا ہے۔ بعض نظموں میں اسلوب کا
کھردرا پن نمایاں ہے اور موضوع شاعری نہیں
بن سکا ہے۔ مثلاً:-

دفتر جانے سے پہلے
کانوں سے ٹکرانے والی
کچھ آوازیں ــــ!
آج آٹا منگوانا ہے
تیل بھی دو دن پیچھے ہی بچا ہے
چائے کی پتی مٹھی بھر ہے۔
سبزی نہیں ہے شام کی خاطر
چینی، کیراسن تیل بھی کل تک مشکل ہی سے چلے گا
سونی کی چپل ٹوٹ گئی ہے
نمکی، بسکٹ کچھ بھی نہیں ہے
(نظم 'سلگتی فکروں کی')

ظاہر ہے کہ اس طرح کی نظموں میں اسلوب کی
دل کشی تلاش کرنا بے سود ہے۔
میرا خیال ہے ظہیر کے اسلوب کی جو خصوصیت
ان کی نظموں کو قابلِ مطالعہ بناتی ہے وہ پیکر تراشی
ہے۔ رنگ برنگے، خوب صورت اور دل نشین پیکر
تقریباً ہر نظم میں ابھرتے ہیں اور قاری کو احساس
کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر
اس مجموعے کی تین بے حد مختصر نظمیں "صبح" "دوپہر"
اور "شام" دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ
"لاالہ" "گم شدہ لمحوں کا احتساب" "دیوہیکل"
"نقش برآب" "واردات" اور "زہر میں ڈوبی
ہوئی ہوا" (بھوپال گیس المیہ سے متعلق) میں
ظہیر کی تخلیقی صلاحیتیں نقطۂ عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔

نام کتاب: پیاسے لوگ

افسانہ نگار: ممتاز شارق
قیمت: دس روپے
ناشر: ادارہ بزم، آزاد نگر، جمشید پور ۱۰

ممتاز شارق نے اب تک زندگی کی صرف
تیس بہاریں دیکھی ہیں۔ لیکن اس کم عمری میں
بھی وہ دو مختلف ادوار سے گزرے ہیں۔ ایک
ان کی پریشان حالی کا دور ہے، جس میں ملک
کے عام تعلیم یافتہ، مگر مفلس اور بے کار نوجوانوں
کی طرح انہوں نے بھی نوکری کے لیے در در کی ٹھوکریں
کھائی ہیں۔ دوسرا وہ زمانہ ہے جو انہوں نے
وطن سے دور سعودی عرب کی ایک پرائیویٹ
فرم میں کام کرتے ہوئے قدرے آسودہ حالی
کے ساتھ گزارا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری ان
ہی دو ادوار کے تجربوں سے عبارت ہے حقیقت
کی عکاسی کو انہوں نے اپنا شعار بنایا ہے، لیکن
مشکل یہ ہے کہ حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے' اسے
تھوڑا شیریں اور قابلِ قبول بنا کر پیش کرنا ہر فنکار
کے بس کی بات نہیں۔ ممتاز شارق ابھی جوان
ہیں۔ انہیں زہر پی کر امرت بانٹنے کا سلیقہ ابھی
سیکھنا ہے۔ اس لیے ناکامیاں ان کے لیے عام طور
پر تلخ کلامی کا سبب بنتی ہیں۔ اور وہ زندگی کے
بے ڈھنگے پن کو کہانی کے لطف میں چھپا نہیں
پاتے۔ یہ صورت قاری کو گراں گزرتی ہے۔

بوڑھے بھکاری کا بھیک مانگنے کی جگہ
اپنے داماد کو جہیز کے طور پر دے دینا۔
(افسانہ شرط)
مکھیا کا گاؤں کے غریب لوگوں کو ستانا
اور ان سے بیگار میں کام لینا۔ (پیاسے لوگ)
سیٹھ اسمٰعیل کا ایک غریب نوجوان کی ایمانداری
کا صلہ دس روپے دے کر اس کی تحقیر کرنا۔
(ننگا آدمی)
اور دفتر میں اپنی امارت کا اظہار کر کے جو...
کا جسم فروشی سے دولت کمانا۔ (دھوپ میں چمکتی ریت)

یہ ایسے واقعات ہیں جو ہندوستانی معاشرے کی اذیت
ناک زندگی کو بلا کسی تکلف کے ہمارے سامنے پیش
کر دیتے ہیں، لیکن انہیں کچھ اور سلیقے سے پیش
کر کے بہترین افسانے لکھے جا سکتے تھے۔ دوسری
طرف عرب ملکوں کے کاسموپولیٹن ماحول میں جنم لینے
والے واقعات "زبانِ یار" "امانت" اور "مسیحا کی
موت" وغیرہ افسانوں میں پیش ہوئے ہیں۔ مگر
یہاں بھی اندازِ بیان میں تہ داری نہیں ہے۔
اس مجموعے کا جو افسانہ موضوع اور پیش کش
دونوں کے اعتبار سے دل کو چھو لیتا ہے وہ "بھا...
ہے۔ خلیجی ممالک میں کام کرنے والوں سے متعلق بہت
سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ ایک
نیا پہلو سامنے لاتا ہے۔

نام کتاب: ہر بار کہا دل نے

افسانہ نگار: ڈاکٹر اودے سرن ارمان
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: ماہنامہ ستانِ ہند، انصاری مارکیٹ،
دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا یہ افسانوی مجموعہ
پڑھتے وقت مجھے نہ جانے کیوں یہ شعر بار بار یاد
آیا ہے

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسا طرز بھی نہیں' ایہام بھی نہیں

زندگی کی سیدھی سادی حقیقتوں کو عام فہم
زبان میں اس طرح بیان کر دینا کہ بظاہر کوئی غیر
معمولی بات نہ محسوس ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ افسانہ
اپنے قاری کو گرفت میں لے لے، ڈاکٹر صاحب کا
خاص فن ہے۔ وہ زندگی کی مثبت قدروں پر ایمان
کی حد تک اعتقاد رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ
انسان کتنا ہی گر جائے شیطان نہیں بن سکتا۔ ہر
اندھیرے سے اجالے کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور نمودار ہوتی ہے
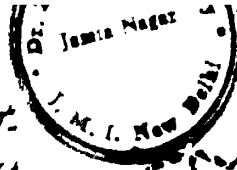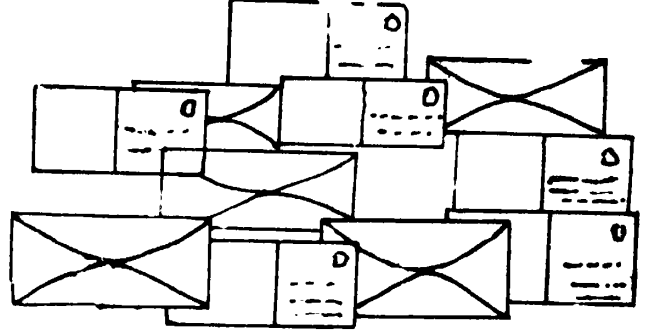
تائید :

عظیم امروہوی کا مقالہ جو انہوں نے نسیم امروہوی پر سپردِ قلم کیا ہے۔ "آج کل" (جولائی ۱۹۸۷ء) میں پڑھا۔ یہ مقالہ نسیم پر اچھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کامیاب مقالے پر میری جانب سے جناب عظیم امروہوی کو مبارک باد پیش فرمائیں۔ جولائی ۱۹۸۷ء کا "آج کل" جس میں یہ مقالہ چھپا ہے، اپنے دامن میں ڈاکٹر حنیف نقوی کا بھی ایک مقالہ "دیوانِ ناسخ: ایک نادر قلمی نسخہ" رکھتا ہے۔ یہ مقالہ بھی دل چسپی اور ادبیت کا حامل ہے۔ اس مقالے سے میری دل چسپی کے وجوہ میں یہ سبب بھی شامل ہے کہ اس میں چند ایسے نتائج نکالے گئے ہیں جو ناسخ کے دواوین کے متعلق ۱۹۸۳ء میں نکلنے والے میرے بعض تحقیقی نتائج کی تائید کرتے ہیں۔ میں نے "مطالعۂ ناسخ" "مشمولہ ادبی مقالے" طبع ۱۹۸۳ء ص ص ۹۰ تا ۹۳ میں متعدد مثالوں کی بنیاد پر یہ بات ثابت کی تھی کہ ناسخ کے پہلے، دوسرے اور تیسرے دیوان میں چند ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو اس لحاظ سے استثنائی حیثیت کی حامل ہیں کہ یہ متعلقہ دیوان کے زمانۂ ترتیب سے قبل یا بعد کا کلام ہیں۔

کاظم علی خاں، لکھنؤ

یاد آگیا....

کچھ جولائی ۱۹۸۷ء کے مندرجات کے متعلق :

اس شمارے کے دو مقالے بطورِ خاص دامنِ نظر کے لیے موجبِ کشش ہوئے، جن میں نند کشور وکرم کا "محمد طفیل : ایک مطالعہ" بڑا جامع اور بصیرت افروز مقالہ ہے۔

برادرم عظیم امروہوی کا مقالہ (جنابِ نسیم امروہوی کی شخصیت اور مرثیہ گوئی سے متعلق) پڑھ کر مجھے اپنا وہ دور یاد آگیا، جب میں لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھا اور اپنے برادرِ نسبتی پروفیسر ناظمیہ کالج مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم کے ساتھ باقر سوداگر کے امام باڑہ میں رہا کرتا تھا اور جناب نسیم امروہوی اُسی کے قریب کرایہ کے ایک مکان میں فروکش تھے ــــ اس طرح گویا ہمسائیگی کی قربت حاصل تھی۔ موصوف کے دو برادرِ نسبتی جو شیعہ کالج کے طالبِ علم تھے پہلے ان سے دوستی ہوئی پھر جناب نسیم تک بھی رسائی ہوئی۔ موصوف ان دنوں چرچ مشن ہائی اسکول میں معلم تھے۔

یہ لکھنؤ کی روایتی تہذیب کا آخری دور تھا۔ تاہم رجب کے مہینے کا آخری ہفتہ۔ گویا مقابلہ مرثیہ گوئی کا ہفتہ ہوا کرتا تھا جیسا کہ صاحبِ مضمون نے بھی لکھا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۲۵ رجب کو ایک ہی وقت میں خاندانِ انیس و دبیر کے چشم و چراغ جناب لڈن صاحب فائز (نبیرہ انیس) اور مرزا طاہر صاحب رفیع (نبیرہ دبیر) حسبِ ترتیب دل آرام کی بارہ دری اور امام باڑہ میر باقر سوداگر میں ہر سال مرثیہ نو تصنیف پڑھا کرتے تھے ــــ جناب نسیم امروہوی ۲۰ رجب کو امام باڑہ ناظم صاحب مرحوم میں جلوہ افروزِ منبر ہوا کرتے تھے "گلزارِ نسیم" میں بہارِ نسیم" تو اُن کی مرثیہ خوانی کے پوسٹر کا عنوان ہوا کرتا تھا نہ مرثیہ کا۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ نسیم صاحب نے سب سے پہلی مجلس جو لکھنؤ میں پڑھی، اس کے حسنِ کلام اور طرزِ ادا دونوں ہی کا تعریف و تحسین کے ساتھ ذکر ہر مجلسِ علم و ادب اور محفلِ شعر و سخن میں کچھ دنوں ہوتا رہا۔ اس کے بعد ہر سال موصوف اسی تاریخ کو نیا مرثیہ پڑھا کیے۔ کچھ برسوں بعد شمس العلماء سرکار ناصر الملت مجتہد کے حادثۂ ارتحال پر ایک "مرثیہ ناصر الملت" وا ناصراہ لکھا۔ اس پر بھی کچھ علمی و اصطلاحی بحث و تنقید کا سلسلہ اخبارات میں چلتا رہا۔

ذکا ملک پوری، پورنیہ سٹی

محدود دائرے :

"آج کل" کے شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء میں جناب اقبال کرشن کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ رفیق الزماں صاحب پر لاعلمی کا الزام لگاتے ہوئے اقبال کرشن صاحب لکھتے ہیں کہ "زرد زرخیز" کی ۱۳ غزلیں اور کچھ اشعار "چاک" میں شامل ہیں۔ حالانکہ کرشن صاحب کے اس بیان سے خود ان کی لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "زرد زرخیز" کے بعد کی کُل ۴۵ غزلیں "چاک" میں شامل ہیں۔ ۱۳ غزلیں اور کچھ اشعار 'زرد زرخیز' سے لیے گئے ہیں 'چاک' کا باقی تمام کلام بہت پرانا یعنی ۱۹۶۰ء سے پہلے کا ہے، جسے زیب مرحوم ازراہِ مذاق "دورِ جہالت کی شاعری" کا نام دیتے تھے۔ "چاک" میں پرانی شاعری کو جگہ کیوں دی گئی۔ اس کا جواب خود زیب مرحوم ہی دے سکتے تھے جس کا اب امکان نہیں۔ نئی غزلوں کے ساتھ ساتھ پرانی غزلوں کی اشاعت کا ایک جواز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ (آگے صفحہ ۴۴ پر)

اُردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر: راج نرائن راز

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد: ۴۶	شمارہ: ۵	دسمبر ۱۹۸۷ء
قیمت: دو روپے	فون: ۳۸۷۰۶۹	اگرہائن پوش شک سمہ ۱۹۰۹

ترتیب

سرورق: ایک آدی واسی دوشیزہ

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن: آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک: زرِ سالانہ: ۲۰ روپے - دو سال کے لیے ۳۶ روپے - تین سال کے لیے ۴۸ روپے

غیر روایتی توانائی

کوئلے اور پیٹرولیم جیسے توانائی کے روایتی وسیلوں میں تیزی سے کمی کی وجہ سے توانائی کے غیر روایتی ذرائع کی اہمیت اتنی بڑھتی جا رہی ہے، جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ان ذرائع سے توانائی کی کُل مانگ کا ۲۰ فی صد حصّہ پُورا ہوگا۔

کوئلے کے متبادل ذریعے کے طور پر توانائی کے نئے اور پھر سے قابلِ استعمال ذرائع سے توانائی کی کُل سالانہ پیداوار یا بچت ۲۵ کروڑ ایک لاکھ ۰ ہزار ٹن ہو جائے گی۔ اس میں سے کوئلے کے متبادل کے طور پر ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن توانائی حیاتیاتی گیس کے پلانٹوں سے ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن کے برابر توانائی باغیچوں سے ۳ کروڑ ۹ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن کے برابر بائیوماس سے اور دو کروڑ ٹن کے برابر توانائی سورج کی حرارت سے حاصل ہوگی۔

کھانا پکانے سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک توانائی کی متواتر سپلائی کا یقینی اہتمام کرنا ہمارے مُلک میں ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ قدرتی ایندھن کے زیادہ استعمال اور توانائی کے روایتی ذرائع کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے توانائی کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے والوں کے لیے اس مسئلہ پر پھر سے غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

۱۹۷۰ء کے دہے اور ۱۹۸۰ء کے ابتدائی برسوں میں توانائی کے بحران کو دیکھتے ہوئے پھر سے قابلِ استعمال توانائی کی ٹیکنالوجیاں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

آج ایک دُور افتادہ گاؤں کا کسی بجلی کے گرڈ سے رابطہ قائم کرنے کا خرچ بہت زیادہ ہے اور شاید ایسا ہی رہے گا۔ اور گاؤں میں کسی قسم کی صنعتی سرگرمی نہ ہونے کی وجہ سے توانائی کی کھپت بہت کم ہے۔ بجلی کو کسی دور افتادہ گاؤں تک پہنچانے میں توانائی بہت زیادہ ضائع ہوگی۔ توانائی کے غیر مرکوز اور بکھرے ہوئے غیر روایتی ذرائع گاؤں کے لیے بہت موزوں ہیں۔ کیوں کہ ایک تو ان کے استعمال کا خرچ بہت کم ہے۔ دوسرے ان کا ماحولیات پر کوئی ناموافق اثر نہیں پڑتا۔ اور یہ ذرائع آسانی سے مقامی طور پر دستیاب ہیں۔

توانائی کے صارفین اور منتظمین کے طور پر گاؤں کے لوگوں کی توانائی کے پروگرام میں سرگرم شرکت توانائی کی پیداواری کامیابی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ ملک میں کنبے کی ضروریات کے سائز کے بائیوگیس کے پلانٹوں، بہتر قسم کے چولہوں اور متعدد شمسی آلات کا بڑے پیمانے پر استعمال شروع ہو چکا ہے۔

۱۹۸۶ء کے بیس نکاتی پروگرام میں گاؤں کے لیے توانائی پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ دیہی علاقوں کو توانائی کی بہم رسانی کے عمل میں (الف) پن بجلی کے چھوٹے نظاموں، سولر فوٹو وولٹیس اور بائیوماس میں سے گیس کی تیاری کے ذریعے گاؤوں میں بجلی پہنچانا۔ (ب) پانی نکالنے والی پون چکّی کے ذریعے پانی کی بہم رسانی اور چھوٹے پیمانے کی آبپاشی (ج) فصل کو خشک کرنے، لکڑی کو خشک کرنے، پانی سے شورہ نکالنے نیز ایندھن اور چارے کے لیے اور بائیوماس گیس تیار کرنے والے پلانٹوں کے لیے خام مال کے طور پر توانائی پیدا کرنے کی غرض سے سورج کی گرمی سے حاصل ہونے والی توانائی کا استعمال شامل ہے۔

توانائی کے متبادل ذرائع کے بارے میں تازہ دستاویز "توانائی ۲۰۰۱" میں آئندہ ۱۵ برس کے لیے بعض مقاصد طے کیے گئے ہیں۔ ان میں بائیوگیس میں ٹکنالوجی کی ترقی بہتر اقسام کے چولہے سورج کی حرارتی توانائی کا استعمال، توانائی کے باغیچے اور ہوا کی طاقت نیز بائیوماس سے بجلی پیدا کرنے جیسی ٹیکنالوجیوں کی تشہیر شامل ہے۔

اس دستاویز کا ایک اور مقصد بجلی کے نظاموں، شمسی حرارت سے پیدا ہونے والی بجلی کے نظاموں اور چھوٹے پیمانوں کے غیر روایتی پن بجلی پلانٹوں کے لیے شمسی فوٹو وولٹیکس جیسی ٹکنالوجیوں کو کاروباری لحاظ سے قابلِ عمل بنانا ہے۔

بہت سے "اورجا گرام" یعنی ایسے دیہات بنائے جائیں گے جو توانائی کے لحاظ سے خود کفیل ہوں۔ جہاں غیر روایتی توانائی کے لئے نظام اور آلات کام میں لائے جائیں گے۔ ساتویں منصوبے میں ایسے ۵ ہزار اورجا گرام قائم کیے جائیں گے۔

چھوٹے اور بڑے پیمانے کی رضا کار تنظیموں کی شمولیت کا یقینی اہتمام کیا جائے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو خاص خاص علاقوں کے لیے نئی تنظیموں کو فروغ دیا جائے گا۔ روزگار مہیا کرنے اور گاؤں کی سطح پر معیار کو بہتر بنانے پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔

توانائی کے غیر روایتی ذرائع کے محکمے نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ساتویں منصوبے اور بعد کے منصوبوں کے دوران ملک کی ترقی میں غیر روایتی توانائی کے

نظاموں اور طریقوں کا حصہ چھوٹے منصوبوں کی نسبت کہیں زیادہ ہونا چاہیے ۔ اس لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غیر مرکوز نظام تعدد دراز علاقوں کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں ۔

اب یہ بات بڑے پیمانے پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ جہاں دیہی آبادی کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بائیوگیس اور ایسی دوسری تکنالوجیوں کے شعبوں میں جامع کوششیں جاری رکھنی چاہئیں، وہاں پسماندہ اور دور افتادہ علاقوں میں توانائی کی کم از کم ضروریات کو پوری کرنے کے پروگرام کو بھی شروع کیا جانا چاہیے ۔ اس پروگرام میں عوام کے مفاد کے لیے جنگل بانی، بائیوگیس، بہتر چولہے، شمسی توانائی، ہوا سے توانائی اور توانائی کے مقامی طور پر دستیاب دیگر وسیلے شامل ہوں گے ۔

۲۰۰۱ء تک ملک میں ۲۵ کروڑ ایک لاکھ ۷۰ ہزار ٹن کوئلے کے برابر سالانہ توانائی پیدا کرنے یا غیر روایتی توانائی کے وسیلوں کے ذریعے اس کے برابر دوسری توانائی کی بچت کرنے کا نشانہ حاصل کرنے کی تجویز ہے ۔ اس میں ۱۵ ہزار میگاواٹ بجلی کی تیاری بھی شامل ہے ۔ درج ذیل اسباب کو دیکھتے ہوئے یہ نشانہ حاصل کرنا ممکن اور قابل عمل ہے ۔

ہزاروں میگاواٹ بجلی صرف بائیوماس سے پیدا کی جاسکتی ہے ۔ ملک میں ہر سال اندازاً ۱۲۴۹۰ لاکھ ٹن بائیوماس پیدا ہوتا ہے ۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ہزار ہیکٹیئر زمین سے تین میگاواٹ بجلی تیار کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے توانائی کے لیے نباتات کی کاشت کے ساتھ ساتھ بجلی تیار کرنے والے یونٹ بھی قائم کیے جائیں گے جو بجلی کے لیے گیس تیار کریں گے اور یہ توانائی کے ایسے مربوط پراجیکٹ ہوں گے، جہاں سے جلانے کی لکڑی اور بجلی دونوں دستیاب ہوں گے ۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف گنے سے حاصل ہونے والے فضلے سے ۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کی جاسکتی ہے ۔ گنے، چاول، ارہر اور ایسی دوسری فصلوں سے جو زرعی فضلہ حاصل ہوگا اس کی بنیاد پر گیس تیار کرنے والے بائیوماس سے بھی بجلی حاصل ہوگی، جو نئی تکنالوجی کی مدد سے بہت کم خرچ پر تیار کی جاسکے گی ۔ یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ ۶۰۰۰ میگاواٹ بجلی بائیوماس سے تیار کی جائے گی ۔ اگر ۲۵ لاکھ ہیکٹیئر رقبے میں توانائی کے لیے درکار نباتات کی کاشت کی جائے تو اس سے براہ راست توانائی کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا

ملک کے تقریباً ۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ دیہی گھروں میں سے ایک کروڑ ۶۰ لاکھ سے لے کر ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ گھر اپنی توانائی کی ضروریات بائیوماس سے پوری کرسکتے ہیں ۔ ہر گھر کے لیے روزانہ اوسطاً ۴ مکعب میٹر گیس کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ۲۰۰۱ء تک ملک میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ بائیوگیس پلانٹ لگانے کی تجویز ہے ۔ ان میں اجتماعی اور ادارہ جاتی پلانٹ بھی شامل ہیں ۔

ملک کے بڑے دریاؤں کے کناروں پر واقع تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں گندے پانی کی صفائی کے پلانٹ لگانے کی تجویز ہے جن کے ساتھ توانائی پیدا کرنے والے یونٹ بھی لگائے جائیں گے ۔ ۲۰۰۱ء تک میٹروپالیٹن قصبوں اور کچھ بڑے شہروں میں گندے پانی سے ۵ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی توقع ہے ۔

شمسی توانائی کے شعبے میں حالیہ ترقی سے پتہ چلا ہے کہ اس ذریعے سے میگاواٹ بجلی کے کارخانے چلانا ممکن ہے ۔ آئندہ کچھ برسوں میں تکنالوجی میں مزید ترقی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ سورج کی گرمی سے تیار ہونے والی بجلی اگر روایتی ذرائع سے حاصل ہونے والی بجلی سے سستی نہیں ہوگی تو قیمت کے لحاظ سے مہنگی بھی نہیں ہوگی ۔

مذکورہ محکمے نے سورج کی گرمی سے ۳۰ میگاواٹ بجلی تیار کرنے والے پلانٹ کا نمونہ تیار کرلیا ہے ۔ اس قسم کے بجلی گھر امریکہ اور کئی دوسرے ملکوں میں لگائے جارہے ہیں ۔ زیادہ بجلی تیار کرنے کی صلاحیت کے شمسی حرارتی بجلی گھروں کی بجلی پر لاگت ڈیزل سے چلنے والے بجلی گھروں سے زیادہ نہیں ہے ۔

شمسی فوٹو وولٹیکس کے شعبے میں تکنالوجی کی ترقی سے کم لاگت ہونے کی توقع ہے ۔ امورفوس سلیکون تکنالوجی اور باریک شمسی خلیوں کی ترقی سے یہ توقع پیدا ہوگئی ہے کہ آئندہ کچھ برسوں میں بجلی تیار کرنے کے یہ ذرائع بھی قابل عمل ہوجائیں گے ۔ چنانچہ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام تک صرف فوٹو وولٹیکس کے ذریعے ہی ہزاروں میگاواٹ بجلی تیار ہونے لگی ہے ۔

شمسی توانائی سے چلنے والے ابتدائی تجرباتی پلانٹ ساتویں منصوبے میں نصب کیے جائیں گے اور بڑے پیمانے پر آٹھویں اور نویں منصوبے کے دوران لگائے جائیں گے ۔ موجودہ صدی کے آخر تک سورج کی گرمی سے ۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی تجویز ہے ۔

چھوٹے پن بجلی پلانٹوں سے ملک کے مختلف حصوں میں مجموعی طور پر ۵ ہزار میگاواٹ بجلی تیار کی جاسکتی ہے ۔ ۲۰۰۱ء تک چھوٹے پیمانے کے پن بجلی تیار کرنے کے ذرائع سے ۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی تجویز ہے ۔

زراعت، اجتماعی خدمتوں، صنعتوں اور خانہ داری کے شعبوں کی توانائی کی ضروریات کا کافی بڑا حصہ شمسی حرارت سے چلنے والے نظام جیسے کہ سورج کی گرمی سے پانی گرم کرنے کے آلات، گرم ہوا سے خشک کرنے والے آلات، سورج کی توانائی سے ٹھنڈک پیدا کرنے والے آلات شمسی کوکروں وغیرہ سے پورا کیا جاسکتا ہے ۔

ہوا سے بجلی تیار کرنے والے چھوٹے آلات، دفاع، نیم فوجی تنظیموں، ریلوں، ڈاک اور تار چھوٹے پیمانے کی دیہی آبادی اور دشوار گزار دیہی علاقوں کی ضروریات پوری کرسکتے ہیں ۔ اس قسم کے بہت سے نظام جن میں ۱ میگاواٹ تک بجلی تیار کرنے یا توانائی کی بچت کرنے کی صلاحیت ہو ۲۰۰۱ء تک قائم کیے جائیں گے ۔

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

م.ک. مہتاب

آزادی اور ترقی کے چالیس برس

کامیابیاں منزل بہ منزل

قومی ترقی ایک مسلسل سفر ہے، جس میں رُکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں اور خطرات بھی، لیکن باہمت قومیں ان رُکاوٹوں کو دُور کرتی ہیں اور خطرات کا مقابلہ کرتی ہوئی اپنے معین راستے پر آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اگر ایک منزل پار ہوتی ہے تو اُس سے بھی بڑا دوسرا نشانہ سامنے رکھ لیا جاتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے مُلک کے تمام وسیلے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ترقی کے معیار کی کوئی مقررہ حد نہیں ہے۔ یہاں قناعت، پست ہمتی کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہاں علاجِ تنگیٔ داماں بھی موجود رہتا ہے۔

اگر ملک کی گزشتہ ہزاروں برس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آزادی کے بعد کے یہ چالیس برس ایک انوکھا اور نیا باب نظر آتے ہیں، جن میں مُلک کے تمام حصوں اور آبادی کے تمام طبقوں کی پستیوں میں سے نکال کر منظم ڈھنگ سے ترقی کے راستے پر آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس عمل میں زراعت ہو یا آبپاشی، تعلیم ہو یا روزگار، صحت ہو یا خوراک، صنعت ہو یا حرفت، سائنس ہو یا ٹکنالوجی، تعمیرات ہوں یا رہائش، سمندر ہو یا خلا کسی بھی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ دوریاں ختم کی گئی ہیں، نابرابریاں کم کی گئی ہیں۔ آبادی کے ایک بہت بڑے طبقے کو غریبی اور ناخواندگی کی خندقوں میں سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر لاکر کھڑا کیا گیا ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے گویا ہزاروں برس کا فاصلہ چالیس برسوں میں طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کو جس کا شمار کئی اعتبارات سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہونے لگا ہے۔ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی مُلک ہے جو آزادی سے قبل غریبی، بھوک، بیماری جہالت اور لاعلمی کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔

اگر چالیس برس کا یہ عرصہ ایک مسلسل سفر تھا تو پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے اس سفر کی منزلیں تھیں۔ جن کو ہم نے ایک کے بعد ایک کرکے پار کیا۔ یہی نہیں، ہم نے قدیم زنجیروں کو توڑنے کے عمل کو تیز کرنے کے لیے منزل بہ منزل زیادہ سے زیادہ بلند نشانے مقرر کیے، جن کا قطعی مقصد غریبی دُور کرنا، ایک جدید معاشرے کی تعمیر سائنس اور ٹکنالوجی کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور کم و بیش ہر شعبے میں خود کفالت حاصل کرنا رہا ہے تاکہ جب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں تو مُلک کا کوئی باشندہ بیماری یا غریبی سے نیچے کے خط کی زندگی بسر نہ کر رہا ہو مسلسل ترقی کے لیے درکار وسیلے مُلک میں دستیاب ہوں، سب کی فلاح و بہبود کے لیے بنیادی ضروریات فراہم ہوں اور ملک اقوام عالم کی برادری میں ترقی یافتہ ممالک کے شانے سے شانہ ملاکر آگے بڑھ رہا ہو۔

منصوبہ بند ترقی کا عمل ہندوستان کے لوگوں کو پنڈت جواہر لال نہرو کی دین ہے۔ اندرا جی نے اس نازک پودے کی آبیاری کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ منصوبہ بندی ہندوستان میں منظم ترقی کا منشور ہے۔ یہ وقت اور حدود کا خاکہ ہے جو مُلک کے مختلف طبقوں اور خطوں کو یکجا کرتا ہے اور ہر برس کی کوششوں کا آنے والے برسوں کے ساتھ تال میل پیدا کرتا ہے۔ اس سے قومی یکجہتی کے نصب العین کو بھاری مدد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ منصوبہ بند ترقی کے عمل نے ہماری ترقیاتی حکمت عملیوں کے بنیادی مقاصد اور منشا کی تکمیل میں بھاری مدد دی ہے۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ملک کی غریبی، لاعلمی اور بیماری کی لعنتوں سے نجات دلانے کے اس منصوبہ بند عمل کو جاری رکھنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ مالی وسیلے مہیا کرنے پر زور دیا ہے۔

ان کوششوں اور قومی رہنماؤں کی دلچسپی کے نتیجے کے طور پر آج ملک بہت سے شعبوں میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لحاظ سے خود کفیل ہو چکا ہے اور باقی شعبوں خاص کر تیل اور خوردنی تیلوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ آزادی سے قبل چاول برما سے، گندم آسٹریلیا اور امریکہ سے اور

کپاس مصر سے درآمد کی جاتی تھی۔ سبز انقلاب کی بدولت اناج کی پیداوار ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ ٹن ہوگئی ہے۔ لمبے ریشے کی کپاس دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے۔ پٹ سن کا خطہ مشرقی پاکستان میں چلا گیا، لیکن اب مغربی بنگال میں اتنا پٹ سن پیدا کیا جاتا ہے کہ اسے برآمد کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح گنے، دالوں، خوردنی تیلوں، دودھ، پولٹری گوشت اور دیگر کاروباری و غذائی فصلوں کی پیداوار میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ چار چار برس کی مسلسل خشک سالی کے بعد بھی آج ملک میں کہیں کوئی شخص بھوک کے پیٹ نہیں سوتا۔ زمانۂ قدیم کے قحط جن میں لاکھوں لوگ لقمۂ اجل ہو جاتے تھے۔ قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ کسانوں کی پیداوار کی سرکاری خرید اور سرکاری ذرائع تقسیم سے عوام کی ضروری اشیا کی فراہمی کے لیے دنیا کا سب سے بڑا انتظام ہندوستان میں موجود ہے۔ سرکار کے پاس قریب ڈھائی کروڑ ٹن اناج کا ذخیرہ ہے۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں واجب نرخوں پر عوام کو اناج اور اشیائے ضروریہ فروخت کرنے والی قریب چار لاکھ دکانیں کام کر رہی ہیں۔

آزادی سے قبل ملک میں کوئلے اور لوہے کی چند کانیں تھیں لیکن آج آہنی اور غیر آہنی دھاتوں کوئلے اور لگنائٹ کی دھاتوں کی کان کنی کے منظر پر ہندوستان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ جاپان اور کئی دوسرے ممالک ہندوستان سے یہ دھاتیں خریدتے ہیں۔

صنعتی پیداوار کے لحاظ سے جو ملک سلائی کی سوئیاں انگلستان سے درآمد کرتا تھا، وہاں آج جدید قسم کے ہوائی جہازوں سے لے کر کمپیوٹروں تک ہر قسم کا مشینی سامان تیار ہو رہا ہے۔ ملک کا صنعتی ڈھانچہ بہت مضبوط ہو گیا ہے گزشتہ چالیس برسوں میں صنعتی پیداوار میں اوسطاً پانچ فی صد سالانہ کی رفتار سے ترقی ہوئی ہے۔

تعلیم، سائنس اور صنعت سے لے کر توانائی، کپڑے، خوراک، خاندانی بہبود، آبادی اور زراعت ہر شعبے کے لیے قومی پالیسیاں مرتب کی گئی ہیں جن پر عمل درآمد کے لیے منصوبے میں پہلے سے کہیں زیادہ مخصیص درکی گئی ہے۔

ترقی کے لیے درکار بنیادی ضروریات میں بجلی کی پیداوار کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ پن بجلی اور حرارتی بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے لگاتار نئے پروجیکٹ قائم ہوتے رہے ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں میں بجلی کی پیداوار میں دس فی سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ توانائی کا دوسرا بڑا ذریعہ خام تیل ہے جن کی ملک کے اندر اور سمندر میں تلاش میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ اب پٹرولیم و پٹرولیم کی نصف سے زیادہ ضروریات ملک میں ہی پوری کی جا رہی ہیں۔ تیل صاف کرنے کے بڑے بڑے پراجیکٹ ملک کے ہر حصے میں لگائے گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل کے میدانوں سے نکلنے والی قدرتی گیس کھاد کی تیاری اور ملک کے کونے کونے میں گھروں میں چولہا جلانے کے ایندھن کے طور پر مہیا کی جا رہی ہے۔ ٹرانسپورٹ، مواصلات، ٹیلی مواصلات، آبی نقل و حمل، ریلوں کے نظام کے شعبوں میں معیشت نے خود کفالت کی جانب بہت بڑے بڑے قدم اٹھائے ہیں۔ معیشت کی مجموعی شرح ترقی کی اوسط ۳٫۵ فی صد رہی ہے۔ جب کہ کبھی کبھی اس نے پانچ فی صد کی حد کو بھی پار کیا ہے۔ ملک میں غیر یقینی موسمی حالات ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء کی بڑی لڑائیوں کے مصارف، آبادی میں اضافے سیلابوں اور سماوی حالات دیکھتے ہوئے اس شرح ترقی کو اطمینان بخش کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان برسوں میں جہاں یورپ کے کئی ممالک میں معیشت کی شرح ترقی منفی ہوئی ہے اور ہمارے ساتھ آزاد ہونے والے کئی ممالک غیر ملکی قرضوں کی بدولت دیوالیہ ہو گئے ہیں، وہاں ہندوستان جمہوریت کے راستے پر ثابت قدمی سے آگے بڑھتا ہوا معیشت کی شرح ترقی میں اضافہ کر رہا ہے۔

سب سے بڑھ کر نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہاں منصوبہ بندی کے عمل میں صرف سرکار ہی کام نہیں کر رہی بلکہ سرکاری اور نجی دونوں شعبے ملک کو آگے لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، جہاں سرکاری دائرۂ کار کے لیے منصوبہ بندی کی جاتی ہے، وہاں نجی دائرۂ کار کے لیے بھی منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اور اخراجات کے نشانے مقرر کیے جاتے ہیں۔ نجی دائرۂ کار کو آگے بڑھنے کی تمام سہولیات مہیا کرنے کی مساعی کے سبب ملک کی ملی جلی معیشت ایک دوسرے کے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح دیہات کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سے کام دھندے دیہی اور گھریلو صنعتوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ اس حوصلہ افزائی کے سبب لوگوں کا دیہات سے نقل مکانی کرنے، شہروں کی جانب رجوع کرنا کم ہو گیا ہے۔ دیہات میں روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوا ہے۔ اور وہاں سے صدیوں پرانی غریبی کو کم کرنے میں مدد ملی ہے۔ دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگراموں پر مسلسل عمل کی بدولت غریب آبادی کو روزگار کی ضمانت دی گئی ہے۔ تعلیم اور تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کا سماجی مرتبہ بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں بہتر سلوک کا یقین دلایا گیا ہے۔ ان کوششوں کی بدولت جن میں سرکاری دائرۂ کار کے بینکوں نے غریب آبادی کو قرضے اور گرانٹیں مہیا کرنے میں خاص حصہ ادا کیا ہے۔ ملک کے دیہات کی شکل بدلنے لگی ہے۔ نئے نئے روزگار کھلے ہیں۔ گندی بستیوں کی حالت سدھری ہے۔ بے گھروں کو گھر ملے ہیں اور نصف سے زیادہ دیہات بجلی کی روشنی سے منور ہو چکے ہیں۔ پنجاب، ہریانہ، ہماچل اور کچھ اور ریاستوں میں کوئی گاؤں ایسا نہیں رہا، جہاں بجلی مہیا نہ کر دی گئی ہو۔ گوبر گیس ٹیکنالوجی کے شعبے میں آج ہندوستان بہت سے ترقی پذیر ملکوں کو بھی مدد دے رہا ہے۔ اس گیس کی بدولت

دیہات کے گھروں سے دھواں اور گندگی ختم ہوئی ہے۔ اور لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہوا ہے۔

ترقیاتی کاموں کے لیے ضروری ہے کہ عوام اپنی بچتوں کے ذریعے حکومت کو سرمایہ کی فراہمی میں مدد کریں۔ ہندوستانی معیشت میں عوام اور اداروں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء تک بچتوں کی شرح مجموعی ملکی پیداوار کی مالیت کا دس فی صد رہی۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں یہ شرح بڑھ کر ۱۵ فی صد اور ۱۹۷۰ء کے دہے میں ۲۰ فی صد ہوگئی ہے۔ اس کے بعد کے سات برسوں میں یہ شرح ۲۵ فی صد کے قریب قریب ہو چکی ہے۔ یہ شرح دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی بچت کی شرح سے بھی زیادہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک کے عوام ملکی ترقی کے عمل میں پوری طرح تعاون کر رہے ہیں۔

تعلیم و سائنس :

آزادی سے قبل ملک میں چند یونیورسٹیاں اور مخصوص مذاہب اور اداروں کے اعلیٰ تعلیمی کالج اور اسکول موجود تھے۔ ان چالیس برسوں میں ملک کے تعلیمی محاذ پر ایک انقلاب آیا ہے۔ ملک میں تحقیق و ترقی کے کام کے لیے کئی علاقائی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹیوں کی تعداد میں کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ۱۵۰ ادارے ہیں۔ اور طبیعیاتی زمینی انجنیرنگ میڈیکل و سماجی علوم کی تعلیم و تحقیق کے لیے ایک سو سے زیادہ مراکز پر کام ہو رہا ہے۔ ایک وقت تھا جب ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تدریس کا کام غیر ملکی پروفیسروں اور سائنس دانوں کے سپرد تھا لیکن آج ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانی پروفیسر، لیکچرر اور سائنس داں غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تعلیم دے رہے ہیں۔ آج ہندوستان میں اتنی بڑی تعلیم و تربیت یافتہ ٹیکنیکل افرادی قوت ہے کہ اس لحاظ سے ہمارا شمار دنیا میں تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔

زراعت :

صنعت اور سائنس، سماجی فلاح و بہبود تعلیم اور تربیت کے شعبوں اور تجارت و بیوپار کی سرگرمیوں میں بے مثال کامیابیوں، مواصلات، کان کنی سمندری کھوج، خلا اور زمین پر ترقی کے نئے سنگِ میل نصب کرنے کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ جس کی ۸۰ کروڑ آبادی میں سے ۷۰ فی صد کا انحصار زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار ہے۔ اس ٹھوس حقیقت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے آبپاشی اور بجلی کے وسائل میں اضافہ کرنے کے لیے بڑے بڑے منصوبے پہلے ترقیاتی منصوبے میں شامل کیے۔ دوسرے اور اس کے بعد تشکیل دیے جانے والے منصوبوں میں بھی ہزاروں کروڑ روپیہ آبپاشی کے وسیلوں میں اضافہ کرنے اور زراعت کے کام میں آنے والی کو بہتر بنانے پر صرف کیا گیا — جن میں زراعت کے نئے طریقوں، کیمیائی کھاد، عمدہ بیجوں کا استعمال اور ملک کی زرعت کی تجدید شامل تھی۔ ان اقدامات کی بدولت ملک میں سبز اور سفید انقلابات آئے۔ ملک اناج اور دودھ، گوشت، انڈوں کی پیداوار کے لحاظ سے خود کفیل ہو گیا اس لحاظ سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے ادوار میں نمایاں کام ہوا۔ ان اقدامات کی بدولت ملک میں زیرِ کاشت رقبہ جو ۵۰-۱۹۴۹ء میں ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ ہیکٹیر تھا، ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۱ کروڑ ۱۵ لاکھ ہیکٹیر اور پیداوار ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۷ کروڑ ۲۳ لاکھ ٹن ہو گئی۔ لیکن اس پیداوار سے ملکی ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں میکسیکو سے درآمد کردہ گندم کا نیا بیج کام میں لایا گیا، جس سے ملک میں سبز انقلاب کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسانوں کو پانی، کھاد اور قرضوں کی فراہمی میں اضافہ کیا گیا۔ سبز انقلاب کی بدولت ۷۶-۱۹۷۵ء میں اناج کی پیداوار بڑھ کر ۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن ہو گئی۔ اس کے بعد اس عمل کو جاری رکھا جا رہا ہے اور پیداوار قریب ۱۵ کروڑ ٹن کے لگ بھگ برقرار رکھی جا رہی ہے۔

زراعت میں سب سے بڑی کامیابی یہ رہی ہے کہ آبپاشی کے وسیلوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے جس کی بدولت ملک خشک سالی کے بدترین اثرات کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ گزشتہ سات برسوں میں خشک سالی کے کئی برس آئے ہیں، جن سے ۷۰ فی صد رقبہ متاثر ہوا ہے لیکن پیداوار میں اتنی کمی نہیں ہوئی جتنی ساتویں دہائی کی خشک سالی کے ایک دو برسوں ہی میں دیکھنے میں آئی ہے۔ ۱۹۸۷ء کی غیر معمولی خشک سالی سے ملک کی ۱۶ ریاستوں اور پانچ مرکزی علاقوں میں خریف کی فصل کی قریب دو کروڑ ٹن کی فصل برباد ہوئی ہے لیکن حکومت کو امید ہے کہ وہ فاضل ذخیروں اور ربیع کی بہتر کاشت کے ذریعے اس خشک سالی کے اثرات پر بھی کم و بیش قابو پا لے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی زراعت میں ایک قسم کا استحکام پیدا ہو گیا ہے اور زراعت اب صرف مون سون پر ہی منحصر نہیں رہی۔

لیکن ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے دو ڈھائی کروڑ ٹن اناج کا ذخیرہ یا پندرہ کروڑ ٹن کی پیداوار اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہماری اناج کی پیداوار موجودہ صدی کے آخر تک ۲۲ سے ۲۴ کروڑ ٹن تک پہنچ جانی چاہیے جس سے ہم قریب ایک ارب آبادی کی ضروریات پوری کر سکیں۔

اسی طرح ہم خوردنی تیلوں اور دالوں کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکے۔ ہمیں ہر برس ۱۳۰۰ کروڑ روپیہ خوردنی تیلوں کی درآمد پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ زراعت کے ریشوں، چائے، ایندھن اور عمارتی لکڑی کی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں۔ دیہات کی خوشحالی کا تعلق زرعی پیداوار میں اضافے اور جنگل بانی پر ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ کھیتی سے آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو۔ دیہات میں گھروں اور راستوں پر درخت لگانے کا ایک بہت بڑا پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے نتائج کچھ برس بعد حاصل ہونے شروع ہو جائیں گے۔

لیکن ہندوستان میں زراعت کو سب سے زیادہ خطرہ بڑھتی ہوئی آبادی سے ہے۔ ۱۹۵۰ میں ملک میں فی کس رقبہ زیرِ کاشت ۰.۳۳ فی صد تھا جو ۱۹۸۰ء میں کم ہو کر ۰.۲۰ رہ گیا اور ۲۰۰۰ء میں صرف ۰.۱۵

فی صدرہ جائے گی ۔ زمین کی زرخیزی بھی کم ہو رہی ہے۔

حکومت بنجر علاقوں کو زیرِ کاشت لاکر ماحولیاتی تحفظ اور زمینی اصلاحات کے ذریعے ان مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آبادی پر قابو پانے اور توانائی کے وسائل میں اضافہ کرنے کی بھی لگاتار کوششیں کی جا رہی ہیں۔

پیداوار بڑھانے کے لیے بہتر ٹیکنالوجی بھی کام میں لائی جا رہی ہے۔ پیداوار میں ۷۵ فی صد اضافہ بہتر ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہوا ہے۔ گندم کی پیداوار ۶۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر قریب ۵ کروڑ ٹن ہو گئی ہے۔ چاول کی پیداوار ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۶ کروڑ ٹن ہو گئی ہے۔ موٹے اناجوں کی پیداوار دوگنی ہو گئی۔ تلہن اور دالوں کی پیداوار بھی دوگنی ہوئی ہے۔ لیکن وہ آبادی میں اضافے کے تناسب کا ساتھ نہیں دے سکی۔

زراعت کے شعبے میں بڑی خامی ، جسے دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ہے کہ مختلف خطوں میں فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار میں بہت فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب میں گندم کی فی ہیکٹیئر پیداوار ۳۵۲۱ کلوگرام ہے جو مدھیہ پردیش میں ۱۱۴۶ کلوگرام ہے۔ چاول کی پیداوار پنجاب میں ۳۱۹۹ کلوگرام فی ہیکٹیئر ہے جو مغربی بنگال میں ۱۵۵۵ کلو ہے۔

اس فرق کو دور کرنے اور بارانی کھیتی کی پیداوار میں اضافے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ملک میں آبپاشی کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ ملک میں اس وقت ۶ کروڑ اسّی لاکھ ہیکٹیئر زمین کے لیے آبپاشی کی صلاحیت پیدا کی جا چکی ہے۔ لیکن یہ صلاحیت پوری طرح استعمال نہیں کی جا رہی ہے۔

اسی طرح ماہرین کی رائے ہے کہ کیمیائی کھادوں کا استعمال ۹۲ لاکھ ٹن سے بڑھا کر دو کروڑ ٹن کرنا ہوگا۔ کیڑے مار دوائیوں کے استعمال میں بھی بھاری اضافے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

ملک میں زرعی آلات و مشینوں کی تیاری ، استعمال اور دیکھ بھال کے کام میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے، جس سے اناج کو سنبھالنے اور بچا کر رکھنے میں بہت مدد ملی ہے۔

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی زراعت نے گزشتہ ۴۰ برسوں میں بہت بڑی بڑی منزلیں پار کی ہیں، لیکن ملک کی آئندہ ضروریات کے پیشِ نظر اس کے سامنے جو چیلنج موجود ہیں، اُن سے نپٹنے کے لیے افرادی اور مالی ذرائع کو وسیع پیمانے پر متحرک کرنے، تحقیق کے عمل کو وسیع کرنے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زراعت پیشہ عوام کی زراعت میں دلچسپی کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

بقیہ : مکتوبات

مرحوم نے Contribution of India in Arabic Literature لکھ کر اس سلسلے کے تمام گوشوں کا انتہائی تحقیقی اور معروضی جائزہ پیش کیا ہے مگر اس پر اور بھی تحقیقی کاموں کی شدید ضرورت ہے تاکہ ہند و عرب کے ثقافتی رشتے مستحکم ہو سکیں۔

ابن خلیل قاسمی ، علی گڑھ

ژرف بینی :

ماہ ستمبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سیّد مظفر حسین برنی کا مضمون "عربی زبان و ادب میں ہندوستانی علماء کا حصّہ" اُن کی عرق ریزی اور ژرف بینی کا نتیجہ ہے۔ لیکن عصرِ حاضر کی خدماتِ حدیث کے ذیل میں شیخ عبید اللہ مبارک پوری کی شخصیت مجہول ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ آپ ہند و بیرونِ ہند کے کبار محدّثین میں سے ایک ہیں۔ حدیث کی وہ جو خدمات انجام دے رہے ہیں، اُن کی نظیر کم از کم ہندوستان میں مشکل ہے۔

فضل اللہ انصاری ، مدھوبنی

عابدہ سمیع الدین

مجاہدۂ آزادی

بیگم حسرت موہانی (نشاط النساء بیگم)

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید ترے کانوں میں پیغامِ عمل جائے

حسرت و بیگم حسرت کی کہانی بھی دار و رسن کی آزمائش کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک ہے ۔ اور ساتھ ہی ان بہت سی بھولی بسری داستانوں میں شمار کی جاسکتی ہے، جن کے ساتھ آزاد ہندوستان کی تاریخ نے مناسب انصاف نہیں کیا۔

بیگم حسرت کا شمار ان خواتین میں ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا ۔ مولانا حسرت سے ہی روایت منسوب ہے کہ اگر بیگم حسرت ، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے، مولانا ابوالکلام آزاد 'الہلال' اور 'البلاغ' نکالتے رہتے ۔ اور جواہر لال زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے ۔ یہ عورتیں وفا اور ایثار مجسم تھیں ۔ انہوں نے جان دے دی اور ہم سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستارو! تم تو جیل جارہے ہو، ہمارا کیا ہوگا؟

(علیم اختر مظفر نگری، مقالہ مولانا حسرت موہانی، شبستان اُردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۶۸ء ص : ۱۲۷)

بیگم حسرت کو ان خواتین میں یوں امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انہوں نے حسرت کو جن کی تمام تر زندگی آزادی کی مکمل تفسیر رہی نہ صرف لیلائے حریت کے سپرد کر دیا بلکہ اپنی زندگی کو بھی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ چکبست نے ان کی قومی خدمات کو سراہتے ہوئے "صبحِ اُمید" میں قوم کے نوجوانوں کو مشورہ دیا تھا:

"بیگم حسرت کی زبان عام جلسوں میں پولٹیکل مردانگی کا راگ گانے کے لیے خلق نہیں ہوئی ہے مگر اس شہیدِ وفا کی زندگی کا نغمۂ خاموش، وطن پرستوں کی روح کو وجد میں لانے کے لیے کافی ہے . . . . ہم قوم کے نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس دیوی کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر استقلال اور ایثارِ نفس کا سبق حاصل کریں ۔"

(چکبست 'صبحِ امید'۔ ۲/۱ سنہ ۱۹۱۸ء)

پروفیسر عبدالشکور نے اپنی تالیف "حسرت موہانی" میں رسالہ "ہمدرد نسواں" نومبر ۱۹۲۴ء کے حوالے سے نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت) کی ابتدائی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے۔

محترمہ نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اُناؤ (اودھ) کے ایک معزز خاندانِ سادات میں پیدا ہوئیں ۔ آپ کے والد سید شبیب حسن موہانی مرحوم رائچور (ریاست حیدر آباد) میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ ساداتِ موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے ۔ اس لیے محترمہ نشاط النساء بیگم قصباتِ اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی ۔ زمانۂ دوشیزیت میں آپ کا خاص شغل یہ تھا کہ پسماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور عالی ایثار کا ثمر ہے ؟ (حسرت موہانی عبدالشکور اشاعت سوم ۔ لکھنؤ ۔ ص : ۱۱۷) اور جس سے ان کے پختہ سماجی شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

۱۹۰۱ء میں جب وہ حسرت کی زندگی میں داخل ہوئیں تو محض کندۂ ناتراش نہ تھیں ۔ گمان غالب ہے کہ قومی و ملکی مسائل سے بھی وہ کچھ نہ کچھ آشنا ضرور رہی ہوں گی ۔ کیوں کہ لکھنؤ سے قربت کے سبب قصبہ موہان میں بھی اردو اخبارات پہنچنے لگے تھے ۔ ہر چند کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ عہدِ طفولیت

• ریڈر پولٹیکل سائنس، ویمنس کالج، اے ۔ ایم ۔ یو، علی گڑھ (یوپی)

تھا۔ تاہم لوگوں کی ملکی سیاست میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ یہ دیہاتی ماحول کی
پلی ہوئی لڑکی نہایت جری، باحوصلہ اور ہر طرح حسرت کی رفاقت کے لیے
موزوں تھی۔ ... حسرت نے مالی اعتبار سے کبھی کسی قسم کی فراغت و اطمینان
کو محسوس نہیں کیا۔ لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ہر کٹھن موقع پر
وہ حسرت کی رفاقت کے لیے آمادہ رہا کرتی تھیں۔ حسرت کو ہمیشہ ان کی
رفاقت پر فخر رہا ہے۔" (رابعہ بیگم، حسرت کی خانگی زندگی، اردو ادب
حسرت نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۵۱ء علی گڑھ صفحہ ۹۸-۹۹) اور حسرت کا یہ فخر
بے جا نہ تھا۔" اگر نشاط النساء بیگم کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان
کی ہم خیالی شریکِ حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم و ثبات کا شاید
ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے۔" (عارف ہسوی، حالاتِ حسرت، دہلی
۱۹۱۸۔ ۱۹۱۹)

جس طرح حسرت کی سوانح عمری کے مصنف کے مطابق مولانا کی لائف
اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیگم حسرت کے واقعات و حالات
شامل نہ کیے جائیں۔ کیوں کہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی کی ہر طرح کی شریک
ہیں اور مولانا کے کاروبارِ قومی میں ہر طرح معین و معاون رہیں۔" (ایضاً)
اسی طرح جدوجہدِ آزادی میں بیگم حسرت کے ایثار اور ان کے سیاسی شعور کے
ارتقاء کا جائزہ حسرت کے سیاسی نظریات و عقائد کے تجزیے کے بغیر ممکن
نہیں۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب کہ حسرت ابھی علی گڑھ کالج میں
زیرِ تعلیم تھے، وہ علی گڑھ آ گئیں اور اس مختصر سے وقفے کے بعد ہی حسرت کی
داروگیر کا وہ طویل سفر شروع ہوا جس کی داستان انہیں کی زبانی سنیے:

ع اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس اک عشق میں، میں نے کیا کیا نہ دیکھا

علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے فراغت پاتے ہی حسرت نے اپنے نظریات و
عقائد کی اشاعت و ترویج کی خاطر ۱۹۰۳ء میں ماہ نامہ اردوئے معلیٰ جاری
کیا۔ اور اس کے ذریعے شرابِ حریت کے جام پر جام لنڈھانا شروع کر دیے۔
حسرت پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے علانیہ علی گڑھ تحریک سے انحراف کیا اور مسلمانوں
کو انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے
کانگریس کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانگریس میں
وہ گرم دل کی سیاست کے علمبردار تھے۔ اس لیے ۱۹۰۷ء کے سورت اجلاس
میں نرم و گرم دلوں کے ٹکراؤ کے بعد بال گنگادھر تلک کے ساتھ وہ بھی باقاعدہ
گرم دل میں شامل ہو گئے۔ اردوئے معلیٰ کے فروری، مارچ ۱۹۰۸ء کے
شمارے 'مصطفےٰ کمال نمبر' میں کالج کے ایک طالب علم کا مضمون "مصر میں انگریزوں
کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کی زد میں آگئے۔
لیکن انہوں نے طالب علم کا نام بتلانے سے انکار کرتے ہوئے تمام ذمہ داری اپنے
سر لے لی۔ مسلم معاشرے پر سیاسی جمود کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج
کی دہشت بھی اس قدر غالب تھی کہ انہیں ایک بھی وکیل یا بیرسٹر مقدمے کی
پیروی کے لیے میسر نہ ہو سکا اور ایک دو پیشیوں میں ہی قید با مشقت کی سزا ہوئی۔
حسرت مسلمانوں میں پہلے سیاسی قیدی ہیں۔ یہ پہلی گرفتاری ہی
نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی اور جس دوران انہوں
نے یہ ثابت کر دیا کہ شوہر کی محض چند سالوں کی رفاقت میں اس دیہاتی ماحول
میں "پلی ہوئی لڑکی" کا شعور کتنا بیدار کتنا پختہ ہو گیا تھا اور اب ایک واضح منزل
کی طرف گامزن تھا۔ مصیبت کے اس نازک وقت میں وہ نہ صرف ہر اعتبار
سے رفیقِ سفر ثابت ہوئیں، بلکہ یہ ان کی مستقل مزاجی و ہم خیالی ہی تھی کہ مجاہدِ
آزادی ہر اس افتاد کو جھیل گیا جو بڑے سے بڑے رہنماؤں کے حوصلے پست کرنے
کے لیے کافی تھی۔ بقول حسرت: "گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیرخوار لڑکی
نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے
سوا کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں
بربنائے سیادت و تائیدِ ربانی حیرت انگیز حوصلہ اور استقلال کا اظہار
ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انہوں نے دوسرے
ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ
کارپردازانِ زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہٖ امرِ حق کی پیروی کے
باعث یوں ہی قوی تھا، لیکن ان کی یہ تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے
اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار! تم سے
کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب
کو انہوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا۔ جن کے ہمراہ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے
آئیں۔ اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں۔ لیکن آخر تک ان کی
جرأت و ہمت میں فرق نہ آیا۔" (مشاہداتِ زنداں، بحوالہ حسرت کی سیاسی زندگی
عبدالقوی دسنوی ص: ۱۷-۱۶)

دورانِ نظربندی جب علی گڑھ مجسٹریٹ نے حسرت کو پڑھنے لکھنے
کی اجازت دے دی تو بیگم حسرت برابر ان کے پسندیدہ اخبار ان تک پہنچاتی
رہیں۔ حسرت کی درویشی پانچ سو روپے جرمانے کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔
چنانچہ ان کی عزیز و نایاب کتابیں حکومت کی طرف سے صرف ساٹھ روپے میں
نیلام کر دی گئیں۔ دورانِ قید حسرت نے جن مصائب اور سختیوں کا سامنا
کیا اس کی ہولناک داستان "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے "اردوئے معلیٰ"
میں قسط وار شائع ہوئی جو سامراجی آمریت و بربریت کی ایک مستند تاریخ
ہے۔

رہائی کے بعد حسرت کا جرمِ عمل قیدِ فرنگ کی بنا پر مزید ترقی کر گیا۔

دوستوں نے ہزار نرم روی کا مشورہ دیا مگر یہ نشہ اترنے والا نہ تھا۔ یہاں تو عالم یہ تھا۔ ع

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دو چار پتھروں کا انتظام کر کے اپنے مختصر سے مکان میں ہی اُنہوں نے کاٹھ کا ایک پریس لگایا جس کا نام اردو پریس رکھا۔ اس مطبع میں بقول عتیق صدیقی: "اگر اسے مطبع کا شاندار نام دیا جاسکے تو حسرت کتابت کرنے کے علاوہ پریس مین کی خدمت انجام دیتے اور نشاط النساء بیگم پیپر مین کی"۔ (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، عتیق صدیقی، دہلی ص ۲۸)

اب صوبہ متحدہ کی جیمس مسٹن کی گورنمنٹ کو اردوئے معلیٰ کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو اردو پریس سے جس کی کل کائنات ایک لکڑی کی دستی مشین اور دو پتھر تھے، قانون مطابع کے تحت تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ حسرت کے پاس اردوئے معلیٰ اور پریس بند کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت کی مطلق العنانی پر احتجاج کرتے ہوئے الہلال کی دو مسلسل اشاعتوں میں" اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت" کے عنوان سے لکھا، جو خصوصیت سے اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں اُنہوں نے بیگم حسرت کو حسرت کی "کوہِ عزم و ثبات" بیوی سے تعبیر کیا ہے۔ (الہلال ۲۱-۲۸ مئی ۱۹۱۳ء)

اسی دوران پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ہندوستان میں سیاسی ہلچل اپنے عروج پر تھی اور ساتھ ہی برطانوی آمریت بھی۔ ترکی سے ہمدردی کے سبب جو اس لڑائی میں جرمنی کا حلیف تھا، ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی طبعاً جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مقاماتِ مقدسہ کے سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ مکمل دستورِ زبان بندی کے تحت سبھی احراری لیڈر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ حسرت ابھی تک آزاد تھے اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں انہیں بھی نظر بندی کا حکم ملا۔ جسے ماننے سے انہوں نے انکار کر دیا، جس کی پاداش میں بالآخر انہیں قید کر دیا گیا۔

حسرت کی دوسری گرفتاری اور بیگم حسرت :

۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء میں حسرت دوسری بار گرفتار کیے گئے —— نشاط النساء بیگم کی زندگی میں یہ تاریخ "ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سیاسی زندگی کا عملی آغاز ہوتا ہے۔ جب اُنہوں نے گھر کی چہار دیواری سے نکل کر حسرت کے مقدمے کی پیروی اپنے ذمّہ لی۔ اور یہ کام انتہائی نامساعد حالات میں بڑی دلیری اور ہمت سے انجام دیا۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور بعد میں ان کی اسیری کے زمانے میں بھی اُنہوں نے بڑی ہمت اور قابلیت کے ساتھ حسرت کے پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمت بھی انجام دی۔ مقدمے کی پیروی کے ساتھ ساتھ اخبارات کی وساطت سے حسرت کے حالات سے بھی عوام کو باخبر رکھا"۔ (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۲۹)

اس بار حسرت کو کئی جگہ قید رکھا گیا۔ پہلے علی گڑھ جیل میں رہے پھر للت پور لائے گئے۔ وہاں سے جھانسی، الہ آباد، پرتاب گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں میں رہے۔ باہر کی دنیا کو ان تمام حالات کا علم بیگم حسرت ہی کے ذریعہ ہوا۔ مثلاً یہ خبر:

"ہندوستانی لکھنؤ رقم طراز ہے کہ مسز حسرت موہانی کی ایک تحریر سے، جو اُنہوں نے ہم کو ارسال کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کو للت پور میں نظر بند رہنے کا حکم دیا گیا ہے"۔ (بحوالہ: مدینہ اخبار بجنور، مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء)

حسرت کو ۱۹۱۶ء میں قانون تحفظِ ہند کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ جس کے مذہبی اور اخلاقی جواز کو وہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا نے للت پور میں نظر بندی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا علم بھی اخبارات کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ہوا۔ آپ فرماتی ہیں کہ" آج حسرت کا خط آیا ہے۔ ان کا مستقل ارادہ ہے کہ ایسے حکم کی تعمیل سے جو بغیر اظہارِ جرم و موقع تردید سزا دیتا ہے، انکار کر دیں گے"۔ (ایضاً)

مولانا عبدالباری فرنگی محل، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد حسرت کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ ابتداءً نشاط النساء بیگم بھی اس سے مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھیں جیسا کہ مولانا عبدالباری کے نام ایک ذاتی خط مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۱۶ء میں اُنہوں نے لکھا تھا:۔

"کل محمد علی صاحب کا خط بھی (چھنڈواڑے سے) آیا۔ ان لوگوں کی بھی یہی رائے ہے حسرت خدا کرے راضی ہو جائیں ورنہ مصیبت تو ہی ہے"۔ (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۵۸)

لیکن جب احکامِ نظر بندی کی خلاف ورزی میں حسرت پر مقدمہ چلایا گیا تو وہ پوری طرح غیر ملکی سامراجیت سے ٹکر لینے کے لیے سینہ سپر تھیں —— مولانا کو للت پور جیل میں اُنہوں نے جو حوصلہ افزا خط لکھا وہ ملاحظہ ہو:

۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء

آج کا کارڈ ۲۷ کا لکھا ہوا اور لفافہ بھی ساتھ ملا... تمہارے استقلال کی حد ہو گئی۔ میں تعریف کرتی ہوں، مگر افسوس کہ تم سے علیٰحدہ رہنے کا خیال سخت تکلیف دہ ہے۔ ناقابلِ برداشت ہے خدا تمہاری مدد کرے۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے خیال غالب یہی ہے کیوں کہ تم اپنی

دشمن کے پکے ہو۔ اور واقعی حق سے اجتناب[۱] کرنا ایک سچے مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ ظلم خدا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ مگر ہم کو کیا۔ ہماری چند روزہ زندگی تو گورنمنٹ کی مہربانیوں کی نذر ہو گئی۔ خیر دنیا میں انصاف نہیں رہا نہ سہی۔ خدا منصف ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کی مہربانی اور مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ جو ظلم کرتا ہے، وہ اپنی تلوار سے اپنا زیاں کرتا ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے مگر ہم ظلم نہیں کرتے۔" (بحوالہ اسلم ہندی رازدانِ حیات سوانح حسرت موہانی، ص: ۱۲۷-۱۲۸)

مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء میں انہوں نے لکھا:

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا تھا کہ حسرت اپنی دُھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ اسی پر بھروسہ ہے۔ خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے۔ آمین۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اگر خدا نہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہیے۔ اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرت کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں۔ چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہو جائے۔" (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط مذکورہ ص: ۶۱)

برطانوی استبداد کے سامنے سر جھکانا حسرت کی سرشت میں تھا نہ بیگم حسرت کی بلکہ معاملہ بالکل ہی برعکس تھا۔ ع

جی مانتا نہیں کہ رہوں بے خطا کیے
تعزیر نے کے آپ نے عادت بگاڑ دی

چنانچہ جب احکام نظربندی کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہو کر حسرت ڈیڑھ سال کے لیے جیل چلے گئے تو اپنے اخباری بیان میں ان کی کوہ عزم و ثبات بیوی نے لکھا۔

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس رائے کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے۔ ایسی نظربندی سے قید بہرحال بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے یہی امید تھی۔" (بیگم حسرت اور ان کے خطوط مذکورہ ص ۲۰) واضح رہے کہ "یہ رائے کسی خوشحال گھرانے کی عورت کی نہیں بیگم حسرت کی تھی، جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اور اجرت پر سلائی کر کے اور چکی پیس کر گزر اوقات کرتی تھیں" (کرشن بلدیو شرما۔ 'آج کل' اگست ستمبر ۱۹۸۱ء ص: ۳۴) گرفتاری کے بعد کی افتاد پر بی اماں (والدہ محمد علی) نے قوم کی بے حسی کی شکایت کرتے ہوئے مسٹر تاج الدین کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ حسرت کے واقعات سے تم مجھ سے بھی زیادہ واقف ہو۔ سرکاری پولیس اس ناکردہ گناہ کو گرفتار کرنے میں تو بے حد مستعد کار تھی مگر کسی سے اس کی دکان کی حفاظت نہ ہو سکی جو اس غریب دردمند مسلمان اور اس کی بیوی و بچی کی گزر اوقات کا ذریعہ تھی۔ کئی ہزار کا مال چوری گیا مگر چور کا سراغ نہ ملا (جمہور کلکتہ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء)

دوران مقدمہ نشاط النساء بیگم نے حسرت کے مقدمے کی پیروی کا کام انتہائی نامساعد حالات میں کیا۔ ان کی زندگی کا یہی وہ دور ہے جب انہوں نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا۔

"وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتیں اور کسی کی پروا نہ کرتیں۔"

(سید سلیمان ندوی نگار لکھنؤ حسرت نمبر جنوری فروری ۱۹۵۲ء ص: ۱۱۸) بقول پنڈت کشن پرشاد کول یہ جرأت مندانہ اقدام انہوں نے اس وقت کیا جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی (ایضاً ص: ۵۹)

حسرت کے بیرسٹر دوستوں نے ان کے مقدمے کی پیروی سے گریز کیا اس سلسلے میں وہ جن صبر آزما مرحلوں سے گزریں اس کے کرب و بے بسی کا اندازہ مولانا عبدالباری کے نام خط کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے: "افسوس ہے کوئی وکیل بیرسٹر پھانسی تک جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کیسی مجبوری و افسوس کا مقام ہے۔" (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط مذکورہ ص ۵،) تاہم باوجود اس عالم کسمپرسی کے جس ہمت و جرأت مردانہ کا انہوں نے ثبوت دیا ہے۔ اس کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان دنوں خود ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کے تحت رانچی میں نظربند تھے، انہیں کے نام اپنے ایک طویل خط میں کیا ہے:

"اخبارات میں صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ کا کمیونک نظر سے گزرا اور آپ کا خط بھی جو سینٹرل (مسلم) بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی خالی نہیں ہوئی ہیں.....

جب میں آپ کے عزم و استقلال اور اس کے ساتھ تنہائی و کسمپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا قلب کا کیا حال ہوتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی مدد ہے جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجہ عزم بخشا ہے جو کسی مرد کو بھی آج نصیب نہیں۔" (مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص: ۱، - ۹۷۰)

انہیں دنوں حسرت کے نام اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی نے بھی جو اس وقت چھنڈواڑہ میں نظربند تھے، بعض ہم عصر لیڈروں کی روش سے اظہار مایوسی کرتے ہوئے لکھا تھا:

"البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے زیادہ بہن (نشاط النساء) کا، جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس جرأت و ہمت سے سنبھالے ہیں اور ساکت و صامت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو باآواز بلند سب کو سنا رہی ہیں تو بے اعتباری

[۱] کذا۔ اجتناب نہ کرنا۔ (ادارہ)

دُور ہو جاتی ہے۔" (محمد علی بنام حسرت موہانی۔ نقوش لاہور۔ مکاتیب نمبر ص ۳۴۸)

بیگم حسرت کے نام بھی علیحدہ ایک خط میں مولانا محمد علی نے انہیں احساسات کا اظہار کیا۔

"بھائی حسرت سے کہہ دیجیے کہ برادرم! باوجود عزم و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا، جس کے سینے میں تم سے بھی بڑا ایک دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر بھی نہ دے سکے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہ دیا۔"
(احمد لاری، حسرت موہانی حیات و کارنامے لکھنؤ ص ۱۴۶)

حسرت نے اس بار بھی قید فرنگ میں جن صعوبتوں کا سامنا خندہ پیشانی سے کیا اس کی اطلاع بھی بیرونی دنیا کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ملی۔ مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۶ء میں لکھتی ہیں:

"محرم کو دفعتاً الٰہ آباد جیل میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں۔ یعنی ان کا سامان ضروری لوٹا، کٹورا وغیرہ زبردستی لے لیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رو سے پھانسی جیل میں اور اب تک الہ آباد میں ان چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے۔ مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں۔ کیوں کہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کر دے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں نے قیدی کے ساتھ کوئی رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ حالانکہ اس نے کوئی رعایت بجز سختی کے نہ کی تھی۔ کھانا بھی وہی جوار، باجرہ کی مٹی ملی ہوئی روٹی ملتی ہے جو درد گردہ کی وجہ سے حسرت کے لیے سخت مضر ہے۔ چنانچہ حسرت نے بھی یہ عہد کر لیا کہ محرم سے جھگڑا شروع ہے۔ اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی بحمداللہ پیروی حسین کے لیے اچھی طرح تیار ہوں (بیگم حسرت اور ان کے خطوط مذکورہ۔ ص: ۱۱۳)

لیکن "ایام بلا" میں بھی بیگم حسرت کی غیور طبیعت نے حسرت کے سیاسی دوستوں کی مالی اعانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا۔ تفصیل کشن پرشاد کول کی ہے: "غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گزر رہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں۔ وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جا کر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بوڑھی بیمار ماں اور بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں۔ حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی۔ وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے۔ لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا: "اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا بندوبست کیا جائے۔" انہوں نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں، آپ اس کی زحمت گوارہ نہ کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعراء کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ بند ہو گیا۔ یہ کاروبار بھی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں بے کار پڑا جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائے گی۔ میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آ کر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے، اس سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپیہ انہوں نے کاشی، ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لیے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انہوں نے مجھے پانچ سو روپے کا چیک فوراً بھیج دیا، جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انہوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصہ تک ہندوستانی اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔" (کشن پرشاد کول نگار یادگار حسرت نمبر ص ۵۹)

پنڈت کشن پرشاد کول کے اس بیان کی تصدیق بیگم حسرت کے مندرجہ ذیل خط سے بھی ہوتی ہے جو کم و بیش اسی طرح کی مالی اعانت کے سلسلے میں انہوں نے ایڈیٹر "ہمدم" کو لکھا تھا۔ اسی قید فرنگ کے دوران ان کے یہاں حوصلہ شکن چوری بھی ہوئی۔ بعض ہمدرد نامہ نگاروں نے توجہ دلائی کہ بیگم حسرت موہانی کی چندے سے امداد کی جائے۔ عارف ہسوی صاحب کو ان کی طبیعت کے پیش نظر شک تھا کہ وہ یہ امداد قبول نہ کریں گی۔ جواب میں بیگم حسرت نے جو خط ایڈیٹر "ہمدم" کو تحریر کیا اس کی نقل مندرجہ ذیل ہے:

۵ دسمبر ۱۹۱۷ء علی گڑھ

برادر محترم تسلیم۔ "ہمدم" میں چوری کے متعلق نوٹ عارف صاحب اور آپ کا نظر سے گزرا۔ آپ کے اظہار ہمدردی کا دلی شکریہ۔ ہمدردی کے جواب میں عرض یہ ہے کہ آپ اس کو شائع فرما دیجیے۔ مشکور ہوں گی۔ اپنے نقصان کا بار دوسروں پر ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم اگر لوگ ہمارے دفتر کی موجودہ کتابوں کی خریداری کے ذریعے سے مدد کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ اس کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے ایڈیٹر ہندوستانی کا شکریہ خاص طور پر ادا کرنا لازم ہے کہ ان کے ذریعے سے اس قسم کی اعانت پہلے بھی ملی تھی اور اب پھر ۵۰۰ روپے نقد خریداری کتب کے لیے وصول ہوئے

ہیں کہ اس رقم کی جو جو کتابیں بہ آسانی بھیجی جاسکتی ہیں، بھیج دیجیے۔ چنانچہ شرح دیوانِ غالب اور دیوانِ حسرت وغیرہ کتابیں ان کو جلد یہاں سے روانہ کر دی جائیں گی۔ یہی طرزِ عمل اور لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔" خاکسار بیگم حسرت موہانی (بحوالہ مدینہ اخبار بجنور ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء) یقیناً ایسی ہی قابلِ احترام ہستیوں کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ فقیری میں نام پیدا کر

بیگم حسرت کا یہی کردار تھا جس سے متاثر ہو کر سید سلیمان ندوی نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

"شوہر کے قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری و استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلے کی نکل سکے۔" (نگار۔ لکھنؤ حسرت نمبر مذکرہ ص: ۱۱۸)

حسرت ابھی قیدِ فرنگ میں تھے کہ بیگم حسرت نے وزیرِ ہند سے ملاقات کرنے والے ہندوستانی خواتین کے ایک نمائندہ وفد میں شرکت کی۔ اس شرکت کی اہمیت دو وجوہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ نشاط النساء بیگم نے دورانِ ملاقات جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ تنہا ان کے کردار کی عکاسی کے لیے کافی ہے اور دوسرے یہ کہ کل ہند وفد میں ان کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اس وقت تک وہ قومی سیاسی زندگی میں بہت مقام حاصل کر چکی تھیں۔

۱۹۱۷ء وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ قومی آزادی کے سلسلے میں عوام کی توقعات میں اضافہ ہوا تھا جنہیں وہ اپنی جنگی خدمات کا جائز صلہ سمجھتے تھے۔ ادھر جنگِ عظیم اپنے فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستانی امداد کی مزید توقع اور دستوری اصلاحات کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو نے ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد کو بھی ان سے ملاقات کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس وفد میں بی اماں (والدہ محمد علیؒ) اور بیگم حسرت کے نام بھی شامل تھے۔ گو بی اماں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر وفد میں شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن نشاط النساء بیگم اس میں شریک ہوئیں۔ اس کا ایک گروپ فوٹو آل انڈیا ویمنس کانفرنس نئی دہلی کے دفتر میں موجود ہے، جس میں مسز این دلوی، بیگم حسرت موہانی، ڈاکٹر مس این جوشی، مسز جنار اداس، مسز چندر سیکھر آئر، مسز ایس کرو سوامی چیتی، مسز لزوراس، مسز سروجنی نائیڈو اور مسز بیسنٹ وغیرہ شامل ہیں۔ (حسرت موہانی۔ ایم حبیب خاں، نئی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۲۳)

اس ملاقات کا پس منظر اور اس کی اخباری رپورٹ درج ذیل ہے۔

"مسٹر محمد علی کو صاحب وزیرِ ہند سے ملنے کی اجازت نہ ملی پھر اسی لیے صاحب وزیرِ ہند کی تشریف آوری سے قبل یہ اعلان کیا گیا کہ وہ ریفارم اسکیم کے سوا کوئی ایڈریس نہ لیں گے۔ پھر اسلامی جلسہ شوریٰ لکھنؤ منعقدہ ۱۴ نومبر سے دو دن قبل لیگ کو یہی فیصلۂ آسمانی یاد دلایا گیا۔ اسی مستحکم دلیل اور قومی محبت سے صوبہ متحدہ کی لیگ کے وفد کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی نظر بندی کے مضمون پر سرخ نشان پھیر کر آئے۔ ورنہ باریاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تمام مسلمانانِ ہند کے قائم مقام وفد سے کہا گیا کہ وہ بھی نظر بندوں کے مضمون کو اپنے ایڈریس سے خارج کر دے۔ باوجودیکہ وفد کے صدر عالی جناب اسحاق خاں صاحب نے بار بار عرض کیا کہ ہم ارکانِ وفد اس بارے میں مجبور ہیں۔ لیکن دفتری اقتدار کی جانب سے جواب ملا کہ مزاجِ شاہاں تابِ خلاف ندارد۔ آخر کار اسلامی وفد، کرورِ مسلمانانِ ہند کی امیدوں کا خون کر کے بے نیل و مرام واپس آگیا۔ غرض صاحب وزیرِ ہند پر پہرے بٹھائے گئے اور سخت سے سخت امور کا ارتکاب کیا گیا تاکہ صاحب وزیرِ ہند کی سمع مبارک تک نظر بندوں کی فریاد نہ پہنچے۔ مگر بیگم صاحبہ حسرت موہانی کی اس دلیری پر دفتری اقتدار انگشت بدنداں ہوگا اور یا پھر غصے سے ہاتھ کاٹ رہا ہوگا کہ بیگم حسرت نے صاحب وزیرِ ہند کے روبرو نظر بندوں کی آزادی کا پیغام پہنچا دیا۔ چنانچہ جب وہ خاتونِ ہند کے وفد میں ان کے سامنے پیش ہوئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا تو فوراً ہی بلا تکلف انگریزی زبان میں کہا "جبکہ باغیانِ آئرلینڈ کو رہا کر دیا گیا ہے تو نظر بندانِ ہند کو بھی آزاد فرما دیجیے۔" اور پھر یہ کہہ کر نیو ایرا NEW ERA کا وہ پرچہ پیش کر دیا جس میں مسٹر مانٹیگو اور مسلمان کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہو چکا ہے اور جو حال ہی میں حکومت صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا ہے۔

راستہ روک کے کہہ دوں گا جو کہنا ہوگا
کیا ملوگے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

ہم اپنی بہن کی خدمت میں تمام ملک کی طرف سے اس جرأت و شہامت پر صرف یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں۔

آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو (بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء)

مندرجہ بالا اخباری رپورٹ سے ایک نیا انکشاف بیگم حسرت سے متعلق یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ یہ استعداد انہوں نے کب اور کیونکر بہم پہنچائی۔ اس پر ان کے قریبی اعزا ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

کل ہند زنانہ وفد کی اس نمائندگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرت کے کردار اور قومی محاذ پر ان کی سرگرمیوں کے سبب جدوجہدِ آزادی کی عظیم مجاہدہ بی اماں (والدہ محمد علی) کی نظر میں ان کے لیے کتنی وقعت و احترام تھا۔

اسی سلسلے میں مسز او ماہنرو کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انہوں نے تحریر کیا تھا!

"اخباروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اس بہادر اور پیاری بیٹی نشاط بیگم (بیگم حسرت موہانی) کے ساتھ مجھے بھی ممالک متحدہ کی خواتین کی قیادت اس وفد میں کرنا ہے جو تمام خواتینِ ہند کی جانب سے جناب وزیر ہند کی خدمت میں ۱۸ ماہ حال کو مدراس میں حاضر ہونے والا ہے۔" (شوکت علی و محمد علی صاحبان کی نظربندی، چند اہم خطوط انجمن اعانت نظربندان اسلام (نمبر۲) دہلی ۱۹۱۸ء ص ۶۹)

حسرت کی قید کی یہ مدت تو ۲۲ مئی ۱۹۱۸ء کو ختم ہوگئی تاہم نظربندی کے احکام اپنی جگہ بدستور رہے۔ نشاط النساء بیگم کی قوتِ ارادی کا اب پھر وہی امتحان اور عزم و استقلال کی پھر وہی آزمائش تھی۔ بوقتِ رہائی وہ نواب اسحاق خاں صاحب اور قاضی بشیر الدین کے ہمراہ جیل کے دروازے پر استقبال کے لیے موجود تھیں۔ رہائی کے بعد کی تفصیل ایڈیٹر جمہور کی زبانی سنیے۔

"قاضی بشیر الدین صاحب کا تار اور بیگم صاحبہ حسرت موہانی کا ایک مفصل خط ملا جس سے حسب ذیل امور معلوم ہوئے۔

(۱) مولانا حسرت نے گورنمنٹ کے احکام کو لینے سے انکار کر دیا۔

(۲) وہ آئندہ پھر پہلے کی طرح احکام نظربندی کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ ہیں۔

(۳) گورنمنٹ ساٹھ روپے ماہوار وظیفہ دینا چاہتی تھی۔ مگر مولانا نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(۴) نواب اسحاق خاں صاحب و دیگر حضرات میموریل تیار کر رہے ہیں جو پندرہ دن کے اندر نینی تال میں پیش ہوگا۔ اگر منظور نہ ہوا تو بقول بیگم صاحبہ" وہی حالت سابقہ بدستور اور خود بخود قائم ہو جائے گی۔ یعنی علانیہ قیام کھٹو رکیا جائے گا اور تمام واقعاتِ گزشتہ از سرِ نو واقع ہوں گے۔"

گو ممدوحہ کا یہ خط پرائیویٹ ہے اور ہمیں حق حاصل نہ تھا کہ ہم اس کے کسی حصے کو شائع کرتے۔ مگر حسرت کے ہم قوموں کے لیے اس کے اندر جو پیامِ عبرت موجود ہے اسے ان تک پہنچانے کے لیے ہم نے یہ بے ضابطگی بھی گوارہ کی۔ موصوف فرماتی ہیں۔ "افسوس اپنا ساتھ دینے والا اس وقت کوئی نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم آپ ہی کوشش کر دیکھیے...... میں عورت ہو کر کیا کر سکتی ہوں۔ خدا مسلمانوں میں اخوتِ اسلامی اور ہمدردی پیدا کرے تو شاید بھلائی کی کوئی صورت نظر آئے۔ ورنہ اس مرتبہ بھی خدانخواستہ وہی ہوا تو صبر کر کے بیٹھ رہوں گی۔" (جمہور)۔ کلکتہ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۱۸ء)

بیگم حسرت کے اس خط سے گو ایک طرح کی بے بسی اور کس مپرسی کا اظہار ہوتا ہے جو ان کی قوتِ ارادی کی فولاد جیسی صلابت اور عزم محکم کی چٹان جیسی مضبوطی سے میل نہیں کھاتا لیکن یہ کیفیت یقیناً عارضی تھی جس کا واحد سبب اپنوں کی بے حسی اور بے رخی تھی۔ اسی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے مرحوم قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا۔

بقول ہمارے نامہ نگار کے مسٹر حسن امام اور آنریبل مسٹر سمیع اللہ بیگ کی رائے یہ ہے کہ حسرت قانون تحفظ ہند کی خلاف ورزی نہ کریں مسٹر حسن امام کا تو ذکر ہی فضول ہے، لیکن مرزا سمیع اللہ بیگ کو ہم ایک سمجھدار محبِ قوم سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم صاحب ممدوح سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے خیال میں مسٹر گاندھی کا طرزِ عمل بھی قابلِ اعتراض ہے؟ کیا حق کے لیے جھگڑنے کا یہ طریقہ کسی حیثیت سے نامناسب ہے؟ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ گاندھی ایک ایسی قوم کے فرزند ہیں جو زندہ ہے اور حسرت ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے ہیں جو عزت اور عظمت کے ساتھ ہی اپنی عصبیت اور غیرت بھی کھو بیٹھی۔ (ایضاً)

اسی بے حسی کی شکایت کے ضمن میں مسٹر تاج الدین کے نام اپنے مذکرہ خط میں بی اماں نے لکھا تھا "حسرت کی مثال اور بھی حیرت انگیز ہے۔ حکومت نے جو دینا چاہا اسے لینے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کو یاد آگیا کہ اسی کے نانا نے تو فاطمہ کے لاڈلے کے منہ میں سے بیت المال کی کھجور 'کخ'، 'کخ' کہہ کر نکلوائی تھی کہ صدقہ اس کی اولاد پر حرام ہے۔ جس کا نانا ایسا ہو پھر حسرت کی طرح غنی کیوں نہ ہو۔ سچ ہے اسی کو یہ کہہ کر حکومت کا ملتا ہوا روپیہ ٹھکرا دینا سزاوار ہے ؎

"بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری بڑا دل"

(جمہور کلکتہ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء)

چند ماہ میرٹھ اور موہان میں نظربند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں بالآخر حسرت کو پھر سے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن پابندیاں ختم ہوتے ہی وہ پھر سے اپنے معمولات میں سرگرم نظر آنے لگے۔ تحریک خلافت کا آغاز ایک بار پھر انہیں گاندھی جی کے قریب لے آیا۔

۱۹۱۹ء کے امرتسر اجلاس میں حسرت کے ساتھ حسبِ معمول بیگم حسرت نے بھی شرکت کی، جس کا تذکرہ عبدالمجید مالک نے اپنے مقالے حسرت موہانی میں کیا ہے "مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہوا جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے۔ اور محترمہ نشاط النساء بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ (آج کل اگست و ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۸)

۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ چھوڑ کر کانپور منتقل ہوئے تو بیگم حسرت بھی کانپور آگئیں۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ جس سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بیگم حسرت کی طبعی خوش مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس تلاشی کی غرض سے علی گڑھ میں ان کی قیام گاہ پر آئی۔ بیگم حسرت نے چپہ چپہ دکھایا مگر ایک مقفل صندوق کے بارے میں کہا

کہ اسے ہاتھ نہ لگائیے گا اگر اندر کا بم پھٹ گیا اور آپ لوگ، زخمی یا ہلاک ہو گئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ پولیس انسپکٹر نے سپاہی سے کہا کہ صندوق کھول کر دیکھو کہ اس میں کیا ہے۔ سپاہی خوف زدہ تھا اور اس لیے اُس نے اپنے افسر سے کہا۔ کہ ذرا اور انتظار کر لیجیے۔ اس صندوق کو مولانا سے ہی کھلوائیں گے۔" جب تھوڑی دیر میں حسرت آئے تو ان سے کہا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں۔ جب اُسے کھولا گیا تو وہ اندر سے بالکل خالی نکلا۔ مولانا کو جب سارا واقعہ بتایا گیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا "بیگم نے مذاق کیا ہوگا۔" (ضیاء الدین احمد برنی "عظمتِ رفتہ" کراچی ص ۱۹۴)

دسمبر ۱۹۲۰ء میں تحریکِ ترکِ موالات کا آغاز ہوا۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستانی غم و غصّے سے بیتاب تھے۔ ناگپور کے دسمبر اجلاس میں کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کی۔ اس میں حسرت کی شرکت ناگزیر تھی۔ بقولِ گاندھی جی یہ راہ حسرت کی دکھائی ہوئی تھی My Experiments-
with Truth - M.K. Gandhi P 478-82

بیگم حسرت یہاں بھی ان کے ساتھ شریک تھیں۔

حسرت پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے سودیشی تحریک کی قیادت کی۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انہوں نے علی گڑھ خلافت اسٹور بھی قائم کیا تھا۔ بیگم حسرت نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور مسلم خواتین میں اسے مقبول بنانے ...... میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے سودیشی کپڑے کی تجارت کی۔ اس پر شبلی نے کہا تھا کہ "تم آدمی ہو یا جن — پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشین بنے اور اب بنئے ہوئے۔" اس کا اعتراف گاندھی جی نے "روز بروز سودیشی" کے عنوان سے اپنے مضمون "ینگ انڈیا" مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۲۰ء میں کیا ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک کو مقبول بنانے کے لیے وہ برابر ملک میں مختلف دورے بھی کرتی رہی تھیں۔ سودیشی کی مقبولیت کا سب سے زیادہ خوش گوار و حیرت انگیز تجربہ شریمتی سرلا دیوی چودھری اور محاذِ آزادی کے مخلص اَن تھک مجاہد مولانا حسرت موہانی کی بیگم کا ہوا۔ اپنے بریلی کے تجربات کے سلسلے میں سرلا دیوی نے لکھا ہے کہ بیگم حسرت کی بلائی گئی میٹنگ میں پندرہ مسلم خواتین نے سودیشی کا عہد لیا۔ Collected Works of
Mahatma Gandhi, Vol. XVII P-429

۱۹۲۱ء کا سال کانگریس کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احمد آباد کے تاریخی شہر میں اسی سال خلافت، کانگریس و مسلم لیگ کے اجتماعات ہوئے۔ کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی اور پھر کھلے اجلاس میں حسرت نے گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود مکمل سوراج کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ "نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پُرامن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کے لیے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہے جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو۔

Report of thirty six Indian National
Congress 1921 P-50

اس وقت کسی فردِ واحد نے بھی اس کی تائید نہیں کی۔ مکمل آزادی کی یہ تجویز انہوں نے اسی سال خلافت کانفرنس کے اجلاس میں بھی پیش کی تھی، لیکن وہاں بھی کسی نے اس کی حمایت نہیں کی تاہم یہی تجویز آٹھ سال بعد کانگریس کے مقاصد میں شامل ہوئی۔ لیکن تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا پہلا اعلان حسرت کی زبانی ہوا۔ بیگم حسرت یہاں بھی حسرت کی ہم نوا و ہم سفر تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی راوی ہیں: "یہ بات بھول یاد رہی کہ واپسی پر ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا۔ حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں حسرت مع بیگم کے بیٹھے ہیں۔ اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرک چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں۔ مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں۔ اسی میں کھانا پینا ہے۔ ہجوم کی کوئی پروا نہیں دوسری طرف دیکھا کہ پنڈت موتی لال کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبے میں لگ رہا ہے اور وہ اس میں آرام سے سوار ہو رہے ہیں۔ اسی وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لیے موزوں ہے۔ حسرت جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے باسر و سامان کے لیے۔" (سید سلیمان ندویؒ) مقالہ واحسرتا! (یادگارِ حسرت نمبر اردو اکاڈمی۔ لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۸۱ء ص ۱۸۱۷)
بیگم حسرت کی اس بے سر و سامانی کی کیفیت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کی ہنسی و خوشی برداشت ان کی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس کے علاوہ ۱۹۲۱ء احمد آباد میں ہی کل ہند زنانہ کانفرنس کا اجلاس بھی بی اماں (والدہ محمد علی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، شریمتی چودھرائن سرلا دیوی اور دیگر ہزاروں مسلم و غیر مسلم خواتین کے ساتھ نشاط النساء بیگم بھی شریک تھیں۔
(مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری اثر بن یحییٰ انصاری ص ۱۴۱)

حسرت کی تیسری گرفتاری اور بیگم حسرت :

خلافت اور کانگریس کے اجلاس میں تقاریر کی بنا پر حکومت بمبئی نے حسرت پر تاجِ برطانیہ کے خلاف اقدامِ جنگ اور بغاوت کے الزام میں دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ چلایا۔ گرفتاری اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور دو سال قیدِ سخت کی سزا ہوئی۔ اس بار وہ یرودا (پونا) جیل میں رکھے گئے — اسی زمانے میں گاندھی جی بھی اسی جیل میں مقیم تھے۔ انہیں پہلا درجہ دیا گیا تھا لیکن حسرت جیسے خطرناک قیدی کے حصّے میں ہمیشہ کی طرح جیل کا تیسرا درجہ ہی آیا اور یزیدی انداز بھی حسبِ سابق تھا۔ جس کی تصدیق بیگم حسرت کے مولانا باری کے نام پونا سے لکھے گئے ۲۸ جنوری ۱۹۲۴ء کے خط سے ہوتی ہے۔ اب تک مولانا کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل

کا برتاؤ نہایت سخت ہے ۔ بلکہ روزانہ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا ہے ۔ حال میں مزید لغویت یہ کی ہے کہ ریش، آئینہ، سرمہ، قرآن شریف رکھنے کا تختہ حتیٰ کہ پانی کا گھڑا تک اٹھوا لیا ہے ۔ پانی کی بھی قلت ہے ۔ روٹی ایک گیہوں کی صبح کو ملتی ہے وہ بھی بند جوار، باجرہ مٹی ملی ہوئی، ترکاری خراب ملتی ہے ۔ یہ سب سزائیں روزانہ اس لیے دی جاتی ہیں کہ کام کیوں نہیں کرتے، مگر مولانا بھی اپنی دھن کے پکے ہیں ۔ برابر سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط. متذکرہ ص ۹۷)

حسرت و بیگم حسرت کے تذکرے میں اس پس منظر کو دھیان میں رکھنا یوں ضروری ہے کہ قید و بند کی بڑی سے بڑی سختی بھی ان کو جادۂ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی ۔ سچا جہاد ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان ہے ۔ یہ ان کا ایمان تھا اور وہ زندگی بھر اس جہاد میں مصروف رہے ۔ بحیثیت عورت طبعی نرم دلی کے باوجود بیگم حسرت ہر ہر قدم پر حسرت کی ہمنوا و دمساز رہیں ۔ چنانچہ اس بار بھی وہ معہ بیٹی و داماد کے پونا میں ہی مقیم رہیں ۔ اور اپنی کفیل آپ رہیں ۔ اس بارے میں انہوں نے کسی کا احسان لینا قبول نہیں کیا ۔ (ضیاء الدین برنی بیگم حسرت عظمت رفتہ کراچی ص ۱۹۵) دوران قید حسرت کو باہر سے کتابیں منگانے اور لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی ۔ بیگم حسرت انہیں کتابوں کے حاشیوں پر خط کا مضمون لکھ دیا کرتی تھیں ۔ ضیاء الدین برنی کے جو اس زمانے میں حکومت بمبئی کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں تھے ۔ استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ "نہ تو میرا کوئی خط ہی مولانا تک پہنچتا ہے اور نہ مجھے ملاقات کی ہی اجازت ملتی ہے ۔ اس لیے خطوں کی باتیں کتابوں کے حاشیے پر لکھ کر بھیجتی ہوں"۔ (ایضاً)

دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے گیا اجلاس کے موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے ۔ ان کی عدم موجودگی میں تحریک ترک موالات کی مخالفت اور کونسلوں میں شرکت کے سوال پر زوردار بحثیں ہوئیں ۔ حسرت بھی ان دنوں قید تھے ۔ نشاط النساء بیگم نے نہ صرف اجلاس میں شرکت کی بلکہ ترک موالات کی وکالت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "مکمل آزادی کے جو لوگ علم بردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں، وہ کونسلوں میں جا کر آئینی اصلاحات کی قسطیں وصول کرتے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ احمد آباد میں (کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ) مکمل آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی تھی، آج داخلۂ کونسل کے حامیوں کا زور اس کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے"۔ (انڈین اینول رجسٹر ۲۳ - ۱۹۲۲ء جلد اوّل ص (۹) ۸۷۲)

سزا کی مدت میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا کہ حسرت رہا کر دیے گئے اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کانگریس سے بددلی کے سبب ۲۹ دسمبر ۱۹۲۴ء کو وہ اس سے مستعفی ہو گئے ۔

"ایامِ بلا" کے دوران بیگم حسرت کی وفا شعاری سے جو نتیجہ عتیق صدیقی نے اخذ کیا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے ۔ "بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط" میں انہ[…] نے تحریر کیا ہے ۔ "حسرت کے ایامِ بلا" ان کے قید و بند کی زندگی کا دور ختم ہوا [...] نشاط النساء بیگم بھی اپنی گھریلو زندگی کے خول میں واپس چلی گئیں ۔ اور اپنی بقیہ زند[گی] کے دس سال اسی خول میں بسر کیے"۔ (ص ۴۷)

یہ تاثر کہ نشاط النساء بیگم کی تمام تر سیاسی سرگرمیوں کی پس پشت محض ایک جذبۂ رفاقت تھا ۔ جدوجہدِ آزادی میں ان کی عظیم الشان خدمات کا منا[سب] اعتراف نہ ہوگا ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے سیاسی شعور کا آغاز اور ارتقاء حسرت کی محبت میں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ارتقاء کے مراحل جس تیزی سے ا[نہوں] نے طے کیے اس میں بڑا دخل ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں کا تھا ۔ عملی زندگی میں ج[وں] جوں سامراجی آمریت و استبداد سے ٹکراؤ بڑھتا گیا اس کے استحصال کی حکمتِ عملی کے گھناؤنے نقوش بھی واضح ہوتے چلے گئے اور سیاسی شعور میں پختگی [کے] ساتھ ساتھ آزادیٔ کامل کا یقین بھی ایمان کی شکل اختیار کر گیا جس کی خاطر و[ہ] بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں ۔

نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیاں محض حسرت کے مقدمات کی پیروی تک ہی محدود نہ تھیں ۔ حسرت کے ساتھ ہر اہم سیاسی اجلاس میں ان کی شرکت اور اس کے لیے بے سروسامانی کی حالت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعو[بتوں] کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کی انتھک جدوجہد، کل ہند زنانہ کانفرنس میں شرکت، ہم خیال سیاسی رہنماؤں سے خ[ط] کتابت، قومی اخبارات سے مسلسل ربط اور کل ہند زنانہ وفد میں مسز بسنٹ و[مسز] نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت جو قومی سطح پر ان کی منفرد حیثیت کی وا[ضح] نشان دہی ہے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدوجہدِ آزادی میں بھی ان کی حیثیت منفرد تھی ۔ کشن پرشاد کول کا یہ بیان زیادہ قرینِ صداقت معلوم ہوتا ہے "وطن پرستی ان میں بھی تھی کہ جیسے حسرت میں ۔ ان کے خلقی رجحانات کے علاوہ غا[لباً] حسرت کی صحبت نے ان میں چار چاند لگا دیے تھے ۔ لیکن میرے خیال میں وہ [...] والی عورت تھیں ۔ اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا ا[ور] میرا اندازہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، حسرت پر کچھ نہ کچھ ان کے اس و[...] کا ضرور پڑتا رہا"۔ (نگار حسرت نمبر متذکرہ ص : ۶۰) اس بیان کا م[...] موازنہ یا حسرت کی عظمت کو کم کرنا ہرگز نہیں ۔ یقیناً حسرت کی عظمت اس وقت بڑھ جاتی ہے ۔ جب وہ خود انتہائی فراخ دلی سے ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء میں بیگم کی دائمی جدائی کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں : "راقم کو بیگم حسرت کی اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا نہ رہا ۔ [...] تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں ۔ اس لیے انہیں [...]

بقیہ ص[...]

سری نیواس لاہوٹی

مخدوم : چند تاثرات

مخدوم کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو رہے ہیں اور آج جب میں ان پر لکھنے کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے سامنے کھڑا ہوں اور زندگانی کی ایک ایک بات کی یاد آ رہی ہے۔ مخدوم میرے لیے صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ وہ دوست، رہبر اور ساتھی بھی تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں ہوئی، جب کہ ہم کامریڈز ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ محلہ دار الشفا میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ حیدر آباد میں مخالف فاشزم اور مخالف سامراج تحریکوں کے زیر اثر نوجوانوں کا ایک گروہ ابھر رہا تھا۔ اور اس گروہ کے رہنما دوسروں کے علاوہ مخدوم محی الدین بھی تھے۔ اور اس گروہ کی ابتدائی تنظیم کامریڈز ایسوسی ایشن تھی۔ اس وقت مخدوم غالباً اڈیکمنٹ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قریب سکونت پذیر تھے۔ میں اور میرے ایک اور ساتھی جواد رضوی مکان تلاش کرتے ہوئے ان کے گھر پہنچے تو وہ اپنے کمرے میں محوِ مطالعہ تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور وجہ بیان کی کہ ہمارے جلسے میں انہیں شریک ہونا ہے۔ انہوں نے حامی تو بھر لی لیکن جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ خارش میں مبتلا تھے۔ اور کسی بھی محفل میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔

اس کے بعد سے ہر روز ملاقاتیں ہونے لگیں اور انہوں نے ہمیں سیاسی نہج پر لگانے میں رہنمایانہ رول ادا کیا۔ ابتدا میں، میں ان کی شاعری سے زیادہ ان کے سیاسی رول سے بہت متاثر تھا، لیکن جوں جوں سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ادبی شعور میں پختگی آنے لگی تو میں ان کی شاعری سے بھی دل چسپی لینے لگا۔ جو آخری وقت تک باقی رہی اور ایک منزل تو ایسی آئی کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور میں ان کی شاعری کے راز داں بن گئے اور جب کبھی کوئی چیز "نازل" ہو جاتی تو سب سے پہلے ہمیں اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بلدہ (حیدر آباد) میں نہیں تھا، لیکن شاعر میں سنانے کی جو خواہش ہوتی ہے وہ دبائی نہیں جا سکتی۔ چنانچہ ایک بار غزل کے "وارد" ہونے کے بعد کوئی نہیں ملا تو انہوں نے "ویکاجی ہوٹل" کے بیرے کو مخمور کر کے غزل سنا کر ذہنی سکون حاصل کیا۔

مخدوم کو پہلی سزا کا مجرم قرار دلوانے میں بھی میرا بڑا حصہ رہا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ۱۹۴۳ء میں گاندھی جینتی کے موقع پر "حیدر آباد کھادی پرچار سنگھ" جس کا کہ میں معتمد تھا، ایک جلسۂ عام حشمت گنج میں منعقد ہوا تھا اس میں مخدوم نے بڑی سخت تقریر کر دی۔ ان کی یہ تقریر نہ صرف وائسرائے کے خلاف تھی بلکہ اس میں انہوں نے ان کے نمک خواروں کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان میں حیدر آباد کے نظام بھی شامل تھے۔ حکومتِ وقت نے اس تقریر کا نوٹس لیا اور مخدوم کے خلاف ایک فوج داری مقدمہ دائر کر دیا۔ اکبر وفاقانی ایڈوکیٹ کے علاوہ بی رام کشن راؤ بھی ان کے وکیل تھے۔ جو پہلے جنرل الیکشن کے بعد حیدر آباد کے چیف منسٹر اور اتر پردیش کے گورنر بنے۔ جنہوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے ملزم کی مدافعت کی، لیکن ڈاکٹر سیادت علی خاں نے جو جج تھے، سزا سنا ہی دی۔ اور مخدوم کو تین مہینے کے لیے سنٹرل جیل حیدر آباد کی ہوا کھانی پڑی۔ اسی سزا کے دوران ان کا پہلا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔

میرے اس مضمون کا خاص موضوع ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں مخدوم کی بحیثیت دوست، ساتھی اور انسان کے، ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک کا زمانہ حیدر آباد کے لیے

• اُردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹

بڑا ہیجانی تھا۔ ہر آن واقعات بدلتے جا رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء کے
اواخر تک میرا اور مخدوم کا کوئی ساتھ نہیں رہا۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے اواخر میں گرفتار
کر لیا گیا اور ۱۹۴۸ء میں چند دنوں کے لیے رہائی عمل میں آئی اور دوبارہ ۱۹۴۹ء
میں پھر دھر لیا گیا۔ اور ۱۹۵۱ء کے آخر میں رہا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پہلے
انتخابات کی ہماہمی بڑے زوروں پر تھی۔ مگر جب بھی فرصت ملتی، احباب جمع
ہوتے اور آپسی گفتگو میں مخدوم سب پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے۔ چاہے وہ ان
کمیٹی کا جلسہ ہو یا ترقی پسند مصنفین کی بیٹھکیں یا سیاسی جلسے، مخدوم ہر ایک کے میر
کارواں بنے ہوئے نظر آتے۔

مخدوم کی بذلہ سنجی بڑی مشہور تھی اور جب سیاسی مباحثے سے طبیعت
زچ آجاتی تو مخدوم کوئی نہ کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے کہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ
کھیل جاتی۔ اور ایسا محسوس ہوتا کہ جامعہ عثمانیہ کا کھلنڈرا مخدوم ہمارے ساتھ
ہے۔ مخدوم کے جامعہ کے ایک سینیئر ساتھی مرزا شکور بیگ جو بعد میں مخدوم کے
ساتھ اسمبلی کے بھی رکن رہے۔ ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ مستقر ورنگل پر ایک
مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں حیدرآباد کے شعرا کے علاوہ باہر سے بھی شعرا
مدعو تھے۔ مشاعرے سے پہلے ڈنر کا اہتمام تھا۔ ڈنر کے لیے جب بلایا گیا تو مخدوم یہ
کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں، باہر چلے گئے۔ کھانا شروع ہو گیا، لیکن مخدوم نہیں
آئے۔ کافی دیر انتظار کے بعد مخدوم اپنے روایتی تبسم کے ساتھ آتے ہوئے
دکھائی دیے تو دوستوں نے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بات ٹال
دی۔ مشاعرے میں مائیک کے پاس کرسی رکھ دی گئی تھی تاکہ شعرا حضرات اس
پر بیٹھ کر کلام سنائیں۔ جب مخدوم کی باری آئی تو انہوں نے کہا کہ وہ کھڑے
ہو کر کلام سنائیں گے۔ غرض وہ مائیک کے آگے اپنے دونوں ہاتھ ناف کے پاس
باندھے کلام سنانے لگے تو احباب کے علاوہ سامعین کو بھی ان کا یہ پوز سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا۔ مشاعرے کے بعد جب صبح کے قریب سب شعرا اور احباب میزبان کے
گھر واپس ہوئے تو مخدوم سے ڈنر میں دیر سے آنے اور غیر متوقع پوز میں کلام سنانے
کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ جب میں پاجامہ باندھ رہا تھا
تو کمر بند ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا کرتا۔ اس لیے پاجامے کو تہبند کی طرح باندھ لیا۔
مشاعرے میں اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں کرسی سے اٹھتے وقت تہبند کا
پیچ ڈھیلا نہ ہو جائے۔ اس لیے میں نے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے اس پیچ کو سہارا
دے کر کلام سنایا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم کے اس بیان کے بعد محفل
کا کیا حال ہوا ہوگا۔

مرزا ظفر الحسن "ذکر یار" کے مصنف مخدوم کے پرانے ساتھی ہونے کے علاوہ
حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ اس وقت میر حسن اور اشفاق حسین بھی
یہیں کام کرتے تھے جو بعد میں مدراس اور بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر بنے ——
ایک دن مخدوم نشر گاہ پہنچے اور ظفر الحسن سے کہا کہ "بلاتی" چلیں گے۔ یہ نشر گاہ
کے قریب ایک ہوٹل کا نام تھا۔ پورا قافلہ جب چائے ختم کر چکا تو مخدوم نے ظفر الحسن کے
سسرال والوں کی تعریف شروع کر دی۔ اس وقت ظفر کے ماموں خسر باٹا کمپنی
میں منیجر تھے۔ ظفر نے اس تعریف کے بعد صاف صاف دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو
تو مخدوم نے جواب دیا کہ تمہارے سر میں بھیجا نہیں، لکڑی کا برادہ بھرا ہوا ہے۔
مجھے جوتے کی ضرورت ہے اور تم فوراً چٹ لکھ دو تاکہ میں وہاں سے جوڑا حاصل
کر لوں۔ ظفر الحسن نے چٹھی لکھ دی۔ مخدوم نے چٹھی پڑھی اور کہا کہ باوجود شرافت
کے شاید تم نے ایک آدھ بار کسی کنجوس خاتون کا بھی دودھ پیا ہے۔ جب ہی تو تم
نے چٹھی میں لکھا ہے کہ ایک جوڑ جوتا لیں گے۔ اگر یہ نہیں لکھتے تو کیا میں پوری
دکان اٹھا لیتا۔ ظفر الحسن کو دوسری چٹھی لکھنی پڑی اور تمام احباب
ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔

مخدوم کی دوستی اور انسانیت کا ذکر نہ ہو تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔
میں صرف ایک ہی واقعہ پر اکتفا کروں گا۔ حیدرآباد کے ایک بڑے دھن والے راجہ
صاحب کے پاس نظام حیدرآباد کے شاہ زادے کی دعوت تھی۔ اس میں مخدوم اور میں
بھی مدعو تھے۔ شاہ زادے کے اسٹاف کے ساتھ دو شاعر بھی تھے۔ ان میں سے ایک
حیدرآباد کے نامور غزل گو تھے۔ ڈنر سے قبل بنت عنب سے شغل رہا۔ مگر ہماری
ٹیبل شاہ زادے اور راجہ صاحب کی ٹیبل سے علیحدہ تھی۔ مگر جب ڈنر ٹیبل پر
جانے کا وقت آیا تو دونوں شاعر وہاں سے کھسکنے لگے۔ مخدوم نے ان دونوں کو
دبوچ لیا اور کہا کہ اگر تم سب کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتے تو ہم بھی ڈنر میں
شریک نہیں ہوں گے۔ قاعدہ یا روایت یہ تھی کہ شاہ زادے کے ساتھ ان
کا اسٹاف کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ جب یہ بات راجہ صاحب کو معلوم ہوئی تو
انہوں نے شاہ زادے سے کچھ کھسر پھسر کی اور اس کے بعد ہم سب نے مل کر ساتھ کھانا
کھایا۔ ورنہ برسوں سے شاہ زادے کے کھانے کے بعد ان کے اسٹاف کو مصاحبین
کو چھوڑ کر کھانا ملا کرتا تھا۔ یہ مخدوم کی انسانیت اور دوست نوازی کی ایک
معمولی مثال ہے۔

مخدوم صرف ایک شاعر ہی کا نام نہیں بلکہ ایک عہد اور جدوجہد
کا بھی نام ہے۔ شاعری ان کا ہتھیار رہی ہے، جسے انہوں نے سیاسی جدوجہد
کے دوران بطور ہتھیار بھی استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے غم کو سماج کا درد
سمجھ کر اور اپنی شاعری کو اس درد سے آشنا کر کے اردو شاعری کو ——
اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح —— نئی فضا سے ہم آہنگ کیا۔ اس کے علاوہ ان
کی شاعری میں اظہار کا جو دلآویز سلیقہ تھا وہ جدید ہوتے ہوئے بھی غزل کی
رومانی فضا سے بھرپور تھا، اس لیے مخدوم اور ان کے قاری و سامع کے
درمیان کبھی فاصلہ حائل نہیں ہوا۔ جو آج کہ جدیدیت کے حامی شعرا کے درمیان
حائل ہے اور ترسیل و ابلاغ ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اردو میں
ترقی پسند ادبی تحریک کے جن شاعروں اور ادیبوں نے قوت موعظا کی ان میں

مخدوم کا نام سرفہرست ہے۔ اس تحریک سے ان کی وابستگی اس کے ابتدائی دور ہی سے رہی تھی۔ وہ ایک طرح سے اپنے عہد کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں طبقاتی شعور اور طبقاتی جدوجہد اور سماجی بیداری کی بے پایاں خواہش موجزن ہے۔

حسن اگر کائنات کا پہلا حسین تخیل ہے تو عشق وہ امانت ہے جس کی حفاظت کی مخدوم نے ہمت کی اور وہ بھی عمر کی اس منزل پر کہ ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے جس کا اظہار ان کی غزلوں میں بذریعہ اتم موجود ہے، لیکن ان کی غزلوں میں عشق کا اظہار، ذہنی بیماری کے طور پر کبھی نہیں ہوا بلکہ ایک گہرا سماجی شعور ان کی غزلوں کے پردے میں بھی پنہاں نظر آتا ہے اور اس شعور کا سنجیدہ اظہار خیال غزل کی روایات اور نرمی نیز اس کے آہنگ کو مجروح نہیں کرتا ہے۔ مخدوم کی نظموں کی خوبی اور وصف کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ہمیشہ ظالموں کو مطعون قرار دیا ہے۔ اس لیے وہ اپنی تخلیقات میں غیر جانبدار نہیں رہے۔ اور انہوں نے ان باتوں کو اظہار کا موضوع بنایا جو حقیقت پر مبنی تھیں۔ اور یہی اعلیٰ شاعری کی بہت بڑی دین ہے۔

مخدوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر کے کبھی اپنے کو شرمندہ نہیں کیا۔ چاہے حالات کی سختیاں ہوں کہ زندانوں کی بیڑیاں اور نہ وہ حاکموں کے جبر و ستم کے مقابلے میں اپنی آواز کو کبھی مدھم ہونے دیا اور یہی ایک بڑے انسان کی خوبی ہے۔ دنیا کے ہر دور میں ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو پیدا ہو کر کبھی مرتے نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ مخدوم بھی ایسے ہی انسانوں میں سے ایک تھے۔ جو محنت کش انسانوں کی جنت بنانے کے جہاد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور اس کے قافلہ سالار بھی۔ اسی لیے تو انہوں نے دعا مانگی تھی کہ :

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامران ہو کوہکن کی جیت ہو

بقیہ : بیگم حسرت موہانی

تنبیہ کا حق حاصل تھا۔ جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔" (حسرت اردوئے معلیٰ فروری تا اپریل ۱۹۴۷ء ص ۲)

بیگم حسرت کی جرأت و ہمت کی صفات، ان کی کارکردگی کی اہلیت و صلاحیت اور ملک کی آزادی کی خاطر جدوجہد کا تجزیہ اگر ہم اس زمانے کے مسلم معاشرے کے پس منظر میں کریں تو ان کے کارناموں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

رہی عمر کے آخری حصے میں "گھریلو خول میں واپس چلے جانے" کی بات تو میرے خیال میں عمر کے آخری دور میں صحت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ خود مولانا حسرت کے سیاسی مسلک کی تبدیلی بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس سے مستعفی ہونے کے بعد جو باوجود اندرونی اختلافات کے ملک کی سب سے زیادہ فعال جماعت تھی، خود حسرت کی زندگی بہت کچھ بدل گئی تھی۔ گو بعد میں وہ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی رہے اور مزدور تحریکات میں بھی برابر حصہ لیتے رہے۔ لیکن ان تمام کاموں میں اب وہ سرگرمی نہ رہی تھی جو اس سے پہلے کے دور میں ملتی ہے۔ حسرت اور بیگم حسرت دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ اس لیے سیاسی سرگرمیوں کے نشیب و فراز میں بھی یکسانیت لازمی بات تھی۔ تاہم زندگی کے اس دور میں بھی شواہد موجود ہیں کہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں کانگریس اجلاس کے موقع پر مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت وہ دونوں مشترکہ طور پر کر رہے تھے۔ بہر حال نشاط النسا بیگم کی عوامی زندگی کا یہ آخری واقعہ ہے جس کا تحریری ثبوت ملتا ہے۔

بس تمام تر تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ قومی جنگِ آزادی میں بیگم حسرت کی قربانیوں کے پس پشت جذبۂ رفاقت و جذبۂ حب الوطنی دونوں ہی مساوی طور پر کارفرما تھے اور قربانی جہاں ہو جس شکل میں ہو اس کا اعتراف خود اپنی بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس اعتراف کے بغیر نہ ہم میں جوشِ عمل پیدا ہو سکتا ہے نہ حسنِ کردار آ سکتا ہے۔ نئی نسل کا یہ شعور ہی کہ قومی آزادی ہم سب کی مشترک میراث ہے، یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ اس قیمتی ورثہ کی حفاظت بھی ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔

بقیہ : جوئے لداخ

طرح سے چند گنے چنے لوگوں میں اپنا مقام بنایا ہے۔

چند ڈاکٹروں سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ سردی نمونیا کے علاوہ یہاں تپِ دق کی بیماری مقابلتاً زیادہ ہے۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی اور خلاف از توقع لداخ کا علاقہ جنسی بیماریوں سے پاک تھا۔ ورنہ عموماً پہاڑی علاقوں میں وہاں کے ناگزیر حالات کی وجہ سے ایسی بیماریاں زیادہ ملتی ہیں۔ تپِ دق کی وجہ لوگوں کا مویشیوں کے ساتھ رہنا اور تنگ جگہوں میں انگیٹھیاں سلگا کر سونا ہے۔ اس کے لیے حفظانِ صحت کے اصولوں کو ذہن نشین کرانا اور ان کے طرزِ رہائش میں مناسب تبدیلیاں کرنا لازمی ہے۔

لداخ یقینی طور پر ہندوستان کا ایک عجیب و غریب خطہ ہے جو فن لینڈ کی سردی، افریقہ کی تپش، جاپان کی مہمان نوازی، ایران کے تصوف اور تبت کے جادو کا بے مثال مرکب ہے۔

سوم آنند

ماضی کے نہاں خانے

کچھ روز ہوئے اُردو کے کچھ پرانے ادبی پرچوں کی ورق گردانی کر رہا تھا — ادبِ لطیف، نیا ادب، نقوش، شاہراہ، نظام وغیرہ۔ یہ اُس وقت کے شمارے تھے جب نئی نسل کے ادیب مستقبل کے خوابوں میں رنگ بھر رہے تھے۔ ارادے اور "آئیڈیل" جوان تھے اور کچھ ایسی فضا تھی کہ محسوس ہوتا تھا جیسے انقلاب اب آیا ہی چاہتا ہے۔ جس کے بعد ہندوستان کیا، دنیا کے بیشتر حصوں میں ایک ارضی جنت قائم ہو جائے گی۔ اُس وقت کے مشہور لکھنے والے ہم لوگوں کے ہیرو تھے اور کسی ادبی پرچے کا نیا شمارہ دیکھ کر ہم سب سے پہلے یہ جاننے کے مشتاق ہوتے کہ اس میں منٹو، بیدی یا کرشن چندر کا کون سا نیا افسانہ ہے۔ اس میں فیض یا ساحر کی کون سی نئی نظم ہے۔

راقم نے جب اردو کے تخلیقی ادب میں دلچسپی لینا شروع کی تو لاہور ادیبوں کا سب سے اہم مرکز تھا اور ادبی حلقوں میں ساحر لدھیانوی کا طوطی بولتا تھا۔ اُن کی "تلخیاں" نئی نئی چھپ کر بازار میں آئی تھی۔ اس مجموعے کی کئی نظمیں زبان زد ہو چکی تھیں۔ خاص طور پر نظم "تاج محل" کے تراشے لڑکے لڑکیاں جیبوں میں لیے پھرتے تھے۔

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اُس زمانے کے ادبی پرچوں کی ورق گردانی کرتے کرتے میں بیچ بیچ میں کئی چیزیں پڑھتا رہا اور اس طرح پرانے دنوں کی یاد میں کھو گیا پھر آج کے ادبی منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہم نے کتنا لمبا سفر طے کیا ہے اور ہم کہاں سے کہاں پہنچے ہیں۔ اُس وقت کیسے کیسے جیالے تھے ہمارے درمیان اور ادب کے شائقین میں اُن کی مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ آج جدید ادب کے سرکردہ اہلِ قلم کو کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور اُن کی تحریروں سے محظوظ ہوتے ہیں؟ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ تجریدی آرٹ اور جدیدیت والے ادب میں کوئی فرق نہیں رہا۔

خیر اس گفتار کا مقصد ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا موازنہ کرنا نہیں۔ ترقی پسند ادب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب تو اس کی خامیوں، کمزوریوں اور ان سب اسباب کا بیان ہو چکا ہے، جن کے باعث یہ تحریک کمزور ہوئی، مگر ایک بات یاد رکھنے والی ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز وہ نہیں جو اس کے بانیوں اور مورخوں نے بیان کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سید سجاد ظہیر نے قیامِ لندن کے دوران اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر ادیبوں کی ایک ایسی انجمن کا منصوبہ تیار کیا جو لکھنے والوں کو حقیقت پسندی کی طرف مائل کرے۔ اُس وقت تک یورپ میں ادیبوں کی ایسی کئی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں۔ مگر جسے ترقی پسندی کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد تو بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ آخر حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری بھی تو ترقی پسندی تھی۔ اور محمد حسین آزاد نے لاہور میں جس بے طرح مشاعرے کی بنیاد رکھی وہ بھی اسی سمت ایک قدم تھا۔ ترقی پسند تو ہم اُسی روز ہو گئے جس روز ہمارے اہلِ قلم نے روایتی ادب کے خول سے نکل کر مغربی تہذیب و ثقافت سے اثر قبول کرنا شروع کیا۔ ہاں ترقی پسند تحریک نے جو نئی چیز ہمیں دی وہ تھا سماجی انصاف کی ضرورت کا احساس۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس احساس کا سب سے بڑا محرک سوویت یونین کا اکتوبر انقلاب تھا۔ اسی احساس نے ہمارے ادیبوں کو نچلے طبقوں کی زندگی پیش کرنے کی طرف مائل کیا۔ اور یہی احساس تھا جس نے ادبی معیار کے پیمانے بدلے اور نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر کے کلام کا پھر سے جائزہ لینے پر مجبور کیا۔

● I-322، نرائن وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۸

کہا جاسکتا ہے کہ نچلے طبقوں کی زندگی ہم ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں گاؤں کے رہنے والے غریب کاشت کار کے شب و روز کا جو نقشہ ہم نے دیکھا ہے، اس کی اردو ادب میں تو کوئی مثال نہیں ملتی۔ مگر پریم چند بھی اکتوبر انقلاب سے بہت متاثر ہوئے اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا پہلا اجلاس جو لکھنؤ میں ہوا اس کی صدارت انہوں نے ہی کی تھی۔ مگر ادب میں سماجی انصاف کے نظریات کو ایک تحریک کی شکل پریم چند کے بعد ہی ملی۔

ہندوستان کی کوئی بڑی زبان ایسی نہ ہوگی جس کے ادیبوں نے اکتوبر انقلاب سے کسی نہ کسی حد تک اثر قبول نہ کیا ہو۔ مگر اردو کے ادیب کئی وجوہات کی بنا پر سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس دور میں ہمارے بہترین لکھنے والے ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں سوویت انقلاب کی وجہ سے روس کی سرزمین، اس کی روایات، تاریخ اور ادب سے بھی ہماری دل چسپی بڑھی۔ اس سے پہلے روس کا نام اگر ہمارے لوگوں نے سنا تھا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز حکمرانوں کو زار روس کے ارادوں سے ہر وقت خطرہ محسوس ہوتا ہے، اس لیے ہمارے اخبارات میں اکثر روس کا چرچا رہتا۔ اس کے علاوہ وسطی ایشیا میں روس کی مملکت کے علاقوں (تاشقند، سمرقند، بخارا وغیرہ) سے ہمارے تاریخی و تہذیبی رشتے تھے۔

اس کے بعد ہندوستان میں اعلیٰ سطح پر انگریزی ذریعۂ تعلیم ہوگئی تو ہمارے پڑھے لکھے طبقے نے روسی مصنفوں کے انگریزی ترجموں سے وہاں کے ادب، روایات اور تاریخ کے بارے میں بہت کچھ واقفیت حاصل کی۔ مگر یہ واقفیت کچھ پڑھے لکھے لوگوں تک محدود رہی جو انگریزی میں چیخوف، گوگول اور ٹالسٹائی وغیرہ پڑھ سکتے تھے۔ پھر ۱۹۱۷ء کا انقلاب آیا۔ یہ ایک ایسا سیاسی و سماجی زلزلہ تھا، جس کے جھٹکے دنیا کے ہر کونے میں محسوس کئے گئے۔ ہندوستان کے ہر گلی محلے میں بھی روس کا اور روس کے بالشویک لیڈروں کا ذکر ہونے لگا۔ اس وقت ہمارے ملک کے دیہات میں پرانی طرز کے جاگیرداری نظام کی بیشتر خرابیاں موجود تھیں اور شہروں میں صنعتی دور کا سرمایہ داری نظام ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا۔ سیاسی طور پر ہم انگریز کے محکوم تھے۔ اسی وجہ سے ہمارے لوگ سماجی انصاف اور سیاسی آزادی کو ہم معنی سمجھنے لگے تھے — اس لیے بالشویک انقلاب گویا ہوا کا ایک ایسا جھونکا تھا جو ایک نئے دور کی نوید لایا۔ فیض احمد فیض نے اپنی یادداشتوں میں کہیں اس وقت کے ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔

"۔۔۔۔ انہیں یادوں میں کہیں گڈمڈ اخباروں کی سرخیاں ہیں اور اخبار بیچنے والوں کا غوغا ہے۔ روس میں زارِ شاہی کا تختہ الٹ گیا۔ ۔۔۔۔ لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کرلی ۔۔۔۔ سرخ انقلاب آگیا۔ جگہ جگہ لوگوں میں چہ مہ گوئیاں ہورہی تھیں۔ ہمارے گھر کے دیوان خانے، اسکول کے اسٹاف روم میں، محلے کی مسجد میں ہر جگہ ایسا ہی تذکرہ ہے۔ یہ روسی انقلاب کیسے ہوا، کیونکر ہوا، کیا انقلابی فوجیں ہندوستان پہنچ کر ہمیں بھی آزاد کرائیں گی؟ مزدوروں، کسانوں کی حکومت کیسی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

اس سلسلے میں ایک معنی خیز بات یہ ہے کہ بالشویک انقلاب سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جن کے عقائد میں مذہب کی بنیادی حیثیت تھی۔ ایسے افراد میں تین ہستیوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال۔ ان تینوں میں عبید اللہ سندھی تو پکے مولوی تھے۔ دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے آپ نے درس لیا تھا۔ مگر سندھی نے مولانا محمود الحسن سے نہ صرف جامع ترمذی پڑھی بلکہ انگریز دشمنی کا بھی سبق لیا۔ ان ہی کی تحریک پر آپ ۱۹۱۵ء میں افغانستان چلے گئے، جہاں راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد میں شریک ہوئے اور ان کی جلا وطن سرکار کے ممبر بنے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی فتح کے بعد آپ ۱۹۲۲ء میں کابل سے ماسکو چلے گئے، جہاں اس وقت لینن کی رہ نمائی میں ایک نئے معاشی اور معاشرتی نظام کی تعمیر ہورہی تھی۔ ماسکو کے بعد آپ ترکی چلے گئے۔ جہاں کمال اتاترک ایک اور انقلاب لا رہا تھا۔ ترکی میں قیام کے بعد عبید اللہ سندھی نے تقریباً بارہ تیرہ برس حجاز میں گزارے اور پھر سے اپنی علمی مصروفیات کی طرف لوٹ آئے۔ مگر اب مذہب کے متعلق ان کے نظریات بہت کچھ تبدیل ہوچکے تھے۔ انہوں نے روس اور ترکی کے انقلابات دیکھے تھے۔

ان مشاہدات سے مولانا نے دو باتیں محسوس کیں۔ ایک تو یہ کہ روحانی ترقی مادی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور دوسری یہ کہ سوشلزم اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ سمجھنے لگے کہ دولت کا چند ہاتھوں میں مرکوز ہوجانا اسلامی اصولوں کے خلاف ہے اور اسلامی قوانین نافذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سوشلزم لایا جائے۔ ۱۹۳۹ء میں عبید اللہ سندھی ہندوستان آئے اور دیوبند میں ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ مگر جب انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا تو سننے والوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اور یہ حیرت پھر مخالفت میں بدل گئی۔

حسرت موہانی، عبید اللہ سندھی سے زیادہ دل چسپ شخصیت تھے۔ وہ مولوی تو نہ تھے، مگر مذہب سے جو انہیں لگاؤ تھا، وہ مولویوں سے کہیں زیادہ تھا۔ آج ہم حسرت کو ان کے کلام کی وجہ سے یاد کرتے ہیں، مگر سیاسی میدان میں ان کی دل چسپی کسی سے کم نہ تھی۔ سیاست میں وہ انتہا پسند تھے اور اپنی انتہاپسندی کی وجہ سے انہوں نے جیل میں وہ مصیبتیں اٹھائی ہیں، جو کم لوگوں کے حصے میں آئی ہوں گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس میں بھی اعتدال پسندوں کی اکثریت تھی۔ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں حسرت نے کامل آزادی کی قرارداد رکھی۔ یاد رہے کہ یہ لاہور کانگریس سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے، جہاں پارٹی نے پہلی بار مکمل آزادی کو اپنا

نصب العین قرار دیا تھا۔ احمد آباد کے اجلاس میں حسرت کی قرارداد کو منظور نہیں کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مولانا حسرت ہمیں ایسے پانی میں کھینچے لیے جاتے ہیں جس کی گہرائی کا پتہ نہیں۔

جس شدت سے حسرت سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے وہ شدت مذہب سے لگاؤ اور شیفتگی میں نظر آتی ہے۔ وہ صوفی بھی تھے ۔۔ جسمانی آرام و آسائش اور روپے پیسے سے اُن کی نفرت اب ضرب المثل بن چکی ہے۔ اپنی جائداد انہوں نے مرشد کے عرس کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اس قدر پھٹے حالوں رہا کرتے تھے کہ سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ مالی وسائل نہ ہونے کے باوجود اُنہوں نے تیرہ حج کیے۔ اسی پر بس نہیں۔ وہ کرشن کے بھی پجاری تھے اور اسی شوق میں برندابن اور متھرا کا پھیرا کیا کرتے۔ ۵

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

ایسے صوفی اور مذہبی آدمی کو مارکسزم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر اکتوبر انقلاب سے حسرت بھی متاثر ہوئے اور بڑی شدت سے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ کانپور میں جب کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس ہوئی تو حسرت موہانی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ اُنہیں مذہب اور کمیونزم میں کوئی تضاد نظر نہ آتا۔ کانپور میں اپنے خطبۂ استقبالیہ میں اُنہوں نے کہا۔

"جو شخص ہمارے اصولوں کو مانے، وہ ہمارے فرقے میں داخل ہے۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ۔ مذہبی شخص ہو یا لامذہب ۔۔ بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے"

حسرت کی سوویت یونین سے عقیدت انہی نظریات کی بنا پر تھی۔ مولانا کے کلام میں حالانکہ ان کی انقلاب پسندی کچھ زیادہ نظر نہیں آتی۔ مگر کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست میں اُن کے عقائد کا مرکز کیا رہا ہوگا ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

کانگریس سے نکل کر مولانا حسرت مسلم لیگ میں چلے گئے۔ مگر سوویت یونین سے اُن کی عقیدت ایسی ہی قائم رہی۔ ۱۹۴۵ء کی ایک نظم ہے ۔ ۵

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں سوویت ہے جہاں میں ہوں

حسرت نے اگر شاعری کو سیاسی عقائد کی وضاحت کے لیے ذریعہ اظہار نہیں بنایا تو علامہ اقبال نے یہ کسر پوری کر دی۔ اقبال کو بھی مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ حسرت کی طرح وہ بھی اکتوبر انقلاب سے متاثر ہوئے (مگر حسرت کی طرح وہ اشتراکی کبھی نہ بنے) اس کا اظہار اُن کی بے شمار نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ اکتوبر انقلاب ہی تھا جس نے اقبال سے اسی طرح کے شعر کہلوائے۔

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

حسرت کے برعکس اقبال کو مارکسزم کا ملحدانہ پہلو بہت کھٹکتا تھا۔ اس کے باوجود کارل مارکس کے نظریات کا سحر اُن پر کام کر گیا اور اُنہوں نے ابلیس کے مشیر کی زبان سے جرمنی کے اس یہودی کے متعلق کہلوایا:

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اس طرح اُنہوں نے لینن کو خدا کے حضور میں کھڑا کر دیا اور اُس سے وہ باتیں کہلوائیں کہ اگر سوویت ریاست کا بانی درحقیقت اُس کے دربار میں جاتا تو یقیناً یہی کہتا:

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اقبال اس معنی میں ترقی پسند نہیں تھے جس معنی میں آج ہم یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ مگر اُن کے بعد آنے والی ترقی پسند ادیبوں کی نسل نے اقبال سے بہت کچھ سیکھا۔ اُس وقت تک تخلیقی ادب لکھنے والوں میں یہ خیال بہت زور پکڑ چکا تھا کہ ادب میں زندگی کی حقیقتیں بیان ہونی چاہئیں نہ کہ گل و بلبل کے قصے۔ اس مکتب فکر کے نمائندہ شاعر فیض احمد فیض تھے۔ وہ پرانی اور نئی نسل کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ روایتی انداز میں اُنہوں نے نئی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ وہی تشبیہیں، وہی استعارے، وہی علامتیں، مگر ان کا مطلب کچھ اور ۔۔ ان کی یہ نظم ترقی پسند تحریک کی اسپرٹ کی بہت خوبی سے نمائندگی کرتی ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

یہ خیال اس قدر مقبول ہوا کہ جگر مرادآبادی جیسا حسن و عشق کا شاعر ۱۹۴۲ء میں قحط بنگال کے وقت یہ کہنے پر مجبور ہوا۔

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دُور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں

(آگے ص ۳۸ پر)

حکیم منظور

زمیں کی بے بسی کو آسمانی لکھ نہیں سکتا
میں شرمندہ ہوں میں جھوٹی کہانی لکھ نہیں سکتا

کسی منزل کی صورت کھل نہیں سکتی ہے آنکھوں پر
وہ خوابوں پر بھی کیا اپنی نشانی لکھ نہیں سکتا

پڑھا کس نے کہ بادل اپنی مرضی سے برستے ہیں
کہا کس نے وہ سنگستاں پہ پانی لکھ نہیں سکتا

ہے مجھ پر، مسکراتی برف، روتی دھوپ کا غصہ
مگر موسم کی ہے کیا سرگرانی لکھ نہیں سکتا

اُگا نا کچھ نئے، تازہ بدن گل، میرا حصہ ہے
مگر عاجز کہ خوشبو پر روانی لکھ نہیں سکتا

ہوا کے ہاتھ پر قائم رہے جب تک مری بیعت
میں اپنے نام دل کی پاسبانی لکھ نہیں سکتا

نئی کوئی جہت نہ دوں گا میں پاؤں کی حرارت کو
کہ بوڑھے راستوں پر میں جوانی لکھ نہیں سکتا

انہی پر کھینچنا ہے دائرہ اپنے سوالوں کا
وہی نقطے کہ جن کے میں معانی لکھ نہیں سکتا

حقیقت زاد ہوں، منظورؔ یہ میرا المیہ ہے
وہ چاہے بھی تو باتیں داستانی لکھ نہیں سکتا

یہ تو کر سکتا ہوں میں: دل کی ہے کیا خواہش لکھوں
یہ مرے بس میں نہیں موسم بنا بارش لکھوں

اس قدر روشن ہوا یہ شہر، نیندیں کھو گئیں
کس کے نام اب میں نئے خوابوں کی آسائش لکھوں

جب کھلتے ہی نہیں، اُس رخِ بدن کے زاویے
کیا غلط لکھوں اگر رنگوں کو بے تابش لکھوں

جب سے ہیں خاموشیاں میرے تکلم کی زباں
نقش گو پھرتے ہیں گفتار افزائش لکھوں

وہ ذرا سا بے مروت تھا یہ کہہ سکتا ہوں میں
لیکن اُس کو کس جگہ سے شاملِ سازش لکھوں

میں کہ معمولات کا قائل نہیں ہوں، کس طرح
صبح کے پاؤں پہ شب زنجیر کی گردش لکھوں

مجھ کو اس سے کیا غرض ہے چاند ہے صحرا نفس
رات آنگن پر میں اس کے نور کی بارش لکھوں

شورشیں جتنی مدامکاں میں تھیں برپا ہو گئیں
میں نئے انساں کے نام اب کون سی شورش لکھوں

ہو گئے موسم جب اندھے اور ہوا پاگل ہوئی
کیوں نہ اے منظورؔ بس پھولوں کو بے رامش لکھوں

احساس کے لکھے ہوئے خاکوں سے الگ ہے
وہ ایک زمانہ ہے، زمانوں سے الگ ہے

ہر بات غلط تھی پسِ دیوارِ معانی
ہر رنگ کہ گویا ہے، زبانوں سے الگ ہے

اُس سب سے بڑے شخص کی پہچان ہے اتنی
وہ تیر اگر ہے تو کمانوں سے الگ ہے

اِک دستِ تہی میرا کہ اک طنز ہے مجھ پر
اِک حرفِ یقیں ہے کہ بیانوں سے الگ ہے

اِک خیمہ کہ پیڑوں کو بھی دعویٰ ہے شجر کا
اِک شہر کہ بازار، دکانوں سے الگ ہے

جرأت کا پیغام سمجھتا تھا شفق کو
وہ سر ہے وہی سر کہ جو شانوں سے الگ ہے

پلکوں سے لہو شہر کی رونق میں کہیں گم
اِک شے ہے کہ دریا کے خزانوں سے الگ ہے

وہ گھر کہ جہاں گل نفسی ہوتی ہے تخلیق
اس شہر کے سب اونچے مکانوں سے الگ ہے

منظورؔ رویہ مرا، اظہارِ مجسم
لفظوں کے سبھی مرثیہ خوانوں سے الگ ہے

ایڈیشنل سکریٹری محکمۂ زراعت، سول سکریٹریٹ، جموں ۱۸۰۰۰۱

حباب ہاشمی

کچھ اس طرح سے مجھ پہ وہ کل مہربان ہوا
دل اُس کے التفات پہ بھی بد گمان ہوا

پتھر سمجھ کے کاٹ رہے تھے جسے جناب
چشمہ لہو کا سینے سے اُس کے رواں ہوا

صحرا میں سر جھکائے کھڑے تھے شجر تمام
اُٹھ کر غبارِ راہ پس کارواں ہوا

صرف ایک لفظ 'کُن' سے ہوئی ساری کائنات
جو کچھ بھی دیکھتے ہو یہاں ناگہاں ہوا

غم یہ نہیں کہ اُس کا نظارہ نہ ہو سکا
غم یہ ہے اپنا ذوقِ نظر رائگاں ہوا

ہم کتنے سادہ دل تھے کہ باتوں میں آ گئے
کل تک جو راہزن تھا وہی پاسباں ہوا

عاری تھا سقف و بام سے اپنا مکاں حباب
لیکن ہمارے واسطے آرام جاں ہوا

• ۲۳۵ - بخشی بازار، الٰہ آباد ۳ (یو پی)

شاہد میر

کچھ آہیں سرد ہواؤں سی کچھ اشک بہ شکلِ موج لیے
خوشیوں کا محل سر کرنا ہے نکلا ہوں دکھوں کی فوج لیے

پُر پیچ بھنور کے سینے سے اٹھی تھیں شعور اوج لیے
آخر کو بھٹکتی موجوں نے شاداب ٹھکانے کھوج لیے

ہم ہیں وہ رشی جو جینے کی ہر اک لذت کو تیاگ چکے
اب دنیا در پہ آئے تو کیا تنہائی میں مرغن بھوج لیے

ہر چیز ضرورت کی حاصل غزلوں سے اگر ہونے لگتی
شہروں شہروں پھرتے نہ جگر ہوتے "عطرِ قنوج" لیے

میں شاعرِ دورِ حاضر ہوں کچھ پوشیدہ کچھ ظاہر ہوں
دلدل میں پھنسے جاتے ہیں قدم لب پر ہوں پیامِ اوج لیے

• گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ ۳۲۷۰۰۱ (راجستھان)

سکندر عرفان

پل بھر کی زندگی کے ہیں کردار مختلف
میں اور میرے مونس و غم خوار مختلف

اُنگلی کٹی تو چرچے مرے قتل کے ہوئے
کمرے میں 'میں تھا اور تھے اخبار مختلف

جس میں اُمنگ زیست کی احساس کی ترنگ
سارے جہاں سے درد کا سنسار مختلف

جب جب بھی اُس کو دیکھا ہے میں نے قریب سے
مجھ کو لگی ہے زندگی ہر بار مختلف

الفاظ اپنی ذات میں جتنے حسین تھے
ان سے تھی اتنی صورتِ اظہار مختلف

ہم نے تمہارے شہر میں محسوس یہ کیا!
اپنوں سے دوستو نہیں اغیار مختلف

عرفان ان میں رنگِ ضیاء ہو تو کوئی بات
تم نے جو عمر بھر لکھا اشعار مختلف

• یونائیٹڈ انڈیا انشورنس کمپنی، شواجی چوک کھنڈوہ (ایم پی)

نیّر قریشی گنگوہی

پُرنور زندگی کی سحر کھو رہے ہیں لوگ
سورج چڑھا ہوا ہے مگر سو رہے ہیں لوگ

کیسے کھلیں گے پھول محبت کے شہر میں
کانٹے جب اپنی راہ میں خود بو رہے ہیں لوگ

چہرے فسردہ حال ہیں آنکھیں بجھی بجھی
عزم و عمل سے دُور یہ کیا ہو رہے ہیں لوگ

ممکن نہیں حیات کی منزل نصیب ہو
راہِ فرار ڈھونڈ کے جب سو رہے ہیں لوگ

ہر دم عروسِ وقت کی برہم مزاجیاں
اِک تازہ انقلاب کو پھر رو رہے ہیں لوگ

راحت کا ذکر چھوڑیے کیسے ملے قرار
ہر لمحہ غم کے بوجھ کو جب ڈھو رہے ہیں لوگ

کچھ ان کے اختیارِ محبت پہ سوچیے
ہنستے ہوئے جو داغِ جگر دھو رہے ہیں لوگ

حالات سازگار ہوں ہرگز نہیں یہ غم
کہنے کو ہنس رہے ہیں مگر رو رہے ہیں لوگ

تعمیرِ زندگی سے گریزاں ہے زندگی
نیّر نشاطِ کیف میں گُم ہو رہے ہیں لوگ

نئی سحر کی تمنّا میں ڈھل رہا ہوں میں
جبینِ وقت کے تیور بدل رہا ہوں میں

نیا سماج، نئی نسل، رُخ نیا ہوگا
نئی حیات کا منظر بدل رہا ہوں میں

گُلوں کے شوق میں پوچھو نہ آبلہ پائی
بھری بہار میں کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں

نہیں یہ فکر کہ منزل مجھے ملے نہ ملے
چلے چلو دلِ خود دار چل رہا ہوں میں

سکونِ قلب میسّر نہ ہو، نہیں ممکن
کہ حادثات کو ٹھکرا کے چل رہا ہوں میں

ہجومِ گردشِ دَوراں کی خیر ہو یا رب
قدم قدم پہ اُبھر کر سنبھل رہا ہوں میں

غمِ حیات کا چھیڑے نہ ذکر اب کوئی
مزاجِ گردشِ دَوراں بدل رہا ہوں میں

سماج و قوم سے تخریب جس کا شیوہ ہے
قدم قدم اُنہیں نیّر کُچل رہا ہوں میں

• نیّر وِلا، گنگوہ، ضلع سہارن پور ۲۴۷۳۴۱

رفیق الزّماں

اور تنہائی سی تنہائی بڑھا لی ہم نے
جب سے دیوار پہ دیوار اُٹھا لی ہم نے

درد، تنہائی، دھُواں، خواب، تمنّا، خوشبو
اتنی راہوں سے کوئی راہ نکالی ہم نے

تیز آندھی میں جہاں لوگ اُڑے جاتے تھے
یہ ہی کیا کم ہے کہ دستار سنبھالی ہم نے

اِک جزیرہ سا خیالوں میں ابھرا کرتا ہے
دل سمندر ہے، کوئی بات چھُپا لی ہم نے

زہر آلود فضا، آگ، لہو کی بارش
دیکھنا! شہر کی تصویر بنا لی ہم نے

دیکھ کر جس کو ترے پاؤں ٹھٹھک جاتے تھے
تیرے رستے سے وہ پرچھائیں اُٹھا لی ہم نے

ہم سفر کوئی ہو، ہاں! کوئی مسافر ہو رفیق
پھر بھی دنیا سے الگ راہ نکالی ہم نے

• فلڈ منیجر، جی۔ ٹی سی انڈسٹریز لمیٹڈ، ۱۳۷/۴ فیض آباد روڈ،
لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۷

رتن سنگھ

مانا موتی

۱۔

نرمند رگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے ایک مسافر نے ایک تھکے ہوئے راہ گیر کو اپنی گاڑی پر بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب راہ گیر کی منزل آگئی تو گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے کہا:

"معلوم ہے کہ تم نے کس کے ساتھ اتنی مہربانی کا سلوک کیا ہے؟"

"نہیں" گاڑی والے نے نہ میں سر ہلایا۔

"میں شیطان ہوں، مگر تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"نہیں! آپ کون ہیں؟"

"میں بھگوان ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھائی اور شیطان کے دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

۲۔

دن کے وقت اسکوٹر پر جاتے ہوئے سامنے سے آنے والے اسکوٹر سوار نے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب تھا آپ کے اسکوٹر کی بتی جل رہی ہے۔"

میں نے اپنی بتی بجھا لی۔

اسے میری غلطی تو دکھائی دے گئی تھی۔ مگر اپنی نہیں۔

اس کے اپنے اسکوٹر کی بتی بھی جل رہی تھی۔

۳۔

صبح جب وہ گھر سے باہر نکلا تو اس کا جوان سایہ زندگی کی روشنی بن کر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

شام کو جب وہ تھکا ہارا گھر لوٹا تو اس کا بوڑھا سایہ اس کے پیچھے گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔

۴۔

ڈاکوؤں کے سردار نے لوٹ کا مال بانٹنے کے بعد ایک نوجوان ڈاکو کو چپ چپ دیکھ کر کہا۔ "ایسا لگتا ہے تم خوش نہیں ہو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے سردار۔ اس ڈکیتی میں میں ہی سب سے آگے آگے تھا۔ میں نے ہی گھر کے چار آدمیوں کو مار کر راستہ صاف کیا۔ میں نے ہی اس بوڑھی عورت کے سینے پر چاقو رکھ کر مال کا پتہ لگوایا۔ پھر مجھے ہی اس بوڑھی عورت کی آنکھوں کو دیکھ کر شک ہوا کہ یہ باہر سے کسی مدد کا انتظار کر رہی ہے۔ اس لیے ہم سب عین وقت پر بچ کر نکل آئے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" سردار نے کہا۔

"لیکن اس میں چپ ہونے کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے سرکار کہ اب لوٹ کا مال بانٹتے وقت میرے ساتھ ہی انصاف نہیں ہوا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ تمہیں انصاف ملنا ہی چاہیے۔" اور سردار نے دوسرے ڈاکو کی طرف اشارہ کیا کہ اسے جاؤ اور پورا انصاف دے دو۔"

اس نوجوان ڈاکو کو غار سے باہر لے جا کر انصاف دے دیا گیا۔

اس کی گردن اڑا دی گئی۔

۵۔

ایک قاتل اور مقتول عالم بالا کے چائے خانے میں ملے تو قاتل نے مقتول کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "یار تم سے گلے لگ کر مجھے بڑی شانتی مل رہی ہے۔"

"لیکن دنیا میں تو تم مجھے جان سے مار کر بہت خوش ہوئے تھے۔"

"ہاں خوش ہوا تھا، لیکن اس کے بعد جب تک جیتا رہا من کو پچھتاوا ہی لگا رہا۔ راتوں کو نیند ٹوٹ

● 45-M، پی پی کالونی، گواری گھاٹ روڈ، جبل پور (ایم پی) ۴۸۲۰۰۸

جاتی تھی اور اکثر سارا سارا دن میں پریشان رہا کرتا تھا۔"

"کسی کو مارنے کے بعد کیا آدمی ایسا محسوس کرتا ہے؟"

"ہاں، میرے ساتھ تو ایسے ہی ہوا۔"

اسی دوران مقتول کی منگوائی ہوئی دو کپ چائے آگئی۔ قاتل کپ اٹھا کر گھونٹ بھرنے لگا تو مقتول نے روک دیا۔ "ذرا ٹھہرو۔ یہ چائے گرا دو۔ تمہارے لیے میں دوسری چائے منگواتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ میں نے تمہاری چائے میں زہر ڈلوا دیا تھا۔ اگر تمہیں زہر دے کر اسی طرح کی بے چینی میرے حصے میں آتی ہے تو پھر ایسا کرنے سے فائدہ کیا!"

۶۔

جنگل کے راجہ شیر نے ایک دن دربارِ عام لگایا۔ جب اس کی ساری رعایا ہاتھی، چیتے، لومڑیاں، گیدڑ، ہرن، چیتل، گدھے، گھوڑے، گدھے، خرگوش وغیرہ جمع ہو گئے۔ تو شیر نے گلا صاف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب شخصی حکومت کا دور ختم ہو گیا ہے۔ دنیا ترقی کرتے کرتے جمہوریت کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے بھی اب راجہ بنے رہنے کا کوئی حق نہیں رہ گیا ہے۔

سب جانور اپنے راجہ کی بات بڑے دھیان سے سن رہے تھے اور دل ہی دل میں حیران ہو رہے تھے۔

راجہ آگے کہہ رہا تھا۔ "اب ہم بھی اپنے جنگل میں جمہوریت کا دور شروع کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ کوئی بھی اپنے آپ کو چھوٹا بڑا محسوس نہ کرے، اس لیے میں بھی اپنے تخت کو چھوڑ کر آپ لوگوں میں شامل ہو رہا ہوں۔ پھر ہم سب مل کر اپنا راجہ چنیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے شیر اپنی اونچی چٹان سے اٹھا اور سب جانوروں کے بیچ آکر بیٹھ گیا۔

چناؤ میں دو لوگ کھڑے ہوئے۔ شیر اور گدھا۔

دوسری طرف سے چناؤ پرچار شروع ہوا، لیکن کمزور جانوروں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی، اس لیے گدھے کا پلہ کافی بھاری لگتا تھا۔

شیر نے جب اپنے ہاتھ سے راج پاٹ جاتے دیکھا تو اس نے اپنی برادری کے لوگوں چیتوں اور لکڑبھگوں کے خون کو گرمایا اور کہا کہ اگر راج پاٹ ہماری برادری سے نکل کر گدھوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ ہم سب کے لیے ڈوب مرنے والی بات ہوگی۔

بس پھر کیا تھا۔ چیتوں اور لکڑبھگوں نے کسی کو چیرا، کسی کو پھاڑا، کسی کو دھمکایا اور اس طرح چناؤ سے پہلے کمزور جانوروں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔

اور اس طرح شیر چناؤ جیت کر پھر اسی اونچی چٹان پر بیٹھ گیا۔ جس پر وہ پہلے بیٹھا کرتا تھا۔

فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وہ جنگل کا راجہ کہلاتا تھا، اب جمہوریت کی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے وہ خود صدرِ مملکت کہلانا پسند کرتا ہے۔

۷۔

کتابوں کی الماری کھول کر دیکھی تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کتنے ہی کتابوں کے کیڑے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دکھائی دئے۔

اب جس کتاب کو بھی ہاتھ لگایا، پتہ چلا کہ کیڑوں نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ کئی کتابوں کی تو یہ حالت تھی کہ چھید اوپر سے شروع ہو کر جلد کے آخر تک چلے گئے تھے۔ کتابوں میں الفاظ کم اور چھید زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔

ادب، تاریخ، فلسفہ، دھرم — کتابوں میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

تبھی کتابوں کو الٹتے پلٹتے ایک کتاب پر نظر پڑی۔ بالکل نئی لگ رہی تھی۔ میں نے جھٹ سے اسے اٹھایا۔ دونوں طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھا لگتا تھا کیڑوں نے اس کتاب کو چھوا تک نہیں۔

پھر اسے کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا کتنے ہی کیڑے کتاب کے اندر مرے پڑے تھے۔

یہ بات کیا ہے۔ باقی کتابوں کو تو کیڑے کھا گئے۔ مگر اس کتاب نے کیڑوں کو کھا لیا۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

تبھی کتاب کے سرورق پر نظر پڑی۔

کتاب ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں تھی۔

۸۔

دریا کے تٹ پر اُگے ہوئے ایک پیڑ سے ایک پانی کی لہر نے طنزیہ پوچھا۔

"پیڑ، پیڑ، تمہاری عمر کتنی ہے؟"

پیڑ نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔

سوال پوچھنے والی لہر خود بہت دور چلی گئی تھی۔ اتنی دور کہ پیڑ کو اس کا وجود کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

۹۔

بنارس کے ایک ٹھگ نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک ایسے مسافر کا پیچھا کیا جو ایک لاکھ روپیہ نقد لے کر چل رہا تھا۔ بنارس تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے سارے حربے آزما کر دیکھ لیے کہ مسافر نے پیسہ کہاں چھپا کر رکھا ہے، لیکن ناکامی رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کلکتہ سے گاڑی چلنے سے پہلے ہی لکھ پتی مسافر کا دوسرے مسافر سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ راستے بھر جلتا رہا۔

بنارس پہنچ کر ٹھگ نے لکھ پتی آسامی کو دوسرے ٹھگ کے ہاتھ پانچ ہزار روپے میں بیچ دیا۔ جب ٹھگ اپنے پیسے وصول کر چکا تو لکھ پتی مسافر نے پہلے ٹھگ سے کہا۔ "دیکھو، دھندے میں تم بھی ہو اور میں بھی، اس لیے اپنی کمائی میں سے میرا حصہ دے دو نہیں تو پولیس کو خبر کر دوں گا۔"

ٹھگ کو اسے ایک ہزار روپے دینے پڑے۔

اس طرح وہ مسافر امرتسر پہنچتے پہنچتے چار اور ٹھگوں کے ہاتھوں بکا اور ہر ایک سے اُس نے اپنا کمیشن وصول کر لیا۔ امرتسر پہنچ کر وہ ٹکٹ چیکر جب پلیٹ فارم پر کھڑا کسی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا تو آخری ٹھگ اُس کے پاس آیا۔

"سیٹھ میرا بیس ہزار کا نقصان تو ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ پیسہ کہاں رکھا تھا؟"

"ہاں ہاں — دھندے میں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہیے۔"

اُس آخری ٹھگ سے ایک ہزار روپیہ وصول کرنے کے بعد سیٹھ نے بتایا کہ روپیہ میرے پاس نہیں بلکہ میرے منیم کے پاس تھا۔

"منیم۔ کون منیم؟ میں نے تو کسی کو آپ کے ساتھ دیکھا نہیں۔"

"ارے بھائی، وہی میرے سامنے والا مسافر۔ جس کے ساتھ میں سارا راستہ لڑتا آیا ہوں۔"

"اچھا — میں چلا۔" ٹھگ نے کہا۔

"نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیا ہے۔ وہ دیکھو، میرا دوسرا منیم بھی تو اشارہ کر رہا ہے۔"

۱۰-

طوفان میں گھِر جانے پر ایک راجہ اور ایک لکڑہارا پناہ لینے کے لیے تقریباً ایک ساتھ ایک سنیاسی کی کُٹیا میں پہنچے۔

سنیاسی نے خود اُٹھ کر لکڑہارے کے پاؤں دھوئے اور آسن بچھا کر آدر سے بٹھایا۔ راجہ کو اُس نے زمین پر بٹھایا۔

بھوجن کا وقت ہوا تو لکڑہارے کو سنیاسی نے تھالی میں پروس کر کھیر کھانے کو دی اور راجہ کو دو دن کی باسی روٹی پتّل پر رکھ کر کھلائی۔

طوفان کے تھمنے پر جب وہ دونوں جانے کے لیے اُٹھے تو سنیاسی نے لکڑہارے کو بڑی عزّت سے وداع کیا اور راجہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

اگلے دن راجہ نے اپنے ہرکارے بھیج کر سنیاسی کو دربار میں بلایا۔ خود تخت پر بیٹھا اور سنیاسی کو ننگے فرش پر بٹھا کر پوچھا کہ اُس نے راجہ کے مقابلے میں لکڑہارے سے اچھا برتاؤ کیوں کیا تھا؟

سنیاسی بولا۔ "مہاراج، دوسرے کو وہی دیا جاتا ہے جو اُس کے پاس نہ ہو۔ آپ کے پاس نہ عزّت کی کمی ہے نہ آرام کی اور نہ اچھے بھوجن کی۔ اس لیے میں نے یہ سبھی چیزیں لکڑہارے کو دیں جو اُسے عام زندگی میں نصیب نہیں ہیں۔ اور پھر میں نے آپ کو زمین پر بٹھا کر باسی روٹی اس لیے کھلائی تاکہ آپ کو یہ پتہ چل سکے کہ آپ کے راج میں غریب کیا کھاتے ہیں۔ اور اُن کی تکلیفیں کیا ہیں؟"

وہ راجہ اُس کے بعد جب تک راج کرتا رہا، وہ باسی روٹی کھا کر زمین پر لیٹتا تھا اور اپنا سارا دھن غریبوں کی زندگی سنوارنے کے لیے خرچ کرتا تھا۔

۱۱-

آدی باسی عورت کھلے میں نہاتے ہوئے اپنے آپ کو ننگا ہونے سے بچا نہیں پا رہی تھی۔ جس ساڑی کو پہنے ہوئے وہ نہا رہی تھی وہی اُسے نہانے کے بعد پہننی بھی تھی۔ اس لیے اُس کے جسم کا کبھی کوئی انگ ننگا ہو جاتا اور کبھی کوئی۔

برآمدے میں بیٹھے ہوئے یہ سب دیکھتے ہوئے مجھے بیوی نے ٹوکا۔

"ننگا نہانا آدی باسی عورت کی تو مجبوری ہے، مگر آپ؟ ....."

اور مجھے لگا جیسے میری بیوی نے شرافت کے کچّے دھاگوں سے بنے ہوئے میرے لباس کو تار تار کر کے سرِ عام ننگا کر دیا ہو۔

۱۲-

ایک جواری پہلے دھن دولت ہارا۔ پھر مکان، پھر اپنی بیوی اور بچّے بھی ہار گیا۔ اُسے بالکل خالی ہاتھ دیکھ کر جیتنے والے جواری نے کہا۔ "اب جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں، میں اور کھیلوں گا۔"

"تمہارے پاس اب داؤ پر لگانے کے لیے بچا ہی کیا ہے؟" جیتنے والے جواری نے پوچھا

"میں اب اپنا آپ داؤ پر لگاؤں گا۔"

"تمہاری قیمت تو دھن، دولت، مکان اور بیوی بچّوں کے ساتھ تھی۔ اُن کے نہ رہنے پر تم تو دو کوڑی کے بھی نہیں ہو۔"

۱۳-

دیوداسی پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر بھگوان کرشن کو رجھانے کے لیے ناچ رہی تھی اور مندر کے مہنت دلیر داس کا من بے قابو ہو کر دیوداسی پر ریجھ اُٹھا تھا۔

دیوداسی کے فن کی تمام خوبیاں، اُس کے جسم کے اُتار چڑھاؤ اور انگوں کی تھرکن میں ڈھل کر اُس کے گھنگھروؤں کی جھنکار بن کر فضا میں بکھر رہی تھیں۔

ادھر مہنت کے من میں خواہشات کی آندھیاں اُٹھ رہی تھیں۔

اُس کی سانس اس طرح تیز چل رہی تھی جیسے کالا ناگ پھنکاریں مار رہا ہو۔

دیوداسی نے ناچتے ناچتے کرشن بن کر گیند جمنا میں پھینکی اور پھر نپے تلے قدم اُٹھاتی چھم چھم کرتی گیند نکالنے کے لیے جمنا میں اُتر گئی۔

دیوداسی نے ایک ادا کے ساتھ دونوں بازو اوپر اُٹھائے اور سر کے اوپر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر شیش ناگ کا پھن بنایا۔ جھوم جھوم کر ناچتے ہوئے اُس نے ایک چکر کاٹا اور پھر ڈنک مارنے کے انداز میں اُس کے بازو بجلی کی طرح گرے تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔

پتہ نہیں مہنت دلیر داس کو سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہوا۔ وہ ایک طرف لڑھکا اور ساتھ ہی اُس کے پران پنکھیرو اُڑ گئے۔

سنگیت بھاؤ میں ڈوبی ہوئی دیوداسی کو کچھ

خبر نہیں تھی کہ کیا ہو گیا۔

وہ اب بھی ناچے جا رہی تھی۔ ناچے جا رہی تھی۔ اس کے گھنگھروؤں کی تال اور تیز ہو گئی تھی۔

۱۴۔

ایک آتنک وادی کے من میں آئی کہ اگر وہ مہاتما بدھ کا قتل کر دے تو اُسے دنیا کا سب سے خطرناک آتنک وادی مان لیا جائے گا۔

اس مقصد سے ہاتھوں میں خنجر لیے وہ گیا اور اپنی طرف سے اُس نے مہاتما بدھ کے سینے میں خنجر اُتار دیا۔

اُسی لمحے وہ لہو لہان ہو کر گر پڑا
خنجر اُس کے اپنے سینے میں اُتر گیا تھا۔

۱۵۔

ایک زمانہ تھا جب میرے جسم کے اندر ایک ہرا بھرا لہلہاتا ہوا جنگل اُگا ہوا تھا۔ اُس جنگل میں خواہشات اور تمناؤں کی بیلیں پیڑوں کے اُوپر وہاں تک چلی گئی تھیں، جہاں آشاؤں کی ٹہنیوں پر خوشیوں کے رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ اُن پھولوں کی خوشبو کو اپنے دوش پر اُٹھا کر اٹھکیلیاں کرتی، سرسراتی ہوا جب چلتی تھی تو میرا سارا وجود اس کے نشے میں چور مست ہو کر جھوم اُٹھتا تھا اور پھر جنگل کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے مسکراہٹوں کے پنچھی جب اپنی اپنی بولی میں چہکنے لگتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔

ایسے میں میری زندگی کسی پہاڑی جھرنے کا سنگیت اپنے ندی سے وجود میں سموئے عمر کے پاٹ پر بل کھاتی ہوئی چل نکلتی تھی۔ تو دھرتی مجھے یوں اپنی گود میں بھر لیتی تھی جیسے ماں ہمکتے ہنستے بچّے کو اپنی بانہوں میں سمیٹے رہتی ہے۔

دھرتی پر چلتے چلتے سینکڑوں ہزاروں ندیاں بچھڑی ہوئی منہ بولی سہیلیوں کی طرح آ کر میرے گلے ملتی تھیں تو میرا وجود خوشیوں کو سمیٹے سمیٹے دوہرا ہو جاتا تھا

ہو جاتا تھا۔

اس طرح اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے جب میں ندی سے سمندر بن جاتا تھا تو میرے وجود میں خوشیوں کے مد و جزر اُٹھنے لگتے تھے۔

لیکن یہ سب تو گزرے وقتوں کی باتیں ہیں۔

پتہ نہیں کس نے تہذیب اور سبھیتا کے نام پر کیا ٹونا کر دیا کہ میرے وجود میں اُگا ہوا ہرا بھرا جنگل آہستہ آہستہ جڑوں سے اُکھڑ گیا۔ اور اس جنگل کے کتنی ہی تمناؤں کی بیلیں سوکھ گئیں۔ خوشیوں کے پھول مرجھا گئے۔ اور رنگ برنگی مسکراہٹوں کے پنچھی ایسے اُڑے، ایسے اُڑے کہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے۔

۱۶۔

بھگوان دیوتاؤں سے مشورہ کر رہے تھے۔ "ہم تو انسان کو صرف پیار کی بھاشا سکھا کر دنیا میں بھیجتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر اُتارو ہو جاتے ہیں؟"

"وہ اس لیے بھگوان!" ایک دیوتا نے کہا "انسان نے اپنے اپنے علاقے میں اپنی اپنی نئی بھاشائیں ایجاد کر لی ہیں۔"

"لیکن ایک بھاشا کے بولنے والے بھی تو آپس میں لڑتے ہیں۔ اس کا کیا کارن ہو سکتا ہے؟"

"وہ اس لیے بھگوان کہ دنیا کی تمام بھاشاؤں کے شبد جھوٹے ہیں۔ وہ سچ تک نہیں پہنچ پاتے۔"

"لیکن شبد جھوٹے کیوں ہیں؟" بھگوان نے پوچھا۔

"وہ اس لیے بھگوان کہ ہر انسان اپنے فائدے کے لیے لفظوں کو اپنے اپنے معنی پہنانے میں لگا رہتا ہے۔"

۱۷۔

یہ سب سپنے میں ہوا۔

اپنے گھر کے پیچھے باغیچے میں کھڑے کھڑے میں نے دیکھا کہ سامنے اونچان پر جو پودے لگے ہیں وہ سوکھ رہے ہیں۔

پودوں کو پانی دینے میں اپنے تالاب سے ایک لوٹے میں پانی بھر کر چلا تو اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کی وجہ سے زمین پر پھسلن ہو گئی تھی۔ میرے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ پانی کا لوٹا بھی ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا۔

باغیچے کے کافی لمبے راستے کے بعد اونچان پر چڑھنے لگا تو وہاں پھسلن اور بھی زیادہ تھی۔

بڑی مشکل سے جب میں اوپر پودوں کے پاس پہنچا تب جا کر احساس ہوا کہ میں بھی کتنا مورکھ ہوں۔ جب بارش ہو رہی ہے تو پھر پودوں کو پانی دینے کی کیا ضرورت ہے۔

اس احساس کے ساتھ ہی نیند کھل گئی۔

جب بھی اس سپنے کی یاد آتی ہے، دل میں ایک پل کے لیے شرمندگی کا احساس جاگتا ہے۔ لیکن اُس کے فوراً بعد میں بڑی حسرت سے سپنے میں دیکھے ہوئے اُس بڑے سے مکان کو ڈھونڈتا رہ جاتا ہوں جس کے پیچھے بڑا سا باغیچہ ہے۔ ساتھ ایک تالاب ہے۔

تصور ہی تصور میں ہاتھ میں پانی کا لوٹا پکڑے بارش میں بھیگتے ہوئے سوکھے پودوں کو پانی دینے کے لیے جاتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ملتی ہے۔

۱۸۔

ایک بار دھوپ نے پیڑ سے آ کر کہا "گرمی اتنی ہے کہ میں خود گھبرا گئی ہوں۔ اگر اجازت ہو تو جہاں اور مسافر تمہارے سائے کے نیچے سکھ کی سانس لے رہے ہیں۔ وہاں میں بھی دو پل بیٹھ کر آرام کر لوں؟"

پیڑ نے کہا "تم ایسا کرو کہ میرے پتّوں اور ٹہنیوں کے اوپر بیٹھ کر آرام کر لو۔ اس طرح تمہیں بھی راحت مل جائے گی اور میرے نیچے بیٹھے مسافروں کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔

۱۹۔

ایک دن پنچھیوں کی ایک سبھا میں اُلو نے یہ سجھاؤ دیا کہ پنچھیوں کو بھی چاہیے کہ تھوڑے بہت دانے دُنکے کا بھنڈار بنا کر رکھیں تاکہ خراب موسم میں انہیں بھی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

طوطا جو پنچھیوں میں سب سے سیانا سمجھا جاتا ہے، اُلو کی بات سن کر بولا۔ "بھائی یہ ایسی مورکھتا کبھی نہ کرنا۔"

"اس میں مورکھتا کی کیا بات ہے۔" اُلو نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ آدمی نے جب سے اناج، کپڑے، ایندھن، روپے پیسے کا بھنڈار کرنا شروع کیا ہے تب سے یہ سبھی ضرورت کی چیزیں کچھ لوگوں کے پاس تو اتنی جمع ہو گئی ہیں کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا کریں؟ اور دوسری طرف باقی لوگ بھکمری، مفلسی اور بیماری کی وجہ سے آئے دن موت کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی اُلو نے اُلو ہوتے ہوئے بھی اپنی تجویز فوراً واپس لے لی۔

۲۰۔

"بھگوان، آپ نے یہ سرشٹی کی رچنا کیسے کی؟" دیوتاؤں نے بھگوان سے پوچھا۔

"ہوا یہ کہ میں جس طرح سوچتا تھا، وہی میرے اندر خود بخود بنتا چلا گیا۔ اور اس طرح ساری سرشٹی کی رچنا ہو گئی۔"

بھگوان ایک پل کے لیے رُکے اور پھر بولے۔ "اور چونکہ میرا ہی نور سب انسانوں میں موجود ہے، اس لیے وہ جیسا سوچتے ہیں ویسی ہی ان کی شخصیت بن جاتی ہے۔"

۲۱۔

ایک سنیاسی ایک لمبی عمر تک برف کی شلا پر بیٹھ کر اپنی طرف سے گھور تپسیا کرتا رہا۔ مگر بھگوان کے درشن نہ ہونے تھے نہ ہوئے۔

آخر اُنہوں نے اپنے گورو کو یاد کیا اور ان کے پرگٹ ہونے پر اُنہوں نے پوچھا "گورو دیو، میری بھگتی میں کیا تروٹی ہے، جو مجھے بھگوان نے درشن نہیں دیے۔"

گورو مسکرائے اور بولے۔ "برف تو خود تمہارے جسم کی گرمی سے پگھلی جا رہی ہے۔ اس پہ بیٹھ کر تپسیا کیسے ہو سکتی ہے۔ تپسیا تو وہ ہوتی ہے جو زندگی کی آنچ میں جل کر کی جائے۔"

تپسوی اُسی وقت سنیاس آشرم چھوڑ کر گرہست آشرم میں داخل ہونے کے لیے اُٹھ کر چل دیا۔

۲۲۔

انجان سمتوں کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک راہی نے پگڈنڈی سے پوچھا:

"مجھ سے آگے جانے والے راہی کہاں تک پہنچ گئے ہیں؟"

پگڈنڈی بولی: "وہ میرے وجود میں سما کر خود پگڈنڈی بن چکے ہیں تاکہ تم اس پر چلتے ہوئے اور آگے جا سکو۔"

۲۳۔

زندگی اُس نئی نویلی دُلہن کی طرح ہے۔ جو اپنے چہرے کو باریک رنگین گھونگھٹ کے پیچھے کچھ اس طرح چھپائے رہتی ہے کہ آدمی اس کے حُسن کی پوری جھلک دیکھتے ہوئے بھی یہی محسوس کرتا رہتا ہے جیسے وہ کچھ نہیں دیکھ پایا۔

زندگی کے حُسن کی پوری جھلک دیکھنے کے لیے وہ جتنے جتن کرتا ہے، اُتنی ہی اُس کی پیاس بڑھتی رہتی ہے۔

بقیہ: ملاحظات

صنعتی گندگی پھر سے قابلِ استعمال توانائی تیار کرنے کے سلسلے میں بہت اہم ذریعہ ہے۔ ڈسٹلری کے بے کار مادوں سے توانائی تیار کرنے والے ۱۴ پراجیکٹ ۲۰۰۱ تک لگانے کی تجویز ہے۔ شہروں سے جو ٹھوس گندگی نکلتی ہے اس میں طبعی اور غیر طبعی بہت سا مادہ ہوتا ہے۔ جسے توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مُلک کے بڑے شہروں اور قصبوں میں ایسے ۴۰ پراجیکٹ شروع کرنے کی تجویز ہے جو ۱۶۰ میگا واٹ توانائی ان ٹھوس مادوں میں سے تیار کریں گے۔

پھر سے استعمال ہونے والی توانائی کی ترقی کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو دیہی اور شہری علاقوں میں غیر روایتی توانائی کے بہت سے نظاموں اور پراجیکٹوں کے لیے کم شرح سُود پر قرض مہیا کرے گا۔

بینکوں اور دیگر سرمایہ کار اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ کم شرح سُود کے قرضوں کے ذریعے صنعتوں اور نجی افراد کی مالی امداد کریں۔ تاکہ وہ توانائی کی بچت اور تیاری کے لیے غیر روایتی توانائی کے نظاموں اور آلات کو استعمال کریں یا انہیں تیار کریں۔

(مہیشور دیال)

انور خان

چند لمحے نشاط کے

جمی نے خلافِ معمول خاموشی سے ناشتہ کیا۔ ٹی وی اُس کے بجائے مہرو نے کھولا۔ چھوٹی بچی شیریں نے اسکول جانے سے قبل ناشتے کی میز پر کئی بار اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ دودھ کا گلاس سامنے دیکھ کر حسبِ معمول وہ ٹھنکی بھی، مگر جمی کو غراتے دیکھ کر جلدی جلدی دودھ سُڑک کر اسکول کو چل دی۔ ناشتہ کر کے جمی نے خاموشی سے کپڑے تبدیل کیے اور بریف کیس اُٹھا کر باہر آگیا۔

لفٹ نیچے جارہی تھی۔ اُسے دیکھ کر لفٹ مین نے روکی اور دروازہ کھول کر سلام جھاڑ دیا۔ جمی نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لفٹ مین سمجھ گیا کہ آج صاب کا موڈ خراب ہے۔ کمال ہے اُس نے سوچا کل ہی تو صاب دہرہ دون سے آیا ہے اور آج اتنا خراب موڈ!

مہرو کو جمی کی ناراضگی کی وجہ معلوم تھی۔ مگر اُس نے سوچا آخر میں بھی کیا کروں۔ میں کوئی سیکس آبجیکٹ تو ہوں نہیں۔ جمی اُسے بے حد پسند تھا۔ اُس میں مردانہ وجاہت بھی تھی اور ذہانت بھی۔ ایک طرف وہ کوہ پیمائی اور گلائڈنگ کا شوقین تھا تو دوسری طرف بزنس مینجمنٹ اور اکنامک تھیوری پر بھی وہ بے تکان گفتگو کرسکتا تھا۔ خوش مزاج، خوش خوراک۔ بس سیکس اُس کی کمزوری تھی۔ مہرو جانتی تھی کہ کالج کے دنوں سے ہی اُس کی دوستی کسی نہ کسی لڑکی سے ہمیشہ رہی۔ اور اس معاملے میں وہ قناعت کا قائل نہ تھا۔

مہرو کو اس کے شوق پر اعتراض نہ تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بستر پر جمی ایک پیگان (Pagan) جبلتوں سے مغلوب Primitive آدمی تھا اور یہ بات مہرو کو بہت اکھرتی تھی۔ آخر وہ ایک پڑھی لکھی مہذب عورت تھی۔ اس نے سوشیالوجی سے ایم اے کیا تھا۔ اُس کی اپنی ایک شخصیت تھی۔ ہنی مون کے دنوں میں اُس نے جمی کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا تھا۔ مگر جمی کی خواہشات! اُن کا کوئی انت نہ تھا۔ اُس کی لائبریری میں کام سوتر، پرفیومڈ گارڈن سے لے کر کوک شاستر اور کنسے رپورٹ تک ہر طرح کی کتابیں بھری پڑی تھیں۔ قریبی دوست مذاق سے اُسے بن مانس کہتے تھے۔ مہرو کے لیے جمی کی زندگی کا یہ پہلو بالکل غیر متوقع تھا۔ کیوں کہ عورتوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ اس قدر خلیق اور شائستہ تھا۔ اُس کی پرانی گرل فرینڈس تک اُس کی تعریف کرتی تھیں۔

آفس میں صبح ہی صبح جمی کی تکرار ہوگئی۔ کام شروع کیے اُسے نصف گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مس بہروز کیبن میں تشریف لائیں۔ وہ کمپنی کی ویلفیئر آفیسر تھیں اور انہیں شکایت تھی کہ دو سال سے وہ جدید طرز کے ٹیلی فون سسٹم کی تجویز پیش کر رہی ہیں۔ مگر جمی اُس پر ایسے ریمارکس لکھ دیتا ہے کہ وہ رد ہو جاتی ہے۔ ورنہ کسی اور کی بھلا کیا ہمت کہ اُن کی تجویز رد کر دے۔ مس بہروز کے آبا و اجداد شہر کے عمائدین میں تھے۔ کوئی شریف، کوئی میئر، کوئی کرکٹ ایسوسی ایشن کا صدر، کوئی چیمبر آف کامرس کا چیرمین۔ اسی لیے اگرچہ انہوں نے گریجویشن پاس کلاس میں کیا تھا، مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ پھر جمی کا تو کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہ تھا۔ اُس کا شمار اُن کے نزدیک بس Riffraff میں تھا اور یہ بات جمی کو بے حد ناگوار گزرتی تھی۔ ویسے تو مشہور یہ بھی تھا کہ کالج کے دنوں میں مس بہروز جمی میں بہت انٹرسٹڈ تھیں۔ مگر جمی کے پاس فرصت کہاں؟ خود جمی کلب میں ایک لطیفہ سنایا کرتا تھا کہ ایک شام ایلفنسٹن کالج کی کینٹین میں بہروز سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ اُس نے جمی سے کہا۔ "جمی! تم کبھی ہمارے گھر نہیں آتے" جمی نے اُس سے کہا کہ تم نے کبھی بلایا نہیں ورنہ میں تو ایک ٹانگ

۴۸/۲۴۔ شیخ بُرہان قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

راضی ہوں۔ کہو تو ابھی چلوں۔ بہروز نے کہا۔
ٹھیک ہے ابھی چلتے ہیں۔ جمی بہروز کے ساتھ
اس کے گھر پہنچا۔ بہروز نے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں
بٹھا دیا۔ جمی نے نظریں دوڑائیں۔ سامنے بہروز
کے دادا کی قدِ آدم تصویر دیوار میں فریم کی ہوئی لگی تھی۔
وہ شہر کے میئر رہ چکے تھے، دائیں طرف ماموں کی
تصویر جو شریف رہ چکے تھے۔ بائیں طرف اُس کی خالہ سارا بیگم
کی تصویر تھی جنہیں وائسرائے نے ڈنر پر مدعو کیا تھا۔
اور اُن سے ڈنر کے دوران کہا تھا کہ سارا بیگم اس وقت
شہر میں سب سے خوب صورت عورت آپ کے سوا
کوئی دوسری عورت نہیں ہو سکتی۔ بہروز نے جمی کو
یہ ساری باتیں بتائیں۔ وہ جمی کو پوری طرح متاثر کرنا
چاہتی تھیں، مگر جمی کی ساری دل چسپی تو بہروز پر
مرکوز تھی۔ وہ اُسے چھیڑتا، بھینچتا، چومتا رہا۔
بہروز نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ بے حد خوش تھی مگر
جمی کی جیسی کہ عادت تھی، دراز دستیاں بڑھتی چلی گئیں۔
بہروز نے تو کوئی مدافعت نہ کی مگر اچانک جمی کی نظر
سامنے پڑی تو میئر کرخت نظروں سے گھورتا نظر آیا۔
گھبرا کر دائیں طرف کو نظریں گھمائیں تو شریف نے آنکھیں
دکھائیں، وہاں سے نظریں ہٹائیں تو بائیں طرف
بہروز کی خالہ اُسے تنبیہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
جمی کے جذبات سرد پڑ گئے اور وہ گھبرا کر باہر چلا آیا۔
یہ لطیفہ جمی نے سینکڑوں بار سنایا تھا مگر
لوگ اُسے محض گپ یا جمی کی شرارت سمجھتے۔
ویسے تو جمی بہروز کو دیکھتے ہی ہوشیار
ہو گیا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے مگر پھر بھی اُس
نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لیے
کہا۔ اور انجان بن کر ایک فائل پر کچھ لکھنے لگا۔ مس
بہروز کو بُرا تو بہت لگا مگر وہ طے کر کے آئی
تھی کہ آج وہ فیصلہ کُن گفتگو کر کے رہے گی۔ اُس نے
تھوڑی دیر انتظار کیا مگر جب وہ بدستور اپنے
کام میں مشغول رہا تو اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے
انتہائی سپاٹ دفتری لہجے میں کہا۔

"Mr. Jamshed,
I have come with an
importent work to you"

آج کا نیا دور

"Really?" جمی نے بھی اسی بے تعلقانہ لہجے
میں گفتگو کی اور قلم رکھ کر اسے شرارتی نظروں سے
گھورنے لگا۔ "لولو سوں کام چھے؟ (لولو کیا کام
ہے؟)

" I have come regarding
my proposal for
new telephones."

"اوہ ساری" جمی نے اطمینان کا سانس
لیا۔

"I am doubtful if we
can spend on this
luxury during
the current year"

جمی ٹیبل پر اُنگلیاں بجاتا ہوا بولا:
"dividend مین شیر ہولڈرس نا مڑے کہ نہ مڑے
کیوائی نہ سکائے (منافع بھی شیئر ہولڈروں کو ملے گا
یا نہیں، کہا نہیں جا سکتا)۔ آ شیئر ہولڈرس نا کون نیں
کرے (ان شیئر ہولڈروں کا سامنا کون کرے گا)
اب تو بہروز کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے کہا۔

"Now Jimmy, why can't
a strong proud man like
you give a straight
forward answer?"

"سوں، مطلب؟" جمی نے کہا:

"What do you want to say"
"You could have simply told
me that you are against this
proposal because I have
proposed it."

be reasonable بہروز Now
آ آفس چھے (یہ آفس ہے)"
بہروز کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہو گیا۔
اُس نے وہ صلواتیں سُنائیں کہ جمی گھبرا کر کیبن کے باہر
نکل آیا۔
لنچ کے بعد کام میں اُس کا من نہیں لگا۔ کام تو
بہت تھا۔ مگر آج صبح سے بلکہ رات سے ہر بات اُس
کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے
گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور سیدھے کلب پہنچا۔
وہاں فلش جمی ہوئی تھی۔ یہ بھی بیٹھ گیا۔ چار بجے
اُس کا دوست شیخ آیا۔ شیخ بیڈمنٹن کا اچھا
کھلاڑی تھا اور اُس سے جمی کی خوب بنتی تھی۔ کالج
کے دنوں سے وہ ایک دوسرے کے یارِ غار تھے۔ جمی
اُسے لے کر کلب کے کیفے ٹیریا میں پہنچا اور بیئر کی
بوتل منگوائی۔ جَو کا پانی معدے میں اُترا۔ کچھ اعصاب
کا تناؤ کم ہوا تو اُسے اچھا لگا۔ تھوڑی دیر وہ اِدھر
اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر اُس نے مہرو کی بات
نکالی۔
شیخ مہرو سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے
جمی سے کہا "یار، صاف بات تو یہ ہے کہ تیرا انٹرسٹ
سیکس میں کچھ زیادہ ہی ہے۔"
جمی مسکرا دیا۔
" یہ تو ہے یار، بٹ یو ڈونٹ فالو می، سالا
سب فائن ہوتے ہوتے کیا ہوتا ہے وہ ایک دم کولڈ
پڑ جاتی ہے۔"
"میرے کو یقین نہیں آتا۔" شیخ نے کہا۔ "میرے
خیال میں تو وہ بالکل نارمل ہے۔"

"You are sure she is not
frigid? really?"

"بالکل۔" شیخ نے کہا۔ "یار، تُو ایک بات سمجھتا
نہیں۔ ماں بننے کے بعد عورت کا سیکس میں انٹرسٹ
ہے نا ایک دَم کم ہو جاتا ہے اور تُو تو سالا ابل ہے۔ وہ
بھی جنگلی۔"
جمی ہنس پڑا۔
بٹ یار سچ بولتا ہوں۔ میرا تو مستک (دماغ)
ایک دَم آؤٹ ہو جاتا ہے۔ ابھی تو تیج لبل پورا تین
ویک کے بعد میں اُس کے پاس گیا تھا کل۔"
"یار پھر تیرا اپروچ کچھ گڑبڑ ہو گا۔ تُو ایسا
کر ڈائرکٹ مہرو سے بات کر۔" شیخ نے کہا۔
"یہ پرابلم تم دونوں کو آپس میں ہی سالو کرنا
پڑے گا۔"
شیخ کی بات سے جمی کو تسلی تو نہیں ہوئی
مگر اُس کا من کافی ہلکا ہو گیا۔
گھر پہنچا تو غصّہ ہلکا ہو چکا تھا۔ مہرو غسل

تی رہی تھی۔ یہ بگل سالی نئی بیماری ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ ریں ریں اُسے ذرا پسند نہ تھی۔

"اے سنگر کون چھے؟" (یہ گائک کون ہے؟) اس نے مہرو سے پوچھا۔ "ائیلو فلیٹ آواج۔ آ ریکارڈ کمپنی کو نے پن ریکارڈ کری لیچ (اس قدر سپاٹ آواز۔ یہ ریکارڈ کمپنیاں کسی کو بھی ریکارڈ کر لیتی ہیں)۔

"اے تو بیناز چھے۔ آپ نی بیناز (یہ تو بیناز ہے، اپنی بیناز) مہرو نے اتنی ہی میٹھی آواز میں کہا۔

"اے بیناز چھے؟ (یہ بیناز ہے؟) جمی گھبرا گیا۔ اُسے نہ غزل سے دلچسپی تھی نہ بیناز سے۔ مگر اب تو بات کچھ اور ہی تھی۔

"مُنے تو اے ریکارڈنگ بروبر نتھی لاگے۔ اے کیسیٹ اوریجنل چھے؟" (مجھے تو یہ ریکارڈنگ برابر نہیں لگتی۔ یہ کیسیٹ اوریجنل ہے؟")

"ایک دم اوریجنل!" مہرو نے جواب دیا۔

کھانے کے دوران جمی نے بچی کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کیا۔ لطیفے سُنائے۔ مہرو اس دوران گھر کے کام کاج میں اُلجھی رہی۔ اس نے جمی کے اگلے روز کے کپڑے نکالے۔ انہیں استری کر کے رکھا۔ جوتوں میں سے میلے موزے نکال کر دھونے کے لیے ڈالے اور الماری سے دھلا ہوا جوڑا نکال کر جمی کے جوتوں پر رکھا۔ بچی کا بستہ چیک کیا کہ اگلے روز کی کتابیں اور کاپیاں ٹائم ٹیبل کے مطابق رکھی گئی ہیں یا نہیں۔ بیناز کا کیسیٹ برابر بج رہا تھا۔ جمی نے کئی بار سوچا کہ اُسے بدل دے مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ مہرو کا موڈ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مہرو نے بچی کا ہوم ورک پورا کروایا اور اُسے سُلانے کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔ بچی کی آنکھیں تو ہوم ورک کرتے کرتے ہی نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں، وہ فوراً سو گئی۔ اس نے عورتوں کا میگزین اُٹھایا اور اوراق اُلٹنے پلٹنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ جمی اسی انتظار میں ہوگا کہ بچی سو جائے تو وہ آئے، لیکن وہ پتہ نہیں کس کتاب میں اُلجھا تھا۔ اُسے تعجب ہوا۔ شاید ابھی جمی کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ اس نے سوچا یہ تو اور بُرا ہوا۔ جمی سے بھلا کب صبر ہوتا ہے۔ وہ غصے میں کروٹیں بدلے گا اور آدھی رات کو جب وہ نیند سے تقریباً مدہوش ہوگی کہ اُسے ٹٹولنا شروع کر دے گا۔ نیند میں اُسے جمی کے ہاتھوں کا لمس بہت بُرا لگتا تھا۔ ویسے ہی وہ بہت گہری نیند سوتی تھی اور ایک بار نیند آجائے تو پھر اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

"آج سووا نو نتھی (سوؤ گے نہیں؟)" اس نے پوچھا

جمی نے کتاب تپائی پر پھینکی اور آگے جھکتا ہوا بولا۔ "تارا تھی ایک وات کروانی ہتی" (تم سے ایک بات کہنی تھی)۔

مہرو نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"Are you not satisfied with me?"

جمی نے کہا۔

"اے میں کیارے کیدوں تنے (یہ میں نے تم سے کب کہا) مہرو نے جھنجھلائے لہجے میں کہا۔

"ایج تو پرابلم چھے" تو کیارے بولتی نتھی۔ پن تارو، بیہیویر مارے ساتھے ائیلو ٹھنڈو چھے کہ منے تو ایج لاگے۔"

(یہی تو پرابلم ہے۔ تم کبھی کہتی نہیں۔ مگر تمہارا رویہ میرے ساتھ اس قدر سرد ہے کہ مجھے تو یہی لگتا ہے۔)

"مارو پن ایک سوال چھے جو تو جواب آپتو ہوئے تو (میرا بھی ایک سوال ہے اگر تم جواب دے سکو تو)

"سول چھے (کیا ہے) جمی نے کہا۔

"Do you think sex is only thing in life?" مہرو نے پوچھا

جمی سٹپٹا گیا۔ مہرو نے دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی تھی۔

"تے تو کھرو پن آئی فیل تو ایک دم ٹھنڈی پڑی جائے چھے؟"

"(یہ تو سچ ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم ایک دم سرد پڑ جاتی ہو) جمی کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔

"I am not complaining, Meru, Please don't misunderstand me"

جسٹ اے بتاؤں چھوں"

"شا ماٹے؟" (کیوں؟) مہرو کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"I only want to know why it happens"

جمی نے کہا۔

مہرو نے کہا کہ اس نے تو کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔ مگر جمی کا رویہ اُس کے لیے ضرور تکلیف دہ ہے۔ یہ ہر وقت کا چپکنا، انگ انگ کو ٹٹولنا، یہ روز روز کا ——— وہ چاہتی ہے کہ کبھی دونوں بیٹھیں، باتیں کریں، کچھ وقت ساتھ میں گزاریں، مل کر کوئی کام کریں۔ مگر جمی کو تو سوائے جسم کے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ہر وقت یہ کس کو اچھا لگ سکتا ہے؟

جمی خاموش ہو گیا۔ مہرو کی بات سچ تھی۔ دراصل عورت کو بحیثیت ایک شخص (Person) کے اس کا ذہن کبھی قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ جب بھی وہ کسی لڑکی یا عورت سے ملتا تو اُسے بے چینی محسوس ہوتی۔ بھلا وہ عورت سے کیا گفتگو کرے۔ ان کی دلچسپیاں الگ، مشغلے الگ، سوچ الگ۔ وہ کچھ بے چین سا ہو جاتا اور لطیفے سُنانے لگتا۔ مہرو اُسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اس سے قریب ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا ضرور تھا کہ مہرو کے پاس بیٹھے، گفتگو کرے، اُس کے ساتھ وقت بتائے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیسے۔ اظہار کا اُسے ایک ہی طریقہ آتا تھا۔ وہ تو بس ہاتھوں، آنکھوں اور ہونٹوں کے ذریعے ہی پیار کا اظہار کر سکتا تھا۔ اور مہرو کو اس سے اتنی ہی اُلجھن ہوتی تھی۔

"پن مہرو تو جانے چھے کہ I love you (مہرو تم جانتی ہو کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں)"۔ جمی نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"ہوں پن اے قبول کرو چھو۔ پن اے تو ماری بات نو جواب نتھی" (میں جانتی ہوں، لیکن یہ تو

ری بات کا جواب نہیں)

مہرو نے اُسے بالکل کارنرکر دیا۔

جمی نے مہرو سے کہا کہ مجھے اپنی غلطی قبول ہے

ڈرکیا اس میں کوئی خامی نہیں ؟ کوئی کمی نہیں ؟"

اب مہرو کے چُپ ہونے کی باری تھی۔ جب سے اُس نے ماڈلنگ شروع کی تھی، وہ ایک عجیب سی کشمکش میں گرفتار ہوگئی تھی۔ مگر اس وقت وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جمی کا مزاج بچوں کا سا ہے۔ اُس نے جمی کے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں پھیرنی شروع کیں۔ اُس کی آنکھوں پر، گالوں پر بوسے دیے۔ اُسے جمی کی ساری کمزوریاں معلوم تھیں۔ جمی تمام تر مزاحمت کے باوجود ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں جمی خراٹے لے رہا تھا۔ مگر اس کا سوال مہرو کے ذہن میں اب بھی گونج رہا تھا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ جمی نے اُس کی شکایتیں بجا، مگر کیا وہ خود پوری طرح بری الذمہ تھی۔ کالج کے دنوں میں ہی جب وہ اپنے عکس کو ایک خوب صورت، چنچل، دلربا انداز میں اخباروں رسالوں، اشتہاری فلموں سے جھانکتے دیکھتی تو اُسے شک ہوتا کہ یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ یہ رُوپ اس کا نہیں ہے۔ وہ تو ایک بالکل سیدھی سادی سی معمولی لڑکی تھی۔ کہیں لان پر یا کسی جھرنے پر اُسے تصویر کھنچوانی ہوتی اور لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی تو اُسے بڑی کوفت ہوتی۔ یہ لوگ اُسے کیوں گھور رہے ہیں۔ کیا دنیا میں اور چیزیں نہیں۔ جسم کی نمائش۔ کیا اس میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں۔ ساری نگاہیں بس اُس کے جسم کو کھوندتی رہتی ہیں۔ یہ فوٹوگرافر، یہ جب تک میرے ایک ایک عضو کو خوب اچھی طرح ٹٹول نہیں لے گا، تصویر نہیں کھینچے گا۔ یہ بے وقوف سمجھتے کیوں نہیں کہ میں محض ایک جسم نہیں۔ ایک انسان ہوں ——— ایک شخص۔ پتہ نہیں کب یہ جھنجھلاہٹ خوف میں بدل گئی۔ وہ اس ماڈل گرل سے ڈرنے لگی جو اس پر قابض ہوگئی تھی۔ اُن دنوں اُس کی ایک تصویر بہت مقبول ہوئی۔ تصویر اگرچہ ساحل کے قریب ہی پتھروں کے درمیان کھینچی گئی تھی۔ مگر فوٹوگرافر نے اس خوبی سے اُسے فوکس کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیچ سمندر میں کسی دُور افتادہ مقام پر ہے۔ سمندر کی لہریں اُس کے جسم سے ٹکراتی ہیں۔ اور جھاگ جھاگ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ اُس کے ہاتھوں میں کوئی بوٹی سوپ ہے جو وہ بڑی نزاکت سے لگا رہی ہے۔ اس تصویر میں وہ بہت خوبصورت گرد و پیش سے بے نیاز نظر آتی تھی کسی ملکۂ حُسن کی طرح اُس کے عریاں جسم کو سمندر کی لہروں اور جھاگ نے لپیٹ لیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ جسم کی رنگت کے بریزیر اور زیر جامہ پہنے ہوئے تھی۔ مگر دُھندلی لہروں اور روشنی کی وجہ سے اُس کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ جمی اسی تصویر کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا تھا۔ اپنے بیڈ روم کی ساری دیواریں اُس نے مہرو کی تصویروں سے بھر دی تھیں۔ شادی کے بعد مہرو نے سب سے پہلے ان تصویروں کو ہٹوایا تھا۔ کیوں کہ تصویروں کے درمیان لیٹے ہوئے اُسے بارہا التباس ہوتا کہ جمی اُس کے ساتھ نہیں بلکہ ان تصویروں کے ساتھ محوِ اختلاط ہے۔ بلکہ تصویریں ہٹوا دینے کے بعد بھی اُس کے ذہن کے کسی گوشے سے یہ خیال ضرور جھنکارتا اور اچانک وہ بے جان ہو جاتی۔ اس کی ساری دلچسپی جاتی رہتی۔

اگلی صبح جمی کا موڈ بڑا شاندار تھا۔ اُس نے شیریں کے ساتھ خوب باتیں کیں۔ مہرو کو دیر تک وہ اپنی دہرہ دون ٹرپ کے متعلق بتاتا رہا بلکہ اُس نے تجویز پیش کی کہ اگلی بار گرمی کی چھٹیاں کلّو منالی کی وادیوں میں گزاری جائیں۔ مہرو نے اس تجویز پر صاد کیا۔ آج وہ لفٹ مین کو دیکھ کر مسکرانا نہیں بھولا بلکہ اُسے ایک اُونی ٹوپی بھی تحفتاً دی، جو اُس کے علاقے سے مخصوص تھی۔

آفس میں کام کرتے ہوئے ایک بار وہ کسی کام سے باہر آیا تو سہراب اپنے کیبن میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔

"اے کاکڑہ کھاؤ" (اے کیکڑہ خور!) وہ آواز کو قدرے مہین کرتے ہوئے چیخا۔ سہراب غصے میں پلٹا۔ مگر اُسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"گاندلا، بن مانس، آوی گیو یا چھو (آگیا واپس ؟)" اُس نے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

واپسی میں جھتار ابداری میں کسی سے باتیں کرتا ہوا نظر آیا تو اُسے دھکا دیتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ کام کے دباؤ میں ایک دوسرے کی موجودگی سے واقفیت کے اظہار کا یہ ایک مانوس طریقہ تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے اسٹاف کو بہر حال یہ اندازہ ہو گیا کہ آج جمی کا موڈ بہت اچھا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ضروری کاغذات پر دستخط حاصل کرنے کے لیے اُس کے کیبن پر بھیڑ لگ گئی۔

دوپہر میں کچھ دیر کے لیے اُسے راحت ملی تو اُس نے کافی منگوائی۔ کافی پیتے ہوئے اُسے مہرو کا خیال آیا اور ساتھ ہی رات کی گفتگو بھی۔ مہرو کی باتوں میں صداقت تھی۔ یہ اُس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ مہرو سے پہلے بھی جن لڑکیوں سے اُس کی دوستی ہوئی تھی وہ اسی لیے ختم ہو گئی تھی کہ لڑکیاں اس کے والہانہ انداز اور اس کے جسمانی اظہار سے تنگ آکر بھاگ جاتی تھیں۔ دو ایک نے تو اُس سے صاف صاف کہا تھا کہ اُس کا ذہن بستر سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں پاتا۔ اُس کے ساتھ مستقل دوستی ممکن نہیں۔ اب یہی بات اگر مہرو بھی کہہ رہی ہے تو کیا غلط ہے۔ ممکن ہے تنگ آکر وہ بھی اُسے چھوڑ دے۔ حالانکہ اُسے فی الحال اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس تصور سے ہی اُسے خلجان ہونے لگا۔ مہرو کو وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا تھا۔ اُس نے طے کیا کہ اپنے معاملات کی اسٹاک ٹیکنگ کیے بہت دن ہو گئے۔ اب اسے اور نہیں ٹالا جا سکتا۔ اُسے اب دوسری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اسی وقت اُس نے طے کر لیا کہ وہ مہرو کو ہفتے میں ایک روز سے زیادہ پریشان نہیں کرے گا۔ صبر تو اُس کے لیے کہاں ممکن تھا، مگر ہاں دوسرے ذرائع بہت تھے اور یہ اُس کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اسی موڈ میں اُس نے مس بہروز کو فون کیا۔ اور اُسے بتایا کہ وہ اس کی تجویز کو مناسب ریمارکس کے ساتھ ڈائرکٹرس میٹنگ میں بھیج رہا ہے۔ مس بہروز بہت خوش ہوئی اور اُس نے بار بار اس کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد اُس نے مہرو کو ٹیلی فون کیا کہ وہ رات دیر سے آئے گا۔ کھانے پر وہ انتظار نہ کرے۔

رات گیارہ بجے وہ گھر پہنچا تو بچی سو چکی تھی۔ مہرو حسب معمول غزلیں سُن رہی تھی۔ اُس نے غزلوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ مہرو سے مشہور غزل گائیکوں کے نام دریافت کیے۔ اُس کا کیسٹوں کا ذخیرہ دیکھتا رہا۔ مہرو کو تعجب تو ہوا، مگر وہ خاموش رہی۔ صبح مہرو کا موڈ بہت اچھا تھا۔ تکان کی کیفیت جو صبح اُس کے چہرے پر ہمیشہ رہتی تھی اُسے نظر نہیں آئی اپنے فیصلے پر اُسے خوشی ہوئی۔ وہ مہرو کو خوش اور چاق و چوبند دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نیا انتظام کئی دن تک خوش اسلوبی کے ساتھ چلا، مگر اس میں کئی خامیاں تھیں۔ ایک تو شام میں مہرو اور بچی کے ساتھ کھانے کا موقع نہیں ملتا تھا، جو اُسے پسند تھا۔ دوسرے مہرو سے ملاقات بس رات ہی میں ہوتی تھی۔ اس کا حل اُس نے یہ نکالا کہ وہ سیدھا دفتر سے گھر آ جاتا۔ رات کے کھانے تک مہرو اور بچی کے ساتھ رہتا پھر کسی بہانے غائب ہو جاتا۔ دو ایک بار وہ مہرو کو لے کر شام کی سیر کے لیے بھی نکلا۔ مہرو واقعی خوش ہوئی۔ اگرچہ رات میں اس کا غائب ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ کچھ تو عادتاً اور کچھ اس خیال سے کہ اب وہ انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا تھا اُس نے جمی سے اس کے متعلق دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اپنی کامیابی پر وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شیخ نے بھی اس کی کارگزاری کی داد دی۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ منصوبے کے مطابق ہفتہ کی رات تک اُسے مہرو سے الگ رہنا تھا۔ مگر جمعہ کی صبح سے اس کا جسم پھوڑے کی مانند دُکھنے لگا۔ دن میں کئی بار مہرو کا ہیولا اُس کے سامنے آیا اور گیا۔ دوپہر تک اس کا موڈ پھر خراب ہو چکا تھا۔ اُسے رہ رہ کر مہرو پر غصہ آنے لگا۔ یہ سالی برف جیسی عورت کیا میرے ہی نصیب میں تھی؟ آخر اور بھی تو عورتیں ہیں۔ شام تک اُس کا سر ہلکے ہلکے دُکھنے لگا۔ غصہ تو اُسے اتنا آ رہا تھا کہ جی چاہا سیدھا کلب چلا جائے۔ مگر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے گھر کا رُخ کیا۔

مہرو نے چائے لا کر دی۔ جمی چائے پی کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

"کیم طبیعت برو بر نہتی؟" (کیوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟) مہرو نے پوچھا۔

"ماتھو بھاری تھئی گیو چھے۔" (سر بھاری ہے) جمی نے جواب دیا۔

مہرو اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر گود میں رکھ کر ہاتھوں سے ہلکے ہلکے دبانے لگی۔ اس دوران اس کی بچی شیریں اُس کے پاس آئی۔ جمی نے اُسے پیار کیا۔ کچھ دیر باتیں کیں پھر مہرو نے اُسے باہر بھیج دیا کہ پپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم باہر کھیلو۔

جمی کو مہرو پر بہت غصہ تھا۔ مگر اسے اتنے قریب پا کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ مہرو سر دباتے دباتے اُس پر جھکی۔ اُس کے بالوں کو آنکھوں کو چُوما۔ اس کی آنکھیں مہرو سے چار ہوئیں تو مہرو کی آنکھوں میں شرارت جھانکتی نظر آئی۔

"سوں چھے؟" جمی نے سر گھما کر اس سے پوچھا۔

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔"

جمی نے پھر سر رکھ دیا۔ مگر تبھی اُسے خیال آیا کہ مہرو محض میکسی پہنے ہوئے ہے۔ وہ بے سُدھ لیٹا رہا۔

"ناراج چھے مارا اوپر؟" (ناراض ہو مجھ سے؟) مہرو نے جھک کر اُس کے کانوں میں کہا۔

"نئیں تو۔" جمی نے کہا۔

تبھی مہرو نے اپنی باہنوں میں اُسے سمیٹ لیا۔

"آؤ سو تھی نتھی؟" (آؤ گے نہیں؟)

"Not now"

"Really?"

"تو آ ہے وی ریتے رہے چھے کہ مینے سارو لاگتو نتھی۔" (تم اس طرح رہتے ہو تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا) مہرو نے کہا۔

"آ بدھو ہوں تاری خوشی ماٹے ج کروں چھوں۔" (یہ سب میں تمہاری خوشی کے لیے ہی تو کر رہا ہوں)

"ایٹلیج تو مینے آ گھنو ج کھراب لاگے چھے۔" (اسی لیے تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے) مہرو نے کہا۔ "آ ہے تارو نیچرل بیہویر نتھی۔" (یہ تمہارا فطری برتاؤ نہیں)

"پن مارو نیچرل بیہویر تمنے کیو و پسند پڑی۔" (لیکن میرا فطری رویہ تمہیں کب پسند ہے۔)

"But I never complained"

مہرو نے کہا۔ "تو ج مارا پر گھڑے چے" (تم ہی مجھ پر غصہ کرتے ہو۔)

یہ کہتے کہتے وہ جمی کے پہلو میں لیٹ گئی۔ جمی بڑی دیر سے خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اب اُس کے لیے ناممکن تھا۔

اُس نے مہرو کو بھینچ لیا۔

تب مہرو نے اُس سے کہا کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اُسے اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی اُسے اسی طرح قبول کر لے۔

رات میں کھانے کے بعد جمی لیٹا تو اس کا سر بالکل ہلکا تھا۔ نائٹ لیمپ کی ہلکی روشنی میں مہرو بیناز کی غزلیں سُن رہی تھی۔ اس وقت اُسے پیناز کی آواز بڑی میٹھی، سُریلی لگی۔ جیسے آواز کا جھرنا دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ مگر وہ ایک بار پھر کنفیوز تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

صبیحہ انور

بدلتا موسم

نعیم کی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ محل کی شکستہ دیواروں پر دھوپ شکن آلود چادر کی طرح یہاں وہاں بچھی ہوئی تھی۔ منحوس سناٹا دھیرے دھیرے ماحول کی رونق نگل رہا تھا۔ صبح صبح دیوار پر پھدک پھدک کر اپنی بے ہنگم آوازوں سے پریشان کرنے والے کوّے بھی تھک ہار کر غذا کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ صرف دیواروں کی دراڑوں میں اُگے گھاس کے گچھے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے اور احساس دلا رہے تھے کہ ہوا چل رہی ہے —

رات اُسے بہت دیر سے نیند آئی۔ یاد نہیں آیا کہ جاگتے جاگتے وہ کب تھک کر سو گیا تھا۔ منھ کڑوا ہو رہا تھا اور ہاتھ پیروں پر تھکن کا غلبہ تھا۔ ایک عجیب سے ہزیمت اور شکست سے بھری تھکن۔ جیسے کوئی تپسیا بے کار چلی گئی ہو — دالان کے در پر طوطے کا خالی پنجرہ لٹک رہا تھا۔ کھپیاں اُلٹی ہوئی تھیں۔ ہوا میں جھولتا ہوا پنجرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے نعیم کی تھکن اور شکست کی تائید کر رہا ہو۔

نعیم کی سمجھ میں جلد ہی اپنی تھکن کی وجہ آ گئی۔ فضا میں وہ مخصوص، چکنی اور لسانذی بُو پھیل رہی تھی۔ جس نے نعیم کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ امام الدین کی چکی پر کام شروع ہو چکا تھا — دھیرے دھیرے یہ بُو ساری فضا میں بس جائے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ سچ میں بہت دیر ہو چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں سرسوں کے بورے اُترنے لگیں گے اور چیخ پکار گالی گلوچ، ٹرانسسٹر پر فلمی گیتوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ نعیم کو معلوم تھا کہ جیسے جیسے باہر کا شور بڑھے گا وہ گھر کے اندر اکیلا ہوتا جائے گا — اتنے بڑے ڈھنڈار صحن میں جہاں ایک جانب مردان خانے کے کھنڈر کا ملبہ ڈھیر ہے — جس کے ہال میں باہر سے رنگین شیشوں والے دروازے لگے ہوئے ہیں۔ مگر اندر سے ہال کے فرش پر قدِ آدم گھاس کا ایک جنگل اُگ آیا ہے۔ چھت گر چکی ہے۔ کہیں کہیں دیوار سے شہتیر اس طرح اٹکے ہیں کہ ملبے سے چھت تک پہنچنے کی سیڑھیاں سی بن گئی ہیں۔ دروازے کھل نہیں سکتے کیوں کہ ملبے کے اندر آدھے دفن ہیں۔ باورچی خانے کے آگے والا امرود کا پیڑ عجیب بے ڈھنگے طریقے سے پھیل گیا ہے کہ خود بخود پردے کی دیوار کا کام کر رہا ہے۔

آنگن کے دوسری جانب وسیع ہال ہے۔ طویل دالان اور کشادہ کمرے ہیں۔ شہ نشینیں ہیں جو کھوئی ہوئی رونق کے باوجود بڑی پُرکشش ہیں۔

باورچی خانے میں کھٹر پٹر ہو رہی ہے۔ شاید جمن نے اُسے دیکھ لیا ہے اور چائے کی تیاریوں میں مشغول ہے۔ بے چارہ جمن جو اس ٹوٹے محل کے اکیلے باسی کو اپنے پُرکھوں کی وفاداری اور نمک خواری کا قرض چکا رہا ہے۔ وہ محل میں بھاگتے دوڑتے رہنے والے نوکروں کی بھیڑ کا آخری آدمی ہے۔ محل کے باہر کی دنیا میں اس کی کوئی پہچان نہیں ہے "مگر شاید میری طرح وہ بھی اپنے نام اپنی پہچان سے چمٹے رہنا چاہتا ہے۔ نعیم نے اُلجھ کر سوچا کہ "میں جانتا ہوں کہ یہ کوشش بے سود ہے۔ مگر اُسے یہ بھی نہیں معلوم —" وہ دیر تک آنگن میں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر الگنی سے تولیہ اُتار کر نیم تاریک غسل خانے میں گھس گیا۔

کل رات نھو حلوائی سے دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ نھو حلوائی کو بچپن میں جلیبی اور بالا کا تھال کاندھے پر رکھے ڈیوڑھی پر آواز لگاتے دیکھا تھا۔ مگر کل رات جو نھو اس سے آنگن میں باتیں کر رہا تھا، وہ ایک بالکل الگ آدمی تھا۔ اب اس کا ایک لڑکا دوبئی کے ہوٹل میں باورچی ہو گیا ہے۔ دوسرا اوورسیئر ہونے والا ہے۔ کہنے

ناجی پریس بلڈنگ، نخاس، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

آج کل نئی دہلی

اطمینان سے وہ پائین باغ کی زمین کا سودا کرنے آیا
تھا۔ حضور اور سرکار کی گردان کے پیچھے جو جذبہ کام
کر رہا تھا، وہ ڈنک بن کر چبھ گیا تھا ـــ اس
کی خاکساری اور انکساری کا زہر اس وقت
نعیم کو بے چین کر رہا تھا۔ نھو کے سامنے کرسی
پر بیٹھے ہوئے وہ بار بار پہلو بدلتا رہا اور
خیالی مچھر اُڑاتا رہا ـــ نھو سامنے کھڑا رہا۔
یہاں تک کہ عشاء کی اذان ہو گئی اور نھو کل پھر
آنے کا وعدہ کر کے پھاٹک کی قریبی مسجد میں
گم ہو گیا۔ نعیم دیر تک اسی ہولناک اندھیرے
میں محل کے پس ماندہ آثار اور پُرشکوہ برجیوں
کو گھورتا رہا ـــ محسن کئی بار وہاں آ کر کھنکھارا
اور پھر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دے کر چلا گیا۔
مگر نعیم نے ہر بات کی طرح اس بات کو بھی نظر انداز
کر دیا ـــ تنہائی اور اکیلے پن کے جس احساس
سے وہ اب تک لڑتا آ رہا تھا اب اس پر غالب
آنے لگا۔

پھاٹک کے پاس والی زمین پر چکی لگانے
کی اجازت امام الدین کو بھائی جان نے دی تھی۔
مگر ان کی غلطی کا خمیازہ نعیم بھگت رہا ہے۔ خود
تو وہ آرام سے امریکہ میں جا بیٹھے، انھیں کیا معلوم
کہ ہاتھ جوڑ کر "میاں بندگی" "حضور بندگی" کہنے
والے امام الدین کے پُرکھوں کی اولاد جب آج
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابری سے سلام علیکم
کہتی ہے تو کیسا لگتا ہے! ـــ انہیں اندازہ
بھی نہیں ہوگا کہ امام الدین کی چکی کی آواز دن بھر
اور کھلی کی بساندھ سے بھاگ کر وہ دن بھر
کتب خانے کے پرانے قلمی نسخوں میں کیوں کھویا
رہتا ہے ـــ یا بھائی بہنوں کو خط لکھ کر وہ
ڈاکیہ کے انتظار میں گھڑی گھڑی کیوں دیکھتا رہتا ہے۔
حویلی کے گرتے ہوئے آثاروں سے زیادہ تشویش،
اُسے بدلتے ہوئے زمانے سے تھی۔ وہ نھو حلوائی
ہو یا امام الدین سب کی نظریں موسم کی طرح بدل
رہی ہیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ بھائی جان سچ ہی
تو لکھتے ہیں کہ میں ماضی کے مزاروں کا مجاور رہوں۔
میں گزرے ہوئے زمانے کا منتظر تو نہیں ہوں۔
آخر یہاں میں کس کا انتظار کر رہا ہوں۔

آپا نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ "خاک ڈالو
حویلی پر۔ تم وہاں سے چلے آؤ۔ خاندان کے سبھی
لوگ قصبات سے باہر نکل آئے۔ آخر تم کو کون
چیز روکے ہے۔ آپا کا خط پڑھ کر نعیم زور سے
ہنس پڑا۔ 'خاک ڈالو' ان کا تکیہ کلام ہے۔ اسے
بے ساختہ آپا یاد آ گئیں ـــ جو پاکستان میں
بیٹھی وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتی ہیں۔
ہندوستان کے موسم اور تہواروں کی جھلک
دیکھ کر ہی ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہیں اور لٹے
محل میں اکیلے بھٹکتے چھوٹے بھائی کو یاد کر کے
پلکوں پر آنسوؤں کے قمقمے سجا لیتی ہیں ـــ مگر
ہر خط میں اُسے ملک سے باہر جا کر پیسے کمانے اور
جلدی سے امیر بن جانے کی ترغیب دلاتی رہتی ہیں۔

"چھ مہینے سے تارا کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نعیم
نے سوچا اُس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ پتہ نہیں ہوا
کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اسکول کی نوکری چھوڑ
دی ہو یا ریسرچ پوری کرنے کے لیے پھر علی گڑھ
چلی گئی ہو ـــ یا پھر پھوپھی اماں نے وہ دُبئی
والے تارا کے کزن کا پیغام منظور کر لیا ہو ـــ
پچھلے خط میں تارا نے کتنی تفصیل سے ایک ایک بات
پوچھی تھی ـــ مگر نعیم کو یاد ہی نہیں آتا کہ تارا
کا خط وہ کس کتاب میں رکھ کر بھول گیا ـــ روز
سوچتا کہ صبح کتب خانے کی ساری کتابیں کھنگال
ڈالے گا۔ مگر صبح اُٹھتے ہی امام الدین کی چکی کی
آواز اور بساندھ سب کچھ بھلا دیتی ـــ پھر
اُسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹتا محسوس
ہوتا ـــ وہ سوچتا کہ باغ میں ٹیوب ویل کی اسکیم
کے لیے تحصیل دار صاحب کئی بار کہہ چکے ہیں۔ پھر
دوبئی کی اس فرم کا جواب بھی اب پوسٹ ہو جانا چاہیے
جس کے لیے سب اس پر زور ڈال رہے ہیں۔ تارا نے
بھی اس کی تفصیل مانگی تھی۔ پھر اچانک ہی نعیم کو
تارا کے اس مال دار کزن کا خیال آ جاتا ـــ جو تین ماہ
کی چھٹی لے کر شادی کرنے کے لیے ہندوستان آیا
ہے۔" سوالات شہد کی مکھیاں بن کر نعیم کے اوپر
بھنبھنانے لگتے۔ آخر یہ ٹوٹا پھوٹا محل میرے پیر کی
کی زنجیر کیوں بن گیا ہے؟ ـــ اس کی ٹوٹی
ہوئی دیواروں میں کب تک پناہ لیتا رہوں گا ـــ
آخر میں محل کی باہر والی بھیڑ کا حصہ کیوں نہیں بن جاتا۔"

خدا جانے نھو حلوائی کی باتوں میں وہ کون سے
نشتر چھپے تھے کہ نعیم کی بے چینی کسی طرح کم ہی نہیں
ہو رہی تھی۔ تنہائی اور اکیلے پن کا زہر دھیرے
دھیرے نسوں میں چڑھ رہا تھا ـــ یادوں کے لشکر
اس پر جارحانہ انداز میں حملہ کر رہے تھے۔ اور ہر وار
کا نشانہ اس کے سینہ پر تھا۔ نعیم دھیرے دھیرے
حوصلہ کھوتا جا رہا تھا۔

امی۔ ابا۔ تارا۔ بھیا۔ آپا۔ دادی جان۔
محسن۔ خورشید۔ مولوی صاحب نہ جانے کتنے چہرے
تھے، جو جگنوؤں کی طرح ناچ رہے تھے ـــ
کوئی منڈیر سے جھانکتا۔ کوئی زینوں پر سے دھم دھم
کرتا گزر جاتا ـــ وہ دیر تک منڈیر پر نیلے آنچل
کو تلاش کرتا رہا جو زینوں کے پاس والی صحنچی میں
چھپ گیا تھا۔ اوپر والے ناغوں سے کوئی ہاتھ نیم
کے اداس اداس پھول اس پر پھینک دیتا اور پھول
کے گرنے سے پہلے چاندی کی موٹھ والی چھڑی مٹھی میں
دبائے ابا کمرے سے نکل آتے، پھول ان کی شیروانی
پر بکھر جاتے۔ ایک آدھ پھول ٹوپی میں اٹکا رہ جاتا۔
پھر پلو سے ہاتھ پونچھتی شفیقن باورچی خانے سے باہر
آ جاتی۔ "نومیاں، نذر ہو گئی ہے۔ چکھے بغیر مت
جائیے گا ـــ آپ کو قسم ہے۔" اس کا تمتماتا ہوا
سالولا چہرہ سوالیہ نشان بن جاتا اور پھر شاداب،
پژمردہ، پُرامید اور ہراساں چہروں کا ایک کارواں
دھول اُڑاتا دالان کے شکستہ دروں میں گم ہو جاتا۔

امرود کے پتوں سے چھن چھن کر مٹیالی اور میلی
دھوپ کے چیتھڑے اس پر پھیلے ہوئے تھے۔ کنوئیں
کی جگت پر ایک پیر ٹکائے ہوئے پتہ نہیں کیوں

سے ایسا لگا جیسے یہ محل آسیب زدہ ہو یا وہ کوئی
پیاسا مُردہ ہے جو صورِ اسرافیل سن کر صدیوں سے
یعنی اس قبر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو
پچھلے برآمدے کی شکستہ دیوار سے جھانکتی ہوئی
اینٹیں اُسے دانتوں سے مشابہ لگیں جیسے کوئی
اونچی آواز میں بتیسی نکال کر اس کی تنہائی اور
ادھورے پن پہ ہنس رہا ہو۔ دروازے کے ٹوٹے
ہوئے رنگین شیشوں پر دھوپ چمک چمک کر آنکھیں
دکھا رہی تھی اوپری منزل پر لگی پیتل کی میخیں کسی
عفریت کے سینگوں کی طرح نوکیلی تھیں۔ نعیم کو
لگا جیسے ابھی ایک چیخ اس کے منھ سے نکلے گی اور
پھر شاید وہ یہاں رُک نہ سکے گا ——
مگر پتہ نہیں کیوں اس کے پیر وہیں زمین سے چپک
گئے۔

وہیں بُت کی طرح کھڑے کھڑے اُسے
بے اختیار فضلو بھائی کا خیال آیا، جن کا پورا
خاندان پاکستان چلا گیا تھا۔ مگر فضلو بھائی کسی
طرح باپ دادا کی چوکھٹ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے
برسوں گزرنے کے بعد ایک دن وہ چیختے ہوئے اپنے
گھر سے باہر نکلے۔ بہت دنوں تک بچوں نے ان پر
پتھر مارے۔ وہ بار بار بڑی عجلت میں ریلوے اسٹیشن
تک جاتے تھے جیسے انہیں ٹرین پکڑنا ہو اور وقت
تنگ ہو —— ریلوے لائن پہ بنے اونچے پُل پہ
پیر لٹکائے وہ گھنٹوں ٹرین کے آنے جانے کا تماشہ
دیکھتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا
رہا پھر سردیوں کی ایک صبح اُن کی اکڑی ہوئی لاش
پُل سے اُتاری گئی۔ برف کے بنے ہوئے بُت کی طرح
سفید —— اُنہیں ایسی کوئی ٹرین نہیں ملی تھی جو
اُنہیں وطن سے دُور لے جاسکتی۔
نعیم کو ایک ٹھنڈک سراپا میں اُترتی ہوئی
محسوس ہوئی۔ جمن چائے کی کشتی لیے اس کی جانب
آ رہا تھا —— جمن کو ہاتھ سے ابھی اور انتظار
کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے جیسے تیسے
کپڑے تن پہ ڈالے۔ اور جوتے کی ڈوریاں باندھتے
ہوئے اُس نے جمن کو کچھ ہدایات دیں۔ اُسے لگا جیسے
وقت کا پرندہ اُڑنے کے لیے بے چین اس کے ہاتھوں
میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ نہ جانے کب اُڑ جائے!!
وہ باہر کی طرف بھاگا۔ کیوں کہ گھڑی بتا رہی تھی
کہ تحصیلدار کے اجلاس کا وقت ہو گیا ہے ادھر
بینک میں لائن لمبی ہو جائے گی —— تارہ کو خط
بھی آج ہی لکھنا ہے کیوں کہ ڈاک تین بجے نکل جاتی
ہے —— وقت کم رہ گیا ہے ——!
محل سے باہر آکر اُسے ایسا لگا جیسے موسم
اچانک ہی خوش گوار ہو گیا ہو۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔
موسم بدل رہا تھا۔ اُس نے آسمان کی جانب نظر
ڈالی۔ چڑیاں قطار بنائے ایک سمت میں باقاعدگی
سے جا رہی تھیں۔ امام الدین کی چکی پہ بھیڑ جمع تھی۔
اس کا چھوٹا بیٹا ابھی ہفتہ بھر پہلے مسقط سے آیا ہے۔
چکی کے باہر اپنی نئی موٹر سائیکل پہ چڑھا بیٹھا تھا۔
اُس کے چیتھڑ قناتیوں نے اُسے گھیر رکھا تھا —— قمیض
کے بٹن بند کرتا ہوا نعیم تیزی سے اس کے پاس سے
گزرا۔ امام الدین نے مسکرا کر انگوچھا ایک کاندھے
سے دوسرے کاندھے پہ ڈالا اور اپنی طرف متوجہ
کرتے ہوئے بولا۔ "بھیا، سلام علیکم"۔
"وعلیکم السلام بھائی وعلیکم السلام"۔
کہتا ہوا نعیم اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر تیزی
سے سڑک پہ مڑ گیا۔
موسم بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ بدلتے
موسم کی خوش گوار خوشبوئیں فضا میں رچی ہوئی تھیں۔
● ●

لقیہ: ماضی کے نہاں خانے

تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُس زمانے میں
ترقی پسند تحریک کا توڑ کرنے والے نہ تھے یا اُن کی
کوئی آواز نہ تھی۔ ادب برائے زندگی کے مقابلے میں
ادب برائے ادب کا جھنڈا اُٹھانے والے بھی بہت
تھے۔ اور اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش بھی
کرتے تھے۔ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے
والے اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ میراجی،
حسن عسکری اور کچھ دوسرے ان کی نمائندگی کرتے تھے
فیض کے الفاظ میں:

"تزکیۂ نفس پران کا ماورائی قسم کا زور
تھا۔ فطرت کی بوقلمونیوں کی عکاسی کرنا،
گل و بلبل چاند تاروں کے گیت گانا اور
محبت اور پیار کے مضامین باندھنا
ان کا طرۂ امتیاز تھا۔"

یہ لوگ کہتے تھے کہ ترقی پسند جو کچھ لکھتے ہیں وہ
پراپیگنڈہ ہے، ادب نہیں۔ قحطِ بنگال کے وقت حسن عسکری
نے کہا تھا کہ قحط پر لکھنے سے کہیں اچھا ہے کہ ننگی تصویریں
دیکھی جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ ترقی پسندوں کی تحریروں
میں پروپیگنڈہ بھی تھا، مگر اس میں اچھے ادب
کی کمی بھی نہیں تھی۔ یہ اہلِ قلم اپنے زمانے کے مزاج کی
نمائندگی کر رہے تھے اور اسی لیے آج ہم اُنہیں یاد
کرتے ہیں۔ نہ ہی یہ سب کمیونسٹ اور مارکسزم
تھے۔ آخر چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم اور
ڈاکٹر تاثیر بھی تو ایک وقت انجمن ترقی پسند مصنفین
کے ممبر تھے۔ تحریک کی کمزوری کا سبب یہ ہوا کہ اس
کا دامن تنگ کر دیا گیا۔ مگر اسے سب سے پہلا
دھکا تو تقسیم ہند کے وقت لگا۔ دو ملک بننے سے
اُردو کے ادیب بھی بٹ گئے۔ کچھ سرحد کے اُدھر رہ
گئے اور کچھ اِدھر آ گئے۔ اس کے بعد جو نئی طرح
کے سیاسی و سماجی سیلاب آئے، اُن کی ایک الگ
داستان ہے۔

ستیش بترا

جُبوے لدّاخ : ۸

لدّاخی تہذیب اور رسم و رواج

لدّاخی تہذیب تبت سے آئے بودھ شمالی ہند اور کشمیر کے سون قبیلوں اور وسط ایشیا و بالتستان کے داڑ اور منگولوں کے رسم و رواج اور اعتقادوں سے گندھی ہے۔ یہاں کی غیر مہمان نواز چوٹیوں، برفیلی ہواؤں اور جغرافیائی حقیقتوں کی ضربیں سہہ سہہ کر ایک خود ساختہ سانچے میں ڈھلی ہے۔ یہاں لوگ صرف اپنی ہمت اور جفاکشی کے باعث ہی زندہ رہے ہیں۔ جس کی داد دینا پڑتی ہے۔ جہاں قدرت کی بے رحمی اور سفاکی کو انہوں نے برداشت کیا ہے، وہاں قدرت کے حسین نظاروں نے انہیں روحانی سکون بھی بخشا ہے اور جمالیاتی حس بھی۔ قدرت نے انہیں سکھایا ہے کہ زندگی ایک انمول دین ہے۔ نفاق، تنگ نظری اور بے اعتباری انہیں تباہی کے غار میں ہی دھکیل سکتے ہیں۔ مذہب اور عقیدے زندگی سے بلند نہیں بلکہ صحیح زندگی گزارنے کے گر سکھاتے ہیں، پیار اور ہمدردی کا درس دیتے ہیں۔ ایندھن کی کمی نے ایک ہی خاندان کے بودھی اور مسلمان بھائیوں کو ایک ہی ہانڈی میں کاٹھ کی دیوار بنا کر گوشت اور سبزی کو ساتھ ساتھ پکانے پر مجبور کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کے عقیدوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اس سے بڑھ کر مذہبی رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے!

کسی منچلے کا کہنا ہے کہ دنیا کے کٹر مذہب پرستوں کو لدّاخ کی چوٹیوں پر بھیج دینا چاہیے تاکہ مذہبی تنگ نظری کو بھول کر وہ انسانیت کا سبق سیکھ سکیں۔

یہاں کے بودھی حکمرانوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے امن کی خاطر مسلم شہزادیوں سے اور بودھی شہزادیوں نے مسلم حکمرانوں سے شادیاں کی ہیں۔ بودھی حکمرانوں نے ان رانیوں کو بھی وہ جاہ و مرتبہ اور سہولیات مہیا کیں تاکہ وہ بلا خوف و خطر اپنے مذہب اور عقیدوں کے تقاضوں کو نبھا سکیں۔ ۱۵۵۵ء میں لدّاخ کے حکمران جم یانگ نمگیال نے سکاردو کے شاہ علی شیر کی دختر شہزادی ارگیال خاتون سے شادی کی۔ اسی طرح سے اُس نے اپنی لڑکی کی شادی علی شیر سے کرنے میں کوئی تامّل محسوس نہیں کیا۔ یہ تقریباً اسی زمانے کا ذکر ہے جب مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کو بھی جے پور کی رانی جودھا بائی سے شادی کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کا خیال آیا تھا۔ جم یانگ اور ارگیال خاتون کے لڑکے سِنگے نمگیال نے جہاں ہیمس اور شے جیسی بودھی خانقاہوں کی تعمیر کروائی، وہاں لیہہ میں اُس نے اپنی ماں کے لیے ترکی اور ایرانی نمونے کی ایک عالی شان مسجد بھی بنوائی۔

اسی طرح تقریباً سو سال بعد ۱۶۶۵ء میں کرگل کے حکمران نے بھی اسکاردو کی ہی مسلم شہزادی تِلا سے شادی کی اور اس طرح سے یہ دونوں حکمراں بودھ مسلم اتحاد کے بانی ثابت ہوئے۔

یہ باہمی خلوص و پیار یکطرفہ نہ تھا۔ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ۱۹۷۶ء میں جب دلائی لامہ نے لدّاخ کا پروگرام بناتے وقت مسلم کرگل کو نظر انداز کیا تو کرگل کے مسلمانوں نے اس ناانصافی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور دلائی لامہ کو مجبوراً کرگل بھی اپنے پروگرام میں شامل کرنا پڑا۔ کرگل میں ان کی آمد کا اتنا ہی شاندار سواگت ہوا جو کسی دوسرے بودھی علاقے میں ہوا تھا۔ لدّاخ کے ایک ہی گھرانے کے دو بھائیوں کا بودھی اور مسلمان ہونا بالکل غیر متوقع نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر دونوں فریق ایک دوسرے کی تقریبوں میں اسی ذوق و شوق سے شامل ہوتے ہیں۔

لدّاخ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مشہور چینی سیّاح فاہیان اور اوکانگ کے زمانے (۴۰۰ء) سے لے کر یہ آج تک سیّاحوں کی توجّہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ فاہیان یہاں ایک ماہ تک رہا۔ اُس نے لدّاخیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بودھی ہیں اور اس ملک میں بلا کی سردی ہے اور ان برفیلے علاقوں میں تھوڑی بہت مکّی کے سوا کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ لدّاخ میں اُس وقت بھی

بودھ مت کا دَور دَورہ تھا۔ ہندوستانی بدھ دھرم اور یہاں کے دھرم میں کوئی فرق نہ تھا، سوائے پرارتھنا چکر Preyer-hell کے جو آج بھی یہاں موجود ہے۔

لداخیوں کی روزمرّہ زندگی' مذہبی رسوم اور عقیدوں پر مبنی ہے۔ اُن کے لبوں پر بودھی کتابوں کے شلوک رہتے ہیں۔ وہ کام کاج کرتے اور گھومتے پھرتے ہوئے بھی اپنا پرارتھنا چکر گھماتے رہتے ہیں۔ اونچی چٹانوں اور چوٹیوں پر' مکانوں اور رہائش گاہوں کی چھتوں پر سفید پرارتھنا جھنڈے لہراتے رہتے ہیں۔ وہ طوفان' برف باری، ژالہ باری کو آسمانی قوتوں کا قہر مانتے ہیں۔ اور زمین کی زرخیزی اور فصلوں کو اُن کی نگاہِ کرم۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے وہ قدرت کی رضامندی جان لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان طاقتوں کو خوش کرنے کے لیے اُنہیں چڑھاوا پیش کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا بہت اہم ہے۔ رئیسوں اور خانہ بدوشوں تک کے گھروں میں دیئے روشن کرنا ضروری ہے۔

لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اُنہیں بار بار پیدا ہونا ہے اور وہ اپنی زندگی میں اچھے اعمال کرکے ہی بلند تر اور اعلیٰ جنم حاصل کر سکتے ہیں۔ دیش کا اعلیٰ مذہبی ادارہ اُن کی زندگی کے فیصلے کر سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک معمولی سے معمولی راہب بھی عزت کا مستحق ہے۔ اور لوگ اعلیٰ شرفاء کی طرح اُنہیں 'کشو' کہہ کر پکارتے ہیں کیونکہ اُس کا تعلق مذہبی جماعت سے ہے۔ بودھ دھرم کے عقیدوں پر اُن کا مکمل ایمان ہے اور ان سے کوئی بھی اختلاف کفر ہے۔

لایقینی، ڈر، مال و جان کی حفاظت، خوشحالی کی تمنا وہ بنیادی انسانی ضرورتیں ہیں جو ہر کسی کو مذہب کا سہارا ڈھونڈنے پر راغب کرتی ہیں۔ جن لوگوں کو قدرت کی سنگینی اور قہر کا تجربہ رہتا ہے۔ اُن کے اعتقادات بھی اتنے ہی مضبوط بن جاتے ہیں اور ان کی زندگی توہمات اور اندھ وشواس کی بیساکھیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس لیے کچھ عجب نہیں کہ ہر سفر سے پہلے، ہر سال شروع کرنے سے قبل، لوگ خانقاہوں کے راہبوں اور لاموں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر تہذیب کی طرح ایمان اور سائنس کی جنگ یہاں بھی شروع ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس وقت تو ایمان کا پلڑا بھاری ہے۔

ہر لداخی نیکی اور بدی کی جنگ میں یقین رکھتا ہے۔ بُرائی پر اچھائی کی فتح پر بھی اس کا مکمل یقین ہے۔ وہ اپنی خانقاہوں، گھروں میں بُرائی کی طاقتوں سے بچنے کے لیے ہر طرح کے ٹونے ٹوٹکے کی استعمال کرتا ہے۔ اُن کی بیشتر رسومات میں یہ پہلو بہت شدت سے اُبھر کر آتا ہے۔ یہی پہلو ان خانقاہوں میں پیش کیے جانے والے ڈراموں اور رقصوں میں بھی نمایاں ہے۔ بُرائی کی طاقتوں کے نقاب بھیانک دہشت ناک چہرے اور سیاہ لباس بھی اسی پہلو کے ضامن ہیں۔ ظلمات اور اندھیرا بھی بُرائی کے نقیب ہیں۔ روشنی اور نور، نیک نیتی اور پاکبازی کی غمازی کرتے ہیں۔ سفید، سُرخ، کیسری اور زرد رنگ نیکی اور اچھائی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی صورتِ حال ہندو دھرم اور مسیحائی مذہب کے ابتدائی ڈراموں اور رقصوں میں بھی کارفرما رہی ہے —

کسی بھی ملک کے رسم و رواج کے لیے اُس کی معاشیات بہت ذمہ دار ہوتی ہیں۔ زمین و جائداد کے سلسلے میں بڑا لڑکا وارث مانا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ اثاثہ بے حد محدود ہوتا ہے لہٰذا اس کا بٹوارہ سماج اور افراد کے حق میں زیادہ سودمند نہیں ہو سکتا۔ بڑے لڑکے کے ذمّے چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت رہتی ہے، لیکن کچھ غربت اور زیادہ انسانی خود غرضی کی وجہ سے چھوٹے بھائی بہن اپنے حقوق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بودھی خاندانوں میں ویسے بھی دھرم کے مفاد کے لیے ہر گھر میں ایک فرد کا خانقاہوں میں راہب بننے لیے بھیجے جانے کی روایت ہے۔ لہٰذا یہ فریضہ اکثر گھر کا چھوٹا بھائی ہی سرانجام دیتا چلا آیا ہے۔ ہر خانقاہ کے پاس گزارہ کے لیے کچھ نہ کچھ زمین و جائداد رہتی ہے۔ اور اس طرح سے بودھی سماج خاندانوں کا تھوڑا بہت بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ یہی صورت لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے اور ان میں سے بھی کچھ ان خانقاہوں میں راہبہ بن جاتی ہیں۔ عموماً اُنہیں رسوم میں شرکت کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اُن کے لیے مذہبی منتروں کا جاپ ضروری ہے۔

ایسی صورتِ حال سے مُفر نتیجے بھی ہیں — مجبوری کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کوئی چھوٹا بھائی خانقاہ کا رُخ کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مذہب کی طرف مائل ہی ہو۔ پھر وہ اپنی زندگی کو اپنی مرضی اور خداداد صلاحیتوں کے بھروسے جینے کے حق سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور سماج اپنے افراد کا بھرپور فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

اگر چھوٹا لڑکا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گھر میں ہی رہتا ہے تو اُس کی ذاتی مالی حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے اس کی شادی کے لیے آسانی سے رشتہ ملنا قریب قریب ناممکن ہے۔ بڑے بھائی کے تجارت یا کام کاج کے سلسلے میں گھر سے اکثر باہر رہنے پر چھوٹے بھائی اپنی بھابی سے رشتۂ ازدواج قائم کر سکتے ہیں۔ جن گھروں میں صرف بیٹیاں اولاد ہوتی ہیں، بڑی لڑکی اپنے گھر میں رکھیل مرد رکھ سکتی ہے۔ جسے عام طور پر 'میگ پا' کہا جاتا ہے۔ ایسے مرد کو اپنا گھر چھوڑ کر مالکن کے گھر ہی رہنا پڑتا ہے۔ گھر کی دوسری بیٹیاں چاہیں تو اپنی شادیاں کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر اُن میں کوئی شادی نہ کرنا چاہے تو وہ بڑی بہن کے 'میگ پا' سے ازدواجی رشتہ قائم کر سکتی ہے۔ میگ پا کی حیثیت بودھی سماج میں بہت قابلِ رحم سمجھی جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ جائداد کے حق سے محروم ہے اور اُسے کبھی بھی چٹکی بجاتے ہی طلاق دی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا صورتِ حال بودھی گھرانوں تک ہی محدود ہے۔ اب جب کہ ہماری سرکار نے ایسے رسم و رواج کو غیر قانونی قرار دیا ہے' ایسی مثالیں جہاں ایک سے زیادہ شوہر یا بیوی کا رواج ہے' پسماندہ علاقوں میں اب بھی مل جاتی ہیں، جہاں زیادہ سے زیادہ تین

بھائیوں کی ایک بیوی ہوتی ہے۔ بچوں کو بڑے بھائی کو ہی باپ ماننا سکھایا جاتا ہے اور دوسرے بھائی چھوٹے باپ، یا چچا ہی کہلاتے ہیں۔ بڑے بھائی کی موت کے بعد بیوی باقی بھائیوں سے طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ اس کا صرف اپنے مُردہ شوہر کے انگلی میں دھاگا باندھ کر توڑنا ایسے رشتوں سے آزاد ہونے کا اعلان ہے۔

زیادہ شوہروں کا رواج سماج کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہے۔ کیوں کہ گھر کی لڑکیوں کے بیاہ رشتے ملنے دشوار ہو جاتے ہیں اور ادھیڑ عمر کی بن بیاہی عورتوں کا مسئلہ تشویش ناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی خانقاہ میں راہبہ بننے کے سوا اُن کے لیے کوئی چارہ نہیں رہتا، لیکن اب اکثر خانقاہوں کی مالی حالت کمزور ہونے لگی ہے اور ایسی عورتوں کا تحفظ بھی ایک مسئلہ ہے۔ ان عورتوں کا راہبہ بننا دھرم کی طرف جھکاؤ نہیں بلکہ ازدواجی منڈی میں خاوندوں کا دستیاب نہ ہونا ہے۔ اگر انہیں خانقاہوں میں جگہ نہیں ملتی تو وہ اپنے بھائیوں کے بچے پالتی ہیں۔ گھر کا کام کاج سنبھالتی ہیں یا کھیتوں میں کام کرتی ہیں، جن کے عوض انہیں صرف خوراک، کپڑا اور چھت ہی نصیب ہو سکتی ہے۔

ایسے حالات میں یہ بن بیاہی بوڑھی عورتیں اسلام قبول کرکے مسلم گھرانوں میں شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ اسلام ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دیتا ہے۔ بہر حال یہ ہر طرح سے ضروری ہے کہ ایسی عورتوں کے لیے مذہب تبدیل کرنے کے علاوہ کوئی واجبی سماجی اور معاشی حل بھی ڈھونڈا جائے۔

لداخ میں تین پیڑھیوں کی دوری شادی کے لیے لازم مانی گئی ہے۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی دونوں کو ہی دوسری شادی کرنے کا حق ہے۔ اگر بیوی کے اولاد نہیں ہوتی تو شوہر اپنی سالی سے شادی کر سکتا ہے۔ جس صورت میں پہلی بیوی کے حقوق اسی طرح برقرار رہتے ہیں۔

شادی کی تاریخ لاما لوگ ایک سال پہلے سے طے کردیتے ہیں۔ شادی طے کرتے وقت ان جوتشی لاماؤں کی اتنی ہی اہمیت ہے جو ہندوستان کے قدامت پسند گھرانوں میں چلی آتی ہے۔

عموماً لڑکی کا رشتہ لڑکے والوں کے ہاں چھنگ بھیج کر طے کیا جاتا ہے۔ چھنگ کے پہلے دور میں شادی کے مختلف پہلوؤں پر غور رہتے ہیں۔ دوسری ملاقات میں دلہن کے والدین کو دیے جانے والے تحفوں کی تعداد اور نوعیت طے کرلی جاتی ہے۔ ایسے تحفوں میں روایتاً سوکھی خوبانیاں، چائے، گوشت، مکھن، چاول اور رومال وغیرہ شامل رہتے ہیں۔ شادی سے دو ہفتے پہلے ایک تیسری ملاقات کے دوران دعوت ولیمہ میں کون کون سے رشتہ دار کھانے پینے کا کیا کیا سامان فراہم کریں گے، طے ہوتا ہے۔ عموماً یہ فریضہ دولہا اور دلہن کے ماموں کو سرانجام دینا پڑتا ہے۔ ان دعوتوں میں کھانا خوب سیر ہو کر کھایا جاتا ہے۔

لداخی شادیوں میں کھانے سے زیادہ پینے کی اشیا پر زور دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ملی جلی نمکین میٹھی چائے پیش کی جاتی ہے پھر پنیر اور جَو کے ستو چھٹے دور میں نشہ آور ناگ چھنگ اور اس کے بعد سول چھنگ کا دور چلتا ہے اور ان سب کے بعد ہی دعوت میں چاول پیش کیے جاتے ہیں۔

لداخی لوگ بہت زندہ دل ہیں۔ دراصل وہ زندگی کی اہمیت کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ دُور دراز علاقوں میں اکیلا رہنے کے عذاب سے بھی واقف ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے کی صحبت میں گزارے گئے خوش گوار لمحے ان کی زندگی کا بیش ترین سرمایہ ہوتے ہیں۔ موسیقی، گانے اور رقص کے دلدادہ اُن کی پُرجوش آوازیں اور فراخ قہقہے اُن کی زندہ دلی کا ثبوت ہیں۔

کھیلوں میں چوگان (پولو) لداخیوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ چوگان کا کھیل غالباً وسط ایشیا کی دین ہے۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ لداخ میں اسے دارد اور منگولوں نے رائج کیا ہے۔ یہ کھیل آج بھی خاص موقعوں پر لیہہ کی مارکیٹ کے پاس میدان میں کھیلا جاتا ہے۔ چونکہ کھیل میں گھوڑے سرپٹ دوڑائے جاتے ہیں اور لکڑی کی گیند پل بھر میں میدان کے اس سرے سے اُس سرے پر پہنچ جاتی ہے، اس لیے اُس دن میدان کی طرف کھلنے والی دکانوں کا بند ہونا بالکل طے ہے۔ یوں بھی لداخی لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر بڑے اشتیاق سے یہ کھیل دیکھتے ہیں۔ چوگان کے بعد تیر اندازی دوسرا مرغوب ترین کھیل ہے۔

لداخ کے گھوڑوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بھیڑوں اور یاک کے علاوہ لداخیوں کو کتے پالنے کا بھی بہت شوق ہے۔ ریوڑوں کی رکھوالی کے لیے کتے بہت ضروری ہیں۔ اس کے لیے لداخی نسل کے کتے مشہور ہیں۔ یہ کتے برفیلے راستوں میں بھیڑوں کو ہانکنے اور انہیں ہر مصیبت سے بچانے کے اہل ہوتے ہیں۔ جاڑے اور برف سے بچنے کے لیے اُن کتوں کے بال بھی بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ برفیلی سردی کا بخوبی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے قد کے گود میں لیے جانے والے لداخی کتوں کی ایک اور نسل بہت ہر دل عزیز ہے۔ ان کتوں کے رنگ عموماً گہرے بھورے یا سیاہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے جسم بھی بالوں سے خوب بھرے رہتے ہیں۔ یہ آسائشی کتے ہم ملک کی عورتوں اور بچوں میں بے حد مقبول ہیں اور کسی گھر میں ان کا ہونا خاندانی امارات کی نشانی تصور کیا جاتا ہے۔ میدانوں کی گرمی سے بچنے کے لیے ان کے لیے ایئر کنڈیشننگ کی سہولت بہت ضروری ہے۔

کسی نے ایورسٹ کے مشترکہ فاتح ایڈمنڈ ہلاری EDMOND HILLARY سے (جو کہ ان دنوں نیوزی لینڈ کی طرف سے ہندوستان میں قائم مقام سفیر ہیں) پوچھا تھا کہ آخر آپ کے ذہن میں ان اونچے اونچے پہاڑوں کو سر کرنے کا خبط کیوں سمایا رہتا ہے۔ اُن کا مختصر سا جواب تھا: کیوں کہ ایسے پہاڑ موجود ہیں!

اب لداخ کا پہاڑی علاقہ ہو اور ہمیں سر کرنے کا خبط نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہ کوہ پیمائی ہمیں نیپالیوں کی طرح لداخیوں کو بھی بطور شرپا (مزدور) روٹی روزی مہیا کرتی ہے۔ اہل لداخ کو سونم وینگیال جیسے سپوت پر بھی فخر ہے۔ جس نے دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا ہے۔ اور اس

(آگے ص ۱۹ پر)

نسیم [illegible] اللہ

جھوٹ بحیثیت ایک آرٹ

ممکن ہے اس عنوان پر اعتراض ہو۔ کہا جائے اسے یوں ہونا چاہیے : "دروغ گوئی بحیثیت ایک فن" لیکن ذرا ٹھہریے۔ اوّل تو یہ عنوان روایتی قسم کا ہو جائے گا۔ دوم جدت کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ ذرا الٹ پھیر ست قدیم کو جدید بنانا بھی ایک فن ہے۔ جھوٹ بحیثیت ایک آرٹ میں وہی لطف ہے جو ڈائننگ ٹیبل پر دستر خوان پھیلا کر انگلیاں چاٹ کر کھانے میں ہے۔

عاقلوں نے آرٹ کو نقل کہا ہے۔ کامیاب آرٹ وہی ہے جس پر آرٹ کا گمان نہ ہو —— دروغ کی فن کاری بھی یہی ہے کہ اس پر دروغ گوئی کا شبہ نہ ہو۔ دیگر فنون کی طرح اس فن کو بھی بلند مقام تک پہنچانے کے لیے قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام ہر ہما شما کا نہیں۔ جیسے مشاعروں میں شعر سنانے والا اور ترنم پر داد وصول کرنے والا ہر شخص شاعر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر دروغ گو فن کار نہیں ہوتا۔

دانشمندوں کا قول ہے سُنی سنائی باتوں پر بالکل یقین نہ کرنا، دیکھے پر نصف ایمان لانا۔ مگر فن کا کمال یہی ہے کہ عقل گم کر دے۔ جب تک ریڈیو کا زمانہ تھا، لوگ سنتے تھے، یقین نہیں کرتے تھے۔ ٹی وی کا زمانہ آیا تو عقلمندوں کی پیروی میں نصف یقین کرنے لگے۔ ایک ملک نے دعویٰ کیا کہ دشمن کے فلاں شہر پر قبضہ ہو گیا ہے۔ دوسرے ملک نے ٹیلی ویژن پر دکھا دیا، شہر کی ہر گلی، ہر شاہراہ پر اس کے سپاہی اس اطمینان سے چہل قدمی کر رہے ہیں جیسے جنگ کے میدان کے بجائے اپنی بیویوں سے دُور کسی تفریح گاہ میں سارے لوازمات کے ساتھ خوش گوار موسم کا لُطف اُٹھا رہے ہیں۔ لوگوں نے اپنے مُلک کے سپاہیوں کو دیکھا، نصف یقین کر لیا۔ باقی نصف کی کمی ان کی جذباتی وابستگی نے پوری کر دی اور فن پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ کیونکہ فن پارے کی بلندی اور جذبات میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اتنا کہ بسا اوقات تنقید نگار فنکار کو ڈبوتا جائے اور سمجھے کہ اُبھار رہا ہے۔ لوگ ٹیلی ویژن دیکھ کر مطمئن ہو گئے تو انکشاف ہوا کہ یہ فلم جنگ شروع ہونے سے پہلے تیار کر لی گئی تھی۔ ثابت ہوا عظیم دروغ گو بھی دیگر بڑے فن کاروں کی طرح اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے۔ وہ حال کے آئینے میں مستقبل دیکھ لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح اردو میں اچھے فن پاروں کی قدر ایک دور کے گزر جانے کے بعد ہوتی ہے۔ اسی طرح اس فلم کی تحسین کا زمانہ کچھ دیر سے آیا، لیکن جب وقت آیا تو سُود بھی وصول ہو گیا۔

ہمارے زمانے میں دروغ گوئی کی حیثیت سکۂ رائج الوقت کی ہے۔ جسے میں گھر کہتا ہوں دراصل کرائے کا ہے۔ مکان مالک نے گھر کی چابی دیتے وقت کہا تھا : "مجھے سو روپے زائد مل رہے تھے۔ لوگ مکان تلاش کرتے ہیں۔ میں شریف کرایہ دار ڈھونڈتا ہوں۔" بغیر سوچے سمجھے میری زبان سے نکلا "ذرّہ نوازی ہے۔ ورنہ شہر میں کون ہے جو آپ کی شرافت کا قائل نہیں۔"

شریف مالک مکان بھی قسمت ہی سے ملتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کرایہ کی جو رقم میں ادا کرتا ہوں کوئی اور دینے کو تیار نہ تھا۔ مختصر یہ کہ مکان لینے اور دینے میں ہم دونوں کی شرافت دُور دُور تک پیشِ نظر نہ تھی۔ برسات آئی۔ چھت ٹپکنے لگی۔ رات بھر موسلا دھار بارش ہوئی۔ میں خود کو میر کا ہم پلہ سمجھتا رہا۔ بیگم کے کہنے پر صبح دوڑا دوڑا مکان مالک کے ہاں پہنچا۔ بڑے خلوص سے ملے۔ خیریت پوچھی۔ میں نے کہا چھت بری طرح ٹپک رہی ہے۔ کہنے لگے مجھے سو روپے زائد مل رہے

• گورنمنٹ انٹر کالج، ڈاک خانہ چھپرہ (بہار) ۸۴۱۳۰۱

تھے۔ ہم دونوں کئی بار اپنی اپنی بات کہہ چکے تو
فرمانے لگے یہ کون سا مسئلہ ہے۔ دو تین روز
ٹھہرئیے۔ سیمنٹ میرے پاس ہے۔ مزدور بھیج
دوں گا۔ اطمینان کی دولت لیے واپس لوٹا۔ اس
سے قبل کہ بیگم کی زبان کھلتی۔ یہ خوشخبری سنا دی۔
چار پانچ روز گزر گئے۔ ان صاحب کی خدمت
میں پھر حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ خیریت
پوچھی۔ میں نے عرض کیا " چھت ہنوز ٹپک
رہی ہے۔ بولے کچھ دن اور ٹھہر جائیے۔ میرا خاص
مزدور ہے۔ بڑا ماہر ہے۔ یہ کام کسی اور سے نہیں
کرایا جا سکتا۔ ورنہ پیسے بھی صرف ہوں گے شکایت
بھی باقی رہ جائے گی۔

" چھت ٹپک رہی ہے۔" بار بار بیگم کہتی
رہیں اور میں مکان مالک کے یہاں تقریباً روزانہ
دوڑتا رہا۔ وہ مزدور بھیجنے کا وعدہ پورے خلوص
کے ساتھ کرتے رہے۔ آخری بار جب گیا تو تین
ماہ نکل چکے تھے۔ کہنے لگے اب تو برسات گزر گئی۔
آئندہ سال انشاء اللہ بارش شروع ہونے سے قبل
چھت مرمت کرا دوں گا۔ ایک دن کا تو کام ہے۔
میں گھر واپس آ گیا۔ بیگم تک بات پہنچا دی۔ وہ
خاموش رہیں۔ بڑا تعجب ہوا۔ کیوں کہ بیگمات کا
لگاتار بلا ضرورت بولتے رہنا میں حق زوجیت
میں شمار کرتا ہوں۔ میرے لیے بیویوں کی یہ خوبی
پہچان کی حیثیت رکھتی ہے۔ گھر میں بیگم نہ
ہوں تو ان کی جگہ ٹی وی، ریکارڈ پلیئر لے تو
لیتا ہے۔ مگر ایک نمایاں فرق باقی رہ جاتا ہے۔
یہ سب کے سب حسب خواہش خاموش ہو جاتے ہیں۔
اور انسان ایک خاص لطف سے محروم ہو جاتا ہے۔
بیگم چپ۔ رہیں اور میں دروغ گوئی کی عظمت
کا قائل ہو گیا۔ اب ذرا سوچیے اگر مکان مالک یہ
کہتے "رہنا ہے تو رہیں ورنہ کوئی اور مکان ڈھونڈ
لیں"۔ تو بات کس قدر غیر شریفانہ بلکہ غیر فن کارانہ
ہو جاتی۔ اب کون کافر دروغ گوئی کے فن پر
ایمان نہ لاتا۔ اس دن سے میرے تجربے کا یہ حصہ
بن گیا کہ دیگر فنون کی طرح اس فن کا تعلق بھی زندگی
سے بڑا گہرا ہے۔

فن نام ہے پوشیدہ رکھنے کا۔ دروغ
گوئی کے فن کا انحصار بھی سچ کے چھپا لینے پر ہے۔
اور یہ بغیر ریاضت کے ممکن نہیں۔ فن کار کی
طرح ہر فن پارے کی اپنی قسمت ہوتی ہے جس
ستارے کے زیر سایہ تخلیق ہوتا ہے۔ اثر دکھائے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے دفتر میں ایک صاحب
بلا درخواست دیے پانچ چھ روز سے غائب
تھے۔ بڑا چرچا رہا۔ دشمنوں سے زیادہ ان کے
مخلص دوست بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر
تھے کیا سزا ملتی ہے۔ بڑے صاحب سے سب
واقف تھے کہ وہ گرجتے ہیں اور برستے بھی۔
وہ حضرت حاضر ہوئے تو سر منڈا ہوا۔ آتے ہی
زار و قطار بہ آواز بلند رونے لگے۔ سب پوچھ
رہے تھے ہوا کیا؟ مگر وہ روئے چلے جا رہے
تھے۔ مشکل سے بولے۔ والد صاحب چھوڑ کر چلے
گئے۔ بڑے صاحب بھی کسی کے والد تھے ممکن ہے
خیال آیا ہو کیسا لائق بیٹا ہے۔ ایک ہمارا بیٹا ہے
میرے مرنے کے بعد فوراً ملنے والی رقم کا حساب
لگائے گا۔ بڑے صاحب چشمہ اتار کر آنکھیں
خشک کرنے لگے۔ شفقت سے ان صاحب
کے سر پر ہاتھ رکھا۔ کہنے لگے صبر کرو۔ انسان
صبر کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ دوستوں
کو بڑی مایوسی ہوئی سارے ارمان دھرے کے
دھرے رہ گئے۔ چار پانچ روز گزرے ایک
ضعیف آدمی تشریف لائے۔ چپراسی نے
سیدھے بڑے صاحب کے چیمبر میں پہنچا دیا —
صاحب نے پوچھا " آپ کون ہیں؟ "

جواب ملا فلاں میرا بیٹا ہے۔ صاحب
سنتے ہی ایسے خاموش ہوئے کہ دیر تک کچھ نہ بول سکے۔
مگر چپراسی ہر آدمی سے کہہ رہا تھا۔ بڑے صاحب
کے دفتر میں بھوت آیا ہے۔ فن پارے میں
کہیں سے کوئی کھوٹ نہیں۔ ہر زاویے سے بھرپور
مگر ستاروں کی گردش کو کیا کہیے۔ دس برسوں
سے ان کے والد کبھی دفتر نہ آئے تھے اور آئے تو
ایسے وقت پر۔

آنکھیں کھلی ہوں اور دماغ روشن تو
دروغ کے فن پارے ہر جگہ دیکھنے اور پرکھنے
کو مل جائیں گے۔

ایک صاحب اپنے اسکول کے دوست کو
فون کرنا چاہ رہے تھے جو قسمت کے چکر سے بڑا
آدمی بن گیا تھا۔ میں نے کہا آپ فون کریں۔
جواب میں کاغذ پر لکھ دیتا ہوں۔ انہوں نے ڈائل
گھمایا کاغذ الٹ کر دیکھنے لگے۔ بولے۔ کمال ہے۔
میں نے لکھا تھا اگر دوست مسلمان ہے' جواب
ملے گا باتھ روم میں ہیں اگر دوست ہندو ہیں تو
پوجا پر بیٹھے ہیں۔ پوچھنے لگے تم نے کیسے لکھ دیا
میں نے بتایا میں اس پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ بضد
ہو گئے۔ ٹاپک بتاؤ۔ میں نے کہا " جھوٹ
بحیثیت ایک آرٹ"۔ بڑے خلوص سے دریافت
کیا " ڈگری مل جائے گی؟" میں نے اطلاع
دی " لکھنے سے پہلے قبول ہو چکی ہے۔" وہ حیرت
کے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔ میں سمجھ گیا۔ ان
کا تعلق ہمارے یہاں کے تعلیمی اداروں سے دور
کا بھی نہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ اونچی ڈگریاں
حاصل نہیں کی جاتیں۔ عطا ہونے کی چیز ہے۔

ہر عقلمند آدمی حال میں جیتا ہے۔ ماضی
تو مر چکا' مستقبل کا کیا بھروسا۔ دروغ گوئی
کے فن کا ماضی چاہے جیسا بھی ہو' حال بڑا شاندار
ہے۔ آج کا ہر عظیم فن کار کمپیوٹر سے خائف ہے۔
کہیں وہ بہتر فن پارے تخلیق نہ کرنے لگے۔ مگر یہ
بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ دروغ گوئی
کا فن کمپیوٹر کے بس کا نہیں۔ وہ زمانہ دور نہیں
جب کمپیوٹر اور آدمی میں تمیز کرنے کے لیے صرف
یہی فن معاون ثابت ہو۔

● ●

نام کتاب : پتّیوں پر چھڑکاؤ (طنزیہ، مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مصنف : احمد جمال پاشا

قیمت : تیس روپے

ملنے کا پتہ : پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، نشاط افزا، سیوان، بہار

پتّیوں پر چھڑکاؤ احمد جمال پاشا کے طنزیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ کتاب بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے اور کتاب کو دیکھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ اکادمی کے مالی تعاون کا جائز استعمال کیا گیا ہے۔

کتاب پروفیسر وہاب اشرفی کے "حرفِ اوّل" سے شروع ہوتی ہے اور پروفیسر عبدالمغنی کے "حرفِ آخر" پر ختم ہوتی ہے۔ دونوں پروفیسر حضرات نے دل کھول کر پاشا صاحب کی تعریف کی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے انگریزی کے منفرد ادیبوں کے اقوال کے حوالے دے کر لکھا ہے کہ احمد جمال پاشا ایک اعلیٰ پائے کے طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان حالات میں مجھے اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھے مسلح پولیس افسروں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہو جو مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ اب بھی کچھ کہنے کا حوصلہ ہے تو بول۔

کہا جاتا ہے کہ لندن میوزیم میں ایک عورت نے ایک تصویر کو دیکھ کر اپنے خاوند سے کہا تھا کہ یہ تو نہایت معمولی تصویر ہے۔ میوزیم کا ڈائرکٹر جو کہیں پاس ہی کھڑا تھا بول اُٹھا "محترمہ، امتحان اس تصویر کا نہیں، آپ کی عقل و فراست کا ہے۔ آپ کو اگر یہ تصویر معمولی دکھائی دے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک آپ میں تصویر کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔" مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کے "حرفِ اوّل" کی روشنی میں اگر پاشا صاحب کی کتاب کے خلاف کچھ لکھوں گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ اچھے ادب کو پرکھنے کی صلاحیت مجھ میں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔

مقامِ شکر ہے کہ کتاب میں شامل مضامین کو پڑھ کر مجھے احمد جمال پاشا کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

احمد جمال پاشا کے مضامین میں جو چیز فوری طور پر متوجہ کرتی ہے وہ اُن کی بے ساختہ نثر ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی آمیزش اس طرح کی گئی ہے جیسے گرم کھچڑی میں گھی۔ انہیں پڑھتے وقت آپ کو محتاط رہنا پڑے گا۔ ورنہ اُن کے خوبصورت جملے دبے پاؤں نکل جائیں گے اور آپ کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔

ان کے کچھ جملے ملاحظہ فرمائیے:

"صدر کے سر پر سے پورا مشاعرہ گزر جاتا ہے مگر وہ آہ کرتا ہے نہ واہ۔"

"ابھی جنگ ہو جانے دیجیے اس کے بعد دنیا میں سوائے شرافت کے کچھ باقی نہ رہ جائے گا۔"

"شرافت دھوم دھام کی شے نہیں جس سے ایوانوں کو سجایا جا سکے۔"

اس طرح کے بے شمار جملے آپ کو کتاب میں ملیں گے آپ پر صرف اتنا لازم ہے کہ چوکس رہیں، پاشا کوئی خوبصورت جملہ آپ تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگائیں گے۔ اُن کو جو کچھ کہنا ہے بے ساختہ کہہ دیں گے۔

اسی کتاب میں ایک مضمون ہے: "کتاب کی جلد" اس مضمون میں اُنہوں نے ظرافت اور طنز کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے ہیں کہ اکیلا یہ مضمون اُنہیں ایک منفرد طنز نگار کی ڈگری دلا سکتا ہے۔ اس مضمون سے صرف ایک جملہ پیش کروں گا:

"مطالعہ ایک ذہنی عمل ہے جس میں قاری اور کتاب میں باقاعدہ کشتی ہوا کرتی ہے اور دونوں کی قلعی ایک دوسرے پر کھل جاتی ہے۔"

اگر پروفیسر وہاب اشرفی کا دھیان اِدھر اُدھر ہو تو میں کہنا چاہوں گا کہ اس کتاب میں دو ایک مضمون مجھے ایسے بھی لگے جیسے صفحات کی کمی کو پورا کرنے کے لیے شامل کیے گئے ہوں۔ جیسے "چمچہ کانفرنس" یا "گدھے کی شان میں ایک قصیدہ"۔ لیکن ۱۶۰ صفحے کی کتاب میں یہ مضامین کل دس صفحات پر قابض ہیں بس۔

میری دلی خواہش ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اردو کی کوئی کتاب ہاتھوں ہاتھ لی نہیں جاتی۔ اس لیے صرف یہ کہوں گا کہ اگر کسی قاری کو طنز و مزاح پر کوئی اچھی کتاب پڑھنے کا شوق ہے تو بلا کھٹکے اس کتاب پر ہاتھ ڈالے۔ اگر پیسے وصول نہ ہوں تو میرا اور احمد جمال پاشا دونوں کا ذمہ۔

دلیپ سنگھ

نام کتاب: عجیب و غریب جانور

مصنف: محمد خلیل قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

موجودہ دور میں سائنس ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے اور زندگی کے کسی شعبے کو بھی سائنس سے بے نیاز نہیں کہا جا سکتا۔ سائنس کی ترقیاں اور فطرت پر اس کی تسخیر کا عمل مسلسل جاری اور ساری ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس دور کو سائنس کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

ان حقائق کے پیش نظر بچوں کو سائنس سے روشناس کرانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کے لیے سائنسی کتابیں لکھی جائیں جو ان میں سائنسی مزاج پیدا کر سکیں۔ چونکہ جانوروں کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس طرح بچے جانوروں کی زندگی کی بہت ساری اچھی باتوں کو پڑھ کر کچھ کرنے اور سوچنے پر مجبور رہوں گے۔ یہی اس کتاب کا اصل مقصد ہے۔

اردو میں بچوں کے لیے سائنسی کتابیں کم یاب ہیں۔ اور ایسی کتابوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جو ان کے اندر سائنسی مزاج پیدا کر سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں جانوروں کا انتخاب خوب کیا ہے۔ سارے جانور عجیب و غریب خصوصیات کے حامل ہیں۔ کتاب کا سائنسی مواد حقائق پر مبنی ہے۔ اس سے مصنف کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے اور اس میں انہیں کامیابی ملی ہے۔

کتاب بچوں کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ بہت کم لوگ چیونٹی کے بارے میں جانتے ہیں۔ اسی طرح بیور، ہاتھی اور کستوری ہرن بھی بچوں کو راغب کیے بغیر نہیں رہتے مثلاً:

"ہاتھی بہت ذہین ہوتا ہے اور وہ جس چیز کو ایک بار دیکھ لیتا ہے پھر وہ کبھی نہیں بھولتا۔"

"بیور کے پرانے مکانات اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ آدمی بھی انہیں توڑ نہیں سکتا۔"

"جس طرح ہم زیادہ بولنا اچھا نہیں سمجھتے، اسی طرح کستوری ہرن بھی اس کا پابند ہے اور کم بولتا ہے۔"

کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہونے پر بھی پڑھنے والوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ تصویریں بھی کتاب کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے۔ جانوروں کی اچھی باتوں کو مصنف نے اس طور پر بیان کیا ہے کہ اردو داں بچے انہیں اپنی زندگی میں اپنا سکیں۔ اور اس طرح پاپولر سائنس کا ایک اہم مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

سید ظہور قاسم

نام کتاب: **موسم زرد گلابوں کا**
مصنف: شاہد میر
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: نکھار پبلیکیشن، مئو ناتھ بھنجن (یو پی)

"موسم زرد گلابوں کا" جناب شاہد میر خاں صدر شعبۂ علم نباتات، گورنمنٹ کالج بانسواڑہ (راجستھان) کا مجموعہ کلام ہے۔ جناب شاہد میر نہایت کم سخن، لیکن حلیم طبع، خوش مزاج اور دوست نواز شخص ہیں۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی ہے۔ دوسروں کی گفتگو بہت غور سے سنتے ہیں۔ دخل در معقولات بالکل نہیں کرتے۔

علم نباتات کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے موسیقی سے بھی شغف پیدا کیا۔ آوازوں اور نغموں سے جناب شاہد میر ایک فن کار کی حیثیت سے محظوظ اور متاثر ہوتے ہیں۔ یہ وہ امتیازات ہیں، جنہوں نے ان کو شاعر بنا دیا۔ ایسا شاعر جس کے کلام کی تاثیر دلوں کو اور معنویت دماغوں کو مسحور کرتی ہے۔

جناب شاہد میر نے اپنی شاعری کو غزل تک محدود رکھا ہے اور غزل بھی وہ جس میں اصول و ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے۔ پورے مجموعے میں صرف دو غزلیں ایسی ہیں، جن میں ردیف نہیں ہے۔ ایک غزل ایسی ہے جس میں پانچ لفظی ردیف اختیار کی گئی ہے۔ گیارہ غزلوں میں ردیفیں تین لفظی ہیں۔ باقی غزلوں میں اگرچہ ردیفیں مختصر ہیں، لیکن بیشتر آسان نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو مطلعے دیکھیں:

مقابلہ تھا ہواؤں سے جنگ کی صورت
میں اپنی ڈور سے ٹوٹا پتنگ کی صورت

لہو کے پھول کھلے گاہ گاہ صحرا میں
یہ واقعات ہوئے گاہ گاہ صحرا میں

ایسی پابندیوں کے ساتھ شعر کہنے اور ایسے شعر کہنے جو جدید دور کے جدید مزاجوں سے بھی ہم آہنگ ہوں، بڑی مشکل بات تھی۔ لیکن جناب شاہد میر نے اس نہایت مشکل کام کو بھی اپنے لیے آسان کر لیا۔ وہ بے ضرورت شعر موزوں کرنے کے قائل بھی نہیں۔ اسی لیے ان کا کلام جدید تشبیہات و استعارات ہی سے مزین نہیں ہے بلکہ مؤثر اور دل کش بھی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام پر مشاعروں ہی میں واہ واہ نہیں لوٹی ہے بلکہ سخن سنجوں کی محفلوں میں بھی خراج تحسین وصول کیا ہے۔

عام طور سے زردی کو خزاں کا رنگ خیال کیا گیا ہے۔ لیکن عرصہ ہوا جوش اور متعلق علوم کے ایک ماہر نے راقم کو بتایا تھا کہ یہ ترقی کا رنگ ہے۔ پھر خیال آیا کہ واقعی: ع

ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں

پت جھڑ کے بعد ہی درختوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اور زردی ہی سرسبزی و شادابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جناب شاہد میر نے اپنے اس پہلے مجموعے کا نام: "موسم زرد گلابوں کا" مقرر کیا ہے۔ یہ نام بہت مبارک ہے۔

محمد انصار اللہ

نام کتاب: **صدائے باز گشت**
مصنف: ڈاکٹر قیام الدین احمد
قیمت: ۱۵ روپے
ملنے کا پتہ: امتیاز احمد، لیکچرار شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۵

تاریخ نویسی بلاشبہ ایک اہم ذمہ داری ہے۔ تصنیف و تالیف کے نقطۂ نظر ہی سے نہیں، بلکہ علمِ تاریخ کے تقاضوں کے لحاظ سے بھی۔ کسی بھی ملک و قوم کے ماضی اور حال کے واقعات، حالات و کیفیات کو منصبی ایمان داری کے ساتھ قلم بند کرنا دیدہ وری ہی کا نہیں، بلکہ اعلیٰ ظرفی کا بھی امتحان ہوتا ہے، اس کے لیے بصیرت درکار ہوتی ہے اور جسارت بھی۔ پھر اس کی بازگوئی یا بازیافت کے ذریعے نئی نسلوں تک تاریخی حقیقتوں اور شواہد کو معتبر ماخذوں اور حوالوں کے ساتھ بلا کم و کاست پیش کرنا بھی کچھ کم اہم کام نہیں۔ جس میں ہو سکتا ہے عظمتوں کے مینارے بھی ہوں اور کہیں کہیں پستیوں کے غار بھی، مگر کسی ملک و قوم کو اپنے ارتقا کے سفر میں کن معرکوں اور انقلابوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی زندگی کے مد و جزر کا رُخ کیا تھا۔ افراد یا جماعتوں کے مزاج اور ان کے رویّے کیا اور کیسے رہتے ہیں۔ کس پر وہ محرکات کیا رہے ہیں، انجام کار نتائج و عواقب نے کس طرح کروٹیں لیں اور آج تازہ صورتِ حال کیا ہے ان سب باتوں پر نظر رکھنا اور قلم اُٹھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ہندوستان ایک قدیم، وسیع و عریض مُلک ہے۔ صدیوں سے یہاں فردی اور جماعتی زندگی کیز الالعباد رہی ہے۔ اس کی ایک عظیم تاریخ ہے، ایک عظیم تہذیب ہے، مختلف وجوہ سے، مختلف حصّوں میں، مختلف تقاضے و محرکات کارفرما رہے ہیں۔ انگریزوں نے مخصوص مقاصد کے تحت اُنہیں مسخ کرتے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ آزادی کے بعد ہمارے مُلک میں قومی دَور شروع ہوا۔ اب ہماری مشترکہ اور مقدّس ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی تاریخ، اپنی تہذیب کو اپنی آنکھوں سے اپنے آئینوں میں دیکھیں اور سمجھیں۔ اس لیے اس نئے قومی دَور کے مورخین و مفسّرین کا کام ان کا اپنا ذاتی شغف ہی نہیں بلکہ سب کا ملا جُلا اور قومی کام بن جاتا ہے، اس لیے پورے وقوف و ادراک، انہماک، تحقیق و ایمان دارانہ تعارف و تجزیہ ہے۔ اس مقدس فریضے سے عہدہ برا ہونا چاہیے۔ "صدائے بازگشت" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ خاصی دل چسپ ہے اور اہم بھی۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے انہیں مندرجہ ذیل حصّوں میں مرتب کیا گیا ہے۔

(ا) مورخ اور تاریخی ماخذ (ب) شخصیاتی خاکے، صوفیا، بادشاہان اور امرا (ج) تاریخی آثار (د) بیرونی سیاح اور ہندوستان (ہ) جنگِ آزادی کی داستان (و) مذہبی و قومی یکجہتی

ان متفرقات پر جیسا کہ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے مقالے بہت مختصر ہیں۔ کیوں کہ ریڈیو کے اندر محدود وقت کے اندر نشر کیے گئے ہیں، مگر کیا ہی اچھا ہوتا اگر انہیں کتابی صورت میں پیش کرتے وقت مناسب حد تک ضروری تفصیلات سے بھی مزیّن کیا جاتا تو تشنگی کی لَے کم ہو جاتی اور خود کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ یوں تو تقریباً سارے مضامین ہی اہم ہیں۔ مگر ان میں امیر خسرو بحیثیت مورخ، نور جہاں اور جہانگیر کا عشق تاریخ کی کسوٹی پر، پٹنہ کی تاریخی یادگاریں، غیر ملکی سیّاح اور ہندوستان۔ ابنِ بطوطہ، ریشمی خطوط تحریک، سہسرام ایک نئے انتظامی دور کی تجربہ گاہ اور نہرو و عالمی امن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نام کتاب : لمحوں کا سفر
مصنف : نذیر فتح پوری
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : اساق پبلی کیشنز۔ ۲، ۵۔ ساپا پیرا اسٹریٹ پونہ ۱

نذیر فتح پوری کا نیا شعری مجموعہ "لمحوں کا سفر" دراصل نئی غزل کے اس نئے موڑ سے شروع ہونے والے سفر کے گھر کی صداؤں کا حصّہ ہے۔ جہاں سے نئی غزل ہر قسم کی خود ساختہ کیفیتوں، غیر حقیقی محسوسات اور خام وارفتگی و مصنوعی شوریدہ سری کی فیشن زدہ اداؤں سے آزاد ہو کر، فطری اور حقیقی شعور و ادراک کے بے ریا شعری اظہار کے ثقہ پیکروں اور سنجیدہ پیراہنوں سے آراستہ ہو کر فکر و نظر کی سوغات کی منتظر نئے افقوں کی سمت رواں دواں ہوتی ہے۔

"لمحوں کا سفر" ایک ذہنی فن کار کے فکر و احساس کی ندرتوں، جدتوں، تجربات و مشاہدات کے دائروں اور جزیروں پر محیط ہے۔ جس کی نظر زبان و بیان کے قرینوں کی روایات سے پوری طرح بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ شعری لسانیات و جمالیات کے نئے مزاجوں اور لفظ و معنیٰ کے بے صوت و صدا خطوط سے حرکیات و جدلیات کی وضاحتوں کے نئے امکانات کی بشارت بھی دیتی ہے۔

میں نے "لمحوں کا سفر" کا بڑی دل چسپی سے مطالعہ کیا ہے اور پوری ذمہ داری سے کہنے کے لیے تیار ہوں۔ کہ نذیر فتح پوری بڑی صلاحیتوں کے شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اپنے فن کے ہیروں کی تراش خراش اور اُن کی آب و تاب نکھارنے میں بڑے خلوص اور انہماک سے ریاضت کی ہے اور زندگی کے مسائل و معاملات کو بشری تقاضوں اور نفسیات کو نئے زاویوں سے دیکھنے، پرکھنے اور احساسات و تاثرات کو ایک نیا Treatment دینے کی کوشش کی ہے۔ خاص کر نئی پہنائیوں کے استعاروں اور علائم کی وساطت سے اُنہوں نے عرضِ ہنر کا جو سلیقہ پایا ہے وہ یقیناً ایک ایسا تہہ دار اور معنی آفرین سلسلۂ گفتگو ہے جو نئی غزل کے موضوعات کی زرخیزیت اور پیرایۂ بیان کی شگفتگی و شادابیت کا مظہر ہے۔

اُن کا یہ کہنا سچا و برحق ہے ؎

لفظ، مضموں، متن ہے اپنے پاس
بات کہنے کا فن ہے اپنے پاس

نام کتاب : آوارہ لکیریں
مصنف : جوہر صدیقی قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : ڈی ۲۸/۸ پانڈے حویلی، وارانسی

"آوارہ لکیریں" جوہر صدیقی کی منتخبہ غزلوں کا
...عہ ہے۔ اس کے مطالعے سے جوہر صدیقی کی شخصیت
...ر شاعری کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگایا جاسکتا
ہے۔ ادب اگر زندگی کا آئینہ ہے تو فن پارے بھی
...ی حد تک فن کاروں کی ذات اور شخصیت کے
...ئینہ دار ہوتے ہیں۔ جوہر صدیقی ایک پختہ کار اور
...ینہ مشق شاعر ہیں جن کو سخن وری ورثے میں ملی ہے۔
...ن کے ہاں کلاسیکی شاعری کی رمزیت اور ایمائیت
...ک اساسی قدر کی حیثیت سے نمایاں ہے۔ بنارس
...یسے تہذیبی مرکز میں انہوں نے غزل کی شمع روشن
...ی ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں تجربات کا تنوع نہیں
...ے۔ اظہار کے جدید قرینے سے بھی کم ہی بار پائے
...ب، لیکن یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ وہ غزل کی تہذیب
...ے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔

جوہر صدیقی کے مضامین گو کہ غزل کی مانوس
...نیاؤں سے اپنے ہیں لیکن ان میں عصریت کا شعور
...ی جھلکتا ہے۔ کبھی واردات کی صورت تو کبھی تجربے
...نکل میں، لیکن معنی خیز انداز میں۔

جوہر صدیقی کا مخصوص لب و لہجہ، مخصوص
...ے و آہنگ جس شعری رویے اور شعری فضا
...مل کر نمایاں ہوا ہے، اُسے جدید کلاسیکیت سے
...بیر کیا جاسکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

...ہیں خشک پتوں پہ تذکرے ہیں لکھوں گا تازہ بہار کے
...ری کائنات تباہ ہیں ابھی تازگی سے کہیں کہیں

بھر دے جام و سبو آخر ہماری پیاس نے
ہم بنامِ تشنگی دریا دلی لے آئے ہیں

آؤ آئینۂ تہذیب نظر میں دیکھو
زلف نے جلوے بکھیرے ہیں پریشاں ہو کر

کوئی طرزِ دل نوازی تھا نہ رنگِ برہمی
اس کی خاموشی مجھے پھر جانے کیوں یاد آئے ہے

اس کے ساتھ ساتھ 'آوارہ لکیروں' کا تموج
احساسات اور جذبات کی چھوٹی بڑی وادیوں سے
گزر کر غزل کے دیارِ رنگ و بُو تک پہنچتا ہے تو
اس کی سُرمئی فضا میں جگنوؤں کی طرح بعض اچھے
شعر بھی جگمگاتے ہیں۔

پروفیسر حکم چند نیر کی یہ بات، جو انہوں نے
اس مجموعے کے پیش لفظ میں کہی ہے، بڑی حد تک
صحیح معلوم ہوتی ہے کہ غزل کی قدیم روایت کے مخصوص
رنگ و آہنگ کا یہ طرز آج بھی قائم ہے اور جناب
جوہر صدیقی کا مجموعۂ کلام 'آوارہ لکیریں' اس کی ایک
اچھی مثال ہے۔

ابوالفیض سحر

نام کتاب: **نوائے شوق**
مصنف: صابر ابوہری
قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر،
راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جناب صابر ابوہری نے اپنے تخلیقی سفر
میں "نوائے جنوں" سے "نوائے شوق" کی منزل تک
پہنچتے پہنچتے طویل اور مسلسل ریاض سے اپنے اسلوب
اور اندازِ بیان کو جس طرح خوب سے خوب تر کر کے
مدارج تک لانے کی سعی کی ہے۔ اس کا اندازہ اس
کے اس دوسرے شعری مجموعے سے بخوبی
ہو جاتا ہے۔ اپنی درویشانہ جبلّت اور مخصوص
فکری رویے کے باوجود اُن کی افتادِ طبع نے اس
بار شاعری کی جن نئی جہتوں کو چھوا ہے، اس سے ان
کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔

اس مجموعے میں شامل معریٰ نظمیں موضوع
کے اعتبار سے نہ صرف صابر صاحب کے کلام کو بوقلمونی
عطا کر رہی ہیں۔ بلکہ ان کی شاعری میں جدید رجحانات
کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ان کی نظم 'سپیرا' اپنے منفرد
انداز کے ساتھ دورِ حاضر کے فنی لوازمات کو بڑی خوبصورتی
سے اپنے جلو میں لیے صابر صاحب کے شعری کردار میں
نئے عناصر کے در آنے کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس طرح
"آغاز و انجام" بھی زمان و مکان کی لامحدودیت
کو اپنے محدود دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اُن کی
کچھ اور نظمیں مثلاً "شہر کی گلیاں" اور "خوش بینی" بھی
اُن کے نئے فکری زاویوں کی آئینہ دار ہیں۔

جناب صابر ابوہری نے اپنی اس کتاب میں
"انسان دوستی" "تصوّف" "ویدک فلاسفی"
اور "وطن پرستی" جیسے اپنے محبوب موضوعات سے
بھی ناانصافی نہیں کی۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "نوائے
جنوں" میں بھی روحانیت، وطنیت اور انسانیت
ان کے اہم شعری محرکات رہے ہیں۔ دراصل وہ
انہیں اقدارِ حسنہ کے علمبردار شعراء جیسے اقبالؔ،
مولانا روم، شیخ سعدیؔ، کیٹس اور ورڈز ورتھ
سے متاثر ہیں اور اپنی شاعری میں بھی انہیں کی طرزِ
فکر سے استفادہ کیا ہے۔

اپنی کتاب کی شروعات انہوں نے دُعا،
سپاس اور مناجات سے تو کی ہی ہے۔ اس کے ساتھ
ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے حضور میں انتہائی خلوص کے ساتھ گلہائے عقیدت
پیش کر کے اور بھگوت گیتا کی تعلیم کو نظم میں قلمبند کر کے اپنی
مذہبی رواداری اور قلندرانہ سرشت کا پتہ دیا ہے۔

جناب صابر ابوہری کی غزل کا مزاج بھی نہ تو
بہت زیادہ روایت سے جُڑا ہوا ہے اور نہ ہی کٹا ہوا
ہے۔ اُن کا عرفان اُن کے اشعار میں کہیں کہیں اعتماد
کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ جیسے یہ عالمِ رنگ و
بُو اور اسرارِ قدرت اُن کے شعور کی دسترس میں ہوں
فکری تہہ داریوں کے باوجود اُن کے کلام میں انتہائی
سادگی اور سلاست ہے۔ سہلِ ممتنع کو اُن کے کلام
کی اوّل خصوصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُن کی شاعری
میں رجائیت کا رنگ شاید اُن کی صوفیانہ فطرت اور
ویدک تعلیمات کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس
مجموعے میں شامل قطعات صابر صاحب کے جذبۂ حب الوطنی
کے آئینہ دار ہیں۔ کتاب کے آخر میں صابر صاحب کا کچھ
فارسی کلام بھی درج ہے۔

ہیرانند سوز

قابلِ قدر :

ماہ نامہ آج کل کے دو شمارے ستمبر اور اکتوبر ۱۹۸۰ء کے ایک ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ حسب روایت دونوں شماروں کے متعدد مضامین بہت پسند آئے۔

خاص طور پر ستمبر کے شمارے میں پروفیسر گیان چند جین کا "ترانۂ ہندی کی کہانی" مواد اور تحقیق کے لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے۔ چونکہ اس موضوع پر خود میں نے کام کیا ہے۔ اس لیے مجھے اس مضمون کی اصل خوبیوں کا صحیح اندازہ ہے۔ اس میں بعض ایسی معلومات ہیں، جن سے بہت سے محققین اور بعض ماہرین اقبال کو غالباً پہلی مرتبہ علم ہوا ہوگا۔

اکتوبر کے شمارے میں بھی حسب معمول کئی مضمون قابلِ ذکر ہیں۔ ابھی حال میں ظفر پیامی صاحب کا ایک دل چسپ اور اپنی نوعیت کا ایک منفرد ناول "فرار" بڑی توجہ اور دل چسپی سے پڑھا تھا۔ اس لیے ان کے مختصر افسانہ 'واپسی' کو بہت شوق سے پڑھا۔ اردو میں سفرنامہ کی روایت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ مگر نشیش بترا صاحب کے سفرنامے کے سلسلے میں ایک نئی جہت اور ایک نیا انداز نظر آیا۔ قدیم لیبیا سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ امید ہے کہ میری طرح 'آج کل' کے دوسرے قاریوں نے بھی اسے دل چسپی سے پڑھا ہوگا۔ قیصر زیدی مرحوم ہمارے حلقے سے تعلق رکھتے تھے اور میرے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ میں ان سے ۱۹۴۳ء سے، جب وہ جامعہ کے مدرسہ ثانوی میں تشریف لائے، ان کی وفات تک بہت قریب سے واقف ہوں۔ اس لیے قدرتی طور پر میں نے ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب اور پروفیسر انور صدیقی صاحب کے مضامین تنقیدی نظر سے دیکھے۔ انصاری صاحب نے شخصیت نگاری کے لیے ایک مخصوص اسلوب اختیار کیا ہے، جو خاصا دل چسپ ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مرحوم کی سیرت اور ان کے خصوصی حقوق پر اچھی روشنی ڈالی ہے مگر قافیہ پیمائی اور طنز نگاری کا بُرا ہو۔ ان کے مضمون کے پہلے جملے پر: "اے ہوش مندو لوگو! اگر تمہاری ہوش مندی میں قبل از وقت فتور نہیں آگیا ہے تو بچو قیصر زیدی کو اپنا آئیڈیل بنانے سے ——"
ایک دوست نے فوراً اضافہ کیا: "اور عبرت پکڑو ان کی ناکام زندگی سے ——"

اسی طرح جب دوسرے پیرے پر نظر پڑی: "قیصر صاحب کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے سرِراہ انتظار کرنا پڑتا تھا" تو ان ہی دوست نے اس فقرے کو یوں مکمل کیا: "اور میں نے ان کو اس وقت دیکھا جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوئے، ریٹائر ہوئے اور اس دنیا سے شکایتوں اور ناکامیوں کا انبار لے کر رخصت ہوئے۔"

انور صدیقی صاحب کا ایک طویل عرصے تک مرحوم سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کی زندگی میں ان کی شاعری اور شخصیت پر انہیں لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی وفات کے انہوں نے اس کی تلافی کر دی۔ خود انور صاحب جہاں ایک اچھے تنقید نگار ہیں، وہاں ایک اچھے تخلیق کار بھی ہیں۔ کم کہتے ہیں، مگر خوب کہتے ہیں۔ کبھی تعمیر پسند حلقے سے تعلق رکھتے تھے مگر اب "حلقہ بندیوں" سے آزاد ہو گئے ہیں، لیکن دوست نوازی اب بھی ان کا شیوہ ہے، ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کے قلم سے کسی دوست کے نازک احساس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں بھی دوست نوازی کو نبھانے کی پوری کوشش کی ہے، مگر ایک جگہ انہوں نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مبالغے سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں: "ان کا تعلق اس دور کے بڑے تخلیقی فن کاروں سے رہا ہے مثلاً: جگر بسوانی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، احسن مارہروی، بیخود دہلوی، بہزاد لکھنوی، سراج لکھنوی، نوح ناروی، جگر مرادآبادی" وغیرہ موصوف نے اردو شاعری کے چاند تاروں کا نام لکھتے وقت یہ بھی خیال نہیں کیا کہ ان میں سے بیشتر ممتاز اساتذہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ قیصر زیدی صاحب نے ان سے زیادہ سے زیادہ اور کسی حد تک استفادہ کیا ہوگا اور بعض سے تو اس کی بھی نوبت نہ آئی ہوگی۔ کیوں کہ قیصر صاحب نے ایم اے ۱۹۴۵ء میں کیا تھا۔ اور احسن مارہروی کا ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو اور ثاقب لکھنوی کا ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو انتقال ہو گیا تھا۔

عبداللطیف اعظمی، نئی دہلی

معیاری :

ستمبر ۱۹۸۰ء کا شمارہ ہم دست ہوا۔ تمام ہی شمولات معیاری ہیں۔ من کہ کا سلسلہ خوب ہے۔

عزت مآب سید مظفر حسین برنی صاحب کا مشمولہ مضمون "عربی زبان و ادب میں ہندوستانی علما کا حصہ" بہت ہی بہتر ہے۔ یوں تو اس سلسلے میں کافی تحقیقاتی کام ہوئے ہیں اور ابھی تک اس کی طرف پیش رفت جاری ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد

(آگے صفحے پر)

ترتیب

ستاروں سے آگے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، لیکن اُن تک رسائی صرف اُن قوموں کو حاصل ہوتی ہے جو زمین سے اُٹھتی ہیں اور افلاک پر کمندیں ڈالتی ہیں۔ حکومتِ ہند کے رہنماؤں نے خواہ وہ جواہر لال تھے، اندرا جی تھیں یا راجیو گاندھی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں دوسری اقوام کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کا تو یہ عقیدہ ہے کہ ہمیں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ دوسری اقوام سائنس اور ٹکنالوجی کے جو تجربات کر چکی ہیں انہیں اپنے ہاں دُہرانا نہیں چاہیے۔ جدید ترین علم سے بہرہ ور ہو کر ترقی اور تحقیق کے عمل میں اُن کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھنا چاہیے۔

حکومتِ ہند کے اسی ترقی پسندانہ نظریہ کا ثمرہ ہے کہ ایٹمی توانائی ہو یا غیر روایتی توانائی کے وسیلے، سمندر کی پہنائیاں ہوں یا آرکٹیکا کے برف پوش اسرار، ہوا ہو یا خلا۔ سمندر کے اندر ہو یا خشکی پر تیل کی تلاش ہندوستانی سائنس داں اور ماہرین کسی بھی شعبے میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے پیچھے نہیں ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں جنہیں ہمارے ساتھ ہی آزادی ملی تھی، ہندوستان ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ کئی شعبے ایسے ہیں، جہاں ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ اور انہیں اپنی ترقی و تحقیق کے نتائج سے فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

حال ہی میں ہندوستان کی ان کوششوں میں ایک اور خوشنما پر کا اضافہ ہوا ہے۔ جب ۱۷ اگست ۱۹۸۷ء کو اقوامِ متحدہ کے سمندر کے نیچے زمین سے معدنیات کی تلاش کے محکمے نے بحرِ ہند کے وسط میں کان کنی کے لیے ایک میدان ہندوستان کو مخصوص کرنے کی درخواست کی منظوری دے دی۔ ہندوستان پہلا ملک ہے، جسے کھوج اور ترقی کے لیے ڈیڑھ لاکھ مربع کلومیٹر کا یہ رقبہ دیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقوامِ متحدہ نے جانچ اور کھوج کرنے کی ہندوستان کی صلاحیتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ سمندر کی تہہ میں تانبے، کوبالٹ، نکل اور مینگنیز کے بھاری ذخیروں کی موجودگی کا امکان ہے۔

جدید علوم کا ایک شعبہ خلا کی تحقیق اور خلا کے وسیلوں کا پُرامن مقاصد کے لیے استعمال ہے۔ ہندوستانی سائنس داں اس علم میں جدید ترین معلومات سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ ملک میں خلائی تحقیق اور قومی ترقی کے لیے اس کے استعمال کے مقصد سے آج سے ۲۵ برس پہلے خلائی تحقیق کی ہندوستانی تنظیم کے نام سے ایک ادارہ "اسرو" قائم کیا گیا، جس نے ترویندرم میں اکویٹوریل ..... راکٹ لانچنگ سٹیشن ۱۹۶۷ء میں قائم کیا۔ یہ نہایت معمولی نوعیت کی تھی جس میں بادلوں کی جانچ کے لیے صوتی راکٹ داغے جاتے تھے۔ ان راکٹوں کو چھوڑنے اور اُن کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے وہاں صرف چند افراد تعینات تھے۔ لیکن ان چوبیس برسوں میں اس تنظیم کی سرگرمیوں میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ آج اس تنظیم میں دس ہزار سے زیادہ سائنس داں اور جدید ٹیکنالوجی کے ماہر ملازم ہیں۔ جو ترویندرم کے وکرم سارا بھائی خلائی مرکز، سری ہری کوٹہ کے "سحر" مرکز، بنگلور کے اسرو سٹیلائٹ سینٹر اور احمد آباد میں واقع خلائی وسیلوں کے استعمال کے مرکز میں کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ احمد آباد میں طبعی تحقیق کی تجربہ گاہ اور سکندر آباد میں ریموٹ سینسنگ ایجنسی قائم کی گئی ہے۔ یہ دونوں تحقیقی ادارے محکمہ خلا کی مالی امداد سے اس کے زیرِ اہتمام کام کرتے ہیں۔

یہ تمام ادارے مصنوعی سیارے اور راکٹ تعمیر کرنے اور انہیں خلا میں داغنے کی سہولیات کے لحاظ سے خود کفیل بنانے کے لئے لگاتار کام کرتے آ رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں آریہ بھٹ، ۱۹۷۹ء میں بھاسکر، ۱۹۸۰ء میں آر ایس اول، ۱۹۸۱ء میں آر ایس ڈی اول اور ۱۹۸۱ء میں ہی ایپل نام کے مصنوعی سیارے خلا میں داغے گئے۔ ان تمام مصنوعی سیاروں کا نمونہ ہندوستان میں ہی تیار کیا گیا اور ان کی ساخت بھی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ گزشتہ سترہ برسوں میں اس کے علاوہ مصنوعی سیارے چھوڑنے کی دو گاڑیاں ایس ایل وی ۳ میں ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۳ء میں نہایت کامیابی سے خلا میں بھیجی گئیں۔ آریہ بھٹ اور بھاسکر نام کے مصنوعی سیارے روسی اڈوں سے روسی راکٹوں کے ذریعے چھوڑے گئے۔ لیکن آر۔ ایس۔ اوّل سیارہ پہلا مصنوعی سیارہ ہے جو ایس ایل وی ۳ کے ذریعے ہندوستان کی سرزمین سے ایک ہندوستانی راکٹ کے ذریعے مدار میں پہنچایا گیا۔

زمین کے مدار میں معلق رہ کر مواصلاتی خدمات مہیا کرنے والا پہلا تجرباتی سیارہ ایپل جون ۱۹۸۱ میں یورپین خلائی ادارے کے راکٹ سے فرانسیسی گی آنا میں سے چھوڑا گیا۔ اس کے بعد روہنی نام کے مواصلاتی سیارے آسمان میں پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ روہنی آر ایس ڈی ۲ کو ہندوستان میں تیار کردہ راکٹوں کے ذریعے خلا میں

پہنچایا گیا جنہیں ایس ایل وی ۳ کہا جاتا ہے۔ اسی دوران بھاسکر دوئم مصنوعی سیارہ بھی کامیابی سے خلا میں پہنچایا گیا۔

چھٹے منصوبے کی کامیابیاں

چھٹے منصوبے میں ملک میں کی جانے والی خلائی تحقیق پر ۱۲۳ کروڑ ۶۷ لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا۔ بھاسکر دوئم اور ایپل پراجیکٹوں کی کامیابی کے بعد ملک مواصلاتی مصنوعی سیارے تیار کرنے اور دور سے زمین اور سمندر میں کھوج کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے — ان سیاروں سے حاصل ہونے والی اطلاعات و معلومات کو زمین پر جمع کرنے اور استعمال کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی ہے۔ زمین سے خلا میں سیارے پہنچانے کے لیے سٹیلائٹ لانچ وہیکل تیار کرنے کے کام میں بھی کافی ترقی ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں ایس ایل وی ۳ کی تیاری ایک اہم مرحلہ تھی جو پی ایس ایل وی کے اعلیٰ راکٹوں کی تیاری کے پراجیکٹوں میں بہت مفید ثابت ہوگی۔

مصنوعی سیارے چھوڑنے کے زمینی انتظامات، مصنوعی سیاروں کا تعاقب کرنے، ان سے پیغامات وصول کرنے اور کنٹرول رکھنے کی سہولیات پیدا کرنا خلائی تحقیق کے قومی پروگرام کا اہم حصہ ہیں۔ چھٹے منصوبے میں یہ سہولیات پیدا کرنے میں بھاری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آریہ بھٹ، ایس ایل وی، روہنی، بھاسکر اور ایپل سلسلے کے مصنوعی سیاروں نے سیارے داغنے اور اُن پر قابو رکھنے کے قومی پروگرام میں بیش قیمت تجربات مہیا کیے ہیں۔ خلائی سائنس کے شعبے میں کئی راکٹ داغے گئے ہیں۔ اور غباروں یا زمین سے تجربات کیے گئے ہیں۔ اس طرح چھٹے پانچسالہ منصوبے میں قومی ترقی اور خود کفالت کی ترجیحات کی بنیادوں کے مطابق خلائی پروگرام کے متعدد شعبوں میں صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔

اس دوران کچھ ناکامیاں بھی پیش آئیں۔ کچھ راکٹ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں ناکام رہے اور کچھ بیش قیمت مواصلاتی سیارے تباہ ہوئے، لیکن سائنس کی دنیا میں تجربات کی ناکامی بھی ماہرین کے علم میں اضافہ کرتی ہے اور ان کے تحقیقی پروگراموں کو ان ناکامیوں سے فائدہ پہنچتا ہے۔

انسیٹ اوّل بی

مذکورہ بالا تجربات کی بنا پر سب سے بڑی کامیابی اکتوبر ۱۹۸۳ء میں مصنوعی سیارہ انسیٹ اول بی کی کامیابی سے مدار میں پہنچانے اور اسے مواصلاتی کاموں کے لیے کامیابی سے استعمال کرنے کی صورت میں حاصل کی گئی۔ یہ مصنوعی سیارہ اب قریب چار برس سے مدار میں کام کر رہا ہے۔ اس سیارے سے تصویریں، پیغامات، نشریات اور ٹیلی کاسٹ کی چاروں خدمتیں بڑی کامیابی سے استعمال میں لائی جا رہی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس سیارے سے پیغامات وصول کرنے کے ۲۸ مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ۳۶ نصب شدہ اور تین گشتی مراکز ہیں۔ اس مصنوعی سیارے سے نیشنل فرٹیلائزر، ٹیلی ویژن، تیل و قدرتی گیس کمیشن اور محکمہ مواصلات پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ محکمہ موسمیات موسم کے بارے میں بروقت پیش گوئیاں کرنے کے لیے اس سیارے کا خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء تک یہ سیارہ موسمیات کے کام آنے والی ۱۴۳۲۰ تصویریں بھیج چکا تھا، جن میں سے ۴۸۰۰ تصویریں صرف ۱۹۸۶ء میں بھیجی گئیں۔ ملک کے ٹیلی ویژن کے تمام قومی پروگرام اسی مصنوعی سیارے سے ملک بھر میں دکھلائے جاتے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں اس مصنوعی سیارے کی خدمات مدراس کے مشہور انگریزی روزنامہ "دی ہندو" کو بھی مہیا کی گئی ہیں۔ اس اخبار کے صفحات کی تصویریں اب مدراس سے اس سیارے کے ذریعے گڑگاؤں میں ہندو کے دفتر میں پہنچائی جاتی ہیں۔ جہاں سے یہ صفحات دہلی ایڈیشن کے لیے شائع کر لیے جاتے ہیں۔ سیارے میں ۲۹۶۱ دو رویہ مواصلاتی رابطے ہیں، جن پر پورا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ملک کے تمام اضلاع میں کمپیوٹر نصب کر کے انہیں اطلاعات مہیا کرنے کی غرض سے اس مصنوعی سیارے کے ذریعے دہلی سے جوڑنے اور دیہات کو تار برقی مواصلات مہیا کرنے کے ۵۰۰ مراکز قائم کرنے کے منصوبوں پر بھی عمل کیا جا رہا ہے۔ متعدد ہمسایہ ممالک بھی انسیٹ اول بی کی تصویروں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس مصنوعی سیارے کا سب سے زیادہ فائدہ ٹیلی ویژن اٹھا رہا ہے جس کے ۱۸۷ اسٹیشنوں میں سے ۱۸۲ اسٹیشن اس مصنوعی سیارے سے جڑے ہوئے ہیں۔

ساتواں منصوبہ :

گزشتہ بائیس برس میں ملک میں خلائی تحقیق کی جو سرگرمیاں جاری ہیں وہ ایسے مراحل میں پہنچ چکی ہیں جہاں تحقیق اور ترقی کے پروگراموں میں سرمایہ کاری قومی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے خلائی خدمات کے قومی سطح پر قیام کی صورت میں رونما ہونے لگی ہے۔ چنانچہ ساتویں منصوبے میں اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ مصنوعی سیاروں پر مبنی ملکی نشریات، مواصلات اور دور سے کھوج لگانے کے پروگراموں کو ملک میں تیار کردہ سیارے داغنے کے انتظام سے چلایا جائے۔ اس مقصد کے لیے سیارے چھوڑنے کی گاڑیوں، مصنوعی سیاروں کی تیاری اور انہیں استعمال کرنے کے پروگراموں میں باہمی ربط پیدا کرنے میں کافی ترقی کی جا چکی ہے۔ منصوبے کے مطابق سیارے چھوڑنے کے لیے غیر ملکی انتظامات پر انحصار کم کیا جائے گا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ خلا کے پروگرام سے تین قسم کی مواصلاتی ضروریات یا خدمات درکار ہوں گی۔ جو ملک کو مسلسل درکار رہوں گی :

۱۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے ۱۵۰ کلوگرام وزنی مصنوعی سیارے۔

۲۔ دور سے کھوج اور اشارات مہیا کرنے والے ۱۰۰۰ کلوگرام وزنی مصنوعی سیارے اور

۳۔ نشریات، مواصلات، موسمیات کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زمین کے اوپر ساکن رہنے والے خلائی سیارے جن سے انڈین نیشنل اسٹیلائٹ سسٹم کو مزید ترقی دی جا سکے۔ ہندوستان میں تیار کردہ انسیٹ II سیارہ ۱۹۹۰ء میں چھوڑا جائے گا۔

ارچنا ورما

ہندی کہانی

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک

ہندی کہانی میں سنہ ۱۹۵۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۶۵ء تک کے پندرہ سال تخلیق اور تنقید دونوں ہی میدانوں میں گہری ہلچل کے سال رہے ہیں۔ اس ہلچل کا نام نئی کہانی تحریک تھا اور نئی کا مطلب صرف پرانی کے مقابلے میں نئی نہیں تھا۔ نئے پن کو جدیدیت کے علم وشعور کے ساتھ جوڑ کر اس وصف کو زندگی اور حقیقت کے لیے ایک نئے نظریے کا سمندر سمجھا گیا ہے۔ ایک طرف یہ روایت سے جڑے جھوٹے کھوکھلے آدرشوں کو اور دوسری طرف تخیل کی ہوائیوں سے تخلیق کردہ حسن کو جھٹلاتا ہے۔ اس کے لیے حقیقت کی علامت تھی حقیقی اور صحیح تجربہ واحساس اور اس کی کسوٹی تھی آس پاس کی روزمرہ کی عام زندگی میں اس تجربے کی موجودگی — دراصل یہی نظریہ اس تحریک میں شمار کیے جانے والے مختلف رجحانات کے قلم کاروں کی مختلف طرح کی کہانیوں کو ایک ہی دھاگے میں باندھتا اور ایک نئی قوت عطا کرتا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد کے سال کئی سطحوں پر شکست وریخت کے سال ثابت ہوئے۔ جنگ آزادی کے دوران فاصلے پر جھلملاتا سنہرا خواب جب حقیقت میں بدلا تو ادھورا اور ناکافی پایا گیا۔ جنگ آزادی کے دوران ایک ایسا منتہائے مقصود تھا جس میں سب کا دشمن یکساں تھا۔ اس کے خلاف متحد ہونے کی ضرورت سفر جاری رہنے تک سب کو ایک ساتھ باندھنے کا کام کرسکتی تھی۔ جدوجہد کے آخری دور میں غیر ملکی حکومت نے فرقہ وارانہ دشمنی کے بیج بو کر اس اتحاد کو تباہ وبرباد کردیا تھا اور آزادی تقسیم کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ بعد کے برسوں میں یہ قدرتی امر ہی تھا کہ ایک مشترکہ دشمن کی موجودگی کا دباؤ سر سے ہٹ جانے کے بعد سب کے خواب اور مفادات الگ الگ ہوجائیں اور علٰحدگی اور بکھراؤ بڑھتا جائے کیوں کہ ہمارے رہنما اُتنا ہی وسیع وعریض سپنا سب کے سامنے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے جو سب کے لیے یکساں منتہائے مقصود ہو۔ دونوں کی سیاست میں فوری فائدے کی امید رکھنے والے سیاست دانوں کی دوراندیشی علٰحدگی پسند نظریات اور شکست وریخت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ وہ انہیں بڑھاوا دیتی ہے اور ان میں کمی لانے کا اہتمام نہیں کرتی۔ یہ صورت حال عام آدمی کی زندگی میں آدرشوں اور سپنوں کے تئیں کشش ومحبت ختم کرنے کا سبب بنتی ہے اور وہ انہیں سچائی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ دوسری اہم بات، متوسط طبقے میں تبدیلی آئی۔ ایسا نہیں ہے کہ جنگ آزادی کے دوران سب کچھ بڑا اُجلا اور بھلا تھا۔ سچائی یہ نہیں کہ حصولِ آزادی سے پیشتر آدرشوں کا اور آزادی ملنے کے بعد آدرشوں کے ٹوٹنے اور کھوکھلا ثابت ہونے کا دور تھا۔ سچائی یہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر تخلیق کار

نام : ارچنا ورما
پیدائش : ۶ر اپریل ۱۹۴۹ء
تصانیف : "کچھ دور تک" (شعری مجموعہ)
"استھگت" (کہانیوں کا مجموعہ)
اس کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔
شغل : مرانڈا ہاؤس (دہلی یونیورسٹی) شعبۂ ہندی میں استاد۔
پتہ : ۳۱ - مرانڈا ہاؤس، اسٹاف فلیٹس دہلی یونیورسٹی کیمپس، دہلی ۱۱۰۰۰۷

جس سفید پوشش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کی حالت آزادی ملنے کے بعد بدل گئی۔ تعلیم اور خوشحالی کے باعث وہ پہلے پُرسہولت اور ساز گار حالات میں تھا۔ جن شعبوں میں اسے برتری حاصل تھی اب ان میں تاجر اور دولت مند کسان طبقوں کے لوگ تیزی سے اپنا دخل جماتے جا رہے ہیں۔ تعلیم کا دائرہ وسیع ہوا اقتدار اور سرمایے کی تقسیم کا سماجی ڈھانچہ اس طرح سے بدلا کہ جس سے اس متوسط طبقے کے حصے میں کمی واقع ہوئی۔ نوکرشاہی کے توسط سے نظام حکومت میں اس کی جو حصہ داری تھی وہ بھی کم ہوئی اور وہ ہر اس جگہ سے بے دخل ہوتا رہا، جہاں سرمائے کا بول بالا ہے۔ اپنے مستقبل پر سے اس کی پکڑ بتدریج ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بذات خود اس بدعنوانی کا شکار بننے کی حالت میں آگیا جو پہلے سے رائج تھی مگر جسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا یا پھر وہ خود جس میں حصہ دار تھا اور منفعت بخش صورت حال میں تھا۔

تیسری اہم بات صنعتوں کے قیام و توسیع کے دُور رس نتائج ہیں جنہوں نے سماجی زندگی میں ایک نئی سرگرمی لاکر تعلقات میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ ان میں مشترکہ کنبے کے دستور کا ٹوٹنا، فرد کنبوں کا ابھرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی وغیرہ کی وجوہ سے فرد پر برادری اور کنبے کے تئیں فرائض اور ذمہ داریوں کے دباؤ کا خاتمہ، بڑے شہروں کی تہذیب کا طلوع، معاشی طبقوں کے درمیان فرق میں اضافہ، فرد کی تنہائی، اجنبیت وغیرہ شامل ہیں۔ موٹے طور پر جدید کہانی کی تحریک کے یہی موضوعات ہیں۔

کہانی کے موضوعات کے انتخاب میں ان مسائل کی چھاپ بہ خوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ کنبے کے انضباط اور کنبے کے نظم و نسق کی شکست و ریخت کی کہانیاں بہت بڑے پیمانے پر لکھی گئیں۔ کمیت کے لحاظ سے اور کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ لگ بھگ سبھی اہم کہانی کاروں نے ایک یا زیادہ کہانیاں ایسی تحریر کیں جن میں کنبے میں ڈھیر سے غیر متعلق اور غیر ضروری ہوتے ہوئے سربراہ کی ناگفتہ بہ تصویر ہے۔ بھیشم ساہنی (چیف کی دعوت) راجندر یادو (تلوار پنج ہزاری، برادری باہر) منوہر شیام جوشی (ایک دربھ ویکتتوا) کملیشور (دیوا کی ماں، کس کے لیے، دنیا بہت بڑی ہے) مارکنڈے (ہنسا جائی اکیلا گُرا کے بابا) شانی (گندے جل کا رشتہ) منو بھنڈاری (اکیلی) موہن راکیش (آرڈر) وغیرہ سبھی نے حقیقت کے اس پہلو کی عکاسی کی ہے۔ جو کردار کبھی کنبے کے اندر نظم و نسق ڈسپلن اور طاقت کی علامت تھا، وہ آہستہ آہستہ حکم عدولی مایوسی اور مذاق کا شکار بنتا گیا ہے اس میں ماں اور باپ دونوں شامل ہیں۔ حالاں کہ والد کی نسبت ماں کے تئیں کہانیاں زیادہ ہمدردانہ نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ کنبے میں اہمیت کا حامل وہ شخص بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کے ہاتھ میں معاشی ذرائع ہیں۔ مثال کے طور پر اوشا پریمودا کی زندگی اور گلاب کے پھول، میں ناکارہ بیٹے کی جگہ کماؤ بہن نے لے لی ہے۔

ان رشتوں کے بگڑنے بننے میں محبت اور ازدواجی زندگی کے بہت گہرائی سے بدلنے والے رشتے شامل ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ خاص طور پر عورتوں کی اس رشتے سے توقعات بدل گئی ہیں۔ تعلیم نسواں، خوشحال فرد، معاشی خود کفالت، خودداری، اپنے وجود کو منوانے کی آرزو وغیرہ اس تبدیلی کی وجوہ ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کی آزادی اسے گھر کے اندر کے رشتے جانچنے کا موقع عطا کرتی ہے اور یہی اندر کے رشتوں پر ایک طرح کے تناؤ اور دباؤ کا کام کرتی ہے۔ گنتی کے حساب سے دیکھا جائے تو ان موضوعات پر لکھی گئی کہانیاں سب سے زیادہ ہوں گی۔ پریم میں سب کچھ نثار کر دینے اور بدلے میں کچھ نہ مانگنے، خود کو گھلا دینے اور مٹا دینے کی خواہش، شادی میں ہر طرح کے تیاگ اور قربانی سے جیسے تیسے شادی کو کنبے کو بنائے رکھنے کی خواہش کا رومان اور آدرش۔ حقیقت کے دباؤ سے چرمرا کر ریشہ ریشہ ہو گیا ہے۔ ادھوری آرزوؤں کے زخم، غیر معروضی سپردگی کا فخر، اپنی انا کے ٹکراؤ میں خود ٹوٹنا اور دوسروں کو توڑنا وغیرہ ان کہانیوں کی بنیادی آواز ہے۔ اس ضمن میں بے ساختہ یاد آنے والی کہانیوں میں تیسری قسم (بھیرو لیشور ناتھ رینو) ایک اور زندگی، فولاد کا آکاش (موہن راکیش) اندھیرے میں، لورز، انتر (نرمل ورما) یہی سچ ہے، تیسرا آدمی (منو بھنڈاری) راجہ نرونسیا، نیلی جھیل، جو لکھا نہیں جاتا (کملیشور) ایک کمزور لڑکی کی کہانی، ٹوٹنا، چھوٹے چھوٹے تاج محل، پرانے نالے پر نیا فلیٹ (راجندر یادو) ساوتری نمبر دو (دھرم ویر بھارتی) وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

زیادہ تر کہانیوں میں خاندانی رشتوں کے ان بدلتے ٹوٹتے سلسلوں کا تجربہ کرداروں کی گہری تکلیف اور اضطراب و بے چینی کے روپ میں ہوتا ہے۔ ایک طرف اس اضطراب و بے چینی میں جکڑ کے خلاف بغاوت، نجات کی آرزو اور چھٹکارے کی خواہش ہے تو دوسری طرف مشترکہ کنبے کے رواج کے ٹوٹنے سے پیدا شدہ عدم تحفظ اور اکیلاپن۔ اس نسل کی تکلیف یہ ہے کہ رشتے بدل گیے ہیں، معیار بدل گیے ہیں، نئی حقیقت کے ظہور نے پرانی حقیقت کو غیر ضروری اور بے تعلق ثابت کر دیا ہے۔ اس حقیقت میں سے نکلنے والا آدرش مسترد ہو گیا ہے لیکن کنبے کے اندر کرداروں سے جڑی ہوئی فرسودہ باتیں اسی طرح بنی رہ گئیں جن سے کوئی اپنے صحیح یا غلط ہونے کی پرکھ کرتا ہے۔ مثالی باپ، مثالی ماں، مثالی شوہر، مثالی بیوی، مثالی بھائی، مثالی بہن وغیرہ کے رول سابقہ حقیقت کے اعتبار سے طے ہیں مگر دراصل ناکارہ اور غیر ضروری ہو چکے ہیں۔ دقت یہ ہے کہ فرد کو اپنی افادیت کا امتحان ان ناکارہ کسوٹیوں پر پرکھے جانے سے دینا ہے۔ نئی کہانی تحریک کی ناقابل فراموش اور زیادہ پر اثر کہانیاں وہ ہیں جو کنبے کی اکائی کی پرانی حقیقت کے ٹوٹنے کی مظہر ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان کہانیوں کی خاصی بڑی تعداد اس فرد کی بے دخلی کی تصویر کشی کرتی ہے جو اب تک کنبے کا بزرگ اور سربراہ ہونے کی وجہ سے خاندان کا کرتا دھرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ فالتو ہے

محروم ہوا، نظر انداز کیا گیا اور کبھی مار پھٹکار کا نشانہ بنا۔ باپ کی یہ درگت ماں کو پس منظر سے اٹھا کر مرکز میں لاتی ہے اور ماں کی حکومت کے پنہاں و باریک طریقوں کی ناقدری و نافرمانی یہ کردار اتنی آسانی سے نہیں کر پاتے۔ اگرچہ ماں کی ناگفتہ بہ حالت کی کہانیاں بھی احاطۂ تحریر میں آئیں۔ لگ بھگ اتنے ہی بڑے پیمانے پر ایسے ہی موثر انداز سے جانچا گیا دوسرا رشتہ محبت نیز ازدواجی رشتہ ہے۔ مشترکہ کنبے کے ٹوٹنے سے جن فرد کنبوں کا ظہور ہوا، ان میں عورت مرد کے درمیان سیدھا سامنا دونوں کو مقابلے کی پوزیشن میں لے آیا۔ ازدواجی تعلقات پر بہت سی توقعات اور ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا۔ ان کے دباؤ اور رشتے کے ٹوٹنے اور چرمرانے کے متعدد حالات اور ان کے اندرونی تناؤ بہت باریکی اور گہرائی سے ان کہانیوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کہانیوں کے کرداروں کے طور طریقوں، ان کے کرب اور چھٹپٹاہٹ کو پوری طرح سے سمجھ پانے کے لیے اس مجرمانہ رویے کو سمجھنا ضروری ہے جو مردہ کرداروں کے زندہ جھولوں کی کسوٹی پہ اپنے آپ کو پرکھنے سے نکلتا ہے۔ بدلے ہوئے ماحول اور نئی حقیقت کے تقاضوں کے سلسلے میں یہ کسوٹی غلط اور بیکار ہو چکی ہے، یہ دیکھنے اور سمجھنے کا وقت اس تحریک کے دور تک نہیں آیا تھا۔

اس مجرمانہ رویے ہی کی وجہ سے ایسا لگ سکتا ہے کہ کہانیاں کبھی کرب اور کبھی کرداروں کے بے یارو مددگار ہونے کو بڑے مبالغے کے ساتھ پیش کر رہی ہیں۔ اس بنتے بگڑتے تناظر میں کہیں پیڑھیوں کا تفاوت دکھائی دیتا ہے تو کہیں ترسیل کی مجبوری۔ اس وجہ سے رشتوں کے اجنبی پن، علیحدگی، دوری نیز انقطاع کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان احساسات و تجربات کی اہم وجہ بڑے شہروں کی زندگی کا تناؤ اور صنعتوں کے قیام و توسیع سے پیدا دیگر باتیں بھی ہیں۔ "ریگز ٹو رچیز" (Rags to Riches) کی کہانیاں اس صنعتی دور میں فرد کی آرزوؤں اور تمناؤں کو اکثر اس کی استعداد سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیتی ہیں۔ زندگی میں افادیت سے زیادہ بڑی کسوٹی کامیابی بنتی ہے یا مایوسی اور ناامیدی کے مواقع اکثر بڑھ جاتے ہیں۔ گلا کاٹ مقابلہ، وقت کی قیمت پیسے میں آنکنے کا موہ، رشتوں سے بڑھ کر املاک کو ترجیح، دم توڑ رفتار سے دوڑ اور آپا دھاپی اکیلے پن، اجنبیت اور پرائے پن کے احساسات و تجربات کو جنم دیتے ہیں۔ نئی کہانی تحریک کی کہانی کے کردار اس نسل کے کردار ہیں جو اپنے جانے پہچانے چھوٹے شہروں، قصبوں میں کنبے اور برادری کا تحفظ چھوڑ کر پہلی بار بڑے شہروں میں آئے ہیں اور اپنی چھوٹی موٹی خوشیوں اور دکھوں کے قصباتی احساس پر بڑے شہر کا حملہ محسوس کر کے یا تو سہمتے سکڑتے اکیلے اور اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں یا ماضی کے سابقہ ماحول کے لیے چڑچڑے اور اداس ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ سے اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے نبرد آزما ان اکیلے، مایوس یا چڑچڑے اور اداس کرداروں میں عورتیں ہیں اور مرد بھی۔ ڈپٹی کلکٹری، زندگی اور جونک (امر کانت) ملبے کا مالک، پانچویں مالے کا فلیٹ (موہن راکیش) دلّی میں ایک موت، کھوئی ہوئی دشائیں (کملیشور) سمبٹری، سیلد (رام کمار) ستمبر کی ایک شام (نرمل ورما) گل کی بنو (دھرم ویر بھارتی) اکیلی لڑکی (منو بھنڈاری) بھٹو (شیو پرساد سنگھ) یادوں کے گھیرے (کرشنا سوبتی) بے ساختہ یاد آنے والی کچھ کہانیاں ہیں جو حالات اور دلی کیفیات کا ایک وسیع و عریض منظر نامہ اپنے اندر سمیٹتی ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ کہانیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یکسانیت صرف یہی ہے کہ ان کے مرکز میں کبھی اپنے فیصلوں کے باعث اور کبھی حالات کی مجبوری کی وجہ سے مجمع سے ہٹ کر الگ آ کھڑا ہوا ایک نسبتاً خود اختیار فرد ہے۔

نئی کہانی میں موضوعات کی سطح کی یہ تبدیلی دراصل کہانی کی اپنی تبدیلی نہیں۔ اسے زندگی میں آئی ہوئی تبدیلیوں کی وجہ سے تعمیری حقیقت کی تبدیلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کہانی میں تبدیلی کا مطلب ہوگا: حقیقت کے ساتھ قلم کار کے تعمیری رشتے میں آنے والی تبدیلی جو نہ صرف شے کو بلکہ روپ کو بھی بدل دیتی ہے۔ اس مرحلے پر نئی کہانی مدعی ہے کہ اس نے روایت سے پوری طرح انحراف کر کے منفرد اور نئی شروعات کی ہے۔ تکنیک اب قلم کار کے لیے موضوعات سے الگ کوئی اسلوب نہیں کہ وہ پلاٹ کو بیان کرنے کے لیے کچھ کردار اور واقعات گھڑے اور ایک متعینہ نقطے سے دوسرے متعینہ نقطے تک کا سفر پورا کر دے۔ نئی کہانی نے تکنیک کو پلاٹ کے شعور کا ایک حصہ بنایا ہے اور کہانی میں اتنی لچک پیدا کر دی ہے کہ اس میں ہر طرح کے تجربات کو سمیٹنے کی طاقت آ گئی ہے۔ سیدھے سپاٹ بیان کے ذریعہ حقیقی صورت حال کا سیدھا بیان، علامتوں سے بھرے استعارات و تلمیحات، تہہ داری، لوک کتھا کا استعمال وغیرہ متعدد ایسے اوصاف کہانی میں داخل ہوئے جو اس سے پیشتر مفقود تھے یا جن کی عکاسی بڑے خفی انداز میں ہوئی تھی۔

تنہائی، اجنبیت وغیرہ جیسی دلی کیفیات کی ظاہر شہادتوں کے باعث اکثر نئی کہانی پر حقیقت پسندی سے متاثر ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے اور کبھی اسے صرف غیر ملکی تقلید مان کر قابل مذمت سمجھا جاتا ہے ——— کہانی کاروں پر اس کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان برسوں کے دوران متوسط طبقے کے طور طریقوں اور اعتقادات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے زندگی میں جو عدم تحفظ کا احساس آیا ہے انہیں کی وجہ سے کہانی کاروں کو حقیقت پسندانہ ذخیرہ الفاظ میں اپنے بحران کی بازگشت سنائی دی۔ وہ اپنی بات کہنے کے لیے مجموعی طور پر ان الفاظ کے استعمال ہی پر انحصار کر سکتا ہے۔ ان کی اندھی تقلید پر نہیں۔ یہ کردار پوری طرح سے ہندوستانی حالات کی پیداوار ہیں۔ وہ انہی کمزوریوں اور خامیوں کے شکار بھی ہیں

فیصلہ کی آزادی اور انتخاب کے حقوق حقیقت پسندی کے بنیادی نظریات ہیں جکے

زیادہ تر کہانیوں کے کردار اپنے حالات کے ہاتھوں میں کھلونا ہیں اور فوری ردعمل میں بے ساختہ اپنا اظہار چاہتے اور کرتے ہیں۔ ہر دوسرا کردار اپنا فیصلہ خود کرنے کا ڈنکا پیٹتا ہے لیکن اکثر یہ اعلان ایک جذباتیت اور تناؤ کا دھماکہ زیادہ ہوتا ہے ایک ذمہ دارانہ عمل کا انتخاب کم۔ دراصل یہ کردار موڑ لیتے ہوئے ایک دھارے کے بہاؤ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہاؤ کے موڑ نے انہیں بنے بنائے اصولوں، آدرشوں، کرداروں اور اقدار کو توڑنے کی ذمہ داری تھما دی ہے۔ ان الفاظ سے متاثر ہونے اور اس کے ذریعے سے اپنی تکالیف بیان کرنے کی وجوہ ان کے حالات میں موجود ہیں۔ یہ سچی حقیقت کا ایک عنصر ہیں۔

دوسرا الزام موضوع کے انتخاب کی اساس پر لگایا جاتا ہے۔ نئی کہانی پوری طرح سے متوسط طبقے کی زندگی اور اس کے مسائل کا اظہار ہے اور وہ مسائل بھی صرف پیار، ازدواجی تعلقات اور دیگر خاندانی حالات تک محدود ہیں۔ عوام اور ان سے وابستہ مسائل کی وسیع دنیا پر ابھی توجہ مرکوز نہیں ہوئی۔ اس الزام کے دفاع میں کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے اور نہ کہنا ضروری ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کہانی کاروں کے حقیقت پسندی کے علم و شعور میں اپنے جانے پہچانے کنبوں ہی کو موضوع سخن بنانے اور ژرف نگاہی سے کام لینے کا اصرار شامل ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کہانی کاروں کی جانی پہچانی دنیا کا دائرہ متوسط طبقے تک محدود ہے۔ کسان مزدور اور ان کی جدوجہد کی تصویر کشی نہ کر پانا ان کی دنیائے تجربات کی حد ہے، کوئی اصولی مخالفت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جو موضوعات منتخب کیے، ان کی جزئیات اور تفصیلات سے اپنے پڑھنے والوں کو بڑے موثر انداز میں متعارف کرایا ہے۔ اس بات سے انکار مشکل ہے کہ پیار و محبت کنبہ اور میاں بیوی بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہیں جتنی کہ اور کوئی دوسری حقیقت ہوسکتی ہے۔

گاؤں کی زندگی کی تصویر کشی کرنے والے شیلیش مٹیانی، مارکنڈے، پھنیشور ناتھ رینو، شوپرساد سنگھ جیسے بعض کہانی کار ہیں بھی، مگر ان کی کہانیاں عوامی جدوجہد کو نہیں چھوتیں، کنبوں کے دائروں ہی میں گھوم کر رہ جاتی ہیں۔

عام طور پر ان کہانیوں میں دلی کیفیات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ حقیقی کیفیات بالعموم مفقود معلوم ہوتی ہیں اور بس اخفی سی جھلک کے بعد غائب ہوجاتی ہیں۔ ان تمام الزامات کے ضمن میں ایک بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے: آزادی کے بعد ہندوستان کا یہ پہلا تخلیقی دور ہے۔ یہ نئی ابھرتی ہوئی حقیقت سے پہلا تخلیقی سابقہ ہے۔ جو کچھ بالکل اپنے آس پاس، اپنے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے وہی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ تخلیق کار پر وارد ہوتا ہے اس سے مانوس ہوچکنے ہی پر وہ سطح زمین پر آکر زیادہ یکسوئی کے ساتھ بیرونی دائرے پر نظر کرسکتا ہے اور اس کی شکست و ریخت کے اضطراب کو محسوس کرسکتا ہے، اس لیے خاندانی ماحول کی تبدیلیوں سے متاثر ہونا اس دور کے قلم کاروں کے لیے قدرتی بات ہے۔ دوم: تبدیلی کا پہلا تجربہ دلی کیفیات کی صورت ہی میں ظاہر ہوتا ہے اور وہی ان کے اظہار کا قدرتی طریقہ بھی ہے۔ تبدیلی کے حقیقی اسباب آہستہ آہستہ صاف ہوتے ہیں اور جب ایک دور کی داخلی کیفیات ہمارے پاس جذبے کی صورت میں موجود ہوتی ہیں، تبھی دوسرے دور میں ان جذبات کا استعمال حقیقت کے طور پر کرتے ہوئے ہم حقیقی حالات میں ان کے ذرائع کی تلاش اور تجزیہ کرسکتے ہیں۔

ان پہلے پندرہ برسوں میں جو کچھ احساسات وجذبات کے طور پر بیان کیا گیا وہ آئندہ برسوں کی حقیقی تصویر کشی اور تجزیہ کی اصل بنیاد ہے۔ اگر یہ ان کہانیوں کی حد ہے، تو یہی اس دور کی حقیقت کے علم و شعور کا لازمی جزو بھی ہے۔

(ترجمہ: نند کشور وکرم)

وفیات

صباح الدین عبدالرحمٰن:

اردو کے سنجیدہ علمی ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ۱۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو عظیم مورخ، محقق، ناقد، صحافی اور مصنف جناب صباح الدین عبدالرحمٰن کا ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ۱۹۱۱ء میں صوبہ بہار کی مردم خیز سرزمین دیسنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مرحوم بڑی ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔ مرحوم نے درجن بھر سے زائد علمی، تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی کتابیں تصنیف کیں۔ مرحوم ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین کے ترجمان "معارف" کی ادارت سے وابستہ ہوگئے اور تادم آخر اسی سے وابستہ رہے۔ مرحوم کو متعدد اداروں نے بہت سے اعزازات و انعامات سے نوازا۔

مرحوم ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ اس کے لیے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہندوستان کی ان تاریخی سچائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، جو ہماری قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی اتفاق کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے انتقال سے علم و ادب کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

نورالحسن انصاری:

فارسی ادب کے مشہور ادیب و محقق پروفیسر نورالحسن انصاری کا ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کی رات کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔

پروفیسر نورالحسن انصاری دہلی یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر تھے۔ انتقال سے چند روز پہلے فارسی ادب میں ان کی خدمات کے لیے انہیں غالب ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان کی موت سے ہندوستان نے فارسی کا ایک عظیم و معتبر محقق و ناقد کھو دیا ہے۔

ہم دست بہ دعا ہیں کہ خداوند کریم مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر و سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

اُدے پرکاش

آج کی ہندی کہانی

۵۷-۱۹۵۶ء سے شروع ہوئی نئی کہانی' تحریک کے ختم ہونے کے بعد ہندی افسانہ نگاری میں لگ بھگ ۱۹۷۰ء تک کا درمیانی عرصہ بے رجحان، بے تحریک نراج کا دور مانا جاتا ہے۔ غیر کہانی، شعوری کہانی، 'سنکری کہانی'، متوازی کہانی وغیرہ جیسی متعدد تحریکوں نے از خود جنم لیا اور وقتی اصطلاحوں، تعریفوں اور وقتی میلانوں سمیت ردی بن چکے رسائل و جرائد کے سیاہ، گرد آلود' پرانے اوراق میں دفن ہو گئیں۔ ان کی بربادی، شکستگی اور بے حسی کے اجزا خود ان کے اندر موجود تھے۔ اس نراجی اور انفرادی 'ہیرو ازم' کی ناکامی سے اُبھے دور میں بھی جو کہانیاں آج تک زندہ رہ پائیں، یقیناً ان کہانیوں پر ان نام نہاد تحریکوں کا سب سے کم اثر تھا یا شاید قطعی کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ ان تمام ہنگاموں اور فتووں سے بے نیاز کہانیاں تھیں، گیان رنجن، کاشی ناتھ سنگھ' رویندر کالیہ، دودھ ناتھ سنگھ، رام نرائن شکل کی کچھ آخری کہانیاں اس کی مثال ہیں۔ ایک نام اور بھی یاد آتا ہے۔ جو نئی کہانی تحریک کے کم معروف، مکتی بودھ' دروازہ' اور وہ دیا ساگر نوٹیال کی طرح آگے چل کر غائب ہو گیا ——— پانو کھولیا

دراصل پتا، گھنٹہ، ریچھ' رکت پات وجیتا، گدھ، اتربھو' ندمن' سگھ' بھیرگن، مکھیہ منتری کی لاش، سہارا اور کھل نائک جیسی کہانیاں اس لیے الگ دکھائی دیتی ہیں کیوں کہ ان کہانیوں میں فرسودہ ہو چکے اسلوب کے مئیں ایک نیا تجربہ ہی نہیں، اپنے وقت کے انسان کی مرکزی (Irony) کو بھی پکڑنے کی کوشش تھی۔ کہانی کو اگر شاعری کی طرح ایک الگ فنِ زبان کی صورت میں مانیں تو یہ کہانیاں صرف اپنے پلاٹ یا کرداروں کے کارن ہی نہیں، خود بیانی کے نئے رجحان' نثر کے نئے اسلوب اور اپنی منفرد ترتیب میں بھی تبدیلی لانے والی تھیں، اس لیے ۱۹۷۰ء کے قریب شاعری میں نئی ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ کہانی میں بھی نئی حقیقت پسندی کے جس نئے دور کا آغاز ہوا، اس کے بنیادی ترغیباتی بیج ان ہی کہانیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ساٹھ کے بعد کی تحریروں میں بار بار جن کہانیوں اور تخلیقات کو اُس وقت اعلیٰ نمونوں کے طور پر پیش کیا گیا' وہ ہندی کہانی کی روایت سے خود بخود تاریخ کے بے رحم اصولوں کی وجہ سے باہر جا گریں۔

۱۹۷۰ء کے قریب شاعری میں نئی ترقی پسند تحریک کے طلوعِ نو کے ساتھ ساتھ کہانیوں میں بھی بنیادی تبدیلی آئی۔ اگر شاعری میں "گولی داغو پوسٹر" جنتا کا آدمی، منتری کا کولم، راجہ کا باجہ' سامراجی آ رہا ہے۔ جیسی نظمیں اس بدلے ہوئے دور کا آدرش بنیں تو سُدھیر گھوشال' میرجا' دیوی سنگھ کون' کام دھینو' لارام پت لا' آخر لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے' جیسی کہانیاں بھی کہانی کے نئے ماڈل کے روپ میں سامنے آئیں۔ ان کہانیوں میں سماجی حقیقت پسندی کا زور سب سے زیادہ تھا۔ ہیرو عوامی طبقے سے تھے۔ سماجی حقیقت پسندی مزدور کسان تحریک کی تھی۔ ساٹھ کے بعد کے کہانی نویسوں کو اگر فرانس کے فلسفۂ وجودیت نے اپنے حلقۂ اثر میں لیا تھا تو اس بار کے کہانی کاروں کا فلسفہ کہانی لینن واد اور مارکس واد تھا۔ ٹپیکل کیریکٹرز ان ٹپیکل سچویشن (Typical Characters in Typical Situations)

کہانی نویسی کا سب سے اہم اصول بنا۔ سماجی حقیقت سے ذرا بھی دور ہٹ کر اگر کہانی کے کسی کردار کے اندرونی درد و کرب کو بیان کرنے کی کوشش کسی تخلیق کار نے کی تو اُسے فرد پسند (دیکتی وادی) ٹٹ پونجیا متوسط طبقے کے احساسات و خیالات سے متاثر ہیئت پرست قلم کار قرار دینے میں دیر نہیں لگائی گئی۔ بورژوا تنقیدی حقیقت پسندی بنام سماج وادی حقیقت پسندی کی بحث انہی دنوں چلی۔ سرہار ادب بھی انہی دنوں لکھا گیا۔ اترارد' بھگیما' پہل وغیرہ اس دور کے تمام رسائل میں ہزاروں کی تعداد میں ایسی کہانیاں مل جائیں گی۔

لیکن شاید اس قلیل مدتی کہانی تحریک کا حشر بھی وہی ہوتا تھا جو روس اور مشرقی یورپ میں مستقبل پسندوں Futurist اور مثبت پسندوں Positivist کا ہوا تھا۔

ہیئت اور مواد کی آپس میں مڈبھیڑ کرا کر مواد کو زیادہ اہمیت دینے والے اس دور میں اگر کہانی نے کہانی کی کھوکھلی، بے بنیاد حقیقت سے دور ہٹنے' ساٹھ

اُدے پرکاش: تصویر و تعارف صفحہ ۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔

کے بعد کی کہانیوں سے نجات دلا کر اُسے ایک ٹھوس بنیاد دی تو دوسری طرف تکنیک اور ہیئت سے ایسی زبردست بے اعتنائی برتی گئی جس کی وجہ سے نئی کہانیوں کے دور میں رینو، امرکانت، شیکھر جوشی، نرمل ورما، بھیشم ساہنی، دھرم ویر بھارتی، اوشا پریم ودا جیسے تخلیق کاروں کے ذریعے حاصل کہانی تکنیک سے بھی پسماندہ تکنیک کی کہانیاں سامنے آئیں۔ کہانی کے کسی مارکس وادی نقاد نے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ انقلابی مزدوروں کی تصویر اٹھارہویں صدی کی کا نکڑہ یا لاجپوت طرز میں بنا دینے سے کوئی مصور انقلابی نہیں ہو جاتا۔ اُسے مصوری کی تکنیکی روایت میں بھی ایک انقلاب لانا پڑتا ہے — پکاسو کی 'گرنیکا' صرف اس لیے انقلابی نہیں تھی کہ اس میں جرمن نازیوں کی وحشی بمباری سے تباہ ایک قصبے کی درد بھری تصویر تھی، بلکہ اس لیے کلاسک ثابت ہوئی کیونکہ اُس نے یورپین مصوری کو دادا وادیوں اور علامت پسندی کے اثر سے بھی آزاد کرایا۔ بہر حال جس کہانی کے کردار سب سے زیادہ انقلابی دکھائی دیتے تھے، جس کہانی میں پلاٹ سماج کے مختلف طبقوں کے آپسی تصادموں کا میدانِ جنگ بن جاتا تھا، وہی کہانی اعلیٰ ثابت کر دی جاتی تھی۔ وجے کانت ایسے کہانی نویسوں کی کہانیاں اس کی مثال تھیں۔

جس طرح لینن کا عقیدہ تھا کہ مارکس واد کو سب سے بڑا خطرہ کمیونزم کو توڑ مروڑ (Distortions) کر پیش کرنے سے ہے، اُس طرح ہندی کہانیوں میں آئے۔ اس نئے حقیقت پسند رجحان کی دشمن ایسی نام نہاد سماج وادی حقیقت پسند کہانیاں ثابت ہوئیں جس سماج وادی حقیقت پسند نظریے کی اساسات میں گورکی کے بعد سے خود روسی ادب میں زبردست تبدیلیاں کر دی گئیں تھیں۔ جہاں چیخوف اور تالستائے سے تحریک و ترغیب پا کر میخائل شولوخوف اور پاسترناک جیسے نئے کہانی نویس بہت پہلے اُبھر چکے تھے، جہاں تالستائے کی سوانح عمری لکھنے کا اہم اور انتہائی عزت افزا کام روسی ہیئت پرستی کے خالق وکٹر شکلووسکی کو سونپا گیا تھا، جہاں فرانسیسی تعمیر پسندی کے مثبت، منفی پہلوؤں پر سنجیدہ مطالعہ چل رہا تھا، وہاں اُس وقت روس کے ۱۹۳۰-۳۶ کی سماج وادی حقیقت پسندی کا نقارہ چالیس سال بعد ہندی کہانی میں بج رہا تھا۔

اگر ایک نظر سے دیکھیں تو کہانی کی یہ حالت ہندی تنقید کے تنزل کے ساتھ گہرائی سے جُڑی ہوئی تھی۔ یورپی ادب کے تحقیق و تجزیہ سے برآمد تحقیق و تنقید کے اصول ہندی کے مارکس وادی نقادوں نے جوں کے توں اپنا لیے تھے اور اُسی شکل و صورت میں اُسے ہندی کہانی پر لاگو کر رہے تھے۔ لوکاچ، بینجمن، گولڈمن، ایلک ویسٹ، کاڈویل، آرنلڈ کیٹل وغیرہ۔ مارکس وادی مفکروں ناقدوں کے اصول دراصل فرانسیسی، جرمن، روسی، ہنگرین اور انگریزی ادب کے تحقیق و تجزیہ اور وہاں کے سماجی حالات میں سے پیدا ہونے والے اصول تھے۔ وہ اُن زبانوں کے ادب کی تواریخ تھے جن کی نثر اور کہانی کی تاریخ چار پانچ سو سال پرانی تھی۔ ہندی کہانی کی ڈیڑھ دو سو سال کی عمر ابھی تشکیلی مرحلے میں تھی۔ ظاہر ہے ان غیر نسلی مارکس وادی جمالیات کے اصولوں نے خود مارکس وادی تخلیق کاروں کو سب سے پہلے نقصان پہنچایا۔ نقادوں کی حمایت و خوشنودی چاہنے والی یا بالفاظ دیگر تنقید کی ذہنیت میں لکھی گئیں ایسی متعدد کہانیاں سامنے آئیں جو دراصل حقیقت کہانیاں نہیں تھیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اُس دور میں اُبھرے متعدد نقاد دراصل نقاد نہیں تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ کہانی نویسوں نے اس دور میں نام نہاد مارکس وادی نقادوں کی طرف تاکنا چھوڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ تیسری دنیا اور مغرب کے مارکس وادی تخلیق کاروں کی تخلیقات کس طرح کی تھیں۔ لاطینی امریکہ میں گارسیا مارکویز، فوئنتیس، کورتازار، وریگاس، مگوئیل اینخل استوریاس کیا لکھ رہے تھے۔ برتولت بریخت نے پولش میں، ایستلا یوزف نے ہنگرین میں کیا لکھا تھا۔ کوئیجی وغیرہ انگریزی میں کیا لکھ رہے تھے یا اپنے ہی ملک میں دیگر ہندوستانی زبانوں میں کیا لکھا جا رہا تھا۔ کیا یہ مثال کافی نہیں کہ مراٹھی میں دیا پوار کا اچھوت یا کنڑ میں شوورام کارنتھ اور یو۔ آر۔ اننت مورتی کی کہانیاں اور ناول اس لیے زیادہ اہم اور پائیدار ہے کیوں کہ ان کہانیوں کی جڑیں خود اپنے دیسی سماج کے شعور، فرسودہ رواجوں اور حقیقت میں پیوست تھیں۔ وہ کسی پرائے تنقیدی اصول سے برآمد تخلیقات نہیں تھیں۔

اب یہ دیکھ لیا جائے کہ آج جس طرح کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں، اُن کی کیا حالت ہے؟ پہلی حقیقی صورتِ حال تو یہی ہے کہ نئی کہانی تحریک کے بعد کے لگ بھگ ایک دہے کی طرح ہی پھر سے اس وقت کہانی یا شاعری کو لے کر کوئی طے شدہ اور طاقت ور تحریک نہیں ہے — ترقی پسند یا جمہوری طبقے کی تحریک کا ایک طے شدہ اُبھار جو ۱۹۷۰ء کے بعد سے دکھائی دے رہا تھا، وہ یا تو منتشر ہو چلا ہے یا اُس نے اُن استعارات کو ترک کر دیا ہے، جن کے چلتے کسی نظم یا کہانی کی پہچان فوراً ترقی پسند یا جمہوری کہانی کی بنتی تھی۔ آٹھویں دہے کے ابتدائی دور کی کہانیاں جس انقلابی حقیقت اور انقلابی کردار کو لے کر بار بار سامنے آتی تھیں، اب ایسی کہانیاں بن چکی ہیں۔ اور تجارتی رنگین رسائل کے صفحات کی زینت بن چکی ہیں۔ یہ بھی ایک رواج سا بن چکا ہے کہ چھوٹے رسائل یا تخلیقی ادب میں وقت وقت پر پیدا ہونے والے کہانی کے رجحانات جب تخلیقی میدان میں پرانے ہو جاتے ہیں تو چھ سات برس بعد نرہبتات سے تخلیق ہو کر منافع خور رسائل میں شرفِ قبولیت پاتے ہیں۔ اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ ۱۹۷۱-۷۴ میں کس طرح کی کہانیاں تخلیق کی گئیں تو اُسے آج سے ۱۴ سال پہلے کے 'ساریکا' کے شمارے اُٹھا کر ملاحظہ کرنے چاہئیں۔ بکاؤ رسائل میں چھپنے والی کہانی اور تخلیقی کہانی کا جو یہ رشتہ ہے غالباً وہی رشتہ نظم اور خود کہانی کے بیچ بھی ہے۔ یہ ہمیشہ ہوا ہے۔ کم از کم ہندی میں تو ہوا ہی ہے کہ سماجی تبدیلیوں سے متاثر اور نئے انسان کی دفی مانگ کے قبل کے اندازے کے مطابق کوئی بھی نئی تخلیقی تحقیق شاعری میں پہلے ہوئی ہے اور کہانی میں بعد ازاں اس کی پیروی کی گئی۔ جیسا کہ ایک نقاد نے ریمارکس بھی ہیں۔ "شاعری کی دُکان پر جو موتی پرانے پڑ جاتے ہیں، اُنہیں ہیرا کہہ کر بیچنے کا کام ہی کہانی کو کرنا رہ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح 'پہل'، 'بھیگما'،

ایک ملاقات:

شریکِ گفتگو: مشرف عالم ذوقی اور خورشید اکرم

"ہندی کہانی کا مستقبل بہت تابناک ہے": راجندر یادو

ذوقی: یادو جی آداب۔

راجندر یادو: آیئے آپ دوستوں کا انتظار کر رہا تھا۔

ذوقی: یادو جی کتنی عجیب بات ہے: آج جب کہ زیادہ تر لوگ

Audio Visual Media

کی طرف راغب ہو رہے ہیں، ہم آپ سے ہندی افسانوں پر بات چیت کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں جبکہ کچھ لوگ ڈیڈ میڈیا...

راجندر یادو: (بیچ میں بات کاٹ کر) ایسا سوچنے والے غلط سوچتے ہیں۔ ابھی سے دیکھ لیجیے، ٹی وی کا جو کریز (craze) کچھ دن پہلے تک تھا، وہ اب نہیں رہا۔ یہ کہنا کہ ٹی وی وغیرہ نے کتابیں پڑھنے کے شائقین کے ہاتھوں سے کتابیں چھین لی ہیں بے کار بات ہے۔ کتابیں ایسا جادو ہیں جن کے سحر سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر امریکہ میں چار چار چینل میں ٹی وی کے چوبیس گھنٹے اسٹیشن کھلے رہتے ہیں پھر بھی وہاں کتنی موٹی موٹی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور کس قدر پڑھی جاتی ہیں۔

خورشید: یعنی ہم پھر ادب کی دنیا میں لوٹ آئیں گے۔

راجندر یادو: ....لوٹنا کیا — ہم کبھی اس سے دور گئے ہی نہیں۔ اور نہ جا سکتے ہیں۔

ذوقی: یادو جی، جب ہندی افسانے کی بات چل نکلی ہے تو ہندی کی موجودہ کہانیوں کو دیکھتے ہوئے ایک سوال ذہن میں اٹھتا ہے: کیا ایسا نہیں لگتا کہ آج کی ہندی کہانی پریم چند سے بہت آگے نکل گئی ہے۔

یادو: دیکھیے، آرٹ کی دنیا میں آگے اور پیچھے کا محاورہ ہی غلط ہے۔ کوئی شخص یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوگا کہ ٹالسٹائی سے آگے کوئی نہیں ہے۔ ادب میں آگے پیچھے کے پیمانے سے کسی دور کے ادب کی رفتار یا کسی ادیب کی تخلیقی صلاحیت ناپنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کی کہانی پریم چند کی کہانی سے الگ ہو گئی ہے۔ آج کے حالات اور پریم چند کے دورِ تصنیف کے حالات میں بہت فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر فن کار اپنے دور میں جیتا ہے۔ وہ اپنے دور کے تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے۔ آج کہانی کار اپنے گرد و پیش کے واقعات کو ایک دوسری طرح سے پرکھتا ہے۔ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے سوچتا ہے، ایک بات یہ بھی ہے کہ جب سے فن کار ایک ہی سماج میں ایک سے مسائل کے درمیان گھرے جی رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کچھ تھوڑا اچھا۔ یہ ان کی اپنی بصیرت پر منحصر ہے نہ کہ صرف کسی روایت پر۔ یہ اور بات ہے کہ جو زیادہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں وہ ذہن میں رہ جاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں، جنھوں نے بہت پختہ انداز میں لکھنا شروع کیا، لیکن بعد میں لکھنا چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے فن کا سرچشمہ جلد خشک ہو گیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مجبوری کی بنا پر ادب سے کنارہ کش ہو گئے۔ مثال کے طور پر گیان رنجن، دودھ ناتھ، بھارتی وغیرہ۔

ذوقی: آپ نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی کہانیوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ ہندی کہانی کو آپ کون سا مقام دیتے ہیں؟

راجندر یادو: اس میں شک نہیں کہ ہندی کہانی بہت آگے ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ترجمہ کی بدولت ہندی کے ادیب نہ صرف غیر ملکی ادب بلکہ ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کے ادب سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

راجندر یادو: تصویر اور تعارف صفحہ نمبر ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

ایسے میں جب کہ ان کے سامنے دوسری زبانوں کے شاہکار کا نمونہ ہوتا ہے۔ ان کے سامنے زیادہ بڑے چیلنج ہوتے ہیں اور دوسری شاید سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندی کے ادیبوں کے پاس جو Social Consciousness ہے وہاں سے زندہ کہانیاں تخلیق کرواتا ہے۔

ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی صرف تین زبانوں میں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں: کنڑ، مراٹھی اور ہندی۔ ایک چوتھی زبان پنجابی ہے جو کہ ابھی اپنے ارتقا کے مرحلوں میں ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ بہت جلد ہی دوسری الاقوامی زبانوں کی کہانیوں کے ہم قدم ہوگی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ بنگلہ کہانیاں اب روبہ زوال ہیں۔ کچھ دنوں پہلے تک بنگلہ زبان میں بہت اچھی کہانیاں تخلیق کی جا رہی تھیں، لیکن اب حال یہ ہے کہ بنگلہ ادیب اپنی پچھلی روایت کو چھوڑ کر کمرشیلزم کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ ایسی کمرشیل کہانیوں میں پڑھے جانے کی کشش تو ہے، لیکن یہ کسی قسم کا دیرپا اثر نہیں چھوڑ پاتیں۔ یہ کہانیاں Popular تو ہو جاتی ہیں، لیکن स्वीकृत نہیں۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ گلشن نندہ زیادہ Popular ہو لیکن بھیشم ساہنی یا اگیئے وغیرہ زیادہ स्वीकृत ہیں۔ Populer کہانیاں اپنے پیچھے کوئی مقصد، کوئی سپنا (Future) نہیں رکھتیں صرف تعداد بڑھاتی ہیں۔

ذوقی: یادو جی، آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کی صرف تین زبانوں کنڑ، مراٹھی اور ہندی میں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ گویا اردو میں لائق اعتنا کہانیاں تخلیق نہیں ہو رہی ہیں۔

راجندر یادو: نہیں، میں اس مغالطہ کو دور کرنا چاہوں گا۔ دراصل اردو اور ہندی کہانی کو میں الگ نہیں مانتا ہوں۔ ہندی اور اردو کے ادیب ایک ہی ماحول میں، ایک ہی جیسے مسائل کے درمیان جی رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے ان کے تجربات و مشاہدات اور محسوسات بھی تقریباً ایک سے ہوتے ہیں — ایسے میں کہانیاں بھی ایک ہی طرح کی تخلیق ہونی چاہئیں۔ پھر بھی جہاں تک میری جانکاری ہے اردو میں اب ایسی کہانیاں نہیں لکھی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ کرشن چندر وغیرہ کے بعد کے افسانہ نگاروں نے آج کے زندہ سلگتے مسائل سے زیادہ اپنی Past Glory کو Highlight کرنے کی کوشش کی۔ ایک حد تک ان کے یہاں یہ احساس ہے کہ ان کے اسلاف جو کبھی اس ملک پر حکمراں رہے تھے، کیسے اپنی تن آسانی اور عیش کوشی کی وجہ سے بے دخل کیے گئے۔ وہ اس پر سر دھن رہے ہیں۔

اردو کہانی کے ہاتھ سے آج کی Reality کا دامن چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنے عہد سے جوجھنے کا حوصلہ کم ہوتا ہوا معلوم پڑتا ہے، لیکن یہ کیفیت ہندوستان میں ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں بہت اچھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔

خورشید: نہیں، اردو میں ایسی کہانیاں برابر لکھی جا رہی ہیں، جن میں عصری مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اردو میں ایک رجحان دیومالائی روایات کے پس منظر میں آج کے حالات کو استعاراتی انداز میں پیش کرنے کا بھی ہے۔ پابندیاں، اظہار اور اسلوب کو نئی راہیں دیتی ہیں اور عصری حقائق ایک نئی معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

راجندر یادو: نجی طور پر مجھے دو طرح کی کہانیوں کو آج کی کہانی تسلیم کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ایک دیومالائی اور دوسری تاریخی۔ آزادی سے پہلے ہمارے یہاں بھی کچھ اس قسم کے تجربے ہوئے۔ لیکن بالآخر ناکام ثابت ہوئے۔ آزادی کے بعد ہندی میں اس قسم کی کہانیاں قطعی نہیں لکھی گئیں۔

میرے خیال میں ایسی کہانیاں دو طرفہ جھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ جو کچھ ہم اب محسوس کرتے ہیں، اب سے دو سو برس پہلے کا آدمی اس سے قطعی مختلف محسوس کرتا تھا۔ تب کے انسان کا سیاسی اور سماجی شعور آج کے انسان کے شعور و افکار سے قطعی مختلف تھا۔ سو یہ کہانیاں آج کی سچائی کو ماضی میں فٹ کر کے اور ماضی کے حالات و واقعات کو حال میں فٹ کر کے دونوں کو Distort کر رہی ہیں۔ اپنی جڑوں سے اکھاڑے دے رہی ہیں۔

خورشید: لیکن آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اردو کہانی کاروں کی جو نئی نسل سامنے آئی ہے، ان کی کہانیوں میں بھی ویسے ہی سماجی شعور کی کارفرمائی ہے، جو آپ کے خیال میں ہندی کہانی کا وصف ہے۔

راجندر یادو: جی ہاں، میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ اردو کے کہانی کار ایک بار پھر عصری مسائل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

ذوقی: خورشید صاحب، آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا ایک رخ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہندی والوں کے سامنے اردو افسانے کا جو آئینہ ہوتا ہے اس میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور اقبال مجید وغیرہ کے بعد کی نسل کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ان کے سامنے جب تک اردو کی موجودہ کہانیوں کا ڈھانچہ نہیں ہوگا وہ کوئی صحیح رائے قائم نہیں

کر پائیں گے۔

راجندر یادو : یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ ہندی کے زیادہ تر رسائل میں بس انہی کی کہانیاں چھپتی ہیں، یہ آپ لوگوں کو سوچنا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی ایک بڑا میڈیم ہے۔ اُردو کے ادیبوں کو ہندی میں آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خورشید : کیا ہندی والوں کا یہ فرض نہیں بنتا کہ وہ اردو کی اچھی تخلیقات کو اپنے یہاں جگہ دیں۔

راجندر یادو : نہیں آپ ایسا نہیں کہہ سکتے کم از کم "ہنس" کا دروازہ اُردو کے تمام ادیبوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔

ذوقی : اُردو کی طرح ہندی کہانی میں بھی کئی تجربے ہوئے ہیں۔ مثلاً اکہانی.....

راجندر یادو : تجربے کے نام پر اکہانی (Anti Story) قسم کی جو نام نہاد کہانیاں لکھی گئیں، وہ دراصل کہانی نہیں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسی کہانیاں لکھنے والے وہ نوجوان ہیں جن کے سامنے ساری سماجی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ یہ نوجوان جب اپنے سپنوں کو بُری طرح ٹوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کی تاب نہیں لا پاتے ہیں۔ ایک طرح کی Frustration کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے من میں ایک Disgust ہوتا ہے پورے سماج پورے نظام کے خلاف۔ ان کے پاس کوئی Future (سپنا) نہیں ہوتا۔ وہ صرف Present کی کہانی لکھتے ہیں۔ ان کے ذہن کے پردے پر جیسی آڑی، ترچھی، ادھوری، بھدّی تصویریں اُبھرتی ہیں، وہ انہیں کو کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر بات غیر واضح اور مبہم ہوگی۔ ان کی کہانیوں میں اُمید کی کوئی کرن نہیں ہوتی بلکہ خودکشی کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جھنجلائی اور بیزار نسل تخریب پر آمادہ ہے اور اسی کی ترغیب دیتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ان کے ذہنوں کو اس طرف مائل کرتے ہیں۔ میرے خیال میں Energy جب استعمال نہیں ہوتی تو وہ اپنے آپ کو ہی کھاتی ہے۔ یا پھر سڑنے لگتی ہے۔ یہ نئی نسل جس کے پاس Energy وافر مقدار میں موجود ہے جب اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہیں مل پاتا تو وہ تخریب کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اگر اسے غلط نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ ایک مسلم / ہندو نوجوان جب اپنے Career کا سپنا ٹوٹتا دیکھ کر بد دل ہو جاتا ہے تو Fundamentalism کی گود میں امان تلاش کرتا ہے۔ اب اس کے پاس نہ Past ہے نہ Future صرف Memory ہے۔ وہ صرف حال کو دیکھ پاتا ہے۔ اب ظاہر ہے جو نسل زندگی سے یوں بیزار بیٹھی ہے، وہ زندگی کی ساری قدروں کو پامال کرے گی۔ وہ کہانی کے Form کو توڑے گی۔ نہ صرف کہانی بلکہ پورے ادب کے Form کو توڑے گی۔

ذوقی : آپ اچھی کہانی کسے مانتے ہیں؟

راجندر یادو : میری نظر میں جو اچھی نظم کا معیار ہے وہی اچھی کہانی کا۔ وہ کہانی جسے آپ بار بار پڑھنا چاہیں۔ وہ کہانی جو آپ کے دل کو چھوتی ہے، جو آپ کے اندر کہیں کوئی Identification دیتی ہے۔ وہ جو ہمیں سنگھرش (Struggle) اور یاتنا (Suffering) کی کتھا سناتی ہے۔ اس Suffering سے چھوٹنے کی کوشش میں کامیابی اور ناکامی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مثلاً شیو مورتی کی کہانی "تریا چرتر" جس کے آخر میں عورت ہی سزا یاب ٹھہرائی جاتی ہے۔

ذوقی : بعض کہانیاں جنہیں آپ بار بار پڑھنا چاہیں؟

راجندر یادو : جیسے ٹالسٹائی کی 'Death of Ivan Ilisch' یا منٹو کی "کھول دو" جنہیں میں نے بار بار پڑھا ہے اور ہمیشہ پڑھنے کی خواہش کی ہے۔

ذوقی : کبھی کبھی Conon Doyle Agatha Christie یا ابن صفی کو بھی بار بار پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے تو کیا.....

راجندر یادو : آپ ان کی کسی ایک تخلیق کو بار بار نہیں پڑھ پائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کی الگ الگ کتابیں پڑھیں۔ اس قسم کی تخلیقات میں ایک خاص قسم کی Mystery ہوتی ہے جو ایک بار پڑھنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی تخلیقات سے قاری بس وقتی طور پر محظوظ ہوتا ہے۔

خورشید : کیا آپ اسے ادب میں کوئی جگہ دیتے ہیں؟

راجندر یادو : مشکل ہے ایسی تخلیقات کو میں ایک الگ طرح کا ادب مانتا ہوں۔ اچھے ادب کو پڑھنے کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ چندر کانتا سنتتی کو پڑھنے والا بعد میں پریم چند کا قاری بن جاتا ہے۔

ذوقی : اگر آپ سے کہا جائے کہ نئی اور پرانی نسل سے سب سے اچھے افسانہ نگار کا انتخاب کریں تو...؟

راجندر یادو : بہت مشکل ہے۔

خورشید : مثال کے طور پر جو چند اچھے نام آپ کے ذہن میں آئیں۔ کسی درجہ بندی کے اعتبار سے نہیں، صرف....

راجندر یادو : فوری طور پر جو چند نام ذہن میں

آتے ہیں، ان میں راکیش (ایک اور زندگی) کملیشور (کھوئی ہوئی دشائیں) شلیش مٹیانی (اردھانگنی) وغیرہ وغیرہ۔

ذوقی : غلام عباس، منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی کی کہانیوں کا کوئی اثر کیا آپ ہندی کہانیوں پر محسوس کرتے ہیں؟

راجندر یادو : ۱۹۶۰-۶۵ء تک ترقی پسند تحریک زوروں پر رہی۔ اس تحریک نے اردو اور ہندی کے افسانہ نگاروں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔ اس وقت اردو کے یہ Stalwarts ہندی ادب پر بھی اس طرح چھائے ہوئے تھے جس طرح اردو پر۔ ۱۹۵۰-۵۵ء کے آس پاس جب ہم لوگوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا تب یہی لوگ ہمارے آدرش تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس زمانے میں خواجہ احمد عباس نے رسالہ سرگم کا اجرا کیا تھا جس میں اردو اور ہندی کی کہانیاں ساتھ ساتھ چھپتی تھیں۔

خورشید : پھر یہ دُوری کیوں کر در آئی ہے؟

راجندر یادو : پھر اردو اور ہندی کی کہانیاں الگ الگ دشاؤں میں بٹ گئیں — اس کی کچھ سماجی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ یہ بھی کہ اردو میں اب وہ Stalwarts نہیں رہے جنہوں نے دونوں زبانوں کی کہانیوں پر اپنا نقش چھوڑا تھا اور دونوں کے افسانہ نگار جن کے سحر میں تھے۔

ذوقی : تجربات کی آپ کی نظر میں کیا اہمیت ہے؟

راجندر یادو : سوال یہ ہے کہ جو تجربہ کیا جا رہا ہے وہ کس ٹھوس حقیقت پر مبنی ہے — بھوگے ہوئے یتھارتھ (سچائی) سے ہی جنم لیتی ہیں تجربے کی ٹھوس حقیقت تاکہ پڑھنے والے کو اس میں اپنا انوبھو نظر آئے۔ تجربہ کا یہ حصہ کہانی کو زیادہ Authentic اور Communicable بناتا ہے۔ وہ تجربہ جس میں زندگی بھی ہو اور فکری عناصر بھی اور تبھی کوئی ایسا زندہ کردار تخلیق ہوتا ہے جو بالکل آپ سے جُڑ جاتا ہے۔ مدتوں آپ اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ تعلق آپ کے تجربے کا ہی ایک حصہ ہے۔ تخلیق کار اور قاری کے مابین Empathy ہونی چاہیے۔ کہانی اپنے تجربے کو Objective بنانے کی کلا بھی ہے۔ تجربہ اتنا Universal ہو کہ قرب و بعد کے فرق کو مٹا دے۔ مثلاً کبھی کبھی کوئی امریکی کہانی ہندوستانی ماحول میں بھی بالکل فٹ بیٹھتی ہے، اس لیے اچھا تجربہ وہ ہے جو آپ کے جذبے کو زیادہ سے زیادہ Transit کر سکے۔ کہانی خود اپنے آپ کو Transcent کر سکے ورنہ چار سو برس پہلے، چار ہزار میل کی دوری پر جو لکھا گیا، اس میں ہمیں اپنا تجربہ کیوں دکھتا ہے۔

ذوقی : یادو جی! کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ کہانی میں نعرہ بازی زیادہ آگئی ہے؟

راجندر یادو : یہ فارمولا بازی ہے۔ Social Action کے نام پر جلد بازی ہے۔ کہانی محض وچار کا پھیلاؤ نہیں ہے۔ اور کوئی خاص فلسفہ بھرنے سے بھی کہانی نہیں بنتی۔ مثلاً آج ستی پر کسی نے کوئی کہانی لکھ لی — یہ کوری نعرہ بازی ہے۔ ایسا فن اور ایسے فن کار جلد اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔

ذوقی : پچھلے دنوں آپ نے ہنس میں تخلیق کاروں کو انعام دینے کی ایک نئی روایت شروع کی۔ جس پر کچھ لوگوں نے بڑا غوغا مچایا۔ ہم مانتے ہیں کہ تخلیق کاروں کو ان کے لکھے کا بہت مناسب معاوضہ نہیں ملتا، لیکن کیا انعام دینے سے درجہ بندی جیسی بات نہیں لگتی؟

راجندر یادو : درجہ بندی سے آپ بچ نہیں سکتے۔ آپ دس کہانیاں پڑھتے ہیں تو ان میں سے ایک کہانی سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ یہ درجہ بندی ہی ہے۔ مثلاً تالستائی نے بہت لکھا، لیکن اس میں سے ہم نے کچھ خاص خاص چیزوں کو سراہا — یہ بھی درجہ بندی ہے — یہ درست ہے کہ کوئی بھی بڑی تخلیق کبھی انعام کے لیے نہیں تخلیق کی جاتی۔ اور نہ ہی کی جا سکتی ہے — پھر بھی اعزاز و انعام سے نوازنے کی روایت کی ہم سراہنا کرتے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی اور گیان پیٹھ بھی انعام دیتے ہیں اور Nobel بھی انعام ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انعام یا درجہ بندی بذاتِ خود غلط ہے، نامناسب ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو اس انتخاب پر اعتبار نہیں ہے۔ انعام کا سلسلہ شروع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ ہمارے ہاں تخلیق کاروں کو معاوضہ کم ملتا ہے، اس لیے اگر کسی تخلیق کار کو کسی اعزاز سے نوازا جائے تو اس کے کچھ مادی معنی بھی ہوں — اسے کچھ مالی منفعت بھی ملے۔

خورشید : اردو کو آپ آج کس حد تک عام لوگوں تک پہنچنے کا ایک صحیح میڈیا مانتے ہیں؟

راجندر یادو : میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں نے ان دونوں زبانوں میں کبھی کوئی فرق نہیں محسوس کیا — یہ بات آپ نوٹ کر لیجیے کہ ہندی والے اردو کے مخالف نہیں ہیں۔ تخلیق کار زبان کا فرق روا نہیں رکھتے۔ اب آپ غزلوں کی باڑھ کو ہی دیکھ لیجیے۔ ہندی میں بھی بے انتہا غزلیں لکھی جا رہی ہیں۔ یہ دور اردو کو

زیادہ سے زیادہ Accept کر رہا ہے۔ مہدی حسن، پنکج ادہاس وغیرہ کی غزلوں کو کون نہیں سنتا۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں تک میں غزلیں گانے کا رواج ہے۔ اردو دنیا کی چند خوبصورت زبانوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ میں تو اس حد تک کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ تراشی ہوئی زبان کوئی دوسری نہیں۔

ذوقی: یادو جی، ہندی کہانی کا مستقبل آپ کی نظر میں کیا اور کیسا ہے؟

راجندر یادو: ہندی کہانی کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ نئے لوگ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ کہانی پھر مرکز میں آ رہی ہے۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دور کہانی کا دور ہوگا۔ آج کے تخلیق کار اپنے دور سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔ اِدھر جو نئی نسل ہندی کہانی کاروں کی سامنے آئی ہے۔ ان کے پاس اپنی عمر سے کچھ زیادہ شعور ہے۔ وہ زیادہ بہتر طریقے سے سوچ رہے ہیں۔ اپنی روایت کی توسیع کا جذبہ بھی ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر تکنیک اور ہیئت میں بھی وہ کچھ نئے تجربے کر رہے ہیں جو پچھلے سپاٹ بیانیہ سے قدرے مختلف ہیں۔ ان میں سے چند ایک نام ہیں: للت کارتکے، شِو مورتی سنجیو، سوئم پرکاش، عالم شاہ خاں، منظور احتشام، مال چند، ستیین کمار، گیتانجلی نمیتا سنگھ وغیرہ۔

خورشید: ایک سوال "آج کل" کے قارئین کی طرف سے میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ کہانیاں جو اس خصوصی شمارہ کے لیے منتخب کی گئی ہیں، ان کے بارے میں آپ کچھ بتائیں؟

راجندر یادو: دیکھیے، ہم نے اپنی دانست میں حال میں لکھی گئی عمدہ کہانیوں کے انتخاب کی صلاح آپ کو دی۔ اس میں ہر کہانی الگ الگ موضوع سے متعلق ہے۔ الگ الگ پیرایہ ہے جو اس کے اپنے مصنف کے اسلوب و فکر کا آئینہ دار۔ ان کہانیوں پر استفسار کرنے سے بہتر میں یہی سمجھتا ہوں کہ انہیں آپ کے پڑھنے والوں پر چھوڑ دوں۔ وہ خود انہیں اپنی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی خوبیوں اور خامیوں کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔ میرے خیال میں آپ کی یہ کاوش ہندی افسانے کا بھرپور منظر نامہ ثابت ہوگی۔

ذوقی: یادو جی، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ جدید ہندی افسانے کو جن لوگوں نے فروغ دیا، ان میں آپ کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارا مقصد تھا کہ آپ سے بات چیت کے ذریعے ہندی کہانی کی سمت و رفتار اور دوسری زبانوں کے ساتھ اس کے تقابل کا جائزہ لیا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے گنگا جمنی تہذیب کے حوالے سے دونوں زبانوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک طرف جہاں ماضی کی خوبصورت روایات کو دُہرایا، وہیں حال کا منظرنامہ اور مستقبل کے تابناک سفر کی داستان کو بھی سامنے رکھا۔ اس کے ساتھ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

راجندر یادو: آپ لوگوں کا بھی بہت بہت شکریہ۔

جدید ہندی کہانی نمبر کے بارے میں

جدید ہندی کہانی نمبر پیشِ خدمت ہے، اس میں پندرہ کہانیاں شامل ہیں۔ تین مضمون ہیں جو ہندی کہانی کے پس و پیش منظر کا موثر احاطہ کرتے ہیں۔

کسی بھی ادبی صنف کا انتخاب خواہ کتنا ہی جامع ہو، ہر پڑھنے اور لکھنے والے کے حسبِ منشا نہیں ہو سکتا۔ مزاج، معیار اور مطمحِ نظر کا اختلاف بہرحال کارفرما رہتا ہے۔ انتخاب بہرحال انتخاب ہے۔ انسائیکلو پیڈیا نہیں۔ اس انتخاب کا مقصد اردو قاری کو ہندی کہانی کے جدید ترین رجحانات سے متعارف کرانا ہے۔ زیادہ توجہ حالیہ کہانی پر ہے۔ بعض پرانے ناموں کی شمولیت کے باوصف اردو قاری کو بیشتر نام نئے معلوم ہوں گے۔

انتخاب کے تعلق سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا، ہندی کے مختلف کہانی کاروں، نقادوں، مدیروں سے بات چیت کی گئی۔ بات چیت کے دوران جن کہانیوں کا بار بار ذکر آیا وہی اس انتخاب میں شامل ہیں۔

ان کہانیوں کے مطالعے سے آپ محسوس فرمائیں گے کہ ہندی کہانی ماضی کی طرح آج بھی زندگی کے بہت قریب ہے۔ یہ انسانی زندگی کی دھوپ چھاؤں، دُکھ سُکھ، چھوٹی بڑی خوشیوں، محزونیوں، محرومیوں، خواہشوں، نفسیات کے تاریک روشن نکتوں، بدلتے ہوئے ماحول، اور معاشرے میں مختلف اثرات کے تحت بنتے بگڑتے انسانی رشتوں کا بڑا مؤثر مرقع ہیں، حقائق ہیں، کہانی ہے، لیکن کہانی پن کہیں حقائق پر حاوی نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ ہندی کہانی کے لُطف و اثر کا راز اس کی فطری سادگی میں ہے، جسے وہ آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ زندگی کی طرح یہ کہانیاں بھی متنوع ہیں۔ یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ یہ نمبر اردو قاری کے لیے کہانی کا ایک مختلف منظر نامہ پیش کرے گا۔

ان کہانیوں کے مطالعے کے دوران آپ یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ ہندی کہانی کار الفاظ کو زیادہ آزادہ روی سے استعمال کرتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے، ان وسعتوں اور گہرائیوں کا احاطہ کرنے کی سعی کا ہے، جو تخلیقی ادراک کا تقاضا ہے۔ ان کہانیوں کے تراجم کے دوران اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اسلوب بے جا متاثر نہ ہونے پائے اور متن اپنی خوشبو، کس بل اور لطف و اثر کا بعینہٖ احساس جگا سکے۔ ممکن ہے اردو قاری کے لیے اسلوب کے بعض اجزا اجنبی اور نامانوس ہوں۔ دراصل اس ضمن میں کوشش یہی رہی ہے کہ کہانی اپنے اصل کے زیادہ سے زیادہ قریب رہے۔

اس نمبر کے لیے کہانیوں کے انتخاب میں جن دوستوں نے ممکنہ اعانت فرمائی اُن میں "ہنس" کے ایڈیٹر جناب راجندر یادو، جناب برجیشور مدان، محترمہ ارچنا ورما، جناب مہیش درپن اور جناب مشرف عالم ذوقی کے نام سرِفہرست ہیں۔ ادارہ ان کا شکرگزار ہے۔ بعض ہندی کہانی کاروں کی تصویریں جناب اروند جین نے فراہم کیں۔ ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔

یہ نمبر آپ کو کیسا لگا۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

وشنو پربھاکر

دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے

عمر نینا کی دس برس کی بھی نہیں تھی لیکن ذہنی طور پر کافی بالغ ہوگئی تھی۔ جیسا کہ اکثر بن ماں کی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بزرگوں نے اس کے لیے عمر کا بندھن ڈھیلا کر دیا تھا۔ اس لیے جب اس نے سنا کہ کچھ دوری پر سویا اس کا چھوٹا بھائی سسک رہا ہے تو وہ چپ چاپ اٹھی، ایک لمحہ خوفزدہ نگاہ سے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

رات آدھی بیت چکی تھی اور چاندنی کا ادجل ہو چکا تھا، پھر بھی کچھ دوری پر سوتے ہوئے ان کے موسا کے کنبے کے دودھ سے دُھلے کپڑے اندھیرے کی سیاہی میں چمک رہے تھے جیسے تاریک شمشان میں آگ کی چنگاریاں۔ وہی چمک نینا کے ننھے سے دل میں کسک اٹھی۔ کسی طرح رُلائی روک کر اس نے آہستہ سے پکارا "کمل۔۔۔ او کمل۔۔"

کمل آٹھویں سال میں چل رہا تھا۔ اس کے چھوٹے سے کھٹولے پر ایک پھٹی سی دری بچھی تھی۔ اس پر وہ لیٹا تھا گُڑمُڑ، پاؤں اس نے پیٹ سے سٹا رکھے تھے اور منہ کو ہاتھوں سے ڈھک رکھا تھا۔ رہ رہ کر اس کا پیٹ سکڑتا اور سسکیاں نکل جاتیں۔ اس نے بہن کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نینا بھی اتنی سہمی ہوئی تھی کہ دوسری بار پکارنے کی ہمت نہ بٹور پائی۔ چپ چاپ کمر سہلاتی رہی، دیکھتی رہی۔ کچھ لمحے بیت گئے تو

نام : وشنو پربھاکر
پیدائش : ۲۱ جون ۱۹۱۲ء بمقام مظفر نگر
تصنیفات : بیس کہانیوں کے مجموعے۔
چھ ناول، تین افسانوں کے مجموعے
بارہ ناٹک، تین سفرنامے، بارہ
بچوں کی کہانیوں کے مجموعے، سوانح
اور یادداشت کی تیرہ کتابیں۔ اس
کے علاوہ بہت سی علمی اور تنقیدی
کتابیں لکھیں۔
اعزاز و انعام : ایک ناول، تین کہانیوں کے مجموعے
دو ڈرامے سوانح اور یادداشت
کی دو کتابیں اور بچوں کے ادب کی
چار کتابیں انعام یافتہ۔ جس میں
سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۷۶ء
قابلِ ذکر۔ متعدد دیگر اعزازات۔
پتہ : ۸۱۸۔ کنڈے والان، اجمیری گیٹ، دہلی

اسے سیدھا کر کے اس کا منہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تب اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو ڈھلک کر کمل کے چہرے پر جا گرے۔ کمل کسمسایا اور پھر آنکھیں بند کیے کیے ہی بولا "دیدی!"

نینا نے چونک کر کہا "تو جاگ رہا تھا رے؟"

"نیند نہیں آتی ... دیدی۔ پتا جی کب آئیں گے؟ دیدی پتا جی کے پاس چلو"

"پتا جی ... ؟"

"ہاں دیدی۔ پتا جی کے پاس چلو۔ آج مجھے موسا جی نے مارا تھا۔ دیدی گلاس توڑا تو پردیپ نے اور مارا ہمیں۔ دیدی یہاں سے چلو"

نینا نے محسوس کیا کہ کمل اب رویا، اب رویا۔

وہ بے چین ہو اٹھی۔ اس نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے اپنے سینے میں سمیٹ کر وہ ننھی ماں، وہیں لیٹ گئی۔ بولی وہ کچھ نہیں، بس اس خاموش ماحول میں اسے زور زور سے تھپتھپاتی رہی اور وہ سبکتا رہا، بولتا رہا "دیدی، آج موسی نے ہمیں باسی روٹی دی۔ سارا حلوہ پردیپ اور رنجن کو دے دیا اور ہمیں بس کھرچن دی اور دیدی، جب دوپہر کو ہم موسا جی کے کمرے میں گئے تو ہمیں ڈانٹ کر نکال دیا۔ دیدی، وہاں ہمیں کیوں نہیں جانے دیتے؟ دیدی تم اسکول سے جلدی آجایا کرو۔ دیدی پتا جی کو

جیل میں کیوں بند کر دیا گیا۔ وہاں پتاجی کو روٹی کون کھلاتا ہے؟ ہم وہاں کیوں نہیں رہتے؟ پردیپ کہتا تھا تیرے پتاجی چور ہیں۔"

تب یک لخت اپنے کو دھوکہ دیتی ہوئی نینا زور سے بول اٹھی "پردیپ جھوٹا ہے" اور اتنا کہہ کر اپنی ہی آواز پر وہ خوف سے تھر تھر کانپ اٹھی۔ اس نے کمل کو زور سے بھینچ لیا۔ کمل کو لگا جیسے دیدی زور زور سے ہل رہی ہے، ہلتی جا رہی ہے ہلتی ہی چلی جا رہی ہے۔ زلزلہ آ گیا کیا؟ اس نے گھبرا کر کہا "دیدی! دیدی کیا ہے؟ بخار آ گیا ہے؟"

"چپ چپ، موسی آ رہی ہے۔"

سچ مچ کوئی اٹھ کر جلدی جلدی ان کے پاس آیا اور کڑک کر پوچھا "کیا ہے، کیا ہے نینا؟ کمل کیا ہے رے؟ ... او ہو بھائی سے لاڈ کیا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں نینا تو یہاں کیوں آئی؟ اری بولتی کیوں نہیں۔ او ہو، بڑے بیچارے گہری نیند میں سوئے ہیں۔ ابھی تو بڑی گُڑ گُڑ میری شکایت ہو رہی تھی، جیسے میں جانتی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ہائے رے میری قسمت۔ او بہن تو خود تو مر گئی لیکن مجھے اس جہنم میں چھوڑ گئی۔"

تبھی موسا بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ پوچھا "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟"

"ہوا میرا سر۔ دونوں بھاگنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔"

"کون بھاگنے کا ارادہ کر رہا ہے؟ نینا، کمل؟ کچھ لیا تو نہیں؟ الماری کی چابی تو ہے؟ رات ہی تو پانچ سو روپیہ لا کر رکھا ہے۔ ارے تم بولتی کیوں نہیں۔ کیوں ری نینا کہاں ہے روپیہ؟" بولتے بولتے موسا اٹھ کر وہاں آ گئے جہاں دونوں بچے ایک دوسرے سے سمٹے سہمے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ موسی نے تنک کر کہا "کیا پتہ کیا کیا نکال کر بھاگتے۔ وہ تو میری آنکھ کھل گئی۔"

اور پھر جھپٹ کر نینا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چل اپنی کھاٹ پر خبردار جو پاس سوئے۔ باپ تو آرام سے جیل میں جا بیٹھا اور مصیبت ڈال گیا مجھ پہ۔ نہ لاتی تو دنیا منہ پر تھوکتی۔ بہن کے بچے تھے۔ ذرا بھی لحاظ نہ آیا۔ لیکن کہنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے گھر میں سونے چاندی کی کان ہے؟ کیا خرچ نہیں ہوتا؟ پڑھائی کتنی مہنگی ہو گئی ہے اور پھر بچوں کی خوراک بڑوں سے زیادہ ہے۔"

روپے نہیں نکلے اس بات سے موسا کو بڑا اطمینان ہوا۔ انہوں نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کہتا ہوں تم تو ۔ ۔ ۔"

"اب چپ رہو۔ بھلے ہی بچیری بہن ہو، ہیں تو بہن کے بچے۔"

"ہاں! بہن کے بچے ہیں۔ تبھی تو بہنوئی صاحب کو رشوت لینے کی سوجھی اور رشوت بھی کیا تھی بیس روپے کی۔ وہ بھی لینی نہیں آئی۔ وہیں پکڑے گئے۔ میں ہوں رات پانچ سو لایا ہوں کوئی مرے ثابت کر دے۔"

"اتنی عقل ہوتی تو کیا اب تک تیسرے درجے کا کلرک بنا رہتا۔"

اور مزا یہ کہ جب میں نے کہا تین سو، چار سو روپے کا انتظام کر دیں۔ تمہیں چھڑانے کا ذمہ میرا۔ تو ستیہ وادی بن گئے۔ میں رشوت نہیں دوں گا۔ نہیں دوں گا تو لی کیوں تھی؟ ارے لیتے ہو تو دو بھی۔ میں تو ۔ ۔ ۔"

موسی نے اچانک دھیمے پڑتے ہوئے کہا "چپ بھی کرو۔ رات کا وقت ہے آواز بہت دور تک جاتی ہے۔"

کافی دیر بڑبڑانے کے بعد جب وہ پھر سو گئے تب بھی دونوں بچے جاگ رہے تھے۔ آنکھوں کی نیند آنسو بن کر ان کے گالوں پر جمتی جا رہی تھی اور اس کے دھندلے پردے پر بہت سی تصاویر بے ساختہ ابھرتی آ رہی تھیں۔ ایک تصویر موسی کی تھی جو انہیں روتے روتے کھرلائی تھی اور وہ پیار محبت جتایا تھا کہ وہ بھی رو رو کر پاگل ہو گئے تھے مگر جیسے جیسے دن بیتتے گئے پیار گھٹتا گیا اور رحم بڑھتا گیا۔ رحم اونچ نیچ اور تکبر کا خالق ہے۔ اس نے آج انہیں جانور سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔

ایک تصویر موسا کی تھی جو تیسرے چوتھے دن بہت سے نوٹ لے کر آتے اور انہیں اشارہ کر کے کہتے "میں کہتا ہوں کہ اس نے رشوت لی تو دی کیوں نہیں؟ ارے تین سو دینے پڑتے تو پانچ سو لینے کا راستہ تو کھلتا ۔ ۔ ۔"

ایک تصویر اپنے پتا کی تھی جو انہیں پیار کرتا تھا۔ جس نے رشوت لی تھی اور جسے جیل میں بند ہوئے دو مہینے بیت چکے تھے اور ابھی سات ماہ باقی تھے۔

نینا نے اچانک دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بھینچ لیا۔ اس کی سسکی نکلنے والی تھی۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں بے چین و مضطرب ہو کر کہا۔ "پتاجی۔ اب نہیں سہا جاتا۔ اب نہیں سہا جاتا۔ موسا تمہارے کمل کو پیٹتے ہیں۔ پتاجی تم آ جاؤ۔ اب ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ اب ہم بڑھیا کپڑے نہیں پہنیں گے۔ پتاجی تم نے رشوت لی تھی تو دیتے کیوں نہیں ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔؟"

اس طرح سوچتے سوچتے بند آنکھوں کے اندھیرے میں پتا کی تصویر اور بھی بڑی ہو اٹھی ۔ ۔ ۔ ایک ادھیڑ شخص کی شبیہہ، جس کی آنکھوں میں پیار تھا، جس کی آواز میں مٹھاس تھی جس نے دونوں بچوں کو نئے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہاں انہیں کوئی مارتا جھڑکتا نہیں تھا۔ وہاں ناشتہ ملتا تھا۔ وہاں وہ تصویریں کاٹتے تھے، کھلونے بناتے تھے۔ اور گھر میں اس کا پتا کھانا بناتا تھا اچھی اچھی کتابیں لاتا تھا، پھل لاتا تھا۔ اس کی ماں کے مرنے پر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

نینا نے یہ سب باتیں پڑوسیوں کی زبانی سنی تھیں۔ وہ اس کے پتا کی بڑی تعریف کرتے تھے اس نے اپنے کانوں سے پتا کو یہ کہتے سنا تھا کہ رشوت لینا پاپ ہے، لیکن پھر انہوں نے رشوت لی ۔ ۔ ۔ کیوں لی ۔ ۔ ۔ آخر کیوں ۔ ۔ ۔؟

پڑوسن کہتی "اس کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم۔ وہ بچوں کو اچھی تعلیم دلانا چاہتا تھا اور تم جانو اچھی تعلیم بہت مہنگی ہے ۔ ۔ ۔"

مہنگی ــــ مہنگی تھی تو اس نے رشوت لی۔

ہونگی ہونا کیا ہوتا ہے۔ اور اب پتا جی کیسے چھوٹیں گے! موسا کہتے تھے "جج کو رشوت دیتے تو چھوٹ جاتے۔ ایک جج نے تین ہزار لے کر ایک ڈاکو کو چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدمی کو جس نے ایک عورت کا خون کیا تھا، جج نے چھوڑ دیا تھا۔ پانچ ہزار لیے تھے۔۔۔ پانچ ہزار کتنے ہوتے ہیں؟ سو۔۔ ہزار۔۔۔ دس ہزار۔۔ لاکھ۔۔۔ یہ کتنے ہوتے ہیں۔۔۔

موسا کہتے تھے "رشوت ہر طرح کی بھی ہوتی ہے۔ ایک پروفیسر نے ایک لڑکی کو ایم اے میں اول کر دیا تھا کیوں کہ وہ خوبصورت تھی۔۔"

نینا نے اچانک نظر اٹھا کر آسمان میں دیکھا تارے جگمگا رہے تھے اور کہکشاں دودھیا روشنی میں پٹی پڑی تھی۔ اس نے سوچا یہ سب کتنا حسین ہے، کیا یہاں بھی رشوت چلتی ہے۔

اس کی سسکیاں اب بالکل بند ہو چکی تھیں اور وہ بڑی سنجیدگی سے سنی سنائی باتیں یاد کر رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔ خوبصورت ہونا بھی کیا رشوت ہے؟ موسا کہتے تھے کہ جب افسر کے پاس خوبصورت لڑکی بھیج دو تو کچھ بھی کروا لو۔ خوبصورت لڑکی اور روپیہ۔ روپیہ اور خوبصورت لڑکی۔۔۔ انہیں لے کر جج اور حاکم کام کیوں کر دیتے ہیں۔ کیوں؟ کیوں۔۔۔ اور خوبصورت لڑکی کا وہ کیا کرتے ہیں۔ کام کرواتے ہوں گے لیکن کام تو سبھی کرتے ہیں۔۔۔ پھر خوبصورت لڑکی کیوں؟۔۔۔ اور اس کے موسا بہت سارے روپے لاتے ہیں مگر لڑکی کبھی نہیں لاتے۔۔۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، لیکن اس ادھیڑ بن میں رات نہ جانے کہاں چلی گئی۔ یہ جانا نہ جا سکا۔ یکایک موسی کی پکار نے اس کے خیالات کا تانتا توڑ دیا۔ ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو موسی کہہ رہی تھی "نینا او نینا، اری اٹھے گی نہیں، پانچ بجے ہیں۔"

پانچ۔۔۔ ابھی تو پہرے دار تین کی آواز لگا رہا تھا۔ کہکشاں کیسی جھلملا رہی تھی۔ اسی راستے سے تو بہشت جاتے ہیں۔

موسی پھر چیخی "اری سنا نہیں نینا؟ کب سے پکار رہی ہوں۔ دونوں بہن بھائی کمبھ کرن سے بازی لگا کر سوتے ہیں۔ چل جلدی۔ چوکا برتن کر میں آتی ہوں۔"

نینا نے اب انگڑائی لینے کا ناٹک کیا پھر کنکناتی ہوئی اٹھی "جا رہی ہوں موسی۔"

زینے تک جا کر جانے اسے کیا یاد آ گیا۔ وہ کمل کے پاس آ گئی اور بڑے پیار سے کان سے منہ لگا کر اسے پکارا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اسے گود میں سمیٹ کر نیچے لے آئی۔

اور جب دو گھنٹے بعد موسی نیچے اتری تو ہکی بکی رہ گئی۔ رسوئی گھر جیسے دودھ میں دھلا ہوا ہو۔ میل کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ برتن چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ بار بار بے یقینی سے آنکھیں مل مل کر دیکھتے ہوئے بولی "آج کیا بات ہے نینا؟"

"کچھ نہیں موسی" نینا نے سہم کر جواب دیا۔

"کچھ نہیں کیسے؟ ایسا کام کیا تو روز کرتی ہے؟"

کمل نے ایک دم کہا "موسی آج پتا جی آئیں گے۔"

"پتا جی؟"

"ہاں، دیدی کہتی تھی۔۔۔"

موسی نے بے یقینی اور شک سے ایسے دیکھا کہ کمل سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ لمحے اس خاموش ماحول میں وہ پتھر کا مجسمہ بنے کھڑے رہے پھر جیسے جاگ کر موسی بولی "تو یہ بات ہے۔ باپ کے استقبال میں رسوئی گھر سجایا گیا ہے۔"

پھر ایک بار زور سے ہنسی اور بولی "مہارانی جی ابھی تو پورے سات مہینے باقی ہیں۔ سات مہینے۔ واہ رے باپ کے لیے دل میں کتنا درد ہے۔ اس کا رتی بھر ہمارے لیے ہوتا تو۔۔۔"

نینا کا چہرہ یکایک پیلا پڑ گیا۔ آگ برساتی آنکھوں سے کمل کی طرف دیکھتی ہوئی وہ وہاں سے چلی گئی۔ اس نظر سے کمل سہم گیا۔ مگر اسے اپنے جرم کا پتہ تب چلا جب یہ ہو چکا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے راستے میں نینا نے اس جرم کے لیے کمل کو خوب ڈانٹا۔ اتنا ڈانٹا کہ وہ رو پڑا۔ اس پر اسے چھاتی سے لگا کر وہ بھی رونے لگی۔

اسی وقت وہاں سے بہت دور ایک سجی ہوئی عمارت سے زور زور سے قہقہہ گونج رہا تھا۔ چھوٹے جج آج خاص طور پر خوش تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی من موہنی کو کمیشن نے محکمۂ ثقافت میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ دوست مبارک باد دینے آئے ہوئے تھے۔ اسی خوشی کا یہ قہقہہ تھا۔ اگر چہ باقاعدہ چائے پارٹی کا کوئی اہتمام نہیں تھا پھر بھی میز پر اچھی بھیڑ بھاڑ تھی۔ انگریز لوگ چائے پیتے وقت بولنا پسند نہیں کرتے تھے مگر بھارتی لوگ کیا اب بھی ان کے غلام ہیں؟ وہ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ من موہنی نے چائے بناتے ہوئے کہا "مجھے تو بالکل امید نہیں تھی مگر سیکریٹری صاحب کی مہربانی کو کیا کہوں۔۔۔"

سیکریٹری صاحب بولے "میری مہربانی۔ آپ کو کوئی نہ تو کر دے؟ آپ کی ذہانت۔۔۔"

ڈائرکٹر کہہ اٹھے "ہاں ان کی ذہانت۔ محکمہ ثقافت تو ہے ہی خواتین کی ذہانت کا شعبہ۔"

سیکریٹری صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پیالے کو میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے کہا "کیا بات کہی ہے آپ نے؟ ثقافت اور خواتین دونوں ایک ہی ہیں۔ ڈرامہ، رقص، موسیقی اور شاعری۔۔۔ اور تشہیر؟"

"ارے عورت سے زیادہ تشہیر کر پایا ہے کوئی؟"

اس وقت بیرے نے آ کر سلام کیا۔ تار آیا تھا۔ کھولنے پر معلوم ہوا کہ چھوٹے جج صاحب کے بیٹے کا تقرر انکم ٹیکس افسر کے عہدے پر ہو گیا ہے اسے مدراس جانا ہو گا۔

"کیا کیا۔۔۔" کہتے ہوئے سب تار پر جھپٹے۔ فرحت و مسرت اور بھی بڑھ گئی۔ چھوٹے جج نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا "دیکھو نرملا! مجھے پورا یقین تھا کہ شرما میری بات نہیں ٹال سکتا اور میری بات بھی کیا، اصل میں وہ تمہارا مرید ہے۔ کہتا تھا عورت۔۔۔"

بات کاٹ کر سیکریٹری صاحب بولے "جی نہیں یہ نہ آپ ہیں اور نہ ہی شریمتی نرملا۔ یہ تو آپ کی فیملی کی ذہانت ہے۔"

اس پر سب نے اظہار مسرت کیا۔ چھوٹے جج صاحب اس کی تردید کرتے کہ بیرے نے آکر پھر سلام کیا۔ حیرانی سے ڈائرکٹر بولے "اس بارکس کا تقرر ہونے والا ہے؟"

بیرے نے کہا "دو بچے حضور سے ملنے آئے ہیں"

"ہم سے؟" چھوٹے جج صاحب حیرت سے بولے۔

"جی"

"کس کے بچے ہیں؟"

"جی معلوم نہیں، بھائی بہن ہیں۔ غریب جان پڑتے ہیں"

"ارے تو بیوقوف، کچھ دے دلا کر لوٹا دیا ہوتا"

"بہت کوشش کی مگر وہ کچھ مانگتے ہی نہیں، بس آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

چھوٹے جج تیزی سے اٹھے۔ ان کا موڈ بگڑ گیا مگر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پھر بیٹھ گئے۔ آج خوشی کا دن ہے، یہیں لے آؤ۔

دو منٹ بعد بری طرح سہمے اور گھبرائے جو دو بچے اندر کمرے میں داخل ہوئے وہ نینا اور کمل تھے۔ آنسوؤں کے داغ ابھی تک رخساروں پر باقی تھے نظروں سے خوف و ہراس جھلک رہا تھا۔ ایک ساتھ سب نے ان کی طرف دیکھا جیسے جام میں مکھی پڑ گئی ہو۔ چھوٹے جج نے پوچھا "کہاں سے آئے ہو؟"

"جی ... جی ..." نینا نے کہنا چاہا لیکن منہ سے الفاظ نہیں نکلے اور باوجود سب کے یقین دلانے کے وہ کچھ لمحے تک خوف و ہراس سے بغیر پلک جھپکائے دیکھتے ہی رہے۔ بس دیکھتے ہی رہے۔ آخر من موہنی اٹھی۔ پاس آکر بولی "کتنے پیارے کتنے خوبصورت بچے ہیں"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا تھا۔ نینا کو جیسے کرنٹ چھو گیا۔ یکلخت مضبوط لہجہ میں بول اٹھی "آپ نے ہمارے پتا جی کو جیل بھیجا ہے، آپ انہیں چھوڑ دیں..."

کمل نے اسی مضبوطی سے کہا "ہمارے پاس پچاس روپے ہیں۔ آپ نے تین ہزار لے کر ایک ڈاکو کو چھوڑا ہے..."

نینا بولی "لیکن ہمارے پتا جی ڈاکو نہیں ہیں۔ مہنگائی بڑھ گئی تھی۔ بس انہوں نے بیس روپے کی رشوت لی تھی"

کمل نے کہا "اگر روپے تھوڑے ہوں تو..."

نینا بولی "تو میں ایک دو دن آپ کے پاس رہ سکتی ہوں"

کمل نے کہا "میری دیدی خوبصورت ہیں، اور آپ خوبصورت لڑکیوں کو لے کر کام کر دیتے ہیں"

رٹے ہوئے پارٹ کی طرح جب وہ ایک کے بعد ایک مکالمے بول رہے تھے تو نہ جانے ہمارے کہانی کار کو کیا ہوا! وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے زمین سورج کی کشش ثقل سے آزاد ہو رہی ہے، لیکن ایسا ہوتا تو کیا ہم یہ ____ لکھنے کو باقی رہتے؟ دھرتی اب بھی اسی طرح گھوم رہی ہے۔

(ترجمہ: نند کشور وکرم)

بقیہ: مہمان دیوتا سمان

سلمان صاحب کی تھالی میں ڈال دیا۔

"آپ ان کے بھائی ہیں؟" پھر وہی خشک آواز۔

سلمان صاحب کو کوفت ہوئی۔

"جی نہیں۔ میرا وہ شاگرد ہے"

"کیا آپ استاد ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کہاں پڑھاتے ہیں؟"

"اپنے ہی قصبے میں!"

"آپ بھی گپتا ہیں"

"جی نہیں!"

"براہمن ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا نام محمد سلمان ہے"

اُنہوں نے اپنا پورا تعارف کرایا اور روٹی کے آخری ٹکڑے میں سبزی لپیٹنے لگے۔

پانڈے جی نے اپنی بیوی کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو پایا کہ وہ خود اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگا کہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہیں، مگر ٹھیک ٹھیک کہہ نہیں پا رہے تھے۔

سلمان صاحب اگلی روٹی کا انتظار کر رہے تھے، لیکن عورت اسٹوو کے پاس سے اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اور کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ سلمان صاحب آم کھانے لگے تھے۔ عورت جب باہر نکلی تو اُس کے ہاتھ میں کانچ کا ایک گلاس تھا اور آنکھوں میں خوف۔ اس نے سلمان صاحب کی تھالی کے پاس رکھا اسٹیل کا گلاس اٹھا لیا تھا۔ اور اس کی جگہ کانچ کا گلاس رکھ دیا تھا۔

سلمان صاحب کو یاد آیا کہ ابھی شام کو جس گلاس میں اُنہوں نے چائے پی تھی وہ بھی اسٹیل کا تھا جس تھالی میں وہ کھانا کھا رہے تھے وہ بھی اسٹیل ہی کی تھی، اس لیے لمحہ بھر کے لیے وہ متفکر ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنی تھالی اٹھائی اور نابدان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں پیالے میں راکھ اور اس پر ایک گُجھنا رکھا ہوا تھا۔ سلمان صاحب نے گجھنا اٹھایا اور اپنی تھالی مانجھنے لگے۔

عورت نے تھوڑا پیچھے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا لیکن پھر وہ فوراً ہی اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

مشری لال ابھی تک نہیں آیا تھا۔

(ترجمہ: از مصنف)

بھیشم ساہنی

وانگ چو

تبھی دُور سے وانگ چو آتا دکھائی دیا۔

ندی کے کنارے لال منڈی کی سڑک پر دھیرے دھیرے ڈولتا سا چلا آ رہا تھا۔ گیروا رنگ کا چُغہ پہنے تھا۔ اور دُور سے لگتا تھا کہ بدھ بھکشوؤں کی طرح اس کا بھی سر مُنڈا ہوا ہے۔ پیچھے شنکر آچاریہ کی اونچی پہاڑی تھی اور اوپر شفاف نیلا آسمان۔ سڑک کے دونوں کنارے اونچے اونچے سفیدے کے پیڑوں کی قطاریں۔ پل بھر کے لیے مجھے لگا جیسے وانگ چو تاریخ کے صفحات سے اُتر کر آ گیا ہے۔ پرانے زمانے میں اسی طرح دیش بدیش سے آنے والے بدھ بھکشو پہاڑوں اور گھاٹیوں کو لانگھ کر بھارت میں آیا کرتے ہوں گے۔ ماضی کے ایسے ہی خوش رنگ دھندلکے میں وانگ چو بھی چلتا ہوا نظر آیا جب سے وہ سری نگر آیا تھا، بودھ وہاروں[1] کے کھنڈروں اور عجائب گھروں میں گھوم رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ لال منڈی کے عجائب گھر سے نکل کر آ رہا تھا۔ جہاں بودھی عہد کے نوادرات رکھے ہیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ وہ بیچ بیچ حال سے کٹ کر ماضی کے ہی کسی عہد گم گشتہ میں محو تھا۔

"بودھیوں سے ملاقات ہو گئی؟" پاس آنے پر میں نے چُٹکی لی۔

وہ مسکرا دیا۔ ہلکی ٹیڑھی سی مسکان، جسے میری موسیری بہن ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی۔ کیوں کہ مسکراتے وقت وانگ چو کا اوپری ہونٹ صرف ایک طرف سے تھوڑا سا اوپر کو اُٹھتا تھا۔

"عجائب گھر کے باہر بہت سی مورتیاں رکھی ہیں میں وہی دیکھتا رہا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔ پھر وہ یکایک جذباتی ہو کر بولا۔ "ایک مورتی کے صرف پیر ہی پیر بچے ہیں۔۔۔"

میں نے سوچا آگے کچھ کہے گا، لیکن وہ اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کا گلا رُندھ گیا اور اس کے لیے بولنا ناممکن ہو گیا۔

ہم ایک ساتھ گھر کی طرف لوٹنے لگے۔

"مہاپران[2] کے بھی پیر ہی پہلے دکھائے جاتے تھے۔" اُس نے کانپتی سی آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ میری کہنی پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھ کی ہلکی سی تھرتھراہٹ دھڑکتے دل کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

شروع شروع میں مہاپران کی مورتیاں نہیں بنائی جاتی تھیں نا! تم تو جانتے ہو پہلے ستوپ کے نیچے صرف پاؤں ہی دکھلائے جاتے تھے۔ مورتیاں تو بعد

نام:	بھیشم ساہنی
پیدائش:	۱۹۱۵ء
تصانیف:	۴ ناول، ۷ کہانیوں کے مجموعے اور ۲ ناٹک
دیگر ادبی سرگرمیاں:	تقریباً ۲ درجن کتابوں کا ہندی میں ترجمہ
اعزاز:	ناول 'تمس' پر ۱۹۷۵ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ
شغل:	لمبے عرصے تک دلّی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے۔ اب ریٹائرڈ۔
پتہ:	۸/۳۰، ایسٹ پٹیل نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

[1] بھکشوؤں کا مٹھ۔

[2] گوتم بدھ کا لقب۔

میں بنائی جانے لگیں تھیں۔ ظاہر ہے بودھی کے پیڑ دیکھ کر اسے مہاپران کے پیڑ یاد آنے لگے تھے اور وہ جذباتی ہو اٹھا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کون سی بات کس وقت وانگ چو کو شادماں کردے۔

"تم نے بہت دیر کر دی۔ سبھی لوگ تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ میں چناروں کے نیچے بھی تمہیں کھوج آیا ہوں" میں نے کہا

"میں عجائب گھر میں تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دو بجے تک ہمیں ہباکدل پہنچ جانا چاہیے۔ ورنہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

اس نے چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ تین بار سر ہلایا اور قدم بڑھا دیے۔

وانگ چو بھارت میں متوالا بنا گھوم رہا تھا وہ مہاپران کی جائے پیدائش لمبینی کا سفر ننگے پاؤں کر چکا تھا۔ سارا راستہ ہاتھ جوڑے ہوئے، جس جس سمت میں مہاپران کے مبارک قدم اٹھے تھے ــــ وانگ چو سحر زدہ سا اس سمت میں گھوم آیا تھا۔ سارناتھ میں۔ جہاں مہاپران نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا اور ہرن کے دونیچے سحر زدہ سے جھونپڑیوں میں سے نکل کر ان کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ وانگ چو گھنٹوں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے عقیدت سے سرشار بیٹھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود اس کے بقول اس کے لاشعور میں غیر واضح سے الفاظ گونجنے لگے تھے۔ اور اسے لگا تھا جیسے مہاپران کا پہلا وعظ سن رہا ہے۔ وہ اس عبادت بھرے تصوّر میں اتنا گہرا ڈوب گیا تھا کہ سارناتھ میں ہی رہنے لگا تھا۔ گنگا کی دھارا کو وہ ہزاروں برس کے دھندلکے میں مقدس ندیا کے روپ میں دیکھتا۔

جب سے سری نگر میں آیا تھا، برف سے ڈھکے پہاڑیوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اکثر مجھ سے کہتا "یہ وہ راستہ لہاسا کو جاتا ہے نا ! اسی راستے بدھ دھرم کی کتابیں تبت میں بھیجی گئی تھیں۔ وہ ان پہاڑی سلسلوں کو متبرک مانتا تھا۔ کیوں کہ ان پر بھی پگڈنڈیوں کے راستے بدھ بھکشو تبت کی طرف گئے تھے۔

وانگ چو کچھ عرصہ پہلے بدھ پروفیسر تان شان کے ساتھ بھارت آیا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ انہی کے ساتھ رہا۔ اور ہندی و انگریزی زبان سیکھتا رہا۔ پھر پروفیسر شان چین لوٹ گئے۔ اور وہ یہیں رہ گیا۔ اور کسی بودھ سوسائٹی سے گرانٹ حاصل کر کے سارناتھ میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں کا دلدادہ ایسا ذی روح جو ماضی کی دلکش تخیلاتی دنیا میں ہی عمر بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں حقیقت کی کھوج کرنے نہیں آیا تھا، وہ تو بودھیوں کی مورتیوں کو دیکھ شادماں ہونے آیا تھا۔ مہینے بھر سے عجائب گھروں کے چکر کاٹ رہا تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ بدھ دھرم کی کس تعلیم سے اُسے سب سے زیادہ ترغیب ملتی ہے۔ نہ تو وہ کسی حقیقت کو پاکر خوشی سے کھل اٹھتا ہے۔ نہ اُسے کوئی تضاد پریشان کرتا۔ وہ بھاگت زیادہ تھا اور متلاشی کم۔

مجھے یاد نہیں کہ اس نے کبھی ہمارے ساتھ کھل کر بات کی ہو یا کسی موضوع پر اپنا خیال ظاہر کیا ہو۔ ان دنوں میرے اور میرے دوستوں کے بیچ گھنٹوں بحثیں چلا کرتیں، کبھی دیش کی سیاست کے بارے میں، کبھی دھرم کے بارے میں، لیکن وانگ چو ان میں کبھی حصہ نہ لیتا تھا۔ وہ سارا وقت دھیرے دھیرے مسکراتا رہتا اور کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہتا۔ ان دنوں دیش میں ولولوں کا سیلاب سا اُمڈ رہا تھا ــــ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ہمارے بیچ اسی کا ذکر رہتا۔ کانگریس کون سی پالیسی اپنائے گی؟ تحریک کون سا رُخ پکڑے گی۔ عملی طور پر تو ہم لوگ کچھ کرتے کراتے نہیں تھے، لیکن جذباتی طور پر اس سے بہت کچھ جڑے ہوئے تھے۔ اس پر وانگ چو کی بے اعتنائی کبھی کبھی ہمیں کھلتی تو کبھی اچنبھے میں ڈال دیتی ــــ وہ ہمارے دیش کے ہی نہیں اپنے دیش کے حالات کے بارے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے اپنے دیش کے بارے میں بھی پوچھو تو وہ مسکراتا سر ہلاتا رہتا تھا۔

کچھ دنوں سے سری نگر کی ہوا بھی بدلی ہوئی تھی۔ کچھ مہینے پہلے یہاں گولی چلی تھی۔ کشمیر کے لوگ مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اب کچھ دنوں سے شہر میں ایک نیا جوش پایا جاتا تھا۔ نہرو جی سری نگر آنے والے تھے۔ اور ان کے استقبال کے لیے شہر کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ آج ہی دوپہر کو نہرو جی سری نگر پہنچ رہے تھے۔ ندی کے راستے ناؤوں کے جلوس کی شکل میں انہیں لانے کا پروگرام تھا۔ اور اسی لیے میں وانگ چو کو تلاش کرتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا۔

ہم گھر کی طرف جا رہے تھے، جب اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا میرا جانا بہت ضروری ہے ....؟ جیسا تم کہو ...."

مجھے دھچکا سا لگا۔ ایسے وقت میں جب لاکھوں لوگ نہرو جی کے استقبال کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے، وانگ چو کا یہ کہنا کہ اگر وہ ساتھ میں نہ جائے تو کیسا رہے، مجھے سچ مچ بُرا لگا، لیکن پھر خود ہی کچھ سوچ کر اس نے اپنا خیال بدل لیا۔ اور ہم ساتھ ساتھ گھر کی طرف چلنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہباکدل کے پل کے نزدیک لاکھوں کی بھیڑ میں ہم لوگ کھڑے تھے۔ میں، وانگ چو اور میرے دو تین دوست۔ چاروں طرف تا حدِ نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر، پل پر، ندی کے ڈھلوان کناروں پر، میں بار بار کنکھیوں سے وانگ چو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کا تاثر کیا ہے۔ ہمارے دلوں میں اُٹھنے والے ولولوں کا اس پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ یوں بھی یہ میری عادت سی بن گئی ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی ساتھ میں ہو، میں اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا کہ ہمارے رسم و رواج، ہمارے رہن سہن کے بارے میں اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ وانگ چو ادھ مندی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھے جا رہا تھا۔ جب نہرو جی کی ناؤ سامنے آئی تو جیسے مکانوں کی چھتیں بھی دہل اُٹھیں۔ راج ہنس کی شکل کی سفید ناؤ میں نہرو جی مقامی نیتاؤں کے ساتھ کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور ہوا میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ میں نے پلٹ کر وانگ چو کے چہرے

کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح بے نیاز سا سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو نہرو جی کیسے لگے؟" میرے ایک ساتھی نے وانگ چو سے پوچھا۔

وانگ چو نے اپنی ٹیڑھی سی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان کے ساتھ کہا — "اچھا۔ بہت اچھا۔"

وانگ چو معمولی سی ہندی اور انگریزی جانتا تھا۔ اگر تیز بولو تو اس کے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔

نہرو جی کی ناؤ دُور جا چکی تھی، لیکن ناؤوں کا جلوس ابھی بھی چلتا جا رہا تھا۔ جب وانگ چو اچانک مجھ سے بولا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے عجائب گھر میں جانا چاہوں گا۔ ادھر سے راستہ جاتا ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔" اور وہ بنا کچھ کہے ایک بار ادھ مندی آنکھوں سے مسکرایا۔ اور ہلکے سے ہاتھ ہلا کر مڑ گیا۔

ہم سبھی حیران رہ گئے۔ اسے سچ مچ جلوس میں دلچسپی نہیں رہی ہو گی۔ جو اتنی جلدی عجائب گھر کی طرف اکیلا چل دیا ہے۔

"یار کس بودے کو اٹھا لائے ہو؟ یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے پکڑ لائے ہو اسے؟" میرے ایک دوست نے کہا۔

"باہر کا رہنے والا ہے۔ اسے ہماری باتوں میں کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔" میں نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"واہ دیش میں اتنا کچھ ہو رہا ہے اور اسے دلچسپی ہی نہ ہو۔"

وانگ چو اب تک دُور جا چکا تھا اور بھیڑ میں سے نکل کر پیڑوں کی قطار کے نیچے آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

"مگر یہ ہے کون؟" دوسرا ایک دوست بولا۔ نہ یہ بولتا ہے نہ چالتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ سارا وقت اِنک کرنے میں دُبکا بیٹھا رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ پچھلے پانچ سال سے یہاں رہ رہا ہے۔ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ بدھ دھرم کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔" میں نے پھر اس کی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

میری نظر میں اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ وہ بدھ گرنتھ کی تلاوت کرتا ہے اور اسی کے لیے اتنی دُور سے آیا ہے۔

"ارے بھاڑ میں جائے ایسی پڑھائی! واہ جی! جلوس کو چھوڑ کر میوزیم کی طرف چل دیا ہے۔"

"سیدھی بات ہے یار" میں نے جوڑا — "اسے یہاں بھارت کا حال نہیں ماضی کھینچ کر لایا ہے۔ ہیون سانگ بھی یہاں بودھ گرنتھ پڑھنے آیا تھا۔ یہ بھی علم کا رسیا ہے۔ بودھ دھرم میں اس کی دلچسپی ہے۔"

گھر لوٹتے ہوئے سارا راستہ ہم لوگ وانگ چو ہی کی چرچا کرتے رہے۔ اجے کا خیال تھا کہ اگر وہ پانچ سال بھارت میں کاٹ گیا ہے تو اب وہ ساری زندگی یہیں پر رہے گا۔

اب آ گیا ہے تو لوٹ کر نہیں جائے گا۔ بھارت میں پردیسی ایک بار آ جائے تو لوٹنے کا نام نہیں لیتا۔

بھارت دیش وہ دلدل ہے کہ جس میں ایک بار باہر کے آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ نکلنا چاہے تو بھی نہیں نکل سکتا — دلیپ نے مذاق میں کہا۔ نہ جانے کون سے کنول توڑنے کے لیے اس دلدل میں گھسا ہے۔

"ہمارا دیش ہم ہندوستانیوں کو پسند نہیں۔ باہر کے لوگوں کو تو بہت پسند ہے۔" میں نے کہا۔

"پسند کیوں نہ ہو گا۔ یہاں تھوڑے میں گزر ہو جاتی ہے۔ سارا دن دھوپ کھلی رہتی ہے۔ پھر باہر کے آدمی کو لوگ پریشان نہیں کرتے۔ جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھے رہنے دیتے ہیں۔ اس پر انہیں تم جیسے سادہ لوح بھی مل جاتے ہیں، جو ان کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں اور ان کی آؤ بھگت کرتے رہتے ہیں۔ تمہارا وانگ چو بھی یہیں پر مرے گا.....!

ہمارے یہاں ان دنوں میری چھوٹی موسیری بہن ٹھہری ہوئی تھی۔ وہی، جو وانگ چو کی مسکان کو ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی۔ چلبلی سی لڑکی۔ بات بات پر شوخی کرتی رہتی تھی۔ میں نے وانگ چو کو دو ایک بار کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے پایا تھا۔ لیکن کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ وہ سبھی کو کنکھیوں سے ہی دیکھتا۔ لیکن اسی شام نیلم میرے پاس آئی اور بولی "آپ کے دوست نے مجھے تحفہ دیا ہے — پیار کا تحفہ۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا دیا ہے؟"

"جھومروں کا جوڑا۔"

اور اس نے دونوں مٹھیاں کھول دیں، جس میں چاندی کے کشمیری طرز کے دو سفید جھومر چمک رہے تھے اور وہ دونوں جھومر اپنے کانوں کے پاس لیجا کر بولی — "کیسے لگتے ہیں؟"

میں بیوقوفوں کی طرح نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے اپنے کان کیسے بھورے بھورے ہیں۔ نیلم نے ہنس کر کہا۔

"کس کے؟"

"میرے اس پریمی کے۔"

"تمہیں اس کے بھورے کان پسند ہیں؟"

"بہت زیادہ۔ جب شرماتا ہے تو براؤن ہو جاتے ہیں۔ گہرے براؤن" اور نیلم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لڑکیاں کیسے اس آدمی کی محبت کا مذاق اُڑا سکتی ہیں۔ جو انہیں پسند نہ ہو۔ یا کہیں نیلم مجھے بنا تو نہیں رہی ہے؟

لیکن میں اس بات سے بہت فکرمند نہیں ہوا تھا۔ نیلم لاہور میں پڑھتی تھی اور وانگ چو سارناتھ میں رہتا تھا۔ اور اب وہ ہفتہ بھر میں سری نگر سے واپس لوٹ جانے والا تھا۔ اس محبت کا انکور اپنے آپ ہی جل جائے گا۔

"نیلم، یہ بھوپر تو تم نے اس سے لے لیے ہیں، لیکن اس قسم کی دوستی آخر میں اس کے لیے غم ناک ہوگی۔ بے بنائے گی کچھ نہیں۔"

"واہ بھیّا، تم بھی کیسے دقیانوسی ہو۔ میں نے بھی چمڑے کا ایک رائٹنگ پیڈ اُسے تحفے میں دیا ہے۔ میرے پاس پہلے سے پڑا تھا۔ میں نے اُسے دے دیا جب لوٹے گا تو پریم پتر لکھنے میں اُسے آسانی ہوگی۔"

"وہ کیا کہتا تھا؟"

"کہتا کیا تھا۔ سارا وقت اس کے ہاتھ کانپتے رہے اور چہرہ کبھی لال ہوتا، کبھی پیلا۔ کہتا تھا مجھے خط لکھنا۔ میرے خطوں کا جواب دینا اور کیا کہے گا بے چارہ بھورے کانوں والا۔"

میں نے غور سے نیلم کی طرف دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں مجھے ہنسی کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیا۔ لڑکیاں دل کی بات چھپانا خوب جانتی ہیں۔ مجھے لگا نیلم اُسے بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس کے لیے یہ کھلواڑ تھا، لیکن وانگ چو ضرور اس کا دوسرا ہی معنی نکالے گا۔

اس کے بعد مجھے لگا کہ وانگ چو اپنا توازن کھو رہا ہے۔ اسی رات میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا باہر میدان میں چناروں کی قطار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب چاندنی میں، کچھ دوری پر پیڑوں کے نیچے مجھے وانگ چو ٹہلتا دکھائی دیا۔ وہ اکثر رات کو دیر تک پیڑوں کے نیچے ٹہلتا رہتا تھا۔ مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ نیلم بھی اس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر چلتی جا رہی تھی۔ مجھے نیلم پر غصہ آیا۔ لڑکیاں کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کھلواڑ سے وانگ چو کی بے چینی بڑھے گی۔ وہ اُسے بڑھاوا دیے جا رہی تھی۔

دوسرے روز کھانے کی میز پر نیلم پھر اس کے ساتھ مذاق کرنے لگی۔ کچن سے ایک چھوٹا سا المونیم کا ڈبہ اُٹھا لائی۔ اس کا چہرہ تپتے تانبے جیسا لال ہو رہا تھا۔

"آپ کے لیے روٹیاں اور آلو بنا لائی ہوں۔ آم کے اچار کی پھانک بھی رکھی ہے۔ آپ جانتے ہیں پھانک کسے کہتے ہیں۔ ایک بار کہیے تو پھانک! کہو وانگ چو جی پھانک!"

اس نے نیلم کی طرف کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولا۔ "بانک!" ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بانک نہیں، پھانک!"

"بانک!" پھر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

نیلم نے ڈبا کھولا اس میں سے آم کے اچار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی۔ یہ ہے پھانک ---- پھانک اسے کہتے ہیں۔ اور اسے وانگ چو کی ناک کے پاس لے جا کر بولی۔ اسے سونگھنے پر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آیا منہ میں پانی؟ اب کہو پھانک!

"نیلم، کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ بیٹھو آرام سے۔" میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نیلم بیٹھ گئی۔ لیکن اس کی شرارتیں بند نہیں ہوئیں۔ بڑے پیار سے وانگ چو سے کہنے لگی ---- بنارس جا کر ہمیں بھول نہیں جائیے گا۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو جھجکیے گا نہیں۔"

وانگ چو لفظوں کے معنی تو سمجھ لیتا تھا لیکن ان کے پیچھے چھپی تضحیک کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔

"بھیڑ کی کھال کی ضرورت ہو یا کوئی نمدہ یا اخروٹ ....."

"نیلم!"

"کیوں بھیّا! بھیڑ کی کھال پر بیٹھ کر گرنتھ پڑھیں گے؟"

وانگ چو کے کان لال ہونے لگے۔ شاید پہلی بار اُسے محسوس ہوا تھا کہ نیلم مذاق کر رہی ہے۔ اس کے کان سچ مچ بھورے رنگ کے ہو رہے تھے، جس کا نیلم مذاق اڑایا کرتی تھی۔

"نیلم جی، آپ لوگوں نے میری بڑی مہمان نوازی کی ہے۔ میں بڑا ممنون ہوں۔"

ہم سب چپ ہو گئے۔ نیلم بھی جھینپ سی گئی۔ وانگ چو نے ضرور ہی اس کی شرارت کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس کے دل کو ضرور ٹھیس لگی ہوگی۔ لیکن میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ نیلم کے تئیں اس کے خیالات بدلیں۔ ورنہ اسے ہی سب سے زیادہ پریشانی ہوگی۔

شاید وانگ چو اپنی حیثیت کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایک دام فریب میں آ گیا تھا۔ جذباتی آدمی کا خود پر کوئی قابو نہیں ہوتا وہ پچھاڑ کھا کر گرتا ہے تبھی اپنی بھول کو سمجھ پاتا ہے۔

ہفتہ کے آخری دنوں میں وہ روز کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آنے لگا۔ ایک بار میرے لیے بھی چغہ لے آیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا کہ وہ اور میں اپنا اپنا چغہ پہن کر ایک ساتھ گھومنے جائیں۔ عجائب گھر میں وہ اب بھی جاتا تھا۔ دو ایک بار نیلم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور لوٹنے پر ساری شام نیلم بودھیوں کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ میں من ہی من نیلم کے اس رویّے سے خوش ہوتا رہا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وانگ چو کی کوئی خواہش، کوئی جذباتی وابستگی ہمارے گھر میں جڑ جما پائے۔ ہفتہ بیت گیا اور وانگ چو سارناتھ واپس لوٹ گیا۔

وانگ چو کے چلے جانے کے بعد اس کے ساتھ میرا تعلق ویسا ہی رہا جیسا عام طور پر ایک شناسا کے ساتھ رہتا ہے۔ گاہے بگاہے خط آ جاتا یا کسی آتے جاتے شخص سے اس کی خیر خبر مل جاتی۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو برسوں تک رسمی جان پہچان کی سرحد پر کھڑے رہتے ہیں۔ نہ سرحد پھلانگ کر اندر آتے ہیں نہ ہی پیچھے ہٹ کر آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مجھے اتنی ہی جانکاری رہی کہ اس کے روز و شب کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ دنوں مجھے تجسس رہا کہ نیلم اور وانگ چو کے بیچ کی بات آگے بڑھی یا نہیں لیکن لگا کہ وہ پریم بھی وانگ چو کی سپاٹ زندگی پر حاوی نہیں ہو پایا۔

برس اور سال بیت گئے۔ ان دنوں ہمارے دیش میں بہت کچھ گھٹ رہا تھا۔ آئے دن [illegible] بنگال میں قحط پڑا۔ 'بھارت چھوڑو' کا آندولن ہوا ---- سڑکوں پر گولیاں چلیں، بمبئی میں ملاحوں کی بغاوت ہوئی۔ دیش میں خوں ریزی ہوئی پھر دیش کا بٹوارہ ہوا۔

سارا وقت وانگ چو سارناتھ ہی میں رہا۔ وہ اپنے آپ میں مطمئن لگتا تھا۔ کبھی لکھتا کہ "تنتر گیان" کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کبھی پتہ چلتا کہ کوئی کتاب لکھنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

اس کے بعد میری ملاقات وانگ چو سے دلّی میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب چین کے وزیرِ اعظم چو این لائی بھارت کے دورے پر آنے والے تھے ——— وانگ چو اچانک مجھے سڑک پر مل گیا۔ میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ مجھے اچھا لگا کہ چین کے وزیرِ اعظم کی آمد پر وہ سارناتھ سے دہلی چلا آیا ہے، لیکن جب اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے وظیفے کے سلسلے میں آیا ہے اور یہ کہ یہاں پہنچنے پر اسے چو این لائی کی آمد کی خبر ملی ہے تو میں اس کی بے نیازی اور بد ذوقی پر حیران ہوا۔ اس کا طور طریقہ ویسا کا ویسا ہی تھا۔ پہلے ہی کی طرح اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان مسکراتا رہا۔ کاروبارِ جہاں سے ویسا ہی بے نیاز، بے اعتنا۔ اس بیچ اس نے کوئی کتاب یا مقالہ وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ تنتر گیان کے ذکر کے دوران بھی وہ مُسکراتا رہا۔ وہ ایک کتابوں کے بارے میں بتاتا رہا جس میں سے وہ کچھ نوٹس لیتا رہا تھا۔ اپنے کسی مقالے کا بھی ذکر کیا، جس پر وہ ابھی کام کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ نیلم کے ساتھ اس کی خط و کتابت چلتی رہی۔ حالانکہ نیلم کب کی بیاہی جا چکی تھی۔ اور دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ہمارے خیالات بھلے نہ بدلیں لیکن ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اپنے مطالعہ وغیرہ کا بھی اس نے ذکر کیا۔ وہاں بھی اس کے شوق اور ولولے میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ پہلے جیسا جوش و جذبہ نہیں تھا۔ بودھیوں کے پیروں پر اپنی جان نچھاور کرتا نہیں پھرتا تھا، لیکن اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ پہلے ہی کی طرح تھوڑا کھاتا، تھوڑا پڑھتا، تھوڑا سیر کرتا اور تھوڑا سوتا تھا اور پھر دور لڑکپن کے جھٹپٹے میں اپنی زندگی کے لیے کھینچی گئی راہ پر کچھوے کی چال مزے سے چلتا آ رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہمارے بیچ بحث چھڑ گئی ——— سماجی نظام کو سمجھے بنا تم بودھ دھرم کو بھی کیسے سمجھ پاؤ گے؟ ہر علم ایک دوسرے سے جڑا ہے، زندگی سے جڑا ہے، کوئی چیز زندگی سے الگ نہیں ہے۔ تم زندگی سے الگ رہ کر دھرم کو کیسے سمجھ سکتے ہو؟

کبھی وہ مسکراتا کبھی سر ہلاتا اور سارا وقت تماش بینوں کی طرح میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے لگا کہ میرے کہے کا اس پر کوئی اثر نہیں رہا کہ میں چکنے گھڑے پر پانی انڈیلے جا رہا ہوں۔

ہمارے دیش میں نہ سہی، تم اپنے دیش کے حالات میں تو دلچسپی لو۔ آنا تو جانو سمجھو کہ وہاں پر کیا ہو رہا ہے۔

اس پر بھی وہ سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر چین میں اس کا کوئی نہیں ہے ——— ۱۹۲۹ء میں وہاں پر کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا تھا، اس میں اس کا گاؤں جلا ڈالا گیا تھا۔ اور سارے عزیز رشتہ دار مر گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔ لے دے کر اس کا ایک بھائی بچا تھا جو پیکنگ کے نزدیک کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ برسوں سے وانگ چو کا تعلق اس سے بھی ٹوٹ چکا تھا۔ وانگ چو پہلے اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔ بعد میں پیکنگ کے ایک اسکول میں پڑھنے لگا تھا۔ وہیں سے وہ پروفیسر شان کے ساتھ بھارت چلا آیا تھا۔

سنو وانگ چو، بھارت اور چین کے درمیان بند دروازے اب کھل رہے ہیں۔ اب دونوں ملکوں کے بیچ تعلقات بحال رہے ہیں۔ اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ حصولِ علم کا یہی کام جو ابھی تک تم الگ تھلگ کرتے رہے ہو، اب تم اپنے دیش کے باضابطہ نمائندے کی حیثیت سے کرو گے۔ تمہاری سرکار تمہارے وظیفے کا انتظام کرے گی۔ اب تمہیں الگ تھلگ نہیں رہنا پڑے گا۔ تم پندرہ سال سے بھی زیادہ سے بھارت میں ہو۔ انگریزی اور ہندی بھاشائیں جانتے ہو، بودھ گرنتھوں کا زبردست مطالعہ رکھتے ہو۔ تم دونوں ملکوں کے تہذیبی رشتے کو قائم کرنے میں ایک بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی۔ سچ مچ اُسے کچھ سہولتیں مل سکتی تھیں۔ کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے؟ دونوں ملکوں کے بیچ خوشگوار تعلقات سے وہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ ہی دنوں پہلے جب وہ وظیفے کی رقم لینے بنارس میں گیا تو سڑکوں پر راہ چلتے لوگ اس سے گلے مل رہے تھے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے ضرور اپنے دیش لوٹ جائے۔ اور وہاں ہونے والی بڑی بڑی تبدیلیوں کو دیکھے اور سمجھے کہ سارناتھ میں الگ تھلگ بیٹھے رہنے سے اُسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنتا، سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہو پایا کہ اس پر کوئی اثر ہوا ہے یا نہیں۔

لگ بھگ چھ مہینے بعد اس کا خط آیا کہ وہ چین جا رہا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اپنے دیش میں جائے گا تو اس کی دھوبی کے کتے جیسی حالت تو ختم ہو جائے گی۔ کہیں کا تو ہو کر رہے گا۔ اس کی زندگی میں نئی توانائی آئے گی۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنا ایک ٹرنک سارناتھ میں چھوڑے جا رہا ہے۔ جس میں اس کی کچھ کتابیں اور زیرِ تحقیق مسودے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، یہ کہ بھارت میں برسوں تک رہ چکنے کے بعد وہ اپنے کو بھارت کا باشندہ مانتا ہے اور یہ بھی کہ وہ جلد ہی بھارت لوٹ آئے گا اور پھر اپنے مطالعے میں لگ جائے گا۔ میں اپنے من ہی من میں ہنس دیا۔ ایک بار اپنے دیش گیا تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔

چین میں وہ لگ بھگ دو برسوں تک رہا۔ وہاں سے اُس نے مجھے پیکنگ کے قدیم راج محل کی تصویر بھیجی، دو ایک خط بھی لکھے۔ لیکن اس سے اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں ملی۔

ان دنوں چین میں بھی بڑے ولولے اُٹھ رہے تھے۔ بڑا جوش تھا اور اس جوش کی لپیٹ میں لگ بھگ سبھی لوگ تھے۔ زندگی نئی کروٹ لے رہی تھی۔ لوگ کام کرنے جاتے تو ٹولیاں بنا کر گاتے ہوئے لال جھنڈے ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے۔ وانگ چو سڑک کے کنارے کھڑا اُنہیں دیکھتا رہ جاتا۔ اپنی کم آمیز طبیعت کے باعث وہ ٹولیوں کے ساتھ گاتے ہوئے جا تو نہیں سکتا تھا، لیکن اُنہیں جاتے دیکھ کر حیران سا کھڑا رہ جاتا، جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

سے اپنا بھائی تو نہیں ملا۔ لیکن ایک پرانا استاد،
دُور سے رشتے کی ایک خالہ اور دو ایک اور شناسا
مل گئے تھے۔ وہ اپنے گاؤں گیا۔ گاؤں میں بہت کچھ
بدل گیا تھا۔ اسٹیشن سے گھر جاتے ہوئے اس کا ایک ہمسفر
بتانے لگا ـــــ وہاں اُس بڑ کے نیچے زمیندار کے
سبھی کاغذ، سبھی دستاویز جلا ڈالے گئے۔ اور زمیندار ہاتھ
باندھے کھڑا رہا تھا۔

وانگ چو نے بچپن میں زمیندار کا بڑا گھر دیکھا تھا۔
اس کی رنگین کھڑکیاں اسے اب بھی یاد تھیں۔ دو ایک بار
زمیندار کی بگھی کو بھی قصبے کی سڑک پر جاتے دیکھا تھا۔۔۔
اب وہ گھر گاؤں کی انتظامیہ کا دفتر بنا ہوا تھا اور بھی
بہت کچھ بدلا تھا، لیکن یہاں بھی اس کے لیے ویسی
ہی صورتِ حال تھی۔ جیسی بھارت میں رہی تھی۔ اس
کے من میں کوئی ولولہ نہیں اٹھتا تھا۔ دوسروں کے جوش و
جذبے اس کے دل پر سے پھسل پھسل جاتے تھے۔ وہ یہاں
بھی تماشائی ہی بنا گھومتا رہتا تھا۔ شروع کے دنوں میں
اس کی آؤ بھگت بھی ہوئی۔ اس کے پرانے استاد کے ایما
پر اسے اسکول میں مدعو کیا گیا۔ بھارت چین، تہذیبی
رشتوں کے بیچ ایک بہت اہم کڑی قرار دے کر اُسے
اعزاز سے نوازا گیا۔ وہاں وانگ چو دیر تک لوگوں کو
بھارت کے بارے میں بتاتا رہا۔ لوگوں نے طرح طرح کے
سوالات پوچھے۔ رسم و رواج کے بارے میں، تیرتھوں،
میلوں، تہواروں کے بارے میں۔ وانگ چو صرف ان سوالوں
کا ٹھیک سے جواب دے پاتا، جن کے بارے میں وہ اپنے
تجربے کی روشنی میں کچھ جانتا تھا۔ لیکن بہت کچھ ایسا تھا
جن کے بارے میں وہ بھارت میں رہ کر بھی کچھ نہیں جانتا
تھا۔

کچھ دنوں بعد چین میں 'لمبی چھلانگ' کی مہم زور پکڑنے
لگی۔ اس کے گاؤں میں بھی لوگ لوہا اکٹھا کر رہے تھے۔ ایک دن
صبح اسے بھی ایک ٹولی کے ساتھ ردی لوہا جوڑنے کے لیے
بھیج دیا گیا تھا۔ دن بھر وہ لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔
ایک نیا جوش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ لوگ بڑے فخر
سے دکھا دکھا کر لا رہے تھے اور سامنے ڈھیر پر ڈال رہے
تھے۔ رات کے وقت آگ کے لپلپاتے شعلوں کے بیچ
اس کو پگھلایا جانے لگا۔ آگ کے ارد گرد بیٹھے لوگ انقلابی
گیت گا رہے تھے۔ سبھی لوگ ایک آواز ہو کر گیت گا رہے
تھے۔ اکیلا وانگ چو منھ بند کیے بیٹھا تھا۔

وہ چین ہی میں تھا کہ دھیرے دھیرے ماحول
میں تناؤ سا آنے لگا اور ایک جھٹپٹا سا گھرنے لگا۔ ایک روز
ایک آدمی نیلے رنگ کا کوٹ اور نیلے ہی رنگ کی پتلون
پہنے اس کے پاس آیا اور اُسے اپنے ساتھ گاؤں کی انتظامیہ
کے دفتر لے گیا۔ راستہ بھر وہ آدمی چپ چاپ رہا۔ دفتر
پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ ایک بڑے سے کمرے میں پانچ
آدمیوں کا ایک دل میز کے پیچھے بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا
ہے۔

جب وانگ چو ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ باری
باری اس سے بھارت میں قیام کے بارے میں پوچھنے
لگے۔ تم بھارت میں کتنے برسوں تک رہے؟ .....
وہاں کیا کرتے تھے؟ ..... کہاں کہاں گھومے؟..
وغیرہ وغیرہ۔ پھر بودھ دھرم کے بارے میں وانگ چو
کی دلچسپی کے بارے میں جان کر ان میں سے ایک شخص
بولا۔ "تمہارے خیال میں بودھ دھرم کے بنیادی عقائد
کی کیا کیا خصوصیات ہیں؟"

سوال وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس
نے آنکھیں مٹمٹائیں۔

روحانی عقائد و خصوصیات کی رُو سے تم
بدھ دھرم کو کیسا مانتے ہو؟

سوال پھر بھی وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا۔
لیکن اس نے بدبداتے ہوئے جواب دیا۔" روحانیت
میں مضمر، انسان کے ابدی سکون کے حصول کے لیے
بدھ دھرم کے بتائے ہوئے راستے بہت اہم ہیں ـــ
مہاپران کا پیغام ....

اور وانگ چو بودھ دھرم کے آٹھ اُپدیشوں
کو بیان کرنے لگا۔ وہ اپنی بات ابھی ختم بھی نہیں کر پایا
تھا، جب پردھان کی کرسی پر بیٹھے کٹیلی ترچھی آنکھوں
والے ایک شخص نے بات کاٹ کر کہا۔" بھارت کی خارجہ
پالیسی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

وانگ چو مسکرایا۔ اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان
پھر بولا۔" آپ حضرات اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ جانتے
ہیں۔ میں تو ایک معمولی بدھ کا پیرو ہوں، لیکن بھارت
بڑا قدیم دیش ہے۔ اس کی تہذیب، امن اور انسانیت
کے تئیں نیک جذبوں کی تہذیب ہے"۔ ....

"نہرو کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟"

"نہرو کو میں نے تین بار دیکھا ہے۔ ایک بار تو
ان سے باتیں بھی کی ہیں۔ ان پر کچھ کچھ مغربی تعلیم کا اثر زیادہ
ہے، لیکن روایتی قدیم تہذیب کے وہ بھی بڑے حامی ہیں۔

اس کے جواب سنتے ہوئے کچھ تو سر ہلانے لگے،
کچھ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ پھر طرح طرح کے ٹیڑھے سوالات پوچھے
جانے لگے۔ انہوں نے پایا کہ جہاں تک حقیقتوں اور بھارت
کے موجودہ حالات کی جانکاری کا سوال ہے، وانگ چو کی
معلومات ادھوری اور مضحکہ خیز ہیں۔

سیاسی نقطۂ نظر سے تو تم صفر ہو۔ بدھ دھرم کی
تعلیمات کو بھی سماجی ضروریات کی تکمیل کے لحاظ سے تم
نہیں ثابت کر سکتے۔ نہ جانے وہاں بیٹھے کیا کرتے رہے ہو۔
لیکن ہم تمہاری مدد کریں گے۔

پوچھ تاچھ گھنٹوں تک چلتی رہی۔ پارٹی افسروں
نے اُسے ہندی پڑھانے کا کام دے دیا۔ ساتھ ہی
پیکنگ کے ایک عجائب گھر میں ہفتہ میں دو دن کام
کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

جب وانگ چو پارٹی دفتر سے لوٹا تو تھکا ہوا
تھا۔ اس کا سر بھنّا رہا تھا۔ اپنے دیش میں اس کا دل
جم نہیں پایا تھا۔ آج وہ اور بھی زیادہ بے چینی محسوس
کر رہا تھا۔ چھت کے نیچے لیٹا تو اُسے اچانک بھارت
کی یاد ستانے لگی۔ اُسے سارناتھ کی اپنی کوٹھری یاد
آئی۔ جس میں وہ دن بھر صحیفوں کی تلاوت کیا کرتا تھا۔
نیم کا گھنا پیڑ یاد آیا، جس کے نیچے بیٹھ کر کبھی کبھی ستایا
کرتا تھا۔ یادوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ سارناتھ کی
کینٹین کا باورچی یاد آیا۔ جو ہمیشہ پیار سے ملتا تھا۔ سدا ہاتھ
جوڑ کر عقیدت سے "کہو بھگون" کہتا تھا۔

ایک بار وانگ چو بیمار پڑ گیا تھا، تو دوسرے
روز باورچی اپنے آپ اس کی کوٹھری میں چلا آیا تھا۔ ...
میں بھی کہوں، چینی بابو چائے پینے نہیں آئے، دو دن

ہوگئے۔ پہلے آتے تھے تو درشن ہو جاتے تھے۔ جیسے ترکی ہوتی بھگوان، تو ہم ڈاکٹر بابو کو بلا لاتے... میں بھی کہوں بات کیا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گنگا کا کنارا آگیا جس پر وہ گھنٹوں گھوما کرتا تھا پھر اچانک منظر بدلا اور کشمیر کی جھیل سامنے آگئی۔ اور پیچھے برف سے ڈھکے پہاڑ۔ پھر نیلم سامنے آئی۔ اس کی کھلی کھلی آنکھیں، موتیوں سے جھلملاتے دانت..... اس کا دل بے چین ہو اٹھا۔

جوں جوں دن بیتنے لگے۔ بھارت کی یاد اُسے زیادہ پریشان کرنے لگی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ سارناتھ میں سوال جواب نہیں ہوتے تھے — جہاں پڑے رہو، پڑے رہو، رہنے کے لیے کوٹھری اور کھانے کے لیے کھانے کا انتظام عبادت خانے کی طرف سے تھا۔ یہاں نئے نظریے سے مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا اور خواہش بھی نہ تھی۔ برسوں تک ایک ہی ڈھرے پر چلتے رہنے کے باعث وہ تبدیلیوں سے کتراتا تھا۔ اس بیٹھک کے بعد وہ پھر سے اپنے آپ میں سمٹنے لگا تھا۔ کہیں کہیں اُسے بھارت سرکار کے خلاف باتیں بھی سُننے کو ملتیں۔ اچانک وانگ چو خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگا اور اُسے لگا کہ زندہ رہ پانے کے لیے اُسے اپنے لڑکپن کے اس غیر شرمندۂ تعبیر خواب میں پھر سے لوٹ جانا ہوگا، جب وہ بودھ بھکشو بن کر بھارت میں عمر بسر کرنے کا تصور کیا کرتا تھا۔

اچانک اس نے بھارت لوٹنے کی ٹھان لی۔ لوٹنا آسان نہیں تھا۔ بھارتی سفارت خانے سے تو ویزا ملنے میں پریشانی نہیں ہوئی، لیکن چین سرکار نے بہت سے اعتراض کیے۔ وانگ چو کی شہریت کا سوال تھا اور بہت سے سوال تھے۔ لیکن بھارت اور چین کے تعلقات ابھی تک بہت بگڑے نہیں تھے۔ اس لیے آخر میں وانگ چو کو بھارت لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ اُس نے من ہی من فیصلہ کر لیا کہ وہ بھارت ہی میں اب زندگی کے دن کاٹے گا۔ بودھ بھکشو بنے رہنا ہی اس مقصدِ حیات تھا۔

جس روز وہ کلکتہ پہنچا، اسی روز سرحد پر چینی اور بھارتی فوجوں کے بیچ مڈبھیڑ ہوئی تھی اور دس بھارتی سپاہی مارے گئے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسٹیشن کے باہر ابھی نکلا ہی تھا کہ دو سپاہی آکر اُسے پولیس کے دفتر میں لے گئے۔ اور وہاں ایک افسر گھنٹہ بھر اس کے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی چھان بین کرتا رہا۔

"دو برس پہلے آپ چین گئے تھے۔ وہاں جانے کا مقصد کیا تھا؟"

"میں بہت برس تک یہاں رہتا رہا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے دیش جانا چاہتا تھا۔" پولیس افسر نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وانگ چو بے فکر تھا اور مسکرا رہا تھا — وہی ٹیڑھی سی مسکان۔

"آپ وہاں کیا کرتے رہے؟"

"وہاں ایک کمیون میں، میں کھیتی باڑی کی ٹولی میں کام کرتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہتے ہیں کہ بودھ گرنتھ پڑھتے ہیں۔"

"ہاں، پیکنگ میں ایک ادارہ میں، میں ہندی پڑھانے لگا تھا۔ اور پیکنگ میوزیم میں مجھے کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔"

"اگر اجازت مل گئی تھی تو آپ اپنے دیش سے بھاگ کیوں آئے؟" پولیس افسر نے غصے میں کہا۔

وانگ چو کیا جواب دے؟ کیا کہے؟

"میں کچھ دنوں ہی کے لیے وہاں گیا تھا۔ اب لوٹ آیا ہوں"....

پولیس افسر نے پھر اُسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شک اُبھر آیا تھا۔ وانگ چو گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ بھارت میں پولیس افسروں کے سامنے کھڑا ہونے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے ضمانت کے لیے پوچھا گیا تو اُس نے پروفیسر تان شان کا نام لیا۔ پھر گرودیو کا، لیکن دونوں مر چکے تھے۔ اس نے سارناتھ کے ادارے کے منتری[۱] کا نام لیا، شانتی نکیتن کے دو ایک پرانے مددگاروں کے نام لیے، جو اُسے یاد تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے سبھی نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ اس کے کپڑوں کی تین بار تلاشی لی گئی۔ اس کی ڈائری کو رکھ لیا گیا۔ جس میں اُس نے بہت سے اقتباسات، ریمارکس لکھ رکھے تھے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے اس کے نام کے آگے ریمارکس لکھ دیے کہ اس آدمی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ریل کے ڈبے میں بیٹھا تو دوسرے مسافر سرحد پر ہوئی جھڑپ کی باتیں کر رہے تھے۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر سب چُپ ہو گئے اور اُسے گھورنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب مسافروں نے دیکھا کہ وہ تھوڑی بہت بنگالی اور ہندی بول لیتا ہے تو ایک بنگالی بابو اچک کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر کہنے لگے۔ یا تو کہو کہ تمہارے دیش والوں نے وشواس گھات کیا ہے نہیں تو ہمارے دیش سے نکل جاؤ...... نکل جاؤ.... نکل جاؤ!

ڈیڑھ دانت کی مسکان جانے کہاں اوجھل ہوگئی تھی۔ اس کی جگہ چہرے پر خوف اُتر آیا تھا۔ اُداس اور خوفزدہ وانگ چو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہے بھی تو کیا کہے؟ جھڑپ کے بارے میں سُن کر اُسے بھی تو دھچکا لگا تھا۔ اس جھگڑے کے سبب کے بارے میں اُسے واضح طور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اور وہ جاننا چاہتا بھی نہیں تھا۔

ہاں سارناتھ میں پہنچ کر وہ سچ مچ مسرور ہو اُٹھا اپنا تھیلا رکشا میں رکھے جب وہ آشرم کے نزدیک پہنچا تو کنٹین کا باورچی بھاگ کر باہر نکل آیا — آگئے بھگوان؟ آگئے، میرے چینی بابو؟ بہت دن بعد درشن دیے۔ ہم بھی کہیں اتنا عرصہ ہوگیا چینی بابو نہیں لوٹے؟ اور کہیے سب خیر خیریت ہے؟ آپ یہاں نہیں تھے۔ ہم کہیں جانے کب لوٹیں گے! یہاں تھے دن میں دو باتیں ہو جاتی تھیں۔ بھلے آدمی کے درشن ہو جاتے تھے۔ اس میں بڑا سکون ملتا ہے۔ اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر تھیلا اُٹھا لیا۔

— ہم دیں پیسے چینی بابو؟

وانگ چو کو لگا جیسے وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے!

---

[۱] منتظم

"آپ کا ٹرنک 'چینی بابو' ہمارے پاس رکھا ہے۔ منتری جی سے ہم نے لیا۔ آپ کی کوٹھری میں ایک دوسرے صاحب رہنے آئے تو ہم نے کہا۔ کوئی چنتا نہیں' یہ ٹرنک ہمارے پاس رکھ جائیے اور چینی بابو آپ اپنا لوٹا باہر ہی بھول گئے تھے۔ ہم نے منتری جی سے کہا۔ یہ لوٹا چینی بابو کا ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔

وانگ چو کا دل بھر آیا۔ اسے لگا اس کی ڈانوا ڈول زندگی میں پھر سے توازن آگیا ہے۔ زندگی کی ڈگمگاتی ناؤ پھر سے خاموشی سے چلنے لگی ہے۔

منتری جی بھی خلوص سے ملے۔ پرانے جان پہچان کے آدمی تھے۔ انہوں نے ایک کوٹھری بھی کھول کر دے دی لیکن وظیفہ کے بارے میں کہا کہ اس کے لیے پھر سے کوشش کرنی ہوگی۔ وانگ چو نے پھر سے کوٹھری کے بیچوں بیچ چٹائی بچھائی۔ کھڑکی کے باہر وہی منظر پھر سے ابھر آیا۔ کھویا ہوا ذی روح پھر سے اپنے مسکن کو لوٹ آیا۔

تبھی مجھے اس کا خط ملا کہ وہ بھارت لوٹ آیا ہے۔ اور پھر سے جم کر بودھی صحیفوں کا مطالعہ کرنے لگا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ماہانہ وظیفہ کے بارے میں تھوڑی تشویش ہے اور اس سلسلے میں اگر میں بنارس میں فلاں صاحب کو خط لکھ دوں تو وظیفہ ملنے میں سہولت ہوگی۔

خط پا کر مجھے کھٹکا ہوا۔ کون سا سراب اسے پھر سے واپس کھینچ لایا ہے۔ یہ لوٹ کیوں آیا ہے۔ اگر کچھ دن اور وہاں رہتا تو اپنے لوگوں کے بیچ اس کا من لگنے لگتا۔ لیکن کسی کی سنک کا کوئی علاج نہیں۔ اب جو لوٹ آیا ہے تو کیا چارا ہے۔ میں نے 'فلاں' صاحب کو خط لکھ دیا اور وانگ چو کے چھوٹے موٹے وظیفہ کا انتظام ہو گیا۔

لیکن وانگ چو کے لوٹنے کے تقریباً دس روز بعد ایک دن صبح جب وہ چٹائی پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اس کی کتاب پر کسی کا سایہ پڑا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پولیس کا تھانے دار کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک پرچی اٹھائے ہوئے۔ وانگ چو کا دل بیٹھ گیا اب یہ کون سی نئی پریشانی اٹھنے والی ہے۔ وانگ چو کو بنارس کے بڑے پولیس اسٹیشن میں بلایا گیا تھا۔ وانگ چو کا من دنوں سے بھر اٹھا تھا۔

تین دنوں بعد وانگ چو بنارس کے پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اسی کے ساتھ بینچ پر ایک اور ضعیف العمر چینی بھی بیٹھا تھا جو جوتے بنانے کا کام کرتا تھا۔ آخر بلاوا آیا اور وانگ چو چک اٹھا کر بڑے افسر کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم چین سے کب لوٹے؟"

وانگ چو نے بتا دیا۔

"کلکتہ میں تم نے اپنے بیان میں کہا کہ تم شانتی نکیتن جا رہے ہو۔ پھر تم یہاں کیوں چلے آئے۔ پولیس کو پتہ لگانے میں بڑی پریشانی ہوئی ہے۔"

"میں نے دونوں جگہوں کے بارے میں کہا تھا۔ شانتی نکیتن تو میں صرف دو دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"تم چین سے کیوں لوٹ آئے؟"

"میں بھارت میں رہنا چاہتا ہوں......"

اس نے پہلے کا جواب دہرایا۔

"جو لوٹ آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟"

یہ سوال وہ بہت بار پہلے بھی سن چکا تھا جواب میں بودھ گرنتھوں کا حوالہ دینے کے علاوہ اسے اور کوئی جواب نہیں سوجھ پاتا تھا۔

بہت لمبا انٹرویو نہیں ہوا۔ وانگ چو کو ہدایت دی گئی کہ ہر مہینے کے پہلے سوموار کو بنارس کے بڑے پولیس اسٹیشن میں اسے آنا ہوگا اور اپنی حاضری لکھوانی ہوگی۔

وانگ چو باہر آگیا، لیکن الجھن سی محسوس کرنے لگا۔ مہینے میں ایک بار آنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ اس کی سپاٹ زندگی میں رکاوٹ تھی، خلل تھا۔

وانگ چو من ہی من اتی الجھن محسوس کر رہا تھا کہ بنارس سے لوٹنے کے بعد کوٹھری میں جانے کے بجائے وہ سب سے پہلے اس مقدس جگہ پر جا کر بیٹھ گیا، جہاں صدیوں پہلے مہاپران نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا اور دیر تک بیٹھا ورد کرتا رہا۔ بہت دیر بعد اس کا من پھر سے ٹھکانے پر آنے لگا اور دل میں پھر سے بھاونا کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔

لیکن وانگ چو کو چین نصیب نہیں ہوا۔ کچھ ہی دن بعد اچانک چین اور بھارت کے بیچ میں جنگ چھڑ گئی۔ دیش بھر میں جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی روز شام کو کچھ پولیس والے جیپ میں آئے اور وانگ چو کو حراست میں لے کر بنارس چلے گئے۔ سرکار یہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ حکومت چلانے والوں کو اتنی فرصت کہاں کہ بحران کے وقت دشمن کے ایک ایک شہری کی حالت کی جانچ کرتے پھریں۔

دو دنوں تک دونوں چینیوں کو پولیس اسٹیشن کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا۔ دونوں کے بیچ کسی بات میں یکسانیت نہیں تھی۔ جوتے بنانے والا چینی سارا دن سگریٹ پھونکتا رہتا۔ اور گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے بڑبڑاتا رہتا۔ جب کہ وانگ چو مغموم ڈھال سا دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا خلا میں دیکھتا رہتا۔

جس وقت وانگ چو اپنی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت دو تین کمرے چھوڑ کر پولیس سپرنٹنڈنٹ کی میز پر اس کی چھوٹی سی پوٹلی کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں پولیس کے سپاہی کوٹھری میں سے اس کا ٹرنک اٹھا لائے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے کاغذوں کا پلندہ رکھا تھا جس پر کہیں پالی میں تو کہیں سنسکرت زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ لیکن بہت سا حصہ چینی زبان میں تھا۔ صاحب کچھ دیر تک تو کاغذوں کو الٹتے پلٹتے رہے روشنی کے سامنے رکھ کر ان میں لکھی کسی خفیہ زبان کو ڈھونڈتے بھی رہے۔ آخر میں انہوں نے حکم دیا کہ کاغذ کے پلندے کو باندھ کر دہلی کے افسروں کے پاس بھیج دیا جائے۔ کیوں کہ بنارس میں کوئی آدمی چینی زبان نہیں جانتا تھا۔

پانچویں دن لڑائی بند ہو گئی، لیکن وانگ چو کو سارناتھ لوٹنے کی اجازت ایک مہینے کے بعد ملی۔ چلتے وقت جب اسے اس کا ٹرنک دیا گیا اور اس نے اسے کھول کر دیکھا تو سکتے میں آگیا۔ اس کے کاغذات اس میں نہیں تھے۔ جن پر وہ برسوں سے اپنے نوٹس اور مضامین وغیرہ لکھتا رہتا تھا اور جو ایک طرح سے اس کا اثاثہ تھے۔ پولیس

افسر کے کہنے پر کہ انہیں دہلی بھیج دیا گیا ہے وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا تھا۔

"میرے وہ کاغذات آپ مجھے دے دیجیے۔ ان پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ بہت ضروری ہیں۔

اس پر وہ افسر رکھائی سے بولا۔ "مجھے ان کاغذوں کا کیا کرنا ہے۔ آپ گئے ہیں آپ کو مل جائیں گے۔" اور اس نے وانگ چو کو چلتا کیا۔ وانگ چو اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ اپنے کاغذوں کے بنا وہ ادھ مرا سا ہو رہا تھا۔ نہ پڑھنے میں من لگتا نہ کاغذ پر نئے نوٹس اتار سکتا۔ اور پھر اس پر کڑی نگرانی رکھی جانے لگی تھی۔ کھڑکی سے تھوڑا ہٹ کر نیم کے پیڑ کے نیچے ایک آدمی روز بیٹھا نظر آنے لگا۔ ڈنڈا ہاتھ میں لیے وہ کبھی ایک کروٹ بیٹھتا کبھی دوسری کروٹ۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی کنویں کے چبوترے پر جا بیٹھتا۔ کبھی کنٹین کی بینچ پر آ بیٹھتا، کبھی گیٹ پر جا کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ اب وانگ چو کو مہینے میں ایک بار کی بجائے ہفتے میں ایک بار بنارس میں حاضری لگوانے جانا پڑتا تھا۔

تبھی مجھے وانگ چو کی چٹھی ملی۔ ساری تفصیل لکھنے کے بعد اس نے لکھا کہ بودھ وہار[1] کا منتری بدل گیا ہے اور نئے منتری کو چین سے نفرت ہے اور وانگ چو کو ڈر ہے کہ وظیفہ ملنا بند ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ میں جیسے بھی ہو اس کے کاغذوں کو بچا لوں جیسے بھی بن پڑے انہیں پولیس کے ہاتھوں سے نکلوا کر سارناتھ میں اس کے پاس بھجوا دوں۔ اور اگر بنارس کے پولیس اسٹیشن میں ہر ہفتے کی بجائے اسے مہینے میں ایک بار جانا پڑے تو سہولت ہوگی۔ کیوں کہ اس طرح مہینے میں لگ بھگ دس روپے آنے جانے میں لگ جاتے ہیں۔ اور پھر کام میں من ہی نہیں لگتا۔ سر پر تلوار لٹکتی رہتی ہے۔

وانگ چو نے خط تو لکھ دیا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ مجھ جیسے آدمی سے یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ یہاں کوئی کام بنا جان پہچان اور سفارش کے نہیں ہو سکتا۔ اور میری جان پہچان کا بڑے سے بڑا آدمی میرے کالج کا پرنسپل تھا۔ پھر میں چند ایک ممبر پارلیمنٹ کے پاس گیا۔ ایک نے دوسرے کے پاس، دوسرے نے تیسرے کے پاس بھیجا۔ میں بھٹک بھٹک کر لوٹ آیا۔ تسلیاں تو بہت ملیں، لیکن سب یہی پوچھتے ——— یہ چین جو گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کیوں آیا۔ یا پھر پوچھتے ——— پچھلے بیس سال سے مطالعہ ہی کر رہا ہے؟

لیکن جب میں اس کے مسودے کا ذکر کرتا تو سب یہی کہتے ——— ہاں، یہ تو ضائع نہیں ہونا چاہیے اور سامنے رکھے کاغذ پر کچھ نوٹ کر لیتے۔ اس طرح کی تسلی مجھے بہت ملی۔ سبھی سامنے رکھے کاغذ پر میری بات نوٹ کر لیتے۔ لیکن سرکاری کام کے راستے چکر دار کے راستوں کے جیسے ہوتے ہیں۔ اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی آدمی تمہیں تمہاری حیثیت کا احساس کراتا رہتا ہے۔ میں نے جواب میں اسے اپنی ساری کوششوں کا ذکر کیا۔ یہ بھی یقین دلایا کہ میں پھر سے لوگوں سے ملوں گا، ساتھ ہی میں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اپنے دیش لوٹ جائے کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔

خط سے اس کے دل کی کیا کیفیت ہوئی، میں نہیں جانتا۔ اس نے کیا سوچا ہوگا۔ لیکن ان تناؤ کے دنوں میں جب مجھے خود چین کے رویہ پر غصہ آ رہا تھا، میں وانگ چو کی مجبوریوں کو بہت ہمدردی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا پھر ایک خط آیا۔ اس میں چین لوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف وظیفہ کا ذکر کیا گیا تھا۔ وظیفہ کی رقم اب بھی چالیس روپے ہی تھی۔ لیکن اسے پہلے اطلاع دے دی گئی تھی کہ سال ختم ہونے پر اس پر پھر سے غور کیا جائے گا کہ وہ ملتا رہے گا یا بند ہو جائے گا۔

لگ بھگ سال بھر بعد وانگ چو کو ایک پرزہ ملا۔ کہ تمہارے کاغذات واپس کیے جا سکتے ہیں اور یہ کہ تم پولیس اسٹیشن آ کر انہیں لے جا سکتے ہو۔ ان دنوں وہ بیمار پڑا ہوا تھا، لیکن بیماری کی حالت میں بھی وہ گرتا پڑتا بنارس پہنچا، لیکن اس کے ہاتھ ایک تہائی کاغذ لگے ——— پوٹلی اب بھی آدھ کھلی تھی۔ وانگ چو کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ پھر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس پر تھانے دار رکھائی سے بولا۔ "ہم کچھ نہیں جانتے ——— انہیں اٹھاؤ اور لے جاؤ ورنہ ادھر لکھ دو کہ ہم لینے سے انکار کرتے ہیں۔

کانپتی ٹانگوں سے وانگ چو پلندہ بغل میں دبائے لوٹ آیا۔ کاغذوں میں صرف ایک پورا مضمون اور کچھ نوٹس بچے تھے۔ اسی دن سے وانگ چو کی آنکھوں کے سامنے دھول اڑنے لگی تھی۔

وانگ چو کی موت کی خبر مجھے مہینہ بھر بعد ملی۔ وہ بھی بودھ وہار کے منتری کی طرف سے کہ مرنے سے پہلے وانگ چو نے وصیت کی تھی کہ اس کا چھوٹا سا ٹرنک اور گنی چنی کتابیں مجھے پہنچا دی جائیں۔

عمر کے اس حصے میں پہنچ کر انسان بری خبریں سننے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور ایسی خبریں دل پر گہرا زخم نہیں لگاتیں۔

میں فوراً تو سارناتھ نہیں جا پایا۔ جانے کی کوئی تک بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہاں وانگ چو کا کون بیٹھا تھا۔ جس سے اظہارِ تعزیت کرتا۔ وہاں تو صرف ٹرنک ہی رکھا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد موقع ملنے پر میں گیا۔ منتری جی نے وانگ چو کے لیے تعریفی کلمات کہے۔ بڑا نیک دل آدمی تھا۔ صحیح معنوں میں بودھ بھکشو تھا وغیرہ وغیرہ۔ میرے دستخط لے کر انہوں نے ٹرنک میرے حوالے کیا۔ ٹرنک میں وانگ چو کے کپڑے تھے۔ پھٹا پرانا چغہ تھا، جو کسی زمانے میں اس نے سری نگر سے خریدا تھا۔ چھوٹا سا کام دار چمڑے کا پیڈ تھا۔ جو نیلم نے اسے تحفتاً دیا تھا۔ تین چار کتابیں تھیں۔ پالی اور سنسکرت کی۔ چٹھیاں تھیں، جن میں کچھ چٹھیاں میری کچھ نیلم کی رہی ہوں گی۔ کچھ اور لوگوں کی۔

ٹرنک اٹھائے میں باہر کی طرف جا رہا تھا جب مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ ملی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کنٹین کا باورچی بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اپنے خطوں میں اکثر وانگ چو اس کا ذکر کیا کرتا تھا

" بابو آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ میرے ساتھ آپ کی بہت چرچا کرتے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے۔ . . !!

اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سارے سنسار میں شاید یہی اکیلا ذی روح تھا جس نے وانگ چو کی موت پر دو آنسو بہائے تھے ——— بڑی بھولی طبیعت تھی۔ (بقیہ ص ۸۱ پر)

[1] بھکشوؤں کا مٹھ

راجندر یادو

لوٹتے ہوئے

لگتا ہے حساب کتاب میں ضرور کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ رہ گئی ہے۔ لیکن دو بار تو دیکھ لیا، پکڑ میں ہی نہیں آتی۔ اب پھر تیسری بار دیکھنا ہوگا ــ طبیعت یوں ہی لوٹ رہی ہے۔ ذرا دھیان ایک جگہ کرو تو آنکھوں کے آگے لال کالے گولے تیرنے لگتے ہیں۔ یہ حساب کتاب کا کام اب کسی الگ آدمی کو دینا ہوگا۔ مگر موٹا حساب تو اپنی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ جی چاہتا ہے چُپ چاپ جاکر لیٹ جائیں۔ مردُلا بال پین کے پچھلے حصے کو سر سے ٹھونک ٹھونک کر اُسے کھولتی بند کرتی رہی۔

دُکان کے سامنے والے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ دونوں سلیس مین اور دربان اِدھر اُدھر کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے وقت گزار رہے ہیں اور دل ہی دل انتظار میں ہیں کہ میم صاحب آج کے خرچے کا حساب ملاکر کیش بکس میں ڈالیں، باہر نکل کر اپنی کھڑکھڑیا کی طرف بڑھتے ہوئے حکم دیں "بہادر، تالے ٹھیک سے دیکھ لینا" تو وہ بھی آزادی کی سانس لیں اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے اپنی اپنی راہ لیں ــ مردُلا کی تھرڈ فورتھ ہینڈ گاڑی کا آپسی نام انہوں نے رکھا ہے کھڑکھڑیا ــ سلیس مین شرما آہستہ سے چوپڑا کے کان کے پاس منھ لے جاکر اکثر پوچھتا ہے "اور اپنی میم صاحب؟ میم صاحب بھی تو کھڑکھڑیا ہو چلی ہیں۔ کون سا ہینڈ ہیں تھرڈ یا فورتھ؟" چوپڑا مذاق میں شامل نہیں ہوتا۔ وہ مردُلا کی عزت کرتا ہے۔ ابھی ابھی اس کی شادی میں انہوں نے خود جاکر اس کی بیوی کو منگل سوتر پہنایا تھا۔ چوپڑا اُن کی طرف ہاتھ اٹھاکر چھی چھی کرتے ہوئے کہتا ہے "ارے شرما صاحب بڑے بوڑھے آدمی ہو... کچھ تو شرم کرو۔ اسے پتہ ہے، شرما کو بڈھے بوڑھے کہہ دینا گالی دے دینے کے برابر ہے۔ لیکن آج ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ دوپہر سے ہی کچھ ہوا ہے ورنہ صبح تو روز کی طرح چُست درست آئی تھیں۔

بات صحیح ہے۔ صبح مردُلا بڑی چست درست آئی تھی۔ وہی چکن کی سفید ساڑی، سفید بلاؤز اور تیلیوں سے بنا ہوا ہیلینڈلوم کا پرس۔ شوکیس کے پاس گھومتی ہوئی چوپڑا اور شرما سے صلاح کر رہی تھی کہ دکان میں کہاں تبدیلی ہونی چاہیے۔ کس جگہ کیا نیا بننا چاہیے۔ کیوں کہ جن ایجنسیوں کی بات چل رہی تھی، وہ طے ہو گئی ہے۔ اوپر ایک الگ سے چھوٹا سا کیبن نکلنا چاہیے۔ نیچے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ مردُلا اوپر کیبن ہی میں بیٹھا کرے گی۔ وہیں سے ساری دُکان پر نگاہ بھی رکھ سکے گی ــ ابھی جہاں بیٹھتی ہے وہاں کیشیئر بیٹھا کرے گا۔ شرما کو سیلس میں لیا جائے گا اور ایک ریٹائرڈ قسم کے اکاؤنٹنٹ کی تلاش کی جائے گی۔ شرما نے

نام : راجندر یادو

پیدائش : ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء

تصانیف : دیوتاؤں کی مورتیاں، کھیل کھلونے، جہاں لکچھمی قید ہے، ابھیمنیو کی آتم ہتیا، چھوٹے چھوٹے تاج محل، کنارے سے کنارے تک، ٹوٹنا، ڈھول، اپنے پار (کہانیوں کے مجموعے) سارا آکاش، شہر اور رمات، منتر ودھ، کلٹا، ان دیکھے ان جانے پل (ناول)

آواز تیری ہے (شعری مجموعہ)

شغل : رسالہ 'ہنس' کی ادارت

پتہ : اکچھر پرکاشن

۲/۳۶ - انصاری روڈ

دریا گنج، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰

اشتار نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ حساب کتاب اور کیش پوری طرح وہ دیکھ سکتا ہے۔ یہ ریڈی میڈ کپڑے دکھاتے دکھاتے اب تو ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں۔

لیکن لنچ کے بعد سے ہی کچھ ہوا ہے۔ دونوں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جہاں وہ کھڑے تھے وہاں ایک الماری کی آڑ پڑتی تھی۔ چوپڑا نے دونوں ہاتھ سر سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "آج میں سوچ رہا تھا کہ جلدی چھٹی لے کر چلا جاؤں گا۔ سو اُن کا موڈ ہی ...... بیوی سے کہہ کر آیا تھا کہ کھانا وانا بنا کر رکھنا سنیما چلیں گے۔ وہ بے چاری الگ بالکونی میں کھڑی کھڑی تپ رہی ہوگی۔ آٹھ بجنے والے ہیں اور ان کا بلنے کا رنگ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔"

"اور ابھی تو لگتا نہیں ہے یہ آدھا پون گھنٹہ اٹھیں گی۔" چوپڑا نے سگریٹ نکال کر ایک شرما کو دی اور دوسری خود جلائی۔ "عورتوں کے کام ہی میں گھپلا ہے۔ لکھا ہے کہ دُکان چلاؤ۔ اپنے گھر بیٹھ کر لونڈیا کے لیے لڑکا کا ہے نہیں تلاش کرتی؟"

"کیا ہوا۔ کوئی لڑکا وڑکا مل گیا کیا؟" شرما نے دھواں اندر لیا تو پچکے گال اور بھی اندر دھنس گئے۔ "آج کل باتیں نہیں کرتی پہلے تو روز کہتی رہتی تھی شرما صاحب کوئی لڑکا بتاؤ۔ اس بار تو پندرہ بیس دنوں سے لڑکی بھی نہیں دکھائی دی ہے۔ کہیں باہر گئی ہے کیا؟"

"ہوگا یار!" چوپڑا کو یکایک اپنی شادی کے لائق بہن کا خیال آ گیا تو وہ سست ہو گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ "آج تو شرما صاحب گھر پر خیر نہیں ہے۔ خدا جانے کھانا بھی ملے گا یا نہیں ...... لگتا ہے بنا کھائے ہی بیوی کو منانے کے لیے سیکنڈ شو میں جانا پڑے گا ......"

"ابے نئی بیوی کو اتنا سر پہ مت چڑھا ورنہ شرما جی کی طرح زندگی بھر روئے گا۔ سالے بچوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہناؤ۔ اسکول چھوڑ کر آؤ تو دُکان آنے کے لیے اپنی تیاری کرو۔ محال ہو جائے گی زندگی ——" شرما نے آدھی رنجیدہ اور آدھی شاطرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اُداس انداز میں ناک سے رُک رُک کر دھواں چھوڑتا رہا۔

چوپڑا نے ہنس کر کہا۔ "اماں شرما صاحب' ابھی دن ہیں ہمارے۔ آپ کی طرح بڑے بوڑھے ہو جائیں گے تو ہم بھی چھوکروں کو صلاح دے دیا کریں گے۔ کیوں کُڑھتے ہو غریبوں سے؟" پھر جیسے کوئی بہت بڑا مذاق کرنے جا رہا ہو۔ اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا "مگر شرما صاحب کبھی کبھی مجھے آپ پر رحم آتا ہے —— گھر ہو یا دفتر آپ کی قسمت میں تو غلامی عورت کی ہی لکھی ہے۔" اُسے خیال ہی نہیں رہا کہ انجانے میں اُس کی آواز کتنی اُٹھ گئی ہے۔ دھیان آتے ہی اُس نے اپنی زبان کاٹ لی۔

لیکن دانتوں کے نیچے دبی ہوئی زبان آدھی ہی رہ گئی۔ جھٹکے سے چیسٹر پٹک —— کر مرڈلا اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کہیں سُن تو نہیں لیا —— دونوں اپنی جگہ جیسے جُھک کر دُبک گئے۔ پھر دیکھیں گے آج تو پتہ نہیں کیا ہو۔" پھر کھٹ کھٹ ...... خالی دُکان میں اُس کے سینڈلوں کی آواز اور دونوں اطراف کے شوکیسوں پر چلتی پرچھائیاں دروازے تک آ گئیں۔ بہادر نے ادب سے دروازہ کھول دیا۔ شرما اور چوپڑا اپنے ٹفن کیریر کا تھیلا اور پورٹفولیو لیے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ برآمدہ اُترنے سے پہلے مرڈلا نے ایک بار دُکان کو تھکی تھکی اور اداس نظروں سے دیکھا۔ لمبے کاریڈور میں اکیلے بلب جل رہے تھے۔ دربانوں نے اپنی اپنی چارپائیاں یا دری بستر نکالنے شروع کر دیے تھے۔ آس پاس نگاہ ڈالی۔ میموری فوٹوگرافر کے کولیپسبل گیٹ بند تھے اور ایک آنکھ مچکا کر باکس کیمرہ دکھاتے لڑکے کی پیلی کالی تصویر لہردار ٹین پر چپکی تھی۔ پھر 'ٹائم' گھڑی چشمے کی دُکان کی بڑی جگمگاتی کانچ کی ونڈو تھی اور اس میں چھوٹی بڑی گھڑیاں جھول رہی تھیں۔ رومر، تواده، ٹائٹس، ٹٹونی' ایلیکس، زینتھ، اومیگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مرڈلا کو بہت سے نام یاد ہو گئے ہیں۔ اپنی دُکان کا نام رکھ لیا تھا "اُپہار" اور اسی نام کو بامعنی بنانے کے لیے آج اُس میں فرق لانے کی بات سوچی تھی۔ کچھ چھوٹی موٹی کاسمیٹکس اور اشیائے تحائف اس میں رہنی چاہئیں۔ بہت نہ ہوں، لیکن جو ہوں وہ بہت اچھے مذاق کی پسند کی ہونی چاہئیں۔

"آٹھ بجے ہی کیسا سناٹا چھا گیا ہے۔" مالو اپنے آپ ہی کہا۔ "پہلے جب ٹائم کی ایسی بندش نہیں تھی تو یہاں دس بجے تک کیسی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ اپنی بات کے ساتھ ہی ٹائم اور میمری دونوں لفظ اُس کے ذہن میں بجے —— ستانی اور اماں بیٹھی اس کے لیے راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ اُس نے اُٹھتی ہوئی جمہائی کے سامنے پرس لگاتے ہوئے کہا۔ "آج تو آپ لوگوں کو بڑی دیر ہو گئی نا —— کیا کروں دوپہر سے ہی طبیعت کچھ خراب سی ہو گئی تھی۔"

"نہیں جی۔ نہیں کچھ نہیں۔ ہاں' ان مسٹر چوپڑہ کو آج بیوی کے ساتھ سنیما جانا تھا۔" شرما نے خوشامدی بھرے انداز میں کہا۔ چوپڑا والا ریمارک مرڈلا نے نہیں سُنا' چلو غنیمت ہے۔

"اچھا، مجھے پہلے بتا دیا ہوتا؟" اُس نے چوپڑا کی طرف مڑ کر کہا۔ "آپ تو اِدھر پٹیل نگر کی طرف ہی رہتے ہیں شاید' آپ کو جہاں سے پاس پڑے وہیں اُتر جائیے۔ چلیے میرے ساتھ ہی چلے چلیے۔" چوپڑا کے فکرمند اور اداس چہرے کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کی نئی بیوی کا دھندلا سا چہرہ یاد میں کوندھا۔ اُسے لے کر کوئی مذاق کی بات اوپر تک آئی بھی' لیکن وہ جھٹ مڑ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

"اچھی بات ہے چوپڑا صاحب' اب تو ہمارا تمہارا راستہ ہی الگ ہو گیا۔" معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے شرما نے بے ضرورت چوپڑا سے ہاتھ ملایا ...... اُس وقت شرما کے چہرے کا انداز مرڈلا نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بغیر دیکھے بھی' تصور میں

دیکھ لیا۔ شرما کی ہر حرکت میں اُسے کچھ گھپلا سا لگتا ہے۔ مالو! اس کی ہر بات کے کئی مطلب ہوتے ہیں، لیکن وہ درگزر کر جاتی ہے۔ چوپڑہ نوجوان ہے اور اس میں کوئی ہیچ نہیں ہے، لیکن شرما گھاگھ ہے۔ جانے کیوں لگتا ہے کہ شرما کو یہ یقین ہے کہ اکیلی عورت کو پٹا لینا مشکل نہیں ہے۔ اور اس کے بعد ساری دُکان کا مالک بھی بنا جا سکتا ہے۔ یہ سازش اُس کے دماغ میں ضرور کہیں نہ کہیں کام کرتی رہتی ہے۔ یہ آدمی جب مردلا کے بارے میں کہیں اور باتیں کرتا ہوگا تو چہرے پر ایک بیہودہ پن ضرور آجاتا ہوگا جس کا مطلب ہوتا ہے کہ مردلا اور اس کے تو ..... ! اُسے ہمیشہ سے شرما سے ایک عجیب سا خوف آتا ہے..... یوں ایک عورت کی نوکری پسند دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں ہے۔ یہ اُسے پتہ ہے۔ اُسے یہ بھی پتہ ہے کہ آس پاس دونوں ہی نے کہہ رکھا ہے کہ مسٹر سہگل بزنس مینجمنٹ کا کورس کرنے امریکہ گئے ہیں اور ان کی غیر حاضری میں ان کی مسز دُکان سنبھالتی ہیں۔ اصلی کام تو تب شروع ہوگا... ابھی تو یوں ہی دن کاٹتا ہیں.... دُکان داری کہیں ان عورتوں کے بس کی چیز ہوتی ہے.... سن کر دیر تک وہ ہنستی رہی تھی۔ ان مردوں کی غیرت بھی..... جان بوجھ کر ان پر باسنگ میں اُسے دل ہی دل میں بہت خوشی ہوتی ہے لیکن سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح ہمیشہ ایک ڈر اور اپنی کمزوری کا احساس اُسے چوکنا بنائے رکھتا ہے اور وہ بغیر مطلب کوئی بات نہیں کرتی۔

بہادر نے پُر تکلف انداز میں دو بار گاڑی کو پونچھ دیا تھا۔ سیٹ پر بیٹھ کر اُس نے پورے حق کے ساتھ ایک بار ہارن دیا تو بات ادھوری چھوڑ کر چوپڑا دوڑا آیا۔ پیچھے سیٹ کا ہینڈل جھٹک کر اُس نے دھیان دلایا کہ دروازے کو لاک لگا ہے۔ مردلا نے بغل والا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی بیٹھ جائیے'..... چوپڑا نے اِدھر اُدھر چھپی نگاہوں سے دیکھا شرما چلا گیا یا کہیں آس پاس ہے؟ پھر سکڑ کر بڑے آہستہ سے بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس سے چپکا سا رہا۔

دو تین بار ایکسیلیٹر دبا۔ لیکن انجن گھُر گھُر کر کے رہ گیا۔ چوپڑا نے سوچا ہی تھا کہ اس بار گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی تو وہ اُتر کر دھکے دے گا۔ تبھی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور جھٹکا کھا کر آگے بڑھی۔ بہادر کے سلام کے جواب میں مردلا نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ روز کی طرح ہوشیار رہنے کو نہیں کہا۔

چھوٹی سی بے بی ہندوستان بڑی بڑی بلڈنگوں کے نیچے ہانپتے ہوئے پہلے کی طرح دوڑ رہی تھی۔ مردلا کا ہاتھ بار بار بغل میں لگے کلچ گیئر کو آگے پیچھے کرتے وقت چوپڑا کے پاؤں سے سٹ جاتا تو وہ اور بھی سکڑ جاتا تھا۔ دونوں خاموش تھے — چوپڑا باہر کے نیون اشتہاروں کو دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ سیکنڈ شو تک ناراض بیٹا کو تیار کیا جا سکتا ہے یا نہیں....

"ارے، ارے، دیکھیے، لال روشنی ہے۔"

چوپڑہ نے جلدی سے کہا۔ چوراہے کی لال روشنی کے باوجود مردلا گاڑی کو آگے نکال لے آئی تھی۔ گاڑی رُکی، گیئر بدلا پھر پیچھے ہوئی اور انتظار کرتی رہی...
... انجن چلتا رہا۔

"آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید۔"

چوپڑا نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

مردلا کی نگاہ اپنے آپ ہی اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی پر جا پڑی۔ ساڑھے آٹھ بجنے کو تھے۔ کیسی بے چینی ہو رہی ہوگی۔ اُس وقت چوپڑا کے دل میں ہوگا کہ ٹریفک کی ساری بتیوں کو کچلتی گاڑی اڑا کر اُسے انتظار کرتی ہوئی بیوی کے پاس پہنچا دے۔ اُسے شاید میری گاڑی کی رفتار بہت کم لگ رہی ہے تبھی پوچھ رہا ہے۔ اماں اور سنیتا اس کا بھی تو انتظار کر رہی ہوں گی — اور کون؟ تبھی ڈی۔ ٹی۔ سی کی بڑی سی بس آ کر برابر کھڑی ہو گئی اور ڈیزل کی بدبو سے مردلا کی سانس گھٹنے لگی۔ پرس سے سینٹ لگا رومال نکالا تو خوشبو چوپڑا کو بھی آئی۔ کہا۔ "پریشان اس لیے ہوں کہ اب کام بڑھانا ہے۔ حساب کتاب کے لیے ایک آدمی الگ سے چاہیے۔ تم نے تو بی کام نہیں کیا ہے نہ؟"

"جی نہیں۔" اُس نے اپنی ایپلیکیشن میں لکھ دیا تھا کہ وہ صرف انٹر ہے، شاید اُس وقت اُس کا خیال نہیں تھا۔ لیکن اُسے خوشی ہوئی مردلا کے دل میں اُسے ترقی دینے کی بات ہے۔ ذرا ذمہ داری کے انداز میں بولا۔ "ہاں، اب تو آپ نے بہت سی ایجنسیاں لے لی ہیں۔"

"ایجنسیوں ہی سے کچھ نہیں ہوتا — کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ یہ سب سر درد بڑھا کر کیا ہوگا؟ اپنے کھانے لائق نکل ہی آتا ہے۔ سنیتا کی شادی ہو جائے اور بس۔"

تبھی ہری بتی اُچھل کر اوپر چمک اُٹھی۔ کلچ آگے پیچھے کیا اور گاڑی پھر جھٹکے سے بڑھی۔ چوراہا پار کرتے ہی سونی سڑک پیچھے چھوٹنے لگی۔ یکایک یوں ہی بے دلی سے پوچھا۔ "وہ جو دوپہر میں ایک صاحب آئے تھے لڑکے کے ساتھ۔ انہیں قمیض، بش شرٹ تم نے ہی دی تھی؟"

چوپڑا یاد کرنے لگا۔ "کون — لنچ کے بعد نا؟ جی ہاں شاید میں نے ہی دی تھی۔" پھر کچھ دیر چپ ہو کر پوچھا، "کوئی غلطی رہ گئی تھی کیا؟"

"نہیں نہیں۔" پیچھے سے ایک گاڑی اوورٹیک کرنے کا ہارن دے رہی تھی۔ اُسے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مردلا ہکلا اٹھی — اُسے جھٹکے سے دھیان آیا کہ کیسے مشینی ڈھنگ سے چوپڑا کے لائے ہوئے روپیوں اور کیش میمو سے روپے کاٹ کر اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے نگاہ ان دونوں خریداروں کی طرف اُٹھ گئی تھی..... اپنے آپ ہی رومال گرا کر اُسے اُٹھانے کے بہانے دیر تک جھکی رہی تھی۔ لیکن ایک بار دیکھ کر شک کو یقین میں بدلنے کی خواہش بہت شدید تھی..... ابھی نہیں، ابھی نہیں..... ہو سکتا

ہے۔ وہ ادھر دیکھے اور پائے کہ خریدار بھی اُدھر ہی دیکھ رہا ہے اور جب بالکل یقین ہو گیا کہ خریدار دُکان سے نکل رہے ہیں۔ تو ڈرتے ڈرتے آڑ سے نکال کر دیکھا تھا۔ نہیں نہیں، شک نہیں۔ وہ مسٹر سنیل ہی تھے۔ خوف سے دھڑکتے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ کیسے بال بال بچی وہ۔ اگر وہ دیکھ لیتے تو کیسے سامنا کر پاتی۔ آج بھی اگر وہ ٹوک کر کہتے "نکل جاؤ" تو شاید اُسے کچھ نہ بنتا کہ یہ دُکان میری ہے اور وہ چُپ چاپ کانپتی ہوئی باہر نکل جاتی۔ ..... لڑکا کون تھا؟ اتنا بڑا ہو گیا۔

سڑک کی بتیاں جلدی جلدی پیچھے چھوٹ رہی تھیں۔ اُسے خیال نہیں رہا تھا کہ ابھی کسی کے بارے میں چوپڑا سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اُسے اتنی دیر راہ دیکھ کر چوپڑا نے یوں ہی کہا، "ان لوگوں نے کافی سامان خریدا تھا ... پچاسی روپے کچھ پیسوں کا کیش میمو کاٹا تھا میں نے ..... آپ انہیں جانتی ہیں کیا؟"

پوری بتیاں کھولے ہوئے سامنے سے ٹرک چلا آ رہا تھا۔ مردلا کچھ ہکا بکا رہ گئی۔ پل بھر میں سمجھ میں نہیں آیا کدھر بچائے۔ پہلی بات تو یہی دل میں آئی کہ گاڑی یونہی چلتی چھوڑ کر آنکھیں بند کر لے۔ شاید ایک زور کا دھماکا ہوگا۔ اُس کے بعد آنکھ کھول کر دیکھیں گے کہ گاڑی چکنا چُور ہو گئی ہے ..... اُس سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ چاروں طرف بھیڑ کھڑی ہے۔ کل اخبار میں ..... لیکن ہنسی بھی آئی۔ آنکھیں کھول کر یہ سب دیکھنے کا موقع کہاں ملے گا؟

لیکن گاڑی بچ گئی تھی اور ٹرک نکلنے کے بعد سڑک پر پہلے سے زیادہ اندھیرا چھا گیا تھا ...... چوپڑا کہہ رہا تھا: "یہ ٹرک والے جب سڑک پر نکلتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اُن کے باپ کی سڑک ہے۔ ڈِپ لائٹ میں تو ان کو یقین ہی نہیں ہے۔"

"ایسے ہی ہیں۔" مردلا بے دلی سے بولی۔ اُسے صبر ہوا۔ ٹرک نے اُسے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔ کیا جواب دیتی ــــ اُس خریدار کو جانتی تھی؟ ہاں جانتی تو تھی، آج سے تیرہ چودہ سال پہلے تک ..... اُس وقت تک جب وہ بغیر کوئی زیور جسم پر لیے ہوئے بابوجی کے گھر آ گئی تھی .....

'اپنے بابوجی سے کہہ دینا شادی کے وقت کا روپیہ یوں نہیں بچے گا ..... اس بار سب لے کر آنا' 'ورنہ'۔ 'ورنہ' کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ بابوجی ریٹائر ہو چکے تھے۔ اُن کے پاس تھا ہی کیا؟ اور اُس کے پاس ہی کیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ صرف سنیتا ..... اس کے بعد پڑھائی۔ دو برا ولودتی، میٹرک، ساہتیہ رتن، انٹر، کیا آج بھی سنیتا یہی سمجھتی ہے کہ اُس کے پتا بلین ایکسیڈنٹ میں نہیں بچے؟ وہ اس ایکسیڈنٹ کا کیسے پوری تفصیل سے ذکر کرتی ہے اور دل کو سمجھاتی ہے ــــ وہ ایک ایکسیڈنٹ ہی تو تھا، جہاں اس کے خواب، خوشیاں سبھی کچھ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔

"پرسوں گول مارکیٹ کے پاس ایک بڑا بھیانک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ــــ ایک دم نئی ایمبیسڈر تھی، پچک کر ایسی ہو گئی تھی کہ پہچان ہی نہیں ہوتی تھی۔ چوپڑا بتا رہا تھا اور اُس نے اپنے بولنے کے بیچ سڑک کی روشنی میں گھڑی بھی دیکھی تھی۔

مان لو ابھی ٹرک سے ٹکر ہو جاتی اور وہ دونوں چپیٹ میں آ جاتے تو کل سب لوگ کیا سوچتے؟ چوپڑا اور مردلا کو لے کر کیسی کیسی باتیں ہوتیں؟ اُس نے پہلی بار چوپڑا کو دیکھا۔ خوب صورت پنجابی نوجوان ہے ..... بہت ہوگا اُس سے دس سال چھوٹا ہوگا۔ شرما پینتالیس کا ہوگا۔ لیکن اُسے دیکھتے ہی اُبکائی سی آتی ہے۔ اس میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے ــــ بہادر بھی چھوٹا سا ہے۔ لیکن ان پہاڑی لوگوں کی عمر کوئی نہیں بتا سکتا۔ لگتا تو پندرہ بیس کا ہے لیکن پینتیس چالیس سے کم کا نہیں ہوگا۔ سب کی عمریں یاد کر کے کہیں وہ اپنے دل کی بات تو نہیں ٹال رہی ہے ....؟ دوسرے دو ایک اور بھی آئے تھے، لیکن اُس نے چوپڑا کو ہی رکھا تھا۔ دُکان میں اسمارٹ خوب صورت سیلس مین رہیں گے تو اچھا رہے گا ــــ شرما کو تو چودھری صاحب نے رکھوا دیا تھا۔ اب وہ پُرانا آدمی ہے۔ لیکن اکثر وہ اُسے نکالنے کی بات سوچتی ہے ــــ اُس کے پیچھے کہیں یہی احساس تو نہیں کہ وہ خوب صورت نہیں ہے؟ اُس نے اچانک ملائم آواز میں کہا: "دیکھو چوپڑا گاڑی میں بیٹھ کر کبھی پرانے ایکسیڈنٹ کی بات نہیں کرنی چاہئے ..... چلانے والے پر اچھا اثر نہیں پڑتا ہے۔ میرا تو کچھ نہیں۔ تمہاری ابھی شادی ہوئی ہے۔"

مردلا کی ہنسی پر وہ جھینپ گیا۔ "آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں سر؟" چوپڑا کو مردلا کی بات ٹھیک لگی۔ اُس نے ذرا قربت کے احساس سے پوچھا "سنیتا بہن کے لیے کوئی لڑکا مل گیا کیا؟"

"کہاں بھائی؟" درد کی پریشانی میں مردلا نے کہا۔ "بہت مصیبت ہے۔ تمہیں سوچو، یہ لڑکے وڑکے تلاش کرنا کہیں ہم لوگوں کے بس کا کام ہے؟" میں نے سنیتا سے کہہ دیا ہے کہ تیری نگاہ میں کوئی ہو تو تو ہی بتا دے ..... کیوں مجھے پریشان کر رہی ہے؟ میں اپنی سمجھ سے تو اچھا ہی تلاش کروں گی۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ ....." اُس نے آہستہ سے سر کو جھٹک دیا ــــ بابوجی نے اپنی سمجھ سے اچھا ہی لڑکا تلاش کیا تھا۔ اُنہیں کیا پتہ تھا کہ .....؟ اُس نے یوں ہی کھانس کر پوچھا، "وہ لڑکا دس ایک سال کا تو ہوگا ہی۔"

"کون سا؟" چوپڑا کو خیال نہیں آیا۔

"اُس کسٹمر کے ساتھ جو آیا تھا۔" باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ اس موڑ پر گاڑی موڑنی ہے کافی آگے آ کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے زور سے اسٹیرنگ گھما کر گاڑی موڑ دی۔

چوپڑا کو لگا کہ اُس خریدار کی اہمیت عام خریداروں سے الگ ہے۔ "ہاں، اتنا تو ہوگا ہی ..... لیکن بڑا اسمارٹ تھا۔"

کتنی خواہش ہوئی کہ اس لڑکے کو پیچھے سے بلا کر روک لے ــــ تمہارے کتنے بھائی بہن ہیں،

کہاں رہتے ہو؟ مردلا نے اس دوسری کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا...... اس سے خوش ہیں؟ ہوتے ہوئے پاس والے خراٹے شیو کرتے وقت ٹیڑھے میڑھے مونہہ کی مختلف شکلیں..... ہاتھوں کو گھما گھما کر کوٹ کو پہننا، سوٹ بوٹ میں جچتی ہوئی شخصیت۔ آنکھیں نکال کر دہاڑنا اور پھر پانچوں انگلیوں کا اس کی کنپٹی پر اُبھر آنا ـــــ انگوٹھی جبڑے پر لگی تھی۔ مردلا کو لگا جیسے آج بھی وہ جگہ دُکھتی ہے۔

..... پھر درد اور ضد سے کٹھور بنا اپنا چہرہ۔

نہیں۔ میں بابوجی سے کچھ نہیں مانگوں تو......

نہیں اماں مجھے کوئی مین ٹیننس نہیں چاہئے ـــــ لکھ دو۔ ان کو کچھ کام آجائے گا۔ اُنہیں روپے کی بہت ضرورت ہے نا؟ آج دیکھتے تو پہچان لیتے کیا؟

پتہ نہیں، اب کیسی لگنے لگی ہے مردُلا؟

کولڈ اسٹوریج میں کہیں پانی چھن چھن کر آرہا تھا۔ جیسے سیکڑوں شہد کی مکھیاں کانوں کے پاس منڈلا رہی ہوں۔ اُنہیں جھٹک کر مردلا دھیرے سے ہنس دی۔ ”نہیں، میں نے تو یوں ہی کہا، آج کل لڑکوں کی ہی بات دماغ میں رہتی ہے۔“ اُسے یاد آیا کہ بات سنیتا کے سلسلے میں چل رہی تھی۔

اُداس مکان اور سُونی سڑک کی بتیاں ایک ایک کرکے پیچھے چھوٹ رہی تھیں۔

اور یکایک مردلا کے دل میں سیکڑوں بار آئی بات پھر سے آئی۔ کیوں نہ کسی اچھے خوب صورت سے لڑکے کو چُن کر اپنے یہاں رکھ لیا جائے۔ آہستہ آہستہ اُسے دُکان میں جما دیا جائے۔ خواہش ہوگی تو دونوں کام آگے بڑھا دیں گے۔ مردلا کا کیا ہے، اب وہ کتنی کبھی ہے۔ کہیں بیٹھ کر بھجن کرے گی۔ سنیتا اُس کی بات سنتی ہے تو ناراض ہو کر کہتی ہے، ”کیا بات کرتی ہو ماں کسی سے پوچھ لو، تم میری بڑی بہن لگتی ہو۔“ سنیتا ہی نے نہیں، یہ بات اُس کے جاننے والے نہ جاننے کتنوں نے کہی ہے..... دُکان کے بہانے کسی کو لاکر کیا وہ اپنے لیے یوں ہی کسی کو نہیں چُن سکتی تھی۔ وہ اکیلی تپسیا کیوں کرے؟ ابھی تو سب کچھ ہے۔

سنیتا ہے۔ ماں ہیں۔ پھر پانچ سال بعد؟ سنتے ہیں، اس عمر میں اکیلاپن کبھی کبھار ہی ہو جاتا ہے..... کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ دوبارہ خانہ داری کے جھنجھٹ میں نہ پڑے اور یوں ہی کوئی سہارا کھوجے..... شرماجی؟ چھی چھی ـــــ ہاں اُس کے بدلے جس آدمی کو لے گی تب اس بات کا خیال رکھے گی..... چوپڑا؟ یا وہ ـــــ وہ چودھری صاحب ـــــ ؟ اُنہوں نے ہی تو دُکان کی بات سُجھائی تھی۔

”بس جی اس موڑ پہ مجھے اُتار دیجئے ـــــ آپ کو تو مشرقی راستے پر جانا ہے۔“ چوپڑا کی کہیں دُور سے آتی ہوئی آواز اُسے کھینچ کر اوپر لے آئی۔ وہ آسن بدل کر ہینڈل پر ہاتھ رکھے اُترنے کو تیار ہو گیا۔

شاید اس لیے جب اس بار کلچ بدلا تو مردلا کی مُٹھی کا نچلا حصہ دُور تک چوپڑا کی سخت رانوں کو رگڑتا چلا گیا۔ ”ساری“ فطری طور پر منھ سے نکلتے لفظوں کو جان بوجھ کر دبا لیا۔ بڑی جلدی آگئے۔ ماں تو ذرا پہلے ہی وہ گاڑی کھڑی کر دیتی کہہ دیتی بگڑ گئی ہے۔ اس طرح چوپڑا کو روک کر ساڑھے نو بجے تک اٹکائے رکھتی اور سیکنڈ شو کا وقت نکال دیتی۔ چوپڑا اُس کے ساتھ وہاں اٹکا ہوتا اور اُدھر کہیں اُس کی بیوی بالکنی میں چکر کاٹ رہی ہوتی۔ بیوی کی کُڑھن کے تصور سے اُسے دل ہی دل میں بڑی خوشی اور آرام کا احساس ہوا۔

گاڑی رُکنے کے ساتھ ہی دروازہ کھول کر چوپڑا اُتر گیا پھر جھٹکے سے بند کر کے جھکا جھکا بولا۔ ”اچھا سر، تھینک یو ویری مچ۔“

”اچھا“۔ گلے کو کھرچتے ہوئے لفظ کے ساتھ اُس نے مشکل سے کہا اور ایک لمحہ کو اندر سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے لگا: چوپڑا کا چہرہ اُس خریدار سے ملتا جلتا ہے اور یہ برابری جیسے ہی زندہ جھینگے کی طرح اُس کی طرف جھپٹے۔ اُس نے رومال سے ناک منھ پونچھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس بار کلچ کھینچا تو لگا کہ اُس کے آس پاس بہت بہت خالی ہو گیا ہے۔ جیسے بہت دنوں بعد بڑے سے بستر پر اکیلے سوتے ہوئے لگتا ہے اب کہیں ہاتھ نہیں سٹتا..... پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چوپڑا ابھی تک کھڑا کھڑا اُس کی طرف ہی دیکھ رہا ہے یا شاید سڑک پار کرنے کے انتظار میں ہے ـــــ اور پل بھر کو جیسے وہ اُسے ہُڑ کر چوپڑا کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہنس ہنس کر اس چوڑی سنسان سڑک پر فٹ پاتھ سے چپکی چھوٹی سی کالی گاڑی کو جھٹکے کھا کھا کر آگے بڑھتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

(ترجمہ: مشرف عالم ذوقی)

منّو بھنڈاری

یہی سچ ہے

کانپور

سامنے آنگن میں پھیلی دھوپ سمٹ کر دیواروں پر چڑھ گئی اور کندھے پر بستہ لٹکائے ننھے ننھے بچّوں کے جھنڈ کے جھنڈ دکھائی دیئے تو ایک دم مجھے وقت کا احساس ہوا... گھنٹہ بھر ہو گیا یہاں کھڑے کھڑے اور سنجے کا ابھی تک پتہ نہیں! جھنجھلاتی سی میں کمرے میں آتی ہوں، کچھ کھلی کچھ بند۔ لمحہ بھر میں انہیں ہی دیکھتی رہتی ہوں پھر یوں ہی کپڑوں کی الماری کھول کر سرسری نظر سے کپڑے دیکھتی ہوں۔ سب بکھرے پڑے ہیں۔ اتنی دیر بیکار کھڑی رہی، انہیں ٹھیک کر لیتی... لیکن دل نہیں کرتا اور پھر انہیں بند کر دیتی ہوں۔

نہیں آنا تھا تو بیکار ہی مجھے وقت کیوں دیا؟ پھر یہ کوئی آج ہی کی بات ہے! ہمیشہ سنجے اپنے بتائے ہوئے وقت سے گھنٹہ دو گھنٹہ دیری سے آتا ہے اور میں ہوں اسی لمحے سے انتظار کرنے لگتی ہوں۔ اس کے بعد لاکھ کوشش کر کے بھی تو کسی کام میں اپنا من نہیں لگا پاتی۔ وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ تھیسس پوری کرنے کے لیے اب مجھے اپنا سارا وقت پڑھائی میں ہی لگانا چاہیے۔ لیکن یہ بات اسے کیسے سمجھاؤں!

میز پر بیٹھ کر میں پھر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن من ہے کہ لگتا ہی نہیں۔ پردے کے ذرا سے ہلنے سے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور بار بار نظر گھڑی کے سرکتے ہوئے کانٹوں پر دوڑ جاتی ہے۔ ہر وقت یہی لگتا ہے، وہ آیا!... وہ آیا!...

تبھی مہتہ صاحب کی پانچ سالہ چھوٹی بچی جھجکتی سی کمرے میں آتی ہے۔ "آنٹی ہمیں کہانی سناؤ گی؟"

"نہیں، ابھی نہیں، بعد میں آنا!" میں روکھے پن سے جواب دیتی ہوں۔ وہ بھاگ جاتی ہے۔

یہ مسز مہتہ بھی ایک ہی ہیں! یوں تو مہینوں شاید میری صورت نہیں دیکھتیں، لیکن بچی کو جب تب میرا سر کھانے کے لیے بھیج دیتی ہے۔ مہتہ صاحب تو پھر بھی کبھی کبھی آٹھ دس دن میں خیریت پوچھ ہی لیتے ہیں، لیکن وہ تو بے حد اکڑو معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ہی ہے، زیادہ دلچسپی دکھاتیں تو کیا اتنی آزادی سے گھوم پھر سکتی تھی؟

کھٹ، کھٹ، کھٹ... وہی جانی پہچانی پاؤں کی آواز! تو آگیا سنجے۔ میں بے اختیار اپنا سارا دھیان کتاب میں مرکوز کر لیتی ہوں۔ رجنی گندھا کے ڈھیر سارے پھول لیے سنجے مسکراتا ہوا دروازے پر کھڑا ہے۔ میں دیکھتی ہوں لیکن مسکرا کر خوش آمدید نہیں کہتی۔ ہنستا ہوا وہ آگے بڑھتا ہے اور پھولوں کو میز پر پٹخ کر، پیچھے سے میرے دونوں کندھے دباتا ہوا پوچھتا ہے: "بہت ناراض ہو؟"

نام: منّو بھنڈاری

پیدائش: ۳ را پریل ۱۹۳۱ء بمقام بھانپورہ

تصانیف: ایک پلیٹ سیلاب، میں ہار گئی، تین نگاہوں کی ایک تصویر، یہی سچ ہے، شریشٹھ کہانیاں اور یہ سَے کہانیاں (کہانیوں کے مجموعے)

آپ کا بنٹی، مہابھوج، سوامی (ناول)

کلوا (بچّوں کے لیے ناول) آنکھوں دیکھا جھوٹ (بچّوں کی کہانیاں)

بنا دیواروں کے گھر، مہابھوج (ناٹک)

پتہ: ۱۰۳ حوض خاص، ڈی ڈی اے فلیٹس نئی دہلی۔

رجنی گندھا کی خوشبو سے جیسے سارا کمرہ مہکنے لگتا ہے۔

"مجھے کیا کرنا ہے ناراض ہو کر؟"، روکھے پن سے میں کہتی ہوں۔

وہ کرسی سمیت مجھے گھما کر اپنے سامنے کر لیتا ہے اور بڑے پیار کے ساتھ ٹھوڑی اٹھا کر کہتا ہے۔ "کیا کرتا، ایسا کوالٹی میں دوستوں کے بیچ پھنسا بہت کوشش کر کے بھی اٹھ نہ سکا۔ سب کو ناراض کر کے آنا اچھا بھی تو نہیں لگتا۔"

جی چاہتا ہے کہ کہہ دوں کہ تمہیں دوستوں کا خیال ہے، ان کے برا ماننے کی فکر ہے، بس میری ہی نہیں! لیکن کہہ کچھ نہیں پاتی۔ ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ . . اس کے سانولے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اپنے آنچل سے انہیں پونچھ دیتی، لیکن آج نہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں معافی کی خواستگار ہیں۔ لیکن میں کیا کروں؟ تبھی اپنی عادت کے مطابق کرسی کے بازو پر بیٹھ کر میرے گال سہلانے لگتا ہے۔ مجھے اس کی اس بات پر غصہ آتا ہے۔ ہمیشہ اسی طرح کرے گا اور پھر دنیا بھر کا لاڈ دُلار دکھلائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ میرا غصہ اس کے آگے ٹک نہیں سکتا۔ . . پھر اٹھ کر وہ پھولدان سے پرانے پھول پھینک دیتا ہے اور نئے پھول سجا دیتا ہے۔ پھول سجانے میں وہ کتنا ماہر ہے! ایک بار میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے رجنی گندھا کے پھول بہت پسند ہیں تو اس نے اصول ہی بنا لیا کہ ہر چوتھے دن ڈھیر سے پھول لا کر میرے کمرے میں لگا دیتا ہے۔ اور اب تو مجھے بھی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ ایک دن بھی کمرے میں پھول نہ ہوں، تو نہ پڑھنے میں من لگتا ہے، نہ سونے میں۔ یہ پھول جیسے سنجے کی موجودگی کا احساس دیتے رہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھومنے نکل جلتے ہیں۔ یکایک ہی مجھے اِیرا کے خط کی یاد آتی ہے۔ وہ بات میں بے صبری سے سنانے کے لیے پریشان تھی، اس غصہ کی وجہ سے اسے ہی بھول گئی تھی۔

"سنو، اِیرا نے لکھا ہے کہ کسی دن بھی میرے پاس انٹرویو کو بلاوا آسکتا ہے، مجھے تیار رہنا چاہیے۔"

"کہاں، کلکتہ سے؟"، کچھ یاد کر کے سنجے پوچھتا ہے اور یکایک اچھل پڑتا ہے۔ "اگر تمہیں وہ جاب (کام) مل جائے تو مزا آجائے دیپا، مزا آجائے!"

ہم سڑک پر ہیں، ورنہ یقیناً جوش میں آکر اس نے کوئی حرکت کر ڈالی ہوتی۔ جانے کیوں، مجھے اس طرح خوش ہونا اچھا نہیں لگتا۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ میں کلکتہ چلی جاؤں، اتنی دور؟ . . .

تبھی سنائی دیتا ہے: "تمہیں یہ جاب مل جائے تو میں بھی اپنا تبادلہ کلکتہ کروا لوں، ہیڈ آفس میں۔ یہاں کی روز کی بک بک سے میرا من تنگ آگیا ہے۔ کتنی بار سوچا کہ تبادلے کی کوشش کروں لیکن تمہارے خیال نے مجھے ہمیشہ باندھ لیا۔ آفس میں سکون ہو جائے گا لیکن میری شامیں کتنی ویران ہو جائیں گی!"

اس کی آواز کی نرمی نے مجھے چھو لیا۔ یکایک ہی مجھے محسوس ہوا کہ رات بہت سہانی ہو چلی ہے۔

ہم دور نکل کر اپنی من پسند ٹیکری پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دور تک ہلکی سی چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور شہر کی طرح یہاں کا ماحول دھوئیں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ وہ دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے اور گھنٹوں مجھے اپنے آفس کے جھگڑے کی باتیں سناتا ہے اور پھر کلکتہ جا کر ساتھ زندگی گزارنے کے خواب سجاتا ہے۔ میں خاموش رہتی ہوں، بس ایک ٹک اسے دیکھتی رہتی ہوں، دیکھتی رہتی ہوں۔

جب وہ چپ ہو جاتا ہے تو بولتی ہوں۔

"مجھے تو انٹرویو میں جاتے ہوتے بڑا ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے کیا پوچھتے ہوں گے! میرے لیے تو پہلا ہی موقع ہے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے۔

"تم بھی ایک ہی بے وقوف ہو! گھر سے دور، یہاں کمرہ لے کر اکیلی تو ہو، ریسرچ کر رہی ہو، دنیا بھر میں گھومتی پھرتی ہو اور انٹرویو کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ کیوں؟"، اور گال پر ہلکی سی چپت جما دیتا ہے۔ پھر سمجھاتا ہوا کہتا ہے: "اور دیکھو، آج کل یہ انٹرویو وغیرہ صرف دکھاوا ہوتے ہیں۔ وہاں کسی جان پہچان والے سے انفلوئینس ڈلوانا جا کر!"

"لیکن کلکتہ تو میرے لیے ایک دم نئی جگہ ہے۔ وہاں اِیرا کو چھوڑ کر میں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ اب ان لوگوں کی کوئی جان پہچان ہو تو دوسری بات ہے!" مجبوری سی میں کہتی ہوں۔

"اور کسی کو نہیں جانتی؟" پھر میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھتا ہے: "نشیتھ بھی تو وہیں ہے!"

"ہو گا، مجھے کیا کرنا ہے اس سے؟"، میں ایک دم بھنا کر جواب دیتی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگ ہی رہا تھا کہ وہ یہی بات کہے گا۔

"کچھ نہیں کرنا؟" وہ چھیڑنے کے لہجے میں کہتا ہے۔

اور میں بھبک پڑتی ہوں: "دیکھو سنجے، میں ہزار بار تم سے کہہ چکی ہوں کہ اسے لے کر مجھ سے مذاق مت کیا کرو! مجھے اس طرح کا مذاق ذرا بھی پسند نہیں ہے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ لیکن میرا تو موڈ ہی خراب ہو جاتا ہے۔

ہم لوٹ پڑتے ہیں۔ وہ مجھے خوش کرنے کے ارادے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ میں جھٹک کر ہاتھ ہٹا دیتی ہوں۔ "کیا کر رہے ہو! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"کون ہے یہاں جو دیکھ لے گا؟ اور دیکھ لے گا تو دیکھ لے، آپ کُڑھے گا۔"

"نہیں، ہمیں پسند نہیں ہے یہ بے شرمی!" اور سچ ہی مجھے راستے میں ایسی حرکتیں پسند نہیں، چاہے راستہ ویران ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہے تو راستہ ہی، پھر کانپور جیسی جگہ۔

کمرے میں لوٹ کر میں اسے بیٹھنے کو کہتی ہوں لیکن وہ بیٹھتا نہیں، بس باہوں میں بھر کر ایک بار چوم لیتا ہے۔ یہ بھی جیسے اس کا روز کا اصول ہے۔

وہ چلا جاتا ہے۔ میں باہر بالکونی میں نکل کر اسے دیکھتی رہتی ہوں . . . اس کی شکل چھوٹی ہوتے ہوتے سڑک کے موڑ پر جا کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں ادھر ہی دیکھتی رہتی ہوں ـــــ بے معنی سی کھوئی کھوئی سی۔ پھر آ کر پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔

رات میں سوتی ہوں تو دیر تک میری آنکھیں میز پر لگے رجنی گندھا کے پھولوں کو دیکھتی رہتی ہیں۔ جانے کیوں، اکثر مجھے بھرم ہو جاتا ہے یہ پھول نہیں ہیں، جیسے سنجے کی اَن گنت آنکھیں ہیں، اور مجھے دیکھ رہی ہیں، مجھے سہلا رہی ہیں، دُلار رہی ہیں۔ اور اپنے کو یوں اَن گنت آنکھوں سے لگاتار دیکھے جانے کی کلپنا سے ہی لرز جاتی ہوں۔ میں نے سنجے کو بھی ایک بار یہ بات بتائی تھی تو وہ خوب ہنسا اور پھر میرے گالوں کو سہلاتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں پاگل ہوں یا مورکھ ہوں! کون جانے، شاید اس کا کہنا درست ہو، شاید میں پاگل ہی ہوں!

کانپور

میں جانتی ہوں، سنجے نشیتھ کو لے کر جب تب شک و شبہ میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ میں نشیتھ سے نفرت کرتی ہوں۔ اس کی محض یاد آنے سے میرا دل نفرت سے بھر جاتا ہے . . . پھر اٹھارہ سال کی عمر میں کیا ہوا پیار بھی کوئی پیار ہوتا ہے بھلا! نرا بچگانہ ہوتا ہے، محض پاگل پن! اس میں جوش رہتا ہے لیکن پختگی نہیں، روانی رہتی ہے لیکن گہرائی نہیں۔ جس روانی سے وہ شروع ہوتا ہے ذرا سا جھٹکا لگنے پر اسی روانی سے ٹوٹ بھی جاتا ہے . . . اور اس کے ذرا سی آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کا ایک دور، ساری دنیا کی باڑھ، بے رخی اور خودکشی کرنے کے مختلف ارادے اور پھر تیکھی نفرت۔ جیسے ہی زندگی کو دوسرا سہارا مل جاتا ہے، ان سب کو بھولنے میں ایک دن نہیں لگتا۔ پھر تو وہ سب ایسی بے وقوفی لگتی ہے جس پر بیٹھ کر گھنٹوں ہنسنے کی طبیعت کرتی ہے۔ تب یکایک ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ سارے آنسو، یہ ساری آہیں اس پریمی کے لیے نہیں تھیں، بلکہ زندگی کے خالی پن اور ویرانگی کے لیے تھیں جس نے زندگی کو بے رس بنا کر بےبس کر دیا تھا۔

تبھی تو سنجے کو پاتے ہی میں نشیتھ کو بھول گئی۔ میرے آنسو ہنسی میں بدل گئے اور آہوں کی جگہ کلکاریاں گونجنے لگیں۔ لیکن سنجے ہے کہ جب تب نشیتھ کی بات کو لے کر بے کار ہی غصہ ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ کہنے پر وہ کھل کھلا ضرور پڑتا ہے لیکن میں جانتی ہوں اسے پوری طرح یقین نہیں ہے۔

اسے کیسے بتاؤں کہ میرے پیار کا، میرے نرم و نازک جذبات کا، مستقبل کے میرے کئی ارادوں کا ایک ہی مرکز سنجے ہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ چاندنی رات میں، کسی ویران جگہ میں، درخت تلے بیٹھ کر بھی میں اپنی تھیسس کی بات کرتی ہوں یا وہ آفس کے دوستوں کی باتیں کرتا ہے، یا ہم کسی اور موضوع پر بات کرنے لگتے ہیں . . . لیکن ان سب کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم پریم نہیں کرتے! کیوں نہیں سمجھتا کہ آج ہمارے جذبات سچائی میں بدل گیے ہیں! سپنوں کی جگہ ہم حقیقت میں جیتے ہیں! ہمارے پریم کو پختگی مل گئی ہے، جس کا سہارا پا کر وہ اور گہرا ہو گیا ہے، لافانی ہو گیا ہے۔

لیکن سنجے کو کیسے سمجھاؤں یہ سب؟ کیسے اسے سمجھاؤں کہ نشیتھ نے میری بے عزتی کی ہے، ایسی بے عزتی، جس کی کچوٹ سے میں آج بھی تلملا اٹھتی ہوں۔ رشتہ توڑنے سے پہلے ایک بار تو اس نے مجھے بتایا ہوتا کہ آخر میں نے کون سا جرم کر ڈالا تھا جس کی وجہ سے اس نے اتنی سخت سزا دی؟ ساری دنیا کی ناپسندیدگی، نفرت اور مذاق اور رحم کا زہر مجھے پینا پڑا! . . . دھوکے باز! نیچ کہیں کا! . . . اور سنجے سوچتا ہے کہ آج بھی میرے من میں اس کے لیے نازک جگہ ہے! چھی! میں اس سے نفرت کرتی ہوں! اور سچ پوچھو تو اپنے کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میں ایک ایسے آدمی کے جنگل میں پھنسنے سے بچ گئی، جس کا پریم محض کھلواڑ ہے۔

سنجے، یہ تو سوچو کہ اگر ایسی کوئی بھی بات ہوتی، تو کیا میں تمہارے آگے، تمہاری ہر واجب غیر واجب کوشش کے آگے، اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتی؟ تمہارے چومنے اور بغل گیر ہونے کے بیچ اپنے کو کیوں بکھرنے دیتی؟ جانتے ہو، شادی سے پہلے کوئی بھی لڑکی کسی کو ان سب کا حق نہیں دیتی۔ لیکن میں نے دیا۔ کیا صرف اس لیے نہیں کہ میں تمہیں پیار کرتی ہوں، بہت بہت پیار کرتی ہوں یقین کرو سنجے، تمہارا میرا پیار ہی سچ ہے، نشیتھ کا پیار تو محض چھل تھا، بھرم تھا، جھوٹ تھا۔

کانپور

پرسوں مجھے کلکتہ جانا ہے۔ سچ بڑا ڈر لگ رہا ہے! کیسے کیا ہوگا؟ مان لو انٹرویو میں بہت نروس ہو گئی تو؟ سنجے کو کہہ رہی ہوں کہ وہ بھی ساتھ چلے، لیکن اسے دفتر سے چھٹی نہیں مل سکتی۔ ایک تو نیا شہر ہے، پھر انٹرویو! سچ، اپنا کوئی ساتھ ہوتا تو بڑا سہارا مل جاتا۔ میں کمرہ لے کر اکیلی رہتی ہوں، تو سنجے سوچتا ہے، مجھ میں بڑی ہمت ہے، لیکن سچ بڑا ڈر لگ رہا ہے۔

بار بار میں یہ مان لیتی ہوں کہ مجھے نوکری مل گئی ہے اور میں سنجے کے ساتھ وہاں رہنے لگی ہوں۔ سچ کتنی سندر کلپنا ہے، کتنی نشیلی! لیکن انٹرویو کا ڈر نشیلے خواب کے جال کو توڑ پھوڑ دیتا ہے . . .

کاش، سنجے بھی کسی طرح میرے ساتھ چل سکتا!

کلکتہ

گاڑی جب ہوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر داخل ہوتی ہے تو جانے کیسے عجیب سے شک، عجیب سے ڈر سے میرا من بھر جاتا ہے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ان گنت آدمی۔ عورتوں میں ایرا کو ڈھونڈتی ہوں۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ نیچے اترنے کے بجائے

یس کھڑکی میں سے ہی دور دور تک نظریں دوڑاتی ہوں۔

آخر ایک قلی کو بلا کر اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اور بستر اتارنے کا حکم دیتی ہوں۔ میں نیچے اتر پڑتی ہوں۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر میری دہشت جیسے اور بڑھ جاتی ہے۔ تب کسی کے ہاتھ کے چھونے سے میں بری طرح چونک جاتی ہوں۔ پیچھے دیکھتی ہوں تو ایرا کھڑی ہے۔

رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہتی ہوں: "سچ، تجھے نہ دیکھ کر میں گھبرا رہی تھی کہ تمہارے گھر بھی کیسے پہنچوں گی!"

باہر آکر ہم ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں۔ ابھی تک میں سنبھل نہیں پائی ہوں۔ جیسے ہی ہوڑہ پل پر گاڑی پہنچتی ہے، ہگلی کے پل کو چھوتی ہوائیں تن من میں ایک تازگی بھر دیتی ہیں۔ ایرا مجھے اس پل کی خاصیت بتاتی ہے اور میں حیران سی اس پل کو دیکھتی ہوں، دور دور تک پھیلے ہگلی کے پھیلاؤ کو دیکھتی ہوں، اس کی چھاتی پر کھڑی اور تھرکتی کئی کشتیاں دیکھتی ہوں، بڑے بڑے جہازوں کو دیکھتی ہوں۔ ۔ ۔

اس کے بعد بہت ہی بھیڑ بھری سڑکوں پر ہماری ٹیکسی رکتی رکتی چلتی ہے۔ اونچی نیچی عمارتوں اور چاروں طرف کے ماحول سے کچھ عجیب سی عظمت کا احساس ہوتا ہے، اور اس سب کے بیچ جیسے اپنے کو بہت کھویا کھویا سا محسوس کرتی ہوں۔ کہاں پٹنہ اور کانپور اور کہاں کلکتہ! سچ، میں نے بہت بڑے شہر دیکھے ہی نہیں۔

ساری بھیڑ کو چیر کر ہم ریڈ روڈ پر آجاتے ہیں۔ چوڑی شاندار سڑک۔ میرے دونوں طرف پھیلے چوڑے کھلے میدان۔ "کیوں ایرا، کون کون سے لوگ ہوں گے انٹرویو میں؟ مجھے تو سچ بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے، سب ٹھیک ہو جائے گا! تو اور ڈر؟ ہم جیسے ڈریں تو کوئی بات بھی ہے۔ جس نے اپنا سارا کیریر اپنے آپ بنایا، وہ بھلا انٹرویو میں ڈرے!"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر کہتی ہے: "اچھا، بھیا بھابی تو پٹنہ ہی ہوں گے؟ جاتی ہے کبھی ان کے پاس یا نہیں؟"

"کانپور آنے کے بعد ایک بار گئی تھی۔ کبھی کبھی یوں ہی خط لکھ دیتی ہوں۔"

"بھئی، کمال کے لوگ ہیں! بہن کو بھی نہیں نبھا سکے!"

مجھے یہ موضوع قطعی پسند نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی اس موضوع پر بات کرے۔ میں خاموش رہتی ہوں۔

ایرا کا چھوٹا سا گھر ہے۔ خوبصورت ڈھنگ سے سجایا ہوا۔ اس کے خاوند کے دورے پر جانے کی بات سن کر پہلے مجھے افسوس ہوا تھا، وہ ہوتے تو کچھ مدد ہی کرتے! لیکن پھر یکایک محسوس ہوا کہ ان کی غیر حاضری میں شاید زیادہ آزادی کا احساس کر سکوں۔ ان کا بچہ بھی بڑا پیارا ہے۔

شام کو ایرا مجھے کافی ہاؤس لے جاتی ہے۔ اچانک مجھے وہاں نشیتھ دکھائی دیتا ہے۔ میں گھبرا کر نظر گھما لیتی ہوں۔ لیکن وہ ہماری میز پر ہی آپہنچتا ہے۔ مجبور ہو کر مجھے ادھر دیکھنا پڑتا ہے، نمسکار بھی کرنی پڑتی ہے، ایرا کا تعارف بھی کروانا پڑتا ہے۔ ایرا پاس کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میری سانس رک جائے گی۔

"کب آئیں؟"

"آج سویرے ہی۔"

"ابھی ٹھہرو گی؟ کہاں ٹھہری ہو؟"

جواب ایرا دیتی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں، نشیتھ بہت بدل گیا ہے۔ اس نے شاعروں کی طرح بال بڑھا رکھے ہیں۔ یہ کیا شوق چرایا؟ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔ وہ دبلا بھی ہو گیا ہے۔

خاص بات چیت نہیں ہوتی اور ہم لوگ اٹھ پڑتے ہیں۔ ایرا کو منّو کی فکر ستا رہی تھی اور میں خود گھر پہنچنے کو بے چین ہو رہی تھی۔ کافی ہاؤس سے دھرم تلہ تک پیدل چلتا ہوا ہمارے ساتھ آتا ہے۔ ایرا اس سے بات کر رہی ہے جیسے وہ ایرا کا ہی دوست ہو۔ ایرا اپنا پتہ لکھا دیتی ہے اور وہ دوسرے دن نو بجے آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔

پورے تین سال بعد نشیتھ کا یوں ملنا! نہ چاہ کر بھی جیسے سارا ماضی آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ بہت دبلا ہو گیا ہے نشیتھ! ۔ ۔ ۔ لگتا ہے، جیسے من میں کوئی گہرا درد چھپائے بیٹھا ہے ۔ ۔ ۔

مجھ سے الگ ہونے کا دکھ تو نہیں اسے ستا رہا؟ تخیل چاہے کتنا سہانا کیوں نہ ہو، ایک دل کو خوش کرنے والی تسکین کیوں نہ ہو، لیکن میں جانتی ہوں یہ جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو کون اسے کہنے گیا تھا کہ تم اس رشتے کو توڑ دو؟ اس نے اپنی مرضی سے ہی یہ سب کیا تھا۔

یکایک میرا من کڑواہٹ سے بھر جاتا ہے۔ یہی تو ہے وہ آدمی جس نے مجھے بے عزت کر کے ساری دنیا کے سامنے چھوڑ دیا تھا محض مذاق بنا کر! اوہ، کیوں نہیں میں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا؟ جب وہ میز کے پاس آکر کھڑا ہوا، تو کیوں نہیں کہہ دیا کہ معاف کیجئے، میں آپ کو پہچانتی نہیں۔ ذرا اس کا کھسیانا تو دیکھتی! وہ کل بھی آئے گا۔ سچ، مجھے اسے صاف صاف منع کر دینا چاہئے تھا کہ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں! ۔ ۔ ۔

اچھا ہے، آئے کل! میں اسے بتا دوں گی کہ جلدی ہی میں سنجے سے شادی کرنے والی ہوں۔ یہ بھی بتا دوں گی کہ میں ماضی کو بالکل بھول چکی ہوں، یہ بھی بتا دوں گی کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسے زندگی میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ ۔ ۔

یہ سب سوچنے کے ساتھ ساتھ جانے کیوں میرے من میں یہ بات بھی اٹھ رہی ہے کہ تین سال ہو گئے، ابھی تک نشیتھ نے شادی کیوں نہیں کی؟ کرے نہ کرے، مجھے کیا؟ ۔ ۔ ۔

کیا وہ آج بھی مجھ سے کچھ امید کرتا ہے؟ ہونہہ! بے وقوف کہیں کا۔

سنجے! میں نے تم سے کتنا کہا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو لیکن تم نہیں آئے! ۔ ۔ ۔ اس وقت جب کہ مجھے تمہاری اتنی اتنی یاد آرہی ہے، بتاؤ میں کیا کروں!

کلکتہ

نوکری حاصل کرنا اتنا مشکل ہے، اس کا مجھے گمان تک نہیں تھا۔ ایرا کہتی ہے کہ ڈیڑھ سو کی نوکری کے لیے خود وزیر تک سفارش کرنے پہنچ

جاتے ہیں، پھر یہ تو تین سو کا جاب ہے . . نشیتھ سویرے
سے شام تک اسی چکر میں بھٹکا ہے، یہاں تک کہ اس نے
اپنے دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ وہ کیوں میرے کام
میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے؟ اس کی واقفیت بڑے
بڑے لوگوں میں ہے اور وہ کہتا ہے کہ جیسے بھی ہوگا
وہ یہ کام مجھے دلوا کر ہی مانے گا۔ لیکن آخر کیوں؟

کل میں نے سوچا تھا کہ اپنے برتاؤ کے روکھے
پن سے میں یہ ثابت کر دوں گی کہ وہ میرے پاس نہ
آئے۔ پونے دس بجے کے قریب جب میں اپنے لوٹے
ہوئے بال کھڑکی پر چھٹکنے گئی تو دیکھا، گھر سے تھوڑی
دور پر نشیتھ ٹہل رہا ہے۔ وہی لمبے بال، کرتا پاجامہ۔
تو وہ وقت سے پہلے ہی آ گیا! سنیے ہوتا تو کبھی وقت سے
پہلے نہ پہنچتا، وقت پر پہنچنا تو وہ جانتا ہی نہیں۔

اسے یوں چکر کاٹتے دیکھ کر میرا من جانے کیسا
ہو آیا! . . . اور جب وہ آیا تو میں چاہ کر بھی ناراض نہ
ہو سکی۔ میں نے اسے کلکتہ آنے کا مقصد بتایا تو
لگا کہ وہ بہت خوش ہوا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فون کر کے
اس نوکری کے بارے میں ساری جانکاری حاصل
کر لی۔ کیسے کیا کرنا ہوگا، اس نے یوجنا بھی بنا ڈالی۔
بیٹھے بیٹھے دفتر کو خبر بھی دے دی کہ آج وہ دفتر
نہیں آئے گا۔

میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کے
اس پیار بھرے برتاؤ کو میں منظور بھی نہیں کر پاتی تھی
نہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سارا دن میں اس کے ساتھ گھومتی
رہی لیکن کام کی بات کے علاوہ اس نے ایک بھی بات
نہیں کی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ سنیے کی بات بتا دوں
لیکن بتا نہیں سکی۔ سوچا، کہیں یہ سن کر وہ دلچسپی لینا
کم نہ کر دے۔ اس کی آج بھر کی کوششوں سے ہی
مجھے کافی امید ہو چلی تھی۔ یہ نوکری میرے لیے کتنی
ضروری ہے، مل جائے تو سنیے کتنا خوش ہوگا، ہمارے
شادی کے بعد شروع کے دن کتنے سکھ سے گزر گئے۔

شام کو ہم گھر لوٹتے ہیں۔ میں اسے بیٹھنے کو کہتی
ہوں، لیکن وہ بیٹھتا نہیں، بس کھڑا ہی رہتا ہے۔ اس
کے چوڑے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔
یکایک ہی مجھے محسوس ہوتا ہے اس وقت سنیے ہوتا تو؟
میں اپنے آنچل سے اس کا پسینہ پونچھ دیتی، اور وہ
کیا بنا باہوں میں بھرے، بنا پیار کیے یونہی چلا جاتا!

"اچھا تو چلتا ہوں۔"

مشینی پرزے سے میرے ہاتھ جڑ جاتے
ہیں، وہ لوٹ پڑتا ہے اور میں ٹھگی سی دیکھتی رہتی ہوں۔

سوتے وقت میری عادت ہے کہ میں سنیے کے
لائے ہوئے پھولوں کو دیکھتی رہتی ہوں۔ یہاں وہ پھول
نہیں ہیں تو بڑا سونا سونا سا لگ رہا ہے۔

پتہ نہیں سنیے، تم اس وقت کیا کر رہے ہو! تین
دن ہو گئے، کسی نے باہوں میں بھر کر پیار تک نہیں کیا۔

کلکتہ

آج سویرے میرا انٹرویو ہو گیا۔ میں شاید
بہت نروس ہو گئی تھی اور جیسے جواب مجھے دینے چاہیئے
ویسے نہیں دے پائی۔ لیکن نشیتھ نے آ کر بتایا
کہ میرا چنا جانا قریب قریب طے ہو گیا ہے۔ میں جانتی
ہوں، یہ سب نشیتھ کی وجہ سے ہی ہوا۔

ڈھلتے سورج کی دھوپ نشیتھ کے بائیں
گال پر پڑ رہی تھی، اور سامنے بیٹھا نشیتھ اتنے دن
بعد ایک بار پھر مجھے بڑا پیارا سا لگا۔

میں نے دیکھا، مجھ سے زیادہ وہ خوش ہے۔
وہ کبھی کسی کا احسان نہیں لیتا، لیکن میری خاطر اس نے
نہ جانے کتنے لوگوں کا احسان لیا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ
چاہتا ہے کہ میں کلکتہ آ کر رہوں؟ اس کے ساتھ اس کے
پاس؟ ایک عجیب سی خوشی سے میرا تن من کانپ اٹھتا
ہے۔ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ اس کا ایسا چاہنا
بہت غلط، بہت نامناسب ہے . . . میں اپنے من کو
سمجھاتی ہوں، ایسے کوئی بات ہی ہے، شاید وہ صرف
میرے لیے کی گئی ناانصافی کا بدلہ چکانے کے لیے یہ
سب کر رہا ہے! لیکن کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کی مدد سے
نوکری پا کر میں اسے معاف کر دوں گی، یا جو کچھ اس
نے کیا ہے، اسے بھول جاؤں گی؟ ناممکن! میں کل ہی
اسے سنیے کی بات بتا دوں گی۔

"آج تو اس خوشی میں پارٹی ہو جائے!"

کام کی بات کے علاوہ یہ پہلا فقرہ میں اس کے
منہ سے سنتی ہوں۔ میں ایرا کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ
اس پیشکش کو مان کر کے منو کی طبیعت کا بہانہ لے کر
اپنے کو کاٹ لیتی ہے۔ اکیلے جانا مجھے کچھ غیر واجب سا
لگتا ہے۔ ابھی تک تو کام کا بہانہ لے کر گھومتی تھی۔
لیکن اب؟ پھر بھی میں منع نہیں کر پاتی۔ اندر جا کر
تیار ہوتی ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے نشیتھ کو نیلا رنگ
بہت پسند تھا، میں نیلی ساڑھی ہی پہنتی ہوں۔ بڑے
چاؤ اور ہوشیاری سے سنگار کرتی ہوں اور بار
بار اپنے کو ٹوکتی جاتی ہوں — کس کو رجھانے کے
لیے یہ سب ہو رہا ہے؟ کیا یہ نرا پاگل پن نہیں ہے؟

سیڑھیوں پر نشیتھ ہلکی سی مسکراہٹ کے
ساتھ کہتا ہے "اس ساڑھی میں تم بہت خوبصورت
دکھائی دیتی ہو۔"

میرا چہرہ تمتما جاتا ہے۔ کنپٹیاں سرخ
ہو جاتی ہیں۔ میں سچ مچ ہی اس فقرے کے لیے تیار
نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ چپ رہنے والا نشیتھ بولا بھی تو
ایسی بات۔

مجھے ایسی باتیں سننے کی ذرا بھی عادت نہیں ہے۔
سنیے نہ کبھی میرے کپڑوں پر دھیان دیتا ہے، نہ
ایسی باتیں کرتا ہے، جب کہ اسے پورا حق ہے۔ اور یہ
بنا حق ایسی باتیں کرے۔

لیکن نہ جانے کیا ہے کہ میں اس پر ناراضگی ظاہر
نہیں کر سکتی بلکہ ایک خوشی کی کپکپی محسوس کرتی ہوں۔
سچ، سنیے کے منہ سے ایسا فقرہ سننے کو میرا من ترستا
رہتا ہے لیکن اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔ پچھلے
اڑھائی سال سے میں سنیے کے ساتھ رہ رہی ہوں۔
روز ہی شام کو ہم گھومنے جاتے ہیں۔ کتنی بار میں نے
بناؤ سنگار کیا، اچھے کپڑے پہنے لیکن تعریف کا ایک
لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں سنا۔ ان باتوں پر
اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ وہ دیکھ کر بھی جیسے یہ
سب دیکھ نہیں پاتا۔ اس فقرے کو سننے کے لیے ترستا ہوا میرا من
جیسے رس میں نہا جاتا ہے۔ لیکن نشیتھ نے یہ بات
کیوں کہی؟ اسے کیا حق ہے؟

کیا سچ مچ ہی اسے حق نہیں ہے ؟... نہیں ہے ؟ جانے کیسی مجبوری ہے، کیسی بے بسی ہے کہ میں اس بات کا جواب نہیں دے پاتی ہوں۔ فیصلہ کن پختگی سے نہیں کہہ پاتی کہ ساتھ چلتے اس شخص کو سچ مچ ہی میرے بارے میں ایسی غیر ضروری بات کہنے کا حق نہیں ہے۔

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں آج میں اسے سنجے کی بات بتا دوں گی۔

"سکائی روم!" نشیتھ ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیتا ہے۔

"ٹن" کی گھنٹی کے ساتھ میٹر ڈاؤن ہوتا ہے اور ٹیکسی ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ نشیتھ بہت ہوشیاری سے کونے میں بیٹھا ہے۔ بیچ میں اتنی جگہ چھوڑ کر کہ اگر ہچکولا کھا کر ٹیکسی رکے تو ہم ایک دوسرے کو نہ چھوئیں۔ ہوا کے جھونکے سے میری ساڑھی کا پلو اس کے سارے جسم کو چھوتا ہوا اس کی گود میں لہراتا ہے۔ وہ اسے ہٹاتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے، یہ ریشمی، رنگین پلو، اس کے تن من کو رس میں بھگو رہا ہے۔ یہ چھونا اسے مسرت میں ڈبو رہا تھا۔ میں مارے کامیابی کے نہ کہنے لائق خوشی سے بھر جاتی ہوں!

چاہ کر بھی میں سنجے کی بات نہیں کہہ پاتی۔ اپنی اس بے بسی پہ مجھے غصہ آتا ہے، لیکن میرا منہ ہے کہ کھلتا ہی نہیں ـــــ مجھے لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا جرم کر رہی ہوں، لیکن پھر بھی بات میں نہیں کہہ سکتی!

یہ نشیتھ کچھ بولتا کیوں نہیں؟ اس کا یوں کونے میں دب کر خالی دل سے بیٹھے رہنا مجھے قطعی اچھا نہیں لگتا۔ اچانک ہی مجھے سنجے کی یاد آنے لگتی ہے۔ اس وقت وہ یہاں ہوتا تو اس کا ہاتھ میری کمر میں لپٹا ہوتا! یوں سڑک پر ایسی حرکتیں مجھے خود پسند نہیں لیکن جانے کیوں، کسی کی باہوں میں لپٹنے کے لیے میرا من تڑپ اٹھتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جب نشیتھ بغل میں بیٹھا ہو، تو اس وقت ایسی خواہش کرنا یا ایسی باتیں سوچنا بھی کتنا نامناسب ہے، لیکن میں کیا کروں! جتنی تیز رفتار سے ٹیکسی بھاگی جا رہی ہے، مجھے لگتا ہے اتنی ہی تیز رفتار سے میں بھی بھی جا رہی ہوں، نامناسب، غیر ضروری اطراف کی طرف۔

ٹیکسی جھٹکا کھا کر رکتی ہے تو میرا احساس لوٹتا ہے۔ میں جھٹکے سے دائیں طرف کا پھاٹک کھول کر کچھ ہڑبڑی سے اتر پڑتی ہوں، جیسے اندر نشیتھ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کر رہا ہو۔

"اجی ادھر سے اترنا چاہیے کبھی" ٹیکسی والا کہتا ہے تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ اُدھر نشیتھ کھڑا ہے ادھر میں، بیچ میں ٹیکسی۔

پیسے دے کر ٹیکسی چلی جاتی ہے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ اچانک ہی مجھے خیال آتا ہے کہ ٹیکسی کے پیسے آج مجھے دینے چاہیے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ چپ چاپ ہم دونوں اندر جاتے ہیں۔ آس پاس بہت کچھ ہے چہل پہل، روشنی، رونق، لیکن میرے لیے جیسے اس کی اہمیت مٹ جاتی ہے۔ میں اپنے کو سب کی نظروں سے ایسے بچا کر چلتی ہوں جیسے میں نے کوئی جرم کر ڈالا ہو، اور کوئی مجھے پکڑ نہ لے۔

کیا سچ مچ ہی مجھ سے کوئی جرم ہو گیا ہے۔

آمنے سامنے ہم دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں میزبان ہوں، پھر اس کا پارٹ بھی وہی ادا کر رہا ہے۔ وہی آرڈر دیتا ہے۔ باہر کی ہلچل اس سے زیادہ من کی ہلچل میں میں اپنے کو کھویا سا محسوس کرتی ہوں۔

ہم دونوں کے سامنے بیرا کولڈ کافی کے گلاس اور کھانے کا کچھ سامان رکھ جاتا ہے۔ مجھے بار بار محسوس ہوتا ہے کہ نشیتھ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اس کے ہونٹوں کی دھڑکن تک محسوس کرتی ہوں۔ وہ جلدی سے کافی کا سٹرا منہ سے لگا لیتا ہے۔

مورکھ کہیں کا! وہ سوچتا ہے کہ میں بیوقوف ہوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ تین دن ساتھ رہ کر بھی ہم سے اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ شاید نوکری کی بات ہی ہمارے بیچ چھائی ہوئی تھی۔ لیکن آج... آج ضرور ہی وہ بات آ جائے گی! نہ آئے، یہ کتنا غیر قدرتی ہے! لیکن نہیں، قدرتی شاید یہی ہے! تین سال پہلے جو باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا، اسے الٹ کر دیکھنے کی جرأت ہم دونوں میں سے کسی میں نہیں ہے؟ جو رشتے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گئے، اب ان پر کون بات کرے؟ میں تو کبھی نہیں کروں گی، لیکن اسے تو کرنی چاہیے۔ توڑا اس نے تھا۔ بات بھی وہی شروع کرے۔ میں کیوں کروں؟ اور مجھے کیا غرض پڑی ہے؟ میں تو جلدی ہی سنجے سے شادی کرنے والی ہوں۔ کیوں نہیں میں ابھی سنجے کی بات اسے بتا دیتی لیکن جانے کیسی بے بسی ہے جیسے اس نے کچھ کہا...

"آپ نے کچھ کہا؟"

"نہیں تو!"

میں شرمندہ ہو جاتی ہوں۔

پھر وہی خاموشی! کھانے میں میرا ذرا بھی من نہیں لگ رہا ہے، لیکن میں مشین سی کھا رہی ہوں۔ شاید وہ بھی ایسے ہی کھا رہا ہے۔ مجھے پھر لگتا ہے کہ اس کے ہونٹ پھڑک رہے ہیں اور سٹرا پکڑے ہوئے انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں، وہ پوچھنا چاہتا ہے: دیپا، تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟

وہ پوچھ ہی کیوں نہیں لیتا؟ مان لو اگر پوچھ ہی لے تو کیا میں اسے کہہ سکوں گی کہ میں تمہیں زندگی بھر معاف نہیں کر سکتی۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ گھوم پھر لی، یا کافی پی لی، تو یہ مت سمجھو کہ میں تمہیں، دھوکے باز کو بھول ہی گئی ہوں؟

اور یکا یک ہی پچھلا سب کچھ آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ ناقابلِ برداشت بےعزتی کرنے والا درد، غصہ، تڑپ کیوں یاد آتی؟ میرے سامنے تو پٹنہ میں گزاری سہانی شامیں اور چاندنی راتوں کی وہ تصویریں ابھر آتی ہیں، جب گھنٹوں قریب بیٹھے خاموش خیالات میں ڈوبے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ بغیر ایک دوسرے کو چھوئے، جانے کیسی غنودگی تن من کو مسرور کیے رہتی تھی، جانے کیسے نشے میں ڈوبے رہتے تھے... ایک عجیب سی، خوابوں کی دنیا میں!... میں کچھ بولنا چاہتی بھی تو وہ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتا: "اپنے پن کے ان لمحات کو ان کہا ہی رہنے دو دیپ!"

آج بھی تو ہم خاموش ہیں، ایک دوسرے کے قریب ہی ہیں۔ کیا آج بھی ہم اپنے پن کے لمحات سے گزر رہے ہیں؟ میں اپنی قوت لگا کر چیخنا چاہتی ہوں نہیں!... نہیں!... نہیں!... لیکن کانپنے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر پاتی۔ میرا یہ غصہ دل کی نہ جانے کون سی گہری گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔

نشیتھ مجھے پل نہیں دینے دیتا۔ ایک عجیب سا جذبہ میرے دل میں اٹھتا ہے کہ چھینا جھپٹی میں کسی طرح میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو جائے! میں اپنے لمس سے اس کے من کے تاروں کو جھنجھنا دینا چاہتی ہوں، لیکن ویسا موقع نہیں آتا۔ بل وہی دیتا ہے، مجھ سے تو اعتراض بھی نہیں کیا جاتا۔

من میں تیز طوفان؛ لیکن پھر بھی بنا کسی خیال کے میں ٹیکسی میں آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔۔ پھر وہی خاموشی وہی دُوری۔ لیکن جانے کیا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ نشیتھ میرے بہت نزدیک آ گیا ہے۔ بہت ہی نزدیک اور بار بار میرا من کرتا ہے کہ کیوں نہیں نشیتھ میرا ہاتھ پکڑ لیتا، کیوں نہیں میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتا؟ میں ذرا بھی برا نہیں مانوں گی، ذرا بھی نہیں! لیکن وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔

سوتے وقت روز کی طرح میں آج بھی سنجے کا دھیان کرتے ہوئے سونا چاہتی ہوں، لیکن نشیتھ ہے کہ بار بار سنجے کی شکل کو ہٹا کر خود آ کھڑا ہوتا ہے۔

کلکتہ

اپنی مجبوری پر بہت غصہ ہوتی ہوں۔ آج کتنا اچھا موقع تھا بات بتا دینے کا! لیکن میں جانے کہاں بھٹکی تھی کہ کچھ بھی نہیں بتا پائی۔

شام کو مجھے نشیتھ اپنے ساتھ جھیل لے گیا۔ پانی کے کنارے ہم گھاس پر بیٹھ گئے۔ کچھ دُور کافی بھیڑ بھاڑ اور ہلچل تھی، لیکن یہ جگہ نسبتاً خاموش تھی۔ سامنے جھیل کے پانی میں چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ چاروں طرف سے ماحول کا کچھ عجیب سا اثر پڑا تھا۔

"اب تو تم یہاں آ جاؤ گی!" میری طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"ہاں!"

"نوکری کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں کچھ جاننے کی بے چینی پھیلتی جا رہی ہے، شاید کچھ کہنے کی بھی۔ مجھ سے کچھ جان کر وہ اپنی بات کہے گا۔

"کچھ نہیں!" جانے کیوں میں یہ کہہ گئی۔ کوئی ہے جو بھے کھوٹ ڈال رہا ہے۔ کیوں نہیں میں بتا دیتی کہ نوکری کے بعد میں سنجے سے شادی کروں گی۔ میں سنجے سے پریم کرتی ہوں، وہ بھی مجھے پیار کرتا ہے؟ وہ بہت اچھا ہے، بہت ہی! وہ مجھے تمہاری طرح دھوکا نہیں دے گا۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہیں کہہ پاتی۔ اپنی اس بے بسی پر میری آنکھیں چھل چھلا آتی ہیں۔ میں دوسری طرف منہ پھیر لیتی ہوں۔

"تمہارے یہاں آنے سے میں بہت خوش ہوں۔"

میری سانس جہاں کی تہاں رک جاتی ہے آگے کے الفاظ سننے کے لیے، لیکن الفاظ نہیں آتے۔ بڑی ڈری، بے چین اور رحم بھری نگاہوں سے میں اسے دیکھتی ہوں جیسے کہہ رہی ہوں کہ تم کہہ کیوں نہیں دیتے نشیتھ کہ آج بھی تم مجھے پیار کرتے ہو، تم مجھے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو۔ جو کچھ ہو گیا ہے اسے بھول کر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو! کہہ دو نشیتھ، کہہ دو!... یہ سننے کے لیے میرا من بے چینی سے چھٹپٹا رہا ہے۔ میں برا نہیں مانوں گی، ذرا بھی برا نہیں مانوں گی۔ مان ہی کیسے سکتی ہوں نشیتھ! اتنا سب ہو جانے کے بعد بھی شاید میں تمہیں پیار کرتی ہوں — شاید نہیں — سچ مچ ہی میں تمہیں پیار کرتی ہوں۔

میں جانتی ہوں — تم کچھ نہیں کہو گے ہمیشہ کے ہی کم بولنے والے جو ہو۔ پھر بھی کچھ سننے کی بے چینی لیے میں تمہاری طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ لیکن تمہاری نظر تو جھیل کے پانی پر جمی ہوئی ہے۔۔۔ شانت، خاموش۔

اپنے پن کے یہ لمحے اَن کہے بھلے ہی رہ جائیں لیکن اَن بوجھے نہیں رہ سکتے۔ تم چاہے نہ چاہو، لیکن میں جانتی ہوں، تم آج بھی مجھے پیار کرتے ہو، بہت پیار کرتے ہو! میرے کلکتہ آ جانے کے بعد اس رشتے کو پھر سے جوڑنے کی بات ہی تم اس وقت سوچ رہے ہو۔ تم آج بھی مجھے اپنا ہی سمجھتے ہو، تم جانتے ہو، آج بھی دیا تمہاری ہے۔۔۔ اور میں؟

لگتا ہے اس سوال کا جواب دینے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جس بنیاد پر میں تم سے نفرت کرتی تھی، اسی بنیاد پر کہیں مجھے اپنے سے نفرت نہ کرنی پڑے۔

لگتا ہے رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی ہے۔

کانپور

من میں زبردست امنگ ہوتے ہوئے بھی نشیتھ کی میٹنگ کی بات سن کر میں نے کہہ دیا تھا کہ تم اسٹیشن پر مت آنا۔ ایرا آئی تھی، لیکن گاڑی پر بٹھا کر چلی گئی یا کہوں میں نے زبردستی اسے بھیج دیا۔ میں جانتی تھی کہ لاکھ منع کرنے پر بھی نشیتھ آئے گا اور الوداع کے ان لمحوں میں اس کے ساتھ اکیلی ہی رہنا چاہتی تھی۔ من میں ایک دبی سی آشا تھی کہ چلتے وقت ہی شاید کچھ کہہ دے۔

گاڑی چلنے میں جب دس منٹ رہ گئے تو دیکھا بڑی بے چینی سے ڈبوں میں جھانکتا جھانکتا نشیتھ آ رہا تھا۔۔۔ پاگل! اسے اتنا سمجھنا چاہیے کہ اس کے انتظار میں میں یہاں باہر کھڑی ہوں۔

میں دوڑ کر اس کے پاس جاتی ہوں: "آپ کیوں آئے؟" لیکن مجھے اس کا آنا بڑا اچھا لگتا ہے وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ شاید سارا دن وہ مصروف رہا اور دوڑتا دوڑتا مجھے الوداع کرنے یہاں آ پہنچا۔ من کرتا ہے کچھ ایسا کروں جس سے اس کی ساری تھکان دور ہو جائے۔ لیکن کیا کروں؟ ہم ڈبے کے پاس آ جاتے ہیں۔

"جگہ اچھی مل گئی؟" وہ اندر جھانکتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"ہاں۔"

"پانی وغیرہ تو ہے؟"

"ہے۔"

"بستر پھیلا لیا؟"

مجھے غصہ آتا ہے۔ وہ شاید سمجھ جاتا ہے، چپ ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں لمحہ بھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ میں اس کی آنکھوں میں تصویروں کی پرچھائیاں دیکھتی ہوں، جیسے کچھ ہے، جو اس کے من میں گھٹ رہا ہے، اسے متھ رہا ہے، لیکن وہ کہہ نہیں پا رہا ہے۔ وہ کیوں نہیں کہہ دیتا، کیوں نہیں اپنے من کی اس گھٹن کو ہلکا کر لیتا۔

"آج خاص بھیڑ نہیں ہے" چاروں طرف نظر دوڑا کر وہ کہتا ہے۔

میں بھی ایک بار چاروں طرف دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن نظر میری بار بار گھڑی پر ہی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے وقت سرک رہا ہے میرا من کسی گہرے دکھ میں ڈوب رہا ہے۔ مجھے کبھی اس پر رحم آتا ہے تو کبھی غصہ۔ گاڑی چلنے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ایک بار پھر غصے بھری نظریں ملتی ہیں۔

"اوپر چڑھ جاؤ، اب گاڑی چلنے والی ہے۔"

بڑی بے سہارا سی نظر سے میں اسے دیکھتی ہوں، جیسے کہہ رہی ہوں "تم ہی چڑھا دو۔۔۔" اور پھر دھیرے دھیرے چڑھ جاتی ہوں۔ دروازے پر میں کھڑی ہوں اور وہ نیچے پلیٹ فارم پر۔

"جا کر پہنچنے کی خبر کر دینا۔ جیسے ہی مجھے ادھر کچھ پکے طور پر معلوم ہوگا تمہیں خبر کر دوں گا۔"

میں کچھ بولتی نہیں، بس اسے دیکھتی رہتی ہوں... سیٹی۔۔۔ ہری جھنڈی۔۔۔ پھر سیٹی۔ میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔

گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے سرکنے لگتی ہے وہ گاڑی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا ہے اور میرے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ من کرتا ہے چلا پڑوں — میں سمجھ گئی نشیتھ، سب سمجھ گئی! جو کچھ تم ان چاروں دنوں میں نہیں کہہ پائے، وہ تمہارے اس لمحہ بھر کے لمس نے کہہ دیا۔ یقین کرو۔ اگر تم میرے ہو تو میں بھی تمہاری ہوں، صرف تمہاری، صرف تمہاری۔۔۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ پاتی۔ بس، ساتھ چلتے نشیتھ کو دیکھتی بھر رہتی ہوں۔ گاڑی کے رفتار پکڑتے ہی وہ ہاتھ کو زور سے دبا کر چھوڑ دیتا ہے۔ میری چھلکتی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں مجھے لگتا ہے یہ لمس، یہ سکھ، یہ لمحہ ہی سچ ہے، باقی سب جھوٹ ہے، اپنے بھولنے کا، دھوکا دینے کی ناکام کوشش ہے۔

آنسو بھری آنکھوں سے میں پلیٹ فارم کو پیچھے چھوٹتا ہوا دیکھتی ہوں۔ ساری شکلیں دھندلی سی دکھائی دیتی ہیں۔ ان گنت ہلتے ہوئے ہاتھوں کے بیچ نشیتھ کے ہاتھ کو، جس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔ گاڑی پلیٹ فارم کو پار کر جاتی ہے اور دور دور تک کلکتہ کی جگمگاتی بتیاں دکھائی دیتی ہیں، پیچھے چھوٹتی جاتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے، یہ شیطان سی ریل گاڑی مجھے میرے گھر سے کہیں دور۔ دور لے جا رہی ہے — ان دیکھی انجانی راہوں میں گمراہ کرنے کے لیے، بھٹکانے کے لیے۔

بوجھل من سے میں اپنے پھیلائے ہوئے بستر پر لیٹ جاتی ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہی سب سے پہلے سامنے سنجے کی تصویر ابھرتی ہے۔۔۔ کانپور جا کر میں اسے کیا کہوں گی؟ اتنے دنوں تک اسے دھوکا دیتی آئی۔ اپنے کو دھوکا دیتی آئی، لیکن اب نہیں۔۔۔ میں اسے ساری بات سمجھا دوں گی۔ کہوں گی سنجے جس رشتے کو ٹوٹا ہوا جان کر میں بھول چکی اس کی جڑیں دل کی کن گہری گہرائیوں میں جمی ہوئی تھیں اس کا احساس کلکتہ میں نشیتھ سے مل کر ہوا۔ یاد آتا ہے تم نشیتھ کو لے کر ہمیشہ ہی شک کرتے تھے، لیکن تب میں جلنے والا سمجھتی تھی، آج مانتی ہوں کہ تم جیتے، میں ہاری!

سچ ماننا سنجے، اڑھائی سال خود بھرم میں تھی اور تمہیں بھی بھرم میں ڈال رکھا تھا، لیکن آج بھرم دھوکے کے سارے جال ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ میں آج بھی نشیتھ سے پیار کرتی ہوں۔ اور یہ جاننے کے بعد ایک دن بھی تمہارے ساتھ اور دھوکا کرنے کی ہمت کیسے کروں؟ آج پہلی بار میں نے اپنے رشتوں کی چھان بین کی تو جیسے سب کچھ ہی صاف ہو گیا اور جب میرے سامنے سب کچھ صاف ہو گیا۔ تو تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ تمہارے سامنے میں چاہوں تو بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔

آج لگ رہا ہے۔ تمہارے لیے میرے من میں جو بھی جذبہ ہے، وہ پیار کا نہیں صرف شکر گزاری کا ہے۔ تم نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا جب اپنے والد اور نشیتھ کو دیکھ کر میں چور چور ہو چکی تھی۔ سارا سنسار مجھے ویران نظر آنے لگا تھا۔ اس وقت تم نے پیار بھرے لمس سے گدگدا دیا۔ میرا مرجھایا — من ہرا ہوا اٹھا۔ میں مارے خوشی کے ناچ اٹھی اور سمجھنے لگی کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ لیکن پیار کی مست گھڑیاں، ناچتے لمحات، لگن کے پل جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں، ہماری زندگی میں کبھی نہیں آئے۔ تم ہی بتاؤ، آئے کبھی؟ تمہارے ان گنت بغل گیر اور چومنے کے بیچ بھی ایک لمحے کے لیے بھی تو میں نے کبھی تن من کی سدھ بسرا دینے والی مسرت کے لمحات کی مستی کا احساس نہیں کیا۔ سوچتی ہوں نشیتھ کے چلے جانے کے بعد میری زندگی میں ایک عظیم سونا پن آ گیا تھا، ایک کھوکھلا پن آ گیا تھا، تم نے اسے پورا کیا۔ تم پورا کرنے والے تھے۔ میں غلطی سے تمہیں پریتم سمجھ بیٹھی۔

مجھے معاف کر دو سنجے اور لوٹ جاؤ۔ تمہیں مجھ جیسی بہت دیپائیں مل جائیں گی جو سچ مچ ہی تمہیں پریتم کی طرح پیار کریں گی۔ آج ایک بار اچھی طرح جان گئی ہوں کہ پہلا پیار ہی سچا پیار ہوتا ہے۔ بعد میں کیا ہوا پیار تو اپنے کو بھولنے کا، بھرمانے کی صرف کوشش ہوتی ہے۔۔۔

اسی طرح ان گنت باتیں میرے دماغ میں آتی ہیں، جو میں سنجے سے کہوں گی۔ کہہ سکوں گی یہ سب؟ لیکن کہنا تو ہوگا ہی۔ اس کے ساتھ اب ایک دن بھی دھوکا نہیں کر سکتی۔ من سے کسی اور کی

بوجاکر کے تن سے اس کی ہونے کا سوانگ کرتی رہوں چھی!
نہیں جانتی، یہ سب سوچتے سوچتے مجھے کب نیند آگئی۔ لوٹ کر اپنا کمرہ کھولتی ہوں، تو دیکھتی ہوں سب کچھ جیسے کا تیسا ہے، صرف پھولدان کے رجنی گندھا مرجھا گئے ہیں۔ کچھ پھول جھڑ کر زمین پر ادھر ادھر بھی بکھر گئے ہیں۔ آگے بڑھتی ہوں تو زمین پر پڑا ایک لفافہ دکھائی دیتا ہے۔ سنیجے کی لکھائی ہے۔ کھولا تو چھوٹا سا خط تھا۔

دیپا
تم نے کلکتہ جاکر کوئی خبر ہی نہیں دی میں آج دفتر کے کام سے کٹک جا رہا ہوں۔ پانچ چھ دن میں لوٹ آؤں گا، تب تک تم آ ہی جاؤ گی۔ جاننے کا مشتاق ہوں کہ کلکتہ میں کیا ہوا:

تمہارا سنیجے

ایک لمبا سانس نکل جاتا ہے۔ لگتا ہے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اس وقفے میں تو میں اپنے کو اچھی طرح تیار کر لوں گی۔ نہا دھو کر سب سے پہلے میں نشیتھ کو خط لکھتی ہوں۔ اس کی حالت سے جو ہچک ہونٹ بند کیے ہوئے تھی، دور رہ کر آپ ہی آپ ٹوٹ جاتی ہے۔ میں صاف الفاظ میں لکھ دیتی ہوں کہ چاہے اس نے کچھ نہیں کہا، پھر بھی میں سب سمجھ گئی ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیتی ہوں کہ میں اس کی اس حرکت سے بہت دکھی تھی، بہت ناراض بھی، لیکن اسے دیکھتے ہی سارا غصہ بہہ گیا۔ اس اپنے پن میں غصہ بھلا ٹک بھی کیسے پاتا؟ لوٹی ہوں تب سے نہ جانے کیسی رنگینی اور نشہ میری آنکھوں کے آگے چھایا ہے...

ایک خوبصورت سے لفافے میں انہیں بند کر کے میں خود پوسٹ کرنے جاتی ہوں۔

رات میں سوتی ہوں تو ایسے ہی میری نظر مرجھائے پھولوں پر جاتی ہے۔ میں کروٹ بدل کر سو جاتی ہوں۔

کانپور
آج نشیتھ کو خط لکھے چوتھا دن ہے میں تو کل ہی اس کے خط کی راہ دیکھ رہی تھی، لیکن آج بھی دونوں ڈاکیں نکل گئیں۔ جانے کیسا سونا سونا، ان منا لگتا رہا سارا دن! کسی بھی تو کام میں دل نہیں لگتا۔ کیوں نہیں لوٹتی ڈاک سے ہی جواب دے دیا اس نے؟ سمجھ میں نہیں آتا کیسے وقت گزاروں۔

میں باہر بالکونی میں جاکر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اچانک خیال آتا ہے، پچھلے اڑھائی سالوں سے قریب اسی وقت، یہیں کھڑے ہو کر میں نے سنیجے کا انتظار کیا ہے۔ کیا آج میں سنیجے کا انتظار کر رہی ہوں؟ یا میں نشیتھ کے خط کا انتظار کر رہی ہوں؟ شاید کسی کا نہیں، کیوں کہ جانتی ہوں کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں آئے گا۔ پھر؟

بلا وجہ کمرے میں لوٹ جاتی ہوں۔ شام کا وقت مجھ سے گھر میں نہیں کاٹا جاتا۔ روز ہی تو سنیجے کے ساتھ گھومنے نکل جایا کرتی تھی۔ لگتا ہے یہیں بیٹھی رہی تو دم گھٹ جائے گا۔ کمرہ بند کر کے میں اپنے کو دھکیلتی سی سڑک پر لے آتی ہوں... شام کا دھندلکا من کے بوجھ کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ کہاں جاؤں؟ لگتا ہے جیسے میری راہیں بھٹک گئی ہیں، منزل کھو گئی ہے۔ میں خود نہیں جانتی آخر مجھے جانا کہاں ہے۔ پھر بھی بلا وجہ سی چلتی رہتی ہوں۔ لیکن آخر کب تک یوں ہی بھٹکتی رہوں؟ ہار کر لوٹ پڑتی ہوں۔

آتے ہی مہتہ صاحب کی بچی تار کا ایک لفافہ دیتی ہے۔ دھڑکتے دل سے میں اسے کھولتی ہوں۔ ایرا کا تار تھا۔ نوکری مل گئی ہے۔ مبارک باد!

اتنی بڑی خوشخبری پا کر بھی جانے کیا ہے کہ خوش نہیں ہو پاتی۔ یہ خبر تو نشیتھ بھیجنے والا تھا۔ اچانک ہی ایک خیال میرے دل میں آتا ہے؛ کیا جو کچھ میں سوچ گئی وہ نرا بھرم ہی تھا۔ صرف میری کلپنا، میرا اندازہ! نہیں نہیں! اس لمس کو میں بھرم کیسے مان لوں، جس نے میرے تن من کو ڈبو دیا تھا، جس کے ذریعے اس کے دل کی ایک ایک تہ میرے سامنے کھل گئی تھی... جھیل پر گزارے ان سہانے لمحات کو کیسے بھرم مان لوں، جہاں اس کی خاموشی ہی آواز بن کر سب کچھ کہہ گئی تھی —— اپنے پن کے وہ ان کہے، خاموش لمحات! تو پھر اس نے خط کیوں نہیں لکھا؟ کیا کل اس کا خط آئے گا؟ کیا آج بھی اسے وہی ہچک روکے ہوئے ہے؟

تبھی سامنے کی گھڑی ٹن ٹن کر کے نو بجاتی ہے میں اسے دیکھتی ہوں۔ یہ سنیجے کی لائی ہوئی ہے... لگتا ہے جیسے یہ گھڑی گھنٹے سنا سنا کر مجھے سنیجے کی یاد دلا رہی ہے۔ لہراتے یہ ہرے پردے، یہ ہری بک ریک یہ ٹیبل، یہ پھولدان، سبھی تو سنیجے کے لائے ہوئے ہیں۔ میز پر یہ قلم اس نے مجھے سالگرہ پر لا کر دیا تھا۔

اپنے ہوش کے ان بکھرے دھاگوں کو سمیٹ کر میں پھر پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن پڑھ نہیں پاتی —— ہار کر میں پلنگ پر لیٹ جاتی ہوں۔

سامنے کے پھولدان کا سونا پن میرے من کے سونے پن کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے میں کس کر آنکھیں موند لیتی ہوں... ایک بار پھر میری آنکھوں کے آگے جھیل کا صاف شفاف نیلا پانی ابھر آتا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس پانی کی طرف دیکھتے ہوئے نشیتھ کی شکل ابھر آتی ہے۔ وہ لاکھ پانی کی طرف دیکھے، لیکن چہرے پر چھپی اس کے من کی ہلچل کو میں آج بھی اتنی دور ہو کر بھی محسوس کرتی ہوں۔ کچھ کہہ پانے کی مجبوری، اس کی بے بسی، اس کی گھٹن بھی میرے سامنے زندہ ہو اٹھتی ہے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے پانی کا پھیلاؤ سمٹ جاتا ہے اور ایک چھوٹی سی لکھنے کی میز میں بدل جاتا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ایک ہاتھ میں قلم لیے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو بالوں میں الجھائے نشیتھ بیٹھا ہے۔ —وہی مجبوری، وہی بے بسی، وہی گھٹن لیے...

وہ چاہتا ہے لیکن جیسے لکھ نہیں پاتا۔ وہ کوشش کرتا ہے، لیکن اس کا ہاتھ بس لرز کر رہ جاتا ہے...

اوہ! لگتا ہے، اس کی گھٹن میرا دم گھونٹ کر رکھ دے گی... میں یکایک آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ وہی پھولدان، پردے، میز، گھڑی...

کانپور
آخر آج نشیتھ کا خط آگیا۔ دھڑکتے دل سے میں نے اسے کھولا۔ اتنا مختصر سا خط!

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

شیلیش مٹیانی

ہارا ہوا

آس پاس کھڑے ہوئے عورتوں مردوں کی موجودگی میں ہی گنڈا مل نے اپنی چارخانی لنگی اتار کر پھینک دی اور گہرے لال رنگ کے لنگوٹ کے اگلے سِرے کو ناگ پھنی کے پتے کی طرح پھیلا لیا تو چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔

یہ خبر تو پہلے ہی پھیل چکی تھی کہ ڈکھہرن موچی نے گنڈا مل پہلوان کے خاص چیلے ڈُلی چند کے منہ پر یہ کہہ دیا تھا کہ۔۔ کہہ دینا اپنے باپ گنڈا مل سے، آگے سے میرے گھر کی طرف منہ کیا تو اس کی بے حیا آنکھوں کو کھینچ کر باہر نکال دوں گا اور زبان میں ٹھونک دوں گا جوتے کی نعل! پتہ چل جائیگا حرام زادے کو کہ دکھہرنا کی بیٹی کو بُری نظر سے دیکھنا کیا ہوتا ہے!

ساری بستی میں یہ سنسنی پھیلی ہوئی تھی کہ اب دکھہرن موچی کی نہ جانے کیا حالت کرے گا گنڈا مل پہلوان۔ بستی کی عورتوں مردوں کا جو ریلا گنڈا مل کے اِردگرد اکٹھا ہوا تھا، ان میں سے سبھی کی آنکھوں میں چٹک لال رنگ کے لنگوٹ کو اپنی قوی الجثہ جانگھوں کے بیچ اینٹھا اینٹھ کر کستے ہوئے گنڈا مل پہلوان کے ساتھ ہی ساتھ دکھہرن موچی کی صورت بھی صاف ابھر رہی تھی۔

دکھہرن موچی وہاں موجود نہیں تھا، مگر لوگوں کو لگ رہا تھا کہ غصّے سے بوکھلائے جنگلی گینڈے کی طرح پھر پھر کر لنگوٹ کو کھوستے کستے ہوئے گنڈا مل پہلوان کے آس پاس ہی کہیں دکھہرنا ضرور کھڑا ہے۔ ہر وقت پانی چوتے رہنے سے مچچاتی اور گڈھوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور

نام: شیلیش مٹیانی
پیدائش: ۴ اکتوبر ۱۹۳۱ء بمقام الموڑا
تصانیف: چھوٹی رسین، حوالدار، باون ندیوں کا سنگم، مڈبھیڑ، گوپلی غفورن
(ناول)
چیل، پیاس اور پتھر، ابیت اور انیہ کہانیاں (کہانیوں کے مجموعے)
ترجیا (مضامین)
پتہ: ۲۶۱۔ اے۔ موتی لال نہرو نگر
الہ آباد (یوپی)

نہ جانے سَر کی کمزوری کی وجہ سے یا کہ اپنی زندگی کے لئے خاص للک کی وجہ سے لگاتار ناک سے رستی رینٹ اور پر اتارے ہوئے بیمار مرغے جیسا جھلی دار جسم۔ لوگوں کو لگ رہا تھا کہ اگر خوفناک ہونے میں گنڈا مل کا کوئی ثانی نہیں ہے تو قابل رحم ہونے میں دکھہرن موچی بھی پوری بستی میں اپنی نسل کا اکیلا ہی ہے۔ اور اسی وجہ سے لوگوں کو گنڈا مل پہلوان کے اپنی ہی جگہ کھڑے ہو کر پینترے بازی کرنے کی بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ عجیب ہی نہیں غیر یقینی بھی۔

لوگوں کے خیال کے مطابق اب تک تو ڈکھہرن موچی کی کمزور گردن پکڑ کر مروڑ بھی چکا ہوتا گنڈا مل پہلوان۔ دکھہرن موچی جیسے قابل رحم اور بغیر سہارے کے آدمی سے اپنی بے عزّتی کا بدلہ چکانے کے لئے گنڈا مل پہلوان کا یوں پینترا بازی کرنا جیسے کہ بہت تگڑے جوڑ کے پہلوان سے نپٹنا ہو۔ لوگوں کو یہ سب کچھ ایک دم حیرت ناک سا لگ رہا تھا۔ حیران کُن اور غیبی۔

خود گنڈا مل پہلوان کی حالت بھی عجیب تھی۔ لگاتار سولہ سترہ برسوں سے جس کسی بستی میں وہ رہا تھا کئی جگہ کئی بار اسے دوسرے پہلوانوں اور گنڈوں کی چنوتیوں سے بھی نپٹنا پڑا۔ مگر ایسا موقع پہلی بار ہی اس کی زندگی میں آیا تھا جب کہ گنڈا مل سیدھے آگے بڑھ کر ٹکرا جانے کے بجائے اپنے ہی پاؤں پر کھڑا کھڑا سینگوں سے زمین کھودتے سانڈ کی طرح صرف پینترے بازی کرتا رہ گیا ہو ——

دکھہرن موچی جیسا ہر طرح سے گیا گزرا آدمی گنڈا مل

بھیڑ تو اسے اور بھی بے قابو بنا ڈالتی ہے اور پھر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتا جو وہ خود کرنا چاہتا ہے۔ تب وہ اس کام کو کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جو بھیڑ اجتماعی طور پر اس سے کروانا چاہتی ہے اپنے ہی ارادے کے آگے کمزور پڑتے ہوئے آدمی پر بھیڑ اپنے ارادوں کو تھوپتی چلی جاتی ہے، اس بات کا گنڈا مل پہلوان کو پہلی بار احساس ہوا۔ وہ اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ پہلے ہی وہ ارادے کی کمزوری کا شکار ہے لیکن اس کے پیٹھ پیچھے چھپی ہوئی بھیڑ اپنا فیصلہ کر چکی ہے۔

اس فیصلہ پر شاید بھیڑ شروع میں ہی پہنچ چکی تھی کہ اب گنڈا مل پہلوان دکھہرن موچی کی گردن مروڑ دیگا اور مار مار کر اس کا کچومر نکال دے گا اور اسی کے سامنے اس کی بیوہ بیٹی کیلاسو کو پکڑ کر اس کی عصمت پر ہاتھ ڈال کر اپنی بے عزّتی کا بدلہ لے لیگا۔ اور جب تک ایسا کر نہیں ڈالے گا تب تک بھیڑ کی آنکھوں میں بسی ہوئی پیاس نہیں بجھے گی۔ بھیڑ کا پہلا فیصلہ آخری بھی ہوتا ہے۔

دکھہرن موچی کی جھونپڑی بستی کے آخری سرے پر تھی لیکن جہاں سے گنڈا مل پہلوان آگے بڑھا وہاں سے بالکل آنکھوں کی سیدھ میں۔

گنڈا مل پہلوان چاہتا تھا کہ اس وقت وہ سیدھے دکھہرن موچی کے جھونپڑے کی طرف نہ جا کر کہیں سناٹے کی طرف چلا جائے۔ مغرب کی طرف پڑنے والے۔ بڑے تالاب اور اس کے کنارے کا بڑا پیپل کا درخت اُسے یاد آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا، گھنٹے، دو گھنٹے کے لئے وہ اسی کے نیچے اپنی چارخانی تہمد بچھا کر لیٹ جائے۔ اور پھر اپنے یکایک اُمڑ آئے ماضی کو پُرسکون ذہن کے ساتھ ٹٹول کر دیکھے، جس نے اسے دکھہرن موچی کے مقابلے میں کمزور بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ مگر پیچھے مُڑ کر نہ دیکھتے ہوئے بھی اُسے لگ رہا تھا کہ بھیڑ بھلے ہی پیچھے چھوٹ گئی ہے مگر بھیڑ میں سے ہر عورت اور مرد کی آنکھ باہر نکل کر اسی کی پیٹھ پر ٹکی ہوئی ہے۔

کبھی کبھی اپنی شہرت اور عظمت کی حالت خود اپنے لئے کتنی خطرناک بن جاتی ہے اور اپنی ہی نظر میں خود کو کتنا بے سہارا اور کمزور بنا دیتی ہے یہ سوچ کر گنڈا مل پہلوان کی آنکھوں میں تھوڑی سی نمی پھیل گئی۔ وہ اپنی آنکھوں کو پونچھ لینا چاہتا تھا تا کہ کہیں دکھہرن موچی کے سامنے آنسو نہ نکل پڑے، مگر اُسے لگا، اس وقت وہ ذرا سا بھی رکا اور آنکھیں پونچھنے میں لگا، تو بھیڑ کی آنکھوں میں اور بھی زیادہ شک پیدا ہو جائیگا اور لوگ اس کے زیادہ قریب پہنچ جائیں گے۔

لگاتار سولہ سترہ سالوں میں اپنی جسمانی طاقت اور اپنی خونخوار فطرت کی وجہ سے خود گنڈا مل پہلوان نے اپنی شخصیت ایسی بنالی ہے کہ آس پاس کے علاقوں میں اس کے نام کا خوف پھیلا ہوا ہے۔ اس کا شاگرد کہلانے میں نئے ابھرتے ہوئے پہلوان فخر سے اپنا سینہ پھیلا لیتے ہیں۔ جس بستی کو کانگریس سرکار نے مہاجروں کے لیے بسا کر بستی نام رکھ دیا تھا وہ بستی، بستی گنڈا مل کے نام سے ہی زیادہ جانی جاتی ہے۔ اور اپنے دلیر شاگردوں کی مدد سے گنڈا مل نے ہر آڑے آنے والے کو شکست دی، جس عورت پر نظر چڑھ گئی اس کو بازوؤں میں باندھ کر ہی دم لیا آج پینتالیس چھیالیس سال کی عمر میں بھی جسم پر کبھی تیل کا ہاتھ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔

یہی بنارسی جنگل پنواڑی پچھلے سال جب بستی میں آیا تھا تو اپنی ساڑھے تین انچی مونچھوں کو ایسے مروڑتا پھرتا تھا جیسے گنڈا مل پہلوان کی اس کے لیے کوئی اہمیت ہی نہ ہو بنارس کے بجرنگ بلی اکھاڑے کا نکلا ہوا پٹھا تھا، گنڈا مل پہلوان کے بھینسے جیسے جسم کو دیکھ کر ہنس پڑتا تھا کہ تو ہی ہے گنڈا مل پہلوان صاحب؟

تب جنگل پہلوان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ گنڈا مل پہلوان نے اپنا سکّہ صرف اپنی جسمانی طاقت کے بدولت ہی نہیں جما رکھی ہے بلکہ دلیری کی وجہ سے جما رکھی ہے۔ کشتی میں ہار جانے پر اکھاڑے سے ہٹ جانے کی حالت تو گنڈا مل کے سامنے آ سکتی ہے مگر کسی سے دشمنی کے اکھاڑے میں تو وہ جان لے کر ہی پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اور وہ بھی یوں کہ لاش کا ہی پتہ نہ چلا، دفن کہاں ہوئی۔

پچھلے سال کی ہی بات ہے گنڈا مل پہلوان کے لئے پان لگاتے ہوئے جنگل پنواڑی نے چھیڑ دیا تھا کیوں پہلوان؟ تمھارے ذرا چونا زیادہ لگا دیں تو کیسا رہے گا؟

اور صرف اتنی سی بات پر ہی گنڈا مل پہلوان نے چونا لگانے کی ڈنڈی پوری کی پوری جنگل پنواڑی کے منہ میں گھسیڑ دی تھی اور جب تک جنگل پنواڑی کچھ سمجھے گدی پر نیچے گرا کر، اس کی ساڑھے تین انچی مونچھوں کو اپنے رام پوری جوتوں کی نوک کے نیچے دبا دیا تھا——

اور آج وہی جنگل پنواڑی دیکھتا رہا ہے کہ گنڈا مل پہلوان دکھہرن موچی جیسے گئے گذرے سے بدلہ لینے کے لیے کتنی پینترے بازی کر رہا ہے۔

گنڈا مل پہلوان کو لگا، اس کی ننگی پیٹھ پر جنگل پنواڑی کی لمبی مونچھوں کی نوک چبھتی چلی جا رہی ہے۔ چونک کر اس نے پیچھے کی طرف دیکھا تو پایا کہ بہت پیچھے چھٹے ہوئے لوگ آگے بڑھتے بڑھتے اب اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر رہ گئے ہیں اور اگر وہ تیزی سے دکھہرن موچی کے جھونپڑے کی طرف نہیں بڑھا تو پھر راستے میں ہی گھیر کر کھڑے ہو جائیں گے۔

گنڈا مل نے محسوس کیا کہ اگر وہ گنڈا مل پہلوان کی شکل میں مشہور نہ ہو کر دکھہرن موچی کی طرح گیا گذرا ہوتا تو اسے یوں بھیڑ سے گھرنا نہیں پڑتا۔ اس ذہنی حالت سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا تو اسے لگا اس کے بھاری جسم کا سارا کا سارا وزن پاؤں کی نسوں پر اُتر آیا ہے اور جلدی جلدی چل پانے میں وہ ناکامیاب ہے۔

اپنے بھاری بھرکم جسم کے پیچھے آتی ہوئی بھیڑ اسے ایسی لگی جیسے گدھوں کا جھنڈ کسی مردہ ڈھور کے پیچھے پیچھے اُڑتا چلا جا رہا ہو۔

گنڈا مل پہلوان کی خواہش ہوئی نالے کی طرف چلا جائے اور وہاں کچھ دیر تک آرام کر کے واپس لوٹے تو دکھہرن موچی اور اس کی بیٹی کیلاسو، دونوں کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھیڑ کے سامنے سامنے دے۔ ایسے میں شاید بھیڑ میں ایسے لوگ بھی نکل آئیں گے جو ہاتھ جوڑتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ وہ دکھہرن موچی اور اس کی بیوہ بیٹی پر رحم کرے۔ اور دکھہرن موچی اور کیلاسو سے معافی مانگنے کو کہہ دیں اور گنڈا مل پہلوان، جا، بڈھا سمجھ کر۔ معاف کیا! کہہ کر آزاد ہو جائے۔

اس سوچ سے گنڈا مل پہلوان کو سہارا ملا اور نالے کی طرف جانے کی بات بھول گیا۔ کچھ تمتمایا ہوا سا، وہ بھیڑ کے انتظار میں رُک گیا۔ جوں ہی جنگل پنواڑی کے آگے آگے چلتا ہوا ڈلی چند پہلوان نظر آیا، وہ زور سے چلّا کر

پہلوان کے منہ پر نعل ٹھوک دینے اور حلقے سے آنکھیں باہر کھینچ لینے کی بات کرے۔ اور گنڈا مل پہلوان بڑی دیر تک یوں اپنی جگہ پر کھڑا صرف چار خانے کی لنگی کو اتارتا اور لال لنگوٹ کو کستا کستا رہ جائے۔ یہ حالت جتنی آس پاس اکٹھا ہوئے لوگوں کے لئے عجیب تھی اس سے کہیں زیادہ خود گنڈا مل پہلوان کے لئے۔

اس بار لنگوٹ کے پچھلے سرے کو کس کر نیچے دباتے ہوئے، سر کو ٹانگوں کے بیچ میں جھکائے۔ جھکاتے ہی گنڈا مل پہلوان کئی باتیں سوچ گیا۔

پہلے تو وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دکھہرن موچی جیسے قابل رحم آدمی کی طرف سے اتنی بڑی چنوتی آنے کا موقع چوں کہ اس کی زندگی میں پہلی بار آیا ہے۔ اسی سے وہ کچھ کشمکش اور ٹھیک ٹھیک طے نہ کر پانے کی حالت میں پھنس گیا ہے۔ اس بار اس نے محسوس کیا، اگر طے نہ کر پانے کی یہی حالت رہی ہوتی تو اُسے نپٹانے کے لیے وہ تیزی سے دکھہرن موچی کی جھونپڑی تک پہنچ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوہ بیٹی کیلا سی کی عصمت لوٹ سکتا تھا تاکہ گنڈا مل پہلوان سے الجھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے وہ جان سکے۔ لیکن اسے اندر ہی اندر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ بالکل اندر کی سطح پر یہ ساری حالت طے پا چکی ہے۔ کوئی ایسا فیصلہ ہے جو بالکل ناممکن طریقے سے اس کے شعور پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی حملہ آور ہونے کی کوشش کرنا چاہتا ہے صرف اپنی ہی جگہ پر سکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اس کا جنگلی گینڈے جیسا خونخوار جسم اپنی ہی جگہ پر ساکت سا ہو گیا ہے۔

اُسے لگا، دکھہرن موچی کی طرف سے آنے والی چنوتی اس کی زندگی میں پہلی پہلی بار نہیں آئی ہے بلکہ یہ کسی بہت پہلے آ چکی چنوتی کی یاد دہانی ہے جسے گنڈا مل پہلوان تب سہہ نہیں سکا ہوگا اور اپنے ہی پیروں پر کھڑا ٹھیک اسی طرح زمین کھودتا رہ گیا ہوگا۔

لنگوٹ کا پچھلا حصّہ کستے کستے گنڈا مل پہلوان کی انگلیوں کے سروں میں آبلے سے پڑنے لگے تھے اور وہ چاہ رہا تھا کہ جب وہ ٹانگوں کے بیچ سے سر اٹھا کر اپنے چاروں طرف دیکھے تو اسے دور دور تک کوئی بھی آدمی یا عورت نہیں نظر آئے۔ ایک سرے پر اکیلا وہ کھڑا ہو اور دوسرے سرے پر بالکل اکیلی کھڑی ہو دکھہرن موچی کی چنوتی۔ اس کی بیوہ بیٹی کیلا سو ــــ تاکہ وہ اپنے اندر ہی گڑے ہوئے مضبوط کھونٹے کو ٹھیک سے ٹٹول سکے، جس کی وجہ سے اس کا جنگلی گینڈے جیسا جسم اپنے ہی پاؤں پر کھڑے کھڑے اپنے ہی وجود کو روندنے کے علاوہ اور کچھ بھی کر پانے میں ناکامیاب ہو گیا ہے۔

سر اٹھاتے ہی گنڈا مل پہلوان نے دیکھا، اس کے آس پاس تماشائی لوگوں کی بھیڑ اور زیادہ ہو گئی ہے۔ اتنا ہی نہیں خبر پھیلتے پھیلتے اس کے سارے شاگرد بھی وہاں جمع ہوئے ہیں اور ہاتھ میں لاٹھی پکڑے پکڑے اس طرح کھڑے ہیں جیسے اسی انتظار میں ہوں کہ استاد گنڈا مل پہلوان حکم دے تو سیدھے جا کر دکھہرن موچی پر ٹوٹ پڑیں۔

گنڈا مل پہلوان نے ایک بار پوری آنکھیں کھول کر اپنے آس پاس کھڑی ہوئی بھیڑ کو دیکھا۔ سہمی سہمی سی آنکھوں میں تجسس اور گود میں بکریوں کے جیسے تھن جھنجھوڑتے ہوئے بچوں کو لیے عورتوں کو دیکھ کر اسے اُبکائی سی آنے لگی۔ ڈھیر سارے مردوں کے چہروں کو اپنی کشمکش کی حالت کو لیکر پر تجسس سمٹتی پھیلتی ہوئی جھلیوں کو دیکھ دیکھ کر اُسے ایسا لگا جیسے کسی ایسے تالاب کو دیکھ رہا ہو جس میں صرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو اور اس میں بھرا ہوا مینڈکوں کا جھنڈ کھدبدا رہا ہو۔

ایسے موقعوں پر لوگوں کے چہرے کتنے بے رحم اور ننگے ہو جاتے ہیں؟ ان تمام لوگوں کے لئے نفرت کو محسوس کرتے ہوئے گنڈا مل پہلوان نے ایک نظر اپنے پیچھے کھڑے شاگردوں پر بھی ڈالی اور پھر ــــ پھر اُسے لگا اس کی نظر کہیں اس جھونپڑی تک بھی پہنچ رہی ہے جہاں کٹنی اور چمرودھا ہاتھ میں لیے بالکل اکیلا دکھہرن موچی کھڑا ہے ــــ اور اس کے پیچھے کھڑی ہے صرف اس کی چنوتی ــــ کہہ دینا گنڈا مل پہلوان سے کہ کٹنی سے سسرے کی آنکھ باہر نکال لونگا؟

ایک طرف بالکل اکیلا دکھہرن موچی اور اس کی پیٹھ پیچھے کھڑی صرف اس کی اپنی ہی چنوتی۔ سال بھر کے بچے کو گود میں لیے بیوہ کیلا سو۔ اور دوسری طرف گنڈا مل پہلوان، اُس کے خونخوار شاگرد اور پچاسوں عورتوں۔ مردوں کا ریلا! ــــ

گنڈا مل پہلوان کو لگا کہ دکھہرن موچی کے مقابلے میں کہیں اس کا پلڑا بہت ہلکا پڑ گیا ہے اور صرف اس کی مدد کے لئے تماشائی عورتوں۔ مردوں کا اور شاگردوں کا اتنا بڑا مجمع چلا آیا ہے۔

یکایک گنڈا مل پہلوان تیزی سے شاگردوں کی طرف پلٹ پڑا۔ "کیوں رے چندوں؟ اکھاڑا لگ رہا ہے یہاں پر، جو سسرے لٹھیت بنے کھڑے ہو گئے ہو؟ جس سے نپٹنا ہوگا گنڈا مل اکیلے نبٹ لیگا۔ تم تماش بینوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

جلدی میں شاگردوں یا کسی دوسرے کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا مگر جگل پنواڑی کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو گنڈا مل پہلوان نے دیکھ لیا۔ اُسے لگا اپنے منھ سے اپنا نام لیتے ہوئے آج پہلی بار صرف گنڈا مل ہی اس کے منھ سے نکل پایا تھا گنڈا مل پہلوان نہیں۔

اسے یہ بھی لگا، جس طرح ساری باتیں دکھہرن موچی کو بچا کر اس نے کہی ہیں، اس سے صرف جگل پنواڑی کی ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں بھی تجسس اُمڑ آیا ہے۔

اپنی کشمکش کی وجہ سے وہ لوگوں کی نظر میں دکھہرن موچی سے ہارتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتے ہی گنڈا مل پہلوان پھر بے قابو ہونے لگا۔ پہلے اس نے زور۔ زور سے دکھہرن موچی کو بھدی۔ بھدی گالیاں دیں۔ پھر کیلا سو سے اپنے ناجائز رشتے قائم کئے اور پھر دل ہی دل میں جگل پنواڑی اور ساری بھیڑ کو گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے اس نے پرے پھینکی ہوئی اپنی چار خانے کی لنگی اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔

بھیڑ سے باہر نکلتے ہوئے، گنڈا مل پہلوان نے زندگی میں پہلی بار یہ جانا کہ جو آدمی خود اپنے ہی اندر سے کمزور پڑ جاتا ہے اسے مددگاروں کی بھیڑ اور بھی زیادہ کمزور بنا دیتی ہے۔

اسے لگا، اندر ہی اندر کمزور اور کشمکش میں پڑے ہوئے آدمی کو تنہائی ہی سہارا دے سکتی ہے بھیڑ نہیں۔

بولا "دلی چند! آگے سے اپنی برادری کی استادی کو خود سنبھال لینا بیٹیا! میں نے تو آج دونوں سسروں کو قتل کر دینا ہے"

گنڈا مل پہلوان کہنا صرف اتنا ہی چاہتا تھا تاکہ دلی چند آگے بڑھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے لگے کہ استاد اتنا بڑا خطرہ اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے حکم ہو تو، میں دکھہرن موچی اور اس کی بیٹی کیلاسو کو آپ کے نیچے لٹا کر دکھلا سکتا ہوں، مگر ضرورت ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کی ہے"۔۔۔ مگر جگل پنواڑی کو دیکھتے دیکھتے اتنا اور بھی گنڈا مل پہلوان کے منھ سے نکل پڑا۔۔۔ اور جو کوئی سسرا بیچ میں پڑنے کی کوشش کریگا اس کی بھی ٹانگ وچیر سے چیر کر الگ رکھ دوں گا"

"چیر کر رکھ دوں گا" کہتے کہتے گنڈا مل پہلوان نے اپنی چارخانے کی لنگی کو چیر کر دو ٹکرے کر دئے۔ اور پھر خود ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اپنے غصّے میں اس نے لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آنے کی بات کو بھی ختم کر دیا ہے۔

گنڈا مل پہلوان نے دیکھا، دلی چند پہلوان سہم کر اپنی ہی جگہ پر کھڑا رہ گیا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی بھیڑ بھی تھم گئی ہے۔ اپنے آپ پر ہی جھنجھلاتے ہوئے گنڈا مل پہلوان اس بار تیزی سے دکھہرن موچی کے جھونپڑے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے طے کر لیا کہ اس طرح کی ذہنی پریشانی سے باہر آنے کا راستہ صرف اس کے پاس اب یہی رہ گیا ہے کہ دکھہرن موچی اور کیلاسو کو جان سے بھلے ہی نہ مارے مگر پیٹے ضرور۔

گنڈا مل پہلوان نے اپنا نوکدار رامپوری جوتا نکال کر ہاتھ میں لے لیا تبھی اسے اچانک یاد آیا کہ آج سے سترہ برس پہلے بھی اس نے اسی طرح اپنا پیشاوری جوتا پاؤں سے نکالا تھا اور۔۔۔۔ اپنے ہی منھ پر دے مارا تھا۔

اس بار وہ ماضی بالکل صاف صاف گنڈا مل پہلوان کے آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔ جس کے یکایک کہیں لاشعور میں آجانے سے ہی گنڈا مل پہلوان شک میں پڑ گیا تھا۔

زمین کا ایک کافی بڑا ٹکڑا ہے۔ جو گنڈا مل پہلوان کے ہندوستان پہنچنے سے بھی بہت پہلے پاکستان میں چھوٹ گیا ہے ۔۔۔ اور کافی بڑے خاندان میں سے باقی رہ گئے ہیں صرف اٹھائیس سال کے گنڈا مل پہلوان اور اس کی آٹھ نو سال کی لڑکی لنولی۔

خونی اور وحشی لوگوں کا ایک بڑا جھنڈ اپنی زمین کے آخری ٹکڑے کو چھوڑنے کی کوشش میں تیزی سے بھاگتے ہوئے گنڈا مل پہلوان کو گھیر لیتا ہے ۔۔۔ پشاور، لاہور اور راولپنڈی کے اکھاڑے کے بڑے بڑے رستموں کو اکھاڑ پھینکنے والا گنڈا مل ان کی خونی آنکھوں کو جھیل نہیں پاتا ہے۔ خوف سے اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وحشیوں کا جھنڈ اس کے پہلوانی جسم کو حقارت بھری آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کے سامنے ہی پھول سی بچی کنولی کو پکڑ لیتا ہے ۔۔۔ اور عصمت جیسی کسی چیز کی خبر ہونے سے بھی پہلے ہی کنولی کی عصمت لٹ جاتی ہے اور گنڈا مل پہلوان ان گنڈوں کے چہروں کی چمک سے چندھیایا سا ایک طرف کھڑا رہ جاتا ہے۔

پھر سامنے ایک دم اکیلی، دم توڑتی ہوئی کنولی چھوٹ جاتی ہے اور ایکدم اکیلا گنڈا مل پہلوان!۔۔۔ اور اپنے ہی پاؤں کا پیشاوری جوتا نکال کر اپنے منھ پر مارتا ہے گنڈا مل پہلوان ہی جوتا مارتا ہے۔ مگر وہ اپنی بیٹی کی عصمت نہ بچا سکنے والا یا اپنی بیٹی کی عصمت کے لئے اپنی جان نہ دے سکنے والا گنڈا مل پہلوان سے منھ پر جوتے مارنے والا گنڈا مل پچھلے سترہ سال میں کہیں اپنے ہی اندر کی گہرائیوں میں دفن ہو چکا تھا۔

آج اچانک پھر گنڈا مل پہلوان کا بھاری بھرکم جسم تھرا گیا ہے گنڈا مل پہلوان کی آنکھیں پھر چندھیاتی چلی جا رہی ہیں اور اسے لگ رہا ہے کہ چاروں طرف گہرا دھند لکا چھایا ہوا ہے اور اس دھند میں دکھہرن موچی کے جھونپڑے کے باہر صرف کمزور اور قابل رحم دکھہرن موچی نہیں کھڑا ہے بلکہ خود گنڈا مل پہلوان ہی کھڑا ہے۔ اور اس کے پیچھے وہ کیلاسو نہیں کھڑی ہے۔ گنڈا مل پہلوان نے گیہوں صاف کرواتے وقت جس کے گال پر چٹکی کاٹ لی تھی بلکہ سترہ سال پہلے کی کنولی کھڑی ہے۔

گنڈا مل پہلوان کے کانوں میں اس بار دلی چند پہلوان کی کہی ہوئی بات گونج اٹھی کہ دکھہرن موچی نے کیسے چمر ودھا دکھا کر کہا تھا کہ ۔۔۔۔ کہدینا اپنے باپ گنڈا مل سے، کہ اس نے ابھی دکھہرن موچی کا کمزور جسم ہی دیکھا ہے، کیلاسو کے باپ کا دل نہیں دیکھا ہے۔

دکھہرن موچی کا جھونپڑا اب کچھ ہی فاصلے پر رہ گیا ہے۔ گنڈا مل پہلوان نے سوچا کہ اس کو اپنے جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہی دکھہرن موچی آگے بڑھ آتا ہے اور ٹھیک ویسے ہی اپنے پاؤں کا چمرودھا گنڈا مل کے منھ پر دے مارتا ہے جیسے کبھی گنڈا مل پہلوان نے خود اپنے منھ پر مارا تھا اور گنڈا مل پہلوان مردے کی طرح ساکت، اپنی جگہ پر کھڑا رہ جاتا ہے۔ اُسے صاف صاف لگتا ہے کہ اس کے مقابلے میں صرف بیوہ کیلاسو کا باپ دکھہرن موچی ہی نہیں ہے بلکہ خود اس کے ہی اندر کا وہ باپ بھی کھڑا ہے۔ جو اس کے لاشعور میں ضمیر کا ایک بوجھ بن کر اندر دبا رہ گیا ہے کہ اپنی بیٹی کی عصمت کے لئے وہ اپنی جان کی بازی نہیں لگا سکا۔

گنڈا مل پہلوان کو لگا کہ بس، اسی بنیاد پر وہ دکھہرن موچی کے سامنے کمزور پڑا ہوا ہے۔ اسے لگا۔ اسے اپنے اندر کا وہ کھونٹا مل گیا ہے جس سے بندھے بندھے اس کا جنگلی گینڈے جیسا بھرا ہوا جسم کمزور پڑ گیا ہے۔

گنڈا مل پہلوان کی آنکھوں کی نسیں تناؤ سے ٹوٹنے ٹوٹنے کو ہو چکی تھیں۔ اسے لگا کہ دکھہرن موچی نے اپنی کٹنی اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں چبھو دی ہے اور انھیں باہر کھینچ رہا ہے جیسے کوئی مچھوارہ تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو پانی سے باہر کھینچتا ہے۔ پھر اسے لگا اس کی ننگی پیٹھ پر جگل پنواڑی کے ساڑھے تین انچی مونچھیں لوہے کی گرم کیلوں کی طرح گھستی چلی جا رہی ہیں دکھہرن موچی کے ہاتھ کا چمرودھا اپنے منھ پر جھیل کر گنڈا مل پہلوان ایکدم چندھیایا سا چپ چاپ کھڑا ہے اور جگل پنواڑی اپنے موٹے ہونٹوں کے نیچے دبی ہوئی سرتی کو گنڈا مل پہلوان کی طرف اُچھالتے ہوئے کہہ رہا ہے "کیوں بے پہلوان! میں نے تو ذرا سا چونا ہی لگانے کی بات کی تھی، اتنے پر ہی چھاتی پر چڑھ بیٹھا تھا۔ اب

کہاں گئی تیری مردانگی اور پہلوانی، جو منہ پر تھکوا کر اور چپر ودھا کھا کر بھی چپ چاپ ہی کھڑا ہے۔

گنڈامل پہلوان کہنا چاہتا ہے کہ مجھ کو جوتا مارنے کا حقدار دکھہرن موچی ہی ہو سکتا ہے! ـــــ گنڈامل پہلوان کہنا چاہتا ہے کہ اپنے منہ پر چپر ودھا مارنے کا حق دار صرف خود ہی ہو سکتا ہوں۔ مگر اس کی زبان ایکدم کند ہو جاتی ہے۔

گنڈامل پہلوان کو لگا کہ جب بھی وہ جگل پنوارڑی اور بھیڑ کی باتیں سوچتا ہے۔ ایک عجیب سی گھبراہٹ اس کو بوکھلانے لگتی ہے اور اپنی اس طرح کی گھبراہٹ کے لمحوں میں وہ اپنی اس غیر یقینی حالت کو اور زیادہ صاف صاف پہچاننے لگتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس طرح پہچاننے لگنا ہی شاید اس بات کو پہچاننے لگنا بھی ہے کہ زیادہ تر لوگوں کی پوری پوری زندگی کیسے انھیں فیصلوں کے مطابق بسر ہو جاتی ہے جو اُن پر دوسروں کے ذریعہ تھوپ دیئے جاتے ہیں۔ اس کو صاف صاف لگا کہ بھیڑ میں ایکبار اپنے آپ کو گنڈامل کی شکل میں پہچانوا دینے کے بعد اپنا فیصلہ خود دے سکنے کی طاقت وہ کھو چکا ہے۔

گنڈامل پہلوان نے پوری گہرائی سے اپنی کمزوری کو محسوس کیا کہ اس وقت وہ دکھہرن موچی سے نہیں بلکہ صرف اپنے آپ سے ہی لڑ سکنے کی حالت میں ہے۔ اور اپنے آپ سے ہی لڑتا ہوا آدمی ہر حالت میں صرف ہارتا ہی ہے چاہے وہ اکیلے کے ہاتھوں میں ہارے یا بھیڑ کے ہاتھوں میں۔

اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ سترہ سال پہلے اسی کے ہاتھوں ہارا ہوا گنڈامل پہلوان اب دوبارہ ہارنے کے لیے تیار نہیں ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ انسان ہمیشہ اپنی ہی ہاتھوں شکست کھاتا ہے۔ اپنی ہی شرم اور اپنی ہی کمزوری کے ہاتھوں اور اس کے سامنے بھی وہ خود اپنے ہی ہاتھوں شکست زدہ ہونے کی حالت ہی باقی رہ گئی ہے۔ اب چاہے وہ بھیڑ کے سامنے ہارے یا دکھہرن موچی کے سامنے۔

اس کے علاوہ گنڈامل پہلوان پہلی بار ایک بات یہ بھی سوچنے لگا کہ دکھہرن موچی اور کیلا سو سے بدلہ لینے یا نہ لینے کا فیصلہ کرنے کا حق دار صرف خود گنڈامل پہلوان ہی ہو سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔ اور اس۔ صرف اسی موضوع پر اس کی ہار جیت کا دارومدار ہے کہ وہ خود اپنے فیصلے پر عمل کر پاتا ہے یا نہیں۔

اس بار گنڈامل پہلوان نے اپنی آنکھوں کا پانی پونچھ کر انگلی سے پرے جھٹکا دیا ـــــ اور جب تک بھیڑ گنڈامل پہلوان ـــــ اور گنڈامل پہلوان دکھہرن موچی اور کیلا سو تک پہنچے، کچھ قدم کے فاصلے پر سے ہی اپنی چارخانی لنگی کے دونوں ٹکڑوں کو اپنی کمر سے لپیٹتا ہوا گنڈامل پہلوان سامنے والے نالے کی طرف بڑھ گیا

(ترجمہ: مشرف عالم ذوقی)

بقیہ: یہی سچ ہے

ڈیئر دیپا!

تم اچھی طرح پہنچ گئیں، یہ جان کر خوشی ہوئی۔ تمہیں اپنی ملازمت ملنے کا تار مل گیا ہوگا۔ میں نے کل ہی ایراجی کو فون پر خبر دی تھی اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ تار دیں گی۔ دفتر کی طرف سے بھی خبر مل جائے گی۔ اس کامیابی کے لیے میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔ سچ، میں بہت خوش ہوں کہ تمہیں یہ ملازمت مل گئی! محنت کامیاب ہوگئی۔ باقی پھر۔

مخلص نشیتھ

بس؟ آہستہ آہستہ خط کے سارے الفاظ آنکھوں کے آگے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ رہ جاتا ہے صرف: 'باقی پھر!'

تو ابھی اس کے پاس "کچھ" لکھنے کو باقی ہے؟ کیوں نہیں لکھ دیا اس نے ابھی؟ کیا لکھے گا وہ؟

"دیپ!"

میں مڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی ہوں۔ رجنی گندھا کے ڈھیر سے پھول لیے مسکراتا ہوا سنجے کھڑا ہے۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ آگے بڑھتا ہے، اور میرا کھویا ہوا ہوش لوٹتا ہے اور زخمی سی دوڑ کر میں اس سے لپٹ جاتی ہوں۔

"کیا ہو گیا تمہیں، پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"تم کہاں چلے گئے تھے سنجے؟" اور میری آواز ٹوٹ جاتی ہے۔ بلاوجہ ہی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ "کیا ہو گیا؟ کلکتہ کا کام نہیں ملا کیا؟ مارو بھی گولی کام کو۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو اس کے لیے؟"

لیکن مجھ سے کچھ نہیں بولا جاتا۔ بس، میری باہوں کی جکڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ رجنی گندھا کی مہک آہستہ آہستہ تن من پر چھا جاتی ہے۔ تبھی میں اپنے ماتھے پر سنجے کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتی ہوں، یہ لمس، اور مجھے محسوس ہوتا ہے یہ سکھ، یہ لمحہ ہی سچ ہے، وہ سب جھوٹ تھا بھرم تھا... اور ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چومتے ہوئے

(ترجمہ: کیدار ناتھ کومل)

★★

بقیہ:

آج کی ہندی کہانی

بلاٹ چننے والے ان انتہائی معروف کہانی کاروں کے ذریعے مستقبل قریب میں ستی روایت میں سیکڑوں کہانیوں کی مینوفیکچرنگ شروع ہو جائے تو یہ اُمّید کے مطابق ہوگی۔ اب اگر ایسا کہانی کار بڑے بڑے دعووں اور اعلانات کے ساتھ اپنی کہانی میں کسی نام نہاد سماجی حقیقت کی تلاش میں جاتا بھی ہے تو یقیناً اُس کا حشر وہی ہوگا جو دنیا کے ممالک کی فتح کے سلسلے میں روس جاتے والے نپولین کا ہوا تھا۔ یعنی سناٹا اور ریگستان۔

(ترجمہ: نند کشور وکرم

کارلو حبشی کا صندوق

کارل نیلسن کو ہم کارلو کہا کرتے اور تقریباً ہندوستانی انداز کے اس طرز تخاطب سے وہ خوش بھی ہوتا۔

"ہم تمہیں کارلی بھی کہہ سکتے ہیں جو پہاڑی علاقہ میں بنا ہوا ایک بودھ مندر ہے یا تمہیں کالی بھی کہا جا سکتا ہے جو ہماری ایک دیوی کا نام ہے۔ کالو یا کالے تو ہمارے یہاں بہت ہوتے ہیں۔"

کارل اور زور سے ہنس پڑتا۔

"تم یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر تمہارے دیوی دیوتا ناراض نہ ہوں، تو تم جو چاہے کہہ سکتے ہو۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارے زیادہ تر دیوتا کالے تھے۔"

وہ نیٹال سے ہندوستان پڑھنے آیا تھا۔

جنوبی افریقہ کی گوری حکومت اسے اس کی اجازت نہ دیتی، لیکن وہ جوہانسبرگ یا ڈربن کی یونیورسٹیوں میں بھی نہیں پڑھ سکتا تھا کیوں کہ وہاں کارلو کو داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ صرف ان کالجوں میں پڑھ سکتا تھا جہاں کالوں کو کچھ مخصوص سبجیکٹ کی ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں وہ اپنے قوم کی تاریخ نہیں پڑھ سکتا تھا کیوں کہ ان کالجوں کے نصاب بھی گوری حکومت کے نمائندے طے کیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ بھاگ کر اپنے ماں باپ کے اصل ملک نائیجیریا پہنچا۔ جو اب آزاد ہو چکا تھا اور وہاں سے نائیجیریا کے شہری کی حیثیت سے حکومت کے وظیفے پر ہندوستان آیا تھا۔

نام: رماکانت

تصانیف: چھوٹے چھوٹے مہا بدھ، تیسرا دیش، دروازے پر آگ، سمادھان، ٹوٹتے جڑتے شور، پیادہ۔ فرضی ادیب (ناول)، زندگی بھر کا جھوٹ، اس کی لڑائی، لوٹ اور بات (کہانیوں کے مجموعے)

شغل: صحافت

پتہ: بی - ۱۲۵ - سادات پور کالونی، دہلی ۱۱۰۰۹۴

یونیورسٹی کینٹین میں مجھے جس میز پر جگہ ملی اس پر کارل نیلسن پہلے سے بیٹھا تھا۔

اس کے سامنے ایک گلاس پانی رکھا تھا۔

اچانک شاید کارل کا گلاس سامنے دیکھ کر مجھے تیز پیاس لگ گئی "کیا میں یہ پانی پی سکتا ہوں" میں نے پوچھا۔

اس نے سلام کرنے والے انداز میں ہتھیلی پیشانی سے لگائی۔

"شیور۔ شیور"

میں گلاس اٹھا کر غٹ غٹ پانی پی گیا۔ پھر میز پر گلاس رکھ کر اسے شکریہ کہنا بھول کر بیرے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ ابھی پیاس نہیں بجھی تھی۔

"تم بہت پیاسے لگ رہے ہو"

"ہاں، دوڑ کر بس پکڑنی پڑتی ہے اور باہر سخت گرمی ہے۔ یہاں اکتوبر میں جاڑا شروع ہو جاتا ہے لیکن اگر تیز دھوپ ہو تو صبح سے گرمی پڑنے لگتی ہے۔"

"بیرا دیر کر کے آئے گا"

"ہاں تیس چالیس میزوں کے لیے دو ہی آدمی ہیں"

اچانک وہ گلاس ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہارے لیے پانی لا دوں"

"یہ میں بھی کر سکتا ہوں ۔"

"لیٹ می سرو یو۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہو گی۔ اے پلیزر ۔"

"تمہیں بھی پیاس لگی ہو گی ۔"

"ہم تم سے بھی گرم ملک کے رہنے والے ہیں۔ پیاس جھیل سکتے ہیں جو نہیں جھیل سکتے وہ کچھ اور ہیں ۔"

وہ گلاس لے کر واٹر کولر کی طرف بڑھا۔

یہ کارل نیلسن سے میری پہلی ملاقات تھی ۔

مال اسکوائر کے ایک طرف بین الاقوامی ہوسٹل تھا۔ دن میں وہاں سناٹا رہتا۔ شام کو اکثر شیشے کے اسکرین سے ڈھکے پورٹیکو کے پیچھے بڑے ہال میں کافی لوگ دکھائی دیتے۔ ایک طرف رکھی پنگ پانگ کی لمبی میز کا عکس باہر جھیل ہریالی میں جذب ہوتا رہتا۔ میز کبھی کھلاڑیوں سے خالی نہیں رہتی۔ باہر بیڈمنٹن ہوتا رہتا ہے جہاں رات میں بھی بھیڑ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی جاز اور راک کے ریکارڈ تیزی سے بجتے سنائی دیتے۔

اب تک میں لاپرواسا ادھر سے گزر جاتا۔ ابھی کارلو سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ اب میں سوچتا ہوں انہیں میں کہیں کارلو بھی ہو گا۔ وہ کچھ کھیلتا، کسی سے بات کرتا، یا اپنے کمرے میں پڑھ رہا ہو گا۔

ہماری ملاقات اب بھی کبھی کبھی کینٹین میں ہی ہوا کرتی۔ ہم اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتے۔ سامنا ہونے پر ہلکی سی ہیلو۔ ہاتے، کے ساتھ تھوڑی دیر بات چیت بھی ہو جاتی۔ کارل کے دوستوں میں زیادہ تر غیر ملکی طالب علم ہوتے۔ انہیں میں ایک الجیرین لڑکی بھی تھی۔

اس شام ہم پھر اکیلے لیکن الگ الگ میزوں پر بیٹھے تھے۔ کارل نے میری طرف ایک دو بار دیکھ کر نظریں ہٹا لیں۔ میں اٹھ کر اس کی میز کے سامنے پہنچ گیا۔

"دوستوں کا انتظار ہو رہا ہے ؟"

"نہیں، آج میں اکیلا ہوں ۔" اس نے کہا۔

"تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ وہ آج اپنی کلاسوں میں ہیں یا کہیں اور گئے ہوں گے۔ وہ ہوتے تب بھی تم ہمارے ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔۔ لیکن تم بھی آج اکیلے ہی ہو۔"

"ہاں ۔" میں اس کے سامنے کی خالی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ابھی اس نے بیرے کو آرڈر نہیں دیا تھا۔ میں نے بھی نہیں۔

ہم بیرے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن یہ انتظار کافی لمبا تھا۔ بیرا ہماری طرف مخاطب ہوتا پھر کچھ دیر میں آنے کا اشارہ کر کے غائب ہو جاتا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ہماری بے صبری بھی۔ "کیوں نہ تم ہمارے ساتھ ہوسٹل چلو۔ وہاں ایک اچھی کینٹین ہے زیادہ بھیڑ بھی نہیں ہوتی ۔" کارل نے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن ہم بین الاقوامی ہوسٹل کی کینٹین میں نہیں بیٹھے۔ ہم سیدھے کارل کے کمرے میں گئے۔ اس نے ہیٹر جلا کر جو چیز تیار کی اس کا مزہ کوکو جیسا تھا۔

"یہ کوکو جیسا لگتا ہے ۔"

اس کے بھاری ہونٹ پھیل گئے۔

"ہنس کیوں رہے ہو ؟"

"تم بھی عجیب آدمی ہو ۔"

"کیوں ؟"

"تم جو پی رہے ہو وہ کوکو ہی ہے ۔"

اب میں بھی ہنس پڑا۔

"پھر بھی تھوڑا فرق ہے ۔"

"ہاں، بنانے کا طریقہ کچھ مختلف ہے ۔"

"تم لوگ چائے نہیں پیتے ۔"

"پیتے ہیں جب ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے نائیجیریا میں۔ وہاں چائے تمہارے یہاں جیسی سستی نہیں ہوتی۔ وہاں یہ لگژری ہے ۔"

"میں سمجھتا تھا تم اپنے یہاں کی کوئی خاص چیز تیار کرو گے ۔"

کارل اداس ہو گیا۔

"کوکو ہمارے یہاں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی اداسی میں کچھ گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "یہ ہمارے یہاں کا مشروب ہے ۔"

"لیکن یہ تو نائیجیرین کوکو نہیں ہے ۔" میں نے میز پر رکھی پیکنگ کا لیبل دیکھ لیا تھا۔

"ہاں نہیں ہے، لیکن ہو بھی سکتی ہے۔ نائیجیریا میں دنیا کا آدھا سے زیادہ کوکو ملتا ہے ۔"

"میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں ۔"

"یہ نائیجیریا کا بھی ہو سکتا ہے اور ملایا، جاوا یا لیٹن امریکہ کے بھی کسی بھی ملک کا۔۔۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ یہ ہمارا ہو کر بھی ہمارا نہیں ہے۔ اس کا لیبل وہی ہو گا جو ہے۔۔ کسی غیر ملکی کمپنی کا۔ کیا تم نے 'کرائی ڈ بلوڈ کنٹری' پڑھی ہے؟ ہمارے یہاں عقل مند لوگ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں اپنی زمین اور اپنے پہاڑوں کو، ان کی اوٹ میں طلوع یا غروب ہوتے ہوئے سورج کی خوبصورتی کو، اس کے بادلوں اور دھنک رنگوں کو بہت پیار مت کرو، کیوں کہ یہ تمہارے ہو کر بھی تمہارے نہیں ہیں۔"

مجھے دکھ ہونے لگا۔ شاید مجھے اس کی دکھتی رگ نہیں چھیڑنی چاہیے تھی۔ لیکن میں یہ جان بھی کیسے سکتا تھا کہ وہ اس بات سے غمگین ہو جائے گا۔ ہم کوکو پی چکے تھے اور گلاسوں کو ایک تپائی پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ گلاسوں کو دھونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے ٹوک دیا۔ "تم رہنے دو میں دھو دیتا ہوں ۔"

کارل نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر ہلکے سے مسکرایا۔

"مرہم لگانا ہمیں اور برا لگتا ہے ۔" اس نے کہا۔

میں بوکھلا اٹھا۔

"تم کسی کے لیے کوئی گنجائش کیوں نہیں چھوڑنا چاہتے ۔"

شاید میری بات کا تیکھا پن میری آواز میں ابھر آیا تھا۔ وہ گلاس تپائی پر رکھ کر پھر بیٹھ گیا۔

"مجھے افسوس ہے۔ ہم ایسے ہو گئے ہیں۔ اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔ لوگ ہم سے غلام کی طرح کام لینا چاہتے ہیں لیکن دوست کی طرح ہماری خدمت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں یہ خوشی نہیں دینا چاہتے ۔"

اب میں نہیں بولا۔ وہ اٹھا اور گلاسوں کو

واش بیسن میں دھو کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ پھر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ کارل کے اٹھنے یا کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے ساتھ نظر آنے والی الجیرین لڑکی اندر آ گئی۔

"تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ سارا افریقہ تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔" اس نے آتے ہی کہا، پھر میری طرف دیکھ کر اپنے اس بے تکلف لہجے پر شرما سی گئی۔

"یہ زورا ہے الجیریا کی"، کارل نے بغیر کسی تکلف کے تعارف کروایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ سارے افریقی طالب علم مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ مسٹر داس ہیں۔ میں ان کا پورا نام آسانی سے نہیں لے سکتا۔"

"نتری نواس۔" میں نے کہا۔

"نمستے"، زورا نے ہندوستانی انداز میں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ وہ غیر ملکی زبانوں میں ایک فرانسیسی زبان ہی بولتی تھی۔ اسی طرح جس طرح ہم انگریزی بولتے ہیں۔ یہاں آکر اس نے انگریزی کی جگہ ہندی سیکھنا زیادہ بہتر سمجھا۔ کارل نے بتایا کہ وہ ہندوستانی رسم و رواج اور معاشرتی نظام کی پڑھائی کر رہی ہے۔ کارل پھر اس کی طرف مخاطب ہوا۔

"زورا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ افریقہ کیوں مجھے ڈھونڈ رہا ہے!"

"کیا آج بدھ نہیں ہے۔ ہمارا ہفتہ واری صلاح مشورہ کا دن!"

"مجھے یاد تھا۔ میں تھوڑی دیر ہی میں داس کو روانہ کر کے آنے والا تھا۔"

"آپ بھی چل سکتے ہیں، چاہیں تو، وہاں ہم کھل کر صلاح و مشورہ اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔" زورا نے کہا۔

اس دعوت میں کوئی تکلف نہیں تھا، لیکن میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے گھر جانا تھا۔ کارل مجھے کمرے کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ شاید مجھے ان کی دعوت ٹھکرانی نہیں چاہیے تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بُرا مانیں۔ میں کارل سے اس کے بارے میں کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے وداع کر کے وہ کمرے میں چلا گیا اور پہلے کی طرح پھر دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں کچھ لمحوں تک ہچکچاتا ہوا کھڑا رہا۔ بند ہوتا دروازہ آہستہ آہستہ اپنی کیلوں پر کھسکتا ہوا کلک کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ کارل یا زورا نے تیز آہنگ گانے والا افریقی کیسٹ لگا دیا تھا۔ مجھے وہاں رکنا بیکار ہی لگا۔

جیسا میں سوچتا تھا، کارل اور زورا میں ایسا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ یہ کوئی ایک ہفتہ بعد کی بات ہے۔ کارل اچانک مجھے اپنے ڈپارٹمنٹ سے باہر جاتا نظر آیا۔ ساتھ میں زورا بھی تھی۔ اس بیچ میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کارل کا چہرہ تھکا اور اداس لگ رہا تھا۔ اس دن کے اپنے طرزِ عمل پر افسوس ظاہر کرنے پر وہ میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اسے زورا نے یاد دلایا اور پھر مجھ سے کہا، "لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم لوگ اسے بھول چکے تھے۔ آپ اپنے اوپر کوئی بوجھ مت محسوس کریں، ہم نے واقعی بُرا نہیں مانا تھا۔"

بات کو سمجھنے کے بعد کارل ایک دھیمی ہنسی ہنسنے لگا۔

"تم ہندوستانی بھی عجیب لوگ ہوتے ہو۔" اس نے کہا، "نزدیکی اور دوری کا ایسا رشتہ ہمارا کسی کے ساتھ نہیں ہے۔"

میں اس کے ساتھ کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔ زورا بھی کچھ الجھن میں پڑ گئی۔ وہ چٹائی جیسی بُناوٹ والی سینڈل اور جینس پہنے بہت صاف ستھری لگ رہی تھی۔ اس نے مسک سینٹ لگا رکھا تھا۔ ہم سائنس کالج سے نکل کر اسکول آف سوشیولوجی کی طرف جانے والے راستے پر چل رہے تھے۔ تین سڑکوں کے بیچ میں مثلث نما پارک میں آئسکریم پارلر پر ٹھنڈی بوتلیں بھی ملتی تھیں۔ ہم اپنی پسند کی بوتلیں چن کر پارک میں ایک کونے میں بیٹھ گئے تھے۔ پیسے زورا نے ہی دیے۔ آج ہی اس کو اسکالرشپ کی رقم ملی تھی۔

کارل اب بھی خراب موڈ میں تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں بوتل سُڑک کر ایک طرف لڑھکا دی۔ مجھے لگا، اس سے جھگڑے بنا ہماری دوستی کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں نے کہا، "تمہاری نزدیکیوں اور دوریوں کی بات میں سمجھ نہیں سکا۔"

یکایک اس کا جھگڑنے والا انداز غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک اداس سنجیدگی نے لے لی۔

"یہ بہت بری بات ہے کہ تمہارے یہاں ہمیں کوئی کام نہیں مل سکتا۔" اس نے کہا، "کام ہم لوگوں کے لیے ہی نہیں ہے۔ میں خود نہیں جانتا کہ پڑھائی کے بعد مجھے کوئی کام مل سکے گا یا نہیں۔"

"یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن بات ہونے کی نہیں ہے۔ ہونے پر بھی کیا ہمیں مل سکتا ہے؟"

"لیکن اس کا تمہاری پہلی بات سے کیا رشتہ ہے؟"

"نہیں ہے لیکن ہے بھی۔ دنیا کی سیاست میں تم ہم سے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔ تمہاری حکومت اور پارٹیاں ہماری آزادی کے لیے بیان اور دلیلیں دیتی ہیں... لیکن انسانی رشتے کے طور پر ہم سے سب سے زیادہ دور ہو۔ ہم تمہارے معاشرے میں ایڈجسٹ نہیں کر پاتے اور تمہارے یہاں کام ہونے پر بھی ہمیں نہیں مل سکتا۔ یورپ ہمیں اپنی غلامی میں باندھے رکھنا چاہتا ہے لیکن وہاں ہم انسانی دوری نہیں محسوس کرتے۔ وہاں ہمیں کام مل جاتا ہے۔"

میرے سامنے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ "کیا تم ہمیشہ اسی طرح تناؤ میں رہتے ہو؟"

"تم تناؤ میں رہنے کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔" وہ عجیب انداز سے یونیورسٹی کے حصے میں بنی عمارتوں اور درختوں سے کٹے آسمان کے ٹکڑے کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم اس کی بات کا برا مت ماننا۔" زورا نے کہا۔ وہ ابھی آدھی بوتل ہی ختم کر پائی تھی اور اس میں پڑے اسٹرا کے ٹکڑے کو انگلیوں سے گھماتی ہوئی کھیل رہی تھی۔ "کارل بہت پریشان ہے۔" اس نے پھر کہا۔

"مجھے صرف تجسس ہے۔"

"کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس کے ملک میں فوجی انقلاب ہوگیا ہے؟ جمہوریت کا تختہ پلٹ کر فوجی تانا شاہی کی حکومت آگئی ہے۔"

"اب یہ خبر نئی نہیں رہ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ان حادثوں پر صرف تعجب ہوتا ہے۔ ہم سمجھ نہیں پاتے کہ سارے افریقہ میں یہ کیوں ہوتا رہتا ہے۔ کیا یہ مختلف قبیلوں کی آپسی چپقلش ہے؟"

کارل کا چہرہ غصے سے بدصورت ہونے لگا۔ دھدھکتی ہوئی آنکھیں جیسے ابھی جلتا ہوا لاوا اُگل دیں گی۔ لیکن تبھی گھرتا ہوا طوفان چھٹ گیا اور وہ اپنے فطری انداز میں آگیا۔ اس کے سفید دانت بجلیوں کے کوندے کی طرح ایک مسکراہٹ میں جھلک اٹھے۔ اس کے بعد پھر وہی گھنی اداسی۔

"تم افریقہ کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ وہ آوٹ لینڈر غیر ملکیوں کی غلط افواہیں ہیں۔ بسس، روڈز، بوتھا اور اسمٹس کے خاندان والے۔ افریقہ میں گورا شاہی حکومت کے بانی۔ جب یہ اندھا جزیرہ کہا جاتا تھا تب وہاں روشنی تھی۔ تب ہم اپنی مرضی کی زندگی جیتے تھے۔ اندھا جزیرہ وہ ان کے آنے کے بعد بنا۔ جب ہماری روشنی ہم سے چھن گئی۔

میں خوف زدہ سا خاموش بیٹھا رہا۔

اس نے پھر کہا "جنگل میں رہنے والے قبیلے اپنی خاص پہچان رکھنے والے سماجی گروپ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے یا ان پر حملے نہیں کرتے رہتے تھے۔ جیسا گوراشاہی کے ماننے والوں نے ساری دنیا کو بتایا۔ وہ ایک دوسرے کو لوٹتے یا ہتھیار بھی نہیں چراتے تھے۔ وہ شکار کھیلتے، چراگاہوں اور کھیتوں کو مل جل کر استعمال کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ادلا بدلی کی تجارت کیا کرتے تھے۔ کیا تم اپنے یہاں کے قبیلوں کے بارے میں نہیں جانتے؟ کیا وہ مہذب بنائے جانے سے پہلے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے؟ ہم شاید انہیں تم سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ملکوں اور سیاسی بٹواروں سے زیادہ بہتر طریقہ سے رہ سکتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لیے لڑتے رہنا مہذب لوگوں کا کام ہے۔"

"تب یہ اکھاڑ پچھاڑ کیوں مچی رہتی ہے؟"

"ہمارا ملک بڑی طاقتوں کے کھیل کا میدان بنا ہے۔ انہیں ہمیشہ مہرے مل جاتے ہیں یا وہ بنا لیتے ہیں۔ ہماری دولت حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیں لڑاتے رہتے ہیں۔" کارل چپ ہوگیا گویا کہیں کھوگیا۔

اب شام گھر آئی تھی۔ ہمارے لوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھتے اٹھتے کارل سے کہا: "خیر تمہارا یہاں ہونا اچھا ہے۔ کم سے کم فی الحال تم محفوظ ہو۔"

کارل کچھ نہیں بولا۔ وہ اپنی جگہ پریشان سا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بیٹھا دیکھ کر زورا بھی اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

"نہیں، تمہارا یہ سوچنا غلط ہے۔ اسے واپس بلاکر جیل میں ڈالا یا گولی ماری جاسکتی ہے۔"

"اگر یہ نہ جائے؟"

"جانا ہی پڑے گا۔ اس کا پاسپورٹ رد کردیا جائے گا۔ اس کی اسکالرشپ بند کی جاسکتی ہے۔ کیا شاہ یا بعد میں خمینی مخالف ایرانی طالب علموں کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں کبھی سیاسی رشتوں کی بلی چڑھا دیا جاسکتا ہے۔"

اب میں بھی کارل کے کچھ اور نزدیک بیٹھ گیا۔ جیسے اس طرح ہم — میں اور زورا — اسے اس کی بدقسمتی سے بچالیں گے۔ ہم پتہ نہیں کتنی دیر ایک دوسرے سے بغیر کچھ بولے بیٹھے رہے۔ یکایک وہ ہمارے بیچ سے سوئے ہوئے پہاڑ کی طرح اٹھ کر تیز قدموں سے ہوسٹل کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔ ہم میں اس کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم نے اسے آواز دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ ہم اندھیرے کو آہستہ آہستہ اُترتا دیکھ رہے تھے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم چپ چاپ اٹھے اور چل پڑے کارل غیر حاضر ہوتے ہوئے بھی جیسے ہمارے بیچ چل رہا تھا۔ ہم اس کے ہوسٹل نہیں گئے۔ ہمیں معلوم تھا وہ اس وقت وہاں نہیں ہوگا۔ ہوتا بھی تو ہم وہاں نہیں جاسکتے۔

کارل یونیورسٹی میں کئی دنوں تک نظر نہیں آیا، نہ ہی اس کینٹین میں جہاں ہم اکثر ملتے تھے۔ زورا سے بھی اگلے ہفتہ ملاقات ہوئی۔ اس دن بدھ تھا۔ وہ اپنی کلاس ختم کرکے افریقی طالب علموں کی بیٹھک میں جا رہی تھی۔

"کیا میں بھی چل سکتا ہوں زورا؟" آج میں نے پوچھا۔

"بہت خوشی سے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہاں کبھی کبھی اسٹوڈنٹ یونین کے لوگ آیا کرتے ہیں۔"

ہم ساتھ ساتھ چل پڑے۔

وہاں نوجوان افریقی موجود تھا۔ ہنستا مسکراتا جنگ لڑتا اور نئی زندگی کی طاقت سے بھرا ہوا۔ کارل بھی وہاں بیٹھ کر غمگین نہیں تھا۔ میرے سلام پر اس نے صرف مسکرا کر سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

زورا تنزانیہ سے چھپنے والا چھوٹے سائز کا ایک انگریزی اخبار لے آئی تھی۔ پہلے صفحہ پر جنوبی افریقہ کی جیل میں برسوں سے قید نیلسن منڈیلا کی تصویر چھپی تھی۔ اس کے ساتھ وہاں چل رہی عوامی تحریک اور چھاپا مار کارروائیوں کی خبر بھی تھی۔ کچھ ملکوں میں غیر ملکی کٹھ پتلیوں اور ملکی تانا شاہوں کے خلاف عوام کی جدوجہد اور حاکموں کے ذریعہ ہونے والے بے رحم ظلم کی خبریں تھیں۔ زورا نے سبھی کو اونچی آواز میں پڑھا۔ زمبابوے کے ڈیویونس ٹومبے نام کے ایک طالب علم نے جو اس بیٹھک کا سکریٹری بھی تھا، ان خبروں کو سامنے رکھ کر ایک تقریر کی۔ ٹومبے اور کچھ دوسرے لڑکوں کو میں نے کئی بار کینٹین میں کارل کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی تقریر کے بعد ہمیں مگوں میں کچھ پینے کے لیے دیا گیا۔

میں کارل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ٹومبے اور ایک کینیائی طالب علم بیٹھا تھا۔ کینیائی کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔

"تم اس دن کوئی خاص چیز پینا چاہتے تھے۔ لو حاضر ہے" کارل نے کہا۔

"اسے کیا کہتے ہیں؟"

"اسے سواہلی کاکٹیل یا پنج کہہ سکتے ہیں جیسے سواہلی زبان کئی زبانوں کو ملا کر بنی ہے اسی طرح یہ کاکٹیل بھی بنتی ہے لیکن اس میں شراب صرف ایک ہے رم، باقی لیمونیڈ اور کروندے کا جوس۔ ہمارے یہاں ایسی گھٹیا چیز نہیں پی جاتی" اس نے مسکرا کر ٹوبیے کی طرف دیکھا۔ ٹوبیے بھی ہنس پڑا۔

"ہمارے یہاں بھی نہیں" اس نے کہا۔ "اسے امریکہ کے نیگرو بلی مینٹ پیتے ہیں اور خاص افریقی ڈرنک کہتے ہیں"

کھڑوی نما کسی باجے کے ساتھ دھیمی آواز میں ایک کیسٹ بجنے لگا۔ بیچ بیچ میں جیسے لوہے کے کئی وزنی کڑوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی۔ کچھ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے ہی پیر سے لے کر کمر تک تھرکنے لگے تھے۔ ہلکے سے اچھل کر زمین پر دونوں پیر ساتھ پٹکتے ہوئے جیسے وہ زمین پر پیر ٹیک کر اوپر اڑ جانا چاہتے ہوں۔ وہیں کنارے سے پانی کی لہریں بھی تھپ تھپ کرتی ٹکرا رہی تھیں۔ افریقہ کی ہر چال میں تیزی ہے۔ طاقت ہے، امنگ ہے۔ مجھے ایسا لگا۔

"یہ ٹیگانیا کا کے، جواب تنزانیہ ہے، مچھواروں کا چاندنی رات اور محبت کا گیت ہے" ایک دوسرے طالب علم نے بتایا۔ "کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی چاندنی رات ہوتی ہے اور ہم محبت کرتے ہیں۔ گوروں کو اس پر یقین نہیں آتا"

ہم باتوں میں مشغول تھے مجھے سواہلی پنچ ذائقہ دار لگ رہی تھی۔ مجھے جو ہو رہا تھا اسے نشہ نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنے آپ باہر نکل پڑنے والا احساس تھا۔ میں نے ٹوبیے سے کہا "تمہاری تقریر دلچسپ تھی، لیکن ایک بات کا جواب تم میں سے کوئی نہیں دیتا"

"کون سی بات؟"

"یہ ٹوریا سرکار دعویٰ کرتی ہے کہ وہاں کالوں کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو ہر سال سارے افریقہ سے بہت سے لوگ وہاں کام کرنے کیوں پہنچتے ہیں؟"

ٹوبیے گمبھیر ہو گیا۔

اور کارل کو جیسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو وہ بدبدایا۔

"مجھے یقین ہے تم اس جھوٹ پر یقین نہیں کرتے"

"میں سچائی جاننا چاہتا ہوں"

"سارے ڈھور ماترا پہنچ جاتے ہیں" کینیائی بڑبڑایا۔

"ہاں، ہاں! یہ رہی سچائی۔ کینیائی نے سچ بات کہہ دی"

"میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں"

"تم نہیں سمجھو گے، جو افریقہ کا نہیں ہے وہ نہیں سمجھے گا۔ ماترا کینیا کی بہت بڑی چراگاہ ہے وہاں جھیلوں میں گھڑیال اور جنگلوں میں خطرناک بھیڑیے رہتے ہیں لیکن ہر طرح کے ڈھور اور دوسرے جانور وہاں چارے اور پانی کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بس ایک فرق ہے جنگل کا قانون انسانی قانون سے بہتر ہے۔ جنگل کے جانوروں میں انسانوں جیسی نفرت نہیں ہوتی۔ وہ مارتے ہیں اپنی بھوک مٹانے کے لیے دوسروں کو مارنے کے اپنے حق کی حفاظت یا منافع کے لیے نہیں۔۔"

یہ بات ٹوبیے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہمارے اردگرد اور کئی افریقی طالب علم آ کھڑے ہوئے تھے۔

"جنوبی افریقہ کی ساری دولت انہیں اپنے آپ نہیں مل گئی تھی۔ ہیرے اور سونے کی کانیں اور اطلانتک کے وہ جزائر جہاں جواہرات زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہماری مدد سے ڈھونڈے تھے۔ ہر لٹیرے کی طرح وہ چالاک لوگ تھے۔ یوئر وار کے پہلے تک جب انہیں ہماری مدد کی ضرورت تھی وہاں افریقیوں کو بھی جائیداد رکھنے کا حق تھا۔ وہ کھیتوں اور فارموں کے مالک ہو سکتے تھے لیکن جب کام نکل گیا تو ہمیں اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اب ہماری دولت سے وہ کچھ اونچی مزدوری کی شکل میں ہمارے آگے چارہ پھینک دیتے ہیں۔ ایسا وہ کسی مہربانی کی وجہ سے نہیں کرتے ہیں۔ وہ ایسا سارے افریقہ کے لوگوں کو وہاں آنے کا لالچ دینے کے لیے کرتے ہیں۔ ہماری زمین انہیں جو روز نئے نئے خزانے دیتی ہے اس میں ہماری ضرورت ہمیشہ بنی رہتی ہے، کیونکہ تنگی، فاقہ کشی، بیماری، قتل و غارت، آتش زنی کے طریقے اپنا کر وہ ہمیں نگلنا بھی جانتے ہیں۔۔۔ ماترا کے شکاری جانوروں یا کانگو کے اجگروں سے کہیں زیادہ خونخوار طریقوں سے۔۔"

کیسٹ پر بہت تیز آہنگ والی موسیقی بجنے لگی تھی۔ روزا میرا منگ پھر بھر گئی تھی۔

"اسے جنوبی افریقہ میں ڈینڈر اسٹرام کہتے ہیں" کارل نے کہا۔

"کیا اس ڈرنک کو؟"

"نہیں نہیں۔ اس موسیقی کو جو اب بج رہی ہے"

"وہی جسے انگریزی میں تھنڈر اسٹارم کہتے ہیں، جو سب کچھ اڑا کر لے جاتا ہے اور تھمنے کے بعد فضا کو شفاف بنا دیتا ہے۔ وہاں اطلانتک کی طرف سے ڈی مسٹ۔ کہرے کی آندھی بھی چلتی ہے جس میں دن میں بھی کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس نام کا کوئی میوزک نہیں ہے، ہوگا تو وہ گوروں کو ہی پسند ہوگا کیونکہ وہ دن کے اجالے میں بھی کچھ دیکھنا نہیں چاہتے۔۔۔"

بات ختم ہونے کے بعد اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم میٹنگ سے باہر آ گئے۔ اپنے ہوسٹل سے وداع کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیا تم کل یا پرسوں میرے ہوسٹل میں مل سکتے ہو؟ میں آج کے لیے بھی کہہ سکتا ہوں، لیکن بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے"

میں نے وعدہ کر لیا۔ وہ ہوسٹل کے دروازے کی

طرف مڑ گیا۔ اس کا ہاتھ زورا کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ لمبے قد کی زورا کے سہارے کے بغیر وہ گر سکتا تھا۔

میں تین دن بعد پہنچ گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں زورا بھی ہوگی۔ لیکن وہ لاؤنج میں پنگ پانگ ٹیبل سے لگی گیند کو اکیلے ہی ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ریکیٹ میز پر ہی چھوڑ کر میری طرف بڑھ آیا۔

"میں نے تمہارا کل بھی انتظار کیا پرسوں بھی۔"
اس نے بغیر کسی جوشش یا ناراضگی کے کہا۔

"مجھے افسوس ہے . . . میں جس دکان میں آدھے وقت کی نوکری کرتا ہوں وہاں سالانہ اسٹاک چیکنگ چل رہی تھی۔ میں یونیورسٹی بھی نہیں آسکا۔"

وہ بغیر یہ بتلائے کہ کہاں جا رہا ہے، چلتا رہا۔ میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم ہوسٹل کے اندر والے لان میں پہنچ کر ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ دن کی بچی ہوئی دھوپ نے پھولوں اور گھاس کا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس نے پلاسٹک کے ہولڈر میں ایک سگریٹ پھنسائی اور چپ چاپ پینے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ بولنا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے سچ مچ افسوس ہے نہ آپانے کا۔" میں نے اسے پھر یقین دلایا۔

"میں اس بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں یہ گھاس دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ ولایتی گھاس کہلاتی ہے، حالاں کہ سنا ہے کہ یہ دراصل آسٹریلیا کی گھاس ہے۔"

"کہیں کی ہو، جو تمہاری زمین میں اُگ سکتی ہے وہ تمہاری نہیں ہوئی؟ جیسے آلو، تمباکو . . ."

"ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن تم نے مجھے کسی خاص ضرورت کے لیے بلایا تھا۔"

"ہاں ہم شاپنگ کرنے چلیں گے۔"

"شاپنگ؟ کیا تمہاری اسکالرشپ جاری ہو گئی؟"

"نہیں، زورا سے اُدھار لیے ہیں۔ دنیا کی ہر اچھی عورت کی طرح وہ کنجوس ہے اور وقت پر ہمیشہ مدد کرتی ہے۔"

"یہ تم اس کی تعریف میں کہہ رہے ہوگے۔"

"تم اس سے میرے الفاظ دہرا سکتے ہو۔"

"لیکن شاپنگ کرنی ہے تو ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ ہمیں چلنا چاہیے۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

"زورا کو بھی آنے دو۔"

"زورا؟ کیا اسے معلوم ہے کہ ہم یہاں بیٹھے ہیں؟"

"اوہ پریشان مت ہو، وہ بالکل بلی ہے۔ ہمیں ضرور ڈھونڈ لے گی۔"

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ تعجب سے پوچھا۔ "زورا سے تمہاری لڑائی وغیرہ ہوئی ہے کیا؟"

کارل ہنس پڑا۔

"لڑائی ہونے پر ہم عورت کو بلی نہیں کہتے۔ ہم انہیں طوائف، ڈائن یا کُتیا بھی نہیں کہتے۔ ہمارے پاس یہ خیال نہیں ہے۔"

"پھر کیا کہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اچھے انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ ضرورت ہوئی تو ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کر سکتے ہیں۔ حبشی عورتیں طاقتور ہوتی ہیں۔ وار جھیل بھی سکتی ہیں اور کر بھی سکتی ہیں۔"

زورا کے بارے میں اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ ہمیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ ہم فوراً چل پڑے ہوسٹل سے باہر نکل کر ہم نے بس لے لی۔

میں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کارل کیا خریدنا چاہتا تھا۔ بس سے اترنے کے بعد اسی نے بتایا۔ وہ چمڑے کا ایک صندوق خریدنا چاہتا تھا۔

"چمڑے کا صندوق؟"

"ہاں، ایک بڑا، خوبصورت اور اچھا صندوق۔ میں یہ اپنی ماں کے لیے خریدنا چاہتا ہوں۔"

"ماں کے لیے؟"

"ہاں ہاں، اپنی ماں کے لیے۔ اس کے دل میں ہمیشہ ایک ایسے صندوق کی حسرت پلتی رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے! وہ جس گورے مالک کے گھر کام کرتی تھی وہاں ایسے ہی ایک صندوق کو چھو دینے کے جرم میں اسے مار پڑی تھی۔ میں اس وقت ایک بچہ تھا میں نے چاہا تھا اس گورے کا خون پی جاؤں اور ویسے ہزاروں صندوق لا کر اپنی ماں کے قدموں میں ڈال دوں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا پر اس گورے کا سر پھوڑ سکتا تھا تبھی میرے خاندان کا پادری کوّے کے پروں جیسا کالا لبادہ اوڑھے ایک گورے پادری کے ساتھ آیا اور اس مالک کے گناہ کے لیے معافی مانگی۔ میں نے تو نہیں پر مجھے معلوم ہے میری ماں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ مذہب یہی کام کرتا ہے ظلم کی روحانی معافی۔"

"کیا تمہارے یہاں ایسے صندوق نہیں ملتے؟"

"ملتے ہیں اچھے سے اچھے۔ گینڈے، چیتے یا ہاتھی، جنگلی سور، گھڑیال سبھی کے چمڑے والے پریٹوریا، ڈربن، کیپ ٹاؤن، جوہانسبرگ سبھی جگہ ملتے ہیں لیکن وہ گوری بستیوں کے بڑے بازاروں میں بکتے ہیں جہاں ہم جا بھی نہیں سکتے۔ افریقی بستیوں میں ایسی دوکانیں نہیں ہوتیں۔ وہاں بنگلے نہیں جھونپڑیاں یا بارک نما کوٹھریاں ہی ہوتی ہیں۔"

ہم جن تھ پر چلنے لگے تھے۔ کارل نے ایک پھیری والے سے مونگ پھلیاں خریدیں اور ہم سب کو دیں۔ ہم سڑک کے کنارے ایک ڈسٹ بن کے پاس کھڑے مونگ پھلیاں کھاتے رہے۔ جگمگاتے چکاچوند میں کارل کے چہرے پر اداسی دکھائی دی، آنکھوں میں یادوں کی پرچھائیاں اس نے سر کے اوپر پیچھے تک ہاتھ پھیلا کر جماہی لی۔

"ایک بار کیپ ٹاؤن کے بازار میں اسی طرح ٹہلتے ہوئے مجھے پکڑ لیا گیا تھا۔ ہفتے بھر کی بامشقت قید کی سزا ملی تھی۔ میں خوش قسمت تھا۔ دنگا یا چوری کا ملزم قرار نہیں دیا گیا تھا۔ نہیں تو مہینوں باہر نکل نہیں پاتا۔ اپنی بستیوں سے ہمیں دور رکھنے کے لیے وہ یہی ہتھکنڈے اپناتے ہیں۔"

"لیکن وہ صندوق تم بعد میں بھی خرید سکتے تھے، جب اپنے ملک جانے لگتے۔ ابھی تو نہیں جا رہے ہو!"

کارل نے زورا کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب انداز سے مسکرانے لگی تھی۔ اس کے چپٹے ہیٹ کے نیچے بوب کٹ بالوں کی لٹ ہوا میں لہرا رہی تھی۔ لمبا چوغہ نما لجیریائی فراک اچانک پھیل کر اس کی جانگھوں کے گرد لپٹ گیا۔

"... ہاں خرید سکتا تھا بعد میں بھی" کارل نے کہا "لیکن اس دن جب میں تم لوگوں کو چھوڑ کر اٹھ گیا تھا میں نے سپنے میں اپنی ماں کو دیکھا تھا... تمہیں پتہ ہے! جب میں بھور کے اندھیرے میں چھپ کر نا تجیریا آنے لگا تھا تو وہ ہماری بستی کے چھور تک مجھے چھوڑنے آئی تھی۔ وہ مجھے موسا کی ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں چھاتی سے لگائے دیر تک روتی رہی۔ میں نے خواب میں ہو بہو اسے اسی طرح دیکھا تھا۔ مجھے چھاتی سے چپٹا کر روتے ہوئے۔ میں اس کے نزدیک ہونا چاہتا تھا، لیکن جب یہ ممکن نہ ہو تو اس کے لیے کچھ کرنا ہمیں اس کے نزدیک لا دیتا ہے۔ زورا یہ سمجھ سکتی ہے۔ وہ عورت ہے۔"

ہم شیشے سے جھپاتی ایک بھڑ بھری روشن دکان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ لمبی چوڑی دکان صرف چمڑے کے سامان سے بھری ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک باہر کھڑے ہم اندر کا نظارہ کرتے رہے۔ پھر صندوقوں کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

دو غیر ملکیوں کے ساتھ آیا دیکھ کر سیلز مین نے معنی خیز انداز میں ایک آنکھ دبا کر مجھے اشارہ کیا۔

میں اشارہ سمجھ گیا۔ میں کان تک لال ہو گیا ہوں گا میں نے کہا "آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔ ہم تینوں دوست ہیں ہمیں ایک صندوق چاہیے۔"

سیلز مین جھینپنے سے زیادہ چڑھ گیا۔ اس نے ہلکے قسم کے دو تین بکس لا کر ہمارے سامنے ٹیک دیے۔

زورا ناراض ہو گئی۔

"ہم اپنے ملک میں بے ادبی کرنے والوں کو چانٹا مار دیتے ہیں۔" وہ بھر پڑی۔

"ساری میڈم۔" سیلس مین سہم گیا۔

"کیا تم یوروپینوں کے ساتھ اس طرح پیش آسکتے ہو؟"

"غلطی ہوئی میڈم۔"

کارل بکسوں کی جانچ کرنے لگا تھا۔ اس نے انہیں پرے کھسکا دیا۔

"مجھے ایک بڑا اور اچھا صندوق چاہیے۔"

اس بار سیلس مین کافی چھانٹ کر کئی اچھے بکسے لایا۔ کارل نے جو صندوق چنا وہ سانپ کی اصلی کینچلی سے مڑھا ہوا کافی چمکدار قسم کا مضبوط صندوق تھا۔ اندر مخملی کپڑے کا استر لگا ہوا تھا اور کئی خانے بنے ہوئے تھے۔ زورا کو بھی وہ پسند آیا اور مجھے بھی۔ کارل نے اسے رنگین کاغذ میں پیک کرنے کے لیے کہا اور ہم دام دے کر باہر آ گئے۔ باہر کی ٹھنڈ راحت دینے والی تھی، لیکن میرے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ کارل کی ایک ہلکی سی تھپکی میں نے پیٹھ پر محسوس کی۔

"شرمندہ ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اپنی پسند کی چیز پر اس کی گرفت ڈھیلی تھوڑی دیر کے لیے اسے چھوڑ گئی تھی۔ اپنا پسندیدہ صندوق وہ ہینڈل سے نہیں بلکہ گود میں اٹھائے بچے کی طرح سینے سے لگائے چل رہا تھا۔

میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "پرانی باتیں دیر سے ختم ہوتی ہیں... میں نے نزدیکی اور دوری والی بات کہی تھی نا، ہم اسے روز ہی جھیلتے ہیں... پھر تجارتی تہذیب میں آدمی اکثر آدمی کی طرح پیش نہیں آتا۔"

میں اب بھی کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ ہم نے ایک اوپین ایر ریستوران میں کافی پی۔ پھر کارل اور زورا سے اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

یونیورسٹی میں زورا مجھے اکیلے نظر آئی۔ وہ کسی بات پر خفا تھی۔

"کارل کہاں رہ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"کارل گدھا ہے۔" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"کیا ہوا زورا؟"

"حساس آدمی کبھی بہت احمق بھی ہو جاتا ہے خاص کر مرد۔"

"تم کہو، میں سن رہا ہوں۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم نے دیکھا تھا وہ کس طرح اس بکسے کو چپکائے ہوئے چل رہا تھا۔ گود میں لیے بچے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے۔ وہ اس کو اسی طرح لیے جن پتھ سے ہوسٹل تک۔ تقریباً دس کیلومیٹر پیدل ہی آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ صندوق بس کی بھیڑ میں ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کہا ٹیکسی یا اسکوٹر کر لیتے ہیں۔ اس نے اسے بھی منع کر دیا۔ اسے ڈر تھا ان کو بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔ وہ چل بھی عجیب انداز سے رہا تھا۔ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے تاکہ کسی کی ٹکر سے صندوق کو ایک کھرونچ تک نہ لگے۔ ہر قدم پر 'ساری، ایکس کیوز می' کہتا ہوا... بیوقوف! میں آدھے راستے سے بس لے کر چلی آئی۔"

"تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے زورا۔" میں نے سنجیدہ رہنے کی کوشش کی۔ "وہ اسی کو تو بچا رہا تھا جس کے لیے تم نے پیسے دیے تھے۔"

"کیا اس نے تم سے کہا ہے؟"

"کیا نہیں کہنا چاہیے تھا؟"

"وہ ہمارے بیچ کی بات تھی۔ کارل کو اسے سب کو بتانے کا حق نہیں ہے۔"

"کارل ہے کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ہوسٹل سے آتے وقت میں اس سے نہیں ملی۔" وہ فرش پر اپنے چٹائی دار سینڈل کی ایڑیاں کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی بہت معمولی بات بھی بہت اہم ہو جاتی ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس حالت میں کارل اس سے کیا کہنا چاہے گا۔ ناراض عورت کے لیے اس کی زبان میں ضرور کوئی لفظ یا احساس کو ظاہر کرنے کا خاص طریقہ ہوگا۔ ہر زبان میں ہوتا ہے لیکن میں نے اسے ملتوی کر دیا۔ اس دن میری دکان کے مالک کے گھر کوئی فنکشن تھا اور وہاں نہ جانے والوں کی غیر حاضری ہمیشہ کے لیے یاد رکھی جاتی تھی۔

ہم اگلی بار ملے تو ان کے بیچ صلح ہو چکی تھی۔

یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی پر اس وقت مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔

اس دن بھی بدھ تھا اور وہ اس ہال کی طرف

جا رہے تھے جیسے ان کی بیٹھک کے دن "افریقہ ہال" کا
نام دے دیا جاتا تھا۔ کارل خاصا سنجیدہ تھا ایک
زورا کی اداسی صاف جھلک رہی تھی۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔
کارل نے کہا "تم بھی ہمارے ساتھ چل سکتے
ہو، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم ضرور چلو۔"
وہاں اس دن جیسا جوش و خروش والا ماحول
آج نہیں تھا۔ نہ سواہلی بینج پائی گئی اور نہ ڈینڈ راسٹرام
یا کوئی دوسرا گیت بجایا گیا۔ اس کی جگہ ایک سنجیدہ
مصروف ماحول تھا۔ زورا آج کوئی اخبار نہیں لائی
تھی۔ ٹوبیسے نے سائیکلو اسٹائل کیا ہوا کئی صفحوں کا ایک
پرچہ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔

یہ افریقی نیشنل کانگریس کا دستاویز تھا
جو پریٹوریا سے چھپا کر باہر لایا گیا تھا اس میں
گورا شاہی کے ظلم اور وہاں کے عوام کی کوششوں
کی ایسی خبریں تھیں جو اخباروں میں نہیں آتی تھیں۔

ٹوبیسے کے پڑھنے کے ساتھ میرے سامنے
دنیا کے اٹلس پر ایک تصویروں والا نقشہ کھلنے لگا
جہاں اندھیرا، خون اور آگ تھی۔ سڑکوں پر نہتے لوگوں
کو گولیوں سے بھون دیا جا رہا تھا اور پھانسی کی کوٹھریوں
میں معصوم لوگ موت کی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔
بیٹے، بیٹوں، بھائیوں، بچوں کی لاشیں تھیں، آنسو تھے
کراہیں اور چیخیں تھیں۔ ان میں کہیں مجھے کارل کا چہرہ
بھی دکھائی دیا اور اس کی ماں کی سسکی بھی سنائی دی
جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی لوگ تھے کہ بغیر
ٹس سے مس ہوئے کھڑے تھے اور مر کر بھی پھر کھڑے
ہو جاتے تھے۔ کسی چٹان سے جیسے ٹکرا کر گولیاں
بیکار ہو جاتی تھیں۔ کسی آتش فشاں کے پھٹنے کے ساتھ
کوئی ڈینڈ راسٹرام شروع ہونے والا تھا۔۔۔ ٹوبیسے پڑھ
کر چپ ہوا تو جیسے وہ آتش فشاں سبھی کے دلوں
میں سلگنے لگا اور وہی آندھی سبھی کے اندر چلنے لگی۔

پرچہ ختم ہونے کے بعد بیٹھک کی فورملٹی
بھی ختم ہو گئی۔ لوگ آپس میں بات چیت کرنے
لگے لیکن ماحول کی سنجیدگی بنی رہی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا
تھا کہ کارل مجھے یہاں کیوں لایا تھا۔ میں بات چیت میں
کوئی مدد نہ کر سکا۔ کارل بھی زیادہ تر چپ رہا۔ پر ٹوبیسے
کے پرچے کے بعد وہ اچانک بہت بے چین لگنے لگا۔
یہ بے چینی ایسے اسی میں نہیں تھی۔ شاید سبھی میں کوئی
مضبوط خواہش پل رہی تھی۔

بیٹھک کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہم
لوٹنے لگے تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا تم سمجھ پاؤ گے کہ یہاں ٹکے رہنا مجھے
ایک جرم لگ رہا ہے۔"

"میں سمجھ پا رہا ہوں، لیکن تم جو یہاں کر رہے
ہو وہ بھی اہم ہے تمہارے ملک کے لیے۔ خود تمہارے
اور تمہارے مستقبل کے لیے۔"

وہ کڑواہٹ کے ساتھ ہنس پڑا۔

"مستقبل! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ جو آزاد نہ
ہو، اس کا بھی کوئی مستقبل ہو سکتا ہے؟"

"لیکن کیا تمہارا ملک کوئی اور نہیں ہے؟ پریٹوریا
میں رنگوں کے فرق کے خلاف اس لڑائی کا تمہاری
نجی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟"

کارل ہنسنے لگا۔

"تم مجھے ایک دوست کی حیثیت سے جو کہہ
رہے ہو۔۔۔ تم خود بھی اس پر یقین نہیں کرتے ہو۔"

زورا ٹوبیسے سے بات کرتی ہوئی آگے نکل
گئی تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس
کی بتیاں صرف گھنی پرچھائیاں بنا پا رہی تھیں۔ زورا
اور ٹوبیسے ہمارا انتظار کرنے کے لیے رک گئے۔

انہوں نے ہماری بات سن لی تھی۔ پاس پہنچتے
پر ٹوبیسے نے کہا "تفریق رنگ کے خلاف لڑائی
دنیا کی ہر انقلابی لڑائی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔
کارل کے ملک میں تاناشاہی مخالف لڑائی سے بھی۔"

کارل نے کہا "ٹوبیسے تم واس کو یہ مت سمجھاؤ
وہ سمجھتا ہے۔ واس جس اسٹوڈنٹ یونین کا ممبر ہے
وہ اسی میں یقین رکھتی ہے۔ وہ صرف مجھے سمجھا رہا تھا۔"

میں زورا کی رائے جاننا چاہ رہا تھا، لیکن
وہ خاموش تھی اور ہم سے الگ ہو کر چل رہی تھی۔
ہم جیسے بغیر راستہ دیکھے ہی انٹرنیشنل ہوسٹل کے
گیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں ٹوبیسے ہم سے جدا ہو گیا
اس کا کوئی فلپائنی دوست اپنے برتھ ڈے کی پارٹی
منا رہا تھا۔ ہم ہوسٹل میں داخل ہوئے۔ زورا اب
بھی کچھ قدم آگے تھی۔ وہ شاید اب بھی ہم سے
الگ رہنا چاہتی تھی۔ وہ ہم سے بنا کچھ بولے یا رُکے
ہوسٹل کے زنانہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔

"سی یو زورا" کارل نے اس سے کہا۔

زورا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کارل کچھ قدم زورا کی
طرف بڑھا پھر غیر یقینی حالت میں ٹھٹھک گیا۔ یہ زورا
کی اس دن والی ناراضگی نہیں ہو سکتی ہے۔ ان بیچ
اور کچھ ہوا تھا لیکن مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔

کارل مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

ہم نے آج پھر کوکو پی۔ پہلے دن کی طرح کوئی
بحث نہیں کی۔ کوکو پیتے ہوئے بھی ہم چپ رہے تھے۔
کوکو ختم کرنے پر میں گلاسوں کو دھونے کے لیے
اٹھا تب بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں پھر
اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"واس، تم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش مت
کرنا، بلکہ تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"لیکن تم کیا کہہ رہے ہو۔"

کارل خاموش کمرے میں ادھر ادھر نظریں
دوڑانے لگا جیسے وہ کچھ ایسا ڈھونڈ رہا تھا جو اسے
مل نہیں پا رہا تھا۔

"اس دن میں نے تمہارے ساتھ ایک
صندوق خریدا تھا" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔"

"اسے میں نے اپنی ماں کے لیے خریدا تھا۔"

"ہاں، یہ بھی تم نے بتایا تھا۔"

"میں اب اسے اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟"

"مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔"

اس کا کمرہ جیسے اب میری نظروں کے سامنے
کھلا تھا۔ پہلے کی طرح آج چیزیں بکھری ہوئی نہیں
تھیں بلکہ سمیٹ کر دو ایر بیگوں میں بھر دی گئی تھیں۔

صرف بستر اور روزمرہ کی چیزیں ابھی باہر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ صندوق بھی پیک کیا ہوا ایک طرف سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

"تو تم نے ارادہ کر لیا ہے" میں نے کہا۔ میں زورا کی ناراضگی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ میری طرح اس نے بھی شاید اسے سمجھانے کی کوشش کی ہوگی۔

"اس کے سوا میں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا ہوں"

"لیکن وہ صندوق تم نے اپنی ماں کے لیے خریدا تھا"

"لیکن اسے برا نہیں لگے گا۔ خاص کر جب اسے یہ پتہ چلے گا کہ میں نے اسے کیوں بیچ دیا یا واپس کر دیا"

میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کارل بھی چپ رہا۔ ہمارے بیچ کچھ بہت دیر تک چھایا رہا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے کچھ کہا نہیں"

"یہ مجھے تمہاری ایک زیادتی لگ رہی ہے"

"میں کر بھی کیا سکتا ہوں"

"کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے"

"کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"اکیلے نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری یونین تمہارے ایر ٹکٹ کا انتظام کر سکتی ہے"

ایرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسیاں آ گئی تھیں۔ کارل کی طرح دو اور افریقی طالب علموں نے لوٹنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسٹوڈنٹ یونین کے کافی لوگ نعرے اور جھنڈوں کے ساتھ انہیں الوداع کہنے آئے تھے اوروں کے ساتھ کارل کا سامان بھی ٹیکسی کی ڈگی میں رکھا جا چکا تھا۔ سامان زیادہ نہیں تھا صرف ایک سوٹ کیس اور ایر بیگ۔ اس دن خریدا ہوا صندوق پیک کی ہوئی حالت میں ہی کارل ہاتھ میں لیے ہوئے باہر کھڑا تھا۔

ٹیکسی پر سوار ہونے سے پہلے وہ اچانک مڑا اور صندوق میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "داس اسے تم ہی سنبھال کر رکھنا، میں یہاں پھر لوٹوں گا —— ابھی میں نہیں جانتا کہ اپنی ماں کے پاس پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ لیکن انتظار کرنا۔ میں ضرور لوٹوں گا اس لیے۔"

"میں بھی انتظار کروں گی کارل! لیکن میرا پتہ شاید یہاں نہیں الجیریا میں ہوگا"

"اوہ! زورا ۔ ۔ ۔ زورا" اس نے صندوق مجھے پکڑا کر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"ٹھیک ہے کارل! میں اسے سنبھال کر رکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوٹو گے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" مجھ سے آگے کچھ نہیں کہا گیا۔

کارل ہنسنے لگا۔

"اگر نہیں لوٹا تو! تم یہی کہنا چاہتے تھے نا داس؟ تب اس کی قیمت اور بڑھ جائے گی۔ تب اسے اس آدمی کی امانت کی طرح رکھنا جس نے اپنے لوگوں اور اپنے ملک کے حق کے لیے جان دے دی۔

الوداع میرے دوست ۔ ۔ ۔"

وہ ٹیکسی پر سوار ہو گیا۔

ترجمہ: مشرف عالم ذوقی

بقیہ: انسان کا لمس

"۔ ابھینیک کو اب پورا یقین ہو گیا تھا کہ پربھات جوشی کے پروگرام میں ضرور کوئی گڑبڑ کی گئی ہے، ورنہ مخالف ٹیم کے گول کے منہ پر پہنچ کر گیند گول میں دھکیلنے کی بجائے گیند کو مخالف سمت میں دھکیلنے کی کوشش کیوں کرتا؟

اب عالمی ٹیم کے سارے کھلاڑی پربھات جوشی کے ساتھ آگئے کیونکہ ان کے پروگرامنگ میں یہ صاف ہدایت تھی کہ مخالف کھلاڑی جدھر کک کرنے کی تیاری کرے ادھر سے گیند کو روکنے کی کوشش کرو۔ تبھی اچانک پربھات جوشی نے ایک پاؤں کو گیند سے آگے رکھا اور دوسرے کی ایڑی سے پیچھے کی جانب کک کرتے ہوئے گیند کو گول میں ڈال دیا۔ گول کے منہ پر اکیلے کھڑے عالمی ٹیم کے گول کیپر نے ڈائیو تو ماری مگر گیند تک پہنچ نہ سکا۔

گول ہو گیا تھا۔ پورا اسٹیڈیم شور سے گونج اٹھا تبھی کھیل ختم ہونے کی لمبی سیٹی بجی۔

پانچ میچوں کی سیریز میں بھارت نے عالمی ٹیم کو آخری میچ کے آخری لمحے میں ایک گول کر کے صفر کے مقابلے میں ایک گول سے ہرایا تھا —— اور گول کیا تھا پربھات جوشی نے۔ پربھات جوشی ——

لیکن اس سارے ہنگامے کا ہیرو گول کرنے کے ساتھ زمین پر آ گرا تھا اور اٹھا نہیں تھا۔

ابھینیک کو اس کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس تک گیا۔ جیسے ہی ابھینیک نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرا، اسے جھٹکا سا لگا کیوں کہ یہ کسی روبو کا نہیں بلکہ کسی انسان کا لمس تھا۔

ترجمہ: نند کشور وکرم

بقیہ: ملاحظات

اور اسی قسم کا دوسرا مصنوعی سیارہ ۱۹۹۱ء میں۔ اس امر کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ دوسرا سیارہ ہندوستان میں تیار کردہ گاڑیوں کے ذریعے چھوڑا جائے۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں اقسام کے مصنوعی سیارے داغنے کی گاڑیاں بھی ہندوستان میں تیار کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

۔۔۔ اکلو گرام وزنی دور سے اشیاء کی موجودگی کا پتہ لگانے والے مصنوعی سیارے کی تیاری کے کام میں کافی پیش رفت کی جا چکی ہے۔ اسے چھوڑنے کی گاڑی یا راکٹ تیار کرنے کا کام بھی جاری ہے۔

انسیٹ اول سی اور انسیٹ اول ڈی کے مصنوعی سیاروں کی تیاری کا کام بھی کافی آگے بڑھ چکا ہے۔

اس طرح خلائی تحقیق ہی نہیں، خلا کے مواصلاتی اور سروے کے مقاصد کے لیے استعمال کی سرگرمیاں ہندوستان میں ایک باقاعدہ صنعت کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ آئی آر۔ ایس اول الف دور سے جائزہ لینے والا پہلا ایک ہزار کلو گرام وزنی سیارہ ہوگا۔ جس کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ملک کے ۲۷ ادارے شرکت کے معاہدوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ اس طرح خلائی تحقیق کا یہ پروگرام ایک قومی پروگرام کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

مرِدُلا گرگ

ڈیفوڈِل جل رہے ہیں

عام طور پر ہندوستان میں ڈیفوڈِل نہیں ہوتے۔ اچھا ہے۔ عام طور پر جو مل جائے۔ اُس کا ملنا بھی کیا ملنا؟ پھر بھی ایک جگہ ہے جہاں وہ ملتے ہیں۔ ہندوستان کی شمالی سرحد پر۔ کشمیر کی وادی میں۔ وادی کے شمالی حصے میں اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ اُن پہاڑوں کے بیچ بسا ایک شہر ہے۔ شہر، قصبہ یا گاؤں؟ پتہ نہیں؛ کبھی ان میں سے ایک رہا ہوگا۔ دنیا بھر کے سیاحوں کے دھاوا بولنے سے پیشتر۔ بس اب تو وہ گلمرگ ہے اور کچھ نہیں۔ گلمرگ یعنی پھولوں کا راستہ۔ ایک رنگین سفر یا سیاحوں کی بندرگاہ۔ ہاں سیاح بھی تو جہاز کی طرح ہوتے ہیں۔

اس جگہ کو یہ نام بھی کسی سیاح نے ہی عطا کیا ہوگا۔

عطا کیا تھا۔

وہ پہلے موسم سرما میں آیا تھا۔ اُس نے پہاڑوں پر جمی سفید برف دیکھی۔ پگھلی برف کے نیچے اُگتی سبز گھاس دیکھی۔ وہ ٹھہر گیا۔ گھاس پھیلنے لگی۔ پتھریلے پہاڑ سبز گھاس کے لہلہاتے ڈھلان بن گئے۔ دُور تک سبز ہی سبز۔ اُسے اچھا لگا بھی اور نہیں بھی۔ اُس نے پھولوں کی چند اقسام کے ان گنت بیج ڈھلانوں پر بکھیر دیے اور لوٹ گیا۔ باقی کام مٹی، پانی، ہوا اور برف کے حفاظتی ذخیرے نے کر ڈالا اور یوں وادی کشمیر کے شمالی حصے میں آباد گلمرگ میں ڈیفوڈِل کھل اُٹھے۔ اور پھر سردی میں برف کے نیچے اپنا بیج محفوظ رکھ کر ہر موسم گرما میں کھلتے رہے۔

ڈیفوڈِل کھلے اور نرگس اور آئرس بھی۔ گلمرگ میں آئے۔ ان سیاحوں کے لیے یہ پھول دیکھنا ایک عام بات ہو گئی ہے۔

میں نے پہلے پہل ڈیفوڈِل وہیں گلمرگ میں دیکھا۔ پیلے رنگ کا بڑا سا پھول۔ چار پنکھڑیاں اور درمیان میں ایک کٹورا سا۔ سب پیلا۔ مجھے پیلا رنگ پسند نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ڈیفوڈِل دیکھنے سے پہلے نہیں تھا۔ لیکن ڈیفوڈِل دیکھ کر لگا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ چلے گا۔ پیلا رنگ بھی چلے گا۔

ویسے مجھے ڈیفوڈِل دیکھنے کا یا کشمیر کا سفر کرنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ بلکہ میں تو وہاں کے بارے میں سُن سُن کر اور پڑھ پڑھ کر تنگ آ گئی تھی۔ لگتا تھا جس کے پاس بھی تھوڑا سا پیسہ ہو وہ شادی کرانے کے فوراً بعد کشمیر بھاگ جاتا ہے۔ اور وہاں سے لوٹ کر اُسے بہشت کا نام دے دیتا ہے جیسے نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے وقتی بہشت کا ہونا ضروری شرط ہے۔ انگریزی میں اس وقت بہشت کو ہنی مون"

نام : مرِدُلا گرگ

پیدائش : ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء

تصانیف : اب تک تقریباً بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اعزاز و انعام : پہلا ناول : "اس کے حصے کی دھوپ" مدھیہ پردیش ساہتیہ پریشد سے انعام یافتہ۔ اس کے علاوہ ناول "چتکوبرا" اور "انتیہ" بہت زیادہ مقبول ہوا۔

شغل : تخلیقی کاموں کے علاوہ رسالہ "روی وار" کے لیے ریگولر کالم لکھتی ہیں۔

پتہ : ۱۱۸ - الیف، مسجد موٹھ، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

کہتے ہیں۔ ویسے ڈیفوڈل کی طرح ہندوستان میں ہنی مون بھی نہیں ملتا۔ اچھا ہی ہے۔ بہت سے لوگ ایک فریب سے بچے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ وقتی بہشت زمین پر جہنم کے احساس کو کچھ اور تیکھا بنا ڈالتا ہے۔

مجھے بھلاووں کا شوق نہیں ہے۔ مجھے جنت کا بھی شوق نہیں ہے۔ مجھے کشمیر جانے کا شوق نہیں تھا۔ مجھے گلمرگ دیکھنے کا شوق نہیں تھا۔

میری شادی سُدھاکر سے ہو چکی تھی۔ سُدھاکر اور میں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو بُرے نہیں لگتے تھے۔ سُدھاکر کو ملازمت ملی تو اُسے لگا کہ اب شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے بی۔ اے پاس کیا تو مجھے لگا کہ اب نوکری کیا کرنی ہے۔ سیدھے سیدھے شادی ہی کر لینی چاہیے۔ سدھاکر نے سوچا ہوگا وینا کیا بری ہے؟ میں نے بھی سوچا سدھاکر کیا بُرا ہے؟ جانا پہچانا آدمی ہے۔ تین سال ساتھ رہا۔ بُرا نہیں لگا۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں اور جو اب تک نہیں لگا۔ آگے چل کر کیوں لگے گا؟ اگر لگا بھی تو دوسروں کی ہی کہاں گارنٹی ہے۔ یعنی بُرا تو کوئی بھی، کسی بھی وقت لگ سکتا ہے۔

ایک دن پکچر دیکھ کر ہم باہر نکلے تو سُدھاکر نے کہا۔

"وینو مجھ سے شادی کرو گی؟"

میں نے کہا۔ "کر لوں گی۔"

...... ہماری شادی ہو گئی۔

اتفاق کچھ ایسا تھا کہ میں اور سدھاکر ایک ہی ذات اور پردیش کے تھے۔ دونوں ہی بنیے اور دونوں ہی اُتر پردیش کے۔ لہٰذا نہ تو اس کے والدین نے کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی میرے ماں باپ نے — خوشی خوشی جہیز کا سامان خریدا۔ مہمان جُٹائے۔ بارات چڑھوائی اور آگ کو گواہ بنا کر پنڈت نے ہمارے پھیرے لگوا دیے۔ محبت کی شادی ہوتی تبھی اور اپنے شہر سے بھاگ کر کہیں پردیش میں جا کر چوری چھپے شادی کرنے کا تھرل Thrill تک نہیں مل پایا۔

شادی ہوتے ہی سدھاکر بولا۔ "ہنی مون کے لیے تو ایک ہی جگہ ہے — کشمیر۔ وہاں کی بکنگ کرالی ہے۔"

"مجھے بھی جانا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

سدھاکر بولا۔ "تمہارا سینس آف ہیومر

Sense of Humour

بہت اچھا ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم شادی سے پہلے کشمیر بھاگ جاتے؟" میں نے کہا۔ سوچا تب ہوتا تھرل — Thrill

جب ہماری شادی میں کوئی اڑچن نہیں پڑی تو پھر وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے کہا — "ہاں ضرورت تو نہیں تھی۔ اب کیوں ہے؟"

"ارے، ساری زندگی یہاں دلی میں پڑے پڑے مرنا ہے۔ کچھ دن تو جی لیں۔ سُنا ہے کشمیر کو سب لوگ جنت بتلاتے ہیں — جنت!"

تو ساری زندگی پڑے پڑے سڑنے کے لیے، اپنے کو تیار کرنے کے لیے ہم لوگ کشمیر چلے گئے۔

سدھاکر نے سن رکھا تھا کہ پورا کشمیر جنت ہے۔ چنانچہ اُس نے قسم کھائی کہ کوئی بھی حصہ دیکھے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اور چونکہ ہم ہنی مون منانے آئے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ جنت کی اس لطف اندوزی میں میں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہوں۔ جنت کے دامن سری نگر سے شروع ہو کر ہم پہلگام، چندن واڑی واپس سری نگر، جھیل ولر، باتہال واپس سری نگر ہوتے ہوئے آخرکار ٹھیک جنت کے کندھوں پر چڑھ گئے یعنی گل مرگ پہنچ گئے۔ تنگ مرگ سے آگے بس نہیں جاتی۔ لہٰذا باقی سفر ہم نے گھوڑوں پر چڑھ کر طے کیا۔ چڑھ کر میں نے اس لیے کہا ہے کیوں کہ گھوڑ سواری کرنا ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ راستہ بے حد خوبصورت تھا۔ دونوں جانب چیڑ کے درخت تھے۔ ٹھنڈی ہوا وغیرہ سب کچھ۔ گھوڑوں پر بیٹھ کر کچھ ہی دور چلنے پر ہم دونوں کی پیٹھ میں درد ہونے لگا تھا۔ اس لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھوڑوں کو روک دینا پڑتا تھا اور نیچے اُتر آنا پڑتا تھا، لیکن ہم اپنے سفر کے ان لمحات کو بے کار نہیں جانے دیتے تھے۔ نیچے اُتر کر ہم ایک دوسرے کو چومنے لگتے اور پھر بغل گیر ہو کر کچھ دور چلتے چلے جاتے تھے۔ ساتھ ہی گرد و نواح کے فطری حُسن کی تعریف بھی کرتے جاتے تھے۔ جنت کے دروازے پر پاؤں رکھتے ہوئے یہ سب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً تب جب آپ ہنی مون منانے آئے ہوں۔

یوں ہی گھوڑوں پر چڑھتے اُترتے ہم گلمرگ ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ یہ منزل طے کرتے ہوئے میری کمر کا درد کچھ مزید بڑھ گیا۔ اتنا کہ لگا یہ محض گھوڑے کی ورزش کی وجہ سے نہیں ہے۔ ویسے اناڑیوں کے ساتھ ہوتا ہی ہے۔ ورزش گھوڑا کرتا ہے اور بدن سوار کا دُکھتا ہے۔

میں نے سدھاکر سے اپنے درد کے بارے میں نہیں کہا۔ عموماً گھوڑے پر بیٹھ کر سدھاکر کی کمر میری کمر سے زیادہ دُکھتی تھی۔ ایک آدھ بار تو مجھے دبانی بھی پڑی تھی۔ اپنی کمر کے درد کا ذکر کر کے میں اس وقت اُسے اس کی کمر کی یاد دلانا نہیں چاہتی تھی۔ درد کی ناپ تول کرنے کا کوئی پیمانہ تو ہمارے پاس تھا نہیں۔ اس لیے پورا اندیشہ تھا کہ اپنی کہتے کہتے کمر مجھے اُس کی دبانی پڑے گی۔

اپنے اپنے دُکھتے بدن گھسیٹ کر ہم بستروں تک گئے اور نڈھال سے اُن پر گر پڑے۔ پھر ایک دو جنبش دے کر انہیں ذرا سا اٹھایا اور ہلکی کروٹوں کے ساتھ رضائیاں اوپر کھینچ کر فوراً سو گئے۔

اُس رات کھانا پینا محبت کرنا سب گول رہا۔

سُدھاکر کے ہونٹوں نے میرے ہونٹوں کو چھوا اور تڑپ کر الگ ہو گئے جیسے دہکتا انگارہ چھو لیا ہو۔

"تم تو جل رہی ہو۔" سُدھاکر نے کہا۔

"صبح ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔ مگر شاید اس

نے سنا نہیں۔

اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ پھر جلدی سے ہٹا لیا۔

"تم اتنی گرم کیوں ہو؟" اُس نے کہا۔

میں بھلا اس کا کیا جواب دے سکتی تھی؟

تبھی کیا جواب دے پائی تھی جب کچھ دن پہلے اُس نے اپنے ہونٹ میرے تھکے بدن پر گھُما کر کہا تھا۔

"تم اتنی ٹھنڈی کیوں ہو؟"

پہلی بار جب اُس نے یہ فقرہ کہا تھا تو میں نے تھکان سے مُندی آنکھوں کو بغیر کھولے جماہی لے کر کہا تھا "یہ کشمیر ٹھنڈی جگہ ہے"۔

تب وہ بہت ناراض ہوا تھا۔

"مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے" اُس نے کہا تھا۔

"تمہارے لیے میرے جذبات مذاق اُڑانے کی چیز ہیں" اُس نے کہا تھا۔

"تم ہر شئے کو اتنی مایوسیت سے کیوں لیتی ہو" اُس نے کہا تھا۔

"میں نے سنا تھا کشمیر آکر مُردہ سے مردہ آدمی رومانٹک ہو جاتا ہے۔ مگر تم ہو کہ تمہاری کاہلی ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی" اُس نے کہا تھا۔

اور..... اور بھی بہت کچھ کہا تھا اُس نے۔

دن بھر ہم کشمیر کے چپے چپے کو کریدتے پھرتے تھے اور دیر تک پیار کرنے کے نئے نئے طریقے آزماتے تھے۔ دن بھر کی تھکان سے چُور ہو کر بستر پر کاہلی سے لیٹے رہنا اور بیچ بیچ میں جماہی لینا، تب مجھے بالکل مناسب لگتا تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتی تھی اگر دعوے سے کہنے کے لیے میں کچھ دیر پہلے اپنی تھکان اور سُستی سے چھٹکارا پا سکتی تو۔ کہ کشمیر آیا ہر سیاح دن بھر گھوم لینے کے بعد رات کو بستر پر لیٹ کر ایسا ہی کرتا ہوگا۔ لیکن ہم اس طرح کے سیلانی نہیں ہیں۔ سدھاکر کہتا تھا ہم ہنی مون منانے آئے ہیں۔ پیار کرنا ہماری قسمت ہے۔ یہ وہ کہتا نہیں تھا مگر میں سمجھ جاتی تھی۔

لیکن پھر ہم دن بھر اِدھر اُدھر ٹکریں کیوں مارتے پھرتے ہیں — آرام و سکون سے پیار کیوں نہیں کرتے؟ اتنا ایک بار میں نے ضرور پوچھا تھا مگر وہ اور بھڑک اُٹھا تھا۔

"کمال کرتی ہو تم" اُس نے کہا تھا۔

"ہم لاکھ پتی کروڑ پتی تو ہیں نہیں جو ہر سال گرمیوں میں کشمیر دوڑے آئیں گے۔ زندگی میں ایک بار موقع ہاتھ آیا ہے۔ اتنا پیسہ خرچ کیا ہے تو پورا دیکھ کر نہیں جائیں گے کیا۔ لوٹ کر کسی سے کہیں گے تو کیا کہ کشمیر گئے بھی اور صرف جھیل ڈل دیکھ کر لوٹ آئے"۔

"تو تھوڑا ٹھہر کر آتے" میں نے کہا تھا۔

"اس سے کیا ہوتا؟"

"تب شاید پیار کرنا اتنا ضروری نہیں رہتا" میں نے دل میں سوچا تھا، لیکن زبان سے کہا نہیں تھا۔ کیوں کہ میں طے نہیں کر پائی تھی کہ سدھاکر اس بارے میں ٹھیک کیا سوچتا ہے — ہو سکتا تھا کہ اُس کا خیال یہی ہوتا کہ شادی کرنے کے بعد عمر بھر پیار کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے میں چُپ رہی تھی۔

اور پھر جب اُس نے دوبارہ کہا تھا — اُس سے کیا ہوتا بولو نا"

تو میں نے کہہ دیا تھا۔ "نہیں اُس سے بھلا کیا ہوتا"

کوئی کوئی دن ایسا بھی ہوتا تھا جب ہم دن بھر گھومتے نہیں تھے۔ صبح صبح گھوم کر دوپہر کو کھانا کھانے ریسٹ ہاؤس لوٹ آتے اور کھا کر پیار کرتے۔ لیکن تب بھی سدھاکر خوش نہیں ہو پاتا تھا۔ تب پیار کر چکنے کے بعد میرا دل کرتا کہ آرام سے سو یا جائے۔ مگر چار بجے ہمیں دوبارہ سیر کے لیے نکلنا ہوتا تھا۔ اور سدھاکر تاخیر برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

تب حسین سے حسین نظارے کو نظر انداز کر کے میں گھومتے ہوئے بار بار پلکیں جھپکاتی رہتی اور بیچ بیچ میں جماہی لے اُٹھتی تھی۔ سدھاکر جھنجھلا کر کہتا تھا "تمہیں لے کر ساتھ گھومنا ایسا ہی ہے جیسے کسی چھڑی کو ساتھ لے کر گھومنا"

سن کر ایک بار میں نے کہا تھا "میرا ساتھ رہنا ضروری ہے کیا؟"

لیکن اس بار سدھاکر کو اس میں کوئی سینس آف ہیومر Sense of Humour نظر نہیں آیا تھا۔

"تم اتنی ٹھنڈی کیوں ہو؟" جھنجھلا کر اُس نے کہا تھا۔

تو اب جب اُس نے کہا — "تم اتنی گرم کیوں ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میرے دماغ میں یہی آیا کہ کہہ دوں یہاں بہت سردی ہے، اس لیے۔ شاید میں نے کہا بھی۔ میرے ہونٹ ہلے تو ضرور مگر معلوم نہیں اُن کا کہا سدھاکر تک پہنچا یا نہیں۔ شاید نہیں پہنچا کیوں کہ جو اب اُس نے کہا — ، اُس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"لگتا ہے تمہیں تیز بخار ہے" اُس نے کہا۔

تو یہ بات ہے۔ میں نے کچھ راحت محسوس کی۔ مجھے دماغ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وجہ مل گئی۔

"ارے تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟ اُس نے کچھ گھبرائی آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ میری چھاتی پر رکھ دیا۔ مگر وہ بھی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹک پایا۔ جھٹکے سے اُسے ہٹا کر وہ بولا "تمہارا سانس تو دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ کیا ہوا تمہیں؟ کچھ بولو تو سہی"۔

میں نے اپنا پورا دم لگا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پلکوں پر رکھے بھاری پتھروں کو کسی طرح پرے سرکا کر ایک بار میں نے اُنہیں اُٹھا ہی لیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس وزن کے نیچے دوبارہ مُند گئیں۔

"ارے کیا ہوا تمہیں؟ بولتی نہیں، ہلتی جُلتی نہیں؟ کیا ہوا؟" سدھاکر نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور پکڑ کر مجھے ہلا دیا۔

میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ اور گھبرا گیا۔

اس کے چلانے پر بربری کہ میں جو بجلی کوندتی چلی
تھی۔اس کے لیے میں الفاظ تلاش کرنے لگی۔
"موت" پہلے میں نے سوچا۔
"قتل" پھر دماغ میں آیا۔
"زنا بالجبر" میرے دماغ نے کہا۔
"ذبح، ذبح، ذبح —— ایک شور سا
میرے سر میں اٹھا۔ لیکن زبان تک آتے آتے نہ
جانے کب عقل نے اسے موڑ دیا۔ اور ....
"درد" میں نے یہی کہا۔
"درد" سدھاکر نے دہرایا۔" درد اور
بخار۔ ٹھہرو، میں ریسٹ ہاؤس کے منیجر سے پوچھ
کر آتا ہوں" ادھر کوئی ڈاکٹر واکٹر ہے ؟"
چلو اتنا تو غنیمت ہوا کہ مرنے کے بعد
میں جنت میں پہنچ گئی ہوں۔ میں نے سوچا پورے
کمرے کو منور کرتی سامنے جو مینارہ نور سی خاتون
کھڑی ہے، ضرور جنت کی حور ہوگی۔ جنت میں حوریں
ہوتی ہیں یا فرشتے۔ میں نے دماغ پر زور ڈالنے کی
کوشش کی۔ اوں ہوں ہوں گے۔ وہ چاہے جو
ہوتے ہوں یہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ جنت کی حور کے
سوا۔ جس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر میں مر کر
بھی اتنی شدید روشنی محسوس کر رہی ہوں، جس
کے کمرے میں آنے سے ایک جگمگاتا نور چاروں طرف
پھیل گیا ہے۔ جس کے مجھ پر ایک نظر ڈال لینے سے
مجھے لگا ہے کہ میرے کسی اپنے نے سر تا پا مجھے روحیت
کر دیا ہے۔
اسے جی بھر کر دیکھنے کے لیے میں نے کوشش
کر کے اپنی بھاری آنکھیں ایک بار پھر کھول لیں۔
مجھے دھکا سا لگا۔ نہیں، شاید یہ فرشتہ
نہیں ہے۔ فرشتے لال پتلون نہیں پہنتے۔ مطلب یہ
کہ ایسا کوئی قانون نہیں کہ وہ لال پتلون پہن ہی نہیں
سکتے۔ لیکن ان کے بارے میں جتنا پڑھا سنا ہے اور
جس کے بھروسے دل میں ان کی تصویر ابھر سکتی ہے،
اس سے یہی یقین ہوتا ہے کہ وہ لال پتلون نہیں
پہنتے۔

تو اگر یہ فرشتہ نہیں ہے تو میں جنت میں بھی نہیں
ہوں۔ اور تب شاید میں مری بھی نہیں —— زندہ
ہوں۔ اچھا لگا جان کر میں زندہ ہوں۔ میں نے اپنے
خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مسکرانے کی
کوشش کی۔ مگر تبھی سدھاکر نے میرے منھ میں تھرما
میٹر گھسیڑ دیا۔
"یہ مسز دستور ہیں" اس نے میرے فرشتے کی جانب
اشارہ کر کے کہا۔
"میں نیچے منیجر سے تھرمامیٹر مانگ رہا تھا تو یہ
مل گئیں۔ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں۔ یہیں پاس کے کمرے
میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا۔ گل مرگ میں کوئی ڈاکٹر
نہیں ملے گا، سری نگر سے بلانا پڑے گا۔ ضرورت پڑی
تو ان کے شوہر دوا دے دیں گے۔"
سدھاکر بول رہا تھا۔ میں بیدار رہ کر اس
کی بات سننے کی کوشش کر رہی تھی، تبھی یہ آگے بڑھی
اور میرے منھ سے تھرمامیٹر نکال لیا۔ میں نے بیدار
رہنے کی کوشش ترک کر دی۔
"ارے یہ تو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے ——
دیکھیے مسز دستور ۱۰۶ ہی ہے نا۔"
سدھاکر کی خوف زدہ آواز سے چونک کر میں
نے آنکھیں کھول لیں۔
وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب آہستہ سے
مسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو تمہیں آنکھیں کھولنے کی
ضرورت نہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔
"ہاں۔" اس نے کہا اور سدھاکر کے ہاتھ سے
تھرمامیٹر لے لیا۔
"کمر میں بہت درد ہے" سدھاکر نے کہا۔
"کیا کرنا چاہیے۔ پتہ نہیں انہیں اچانک کیا ہو گیا ہے۔"
"میں ڈاکٹر دستور کو بلا لاتی ہوں" اس نے
کہا۔
"جنت بھی ہے اور حور بھی۔ بس موت کی کمی
ہے۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ مگر دماغ کام کر رہا
تھا۔ مجھے ان کے سوچنے کے انداز پر ہنسی آگئی، لیکن
میری کمر نے بغاوت کر دی۔ درد سے کراہ کر بولی۔

"موت پر ہنسو مت۔ مرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لو یہ
تمہیں بے ہوش بھی نہیں ہونے دیتی۔ مگر میرا دماغ بھی
کچھ کم نہیں تھا۔ بولا" تو مرد اور فرشتے کی صورت
پر دھیان جما کر سونے کے انداز میں لیٹ گیا۔ چاہے
کمر نے درد سے بھلے ہی نہ سونے دیا ہو لیکن وہ اسے
پوری طرح بیدار بھی نہ رکھ سکی۔
"مائی گاڈ۔ شی از ڈن فار" جج کے فرمان کی طرح
کمرے میں گونجا۔ اور میرے نیم خوابیدہ دماغ کو جھنجھوڑ دیا۔
گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے ہاتھ میں
میرا ہاتھ لیے جو شخص کھڑا تھا وہ سدھاکر نہیں تھا۔
"کیا ڈاکٹر! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" سدھاکر
یہ تھا۔
"ان کی حالت بہت خراب ہے۔"
انہوں نے اپنی آواز اتنی دھیمی کر لی تھی کہ میرے
لیے سننا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی میرے کان ادھر ہی لگے
رہے۔ حیرت ہے کہ اپنی حالت سے زیادہ مجھے ان
کی باتیں سننے میں دلچسپی ہو رہی تھی۔
"بچے کتنے ہیں آپ کے؟" اسی آدمی کی آواز
ابھری۔
بچے؟ ابھی تو ہماری شادی کو ہی پندرہ دن ہوئے
ہیں" یہ سدھاکر تھا۔
"اوہ، اچانک کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑا" تب تو
آپ کو بھی ان کے ساتھ مرنا ہوگا۔ اس نے کہا۔
"کیا؟" سدھاکر چیخ سا پڑا تو میں بھی زور
سے ہنس دی۔
"اب پتہ چلے گا بچو .... سارا سارا دن مجھے
ساتھ لیے گھومتے تھے نا .... ساتھ نہیں رہیں گے
تو ہنی مون کیسے منے گا .... تو ..... سدھاکر جی
..... ہنی مون .... اب .... بچ کر کہاں
جائیے گا ..... اصلی ہنی مون تو اب منے گا .....
مروں گی تو ساتھ لے کر ....
"کیا ہوا .... ڈیلیریس Delirious
ہو گئی۔ ہنسے کیوں جا رہی ہو؟ سدھاکر چیخا۔ لیکن میری
ہنسی تب رکی جب ایک ٹھنڈے ٹھوس ہاتھ نے

میرا ہاتھ تھام لیا۔ اُس میں نرمی تھی نہ ہمدردی۔ تھا تو صرف اپنا پن۔

"اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو تم لوگ" میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں سنبھالے نکھر کر اُس نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو گولڈی۔ انجکشن، دوا جو دینی ہو، دو۔ شادی کے پندرہ دن بعد بھی بھلا کوئی مرتا ہے، مسٹر..... کیا نام ہے آپ کا؟"

"سدھاکر۔"

"اور تمہارا؟" اُس نے پوچھا اور اپنا ایک کان میرے ہونٹوں کے پاس جھکا لیا۔

"وینا" میں نے کڑبڑا کر کہا۔

"مسٹر، کیا وینا آتے ہی بیمار پڑ گئی تھی؟"

"جی نہیں۔"

"اوہ، تبھی میں سوچ رہی تھی کہ کمرے میں پھول کیوں نہیں ہیں۔ آپ جائیے، مسٹر سُدھاکر، باہر جا کر کچھ پھول لے آئیے ——"

"لیکن میں کیسے جا سکتا ہوں۔"

"کیوں۔ آپ کی طبیعت بھی ناساز ہے کیا۔"

"نہیں، پر انہیں تنہا چھوڑ کر؟"

"تنہا کہاں ہیں؟" اُس نے کہا تو میں نے اُس کی مٹھی میں بند پڑے اپنے جلتے ہاتھ کو وہیں پھڑپھڑا کر اُس کی ہتھیلی پر ہلکے سے دبا دیا۔

"ابھی تو ڈاکٹر صاحب دوا دارو کریں گے۔ آپ جائیے نا۔ پھول لے کر آئیے۔ کمال ہے آدمی کے بیمار پڑنے کا فائدہ ہی کیا جو چند پھول بھی نصیب نہ ہوں۔ جائیے نا اور گولڈی تم انجکشن وغیرہ جو دینا ہے دیکر اپنا راستہ نپلو۔ اتنی بھیڑ بھاڑ میں کوئی اپنی بیماری کیا خاک اینجائے (Enjoy) کرے گا۔"

ایک بار پھر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا دیا۔

وہ ہنس دی۔ پھر اپنا وہ ہاتھ ہٹا کر دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ "لو، اب اسے گرم کرو۔"

میرے بازو میں سُوئی چُبھی۔

ایک بار آنکھیں کھول کر میں نے اُسے دیکھا پھر شاید میں سو گئی۔

میں بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ دو توانا ہاتھ میری کمر تھامے اُس پر مالش کر رہے تھے —— سمندری جوار بھاٹا کی طرح درد کی لہریں اوپر سے نیچے اُتر رہی تھیں۔ پہلی بار درد کی ٹیسوں کو کوئی تھامے لے رہا تھا۔ ہر ٹیس اب اپنے ساتھ راحت لیے ہوئے تھی۔

ایک طویل سانس کھینچ کر میں نے اپنی جلتی آنکھیں کھول دیں۔ سامنے پیلے پھولوں کے گُچھے جھوم رہے تھے۔ اگر وہ دو توانا ہاتھ میری کمر نہ تھامے ہوتے تو ایک بار پھر مجھے وہم ہو جاتا کہ میں مر چکی ہوں۔ اور جنت میں ہوں۔

"ڈیفوڈل ہیں۔" کمر کے اوپر سے آواز آئی۔

"تو یہ ڈیفوڈل ہیں۔ پیلے، چار بڑی بڑی پنکھڑیاں اور بیچ میں کٹورا سا۔ لبالب شراب سے بھرا۔ شاید۔ مگر پیلا۔ مجھے پیلا رنگ پسند نہیں ہے۔ لیکن ڈیفوڈل دیکھ کر لگا کوئی حرج نہیں ہے۔ پیلا رنگ بھی چلے گا۔"

دیر تک اُس کی جانب دیکھتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھوں میں پانی آ گیا —— میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی کمر پر ٹکے ہاتھوں نے مجھے تھام کر سیدھا کر دیا۔

میں نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔

"تمہاری کمر کافی نازک ہے۔" اُس نے کہا۔ "مزہ آیا ملتے ہیں۔ آنکھیں کھولو۔ اِدھر بھی ڈیفوڈل ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈیفوڈل کے پھولوں کے پیلے پس منظر میں کھلا اُس کا چہرہ دیکھا۔ پیلے کینوس پر الیچی رنگ جیسے پھیلے اُس کے گھنے بھورے بال دیکھے۔ اُن کے درمیان جڑی اُس کی شرارتی بھوری آنکھیں دیکھیں۔ سٹورغ میک اپ سے اُس کا گورا چہرہ دیکھا اور دیکھا کہ اب اُس نے لال نہیں نیلے رنگ کا کورٹ پینٹ پہن رکھا ہے۔ شاید ایک دن گزر چکا تھا۔

"واہ، میرے فرشتے کافی ماڈرن ہو تم۔" میں نے سوچا۔ پھر میری آنکھیں باقی کمرے میں گھوم گئیں۔

"سدھاکر دوا لینے سری نگر گیا ہے۔" اُس نے کہا۔

میں مطمئن ہو کر مسکرا دی۔ پھر کچھ خیال آیا اور میں نے اپنے پپڑائے ہونٹوں پر زبان پھیر کر دھیرے سے پوچھا۔

"پھول کون لایا؟"

"وہی سدھاکر، کل۔ دیکھا تم نے اور لوگوں کے مرنے کے بعد پھول ملتے ہیں اور تمہیں پہلے ہی مل گئے۔"

"کام کم ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "اب جب مرو گی تو اور نہیں لانے پڑیں گے۔"

اب تک میری دھیمی آواز سُن پانے کے لیے وہ میرے چہرے کے پاس کھسک آئی تھی۔ اُس نے اپنا منہ میرے چہرے پر جھکا لیا تھا۔

"کون سے پھول پسند کرو گی اپنے کفن پر۔" اُس نے پوچھا۔

"یہی۔"

"ڈیفوڈل؟"

"ہاں۔"

"اتنی جلد بازی نہ کرو۔" اُس نے کہا۔ "ابھی تم نے آئرس اور نرگس دیکھے کہاں ہیں؟"

"دکھلاؤ گی؟"

"ہاں، سدھاکر آئے گا تو لانے بھیج دیں گے۔"

"کب تک آئے گا؟"

"رات تک۔"

میرے چہرے پر دلی اضطراب دوڑ گیا ہوگا۔ کیوں کہ اب اُس نے کہا "فکر مت کرو۔ وہ بہت تھکا ہوگا۔ آتے ہی سو جائے گا۔"

میں اُسے بہت سمجھانا چاہ رہی تھی۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں سدھاکر کا پاس ہونا پسند نہیں کرتی۔ وہ میرا شوہر ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ مجھے بُرا نہیں لگتا۔ لیکن آج کل بیماری میں موت کے قریب میں اُسے دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہونا نہیں چاہتی کہ میں نے اُس کا ہنی مون ہیپ ہیٹ کر کے رکھ دیا۔ زندگی میں صرف ایک بار کشمیر آنے کا موقع ملا۔ گل مرگ کا خواب دیکھتے دیکھتے آخر گل مرگ پہنچا تو کیا بیمار بیوی سے تیمارداری کا رشتہ جوڑنے.... اچھا ہنی مون منایا..... بے چارہ سدھاکر۔

یہ سب میں کہنا چاہ رہی تھی، لیکن میرا گلا سُوکھا جا رہا تھا۔ آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب میں نے کہہ ڈالا یا سوچا بھر۔ میں نے کسمسا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے صحت یاب ہو جانے پر اُسے اس بیماری کے بارے میں پھول اور برف کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہے گا۔" اُس نے کہا۔

میں سمجھ گئی۔ اُسے کچھ بھی سمجھانا ضروری نہیں ہے۔

"کل اسے کھلن مرگ بھیج دیں گے۔" وہ کہتی گئی "کہیں گے، سب سے بڑھیا آئرس وہاں کھلتے ہیں۔ اور وہاں برف ہے۔ برف ہی برف۔ دُور دُور تک۔ نزدیک بھی۔ اوپر چڑھائی تک۔ نیچے ڈھلان پر۔ آئرس کا بڑا سا گچھا ہاتھ میں لے کر اور اپنے کر لیے اوپر برف میں جما کر وہ ایک بار جو پھسلا تو سیدھا گل مرگ آ پہنچا۔

منظر میری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گیا۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ کھلکھلا کر میں ہنسی بھی، لیکن ہنسی ہونٹوں سے چھوٹی نہیں۔ بس اندر ہی اندر چوکڑیاں بھرتی رہی۔

بازو میں کچھ چبھا۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ وہی ڈاکٹر جسے وہ گولڈی کہتی ہے، بازو میں انجکشن دے رہا ہے۔

وہ برف جس کی ڈھلان پر سدھاکر پھسلا آ رہا تھا، دھندلی پڑنے لگی...... ڈھاکے کی ململ کی طرح نہیں..... ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھی چادر سی باریک پرت..... ہوا میں آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی..... ایک پرت پر پھر دوسری پرت..... اُس کی دور اندیشی کو ڈھکتی ہوئی.... برفیلے نظاروں سے کھیلتا ہوا۔ اُسے گھونگھٹ کی اوٹ میں لیتا ہوا دھندلکا...... وار کرنے کو حاضر.... ستار کے تاروں کی طرح کسی درد سے تنی نسوں کو سہلاتا ذرا ذرا آہٹ بھرا سلیٹی اندھیرا.... پرت در پرت گہرا پڑا..... قریب.... نیند یا آرام بخش چھاؤں..... سکون..... آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا سکون۔

سونے اور جاگنے کے بیچ درد کے شکنجے سے باہر پھسل آنے کے جھٹ پٹے میں، میں نے اُس کی آواز کو کہتے سُنا "اور اگر تم مر گئیں تو ہم تمہیں وہیں کھلن مرگ لے جا کر برف کے نیچے دفنا دیں گے۔ آئرس سے ڈھک کر — کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"لیکن ایسے نہیں" دُور ہوتی اُس کی آواز نے کہا "اس سے پہلے ایک بار تمہیں کھلن مرگ جا کر اس کے بارے میں پختہ رائے قائم کرنی ہوگی۔ ایسے تو تم ڈیفوڈل کے لیے بھی ہاں کہہ دیتی ہو۔ اور آئرس کے لیے بھی۔ مگر دونوں کے درمیان امتیاز کرنا بہت ضروری ہے۔ ہے نا؟"

"ہوں...." دُور سے آ رہی اُس کی آواز کو میں نے ایک بار اپنے سے باندھ کر محسوس کیا۔ پھر دُور ہوتے ہوئے جانے دیا۔

"اُف! کس قدر سردی ہے۔" سدھاکر کہہ رہا تھا۔

سراپا برف سے اٹا، ہاتھ میں پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھامے وہ ابھی ابھی کھلن مرگ سے لوٹا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے میرے فرشتے نے کہا تھا۔ لیکن یہ کیا آئرس ہیں؟ میں نے دھیان سے پھولوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پیلے پھول، چار بڑی بڑی پنکھڑیاں اور بیچ میں کٹورا سا لبالب شراب سے بھرا۔ شاید۔ مگر پیلا۔ دھت۔ میں نے سوچا یہاں کیا ہر پھول پیلا ہوتا ہے۔ اور شکل و صورت میں بھی ایک سا۔ بس نام الگ الگ رکھتے ہیں۔ یہ تو سراسر فریب ہے۔ مجھے بہت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

سدھاکر نے پھول سامنے کارنس پر ٹکا دیے اپنا گیلا کوٹ اُتار کر اُسے جھاڑتا ہوا بولا — "کیا جگہ ہے کھلن مرگ — برف ہی برف — مزہ آ گیا!"

کوٹ اُس نے کرسی پر پھینک دیا۔ وہاں پڑا لیورپے بازو کا سویٹر اٹھا کر پہن لیا اور بولتا گیا۔ سردیوں میں لوگ باگ اسکیٹنگ کرنے کھلن مرگ آتے ہیں۔ وہاں آج بھی بے شمار لوگ تھے۔ لیکن ابھی برف پگھلی نہیں ہے وہاں۔ ڈیلوگن مہنگے کیا کم تھے۔ ارے پوری طرح لوٹ تھی۔ لوٹ۔ پیسہ لٹاؤ اور بدلے میں مزہ لوٹو..... یہی دستور ہے زمانے کا۔ مگر اپن نے بھی طے کر لیا تھا کہ مزہ تو لیں گے پورا، مگر پیسہ خرچ نہیں کریں گے۔ سو اپن تو کھلن مرگ کی پہاڑی پر جم کر بیٹھے اور نیچے پھسل پڑے۔ بھگوان نے کر لیے دیے ہیں۔ اسی لیے تا — ارے ہندوستانی آدمی کے لیے اس کی (Ski) ہیں اس کی (Ski) سچ کہتا ہوں لوگوں پہ آنے والوں سے پہلے نیچے میں پہنچا اور ٹھاٹ سے کہ کیا بتلاؤں۔"

وہ کھل کر ہنس دیا۔

میں نے بہت چاہا میں اس کی ہنسی میں شامل ہو جاؤں اور میں ہنسی بھی۔ مگر پہلے کی

طرح ہنسی ہونٹوں سے پھوٹی نہیں — اندر ہی اندر
جھنجھنا کر رہ گئی —— اُس بے آواز ہنسی
کو سدھاکر کیسے سنتا؟ نہیں سُنا اُس نے۔

اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ قریب آکر بستر
پر میرے برابر بیٹھ گیا۔ جیسے ابھی ابھی کوئی غلط بات
کہہ گیا ہو۔ اس طرح سنجیدہ سپاٹ آواز میں بولا —
کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ سچ تم لوگوں کے کہنے
سے میں کھلن مرگ چلا تو گیا اکیلے، تمہارے بغیر لیکن
مزہ نہیں ہے۔ تم ساتھ رہتیں تو کتنا اچھا
ہوتا۔ ہنی مون پر آکر تم بیمار پڑ گئیں۔ پتہ نہیں،
کیوں، مجھے لگتا ہے کہ اس میں میرا ہی قصور ہے۔"

میری ہنسی کا دم گھُٹ گیا۔ میں چپ چاپ
پڑی تو رہی مگر اندر ایک چیخ پنپ اُٹھی۔ او
سدھاکر تم مجھے پہلے کہیں زیادہ اپنے لگ رہے
تھے۔ تب جب تم خوش تھے، مطمئن تھے، شوخ
تھے۔ ہنس رہے تھے، تم بتا رہے تھے، جو تم محسوس
کر رہے تھے وہی دکھلا رہے تھے۔ تم سے کس
نے کہا تمہیں مجھے بہلانا چاہیے — بہکا کر؟

"دیکھو" سدھاکر اسی تیماردارانہ لہجے
میں کہہ رہا تھا "میں تمہارے لیے کتنے سارے
پھول لایا ہوں، وہی جو پرسوں لایا تھا۔ ویسے
اوپر اور بھی پھول تھے نیلے نیلے۔ مگر میں نے سوچا
تمہیں پرسوں یہ اتنے پسند آئے تھے لہٰذا یہی لے
چلوں۔"

"اوہ تو یہ کھلن مرگ کے آئرس نہیں ہیں
اب میری سمجھ میں آیا کہ سدھاکر کو پھولوں کی یاد
نیچے واپس پہنچ جانے پر آئی ہوگی اور وہاں قریب
میں اُسے یہی پھول دکھلائی دیے ہوں گے۔ یعنی
یہ ڈیفوڈل ہیں۔ آئرس نہیں۔ کہیں کوئی دھوکہ باری
نہیں ہے۔ جلیں گے۔ میں نے سوچا ڈیفوڈل بھی
جلیں گے۔ یہ جان کر کہ اوپر کھلن مرگ پہنچ جانے پر
برف پر سیلانیوں کو دیکھ کر سدھاکر اتنا جوش
میں آ گیا تھا کہ اُسے میری اور پھولوں کی قطعی یاد
نہیں رہی تھی۔ مجھے اس پر پیار آ گیا۔ میں نے ہنس
کر اُس سے یہ کہنا چاہا تھا، لیکن شاید کہہ نہیں پائی
درد کا کوہِ جوان آج کچھ زیادہ بے رحمی سے
کوڑے برسا رہا تھا۔ گونڈی نے جو انجکشن دیا تھا
وہ بھی اُس کے سامنے پٹا سا پڑا تھا۔ اس کی بخشی
خماری بس اتنا کر پائی تھی کہ ذہن میں آیا ہر
لفظ زبان پر آنے سے پہلے ہی لڑکھڑا کر گر جاتا تھا۔
باہر نکل نہیں پاتا تھا۔

کُرد کر سدھاکر میرے بستر سے اُٹھ کھڑا
ہوا۔ بولا۔ کیا زبردست سردی ہے۔ دیکھوں —
مینیجر سے کہوں کمرے میں آگ جلانے کا انتظام
کر دے۔ آگ تاپے بغیر آج ٹھنڈ ٹک جاتی نہیں دکھتی۔"

جاتے جاتے وہ رُکا۔ میری طرف مُڑا —
بولا "تمہیں بھی آرام رہے گا۔ سینک لگے گا تو
درد ورد خود ہی کم ہو جائے گا۔" اور باہر چلا
گیا۔

میں نے ڈیفوڈل کے گچھے کو دیکھنے کی
کوشش میں آنکھیں کھولیں۔ درد سے ہٹا کر
دھیان پھولوں پر مرکوز کیا۔ جسم میں بسی خماری کو
دماغ پر حاوی ہو جانے دیا۔ اس بار جو دھندلکا
اندھیرے کی تہوں میں گہرایا تو وہ پیلے رنگ کا
احساس لیے ہوئے تھا۔

آنکھ کھُلتے ہی میں نے آگ دیکھی ——
دوزخ کی آگ ..... دوزخ کی آگ .....
چٹ چٹ چٹختی لکڑیاں ..... دھو دھو دہکتے
شعلے ..... آگ کے شعلے۔ کہیں معصوم نیلی لَو
کا نام نشان نہیں ..... جو لپیٹ اُٹھتی لال۔
..... خوف سے آلودہ ..... نارنگی، سیندھوری
سرخ ..... دوزخ کی آگ ..... خون سے بھری
ہوئی ..... ہو ہو ہڑکتی ہڈیاں ..... تلملاتی تیز
روشنی ..... دھائیں دھائیں دھمکتی رگیں۔
میرے فرشتے تم کہاں چلے گئے؟ میں مر کر دوزخ
میں آ پڑی ..... آگ کی سرخ لپٹوں اور چکاچوند
کے بیچ .....

چھٹکارہ پانے کے لیے میں نے ہاتھ پاؤں
مارے تو پایا کہ وہ ملائم بستر پر پڑ رہے ہیں —
تو کیا دوزخ میں گدگدے بستر ملنے لگے ہیں؟
نہیں۔ کہیں کچھ غلطی ضرور ہے۔ میں نے آنکھیں
بند کر لیں آگ کی لپٹوں کو پرے دھکیلا اور بالکل
دوسری جانب منھ گھما کر آنکھیں کھولیں۔ وہاں
آگ کا احساس تو تھا، مگر آگ نہیں۔ تو شاید
میں مری نہیں۔ اب میری نظر کے دائرے میں ایک
چہرہ جھلملایا۔ سدھاکر۔ نہیں میں قطعی مری نہیں۔
"کیوں بڑھیا جل رہی ہے نا آگ؟" وہ
بولا۔

تو وہ جانتا ہے۔ اسے بھی آگ دکھائی جا رہی
ہے۔ میری نظریں پھر گھوم گئیں۔ وہی نارنگی، سیندھوری
سرخ لپٹیں۔ وہی دھو دھو دہکتی لکڑیاں، وہی
چکاچوند، وہی تپش اور ..... آگ کی جھلستی
لپٹوں کے ٹھیک اوپر کارنس پر پڑے ڈیفوڈل۔
سرخ لو کے نوکیلے ناخنوں سے بندھے پیلے بیچارے
پھول۔ اُن کی پنکھڑیوں کے کونے جھلس کر سکڑ گئے
تھے۔ دیا سلائی کی لو دکھلائے خط کے ورق کی
طرح۔

ڈیفوڈل جل رہے ہیں۔ میرے اندر چیخ
اُبھری۔ ڈیفوڈل جل رہے ہیں۔ مگر کمرے میں
کوئی آواز نہیں ہوئی۔ لکڑیوں کے جل کر چٹخنے کی
آواز کے سوا۔ میں نے اپنی پوری طاقت کا استعمال
کیا اور چیخ کو باہر اچھال دیا۔

"ڈیفوڈل جل رہے ہیں"

سدھاکر نے چونک کر میری جانب دیکھا اور
پوچھا "کیا ہوا؟"

"ڈیفوڈل"

"ڈیفوڈل؟" اُس نے دہرایا۔ "ڈیفوڈل
کیا؟"

"ڈیفوڈل جل رہے ہیں۔" میں نے پھر چیخ
کر کہا۔ مگر آخری لفظ تک آتے آتے میری آواز
مدھم ہوتے ہوتے ٹوٹ گئی۔ میری آنکھوں سے
آنسو نکل آئے اور ہچکیاں لیتے لیتے پھر کہا ——

"ڈیفوڈل۔"

"کیا ہو گیا؟" سدھاکر نے بے حد تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "بخار زیادہ بڑھ گیا ہے کیا؟"

میں بول نہیں پائی۔ بس روتی رہی۔

"ٹھہرو۔ ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" کہتا وہ کمرے سے باہر دوڑ گیا۔

آنسوؤں کے پردے کے پیچھے سے مجھے ایک زرد روشنی کا احساس ہوا۔

"کیا چاہیے۔" اس نے میرے چہرے پر جھک کر کہا تو میں نے جانا آج وہ پیلے کپڑوں میں ہے۔ ڈیفوڈل کی طرح پیلے۔ میں بری طرح گھبرا گئی۔ کس کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تبھی اس نے کہا "ارے ڈیفوڈل جل رہے ہیں۔" پھر میرے منھ سے منھ سٹا کر بولی۔

"تو تم اس لیے رو رہی ہو؟"

میں نے سر ہلانے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈیفوڈل اٹھا لیے۔ اور لاکر میرے سرہانے رکھ دیے۔

"ان پھولوں کا نام ڈیفوڈل ہے کیا؟" سدھاکر نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔

"اور یہ آگ کی گرمی سے جلنے لگے تھے؟"

"ہاں۔"

"اوہ!" سدھاکر قہقہہ مار کر ہنس پڑا —

میں نے سوچا انہیں ڈیلیریس Delirious ہذیان ہو گیا یا معلوم نہیں کیا مصیبت آ گئی — واہ صاحب واہ حد ہو گئی۔

وہ دیر تک ہنستا رہا۔ اس کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔

تب تک وہ آگ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس نے کچھ لکڑیوں کو کھینچ کر باہر کر دیا۔ آگ کا دائرہ بڑھ گیا، لیکن سینک کم ہو گئی۔ اس نے کچھ لکڑیوں کو فرش پر پٹخ کر بجھا دیا۔ آگ کی تپش کم ہو گئی۔

وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔ بولی۔ "مجھے آگ پر بھٹے بھون کر کھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ تمہیں؟"

میں نے گردن ہلائی۔ "شاید۔"

ابھی گولڈی دوسرا انجکشن لے کر آتا ہے۔

تب تک سوچا۔ "آگ کی گرماہٹ کتنی پرسکون ہوتی ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وقت پر گولڈی آجائے گا۔ مجھے اس کا انتظار کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

"اسے کہتے ہیں کمرہ۔" دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی وہ کہہ رہی تھی۔ "ایک ہمارا کمرہ ہے۔ اندر جھانکو تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے اندر جی رہا ہے۔"

وہ آہستہ سے ہنسی۔ "یا مر رہا ہے۔"

"ارے آئیے نا۔ اندر آئیے۔" سدھاکر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ اندر آ گئی۔

"دوا دے دی؟" اس نے پوچھا۔

"دوا؟ وہ تو..... وہ میں لے تو آیا ہوں..... سری نگر سے..... مگر دینے کو تو..... میں نے سوچا..... ڈاکٹر صاحب بتلائیں گے تبھی....."

آج پھر سدھاکر دوا لینے سری نگر گیا تھا۔ ابھی شام ہوتے ہی لوٹا ہے۔

"لائیے۔ مجھے دیجیے۔ میں دیتی ہوں۔" اس نے کہا۔

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر سے پوچھا کیوں نہیں۔ میری طرح وہ جان گئی ہوگی کہ ان کچھ ہی دنوں میں سدھاکر توقع کرنے لگا ہے کہ وہ ہی خود آکر مجھے دوا دے گی۔

اس کے ہاتھ سے لے کر گولی نگلتے ہوئے میں فطری انداز سے مسکرا دی۔

"تو اس وقت درد کم ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں کم ہے۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر وہ اپنی بھوری آنکھیں میرے چہرے پر ٹکائے رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "لگتا ہے تم نہیں مرو گی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ ہمیشہ مرنے کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" اچانک سدھاکر پھٹ پڑا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"وینا ویسے ہی کافی پریشان ہیں۔ بیماری میں انسان کو ویسے ہی برے برے خواب آتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس کی ہمت بندھانی چاہیے۔ اگر ہم مرنے کی باتیں کرنے لگے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ سوچیے تو؟"

"آپ تو کبھی مرنے کی بات نہیں کرتے نا؟" اس نے کہا۔

"نہیں، میں کیوں کروں گا؟ مگر....."

"نہیں، آپ کیوں کریں گے۔ آپ کبھی مریں گے تھوڑا۔" کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اتنے زور سے کہ میں آنکھیں کھول کر اس کا ہنستا ہوا دیکھنے کو مجبور ہو گئی اور ایک بار دیکھ لینے پر مسحور سی دیکھتی رہ گئی۔

اس کا گورا چہرہ لال پڑ گیا تھا، گلابی نہیں۔ لال۔ جیسے رخساروں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہوں۔ اس کے تراشیدہ بھورے بال اس کی تپش برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے چہرے سے الگ بکھر گئے تھے۔ ہنسی کے جھٹکے کے ساتھ ہی اس کا سر پیچھے جھک گیا تھا۔ گول شکل کے کرۂ ارض کی طرح وہ اس کے چہرے کے چاروں طرف کھلے ہوئے تھے۔ آج پہلی بار میں نے دیکھا کہ اس کی بھوری آنکھیں درحقیقت بھوری نہیں ہیں۔ ایک ہلکا سا سبز رنگ ان میں جھلملاتا رہتا ہے جو جذباتی ہو جانے پر تیکھی چمک کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ اس وقت تو اس کی آنکھوں میں سبز روشنی کی چنگاریاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ بھورا رنگ دکھلائی نہیں دے رہا تھا۔

"ارے کہیں یہ سچ مچ فرشتہ تو نہیں؟" میں سوچتی رہ گئی۔ پہلی بار اُسے درد اور بخار کی خماری میں دیکھا تھا۔ سوچا تھا اسی لیے فرشتہ لگی ہوگی۔ مگر آج تو میں ہوش و حواس میں ہوں۔ تب اس کا یہ رُوپ۔ خوف و مسرت کی لہریں ایک کے بعد ایک میرے جسم کو تھرتھراتے ہوئے نکل گئیں — میرا جی چاہا وہ یوں ہی ہنستی رہے اور میں اُسے دیکھتی رہوں۔ اور پھر ڈر سے کانپ کر میں نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ خوف زدہ، سحر زدہ اور مسرور و شادماں میں اُسے دیکھتی رہی۔

"کبھی نہ کبھی تو سبھی کو مرنا ہے۔" میں نے سنا سدھاکر کہہ رہا ہے۔

سُن کر یقین نہیں ہوا کہ سچ مچ اُس نے یہ کہا ہے اور وہ بھی غصّے کے انداز میں۔ اُس نے جو کہا تھا اُس کا جواب چاہے اور کچھ بھی ہو یہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی خوب صورتی نے سدھاکر کے دل میں کوئی رومان پیدا نہیں کیا تھا؟ اچانک مجھے سدھاکر پر بے حد رحم آنے لگا اور رحم کے ساتھ پیار بھی۔ بے چارہ بھولا بھالا سیدھا سادہ سدھاکر۔ جو ہو، ہے تو میرا اپنا ہی۔

اس کی ہنسی ایک دم سے رُک گئی۔

"آپ سچ کہتے ہیں۔" اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

پھر میری جانب مُڑ کر بولی "اب جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ تم۔ آئندہ ہفتے ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ اور اس سے پہلے تمہیں میرے ساتھ کھلن مرگ جانا ہے۔"

"پتہ لے کر کیا کیجیے گا۔ ہم دہلی میں تو رہتے نہیں۔" اُس کی آواز کافی مستحکم تھی۔ مگر سدھاکر مضطرب نہیں ہوا۔

"واہ کبھی بمبئی آئیں گے تو کیا ملیں گے نہیں۔" اُس نے کہا۔

"نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ میں تمہیں بمبئی میں ملنا نہیں چاہتی..... آگ اور پھولوں کے بغیر تمہارا وجود ہی کیا ہے..... زندگی میں ایک بار تم سے ملنا... جی بھر کر صرف ایک بار — اور بات ہے میرے فرشتے لیکن بار بار؟ بمبئی کی ملگجی شاموں میں ٹیوب لائٹ کی چکاچوند روشنی میں تمہیں پرکھنا... نہیں میں اتنی زیادتی برداشت نہیں کرسکوں گی۔"

"بمبئی میں؟" وہ ہنس پڑی۔ "وہاں کیا پتہ میں آپ کو پہچان ہی نہ پاؤں۔"

سدھاکر کا منھ اُتر گیا۔

لیکن وہ اُسے نہیں مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ہنس دی۔ "تم کیسے سمجھ جاتی ہو ہر بات؟"

"ایسے نہیں کہتے جنا۔" ایک لاڈ بھری شکایت ڈاکٹر دستور کی طرف سے آئی۔

آج میں نے پہلی بار ڈاکٹر دستور کو دیکھا ہے۔ انجکشن کی سرنج سے الگ کرکے۔ ڈاکٹر دستور نہیں گولڈی۔ وہ اُنہیں گولڈی کہتی ہے نا، وہ سچ مچ گولڈی (سنہرے) ہی ہیں ٹھوس سونے کی طرح نہیں بلکہ ایک سنہرا احساس لیے ہوئے۔ اُن کے بال، اُن کی بھوری آنکھیں، اُن کی جلد کی چمک۔ سب میں سنہراپن۔ ان کی شخصیت بھی پگھلے ہوئے سونے کی طرح ہے۔ ایسا، جو آسانی سے گھڑا جاسکتا ہے۔ مگر من نہیں چاہتا ہے ایسا کرنے کو۔ ایک مسرت بخش استقلال ہے اُن میں۔ جو اُنہیں جیسے وہ ہیں اُسی حالت میں رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

آج میں اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ہوں وہ سب بھی ہیں۔ سدھاکر، گولڈی اور جنا۔ آج میرے لیے وہ صرف فرشتہ ہی نہیں، جنا بھی ہے۔ پرسوں صبح وہ دونوں واپس بمبئی چلے جائیں گے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔

"ایسے نہیں کہتے جنا۔" گولڈی نے کہا تھا اور وہ سدھاکر کی طرف مُڑ گئے تھے۔

"کبھی بمبئی آئیں تو ضرور ملیے گا۔ بہت خوشی ہوگی ہمیں۔ اپنا پتہ میں آپ کو دے دوں گا۔" انہوں نے اب کہا۔

"ہم پر آپ کا اتنا بڑا احسان ہے —" سدھاکر نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ "اور ہم آپ سے ملیں تے بھی نہیں۔ کیسے ہوسکتا ہے۔"

سن کر سچ مچ مجھے بڑا غصّہ آیا۔

اس بیچاری نے میری جان بچائی ہے — اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اُس کا جینا محال کردیں۔ جب بھی بے چاری باہر کی ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے دروازہ کھولے تو ہم دہلیز پر کھڑے نظر آئیں اپنا شکریہ ساتھ لیے ہوئے۔ دھت۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ زندگی بچائی ہے ٹھیک ہے۔ زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لے لیا۔

رحم اور ہنسی کے ملے جلے جذبات سے میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ مجھے مطمئن کرتی ہوئی وہ ایک بار مسکرائی۔ پھر بولی "اچھا ٹھیک ہے آخری دن پتہ لے لیجیے گا۔"

کہتے کہتے مجھے ایسا لگا جیسے وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی ہے۔ شاید یہ میرا وہم تھا، مگر میرے ساتھ گولڈی نے بھی چونک کر اُس کی طرف دیکھا اُدھر دیکھتے دیکھتے ہی اُنہوں نے 'ہاں' بھی کہا۔ لیکن بے دلی سے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے۔

"پرسوں جارہے ہیں نا آپ؟" سدھاکر نے پوچھا۔

کچھ دیر اس کا سوال خلا میں ٹنگا رہا پھر گولڈی نے کہا — "ہاں۔"

"کہاں۔" جنا نے پوچھا

"بمبئی۔" سدھاکر نے کہا

"وہ تو پرسوں جائیں گے۔" اُس نے کہا "ابھی تو کل بیچ میں ہے۔ کل ہم سب کھلن مرگ جائیں گے۔ تم بھی۔" آخری بات اُس نے مجھ سے کہی تھی۔

"لیکن یہ تو ابھی بہت کمزور ہیں۔ سدھاکر نے مداخلت کی۔ "تین میل چڑھائی پر چڑھ کر جا

ہے۔ میں نہیں سمجھتا ان کے لیے ٹھیک ہوگا۔ کیوں ڈاکٹر دستور آپ کی کیا رائے ہے؟"

گولڈی ابھی تک جنا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اب چونک کر انہوں نے کہا۔ "ہوں۔ ہاں وینا تمہیں کیسا لگ رہا ہے۔ چل سکو گی نا تم؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

مگر میرا یہ چھوٹا سا جواب سدھاکر کے الفاظ کے سیلاب کے نیچے دب گیا۔

"ارے ان سے پوچھیں گے تو وہ کہہ ہی دیں گی 'ہاں'، پہلے بھی تو یہی ہوا تھا۔ اگر سری نگر میں ہی کہہ دیتیں کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ہم گل مرگ آتے ہی کیوں؟"

آتے ہی نہیں ــــ میں نے سوچا کتنا کچھ چھوٹ جاتا تب جیسے اب کھلن مرگ چھوٹ جائے۔ نہیں۔ میں نہیں چھوڑوں گی۔

"پیدل نہیں جا سکتی تو کیا ہوا؟" مجھ سے پہلے ہی جنا کہہ رہی تھی۔ "ڈانڈی میں اٹھا کر لے چلیں گے۔ کیوں مسٹر سدھاکر اٹھا سکیں گے نا؟"

"میں... میں..." سدھاکر بے چارہ ہکلا گیا۔

میں اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"چلیے معاف کیا" اس نے کہا "گلمرگ میں ڈانڈی والوں کی کمی نہیں ہے۔ کسی کو بھی طے کر لیں گے۔"

"ہاں" گولڈی بولے۔ "دونوں خواتین ڈانڈی میں چل سکتی ہیں۔"

"دونوں؟" وہ ہنسی روک، بھنویں اوپر چڑھا کر بولی۔ "میں بھی؟ کیوں؟"

"یوں ہی" گولڈی بولے۔ "میں نے سوچا وینا کا ساتھ ہو جائے گا۔"

وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی "برف پر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے نہیں تو کھلن مرگ جانے کا فائدہ ہی کیا؟"

وہ اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا اور میرے کان میں پھسپھسا کر بولی "بیچ بیچ میں تم بھی ڈانڈی سے نیچے پھدک آیا کرنا ــــ برف پر ہوں؟"

"میں تمہارے ساتھ رہوں" میں نے بھی پھسپھسا کر کہا۔

ہم کھلن مرگ پہنچ گئے۔

سدھاکر کی زبانی میں نے اس کے بارے میں کافی سن رکھا تھا مگر خود وہاں آنا اور بات ہے۔ خود میرے پیروں کا برف کے نرم فولاد میں دھنس دھنس جانا...... اور بات تھی۔ خود میرے ہاتھوں کا برف کا پگھلتا لمس محسوس کرنا...... اور بات تھی۔

جنا نے آج پھر لال کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ اس کے اوپر نائیلون کا موٹا لبادہ جس کے اندر روئی بھری ہوئی ہے، وہ بھی لال۔ سفید برف پر سورج کی روشنی کے نیچے وہ آگ کے شعلوں کی طرح چمک رہی تھی۔

دور کسی انجانے نقطے پر ٹکی اس کی سپنیل بھری آنکھیں رہ رہ کر ایک وحشی ہری کوند سے چمک اٹھتی تھیں۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ہری چنگاریاں جب تب لہرا جایا کرتی ہیں یہ میں جانتی ہوں۔ مگر ایسی ہری لو پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ہو سکتا ہے یہ اس لیے ہو کیوں کہ میں اسے آج پہلی بار کھلے میں سورج کی روشنی میں دیکھ رہی ہوں۔ اب تک جب بھی اسے دیکھا ہے تو کمرے کے اندر کی پھیکی روشنی میں۔

برف پر ہنستی دوڑتی وہ اچانک ہونٹ دانتوں کے نیچے بھینچ لیتی ہے اور سنجیدہ ہو اٹھتی ہے۔ مگر کچھ ہی دیر کے لیے۔ پھر سر جھٹک کر بال ہوا میں لہرا دیتی ہے اور بھینچے ہونٹ چھوڑ کھل کر ہنس دیتی ہے۔ بار بار دانتوں کے نیچے آکر اس کے ہونٹ سوج گئے ہیں اور دیگر دنوں سے زیادہ گوشت سے بھرے لگ رہے ہیں۔ مجھے ایک دلچسپ خیال آیا کہ پیار کر چکنے کے بعد یہ ضرور ایسے ہی دکھائی دیتے ہوں گے۔

ہوا میں باندھی گئی رسی پر چلنے والی کسی سرکس کی نٹنی کی طرح اس کی چال میں ایک عجیب سا اٹکھا پن ہے۔ لگ رہا ہے کہ اس کا اٹھایا ہر قدم ایک کپکپاتے رومان سے بھرا ہے۔ جس کی برقی لہریں اس کے جسم سے پھوٹ کر ہمارے جسم کو جھنجھنائے دے رہی ہیں۔

اتنے شدید فطری انداز سے آج تک میں نے کسی کی موجودگی محسوس نہیں کی۔ بار بار مجھے یہ خیال آتا ہے اور حیرانی ہوتی ہے کہ ہمارے ارد گرد منڈلاتے لوگ اس کی موجودگی سے مسرور کیوں نہیں ہو رہے ہیں۔

لیکن شاید ہم جہاں بھی جاتے ہیں، اپنے ساتھ ایک بند گول دائرہ بھی لے جاتے ہیں، جو ہمارے ساتھ اس کے حلقے کے اندر ہوتے ہیں، صرف وہی ہمیں محسوس کر سکتے ہیں۔ حلقے کے باہر کے لوگ نہیں۔ مگر ایک بات کا مجھے یقین ہے میری طرح گولڈی بھی دائرے کے اندر ہے، باہر نہیں۔ میری طرح وہ بھی اسے محسوس کر رہے ہیں۔ جب وہ کہیں دور دیکھ رہی ہوتی ہے تو کئی بار میں دیکھتی ہوں کہ گولڈی اسے ہی دیکھ رہے ہیں اور سدھاکر؟ لیکن اس کا خیال تو مجھے بہت بعد میں آیا تھا۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے جنا ہنس پڑتی ہے۔ اپنے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑتی ہے اور دوسرے میں گولڈی کا اور برف میں دوڑ پڑتی ہے۔ دوڑتے دوڑتے اچانک رک جاتی ہے اور ہم اسے ساتھ لیے لیے وہیں برف پر رک جاتے ہیں ــــ ایک دوسرے کا سہارا لے کر اٹھتے اٹھتے وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ اور اس کی ہنسی ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ ہم کھلکھلا دیں۔

ہوتے ہوتے میں نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی مجھ پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ میں نے اس کا تجزیہ کرنا ہی نہیں، بلکہ اس کے بارے میں سوچنا بھی بند کر دیا ہے۔ مسحور ہو کر میں وہی کرتی جا رہی

ہوں جو وہ کر رہی ہے یا جو وہ مجھ سے کروانا چاہ رہی ہے.... میں.... اور گولڈی بھی۔

گزشتہ پانچ ماہ سے یہاں مسلسل برف پڑتی رہی ہے۔ ایک تہہ پر دوسری تہہ جم کر شیشہ بن گئی ہے۔ اس ٹھوس ٹھنڈے وسیع علاقے میں گزشتہ دنوں پھر تازہ برف پڑی ہے۔ ملائم اور چورا چورا۔ دھکا کھاتے ہی ٹھنڈا سفید برادہ سطح سے اچھل اچھل پڑتا ہے۔ ہمارے کپڑوں پر چھڑکاؤ کرتا۔

ہم ہاتھوں سے تازہ برف کھود رہے ہیں۔ کھود کر فوارے کی مثل ہوا میں اچھال رہے ہیں۔ گولے بنا بنا کر ایک دوسرے پر پھینک رہے ہیں۔ دوسروں کے گولوں سے اپنے کو بچاتے ہوئے برف پر دوڑ رہے ہیں۔ اپنے گولے پھینکنے کے لیے دوسروں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اور ہنس رہے ہیں۔ نشانہ چوک جانے پر بھی اور نشانہ ٹھیک لگ جانے پر بھی۔ دراصل ہم نہیں جانتے کہ ہم کیوں ہنس رہے ہیں۔ وہ ہنس رہی ہے تو ہم بھی ہنس رہے ہیں۔ بات بے بات.... اس پر.... اپنے پر.... اس کی اپنی ہنسی پر۔

برف کا سپاٹ میدان ختم ہو رہا ہے — جگہ جگہ ڈھلان دکھائی دے رہی ہے۔ کہیں آئرس کی نیلاہٹ اور کہیں ڈیفوڈل کی زردی میں ڈوبی برف سے ڈھکی ڈھلانیں۔ سیاح ٹوبوگن پر سوار ڈھلانوں پر پھسل رہے ہیں۔

بائیں جانب برف کی ڈھلوان نہیں کھڑی چڑھائی ہے۔ ہم چوٹی پر ہیں۔ نیچے کھائی ہے۔ کوئی ادھر نہیں جاتا۔ گائیڈ سب کو دائیں طرف بھیج دیتے ہیں۔ نوآموز ڈر رہے ہیں۔ ماہر ہنس رہے ہیں۔ ٹوبوگن پر لوگ فراٹے سے نیچے ہوا کی طرح تیزی سے پھسل رہے ہیں۔

ان کی دنیا سے الگ تھلگ ہم ایسے کچھ بے فکرے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی سہارے کے چھوٹی چھوٹی ڈھلانوں پر پھسل رہے ہیں۔ ایسے لوگ جنہیں کھیل میں پوری طرح مہارت نہیں، بس وقتی جیتی چاہیے — برف کا لمس، ہوا کی سرسراہٹ، بدن کا کھلنا، کسی کا ساتھ اور مل کر ہنسنے کا موقع۔ بس کافی ہے ہمارے لیے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہم برف پر بیٹھ رہے ہیں۔ پاؤں جما کر آگے کی طرف دھکا دے رہے ہیں۔ اور لڑھک کر نیچے پہنچ رہے ہیں۔ برف سے اٹے ہم ایک دوسرے کو تھامے بے تحاشا ہنس رہے ہیں۔ کھڑے ہو کر کپڑوں سے برف جھاڑ رہے ہیں اور دوبارہ اوپر کی جانب دوڑ رہے ہیں۔ ہانپتے ہانپتے اوپر پہنچ رہے ہیں۔ لمبی لمبی سانسیں بھر کر سستا رہے ہیں۔ اور پھر بدن کو دھکیل کر نیچے کی جانب لڑھک رہے ہیں۔

ایک ڈھلان سے دوسری ڈھلان تک۔ ایک چڑھائی سے دوسری چڑھائی تک — نشے میں سرشار۔ مست، کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف۔ کب ہم سے ہمارا شعورِ سمت ہم سے چھوٹ گیا۔ ہمیں پتہ نہیں چلا۔ اس ایک سے برفیلے پُرفضا مقام پر دائیں بائیں شمال جنوب کا امتیاز کرنا تھا بھی مشکل۔

"تم تھک گئی ہو" اس نے مجھ سے کہا — "اب آرام کرو"

"ہاں تھک تو گئی ہوں"۔ اتنا کہہ کر میں وہیں برف پر لیٹ گئی۔

اس نے اپنا لبادہ اتارا اور مجھے اس میں لپیٹ دیا۔ میری شلوار قمیص اور اس پر پڑا کوٹ گیلا ہو چکا تھا۔ اس کے لبادے کا نچلا حصہ ان کی نسبت کافی سوکھا تھا اور گرم بھی۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھاما اور نیچے جھک کر میری دونوں آنکھوں پر ایک ایک بوسہ دے دیا۔

میری پلکیں مند گئیں۔ بوسہ لینے کو خود بخود مند گئیں۔ بعد میں بھی میں نے انہیں کھولا نہیں پلکوں کے نیچے کچھ رِستا رہا۔ ٹپکتا رہا، پھیلتا رہا۔

"رہو تم" میں نے سنا

پلکیں موندے موندے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لینا چاہا، مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ شاید وہ کچھ دوری پر رہی ہو گی۔

اس کے لبادے کی آرام دہ گرماہٹ کے نیچے میرے بدن کی نس نس میں بسی تھکان سکون پانے لگی۔ میری آنکھیں ایک بار بھی نہیں کھلیں۔ بند ہی بند نیند کے خمار میں ڈوب گئیں.... ڈوبی رہیں.... دیر تک....

"ادھر مت جائیے۔ ادھر کھائی ہے"۔ مجھے لگا جیسے کوئی چیخ رہا ہے۔

"جنا!"

میرے نیم خوابیدہ شعور کو جھنجھوڑتی ایک بھیانک چیخ گونجی۔

میں اٹھی اور جس طرف سدھا کر اور گولڈی کو بھاگتے دیکھا، ادھر ہی دوڑ پڑی اور میرے ساتھ ساتھ برف پر کھیل میں مشغول سیاحوں کا ایک پورا ہجوم۔

اور پھر ہم سب ایک ساتھ رک گئے۔ سرحد پر آکر۔ کیوں کہ آگے چل کر جانا ناممکن تھا۔ ایک قدم آگے کھائی تھی، سیدھی نیچے جاتی گہری کھائی کھائی میں نیچے بہت نیچے، بے شمار کھلے ڈیفوڈل کے زرد پھول اور ان کے درمیان سورج کی روشنی میں چمکتا ایک چھوٹا سا سرخ دھبہ۔

..... پھر سب گڈمڈ ہو گیا۔ گولڈی کی وہ خوف ناک چیخ چاروں اطراف سے ٹکرا ٹکرا کر اب تک سر دھنتی بھٹک رہی تھی۔ میں نے بھی چیخنے کی کوشش کی اور چکر کھا کر وہیں گر پڑی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ادھر مت جائیے ادھر کھائی ہے"۔ ایک بار پھر سدھاکر کہہ رہا تھا۔

شام سے وہ اس بات کو بار بار دہرا رہا تھا۔

میں ہوٹل کے اپنے کمرے میں پڑی ہوں۔ پاس کے کمرے میں اسٹریچر پر چادر سے ڈھکی جنا کی شکستہ

لاش پڑی ہے۔ کل دوپہر کو اسے ہوائی جہاز سے بمبئی لے جایا جائے گا۔ آخری رسوم کے لئے۔ کچھ دیر پہلے سدھاکر نے مجھے بتایا ہے کہ وہ گولڈی کے ساتھ بمبئی جائے گا۔ اور مجھے بھی جانا چاہیے۔

"اتنا تو ہمیں اُن کے لیے کرنا ہی چاہیے۔" اُس نے کہا۔

اس سب پر میں نے توجہ نہیں دی۔ اُس کی بات سُن کر کہا تھا —— جنا کو یہیں گلمرگ میں برف کے نیچے دفنانا ہوگا۔ آئرس کے پھولوں سے ڈھک کر۔"

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟" سدھاکر بولا تھا۔

"ڈاکٹر دستور پارسی ہیں۔ پارسی لوگ جانتی ہو لاش کو دفناتے نہیں اور جلاتے بھی نہیں۔ وہ لاش کو ایک اونچے برج پر رکھ دیتے ہیں۔ گدھ اُسے کھا لیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ مرکر بھی آدمی کو کسی کے کام آنا چاہیے۔"

"نہیں۔" میں زور سے چیخی۔ "میں جانتی ہوں وہ برف کے نیچے رہنا چاہتی ہے۔ ڈیفوڈل اور آئرس کے پھولوں کے ساتھ۔ ورنہ وہ یہاں جاکر مرتی ہی کیوں؟ اسے یہیں دفنانا ہوگا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا نا کہ وہ لوگ پارسی ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"جنا اور گولڈی۔"

"جنا مرگئی۔"

"ہاں مگر وہ تھی تو پارسی۔"

"نہیں۔" میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جنا تھی .... بس جنا۔" اور دل میں کہا۔ "فرشتہ تھی بس فرشتہ۔ اس برفیلے علاقے کی فرشتہ۔

"اسے یہیں دفنانا ہوگا۔ میں ابھی گولڈی سے کہتی ہوں۔" میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ باہر جانے ہی والی تھی کہ سدھاکر نے مجھے پکڑ لیا۔

"ابھی نہیں۔" اُس نے کہا تھا۔ "صبح بات کرنا۔ ابھی چل کر چپ چاپ لاش کے پاس بیٹھو۔ میں بھی وہیں بیٹھنے جا رہا ہوں۔ گولڈی اکیلے ہیں۔"

اور پھر سدھاکر بتلاتا رہا تھا ..... اس حادثے کے گھنٹوں بعد تک گولڈی کیسے گم سُم بنے رہے تھے۔ اِدھر میں بے ہوش ہو گئی اُدھر گولڈی بے بسی کی حالت میں۔ ساری ذمہ داری سدھاکر کے شانوں پر آ پڑی۔ مجھے ڈاکٹروں کے بھروسے چھوڑا۔ مانٹ ویلنگٹن کلب سے کچھ اور آدمیوں کو بلایا۔ نیچے اُتر کر سیدوں کے یہاں سے اُنہوں نے جنا کی لاش کو برآمد کیا۔ طبی امداد کی تو اُس بے چاری کو ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی جو کچھ کرنا تھا گولڈی نے کر دیا۔ وہاں اور ڈاکٹر تھا ہی کون۔ جنا کا ٹوٹا پھوٹا جسم دیکھ کر سن ہوتے اندر سے اُس کا ڈاکٹر بیدار ہوا تھا۔ لیکن اُسے مُردہ قرار دینے کے بعد وہ پھر سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ سدھاکر نہ ہوتا تو کوئی کام بھی پورا نہ ہو پاتا —— نہ میری خبر نہ بمبئی کی ٹکٹ نہ کل مرگ سے سری نگر تک ٹیکسی کا انتظام نہ پولیس سے ایکسیڈنٹ سے موت کا سرٹیفکیٹ ...... اور بھی جانے کیا کیا؟ کل بھی وہی سدھاکر کو ساتھ لے کر بمبئی جائے گا —— آج رات بھی وہی کسی نہ کسی طرح گولڈی کو سنبھالے رہے گا .....

میں نے سدھاکر کی بات مان لی۔ وہ وقت گولڈی سے بات کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن اُس کے انتہائی اصرار پر بھی میں جنا کی لاش کے پاس نہیں گئی۔

"تم جاؤ۔" میں نے کہا۔ "کچھ دیر بیٹھو اُس کے پاس۔"

جانے سے پہلے اُس نے گہرے دُکھ کے ساتھ کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا اُدھر مت جانا، اُدھر کھائی ہے۔" اور اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

تب میں نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اپنے چہرے سے سٹا لیا۔ اور دیر تک اُس کی آنکھوں کی نمی محسوس کرتی رہی۔

گولڈی نے ہمیں بمبئی لے جانے سے انکار کر دیا۔ سدھاکر نے ضد بھی کی۔ مگر وہ مانے نہیں۔ اچھا ہوا اُنہوں نے خود ہی منع کر دیا۔ مجھے نہیں کرنا پڑا۔ اب میں کچھ دن یہاں رہنا چاہتی ہوں۔

گولڈی کے جانے سے پیشتر میرے نام ڈاک سے جنا کا [illegible] خط آیا تھا۔ لکھا تھا:

میرے فرشتے:

خوبصورت، یہ حق صرف تمہیں ہی نہیں، دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے۔ اور لوگ چاہیں تو اس حادثے کو مان کر الگ کر دیں۔ جانتی ہوں تم نہیں کر سکو گی۔ اسی لیے تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔

آج سے دو مہینے پہلے میں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی موت کے لیے جگہ اور وقت کا انتخاب میں خود کروں گی۔ گزشتہ دو مہینوں کے دوران ہم کہاں کہاں نہیں گھومے۔ لیکن اس سے پہلے مجھے کوئی جگہ پسند نہیں آئی۔ یا شاید وقت ہی موزوں نہ تھا۔ گلمرگ پہنچنے پر کھلن مرگ دیکھا اور پھر تم ملیں تو میں نے طے کر لیا۔ اب آگے سفر نہیں کروں گی۔

اچھا سچ بتلاؤ، رشک مت کرنا، مقابلہ تم سے نہیں ہے، اتنی خوبصورت موت تم نے اس سے پہلے کسی کی دیکھی ہے؟ نہیں نا؟

لیکن ہاں! تم یہ مت سمجھ لینا کہ موت ہی خوبصورت ہوتی ہے یا موت خوبصورت ہی ہوتی ہے۔ خوبصورت درحقیقت زندگی ہی ہوتی ہے۔ مگر موت اُس کا حصہ ضرور بن سکتی ہے۔

جانتی ہو جب کوئی زندگی سے انتہائی پیار کرتا ہے تو اس کے لیے مرنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔

ہاں، مگر تم ابھی نہیں مر سکتیں۔ تمہیں ابھی زندگی سے پیار کرنا سیکھنا ہے اور سدھاکر سے بھی۔ پیار اپنے آپ نہیں ہوتا۔ سیکھنا پڑتا ہے۔

برجیشور مدان

چلغوزے

منسارام کو اچانک ہی ایمپوریم والی لڑکی کی یاد آگئی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کے ساتھ چلغوزے بھی یاد آئے۔ چلغوزوں کا خیال آتے ہی منسارام کے منھ میں پانی آگیا۔ اسے ایمپوریم والی لڑکی کے ساتھ ساتھ چلغوزوں کی یاد آنے پر اتنی حیرانی نہیں ہوئی، جتنی اس بات پر کہ اسے چلغوزوں کا ذائقہ اب تک یاد تھا۔ حالانکہ اُسے یہ بالکل یاد نہیں تھا کہ پچھلی بار اس نے چلغوزے کب کھائے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بچپن کی طرح اُن دنوں کی یاد کر کے، جب اس کی جیب میں چلغوزے بھرے رہتے تھے، اس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا تھا اور جیب میں سوراخ کو دیکھ کر واپس آگیا تھا۔

یہ سوراخ وہ اکثر بھول جاتا ہے اور پتہ تب چلتا ہے جب غلطی سے "ریزگاری" جیب میں ڈال لیتا ہے۔ وہ سکے دوسروں کو بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی جیب میں سوراخ ہے۔

منسارام کو یاد آیا کہ ایک دن ایمپوریم والی لڑکی کے سامنے بھی اُسے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ جب اس کے کاؤنٹر پر ہی سکے کھن کھن کرکے اس کی جیب سے گر پڑے تھے۔ وہ اپنی ہنسی روک نہیں پائی تھی۔ منسارام کو وہ ہنسی سکوں کی کھن کھن کی طرح ہی لگی تھی اور اُسے دبانے کے لیے ایمپوریم والی لڑکی کو منھ میں پلو ٹھونسنا پڑا تھا۔

نام : برجیشور مدان
پیدائش : ۲۰ ؍ اگست ۱۹۴۴ء

تصانیف : لیٹر بکس (کہانیوں کا مجموعہ)
اعزاز و انعام : 'لیٹر بکس' دہلی ہندی اکیڈمی سے انعام یافتہ
شغل : صحافت

پتہ : 'فلمی کلیاں' ۲۱/۴۲۷۵ ۔ انصاری روڈ، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲

منسارام کو لگا تھا جیسے ہنسی اس نے اپنے پلو سے باندھ لی اور کبھی پلو کی گانٹھ کھلتے پر سکوں کی طرح کھن کھن کرتی ہوئی گر پڑے گی۔

یہ سوچتے ہوئے بھی منسارام کے منھ میں چلغوزوں کا ذائقہ تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس ذائقے کے لیے مونگ پھلی خرید لیتا۔ لیکن جہاں منسارام کھڑا تھا وہاں مونگ پھلی کا کوئی خوانچہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ مونگ پھلی والے خوانچے تو اب صرف پرانی دلی میں نظر آتے ہیں۔ وہ بھی ایسی جگہ جہاں کمیٹی والوں کو آتا دیکھ کر مونگ پھلی والے کسی نہ کسی گلی میں بھاگ سکیں۔

یہ نئی دہلی کے کناٹ سرکس کا علاقہ تھا۔ ائیر انڈیا کے دفتر کے سامنے منسارام کھڑا تھا۔ اُن دنوں اُسے یہ ائیر انڈیا کا راجہ سرکس کے جوکر کی طرح لگتا تھا۔ اس کے سامنے ایمپوریم میں سجے نقلی ہاتھی، شیر اور چیتوں کے بیچ کھڑی لڑکی اُسے سرکس کی حسینہ کی لگتی تھی۔

ایمپوریم والی لڑکی اُسے اس لیے یاد آئی تھی کہ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں کبھی ایمپوریم تھا بلکہ ایک پوری قطار تھی، جس میں بھارت کے تمام صوبوں کے ایمپوریم تھے۔ اُسے ایسا لگا کہ یہ جگہ اس لیے چنی گئی ہوگی کہ ائیر انڈیا کا دفتر سامنے ہونے کی وجہ سے

زیادہ سے زیادہ غیر ملکی گاہک مل سکیں گے۔

منسارام کو ہمیشہ ایمپوریم میں میم اور صاحب لوگ نظر آتے تھے۔ وہیں اس نے لڑکی کے کاؤنٹر پر چلغوزے دیکھے تھے۔ اُسے حیرانی ہوئی تھی کہ چلغوزوں کا کیا کام۔ منسارام کو یاد ہے کہ تب بھی اس کے منہ میں پانی آیا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر مونگ پھلی کے لیے دیکھنے لگا تھا۔ کیوں کہ اُن دنوں خوانچے میں مونگ پھلی کے ساتھ چلغوزے بھی ہوتے تھے۔ پھر مونگ پھلی کے خوانچوں سے چلغوزے غائب ہو گئے۔ اور اب تو ڈرائی فروٹ کی دکانوں پر ہی ملتے ہیں۔

منسارام کو لگا کہ چلغوزے مونگ پھلی کے خوانچے سے اس لیے غائب ہو گئے ہیں کہ میم اور صاحب لوگوں نے بھی اس لڑکی کے کاؤنٹر پر چلغوزے دیکھے ہوں گے اور ان کا ایکسپورٹ ہونے لگا ہوگا۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں ایمپوریم میں رکھی دوسری چیزیں بھی ایکسپورٹ نہ ہونے لگیں اور دیش سے غائب ہو جائیں۔ منسارام کو یاد ہے اس کے پتا بتایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے اس دیش میں کیا کیا تھا اور ان کے بعد دیش سے کیا کیا غائب ہو گیا۔

پہلی بار منسارام ایک ادیب دوست کے ساتھ ایمپوریم گیا تھا۔ وہ لوگ ایمپوریم میں دستکاری کی چیزیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ دستکاروں پر ایک ناول لکھ رہا تھا، جس میں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح دستکاروں کا استحصال ہوتا ہے۔ اُنہیں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے اور غیر ملکی گاہکوں کو ان کی بنائی ہوئی چیزیں مہنگے داموں پر بیچی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھی دانت، لکڑی اور پتھر سے چیزیں بنانے والے کاریگروں کو بلا کر انہیں وہاں کام کرتے ہوئے بھی دکھایا جاتا تھا اور میم صاحب لوگ ان کی تصویریں کھینچتے۔

دراصل لڑکی کے کاؤنٹر پر جو چلغوزے تھے، وہ بھی دستکاری سے بنے تھے۔ منسارام اُنہیں اصلی سمجھ بیٹھا تھا۔ اُس نے لڑکی سے چلغوزے کا بھاؤ پوچھا تو اُس نے بتایا 'فقط بیسے ڈزن'۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ چلغوزے بھی درجن کے حساب سے ملنے لگے۔ پھر یہ سوچ کر یہ شاید ناپ تول کے میٹرک پیمانے کی وجہ سے ہو، اس سے ایک درجن چلغوزے لے لیے تب اُسے پہلی بار پتہ چلا کہ شہر میں ہاتھی دانت کی طرح کھانے والی چیزیں اور ہوتی ہیں دکھانے والی اور۔ اُس نے چلغوزے توڑنے کی کوشش کی تھی اور لڑکی کے پلو میں ہنسی بندھ گئی۔ سکوں کی کھن کھن والی ہنسی۔ اُس نے منسارام کو بتایا یہ کھانے والے نہیں ہیں۔

منسارام کو لگا تھا کہ کھانے والے چلغوزے میم صاحب لوگوں کے لیے ہوں گے۔ یہ بھی کیا پتہ کہ یہ لوگ انہیں کھانے والے چلغوزے دکھا کر دکھانے والے ہی ایکسپورٹ کرتے ہوں۔ لیکن لڑکی منسارام کو اچھی لگی تھی۔ خاص طور پر اس کی سکوں کی کھن کھن والی ہنسی۔ جسے سننے کے لیے وہ لکڑی کے کیا لوہے کے چلغوزے بھی کھانے کو تیار تھا۔ یہی نہیں اُس نے اس کی ہنسی سننے کے لیے اپنی جیبوں میں جان بوجھ کر سوراخ کر لیے تھے۔

اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ پریم کرے گا اُس لڑکی کے ساتھ۔ اس پریم پر ایک کہانی لکھے گا۔ اُس نے کہانی کا پلاٹ بھی سوچ لیا تھا۔ انجام اس کے ادیب دوست نے بتا دیا تھا کہ لڑکی اس کے لیے اصلی چلغوزے لا کر رکھ دیتی ہے اور اُسے نوکری سے جواب مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سرکاری دکان میں پرائیویٹ مال بیچتی ہے۔

وہ کہانی منسارام کبھی نہیں لکھ سکا۔ لیکن بہت معصوم تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ لڑکی اُسے سچ مچ محبت کرتی ہے۔ وہ سچ مچ دکان میں چلغوزے لا کر رکھ دیتی، لیکن ڈرتی ہے کہ کہیں اُسے نوکری سے جواب نہ مل جائے۔ نوکری اُس کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ منسارام نے دکان پر کام کرنے والے روشن لال سے پتہ لگا لیا تھا۔ روشن لال سے اُس نے دوستی اس لیے کر لی تھی کہ وہ اُسے اس لڑکی کے بارے میں اطلاع دیتا رہے۔

روشن لال نے اُسے بتایا تھا کہ لڑکی بہت غریب ہے۔ پتا ریٹائر ہیں۔ ماں سوتیلی ہے۔ بھائی بی اے پاس ہے اور بے روزگار ہے۔

منسارام سوچتا تھا کہ اگر وہ غریب نہ ہوتا تو نوکری نہ کرتا۔ سارا دن پریم کرتا۔ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی وہ فورسیٹر پکڑ کر سیدھا کناٹ پلیس پہنچتا۔ وہ چاندنی چوک سے نکلنے والے ایک فلمی رسالے میں کام کرتا تھا۔ آج وہ اس سے اندازہ لگاتا ہے، وہ اس کی محبت میں کس قدر پاگل تھا۔ بس تک انتظار اس سے نہیں ہوتا تھا۔ ایمپوریم کے سامنے ایر انڈیا کا راجہ دیکھ کر وہ سوچتا کاش چاندنی چوک سے لے کر کناٹ پلیس تک ہوائی جہاز اڑتے۔ تصور میں وہ ہوائی جہاز کا پائیلٹ بن جاتا۔ یہی نہیں کئی بار تصور میں وہ ہوائی جہاز اڑاتے ہوئے قلابازیاں کھانے لگتا ——— لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں ایمپوریم والی لڑکی شادی سے پہلے ہی بیوہ نہ ہو جائے، وہ قلابازیاں لگانا بند کر دیتا۔

ان دنوں اُس نے لڑکی کی محبت میں رومانی کہانیاں پڑھیں۔ گولیری کی "اُس نے کہا تھا"۔ پڑھنے کے بعد تصور میں وہ لہنا سنگھ بن جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عالمی جنگ ہو اور اُسے اپنی محبت ثابت کرنے کا موقع مل جائے۔ حالانکہ اب وہ سوچتا ہے کہ اچھا ہوا عالمی جنگ نہیں ہوئی اور لڑکی نے اُسے کچھ کہا نہیں۔

ان دنوں وہ جنگ کے بارے میں سوچتا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ بڑے دیش ایٹمی طاقت اس لیے ہی بڑھا رہے ہیں کہ اُس کی محبت لافانی ہو سکے۔

عالمی جنگ نہیں ہوئی۔ البتہ ایمرجنسی کے دوران کافی ہاؤس اور اس کے ساتھ وہ قطار جس میں ایمپوریم تھے، ٹوٹ گئی تب یہ جگہ منسارام کو ایسے لگتی تھی جیسے ہوائی حملوں میں وہاں بم گرا ہو۔ بعد میں وہاں انڈر گراؤنڈ مارکیٹ بن گئی۔ انڈر گراؤنڈ پارکنگ بن گئی۔

اب انڈر گراؤنڈ مارکٹ میں لوگوں کو دیکھ کر اُسے لگتا ہے کہ ہوائی حملے کا سائرن سن کر لوگ بچاؤ کے لیے کھائیوں میں جا رہے ہوں۔ اُسے لگتا ہے جیسے انڈر گراؤنڈ مارکٹ اور پارکنگ ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے ہی بنائی گئی ہے تاکہ اوپر سے پتہ نہ چلے کہ یہاں مارکٹ

ہے۔

اِن دنوں کی بات یاد کرتا ہے تو منسارام کو لگتا ہے کہ ان دنوں بہت کچھ انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا۔ دستکاروں کے استحصال پر ناول لکھنے والا اس کا دوست بھی۔

اسے پھر ایمپوریم والی لڑکی کی ہنسی یاد آئی۔ وہ ہنسی اُسے کتنی اچھی لگتی تھی بلکہ اُس نے جان بوجھ کر اپنی جیبوں میں سوراخ کر لیے تھے۔ کل وزن کرنے والی مشین میں سکّہ ڈالنے کے بعد جب ٹکٹ کی بجائے سکّہ ہی باہر آ گیا تو اُسے جیب کے سوراخ یاد آئے تھے۔ اُس نے تین بار سکّہ ڈالا تھا اور تینوں بار ہی وہ واپس آ گیا۔ تب بھی اُسے ایمپوریم والی لڑکی یاد آئی تھی۔ ایمرجنسی کے دنوں میں ہی اس لڑکی کی شادی ہو گئی تب منسارام دہلی میں نہیں تھا۔ حالانکہ لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے کہہ دیتا کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا۔

لڑکی نے شادی کر لی تھی اور جب تک منسارام کی اپنی شادی نہیں ہوئی وہ یہی سمجھتا رہا کہ لڑکی نے ایمرجنسی میں عدم تحفظ کے احساس سے شادی کر لی تھی۔ لیکن محبت وہ اسی سے کرتی ہے۔

اُس نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں ہیروئن ہیرو کے چلے جانے کے بعد اکاؤنٹنٹ سے شادی کر لیتی ہے۔ اور ہیرو کے لوٹنے پر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ دراصل شادی تو اُس نے عدم تحفظ کے احساس سے کی تھی۔

شادی کے بعد دھیرے دھیرے منسارام ایمپوریم والی لڑکی کو بھول گیا۔ بہت دنوں بعد اسے اس کا خیال تب آیا تھا جب ایک دن اچانک ہی سڑک پر اُسے روشن لال ملا۔ منسارام تو اُسے پہچان بھی نہ سکا تھا۔ حالانکہ اُس نے روشن لال پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُس نے اُسے پہچانا نہیں، لیکن من ہی من وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے کہاں دیکھا ہے۔ ایک زمانے میں وہ فٹ بال میچ دیکھا کرتا تھا اور اچانک ہی کبھی میچ کے دوران بنا کوئی شناسا مل جاتا تو اُسے یاد نہ آتا۔ پھر جب وہ کہتا آج کل میچ دیکھنے نہیں آتے تو یہ سن کر اُسے یاد آجاتا۔ اُس نے فٹ بال میچ کے بارے میں سوچا۔ پھر اس امکان پر غور کیا کہ وہ کسی فلم ڈسٹری بیوٹر کے ہاں کام کرتا ہوا اور فلم کے پریمیئر پر ملا ہو یا جس بس میں وہ آتا ہے اس کا ہی کوئی ان دنوں کا پسنجر ہو جب وہ روزانہ ایک ہی بس میں جاتا تھا۔ اب تو منسارام کا کوئی ٹائم ہی نہیں رہا۔ منسارام نے ہر جگہ کے بارے میں سوچا لیکن ایمپوریم کی یاد اُسے نہیں آئی۔ بلکہ وہ روشن لال سے اس قسم کی باتیں کر کے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ملے۔ آج کل کس بس میں آتے ہیں؟

روشن لال نے نمبر بتایا تو وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس نمبر کی بسیں کس علاقے میں چلتی ہیں! یہ تو روشن لال نے ہی پوچھ لیا کہ آج کل کس اخبار میں لکھ رہے ہیں۔ ایمپوریم کے بارے میں خبر دینا ہے تو اُسے یاد آیا۔ یہ تو روشن لال ہے اور وہ اسے فٹ بال کے میدان میں، فلم ڈسٹری بیوٹروں کے دفتر میں اور بسوں میں ڈھونڈ رہا تھا۔

منسارام نے خود کو گمراہ محسوس کیا کہ وہ روشن لال کو بھول گیا جب کہ روشن لال اُسے لڑکی کے بارے میں سب خبریں دیا کرتا تھا۔ روشن لال ایمپوریم میں ڈسپیچر تھا۔ لیکن کام اس سے سیلز مین کا لیا جاتا تھا۔ روشن لال کو محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا استحصال ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ اسی میں اپنی عزت سمجھتا تھا۔ جب کبھی ایمپوریم کا منیجر اسے اس کی جگہ پر بٹھانے کی کوشش کرتا وہ منسارام کے پاس کوئی نہ کوئی خبر لے کر آجاتا کہ منیجر کے بارے میں ایک خبر چھپوا دو۔ اس کے پاس ایمپوریم کے اتنے راز تھے کہ ایمپوریم والے اس سے سیلز مین کا کام لیتے رہتے۔

روشن لال نے بتایا کہ بہت عرصہ بعد ایک تند مزاج منیجر آیا ہے۔ کہتا ہے ڈسپیچ دیکھو۔ اگر وہ نہ مانا تو آپ کو ایک خبر چھپوانی پڑے گی۔ میں سب کا پول کھول دوں گا۔ سرکاری دوکان میں پرائیویٹ دوکانیں چل رہی ہیں، جو لوگ سیلس ٹیکس نہیں دینا چاہتے اور بل نہیں مانگتے انہیں پرائیویٹ بیوپاریوں کا مال بیچ دیتے ہیں اور تو اور نقلی بل بکس تک استعمال کرتے ہیں پھر اس نے منسارام کو بتایا کہ اس لڑکی نے بھی وہاں نوکری کر لی ہے۔

منسارام کو لگا اب دوکان میں اصلی چلغوزے مل جائیں گے۔ لیکن پھر اُسے اپنے دانتوں کا خیال آ گیا۔ و دانت بھی اب ہلتے ہوئے محسوس ہوئے، جن سے برسوں پہلے لکڑی کا چلغوزہ توڑنے کی کوشش کی تھی ؟ اُسے یاد آیا کہ صبح وہ بس کو دیکھ کر ہی ہانپنے لگا تھا جیسے ان دنوں لڑکی کو دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اُسے لگا کہ اس کی عمر چالیس سال کی ہو گئی ہے اور چالیس سال کے بعد آدمی کو اپنا چیک اپ کروا لینا چاہیے۔

گری راج کشور

وہ نہیں آئے...

خبر ملی تھی کہ پتاجی گر گئے ہیں۔ اُن کی ہڈی چُور چُور ہو گئی ہے۔ وہ بستر مرگ پر ہیں — پڑے پڑے کراہتے رہتے ہیں —— ایسا نہیں تھا کہ اُن کے پاس کوئی نہیں تھا یا اُن کا بڑا لڑکا اتنی دُور ہو کہ وہ جگہ ریل گاڑی یا ہوائی جہاز سے جُڑی نہ ہو.... " اُسے وہاں سے پیدل یا اونٹ پر چلنا پڑتا ہو۔ پتا کے پاس اُن کے دو چھوٹے والے بیٹے بھی تھے۔ ماں بھی تھی، لیکن اُنہیں بڑے بیٹے کا انتظار رہتا۔ بڑا بیٹا مصروف تھا، اس لیے بڑے بیٹے کے پاس سے یہی خبر آئی کہ وہ اتنا مصروف ہے کہ اگر اس کی اپنی ٹانگ بھی ٹوٹ جائے تو وہ اپنی حد درجہ مصروفیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ جب یہ خبر آئی کہ وہ تین چار دن سے قبل نہیں پہنچ سکتا تو گھر کے لوگوں نے دوسرے طریقوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر وہ اس بڑھاپے میں کب تک پڑے کراہتے رہیں گے۔ ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ شروع ہو گیا۔
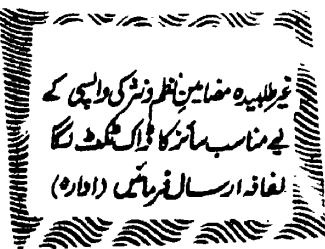
ہڈی کے امراض کا ایک نوجوان ڈاکٹر سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر کچھ ہی سال پہلے وہاں آیا تھا۔ اُس نے ایک اچھا خاصا نرسنگ ہوم کھول لیا تھا۔ وہاں بجلی اکثر چلی جاتی تھی، اس لیے ایک جنریٹر بھی لگا دیا تھا۔ وہ اتنی زور سے گڑگڑا کر چلتا تھا کہ اگر دماغ کی نسیں کمزور ہوں تو وہ اس کی تیز آواز سن کر چٹخ جائیں —— لیکن اچھا کوئی دوسرا اسپتال نہ تھا۔ پتا کو انہی ڈاکٹر صاحب کو دکھایا گیا۔

ڈاکٹر نے پوچھا: "بابا کی عمر کتنی ہے؟"

"چوراسی سال۔"

ڈاکٹر نے فوراً کہا: "دیکھیے اس عمر میں ہڈی مشکل سے جُڑتی ہے۔ جسم کے تمام عضو کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں جو ٹوٹی ہڈی جوڑنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ دو ہی طریقے ہیں یا تو انہیں اسی طرح پڑے رہنے دیا جائے یا چھ مہینے میں خود بخود جیسے تیسے ہڈی جُڑ جائے گی یا پھر پیسہ خرچ کرنا چاہیں تو ان کا کولہا بدل کر دھات کا نیا کولہا لگا دیا جائے۔"

پتا شاید اسی لیے اپنے بڑے بیٹے کو بار بار یاد کر رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ہونا ہے، فیصلہ وہی کرے۔ کوئی بھی آخری فیصلہ کرنے کے سوال پر ماں اور دونوں ناخواندہ بیٹے تو بغلیں جھانکنے لگے۔ پتا نے پھر اپنے بڑے لڑکے کے لیے چلّانا شروع کیا۔ جتنا کراہتے تھے، اتنا ہی بڑے بیٹے کا نام زبان پر آتا تھا۔ اُن کی رائے میں اس کے پاس پیسہ بھی تھا۔ اور عقل بھی۔ جب کہ یہ دونوں تو بالکل ہی گنوار ٹھہرے۔ بیچ بیچ میں وہ جھنجھلا اُٹھتے۔

نام: گری راج کشور
مقام پیدائش: مظفر نگر
تصانیف: لوگ، جنگل بندی، پربشٹی، اندر سنیں، دو دیا ترائیں، یتھا پرستاوت، چڑیا گھر (ناول)
پیپر ویٹ، نیم کے پھول، چار موتی بے آب، شہر در شہر، ہم پیار کر لیں، رشتہ اور دوسری کہانیاں (کہانیوں کے مجموعے)
پرجا ہی رہنے دو، ترمیدہ، گھاس اور گھوڑے، چہرے چہرے کس کے چہرے (ڈرامے)
شغل: ڈائرکٹر رچناتمک لیکھن اور پرکاشن کیندر آئی آئی ٹی، کانپور
پتہ: ۵۰۰- آئی آئی ٹی، کانپور

وہ کیوں نہیں آتا۔ یہاں باپ پڑا پڑا سڑ رہا ہے۔
لڑکوں نے بتایا: "بھائی تین چار دنوں بعد آئیں گے۔ وہاں اُنہیں کام ہے۔"
پتا نے پوچھا: "تم نے اُسے بتایا نہیں کہ اس کا باپ ..... جس کے نطفے سے وہ پیدا ہوا، یہاں مر رہا ہے۔"
اُس نے کہا: "بتا دیا۔" یکایک پتا کو زیادہ تیز درد اُٹھا۔ وہ بستر پر تقریباً لوٹنے لگے تھے ــــ لیکن اُنہیں اُسی حال میں چھوڑ دیا گیا۔ اس لیے کہ وہ ہلنے ڈُلنے کے لائق نہیں تھے۔ وہ صرف چلّائے جا رہے تھے۔ ہائے میرا کیا ہوگا۔ اسی دن کے واسطے چھ چھ ہاتھ کے بیٹے پیدا کیے تھے۔ پھر فون ملایا گیا۔ بڑا لڑکا تھوڑا اُکھڑ بھی گیا۔ "یہاں کانفرنس چل رہی ہے۔ دُور دُور سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ساری ذمہ داری میرے اوپر ہے۔ آپ لوگ آپریشن کرائیں۔ روپیہ بھجوا رہا ہوں۔ بہن آئے گی۔ میں کانفرنس ختم ہوتے ہی پہنچ جاؤں گا۔" اُن دونوں لڑکوں نے کہا: "وہ بغیر آپ کے آپریشن نہیں کرائیں گے۔"
"میں بہن کو فون کیے دیتا ہوں۔ وہ پتا کو سمجھا دے گی۔"
وقت ختم ہو گیا تھا۔ فون کٹ گیا۔
اس کے باوجود پتا کی ضد برقرار رہی: "نہیں آئے گا تو میں یونہی پڑا پڑا مر جاؤں گا۔ چھوٹے لڑکوں کی خود اعتمادی کو پہلی بار دھکا پہنچا تھا۔ آخر اُن کے آنے سے ایسا کیا ہو جائے گا، جو وہ نہیں کر سکتے۔ آنا ہوتا تو اب تک آ نہیں جاتے۔ جو گھر میں موجود ہے، اُس کی کوئی اہمیت نہیں، جو نہیں ہے اُسی کا رونا لیے جا رہے ہیں۔ وہ پیسے والے ہیں نا اور ہم غریب۔ لیکن اُن کی ہمدردی کے محتاج نہیں۔ کیا ہم اپنے پتا کا علاج بھی نہیں کرا سکتے۔؟ غصے میں یہ لوگ یہاں تک کہہ گئے ہمیں نہیں چاہئیں اُن کے روپے ــــ رکھ لیں اپنے پاس۔ ہم کریں گے دیکھ بھال۔ حالانکہ ماں کھنکھاتی بھی رہی۔ ایک آدھ بار کہنی سے ٹھوکا بھی لگایا۔ تب تک بہت پہنچ چکی تھی۔ اس طرح کی باتیں سُن کر اُس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔
چھوٹے بیٹوں نے ایمبولینس منگائی اور پتا کو اٹھا کر اسی ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں لے گئے، جس کی بیوی وہاں ڈاکٹر تھی اور نرسنگ ہوم کے لیے دولت اپنے جہیز میں لائی تھی۔ وہاں پہنچے تو بجلی گُل ہو چکی تھی، جنریٹر شور کر رہا تھا۔ پتا جی کو وحشت ہوئی۔ میں یہاں کیسے رہوں گا۔ سر کے ٹکڑے ہو جائیں گے یہاں ــــ کو لہے کے تو ہو ہی گئے۔ باقاعدہ پرائیویٹ کمرہ بُک کرایا گیا۔ بڑے بیٹے نے سب باتیں بہن کو فون پر بتا دی تھیں۔ جب آپریشن کی تیاری ہو گئی تو ڈاکٹر کے مددگار نے آ کر کہا: "دو ہزار روپے جمع کرانے ہوں گے۔"
لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ روپوں کی ضرورت آپریشن کے بعد پڑے گی ــــ تب دیکھا جائے گا۔ اُن میں بڑا والا تھوڑا چلتا پُرزہ قسم کا آدمی تھا۔ بولا: "آپ آپریشن شروع کیجیے، ہم لے کر آتے ہیں۔"
وہ آدمی ہنسا: "جناب یہاں ایسا نہیں ہوتا ــــ ایسے مریض تو روز ہی آتے ہیں۔ جو آپریشن کرانے کے بعد پیسہ لانے چلے جاتے ہیں۔ بوڑھے لوگوں کے تیماردار تو اکثر آتے ہیں۔ معاف کیجیے، آپ کے پتا کو ہم اپنا پتا بنا کر رکھنے کے لیے قطعی تیار نہیں۔ آپ روپیہ لے آئیے تو ہم آپریشن شروع کر دیں گے۔ ورنہ ہڈی تو دیر سویر میں جُڑ ہی جائے گی اور ویسے بھی آپ کے پتا جی نے ایک لمبی عمر تو جی ہی لیا ہے۔"
لڑکوں کی سٹی پٹی گُم ہو گئی۔ وہ ماں کے پاس پہنچے۔ ماں نے ہاتھ جھاڑ دیے: "میں کہاں سے لاؤں؟" اور بہن کی جانب اُنگلی اُٹھا دی۔
وہ بہن کے پاس پہنچے۔ بہن کچھ بولی نہیں۔ صرف پوچھا..... "کتنے روپیوں کی ضرورت ہے؟"
"چار ہزار ــــ" بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہلایا۔
"اچھا چلو میں چلتی ہوں۔"
اُن دونوں کو غصہ آ گیا..... "ہم کیا کھا جائیں گے۔"
بہن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیدھے ڈاکٹر کے پاس پہنچی ــــ اور کہا: "آپ آپریشن کریں۔ میرے پاس اس وقت صرف دو ہزار روپے ہیں۔ باقی دو ہزار کا چیک لے لیجیے۔"
ڈاکٹر نے بہن کی طرف دیکھا اور گھنٹی بجا کر اپنے معاون کو بلایا اور پوچھا: "آپ نے کتنا روپیہ جمع کرنے کے لیے کہا ہے؟"
"دو ہزار سر۔"
بہن نے فوراً بات سنبھالی: "لگتا ہے مجھے سمجھنے میں غلطی ہو گئی۔ دو ہزار تو میرے پاس ہیں۔"
جو آپریشن روپیہ جمع نہ کرنے کی وجہ سے رُک گیا تھا۔ اُس کی تیاری پھر شروع ہو گئی۔ بہن نے اس واقعے کے متعلق اُن لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔ پتا جب آپریشن تھیٹر چلے گئے تو دونوں بھائی بہن کی نظروں سے بچتے ہوئے چلنے لگے۔ بہن سمجھ گئی وہ آنکھیں ملانے سے ڈر رہے ہیں۔ اُس نے ماں سے اُن دونوں کو سُناتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر صاحب بڑی مشکل سے دو ہزار روپے میں آپریشن کرنے کو تیار ہوئے۔ وہ بھی جب مجھے کہنا پڑا کہ آپ نہیں کریں گے تو ہم پتا جی کو دلّی لے جائیں گے۔"
دونوں بھائی کان دبائے ایسے سُن رہے تھے جیسے سُن ہی نہیں رہے ہوں بلکہ کچھ اس طرح سے دبے ہوئے تھے جیسے گڈھے کی مٹی پانی پی کر دب جاتی ہے۔
پتا کا آپریشن تقریباً تین گھنٹے چلا۔ اس دوران بہن پرس بغل میں دبائے اور شال اوڑھے آپریشن تھیٹر کے باہر بنچ پر بیٹھی رہی۔ ماں دوسری طرف کرسی پر بیٹھی تھی خاموش خاموش ــــ دونوں لڑکے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بیچ بیچ میں جوگیوں کی طرح پھیرا لگا جاتے۔ انہیں دیکھ کر بہن نے ایسا محسوس کیا جیسے ان دونوں نے ہلکا سا نشہ کر رکھا ہو۔ مگر اس بات کو وہ دل ہی میں رکھے رہی۔ پوچھنے کا نہ موقع تھا نہ ہمت۔
تھوڑی دیر بعد جب ماں نزدیک آئی تو بہن سے رہا نہیں گیا اور پوچھ ہی ڈالا: "دونوں کیا اب

بھی نشہ کرتے ہیں ؟"
ماں جھٹ سے بولی " مجھے کیا پتہ ۔ میری قسمت تو ویسے بھی پھوٹی ہوئی ہے ۔ ان کا نشہ دیکھوں یا انہیں دیکھوں ۔ انہیں کچھ ہو گیا تو مجھے کوئی ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دے گا ۔"
ماں کی بات بہن کو پسند نہیں آئی ۔ اُس نے بہت روکنا چاہا خود کو ، لیکن ناکام رہی ۔ منھ سے آخر نکل ہی گیا ۔ " بڈی ٹوٹنے سے کوئی نہیں مرتا ۔ تم اکیلی ہی نہیں ، ہم سب الگ الگ طور پر پیتا کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے ہیں ۔"
اس بار ماں کو بہن کی بات اچھی نہیں لگی
" ٹھیک ہے بولو . . . . جو کہنا ہے کہہ لو ــــ تیرے پتا جی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے ۔ عزیزی تیرے تین نام : لُچّا ، بھڑوا ، بے ایمان ۔"
" آپ یہ سب کیا کہہ رہی ہیں ۔ یہ زبان آپ کے بولنے کی ہے ۔ پیتا کے علاج میں کس بات کی کمی ہے ۔ بھائی نے مجھے بھیجا ہے اور یہ دونوں تو کہہ رہے تھے کہ پیتا کا علاج وہی کرائیں گے ۔ انہیں کسی کی مدد نہیں چاہیے ۔"
" ان بے چاروں کو تو بار بار بیچ میں کیوں گھسیٹ رہی ہے ۔ ان کے پاس ہوتا تو کرتے نہیں کیا ؟ اب بھی جو بن رہا ہے ، کر رہے ہیں ۔"
" جب یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو پھر مجھ سے دو ہزار کی جگہ چار ہزار مانگنے کی کیا ضرورت تھی ۔ ڈاکٹر دو ہزار بولا تھا اور یہ چار ہزار مانگنے لگے ۔"
ماں کی آواز میں تھوڑی نرمی آ گئی ــــ
" مجھے تو پتہ نہیں ۔" پھر تھوڑا ٹھہر کر بولی ۔ " پریشانی میں آدمی کا دماغ ٹھیک نہیں رہتا ۔ سوچتا کچھ ہے منھ سے نکلتا کچھ ہے ۔" جب سے یہ گرے ہیں مجال ہے ان دونوں نے ایک منٹ کے لیے بھی آنکھ جھپکائی ہو ۔ چاہے جتنے بھی بُرے ہوں باپ کی خدمت تو یہی کر رہے ہیں ۔ چاہے نشہ کر کے کر رہے ہوں یا پھونک کے رکھ کر ــــ اور کسی کو تو جھانکنے کی بھی فرصت نہیں ۔"
بہن کے دل میں آیا کہ سو صلوات سنائے لیکن خاموش رہ گئی ۔ ماں کہتی رہی ۔ " ہم نے تو سب کو خبر دی تھی ۔ کبھی کوئی بعد میں یہ نہ کہے کہ ماں دوسری تھی ۔ باپ تو اپنا تھا ۔ کسی کو کیا پتہ کتنے دن کے مہمان ہیں ــــ ۔" پھر اُس نے رونا شروع کر دیا ۔ روتے روتے بولی : " اگر یہ کمبخت کسی کام کے ہوتے تو رونا کیا تھا ۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ کرو بھی اور گالی بھی سنو ۔ جب ان کی قسمت میں دُر دُر اور بھاگ بھاگ ہی لکھا ہے تو کیا کرے ۔ میں نے تو غیروں کی بھی خدمت کی ہے ۔"
دراصل بہن کو بھائی نے تاکید کی تھی کہ ماں چاہے جو بھی کہے منھ نہیں کھولنا ہے ۔ دو تین دن بعد وہ آ ہی جائے گا ۔ لیکن اُس سے چُپ نہیں رہا گیا ۔ بولی ۔ " بھیا اگر آ سکتے تو آ نہیں جاتے ۔ انہیں کیا اپنے پتا سے پیار نہیں ۔"
" نہیں کیا ، ہم تو یہی کہیں گے کہ بھگوان کرے سب اپنا اپنا راج پاٹ سنبھالیں ۔ ہم بھی جیسے تیسے دن کاٹ ہی لیں گے ۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم سے جو بنا ہم نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ۔"
بہن کا خون اُبل رہا تھا ۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا وہ جلدی سے اُس طرف چل دی ۔
ڈاکٹر صاحب نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے انگریزی میں کہا ۔ " آپ کے پیتا کا آپریشن کامیاب رہا ہے ۔ آپ لوگ اُنہیں صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کا خیال رکھنا ہوگا ۔ کچھ دوائیں منگانی ہوں گی ۔ لسٹ چھوٹے ڈاکٹر سے لے لیجیے ۔ گلوکوز دینا ہوگا ۔ بلڈ چڑھانا ہوگا ۔ رات بھر ایک آدمی کو جاگنا پڑے گا ۔ اگر مریض ہاتھ ہلائے گا تو سوئی نکل جائے گی ۔ یہ ضروری ہے کہ دونوں " ڈرپ " ٹھیک طرح سے چلتے رہیں ۔"
ڈاکٹر نے ذرا ٹھہر کر دوبارہ کہا ۔ " دیکھیے آپریشن میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی ہے ۔ میں نے سوچا نہیں تھا کہ اتنی محنت پڑ سکتی ہے ۔ میرے اسٹاف نے بھی کافی مدد کی ۔ کولہے کا ٹوٹا ہوا حصہ کاٹنے میں بڑی زحمت اُٹھانی پڑی ۔ آپ پانچ سو روپے اور جمع کر دیں ۔"
" چیک دے دوں ؟ " بہن نے کہا ۔
" دیکھیے چیک ویک کا چکر ٹھیک نہیں رہتا ۔ آپ کل روپیہ نکلوا کر دے دیجیے ۔"
" جی ۔"
" اور ہاں یہ بھی سُن لیجیے کہ اگر کل روپیہ جمع نہ ہوا تو مریض کی ذمہ داری ہماری نہ ہو کر آپ کی ہو گی ۔ میں اس معاملے میں صفائی پسند ہوں ۔"
ڈاکٹر تو کھٹ کھٹ کرتا ہوا چلا گیا ۔ بہن چکر میں پڑ گئی ۔ جتنا روپیہ گھر میں تھا ، اُسے لے کر وہ فون ملتے ہی روانہ ہو گئی تھی ہاں چیک بُک ساتھ رکھ لی تھی کہ ضرورت پڑی تو چیک کاٹ کر دے دے گی ۔ نقد تمام روپیہ ڈاکٹر کو دیا جا چکا تھا ۔ اُسے ماں سے کہنا پڑا ۔ " ڈاکٹر پانچ سو روپے اور مانگ رہا ہے ۔ بھیا پرسوں سے پہلے نہیں آئیں گے ۔ دو دن کے لیے کسی سے ایک ہزار کا انتظام کرنا ضروری ہے ۔ اگر کل ڈاکٹر کو روپیہ نہ ملا تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر پتا جی کی دیکھ بھال میں کوتاہی کرنے لگیں ۔"
" میرے پاس ہوتا تو دوسروں کا منھ کیوں دیکھتی ۔ لڑکوں کے پیچھے پھونک کے تھوڑے ہی لگے تھے جو چار ہزار مانگے تھے ۔ آخر مرد ذات ہیں ، دُور تک سوچتے ہیں ۔ جو کرتا ہے وہ ہی جانتا ہے ۔"
بہن نے اپنی بات پھر دُہرائی ۔ " تو پھر روپیہ کہاں سے آئے گا ؟"
" میں نے تو کہہ دیا ۔ میرے پاس نہیں ہے ۔ تمہارے پاس نہیں تھا تو کاہے کو کٹولنے کو باپ کو سر پہ ڈال دیا ، جہاں اتنے دن سڑتے رہے ، وہاں کچھ دن اور سڑتے ۔"
" کہیں سے منگا دو ۔"
" کس سے مانگتی پھروں ؟"
" اگر کل تک ڈاکٹر کو پانچ سو روپے نہیں ملے

تو ڈاکٹر علاج نہیں کرے گا۔"

ماں گم ــــــ!

بہن پھر بولی۔ میں چیک کاٹ دیتی ہوں آپ منگوا دیجیے۔ دس پانچ روپے کاٹنا چاہے گا تو کاٹ لے گا۔"

ماں پھر چپ ــ!

پتا کو آپریشن تھیٹر سے باہر لایا جا رہا تھا۔ پتا کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ابھی درد کا احساس بالکل نہیں تھا۔ اُن کی ریڑھ کی ہڈی کے پاس نیچے کی طرف سُوئی لگا کر، اُن کا نیچے والا حصّہ سُن کر دیا گیا تھا۔ عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے بے ہوش نہیں کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے سب سے پہلے ماں کو ہی دیکھا۔ اُن کے دیکھتے ہی ماں نے ہوں ہوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ پتا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ بہن ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔ "پتہ نہیں قسمت میں کتنی تکلیف اور لکھی ہے۔"

اُنھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اتنا ہی سننے کے لیے آنکھیں کھولی ہوں۔ اُنہیں بستر پر لٹا یا گیا تو وہ آنکھیں مُوندے رہے۔ درد کا احساس کچھ دیر بعد شروع ہوا۔ جیسے جیسے اینستھیسیا کا اثر کم ہوتا گیا، تکلیف بڑھتی گئی۔ پھر تو حالت یہ ہو گئی کہ زور زور سے روتے اور کہتے "میرا گلا گھونٹ دو۔ مجھے مار ڈالو۔" روتے روتے ماں کو پکارتے "تو کہاں چلی گئی۔ جو کچھ پوچھنا ہے۔ پوچھ لے۔ میں چلا جاؤں گا تو روتی پھرے گی۔" پھر یکایک بڑے بیٹے کا خیال آجاتا "ابھی آیا یا نہیں یا مرنے پر ہی آئے گا۔"

اُن کے دونوں دوسرے بیٹے تھوڑی دیر کے بعد چکر لگا جاتے۔ بہن کو بار بار ڈاکٹر کے پاس دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا۔ کبھی وہ پیشاب نہ ہونے کی شکایت کرتے، کبھی کہتے میرا کولہا چھلا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی جب بے چینی بہت بڑھ جاتی ہے تو ماں کہتی "ڈاکٹر کو بلا لو۔ ان کی تو سانس ہی نہیں چل رہی ہے۔"

بہن بار بار سمجھاتی "آپ بار بار منھ سے بُری باتیں کیوں نکالتی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن تک تکلیف تو رہے گی ہی۔"

اُن کا بولنا اور زیادہ ہو جاتا "ان لڑکوں کو دو منٹ نہیں بیٹھا جاتا۔ یہ نہیں کہ دشرتھ جیسا باپ مر رہا ہے۔ آکر پوچھ لیں کہ پتا جی کیسے ہیں؟ ارے تم نہیں کرو گے تو کیا غیر کرنے آئیں گے۔ جا کر ڈاکٹر کے پاس ہو آتے ..."

بہن کو پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑنا پڑتا۔

چھوٹا ڈاکٹر ہنس کر کہتا "بڈھی کے مریض کو تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ چلیے میں آتا ہوں۔"

تب ان لڑکوں میں سے کوئی چکر کاٹ کر آجاتا۔ ماں پیار سے سمجھاتی۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ گے تو کوئی شان میں فرق نہیں آجائے گا۔ پتہ نہیں کتنے دن کے مہمان ہیں؟"

"بہن کو جب ہم پر اعتبار ہی نہیں تو ہم بیٹھ کر کیا کریں۔ وہی دیکھ بھال کریں۔"

"تم نے دو کے چار ہزار کیوں مانگے تھے؟"

"مانگ لیے تو کیا ہو گیا۔ وہ واہی بھی لُوٹنا چاہیں اور پیسہ بھی مل مل کر خرچ کریں۔ دونوں باتیں نہیں چلتیں۔ ہر وقت اُن کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے رہیں۔ دو چار سو روپے فالتو پڑے رہیں گے تو کام ہی آئیں گے۔"

کہتا ہوا وہ تیزی میں باہر نکل گیا تھا۔

بہن ڈاکٹر کو لے کر آئی۔ ڈاکٹر انجکشن کی سرنج بھرنے لگا تو پتا بولے "میرا سارا جسم چھید ڈالو گے کیا؟"

"دراصل انہیں انجکشن کے نام سے بچپن سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جب کہ پتا کے پتا زیادہ ماڈرن تھے۔ اُن کا زندگی بھر یہی خیال رہا کہ بغیر انجکشن کے نہ درد ٹھیک ہوتا ہے نہ بیماری جاتی ہے۔ وہ انجکشن کو پسند کرتے تھے۔ ایک تو رئیس۔ اور پھر انگریزوں میں اُٹھنا بیٹھنا۔ چار لفظ انگریزی بھی جان گئے تھے۔ ان کی موت کے بعد ماں کا پرسنل ڈاکٹر بتایا کرتا کہ کئی موقعوں پر جب اُنہیں دوا سے فائدہ نہیں ہوتا تو وہ ڈسٹلڈ واٹر کا انجکشن منگوایا کرتے تھے۔ انجکشن لگتے ہی اُنہیں آرام ملتا تھا۔ پتا بھی یہی مانتے تھے ـــــ کہ جب اُن کے پتا تھے تو اس وقت پتا کا کچھ مطلب ہوا کرتا تھا اور اب ـــــ؟ ان کی موجودگی میں کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ بغیر اجازت کبھی رات کو وہ حویلی میں سونے چلے گئے ہوں، جب تک وہ خود نہیں کہہ دیتے کہ رات بہت ہو گئی۔ جا کر سو جاؤ ـــــ اور اب تو پتا کو انتظار ہوتا ہے کہ بیٹے کو کب فرصت ملے اور بات کی جائے۔ بیماری کے دوران بھی وہ پتا کی باتوں کو یاد کیا کرتے تھے کہ کیا وہ پتا تھے اور ایک وہ پتا ہیں۔

پہلے کے پتا اور آج کے پتا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُنہوں نے کچھ بھی نہیں سوچا کہ تکلیف کے وقت بیٹا، بڑا ہو یا چھوٹا، باپ کو تکلیف سے نجات دلانے کی قوت رکھتا ہے۔ لیکن یہی سوچتے تھے کہ بڑا بیٹا آجائے گا تو انہیں تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ اُن کی موجودگی کاغذ پر رکھے وزن کی طرح ہو گی۔ اس کے عہدے رتبے کی وجہ سے ڈاکٹر بھی دھیان دیں گے۔ جب بھی پتا بڑے بیٹے کو پوچھتے تو ماں بہن کی طرف دیکھنے لگتی ـــ بہن منھ پھیر لیتی تو وہ کہتی ـــــ "اسے ایک کام تھوڑا ہی ہے۔ بہت کام ہیں۔ کام نپٹ جائے گا تو آئے گا۔"

جب ماں یہ باتیں کئی بار دُہرا چکی تو بہن کو غصہ آگیا۔ "آخر آپ مجھے سُناتی کیا ہیں۔ بھیا آجائیں تو اُنہیں سُنائیے گا۔"

"میں تو سمجھا رہی ہوں۔ دو ہزار بھیج دیا تو کیا فرض پورا ہو گیا۔"

"دے تو رہی ہوں چیک۔"

"چیک سے کیا ہونے جانے والا۔"

بہن خاموش ہو گئی۔ پتا پھر بڑبڑانے "سب کے سب کہاں چلے گئے۔ کسی کو فرصت نہیں۔ مجھے پیشاب جانا ہو تو کیا کروں۔"

"سب باہر ہیں۔ کمرہ اتنا چھوٹا ہے۔ لوگ کہاں بیٹھیں۔ کہو تو بلا لوں۔"

"مجھے پیشاب کرانے چلو۔"

"پیشاب کی نلی پڑی ہے۔ سب تھیلی میں اکٹھا ہو رہا ہے۔"

وہ پھر نادم ہو گئے ۔ "مجھے پیشاب کیوں نہیں کراتی ۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ۔"

بہن کو بیچ میں بولنا پڑا ۔ "آپ یہیں کر لیجیے ۔"

پتا کی آنکھیں نماسا لود ہو گئی تھیں ۔ انہیں کسی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھ باہر نکال کر بولے ۔ "میرے ہاتھ مٹی سے دھلوا دو ۔"

ماں بولی ۔ "ہاتھ کیوں دھوئے گے ۔ پڑے پڑے کہیں آدمی گندا ہوتا ہے ۔"

وہ پھر بولے ۔ "میرے ہاتھ کیوں نہیں دھلاتے ۔"

بہن نے ہاتھوں پہ ذرا سا پانی ڈال کر تولیے سے پونچھ دیا ۔ وہ پھر غفلت کی نیند سو گئے ۔ ماں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ۔ "تم لوگ تو دو چار دن میں راستہ لوگے ۔ یہاں ان کی بات بے بات کی صنکوت پوری کرے گا ۔"

"ایسی باتیں سوچنے سے کیا فائدہ ؟"

"ہے بھگوان انہیں گھسٹنا مت ۔"

بہن کو ماں کا یہ بڑبڑانا اچھا نہیں لگ رہا تھا ۔ وہ باہر چلی گئی ۔ باہر دونوں لڑکے سگریٹ پھونک رہے تھے ۔ ہر دم پر کھر کھر کر کے کھانس بھی رہے تھے ۔ بہن نے دیکھا اور چپ چاپ اندر چلی آئی ۔

بہن کو اندر لوٹتے دیکھ کر دونوں کھسک لیے ۔

بھائی تیسرے دن آئے ۔ پتا کافی کمزور ہو گئے تھے ۔ پیشاب کی مقدار بھی کم ہو گئی تھی ۔ دن بھر میں سات سو سی سی پیشاب ہوا تھا ۔ غفلت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی ۔ ماں ہر وقت وہاں رہتی ۔ پانی پلانے کی ذمہ داری انہیں کی تھی ۔ ڈاکٹر انہیں سے پوچھتے کہ پانی پلایا یا نہیں ۔ جو سمجھ میں آتا وہ کہہ دیتیں کہ اتنے گلاس ۔ ڈاکٹر چکر میں پڑ رہے تھے کہ اتنا پانی پلایا جا چکا پھر پیشاب اتنا کم کیوں ؟ پتا کو جب پانی پلایا جاتا تو وہ ایک آدھ گھونٹ پی کر منہ موڑ لیتے ۔ ڈاکٹر نے بھیا کو الگ لے جا کر کہا ۔ "دیکھیے صاحب ، ہمیں شک ہے کہ ان کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں ۔ اس سے پہلے کہ کوئی خطرے کی بات ہو ، آپ انہیں دلی لے جائیں ۔ ضرورت پڑی تو کم از کم ڈائلوسس تو ہو جائے گا ۔ یہاں تو اس کی بھی سہولت نہیں ۔"

بھائی نے فوراً ہی انتظام کیا ۔ حالانکہ ماں دلی جانے کے خلاف تھی ۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہاں لے جا کر ان کی مٹی کیوں خراب کرتے ہو ؟ کم از کم گھر کی ڈیوڑھی تو نصیب ہو جائے گی ۔ پہلے آ گئے ہوتے تو بات دوسری تھی ۔"

باقی دونوں بیٹے بھی لے جانے کے خلاف تھے ۔ وہ پیٹھ پیچھے کھسر پھسر کرتے ۔ "پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر آ گئے ۔ جب ضرورت تھی تب ہم مر رہے تھے وہاں سسرال جو ہے ، انہیں لے جا کر سڑنے کے لیے اسپتال میں ڈال دیں گے ۔ اور آپ سسرال میں مزہ ماریں گے ۔ ہم بھی تو ان کی اولاد ہیں ۔ ایک بار پوچھا تک نہیں ۔"

"ہر ایک کے سو ، سو ، پچاس ، پچاس روزانہ خرچ ہو رہے ہیں ۔ یہ خرچ کون پورا کرے ؟"

"چل کر کہتے کیوں نہیں ۔"

"مطلب ؟"

"تھیلا ہم نے ہے اور آپ دو چار ہزار روپے خرچ کر کے قابل بیٹے بن گئے ۔ ہم نالائق وہ لائق ۔"

"کوئی کسی کا باپ نہیں ۔"

"ٹھیک ہے جسے لے جانا ہو لے جائے ۔ ہمارا جو خرچ ہوا ہے ہمیں دے جائے ۔"

پتا کو ایمبولنس میں لٹا دیا گیا ۔ ایک ڈاکٹر بھی ساتھ جا رہا تھا ۔ بھائی نے اُن دونوں کے پاس آ کر کہا ۔

"تم لوگوں سے جلد بازی میں بات نہیں ہو سکی ۔"

وہ چپ کھڑے رہے ۔

بھائی نے پوچھا ۔ "کچھ کہنا ہے کیا ؟"

"نہیں تو ۔" گردن ہلا کر جواب دیا گیا ۔

"ڈاکٹر نے دلی لے جانے کی صلاح دی ہے ۔"

"اگر وہاں کچھ ہو گیا تو ؟"

"نہیں ۔ ایسا کیوں سوچتے ہو ۔"

"ہمارے پاس جو تھا سب خرچ ہو گیا ۔"

بھائی نے ان کی طرف دیکھا ۔ "کتنا خرچ ہو گیا ؟"

"سب کچھ تو ہم نے کیا ۔ بہن نے تو صرف دو ہزار روپے جمع کیے ۔"

"تو . . . . ؟"

اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ ماں بولی ۔

"ان بیچاروں نے اپنی اوقات بھر بہت کیا ۔"

"میں نے بہن کے ہاتھ روپے بھیجے تھے ۔"

"اُن روپیوں سے کیا ہوتا ۔ آپریشن کی فیس بھی پوری نہیں ہوئی ۔"

بھائی نے دھیرے سے کہا ۔ "ٹھیک ہے اپنے اپنے پرچے بنا کر دے دو ۔"

پرچے جیبوں میں تیار تھے ۔ جھٹ پٹ سامنے آ گئے ۔ بھائی نے الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ پھر جیب میں رکھ لیا ۔ "ٹھیک ہے ۔"

پتا ایمبولینس میں لد کر چل دیے ۔ سڑک پرانی اور ٹوٹی ہوئی تھی ۔ بھائی نے چھوٹے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ۔ پتا کو تکلیف ہو رہی تھی ۔ اُس نے انجکشن بھرا اور لگا دیا ۔ بھائی بار بار ڈاکٹر سے پھسپھسا کر پوچھ رہے تھے ۔ "کوئی گھبرانے کی بات ؟" ڈاکٹر ہر بار یہی کہتا ۔ "نہیں ، کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے ۔ کمزوری کی وجہ سے سر ہل ڈول رہا ہے ۔ سڑک بھی خراب ہے ۔ جب تک بنے گی نہیں ، اسی طرح جھٹکے لگتے رہیں گے ۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر ڈرائیور سے کہا ۔ "ذرا سنبھل کر ۔" سر کو بچانے کے لیے گردن کے دونوں طرف تکیے لگا دیے ۔

بھائی کے علاوہ گاڑی میں ماں اور بہن تھے ۔ ماں نے رونا شروع کر دیا ۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا مت لے چلو ۔"

چھوٹے ڈاکٹر نے کہا ۔ "آپ گھبراتی کیوں ہیں ؟ کمزوری کی وجہ سے بے ہوشی چھا گئی ہے ۔"

ماں بڑبڑاتی رہی ۔ "کم از کم وہاں ڈیوڑھی تو نصیب

ہو جاتی!"

بھائی کچھ بولے نہیں۔ پتا کی نبض ٹٹولتے رہے۔

اسپتال پہنچے تو آدھی رات بیت چکی تھی — بھرتی ہوتے ہی سب سے پہلے اُنہیں آکسیجن دی گئی۔ پھر ڈرپ لگا۔ ماں بہن دونوں کو بھائی نے ایک بینچ پر گدا بچھا کر آرام کرنے کو کہا۔ خود ایمرجنسی روم کے باہر بینچ پر بیٹھ گئے۔ بیچ بیچ میں کوئی چھوٹا ڈاکٹر یا نرس باہر نکلتے تو بھائی کھڑے ہو جاتے۔ کبھی وہ اندر سے لائی ہوئی پرچی پکڑا دیتے یا کبھی آگے نکل جاتے۔ بہن کو بٹھا کر بھائی دوا لانے دوڑ پڑتے۔ کبھی خود ہی پوچھتے۔ "کیا حال ہے ڈاکٹر؟" ڈاکٹر گردن ہلا کر رہ جاتا۔ کھلا جواب کوئی نہیں دے رہا تھا۔ گُل ملا کر اندر سے دو پرچیاں آئیں۔ کافی جدّ و جہد کے بعد ڈاکٹر کی آنکھوں میں پتا کی زندگی کو لے کر روشنی کی ایک کرن چمکی —— تب تک تو صبح ہو چکی تھی۔ ماں کئی بار رونا دھونا شروع کر چکی تھی۔ "میری کسی نے نہیں سُنی۔ وہاں اپنی ڈیوڑھی اور اپنے لوگ تو ہوتے۔ یہاں کون بیٹھا ہے؟"

دو ڈاکٹر باہر نکلے۔ اُنہوں نے بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر آگے بڑھ گئے۔ بھائی کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اندر مریض پڑا ہے اُس کے بارے میں دو لفظ کہنے کی بھی مہلت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد جونیئر ڈاکٹر باہر آئے۔ وہ بھی بھائی کی طرف دیکھ کر قریب قریب اسی طرح مسکرائے۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہ مکمل پن نہیں تھا، جیسا اُن دو سینیئر ڈاکٹروں کی مسکراہٹ میں تھا۔ بڑے ڈاکٹر کے مسکرانے کے ڈھنگ سے ہی لگتا تھا کہ مریض بچ جائے گا۔ اُن جونیئر ڈاکٹروں میں سے ایک جو شاید ابھی کافی کچّا تھا۔ بولا "اپنی ممی کو اندر بھیج دیں۔ مریض کو ہوش آگیا ہے۔ وہ اُنہیں بلا رہے ہیں۔"

بھائی ماں کو دروازے تک چھوڑ آئے۔ بھائی بہن ریلنگ پر جھک کر دو مختلف دشاؤں میں دیکھنے لگے۔ دوسرے کونے سے ٹیوب لائٹ کی مدّھم روشنی ابھی بھی اُن کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

نرس نے باہر نکل کر بہن سے کہا — "آپ لوگ بھی جائیے۔ آپ کے ڈیڈی بول رہے ہیں —

"لیکن اُنہیں زیادہ نہیں بولنے دیجیے گا۔"

بھائی بہن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اندر بڑھ گئے۔

اب پتا ڈوبتی آواز میں اُن دونوں کا نام لے کر پوچھ رہے تھے۔ "وہ پھر باہر نکل گئے۔"

"وہ آئے کہاں —؟"

پتا تھوڑی دیر چُپ رہے۔ بےہوشی کے عالم میں پھر بولے۔ "کہاں سے؟"

"تم دلّی کے اسپتال میں ہو۔ گھر نہیں!"

پتا چُپ ہو گئے۔ بیچ بیچ میں وہ ڈوب ڈوب جاتے تھے — اُبھرتے تو پوچھتے۔ وہ اب تک نہیں آئے —— کوئی مرے یا جیے۔ اُن کی بلا... ... سے...."

آگے آواز نہیں سنائی پڑی۔

"میں نے کہا نا کہ وہ آئے ہی کہاں ہیں۔ کوئی لاتا تو آتے۔ ایمبولینس چلی تو وہ بےچارے بےبسی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے!" ماں سسکنے لگی۔

بھائی پہلے تو ٹھٹھکے۔ پھر آگے بڑھ کر بولے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی اُنہیں جا کر سویرے لے آؤں گا۔ ڈاکٹر نے بولنے کو منع کیا ہے۔"

ماں کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا۔ بہن ابھی بھی دروازے پر کھڑی تھی۔ اور پتا پوچھ رہے تھے —— "وہ اب تک نہیں آئے.... اب تک"

(ترجمہ: مشرف عالم ذوقی)

بقیہ: ڈیفوڈل جل رہے ہیں

ہاں ایک بار سیکھ لو پتہ چل جاتا ہے کہ با معنی صرف پیار کرنا ہی ہوتا ہے۔ کیسے کیا جائے۔ یہ نہیں۔ بدلے میں پیار پانا تو بالکل نہیں۔ کچھ لمحوں کے لیے فرشتہ مل جائے تو اور بات ہے۔ مگر فرشتے چند لمحوں سے زیادہ نہیں ٹکتے۔

ایک بات اور۔ اگر گولڈی میری آخری رسوم بمبئی جا کر کرنا چاہے تو اُسے منع مت کرنا۔ اپنی لاش سے مجھے کوئی موہ نہیں ہے۔

میں نہیں جانتی، گولڈی جانتا ہے یا نہیں کہ میں جانتی تھی کہ مجھے 'لیوکیمیا' ہے، مگر وہ ڈاکٹر ہے وہ ضرور جانتا ہوگا۔

میں نہیں چاہتی کہ وہ میری سانسوں کو گنے اور ان کا حساب رکھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کتنا ہوشیار ڈاکٹر ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اُس کا حساب کتنا صحیح نکلتا ہے۔ لیکن دیکھو کیسا چکمہ دیا میں نے۔ جمع کے اعداد ہی بدل ڈالے۔ خود غرض لگی نا؟ سارا کریڈٹ خود ہی جو لے لیا۔

مگر ایک بات تو مانو گی اب جب بھی گولڈی میری موت کو یاد کرے گا تو اُسے برف یاد آئے گی۔ ٹھنڈی خوش نما اور آرام دہ برف اور یاد آئے گی ہم لوگوں کی ہنسی۔ میری اور تمہاری سچّی اور کھنک دار — میرے ساتھ ساتھ اُسے تم یاد آؤ گی۔ موت کی بجائے اُسے زندگی یاد آئے گی۔ خوش نما، سچی اور کھنک دار۔

ٹھیک ہوگا نا؟

—— رجنا

(ترجمہ: نند کشور وکرم)

پنکج بشٹ

آویدن کرو

اس رات سو سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا تھا جملہ آور فوجیوں جیسے خونخوار بادلوں نے کئی گھنٹہ پہلے شہر کو گھیر لیا تھا۔ شام اس دن ہوئی نہیں۔ ہلکے بادلوں والی شامیں کتنی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے بادلوں کی اوٹ میں مغربی افق ٹرانسپیرنسی میں بند تصویر سا دلکش لگتا ہے۔ پیڑوں اور اونچی اونچی بنی ادھوری عمارتوں کے پیچھے، لیکن اس شہر میں یہ سب دیکھنے سننے کا وقت ہے کس کے پاس، اس لیے یوں سیدھے رات کے اتر آنے سے کسی کو افسوس نہیں ہوا، حیرت بھلے ہی ہوئی ہو۔ اس شہر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لیے ہم سبھی اپنا استعجاب چھپائے رکھتے ہیں۔ ایک بنے بنائے جواب سے بچنے کے لیے کہ اجی! آج کل کیا نہیں ہوتا یا اس کا سبب یہ ہے کہ اگر آپ تعجب کا سبب جان لیں تو پھر اس کا مزا جاتا رہتا ہے۔ اس لیے ہم اپنے اندر اپنا استعجاب چھپائے رکھتے ہیں۔ کچھ پل کے اس داخلی سرور کے لیے جو دگرنہ کمیاب ہے، خالص شہد کی طرح۔

سو سال پہلے ۱۸۸۲ء میں جو بارش ہوئی تھی اس کے بارے میں دوسری صبح کئی اخباروں نے بتلایا۔ لیکن شام کو ہی لگ رہا تھا کچھ ٹوٹے گا ضرور پیڑ، پل، سڑک، مکان جھونپڑی۔

وہ کھڑکی سے سٹی چارپائی پر بے حد کاہلی

نام :	پنکج بشٹ
پیدائش :	۲۰ فروری ۱۹۴۶ء بمقام : ممبئی
تصانیف :	'پندرہ جمع پچیس' 'بچے گواہ نہیں ہو سکتے' (کہانیوں کے مجموعے) 'لیکن دروازہ' (ناول)
اعزاز :	اوم پرکاش اعزاز یافتہ
شغل :	سرکاری ملازمت
پتہ :	۹۔اے۔ دلشاد گارڈن دہلی ۱۱۰۰۶۳

میں پڑا جھول رہا تھا۔

"کھڑکی بند کر لو" بیوی نے اندر والے کمرے سے جو رسوئی کے کام بھی آتا تھا، کہا تھا۔

آندھی کا جھونکا سڑک پر یوکلپٹس کے پیڑوں کو ایسے ہلا رہا تھا جیسے شادیوں میں لوگ شراب پی کر جھگڑا کرتے ہیں۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں گھس کر ہوا چلتے ہوئے اسٹوو سے یوں چھیڑ خانی کر رہی تھی جیسے گلی کے لفنگے لڑکے کسی شریف عورت سے۔ سبزی شاید بن چکی تھی۔ روٹی توے پر ڈالتے ہی بیوی اسے بلائے گی۔ اگرچہ وہ بیوی کے بلانے کا انتظار کرتا ہے، لیکن چارپائی پر لیٹا لیٹا ہی جان جاتا ہے کہ کب پہلی روٹی سینکی گئی ہے۔ بُو سے نہیں بلکہ روٹی کے پھولنے سے کمرے کے درجۂ حرارت میں جو دباؤ پڑتا ہے اس سے۔ وہ اب بُو کے احساس سے عاری ہو چکا ہے۔ البتہ برسوں سے صرف ایک عجیب قسم کی بُو اس کے ہاتھوں سے آتی رہتی ہے تنگدستی میں اچانک ایک روٹی کا پھول جانا اس کی سانس پر دباؤ ڈالتا ہے اور وہ جان جاتا ہے کہ روٹی سینکی گئی ہے لیکن یہ دباؤ بس پہلی روٹی تک ہی اتنا شدید رہتا ہے۔ اس کے بعد سب معمول پر آ جاتا ہے اور بار بار کی پھولتی روٹیوں کے ساتھ اس کی سانسیں تال میل بٹھا لیتی ہیں۔

دھول دھیرے دھیرے تپنی کے سلیقے سے سجائے کمرے کو روندرہی تھی۔ کل صبح جب تپنی کو کمرہ صاف کرنا پڑے گا تب کوسے گی اسے: کوی جی کا کیا جاتا ہے۔ وہ تو ہوا پانی گرد و غبار بنادیں گے اور گھر کو گرد و غبار سے بھر کر چلتے بنیں گے۔

رکوی، لفظ گالی کی طرح ہے۔ وہ کسی بھی طرح سے کوی نہیں ہے۔ اس نے کبھی کویتا لکھی ہی نہیں۔ اسکول کالج کے دنوں میں مجبوری میں پڑھی کویتاؤں کے علاوہ اس نے کبھی کچھ پڑھا ہو، یاد نہیں پڑتا۔ پھر بھی وہ اس کو ٹوک نہیں پاتا۔

باہر آندھی کا زور بڑھتا جارہا ہے اور اچانک ایک جھونکا کارنس پر وجہ بے وجہ رکھے کاغذوں کو اڑا دیتا ہے۔ اپنی انتہائی کاہلی کے باوجود ایک اُڑتے کاغذ پر وہ اس تیزی سے جھپٹا جیسے تتلی پکڑنے کے لیے بچہ۔ اور اسے یوں ہی پڑھنے لگا۔ منا کی چٹھی تھی۔ پہلے جملے نے ہی اس کی طبیعت مضمحل کر دی۔ اس نے کئی دفعہ کہا ہے ان چٹھیوں کو سنبھال کر نہ رکھا کرو۔ آتے ہی فوراً پھاڑ کر پھینک دیا کرو جیسے وہ خود کرتا ہے۔ پھر بھی جہاں دیکھو یہی چٹھیاں۔ ڈاک میں اور کچھ آتا ہی نہیں ہے سوائے منا کی چٹھیوں کے۔ وہ چٹھیوں کو آتے ہی بنا پڑھے پھاڑ کر پھینک دینا چاہتا ہے لیکن کسی ڈراؤنی فلم جیسی یہ چٹھیاں اپنی وحشت انگیزی کے باوجود کھینچتی ہیں۔

"بھائی صاحب! اپنا شہر بھی بدل رہا ہے" منا نے لکھا "جہاں سڑکیں تھیں اب نالیاں نکل آئی ہیں نالیاں سڑکیں ہوگئی ہیں۔ ہم نے نچلی منزل ہی چھوڑ دی ہے۔ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ گھر کا گندہ پانی اب باہر نہیں جاتا البتہ ہم کبھی کبھی کھڑکیوں کے راستے آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ادھر گھر ایک لگاتار سرانڈ سے بھرا رہتا ہے۔ ہم لوگ سمجھ نہیں پارہے ہیں کہ یہ بدبو آخر ہے کیسی؟ اماں کا کہنا ہے بنوٹئے[1] کا پانی اتنا بدبو نہیں مارتا۔ بابوجی بھی اس سے متفق ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بدبو اسی پانی کی ہے جو کئی برسوں سے نچلی منزل میں جمع ہورہا ہے۔ اماں اس پہ اپنی ناک کی پٹی کھول کر غصے سے کہتی ہے تم سب بے وقوف ہو، یہ سرانڈ تمہارے سرٹیفیکٹ کی ہے، کیا بھائی صاحب یہ وجہ ہوسکتی ہے؟ یہاں میں نے کئی بار اپنے سارے سرٹیفیکٹوں اور ڈگریوں کو سونگھ کر دیکھا ہے وہ گل تو رہی ہیں لیکن بدبو شاید....

میں نے اس پہ ارمیلا سے پوچھا کہ دیدی تیرا کیا کہنا ہے؟ وہ پہلے تو کئی دن تک چپ رہی لیکن ایک دن جب اس بدبو پہ میرا اماں اور بابوجی سے زبردست جھگڑا ہوگیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ کیا کوئی آدمی بلاجب غیر متعلق رہ سکتا ہے۔ یوں معاملات سے قطع نظری غیر مناسب فعل ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ تب کہیں وہ بولی "قطع نظری کا سوال ہی نہیں ہے۔ اصل میں مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی کچھ محسوس ہی نہ کرے۔ یہ پہلے تو ایسی نہ تھی۔ میں اس بات سے کئی دن پریشان رہا کہ آخر ارمیلا دیدی اتنا گھبراتی کیوں ہے؟ شاید گھر میں سکون قائم رکھنے کے لیے کیوں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بدبو کی وجہ سے سو نہیں پاتا ہے اور مہینوں سے لگاتار جاگتے رہنے کی وجہ سے ہم اکثر اتنے چڑچڑے رہتے ہیں کہ بلیوں کی طرح آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ لیکن نہیں.... وہ شاید جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اس روز میں نے اسے صبح کے سورج کی تانہ روپہلی کرنوں میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں نے دیکھا ارمیلا دیدی کا چہرہ ٹھوس اور سپاٹ ہوتا جارہا ہے۔ کسی بھی طرح کا کوئی تاثر نہ تھا۔ "تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے؟"، جب میں نے پوچھا تو بولی "پتہ نہیں، دیکھو تو آج کل مجھے اپنے چہرے پر کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ میں نے جب انگلی سے اس کا چہرہ چھوا تو وہ پلاسٹر آف پیرس جیسا سخت لگا۔ بھور کی نمی سے ٹھنڈا یا۔ اس کے چہرے پر میری انگلی کا نشان اس طرح ابھر آیا جیسے پوس کی صبح کھڑکی کے شیشے کو چھودیا ہو۔ کیا بھائی صاحب یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان دیکھتے دیکھتے مٹی ہوجائے۔ بابوجی کا کہنا ہے پشتینی مکان کی بوسیدہ اینٹوں سے اڑرہی دھول اس کے گراز چہرے پہ جم گئی ہے۔

آج کل بابوجی احتیاطاً جہاں جہاں اینٹیں بھربھرا گئی ہیں کاغذ سے بھر رہے ہیں"

آخر میں اس نے لکھا تھا "بھائی صاحب! اب یہ بدبو مجھ سے سہی نہیں جاتی۔ میں وہاں آنا چاہتا ہوں ہاں! دیدی کی فکر نہ کرنا ابھی وہ صرف گردن تک ہی جمی ہے۔ اماں کل کسی طرح رسیوں کے سہارے اتر کر کہیں سے تعویذ لے آئی ہیں۔ ٹھیک ہو ہی جائیں گی۔ اور پھر بابوجی آگے کے لیے احتیاطاً تو برت ہی رہے ہیں۔" آپ کا منا" کے بعد اس نے پھر لکھا تھا "مکرر: اگر ہوسکے تو تب تک کے لیے 'خوب کھیلو' کا ایک کرکٹ نمبر اور کپل دیو کا ایک بلو اپ بھیج دینا۔

"سنتے ہو" تپنی نے آواز دی "کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے گھنٹہ بھر سے" کمال ہے وہ سوچنے لگا، یہ تپنی کے کان بھی...... اسٹوو کی بھائیں بھائیں کے باوجود سن لینا کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے وہ خود کو ملامت کرتا، اٹھ کر دھیرے دھیرے گلی کی جانب کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔

"کون؟" دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"میں" باہر سے تھکی سی آواز آئی "کیا منا ہوسکتا ہے!" یکبارگی یہ خیال اس کے دماغ میں کوندا۔ لیکن اس نے تو تب تک کے لیے کرکٹ نمبر منگوایا تھا۔ یہ منا بھی عجیب ہے اس کی ہر چٹھی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے اور کسی میں بھی تاریخ نہیں۔ اب بھلا کیسے پتہ چلے، کون سی چٹھی کب آئی؟ ہوسکتا ہے چٹھی پرانی ہو مگر اس نے کرکٹ نمبر بھیجا ہی کہاں! اصل میں کاہل تو وہ ہے ہی لیکن جب بھی وہ 'خوب کھیلو' خریدنے گیا ہے، تو پتہ چلا کہ وہ کب کا بک چکا ہے اور اگلا خصوصی شمارہ خریدنے کے لیے اسے لائن میں لگنا ہوگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ جمہوریت ہے اور سب برابر ہیں لیکن ساری رات اخبار کے دفتر کے باہر کرکٹ نمبر کے لیے لائن میں لگنا ممکن بھی تو نہیں ہے۔ آخر وہ شادی شدہ آدمی ہے۔

[1] برتن دھونے کی جگہ

وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکا لیکن "میں" کے جواب میں بعد میں "کون" پوچھنا اسے بے ہودہ حرکت لگی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

"آپ؟" کیا منا اتنا بدل سکتا ہے۔ وہ تذبذب میں تھا۔ اسے کیا ہوا ہوگا؟ کیا کہیں جھگڑا کر آیا ہے۔ وہ اس آدمی کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"میں ۲۰۱۹۹۸۴۳"

اتنا خون کیسے بہا ہوگا؟ کیا ایسی حالت میں جب کہ کسی کا سر اس بری طرح کچلا ہوا ہو اور مغز تک دکھائی دے رہا ہو اسے ہسپتال نہیں جانا چاہیے۔

"کون؟" وہ خون سے لت پت آدمی کو پہچان نہیں پا رہا تھا اس لیے پوچھنا مجبوری ہو گئی۔

"میں ۲۰۱۹۹۸۴۳ ہوں۔"

"لیکن ....؟" وہ گھبراہٹ میں کچھ اٹکا۔

"لیکن یہ نمبر تو منا کا ہے۔" اس نے کہہ ہی دیا۔

اس آدمی کے سر سے خون لگاتار ٹپک رہا تھا۔ اس نے پھر کہا "نہیں، ۲۰۱۹۹۸۴۳ تو میرا رجسٹریشن نمبر ہے۔ آپ نے ہی دیا تھا۔" اچانک سڑاند بڑھ گئی۔ اس نے خوف کے احساس میں مبتلا ہو کر دونوں ہاتھ پیچھے کر کے مٹھی بند کر لی (شاید اماں ٹھیک کہتی ہے) ہاں! اسی کا دیا ہوا نمبر ہے تب منا کا نمبر بھی آس پاس ہی ہوگا۔

"تمہیں 'کال لیٹر' ملے گا۔ ٹائپنگ ٹیسٹ تو تم نے پاس کر لیا تھا نا؟"

"آپ کو پتہ ہے میرا بیگ کہاں ہے؟" اس ۲۰۱۹۹۸۴۳ نے پوچھا۔

"بیگ؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"ہاں بیگ! اس میں بارہ سو روپے تھے سامان کے۔"

"نہیں تو۔" وہ سمجھ نہیں پایا یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے۔

"میرا بیگ جس میں سو سو کے آٹھ، پچاس کے تین، دس دس کے پندرہ اور باقی پانچ دو اور ایک کے نوٹ تھے۔"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"پر آپ وہاں تھے تو۔" خون آلودہ شخص نے کہا۔

"کہاں؟"

"صبح اس بھیڑ میں۔"

کمرے سے آتی ہلکی روشنی میں اس کی مٹ میلی دھاری دار پتلون کو دیکھ کر اسے یاد آیا۔

اس کی بس اچانک دفتر سے دو کیلو میٹر پہلے رک گئی تھی۔ ٹریفک آگے جام تھا۔ مئی کے گرم دنوں میں دن کے دس بجے آلو کے بوروں کی طرح آدمیوں سے ٹھسا ٹھس بھری بس میں بھلا کون بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اور پھر وہ تو کھڑا کھڑا ہی آ رہا تھا۔ بس کے جلدی چلنے کے آثار نہیں تھے۔ پہلے کھڑے ہوتے مسافر اترے پھر بیٹھے ہوتے مسافروں میں سے بھی کچھ نے سیٹ کا موہ چھوڑا۔ اور جب وہ دفتر وقت پر پہنچ پانے کی الجھن میں سگریٹ سلگا رہا تھا کہ کسی نے کہا۔ "ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سائیکل سوار بس سے ٹکرا گیا ہے۔" کام پر جانے والے لوگوں کی بھیڑ بسوں کے پیٹ سے نکل کر اس طرح پھیل گئی تھی جیسے چیونٹیاں بل میں پانی گھس جانے سے۔

وہ بھی دھیرے دھیرے چل کر وہاں پہنچ گیا جہاں بھیڑ نے گھیرا بنا لیا تھا۔

"مر گیا ہے۔" کسی نے کہا تھا۔

"نہیں ابھی جان ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"لیکن بچے گا نہیں۔" تیسرے نے کہا۔

"پولیس آ گئی ہے؟" چوتھے نے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں سامنے کون ہے؟" کسی اور نے اشارہ کیا۔

"لیکن یہ اس طرح کھڑی کیوں ہے؟" پہلے نے پوچھا۔

"ایمبولنس کا انتظار ہے۔" ایک اور نے کہا۔

"لیکن ایمبولنس آئے گی کیسے؟" کسی نے پھر سوال کیا۔

"ایسے تو مر ہی جائے گا۔" اس شخص نے پھر کہا جو پہلے اس کی موت کا اعلان کر چکا تھا۔

"لیکن انہیں اسے لے جانا چاہیے۔" ایک اور نے کہا۔

"یہ کام پولیس کا نہیں ہے۔" کسی اور نے کہا۔

"کیوں جی ٹریفک کب کھلے گی؟" اس نے بے فکری سے کھڑے سگریٹ پی رہے سپاہی سے پوچھا تھا۔

"جب ایمبولنس آئے گی۔" سپاہی نے کہا۔

"ایمبولنس کب آئے گی؟" اس نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

سپاہی اس پر جھلا اٹھا۔ "دیکھتے نہیں کیا، ٹریفک کس قدر جام ہے۔ ایک تو مر ہی رہا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو دو ایک کو ایمبولنس کچل دے۔ ارے، جب ٹریفک چلے گی تو ایمبولنس بھی آئے گی۔ عجیب بے وقوف مل جاتے ہیں۔" وہ جھینپ گیا تھا سپاہی کے جواب اور اس میں شامل لوگوں کی ہنسی سے جو اس کی حماقت پر انہیں آئی تھی۔ ہنسی سے ہی کھلبلی کے سبب بھیڑ میں پڑ گئی دراڑ سے اس نے ایک پل کو سڑک پر پڑے آدمی کا پیر دیکھا تھا جو مٹ میلے دھاری دار پتلون کے پائنچے سے ڈھکا تھا۔ تو کیا یہ وہی ہوگا صبح والا؟ اس نے سوچا لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا کیوں کہ اس نے سڑک پر پڑے ہوئے اس آدمی کا چہرہ تو درکنار ایک پیر تک نہیں دیکھا تھا اور وہ وہاں سے ہٹ کر واپس اپنی بس کے نزدیک جا پہنچا تھا اور وہیں بس کی چھاؤں میں کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اپنے دیش کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ دیش کے بارے میں تبھی سوچا کرتا تھا جب ذاتی طور پر بہت پریشان ہو جاتا تھا۔ جانے کب تک بس کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں کھڑا وہ سوچتا رہا۔ نہ ختم ہونے والی باتیں۔ اسی بیچ پولیس نے بھیڑ کو ہٹا دیا تھا اور جانے کیسے سواریاں ایک طرف دھیرے دھیرے کھسکنے لگی تھیں۔ وہ بھی لپک کر اپنی بس میں چڑھ گیا تھا۔

اگر یہ صبح کی بات کر رہا ہے تو وہی ہوگا۔ اسے یقین سا ہوتا جا رہا تھا کیوں کہ اس بیچ زبردست گڑگڑاہٹ سے پہلے جو بجلی چمکی تو اس نے اس کی روشنی میں جگہ جگہ رگڑ کھا کر پھٹی ہوئی خون آلودہ پتلون

کو دیکھ لیا تھا۔
"پانی برسے گا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"آپ کچھ بتا سکتے ہیں" خون آلودہ اجنبی نے
پھر پوچھا۔
"لیکن تم کو کال لیٹر کیوں نہیں ملا؟" اس نے ہی
سوال کیا۔
"آپ کے دفتر میں مجھے بتایا گیا کہ پچھلے جاڑے
میں ایک لیٹر میرے نام بھیجا گیا تھا"
"پھر بھی" اس نے کچھ حوصلہ مندی سے پوچھا۔
"لیکن ملا نہیں، شاید ٹھنڈ کی وجہ سے راستے میں
کہیں جم گیا"
"ٹھنڈ" اس نے دوہرایا "ٹھنڈ"
اجنبی خاموش رہا۔
"میں اس بار دیکھوں گا" اس نے تسلی دی۔
"لیکن جب تک ٹھنڈ پگھلے گی نہیں وہ نہیں
آسکتا۔ اس لیے میں اپنے روپوں کو ڈھونڈ رہا ہوں"
"آپ بتا دیجیے نا، آپ تو وہاں تھے"
"لیکن وہاں تو بہت لوگ تھے" اس بار
وہ کچھ جھنجھلا گیا "میں ہی تھا کیا وہاں؟"
"میں سب سے پوچھ رہا ہوں۔ جتنے بھی لوگ وہاں
تھے سبھی سے تو پوچھ رہا ہوں" خون آلودہ شخص نے
تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔
"لیکن کیا ثبوت ہے کہ تمہارے پاس اتنے پیسے
تھے؟" اس نے پوچھا اور دل ہی دل میں اس وسوسہ
پر غور کرنے لگا کہ کہیں یہ آدمی اپنا پھٹا ہوا سر دکھا کر
شریف لوگوں کو ٹھگ تو نہیں رہا ہے۔
"چاہو تو مجھ سے کچھ پیسے لے لو" اس نے پیچھا
چھڑانے کے لیے کہا اور بنا کچھ سنے مڑ کر اندر کی طرف
روپیے لانے چل پڑا۔ کتنے روپیے مناسب ہوں گے، یہ
فیصلہ کرنے میں اسے کچھ سیکنڈ لگے تھے۔ آخر چوٹ
تو لگی ہی ہے، یہ سوچ کر پانچ روپے کا نوٹ لے کر لوٹا۔
بادلوں کی گڑگڑاہٹ تیز ہو چکی تھی۔ آسمان
سنسان و تاریک تھا۔ مکان سڑکیں اور کھمبے بادلوں
کی گرج سے تھرا اٹھتے تھے، لیکن وہ خون آلودہ شخص نظر
نہیں آ رہا تھا۔ ایسی حالت میں آخر گیا کہاں ہوگا۔ وہ کچھ
سوچ میں پڑ گیا اور دو قدم آگے بڑھ کر کھوجنے کی
کوشش بھی کی لیکن آس پاس کہیں کوئی نہ تھا۔
چلو اچھا ہوا چلا گیا۔ اس قدر خون میں لت پت
آدمی سے کسی سمجھ دار آدمی کو اتنی دیر بات بھی نہیں کرنی
چاہیے۔ پولیس، فوجداری کے چکر میں کون پڑے۔
اس نے من ہی من سوچا۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی
جو چند قدموں کی دوری طے کرنے تک تیز بارش میں
بدل گئی۔ اس نے جلدی سے چٹخنی چڑھائی اور واپس
چارپائی پر دراز ہو گیا۔
نیند کے پہلے جھونکے کے ساتھ اسے یاد آیا،
کیا نمبر ۲۰۱۹۹۸۴۳ ابھی تک اسپتال نہیں گیا ہوگا۔
دوسری صبح کمرے کے فرش پر پیروں کے
نشان دیکھ کر وہ دہل گیا تھا۔ خون آلودہ قدموں کے
نشان جو باہر سے آئے تھے، اس کی چارپائی پر ختم
ہو رہے تھے۔ اس کی پتنی نے کئی بالٹی پانی سے رگڑ
رگڑ کر دھبوں کو صاف کیا۔ اس کے بعد ہی وہ بستر سے
اٹھا تھا۔ قسمت سے پتنی کو باہر نہیں صاف کرنا پڑا کیونکہ
اس رات سو برس کا ریکارڈ ٹوٹا تھا اور بارش نے خون
کا نام و نشان نہیں چھوڑا تھا۔
اس رات مارننگ ٹائمس میں شفٹ انچارج
سکسینہ تھے۔ جب سٹی ایڈیشن کا فرنٹ پیج انہوں نے
پریس میں بھیجا تب تک تو یو این آئی اور پی ٹی آئی
کسی کے "ٹکر" پر بارش کے بنائے ریکارڈ کی خبر نہیں
آئی تھی۔ آتی بھی کیسے، بارش تب تک تھمی نہیں تھی۔ ہاں
جہاں تک بارش کا سوال تھا اس پر انہوں نے چار کالم
کی رپورٹ جلی سرخی کے ساتھ شائع کی۔ شہر میں
زبردست بارش، کئی علاقے زیر آب۔ صفحہ پریس میں
بھیجنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ نے انہیں بتلایا کہ جو گاڑیاں
پہلی شفٹ والوں کو چھوڑنے گئیں وہ واپس
لوٹ نہیں پائی ہیں۔
پچھلے سو سالوں میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ پی ٹی
آئی نے اگلی دوپہر محکمہ موسمیات کے حوالے سے بتلایا۔
مئی ۱۹۰۹ء میں ۲۴ گھنٹہ میں ۴ سینٹی میٹر پانی برسا تھا
جو اب تک کا ریکارڈ تھا، لیکن ماہ مئی کے اس روز ۲۴
گھنٹہ میں ۱۲ سینٹی میٹر ریکارڈ توڑ پانی برسا اور درجۂ
حرارت ۲۵ سینٹی گریڈ یا کم سے کم ۶ ڈگری سینٹی گریڈ
پر جا پہنچا تھا۔ کیا کم ہوتا ہے اتنا گرنا؟
اور اسی دن ان کے سٹی رپورٹر کی پولیس کے
عوامی رابطہ کے آفیسر کے ذریعہ دی گئی اطلاع کے
حوالے سے تیسرے صفحہ پر چار پانچ لائن کی تین جملوں
پر مشتمل رپورٹ چھپی تھی: کنور سنگھ نامی ۲۸ سالہ
نوجوان چوراہے پر سٹی بس سے ٹکرا گیا تھا۔ پولیس
نے اسے فوراً اسپتال پہنچایا اور وہاں چار گھنٹے بعد اس کی
موت واقع ہو گئی۔ گریجویشن کے بعد کئی سال تک
بے روزگار رہنے کے بعد اس نے پچھلے برس قرض
ملنے پر خوانچہ لگایا تھا جس کا افتتاح وزیر اعظم نے
کیا تھا۔ رپورٹ میں کہیں نہیں لکھا تھا کہ اس کا ایمپلائمنٹ
ایکسچینج رجسٹریشن نمبر ۲۰۱۹۹۸۴۳ تھا ——
اس نے کچھ دیر سوچا پھر منا کو تار روانہ
کر دیا: خوانچہ خالی ہے . . . . .

بقیہ: وانگ چو

بیچارے کو پولیس والوں نے بہت پریشان کیا۔ شروع شروع
میں تو چوبیس گھنٹے کی نگرانی رہتی تھی۔ میں اس حوالدار
سے کہوں بھیا، تو کیوں اس بیچارے کو پریشان کرتا ہے،
وہ کہے، میں تو ڈیوٹی کر رہا ہوں . . . !"
میں ٹرنک اور کاغذوں کے پلندے لے آیا ہوں۔
اس پلندے کا کیا کروں؟ کبھی سوچتا ہوں اسے
چھپوا ڈالوں، لیکن ادھوری تحریر کو کون چھاپے گا۔
پتنی روز بگڑتی ہے کہ میں گھر میں کچرا بھرتا ہوں۔
دو تین بار وہ پھینکنے کی دھمکی بھی دے چکی ہے، لیکن
میں اسے چھپاتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تختے پر رکھ دیتا
ہوں۔ کبھی پلنگ کے نیچے چھپا دیتا ہوں، لیکن
میں جانتا ہوں کہ کسی دن یہ بھی گلی میں پھینک دیے
جائیں گے۔ (ترجمہ: خورشید اکرم)

ٹریفک جام

ہمارے اندر کوئی لگاتار چابک برسا رہا تھا۔ ہمارے
ہر بار ہمیں پہلے کی نسبت تیز رفتار ریس ڈال رہے
۔ ہم پسینے سے نہائے، منہ میں جھاگ بھرے ریس
ں کے گھوڑوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بچتے بچاتے
ٹکاتے سڑکوں کو جوڑتے گھٹاتے جب ہماری
ئیکلیں شاہراہ کے چوراہے پر ٹریفک پولیس کے
نارے پر رکیں تو بدامنی سے بھرے شہر کی دہشت
ا اٹھی تھی۔ دونوں بازوؤں پر جگہ جگہ کچے کوئلے
ںوں کی مانند جل رہے تھے اور آسمان میں بادلوں کے
ہر چیتھڑا ی لاشوں کی طرح سُرخ ہو رہے تھے۔ نیچے
ڑتے دھوئیں اور دھول کے بگولوں میں ہم چونک کر
لپلپاتے چھرے یا بم کی آہٹ کی شناخت کرنے
۔ ہم تین تھے ـــ میں، بھاسکر اور عباس۔ ہمیں
ٹریفک پولیس ہمیں روک رکھنے کی سازش کر رہی
یا پتہ نہیں اس کی پیٹھ پر کسی ریوالور کی نلی ہے جس
، وہ ہل نہیں پا رہا ہے۔ اُف گاڑیاں بھی کتنی ہو گئی
۔ تانتا ہی نہیں ٹوٹ رہا ہے۔

چند لمحوں کے بعد ٹریفک پولیس کا تنا ہاتھ
ریپٹ پر آ لگا اور دوسرا ہاتھ پھیل گیا۔ جادوگر
ارح اس کے اِنگی کرتے ہی مچھلیوں کی طرح اس
ت کا ٹریفک چیپٹا کر رینگنے لگا۔ سڑک کے بے شمار
ے اور ٹھوکروں میں ہچکولے کھاتے ہوئے ٹرکوں

کی غراہٹ، گیئر بدلنے کی گرج کے بیچ ہم مردم خوردں
کی چوٹوں سے بچ نکلنے کے رومانی لمحوں سے گزر
رہے تھے کہ اچانک ہمارے دیکھتے ہی پل کے پاس
کولتار کی سڑک پگھل اٹھی اور مستی میں اڑے جا رہے
پرندوں کے پر چپکنے لگے۔ پھڑ پھڑا اٹھیں، کلبلا اٹھیں
اور چیخیں۔ تیزی سے آگے بڑھنے کی غرض سے
بغل میں ایک متوازی لائن بھی کھنچتی گئی، بغیر اس کی
پروا کیے کہ ادھر کی گاڑیاں کیسے پار ہوں گی تیسری
قطار کی لکیر کھینچتا ہوا ایک بھاری بھرکم ٹرک اپنے
لمبے لمبے ڈینوں کو ہلاتے ہوئے اُڑا اور ریگی کے
" نو اوورٹیکنگ آن دی برج" کے بورڈ کے پاس
گڈھے میں بکھر گیا۔ ۔۔چھر۔۔ر۔۔۔ر۔۔۔ہیرے کے
ریزے کی طرح اجلی چینی کے دانے سڑک پر بکھر گیے۔
ٹرک کے پیچھے پیچھے چلنے والے ٹرکوں اور ان کے پیچھے
سرکاری جیپ کے بریک چی۔۔۔چ۔۔۔ی۔۔۔
کرتے ہوئے کس گیے۔ اس سے پہلے کہ جیپ کے
پیچھے بیٹھی زنانی سواریاں ہچکولے کھا کر سنبھلتیں کہ
پیچھے سے آرہے تانگے کے گھوڑے کا گھناؤنا تھوبڑا
ان کی گود میں آ گرا۔ خوف دہراس کی ملی جلی چیخیں۔ ہم
سائیکل سے اترے ہی تھے کہ ہم نے دیکھا۔ جیپ
سے اترے نوجوان نے پیٹی کھول کر چابک کی طرح
لہرادی ہے۔ باری باری سے گھوڑے اور تانگے

نام: سنجیو
پیدائش۔ ۱۹۴۷ء بمقام سلطان پور

تصانیف: کسن گڑھ کے اہیری سرکس، ساودھان!
نیچے آگ ہے (ناول)
تیس سال کا سفرنامہ، آپ یہاں ہیں
(کہانیوں کے مجموعے)

پتہ: مین لیباریٹری
آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی
کلٹی (مغربی بنگال)

والے پر سٹاک ... سٹاک ... تانگے میں زلزلہ آگیا ہے۔ تانگے والا درد سے بلبلا اٹھا ہے "حضور چھوڑ دیجیے۔ جانور ہے حضور! آپ کی طرح بریک نہیں لگا پاتا ..."

سٹاک! "ارے ارے سواریوں پر تو رحم کرو" تانگے پر سوار زنانی سواریاں برقعے سے ہاتھ باہر نکال کر تانگے سے بری طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ لگا کہ اب گریں کہ تب۔ "ابے تو اتنی تیزی سے ہانکنے کی کیا ضرورت تھی، جب روک نہیں سکتا" جیپ کی زنانی سواریوں کو گھورتے ہوئے ٹرک ڈرائیور سردار اسے ڈانٹتا ہے۔ پتہ نہیں اس کی یہ مہربانی تانگے کی سواریوں پر کیوں نہیں ہوتی۔

"بھاگ، سالے بھاگ" ایک ساتھ کئی دُردراہٹیں

"بھاگنے کی کوئی جگہ بھی تو بچی ہو سرکار"

پیٹنے والا مڑ کر دیکھتا ہے۔ بس سمیت پچاسوں گاڑیاں آجڑی ہیں ان کے پیچھے۔ اچانک مجھے سائیکل اور ساتھیوں کا خیال آتا ہے۔ میں پیچھے چل دیتا ہوں انہیں ڈھونڈنے۔ کچھ ہی ٹرکوں کے پیچھے گاڑیوں کے بیچ چپکا سا کھڑا ہے عباس۔ اپنی اور میری سائیکل کے ساتھ۔

"میں نے سمجھا تو بھی گیا" عباس جھلاتے ہوئے بولا۔

عباس کو سائیکل کی نگرانی میں چھوڑ کر میں پھر آگے بڑھتا ہوں۔ بھاسکر کی تلاش میں۔ اسکوٹروں اور سائیکلوں سے خالی جگہیں بھرتی جا رہی ہیں۔ تانگے والے کے پاس اب ایک نیا اُبال آگیا ہے۔ بس کے لڑکے اتر کر جیپ والے کو گالی اور مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ بھیڑ کی طرح ہجوم اب تانگے والے کا حمایتی ہوگیا ہے۔ نوجوان قوت کے اس طوفان میں بھاسکر کہیں نہیں ہے۔

ٹرکوں، گاڑیوں کے بیچ سے آگے گزرتے ہوئے ٹرک اور بکھری ہوئی چینی تک آپہنچا ہوں لیکن مجھے چیونٹے نظر آرہے ہیں — چینی پر پلے پڑ رہے ہیں۔ تھیلوں، تولیوں حتیٰ کہ جیبوں میں چینی بھری جا رہی ہے۔ کھُرچ کھرچ کر۔ — پولیس! پولیس! جی نہیں پولیس نہیں ہے۔ یہ خاکی وردی والے تو فائر بریگیڈ کی گاڑی کے جوان ہیں۔ رعب جما کر پل پڑے ہیں۔ چیونٹوں کے جھنڈ میں۔ چوری کی چینی۔ ٹرک کے ڈرائیور اور مزدور بھاگ چکے ہیں۔

بھاسکر کو کھوجتی ہوئی میری نگاہیں ان گنت چیونٹوں، مٹکوں کے جھنڈ، ٹرکوں بسوں کی چیسز سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہیں۔ میں آگے سرکتا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والوں کا ریلا سرک رہا ہے۔ بھاسکر کو تلاش کرتے ہوئے میں جہاں تہاں دیکھتے ہوئے بڑھتا جا رہا ہوں۔ آگے کا ٹریفک بھی ایک جیسا جام سامنے ہے ایمبولینس اس فوج کا سربراہ۔ اس طرف کے فوجی کمانڈر فائر بریگیڈ کی گاڑی کے بالمقابل۔ بڑبڑاتا ہے ایمبولینس کا ڈرائیور۔ "سالوں نے اتنا تک نہیں سوچا کہ پوری سڑک جام کر دینے پر ادھر والے نکلیں گے کیسے؟ ڈلیوری کیس ہے۔ ان کے باپ کا کیا!"

دھکے کھاتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔ گاڑیوں پر تحریر عبارتوں کو پڑھ پڑھ کر اندازہ لگاتے ہوئے کہ یہ دہلی کا ہے، یہ کانپور کا، یہ کلکتہ کا، یہ سردار جی کا ہے، یہ سنگھ کا، یہ ... بیکار ہے سب ایک جیسے ہیں۔

"ہم کتنی دفعہ بولا کہ زور سے پیڈل مارو ... زور سے پیڈل مارو مگر کہاں سنتا۔ لا کے پھنسا دیا نا پُل پر" رکشے پر اکیلے بیٹھے تُلک دھاری موٹے سیٹھ جی کی بڑبڑاہٹ۔

"سب کو ہمیں نے پھنسا دیا؟ آپ کو تو جا کے گدی پر بیٹھنا ہے اور یہاں سالی دو گھنٹے کی کمائی چوپٹ" کہتا ہوا رکشا چلانے والا آگے کی جانب دیکھتا ہے۔

"پانی! پانی ہے؟" ایک تجسس۔ شاید کوئی مریض ہے۔ رکشے سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔

"یہاں کہاں پانی ہے؟ ہاں نیچے پانی ہی پانی ہے" ایک فقرہ۔ میں چونک کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ ندی بہہ رہی ہے نیچے۔ بھاسکر کو ڈھونڈتے ہوئے کتنی دور چلا آیا ہوں۔ بیچ میں لٹکے ہوئے ہیں ہم۔ ڈوب مرنے کے لیے اس سے بڑھیا جگہ کون سی ہوگی" ایک فقرہ۔ چونک کر دیکھتا ہوں۔ نہیں بھاسکر نہیں۔ تاش کھیلنے والوں کا گروہ۔ تاش جمائے ہوئے۔

"اماں یار اتنی گاڑیاں پُل کی چھاتی پر سوار ہیں۔ اگر خدانخواستہ پل ٹوٹ گیا تو ...؟" ہر فقرے کے ساتھ تاش کا گرنا۔

"ہاں پُل کمزور ہے" یہ داخلے کے مقام پر لکھا ہے۔"

"معلوم ہے۔ گزشتہ ہفتے اس پل پر دو قدم آگے ایک ٹرک ریلنگ توڑتے ہوئے گیند کی طرح نیچے جا گرا تھا۔"

"کہاں؟"

"و ... ہ ... وہاں"

نظریں نیچے اندر کی جانب جھک گئی ہیں۔ ندی کے پانی میں پرچھائیاں تیر رہی ہیں۔ "کوئی نہیں بچا ہوگا؟" ایک گھبراہٹ۔

"ہاں کوئی نہیں بچا" ہنسی مذاق میں ابھرتا خوف۔ خوف میں ابھرتا ٹھٹھا مذاق۔

"کیوں ایسی منحوس بات کرتے ہیں آپ لوگ؟" بوڑھی سیٹھانی کا تھلتھلا ڈھیلا چہرہ مالا کے منکوں کو جلدی جلدی ٹٹولنے لگتا ہے۔ میری نظریں ایک ایک انسانی سر کی کڑی ٹٹولتے تھکنے لگی ہیں۔ بڑی مشکل سے سرک پا رہا ہوں۔ کہاں مر گیا بھاسکر؟

"کیا لولی سپاٹ (Lovely Spot) ہے" شاعر نما شخص اس منحوسیت میں بھی کہیں حسن کا ٹکڑا چن رہا ہے۔ "سرمئی اندھیرے میں پھیلی ہوئی ندی کی اپنی ہی رنگت ہے۔"

آواز سن کر اسٹیشن ویگن کھول کر پہاڑی تک اچک اچک کر دیکھنے لگتی ہے ایک نوجوان لڑکی۔ چست جینز اور گلابی گنجی جیبھتی ہے دھول اور تھکان بھری آنکھوں میں۔

"پاپا ریلی اے لولی سپاٹ — وی آر لکی ٹو انجائے" (Pope, really a lovely spot, we are lucky to enjoy)

"آئی سے کم ان سائیڈ۔ کم ان سائیڈ۔ ڈونٹ کری ایٹ اے سین" چیختی ادھیڑ گنجی چاند
(I say come inside,come inside.
Don't create a scene)

او... ہوں نہ پاپا۔ لاڈ میں لرزتی ہے لاڈلی۔ فقروں کا شور۔ موسم خوشگوار ہو چلا ہے۔ دوسرے ہی لمحے یہ پری قید ہو جاتی ہے اسٹیشن ویگن میں۔ پرستان اوجھل۔ سہانی شام رات میں ڈھل گئی ہے۔ مایوسی میں کسی کار کا ٹرانزسٹر چالو کر دیا جاتا ہے۔

"اجنبیوں سے گھرے اس ماحول میں کچھ بھی ہو سکتا ہے" ایک خدشہ۔

"نہیں، اس بھیڑ میں کچھ کر گزرنے کی ہمت شاید ہی کسی میں ہو" ایک دلاسا۔ بھیڑ ایک پل کو دشمن لگ رہی ہے۔ پھر دوست، پھر دشمن، پھر...

جی چاہتا ہے واپس چلا جاؤں لیکن اس وحشی شہر میں کسی ہم سفر کو چھوڑ دینا گوارا نہیں۔ ایک دوسرے کے تحفظ کا سوال ہے۔ دو دھندھناتی بھیڑ تک آخری بار ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لوگ اسٹیشن کی دھکم پیل کی طرح بلبلا رہے ہیں صرف ایک جانے پہچانے کندھے کی چاہ میں کتنے اجنبی کندھوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ بھیڑ کے پاس آکر دھند میں ڈوبے ایک ایک چہرے کو ٹٹول رہا ہوں۔ بھیڑ کے سیلاب پر تیرتے انسانی سروں میں ایک بھی اپنا نہیں۔ یہاں پتہ چلتا ہے پاس سے گزرتے ہوئے ایک مونگ پھلی والے کو کار کا دروازہ کھلنے سے چوٹ آگئی ہے۔ لوگ اپنے خوانچے کی بکھری مونگ پھلیاں چن کر بس کی چھت پر رکھوا رہے ہیں۔

مونگ پھلی والے کو ہاتھوں ہاتھ کاریوں کی چھتوں پر سے گزار کر ہسپتال پہنچانے کی جگت ہو رہی ہے۔ ٹرک کے اوپر کھڑا اخلاصی دور دور تک دیکھتا ہے۔ اُدھر بھی کیچا کیچ، اِدھر بھی کیچا کیچ۔ پاؤں چپ چپے سیال پر پڑتے ہیں۔ کیا پتہ پٹرول ہے یا ڈیزل ہے۔ مونگ پھلی والے کا خون یا کار مالک کے پان کی پیک۔ ہمدردی سے اپنی منزل تک پہنچتا ہوں تو آگے بڑھنے سے زیادہ ضروری پیچھے لوٹنا معلوم ہوتا ہے۔

"ارے باپ رے۔ مار ڈالا" کسی کے پاؤں کچل گئے شاید میرے جوتے سے۔ میں خود ان کے لیے مصیبت ہوں۔ معافی مانگتا ہوا لڑکوں کے اغل بغل سے آگے کھسکتا ہوں۔ یہاں ایک کا وجود دوسرے کے لیے مزاحمت ہے۔

"دیکھا بھئی جیب کترے ٹہل رہے ہیں۔ ہڈیوں میں خوف لاوے کی طرح رینگتا ہے۔ کہیں لوگ سچ مچ جیب کترا مان کر پل پڑے تو؟ بھیڑ کا کیا بھروسا۔ بھاسکر کو گالی دیتا ہوں پھر اپنے کو پھر عباس کو۔

"اوآں! اوآں" خوف سے سیٹھ جی رکشے پر اچھل پڑتے ہیں۔ ایمبولینس کی گاڑی سے آرہی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز کا تشکوک بھرا تجزیہ کرتے ہیں۔ ایمبولینس کی طرف اچک اچک کر جھانک رہے ہیں، وہیں سے۔

"ایک لڑکے کے رونے پر چونک پڑے سیٹھ جی، کیا پتہ بلی بنتا ہے یا شیر" ہنس رہا ہے رکشے والا۔ ایمبولینس کا ڈرائیور تانک جھانک کر رہے لوگوں پر جھلا رہا ہے "ارے میرے باپ لوگ، شرم حیا نہیں ہے، کیا دیکھتے ہو؟"

"اپنی پیدائش" ایک ڈھیٹ جواب چاروں طرف سے بھونپو گھنٹیاں اور مڈگارڈ پیٹنے کا شور۔ ایک ہی فقرے سے وہ ہیرو بن گیا۔

"سالا دو گھنٹے سے ٹریفک جام ہے، جو نہ ہو جائے وہ کم ہے"

بھناتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک شخص ٹرک میں لگے بڑے کنستر سے پانی پی رہا ہے۔ شاید وہ پانی مانگنے والا مریض پانی کی تلاش میں یہاں تک گھسٹتا چلا آیا ہے۔ اندازہ لگاتا ہوں چینی والا ٹرک کتنی دور ہے۔ جغرافیہ بدل گیا ہے۔ بند دیست میں اور بھی سڑاؤ آگیا ہے۔ دیسی شراب کی بدبو۔ رکشے پر کوئی پینیچر پیکڑ رہا ہے۔ کہیں سے ٹپک پڑا ہے۔

"اے اور رکشے والے ادھر کا ہے کو گھسیڑ رہا ہے" اپنی جیب کے سامنے لکشمن ریکھا کھینچ کر ڈانٹتا ہے افسر۔

"حضور! بوکھلا گیا ہے رکشے والا۔

"کتنا ٹیکس دیتا ہے سڑک کا؟" ایک تنی ہوئی آواز۔

"کیا بولا؟" بولتے ہوئے خماری ٹوٹتی ہے پیکڑ کی اور اس کے ساتھ ہی وہ اتر پڑتا ہے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اینٹ روڑوں کی لکشمن ریکھا توڑتے ہوئے شہیدی انداز میں بھبھکتا ہے۔ زیادہ روڈ ٹیکس دے کر سڑک بیاہ لی ہے اپنے نام کیا؟ یا سڑک تمہارا باپ تمہارے نام کر گیا تھا۔ آج زیادہ روڈ ٹیکس دے کر ہم کو سڑک سے نکالو تم، کل زیادہ انکم ٹیکس دے کر ہماری رہی سہی املاک نیلام کروا لو۔ پرسوں زیادہ مال گزاری دے کر ہمیں جلا وطن قرار دے دو"

مجمع اکٹھا ہو گیا ہے۔ بس سے اتر اتر کر لوگ ارد گرد بچی کھچی جگہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ اندر ہی اندر غصے میں اینٹھ رہا ہے افسر۔

"کوئی سالا امیر کیسے بنتا ہے اس دیش میں، ہم سے پوچھو" بھبکے کا دوسرا دور۔

"بتاؤ، بتاؤ منوج کمار بتاؤ" بھیڑ سے نکل آیا ہے کوئی جمورا۔

"اے گالی مت دو، نہیں تو! دیکھو اگر کوئی سالا قانون مانتا ہے۔ ٹیکس سے بچانکی نہیں دیتا تو امیر نہیں بن سکتا۔ کوئی دھرم پتر دھرم مانتا ہے، اس کے اصولوں پر چلتا ہے تو امیر بن نہیں سکتا۔ کوئی دیش بھگت دیش مانتا ہے تو اس کنگال دیش میں امیر بننے سے پہلے خودکشی کو بہتر سمجھے گا"... باغی کی تقریر میں فرق آگیا ہے۔ افسر ایک پولیس کے سپاہی کو لاچکا ہے۔ شاید دور ہی سے ٹرک کی چینی کو سونگھتا ہوا ادھر ہی جا رہا تھا کہ صاحب نے پکڑ لیا ہے۔ اب انہوں نے پیکڑ کو للکار دی ہے چوتڑ پر ایک دھول۔

"چل سالے بھاگ یہاں سے۔"

"ہم سالا پیسہ دے کر پیتا سپاہی جی۔ آپ تو حرام کی۔۔" اور ایک تھپڑ پڑتے ہی گر کر اٹھتا ہے پیکرٹ۔ جیب سے دو روپے نکال کر سپاہی کے پاؤں چھو کر گڑگڑاتا ہے۔

"چل سالے بھیجتے ہیں حاجت میں۔"

"نہیں مائی باپ ہم پیئے گا نہیں تو تم جیئے گا کیسے؟ نس بندی۔ نل بندی ب ب۔۔۔ الٹی۔ بدبو سے ناک پھٹنے لگی ہے۔ سالا جہنم ہے۔ گاڑی کو بدبو میں ڈوبتی چھوڑ کر بھیڑ خود چھٹنے لگی ہے۔

پولیس کا سپاہی بدک کر الٹے ہوئے ٹرک کی طرف چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگتا ہے۔ اس کی شخصیت کا فائدہ اٹھا کر میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ اس کوشش میں کہنی چھل جاتی ہے۔ ایک بار پھر اپنے کو کوستا ہوں۔

چیونٹیوں اور چیونٹوں کی بھیڑ اب بھی دانے ڈھونڈ رہی ہے۔ مڈگارڈوں پر ڈنڈا پٹکارتا سپاہی کسی کو دبوچ لیتا ہے۔

"ابے کون مار رہا ہے مڈگارڈ پر۔ ایک ٹرک ڈرائیور کی دبنگ آواز۔ سپاہی ٹارچ جلا کر اپنی پوری شخصیت میں تنتا ہے۔" لوٹنے کے لیے جام لگا رکھا ہے سالوں نے۔ باپ کی چینی ہے اور باپ کی سڑک۔"

"انتہائی بے انصافی۔ چینی کی لوٹ ہو اور پولیس دیکھتی رہ جائے۔" اندھیرے میں ایک فقرے کا بلبلا ابھرا۔

"کون ہے ذرا ادھر تو آؤ۔ چوری اور اوپر سے سینہ زوری!"

"اٹھا کر پھینک دو سالے کو نیچے ندی میں۔ اس سے پوچھو اس کے آقا لوگ کہاں ہیں؟"

"ایک خاکی وردی کیا پا گیا۔ رنگ جمانے چلا آیا۔ یہاں سالے خود پھنسے پڑے ہیں۔ تین تین گھنٹوں سے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے!"

بھیڑ کے بہادروں کی آواز۔ ان گنت بھونکتے کتوں کے بیچ پھنسا اکیلا بھیڑیا۔ سپاہی کھسیا کر بھیڑ میں گم ہونا چاہتا ہے مگر ٹریفک اس قدر جام ہے کہ اس کی کوشش مضحکہ خیز ہو رہی ہے۔ پاس آکر پولیس کا سپاہی اپنی جیب ٹٹولتا ہے۔

"کیا ہوا سپاہی جی! کتنے تھے؟"

"دو سو سے کچھ زیادہ ہی۔" ہوائیاں اُڑ رہی ہیں خاکی وردی والے کے چہرے پر۔

"اتنے پیسے ایک دن میں اُگاہ لیتے ہو سپاہی جی۔"

"ڈاکو کے گھر میں ڈاکہ" ڈنک سہنے کو مجبور ہے غیر محفوظ محافظ۔

"بھئی ایک بیڑی تو دو۔" رکشے والے پر تنا رہنے والا گھونسہ التجا میں بدل گیا ہے۔

"بھائی۔۔۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ جس منہ سے ماں بہن کے لیے گالیاں دیتے آئے تھے آج اچانک بھائی، یہی ہوتا تو اتنا وبال کیوں کھڑا ہوتا۔"

"دے دو یار!"

سپاہی سارا رعب داب بھول کر اپنے پن کے سہارے گھس بیٹھ کرنے میں لگا ہوا ہے جیسے کوئی پرندہ کانچ کی دیوار میں داخل ہونے کے لیے پر پھڑپھڑا رہا ہو۔

بیچ کی باڑ اور بھی گھنی ہو گئی ہے۔ میں دیگر پیدل چلنے والوں کی طرح ریلنگ پکڑ پکڑ کر سرک رہا ہوں۔ ذرا سا بھی پاؤں پھسلے تو سیدھے ندی میں۔ کچھ ہی دور سرک پایا ہوں کہ ریلے سے بچھڑ جاتا ہوں۔ سامنے بیٹھی کچھ عورتیں ریلنگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ پاس آتے ہی دھند کچھ چھٹتی ہے تو بدکتا ہوں۔ تو کیا یہ عورتیں نبٹنے بیٹھی تھیں۔ پاؤں میں اب تک چپکی ساری سوئی چپچپاہٹ جاگ پڑتی ہے۔ اب۔۔۔۔! پاؤں کا جوتا ٹرک کے ٹائر سے رگڑتے ہوئے سوچتا ہوں۔ کیا کیا جائے۔۔۔۔! اس کائنات میں کہاں ہوں۔ میرا وجود کیا ہے؟ دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹرکوں بسوں کاروں کی روشنیوں کے مایا محل۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہو گا محلے میں، گلی میں، گھر میں۔ ہر روز ہی تو ستھرگوے پھٹتے ہیں۔۔۔ اور پھر بھاگ دوڑ، پولیس کی گشت اور کچھ بے گناہوں کو پکڑ کر خانہ پوری کا ایک معمول۔ اس مایا محل کی صف آرا روشنیوں میں دہشت دپ دپ جلتی سی لگتی ہے۔

پتہ بھی نہیں کب روشنیاں پگھلیں اور میں پیدل چلنے والوں کے ریلے میں بہہ نکلا۔ پتھر کی طرح لڑھک رہا ہوں کہ کسی جانے پہچانے گھاٹ پر ٹھٹھک کر دیکھتا ہوں۔ ارے یہ تو شاید وہی تانگے والا ہے اب شاید مرہم پٹی ہو چکی ہے۔ اور یہ غراہٹ۔۔۔ کسی پر بگڑ رہا ہے نوجوان؟ اب چابک کا نشانہ کون ہے؟

"بتائیے صاحب۔ جیپ میں بھلے گھر کی عورتیں ہیں، یہ کہاں کی شرافت ہے بتی جلا کر بار بار گھورنا؟ تانگے والا نوجوان کا حمایتی بن گیا ہے۔

"کون؟"

"وہی ٹرک کا سردار ڈرائیور اور کون؟"

"آپ کو پٹی کس نے باندھی؟"

"صاحب نے۔"

"مارا کس نے تھا؟"

"وہ تو غصے کی بات تھی۔ اب ہمارا ابھی گھوڑا سالا ایک دھامڑ۔ میم صاحب لوگ تو ڈر کے مارے مر ہی جاتیں۔"

تانگے والے، جیپ والے اور ٹرک والے کی مقابلہ آرائی ایک بار پھر بدلی ہے لیکن بھیڑ کی رائے عامہ اس بار اس معاملہ سے ہٹ کر ہمہ پہلوی ہونے لگی ہے۔ اس میں اڑا اڑا میں بھی بھنے لگا ہوں۔

بھیڑ جھولے کی پینگ کی طرح دونوں طرف جھولتی ہے۔ لوگ ٹوٹتے ہیں، مکان کی طرح اور کسی گاڑی یا آدمی پہ بھربھرا کر گرتے ہیں۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر آگے بڑھنے کی ہوڑ پھر لگ گئی ہے۔ بلوہ ہو گیا ہے۔ بدمعاش ٹرکوں کاروں وغیرہ کی باڑیوں کو پھلانگ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

امن پسند لوگ ایسا نہ کرنے کا اپدیش دے رہے ہیں۔ گاڑی والوں کی مزاحمت کام نہیں آ رہی ہے "بھیڑ واد" مجھ میں بھی حوصلہ پیدا کرتا ہے اور میں بھی اپنے آپ کو سردار جی کے ٹرک پر چڑھا ہوا پاتا ہوں۔

"نہیں مانیں گے آپ لوگ۔" سردار جی کی آواز اور ایک تیکھا غلیش۔

میں اتر تو گیا ہوں لیکن آ گے ہر گاڑی والا ہر پیدل چلنے والے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ آدم خوروں کے جنگل کے قانون میں تھوڑا پھیر بدل ہوگیا ہے۔ ابھی نہ ان کے پنجے تنے ہیں، نہ نکیلے دانت کھلے ہیں اور نہ ان کی غراہٹیں ہیں۔ کان پونچھ گرائے پڑے ہیں۔ یہ بھیڑوں کی طرح، مشتعل پیدل چلنے والوں کی زیادتی کو سہتے ہوتے۔ لیکن یہ کیا۔ بھیڑ پھر جم گئی اور میں اب ہل بھی نہیں سکتا۔ ایک بار عباس کو آواز دیتا ہوں، دوسری بار بھاسکر کو آواز دیتا ہوں مگر ہر بار جواب میں ان کی آوازوں کی جگہ دوسری آوازیں آتی ہیں۔ میں ایک ایسے جزیرے میں تبدیل ہوگیا ہے جہاں نہ کوئی ڈسپلن ہے نہ کوئی نبدوبست نہ کوئی راہ ہے اور نہ کوئی ضابطہ۔

"آخر کیسے ہوا یہ جام؟ آپ تو اُدھر سے آ رہے ہیں نا؟"

"آگے گڑھے سے توازن کھو کر ایک ٹرک الٹ گیا ہے۔"

"اس اندھی بدمست دوڑ میں نہ الٹنا حیران کُن ہوتا۔"

"اپنی منزل پر پہنچنے کی سب کو جلدی ہے۔"

"ارے صاحب! ان ٹرک والوں کی منزل میں جانتا ہوں۔ آگے سڑک کے دونوں طرف بنے چکلہ گھروں تک چلے جایئے، یہ وہاں لائن مار کر کھڑے ملیں گے۔ یہاں سے جتنی جلدی ہو، دبتے کچلتے صحیح غلط بھول کر چلے چلو ورنہ چکلہ گھر میں اگر ٹریفک جام ہوگیا تو۔۔۔" اجتماعی جھلاہٹ۔

"نہیں بھائی ادھر پٹرول پمپ پر بھی تیل کے لیے ٹرکوں نے دھرنا دے رکھا ہے۔ آج کوئی جلوس بھی نکلنے والا تھا اور شاید پوسٹ پر پولیس کی وصولی بھی۔"

"ہوں۔۔۔ کافی سنگین مسائل ہیں گاڑیاں بھی تو کافی بڑھ گئی ہیں۔ اب بھگتیے ان کی مار۔ پہلے ہی گاڑی ایک نہ ہو آپ کے پاس۔"

"بھئی جام یک لخت تو ہوتا نہیں، چینی کا بھاؤ، تیل کا بھاؤ، بجلی کا ابھاؤ، ایمانداری کا ابھاؤ۔۔۔ بھاؤ بھاؤ۔۔۔ ابھاؤ ابھاؤ۔۔۔ کمی کمی۔۔۔ عمل ردِعمل۔۔۔"

"کھر پتواروں کی طرح مسائل کو بے روک ٹوک بڑھتے رہنے دیجئے۔ ایک دن چکہ جام ہونا ہی ہے۔"

"کوئی بائی پاس ہے۔۔۔ کوئی بائی پاس۔۔۔ کوئی؟" کولتار سے چپکے پرندوں کی بے معنی چھٹپٹاہٹ، جھنجھلاہٹ بڑھ رہی ہے۔ گھڑی کی طرف بار بار دیکھنا۔" اف ذرا سی ذاتی سہولت کے لیے اتنے افراد کو اس مار ڈالنے والی حالت میں جھونک دیا گیا ہے۔"

"اب دیکھیے نا، 'نو اوورٹیکنگ آن دا برج' کے سائن بورڈ پر ہی اوورٹیکنگ ہوئی اور چوری کی چینی کا ٹرک بکھر گیا۔"

"آپ نے ٹرک کی باڈی پر لکھا وویکانند کا قول نہیں پڑھا۔ 'چالاکی کے ذریعہ کوئی بڑا کام نہیں ہوتا۔'"

"ایک بار گدی پر بیٹھ جانے پر ہم بھی اپدیش جھاڑ سکتے ہیں۔ لوگ مہاپرشوں کو ڈھال بنا کر لوٹتے ہیں۔"

"بھیا جو کچھ ہو اس تہذیب کا حشر بہت صاف دکھائی دے رہا ہے۔ تمام اخلاقیات نصیحتوں اچھے مقولوں کے باوجود ہم اپنی نیم چالاکی ہی سے بھسماسُر کی طرح جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔ یا مڈاسوں کی طرح زندگی کی حرکات چمکیلی بے جان دھات میں ڈھل جائیں گی۔"

"سچ۔ دائیں بائیں، کچلتے دھکیلتے آج ہم تہذیب کو گھسیٹ کر کہاں لے آئے ہیں۔"

"یہاں اس پل پر اس ٹریفک جام پر ہرنا کیشپ کی طرح زیریں لب شکی قتل گاہ پر اور انجام۔۔۔ آل آرڈیسٹانڈ ٹو پیرش ویدر گلٹی آر ناٹ"

ان سارے فقروں اور مکالموں میں نہ چاہ کر بھی شامل میں نے اب اپنی پیٹھ کسی ٹیکسی کی باڈی پر ٹیک دی ہے۔ آنکھوں کے سامنے کالا پردہ لہرا رہا ہے۔ کسی جانباز کے پروں کی سرسراہٹ۔ پست ہو چکا ہوں۔ کولتار سے چپکے پرندوں کی چھٹپٹاہٹ ناکام ہو رہی ہے۔ وقت چٹان کی طرح جم رہا ہے۔ تھوڑی ہی دوری پر پڑی ہوگی میری سائیکل اور کھڑا ہوگا عباس۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں پھر اسی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔ آدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے آدمی۔ گاڑی سے مقابلہ کرتی ہوئی گاڑی۔ مکان سے مقابلہ کرتے ہوئے مکان۔ ایک دوسرے کو کچلتے، نگلتے، کٹ کٹاتے سیلاب کے پانی کی طرح بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ زندہ ہی دیواروں میں چُن دیے جانے کا احساس۔ سچ ہم مڈاسوں اور بھسماسُر کی اولاد خود اپنے جال سے بچ نہیں سکتے۔

ترجمہ: نند کشور وکرم

بقیہ: ھیلیم

کچن بیڈ روم میں گھس آئے ہیں۔۔۔۔ تباہی مچا رہے ہیں۔۔۔۔ ایک ہاتھی نے آدمی کو اپنی سونڈ میں اٹھا دیوار پر دے مارا ہے۔۔۔ پلاسٹر آف پیرس کے بُت کی طرح آدمی ریزہ ریزہ ہوگیا ہے۔۔۔۔ ٹوٹے ہوئے ٹی وی ویڈیو، اسٹیریو ایرانی قالین پر بکھرے پڑے ہیں۔۔۔۔ ہاتھی ماروتی سے فٹ بال کھیل رہے ہیں۔۔۔۔ ٹڑا ہنس رہا ہے۔۔۔۔

صبح کی روشنی اور جانی پہچانی چیزیں، چہرے، آوازیں اسے تقویت دیتے ہیں۔ جانے پہچانے راستے پھر پھیلنے لگتے ہیں۔ پھیلتے جاتے۔۔۔۔ پھیلتے جاتے! وہ دوڑنے لگتی۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑیں اور ٹڑے کی ہنسی مصروفیت میں کھو جاتی۔ ساری مصروفیات کے باوجود کبھی کبھی ٹن انگ ٹن انگ سنگیت لوٹ آتا اور گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دیتے لگتیں۔ (ترجمہ: جیرامداس فلک)

سریش اُنیال

انسان کا لمس

آرکائیوز کا کام ابھیشیک نے اپنی مرضی ہی سے چنا تھا۔ اس کا کوئی بھی ساتھی اس کام کو نہیں لینا چاہتا تھا۔ دیسے تو ابھیشیک بھی نہ چاہتا لیکن اس کے ہاتھ کہیں سے بیسویں صدی کا ایک کیپسول لگ گیا تھا اور جب اس نے اپنے ڈی کوڈر سیٹ پر اسے چلا کر دیکھا تو وہ سچ مچ حیران رہ گیا۔ اس وقت سڑکیں زمین پر ہوتی تھیں اور پریمیٹو (Primitive) جیسی چار پہیے کی گاڑیوں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ غذا پانے کے لیے بھی وہ اناج کو معدنی تیل یا معدنی گیس کے ایندھن پر پکایا کرتے تھے۔ انھیں دن میں دو یا تین بار کھانا پڑتا تھا۔ منھ سے چپڑ چپڑ کرکے۔

اس کیپسول کو دیکھتے ہوئے اسے بڑی ہنسی آرہی تھی، لیکن بعد ازاں اس کے دماغ میں کچھ اور باتیں بھی آئیں۔ ان سو برسوں میں چیزیں بڑی تیزی سے بدلی ہیں۔ آج انسان وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو انیس۔ سو چھیاسی میں کر سکتا تھا۔ تب زمین کی آبادی تقریباً تین ارب تھی جو آج بڑھ کر پچاس ارب ہو گئی ہے۔ زمین کے ہر انچ پر ہر حصّے میں مکان ہیں۔ نہ کہیں کھیت، نہ جنگل۔ معدنی تیل اور پھر معدنی گیس تو سن دو ہزار دس عیسوی تک ہی زمین پر ناپید ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ایٹمی توانائی کا نمبر آیا . . . . اور کہاں بیسوی صدی کے آخری برسوں میں ایٹمی جنگ کی بات کرتے تھے اور کہاں دو ہزار پچاس تک آتے آتے

نام : سریش انیال

پیدائش : ۴ رفروری ۱۹۴۷

بمقام : دہرہ دون

تصانیف : دراصل، یہ کلپنا لوک نہیں (کہانیوں کے مجموعے)

ایک اجھیان اور ادارت)

شغل : رسالہ "ساریکا" کے شعبۂ ادارت سے وابستہ

پتہ : ۴۲۱۔ الیف، پاکٹ II میور وہار، دہلی ۱۱۰۰۹۱

حالت یہ ہوگئی کہ دھرتی کا سارا یورینیم، تھوریم ریڈیم وغیرہ ایندھن کی صورت میں خرچ ہوگئے۔ اگر سائنسدانوں نے شمسی توانائی کو بڑی مقدار میں برقی توانائی میں تبدیل کرنے کے طریقے نہ کھوج نکالے ہوتے تو نہ جانے کیا ہوگیا ہوتا۔

جب زمین کے ہر حصّے میں مکان بنے تھے تو بھلا کھیتوں کے لیے جگہ کہاں ہوتی اور اناج کہاں پیدا ہوتا۔ اب تو انسانی جسم کے لئے ضروری کاربوہائڈریٹ پروٹین وٹامن وغیرہ سمندری نباتات سے حاصل کئے جاتے ہیں، جنھیں کارخانوں میں پراسیس کرکے گولیوں کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہ گولیاں ایک بار لینے پر پورے ہفتہ تک اپنا اثر کرتی ہیں۔

ایسی حالت میں جب نہ اناج مل سکتا ہے اور نہ اسے پکانے کے لئے معدنی تیل یا گیس کی توانائی تو پھر بیسویں صدی والوں کی طرح کا کھانا کھایا ہی کیسے جاسکتا ہے۔ ان سب اشیاء کے نمونے تو عجائب گھر میں ضرور رکھے ہوں گے مگر اس اناج کو محفوظ رکھنے کے لئے جس طرح کے کیمیات کا استعمال کیا گیا ہوگا اس سے وہ کھانے کے قابل یقیناً نہیں رہا ہوگا۔

ابھیشیک کے دل میں آہستہ آہستہ بیسویں صدی کے بارے میں زیادہ جاننے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ صرف آرکائیوز ہی میں اسے بیسویں صدی کے کیپسول مل سکتے

تھے۔ لہٰذا وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح سے اس کا تبادلہ آرکائیوز میں ہو جائے اور جلد ہی اسے اس کا موقع بھی مل گیا۔

آرکائیوز میں اس کی ملاقات بابا سے ہوئی تھی۔ بابا کا نام سرکاری کمپیوٹروں میں تو ضرور کچھ نہ کچھ درج ہوگا لیکن لوگ انھیں تعظیم سے بابا ہی کہتے تھے۔ ان کی پیدائش اس صدی کے پہلے دن ہوئی تھی، ان کا بے مثل حافظہ ہی ان کی بنیادی خصوصیت تھی۔ اپنے بچپن کے واقعات انھیں جوں کے توں یاد تھے۔ شاید اسی قوت یادداشت

ابھیشیک کی جان کاری میں وہ پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ روٹی دال سبزی کا کھانا کھایا تھا۔ یہ نام ہی تو بتاتے تھے بابا نے اس دور کے کھانے کے۔ اس عہد کی ایک اور شے کا بابا اکثر ذکر کرتے تھے۔ یہ شے تھی فٹ بال۔ چمڑے کے ایک ہوا بھرے گولے کو ایک ٹیم کے لوگ پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے لکڑی کے ایک خانے میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ بابا کہتے تھے کہ انھوں نے ایسے کئی مقابلے دیکھے ہیں۔ دنیا کے لگ بھگ ہر دیش میں یہ فٹ بال کھیلا

کھلاڑیوں کو جوش دلا رہے تھے اور کھلاڑیوں کا کمال دیکھو، انھیں اس بات کی تو فکر ہی نہیں تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے کے کھیل میں وہ اپنی کتنی کیلوریز خرچ کر رہے تھے۔ اتنی محنت کا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا، آج جیسی بات ہوتی تو لوگ خود کھیلنے کی بجائے اپنے روبو کو کھلواتے، روبو کی محنت سستی پڑتی ہے اسے صرف چارج کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے بجلی تو سولر الیکٹرو سسٹم سے جتنی چاہو، آسانی سے مل جاتی ہے۔

کی وجہ ہی سے وہ ابھی تک کام کر رہے تھے۔ کسی بھی پرانی شے کے بارے میں جان کاری کی ضرورت ہو تو جب تک آپ کمپیوٹر کے بٹنوں کو دبا رہے ہوں گے، بابا ساری جان کاری آپ کو اپنی یادداشت کے بل بوتے پر فوراً دے دیں گے۔ پھر آپ اپنی تسلی کے لئے کمپیوٹر سے بھی پتہ کر لیجئے کیا مجال جزئیات میں بھی کوئی چوک رہ جائے۔

جاتا تھا۔ کتنی جگہ رہتی ہوگی تب لوگوں کے پاس!

بابا نے ایک کیپسول کو آرکائیوز کے ڈی کوڈر پر چلا کر اسکرین پر فٹ بال کے ایک ٹورنامنٹ کے کچھ میچ دکھائے تھے۔ یہ عالمی کپ کا مقابلہ تھا۔ سو سال پہلے انیس سو چھیاسی کا۔ ابھیشیک نے دیکھا کہ کھیلنے والوں میں جوش و خروش تو ہوتا ہی تھا۔ دیکھنے والے بھی بڑے پُرجوش ہوا کرتے تھے۔ لوگ اُچھل اُچھل کر

انسان کے لئے تو غذائی گولیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالانکہ سمندر میں نباتات کی کمی نہیں لیکن اس پر بھی آج کا انسان وہ غلطی کبھی نہیں دُہرانا چاہے گا جو اس کے اجداد نے کی، اپنا سارا معدنی سرمایہ ختم کر کے وہ لگ بھگ دیوالیہ ہو گئے تھے۔ اسی لیے سمندری نباتات کا استعمال بڑے نظم و ضبط کے ساتھ ہو رہا ہے۔ نباتات کے کنٹرول کے لئے باقاعدہ عالمی بحری تنظیم

بنائی گئی ہے جو تمام سمندری نباتات کی مالک ہے سمندری نباتات سے غذائی گولیاں بنانے والے سارے کارخانوں پر اسی کا کنٹرول ہے اور وہی دنیا کے ہر فرد کے لئے غذائی مقدار کا تعین کرتی ہے۔

غذا کے علاوہ ہوا میں آکسیجن کی مقدار بھی ایک ایسی شے ہے جو محنت کے راستے میں اڑچن ہے۔ بابا نے ابھیشیک کو بتایا تھا کہ پہلے فضا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آکسیجن میں بدلنے والے آلات کی ضرورت ہوتی ہی نہیں تھی یہ کام پیڑ پودے کرتے تھے۔ ابھیشیک کو حیرت ہوتی ہے کہ جو کام اتنے بڑے بڑے آکسیجن پلانٹ کرتے ہیں پہلے یہ پیڑ پودے ہی کر لیا کرتے تھے۔ درخت تو خیر ابھیشیک نے صرف پرانے زمانے کے کیپسول پر دیکھے تھے۔ ہاں کچھ پودے اس کے گھر کے گملے میں ضرور لگے تھے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ فوٹوسنتھیسز (Photo Synthesis) کے عمل میں یہ پودے کاربن ڈائی آکسائیڈ اندر کھینچتے اور آکسیجن چھوڑتے جاتے ہیں، پیڑ پودے یہ کام بڑے پیمانے پر کرتے تھے اور اس طرح دنیا کی اتنی بڑی آبادی کے لیے کافی آکسیجن تیار ہو جایا کرتی تھی، ابھیشیک کے لیے حیرانی کی بات تھی۔

وہ بیسویں صدی کے بارے میں جتنا زیادہ جانتا اتنا ہی اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اس زمانے کے لوگوں کے آرام و آسائش کو دیکھ کر اسے رشک آتا

فٹ بال کے مقابلوں میں وہ دیکھتا کہ درمیانی وقفے کے دوران کھلاڑی نیچے لیٹ کر لمبے لمبے سانس کھینچتے۔ ان کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہوتا۔ ہاپ رہے۔ اب جیسی بات ہوتی تو اتنی کم آکسیجن والی فضا میں ان لوگوں کا دم ہی گھٹ گیا ہوتا۔

لیکن نہ جانے کیا کشش تھی فٹ بال میں کہ ابھیشیک اپنے آپ کو اس کے بارے میں سوچنے سے روک نہیں پاتا تھا۔ وہ بابا سے اکثر فٹ بال کی باتیں کیا کرتا تھا۔ بابا نے اسے کئی عظیم فٹ بال کھلاڑیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ انھوں نے اسے پیلے کے بارے میں بتایا تھا۔ بابی مور کے بارے میں میراڈونا، رومے نگے، پاؤلو روسی، اروِن دیپ کر، سمیت راجپوت وغیرہ کے تیز طرار کھیل اور فٹ بال میں ان کے معجزے سناتے تھے۔ ایک دن ابھیشیک اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اس نے پوچھ ہی لیا —— "بابا کیا آپ نے بھی فٹ بال کھیلا ہے؟"

بابا نے اپنا چہرہ گھما کر ابھیشیک کی طرف کیا۔ ان کے چہرے سے کچھ ایسے مترشح تھا جیسے پوچھ رہے ہوں کیا تم نے وہی سوال پوچھا ہے جو میں نے سنا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک درد تھا۔

"بتاؤ نا بابا! کیا آپ نے بھی فٹ بال کھیلا ہے؟" ابھیشیک نے اصرار کے ساتھ پھر پوچھا۔

"ہاں اور نہیں" ان کے الفاظ کہیں دور سے آتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

"میں سمجھا نہیں بابا"

"آخری عالمی کپ فٹ بال میچ ۲۰۱۸ میں کھیلا گیا تھا۔ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بھارت عالمی فٹ بال میں چمکنے لگا تھا۔ ۲۰۲۲ کا عالمی کپ فٹ بال بھارت میں ہی ہونا تھا۔ ۲۰۱۰، ۲۰۱۴ اور ۲۰۱۸ میں لگاتار بھارت ہی عالمی کپ جیتتا تھا اور ۲۰۲۲ میں بھی لگ بھگ یقینی تھا کہ بھارت ہی جیتے گا۔ اس عالمی کپ کے لئے جو بھارتی ٹیم چنی گئی اس میں میں بھی تھا۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آخری عالمی کپ ۲۰۱۸ میں ہوا تھا"

"ہاں ۲۰۲۲ کا عالمی کپ کھیلا ہی نہیں گیا۔ گزشتہ کچھ برسوں سے کھیلوں کے دوران دم گھٹنے سے لوگ مرنے لگے تھے۔ ۲۰۱۸ کے عالمی کپ کے دوران ہی کم از کم دس کھلاڑی کھیل کے دوران ہی دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔ کئی ممالک نے تو کھیلوں پر پابندی لگا دی تھی۔ شطرنج ایسے کھیل زیادہ مقبولیت پانے لگے تھے۔ لیکن ہم لوگوں میں ایک جوش تھا، ہم جو فٹ بال کھیلتے تھے اور فٹ بال سے پیار کرتے تھے۔ سارے خطرات کے باوجود ہم نے بہت کڑی محنت کی۔ ایک طرح سے ہم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ۲۰۲۲ کا عالمی کپ جیتنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ایک کے بعد ایک کئی سارے ملک مقابلے سے اپنے نام واپس لینے کا اعلان کرنے لگے۔ تمام ممالک اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالنے لگے کہ ایسے سارے کھیلوں پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کیا جائے جن میں جسمانی محنت پڑتی ہے" اتنا کہہ کر بابا کچھ دیر کے لئے رکے۔ ابھیشیک نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بولنے میں شدید تکلیف ہو رہی ہو۔ کسی طرح ان کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ "اور مقابلے سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے اقوام متحدہ نے فٹ بال اور دیگر کھیلوں پر پابندی عائد کر دی۔ بھارت کو مجبوراً عالمی کپ کا اہتمام رد کرنا پڑا" یہ کہنے کے ساتھ ہی انھوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

ابھیشیک دراصل بابا کو دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ پوری رات وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے بابا کو انجانے میں جو تکلیف پہنچائی ہے، اس کی اب کس طرح تلافی کرے۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک بات آئی کہ کیوں نہ فٹ بال کے میچ کا انتظام کرایا جائے۔ ظاہر ہے کہ آدمی تو کھیل نہیں پائیں گے لیکن اگر روبوٹوں کو اس کھیل کے قابل بنایا جا سکے تو دیکھنے والے کی حیثیت ہی سے سہی فٹ بال کا مزہ تو لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں آتے ہی ابھیشیک خود ہی اچھل پڑا۔ اگلے دن صبح اس نے بابا سے اس سلسلے میں بات کی لیکن معاملہ اتنا آسان نہیں تھا۔

اس کے لئے کچھ چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک تو میدان کی۔ زمین پر تو میدان کے لئے کہیں جگہ نہیں ہوگی۔ ہاں سمندر کے اوپر ضرور ایک پلیٹ فارم بنایا جا سکتا ہے۔ اتنا بڑا کہ اس پر فٹ بال کا میدان ہو اور دیکھنے والوں کے لئے بیٹھنے کی جگہ کی گنجائش بھی۔ عام کارکن روبوٹوں سے تو کام نہیں چل سکتا! اس لئے کمپیوٹر سے روبو بنانے پڑیں گے۔ فٹ بال کے قاعدوں اور فٹ بال کھیلنے کے طریقوں کے پروگرام بنا کر انھیں فیڈ (Feed) کرایا جائے گا۔ ریفری کے کام میں تو خیر ٹیلی ویژن کیمرے کی بھی مدد لی جا سکتی ہے یوں بھی جب روبوٹوں کو بتا دیا جائے گا کہ کیا کرنا فاؤل (Foul)

ہوتا ہے تو وہ ویسا کریں گے ہی نہیں قواعد پر چلنے میں مشینیں آدمی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ایماندار ہوتی ہیں۔

اس سب کی ذمہ داری بابا نے اپنے سر پر لے لی۔ انھوں نے آرکا ریوز کے ڈائرکٹر کو یہ خیال بتایا۔ اور ایک نئے اور جوڑی کہ اس کھیل کے دیکھنے سے لوگوں کو تھرل (Thrill) ملے گا اور یہ تھرل ان میں جوش و خروش پیدا کرے گا کیوں کہ تھرل جیسی شے کا ملک بھر میں فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ ڈائرکٹر کو یہ بات پسند آگئی۔ اس نے معاملے کو کھیلوں کے محکمہ اور بعض دوسرے محکموں تک پہنچایا۔ کھیل کے ساتھ تھرل والا جو پوائنٹ جڑ گیا تھا اس سے تو لوگ یوں ہی اس کے حامی بن گئے۔ جب دور درشن سروے کے ذریعہ لوگوں سے رائے مانگی گئی تو سب نے حمایت کی کہ کھیل ضرور ہونا چاہئے۔

روبو بنانے والی ایک فرم کو خاص طور پر کمپیوٹری روبو تیار کرنے کا آرڈر دیا گیا۔ ان روبوٹوں کے لئے کھیل کے قواعد اور کھیل سے متعلق باریکیوں کا پروگرام بابا نے خود ہی تیار کر کے ان میں فیڈ (Foul) کیا۔ ان روبوٹوں کے نام پرانے زمانے کے فٹ بال کھلاڑیوں ہی کے ناموں پر رکھے گئے۔ دو ٹیمیں بنائی گئیں ایک بھارت کی اور دوسری باقی دنیا کی۔ عالمی ٹیم میں بیکن بائر تھا، پیسا ریلا تھا، بابی مور تھا، وول فینگ اوو رتھ تھا، مشیل پلاٹینی تھا، سٹین لی میتھیوز تھا، پیلے تھا، رومے نگے تھا، پاؤلو روسی تھا۔ گول کیپر پیٹر شلٹن تھا۔ اسی طرح بھارتی ٹیم میں پی کے بینرجی، سوبرت بینرجی، جیسے بیسویں صدی کے اور پربھات جوشی ارون دیپاکر، سمپت راجپوت وغیرہ اکیسویں صدی کے کھلاڑی تھے۔

دراصل پربھات جوشی کا نام ابھینیک کے اصرار پر رکھا گیا تھا۔ پربھات جوشی نے کبھی بین اقوامی فٹ بال میں بھارت کی نمائندگی نہیں کی تھی مگر ابھینیک کا کہنا تھا کہ یہ بین اقوامی فٹ بال کی بدقسمتی تھی کہ وہ پربھات جوشی کے کھیل سے محروم رہا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ تھا کہ پربھات جوشی دراصل بابا ہی کا نام تھا۔

بھارت اور بقیہ دنیا کی ٹیم کے درمیان پانچ میچوں کی سیریز رکھی گئی تھی۔ پہلا میچ دیکھنے کے لئے بھاری تعداد میں بھیڑ جمع ہوئی۔ بابا اور ابھینیک منتظمین میں تھے۔

سیٹی بجنے کے ساتھ ہی کھیل شروع ہوا۔ ابھینیک نے دیکھا کہ بابا ہی سب سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ مختلف کھلاڑیوں کے نام لے لے کر انھیں ہدایت دے رہے تھے حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ ان روبوٹوں پر ان کی کسی زبانی ہدایت کا اثر نہیں ہوگا۔ وہ تو اسی حساب سے عمل کریں گے جیسا کہ انھیں فیڈ کیا گیا ہے۔

پھر بھی کھیل بہت تیز اور بڑا صاف ہو رہا تھا۔ کہیں کوئی فاؤل (Foul) نہیں تھا نہ کسی کو چوٹ پہنچانے کی بے جا حرکتیں۔ لیکن گول نہیں ہو پا رہا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی گول نہیں ہوا۔ بابا کی طرف سے بنایا گیا پروگرام اتنا ٹھیک تھا کہ فارورڈوں کی ہر چال کا جواب ڈیفنڈروں کے پاس تھا۔ گیند کبھی ایک ٹیم کے گول کے منھ کے پاس پہنچتی لیکن اس کی دفاعی صف کو توڑ نہ پاتی۔ اسی طرح دوسرے گول کے منھ پر بھی دفاعی صف کی مستحکم دیوار ہی ملتی۔

بابا بار بار جھنجھلا رہے تھے۔ آخر گول کرنے کے لئے حملہ آور صف کی مہارت ہی تو کافی نہیں ہوتی۔ دفاعی صف کی چوک کا بھی اس میں دخل ضروری ہوتا ہے اور بابا ایسی بے ایمانی نہیں کر سکتے تھے کہ ایک ٹیم کی دفاعی صف کے لیے ایسا پروگرام بناتے کہ وہ گول کھا جائے۔

دوسرے تیسرے اور چوتھے میچ میں بھی صورت حال یہی رہی۔ دونوں فریق انتہائی کوشش کرتے لیکن گول ہی نہ ہو پاتا۔ اور فٹ بال کے میچ میں اگر گول نہ ہو تو اس میں مزہ آدھا بھی نہیں رہ جاتا۔ یہ سب دیکھ کر بابا بار بار کہتے کہ یہ آدمیوں کا کھیل ہے۔ مشینیں اسے نہیں کھیل سکتیں اور آدمی کو کھیلنے نہیں دیا جاتا۔ وہ جھلا رہے تھے۔ ان کھلاڑی روبوٹوں پر بھی اور خود پر بھی۔

پانچویں میچ کے دن ابھینیک کو یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ بابا میچ دیکھنے نہیں آئے۔ میچ شروع ہوا۔ ابھینیک کا دھیان ابھی گیٹ کی طرف تھا کہ بابا شاید آتے ہی ہوں۔ کھیل میں اس کی دلچسپی اب زیادہ نہیں رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی تعداد بھی کافی کم تھی اور جو لوگ تھے بھی ان میں جوش و خروش نظر نہیں آ رہا تھا۔

کچھ تماشائیوں کے منھ سے بار بار پربھات جوشی کا نام سن کر ابھینیک کا دھیان میدان کی طرف گیا۔ اس نے دیکھا کہ جس روبو کا نام پربھات جوشی رکھا گیا تھا، وہ آج کافی ڈھیلا کھیل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ کہیں وہ بھی بابا کی طرح کھیل کے اس پھیکے پڑ جانے سے ناامید تو نہیں ہو گیا ہے لیکن مشینوں میں احساس کہاں ہوتا ہے؟ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی پیدا ہو گئی ہو۔ لیکن ایسا ہونے پر تو اسے خود بخود میدان سے باہر آنا چاہئے تھا اور اس کی جگہ ریزرو روبو چلا جاتا۔ یا پھر پروگرام میں کوئی پھیر بدل کیا گیا ہو مگر ایسا تو بابا کے علاوہ اور کوئی کر نہیں سکتا تھا اور وہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگے۔

ابھینیک نے دیکھا کہ لوگ پربھات جوشی کے مت کھیل پر مذاق اڑا رہے تھے جب گیند اس کے پاس آتی اور وہ اسے نہ لے پاتا تو لوگ ہنسنے لگتے۔

کھیل ختم ہونے میں ایک دو منٹ رہ گئے تھے۔ ابھینیک نے دیکھا کہ پربھات جوشی کے کھیل میں جیسے جان آگئی ہے۔ وہ لپک کر فٹ بال کی طرف بڑھا اور اکیلا ہی گیند کو عالمی ٹیم کے گول کے منھ تک لے آیا۔ عالمی ٹیم کا کوئی دوسرا روبو نہ تو اس سے گیند ہی چھین سکا اور نہ ہی اس نے اپنی ٹیم کے کسی روبو کو پاس دیا۔

گول کے پاس پہنچتے ہی وہ یک لخت گھوما اور کسی دفاعی کھلاڑی کی طرح گیند کو گول سے دور دھکیلنے کی ابتدا کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ گیند اس کے پیروں پر تھی۔ اس کی اس حرکت پر عالمی ٹیم کی دفاعی صف کے کھلاڑی چکرا سے گئے شاید ان کے پروگرام میں یہ کہیں نہیں تھا کہ مخالف کھلاڑی اگر گیند کو گول کی طرف سے مخالف سمت کو ہٹ کرنے لگے تو یہ کیا کریں

عبدالبسم اللہ

مہمان دیوتا سمان

گرمی بہت تیز تھی۔ تین چار دنوں سے برابر لُو چل رہی تھی۔ جگہ جگہ موتیں ہو رہی تھیں۔ شہر کی سڑکیں چولہے پر چڑھے توے کی مانند تپ رہی تھیں۔ بڑے لوگوں نے دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگوا لی تھیں اور اُن کے نوکر انہیں پانی سے تر کر رہے تھے۔ دکانوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ پٹری پر بیٹھنے والے نائی خوانچے والے اور لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے اوور برج Over Bridge کے نیچے پہنچ گئے تھے اور شام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ رکشوں میں لوگ اس طرح دُبک کر بیٹھے تھے اگر جسم کا کوئی حصہ باہر نکلا رہے گا تو جل جائے گا۔ تقریباً سبھی کے رومال پسینہ پونچھتے پونچھتے کالے ہو گئے تھے۔ دیہات کے لوگ تو اپنے چہروں کو موٹے تولیہ یا گمچھے سے اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ وہ دُور سے ڈاکو جیسے دکھائی پڑتے تھے

پیدل چلنے والے لوگوں نے اپنے سر پر چھاتہ نہیں تو اپنا بیگ ہی رکھ لیا تھا۔ کسی کسی نے رومال کو ہی سر پر باندھ لیا تھا۔ ٹھیلوں پر بکنے والا پانی پانچ پیسہ گلاس سے بڑھ کر دس پیسے کے بھاؤ ہو گیا تھا۔ گویا گرمی نے اس شہر کے سماجی اور معاشی نظام کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ لوگ آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام تھے۔ مزے کی بات یہ کہ وہ گرمی کا کچھ بگاڑ

نام : عبدالبسم اللہ

پیدائش : ۵ جولائی ۱۹۴۹ء بمقام الہ آباد

تصانیف : ٹوٹا ہوا پنکھ، کتنے کتنے سوال (کہانیوں کے مجموعے)

مجھے بولنے دو، چھوٹے بتوں کا بیان (شعری مجموعے)

سمر شیش ہے، زہر باد، جھینی جھینی بینی چدریا (ناول)

اعزاز : جھینی جھینی بینی چدریا ناول کو ۱۹۸۷ء کا سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا

شغل : جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی میں لیکچرار

پتہ : شعبۂ ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نہیں سکتے تھے۔ لُو سے بچنے کے لیے البتہ اُنہوں نے اپنی جیبوں میں پیاز کی چھوٹی چھوٹی پوٹیاں رکھ لی تھیں اور شُکر منا رہے تھے۔

ایک چھوٹا سا پیاز سلمان صاحب کی جیب میں بھی پڑا تھا۔ اسے اُن کی بیوی نے چپکے سے رکھ دیا تھا۔ سلمان صاحب کو حالانکہ اس بات کا پورا پتہ نہ تھا لیکن وہ یہی مان کر چل رہے تھے کہ پیاز کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے پر ڈٹے ہوئے تھے کہ لُو کا پیاز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

سلمان صاحب اپنا سوٹ کیس اُٹھائے چھن چھن کرتی سڑک پر بڑھے جا رہے تھے۔ اُنہیں خواہش ہو رہی تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح اپنے سر پر رومال باندھ لیں یا تولیہ نکال کر چہرے کے ارد گرد لپیٹ لیں۔ لیکن قباحت کے خیال سے وہ ایسا نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کے علاوہ اُنہیں اس بات کی بھی جلدی تھی کہ وہ فوراً مسٹری لال گپتا کے گھر پہنچ جائیں۔ رکشا اُنہیں ملا نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے من کو یہ بھی سمجھاتے جا رہے تھے کہ اسٹیشن سے اس کا کمرہ زیادہ دُور نہیں ہے یہ بات مسٹری لال نے ہی اُنہیں بتائی تھی۔

سلمان صاحب مسٹری لال گپتا سے ملنے پہلی بار اُس شہر میں پہنچے تھے۔ مکان نمبر تو اُنہیں یاد تھا، لیکن محل وقوع کا پتہ نہیں تھا۔ انہیں پورا یقین

تاکہ وہ مشری لال گپتا کو ضرور ڈھونڈ لیں گے۔

مشری لال گپتا سلمان صاحب کے پڑوس ایک ایسا لڑکا تھا، جو قصبہ بھر میں اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے مشہور تھا۔

گپتا خاندان کا وہ پہلا نوجوان تھا جس نے گوشت کھانا شروع کیا تھا۔ وہ مسلمان ہوٹلوں میں چائے پیا کرتا تھا۔ جی ہاں، جس طرح بنارس کی یونیورسٹی ہندو ہے اور علی گڑھ کی یونیورسٹی مسلمان۔ ٹھیک اسی طرح اُن کے قصبے کے ہوٹل بھی ہندو اور مسلمان تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندو ہوٹلوں میں مسلمانوں کے لیے یا مسلمان ہوٹلوں میں ہندوؤں کے لیے داخلے کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ پھر بھی جو مذہبی لوگ تھے وہ اُسے بُرا سمجھتے تھے۔ سلمان صاحب کے پڑوسی دکی صاحب ہمیشہ مسلمان حلوائی کے یہاں سے مٹھائی منگواتے تھے۔ کیوں کہ شیو چرن حلوائی استعجب نہیں کرتا تھا۔

اُس قصبے میں اُن دنوں صرف ایک اسکول تھا۔ وہاں سنسکرت پڑھنا سب کے لیے لازمی تھا۔ چنانچہ سلمان صاحب نے بھی "رامہ رامو راماہ" پڑھنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اردو نہیں پڑھ سکے۔ جیسے مشری لال کے بابا گردھاری لال گپتا اپنے زمانے میں صرف اردو ہی پڑھ سکے تھے سنسکرت سیکھنے کا موقع انہیں نہیں ملا تھا۔ ایک تو وہاں کوئی دوسرے مدرسہ میں اُس کا انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ اس قسم کی مجبوریوں نے سلمان صاحب سے سنسکرت پڑھوائی۔ اور جب وہ اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر پہنچے تو وہاں بھی انہوں نے سنسکرت ہی پڑھی۔ انہیں یقین تھا کہ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ کہیں نہ کہیں سنسکرت کے لیکچرار ہو جائیں گے۔ پر ایسا نہیں ہوا۔ اور اب وہ اپنے ہی قصبے میں نئے نئے کھلے اسلامیہ مڈل اسکول میں ہسٹری پڑھانے لگے تھے۔

مشری لال جن دنوں انٹر کر رہا تھا، سلمان صاحب نے اُسے صبح شام سنسکرت پڑھائی تھی، اس لیے وہ انہیں اپنا استاد مانتا تھا اور اُن کے پاؤں چھوتا تھا۔ اب وہ بی۔ اے کر چکا تھا اور کسی کمپٹیشن کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ سلمان صاحب جب اُس کے شہر میں آئیں تو اس کے یہاں ضرور تشریف لائیں۔ مشری لال کی اس خواہش کو بلا توقع پورا کرنے کے لیے ہی وہ بغیر اطلاع دیے اُس شہر میں پہنچ گئے تھے اور اچانک اس کے دروازے پر دستک دے کر اُسے چونکا دینا چاہتے تھے۔

سلمان صاحب نے محلّہ کا نام یاد کیا۔ گوپال گنج۔ ہاں یہی نام ہے۔ مکان نمبر بی۔ ۵۶۲۔ رادھا رمن مشرا کا مکان۔ اسٹیشن سے یہی کوئی آدھ میل پر واقع۔

"کیوں بھائی صاحب گوپال گنج کدھر پڑے گا"

اُنھوں نے ایک دُکان دار سے پوچھا تو پان کی پیک تھوکنے کی زحمت نہ کرتے ہوئے اُس نے گل گلا کر یہ بتایا کہ وہ حضرت تھوڑا آگے نکل آئے ہیں۔ پیچھے مُڑ کر بجلی کے اُس والے کھمبے سے سٹی ہوئی گلی میں چلے جائیں۔

سلمان صاحب اس کی دُکان کے شیڈ Shed سے جب باہر نکلے تو لُو کا ایک تھپیڑا جھٹ اُن کے گال پر لگا اور اُنھوں نے اپنی ایک ہتھیلی کنپٹی پر رکھ لی۔ ٹھیک اُسی وقت انہیں اپنی جیب میں پڑی ہوئی پیاز کا خیال آیا اور لمحہ بھر کے لیے وہ مطمئن ہو گئے۔ ہاں یہی گلی تو ہے۔ اُنھوں نے بجلی کے کھمبے کو غور سے دیکھا اور گلی میں داخل ہو گئے۔

داہنی طرف اے بلاک تھا۔ سلمان صاحب نے سوچا کہ بائیں طرف ضرور بی بلاک ہوگا۔ پر اُدھر ایچ بلاک تھا۔ وہ اور آگے بڑھے شاید 'اے' والی سائڈ میں ہی آگے چل کر بی پڑے۔ لیکن نہیں۔ جہاں اے ختم ہوا، وہاں سے ایم شروع ہو رہا تھا۔ بائیں طرف سی تھا۔ وہ چکر کھا گئے۔

"کہاں جانا ہے؟"

ایک صاحب سڑک پر چارپائی نکال کر اُس پر ٹپکتے ہوئے تھے۔ اور نیچے گرتے ہوئے کھٹملوں کو مار رہے تھے۔ اُنھوں نے ان کی بے چینی کو شاید بھانپ لیا تھا۔ سلمان صاحب نے اپنے جوتے سے کھٹمل کے ایک بچّے کو مارا اور پوچھا۔

"صاحب، یہ بی۔ ۵۶۲ کدھر پڑے گا؟"

"او مسر جی کا مکان؟ وہ پرانے گوپال گنج میں ہے۔ آپ اِدھر سے چلے جائیے اور آگے جا کر مندر کے پاس سے داہنے مُڑ جائیے گا۔ وہاں کسی سے پوچھ لیجیے گا۔"

سلمان صاحب نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑے۔ مندر کے پاس پہنچ کر جب وہ داہنی طرف مُڑے تو اُنھوں نے دیکھا کہ پیچھے چار پانچ بھینسیں بندھی ہوئی ہیں اور ایک لڑکی اپنے برآمدے میں کھڑی ہو کر دور جاتے ہوئے چوڑی والے کو بلا رہی ہے۔

"پرانا گوپال گنج کیا یہی ہے؟"

اُنھوں نے اس لڑکی سے جانکاری لینی چاہی، لیکن اُس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اُس کا سارا دھیان چوڑی والے کے ٹھیلے پر لگا ہوا تھا۔ سلمان صاحب آگے بڑھ گئے۔

تھوڑا اور آگے جا کر انہیں پرانے ڈھنگ کے اونچے اونچے مکان دکھائی پڑے۔ جن کے سائے میں اُس علاقے کی گلیاں مقابلتاً ٹھنڈی اور تنگ تھیں۔ ننگ دھڑنگ بچے اچھل کود رہے تھے۔ سلمان صاحب کا جی چاہا کہ وہ یہاں لمحہ بھر کے لیے کھڑے ہو جائیں لیکن اُنھوں نے اپنا ارادہ فوراً ہی ترک کر دیا اور آگے بڑھنے لگے۔

سامنے ایک لڑکا دوڑا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک موٹا سا چوہا گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ لڑکے نے چوہے کی دُم میں سُتلی باندھ رکھی تھی۔ وہ اس کا ایک سرا تھامے ہوئے تھا۔ سلمان صاحب کو دیکھ کر جیسی کہ انہیں اُمید تھی، وہ بالکل نہیں ٹھٹکا اور اُن کی بغل سے بھاگ نکلنے کے چکر میں اُن سے ٹکرا گیا۔

"یہ بی۔ ۵۶۲ کدھر ہے جی؟ تمہیں پتہ ہے مشرا جی کا مکان؟"

لڑکے نے اُن کی طرف اُچٹتی سی نظر ڈالی اور ایک مکان کی طرف اشارہ کرتا ہوا بھاگ گیا — اس کے پیچھے پیچھے چھما بھی گھسٹتا ہوا چلا گیا۔

سلمان صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس عظیم عمارت کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ وہاں باہر دو عورتیں چارپائی پر بیٹھی تھیں اور پنجاب کے مسئلے کو اپنے ڈھنگ سے حل کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

"اری بِٹّن کی اماں، وہ تو شکر مناؤ کہ ہم ہندوستان میں ہیں، پنجاب میں ہوتیں تو نہ جانے کیا گت ہوئی ہوتی؟"

"رادھاچرن مشرا جی کا مکان یہی ہے؟"

عورتیں چارپائی پر بیٹھی رہیں۔ جب کہ سلمان صاحب نے سوچا تھا کہ اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ جیسا کہ اُن کے قصبے میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو شہر ہے۔

"مسرجی یہاں نہیں رہتے۔ وہ جواہر نگر میں رہتے ہیں۔ یہاں بس اُن کے کرایہ دار رہتے ہیں۔"

ایک عورت نے انہیں جانکاری دی اور خاموش ہو گئی۔

"کیا کام ہے؟"

دوسری نے پوچھا اور اپنا سر کھجلانے لگی۔

"اُن کے مکان میں ایک لڑکا رہتا ہے — مشری لال گپتا۔ اُسی سے ملنا تھا۔"

"اوپر چلے جائیے۔ سیڑھی چڑھ کر۔ دوسرا والا کمرہ انہیں کا ہے۔"

اُس سر کھجلانے والی عورت نے بتایا اور کھڑی ہو گئی۔

سلمان صاحب اندر چلے گئے۔

وہاں اندھیرا تھا اور زینہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑے رہنے کے بعد انہیں کونے میں ایک نل دکھائی پڑا۔ پھر زینہ بھی نظر آنے لگا اور وہ سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھنے لگے۔

اس درمیان اُنہوں نے قیاس لگایا کہ مشری لال سو رہا ہوگا اور دروازہ کھٹکھٹا کر اُسے جگانا پڑے گا۔ وہ ہڑبڑاتا ہوا اُٹھے گا اور چٹخنی کھول کر آنکھیں ملتے ہوئے باہر دیکھے گا اور پھر سامنے اُنہیں پاکر چرنوں پر جھک جائے گا۔

"کون؟"

زینہ ختم ہوتے ہی اُس پار کسی عورت کا سوال سنائی پڑا۔ وہ ٹھٹھک گئے۔

"مشری لال جی ہیں کیا؟"

"تھوڑا ٹھہریے۔"

اس عورت نے ذرا سختی سے کہا اور سلمان صاحب کو لگا کہ عورت کسی مخصوص کام میں لگی ہوئی ہے۔ وہ بغیر کواڑوں والے اس دروازے کے اس پار کھڑے ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ تبھی اُنہوں نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی گوری سی عورت صرف پیٹی کوٹ اور بریزیر پہنے برآمدے سے بھاگ کر سامنے والی کوٹھری میں داخل ہو گئی۔ وہ جلدی سے ساڑی لپیٹ کر بلاؤز کا ہک لگاتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"آئیے۔"

اُس نے سلمان صاحب کو پکارا تو وہ اس طرح اندر داخل ہوئے جیسے اُنہوں نے اس عورت کو ابھی تھوڑی دیر پہلے بھیتر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا۔ عورت نے بھی شاید یہی سوچا اور اطمینان سے کھڑی رہی۔

سلمان صاحب نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک طرف ایک اُتاری ہوئی گیلی ساڑی پڑی ہے اور رچے، صابن کی خوشبو پورے ماحول میں بسی ہوئی ہے۔

"مشری لال جی بغل والے کمرے میں رہتے ہیں پر وہ ہیں نہیں۔ صبح سے ہی کہیں گئے ہوئے ہیں — آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ بیٹھیے۔"

عورت نے نہایت خلوص کے ساتھ یہ سب کہا اور ایک بنسکھٹ بچھا کر پھر بھیتر چلی گئی — تھوڑی دیر بعد وہ ایک طشتری میں گڑ اور گلاس میں پانی لیے ہوئے باہر آئی اور بنسکھٹ پر طشتری رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی لیجیے۔ آج گرمی بہت ہے۔"

اتنا کہہ کر اُس نے اپنی اُتاری ہوئی ساڑی کی طرف دیکھا اور جانے کیا سوچ کر پانی نیچے رکھ کر پھر اندر چلی گئی۔ اس مرتبہ وہ تاڑ کا ایک پنکھا لے کر لوٹی اور اُسے بھی بنسکھٹ پر رکھ دیا۔

سلمان صاحب نے گڑ کھایا، پانی پیا اور پنکھا لے کر اُسے آہستہ آہستہ جھلنے لگے۔

"مشری لال کہیں باہر تو نہیں چلا گیا ہے؟"

"باہر تو نہیں گئے ہیں۔ شہر ہی میں ہوں گے کہیں۔ پکچر وکچر گئے ہوں گے یا کسی دوست کے ہاں چلے گئے ہوں گے۔ روز تو کمرے ہی میں رہتے ہیں۔ آج ہی نکلے ہیں باہر۔"

سلمان صاحب نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ اُنہوں نے تھکان محسوس کی اور بنسکھٹ پر تھوڑا پسر گئے۔

عورت پھر اندر سے تکیہ لے آئی۔

"آپ تھوڑا آرام کر لیں۔ گپتا جی شام تک تو آ ہی جائیں گے۔"

عورت نے اُن کے سرہانے تکیہ رکھا اور اپنی گیلی ساڑی بالٹی میں رکھ کر نیچے اُتر گئی —

سلمان صاحب جب لیٹے تو جیب میں پڑا ہوا پیاز اُنہیں چبھنے لگا۔ اُنہوں نے اسے نکال کر چارپائی کے نیچے گرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُنہیں نیند آ گئی۔

نیند میں اُنہوں نے خواب دیکھا کہ ان کے اسکول میں ماسٹروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے اور پی ٹی ٹیچر ستیہ نارائن یادو کو ہیڈ ماسٹر صاحب بُری طرح ڈانٹ رہے ہیں۔ سلمان صاحب اُن کی طرف داری کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو سارے ماسٹر اُن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اُن کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

لگتا ہے رات ہو گئی ہے۔ اندر ایک مٹ میلا سا بلب جل رہا ہے، جس کی روشنی برآمدے میں

بھی آ رہی ہے۔ برآمدے میں کوئی بلب نہیں ہے۔ اندر سے آنے والی روشنی کے اُس چوکور ٹکڑے میں ایک اسٹوو جل رہا ہے اور عورت سبزی چھونک رہی ہے۔ جہاں دوپہر میں جے صابن کی خوشبو بھری ہوئی تھی، وہیں اب زیرے کی مہک اُڑ رہی ہے۔

"مشری لال نہیں آیا ابھی تک"۔

"ارے، اب ہم کیا بتائیں کہ آج وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ روزانہ تو کمرے میں گھسے رہتے تھے"۔

اُس عورت نے فکر مند لہجے میں کہا اور اسٹیل کے ایک گلاس میں پہلے سے تیار کی گئی چائے لے کر اُن کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"ارے آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے، چائے تو بنتی ہی ہے شام کو"۔

سلمان صاحب نے گلاس تھام لیا۔ عورت اسٹوو کی طرف مڑ گئی۔

تبھی ایک تازہ تازہ نہائے ہوئے صاحب، کمر میں گمچھا لپیٹے جنیو ملتے ہوئے زینہ چڑھ کر اوپر آئے اور کمرے میں گھس کر ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرنے لگے۔ زیرے کی مہک کے ساتھ ساتھ اب اگربتی کی مہک بھی ماحول میں تیرنے لگی تھی۔

سلمان صاحب نے اندر جھانک کر دیکھا تو پایا کہ اُس کمرے میں پوری گرہستی بڑے سلیقے کے ساتھ سجی ہوئی تھی اور دیواروں پر رام، کرشن، ہنومان، شنکر، پاروتی، لکشمی اور گنیش وغیرہ تمام دیوی دیوتاؤں کی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ وہیں ایک طرف لکڑی کی ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا — رام منوہر پانڈے، اسسٹنٹ ٹیلی فون آپریٹر۔ وہ صاحب اپنے داہنے ہاتھ میں اگربتی لیے بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کی کہنی تھامے سبھی تصویروں کو اگربتی کی خوشبوؤں سے معطر کر رہے تھے اور بہت عقیدت کے ساتھ رامائن کی چوپائیاں گنگنا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ گیتا کے اشلوک بھی صحیح غلط تلفظ کے ساتھ بول جاتے تھے۔ چھت پر ایک گندہ سا پنکھا نہایت دھیمی رفتار سے چل رہا تھا

عورت نے سبزی پکا لی تھی اور اب وہ روٹیاں بنا رہی تھی۔ سلمان صاحب کی خواہش ہوئی کہ اب وہ وہاں سے چل دیں اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ صبح آکر مشری لال سے مل لیں گے۔ کیوں کہ رات کافی ہوتی جا رہی ہے اور ابھی تک اُس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

وہ کھڑے ہو گئے۔

"میں اب چلتا ہوں۔ کل سویرے آکر مل لوں گا"۔

اُنھوں نے اپنا بیگ اُٹھا لیا۔

"کہاں جائیں گے؟"

عورت نے اُن سے سیدھا سوال کیا اور پیچھے مڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"کسی ہوٹل میں رُکوں گا"۔

"کیوں بھائی صاحب، ہوٹل میں کیوں رُکیے گا۔ کیا یہاں جگہ نہیں ہے۔ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ کھا لیجیے اور چھت پر لیٹیے۔ رات میں گپتا جی آ ہی جائیں گے اور اگر نہ بھی آئے تو صبح چلے جائیے گا۔ اس وقت تو میں آپ کو نہ جانے دوں گی۔ آئیے جوتا ووتا اُتاریے اور ہاتھ منھ دھو کر کھانے بیٹھیے"۔

"نہیں بھابی جی، آپ کیوں زحمت کرتی ہیں"۔ اُس عورت کو اب بھابی کہنے میں سلمان صاحب کو اب کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔

"زحمت کی کیا بات ہے؟" آئیے کھانا کھائیے"۔

سلمان صاحب مجبور ہو گئے۔ اُنھوں نے جوتے اُتارے اور ہاتھ منھ دھو کر کھڑے ہو گئے۔

اب تک پانڈے جی اپنی پوجا آرادھنا سے فارغ ہو گئے تھے اور اندر بھی چوکی پر بیٹھ کر کچھ کاغذ پتر دیکھ رہے تھے۔ سلمان صاحب کو اُنہیں نمسکار تک کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ اُنہیں بہت ناگوار لگ رہا تھا، لیکن اب اتنی دیر بعد نمسکار کرنے کا کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُنھوں نے سیدھے سیدھے بات کرنے کی کوشش کی۔

"بھائی صاحب آپ بھی اُٹھیے؟"

"نہیں، آپ کھائیے۔ میں تھوڑی دیر بعد بھوجن کروں گا"۔ اُنھوں نے قدرے خشک لہجے میں سلمان صاحب کو جواب دیا۔ اور بغیر اُن کی طرف دیکھے اپنے کاغذ پتر میں اُلجھے رہے۔

"آپ بیٹھیے۔ دن بھر کے بھوکے پیاسے ہوں گے۔ وہ بعد میں کھائیں گے۔ دفتر سے آکر اُنھوں نے تھوڑا سا ناشتہ بھی کیا ہے۔ آپ تو سو رہے تھے"۔

عورت نے ایک بار پھر کہا۔ اور پیڑھی رکھ کر تھالی لگا دی۔ لوٹے میں پانی اور گلاس رکھ دیا۔

وہ اندر سے بہت خوش تھے۔ اُن کے قصبے میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ بغیر ذات، دھرم کی جانکاری کے بغیر کوئی براہمنی کسی کو اپنے چوکے میں بٹھا کر کھانا کھلائے۔ لیکن شہر میں ایسا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ بھی بہت کچھ دیہاتی خیال کے ہیں۔ لیکن ہے تو آخر شہر۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگ ترقی پسند ہوتے ہیں۔ اُن میں تنگ نظری نہیں ہوتی۔ وہ مذہبی ہوتے ہوئے بھی تعصب سے بری ہوتے ہیں۔

سلمان صاحب سوچ رہے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ اُنہیں بینگن کی سبزی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ تازہ آم کا اچار حالانکہ پورا گلا نہیں تھا۔ مگر لذیذ تھا۔ روٹیوں پر گھی بھی چپڑا ہوا تھا۔ ایسی روٹیاں اُن کے گھر نہیں بنتیں۔ وہاں تو اُلٹے توے پر بنی ہوئی چپاتیاں ہوتی ہیں۔

عورت نے ایک پھولی ہوئی بھاپ اُڑاتی روٹی ان کی تھالی میں اور ڈال دی تھی۔

"آپ گپتا جی کے گاؤں سے آئے ہیں؟"

سلمان صاحب نے سر اُٹھایا۔ پانڈے جی اب کاغذ پتروں سے فراغت پا چکے تھے اور آم کاٹ رہے تھے۔ اُن کی آواز میں پہلے جیسی خشکی موجود تھی۔

"جی ہاں"۔ سلمان صاحب نے جواب دیا۔ اور اچار اُٹھا کر چاٹنے لگے۔

پانڈے جی نے اشارے سے بیوی کو اندر بلایا اور آم کی تین پھانکیں تھما دیں۔ عورت نے اُنہیں

اُدئے پرکاش

ترِچھ

نام : ادئے پرکاش
پیدائش : جنوری ۱۹۵۲ء موضع چھتیس گڑھ کے ایک گاؤں میں۔
تصانیف : سنو کاریگر، ابوتر، کبوتر (شعری مجموعے) دریائی گھوڑا (کہانیوں کا مجموعہ)
اعزاز : ۱۹۸۱ء میں نظم 'تیت' کے لیے بھارت بھوشن اگروال انعام اور ۱۹۸۳ء میں کہانیوں کا مجموعہ 'دریائی گھوڑا' کے لیے اوم پرکاش اعزاز۔
شغل : رسالہ 'دنمان' کے شعبہ ادارت سے وابستہ۔
پتہ : ایچ - ۱۵۱ ۔ ڈی ڈی اے فلیٹس اشوک وہار، دہلی

اس حادثے کا رشتہ پتا جی سے ہے۔ میرے خواب سے ہے۔ اور ایک شہر سے بھی ہے۔ شہر کے لئے جو ایک پیدائشی ڈر ہوتا ہے، اس سے بھی ہے۔

پتا جی جب پچپن سال کے ہو چکے تھے۔ دُبلا بدن۔ بال بُھٹے کے ریشے جیسے سفید۔ سر پر جیسے روئی رکھی ہو۔ وہ سوچتے زیادہ تھے۔ بولتے بہت کم۔ جب بولتے تو ہمیں راحت ملتی، جیسے دیر سے رکی سانس نکل رہی ہو۔ ساتھ ساتھ ہمیں ڈر بھی لگتا۔ ہم بچوں کے لیے وہ ایک بہت بڑا معمہ تھے ہمیں پتہ تھا کہ دنیا کے تمام علم کی کنجی ان کے پاس ہے۔ ہم جانتے تھے کہ دنیا کی تمام زبانیں وہ بول سکتے ہیں۔ دنیا ان کو جانتی ہے اور ہماری طرح ان سے رعب کھاتی ہے ادب کرتی ہے۔

ہمیں ان کی اولاد ہونے پر فخر تھا۔

کبھی کبھی ویسے ایسا سالوں میں ایک آدھ بار ہی ہوتا، وہ شام کو ہمیں اپنے ساتھ ٹہلانے کہیں باہر لے جاتے۔ چلنے سے پہلے وہ منھ میں تمباکو بھر لیتے۔ تمباکو کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں پاتے تھے۔ وہ چُپ رہتے۔ یہ خاموشی ہمیں بہت سنجیدہ، باوقار، حیرت انگیز اور بھاری بھرکم لگتی۔ چھوٹی بہن کبھی ان سے راستے میں کچھ پوچھنا چاہتی تو فوراً میں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا تاکہ پتا جی کو نہ بولنا پڑے۔

ویسے یہ کام کافی مشکل ہوتا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میرا جواب غلط ہوا، تو پتا جی کو بولنا پڑے گا۔ بولنے میں انھیں پریشانی ہوتی تھی۔ ایک تو انھیں تمباکو کی پیک پھینکنی پڑتی تھی، پھر بس دنیا میں وہ ہوتے وہاں سے نکل کر یہاں تک آنے میں ایک مشکل فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ ویسے بہن کے سوالوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ جیسے یہی پوچھ لیتی تھی کہ سامنے والے پیڑ کی ٹہنی پر بیٹھی اس چڑیا کو کیا کہتے ہیں۔ میں چونکہ ہر چڑیا کو جانتا تھا اس لئے بتا سکتا تھا کہ وہ نیلکنٹھ ہے اور دسہرے کے دن اسے ضرور دیکھنا چاہئے۔ میری پوری کوشش یہی رہتی کہ پتا جی کو آرام رہے اور وہ سوچتے رہیں۔

میری اور ماں کی، دونوں کی پوری کوشش رہتی کہ پتا جی اپنی دنیا میں ہنسی خوشی رہیں۔ وہاں سے انھیں جبراً باہر نہ نکالا جائے۔ وہ دنیا ہمارے لیے بہت عجیب وغریب تھی، لیکن ہمارے گھر کی اور ہماری زندگی کی بہت سی پریشانیوں کا خاتمہ پتا جی وہیں رہ کر کرتے تھے۔ جیسے جب میری فیس کی بات آئی، اُس وقت ہمارے گھر کا آخری گلاس بھی گم ہو گیا تھا اور سب لوگ لوٹے سے ہی پانی پیتے تھے۔ پتا جی دو دن تک بالکل چپ رہے ماں کو بھی شک ہوتا تھا کہ پتا جی فیس کی بات بالکل بھول گئے ہیں یا پھر اس کا حل ان کے بس سے باہر ہے۔ لیکن تیسرے دن صبح ہی صبح پتا جی نے مجھے ایک خط دیا اور شہر کے ایک ڈاکٹر پنت کے پاس بھیجا۔ مجھے بہت حیرت

ہوئی جب ڈاکٹر نے مجھے شربت پلایا اور گھر کے اندر لے جاکر اپنے بیٹے سے میرا تعارف کرایا اور سو سو کے تین نوٹ مجھے دیئے۔

ہم پتاجی پر فخر کرتے تھے، پیار کرتے تھے، ان سے ڈرتے تھے اور ان کے ہونے کا احساس ایسا تھا جیسے ہم کسی قلعے میں رہ رہے ہوں۔ ایسا قلعہ جس کے چاروں طرف گہری نہریں کھدی ہوئی ہوں، برجیں بہت اونچی ہوں، دیواریں سخت لال چٹانوں کی بنی ہوئی ہوں اور ہر باہری حملے سے ہمارا قلعہ محفوظ ہو۔

پتاجی ایک خوب مضبوط قلعہ تھے، ان کے پرکوٹے پر ہم سب کچھ بھول کر کھیلتے تھے اور رات میں خوب گہری نیند مجھے آتی تھی۔

لیکن اس دن، شام کو پتاجی جب باہر سے ٹہل کر آئے تو ان کے ٹخنے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں گاؤں کے کئی لوگ وہاں آگئے۔ پتہ چلا کہ پتاجی کو جنگل میں ترِچھ (ایک زہریلا گرگٹ کی طرح کا جانور) نے کاٹ لیا ہے۔

ہم سب جانتے تھے کہ ترِچھ کے کاٹنے پر آدمی بچ ہی نہیں سکتا۔ رات میں لالٹین کی دھندلی، میلی روشنی میں گاؤں کے بہت سے لوگ ہمارے آنگن میں جمع ہوگئے تھے۔ پتاجی ان کے بیچ میں تھے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے۔ پھر پاس ہی کے گاؤں کا چٹوا نائی بھی آیا۔ وہ آرنڈ کے پتے اور کنڈے کی راکھ سے زہر اتارتا تھا۔

—— ترچھ میں نے ایک بار دیکھا تھا۔

تالاب کے کنارے جو بڑی چٹانوں کے ڈھیر تھے اور جو دوپہر میں خوب گرم ہو جاتے تھے ان میں سے کسی چٹان کی دراڑ سے نکل کر وہ پانی پینے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔

میرے ساتھ تھا تھانو تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ترچھ ہے۔ کالے ناگ سے سو گنا زیادہ اس میں زہر ہوتا ہے' اسی نے بتایا کہ سانپ تو تب کاٹتا ہے جب اس کے اوپر پیر پڑجائے یا کوئی جب زبردستی اسے تنگ کرے۔ لیکن ترچھ تو نظر ملتے ہی دوڑتا ہے اور پیچھے پڑجاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کبھی سیدھے نہیں دوڑنا چاہیے ٹیڑھے میڑھا چکر کاٹتے ہوئے، گول مول دوڑنا چاہیے۔

دراصل آدمی جب بھاگتا ہے تو زمین پر وہ صرف اپنے پیروں کے نشان ہی نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر نشان کے ساتھ، وہاں کی دھول میں اپنی مہک بھی چھوڑ جاتا ہے۔ ترچھ اس مہک کے سہارے دوڑتا ہے۔ تھانو نے بتایا کہ ترچھ کو چکمہ دینے کے لیے آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ پہلے تو وہ بالکل پاس پاس قدم رکھ کر جلدی جلدی کچھ دور دوڑے پھر چار پانچ بار خوب لمبی لمبی چھلانگ لگا دے۔ ترچھ سونگھتا ہوا دوڑتا آئے گا، جہاں پاس پاس پیر کے نشان ہوں گے وہاں اس کی رفتار خوب تیز ہوگی اور جہاں سے آدمی نے چھلانگ مارے ہوں گے وہاں وہ الجھن میں پڑجائے گا وہ اِدھر اُدھر اس وقت تک بھٹکتا رہے گا جب تک اسے اگلے پیر کا نشان اور اس میں بسی گندھ نہیں مل جاتی۔

ہمیں ترچھ کے بارے میں دو بات اور پتہ تھی۔ ایک تو یہ کہ جیسے ہی وہ آدمی کو کاٹتا ہے، ویسے ہی وہ وہاں سے بھاگ کر کسی جگہ پیشاب کرتا ہے اور اس پیشاب میں لوٹ جاتا ہے۔ اگر ترچھ نے ایسا کر لیا تو آدمی بچ نہیں سکتا۔ اگر اس سے بچنا ہے تو آدمی کو ترچھ کے پیشاب میں لوٹنے سے پہلے کسی کنویں یا تالاب میں ڈبکی لگا لینی چاہئے یا پھر ترچھ کے ایسا کرنے سے پہلے اسے مار دینا چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ ترچھ کاٹنے کے لیے تبھی دوڑتا ہے جب اس سے نظر ٹکرا جائے۔ اگر ترچھ کو دیکھو تو کبھی اس سے آنکھ مت ملاؤ۔ آنکھ ملتے ہی وہ آدمی کی مہک پہچان لیتا ہے اور پھر پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر تو آدمی چاہے پوری زمین کا چکر لگالے ترچھ پیچھے پیچھے آتا ہے۔

میں بھی تمام بچوں کی طرح ترچھ سے بہت ڈرتا تھا۔ میرے برے سپنے کے سب سے خطرناک کردار دو ہی تھے۔ ایک ہاتھی اور دوسرا ترچھ۔ ہاتھی تو پھر بھی دوڑتا دوڑتا تھک جاتا تھا اور میں پیڑ پر چڑھ کر بچ جاتا تھا یا پھر اڑنے لگتا تھا لیکن ترچھ؟ اس کے سامنے تو میں کسی اندر جال میں بندھ جاتا تھا۔ میں خواب میں کہیں جا رہا ہوتا تو اچانک ہی کسی جگہ وہ مل جاتا۔ اس کی جگہ طے نہیں ہوتی تھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ چٹانوں کی دراڑ میں، پرانی عمارتوں کے کھنڈر یا کسی جھاڑی کے پاس نظر آئے۔ وہ مجھے بازار میں، سینما ہال میں، کسی دوکان یا میرے کمرے میں ہی نظر آسکتا ہے۔

میں خواب میں کوشش کرتا کہ اس سے نظر نہ مل پائے لیکن وہ آتی شناسا نظروں سے مجھے دیکھتا کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا تھا اور بس آنکھوں کے ملتے ہی اس کی نظر بدل جاتی تھی۔ وہ دوڑتا تھا اور میں بھاگتا تھا۔

میں گول گول چکر لگاتا۔ جلدی جلدی پاس پاس ڈگ بھر کر اچانک خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگانے لگتا، اڑنے کی کوشش کرتا، کسی اونچی جگہ چڑھ جاتا، لیکن میری ہزار کوششوں کے باوجود وہ چکمہ نہیں کھاتا تھا۔ وہ مجھے بہت شاطر، سمجھ دار، چالاک اور خطرناک لگتا۔ مجھے لگتا کہ وہ مجھے خوب اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی کی جو چمک تھی۔ اس سے مجھے لگتا کہ وہ میرا ایسا دشمن ہے جسے میرے دماغ میں آنے والے ہر خیال کا پہلے سے پتہ ہے۔

میرا سب سے خطرناک، تکلیف دہ، خوف ناک اور بے چینی سے بھرا ہوا یہی خواب تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرا پورا بدن تھک جاتا۔ پھیپھڑے پھول جاتے۔ میں پسینے سے تر بتر ہو کر بے دم سا ہونے لگتا اور ایک بہت ڈراونی، سن کر دینے والی موت میرے قریب آنے لگتی۔ میں زوروں سے چیختا رونے لگتا، پتاجی کو، تھانو کو یا ماں کو پکارتا اور پھر میں یہ جان جاتا کہ یہ ایک خواب ہے، لیکن یہ پتہ چلنے کے باوجود میں اچھی طرح سے جانتا کہ تب بھی میں اپنی اس موت سے نہیں بچ سکتا۔ موت نہیں —— ترچھ کے ذریعہ اپنے قتل سے۔ اور ایسے میں خواب میں ہی یہ کوشش کرتا کہ کسی طرح میں جاگ جاؤں۔ میں پوری طاقت لگاتا خواب میں ہی آنکھیں کھول کر پھاڑتا، روشنی کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور زور سے کچھ بولتا۔ کئی بار بالکل عین موقعے پر میں جاگنے میں کامیاب ہو جاتا۔

ماں بتاتی کہ مجھے خواب میں بولنے اور چیخنے کی عادت ہے۔ کئی بار انھوں نے مجھے نیند میں روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ایسے میں انھیں مجھے جگا ڈالنا چاہئے تھا۔

لیکن وہ میری پیشانی کو سہلا کر مجھے لحاف سے ڈھک دیتی تھیں اور میں اس خوفناک دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اپنی موت۔ بلکہ اپنے قتل سے بچنے کی کمزور کوشش میں بھاگتا، دوڑتا، چیختا۔

ویسے آہستہ آہستہ میں نے تجربوں سے یہ جان لیا تھا کہ آواز ہی ایسے موقعوں پر میرا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس سے میں ترچھ سے بچ سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہر بار اس ہتھیار کی یاد مجھے ایک دم آخری وقت پر آتی تھی تب جب وہ مجھے بالکل پا لینے والا ہوتا تھا۔ اپنی موت کی سانس مجھے چھونے لگتی۔ موت کے نشے میں بھرے ایک بے جان مگر ڈراونے اندھیرے سے میں گھر جاتا۔ لگتا میرے نیچے کوئی مضبوط سہارا نہیں ہے۔ میں ہوا میں ہوں اور وہ لمحہ آ جاتا جب میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہوتا، تبھی بالکل اسی ایک بہت ہی چھوٹے اور نازک لمحہ میں مجھے اپنے اس ہتھیار کی یاد آتی اور میں زور زور سے بولنے لگتا اور اس آواز کے سہارے میں خواب سے باہر نکل آتا۔ میں جاگ جاتا۔

کئی بار ماں مجھ سے پوچھتی بھی کہ مجھے کیا ہو گیا تھا تب میرے پاس اتنے الفاظ نہیں تھے کہ میں انھیں سب کچھ ایک ایک چیز اسی طرح بتا پاتا۔ اپنی اس کمی کے بارے میں مجھے خوب پتہ تھا اور اسی وجہ سے میں ایک عجیب سا تناؤ بے چینی اور مجبوری کے احساس سے گھر جاتا۔ آخر میں ہار کر اتنا ہی کہہ پاتا کہ "بہت ڈراؤنا خواب تھا"۔

جانے کیوں مجھے شک تھا کہ پتا جی کو اسی ترچھ نے کاٹا ہے جسے میں پہچانتا تھا اور جو میرے خواب میں آتا تھا۔

لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ جیسے ہی وہ ترچھ پتا جی کو کاٹ کر بھاگا، پتا جی نے اس کا پیچھا کر کے اسے مار ڈالا تھا۔ طے تھا کہ اگر وہ فوراً اسے نہیں مار پاتے تو وہ پیشاب کر کے اس میں ضرور لوٹ جاتا۔ پھر پتا جی کسی حال میں نہیں بچتے۔ یہی وجہ تھی کہ پتا جی کو لے کر مجھے اتنی فکر نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرح کی راحت اور سنجات کی خوشی میرے اندر آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی تھی۔

وجہ، ایک تو یہی کہ پتا جی نے ترچھ کو فوراً مار ڈالا تھا اور دوسری یہ کہ میرا سب سے خطرناک پرانا دشمن آخر کار مر چکا تھا۔ اس کا قتل ہو گیا تھا اور میں اب اپنے خواب میں کہیں بھی بغیر کسی ڈر کے سیٹی بجاتا ہوا گھوم سکتا تھا۔

اس رات دیر تک ہمارے آنگن میں بھیڑ رہی تھی پتا جی کی جھاڑ پھونک چل رہی تھی۔ کاٹی گئی جگہ پر چیر کر خون بھی باہر نکال دیا گیا تھا اور کنوئیں میں ڈالنے والی لال دوا (پوٹاسیم پرمیگنیٹ) زخم میں بھر دی گئی تھی۔ میں بے فکر تھا۔

اگلی صبح پتا جی کو شہر جانا تھا۔ عدالت میں پیشی تھی۔ ان کے نام سمن آیا تھا۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو کیلو میٹر دور سے نکلنے والی سڑک سے شہر کے لیے بسیں گذرتی تھیں۔ ان کی تعداد دن بھر میں مشکل سے دو یا تین تھی۔ غنیمت تھا کہ پتا جی جیسے ہی سڑک پر پہنچے۔ شہر جانے والا پاس کے گاؤں کا ایک ٹریکٹر انھیں مل گیا۔ ٹریکٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ جان پہچان کے تھے۔ ٹریکٹر دو ڈھائی گھنٹہ میں شہر پہنچ جانے والا تھا۔ یعنی عدالت کھلنے سے کافی پہلے۔

راستے میں ترچھ والی بات چلی۔ پتا جی نے اپنا ٹخنہ اُن لوگوں کو دکھایا۔ ٹریکٹر میں پنڈت رام اوتار بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ترچھ کے زہر کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی یہ چوبیس گھنٹے بعد، ٹھیک اسی وقت، جس وقت یہ کاٹتا ہے، اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس لئے پتا جی کو ابھی بے فکر نہیں ہونا چاہئے۔ ٹریکٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے پتا جی کا دھیان ایک اور بڑی غلطی کی طرف کھینچا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو پتا جی نے بالکل ٹھیک کیا کہ ترچھ کو فوراً مار دیا لیکن اس کے بعد بھی ترچھ کو نہیں چھوڑ دینا چاہئے تھا اسے کم سے کم جلا ضرور دینا چاہئے تھا۔

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بہت سے کیڑے مکوڑے اور جانور رات کو چاند کی روشنی میں دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔ چاندنی میں جو شبنم اور ٹھنڈک ہوتی ہے اس میں امرت ہوتا ہے اور کئی بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ جس سانپ کو مرا ہوا سمجھ کر رات میں یوں ہی پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کا بدن رات میں چاندنی کی ٹھنڈک میں بھیگ کر دوبارہ جی اٹھتا ہے اور وہ بھاگ جاتا ہے۔ پھر وہ ہمیشہ بدلا لینے کے فراق میں رہتا ہے۔

ٹریکٹر کے لوگوں کو شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات میں جی اٹھنے کے بعد ترچھ پیشاب کر کے اس میں لوٹ جائے۔ ایسا ہوا تو چوبیس گھنٹے بیتتے، ٹھیک اسی گھڑی کے آنے پر ترچھ کا جان لیوا زہر پتا جی کے بدن میں چڑھنا شروع ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے صلاح بھی دی کہ پتا جی کو وہیں سے واپس لوٹ جانا چاہئے اور اگر خوش قسمتی سے ترچھ کی لاش اسی جگہ پڑی ہو تو اسے اچھی طرح جلا دینا چاہئے۔ لیکن پتا جی نے انھیں بتایا کہ وہاں حاضری کتنی ضروری ہے۔ یہ تیسرا سمن ہے اور اگر اس بار بھی وہ عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو غیر ضمانتی وارنٹ نکلنے کا ڈر تھا۔ حاضری بھی اس مکان کو لے کر تھی جس میں ہمارا خاندان رہ رہا تھا۔ وکیل کو پچھلی دو بار کی حاضری میں فیس بھی نہیں دی جا سکی تھی اور اگر اس نے لاپروائی دکھا دی اور جج سنک گیا وہ ہماری قرقی ضبطی بھی کرا سکتا تھا۔

عجیب حالت تھی کہ اگر پتا جی اس ترچھ کی لاش کو جلانے کے لیے ٹریکٹر سے اتر کر وہیں سے گاؤں لوٹ آتے تو غیر ضمانتی وارنٹ کے تحت وہ گرفتار کر لیے جاتے اور ہمارا گھر ہم سے چھن جاتا۔ عدالت ہمارے خلاف ہو جاتی۔

لیکن پنڈت رام اوتار ایک وید بھی تھے۔ جیوتش کے علاوہ انھیں جڑی بوٹیوں کی بھی گہری جانکاری تھی۔ انھوں نے صلاح دی کہ ایک طریقہ ہے جس سے پتا جی حاضری بھی دے سکتے ہیں اور ترچھ کے زہر سے چوبیس گھنٹے بعد بچ بھی سکتے ہیں۔

اگلے گاؤں سامت پور میں ٹریکٹر روک دیا گیا اور ایک تیلی کے کھیت میں دھتورے کے پودے آخر کار ڈھونڈ نکالے گئے۔ دھتورے کے بیج کو پیس کر اُسے تانبے کے پرانے سکے کے ساتھ اُبال کر کاڑھا تیار کیا گیا۔ کاڑھا بہت کڑوا تھا اس لئے اسے چائے میں ملایا گیا اور پتا جی کو وہ چائے پلا دی گئی اس کے بعد

سبھی بے فکر ہو گئے۔ ایک بہت بڑے خطرے سے پتا جی کو نکالنے کی کوشش ہو رہی تھی۔

ویسے مجھے ترچھ کے بارے میں تیسری بات بھی پتہ تھی جو پتا جی کے جانے کے کئی گھنٹے بعد اچانک یاد آئی تھی۔ یہ بات سانپ کی اس بات سے ملتی جلتی تھی جس کی وجہ سے آگے چل کر کیمرے کی ایجاد ہوئی تھی۔

مانا یہ جاتا تھا کہ اگر کوئی آدمی سانپ کو مار رہا ہو تو اپنے مرنے سے پہلے وہ سانپ، آخری بار، اپنے قاتل کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتا ہے۔ آدمی اس کا قتل کر رہا ہوتا ہے اور سانپ ٹکٹکی باندھے اس آدمی کے چہرے کی ایک ایک باریکی کو اپنی آنکھ کے اندرونی پردے پر درج کر رہا ہوتا ہے۔ سانپ کی موت کے بعد سانپ کی آنکھوں کے اندرونی پردے پر اس آدمی کی تصویر صاف ابھر آتی ہے۔

بعد میں آدمی کے جانے کے بعد، اس سانپ کا دوسرا جوڑا آ کر اس مرے ہوئے سانپ کی آنکھ کے اندر جھانکتا ہے اور اس طرح وہ قاتل کو پہچان لیتا ہے۔ سارے سانپ اسے پہچاننے لگتے ہیں پھر وہ کہیں بھی چلا جائے، اس سے بدلا لینے کے فراق میں رہتے ہیں۔ ہر سانپ اس کا دشمن ہوتا ہے۔

مجھے شک تھا کہ مرے ہوئے ترچھ کی آنکھ کے اندرونی پردے پر پتا جی کا چہرہ درج ہوگا، کوئی دوسرا ترچھ آ کر اس کی لاش کی آنکھ میں جھانکے گا اور پتا جی وہاں پہچان لیے جائیں گے۔ میرے اندر اس بات کو لے کر بے چینی پیدا ہوئی تھی کہ پتا جی نے یہ ساودھانی کیوں نہ برتی۔ انھیں ترچھ کو مارنے کے ساتھ ہی کسی پتھر سے اس کی آنکھوں کو کچل دینا چاہئے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ پتا جی شہر جا چکے تھے اور میرے سامنے الجھن یا چنوتی تھی کہ جس جگہ ترچھ کو مارا گیا ہے وہ جگہ ڈھونڈ نکالوں۔

میں تھانو کے ساتھ بوتل میں مٹی کا تیل دیا سلائی اور ڈنڈا لے کر جنگل میں ترچھ کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا تھا بہت اچھی طرح۔ تھانو ناامید تھا۔

پھر اچانک ہی مجھے لگنے لگا کہ اس جنگل کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ایک پیڑ میرے شناسا ہیں۔ اسی جگہ سے کئی بار خواب میں ترچھ سے بچنے کے لیے میں اِدھر اُدھر بھاگا تھا۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا۔ بالکل یہی وہ جگہ تھی۔ میں نے تھانو کو بتایا کہ ایک پتلا سا نالا اس جگہ سے کتنی دور جنوب کی طرف بہتا ہے۔ نالے کے اوپر جہاں بڑی بڑی چٹانیں ہیں، وہاں کیکر کا ایک بہت پرانا درخت ہے جس پر شہد کے بڑے بڑے چھتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کئی صدیاں پرانے ہیں۔ میں اس بھورے رنگ کی چٹان کو جانتا تھا جو برسات میں نالے کے پانی میں آدھی ڈوبی رہتی تھی اور بارش کے بہنے کے بعد جب باہر نکلتی تھی تو اس کی کھوؤں میں کیچڑ بھر جاتی تھی۔ عجیب عجیب پودے وہاں اُگ جاتے تھے۔ چٹان کے اوپر ہری کائی کی ایک پرت سی جم جاتی تھی۔ اسی چٹان کی سب سے اوپر والی دراز میں ترچھ رہتا تھا۔ تھانو اس بات کو میرا خواب مان رہا تھا۔

لیکن بہت جلد ہمیں وہ نالا مل گیا۔ کیکر کا وہ بوڑھا درخت بھی، جس پر شہد کے چھتے تھے اور وہ چٹان بھی۔ ترچھ کی لاش چٹان سے ذرا ہٹ کر، زمین کے اوپر گھاس پر چت پڑی ہوئی تھی۔ بالکل یہی ترچھ تھا۔ میرے اندر ہنسا اور جوش اور خوشی کی ایک ملی جلی سنسنی دوڑ رہی تھی۔

تھانو نے اور میں نے سوکھے پتے اور لکڑیاں اکٹھی کیں، خوب سارا مٹی کا تیل اس میں ڈالا اور آگ لگا دی۔ ترچھ اس میں جل رہا تھا۔ اس کے جلنے کی بدبو ہوا میں پھیل رہی تھی۔ میرا دل زور سے چلانے کو ہوا لیکن میں ڈرا کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں اور یہ سب کچھ محض خواب ہی نہ ثابت ہو۔ میں نے تھانو کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ میرا بہت ہی اچھا دوست تھا۔

میرے خواب میں اسی جگہ سے نکل کر اس ترچھ نے کئی بار میرا پیچھا کیا تھا۔ حیرت تھی کہ اتنے لمبے عرصے اس کے ٹھکانے کو اتنی اچھی طرح سے جاننے کے باوجود کبھی دن میں آ کر میں نے اسے مارنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

میں آج بے حد خوش تھا۔

پنڈت رام اوتار نے بتایا تھا کہ ٹریکٹر نے پونے دس بجے کے لگ بھگ شہر کا چنگی پار کیا تھا۔ وہاں انھیں ناکے کا ٹول ٹیکس چکانے کے لیے کچھ دیر رکنا بھی پڑا تھا۔ وہاں پر پتا جی ٹریکٹر سے اتر کر پیشاب کرنے گئے تھے۔ لوٹنے پر انھوں نے بتایا تھا کہ ان کا سر کچھ گھوم سا رہا تھا، تب تک پتا جی کو دھتورے کا کاڑھا (شربت) پیے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ ٹریکٹر نے پتا جی کو شہر میں دس بج کر پانچ۔ سات منٹ کے آس پاس چھوڑ دیا تھا۔ ٹریکٹر میں ہی بیٹھے پلڑا گاؤں کے ماسٹر نند لال کا کہنا تھا کہ جب شہر میں منزوا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر پتا جی کو ٹریکٹر سے اتارا گیا تب انھوں نے شکایت کی تھی کہ ان کا گلا کچھ سوکھ سا رہا ہے۔ وہ کچھ پریشان بھی تھے کیونکہ عدالت جانے کا راستہ انھیں معلوم نہیں تھا اور شہر کے لوگوں سے پوچھ۔ پوچھ کر کہیں جانے میں انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔

پتا جی کے ساتھ ایک دقت یہ بھی تھی کہ گاؤں یا جنگل کی پگڈنڈیاں تو انھیں یاد رہتی تھیں۔ شہر کی سڑکوں کو وہ بھول جاتے تھے۔ شہر وہ بہت کم جاتے تھے۔ جانا ہی پڑے تو آخری وقت تک وہ اسے ٹالتے رہتے تھے تب تک جب تک جانا بالکل ضروری نہ ہو جائے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ پتا جی سارا سامان لے کر شہر کے لیے روانہ ہوئے اور بس اڈے سے لوٹ آئے۔ بہانہ یہ بنایا کہ بس چھوٹ گئی جب کہ ہم سب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ پتا جی نے بس کو دیکھا ہوگا، پھر وہ کہیں بیٹھ گئے ہوں گے ـــ پیشاب کرنے یا پان کھانے پھر انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بس چھوٹ رہی ہے۔ انھوں نے ذرا سا اور انتظار کیا ہوگا جب بس نے رفتار پکڑ لی ہوگی۔ تب وہ کچھ دور تک دوڑے ہوں گے۔ پھر ان کے قدم دھیمے پڑ گئے ہوں گے اور افسوس اور غصّہ ظاہر کرتے وہ لوٹ گئے ہوں گے۔ ایسا کرتے ہوئے انھیں خود بھی لگا ہوگا کہ بس سچ مچ چھوٹ گئی ہے۔ ایسے میں جب کہ ہم مان چکے ہوتے کہ وہ شہر جا چکے ہیں، وہ

لوٹ کر ہمیں حیرت زدہ کر دیتے۔

ٹریکٹر سے منروا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر، مندہ واچ کمپنی کے ٹھیک سامنے تقریباً دس بج کر سات منٹ پر اترنے کے بعد سے لے کر شام چھ بجے تک پتاجی کے ساتھ شہر میں جو کچھ ہوا اس کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ جان کاری بھی کچھ لوگوں سے بات چیت اور پوچھ تاچھ کے بعد ملی ہے۔ کسی کی بھی موت کے بعد، اگر وہ موت بہت ہی اچانک اور غیر فطری طریقے سے ہوئی ہو، ایسی جان کاریاں مل ہی جاتی ہیں۔ اُس دن بُدھ، ۱ رمئی ۲،۶ کو صبح دس سے لے کر شام چھ بجے تک تقریباً پونے آٹھ گھنٹے میں پتاجی کہاں۔ کہاں گئے، کہاں۔ کہاں ان کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ اس کی بہت صحیح اور بہت صاف جان کاری تو ملنی مشکل ہے۔ جو خبریں یا جان کاریاں بعد میں ملیں ان کے ذریعہ ان حادثوں کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ بلرا گاؤں کے ماسٹر نند لال کا کہنا تھا کہ جب پتاجی ٹریکٹر سے اترے، تبھی انھوں نے گلا سوکھنے کی شکایت کی تھی۔ اس کے پہلے چنگی کے پاس انھوں نے سر گھومنے کی شکایت کی تھی جب وہ پیشاب کر کے لوٹے تھے۔ یعنی پتاجی پر دھتورے کے بیجوں کے کاڑھے کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ویسے بھی شہر پہنچنے تک پتاجی کو کاڑھا پیے ہوئے لگ بھگ دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت پتاجی کو پیاس بہت لگی ہوگی۔ گلا بھگونے کے لیے وہ کسی ہوٹل یا ڈھابے کی طرف گئے بھی ہوں گے لیکن جیسا کہ مجھے ان کی فطرت کے بارے میں پتہ ہے۔ وہ وہاں کچھ دیر کھڑے رہے ہوں گے اور پھر ایک گلاس پانی مانگنے کا فیصلہ نہ کر سکے ہوں گے۔ ایک بار انھوں نے بتایا بھی تھا کہ کچھ سال پہلے گرمیوں کے دنوں میں جب انھوں نے کسی ہوٹل میں پانی مانگا تھا تو وہاں کام کرنے والے نوکر نے انھیں گالی دی تھی۔ پتاجی بہت حساس تھے، اس لیے انھوں نے اپنی پیاس کو دبایا ہوگا اور وہاں سے چل پڑے ہوں گے۔

سوا دس سے لے کر لگ بھگ گیارہ بجے کے بیچ، پینتالیس منٹ تک پتاجی کہاں۔ کہاں گئے۔ اس کی کوئی جان کاری کہیں سے نہیں ملتی ہے اس بیچ کوئی خاص حادثہ بھی نہیں ہوا، جس سے کوئی کچھ کہہ سکے۔ پھر شہر میں سڑک پر آتے۔ جاتے لوگوں میں سے کسی نے ان پر دھیان دیا ہو، انھیں دیکھا ہو، اس کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ اس بیچ پتاجی نے کچھ لوگوں سے عدالت جانے کا راستہ پوچھا ہوگا اور ان کے دماغ میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے وکیل ایس۔ این اگروال سے پانی مانگ لیں گے لیکن ان کے پوچھنے پر یا تو لوگ چپ رہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئے ہوں گے یا کسی نے اتنی بوکھلاہٹ اور جلدبازی میں انھیں کچھ بتایا ہوگا، جو پتاجی ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ہوں گے اور صرف شرمندہ دُکھی اور پریشان ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ شہر میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

ویسے بیچ کے پون گھنٹے کے بارے میں میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس بیچ پتاجی پر کاڑھے کا اثر کافی بڑھ گیا ہوگا۔ مئی کی دھوپ اور پیاس نے اس اثر کو اور بھی تیز اور بھی گہرا کر دیا ہوگا۔ ان کے پیر لڑکھڑانے بھی لگے ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ ایک آدھ بار اس بیچ انھیں چکر بھی آ گئے ہوں گے۔

پتاجی گیارہ بجے، شہر میں دیش بندھو مارگ پر موجود اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی عمارت میں گھسے تھے۔ وہ وہاں کیوں گئے۔ اس کی وجہ ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آتی۔ ویسے ہمارے گاؤں کا رمیش دت شہر میں لینڈ ڈیولوپمینٹ کارپوریشن بینک میں کلرک ہے۔ ہو سکتا ہے پتاجی کے دماغ میں صرف بینک رہا ہو اور وہاں سے گذرتے ہوئے اچانک انھوں نے اسٹیٹ بینک لکھا ہوا دیکھا ہوگا اور وہ اُدھر گھوم گئے ہوں گے۔ انھوں نے اب تک پانی نہیں پیا تھا اس لئے انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ رمیش دت سے پانی مانگ لیں گے، عدالت جانے کا راستہ بھی پوچھ لیں گے اور اُسے بتا سکیں گے کہ ان کا سر گھوم رہا ہے، یہ بھی کہ کل شام انھیں ترچھ نے کاٹا تھا۔ اسٹیٹ بینک کے کیشئر اگنی ہوتری کے مطابق وہ اس وقت کیش رجسٹر چیک کر رہا تھا اس کی میز پر لگ بھگ اٹھائیس ہزار روپیوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت گیارہ سے دو تین منٹ اوپر ہوئے ہوں گے تبھی پتاجی وہاں آئے۔ ان کے چہرے پر دھول لگی ہوئی تھی چہرہ ڈراونا ہو رہا تھا اور اچانک ہی انھوں نے زور سے کچھ کہا تھا۔ اگنی ہوتری کا کہنا ہے کہ میں اچانک ڈر گیا۔ عموماً ایسے لوگ بینک کے اتنے اندر کیشئر کے ٹیبل تک نہیں پہنچ پاتے اگنی ہوتری کا کہنا یہ بھی تھا کہ اگر وہ پتاجی کو ایک آدھ منٹ پہلے سے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ لیتا تو وہ اتنا نہیں ڈرتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ پوری طرح سے کیش رجسٹر کے حساب کتاب میں جٹا ہوا تھا تبھی اچانک ہی پتاجی نے آواز نکالی اور سر اٹھاتے ہی انھیں دیکھ کر وہ ڈر گیا اور چیخ پڑا۔ اس نے گھنٹی بجا دی۔

بینک کے چپراسیوں، دو پہرے داروں اور دوسرے کارکنوں کے کہنے کے مطابق اچانک ہی کیشئر کی چیخ اور گھنٹی کی آواز سے وہاں موجود سب لوگ چونک گئے اور اس طرف دوڑے۔ تب تک نیپالی چوکیدار تھاپا نے پتاجی کو دبوچ لیا تھا اور مارتا ہوا کامن روم کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک چپراسی رام کشور، جس کی عمر پینتالیس سال کے آس پاس تھی، نے کہا کہ اس نے سمجھا کہ کوئی شرابی دفتر میں گھس آیا ہے یا پاگل اور چونکہ اس کی ڈیوٹی بینک کے سامنے والے دروازے پر تھی اس لئے برانچ منیجر اسے چارج شیٹ کر سکتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ پتاجی کو مارا جا رہا تھا، تبھی انھوں نے انگریزی میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے چپراسیوں کا شک بڑھ گیا۔ اسی بیچ شاید اسسٹنٹ برانچ منیجر مہتہ نے یہ کہہ دیا کہ اس آدمی کی اچھی طرح سے تلاشی لے لینا بہتر ہے اس کے بعد ہی باہر نکال دینا۔ ویسے چپراسی رام کشور کا کہنا تھا کہ پتاجی کا چہرہ عجیب طرح سے ڈراؤنا ہو رہا تھا اس پر دھول جمع ہو گئی تھی اور اُلٹی کی مہک آ رہی تھی۔ بینک کے چپراسیوں نے پتاجی کو زیادہ مارنے پیٹنے کی بات سے انکار کیا۔ لیکن بینک کے باہر، ٹھیک دروازے کے پاس جو پان کی دوکان ہے اس میں بیٹھنے والے بنّو کا کہنا تھا کہ جب ساڑھے گیارہ بجے کے آس پاس پتاجی بینک سے

ئے تو ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور نچلا ہونٹ
لیا تھا جہاں سے خون نکل رہا تھا۔ آنکھوں کے
رجن اور کتھئی چکتے تھے۔ ایسے چکتے بعد میں بیگنی یا نیلے
تے ہیں۔

اس کے بعد، یعنی ساڑھے گیارہ بجے سے لے کر
بجے کے بیچ پتا جی کہاں۔ کہاں گئے اس کے بارے
ئی جان کاری نہیں ملتی۔ ہاں اسٹیٹ بینک کے
پان کی دوکان لگانے والے بنّو نے ایک بات اور
تھی۔ حالانکہ اس بارے میں وہ پوری طرح سے کلیر
تھا یا ہو سکتا ہے کہ اسٹیٹ بینک کے کارکنوں سے
وجہ سے وہ صاف صاف بتانے سے کترا رہا ہو۔
نے بتایا کہ اسٹیٹ بینک سے باہر نکلنے پر شاید (وہ
اید، پر بہت زور ڈال رہا تھا) پتا جی نے کہا تھا کہ
کے روپے اور کاغذات بینک کے چپراسیوں نے
لیے ہیں لیکن بنّو کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے پتا جی
وئی اور بات کہی ہو کیونکہ وہ ٹھیک سے بول نہیں
ہے تھے۔ ان کا نچلا ہونٹ کافی کٹ گیا تھا۔ منھ
لار بھی بہہ رہی تھی اور ان کا دماغ صحیح نہیں تھا۔

میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس وقت پتا جی پر کاڑھے
ثر بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ حالانکہ پنڈت رام اوتار
بات سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دھتورے
بیج تو ہولی میں بھانگ کے ساتھ بھی گھوٹے جاتے
لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی پوری طرح سے پاگل
ہائے۔ پنڈت رام اوتار کا ماننا ہے کہ یا تو ترچھ کا
اس وقت پتا جی کے بدن میں چڑھنا شروع ہو گیا
اور اس کا نشہ ان کے دماغ تک پہنچنے لگا تھا یا پھر
ن ممکن ہے کہ جب اسٹیٹ بینک میں پتا جی کو تھاپا
یدار اور چپراسیوں نے مارا۔ پیٹا تھا تب ان کے
کے پیچھے کی طرف کوئی چوٹ لگ گئی ہو اور اس دھکے
ان کا دماغ سنک گیا ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اُس
ت پتا جی کو تھوڑا بہت ہوش تھا اور وہ پوری
شش کر رہے تھے کہ کسی طرح شہر سے باہر نکل جائیں۔
بدر روپے اور عدالت کے کاغذات بینک میں چھن
نے کی وجہ سے انھوں نے سوچا ہو کہ اب یہاں

رہنے کا کوئی مطلب بھی نہیں ہے۔ انھوں نے شاید
ایک آدھ بار سوچا ہوگا کہ واپس بینک جا کر اپنے
کاغذات تو کم سے کم مانگ لائیں پھر ایسا کرنے کی ان
کی ہمت نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ ڈر گئے ہوں گے۔ انھیں
ان کی زندگی میں پہلی بار اس طرح سے مارا گیا تھا اس
لئے وہ ٹھیک سے سوچ پانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے
ہوں گے۔ ان کا بدن بہت دبلا تھا اور بچپن سے ہی
انھیں اپینڈیسائٹس کی شکایت تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ اُس وقت ان پر کاڑھے کا اثر اتنا زیادہ ہو گیا ہوگا
کہ وہ ایک چیز پر دیر تک سوچ نہیں پا رہے ہوں گے
اور دماغ میں ہر پل پیدا ہوتے چھوٹے چھوٹے بلبلوں
جیسے خیالوں یا نئے نئے جھٹکوں کے قابو میں آ کر اِدھر سے
اُدھر چل پڑتے رہے ہوں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں،
مجھے اچھی طرح سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دماغ
میں گھر لوٹنے اور شہر سے باہر نکلنے کی بات — ایک
ٹھہری ہوئی یا بار بار کہیں اندھیرے سے ابھرنے والی،
پھلے ہی کچھ لمحوں کے لئے اور بہت ہی دھندلی بات ضرور
رہی ہوگی۔ پتا جی تقریباً سوا بجے شہر کے پولیس تھانے
پہنچے تھے۔ تھانہ شہر کے باہری چھور پر سرکٹ۔ ہاؤس کے
پاس بنا ہوا وجے استمبھ کے پاس ہے۔ حیرت یہ ہے کہ
تھانہ سے بمشکل ایک کیلو میٹر دور عدالت بھی ہے
اگر پتا جی چاہتے تو یہاں سے پیدل ہی دس منٹ میں
عدالت پہنچ سکتے تھے۔ سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پتا جی اگر
یہاں تک پہنچ گئے تھے تو کیا تب ان کے دماغ میں
عدالت جانے کی بات رہ بھی گئی تھی۔ ان کے کاغذات
تو رہ نہیں گئے تھے۔

تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او راگھویندر پرتاپ
سنگھ نے کہا کہ اُس وقت ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے
تھے۔ وہ گھر سے لائے گئے ٹفن کو کھول کر لنچ لینے کی
تیاری کر رہے تھے۔ آج ٹفن میں پراٹھوں کے ساتھ
کریلے رکھے ہوئے تھے کریلے وہ کھا نہیں پاتے اور اسی
الجھن میں تھے کہ اب کیا کریں۔ تبھی پتا جی وہاں آئے
تھے۔ ان کے بدن پر قمیص نہیں تھی پینٹ پھٹی ہوئی تھی
لگتا تھا کہ وہ کہیں گر گئے ہوں گے یا کسی گاڑی نے

انھیں ٹکر ماری ہوگی۔ تھانے میں اس وقت ایک ہی
سپاہی گجادھر پرساد موجود تھا۔ سپاہی کا کہنا تھا کہ
اس نے سوچا کوئی بھکاری تھانے میں گھس آیا ہے۔
اس نے آواز بھی دی لیکن پتا جی تب تک ایس۔ ایچ۔
او راگھویندر پرتاپ سنگھ کی ٹیبل تک پہنچ چکے
تھے۔ ایس۔ ایچ۔ او نے کہا کہ کریلوں کی وجہ سے ویسے
ہی ان کا موڈ آف تھا۔ تیرہ سال کی شادی شدہ زندگی
کے بعد بھی بیوی یہ نہیں جان پائی کہ کون سی چیز انھیں
پسند ہے اور کون سی ناپسند۔ اتنی ناپسند کہ وہ ان
چیزوں سے نفرت کرتے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی نوالا
منھ میں رکھا، پتا جی بالکل قریب پہنچ گئے۔ پتا جی کے
چہرے اور کندھوں کے نیچے الٹی لگی ہوئی تھی اور اس
کی بہت تیز بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایس۔ ایچ۔ او نے پوچھا
کہ کیا بات ہے تو جواب میں پتا جی نے جو کچھ کہا اسے سمجھنا
بہت مشکل تھا۔ ایس۔ ایچ۔ او راگھویندر سنگھ
بعد میں پچھتا رہا تھا کہ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ یہ آدمی
بکیلی گرام کا پردھان اور سابق ٹیچر ہے تو وہ اسے تھانے
میں کم سے کم دو چار گھنٹے بیٹھا لیتے۔ باہر نہ جانے دیتے۔
لیکن اس وقت انھیں لگا کہ یہ کوئی پاگل ہے اور انھیں
کھاتے ہوئے دیکھ کر یہاں تک گھس آیا ہے۔
اس لئے انھوں نے سپاہی گجادھر شرما کو غصّے میں آواز
دی۔ سپاہی پتا جی کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ گجادھر
شرما کا کہنا تھا کہ اس نے پتا جی کے ساتھ کوئی مارپیٹ
نہیں کی اور اس نے دیکھا تھا کہ جب وہ تھانے آئے
تھے تب ان کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا، ٹھڈی پر کہیں رگڑ
کھا کر گرنے سے کھرونچ کے نشان تھے اور کہنیاں
چھلی ہوئی تھیں۔ وہ کہیں نہ کہیں گرے ضرور تھے۔

یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ تھانے سے نکل کر لگ
بھگ ڈیڑھ گھنٹہ پتا جی کہاں کہاں بھٹکتے رہے۔ صبح
دس بج کر سات منٹ پر جب وہ شہر آئے تھے اور منروا۔
ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر ٹریکر سے اترے تھے
تب سے لے کر اب تک انھوں نے کہیں پانی پیا تھا یا
نہیں، اسے جاننا مشکل ہے۔ اس کی امید بھی کم ہی
ہے۔ ہو سکتا ہے تب تک ان کا دماغ اس قابل نہ

رہ گیا ہو کہ وہ پیاس کو بھی یاد رکھ سکیں۔ لیکن اگر وہ پولیس تھانے تک پہنچ گئے تو ان کے دماغ میں نشے کے باوجود، کہیں بہت کمزور سا، اندھیرے میں ڈوبا ہوا یہ خیال رہ گیا ہو گا کہ وہ کسی طرح اپنے گاؤں جانے کا راستہ وہاں پوچھ لیں۔ یا اس ٹریکٹر کا پتہ پوچھ لیں یا اپنے روپے اور عدالتی کاغذ چھن جانے کی رپورٹ وہاں لکھوا دیں۔ یہ سوچنے کے قریب پہنچنا ہی بڑی طرح بے چین کرنے والا ہے کہ اس وقت پتاجی صرف ترچھ کے زہر اور دھتورے کے نشے کے خلاف ہی لڑ رہے تھے بلکہ ہمارے مکان کو بچانے کی فکر بھی کہیں نہ کہیں اُن کے نشے کی نیند میں سے بار بار سر اٹھا رہی تھی۔ شاید انھیں اب تک یہ لگنے لگا ہو گا کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے صرف ایک خواب ہے۔ پتاجی اس سے جاگنے اور باہر نکلنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہوں گے۔

سوا دو بجے کے آس پاس پتاجی کو شہر کے بالکل شمالی حصے پر مبنی سب سے اچھی کالونی ــــ اتواری کالونی میں گھستے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ کالونی صرّافہ بازار کے چودھریوں، پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے بڑے ٹھیکیداروں اور ریٹائرڈ افسروں کی کالونی تھی کچھ امیر جرنلسٹ اور شاعر بھی وہاں رہتے تھے۔ یہ کالونی ہمیشہ خاموش اور حادثوں سے بچی ہوئی رہتی تھی۔ جن لوگوں نے یہاں پتاجی کو دیکھا تھا انھوں نے بتایا کہ اس وقت ان کے بدن پر صرف ایک جنگھیا بچا ہوا تھا جس کا ناڑا ٹوٹ گیا تھا اور وہ اُسے اپنے بائیں ہاتھ سے بار بار سنبھال رہے تھے۔ جس نے بھی انھیں دیکھا اس نے یہی سمجھا کہ کوئی پاگل ہے۔ کچھ نے کہا کہ وہ بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر زور زور سے گالیاں بکنے لگتے تھے۔ بعد میں اسی کالونی میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ ٹھیکیدار سونی صاحب اور شہر کے سب سے بڑے اخبار کے خصوصی نامہ نگار اور شاعر ستیندر تھپلیال نے بتایا کہ انھوں نے پتاجی کے بولتے ہوئے الفاظ کو ٹھیک سے سنا تھا اور دراصل وہ گالیاں نہیں بک رہے تھے بلکہ بار بار کہہ رہے تھے ــــ میں رام سوارتھ پرساد، ایکس اسکول ہیڈ ماسٹر۔ اینڈ ویلیج ہیڈ آف گرام ــــ بکیلی ــــ! شاعر جرنلسٹ تھپلیال صاحب نے افسوس ظاہر کیا۔ دراصل اسی وقت وہ امریکی سفارت خانہ کی کسی خاص پارٹی میں موسیقی سننے دہلی جا رہے تھے اس لئے جلد بازی میں وہ چلے گئے۔ ہاں تحصیل دار سونی صاحب کا کہنا تھا کہ "مجھے اس آدمی پر بہت ترس آیا اور میں نے لڑکوں کو ڈانٹا بھی، لیکن دو تین لڑکوں نے کہا کہ یہ آدمی رام رتن صرّاف کی بیوی اور سالی پر حملہ کرنے والا تھا۔" تحصیل دار نے کہا کہ ایسا سننے کے بعد انھیں بھی لگا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی بدمعاش ہو اور ناٹک کر رہا ہو۔ لڑکے انھیں تنگ کرنے میں لگے تھے اور پتاجی بیچ بیچ میں زور زور سے بول رہے تھے "میں رام سوارتھ پرساد ــــ ایکس اسکول ہیڈ ماسٹر . . . ."

اگر حساب لگایا جائے تو منزوا ٹاکیز کے پاس والا چوراہا، جہاں پتاجی ٹریکٹر سے صبح دس بج کر سات منٹ پر اترے تھے وہاں سے لے کر دیش بندھو مارگ کا اسٹیٹ بینک، پھر وجے استمبھ کے پاس کا تھانہ اور شہر کے باہری شمالی سرے پر بسی اتواری کالونی کو ملا کر وہ اب تک لگ بھگ تیس بتیس کیلو میٹر کی دوری تک بھٹک چکے تھے یہ جگہیں ایسی ہیں جو ایک ہی رُخ میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پتاجی کی دماغی حالت یہ تھی کہ انھیں کچھ ٹھیک ٹھیک سوجھ نہیں رہا تھا اور وہ اچانک ہی کسی بھی طرف چل پڑتے تھے، جہاں تک صرّاف کی بیوی اور سالی پر ان کے حملہ کرنے کی بات ہے تھپلیال صاحب سچ مانتے ہیں، میرا اپنا اندازہ ہے کہ پتاجی ان کے پاس یا تو پانی مانگنے گئے ہوں گے یا بکیلی جانے والی سڑک کے بارے میں پوچھنے۔ اُس ایک پل کے لئے پتاجی کو ہوش ضرور رہا ہو گا۔ لیکن اس حلیے کے آدمی کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ عورتیں ڈر گئی ہوں گی۔ ویسے پتاجی کی داہنی آنکھ کے اوپر، بھوں پر چوٹ لگی تھی جس کا خون رس کر ان کی آنکھ پر آنے لگا تھا، وہ چوٹ ان کو اتواری کالونی میں ہی لگی تھی کیوں کہ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ لڑکے انھیں بیچ بیچ میں ڈھیلے مار رہے تھے۔

وہ جگہ اتواری کالونی سے بہت دور نہیں ہے جس جگہ پتاجی سب سے زیادہ چوٹیں لگیں۔ نیشنل ریسٹورینٹ نام کے ایک سستے سے ڈھابے کے سامنے والی خالی جگہ پر پتاجی گھر گئے تھے۔ اتواری کالونی سے لڑکوں کا جھنڈ ان کے پیچھے پڑ گیا تھا اس میں کچھ بڑی عمر کے لڑکے بھی شامل ہو گئے تھے۔ نیشنل ریسٹورینٹ میں کام کرنے والے نوکر ستے کا کہنا تھا کہ پتاجی نے غلطی یہ کی تھی کہ ایک بار انھوں نے غصّے میں آ کر پھر پھر ڈھیلے مارنے شروع کر دیئے تھے۔ شاید انھیں کا ایک بڑا سا ڈھیلا سات آٹھ سال کے ایک لڑکے وکی اگروال کو لگ گیا تھا، جس کے بعد اُسے کئی ٹانکے لگے تھے ستے کا کہنا ہے کہ اس کے بعد جھنڈ زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ وہ ہلّا مچا رہے تھے اور چاروں طرف سے پتاجی کو پتھر مار رہے تھے۔ ڈھابے کے مالک سردار ستنام سنگھ نے بتایا کہ اس وقت پتاجی کے جسم پر صرف پٹے والی ایک چڈی تھی، دُبلے بدن کی ہڈّیاں اور چھاتی کے سفید بال نظر آ رہے تھے، پیٹ پچکا ہوا تھا، وہ دھول اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے، سر کے سفید بال بکھرے ہوئے تھے ما داہنی آنکھ کے اوپر سے اور نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ ستنام سنگھ نے دُکھ اور پچھتاوے کے ساتھ کہا "میرے کو کیا معلوم تھا کہ یہ آدمی سیدھا سادہ، عزّت دار، ساکھ، رسوخ کا انسان ہے اور نصیب کے پھیر میں اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔" ویسے ڈھابے میں کپ پلیٹ دھونے والے نوکر ہری کا کہنا تھا کہ بیچ بیچ پتاجی بھیڑ کو انڈ۔ بنڈ گالیاں دے دے کر ڈھیلے مارنے لگتے تھے۔ "آؤ سسُرو۔ آؤ۔ ایک ایک کو مار ڈالوں گا . . تمھاری ماں کی ــ"، لیکن مجھے شک ہے کہ پتاجی نے ایسی کوئی گالی دی ہو گی۔ ہم نے کبھی بھی انھیں گالی دیتے ہوئے نہیں سنا تھا۔

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کیوں کہ پتاجی کو میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس وقت تک انھیں کئی بار لگا ہو گا کہ ان کے ساتھ جو بیت رہی ہے وہ سچائی نہیں ہے ایک خواب ہے۔ پتاجی کو یہ سارے حادثے، اول جلول، اوٹ پٹانگ اور بے مطلب لگے ہوں گے۔ وہ ان سب پر شک کرنے لگے ہوں گے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ یہ سب کیا بکواس ہے۔ وہ تو گاؤں سے شہر آئے ہی نہیں ہیں انھیں کسی ترچھ نے نہیں کاٹا ہے

بلکہ ترچھ تو ہوتا ہی نہیں ہے ایک من گڑھنت اور وہم ہے . . . . اور دھتورے کا کاڑھا پینے کی بات تو مضحکہ خیز ہے وہ بھی ایک تیلی کے کھیت میں اس کا پودھا کھوج کر۔ انھوں نے سوچا ہوگا اور پایا ہوگا کہ بھلا ان پر کوئی مقدمہ کیوں چلے گا۔ انھیں عدالت جانے کی کیا ضرورت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سُرنگ جیسا لمبا ڈراونا خواب جیسا مجھے آتا تھا، پتاجی کو بھی آتا رہا ہوگا۔ میرے اور ان کے درمیان بہت سی باتیں ملتی جلتی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس وقت تک پتاجی پوری طرح سے مان چکے ہوں گے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب جھوٹ ہے اور تخیلاتی ہے اس لئے وہ بار بار اس خواب سے جاگنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہوں گے اگر وہ بیچ بیچ میں زور۔ زور سے کچھ بولنے لگتے تھے یا شاید گالیاں بکنے لگتے تھے تو اسی مشکل کوشش میں کہ وہ اس آواز کے سہارے اس خراب خواب سے باہر نکل آئیں نیشنل ریسٹورینٹ کے نوکر اور مالک ستنام سنگھ نے جیسا بتایا تھا اس کے مطابق اس جگہ پر پتاجی کو بہت چوٹیں آئیں تھیں ان کی کنپٹی، ماتھے، پیٹھ اور بدن کے دوسرے حصّوں پہ کئی اینٹ اور ڈھیلے آکر لگے تھے۔ سڑک کا ٹھیکہ لینے والے ٹھیکے دار اروڑا کے بیس بائیس سال کے لڑکے سنجو نے انھیں دو تین بار لوہے کی راڈ سے بھی مارا تھا۔ ستے کا کہنا تھا کہ اتنی چوٹوں سے کوئی بھی آدمی گر سکتا تھا۔

مجھے یہ سوچ کر ایک عجیب سی راحت ملتی ہے اور میری پھنستی ہوئی سانسیں پھر سے ٹھیک ہو جاتی ہیں کہ اس وقت پتاجی کو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا رہا ہوگا کیوں کہ وہ اچھی طرح سے پوری دلیل اور گہرائی سے محسوس کرنے لگے ہوں گے کہ یہ سب محض ایک خواب ہے اور جیسے ہی وہ جاگیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنکھ کھلتے ہی آنگن بُہارتی ماں نظر آئے گی یا نیچے فرش پر سوئے میں اور چھوٹی بہن دِکھ جائیں گی۔ یا گوریّوں کا جھنڈ۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں بیچ بیچ میں اپنے اس عجیب وغریب خواب پر ہنسی بھی آئی ہو۔

اگر پتاجی نے غصّے میں لڑکوں کی طرف خود بھی ڈھیلے مارنے شروع کر دیئے تھے تو اس کے پیچھے پہلی وجہ تو یہی تھی کہ یہ ڈھیلے خواب کے اندر جا رہے ہیں اور اس سے کسی کو کوئی چوٹ نہیں آئے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری طاقت سے ڈھیلا مار کر وہ تجسس اور بے چینی سے یہ انتظار کرتے رہے ہوں کہ وہ جیسے ہی کسی لڑکے کو لگے گا اس کا سر پھٹ جائے گا اور ایک ہی جھٹکے میں ان کا یہ ڈراونا خواب بھی ختم ہو جائے گا چاروں اور سے اصلی دنیا کی بے تحاشہ روشنی اندر آنے لگے گی۔ ان کا زور۔ زور سے چیخنا بھی دراصل غصّے کی وجہ سے نہیں تھا۔ وہ اصل میں مجھے، چھوٹی بہن کو۔ ماں کو یا کسی کو بھی پکار رہے تھے کہ اگر وہ اپنے آپ اسی خواب سے جاگ پانے میں کامیاب نہ بھی ہو پائیں، تب بھی کوئی بھی آکر انھیں جگا دے۔

ایک سب سے بڑی افسوس کی بات اس بیچ ہوئی۔ ہمارے گاؤں کی گرام پنچایت کے سرپنچ اور پتاجی کے بچپن کے پرانے دوست کندھئی رام تواری تقریباً ساڑھے تین بجے نیشنل ریسٹورینٹ کے سامنے سے گذرے تھے وہ رکشے پر تھے انھیں اگلے چوراہے سے بس لے کر گاؤں لوٹنا تھا۔ انھوں نے اس ڈھابے کے سامنے بھیڑ کو بھی دیکھا اور انھیں یہ پتہ بھی چلا کہ وہاں پر کسی آدمی کو مارا جا رہا ہے۔ ان کی خواہش بھی ہوئی کہ وہاں جا کر دیکھیں کہ آخر معاملہ ہے۔ انھوں نے رکشہ رکوا بھی لیا۔ لیکن ان کے پوچھنے پر کسی نے کہا کہ کوئی پاکستانی جاسوس پکڑا گیا ہے جو پانی کی ٹنکی میں زہر ڈالنے جا رہا تھا اسے ہی لوگ مار رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت پنڈت کندھئی رام کو گاؤں جانے والی بس آتی ہوئی نظر آئی اور انھوں نے رکشہ والے کو اگلے چوراہے تک جلدی۔ جلدی رکشہ بڑھانے کے لئے کہا۔ گاؤں جانے والی یہ آخری بس تھی۔ اگر اس بس کے آنے میں تین چار منٹ کی بھی دیری ہو جاتی تو وہ آرام سے وہاں جا کر پتاجی کو دیکھتے اور انھیں پہچان لیتے۔ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس ہمیشہ آدھ۔ پون گھنٹہ لیٹ رہا کرتی تھی لیکن اس دن اتفاق سے وہ بالکل صحیح وقت پر آ رہی تھی۔

ستنام سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ بھیڑ نیشنل ریسٹورینٹ کے سامنے سے تب ہٹی اور لوگ تتر بتر ہوئے، جب بہت دیر تک پتاجی زمین سے اٹھے ہی نہیں۔ اینٹ کا ایک بڑا سا ڈھیلا ان کی کنپٹی پر آکر لگا تھا۔ ان کے منھ سے خون آنا شروع ہوا تھا۔ سر پر چوٹیں بھی بہت تھیں۔ ستنام نے بتایا کہ جب پتاجی بہت دیر تک نہیں ہلے۔ ڈولے تھے لڑکوں کے جھنڈ میں سے کسی نے کہا کہ لگتا ہے یہ مر گیا۔ جب بھیڑ چھٹنے کے دس پندرہ منٹ بعد بھی پتاجی نہیں ہلے۔ ڈولے تو ستنام سنگھ نے ستّے سے کہا کہ وہ ان کے منھ پر پانی کے چھینٹے مار کر کے دیکھے کہ اگر وہ صرف بے ہوش ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اُٹھ جائیں۔ لیکن ستے پولیس کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔ بعد میں ستنام سنگھ نے خود ہی ایک بالٹی پانی ان کے اوپر ڈالا تھا۔ دور سے پانی ڈالنے کی وجہ سے زمین کی مٹی گیلی ہو کر پتاجی سے لتھڑ گئی تھی۔

سردار ستنام سنگھ اور ستے دونوں کا کہنا تھا کہ لگ بھگ پانچ بجے تک پتاجی اسی جگہ پڑے ہوئے تھے تب تک پولیس نہیں آئی تھی۔ پھر ستنام سنگھ نے سوچا کہ اُسے پنچ نامہ اور گواہی وغیرہ میں نہ پھنسنا پڑ جائے اس لئے اس نے ڈھابہ بند کر دیا تھا اور ڈیلائٹ ٹاکیز میں دآن ملو سجنا، فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔

اس وقت لگ بھگ چھ بجے تھے جب سول لائنس کی سڑک کی پٹریوں پر ایک قطار میں بنی موچیوں کی دوکان میں سے ایک موچی گنیشوا کی گمٹی میں پتاجی نے اپنا سر گھُسیڑا۔ اس وقت ان کے بدن پر چڈھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل کسی چوپائے کی طرح رینگ رہے تھے۔ بدن پر کالکھ اور کیچڑ لگی ہوئی تھی اور جگہ جگہ چوٹیں تھیں۔

گنیشوا ہمارے گاؤں کے تالاب کے پار والے ٹولے کا موچی ہے اس نے بتایا کہ میں بہت ڈر گیا اور ماسٹر صاحب کو پہچان ہی نہیں پایا۔ ان کا چہرہ ڈراونا ہو گیا تھا اور پہچان میں نہیں آ تا تھا۔ میں ڈر گمٹی سے باہر نکل آیا اور شور مچانے لگا۔ دوسرے موچیوں کے علاوہ وہاں کچھ اور لوگ بھی اکٹھا ہو گئے تھے۔ لوگوں نے جب گنیشوا کی گمٹی کے اندر جھانکا تو وہاں اس کے سب سے آخری کونے میں، ٹوٹے پھوٹے جوتوں، چمڑوں کے ٹکڑوں، ربر اور چیتھڑوں کے بیچ پتاجی دبکے ہوئے تھے ان کی سانسیں تھوڑی بہت چل رہی تھیں۔ انھیں وہاں سے کھینچ کر نکالا گیا تبھی گنیشوا نے انھیں پہچان لیا۔ گنیشوا کا کہنا کہ اس نے پتاجی کے کان میں کچھ آوازیں بھی لگائی لیکن

وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ بہت دیر بعد انھوں نے رام سوارتھ پرساد اور بکیلی جیسا کچھ کہا تھا، پھر چپ ہو گئے تھے۔

پتا جی کی موت سوا چھ بجے کے آس پاس ہوئی تھی۔ تاریخ ۱۷ مئی ۱۹۷۲ء چوبیس گھنٹے پہلے لگ بھگ اسی وقت انھیں ترچھے کاٹا تھا۔ چوبیس گھنٹے پہلے کیا پتا جی ان حادثوں اور اس موت کا اندازہ کر سکتے تھے۔

پتا جی کی لاش شہر کے مردہ گھر میں پولیس نے رکھوا دی تھی۔ پوسٹ مارٹم میں پتہ چلا تھا کہ ان کی ہڈیوں میں کئی جگہ فریکچر تھا، دائیں آنکھ پوری طرح پھوٹ چکی تھی کالربون ٹوٹا ہوا تھا۔ ان کی موت ذہنی صدمہ اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق ان کا پیٹ خالی تھا۔ اس کا مطلب ہوا کہ دھتورے کے بیجوں کا کاڑھا الٹیوں کے ذریعے پہلے ہی نکل چکا تھا۔

حالانکہ تھا لو کہتا ہے کہ اب تو یہ طے ہو گیا کہ ترچھ کے زہر سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد اس نے اپنا کرشمہ دکھایا اور پتا جی کی موت ہوئی۔ پنڈت رام اوتار بھی یہی کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت رام اوتار اس لئے ایسا کہتے ہوں کہ وہ خود کو یقین دلانا چاہتے ہوں کہ دھتورے کے کاڑھے کا پتا جی کی موت سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

میں سوچتا ہوں، اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ شاید آخر میں جب گنیشوا نے اپنی گمٹی کے باہر پتا جی کے کان میں آواز دی ہوگی تو پتا جی خواب سے جاگ گئے ہوں گے۔ انھوں نے مجھے، ماں کو اور چھوٹی بہن کو دیکھا ہوگا، پھر وہ داتون لے کر ندی کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ ندی کے ٹھنڈے پانی سے انھوں نے اپنا چہرہ دھویا ہوگا۔ کُلّا کیا ہوگا اور اس لمبے ڈراونے خواب کو وہ بھول گئے ہوں گے۔ انھوں نے عدالت جانے کے بارے میں سوچا ہوگا ہم لوگوں کے مکان کی فکر نے انھیں پریشان کیا ہوگا۔

لیکن میں اپنے خواب کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو مجھے اکثر آتا ہے۔ وہ یوں ہے کہ میں کھیتوں کی مینڑ، گاؤں کی پگڈنڈی سے ہوتا ہوا جنگل پہنچ گیا ہوں۔ میں رکسا نالہ، کیکر کے پیڑ کو دیکھتا ہوں۔ وہ بھوری چٹان وہاں، اسی جگہ ہے جو ساری بارش کے موسم میں نالے کے پانی میں ڈوبی رہتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ ترچھ کی لاش اس کے اوپر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے ایک بے تحاشہ خوشی اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے آخر وہ مارا گیا۔ میں تھپڑے کر ترچھ کو کچلنے لگتا ہوں۔ زور زور سے اسے مارتا ہوں۔ میرے پاس تھا نو مٹی کا تیل اور ماچس لئے کھڑا ہے تبھی اچانک ہی میں پاتا ہوں کہ میں اس چٹان پر نہیں ہوں، تھا نو بھی وہاں نہیں ہے وہ کوئی جنگل نہیں ہے بلکہ دراصل شہر میں ہوں میرے کپڑے بہت ہی میلے۔ پھٹے ہوئے چیتھڑوں جیسے ہو گئے ہیں۔ میرے گالوں کی ہڈیاں نکلی ہیں بال بکھرے ہوئے ہیں مجھے پیاس لگی ہے اور میں بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید میں بکیلی اپنے گھر جانے کا راستہ پوچھنا چاہتا ہوں اور تبھی اچانک چاروں طرف شور اٹھتا ہے گھنٹیاں بجنے لگتی ہے —— ہزاروں ہزاروں گھنٹیاں میں بھاگنے لگتا ہوں۔

میں بھاگتا ہوں —— میرا پورا جسم بے دم ہونے لگتا ہے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں اور پاس پاس قدم رکھ کر اچانک لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوں۔ اڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بھیڑ لگتا ہے میرے پاس پہنچنے والی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی گرم اور بھاری ہوا مجھے سن کر دیتی ہے اپنے قتل کی سانسیں مجھے چھونے لگتی ہیں اور آخر کار وہ پل آجاتا ہے جب میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہوتا ہے۔

میں روتا ہوں —— بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا پورا بدن نیند میں ہی پسینے میں ڈوب جاتا ہے میں زور زور سے بول کر جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خواب ہے —— اور ابھی آنکھیں کھولتے ہی یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خواب کے اندر اپنی آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوں —— دور تک —— لیکن وہ پل آخر آ ہی جاتا ہے۔

ماں باہر سے مجھے دیکھتی ہے۔ میرا سر سہلا کر مجھے لحاف سے ڈھانپ دیتی ہے اور میں وہاں اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہوں۔ اپنی موت سے بچنے کی کوشش میں جوجھتا بے دم ہوتا، روتا، چیختا اور بھاگتا۔

ماں کہتی ہے مجھے ابھی بھی نیند میں بڑبڑانے اور چیخنے کی عادت ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں اور یہی سوال ہمیشہ مجھے پریشان کرتا ہے کہ مجھے آخر کار اب ترچھ کا سپنا کیوں نہیں آتا۔

ترجمہ: مشرف عالم ذوقی

ہیلیم

نام : للت کارتیکے
پیدائش : ۳ر اپریل ۱۹۵۸ء سارن (ہریانہ)
ادبی سرگرمیاں : ۱۹۷۸ء میں رسالہ 'کدھر' کی ادارت۔
انجمن ترقی پسند مصنفین کے رسالہ 'الھ' کی ادارت۔
شغل : اگروال کالج، بلبگڑھ میں انگریزی کے لیکچرار
پتہ : معرفت اروند جین ایڈوکیٹ
۲۱/۴۶۴۸، انصاری روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

چھوٹے قد، سانولی رنگت اور بیج کٹ بالوں
س لڑکی میں سینئی ایم ایم کا دماغ تھا اور دماغ
یٹ مین کلرک کا ایک سپنا۔ سپنا کوئی مستقل تصویر
ھا کہ وہ خود یا کوئی اور اسے آخری روپ
یک ہی بار میں بیان کر سکتا۔ وہ ایک فلم کے
تھا۔ بہتے ہوئے منظر، ایک کے بعد ایک ہوتا ہوا
۔ اس خواب کے بہاؤ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔
، روز کچھ منظروں اور واقعات، کردار اور مکالموں
فہ ہو جاتا۔ وہ پرانے منظروں کی تفصیلات
ر، کرداروں کے ہیئر اسٹائل اور لباسوں
میں تبدیلیاں کر کے انہیں لگاتار اپ ٹو ڈیٹ
رہتی۔

ہاں اہم کردار ضرور فائنل ہو چکے تھے۔ ایک
بد دوسرا اس کا ہیرو۔ سفید دودھیا دانتوں،
، آنکھوں والا ایک لمبا، پرکشش شخص۔ لیوں
ں شخص کا نام پتہ پکے طور پر نہیں جانتی تھی۔ بے شمار
ں میں اور بے شمار جگہوں پر وہ اس کو نظر آتا رہا
کبھی سوٹنگ شرٹنگ کے اشتہاروں میں، کبھی
پلیس کے برآمدوں میں، کبھی ان نئے بستے وہاروں
ہاں وہ ٹیوشنیں پڑھانے جایا کرتی تھی۔ ایک
بیت سے آئے کسی رشتے دار پریوار کے ساتھ گھومنے
؛ وہ شام کو انڈیا گیٹ گئی تھی تو وہ اسے سردیوں

کی دھند اور اترتی ہوئی رات کے ساتھ سٹ کر بیٹھا
ہوا، کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑک کے آس پاس کی
دھندلی پیلی روشنی سے پارک کے اندھیرے کی طرف
خود بخود اٹھتے قدموں سے بڑھتا، جانے کس کی کمر
کو اپنی باہوں میں گھیرے اندھیرے کی چٹان سے باہر
نکل کر سڑک کی روشنی کے مٹیالے پُرسکون تالاب
میں اترتا ہوا۔

عمر کے کس موڑ پر کیسے اس خواب کا آغاز ہوا۔ لڑکی
کو نہیں معلوم۔ جانے کتنے برسوں سے وہ اس شخص اور
اپنے چاروں طرف جلتی بجھتی رنگ برنگی نیون لائٹوں
سی طلسمی، جھلمل دنیا بناتی رہی تھی۔ اسے کہیں کوئی منظر
خوش گوار لگتا، کوئی فضا پسند آجاتی کوئی چیز دلچسپ
لگتی تو پتہ نہیں وہ کب اپنے آپ اس دنیا میں شامل
ہو جاتی۔ وہ کب اس دنیا کے اندر ہوتی، کب باہر۔
کہہ پانا مشکل ہے۔ شاید وہ ایک ساتھ باہر بھی ہوتی
اور اندر بھی۔

ٹرن ٹنگ! شام کو آدمی اپنے کام سے
گھر لوٹتا ہے۔ وہ کبھی ڈاکٹر ہوتا ہے، کبھی الیکٹرانکس
انجینئر، کبھی فلائٹ لیفٹیننٹ، کبھی منیجر، کبھی
آئی اے۔ ایس افسر۔۔۔ کبھی کبھی بزنس مین!۔۔۔
اس کے گورے گڈیک چہرے پر ہلکی سی تھکان ہے، لال
ہونٹوں پر دھلی سفید مسکان، چوڑے ماتھے پر جھولتی

نرم بالوں کی ایک کالی لٹ۔ لڑکی بڑے دل کش انداز میں چائے لاتی ہے۔ سپنے میں ٹرے، کراکری، چائے کا برانڈ، پینٹنگس، میز، صوفہ، ٹی وی، ایرکنڈیشنر، ویڈیو، اسٹیریو بدلتے رہتے تھے۔ لڑکی کے ان چیزوں سے متعلق علم کے بڑھتے جانے کے ساتھ ساتھ آدمی مدہوش سا اس کی طرف دیکھتا ہوا اٹھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہے۔ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہے۔ لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لیے لیے کئی بار ایڑیوں پر گھوم جاتا ہے۔ وہ دونوں کھلکھلاتے ہوئے گدگدے ایرانی قالین میں ڈھیر ہو جاتے ہیں.... ٹن... ن۔ ن ....نا۔ انگ!

ٹن۔ انگ! وہ دونوں اپنی نئی ماروتی میں شاپنگ کرنے نکلے ہیں۔ آدمی کا قد و قامت، لباس، چہرے اور آنکھوں میں دمکتا رعب دیکھ کر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتی بھیڑ راستہ چھوڑتی جاتی ہے۔ وہ اس کی چھایا میں سوفتی کرتی ایک جگمگ اسٹور سے نکل کر دوسرے، پھر تیسرے ..... میں گھستی چلی جاتی ہے۔ ایک ایک چیز کو پرکھتی ہے، خوب مول بھاؤ کرتی ہے، آخر میں دکان دار کے بتلائے ہوئے بھاؤ سے کچھ کم پر چیزیں خرید لیتی ہے۔ پہلے آدمی کی باہیں پیکیٹ ڈبیوں سے بھرتی ہیں، پھر لڑکی کی۔ ہر ڈبے کے ساتھ وہ زمین سے تھوڑا اوپر اٹھتے جاتے ہیں۔ اطمینان، تحفظ اور خود اعتمادی سے بھرتے جاتے ہیں۔ اس رات ان کا پیار اور گہرا ہو جاتا ہے۔ پہلے شاپنگ ویسپا پر ہوتی تھی پھر ایک سیکنڈ ہینڈ ایمبیسڈر آئی۔ اسے بیچ کر اور اس دوران کی بچت ملا کر پدمنی پریمیئر لی۔ شکر ہے کہ اس نے ضد کر کے ماروتی کی رجسٹریشن کروا دی تھی۔ ورنہ بلیک میں لینی پڑتی۔ دن بدن بڑھتی بلیک اور اپنی کوٹھی کے پورچ میں بازار بھاؤ پر آ کھڑی ہوئی ماروتی کو دیکھ کر آدمی جذباتی ہو جاتا ہے۔ "او ہو، آرتی، یو آر ٹو وائز

You are too wise

ٹو فارسائیٹڈ Too farsighted

میں تو صرف پیسہ کمانا جانتا ہوں۔ اس کا صحیح استعمال تمہیں کرنا آتا ہے۔" لڑکی یہ سن کر پھولی نہیں سماتی۔ ایکا ایک اداس ہو جاتی ہے۔ ماضی کی راہوں پر واپس لوٹتی ہے اور جیسے کسی گہرے اندھیرے تہہ خانے سے بولتی ہے۔ "سب ممی نے سکھایا۔ راجے سب! ممی ہی نے ہمارے گھر کو بنایا۔ بڑھایا! پاپا تو بس.... کیول ڈیڈی اب اس پدمنی کو ٹیکسی نہ بنا دیں..... ٹن۔ گ۔ گ۔ انگ۔!!

ٹن انگ! وہ ساڑی کا پلو کمر میں کھونس کر کوٹھی کے آگے پیچھے لگائے گئے پودوں کو پانی دے رہی ہے۔ نیپالی نوکر، بہادر کچن کا کام چھوڑ کر اس سے کچھ دور آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ انگلیاں چٹکاتا وہ کبھی زمین کبھی پھولوں کبھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ کچھ پریشان سا۔ بہادر کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ غصے کا اظہار کرتی ہے۔ "کیا ہے رے؟ .... کچن کا کام ختم ہو گیا کیا؟" بہادر انگلیاں چٹکاتا، ہکلاتا ہے۔ "میم صاحب'.... میم صاحب ..... وہ" اس کے چہرے پر غصے کی لکیریں اور گہری ہو جاتی ہیں۔ "کیا میم صاحب، میم صاحب لگا رکھی ہے۔ بولنا نہیں آتا کیا؟ تم گنواروں کو کبھی کچھ نہیں آئے گا۔ کتنی بار کہا ہے، جو کہنا ہو اسے پہلے ٹھیک سے سوچو، پھر صاف صاف کہو۔" بہادر کی نظریں زمین، پھولوں، اس کے چہرے سے لڑکھڑاتی ہوئی زمین پر جا گرتی ہیں۔ وہ ڈھیلے بدن کو کچھ کچھ راست حالت میں لاتا ہے۔ کچھ دیر سوچتا ہے پھر ایسے بولنے لگتا ہے جیسے کوئی بچہ اپنے استاد کو کوئی سبق سنا رہا ہو۔ "گھر سے خط آیا ہے۔ باپ بیمار ہے، پیسہ منگایا ہے۔ نہیں بھیجا تو مر جائے گا۔" بہادر کے کھڑے ہونے اور بولنے کے انداز پر اس کی ہنسی چھوٹنے کو ہوتی ہے کہ وہ پھر انگلیاں چٹکاتا، ہکلاتا ہے۔ "میم صاحب.... اس مہینے کی تنخواہ.... اس مہینے کی تنخواہ پہلے ہی دے دو میم صاحب...." لڑکی ہنسی کو ملتوی کر کے پھر غصے کا اظہار کرنے کو ہوتی ہے کہ بہادر کی آواز رندھ جاتی ہے۔ "میم صاحب.... .... باپ....!" اس کا دل پگھل جاتا ہے لیکن کھڑیر بنی رہتی ہے۔ "پیسے کی کان ہے کیا یہاں؟ اس مہینے کا کام کیا پہلے ہی کر دیا ہے جو تنخواہ پیشگی دے دیں؟" بہادر انگلیاں چٹکاتا سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔ وہ آواز کو تھوڑا نرم کر لیتی ہے۔ "اچھا اچھا رومت! چل کچن کا کام ختم کر۔ شام کو صاحب سے پوچھ کر بتا دوں گی۔"

.... لڑکی پھولوں پودوں کو پانی دیتی سوچتی جاتی ہے۔ پیسے تو اسے دینے ہی چاہئیں۔ اس عمر میں بیچارہ پھر کہیں اور کھسک گیا تو! شریمتی برمن تو پہلے ہی اسے پھسلانے کے چکر میں ہے۔ لیکن نوکروں کو تو تھوڑا ڈانٹ ڈپٹ کر رکھنا ہی چاہیے ورنہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ممی کے سارے گر کتنے کامیاب ہیں! میری جگہ پاپا ہوتے تو کیا کرتے؟ .... ہوں! بہادر سے کام لینے کی بجائے اسے پڑھانے لکھانے لگتے۔

Papa was an impractical Guy

لیکن میں نے بھی کیا نہیں کیا بہادر کے لیے۔ آیا تھا تو کتنا گندہ تھا۔ چکٹ کپڑے، میلا بدن۔ ایسا نوکر بھلا Guest لوگوں کے سامنے لایا جا سکتا تھا۔ اب تو بہادر کا حلیہ بدل گیا ہے۔ نوکر نہیں منی ڈینی لگتا ہے۔ شریمتی برمن نے دیکھا تھا تو بولیں "اوہ! How cute" وہ اپنی کامیابی پر سرشار ہو اٹھتی ہے۔ فیصلہ کر لیتی ہے کہ شام کو بہادر کو پیشگی تنخواہ دے دے گی۔ سوا سو ہی کی بات تو ہے۔ اپنی مہربانی اور فراخ دلی پر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ ہاں جی ہم سے تو نہیں بنا جاتا اتنا پتھر دل! ہم نے بھی تو برے دن دیکھے ہیں۔ اندر جا کر بہادر سے کہتی ہے "چائے پینے کا من ہو تو بنا لو۔" ٹن۔ ن۔ ن۔ انگ!!

ٹن۔ انگ! آدمی نے کام سے تھک کر پندرہ دن کی چھٹیاں لیں۔ وہ دونوں ایرانڈیا کے جہاز کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے وداع کرنے آئے دوستوں سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ نیپال، سنگاپور، ہانگ کانگ! دوستوں نے کافی سامان لکھوا دیا ہے وہاں سے لانے کے لیے۔ تھوڑا خطرہ ہے، لیکن ایک طریقے سے مفت میں پڑ جائے گا۔ یہ ٹرپ۔ ہو سکتا ہے کچھ بچت بھی ہو جائے۔ آدمی پھر جذباتی ہو گیا ہے ——

You are too wise

مانی دور اندیش۔ ٹن۔ن۔ن۔ن۔انگ۔گ۔

ٹن۔انگ! اُس نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی ٹیوشن بھی۔ اسٹاک شئیرز کے ذریعے وہ گھر بیٹھے اس سے دوگنا کمارہی ہے۔ پڑھا تو اس دنیا میں صرف پاپا جیسے لوگ سکتے ہیں۔ ایک کوچنگ سینٹر کھول دیا ہے۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں۔ چھوٹے بھائی کو اس کا پرنسپل بنا دیا ہے۔ شروع میں تھوڑا سا دماغ لگانا پڑا تھا۔ اب تو سارا کام اپنے آپ چلنے لگا ہے۔ چھوٹا دیکھ ریکھ میں ٹرینڈ ہو گیا ہے۔ پڑھنے میں تو اس کا شروع سے من نہیں تھا۔ وہ اسے Settle نہ کرتی تو چھوٹا جانے کیا کرتا۔ کس عقیدت سے دیدی دیدی کہتا ہے۔ ٹی۔ن۔ن۔ انگ۔گ۔گ۔ گ!! ٹن۔ انگ۔ ٹن۔ ای۔ نگ۔ ٹن۔ن۔ن۔ ان۔نا۔

منظر اور حالات کہیں رکتے نہیں تھے۔ ہر منظر اور حالات میں اُسے اپنی سوچ سکا، چہرے کے آثار چڑھاؤ اور مکالمے بالکل ٹھیک طور پر معلوم تھے۔ اس کے پاس مستقبل کا ایک پہلے سے طے شدہ نقشہ تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں خواہشات۔ سفید، سنہرے بالوں والے عربی گھوڑوں کی طرح دوڑتیں کہ کوئی اونچی دیوار حائل ہو جاتی۔ گھوڑے بے چینی سے ہنہناتے، پیر پٹکتے۔ لڑکی غصے اور جھنجھلاہٹ سے بھر جاتی۔ کاش! کوئی اُسے دھان کی طرح اس کے حالات کی زمین سے اکھاڑ کر وہاں لے سکتا۔ جہاں ممی ہمت بندھاتی۔ اس دیوار میں کبھی کسی طرح سوراخ کریں گے چھوٹی۔ کبھی اندیشوں اور غیر یقینی پن کی کھائیوں کے کناروں پر گھوڑے رک جاتے، پیچھے ہٹنے لگتے۔ وہ ممی کی طرف دیکھتی۔ "پل بچھاؤ ممی۔ ان کھائیوں پر کوئی پل بچھاؤ۔ ممی گلوکوز کی بوتلیں چڑھواتی۔ کبھی گھوڑے خوف اور بے بسی کی گہری دلدل میں دھنس جاتے اور ڈوبنے لگتے ___ لڑکی چلاتی۔ "ممی.....!!" کراہتے ہوئے ڈھانچے سی ممی کراہتے ہوئے بستر سے اٹھتیں۔ خود کو جیسے تیسے

بٹور کر تھکی آنکھوں سے آس پاس کوئی رسی ڈھونڈنے لگتیں۔ شروع میں..... یہ لیکن، رنگوں اور روشنیوں میں چھپا ایک نقطے کے مانند تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جسامت بڑھنے لگی۔

ہوش سنبھالنے سے لے کر پاپا کے میوزوگ وبھاگ Psychiatric ward میں داخل کرائے جانے تک لڑکی نے ممی کو ہمیشہ پاپا سے جھگڑتے پایا تھا۔ پاپا کالج سے آکر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے یا جانے کس کس جگہ جلسوں، نشستوں اور سمیناروں میں دن گزار کر رات گئے گھر لوٹتے۔ لیکن ان کی لکھائی پڑھائی اور گھومنے پھرنے کا کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہیں آتا تھا۔ پڑوس میں پروفیسر گپتا تھے۔ تگڑی پیسے ٹیوشنوں کے کئی کئی گروپ چلاتے۔ گائیڈیں Guides لکھتے۔ بھاری بھرکم شریمتی گپتا ممی سے کہتیں۔ "بہن چلے ہے آج واشنگ مشین دیکھ آویں..... ہم نے تو اپنے ببلو کی خاطر بھی روہنی Rohini میں مکان رجسٹر کروا دیا ہے۔"

ممی پاپا کے آگے پیچھے بڑبڑاتی، ارے اس گھر ان بچوں کے بارے میں بھی کچھ سوچو کہ ساری زندگی بس ڈرکین ہی کرتے رہو گے!" پاپا کتابوں کے بنڈل خرید لاتے۔ ممی ان پر حقارت بھری نظر ڈالتی اور تنک کر کہتیں۔ "کسی کام کی چیز پر بھی کبھی پیسہ خرچ کرو گے کہ بس اس گھر کو ناولوں سے بھرتے رہو گے۔ تین تین بچوں کے باپ ہو گئے۔ سوچ سمجھ کر خرچ کرو۔ جب گرہستی کی ہے تو گرہستی کی طرح نبھاؤ۔"

گھر کبھی پاپا کے عجیب و غریب دوستوں سے بھر جاتا۔ وہ قہقہے لگاتے۔ کچن میں گھس کر ساری چینی ختم کر ڈالتے۔ فرش کو سگریٹ بیڑیوں کے ادھ جلے ٹکڑوں سے بھر دیتے۔ بحث کرتے۔ بحث کے دوران ایک دوسرے کو غصے سے دیکھتے۔ زور زور سے بولتے خاموش ہو جاتے۔ تیز تیز کش مارتے۔ پھر قہقہے لگانے لگتے۔ وہ لڑکی سے دو سال بڑے بھائی کو بہت چاہتے۔ اسے جانے کیا بتاتے، کتابیں دے جاتے۔ وہ ان کے بیچ بیٹھا ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے آنکھیں

پھاڑے انہیں دیکھتا۔ ان کی بحث سنتا رہتا۔ ان کے لیے چائے بنا کر خوش ہوتا۔ دوڑ دوڑ کر پان لاتا۔ ممی لڑکی اور چھوٹے کو لے کر چھت پر چلی جاتی۔ کڑھتی ہوئی بار بار ٹھنڈی سانسیں چھوڑتے ہوئے لڑکی سے کہتیں "دیکھ لے چھوٹی، دیکھ لے۔ لٹ رہا ہے ہمارا گھر! یہ نکھٹو ڈاکو ہمیں برباد کر دیں گے۔ دیکھ لے چھوٹی دیکھ لے" لڑکی کو پاپا اور دوستوں پر غصہ آتا۔ چھوٹا مٹھی بند کر کے ایک انگلی کو سیدھا کر کے فائر کرنے لگتا۔ "ملا ہو کل میں انہیں بندوق سے اُڑا دوں گا۔ ٹھائیں...... ٹھائیں..... ٹھائیں!" کمرے سے آنگن اور آنگن سے چھت تک نہ سمجھ آنے والے لفظوں کے ٹکڑے...... اُڑتے رہتے۔ آزادی کے بعد صارفین وادی سماج..... عوام کی بیداری کو سیاسی رنگ دینا...... تلنگانہ کا طریقہ، نہرو کی پالیسیاں، فاسسٹ تنظیمیں! پاپا کو کچھ نہیں آتا تھا۔ نہ پڑوسیوں نہ رشتہ داروں سے قاعدے کی بات کرنا، نہ خرید و فروخت نہ ڈھنگ سے رہنا سہنا سب ممی کو کرنا پڑتا۔ وہی سوگ شگن کے موقعوں پر لوگوں کے یہاں آتی جاتیں۔ لڑ جھگڑ کر گھر کے سامان میں اضافہ کرتیں۔ خریداری کرتیں۔ باپ رے۔ ممی کو کتنا کچھ پتہ تھا۔ آج کل کون سی نوکری میں کتنا پیسہ ملتا ہے۔ کس عہدے کا داماد کتنے تک کا پڑتا ہے۔ کس پڑوسی نے چپ چاپ اپنی کنواری لڑکی کا اسقاطِ حمل کروایا ہے۔ کس رشتہ دار کے لڑکے نے پریم وِواہ کیا ہے..... ممی صرف میٹرک پاس تھیں اور پاپا لیکچرار تھے۔ دونوں کے علم میں کتنا فرق تھا۔ لڑکی ممی سے متاثر رہتی۔ ممی کہیں بھی آتے جاتے لڑکی کو اکثر ساتھ رکھتیں۔ پھر چھوٹے موٹے کاموں میں اُسے اکیلے بھیجنے لگیں ڈھیر ساری ہدایتوں کے ساتھ۔

دو لڑکیاں اور ہو گئیں۔ ممی کا جھگڑنا بڑھ گیا۔ وہ تین تین لڑکیوں کی شادی کے بوجھ کی بات کرتی رہتیں۔ پاپا کبھی کبھی کہتے "ان کے بڑے ہونے تک زمانہ بدل جائے گا۔ اپنی پسند کے لڑکوں کے ساتھ یہ اپنی شادیاں خود کر لیں گی۔" ممی چلا اٹھتیں۔

"بگاڑ دو۔ ابھی سے بگاڑ دو۔ اور کچھ تو تمہارے بس کا نہیں ہے۔ ہائے رام ... قسمت پھوٹ گئی رے!" ممی دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹتیں ـــ ساڑی کا آنچل منھ میں ٹھونس کر رونے لگتیں۔ پپا اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ڈری سہمی چھوٹی بچیاں ممی سے لپٹ جاتیں۔ بڑا ممی کو گھورتا۔ ممی پپا کے بند کمرے کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر گالیاں دینے لگتیں۔ بڑا جھپٹ کر ان کے منھ کو اپنی ہتھیلی سے بند کر دیتا۔ ممی فرش پر پیر پٹکنے لگتیں۔ چھوٹا ہاتھ کو بندوق بنا بڑے کی طرف فائر کرتا۔ بڑا اُسے دھکا دیتا۔ وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا ممی کو گھورتا۔ پھر پپا کے کمرے میں گھس جاتا۔ لڑکی ممی کو پانی پلاتی۔

ممی ہمت والی تھی۔ پپا دبو اور ڈرپوک سے۔ ممی جھگڑتی۔ پپا دھیمی آواز میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ بیچ میں چپ ہو جاتے۔ پھر ممی کے پاس سے ہٹ جاتے۔ وہ گھر سے کافی باہر رہنے لگے تھے۔ ہاں بڑا اکثر ممی کو اُلٹا سیدھا کہتا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ممی کے ہاتھوں میں سمٹتا گیا۔ سارے فیصلے۔ پپا کو دو کپ روز چائے۔ گھر سے کالج آنے جانے کا بس کا کرایہ اور مہینے میں ایک آدھ کتاب کے پیسے دے دیے جاتے اور بس۔ ممی نے پاس پڑوس کی عورتوں کو ملا کر دو چھوٹی چھوٹی لاٹریاں شروع کیں۔ بینک میں تینوں لڑکیوں کے نام ماہوار کچھ پیسہ جمع ہونے لگا۔ سوئیٹر بُننے کی ایک مشین خریدی گئی اور ایک تختے پر یہ لکھ کر گھر کے باہر لٹکا دیا گیا: "یہاں ڈیزائن دار سوئیٹر بُنے جاتے ہیں۔" پپا کے کمرے سے کتابوں کے ڈھیر نکال کر پرانی ساڑیوں میں باندھ کر کچن کی پرچھتی پر رکھ دیے گئے اور کمرہ کرایہ پر چڑھا دیا گیا۔ پپا کے عجیب و غریب دوستوں کی آمد بند کر دی گئی۔ خالی خالی لگنے والے گھر میں ایک ایک کر کے چیزیں آتی گئیں۔ ڈبل بیڈ، صوفہ، دیوار گھڑی، کوکنگ گیس، گھر اب گھر سا لگنے لگا۔ جب کوئی نئی چیز آتی تو پورے محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے دیکھنے آتیں۔ نئی چیز پر ہر پہلو سے چرچا ہوتی۔ شریمتی گپتا سے مقابلہ کیا جاتا۔ ممی سج سنور کر صوفہ پر بیٹھتیں اور منھ بنا بنا کر پڑوسنوں سے باتیں کرتیں۔ محلے کی عورتوں کے سماج میں ان کی قدر اور رتبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

پپا اور بڑا جانے کہاں کہاں گھومتے۔ دیر سے گھر لوٹتے اور چپ رہتے۔ پپا کی جیب میں تو معلوم نہیں کیا تھا۔ لیکن بڑے کی جیب انگارے پر بھی رکھی رہتی۔ لڑکی کو بڑے سے ڈر لگتا۔ وہ چھوٹے سے پیار کرتی۔ جس روز ٹی وی آیا پپا آہستہ سے بڑبڑائے، "کیا کر رہی ہو تم، بچوں کو کیسے جینا سکھا رہی ہو؟" ممی نے کڑوی نگاہوں سے انہیں دیکھا "ایسے جینا سکھا رہی ہوں جیسے جینا چاہیے۔ جیسے دنیا جی رہی ہے۔ تم جیسے نامرد ......" چپ چاپ کھڑا بڑا ممی کی طرف لپکا "پھر سے کہو... پھر سے کہو ذرا ....." پپا اس کا ہاتھ تھام باہر لے گئے۔

لڑکی بی اے کر چکی تھی۔ 'سریتا' پڑھتی، 'سپان' SPAN منگواتی۔ شام کو بڑے اور پپا کو چھوڑ سب ٹی وی کے چاروں طرف بیٹھتے۔ وہ ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھتی پڑھتی کہہ اُٹھتی۔ "ہائے! یہ بات تو ممی بھی کہتی ہیں! ممی از سو وائز

Mama is so wise

ایک دن بڑے نے سن لیا تو اس پر غرّا پڑا۔

"Your Mama is a spider

لڑکی کو اس کی بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بھی پتہ نہیں۔ پپا کی طرح کس دنیا میں رہتا ہے! کیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ پرسوں ممی کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ وہ ہیلیم بھرا غبارہ ہیں! ایم۔ اے کے بعد یوں ہی آوارہ گردی کرتا گھومتا ہے ـــ ممی نے کہا۔ کمپٹیشن competition میں بیٹھو تو اس طرح ممی کو دیکھا تھا جیسے بھسم کر دے گا۔ مسٹر سکھیجہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ ڈائیاں بنانے کی مشین اس کے لیے گھر ہی میں لگوا دو۔ وہ گائیڈ Guide کر دیں گے۔ مارکیٹ بنوا دیں گے۔

This Mr. Sukhija is a successful man.

کچھ ہی برسوں میں کتنا بڑا کاروبار پھیلا دیا ہے ـــ انہوں نے ڈیل کارنیگی پڑھا ہے کیا.... کہاں پڑھا ہوگا۔ آٹھویں کے بعد تو انہوں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ممی کو لڑکی کی شادی کا فکر ستانے لگا تھا۔ وہ جان کاروں، رشتہ داروں سے لڑکا بتانے کے لیے کہتیں۔ ممی اور لڑکی ان کے بتائے ہوئے لڑکوں پر ناک بھوں سکیڑ لیتیں۔ ڈھیلے ڈھالے U.D.C. ریلوے میں کلرکی کرتے بوڑھے جوان۔ گورنمنٹ اسکول کے جیست اور تھرڈ ماسٹر۔ ممی کہتیں "یہ لوگ سوچتے ہیں ہمیں ان کے داماد ہی سا لیچڑ ہی چاہیے!" لڑکی نے ایم۔ اے کے پہلے سال میں سنتوشی ماں کے برت رکھے۔ اور دوسرے سال وہ لامذہب ہو گئی۔ شکروار کو کھٹائی کھانے لگی۔ پپا اور بڑے کو لے کر ممی کا غصہ بڑھنے لگا۔ کیسے مرد ہیں یہ دنیا سے نیارے۔" وہ ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو چلی۔ لیکن وہ لڑکی کے لیے سہاگ دوڑ کرتی رہیں۔ لوگوں کو کہتی رہیں۔

ممی زمین اور زمانے کو سمجھنے والی عورت تھیں جانتی تھیں کھاتے پیتے گھروں کے خوبصورت، صحتمند اور کماؤ بیٹے یونہی دولہے بن کر نہیں آ جاتے۔ ممی پاس تک دیکھتیں۔ گھر کے آنگن میں انہوں نے ایک بلیک بورڈ، کچھ کھلونے اور چار چھوٹے چھوٹے اسٹولوں اور تھرڈ ڈویژن میں بی اے پاس ایک ٹیچر کا بندوبست کر کے کریسنٹ نرسری پبلک اسکول کھول دیا۔ محلے اور آس پاس کے دس پندرہ چھوٹے چھوٹے بچے آنگن میں "اے" سے "ایپل" گانے لگے۔ بڑی لاٹریاں ڈالنی شروع کر دیں۔ مسٹر سکھیجہ سے پوچھ تاچھ کر کے چھوٹے موٹے اسٹاک شیئر خریدنے لگیں۔ اب وہ اپنے لاڈلے چھوٹے پر بھی بگڑنے لگی تھیں۔ وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر پوڈیک اور بہروس لی کے پوسٹر جمع کرتا رہتا۔ بونی ایم کے کیسیٹ سنتا رہتا۔ بڑا تو پہلے ہی کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا تھا۔ لوٹتا تو اس کی آنکھیں دہکتی ہوتیں۔ کپڑوں اور بالوں میں دھول بھری ہوتی۔

چھوٹی لڑکیاں بھی تیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھیں۔

رام رام کرکے ایک کام کا لڑکا نظر آیا۔ لمبا، خوبصورت سیلز مینیجر لڑکی نے فوٹو دیکھتے ہی اُسے پسند کر لیا۔ اس کے اندر کئی دن ٹن اٹنگ ٹن اٹنگ ہوتی رہی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے۔ ممی جوش سے بھر گئیں۔ لڑکے والے دیکھنے آ رہے تھے۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں شروع ہوئیں۔ وہ اپنی کار میں آئے۔ لڑکے کی ڈاکٹر بہن، ماں، بھائی اور لڑکا، شکل، لباس، بات چیت، خاندان سب حسب منشا! لڑکے نے لڑکی کو دیکھا پھر دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگا جو لڑکی کے ایک مصور دوست نے بنائی تھی اور جس پر لڑکی نے منتیں کرکے اپنا نام لکھوا لیا تھا۔ لڑکی کے گھر والوں نے کوئی خاص دلچسپی سے بات چیت نہیں کی۔ ممی نے اس دن کے لیے سکھیجہ کا ملازم مانگ لیا تھا۔ وہ بیٹھی بیٹھی مہمانوں سے ڈھیروں باتیں کرتی رہیں۔ انہیں ہمیشہ پتہ ہوتا تھا کہ کب اور کہاں کیسی باتیں کرنی چاہئیں۔ وہ جانے لگے۔ ممی کے جواب مانگنے پر بولے کہ ڈاک سے بتا دیں گے۔

اس دن ممی نے چھوٹے کے پوسٹر پھاڑ کر پھینک دیے۔ بڑے اور پپا کو کوسا اور کراہتی ہوئی بستر پر پڑ گئیں۔

لڑکی کی کلاس میں کئی عشق چل رہے تھے۔ ایک دو نے اس پر بھی لائن ماری۔ ایک لڑکا اُسے کچھ پسند آیا۔ حالانکہ اس کا قد خیالوں میں بسے شخص سے چھوٹا تھا۔ لیکن وہ تین انچ سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ لڑکی نے جانچ پڑتال کی۔ وہ سوشیولوجی پڑھ رہا تھا۔ باپ کا ہیلمیٹ بنانے کا کارخانہ تھا۔ گھر میں اکیلا لڑکا تھا۔ لڑکی کو لے کر سنجیدہ تھا۔ ایک دقت سامنے آئی۔ وہ دوسری ذات کا تھا۔ لڑکی نے اس معاملے پر ترقی پسند بن جانے کا فیصلہ کیا۔ ملنا جلنا شروع ہوا۔ لڑکی کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ اسے معلوم تھا کس نمبر کی ملاقات میں بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ لیکن پہلی ہی بار میں اُسے پتہ لگ گیا کہ لڑکا ہر معاملے میں بے حد کورا، کمزور، بہت جذباتی اور ڈرپوک ہے اس کے ماں باپ ذات پات کے بہت پابند ہیں۔ اور لڑکی سے اس کی شادی کسی حالت میں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کہ وہ اپنے ماں باپ سے بہت پیار کرتا ہے اور سپنے میں بھی انہیں دکھ پہنچانے کی بات نہیں سوچ سکتا۔ لیکن وہ لڑکی کو بہت چاہتا ہے اور اس کے بغیر جینا اُسے ناممکن لگتا ہے۔ عجیب اُلجھن بھرے حالات تھے لڑکی نے اپنے پاس جمع کیے سارے فارمولوں سے یہ سوال حل کرکے دیکھا، لیکن نہیں ہو سکا۔ لڑکا آخر اس سے چاہتا کیا ہے؟ کیا ممی سے صلاح لی جائے؟ ایم۔ اے فائنل کا پورا سال اسی ادھیڑ بُن میں گزر گیا۔ لڑکا اس کی طرف معصوم اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

ممی نے چھوٹے کے لیے ڈائی بنانے والی مشین لگوا دی تھی، لیکن وہ صرف پوسٹر جمع کرتا، انگریزی فلمیں دیکھتا۔ کمرہ بند کرکے ٹریولٹا کی طرح ناچنے کی کوشش کرتا۔ کویت والے رشتے دار کو خط لکھتا کہ اس کے لیے وہیں کوئی کام ڈھونڈ دیں وہ ہندوستان سے بور ہو گیا ہے اور جواب کا انتظار کرتا رہتا۔ ایک دن سکھیجہ نے ممی کو بتایا کہ بڑا اسرکار کے خلاف کام کرتا ہے۔ ”غلط گل ہے جی۔ بڑا اوچھا کم ہے جی! کوئی ہونہار بندہ کدے راج دی خلافت نہیں کردا جی!“ پپا بہت عجیب ہو گئے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ دن بھول جاتے کہ وہ کون ہیں۔ خود کو کبھی کرشنامین بتاتے کبھی نہرو۔ اوٹ پٹانگ بکتے ” قومی یکجہتی..... سرکاری پارٹی کا بدلتا ہوا روپ..... نیا امیر طبقہ!“ اگلے دن پھر ٹھیک ہو جاتے ممی اب اُسے چڑاتی نہیں تھیں۔ ان سے نظر بچاتیں لڑکی کو کئی دفعہ اور دیکھنے والے آئے۔ بات نہیں بنی۔ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہو جاتی۔ لڑکا ٹھیک ہوتا تو آمدنی کم ہوتی۔ آمدنی اُمید کے آس پاس ہوتی تو لڑکا لمبا اور خوب صورت نہ ہوتا۔ کہیں دونوں باتیں ٹھیک ہوتیں تو لڑکے والے ڈاک سے جواب دینے کی بات کہہ کر چلے جاتے..... شہر میں روز اسٹوو پھٹنے لگے تھے۔ بہوئیں جلتیں یا جلا دی جاتیں۔ ممی بڑبڑائی، ”ہے بھگوان یہ کیا ہو رہا ہے؟“ لڑکی کو بھی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے کبھی ڈر لگنے لگتا۔ وہ ممی کو کئی بار اکیلے میں روتے پاتی۔ پھر ایک دن پپا ایک مہینے تک بھولے رہے۔ وہ کون ہیں؟ سکھیجہ کی کار میں ممی انہیں اسپتال لے گئیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں ذہنی بیماریوں کے شعبے میں داخل کر لیا۔ اگلے دن ممی کو بھی گلوکوز چڑھوانا پڑا۔

ممی کے بنائے راستوں پر اب ساری بھاگ دوڑ لڑکی کے پیروں کو کرنی پڑتی۔ ڈھیروں حساب کتاب ڈھیروں جوڑ توڑ۔ اس نے مفت میں سکھیجہ کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ سکھیجہ کے ایک دوست نے آکسفورڈ کانونٹ ماڈل اسکول کھولا۔ لڑکی فی الحال ٹیچر ہو گئی۔ صبح آٹھ بجے اسکول نکلتی۔ دوسے آٹھ و بجے تک سے آٹھ وہاروں میں نئے رئیسوں کے بگڑتے بچوں کو ٹیوشنیں پڑھاتی۔ بچوں کی موٹی موٹی ممیوں سے بات کی بات میں گھل مل جاتی۔ ان کے گھروں میں آنے والی چیزوں کے بارے میں جانکاریاں لیتی۔ گھر کے اسکول کی دیکھ بھال۔ لاٹریاں، اسٹاک شیئر، سماج کے تقاضے سب لڑکی کے ذمہ۔ وہ بُری طرح تھک جاتی۔

لیکن دن کی تمام مصروفیات اور تھکان کے باوجود بیچ بیچ میں ٹن اٹنگ ٹن اٹنگ کا سنگیت بجتا۔ گھوڑوں کے بال اُڑتے اور رات کو جب اس کے پاس کوئی مصروفیت نہ بچتی تو وہ اپنی عمر کے سال گنتی تو ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگتی۔ اُسے اپنے آپ بہت اکیلا لگتا۔ گھر ہی کے لوگوں کے چہرے سوال بن کر اُسے گھیرنے لگتے۔ ممی پپا، بڑا چھوٹا وہ خود! سنگیت اور گھوڑوں کی ٹاپیں مدھم پڑتیں۔ دُور اور دُور ہوتی جاتیں اور آخر میں نہ جانے کہاں کھو جاتیں۔ وہ ایک اندھے کنویں میں ڈوبتی جاتی۔ کنویں میں اسٹوو پھٹنے کے دھماکے اور جلتی عورتوں کی چیخیں گونجتیں۔ وہ پسینے میں نہا جاتی۔

اُسے نیند میں بُرے بُرے سپنے آتے۔ پاگل جنگلی ہاتھیوں کا چنگھاڑتا ہوا ایک جھنڈ اس کی کوٹھی کے پھولوں اور پودوں کو اپنے بھاری بھرکم پیروں سے کچل رہا ہے..... وہ دروازے توڑ کر ڈرائنگ روم میں

(باقی [illegible])

ترتیب

نئی تعلیمی پالیسی کی پیش رفت

سال ۱۹۸۷ء میں قومی تعلیمی پالیسی پر عمل آوری کے تحت کچھ نئی اسکیموں پر عمل درآمد ہوا۔ پارلیمنٹ نے نئی تعلیمی پالیسی کو ۸۔ مئی ۱۹۸۶ء کو منظوری دی اور عملی پروگرام کو ۲۲۔ اگست ۱۹۸۶ء کو منظوری دی۔ طالبات کو ۱۲ ویں درجے تک مفت تعلیم دینے کی اسکیم کو مرکز کی زبردست امداد سے تمام صوبوں میں نافذ کیا گیا۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں تعلیم پر ہونے والے کُل خرچ کا ۲۷ فیصد حصہ ابتدائی تعلیم کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، جسے ۸۸-۱۹۸۷ء میں بڑھا کر ۳۷ فی صد کر دیا گیا۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۲۰۵ نوودیالیہ قائم کیے گئے۔

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی مینجمنٹ میں دو ڈپلومہ کورسوں مراسلاتی تعلیم کا ایک ڈپلومہ کورس اور راجستھان اور شمال مشرقی ریاستوں کے بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کے لیے ایک سرٹیفکیٹ ڈپلومہ کورس کی شروعات کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۸۷ء کے موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران سارے ملک میں ۵ لاکھ اساتذہ کو تربیت دی گئی۔ ۱۹۸۶ء کی ان ہی چھٹیوں کے دوران ۵ لاکھ اساتذہ کو پہلے ہی یہ تربیت دی جا چکی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں رضاکارانہ طور پر دو لاکھ کالج طلبا کو عملی خواندگی کے پروگرام میں شامل کیا گیا۔

فروری اور اپریل ۱۹۸۷ء میں ریاستی وزرا تعلیم اور ریاستی سکریٹریوں کی کانفرنسوں میں نئی تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کی حکمتِ عملی پر غور و خوض کیا گیا۔ اس کے بعد جون ۱۹۸۷ء میں تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کی میٹنگ میں اس کا جائزہ لیا گیا۔

غیر رسمی تعلیم:

رسمی تعلیم میں بچہ اسکول جاتا ہے، لیکن غیر رسمی تعلیم میں اسکول کو بچے تک پہنچنا ہوتا ہے۔ غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کے تحت بہت سے نئے پروجیکٹ شروع کیے جا رہے ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں غیر رسمی شعبے کو اوّلین ترجیح دی گئی ہے۔ کیوں کہ خیال کیا جاتا ہے کہ رسمی تعلیم کا نظام تعلیم کو عام کرنے اور بیچ میں ہی تعلیم کو ترک کر دینے والوں کو اسکولوں میں روکنے کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ غیر رسمی تعلیم کی اسکیم ۱۹۷۹ء میں شروع کی گئی تھی اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ۹ ریاستوں تک محدود تھی۔ اروناچل پردیش دسواں صوبہ ہے جسے تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اس پوری اسکیم پر نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

آپریشن بلیک بورڈ:

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت یہ ایک اہم اسکیم ہے جس کا مقصد پرائمری اسکولوں میں تمام ضروری سہولیات فراہم کرنا ہے۔ یہ اسکیم رسمی اسکولوں تک محدود ہے۔ اس کے تحت فراہم کی جانے والی سہولیات میں دو بڑے کمرے، بلیک بورڈ، ڈسٹر اور نقشے، چارٹ اور دیگر تدریسی ساز و سامان اور کھلونے وغیرہ فراہم کیے جاتے ہیں۔ ٹیچر گائیڈ اور دوسرے استاد کی اسامی ہونے پر خاتون ٹیچر کا تقرر بھی اس میں شامل ہے۔

سالِ رواں میں اس اسکیم کے تحت تقریباً ۲۰ فی صد ترقیاتی بلاکوں اور میونسپل وارڈوں کو شامل کیا جائے گا۔ ۳۰ فی صد کو اگلے برس اور بقیہ ۵۰ فی صد کو تیسرے برس شامل کیا جائے گا۔

تعلیم بالغاں:

ملک میں ناخواندگی کے خاتمے کے لیے ایک بڑے پروگرام "قومی خواندگی مشن" کو قطعی شکل دی گئی ہے — "شرمک ودیا پیٹھ" اسکیم پر بھی نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ نئے بیس نکاتی پروگرام کا حصہ ہے، اس لیے اس مقررہ وقت کے اندر نافذ کیا جانا ہے۔ یہ پروگرام ریاستی سرکاروں کے ریاستی منصوبوں کے تحت شروع کیے جانے والے پروگراموں کے علاوہ ہیں۔

خواتین کی تعلیم:

خواتین کی حالت میں نمایاں بہتری لانے کے لیے نئی تعلیمی پالیسی کے تحت خواتین کی تعلیم کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مردوں میں خواندگی کی شرح ۴۷ فی صد اور خواتین میں ۲۵ فی صد ہے۔ لڑکیوں میں درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ناخواندگی کے مسئلے کی جڑیں خواتین کی ناخواندگی میں پیوست ہیں، جو ملک کی ترقی اور آئینی مقاصد کی تکمیل کی راہ میں حائل ہیں۔ لہٰذا اس مسئلے کو کم مدتی اور طویل مدتی دونوں طرح کے پروگراموں کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے۔

نیشنل ٹیسٹنگ سروس :

نیشنل ٹیسٹنگ سروس کا رضاکارانہ بنیاد پر اور مرحلے وار قیام ڈگریوں کو ڈگری سے نہ جوڑنے سے متعلق ہے۔ اس کا مقصد مخصوص عہدوں کے لیے امیدواروں کی مناسبت کا تعین کرنا ہے۔ اور سارے ملک کے لیے معیار وضع کرنے میں مدد دینا ہے۔ ان امتحانات کا اصل فائدہ یہ ہوگا کہ وہ افراد جن کے پاس رسمی تعلیم کی ڈگریاں نہیں ہیں، وہ مختلف عہدوں کے لیے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکیں گے۔ یہ عہدے اس وقت گریجویٹ افراد کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

اساتذہ کی تنخواہوں کی نئی شرحیں :

حکومت نے جون ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کی تنخواہوں کی نئی شرحوں کا اعلان کیا تھا تاکہ تعلیم کے معیار میں بہتری لائی جا سکے — یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نئے اساتذہ کی تربیت کے لیے خصوصی اسکیم بھی شروع کر رہا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اکیڈمک اسٹاف کالج بھی کھولے جائیں گے — تحقیق اور ترقی کے پروگراموں کو بھی مستحکم کیا گیا ہے۔

تکنیکی تعلیم :

تکنیکی تعلیم کے شعبے میں ایک اہم تبدیلی دسمبر ۱۹۸۷ء میں اس بل کا پاس کیا جانا تھا، جس کی رُو سے تکنیکی تعلیم کی کُل ہند کونسل کو قانونی اختیارات دیے گئے۔ اس بل کے پاس ہونے سے تکنیکی اداروں کی تعداد میں قابلِ لحاظ اضافہ اور چندہ وصول کرنے والے اداروں پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔

موجودہ پروگرام :

تمام موجودہ پروگراموں پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ اگلے دو برسوں میں لڑکیوں کے چار رہائشی پالی ٹکنیک قائم کیے جائیں گے۔ آسام معاہدے کے تحت آسام میں ایک یونیورسٹی اور ایک آئی آئی ٹی قائم کیا جائے گا۔

پنجاب میں لونگووال انسٹی ٹیوٹ برائے انجنیئرنگ اور ٹکنالوجی قائم کرنے کی تجویز ہے۔ جس کے لیے تمام تیاری مکمل ہو چکی ہے۔

کمزور طبقوں کے لیے پروگرام :

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے کمزور طبقوں کے لیے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر کوچنگ شروع کی گئی ہے۔ ایسے بچوں کے والدین صفائی ستھرائی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ میٹرک کے بعد ملنے والے وظیفے کی رقم ۴۵ روپے سے بڑھا کر ۲۰۰ روپے ماہوار کر دی گئی ہے۔ ۱۰ پالی ٹیکنک ایسے علاقوں میں کھولے گئے ہیں، جہاں اقلیتی فرقوں کی زیادہ آبادی ہے۔

وفیات

جنوری جان لیوا ثابت ہوا۔ اردو دنیا کی تین مشہور ہستیاں، بیسویں صدی کے بانی اور مدیر جناب خوشتر گرامی، مشہور ادیبہ بیگم صالحہ عابد حسین اور مشہور افسانہ نگار ستیش بترا — ہمارے درمیان سے اٹھ گئیں : ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بیسویں صدی کے مدیر خوشتر گرامی کی ولادت ۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو رنگ پورہ سیالکوٹ کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد دیوان بشمبر داس اپنے علاقے کے معروف تاجر تھے۔

متمول گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باوجود خوشتر گرامی کی ابتدائی زندگی مصائب میں گزری۔ دیوان بشمبر داس کو کاروبار میں گھاٹا پڑا۔ آخری ایام بے حد عسرت میں گزرے۔ خوشتر گرامی ابھی تین برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بچپن اور لڑکپن فاقہ مستی اور تنگ دستی میں گزرا۔ بچوں کو ٹیوشنیں پڑھا کر جیسے تیسے گزارا کیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا، مگر تعلیم جاری نہ رکھ پائے۔ پھر ادیب فاضل کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ طبیعت میں آزادہ روی اور آزادی پسندی سمائی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں اخباروں کے دفاتر کا پھیرا رہا۔ "زمیندار" اور "بندے ماترم" کے نامہ نگار رہے۔ متعدد اخباروں میں اداریہ نویس کی حیثیت سے کام کیا۔ برسوں ہفتہ وار "مزدور" کی عنانِ ادارت سنبھالے رہے۔

۱۹۳۶ء میں بیسویں صدی جاری کیا۔ یہ رسالہ اس اعتبار سے عہد آفریں ثابت ہوا کہ اس سے اردو کے افسانوی ادب میں نئے دور کا آغاز ہوا۔

خوشتر گرامی اور بیسویں صدی لازم و ملزوم تھے۔ تاہم ۱۹۷۵ء میں خوشتر صاحب نے بیسویں صدی رحمٰن نیر صاحب کے سپرد کیا۔ یہ رسالہ آج بھی سابقہ روایات کے ساتھ نکل رہا ہے۔ رحمٰن نیر صاحب کی ادارت میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

خوشتر گرامی گزشتہ کچھ عرصہ سے علیل چلے آ رہے تھے۔ جنوری ۱۹۸۸ء کے اوائل میں جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو دہلی کے ہولی فیملی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ء کو داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ایک نڈر صحافی، ایک سچا ادیب اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔

اردو کی مشہور ادیبہ، افسانہ و ناول نگار اور "آج کل" کی دیرینہ کرم فرما بیگم صالحہ عابد حسین کا مختصر علالت کے بعد ۹ جنوری ۱۹۸۸ء کو نئی دہلی میں انتقال ہوا۔

بیگم صالحہ عابد حسین کی ولادت ۱۸ اگست ۱۹۱۳ء کو پانی پت میں ہوئی۔ مرحومہ خاندانِ حالی کی ایک ممتاز فرد تھیں۔

پہلا افسانہ آٹھ برس کی عمر میں لکھا۔ پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ناولوں میں عذرا، آتشِ خاموش، قطرے سے گہر ہونے تک، راہِ عمل، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، ساتواں آنگن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں میں یادگارِ حالی اور ہمارے انیس کو بڑی شہرت ملی۔ دیگر مطبوعات میں خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں، مجالس النسا وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۸۳ء میں بھارت سرکار نے پدم شری کے اعزاز

بقیہ ص ۲۶ پر

حواشی وغیرہ: کالی داس گپتا رضا

آبِ حیات میں

ترجمۂ غالب

ڈاکٹر صفدر آہ مرحوم لکھتے ہیں:

"آبِ حیات میں جو موادِ تحقیق پیش کیا گیا ہے، اگر اُسے
ہٹا لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ جیسے سورج ڈوب گیا اور
اردو تحقیق کی دنیا میں ایک تاریکی پھیل گئی ہے[1]۔"

یہ بات اس حد تک یقیناً صحیح ہے کہ جو مواد بلحاظِ مقدار و تفصیل 'آبِ حیات' میں پیش کیا گیا ہے اس سے پہلے وہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ مگر اس سے یہ مراد لینا کہ یہ مواد تمام و کمال 'تحقیق شدہ ہے' درست نہیں اور یہ مان لینا بھی غلط ہے کہ آزاد نے ہر شاعر کے بیان میں اُس غیر جانب داری سے کام لیا ہے جو ایک محقق کے لیے اشد ضروری ہے۔

'آبِ حیات' میں شامل ترجمۂ غالب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، آزاد کا مسحور کن طرزِ نگارش اور بے پناہ قوتِ انشا، پردازی قاری کو باور کرا دیتے ہیں کہ آزاد غالب کے بے حد مدّاح ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے اُن کے بیان ایسے ہیں، جن میں ایک نہ ایک چُٹکی بھی لی گئی ہے جو تعریف کے بجائے غالب کی تحقیر ہی کا باعث بنتی ہے۔

آزاد نے غالب کے سوانح بیشتر غالب کے خطوں کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اور کچھ بیانات اپنے استاد ذوق کے حوالے سے بھی دیے ہیں۔ مگر تحقیقی لحاظ سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ خامیوں سے پُر ہیں۔ ایسی غلطیوں کی نشان دہی میں نے حواشی میں کر دی ہے۔ چونکہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم ایک طرح سے غالب کے اوّلین سوانح نگار ہیں۔ اس لیے اُمید کرتا ہوں کہ ان کی تحریر کی دل کشی اور اہمیت میں یہ حواشی مزید اضافے کا باعث ہوں گے۔

نجم الدولہ دبیر الملک[1] مرزا اسد اللہ خاں[2] غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا، ہندو رؤسا، اکبر آباد میں علوِّ خاندان سے نامی اور میرزا سے فارسی میں اسی طرح اُردوئے معلّٰی[2] کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ اُن کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جاوے۔ نام اسد اللہ تھا پہلے اسد تخلّص کرتے تھے۔ جو جبر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلّص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا:

---

[1] میرا در میرات: مطبوعہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء ص ۵۳۔

● ۴۳-اے، جل درشن، چوتھی منزل، نیپین سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

+ دیوانِ فارسی میں ۲۰، ۲۵ شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ بعض اشخاص کا قول ہے کہ ذوق کی طرف چشمک ہے۔ غرض اس میں کا ایک شعر ہے: ؎ راست میگویم من واز راست سر نتواں کشید - ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است[1] —
(حاشیہ از آزاد)

[1] غالب جب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو شاہ ظفر کے حضور میں پیش ہوئے تو بادشاہ نے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کہہ کر مخاطب کیا۔

[2] [3] پورا نام محمد اسد اللہ بیگ خان تھا

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب — ارے او شیر رحمت ہے خدا کی[1]

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا کیوں کہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۲۵ھ و ۲۸-۱۸۲۷ء میں اسداللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار[2] کیا، لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انہیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ برباد، جنگلوں، پہاڑوں میں چلے گئے۔ مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپاہ گری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال اُدھر جُھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انہی میں سے قائم ہو گئی مگر اقبال کا جُھکنا جھونکا ہوا کا ہے۔ کئی پشتوں کے بعد اُس نے پھر رُخ پلٹا۔ اور سمرقند میں جس طرح اور شرفا رہتے تھے اسی طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھا دیا۔

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدرآباد میں جا کر نواب نظام علی خاں بہادر کے سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔[1] کئی برس بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑ گئی۔ وہاں سے گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔[2] اس وقت مرزا کی پانچ برس کی عمر تھی۔ نصراللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ انہوں نے دریتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کمشنری ہو گئی۔ ان کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور ۴ سو سوار کے افسر مقرر ہوئے۔ ۱۷ سو روپیہ مہینا ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر۔ سونک سون کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہو گئی۔

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگِ ناگہانی میں وہ مر گئے۔[3] رسالہ برطرف ہو گیا۔ جاگیر ضبط ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپوں کی جائداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیرزادہ جو شاہانہ دل و دماغ

---

[1] یہ شعر آزاد کا من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ اصل شعر جس کا ذکر خود غالب نے اردوئے معلیٰ میں کیا ہے وہ میر امانی اسد شاگرد سودا کا ہے اور اس شعر سے قدرے مختلف ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش! رحمت خدا کی

[2] غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں بنوائیں۔ پہلی پر اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ کرایا اور دوسری پر (جو بعد میں بنوائی گئی) اسداللہ الغالب ۱۲۳۱ھ۔ ۱۲۳۱ھ مطابق ہے ۱۶-۱۸۱۵ء کے۔ دوسری مہر حقیقت میں حضرت علیؓ کا لقب ہے اور عبارت بطور سجع ہے۔ بعد میں تبدیلیٔ تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔ ۱۸۱۶ء میں غالب تخلص کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے۔

[3] اس قطعہ کے کُل ۱۹ شعر ہیں۔ قطعہ پہلی بار دیوانِ (کلیات) فارسی غالب (پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۵ء) کے صفحہ ۲۵ پر درج ہوا۔ اس کے تین شعر (تیسرا، چوتھا اور چودھواں) ملاحظہ فرمائیے:

نیست نقصان یک دو جزو است از سوادِ ریختہ — کاں و ترم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ من است

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

دیدہ ور سلطان سراج الدین بہادر شہ کہ او — آں شہ ریبند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من است

شاہ ظفر ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے گویا یہ قطعہ جو کہا جاتا ہے کہ غالب نے ذوق سے خطاب کر کے کہا ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۵ء (سالِ طباعتِ کلیاتِ فارسی غالب) کے مابین کسی وقت فکر کیا ہوگا۔ مجموعۂ اردو کا ذکر بھی کیا ہے، اس لیے ۱۸۴۱ء کے بعد شاید ۱۸۴۲ء کا کہا ہوا ہو۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسے گھاٹے کا سودا نہیں۔ اگر میں نے ایک دو جُز کا مجموعۂ کلام تصنیف کیا ہے۔ کیوں کہ یہ میرے فرہنگ کے نخلستان کا ایک معمولی پتّا ہے۔ اگر رنگ رنگ کے نقوش دیکھنا چاہتے ہو تو میرا فارسی کلام دیکھو اور میرے بے رنگ مجموعۂ اردو (دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ: ۱۸۴۱ء) کو نظر انداز کر دو۔ مگر غالب یہ فارسی قطعہ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ (نسخۂ شیرانی میں) ۱۸۴۲ء سے سترہ اٹھارہ سال پہلے وہ خود لکھ آئے ہیں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی — گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں ••

•• اور یہ شعر اس مجموعۂ اردو میں انہوں نے برقرار رکھا ہے جسے "بے رنگ" کہا ہے۔ یعنی دیوانِ غالب اردو مطبوعہ ۱۸۴۱ء شعر اس کے ص۱۵ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

---

[1] یہ درست نہیں۔ نواب نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں ان (غالب کے والد) کا نام نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ وہ حیدرآباد میں بہت معمولی حیثیت سے کارگزار رہے ہوں گے (غالب اور آہنگِ غالب اشاعتِ دوم ستمبر ۱۹۶۹ء) یعنی تین سو یا چار سو کی جمعیت کے رسالدار نہ ہوں گے۔

[2] یہ واقعہ ۱۸۰۲ء کا ہے۔ غالب نے اپنے والد کے الور راج کے تحت لڑتے ہوئے مارے جانے کا ذکر ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

کافی بود مشاہدہ، شاید ضرور نیست

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

[3] غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے ہاتھی سے گر کر زخمی ہو جانے سے انتقال کیا (تقریباً اپریل ۱۸۰۳ء)

ہ کر آیا تھا۔ اسے ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال پر زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے، مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے+ چنانچہ آخر میں کسی دوست نے انہیں لکھا تھا کہ نظامِ دکن کے لیے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعے سے بھجوا سکے۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شاملِ جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے۔ مگر تین ہزار روپیہ سال۔ ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکارِ انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر ریذیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگِ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینا مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زائد نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ ۷ برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی۔ والیٔ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔

غرضیکہ نواب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم[1] سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے[2] اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزازِ خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور ۷ پارچہ خلعت تین رقم جیغہ، مرصع مالائے مروارید۔ ریاست دو دمانی کی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور ایامِ جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلی میں آئے۔[3] یہاں اگرچہ گزران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا۔ اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی۔ مگر اپنے علوِ حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے تنگ رہتے تھے۔ پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور ہمیشہ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے۔ کیا خوب فرمایا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۔۔۔ یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے[4]

جب دلی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی۔ ادھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی اُدھر پنشن بند ہو گئی اور انہیں رام پور جانا پڑا۔[5] نواب صاحب سے ۲۰، ۲۵ برس کا تعارف تھا۔ یعنی ۱۸۵۵ء میں ان کے شاگرد ہوئے تھے[6] اور ناظم تخلص قرار پایا تھا۔ وہ بھی گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ یہ اصلاح کر کے بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی تنخواہ جاری سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی عنایت فتوحِ غیبی گنی جاتی تھی۔ جب دلی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا کر دیا۔ اور انہیں بہت تاکید سے بلایا۔ یہ گئے تو تعظیمِ خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغل گیر ہو کر ملاقات کی اور جب تک رکھا کمالِ عزت کے ساتھ رکھا۔ بلکہ سو روپیہ مہینا ضیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دلی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے ۔۔۔۔ کیوں کہ پنشن سرکاری بھی جاری ہو گئی تھی۔[7]

+ اصل حال یہ ہے کہ جب مرزا نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ سر جان بکم صاحب گورنر بمبئی کو سپرد کیا۔ کیوں کہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی تھیں وہ لارڈ لیک صاحب کمانڈر انچیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور انہیں کے دستخط سے اسناد جاری ہوئے تھے۔ جب ان کے پاس یہ مقدمہ اور اس کے کاغذات پہنچے تو انہوں نے لکھا کہ مدعی غلط کہتا ہے۔ نواب احمد بخش خاں ہمارا قدیمی دوست تھا اور بڑا راست امیر تھا۔ اس پر یہ اتہام ضد سے کیا گیا ہے۔ ہم نے پانچ ہزار روپے سالانہ لکھا تھا جس میں سے تین ہزار مدعی اور اس کے متوسلین کے لیے تھے اور دو ہزار خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کے نام تھے۔ پھر مرزا صاحب نے ولایت میں مرافعہ کیا۔ وہاں بھی کچھ نہ ہوا بموجب تحقیق نواب ضیاء الدین خاں بہادر دام ظلہم العالی کے تحریر ہوا (حاشیہ از آزاد)

[1] نواب احمد بخش خان کا انتقال اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا۔ غالب کو یہ خبر سفرِ کلکتہ کے دوران مرشد آباد میں ملی۔

[2] غالب ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ اسی روز شملہ بازار (متصل چیت پور) میں گروتالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔

[3] ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دلی واپس ہوئے۔

[4] یہ شعر ۱۸۲۶ء یا اس سے پہلے کا فکر کردہ ہے اور بیدل کے ذیل کے فارسی شعر کا چربہ ہے۔

مطلبم از مے پرستی تر دماغی ہا نہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

[5] ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے اور ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے۔

[6] نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو غالب کے شاگرد ہوئے۔

[7] مئی ۱۸۶۰ء میں دوبارہ انگریزی پنشن کا اجرا ہوا۔

اس ہے چند سال زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سُنائی نہ دیتا تھا۔ نقشِ تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ خوراک دو تین برس یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آبِ گوشت، شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس[1] کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہانِ فانی سے انتقال کیا اور بندہ آثم نے تاریخ لکھی: آہ غالب بمرد[2]۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے   عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات:

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علومِ درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اُٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا جس نے اس کی فکر میں یہ بلند پروازی، دماغ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز، لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جابجا ان کا قول ہے اور حقیقت میں لُطف سے خالی نہیں کہ زبانِ فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو قاطع برہان بھیج کر خط لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں "دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد خُدا لیا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی — گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن بچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔ مبدہٗ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔

ہرمزد[3] ۔ نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا۔ اس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا۔ ایام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آ نکلا اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ان کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی جس نے اُسے کھینچا اور دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتسابِ کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضانِ صحبت کا انہیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے:-

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معانی سے کھینچوں، مگر یاد آیا کہ اُنہوں نے ایک جگہ اسی رنگ روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے۔ میں اس سے زیادہ کیا کر دوں گا۔ اس کی نقل کافی ہے۔ مگر اوّل اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی اور وہ ایک وجیہہ اور طرح دار جوان تھے۔ اِن سے اُن سے دید وادید نہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی زمانے کی ہم وطنی، شعر گوئی، ہم مذہبی اور اتحادِ خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسہ میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنتا ہوں کہ طرحدار آدمی ہیں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ انہیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حُلیہ بھی لکھا۔ اب اس کے جواب میں جو مرزا آپ اپنی تصویر کھینچتے ہیں، اسے دیکھنا چاہیے۔ "بھائی، تمہاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سُنا تھا جس زمانہ میں وہ حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہرحال تمہارا حُلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا، اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمہاری) ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

(میرے) جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار (میں نے) مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں

---

[1] ۷۳ برس ہجری سنہ کے حساب سے

[2] اس تاریخ پر اکثر احباب کو توارد ہوا۔ حقیقت میں اس قطعے سے ماخوذ ہے جو خود غالب نے ازراہِ تفنن ایک دفعہ کہا تھا۔

من کہ باشم کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال   مُرد غالب، بگو کہ "غالب مُرد"

آگے چل کر خود آزاد نے بھی لطیفے کے تحت یہ قطعہ درج کیا ہے

[3] ہرمزد ثم عبدالصمد استادِ غالب بعض کی نظر میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس پر طرفین میں لمبی لمبی بحثیں ہو چکی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا وجود تھا اور غالب نے اپنے بچپن میں زبانِ فارسی کے کچھ نکات ان سے سیکھے ہوں گے۔ اگرچہ شعرِ غالب سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا ہوگا۔

(یعنی دلی میں) ایک وردی ہے۔ عام ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، مونہہ پر داڑھی، سر پر بال۔ میں نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا۔" اس فقرہ سے بھی معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس ان کا اکثر اہلِ ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ کلاہ پاپاخ نہ تھی، مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی اور ایسا ضرور چاہیے تھا کیوں وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ مشق دلی کے ساتھ نباہتے تھے اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے۔ اس اعزاز پر کہ جو ان کے پاس باقی تھا۔ دو دفعہ آسمانی صدمہ پہنچے۔ اوّل جب کہ چچا کا انتقال ہوا۔ دوسرے جب ۱۸۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ اُردوئے معلّی میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے اور دل پر جو گزرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا۔

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے، اُس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دلّی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینے کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسبِ دستورِ قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ اُدھر سے آئے نہ یہ اِدھر سے گئے۔ اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔[1] اُنہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جا کر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں بحیثیتِ ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اُس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا۔ ان سے کتاب پڑھوا کر سُنی اور زبانی باتیں کر کے اسّی روپیہ تنخواہ

[1] یہ واقعہ آزاد اور ان کے تتبع میں حالی نے ۱۸۴۲ء کا قرار دیا ہے، مگر حقیقت میں ۱۸۴۰ء کا ہے۔

قرار دی۔ اُنہوں نے سو روپے سے کم منظور نہ کیے۔ صاحب نے کہا سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو۔ ان کے دل نے زمانہ کو دلی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں۔ مرزا کے گھُلے ہوئے طور طریقہ تو ہاتھ سے ہمیشہ مرزا کے تنگ رکھا مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے۔ چنانچہ اردوئے معلّیٰ کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے+۔ مرزا تفتہ[2] اپنے شاگرد رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں "سو روپیہ کی ہُنڈی وصول کر لی۔ ۲۴ روپیہ یار وغیرہ کی معرفت اُٹھے تھے، وہ دیے۔ ۵۰ روپیہ محل میں بھیج دیے۔ ۲۶ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے۔ جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بُری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر کہ قصہ تمام ہوا۔"

کدارناتھ آپ کا دیوان تھا۔ اسی عالم میں ماہ بماہ آ کر چِٹّھا بانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اس کے لیے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ہنڈوی میں ۱۲ دن کی میعاد تھی۔ ۶ دن گزر گئے تھے، ۶ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس ۱۵ معہ نقد بکس میں ہیں اور ۴ بوتل شراب کی اور ۲ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔"

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں: محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے پر کیا امکان جو چل سکوں۔ صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے۔ پلنگ پر سے پھسل پڑا۔ ہاتھ مونہہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے، کلّی کی پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا اور پڑ رہا۔

نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت ۱۳ برس کی عمر تھی۔ باوجود یہ کہ اوضاع و اطوار آزادانہ رکھتے تھے۔ لیکن آخر صاحبِ خاندان تھے۔ گھر والوں کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مدِ نظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید سے کہ خلافِ طبع تھی جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹالتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سنیں اور ان کے خطوط سے بھی اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی۔

+ مرزا صاحب سے بھی عمر میں بڑے معلوم ہوتے تھے۔ فارسی کے عاشق تھے، اس لیے باوجود ہندو ہونے کے مرزا تفتہ کے نام سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ دیوانِ قصائد اور دیوانِ غزلیات چھپوا دیا تھا۔ فارسی ہی شعر کہتے تھے۔ (حاشیہ از آزاد)

[2] ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی (ولادت: ۱۷۹۹/۱۸۰۰ء - وفات: ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء)

اُس نے امراؤ سنگھ کے نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اب اور شادی نہ کرے تو کیا کرے، پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی۔ یہ دوسری بی بی مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

جب ان کی پنشن کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں "تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ البال و خوشحال رہتا۔"

مرزا صاحب نے فرزندانِ روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین سے ایک انبوہ بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا۔ مگر افسوس کہ جس قدر ادھر سے خوش نصیب ہوئے اسی قدر فرزندانِ ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں: "سات بچے ہوئے مگر برس برس دن کے پس و پیش میں سب ملکِ عدم کو چلے گئے۔

اُن کے بی بی کے بھانجے الٰہی بخش خاں مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے اور عارف تخلص کرتے تھے۔ عارف جوان مر گئے[3] اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لیے مرزا نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انہیں گلے کا ہار کیے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے۔ ان کے آرام کے لیے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ اُن کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت ان سے لیتے تھے۔ دنیا کی ضرورتوں میں اُنہیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب[4] ضیاء الدین خاں صاحب شاگرد میں۔ نواب امین الدین خاں مرحوم والیٔ لوہارو بھی آدابِ خوردانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے۔ نواب علاؤالدین خاں والیٔ حال اس وقت ولی عہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب[5] نواب علاؤ الدین خاں صاحب کو لکھتے ہیں: "میاں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی[+] کہتی ہیں کہ ہائے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک مجھ کو بھائی سے وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیرین جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مرمت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔ غالب۔"

مرزا کثیر الاحباب تھے۔ دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنائیت سے زیادہ ان کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفاء اور رئیس زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی۔ انہی سے غم غلط ہوتا تھا اور اسی میں ان کی زندگی تھی۔ لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کہتے تھے جو دوستوں سے۔ اُدھر ہونہار جوانوں کا مؤدب بیٹھنا، ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا۔ اُدھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حدِ ادب سے قدم نہ بڑھانا ادھر پھر بھی شوخِ طبع سے باز نہ آنا، ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ بہرحال انہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ چنانچہ میر مہدی، میر سرفراز حسین، نواب یوسف مرزا وغیرہ۔ اکثر شریف زادوں کے لیے خطوط اردوئے معلیٰ میں ہیں جو کہ ان جلسوں کے فوٹوگراف دکھاتے ہیں۔

زمانے کی بے وفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی جو ان کے خاندان اور کمال کے لیے شایان تھی اور انہی دونوں باتوں کا مرزا کو بہت خیال تھا لیکن اس کے لیے وہ اپنے جی کو جلا کر دل تنگ بھی نہ ہوتے تھے بلکہ ہنسی میں اُڑا دیتے تھے ان دونوں باتوں کی سند میں دو خط[+] نقل کرتا ہوں۔ ایک خط میر مہدی صاحب کے نام ہے کہ ایک شریف عالی خاندان ہیں اور ان کے رشید شاگرد ہیں۔ دوسرا خط منشی ہرگوپال صاحب تفتہ تخلص کے نام ہے، جن کا ذکر خیر مجملاً پہلے لکھا گیا ہے۔

میر مہدی تم میری عادات بھول گئے۔ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع

---

[1] ۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۹ اگست ۱۸۱۰ء کو پورے ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔

[2] اگر آزاد نے یہ عبارت خط بنام میاں داد خاں سیاح سے لی ہے تو وہ یوں ہے اور خط ۲۵ اگست ۱۸۹۷ء کو لکھا گیا تھا۔۔۔ "سات بچے ہوئے ــــ لڑکے بھی لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر ۱۵ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔۔" حیرت ہے کہ غالب نے اپنی کسی اولاد کے پیدا ہونے یا مرجانے کا ذکر اپنے کسی خط میں نہیں کیا۔ کسی ہم عصر کے یہاں بھی اس کی نشاندہی اب تک نہیں کی جاسکی۔

[3] عارف۔ ولادت: ۱۸۔۱۸۱۷ء وفات: اپریل ۱۸۵۲ء

[4] ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں۔ ولادت: اکتوبر ۱۸۲۱ء وفات: ۲۷ جون ۱۸۸۵ء

[5] علاؤ الدین احمد خاں علائی، ولادت ۱۸۳۴ء وفات دسمبر ۱۸۶۹ء

+ الٰہی بخش خاں مرحوم کی بیٹی۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کی حقیقی بھتیجی ہوئیں۔ وہ ان کی بی بی تھیں۔ چونکہ کوٹھی کا مکان رہنے کو مانگا ہے، اس لیے اپنے تئیں صاحب اور بی بی کو میم صاحبہ اور بچوں کو بابا لوگ بتایا (حاشیہ از آزاد)

+ دیکھو اردوئے معلیٰ کے خطوط (حاشیہ از آزاد)

کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نمازِ تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح بسر ہوتی ہے+۔ اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادثات ہو تو بدنامی عمر بھر رہے اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس ہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا۔ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ ایک صاحب نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ عزت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔ خان صاحب بسیار مہربان دوستان القاب خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔

تجنی ناظر۔ حکیم کسی سے تو قیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کر لیں۔ "خط بنام ملنی ہر گو پال تفتہ۔ بس اب تم اسکندرآباد میں رہے کہیں اور رکیوں جاؤ گے بنک گھر کا روپیہ کھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے میاں۔ نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل[1] خوب کہتا ہے:

رغبت جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام زیں ہوسہا بگذر یا مگذر میگذرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔ مرزا کے تمام خاندان کے بزرگوں کا مذہب سنت و جماعت تھا، مگر اہلِ راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبت میں تھا نہ کہ تبرا و تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انہیں تفضیلی کہتے تھے اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

منصور فرقۂ علی اللّٰہیان منم آوازۂ انا اسد اللہ بر افگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سنت و جماعت تھے، لیکن ان کی اپنائیت میں کسی طرح کی دوری نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخرالدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہلِ دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔

تصنیفات اُردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا[2]۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً پندرہ سو شعر، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر مثنوی ۳۳ شعر، متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رباعیاں ۱۶، دو تاریخیں جن کے چار شعر، جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالم معنے میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس ملکِ بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیمِ سخن کا بھی بادشاہ تھا، اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا۔

+ دیکھو اردوئے معلی کے خطوط — (حاشیہ از آزاد)

+ غرہ رمضان سے لے کر یہاں تک فقط شوخی طبع ہے کیوں کہ جو جو باتیں ان فقیروں میں ہیں، مرزا ان سے کوسوں بھاگتے تھے اور یہ خط غدر کے بعد کا ہے۔ اس وقت یہ باتیں دلی میں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ (حاشیہ از آزاد)

[1] بیدل: ولادت: ۴۵-۱۶۴۴ء وفات: ۱۷۲۰ء

[2] غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار چھپا۔

پہلی بار: مطبع سید الاخبار دلی سے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں، اس میں ۱۰۹۶ شعر ہیں

دوسری بار: دارالسلام دلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں، اس میں ۱۱۵۸ شعر ہیں

تیسری بار: احمدی " " جولائی ۱۸۶۱ء میں، اس میں ۱۷۹۶ شعر ہیں۔

چوتھی بار: مطبع نظامی کانپور سے جون/جولائی ۱۸۶۲ء میں، اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں

پانچویں بار: مفید خلائق آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں، اس میں ۱۷۹۵ شعر ہیں۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی[۱]

اور ایک رُباعی بھی کہی۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل[۲]

ایک دن استادِ مرحوم سے مرزا صاحب کے اندازِ نازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا: خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر اُن کے میں تمہیں سُناتا ہوں۔ کئی متفرق شعر پڑھے ایک اب تک خیال میں ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں اُن کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اوّل یہ کہ معانی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترتیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں، لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ویسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہلِ ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے[۳] غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ دیکھو آخر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے معلوم ہو جائے گی۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بیعدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کوتوالِ شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم۔ نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا: اتنا کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں[۱]

عودِ ھندی: کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں۔ اکثر خطوں میں ان لوگوں کے جواب ہیں جنہوں نے کسی مشکل شعر کے معنے پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی یا اردو کا دریافت کیا۔

اُردوئے معلّٰی[۲] ۔ ۱۲۸۵ھ ۔ ۱۸۶۹ء چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو کے خطوط ان کے ہاتھ آئے ایک جگہ ترتیب دیے اور اس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اُردوئے معلّٰی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا "جگر خون کن اتفاق ہے — اب دو رنگ درزی کی تقصیر معاف کیجیے۔ پس چاہیے کوئل کی آرائش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔ سرمایہ نازشِ قلمرو ہندوستان ہو۔" بعض جگہ خاص محاورۂ فارسی کا ترجمہ کیا ہے جیسے میر اور سودا وغیرہ استادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہی خطوں میں فرماتے ہیں اس قدر عذر چاہتے ہو۔ یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ عذر خواستن جو فارسی کا محاورہ ہے وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اس شخص سے خس برابر علاقۂ عزیز داری کا نہیں۔ یہ بھی ترجمہ — نظر بریں ضابطہ کہا ہے۔ منشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ کرتے ہیں۔ گلہ ہا دارند و شکوہ ہا دارند فارسی کا محاورہ ہے۔ کیوں مہاراج کو دل میں آنا' منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ یاد آوردن خاص ایران کا سکہ ہے۔ ہندوستانی

---

[۱] ۱۰۰ ، ۳۰۲ ، فکر کردہ : ۱۸۲۱ء

[۳] آغا جان عیش : ولادت تقریباً ۱۷۸۵ء وفات : ۱۸۷۹ء

---

[۱] یہ محض داستان سرائی ہے۔ اب سب اس بات پر متفق ہیں کہ انتخابِ کلامِ غالب میں سوائے غالب کے کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سفرِ کلکتہ سے پہلے ہی کبھی مولوی فضل حق نے غالب کو مغلق اشعار کہنے سے ٹوکا ہو۔

[۲] مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا، مگر کتاب پہلی بار ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

[۳] غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپی

یا دکرنا بولتے ہیں، جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ ہر چہ بر شما منکشف است بر من مخفی نماند۔

ان خطوں کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں ان میں خوب ادا ہو سکتی ہیں - یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں - اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملاتِ خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں - اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہے - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم ہمیشہ انہیں ستاتے تھے اور وہ علوِ حوصلہ سے ہنسی میں اڑاتے تھے - پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہ کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو، غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں - اس لیے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزا نہ آئے تو کچھ تعجب نہیں۔

اس کتاب میں قلم - التماس کو مونث - پنشن، بیداد - بارک کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا"۔

لطافتِ غیبی[1]: اس رسالے میں منشی سعادت علی کی طرف روئے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچہ میں سیف الحق کا نام لکھا ہے مگر اندازِ عبارت اور عبارت کے چٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں - درِ اصل وہی میاں داد خاں ہیں، جن کے نام چند رقعے مرزا صاحب کے اردوئے معلیٰ میں ہیں - چنانچہ ایک رقعہ میں انہیں فرماتے ہیں کہ صاحب، میں نے تم کو سیف الحق خطاب دیا۔ تم میری فوج کے سپہ سالار ہو۔

تیغ تیز[2]: مولوی احمد علی پروفیسر مدرسہ ہگلی نے قاطع برہان کے جواب میں موید البرہان لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر تیغِ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان کے آخر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔

تصنیفاتِ فارسی:

فارسی کی تصنیفات کی حقیقت حال کا لکھنا اور ان پر رائے لکھنی اُردو کے

---

[1] یہ رسالہ ۲ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپا تھا۔

[2] 'تیغ تیز' ۱۸۶۷ء میں مطبع اکمل المطابع سے چھپی تھی

[3] ساطع برہان (فارسی صفحات ۱۶۴) ۱۲۸۲ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی چونکہ یہ غالب کی کتاب قاطع برہان کی مخالفت میں ہے۔ اس لیے اس میں غالب کی طرف سے (چاہے وہ کسی سید عبداللہ کے نام سے سہی) کوئی تحریر کیوں کر ہو سکتی ہے۔

تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے فقط فہرست لکھتا ہوں۔

قصائد - حمد و نعت میں آئمۂ معصومین کی مدح میں - بادشاہ دہلی۔ شاہ اودھ۔ گورنروں اور بعض صاحبان عالی شان کی تعریف میں ہیں۔

غزلوں کا دیوان[1]: معہ دیوان قصائد کے ۳۳ - ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعہ سے اہلِ ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔

پنج آہنگ[2]: اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب - فارسی کے انشا پردازوں کے لیے جو کہ ان کے انداز میں لکھنا چاہئیں - ایک عمدہ تصنیف ہے۔ ۱۸۶۲ء میں قاطعِ برہان چھپی - بعد کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا اور درفشِ کاویانی نام رکھا۔ برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں مگر اس پر فارسی کے طرفداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی۔

نامۂ غالب[3]: قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے - چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نام ایک معلم نابینا تھے - انہوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا - مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطورِ جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامۂ غالب رکھا۔

مہر نیم روز[4]: حکیم احسن اللہ خاں طبیبِ خاص بادشاہ کے تھے - انہیں تاریخ کا شوق تھا اور اہلِ کمال کے ساتھ عموماً تعلقِ خاطر رکھتے تھے - مرزا نے ان کے ایما سے اول کتاب مذکور کا ایک حصہ لکھا - اسی کے ذریعے سے ۱۸۵۰ء میں باریابِ حضور ہو کر خدمتِ تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوا - چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال بیان کر کے مہر نیم روز نام رکھا - ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا۔

دستنبو[5]: ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۵۸ء تک حالِ بغاوت۔ روداد تباہی شہر۔ اپنی سرگزشت۔ غرض کل پندرہ مہینے کا حال لکھا ہے۔

سبد چین[6]: دو تین قصیدے چند خطوط فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج نہ ہوئے تھے۔

(بقیہ "ترجمۂ غالب" آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں:)

---

[1] کلیات (دیوان) نظم فارسی "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا، مگر یہ پہلے پہل ۱۸۴۵ء میں مطبع دار السلام دہلی سے چھپا۔

[2] پنج آہنگ پہلی بار ۴ اگست ۱۸۴۹ء کو مطبع سلطانی دہلی سے چھپی۔

[3] ۱۶ صفحے کا یہ رسالہ (اگست) ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد میرزا خاں) دہلی سے چھپا مگر یہ فارسی نہیں بلکہ اُردو تصنیف ہے۔

[4] پہلی بار ۱۲۷۱ھ (۵۵ - ۱۸۵۴ء) میں فخر المطابع سے شائع ہوئی۔ کل صفحات ۱۱۶

[5] پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ سے نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔

[6] سبد چین میں خطوط شامل نہیں ہیں اور اس میں قصیدوں اور قطعوں کے علاوہ رباعیاں غزلیں وغیرہ بھی ہیں۔ کتاب اگست ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی، دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

کمال احمد صدیقی

رموزِ غالب

بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کو اس طرح اپنے سینے سے چمٹائے نہیں رکھتا، جس طرح بندریا اپنا مرا ہوا بچہ چمٹائے رکھتی ہے۔ بڑے شاعر کی جہاں یہ پہچان ہے کہ وہ اپنے عہد کی زندگی سے گہرے طور پر وابستہ رہتا ہے اور اس کے کلام میں عصری زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ پہچان بھی ہے کہ اس کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے۔ غالبؔ یقیناً بڑے شاعر تھے، وہ دور تک مستقبل کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے، لیکن یہ صلاحیت اُن میں یقیناً نہیں تھی جو شعر انہوں نے ۱۲۴۰ھ کے بعد لکھے یا اپنے کلام میں جو اصلاحیں ۱۲۳۷ھ اور ۱۲۴۲ھ کے درمیان کیں، وہ ۱۲۳۱ھ میں کر لیتے۔

یہ مخطوطہ (نسخۂ بھوپال ثانی، نسخۂ عرشی زادہ، نسخۂ امروہہ) مصرعوں کی ایسی قرأت سے پٹا پڑا ہے کہ نسخۂ بھوپال کی بجائے نسخۂ شیرانی ہے۔ نسخۂ بھوپال جس کی سنہ کتابت ۱۲۳۷ھ ہے۔ اس مبینہ بیاضِ غالب کی مبینہ تاریخِ کتابت سے چھ برس بعد کا ہے اور نسخۂ شیرانی نسخۂ بھوپال سے چھ برس بعد کا ہے۔ یہ چھ برس اس کا وقفہ بھی بہت سوچ سمجھ کر رکھا گیا ہوگا۔ شاید سائیکل دکھانا مقصود ہو ہجری سنوں کے حساب سے۔

۱۔ چھ برس کے تھے کہ یتیم ہوئے۔

۲۔ بارہ برس کے تھے تو "تذکرۂ سرور" (۱۲۲۴ھ میں) ختم ہوا۔ یہ پہلا تذکرہ ہے، جس میں میرزا کا ترجمہ ہے۔

۳۔ ۱۸ برس کے تھے تو ۱۲۳۰ھ میں اس مبینہ "ردیف وار بیاض" کی تدوین شروع ہوئی، جو ظاہر ہے ۱۲۳۱ھ میں تقویم کے حساب سے اس عہد کے غالب شناسوں نے ختم کرائی۔ حساب میں کہیں ایک برس کی چوک ہو گئی، ورنہ شاید اسے ۱۲۳۰ھ میں ختم کرانا مقصود تھا۔ اسی لیے سن ترقیمے میں نہیں ہے۔

۴۔ ۲۴ برس کے تھے تو ۱۲۳۶ھ میں اس مخطوطے کی تدوین شروع ہوئی جو ۱۲۳۷ھ میں ختم ہوا۔ مالک رام اور آل احمد سرور اسے نسخۂ بھوپال' نہیں 'نسخۂ حمیدیہ' کہتے ہیں۔ باقی اسے نسخۂ بھوپال کے نام سے جانتے ہیں۔

۵۔ ۳۰ برس کے تھے کہ وہ مخطوطہ تیار ہوا / ہونا شروع ہوا، جو نسخۂ شیرانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

۶۔ میرزا کی زندگی کے اہم واقعات کے اور سن بھی اس سائیکل کے لیے ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ آخری سن ظاہر ہے وفات کا ہے۔ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ جب وہ چونسٹھویں سال میں تھے کیوں کہ ان کی پیدائش رجب ۱۲۱۲ھ کی ہے۔

افسوس ہے، غالبؔ شناسوں میں کوئی ستارہ شناس نہیں تھا ورنہ بیاضِ غالبؔ کے اس پہلو پر بھی لکھا جاتا۔

میرزا کی یہ خود نوشت بیاض' جسے ۱۲۳۱ھ کا بتایا جاتا ہے '۱۰۴ صفحات پر ایسا کلام بھی رکھتی ہے، جس کی قرأت بہت بعد کے نسخے کی ہے۔ "تحقیقی جائزہ" میں ایسے سارے مقامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہاں چند مثالیں شہادت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں تاکہ آپ خود فیصلہ کر سکیں کہ کیا یہ ممکن اور قرینِ قیاس ہو سکتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی اتنی اصلاحوں کو مسترد کر کے پہلے کی قرأت پر مراجعت کرے۔

"مخطوطے" میں دوسرے صفحہ پر ہی (ورق ۲ الف) یہ شعر ہے:

• ۱۰۶ - بلاک نمبر ۱، اولڈ کیمپس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بے تابی
خرامِ ناز برقِ حاصلِ سعیٔ سپند آیا

نسخۂ بھوپال میں قافیہ پسند ہے۔ اس پر میرزا نے اصلاح کی اور نسخۂ شیرانی میں قافیہ سپند رکھا گیا۔

۲۔ مخطوطے میں شعر ہے:

رہا نظارہ وقتِ بے نقابیہا بجز دلرزاں
سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بر رو تھا

نسخۂ بھوپال میں مصرعِ ثانی میں "شیشہ بر رو" ہے اور نسخۂ شیرانی میں "شستہ بر رو"۔

۳۔ "مخطوطے" میں شعر:

اسد کو پیچ تابِ طبعِ برق آہنگ مسکن ہے
حصارِ شعلۂ جوالہ میں عزلت گزیں پایا

نسخۂ بھوپال میں قافیہ عزلت نشیں ہے۔ نسخۂ شیرانی میں (عزلت گزیں)۔ امتیاز علی خاں عرشی نے اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ نسخۂ بھوپال میں پہلے مصرع کا آخری لفظ "سے" ہے اور نسخۂ شیرانی میں "ہے"۔

۴۔ "مخطوطے" کے ورق ۳ رخ ب اور ورق ۴ رخ الف پر ایک غزل میں چھ اشعار بشمول مطلع و مقطع اس ترتیب میں لکھے ہوئے ہیں جس ترتیب میں نسخۂ شیرانی میں ہیں۔ نسخۂ بھوپال کا چوتھا شعر، نسخۂ شیرانی میں پانچواں اور نسخۂ بھوپال کا پانچواں شعر، نسخۂ شیرانی میں چوتھا ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے:

۵۔ بر من شرم ہے باوصفِ شوخی، اہتمام اوسکا
نگیں میں جوں شرر در سنگ ناپیدا ہے نام اوسکا

دوسرے مصرعے کی قرأت نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے۔ لیکن پہلے مصرع میں شوخی کی جگہ شہرت نسخۂ بھوپال اور گل رعنا میں ہے۔ اس بات کی نشاندہی عرشی نے اپنے نسخہ میں اختلافِ نسخ کے باب میں کی ہے۔ گویا "مخطوطے" میں نسخۂ بھوپال کا دوسرا مصرع اور نسخۂ شیرانی کا پہلا مصرع ہے۔

۶۔ اس غزل کا تیسرا شعر ہے:

مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ پیدا ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیوے گا پیام اوسکا

نسخۂ بھوپال کے متن میں، دوسرے مصرع میں "لایا ہے" کتابت کیا گیا اور حوالے کے نشان بنا کر حاشیہ میں "دیویگا" لکھا گیا۔ ظاہر ہے "دیویگا" ۱۲۳۷ھ کے بعد کی اصلاحی صورت ہے۔ نسخۂ بھوپال کی کتابت کے وقت تک "لایا ہے" ابتدائی قرأت تھی۔

۷۔ ورق ۴ ب اور ۵ الف پر ایک غزل ہے جس کا مقطع ہے:

جاں نذر ہولئے یک نفس گرم ہے (اسد) پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

اختلافِ نسخ کے باب میں نسخۂ عرشی میں یہ اندراج ہے کہ پہلے مصرع میں "نفس گرم" "نسخۂ بھوپال میں تھا۔ متداول دیوان میں "نگہ گرم" ہے"، لیکن غلطی سے لطیف ایڈیشن میں "نگہ گرم" نسخۂ بھوپال کا متن اور نسخۂ بھوپال کو متداول متن قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ ۵۔ الف پر ہی وہ غزل ہے جس کا مطلع ہے:

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

لطیف ایڈیشن میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مطلع نسخۂ بھوپال کا ہے۔ نسخۂ عرشی میں اس کو سہو قرار نہیں دیا ہے۔ اس سے دو نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ناقلِ نسخۂ بھوپال سے سہو ہوا اور وہ مطلع نقل کرنا بھول گیا۔ جو بعد میں حاشیہ پر اضافہ کیا گیا۔

۲۔ جو کاغذات اس کو ردیف وار بیاض (نسخۂ بھوپال) تیار کرنے کو دیے گئے تھے، ان میں مطلع قلمزد تھا، اس لیے اس نے نہیں لکھا۔ بعد میں اس زمین میں میرزا نے ایک مطلع کہا اور ایک شعر کہا۔ شعر یہ ہے جو متداول کلام میں ہے۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

غالب مطلعوں کے معاملے میں اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے ذرا مختلف یوں ہیں کہ عام طور سے ایک غزل میں ایک ہی مطلع رکھتے تھے۔ حسنِ مطلع بہت کم کہتے تھے۔ بیشتر ورناقل سے غلطی ہونا قوی امکانات میں سے ہے۔ لیکن معمولی کی غلطی کاتبوں سے لفظ چھوٹ جانے یا لفظ غلط پڑھنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ غزل چونکہ مطلع سے شروع ہوتی ہے، اس لیے اگر مطلع ہوتا تو ضرور لکھا گیا ہوتا۔ یہ مطلع قلمزد کلام میں اس لیے ہونا قرین قیاس نہیں کہ نسخۂ بھوپال کے بعد متداول کلام تک میں یہ باقی رہا۔ اس لیے غالب امکان اس بات کا ہو کہ مطلع کوئی اور رہا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو وہ ابتدائی کلام والا مطلع اس مبیضہ اولین ردیف وار بیاض میں کیوں نہیں، اور حاشیے والا مطلع جس کے بعد کے اضافے کیے جانے کے بہت قوی امکانات ہیں، اس بیاض میں کیوں ہے؟

۹۔ اس غزل میں ایک شعر اور ہے:

بے خونِ دل ہے چشمِ جنوں میں نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا!

امتیاز علی خاں عرشی نے اختلافِ نسخ کے باب میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ یہ شعر بھی نسخۂ بھوپال کے حاشیوں کے شعروں میں سے ہے۔ ظاہر ہے اس شعر کا اضافہ ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد کا ہے۔ اگر شعر ۱۲۳۱ھ کے چھ، سات، آٹھ برس بعد موزوں کیا گیا تو اس بیاض کے متن میں کیا کر رہا ہے جو بخطِ غالب بھی بتائی

جاتی ہے۔ اور اس بات پر بھی اس عہد کے "غالب شناس" اصرار کرتے ہیں کہ یہ میرزا کی پہلی ردیف وار بیاض ہے جو انہوں نے بہ نفسِ نفیس تحریر فرمائی :

۱۰۔ ۵۔الف پر ایک اور غزل ہے جس کا چوتھا شعر نقوش لاہور (نسخۂ امروہہ) اور نسخۂ عرشی زادہ میں، ایک لفظ کی تبدیلی کی وجہ سے الگ الگ قرأتوں کا حامل ہے۔ نسخۂ امروہہ میں شعر بخطِ غالب یوں تحریر فرمایا گیا ہے۔

ہجگر ہو مانعِ دامن کشی ذوقِ خود آرائی
ہوائے نقشبند آئینہ سنگِ مزار اپنا

نسخۂ عرشی زادہ میں مصرعِ ثانی کا پہلا لفظ ہوائے نہیں، بلکہ دو لفظ ہیں۔ ہوا ہے۔ ئے، مخطوطے والے خط میں ہے تے ہوگیا۔ اسی اسلوب میں اس مقام پر میں اس بات سے بحث نہیں کروں گا کہ میرزا اپنی وفات کے سو برس بعد نسخۂ عرشی زادہ میں اپنے نیزے کے قلم سے کو ہے بنانے کیسے آگئے؟ اور یہ کہ ایک "مخطوطے" کے دو عکس ایک دوسرے سے کیسے مختلف ہوگئے؟ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ نسخۂ شیرانی میں سہوِ کاتب سے "ہوائے" لکھا گیا تھا۔ یہ نسخۂ شیرانی کی قرأت نسخۂ امروہہ میں کیسے در آئی؟ نسخۂ شیرانی کاتب نے لکھا تھا۔ مخطوطہ بخطِ غالب ہونے کا دعوے کیا جاتا ہے۔ نسخۂ بھوپال جو ان دونوں کے درمیان میں ہے، اس میں ہوا ہے' لکھا ہے جو درست ہے۔ نسخۂ بھوپال میں پہلے مصرع میں "شوقِ خود آرائی ہے" جو اس مخطوطے میں "ذوقِ خود آرائی" ہے۔ اگر دوسرے مصرع میں ہوائے' میرزا نے نہیں لکھا تو شوق کی جگہ ذوق بھی ان کی فکر کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

۱۱۔ اس غزل کا ایک اور شعر ہے :

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ کوششہا
نیازِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

اختلافِ نسخ کے باب میں نسخۂ عرشی میں یہ اظہار ہے کہ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے اس شعر کے، دوسرے مصرع کا پہلا لفظ نسخۂ شیرانی میں نیاز ہے۔ نسخۂ بھوپال کا مصرع ہے :

نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

۱۲۳۱ھ کے "مخطوطے" میں ۱۲۳۷ھ کے نسخۂ بھوپال کی قرأت کے بجائے اس کی اصلاحی صورت، چھ برس بعد والے نسخۂ شیرانی کی ہے!

۱۲۔ مقطع اس غزل کا متداول دیوان میں ہے۔ اس غزل سے صرف اسی کو انتخاب کیا گیا :

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں، گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

یہ مقطع نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر ہے۔ یعنی ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد کا۔ ۱۲۳۷ھ کے نسخے میں تو یہ متن میں نہیں۔ حاشیے پر ہے، لیکن ۱۲۳۱ھ کے "مخطوطے" میں یہ حاشیے پر نہیں بلکہ جزوِ متن میں ہے۔

۱۳۔ ورق ۵ کے رُخ ب پر ایک شعر ہے :

وصل میں بختِ سیہ نے سنبلستاں گل کیا
رنگِ شب تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

بختِ سیہ مخطوطہ سازوں اور مخطوطہ نویس کے ہاتھوں، بیشانیوں کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ نسخۂ بھوپال میں شعر یوں ہے : جس کی تصدیق نسخۂ حمیدیہ سے ہوتی ہے :

وصل میں بختِ رسا نے سنبلستاں گل کیا
رنگِ شب، تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

بختِ سیہ اصلاحی صورت ہے جو مصرع ۱۲۳۱ھ کی مبینہ بیاضِ غالب بخطِ غالب میں درج کرایا گیا ہے۔ وہ نسخۂ شیرانی کا ہے۔ کیا واقعی میرزا نے ابتدائی قرأت رد کر کے ۱۲۳۷ھ میں لکھے جانے والے نسخے کے لیے "بختِ رسا" لکھوایا، اور اس چھ برس بعد نقل کیے جانے والے نسخے میں پھر رد کیے ہوئے مصرع کی طرف رجوع کیا۔

۱۴۔ اسی صفحے پر ایک شعر ہے، جس کے دوسرے مصرع میں اصلاح دکھائی گئی ہے۔ اصلاح سے پہلے شعر کی یہ قرأت تھی :

شب کہ تھی کیفیت محفل بیادِ روئے یار
در نظر ہا داغِ مے، خالِ لبِ پیمانہ تھا

دوسرا مصرع اصلاح سے یوں ہوگیا :

ہر نظر میں داغِ مے، خالِ لبِ پیمانہ تھا

یہ اصلاحی مصرع نسخۂ شیرانی میں ہے۔ نسخۂ بھوپال میں مصرع کی قرأت یہ ہے :

ہر نظر داغِ مے، خالِ لبِ پیمانہ تھا

نسخۂ شیرانی کا مصرع نسخۂ بھوپال کے چھ برس کے بعد کی اور اصلاح شدہ صورت ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں، ۱۲۳۷ھ کے بعد کا مصرع!

۱۵۔ ورق ۶ رُخ الف پر، دوسرے کالم میں ایک شعر ہے :

یہ عجز آبادِ وہمِ مدعا تسلیم شوخی ہے
تغافل کو نہ کر مغرورِ تمکین آزمائی کا

نسخۂ حمیدیہ کے مطابق نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع یوں ہے :

تغافل کو نہ کر معروفِ تمکیں آزمائی کا

فٹ نوٹ میں یہ اندراج ہے : حاشیے پر "معروف" کی جگہ "معزول" لکھا ہے۔ نسخۂ عرشی میں معزول ہی ہے۔ لیکن اختلافِ نسخ کے باب میں امتیاز علی خاں عرشی نے یہ معلومات فراہم کی ہیں۔ غالب نے اس معروف کے اوپر مغرور بنایا ہے۔ یہی لفظ قا (یعنی نسخۂ شیرانی) میں بھی نقل ہوا ہے۔ عرشی نے نسخۂ بھوپال کو دیکھا تھا۔ اور یادداشتیں بھی تیار کی تھیں۔ ان کا کہنا ہے حمیدیہ میں معزول سہوِ کتابت ہے۔ نیز اس میں اصلاح کو متن کی جگہ حاشیے میں تحریر کیا ہے۔

عرشی تحقیق کے شعبہ میں ثقہ شخصیت ہیں اور ان کے بیان کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

حاشیے پر پہلا مصرع وہی ہے جو نسخۂ بھوپال میں ہے، سوائے اس کے کہ نسخۂ حمیدیہ میں گلہ الف سے نہیں ہے جو نسخۂ بھوپال کے املا کے مطابق ہے اور اس کی تصدیق عرشی کے نسخہ سے ہوتی ہے، جس میں یہی املا ہے۔ بخطِ غیر قافیے میں وہ املا کہاں سے آگیا جو بعد میں میرزا نے اپنایا؟ حاشیے کی اس غزل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میرزا نے "اپنی لکھی ہوئی" یہ بیاض بہت دنوں تک اپنے پاس رکھی۔ کیوں کہ انہوں نے اسد کے بہت سے مقطعوں کو غالب والا بنایا اور بھی اصلاحیں کیں۔ میرزا کے بعد یہ کسی صاحبِ ذوق کے پاس رہی۔ جنہوں نے میرزا کا دستیاب کلام جو بیاض میں نہیں تھا، حاشیے پر لکھ دیا۔ ہم مان لیتے اگر:

۱۔ یہ غزل بھی اُسی ورق کے حاشیے پر ہوتی، جس کے حوض میں "بخطِ غالب" یہی غزل لکھوائی گئی تھی۔

۲۔ صرف اسی غزل میں نہیں، اور غزلوں میں بھی میرزا نے قابلِ ذکر تبدیلیاں کی تھیں۔ وہ بھی حاشیوں پر دکھائی جاتیں۔

۳۔ نسخۂ شیرانی (۱۲۴۲ھ) کے مصرعے اس نسخے کے حوض میں اتنی بڑی تعداد میں نہ ہوتے۔

آئیے اب چوتھے شعر سے لطف اندوز ہوں:

حوض میں شعر کی قرأت نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے:

خوش افتادگی کہ بصحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں

حاشیے پر مصرعِ اولیٰ مختلف ہے:

خوش افتادگی کہ بصحرائے آشکار

نسخۂ امروہہ اور نسخۂ عرشی زادہ میں غیر اہم نکتوں پر تصریحات اور حواشی کے تحت جواز پیش کیے گئے ہیں اور بعض تضادات کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن انتظار کے بجائے آشکار حاشیے پہ ہونے پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی، اس لیے اس کی وجہ سے جعل کھل جاتا اور یہ سوال اُبھرتے:

۱۔ اگر آشکار میرزا کی اصلاح ہے تو یہ اصلاح اُنہوں نے کب کی، اور اس کی اطلاع "حاشیہ نگار" کے علاوہ کسی کو کیوں نہیں ہوئی۔

۲۔ اگر یہ اصلاح ۱۲۳۱ھ کے بعد کی ہے تو نسخۂ بھوپال میں انتظار کیوں ہے، نسخۂ شیرانی میں انتظار کیوں ہے؟

"تحقیقی جائزہ" لکھتے وقت میرا خیال یہ تھا کہ عادتاً مخطوط نویس نے حاشیہ پر بھی اصلاحِ معکوس کا عمل جاری رکھا۔ لیکن اٹھارہ اُنیس برس بعد جب آج پھر اس کے بارے میں سوچا، تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا خیال غلط تھا۔ دراصل نسخۂ بھوپال کے صفحہ ۱۴ پر "گنجینۂ معنی" میں اس شعر کی جو قرأت اُنہوں نے رکھی ہے، اُس میں معزولی ہے اور "غلط نامے" میں بھی اس سلسلے میں کوئی اندراج نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اس نکتے پر گفتگو کا نہیں ہے۔

یہاں پر تو صرف اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ "مخطوطہ" اپنے فوراً بعد آنے والے دیوان (نسخۂ بھوپال) کے بجائے اُس کی اصلاحی شکل اپنے متن میں کسی اصلاح کے بغیر دکھا رہا ہے۔

۱۶۔ اسی غزل میں ایک اور شعر یہی کہانی فریاد کے طور پر سنا رہا ہے:

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا غوغا ہے تیری بے وفائی کا

نسخۂ حمیدیہ کے مطابق نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع یہ ہے:

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

متداول دیوان میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے، لیکن نسخۂ شیرانی میں چرچا کی جگہ غوغا ہے۔ اس بات کے شاہد، اختلافِ نسخ کے باب میں عرشی ہیں۔ ایک بحث یہ کی جا سکتی ہے کہ اسی مثال کو لے لیجیے۔ ۱۲۳۷ھ کے نسخے میں چرچا کو رد کیا اور ۱۲۴۲ھ کے نسخے میں غوغا لکھوایا۔ لیکن مطبوعہ نسخوں میں ۱۲۳۷ھ کی قرأت بحال کر دی۔ لیکن یہ کج بحثی ہوگی۔ اس لیے کہ ایک آدھ جگہ یہ ممکن ہے یہ اصلاح کی استثنائی صورت ہوتی ہے، جب شاعر اوریجنل قرأت پہ واپس آتا ہے۔ ایک ہی جگہ بخیہ کرنا، اُدھیڑنا پھر بخیہ کرنا۔ اور عادتاً یہی کرتے رہنا میرزا میں نہیں، کسی اور کردار کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ اسی زمین میں ایک اور غزل ہے، جو ورق ۶ ب کے تیسرے کالم میں ہے۔ تیسرا شعر یہ ہے:

نظر بازی طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے
رہا بیگانۂ تاثیر افسوں پارسائی کا

میرے سامنے نسخۂ حمیدیہ کا جو نسخہ ہے وہ اردو اکادمی اُترپردیش نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں بھی شعر کی یہی قرأت درج ہے، جو نسخۂ بھوپال کی ہونا چاہیے، لیکن نسخۂ عرشی کے مطابق نسخۂ بھوپال میں پہلے مصرع کی قرأت وہ ہے جو گنجینۂ معانی میں درج کی گئی ہے:

نظر بازی طلسمِ وحشت آبادِ پریشاں ہے

اختلافِ نسخ میں عرشی کے اندراج کے مطابق پرستاں نسخۂ شیرانی کی قرأت ہے۔

۱۸۔ ورق ۶ ب پہ ایک غزل کا مقطع ہے:

اسد تاثیرِ ما فیہائے حیرت جلوہ پرور ہے
گر آبِ چشمۂ آئینہ دھووے عکس زنگی کا

نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کا مصرعِ ثانی یہ ہے :

گر آبِ چشمۂ آئینہ ہووے عکسِ زنگی کا

اختلافِ نسخ کے باب میں عرشی نے اپنے نسخہ میں جو اندراج کیا ہے، اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ گنجینۂ معانی میں عرشی نے نسخۂ بھوپال ہی کا مصرع رکھا ہے۔ عرشی نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ نسخۂ شیرانی میں لفظ "ہووے" ہے۔

گویا یہاں بھی ۱۲۳۱ھ کے مبینہ "مخطوطے" میں ۱۲۳۷ھ کے نسخے کا مصرع نہیں، بلکہ اس کا اصلاح شدہ روپ ہے۔

۱۹۔ ورق ۸ ب پر ایک غزل کے چار شعر ہیں اور دو شعر اگلے ورق پر ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ میں یہ گیارہ شعروں کی غزل ہے۔ متداول دیوان میں ان میں سے نو شعر ہیں، جن میں سے پانچ نسخۂ بھوپال کے حاشیے کے ہیں۔ اختلافِ نسخ کے باب میں عرشی نے اپنے نسخے میں یہ بات واضح الفاظ میں کہی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں حاشیے کے پانچ شعروں کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے حاشیے کے یہ پانچ شعر ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد کے ہیں۔ حاشیے کے ان پانچ شعروں میں سے ایک اس "مخطوطے" میں بھی ہے۔ جو ۱۲۳۱ھ میں بخطِ غالب لکھا گیا تھا۔ شعر یہ ہے :

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط —

شعلہ خس میں مثلِ خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

یہ بہت معمولی سی بات ہے کہ مصرعِ ثانی پہلے یوں تھا :

شعلہ خس میں، جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

اس مصرع میں اصلاح ہوئی اور الفاظ کا دروبست زیادہ چست ہو گیا :

شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

اتنی مثالوں کے بعد اب یہ سوال تو نہیں کر سکتے کہ ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد کا مصرع ۱۲۳۱ھ کے نسخے میں کیا کر رہا ہے؟ ہاں اس سے مناسب نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے۔

۲۰۔ ورق ۱۱، رخ الف پر ایک غزل کا حسنِ مطلع ہے

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا

موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

نسخۂ حمیدیہ میں صـ۲۶ پر یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی دیوان (نسخۂ بھوپال) میں یہ شعر حاشیے پر بعد میں بڑھایا گیا ہے گویا ۱۲۳۱ھ کے مبینہ دیوان میں میرزا کی "دور فہمی" نے شاید بے خیالی میں وہ شعر بھی لکھ ڈالا جو انہوں نے ۱۲۳۷ھ میں نسخۂ بھوپال کی کتابت کے بعد (دوبارہ) موزوں کیا!

۲۱۔ ورق ۱۲۔ الف پر ایک شعر یوں لکھا ہے :

اے آبلہ کرم کر یہاں رنجہ یک قدم کر

اے نورِ چشمِ مجنوں، اے یادگارِ صحرا

مجنوں کے نورِ چشم اور لیلیٰ کے لختِ جگر کے کیا مطلب ہوتے ہیں اس سے میرزا واقف تھے یا نہیں۔ یہاں اس کے بارے میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ (نسخۂ بھوپال میں نورِ چشم درست ہے، جس کی تصدیق نسخۂ حمیدیہ سے کی جا سکتی ہے) یہاں صرف پہلے مصرع میں "یک قدم" پر غور کرنا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں اک قدم ہے۔ نسخۂ بھوپال میں اعراب بالحروف لکھے گئے — اس لیے الف میں کسرہ دکھانے کے لیے اِیک لکھا گیا ہوگا۔ جیسے ایک اور اِک کے التباس کو دور کرنے کے لیے مفتی محمد انوار الحق نے اِک لکھا۔ نسخۂ بھوپال میں اِیک (اِک) ہے۔ نسخۂ شیرانی میں یک ہے اور نسخۂ بھوپال میں بجائے نسخۂ شیرانی کا مصرع اس ۱۲۳۱ھ کے "مخطوطے" میں ہے۔ روشن ضمیر ہو تو مرزا کا ایک۔ گیارہ برس بعد والی اصلاح ۱۲۳۱ھ میں کر دی۔

۲۲۔ اس غزل میں ایک اور شعر کی قرأت "بخطِ غالب" یہ دکھائی گئی ہے :

ہر ذرہ یکدل پاک آئینہ خانۂ خاک

تمثالِ شوقِ بے باک صد جا دوچارِ صحرا

اضافت خانہ کی ہ پر نہیں، آئینہ کی ہ پر ہے۔ اس مخطوطے میں جا بجا "غالب" کے خط میں اصلاحیں بھی ہیں، جو بہت سی کتابت کی غلطیاں انہوں نے دور نہیں کیں اور اس عہد کے "غالب شناسوں" کے چومنے کے لیے چھوڑ گئے۔ ان میں سے یہ بھی ہے۔

نسخۂ حمیدیہ میں بھی "آینہ خانۂ خاک" میں کتابت کی ایسی ہی بھونڈی غلطی ہے۔ یعنی خانہ اور خاک میں اضافت کا بہت مضبوط رشتہ دکھانے کے لیے ہ پر ہمزہ اضافت بھی ہے۔ اور نیچے کسرۂ اضافت بھی۔ ظاہر ہے کتابت کی اس غلطی کے ذمہ دار مفتی انوار الحق نہیں۔ عرشی نے اپنے نسخہ میں "آینہ خانہ ہے خاک" نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کی قرأت درج کی ہے۔ ہو سکتا ہے ۱۲۸۵ھ کے آس پاس کا میرزا کا اپنا لکھا ہوا کوئی "مخطوطہ" دریافت ہو جائے۔ اور آئینہ خانہ خاک" اس میں ملے۔ کیوں کہ آخر عمر میں انہیں شعر سے رغبت نہیں رہی تھی۔ ۱۲۸۵ھ کی قرأت اگر یہی ہو تو اس مخطوطے کی قدر و قیمت اور بڑھ جائے گی کہ ۱۲۳۱ھ سے پہلے غالب کتنے دور فہم تھے۔

۲۳۔ ورق ۱۳ کے الف رُخ پہ پہلا شعر ایک مشہور غزل کا مطلع کے بعد والا شعر ہے :

دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری

بسکہ ذوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع ہے :

بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

نسخۂ بھوپال میں "شوقِ آتشِ گل" ہونے کی تصدیق نسخۂ حمیدیہ سے بھی ہوتی ہے۔ اور عرشی نے بھی اختلافِ نسخ کے باب میں بھی یہی اظہار کیا ہے اور یہ اندراج

بھی کہ "ذوقِ آتشِ گل" نسخۂ شیرانی میں ہے۔

۱۲۳۷ھ کے مخطوطے کا مصرع اصلاح کے بعد ۱۲۴۲ھ کے نسخے میں میرزا نے لکھوایا۔ ۱۲۳۱ھ کے مخطوطے میں یہ آئندہ کی اصلاح موجود ہے!

اس غزل کا مطلع بہت مشہور ہے :

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

کوئی خاص بات نہیں ہے۔ "ماورائے سخن" بھی کوئی بات نہیں ہے۔ دعویٰ اور دلیل بھی نہیں ہے۔ کوئی حسی تجربہ بھی نہیں ہے۔ زبان کا چٹخارہ بھی نہیں ایک لوٹی ماری تشبیہ ہے، اور گویا کی نذر ہوگئی، لیکن غزل کے مطلع کی وجہ سے غزل مشہور ہوگئی۔ بات مطلع کی ہو رہی تھی۔ نسخۂ بھوپال میں اس کی صورت یہ ہے :

اُف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گو یا جل گیا!

۱۲۳۷ھ کے نسخے میں (جو نسخۂ بھوپال کہلایا) یہ مصرع منسوخ ہوا اور پہلا مصرع وہ لگایا گیا جو متداول دیوان میں ہے اور جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ۱۲۳۱ھ کے مخطوطے میں اصلاحِ معکوس سے پہلے مصرعے کا حلیہ بگاڑ کر مطلع یوں لکھا ہے:

اُف نہ کی گو سوزِ غم سے، بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

اس مخطوطے میں "بخطِ غالب" متعدد اصلاحیں ہیں۔ گویا بہت دنوں تک یہ کلام بلاغت نظام میرزا کے پاس رہا۔ لیکن انہوں نے ادبِ عالیہ کے اس نمونے کو اسی طرح رہنے دیا! یہ سوال میرزا سے خود سے نہیں کیا۔

گو سوزِ غم سے اُف نہ کی ــــــ کس نے ؟
محابا جل گیا ــــــ کون ؟

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا ــــ کون، بھی آخر کون ؟ ۔ ظاہر ہے یہ معیر محمد خاں گویا یا کسی اور گویا کے بارے میں شعر ہوتا تو بے معنی نہ ہوتا۔ دل کے لفظ کے بغیر یہ شعر میرزا پر تھوپا نہیں جا سکتا۔ ہوسکتا ہے ۱۲۸۵ھ کے آس پاس کی کسی بیاض میں یہ شعر ۱۲۳۱ھ کی مبینہ قرات کے ساتھ پایا جائے۔ کیونکہ میرزا شاعری سے مونہہ موڑ چکے تھے۔

۲۴۔ ورق ۱۶ الف اور ب پر وہ غزل ہے، جس کا مطلع ہے :

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

اس غزل کا مقطع خاص طور سے ملاحظے کے لائق ہے، جس میں مخطوطہ ساز یا مخطوطہ سازوں نے بیدل کے ایک مصرع کو جس پر میرزا نے گرہ لگائی تھی، میرزا کا مصرع سمجھ لیا، اور جب ایسا سمجھ لیا تو "اصلاحِ معکوس" کا قانون اس پر بھی نافذ کر دیا، اور اس کی قرات نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی سے مختلف دکھا دی۔ بیدل کا مصرع یہ ہے :

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما، ہیچ

غالب نے بیدل کو عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا :

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل

بخطِ غالب، دارد کی جگہ باشد کر کے نسخۂ بھوپال کی خوانگی دکھا دی:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما باشد و ما، ہیچ

"نقوش" (نسخۂ امروہہ) میں نستعلیق میں اس شفیعہ آمیز خط، خط کی نستعلیق خوانگی بھی دی گئی ہے۔ مرتب نے نستعلیق خوانگی میں بیدل کا صحیح مصرع دارد کے ساتھ لکھا ہے۔ اپنے دل میں انہوں نے بھی محسوس کیا میرزا کو اپنے مصرعوں میں تحریف پسند نہیں تھی۔ اپنے کلام میں دوسروں کا کلام ملانے والے کاتبوں کو فحش گالیاں دیتے تھے۔

"بھائی شہاب الدین خاں۔ واسطے خدا کے تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر، یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس نے یہ شعر ہیں اُس کے باپ اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد لپشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں۔"

اگر میرزا نے اس مخطوطے کا کلام جو نو دریافت ہے اور جس میں تحریف کی گئی ہے۔ اصلاحیں دی گئی ہیں ـــ اور اس کا خط، اگر خود سے منسوب کیے جاتا سنتے، تو اُن کے ردِ عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (باقی اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

بقیہ : الوداع لداخ

زیرِ تعمیر ہے۔ جب یہ سڑک بن جائے گی، ہم ایک بار پھر لداخ آئیں گے! کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

تریت اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیے لیکن کرشنا بھابی نے اچانک چلا کر کہا۔

"صرف ایک شرط پر"

ہم صرف شرط کی وضاحت سننے کے لیے بے چین تھے۔

"اس بار سب خرچ کرنے پر کوئی روک ٹوک نہ ہوگی!" اس میں تریت کی پُرجوش تائید بھی شامل تھی۔ اور ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ ●●

عبدالمغنی

عبدالحق کی تنقید نگاری

شبلی اور حالی کے بعد اردو ادب کے جس تنقید نگار پر نگاہ ٹھہرتی ہے وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ہیں۔ وہ ادب میں حالی کی اخلاقیات اور شبلی کی جمالیات کے جامع ہیں۔ وہ حالی سے بہت زیادہ اور براہِ راست مغربی تصورات سے واقف ہیں۔ لیکن ان کا اسلوبِ بیان اپنی مشرقی نفاست میں شبلی سے قریب تر ہے۔ گرچہ اس میں رنگینی کم اور سادگی زیادہ ہے۔ بہر حال شبلی ہی کی طرح وہ بھی ایک محقق ہیں اور ان کی تنقید کو تحقیق سے بالکل الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ درحقیقت عبدالحق کی تنقید نگاری میں ایک تحقیقی وزن ہے۔ اور ان کی تحقیق میں ایک تنقیدی نظر ہے۔ وہ صرف ادیب نہیں، عالم بھی ہیں۔ علم و ادب کا یہ امتزاج ہی انہیں بہ یک وقت شبلی اور حالی دونوں کا جانشین بناتا اور اردو تنقید کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس مقام کی ایک نمایاں خصوصیت مشرق و مغرب کی ہم آہنگی بھی ہے۔ عبدالحق، شبلی و حالی کی بہترین تنقیدی روایات کے نہ صرف وارث بلکہ ان میں کچھ توسیع کرنے والے بھی ہیں۔ یہی چیز انہیں جدید اردو تنقید کے بانیوں اور اُن کے بعد آنے والے جدید تر اُردو ناقدین کے درمیان انتقال کی ایک اہم کڑی بنا دیتی ہے، اس سلسلے میں ان کے کم عمر ہم عصروں میں کوئی ان کا جانشین نہیں نظر آتا ہے۔

عبدالحق نے کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی نہ ان کا کوئی مستقل تنقیدی مقالہ دستیاب ہے۔ بالعموم اور بہ کثرت انہوں نے یا تو مقدمے لکھے ہیں یا تبصرے۔ ان مقدموں اور تبصروں میں وہ سب باتیں ہیں جو مقالات و مضامین میں پائی جاتی ہیں۔ یہ علمی و ادبی کاوشیں اپنے موضوعات کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات ہیں۔ ان میں معتدبہ تحریریں موضوع کے تمام اہم پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ عبدالحق نے جس کتاب پر قلم اٹھایا ہے عام طور پر اس کے مصنف کی سیرت کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مواد کی اس طرح تشریح کی ہے کہ فکر و فن، اخلاقیات و جمالیات اور اقدار و مسائل کے زاویے واضح ہو گئے ہیں۔ روایات پر بھی بحث کی گئی ہے اور تجربات پر بھی، قدیم کی بھی قدر شناسی ہے اور جدید کی بھی۔ نظریاتی و معاشرتی امور کے ساتھ ساتھ لسانیات اور محاورات سے بھی اعتنا کیا گیا ہے۔ یہ مطالعات وافر ادبی و تہذیبی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں تجزیہ، موازنہ اور فیصلہ سبھی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک مرکب، متوازن اور مکمل تنقید کے نمونے ہیں، یہ حقیقی قدر شناسی کی مثالیں ہیں، جن میں نہ کسی کی رعایت و مروّت ہے نہ کسی پر سبّ و شتم۔ عبدالحق کا انداز تنقید معروضی ہے۔ گرچہ ان کی اپنی ترجیحات عیاں ہیں۔ ان کے کچھ مفروضے ہیں۔ ان کی پسند و ناپسند بھی ہے، مگر بالکل شخصی تعصبات کم سے کم ہیں اور افراط و تفریط تقریباً مفقود۔ عبدالحق کی رایوں سے اختلاف ضرور کیا جا سکتا ہے، مگر ان پر الزام نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی طرف التفات مفید ہوگا۔

ناقدانہ صلاحیت کے متعلق عبدالحق کا یہ خیال حقیقت افروز ہے:

> "تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے، جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دُور بیں ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دربارۂ ادبیات کا تشنا بھی ہو، جس نے ایک مدّت مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کے بیان کرنے کی قدرت رکھتا اور دوسروں کے دل نشین کر سکتا ہے۔" (رُوحِ تنقید" —— تنقیداتِ عبدالحق
>
> مرتبہ: محمد تراب علی خاں ناز، صفحہ ۹۹)

اس مختصر سے بیان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تنقید نگاری کے لیے حسب ذیل اوصاف مطلوب ہیں:

• وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ ۷...۳۰۰

۱۔ ادبیات سے شغف۔
۲۔ کثرتِ مطالعہ
۳۔ غور و فکر
۴۔ کافی تجربہ
۵۔ ذوقِ سلیم
۶۔ وسعتِ نظر
۷۔ قوتِ فیصلہ
۸۔ قدرتِ بیان

اس سلسلے میں عبدالحق ایک پتہ کی بات یہ بھی بتاتے ہیں کہ :

"تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی بلکہ اعلیٰ درجے کا کلام اور اعلیٰ پائے کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۰۱ - ایضاً)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ براہِ راست تخلیقی اور تنقیدی دونوں قسم کی ادبیات کے اصل متون کا مطالعہ کرنے سے تنقیدی حس بیدار ہوتی اور تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ ادب کی تاریخوں وغیرہ میں بالواسطہ دوسروں کی رائیں پڑھ لینے سے تنقید کی استعداد حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ "اعلیٰ درجے کا کلام" کے ساتھ ساتھ "اعلیٰ پائے کی تنقیدیں" کو بھی ذوقِ تنقید کے نشوونما کا ایک وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالحق تخلیق کے علاوہ تنقید کی اصلیت و اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ یہ ادب و تنقید کا جدید ترین اور صحیح ترین نقطۂ نظر ہے جس کا علم و احساس بہت عام نہیں ہے۔ اس سے ادب میں تنقید کے کردار پر روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ناقد کی حیثیت فن کار سے کم تر نہیں ہے بلکہ وہ ادب و تہذیب کی تزئین و ترویج میں فن کار کے ساتھ شریک ہے اور اس کا معاون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں کے لیے تنقید کی ضرورت و افادیت کا اقرار عبدالحق ان لفظوں میں کرتے ہیں :

"تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اسے ذاتی اظہار کی قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شیفتگی سے بچاتی اور دوسری طرف جدت یا جدلیات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے یعنی بریک کا کام دیتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے اور پھر بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لیے تنقید لازم ہے۔"

("اردو تنقید کا ارتقا" ـــ مقدماتِ عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۱۴۷)

تنقید کو "تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریح کا ایک ذریعہ" قرار دے کر ایک بار پھر عبدالحق نے تنقید کی تخلیقی نوعیت پر تاکیدی نشان لگا دیا ہے۔ یہ ان کے نظریۂ ادب کی وسعت کا ایک ثبوت اور ان کی تنقیدی باریک بینی نیز روشن خیالی کی دلیل ہے۔

مشرقی و مغربی تنقید کی بحث عبدالحق کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جدید تعلیم یافتہ ناقدین اپنی کوتاہ نظری سے مشرقی تنقید کی تحقیر کر رہے تھے۔ ایک اچھے، سچے اور بڑے ناقد کی طرح عبدالحق نے اپنے ہم عصروں کو اس مسئلے پر اس طرح خبردار کیا :

"مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے الفاظ سے کام لیں۔ یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہیں اور ان کا مفہوم معین ہے۔ پڑھنے والے ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم بلا تامل سمجھ جاتے ہیں۔ کیا تمام مشرقی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ترک کرکے اور سر تا سر مغربی الفاظ و اصطلاحات کے اختیار کرنے ہی سے تنقید قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔" (صفحہ ۲۷۲ - ایضاً)

یہ ایک چبھتا ہوا سوال ہے جس نے جدت پرست نقادوں کو شرمندہ کیا ہو یا نہیں، مگر باذوق قارئینِ ادب کو ضرور ایک حقیقت سے آگاہ کر دیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اردو تنقید میں مغرب پرستی کا رواج عقل و دانش سے خالی ہے۔ اس موضوع پر عبدالحق کے یہ نکات بصیرت افروز ہیں کہ مشرقی کلام کی تنقید میں مشرقی اصطلاحات کا استعمال بالکل مناسب و موزوں ہے اور فی الواقع یہی الفاظ و اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم واضح ہونے کے سبب وہ بہ آسانی قارئین کی سمجھ میں آ جاتے اور انہیں متاثر کرتے ہیں۔ اس بیان میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ نامانوس اور اجنبی قسم کے مغربی الفاظ و اصطلاحات نہ تو ٹھیک ٹھیک قارئین کی سمجھ میں آتے ہیں نہ انہیں متاثر کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کی افادیت محدود ہو جاتی ہے جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی انداز کی پیچیدگی بیان دراصل پراگندگیِ خیال کے سبب ہو۔ یعنی اس انداز کے تنقید نگاروں کی فکر واضح نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے اظہار میں ابہام ہے۔

تنقید میں طرزِ بیان کی وضاحت پر عبدالحق بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور خیال کی اوّلیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس کے اظہار کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں :

"اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حسنِ بیان ذریعہ۔ لیکن طرزِ بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تنقید میں نقاد اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۷۰، ایضاً)

ادب و تنقید کا یہ ترکیبی نقطۂ نظر تازہ ترین بھی ہے اور بہترین بھی۔ موضوع و اسلوب کے درمیان جسم و روح کا رشتہ بتا کر دونوں کی ہم آہنگی کا جو تصور عبدالحق نے پیش کیا ہے وہ

حقیقت پسندانہ اور بصیرت مندانہ ہے۔

عبدالحق کے دور میں اخلاقی، معاشی اور نفسیاتی تنقیدوں کے مکاتبِ فکر کے درمیان جو معرکہ آرائی شروع ہوئی اس میں غلو، مبالغہ اور افراط و تفریط سے اس درجہ کام لیا گیا کہ تفرقے اور فتنے کی صورت پیدا ہو گئی جس سے علمی وقار غارت اور ادبی توازن برہم ہونے لگا۔ یہ گویا قدیم و جدید کی کش مکش تھی، جس کی تہہ میں مشرق و مغرب کی آویزش پنہاں تھی۔ عبدالحق اس عبوری دور میں ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو قدیم و جدید اور مشرقی و مغربی عناصر و اقدار کی جامع تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے انتہا پسندیوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال پیش کیا۔ اور چاہا کہ حریف مکاتب کے مابین مفاہمت و مصالحت ہو جائے تاکہ ناقدین ایک شغلِ مشترک میں باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں۔ اور اس طرح ادب و تنقید کی ترقی صحیح رُخ پر ہو۔ اُنہوں نے اپنے وقت کے ادبی نزاع کو ایک آفاقی تناظر میں دیکھا۔ اور اس کا ایک عمومی جائزہ لے کر اصلاحِ احوال کی کوشش کی:

> "افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ہیں۔ مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ اور اس زمانے میں فرائڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے، ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے اکتشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ افتادِ طبع، ماحول، تعلیم و تربیت و صحبت کی بِنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب اس میں غلو ہو تاہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے، اس لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیرِ اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں۔ اور دوسرے رُخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صحیح تنقید اُس وقت ہو گی جب ادب کے ہر رُخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی، ماورائی، روحانی، جذباتی کہتا اور اُسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا ہے اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو فرائڈ اور مارکس پرستی میں مادیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی، کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ بیشک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں، لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خادم ہے۔ کیا تنقید کے لیے لازم ہے کہ نقاد کسی خاص مسلک کا مقلد ہو۔" (ص ۷۰۔ ۴۶۹ ایضاً)

یہ حالات اور حقائق کا ایک متوازن، عالمانہ اور مفکرانہ تجزیہ ہے۔ چند لفظوں میں مابہ النزاع مسئلے کی ایک معروضی تشریح بھی ہے اور اس کے ایک معقول حل کی طرف اشارہ بھی۔ یہ ایک منصفانہ رویّہ ہے جس میں نہ جانب داری ہے نہ تعصب۔ گرچہ حقیقت پسندی کے پیشِ نظر معاشی و نفسیاتی نظریہ بازوں اور حربہ اندازوں کی جارحیت کے مقابلے میں اخلاقی نقطۂ نظر کا دفاع کیا گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ بے اعتدالی اور زیادتی مارکس اور فرائڈ کے ماننے والوں سے سرزد ہوئی ہے اور ان کی بے جا شدت نے تنقیدی توازن کو برہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں روایت و جدّت اور روحانیت و مادیت کی کش مکش کا نقشہ جس طرح کھینچا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کی ہمدردی ان کے مظلوم ہونے کے سبب روایت و روحانیت کے ساتھ ہے۔ گرچہ جدّت و مادیت کی حقیقت سے اُنہیں انکار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادب میں معاشی تجزیے اور تحلیل نفسی کا عمل زیرِ عمل الہامی و روحانی ذوق و وجدان کے تحت ہو تاکہ حد سے بڑھی ہوئی جمالیات نہ اقتصادیات کی بے راہ روی ادب و تہذیب کی تباہی کا سامان نہیں کرے اور روحانیت و اخلاقیات کے اصول و اقدار انسانیت کو تعمیر کے راستے پر گامزن رکھیں۔ اس بحث میں عبدالحق نے بہت ہی موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ادب و تہذیب اور علوم و فنون کی ترقیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنا نقطۂ نظر مؤثر طریقے پر پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُنہوں نے انتہا پسندانہ اشتراکی و نفسیاتی تنقید کے محض تنقید ہونے سے نہیں "ادبی تنقید" ہونے سے انکار کیا ہے۔ یعنی مارکس اور فرائڈ کے نظریات ادب کی اصلیت کی تشریح میں بہت زیادہ مفید نہیں۔ اس لیے کہ وہ ادب کے سرچشمۂ الہام و وجدان سے آگاہ نہیں یا اس کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اس طرح وہ اشارہ کرتے ہیں کہ نقاد کے لیے کسی خاص مسلک کا "مقلد ہونا لازم" نہیں۔ یعنی نقاد چاہے اور کر سکے تو ذاتی غور و فکر سے کام لے کر زندگی اور ادب کا کوئی معین موقف اختیار کر سکتا ہے، بلکہ اسے کرنا چاہیے۔

عبدالحق کے تنقیدی تصورات پر مبنی تنقیدی مطالعات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے نظریات کا اطلاق کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور ان کی فکر کس پیمانے پر بروئے عمل آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" اور "انتخابِ کلامِ میر" پر ان کے تبصرے اور مقدمہ کا تجزیہ کافی ہوگا۔ اس سلسلے میں عبدالحق کے یہ جملے بہت فکر انگیز ہیں۔ اور ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ:

> "جس شاعری کی ابتدا کوہِ ہمالہ ہو اس کی انتہا کیا ہو گی؟ میں اقبال کے لیے اس میں نیک شگون پاتا ہوں۔ وہ محاسن جو ہم نے بعد میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں نکالے، ان سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخئیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔"

("بانگِ درا" تنقیدات عبدالحق، صفحہ ۵)

بعض ناقد "ہمالہ" کو پہلی نظم اور "بانگِ درا" کو پہلا مجموعہ سمجھ کر ان کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک غلط اندازِ تنقید ہے۔ اس کے خلاف عبدالحق حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور صحیح طور پر نظم اور مجموعہ دونوں کے ان بنیادی محاسن کا سراغ لگاتے ہیں، جو بعد میں بلاشبہ زیادہ وسیع پیمانے پر برگ و بار لائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی جو خصوصیات ابتدا ہی میں ظاہر ہوئیں ان ہی کا ارتقا انتہا تک ہوتا رہا۔ فکر و فن دونوں کے اعتبار سے "بانگِ درا" کی تخلیقات اردو میں "بالِ جبریل"، "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" کی منظومات کی پیش رو ہیں۔ جب کہ فارسی میں "پیامِ مشرق" جیسا اہم مجموعہ اعلیٰ پائے کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ آگے چل کر عبدالحق اقبال کے سوانح پر روشنی ڈالتے ہوئے ان عمرانی احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، جن میں اقبال کی شاعری رونما ہوئی اور اس کے ذہنی ارتقا میں شاعر کے ہم سفر بن کر اس کے اشعار کی ٹھیک ٹھیک تشریح کرتے ہیں۔ چنانچہ قوم پروری سے ملت پروری کی طرف اقبال کے میلان کی توجیہ وہ اس طرح کرتے ہیں:

"وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے، سخت بے زار ہیں۔ وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لیے باعثِ ہلاکت اور موجبِ آفت خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی جنگِ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر دنیا پر نازل ہوئی، اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو بے روح اور صداقت سے خالی ہے، انہیں اس عقیدے پر اور مستحکم کر دیتی ہے۔ اس طوفانِ سرمایہ داری و استبداد میں انہیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے۔ اور جو جغرافی حدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالاتر ہے۔" (ص ۹۴ ایضاً)

پیامِ اقبال کی اس ہمدردانہ ترجمانی کے باوجود عبدالحق اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ کہیں اقبال اپنے وطن ہندوستان اور اس کی آبادی سے بالکل صرفِ نظر نہیں کر لیں۔ اس معاملہ میں وہ ترانۂ ہندی اور ترانۂ ملّی کے فرق پر زور دیتے ہیں — انہیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ فارسی کے ساتھ وابستگی کے سبب اقبال اردو کو نظر انداز نہ کر دیں۔ یہ دونوں اندیشے ایک غلط فہمی پر مبنی تھے اور غلط ثابت ہوئے۔ ملک کی آزادی میں اقبال کا حصہ فکر و عمل دونوں میں ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے مفکر یا رہنما سے ذرا بھی کم نہیں۔ بلکہ بہتوں سے بہت زیادہ ہے۔ غلام ہندوستان کو انقلاب کا نعرہ اور آزادی کا ترانہ اقبال ہی نے دیا۔ جس کے بغیر دلوں میں وہ حرارت و جرأت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ جس نے بالآخر تحریکِ آزادی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ شاعر کے علاوہ بحیثیت ایک سیاست داں کے بھی اقبال کا تدبر یک وقت وطن دوستی اور ملت دوستی سے مرکب ہے۔ اور اگر سیاسی پارٹیوں کے بعض بڑے رہنما خواہ وہ کانگریس کے ہوں یا لیگ کے۔ انگریزوں بالخصوص برطانوی سامراج کے آخری وائسرائے کے شر پسندانہ فریب میں نہیں آجاتے تو اقبال کی وفات کے نو سال بعد برِ صغیر کی خوں ریز تقسیم نہیں ہوتی۔ اس طرح بانگِ درا کے بعد اردو شاعری نے کلامِ اقبال کے بہترین نمونے پیش کیے۔

بہرحال اقبال کے نقطۂ نظر پر قدامت پرستی کے الزام کو عبدالحق اس طرح رد کرتے ہیں:

"ان کی قدامت پرستی مُردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اُداسی پیدا کرتی ہے بلکہ وہ ان اصولوں کی پیروی ہے، جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے۔ وہ اپنے پیام میں عہدِ ماضی کی درخشاں مثال دکھا کر بار بار انہیں عمل اور جد و جہد اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے۔" (ص ۷۶ ایضاً)

یہ اقبال کی روایت پسندی کی بہت معقول توجیہ ہے۔ لیکن "قدامت پرستی" کا لفظ انگریزی لفظ "کنزرویٹزم" کا ترجمہ ہو تو ہو، اس طرح ناموزوں ہے جس طرح "پیٹریٹزم" کا ترجمہ "وطن پرستی"۔ اس لیے کہ کم از کم اقبال کے معاملے میں خدا پرستی کے ساتھ کوئی دوسری "پرستی" حتیٰ کہ خودی "خود پرستی" بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا صحیح ترجمہ "قدامت پسندی" ہونا چاہیے۔

عبدالحق نے اقبال اور ٹیگور کا جو موازنہ پیش کیا ہے اس سے ان کی انصاف پسندی کی کوشش کے باوجود ان کے تعقل کی حدود بھی آشکار ہوتی ہیں:

"ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت گہرا اور بے تحاشہ ہے، لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطلعِ نظر اگرچہ مقابلتاً محدود ہے، مگر زیادہ قوی، زیادہ پُرزور اور زیادہ شورانگیز ہے۔ ٹیگور کے ہاں نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے۔ مگر اقبال کے یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بے چاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لیے اُچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب و کیف کے ساتھ خودداری ہے اور یہاں وارفتگی و شیفتگی" (ص ۷۹ ایضاً)

اس تجزیے میں ٹیگور کے یہاں نسائیت اور اقبال کے یہاں مردانگی کی بات ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن دونوں کے کلام میں عقل و عشق کی حدود، جنون و خرد کے فرق اور محدود و لامحدود کی جو تمیز کی گئی ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ اس میں تضاد بھی ہے اور پراگ

خیالی بھی۔ اگر اقبال کا مطمحِ نظر نسبتاً محدود ہے تو ان کا کیف و وجد ہر حد سے آگے کیسے چلا جاتا ہے۔ جب کہ ٹیگور کا جذبہ ایک حد کے اندر رہتا ہے۔ اقبال کے نظریۂ خودی کی انتہا یہ ہے کہ انسان خدا کے قریب پہنچ جائے اور زندگی بھر اس کا شریکِ کار اس معنی میں رہے کہ اس کی مشیت کی تعمیل و تکمیل کے لیے اس کے احکام بجا لاتا رہے۔ جب کہ ٹیگور انسان کی خودی کو خدا کی ہستی میں ضم کر دیتا ہے۔ یہ دراصل اسلام اور ویدانت کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کا مطمحِ نظر بہت محدود اور معمولی بلکہ رسمی طور پر صوفیانہ ہے جس کے اندر ہندو بھگتی کا فنائے شخصیت کا تصور کام کر رہا ہے۔ اس کے خلاف اقبال انسان کی خودی کو اس درجہ مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کائنات کے ارتقا میں خدا کے ساتھ مستقل بالذات طور پر تعاون کرے۔ اس طرح اپنی خودی کے آفاقی امکانات کو روبہ عمل لائے۔ جس کے آگے اور پیچھے کوئی حد نہیں ہے۔ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ ٹیگور عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا سمجھتا ہے۔ لیکن اقبال کا قطرہ ایک دریائے ناپیدا کنار بننا چاہتا ہے۔ یہ تشریح واضح کرتی ہے کہ عبدالحق کی رائے کے برعکس "خودداری" اقبال کے یہاں ہے۔ جب کہ "وارفتگی" ٹیگور کے یہاں۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالحق کے بیان کے برخلاف اقبال کے اندازِ نظر میں عقل و عشق یا جنون و خرد کا جو توازن ہے وہ ٹیگور کے اندازِ نظر میں مفقود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عبدالحق کو اقبال اور ٹیگور کا کوئی گہرا اور وسیع تقابلی مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور انہوں نے اپنے دور کے بعض سطح بیں ادیبوں کی خیال آرائیوں سے متاثر ہو کر کافی غور و فکر کے بغیر ایک غلط رائے قائم کر لی۔

ایسی ہی غلط رائے کا اظہار عبدالحق نے اقبال کے فنِ شاعری کے بعض پہلوؤں کے متعلق بھی کیا ہے:

> "تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوقِ سخن ہے، بہ آسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرزِ ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی۔ اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں۔ مگر شان و شکوہ زور اور شور امنڈتے ہیں۔ جذبات کی ادائیگی، حکیمانہ نظر اور شاعرانہ اندازِ بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔" (ص ۷۸-۷۷ ایضاً[۹])

اقتباس کا آخری جملہ قبل کے جملوں کی تردید کرتا ہے۔ یہ تضاد بیان ایک الجھن کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عبدالحق اقبال کے فنی تجربات کی داد دینا چاہتے ہیں۔ مگر اردو تنقید نثر شاعری کی روایات انہیں روکتی ہیں۔ بندش، چستی، نزاکت اور سوز و گداز کا ایک خاص مفہوم اور معنی کے بعض شاعروں پر اس کا اطلاق متعین ہو چکا ہے، جو ایک معیار بن گیا ہے۔ لہٰذا عبدالحق اس معیار پر اقبال کے تجربے کو جانچنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کے اشعار میں ابتدا سے تراکیب کی جو چستی اور روانی ہے وہ غالب کے یہاں بھی ان کے کلام کے دورِ متوسط سے قبل نہیں پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر اقبال کی نظم "ہمالہ" کی تراکیب کا موازنہ غالب کے ابتدائی کلام سے کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ فنِ شاعری کو غالب نے جہاں ترقی دے کر چھوڑا تھا، وہاں سے اقبال نے شروع کیا اور بہت دور تک آگے گئے۔ اردو شاعری کی روایت میں اقبال کی انفرادیت کا کمال یہی ہے۔ جہاں تک نزاکت کا معاملہ ہے اس کے لیے روایتی تصورات میں بھی غالب نہیں، میر مشہور ہیں۔ ممکن ہے عبدالحق کا مفہوم لطافت ہو، مگر اس کے لیے انہوں نے صحیح لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نزاکت کا لفظ بجائے خود محض اس ملائمیت کیلئے ممکن نہیں، جس کا اثبات کلامِ میر میں خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک زیادہ وسیع لفظ ہے اور اس میں نفاست کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس معنی میں اقبال کے یہاں نزاکت کسی اردو یا فارسی شاعر سے کم نہیں ہے۔ یہی حال لطافت کا ہے۔ اقبال کے یہاں ہرگز وہ تکلف اور بے اعتدالی نہیں ہے جس کا احساس عبدالحق کو ہوا ہے۔ اس طرح سوز و گداز اور دردمندی میں اقبال کا "شکوہ" اس کیف کا حامل ہے جو مسدس حالی میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ "تصویرِ درد" سے "ذوق و شوق" تک سوز و گداز اور درد کی جو فراوانی ہے اس کا تھوڑا ہی سا حصہ حالی کے کلام میں، اس کا پیمانہ محدود ہونے کے سبب، پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے تنقیدی مطالعات میں عبدالحق روایاتِ تنقید میں کوئی اجتہاد نہیں کر سکے۔ شاید اس لیے کہ وہ اصلاً ایک محقق اور عالم تھے۔ لہٰذا روایت میں کچھ توسیع کے باوجود اس کی تجدید اور بہت زیادہ ترقی کے لیے درکار صفات اپنے اندر پیدا نہیں کر سکے۔

عبدالحق کا مطالعۂ میر زیادہ متوازن، واضح اور بھرپور ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک نسبتاً قدیم شاعر کا مطالعہ ہے جس کی کچھ روایات بن چکی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے میر کے سوانح اور احوال کی تفتیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے امتیاز پر بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح میر کا کلام درحقیقت ان کی سیرت کا آئینہ ہے یا ان کے کلام کی زیبائی۔ ان کے کلام کی رعنائی کا باعث ہے۔ اسے ایک تاریخی یا شخصی مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ حقیقی بن جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ناقد نے شاعر کی زندگی سے اعتنا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کا بھی معروضی تجزیہ کیا ہے۔ گرچہ ممکن ہے کہ تجزیے کے ہر پہلو سے پورا اتفاق نہیں کیا جائے، خاص کر جہاں درد اور انیس کے ساتھ میر کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بہرحال جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ عبدالحق نے میر کے اسالیبِ شاعری کا جائزہ لیا ہے، وہ مجموعی طور پر قاری کو مطمئن کر دیتا ہے کہ ایک بڑے فنکار کی قدرشناسی کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے

کہ اس مطالعۂ میر میں عبدالحق نے جو تنقیدی نکات پیش کیے ہیں، ان پر اب تک مبسوط کتابیں بھی کوئی اضافہ نہیں کر سکی ہیں۔ یہ ایک ایسا عالمانہ اور محققانہ مطالعہ ہے جس میں تنقیدی بصیرت بہت نمایاں ہے۔ یہ مقدماتِ عبدالحق کا ایک اہم ترین نمونہ اور ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے :

"یوں تو میر صاحب کے تمام نامور ہم عصروں کے کلام میں سادگی، صفائی اور روزمرّہ کی پابندی پائی جاتی ہے۔ لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی جب تک کہ زبان میں تازگی، ادائے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی و جدّت نہ ہو۔ میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں یک جا جمع ہیں اور پھر اس پر درد اور تاثیر خداداد معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے تمام ہم عصروں اور اردو شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ البتہ خواجہ میر درؔد ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے سلاست و فصاحتِ زبان کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے۔ بیان میں جدّت اور تازگی بھی پائی جاتی ہے، جس سے وہ میر صاحب کے لگ بھگ قریب پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن بیان میں وہ گھلاوٹ نہیں جو میر صاحب کے یہاں ہے اور نہ غایت درجہ سلاست و سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے اور نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے۔ خصوصاً بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں ایک خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آیا۔ میر صاحب کا بڑا کمال اس میں ہے — میر انیس بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، میر صاحب کو نہیں پہنچتے۔ میر انیسؔ میں پھر بھی تصنع اور تکلّف آجاتا ہے، میرؔ اس سے بالکل بری ہے۔ وہ خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اس کا شعر سوز و غم کی صحیح اور سچی تصویر ہے، جس میں تکلّف کا نام نہیں۔ میر انیسؔ کے یہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے، لیکن میرؔ کے اشعار میں الفاظ خیال کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے اور اُسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا — میر انیسؔ کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے۔ میرؔ کے ہاں سکون اور خاموشی ہے۔ اور اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے، جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اس وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جاکر کھٹکتا ہے۔ میر انیسؔ رُلاتے ہیں۔ میرؔ خود روتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی۔"

(انتخاب کلامِ میرؔ — مقدماتِ عبدالحق ص ۹۵-۱۹۴)

اس بیان میں میرؔ کی جتنی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، سب صحیح ہیں اور ان سے کلامِ میرؔ کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ سادگی، بے ساختگی، درد و غم، سوز و گداز، تازگی و شگفتگی یقیناً اشعارِ میرؔ کے امتیازی نشانات اپنے مجموعی کیف و کم کے لحاظ سے ہیں، لیکن میرؔ کے ساتھ موازنے کے لیے دردؔ اور انیسؔ کا انتخاب بہت موزوں نہیں دردؔ کا تصوّف اور انیس کی رزمیہ نگاری میرؔ کے تغزل سے مختلف چیزیں ہیں۔ چنانچہ دردؔ کو میرؔ کے لگ بھگ قرار دینا تنقیدی شعور کی دلیل نہیں۔ اس طرح میر انیسؔ کے یہاں تکلف اور تصنع کا سراغ لگانا تنقیدی ذوق کا ثبوت نہیں۔ میر غزل گو ہیں اور انیسؔ نظم نگار۔ لہٰذا انیسؔ کی شاعری لازماً جگ بیتی ہوگی اور میرؔ کی آپ بیتی۔ مگر کمالِ فن کے لیے یہ فرق فیصلہ کُن نہیں۔ نہ انیسؔ میرؔ کی دروں بینی میں دخل دے سکتے ہیں نہ میر انیسؔ کی جہاں بینی میں۔ دونوں اپنی اپنی سلطنت کے سلطان ہیں اور ان کے ممالک کی سرحدیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔ جہاں تک الفاظ و خیالات کے باہم دگر پیوستہ ہونے کا تعلق ہے، وہ جس حد تک میرؔ کے یہاں ہے، اسی حد تک انیسؔ کے یہاں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے موضوع کے مؤثر اظہار کے لیے انیسؔ کا اسلوب اتنا ہی فطری ہے، جتنا میرؔ کا اپنے موضوع کے لیے۔ شاید عبدالحق نے شبلیؔ کے معرکہ آرا تنقیدی کارنامے "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" کا مطالعہ بغور نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اردو مرثیہ نگاری بجائے خود ایک عظیم صنفِ سخن ہے اور اس کی عظمت کے معمار انیسؔ ہی ہیں۔ جنہوں نے المیہ نگاری کے ساتھ رزمیہ نگاری اور فطرت نگاری کو ملاکر اعلیٰ پائے کی نظم نگاری کا ثبوت دیا ہے، جس کا کمال غزل نگاری کا ہرگز محتاج نہیں۔ اور نہ کوئی غزل گو۔ یہاں تک کہ میرؔ بھی اس نظم نگاری کا مقابلہ اس کے اپنے دائرہ کار میں کر سکتا ہے۔

میرؔ کی مثنویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالحق کہتے ہیں :

"مثنوی اصنافِ نظم میں بہت مشکل ہے۔ میر صاحب نے اسے خوب نبھایا ہے۔ اردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ ہیں۔ مثنوی کو انہیں کی بدولت ترقی ہوئی۔ میر حسنؔ اور شوقؔ وغیرہ سب اُنہیں کے مقلد ہیں — البتہ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ کی مثنوی "خواب و خیال" ایک ایسی نظم ہے جو روزمرّہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، لیکن وہ ہجر و وصل، راز و نیاز، تغافل معشوقانہ اور سراپا کی داستان ہے۔ جس میں قصّے کا سا کوئی تسلسل نہیں۔ اور اس لیے میر صاحب کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو کسی طرح نہیں پہنچتی بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔"

(ص ۲۰۲ ایضاً)

مثنوی نگاری میں اثر کے ساتھ میر کا جو موازنہ عبدالحق نے کیا ہے اور اس سلسلے میں میر کی فضیلت کا جو نتیجہ جس جہت سے انہوں نے نکالا ہے وہ صحیح اور اعلیٰ تنقیدی بصیرت پر مبنی ہے، اس لیے تخلیقاتِ نظم کے اجزا کے بجائے کل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا ہے، لیکن اس معاملے میں میر حسن پر میر تقی کی ترجیح محلِ نظر ہے اور میر حسن کی سطح پر شوق کو رکھنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میر غزل کے بادشاہ اپنی خاص حدود کے اندر ہیں۔ مگر مثنوی کی بادشاہت کا تاج بھی ان کے سر پہ رکھنا مناسب نہیں۔

بہر حال مثنویوں کی قدر شناسی کے باوجود عبدالحق نے مسدس حالی پر مقدمہ لکھتے ہوئے زبان کی سادگی کے معاملے میں ان کی خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے حالی کی سلاستِ بیان کے سلسلے میں یہ مبالغہ کیا کہ "حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کی ہے۔" (مقدمات ص ۲۲۵) ۔ لیکن "خطوطِ سر سید" کے اسلوب پہ تنقید کرتے ہوئے عبدالحق نے انصاف سے کام لیا ہے:

"جس طرح ان کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہ تھا اسی طرح ان کی عبارت بھی مُنہ نما عیب سے خالی نہیں۔ وہ بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اس طرح ادا کر دیتے ہیں، لیکن اس بے تکلفی اور بے ساختہ پن میں بعض وقت عجیب عجیب فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔"

(ص ۵۳ "تنقیدات")

خواجہ حسن نظامی کی نثر پر بھی عبدالحق نے جچی تُلی رائے دی ہے اور قبل کے دو نثر نگاروں کے اسالیب کے ساتھ اس کا موازنہ انہوں نے بصیرت مندی کے ساتھ کیا ہے:

"بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اُڑایا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے فقرے اور جملے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے، لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہوا جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں، مگر اس کے بجائے سوز و گداز ہے۔"

(ص ۲۴۴ ـ "مقدمہ سی پارہ دل" ـ مقدمات)

"اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" عبدالحق کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے، مگر اس علمی مطالعے میں انہوں نے تنقیدی نظر کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بالکل صحیح کہتے ہیں:

"یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب یا شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی نہ انہیں اس کا کچھ خیال تھا۔ ان کی غایت ہدایت تھی، لیکن اس ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے اضافے و اصلاحیں ہوتی گئیں۔ اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی۔ جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہو گئی۔ گو یہ ایک بھولی بسری داستان ہے۔ لیکن اردو زبان کا مؤرخ ان کے احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔"

(ص ۸۴)

یہ ایک لسانی تجزیہ ہے جو تاریخی زاویۂ نگاہ سے کیا گیا ہے۔ اس کا ناقدانہ انداز واضح ہے، جس کے مطابق قدر شناسی میں قدر افزائی کا مبالغہ نہیں کیا گیا ہے اور تحقیق کو حقیقت پسندی کی حدود میں رکھا گیا ہے۔ اس سے ایک عالمانہ تفکر کے ضبط و احتیاط کا پتہ چلتا ہے۔ جو عام طور پر عبدالحق کے کثیر التعداد اور متنوع مقدمات کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ان معدودے چند محققوں میں سے ایک ہیں جو اپنی محنت کے نتائج شخصی جوش و خروش کی بجائے بالعموم حکیمانہ تحمل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مقدمہ نگاری میں تحقیق و تنقید کا یہ توازن بہت ہی نادر ہے۔ یہ ایک نہایت باذوق اور باشعور شخصیت کا اشارہ ہے۔ اس میں ذہانت و متانت کا وہ امتزاج ہے جو ادب کے بااصول معروضی مطالعے کے لیے ضروری ہے۔

ان مباحث کے پیشِ نظر ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر شبلی و حالی کے بعد عبدالحق اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں اور انہوں نے اپنے دونوں بزرگوں کے مشرقی و مغربی رجحانات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے ایک جامع تنقیدی نصب العین کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ لیکن بعد کے ناقدین نے اس نمونے پر پورے طور سے عمل نہیں کیا۔ رشید احمد صدیقی اور نیاز فتح پوری کا انداز مشرقی رہا جب کہ کلیم الدین احمد اور احتشام حسین نے مغربی رویہ اختیار کیا اور آل احمد سرور صاحب مشرق و مغرب کے درمیان تذبذب میں پڑ گئے۔ اس طرح عبدالحق تک اردو تنقید کی جو سیدھی لکیر آئی وہ اپنے رُخ پر آگے نہیں بڑھ سکی۔ اور پیچ و خم کا شکار ہو گئی۔ خواہ اس کے حجم میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہو۔ اس صورتِ حال کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبدالحق کے بعد تحقیق و تنقید کا باہمی ربط ٹوٹ گیا۔ ناقد اور عالم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ممکن ہے کسی حد تک تہذیبی قدروں کے ساتھ وابستگی کا مسئلہ بھی اس سلسلے میں درپیش رہا ہو۔ اس معاملے میں ایک بہت بڑا سوال شخصیت کا بھی ہے۔ عبدالحق اپنے پیش رووں کی طرح پورے معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے ایک تحریک اپنی خاص لسانی و ادبی جہت سے چلا رہے تھے۔ لہٰذا ان کے سامنے زندگی اور ادب کا ایک مجموعی تصور رکھا، جو ان کی حقیقت پسندی اور استقامت کا باعث تھا۔ ان کے بعد آنے والے ناقدین اس تصور سے بہرہ ور نظر نہیں آتے۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا ہم عبدالحق کو ناقدِ کامل کہہ سکتے ہیں کلیم الدین احمد نے کہا ہے:

"جس نقاد کی اردو دنیا منتظر ہے وہ عبدالحق نہیں۔"

(ص ۱۳۹ ـ "اردو تنقید پر ایک نظر" اشاعت ۱۹۸۳ء)

یہ بیان اس نکتے پر مبنی ہے کہ عبدالحق نے پرانی قدروں میں انقلاب برپا کر کے نئی قدریں

نہیں پیش کیں۔ ظاہر ہے کہ کلیم الدین احمد قدروں کی آفاقی اہمیت سے واقف نہیں۔ نہ قدیم و جدید کا کوئی اصولی معیار ان کے سامنے ہے۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ عبدالحق کا نقص حالی کی دکھائی ہوئی پیروی مغربی کی راہ پر بہت آگے نہیں بڑھنا ہے۔ بجائے خود نقص کی یہ دلیل ناقص ہے۔ اور اس کا منبع ایک خاص قسم کی مغرب پرستی ہے۔ جو توازن سے خالی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جس چیز کو عبدالحق کلیم الدین احمد کا عیب سمجھتے ہیں وہ دراصل ان کا ہنر ہے۔ عبدالحق اگر ناقد کامل نہیں ہیں تو اس کی وجہیں دوسری ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا کوئی نظام تنقید نہیں ہے، جس میں اصولی اور نظریاتی مباحث کے ساتھ عملی اور تجزیاتی مطالعات مستقل و منظم طور پر یک جا ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کی کوئی باضابطہ ہموار اور استوار فکر نہیں ہے، جس سے حیات و کائنات کے متعلق ان کے معین تصورات کی وضاحت ہو۔ چنانچہ ان کے سرمایۂ تنقید میں جو کچھ ہے نہ صرف باذوق تبصروں اور چند اخلاقی بیانات پر مشتمل ہے۔ گرچہ یہ تبصرے اور بیانات اپنی جگہ بہت اہم اور باعثِ امتیاز ہیں۔

بہرحال تذکروں سے شبلی و حالی تک کی اوّلیں تنقیدی کوششوں کے فوراً بعد کسی ناقد کامل کا ظہور متوقع نہیں تھا۔ کلیم الدین احمد نے وقت سے پہلے اس کا انتظار کیا اور مایوس ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی تنقیدوں کو حقیقت منتظر سمجھتے ہوں اور ناقد کامل کی حیثیت سے نمایاں ہونے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ان کی حقیقت ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔ اور ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ جس مقام تک بعض تاریخی وجوہ سے عبدالحق کی رسائی نہیں ہو سکی، اس مقام تک ان کے بعد آنے والے ناقدین بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لہٰذا عبدالحق کی اہمیت یہ ہے کہ اپنے وقت میں انہوں نے اردو ادب کی تنقیدی روایات کو فروغ دیا۔ اس میں کچھ توسیع کی اور مستقبل کے ارتقا کے لیے صحیح رُخ کی طرف اشارے کیے۔ یہ رُخ مشرقی تصور کی بنیاد پر مغربی تجربات کے ایک جامع نقطۂ نظر اور آفاقی معیار کا حصول تھا تاکہ اخلاقیات اور جمالیات کے امتزاج سے مطالعۂ ادب کے بہترین طریقے کا سُراغ لگ سکے اور تہذیبی قدریں نہ صرف پورے طور پر واضح ہوں بلکہ ان کے ساتھ وابستگی اتنی عام ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں کی ترقی استقامت کے ساتھ ایک نقطۂ وحدت کی طرف ہوتی رہے۔ اس جہت سے عبدالحق کے تمام علمی و ادبی کارناموں کے مکمل مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔

اس مطالعے میں عبدالحق کا اسلوب نگارش ہماری کافی مدد کر سکتا ہے۔ عام طور پر ان کی نثر میں وہ نفاست پائی جاتی ہے جو شبلی سے منسوب ہے۔ اس میں وہ ناہمواری نہیں جو سرسید اور حالی کی تحریروں میں بہ کثرت نظر آتی ہے۔ گرچہ شبلی کی شوخی اور شگفتگی کے بجائے عبدالحق کے اسلوب میں مقابلتاً سادگی اور قدرے خشکی نمایاں ہے۔ نفاست کے ساتھ متانت کی خصوصیت عبدالحق کے طرزِ اظہار کو ان متنوع مطالعات کے لیے سازگار بناتی ہے۔ جو ان کے کثیر التعداد مقدموں اور دیباچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک کاروباری نثر ہے جو ہر قسم کے تبصروں میں کام آسکتی ہے۔ اس سے ایک ایسی شخصیت نے کام لیا، جس کی دلچسپیاں وسیع تھیں اور وہ اپنے وقت کے اکثر علوم و فنون کی تصنیفات کا تعارف پختگی اور سنجیدگی کے ساتھ بالعموم باذوق اور باشعور طریقے سے کراتی تھی۔ لسانیات اور قواعد کے مسائل سے مذہب و سائنس کے معرکے تک کوئی چیز اس کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں تھی۔ ادب میں شاعری، تذکرہ، تنقید، تحقیق، تاریخ، افسانہ سب پر اس کی توجہ تھی۔ عبدالحق کا اسلوب فی الواقع ایک تحریک کا ترجمان تھا۔

تنقید نگاری میں ایک تحریکی حرارت شبلی و حالی کی طرح عبدالحق کی وہ خصوصیت ہے جو انہیں اپنے پیش روؤں کا وارث، ہم عصروں کا قائد اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ روایات کے امین، حالات کے مبصر اور ترقیات کے علمبردار تھے۔ اردو تنقید میں ان کا مقام محفوظ، مستحکم، منفرد اور ممتاز ہے۔

بقیہ: وفیات

سے نوازا۔ متعدد ریاستی اردو اکادمیوں سے انعام پائے۔

●

ستیش بترا کو مرحوم لکھتے ہوئے ذہن اور قلم دونوں ساتھ نہیں دیتے۔ موصوف مدیر آج کل کے مشفق دوست اور آج کل کے دیرینہ کرم فرما تھے۔ اُن کا لدّاخ کا سفر نامہ "جھومے لدّاخ" کے عنوان سے 'آج کل' میں بالاقساط شائع ہو رہا تھا۔ اس کی آخری قسط موصوف نے ۸ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو ڈاک سے روانہ کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ یہ قسط دینے کے لیے خود آنا چاہتے تھے، مگر علالت کے باعث ایسا نہیں کر پائے۔ "جھومے لدّاخ" کی آخری قسط ہی غالباً اُن کی آخری تخلیق ہے، جو اس شمارے میں شامل ہے۔ اس شمارے میں اُن کا لکھا ہوا "من کہ..." بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

بیماری بعد میں کینسر تشخیص ہوئی۔ اختتام کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ چالیس پینتالیس دنوں میں اردو کا یہ فعال ادیب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے رخصت ہو گیا۔

اپنی ادبی زندگی میں ستیش بترا نے ایک سو افسانے لکھے جو اُن کے پانچ افسانوی مجموعوں — ویران بہاریں، بوند بوند ساگر، آڑی ترچھی لکیریں، اُڑتے لمحے، اور بے لباس لمحے (زیرِ اشاعت) میں شامل ہیں۔ ایک ناول "پرچھائیوں کے دیش میں" شائع ہوا۔ دو سفر نامے "سمٹتے فاصلے" اور "جھومے لدّاخ" تصنیف کیے۔ یہ دونوں مصوّر سفر نامے آج کل میں بالاقساط شائع ہوئے۔ بعض کہانیوں پر مبنی ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے۔

ادارہ "آج کل" مرحومین کے غم میں سوگوار ہے۔

غزلیں

اعجاز اعظمی

برسوں لیے پھری ہے مجھے رہ گزارِ شوق
منزل تھی حسن، رخصتِ سفر تھا غبارِ شوق

جس کی تپش سے خانۂ دل راکھ ہو گیا
لب تک نہ آسکا وہی حرفِ شرارِ شوق

گندم کی آنچ، فکر کے شعلے، طلب کا رنگ
کتنا حسیں لگے ہے مرا لالہ زارِ شوق

وجہِ نشاطِ حسن فروغِ دروں ہے تو
تجھ سے جمال جواں ہے غمِ روزگارِ شوق

چاہت نشاطِ روح، ریاضت عذابِ جاں
اک رازدارِ حسن ہے، اک رازدارِ شوق

اعجاز زندگی سے مفر کی طلب نہ ہو
جاری ہمہ شہرِ دل میں رہے کاروبارِ شوق

روزِ ازل سے ہوں گرفتارِ زندگی
میں کھولتا رہا درِ اسرارِ زندگی

جلوہ قدم قدم ہے تو نغمہ روش روش
جنت نگاہ ہے مرا گلزارِ زندگی

تم حادثہ ہوا اور گزرتے نہیں ادھر
سُونے پڑے ہیں کوچہ و بازارِ زندگی

فن کار ہوں طہارتِ فکر و نظر کے ساتھ
کرتا ہوں ترجمانیٔ اقدارِ زندگی

خلدِ وطن سے خود ہی نکلنے کے جرم میں
ڈکسن[1] کی قید میں ہے گنہگارِ زندگی

کامل اگر ہو جذبۂ تحقیق و جستجو
اعجاز سنگ میں بھی ہیں آثارِ زندگی

آر۔ پی۔ شوخ

رنگ باری فلک تھی کہ بدن تھا اُس کا
میری آنکھوں میں دھنک تھی کہ بدن تھا اُس کا

آئینہ خانہ تھا ہر عضو نگاہوں کے لیے
کسی ہیرے کی دمک تھی کہ بدن تھا اُس کا

اس کے چہرے کی شفق دیکھ کے دیکھا نہ گیا
چڑھتے سورج کی چمک تھی کہ بدن تھا اُس کا

پاس بیٹھا تو لگا آگ پکڑنے میں بھی
کسی شعلے کی لپک تھی کہ بدن تھا اُس کا

ٹوٹ کر گرتا کوئی اور ثمردار شجر
وہ تو کہیئے کہ لچک تھی کہ بدن تھا اُس کا

تجھ کو معلوم ہے اے دستِ تہی کچھ تو بتا
میری بانہوں میں مہک تھی کہ بدن تھا اُس کا

• موضع کجراواں، پوسٹ نزدہ، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

[1] پورٹ ڈکسن جہاں میں نے ۳۳ سال گزارے ہیں۔ یہ ملائشیا کا ایک ساحلی شہر ہے۔

• ایم۔ این۔ کالج، شاہ آباد مارکنڈا (ہریانہ)

ملکہ نسیم

قدم قدم پہ یہاں مسئلے سُلگتے ہیں
جدھر بھی جاؤ ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں

جواب جن کے نہیں ہیں ہمارے پاس کوئی
وہی سوال سرِ انجمن اُچھلتے ہیں

ذرا سا اور رہِ جستجو حق کی بارگاہوں میں
ابھی تو سنگ ہیں نیزوں پہ سر بھی ملتے ہیں

یقین کس کو کہیں اور گماں کہیں کس کو
ہر ایک پل میں تو چہرے یہاں بدلتے ہیں

ذرا سی کم کر دے پرواز کی ہوس اپنی
کہ بازوؤں میں یہ منظر نہیں سمٹتے ہیں

انہیں کو ڈھونڈ رہے صحرا کے آہوؤں کی طرح
ہمارے جسم میں دل بن کے جو دھڑکتے ہیں

زمانے والو اسے بزدلی کا نام نہ دو
بصد خلوص جو ہم سب سے جھک کے ملتے ہیں

• نزد کورٹ، سیہور ۴۶۶۰۰۱

سطوت زہرا سطوت

اُداس زیست میں کچھ تو رہے خوشی کے لیے
یہ چار آنسو سجائے ہیں زندگی کے لیے

وہ کون ہیں کہ جنہیں عشق میں ملی منزل
یہ ایک ہم ہیں بھٹکتے ہیں گمرہی کے لیے

تمہاری یاد کو اب تک سنبھال رکھا ہے
یہ روشنی بنی تاریک زندگی کے لیے

وہ کیسا لمحہ تھا جب میں نے اس سے منہ موڑا
تمام عمر ہی رونا ہے بے رُخی کے لیے

نشہ ہے عشق کا مدہوش ہوں زمانے سے
کسی کو کچھ بھی نہ مل پایا زندگی کے لیے

میں ساجدہ ہوں میں سجدوں سے عشق رکھتی ہوں
جہاں میں کچھ بھی نہ رہ جائے بندگی کے لیے

دُکھا جو دل تو مری رُوح نے کیا محسوس
کسک یہ کافی تھی سطوت کی شاعری کے لیے

• ۱۷۶۸۔ سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیصر جہاں صبا

نہ کوئی غم کی ادا ہے نہ اب خوشی کی ادا
یہ زندگی ہے، تو پھر کیا ہے زندگی کی ادا

ہیں بدنصیب جنہیں زندگی سے کچھ نہ ملا
نہ مرگِ غم کا سلیقہ نہ سرخوشی کی ادا

عجیب لوگ ہیں اس دور کے بھی کیا کہیے
کہیں ملی نہ زمانے میں زندگی کی ادا

تری ادائے تغافل حسیں سہی لیکن
پسند آئے گی کس کو یہ بے رُخی کی ادا

ملے جو مجھ سے وہ، گمراہ ہو نہ جائے کہیں
ہے بندگی سے حسیں میری کافری کی ادا

یہ گمرہی بھی مری منزل آشنا سی ہے
ملی ہے عشق میں جو مجھ کو گمرہی کی ادا

صبا کسی کو کہاں بانکپن یہ ملتا ہے
فقیرِ شہر سے سیکھی ہے خسروی کی ادا

• ۹۹/۲۳۷، نالہ روڈ، کنگھی محال کان پور

کمال جعفری

ہمسفر اے راہرو! جب راستہ ہو جائے گا
منزلِ مقصود کا طے فاصلہ ہو جائے گا

پھول کی مانند ہر دم مسکراؤ دوستو!
دیکھتے ہی دیکھتے ہر غم فنا ہو جائے گا

دشمنوں سے ملتے رہنا دوستو لیکن ساتھ ساتھ
شہر میں ہر شخص تیرا ہمنوا ہو جائے گا

ہیں وفاداری کی قسمیں جس کی کھاتا تھا بہت
کیا پتہ تھا آج وہ دشمن نما ہو جائے گا

بغض و نفرت سے بچا دامن کو اپنے اے کمالؔ
تیرا دل شفاف مثلِ آئینہ ہو جائے گا

۲/۸۱ ۔ ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵ ۱۱۰۰

بدر نظیری

اپنے دل کی کتاب تازہ رکھ
دوستوں کا حساب تازہ رکھ

دوستوں کے غبارِ دل پہ نہ جا
اپنے چہرے کی آب تازہ رکھ

دیکھ اورنگِ خواب سے باہر
قصرِ تعبیرِ خواب تازہ رکھ

تیرگی کو لپیٹ کر رکھ دے
ہاتھ پر آفتاب تازہ رکھ

نکہتوں سا ہو چاندنی کا مزاج
ماہِ دل پر گلاب تازہ رکھ

ظفر اسٹورس، پوسٹ گورارو ملز ۸۲۴۱۱۸ ضلع گیا (بہار)

شفق امام

یہ تو سچ ہے کہ ابھی جیت مقدر میں نہیں
یہ غلط ہے کہ زمانہ مری ٹھوکر میں نہیں

خیریت سمجھو کہ تم بچ کے چلے آئے ہو
ورنہ یہ رسم ابھی شہرِ ستمگر میں نہیں

قابلِ غور تری ذات کی تہہ داری ہے
اتنی گہرائی کسی اور سمندر میں نہیں

ہیں مری خواہشیں محتاط سفر میں کتنی
پاؤں کی چاپ بھی اتنے بڑے لشکر میں نہیں

سنگدل رحم کے جذبے سے ہو کیوں کر واقف
جو صفت شیشے میں ہے وہ کسی پتھر میں نہیں

۱۰/۲۱۷ ۔ سرائے میاں، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

غزلیں

حیات وارثی

کامیاب مقصد میں با اصول ہوتے ہیں
بے شمار کانٹوں میں چند پھول ہوتے ہیں

سر کے ساتھ جھک جائیں جب جواں خم بھی
عبدیت کے نذرانے تب قبول ہوتے ہیں

میری ذات تجھ سے ہے مجھ سے منکشف ہے تو مگر
تذکرے من و تو کے اب فضول ہوتے ہیں

حاسدوں کی فطرت میں کیا تضاد ہوتا ہے
دوسروں پہ ہنستے ہیں خود ملول ہوتے ہیں

سرد ہوتی جاتی ہیں دھڑکنیں تعلق کی
انتظار کے سائے جتنے طول ہوتے ہیں

باغ انور، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

نواب احسن

سر پہ سایہ فگن ماں کا آنچل بھی ہے
زندگی ماماتاؤں کا مقتل بھی ہے

جس نے راہِ صداقت کو اپنا لیا
سامنے اس کے تیروں کا جنگل بھی ہے

کیسا صحرا میں ہے سجدۂ بے خودی
کانپتا ہے فضا رات یو جبل بھی ہے

تشنہ کامی سے سیراب ہے زندگی
نہر کا قرب ہے خالی چھاگل بھی ہے

جس کو احسنؔ شہادت کا درجہ ملا
موت اس کی حیاتِ مسلسل بھی ہے

۲۲۶/۱۵۴، بخشی بازار، الہ آباد

شاہد انور

اپنا غم چھپانے کو محفلیں سجاتے ہیں
بیٹھ کر اکیلے میں اشک جو بہاتے ہیں

کس کو اپنے زخموں کی داستاں سنائیں گے
راز داں ہی خود اپنی داستاں سناتے ہیں

اک حسین چہرے پر سرخیاں ہیں مقتل کی
لوگ خوف کھاتے ہیں پھر بھی مسکراتے ہیں

زندگی تماشہ ہے وقت کے مداری کا
ناچتی ہے یہ دنیا ہاتھ نچاتے ہیں

روشنی جو دیتے تھے ہر نظر کو دنیا میں
آج وہ دیے انورؔ اپنا منہ چھپاتے ہیں

۱۲۰۱ ۔ گلی مزار والی، سلطان محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰

مَن کہ . . .

ستیش بترا

نام (اصلی، قلمی) : ستیش بترا
والد کا نام : جناب رگھوناتھ لعل بترا ۔ سیشن جج (انتقال جون ۱۹۲۸ء)
والدہ کا نام : محترمہ سورج دیوی (انتقال : ستمبر ۱۹۳۱ء)
تاریخِ پیدائش : ۱۹ / مارچ ۱۹۲۶ء
مقامِ پیدائش : پنڈ دادنخان ضلع جہلم (پاکستان)
آبائی مقام : گروٹ (GIFCTE) ضلع سرگودھا
مستقل پتہ : سیکٹر ۱۶ - اے / ۵۲۰ فرید آباد ۱۲۱۰۰۲
موجودہ ملازمت یا پیشہ : تمام عمر ملک کے بہت ہی ممتاز کاروباری اداروں میں گزری ۔ ریٹائر ہونے کے بعد اب چند صنعتی فرموں کا کاروباری مشیر ہوں ۔ لکھنا پڑھنا کالج کے دنوں سے شریکِ زندگی رہا ہے ۔
ابتدائی تعلیم : سناتن دھرم اسکول گجرات، آریہ اسکول، لدھیانہ، گورنمنٹ اسکول دہلی اور ڈی اے وی اسکول لاہور ۔
اعلیٰ تعلیم : بی ۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور (۱۹۴۴ء) ایم ۔ اے : (انگریزی ادبیات) سینٹ جانز کالج، آگرہ (۱۹۴۶ء)
مذہب/دھرم : مختلف اسکولوں، کالجوں میں رہنے کی وجہ سے تقریباً سبھی مذہبوں سے فیض پایا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسانیت سے اونچا کوئی دھرم نہیں ۔
ادبی زندگی : بارہ سال کی عمر میں ایک بچگانہ افسانہ "محبت کا بلیدان" "کرم ویر" لاہور کے بیساکھی ایڈیشن میں ایک بہت ہی حوصلہ افزا نوٹ کے ساتھ چھپا تھا ۔ ترجموں کی چاٹ سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی (گورنمنٹ کالج، لاہور) میں لگی، جس کا اوّلین نتیجہ ایچ ۔ جی ۔ ویلز کی ایک ترجمہ شدہ کہانی مطبوعہ : "ہمایوں" لاہور کی صورت میں برآمد ہوا ۔ پہلا طبع زاد افسانہ "دھڑکن" "خیام" لاہور میں غالباً ۱۹۴۵ء میں چھپا تھا ۔ ۱۹۴۳ء میں اس سے قبل لندن اسکول آف جرنلزم لندن سے افسانہ نگاری کا کورس کرکے ڈپلومہ حاصل کیا ۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور جناب غلام مصطفیٰ تبسم میرے استادِ محترم رہے ہیں ۔ شبلی بی کام مدیر 'عالمگیر' و 'خیام' نے سالنامہ 'خیام' ۱۹۴۵ء میں میرے افسانہ "خشک پتے" اور میرا تعارف کراتے ہوئے اداریہ میں لکھا تھا: "ستیش بترا ہماری نئی ادبی دریافت ہیں ۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمیں اُن کی قلمی اعانت حاصل ہے ۔"
۱۹۴۴ء میں آگرہ پہنچنے پر میرے افسانے "شاعر" میں بھی چھپنے لگے ۔ تب سے ہند و پاک کے سبھی ممتاز رسالوں میں چھپنے کا فخر حاصل ہے ۔
شادی : ۲۵ ستمبر ۱۹۴۹ء میں کانپور میں بسے ایک ممتاز مہاجر گھرانے میں ہوئی ۔
بیوی کا نام : محترمہ ترپت بترا ۔
بچے : دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ۔ سبھی شادی شدہ ہیں ۔ ہم لوگ نانا نانی دادا دادی بن چکے ہیں ۔
اخبار و رسائل جن میں افسانے چھپتے رہے ہیں :
خیام، عالمگیر، ہمایوں، نقوش، داستان گو (لاہور)
ساقی، سیپ، رابطہ (کراچی)
بیسویں صدی، شمع، آج کل (دہلی)
الشجاع، نگارش، ملاپ، راہی، محور، تلاش (دہلی)
ساحل، کتاب نما (دہلی) فسانہ (الٰہ آباد) شاعر (آگرہ ۔ بمبئی)
خیال (کامٹی) زبان و ادب (پٹنہ) نیا دور، کتاب (لکھنؤ) جادہ (بھوپال) پاسبان (چندی گڑھ، آندھرا پردیش، حیدرآباد)
ہماری زبان (علی گڑھ، دہلی) شیرازہ (سری نگر) سنگم (جموں)
ڈائجسٹ : شاہکار (الٰہ آباد، بنارس) نقش (کراچی)
اُردو کے نمائندہ افسانوں کے انتخاب :
آج کل کے افسانے
کلاسیک ادب : (ویران بہاریں)
(The Quest)
AUTHOI.S GUIID SELECTION "ویران بہاریں"
تصانیف :
۱ ۔ ویران بہاریں (۱۹۶۱) بارہ افسانے
ویران بہاریں، فن کار، آوارہ، جھاگ، پُل کے نیچے، روشنی بھنور، کٹی پتنگ، فاختہ اور، نحوست، کیڑے
۲ ۔ بوند بوند ساگر (۱۹۶۳ء) سولہ افسانے
بکھر گئے تنکے، چنگاری، تیس سال پہلے، روہتانگ پاس، نئے پرانے سسکیاں اور اندھیرا، ریشماں، قلمی دوستی، ایکسپرٹ، اجنبی، کانٹا، الجھنیں، سوکھا جھرنا، پکارتے ہیں یہ زمین و آسماں . . . . .

ستیش بترا

کیپٹن پرساد ، دوسرا بیٹا ــــ علاوہ مضمون نئی بات نیا انداز، ایک اسکیم
اور میں اور میرے افسانے بھی شامل ہیں ۔
۳ ۔ آڑی ترچھی لکیریں (۱۹۷۳ء) ۱۸ افسانے
نیا شوشنکر، ادھوری کہانی، ضمیر کا کرب ، دیس پردیس ، کرسی ، بڑی دو حصوں میں بٹی ہوئی عورت ، آڑی ترچھی لکیریں ، برش سلین اور دھوپ ، واپسی ، لوسی ، ناخلف اولاد ، جینے کا بار ، ہم لوگ ، تیسرا وجود خدا بخشے ، بے نام ، آخری سودا ۔ اس کے علاوہ پیش لفظ بہ عنوان 'آپ اور میں' شامل ہے ۔
۴ ۔ اُڑتے لمحے (۱۹۸۳ء) ۲۰ افسانے
مصنف کا پیش لفظ 'آپ اور میں' ــ افسانوی فن کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے شامل ہے ۔
ویڈنگ گاؤں ، ان رشتوں کو نام نہ دو ، دانہ پانی ، یہ رشتے ! یون گھنٹہ ، دراڑ ، ذلت کے لمحوں کا حساب ، یہ قربتیں یہ دوریاں کھوئے لمحوں کا گھاؤ ، ڈیرانٹ اور ہیگلی ، آواز کے بندھن' سوکھی دھرتی ، پہاڑ کی سیر ، پیا بن نا بیں آوت چین ،
کانچ کا سہارا ، ہوٹل سے ہوٹل تک ، ایک ہی کشتی کے سوار' ایک پھول سورنگ ۔
۵ ۔ بے لباس لمحے (زیر اشاعت) ۱۶ افسانے
جو بیت گیا سو بیت گیا ، پھیلتے سمٹتے فاصلے ، ٹھنڈا پسینہ' ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی ، تیرا میرا تاج محل ، اپنے ڈھنگ سے گزاری گئی زندگی ، بے داغ لوگ ، خالی پن کا بوجھ' آخری وقت ۔
دھرتی کے بیٹے ، صحرا میں چند بوندیں ، تصویر کا پہرہ ، کیسری ٹوپا ، چکرویو سوتی جاگتی آنکھوں کا سپنا ، ترس کا بوجھ
۶ ۔ پرچھائیوں کے دیش میں (ناول) ۱۹۷۱ء
۷ ۔ سمٹتے فاصلے (سفرنامہ) زیر اشاعت (یہ سفرنامہ آج کل نئی دہلی میں پندرہ قسطوں میں چھپ چکا ہے ۔ (جنوری :)
دیگر زبانوں میں شائع شدہ افسانوی مجموعے : ہندی :
بکھر گئے تنکے (۱۹۸۴ء) ۱۸ افسانے
'جلتے بجھتے دیپ' (زیر اشاعت)
انگریزی : The Quest ۱۹۸۶ء ۱۹ افسانے
تیلگو ، تامل ، کنڑ ، بنگالی ، پنجابی میں بہت سی کہانیاں ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہیں ۔
علم و مطالعہ : ناقص ہی کہا جا سکتا ہے ۔
سیاحت و سفر : امریکہ اور کناڈا (۱۹۶۷ء)
ناروے ، برطانیہ ، ڈنمارک ، امریکہ ، کناڈا (۱۹۸۴ء)
لداخ ، بھوٹان ، نیپال (۱۹۸۵ء)
ہندوستان کا ہر کونہ قریب قریب دیکھا بھالا ہے ۔
ریڈیو ۔ ٹی وی : لکھنؤ ، دہلی ، جموں اسٹیشنوں سے افسانے نشر ہوتے رہے ہیں ۔ کچھ افسانوں پر مبنی ریڈیو ڈرامے بھی براڈ کاسٹ ہوئے ہیں ۔ لکھنؤ ٹی وی کے ادبی مباحثوں کے پروگراموں میں شریک رہا ہوں ۔
مضامین : ۱ ۔ ادب اور معروضیت (ہماری زبان : یکم جنوری ۱۹۶۱ء)
۲ ۔ میں اور میرے افسانے : 'محور' نئی دہلی میں چھپا تھا ۔ مجموعہ 'بوند بوند ساگر' میں شامل ہے
۳ ۔ المیہ تقسیم اور متعلقہ افسانوی ادب : 'شیرازہ' سرینگر ۱۹۸۵ء
۴ ۔ میرے شب و روز (بیسویں صدی) ۱۹۸۲ء
مصنف پر لکھے گئے مضامین وغیرہ :
رام لعل : سابق افسانہ نگار ۔ مطبوعہ : راہی دہلی ۱۹۵۸ء
ہرچرن چاولہ : ستیش بترا اور اس کا فن (سنگم : جموں اور نگارش کراچی)
ستیش بترا زندہ لمحوں کا نقاش
منظر سلیم : نئی بات ، نیا انداز (شامل مجموعہ : بوند بوند ساگر)
محمود ہاشمی : ایک منفرد افسانہ نگار (شاعر : بمبئی)
ہیرانند سوز : اُڑتے لمحوں کے ساتھ (چنگاری : دہلی)
ڈاکٹر گیان چند جین : مقدمہ
تشکیل نوازش رضا : آڑی ترچھی لکیریں (اندازے : الہ آباد ۔ شمارہ : ۶ ۱۹۶۹ء)
شمس تبریزی : ستیش بترا ـــ تلخ حقیقتوں کا افسانہ نگار
ریسرچ : رانچی یونیورسٹی کے محمد محفوظ عالم انصاری صاحب ، ڈاکٹر وہاب اشرفی اور مولانا قاضی محمد شعیب صاحب کی نگرانی میں "ستیش بترا کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان کے تحت کام کر رہے ہیں ۔
انعامات ، ایوارڈ و اعزازات :
اتر پردیش اردو اکادمی ، ہریانہ ساہتیہ اکادمی ، مغربی بنگال اردو اکادمی ، میرا اکادمی نے چیدہ مجموعوں کو انعامات سے نوازا ہے ۔
ہریانہ اردو اکادمی کی طرف سے مجموعی ادبی خدمات کے لیے سید مظفر حسین برنی ایوارڈ برائے ۱۹۸۶ء دیا گیا ہے ۔

ستیش بترا مرحوم نے یہ "من کرت" جنوری ۱۹۸۷ء میں مرتب کیا تھا ۔ چنانچہ تصانیف میں جدول لداخ مذکور نہیں ہے ۔
یہ سفرنامہ آج کل میں مئی ۱۹۸۷ء سے بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا ۔ اس کی آخری قسط زیر نظر شمارے میں شامل ہے ۔ (ادارہ)

روز مکرجی

عنائیِ خیال

بچّے اب جوان ہوگئے تھے۔ اس کا چھوٹا سا
ندان کرۂ زمین پر بکھر گیا تھا۔ برسوں کی مشقت
بعد اب اُس کے شوہر کی ایک سرکاری شعبہ میں سب
اعلیٰ عہدے پر تقرری ہوگئی تھی۔ خود اُس نے دہلی
سوسائٹی میں اپنے لیے ایک مخصوص مقام بنالیا تھا۔
راب وہ زندگی کے اُس دوراہے پر کھڑی تھی، جب
انی ختم ہوجاتی ہے اور بڑھاپا اپنی باہیں کھولے
رے قریب سے قریب تر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
ایسا مقام ہے جب عورت کے لیے یہ فیصلہ مشکل
وجاتا ہے کہ زندگی کی آخری شاہراہ پر کس طرح گامزن
د، وقت گزارنے یا ان سے دستبردار ہوکر وقت
دِ خود اپنی بسر کرے۔ اگر اس کا اعتقاد مذہب پر ہوتا
ب بھی تو ہندو مذہب نے اس کو کسی واضح راستے پر
لنے کے لیے عورت کی کچھ صاف صاف راہبری نہیں کی۔
رخاص طور پر اس جیسی عورت کی وہ ہندو سماج کے متوسط
بقے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بچپن اور جوانی کی
دیں مذہب اور معاشرے کے جشنوں اور ان
یوں کی زیادہ تر تھیں جنھوں نے آخری دم تک اپنے
ائد کو ایک نعمت کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ
قائدان کو ان گنت صدیوں سے سینہ بسینہ ورثے
میں ملے تھے۔ ان پر شک و شبہ کرنا تو درکنار ان کے
متعلق سوال کرنا بھی اُن کے لیے جائز نہ تھا کیونکہ
اُن کو خوف تھا کہ جواب کی جستجو میں وہ کہیں ایک
خوش کن اور جانی بوجھی شاہراہ سے بھٹک کر کسی سنگلاخ
پُرخار راستے پر نہ چلے جائیں۔ مذہب کی رُو سے اس
کی اب وہ عمر ہونے کو آئی تھی، جب مرد سنیاس
لیتے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں، غاروں یا سبز
بنوں میں کُٹیاں بناکر رہتے تھے اور اس علم کی روشنی
میں جو انہوں نے ساری عمر جمع کیا تھا۔ زندگی کے
مسائل اور اس کے دُکھوں پر غور کرتے۔ ان میں
سے چند اس راہ پر نکل جاتے، جہاں اُن سے
ہزاروں سال پہلے کپل وستو کا ایک شہزادہ بھی گیا
تھا یا یہ مسائل اُن کے لیے ایسی گرہ بن کر رہ جاتے
جس کی عقدہ کشائی اُن کے بس کی بات نہ ہوتی اور
وہ دنیاداری کی بندشوں کو توڑ کر اس اٹل حقیقت
کے سائے میں پناہ لیتے، جس کے پُرشکوہ نغمے ویدوں
نے گائے ہیں یا اس پُرفضا باغ میں نکل جاتے جہاں
سُور داس، میرا اور ودیاپتی کے گیت گونج رہے
ہیں۔ لیکن جہاں تک عورت کا تعلق ہے، جواب
مبہم تھا۔
اپنی نانی دادی کی طرح پوجا گھر بناکر اس میں
صبح و شام بیٹھنا اس کے تصور میں کبھی نہیں تھا۔
نہ ہی وہ ان امیر اور خوش حال عورتوں میں تھی جو
قیمتی ساڑیوں میں ملبوس کافی کے گھونٹ لے لے کر
غریبوں کے لیے چندہ جمع کرنے کی تجویزوں پر غور کرتی
ہیں۔
جوانی میں لندن سے اُس نے M.Phil کیا تھا۔ یہ ڈگری
ایک طرح کا قرض تھی، جو اُس کے شوہر دیپک رائے
ادا کرنا چاہتے تھے۔ شادی سے پہلے اُس نے کیلی فورنیا
یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ساس سسر اور گھر
کی دیکھ بھال، نئی نئی شادی کے بعد جذباتی اور حیاتیاتی
تقاضوں کو پورا کرنے میں وہ دونوں ایسے محو ہوگئے تھے کہ
اُس کے لیے ان بندھنوں کو توڑ کر دو سال کے لیے
امریکہ جیسے اَن جانے مُلک میں جانا ممکن نہیں تھا۔
دونوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ چند سال بعد جب
حالات اجازت دیں گے تو وہ امریکہ یا انگلینڈ جاکر
کوئی کورس کرے گی، لیکن زمانہ گزرتا ہی گیا۔ دونوں
کی زندگی اس قدر خوش گوار تھی کہ کورس کرنے کا خیال
برابر ٹلتا رہا۔ پھر دو بچے ہوگئے۔ جب چھوٹے بچے
کی عمر ۱۰ سال تھی، دیپک رائے نے اُس کے ذہنی اور
جذباتی جمود کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ "تم
نے M.Phil کرنے کا ارادہ بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

62-WINDERMERE ROAD MUSWELL HILL LONDON N 10

"ارادے تو ارادے ہوتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر ارادہ پورا ہو جائے۔" اُس نے اُکتائی ہوئی نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا یہ موڈ وہ کافی دن سے محسوس کر رہے تھے۔ اُنہوں نے خوش دلی سے جواب دیا "ٹھیک ہے نسان ہزاروں ارادے کرتا ہے۔ ان سب کو پورا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن M. Phil کرنے کا ارادہ تو ن میں شامل نہیں ہے۔ بیٹے بڑے ہو گئے ہیں۔ بتاجی کی موت کے بعد اب ماں اتنی مصروف بھی نہیں یں۔ بچوں کی دیکھ بھال وہ کر لیں گی۔ گھر کا انتظام تم نے اتنے سلیقے سے کیا ہے کہ تمہاری غیر موجودگی یں بھی کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔ جاؤ تم لندن چلی جاؤ۔ وہاں institute of education میں میرے ایک دوست بھی ریڈر ہیں۔ ان سے مدد ملے گی۔

ہم دونوں نے الہ آباد سے ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر وہ ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ذرا انقلابی آدمی تھے۔ اس لیے دو سال کے بعد نوکری سے نکالے گئے۔ پھر وہ سیاسی حالات سے دل برداشتہ ہو کر انگلینڈ چلے گئے۔ وہیں رہ کر سائیکولوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد نوکری مل گئی ـــــ لیکن کوئی ایسی نوکری نہیں ملی جس میں اُن کے مضمون اور قابلیت کا صحیح استعمال ہو سکے، اس لیے اب وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بڑے خوش مزاج اور وجیہہ آدمی ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں اب تک شادی نہیں ی۔"

"کیا رنجیت کا ذکر کر رہے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ تمہارے بڑے گہرے دوست تھے۔ سیاسی اختلاف کے باوجود بھی تم دونوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا تھا۔ ایک زمانے میں تم دونوں میں خوب خط و کتابت بھی تو تھی۔"

اُس نے بات کا رُخ پلٹا۔ "تھی تو، لیکن ہم مرد یادہ تر خط و کتابت کے معاملے میں کاہل ہوتے ہیں۔ مگر س سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ان کو خط لکھ دوں گا کہ تم داخلہ لینا چاہتی ہو۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہماری شادی کو بارہ برس ہو گئے۔ میں نے education پر کوئی کتاب بھی سنجیدگی سے نہیں پڑھی۔ تم کہتے ہو M. Phil کر آؤں۔" وہ ذرا چڑ کر بولی۔

"کیوں، اتنی موٹی موٹی کتابیں .... Psychology پر لاکر پڑھتی ہو۔"

"وہ بات دوسری ہے، لیکن دوبارہ لیکچر سننا۔ کورس کی کتابیں پڑھنا اور امتحان دینا دوسری بات ہے۔"

"کوئی دوسری بات نہیں ہے۔ پھر تم کل ہی تو نہیں جا رہی ہو۔" بات کا رُخ بدل کر وہ پیار سے بولے۔ "راج، میں اتنے دن سے دیکھ رہا ہوں تم اُکتائی اُکتائی رہتی ہو۔ میرا خیال ہے تم کو ذہنی جد و جہد ..... excitement کی ضرورت ہے، ورنہ اس خوبصورت سر کے اندر جیتا جاگتا دماغ ہے نا، وہ سو جائے گا۔"

اُس نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ اُسے احساس ہوا: اُنہوں نے سچی اور دل کی بات کہہ دی ہے۔ اُس نے اُن کے بہت قریب آکر اُن کے شانے پر سر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اس وقت ان پر بہت پیار آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ "یہ میرے دل کا سارا حال جانتے ہیں۔ مالی، جسمانی، ذہنی۔ میری ساری ضروریات کو پورا کرنے کا بار بھی اُنہوں نے لیا ہے۔ کیا میں بالکل اپاہج ہو گئی ہوں۔" اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔

دیپک رائے ان لوگوں میں تھے، جو کسی بات کو لٹکائے نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار جو ارادہ کیا اس کو اپنی حد تک عملی جامہ پہنانا اُن کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی دن scholarship کے لیے وہ فارم وغیرہ لے آئے۔ رات کو جب وہ اُن کے مطالعے کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ کسی کو خط لکھ رہے تھے۔

"اتنی رات گئے کس کو خط لکھ رہے ہو۔" اُس نے پوچھا تھا۔

"اپنے ایک عزیز دوست کو۔" وہ ذرا راز دارانہ لہجے میں مسکرا کر بولے۔

"رنجیت کو لکھ رہے ہو نا۔" وہ بولی۔

"ہاں، تمہارے ہی بہانے سے اُس سے خط و کتابت جاری ہو جائے۔ تم نے فارم بھر لیے؟ میں نے رنجیت کو لکھ دیا ہے کہ داخلے اور Subjects کے بارے میں لکھیں۔ اُن کا مضمون بھی Psychology ہے۔ ان سے اچھی رائے کوئی اور نہیں دے سکتا۔ مجھے اطمینان رہے گا کہ تمہاری دیکھ بھال کرنے والا وہاں کوئی موجود ہے۔"

وہ چڑ کر بولی تھی۔ "وہاں بھی ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی ذمہ داری خود نہیں لے سکتی۔ عورت ہوں نا؟"

دیپک رائے نے کہا تھا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ پھر اتنے گھر مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر پہلی بار اکیلی یورپ جاؤ گی۔ ہم سب کی یاد نہیں آئے گی کیا؟ میں جانتا ہوں پہلے پہل دل بہت گھبرائے گا۔ ایسے میں کوئی جانا پہچانا اپنا مل جائے تو بڑا سکون ہوتا ہے۔ رنجیت میرے بھائی کی طرح ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔

اُن کی باتیں سُن کر اُسے شرمندگی ہوئی تھی۔ پھر بولی تھی۔ "تم مجھے کیوں اتنی دُور دھکیل رہے ہو۔ تم کو، بچوں کو، ماں جی کو چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ پھر اگر میں نے M. Phil کر بھی لیا تو کیا تیر مار لوں گی۔ نوکری تو کر نہیں سکتی۔ اتنی عمر میں کون مجھے نوکری دے گا۔"

دیپک نے اس کی کشمکش سمجھ کر کہا۔ "نہیں پاگل، نوکری کا سوال نہیں ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم نے سب کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب تم کو اپنے لیے بھی کچھ کرنا ہے M. Phil تم یہاں بھی کر سکتی ہو۔ لیکن یورپ جا کر تمہارا واسطہ ایک دوسرے معاشرے، دوسرے ماحول اور لٹریچر سے پڑے گا۔ یہ ایک بڑا قیمتی تجربہ ہے۔ ابھی میں خط ختم کر کے آتا ہوں۔"

پھر ایک سال آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ برٹش کاؤنسل سے اُسے وظیفہ بھی مل گیا۔ رنجیت کے ذریعے سے داخلے میں بھی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ دو سال بعد وہ.....

M. Phil کرکے واپس آئی۔ ایک ماہ بعد ہی اسے پارٹ ٹائم لیکچرر شپ مل گئی۔ اور لندن کی یادیں ذہن میں دھندلا سی گئیں۔

آج وہ چند ضرورت کی چیزیں خریدنے کالج ہی سے بازار چلی آئی تھی۔ دکان دار کو پیسے دے کر اس نے مڑکر باہر دیکھا تو ایک شخص تیزی سے دکان کے سامنے سے گزرتا ہوا نظر آیا — وہ صرف ایک ہلکی سی جھلک دیکھ پائی۔ لیکن وہ یقیناً کہہ سکتی تھی کہ وہ رنجیت تھا۔ وہی قد، وہی جسم، ویسے ہی بال، ویسے ہی چلنے کا انداز اور اسی قسم کی Tweed کی جاکٹ۔

بغیر سوچے ہوئے وہ تیزی سے دکان سے باہر نکلی اور بڑے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس شخص کے پاس پہنچ کر اس نے آواز دی "رنجیت"۔ اس شخص نے مڑکر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رنجیت نہیں تھا۔ اسے اپنے اوپر بہت غصہ آیا۔

"معاف کیجیے۔ میں نے آپ کو کوئی اور شخص سمجھا تھا۔" اس نے بڑے وقار سے انگریزی میں معافی مانگی۔ پھر بولی "شاید آپ کی جاکٹ دیکھ کر غلطی ہوئی۔ یہ انگلینڈ کی سلی ہوئی ہے نا؟"

اجنبی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر بولا "کوئی بات نہیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ جاکٹ لندن کی سلی ہوئی ہے۔ میرے بھائی وہاں رہتے ہیں۔ وہ میرے لیے لائے تھے۔ کیا آپ وہیں سے آئی ہیں؟"

اس نے کہا "جی نہیں"۔ لیکن زمانہ گزر گیا وہاں گئی تھی"۔ اور پھر اجنبی سے دوبارہ معافی مانگ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس آگئی۔

بازار سے باہر نکل کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ چیزیں پاس رکھ کر وہ کار میں چند منٹ کے لیے خاموش بیٹھی رہی۔ "کیا حماقت ہے"۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ اس عمر میں کم عمر لڑکیوں کی طرح دوڑ کر ایک شخص کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر رنجیت ہندوستان آتے تو ہم سے ملنے نہ آتے! یہ کیسے ممکن تھا! پھر اس کے دل میں ایک خلش سی ہوئی "شاید نہ آتے۔ شاید نہ آئے"۔ اس نے زیر لب دہرایا۔ "لیکن کیوں"۔ اس نے سوچا یہ مرد ہم کو ایک معمہ سمجھتے ہیں۔ کیسی موٹی موٹی کتابیں عورتوں کی نفسیات اور ان کے کردار کے تضاد پر لکھ ڈالیں۔ لیکن کیا وہ اپنے آپ کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہوں۔ اس نے سر ہلا کر کہا اور کار اسٹارٹ کرکے گھر کی طرف چل دی۔

دیپک کسی کانفرنس میں شرکت کرنے سویڈن گئے ہوئے تھے۔ گھر میں اس کے اور نوکروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا، لیکن دوپہر کے حبس کے بعد شام کی ہواہیں تازگی اور راحت تھی۔ اگر وہ چاہتی تو شام گزارنے اپنی کسی دوست کے پاس چلی جاتی۔ لیکن اس نے گھر پر ہی رہ کر اگلے ہفتے کا لیکچر تیار کرنے کا ارادہ کیا۔ نہا کر بال سکھانے کے لیے وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کے گھنگھرالے بال اب بھی کالے تھے۔ صرف چند سفید بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ ان عورتوں میں تھی، جن کے چہرے پر وقت اپنی مہر جلدی نہیں لگا پاتا۔ اس کا چھریرا بدن اب ذرا گداز ہوگیا تھا۔ اس میں اب بھی کشش تھی۔ آئینہ دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ پھر بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا کر اس نے پہننے کے لیے ساڑی نکالی۔ وہ پرانی اور نئی ساڑیوں کو الٹتی پلٹتی رہی۔ پھر ڈھاکے کی ململ کی ایک ساڑی نکال کر پہنی اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اپنا عکس دیکھ کر اسے دھکا سا لگا۔ یہ تو وہی ساڑی تھی جو رنجیت کو بہت پسند تھی۔ اس ساڑی میں اسے ملبوس دیکھ کر اس نے کہا تھا "اس ساڑی میں تمہارا گندمی رنگ سونے کی طرح چمک رہا ہے"۔ پھر بڑے پیار بڑی نرمی سے ان کے لبوں نے اس کے گال کو چھو لیا تھا۔

"مجھے کیا ہوگیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ نوجوان بیٹے ہیں، چاہنے والا شوہر ہے اور میں ایک رومانٹک نوعمر لڑکی کی طرح ایک غیر مرد کے متعلق سوچ رہی ہوں"۔ —— اس کے جذبات اس کے خیالات اس کے لیے معمہ بن گئے تھے — لیکن اسے نہ احساس گناہ تھا اور نہ وہ اس محبت پر شرمندہ تھی، جو ایک زمانہ گزر گیا اس نے ایک دور دیس کے باسی، سے کی تھی۔ اسے کتنے ایسے موقعے یاد آئے، جب دوسرے مردوں نے اس کے پاس آنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے انہیں قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ گرمیوں کی اس خوش گوار شام کو باغ میں بیٹھی ٹہلتی وہ ان کے متعلق سوچتی رہی تھی، ان کے چہرے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے آتے رہے۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے، جن کو اس نے خود بھی بڑا جاذب پایا تھا۔ پھر اسے مائیکل یاد آیا۔ کیسا حسین لڑکا تھا۔ بالکل یونانی دیوتا کے بت کی طرح — سنہرے گھنگھرالے بال، نیلی نیلی آنکھیں، دراز قد، ہونٹوں پر جیسے ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ لندن میں اس کے ہی ہوسٹل میں چند کمروں کے فاصلے پر رہتا تھا۔ پہلے دن ہی مائیکل اس سے بڑی محبت سے پیش آیا تھا۔ وہ اپنے شوہر، دونوں بچے اور ہر مانوس چیز کو چھوڑ کر ایک نئے اور عجیب و غریب ملک میں رنگ برنگے طالب علموں کے درمیان گھری ہوئی اکیلی ہی اکیلی بیٹھی ہوسٹل کا بدذائقہ کھانا کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اپنا چھوٹا بیٹا یاد آرہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہر لقمہ اس کے گلے میں اٹکا جا رہا ہے۔ "کھانا بہت خراب ہے نا؟" اس کے پاس بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے اس سے سوال کیا۔

وہ اپنی دنیا میں ایسی غرق تھی کہ اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ وہ کب اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں"۔ اس نے سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ"۔ لڑکے نے ہنس کر بڑی صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا تھا "میرا نام مائیکل ہے"۔ میں تمہاری کلاس میں ہوں۔ ہم دونوں کے Subjects بھی ایک ہیں۔ تم نے تو میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لیکن ہم لڑکے ہر خوب صورت لڑکی کا نام اور اس کی شکل دل پر نقش کر لیتے ہیں"۔ وہ پھر ہنسا

"تمہارا نام راجیشری رائے ہے نا؟ میرے لیے یہ نام ذرا مشکل ہے۔ میں تمہیں راج کہہ کر پکاروں گا۔ کوئی اعتراض تو نہیں؟" مائیکل کی ہنسی اور اس کی خوش مزاجی نے اس کے دل پر پھاہا سا رکھ دیا۔

وہ سر ہلا کر بولی "کوئی اعتراض نہیں۔ میرے سارے دوست مجھے راج کہتے ہیں۔"

"شکریہ۔ شکریہ۔ تو میں دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ اب بھولنا نہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس دن سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ پارک میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اُس نے مائیکل کو دیپک اور اپنے بیٹوں کی تصویریں دکھائی تھیں۔ بچوں کے خط پڑھنے کو دیے تھے۔ مائیکل نے اُس سے اپنی بہنوں اور والدین کے متعلق باتیں کی تھیں۔ وہ اسکاٹ لینڈ سے آیا تھا اور اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ اُسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ جب وہ خالص گلاسگو کے لہجے میں باتیں کرتا تھا تو اُس کے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا اور مائیکل کہتا "ارے تم بڑی جاہل ہو۔ گلاسگو کی بولی نہیں سمجھتیں۔ سب سے پہلے تو تم کو اسکاٹ لینڈ ہی جانا چاہیے تھا۔ ہم اسکاٹ لینڈ والے ہی تمہارے دوست ہیں۔ ان انگریزوں نے تو ہم دونوں کا خون چوسا ہے۔"

وہ کہتی "تو تم کیوں یہاں آئے ہو اسکاٹ لینڈ چھوڑ کر۔"

"ارے ہم مردوں کی بات دوسری ہے ہم شیر ہیں جنگل کے بادشاہ۔ جہاں چاہیں جائیں۔" اسے چڑانے کے لیے مائیکل نے کہا تھا۔

مائیکل کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کی طرح اس کی بھی اخلاقی قدریں نئی تھیں۔ لیکن اس نے کبھی دوستی کی حد سے قدم باہر نہیں رکھا تھا۔ اُسے معلوم تھا وہ شادی شدہ ہندوستانی عورت ہے اور لاکھ اپنے پرانے معاشرے کی بندشوں سے آزاد سہی، وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جس سے اُن کی دوستی کو ضرر پہنچے۔

اُسے یاد آیا۔ ' جاڑوں کی ایک شام کو وہ دونوں ہوسٹل کے کامن روم میں آگ کے قریب بیٹھے کیٹس اور دوسرے رومانٹک شعراء کی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ کتاب ایک ہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھے تھے۔ مائیکل نے ایک نظم ختم کرنے کے بعد اُس سے کہا تھا "اب تم پڑھو۔"

اُسے خیال ہوا مائیکل کی آواز بھاری ہو گئی ہے۔ اور اس کے چہرے پر ایک غبار سا آگیا ہے۔

اس وقت رات کے تقریباً نو بجے تھے۔ طلباء اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے یا اب تک لائبریری اور سنیما وغیرہ سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ دونوں اکیلے تھے۔ مائیکل کا بازو اس کی پشت پر تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے صوفے کی پشت پر سر رکھے بڑے انہماک سے نظم سُن رہا تھا۔ جب نظم ختم ہو گئی تو اُس نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا پھر کہا تھا۔ "چلو میرے کمرے میں چلیں۔"

"کیوں؟ اتنے آرام سے تو یہاں بیٹھے ہیں۔" اُس نے معصومیت سے کہا تھا۔

مائیکل نے اس کے بہت قریب آکر آہستہ سے کہا تھا "کیوں کہ آج رات میں تم کو جی بھر کے پیار کرنا چاہتا ہوں۔"

اُسے یاد آیا وہ مائیکل پر ناراض نہیں ہوئی تھی۔ وہ یورپ کے معاشرے کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اُسے صرف ڈر لگا تھا کہ اُن کی ایسی خوبصورت دوستی ختم ہو جائے گی۔ اُسے یاد آیا جس دن وہ ہندوستان چھوڑنے والی تھی، اُس رات دیپک نے بھی اُسے دل بھر کے پیار کیا تھا۔ پھر کہا تھا 'ہم دونوں ایک دوسرے سے دو سال کے لیے الگ ہو رہے ہیں۔ نہ میں سنیاسی ہوں اور نہ تم سے اس کی توقع کرتا ہوں۔ اگر اس عرصہ میں چند لمحوں کے لیے ہم کہیں سہارا لے لیں تو وہ کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ نہ میں تم سے پوچھوں گا نہ تم مجھ سے سوال کرنا۔'

اُس نے جواب دیا تھا "تمہارا دماغ خراب ہے۔" اُس دن اُس نے مائیکل کی طرف نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ کیسا جاذب نظر جوان تھا — لیکن وہ ایک ہندوستانی عورت تھی۔ دو بیٹوں کی ماں۔ دوستی کی حد کو عبور کرنے کا خیال اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولی تھی "مائیکل' تم بڑے خوبصورت ہو۔ مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ لیکن یہ محبت ایسی ہے جیسی ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے۔" اُس نے مبالغہ کیا تھا۔

مائیکل زور سے قہقہہ لگا کر بولا تھا "ارے تم بڑی دقیانوسی عورت نکلیں۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"۳۴ سال۔" اُس نے ایک سال اور بڑھا کر بتایا تھا۔

مائیکل دوبارہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "جانتی ہو میری عمر کتنی ہے؟ میں پچیس سال کا ہوں۔ تو تمہارے مُلک میں نو سال کی لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں۔" اُس نے طنزاً کہا تھا۔

اور وہ ذرا شرمندہ ہو کر بولی تھی "خیر ماں نہ سمجھو بڑی بہن سمجھ لو۔"

مائیکل صوفے سے اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا "راج، اس قسم کی حماقت کی باتیں نہ کرو۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں جذبات کی رَو میں بہہ گیا اور بھول گیا کہ تم ہندوستانی عورت ہو۔ کتنے بھی دعوے کرو، تمہاری اخلاقی قدریں اب تک بڑی دقیانوسی ہیں اور ہنس کر اُس کی پیشانی کا بوسہ لے کر کہا تھا "شب بخیر دیدی۔" (اُس نے ہندی کے چند الفاظ اُس سے سیکھ لیے تھے) اور زینے پر چڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھی رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے تھے۔ اُس نے سوچا تھا کیسی اچھی دوستی تھی، آج ختم ہو گئی۔ لیکن دوسری صبح مائیکل نے اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور سوچا تھا یہ یورپ والے بھی کیسے عقلمند ہیں۔ زمانے کے ساتھ اُنہوں نے اپنی اخلاقی قدریں بدل کر زندگی کتنی آسان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مائیکل کو یاد کرکے وہ مسکرائی ---- اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ نوکر نے اس سے آکر کہا: "کھانا تیار ہوگیا ہے میم صاحب، میز پر لگا دوں؟" اور وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

کھانا کھا کر رات گئے تک وہ اگلے ہفتے کا لیکچر تیار کرتی رہی۔ کام ختم کرنے کے بعد جب اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ایک بج رہا تھا، لیکن وہ اب تک تھکی نہیں تھی۔ کام ختم کرکے جو اطمینان اور سکون اُسے ہو رہا تھا، اُس میں بڑی لذت تھی۔ وہ زیر لب گنگناتی ہوئی اُٹھی۔ اُس نے کاغذات اور کتابوں وغیرہ کو سلیقے سے رکھنا شروع کیا۔ پھر وہ ایک دم رُک گئی۔ وہ ایک گیت گنگنا رہی تھی، جو رنجیت کو بہت پسند تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو کر کھڑی ہو گئی۔

کالج میں وہ Psychology کی لیکچرار تھی۔ اگر وہ چاہتی تو بڑے ٹھنڈے دل سے وہ اپنا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی، لیکن ان جھگڑوں میں پڑنے کی اُسے ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ جو موڈ اس پر چھایا ہوا تھا، اس میں نشہ تھا، لذت تھی، ایک طلسم تھا جسے وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کے قدم کتابوں کی اس الماری کی طرف بڑھے، جہاں تصویروں کے البم رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے اس البم کو نکالا جس میں لندن کے قیام کی تصویریں تھیں۔ اس کے ہاتھ ورقوں کو پلٹتے رہے۔ پھر اُس کی نظریں ایک تصویر پر جم گئیں، جو ایک پک نک کی تھیں۔ کتنے جانے پہچانے چہرے تھے اس میں۔ زندگی کے بہت ہی قلیل عرصے کے لیے اس میں سے کئی، اس کے کتنے عزیز دوست ہو گئے تھے۔ اب وہ کہاں ہیں؟ اپنے کاموں میں مصروف ہیں، اپنی اپنی دنیا میں محو ہیں۔ اُسے خیال آیا، جہاں وہ ہیں وہی مقام، وہی لمحے اُن کے لیے سب سے اہم ہیں۔ اُن کے لیے کرۂ زمین کا محور بھی وہیں ہے۔ اُس نے چند ورق اور پلٹے پھر رُک گئی۔ رنجیت کی تصویر اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں چشمے کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا:

To my friends ,

Raj and Deepak

یہ تصویریں خاص طور پر انہوں نے دیپک کے لیے بھیجی تھیں۔ ان سے ملے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ دیپک نے انہیں لکھا تھا اپنی ایک تصویر بھیج دو تاکہ معلوم ہو تم کتنے بدل گئے ہو۔ بے جانے بوجھے اس کی اُنگلیاں تصویر کے نقوش پر چلتی رہیں۔ پھر اُس نے آہستہ سے البم بند کرکے رکھ دی۔ اور کپڑے بدل کر سو گئی۔

ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور باوجود کوشش کے بھی دوبارہ سو نہ سکی۔ باغ میں اب تک رات کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں جاکر اُس نے چائے بنائی اور کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر پینے لگی۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوکر ابھی تک سو رہے تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اکیلی نہیں ہے۔ یادوں کا ایک سمندر تھا، جو اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا وہ اس کے ریلے میں بہہ گئی ہے۔

اُسے اپنا بچپن یاد آیا۔ اپنے ماں باپ یاد آئے۔ اپنی ماں کا چہرہ اُس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ اُس زمانے کا جب وہ جوان تھیں۔ حالانکہ اُس نے کبھی اُنہیں جوان نہیں سمجھا تھا۔ ان کے کالے کالے گھنگھرالے بال اُسی کی بالوں کی طرح تھے بلکہ اُس کا چہرہ اُن کے چہرے سے کتنا ملتا تھا۔ لیکن وہ کتنی مہان تھیں۔ کتنی معصوم اور نیک تھیں۔ اُس کی اور اُن کی کیا برابری! پھر اسے خیال آیا ہم اپنے والدین پر نیکی، بڑائی اور معصومیت کا کتنا بار رکھ دیتے ہیں۔ ہم اُنہیں ایک بہت بلند مقام پر بٹھا دیتے ہیں اور خود بھی اس مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتے ہیں۔ شاید اپنی سطح سے بلند ہو کر اپنے آدرشوں تک پہنچنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے، لیکن یہ مقام جہاں وہ ہماری نظروں میں ہیں وہ حقیقت کم اور خواہشات پر زیادہ مبنی ہے۔ اُسے خیال آیا: میرے دونوں بیٹے بھی کیا اپنے ذہن میں میری ایسی ہی خیالی تصویر لیے ہوئے ہیں جیسی میرے دل میں میری ماں کی ہے۔ لیکن وہ عورتیں جو کسی کی محبوبہ تھیں، کسی کی بہن تھیں، کسی کی ماں بھی تھیں۔ محبت کرنا اور محبت کا جواب دینا اگر کوئی گناہ ہوتا تو ہم نے اُس کے گیت کیوں گائے ہیں۔ اُن پر کیوں سر دھنتا ہے۔ انسان کا عشق روحانی اور جذباتی ہی نہیں، جسمانی بھی ہوتا ہے۔ ہم حواس کا سہارا لے کر ہی ہر چیز کو محسوس کرتے ہیں۔

چائے کی پیالی سامنے رکھے وہ خاموش بیٹھی رہی اور اُس کے خیالات بھٹکتے رہے۔ اسے رنجیت کی یاد آئی۔ اُن سے پہلی ملاقات کی یاد آئی جب وہ اُسے ایرپورٹ لینے آئے تھے۔ انہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ ان سے بڑی جھجک کر ملی تھی۔ حالانکہ اس اجنبی ملک میں وہی ایک ایسے شخص تھے، جن سے اُس کے اپنے ملک اور دیپک کی یادیں وابستہ تھیں، لیکن رنجیت اس سے بڑی گرمجوشی سے ملے تھے۔ اُسے ہوسٹل لے گئے تھے اور پھر شام کو آکر ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے لے گئے تھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک ہندوستان وہاں کی سیاست اور پرانے دوستوں کے علاوہ دیپک اور اس کے بچوں کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے۔ ہوسٹل واپس آکر اُس نے دیپک کو خط میں لکھا تھا: "تم سے رنجیت کے بارے میں اتنی بار سنا تھا، لیکن اُن سے مل کر اور باتیں کرکے معلوم ہوا تم دونوں کی دوستی کی وجہ کیا ہے۔ تم دونوں کے سوچنے، باتیں کرنے کا انداز ایک دوسرے سے اتنا ملتا ہوا ہے کہ انہیں دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ تمہارے بھائی ہوں اور انہیں دیکھ کر تمہاری یاد اور بھی آئی۔ تم نے ٹھیک کہا تھا تم سب کو چھوڑ کر میں بہت دُکھی ہوں گی۔ بچوں کو یاد کرکے میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ تم نے اتنی دور کیوں مجھے بھیج دیا اور میں کیوں راضی ہو گئی۔ لیکن اتنی بڑی قربانی دے کر میں یہ موقع برباد نہیں کر سکتی۔ اس لیے کام ہی میرا سہارا ہے اور کام ہی میں مجھے سکون ملے گا۔ لیکن تمہارے ہر خط کے انتظار میں میری آنکھیں لگی رہیں گی۔"

ٹرم term شروع ہوتے ہی اُس نے
بڑے انہماک سے کام شروع کر دیا۔ اُسے اندازہ ہوا کہ
حالانکہ کالج چھوڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا، لیکن
اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے اس کا شمار کالج کی
اچھی طالبات میں ہونے لگا۔ اس کے نوٹس، اس کے
ٹیوٹوریل دیکھ کر رنجیت کے دل میں بھی اس کی عزت
بڑھی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُن کی دوستی ایک
دوسرے کی عزت کی مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔
بچوں کے خطوط اور دیپک کے بڑھاوے کی وجہ
سے ایک سال کا عرصہ اُس نے بسر سے گزار دیا۔ دوسرے
سال اُسے محسوس ہوا کہ وہ ہوسٹل میں اتنی اچھی طرح کام
نہیں کر سکتی جتنا وہ چاہتی تھی۔ کالج کے پاس ہی اُسے
رنجیت کے ذریعے سے کمرہ مل گیا اور وہاں جا کر اُس
نے ساری تفریحوں کو بھلا کر اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے
میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا اور ایک دن جب
وہ کالج سے واپس لوٹ کر آئی تو احساس ہوا کہ اُس کا
پرانا درد سر مرض میگرین واپس آ گیا ہے۔ دو دن
تک وہ گھر سے نہ نکل سکی۔ اور نہ کسی کو اس کی بیماری
کی خبر ملی۔ تیسرے دن جب اُس کے سر کا درد تو ختم
ہو گیا تھا، لیکن کمزوری سے بالکل نڈھال ہو کر تقریباً
اندھیرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے دروازے کی
گھنٹی کی آواز سنی۔ اس کے بعد کسی نے اُس کا دروازہ
کھٹکھٹایا اور اندر آنے کی اجازت لے کر رنجیت
داخل ہو گئے۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی طبیعت خراب
تھی۔ کسی سے کہہ کر فون تو کروا دیا ہوتا۔" وہ پلنگ کے
پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "آپ کی
لینڈ لیڈی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو میگرین ہو گیا تھا۔"

وہ بولی۔ "ہاں! لیکن خبر دینے کا کوئی فائدہ
نہ تھا۔ جو آنٹی نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلا دیا تھا۔ مجھے
صرف خاموشی اور آرام کی ضرورت تھی۔ آپ کو خواہ
مخواہ پریشان کیا کرتی!"

"خیر اب بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں ——
چائے بنائیں گی؟"

"ہاں، آپ اپنے لیے بھی بنا لیجیے۔" چائے
پینے کے لیے وہ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آہستہ
آہستہ اُس سے باتیں کرتی رہی۔ اُسے معلوم بھی نہیں
ہوا، لیکن نہ جانے کس بات پر یاس کی یاد کر کے وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی
کہ آنسوؤں کا جو باندھ ٹوٹ گیا تھا اُسے روک
سکتی۔ اُسے روتے دیکھ کر رنجیت کرسی سے اُٹھ کر
اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ پھر اُس کا سر اُن کے
شانے پر تھا اور اُس کے آنسو اُن کی جاکٹ میں جذب
ہوتے رہے۔ آہستہ آہستہ اُن کے لب ایک دوسرے
کے لبوں سے مل گئے۔ اس لمس میں کیسا نشہ تھا، اسی نشہ
میں وہ بہہ گئے تھے۔ اُن کے بوسے اُن کے چہرے،
اُس کی آنکھوں اُس کے ہونٹوں کو پھولوں کی نرم نرم
بارش کی طرح چھو رہے تھے۔ ان دونوں کو معلوم
نہیں ہو اور کتنی دیر تک ایک دوسرے کی قربت کے
نشے میں سرشار رہے۔ جب ہوش آیا تو اندھیرا ہو چکا
تھا۔ رنجیت اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے ایک
خواب سے جاگے ہوں۔ پھر آہستہ سے انہوں نے کہا
اب میں جا رہا ہوں۔ کالج میں خبر دے دوں گا کہ آپ
بیمار ہیں۔ ان کے جانے کے بعد اُس نے سوچا یہ آج کیا
ہو گیا۔ یہ کیسی کشش تھی کہ ہم دونوں ہی اس کے طوفان
میں بہہ گئے۔ لیکن اُسے اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ اُس
کے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک
دوسرے کے اس قدر قریب آ جائیں گے۔ پھر اُسے
دیپک کے الفاظ یاد آئے: "نہ میں سنیاسی ہوں اور
نہ تم سے اس کی توقع کرتا ہوں۔" اُس نے سوچا اس
وقت دیپک کیا کر رہے ہوں گے۔ کہاں ہوں گے۔ کیا
سوچ رہے ہوں گے۔

کافی رات گزر چکی تھی۔ میگرین کے دورے کے
بعد وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتی
جا رہی تھیں۔ وہ پلنگ پر لیٹ کر سو گئی۔

دوسرے دن جب آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔
وہ نہانے کے بعد ناشتہ کر کے کالج چلی گئی۔ کئی دن غیر حاضری
کی وجہ سے کام کا جو نقصان ہوا تھا اُسے پورا کرنا چاہتی
تھی۔ سب سے آخر کا لیکچر رنجیت کا تھا۔ وہ بھی گئی لیکن
اُسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے آنکھیں بچا رہے ہیں۔
لیکچر کے بعد وہ جلدی سے کمرے کے باہر نکل گئے۔ نہ
اس سے بات کی اور نہ کسی اور طالب علم سے۔ یہ سلسلہ
کئی دن جاری رہا۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ انہیں
روک کر ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرے۔ ایک دن
وہ لیکچر روم سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس نے دو لڑکیوں
کو باتیں کرتے سُنا۔ "تم نے غور کیا، آج کل رنجیت راج کا
بالکل نوٹس (notice) نہیں لیتے۔" دوسری
نے جواب دیا: "ہاں ذرا اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے
ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وجہ ہے۔" پہلی لڑکی بولی

"LOVERS' QUARREL"

پھر دونوں ہنستی ہوئی دور نکل گئیں اور وہ کھڑی کی کھڑی
رہ گئی تھی۔ لیکن دوسرے دن سنیچر کو کافی صبح صبح وہ
رنجیت کے گھر گئی۔ گھنٹی کی آواز سُن کر جب انہوں نے
آ کر دروازہ کھولا تو اُسے دیکھ کر وہ گھبرا سے گئے۔ اُن
کے بیٹھنے کے کمرے میں جاتے ہی اُس نے اُن سے سوال
کیا تھا۔ "آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ میری بدنامی؟"
انہوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا
تھا۔ "آپ میرے شوہر کے بڑے عزیز دوست ہیں۔
جس طرح آپ آج کل مجھے ignore کر رہے
ہیں۔ اس سے لوگ یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہم دونوں
میں لڑائی ہوئی ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمارے تمہارے
ملک والوں کی طرح دوسروں کے جھگڑوں میں نہیں
پڑتے۔" انہوں نے کہا تھا۔

اُس نے ناراض ہو کر جواب دیا تھا۔ "غلط بالکل غلط۔
میں نے خود لڑکیوں کو کہتے سُنا ہے کہ ہم میں لڑائی ہوئی
ہے۔ "LOVER'S QUARREL"
انسانی رشتوں میں دلچسپی لینا ہمارے یہاں ہی محدود
نہیں ہے۔ ایک سال اس ملک میں رہ کر میں اس نتیجہ
پر پہنچی ہوں کہ ہماری نسبت یہ کتنے ہی فراخ دل سہی، لیکن
انسان کی فطرت ہر جگہ ایک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ
یہ بتائیے آپ مجھے اس طرح کیوں ignore کر رہے

ہیں؟"

"میں آپ کو ignore نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے آپ سے شرمندگی ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"کیوں؟" اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان سے سوال کیا تھا۔ "آپ میرے بڑے عزیز دوست کی بیوی ہیں اور میں ایسی ذلیل حرکت کر بیٹھا۔" اس نے غصہ سے جواب دیا۔

"میں دیپک کی بیوی ہوں لیکن اس کی ملکیت نہیں۔ اور نہ آپ کو شرمندگی کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی تھی۔ دُکھی تھی۔ آپ ذرا میرے قریب آگئے تو کوئی قیامت نہیں آگئی، لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے قریب آنے سے میرے دل میں میرے شوہر میرے بچوں کی محبت میں کمی آگئی ہے تو آپ کا خیال غلط ہے۔ ہمارا رشتہ بڑی مستحکم بنیاد پر ہے۔ میرے دل میں اتنی جگہ ہے کہ ایک چھوٹا سا کونہ آپ کو بھی دے سکتی ہوں۔"

اُنہوں نے کہا تھا: "لیکن راج، اگر دیپک کو معلوم ہو گیا تو اُسے کتنا دکھ ہوگا۔ کتنا غصہ آئے گا مجھ پر۔"

"ہاں۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا ہے کہ دیپک کتنے طویل عرصہ کے لیے نوکری کے سلسلے میں باہر چلے جاتے ہیں۔ کیا وہ کبھی بھی کسی کے قریب نہیں گئے ہوں گے۔ چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی نہ اُنہوں نے مجھے ہر منٹ کی رپورٹ دی ہے اور نہ میں نے مانگی۔ لیکن وہ مرد ہیں۔ اُن میں بڑی کشش ہے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ چاہے وہ کتنے ہی دن بعد واپس آئیں، گھر آکر اُنہیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اُنہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔"

رنجیت نے اُسے بڑے تعجب سے دیکھا تھا۔ اور اس نے کہا تھا: "آپ نے بہت دن سے ہندوستان چھوڑ دیا ہے، اس لیے آپ کے ذہن میں وہاں کی وہی تصویر ہے جو آپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ لیکن ہمارا دیس بہت بدل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہم بھی بدل رہے ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی رشتے نہ یہاں بدلے ہیں نہ وہاں۔ لیکن ان لوگوں میں جنگ کے بعد کتنی تبدیلی آئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس درمیان میں ہم بالکل نہیں بدلے ہیں۔ ملک میں اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ وہ تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ہماری اخلاقی قدریں ویسی کی ویسی ہیں۔"

رنجیت سر جھکائے ہوئے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر بولے: "تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہندوستان کی جو تصویر میں اپنے ذہن میں لے کر آیا تھا، وہ اب تک بدلی نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ تم جیسی عورتیں بھی وہاں ہیں۔"

اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا: "میں کوئی انوکھی عورت نہیں ہوں۔ میرے طبقے کی اور بھی عورتیں ہیں جو میری ہم خیال ہیں، لیکن ہم اپنے خیالات کا پرچار نہیں کرتے پھرتے۔"

"تو میں کیا کروں؟" اُنہوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"جس طرح آپ مجھ سے برتاؤ کرتے تھے ویسے ہی کیجیے۔" پھر رنجیت کے قریب آکر اُس نے آہستہ سے کہا تھا: "آپ سے دوستی کی اہمیت میرے لیے بہت ہے۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ آپ میں کشش محسوس کرتی ہوں۔ اس لیے بھی کہ آپ میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو میرے دیپک میں بھی ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتی کہ دو لمحے کے لیے آپ کے قریب آکر میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔ اس کے بعد اُن کی دوستی ایک ہموار لیکن خوش گوار راستے سے گزری تھی۔ امتحان قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ وہ بہت مصروف تھی۔ وہ کبھی کبھی چند طالب علموں کے ساتھ یا رنجیت کے ساتھ تفریح کے لیے نکل جاتی۔

وہ دن اس کے لیے بہت قیمتی تھے۔ دیپک اور بچوں کی یاد اس کے دل میں ترو تازہ تھی، لیکن ساری ذمہ داریوں سے ہٹ کر وہ صرف اپنے دل و دماغ اور اپنی شخصیت کے لیے سرمایہ جمع کر رہی تھی۔ طالب علموں کی بحثیں، لیکچر، نئی نئی کتابیں تازہ ہوا کی طرح تھیں جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو دوبارہ جگا دیا تھا اور ان دنوں کا وہ سرمایہ اب بھی اس کے پاس محفوظ تھا۔ اس کی اپنی بھی دنیا تھی۔ وہ صرف شوہر اور بچوں کے سہارے نہیں جی رہی تھی۔ اس کی شخصیت کی نشوونما میں صرف اس کی کوششیں شامل نہیں تھیں۔ دیپک نے بھی اس کی مدد کی تھی اور اس نے اور بچوں سے چھوٹ کر جب وہ جُدائی کے غم کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی تو رنجیت نے چند لمحوں کے لیے پناہ دے کر اس کی نسائیت اور اس کے وقار کو جگا دیا تھا۔ ان کی یاد بھی کتنی خوش گوار تھی۔

اپنی دل کش یادوں میں محو وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اُسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ باہر باغ میں رات کا دھندلکا صبح کی روشنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

نوکر نے چائے کی کشتی اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس دن اُسے کالج نہیں جانا تھا۔ شام کو دیپک بھی واپس آ رہے تھے۔ وہ چائے پی کر خانہ داری کے کاموں اور شوہر کی آمد کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ کئی دن سے اس کے دل پر جو ایک کیفیت طاری تھی وہ اب بدل گئی تھی۔ لیکن اب بھی کسی دوست یا عزیز کے پاس جا کر تفریح کرنے کی خواہش اُسے نہیں تھی — فون پر اُس کی ایک عزیز دوست نے لنچ پر مدعو کیا۔ لیکن اُس نے بہانہ کر کے منع کر دیا۔ اُس نے اپنے بیٹوں کو خط لکھے۔ اپنے والد کو فون کیا اور پھر سارا دن ایک رسالے کے لیے نفسیات پر ایک مضمون لکھتی رہی۔

شام کو نہا کر اور کپڑے بدل کر وہ دیپک کا انتظار کرنے لگی۔ اُنہوں نے اسے سویڈن سے فون کیا تھا کہ وہ لندن بھی جا رہے ہیں۔ اُنہیں وہاں ہندوستانی سفارت خانے میں کوئی کام تھا۔ زیادہ وضاحت سے وہ فون پر باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ آج اُن کا جہاز دیر سے آ رہا تھا اور وہ بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ تقریباً نو بجے اُس نے کار کی آواز سنی وہ باہر نکل آئی۔ دیپک سفر سے تھکے ہوئے تھے لیکن اُسے دیکھتے ہی اُن کی تھکن دُور ہو گئی۔ (باقی صفحہ ۴۳ پر)

فاروق خالد

بادشاہ کی موت

بادشاہ کی مسخ شدہ برہنہ لاش محل کے وسیع و عریض سفید چوکور ہال کے ڈھلواں فرش پر اپنے خون سے چپکی پڑی تھی۔ یہاں ہال کمرے کے عرض و طول کی لمبائی جتنے، دو دو کی صورت میں آمنے سامنے شفاف، مضبوط پلاسٹک کے آٹھ محراب دار ستون تھے۔ جن کے درمیان ایسے ہی پلاسٹک کے سیدھے اور کونوں میں نوّے درجے کے زاویے والے تختے گِر کر راستے بند کرتے تھے۔ ستونوں کے اوپر چھت بھی شفاف تھی، جو اس وقت کے دُھندلے نیلگوں آسمان کی غلافی چھت لیے ہوئے تھی۔ یہ محل زیرِ زمین پھیلی طویل راہ داریوں اور غلام گردشوں میں منقسم بے شمار خواب گاہوں، لاتعداد چھوٹے بڑے کمروں، جملہ لوازمات سے مزیّن باورچی خانوں اور غسل خانوں کے علاوہ تیراکی کے چھ تالابوں کے اوپر چونسٹھ ہال کمروں پر مشتمل تھا اور حدِ نگاہ تک پھیلے ریگستان میں کسی جزیرے کی مانند تنہا کھڑا تھا۔ بادشاہ سلامت مرنے سے پہلے شاہی لباس میں جلوہ افروز تھا۔ لیکن موت واقع ہوتے ہی اس کے دو وفادار سپاہی گویا اس کی زندگی کی آخری حرکات کے طور پر اس سے آن چمٹے تھے۔ اور آناً فاناً اس کے تاج، پُرشکوہ کپڑوں اور موتیوں اور مخملوں کو اس کے جسم سے علیحدہ کر کے پاس ہی فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے۔

کچھ دیر پہلے کا فرضی زندگی لیے حقیقتاً غیر زندہ بادشاہ اب اپنے مقام پر گلنے سڑنے کی نقطۂ نابود پر ختم ہوتی ہوئی رفتار سے کئی گنا زیادہ تیزی کے ساتھ عبرت ناک ہوتا جا رہا تھا۔ سیاہ فام جنہوں نے اچانک اس پر ہلّہ بول دیا تھا، دراصل اس کے 'تصور کردہ' ماتحت تھے، جنہوں نے اب اسے حواسِ خمسہ سمیت اس کے بہت سے خیالات و تصوّرات سے نجات دلا دی تھی۔

محل کے سیاہ و سفید ڈبہ جیسے ہال کمروں میں دس سالہ جشنِ عہد جاری تھا۔ بادشاہ کے وزیر، سپہ سالار اور سپاہی اس کے ارد گرد مؤدّب کھڑے تھے اور وقتاً فوقتاً جھک جھک کر کورنش بجا لا رہے تھے۔ بادشاہ کسی کو مسکراہٹ کا تحفہ دیتا اور کسی پر سرزنش کرتی نگاہیں ڈالتا اپنے چوکور شب و روز میں سفر کر رہا تھا کہ اس کے وزیرِ باتدبیر نے آکر اطلاع دی کہ محل میں دشمن افراد موجود ہیں جو اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں ہیں۔ بادشاہ پہلے تو لمحہ بھر کے لیے متفکر ہوا پھر وزیر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پورے وجود کے ساتھ بل بلا کر ہنسا اور بولا: "تمہیں وہم ہوا ہے۔ اس خشکی اور پھر تری کے ریگستان در ریگستان میں جہاں کوئی بھی پیدل یا سوار دُور سے دکھائی دے جاتا ہے اور جہاں خود کو روپوش کرنے کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے، دشمنوں کا کیا کام؟" وزیر نے کہا: "جنابِ عالی، آپ کے چند سیاہ فام سپاہی، باورچی، خانسامے اور نچلے درجے کے خادم جنہیں آپ نے سیاہ فام اکثریت کے دل میں جگہ پانے کے لیے یہاں ملازم رکھا ہوا ہے، در پردہ وہ آپ کے مخالف ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی آپ کے ساتھ نمائش کیوں ضروری ہے۔ یا تو آپ انہیں اُن کے عوام میں واپس بھیج دیں یا پھر یہاں انہیں خود سے دُور مگر بہ ظاہر قریب دکھائی دیتے ہوئے ایک ایسے اسرار میں قید رکھیں کہ آپ تک پہنچ ان کے بس میں نہ ہو۔" بادشاہ نے جواب دیا کہ ستونوں کے درمیان گرتی شفاف دیواریں اسی لیے موجود ہیں کہ اگر مبارزت کی کوئی ڈھکی چھپی صورت ہی کیوں نہ پیدا ہو، یہ فوراً اپنا عمل سرانجام دیتی ہیں۔ دوبارہ ہنسنے کے دوران بادشاہ کی موٹی اور چوڑی چکلی زبان اس کے منہ میں تھرکنے لگی۔ اتنے تھوڑے عرصے میں اس کا یوں حرکت پذیر ہونا کسی عذاب سے کم نہ ہوتا تھا۔ وزیر نے سر جھکایا اور اب یہ ایک ایسے شخص کا تاثر دیتا دکھائی دیتا تھا جو کہنا چاہتا ہو کہ میری باتوں سے آپ کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ میرے اندازے یا خدشے ایسے ہیں کہ پیاز یا کیلے کے درخت کے تنے پر سے پرتیں اُتارتے جائیے مگر اندر سے کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ بادشاہ مطمئن انداز

TIDORE STRAAT, 55-3
095, HH/AMSTERDAM
NEDERLAND

سے آگے بڑھنے کو تھا کہ وزیر کا سر خود بخود دوبارہ اُٹھ گیا اور وہ ہر شے کے باطن میں چھپی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے اردگرد پھیلے خطرناک نتائج کے حامل اندیشوں کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا کہ محل میں اچانک کھلبلی مچ گئی۔ سیاہ فام ملازمین نے اپنے فرائض کا چولا اُتار پھینکا تھا اور چند گھوڑوں، ہاتھیوں، ڈھالوں اور نیزوں پر قبضہ کرکے مورچے سنبھال لیے تھے۔ ان کے سربراہ نے اپنے دستِ راست کو اہم امور سمجھائے، گھڑ سوار اور فیل سوار جوانوں کو ہدایات دیں اور پیدل دستے کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ شفاف دیواروں کا خودکار میکانکی عمل شروع ہوچکا تھا۔ یہ مخالفین کے ہر فرد کو، اس کے مقام و رتبے کے لحاظ سے، ایک خاص حد تک اور خاص زاویے میں حرکت کرنے اور حملہ آور ہونے کی اجازت دیتی تھیں۔ عرصہ سے ایک بادشاہ کے زیرِ اثر اس محل میں رہنے والے افراد اب دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے تھے اور ہر ایک گروہ کے لوگ دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ کبھی سیاہ فاموں کا کوئی گھڑ سوار برق رفتاری کے ساتھ ایک ہال کو ٹاپتا ہوا دائیں یا بائیں سمت مُڑتا یا بادشاہ کا کوئی سپاہی دیوانہ وار چلتے ہاتھی پر بیٹھا ایک سیدھ میں دوڑتا آکر دشمن کو کچل دیتا۔ اس معرکے میں بادشاہ کے وزیر، مشیر اور سپاہی اس سے کافی فاصلے پر چلے گئے تھے، مگر پھر بھی اسے حفاظت میں لیے ہوئے تھے۔ اس کا ایک پیادہ سپاہی جو اب اتفاق سے اس کی دائیں جانب دو ستونوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بڑے ادب سے بولا: "حضورِ والا، میرا برسوں پہلے کا بچھڑا ہوا ہم سفر اپنے ہمیشہ کے لڑکپن میں موجود مجھ سے مخاطب ہے کہ آپ کو اس امر سے آگاہ کروں کہ جنگ و جدل یا معرکہ آرائی پیادوں سے جائز نہیں اور اس پوری کائنات میں کوئی شے بھی ایسی نہیں، جو ہم سے اپنائیت کا قابلِ فہم تعلق نہ رکھتی ہو۔ یہ وقتوں پہلے کا ہم سفر مجھے یاد کرانا چاہتا ہے کہ دراصل ہمیں اپنے اُن ناقابلِ فہم تعلقات سے جنگ کرنی چاہیے جو ہم اپنی ذات میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔" بادشاہ نے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور آگے کے ہال میں کھڑے سپاہی کو حکم دیا کہ وہ اپنے سامنے کے دو ستونوں کے پار چلا جائے۔ اس کا وہاں جانا تھا کہ ایک طرف کے چار ہال کمروں کے زاویے دار شفاف تختے اوپر کو اُٹھے اور سیاہ فام فیل سوار نے آکر "لڑکپن والے" سپاہی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جو ڈھلوان فرش پر گرتے ہی محراب دار ستونوں کے بیچ میں سے پھسلتا ہوا محل کے باہر ویرانے میں جا پڑا۔ سیاہ فام فیل سوار کا یہاں آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیوں کہ بادشاہ کی دائیں جانب دو ستونوں کے درمیان والے پلاسٹک کے تختے فوراً اوپر کو اُٹھے تھے، جہاں سے گزر کر اُس نے سیاہ فام فیل سوار کو زمین بوس کر دیا تھا اور جس کی لاش بھی اپنے مُردہ فیل سمیت چند ہال کمروں کے فرشوں سے پھسلتی ہوئی باہر جا پڑی تھی۔ اب کونے میں ڈھال اور نیزہ سنبھالے سیاہ فام نے آکر دشمن کے سپاہی کو مار گرایا۔ بادشاہ کا وزیر بدلہ لینے کے لیے اُس کے سامنے پہنچا۔ سیاہ فاموں کے سربراہ نے ڈھال اور نیزہ سنبھالے ساتھی کو اپنی جگہ سے نہ ہلنے کا اشارہ کیا اور اپنے وزیر کو اس کے سامنے کی آخری دوسری صف میں بھیج دیا۔ مخالف گروہ کا ایک گھڑ سوار جلدی سے ایڑ لگاتا سیاہ فام وزیر اور بادشاہ کے درمیان آگیا۔ پلاسٹک کے چوڑے اور چکور تختے اپنے خودکار نظام کی وجہ سے گر اور اُٹھ رہے تھے۔ اب معرکہ آرائی انتہائی فیصلہ کُن حدود میں داخل ہوگئی تھی — اگر سیاہ فام وزیر بائیں طرف کے ہال میں کھڑے بادشاہ کے گھڑ سوار کو ہلاک کرے تو پھر اس کا بادشاہ سے یا پھر اس کے ایک فیل سوار سے بچنا ناممکن تھا اور اگر یہ بادشاہ پر وار کرنے کے لیے اپنی بائیں جانب آگے یا پیچھے کے ہال میں داخل ہو تو بھی اس کی موت یقینی تھی۔ سیاہ فاموں کے سربراہ نے اُسے بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیا اور اپنے ایک اور ڈھال اور نیزہ سنبھالے سپاہی کو آگے روانہ کیا۔ بادشاہ کا وزیر جلدی سے سیاہ فاموں کے وزیر کے سامنے والے ہال میں پہنچا۔ مگر وہ بادشاہ کے لیے جانی خطرہ بن کر اس کے مقابلے میں آیا۔ اب اگر بادشاہ کا گھڑ سوار اسے ہلاک کرتا ہے تو سیاہ فاموں کا ڈھال اور نیزہ سنبھالے سپاہی اس گھڑ سوار کو موت کے گھاٹ اُتار کر اپنے ساتھی کی جگہ لیتا ہے، جس سے کہ کسی شدید خطرے کا احتمال نہ تھا، مگر بادشاہ یہ اندازہ نہ لگا سکا اور جان بچانے کے لیے جلدی سے پیچھے کے ہال میں داخل ہوا۔ سیاہ فاموں کا وزیر بائیں جانب پیچھے کے ہال میں پہنچ کر بادشاہ کے لیے پھر موت کی شکل میں موجود تھا۔ بادشاہ نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک فیل سوار کو سامنے کے ہال میں بھیجا جو فوراً ہی سیاہ فام فیل سوار کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر کر ویرانے میں لُڑھک گیا۔ بادشاہ غصہ اور طیش میں آکر دشمن فیل سوار پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی موت لازمی تھی، مگر بادشاہ کی یہ پیش قدمی اس کی اپنی مصنوعی زندگی کا انجام ثابت ہوئی تھی — سیاہ فاموں کا وزیر اب پھر اس کے لیے موت کی شکل میں موجود تھا جس سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

جوں ہی بادشاہ کی موت واقع ہوئی اُس کے دو سپاہی گرتے پڑتے اس کی لاش کے پاس پہنچے اور اسے مادر زاد برہنہ کرکے قریب ہی ڈھیر ہوگئے۔ تب بادشاہ غیر سلامت کے تمام آدمی اپنی جگہوں پر سواریوں سمیت مُردہ ہوکر گر پڑے گویا کہ اُنہوں نے بھی زہر سے بُجھی اُنیوں سے اپنے اور اپنے جانوروں کے جسموں سے زندگی کو خارج کر دیا ہو۔ ماسوائے بادشاہ کے، ان سب کی لاشیں ڈھلوان فرشوں پر لُڑھکتیں، ستونوں سے ٹکراتیں، محل کے باہر مختلف اطراف میں جا پڑیں۔ سیاہ فام تھوڑی دیر کے لیے یہاں کھڑے رہے اور پھر اپنے مُردہ ساتھیوں کو دفنانے کی غرض سے باہر نکلے۔ انہوں نے انہیں عزت و احتشام کے ساتھ سپردِ خاک کیا اور غیر حقیقی موت اور حقیقی زندگی کے مابین جو مختصر سا فاصلہ ہے اس کا، قدرت کی طرف سے اپنے بدنوں میں اُترتی دُعا کے طور پر، اندازہ لگایا۔ کچھ دیر وہ یہاں بلاحس و حرکت کھڑے رہے جیسے اپنے بچھڑے ساتھیوں کے ساتھ کسی پوشیدہ مطابقت کو جان لینا چاہتے ہوں، تب فتح کی صورت میں اپنے آپ سے کیے وعدے کو نبھانے کے لیے وہ محل کی زیرِ زمین تعمیر میں اُترے۔ یہاں کئی غلام گردشوں اور راہ داریوں سے ہوتے ہوئے اچانک ایک ایسے کمرے میں پہنچے، جس کی ہلکی سبز دیواریں یوں جا بجا چھپکلیاں بنے ہوئے تھیں جیسے یہ فوجیوں کی ڈب کھڑبی وردی

ہو۔ انہیں اس طرف زیادہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ کیوں کہ قریب ہی کونے میں ایک عورت کی سربریدہ برہنہ لاش پڑی تھی۔ اس سے تعفن یا کسی قسم کی بدبو وغیرہ نہیں آرہی تھی۔ مگر ناف کے نیچے مکڑی نے جالا بُن دیا تھا۔

اس بے پردہ مُردہ جسم کو دیکھتے ہی انہوں نے اطراف کا بغور جائزہ لیا مگر نہ تو انہیں کہیں سپاہیوں کے مُردہ جسم دکھائی دیے اور نہ ہی یہاں کا فرش ڈھلواں تھا۔

وہ اس جگہ سے ٹلنے کی سوچ رہے تھے کہ انہیں سامنے بند دروازے کے عقب سے یکسانیت لیے ہلکی ہلکی سرسراہٹ سُنائی دی۔ ایک سیاہ فام نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

یہ ایک قدرے پست چھت کمرا تھا جس کی چھت میں واقع ایک چھوٹے سے سوراخ سے گیہوں کے دانے گر رہے تھے۔

وہ پہلے تو حیرت سے اس منظر کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی دانوں کو ہتھیلی میں رکھ کر ان کا قریبی جائزہ لیا۔ سب کی نظریں اس اثبات کی غماز تھیں کہ یہ کرم خوردہ اناج ہے، جس کے شگاف گو مختلف انداز کے ہیں۔ مگر ان پر کچھ مہین مہین سا لپٹا ہوا ہے۔ سیاہ فام یہاں سے الٹے قدموں واپس ہوئے۔ یہ پانی بھرے تالاب میں اس فرض کو پورا کرتے پہنچے، جس کا انہوں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ یہاں ایک طرف کنارے پر لکڑی کا چراغ جل رہا تھا اور قریب ہی دیوار پر لگا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ ایک سیاہ فام نظریں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگا تو اس کے ساتھی نے کہا "ادھر مت دیکھو، ہم وقت کی اس طور پر تقسیم سے آزاد ہیں اور نہ ہی گھڑی وقت کا ساتھ دیتی ہے۔ اس میں ایک موقع آتے یہ وقت مُردہ ہو جاتا ہے جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ جب رات کے بارہ بجتے ہیں تو اس کے بعد پھر سے ایک شروع ہوتا ہے اور یہ "ایک" گھڑی میں صفر سے اپنا آغاز کرتا ہے۔ مگر وقت کے سفر میں کبھی صفر نہیں آتا۔"

پہلے شخص نے جواب دیا "نہیں، میں یہ سوچ رہا ہوں جب انسان نے پہلے پہل آگ دیکھی ہوگی تو اس نے کیا خیال کیا ہوگا اور تم اس وقت کا بھی اندازہ لگاؤ جب سورج نہیں تھا۔"

یہ بات سب نے سُنی اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے ایسا سوال پوچھنے لگے جس میں جواب بھی مضمر تھا۔ خود سے کیے وعدے کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے چُست جانگیے پہنے۔ زیرِ آب سانس لینے کے لیے گیس سلنڈر شانوں پر باندھے اور ہاتھوں میں وزنی ڈمبل لیے پانی بھرے تالاب کے فرش پر دوڑنے کے ارادے سے اندر کود پڑے۔ وہ وقفوں کے بعد تالاب سے باہر آتے۔ اپنے اجسام کو خوراک و آرام بہم پہنچاتے اور پھر پانی میں کود کر پہلے والے عمل میں شریک ہو جاتے۔ ایک عرصہ بعد جب انہوں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی تو اس پر وقت جوں کا توں وہی تھا۔ مگر نیچے فرش پر چراغ موجود نہیں تھا۔ وہ سب وہاں پہنچے جہاں بادشاہ کی لاش کو چھوڑ گئے تھے۔ فرش پر نیچے اس کے اپنے خونی نقشے پر اس کا نام و نشان مٹنا شروع ہو چکا تھا۔

بقیہ: رعنائی خیال

نوکر سامان رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو وہ اُن سے لپٹ گئی۔ پھر آہستہ سے بولی "مجھے —— کیا تھا۔"

دیپک نے شرارت سے مسکرا کر جواب دیا —

"بالکل نہیں۔" وہ بھی ہنس پڑی۔

ملت کا کھانا کھا کر دیپک نے اپنا بریف کیس کھول کر مسکراتے ہوئے ایک تصویر اسے دی۔ اس نے سرورق پلٹ کر دیکھا۔ رنجیت اور ایک انگریز عورت اُس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ وہ تعجب سے بولی "یہ کون ہے؟"

"ان کی بیوی۔ چند ہفتے ہوئے ان دونوں کی شادی ہوگئی ہے۔ رنجیت بہت خوش ہیں۔ ہم دونوں تمہاری باتیں کرتے رہے۔ اُس کے دل میں تمہاری ذہانت اور تمہاری شخصیت کی بڑی عزت ہے۔ میں نے لندن جا کر اُن کو فون کیا تھا۔ کالج ہی میں تھے۔ بڑے اصرار سے اپنے گھر بلایا۔ بڑی خوشی ہوئی اُنہیں دیکھ کر۔ یہ تصویر اُن کی بیوی نے خاص طور پر تمہارے لیے بھیجی ہے۔ دیکھو کیا لکھا ہے۔"

اُس نے دیکھا۔ لکھا تھا:

To, Raj and Deepak.
With best wishes. Cathy

اس کے نیچے رنجیت نے لکھا تھا:

To, my dear friends who
taught me to love.

بقیہ: دل بھی تو ہے

نے کیا تھا۔ ورنہ میری دلچسپی تاریخ میں تھی۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر تم نے ہسٹری لی تو اُن کتابوں کا کیا بنے گا جو میں تمہارے بڑے بھائی کے لیے خرید چکا ہوں۔

بیماری کے بعد جب میں پہلی بار درزی کو ناپ دینے گیا تو اُس کے ہاتھ لگانے سے مجھے بڑی گدگدی ہوئی۔ درزی حیران ہو کر پوچھنے لگا "کھی کھی کیوں کر رہے ہو۔ زندگی میں پہلے کبھی ناپ نہیں دیا۔" میں اس کو سچ کیا بتاتا۔ گھر کے بھید کوئی دوسروں کو بتاتا ہے کیا۔

ایک فائدہ اس بیماری کا یہ بھی ہوا کہ میں یہ مضمون لکھ پایا ہوں۔ تقریباً تمام مزاح نگار اپنی اپنی بیماریوں پر مضمون لکھ چکے ہیں۔ کسی نے داڑھ کے درد کا قصہ لکھا تو کسی نے ٹانگ ٹوٹنے کی داستان۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میری اچھی صحت نے مجھے ایک مضمون سے محروم کر رکھا ہے۔ میں اپنے بیمار دل کا شکر گزار ہوں جس کی وجہ سے اب میں بھی دوسرے مزاح نگاروں کے سامنے گردن اکڑا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہم بھی اب پانچوں سواروں میں ہیں۔

ستیش بترا

جولے لدّاخ ــ ۹ (آخری قسط)

الوداع لدّاخ ــ پھر ملیں گے!

اٹھارہ تاریخ آن پہنچی تھی، جب ہمیں صبح کی فلائیٹ سے چنڈی گڑھ روانہ ہونا تھا، لیکن اٹھارہ تاریخ آئی اور چلی گئی ۔ اور ابھی تک ہم لیہہ میں تھے ۔ اسی ہوٹل میں ـــــ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے قیام وطعام کی ذمہ داری اب انڈین ایرلائنس نے سنبھال لی تھی ۔

ہوا یہ کہ ہم صبح سویرے ہوٹل کے مالک سجاد حسین صاحب سے رخصت ہوکر ہوٹل کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ایرپورٹ پہنچ گئے ۔ وہاں سامان اور ٹکٹ چیک کروائے ۔ ذاتی تلاشی دی ۔ معلوم ہوا فلائٹ خرابیٔ موسم کی وجہ سے کچھ دیر میں آئے گی ۔ کچھ دیر کے بعد ناشتے کے نام پر دو بسکٹ اور اورنج کی بوتلیں ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئیں ۔ ابھی ہم ان مرحلوں سے گزر ہی رہے تھے کہ اعلان ہوا کہ دہلی ۔ چنڈی گڑھ سے آنے والی فلائٹ جسے ہمیں چنڈی گڑھ ۔ دہلی لے جانا تھا، لگاتار خرابیٔ موسم کی وجہ سے منسوخ کردی گئی ہے ۔ اب ہمیں اگلی فلائٹ ایک دن کے وقفے کے بعد ملے گی ۔ لہٰذا ہمیں ہوٹلوں میں قیام وطعام کے کوپن دے کر سرکاری مہمان بنا دیا گیا ۔ (کسی غلط معنوں میں نہ لیجیےگا)

قیاس آرائیاں ہوئیں کہ اگر اگلی فلائٹ بھی اسی طرح منسوخ ہوگئی تو ..... کچھ مسافروں کو دہلی سے دوسری جگہوں کے لیے ریل یا ہوائی جہاز کی سیٹیں تک تھیں ۔ کچھ لوگوں کو کسی نہ کسی ضروری سلسلے میں دو چار روز بعد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا لازمی تھا ۔ بہرحال سرکاری مہمان ہونے کی بدولت ہم میں سے بہت سے لوگ مطمئن تھے کہ چلیے اسی بہانے لیہہ میں مزید قیام کی گنجائش نکل آئی اور وہ بھی سرکاری خرچ پر ۔ اگرچہ آنے جانے والی ٹیکسی کا بھاڑا ہمارے ہی ذمّے تھا ۔

لیہہ کا ہوائی اڈّہ ہوائی فوج کی تحویل میں ہے اور ایرلائنس کے جہازوں کو اترنے چڑھنے کی اجازت صرف دس گیارہ بجے تک ہے ۔ چونکہ عموماً چنڈی گڑھ اور لیہہ کے بیچ بعد دوپہر موسم بہت خراب ہو جاتا ہے اس لیے دوپہر یا بعد دوپہر کی اڑانیں ممکن نہیں ہوتیں ۔ اور پھر گیارہ بجے کے بعد ہوائی فوج کا انتظامیہ اس ہوائی اڈے کو اپنے طیاروں کی اڑانوں کے لیے وقف کر دیتا ہے ۔ لہٰذا مسافروں کو اس پریشانی کا سامنا اکثر کرنا پڑتا ہے ۔ مقامی ایرلائنس کا عملہ لیہہ میں ہوائی فوج کے اور دہلی میں اپنے انتظامیہ کے رحم وکرم پر ہے ۔ اور ان دونوں کا تال میل لیہہ سے آنے والی اڑانوں کے لیے بےحد ضروری ہے ۔ لیہہ سے ایک اڑان سری نگر بھی جاتی ہے اور اس طرح سے چند مخصوص دنوں پر براستہ سری نگر دہلی پہنچنا بھی ممکن ہو جاتا ہے، لیکن اس کا دارومدار اس فلائٹ اور سری نگر سے دہلی جانے والی فلائٹ کی خالی نشستوں پر ہوتا ہے اور پھر ہم تو چنڈی گڑھ کے مسافر تھے نہ کہ دہلی کے ۔ مقامی دفتر سے ایک مخصوص فلائٹ کا تقاضا بھی کیا گیا ۔ کیوں کہ آئندہ اڑانوں میں پیشگی ریزرویشن والوں کا بار ہونا بھی لازمی تھا ۔

اب ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے کا وقت تھا ۔ اس دوران کرشنا بھابی اور تربیت کو انتہائی مصروف رکھنا بھی ضروری تھا ۔ کیوں کہ اس فالتو وقت کا نزلہ بازار میں خریداری کرتے ہوئے ہم پر اثرانداز ہو سکتا تھا ۔ لہٰذا پریم بھائی صاحب اور میں نے انتہائی رازداری اور حکمتِ عملی برتتے ہوئے ان دونوں کے پاس سے فالتو رقم کا چارج لے لیا ۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ اقدام اُن کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے اور اس کی کچھ تلافی بھی ہوتی چاہیے ۔ ہم نے انہیں قریبی ویڈیو پارلر کا شو دکھانے کا پروگرام بنایا ۔ شو کے اوقات تک فارغ ہونے کی وجہ سے ہم نے قریبی ٹورسٹ آفس میں جاکر لدّاخ کے مختلف نقشوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لدّاخ میں کم سے کم ۲۱ چوٹیاں ایسی تھیں، جن کی بلندی ۲۰ ہزار فٹ سے زائد تھی ۔ ان میں سے چند چوٹیوں کی بلندی حسب ذیل ہے :

قراقرم ۲۶۰۰۰ فٹ ۔ نُنرا ۲۵۱۸۰ فٹ
دکُن ۲۳۴۱۰ فٹ ۔ کُمن ۲۳۲۱۹ فٹ

اور پھر اس کے بعد تو لیقیہ، اچوٹیوں کا تانتا سا ہے۔ اس لیے کچھ عجب نہیں کہ لداخ کوہ پیمائی کے شوقینوں کو دعوت دیتا ہے اور یہ شیدائی یہاں مقناطیس کی طرف کھنچے چلے آتے ہوں۔ ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے درجنوں کاروباری ادارے اور ایجنسیاں موجود ہیں، جو انہیں خیمے، قلی، خچر، گائڈ، آکسیجن سلنڈر، کھانے پینے کا سامان اور دیگر متعلقہ ضروریات فراہم کرتے ہیں۔ دراصل کوہ پیمائی کے شوق نے دنیا بھر میں ایک نئی صنعت کو جنم دیا ہے، وادیٔ کشمیر کی طرح سیاحت بھی لداخیوں کو ایک اہم ذریعۂ معاش فراہم کرتی ہے اور ایسے مواقع دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔

ہمارا پروگرام غیر یقینی ہونے کی وجہ سے اہم چینی محاذ کے پاس واقع یہاں سے ڈیڑھ دو سو کلومیٹر دور پینگانگ جھیل جانے سے بھی قاصر رہے حالانکہ سنیل نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے توسط سے وہاں جانے کی تمام سہولیات مہیا کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ ہم اس علاقے میں دورہ کرتے ہوئے سینیئر افسروں کے ساتھ وہاں جا سکتے تھے۔ یہ علاقہ مکمل طور پر فوج کی تحویل میں ہے، جہاں فوجی عملے کے علاوہ کسی کو جانے کی اجازت شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ یہاں صرف یہی مشکل تھی کہ ہمیں آنے جانے میں دیر سویر ہو سکتی تھی۔ اور جس کی وجہ سے ہماری فلائٹ کے اوقات کی پابندی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ہمیں پینگانگ جھیل کے بارے میں بتایا گیا کہ وہاں کے حسین نظارے جنت کے نظاروں سے کم نہ تھے۔ ٹھہرے ہوئے زمردیں پانی میں آس پاس کی پہاڑیوں کے ہلکورے کھاتے عکس ایک نادر نظارہ مہیا کرتے ہیں۔ ۱۴۰ کلومیٹر لمبی اور چار چھ کلومیٹر چوڑی جھیل کے بیچوں بیچ ہند چینی سرحد ہے جس کے آر پار گرمی کے موسم میں اپنے اپنے حصوں میں ہندوستانی اور چینی فوجی کشتیاں گشت لگاتی رہتی ہیں۔ جھیل کے آس پاس اور اس کی پُرسکون سطح پر قدرتی نباتات اور حیوانی زندگی مرحدود سے غافل اپنی مستی میں لہراتی رہتی ہے۔ دن کی بدلتی روشنی میں اور خصوصاً شام کو ڈوبتے سورج کی ارغوانی روشنی میں یہ جھیل کتنے دلکش رنگ بدلتی ہے۔ انہیں قدرت کا شاہکار ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہاں پہنچنے کے لیے کھرڈنگلا درہ (اونچائی ۱۸،۳۷۶ انٹ) پار کرنا پڑتا ہے اور اس فوجی سڑک کو دنیا بھر کی سب سے اونچی سڑک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں راہ گیر خدا سے باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ اس درہ کے پار ہی لداخ کی سب سے حسین اور ہری بھری وادی نبرا ہے۔ جہاں خوبانیاں، بیڑا اور شہتوت کے پیڑوں کے جنگل ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہم نے ابھی تک لداخ کا آدھا حصہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لاہول سپتی سے زنسکار کا علاقہ تو ہم نے ابھی نقشوں ہی میں دیکھ کر ہی اپنی معلومات میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ کاش کہ ہم لداخ پوری طرح دیکھ سکتے۔ پینگانگ جھیل دیکھنے کا موقع تو ہم نے خواہ مخواہ کھو دیا۔ پریم بھائی صاحب تو مایوسی کے عالم میں کبھی کبھی یہ نیم مصرعہ گنگناتے۔ "یہ نہ تھی ہماری قسمت ...." بہر حال سمجھوتا ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے تو آپ بھی قائل ہوں گے۔

اس دوران شہر گھومتے گھومتے ہماری نظر اکثر سایہ کیے ہوئے قدیم لداخی شاہی محل پر جا پڑتی۔ پریم بھائی صاحب کے پاس وقت ہو اور کوئی ایسی دلفریب عمارت دعوتِ نظارہ دے، یہ ناممکن تھا کہ وہ توجہ سے محروم رہ جائے۔ نہ جانے اب تک کیوں موقع ہاتھ نہیں لگا تھا۔ غالباً اس لیے کہ اس بوسیدہ محل میں اب کچھ زیادہ دیکھنے کو نہیں بچا تھا۔ پھر بھی عمارت تو سامنے تھی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ پر اس پر دھاوا بولنے کے ارادے سے پوچھا تو میں نے انہیں تربت اور کرشنا بھابی کی رضامندی لینے کے لیے اشارہ کر دیا۔ جیسا کہ ہمارا قیاس تھا۔ وہ دونوں اتنی بلندی پر پیدل جانے کے لیے تیار نہ تھیں۔ وہاں تک جیپ جانے کے لیے بھی کوئی سڑک نہ تھی۔ اس محل کے راستے شہر کی پُرپیچ گلیوں میں سے گزرتے ہیں اور نیچے محل تک جاتے تھے۔ لہٰذا اس محل کو سر کرنے کا پروگرام اگلی دوپہر کے لیے بنا لیا گیا۔

اگلی دوپہر جب خواتین سستا رہی تھیں۔ ہم دونوں اس شاہی محل کو دیکھنے کے لیے نکل پڑے۔ شہر کی گلیوں اور حویلیوں میں سے گزرتے کبھی کبھار گھروں کے بیچوں بیچ ہوتے ہوئے ہم محل جانے والی پگڈنڈی پر پہنچ گئے۔ محل جانے کے لیے شہر کی مختلف سمتوں سے تین چار پگڈنڈیاں اوپر جاتی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ ان میں سے کوئی بھی پگڈنڈی ہماری پگڈنڈی کے مقابلے میں زیادہ چوڑی یا زیادہ سہل نہ تھی۔ یوں بھی حاکم تک رسائی اتنی سہل نہیں ہوتی۔ یہ پگڈنڈیاں ان کا واضح ثبوت معلوم ہوتی تھیں۔ دور سے یہ شاہی محل ایک مستطیل شکل لیے ہوئے ہے۔ ایک کے اوپر ایک دیو جسامت پتھر جمائے یہ شاہی محل آسمان سے باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ اہرام مصر کی طرح ہی اتنے قوی ہیکل پتھروں کو ان بلندیوں پر پہنچانے کا راز صرف مزدوروں اور غلاموں کی ہمت اور ان تھک کوششوں ہی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ نہ جانے کتنی جانیں قربان ہو گئی ہوں گی اس قصرِ شاہی کو بناتے بناتے!

محل کے مشرق میں ایک لکڑی کا نہایت بڑا شیر ہے کہا جاتا ہے کہ محل کے عروج کے زمانے میں یہ شیر ایک رسی سے بندھا اپنے پنجرے سے اندر اور باہر نکالا جاتا تو وہ اس وقت دہاڑتا۔ ہو سکتا ہے اُن دنوں یہاں سچ مچ کا شیر ہی رکھا جاتا ہو ورنہ ٹیپ ریکارڈر سے محروم زمانے میں یہ دہاڑ کیسے اور کیوں کر پیدا کی جاتی ہوگی، ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ یہاں سے چٹان میں کھدی اونچی سیڑھیاں ایک دربار نما دالان میں کھلتی ہیں جو شاید اس سنہری زمانے میں رقاصاؤں کے تھرکتے پاؤں کی جھنکار سے گونجتی ہوں گی یا پھر اسی دربار میں امن اور تجارت جیسے مختلف موضوعات پر بحث مباحثے ہوتے ہوں گے۔ آج کا یہ دالان کسی زمانے کا شاہی دربار تھا، جس کی دیواریں حسین بودھی حکایتوں سے منقش تھیں اور جو ڈوگروں کے حملے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ آج یہ بوسیدہ محل چمگادڑوں کا مسکن بن چکا ہے۔ محل کے اندر جگہ جگہ لکڑی کی بوسیدہ کرم خوردہ زینے ہیں، جن سے آج بھی احتیاط کے ساتھ

ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ محل کے اندر بھی دو ایک خانقاہیں ہیں جہاں سے آنے جانے راہبوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ محل کا ایک گوشہ اب بھی اس کے وارثوں کے لیے وقف ہے۔

محل سے اوپر بلندی پر ایک شاہی خانقاہ الگ بنی ہوئی ہے جس کی طرف ایک تیکھی اور دشوار پگ ڈنڈی جاتی ہے۔ یوں تو محل سے خانقاہ کچھ زیادہ بلندی پر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر جب ہم نے چڑھنا شروع کیا تو مجھے چکر آنے لگے۔ شاید اس کی اونچائی اور پھر آکسیجن کی کمی اس کے لیے ذمہ دار ہوگی چونکہ دو سال قبل ہی میں دل کے عارضے کا شکار رہا تھا۔ پریم بھائی صاحب نے مجھے یہ جوکھم لینے سے منع کیا۔ اور مجھے ایک پتھر پر بٹھا کر خود ایک بھیڑ کی مانند اس پگ ڈنڈی پر روانہ ہو گئے۔ میں پتھر پر بیٹھا ان بلندیوں سے لیہہ شہر کا جائزہ لیتا رہا۔ سارا شہر کیا آس پاس کی پہاڑیاں بھی حدِ نظر میں تھیں۔ قدرت کی گود میں بسا یہ شہر سچ مچ بے حد حسین اور روح پرور نظارہ پیش کرتا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر شہر کے بڑے بازار کی طرف دیکھا۔ مجھے یکایک احساس ہوا کہ اگر میرے پاس سے کوئی بھی پتھر لڑھکا تو وہ سیدھا جھانک گلی ہی میں جا کر رکے گا۔ جیسے روحانی بلندیوں سے گر کر جھانک گلی میں گرنا کوئی فطری عمل تھا۔ زندگی کی یہ شاہراہ ان ڈانڈوں کو عجب طرح سے ملاتی تھی۔

اگلے روز ہم پھر ایک بار سجاد حسین صاحب اور ہوٹل کو الوداع کہہ کر ایرپورٹ پر موجود تھے۔ بالکل پہلے دن کی طرح۔ ہمارا سامان ایرلائنز کے عملہ کو سونپا گیا۔ اسی طرح ذاتی تلاشی دینے کے بعد ہم رخصتی لاؤنج کی چھت کے نیچے بیٹھے تھے آج بھیڑ پہلے روز سے کچھ زیادہ تھی۔ اسی طرح ہوائی جہاز کے تاخیر سے آنے کا اعلان ہوا اور پھر پہلے کی طرح ہی ناشتے کے نام پر بسکٹ اور ڈرنک تھما دیے گئے۔ اور پھر چند منٹ بعد فلائٹ بالکل اسی طرح سے منسوخ ہونے کی خبر سنائی گئی۔ ایک بار ہم پھر اپنا سامان ٹیکسی میں لاد کر واپس ہوٹل کھانگری پہنچ گئے۔ سجاد حسین صاحب نے واپس ہمارے کمرے سونپ دیے۔ اب کی بار ہمیں یہ سرکاری مہمانی کچھ زیادہ اچھی نہ لگی۔ اب اگلی فلائٹ کا ہمیں اگلی صبح تک انتظار کرنا تھا۔

سارا دن کوفت میں بیتا۔ ایک بات باعثِ مسرت تھی کہ لیہہ میں بڑھتے قیام کے ساتھ ساتھ ہماری لداخی زبان دانی کے ذخیرے میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جیگشی (شکریہ) کے ساتھ جو جملہ ترپت کا مرغوب ترین جملہ تھا۔ وہ تھا "چاہ مینی دو کان کا ئیز دوت" (چائے کی دکان کہاں ہے) شاید اس لیے کہ وہ چائے کی رسیا ہے اور اسے ہر دو گھنٹے بعد چائے درکار ہے۔ گرچہ ہمیں کرشنا بھابی کے "نیا۔ بازار قا زت!" (بازار کہاں ہے؟) جیسے جملوں سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ اب وہ ہوٹل کے بیرے لڑکوں کو نونو اور لڑکیوں کو ... کہہ کر بلانے لگی تھیں۔

اس دوران ہم نے کچھ بچوں سے لوک گیت بھی سیکھ لیے تھے۔

لو... لالو لو جھوں لا لو لو!

... لو... لو۔

(... کے حضور میں چلو! بدھ کے حضور میں چلو۔ دھرم کے حضور میں چلو۔)

یا پھر

الی دے ایلی دے ... دے!

... دے ... دے ... دے ... دے!

(ہمیں الی ... دیجیے (الی بی سستے قسم کے زیور ہیں) سونی دیجیے۔ لوٹی ہوئی ہی کیوں نہ ہو، کوڑی بھی چاہے ٹوٹی ہوئی ہو۔ چمٹی دیجیے)

اور ہم سب ان کے لوک گیتوں کو بیٹھے بیٹھے گانے لگتے۔

اگلی صبح ہم معمول کی طرح پھر ایرپورٹ پر موجود۔ آج آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا لہٰذا پُر امید نگاہیں آسمان میں آنے جانے والے جہاز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہم پھر رخصتی لاؤنج میں کرسیاں سنبھالے جہاز کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک پھر فلائٹ کی تاخیر کا اعلان ہوا۔ چنڈی گڑھ اور لیہہ کی پہاڑیوں میں پھر موسم خراب تھا۔ ابھی بسکٹ اور ڈرنکس نمودار ہی ہوئے تھے کہ کرشنا بھابی نے پیشین گوئی کی "لو اب فلائٹ کینسل ہونے کا اعلان بھی ہونے کو ہے"۔ اور سچ مچ اگلے پانچ منٹوں میں یہ اعلان ہو گیا۔ اب کی بار یہ انکشاف بھی ہوا کہ اب ہم سرکاری مہمان نوازی کے بھی حق دار نہ ہو سکیں گے۔ سچ بات تو یہ تھی کہ ہماری ٹکٹوں کے بھاڑے سے کہیں زیادہ انڈین ایرلائنز ہماری مہمان نوازی پر خرچ کر چکی تھی، لیکن اس میں ہمارا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ ادھر ہر بار آنے جانے کی ٹیکسی کا بھاڑا اسی روپے بیٹھتا ہمیں ہی چکانا پڑتا۔

اگرچہ ایرلائنز والے کئی دنوں سے دہلی کنٹرول سے اضافی فلائٹ کا تقاضا کر رہے تھے۔ لیکن یہ خواب ابھی تک شرمندۂ وفا تھے۔ ہر فلائٹ کینسل ہونے کے ساتھ ساتھ مسافروں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کی پونجی بھی اب ختم ہونے کو آ رہی تھی اور شاید وہ ایک مزید جھٹکے کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہ گئی تھی۔ کچھ کم ہمارا تو یہی حال تھا۔ ایرلائنز کی بے وفائی پر سب لوگ چیں بجبیں تھے۔ دہلی پہنچ کر اخبار میں واویلا مچانے اور پارلیمنٹ میں سوال اٹھانے کے درجنوں پلان بنائے گئے۔ اُدھر یہ افواہ بھی تھی کہ زوجیلا کو بھی بُرے موسم نے گھیر رکھا تھا جس کی وجہ سے سڑک کسی وقت بھی بند ہو سکتی تھی۔ لہٰذا مسافر بھاگ بھاگ کر بسوں، ٹیکسیوں میں غرض یہ کہ جس سواری کا بھی امکان نظر آتا اپنی سیٹیں بک کرا رہے تھے۔ ہم نے بھی ایرلائنز کے ٹکٹ واپس کر کے بسوں میں پناہ لینے کی ٹھانی۔ خوش قسمتی سے ایک بس کی آخری چار سیٹیں ہمارے ہاتھ لگیں اور ہم خدا کا شکر بجا لائے۔

اب سری نگر تک دو دن اور پھر وہاں سے دہلی تک کی مزید دو دن کی مسافت سامنے تھی۔ چنڈی گڑھ جانے والا پلان منسوخ قرار دیا گیا۔ اگر جموں سے ہمیں ریل کی سیٹیں مہیا ہو گئیں تو بہتر ورنہ اگلے چار یا پانچ روز کا سفر بس ہی میں طے کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جہاں یہ چار یا پانچ دن کی جان لیوا مسافت سامنے تھی، وہاں یہ خیال کہ ہمیں لداخ کے پہاڑ اور زوجیلا کے نظارے دیکھنے کو پھر ملیں گے، ہمیں خوش گوار سکون بھی دے رہے تھے۔

ہم سب ایک بار پھر بس میں بیٹھے لداخی پہاڑوں کے جلوے ذہن میں بسانے میں محو تھے۔ جب پریم بھائی صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے منالی[1] لیہہ شاہراہ

(آگے صفحہ ۱۸ پر)

---

[1] یہ سڑک حال ہی میں اکتوبر ۱۹۸۷ء میں بن کر تیار ہوئی ہے۔

دلیپ سنگھ

دل ہی تو ہے

۶ر اپریل ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ میں دفتر میں اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ میرے دل میں شدید درد اٹھا۔ اسی درد کو بعد میں دل کے دورے کا نام دیا گیا۔ دفتری زبان میں 'دورے' کے لفظ کو دل وجان سے پسند کیا جاتا ہے لیکن دل کے دورے سے بڑے بڑے خوف کھاتے ہیں۔ بظاہر دو دوروں میں اتنا فرق ہونا تو نہیں چاہیے، لیکن کیا کیا جائے کہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر سرکار اپنے اُن افسران کو جو دورے کے ہر دم متلاشی رہتے ہیں، یہ بتا دے کہ دورے کے ساتھ آپ کے دل کو بھی دورے پر بھیجا جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ سرکاری خرچ میں لاکھوں روپے کی بچت ہو سکتی ہے۔

میں اپنے دل کے دورے کا ذمہ دار اپنے شاعر دوست کو نہیں ٹھہراتا، کیوں کہ وہ بے چارا تو مجھے وہی شعر سنا رہا تھا، جو میں سینکڑوں بار پہلے سن چکا تھا اور میں وہی داد دے رہا تھا جو پہلے کئی بار دے چکا تھا۔ مجھے اس سے شکایت ہے تو بس اتنی کہ جب میں نے اس سے ذکر کیا کہ میرے دل میں درد اٹھ رہا ہے تو بجائے مجھے ہسپتال لے جانے کے اس نے مجھے یہ کہہ کر تسلی دی کہ مرزا غالب نے کہا ہے کہ : ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

اُس دن مجھے احساس ہوا کہ اردو شاعروں نے سیکڑوں ایسے شعر کہہ رکھے ہیں جو بوقتِ ضرورت کام آنے کی بجائے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ایک چچا ایک اُردو شعر ہی کی وجہ سے اپنی جان کھو چکے ہیں۔ جنگل میں ایک ندی میں نہاتے ہوئے اُنہوں نے ایک شیر کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے کی بجائے وہ ایک طرف کو ہٹ گئے۔ کیوں کہ اُنہوں نے اردو شاعر کا یہ مصرعہ سن رکھا تھا کہ : ع

شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

لیکن شیر کو اس مصرعے کا علم نہیں تھا، چنانچہ اُس نے سیدھا تیرنے کی بجائے دائیں طرف کا رُخ کیا اور چچا جان کو جا لیا۔ میری چچی نے اُس شاعر پہ ہرجانے کا مقدمہ درج کرنے کی سوچی تھی، لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ مقدمے کا یہاں ایسے بھی ہوتا ہے کہ جب ملزم شاعر اور مظلومہ چچی خدا کی بخشی ہوئی زندگی گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جائیں گے' مقدمہ ابھی تک چل رہا ہوگا، تو اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرا چپراسی شاعر نہیں تھا۔ اُس نے فوراً ٹیکسی بلائی اور مجھے ہسپتال لے گیا۔ دو تین دن تو ہمارے بے ہوشی میں گزر گئے اور جب ہوش آیا تو بال بچوں کی فکر دامن گیر ہوئی۔ میں نے سوچا اگر دل کا دورہ مہلک ثابت ہوا تو ان کا کیا بنے گا۔ پھر خیال آیا کہ اگر مہلت بھی مل گئی تو ہم کون سا تیر مار لیں گے۔ پھر یہ خیال آنے سے جی خوش ہو گیا کہ سیکڑوں ایسے دوست ہیں، جن سے قرض لے کر بال بچوں اور بیوہ کے لیے ایک معقول رقم چھوڑی جا سکتی ہے۔

ہسپتال میں ایک مہینہ گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے دل کی رفتار کچھ نارمل سی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر سے میں نے ذکر کیا کہ میں اپنے آپ کو تندرست محسوس کر رہا ہوں۔ اُس نے پوچھا "آپ کو کیسے پتہ؟ آپ ڈاکٹر ہیں کیا؟" میں نے کہا ڈاکٹر تو نہیں ہوں، لیکن کچھ دنوں سے نرسوں سے میری دل چسپی بڑھ رہی ہے۔ اس میں مجھے شک ہوا کہ رو بہ صحت ہوں۔ وہ ہنسا اور ایک لمحے کے لیے ڈاکٹر سے مزاح نگار بن گیا۔ کہنے لگا "آپ کو اتنا تو معلوم ہوگا کہ دیئے کی لو جب بجھنے کے قریب ہوتی ہے تو کچھ زیادہ بھڑکنے لگتی ہے۔ یہ سنتے ہی نرسوں میں میری دل چسپی ختم ہو گئی۔

جب میں ہسپتال میں داخل ہوا تھا تو ڈاکٹر اور نرسیں مجھے مسٹر دلیپ سنگھ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد بھائی صاحب کہنے لگے کچھ اور دن گزرے تو مجھے انکل کہنے لگے۔ میں حیران ایسا کیوں

• ۴/۵۹ - راجندر نگر، نئی دہلی ۶۵ ۱۱۰۰

ہو رہا ہے۔ ایک دن آئینہ دیکھا تو حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ میں کئی سالوں سے داڑھی کو خضاب لگا رہا ہوں کیوں کہ خضاب اصلی کوالٹی کا ہوتا ہے، اس لیے میری عمر پر پردہ ڈالے ہوئے تھا۔ ہسپتال میں چونکہ خضاب کی سہولت جہیا نہیں تھی، اس لیے میری عمر دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ ہسپتال کے لوگ مجھے بابا جی کہنے لگیں، یہاں سے کھسکنا چاہیے

ہسپتال والوں نے مجھے اس ہدایت کے ساتھ گھر بھیج دیا کہ چھ ہفتے مکمل آرام کروں۔ گھر پہنچا تو مزاج پرسی کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

ہمارے ہاں مزاج پرس مریض کا مزاج پوچھنے کی بجائے اپنے مزاج کی خبر زیادہ دیتے ہیں چنانچہ چند ہی دنوں میں مجھے پتہ چل گیا کہ میرے کس کس دوست کو گنٹھیا ہے اور کس کس کی آنکھوں میں موتیابند اُتر رہا ہے۔ کس کس کو سُنائی کم دیتا ہے اور کس کس کو دکھائی کم۔ کس کس پر فالج گر چکا ہے اور کون عین وقت پر پرے ہٹ گیا اور فالج اُس کے قریب بیٹھی اُس کی بیوی پر آ گرا۔ مجھے نہ صرف اپنے دوستوں کی بیماریوں کی مکمل اطلاع مل گئی۔ بلکہ اُن کے پورے خاندان کی بیماریوں کا بھی علم ہو گیا۔ مجھے تو یہاں تک پتہ چل گیا کہ اُن کے بزرگوں نے اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے وقت کن کن بیماریوں کا سہارا لیا تھا۔

تقریباً ہر مزاج پرس نے مجھے دل کے دورے کے علاج بھی بتائے۔ مجھے اپنی بیماری کے دوران احساس ہوا کہ ہم سب کے اندر کسی کونے کھدرے میں ایک حکیم چھپا بیٹھا رہتا ہے، جو کسی بیمار کو دیکھتے ہی فوراً باہر نکل آتا ہے اور نسخے پر نسخہ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی یہ حکیم بڑے خطرناک وقت پر بیدار ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک بزرگ جب بہت بیمار ہوئے تو میں اُن کے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر جب اُن کا معائنہ کر رہا تھا تو اُسے چھینک آ گئی۔ اُس چھینک کو سُن کر بزرگ کے اندر سویا ہوا حکیم بیدار ہو گیا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا۔ ”بیٹا تمہیں تو بہت زوروں کا زکام ہو رہا ہے۔ اس کا فوری علاج نہ ہوا تو یہ فلو میں تبدیل ہو جائے گا۔ گھر جاؤ اور جوشاندے کی چائے بنا کر پیو۔ رات کو سونے سے پہلے منقے کے تین دانے اور ایک چھوہارا دودھ میں ڈال کر پی جاؤ۔ انشاء اللہ شفا ہو گی۔ یہ کہتے کہتے اُن کی اپنی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

تیمارداروں کا صرف ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر جب یہ آتے ہیں تو ایک تھیلا پھلوں کا ساتھ لاتے ہیں۔ ان پھلوں سے مریض کو کوئی فائدہ ہو نہ ہو اُس کے گھر والوں کی صحت ضرور بہتر ہو جاتی ہے۔ میری بیماری کے دوران گھر میں پھلوں کے استعمال میں خوب اضافہ ہوا۔ گھر والوں نے جب دیکھا کہ میں عنقریب ٹھیک ہوا چاہتا ہوں تو دھڑا دھڑ رشتہ داروں اور دوستوں کو فون کرنے شروع کر دیے۔ کہ آپ تیمارداری کے لیے جلد تشریف لائیے۔ اُن لیٹ آنے والوں میں میرا ایک مزاح نگار دوست بھی تھا۔ جب وہ آیا تو میں نے شکایت کی کہ اتنے دنوں سے میں بیمار پڑا ہوں۔ آپ مجھے دیکھنے ہی نہیں آئے۔ اُس نے جواب دیا۔ ”آپ مجھے الزام دے رہے ہیں۔ لیکن آپ کو اندازہ بھی ہے کہ بازار میں سنگتروں کا بھاؤ کیا ہے۔ آج ہی ریٹ کچھ گرا تو میں فوراً چلا آیا۔

مزاح نگاروں کی عادت ہے ایسے سنگین موقع پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایک مزاح نگار نے مجھے بتایا۔ آپ تیسرے مزاح نگار ہیں جسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ کسی کو ریسرچ کرنی چاہیے۔ کہ مزاح نگاری اور دل کی بیماری کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ چلیے اس بیماری کی وجہ سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کے پہلو میں دل ہے۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم نے جو اپنے معشوق کے نام کر رکھا ہے وہ دل ہی ہے۔ کوئی پتھر کا ٹکڑا تو نہیں۔ میں نے کہا یقیناً پتھر کا ٹکڑا ہو گا۔ کیوں کہ میں نے آج تک آپ کو کام کی کوئی چیز کسی دوسرے کے حوالے کرتے نہیں دیکھا۔

میرے ایک دوست نے مجھ سے ہمدردی جتلاتے ہوئے کہا کہ آپ ٹھیک تو ہو جائیں گے، لیکن زندگی کا لطف جاتا رہے گا۔ خوراک آپ کو بہت سادہ کھانا پڑے گی۔ میں نے کہا۔ ”وہ تو ہے“۔ کہنے لگے ”ناؤ نوش پر تو مکمل پابندی لگ گئی ہو گی“۔ میں نے کہا۔ ”وہ تو ہے“۔

اب تک میں اُن کی ہمدردی سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ میں نے کہا دیکھیے قسمت کی بات ہے۔ کچھ دن پہلے ہی ایک بوتل سکاچ خرید کے لایا تھا، لیکن اب وہ میرے کس کام کی۔ اُس الماری میں پڑی رہے گی۔ اُنہوں نے الماری میں سے بوتل نکالی اور میری آنکھوں کے سامنے اسی تھیلے میں ڈال لی، جس میں سے چھ کیلے نکال کر اُنہوں نے میرے سامنے رکھے تھے۔ کہنے لگے مشکل وقت میں دوست، دوست کے کام نہیں آئے گا تو پھر کون آئے گا۔

دل کی بیماری کے سلسلے میں مجھے کچھ مفید مشورے بھی ملے، جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اب مجھے بسوں میں سواری کرنے کی بجائے موٹر خریدنی چاہیے اور اُسے چلانے کے لیے ایک ڈرائیور رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے میرے دوستوں کا خیال تھا کہ مجھے دل کا دورہ نہیں پڑا۔ میری لاٹری نکلی ہے۔

دل کی بیماری کی وجہ سے نقصان تو بہت ہوئے لیکن ناشکر گزاری ہو گی اگر فوائد کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس بیماری کی وجہ سے دفتر میں میرا وقار بہت بڑھ گیا ہے۔ میرے افسرانِ بالا بات کرتے وقت مجھ سے آواز تک اونچی نہیں کرتے کہ کہیں میری موت کا الزام اُن کے سر نہ جائے۔ میں دن بھر ہاتھ پر ہاتھ بلکہ دل پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوں، لیکن کیا مجال جو مجھے کوئی کام کہہ دے۔ اس بیماری کی وجہ سے مجھے وزن کم کرنا ضروری تھا۔ میں نے دیکھا کہ وزن کے گھٹنے سے میرے جسم کے کئی ایک پرزے سکڑ گئے۔ اس وجہ سے مجھے پورا وارڈ روب نیا مل گیا۔ یہ کوئی معمولی فائدہ نہیں۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس نے آج تک کبھی درزی کو ماپ نہیں دیا۔ خدا کے فضل سے ہم سات بھائی ہیں۔ ہمارے گھر میں کپڑے ہمیشہ بڑے بھائی صاحب کے ہی سلتے رہتے ہیں۔ جنہیں ہم سارے بھائی باری باری پہنتے ہیں۔ اس لیے ماپ ہمیشہ اُنہی کا لیا جاتا تھا۔ میں نے تو انگریزی میں ایم اے محض اس لیے کیا کہ بھائی صاحب

(آگے صفحہ [illegible] پر)

ترتیب

ماحولیاتی آلودگی

اُن تمام اَن گنت طریقوں کو جن سے انسان، ماحول اور گرد و نواح کو نقصان پہنچاتا ہے، مجموعی طور سے آلودگی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم اپنی ہوا کو گیسوں اور دھوئیں سے اپنے پانی کے وسیلوں اور ذخیروں کو کیمیات اور نالیوں کی غلاظت سے اپنی مٹی کو کیمیاوی کھادوں اور جراثیم کش ادویات کی بڑھتی مقدار سے آلودہ کرتے ہیں۔ صنعت کاری سے پیدا ہونے والی گرمی سب طرح کے فضلہ جات اور گھروں نیز رہائشی علاقوں میں بکھری غلاظت آلودگی کی مختلف اقسام ہیں۔

آلودگی میں اضافے کی ایک اہم وجہ یہ رہی ہے کہ اس کی روک تھام بڑی مہنگی پڑتی ہے۔

گیسوں نیز مائعات یا ٹھوس اشیاء کے لاکھوں ٹن ذرّات ہماری فیکٹریاں، گھر اور موٹر گاڑیاں ہر سال ہوا میں پھینکتے رہتے ہیں۔ ہوا کی زیادہ تر آلودگی چیزوں کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز جلائی جاتی ہے تو اس سے حرارت ، دھواں، گیس وغیرہ پیدا ہوتی ہیں جو کہ ہوا کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ چلتی ہوا آلودگی کی موجب اشیاء کو بکھیر سکتی ہے۔ بارش اور برف باری کسی حد تک ان کو زمین تک بہا کر لے آتی ہیں اور اس طرح آلودگی میں کمی ہوتی ہے۔

ہوا کی آلودگی نہ صرف انسانوں کو بلکہ حیوانات اور نباتات کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

قدیم عمارتیں اور سنگتراشی کے مجسمے آلودہ ماحول کی وجہ سے دھیرے دھیرے گھس کر بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ صنعت کاری سے غلو، مغربی ممالک میں تیزابی بارش کا تجربہ، آلودگی کی ایک اور مثال ہے۔

جن علاقوں میں دُھند بنتی ہے، وہاں صنعتی کارخانوں اور گھریلو چمنیوں کا دھواں اور موٹر گاڑیوں سے خارج ہونے والی آلودگی سب دُھند سے مل کر "اسماگ" پیدا کرتے ہیں جو صحت کے لیے مضر ہونے کے علاوہ مصروف شاہراہوں پر گاڑیوں کے بڑے بڑے حادثوں کے موجب بنتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی صنعت کاری اور نیوکلیائی طاقت کے فروغ کی وجہ سے گرمی کے اخراج میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ گرمی پیدا کرنے والی سرگرمیاں بھی بڑھتی ہیں۔ ترقیاتی سرگرمیوں کی وجہ سے البیڈو (منعکس ہونے والی توانائی) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں ہیں پختہ اشیاء اور اسفالٹ سے سڑکوں کی سطح تیار کرنا اور درختوں کو اندھادھند گرانا۔ موجودہ رفتار برقرار رہی تو اگلے پچاس سال تک یہ زمین کسی طرح کی زندگی کے قابل نہیں رہے گی۔

سورج اور بیرونی خلا سے حرارت کا انتشار جو کہ سطح زمین تک آتا ہے۔ ایک دیگر نادیدہ سے آلودہ عنصر کی صورت ہی ہے۔ گیسیں اور ذرات چھوڑنے والی اشیاء کسی علاقے کے اوسط درجۂ حرارت میں تبدیلیوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ ذرات بکھیرنے والی اشیاء سورج کی روشنی کو بکھیر کر درجۂ حرارت کو کم کرتی ہیں۔ کچھ گیسیں سُورج کی روشنی کو زمین تک آنے تو دیتی ہیں۔ لیکن دُھوپ کی گرمی کو سطح زمین سے اُٹھ کر واپس خلا میں جانے سے روکتی ہیں۔ اس سے علاقے کے اوسط درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے "سبز مکان کا اثر" مٹی میں فضلے کی تہیں لگتی ہیں جن میں مُردہ پودے اور جانوروں کا فضلہ شامل ہوتا ہے۔ ان سے "ہیومس" پیدا ہوتا ہے۔ مٹی میں موجود جراثیم سے نائٹریٹ فاسفیٹ اور دیگر غذائی مرکبات میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان سے اُگتے ہوئے پودوں کو خوراک ملتی ہے۔

'ہیومس' کو مفید مطلب بنانے والے جراثیم کیمیاوی کھادوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں

مٹی کا کٹاؤ، مٹی کو آلودہ کرنے کی ایک اور گھٹیا صورت ہے۔ درختوں کا اندھا دھند کاٹنا اور سطح زمین کے توازن میں غیر متوقع تبدیلیاں جیسے ڈیموں کی تعمیرات، پانی کے ذخیروں کی تیاری یا مناسب پختہ پشتوں کے بغیر نئی نہریں تیار کرنا تمام مٹی کے کٹاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ مٹی پر ڈالے گئے فضلے میں خالی ٹین، ڈبوں، کھوکھوں وغیرہ جیسی کباڑ کی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان کو تباہ کرنے کے لیے جلانے اور گرم کرنے وغیرہ کا عمل بھی آلودگی کے ایک دوسرے مسئلہ کو جنم دیتا ہے۔

انسانی ترقی اور تہذیب کو دریاؤں نے ہمیشہ زندگی بخشی ہے، لیکن انسان انہیں دریاؤں کو غلیظ کر دیتا ہے، جو اس کی زندگی کا سہارا ہیں۔ دریاؤں کی آلودگی کا بہت سا حصہ شہری فضلوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جنہیں اکثر کیمیائی طور سے ٹھکانے نہیں لگایا جاتا۔ جانوروں کو نہلانا، کوڑے کرکٹ اور

صنعتی اخراج کو ان میں ڈالنا اور مردہ جانوروں اور انسانی لاشوں کا دریا میں ٹھکانے لگانا، دریاؤں کی آلودگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

کیمیائی کھادیں اور جراثیم کش ادویات جو کھیتی میں استعمال کی جاتی ہیں آبپاشی کے پانی کے ذریعے دریاؤں میں چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں ان سب کی صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں جو دریا کے پانی کو پینے اور نہانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ۸۰ فی صد بیماریاں پانی کے ذریعے پھیلتی ہیں۔ یہ امر اس لیے مزید تشویش کا باعث ہے کہ پچاس ہزار سے زیادہ آبادی والے ۵۲ شہر دریا کے کنارے واقع ہیں۔

ہم اپنے دریاؤں اور سمندروں میں تیل، کیمیائی اخراج ، بھاری دھاتوں کے ریڈیو ایکٹو اسکریپ، مصفی ادویات، جراثیم کش ادویات اور بہت سی دیگر اشیاء ڈالتے رہتے ہیں۔ اب سمندر میں سیسے اور پارے کی بڑی مقدار ہے۔ مچھلیاں جو کہ سمندر کے کم گہرے حصوں میں رہتی ہیں جمع شدہ پارہ پی جاتی ہیں اور بیماری کا باعث بن جاتی ہیں۔ دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی ضروری پروٹین کے لیے مچھلی پر انحصار کرتی ہے

ایٹمی توانائی کی تنصیبوں سے نکلے ہوئے ریڈیو ایکٹو کوڑے کو گہرے سمندر میں ڈالا جاتا ہے۔ سمندر کے اندر آتش فشاں پہاڑ تیل کے لیے کھوج کے کام اور گہرے سمندروں کی معدنیات جیسے متعدد عناصر ایسی حرکات پیدا کر سکتے ہیں جن سے گہرے، پایاب اور سطحی پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ ایک ایٹمی آزمائش کے دوران ریڈیو ایکٹو کے محض آدھے ٹن فضلے سے بحرالکاہل کے دس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبے میں تشویش ناک مسائل پیدا ہو گئے

جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ریڈیو ایکٹو فضلوں کی مقدار ۱۰۰۰ ٹن سے زیادہ ہو جائے گی تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ کتنے خطرات ہمارے حصے میں آئیں گے۔

پارے کو ایک معاون کیمیا کی طرح پالی ونل۔ کلورائیڈ تیار کرنے میں نیز کاغذ بنانے اور دھلائی کے کام میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دھات جسم کے خلیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس سے بڑھاپا جلد آتا ہے۔ سوجھ بوجھ گھٹ جاتی ہے اور موت جلد ہوتی ہے۔

موٹر گاڑیاں ہر سال ہوا میں ٹنوں سیسہ پھونکتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں مشرقی اور شمال مشرقی علاقوں کی ریفائنریوں میں پیدا ہونے والے پٹرول میں سیسے کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ پٹنہ اور گوہاٹی میں چوراہوں پر گندی ہوا میں سیسے کی مقدار دلی کی نسبت آٹھ سے دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جس موٹر اسپرٹ میں سیسہ ہوتا ہے، اس کی کھپت ۱۹۸۳ء کے بعد پانچ فی صد کے متوقع اضافہ کی وجہ سے تقریباً دوگنی ہو گئی ہے۔

لیڈ آرسینٹ کے اس اسپرے سے جو کھیتی میں استعمال کیا جاتا ہے سیسہ خوراک میں شامل ہو جاتا ہے۔ سیسے کو ان ڈبوں کے بند کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، جن میں خوردنی اشیاء بند کی جاتی ہیں۔ اس سے زہر پیدا ہوتا ہے۔ سیسے سے متاثر ہونے کی صورتِ حال صدی کے اختتام تک آج کی نسبت تین یا چار گنا ہو جائے گی۔ کیوں کہ موٹر گاڑیوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی۔

محض شمالی نصف کرۂ ارض میں سمندر کی تہہ میں بیٹھنے والا سیسہ پانچ لاکھ ٹن فی سال کے حساب سے اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ برتنوں کو اندر سے صیقل کرنے کے لیے جو کیڈمیم استعمال کیا جاتا ہے اس سے گردے کو نقصان پہنچتا ہے اور یہ اعصابی نظام نیز قوتِ مردانگی پر اثر انداز ہوتا ہے یہ دھات جسمانی نظام پر اثر انداز ہونے سے پہلے کافی دیر تک جسم میں موجود رہتی ہے۔ کیڈمیم کی زیادہ تر مقدار ان پودوں کی چھوڑی ہوئی دھول سے آتی ہے جو جست، سیسہ اور تانبے کی کچی دھات رکھتے ہیں۔

بہت سی دیگر زہریلی دھاتیں بھی ہیں جو ماحول اور زندہ چیزوں میں آلودگی پیدا کرتی ہیں۔ ان دھاتوں میں بیریلیم، ٹیلیئم، سیل
تھیلیم شامل ہیں۔

دیکھنے میں بالکل بے ضرر اور بہت اس
آنے والی لیکن خطرناک اور نقصان پہنچانے و
شے کا نام ایس بیس ٹاس ہے۔ ایس بیس ٹا
کے ذرات جو جسم کے اندر جاتے ہیں، ان سے
خطرناک سرطان ہوتا ہے، جو پھیپھڑوں ک
والی جھلی میں پیدا ہوتا ہے۔ ایس بیس ٹاس
کانوں اور اسے استعمال میں لانے والی صنعتو
کام کرنے والوں کے لیے اس کا خطرہ بہت ز
ہوتا ہے۔ ایس بیس ٹاس کو صرف ساؤنڈ پر
یا فائر پروفنگ، انسولیشن یا اندرونی سجاوٹ
لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ بیئر اور سادہ م
کو فلٹر کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

شور کے ارتعاش کی لہریں جو بے قا
وقتوں کے ساتھ بڑے زور سے پیدا ہوتی
ماحول کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ موٹر گاڑیوں، مش
جیٹ جہازوں، کارخانوں کے بھونپوؤں
دیگر کئی طرح کے شور و شغب سے آلودگی وجود
آتی ہے۔

جہاں وہ شور جو انسان کے کان کی عام قو
برداشت سے زیادہ ہوتا ہے، ارتعاش
سر درد پیدا کرتا ہے، وہاں شدید شور یا دیر تک
شور کے زیرِ اثر رہنے کی صورتِ حال بہرے پ
لے جاتی ہے۔

عام بول چال یا ایک اوسط درجے کے
کمرے میں شور کی سطح، سب ۶۰ ڈیسی بل (شور
شدت ناپنے کا پیمانہ) ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک
جیٹ ہوائی جہاز انسان کے کان کے بہت
سے پرواز کرتا ہے تو یہ سطح ۱۶۰ ڈیسی بل تک
جا سکتی ہے۔

(المیں رسری کم

فیرہ: کالی داس گپتا رضا

دوسری اور آخری قسط

یات میں

ترجمۂ غالب

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نواب
رزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور وہ ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی
نیاء الدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انہیں نیر رخشاں تخلص کرکے
شید شاگرد اور خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفۂ دوم۔ نواب علاؤ الدین خاں
ے تھے۔

اُن کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کے شوق کو بڑی
، اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے دس، پندرہ برس
ان کی تحریریں اردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں
رماتے ہیں:

"بندہ نواز! زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔
سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں
رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں[1]

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے،
ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں، جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں
رسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے، ان میں جو صاحب اب آ ان
میں ان سے بھی عند الضرورت اسی زبان میں مروج مکاتیب مراسلت
ناق ہوا کرتا ہے۔"

اُردوئے معلیٰ میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو تحریر فرماتے ہیں۔ "میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا[1] تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی۔"

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرایئے گر مہرِ نماز — میکدہ میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مستی آلودہ سرانگشتِ حسیناں لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے ماتا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ بھول گیا۔+ نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجود یکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر

---

[1] ہوم کے پیشِ نظر اسے غالب کی آخری عمر کا شعر سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے مابین کہا گیا ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۹ سال سے بھی کم تھی۔

[1] یہ قطعہ قیامِ کلکتہ کے زمانے میں کہا گیا تھا۔ ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء کوئی سال بھی ہو سکتا ہے مگر قیاس ہے کہ ۱۸۲۹ء ہی میں کہا گیا ہوگا۔ + دیکھو قطعہ اردوئے معلیٰ میں۔ (حاشیہ از ناظم) غالب لکھتے ہیں "بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں"۔ غالب کا یہ خط مرزا حاتم علی مہر کے نام اواخر نومبر ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف سات شعر درج ہیں جبکہ قطعہ ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے پھبتی یعنی تشبیہ بھی رائج ہے۔ جیسے آتش سہ

کماں سے دی کبھی تشبیہ ہم نے تیغ سے گاہے
کہی ہیں پھبتیاں اس ابروئے خمدار پر کیا کیا

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

شاہ انہی کی ولیعہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ جب اُن کی شادی کا موقع
اتو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے سہرا کہہ حضور میں گذرانا۔

سہرا[2]

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا — ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک — کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار — لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سُن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پہ چشمک ہے۔ گویا اس کے معنے ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے، یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرف داری ہے۔ بچہ اسی دن استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا کہ استاد اسے دیکھیے۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی — پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ اُستاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ تاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا — آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک — کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا
تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید — رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ۔ یہ کہے سبحان اللہ — دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تاجِ اور ینے میں رہے اخلاص بہم — گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دُھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی — گائیں مُرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار — تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش — سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا — تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامین سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے ادا شناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ حضور میں گذرانا۔

قطعۂ درمعذرت

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہی کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے[1]

کلکتہ میں بہت سے اہلِ ایران اور بڑے بڑے علماء و فضلا موجود تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لیے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ ان کی شان کے لیے

---

[1] سالِ فکر ۱۸۵۲ء — یہ لطیفہ قطعی آزاد کا اختراع ہے۔ کیونکہ جب یہ مثنوی لکھی گئی تھی تب اس کا نام "بادِ مخالف" نہ تھا بلکہ "آشتی نامہ" تھا (اور "وداد پیام" یعنی دوستی کا پیغام) تھا جیسا کہ آخری شعر سے ظاہر ہے ؎
آشتی نامہ و وداد پیام — ختم شد والسلام والاکرام
"بادِ مخالف" کا عنوان ترتیبِ دیوان کے وقت دیا گیا معلوم ہوتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ گزشتہ صفحہ) اگر حساب لگا کر دیکھا جائے تو غالب نے بیس بائیس پھبتیوں (نیہوں) کی بات درست کہی تھی۔ اس قطعہ کے کل ۱۳ اشعار میں ۲۱ پھبتیاں ہیں ... رف پچھلے چار مصرعے (۲ شعر) اور آخری شعر کا پہلا مصرع (بندہ پرور کے کف ... ت کو دل کیجیے فرض) بیانیہ ہیں۔ باقی ۲۱ مصرعوں میں سے ہر مصرع میں تشبیہ موجود ہے۔
[2] فکر کردہ ۱۸۵۲ء

حقیقت میں ان کی عظمت ہونی چاہیے تھی اور ضرور ہوتی، مگر ایک
ج پڑ گیا۔ اس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک فارسی کی
ں۔ اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا۔ اور اعتراض ہو جب
سے تھا جو مرزا قتیل نے ایک اپنے رسالے میں لکھا ہے۔ مرزا نے سن کر کہ
ں ہوتا ہے؟ اور مجھے قتیل سے کیا کام؟ ایک فرید آباد کا کھتری تھا۔ میں
ن کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔
ئین مہماں نوازی سے آنکھیں بند کر لیں اور جوش و خروش خاص و عام
ہوا۔ مرزا کو تعجب ہوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہو جائے
ن رومی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی لکھی اور اس میں کچھ شک نہیں
نوری کی دی ہے۔ معرکہ کا سارا ماجرا نہایت خوبی کے ساتھ نظم
اکیا۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا۔ اپنی طرف سے انکسار مناسب کے
مذرت کا حق پورا کیا۔ لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں
یں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی
ں کا عذر کرتے۔ ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے۔ معلوم
ادِ مخالف۔ دوسرے نے گلستان کا فقرہ پڑھا۔ یکے از صلحا زبادِ مخالف
پیچید اور سب نے ہنس دیا[۶]

ما : دلّی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدر الدین
حب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا
نے جس وقت یہ مصرع پڑھا۔ ع : بوادیے کہ دران خضر را عصا خفت
۔ مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است
م ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔
یرازی کا عصا نہ پکڑا گیا۔ ع : وے بحملۂ اوّل عصائے شیخ بخفت۔
نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام
یں۔

ما : ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔
ہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے
ھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن[۱]

مرزا صاحب کو ایک آفتِ ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس
نا پڑا کہ جیسے حضرت یوسف کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے۔
گئی تھیں۔ ایک دن بیٹھے ان میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس
یادت کو آئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ آپ نے یہ شعر پڑھا

ہیں دن سے گرفتارِ بلا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں[۲]

ن دہلی

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا
کُرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔

ہائے اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا[۳]

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی
منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔
آپ نے فرمایا:

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں[۴]

پنشن سرکار سے ماہ بماہ ملتی تھی۔ بغاوتِ دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا
کرے۔ اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں:

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار[۵]

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں، جس کی بدولت بادشاہ
دہلی کے دربار سے ششماہی تنخواہ کے لیے ماہوار کا حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد
میں بھی اس طرح کی غزل و نصب انہوں نے اکثر کیے ہیں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں۔
انوری وغیرہ اکثر شعرا نے ایسا کیا ہے۔

لطیفہ ۱۸ : مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا اُن
کی ملاقات کو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری

---

[۱] یہ شعر ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا فکر کردہ ہے اور مفتی صدر الدین آزردہ ۱۵ اپریل ۱۸۴۲ء کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ محض شعر کو سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔

[۲] سالِ فکر لغایت ازمئی ۱۸۴۷ء۔ غالب دوسری بار ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو جوئے کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ پہلی بار جرمانہ ادا کر کے گلو خلاصی کرالی تھی۔ اب کی چھ ماہ قیدِ بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ جرمانہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں چھ ماہ مزید قید اور اگر اصل جرمانے کے علاوہ پچاس روپے مزید ادا کر دیں تو مشقت معاف۔

[۳] قید خانے کا کُرتہ پھاڑا نہیں جا سکتا۔ افسرانِ قید خانہ کو لوٹانا پڑتا ہے۔ نیز یہ شعر ۱۸۴۷ء سے کم از کم ۲۶ سال پہلے کہا گیا تھا (فی البدیہہ نہیں) یوں بھی اس شعر کا اطلاق یہاں کیوں کر ہو سکتا ہے؟

[۴] حسین علی خاں شاداں پسرِ زین العابدین خاں عارف اس وقت سات آٹھ سال کے ہوں گے۔ اس لیے شعر کا سالِ فکر ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ ہوگا (شاداں ولادت: ۱۸۵۰ء وفات: ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء)

[۵] یہ ایک قطعے کے شعر ہیں جو ۱۸۵۵ء میں تصنیف ہوا تھا کل شعر ۲۰ ہیں۔

کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع : بیا برادر آور سے بھائی۔ چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی لونڈی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے۔ ع : بنشین مادر بنیشد ری مائی ما

لطیفہ : مرزا کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا بھائی اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے ؟

لطیفہ : بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں۔ کی مرتی ہوں۔ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لیے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ لو بُوا! بھلا یہ کیا فکر ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے۔

لطیفہ : ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا۔ حضرت آج میں امیر خسروؒ کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھیے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھا لیں، چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

بعض+ شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپ نے حضرت علیؓ کی مدح میں بہت قصیدے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے۔ صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا۔ مرزا نے ذرا تامل کر کے کہا کہ ان میں کوئی ایسا نہ دکھا دیجیے تو اس کی تعریف بھی کہہ دوں۔ مرزا صاحب کی شوخیٔ طبیعت ہمیشہ انہیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی، جس سے ناواقف لوگ انہیں الحاد کی تہمت لگائیں اور چونکہ یہ رنگ ان کی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے دوست ایسی باتوں کو سن کر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے، وہ اور بھی زیادہ چھینٹے اڑاتے تھے۔ ان کی طبیعت سرور شراب کی عادی تھی، لیکن اسے گناہِ الٰہی سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ محرم میں ہرگز نہ پیتے تھے۔

لطیفہ : غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ ان دنوں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے، صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلی گئے اور حب الوطن اور محبت حق کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ ان دنوں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بسبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح سمجھا۔

لطیفہ : بھوپال سے ایک شخص دلی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ اُن سے بکمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُن بیچارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے۔ اُنہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اُٹھا لیا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

لطیفہ : ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی، تارے چھٹکے ہوئے تھے آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے جبھی بکھرے ہوئے ہیں نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹا۔

لطیفہ : ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت جماعت تھا، رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے، عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیتا ہوں۔

لطیفہ : رمضان کا مہینہ تھا آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے۔ اُنہوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ مسکرا کر بولے، شیطان غالب ہے۔

یہ لطیفہ اہلِ ظرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے کہ عالمگیر کا مزاج سرمد سے مکدر رہتا، اس لیے ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی جو اس عہد میں قاضی شہر تھا۔ اُس نے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا پکڑا۔ اوّل بہت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ سوال و جواب ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں۔ شرع کا حکم اسی طرح ہے۔ کیوں حکم الٰہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا کروں بابا شیطان قوی ہے۔

لطیفہ : جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰؔ خاں صاحب مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کے رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ لیجیے۔ چونکہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں کیا جاڑے میں بھی۔

لطیفہ : ایک صاحب نے اُن کے سُنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیے تو کیا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دُ

لہ قاضی عبدالودود مرحوم نے اس لطیفے کو آزاد کے اختراعات سے کہا ہے۔

+ یہ لطیفہ کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے (حاشیہ از آزاد)

نہیں قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی۔ باسامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری۔ تیسرے صحت[۱] آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اُسے اور چاہیے کیا جس کے لیے دعا کرے۔

مرزا صاحب کو مرنے سے بیس برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادہ ہاتھ آیا۔ وہ بہت بھایا اور اُسے موزوں فرمایا۔

تاریخ فوت

منکہ باشم کہ جاوداں باشم ۔۔۔ چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بپرسند در کدامیں سال ؟ ۔۔۔ مُرد غالبؔ بگو کہ غالب مُرد

اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی۔ ہزاروں آدمی مر گئے۔ ان دنوں دلی کی بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے+۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے[۲]

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فسادِ ہوا کے سمجھ لیا جائے گا۔

غزلیں

[۳]
شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۔۔۔ کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل ۔۔۔ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

[۴]
دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا ۔۔۔ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا ۔۔۔ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں ۔۔۔ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۔۔۔ گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۔۔۔ گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

[۵]
کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں ۔۔۔ یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ۔۔۔ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۔۔۔ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۔۔۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۔۔۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۔۔۔ پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

[۶]
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ۔۔۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر حلقہ میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ ۔۔۔ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۔۔۔ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۔۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۔۔۔ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۔۔۔ گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

[۷]
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۔۔۔ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۔۔۔ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔۔۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ۔۔۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۔۔۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۔۔۔ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۔۔۔ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ۔۔۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔۔۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۔۔۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

+ اپنے تئیں لسان الغیب قرار دیا۔ (حاشیہ از آزاد)

۱ غالب نے "انتخابِ غالب" میں خود یہ لطیفہ لکھا ہے۔ اگرچہ مفہوم وہی ہے تاہم یہ معلوم ہو جائے گا کہ "..... ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان سامنے حاضر ہو....." جیسے الفاظ کا اضافہ آزاد نے کیا ہے۔ یہ لفظ غالب کے نہیں۔

۲ یہ غزل دیوانِ غالب اردو (دوسرا ایڈیشن) مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۴۷ء کے بعد کہی گئی تھی۔ اگر غالب کے خط بنام میر مہدی مجروح مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء میں دیے گئے بیان پر بھروسہ کیا جائے تو دس سال تاریخِ خط میں سے منہا کر کے اس غزل کا سالِ فکر ۱۸۵۱ء متعین کیا جا سکتا ہے۔

۳ سالِ فکر ۱۸۱۶ء

۴ سالِ فکر ۱۸۲۱ء

۵ سالِ فکر ۱۸۴۷ء

۶ سالِ فکر ۱۸۲۱ء

۷ ،، ،، بعد از ۱۸۴۷ء

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — ایک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

[۳] حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کو دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا — گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے — رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کیلئے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کیلئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے
فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — دراز دستی قاتل کے امتحاں کیلئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے
بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کیلئے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک — بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کیلئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

استدراک

آزاد نے عبداللہ خاں اوج کا حال ترجمۂ غالب کے حاشیے میں دیا ہے۔ چونکہ حاشیہ خاصا طویل ہے۔ میں نے قاری کی دلچسپی کے لیے یہاں آخر میں لگا دیا ہے۔

اوج تخلص: عبداللہ خاں نام۔ ۴۰۔ ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انہیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا۔ اس لیے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل

---

[۱] سال فکر بعد از ۱۸۴۷ء
[۲] سال فکر: ۱۸۵۴ء
[۳] ″ ″ ″ ۱۸۴۷ء + بادشاہ کے بیٹھے تھے (حاشیہ از آزاد)

[۱] سال فکر: ۱۸۵۱ء
[۲] ″ ″ : ۱۸۴۷ء

کہتے تھے ۔ فکرِ مضامین اور تلاشِ الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے ۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہوگیا تھا۔ بعض شعر پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا۔ جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر پڑھتا رہا۔ پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے ۔ بعض اشخاص شہر کے اور قلعہ میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے ۔ مگر استاد سب کہتے تھے ۔ شعرائے باکمال کہہ جا کر سناتے تھے اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کے فغاں و فریاد لے کر چھوڑتے تھے کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے ۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے خوب خوب بہت خوب کہتے، اور مکرر پڑھواتے تھے ۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں اور مرزا تو ایسے دل لگی کے مصالح ڈھونڈتے رہتے تھے یہ نعمت خدا دے ۔ شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کا فر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں ۔ شعر کے خدا ہو خدا! سجدہ کا اشارہ کرتے اور کہتے ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ میں اُن دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے ۔ اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو ۔ رستہ میں مل جاتے تو دس قدم دُور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے ۔ پھر شعر سنتے سناتے چلتے قلعہ کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے ۔ غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے ۔ ایک دن رستہ میں ملے ۔ دیکھتے ہی کہنے لگے ۔ آج گیا تھا، اُنہیں بھی سُنا آیا ۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا :

ذرّہ جُز بر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیوان ہونا

پھر بیان کیا کہ ایک جلسہ میں مومن خاں بھی موجود تھے ۔ مجھ سے سب نے شعر کی فرمائش کی ۔ میں نے ناسخ کی غزل پر غزل کہی تھی ۔ وہ سنائی ۔ مقطع پر بہت حیران ہوئے ۔ ع کہ جس کو کہتے ہیں چرخ ہفتم ورق ہے دیوان ہفتمیں کا پوچھنے لگے کہ کیا آپ ساتواں دیوان لکھتے ہیں ؟ میں نے کہا کہ ہاں اب تو آٹھواں ہے ۔ چپ ہوگئے ۔

عمومی واقعات پر اکثر شعر کہا کرتے تھے ۔ مومن خاں کو کنور اجیت سنگھ نے پھبتی دی ۔

آپ نے کہا ۔

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتی کا دان لیتا ہے

دلّی میں شیریں ایک بڑی نامی رنڈی تھی ۔ وہ حج کو چلی ۔ آپ نے کہا ۔
بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلّی حج کو چلی   مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

۳۰ ، ۲۰ برس ہوگئے ۔ وہ چرچے نہ رہے اکثر شعر یاد تھے ۔ حافظے نے بے وفائی کی ۔ شاید حروف کا غذ وفا کریں ۔ جو یاد ہے لکھ دیتا ہوں اور ان کی جاں خراشی اور بربادی کا افسوس کرتا ہوں ۔

ہیں مچھلیاں بھووں کی چینِ پُرشکن کے اندر   اُلٹی ہے بہتی گنگا مچھی بھون کے اندر
دنیائے منقلب کا الٹا ہے کارخانہ   ہے مہر شمع داغ دن اس انجمن کے اندر
میں وہ ہوں تحمل جوئے سلسبیل دریائی   میری ہے کشتی گل نا رحبیلِ دریائی
مجھے اُترتی ہے گردابِ آسماں سے وحی   ہے راہبر خضرِ جبرئیلِ دریائی
میں کالا پانی پڑا نا پیتا ہوں ہر شب و روز   زمیں کا گز ہے مرا کلکِ میلِ دریائی
بنا ہے کنگرۂ خار و ۔ ملکِ دشت حصار   مرا ہے آبلہ بُرجِ فصیلِ دریائی

ہے آبشاری کی مضمونِ آبدار کو دہت   ہمارا خامہ ہے خرطوم فیلِ دریائی
جہاز ہے مرا ایک تارِ لنگرِ دم پر   مرے عمل میں ہے جر ثقیلِ دریائی
میں اپنے کوچ کی ہوں موج میں بہا جاتا   حباب دار ہوں کوسِ رحیلِ دریائی
ہماری موجِ تلاطم سے آشنائی ہے   یہ آبِ شور ہے دیتا رفیلِ دریائی
ہے اوج مرزمک دیدہ ۔ مردمِ آبی   نکال دیدۂ تر سے سبیلِ دریائی
وحشت مجھے زنجیر پہناتی ہی تھی اکثر   طفلی میں بھی ہنسلی مری جاتی ہی تھی اکثر
جب تھا زرِ گل لینہ غنچہ کی گرہ میں   بلبل پڑی گلچھرے اڑاتی ہی تھی اکثر
دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا   لے پُل صراط اُترے یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سرا سے اُلفت   سُم میں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا
کسبِ شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل   سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
کھاتا ہے جوشِ عشقِ شیریں و شونمیں رونا   ہے آبِ شورِ گریہ آبِ زلال اپنا
چیچک کے آبلوں کی میں باگ موڑتا ہوں
(حاشیہ از آزاد)

بقیہ : نئی کتابیں

ہوں، ان سب کو ہی دت نے برتا پرکھا اور پیش کیا ہے ۔ موصوف کے ناولوں میں واقعی سماج کے ایسے ایسے مسائل کی عکاسی ہوتی ہے، جنہیں ایک حساس ادیب ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ "یادیں" ایک دلچسپ تخلیق ہے، جس کی کتابت اچھی ہے اور طباعت آفسیٹ سے ہے ۔ سرورق موضوع کے مطابق اور جاذبِ نظر ہے ۔

انور کمال حسینی

کمال احمد صدیقی

دوسری اور آخری قسط

رموزِ غالب

۲۵۔ ورق ۱۶، رخ ب پر شاہ نصیر کی زمینوں کی یاد دلانے والی ایک غزل ہے۔ جو پانچ شعروں پر مشتمل ہے۔ نسخۂ بھوپال میں بھی یہ پانچ شعروں کی غزل ہے۔ چوتھا شعر مخطوطے میں اس طرح لکھا ہے کہ پہلے مصرعے کا آخری لفظ یکسر یا یکدست، یہ فیصلہ کرنے میں تذبذب ہوتا ہے۔

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکدست
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

نسخۂ امروہہ (نقوش) میں تصریحات کے تحت بتایا گیا ہے کہ یکسر تھا، اصلاح سے یکدست کیا گیا۔ نسخۂ عرشی زادہ میں حواشی کے تحت اس کے بالعکس بات کہی گئی ہے۔ یعنی یکدست تھا، یکسر اصلاحی صورت ہے۔

اتنے دن "مخطوطہ" میرزا کے پاس رہا ہو، اتنی اصلاحیں اس میں ہوئی ہوں اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے ہوں کہ یک دست رکھوں یا یکسر۔ یہ مُبہم بات مُبہم قرأت کیسی؟ کوئی تصریح یا حاشیہ آرائی اس لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ نسخۂ بھوپال میں یکسر ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں اس بات کا اظہار نہیں ہے، لیکن اختلافِ نسخ کے باب میں عرشی نے واضح کیا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں مصرع تھا،

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں تجھ سے

تجھ سے کی جگہ یکسر کیا گیا ہے۔ یکسر جب ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد اصلاح ہے تو ۱۲۳۱ھ کے بتائے جانے والے نسخے میں یہ قرأت کیسے پہنچی جو یکسر کا ۱۲۳۱ء میں یکدست سے بدلا جانا قرینِ قیاس اس لیے نہیں کہ یہ اصلاحِ معکوس ہے۔ یکدست کا یکسر کیا جانا بھی قرینِ قیاس اس لیے نہیں کہ اس صورت میں تجھ سے نسخۂ بھوپال میں نہیں لکھا جاتا، جو اصلاح سے یکسر کیا گیا۔ سوال ہے کہ ۱۲۳۷ھ یا اس کے بعد ہونے والی اصلاح ۱۲۳۱ھ کے مبینہ نسخہ میں کیوں اور کیسے؟

۲۶۔ ورق ۱۸۔ الف پر غزل کا ایک شعر ہے،

نازِ خود بینی کے باعث محرمِ صدبے گناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ تاب آئینہ پر

نسخۂ بھوپال کی جو قرأت نسخۂ حمیدیہ میں یہ درج ہے:

نازِ خود بینی کے باعث خونیِ صدبے گناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ و تاب آئینہ پر

"مخطوطہ" جو ۱۲۳۱ھ کا بتایا جاتا ہے، ۱۲۴۲ھ کے نسخۂ شیرانی کا ورژن پیش کر رہا ہے، جب کہ درمیان میں ۱۲۳۷ھ کا نسخۂ بھوپال ہے۔ گویا میرزا نے ۱۲۳۷ھ کے نسخے کے شعر میں جو تبدیلی کی ۱۲۴۲ھ کے نسخے کے لیے وہ دراصل مراجعت تھی ۱۲۳۱ھ کے نسخے کی قرأت کی طرف؟

۲۷۔ جعلی نوٹ اور جعلی سکّے اگر وزن میں اور وضع میں، اور دھات کے اعتبار سے کھرے سکّوں اور نوٹ جیسے ہوں اور ہوتے ہی ہیں، تب بھی پرکھتے وقت ذرا سے فرق کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک نقطے کا فرق بھی بہت ہوتا ہے اور اب جس شعر (مطلع) کا ذکر آئے گا، وہ دو نکتوں کی وجہ سے پکڑ میں آگیا۔

ورق ۱۹۔ رُخ الف پر جو غزل شروع ہوتی ہے، اس کا مطلع ہے،

فسون یکدلی ہے لذتِ بیداد دشمن پر
کہ برق از وجد جوں پروانہ بال افشاں ہو خرمن پر

مصرع ثانی اصلاح سے یوں ہوا:

کہ وجد برق جوں پروانہ بال افشاں ہو خرمن پر

نسخۂ بھوپال کی جو قرأت نسخۂ حمیدیہ میں درج ہے، یہی ہے، لیکن عرشی نے اپنے نسخے کے باب "اختلافِ نسخ" میں بتایا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں جوں نہیں، چوں ہے۔ چوں نسخۂ شیرانی میں ہے!

۲۸- اسی ورق پر ایک دوسری غزل کا مقطع ہے :

(اسدؔ) پیری میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے
نہیں ہے نغمہ سے خالی خمیدن ہائے چنگ آخر

نسخۂ بھوپال کا پہلا مصرع نسخۂ حمیدیہ میں یہ ہے :

اسد پیری میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے

مخطوطے میں پہلا مصرع نسخۂ شیرانی کا ہے ۔

۲۹ - اس غزل میں ایک شعر اور بھی توجہ طلب ہے :

تڑپ کر مر گیا وہ صیدِ بال افشاں کہ مضطر تھا
ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت، زخمِ خدنگ آخر

دوسرے مصرع میں "زخمِ خدنگ" نسخۂ شیرانی میں ہے ۔ نسخۂ بھوپال کی قرأت، نسخۂ حمیدیہ میں یہ دی ہوئی ہے :

ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت، چشمِ خدنگ آخر

یہاں بھی ۱۲۳۱ھ کے "مخطوطے" میں، ۱۲۳۱ھ کے نسخے کا نہیں، بلکہ ۱۲۴۲ھ کے نسخے کا مصرع ہے !

۳۰ - ابھی تک تو دس گیارہ برس کے چوکھٹے میں جو نسخے تھے، اُن کے سیاق و سباق میں ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ ۱۲۳۱ھ کے مبینہ نسخے میں اشعار کی وہ صورتیں ہیں، جو، ۱۲۳۱ھ کے نسخے میں اصلاح کے بعد ظہور میں آئیں۔ اب یہ ذرا وقت کے چوکھٹے کا رقبہ اور بڑھتا ہے ورق ۱۹۔ ب پر مطلع کے بعد کا شعر یوں لکھا ہے :

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ مائل ہیں
تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

نسخۂ حمیدیہ کے مطابق نسخۂ بھوپال میں شعر یوں ہے :

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

تجھ سا اور تجھسا میں ہائے مخلوط ہونے نہ ہونے پر اس وقت گفتگو ہو سکتی تھی کہ اگر دونوں نسخوں میں سے ایک کے بخطِ غالب ہونے کا امکان ہوتا۔ لیکن مائل اور عاشق پر آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔ مائل لفظ پہلے مصرع میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی کے تذکرے "گلشنِ بے خار" میں میرزا کی اس شعر میں واقع ہوا ہے ۔ میرے سامنے نولکشور پریس کا ۱۸۷۱ء (۱۲۹۱ھ) کا چھپا ہوا نسخہ ہے ۔ مؤلف نسخہ، اُن کے استاد مومن خاں مومنؔ اور دوسرے شعرا کی کہی ہوئی تاریخیں آخر میں شامل ہیں ۔ یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں مکمل ہوا تھا۔ نمونۂ کلام کے طور پر میرزا کے ۴۸ شعر درج ہیں۔ بہت صاف اور واضح شعر ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ انتخاب خود میرزا نے کیا تھا۔ میرزا اور شیفتہ کے بہت گہرے مراسم تھے ۔ مومنؔ کے انتقال کے بعد وہ اپنا اردو کلام بھی میرزا کو دکھانے لگے ۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ میرزا کے کسی شعر میں کوئی تحریف ہوئی ہے ۔ مائل لفظ عاشق کی جگہ میرزا نے ۱۲۵۰ھ کے آس پاس رکھا ہے جب اُنھوں نے "گلشنِ بے خار" کے تذکرے کے لیے انتخاب کیا ۔ یہ ۱۲۵۰ھ کے آس پاس کی اصلاحی قرأت نسخۂ بھوپال سے پہلے کے مخطوطے میں کیسے اور کیوں ؟

۳۱- ایک نقطے نے "مخطوطے" کو کھرا کھوٹا طے کرنے کا نکتہ اس مثال سے بھی واضح ہوتا ہے ۔ ورق ۲۰ کے دوسرے کالم میں دوسری اور تیسری سطریں اس شعر کے لیے وقف ہیں۔

لذتِ تقریرِ عشق ، پیرِ دگی گوششِ دل
جوہر افسانہ ہے عرضِ تحمل ہنوز !

نسخۂ بھوپال کا مصرع نسخۂ حمیدیہ میں یہ ہے : جوہر افسانہ ہے عرضِ تحمل ہنوز !
عرشی نے بھی اپنے نسخے میں نسخۂ بھوپال کی اس قرأت کو نسخۂ شیرانی کی قرأت پر ترجیح دی ہے ۔ نسخۂ شیرانی میں تحمل ہی ہے اور وہی اس مخطوطے میں بھی ہے ۔

نسخۂ بھوپال کی اصلاح ۱۲۳۱ھ کے نسخے میں کیوں اور کیسے ؟

۳۱ - ایک نقطے کے ہیر پھیر کے بعد اب ایک چھوٹے سے حرف (عطف) کا ہیر پھیر۔

ورق ۲۱، رخ ب کے کالم ۲ میں دوسرا شعر یوں لکھا ہے ۔ (اضافت نہیں ہے)۔

سختیِ راہِ محبت ، منعِ دخلِ غیر ہے
پیچتابِ جادہ حکمِ جوہرِ تیغِ عسس

نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کے شعر کا مصرعِ ثانی یہ ہے

پیچ و تابِ جادہ ہے یہاں جوہرِ تیغِ عسس

پیچتاب ، نسخۂ شیرانی میں ہے جس میں نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں ہیں۔ اس اصلاح کا ۱۲۳۱ھ کے نسخے میں ہونا محال ہے ۔ اس لیے ہے یہاں کی جگہ حکم (بہ اضافت) الحاقی لفظ ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں پیچ و تاب کی جگہ پیچتاب بھی صرف ایک و نہ ہونے کی وجہ سے الحاقی قرار پاتا ہے ۔

۳۲ - اسی صفحہ پر اگلی غزل میں بھی یہی صورت ہے ۔ مطلع ہے :

دشتِ الفتمیں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس
پیچتابِ جادہا خطِ کفِ افسوس و بس !

نسخۂ بھوپال کا مصرعِ ثانی نسخۂ حمیدیہ میں درج ہے :

پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

نسخۂ شیرانی کا مصرع ہے :

پیچتابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

زیرِ نظر "مخطوطے" میں بھی یہی مصرع لکھا گیا تھا، لیکن بعد میں ہے کھرچ کر ہا لکھا گیا ۔ چاقو سے ہے کھرچ کر ہا بنائے جانے کے کلیۂ نسخۂ امروہہ اور

نسخۂ عرشی دونوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تے کو کھرچ کر آ بنانے سے نام نہاد
تبدیلی رنگ کی نمائش تو ضرور کر دی گئی۔ لیکن اس میں میرزا کی تحقیر کرنے کا بھی ایک
پہلو ہے۔ یعنی ایک بہتر قرأت کو شعوری طور پر اُن سے بگڑوایا گیا۔
دشت الفتیں میں کیا اس طرح میرزا لکھتے؟ دشت اور الفت کے
درمیان اضافت کا رشتہ ہے۔ دشت اور الفتیں کے درمیاں نہیں۔

۳۳۔ ورق ۲۴ رُخ ب پر ایک شعر ہے:

صافیِ رخسار سے ہنگامِ شب
عکس داغِ مہ ہوا عارض پہ خال

نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کی یہ قدرت درج ہے۔

صافیِ رخسار سے ہنگامِ شب
عکس داغِ شب ہوا عارض پہ خال

نسخۂ شیرانی میں شعر کی قرأت یہ ہے۔

صافیِ رُخ سے ترے ہنگامِ شب
داغِ عکسِ مہ ہوا عارض پہ خال

"مخطوطے" میں مصرعِ اولیٰ نسخۂ بھوپال کا ہے۔ لیکن مصرعِ
ثانی وہ ہے، جو نسخۂ بھوپال کے مصرع کی اصلاحی شکل ہے اور یہ اصلاح
۱۲۳۷ھ اور ۱۲۴۲ھ کے درمیان میرزا نے کی تھی۔ لیکن اس "مخطوطے" میں
جو ۱۲۳۱ھ کا بتایا جاتا ہے، مستقبل کا مصرع یہاں بھی اپنے ورق پر
رکھتا ہے!

۳۴۔ اسی غزل میں ایک اور شعر بھی توجہ طلب ہے:

نورِ خوباں سے ید بیضہ ہے آج
ورنہ تھا خورشید یک دستِ سوال

نسخۂ بھوپال میں شعر یوں تھا:

نورِ حیدر سے ہے اس کی روشنی

میرزا نے اس مصرع کو اصلاح سے یوں کیا:

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

نسخۂ شیرانی میں شعر یہی ہے۔ صرف دوسرے مصرع میں ہے کو تھا
کر دیا۔ اور تھا کے ساتھ یعنی چھ سے گیارہ برس تک کسی وقت ہونے والی
اصلاح دوسرے مصرع میں "مخطوطہ" دکھا رہا ہے، جو ۱۲۳۱ھ کا بتایا جاتا
ہے۔ پہلا مصرع مخطوطے میں الحاقی ہے۔ دوسرے مصرع میں دستِ سوال
اور اس کی رعایت سے پہلے مصرع میں "ید بیضہ" یہ رعایتِ لفظی اسی طرح کی ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمتِ خدا کی

میرزا یہ شعر خود سے منسوب کیے جانے پر کیسے آگ بگولہ ہوئے تھے۔
اس بات سے غالب کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔ اس پر بھی کوئی اسے میرزا کا
مصرع تسلیم کرنے پر تیار ہو، تو اس کی غالب شناسی کی داد دینے کے لیے اگر
مقدور ہو تو نوحہ گر رکھنا پڑے گا۔

۳۵۔ ورق ۲۵ کے الف رخ پر آخر میں ایک مطلع ہے:

بہرِ عرضِ حالِ شبنم تے رقم ایجاد گل
ظاہرا ہے اس چمن میں لالِ مادر زاد گل

میرزا کے مطلع کی یہی قرأت ہے، لیکن ۱۲۳۷ھ کے بعد اور ۱۲۴۲ھ سے
پہلے۔ ۱۲۳۷ھ سے پہلے مصرعِ اولیٰ میں تے کی وجہ سے الحاقی قرار
پائے گا۔ کیوں کہ مصرع کا یہ روپ نسخۂ شیرانی میں ہے۔ نسخۂ بھوپال کا مصرع
نسخۂ حمیدیہ میں یوں نقل ہوا ہے:

بہرِ عرضِ حالِ شبنم ہے رقم ایجاد گل

۳۶۔ ورق ۲۶، رُخ الف پر یہ شعر غزل میں ہے،

رسیدن گل باغِ واماندگی ہے
عبث محمل آرائے رفتار ہیں ہم

نسخۂ بھوپال میں پہلا مصرع یہی ہے۔ لیکن دوسرے مصرع میں ایک لفظ
کا فرق ہے:

عبث محفل آرائے رفتار ہم

نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کی قرأتوں میں صرف اسی ایک لفظ کا
فرق ہے نسخۂ شیرانی میں محمل ہے۔ نسخۂ شیرانی، چونکہ نسخۂ بھوپال کے بعد کا
ہے، اس لیے محمل، اصلاحی مصرع کی صورت ہے، جو یقیناً ۱۲۲۱ھ کے بعد کی
ہے۔ ۱۲۳۱ھ

۳۷۔ ورق ۲۶۔ رُخ ب پر یہ شعر توجہ چاہتا ہے۔

نقشبندِ چاک ہے موج از فروغِ ماہتاب
سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں در ویرانہ ہم

نسخۂ بھوپال میں پہلے مصرع میں اصلاح کی گئی ہے۔ پہلے مصرع یوں
تھا:

نقشبندِ خاک ہے موج از فروغِ ماہتاب

اصلاح سے شعر یوں ہوا:

ہے فروغِ ماہ سے ہر موج یک تصویرِ خاک   سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم

نسخۂ شیرانی میں :

ہے فروغِ ماہ سے ہر موج ایک تصویرِ چاک (اک)
سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم

نسخۂ بھوپال میں خاک ہے۔ چاک نسخۂ حمیدیہ میں ہے اور یہی لفظ مخطوطے میں ہے۔ اس کا امکان نہیں کہ نیچے تین نقطے دینے کے بجائے غلطی سے اوپر ایک نقطہ لگ گیا۔ کیوں کہ اصلاح سے پہلے کے مصرع میں بھی خاک ہے اور اصلاح کے بعد بھی۔ جب "مخطوطہ" پایۂ اعتبار سے گر گیا تو قرأت کا فرق اس کے الحاق الفاظ کی وجہ سے ہے۔

۳۸۔ اسی ورق پر ایک اور شعر ہے جو مخطوطہ نگاروں اور کاتب کے ظلم پر اس "بیاض" کے خلوت خانے میں ماتم کر رہا ہے۔

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ خلوتخانہ ہم

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ماتم خانہ کو خلوت خانہ کیا گیا ہے، یا خلوت خانہ کو ماتم خانہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماتمخانہ لکھنے کا ارادہ ماتہ لکھنے کے بعد بدل گیا اور خلوت خانہ لکھ دیا گیا۔ کون سا قافیہ پہلے اور کون سا بعد میں لکھنے کی سعی فرمائی گئی، یہ اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال میں قافیہ ماتم خانہ ہے اور نسخۂ شیرانی میں خلوتخانہ۔ نسخۂ عرشی زادہ میں تصریحات کے تحت یہ اندراج ہے کہ قافیہ پہلے خلوتخانہ تھا، جو ماتم خانہ کیا گیا۔ نسخۂ امروہہ کے مطابق قافیہ "خلوتخانہ" ہے۔ سوچنے کی باتیں یہ ہیں :

۱۔ اگر قافیہ خلوتخانہ پہلے لکھا تھا تو اُسے ماتم خانہ کیوں کیا؟ صرف اس لیے کہ نسخۂ بھوپال کی قرأت کے مطابق ہو؟ لیکن یہ اصلاح تو اس قافیہ پر دی گئی جو ۱۲۴۲ھ والے نسخے میں لکھا گیا۔ یعنی ۱۲۳۷ھ کے مصرع کی اصلاحی شکل ہے۔
۲۔ اگر قافیہ ماتم خانہ لکھا تھا تو وہ خلوت خانہ کیوں بنایا گیا — کیوں کہ ماتم خانہ نسخۂ بھوپال میں ہے اور اس کی قرأت اصلاح کے بعد نسخۂ شیرانی میں پہنچی۔ ۱۲۴۲ھ کی قرأت اور وہ بھی اصلاح کی کارفرمائی سے ۱۲۳۱ھ میں کیسے؟

کیا یہ دکھانا مقصود تھا کہ میرزا کو اصلاحات اور اصلاحاتِ معکوس کا مالیخولیا تھا؟

۳۹۔ ورق ۲۷۔ الف پر مطلع کے بعد کا شعر ہے :

کیا دے صدا کہ کلفتِ گم گشتگاں سے آہ
ہے سرمہ گردِ رہ بگلوے جرس تمام

نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع یہی ہے، لیکن پہلا مصرع یہ ہے :

کیا دے صدا کہ اُلفتِ گم گشتگاں سے آہ

لیکن نسخۂ شیرانی میں پہلا مصرع کلفت کے ساتھ "مخطوطے" کے مطابق ہے۔ یہاں بھی وہی مضمون ہے کہ نسخۂ بھوپال کی اصلاحی شکل مستقبل میں بھی ہے اور ماضی میں بھی۔ گویا ماضی اور مستقبل ایک ہیں بس حال مختلف ہے!

۴۰۔ اس نسخے میں ایک حرکت اور ہے۔ حوض میں تو "میرزا کے خط میں" اُن کا نسخۂ بھوپال سے پہلے کا کلام لکھوایا گیا ہے۔ لیکن حاشیوں میں "بخطِ غیر" میرزا کا کچھ کلام ہے۔ وثوق سے تو اس خطِ غیر کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ "مخطوطہ" نویس ہی نے ذرا سا انداز بدل کر حاشیے پر بھی کلام لکھا ہے اور ایسی غلطی بھی اس میں در آئی ہے کہ اگر حوض میں یہی غلطی ہوتی تو اُسے میرزا کے کلام کی ۱۲۳۱ھ سے پہلے کی قرأت قرار دیا جاتا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ معاملہ ختم۔ لیکن ہوا یہ کہ مخطوطہ سازوں نے ایک ہی غزل کے دو روپ بنا لیے تھے۔ ایک حاشیے کے لیے اور ایک حوض کے لیے۔ حاشیے پر "بخطِ غالب" لکھے جانے کے لیے اور اور حاشیے پر بخطِ غیر۔ ورق ۳۰ ب —— اور ۳۱ الف پر بات اُلٹی ہو گئی۔ حوض والی غزل کا ایک شعر "بخطِ غیر" حاشیے پر لکھ دیا گیا اور بخطِ غیر والی حاشیے کی غزل کا ایک شعر حوض میں۔ ورق ۲۷۔ الف پر۔ حوض کی غزل کا حاشیے کی غزل سے مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

حوض اور حاشیے پر پہلا مطلع ایک ہی قرأت کا حامل ہے :

شورش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں
جوں گردِ راہ جامۂ ہستی قبا کروں

مطلع اسی طرح نسخۂ بھوپال میں بھی ہے۔
حُسنِ مطلع حوض میں :

گر بعدِ مرگ عرضِ جنونِ ہوا کروں
موجِ غبار سے پرِ یک دشت وا کروں

حاشیے پر قرأت یہ ہے :

گر بعدِ مرگ وحشتِ دل کا گلا کروں
موجِ غبار سے پرِ یک دشت وا کروں!

کی قرأت جس شعر میں دکھائی گئی تھی، وہ حاشیے پر "بخطِ غیر" لکھا جانا تھا اور اصلاحِ معکوس والا جس میں "صحرائے آشکار" دکھایا گیا تھا۔ ابتدائی ورژن کے طور پر حوض میں "بخطِ غالب" لکھا جانا تھا۔ ذرا سی بھول چوک سے بات بگڑ گئی اور اسی لیے اتنی بڑی سی بات کو نسخۂ امروہہ کی تصریحات اور نسخۂ عرشی زادہ کے حواشی میں نظر انداز کیا گیا۔

البتہ ایک شعر، جس میں اصلاحِ معکوس کی گئی تھی، حوض ہی میں لکھا گیا:

آ، اے بہار ناز، کہ جوشِ خرام سے
دستار گردِ شاخِ گُلِ نقشِ پا کروں

حاشیے پر پہلا مصرع نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے
آ، اے بہارِ ناز، کہ تیرے خرام سے
اگرچہ مصرع آخر تک لکھا ہے۔ باقی جلد سازی سے کٹ گیا ہے۔

۴۱۔ ورق ۲۸۔ الف پر ایک شعر ہے:
تماشا کہ اے محوِ آیینہ بازی
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نسخۂ بھوپال میں مصرعِ اولیٰ ہے:
تماشا کر اے محوِ آیینہ داری

نسخۂ شیرانی میں:
تماشا کہ اے محوِ آیینہ سازی

ظاہر ہے کہ نسخۂ شیرانی میں "آیینہ سازی" کتابت کی غلطی ہے۔ اگرچہ عرشی نے اسے سہوِ کتابت نہیں بتایا ہے صرف اختلافِ نسخ تسلیم کیا ہے۔ "محبوب آیینہ سازی" نہیں کرتا۔ نسخۂ شیرانی کا مصرع یہ سمجھنا چاہیے۔
تماشا کہ اے محوِ آیینہ بازی

اور یہی قرأت مخطوطے میں دکھائی گئی ہے۔ متداول دیوان کے لیے میرزا نے نسخۂ بھوپال کے "آیینہ داری" ٹکڑے کو تو رکھا، لیکن "تماشا کر" کے ٹکڑے کو "تماشا کہ" وہ پہلے ہی نسخۂ شیرانی کے لیے کر چکے تھے۔

۴۲۔ ورق ۲۸۔ الف پر مطلع ہے:
جوں مردمکِ چشم میں ہوں جمع نگاہیں
خوابیدہ حیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

نسخۂ بھوپال میں مطلع جس طرح تھا، وہ نسخۂ حمیدیہ میں یوں ہے:
جوں مردمکِ چشم سے ہوں جمع نگاہیں
خوابیدہ بحیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

"سے" محلِ نظر ہے۔ کیوں کہ "جوں مردمکِ چشم سے پیدا ہوں نگاہیں" تو درست ہو سکتا ہے۔ مردمکِ چشم سے نگاہیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہاں سے تو نگاہیں ..... نکلتی ہیں۔ یہ بات میرزا نے بھی محسوس کی ہوگی، اور اسی وجہ سے نسخۂ شیرانی کے لیے مصرع میں اصلاح کی اور "سے" کی جگہ "میں" رکھ دیا۔
جوں مردمکِ چشم میں ہوں جمع نگاہیں۔

یہ مصرع جو ۱۲۳۷ھ کے بعد کا ہے، ۱۲۳۱ھ کے مخطوطے میں کیسے آ گیا اور اگر یہ ابتدائی صورت مصرع کی تھی تو "سے" نسخۂ بھوپال کے لیے کیوں لکھوایا گیا۔

۴۳۔ اس غزل کا مقطع، جو ورق ۲۸ ب پر ہے توجہ طلب ہے۔
یہ مطلع (اسدؔ) جوہرِ افسونِ سخن ہو
گر عرضِ تپاکِ نفسِ سوختہ چاہیں

نسخۂ بھوپال میں مصرعِ ثانی یہ ہے:
گر عرضِ تپاکِ جگرِ سوختہ چاہیں

نفسِ سوختہ، نسخۂ شیرانی کی قرأت ہے۔ ایک بار پھر یہ بوالعجبی سامنے آتی ہے کہ ۱۲۳۷ھ کے بعد کی اصلاحی قرأت ۱۲۳۱ھ کے مبینہ نسخے میں دکھائی گئی ہے۔

۴۴۔ مقطع میں، جس مطلع کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس "مخطوطے" میں یوں ہے:
حسرت کشِ یک جلوۂ بیدل ہیں نگاہیں
کھینچوں ہوں سویدائے دلِ چشم سے آہیں

فکرِ بیدل کا اعجاز، میرزا کا خیال تو "دیکھ" سکتا تھا، کھینچ تان کر "خیالِ بیدل کا جلوہ" غالب کی فکر بھی "دیکھ" سکتی تھی۔ "نغمۂ بیدل" کی طرح "آہنگِ بیدل" سے وہ فیض یاب ہو سکتے تھے۔ لیکن بیدل کی بشارت "بیدل کے چہرۂ زیبا دیکھنے کی حسرت! نہیں صاحب یہ الحاقی مصرع ہے۔ کیوں کہ بیدل کو زبردستی کھینچ کر لایا گیا ہے۔ مقطع میں جس مطلع کی طرف اشارہ ہے، اس کی قرأت یہ ہے:
حسرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں
کھینچوں ہوں سویدائے دلِ چشم سے آہیں

بار بار غزل پڑھنے اور غور کرنے سے یہ گمان تقویت پاتا جاتا ہے کہ میرزا پہلی غزل کے مطلع سے یا ساری غزل سے مطمئن نہیں تھے۔
جوں مردمکِ چشم سے پیدا ہوں نگاہیں
خوابیدہ بحیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

تلازمے اور الفاظ وہی رکھے۔ چشم، نگاہیں، داغ، سویدا آہیں۔ اور غزل ختم کرنے سے پہلے ہی اس زمین میں ایک اور غزل کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی الفاظ اور تلازمے رکھ کر، دوسری غزل کا مطلع کہا جس کی بگڑی ہوئی شکل بیدل کے ساتھ "مخطوطے" میں موجود ہے۔ اس میں بیدل کی وجہ سے ایک رعایت لفظی، دوسرے مصرع میں "دلِ چشم" کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے، جسے صنعتِ تضاد کہہ سکتے ہیں۔ غزل، قصیدے کی تشبیب الگ کر کے ایک صنف کے طور پر وجود میں آئی، جن حضرات نے غائر نظر سے قصیدے کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مطلعِ ثانی یا ایک اور مطلع کے مطلب صرف دو ہم قافیہ مصرعے نہیں ہوتے بلکہ قصیدے کا ایک اور باب ہوتا ہے۔ یہاں بھی غالب نے جو ایک اور مطلع کا حوالہ مقطع میں دیا ہے، اس سے مراد یقیناً یہی ہے کہ ایک

اور ہم طرح غزل کہنے کا ارادہ تھا اگر ایک اور غزل اُنہوں نے نہیں کہی ہوتی تو مقطع بدل دیتے ۔ مقطع برقرار رہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے ایک اور غزل بھی کہی، جس کا صرف ایک مطلع نسخۂ بھوپال میں ہے ۔ باقی اشعار نظری ہوئے ۔ اس مبینہ ۱۲۳۱ھ کی پہلی ردیف وار بیاض میں، صرف ایک مطلع ہی کیوں ہے ، پوری غزل کیوں نہیں، جبکہ ایسا ایسا بے ہودہ کلام ہے جو لکھا گیا اور اس پر خطِ تنسیخ پھیر اگیا ۔ جس طرح "مخطوطہ سازوں" کو یہ علم نہیں تھا کہ نیزہ کا قلم فولاد کا نہیں ہوتا اور اس لیے "زنگِ خامہ" اصلاحِ معکوس سے انہوں نے میرزا کے کلام کی ابتدائی قرآت میں دکھایا اسی طرح انہیں اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ مقطع میں اگلے مطلع کا ذکر پورے قصیدے یا ایک اور ہم طرح غزل کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۔

۴۵ ۔ ورق ۔ ۲۹ الف پر یہ مطلع ہے :

ہے ترحّم آفریں آرائشِ بیداد یہاں
اشکِ چشمِ دام ہے ہر دانۂ صیّاد یہاں

نسخۂ حمیدیہ میں ۱۲۳۷ھ کے نسخۂ بھوپال کی قرأت یہ ہے :

ہے ترحّم آفریں آرائشِ بیداد یہاں
اشکِ چشمِ دام ہے پروانۂ صیّاد یہاں

۱۲۳۱ھ کا مبینہ 'مخطوط' مطلع کو اُن الفاظ میں پیش کر رہا ہے جو ۱۲۴۲ھ کے نسخے (شیرانی) میں ہیں ۔

۴۶ ۔ اس غزل کا پانچواں شعر ہے :

جنبشِ دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار وا
کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے فرہاد یاں

نسخۂ حمیدیہ کے مطابق نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر جو دو شعر بعد میں بڑھائے گئے ہیں اُن میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ۔ نسخۂ عرشی میں صرف دوسرے شعر کے حاشیے پر ہونے کا اظہار ہے ۔ شاید اس کی وجہ سے "مخطوطہ سازوں" کو دھوکا ہوا ۔ اور یہ شعر ۱۲۳۱ھ کے مبینہ "مخطوطے" میں کتابت کر دیا گیا ۔ جو ۱۲۳۷ھ کے بعد کا ہے ۔

۴۷ ۔ ورق ۔ ۲۹ ۔ الف ہی پر یہ مطلع ہے :

اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
یکطرف جلتا ہے دل اور یکطرف جلتا ہوں میں

نسخۂ بھوپال میں دوسرا مصرع ہے :

ایک طرف جلتا ہے دل اور ایک طرف جلتا ہوں میں

اُس زمانے میں چونکہ اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے اس لیے یہ اِک ہے (آج کے اسلوبِ نگارش میں) نسخۂ شیرانی میں دونوں جگہ یکت ہے ۔ "مخطوطے" میں نسخۂ شیرانی کا مصرع ہے ۔

یہاں ایک بات اور عرض کرنا ہے ۔ امتیاز علی خاں عرشی اردو عربی اور فارسی کے عالم تھے ۔ اور مصرع موزوں پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ اُن کے نسخے میں جن مقامات پر نا درست قرأت درج ہے، اُن میں سے یہ بھی ہے اُنھوں نے اعراب بالحروف کا خیال نہیں کیا اور اپنے نسخے میں :

"ایک طرف جلتا ہے دل اور ایک طرف جلتا ہوں میں"

لکھوا دیا اور اس طرح آج کے اسلوب میں مصرع ساقط الوزن ہو گیا ۔ ۱۸، ۱۹ برس پہلے نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام میں اغلاط کی جو نشان دہی میں نے کی تھی، ان میں یہ غلطی بھی شامل[1] ہے ۔

۴۸ ۔ ورق ۳۰ ۔ رُخ پر ایک غزل کا مقطع ہے :

اسد حسرتکشِ یکداغِ مشک آلودہ ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

نسخۂ حمیدیہ میں نسخۂ بھوپال کی یہ قرأت ہے :

اسد حیرت کشِ یک داغِ مشک اندودہ ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

نسخۂ شیرانی میں مقطع یوں ہے :

اسد حسرت کشِ یک داغِ مشک اندودہ ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

بات بہت واضح ہے : "حسرت کش" ۱۲۴۲ھ کے مخطوطے میں ہے ۱۲۳۷ھ کے مخطوطے میں "حیرت کش" ہے ۔ ۱۲۳۱ھ کی مبینہ "بیاضِ غالب بخطِ غالب" میں نسخۂ بھوپال کو پھلانگ کر نسخۂ شیرانی کا "حسرت کش" لکھا جانا اسے جعلی ثابت کرتا ہے ۔ "مشک اندودہ" کی جگہ "مشک آلودہ" خود بخود الحاقی قرار پاتا ہے ۔

---

[1] بیاضِ غالب تحقیقی جائزہ ص۲۳۲ اور رموزِ غالب

بقیہ: مٹی کی چڑیوں کا انتظار

رابعہ کو خط لکھے پندرہ سال دن گزر چکا ہے ۔ گلی میں ڈاکیہ آکر جا چکا ہے ۔ ننھے ماموں آنکھوں پر ہاتھ کا چھجّہ بنا کر دیکھ رہے ہیں ۔ رابعہ نے خط ضرور لکھا ہوگا ۔ لگتا ہے ملا نہیں ۔ یا کون جانے ایک دن وہ بلا اطلاع آ جائے ۔ ننھے ماموں کو بے انتہا حیرت بھری مسرّت دینے کے لیئے اور رابعہ کی گودی میں وہ ہوگی ۔ ننھی رابعہ ۔ اس کے لئے خریدی گئی مٹی کی چڑیاں طاق پر محوِ انتظار ہیں اور محوِ انتظار ہیں ننھے ماموں ۔

اور ننھی رابعہ بڑی رابعہ کی گود میں بیٹھی ڈل جھیل میں تیر رہی ہے ۔

عبدالقوی دسنوی

نوعمر صحافی

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

آج بلاشبہ یہ بات نہایت یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مسلمان صحافی پیدا ہوئے اور ہندوستانی سیاست داں کی بلند اور محترم جگہ حاصل کر کے سفرِ زندگی کو اختتام تک پہنچا گئے۔ انہوں نے شاعری کا جادو جگایا، نثر کی ساحری کی، مذہبی میدان میں اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کی کہ امام الہند کا مرتبہ پایا۔ قرآن فہمی میں اپنی شناخت کرائی اور بلند مرتبہ پایا، لیکن ان کی یہ تمام فتوحات صحافت سے سیاست کے سفر میں گم ہو گئیں۔

اردو ہی نہیں، میرا خیال ہے شاید ہی ہندوستان کی کسی زبان میں ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی جیسا کم عمر صحافی پیدا ہوا ہو۔ جس نے اس راہ کی پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی اپنی فکری بلندی، اپنی ادبی صلاحیت، اپنے مذہبی رجحان، اپنے قومی خیالات، اپنے تعلیمی نظریات، اپنے اصلاحی پروگرام اپنے اردو زبان کی خدمات کے جذبے، اپنے تنقیدی شعور، اپنے روشن خیال اور اپنے صالح جذبات سے سارے ہندوستانی مسلمانوں کے اہلِ نظر، اہلِ خبر اہلِ کمال، اہلِ ادب اور قومی خدمت گزاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اور سب کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ ایک معمر، تجربہ کار، باصلاحیت، باوقار صحافی، ملک و ملت کی رہنمائی کی بہت اچھی صلاحیت کے مالک بھی ہیں اور نہایت مستحکم ارادے اور بلند حوصلے کے ساتھ اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف بھی ہیں۔

زندگی کے گزرتے ہوئے روز و شب، ماہ و سال میں نیک نامی اور کامیابی کی منزلوں نے ان کے قدم، قدم پر اس وقت سے ہی چومنے شروع کر دیے تھے۔ جب وہ گلدستہ نکالنے کے شوق میں نیرنگِ عالم نکال سکے تھے۔ ہفتہ وار المصباح (۱۹۰۱ء) اپنی ادارت میں منظرِ عام پر لا چکے تھے۔ احسن الاخبار (۱۹۰۲ء) کی ترتیب و اشاعت میں معاونت کرنے لگے تھے۔ مرقع عالم ہردوئی میں چھپنے لگے تھے۔ مخزن کے مضمون نگاروں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ الپنچ پٹنہ کے صفحات پر اپنے رشحات قلم کی بدولت نظر آنے لگے تھے۔ ایڈورڈ گزٹ شاہجہاں پور کے وقتی ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ منشی محبوب عالم صاحب کو دوبارہ پریس کانفرنس کی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ہفتہ وار تحفہ احمدیہ کی ترتیب کا کام سنبھالنے لگے تھے۔ ماہنامہ خدنگ نظر لکھنؤ کے حصہ نثر کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہو گئے تھے۔ اور نیک نامی اور کامیابی کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ کامیابی اور فتوحات کی یہ ساری منزلیں وہ گیارہ بارہ سال کی عمر سے تقریباً پندرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے طے کر رہے تھے کہ ان کے دل میں اپنا ایک مستقل ماہ نامہ جاری کر کے اردو زبان اور قوم کی خدمت کرنے کی خواہش مچلنے لگی اور وہ بہت جلد اپنی اس خواہش کو عملی جامہ اس طرح پہنا سکے کہ ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو انہوں نے کلکتہ سے اپنا بامقصد پہلا ماہ نامہ لسان الصدق دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا۔

اگرچہ اس وقت تک اردو کے نہایت اہم اور معتبر ہفتہ وار، پندرہ روزہ ماہ نامے اور سہ ماہی نکل چکے تھے یا نکل رہے تھے، جن میں معارف، علی گڑھ مخزن لاہور، مرقع عالم ہردوئی، خدنگ نظر لکھنؤ، زمانہ کان پور، تالیف و اشاعت، لاہور، الہ آباد ریویو، الہ آباد، ریاض الاخبار (گورکھپور) پیسہ اخبار (لاہور) عین الاخبار (مرادآباد) ایڈورڈ گزٹ (شاہ جہاں پور) نظام الملک (مرادآباد) وغیرہ اہم تھے۔ ایسے وقت میں لسان الصدق نے اپنے نوعمر اڈیٹر کے ذریعے اپنا تعارف کرایا اور ان جرائد کے درمیان اپنی شناخت کرائی اور انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان میں سے اکثر نے اس ماہ نامہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے متعلق اس طرح کی رائے کا اظہار کیا:

صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

"مخزن" لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء میں شیخ عبدالقادر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

"مولوی صاحب کے نام (یعنی ابوالکلام آزاد) سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ مخزن کے اوراق میں ان کے متعدد مضامین نکل چکے ہیں۔ اس کے سوائے انہیں اڈیٹری سے بھی تعلق رہا ہے۔ کلکتہ کے ایک ہفتہ وار[۱] اخبار اور لکھنؤ کے ایک مشہور رسالہ[۲] کی ترتیب کی خدمت دیر تک ان کے سپرد رہی ہے۔ ان کی ذاتی خداداد لیاقت اور واقفیت فن سے اُمید پڑتی ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکے گا۔"[۳]

مولوی ظفر علی خان نے فروری ۱۹۰۴ء کے "افسانہ" میں لسان الصدق سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

"۔۔۔۔ اس رسالے کے دو نمبر ہم نے دیکھے جن سے اس حسن ظن کی تصدیق ہوگئی جو ہم کو مولانا ابوالکلام کی نسبت پہلے سے تھا۔ پرچہ کا نام ایسے زمانہ میں جب کہ کثیر التعداد رسالجات و اخبارات کی اشاعت سے عمدہ ناموں کا کال پڑ گیا ہے۔ ایڈیٹر کے حسن انتخاب کا شاہد ہے۔"[۴]

عین الاخبار مراد آباد کے ایڈیٹر نے ۲۸ جنوری ۱۹۰۴ء کو تحریر کیا ہے :

"۔۔۔۔ مضامین کے بارے میں یہ عرض کرنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس کے ایڈیٹر کے خیالات ایسے ہی پاکیزہ ہیں کہ جیسے ایک خیر خواہِ مذہب کے ہونے چاہئیں۔"[۵]

دسمبر ۱۹۰۳ء کے "دل چسپ" میں لسان الصدق کے متعلق یہ لکھا گیا ہے :

"کلکتہ سے ایک ماہوار رسالہ جاری ہوا ہے، جس کے مہتمم اور ایڈیٹر مولوی ابوالکلام محی الدین احمد صاحب دہلوی ہیں جو ہندوستان کے مشہور انشا پرداز ہیں اور عرصہ دراز سے ملک و قوم کو اپنے مفید اور برجستہ خیالات سے مستفید کر رہے ہیں۔"[۶]

اڈورڈ گزٹ شاہ جہاں پور جنوری ۱۹۰۴ء میں تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا گیا:

"ہم صرف دو صاحبوں کے نام لے سکتے ہیں جنھوں نے لفظ تنقید کو اپنے اصلی معنوں میں سمجھا ہے اور نہ صرف سمجھا بلکہ عملاً ظاہر بھی کر دیا ہے۔ ان میں سے پہلے مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر تالیف و اشاعت لاہور اور دوسرے شیخ عبدالقادر صاحب بی اے مالک و ایڈیٹر مخزن لاہور ہیں یا اب ہمارے دوست مولوی ابوالکلام آزاد نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔"[۷]

اس زمانے کے ان اہم رسائل کے مدیروں کی اس طرح کی تعریفی تحریروں سے دو باتوں کی طرف ذہن جاتا ہے۔ اول یہ کہ لسان الصدق اور اس کے اہم مقاصد کو اس وقت نہ صرف پسند کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا بلکہ اس کے پہلے ہی شمارے نے اس زمانے کی معروف شخصیتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ دوسرے یہ کہ نوعمر آزاد کی پچھلی تحریروں نے کچھ ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ اہل علم میں متعارف ہو چکے تھے۔ عام طور سے لوگ انہیں عمر رسیدہ شخص، تجربہ کار مدیر، معروف عالم اور نیک نام مصنف متصور کرنے لگے تھے۔ لیکن لسان الصدق کی ان کی ادارت میں اشاعت، اس کے معیار اور حسب ذیل مقاصد نے اردو زبان کے اہل قلم اور اہل علم و فکر کو ان کا اور زیادہ مشتاق بنا دیا تھا۔

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی
۲۔ ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔
۳۔ علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگالہ میں۔
۴۔ تنقید یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

لسان الصدق کے پہلے شمارے کے دس صفحات پر ان مقاصد کو پھیلا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ رسالے کے مزاج اور مقاصد کو سمجھنے میں آسانی ہو اور یہی ہوا۔ اس تشریح نے آزاد کے اس وقت کے افکار، اُن کی ذہنی کیفیت اور قومی و ملی دل چسپی سے عام قارئین کو پوری طرح واقف کرا دیا ——— یقیناً اردو دنیا میں آزاد کے یہ خیالات اور مقاصد نئے نہ سہی، ان کے قلم سے فکر انگیز اور پُرکشش ضرور محسوس ہوئے، جس کی وجہ سے لوگوں کی نظریں ابوالکلام آزاد کی طرف اُٹھنے لگیں۔ ان کے جذبے کی سچائی اور مقاصد کی اہمیت نے ان کے قلم میں بڑا اثر پیدا کر دیا تھا۔ صفحہ اول پر ان کا یہ اعلان اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا :

"الصدق ینجی و الکذب یھلک"

لسان الصدق کا دستور العمل ہے اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے۔ جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی اُمید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ اُنہیں ایسے ترانے سنائے گا جو

۱۔ احسن الاخبار کلکتہ
۲۔ خدنگ نظر لکھنؤ
۳-۴-۵-۶۔ لسان الصدق، کلکتہ۔ ص: ۱۸۔ فروری ۱۹۰۴ء
۷۔ لسان الصدق کلکتہ۔ ص: ۲۳۔ اپریل ۱۹۰۴ء

نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی
ہے۔ پھر سچائی کی زبان کیونکر شیریں معلوم ہوگی ؟
یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سُنائے گا، جو اگرچہ تمہیں ناگوار
معلوم ہوں گی۔ لیکن اس زمانے کو دُور نہ سمجھو، جب کہ
صدق کا سچی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔"

یہ اعلان جس یقین اور اعتماد کے ساتھ کیا گیا ہے وہی اس رسالہ کے مدیر کی بڑائی اور نیک نیتی کی نشان دہی کرتا ہے، لیکن اپنی تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کے باوجود اس رسالے نے بہت مختصر زندگی پائی۔ نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک اس کے کُل تیرہ[۸] شمارے منظرِ عام پر آئے۔

یہ ماہ نامہ نومبر ۱۹۰۳ء سے ستمبر ۱۹۰۴ء تک مسلسل نکلتا رہا۔ پھر چھ مہینہ کے وقفہ کے بعد اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے دو شمارے مشترکہ آئے۔

آسانی کے لیے میں اسے دو دَور میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا دور ابتدا سے ستمبر ۱۹۰۴ء تک اس لیے مناسب ہے کہ اس زمانے میں یہ رسالہ ایک مزاج کے ساتھ نکلتا رہا۔ دوسرا دَور چھ ماہ بعد اپریل مئی ۱۹۰۵ء کا مشترکہ شمارہ ایڈیٹر کے نئے عزائم اور مقاصد کے ساتھ نکل کر ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

پہلے دَور میں جو تحریریں خود مولانا آزاد اور دوسرے مضمون نگاروں کی شائع ہوئی ہیں، اُن کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا نے جن مقاصد کا پہلے شمارے میں ذکر کیا تھا، اُن ہی کی روشنی میں لسان الصدق میں تمام تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ اس دَور میں مولانا آزاد کے علاوہ محمد یوسف رنجور عظیم آبادی، ابو النصر آہ، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، غلام [illegible] مہر، رضا علی وحشت، سید محمد سعید بلگرامی، محسن الملک، سید شاہد حسین اثیم [illegible] وغیرہ اس کے مضمون نگار تھے۔ ان میں سب سے زیادہ تحریریں خود مولانا آزاد کی ہیں۔ ان کے بعد غلام یٰسین ابو النصر آہ، محمد یوسف رنجور عظیم آبادی کی شائع ہوئی ہیں۔

مولانا آزاد کی تحریریں رسالہ کے مقاصد کی ترجمان ہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مقاصد سے غافل نہیں رہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ہمیشہ فکرمند نظر آئے۔ سرسید کے بہت بڑے ہمنوا رہے۔ شبلی کے ہم خیال، ہم مزاج ہی نہ تھے۔ بلکہ ہمیشہ اُن کی صلاحیتوں کے معترف رہے اور ذہنی طور پر اُن کے قریب رہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے تصنیفی کاموں اور خدمات کے دل سے قدر داں اور ان کی کامیابیوں اور نیک نامیوں سے خوش ہوتے رہے اپنی زبان اردو کے لیے فکرمند تھے اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ہمیشہ اردو کے تصنیفی کاموں سے باخبر رہے اور باخبر کرتے رہے۔ رسالے کے ذریعہ صحت مند تنقید کو رواج دینے کی کوشش کرتے رہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی لیتے رہے۔ اور رسوم اور توہمات کے خلاف آواز اُٹھاتے رہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی اصلاح چاہتے رہے۔ سرسید سے وابستگی کی وجہ سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق لسان الصدق میں مولانا آزاد نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

> "....ابتدا میں سرسید مرحوم نے "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" تجویز کیا تھا۔ اگرچہ تقریباً کانگریس اور کانفرنس دونوں ہم معنی ہیں۔ لیکن انگریزی میں کانگریس کا عموماً "سیاسی مجلسوں" پر اطلاق ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو اس خیال سے کہ کانگریس کا نام ایسی حالت میں کہیں لوگوں کو دھوکا نہ دے سرسید نے بجائے کانگریس کے کانفرنس سے نام تبدیل کر دیا۔ جو آج تک قائم ہے۔ لیکن جس زمانے میں سرسید نے کانفرنس کی بنا ڈالی ہے اُسی زمانے میں تعلیمی ضرورت سب سے بڑی اشد ضرورت تھی اس لیے سرسید نے "ایجوکیشنل کانفرنس" نام تجویز کرکے خاص تعلیمی مقصد قرار دیا۔"[۹]

لسان الصدق میں یہ پہلی تحریر ملتی ہے جس میں مولانا آزاد سرسید کے ہم نوا محسوس ہوتے ہیں۔ پھر جنوری ۱۹۰۴ء میں وکسحیگہ نیشنل کانگریس

---

[۸] جلد ۱ نمبر ۱ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء صفحات ۱۶ ہادی پریس کلکتہ نمبر ۱۴۱ ہیرسین روڈ
جلد ۱ نمبر ۲ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۳ء " ۱۶ ہادی المطابع واقع ہیرسین روڈ نمبر ۱۴۱ کلکتہ
جلد ۲ نمبر ۱ ۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء " ۱۶ " " " " "
جلد ۲ نمبر ۲ ۲۰ فروری ۱۹۰۴ء " ۲۴ " " " " "
جلد ۲ نمبر ۳ ۲۰ مارچ ۱۹۰۴ء " ۲۴ " " " " "
جلد ۲ نمبر ۴ ۲۰ اپریل ۱۹۰۴ء " ۲۴ " " " " "
جلد ۲ نمبر ۵ ۲۰ مئی ۱۹۰۴ء " ۳۲ " " " " "
ضمیمہ معاشرانہ زندگی : محمد یوسف رنجور صفحات ۸
جلد ۲ نمبر ۶-۷ جون جولائی ۱۹۰۴ء صفحات ۴۲ " " " " "
ضمیمہ معاشرانہ زندگی، محمد یوسف رنجور صفحات ۸
جلد ۲ نمبر ۸-۹ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء صفحات ۳۲ مطبع فیض رساں بمبئی میں چھپا
جلد ۳ نمبر ۱-۲ اپریل، مئی ۱۹۰۵ء صفحات ۵۷ مفید عام پریس آگرہ بہ اہتمام محمد قادر علی خاں صوفی

کل صفحات : ۲۸۳ + ۱۶ صفحات (معاشرانہ زندگی)

[۹] لسان الصدق کلکتہ دسمبر ۱۹۰۳ء ص: ۴

کے متعلق اس انداز سے لکھتے ہیں، جس سے ابوالکلام آزاد کے کانگریس سے اختلاف کا احساس ہوتا ہے۔

"باخبر ناظرین واقف ہوں گے کہ جب ہندوؤں نے نیشنل کانگریس قائم کی تھی تو سرسید مرحوم کی مخالفت منجملہ اور وجوہ کے سب سے زیادہ اس وجہ پر مبنی تھی کہ اس کا نام گورنمنٹ کو سخت دھوکا دینے والا ہے۔ اس کا نام دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ایک قومی کانگریس ہے۔ حالانکہ سوا ہندوؤں کے اس میں کوئی شریک نہیں ہے پھر نیشنل کا لفظ بالکل حالت کے خلاف ہے۔ ہندو کہتے تھے کہ اس میں دیسی عیسائی شامل ہیں اور مسلمان بھی اس کے ہمدرد ہیں۔ سرسید کو مسلمانوں کا بچانا منظور تھا۔ اُنہوں نے پبلک اور گورنمنٹ پر ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج تیرہ چودہ برس کے بعد خود کانگریس کے ہمدردوں کو اس کا احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے سرگرم ممبر اب وہی راگ گانے لگے ہیں، جو کبھی سرسید کی زبان پر جاری تھا اور جس نے اسی کانگریس کی زبانی دشمنِ قوم و ملت کا خطاب انہیں دیا تھا۔" [10]

لیکن مئی ۱۹۰۴ء پہنچتے پہنچتے مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کی طرف رجوع ہونے لگتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں یہ نیا موڑ آیا تھا۔ اُنہوں نے کانگریس کے بارے میں تحریر کیا:

"انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس امسال بمبئی میں قرار پایا ہے جس کی طیاریاں نہایت وسیع پیمانے پر ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔ کانگریس کا بیسواں اجلاس ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بہ لحاظ نتائج کے یہ اجلاس پچھلے انیس جلسوں پر فوقیت لے جائے گا۔ اس اجلاس کے چیئرمین مسٹر فیروز شاہ مہتا انتخاب کیے گئے ہیں، جو مشہور عالی دماغ اور کانگریس کے قدیم حامی ہیں۔ اگر ہماری یاد غلطی نہیں کرتی تو غالباً کانگریس کے دوسرے جلسہ کی کرسی صدارت کو بھی اُنہیں سے رونق دی گئی تھی۔ بمبئی کے مشہور قومی فیاض مسٹر ٹاٹا سے بھی ہمدردی کی توقع کی جاتی ہے، جن کے اصلاحی خیالات اور قومی محبت کانگریس کے مقاصد سے کبھی مخالفت نہیں کر سکتی۔" [11]

لیکن ان کی سرسید سے وابستگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ سرسید کے علاوہ جن اہم شخصیتوں سے مولانا آزاد کو اس زمانے میں خاص دلچسپی تھی ان میں دو نام حالی اور شبلی بہت اہم ہیں۔ دونوں سے آزاد کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ دونوں کے علمی و ادبی کاموں اور افکار و خیالات کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ لسان الصدق کے مختلف اوراق پر ان دونوں محترم شخصیتوں سے آزاد کی گہری وابستگی کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ جنوری ۱۹۰۴ء کے لسان الصدق میں "قومی اعزاز" کے تحت مولانا حالی سے متعلق یہ تحریر ملتی ہے:

"جناب مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی نظم و نثر تصنیفات سے اردو لٹریچر میں جو نئی جان پیدا کر دی ہے وہ ہمیشہ اردو زبان کی تاریخ میں نمایاں طور پر یادگار رہے گا۔ یہ اُنہیں کا احسان ہے کہ اُنہوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو بایوگرافی کے جدید اصول سے آشنا کیا اور سب سے پہلے اوس کا عمدہ نمونہ حیاتِ سعدی پیش کیا۔ یہ اُنہیں کے پُر زور قلم کا اثر ہے جس نے مقدمہ دیوانِ حالی میں پیدا ہو کر تمام ہندوستان میں نیچرل شاعری کی دھاک باندھ دی۔ اُنہیں کے درد بھرے دل نے پہلے پہل ہم کو یہ نصیحت کی کہ اوروں کی مرثیہ نگاری چھوڑ کر کچھ دیر اپنی حسرت ناک حالت کا مرثیہ بھی کہہ لو نہ صرف یہ نصیحت کی بلکہ قومی مرثیہ لکھنے کی خود ابتدا کی اور لکھ کر ہمیں دکھلا دیا کہ سچے دل سے جو مرثیہ لکھا جائے گا وہ ایسا موثر ثابت ہوگا، اسی قومی مرثیہ نے قوم پر وہ فوری اثر کیا جو تہذیب الاخلاق کی ہفت سالہ کوشش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ایک ایک بند ہمارے لٹریچر کے لیے قابلِ فخر اور ایک ایک شعر مصائب کی سچی تصویر ہے۔" [12]

اور حالی کی تصنیف "حیاتِ جاوید" کے متعلق یہ فیصلہ سناتے ہیں:

"اُن کی سب سے آخری مگر سب سے بیش بہا تصنیف "حیاتِ جاوید" (سرسید کی لائف) بے شبہ ایسی کتاب ہے جسے تصنیف کرنے سے مولانا نے قوم کو اور قوم کی زبان کو ہمیشہ کے لیے اپنا مرہونِ منت کر لیا ہے۔ اردو زبان

---

[10] لسان الصدق جنوری ۱۹۰۴ء ص: ۳

[11] لسان الصدق۔ مئی ۱۹۰۴ء ص: ۵

[12] لسان الصدق۔ جنوری ۱۹۰۴ء ص: ۱۴

میں یہ پہلی بائیوگرافی ہے جو اس محنت اور جاں کاہی سے تصنیف
ہو کر انگریزی تصانیف کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ
کرتی ہے۔" [۱۳]

حبیب "ریاض الاخبار" گورکھپور اور "پیسہ اخبار" لاہور میں مولانا حالی کی شاعری
کے بارے میں غلط بحث چھڑ گئی تو مدیر لسان الصدق سے رہا نہ گیا۔ انہوں
نے دونوں کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا:

"... داغ اور جلیل کی ایک غزل سے کر حالی کے کلام سے
مقابلہ کرنا سخت غلطی ہے۔ اگر داغ و جلیل اوس
میدان کے مرد ہوتے، جہاں حالی اپنا گھوڑا سرپٹ
دوڑاتے ہوئے لے گئے ہیں تو مقابلہ کوئی نسبت رکھتا
ورنہ ایک قومی شاعر کا کسی حسن و عشق کے مارے ہوئے
غزل گو سے مقابلہ کرنا نری احمقی ہے۔" [۱۴]

آزاد کی مولانا شبلی سے پہلی ملاقات دسمبر ۱۸۹۹ء[۱۵] میں کلکتہ میں ہوئی تھی۔
ممکن ہے اس ملاقات سے پہلے ہی سے مولانا شبلی سے اُن کی واقفیت ہو اور وہ
ان سے ذہنی وابستگی رکھتے ہوں یا پھر اسی ملاقات کے بعد سے آزاد مولانا
شبلی سے قریب ہوگئے ہوں۔ چنانچہ لسان الصدق کے اوراق میں مولانا شبلی
سے گہرے تعلق کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو محمڈن
ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی کی رپورٹ ۱۹۰۳ء کے متعلق مولانا آزاد نے اپنے خیالات
کا اس طرح اظہار کیا ہے:-

"انجمن ترقی اردو کی رپورٹ ۱۹۰۳ء جو جناب مولانا شبلی
نعمانی سکریٹری انجمن نے پیش کی اُوس کے دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس انجمن نے اپنے سکریٹری کی بدولت
ان نو مہینوں میں جو کوشش کی ہے اور جس قدر عملی
نتائج اوس سے پیدا ہوئے ہیں وہ کانفرنس کی زندگی
میں پہلی کوشش سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔"

اور کانفرنس کی دوسری شاخوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں:

"... الغرض مولانا شبلی بالقابہ کی بے بہا کوشش ضرور
قابل تحسین ہے۔ کاش کہ کانفرنس کی اور شاخیں بھی
اسی طرح کی کوشش کرتیں۔" [۱۶]

---

۱۳ لسان الصدق جنوری ۱۹۰۴ء ص: ۱۴
۱۴ ،، ،، فروری ۱۹۰۴ء ص: ۳
۱۵ ابوالکلام آزاد: عبدالقوی دسنوی ص: ۲۷
۱۶ لسان الصدق فروری ۱۹۰۴ء ص: ۲

اسی شمارے میں مولانا شبلی کی تیار کردہ انجمن ترقی اردو سے متعلق تفصیلی رپورٹ
بھی شائع کی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضمون "ترقی اردو" میں مولانا
شبلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تراجم علوم و فنون کے متعلق اگرچہ ہم تمام بحثیں طے
کرچکے ہیں، لیکن ابھی ایک اور مخالف رائے پر بحث کرنا
باقی ہے جو قوم کے ایک فاضل اور باوقعت مصنف
کے قلم سے نکلی ہے۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے اپنے
مشہور مضمون "گزشتہ تعلیم مسلمانان" میں قدیم تراجم
علوم پر بحث کرتے ہوئے ایک طویل فہرست ان کتابوں
کی دی ہے جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں سنسکرت، یونانی
اور فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔"

اس کے بعد مولانا آزاد نے مولانا شبلی کی تحریر کے اس اقتباس کو پیش کیا ہے
جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ کے مخالف تھے، جس کی وضاحت کے لیے مولانا
آزاد نے ان کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا تھا، جس کا جواب ۲۲ مارچ
۱۹۰۳ء کو انہوں نے دیا تھا:

مکرمی! آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا.....
ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔ گزشتہ تعلیم میں سرسید نے مجھ سے
عبارت بہ جبر لکھوادی تھی میں نے سخت انکار کیا تھا، لیکن ان کا
اصرار غالب آیا۔
میں تو ترجمہ کو اصلی علمی خدمت سمجھتا ہوں بلکہ انشاءاللہ اس کا
ایک باضابطہ سررشتہ قائم کروں گا۔ [۱۵]

اس طرح لسان الصدق کے اوراق کے مطالعہ سے صاف صاف محسوس
ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سرسید، حالی اور شبلی کے افکار سے کافی متاثر تھے اور
ان کی خدمات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

لسان الصدق کا جون جولائی ۱۹۰۴ء کا شمارہ مشترکہ آیا۔ پھر اگست
اور ستمبر کا بھی مشترکہ شمارہ شائع ہوا، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مشترکہ
شمارہ تین ماہ کے وقفہ سے شائع ہوا۔ جس میں مولانا آزاد "خریداران لسان
الصدق کی خدمت میں ایک گزارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تین مہینے کی مسلسل غیر حاضری کے بعد آج لسان الصدق
حاضر ہوتا ہے۔ اڈیٹر کی سخت علالت، مختلف مقامات
کا سفر، چند در چند پریشانیاں۔ یہ اور اسی قسم کے
اور وجوہ ہیں جن سے میں اس وقت معذرت کا کافی کام

---

۱۷ لسان الصدق اگست ستمبر ۱۹۰۴ء

ہے سکتا ہوں ۔ لیکن درحقیقت اپنی ذاتی مجبوریوں کو
کسی پبلک کام میں پیش کرنا ایک ناجائز طریقہ ہے
اس لیے میں اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے لسان الصدق
کی آئندہ حالت کے متعلق اطمینان دلاتا ہوں کہ اب
اس کو آپ ہمیشہ وقت کا پابند اور ہر حیثیت سے بہتر
پائیں گے ۔"

اس کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا کہ :

"۔۔۔۔ اس پرچہ میں آئندہ آپ کو اُن حضرات کی
تحریریں نظر آئیں گی جن کی مستقل تصنیفات کے سوا
عام رسائل میں بہ مشکل زیارت ہوتی ہے ۔ چھپائی
لکھائی کے لحاظ سے یہ پرچہ انشاءاللہ تمام پرچوں میں
ممتاز ثابت ہوگا۔ عمدہ تصاویر اور نقشوں سے پرچہ
کو رونق دی جائے گی ۔ عام مضامین کے سوا بالخصوص
سائنٹیفک تحریرات کا خاص اہتمام ہوگا اور عموماً
انہیں عنوانوں پر تحریریں نکلا کریں گی ، جن پر اردو
میں آج تک بالکل نہیں یا بہت کم لکھا گیا ہے ۔"

اسی شمارے میں ایک بار پھر ص ۱۳ پر لسان الصدق ۱۹۰۵ء کے تحت اعلان کیا گیا ہے :-

"لسان الصدق کی زندگی میں عنقریب ایک انقلاب
ہونے والا ہے ! یہ انقلاب صرف مبادلہ سنین کا انقلاب
نہ ہوگا بلکہ اس کی صوری اور معنوی حالتوں میں ایسے
اہم تغیرات ہوں گے جن سے اس کی وہ قدیم صورت
بالکل ہی بدل جائے گی ۔"

چنانچہ آئندہ ۱۹۰۵ء سے لسان الصدق کی تبدیلیوں کے متعلق یہ باتیں تحریر کی گئی تھیں :

۱۔ "لسان الصدق" جنوری ۱۹۰۵ء سے مستقل دو جُز کی ضخامت
میں نکلا کرے گا ۔"
۲۔ مفید عام پریس میں چھپا کرے گا ۔
۳۔ جنوری سے ایک نیا سلسلہ مشاہیر الشرق شروع ہوگا ۔
۴۔ تصویریں اعلیٰ درجہ کی چھاپی جائیں گی ۔
۵۔ قیمت میں بھی اضافہ کیا جائے گا ۔

اور اس رسالہ کے مقاصد یہ بتائے گئے تھے :

۱۔ اصلاح خیالات
۲۔ آئندہ ایسے مذہبی مضامین شائع ہو سکیں گے جن میں کسی خاص
تحقیق سے کام لیا گیا ہو ۔

۳۔ ترتیب مضامین کی یہ صورت ہوگی :

۱۔ انیسویں صدی کے کسی مشرقی فاضل کی تصویر اور حالات
۲۔ ایک مذہبی مضمون
۳۔ علمی ، تاریخی ، اخلاقی اور سائنٹیفک مضامین ۔
۴۔ انتقاد
۵۔ کسی عمدہ کتاب کا مسلسل ترجمہ یا کوئی مفید علمی تصنیف ۔

اسی شمارے میں مولانا آزاد نے اپنی تصنیف "معتزلہ" کی اشاعت کا بھی اعلان کیا ہے ۔ انہوں نے تحریر کیا ہے :

"چنانچہ کچھ عرصہ سے میں اس کی ترتیب میں بھی مصروف
ہوں ۔ اس کے تین حصے قرار دئے ہیں
۱۔ پہلے حصہ میں ذیل کے مضامین ہیں :
اسلام کی ابتدائی حالت ، اسلام کی سادگی ، ممدن اقوام میں
اسلام کی اشاعت ، مذہبی اعتقادات میں باریک بینی کی ابتدار
اختلاف عقائد کے وجوہ ، مختلف فرقوں کا پیدا ہونا اور معتزلہ کا آغاز
اعتزال کا پہلا دور ، دوسرا دور ، تیسرا دور ، چوتھا دور ، اعتزال
کا تنزل ۔
۲۔ دوسرے حصے میں ذیل کے مضامین ہوں گے :
معتزلہ کے مختلف طبقات اور ان پر ایک اجمالی نظر ، مشاہیر معتزلہ
کے حالات ۔
۳۔ تیسرے حصے میں معتزلہ کے عقائد و اصول پر مفصل ریویو ہوگا ۔
پہلا حصہ لکھ چکا ہوں ۔ دوسرا زیر ترتیب ہے ۔

لسان الصدق کے پہلے دور کے آخری شمارے میں ۲۰ جون ۱۹۰۵ء سے ایک ماہ وار رسالہ "ریویو" نکالنے کی خبر بھی دی گئی ہے جس کا مقصد قابل قدر تصنیفات پر تبصرہ شائع کرتا تھا ، لیکن یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا یا نہیں ، اس کا علم نہیں ہو سکا ۔

دوسرے دور کا پہلا اور آخری شمارہ دراصل پہلے دور کے آخری شمارہ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء کے چھ ماہ بعد اپریل ۱۹۰۵ء میں آیا تھا ۔ جس کی ضخامت غالباً ۵۹ صفحات تھی ۔ اداریہ میں مولانا آزاد نے تحریر کیا تھا :

"جنوری ۱۹۰۵ء کا نمبر ۳۰ صفحوں تک لکھا جا چکا تھا
اور اشاعت میں صرف ایک ہفتہ دیر تھی کہ یکایک
علالت کے ایک سخت حملہ نے ایڈیٹر کو دو مہینے ذی فراش

---

۵۹ لسان الصدق کے اس شمارے کے ۵۹ صفحات کا ہی مجھے علم ہو سکا ہے ۔

بتا دیا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری ذاتی مجبوریاں کسی پبلک کام کے لیے معقول عذر کا کام نہیں دے سکتیں۔ لیکن جب کہ اردو رسالوں کی غریب حالت زمانے پر ظاہر ہے جس کی زندگی اور زندگی کے تمام لوازم صرف ایک شخص کی قوت اور اطمینانی حالت سے تعلق رکھتے ہیں تو ایسی حالت میں ہم کیوں نہ صاف صاف عرض کر کے قدر دانان لسان الصدق سے معافی کے خواستگار رہوں۔ تین مہینے کی غیر حاضری نے سلسلۂ ترتیب میں چونکہ بہت بڑا انقطاع پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے اس جدید اشاعت کا پہلی سہ ماہی چھوڑ کر اپریل ۱۹۰۵ء سے شروع کیا جاتا ہے۔ ابتدائی نوٹس کا تعلق اگرچہ زیادہ تر جنوری ۱۹۰۵ء سے ہے، لیکن چونکہ نتیجہ کے لحاظ سے ہر زمانے کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے اپریل کے نمبر میں ان کا شائع کرنا مجبوری پر نظر کرتے ہوئے زیادہ ناموزوں نہیں ہے۔[۵۰]

اس شمارے میں پہلی دو تحریریں (مبادلۂ سنین ترقی اردو نمبر ۲) خود مولانا آزاد کی ہیں۔ مبادلۂ سنین میں مولانا آزاد نے اپنی بیماری اور ان دوسری پریشانیوں اور مجبوریوں کا اظہار کیا ہے، جن کی وجہ سے لسان الصدق جنوری ۱۹۰۵ء میں منظرِ عام پر نہ آسکا۔ لکھتے ہیں:

"لسان الصدق ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اور جنوری ۱۹۰۴ء سے اس کی دوسری جلد شروع ہوئی تھی۔ نومبروں پر یہ جلد ختم ہو گئی اور آج جنوری ۱۹۰۵ء ہے۔ یہ تیسری جلد میں قدم رکھتا ہے۔"

....

اس سال بھر ہم کن مجبوریوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہے؟ یہ سوال پہلے سوال سے گو آسان ہے مگر اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مختلف مقامات کا سفر، سخت دائم المرضی، چند پریشان کن واقعات، بعض ایسی پیچیدگیاں جو وسعت تعلق سے دنیا میں رہنے والوں کو اکثر پیش آیا کرتی ہیں۔ اور اسی قسم کے متعدد واقعات جو سال بھر میری امیدوں اور آرزوؤں کو خاک میں ملا کر پریشانی میں اضافہ کرتے رہے ..."

آگے یورپ اور امریکہ سے نکلنے والے مختلف مزاج اور معیار کے رسالوں کا تذکرہ کر کے اپنے باخبر ہونے کا ثبوت دیتے ہیں اور "ریویو" ضمیمہ کے طور پر نکالنے کی اطلاع دیتے ہیں۔

علامہ شبلی کا ذکر کرتے ہوئے نہایت اعتماد سے لکھتے ہیں،

"شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے (بہ لحاظ اس خاص شفقت و عنایت کے جو ایک عرصہ سے ہمارے حال پر فرماتے ہیں اور بہ لحاظ اس خصوصیت کے جو ہم کو مولانا کے تمام خادموں میں حاصل ہے) وعدہ فرمایا تھا کہ جنوری کے نمبر کے لیے کوئی مضمون ضرور عنایت فرمائیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ لسان الصدق کے سادہ صفحات ادھر تو اس مضمون کا انتظار کر رہے تھے اور ادھر مولانا مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہو کر ایفائے وعدہ سے مجبور ہو رہے تھے۔ مضمون پہنچا تو یہ پہنچا کہ ایک صغیر سن بچہ اور ایک صلبی اولاد صاحبزادے کے انتقال نے مولانا کے دل و دماغ کو سخت صدمہ پہنچایا۔"

آگے یہ بھی تحریر کیا:

"ممکن تھا کہ اگر ہمارا اصرار بڑھتا تو وہ ہمارے ناکام امید کے کامیاب کرنے کی کوشش کرتے، لیکن درحقیقت وہ خادم سخت نالائق ہے جو اپنے قابلِ احترام مخدوم کو ایسی پریشانیوں میں تکلیف دینے کی جرأت کرے۔ اس لیے ہم مولانا کی آئندہ عنایتوں کے امیدوار ہو کر اس بے جا جرأت سے باز رہے۔"[۵۱]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کی کامیابی کا ذکر بھی ملتا ہے، جس میں شرکت کے لیے مولانا آزاد نے ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء کو لکھنؤ کا عزم کیا تھا۔ لیکن ناگہاں بیماری کی وجہ سے لکھنؤ بہت دیر سے پہنچے تھے۔

۱۹۰۴ء میں نکلنے والے رسائل "اتحاد" اور "عرفان" کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اتحاد کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:

"اتحاد اس زبردست اتحاد کو مضبوط کرنا چاہتا ہے جو قدرت نے ایک ملک کی دو قوموں میں اتحاد ملکی کے لحاظ سے پیدا کر دیا ہے۔"

لیکن "العرفان" کے نکلنے پر ناپسندی ظاہر کی۔ انہوں نے لکھا:

"دوسرا رسالہ جس مقصد کے لیے شائع ہوا ہے اس کی ضرورت ہی میں ہم کو کلام ہے۔ ہر قوم کے تنزل پر مذہب کی ایک نئی صورت پیدا ہو جایا کرتی ہے جو

---

[۵۰] لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۵۹۔ بحوالہ امام الہند مولانا آزاد از امداد صابری ص ۴۲

[۵۱] لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص: ۱۹-۱۸

تنزل کی بنیادیں مضبوط کر دیتی ہے۔ مسلمانوں کے
تنزل نے مذہبی صورت میں جو ایک نئی شکل اختیار
کی ہے ہمارے نزدیک اس کا نام تصوف ہے۔"

اس تحریر میں اردو پریس کانفرنس کا ذکر بھی ملتا ہے، جس کا خیال منشی محبوب عالم کو ۱۸۹۵ء میں آیا تھا۔ اور مئی ۱۸۹۶ء میں ایک جلسہ بھی کیا گیا تھا۔ لیکن یہ جلسہ اس لیے ناکام ہوا تھا کہ صرف دو ایڈیٹر جلسہ میں شریک ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ منشی محبوب عالم کی ہمت پست ہو گئی تھی، لیکن جب ایڈورڈ گزٹ شاہ جہاں پور میں مولانا آزاد نے ایک نوٹ لکھ کر منشی صاحب کو پریس کانفرنس کی طرف ایک بار پھر متوجہ کیا تو بمبئی کانفرنس کے بعد محمڈن پریس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ قواعد اور دستور مرتب کیے گئے۔ عہدے دار منتخب ہوئے۔ "آفیشل سکریٹ بل" کے خلاف تجویز پاس کی گئی۔ اس کے باوجود مولانا آزاد نے لکھا :

"لیکن جب ان کارروائیوں کے بعد نظر اٹھا کر
دیکھا گیا تو تمام زور و شور بادِ ہوائی معلوم ہوا اور
پھر وہی خاموشی چھا گئی۔" [۲۰]

مسلم پریس کانفرنس کا دوسرا جلسہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۴ء کو لکھنؤ میں ہوا جس میں خواجہ غلام الثقلین (ایڈیٹر عصر جدید) مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر البشیر) ریاض الدین (ایڈیٹر الریاض) مولوی ابوالکلام آزاد (ایڈیٹر لسان الصدق) اور شیخ جمال الدین (ایڈیٹر ہمدرد) نے بحث میں حصہ لیا اور مسلم پریس کانفرنس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور دستور العمل تیار کیا گیا۔

اس تحریر میں سرسید کا ذکر مولانا آزاد نے اس طرح کیا ہے :

"... اس سے چالیس برس پیشتر جب کہ مرحوم سرسید
احمد خاں نے اپنی علمی اور مذہبی اصلاح کی بنا رکھی
اور موجودہ مدنیت پر نظر کر کے ایک نئے
علم کلام کی بنا ڈالی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر
اس واحد او یکتا، منادی کرنے والے کے بہت
سے شریک پیدا ہو جائیں گے اور وہ ہی آواز بلند
کریں گے جو اس مظلوم کی مصلح زبان سے نکل کر
کفر و ضلالت کا خطاب پا چکی ہے۔" [۲۱]

لسان الصدق کے اس آخری شمارے کے اداریہ کے مطالعہ سے سولہ سترہ سال کے ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کی علمی صلاحیت قومی دلچسپی، صحافتی تجربات، وسعت مطالعہ کے ساتھ ان کے اپنے آپ پر اس اعتماد اور یقین کا علم ہوتا ہے جو سالہا سال کی ریاضت اور مسلسل کوشش کے بعد ہی کسی فرد کے حصہ میں آتا ہے۔

لسان الصدق نے تقریباً ڈیڑھ سال کی مختصر زندگی پائی جس میں اس کے کُل تیرہ نمبر منظرِ عام پر آئے۔ ان میں بھی تین نمبر مشترکہ ہیں یعنی دو دو ماہ کے ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ لیکن اس مختصر عمر کے باوجود اس ماہنامے نے اردو صحافت میں اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیابی حاصل کی، اس کے اہم مقاصد نے غور و فکر کی دعوت دی اور اس کے نوعمر مدیر نے جہاں لسان الصدق کے پس پردہ اپنی ذہانت، اپنے اصلاحی جذبے اپنے تنقیدی شعور اور اپنے اندازِ فکر سے آگاہ کیا، وہاں واضح طور سے سرسید مرحوم کے افکار و اعمال کی پسندیدگی کا اور حالی و شبلی سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے ان تین شخصیتوں کے اندازِ فکر کے وہ بہت دلدادہ تھے، جس کا اظہار ان اوراق میں نہایت بے باکی کے ساتھ کرتے رہے تھے۔

●●

---

[۲۰] لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص ۲۳
[۲۱] ،، ،، ،، ،، ،، ص ۳۵

بقیہ : مکتوبات

اس "جدید ہندی کہانی نمبر" میں سب ہی کہانیاں خوب ہیں۔ مگر "وانگ چو" "انسان کا لمس" "مہمان دیوتا سمان" اور "ہارا ہوا" پسند آئیں۔

م۔ رحمٰن، دہلی

مرحبا :

خوبصورت سرورق، عمدہ مقالے اور بہترین افسانوں سے مزین "جدید ہندی کہانی نمبر" پیشِ نظر ہے۔ آپ نے بلاشبہ بہت محنت اور سلیقے سے یہ کام انجام دیا ہے۔ لائقِ تحسین ہیں آپ اور مبارکباد کے مستحق ہیں وہ جن کی تھوڑی محنت بھی اس شمارے کے ساتھ ہے۔

محمد منظر امام، سوڑھی

مبارکباد

"آج کل" کا جدید ہندی کہانی نمبر" نظر نواز ہوا۔ یہ معلوماتی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ میں بھی ہندی ادب کا طالب علم رہا ہوں۔ اسی لیے یہ نمبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

آپ کے انتخاب کی داد دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ کہانی کاروں کا مختصر تعارف اور تصاویر نے اس نمبر کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

شاکر حسین، بدایوں

●●

تنویر احمد علوی

کونارک

عہدِ رفتہ کا دل نشین کھنڈر
سوریہ مندر کا یہ حسین کھنڈر
جیسے افسوں بھی ہے فسانہ بھی
آب و گل کا نگار خانہ بھی

سازو آہنگ کا یہ نقشِ جمیل
رامش و رنگ کا یہ نقشِ جمیل
سنگ پارے ہیں برگِ نے کی طرح
زندگی کی حسین لے کی طرح

کیا قیامت ہے حسن پیکر بھی
آئینہ بن گیا ہے پتھر بھی
رنگ شالہ ہو جیسے پھولوں کی
دیو مالا ہو جیسے پھولوں کی

ایک پیکر ہزار تصویریں
ایک خواب اور لاکھ تعبیریں
جیسے فانوسِ ناز رقص میں ہو
جیسے موجوں کا ساز رقص میں ہو

شہرِ سنگ اور بزمِ دل کی طرح
معنیٔ حسنِ آب و گل کی طرح
رگِ جاں کی تپش کو کیا کہیے
آرزو کی خلش کو کیا کہیے

نفسِ شوق کی یہ تیشہ گری
ذہن کی کارگاہِ شیشہ گری
وہ جسے روکشِ حرم کہیے
جلوہ گاہِ رُخِ صنم کہیے

رنگ و بو کا طلسم کیا شے ہے
کس سے کہیے کہ جسم کیا شے ہے
قد و گیسو کی بات کون کرے
ذکرِ شاخِ نبات کون کرے

سانس لیتی ہوئی وہ پنکھڑیاں
جیسے کرنوں کی ریشمی لڑیاں
روح کا اہتزاز پلکوں میں
خلوتِ دل کا راز پلکوں میں

وقت ہے قید آبگینوں میں
دھوپ اور چھاؤں کے سفینوں میں
صبح ہے عارضِ صبا کی طرح
شام ہے زلفِ سرمہ سا کی طرح

اور یہ دلکش مورتوں کا آواگون
دل میں جیسے منتوں کا آواگون
وادیٔ جاں دھنک سے نکھری ہوئی
کہکشاں زندگی میں بکھری ہوئی

زندگی کا یہ ناتمام سفر
صبح اور شام کا مدام سفر
سلسلہ اس پہ آٹھ پہروں کا
ابدی رقص جیسے لہروں کا

برق و شبنم بدلتے رہتے ہیں
دل کے موسم بدلتے رہتے ہیں
عرضِ نغمات کہہ سکیں جس کو
رقصِ لمحات کہہ سکیں جس کو

جیسے نبضِ بہار چھو جائے
دل کو ریشم کا تار چھو جائے
شاخِ گل ناز سے جھکنے لگے
اور کلی حسن کی ہمکنے لگے

لمحۂ انبساط کی وہ کشش
آرزوئے نشاط کی وہ کشش
دل سے شعلے لپٹتے جاتے ہیں
اور بازو سمٹتے جاتے ہیں

رتی رس بن کے سحر چھلکا ہوا
دل کا آبِ حیات چھلکا ہوا
وہ جسے ارتعاشِ ساز کہیں
روح کا رقصِ دل نواز کہیں

آبگینہ سحر کا ٹوٹا ہے
دستِ ساقی سے جام چھوٹا ہے
زندگی کھو گئی ہے پھولوں میں
بھر گئی ہے شراب پھولوں میں

کششِ آب و گل ارے توبہ
خلوتِ جان و دل ارے توبہ
جیسے پرچھائیاں گلابوں کی
رقص گاہیں حسین خوابوں کی

کس سے کہیے کہ آرزو کیا ہے
حسنِ معنی کی جستجو کیا ہے
کتنے جلوے ہیں جسم و جاں کے لیے
دیدہ و دل کے امتحاں کے لیے

آسماں کے حسین آنگن میں
چاند تاروں کے ریشمی بن میں
زیست آتش بجام رہتی ہے
اور پھر تشنہ کام رہتی ہے

رنگ در رنگ یہ نشانِ حیات
نقش در نقش یہ جہانِ حیات
روح پیکر تلاش کرتی ہے
اپنے مظہر تلاش کرتی ہے

۳۷۴۶۔ خلیق منزل، چوڑی والان دہلی ۱۱۰۰۰۶
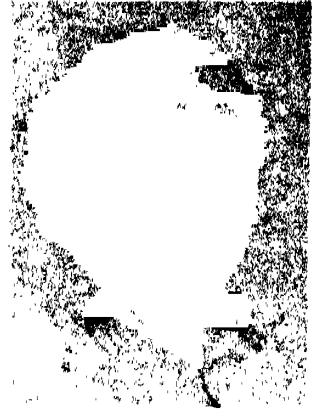
گئے وہ دن!

اندر سروپ دت نادآں

گئے وہ دن
کہ جب تاروں کی چادر اوڑھ کر سوتے تھے اس
بستی کے باشندے
جب اُن کے خواب وابستہ تھے دادی ماں کی
اُس کبوڑھی کہانی سے
وہ پریوں کی کہانی جس کی گنگا سی روانی پر
لٹاتی تھیں مدھر راتیں
خزانے میٹھی نیندوں کے .....
گئے وہ دن
کہ جب سورج
بزرگوں کی طرح اس نیک دل بستی کے باشندوں کو
سوتے سے جگاتا تھا
اور اُن کے بےشکن ماتھوں پہ بوسے دے کے کہتا تھا
اٹھو اے نیند کے ماتو
کہ وہ سپنے
وہ سُکھ سپنے
جو تم نے نیند کے عالم میں دیکھے تھے
تمہاری راہ میں آنکھیں بچھانے کو پریشاں ہیں....

نہ جانے کیوں یہ بستی اپنے سُکھ سپنوں کو کھو بیٹھی
نہ جانے کیوں یہ بستی نیند سے محروم ہو بیٹھی !

• بی. ۳۰/۲۶۹- پشچم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

نہ جانے کون سی منزل میں وہ خدا ہے ابھی
کہ اِک جہان مصیبت میں مبتلا ہے ابھی
کیا ہے رام نے مغلوب لاکھ راون کو
وہ خیر و شر کا تصادم بنا ہوا ہے ابھی
حکایتوں میں چھپا لیجیے حقائق کو
مگر وہ ذہنِ رسا جس کی آنکھ وا ہے ابھی
برس کے بھی نہیں برسیں گھٹائیں ساون کی
دیارِ شوق میں سوکھا پڑا ہوا ہے ابھی
بدلتی رُت اُسے راجا بنا گئی ہے مگر
وہ اپنی ذات سے آگے کہاں بڑھا ہے ابھی
نہیں ہے یاد اُسے رسمِ خوں بہا شاید
جو اہلِ غم کے لہو میں نہا رہا ہے ابھی
رکھو نہ طاق پہ سازِ غزل کو دل والو!
کہ زندگی کسی نخچیر کی بکا ہے ابھی
ابھی سے کیوں ترے چہرے کا رنگ اُڑنے لگا
مجھے جو کہنا ہے، میں نے کہاں کہا ہے ابھی
نہ باز آؤں گا میں اس سفر سے اے ناداں
کہ اس منڈیر پہ روشن مری دعا ہے ابھی

کنول ضیائی

ذرّے کو آبِ تاب سے اختر بنائے گا
کس کا نصیب کس کو سکندر بنائے گا

اے وقت تُو نے بیچ دی ہے ساری کائنات
اب کون سی گلی میں مرا گھر بنائے گا

یہ دوستی کا ہاتھ نہیں ہے، بڑھا نہ ہاتھ
چھو کر مرے وجود کو پتھر بنائے گا

اِک حادثے کو دے کر سازش کا روپ رنگ
اِک اتفاق ہے جسے محشر بنائے گا

اس عام سے بشر کی کرامات دیکھنا
پتھر کو پھول، پھول کو پتھر بنائے گا

اس کی جنوں خیز طبیعت پہ شک نہ کر
شاعر ہے صرف کاغذی پیکر بنائے گا

اپنا مقام مُردہ پرستی کے دور میں
جو بھی بنائے گا یہاں، مرکر بنائے گا

۳۰- راجا روڈ، دہرہ دون (یو پی)

مرتضیٰ علی شاد

صحرا سے پیاس دشت سے پہنائیاں ملیں
ہم کو سمندروں سے پذیرائیاں ملیں

دیکھے ہوئے سے خواب کی پرچھائیاں ملیں
تجھ سے بچھڑ کے پھر وہی تنہائیاں ملیں

اِس شہرِ کم نگاہ میں تو ہی نہ مِل سکا
ہر چند تیرے نام پہ رسوائیاں ملیں

دیکھا تو کم عیار تھا دریا، مگر کبھی
سوچا تو ساحلوں پہ بھی گہرائیاں ملیں

جیسے لب و نگاہ کے موسم بدل گئے
کل مجھ کو گھورتی سی شناسائیاں ملیں

پردیس کی سُلگتی ہوئی رات میں کبھی
گھر یاد آگیا ہے تو پُروائیاں ملیں

ق

آنکھوں میں پھر سے گاؤں کے منظر ہرے ہوئے
وہ کھیت، وہ درخت، وہ انگنائیاں ملیں

دُعا

ہوا کی جلتی ہوئی ردا کو سحاب کر دے
سُلگتی راتوں کی ساعتوں کو گلاب کر دے

میں پیاس بن کر سمندروں کو پکار آیا
جزا دے یا میری تشنگی کا حساب کر دے

سراب و صحرا، حباب و دریا، مری کہانی
ورق ورق نوچ کر مجھے بے کتاب کر دے

لہو کی بارش زمیں سے پیار کا صلہ ہے
تو کاٹ دے میرا سر مجھے آفتاب کر دے

دُعا کے سُوکھے ہوئے لبوں پر عتاب کیسا
نچوڑ دے بادلوں کو، آتش کو آب کر دے

راجن سرحدی

کبھی بکھرے ہوئے رنگوں، کبھی خوابوں کی تلاش
مری آنکھوں کو ہے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی تلاش

بھاگتے پھرتے ہیں ہم شہر سے جنگل، جنگل
اور لے جائے کہاں ہم کو غزالوں کی تلاش

آسماں چھوتے ہوئے نکلے ہیں پنچھی کتنے
شاید اُن کو بھی ہے خوابوں کے جزیروں کی تلاش

لوگ بیگانوں میں ڈھونڈا کیے اپنے لیکن
ہم تو کرتے رہے اپنوں ہی میں اپنوں کی تلاش

کوئی بھی عہد نہ تھا دائمی خوشیوں سے بھرا
ہر زمانے کو رہی اگلے زمانوں کی تلاش

سامنے میرے ہیں یادوں کی کتابیں کتنی
میرا مقصد ہے کئی گُمشدہ لفظوں کی تلاش

شہر در شہر نہ یاد آئی کوئی بھی صورت
دشت در دشت رہی کیوں مجھے چہروں کی تلاش

سر اُٹھاتی ہیں، مچلتی ہیں جو اکثر راجن
ایسی لہروں کو ہے آوارہ ہواؤں کی تلاش

پروفیسر شعبۂ اقتصادیات، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال
۲۰۵/اے، ڈوگرہ محلہ، کینال روڈ، جموں توی

عابد سہیل

میں جھوٹ نہیں بول رہا

میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اس وقت بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ لیکن میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اصل میں میرے خاندان میں اس سے پہلے کوئی گرفتار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ لیکن اب میری گھبراہٹ دور ہو چکی ہے۔ میں کچھ کچھ جیل کا عادی بھی ہو چکا ہوں۔ اس لیے آپ کے سامنے سب کچھ سچ سچ بتلائے دیتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں جج صاحب، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم ایک بہادر قوم سے تعلق رکھتے ہیں — کنور رانی بھی ہماری ہی ذات کی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی شرافت کا وہی خون دوڑ رہا تھا۔ اپنا ارادہ اس نے خود ہی ظاہر کیا تھا۔ ہم لوگوں نے اس کو مجبور نہیں کیا تھا، لیکن یہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ میں بھی اس کی بات سن کر بہت خوش ہوا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے اس پر راضی کیا تھا۔ مجبور کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ لیکن میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ اصل میں اس وقت اس کی آنکھیں روتے روتے سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ بالوں پر دھول اُڑ رہی تھی — دھول ہم نے نہیں ڈالی تھی۔ ہم نے اسے ایسی حالت بنانے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ میں اصل میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔

رکمنی نے جو یہ کہا ہے کہ اس نے بھابی کی مٹھی میں دھول رکھ کر یہ کہا تھا کہ اسے بالوں میں ڈال لو تو یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے یہ بات بالکل جھوٹ کہی ہے مجھ کو خود رکمنی نے بتایا تھا کہ بھابی نے جب چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو میں سمجھی کہ وہ دھول تلاش کر رہی ہیں۔ ہم غریب آدمی ہیں، لیکن ہمارا مکان پکا بنا ہے۔ فرش بھی پکا ہے۔ اس پر مٹی کہاں ملتی۔ لیکن پہلے یہ مکان پکا نہیں تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھائی صاحب کی شادی میں ملنے والے روپوں سے فرش پکا کروایا گیا تھا، لیکن یہ بھائی صاحب کی شادی کے وقت پکا نہیں تھا۔ جی، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ رکمنی نے خود سے مٹی لا کر نہیں دی تھی۔ میری بہن بہت عقل مند ہے۔ اس کی عقل کی سب تعریف کرتے ہیں — اس نے بھابی کے دل کی بات جان لی تھی اور باہر کی پھلواری سے تھوڑی سی مٹی لا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دی تھی، لیکن بھابی کے ہاتھ ہل تک نہیں رہے تھے۔ یہ بات مجھے رکمنی نے خود بتائی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ بھابی مٹی اپنے سر پر خود ڈال لینا چاہتی تھی، لیکن ایک ہی دن میں وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کے ہاتھ ہل تک نہیں رہے تھے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ رکمنی بہت عقل والی ہے۔ اس نے بھابی کا وہ ہاتھ اٹھا کر جس میں اس نے مٹی رکھ دی تھی، بھابی کے سر پر رکھ دیا تھا، اس کے بعد بھی بھابی ہاتھ ہلا تک نہ سکیں تو رکمنی نے اپنے ہاتھوں سے ان کا ہاتھ زور زور سے ہلایا تو بھابی کے سر اور چہرے پر مٹی پھیل گئی۔ میں نے کہا نا کہ رکمنی نے یہ بات بالکل غلط بتائی تھی کہ اس نے بھابی کی مٹھی میں دھول رکھ کر ان سے یہ کہا تھا کہ اسے بالوں میں ڈال لو۔

لیکن یہ بات میں نے بیچ سے بتائی ہے — اب میں ساری بات بالکل شروع سے بتاتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ہم لوگ عزت دار آدمی ہیں۔ جی ہاں، یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ بھابی بھیا کے ساتھ بس دس پندرہ دن ہی رہی تھیں۔ شروع میں تین چار دن اس کے بعد سات آٹھ دن پھر دو تین دن بالکل آخر میں۔ لیکن اس کا اصل بات سے کیا تعلق؟ بھائی صاحب کی موت سے ان پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ جبھی تو بھابی روئی بھی نہیں تھیں بس گم سم بیٹھی رہی تھیں۔ اصل میں وہ ہم لوگوں کو اتنا چاہتی تھیں کہ ہمارے سامنے رو کر ہمارا دکھ نہیں بڑھانا چاہتی تھیں، لیکن جب رکمنی نے ان کے سر پر دھول ڈالی — جج صاحب

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

چکا ہوں کہ میں بے وقوف آدمی ہوں۔ ادھر
ں ادھر جوڑ دیتا ہوں۔ رکمنی نے ان کے
ی نہیں ڈالی تھی بلکہ ان کی مدد کی تھی۔ بھابی
ے کمرے میں جاتے وقت دیوار میں ٹنگے بڑے
میں اپنی صورت دیکھی ہوگی اور یہ سوچ کر کہ
صورت سے بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے
یہ کا دیہانت ہوگیا ہے۔ وہ پریشان ہوگئی
۔ میرا مطلب ہے پریشان ہوگئی ہوں گی۔ آئینہ
ا نہیں ہے کہ اس میں دور ہی سے کوئی اپنی
ت دیکھ لے، لیکن بھابی نے اپنی صورت ضرور دیکھ
ی اور اسی لیے پریشان ہوگئی ہوں گی۔ تو میں کہہ
ا کہ بھابی کے سر پر دھول رکمنی نے نہیں ڈالی تھی
مدد کی تھی۔ رکمنی ہے تو بہت عقل والی۔ لیکن
طرح سیدھی سادی بھی ہے۔ اس نے بھابی کی
ی تو سمجھی کوئی بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس
ں نے آپ کے سامنے کہہ دیا کہ بھابی کے
ں دھول اُس نے ڈالی تھی

رکمنی نے جو یہ کہا کہ بھابی بالکل چُپ چاپ
تھیں اور روئی بالکل نہیں تھیں تو آپ اس
ی غلط مطلب نہ لیں ــــ میں آپ کو ساری
، بالکل شروع سے بتاتا ہوں۔ جب میں ساری
بتا چکوں گا تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں
، سچ بول رہا ہوں۔ ایک بات بھی جھوٹ
نہی ہے میں نے۔ اصل میں ہم لوگ عزت دا
ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ ہم نے تو شادی
ر بھابی کو کسی وقت ہنستے بھی نہیں دیکھا تھا۔
اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شادی سے خوش
تھیں اور جو وہ ہمارے ہاں دو تین دن رہنے کے
پنے گھر چلی گئیں تھیں اور تین مہینے بعد لوٹی
، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گھر والوں کو بتانا
ی تھیں کہ وہ کتنی خوش ہیں۔ بھائی صاحب
، کے ساتھ نہیں جاسکے تھے کیوں کہ وہ بیمار
ور علاج کرا رہے تھے۔ ان کے نہ جانے کا اس
ے کوئی تعلق نہیں کہ ان کو روزانہ پولیس چوکی

میں حاضری لگانا پڑتی تھی۔ وہ بیمار نہ ہوتے تو ان کے
ساتھ ضرور جاتے۔ برات لے کر جانے کے لیے بھی تو
ان کو پولیس نے دو دن کی اجازت دے دی تھی۔
اس بار بھی مل جاتی، لیکن رپورٹ ان کے خلاف
بالکل جھوٹی لکھائی گئی تھی۔ وہ پکڑے نہیں گئے تھے۔
بس پولیس ان کو صحیح بات معلوم کرنے کے لیے اپنے
ساتھ لے گئی تھی، لیکن وہ کیس بالکل جھوٹا تھا۔

تو میں جج صاحب ساری بات بالکل شروع
سے بتا رہا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بھابی ہمارے
گھر میں بہت خوش تھیں۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ
خوشی کے دن کتنی جلدی گزر جاتے ہیں۔ اصل میں
بھابی ہمارے یہاں اتنے کم دنوں نہیں رہیں جتنے میں
نے ابھی بتائے تھے۔ ہم لوگ بھی اتنے خوش تھے
کہ جتنے دن بھی وہ رہیں ایسا لگا جیسے بس دو تین
دن ہی گزرے ہوں۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر جو اتنے
زیادہ دنوں رہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر
والوں کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ کتنی خوش ہیں۔ خوشی
کے دن تو جلدی گزر جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی
خوشی کے دنوں کی باتیں بتائے۔ چاہے وہ دو
ایک دن کی ہی خوشی کیوں نہ ہو تو کئی دن لگ جائیں
گے بلکہ شاید پورا مہینہ ہی لگ جائے پھر بھی
بات پوری نہ ہو۔ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔
اس لیے اِدھر کی بات اُدھر جوڑ دیتا ہوں۔ ہاں تو
میں کہہ رہا تھا کہ رکمنی نے بھابی کے سر پر مٹی نہیں ڈالی
تھی۔ ہم لوگ عزت دار آدمی ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں
بولتے۔ میں سیدھا سادہ آدمی ہوں اور میری
ماتا جی ....

لیجیے جج صاحب میں پھر بہک گیا۔ اصل
میں ساری بات میں بالکل شروع سے بتانا چاہتا ہوں
ہوں میرے بھیا کو کوئی ایسی بیماری نہیں تھی۔ وہ
بیمار بھی نہیں تھے۔ بس جانے کیا بات ہوئی کہ وہ
ایک دم مر گئے۔ بھابی کو تو بہت دیر تک یقین
ہی نہیں آیا۔ بلکہ اس کارن وہ روئی تک نہیں کہ انہیں
بھیا کے مر جانے کا یقین ہی نہیں تھا۔ ماتا جی پرانے

زمانے کی عورت ہیں۔ بھابی کی خاموشی ان کو بہت بری
لگی، لیکن انہوں نے ان سے کچھ کہا نہیں۔ اپنے کمرے
میں اونچی آواز میں کچھ بولی ہوں تو بات دوسری
ہے، لیکن بھابی نے ان کی آواز بالکل نہیں سنی ہوگی ــ
وہ تو آنگن کے دوسرے طرف والے کمرے میں تھیں،
جس میں ٹی وی رکھا ہوا ہے۔ جب ماتا جی چلا رہی
تھیں۔ اصل میں وہ چلا نہیں رہی تھیں۔ ان کی آواز
ہی اتنی اونچی ہے کہ دھیرے سے بھی بات کرتی ہیں
تو پڑوس والوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ
رہی ہیں۔ بھابی تو اس وقت ٹی وی والے کمرے
میں تھیں، لیکن ٹی وی چل نہیں رہا تھا، لیکن مجھے
ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ ٹی وی چل رہا تھا یا نہیں۔
میں تو اس وقت گھر میں تھا نہیں۔

ہم لوگ غریب آدمی ہیں۔ سیدھے سادے آدمی
ہیں۔ ہمارے یہاں ٹی وی کہاں؟ وہ تو بھابی کو شادی
میں ملا تھا، لیکن ہم لوگوں نے مانگا کچھ نہیں تھا۔ بھیا جی
نے موٹر سائیکل بھی نہیں مانگی تھی اور جھمکے، کرن پھول،
سونے کے بندے، چوڑیاں، گلے کا ہار، یہ سب سامان
بھابی کے پاس ہی رہتا تھا۔ ان ہی کا تو تھا۔ ہمیں اس
سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ پھر ہم عزت دار آدمی ہیں۔
دوسروں کی چیز پر آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ہم لوگوں
نے تو یہ ساری چیزیں بس اس وقت دیکھی تھیں جب
بھابی بیاہ کر آئی تھیں، لیکن سارا سامان رہتا بھابی
کے پاس ہی تھا۔

میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔
ہم لوگوں نے مانگا کچھ نہیں تھا۔ نہ نقد نہ کوئی زیور ــ
بھابی کے پتا جی نے دس ہزار کا بینک کا کاغذ اپنی بیٹی
کو دیا تھا۔ کوئی اپنی بیٹی کو جو جی چاہے دے دے۔
ہم لوگ روکنے والے کون ہوتے ہیں۔ بھیا اسے
لینے سے انکار کیسے کر دیتے، لیکن بھیا نے اسے خرچ
نہیں کیا تھا۔ بس بینک میں اپنے حساب میں جمع کر دیا
تھا۔ فرش پکا کرانے میں بھی بھیا نے یہ روپیہ خرچ نہیں
کیا تھا۔ وہ روپے تو اس کو سلام کرائی میں ملے
تھے۔ بھیا سلام نہ کرتے تو ان کے سسرال والے کیا کہتے

ہاں تو میں زیورات کی بات کر رہا تھا۔ زیور سارا بھابی ہی کے کمرے میں رہتا تھا۔ لوہے کے بکسے میں۔ لیکن بھابی کے پاس کوئی تالا نہیں تھا۔ اس لیے ماتاجی نے اپنا تالا ڈال دیا تھا۔ بھابی کے پاس چابی کا گچھا بھی نہیں تھا۔ سو ماتاجی نے بکس کی چابی اپنے گچھے میں ڈال لی تھی، لیکن اس کا بھیا اور پھر بھابی کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات میں نے اس لیے بتائی کہ میں ساری بات بالکل شروع سے بتانا چاہتا ہوں۔

رکمنی کی یہ بات کہ بھابی باغ میں جاکر چھپ گئی تھیں، ٹھیک تو ہے، لیکن ویسی نہیں جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں وہ ہم لوگوں کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے چپکے سے باغ میں چلی گئی تھیں اور کوئی وجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت تو ہم لوگوں نے انہیں کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ اور کچھ بتانا تھا بھی نہیں۔ وہ تو خود ہی کہہ رہی تھیں۔ اصل میں بھائی صاحب کی موت کا ان کو اتنا غم تھا کہ انہوں نے منھ سے ایک بول بھی نہیں نکالا تھا، لیکن ہم لوگوں نے ان کے دل کی بات جان لی تھی۔ اصل میں ہم لوگ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں تو جب رات میں ان کا بستر خالی ملا تو ہم لوگوں نے انہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں بھیا کے غم میں بھابی کنویں یا تالاب میں کود کر جان نہ دے دیں۔ وہ اس طرح جان دے دیتی تو دنیا ہم کو کیا کہتی۔ ہم غریب ہیں، لیکن عزت دار آدمی ہیں۔ لیکن وہ کہیں نہیں ملیں۔ ہم نے ایک ایک کنواں، ایک ایک تالاب دیکھ ڈالا۔ جنگل سے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ آپ اسے چاہے جنگل کہیں چاہے باغ۔ دو چار پھول بھی وہاں لگے رہتے ہیں۔ جیسا میں نے کہا۔ جنگل سے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اصل میں بھابی خاموش طبیعت کی عورت ہیں۔ جب وہ کہیں نہیں ملیں تو ہم لوگوں نے انہیں جنگل میں ڈھونڈا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چھپ نہیں گئی تھیں۔ اصل میں ٹارچ کی روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس لیے وہ برگد کے درخت کے پیچھے چلی گئی تھیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رو رہی ہوں اور یہ بات ہم لوگوں سے چھپانے کے لیے وہ برگد کی جٹاؤں میں چھپ گئی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کہ وہ ہم لوگوں سے چھپ رہی ہوں۔ جب پتاجی نے انہیں پکارا تو وہ باہر نکلنے کے لیے فوراً آگے بڑھی تھیں، لیکن ان کے کپڑے جٹاؤں میں پھنس گئے تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ ہم لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ باہر نہیں آنا چاہتیں، جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تھی۔ جس سے ان کے شریر پر جگہ جگہ کھرونچ لگ گئی تھی۔ اصل میں، میں ساری باتیں بالکل شروع سے بتا رہا ہوں اس لیے باتیں اُلجھ جاتی ہیں۔

ہم نے انہیں جنگل سے گھر لانے میں کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ وہ گھر اپنی مرضی سے راضی خوشی سے آئی تھیں۔ ہم لوگوں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ پتاجی نے جب بھابی کی باہوں سے خون بہتے دیکھا تھا تو کہا تھا کہ پیدل چلنے میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ ہم لوگ سیدھے سادے آدمی ہیں اور میں ساری باتیں بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ پتاجی نے کہا تھا کہ بھابی کو پیدل چلنے میں تکلیف ہوگی۔ کیوں کہ ان کے بازو سے خون بہہ رہا تھا تو ہم نے انہیں اٹھا لیا تھا۔ لیکن ہم نے انہیں گود میں نہیں اُٹھایا تھا۔ بھابی کو گود میں کون اٹھاتا۔ ہم انہیں چاروں ہاتھوں پاؤں سے لٹکا کر بڑے آرام سے گھر لائے تھے۔ اس میں ان کو تکلیف بالکل نہیں ہوئی تھی۔

جج صاحب، ہم لوگ اپنی عزت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں کرتے، جس سے ہماری عزت پر کوئی اُنگلی اُٹھائے۔ ہم اُنہیں گود میں لاتے اور کوئی دیکھ لیتا تو کیا کہتا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ بھابی کے گھر والے جہیز کا سارا سامان واپس مانگ رہے تھے۔ وہ مانگ ہی کیسے سکتے تھے۔ ان کو بھیا اور بھابی کے مرنے کی خبر کافی دیر سے ملی تھی، لیکن ہم لوگوں نے کچھ چھپایا نہیں تھا۔ بس کسی کو دھیان ہی نہیں آیا کہ بھابی کے گھر والوں کو خبر کر دی جائے۔ اصل میں بھابی جو رو نہیں رہی تھیں، اس لیے ہم بہت پریشان تھے، نہیں تو ایسی کون سی بات تھی۔ میں ہی موٹر سائیکل پر جاکر انہیں خبر دے سکتا تھا۔ دو ہی گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ موٹر سائیکل ملی تو بھیا کو تھی۔ لیکن اُنہوں نے مجھے دے دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب شادی میں تجھے موٹر سائیکل ملے، تب اپنی چلانا ـــ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جہیز میں موٹر سائیکل مانگتا۔ ہم لوگ عزت دار آدمی ہیں۔ شادی بیاہ میں اپنے مونھ سے کچھ نہیں مانگتے۔ کوئی اور کچھ کہہ دے تو ہم ہر ایک کا منھ تھوڑی بند کر سکتے ہیں۔

اصل میں بھابی کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہم لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جنگل میں اپنے پتی دیو کی موت پر رونے کے لیے گئی تھیں۔ پتاجی نے اُنہیں بہت سمجھایا تھا، لیکن ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا اور پھر ایک دن بعد تو ساری دنیا کو پتہ لگ ہی جاتا کہ اُنہیں بھیا کے مرنے کا کتنا دُکھ تھا۔ لیکن یہ بات ہم نے اس وقت ان کو نہیں بتائی تھی مکان میں لے جاتے وقت ان کا شریر کواڑ سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ہم کو اس بات کا پتہ ایسے چلا کہ اتنے زور سے دروازے سے ٹکرانے پر ان کے منھ سے ہلکی سی چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔

عزت کی بات ہو تو جج صاحب کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پھر ہم لوگ تو عزت دار آدمی ہیں۔ بھابی کو ان کے کمرے میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ ان کو بند کیوں کیا جاتا؟ ماتاجی نے مجھ سے دروازہ باہر سے بند کرنے کے لیے کہا بھی نہیں تھا، لیکن ان کو بہت دُکھ تھا کہ بھابی رو نہیں رہی ہیں، لیکن وہ خود بھی سب سے کہہ رہی تھیں کہ بھابی اس لیے نہیں رو رہی ہیں کہ وہ ہم لوگوں کا دکھ بڑھانا نہیں چاہتیں۔ انہوں نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ انہوں نے تو مجھ سے بھی دروازہ باہر سے بند کرنے کو نہیں کہا تھا۔ اور پھر بھابی تو بے ہوش تھیں۔ وہ اتنا بھاری دروازہ کھول بھی کیسے سکتی تھیں۔ اصل میں، میں نے سوچا تھا کہ بھابی کی طبیعت خراب ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات برات اُٹھیں اور آنگن میں رکھی کسی چیز سے ٹکرا کر گر

جاتیں۔ اس سمے ان کی بے ہوشی کی بات میں بھول گیا تھا۔ اس لیے میں نے ہی باہر سے زنجیر بند کر دی تھی۔ ان کو کمرے میں بند کرنا ہوتا تو میں نے تالا ڈال دیا ہوتا، لیکن میں نے تالا نہیں ڈالا تھا۔ بس کنڈا پھنسا دیا تھا۔

میں ساری باتیں بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا ہمارے یہاں بہت دنوں سے آنا جانا تھا۔ گھر کے سب لوگ اُنہیں کا علاج کرتے تھے۔ بھائی صاحب کا علاج بھی اُنہوں نے ہی کیا تھا۔ ان کو بہت دُکھ تھا کہ وہ بھائی صاحب کو بچا نہیں پائے تھے۔ جب رات میں وہ آئے اور انہیں پتہ لگا کہ بھابی کو چوٹ لگ گئی ہے تو اُنہوں نے انہیں فوراً دیکھا۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کو بلا کر نہیں لائے تھے۔ بھابی کا علاج کرنے کے لیے ہم لوگوں نے نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا بھی پلائی اور انجکشن بھی لگایا۔ ڈاکٹر صاحب بہت مشہور آدمی ہیں۔ بڑے اچھے ڈاکٹر بھی ہیں۔ ہم لوگ بہت خوش تھے کہ بھابی کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن ابھی وہ بالکل ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ ہم لوگ عزت دار آدمی ہیں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ لیکن بھابی کچھ بول نہیں رہی تھیں۔ بس اَدھ کھُلی آنکھوں سے ہم لوگوں کو دیکھے جا رہی تھیں، لیکن ان کو ہوش نہیں آیا تھا۔

دلہن اُنہیں محلے پڑوس کی عورتوں نے بنایا تھا۔ وہ خفا نہیں لگ رہی تھیں۔ کچھ کچھ خوش تھیں۔ لیکن کچھ ایسی خوش بھی نہیں تھیں۔ ہم لوگ ان کو پکڑ کر نہیں لے گئے تھے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ بھیّا کی موت کا اُنہیں بہت دُکھ تھا۔ دُلہن بناتے سمے ماتاجی اور رکمنی نے انہیں پکڑ نہیں رکھا تھا۔ کمزوری سے ان کی آنکھیں بند تھیں اور سر پیچھے کو ڈھلک جاتا تھا۔ رُکمنی بس مضبوطی سے ان کا سر پکڑے ہوئے تھی اور ماتاجی نے بس اس لیے ان کو پکڑ رکھا تھا کہ کہیں بے ہوشی میں ان کا ہاتھ مہندی کے کٹورے یا سیندور کی ڈبیا پر نہ پڑ جائے، لیکن وہ بے ہوش نہیں تھیں۔ میں ساری بات بالکل شروع سے بتا رہا ہوں۔ بھابی بھیّا کے ساتھ بہت خوش تھیں۔ وہ ان سے اتنی خوش تھیں کہ جب بھیّا غصہ ہوتے تھے تو وہ جواب بھی نہیں دیتی تھیں۔

میں ساری بات شروع سے بتا رہا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ اُنہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی میں عزت دار آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں یہ بات بالکل جھوٹ ہے۔ بھابی نے بھاگنے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی اور وہ بھاگ بھی کیسے سکتی تھیں — گڑھا اتنا گہرا تھا کہ وہ اس میں سے نکل ہی نہیں سکتی تھیں۔ بھاگتیں کیسے؟ اُنہوں نے شور بھی نہیں مچایا تھا، وہ چیخی چلائی بھی نہیں تھیں۔ یہ بات بالکل من گھڑت ہے کہ وہ چیخ چلا رہی تھیں۔ ہزاروں آدمی زور زور سے جے جے کار کر رہے تھے۔ ان کی چیخ سُنائی ہی نہیں دے سکتی تھی۔ کسی نے ان کو چیختے نہیں سُنا تھا۔ میں سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ عزت دار ہوں۔ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اصل میں ساری بات بالکل شروع سے بتانا چاہتا ہوں — بھابی روئی .....

●●

بقیہ: پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

تسلسل کے پیچھے ایک ہی شخص (اگرچہ مختلف تخلص) کار فرما ہیں ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

لیکن ہمارا بنیادی سوال (جو صفحہ نمبر ۲ پر پیدا ہوا تھا) اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اگر دیوانِ غالب نامی کتاب میں جو غزلیں وغیرہ شامل ہیں غالب نے نہیں لکھیں تو پھر کس نے لکھیں؟

اس مسئلے پر کئی لوگوں نے سر کھپائی کی ہے' ان میں سے محقق محکمۂ تعلیم میں ڈسٹرکٹ اسکول انسپکٹر کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک دن ایک اسکول کی دسویں کلاس کے طلبا سے یہی سوال پوچھا۔ یعنی دیوانِ غالب کس نے لکھا؟ جب کوئی لڑکا جواب نہ دے سکا تو کلاس ٹیچر نے سب سے ذہین طالب علم کو جواب دینے کے لیے کہا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اُٹھا اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا: — "جناب' مجھے معلوم نہیں، لیکن یقین مانیے میں نے نہیں لکھا۔" انسپکٹر نے ایسے بظاہر گستاخانہ جواب کے لیے ہیڈ ماسٹر سے وضاحت مانگی۔ ہیڈ ماسٹر نے طالب علم کی طرف گھور کر جواب دیا۔ "یہ بڑا شریر لڑکا ہے ضرور اسی نے لکھا ہوگا۔ آپ فکر مت کیجیے میں تفتیش کر کے آپ کو رپورٹ بھیج دوں گا۔"

یہ بات تو تمام محقق تسلیم کرتے ہیں کہ غالب کی بیشتر غزلیں اسد نے ہی لکھیں۔ یہ اتفاقیہ بات ہے کہ دونوں ہم نام تھے۔ اس سے کنفیوژن اور بھی بڑھتا ہے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مالک رام کے مطابق ان دونوں تخلصوں کے باپ بھی ہم نام تھے بلکہ دونوں ہم زاد تھے۔ یہاں سٹری اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ ہم مالک رام کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک دن غالب اپنے اُن تمام رفیقوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے مل کر غزل سرائی کرتے تھے، ایک بڑی کامیاب غزل ہوئی تھی۔ تمام دوست جشن کے موڈ میں تھے۔ شراب کے خُم پر خُم چل رہے تھے۔ سب جھوم رہے تھے۔ اتنے میں سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک افسر وہاں آن دھمکا اور آتے ہی پوچھا: "آپ میں سے غالب کون ہے؟"

اب وہ شخص جو اپنے آپ کو غالب کہتا تھا اور جسے سب لوگ بھی اُسی نام سے پکارتے تھے' بڑی اُلجھن میں پڑ گیا۔ آج اُس گروہ کی سازش بے نقاب ہونے والی تھی۔ اب وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہم سب غالب ہیں۔ لیکن آدمی حاضر دماغ تھا۔ اُس نے فوراً فی البدیہہ شعر کہہ دیا ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

یہ شعر سُن کر سی۔ آئی۔ ڈی کا افسر جو بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا پھڑک اُٹھا اور انکوائری کو بھول کر اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ اُس کے واپس جانے کے انداز اور طریقے سے یہ روایت چل نکلی کہ وہ انسان نہیں جن تھا۔ لیکن اگر وہ جن تھا تو آتے وقت سیدھے پاؤں کیسے آیا۔ غالبؔ (یا کہ اسدؔ؟) آتے وقت اُس کے پاؤں کا رُخ کسی نے نوٹ نہیں کیا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ اس شعر کی وجہ سے اُردو شاعری کا ایک بہت بڑا معمّہ کھُلتے کھُلتے رہ گیا۔

●●

ذکیہ مشہدی

مٹّی کی چڑیوں کا انتظار

"میں کا کروں رام موہے بڈھا مل گیا۔ ہو ہو بڈھا مل گیا"

ناک سے طبلہ بجاتا وہ سرمہ زدہ آنکھوں اور پان زدہ باچھوں والا لونڈا پاس سے گاتا ہوا گزر گیا۔

ننھے مرزا یوں بدکے جیسے ان کا پیر کسی گلگلے مینڈک پر پڑ گیا ہو۔ اضطراری طور پر انھوں نے رالعہ کا ہاتھ کس کر تھاما اور بڑبڑائے۔ لاحول ولاقوۃ۔ شریفوں کا راستہ چلنا دشوار ہے۔ پھر انھوں نے سامنے سے گزرتے ہوئے رکشے والے کو پکارا۔ ارے میاں۔ امین آباد چلوگے؟ آجاؤ جلدی سے۔ شاباش!

"ماموں ——" رالعہ نے انھیں حیرت سے دیکھا۔ بس آتی ہی ہوگی۔ رکشہ کیوں لے رہے ہیں؟ ایک تو کرایہ چوگنا۔ اس پر سے دیر لگائے گا۔ چوپٹیوں سے امین آباد تک کا رستہ ——"

"کرائے کی تجھے کیا فکر۔ چل بیٹھ جا جلدی سے۔"

رکشے میں چڑھ کر ماموں نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور دوبارہ لاحول پڑھی۔

رالعہ کو لے کر نکلنا اب دن بدن پریشان کن ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ چند دن پہلے بھی ایسے ہی ایک سنحا سی لونڈا اول فول بکتا پاس سے گزر گیا تھا۔ وہ تو خیریت ہے کہ رالعہ ابھی ان آوازوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتی۔ یا دیتی بھی ہو تو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ آخر سینیر کیمبرج کا امتحان دینے والی ہے۔ اتنی سمجھ تو آ ہی گئی ہوگی اس میں۔ انھوں نے رالعہ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ کپڑے کہاں سے لے گی بیٹا؟ انھوں نے دھیان بٹانے کو خواہ مخواہ سوال کیا۔ رالعہ اپنے کپڑے ہمیشہ شفیق چہرے والے بوڑھے سردار امریک سنگھ کے یہاں سے لیا کرتی تھی جو تھان پر قینچی چلاتے وقت مسکرا کر گاہک کا چہرہ دیکھتے اور دھیرے سے بولتے بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم —— رالعہ نے دوبارہ حیران آنکھوں سے ماموں کی طرف دیکھا — جیسے کہہ رہی ہو آج کیا ہو گیا ہے ماموں؟

کہاں سے چلے آ رہے ہیں ماموں؟ بڑی لمبی چوڑی خریداری کر آئے؟

واپسی میں بھی ماموں رکشہ پر ہی آئے تھے۔ دروازے پر پڑے تالے میں چابی گھما رہے تھے کہ صورِ اسرافیل کی طرح اچانک وہ آواز سنائی دی۔ گھبرا کر اچھل گئے۔

"ہا ہا ہا —— ڈر گئے! ارے ماموں میں ہوں سکندر۔"

حرامزادے، میں تیرا ماموں کب سے ہو گیا۔ ننھے مرزا نے دل ہی دل میں دانت کچکچا کر کہا لیکن اوپر سے نرم آواز میں بولے "نہیں میاں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں ذرا کسی خیال میں گم تھا، چونک گیا۔"

سکندر نے پوری بات نہیں سنی۔ وہ رالعہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ارے یہ اس ننھی منی لڑکی پر اتنا بوجھ کیوں ڈال دیا ہے۔؟ اس نے رالعہ کے ہاتھ سے سنگھاڑوں اور ترکاری سے بھری ٹوکری لینی چاہی جو تالا کھولتے وقت ماموں نے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ کپڑوں کا پیکٹ تو پہلے ہی اس نے پکڑ رکھا تھا۔

ننھے مرزا نے تقریباً لپک کر ٹوکری رالعہ کے ہاتھ سے چھین لی۔ "رالعہ تم اندر چلو" ان کا لہجہ کرخت ہو اٹھا۔ اچھا میاں خدا حافظ —— انھوں نے رکھائی کے ساتھ سکندر سے کہا اور غڑاپ سے دروازے کے اندر غوطہ لگا گئے۔

"لفنگے ٹٹ پونجیے۔ چلے آتے ہیں بِن بلائے۔ میں تو مخاطب تک نہیں ہوتا، ان لوگوں سے کبھی۔"

سکندر کے جانے کے بعد وہ بڑبڑائے۔

ماموں ادھر کچھ زیادہ ہی کھرّے ہوتے جا رہے ہیں۔ رالعہ کو ہنسی آ گئی۔ ویسے بھی جو رشتہ جبّا تا۔ اللہ میاں سے ناتا۔ اب تو پڑوسیوں تک سے بات نہیں کرتے۔

پڑوس والی لاج (Lodge) میں لڑکے
ٹین پیٹ پیٹ کر گا رہے تھے ـــــ میری بھینس کو
ڈنڈا کیوں مارا۔ تیرے باپ کا وہ کیا لیتی تھی۔ کھیت
میں مزے سے چرتی تھی۔ میری بھینس . . . . شاید
سکندر بھی جا کر ان میں شامل ہو گیا تھا۔

چل رابعہ کھانے کی تیاری کرتے ہیں ـــ پھر
ماموں نے کان کھڑے کر کے ہولے کے رخ چہرہ گھمایا
اور ان مسلسل آرہی آوازوں کو سُوں سوں کر کے سونگھا۔
کیا زمانہ آ لگا ہے اور کیا معیار ہو گیا ہے لوگوں کا۔
اب بھلا دیکھو۔ یہ سب کے سب طالبِ علم ہیں۔ چھری
ڈھونڈتے ہوئے ماموں بڑبڑانے لگے۔ ایک ہمارا
زمانہ تھا ـــ انھوں نے جھولے سے ترکاریاں نکالیں
اور سُوپ میں جھولا اُلٹ دیا۔

ماموں کچھ ایسے بوڑھے بھی نہیں تھے۔ بس
ادھیڑ ہوں گے بمشکل تمام۔ پھر بھی ہر وقت اپنے
زمانے کی دہائی یوں دیتے رہتے تھے جیسے اصحابِ
کہف کے زمانے کے ہوں۔ رابعہ پھر ہنس پڑی۔

ہنسنے کی کیا بات ہے۔ چل جا کے پڑھنے بیٹھ۔
ساری شام تفریح میں گزر گئی۔ میں کھانا پکا کے آواز
دے لوں گا۔ بس آکر چپاتیاں ڈال دینا۔ ماموں غرائے۔

کھانا کھانے کے بعد نومبر کی گلابی خنکی میں
رابعہ وہ گلابی کمبل گلے تک کھینچ کر سو گئی جو ماموں بڑے
پیار سے اس کے لئے خرید کر لائے تھے تو اس کے
معصوم چہرے پر کھنچی سیاہ پلکوں کی چلمن دیکھ کر
ماموں کی نیند اڑ گئی۔ انھیں اس لونڈے کا آوازہ
یاد آیا اور پھر سکندر کا جملہ۔ ضرور اس نے ماموں کے
پردے میں رابعہ کو مخاطب کیا ہوگا۔ صبح صبح جب
رابعہ اسکول جانے کے لئے نکلتی ہے تو میاں یاور
بیگ کی لاج میں رہنے والے لڑکوں میں سے کئی باہر
کھڑے دانت صاف کرتے اور ادھر ادھر پچر پچر تھوکتے
نظر آتے ہیں۔ لاج میں بڑا سا صحن ہے۔ صحن میں
نالی ہے۔ بھلا بتاؤ باہر نکل کر دانت گھسنے کی کیا
ضرورت ہے۔ صرف رابعہ کو تکنے نکلتے ہوں گے تب
ہی تو آنکھوں میں مسکراہٹ بجلی کے کوندے کی طرح
لپکتی چلی جاتی ہے۔

اس دن ننھے ماموں کی نیند اڑ گئی۔ ساری رات
یہی سوچتے رہے۔ رابعہ جوان ہو رہی ہے۔ اس کی
جوانی میں دن بدن اضافہ ہوگا۔ کسی کی عمر پیچھے کی طرف
نہیں دوڑتی۔ گھر میں کوئی عورت نہیں ہے پہلے پڑوس
میں کرایہ داروں کا کنبہ تھا۔ ان کو نکال کر میاں یاور
نے گھر کو لاج میں تبدیل کرا دیا۔ شریفوں کی جگہ آٹھ
دس لفنگے آکر رہنے لگے۔ اور تو اور سب کے سب ننھے
مرزا کو ننھے ماموں بھی کہنے لگے ہیں۔ رابعہ کا سن کر کہتے ہیں۔
وہ اکثر انھیں پکارتی ہے تو آواز صاف باہر جاتی ہے۔

سوچتے سوچتے ننھے ماموں کو لگا جیسے سارا شہر
رابعہ کے پیچھے لگ گیا ہے۔ اسے ہوسٹل میں ڈالنا
پڑے گا ورنہ کہیں کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو۔ اس "تو"
سے ننھے ماموں کو پسینے چھوٹ گئے۔ اپنا موٹا کھدر کا کمبل
اٹھا کر انھوں نے دور پھینکا اور بستر میں اٹھ کر اکڑوں
بیٹھ گئے۔ ہوسٹل میں تین سو روپے ماہوار خرچ آئے
گا۔ وہ اسکول میں دریافت کر چکے تھے۔ ان کی تنخواہ
کوئی پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ دو سو ان کی ضرورت
کے لئے کافی ہوں گے۔ ان کا خرچ تھا ہی کتنا؟
سارے خرچوں کی جڑ بیوی بچے ندارد۔ اماں ابا بھی
زندگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے تھک چکے تھے اور
اب پاؤں پسار کر قبرستان میں سو رہے تھے۔

یہ سب تو کچھ ٹھیک تھا لیکن پچھلے پانچ برسوں
سے رابعہ ان کی زندگی کا محور بن چکی تھی۔ اس کے بغیر
وہ رہیں گے کیسے؟ پینتالیس سالہ کنوارے ننگوڑے
ناٹھے۔ احمق الذی ننھے ماموں!

ننھے ماموں کنوارے کیوں تھے؟ یہ داستان
مختصر بھی ہے اور روایتی بھی۔ پڑوس کے کنبے کی
پیاری سی سیدھی سادی گھریلو لڑکی منّو کو دل دے
بیٹھے تھے۔ وہ اماں کے پاس قرآن شریف پڑھنے
آیا کرتی تھی۔ کبھی اس سے براہِ راست ایسی کچھ بات
ہوئی تھی نہ وعدے وعید۔ مگر آنکھوں کے رستے سیدھی
دل میں اتر آئی تھی۔ گھما پھرا کر بات اماں کے گوش
گزار کرائی تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ نہ
بابا۔ ہم مغل ہیں۔ سیّد زادی مانگنے کیسے جائیں۔ جوتیوں
سے تواضع کریں گے میاں عباس علی نقوی۔ اماں نے
اس کے آگے نہ کچھ کہا نہ ہی ننھے ماموں کی، جو اس
وقت صرف ننھے کہلاتے تھے، ہمت ہوئی کہ اس کے
آگے کچھ کہیں۔ منّو کی ڈولی اٹھ گئی۔ پتہ نہیں اس کے
دل میں کیا تھا۔ یہ تو کبھی معلوم نہ ہوسکا۔ ہاں ماموں
کے دل میں جو کچھ تھا، وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کے بعد
انھوں نے کہیں اور شادی کے نام پر ہاں کر کے نہیں
دی۔ پھر جب وقت گزرا اور زخم کچھ مندمل ہوا تو وہ
لوگ ہی نہ رہے جو ننھے مرزا کی شادی کا ارمان کرتے
تھے اور اس پر مُصر تھے۔ انھوں نے آئینے میں اپنی صورت
دیکھی اور بالوں میں جھلملاتی سفیدی پر نظر ڈال کر اپنی
شادی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے گرد آلود فائلوں تلے دبایا۔

جن دنوں منّو کی شادی ہوئی ننھے ماموں کے
بی۔ ایس۔ سی کے امتحان چل رہے تھے۔ نتیجہ آیا تو
معلوم ہوا بڑے شاندار طریقے سے فیل ہوئے ہیں۔
چچا زاد بھائی سلیم الزّماں جو ہسٹری آنرز کر رہے تھے
امتیازی نمبروں سے پاس ہوئے۔ ان کے یہاں
شکرانے کا میلاد ہوا۔ حضرت شاہ مینا کے مزار پر چادر
چڑھائی گئی۔ ننھے ماموں سے والدین کی بڑی توقعات
وابستہ تھیں۔ تینوں بھائیوں میں یہ اکیلے سائنس پڑھ
رہے تھے۔ ابا سوچتے تھے ڈاکٹر بنائیں گے لیکن ننھے
ماموں تو دو بار مزید فیل ہوئے اور والدین کے ارمانوں
کو خاک میں ملا کر سکریٹریٹ میں کلرکی کرنے لگے۔ بھائی
سلیم الزّماں ریونیو سروس میں آ گئے تھے۔ ایک بار پھر
چچا ابا کے گھر شکرانے کا میلاد ہوا اور ایک متمول گھرانے
کی خوبصورت، تعلیم یافتہ لڑکی بہو بن کر گھر آ گئی۔ ننھے
ماموں کو ناکارہ قرار دے کر سب نے خاندان کے
رجسٹر سے خارج کر دیا۔ سلیم الزّماں کا عہدہ اور دلہن
دیکھ کر اماں کے کلیجے میں دھواں اٹھا کرتا تھا۔ "اپنا
ہی سکہ کھوٹا ہے ـــ کسی کا کیا قصور" وہ اکثر
ٹھنڈی سانس لے کر کہتی تھیں۔ ویسے ان کے دونوں
بڑے بیٹے معقول عہدوں پر تھے اور بیٹیاں بھی بیاہ

کرا پنے اپنے گھر تھیں۔ لیکن ننھے ماموں کا دیا ہوا
داغ کچھ ایسا تھا، ان سے توقعات کچھ اتنی زیادہ ہی
تھیں کہ اماں کبھی وہ غم نہ بھلا سکیں۔
سارے کے سارے بھائی بہن الگ الگ
شہروں میں تھے۔ بھائی نوکریوں پر اور بہنیں سسرال۔
اماں ابا کے انتقال کے بعد ننھے ماموں بالکل تنہا
رہ گئے۔ کبھی کبھی جی گھبرا جاتا اور ڈھنڈار گھر کے
در و دیوار [illegible] کو دوڑتے تو ماموں بھانجوں بھتیجوں
کی چھٹیوں کا حساب لگاتے اور دو چار روز کے لئے
کسی بھائی یا بہن کے گھر پہنچ جاتے۔ سوغات کی
ٹوکریاں ساتھ ہوتیں۔ چلتے وقت بچوں کو نقدی
الگ سے دیتے اس لئے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔
بڑی آپا کی بیٹی رابعہ بڑی ذہین نکلی تھی۔
اگرچہ ابھی ابتدائی جماعتوں میں تھی لیکن آثار نظر
آرہے تھے کہ کچھ کر سکے گی۔ آپا کثیر العیال تھیں۔
قصبے کے میونسپل اسکول میں پڑھا لینا تو بساط سے
باہر نہیں تھا لیکن سوچتی تھیں کہ لکھنؤ جا کر پڑھتی تو کیا
ہی اچھا ہوتا۔ اس کے بعد تین بیٹے تھے۔ اگر کہیں میڈیکل
میں نکل گئی تو بھائیوں کو بھی سنبھال لے گی۔ آپا بڑی
دور اندیش تھیں۔ ابکی جو ماموں سندیلے آئے تو انھوں
نے رابعہ کو ان کی گود میں لاکر بٹھا دیا اور کہا "ننھے!
آج سے میں اس لڑکی پر سے اپنے تمام حقوق سے
دست بردار ہوتی ہوں۔ یہ اب تمھاری بیٹی ہوئی۔
لکھنؤ لے جاؤ اور ساتھ رکھ کر اسے لکھاؤ پڑھاؤ۔"
ماموں کو جیسے کانوں پر یقین نہ آیا۔ جب آیا
تو نہال ہو اٹھے۔ دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر
کبھی نہیں للچاتے تھے لیکن بچوں کو دیکھ کر ضرور
للچایا کرتے تھے۔ بچوں سے انھیں بے حد انسیت تھی۔
پھر جب سے اماں ابا مرے تھے، دفتر سے واپس
آکر وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ خوشی خوشی مالِ
غنیمت کی طرح انھوں نے رابعہ کو سمیٹا اور ساتھ لے
آئے۔ بڑی تگ و دو کے بعد اس کا داخلہ ایک مہنگے
کونونٹ اسکول میں کرایا، جہاں پہنچتے ہوئے متوسط
طبقے کے پر جلتے تھے لیکن ماموں پر جلانے کو تیار تھے۔

رابعہ کی صورت میں چمکیلی دھوپ کا ایک چھوٹا سا
ٹکڑا ان کے آنگن میں در آیا تھا۔ اسے ہوسٹل بھیج
کر گھر کو پھر سے کال کوٹھری میں تبدیل کر دینے کا
خیال ہی لرزہ خیز تھا لیکن ساتھ ہی انھیں احساس
تھا کہ رابعہ کو اس طرح وہ اب ساتھ نہیں رکھ سکیں گے۔
______ دفتر کی فائلوں میں سر کھپاتے
ہوئے بھی وہ اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ گھر واپس
آئے تو رابعہ کی صورت دیکھ کر کلیجے میں ہوک اٹھی۔
رابعہ گھر پر نہیں رہے گی تو واپس آنے پر گھر کیسا لگے
گا؟ اگر وہ اسے ہوسٹل نہ بھیج کر ایک بوڑھی ملازمہ
کا انتظام کر لیں جو ہر وقت گھر پر رہے تو؟ آخر
ہوسٹل بھیجنے پر بھی تو اخراجات بڑھیں گے۔ ذرا
دیر کو ان کا ذہن چین سے ہو گیا۔ ہاں یہ خیال زیادہ
بہتر ہے۔

"ماموں ______ " بچپن اور جوانی کی گلے
ملتی میٹھی آواز میں رابعہ نے بڑی محبت سے انھیں
پکارا اور ایک خط ان کی ناک کے آگے لہرایا
"ماموں۔ خط۔ تحریر سے لگتا ہے بڑے ماموں کا
ہے۔" بڑے بھائی ننھے مرزا کو شاذ و نادر ہی خط لکھا
کرتے تھے۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی خاص بات
ہے۔ رابعہ خط ماموں کو پکڑا کر چائے کا پانی اسٹوو
پر رکھ رہی تھی۔ انھوں نے لفافہ چاک کیا۔
بڑے بھائی نے لکھا تھا "تمھاری بھتیجی کی
شادی تقریباً طے ہو چکی ہے۔ بس لڑکے کے تعلیم
ختم کرنے کی دیر ہے۔ ادھر مکان میں بھی ہاتھ لگ
چکا ہے۔ منجھلے بھائی کے یہاں بھی کم و بیش یہی حالات
ہیں۔ اب لکھنؤ آ کر تو کسی کو رہنا نہیں۔ ہم لوگوں
نے یہیں اپنے اپنے مکان بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
باپ دادا کی نشانی کہہ کر اس کھٹیچر لکھنؤ والے مکان
کو چپٹے رہنا جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ رہا
تمھارا سوال تو اکیلے ہو۔ اتنے بڑے مکان کا کیا
کرو گے۔ کسی بھی جگہ ایک کمرہ لے کر رہ سکتے ہو۔
بغل والی یادر بیگ کی لاج میں ہی مل جائے گا۔
ہم لوگ چاہتے ہیں کہ مکان بیچ دیا جائے گرچہ اس
میں اب کچھ رہ نہیں گیا ہے پھر بھی اتنی رقم ضرور
مل جائے گی کہ اس آڑے وقت میں سہارا مل جائے۔"
______ رابعہ کو ہوسٹل بھیجنے نہ بھیجنے کی
کشاکش سے ماموں آزاد ہو گئے۔
"ماموں چائے ______ " رابعہ نے
بڑے ہی سلیقے سے رکھی چائے کی پیالی اور
بسکٹوں کی طشتری ماموں کی طرف بڑھائی تو
یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ماموں کی آنکھوں میں
آنسو تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا
اور دھیرے سے بولے "ہوسٹل میں رہے گی بٹیا؟"
رابعہ کے ہوسٹل چلے جانے کے بعد ننھے
ماموں سنیچر اتوار کے لئے زندہ رہنے لگے۔ سُمار
سے وہ انگلیوں پر دن گننا شروع کر دیتے۔ ان
دنوں کو وہ پل پل کر کے کاٹتے تھے۔ شیطان کی
آنت کی طرح طویل ہو جاتے تھے یہ پانچ دن۔ پھر
کہیں ختم ہفتہ آتا تھا جب ہوسٹل میں رہنے والی
لڑکیوں سے ان کے سرپرست شام کو جا کر مل سکتے
تھے۔ مہینے کے آخری ختم ہفتے پر وہ انھیں گھر بھی
لا سکتے تھے۔ یا پھر چار دن لگاتار چھٹیاں پڑیں تب
بھی۔ ماموں ان چھوٹی موٹی چھٹیوں کا بھی بے چینی
سے انتظار کرتے تھے جب وہ اسے جا کر "گھر"
لائیں گے اور اس کی میٹھی آواز دوبارہ ان کے
گھر میں گونجے گی جو اب ایک کوٹھری پر مشتمل تھا۔
وہ اس کے ساتھ مل کر کھانا پکائیں گے، جاڑوں
میں بھوبل بھری انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اسے دنیا
بھر کے قصے سنائیں گے اور لطیفے بھی۔ رابعہ کھلکھلا
کر ہنسے گی تو ان کی سونی کوٹھری میں پھول ہی پھول
کھلتے چلے جائیں گے۔ اور یوں سنیچر اتوار کی گنتی کرتے
دو برس گزر گئے۔ رابعہ اب سائنس لیکر انٹرمیڈیٹ
کر رہی تھی، باسکٹ بال کی بہت اچھی کھلاڑی تھی
اور ڈراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ ماموں کا
سینہ فخر سے پھول جاتا۔ آندھی آئے یا طوفان،
بخار چڑھا ہو یا دمے کی شکایت نے ناک میں
دم کر رکھا ہو ماموں سنیچر کی شام کو سائیکل کھڑکھڑاتے

بٹیا سے ملنے ضرور پہنچتے۔

یہ مہینے کا آخری ختم ہفتہ تھا۔ رابعہ کو گھر لانے کا دن۔ خوشی خوشی شیروانی کے بٹن درست کرتے اپنی کھٹارا سائیکل کی گھنٹی بجاتے ماموں رابعہ کے اسکول کی پُرشکوہ عمارت میں داخل ہوئے تو ہوسٹل کے مہمان خانے کے گیٹ پر تعینات چپراسی نے بتایا کہ رابعہ بٹیا یہ ختم ہفتہ گزارنے ”بڑے ماموں صاحب“ کے یہاں چلی گئی ہیں۔ ایک لمحے کو ننھے ماموں کا منھ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ یہ کون ماموں پیدا ہو گئے اور یہ کہ رابعہ کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت کیسے ملی۔ دوڑے پرنسپل کے آفس کی طرف۔ گھنٹہ بھر راہداری میں کھڑے رہنے کے بعد باریابی کی اجازت ملی تو معلوم ہوا کہ چچا زاد بھائی سلیم الزّماں پچھلے ماہ انکم ٹیکس کمشنر ہو کر لکھنؤ آگئے تھے۔ رابعہ کے والد نے انھیں مقامی سرپرست نمبر ۲ قرار دے کر لڑکی کو ان کے ساتھ آنے جانے کا اجازت نامہ پرنسپل کو بھجوا دیا تھا۔ آج آ کر وہ رابعہ کو لے گئے تھے۔

بڑی آپا نے بھائی سلیم الزّماں کو بڑی لجاجت سے لکھا تھا ـــــ ”ننھے رابعہ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن وہ اسے گھریلو ماحول نہیں دے سکتے۔ کبھی کبھی گھر لے جائیے گا۔ بڑی عنایت ہوگی ـــــ“

ننھے ماموں منھ لٹکائے واپس ہو گئے۔ راستے میں حسب عادت رابعہ کے لئے چاکلیٹ خریدے تھے اور مونگ پھلیاں۔ پیکٹ انھوں نے چپراسی کو تھما دیا۔ ”لو میاں کشوری تم رکھ لو اسے۔ بچوں کو دے دینا۔ اب واپس کیا لے جاؤں۔“

سلیم ماموں کی چم چم کرتی سرکاری گاڑی، باوردی ڈرائیور پیچھے بیٹھی نفاست سے ساری کا پلو سنبھالتی ممانی جو ادھیڑ عمر ہوتے ہوئے بھی نہایت اسمارٹ تھیں۔ دلچسپ باتیں کرنے والے ماموں۔ تین عدد ماموں زاد بھائی اور ایک عدد بہن۔ ان سب نے رابعہ کو اچانک اپنی ہوسٹل کی ساتھی لڑکیوں کی صف میں لا بٹھایا جن کے گھر سے ملنے آنے والے افراد ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ احساس رابعہ کو بڑا اچھا لگا۔ ننھے ماموں کی معصوم محبت سے بھی زیادہ۔ جب سے وہ ہوسٹل میں رہنے لگی تھی کھٹارا سائیکل اور لانبی لانبی جناداری گاڑیوں کا تضاد اس کے ذہن میں بہت واضح ہو گیا تھا۔

شام کی چائے کا وقت ہو چکا تھا جب ماموں کی گاڑی پورٹیکو میں رکی اور ممانی رابعہ کو ساتھ لئے ہوئے اتریں۔ ایک ملازم باہر لان میں کرسیاں لگا رہا تھا۔

بھئی چائے یہیں پئیں گے۔ ممانی نے کہا۔

رابعہ دلچسپی کے ساتھ خوشنما پھولوں اور سلیقے سے تراشی گھاس کو دیکھتی رہی جو ماموں اور ممانی کے اعلیٰ ذوق کی غماز تھی۔ اس خوبصورت پس منظر میں چائے کے گھونٹ بھرتے اور بہت جلدی بے تکلف ہو جانے والے بھائی بہنوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے رابعہ نے ننھے ماموں کے کمرے کا تصور کیا، جہاں اسے اس وقت ہونا چاہئے تھا۔

سب سے پہلے ننھے ماموں شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے۔ پاجامہ اتار کر لنگی چڑھاتے۔ پھوں پھوں کر کے برادے کی انگیٹھی پھونکتے۔ اس پر جو چائے بنتی اس میں دھوئیں کی مہک ہوتی۔ پٹری بچھا کر اس پر کھانا کھایا جاتا۔ بڑا ہی غیر دلچسپ ماحول ہوتا۔ وہ ذرا کی ذرا باہر جھانکتی تو ماموں سر پر تعینات ہو جاتے ـــــ اے ربّو خبردار جو ادھر ادھر جھانکا۔ ایک تو رابعہ کو اپنا ”اولڈ فیشنڈ“ نام یوں ہی ناپسند تھا اس پر سے ربّو ـــــ سونے پر سہاگہ۔ بس ننھے ماموں کے چہرے کی جھریوں پر اسے بڑا رحم آتا تھا بیچارے۔ بڑی محبت کرتے تھے۔ اس کو گھر لے جاتے تو بولائے بولائے پھرتے۔ ”تیرے لئے گھی بچا کر رکھا تھا ربّو۔ آٹے کا حلوہ بنا دوں؟ جلیبیاں لا دوں؟ آملے کا مربّہ کھائے گی؟ اچھا تو کیا کھائے گی، کچھ منھ سے بول تو سہی۔ ٹنڈے کے کباب پراٹھے لا دوں؟ ٹنڈے کے کباب رابعہ کی کمزوری تھے۔ ابھی وہ حامی بھر دیتی تو ماموں آگے سے دروازے کی کنڈی چڑھا دیتے اور دوڑ جاتے ٹنڈے کی دوکان پر۔ دو تازہ کباب لاتے اور سب رابعہ کو ٹھنسا کر دم لیتے۔ خود بیٹھے معصومیت سے اسے تکا کرتے جیسے وہ سارے نوالے ان کے پیٹ میں جا رہے ہوں۔ اس وقت وہ بڑے ہی قابلِ رحم لگا کرتے تھے ـــــ لیکن بڑے بور بھی۔ دل ہی دل میں رابعہ نے اپنی چھٹیوں کا نصف حصّہ ماموں سلیم الزّماں کے حوالے کر دیا۔

چلتے وقت رابعہ ممانی کے گلے میں جھول گئی۔

”پیرنٹس ٹیچر میٹ“ میں ضرور آئیے گا۔ ننھے ماموں اس میں کبھی نہیں آتے۔ بے چارے نہ تو روانی سے انگریزی بول سکتے ہیں، نہ ہی اس ماحول میں فٹ ہوتے ہیں۔ شاید اس کا انھیں خود احساس ہے ـــــ آخری بات اس نے ممانی سے کہی نہیں۔ صرف دل میں سوچا۔

ممانی کو اپنی چھوٹی بیٹی کا داخلہ اس اعلیٰ درجے کے کالج کے اسکول سیکشن میں کرانا تھا۔ ایک ”بھانجی“ پہلے اسکول میں پڑھ چکی ہے اور اب کالج میں پڑھ رہی ہے تو اسکول پر تھوڑا سا حق ہو جائے گا، دوسرے پیرنٹس ٹیچر میٹ میں جائیں گی تو پرنسپل اور اساتذہ سے ذاتی واقفیت بھی ہو جائے گی۔ ٹٹ پونجیے سسرالی عزیزوں میں زیادہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بیگم سلیم الزّماں نے کھلے دل سے رابعہ کو بھانجی تسلیم کر لیا اور ساری تقریبوں اور میٹنگوں میں شریک ہونے کا وعدہ بھی کیا۔

ننھے ماموں کی اجاڑ زندگی میں مزید اداسی گھل گئی۔ رابعہ نے اپنی چھٹیاں ان کے اور سلیم ماموں کے درمیان ففٹی ففٹی کر دی تھیں۔ دو برس اور گزر گئے۔ رابعہ انٹرمیڈیٹ کے بعد پری میڈیکل ٹسٹ میں بیٹھی تو کامیاب نہیں ہو سکی اس لئے

اس نے بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ "اگلے سال پھر بیٹھ جانا" ننھے ماموں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔ ویسے بھی بی۔ ایس۔ سی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا بورڈ زیادہ بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ وہ مسکرائے تھے۔

ماموں ـــــ رابعہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ہوسٹل کی فیس میں یک لخت پچاس روپے ماہوار کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اگلے ماہ سے ....

مہنگائی آسمان چھو رہی ہے۔ اضافہ تو ہوگا ہی۔ ننھے ماموں نے رسان سے کہا۔ حالاں کہ ان کی تنخواہ میں پچاس روپے ماہوار کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اور مہنگائی میں اضافہ ہوسٹل ہی میں نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں ہو رہا تھا۔ گھر آکر وہ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ وہ اپنے اخراجات میں کہاں کٹوتی کر سکتے ہیں۔ رابعہ کے بی۔ ایس۔ سی کے اور پھر اس کے بعد پری میڈیکل کے انتخابات سر پر ہوں گے۔ ہوسٹل کتنا بھی مہنگا ہو آخر ہے تو ہوسٹل۔ بھلا کہیں پسندیدہ اور مقوی کھانا ملا کرتا ہے وہاں۔ انھوں نے پاجامہ اتار کر لنگی چڑھائی اور طاق میں رکھی پڑیاں ٹٹولنے لگے۔ رابعہ کے لئے دھنیے کا اطریفل بنانا تھا اور آملے کا مربہ۔ دماغ میں طاقت نہیں رہے گی تو پڑھے گی کیسے۔ اطریفل کا نسخہ جھوائی ٹولے کے ایک پرانے حکیم صاحب نے دیا تھا۔ دماغ کے لئے بہت مفید ہے۔ انھوں نے بتایا تھا۔ نسخہ مہنگا تھا لیکن ننھے ماموں بندھوا لائے تھے۔ کوٹ چھان کر شہد میں ملا کر پکانا تھا۔ کمر کس کر انھوں نے پڑوسیوں سے ہاون دستہ مستعار لیا اور دوائیں کوٹنے میں جٹ گئے۔

قبر میں اماں نے کروٹ بدلی۔ ننھے جو تم ہڈیاں سکھا رہے ہو تو تھوڑا سا اطریفل اپنے لئے بھی تو رکھ لو۔ اور دس بیس آملے بھی۔ انھوں نے بلبلا کر کہا لیکن مردوں کی آواز تو اللہ میاں چھین لیتے ہیں۔ اماں ہوتیں تو چھوٹے لاڈلے بیٹے ننھے مرزا کو یوں دیکھ کر کیسا تڑپتیں۔ مگر شفیق ماں کی محبت داستان پارینہ ہوچکی تھی۔

اگلے سنیچر کو وہ دونوں چیزیں لے کر خوش خوش رابعہ سے ملنے گئے تو رابعہ کو دیکھ کر چونکے۔ وہ بڑی اداس اور دل گرفتہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مزاج تو بے حد شوخ اور چنچل تھا۔ کیا بات ہے ربو؟ انھوں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"سلیم ماموں کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ دو ہفتے بعد وہ لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔ امتحان بھی سر پر ہیں۔" بھائی سلیم الزماں کے تبادلے کی خبر سن کر ننھے ماموں کو ایک کمینی سی مسرت کا احساس ہوا۔ اس مسرت پر قابو پایا تو ایک حیرت سے دوچار ہوئے۔ سلیم الزماں کے تبادلے سے رابعہ اتنی اداس کیوں ہے۔ مسرت کی جگہ حسد نے لے لی۔ کیا رابعہ کے لئے کوئی بھی ان کی جگہ چھین سکتا ہے؟ رابعہ صرف گیارہ بارہ برس کی تھی جب وہ اسے لے کر آئے تھے۔ پچھلے آٹھ برسوں سے وہ ان کے پاس تھی، صرف گرمی کی چھٹیوں میں گھر جاتی تھی ماں باپ کے پاس۔ اکثر چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے بھاگ آیا کرتی تھی۔ اس کا دل لکھنؤ میں زیادہ لگنے لگا تھا۔ وہاں وہ سات بچوں میں سے ایک تھی اور یہاں تنہا۔ ننھے ماموں اسے خون جگر سے سینچ کر پال رہے تھے۔ منّو ان کی ہوگئی ہوتی اور اس کے بچے ان کے آنگن میں کھیلتے ہوتے تو ان سب کو وہ جتنی محبت دیتے وہ انھوں نے تنہا ربو پر نچھاور کر دی تھی۔ سلیم الزماں کے یہاں وہ وقتاً فوقتاً محض دو سال کے عرصے تک آتی جاتی رہی ہے۔ پھر ان کے تبادلے کی خبر سن کر اس قدر اداس کیوں ہے؟ پھر انھوں نے خود کو سمجھایا۔ بچی ہی تو ہے ابھی۔ وہاں ہم عمر بھائی بہن تھے۔ گھر کا ماحول تھا۔ دل زیادہ لگتا ہوگا۔ میرے یہاں آکر ایک کمرے میں بند ہو جاتی ہے بے چاری۔

رابعہ ـــ اگلی بار جب تم میرے گھر چلو گی تو میں تمھیں فلم دکھانے کو بھیج دوں گا۔ اپنی کچھ سہیلیوں سے بات کر کے رکھنا۔ اکیلے کیسے جاؤ گی۔ چار ٹکٹ لا دوں گا۔

رابعہ مسکرائی۔ بڑی پھیکی سی مسکراہٹ۔ کیا لے آئے ماموں ـــ؟ اس نے جھولے کی طرف اشارہ کیا۔ دھنیے کا اطریفل ہے اور آملے کا مربہ۔ چا
کے ورق الگ سے رکھ دیئے ہیں۔ روز صبح منھ ایک آملہ ایک ورق میں لپیٹ کر کھا لینا اور صبح شام دونوں وقت۔

رابعہ نے اپنی جھنجھلاہٹ ظاہر نہیں ہو
دی۔ آملے تو شاید کھا لئے جائیں لیکن یہ بلّی جیسا اطریفل۔ اس پر تو پھپھوند ہی جمے گی۔ مخواہ محنت کرتے ہیں ماموں۔ پوچھ تو لیتے۔ ا
بیزاری سے جھولے میں سے ڈبہ نکالا۔

ـــــ رابعہ اگلے ہفتے بھی اداس د
دی اور اس سے اگلے ہفتے بھی تو ماموں کو کھ
یہ کوئی وقتی مسئلہ نہیں تھا کہ آیا اور گزر گیا۔ کو
بات تھی۔ رابعہ کے لئے وہ ایسے ہی حساس ت
ماں اپنے بچے کے لئے ہوتی ہے۔

"کیا بات ہے بٹیا۔ ماموں کو نہیں بـ
جملہ بڑا سادہ تھا لیکن دل کی ایسی گہرائیو
نکلا تھا کہ رابعہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ چہ
کرب کا گہرا تاثر پھیل گیا۔ اس نے سر جھکا
پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ "
سے پوچھ لیجئے گا ماموں ـــ" اس نے اٹ
اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

ماموں کو انتظار کی تاب کہاں۔ پیدل پہنچ گئے ہانپتے کانپتے رفعت کے گھر۔ رفعت کی بچپن کی سہیلی تھی۔ ڈے اسکالر تھی۔ اس ماموں کو معلوم تھا۔ جب رابعہ ان کے ساتھ تھی تو وہ اکثر اس کے اصرار پر اس کو کھانے کے گھر لے جاتے تھے۔

رفعت نے جو کچھ ماموں کو بتایا اس
لباب یہ تھا کہ سلیم ماموں کے یہاں رابعہ کی ایک لڑکے سے ہوا کرتی تھی جو سلیم ماموں
لڑکے کا دوست تھا۔ وہ بریلی کے ایک کھا
گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور میڈیکل کا
آخری سال کا طالب علم تھا۔ دو سال تک اک
ہوتی رہنے والی ملاقاتوں نے پسندیدگی کو گ

نگاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ سلیم ماموں کے تبادلے کے بعد ملاقات کے راستے بند ہوگئے ہیں۔ دوسرے اس کی تعلیم بھی قریب الختم ہے۔ لڑکا ذرا شرمیلا ہے۔ گھر والے اب اس کا رشتہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ شاید منھ کھول کر بول نہ سکے۔ رابعہ کہتی ہے اس کی شادی وہاں نہ ہوئی تو وہ تاعمر کنواری رہے گی۔

خاندان میں ایک اور ننھے ماموں؟ وہ کرب جو ان کا مقدر تھا، اب رابعہ کا مقدر بنے گا۔ رابعہ کا، جو انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ننھے ماموں کے سائے میں رہتے کے باوجود اگر تاریخ نے رابعہ کے ساتھ اپنے آپ کو دوہرایا تو لعنت نہ ہو گی ننھے ماموں پر۔

——— انہوں نے کمر کسی اور جنگی سطح پر اپنی مہم میں جٹ گئے۔ لکھنؤ والے بیٹیوں کا رشتہ لے کر خود نہیں جاتے خواہ لڑکیاں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں یا کنواری رہ جائیں۔ لیکن منل بچے ننھے مرزا کنگ جارج میڈیکل کالج کے ٹرانس گومتی ہوسٹل میں اس لڑکے سے ملنے گئے اور لڑکی والوں کی ساری انا، ساری حیا، ساری خودداری گومتی میں سپرد آب کر کے چلے آئے۔ لڑکے کو انھوں نے سنجیدہ پایا تھا۔ انھوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے روپیہ نکلوایا۔ کئی چکر بریلی کے خود لگائے۔ زندگی میں پہلی بار اپنے لئے عمدہ کپڑے سلوائے تاکہ لڑکی والے انھیں پھکڑ نہ سمجھیں۔ تحائف کی بھرمار کر دی۔ ایک ساتھی کلرک کے کوئی عزیز ڈاکٹر تھے ان کو درمیان میں ڈلوایا تاکہ ایک معزز ہستی کا ساتھ رہے۔ کسی بھی طرح لڑکے والوں کو رام کر کے دم لیا۔ جس دن وہ بیس کلو کھوئے کے لڈو اور ایک من پھلوں کے ٹوکرے لڑکے والوں کے یہاں پہنچا کر اور ان سے رابعہ کے والدین کے نام رقعہ بھجوا کر لکھنؤ لوٹے تو انھوں نے تنڈے کے یہاں سے اپنے لئے ورقی پراٹھے خریدے اور کباب بھی۔ اور کھا کر ایسی نیند سوئے جو منو کی ڈولی اٹھنے کے بعد سے کبھی نہیں سوئے تھے۔ ایک خوش و خرم انسان کی بے فکر، گہری نیند۔

لڑکے والوں کے رقعے کے ساتھ آپا کو ننھے مرزا کا خط بھی ملا۔ "رابعہ ان کی لے پالک ہے اس لئے انھیں زبان دینے کا حق پہنچتا تھا۔ وہ زبان دے چکے ہیں۔ آپا اور بھائی صاحب کو تو محض خانہ پری کے لئے لکھوا دیا ہے۔ ورنہ ان کی دی ہوئی مٹھائی تو لڑکے والے اپنے اعزہ میں تقسیم کرا چکے ہیں۔" آپا کو پتنگے لگ گئے۔ انھیں پورا یقین تھا لڑکی ڈاکٹر بنے گی آخر اسے جنادری کونونٹ کالج سے تعلیم مکمل کر رہی ہے ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہے۔ رشتوں کی اسے کیا کمی رہے گی! ابھی عمر ہی کیا ہے۔ بیسواں سال چل رہا ہے۔ آج کل تو اٹھائیس اور تیس میں شادیاں ہو رہی ہیں۔

بڑی ہائے توبہ مچائی آپا نے۔ برقعہ پھٹکارتی لکھنؤ پہنچ گئیں۔

"کیوں میاں لڑکی بیچ دی تھی کیا تمھارے ہاتھ؟" انھوں نے بھویں چڑھا کر آگ برساتی نظروں سے ماموں کو گھور کر کہا۔

"یہی سمجھ لو۔" ننھے ماموں نے مضبوطی سے جواب دیا اور اپنی جگہ کھونٹے کی طرح گڑ گئے۔

ایسی اچھی شادی کی انھوں نے۔ پراویڈنٹ فنڈ اور کوآپریٹو دونوں سے قرض لیا۔ کہیں لڑکے والوں کے دل میں پھانس نہ رہ جائے کہ گرے پڑے گھر کی لڑکی اٹھا لائے ہیں۔ ڈاکٹر لڑکا دیا اور خسارے میں رہے نہیں صاحب! ماموں نے سب کو خوش کر دیا۔

رخصتی کا وقت قریب آیا تو ماموں رابعہ کے قریب گئے۔ اب لکھنؤ لوٹیں گے تو کیا ہو گا وہاں ان کے لئے۔ ایسا تو انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا خیال تھا اب کی بار امتحان میں رابعہ منتخب ہو جائے گی پانچ سال میڈیکل کالج میں پڑھے گی۔ وہیں شادی بیاہ کر دیں گے۔ وہیں پریکٹس جائے گی اپنے ڈاکٹر دولہا کے ساتھ۔ وہ ان کے پاس سے کہیں دور چلی جائے گی، یہ تو کبھی نہیں سوچا تھا۔

دلہن بنی رابعہ کے چہرے پر نور اترا تھا۔ ایسا نور جو دل کے اندر روشنیاں جلنے پر چہرے پر اترتا ہے۔ ننھے ماموں کے تنہائی کے خوف سے قطعی ناآشنا اس کی آنکھیں مستقبل کے خواب بن رہی تھیں۔ انہونی ہونی ہو گئی تھی۔ اس کا رُواں رُواں تھرک رہا تھا۔ ننھے ماموں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ چہرہ دیکھا۔ ایک اور دلہن کا چہرہ اس چہرے پر منعکس ہوا۔ اٹھا صدیاں گزر جانے پر بھی اس چہرے کے عکس پر وقت کی گرد نہیں پڑی تھی۔ وہ حافظے میں ویسا ہی شاداب تھا۔ کیا اس پر بھی اتنی ہی خوشی کی دمک تھی یا کسی کو کھو دینے کی کسک تھی؟ ایک آہنی گھونسہ پھر سینے پر لگا۔ ایک درد کی تیز لہر پھر ریڑھ کی ہڈی سے گزر کر کلیجے میں سما گئی۔ منو۔ منو۔ تجھے تو میں بھلا چکا تھا۔ رابعہ کے جانے کے بعد تو اگر پھر حواسوں پر سوار ہو گئی تو میں باقی زندگی کیسے گزاروں گا؟

——— باقی زندگی گزار رہے ہیں ننھے ماموں رابعہ کے خطوں کے سہارے ان خوش خبریوں کے سہارے جو وقتاً فوقتاً انھیں ملتی رہی ہیں۔ رابعہ کے یہاں بیٹا ہوا۔ پھر اس کی تصویر آئی۔ ماموں نے کھلونوں اور کپڑوں کا پارسل بھیجا اور روپے بھی بھیجے۔ پارسل اپنے ہاتھ سے سیا تھا۔ بڑے جتن سے ایک ٹانکا ٹانکا لاتھا۔ یوں زندگی کے تین چار دن ہنسی خوشی سے گزر گئے۔ پھر انتظار کیا پارسل کی رسید اور رابعہ کے خط کے آنے کا۔ مہینہ بھر بعد رابعہ کا جواب آیا۔ تین چار دن اس کو دہراتے رہنے میں نکل گئے۔ یوں ریگستان جیسی زندگی میں کبھی کبھی ننھے نخلستان آتے رہے اور چند سال اور گزر گئے۔ اس درمیان رابعہ ننھے بچے کو لے کر سندیلہ، والدین کے پاس آئی تھی۔ ماموں کو خبر ملی تو فوراً سندیلہ پہنچ گئے۔ رابعہ کو دیکھا نازک سی دھان پان لڑکی اب ایک باوقار عورت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ کپڑوں

لتوں اور چیزوں سے فارغ البالی اور خوش حالی عیاں تھی۔ پیارا سا گل گوتھنا سا بچہ تھا۔

"کیوں ربّو ـــــ کبھی لکھنؤ آنے کو جی نہیں چاہتا؟" ننھے ماموں سوچ رہے تھے کہ لکھنؤ میں اپنے گوشۂ تنہائی میں اس کے خوبصورت گڈے سے کھیل سکتے، جی بھر کے اسے گود لے سکتے تو کیسا اچھا ہوتا۔

چاہتا تو ہے ماموں۔ اتنے دن وہاں رہی، پڑھا۔ مگر کہاں ٹھہروں گی؟ سسرالی عزیز بھی نہیں ہے وہاں کوئی۔

کہاں ٹھہروں گی؟ یہ جملہ ماموں کا دل کچوٹ گیا۔ مگر وہ خاموش رہے۔

خبریں آتی رہیں۔ رابعہ کے یہاں ایک اور بیٹا ہوا۔ پھر معلوم ہوا رابعہ نے وہیں بریلی میں ایم۔ ایس۔ سی کلاسز جوائن کر لی ہیں۔ خط لکھنے کی فرصت اسی لئے اب کم ملتی ہے۔ چھ مہینے کے انتظار کے بعد دونوں بیٹوں کی تصویروں کا پیکٹ آیا اور ایک بیٹی ہونے کی خبر بھی۔

ننھے ماموں فکرمند رہا کرتے تھے۔ تین بچے، ربّو کا ایم۔ ایس۔ سی فائنل ہے۔ بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ اپنی فکروں کا انھیں احساس نہیں تھا۔ ربّو کی شادی کا قرض چکا کر فارغ ہوئے تو رٹائر ہونے کا وقت آ گیا۔ پنشن بہت قلیل تھی۔ اس میں گزارا مشکل سے ہوتا تھا۔ جو روپے یکمشت ملے تھے ان سے ربّو کے چھوٹے بھائی کو پڑھا رہے تھے۔ وہ میڈیکل میں منتخب ہو گیا تھا۔ ربّو کی شادی جلدی کر کے جو احساس جرم ڈھو رہے تھے اس کی تلافی کا یہی طریقہ تھا۔

اپنی ذات کو شکنجے میں کس کر، دال پتلی کر کے، کپڑوں میں پیوند لگا کے ادھر انھوں نے کچھ روپے پس انداز کئے تھے۔

ربّو کے خط اب نہیں کے برابر تھے۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ ایم۔ ایس۔ سی کر کے مقامی کالج میں لکچرار بھی ہو گئی تھی، "یوں ہی وقت گزارنے اور گھر کی یکسانیت سے فرار کے لئے۔" اس نے ماموں کو کبھی لکھا تھا۔ "ورنہ روپیوں کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ کا شکر ہے۔ نعیم کی پریکٹس اچھی چلتی ہے ـــــ"

زندگی کے طویل ریگستان میں آنے والے نخلستانوں کے درمیانی فاصلے بڑھتے جا رہے تھے، روز صبح ننھے ماموں ربو کے بچوں کی تصویروں کا پیکٹ نکالتے۔ پھر تصویر کو بغور دیکھتے اور پھر رکھ دیتے۔ نظر کچھ زیادہ دھندلانے لگی تھی۔ کبھی کبھی فضا، لوگ، اپنی کوٹھری۔ سب جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ کہاں جائیں کیا کریں۔ اکثر خود سے باتیں کرتے۔ انگلیوں پر نہ جانے کیا کیا حساب لگاتے۔ شاید یہ کہ منوّا ان کا مقدر ہوتی تو آج ان کے آنگن میں کتنے پوتے نواسے کھیل رہے ہوتے۔ اور منوّا رہتی پتلی دال کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ پکا رہی ہوتی۔ اس کے سر پر کتنے سفید بال ہوتے اور اس کی پتلی پتلی بوڑھی انگلیوں میں مہندی رچی ہوتی یا نہیں؟ اور نہ جانے کن کن باتوں کا حساب جو اگر ہو جاتیں تو کیا ہوتا۔ پھر خود کو سمجھاتے۔ اب ان باتوں کا حساب لگانے سے بھی کیا حاصل ننھے مرزا؟ زندگی کی شام ڈھلنے کو آئی۔ اب تو بس یہ جی چاہتا ہے کہ ایک بار رابعہ کو یہاں بلاؤں، دولہا میاں بھی آئیں اور بچے بھی۔ سب سے چھوٹی کو تو دیکھا ہی نہیں۔ تصویر میں بالکل رابعہ کی شبیہ لگتی ہے۔

ـــــ اس دن ننھے ماموں نے اپنا گلّق توڑا۔ روپے نکالے۔ امین آباد سے مٹی کی وہ ننھی ننھی چڑیاں لائے جو بچپن میں رابعہ کو لا کر دیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے فنکاروں کی انگلیوں کا نمونہ۔ مٹی کے پھل اور میوے۔ ننھی ننھی ہنڈکلیاں۔ رابعہ بچپن میں ان سے کھیلا کرتی تھی۔ ٹرنک کی تہہ کھکوڑی۔ اس میں سے ایک ننھا سا آئینہ نکالا۔ چھوٹی رابعہ بچپن میں اس میں اپنا منہ دیکھا کرتی تھی۔ یادگار سمجھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ یہ سب سامان وہ ننھی رابعہ کو دیں گے۔ رابعہ کی نئی شبیہ کو۔ اس کے لوٹتے بچپن کو۔ پھر انھوں نے رابعہ کو خط لکھا۔

"گرمی کی چھٹیوں میں سب طلبا گھر چلے جاتے ہیں۔ میں نے دو کمروں کے لئے کہہ دیا ہے۔ چھٹیوں میں لاج مکمل طور پر خالی ہوگی۔ کمرے صاف ستھرے بھی ہیں۔ تمھیں تکلیف نہیں ہوگی۔ ان چھٹیوں میں بچوں سمیت آ جاؤ۔ میرا کیا بھروسہ نہ کوئی دیکھنے والا نہ بھالنے والا۔ نہ جانے کب چل بسوں۔"

چوبیٹوں کی اس لاج کو رابعہ کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کے تصور سے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔ بچوں کو ایسی جگہ رہنے کی عادت نہیں ہے۔ نعیم کیا کہیں گے۔ پھر ننھے ماموں کا وہ سارا انگڑ کھنگڑ۔ بچوں کے لئے دوڑے دوڑے جائیں گے اور پتے پر چاٹ لے آئیں گے۔ فضلو کے یہاں کے گندے برتنوں میں کھانا لایا کریں گے۔ اس نے خط اٹھا کر کنارے رکھ دیا۔ ماموں سلیم الزماں کی آخری پوسٹنگ کشمیر ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ رٹائر ہو جائیں گے۔ صرف دس ماہ اور باقی ہیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں کشمیر جا کر اطمینان سے رہنے کا موقع تھا۔ یوں تو ہوٹل میں بھی رہا جا سکتا تھا لیکن ماموں سلیم الزماں کے یہاں جا کر رہنے کی بات دوسری تھی۔ ان کا ذکر وہ بہت کیا کرتی تھی۔

"میرے وہ ماموں جو کمشنر ہیں ـــــ"

شادی پر ایک دن کے لئے آئے بھی تھے گرچہ ممانی اور بچے نہیں آ سکے تھے۔ اس نے ماموں سے خط و کتابت "مین ٹین" رکھی تھی۔ ماموں نے ایک بار لکھا تھا ـــــ "کبھی آنا"

رابعہ نے کشمیر جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ننھے ماموں کو وہ کچھ لکھ دے گی۔ گرمی بہت ہے۔ نعیم کی خواہش ہے کہ کشمیر جائیں۔ لکھنؤ تو مئی جون میں بھٹی بنا ہوا ہوگا۔ یا کچھ بھی۔ ننھے ماموں بڑے ہی سیدھے ہیں کچھ نہیں کہیں گے۔

(آگے صفحہ ۱۶۱ پر)

نریندر لوتھر

پُوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے!

عُرف

اُردو شاعری میں تخلّص کے مسئلہ کا ایک پہلوُ

یہ اچھی بات ہے کہ اردو شاعری میں تخلص کا رواج ہے۔ اس سے چوری پکڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مغربی شاعری میں اس قسم کا کوئی چلن نہیں۔ اس لیے کئی بار مناقشے ہوتے ہیں کہ شیکسپیر کے سانیٹ اور ڈرامے خود اس نے نہیں بلکہ کسی اور شخص مثلاً (MARLOWE) یا بیکن (BACON) وغیرہ نے لکھے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں نے تخلص کا ہندوستانی سسٹم کیوں نہیں اپنایا۔ پوپ، ملٹن، کیٹس شیلی وغیرہ نام آسانی سے کسی بھی انگریزی نظم میں سما سکتے تھے۔ اگر شیکسپیر کا نام تخلص کے لیے قدرے لمبا تھا تو وہ اپنے پہلے نام کا مخفف وِل (WILL) یا بعد میں دیا گیا لقب بارڈ (BARD) استعمال کر سکتا تھا BARD OF AVON سے بارڈ ایوانی ہو سکتا تھا۔ ایسے تخلص سے تو وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اردو میں بھی شاعری کر سکتا تھا، اس لیے اردو داں طبقے کو شیکسپیر پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔

اپنی اس تجویز کی تائید میں ہم چند مثالیں دے سکتے ہیں، جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ انگریزی شاعری میں تخلص کا استعمال بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا (ہے)

شیکسپیر کے مشہور سانیٹ نمبر ۳۰ کو لیجیے ؎

WHEN TO THE SESSIONS OF
SWEET SILENT
THOUGHT ....

BUT IF THE WHILE I THINK
THEE , DEAR FRIEND

ALL LOSSES ARE
RESTOR'D , ALL
SORROWS END

اس سانیٹ کے 'مقطع' میں لفظ 'فرینڈ' FRIEND کی جگہ تخلص آسکتا تھا۔ جیسے اس کا تخلص 'وِل' WILL استعمال کر لیں۔ اب مقطع یوں ہوگا:

BUT IF THE WHILE I THINK
ON THEE DEAR WILL

ALL LOSSES ARE RESTOR'D ,
ALL SORROWS NIL

دوسری مثال شیلی کی لیجیے۔ اصلی قطعہ یوں ہے ؎

HAIL TO THE BLITHE SPIRIT

BIRD THOU NEVER WER'T

تخلص کے ساتھ یہ یوں ہو جائے گا:

SHELLEY HAILS THEE,
BLITHE SPIRIT
BIRD THOU NEVER WER'T

اسی طرح کیٹس کے مشہور

ODE ON A GRECIAN URN

میں بھی تخلص بڑی خوبی سے آسکتا ہے۔ اس نے کہا تھا ؎

HEARD MELODIES ARE SWEET,
BUT THOSE UNHEARD
ARE SWEETER; THEREFORE,
YE SOFT PIPES, PLAY ON

اس کی دوسری سطر تخلص کے ساتھ یوں ہو جائے گی ؎

....ARE SWEETER;THEREFORE,
OH KEATS! PLAY ON

مثالیں تو اور بھی دی جا سکتی ہیں، لیکن وقت، جگہ، کاغذ اور سیاہی کی کمی یعنی انفلیشن کی وجہ سے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔

اس طرح ایک تو ہمیں یہ یاد رکھنے میں آسانی رہتی ہے کہ فلاں نظم کس نے لکھی اور دوسرے ان شاعروں کی شہرت اور بھی زیادہ ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ اوپر دی گئی مثالوں میں تخلص کی وجہ سے نظموں کے وزن میں کچھ کمی بیشی ہو گئی ہو، لیکن اتنے بھاری بھرکم شاعروں کی اتنی وزنی نظموں میں تھوڑے سے وزن کے کم یا زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ہم ایک اصول کی بات کر رہے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ

"ڈمپل" 6-3-1090، سوماجی گوڑا، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

شاعر ہمارے تجویز کیے ہوئے یا اپنے ناموں پر مبنی تخلص رکھتے۔ اردو شاعروں کی طرح شاعرانہ یا اوٹ پٹانگ تخلص بھی رکھ سکتے تھے، جس سے بحر اور وزن اور نظم کے دوسرے اصناف پر کوئی فرق نہ پڑتا۔

ایک مدرسۂ فکر کے مطابق یوروپی شاعروں نے تخلص کا استعمال اس لیے نہیں کیا کہ ان میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ بالفرض اگر عوام کو اُن کی شاعری پسند نہ آتی تو وہ اپنی شخصیت کو کیسے چھپاتے!

روس میں ایسے واقعات دیکھنے یا سننے میں آئے تھے، جن میں شاعروں نے تخلص کا استعمال کیا ہو، لیکن انقلابِ روس کے بعد ذاتی جائداد ممنوع قرار دی گئی تھی۔

اس لیے کوئی شاعر تخلص کے ذریعے کسی نظم پر اپنی ملکیت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ گلاسنوسٹ کی نئی پالیسی کے تحت تخلص کے استعمال کی محدود اجازت دی گئی ہے۔ اب ہر شاعر اپنی پانچ نظموں میں سے ایک میں تخلص کا استعمال کر سکتا ہے۔

کئی لوگ غالب کے بارے میں بھی ویسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جیسے کچھ انگریزی نقاد شیکسپیر کے بارے میں۔ یعنی اُن کا قول ہے کہ غالب کی غزلیں کسی اور شخص نے لکھی ہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ باور نہیں کرتے کہ اتنی اچھی شاعری کوئی اصلی شخص اور وہ بھی اکیلا کر سکتا تھا (ہے) مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ غالب بذاتِ خود ایک نہیں انیک تھا۔ اس ٹِنک کو غالب نے خود ہوا دی۔ اُس نے دعویٰ کیا تھا۔

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس سے کئی محققوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کی شاعری چند دوستوں کے اشتراکی عمل کا نتیجہ تھی۔

بیت بازی کا رواج بھی تقریباً اُسی وقت شروع ہوا تھا۔ ایک شخص نے آئیڈیا دیا۔ دوسرے نے ایک مصرع کہا تیسرے نے اُس کی ترمیم کی۔ چوتھے نے دوسرے مصرع کا ڈرافٹ تیار کیا اور اس طرح شام تک ایک آدھ غزل تیار ہو گئی۔ غزل ہو جانے کے بعد ضیافت ہوتی۔ جس میں غزل کو آپریٹو سوسائٹی کے ممبر سوسائٹی سے بغض کے جذبے کو دباتے رہتے۔ غالب نے خود کہا ہے کہ وہ کبھی نشے کے لیے شراب نہیں پیتا تھا۔ وہ صرف 'خودی' کے خیال کو مارنے کے لیے ایسا کرتا تھا تاکہ اس کی کو آپریٹو سوسائٹی کی ممبر شپ برقرار رہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

طبا طبائی کے مطابق اس 'بے خودی' میں اُس 'انجمن' کی طرف اشارہ ہے جو غزل لکھا کرتی تھی (لیے خود اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ لیکن آسی اور خاکسار طبا طبائی سے متفق ہیں)

خیر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے اشخاص یا شعراء کون تھے جن کی اجتماعی کاوشیں غزل کی صورت میں نمایاں ہوتی تھیں۔ ادیبوں، محققوں، جاسوسوں اور پولیس کی ان تھک کوششوں کے باوجود اُن میں سے ابھی تک صرف ایک شخص کا پتہ لگ سکا ہے۔ وہ نام ہے اسد۔ ناظرین جانتے ہیں کہ کئی غزلوں میں جو دیوانِ غالب میں شامل ہیں 'اسد' کا تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ شروع میں صرف غالب اور اسد نے ہی مل کر شاعری کی۔ بعد میں اُن کی کامیابی کو دیکھ کر چند اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس تھیوری کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اسد۔ غالب کی ابتدائیہ شاعری میں اسد کا تخلص استعمال کیا گیا ہے: مثلاً ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ایک محقق کا قول ہے کہ اسد نے بڑھاپے میں شاعری شروع کی تھی۔ اُس نے غالب کی ہونہاری کو دیکھ کر یا میر کے ریمارک سے متاثر ہو کر اُسے اپنے ساتھ مل کر لکھنے کی دعوت دی۔ چند برسوں کے بعد وہ انتقال کر گیا (اسد) اور اس طرح اُس کا تمام کاروبار بمع تخلص غالب کے ہاتھوں میں آ گیا۔ (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسد کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی) بعد میں غالب نے بھی چند ذہین نوجوانوں کو اپنا پارٹنر بنا لیا۔ اور اس طرح یہ کاروبار اور بھی پھلا پھولا۔

ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ اسد نے اپنے پارٹنرز کی منظوری کے بعد چند غزلوں میں اپنا نام ڈال دیا۔ یہ بات پارٹنرز کو پسند نہیں آئی۔ اُنہوں نے اعتراض کیا تو اسد نے بڑا سیدھا سادہ جواب دیا کہ میں نے یہ نام اس لیے استعمال کیا تاکہ دشت میں ہماری دھاک جم جائے۔ (اسد کے لغوی معنی شیر کے ہوتے ہیں) ایک بار ایسا ہو جاتا تو یہ نام آئندہ غزلیات سے خارج کیا جا سکتا تھا۔ یہ دلیل قبول نہیں ہوئی، لیکن اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسد کافی چالاک اور گھاگ قسم کا شخص تھا۔

ایک محقق نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اسد دراصل میر تقی میر تھا۔ میر کو فارسی نہیں آتی تھی۔ اس معذوری کے باوجود وہ بڑی کامیاب اور معقول شاعری کرتا رہا۔ لیکن خواص کا اعتراض تھا کہ فارسی الفاظ کے بغیر اردو شاعری کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر کسی نے اُسے ورغلایا کہ تم دلّی کو اتنا مِس MISS کرتے ہو۔ اگر اپنی شاعری میں فارسی کا استعمال کرنا شروع کر دو تو مغل بادشاہ خوش ہو جائے گا اور تمہیں اپنا مصاحب بنا لے گا۔ میر بیچارہ لالچ میں آ گیا۔ ذہین تو تھا ہی۔ جلد ہی فارسی میں مہارت حاصل کر لی، لیکن فارسی میں شاعری کے لیے اُسے ایک خالص تخلص کی ضرورت تھی۔ اس طرح اُس نے اپنا تخلص اسد رکھ لیا۔

اس نظریے کی تائید غالب کے اُس شعر سے ہوتی ہے جو اُس نے میر کی تعریف میں لکھا تھا اور جس میں اُس نے میر کی عظمت کو تسلیم کیا تھا۔ یہ بات آسان نہیں کیونکہ عام طور پر اردو شاعر اپنی زندگی میں کسی دوسرے کی تعریف نہیں کرتا اور موت کے بعد کر نہیں سکتا۔ غالب کا وہ شعر ہے۔

؎ ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک بار ماہر نفسیات نے تو یہاں تک بھی کہا ہے کہ یہ اعتراف "فرائڈین سلپ" (FREUDIAN SLIP) ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر خود میر عرف اسد عرف غالب ہی نے لکھا ہے۔ اس لیے ناقد اکثر کہتے ہیں کہ اردو شاعری کی روایت میں تسلسل ہے۔ اُنہیں یہ پتہ نہیں کہ اس

(آگے صفحہ ۳۱ پر)

نام کتاب: مہابھنشکرمن
شاعر: عنبر بہرائچی
قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی

اردو شاعری میں اس کتاب کی اشاعت ایک نیک فال ہے۔ اردو شاعری مجموعی طور پر سہل پسندی کا شکار ہو گئی تھی۔ غزل گو شاعر پہلے فن کی باریکیوں پر ضرور نظر رکھتے تھے، جس کے لیے ریاضت کرنا پڑتی تھی۔ نئی غزل کے نام پر جو کچھ لکھا گیا ان میں پرانی شاعری کے اوصاف نہیں تھے۔ زبان و بیان کی خوبیاں مفقود تھیں اور نئے اوصاف کی نشاندہی تا ایں دم نہیں ہو سکی۔ پھر آزاد غزل کا شوشہ چھوڑا گیا اور اس کے بعد 'ہائیکو' کا۔ اگر غزل کے ہر شعر کو اکائی مان لیا جائے تو ریزہ گوئی کا الزام صحیح نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ دو مصرعوں میں بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اب 'ہائیکو' کا رواج شروع ہوا ہے۔ اگر دو مصرعوں میں بات کہنے سے شاعر مردود ٹھہرتا ہے تو تین مصرعوں میں بات کہنے سے وہ احترام کا مستحق بن جاتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ میں نہ ہائیکو کا مخالف ہوں نہ غزل کا۔ لیکن ادب کی تاریخ میں لازوال شہرت انہیں شاعروں کو ملی ہے جنہوں نے کسی موضوع پر جگر کاوی سے کام لے کر طویل نظمیں لکھیں۔ مثلاً فارسی میں شاہنامہ کا مصنف فردوسی اور مثنوی کے مصنف مولانا روم۔ پنجابی میں بھی وارث شاہ نے 'ہیر' لکھ کر لازوال شہرت پائی۔ اردو میں کچھ مثنویاں ہیں ضرور، لیکن ان کا موضوع ہندوستان کی آب و ہوا کے مطابق نہیں۔ انیس و دبیر کے مرثیے مستحق توجہ تھے۔ لیکن بہت کم ناقدوں کا دھیان اس طرف گیا ہے۔

گزشتہ پچاس برس میں عنبر بہرائچی پہلا شاعر ہے جس نے ایک مشکل موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کے لیے جس محنت شاقہ کی ضرورت تھی اس سے پہلو تہی نہیں کی۔

موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جو محنت کی ہے اس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

"قدیم ہندوستانی ادب، فلسفہ اور تہذیب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے زیر نظر تخلیق کو قلم بند کرنے سے قبل میں سنسکرت ادب کے مایہ ناز بودھ شاعر اشوگھوش (अश्वघोष) کی عظیم تخلیق "بدھ چریتم" ("बुद्ध चरितम") کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اشوگھوش، کالی داس کے ہم پلہ ہیں۔ میں نے بیشتر واقعات اور کردار "بدھ چریتم" ہی سے لیا ہے۔"

مصنف کے کچھ دوستوں نے کتاب کے عنوان پر اعتراض کیا تھا کہ یہ عنوان اردو والوں کے لیے غیر مانوس ہے۔ اپنے جواز میں مصنف کی یہ دلیل قابل جواز ہے کہ اردو زبان میں باہری عناصر کو قبول کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے اور یہ بھی کہ لفظ 'مہابھنشکرمن' کی بودھوں کے نزدیک وہی اہمیت ہے جو کہ اہل اسلام کے نزدیک لفظ ہجرت کی اہمیت ہے۔ "یہ لفظ سنسکرت زبان کا ہے جو دو لفظوں سے بنا ہے۔ مہا یعنی عظیم اور 'بھنشکرمن' یہ معنی نکلنا۔ دوسرے الفاظ میں اس لفظ کا اردو ترجمہ 'غربت عظیم' ہوتا ہے"۔ میرے اپنے خیال میں ہجرت اور مہابھنشکرمن میں ایک معنوی ربط بھی ہے۔ اپنے معنوی وجود کے تحفظ کے لیے دنیوی قید علائق کو خیرباد کہنا۔ دراصل مہاتما بدھ کا تجربہ اتنا انوکھا نہیں تھا۔ مثلاً جب بدھ شاہی محل کی آسائشوں پر ترک کر کے سنگھ میں شامل ہونے کے لیے نکلے تو ان کے ساتھ ان کا ایک خادم نائی بھی تھا، جسے بدھ سنگھ میں اہم مقام دیا۔ مصنف نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے جیسے طبقاتی اونچ نیچ کے خلاف یہ پہلا جہاد ہو۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے جب بھگوان رام بن باس کے لیے گئے تو انہوں نے بھی اپنا قیام بالمیکی کی کٹیا میں کیا تھا، جو اونچی ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور تمام دینی علوم کے ماہر تھے۔ راون کے خلاف جہاد میں بھی بھگوان رام کا ساتھ بن باسیوں نے دیا تھا۔ اور یہ جہاد راون کے خلاف تھا جو ویدوں کا بہت بڑا ماہر تھا۔ بدھ کا یہ عقیدہ کہ ایک موقع پر آدمی کو ذات پات ہی نہیں بلکہ خود مذہب کو بھی خیرباد کہہ دینا چاہیے بہت زیادہ انوکھا نہیں۔ اس کے ڈانڈے صوفیوں کے ترک ترک سے ملتے ہیں۔ پھر بھگوان کرشن نے ارجن کو سب دھرموں سے اوپر اٹھ جانے کا جو مشورہ دیا تھا کیا وہ یہی بات نہیں۔ بہرحال اس سے مہاتما بدھ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سچائی کی تلاش ایک مسلسل عمل ہے جس میں مہاتما بدھ نے جو حصہ لیا اس کی عظمت اپنے طور پر مسلّم ہے۔

اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو مصنف

نے مشورہ دیا ہے کہ وہ قدیم ہندوستان کے اساطیری ادب اور علاقائی زبانوں کے ادب سے خاص لگاؤ پیدا کریں، جن لوگوں نے دکنی اردو ادب کا مطالعہ کیا ہے، اس سے انکار نہیں کریں گے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس حقیقت کو بالکل ہی نظر انداز نہیں کیا۔ لکھنؤ میں انیس اور دبیر کے مرثیے بھی اس کے شاہد ہیں کہ اردو شاعری کی نشوونما خلا میں نہیں ہوئی تھی۔ ان مرثیوں میں حضرت امام حسینؑ کا جو کردار ابھرتا ہے، وہ ایک عرب مجاہد سے کہیں زیادہ ایک ہندوستانی سورما کا ہے۔ ہندوستان کے سبھی رسم و رواج انیس و دبیر کے مرثیوں میں موجود ہیں۔ پھر صوفی شعراء کے کارنامے ہیں جن میں ملک جائسی کا پدماوت کی اہمیت تو مسلمات کا درجہ رکھتی ہے۔ اس طویل نظم کا موضوع اور ماحول دونوں یکسر ہندوستانی ہیں۔ بہر حال مصنف کا مشورہ اپنی جگہ صحیح ہے اور اس پر زیادہ سے زیادہ عمل ہونا چاہیے۔

نظم شاعر نے واقعی بڑی محنت سے لکھی ہے۔ مثلاً مریض کو دیکھ کر گوتم پر جو کیفیاتِ کرب طاری ہوئی تھیں، ان سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے والد نے سارتھی کو بدل دیا بعد نئے سارتھی کو ہدایت تھی کہ وہ شہزادے کو اس قسم کی باتوں سے محفوظ رکھے۔ لیکن شدنی ہو کر رہتی ہے۔ شاعر کے الفاظ میں:

پھر نیا رتھ آ گیا وہ سارتھی بدلا گیا
شاہرہ کے چپے چپے غور سے دیکھے گئے
شبھ لگن پر اذنِ شہ پا کر، کنور سوئے چمن
دل میں پھر اک اور تازہ جستجو لے کر بڑھے
تماشیت کو یہی منظور دو پل بعد ہی
سامنے ارتھی ملی سنسار تج کر جاتے ہوئے
پھر ہوئے وہ سارتھی سے اس طرح محوِ سخن
"کون ہے؟ جاتے ہیں، جس کو لوگ کاندھے پر لیے
غم زدہ مجمع ہے جس کے پیچھے پیچھے جا رہا
جس میں کچھ خاموش ہیں کچھ لوگ گریہ کر رہے"
سارتھی بولا: "میرے آقا یہ صید مرگ ہے
بے وفائی کی ہے اس سے وصفِ جان و عقل نے
لوگ کل تک اپنی پلکوں پر بٹھاتے تھے مگر
آج مر جانے پہ جاتے ہیں جلانے کے لیے"
دور سوکھے پیڑ پر اک چیل نالہ زن ہوئی
سارتھی سے وہ پریشانی میں یوں کہنے لگے
"صرف اس نے موت پائی یا کہ مرتے ہیں سبھی"
"سارے جاں دار ول پہ آقا ابر چھٹتے موت کے"
اس وضاحت کے شرارے ناگ پھنیوں کی طرح
ان کے دل کی سب رگوں میں پاؤں پھیلانے لگے
ہاتھ پر رخسار رکھ کر کھنچے لہجے میں کہا
موت ہے برحق مگر سب ہیں بہت بے خوف سے
ہر بشر کو اک نہ اک دن وہ اٹھا لے جائیگی
جانے کیوں اس بات کو سب لوگ ہیں بھولے ہوئے
سیر کو جانا عبث ہے سارتھی! واپس چلیں
جان کر ایسے حقائق شاد کیسے دل رہے؟"

اس قسم کے مناظر سبھی دیکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک عام آدمی ان سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ لیکن بدھ نے انسانی مصائب سے نجات کی جستجو کی۔ یہ جستجو بجائے خود اہم ہے۔ اس میں ان کو پوری طرح کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں۔ یہ بات زیادہ اہم نہیں کیونکہ علم کی ابتدا بھی سوال ہے اور انتہا بھی سوال۔

گوپال متل

نام کتاب: تنقیدِ مشرق

مصنف: عبدالمغنی

قیمت: ۳۷ روپے

ملنے کا پتہ: اردو بک فاؤنڈیشن، ۴۸۸ - بی - ایف ڈی سی کمپلیکس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

یہ ڈاکٹر عبدالمغنی کے تنقیدی مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس میں متعدد موضوعات پر پندرہ مضامین ہیں۔ ان میں نظریاتی بحثیں ہیں اور علمی مطالعے بھی۔ نثر و نظم، شعر و تنقید اور افسانہ و ظرافت جیسی متنوع اصنافِ ادب پر بہت واضح قطعی اور مثبت طور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ حسب ذیل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کے ذہن نے کتنی مختلف جہتوں کا احاطہ کس وسعت کے ساتھ کیا ہے:

جدید اردو افسانہ۔ ظفر کی شاعری پر غالب کا اثر۔ اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام۔ اکبر الہ آبادی کا فن۔ میر کا تصورِ انسان۔ جدید ادبی تنقید کے مسائل۔ جمیل مظہری کا نازِ بندگی۔ اقبال اور کارل مارکس۔ حسرت کی شاعری۔ حالی بحیثیت نثر نگار۔ چکبست کی نظم نگاری۔ سہیل عظیم آبادی شخص اور فن۔ اردو ادب میں مشرق کی بازیافت۔ ظریفانہ ادب اور تنقید معاشرہ۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت ادیب۔

مجموعے کا نام ایک مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے مصنف کے اندازِ تنقید کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس انداز کی کچھ وضاحت "اردو ادب میں مشرق کی بازیافت" سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عنوان کتاب ہی پر لکھے ہوئے مصنف کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے مشرقی تصورِ تنقید کے علمبردار ہیں جو قدیم و جدید دونوں کا ایک متوازن مرکب اور ایک آفاقی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ مصنف کے علمی و ادبی مباحث سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ تنقیدِ ادب میں جامعیت اور توازن کے اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعے سے ایک باخبر قاری کے ذہن پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی نے عصرِ حاضر کے اردو ادب میں ترقی پسندی اور جدیدیت یا اشتراکیت اور فن پرستی کی کشمکش سے صرفِ نظر کر کے بلکہ دونوں مکاتیبِ فکر یا رجحانات کی بے اعتدالیوں پر تنقید کرتے ہوئے ایک ایسا اخلاقی نقطۂ نظر اور نظریاتی جادۂ اعتدال پیش کیا ہے۔ جس کے مطابق ادب کی تشکیل جدید صرف ان مثبت اور تعمیری عناصر سے ہو سکتی ہے۔ جو زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے معیار کو سامنے رکھ کر اقدارِ انسانیت کی تزئین و ترقی اور فروغ و عروج کا سامان

کریں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کے تنقیدی مطالعات میں نظریاتی اور علمی دونوں قسموں کی ادبی تنقید کی مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ادب کی طرح تنقیدی ادب میں بھی فکر و فن کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک طرف فنی معیار سے کسی نمونۂ ادب کی اصلیت و حقیقت کا سراغ لگاتے ہیں جب کہ دوسری طرف ایک فکری، اخلاقی اور نظریاتی نصب العین کے مطابق پارۂ ادب کی عظمت و مرتبت کا تعین کرتے ہیں۔ ان دونوں کاموں میں وہ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتے اور پوری صفائی اور مضبوطی کے ساتھ اپنا موقف ایک ایسے اسلوبِ بیان سے پیش کرتے ہیں جس کا بہرحال اثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہوتا ہے۔

قیوم خضر

نام کتاب: **مذہب کی حقیقت**
مصنف: خلیل شرف الدین
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"مذہب کی حقیقت" کے عرفان کی انسانی کوششیں اتنی ہی قدیم ہیں، جتنا کہ خود مذہب۔ مذہب وہ شاہراہ ہے، جس پر چل کر انسان حقیقتِ اعلیٰ تک پہنچتا ہے، لیکن مذہب کی اس شاہراہ پر سلامتی کے ساتھ سفر کرنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ امیر خسروؒ کے لفظوں میں مدھوا سے مٹکی بھر کر لے آنا آسان نہیں ہے۔ چونکہ پنگھٹ کی ڈگر بڑی کٹھن ہے۔

آج کی دنیا میں جب کہ مذہب (یا مذاہب) بظاہر اعداء کے نرغہ میں نظر آتا ہے تب بھی ہماری انسانی آبادی کی غالب ترین اکثریت مذہبی ہونے کی دعویدار ہے۔ لیکن اس راستے پر چلنے والوں کے لیے جس زادِ راہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا احساس بھی ہم میں سے اکثر کو نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی احساس کو بیدار کرانے کی ایک شعوری کوشش ہے، جو ایک ایسے شخص کے مضامین و مکاتیب کا مجموعہ ہے، جس نے انہیں کتابی صورت میں شائع کرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ شاید اپنے جدہ کے قیام کے زمانے میں انہیں لکھ کر وہ اپنے ایک عزیز کے نام بمبئی بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی ہمشیرہ نے ان مضامین کی اشاعت کا فیصلہ کیا جس کے لیے یقیناً ہمارے جیسے مذہبی امور کے ...... طالب علم ان کے ممنون ہیں۔

خلیل شرف الدین مرحوم کے "ان مضامین کے مطالعے سے" بقول جناب معین الدین حارث مرحوم "یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک دردمند مردِ مسلم جو موجودہ دور کی رسمی قدیم یا جدید طرزِ تعلیم کے پورے چکر سے نہ گزرا ہو نہ کسی دارالعلوم سے اس کی دستار بندی ہوئی ہو یا اس نے کوئی ڈگری حاصل کی ہو، مگر جسے قرآن فہمی کا ذوق قدرت نے ملا ہو اور اسی کے ساتھ جس کا سینہ ملت کے درد سے گھرا ہو اور جس کی اصلاح کی اُسے لگن ہو، وہ اپنے دل کی بات کتنے مؤثر انداز میں پیش کر سکتا ہے اور اپنے خیالات کی تائید میں کلامِ ربانی کے حوالے کس برجستہ طریقے سے پیش کر سکتا ہے۔"

خلیل شرف الدین مرحوم ہماری تحریکِ آزادی کے ان گمنام مجاہدوں میں سے ایک تھے جنہوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور ممکنہ قربانیاں دیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے رسومات اور توہمات کی جکڑ سے بھی انسانوں کی نجات اور آزادی کے لیے اپنے فکر و عمل سے جدوجہد کی۔

بظاہر یہ کتاب ایسا لگتا ہے کہ صرف مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے، لیکن دراصل یہ کتاب اگر غور سے پڑھی جائے تو مذہب کے ہر طالب علم اور ہر مذہبی شخص کے لیے ایک ایسا نسخۂ جانفزا ہے، جو بتاتا ہے کہ مذہب ہر قسم کے تفاخر اور غرور سے سخت بیزار ہے۔ جہاں تفاخر اور غرور ہوگا، وہاں آپ کو مذہب ہرگز نہ ملے گا۔

زیرِ نظر کتاب میں مرحوم خلیل شرف الدین کے ۱۷ مضامین اور ۴۳ مکتوبات ہیں نیز ایک تعزیتی خط جو اُن کے دیرینہ رفیق جناب محمد طیب صاحب نے مرحوم کی بہن کو دہلی سے لکھا تھا اور اس کا جواب جو امۃ اللہ شرف الدین (مرحوم کی بہن) نے لکھا تھا، میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور کتابت، طباعت اور سرورق سب ہی کے لیے کتاب کے مرتب اور نگراں جناب محمد طیب صاحب نے بڑا اہتمام کیا ہے۔

امید ہے کہ مذہب کی حقیقت کے متلاشی تمام لوگ مذہب و ملت کے اختلاف سے بالاتر ہو کر اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔

نام کتاب: **تصوف کی باتیں**
مرتب و مؤلف: ڈاکٹر ظہور الحسن شارب
ناشر: تاج پبلشرز، ۱۶۹۷ - بیری والا باغ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
قیمت: دس روپے

"تصوف کی باتیں" انسان کے باطن کی صفائی اور قلب و نظر کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے۔ تصوف پر اہلِ ظاہر نے بڑے اعتراضات کیے ہیں، لیکن جس طرح فقیہہ حرم کی بے توفیقی کو بہانہ بنا کر شریعت کی گردن نہیں اُڑائی جا سکتی اسی طرح کسی نام نہاد صوفی کی بدمستیوں کی بنا پر تصوف کو بھی دار پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ بے عملی، فرائض سے کوتاہی، گمراہی اور مذہب سے سرکشی کے لیے بھی لوگوں نے تصوف کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی اور اس طرح کی کوششوں سے تصوف کے بارے میں غلط فہمیوں کو بہت بڑھاوا ملا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کے بغیر تو کوئی شخص صوفی ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت جنید بغدادی سے کسی نے پوچھا تھا کہ صوفی بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟" آپ نے فرمایا "بس آٹھ خوبیاں پیدا کرنی ہوتی ہیں۔" پوچھا گیا "وہ کون سی؟" سید الطائفہ جنیدؒ نے جواب دیا:

۱۔ ایثارِ ابراہیمؑ ۲۔ اطاعتِ اسماعیلؑ ۳۔ صبرِ

موسیٰؑ ۴۔ صبرِ ایوبؑ ۵۔ اشارہ ذکریاؑ ۶۔ قناعتِ عیسیٰؑ ۷۔ غربتِ یحییٰؑ اور ۸۔ فقیرِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آج جب کہ تمام مادی آسائشوں کے باوجود ایک عام انسان کا قلب اور دماغ تناؤ کا شکار ہے ضروری ہے کہ تصوف کے چشمۂ صافی کی طرف لوگوں کو ترغیب دلائی جائے۔ اور تصوف کی اصل اور اس کی اثر آفرینی سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے، بتایا جائے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تصوف اور اہلِ تصوف کی تعلیمات اور زندگی کی تبلیغ اور اشاعت کا بڑا اور کارِ ثواب، بڑی پامردی، عزم اور استقلال کے ساتھ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب صاحب ایک طویل مدت سے انجام دے رہے ہیں۔ ذاتی طور پر ملاقات نہ ہونے کے باوجود یہ بات ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ وہ بحرِ تصوف کے ہر طرح سے شناور ہیں۔ خبر ہی نہیں اس باب میں نظر بھی رکھتے ہیں اور عمل پیرا بھی ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر ان کی زیرِ نظر کتاب بڑی اہم ہے۔

اس کتاب میں پندرہ خطوط اور ان میں سے چودہ کے جواب شامل ہیں۔ یہ تمام خطوط جناب ظہور الحسن شارب صاحب نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء سے ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کے بیچ اپنے بزرگ اور مرشد حضرت نواب محمد خادم حسن شاہ المعروف بہ نواب گدڑی شاہ باباؒ کی خدمت میں ارسال کیے اور ان میں سے ہر خط میں تصوف پر کیے جانے والے مختلف اعتراضات کا ذکر ہے تو ہر خط کے جواب میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس طرح سے تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا نہ صرف ازالہ ہو جاتا ہے بلکہ تصوف کی تعلیمات، اصطلاحات، مضمرات و متعلقات، نکات اور صوفیانہ اشعار و خیالات پر بھی کافی روشنی پڑ جاتی ہے۔

زبان سادہ اور انداز دل نشین ہے۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے کتاب اچھی اور قیمت مناسب ہے۔

اختر الواسع

نام کتاب: **لسانیات کے بنیادی اصول**
مصنف: ڈاکٹر اقتدار حسین خاں
قیمت: ۴۰ روپے
تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں ہے کہ اردو میں لسانیات پر تصانیف کا فقدان ہے۔ بالخصوص جدید لسانیات پر چند مضامین، دو ایک تصانیف اور بعض ترجموں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے "لسانیات کے بنیادی اصول" ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

لسانیات زبان کے سائنسی مطالعہ کو کہتے ہیں لیکن اردو میں اس سائنس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اردو میں زبان کو زیادہ تر شعر و ادب سے ہی متعلق سمجھا گیا ہے۔ کسی لفظ یا محاورہ وغیرہ کی سند کے لیے کسی بڑے شاعر کے شعر کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ زبان کی اپنی ساخت ہوتی ہے، بندش ہوتی ہے، ضرورتیں ہوتی ہیں، آوازیں ہوتی ہیں۔ اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ زبان میں جہاں کہیں ضرورت پڑے اس کے لیے لسانیاتی نقطۂ نظر سے سند لی جائے۔

اس کے لیے لسانیات کے مطالعہ کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنی ہوگی۔ اقتدار صاحب نے اپنی اس تصنیف میں لسانیات کے تمام اہم موضوعات کے جائزے کے ساتھ ساتھ تاریخی لسانیات کے حوالے سے زبانوں کے آپسی رشتے اور زبانوں کی نسبی درجہ بندی کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ ہند یورپی زبانوں کا باقاعدہ شجرہ ہی دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقتدار صاحب نے لسانیات اور تدریسِ زبان کے سلسلے میں بھی گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ زبانوں کی تعلیم و تدریس میں لسانیات کا کیا کردار ہونا چاہیے۔

"لسانیات کے بنیادی اصول" اپنے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔ جو ہماری درسی ضرورت کو بھی کسی حد تک پورا کرے گی۔ ایسی معلوماتی اور علمی کتابیں مطالعے کے بعد بھی ریفرنس کے لیے محفوظ رہنی چاہئیں۔

نام کتاب: **نیلمبر**
مصنفہ: حمیدہ سلطان
قیمت: بیس روپے
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

'نیلمبر' حمیدہ سلطان کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے، جس کا مقدمہ قاضی عبدالستار نے لکھا ہے۔

حمیدہ سلطان کا نام اردو کی ادبی دنیا میں اور خاص طور سے دہلی والوں کے لیے خوب جانا پہچانا ہے۔ موصوفہ نے زیادہ نہیں لکھا ہے، لیکن جتنا بھی لکھا ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موصوفہ کا ناول 'رنگ محل' مسلمانوں کی تہذیبی زندگی، بیگماتی ماحول اور سادہ زبان کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ 'نیلمبر' کے بعض افسانے قاری کو تاریخ کے نگار خانوں میں لے جاتے ہیں تو کچھ افسانے زندگی میں انسانی کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں، جن میں نفرت ہے، محبت بھی اور محبوب پر قربان ہو جانے کا جذبہ بھی۔

عذرا باجی اس مجموعے کی سب سے طویل کہانی ہے جو پچاس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ عذرا باجی جیسے کردار دنیا میں نایاب نہیں ہیں مگر عام بھی نہیں۔ اگرچہ اس مجموعہ کی کہانیوں کے پلاٹ بہت فکر انگیز نہیں ہیں، لیکن ہر کہانی کا تانا بانا بڑی مہارت سے بُنا گیا ہے۔ زبان آسان اور سادہ ہے۔ بقول قاضی عبدالستار ان کہانیوں کے کردار فرد نہیں ایک عہد ہیں۔ ایسا عہد جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے غبارِ زریں سے وہ صورتیں اُبھر آئی ہیں، جن کے ایک نقاب کو اٹھانے سے پوری پوری کتابیں عاجز ہیں۔

یقیناً اپنے اختصار اور زبان و بیان کی چابک دستی کے نقطۂ نظر سے نیلمبر قارئین کے لیے ایک خوب صورت تحفہ ہے جس کی پذیرائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب: **فصیل**
مصنف: تسکین زیدی
قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: شاخ ادارہ بزم خضر راہ، ۱۲/۵۴/۴۴ ۔ گوال ٹولی، کانپور

"فصیل" تسکین زیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔
تسکین زیدی اپنے افسانوں کا مواد حالات اور اپنے آس پاس کی زندگی سے لیتے ہیں وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔
تسکین زیدی کا اسلوب سادہ اور زبان سلیس ہے بلکہ یوں کہیے کہ عام بول چال کی زبان میں وہ روداد جہاں بیان کر جاتے ہیں ان کا یہ براہِ راست انداز ہی ہے جو کہانی میں کہانی پن کو برقرار رکھتا ہے، جس سے پڑھنے والا کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوتا ہے۔
ہنگامی حالات سے متاثر ہو کر تسکین زیدی نے جو افسانے رقم کیے ان میں دھوئیں کی لکیر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جو وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی موت کے بعد ہونے والے ملک گیر فسادات کا اظہار بھی ہے اور ان پر تبصرہ بھی۔
ہنگامی حالات ہوں یا سماجی برائیاں، زندگی کے مسائل ہوں یا طبقاتی کشمکش، خواتین کی الجھنیں ہوں یا بچوں کی دشواریاں یا عوام کی پس ماندگی — تسکین زیدی سب ہی کے بارے میں اپنے سادہ اور براہِ راست اسلوب میں کہہ جاتے ہیں۔ جذبوں کی آنچ میں جسم کی ضرورت کا اظہار ہے تو ندامت کا بوجھ، ضمیر اور ضرورت کا تصادم۔ حصار اور تلاش میں تسکین زیدی نے مغربی تہذیب کے مضر اثرات کی نشاندہی کی ہے اور مشرقی تہذیب کی خوبیوں کو سراہا ہے۔
"فصیل" تسکین زیدی کے افسانوں کا بہتر مجموعہ ہے جو ان کے بہتر ادبی مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

نام کتاب: تیسرے رُخ کی تصویر
مصنف: رحمٰن حمیدی
قیمت: دس روپے
ناشر: کاملپور اکاڈمی۔ جگجیون روڈ، گیا (بہار)

"تیسرے رُخ کی تصویر" رحمٰن حمیدی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ رحمٰن حمیدی اردو کے ایک جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ رحمٰن حمیدی کو بات کہنے کا سلیقہ ہے اور وہ اشاروں میں ہی سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ 'پرندوں کے قیدی' نامی کہانی میں ہمارے زمانے کی عکاسی بڑے علامتی انداز میں کی گئی ہے، جب کہ کہانی پتھر کی آواز میں انسانی رشتوں کی اہمیت و فوقیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ 'پانی کے قیدی' سیکس و زندگی کے بارے میں ہے تو اندھیرے کی زد میں منجمد حیات میں عصرِ حاضر کے درد و کرب کو برتا گیا ہے۔
بقول کلام حیدری: "حمیدی کی کہانیاں ذہنی ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ وہ منجمد ذہن کو بھی پگھلا دیتی ہیں،، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حمیدی انسانی نفسیات کا تجزیہ کر کے اسے اپنے تجربوں کی اساس پر علامت کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی لیے قاری ان کی کہانیوں سے سرسری انداز میں متعارف نہیں ہوتا بلکہ اسے انہیں سمجھنے کے لیے غور و فکر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔
رحمٰن حمیدی اپنی علامتی کہانیوں میں فرد و معاشرے کے عسرت و عشرت، محکومی و آزادی اور خارج و باطن کی معنویت کے پس منظر میں تیسری دنیا کے مسائل جس طرح برتتے ہیں وہ صلاحیت انہیں دوسرے علامت پسند افسانہ نگاروں کی بھیڑ سے الگ کرتی ہے۔ 'تیسرے رُخ کی تصویر' جدید علامتی افسانوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔

نام کتاب: **شاخیں**
مصنف: اسلام پرویز، قیمت: پندرہ روپے
پیش کش: ادارہ فروغِ اردو، سیتامڑھی (بہار)

"شاخیں" اسلام پرویز کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ موصوف کا پہلا مجموعہ "ٹوٹی ہوئی پتیاں" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس طرح 'شاخیں' اسلام پرویز کے گزشتہ دس سال کے شعری سفر کا سرمایہ ہے۔
پروفیسر اویس احمد دوراں نے اسلام پرویز کو احتجاجی لے کا شاعر کہا ہے۔ بقول پروفیسر موصوف اسلام پرویز ترقی پسند شاعر ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے مجموعے ٹوٹی ہوئی پتیاں میں جبر و استحصال کے خلاف احتجاجی اور طنزیہ اشعار موجود ہیں۔
"ٹوٹی ہوئی پتیاں" کی احتجاجی لے 'شاخیں' تک پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس احتجاجی لے کے باوجود شاخیں شاعر کی فکر کی تازگی، احساس کی شدت کے ساتھ شعری حسن کی بھی عکاس ہے۔ اسلام پرویز نے زندگی کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور حالاتِ حاضر کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے ؎

بڑا کٹھن ہے یہ تاریک راستوں کا سفر
دلوں میں عزم و عمل کے دیئے جلائے چلو

کوئی بھی ظلم ہو چپ چاپ کیوں سہے انساں
یہ احتجاج کا موسم ہے، احتجاج کرو

اسلام پرویز کے شعری تجربے شاید ان کی اپنی زندگی کے تجربوں پر انحصار کرتے ہیں، اسی لیے ان کے لہجے میں دردمندی ہے (مگر مایوسی نہیں) درد اگرچہ زندگی میں رچ بس گیا ہے، مگر حوصلہ بلند ہے۔
'شاخیں' گو ایک مخصوص لب و لہجے کی شاعری ہے، لیکن اس میں ایک عام آدمی کے جذبات موجود ہیں۔ ایسی شاعری جو اپنی معلوم ہو ضرور پسند آتی ہے۔

نام کتاب: **غواص قریشی**
مرتب: فیروز اختر، قیمت: دس روپے
ناشر: بزم غواص، پیلخانہ، ہوڑہ (بنگال)

غواص قریشی سرزمین بنگال کے ایک بزرگ اردو شاعر تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں آپ کی شخصیت

اور شاعری پر مضامین یک جا ہیں۔ ساتھ ہی غواص قریشی کی دس منتخب غزلیں بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ دراصل جو لوگ بنگال کے بزرگ شعراء کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب تعارفی مواد فراہم کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف غواص قریشی کی شخصیت و شاعری پر تنقید و تبصرہ ملتا ہے بلکہ اس میں بنگال کے دوسرے ادیب و شاعروں کے اسلوب و انداز کے تذکرے بھی موجود ہیں جو ضرورت کے مطابق ریفرنس کا کام دے سکتے ہیں۔

غواص قریشی (متوفی ۱۹۷۸ء) کے فن اور شاعری پر سالک لکھنوی، اعزاز افضل، اختر جاوید، اشہر ہاشمی، قیصر شمیم اور ڈاکٹر ایم اے نصر کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں تو ان کی شخصیت کے بارے میں ماسٹر عبدالرحیم پریمی اور حلیم اثر نے اظہارِ خیال کیا ہے۔

غواص قریشی اردو کے بہت بڑے اور بہت مشہور شاعر نہیں تھے، لیکن اپنے بزرگوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا بڑی صحت مند روایت ہوتی ہے اور اس کے لیے یقیناً بزمِ غواص کے اراکین قابلِ مبارک باد ہیں، جنہوں نے اپنی ایک ادبی شخصیت کی پذیرائی کی ہے۔ یقیناً یہ بنگال کی اردو دنیا میں ایک خوش آئند کوشش ہے جس کی قدر کی جانی چاہیئے تاکہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

نام کتاب: آدمی نصیبوں والا

مصنف: برنارڈ شا

قیمت: بارہ روپے

زیرِ نظر کتاب میں دو کمزوریاں فوراً محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو برنارڈ شا کو برناڈ شا لکھا گیا۔ اور دوسرے ڈرامے کا اصل انگریزی نام بھی نہیں دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ترجمے پر زور ہے اس لیے بہتر ہوتا کہ اصل نام The man of Destiny کا بھی حوالہ دے دیا جاتا۔ برنارڈ شا کے سبھی ڈرامے اہم ہیں اور سب کا ترجمہ اردو میں ہونا چاہیے، مگر قاری کو اصل ڈرامے کا نام بھی معلوم رہنا چاہیے۔

ابو یوسف پیر بیگھوی نے اردو ترجمے کے لیے شا کے ایک اچھے ڈرامے کا انتخاب کیا ہے جو طربیہ انداز کا ایک دل چسپ ڈرامہ ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے آج کے دور میں اس کی معنویت کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ "آدمی نصیبوں والا" مشہور فاتح نپولین کے کردار پر انحصار کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں اس کردار کی بے ساختہ صناعی میں اصلیت اور سادگی اکائی بنے ہوئے ہیں۔ اس ڈرامے میں غیر مطمئن نسلوں میں اُمنگ پیدا کرنے اور ان کا رُخ مستقبل کے روشن دور کی طرف منعطف کرنے کی خاطر طنز و مزاح کے ذریعے اس بڑھتی ہوئی کج روی کا پول کھولا گیا ہے، جو معاشرے میں مضرت رساں حد تک حلول کر چکی تھی۔ کج روی اور بناوٹ کیوں کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں کم نہیں ہے، اس لیے اس ڈرامے کے مکالمے ہمارے دَور کے تقاضوں کے پیشِ نظر آج بھی Relevant ہیں۔ ترجمہ لفظی نہیں ہے۔ مگر اصل متن کو پیش کرتا ہے۔ تحریر شستہ اور رواں ہے۔ ایسے ترجموں کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

نام کتاب: منٹو کے بہترین افسانے

مصنف: سعادت حسن منٹو

ناشر: ڈائمنڈ پاکٹ بکس، دریا گنج، نئی دہلی

قیمت: ۶ روپے

اردو کا کون سا ایسا قاری ہے جس نے منٹو کو نہیں پڑھا یا اس کو پڑھنا پسند نہیں کرے گا۔ اردو افسانے کی دنیا میں منٹو بہت بڑا نام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منٹو کا ہر افسانہ بہترین ہوتا ہے گو کہ مختلف مرتب اپنے انداز سے بہترین افسانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں منٹو کے دس افسانے شامل ہیں۔ یہ ہتک، موذیل، بابو گوپی ناتھ، جانکی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، لائسنس، سرکنڈوں کے پیچھے، خوشیا، عورت ذات اور بلاؤز ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ہی منٹو کے مشہور افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ منٹو کی تحریروں سے تین چھوٹے چھوٹے اقتباس بھی ہیں جو بہت تیکھے اور منٹو کی نشتر زنی کا اظہار ہیں۔ یہ سب ہی مانتے ہیں کہ منٹو نے اپنے کردار روزمرہ کی زندگی سے لیے ہیں اور جیسا اُنہیں دیکھا اور پایا ہے بالکل ویسی ہی تصویر کشی کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کرداروں میں ہمیں اپنی زندگی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور اسی لیے کبھی ہم شرمندہ ہوتے ہیں تو کبھی جھنجھلاتے ہیں۔

منٹو انسان دوست ہے۔ دوست نواز ہے اور وہ بُرے سے بُرے کردار میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی تلاش کر لیتا ہے۔ وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ہی انسانی زندگی کی خرابی کے لیے ذمہ دار مانتا ہے۔

نام کتاب: یادیں

مصنف: دت بھارتی

ناشر: ڈائمنڈ پاکٹ بکس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت: ۶ روپے

دت بھارتی اردو کے ایک جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ ناولوں کی دنیا میں دت بھارتی کا اپنا ایک مقام ہے۔ چوٹ اور گناہ دت بھارتی کی وہ تخلیقات ہیں جو اپنے اسلوب، پلاٹ اور کرداروں کے لیے آج بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۳۳ برس کے نام سے دت بھارتی نے اپنی سوانح عمری لکھی اور خود ہی اپنا محتسب بن کر اپنے ادب کا جائزہ لیا۔ دت بھارتی نے کچھ عرصہ تک اردو میں نہیں لکھا، لیکن اب ڈائمنڈ پاکٹ بکس میں پھر ان کی تخلیقات شائع ہونے لگی ہیں۔ "یادیں" دت بھارتی کا تازہ ترین ناول ہے۔ جس میں اُنہوں نے زندگی کی تلخ ترش اور میٹھی یادوں کی کہانی سُنائی ہے۔ ریکھا کے کردار کے ذریعے اُنہوں نے آج کی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ کھانے کی ضرورت ہو یا رہنے کی یا کچھ اور مسائل

باقی صفحہ ۱۰ پر

خلافِ واقعہ :

محترمہ عابدہ صاحبہ اپنے مضمون مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں تحریر کرتی ہیں کہ :

"اُردوئے معلیٰ کے فروری، مارچ ۱۹۰۸ء کے شمارے "مصطفےٰ کمال نمبر" میں کالج کے ایک طالب علم کا مضمون : "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کے زد میں آگئے۔"

اس سلسلے میں عرض ہے کہ :

(۱) اصل نام مصطفےٰ کامل ہے، مصطفےٰ کمال نہیں! مصطفےٰ کمال کا تعلق ترکی سے تھا، جب کہ مصطفےٰ کامل مصر کے رہنے والے تھے اور مصطفےٰ کامل کا زمانہ، ترکی کے مصطفےٰ کمال سے پہلے کا ہے۔

اس طرح اُردوئے معلیٰ کا مذکورہ شمارہ "مصطفےٰ کامل نمبر" ہے۔

(۲) اردوئے معلیٰ کے مذکورہ بالا شمارے میں کوئی بھی تحریر "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شاملِ اشاعت نہیں ہے۔ یہ شمارہ میری نظر سے گزرا ہے، جس میں مختلف عنوانات کی درج ذیل تحریریں شامل ہیں اور یہ صحیح ہے کہ اس میں کسی بھی مضمون نگار کا نام شائع نہیں کیا گیا ہے :

۱۔ مرحوم مصطفےٰ کامل پاشا ۲۔ مصطفےٰ کامل پاشا کے حالات
۳۔ مصطفےٰ کامل پاشا کی اسپیچ ۴۔ مصطفےٰ کامل پاشا
(ماخوذ از اخبار بندے ماترم کلکتہ)
۵۔ مصطفےٰ کامل پاشا مرحوم (نظم)، فارسی
۶۔ مصری ہیرو مرثیہ مصطفےٰ کامل پاشا از حافظ ابراہیم مصری ترجمہ عربی
۷۔ مصطفےٰ کامل پاشا کے آخری الفاظ۔
۸۔ متفرق حالات!

محمد نعمان خاں، بھوپال

کامیاب عکّاسی :

"آج کل" دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع رتن سنگھ کی ۲۳ کہانیاں زندگی کے مختلف التورع جہات کی کامیاب عکّاسی کرتی ہیں۔ ان تمام کہانیوں کا مشترکہ عنوان "مانک موتی" بہت میل کھاتا ہے۔ یوں تو سبھی کہانیاں کسی نہ کسی حادثاتی کیفیات کا آئینہ دار ہیں جو درس و تاثر سے لبریز ہیں۔ چھٹی کہانی، جو ہمارے پڑوسی ملکوں اور ساتویں کہانی جو ایشیائی ملکوں کے تحقیر آمیز تجربوں کے پس منظر میں جس طور سے لکھی گئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

ستیش بترہ منجھے ہوئے اور تسلیم شدہ افسانہ نگار تو ہیں ہی "آج کل" کے ذریعے انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ "سفر نامہ" لکھنے کے فن پر نہ صرف قادر ہیں بلکہ اس فن میں بھی وہ اپنی انفرادیت منوا سکتے ہیں۔

نسیم محمد جان کا انشائیہ "جھوٹ بحیثیت ایک آرٹ"، مختصر ہے لیکن صرف اس وجہ سے اس کی تعریف نہ کرنا غلط ہوگا۔

غزلوں میں حکیم منظور، حباب ہاشمی، سکندر عرفان اور رفیق الزماں صاحب متاثر کرتے ہیں۔

عطا عابدی، دربھنگہ

عمدہ :

اس بار رتن سنگھ کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے دل موہ لیا۔ چند کہانیوں پر البتہ یہ شبہ ضرور ہوا کہ انہیں کہانی کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایسا خیال کبھی کبھی جوگندر پال کی منی کہانیوں کو پڑھ کر بھی ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں نے بڑی عمدہ منی کہانیاں لکھی ہیں۔

انور خاں، ممبئی

خوش نصیبی :

"جدید ہندی کہانی نمبر" دیکھا اور پڑھا۔ اردو پڑھنے والوں کی خوش نصیبی ہے کہ اس طرح ہندی ادب کی ایک اہم صنف "جدید کہانی" سے روشناس ہوئے۔ کیا اچھا ہو کہ اردو کے پڑھنے والے ہندی نظم اور ہندی ڈرامے سے بھی روشناس کیے جائیں اور پھر یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری رکھا جائے کہ ملک کی مختلف زبانوں کے ادب کا تعارف اردو والوں سے کرایا جائے۔ مثلاً آسامی، بنگالی، اُوڑیہ، ملیالم، تامل اور گورمکھی وغیرہ جدید کہانی نمبر نکالے جا سکتے ہیں۔

بقیہ صـ۲۴ـ پر

اُردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر
راج نرائن راز
سب ایڈیٹر:
خورشید اکرم

جلد : ۴۶	شمارہ : ۹	اپریل ۱۹۸۸ء
قیمت : دو روپے	فون : ۳۸۷۰۶۹	چیت۔ بیساکھ شک سمت ۱۹۱۰

ترتیب

اسسٹنٹ ڈائرکٹر پروڈکشن : آر۔ ایس۔ مینجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آجکل" (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۲۰ روپے - دو سال کے لیے : ۳۶ روپے - تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

ملاحظات

دیہی ترقیات اور بجٹ

عوام کے مفادات کو اولیت دے کر وضع کیا جانے والا بجٹ ۸۹-۱۹۸۸ء مختلف محاذوں پر ایسی پیش قدمی کا نقیب ہے جس سے کہ سوکھے کے دشوار حالات سے گزرنے والی معیشت کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اس سال ہمارے ملک کو اس صدی کے سب سے بھیانک سوکھے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بجٹ میں زراعت کے پروگراموں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور دیہی علاقوں میں سماج کے کمزور طبقات اور انسانی وسائل کی ترقی نیز روزگار کے مواقع بڑھانے کے پروگراموں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کے لیے جو خاص منصوبے بنائے گئے ہیں، ان میں سے چند کا ذکر اختصار کے ساتھ یہاں درج ہے۔ ان منصوبوں سے سارے دیش کے دیہی عوام اور کسان یکساں مستفید ہوں گے۔

کسانوں کو زرعی اخراجات میں کمی کی غرض سے سبھی بینکوں کے ذریعے دیے گئے زرعی قرض کی مجموعی رقم ۷½ ہزار تک شرح سود میں ڈیڑھ سے ڈھائی فی صد اور مجموعی قرض ۱۵۰۰۰ ہزار روپے تک میں ایک فی صد سے ڈھائی فی صد تک کی کمی کر دی گئی ہے۔ اس کے لیے ریزرو بنک نے ہدایت جاری کر دی ہے۔ زراعت کے لیے ریزرو بنک کی معاونت سے پبلک سیکٹر بنک سال ۸۹-۱۹۸۸ء میں مزید تین ہزار کروڑ روپے کے زرعی قرض فراہم کریں گے تاکہ زرعی قرض زیادہ سے زیادہ کسانوں کو مل سکے۔ ہر گاؤں کو بینک سے جوڑا جائے گا ہر بینک کا حلقۂ اثر ۱۵ سے ۲۵ گاؤں ہوگا۔ اس کے علاوہ کسانوں اور کوآپریٹو موومنٹ کے مطالبات کے پیش نظر قدرتی آفات کی صورت میں انہیں راحت دینے کی غرض سے ایک "قومی زرعی امدادی قرض فنڈ" قائم کیا جا رہا ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائلیوں کی فلاحی اسکیم کی مالی معاونت کے لیے ایک "درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن" قائم کیا جائے گا۔ یہ کارپوریشن صوبائی سطح پر بنائے گئے ایسے کارپوریشن اور ایجنسیوں کے ساتھ مل کر کام کرے گا جس کے لیے عارضی طور پر پچاس کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

اگلے خریف اور ربیع کے موسم میں فصل کے لیے کسانوں کو کھاد پر ۷½ فی صد کی خصوصی رعایت دی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے ایک بستہ یوریا کھاد کی قیمت میں ۸ روپے ۸۰ پیسے کی کمی ہوگی۔

دیہی عوام کی رہائش کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ریزرو بنک، نیشنل ہاؤسنگ بنک کو سو کروڑ روپے کی اضافی رقم فراہم کرے گی۔ کسانوں کو گھر بنانے میں مالی معاونت دینے کے لیے لینڈ ڈیولپمنٹ بنک کے دائرۂ کار کو بڑھایا جائے گا۔ ریاستی حکومتوں سے اس سلسلے میں قانونی اقدامات کی گزارش کی جائے گی۔ چھوٹے کسانوں کو مکان بنانے کے لیے 'HUDCO' متعینہ شرح سود سے ۲ فی صد کم پر قرض فراہم کرے گی۔ یہ قرض ۲۲ سالوں میں واجب الادا ہوگا۔ یہ سہولت گھاس پھوس کی چھت بدلنے جیسی بہتری کے اقدامات کے لیے بھی دی جائے گی۔ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے دیہی عوام کی جھونپڑی میں بجلی پہنچانے کے لیے تار و کنکشن حکومت کے خرچ پر لگائے جانے کی تجویز بھی رکھی گئی ہے۔ "دیہی آبادی ماحولیاتی دستی منصوبہ" کے تحت HUDCO کے ذریعے نالے، پاخانوں اور دیگر فضلوں کی صفائی کے لیے مناسب انتظام کیا جائے گا۔

گاؤں کے کچے مکانات جہاں ہر وقت قدرتی آفات نیزے کی نوک پر ہوتے ہیں، وہاں اتفاقی حادثات کی تلوار بھی ہر وقت ان کے سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔ آگ جو دیئے میں محصور رہ کر ان کچے مکانات کو روشنی بخشتی ہے، کبھی اس کا جلال ان کچے مکانوں کو خاکستر بھی کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں دیہات کے غریب مزدوروں، کسانوں اور دستکاروں کو پھر ایک نیا نشیمن تعمیر کرنے کے لیے جنرل انشورنس کارپوریشن بیمہ کی رقم ادا کرے گی جب کہ بیمہ کی قسطوں کی ادائیگی حکومت کرے گی۔

دیش کے سب سے پچھڑے دیہی علاقوں، قبائلی علاقوں اور شہروں کے پچھڑے علاقوں کے بچوں کی فلاح کے لیے ۱۲۴۸ Integrated Child Development.Services Projects منظور کیے گئے۔ سوکھا سے متاثرہ علاقوں اور بالخصوص سرحدی کسانوں کے لیے ایک نیا پروگرام "جل دھارا" کے نام سے شروع کیا جائے گا، جس کے تحت انہیں برائے نام کرایے یا ٹھیکے پر پمپ سیٹ فراہم کیے جائیں گے۔ سینچائی کے لیے پمپ سیٹوں میں استعمال ہونے والے بجلی کے موٹر کو ایکسائز سے مستثنیٰ رکھنے میں احکامات جاری کیے گئے ہیں۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے چھوٹے اور سرحدی کسانوں کی سہولت کے لیے دس لاکھ کنویں کھودے جائیں گے۔

دیہی عوام کو بچت کی ترغیب دینے کے لیے "کسان وکاس پتر" شروع کیا جائے گا، جس میں جمع شدہ رقم پانچ برس میں دوگنی ہو جائے گی۔ ڈھائی برس

کے بعد پتر ٹھنانے کی سہولت بھی حاصل ہوگی۔

سماج کے کمزور طبقوں مثلاً پرائمری اسکول، ٹیچروں، کوآپریٹو دودھ پیدا کرنے والوں، دستکاروں، دکانوں میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے لائف انشورنس کارپوریشن کے ذریعے ایک گروپ انشورنس اسکیم شروع کی جائے گی۔ اسی طرح حجاموں، درزیوں، موچیوں، معماروں، بڑھئی اور اس طرز کے دیگر پیشہ سے متعلق لوگوں کے لیے بھی ایسے منصوبے بنائے جائیں گے۔ بے زمین کسانوں، ہتھ کرگھا بنکروں، رکشا والوں کے لیے ۵۰ فی صد پریمیم پر گروپ انشورنس کی سہولت دی جائے گی۔ بقیہ ۵۰ فی صد کی پریمیم کی ادائیگی کے لیے ایک سماجی تحفظاتی فنڈ قائم کیا جائے گا جس کے لیے عارضی طور پر سو کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے مستفید ہونے والوں کی لائف انشورنس حکومت کے ذریعے کی جائے گی۔ یہ انشورنس ۰۰ ۳۰ روپے کی ہوگی۔ جب کہ حادثاتی موت کی صورت میں یہ رقم دوگنی ہو جائے گی۔ اس سے تقریباً ۳۰ سے ۴۰ لاکھ کنبوں کو فائدہ ہوگا۔ ان سارے اقدامات کے لیے لائف انشورنس کارپوریشن کو احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔

فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مارنے والی ادویہ کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام مال کو ایکسائز ڈیوٹی سے کلی طور پر مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ برآمدی خام مال پر کسٹمز ڈیوٹی میں بھی زبردست کمی کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔

کولڈ اسٹوریج قائم کرنے کے کام آنے والے پرزوں اور دیگر اشیاء پر ایکسائز ڈیوٹی ۱۵ فی صد سے ۴۰ فی صد تک کم کر دی گئی ہے۔ زراعت، باغبانی، مرغی فارم اور شہد کی مکھیوں کا چھتہ لگانے کے لیے جدید تکنیک سے فیض اٹھانے کے لیے ان مقاصد میں استعمال ہونے والے مشینوں جیسے اسپرنکلر سسٹموں، چارہ مکسروں کو ایکسائز ڈیوٹی سے کلی طور پر مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بہت اہم دودھ نکالنے والے آلات اور دودھ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری دواؤں کی برآمدی پر کسٹم ڈیوٹی میں کمی کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔

جنتا کپڑے کی قیمت میں سرکار کی طرف سے مزید چھوٹ کی صورت میں ۵، ۷ پیسہ فی اسکوائر میٹر کی کمی ہو جائے گی۔ سوتی دھاگوں پر ایکسائز ڈیوٹی میں کمی ہوگی۔ جس سے لاکھوں بنکروں اور غریبوں کو فائدہ ہوگا —

کھادی کپڑوں پر دی جا رہی رعایت کی طرح کمبل اور کمبلی پر بھی دس فی صد کی چھوٹ دی جائے گی۔ ہتھ کرگھا کے ذریعے بنائے جانے والے فیبرکس کے بنانے میں کام آنے والے دھاگوں پر ایکسائز ڈیوٹی کم کی جائے گی۔ سوتی دھاگوں پر ایکسائز ڈیوٹی ۵ ، ۲ فی صد تک کم کر دی جائے گی۔ ہتھ کرگھے پر بنائے گئے اونی فیبرکس (Fabrics) کو ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ رکھنے کے احکامات جاری کر دئے گئے ہیں۔

عام استعمال میں آنے والے بہت سی چیزوں مثلاً سیندور، کاجل، اسٹیل کے برتن، گاؤوں میں کوآپریٹو اداروں اور کھادی گرام صنعتوں کے ذریعہ بنائے جانے والے کپڑے دھونے کے صابن اور کاربولک صابن پر ایکسائز ڈیوٹی ختم کر دی گئی ہے۔ بجلی کے بلب پر ۵۰ پیسے فی بلب کمی کر دی گئی ہے۔ نیز کانچ کے سامان جیسے جگ، پیالے، پلیٹ وغیرہ پر ایکسائز ڈیوٹی میں کمی کر دی گئی ہے۔ قیمتی اور جان بچانے والی ضروری ادویہ کی قیمت میں کمی کی گئی۔ سائیکلوں کے ٹائر اور صنعتی ملٹر فیبرکس کی تیاری کے سلسلے میں کام آنے والے نائلن فلامنٹ دھاگوں پر ایکسائز ڈیوٹی ۷۰ روپے فی کلوگرام سے گھٹا کر ۱۳، ۸ روپیہ فی کلوگرام کر دینے کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔ جب کہ مچھلی پکڑنے کے جال کے بنانے میں استعمال ہونے والے ڈینئر کے فلامنٹ دھاگوں پر اس سے بھی کم یعنی ۵۵، ۴ روپے فی کلوگرام کے حساب سے ایکسائز ڈیوٹی واجب الادا ہوگی۔

دیہاتوں میں روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرنے کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں اور دیہی صنعتوں کے ذریعے بنائے جانے والے سامان جیسے ریڈیو کیسیٹ ٹیپ ریکارڈر، جوتے، چپل، اچار، مربے اور پھلوں کے رس وغیرہ کو ایکسائز ڈیوٹی سے پوری طرح مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جب دیہی عوام کو روزگار کے مناسب مواقع گاؤں میں ہی فراہم ہوں گے تو وہ تلاشِ معاش میں شہروں کی طرف نہیں آئیں گے۔

غیر طلبیدہ مضامینِ نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں (ادارہ)

مالک رام

صادقین اور غالب

• مالک رام

یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ مہینا نومبر کا تھا۔ ایک صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے چونگا اٹھایا تو دوسری طرف سے غالب اکیڈمی کے سکتر جناب ذہین نقوی کی آواز سنی :

"کراچی سے صادقین صاحب تشریف لائے ہیں۔
وہ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ کب انہیں
ساتھ لے کر حاضر ہو جاؤں ؟"
"کارِ خیر میں استخارے کی کیا حاجت ہے! آج
ہی سہ پہر کی چائے میرے ساتھ پیجیے۔"

اگرچہ میں اس سے پہلے صادقین سے کبھی ملا نہیں تھا، لیکن میں ان کے نام اور کام سے ناواقف نہیں تھا۔ میں جس زمانے میں سرکار بلجیئم میں مقیم تھا —— ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک —— تو وہاں کے بین الاقوامی کسٹم ادارے میں پاکستان کے نمائندے جناب عبدالقادر عیدروس تھے۔ میں ہندوستان کی طرف سے اس ادارے کے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہاں عیدروس صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بہت دوستانہ اور بے تکلفی کے ہو گئے۔ وید و وادید اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ ہمارے مذاق مشترک اور پسند و ناپسند کے موضوع یکساں تھے۔ ۱۹۶۴ء میں میرے ہندوستان واپس آجانے کے بعد بھی ہماری خط و کتابت قائم رہی۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ بھی کراچی چلے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے وہاں سے مجھے صادقین کی لکھی ہوئی سورۂ رحمٰن کا مطبوعہ نسخہ بھیجا۔ اس پر صادقین کے دستخط ہیں۔ انھوں نے نسخے کے پہلے ورق پر یہ عبارت لکھی ہے :

بسم اللہ
جناب مالک رام مدظلہ
عبدالقادر عیدروس صاحب کی طرف سے
بقلم عاصی صادقین عفی عنہ
۱۸ نومبر ۷۰ء

اس سورت میں (۷۸) آیتیں ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گنوائی گئی ہیں۔ اور ہر ایک کے بعد پوچھا گیا ہے کہ آخر تم خدا کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝) اس طرح ۳۱ مرتبہ اس آیت کی تکرار ہوئی ہے۔ صادقین نے یہ آیت ہر بار نئے انداز سے لکھی ہے۔ صادقین سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

اس کے بعد مرزا ظفر حسن مرحوم نے تصویروں کا وہ مجموعہ تحفتاً بھیجا۔ جو صادقین نے غالب کے شعروں پر بنائی ہیں۔ بہت دن بعد ایک اور ہم مشرب دوست شمشاد حسین رضوی نے جو کراچی کے یونائیٹڈ بینک میں ملازم تھے۔ بنک کا ۱۹۸۱ء کا کیلنڈر بھیجا، جس میں "اقبال کے چند اشعار صادقین کی مصوری اور خطاطی کے آئینے میں" کے عنوان سے شامل کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے ان کی بنائی ہوئی تصویریں اور خطاطی کے نمونے جمع کرنے شروع کیے۔ غالب کے اشعار والی تصویروں میں سے میں نے یہ دو تصویریں جو کھٹے میں لگوا کر اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھی ہیں :

۱۔ دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

• سی - ۵۰۴ - ڈیفینس کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

۲۔ کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا
کاش کے ہوتا قفس کا در کھُلا

سہ پہر کو ذہبی نقوی صاحب انہیں ساتھ لیے تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا اکہرے جسم کا آدمی، نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ، نیم وا چمک دار روشن آنکھیں، ننگے سر، سر کے بال بکھرے ہوئے۔ کچھ کھویا کھویا سا ––– میرے سامنے کھڑا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے مجھے لاہور کے زمانۂ قیام میں وہاں کے کئی مشہور و معروف مصوروں سے ملنے کی مسرت حاصل رہی ہے۔ چغتائی، استاد اللہ بخش، شاکر علی سے تو اچھے خاصے مراسم تھے۔ چغتائی کو میں ۱۹۲۶ء سے یعنی "نیرنگِ خیال" کے زمانے سے بہت قریب سے جانتا تھا۔ اور یہ تعلقات ان کی وفات (جنوری ۱۹۷۵ء) تک قائم رہے ––– لیکن یہ سب پنجابی تھے اور آپ جانتے ہیں کہ پنجابی تن و توش کے اعتبار سے کیسے ہوتے ہیں۔ میں نے صادقین کی بھی کچھ ایسی ہی شکل اپنے تصور اور ذہن میں بنا رکھی تھی۔ اب جو انہیں گوشت پوست میں متشکل دیکھا تو واقعی کچھ تعجب بلکہ مایوسی سی ہوئی۔ میں انہیں اس سے کہیں زیادہ صحت ور دیکھنا چاہتا تھا۔ خیر . . . .

ہم خاصی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے جب کمرے میں اپنی بنائی ہوئی تصویریں لٹکی دیکھیں تو بہت خوش ہوئے۔ خدا معلوم یہ میرے خوش کرنے کو تھا یا حقیقت! فرمایا: میرا ہندوستان آنے کا ایک مقصد آپ سے ملاقات بھی تھی کہ ہم دونوں غالب کے پرستار ہیں۔ میں نے آپ کی غالب سے متعلق تمام تحریریں پڑھی ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

ان کا پورا نام صادقین احمد نقوی تھا۔ وہ جون ۱۹۳۰ء میں مغربی یو پی کے ضلع مراد آباد کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے، جو ہندوستان بھر میں شیعی حضرات کا بہت بڑا مرکز ہے (ضمناً یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر "امروہا" ہائے ہوز کی بجائے الف مقصورہ سے لکھا جائے تو اس کے عدد "کربلا" کے برابر ہیں۔ یعنی ۲۵۳۔ صادقین تین بھائی تھے: . . . .
سب سے بڑے کاظمین احمد، دوسرے حسنین احمد اور سب سے چھوٹے یہ صادقین احمد۔ ان کے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ شرف الدین (شاہ ولایت) دسویں اثنا عشری امام حضرت علی نقی کی اولاد میں سے تھے۔ اسی لیے یہ لوگ نقوی کہلاتے ہیں۔ ہمارے زمانے کی بعض مشہور ادبی شخصیتیں اسی خاندان کی نام لیوا ہیں۔ مثلاً معروف شاعر رئیس امروہوی، جو پچھلے چالیس سال سے کراچی کے روزنامہ "جنگ" میں روزانہ قطعہ لکھتے آ رہے ہیں (ان کے قطعات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں)؛ اسی "جنگ" کے سابق ایڈیٹر سید محمد تقی بھی نقوی ہیں ––– (مشہور اداکارہ مینا کماری والے) کمال امروہوی بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں۔

صادقین کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ انہوں نے ڈرائنگ اور آرٹ سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ بالآخر بی۔ اے کی سند آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد شروع میں چند دن امروہہ کے امام المدارس ہائی اسکول میں ڈرائنگ کے استاد رہے۔ یہ اسکول اب ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا ہے۔

۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ جہاں اُن کے بڑے بھائی کاظمین احمد پہلے سے جا چکے تھے۔ وہاں ابتدائی زمانہ ان پر بہت سخت گزرا۔ تلاشِ معاش میں کہاں کہاں کے پاپڑ نہیں بیلے۔ کچھ دن ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ آخر کار پانو توڑ کے کراچی میں رختِ سفر کھول دیا۔
بنیادی طور پر ان کا گھرانا زمیں داروں کا تھا۔ کچھ زمین ان کی ملکیت میں تھی، جس سے سالانہ ضرورت بھر کی فصل پیدا ہو جاتی تھی ––– سستا سماں تھا۔ ضرورتیں محدود تھیں اور وقت اور روپیہ ضائع کرنے کے لیے لغویات محدود تر ––– لہٰذا گھر کے اُجلے خرچ کی طرف سے اطمینان تھا۔ لوگوں میں علم حاصل کرنے اور اپنی اور اپنی اولاد کی تربیت اور تہذیب کا جذبہ تھا۔ مدارس میں طلبہ کو خوش خطی کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی تھی۔ خوش خطی منشی کا زیور تصور ہوتی تھی۔ صادقین کے خاندان میں بھی خوشنویسی نسلاً بعد نسل چلی آ رہی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے بتایا تھا کہ میرے پاس اپنے مختلف بزرگوں کے لکھے ہوئے سات قرآن مجید موجود ہیں۔ ان کے والد سید سبطین احمد بھی اچھے خوش نویس تھے۔ اگرچہ انہوں نے اسے کبھی اپنا ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

غرض اس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ انہیں بچپن سے اپنے ارد گرد کتابیں ––– خوشخط لکھی ہوئی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا تو لامحالہ اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس پیشہ اختیار کیا، تو آرٹ ٹھہرا۔ چنانچہ ابتدا تصویر کشی سے ہوئی۔ جو بعد کو خطاطی میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن ان کی خطاطی بھی دراصل مصوری ہی کی دوسری شکل ہے۔
اسلام میں، بوجوہ تصویر کشی کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لہٰذا وہ لوگ جنہیں اس سے دلچسپی تھی، انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لیے خطاطی پر توجہ کی۔

میرا خیال ہے، اور یہ میں کہیں لکھ بھی چکا ہوں کہ بابل کی پرانی زبان موجودہ عربی ہی کی اولین شکل ہے، اور عربی خطِ کوفی بھی بابل کے قدیم یعنی یا مسماری رسم الخط کی ارتقائی شکل ہے۔ صدرِ اسلام میں عرب میں یہی خطِ کوفی رائج تھا۔ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خطوط اور فرامین دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئے اور مختلف کتاب خانوں یا نجی ذخیروں میں ملتے ہیں، اسی خط میں ہیں۔ قرآن کریم کے تمام قدیم قلمی نسخے بھی خطِ کوفی

میں ہیں۔

یہ خطِ کوفی چوتھی صدی ہجری کی ابتدا (یعنی دسویں صدی عیسوی) تک رائج رہا۔ ابن مقلہ نے اسی سے چھ خط نکالے ۔ جن کے نام اس طرح لکھے گئے ہیں:

نگارِ من خطِ خوش می نویسد
بغایت خوب دلکش می نویسد
متناشیر و محقق، نسخ و ریحان
رقاع و ثلث ہر شش می نویسد

چوتھی صدی ہجری میں پہلے رقاع اور توقیع کی آمیزش سے تعلیق بنا اور پھر خواجہ میر علی تبریزی نے تعلیق اور نسخ کو ملا کر نستعلیق ایجاد کیا جو آج تک فارسی اور اردو کا مقبول عام خط ہے۔

اسلامی خطاطوں نے نستعلیق سے متعدد خط پیدا کیے۔ خطِ گلزار، خطِ طاؤس، خطِ ماہی، خطِ گوہر، خطِ زلفِ عروس، خطِ طغریٰ اور دسیوں اور — جیسا کہ ان ناموں ہی سے ظاہر ہے۔ دراصل ان کا مقصد تزئین و آرائش اور تصویرکشی کی جبلّی خواہش کو عملی جامہ پہنانا تھا اور اس میں وہ لوگ بدرجۂ اتم کامیاب رہے۔ آپ ان خطوں میں کوئی تحریر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صفحہ نقشِ تصویر بنا ہوا ہے اور اسی لیے عام آدمی کے لیے اس میں مرموز عبارت کا پڑھنا آسان نہیں، اور اس کے لیے خاص تعلیم اور مشق کی ضرورت ہے۔

صادقین نے خطاطی میں ایک نئی روش نکالی اگرچہ ان کا خط بنیادی طور پر نستعلیق ہی رہا، لیکن انہوں نے اس میں بعض شخصی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ مثلاً وہ لفظ کے شروع یا آخر کے درمیانی حرف پورا لکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی لفظ کو توڑ کر اس کے اجزا کو پورا لکھ دیتے تھے۔ لیکن پوری تحریر میں تصویری کیفیت پیدا ہو جاتی۔

تصویرکشی میں بھی ان کا مخصوص انداز ہے۔ انہوں نے بعض اشخاص کی جو تصویریں بنائی ہیں، ان میں تو البتہ اعضا مکمل اور قدرتی ہیں۔ ورنہ خیالی تصویروں میں کوئی تناسب نہیں۔ اعضا اُکھڑے اُکھڑے، الگ الگ، چھوٹے بڑے اور بعض اوقات بڑے بھیانک ہیں، لیکن ان کی بنائی ہوئی تصویر کسی شعر کی تعبیر ہو یا خیالی —— اس سے قوت اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔

بہرحال ان کے فن میں انفرادیت ہے۔ تحریر ہو یا تصویر، اگر آپ کو ان کے فن سے مزاولت رہی ہے تو آپ کو پہلی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ صادقین کی تخلیق ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا کوئی متبع پیدا ہوتا ہے یا وہ اپنے انداز کے خود ہی خالق ثابت ہوتے ہیں اور خود ہی خاتم۔

جب انہوں نے اپنے نئے انداز کی تصویریں اور تحریریں پیش کیں، تو ابتداً لوگ اس پر بہت بھڑکے۔ کیوں کہ یہ کسی مسلّمہ اصول پر پوری نہیں اُترتی تھیں، لیکن وہ بھی اپنی دُھن کے پکے تھے، استقلال سے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے کام سے مانوس ہوتے چلے گئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ آرٹ کی دنیا میں ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ آپ اسے پسند یا ناپسند تو کر سکتے ہیں لیکن اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال جیسا کہ انہوں نے ایک شعر میں کہا ہے: انہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ ہر میدان میں اپنی راہ خود نکالی اور اس پر چل پڑے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی اسے پسند کرتا ہے یا نہیں۔ لکھتے ہیں:

خطاطی میں، شاعری میں، نقاشی میں
آپ اپنا ہوں شاگرد، خود اپنا اُستاد

لیکن رئیس امروہوی نے کہا ہے کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔ یہ غالباً صحیح ہوگا۔ شاید آغاز میں ان سے مشورہ کیا ہو!

۱۹۶۰ء میں حکومتِ پاکستان نے انہیں فن کی خدمات کے صلہ میں "تمغۂ امتیاز" عطا کیا اور پھر ۱۹۶۵ء میں "تمغۂ حسنِ کارکردگی" (Pride of Performance) سے نوازا۔

۱۹۶۱ء میں French Committee of International Association of Plastic Arts نے جو حکومتِ فرانس کی وزارتِ ثقافت کا ایک شعبہ ہے، انہیں (۸۰۰) فرانک ماہانہ وظیفے پر فرانس آنے کی دعوت دی، جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ نہ صرف پانچ مہینے کے لیے وہاں گئے۔ لیکن تقریباً ۶ برس کے بعد واپس آئے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ جہاں گئے۔ اگر وہاں کا ماحول پسند آگیا اور دل لگ گیا، تو پھر واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

فرانس کے قیام کے دوران میں ان کی تصاویر کی کئی نمائشیں منعقد ہوئیں۔

سب سے پہلی نمائش حکومتِ فرانس کے زیرِ اہتمام، فرانس کی مشہور بندرگاہ ہاور Le Hawre کے عجائب گھر میں ۳۰ر جون سے ۲۵ر جولائی ۱۹۶۲ء تک ہوئی۔ یہ دونوں باتیں باعثِ فخر ہیں یعنی نمائش کا اہتمام حکومت نے کیا اور یہ کسی گیلری کی بجائے عجائب گھر میں منعقد ہوئی۔ ہاور سے واپس آئے تو دوسری نمائش اسی سال ۲ر اکتوبر سے ۲۵ر اکتوبر تک گیلری کیمبرٹ پیرس میں ہوئی۔ یہ نمائش مشہور بین الاقوامی ادارے Congress for Cultural Freedom کے زیرِ اہتمام ہوئی تھی۔ اسی کے بعد پیرس کے معتبر اور باوقار اخبار "فگارو" (Le Figaro) کے ۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کے ہفتہ واری آرٹ ضمیمہ میں فرانس کے شہرۂ آفاق نقاد موسیو ریمان کونیا (Raymond Cogniat)

نے صادقین سے متعلق ایک مضمون شائع کیا، جس میں ان کے فن کی جدت اور تازگی اور غیر تقلیدی روش کی دل کھول کر تعریف کی۔ غالباً اسی کے بعد پیرس کے ماڈرن آرٹ کے عجائب گھر نے ان کی دو تصویریں ایک ہزار فرانک میں خرید لیں۔ یہ آج بھی اس عجائب گھر میں موجود ہیں۔

اگلے سال کے آخر میں یعنی ۱۴ دسمبر ۱۹۶۳ء سے لے کر ۵ جنوری ۱۹۶۴ء تک پیرس کے اسی ماڈرن آرٹ کے عجائب گھر کی بڑی نمائش میں بھی ان کی دو تصویریں رکھی گئیں، جو بہت بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ اس نمائش میں صرف مسلّمہ عالمی اساتذہ اور فن کاروں کی تصویریں رکھی جاتی ہیں۔

قیامِ فرانس کے دوران کا ایک بہت بڑا کارنامہ ان کا مشہور نوبل انعام یافتہ فرانسیسی مصنف البرکامو Albert Camus کی کتاب اجنبی (L' Etranger) کا مصوّر ایڈیشن تیار کرنا تھا۔ کامو کا بہت کم عمری میں یعنی صرف ۴۶ برس کی عمر میں ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ کتاب وہاں کی Automobile Book Society of France نے اس کی وفات کے بعد مصوّر شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو تصویروں کی تیاری کا کام صادقین کے سپرد ہوا۔ انہوں نے یہ تصویریں ۱۹۶۴ء میں مکمل کیں۔ کتاب اگلے برس چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کا اجرا، کونکورڈ کے مشہور میدان (Place de le Concorde) میں ایک بہت بڑے اجتماع میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا۔ اس کتاب میں ان کی ۲۸ رنگین تصویریں ہیں۔ نیز گیارہ ابواب کے آخر میں جہاں جگہ خالی تھی، وہاں سپید و سیاہ تصویریں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ اسی کے بعد ان کا نام "دنیا کے مشہور مصوّر" نامی کتاب میں شامل ہوا۔ کامو کی کتاب کی تصویروں کے لیے انہیں غالباً ستّر ہزار فرانک دیے گئے تھے۔

اب انھوں نے تفریح کی خاطر سوئیزرلینڈ کا سفر کیا اور وہاں کے شہر لوزان میں ڈیرے ڈال دیے، لیکن ان کی شہرت ان سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ یہاں انہوں نے پاویلین کے لیے ۲۶ فٹ لمبی اور ۹ فٹ چوڑی دیواری تصویر (Mural) تیار کی۔ جب پیرس واپس آئے تو پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن کے دفتر میں ایسی ہی ساٹھ گز لمبی دیواری تصویر تیار کرنے کا کام ان کے تفویض ہوا۔ یہ دفتر پیرس کی مشہور مرکزی شاہراہ (Champs Elysees) شانزے لیزے پر ہے۔

ان کی ایسی ہی تین دیواری تصویریں پاکستان میں بھی ہیں: ۱۔ تربیلا ڈیم ۲۔ دولت پاکستان بنک ۳۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ممکن ہے اور بھی ہوں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

پیرس سے وہ اکتوبر کے اواخر میں امریکا گئے۔ یہاں واشنگٹن میں ان کی تصویروں کی کامیاب نمائش ۲۵ جولائی سے ۲۵ اگست ۱۹۶۳ء تک ہو چکی تھی۔ اور لوگ ان سے اور ان کے فن سے واقف تھے۔ واپسی پر لندن پہنچے، جہاں اسی سال ۳۱ اکتوبر سے ۲۴ نومبر تک نمائش ہوئی؛ اس میں انہوں نے اپنی (۵۵) تصویریں رکھی تھیں۔

جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں وہ نومبر ۱۹۸۱ء میں اپنے اعزّہ سے ملنے کو ہفتے عشرے کے لیے یہاں آئے۔ لیکن یہاں دلی میں چاہنے والوں نے انہیں ایسا گھیرا کہ ان کے لیے راہِ فرار بند ہو گئی۔ بالآخر یہاں انہوں نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اس میں فرش پر ایک چٹائی ڈال دی۔ کمرے میں ایک کنارے پلنگ پڑا تھا۔ جس پر وہ دن رات چند منٹ کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ جاتے تھے ورنہ سارا وقت اسی چٹائی پر بیٹھے رہتے اور چائے کا دور چلتا رہتا، جو آتا اسی چٹائی پر بیٹھتا اور یہ بوریا نشین قلندر حسبِ توفیق اس کی خاطر مدارات کرتا۔

دلی میں انہوں نے ہمدرد نگر میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے گنبد کو اسمائے حسنیٰ عطا کیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام آئے ہیں۔ صادقین نے دو ڈھائی مہینے میں یہ پینل تیار کیے تھے۔ اور اس کام کے لیے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ جن اصحاب کو خطاطی سے دلچسپی ہے، انہیں صرف ان کے دیکھنے کے لیے شدّ رحال کرنا چاہیے۔

یہاں سے وہ علی گڑھ گئے۔ وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اپنے فن کے نمونے چھوڑے۔ وہاں سے بنارس کا رخ کیا۔ بنارس میں انہوں نے کلا بھون کے مرکزی ہال میں ایک طویل و عریض تصویر بنائی۔ اس کا افتتاح مہاراجہ بنارس نے کیا تھا۔

ایک رباعی میں انہوں نے بنارس کے قیام کے زمانے کا ایک تاثر بیان کیا ہے:

میخانے میں گہری جو وہاں رات ہوئی
پھر شہرِ بنارس میں عجب بات ہوئی
نکلا جو خرابات سے غالب سے مری
اک کوئے ملامت میں ملاقات ہوئی

جیسا کہ معلوم ہے، غالب کلکتے جاتے ہوئے کچھ دن بنارس میں رکے تھے۔ ان کی لاجواب فارسی مثنوی "چراغِ دیر" اسی قیام کا ثمرہ ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے جس والہانہ انداز میں بنارس کے "قیامت قامتوں" اور "مژگاں درازوں" کا ذکر کیا ہے، وہ قابلِ دید ہے۔

اس کے بعد وہ میر عابد علی خاں مدیر و مالک روزنامہ سیاست کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ وہاں انہوں نے اردو گھر، مغل پورہ میں ایک دیواری تصویر بنائی، جو اردو گھر کے لیے باعثِ افتخار ہے اور رہے گی۔ یہاں سے انہوں نے سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی۔

وہی سلطان شہید جن کا یہ قول اقبال نے جاوید نامہ میں نقل کیا ہے:

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیرے، بہ از صد سالِ میش

صادقین نے یہاں بھی تصویروں کا نذرانہ پیش کیا۔

دلّی واپسی کے بعد انہوں نے پاکستان مراجعت کی ٹھان لی۔ اور آخر تقریباً تیرہ مہینے کے قیام کے بعد ہندوستان سے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۲ء کو اپنے احباب اور مداحین سے رخصت ہوئے۔ ان کا دوبارہ یہاں آنے کا ارادہ تھا اور وہ اپنی رباعیوں کا دوسرا مجموعہ یہاں سے شائع کرنا چاہتے تھے (پہلا "رباعیات صادقین نقاش" کے عنوان سے ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں لاہور سے شائع ہوا تھا) لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ منظور نہیں تھا اور وہ نہ آسکے۔

ان کی زندگی بے حد غیر منظم اور غیر معتدل تھی۔ اسی سے صحت بھی خراب رہتی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں دو تین برِ اعظموں کے بڑے بڑے بے پروا اور رحیم قسم کے قلندر دیکھے ہیں، لیکن سچ مانیے کہ صادقین ان میں بھی صفِ اوّل میں جگہ پانے کے مستحق تھے۔ وہ عمر بھر مجرد رہے۔ تاہل کا کھڑاگ کبھی پالا ہی نہیں اور غالباً یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ دراصل وہ خانہ داری کی ذمہ داریوں کی گوں کے آدمی تھے ہی نہیں۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ جو کسی ذمہ داری کے سر پر آپڑنے سے فرض شناسی کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ انہیں اس کا موقع نہ ملا۔ اور یہ خفیف سا امکان کہ شاید گھر بار ہو جانے پر وہ کچھ محتاط ہو جاتے اس کا تجربہ ہی نہ ہو سکا۔

دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی شخص ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہ رہا۔ اور جب انسان کسی ڈھلوان پر پھسلنے لگتا ہے۔ اگر رستے میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو، تو پھر وہ تہ سے اِدھر دم نہیں لے سکتا۔ بہرحال اب ان سب باتوں کی مُکّے بعد از جنگ سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

جنوری ۱۹۸۷ء کے آخری ہفتے میں ان پر کراچی میں نمونیہ کا حملہ ہوا۔ فوراً جناح اسپتال پہنچائے گئے۔ چند دن بعد وہاں سے ایک پرائیوٹ سرجن ڈاکٹر رحیم کے کلینک

(Orthopaedic Medical Institute)

میں منتقل کر دیئے گئے۔ وہیں منگل ۱۰ فروری ۱۹۸۷ء علی الصبح تین بجے اپنے خالق کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہِ راجعُون۔ دعا ہے کہ اللہ کریم ان سے فضل و کرم کا سلوک فرمائے۔ آمین!

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

(۲)

صادقین نے تین شاعروں کے کلام کو مصور کیا: غالب، اقبال، فیض۔ فیض کے کلام کی تصویروں کا عجیب قصہ ہوا۔ انہوں نے یہ تصویریں حفاظت کی خاطر ایک نوجوان دوست کی تحویل میں دے دی تھیں۔ ان حضرت نے یہ بیچ ڈالیں اور اطلاع دیے بغیر ملک سے باہر چلا گیا۔ جب کسی نے آکے صادقین سے اس کا ذکر کیا تو کہا:

"بے چارہ لڑکا ضرورت مند ہوگا۔ اسے شادی کرنی تھی۔
چلو، اچھا ہوا۔ میری پینٹنگز (Paintings)
سے اس کی ضرورت پوری ہو گئی۔"

بہرحال فیض والے کلام کی کوئی تصویر میری نظر سے نہیں گزری۔ خدا معلوم کس کے پاس ہیں۔

وہ غالباً غالب کا مصور دیوان شائع کرنا چاہتے تھے۔ کسی باعث یہ دیوان شائع کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے اس پر بہت خرچ اٹھ جاتا۔ اس پر انہوں نے ۲۳ رنگین تصویریں پُرتکلف طریقے پر چھپوا کر اور انہیں گتے کے ڈبے میں بند کروا کے شائع کر دیں۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ آخر ہمارے قدیم کلاسیکی شعراء کو کیوں مصور نہیں کیا گیا؟ پہلی مرتبہ یہ کام غالب ہی سے کیوں شروع ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ غالب سے پہلے کی ہماری شاعری میں جو یکسانیت اور عدم تنوع ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ دکنی سے لے کر بلکہ ولی سے ہی کیوں، اس سے پہلے محمد قلی قطب شاہ سے لے کر، مومن اور ذوق تک سب کے کلام کو مصور کرنا چاہیں، تو ایک تصویر کافی ہوگی۔ اس میں کسی حسینہ کے ارد گرد چند پروانے اڑتے ہوئے دکھا دیجیے۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

یہ غالب تھا، جس نے سب سے پہلے حسن و عشق کے علاوہ زندگی کے اور مسائل کو بھی موضوعِ کلام بنایا۔ انہوں نے کائنات میں انسان اور انسانیت کی مرکزی اہمیت پر خاص طور پر توجہ مبذول کرائی۔ انفس و آفاق کے جن مسئلوں کو انہوں نے بار بار مختلف انداز سے پیش کیا۔ ان سے پہلے کسی شاعر نے انہیں درخورِ اعتنا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب مصوروں کی دلچسپی کا مرکز بنے۔

سب سے پہلے چغتائی نے اس پر توجہ کی۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں "مرقع چغتائی" شائع کیا۔ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ آج جب کہ اس تاریخی واقعے پر (۶۰) برس گزر چکے ہیں۔ ہم اس گرم جوشی اور ذوق و شوق اور فخر و مسرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کا مظاہرہ اردو حلقوں کی طرف سے "مرقع" کی اشاعت پر کیا گیا تھا۔ اس کے چند سال بعد انہوں نے کچھ مزید تصویریں "نقشِ چغتائی" کے عنوان سے شائع کیں۔

چغتائی کے بعد صادقین نے غالب کو اپنی مصوری کا موضوع بنایا۔ غالب اور صادقین میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں پیدائشی باغی تھے۔

دونوں نے اپنی راہ آپ نکالی اور کسی مسلّمہ اصول کی پیروی نہیں کی۔

نمی روم براہے کہ کاروان رفت ست

دونوں بے استاد سے تھے۔ نہ غالب نے کسی سے اصلاح لی، نہ صادقین نے اپنی مصوری یا خطاطی کے لیے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ دونوں کو اپنے زمانے کے جغادریوں کی مخالفت اور نکتہ چینی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ غالب کے معترضوں نے کہا:

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

صادقین کے خُردہ بینوں نے کہا:

"اُس کے فن میں تکرار ہے۔ تصویریں بے رنگ ہیں، جن میں نومیدی و بدصورتی ہے"۔

تکرار کا اعتراض، ظاہر ہے، خاصۃً کائنات کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام اور کلام دیکھیے، ہر طرف تکرار کی بھرمار ہے۔ ابتدائے آفرینش سے وہ انسان پیدا ہوتا آرہا ہے۔ جو سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ وہی شکل، وہی ناک نقشہ لیکن آپ کو کبھی یکسانیت کی اُکتاہٹ یا اس پر کبھی اعتراض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پھر اس نے جتنا کلام اپنے بندوں پر نازل فرمایا ہے، اُس میں بے حد تکرار ہے۔ سب کتابوں میں ایک ہی تعلیم مختلف لفظوں میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ قرآن ہی کو لے لیجیے۔ صرف ایک سورت میں ایک آیت (فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان) کو (۳۱) مرتبہ دُہرایا ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ ان کی تصویریں بے رنگ ہیں۔ اور ان میں نومیدی اور بدصورتی ہے تو یہ بھی قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ اوّل تو پسند اپنی اپنی۔ ضرور نہیں کہ جو چیز آپ کو پسند ہو، دوسرے بھی اُس پر آپ سے متفق ہو جائیں۔ اور نہ آپ کی ناپسندی کو سب مردود قرار دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن اصولی بات یہ ہے کہ فن کار کا اپنے گردوپیش کا ردّعمل اس کی تخلیق پر لازماً اثرانداز ہوگا۔ یہ لازمۂ حیات ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ اگر مصوّر ایسے وقت اور حالات میں تصویر بنائے، جب وہ کشمکش کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے یا وہ ناموافق سماجی اور ملکی حالات سے متاثر ہو رہا ہے یا قومی اور بین الاقوامی سطح پر کچھ ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں، جنھیں اس کی حساس طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ اور وہ انھیں بنی نوعِ انسان کے لیے مضر اور خلافِ انسانیت خیال کرتا ہے تو لازماً اس کی نفسیاتی کیفیت کا اثر تصویر پر ضرور پڑے گا۔ آپ اسے "نومیدی" یا "بدصورتی" سے کیوں کر تعبیر کر سکتے ہیں!

چغتائی اور صادقین کے فن میں ایک واضح تفاوت ہے۔ چغتائی انسانی تصویرکشی (یعنی پورٹریٹ Portrait) میں ماہر ہے خطوں اور لکیروں کی مدد سے تصویر بنانے میں اس کا جواب نہیں۔ اس نے متعدد تصویروں میں کوئی رنگ استعمال نہیں کیا، بس چند خط ہیں، لیکن ان سے جو تصویر اُبھر کر سامنے آئی ہے، وہ اتنی جاندار ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے ابھی بات کرنے لگے گی۔

صادقین اس کے مقابلے میں فضا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ پوری تصویر کو دیکھنے والے کے سامنے ایک اکائی کے طور پر پیش کر کے اُسے متاثر کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر تصویروں کو ٹکڑوں میں نہیں بحیثیتِ مجموعی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے نئی دنیا پیدا کر دی ہے۔ ان کی ایمائیت اور رمزیت کو پورے طور پر سمجھنے، اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے، اور اس سے لُطف اندوز ہونے کے لیے، ان کی تصویروں کو بار بار دیکھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خیر، یہ دوسرا موضوع ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ مناسب موقع و محل بھی نہیں ہے۔ میں نے اوپر اس مجموعے کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے غالب کے اشعار کی تصویریں یک جا کر دی ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل اشعار کو مصوّر کیا گیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پَر کھُلا — کاش کے ہوتا قفس کا در کھُلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے، راہ کو پُر خار دیکھ کر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

تو، اور آرائشِ خمِ کاکل — میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے　　ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے　　جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی　　رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

حسن بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے　　آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

ٹک آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

میں یہ مضمون صادقین کی ایک رُباعی پر ختم کرتا ہوں، جو انھوں نے لکھ کر مجھے تحفتہً دی تھی:

کیا کیا نہ کیا، زہرہ جبینوں کے لیے
ہاں، اُن کے نبھانے کے قرینوں کے لیے
غالب نے مصوری تھی سیکھی، لیکن
ہم شاعری کرتے ہیں حسینوں کے لیے

●●

بقیہ: مکتوبات

دیتی ہے۔ بہت عمدہ شاہکار ہے یہ۔ میرے خیال سے اردو میں اس قسم کی کہانی نہیں لکھی گئی اب تک۔

راجندر یادو سے لیا گیا انٹرویو بہت کامیاب ہے۔ اُنہوں نے اردو زبان سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ وہ حق گو اور حق پرست ہیں۔

اس نمبر کی دیگر کہانیاں بھی خصوصاً 'وانگ چو' (بھیشم ساہنی) اور 'ڈیفوڈل جل رہے ہیں' (مردُلا گرگ) پسند آئیں۔

ملا جلا کر "جدید ہندی کہانی نمبر" ایک تحفۂ عظیم ہے۔

جمال اویسی، دربھنگہ

جاندار

ہندی کہانی نمبر کا سرورق بے انتہا پسند آیا۔ آرٹسٹ اور آپ دونوں کو میری طرف سے مبارک باد۔ کہانیوں کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ یہ پرچہ بہت اہم اور جاندار ہے۔

نگار عظیم، نئی دہلی

پہلا قدم:

ماہ نامہ "آج کل" کا جدید ہندی کہانی نمبر پیش نظر ہے اردو پڑھنے والوں کے لیے تحفۂ عظیم۔ یہ نمبر اپنی نوعیت کے لحاظ سے غالباً پہلا قدم ہوگا۔ جو آپ نے جدید ہندی کہانی کے ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔

"آج کی ہندی کہانی" اور راجندر یادو سے لیے ہوئے انٹرویو نے کافی مواد اکٹھا کیا ہے۔ جس سے پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

بھیشم ساہنی، عبدالبسم اللہ، رماکانت اور منو بھنڈاری کی کہانیاں اچھی کہانیوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ویسے ہر کہانی معیاری ہے۔ مجھے اُمید ہے آئندہ بھی ہند کی دوسری زبانوں کے نمبر شائع کیے جائیں گے۔ اس نمبر پر آپ میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔

اظہر نیر دربھنگوی، پھلائی نگر

گیان چند *

حضرت فریدالدّین مسعود شکر گنجؒ کی اُردو شاعری

مولوی عبدالحق[1] نیز خواجہ فرید کے سوانح نگار گربچن سنگھ طالب[2] کے مطابق ان کا زمانۂ حیات ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء ہے۔ وہ ملتان کے قریب قصبہ کھوتوال میں پیدا ہوئے۔ سیر الاقطاب میں اس جگہ کا نام کھتی وال اور بعض دوسری کتب میں کھتوال بھی لکھا ہے[3]۔ وہ دہلی جاکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مُرید ہوئے۔ اور پھر وہاں سے واپس آکر پنجاب کے قصبہ اجودھن میں مقیم ہوگئے۔ بعد میں اس قصبے کا نام پاک پٹن ہوگیا۔ وہیں ۶۶۴ھ میں وصال ہوا۔ ان کے سلسلۂ طریقت کی بارہویں پشت میں شیخ برہم فریدالدین ابراہیم ثانی (م ۹۶۰ھ) ہوئے۔ انہیں ثانی فرید اور ثالث فرید بھی کہا جاتا ہے[4]۔ گرو نانک پاک پٹن جاکر شیخ فرید ثانی سے ملے تھے۔ گرو گرنتھ صاحب میں 'شلوک شیخ فرید کے' کے عنوان سے ۱۳۰ دوہے یا اشلوک ہیں۔ یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ حضرت فرید شکر گنجؒ کا کلام ہے یا شیخ برہم فرید ثانی کا۔ بابا شکر گنج کو محض 'شیخ فرید' کہنا قرین قیاس نہیں۔ یوں بھی شکر گنج کا پورا نام فریدالدین مسعودؒ تھا۔ اگر وہ شعر کہتے تو اس میں فرید کے بجائے مسعود تخلص استعمال کرتے۔ حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے[5]:

ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بالفعل دشوار ہے کہ یہ کلام آیا فرید اوّل سے تعلق رکھتا ہے یا فرید ثانی سے؛ سکھوں کے گرنتھ صاحب میں جو مجموعۂ کلام ہے وہ فرید ثانی کا مانا جاتا ہے۔

سب سے پہلے فرید کی تشخیص کا مسئلہ میکالیف نے اُٹھایا تھا[6]۔ اس کی تحقیق کی اساس ایک جنم ساکھی پر ہے، جس میں گرو نانک اور شیخ فریدؒ کی ملاقات کا ذکر ہے۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ گرنتھ صاحب میں جس فرید کا کلام شامل ہے، وہ فرید ثانی ہے۔ بھائی کاہن سنگھ نابھا نے گرنتھ صاحب کی قاموس 'مہان کوش' کے نام سے مرتب کی ہے۔ اس میں بھی اُنہوں نے شیخ فرید کو شیخ ابراہیم مانا ہے۔ یہی رائے لاجونتی راما کرشنا کی ہے جنہوں نے فرید پر تحقیق کی ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے پنجابی ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اُنہوں نے فرید ثانی کا نظریہ تسلیم کیا تھا، لیکن بعد میں اُنہوں نے اپنی رائے بدل لی۔ اُنہوں نے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں فروری ۱۹۳۸ء سے فروری ۱۹۳۹ء تک کئی قسطوں میں ایک مضمون شائع کیا، جس کا عنوان تھا: "بابا فرید گنج شکر، شیخ ابراہیم اور فرید ثانی"۔ اس میں اُنہوں نے گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کو شکر گنجؒ کا قرار دیا ہے۔ گرو نانک یونیورسٹی امرتسر کے پروفیسر پریتم سنگھ اور پروفیسر دیوان سنگھ بہ شدت مصر ہیں کہ یہ شکر گنج ہی کا کلام ہے۔

دقت یہ ہے کہ ان اشلوکوں کے مصنف کا مسئلہ سکھوں کے مذہبی عقیدے سے مل گیا ہے جس سے علمی معروضیت سے اس کا مطالعہ مشکل ہوگیا ہے۔

گرو ارجن دیو نے ۱۶۰۴ء میں گرنتھ صاحب کا جو اصل نسخہ مرتب کیا تھا، وہ تو اب ملتا نہیں۔ اس کی چار نقلیں تیار ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کرتار پور (پنجاب) میں محفوظ ہے۔ اس کے محافظ گرنتھی اسے کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مجلد کپڑے کے جزدان میں لپٹی رکھی ہے؛ بس دُور سے اس کے درشن کرا دیے جاتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ پنجابی کے دیویندر سنگھ "پنجابی ادب کی تاریخ گرو نانک سے پہلے" کے موضوع پر مقالہ لکھ رہے تھے (ڈاکٹر دیویندر سنگھ اب کشمیر یونیورسٹی میں ہیں۔) اپنی تحقیق کے دوران اُنہوں نے کثیر نذرانہ پیش کر کے چند لمحوں کے لیے اس نسخے سے شیخ فرید سے منسوب کلام دیکھا۔ اس میں شیخ فرید کے نام کے تحت ۱۲۵ دوہے ہیں، جن میں سے دو گرو امر داس (یا گرو رام داس) کے ہیں اور اس کی صراحت اس میں موجود ہے

---

* شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی کمرشل ہولڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

یعنی انہیں حاشیے میں لکھا گیا ہے۔ حاشیے میں ساتھ ہی کسی دوسرے خط اور دوسری روشنائی سے مزید پانچ دوہے فرید کے نام سے اضافہ کیے گئے ہیں۔ مروجہ مطبوعہ گرنتھ صاحب میں جو ۱۳۰ اشلوک ملتے ہیں، ان میں سے دو گرونانک کے ہیں اور ایک دوہا گرو ارجن دیو کا ہے یعنی گرنتھ صاحب میں ان اشعار کا موجود ہونا یا ان کا شیخ فرید سے منسوب ہونا اہلِ تحقیق کے لیے حتمی شہادت نہیں۔ گرنتھ صاحب میں شیخ فرید سے اشلوکوں کے انتساب کے بارے میں چار نظریے ہیں :

۱۔ یہ کلام بابا فرید شکر گنجؒ کا ہے۔
۲۔ یہ کلام شیخ فرید ثانیؒ کا ہے۔
۳۔ یہ دونوں کا ملا جلا کلام ہے۔
۴۔ ڈاکٹر دیویندر سنگھ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک کے مختلف صوفیوں کا ملا جلا کلام ہے۔

پروفیسر شیام لال کالڑا عابد پشاوری اور ڈاکٹر دیویندر سنگھ کے مطابق گروگرنتھ صاحب میں سنتوں اور صوفیوں کا کلام ان کی زمانی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ شیخ فرید کا کلام کبیر کے بعد درج ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مرتب کی رائے میں یہ شیخ فرید ثانی کی تخلیق ہے۔

کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ ہمارا موضوعِ سخن تو "شکر گنج کی اردو شاعری" ہے اور بات ہو رہی ہے اشلوکوں کی۔ واضح رہے کہ شیخ شکر گنج کی مادری زبان پنجابی تھی۔ ان سے منسوب پنجابی کلام گروگرنتھ صاحب کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ چونکہ بارہویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک پنجابی اور کھڑی بولی میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس لیے پنجابی کلام میں جہاں کھڑی بولی یا برج نما اشعار مل جاتے ہیں، انہیں اردو اور ہندی والے دونوں اپنا مال سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی ادب اور اردو ادب دونوں کی تاریخ میں ہمیں گرونانک کا کھڑی بولی نما کلام ملتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اردو ادب کی ابتدائی صدیوں میں صرف دو قسم کا کلام ملتا ہے :

(الف) برج بھاشا اور فارسی آمیز یا کھڑی بولی اور فارسی آمیز ریختے جو اردو اوزان میں ہوتے ہیں۔

(ب) خالص ہندی۔ بعض اوقات برج بھاشا کے ان دوہوں میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔

قدامت کی تلاش میں اردو والے ایسا کلام اپنانے پر مجبور ہیں ــ لگتا یہ ہے کہ قدیم دور میں اردو ہندی کی تفریق نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کا یہ اعتراف دلچسپ ہے جو انہوں نے نویں اور دسویں صدی ہجری کی اردو شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:[۵۸]

اس دور میں شعر کے میدان میں اردو زبان کا دوسری زبانوں سے تمیز کرنا ایک مشکل امر ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے قائل مسلمان ہیں یا اس میں اسلامی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یا بعض اوقات اسلامی جذبات کی پیروی کی گئی ہے اور کوئی وجہِ امتیاز نہیں۔ لیکن یہ مابہ الامتیاز بھی نہایت ہلکے رنگ میں نظر آتا ہے۔

درحقیقت یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان عام طور پر ہندی اوزان و جذبات و خیالات کا تتبع کرتے تھے۔ اردو نظم کا وہ دور جس میں وہ دوسری زبانوں کی شاعری سے ممیز ہوتی ہے۔ دسویں صدی ہجری سے قبل شروع نہیں ہوتا۔ جب گجرات اور بالخصوص دکن میں اردو شاعری بہ تقلیدِ فارسی روشناس ہوتی ہے اور فارسی جذبات و خیالات و عروض کا پرتو قبول کر لیتی ہے۔

پس جب ہم بابا فریدؒ کی اردو شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اس قدیم کھڑی بولی کے دوہوں سے ہے جن میں برج بھاشا یا پنجابی کی پُٹ ملتی ہے۔ بعد کے مفہوم کی اردو زبان کا اس دور میں کوئی سوال ہی نہیں۔

قدیم دور سے منسوب ادبی تخلیقات کی جانچ کا ایک اہم پیمانہ ان کی زبان ہے۔ زبان کے ارتقا کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے لسانی شعور سے طے کیجیے کہ کیا ان تخلیقات کی زبان اس دور سے میل کھاتی ہے۔ شکر گنج سے منسوب متعدد اشلوکوں کی زبان اتنی صاف ہے کہ انہیں شکر گنجؒ کی تصنیف ماننے کے لیے جس عقیدت کی ضرورت ہے وہ اہلِ تحقیق کے ہاں نہیں ملتی مثلاً :

جوبن جائے تو جائے، پر پیا کی پیت نہ جائے
دیکھ سکھی، جو بن کتنے بن پریت کے کمہلائے

دور ہے گھر اور گلی میں کیچڑ اور پیا سے پیار
چلوں فرید، تو کمبل بھیگے، رہوں تو ٹوٹے پیار[۵۹]

یہ زبان بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں ناممکن ہے۔ یہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے کہ میں شکر گنج کی بانی نہیں ہوں پھر بھی گروگرنتھ صاحب میں بعض اشلوک شکر گنجؒ کے ہو سکتے ہیں۔ یہ کون سے ہیں؟ اس کا فیصلہ کیوں کر ہو۔ ذیل میں شیخ فرید ثانی سے قبل کی کتابوں سے شکر گنجؒ سے منسوب چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ وہ ان کے ہوں یا نہ ہوں بہر حال فرید ثانی کے نہیں ہو سکتے۔

(۱) میر خورد سید محمد بن مبارک کرمانی (م: ۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸ء) نے سیر الاولیاء میں ان کا یہ دوہا درج کیا ہے :

گفت تنوتیں کاڑری ناکاں ست منائے
بس کندے مدمن گرہو رین کہائے[۹]

مختلف کتابوں میں اس کا متن الگ ہے۔ معلوم نہیں صحیح کیا ہے۔
میرے نام اپنے مکتوب میں ڈاکٹر عابد بیشاوری نے اعتراض کیا کہ سیر الاولیا میں صرف یہ لکھا ہے کہ یہ شعر شیخ الاسلام کی زبان پر آیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ انہیں کی تصنیف بھی ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک دوہا شیخ فرید کے نام سے گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ اس کی زبان کافی قدیم ہے اور یہ بابا فرید کا ہو سکتا ہے۔

(۲) گجرات کے مشہور صوفی شیخ سراج الدین ملقب بہ شاہ عالم (م ۸۸۰ھ) کے مجموعۂ ملفوظات کا نام "جمعاتِ شاہی" یا "جمعاتِ شاہیہ" ہے۔ اس میں شکر گنج کا یہ منظوم قول ملتا ہے:

اساکیری یہی سورہیت
جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت

(۳) بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء) نے اپنی کسی تصنیف میں بابا گنج شکر کا یہ دوہا نقل کیا ہے:

سائیں سیوت گل گئی، ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیوساں جب لگ ہوسوں کیہہ

(۴) انجمن ترقی اردو پاکستان میں شیخ بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) کی تالیف خزائن رحمت اللہ کا مخطوطہ موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اس میں ذیل کے اشعار بابا فرید کے نام سے درج ہیں:

راول دیول ہے نہ جائیے
بھاٹا پسند، روکھا کھائیے
ہم درویشنہ ایہے ریت
پانی لوڑیں اور مسیت

جس کا سائیں جاگت، سو کیوں سوئے داس

لیکن لاہور میں اس کتاب کا جو نسخہ "گلستانِ رحمت" کے نام سے ہے، اس میں مندرجہ بالا دو اشعار نیز ایک اور شعر کو ملا کر، خود باجن سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے دو اشعار کا متن یہ ہے[۱۱]

راول دیول ہم نہ جانا | بھاٹا پہننہ، روکھا کھانا
ہم درویشنہ ایہی ریت | پانی لوڑیں، ہور مسیت

ان اشعار کی ملکیت کے بھی دو دعوے دار ہیں۔ مہدوی روایات میں انہیں حضرت سید محمد جونپوری کی تصنیف کہا گیا ہے۔ شیرانی نے ۲۹-۱۹۲۸ء مثنوی تاریخ عربی کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں سے ان دو اشعار کو یوں نقل کرتے ہیں:

بھاٹا پہنیں، لوڑکا کھائیں | راول دیول کبھی نہ جائیں
اس گھر آئی یا ہی ریت | پانی چاہیں اور مسیت

پھر ان کے بارے میں لکھتے ہیں[۱۲]:

یہ نہ سمجھا جائے کہ ان اشعار کے مالک سید محمد مہدی ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ان کے راوی ہیں، نہ مالک۔ لیکن جس کثرت سے مہدوی روایات میں یہ شعر منقول ہیں، ان سے قوی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی کے طبع زاد مانے گئے ہیں۔ دراصل ان شعروں کے مالک شیخ بہاء الدین باجن ہیں۔

لیکن ان کے بعد شیرانی نے ۴۱-۱۹۴۰ء میں دائرے کے مہدویوں پر مضمون لکھا[۱۳]۔ وہاں بغیر احتجاج کے ان اشعار کا انتساب سید محمد مہدی سے قبول کر لیا۔ آخر ان اشعار کا مصنف کون ہے؟ "لوڑیں" خالص پنجابی لفظ ہے۔ جس کے معنی رکھنا یا چاہنا نہیں۔ یہ لفظ بابا فرید ہی استعمال کر سکتے تھے۔ باجن کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ انہوں نے "گلستانِ رحمت" میں اس سلسلے کے تین اشعار لکھے ہیں جب کہ مہدوی روایات میں صرف دو ہیں۔ لیکن مہدوی کتب میں بالاتفاق انہیں ان کے ہادی سے منسوب کرنا بھی ایک وزن رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار باجن کے ہوں یا حضرت سید محمد جونپوری کے، شیخ گنج شکر[رح] کے نہیں ہیں۔ ان کی زبان عہد گنج شکر سے کہیں زیادہ جدید ہے۔

مندرجہ بالا نمونے فرید ثانی سے قبل کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اب بعد کی کچھ کتابوں سے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

(۵) ایک ریختہ دو بیاضوں میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں[۱۴]:

کئی سال ہوئے محمد قسیم صاحب دسلوی بہاری کا ایک خط مجھے موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ کتب خانہ الاصلاح دسنہ کی ایک قلمی کتاب کی جلد خراب ہو گئی تھی۔ جب اس کی نئی جلد بندھنے کو دی تو جلد کے اندر ایک کاغذ لگا ہوا ملا، جس پر حضرت گنج شکر[رح] کی یہ غزل ریختہ لکھی ہوئی تھی۔

اس سے آگے: ع 'وقتِ سحر وقت مناجات ہے' کے چار شعر دیے ہیں۔ یہی ریختہ محمود شیرانی کی مملوکہ ایک بیاض میں بھی ہے[۱۵] اس میں پانچ شعر ہیں اور ان کا متن صحیح تر ہے۔ شیرانی کے یہاں کا متن ذیل میں درج ہے اور اس نشان (ﺲ) کے ساتھ اختلاف نسخ درج کیے جاتے ہیں۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے | خیز دو لوں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ست | خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

بادم خود ہم رہ[1] احرار باش | صحبتِ اشرار[2] بری بات ہے
باتنِ تنہا مپوی زیں جہاں[3] | نیک عمل کُن کہ وہی سات ہے
پندِ شکر گنج بجاں گوش[4] کُن | ضائع مکُن عمر کہ ہیہات ہے

سید سلیمان ندوی کو یہ تسلیم نہیں ہے کہ یہ نظم شکر گنج کی ہے۔ ان کی رائے میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے 'جامع' کی نظم ہے' نہ کہ خود حضرت کی۔ آخری شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے۔ ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے[19]

مجھے اس دلیل سے اتفاق ہے۔

(۶) ایک پرانی بیاض سے مولوی عبدالحق کو شکر گنج کی یہ نظم ملی:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک | پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے | بوکڑوں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں | گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
گوشہ گیری میں گر خدا ملتا | گوش چیریاں (کذا) کوئی نہ واصل تھا

عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کے لاچار ا ہے[20]

نظم کے پہلے اور آخری شعر کے پہلے مصرعے غیر موزوں ہیں۔ یوں موزوں ہو سکتے تھے:

ع : تن کے دھونے سے دل جو ہوتا پوک
ع : عشق کا رمز ہی نیارا ہے

مثنوی میں پنجابیت کا اثر ہے۔ مثلاً بوکڑوں (بکروں) لانے (لگانے) بیلاں' واصلاں' لیکن اس سے قطع نظر یہ زبان حضرت کے عہد کے لیے بہت زیادہ صاف ہے۔ آخری شعر آج کی زبان میں ہے۔ پہلے مصرع میں قافیے کی مجبوری سے پاک کو پوک' باندھنا کسی خامکار' ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

(۷) مولوی عبدالحق ان کی ایک اور نظم " جھولنا شکر گنج " کا ذکر کرتے ہیں جو چار صفحوں پر مشتمل ہے۔ اب اس کا مخطوطہ انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں محفوظ ہے۔ جھولنا ایک ہندی صنفِ سخن ہے۔ اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے تین مصرعوں میں دس دس ماترائیں ہوتی ہیں، چوتھے مصرع میں سات۔ یعنی دوسرے عروضیوں کے مطابق اس میں دو مصرعے ہوتے ہیں: پہلے مصرع میں ۱۲ اور دوسرے میں ۱۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ میزان وہی ۲۷ ہوئی — اردو میں جھولنے کی پانچ مثالیں ہیں۔ یہ مثنوی کے انداز کے دو شعروں پر مشتمل ہوتا ہے اور عجیب بات ہے کہ اردو جھولنے کے ہر مصرع میں ۲۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ واضح ہو کہ اس عروضی صنف کا جھولنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مولوی عبدالحق نے "جھولنا شکر گنج" سے یہ دو شعر دیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ چار صفحے کا ایک رسالہ ہے۔ واضح نہیں کہ اس میں بھی دو ہی شعر ہیں۔ یا پورا رسالہ منظوم ہے:

سگن ذکرِ جلی :

جلی یار کی کرنا ہر گھڑی' یک تل حضور سوں ملنا نہیں
اُٹھ بیٹھ میں یاد سوں شاد رہنا' گواہ دار کو چھوڑ کے چلنا نہیں
پاک رکھ تو دل کو غیر ستی آج سائیں فرید کا آوتا ہے
ندیم قدیمی کے آوتے سیں لازوال دولت کوں پاونا ہے[22]

مولوی صاحب نے اپنے ماخذ کے پایۂ استناد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ سیر الاولیاء اور لمعاتِ شاہیہ کے کلام کی زبان اور اس جھولنے کی زبان میں مطابقت نہیں۔ اس میں فرید تخلص سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بابا فرید شکر گنج ہی کے اشعار ہیں۔ ممکن ہے یہ سولہویں صدی عیسوی کے فرید ثانی کے ہوں۔

(۸) محمد علی اصغر کی کتاب جواہرِ فریدی میں یہ دوہا ملتا ہے:

فریدا دھر سولی پنجرہ تیلیاں ٹھوکن کاگ
اب اجیون ہا ہورے' تو دھن ہمارے بھاگ[23]

جواہرِ فریدی کے اردو ترجمے میں اس دوہے کا متن یوں ملتا ہے:

فریدا دھر سولی سر پنجرے تکیاں تو کت پاک
اب جیوں ہمہ یا ہڑے سو دھن سادھے بھاگ[24]

ایک تو قدیم زبان اس پر اردو رسم الخط۔ معلوم نہیں متن کیا سے کیا ہو گیا ہے۔

اس دوہے کی زبان اتنی قدیم ہے کہ یہ شیخ فرید شکر گنج کا ہو سکتا ہے۔ " جواہرِ فریدی کا ماخذ کیا ہے معلوم نہیں۔

(۹) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے ان کا یہ ہندی شعر نقل کیا ہے:

جب شہ آبارات کرں' ہوں رُخ کیوں موروں
بازی میری کنتہ کی نت قائم ہو روں[25]

اس کا ماخذ اور ماخذ الماخذ جانچنے کی ضرورت ہے۔

(۱۰) سخاوت مرزا نے کسی قدیم بیاض سے ان کے ریختہ کی یہ مثال دی ہے:

راستا وہی ہے گو ید | چپا وہی ہے گو ید

---

[1] ہم دم و ہشیار
[2] اخیار
[3] زمین
[4] بدل و جاں شنو

در دل یہی ضرب کند　　تار استا ایں با تو گویدئه[26]

ان میں سے بیشتر چیزیں صریحاً الحاقی ہیں۔ یہ مجہول الاسم بیاضوں میں ملتے ہیں جو عہدِ شکر گنج سے صدیوں بعد لکھی گئیں۔ سیر الاولیار کا دوہا اور باجن کا پہلا دوہا ان کے عہد کی زبان کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ فرید ثانی سے پہلے کی کتابوں میں ہیں۔ ان دوہوں کی زبان کو پیمانہ مان کر جب ہم بیاضوں میں مندرج کلام کو ناپتے ہیں تو وہ بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے جہاں تک اس کلام کے شعری مرتبے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت اپنی قدامت کی وجہ سے ہے، ادبیت کے باعث نہیں۔ اسے بزرگوں کے باقیات الصالحات کے طور پر دیکھا جائے گا۔ گرنتھ صاحب میں مندرج چند دوہے شکر گنج[27] کے ہو سکتے ہیں۔ وہ شعری اور فکری لحاظ سے بہتر ہیں۔

مآخذ :

۱۔ عبدالحق : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" (علی گڑھ تاریخ طبع ندارد) ص : ۱۳

۲۔ گربچن سنگھ طالب : بابا شیخ فرید : مترجم عتیق صدیقی (نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی ۱۹۷۸) : ۵ نیز ۱۱

۳۔ ایضاً : ۱۳ (مترجم کا فٹ نوٹ)

۴۔ محمود شیرانی : "اردو کے فقرے اور دوہے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے" (اورینٹل کالج میگزین، لاہور۔ اگست ۱۹۳۰ء نیز مقالاتِ شیرانی (لاہور ۱۹۶۶ء) ۱ : ۱۴۱)

۵۔ ایضاً ۱۴۱

۶۔ بابا فرید کی تشخیص کی بحث کا ماخذ ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پشاوری (پروفیسر اردو جموں یونیورسٹی) کا ایک مفصل معلوماتی مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء بنام راقم الحروف ہے۔ یہ انہوں نے اسی یونیورسٹی کے شعبۂ پنجابی کے دیویندر سنگھ سے تبادلۂ خیالات کے بعد لکھا تھا۔ اس زمانے میں دیویندر سنگھ "پنجابی ادب کی تاریخ گرونانک سے پہلے" کے موضوع پر پی۔ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے۔

۷۔ محمود شیرانی : "اردو کے فقرے اور دوہے" مقالاتِ شیرانی، ۱ : ۱۵۸

۸۔ شری آدی گرنتھ صاحب جی (گرمکھ پریس امرتسر) ۱۳۷۷ تا ۱۳۸۴ بحوالہ ڈاکٹر پرکاش مونس؛ "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" (الہ آباد ۱۹۷۸ء) : ص ۱۰۸

۹۔ سیر الاولیار : ۶۴ بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (لاہور ۱۹۷۱ء) ۶ : ۱۵۸ نیز سید سلیمان ندوی : نقوشِ سلیمانی : ۴۳ (طبع اول ۱۹۳۹ء)

۱۰۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما ... ص ۱۱

۱۱۔ محمود شیرانی "اردو کے فقرے اور دوہے ..." مقالاتِ شیرانی، ۱ : ۱۴۰

۱۲۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (دلی ایڈیشن ۱۹۷۷ء) ۱ : ۲۷

۱۳۔ ایضاً ۱۲،۶

۱۴۔ محمود شیرانی : تاریخِ غریبی، ۱۱۷۷ تا ۱۱۶۴، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ نومبر ۱۹۲۸ء و فروری ۱۹۲۹ء نیز مقالاتِ شیرانی ۲ : ۵۰-۲۴۹

۱۵۔ دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ (اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۰ء و فروری ۱۹۴۱ء نیز مقالاتِ شیرانی ۲ : ۲۵۰

۱۶۔ شیرانی "گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں" (اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء) ؛ نیز مقالاتِ شیرانی ۱ : ۱۷۳۔ (مقالات میں شامل کرتے وقت عنوان میں سولھویں صدی عیسوی کو بدل کر دسویں صدی ہجری کر دیا ہے)

۱۷۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما ص : ۱۲

۱۸۔ شیرانی، مقالاتِ شیرانی : ۱ - ۱۴۰

۱۹۔ نقوشِ سلیمانی : ۴۳

۲۰۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما : ۱۲

۲۱۔ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو (کراچی ۱۹۶۵ء) ۱ : ۴۹۲

۲۲۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما : ۱۳-۱۲

۲۳۔ فارسی جواہرِ فریدی : ۱۸۷۔ بحوالہ مقالاتِ شیرانی، ۱ : ۱۴۰

۲۴۔ اردو ترجمہ جواہرِ فریدی ۲۲۸ بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، ۶ : ۱۵۹

۲۵۔ تعارفِ تاریخِ اردو : ۱۷-۱۸، بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان ایضاً : ۱۶۰

۲۶۔ سخاوت مرزا : "قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض" (اردو، کراچی اکتوبر ۱۹۵۰) : ۱۸۔ بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، ایضاً ۱۵۹۔

اسلوب احمد انصاری

اقبال اور بلیک

اقبال جن مغربی مفکرین اور شعراء سے براہِ راست متاثر ہوئے، ان میں کہیں انگریزی شاعر ولیم بلیک کا ذکر نہیں آتا نہ اس کا شمار اُن شاعروں کے زمرے میں کیا جا سکتا ہے، جن کے بارے میں اقبال نے انتہائی جامعیت اور دیدہ وری کے ساتھ مختصر طور پر بلکہ بعض اوقات ایک ایک مفرد شعر میں اپنے تاثرات کو ڈھالا ہے۔ انگریزی شاعروں سے اکتسابِ فیض کے سلسلے میں انہوں نے اپنی نجی ڈائری میں ورڈز ورتھ کا خاص طور سے نام لیا ہے، اور اجمالاً بائرن اور براؤ ننگ کے بارے میں "پیامِ مشرق" میں اپنے ردِ عمل کا اظہار مفرد اشعار میں بیان کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہایت دل چسپ ہے کہ ان سب مفکروں اور شاعروں سے بڑھ کر جو ذہنی مماثلت بعض موضوعات اور محرکاتِ شعری کے سلسلے میں اقبال اور بلیک کے مابین نظر آتی ہے، اس کا سراغ کہیں اور نہیں ملتا۔ گو اس کا بھی کہیں ثبوت موجود نہیں کہ انہوں نے کسی بھی مرحلے پر ولیم بلیک کی شاعری کا مطالعہ کیا ہو۔ یہ بات بعینہٖ ایسی ہے کہ اقبال کی شاعری میں ہمیں وجودی تجربے کے بعض عناصر کا انعکاس بیّن طور پر نظر آتا ہے، لیکن انہوں نے بذاتِ خود کسی وجودی فلسفی کا ذکر اپنی تحریروں میں نہیں کیا، اس کے علی الرغم کہ ان میں سے بعض ان کے معاصر تھے۔ دراصل ہمیں دو امور کے درمیان امتیاز کرنا چاہیے۔ یعنی اثرات اور مماثلتیں۔ اثرات کو متعین اور مستحکم کرنے کے لیے تحریری شہادت اور اندراجات کی دستیابی ضروری ہے تاکہ ان سے استناد کا درجہ حاصل کیا جا سکے۔ مماثلتیں اتفاقی بھی ہو سکتی ہیں اور ذہنی اور مزاج کی ہم آہنگی اور یک رنگی کا نتیجہ بھی۔ اقبال اور بلیک کے سلسلے میں موخر الذکر صورتِ حال ہی سے ہمیں بیش از بیش سابقہ پڑتا ہے اور یہی زیادہ معتبر بھی ہے۔

اقبال اور بلیک دونوں ہی زندگی کی اساس کو روحانی مانتے ہیں اور اس معاملے میں وہ روسی وجودی مفکر NICHOLAS BERDYAEV کے مماثل ہیں، جس نے اپنی خود نوشت سوانح میں DREAM AND REALITY (نیو یارک، ۱۹۵۱ء) میں اپنے ذہنی اور روحانی سفر کی سرگزشت قلم بند کرتے ہوئے اس روحانی اساس کی طرف بالتفصیل اشارے کیے ہیں۔ اس نے دنیا کے سیاق و سباق میں انسان کی بیگانگیت یعنی .... ESTRANGEMENT اور انسان کے سیاق و سباق میں کائنات کی تجسیم یعنی EXTERIORIZATION کا ذکر کیا ہے۔ اقبال اور بلیک وجود کی مادی حقیقت میں یقین نہیں رکھتے۔ تینوں معروض کے مقابلے میں موضوع کی اوّلیت تصوراتی علم کے مقابلے میں وجدانی علم کی فوقیت، جوہر کے مقابلے میں وجود کی برتری اور عمومیت کے مقابلے میں قطعیت اور انفرادیت کی ترجیح کے قائل اور جاننے والے موضوع اور موجود موضوع کی ہم آہنگی پر مصر ہیں اور جائز طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ روحانی سطح مادے کی نسبت زندگی کی زیادہ گہری سطح ہے۔ اقبال اور بلیک دونوں اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ حقیقت کی کوئی قابلِ لحاظ اور تشفی کن توجیہہ محض مادی بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی۔ علم کے حصول کے جن دو ماٰخذ کا ذکر اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں کیا ہے، وہ تاریخ اور فطرت ہیں۔ بلیک فطرت یعنی مادی کائنات کو شیطان کی تخلیق سے تعبیر کرتا ہے اور اقبال نے بھی خطبات میں بالصراحت اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے جب انہوں نے یہ کہا:

WHAT WE CALL NATURE OR NOT-SELF IS ONLY A FLEETING MOMENT IN THE LIFE OF GOD

ڈیپارٹمنٹ آف انگلش، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ یوپی

بلیک نے ایسے فن کو حتمی طور پر مسترد کر دیا ہے، جو فطرت کی نقالی پر منحصر ہو اور ایسا کرنا بھی میل کھاتا ہے۔ اس کے اس تصور سے کہ انسان اصلاً ایک روحانی وجود ہے جو زائل پذیر اور فنا آمادہ ہیولے کے اندر محبوس ہمارے روبرو ہے۔ اقبال نے "ضربِ کلیم" میں حقیقت نگاری کو فطرت کی غلامی سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ دونوں ورڈز ورتھ سے بمراحل دور ہیں، جس کی شاعری کا سارا تار و پود انسان اور فطرت کے مابین ردِ عمل کی گوناگونی پر قائم ہے۔ فطرت کو علم کا ماخذ سمجھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ حواس کی دولت پر تکیہ کیا جائے۔ اقبال اور بلیک دونوں حواس سے حاصل شدہ علم کو وقعت کی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ حواس کے علاوہ علم کے حصول کے دوسرے ذرائع بھی ہیں جیسے وجدان اور تخیل اور یہ زیادہ معتبر اور قابلِ وثوق ہیں۔ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ہمیں زندگی کی گہرائیوں میں لے جاتا ہے اور اس کے اسرار و رموز ہم پر منکشف کرتا ہے۔ بلیک کی شاعری میں ہمیں اس ذہنی فضا کے خلاف احتجاج بلکہ بغاوت کے آثار ملتے ہیں جس کی اٹھارہویں صدی کے انگلستان میں نیوٹن کی طبیعیات اور لوک کے فلسفۂ علم نے تشکیل کی تھی اور جس کے لیے ایک حد تک سترہویں صدی کے آغاز میں بیکن کے استقرائی طریق کار نے داغ بیل ڈالی تھی۔ یہاں علم کا سارا انحصار علت و معلول کے سخت گیر قانون، یعنی مشاہدات کی اکائیوں کی مفروضہ سچائی، ان سے نتائج کے استخراج و استنباط، ان کی تصدیق و توثیق اور ان کی بنیاد پر اطلاع و واقفیت کی پوری عمارت کے کھڑا کرنے پر ہے۔ نیوٹن کی طبیعیات کا سلسلہ بڑی حد تک سترہویں صدی کے انگریزی مفکر ہابس سے جا ملتا ہے جو کائنات میں صرف دو ہی عناصر کی موجودگی کا قائل تھا۔ یعنی مواد اور حرکت۔ اور لوک کے فلسفۂ علم کی بنیاد بھی دراصل وہ تاثرات اور مدرکات ہیں جو حواس پر اشیا کے تصادم یعنی I MPI NGEME NT سے پیدا ہوتے ہیں (یعنی پہلے سے کسی بھی شکل میں اپنا وجود نہیں رکھتے) اور پھر ایک میکانکی طریقہ سے یہ تاثرات زینہ بہ زینہ ایک عملِ تنقیح سے گزر کر تصورات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہی ہمارے علم کی اساس فراہم کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کی اس مادیت کے خلاف جو سائنسی طریقۂ کار کے نقطۂ عروج تک پہنچ جانے کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اقبال کا ردِ عمل روسی مفکر BERDYREV کے پہلو بہ پہلو جس کا ذکر شروع میں کیا گیا تھا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی یاد بھی دلاتا ہے۔ یہ سب مفکر اور شاعر مادیت کی نفی کرتے ہیں۔ اور مشینی زندگی کی لعنتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ایلیٹ اور لارنس دونوں کے نزدیک مادیت کی طرف روز افزوں یہ رجحان، زندگی کی برگزیدگی، اس کی تخلیقیت اور آزادی کی طرف تشویق کو مجروح اور داغ دار کر دیتا ہے۔

اقبال اور بلیک دونوں کی شاعری میں مرکزی موضوع شعورِ انسانی ہے۔ اس شعور کو مادی احوال متعین نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس مادی احوال میں تبدیلیاں اسی کی وجہ سے نمودار ہوتی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ مسئلہ مارکسی نقطۂ نظر سے متصادم اور اس کے متضاد ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال نے اسے وقت سے ہم آہنگ قرار دیا ہے اور شعور کی تین شکلوں کی نشاندہی شہادت طلبی کی نسبت سے جو الوہی تانے بانے کے خد و خال کو متعین کرنے کے لیے لابدی ہے، اس طرح کی ہے:

شاہدِ اول شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

بلیک کے ہاں بھی شعور ایک تخلیقی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہی مادی حقائق کو وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ وہ فی نفسہٖ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اقبال اور بلیک دونوں کے نزدیک شعور مقدم اور مادہ مؤخر ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مادہ دراصل شعور ہی کی یخ بستہ اور انجماد یافتہ شکل ہے۔ اقبال کی طرح بلیک نے بھی شعورِ انسانی اور وقت کے درمیان نقطۂ اتصال قائم کیا ہے۔ شعور میں چونکہ انجماد نہیں ہے بلکہ یہ توسیع، تبدیلی اور تنقیح کا اہل ہے اور نئی صداقتوں کو قبول کرنے اور پرانی صداقتوں کو نئے انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت سے متصف ہے۔ اس لیے اس کے اور وقت کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ وقت بھی ایک رواں دواں مظہر ہے اور شعور بھی لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے ایک معنی میں شعور اور وقت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ حقیقت دراصل ان ہی دونوں کے وسیلے سے ممکن الاثبات بنتی ہے۔ "جاوید نامہ" میں معراجِ واقعہ نبی کریمؐ کے سیاق و سباق میں اقبال نے شعور اور زمان و مکان کی ہم آہنگی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔:

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق — وارہاند جذب و شوق از تحت و فوق

اس کے ساتھ ہی "بالِ جبریل" میں نظم "زمانہ" کا یہ شعر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

یہاں وقت کے سلسلے میں دو تصورات کو پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے۔ ایک وہ وقت جو گردشِ مسلسل ہے اور زوال یافتہ اختلال زدہ کائنات میں پیوست ہے۔ اسے ریاضیاتی یا ہیئتی وقت کہا جا سکتا ہے اور دوسرا وہ جسے عارفانہ اور وجدانی وقت کہہ سکتے ہیں، جسے باطنی نظر گرفت میں لا سکتی ہے۔

وقت کی گویا دو متضاد الابعاد ہیں، جنہیں ناپنے اور متعین کرنے کے پیمانے یکسر مختلف ہیں۔

اقبال کی شاعری میں ایک اور اہم موضوع خودی یا انا ہے۔ جسے مرکزیت حاصل ہے۔ لیکن یہ وہ انا نہیں ہے جو خود پرستی سے غیر متمائز ہے۔ انائے محدود دراصل ان کے نزدیک انسان کے اندر مستقر توانائیوں سے عبارت ہے۔ یا یہ کہنا چاہیے کہ یہ وہ مرکز ہے جس کے ارد گرد نفسی قوتیں مجتمع کر دی گئی ہیں۔ یہ ہرگز خود پرستی کے ہم معنی نہیں، بلکہ خود آگہی اور خود شناسی کے مرادف ہے۔ اقبال کی تنقید میں اس کے لیے دو الفاظ مستعمل رہے ہیں یعنی ذات یا نفس اور الیغو۔ اقبال نے اپنے خطبات میں جگہ جگہ الیغو کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ بلیک کے ہاں اس کے لیے متبادل لفظ SELFHOOD نہیں بلکہ IDENTITY ہے"۔ SELFHOOD کے لفظ کی تمام تر ذہنی وابستگیاں وہی ہیں، جنہیں اردو زبان کے شاعر خود بینی اور کبر و نخوت کے ذریعے متشخص کرتے رہے ہیں۔ بلیک کے ہاں SELFHOOD اور عقل و خرد کے طریقہ ہائے کار باہم ملحق اور وابستہ ہیں۔ اوّل الذکر کے لیے متبادل اصطلاح SATAN بھی ہے اور چونکہ وہ مذمت کا آلۂ کار ہے اس لیے اس کا دوسرا نام ACCUSER ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود پرستی، تعقل ہی کی آفریدہ اور تراشیدہ ہے۔ اس پر فتح پا چکنے کے بعد ہی انسان حقیقت مطلقہ میں بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔ عقل پرستی، کاروبارِ زیست میں نوع بہ نوع پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ بلیک کے ہاں عقل و خرد اور تخیل اس طرح ایک دوسرے کے متضاد اور مدِ مقابل ہیں۔ جیسے اقبال کے ہاں خرد اور عشق۔ وہ دونوں عقل کے کلیتہً مخالف نہیں ہیں۔ لیکن اس کے اکتسابات اور کارناموں کو محدود ضرور سمجھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں خودی یعنی خود شناسی اور خود آگاہی اور بلیک کے ہاں IDENTITY تقریباً ہم معنی ہیں۔ اور اسی طرح خود پرستی اور SELFHOOD بھی ایک دوسرے کے ہم رُتبہ ہیں۔ بلیک کے ہاں IDENTITY کے حصول اور ارتقا کا وسیلہ کار تخیل ہے اور اقبال کے ہاں خودی عشق کی روٹی پر پلتی اور بڑھتی ہے۔ یہ امر بغایت دلچسپ ہے کہ اقبال زمان و مکان کو کسی بھی نوع کی وجودی حقیقت کا حامل اور سزاوار نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دونوں انسانی ذہن یا عقل کے آفریدہ ہیں۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ

اسی طرح بلیک بھی زمان و مکاں کی منفرد اور مطلق حقیقت کو نہیں مانتا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ دونوں عقل ہی کے تراشیدہ ہیں۔ اور ان دونوں میں تبدیلی، شعور و ادراک میں تبدیلی پر انحصار رکھتی ہے۔ اس خیال اور عقیدے کا بیّن اظہار ہمیں اس کی عظیم اور شہرۂ آفاق نظم 'ملٹن' کے پہلے حصّے میں ملتا ہے جس کی پہلی سطر یہ ہے:

AND ALL THE GREAT EVENTS OF TIME
START FORTH......

اقبال اور بلیک دونوں بنیادی طور پر مذہبی شعور کے شاعر ہیں — جیسے دانتے اور ملٹن بھی۔ دونوں کی شاعری میں یہ شعور آخر آخر تک جھلکتا ہے۔ البتہ یہ امر دلچسپ ہے کہ دونوں راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود بالترتیب اسلام اور عیسائیت کے روائتی تصوّر سے ہمیشہ ناآسودہ رہے، اور اپنی ذاتی تعبیر و تفسیر ہی کو معتبر سمجھتے اور اس پر اصرار کرتے رہے۔ بلیک کا عیسائیت اور حضرتِ عیسیٰ مسیح کی شخصیت کا اپنا منفرد تصور تھا جو عام مذہبی عقیدے سے بہت ہٹا ہوا ہے۔ اس کی شاعری میں شعری محرکات اور محاکات انجیل مقدس خصوصاً "عہد نامۂ عتیق" سے لیے گئے ہیں، لیکن اس نے انہیں اپنی اسطوری شاعری کے چوکھٹے میں اس طرح کھپایا اور پیوست کیا ہے جو اسی کا کارنامہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کی مطہر ولادت کے عقیدے کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اور نہ کسرِ نفسی اور فروتنی کے اس تصوّر کو جو عموماً ان سے منسوب کیا جاتا ہے اور انہی سے مختص کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ انہیں ایک جری، حریت پسند اور روایت شکن فرد کے طور پر سراہتا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ اقبال اور بلیک دونوں کلیسا کے بھی شدید طور پر مخالف ہیں۔ اور مذہب کی اجارہ داری کے بھی۔ اسلام میں تو خیر کلیسا کا وجود ہی نہیں ہے البتہ مذہب کے نام نہاد ٹھیکے داروں کی نئی نئی تنظیمیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لیے براہِ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور انجیلِ مقدس اور قرآنِ کریم دونوں کی تفہیم اور تعبیر و تفسیر کا حق اسے آزادانہ طور پر حاصل ہے۔ اس معاملے میں نہ کسی کو اس کے معاملے میں اس کے راستے میں مزاحم ہونے کا اختیار ہے۔ اور نہ ہدایت اور رہنمائی کے لیے دوسروں کا دستِ نگر ہے — ایک قطعے میں اقبال نے مذہب کی صحیح روح سے متصف اور اس کی طرف انفعالی اور میکانکی رویّہ رکھنے والوں کے مابین فرق کو اس طرح واضح کیا ہے:

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل

یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

یہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست

وہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اور "ضربِ کلیم" میں 'مُلّا کے حرم' سے ان کے خطاب کا انداز یہ ہے:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال   تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اور بلیک نے اپنی معروف نظم THE HUMAN ABSTRACT میں یہ بلیغ نکتہ پیش کیا ہے کہ کلیسا کے نگہبانوں نے عیسائیت کی صحیح اور سچی تعلیمات کو اپنی تاویلات بےجا سے ایک پُراسرار شے میں جسے اُس نے TRΞE OF MYSTERY کا نام دیا ہے، تبدیل کر دیا ہے اور کلیسا کے عہدے داران اور مذہب کے نام نہاد مدعی اور درپردہ ضمیر فروش اس سے اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے اسے اندر اندر کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔

اقبال اور بلیک دونوں ہبوطِ آدم کے بنیادی مسئلے سے بغایت دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن بلیک کے نزدیک زوالِ انسانی کے عیسوی تصوّر کو مطلق کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی شاعری اور مابعد الطبیعیاتی یا اسطوری فکر میں زوال دراصل انسانی فطرت کے عناصرِ ترکیبی میں افتراق و اختلال پیدا ہو جانے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ ان چار عناصر یا بنیادی قوتوں کی اس کی اسطوری کائنات میں یہ چار کردار نمائندگی کرتے ہیں ——

URIZEN ، LUVAH ، LOS اور THARMAS یعنی بالترتیب تخیل، عقل، جذبات اور جبلتیں۔ اس نظریے کی توثیق جدید نفسیات کے عظیم ماہر یونیگ JUNG کے نقطۂ نظر سے حیرت انگیز طور پر ہوتی ہے۔ ان میں باہمی افتراق کا ایک اہم سبب منجملہ اور دوسرے اسباب کے عقل کی باقی تین عناصر پر اپنی بالادستی قائم کرنا ہے۔ عقل کی بالادستی کی یہ کوشش اُس ہم آہنگی توازن اور نظم کو ملیامیٹ کر دیتی ہے جو نصب العین حالات میں ظہور پذیر ہونا چاہیے، اس ہم آہنگی اور نظم و ضبط کا اختلال میں بدل جانا دراصل زوالِ آدم کا پیش خیمہ ہے اور اقبال بھی جنت سے اخراجِ آدم اور کرۂ ارض پر اس کی سکونت کو زوال سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ یہ ان کے نزدیک ارتقائے شعور کی پہلی منزل ہے۔ پہلے اردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" کی ایک ابتدائی نظم "سرگزشتِ آدم" میں یہ خیال اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:-

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

یہ گویا معصومیت سے تجربے کی طرف سفر کا نشان راہ ہے یا ازلی اور ابدی زندگی کے جو انجماد کا مظہر ہے، ارضی زندگی کی ہماہمی میں شرکت کی طرف پہلا قدم جس کا اُٹھانا انسان کے لیے لابدی ہے

پیامِ مشرق میں اس کا ذکر پُر اہتزاز لہجے میں اس طرح کیا گیا ہے:

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل و کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہِ آسمان نوردن بہ ستارہ راز کردن
بہ گدازہائے پنہاں بہ نیازہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بہ حریمِ ناز کردن
گہے شبنمی نہ دیدن بہ ہجومِ لالہ زارے
گہے خارِ نیش زن را ز گل امتیاز کردن

ہمہ سوز ناتمامم ہمہ دردِ آرزویم
بہ گماں دہم یقیں را کہ شہیدِ جستجویم

اور اردو مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" میں نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" میں یہ اشعار انتہائی درجے معنی خیز ہیں:

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

تری ادا سے ہے بےپردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے سازکی فطرت نے کی ہے مضرابی

بلیک اور اقبال دونوں ہبوطِ آدم کے مروجہ تصوّر کو گمراہ کُن جانتے ہیں۔ بلیک تو عیسائیت میں پختہ عقیدہ رکھنے کے باوجود اور اس امر کے علی الرغم کہ یہ تصور مذہبی فکر اور شعر و ادب میں برابر اس درجہ دخیل رہا ہے' اسے مسترد کرتا ہے۔

اسی طرح بلیک اور اقبال دونوں ہی جنت اور جہنم کے ضمن میں تسلیم شدہ روایتی تصور کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ دونوں انہیں جغرافیائی مقامات نہیں بلکہ نفسیاتی کیفیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ جنت اور جہنم پہلے سے طے شدہ نقطے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی کیفیات ہیں جن سے گزرنا انسان کے لیے لازمی بھی ہے اور خود اختیاری بھی۔ ہم شاید ان کے خود ہی خالق بھی ہیں (یہی خیال ہمیں انگریزی شاعر ملٹن کے ہاں بھی ملتا ہے) کیونکہ ارادے کی آزادی ہمیں بڑی حد تک حاصل ہے اور ہم اپنے اعمال کے لیے جواب دہ بھی ہیں اور ذمے دار بھی۔

اس سے پہلے یہ کہا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کے بارے میں بلیک کا تصور سراسر انفرادی اور غیر متوقع ہے۔ وہ ان کے مسئلے میں مروجہ معتقدات کا حامی نہیں ہے اس کے ہاں دو خیالات واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حضرتِ عیسیٰ کی شخصیت میں ایک باغیانہ میلان نمایاں ہے۔ یعنی اشیاء کو بجنسہٖ قبول کرنے کی بجائے ان کے بارے میں نہ صرف تشکیک آمیز رویّہ رکھنا بلکہ مستند اور قبول شدہ عقائد پر کاری ضرب لگانا اور دوسرے اُنہیں عفو و درگزر کی تجسیم نہ سمجھنا۔ بلیک نے ان کے لیے LAMB اور TIGER کی دو بلیغ علامتیں استعمال کی ہیں اور روایتی تصور کے حضرت عیسیٰؑ کو VEGETATED CHRIST کا نام دیا ہے۔ اس نے جگہ جگہ

حضرت عیسیٰ کا ذکر ایسے فن کار کی حیثیت سے کیا ہے، جس کے اندر تخیل کی قوت اپنی پوری ثروت اور ہمہ گیری کے ساتھ موجود ہے۔ یہ الفاظِ دیگر تخیل کی نجات دہندہ یعنی REDEMPTIVE قوت کے لیے ان کی شخصیت ایک معنی خیز اشارہ ہے۔ چنانچہ اس کی ایک تحریر میں یہ جملے ملتے ہیں :

JESUS AND HIS APOSTLES WERE ALL ARTISTS. THEIR WORKS WERE DESTROYED BY THE SEVEN ANGELS OF THE SEVEN CHURCHES IN ASIA. ANTI CHRIST . ,SCIENCE

حضرتِ عیسیٰ کی شخصیت کے لیے ایک متبادل ترکیب ——— DIVINE HUMANITY کی بھی ہے۔ یعنی ایک ایسی ہستی جو نہ صرف اکملیت کی تجسیم پیش کرتی ہے اور پوری انسانیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بلکہ جو الوہیت اور انسانیت کا نقطۂ انقطاع ہے' اس طرح اقبالؔ نبیٔ کریمؐ کو انسانِ کامل تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی ہستی جس کے اندر انسانی امکانات اور تمام ممکنہ توانائیاں بہ حدِ کمال بروئے کار آچکی ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جب بلیک حضرتِ عیسیٰ مسیح کو فن کار کے نام سے پکارتے ہیں تو ان کا اشارہ اس تخلیقیت یعنی ——— CREATIVITY کی طرف ہوتا ہے جو ایک طرح کی ماورائیت ——— TRANSCENDENCE کے مرادف ہے۔ یعنی روح کی ایسی نقل و حرکت یا جنبش جو انفرادی نفس سے آگے لے جائے اور خود پرستی پر ضرب کاری لگائے۔

اقبالؔ کا ذہن تمام تر انہیں خطوط پر تو کام نہیں کر رہا ہے، لیکن مردِ مومن کا تصور جو دراصل ARCHETYPAL انسان کی ایک شکل ہے' ان کے ہاں موجود ہے۔ یہ تصور بہت سے مغربی مفکروں کے ذہنی اُفق پر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ بہت سے نقادوں نے اقبالؔ کے ہاں مردِ مومن کے تصور کا سرچشمہ نطشے کے ہاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کا ربط و تعلق برنارڈ شا کے ہاں فوق البشر یعنی SUPERMAN سے بھی ملایا ہے۔ اپنے اسطوری نظام میں بلیک نے اسے ALBION کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں اس کی کچھ کچھ پرچھائیاں عبدالکریم الجیلی اور محی الدین ابن عربی کے انسانِ کامل میں ملتی ہیں۔ انہی دونوں کے تتبع میں یا غالباً آزادانہ طور پر اقبال کے پیشِ نظر اور ان کے اعماقِ قلب میں نبیٔ کریمؐ کی ذاتِ اقدس جاگزیں رہی ہے۔ جو اسلامی LOGOS کے قانون کی عملی تفسیر بھی ہے۔ اس اعتبار سے کہ آپ میں الوہیت یعنی DIVINITY اور انسانیت یعنی 'HUMANITY کے مابین نقطۂ ارتباط متعین کیا جاسکتا ہے یا عبدالکریم الجیلی کے الفاظ میں ہویت یعنی HE-NESS اور انائیت یعنی I-NESS کے درمیان توافق و ہم آہنگی یا ان دونوں کا انضمام ہے۔ جاویدنامہ میں اقبال "زندہ رود" کے علامتی کردار کے روپ میں "سرِ آں جوہر" کی حقیقت کے بارے میں مشتاقانہ استفسار کرتے ہیں۔ حلاج بن منصور کی زبان سے پورے بند میں عبد اور عبدہ کے مابین فرق کو بڑی معنویت کے ساتھ منکشف کیا ہے۔ اس خاص مقام پر حلاج کا ذکر اس لیے کرایا گیا ہے کیوں کہ موصوف کے نزدیک ہستیٔ مطلق یا جوہرِ خالص کا رازِ محبت کے سوا کچھ نہیں۔ عبد اور عبدہ (اور مؤخرالذکر اصطلاح کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نبیٔ کریمؐ کی ذاتِ اقدس کے لیے ایک معنی خیز استعارہ ہے۔) کے مابین وہی فرق ہے جو علم اور حکمت، عقل اور عشق، فکر اور جذبے ادراک اور احساس اور ابن الکتاب اور ام الکتاب میں ہوتا ہے۔

عبدہ از فہمِ تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے عجم است — آدم است و ہم از آدم اقدم است
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہاست — عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سرِ لاالٰہ نیست
لاالٰہ تیغ و دم او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگون کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

بالِ جبریل کے آغاز میں ایک نظم میں اُنہوں نے نبیٔ کریمؐ کی شان میں یہ بلیغ اشعار کہے ہیں :

وہ دانائے سبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

مسجدِ قرطبہ میں یہ شعر بھی بہت معنی خیز ہیں :

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

اور پھر مثنوی 'مسافر' میں حکیم سنائی کی روح سے یہ کہلوایا :

می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ ست

راقم الحروف کی رائے میں بلیک کے ہاں قوتِ متخیلہ جو حضرتِ عیسیٰ مسیح کی شخصیت میں مجسم ہوگئی ہے اور اقبالؔ کے ہاں عشق و مستی جس کا جسمانی اور خارجی پیکر نبیٔ کریمؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ بڑی حد تک مماثل ہیں۔ بلیک کی نظم THE FOUR ZOAS میں سے یہ تراشا جو اس سطر سے شروع ہوتا ہے اور حضرتِ عیسیٰ مسیحؑ کی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔

THEN THOSE IN GREAT ETERNITY IN
THE COUNCIL OF GOD

اقبالؔ کے تصور میں جو امر بنیادی اہمیت رکھتا ہے وہ عقیدے اور عمل کی ہم آہنگی اور اتحاد یا عشق و خرد کا اتصالِ باہمی اور انضمام ہے اور بلیک کے

ہاں GOD-MAN کا تصور برنارڈ شا کے برعکس، اقبال، انسان کامل یا فوق البشر کے
ظہور کے مستقبل میں منتظر نہیں ہے جو زندگی کی توانائی یا قوتِ زیست کے حیاتیاتی
نقطۂ ارتقا پر نمودار ہوگا۔ بلکہ ان کے خیال اور عقیدے کے مطابق وہ نبی کریم کی
ذاتِ اقدس میں مجسم ہو چکا ہے۔ بلیک کے ہاں، ایک غالب رجحان زندگی
کو اس کی تمام تر فراوانی اور ثروت و وفور کے ساتھ قبول کرنے کا ہے۔ وہ
رہبانیت کی زندگی کو ایک طور پر محرومیت سے تعبیر کرتا ہے اور اسی لیے اُسے
مسترد کر دیتا ہے۔ یہ رجحان ہمیں اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے۔ دراصل اسلام کے
ضابطۂ حیات میں جس کا انعکاس ہمیں اقبال کی شاعری میں ملتا ہے، رہبانیت
کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اقبال انسان کو بے لگام چھوڑنے کے حق
میں نہیں ہیں۔ بلکہ اس پر اخلاقی پابندیاں عائد کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔
تاکہ فسق و فجور یا افراتفری اور خلفشار اور بے ربطی فکر و عمل کے لیے راہیں نہ
کھل جائیں۔ بلیک کے ہاں یہ استبعادی یعنی PARADOXICAL صورتِ حال
ملتی ہے کہ ایک طرف وہ اخلاقی قوانین کی بالادستی اور قہرمانی کے خلاف ہے۔
اور دوسری جانب جبلی خواہشات کی حرمت یعنی DIVINITY کو بھی تسلیم
کرتا ہے لیکن کج روی اور بلا روک ٹوک حسی لذت کی غلامی بھی اسے کسی قیمت
پر گوارا نہیں۔ شاید اس امر سے واقفیت قاری کے لیے باعثِ دلچسپی ہو کہ عیسوی
رہبانیت اور نفس کشی کے ضابطے کے مقابلے میں جس کے مطابق انسانی خواہشات
کو بیخ دینا اور انہیں شہید کرنا لازمی اور مطبوعِ خاطر سمجھا جاتا ہے، بلیک اسلام
کی جنسی اخلاقیات کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے۔

اقبال اور بلیک دونوں وجدان کو تعقل پر فوقیت دیتے ہیں (جیسا
کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا ہے) کیوں کہ جہاں وجدان اور تخیل حقیقت کا ادراک
براہِ راست طور پر اور جستہ زدن میں کرتے ہیں۔ وہاں عقل قدم قدم پر پا بجولاں
نظر آتی ہے۔ عقل کی کارکردگی ہر چند مسلم اور ناقابلِ انکار لیکن وہ حسی مشاہدات
کے سامنے سپر انداز ہو جاتی ہے اور ان کے تصرف کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتی ہے۔
وجدان اور تخیل کا تعلق ماوق الحسی کوائف سے ہے۔ جہاں عقل کی زیرکی اور
رہنمائی کام نہیں آتی کیوں کہ یہ ایک طرح کے جبر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دونوں
کے ہاں ورڈز ورتھ کے مثل ایک نمایاں رجحان متصوفانہ تجربے کی طرف
ملتا ہے۔ ورڈز ورتھ کا سروکار حسی تجربات سے بھی ہے۔ لیکن اس کے پہلو
بہ پہلو اس کے ہاں ماورائیت کی طرف بھی واضح رجحان ملتا ہے۔ یہی حال
بلیک اور اقبال کا بھی ہے۔ بلکہ بلیک تو حسی تجربات کو سرتاسر ناقص
اور گمراہ کن تصور کرتا ہے۔ دونوں زندگی کو مثل ایک توانائی کے جانتے ہیں
اور دونوں کے ہاں نطشے کے CULT OF ENERGY کے بھی آثار نظر آتے
ہیں۔ بلیک کا یہ قول خاصا مشہور ہے:

THE ROAD OF EXCESS LEADS
TO THE PALACE OF WISDOM

اور یہ بھی کہ:

ENERGY IS THE ONLY LIFE AND IS
FROM THE BODY; AND REASON IS THE
BOUNDARY OR OUTWARD CIRCUMFERENCE OF ENERGY

اور مزید یہ کہ:

ENERGY IS ETERNAL DELIGHT

یہاں یہ اضافہ کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ INTELLECT
کی طرح ENERGY بھی بلیک کے یہاں تخیل کے لیے ایک متبادل اصطلاح
ہے۔ اقبال اور بلیک دونوں کے یہاں دانش و بینش کا معمول اور زندگی کی
دوامی مسرت کا راز اس کے وفور اور کثیر العناصری کو تسلیم کرنے اور اس کا احترام
کرنے میں پوشیدہ ہے۔ زندگی کی افسردگی، ناتمامی اور انجماد میں نہیں ہے۔
یہ دونوں زندگی کو دل سے قبول کرتے ہیں۔ اور اس کی نعمتوں اور برکتوں کی توجیہہ
کرتے نظر آتے ہیں اس کی نفی نہیں کرتے اور نہ اس میں ایسی تنسیخ جائز سمجھتے ہیں کہ
وہ حظ و کیف سے خالی ہو کر ذات کے لیے ایک بوجھ اور وبال بن جائے۔ وہ
دونوں وفور اور پر مایگی کے بھی قائل ہیں اور قوت و شوکت کے بھی۔ زندگی
کی طرف ان کا رویہ مثبت، ایجابی اور بہجت آمیز قبولیت کا ہے۔ انکار،
تردد، اور بے کیفی کا نہیں۔ دونوں کے ہاں ایک معروف شعری علامت جو مستعمل
ہوئی ہے وہ شاہین یا عقاب کی ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں جن کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

عقاب اقبال کے لیے تخلیقی توانائی اور آزادہ روی کی جبلت دونوں
کی علامت ہے اور بلیک کے یہاں یہ شعری فطانت کے رمز کے طور پر استعمال
میں لایا گیا ہے:

سطور بالا میں کئی بار تخلیقیت کا ذکر آچکا ہے۔ یہ عنصر اقبال اور بلیک
دونوں کے ہاں مشترک ہے۔ اور ملزوم ہے۔ آزادی کے تصور کے ساتھ
یہ کہا جا چکا ہے کہ بلیک جب حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریّن کا شمار فن کاروں
میں کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے عمل کے اہل تھے جو محدود
کی سطح سے اوپر اٹھ کر لامحدود کی کائنات میں داخل ہو سکے اور خود پرستی اور
انانیت کی نفی کر سکے۔ اقبال کے نزدیک نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس اسلامی کلمۂ
ربانی کی انسانی شبیہہ اس لیے ہے کیوں کہ آپؐ کو نہ صرف وجود کے کنبہ کی پرشکوہ

جستجو تھی بلکہ آپ نے تاریخ اور وقت کے تسلسل کو ایک غیر مشتبہ سمت عطا کی اور انسانی روح کی آزادی اور برتری کا اعلان فرمایا۔ تخلیقیت، آزادی سے منسلک اور وابستہ ہے۔ اقبال اور بلیک دونوں کے یہاں آزادی کا انحصار ہے — وجود کے غیر وجود سے ابھرنے اور ممیز ہونے پر یعنی یہ محدود میں تنصیب یعنی INS-RTION کا نام نہیں بلکہ نامحدود یعنی IIFI IITE کی طرف پرواز سے عبارت ہے۔ تخلیقیت آزادی ہی کی وجہ سے ممکن الوجود بنتی ہے — اسے کوئی دوسری شے متعین نہیں کرتی۔ یہ غیر وجود سے خالی ہوتی ہے اور غیر مرتب ہوتی ہے — یہ بات بارہا کہی گئی ہے کہ اقبال کے بیشتر شعری محرکات کے اولین نقوش "بانگِ درا" کی نظموں میں ملتے ہیں۔ خضرِ راہ کے قلب میں جو اپنی ناہمواری کے باوجود ایک وقیع شعری کارنامہ ہے، ہمیں 'زندگی' کے عنوان سے ایک پُر اہتزاز نغمہ ملتا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

یوں تو یہ پورا ترانہ زندگی کو ایک سرجوش یا IMPETUS کے طور پر متصور کرتا ہے جو زمان و مکان اور امروز و فردا کی بندشوں سے گزر کر ماورائیت کی حدوں کو چھو لینا چاہتا ہے، لیکن چوتھا اور پانچواں شعر خاص طور پر غور طلب ہیں۔ بحرِ بیکراں اقبال کے ہاں اور دوسرے شاعروں کے مماثل لاحدودیت یا INFI NITY کا اشارہ ہے اور اس کا حصول آزادی کے تصور سے منسلک و مربوط ہے۔ پانچویں شعر میں قوتِ تسخیر ایک تخلیقی قوت یا توانائی ہے جو زندگی کے ہیولا کو یکسر منقلب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان اشعار میں بہت سے ایسے محرکات کا اولین نقش ملتا ہے جو اقبال کی بعد کی شاعری میں زیادہ بلوغت فکر و نظر کے ساتھ سامنے آئے۔ تخلیقیت، آزادی اور ماورائیت پر تینوں محرکات باہم دگر وابستہ ہیں۔ چنانچہ 'زبورِ عجم' کے مندرجہ ذیل اشعار اس امر پر شہادت دیتے ہیں :

سیلم مرا، بجوئے تنک مایۂ مپیچ
جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

نگاہِ ما بہ گریبانِ کہکشاں افتد
جنونِ ما کجا شور ہائے و ہوز کجاست

شایانِ جنونِ ما نہ پہنائے دو گیتی نیست
ایں رہگزرِ ما را - آں رہ گزرِ ما را

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بودہ است
بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بودہ است

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

'بالِ جبریل' میں جو اقبال کا آخری اردو مجموعۂ کلام ہے اور ہر لحاظ سے ان کی شاعری کا گل سرسبد کہلائے جانے کا مستحق اس مسئلے پر نوع بہ نوع انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے :

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن لامکاں سے دور نہیں

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

(آگے صفحہ ۳۳)

[illegible]

مسعود منور

غزل

تیرا انداز تھا یا پیار کی گہرائی تھی
وہ ملاقات تو سوغاتِ وطن لائی تھی

مجھ سے بچھڑی ہوئی آنکھوں کی پذیرائی کو
ایک اشکوں کی قیامت مرے ساتھ آئی تھی

کیسے پھول اُٹھتے تھے اک گوشۂ تنہائی میں
تیرے ہونٹوں کی گلابوں سے شناسائی تھی

جو بھی آنند تھا اُس غیب کی اقلیم میں تھا
تا یہ موجود، فقط درد کی دارائی تھی

نہ کوئی ملک، نہ فرقہ نہ کوئی قومیت
مجھ مسافر کی زمیں، ذات کی پہنائی تھی

کیسی پرکیف، جدائی کی شبیں تھیں مسعود
سبزۂ سرما میں کھلی برف کی زیبائی تھی

۴/ اپریل ۸۸ء
نئی دہلی

مسعود منور
Syrinvegen 15 A
3408 Tranby
ناروے

میں فقط سسکی

تخت سنگھ

بڑی ہی قیمتی وہسکی
وہ سب جب پی رہے تھے
لاابالی پن کے عالم میں
نشاط آگیں امنگوں کی
خمار آور ترنگوں کی
سنہری زندگانی جی رہے تھے
تو مجھے
ماحول نے غصے سے یوں دیکھا
وہ جیسے مجھ کو
بس اک ہی نظر میں پھونک ڈالے گا
مجھے یوں بھی لگا جیسے
زمیں اک دم نگل لے گی
رہِ اشکِ رواں زندہ ہی کھا لے گی
جڑیں لگ جائیں گی زخموں کی
خون افشاں کلیجے میں
مری افسردگی کے گنبدِ بے در میں جاگی
چیخ میری روحِ گریاں کی
مگر لوٹ آئی واپس آہ سی بن کر

پھر اپنے چہرۂ بے نقش کو
کچھ فاصلے سے غور سے دیکھا

میں اک الٹی ہوئی کشتی تھا دریا میں
مرے ماتھے پہ فصل اُگ آئی تھی
ٹھنڈے پسینے کی
خموشی کی فغاں میرے لہو میں جاگ اٹھی تھی
پرافشاں تھے
مری سانسوں میں گھائل مضمحل پنچھی
بہت کچھ جھوٹ بھی تھا
سچ بھی تھا اک خواب کی صورت

میں ماضی کی طرح زخمی
اپاہج حال کی صورت
میں فردا کی طرح دھندلا
وہ لہریں تھے
میں ساحل ہوتا کنارا تھا
وہ سب
جب پی رہے تھے قیمتی وہسکی
تو سرتاسر خوشی کے قہقہے تھے
قہقہوں میں بہہ رہے تھے
میں فقط سسکی

• ۴۰-۲۰ اگوارہ گوجراں، جگراؤں (لدھیانہ)

غزل

قاضی حسن رضا

ہم تھے طلسم ہوش رُبا کی تلاش میں
دن ہو گیا تمام ہوا کی تلاش میں

سنتے ہیں آدمی کی خدا کو تلاش ہے
دنیا بھٹک رہی ہے خدا کی تلاش میں

خنجر کا ایک وار کہ سرخی چہار سمت
اب کون جائے برگِ حنا کی تلاش میں

بستی میں جو ملا وہ مسیحا سے کم نہ تھا
اور اک ہجوم دستِ شفا کی تلاش میں

ہر موڑ پر صدائیں لگاتی ہے زندگی
میرے معاصرین قضا کی تلاش میں

میں اُن کی جستجو میں بھٹکتا ہوں روز و شب
دیوار و در ہیں سیلِ بلا کی تلاش میں

گم نامیوں کو ڈھال بنائے رہو ابھی
شہرت کے ہاتھ ہوں گے رضا کی تلاش میں

• قاضی پورہ، کھنڈوہ، (ایم پی) ۴۵۰۰۰۱

...اجیندر بہادر موج

...ب زمانہ دشمن ہو بات سچ جو کہہ دیں تو
...دتی ہے گھٹن رکھیں دل کی بات دل میں تو

...وسروں کے ماتھے پر تل کو دیکھنے والے
...اغ اپنے چہرے کے آئینے میں دیکھیں تو

...عجیب نگری ہے ہر طرف ہے خاموشی
...ں میں رہنے والوں کے حال چال پوچھیں تو

...یکھتے ہیں سب لیکن بولتا نہیں کوئی
...ہ یہاں کے لوگوں سے ہم ہی چل کے بولیں تو

...طرف اندھیرا ہے گمرہی کا عالم ہے
...ہبرانِ وقت اس کا کچھ علاج سوچیں تو

...یشے کے مکانوں میں چھپ کے بیٹھنے والے
...ہر طرف فضاؤں میں پتھروں کو دیکھیں تو

...ب موج کو طوفاں ہر طرف سے گھیرے ہیں
...ئے ہیں جو طوفاں میں پار بھی لگا دیں تو

موج روڈ، فتح گڑھ، یوپی ۲۰۹۶۰۱

سیّد رونق رضا

آنکھ نے خانہ خرابی کے وہ منظر دیکھے
خاک ہوتے ہوئے کاغذ کی طرح گھر دیکھے

اے مری تشنہ لبی تیری بدولت میں نے
ابر پیے بھر کے سائے میں سمندر دیکھے

تو وہ دشمن ہے سرِ معرکۂ حفظِ خودی
چاہتا یہ ہے انا کو مری بے سر دیکھے

خواہشیں جسم کی پیاسی ہیں برس بارشِ قرب
تاکہ صحرا کبھی سیرابی کا منظر دیکھے

کس کو فرصت ہے مری آنکھ کے آنسو پونچھے
کیوں کوئی جلتی ہوئی آگ میں جل کر دیکھے

اپنے خوابوں کی جواں مرگی پہ روتے روتے
آنکھ نے پھر سے نئے خواب کے منظر دیکھے

• تارن ٹِکلی، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱

اقبالؔ ردولوی

بے بس ہوا ہے وقت کی ٹھوکر کے سامنے
ایسے بھی موڑ آئے ہیں رہبر کے سامنے

اس پیکرِ بہار سے یارو بچھڑ کے ہم
کیا کیا خجل ہوئے ہیں گُلِ تر کے سامنے

اک بحرِ بیکراں نے بجھائی نہ تشنگی
اِک شخص مر رہا تھا سمندر کے سامنے

جو بات خود سے کہتے ہوئے ڈر رہے تھے لوگ
وہ بات میں نے کہہ دی ستمگر کے سامنے

جن کو بیان کرنے کی ہمت نہیں پڑی
لمحات وہ بھی آئے سخن ور کے سامنے

جُز اِک ضمیر اور تو کچھ بھی نہیں بچا
تنہا کھڑا ہوا ہوں بھرے گھر کے سامنے

تشنہ گرم ہے اور دلِ پر حزن کی داستاں
اقبالؔ عرضِ حال ہے پتھر کے سامنے

• درگاہ شریف، ردولی، بارہ بنکی

جگر جالندھری

آرام دل و جاں تھا کبھی پیار کا سایہ
اب لگتا ہے گرتی ہوئی دیوار کا سایہ

ہم سائے اب اتنا بھی گوارا نہیں کرتے
مل جائے جو دیوار سے دیوار کا سایہ

تم کرشن کنھیا کی طرح خود کو بناؤ
سانپوں سے اگر چاہتے ہو پیار کا سایہ

خیرات اگر آپ اُسے دے نہیں سکتے
درویش کو دے دیجیے دیوار کا سایہ

نفرت کی کڑی دھوپ نے دم توڑ دیا ہے
پھر چاروں طرف بڑھنے لگا پیار کا سایہ

ہم کو اِدھر اپنوں کی جگر! دھوپ بھلی ہے
تم کو ہو مبارک اُدھر اغیار کا سایہ

ماروا کا ٹیچ، گلی نمبر ۶، گوبند کالونی، پٹیالہ ۱۴۷۰۰۱

حامد جعفری

رنگ و نور کا موسم، قرب مہ وشاں رکھنا
یہ بھی کوئی عادت ہے جی دھواں دھواں رکھنا

اختیار اور اتنا زیر پا مہ و انجم
اور ایسی لاچاری سر پہ آسماں رکھنا

لفظ وہ عطا کرنا زخم پر جو مرہم ہوں
رائیگاں نہ ہو جائے مجھ کو بھی زباں رکھنا

کشتیوں کا گر ایمان معرکے سمندر سے
ناخدا کی محرومی قرض بادباں رکھنا

فصل نارسائی میں چند لمحے قربت کے
حزن کی رُلائیں تو ان کو انس جاں رکھنا

۱۷۔ سول لائنس، پالی ٹیکنک، بھوپال

پرکاش تیواری

صاحب خانہ کو بے گھر کر گیا
کیا کرشمہ تیرا پیکر کر گیا

دل میں تیرا درد ایسا آ بسا
مجھ کو میرے گھر سے باہر کر گیا

تیرا غم تھا ایک لعل شب چراغ
صحن جسم و جاں منور کر گیا

جاگتی آنکھوں میں سپنے رکھ دیے
یہ غضب بھی وہ ستم گر کر گیا

میں تو صحرا کی سلگتی ریت تھا
وہ مجھے چھو کر سمندر کر گیا

جس طرح چاہے لگا ٹھوکر مجھے
دل کو وہ پرکاش پتھر کر گیا

۲۱۵۹۔ لودی روڈ کمپلیکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

کشمیری لال ذاکر

آپ ہیول

ریاست جموں کشمیر کو شیخ محمد عبداللہ کے بعد کوئی بھی اتنا قد آور چیف منسٹر نہیں ملا۔ وہ واقعی شیرِ کشمیر تھا۔ سن سینتالیس میں قبائلیوں کے بڑے ہی زبردست حملے کو نہتے کشمیریوں کی مدد سے روکنا اور کشمیر کی وادی کو ان قیامت خیز لمحوں میں بچا لینا شیخ عبداللہ کا ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے، جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ڈوگرہ فیوڈل ازم کو ختم کر کے ریاست کو جمہوری نظام دلانا کوئی معمولی کام نہیں تھا اور اسے صرف شیخ عبداللہ جیسی شخصیت ہی سر انجام دے سکتی تھی۔

پھر کئی برسوں تک ایسا ہوتا رہا کہ وزارتیں بنتی رہیں اور ٹوٹتی رہیں۔ چیف منسٹر حلف لیتے رہے اور کچھ عرصہ حکومت چلاتے رہے۔ لیکن بہت دیر تک ٹِک نہ سکے۔ کچھ کشمیری عوام کی بیداری، کچھ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور کچھ سیاسی گٹھ جوڑ۔ غرض یہ کہ کسی نہ کسی سبب سے ریاست کا نظام مجموعی طور پر مضبوط بنیادوں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ لیکن ہر ایک چیف منسٹر نے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور پریس اور میڈیا کا تعاون لینا چاہا۔ آج کے دَور میں پریس کا رول بڑا اہم ہے۔ اس لیے کوئی بھی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ پریس اس کا ساتھ نہ دے اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو اُچھالتا رہے۔

سری نگر میں ایک بہت بڑی ایڈیٹرز کانفرنس ہو رہی تھی۔ آنند اور سرجو دونوں کو ہی دعوت نامے ملے تھے۔

آنند کو تو پہاڑوں سے پہلے ہی پیار تھا۔ اور کشمیر کی وادی سے تو اس کا ذاتی لگاؤ بھی تھا کیونکہ اس کا بچپن وہیں گزرا تھا۔ اسے جب بھی کشمیر جانے کا موقع ملتا اُسے لگتا جیسے وہ ایک بار پھر اپنے بچپن کا زمانہ گزار آیا تھا وہاں۔ ایک عجیب ناسٹیلجیا کی سی کیفیت چھائی رہتی تھی اس کے دل و دماغ پر۔ واپس آ جانے پر بھی کئی روز تک وہ ذہنی طور پر اسی وادی میں جیتا رہتا۔ مالنولیک اوبیشن تھا اُسے کشمیر کی حسین وادی سے۔

بڑا اَپ سیٹ تھا وہ اس ورزٹ کے بارے میں۔

اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو وہ ویژن میں کشمیر پر ایک رنگین فیچر کرنا چاہتا تھا وہ۔ وہاں جا کر اس کا پورا بلیو پرنٹ تیار کرنا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ تھی سرجو۔ وہ پہلی بار کشمیر جا رہی تھی۔ آنند چاہتا تھا کہ وہ سرجو کو پوری وادی میں گھمائے بلکہ فیچر کا کام بھی وہ اسی کو سونپنا چاہتا تھا۔ سرجو کو بھی بڑا اشتیاق تھا کشمیر جانے کا۔ آنند کے ساتھ جانا تو اُسے اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ آنند نے تو بلکہ اپنے کچھ دوستوں کو لکھ بھی دیا تھا اور ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ بھی او کے کروا لیے تھے۔ اپنا اور سرجو کا ٹکٹ۔

لیکن ایک دن پہلے سرجو کا فادر ایک دم بیمار ہو گیا اور سرجو کا جانا آخری وقت پر کینسل ہو گیا۔ آنند نے بھی جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن سرجو کے بار بار کہنے پر وہ راضی ہو گیا تھا۔ اُس نے سرجو کو ایئرپورٹ تک جانے سے روک دیا تھا اور اکیلا ہی گیا تھا ایئرپورٹ پر وہ۔

سرجو کے ساتھ نہ ہونے کا بڑا رنج تھا آنند کو۔ پورا دن اس کے من کی یہی حالت رہی۔ اس رات جب اس نے ٹیلی فون پر بات کر کے سرجو کے فادر کے بارے میں پوچھ لیا تو اس کی تسلی ہوئی۔ چنڈی گڑھ کی لائن تو دیر میں ملی، لیکن سرجو سے بات ہو جانے پر آنند کو بڑی تسکین ہوئی۔

کانفرنس کے دوسرے دن شام کو ریاست جموں کشمیر کے ایڈیٹرز اور جرنلسٹس کی طرف سے چائے تھی۔ جموں اور سری نگر کے کچھ بزرگ جرنلسٹس کے علاوہ آنند کی ملاقات کئی نوجوان جرنلسٹس اور

سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی، ہاؤس نمبر ۸، ۹، سیکٹر ۹
پنچ کولا، ہریانہ

پریس رپورٹرز سے بھی ہوئی۔ دونوں نسلوں کے اخبار نویسوں کے نظریات اور اپروچ میں بڑا فرق تھا۔ آنند کو لگا جیسے پورے ہندوستان میں آج یہی کیفیت تھی۔ پرانی قدریں اور نئی قدریں آمنے سامنے کھڑی تھیں اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی سنجیدہ کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کے اپنے اپنے لاجک تھے، لیکن انصاف کرنے والا جج ایک ہی تھا جسے وقت کہتے ہیں "وقت" چھوٹے اور بڑے، پرانے اور نئے، جوان اور بزرگ کسی میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ اپنا فیصلہ دے دیتا ہے۔ کبھی ایک فریق ناراض ہو جاتا ہے، کبھی دوسرا فریق اور اس فیصلے کے خلاف کسی کچہری میں اپیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہی سب سے بڑی کچہری ہے۔

وقت کی کچہری!

وقت کی عدالت!

اس پارٹی میں آنند کی ملاقات سادھنا دھیر سے ہوئی۔ تیکھے نقوش اور تیکھے ذہن والی ایک فری لانسر۔ اس کی ایک آدھ تحریر آنند کی نظر سے گزری بھی تھی بلکہ تازہ السٹریٹڈ ویکلی میں کشمیر کی شاعرات پر اس کا ایک آرٹیکل بھی تھا۔

"آپ نے میرا آرٹیکل پڑھا ہے؟"

"نہیں!"

"السٹریٹڈ ویکلی کی ایک کاپی ہے میرے پاس۔ آپ آرٹیکل پڑھ کر واپس کر دیجیے۔"

"شکریہ: مجھے تو کشمیر کی دو ہی شاعرات کے بارے میں علم ہے: للیشوری اور حبہ خاتون۔"

"دو اور بھی ہیں۔ آرنی مل اور روپا بھوانی۔" سادھنا دھیر نے کہا۔

"ان میں سے زیادہ مشہور تو حبہ خاتون ہی ہیں نا!"

"جی ہاں، وہ ایک بہت اچھی شاعرہ کے علاوہ ایک بہت اچھی گائیکا بھی تھی۔"

"اور خوب صورت بھی!"

"وہ تو تھی ہی۔ اسی لیے تو یوسف شاہ نے اس سے شادی کر لی تھی اور اُسے اپنے محل میں لے گیا تھا۔"

"یہ حبہ کدل کا علاقہ اسی کے نام پر ہے کیا؟"

"حبہ کدل، حبہ خاتون کے نام پر ہی ہے۔"

"سُنا تھا بمبئی کا کوئی پروڈیوسر حبہ خاتون پر فلم بنا رہا تھا۔"

"سُنا تو میں نے بھی تھا۔ فلمی دنیا کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ موسٹ انڈیپینڈ ایبل پیپل۔"

سادھنا دھیر کی بات سُن کر آنند زور سے ہنسا۔

"آپ کو بھی کوئی تجربہ ہوا ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"آپ کو چاروں شاعرات میں سے کون پسند ہے؟"

"روپا بھوانی۔"

"وہ کیوں؟"

"روپا بھوانی دھر خاندان سے تھی۔"

"صرف اس لیے؟"

"یہی سمجھ لیجیے۔ اس کی شادی سپرو خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کا خاوند بہت شکی تھا۔"

"اور آپ کا خاوند؟"

"وہ روپا بھوانی کے خاوند سے بھی زیادہ شکی تھا۔"

"کمال ہے۔"

"وہ اپنے خاوند کو چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس آگئی تھی۔"

"اور آپ؟"

"میں بھی اپنے پیرنٹس کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ اپنے نام کے ساتھ سپرو میں نے ایک دن بھی نہیں لکھا۔ دھر ہی لکھتی ہوں۔"

"آپ بھی شاعری کرتی ہیں؟"

"جی ہاں ـــ انگلش میں لکھتی ہوں۔"

"کشمیری میں نہیں؟"

"جی نہیں۔ روپا بھوانی میں اور مجھ میں آخر کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے۔"

"تو آپ کچھ سُنائیں گی نہیں؟"

"آج نہیں!"

"تو کب؟"

"کانفرنس ختم ہو جائے تو ایک دن میرے ساتھ گزاریے گا۔ آپ کو ادھر ادھر گھماؤں گی بھی اور اپنی نظمیں بھی سُناؤں گی۔"

"تھینکس۔ ویکلی آپ کو کل واپس کر دوں گا۔"

"آرٹیکل پڑھنے کے بعد ویسے ہی نہیں۔"

"جی ہاں۔" آنند نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر وہ سادھنا دھر سے الگ ہو گیا۔ دہلی کے کچھ دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس رات آنند اپنے دہلی کے دوستوں سے ہی گھرا رہا۔ آدھی رات کے قریب ہوٹل واپس آیا۔ اس رات وہ سروج سے بھی ٹیلی فون پر بات نہ کر سکا۔

کانفرنس کے بعد آنند نے ایک پورا دن سادھنا دھر کے ساتھ گزارا۔ سادھنا کے والدین نے زیرو برج کے پاس ہی دریائے جہلم کے کنارے، راج باغ میں اپنی بہت بڑی کوٹھی بنا رکھی تھی۔ سادھنا پرم پراؤں کی ماری لڑکی کی طرح آنند کو اپنے والدین سے ملانے اپنے گھر نہیں لے گئی تھی۔ وہ صبح آنند کے ہوٹل ہی پہنچ گئی تھی اور ناشتہ بھی اُس نے آنند کے ساتھ ہی کیا تھا۔

"یہ شال میں آپ کے لیے لائی ہوں۔" اس نے شال آنند کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب صورت شال ہے۔ کہاں سے خریدی ہے؟"

"خریدی نہیں ہے۔"

"تو چُرائی ہوگی؟"

"چُرائی بھی نہیں۔ میرے فادر کی فیکٹری ہے شالوں کی۔"

"او ہو۔ بہت بہت شکریہ۔" آنند نے شال کو کھول کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہے۔" سادھنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تو اچھا ہوں۔"

"یہ تو شاعروں والا انداز ہے۔ داد حاصل کرنے کا۔ آپ شاعر بھی ہیں کیا؟"

"بس وہی نہیں ہوں۔" وہ ہنسا اور اس نے شال کندھوں سے اُتار کر پلنگ پر ڈال دی۔

"تہ کر دوں؟"

"میں کر لوں گا۔ آپ تکلیف نہ کریں — ہو سکے تو مجھے کالے رنگ کی ایک لوئی دلوا دیئے۔"

"آپ کو لوئی چاہیے۔"

"جی ہاں۔ ایک ہے، لیکن پرانی ہو گئی ہے۔"

"اس کے لیے تو کسی بکروال سے دوستی کرنی پڑے گی۔"

"تو رہنے دیجیے۔ بکروال سے دوستی مت کیجیے۔ وہ بے چارہ گھر گھاٹ سے جاتا رہے گا۔"

دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ آنند جانے کے لیے تیار ہوتا رہا اور سادھنا دھر اخباروں کے صفحے اُلٹتی رہی۔

سادھنا دھر آنند کو ڈل کے کناروں پر ہی گھُماتی رہی کیوں کہ وہ دُور نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہارون، نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی اور بس۔ دوپہر کا کھانا جیسا تیسا کھا لیا اور گھومتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ سب جگہیں یوں تو پہلے بھی کئی بار دیکھ رکھی تھیں آنند نے، لیکن سادھنا کے ساتھ ہونے سے ساری کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ سادھنا نے بہت سی تصویریں بھی لے تھیں آنند کی۔

"اتنی ڈھیر ساری تصویروں کا کیا کریں گی آپ؟"

"اپنی لوکیلیٹی کے بچوں کو ڈرانے کے کام آئیں گی۔"

"اور اگر بچوں کی ماؤں نے دیکھ لیں تو؟"

"ان کے خاوند ڈر ریں گے۔"

"ڈریں گے تو خیر کیا۔ آپ کی کوٹھی کے گیٹ پر دھرنا ڈال دیں گے۔"

"مذاق چھوڑیے اور میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔"

وہ دونوں چشمہ شاہی کے ٹورسٹ ریسٹورنٹ کے باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"سوال پوچھنے والوں سے میں بہت ڈرتا ہوں۔"

"لیکن پریس کانفرنس میں تو چیف منسٹر سے سب سے زیادہ اور مشکل سوال آپ ہی نے پُوچھے تھے۔"

"وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔"

"اور یہ۔"

"پرسنل معاملہ ہے۔"

"تو پرسنل سوالوں کے جواب آپ نہیں دیتے۔"

"دیتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ بہت پرسنل نہ ہوں۔"

"ویسے ہیں آپ ٹیڑھے آدمی۔"

"میری لینڈ لیڈی بھی یہی کہتی ہے۔"

"اور آپ کی وائف۔"

"اس جھنجھٹ سے ابھی تک بچا ہوا ہوں۔"

"وائف کو آپ جھنجھٹ کہتے ہیں۔"

"اس وقت میں سپرو صاحب کی طرف سے بول رہا ہوں۔"

"کون سپرو صاحب؟"

"جن کو چھوڑ کر آپ اپنے پیرنٹس کے ساتھ رہتی ہیں۔"

"تو سپرو کو بھی کوئی طرف دار مل گیا آخر۔"

"یہی سمجھ لیجیے۔ آپ اپنا سوال تو پوچھیے۔"

"آپ نے تو موڈ ہی خراب کر دیا سارا۔"

"آئی ایم سوری۔"

"کیا آپ مجھے دہلی میں کوئی کام دلوا سکتے ہیں؟"

"کس طرح کا کام؟ گورنیس کا، ٹیچنگ کا، سیلز کا، ماڈلنگ کا؟"

"نہیں سبزی بیچنے کا۔"

"وہ تو مشکل ہے۔"

"نئی سبزی منڈی بن جانے سے سبزی بیچنے کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔"

"کپڑے دھونے کا سہی۔"

"ہر تیسری دُکان ڈرائی کلینر کی ہے دہلی میں۔ یہ کام نہیں مل سکے گا۔"

"تو رکشا چلانے کا کام دلوائیں۔"

"اس کے لیے لائسنس کی ضرورت ہے۔ عورتوں کو رکشا چلانے کا لائسنس نہیں ملتا۔"

"بہار جھونکنے کا کام تو مل ہی جائے گا!"

"وہ تو مل سکتا ہے لیکن یہ کام تو آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے دہلی جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میرا یہاں سے فوراً ہی چلا جانا بہت ضروری ہے۔ سپرو سے میرا طلاق کا معاملہ چل رہا ہے۔ یہاں رہوں گی تو جلدی فیصلہ نہیں ہو گا۔"

"فری لانسنگ تو آپ دہلی میں کر ہی سکتی ہیں۔ اس کا انتظام تو ہو جائے گا۔" لیکن مسئلہ مکان کا ہو گا۔"

"کسی ہاسٹل میں انتظام کروا دیجیے گا۔"

"آپ کو دہلی کے بارے میں کتنا معلوم ہے؟"

"بہت کم۔"

"میں پچھلے بیس سالوں سے وہاں جھک مار رہا ہوں اور میں ابھی تک نہیں پہچان سکا اس شہر کو۔ بڑا بہروپیا ہے وہ شہر۔ اسے آسانی سے نہیں پہچانا جا سکتا۔"

"تو آپ مجھے "ویژن" جوائن کروا دیں۔"

"ویژن" حاضر ہے۔ لیکن وہ بہت چھوٹا اخبار ہے اور اس کی سرکولیشن بھی بہت زیادہ نہیں۔"

"مجھے یہ نگر چھوڑنا ہے ہر حالت میں —

آئی وانٹ سم سینڈنگ سلوشن۔ آنند صاحب۔"
"تو سرجو کے ساتھ آپ بھی شامل ہو جائیے۔"
"سرجو کون ہے؟"
"سرجو شرما "ویژن" کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سوچ لیجیے آپ؟"
"سوچ لوں گی!"
"لیکن دو بھو کی شیرنیاں ایک پنجرے میں نہیں رہ سکتیں۔" آنند نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"شیر نہیں رہ سکتے۔ شیرنیاں تو رہ سکتی ہیں۔"

"بہر حال مائی آفر سٹینڈز۔"
"تھینک یو ویری مچ۔ آنند صاحب۔"
جب وہ چشمہ شاہی کے باغ پر سیڑھیوں پر پہنچے تو دونوں رُک گئے۔ ڈل لیک اور بلوارڈ روڈ بجلی کے قمقموں کی روشنیوں میں بڑا ہی طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔ دُور پھیلا سری نگر کا شہر ایک مہان جادو نگری کے سمان لگ رہا تھا۔
"کتنا جادو ہوتا ہے روشنی میں۔" آنند بولا۔
"لمحہ بھر میں اندھیرے کو زندہ کر دیتا ہے۔"
"زندہ بھی اور خوب صورت بھی۔" آنند نے کہا۔
"آئیے ایک طرف ہو جائیں۔ میں آپ کو اپنی ایک تازہ نظم سُناتی ہوں۔"
پھر وہ دونوں سیڑھیوں سے ہٹ کر گھاس کے قطعے کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ نیم اندھیرے اور نیم اُجالے کی فضا میں سادھنا دھر نے جب اپنی پیاری آواز اور خوب صورت تلفظ کے ساتھ تازہ نظم سُنائی تو آنند جھوم اُٹھا۔
"مجھے یہ نظم دے دیجیے۔ 'ویژن' کے تازہ الشّوع میں جائے گی۔"
"شکریہ۔"
اور پھر آنند نے بڑی محبت سے سادھنا کا کندھا تھپتھپایا اور سادھنا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پیار کی ترستی ہوئی روح کو پیار کی ٹھنڈی شبنم مل گئی تھی۔ رات کو ہوٹل سے آنند نے ٹیلی فون پر سرجو سے بات کی۔
اس کے فادر کی حالت ٹھیک تھی، لیکن اس کی لینڈ لیڈی مسز ورما کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ اور وہ کوما میں تھیں۔ سرجو نے اُسے اگلے دن واپس آجانے کو کہا۔
حالانکہ اگلے دن کے لیے آنند نے کچھ ضروری پروگرام رکھے ہوئے تھے۔ اگلے دن پہلی فلائٹ سے آنند چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔
سادھنا دھر اُسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔
اور اس کے لیے حبّہ خاتون کا ایک بہت اچھا پورٹریٹ بھی لائی تھی۔
"اسے اپنے ڈرائنگ روم میں لگائیے۔"
"ڈرائنگ روم تو ہے کہاں اپنے پاس؟"
"تو وہ بھی لے جائیے یہیں سے۔"
"نہیں۔ بعد میں بھیج دینا یا اپنے ساتھ لے آنا۔ جب تم چنڈی گڑھ آؤ۔"
"لے آؤں گی۔" سادھنا دھر مسکرائی۔
اور پھر اُسے سکیورٹی چیک اپ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
جب تک ہوائی جہاز نے اُڑان نہ بھری وہ ایئرپورٹ پر ہی کھڑی رہی۔ آنند جاتے جاتے اپنا پورا امپیکٹ چھوڑ گیا تھا۔ اور ساتھ ہی لے گیا تھا کیسری کی پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو جو پامپور کے کھیتوں میں گھل رہی تھی اس سمے نرم نرم دھوپ کی گرمائی میں۔

آنند جب چنڈی گڑھ ایئرپورٹ سے اپنے گھر پہنچا تو اُس نے دیکھا ورما صاحب کے گھر کا گیٹ چوپٹ کھلا تھا اور گھر کے در و دیوار سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے اپنا سامان اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں کے سامنے رکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور اس میں ایک چٹ ٹھنسی ہوئی تھی۔ اس نے وہ چٹ نکالی۔ سرجو نے لکھ رکھا تھا — "میں مسز ورما کی ارتھی کے ساتھ شمشان جا رہی ہوں۔ وقت سے پہنچ جاؤ تو وہیں آجانا —" سرجو۔
چٹ پڑھ کر آنند کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
اُسے لگا مسز ورما شمشان سے آگئی تھی۔
سب کی نظریں بچا کر اور چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"تمہارا بہت انتظار کیا تھا میں نے۔"
"لیکن تم تو وہاں سادھنا دھر کے چکر میں تھے تمہیں واپس آنے کی جلدی کیوں ہوتی۔ ہر سفر کے بعد تم کسی نہ کسی لڑکی کو پھانس لاتے ہو۔ بہت دلگر قسم کے آدمی ہو تم۔"
"مجھے معلوم تھا کہ وقت سے گھر پہنچ کر بھی تم شمشان نہیں آؤ گے۔ یہیں پڑے رہو گے اور سگریٹ پھونکتے رہو گے۔ ورما صاحب کو تمہارا سگریٹ پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"
"ورما صاحب کا دھیان رکھنا میرے بعد۔"
مجھے بے شک بھول جانا۔ مرے ہوؤں کو سبھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن تم تو زندہ لوگوں کو بھی یاد نہیں رکھتے۔
نہایت واہیات قسم کے آدمی ہو تم!
اچھا تو میں واپس شمشان جاتی ہوں۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔
آنند کو لگا کہ ایک برف جیسے سرد ہاتھ نے اس کے گال کو تھپتھپایا تھا اور پھر اُسے یہ بھی لگا کہ ایک سایہ سا سیڑھیاں اتر کر بڑی تیزی سے چوپٹ کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔
وہ وہیں بیٹھ گیا آخری سیڑھی پر۔ اپنے فلیٹ کے بند دروازے سے ٹیک لگا کر۔ اس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں اور وہ اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔
کالے رنگ کی فیوفر وین رُکی تھی سڑک پر۔

اس میں سے کچھ لوگ اُتر رہے تھے جو مسز ورما کی
ارتھی کے ساتھ شمشان گئے تھے۔ سب سے آخر
میں سرجو اُتری تھی ورما صاحب کو سنبھالتے ہوئے۔
ورما صاحب تو لڑکھڑا رہے تھے۔ ان سے تو اپنی
چھڑی بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنبھالی جا رہی تھی۔
پیشتر اس کے کہ سرجو انہیں سہارا دے کر گیٹ تک
لاتی۔ آنند سیڑھیاں اُتر کر گیٹ کے باہر سڑک پر
پہنچا اور ورما صاحب کو اپنی باہوں میں لے لیا۔
"یور سوئیٹ لینڈ لیڈی از گان"۔ ورما صاحب
نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا
"مائی مس فارچون ورما صاحب"۔ آنند
نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
اور پھر ایک خاتون نے لپک کر ورما صاحب
کے گھر کا تالا کھولا۔ غالباً یہ پربھا تھی۔ مسز ورما کی
بہن۔ اسی کو تو اس نے دہلی میں ٹیلی فون کر کے آنند
کے ٹیلی فون کا اُدگھاٹن کیا تھا کچھ عرصہ پہلے۔
پھر لوگ دھیرے دھیرے چلے گئے اور ورما
صاحب کے ڈرائنگ روم میں صرف چار جنے رہ گئے۔

ورما صاحب
پربھا
آنند
اور سرجو

جب شام کو سرجو نے ورما صاحب کو چائے کی
پیالی پیش کی تو انہوں نے پیالی چپ چاپ لے لی
اور پھر آنند سے بولے۔
"میں پچھلے تیس برسوں میں پہلی بار اکیلے
چائے پی رہا ہوں"۔
"ہم سب ساتھ ہیں جیجا جی"۔ پربھا نے کہا۔
"تم نہیں سمجھو گی میری بات۔ صرف آنند ہی
سمجھ سکتا ہے"۔
"جی"۔ آنند بولا۔
"بہت یاد کیا اُس نے تمہیں۔ کوما میں جانے
سے پہلے"۔
"شی واز اے گریٹ لیڈی ورما صاحب"
"اسے ہر وقت کوئی خدمت گزار چاہیے تھا۔
اب میں کس کی خدمت کروں گا؟"
ورما صاحب کا ہاتھ کانپنے لگا۔ اُنہوں نے
لرزتی ہوئی چائے کی پیالی کو نیچے دری پر رکھ دیا۔
اُن کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔
"ہم دونوں ایک دوسرے کی خدمت کریں گے
ورما صاحب"۔
آنند کے یہ الفاظ سننے کے بعد ورما صاحب
نے بڑے عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ
رہے ہوں تم جھوٹ بول رہے ہو۔
پھر سرجو بولی۔
"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے میں تازہ چائے
لاتی ہوں۔ اُس نے دری پر رکھی ورما صاحب کی
پیالی اور پربھا اور آنند کی پیالیاں بھی باری باری
اٹھائیں اور کچن میں چلی گئی۔
ورما صاحب نے پیٹھ دیوار کے ساتھ
لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔
رات کو گھر جانے سے پہلے سرجو نے آنند
کو دو اہم خبریں دیں۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ وجینتی بیّے
اچانک چنڈی گڑھ چھوڑ کر کیریلا چلی گئی تھی۔
اور اس کے کہنے کے مطابق وہ ملیالا منورما ڈیلی
جوائن کرنے والی تھی۔
"لیکن یہ فیصلہ اچانک اُس نے کیسے کر لیا؟"
"یہ تو میں نہیں جانتی۔ کچھ ذاتی کارنوں سے
اُس نے چنڈی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا"۔
"وہ کون سے ایسے کارن ہو سکتے ہیں؟"
"میں بھی ہو سکتی ہوں ایک کارن!"
"وہ تو خیر میں بھی ہو سکتا ہوں"۔
"بہر حال وجینتی بیّے چلی گئی ہے۔ وہ آپ کو
ایک طویل خط لکھے گی"۔
"کوئی اور خبر؟"
"خاصی اپ سیٹ کرنے والی خبر ہے"۔
"کیا ہوا؟"
"ہوا تو کچھ نہیں، لیکن ہو سکتا ہے"۔
"کچھ بتاؤ تو"۔
"گوربخش آپ کے بہت خلاف ہے۔
"وہ تو کئی دنوں سے میرے خلاف ہے"۔
"اب تو وہ ایک طرح سے انڈر ورلڈ کا دادا
بن گیا ہے۔ سبھی کچھ کر رہا ہے آج کل"۔
"وہ سب جو اُسے نہیں کرنا چاہیے"۔
"ہاں۔"
"لیکن زندگی تو اُس نے اپنے انداز سے گزارنی
ہے، سرجو"۔
"کون منع کرتا ہے اُسے۔ جو چاہے کرے۔ لیکن
ہمیں تو پریشان نہ کرے"۔
"کیا ہوا ہے اب"۔
"پچھلے تین چار دنوں میں وہ کئی بار کہہ چکا ہے
کہ اگر میں نے آپ کو نہ چھوڑا تو وہ آپ کو مروا ڈالے گا"۔
"اور؟"
"اور یہ کہ میں "ویژن" چھوڑ دوں"۔
"تم نے کیا سوچا ہے؟"
"پتاجی کی صحت اچھی نہیں۔ میں بہت پریشان
ہوں اور گوربخش ہر روز کوئی نہ کوئی بکھیڑا شروع
کر دیتا ہے"۔
"تو کیا کرنا چاہیے"۔
"آپ ہی بتائیے!"
"مجھے زندگی کا بڑا موہ ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔
اگر میری سلامتی اسی میں ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو تو چھوڑ دو
بے شک مجھے"۔
"آپ کہہ رہے ہیں یہ بات؟"
سرجو نے آنند کو اپنی باہوں میں کس لیا اور
اپنا چہرہ آنند کی چھاتی پر رکھ کر رونے لگی۔ وہ کئی
دنوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کے صبر کی گاگر چھلک
گئی۔ سرجو واقعی ایک ندی بن گئی تھی اس سمے۔
"اور کیا کہوں سرجو؟" آخر تم کب تک
اپنے بھائی کا مقابلہ کر سکو گی؟ جو لالچی بھی ہے اور
بدمعاش بھی"۔
"جب تک آپ میرے ساتھ ہیں مجھے کسی کا ڈر نہیں"

"میں تو ساتھ ہوں، لیکن تقدیر بھی تو ساتھ ہونی چاہیے۔ ستارے بھی تو ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"اور میری تقدیر۔ میرے ستارے؟"

"دونوں گردش میں ہیں آج کل اور ابھی کچھ دیر رہیں گے بھی۔"

"تو آپ مجھے ٹال رہے ہیں؟"

"ٹال کہاں رہا ہوں؟ میں ہر گھڑی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس بات کا یقین رکھو۔"

آنند نے سرجو کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر جیب میں سے رومال نکال کر اُسے پونچھا اور کہا۔

"ہیو فیتھ ان می ڈیر۔ آئی شیل ناٹ لیٹ یو ڈاؤن۔"

آنند کا یہ جواب سُن کر سرجو سنبھل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور مسکراہٹ کا اُجالا اپنے پلّو میں باندھے پل پل گہرے ہوتے ہوئے رات کے اندھیرے میں سرجو اپنے گھر چلی گئی۔ اب اُسے اور تیز روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ جتنی روشنی اس کے پاس تھی وہی کافی تھی۔

کچھ دنوں سے آنند نے ایک بہاری چھوکرا نوکر رکھ لیا تھا۔ وہی آنند اور ورما صاحب کا کھانا بناتا تھا۔ ورما صاحب چاہتے تھے کہ کچن اُنہیں کا استعمال کیا جائے تاکہ اُن کے گھر میں کچھ تو زندگی کے آثار نظر آئیں۔ کچن چلاتی سرجو تھی۔ خرچ آنند کرتا تھا۔

پہلے آنند اکثر دوپہر کا کھانا مس کر دیا کرتا تھا، لیکن ورما صاحب کی وجہ سے وہ لنچ کے وقت گھر آجاتا تھا اور ڈائننگ روم بھی ورما صاحب کا ہی استعمال ہوتا تھا۔ برتن بھی اُنہیں کے استعمال ہوتے تھے۔ کبھی کبھی سرجو بھی شامل ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن عام طور سے وہ دوپہر کا کھانا اپنے ہی گھر میں لیتی تھی۔ اپنے فادر اور مدر کے ساتھ۔ رات کا کھانا بھی آنند اور ورما صاحب اکٹھے ہی کھاتے تھے

شروع شروع میں تو آنند ڈرنک اپنے ہی فلیٹ میں لیتا تھا، لیکن ایک دن ورما صاحب نے اُسے کہا تھا کہ وہ ڈرنک بھی اُنہیں کے ڈرائنگ روم میں لیا کرے۔

"لیکن آپ کو تو شراب پینا پسند نہیں ورما صاحب!"

"میں خود نہیں پیتا لیکن میرے سامنے دوسرے تو پی سکتے ہیں۔"

"اسی وجہ سے تو آپ کئی بار مجھ سے ناراض بھی ہوئے تھے۔"

"اس لیے کہ مسز ورما تمہاری وجہ سے زیادہ پینے لگی تھیں۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں، پی کر بہک جاتی تھیں وہ۔"

"میرا تو ایسا خیال نہیں۔"

"پیتی تو وہ تمہارے ساتھ تھی۔ لیکن بہکتی وہ یہاں آکر تھی۔"

"سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں اس وقت تو وہ ملکہ سمجھنے لگتی تھی اپنے آپ کو۔"

"اور آپ پر حکم چلاتی تھیں؟" آنند ذرا سا ہنسا۔

"ارے یار بوچھو مت۔ کیا کچھ کرواتی تھی مجھ سے وہ۔"

یہ جواب دیتے ہوئے ورما صاحب بھی ہنسے اور پھر بولے۔

"ایک دن ذرا سی مجھے بھی پلانا۔"

"تاکہ آپ بھی بہک سکیں۔"

"اور ایک دن میں بھی حکم چلاؤں۔"

"کس پر؟"

"تم پر ہی چلاؤں گا۔ اب ہے ہی کون میرے پاس۔"

"تو آج ہی یہ نیک کام ہو جائے۔"

"آج نہیں۔ پھر کسی دن سہی۔"

اُس دن ورما صاحب کا موڈ خاصا اچھا تھا۔ اور کئی ہفتوں کے بعد اُنہوں نے زندہ رہنے میں دلچسپی دکھائی تھی۔ ورنہ تو وہ ہر وقت یہی کہتے رہتے تھے کہ مسز ورما کے چلے جانے کے بعد ان کا زندہ رہنا ایک دم بے کار تھا۔

جس دن ورما صاحب نے پہلی بار ڈرنک لی، اس دن سرجو بھی وہیں تھی۔ ڈرنک بنائی بھی اُسی نے تھی۔

"ڈرنک بھی تم اسی سے بنواتے ہو۔"

"ہاں عورتیں ناپ تول میں ماہر ہوتی ہیں۔ مجال ہے جو ایک قطرہ بھی زیادہ ڈالیں گلاس میں۔ اچھے ہوٹلوں میں بار زکو عورتیں ہی سنبھالتی ہیں۔"

"ویسے تو سٹیٹس آف وومن کے بڑے حامی ہیں لیکن جب موقع ملے ان کی کھچائی سے باز نہیں آتے۔"

یہ کہتے ہوئے سرجو نے دونوں کو ڈرنک آفر کیے۔ پھر آنند نے اپنا گلاس بڑی آہستہ سے ورما صاحب کے گلاس سے ٹکرایا۔ اور بولا۔

"ٹو یور ہیلتھ اینڈ لانگ لائف ورما صاحب۔"

دونوں نے اپنے اپنے گلاسوں سے ایک ایک سپ لیا۔ سرجو نے ایک گھونٹ نیبو پانی کا لیا اور پھر کچن میں چلی گئی۔ بہاری چھوکرے کا ہاتھ بٹانے۔

کچھ دیر دونوں ہی خاموشی سے پیتے رہے۔ پھر آنند نے سگریٹ سلگائی اور صوفے سے ٹیک کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"تمہارا کوئی وکیل واقف ہے؟"

"بہت ہیں۔ کہیے کیا کام ہے؟"

"میں اپنی وصیت لکھوانا چاہتا ہوں۔"

"یہ خیال کیسے آگیا اچانک آپ کو؟"

"اچانک نہیں آیا۔ کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔"

"کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"یہ مکان میں تمہارے نام کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ تو ابھی سے بہک گئے۔"

"ارے نہیں میں سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ پربھا چاہتی ہے کہ میری ساری جائیداد اُسے مل جائے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ مسز ورما کی بہن ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"وہ کچھ دنوں میں چنڈی گڑھ آنے والی ہے۔ اسی مقصد کے لیے۔"

"لیکن میرے نام کیوں کرنا چاہتے ہیں یہ مکان آپ؟"

"اس لیے کہ ایک دن جب مسز ورما تمہارے کمرے سے پی کر آئی تھی تو اُس نے مجھے یہی حکم دیا تھا کہ وہ تمہیں بہت پیار کرتی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے ورما صاحب۔"

"ایک طرح سے تم میرے رقیب بھی ہو۔"

"ایسا مت کہیے۔"

"کہتے ہیں کہ پینے کے بعد آدمی سچ بولتا ہے۔ اُس نے بھی پی کر یہی سچ بولا تھا۔ میں بھی پی کر ہی یہی بات کہہ رہا ہوں۔"

"آئی ایم سوری ورما صاحب۔"

"سنو تم کل کسی وکیل کو لے آؤ۔ میں یہ سارا مکان تمہارے نام کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں کیا کروں گا اتنے بڑے مکان کو؟"

"یہ بھی بعد میں بتا دوں گا۔"

"تو پھر اسی طرح کرتے ہیں ——" آنند بولا۔

"کس طرح؟"

"آپ اپنی وصیت میں یہ مکان میرے نام کر دیجیے۔ میں اپنی وصیت میں اسے آپ کے نام کر دوں گا۔"

آنند کی یہ بات سنتے ہی ورما صاحب نے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ اور پھر زور کا قہقہہ لگا کر بولے۔

"یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ شراب چڑھنے لگی ہے۔"

"جب آدمی ایسی باتیں کرنے لگتا ہے۔"

"کیسی باتیں؟"

"جیسے میں کر رہا ہوں۔" آنند نے جواب دیا۔

"نہیں۔ جیسے میں کر رہا ہوں۔"

دونوں صوفے سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جب سرجو کچن سے واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیے اپنے اپنے خالی گلاسوں کو دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" سرجو نے پوچھا۔

"ویٹنگ فار دی اینجل۔"

ورما صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اپنا خالی گلاس سرجو کے حوالے کر دیا۔

"ماپ تول کو مت بھولنا۔" آنند نے سرجو کی طرف پیار سے دیکھا اور اپنا خالی گلاس بھی اس کی طرف سرکا دیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں پڑھیے)

بقیہ: اقبال اور بلیک

اقبال اور بلیک کے فکری نظام میں ایک سے زیادہ مشابہتوں کے باوصف ایک فرق ضرور ہے اور اسے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ بلیک نے اپنے ... مابعد الطبیعیاتی فہم و ادراک کو مجسم و معتبر بنانے کے لیے ایک اسطوری نظام تخلیق کیا ہے۔ زندگی اور انسان کے بارے میں اس کی بصیرتوں کا اظہار اس نظام کو ڈرامائی شکل دینے میں ہے یعنی اس کے لیے اسطوری کرداروں اور اسطوری مواقع کی پیش کش جس کے ذریعے یہ بصیرتیں پڑھنے والوں پر منکشف ہوتی رہیں۔ اس کے برعکس اقبال کے ہاں بالعموم ان کا اظہار تصورات کی مدد سے کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں چند اسطوری نظمیں بھی موجود ہیں، جن میں ان کے ایقانات کو زیر سطح متعین کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی حیثیت استثنا کی ہے۔ اقبال کا تخیل اساسی طور پر اسطوری تخیل نہیں ہے۔ وہ ایک ٹھوس اور قطعی بنیاد پر عمل کرتا ہے۔ ایک اور فرق کا بھی تذکرہ کر دینا اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی کی نقش گری کے ضمن میں عزم و ارادے یعنی WILL کا ادعا ضروری ہے۔ بلیک اس طرح کے ادعا کو تمام خرابیوں کی جڑ تصور کرتا ہے۔ اور اُسے حقیقت کے ادراک و انکشاف کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ سمجھ کر اس کا قلع قمع کرنے کا حامی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا بلیک کی شاعری کا پس منظر اٹھارہویں صدی کا وہ فکری ارتقا تھا جو ایک طرح کی بے روح مادیت اور میکانکیت پر منتج ہو چکا تھا۔ اس نے تخلیقی امکانات کے سرچشموں کو گدلا بلکہ خشک کر دیا تھا اور بعض سائنسی قضایا اور ریاضی کے فارمولے ہی حقیقت کے انکشاف کا واحد ذریعہ بن کر رہ گئے تھے۔ اقبال کے ذہن میں وہ پورا معاشرہ تھا اور وہ علمی رویے تھے جنہیں انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں اور سائنسی مزاج یعنی SCIENTISM نے جنم دیا تھا۔ اس کے خلاف اپنی ناآسودگی کا اظہار وہ اس شد و مد، بے صبری اور تندی کے ساتھ کرتے ہیں، جس کا اظہار بلیک نے اپنے اسطوری تخیل کی آڑ لے کر کیا تھا۔ دونوں کے ہاں بلند آہنگی کے ساتھ نظر کو وہ شفافیت اور بصیرت و وجدان کی وہ نادرہ کاری بھی ہے، جس کے ذریعے تخلیقی فن کار اپنے اردگرد کی سطح سے ماورا ہو کر زندگی کی سچائیوں کا ادراک کرتا ہے اور انہیں بے جھجک طریقے سے معرض اظہار میں لاتا ہے۔

علی امام نقوی

مرسڈیز 1210 ایر کنڈیشنڈ بس محض پل بھر کے لیے رُکی۔ کنڈکٹر نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور وہ سُرعت کے ساتھ بس میں داخل ہو گیا۔ دو رویہ نشستوں پر بیٹھے الفہد کنسٹرکشن کے بھارتی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی ورکرز اُسے دیکھ کر مسکرائے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پاکستان کا مکرانی ڈرائیور پہلے تو قدرے اونچی آواز میں ہنسا، پھر کھکار کر گلا صاف کرنے کے بعد اونچی آواز میں بولا:

"نصیبوں والا بندہ ہے۔ دمام میں بھی بیگم کی آواز سُن لیتا ہے۔"

اُس نے مُڑ کر مکرانی ڈرائیور کو دیکھا اور اُسی کی طرح آواز بلند کرتے ہوئے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

"صرف آواز سنتا ہوں۔ کبھی کبھی سُنا بھی دیتا ہوں۔ معلوم ہے۔ کیوں؟"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہندوستانی ہوں، یہاں والوں کی زبان میں ہندو ــــ استھان کا ہوں۔ ورنہ میرے گھر بھی فون لگا ہوتا پیارے اور . . . . اور پھر ہم کیسیٹ کے محتاج نہ ہوتے۔"

اُس کے طنزیہ جواب کو سُن کر مکرانی ڈرائیور نے مونہہ بناتے ہوئے اک دم سے بس آگے بڑھا دی۔ مختصر سے سوال جواب پر الفہد کنسٹرکشن میں کام کرنے والے افراد نے مختلف انداز میں اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔ وہ ساتھیوں کے عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑکی کے پاس خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈھیلی ڈھالی سُوتی قمیض کی جیب میں سے روتھ مینس کا ایک سگریٹ نکال کر اس نے دانتوں میں دبایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سرے کو لائٹر کی آگ دکھا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو تین کش لے کر اُس نے SMOKE گلاس سے باہر نگاہ دوڑائی۔ اونچی اونچی خوش نما اُجلی اُجلی عمارتیں پیچھے چھوٹتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی بس صاف و شفاف ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ وہ اب بھی باہر دیکھ رہا تھا۔ اونچی، خوش نُما اور محل عمارتوں کی جگہ اب ریگستان نے لے لی تھی۔

"گھر سب خیریت ہے نا؟"

اُس کے عقب سے ایک شناسا آواز سوال بن کر اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ جواب میں وہ مسکرا کر قدرے ترچھا ہوا۔ سوال کرنے والے ہندوستانی ساتھی کو دیکھا اور اپنی مسکراہٹ کو مزید دل کش کرتے ہوئے اُس نے پتلون کے بیلٹ میں پھنسے واک مین کا سوئچ آن کر دیا۔ چند ثانیہ بعد ہی اُس کے کانوں میں رس گھلنے لگا۔

". . . . . آپ آ رہے ہیں . . . . . خدا قسم . . . . سچ کہتی ہوں . . . . دل کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا ہے۔ بس ایسا لگتا ہے . . . . . ابھی ابھی مجھے پھولوں کی سیج پر بٹھایا گیا ہے۔ محلّے کی لڑکیاں کمرے کا دروازہ بند کر گئی ہیں اور کوئی پل جا رہا ہے کہ آپ آئیں . . . . بس یہ دل اُس روز کے بعد اب اسی انداز . . . . . . اسی رفتار سے دھڑکا ہے . . . . . آپ تو جانتے ہی ہوں گے . . . . . کتنے دنوں بعد گھر لوٹ رہے ہیں۔ . . . . . جانتے ہیں نا۔ یا . . . . یا میں ہی بتاؤں . . . . پورے چار سال، سات مہینے اور کچھ دن . . . . . میں نے اس پورے عرصے کا ایک ایک پل گِنا ہے . . . . سب کے ہوتے ہوتے بھی میں اپنے کو تنہا تنہا سی محسوس کیا کرتی ہوں۔ صبح سے شام تک کی مصروفیت بھی تنہائی کا احساس کم نہیں کرتی۔ کیوں؟ آپ کو تو پتا ہوگا۔ . . . ایسا کیوں ہوتا ہے؟ . . . . ہاں۔ ایک بات تو بتایئے یہ کبھی کبھی ایسا کیوں لگتا ہے۔ میں بہت کچھ آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ سب کچھ ذہن میں ہوتا ہے۔ میں طے کر لیتی ہوں۔ یہ کہوں گی وہ کہوں گی۔ یہ بتاؤں گی۔ وہ بتاؤں گی . . . . . مگر . . . . . ٹیپ ریکارڈر آن کرتی

• معرفت مکتبہ جامعہ پرنسٹن بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

ں تو ساری باتیں اناپ شناپ سی لگتی ہیں ــــ
جتی ہوں آپ کا دُکھ مجھ سے زیادہ ہے۔ آپ
ں اکیلے ہیں۔ میرے پاس تو سب ہیں' امّاں ہیں' نند ہے'
رہے اور.... اور گُڈّی ہے..... گُڈّی....
ی..... اور.... آ.... آپ کی گُڈّی......
ب آپ گئے تھے، اپنی گُڈّی ذرا سی تھی۔ بس
ا کرتی تھی۔ کلکاریاں بھرا کرتی تھی مگر اب....
ب تو خوب بولتی ہے۔ تُتلا تُتلا کر باتیں کرتی ہے۔
ے ـــ یہ لو وہ امّاں آرہی ہیں (وقفہ)
ارے سے کہہ رہی ہیں ٹیپ ریکارڈر میرے
منے رکھ دے۔ میں بھی اپنے بیٹے سے دو باتیں کرلوں۔"

بس کی رفتار میں ایک لطیف سے جھٹکے کے
د تھوڑا سا اضافہ سب ہی نے محسوس کیا ہے۔

"شاہ جی..... کیا ارادے ہیں؟ کسی نے
ائیور سے پوچھا۔

"ارادے نیک ہیں برادر ــــ" مکراتی
تیوربتیسی کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"ذرا سنبھال کر چلاؤ بھائی۔ سب بال بچے
لے ہیں۔"

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے برادر؟"

وہ ایک اُچٹتی سی نظر ڈرائیور اور اسپیڈو میٹر
ڈالنے کے بعد پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں محو ہو جاتا
۔ یکایک بس کی خنکی اسے کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی
۔

"پیارے رفیق بیٹے..... السلام علیکم..... بعد
کے معلوم ہو کہ ہم سب خیریت سے ہیں اور اللہ سے دعا
تے ہیں کہ وہ تمہیں بھی اپنی امان میں رکھے۔ اپنے
ست لئیق احمد، بھنڈی بازار والے کے ہاتھ تم نے
یسیٹ بھیجا تھا، وہ میں نے بھی سنا۔ سُن کر لگا تم
ام میں نہیں اِدھر ہی ہو۔ برابر کے کمرے میں....
ے آس پاس۔ ہاں ـــ یہ جان کر بہت جی خوش
کہ تم نے تین بار عمرہ کیا ہے۔ ایک مرنے والے کے نام۔
میرے لیے اور آخر میں اپنی دُلہن کے لیے۔ اللہ.....
تو بڑے نصیب والے نکلے رفیق میاں..... مگر میں
پوچھتی ہوں تم نے اپنے لیے عمرہ کیوں نہیں کیا؟ میرے اور
اللہ بخشے بہشتی کے نام عمرہ ادا کیا، سو ٹھیک کیا۔ پر
دُلہن کے بجائے تم کو خود عمرہ کرنا چاہیے تھا۔" (وقفہ)
ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا تھا۔ سموک گلاس سے باہر
دھوپ کچھ زیادہ ہی تیز ہو چلی تھی۔ ایک لمحہ کی خاطر
اُس نے پلکیں جھپکائیں۔ پھر نشست پہ پہلو بدلا کہ
کھڑکی سے باہر سورج سموک گلاس میں تانبے کی ٹکیہ
کی طرح چمکتے ہوئے اس کا ہم سفر تھا۔

"یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم آرہے ہو۔
اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں ساتھ خیریت کے
تمہیں گھر لائے (آمین) ہاں، اب کچھ باتیں غور سے
سُنو۔ آنے سے پہلے اپنی زیبن کے لیے سونے کی ایک
چین اور دو چار اچھی سی میکسیاں ضرور خرید لینا۔
دوستوں کے ہاتھوں جو کپڑے تم بھیجتے رہے ہو ان
میں سے زیبن کا حصہ میں نے اپنے ہاتھوں اُس
کے سپرد کیا ہے، لیکن اب زیبن کی فرمائش چین
کی ہے۔ اُس کا میاں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔
پچھلے سنیچر کو میں زیبن کے گھر گئی تھی تو وہ کہہ رہا تھا۔
..... بھائی کو خط لکھو تو میری طرف سے لکھنا آتے
وقت میرے لیے سیکو فائیو یا سٹی زن گھڑی ضرور
لائیں۔ تمہاری بڑی امّاں دو کُرتوں کے کپڑے
کی فرمائش کرچکی ہیں۔ وہی سفید چکنے چکنے سے کپڑے
کی..... کیا کہتے ہیں اُسے؟ اور ہاں ایک جانماز
بھی اُن کے لیے لیتے آنا۔ اپنی بازو والی لمبی خالہ ہیں
نا۔ ارے وہی مونس اور امتیاز کی امّاں۔ وہ نائیلون
کی چٹائی کو کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں۔ اور اب ــــ اب
میں اپنے لیے تم سے کہہ رہی ہوں۔ میرے لیے سونے کی
دو چوڑیاں ضرور لانا۔ اللہ بخشے بہشتی کو..... ان کے
زمانے میں زندگی بس گزر گئی..... وہ کہا کرتے تھے
رفیق جوان ہو کر تمہیں عیش کرائے گا۔ خدا تمہیں جیتا
رکھے۔ تم نے کوئی دُکھ نہیں دیا۔ اچھا کھلایا، اچھا
پہنایا۔ بس..... اب یہ دو چیزیں لیتے آؤ۔ چوڑیاں
اور مکہ شریف سے میرے لیے کفن۔ ہاں کفن خریدنے کے بعد
اُسے اللہ کے گھر سے ضرور مس کرنا..... اب زندگی کا کیا
بھروسہ..... پتہ نہیں کب بُلاوا آجائے اور کیا کہوں؟
لو..... وہ تمہاری گُڈّی آگئی۔ خوب پٹر پٹر بولتی ہے مگر
ابھی زبان صاف نہیں ہوئی ہے۔ تمہاری دُلہن سے کہتی
ہوں گُڈّی کو سالن کھلاؤ۔ تھوڑا مرچ مسالہ کھائے گی
تب ہی تُتلاہٹ ختم ہوگی پر وہ سنتی کہاں ہے۔ ایک
روز میں نے اُسے ذرا سا سالن کھلا دیا۔ یقین کرو آنکھیں
تمہاری دلہن کی بھر آئی تھیں۔ اچھا، اب اجازت دو۔"
(وقفہ)

"سُن لیں آپ ـــ نے امّاں کی باتیں....
ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی..... ہوں'.... ہاں یاد
آیا۔ میں نے ایک ایک پل گن گن کاٹا ہے۔ صرف اس
لیے کہ اپنے حالات سُدھر جائیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ اُس
نے کرم کیا۔ حالات سُدھرتے ہی رہے۔ گھر کی دیواریں
جو کلی چونے کو ترسا کرتی تھیں اب چمچماتی ہیں۔ کل ہم
سب موٹا گاڑھا پہنتے تھے، آج جاپانی کپڑوں میں
سجے سجے پھرتے ہیں۔ گھر میں ٹیپ ریکارڈر ہے،
ریڈیو ہے، کلر ٹی وی ہے۔ سب ہی کچھ تو ہے....
بس..... آپ کے گلف جانے سے ہماری روزمرّہ
کی زندگی بھی بدل گئی ہے۔ پہلے امّاں فجر پڑھ کر مصلّے
پر ہی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ آگے پیچھے ہل ہل کر۔ اب
وہ صرف ہلتی ہیں اور تلاوت ٹیپ ریکارڈر پر مصری
قاری کرتا ہے بس امّاں تو بیٹھی جھوما کرتی ہیں۔"

ایک جھٹکے کے ساتھ بس کی رفتار کم ہوئی تو
اُس نے چونک کر مکرانی ڈرائیور کو دیکھا۔ وہ دوبارہ
گیئر بدل کر رفتار بڑھا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھا
اروند بھینڈے اُس سے مخاطب ہوا۔

"ہے پاکستانی ڈرائیور لوگ، لئی فاسٹ بھاگتو
..... کیا بولتا ہے رفیق بھائی۔" اس نے سر گھما کر
اثبات میں ہلایا۔

"بن کائے کو۔ اپن پوچھتا جلدی کائے کی...
سائٹ پہ جانے کا..... ٹیم پہ جانے کا، کیا بولتا ہے۔"

"یہ کدھر بولتا ہے؟" بھینڈے کے برابر میں
براجے ایک ساتھی نے کہا۔

"تو گپ بس۔ وہ گھر والوں کی باتیں سُن رہا ہے۔"

گئی ہے۔ ایک میں ہوں.... باپ خط لکھتا ہے نا بھائی۔ .... بس ایک خط آتا ہے۔ اپنی گرل فرینڈ کا۔ وہ بھی تین مہینے میں ایک بار.... کسی کو اپنا خیال ہے ہی نہیں۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر ہیڈ فون پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر دی

"سب ہی کچھ تو بدل گیا ہے بس کمی ہے تو آپ کی.... اب آپ آئیں اور ادھر ہی کچھ کریں۔ آپ کے بنا اب رہا نہیں جاتا.... آپ نے پوچھا ہے.... تمہارے لیے کیا لاؤں؟ ہے نا — ؟ کیا واقعی بتادوں اچھا تو سنیے۔ لاسکیں تو وہ راتیں لیتے آیئے جو آپ کے بغیر گزر گئیں۔ وہ دن لے آئیں جس کی مصروفیتیں ہم مل بانٹ کر خوش ہوا کرتے تھے اور ہاں سنیے تو گڈّی کیا کہہ رہی ہے۔ یاد ہے نا.... پچھلے کیسیٹ میں اُس نے کیا کہا تھا:" (وقفہ)

آنکھیں بند کرتے ہوئے اُس نے واک مین کا سوئچ آف کر دیا۔ اُسے پچھلے کیسیٹ میں گڈّی کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ توتلی زبان میں اُس نے کہا تھا:

"چھلا مالیکم.... پاپا.... ہم.... اچھے ہیں.... چوپ اچھے ہیں.... آپ کیسے ہیں.... اول کیا بولیں پاپا.... اچھا چھنیے.... چھات چھندل پال چھے۔ گلیوں کے باجاں چھے.... اچھی چھی گُلیا لاتا.... پپّا جب بھی تم آنا"

بس نے پھر ایک جھٹکا لیا تھا۔ اور اب اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور ایک وہی کیا سب ہی سنبھل کر بیٹھ چکے تھے کہ بس کچھ ہی لمحوں بعد ایک چوراہا آنے والا تھا' جو برصغیر کے لوگوں میں خونی چوراہے کے نام سے مشہور تھا۔ اس چوراہے پر عموماً وہ ڈرائیور زحادثوں کا شکار ہوا کرتے تھے، جن کی طبیعت میں صبر کا فقدان ہو یا پھر تیز روی کی دھن میں جو ٹریفک کے بنیادی قواعد کے ابتدائی نکات فراموش کر دیا کرتے۔ ہمیشہ مکرانی ڈرائیور اس چوراہے سے نصف فرلانگ قبل ہی بس کی رفتار کم کر دیا کرتا تھا پر آج کسی رَو میں اس نے رفتار کم نہیں کی تھی اور اب ہنگامی طور پر اُس نے بریک لگایا تھا۔ سب ہی نے بُرے بُرے منہ بنائے تھے۔ ایک پاکستانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا جھنجلا کر اس نے مکرانی ڈرائیور سے کہا۔

"شاہ جی، کیا جلدی ہے؟"

"تم کیوں فکر کرتے ہو برادر۔"

"فکر — کیا بولتا ہے —" بھینڈے چُپ نہ رہ سکا۔

"اوئے تو چُپ رہ۔"

"چُپ رہوں۔ ہیئے می گپ نبون۔ بکتلے کانئے۔ رفیق بھائی۔ کیا بولتا ہے۔"

"تجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ موت سے ڈرتا ہے سالے۔"

"کیا بولتا ہے۔ موت سے نہیں ڈرے گا تو کیا تیرے سے ڈرے گا۔ ابھی ہم دیکھا ہی کیا رے۔"

"گلف دیکھ لیا اور کیا رہ گیا —" دوسرے پاکستانی ساتھی نے بھینڈے کو چھیڑا۔

"گلف — ہونہہ —" بھینڈے نے مُنہ بنایا۔ "ستیاناس کیا۔ تم لوگ گلف کو۔ کیا بولتا ہے۔ سالا.... تم لوگ...."

"اے — سالا بولتا ہے۔" بھینڈے کو چھیڑنے والا اُس پر برہم ہوا۔ فوراً ہی دوسرے ساتھیوں نے معاملہ رفع دفع کیا۔ بس اب پھر تیزی سے سائٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس نے ایک ذرا سی گردن اُٹھا کر اسپیڈو میٹر پر نگاہ ڈالی۔ پھر نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر کے کشادہ ہائی وے کو دیکھنے لگا۔ دُور، کافی دُور سائٹ کی عمارتیں سراب کی لہروں میں لرزتی نظر آنے لگیں۔ اُس نے پھر واک مین کا سوئچ آن کر دیا — گڈّی کی آواز اُس نے سُنی۔

"پاپا.... چھلا مالیکم.... ہم.... اچھے چھے ہیں.... آپ کیسے ہیں؟.... ہم ممی کے چھات اسکول جاتے ہیں.... گھل آکل.... کھیلتے ہیں.... اول چھنیے.... ہماری گُلیا کی چھادی ہوگئی.... وہ چلی گئی.... آپ ہماری گُلیا جلول لانا.... ممی بولیں.... آپ آ لئے ہیں۔ پھر.... اچھا.... آپ جلدی چھے آجائیں۔ بچھ.... آپ آجائیں.... اول.... اول چھنیں.... جلدی چھے آجائیں.... اول کیا بولیں.... ہاں.... ہم پھول وہی گانا آپ کو چھناتے ہیں.... چھنیے.... چھات چھندل پال چھے۔ گلیوں کے باجاں چھے.... گُلیا چاہیے نا لانا.... گُلیا چاہیے نا لانا.... پپّا جلدی آجانا.... پپّا جلدی آجانا.... پپّا جلدی آجانا.... پپّا.... پپّا...."

"شاہ جی.... سائٹ پہ لوٹ آؤ۔"

مکرانی ڈرائیور نے انجن بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بے اختیار اپنی سیٹ چھوڑ کر اُس کی طرف لپکا۔ دوسرے پل وہ اُس کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اُس کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ دونوں آگے پیچھے بس سے اُترے تھے۔ ابھی صبح کے صرف ساڑھے سات بجے تھے، لیکن سورج آگ برسا رہا تھا اور ان کی نظروں کے سامنے ایک سیدھی لمبی سڑک سورج کی طرف چلی جا رہی تھی۔ ●●

محمود بالیسری

رونمائی

ایس۔ سی۔ بی میڈیکل کالج کا ہسپتال صوبے کا سب سے بڑا ہسپتال کہلاتا ہے۔ یہ ہسپتال برسوں سے صوبے کے لاکھوں انسانی .... زندگی کا محافظ بنا اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کے احاطے میں چوڑی چوڑی کول تار کی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہسپتال کے مختلف شعبوں میں روزانہ مریضوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ اس ہسپتال کا زچہ خانہ مشہور ہے۔ اس میں روزانہ کم از کم پچاس بچے تولّد ہوتے ہیں۔

آج زچہ خانے کے باہر دو شخص بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ سلیم دُرّانی سوچ رہے تھے کہ وہ شخص کسی دُور گاؤں کا رہنے والا ہوگا جیسا کہ اس کے لباس اور طور طریق سے ظاہر تھا۔ وہ سگریٹ سلگانے لگے اور وہ شخص بیڑی کے کش لگا رہا تھا اور پھر ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر تمباکو منھ میں ڈالنے لگا۔ دونوں سب کچھ کر رہے تھے، لیکن ان کے چہرے سے گھبراہٹ اور بے قراری ہویدا تھی۔

سلیم دُرّانی سوچ رہے تھے کہ ماں بننے کی خواہش اور تمنّا نیلوفر کو کس قدر بے قرار کر رہی ہے۔ شادی کے پانچ طویل سال بیت گئے تھے، لیکن وہ ماں نہیں بن پائی۔ اس کا سلیم دُرّانی کو بھی قلق تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹروں کا سہارا لیا گیا۔ بہت دیر میں اُن کی اُمید بر آئی۔ وہ اب خوش تھے۔ نیلوفر کی خوشی کی تو کوئی انتہا نہیں تھی۔ ایک ننھی جان کو عالمِ سکوت سے اس جہانِ رنگ و بُو میں لانے کے لیے جس تخلیقی کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کا احساس نیلوفر کو تھا پھر بھی اس کا چہرہ خوشی اور انبساط سے دمک رہا تھا۔

نیلوفر اور سلیم دُرّانی کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔ انہیں تو صرف ایک ہنستی بولتی ننھی سی جان کی خواہش تھی اور وہ اب انہیں ملنے والی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ سلیم دُرّانی بے تاب ہو کر کبھی کبھی نیلوفر سے پُوچھتے کہ مہمان کب آ رہے ہیں۔ نیلوفر ہنستے ہوئے کہتی کہ بہت جلد —— نیلوفر کے پیٹ پر کان رکھ کر سلیم دُرّانی کچھ سننے کی کوشش کرتے۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا کہ ایک ننھی سی جان ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اس جہانِ رنگ و بو میں آنے کے لیے۔ ان کا چہرہ باپ بننے کی خوشی میں تمتما اُٹھتا اور نیلوفر شرما جاتی اور سلیم دُرّانی اس کی جھکی ہوئی پلکوں میں کھو جاتے۔

آج وہ دن آ گیا تھا۔ وہ انتظار بڑی بے چینی سے ہو رہا تھا۔ تاخیر کیے بغیر سلیم دُرّانی نیلوفر کو ہسپتال لے آئے اور اپنی ماں کو اس کی خبر پہنچا دی۔ شاید ان کی ماں بھی اب آنے والی تھیں۔ زچگی کا تجربہ نہ سلیم دُرّانی کو تھا اور نہ نیلوفر کو۔ سلیم دُرّانی سوچ رہے تھے کہ کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ اسی طرح زچہ خانے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں اتنا بھی خیال نہ رہا کہ ان کے ساتھ ایک اجنبی شخص بھی ٹہل رہا ہے۔ اور اس کو ویسی ہی پریشانی اور تشویش ہے۔ اجنبی شخص سلیم دُرّانی سے مخاطب ہوا۔ "بابوجی" سلیم دُرّانی نے پلٹ کر دیکھا اور کہا: "کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"بابوجی! شاید یہ آپ کی دوسری یا تیسری زچگی ہوگی؟"

"نہیں، یہ پہلی زچگی ہے۔" سلیم دُرّانی کو اس اجنبی شخص میں اپنائیت محسوس ہونے لگی۔

"اور تمہارا؟" سلیم دُرّانی نے سوال کیا۔ اجنبی شخص جواب دینے میں تاخیر کرنے لگا۔ اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی پھر بھی اُس نے کہا۔

"بابوجی! یہ چوتھا بچہ ہوگا۔ تین لڑکیاں

• اکنامک ہاؤس، فرسٹ فلور، فرسٹ فلینک روڈ، ڈونگری، ممبئی ۴۰۰۰۰۹

ہیں۔ چوتھی بار لڑکے کی اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔"

"تم کرتے کیا ہو؟"

"کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ گاؤں میں میری چھوٹی سی دکان ہے۔ کسی طرح گزارہ کر لیتے ہیں۔"

"تو پھر زیادہ اولاد کے خواہش مند کیوں ہو؟ تم ان بچوں کو اچھے انسان بنا بھی سکو گے؟ لڑکی ہو یا لڑکا اس میں کیا فرق پڑتا ہے!" اس پر اجنبی شخص نے خاموشی اختیار کر لی اور سلیم درّانی نے اسے مشورہ دیا۔ "آج کل فیملی پلاننگ کے مرکز ہر جگہ کھلے ہیں۔ اس کے علاوہ بازار میں مختلف قسم کی دوائیں بھی ملتی ہیں۔ ان سب سے تم فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ لڑکا ہونے کے لیے آس لگائے بیٹھے ہو۔ اس طرح کتنے بچے پیدا کرتے جاؤ گے اور ابھی ابھی جو زچگی ہونے والی ہے کیا اس کی کوئی گارنٹی ہے کہ لڑکا ہی ہوگا میرے بھائی! بچے پیدا کر کے اگر ہم انہیں صحیح طور پر پرورش کر کے اور تعلیم و تربیت سے مزین کر کے اچھا انسان نہ بنا سکے تو ہمیں بچے پیدا کرنے کا کیا حق ہے۔ بھوک اور پیاس سے جب وہ تلملائیں گے اور مجبوراً چوری اور دوسرے غیر قانونی دھندے کریں گے تو کیا تمہارے لیے یہ اچھی بات ہوگی۔ ایک ہی بچہ ہو، لیکن مکمل انسان ہو!"

اس مرتبہ بھی اجنبی شخص خاموش رہا۔ کیا جانے سلیم درّانی کی باتیں اُسے اچھی بھی لگیں؟ —— پھر وہی چہل قدمی، سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں۔ دونوں دل ہی دل میں شاید سوچ رہے تھے کہ کس موضوع پر گفتگو چھیڑی جائے۔ ٹھیک اسی وقت زچہ خانے کے اندر سے کسی کے چیخنے اور کراہنے کی آواز مسلسل آنے لگی۔ یہ کس کی آواز ہو سکتی ہے؟ سلیم درّانی دروازے سے کان لگا کر سننے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اجنبی شخص بھی دروازے سے کان لگائے سن رہا ہے —— دونوں کس قدر بے تاب تھے۔ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ اس وقت ان کے اندر امیر اور غریب کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اونچ نیچ کا فرق بے معنی تھا۔ انسان کے اندر جس طرح اجزائے انسانی یکساں ہوتے ہیں، اسی طرح دکھ درد اور محبت کا احساس بھی یکساں ہوتا ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ انگلینڈ کا رہنے والا ہو یا افریقہ کا۔ اُسے بھوک لگتی ہے، شادی کی خواہش ہوتی ہے اور تخلیق کی تمنا دل میں لیے دکھ درد جھیلتا ہے —— یہی چیز یہاں بھی تھی۔ سلیم درّانی جس طرح بے قرار نظر آ رہے تھے، اسی طرح اجنبی شخص بھی بیتاب تھا۔

سلیم درّانی کے جسم سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اجنبی شخص چونکہ تین بچوں کا باپ تھا، اُسے زچگی کا تجربہ تھا۔ وہ سلیم درّانی کو دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ اس طرح گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ زچہ خانے کے اندر سے چیخ اور کراہ کی آواز تو آئے گی ہی۔ کیوں کہ زچگی کے وقت تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ میں تو یہاں اپنی بیوی کو لے کر تین بار آ چکا ہوں اور یہ چوتھی بار ہے۔ اس زچہ خانے میں مائیں آتی ہیں اور بچے کو گود میں لے کر خوشی خوشی گھر واپس جاتی ہیں۔ ہاں مشکل بھی درپیش ہوتی ہے۔ کبھی بچے کو بچایا نہیں جا سکتا تو کبھی ماں کو۔ تقدیر کا لکھا کون بدل سکتا ہے۔ سب کچھ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

سلیم درّانی کی کچھ ڈھارس بندھی۔ اگر یہ اجنبی شخص نہ ہوتا تو شاید سلیم درّانی ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ اجنبی شخص بیڑی پی رہا تھا۔ دیوار پر آویزاں گھڑیال بارہ بجا رہا تھا۔ گھڑیال کے گھنٹے کی آواز کے ساتھ دل کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہو گئیں۔ کس حالت میں نیلوفر ہوگی۔ یہ سوچ کر سلیم درّانی پریشان ہو جاتے۔ کیوں کہ یہ پہلی زچگی تھی۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ جب زچہ خانہ کا دروازہ کھلے گا تو پہلے وہ نیلوفر کو بوسہ دیں گے یا نوزائیدہ بچے کے ننھے ننھے گال پر۔ سلیم درّانی اس طرح کی باتیں سوچتے رہے۔ لیکن وہ اجنبی کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سلیم درّانی کی باتیں کس قدر حقائق پر مبنی ہیں۔ بیٹے کی اُمید پر وہ کتنا غلط کام کر رہا ہے۔ آج کل لڑکیاں لڑکوں سے کم نہیں ہیں۔ بیٹے کی شادی کرنے کے بعد اب اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن لڑکیاں جہاں بھی رہیں ماں باپ کا خیال رکھتی ہیں۔ آج کی زچگی کے بعد وہ ضرور آپریشن کرائے گا۔ واقعی یہ بات صحیح ہے کہ آج کل دن بدن مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر چیز کی قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف بچے پیدا کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں پرورش کرنا اور پھر صحیح تعلیم و تربیت دے کر ایک اچھا انسان بنانا زیادہ ضروری ہے۔ آج تک اُسے کسی نے نہیں سمجھایا تھا۔ کتنا غلط راستہ اُس نے اختیار کیا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس کی ملاقات سلیم درّانی سے ہو گئی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اپنی بیوی پر کتنا ظلم کر رہا تھا وہ۔

اجنبی شخص زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی کی مظلومیت پر افسوس کر رہا تھا۔

ان کے کانوں میں نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز پڑی۔ دونوں چہل قدمی سے یک بیک رک گئے۔ باپ بننے کی خوشی دونوں کے دلوں میں بسی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اونچ نیچ، امیر غریب اور ذات پات کی دیواریں توڑ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہے تھے۔ دل کی دھڑکنوں سے باپ بننے کی خوشی آشکارا تھی۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کے دل میں، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، جاہل ہو یا تعلیم یافتہ یکساں دھڑکن بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

دونوں دل ہی دل میں اپنے اپنے خدا اور بھگوان کو پکار رہے تھے۔ ایک کے دل میں لڑکے کی تمنا تھی تو دوسرا بالخصوص لڑکا یا لڑکی سے بالاتر ایک ننھی سی ہنستی بولتی گڑیا کا طلب گار تھا۔ ان کے دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا، جس میں وہ ڈوب کر ابھر رہے تھے۔ باپ بن جانے کے بعد انسان کو اس قدر فخر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی سے سنہرے تمغے ملنے

پر بھی نہیں ہوتا۔ سلیم درّانی خوشی سے جھوم رہے تھے اور اجنبی شخص کی بھی قلبی واردات کچھ اسی قسم کی تھی۔ اگر اس شخص کو بعد میں معلوم ہوگا کہ اس کا لڑکا نہیں بلکہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو کیا اس کو کوفت نہیں ہوگی؟ وہ پھر آئندہ سال اپنی بیتی کو لے کر یہاں آئے گا اور اسی طرح بچوں میں اضافہ کرتا رہے گا خدا کرے کہ اس کا لڑکا ہی پیدا ہو۔ سلیم درّانی دل ہی دل میں اُسے دعائیں دے رہے تھے۔

دونوں زچہ خانے کے دروازے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔ کون کہے گا کُھل جا سِم سِم۔ کب کُھلے گا یہ دروازہ۔ ان کی ساری اُمیدیں اُن کے خواب اور مستقبل سب کچھ بند تھے۔ ایک ایک لمحہ ان کے لیے ایک ایک یُگ سے کم نہیں تھا۔ انتظار کی گھڑیاں کس قدر اذیت ناک ہوتی ہیں۔ یہ کوئی ان سے اس وقت پوچھتا۔

زچہ خانہ کا دروازہ اب کُھل گیا تھا —
دونوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ایک سفید پوش نرس زچہ خانہ کے باہر آئی۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں اپنی اپنی بیویوں کی صحت کے بارے میں اور لڑکا ہوا یا لڑکی جاننے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ نرس اسی طرح گردن جھکائے کہنے لگی۔ "بچہ ٹھیک ہے۔ لیکن ماں کو بہت کوشش کرنے کے باوجود بچایا نہیں جا سکا —" بس اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ اور دروازہ بند ہو گیا اس کے بعد زچہ خانے سے دردِ زہ سے کراہنے کی ایک اور آواز آنے لگی۔

کس کی بیتی کو بچایا نہیں جا سکا؟ دونوں خاموش تھے۔ ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے، لیکن زبانیں گنگ تھیں۔ ایک دوسرے سے دریافت کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ نرس نے اس بارے میں کوئی صاف بات نہیں کہی تھی۔ موت کا سوگ دونوں پر طاری تھا۔ جُدائی کا درد دونوں محسوس کر رہے تھے۔ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے کو تسلّی بھی دینے کی ہمّت بھی ان میں نہیں تھی۔ اور پھر تسلّی بھی دیں تو کس کو دیں اور کس بات کی۔ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ جو اب منجدھار تک پہنچ گئی تھی۔ اب کون ڈوبتا ہے اور کون کنارے لگتا ہے۔ یہ دیکھنا ہے۔

سلیم درّانی سوچ رہے تھے کہ کیا واقعی نیلوفر اُنہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ضرور اپنی گود میں بچّہ لے کر زچہ خانے سے باہر آئے گی۔ گاؤں سے ماں آج ہی پہنچنے والی ہیں — پوتا یا پوتی کو دادی گود میں اُٹھائے گی اور بے تحاشا چومنے لگے گی۔ سلیم درّانی کی چھوٹی سی دنیا مسکرا اُٹھے گی۔ ہو سکتا ہے اس اجنبی کی بیتی چل بسی ہو۔ اے میرے خدا ایسا ہی ہو۔ اب سلیم درّانی کتنے ظالم بن گئے تھے۔ چند لمحے قبل وہ دعا دے رہے تھے کہ اس اجنبی شخص کا لڑکا ہی پیدا ہو اور اب اس کی بیتی کی مَوت کی دُعا مانگ رہے تھے۔ انسان کس قدر خود غرض ہوتا ہے جب اپنے پر آبنتی ہے تو وہ دوسروں کی پروا نہیں کرتا۔ کچھ دیر پہلے جس شخص کو اپنا ہم سفر سمجھ رہے تھے، اب وہ شخص دشمن نظر آنے لگا تھا۔ وہ شاید بھول گئے کہ وہ اجنبی بہت دُور کسی گاؤں کا ہے اور گھر میں تین بچّوں کو چھوڑ کر آیا ہے۔ اس کے بچّے اپنی ماں کے لوٹنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر ماں انہیں چھوڑ کر چلی گئی تو ان بچّوں کو کون سنبھالے گا۔ اس علاوہ ابھی ابھی جو بچّہ پیدا ہوا ہے اُس کی کون پرورش کرے گا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں سلیم دُرّانی اُس اجنبی شخص کی بیتی کی مَوت کی دُعا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اجنبی شخص بھی کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلیم درّانی کی بیتی ہی مَوت کی آغوش میں پہنچ گئی ہے۔ یہ اس کی پہلی زچگی ہے۔ ہو سکتا ہے دردِ زہ کی تاب نہ لا کر دم توڑ گئی ہو، لیکن اس کی عورت تو تینوں بچوں کی ماں ہے۔ اور تجربہ کار عورت ہے وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ غریب سب کچھ جھیل سکتا ہے اور اوپر والا بھی غریبوں کو جلد نہیں اُٹھاتا۔ نازک اندام ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہے بھگوان ایسا ہی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بابو جی نوجوان ہیں۔ یہ پہلا بچّہ ہے۔ اگر کچھ ہو گیا تو وہ دوسری شادی کر کے گھر بسا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی بیتی مر گئی تو بچّے بے سہارا ہو جائیں گے۔ جب اُنہیں بھوک لگے گی تو انہیں تسلّی دینے کے لیے ان کی ماں نہ ہوگی۔ وہ کیسے ان بچوں کو بہلا سکے گا اور ان کی پرورش کر سکے گا۔ اس کے علاوہ اجنبی شخص یہ بھی سوچ رہا تھا کہ چند لمحے قبل وہ سلیم درانی کو تسلّی دے رہا تھا اور ان کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا اور اب وہ کیسے ان کی بیتی کی مَوت کی دعا مانگ رہا ہے۔ دونوں ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ دونوں کا فکر و خیال یکساں تھا۔

نرس زچہ خانے سے باہر وہیل اسٹریچر پر ایک ایک لاش لیے آرہی ہے۔ سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر تنی ہوئی تھی۔ دونوں اس گاڑی کی طرف دوڑ گئے۔ اور گاڑی کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے۔ دونوں پر غم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ ان کے بدن کانپ رہے تھے۔ زچہ خانے کے اندر سے بچّے کے رونے کی آواز آرہی تھی پر ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ لاش کے چہرے سے چادر ہٹانے کی دونوں کوشش کرنے لگے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور انہیں محسوس ہوا جیسے ہاتھوں کو فالج مار گیا ہو۔ وہ صرف ہاتھ بڑھائے سفید چادر سے ڈھکے ہوئے ایک مردہ وجود کو مایوس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کتنی سفید تھی یہ چادر بالکل سچائی کی طرح۔ یہ دونوں سچائی کا مقابلہ کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ دونوں پر خوف طاری تھا۔ ان میں سچائی کا مقابلہ کرنے کی قوت مفقود ہو گئی تھی۔ آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن لاش کے چہرے سے سفید چادر ہٹانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی . . . .

●●

محمد اسداللہ

لکھنے کی فرمائش پر

میرے چند دوست وقفے وقفے سے یہ فرمائش کرتے رہتے ہیں کہ تم صوری اعتبار سے خالص شاعر نظر آتے ہو، معنوی اعتبار سے بھی شاعر کیوں نہیں بن جاتے؟ آخر تم لکھتے لکھاتے کیوں نہیں؟ ممکن ہے اس طرح تمہارے اندر چھپا ہوا غالب، شیکسپیئر یا ٹالسٹائی باہر آکر لوگوں کو درسِ عبرت دینے لگے۔ میں ان تمام دوستوں کی خدمت میں اپنے دوست مسٹر اے ٹو زیڈ کا ادب کے متعلق یہ نظریہ پیش کرتا ہوں کہ آج کل جس قسم کی الّم غلّم چیزیں لکھی جا رہی ہیں، اسے دیکھ کر کچھ نہ لکھنا ادب کی زیادہ بڑی خدمت ہے۔ آپ کو میرے فن کار ہونے کا اعتراف ہے تو کیوں نہ میری اسی خدمت پر مجھے پدم شری یا ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ دے دیا جائے۔ یوں بھی میں نہ ادب برائے زندگی کا قائل ہوں نہ ادب برائے ادب کا بلکہ ادب برائے ایوارڈ کا حامی ہوں۔

لکھنے کے سلسلے میں میرا سب سے پہلا عذر، جو ممکن ہے، آپ کی نظر میں گناہ سے بدتر ہو، یہ ہے کہ میں ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ گاؤں میں گھاس اگتی ہے اور گھاس ہی کھودی جاتی ہے۔ ادبِ عالیہ فقط شہروں میں پیدا ہوتا ہے؛ بلکہ کوئی شہر میں بیٹھ کر گھاس کھودے تو وہ بھی ادب میں اضافہ کہلاتا ہے۔ یہ اضافہ آج کل ہماری زبان میں اس کثرت سے ہونے لگا ہے، جتنی کثرت سے جنگل میں گھاس بھی نہیں اگتی۔ شاید اسی لیے مسٹر اے ٹو زیڈ کہا کرتے ہیں: "سارا ادب اضافی ہو کر رہ گیا ہے"۔

دوستوں کے اصرار پر صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو میں اپنے آپ کو لکھنے پر آمادہ کرتا ہوں۔ افسانے کا پلاٹ گھڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سوچنے کے لیے سر کھجاتا ہوں۔ کوئی نادر آئیڈیا تو نہیں ملتا، بیگم کے سر کی ایک آدھ مہاجر جوں ہاتھ لگتی ہے، جسے فوراً ابدی نیند سلا دیتا ہوں۔ لکھتے وقت میرے سامنے مسائل کی ایک قطار کھڑی رہتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں سوچنے بیٹھتا ہوں تو بس سوچتا ہی چلا جاتا ہوں۔ لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس لامتناہی سوچ کے سلسلے کا خاتمہ ہوتے ہی جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو خیالات بھی سوچ کے ساتھ رخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔ جیسے وہ سوچ کی دُم ہوں۔ بعض لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ لکھ تو لیتے ہیں، سوچ نہیں پاتے اور بعض نہ سوچ پاتے ہیں نہ لکھ پاتے ہیں۔ پھر بھی ادیب بن جاتے ہیں۔ بعض رسالوں کی پرانی فائلیں یا مغربی ادیبوں کے تراجم انہیں باقاعدہ ادیب بنانے کے لیے کافی ہیں۔ ان میں سے بعض کے لیے سوچنا، لکھنا، پڑھنا اور ادیب ہونا امریکہ، افریقہ، یورپ اور آسٹریلیا ہی کی طرح چار مختلف برِاعظم ہیں۔ میرے ایک شناسا کے اس انکشاف پر کہ وہ لکھتا بھی ہے میں نے پوچھا: "کیا افسانے لکھتے ہو؟" بولا۔ "نہیں، صرف ناول لکھتا ہوں۔"

پھر کسی موقع پر دریافت کیا۔ "آپ نے منٹو کی کہانی 'موذیل' پڑھی ہے؟" کہنے لگا "نہیں۔ ہماری انگریزی اچھی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمیں مغرب کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔" پھر کسی دن غلطی سے پوچھ لیا کہ کیا تم نے قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" پڑھا ہے؟ تو ہتھے سے اکھڑ گئے اور آگ بگولہ ہو کر بولے۔ "تمہیں کتنی بار سمجھایا کہ ہم صرف لکھتے ہیں پڑھتے نہیں۔ اس کی ضرورت تم جیسے جاہلوں کو ہے۔"

میں نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا۔ "صاحب، آپ تو خفا ہو گئے میں نے تو بس اس لیے کہہ دیا کہ مس حیدر واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں۔" اس پر وہ صاحب کہنے لگے "بھئی جب ہم خود اتنا اچھا لکھ لیتے ہیں تو دوسروں کی چیزیں پڑھنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔"

معرفت ایورسٹ ہارڈویئر، ورُوڈ ۴۴۴۹۰۶ مہاراشٹر

گزشتہ دنوں میں نے بہت سر کھپایا اور ایک آڑی ترچھی نظم لکھ ماری۔ اور درد سے نڈھال سر کو تھام کر سوچا کہ شاعری واقعی سر پھروں کا شیوہ ہے۔ پھر ایک بزرگ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ حضرت اصلاح فرما دیجیے۔ وہ ہم پر بُری طرح برہم ہوئے۔ کہنے لگے کیا ہمیں حجام سمجھ رکھا ہے؟

عرض کیا "داڑھی کی نہیں، نظم کی اصلاح مقصود ہے۔ چنانچہ انہوں نے نظم پڑھنے کے بعد ایک زور دار ہنکار بھری اور کہا "یہ نظم ہے؟" اس سے تو چھ مہینے کی لاوارث جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اچھی ہوتی ہے۔ اگر یہ نظم ہے تو تم اس میں کیا کہنا چاہتے ہو۔ برخوردار پہلے پلاٹ بناؤ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ پلاننگ کے بغیر دنیا کے سارے کام ادھورے ہیں۔ پلاننگ کے بعد نظم بناؤ پھر ہمیں دکھاؤ۔ یوں اُلّو نہ بناؤ۔ اس کے بعد جو ٹوٹا ہوا تار جوڑا تو مسلسل آدھے گھنٹے تک فیملی پلاننگ پر لیکچر پلاتے رہے۔

آئندہ اس مجرد نسخے پر عمل کرنے کے نتیجے میں نظم کا پلاٹ تو عمدہ بن گیا اور اب بھی فائل میں چین کی نیند سو رہا ہے۔ البتہ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر وہ نظم کیا ہوئی جس کا یہ پلاٹ ہے۔

نوٹ:۔ وہ نظم آج تک گھر لوٹ کر نہیں آئی کسی صاحب کو کہیں نظر آجائے تو ہم تک پہنچانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ معقول انعام سے نوازا جائے گا بی نظم تم جہاں کہیں ہو فوراً گھر چلی آؤ۔ تم سے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ تمہاری امّی کی طبیعت سخت ناساز ہے۔ تمہاری یاد میں پچھاڑیں کھا رہی ہے۔

ان دنوں ادیب و شاعر بننے کے چکر میں ہمارے ذہن کی عجیب سی حالت ہو گئی تھی۔ ذہن میں محزونی کے عالم میں خیالات اس طرح گردش کرتے رہتے۔ جیسے دُرِ یتیم در در بھٹکا کریں۔ ہم سوچتے، کیا ادب بھی یتیم و اسیر خیالات کا ایک یتیم خانہ ہے؟ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا ذہن ایک مضمون قلم بند کر رہا ہے۔ پھڑپھڑاتے اوراق کا ڈھیر پورے کمرے میں سما گیا ہے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے۔ مگر ذہنی بخار اترنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قلم ٹیبل پر پڑا ہوا تھا لہٰذا دنیا جہاں تھی وہیں ہے۔ آخر کمرے میں تنہا میں ہوتا ہوں اور بھائیں بھائیں کرتے ہوئے در و دیوار اور خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بولتا ہوا دماغ۔ اور پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ڈھیلی ادوائن والی چارپائی جو چرمرا کر حرفِ شکایت زبان پر لے آتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں ایک ٹیپ ریکارڈر ہو جس میں تمام خیالات بھر دوں کیوں کہ قلم چلانا اور اس کے ہمراہ ذہن کا بھی چل نکلنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کی موجودگی میں دنیائے علم و ادب میری عظیم الشان کاہلی کے باوجود میرے افکارِ عالیہ سے محروم نہ رہے گی، جس کا میرے دوستوں کو بڑا ارمان ہے۔ لیکن ایک قباحت یہ ہے کہ کمرے میں تنہا بڑبڑاتا ہوا دیکھ کر، میرے جوش و خروش اور فلسفیانہ افکار سُن کر اہلِ خانہ کہیں مجھے مینٹل ہاسپیٹل میں بھرتی نہ کرا آئیں۔

بارہا ایسا بھی ہوا کہ میں نے کاہلی پر تین حرف بھیجے، لکھنے کے لیے تیار ہوا اور آدھی آدھی رات جاگ کر ایک آزاد نظم سپردِ قلم کی اور کاغذ سرہانے رکھ کر سو گیا۔ صبح جو ذرا دیر میں آنکھ کھلی تو آزاد نظم کی آزادی ملاحظہ فرمائی کہ آنگن میں بندھی بکری "روایت" کے کھونٹے میں پھنسی رسی تڑا کر بصد ناز کمرے میں چلی آئی ہے اور آزاد نظم والے کاغذ کی جگالی میں مصروف ہے۔ نظر پڑی تو نظم کا ایک تہائی حصہ بکری کے حلق سے نیچے اُتر چکا ہے (جو دیگر قارئین کے حلق سے نیچے ہرگز نہ اُترتا) اور اب کاغذ کے اگلے سرے پر لکھا ہوا نظم کا عنوان "موت کے منھ میں" بکری کے منھ سے باہر لٹک رہا ہے۔ جب تک ہمارا ہاتھ وہاں پہنچا عنوان بھی نظم سے جا ملا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ راجعون۔

آخری چیز جس کے آگے سب بے بس ہیں وہ ہیں مدیر رسالہ۔ ان لوگوں کو تخلیقات اشاعت کے لیے ارسال کی جائیں تو اکثر ان کے ساتھ منسلک تعریفی خط علیحدہ کر کے چھاپ دیتے ہیں اور تخلیق کو اُلٹے پیروں واپس کر دیتے ہیں۔ اسی لیے بیشتر لکھنے والے تعریفی خطوط ہی مدیروں کے نام بھیجتے ہیں۔ کیوں کہ یہ شئے لطیف آج تک کبھی معذرت کے ساتھ واپس نہیں ہوئی۔ واقعتاً اسی معذرت کے خوف نے ہمیں لکھنے سے ایک مدت تک محفوظ رکھا۔ یہی سر درد ہمارے ایک پہلوان قسم کے دوست کو بھی ہے۔ دراصل ایک مقامی رسالے کے ایڈیٹر انہیں کسی طور پاس پھٹکنے ہی نہ دیتے تھے۔ ہم سے شکایت کرنے لگے تو ہم نے بات ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ یار! ہمارے محلے کے تمام کنویں نمکین ہیں۔ ہمارے گھر جب بھی دال پکتی ہے تو میٹھے پانی کے لیے ہم محلے کی بڑی باولی پر جاتے ہیں۔ اگر اس پرچے میں تمہاری بھی دال نہیں گلتی تو تم بھی اس بڑی باولی سے استفادہ کیوں نہیں کرتے؟

ہمیں کیا خبر تھی کہ موصوف ہمارے اس مذاق کے تئیں اس قدر سنجیدہ ہو کر عمل پیرا ہوں گے۔ دوسرے دن سرِ شام محلے میں شور اُٹھا کہ باولی کے قریب سے گزرتے ہوئے "ایڈیٹر صاحب" کو کسی نے دھکا دے کر باولی میں گرا دیا۔

کچھ دیر بعد پوری خبر موصول ہو گئی کہ باولی نے ایڈیٹر صاحب کو معذرت کے ساتھ واپس کر دیا ہے کہ مضمون پامال تھا۔

نام کتاب: چراغِ نیم شب

مصنف: سلیم احمد

صفحات: ۱۲۰ قیمت: ۲۵ روپے
نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ ۱۹۸۶

نام کتاب: خاموش آواز

شاعر: جاں نثار اختر

صفحات: ۸۰ قیمت: ۲۵ روپے
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال

نام کتاب: اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری

قمر جہاں

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۴۵ روپے
قمر جہاں، ریڈر شعبۂ اردو، سندو تی میلا کالج،
بھاگلپور (بہار) ۱۹۸۷

نام کتاب: لمعاتِ سہا

مولانا سہا مجددی

صفحات: ۱۵۲ قیمت: ۱۸ روپے
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۸۵

نام کتاب: کلامِ حامد

حامد سعید خاں

صفحات: ۱۱۰ قیمت: ۱۲ روپے
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال

نام کتاب: اشعارِ نادر اشہر

منشی پربھولال گوڑ اشہر

صفحات: ۱۷۶ قیمت ۱۸ روپے
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال

نام کتاب: انتخاب غزلیات (برائے بی اے سال اول)

مرتبین: مختار شمیم، اظہر راہی، فضل تابش

صفحات: ۴۸ قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے
مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال ۱۹۸۶

نام کتاب: کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار

مہ نور زمانی بیگم

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۴۵ روپے
مہ نور زمانی بیگم، لیکچرر شعبۂ اردو، بنگلور یونیورسٹی
بنگلور ۱۹۸۷

نام کتاب: تحقیقات وتاثرات

اکبر رحمانی

صفحات: ۱۹۲ قیمت: ۳۵ روپے
اکبر رحمانی، جلگاؤں ۱۹۸۷

نام کتاب: محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے

مرزا اکبر علی بیگ

صفحات: ۲۵۵ قیمت ۴۰ روپے
ادارۂ شعر و حکمت ۸۶۵-۶-۱۱، ریڈ ہلز، حیدرآباد ۱۹۸۷

نام کتاب: انگبین

قیصر زیدی

صفحات: ۱۳۶ قیمت: ۲۰ روپے
مکتبۂ کائنات، ۴۱-امام بارہ لین، رشید مارکیٹ
ایکسٹینشن، دہلی ۵۱ - ۱۹۸۷

سلیم احمد ایک دولت مستعجل تھے۔ شاعری، تنقید، ڈرامے، مضامین، کالم، ریڈیو فیچر غرض جس میدان میں قدم اٹھایا اپنا نقش چھوڑا۔ اور ۱۹۸۳ء میں ۵۶ سال کی عمر میں نقاشِ ازل سے جا ملے۔ سلیم احمد کے مجموعے "چراغِ نیم شب" کی افادیت دُہری ہے کیوں کہ اس کے شروع میں سلیم احمد اور ساقی فاروقی کے چند خطوط بھی شامل ہیں، جن سے قدیم وجدید، کلاسکیت اور رومانیت اور خود سلیم کے فکر وفن پر روشنی پڑتی ہے۔

ساقی فاروقی خاص الخاص جدید تے ہیں۔ سلیم احمد کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کاش میں آپ کی غزل سے بھی اتنا خوش ہوتا جتنا کہ آپ کی شخصیت اور تنقید سے .... جو چیز آپ کی شاعری کا دامن پیچھے ہی پیچھے کی طرف کھینچتی رہتی ہے وہ آپ کی کلاسکیت ہے ... اگر تجربہ جدا ہے تو اس کے الفاظ بھی جدا ہوں گے۔ یعنی لفظوں کی نشست و برخاست اور آہنگ اپنا ہونا چاہیے۔ آپ کے یہاں گاہے گاہے ایسا ہوا ہے۔ ۹۰ فی صد نہیں ہوا ہے"۔

اس کا جواب سلیم احمد یوں دیتے ہیں: "انگریزوں کی آمد کے بعد سے ... ہماری تہذیب اندر اور باہر سے ٹوٹنے لگی۔ جدیدیت کی تاریخ دراصل اس شکست و ریخت کے مختلف مرحلوں

کی تاریخ ہے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ جدیدیت تین تحریکوں میں ظاہر ہوئی۔ حالی اور آزاد کی تحریک، ۱۹۳۰ء کے جمال پرستوں کی تحریک، ۱۹۳۶ء میں نیا ادب یا ترقی پسند تحریک۔ تقسیم ہند کے بعد سے جدیدیت کا عمل اور زیادہ تیزی سے گہرا ہونا شروع ہوا اور ایسے افراد پیدا ہونے لگے جو اپنے ماضی اور روایت سے نہ صرف بیگانہ ہیں بلکہ اس کو مکمل طور پر رد کرنا چاہتے ہیں۔

"دوسرا رخ یہ ہے کہ معاشرے میں جہاں ایک طرف ماضی اور روایت سے ٹوٹنے کا عمل ہو رہا ہے وہاں دوسری طرف ماضی اور روایت سے جڑنے کا عمل بھی جاری ہے۔ اقبال، جوش، فراق یہاں تک کہ غزلوں والے فیض تک اس عمل کی نمائندگی کرتے ہیں . . . .

"یوں میرے وجود کے دو حصے ہو گئے۔ ایک شعوری حصہ جو واضح طور پر روایت اور ماضی کے حق میں ہے، دوسرا لاشعوری حصہ جس پر جدیدیت کے اتنے ہی اثرات ہیں جتنے کسی اور ایسے فرد پر جو میری تاریخ پیدائش کے لگ بھگ پیدا ہوا ہو۔

"میری کلاسیکی شاعری کی ناکامی یہ نہیں ہے کہ وہ کلاسیکی ہے۔ اس کی ناکامی یہ ہے کہ وہ میرے شعور کی کوشش ہے اور اس میں لاشعور صرف کہیں کہیں شریک ہوا ہے۔ علاج یہ ہے کہ تاریخ، کلچر اور تجربہ شعور کے پل سے گزر کر لاشعور تک پہنچیں اور پوری شخصیت میں سرایت کر جائیں۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں صرف شاعری ہی میں نہیں، زندگی میں بھی نظم و ضبط کو جذبات کے کھلے ڈلے اظہار پر فوقیت دیتا ہوں۔ نئی نسل کو میری شاعری میں ویسے جذبات نہیں ملتے، جن سے وہ خود کو Identify کرتے ہیں تو وہ مجھ سے مایوس ہوتی ہے۔ لیکن تربیت یافتہ جذبات کی قلبِ ماہیت کا عمل میری غزلوں میں بھی بہت ہوا ہے اور میں اسے اپنا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں۔"

سلیم احمد ایک طرف تو "لاشعور کی شاعری" کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف شاعری میں "نظم و ضبط" کی۔ ایک تو شاعری میں "جذبات" کی جگہ "نظم و ضبط" کا لانا ٹی ایس ایلیٹ کا نظریہ ہے جسے اردو شاعری میں منطبق کرنا محلِ نظر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "تربیت یافتہ جذبات کی قلبِ ماہیت" ورڈز ورتھ کے الفاظ Emotions recollected in tranquility کی یاد دلاتا ہے۔ پھر لاشعوری شاعری اگر ارادتاً کی جائے تو وہ لاشعور کی نہیں بلکہ شعور کی شاعری ہو جائے گی اور اس پر وہی الزام وارد ہو سکتا ہے جو فراق پر کیا گیا تھا کہ وہ تو "سوچ سوچ کر" شعر کہتے ہیں۔

سلیم احمد کی تنقید سے اختلافِ رائے ہو سکتا ہے لیکن اُن کی شاعری سے نہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کون دفناتا اُسے، وہ اک برہنہ لاش تھی
سب نے پوچھا کون ہے وہ کون سے لشکر کا ہے

سوچتا رہتا ہوں میں تیری اُڑانیں دیکھ کر
یہ ہوا کا زور ہے یا تیرے بال و پر کا ہے

ساری کڑیاں توڑ دیں میں نے محبت کے سوا
کون توڑے گا اِسے، یہ جبر تو اندر کا ہے

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے
گھاس اس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے

خموشی کے صحن ہیں اور سناٹے کی دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں جن کو گھروں میں ڈر نہیں لگتا

یہ ممکن ہے وہ اُن کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

آسماں کے تاروں میں آگ یہ کہاں ہوگی
آدمی سلگتا ہے، آدمی کی حسرت میں

اُفق پر جا ملیں گے آسماں سے
یہ کتنا فاصلہ ہوگا یہاں سے

ہوا نے دی درِ ویراں پہ دستک
کئی پرچھائیاں نکلیں مکاں سے

سلیقہ جس کو مرنے کا نہیں ہے
وہ اُٹھ جائے ہمارے درمیاں سے

محبت، ہجرت اور موت یہ سب جذبات کے موضوعات ہیں، جو نہایت لطیف و موہوم محسوسات کے ساتھ۔ ایک بالکل نئے لہجے اور سادہ، واضح اور روشن پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ جدید ذہن کو یہ اظہارِ بیان کلاسکیت میں رچ بس جانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ سلیم احمد نے واقعی تربیت یافتہ جذبات کی قلبِ ماہیت کا حق ادا کیا ہے۔

مشاہیر اپنی خود نوشت سوانح کی بہ نسبت اپنے خطوط میں، خصوصاً اپنے عشقیہ خطوط میں بہت کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہ اور بحث ہے کہ ایسے خطوط کو چھاپنا چاہیے یا نہیں۔ بہرحال ایک بار جب یہ خطوط چھپ جاتے ہیں تو (شعر کی طرح) وہ عوامی ملکیت ہو جاتے ہیں اور ہر ایک اُن پر تبصرہ کرنے کا اور اُن کے ذریعے لکھنے والے کی شخصیت اور ذہن تک پہنچنے کا حق دار ہو جاتا ہے۔

جاں نثار اختر کے جو خطوط (خاموش آواز) اپنی پہلی بیوی صفیہ کے نام ہیں وہ خالص محبت اور جذبے کے خطوط ہیں جو صفیہ کے والہانہ خطوط (زیرِ لب) کا بھرپور جواب ہیں۔ لیکن دوسری بیوی خدیجہ کے نام اُن کے خطوط ادبیات زیادہ ہیں اور ذاتی کم۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے وہ محبوب کو ذہنی طور پر مسخر کرنا چاہتے ہیں اور پھر اُسے پیار کے قابل بنا کر پیار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے پگ میلیون

ناميلکس بھی کہہ سکتے ہیں (پگ میلیون وہ بُت تراش تھا، جس نے ایک نہایت حسین عورت کا بُت تراشا۔ بُت میں جان پڑ گئی اور وہ اُس پر عاشق ہو گیا۔) چنانچہ ایک جگہ محبوب نے کسی کے بارے میں رشک کا اظہار کیا ہے تو جاں نثار اختر نے اس پر خوش ہونے کی جگہ اُسے بدگمانی کا نام دے کر محبوب کو خاصی ڈانٹ پلائی ہے۔ بہرحال ان خطوط سے جاں نثار اختر کی پڑھی لکھی، مہذب اور حساس شخصیت ضرور اُبھرتی ہے۔ خطوط کی دلچسپی نہ صرف اُن کی ذاتی نوعیت میں ہے بلکہ ایک شاعر اور معلّم کی زندگی کی اونچ نیچ اور مشاہیر پر اُس کے بے لاگ تبصروں میں بھی ہے۔ جن کے بارے میں اُسے کبھی گمان نہ ہوگا کہ وہ شائع بھی کیے جائیں گے —

ان تبصروں میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی پر اُن کے تبصروں کے چند اقتباسات درج ہیں:

"تم نے علی عباس حسینی کے ناول "شاید کہ بہار آئی" پر جو رائے لکھی ہے اس سے ظاہر ہے نہ میں اختلاف کر سکتا ہوں نہ اتفاق — تمہیں معلوم ہے میں نے تو یہ ناول پڑھی ہی نہیں ہے۔ البتہ اُنھوں نے بعض بڑے خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔ اتنا جانتا ہوں... بہرحال لکھنے کا ڈھنگ اُنھیں ضرور آتا ہے۔ ناول نگاری اُن کے بس کی ثابت ہوئی یا نہیں یہ تم جانو۔" (ویسے یہ ناول اور ایک ناول "ندیا کنارے" فرمائش پر لکھے گئے تھے اور حسینی خود اُنھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ راقم اس کی تصدیق کر سکتا ہے کیونکہ علی عباس حسینی اس کے والد تھے)

"کرشن سے ہم اُن کے موضوع پر اس سے بہتر کہانی کی توقع کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اُنھوں نے جو زیادہ لکھنے کو خوبی بنا لیا ہے، یہ اُنھیں نقصان پہنچا رہی ہے۔ وہ اگر کم لکھیں اور پوری کاوش و محنت کے ساتھ۔ تو آج بھی اُن کی ٹکر کا کوئی افسانہ نگار مشکل سے ملے گا۔ مجھے اگر کرشن کے علاوہ کسی اور کے افسانے اپیل کرتے ہیں تو احمد ندیم قاسمی کے۔"

"پہلی بات یہ کہ جان لو کہ میں نے اُنھیں (قرۃ العین حیدر کو) بہت زیادہ نہیں پڑھا، جو کچھ پڑھا ہے، اس کی بنیاد پر اجمالاً تمہیں اپنے تاثرات لکھ رہا ہوں۔ اُن کے لکھنے کا دائرہ دراصل بورژوا طبقے کی زندگی تک محدود ہے، لیکن یہ خیال رہے کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ البتہ سوال اپروچ کا ہے۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے وہ بورژوا طبقے کو پورا سماج تصور کر بیٹھی ہیں۔ یا کم سے کم سماج کا نمائندہ طبقہ سمجھتی ہیں اور اسی تصور کی بنا پر اُن کے ناولوں اور افسانوں کا زندگی سے غیر حقیقی رابطہ ہوتا ہے۔"

"تمہاری عصمت چغتائی کا تنقیدی شعور بہت کچا ہے۔ وہ افسانہ نگار ضرور اچھی ہیں، لیکن "چوتھی کا جوڑا" لکھنے کے بعد سے تو افسانہ نگاری بھی اُن کی ختم ہو کے رہ گئی ہے۔ بہرحال ایک افسانہ نگار کا اچھا تنقید نگار ہونا بھی تو کوئی ضروری نہیں۔"

اور آخر میں مجاز کی موت پر (مجاز صفیہ کے بھائی اور جاں نثار اختر کے سالے بھی تھے) بہت بڑا شاعر، بہت پیارا دوست، بہت اچھا انسان... میں نے اُسے ہر حال میں دیکھا۔ خوش، غمگین، بے کیف، مدہوش، مطمئن، غیر آسودہ، بے حال، دیوانہ، متین، متفکر، بے نیاز ناز کرتے ہوئے بھی اور ناز اُٹھاتے ہوئے بھی۔ نہ جانے کتنی تصویریں اس ایک تصویر سے اُبھر رہی ہیں۔ میں اُس کی زندگی کو سوچتا ہوں تو سمجھ نہیں سکتا کہ زندگی زیادہ ظالم ہے یا موت۔"

اگر سلیم احمد کو دولت مستعجل کہا جا سکتا ہے تو اختر شیرانی (۴۸ - ۱۹۰۵ء) کو کیا کہا جائے گا جو ۴۳ سال کی مختصر مدت میں اتنا کچھ تخلیق کر گئے کہ وہ نو شعری مجموعوں اور چھ نثری تصانیف پر مشتمل ہے۔ دنیا عام طور پر اختر شیرانی کو رومانی شاعر کے طور پر یاد کرتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر قمر جہاں نے اُن کی جنسی شاعری پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ گو کہ اُنھوں نے سلیم احمد کے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ:

"اختر شیرانی کی شاعری اوپر والے دھڑ کے جوڑے کی چوما چاٹی کی داستان ہے —"
(شیخ سدو کا بکرا اور اختر شیرانی)

ڈاکٹر قمر جہاں نے اس سلسلے میں احتشام حسین کی رائے بھی نقل کی ہے:

"اختر شیرانی کا عشق افلاطونی اور جنسی محبت دونوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس کی ابتدا تو جنسی اور جسمانی محبت سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کی معراج تخیلی محبت ہے، جہاں محبوبہ سے زیادہ محبت کا دھیان آتا ہے، جہاں معشوقہ نہیں، عشق سب کچھ بن جاتا ہے۔"

سلیم احمد نے اختر شیرانی کو ایک ایسا Monster بنا کر پیش کیا ہے جو جنسی جذبہ محسوس تو کر سکتا تھا لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا جواب ڈاکٹر قمر جہاں نے نہیں دیا ہے۔ اور وہ بھی اس نتیجے پر پہنچتی ہیں،

"لیکن اختر حقیقت سے رومان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ محبوبہ کو یاد کرتے کرتے اس کے خوب صورت تصور میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ پھر محبوبہ کے بجائے صرف تصور ہی تصور رہ جاتا ہے اور یہی کمزوری اُن کے فن کو یکگانہ بنا دیتی ہے۔ جیسے جیسے ہم سن بلوغ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، اُن کا تاثر اور کیف کم ہونے لگتا ہے۔ یہ ہمارے جذبات کی پوری آسودگی نہیں کر پاتی ہے۔ ایک طرح کی تشنگی اور تھکا دینے والی یکسانیت کا احساس اکثر اُن کے قاری کو بور کرنے لگتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری حافظ اور امراء القیس کے فن کے قریب پہنچ کر بھی اُن کے مدمقابل نہیں کھڑی کی جا سکتی۔"

ڈاکٹر قمر جہاں نے اختر شیرانی کا بہت محنت

سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن دراصل اختر شیرانی کی رومانیت اور جنسیات پر اب کافی لکھا جا چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے پہلوؤں پر لکھا جائے جن سے ابھی تک سیر حاصل بحث نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً وطن کی مٹی سے اُن کے پیار پر یا جذبۂ حریت پر جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں :-

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

گو کہ بقول آل احمد سرور، آزادی کے نام پر مرنے مارنے کی آرزو بھی دراصل اختر شیرانی کی رومانیت کا ایک پہلو ہے۔

اختر شیرانی کے ایک ہم عصر اور ہم وطن سید ممتاز احمد سہا مجددی ۱۸۶۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۴۷ء میں وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ اُن کا قد مشکل سے ۲½ فٹ کا تھا۔ لیکن اُن کے ادبی قد کاٹھ اور کردار کے بارے میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں :

"سہا کیا تھے کیونکر بتاؤں۔ وہ اپنے کلام میں اس قدر نمایاں نہیں جس قدر اپنے کردار میں نمایاں تھے۔ گفتنی امور میں بعض اوقات بہت کم جان ہوتی ہے اور ناگفتنی سننے کے لیے بڑی جان دار سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے میں اس کی شرح نہیں کروں گا کہ سہا جیسے ننھے منے انسان کے اندر کس قدر بڑائیاں تھیں۔ ان کی طبیعت میں شاعری کا کس قدر رچاؤ تھا۔ اور اس "لقامت کہتر" انسان کے سینے میں بے پناہ جرأت و بے باکی کا کس قدر زبردست کوہِ آتش فشاں دہک رہا تھا۔ "لمعاتِ سہا" سے سہا کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

قصہ وہ ازل کا تھا اب یاد کسے ہوگا
اِک بار یہاں ہوتی پھر انجمن آرائی

فنا کے آغوش میں ہے ہستی، خزاں محیطِ بہارِ ہستی
چراغ تو جل رہے ہیں، لیکن ہوا کے جھونکوں میں جل رہے ہیں

نہیں دیر و حرم کی قید کوئی وضع داری ہے
کہ ہم جس آستاں پر جا پڑے اُٹھا نہیں جاتا

اُٹھتے تو کہاں جاتے جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر ترے گھر کے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

کوئی تم کو کیا جانے، اور ہاں، بظاہر تم
ناسزا نہیں کہتے، ناروا نہیں کرتے

میں غریب کیا کہتا تم کو آرزو دشمن
ورنہ تم جو کرتے ہو، آشنا نہیں کرتے

سہا شاعر کے علاوہ شارحِ کلامِ غالب بھی تھے اور ایک زمانے میں اُن کی شرح "مطالب الغالب" کی بڑی دُھوم تھی۔ لہٰذا اُن کے کلام میں غالب کی بحروں کا استعمال اور آہنگ و مضامین غالب کی بازگشت اور جھنکار کا سنائی دینا ایک فطری امر ہے۔

سہا کے کلام کا دیباچہ جوش ملیح آبادی نے اور اُن کی ذات اور فن پر ایک سیر حاصل مضمون اختر سعید خاں نے لکھا ہے۔

اختر سعید خاں کے والد حامد سعید خاں بھوپالی، سہا مجددی کے دوست اور ہم عصر تھے۔ اُن کے دیوان "کلامِ حامد" کا دیباچہ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے۔ حامد کی شاعری میں بھی کلاسیکیت کا رچاؤ اور پختگی، فکر کی گہرائی اور ندرتِ ادا پائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

رُکے رُکے سے ستارے ڈرا ڈرا سا جہاں
مگر مزاجِ جنوں برہمی پہ آیا ہے

خدا ہی خیر کرے رازِ کائنات کی اب
تمام عمر میں دیوانہ مسکرایا ہے

اسیر اب کہیں ان تیلیوں سے رُکتے ہیں
قفس میں اہلِ چمن کا پیام آیا ہے

حیراں ہوں کہ اب وسعتِ کونین کیا ہوئی
اُٹھنے کو تو اُٹھ آئے ترے آستاں سے ہم

حجابِ راہ ہیں دیر و حرم مگر پھر بھی
مِری نظر سے تری رہ گزر نہیں چھپتی

ہمارے سابقین میں اکثر صالحین ایسے گزرے ہیں جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا بہت پیارا نمونہ پیش کرتے تھے۔ اُنہیں میں ایک منشی پربھو لال گوہرا شہر اجینی تھے۔ آپ ایک ایسے برہمن تھے، جو نہ صرف اردو فارسی کی تدریس میں مشغول رہے بلکہ مسلمانوں کو کلمہ، نماز، روزہ اور عملیات کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ کے دیوان "اشعار نادر اشہر" میں غزل، نظم، تضمین، حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، مراثی، سلام، نوحے غرض کہ وہ سب کچھ شامل ہے، جس سے اسلام سے آپ کی گہری واقفیت اور تصوف سے آپ کے لگاؤ کی عکاسی ہوتی ہے۔ زبان میں لکھنؤ کی سلاست اور حلاوت ہے جس کا فطری سبب یہ ہے کہ آپ شاعری میں حضرت کیفی کاکوروی جانشین حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

وہ باقی رہا جو فنا ہو گیا
خودی جس نے چھوڑی خدا ہو گیا

ہم سے جو کوئی ملا، دل سے ملا
اور نا خوش کوئی مشکل سے ملا

خدا کا آسرا ہے بے کسوں کو
نہیں کوئی کسی کا بے کسی میں

مرا سایہ بھی مجھ سے بھاگتا ہے
ہوا ہے کون کس کا مفلسی میں

دل اک آئینۂ عالم نما ہے
تماشا ہے خدائی کا اسی میں

شفاعت ہیں خیر البشر کرنے والے
قیامت کا میدان سر کرنے والے

تمہارے ولی ہیں تمہارے وصی ہیں
جو تھے جنگِ خیبر کو سر کرنے والے

کلیم آپ کے طور پر کیوں وہ آئیں
جو ہیں لامکاں کا سفر کرنے والے

تنہا، حامد اور اشہر کا کلام مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال نے شائع کیا ہے۔ دیگر کتابوں کے علاوہ اکیڈمی نے درسی کتب بھی شائع کی ہیں، جن میں انتخاب غزلیات برائے بی اے سال اوّل: مرتبہ مختار شمیم، اظہر راہی اور فضل تابش پیش نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش ہے۔ لہٰذا ولی ہے تو سراج نہیں، میر و درد ہیں تو سودا و سوز نہیں، آتش ہیں ناسخ نہیں۔ غالب و مومن ہیں ذوق نہیں۔ داغ ہیں امیر و شاد و چکبست نہیں۔ حسرت و فانی، جگر و فراق ہیں، یگانہ عزیز و آرزو نہیں۔ اور فراق تک پہنچتے پہنچتے گاڑی رک جاتی ہے۔ امید ہے کہ اس کی تلافی انتخاب برائے سال دوم میں کر دی گئی ہو گی۔ البتہ جو غزلیں انتخاب کی گئی ہیں اُن سے اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔

بھوپال سے آگے مہاراشٹر اور آندھرا تک پہنچے تو پروفیسر اکبر رحمانی نے "تحقیقات و تاثرات" میں اقبال، ٹیگور اور لمعہ حیدرآبادی کے تعلقات کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا علی اکبر بیگ نے محمد عزیز مرزا کی شخصیت، حیات اور کارنامے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مرلوزر زمانی بیگم نے کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مرلوزر زمانی بیگم نے ایم فل کی ڈگری کے لیے کرشن چندر کے ناولوں کے نسوانی کردار پر مقالہ لکھا تھا۔ اسی کو ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت دی ہے۔ لیکن اُن کا انداز بیانیہ ہے یعنی کرداروں کی تفصیل تو دی گئی ہے، لیکن اُن کے تجزیے و توجیہہ کی مدد سے کرشن کے فکر و فن کے بارے میں کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت جو حیدرآباد میں ہوئی ہے ادنیٰ درجہ کی ہے۔

اس کے برعکس پروفیسر اکبر رحمانی کی کتاب "تحقیقات و تاثرات" جس کی کتابت و طباعت مالیگاؤں میں ہوئی ہے، نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس میں چند خصوصی مضامین اقبال، پریم چند اور احتشام حسین پر ہیں۔ اقبال کے سلسلے میں "اقبال، ٹیگور اور لمعہ حیدرآبادی" خاصے کی چیز ہے۔ اس میں ٹیگور کا ایک نایاب خط مورخہ ۷ رفروری ۱۹۳۳ء ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی کے نام شامل ہے، جس میں ٹیگور نے اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"بارہا مجھے اس چیز نے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ رویہ اُس ادب کے متعلق بالکل غلط ہے جو انسانی دل و دماغ کے عالم گیر پہلو سے بحث کرتا ہے اور اس طرح تمام ملکوں اور زبانوں کے شعراء اور اہلِ فن کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں، ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام کرنے والے دو دوست ہیں اور اُس جگہ ایک ہو جاتے ہیں، جہاں انسانی دماغ اپنا بہترین ہدیہ "جاودانی انسان" انسان کے حضور میں پیش کرتا ہے۔" (ترجمہ اکبر رحمانی)

اقبال کے ایک خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور لاہور میں اقبال سے ملنے اُن کے گھر گئے تھے، مگر اقبال شہر کے باہر گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا ملاقات نہ ہو سکی۔

محمد عزیز مرزا پر ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی کتاب میں حقِ تحقیق ادا کیا گیا ہے۔ مصنف کی دیدہ ریزی کے باعث ہمارے سامنے عزیز مرزا کی مستند اور بھرپور دلآویز اور عالمانہ شخصیت اُبھر کر آتی ہے۔ اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے بارے میں ہر بیان اور دعوے کو شواہد اور ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور یہ حزم و احتیاط اچھی تحقیق کا خاصہ ہے۔

قیصر زیدی کے بارے میں "آج کل" چند خصوصی مضامین اکتوبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع کر چکا ہے۔ "انجمن" قیصر زیدی کے شعر و نثر کا وہ انتخاب ہے جو عقیل الغروی صاحب نے پیش کیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں: "یہ فن پارے خود فن کار کا انتخاب نہیں ہیں اور نہ فن کار کے پورے فنی سرمائے کو پیشِ نظر رکھ کر انتخابات کیے گئے ہیں۔ بس یہ ہے کہ چند ملاقاتوں کے طفیل میں جو کچھ میرے سامنے آیا اُسے یک جا کر کے اربابِ ذوق و شعور کی نذر کر رہا ہوں۔" معلوم نہیں موصوف کو یہ کارِ خیر انجام دینے کی کیا عجلت تھی۔ راقم کو قیصر زیدی صاحب کی خدمت میں گزشتہ تیس سال سے نیاز حاصل تھا۔ اور وہ اُن کی علمیت اور نیکی دونوں کا قائل ہے۔ شاید اسی لیے دل میں خیال آتا ہے کہ گو کہ عقیل الغروی صاحب یہ کتاب شائع کر کے اپنی دانست میں قیصر زیدی کو خراج عقیدت پیش کر کے سرخرو ہو گئے، لیکن اس سے قیصر زیدی کا کوئی بھلا نہ ہوا۔ (مہدی عباس حسینی)

اہم قدم :

یوں تو آپ نے آج کل کے بہت خاص نمبر شائع کیے اور عوام و خواص میں مقبولیت کی سندیں حاصل کیں۔ لیکن جدید ہندی کہانی نمبر سچ مچ ایک نہایت اہم قدم ہے۔ آپ نے اردو دنیا کو ہندی کی چند نہایت شہکار کہانیوں سے روشناس کرایا ہے۔ انتخاب اور ترجمہ دونوں کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس کی بیشتر کہانیاں زندگی سے اس قدر قریب اور جڑی ہوئی ہیں کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اس کہانی میں شامل ہے یا جھیل رہا ہے دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے (وشنو پربھاکر) وانگ چو (بھیشم ساہنی) لوٹتے ہوئے (راجندر یادو) یہی سچ ہے (منو بھنڈاری) ہارا ہوا (سلیش مٹیانی) کاربو جلتی کا صندوق (رماکانت) ڈیفوڈل جل رہے ہیں (مردُلا گرگ) ترچھ (اُدے پرکاش) اور ہیلیم (للت کارتکیے) نے بہت متاثر کیا۔ ان میں ایک ایک کہانی ایسی ہے کہ اس پر کئی صفحات سیاہ کر دیے جائیں اور اس کے بعد بھی تشنگی کا احساس باقی رہ جائے خاص کر 'دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے' کا اختتامیہ۔ 'یہی سچ ہے' میں کردار دیپا کا ذہنی Conflict 'ہارا ہوا' میں گنڈا مل پہلوان کا کردار اور اس کی ذہنی کشمکش اور ماضی کی یاد اور 'ڈیفوڈل جل رہے ہیں' میں جنا کے زندگی گزارنے اور موت کو گلے لگانے کا انداز نرالا انوکھا اور پُر تاثیر ہے۔ 'وہ نہیں آئے' میں بھی فن کار ایک باپ کی نہایت حقیقی تصویر کشی کی ہے، جس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ 'ترچھ' میں اُدے پرکاش نے آج کے بے حس معاشرے کو بے نقاب کر دیا ہے اور اس گلدستہ کی آخری کہانی 'ہیلیم' کا منظر اور مکالمے تو بھولتے ہی نہیں۔ کیا نقشہ پیش کیا ہے۔ لگتا ہے آج کے ادیب، شاعر یا ایسے لوگوں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے، جنہوں نے مادی حصول کو اپنی زندگی کا شیوہ نہیں بنایا ہے۔ غرض کس کس کی تعریف کروں؟ ایک جملہ جناب مشرف عالم ذوقی کے بارے میں ضرور لکھوں گا کہ انہوں نے ہندی سے اردو ترجمہ کرتے وقت ایک اعلیٰ معیار کا تخلیق کار ہونے کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ نند کشور وکرم کے بارے میں کیا لکھوں کہ وہ پہلے سے ہی شہرت یافتہ اور مستند ہیں۔ کہانیاں طوالت کے باوجود قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ اور شاید یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آپ کا شمارہ اردو حلقے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور ایک بار پھر مبارک باد!

م۔ ق۔ خاں، گیا، بہار

قیمتی، بے مثال :

بہت لمبے انتظار کے بعد آج کل کے ہندی کہانی نمبر کے ساتھ میں گھر لوٹا۔ آج کل کے 'جدید ہندی کہانی نمبر' کے سرورق، موضوع، مواد، انتخاب، ترجمہ اور ان سب کے معیار نے بہت متاثر کیا۔ اتنا بھرپور اور ضروری نمبر ہم سب کو مبارک ہو۔

نو کہانیوں نے میرے ذہن میں چند مختلف دائرے بنائے ہیں اور ہر دائرے کی اپنی حیثیت ہے۔ قیمتی، بے مثال — ! کوئی کسی سے کمتر نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہر دائرے میں فکر و فن اور اس کے بیان کے اعتبار سے تین تین کہانیاں اپنی مخصوص ترتیب کے ساتھ یوں اُبھرتی ہیں :

دائرہ نمبر ۱ : ۱۔ یہی سچ ہے (منو بھنڈاری) ۲۔ وانگ چو (بھیشم ساہنی) ۳۔ ڈیفوڈل جل رہے ہیں (مردُلا گرگ)

دائرہ نمبر ۲ : ۱۔ کاربو جلتی کا صندوق (رماکانت) ۲۔ انسان کا لمس (سریش اُ...) ۳۔ چلغوزے (پربھیشور مدان)

دائرہ نمبر ۳ : ۱۔ ترچھ (اُدے پرکاش) ۲۔ ٹریفک جام (سنجیو) ۳۔ ہیلیم (للت کارتکیے)

اور عبدل بسم اللہ کی کہانی "مہمان دیوتا سمان" ایک بہت بڑی سماجی اور فنی ذمہ داری کی پُروتی ہے۔

ہندی کہانی اور آج کی ہندی کہانی' مضامین دونوں قیمتی ہیں۔ راجندر یادو سے بات چیت دلچسپ ہے۔ سرورق خوبصورت اور پُرکار ہے۔

انور ندیم، لکھنؤ

گہری معنویت :

موجودہ سماجی ڈھانچے اور انسانی نفسیات کے پس منظر میں اس نمبر کی کہانیاں گہری معنویت رکھتی ہیں۔ وشنو پربھاکر کی "دھرتی ابھی گھوم رہی ہے" بھیشم ساہنی کی "وانگ چو" عبدل بسم اللہ کی "دیوتا سمان" ایسی کہانیاں ہیں، جن سے تلخ سماجی حقائق عریاں ہو جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ آج کی اس مہذب د

میں بھی ہمارا ڈھانچہ اور ثقافتی احساس کتنا ناقص ہے۔ شیلش مٹیانی کی "ہارا ہوا" رماکانت کی "کاربو جلنتی کا صندوق" برجیشور مدان کی "چلغوزے" گری راج کشور کی "وہ نہیں آئے" جیسی کہانیاں انسانی نفسیات کی گرہوں کو چابک دستی سے کھولتی ہیں۔ راجندر یادو کی "ٹوٹتے ہوئے" منو بھنڈاری کی "یہی سچ ہے" مردلا گرگ کی "ڈیفوڈل جل رہے ہیں" عورتوں کے بنیادی جذبات کی اچھی نباضی کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں مشاہدے اور تجربے کا بڑا انوکھا اظہار ہوا ہے۔ بعض کہانیاں تو ایسی ہیں جو قارئین کو معلومات بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ مثلاً اُدے پرکاش کی 'ترچھ' یا سریش انیال کی "انسان کا لمس" ان کہانیوں سے کافی حد تک کہانی کاری کے نئے امکانات روشن روشن ہوتے ہیں۔ قاری کو صرف نئی فکر ہی نہیں ملتی۔ معلومات کا ذخیرہ بھی ہاتھ آتا ہے۔ پنکج بشٹ کی "آویدن کرو" سنجیو کی "ٹریفک جام" اور للت کارتکے کی "ہیلیم" بھی ہمیں کہانی کی دنیا میں نئی دنیا دکھاتی ہیں۔

آپ نے جدید ہندی کہانیوں کا جو انتخاب پیش کیا ہے، وہ ہماری توجہ کو کہانی کی نئی سمتوں کی دل کشی کی طرف مبذول کراتا ہے۔ یہ انتخاب بزرگ و برنا دونوں کہانی کاروں کا ہے، اس لیے ہندی کہانی کی اچھی نمائندگی کرتا ہے۔ مشاق فن کاروں کے ساتھ نئے اور نوجوان کہانی کار بھی فن کی خراد پر چڑھ کر کھرے اُترنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتے ہیں۔

کہانیوں کے تقریباً سارے ترجمے اعلیٰ معیار کے ہیں۔ ان کا اردو قالب ترجمہ نہیں طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔

جدید ہندی کہانی نمبر سے متعلق ارچنا ورما اور اُدے پرکاش کے مقالے بھی کافی معلوماتی اور وقیع ہیں۔

راجندر یادو سے مشرف عالم ذوقی اور خورشید اکرم نے جو انٹرویو لیا ہے وہ بھی بڑا جاندار ہے۔ کیوں کہ اس میں موزوں، روشن اور ذہین سوالات پوچھے گئے ہیں۔ ارچنا ورما اور اُدے پرکاش کے مقالوں کی کمی جو اردو افسانے کی بے ذکری سے متعلق تھی، یہاں دُور ہو جاتی ہے۔

محمد منصور عالم، آرہ

دستاویزی :

"جدید ہندی کہانی نمبر" ملا۔ آپ نے اُردو کے قارئین کی خاطر اس نمبر کو نکال کر بڑا کام کیا ہے۔

تقریباً تمام منتخب شدہ کہانی، ہندی کی اہم کہانی کہی جا سکتی ہے۔ کچھ کہانیوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مثلاً "دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے" (وشنو پربھاکر) "وانگ چو" (بھیشم ساہنی) "یہی سچ ہے" (منو بھنڈاری) "کاربو جلنتی کا صندوق" (رماکانت) "انسان کا لمس" (سریش انیال) اور "مہمان دیوتا سمان" (عبدل بسم اللہ) جیسی کہانیاں عصری حسیت کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کہانی آج کے موجودہ مسائل سے الگ نہیں۔ سریش انیال کا داستانی تجربہ بڑا خوب صورت ہے۔

ہندی کہانی نمبر ایک اہم Anthology ہے جس کی اپنی دستاویزی حیثیت ہے۔

قیصر زماں قیس، اگریڈیہہ (بہار)

بیدار عصری حسیت :

آج کل کا "جدید ہندی کہانی نمبر" اندھیرے میں اٹھا ہوا ایک جگمگاتا قدم ہے جو جدید ہندی افسانوی ادب کی بابت اردو کے قارئین میں صحیح افسانوی ہوش مندی اور عصری حسیت کو بیدار کرتا ہے۔

ہندی کے تاریخ ساز افسانہ نگار نرمل ورما اور کملیشور سے لے کر دودھناتھ، کاشی ناتھ سنگھ اور دوسرے لوگوں کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اس کے باوجود پرچہ بصیرت افروز اور آسودگی بخش ہے۔

تنویر سامانی، الہ آباد

بہار کا فرد :

اُردو میں تو آپ حضرات اپنی تنگ نظری اور عصبیت کا ثبوت دیتے ہی رہتے ہیں، لیکن ہندی کے ساتھ بھی آپ کا وہی رویہ ہوگا یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

کیا یہ "جدید ہندی کہانی نمبر" جدید ہندی کہانیوں کی نمائندگی کرتا ہے؟

جس طرح اردو کہانیوں کی منزل کے سپہ سالار بہار کے کہانی کار ہیں، اسی طرح ہندی کہانیوں کے ساتھ بھی ہے اور حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ یہاں کا ایک فرد بھی نہیں۔

آئندہ ایسے نمبر شائع کرنے سے گریز کریں۔

قیصر رضا، پٹنہ

تحفۂ عظیم :

"آج کل" کا جدید ہندی کہانی نمبر پڑھا۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیت کا میں پہلے بھی معترف تھا۔ آج فخر کرتا ہوں کہ آپ نے اردو والوں کو ایک گراں قدر نمبر عطا کیا ہے۔ "جدید ہندی کہانی نمبر" ایک دستاویز کی صورت سے محفوظ کیا جائے گا۔ اس نمبر کی نمائندگی محترم وشنو پربھاکر کی کہانی "دھرتی اب بھی گھوم رہی ہے" کرتی ہے۔ یہ کہانی ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ

بقیہ صـ۲ـ پر

اُردو کا مقبول عام مصوّر ماہ نامہ

آج کل

ایڈیٹر: راج نرائن راز

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد : ۴۶
شمارہ : ۱۰
مئی ۱۹۸۸ء بیساکھ جلیشٹھ شک سمت ۱۹۰۹
قیمت : تین روپے فون : ۳۸۷۰۶۹

سرورق : ضیا فیضی

اندرونِ ملک : زرِ سالانہ : ۲۰ روپے، دو سال کے لیے : ۳۶ روپے، تین سال کے لیے : ۴۸ روپے
اسسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن : آر۔ ایس۔ منچال
مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
ترسیلِ زر کا پتہ : بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اگیئے نمبر

ترتیب

لاکھوں افراد کے لیے خواندگی

ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے سماجی قوتوں کو یک جا کرنے اور عوام کو شریک کرنے کے معینہ مدت کا پروگرام " قومی خواندگی مشن " شروع کیا گیا۔ اس مشن کی شروعات کے سلسلے میں ایسے ہی پروگرام ریاستی راجدھانیوں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور اضلاع و پروجیکٹ کی سطحوں پر منعقد کیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی کام کاج کے لائق خواندگی کا عوامی پروگرام بھی شروع کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں این۔ سی۔ سی، نیشنل سروس اسکیم، نہرو یووک کیندروں اور بھارت اسکاؤٹ گائیڈ کے تقریباً پانچ لاکھ طالب علم رضاکار شرکت کریں گے۔ ان رضاکاروں کو خواندگی سے متعلق ساز و سامان مفت فراہم کیا جائے گا۔ اس مشن کے لیے دس ہزار نوجوان کارکنوں کو تربیت دینے کا پروگرام بھی شروع کیا جائے گا۔

قومی خواندگی مشن کا مقصد سیاسی وابستگی سے قطع نظر سماج کے تمام طبقوں کو اس کام میں شریک کرنا ہے۔ ٹریڈ یونین، رضاکار تنظیمیں، نوجوان، خواتین، مسلح افواج کے اراکین اور دیگر افراد کو بھی اس مشن میں شامل کیا جائے گا۔ اس مشن کا مقصد لاکھوں عوام، خاص کر ۱۵ سے ۳۵ برس کی عمر کے لوگوں کی زندگی اور ماحول کے معیار میں تبدیلی لانا ہے۔ اس سماجی مشن کی خاص توجہ دیہی علاقوں، درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے طلبا، نیز خواتین اور سماج کے کمزور طبقوں پر ہوگی۔ کیوں کہ خواندگی ترسیل اور انسانی وسائل کی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے اس مشن سے بالآخر ملک کی مجموعی ترقی میں مدد ملے گی۔

چیلنجوں کی سمتیں :

خواندگی کا مذکورہ قومی پروگرام ناخواندگی کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ناخواندہ افراد کی تعداد ماضی میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ عام کرنے اور تعلیم بالغان پر خاص توجہ دیے جانے کے باوجود برابر بڑھ رہی ہے ۔ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ سماجی اور اقتصادی پس ماندگی اور ناخواندگی کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنی مدد آپ کے پراجیکٹوں کے لیے دی جانے والی اقتصادی امداد کا بھی پورا فائدہ نہیں اٹھا پائے ہیں۔ دیہی ترقیات اور عوامی شرکت سے متعلق پروگراموں پر اب چونکہ کافی زور دیا جا رہا ہے، اس لیے قومی خواندگی مشن کو اب عوام کے رہن سہن اور کام کاج کے حالات کو خصوصی طور پر دیہی اور پسماندہ علاقوں میں بہتر بنانے سے پانچ قومی ٹیکنالوجی مشنوں کے ایک حصے کے طور پر تیار کیا گیا ہے۔

قومی خواندگی مشن کے تحت ۱۵ سے ۳۵ برس کے عمر والے گروپ کے آٹھ کروڑ افراد کو کام کاج کے لیے تعلیم دینے کی تمام کوششیں کی جائیں گی جن میں سے ۳ کروڑ کو ۱۹۹۰ء تک اور بقیہ ۵ کروڑ کو ۱۹۹۵ء تک اس لائق بنایا جائے گا۔ ان افراد کے اندر قومی یک جہتی، اتحاد، خواتین کی مساوات، ماحولیات کے تحفظ اور چھوٹے کنبے کی افادیت سے متعلق اقدار کو قبول کرنے اور انہیں فروغ دینے کا شعور بیدار کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔

مسلسل تعلیم :

قومی خواندگی مشن کے تحت مسلسل تعلیم میں "جن شکشا نیلایم" کا ایک نیا تصور بھی ہے۔ ایک "نیلایم" تقریباً ۵ ہزار آبادی والے چار یا پانچ گاؤں کے لیے ہوگا۔ نیلایم میں شام کی کلاسیں، لائبریری ریڈنگ روم، کھیل کود، جسمانی سرگرمیاں، ثقافتی پروگرام اور ٹیلی ویژن اور وی سی آر کی سہولیات کے ساتھ ایک ترسیلاتی مرکز کی سہولت بھی مہیا کی جائے گی۔ متعدد موضوعات پر عمل اور آسان تربیت کے پروگرام ہوں گے اور ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں ایک ہی جگہ سے تمام اطلاعات مہیا کی جائیں گی۔

آجرین، ٹریڈ یونینوں، یونیورسٹیوں، کالجوں اور پالیٹیکنکوں کو بھی توسیعی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ مذکورہ پروگرام کے علاوہ بڑے پیمانے پر کتابوں سے استفادہ کرنے کے فروغ کے پروگرام بھی شروع کیے جائیں گے۔ تعلیمی اداروں میں لائبریریوں اور ریڈنگ روم کو عوام کے لیے شام کو کھول دیا جائے گا۔

قومی خواندگی مشن کے تحت پڑھانے اور سکھانے کے لیے بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ان سہولیات میں نئی قسم کی سلیٹیں، گلوب، نقشے، ریڈیو کیسٹس، سلائیڈس اور فلموں وغیرہ کا استعمال بھی شامل ہے۔ جلد سکھانے والی موجودہ تکنیکوں کا جائزہ لیا جائے گا اور خواندگی کے بعد والے اور مسلسل

تعلیم کے شعبوں کو بہتر بنایا جائے گا۔ مشن پروگرام کے انتظام، پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی، اعداد و شمار کا تجزیہ وغیرہ کرنے میں کمپیوٹروں کا استعمال بھی کیا جائے گا۔

قومی خواندگی مشن کے تحت بالغ افراد کے لیے تعلیمی مراکز گاؤں یا محلّہ کی سطح پر کام کریں گے۔ مقامی علاقہ کا ایک شخص آٹھ سے دس تک مراکز کی نگرانی کرے گا اور اُسے پریرک کہا جائے گا۔ یہ جن "شکشا نیلایم" کے ذریعے خواندگی کے بعد کے پروگرام بھی بنائے گا۔ ضلع کی سطح پر ضلع تعلیمی بورڈ تمام منصوبہ بندی اور انتظام کے لیے ذمہ دار ہوگا۔ ضلعی وسائلی یونٹ، تکنیکی وسائل فراہم کرے گا۔ ضلع تعلیمی بورڈ مختلف اداروں کے درمیان ذمہ داری کا بھی تعین کرے گا۔ اور ضلعی وسائلی یونٹوں کی مکمل رہنمائی بھی کرے گا ضلعی وسائلی بورڈ ضلع کی سطح پر تکنیکی امداد فراہم کرے گا۔ اور کارکنوں کو تربیت بھی دے گا۔

مذکورہ یونٹ بنیادی اور خواندگی کے بعد کے پروگراموں کے لیے ساز و سامان تیار کرے گا یہ یونٹ ذرائع ابلاغ کی مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کریں گے اور اس کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔

ملک کے چالیس اضلاع کو تکنیکی جان کاری کی نمائش کے لیے منتخب کیا گیا ہے اور خواندگی کی کوششوں کے لیے تکنیکی دریافت فراہم کرنے کی غرض سے ملک کے سائنسی اور ٹیکنولوجیکل اداروں کا اشتراک حاصل کرنے سے متعلق انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ خیال ہے کہ دیگر اضلاع میں اس کے استعمال سے قبل ان چالیس اضلاع میں نئے طریقوں اور نئے تکنیکی ساز و سامان کو آزما لیا جائے۔ یہ ملک میں خواندگی بالغان کے ضمن میں اعلیٰ تخلیقی کوششوں میں سے ایک ہے اور اس سے پروگرام کو کافی مدت سے درکار عملی امداد مہیا کیا جانا متوقع ہے۔

ملک میں شرمک ودیا پیٹھ نظام روزگار مہیا کرانے والوں، ٹریڈ یونینوں اور محنت کشوں کی بہبود کے مراکز کے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ایک ادارے کی حیثیت سے کام کرے گا اور اُن اداروں کو شریک کرے گا جو کام کاج کے لائق خواندگی کے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ کارکنان اور ان کے کنبوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے متعلقہ تعلیمی پروگراموں کا اہتمام بھی کریں گے۔ ضرورت پڑنے پر شرمک ودیا پیٹھ ادارے اپنی ہم خیال ایجنسیوں کی مدد بھی لیں گے۔ ۱۹۸۷-۸۸ء کے دوران شرمک ودیا پیٹھ نے ضرورتوں پر مبنی کورسوں کا اہتمام کیا اور صرف دسمبر ۱۹۸۷ء تک تقریباً ۹۰۷۹۷ لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔

تربیتی ادارے:

رضاکار اداروں، یونیورسٹیوں، ٹریڈ یونینوں، نہرو یووک کیندروں اور سماجی اور محنت سے متعلق تحقیقی اداروں کو تربیتی اداروں کے طور پر نشاندہی کی جائے گی۔ ہر ادارہ ۵۰ سے ۷۵ افراد کو ہر برس منتخب کر کے تین ہفتوں کی تربیت دے گا۔ مذکورہ تربیت یافتگان، سماجی ترقی سے وابستہ نوجوان، سابق فوجی پنچایت کے اراکین اور دیگر فرض شناس افراد ہوں گے۔ جن میں خواتین کی تعداد پورے گروپ کا تقریباً تیسرا حصہ ہوگی۔ تربیت یافتہ افراد میں سے ۲۰۰۰ سے ۲۵۰۰ افراد قومی خدمت سے متعلق اسکیم پوری مدت یا تھوڑی مدت کے رضاکاروں کے طور پر خواندگی پروگرام کی کارکردگی کے انسپکٹروں اور تعلیم کے سرگرم کارکنوں کے طور پر کام کریں گے۔ رضاکار تنظیموں کی تعداد ۱۹۸۷-۸۸ء کی ۳۰۰ کے مقابلے میں تجاوز کر کے ۱۹۸۹-۹۰ء میں ایک ہزار ہو جانے کی توقع ہے۔ مذکورہ تنظیموں کی نشاندہی ریاستی حکومتوں، سماجی بہبود کے بورڈوں، کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن، سماجی اور تحقیقی مراکز — جیسے راجستھان میں تلونیا اور الموڑہ میں اتراکھنڈ سیوا ندھی ہیں، کے ذریعے کی جائیں گی۔

ترغیب کے سلسلے میں ذرائع ابلاغ عامہ کا کردار:

ذرائع ابلاغ عامہ، قومی خواندگی مشن میں عوامی اشتراک پیدا کرنے کے لیے بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ دیہی تعلیمی کمیٹیاں اور جتھے یا ثقافتی کارواں 'طلبا'، اساتذہ اور فن کار دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ کر کے عوام کو ان کے حقوق اور خواندگی کی اہمیت سے واقف کرا سکتے ہیں۔ سماج کے محروم طبقات کے مفاد کے لیے خصوصی فلمیں بھی تیار کی جائیں گی۔

مالی اخراجات:

قومی خواندگی مشن کے اخراجات کا تخمینہ ۱۹۹۰ء تک ۵۵۰ کروڑ روپے ہو جانے کی توقع ہے۔ مذکورہ تخمینے کی رقم میں سے ۳۴۰ کروڑ روپے کے اخراجات مرکز اور ۲۱۰ کروڑ روپے ریاستیں برداشت کریں گی۔ مرکز میں انسانی وسائل کی ترقیات کے مرکزی وزیر کی قیادت میں تعلیم بالغان کا ایک قومی ادارہ قائم کیا جائے گا اور ریاستی سطحوں پر بھی ایسے ہی ادارے قائم کئے جائیں گے۔

●

آجکل کا سچدانند ہیرانند واتسیاین اگیے نمبر پیشِ خدمت ہے۔ گیان پیٹھ انعام یافتہ مصنفین پر خصوصی گوشوں کی اشاعت کا جو سلسلہ ہم نے بھارتیہ گیان پیٹھ کے تعاون سے شروع کیا تھا، اسے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا مناسب ہوگا۔ یہ خاص نمبر ہم نے گزشتہ برس اگیے جی کے انتقال کے بعد شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خواہش تھی کہ اردو قارئین کو ہندی ادب کی اس قد آور شخصیت، اس عہد آفریں شاعر و ادیب کی سبھی تخلیقی جہات سے مؤثر انداز میں متعارف کرایا جائے۔ جیسے جیسے اس نمبر کا کام آگے بڑھا

(بقیہ ص پر)

آل کہ...

نام: سچدانند ہیرانند واتسائن اگیئے

پیدائش: ۷ر مارچ ۱۹۱۱ء

سفر کویتا کا...

۱۔ بھگن دوت ۱۹۳۳ء

۲۔ چنتا ۱۹۴۲ء

۳۔ اتّے لم ۱۹۴۶ء

۴۔ ہری گھاس پر چھن بھر ۱۹۴۹ء

۵۔ باورا اہیری ۱۹۵۴ء

۶۔ اندر دھنش روندے ہوئے یہ ۱۹۵۷ء

۷۔ اری او کرونا پربھامئے ۱۹۵۹ء

۸۔ آنگن کے پار دوار ۱۹۶۱ء

۹۔ پوروا (اتّے لم اور ہری گھاس پر چھن بھر)

۱۹۶۵ء

۱۰۔ سنہلے شیوال ۱۹۶۵ء

۱۱۔ کتنی ناؤں میں کتنی بار ۱۹۶۷ء

۱۲۔ کیونکہ میں اُسے جانتا ہوں ۱۹۶۹ء

۱۳۔ ساگر مدرا ۱۹۷۱ء

۱۴۔ مہاورکش کے نیچے ۱۹۷۲ء

۱۵۔ پہلے میں سناٹا بُنتا ہوں ۱۹۷۳ء

۱۶۔ ندی کی بانک پر چھایا ۱۹۸۲ء

۱۷۔ ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے

۱۸۔ سدانیرا

سفر کہانی کا... (پہلی کہانی ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی)

۱۔ وپتھگا ۱۹۳۷ء

۲۔ پرمپرا ۱۹۴۴ء

۳۔ کوٹھڑی کی بات ۱۹۴۵ء

۴۔ شرنارتھی ۱۹۴۸ء

۵۔ جے دول ۱۹۵۱ء

۶۔ یہ تیرے پرتی روپ ۱۹۶۹ء

۷۔ سمپورن کہانیاں (دو حصّے) ۱۹۷۵ء

ناول کی دنیا...

۱۔ شیکھر: ایک جیونی

پہلا حصّہ ۱۹۴۱ء

دوسرا حصّہ ۱۹۴۴ء

۲۔ ندی کے دویپ ۱۹۵۲ء

۳۔ اپنے اپنے اجنبی ۱۹۶۱ء

تنقیدی مضامین کے مجموعے

۱۔ ترِشنکو ۱۹۴۵ء

۲۔ سب رنگ ۱۹۴۶ء

۳۔ آتم نے پد ۱۹۶۰ء

۴۔ ہندی ساہتیہ - ایک آدھونک

پری درشیہ ۱۹۶۷ء

۵۔ سب رنگ اور کچھ راگ ۱۹۶۹ء

۶۔ البالا ۱۹۷۱ء

۷۔ لکھی کاغذ کورے ۱۹۷۲ء

۸۔ ادیہ تن ۱۹۷۷ء

۹۔ جوگ لکھی ۱۹۷۷ء

۱۰۔ سوتنتر ۱۹۷۸ء

۱۱۔ سروت اور سیتو ۱۹۷۹ء

۱۲۔ ویکتی اور ویوستھا ۱۹۷۹ء

۱۳۔ اپ ردیھ ۱۹۷۹ء

۱۴۔ یگ سندھیوں پر ۱۹۸۱ء

۱۵۔ دھارا اور کنارے ۱۹۸۲ء

۱۶۔ سمرتی لیکھا ۱۹۸۲ء

۱۷۔ کہاں ہے دوارکا ۱۹۸۲ء

۱۸۔ چھایا کا جنگل ۱۹۸۵ء

ڈرامہ...

۱۔ اُتر پریہ درشی ۱۹۶۷ء

سفرنامہ:

۱۔ ارے یایاور رہے گا یاد ۱۹۵۳ء

۲۔ ایک بوند سہسا اُچھلی ۱۹۶۰ء

۳۔ اتنش ۱۹۷۵ء

ڈائری...

۱۔ بھونتی ۱۹۷۲ء

۲۔ انترا ۱۹۷۵ء

۳۔ ساسوتی ۱۹۷۹ء

ترجمے...

۱۔ آئی بوایندرک کا دونیری ٹرس اپلی فینٹ

۲۔ روماں رولاں کا ویویکانند

۳۔ دارینیگیشن (جینیندر کمار کے تیاگ پتر کا انگریزی ترجمہ)

۴۔ رویندر ناتھ ٹیگور کے "گورا" کا ہندی میں ترجمہ۔

۵۔ رویندر ناتھ ٹیگور کے "راجا" کا ہندی میں ترجمہ۔

۶۔ لاگرکیسٹ کا دا مرلی لینڈ (ہندی میں ترجمہ)

ادارت/ترتیب

۱۔ ہوم وتی اسمارک گرنتھ

۲۔ روپانبرا

۳۔ پُشکرنی

۴۔ تار سپتک

۵۔ دوسرا سپتک
۶۔ تیسرا سپتک
۷۔ چوتھا سپتک
۸۔ نہرو بر تھ ڈے بک
۹۔ بعد کی پیڑھی کے کویوں کی چینت شرنکھلا: رگھوویر سہائے، سرویشور دیال سکسینہ، اجیت کمار، شانتی مہروترا۔

انگریزی میں ....

۱۔ پریزنٹ ڈیز اینڈ ادر پوئمس ۱۹۴۶ء
۲۔ ٹو آئیج ہز اپنے اسٹرینجر (ناول) ۱۹۶۷ء
۳۔ فرسٹ پرسن، سیکنڈ پرسن (کویتائیں) ۱۹۷۱ء
۴۔ سائنس سائلنس ۱۹۷۶ء
۵۔ نیلامبری (فیگراِن بلو پوئمس) ۱۹۸۱ء
۶۔ آئی لینڈس اِن دا اسٹریم (ناول) ۱۹۷۹ء
۷۔ مکلینٹ کلے (ڈائری) ۱۹۸۲ء
۸۔ پریپیرنگ دگراؤنڈ (ڈائری) ۱۹۸۳ء

اگیئے کی تخلیقات کے ترجمے:

۱۔ جرمن۔ اشٹین ڈہ ونٹے۔ ایل۔ لو۔ تونزے ۱۹۷۶ء
۲۔ سوئیڈش۔ دین اور کینڈرے اگیئے: آرٹن آل وڈ ۱۹۸۱ء
۳۔ سیرب کروٹیشین: دریگو سلاو ایڈرک ۱۹۷۱ء

اعزازات:

ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۴ء
بھارتیہ گیان پیٹھ ۱۹۷۸ء
یوگوسلاویہ کا سب سے بڑا انعام "سورن مالا" ۱۹۸۳ء

آخری سفر:

۴ اپریل، ۱۹۸۷ء

(مرتب: مشرف عالم ذوقی)

بقیہ: اگیئے کی وساطت

یکسانیت دریافت کر کے ایک بار میں نے اگیئے ہی سے پوچھ لیا "ششی یا ریکھا کی خود سپرگی کی بنیاد پر شیکھر یا بھون جب اپنے مستقبل کی عمارت کھڑی کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں تو کیا ششی یا ریکھا ان کے لیے ذریعہ یا زیادہ سے زیادہ محرک بن کر نہیں رہ جاتیں؟"

جواب میں اگیئے نے کہا "میرے خیال میں شیکھر اور بھون کے کردار اور عورت کے متعلق ان کے نظریات میں فرق ہے۔ شیکھر یہ مانتا ہے کہ عورت اپنے پیار سے کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں بھی عورت کا اس طرح کا رول رہا ہے اور اس کے دل پر اس بات کا بوجھ بھی ہے۔ اس کو بنانے میں کوئی ٹوٹ جائے، اس میں جہاں وہ دان دینے والے کا احسان مند ہے وہاں اس وجہ سے پریشان بھی ہے کہ کیا وہ جتنا دے سکتا ہے، اس سے زیادہ اسے مل چکا ہے یعنی وہ عرصے تک مقروض بنا رہے۔ بھون کے جرم کا مقصد دوسرے طریقے کا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے۔ اس کی انا بھی شیکھر جیسی مضبوط نہیں ہے۔"

کسی کا دیر تک مقروض رہنا نہ تو شیکھر کو گوارہ ہے نہ اس کے خالق اگیئے کو اور نہ ہی ان کو بنیادی تحریک دینے والے والتسائن کو۔ نہ ناول میں اور نہ ہی زندگی میں۔ ان کی انا کا جذبہ اتنا مضبوط ہے کہ دیر تک مقروض رہ جانے کے تصور سے ہی وہ کانپنے لگتے ہیں۔ اور متعلقہ شخص سے وہ خواہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، نجات پانے کے لیے چھٹپٹانے لگتے ہیں۔ وہ ندی کے دو یپ ہی بنے رہنا چاہتے ہیں۔ فرد کو سماج کی اٹوٹ دھارا میں چھوڑ دینے کو قطعی طور پر تیار نہیں ہیں۔ انہیں اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ "بہیں گے تو ریت بن جائیں گے۔ بہیں گے تو رہیں گے ہی نہیں۔"

فرد کے لافانی ہونے میں گہرا یقین رکھنے والے اور اس کی انفرادیت کو سب سے برتر ماننے والے اگیئے کو یہ صورتِ حال کسی طور پر بھی قبول و گوارا نہیں۔

(ترجمہ: بلجیت سنگھ مطیر)

بقیہ: ملاحظات

نمبر کا خاکہ مختصر ہونے لگا۔ سبب ترجمے کی دشواریاں بنیں۔ کہانیوں اور افسانوی ادب کے تراجم دشوار نہ تھے، اُن پر لکھے گئے تنقیدی مضامین اور اگیئے کے ہی تنقیدی مضامین البتہ خاصی پریشانی کا سبب بنے۔ جن احباب نے ابتداً دستِ تعاون بڑھایا تھا، بعد میں معذرت خواہ ہوئے۔ کام بہر حال شروع ہو چکا تھا، جو خاصی تاخیر کے بعد اب مکمل ہوا ہے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ نمبر آپ کو کیسا لگا، اس بارے میں ہمیں آپ کی رائے جاننے کا اشتیاق رہے گا۔

اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں بھارتیہ گیان پیٹھ کے ڈائریکٹر جناب بشن ٹنڈن، بھارتیہ گیان پیٹھ کے سکریٹری جناب بال سروپ راہی، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق ریڈر ڈاکٹر ستیہ دیو چودھری، جناب دیویندر اسّر نے مفید مشورے دیے۔ ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

دُنیائے ادب میں آج کل کے خاص نمبر بڑی شہرت اور مرتبے کے حامل رہے ہیں۔ خاص نمبروں کی اشاعت کا اہم اور جامع منصوبہ جو ہمارے پیشِ نظر ہے، اس سے ہماری اس روایت میں یقیناً دور رس اور ہمہ جہت توسیع ہوگی۔ "جدید ہندی کہانی نمبر" اور "اگیئے نمبر" کے بعد جولائی میں ہم آج کل کا "پنجابی کہانی نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی اوّلین کوشش ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ یہ نمبر آج کل کے سابقہ نمبروں کی طرح بہت مقبول ہوگا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد کی صدسالہ تقریبات کے موقع پر ایک تاریخی نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ توقع ہے کہ یہ نمبر آزاد شناسی کے باب میں اضافہ خیال کیا جائے گا۔ اس میں مولانا کی شخصیت، خدمات اور کارناموں پر نئی جہات اور زاویوں سے روشنی ڈالی جائے گی۔

اسی برس "نئی تنقید نمبر" کی اشاعت کا منصوبہ بھی ہے۔ اس کی تیاریاں بھی شروع ہیں۔ یہ نمبر بھی اپنی نوعیت کا اُردو میں پہلا نمبر ہوگا۔ ان خاص نمبروں کے سلسلے میں ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

خاموشی کا پجاری اگیئے

وجے اگروال

سفید گھنی داڑھی، سفید بال، آنکھوں پر موٹا چشمہ، سفید کرتے پاجامے میں ملبوس کوئی شخص کسی ادبی نشست یا تقریب میں کسی گوشے میں سیدھا کھڑا نظر آئے تو تسلیم کرلیں کہ وہ اگیئے جی ہیں۔ حالانکہ اُنہیں سبھی جانتے ہیں۔ لفظوں کا یہ خاموش فن کار اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموشی کی روح میں سما گیا ہے۔ یقین نہیں آتا اور یقین کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ برف پوش ہمالیہ کی طرح صاف شفاف، بلند، ثابت قدم اور ناقابلِ شکست ایک وقیع، پُراعتماد شخصیت کے گل کر پانی میں تبدیل ہو جانے کی خبر پر بھلا کون یقین کرنا چاہے گا، لیکن دل کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔

اگیئے جی نے اپنے مضمون "پانی کے سور" میں لکھا تھا: "پانی کی آواز میرے حافظے میں کئی طرح سے محفوظ ہے۔۔۔۔ یک سناٹا مجھے سنائی دینے لگتا ہے۔ اس سناٹے کی بے شمار آوازیں ہیں۔ مجھے سناٹے کی طرح طرح کی آوازیں سننے کا تجربہ ہے" خاموشی کا یہ اظہار اگیئے جی کی پوری شخصیت اور ریاضت کی اساس ہے۔ ایک طرف پانی کی آوازوں کی یادیں دوسری طرف سناٹا اور سناٹے کی بھی لاتعداد آوازوں کو سننے کے لیے اُنہیں اپنے باطن کے سکوت کو اور کتنا گہرا، بردبار اور خالی کرنا پڑا ہوگا، سماعت کو مزید زود حس بنانا پڑا ہوگا۔ اس صبر آزما ریاضت ہی کی تکمیل پر کہیں ان میں سناٹے کی لاتعداد آوازوں میں امتیاز کرنے کی بے پناہ صلاحیت پیدا ہو سکی ہوگی۔ عام آدمی تو اطراف کا شور و غل تک نہیں سُن پاتا کیوں کہ اس کے حسی اعضا بتدریج سست ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ جو شخص سناٹے کی لاتعداد آوازیں سنتا ہوگا، اس کے حسی اعضا کس قدر لطیف اور تیز ہوں گے۔ یہی حساسیت آدمی کو شاعر بناتی ہے۔ اور اس حساسیت کی حدوں کی وسعت ہی شاعر کی وسعت بنتی ہے۔

اگیئے جی کے احساس کی وسعت سناٹے کی لاتعداد آوازوں کو محیط تھی۔ گزشتہ برس "ہزاری پرساد دویدی یادگار سلسلۂ تقاریر" میں اگیئے جی نے اچاریہ دویدی جی کے اس قول سے اتفاق کیا تھا کہ "پھول کا بھی آہنگ ہوتا ہے"۔ وہ تمام عالم آہنگ سے پُر مانتے تھے۔ آہنگ کا مطلب ہے، فطرت کا اپنے عمومی ضابطوں کے تحت مسلسل حرکت میں رہنا۔

ان کا کہنا تھا کہ محنت نہ کرنا ایک محنت ہے۔ اگر وہ آہنگ کے خلاف ہو۔ دل کی دھڑ میں آہنگ ہے۔ نبض کے چلنے، کلیوں کے چٹکنے اور پھولوں کے کھلنے میں آہنگ ہے۔ یہ آہنگ انتہائی لطیف اور نرم ہے۔ ہلکی سی آواز کی ہ سی ضرب بھی اس آہنگ کو توڑ سکتی ہے۔ آہ میں ایک حسن ہے اور آہنگ کا ٹوٹنا حُسن کا بکھر جانا جو اگیئے جی کو قطعاً قبول نہیں تھا۔ اس لیے وہ خا رہتے تھے تاکہ کہیں اندر کا آہنگ ٹوٹ کر حُسن کو پارہ نہ کر دے۔ شاید اسی لیے وہ سفید لباس زیب تن کرتے ہوں گے کہ کہیں کرنوں کے جذب ہونے سناٹے کی آفاقی آوازوں کو منتشر نہ کر دے۔

بلاشبہ اگیئے خاموشی کے پجاری تھے

بہت پہلے اُنہوں نے کہا تھا۔ "آپ باہری شور کا سامنا صرف خاموش رہ کر کر سکتے ہیں اور اگیئے تاحیات یہی کرتے رہے۔ ان کی ذاتی زندگی کو کر کئی حملے کیے گئے، ان کے ادب کو فراریت پسند کہا گیا، قدامت پسند کہا گیا، لیکن اگیئے نے آواز جواب آواز سے نہیں دیا۔ آوازوں کو اپنے اندر کرنے کے بعد ان کے خاموش ہونٹوں پر اُبھرنے سنجیدگی کے آثار ہی جواب کی شکل میں ظاہر ہو تے۔ وہ خاموشی کا ایک سرچشمہ گویائی تھے۔ جب

325 - X، سروجنی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

ے آوازوں کی بے شمار لہریں رواں رہتی تھیں ۔
دراصل خاموشی ہی ان کا اظہار تھی، یہ سکوت ظاہری
تھا اور باطنی بھی ۔ خاموشی کی ریاضت کوئی سہل
نہیں ہے ۔ یہ ایک طرح لفظوں کی ریاضت بھی ہے
پوری لفظوں کی ریاضت نہ کہہ کر آواز ۔ لفظ کی
ریاضت کہہ لیں ۔ لفظ ہی برہما ہے ۔ لفظوں کی
ریاضت ہی برہما کی عبادت ہے ۔ پرانے رشی منی
جب دور غاروں میں جاکر سکوت کے عالم میں
عبادت و ریاضت کرتے تھے تو وہ خود کو اندر سے
منضبط ہی تو کرتے تھے ۔ 'نفس' خیالات اور زبان
کا ضبط ۔ جب یہ تینوں منضبط ہوتے تو ان کی زبان
اتنی پرجلال ہو جاتی تھی کہ ان کے لفظ آواز نہ رہ
کر "وردان" یا "شراپ" بن جایا کرتے تھے ۔
زبان کا یہی ضبط ہے جو خاموشی اختیار کرنے سے
حاصل ہوتا ہے ۔ اگیئے ادب کی ایسی ہی ریاضت
کرنے والی ہستی تھے ۔ اور وہ اپنے زمانے کی واحد
ہستی تھے ۔ اگر سامنے والے کی کوشش سے
انہوں نے مونہہ کھولا بھی تو یوں جیسے نہایت
غور و فکر کے بعد کچھ کہنے جا رہے ہوں ۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی زبان سے ادا ہونے
والے 'الفاظ' سناٹے کی اتھاہ گہرائیوں سے اچانک
اچھلی ہوئی شفاف اور ٹھنڈے پانی کی بوندیں
ہوں ۔ شہر خموشاں کا سناٹا اپنے سکوت
ہی میں زندگی کے فانی ہونے کا سبق چیخ چیخ کر
دیتا ہے ۔ اگیئے جی بھی بغیر کچھ کہے بہت کچھ بلکہ سب
کچھ کہہ جاتے تھے ۔ "تار سپتک" میں انہوں نے
لکھا ہے: جو شاعر لفظ کی باطنی خصوصیات
کے تئیں ہوش مند نہیں وہ بامعنی لفظ کا متلاشی
نہیں ہے اور میں کہوں گا کہ وہ شاعر نہیں ہے
نہ ہوگا ۔ لفظ کی باطنی خصوصیات کے تئیں بھی
ہوش مندی اگیئے جی کو خاموش کر دیتی تھی ۔
پانی کم گہرا ہو تو اس کے بہاؤ میں گونج
ہوتی ہے جب کہ سمندر کا پانی خاموش اور ٹھہرا ہوا
معلوم ہوتا ہے ۔ جس کے باطن میں علم کی طلب کی آگ
روشن ہو، اس کی سطح پر رواں لہروں کا بہاؤ اس
کے اصل کو بھلا کیا بدلے گا ۔ جب کہنے کو بہت کچھ
ہوتا ہے تو انسان کچھ بھی نہیں کہہ پاتا ۔ لفظوں کو
زبان دینے کی اسی کشمکش میں خاموش رہنا انسان
کی مجبوری ہو جاتی ہے ۔ کیا نہیں ! کیسے کہیں !
انہیں سوالوں کے جواب کی تلاش میں انہوں نے
ادب کی نہ جانے کس کس صنف کی غواصی کی ۔ ہر
صنف اگیئے جی کے سکوت کا لمس پاکر لہرا اٹھی ۔
شگفتہ ہو گئی ، لیکن اگیئے جی خاموش رہے ۔ شاید
انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ بہترین تخلیق ابھی
لکھی جانی ہے ۔ اور وہ اسی ان کہے کی تلاش
میں تاحیات اندر ہی اندر خاموش رہ کر بھٹکتے
رہے ۔ بھٹک کر کچھ دریافت کر لینے کا کام آسان
نہیں ہوتا ۔ نہ جانے ماضی کے اندھیرے کے کن گوشوں
میں پڑی ، گرد بھری تہوں تک جانا پڑتا ہے ۔ پھر
اس جانچ پرکھ کے لیے جو ارتکاز چاہیے وہ خاموش
رہے بغیر ممکن نہیں ۔ اگیئے جی محقق تھے اور آخر
تک محقق رہے ۔ ادب ، ثقافت اور فلسفے کے نہ
جانے کتنے ان دیکھے گوشوں پر انہوں نے روشنی
ڈالی ۔

ہمارا ملک شمال کی سمت سے دشمنوں
کے حملے سے تحفظ کے احساس سے مطمئن ہے ۔
کیوں کہ ادھر ہمالیہ قدم جمائے کھڑا ہے ۔ اسی
طرح کوئی بھی ہندوستانی قومی و بین الاقوامی مذاکرات
میں ہندوستانی ثقافت اور ہندی زبان کی آبرو
کے ضمن میں یہ سوچ کر مطمئن رہتا تھا کہ وہاں
اگیئے موجود ہیں ۔ بلاشبہ بین الاقوامی ادبی
محاذوں پر اگیئے جی کی موجودگی ہندوستانیوں کے
لیے باعث اطمینان تھی ۔ اگیئے جی ہندوستانی
ثقافت کی دھڑکنوں کے مترادف تھے ۔ ان کی خاموش
موجودگی ہی ماحول میں سنجیدگی پیدا کرتی تھی ۔
ان کے آتے ہی شوخیاں ساکت ہو جاتی تھیں ۔
اور شور اگیئے کی ہی طرح سکوت میں تبدیل ہو جاتا
تھا ۔ یہ سب مشینی انداز میں بلا ارادہ اور خود بخود
ہو جاتا تھا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے ماحول پر
ان کی خاموشی کی دہشت طاری ہو گئی ہو اور سب
کچھ ان کی شخصیت کے متوازی منظم ہو گیا ہو ۔
جنہوں نے اگیئے جی کی تقریریں سنی ہیں انہوں نے
ان کی آواز کی خاموشی کا احساس کیا ہوگا ۔ منضبط
انداز میں ان کی آواز بغیر کسی اتار چڑھاؤ کے
ایک آہنگ میں جاری رہتی تھی ۔ خاموشی میں
لپٹی ہوئی ۔ آپ اگیئے جی سے اختلاف کر سکتے
تھے، لیکن ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے ۔
اگیئے اکیلے نہیں ، بلکہ اپنے ساتھ ایک پوری فضا
لے کر چلتے تھے ، جس سے متاثر ہوئے بغیر رہنا آسان
نہیں تھا ۔

اگیئے جی نے خود نوشت حالات زندگی نہیں
لکھے ۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ لکھ نہیں سکتے تھے ۔
یا لکھنا نہیں چاہ رہے تھے یا لکھنے کو کچھ تھا نہیں ۔
سچ شاید یہ ہے کہ اس سے ان کی خاموشی میں خلل
واقع ہونے کا امکان البتہ تھا ۔ سوانح حیات
یعنی اپنے بارے میں کہنا اور اس کے نتیجے میں اپنے
چاروں طرف شور و غل کا ماحول پیدا کرنا ہے ۔ ایسے
میں پھر بھلا کیوں چھیڑیں اپنی ذات کے خاموش
تاروں کو ۔ جو درخت پر گھر بنا کر رہنا چاہ رہا
ہو، وہ اپنی آوازوں کا قید خانہ کیوں تعمیر کرتا ۔
آپ اور ہم چیختے رہیں ، لیکن ریاضت کرنے والے
کا باطن خالی ہے ۔ کان بند ہیں اور نتیجتاً ہماری
آوازیں ان کی شخصیت کے گنبد سے ٹکرا کر ہم تک
لوٹ آتی ہیں ۔ گنبد ہمیشہ کی طرح خاموش ، بے حرکت
اور اپنی سوچ میں غرق ہے ۔

اگیئے جی کی خاموشی ظاہری اور باطنی دونوں
سطح پر تھی اور دونوں تک پر وہ انتہائے کمال
تک پہنچ چکی تھی ۔ اگیئے کی خاموشی ان کے ادب
میں جگہ جگہ پھیلی ہوئی ملتی ہے ۔ "شیکھر ۔ ایک جیونی"
کی بغاوت میں ایک عجیب طرح کی خاموشی چھائی ہوئی
ہے ۔ کبھی آتش فشاں جیسی خاموشی جس کی تخلیقات
کے نام ہو ۔ "ندی کے دویپ" اور "اپنے اپنے اجنبی"
(باقی صفحہ ۳۸ پر)

رن ویر رانگرا

اگیئے کی وساطت سے واتسائن کی دریافت

اگیئے گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے پندرہ شعری مجموعے، سات کہانیوں کے مجموعے، تین ناول، بیس مضامین کے مجموعے، دو سفرنامے اور دو روزنامچے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی بھی متعدد پہلوؤں کی حامل تھی۔ وہ انقلابی اور سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف فنون میں یدِطولیٰ بھی رکھتے تھے۔ وہ ادیب اور مصوّر ہونے کے علاوہ باغبانی، بڑھئی اور باورچی کا کام بھی عمدہ طریقے پر اور بخوشی انجام دیتے تھے۔ وہ خوش سلیقگی اور شان و شوکت کے دلدادہ تھے؛ لیکن سہولیات میسّر نہ ہونے پر درویشوں کی طرح بھی رہ سکتے تھے۔ ان کی پسند و ناپسند کی حدود بہت سخت تھیں۔ اپنی گل و سنگ زندگی میں انہوں نے اپنے ارد گرد دوستوں کا اجتماع بنا رکھا تھا۔ لیکن ان کے دشمنوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مداحوں اور تنقید نگاروں دونوں کی تعداد بے شمار تھی۔

بنیادی طور پر وہ اپنے آپ کو شاعر مانتے تھے۔ اگرچہ ان کا شمار نئی شاعری کے جنم داتاؤں میں ہوتا ہے، تاہم اعلیٰ ترین شعری تخلیقات کے باوجود ان کی شاعری متضاد آرا کی شکار بنی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات کو دوبالا کرنے میں ان کی نثری تخلیقات کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کو بنائے رکھنے کے لیے ان کا نثری ادب ہی کافی ہے۔ "روز" "جے دول" "ہیلی بون کی بطخیں" "سیٹھا رکا دھرج" "شرن داتا" "بدلہ" وغیرہ۔ ان کی لاثانی کہانیاں نیز "شیکھر — ایک جیونی" اور "ندی کے دویپ" نامی بے جوڑ ناولوں کا شمار دنیا کے بہترین نثری ادب پاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کہانی کار نے صرف ایک بار مات کھائی ہے۔ اعلان کرنے کے باوجود نیز اپنے قارئین کے لاکھ چاہنے پر بھی وہ "شیکھر — ایک جیونی" کا تیسرا حصہ نہیں لکھ سکے۔

اگیئے کے یہ دونوں ناول اور خاص طور پر "شیکھر — ایک جیونی"، سوانحی تخلیقات ہیں۔ ان میں اگیئے کے اپنے سوانح کا عنصر کتنا ہے اور ان کی مدد سے مصنف کی شخصیت کے ارتقائی مرحلوں کی کس حد تک شناخت کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ان ناولوں کے تخلیقی زمانے تک اگیئے کے حیاتیاتی دائرے کی اجمالی واقفیت ضروری ہے۔ ان کا آبائی وطن پنجاب میں واقع قصبہ کرتارپور تھا۔ اور وہ بھنوٹ سارسوت گوتر برہمن خاندان سے تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر ہیرانند شاستری حکومتِ ہند کے محکمۂ آثارِ قدیمہ میں اعلیٰ افسر تھے۔ وہ سنسکرت کے جیّد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وقارِ ذات اور نظم و نسق کے بھی شیدائی تھے۔ وہ بیشتر سرکاری دَورے پر رہا کرتے تھے۔ اگیئے کی پیدائش، مارچ ۱۹۱۱ء کو کسیا (دیوریا) میں آثارِ قدیمہ کے ایک کھدائی کیمپ میں ہوئی تھی۔ ان کا بچپن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک لکھنؤ اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک جموں اور کشمیر میں گزرا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ اپنے والد کے ساتھ نالندہ آگئے۔ جہاں اُنہوں نے ہندی لکھنا شروع کی۔ ان کی تعلیم گھر ہی پر سنسکرت کی بنیادی روایت کے مطابق شروع ہوئی تھی۔ گھر ہی پر اُنہوں نے پنڈت سے رگھوونش، رامائن، ہتوپدیش وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ مولوی سے اُنہوں نے شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں اور ایک پادری سے انگریزی کا درس لینا شروع کیا۔ ان کی ذہنی تربیت میں والدہ سے زیادہ والد کی شخصیت کارفرما رہی۔ اپنے بچپن میں اُنہیں اپنی چھوٹی خالہ اور بڑی بہن سے بہت پیار ملا۔ ان کے جنیئو پہننے کی رسومات ۱۹۲۱ء میں اڑیسہ کے مادھو آچاریہ نے ادا کیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بھنوٹ سے واتسائن بن گئے۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ واقعہ کے آس پاس اُنہوں نے اپنی والدہ کے ساتھ پنجاب کا سفر کیا، جس کی وجہ سے ان کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء

میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا — بعد ازاں انہوں نے ۱۹۲۷ء میں کرسچین کالج مدراس سے سائنسی موضوعات کے ساتھ انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے فورمین کرسچین کالج لاہور سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی — اسی دوران ان کا چندر شیکھر آزاد، سکھ دیو اور بھگوتی چرن بوہرہ ایسے مشہور انقلابیوں سے رابطہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے ایم۔ اے (انگریزی) کے سال اوّل میں داخلہ لیا۔ لیکن روز افزوں انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا — اپنے انقلابی دوستوں کے ساتھ دلّی میں بم فیکٹری قائم کی۔ وہ ایسی ہی ایک فیکٹری امرتسر میں قائم کرنے کی کوشش میں تھے کہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء کو پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک دلّی میں مقدمہ چلا۔ دلّی جیل کی کال کوٹھری ہی میں "شیکھر — ایک جیونی" نام کے ناول کی تخلیق ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں جیل سے رہا ہوئے اور گھر میں نظر بند کردیے گئے۔

۱۹۳۶ء میں انہوں نے "سینک" آگرہ کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۳۷ء میں پنڈت بنارسی داس چترویدی کے ایما پر "وشال بھارت" سے وابستہ ہوگئے۔ اور لگ بھگ ڈیڑھ سال تک اس جریدے کے مدیر رہے۔ اس کے بعد ریڈیو میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۴۲ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا اور آسام برما سرحد پر تعینات ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں فوجی ملازمت کو خیرباد کہا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک 'پرتیک' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کی ملازمت میں رہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے میں وزٹنگ پروفیسر رہے۔ وہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۹ء تک 'دنمان' کے اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمز کے مدیر بھی رہے

۱۹۲۴ء میں انہوں نے پہلی کہانی اور ۱۹۲۷ء میں پہلی نظم لکھی۔ ان کی اہم مطبوعات کا سلسلہ مندرجہ ذیل ہے:

وِپتھگا (کہانیوں کا پہلا مجموعہ: ۱۹۲۷ء)
شیکھر — ایک جیونی (جلد اوّل: ناول ۱۹۴۱ء)
تار سپتک (شعری مجموعہ: ۱۹۴۱ء)
شیکھر — ایک جیونی (جلد دوم: ناول: ۱۹۴۴ء)
اتیلم (شعری مجموعہ: ۱۹۴۶ء)
پریزن ڈیز اینڈ اَدَر پوئمز Prison Days and other poems (شعری مجموعہ: ۱۹۴۶ء)
ہری گھاس پر چھن بھر (شعری مجموعہ ۱۹۴۹ء)
باورا اہیری (شعری مجموعہ: ۱۹۵۴ء)
ندی کے دویپ: (ناول ۱۹۵۲ء)
ارے یایاور رہے گا یاد (سفرنامہ: ۱۹۵۳ء)
جے دول (کہانیوں کا مجموعہ: ۱۹۵۱ء)
اندر دھنش روندے ہوئے یہ (شعری مجموعہ ۱۹۵۷ء)
اری او کرونا پربھامے (شعری مجموعہ ۱۹۵۹ء)
آتمنے پد (مضامین کا مجموعہ: ۱۹۶۶ء)
اپنے اپنے اجنبی (ناول: ۱۹۶۱ء)
ایک بوند سہسا اچھلی (سفرنامہ ۱۹۶۰ء)
آنگن کے پار دوار (شعری مجموعہ: ۱۹۶۱، ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ
سنہلے شیوال (شعری مجموعہ ۱۹۶۵ء)
کتنی ناووں میں کتنی بار (شعری مجموعہ: ۱۹۶۷ء بھارتیہ گیان پیٹھ سے انعام یافتہ)
کیوں کہ میں اسے جانتا ہوں (شعری مجموعہ: ۱۹۶۹ء)
ساگر مدرا (شعری مجموعہ ۱۹۷۰ء)
بھونتی (روزنامچہ ۱۹۷۲ء)
پہلے میں سناٹا بنتا ہوں (شعری مجموعہ، ۱۹۷۳ء)
مہاورکش کے نیچے (شعری مجموعہ ۱۹۷۷ء)
ندی کی بانک پر چھایا (شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء)

اگیئے کا پورا نام سچیدانند ہیرانند واتسائن تھا۔ وہ اسے اپنے تخلص اگیئے سے علیحدہ ہی رکھتے تھے اگر کوئی ان کا پورا نام لکھنے کی کوشش میں سچیدانند ہیرانند واتسائن اگیئے لکھ دیتا تو یہ اُن کو بہت بُرا لگتا تھا۔ شاید جنوبی ہند کی روایات کے زیر اثر انہوں نے اپنے عالم والدِ محترم کا نام اپنے نام کے ساتھ منسلک کرلیا تھا۔ ان کا گوتر تو بھنوٹ تھا، لیکن جنیو کی رسومات کے دوران اڑیسہ کے مادھو آچاریہ نے ان کے گوتر 'وتس' کی بنا پر انہیں جو واتسائن نام دیا تھا، اسے ہی انہوں نے لقب کے طور پر اختیار کرلیا۔ 'اگیئے' کا تخلص انہیں جینندر کمار سے ملا تھا۔ یہ کیسے ہوا۔ اس کی تفصیل جینندر کے الفاظ میں یوں ہے:

"انہیں دنوں (انقلابی تحریک کے دوران) سچیدانند واتسائن کا دلّی میں کیس چل رہا تھا۔ وہ جیل میں تھے۔ جیل سے ان کی چٹھیاں آنے لگیں۔ تخلیقات آنے لگیں۔ ان کا مقصد کچھ اس طرح تھا کہ کیا یہ تخلیقات شائع ہوسکتی ہیں۔ میں نے تب پریم چند کو ان کی ایک کہانی بھیج دی۔ وہ ہفتہ وار "جاگرن" نکالتے تھے۔ میں نے سوچا کہ واتسائن نے جیل سے تخلیقات بھیجی ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے ان کا نام دینا ٹھیک نہ ہو۔ اسی لیے اگیئے (نامعلوم) لکھ دیا۔ انہیں دنوں "وشال بھارت" کا ایک خاص کہانی نمبر نکلنے والا تھا۔ وہاں بھی میں نے بنارسی داس چترویدی کو واتسائن کی ایک کہانی بھیج دی۔ اگیئے کے نام سے۔ اسی طرح واتسائن سے میرا غیبی تعارف ہوا تھا۔

اسی زمانے میں مجھے واتسائن کے جیل سے کئی خط ملے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے تحریر کیا کہ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش ہے۔ کیا کیا جائے۔ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ایک ہی راستہ ہوسکتا ہے۔ سیشن کورٹ میں فلاں تاریخ کو ہمارے مقدمے کی شنوائی ہے۔ طے ہے کہ عدالت میں جرم ثابت ہونے کے فوراً بعد ہمیں جیل سے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ بہت اچھا ہو کہ آپ عدالت میں ملنے آجائیں۔

"ان دنوں میں صدر پہاڑی دھیرج میں رہتا تھا۔ سیشن کورٹ وہاں سے دور نہیں تھا۔ عدالت میں، میں نے دیکھا واتسائن کے ہتھکڑی لگی ہے اور پولیس پاس کھڑی ہے۔ جب ہتھکڑ یاں کھل گئیں تو ہم لوگ وہیں بیٹھ گئے۔ بات چیت ہوئی۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے ——

جب واتسائن کو معلوم ہوا کہ میں نے ان کا نام اگیئے رکھ دیا ہے تو انہوں نے ابتدا میں ناخوشی ظاہر کی۔ لکھا۔ میرا تو پہلے ہی سے ایک تخلص ہے۔ شری وتس۔ آپ نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ شری وتس کا ایک معنی ہاتھی بھی ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو لگے گا کہ وہ نام بھی بامقصد ہی تھا۔ کچھ دنوں تک واتسائن متذبذب رہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اگیئے تخلص اختیار کرلیا۔"
(نوبھارت ٹائمز ۹ مارچ ۱۹۸۶ء)

انہوں نے س۔ ہ واتسائن اور اگیئے دونوں ناموں سے لکھا ہے اور ابتدائی زمانے میں 'کٹھی چاتن' کے تخلص سے بھی۔ تخلیقی ادب وہ اگیئے نام سے بہتر تنقیدی اور دیگر اصناف کے لیے س۔ ہ۔ واتسائن کے نام سے مضامین لکھتے تھے۔ اس تقسیم سے کبھی کبھی تنازعہ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ س۔ ہ واتسائن نام سے اگیئے کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے تھے ——
ساہتیہ اکاڈمی کی ۱۹۵۷ء میں مطبوعہ کتاب : کن ٹمپریری انڈین لٹریچر" Contemporary Indian Literature میں شامل ان کا مضمون ہندی لٹریچر اس کی واضح مثال ہے، جو س۔ ہ۔ واتسائن کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں اگیئے کی تخلیقات پر بحث کی گئی تھی۔ اس مضمون پر ہندی دنیا میں خوب واویلا ہوا تھا ——
اگیئے کے ناول طبقاتی کشمکش کے ناول نہیں۔ یہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان ہونے والی کشمکش کے ناول بھی نہیں ہیں۔ موجودہ غیر یقینی بدانتظامی اور مشکلات سے گھرے ہوئے زمانے میں فرد کے اندر بھی بے شمار و متعدد شخصیتیں ابھر آئی ہیں اور ان کی وجہ سے اس میں کشمکش چل رہی ہے —— انسانیت کے مکمل تجربات کو روشنی میں لانے اور ایمان داری کے ساتھ اس کی شناخت کرنے کی کوشش کرنا ہی ان کے ناولوں کا مقصد ہے۔ اس طرح ان کے ناول انفرادی تصویر کشی کے ناول بن گئے ہیں۔ اگیئے کی دل چسپی ہمیشہ ذات ہی میں رہی ہے۔ سماجی نظریے کو وہ غلط نہیں ٹھہراتے، لیکن اسے فیصلہ کن بھی نہیں مانتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ فرد کو دبا کر جس معاملے کا بھی فیصلہ ہوگا وہ غلط ہوگا۔ وہ قابل نفرت اور ناقابل برداشت ہوگا۔ "نیا سماج" کے مئی ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون ندی کے دویپ —— ایک تعارف، میں انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ فرد اپنے سماجی سنسکاروں کا مجموعہ ہے۔ سایہ بھی اور پتلا بھی۔ اسی طرح سے وہ اپنی حیاتیاتی روایات کا عکس بھی ہے اور نقش بھی۔ جن حالات سے وہ بنتا ہے انہیں کو بناتا اور بدلتا بھی ہے۔ وہ فقط ایک پتلا ایک انسان نہیں ہے، وہ ایک فرد ہے، عقل و دانش رکھنے والا فرد۔

اپنی ایک مشہور نظم "ندی کے دویپ" میں اگیئے نے فرد اور سماج کے تعلقات کو لے کر ایک تصویر اس طرح پیش کی ہے :

ہم ندی کے دویپ[1] ہیں
ہم نہیں کہتے کہ ہم کو چھوڑ کر[2] سروت سونی بہہ جائے
وہ ہمیں آکار[3] دیتی ہے
ہمارے کون[4] گلیاں، انتریپ[5]، ابھار[6]، سیکت کول[7]
سب گولائیاں اس کی گڑھی ہیں
ماں ہے وہ اسی سے ہم بنے ہیں
کنتو[8] ہم ہیں دویپ
ہم دھارا نہیں ہیں
ستھر سمرپن[9] ہے ہمارا
ہم سدا سے دویپ ہیں سروت سونی کے کنتو ہم بہتے نہیں ہیں
کیوں کہ بہنا ریت ہونا ہے
ہم بہیں گے تو رہیں گے ہی نہیں!"

"شیکھر —— ایک جیونی" شدید کرب کی ایک رات میں پھانسی کی کوٹھری میں پڑے ایک انقلابی کا اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنے کا عمل ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ جیسا ہے ویسا ہوا کیوں؟ اس تلاش میں وہ جذبات سے کام لینے کے بجائے زندگی کے اصول پر سے عملی سلسلے یعنی اپنی زندگی کا جوڑ ایمان داری سے تجزیہ کرتا ہے۔ اس طرح شخصیات کا سلسلہ وار ارتقا اس ناول کا اہم موضوع بن جاتا ہے۔ اس ناول کے دو حصے ہیں۔ پہلا ناول کے ہیرو کے بچپن کا مطالعہ پیش کرتا ہے —— بچپن کے حالات کے تھپیڑوں سے اس کے کردار کی نشوونما اور پھر ان حالات کی تنقید۔ شیکھر اگر آخرکار ایک مضبوط انقلابی بن سکا تو وہ یقیناً ایک غیر معمولی بچہ رہا ہوگا۔ وہ جنم سے باغی تھا اور اس کے حالات بھی ایسے بنتے چلے گئے کہ اس کے درون میں چھپا ہوا انقلابی تخم روزافزوں پروان چڑھتا گیا۔ وہ فطرتاً ہاں میں ہاں ملانے والا نہیں بلکہ اپنی مرضی کا مالک اور باغی بنا۔ اس کے والدین کا مزاج۔ بہن بھائیوں میں اس کا درجہ، گھریلو قاعدہ قانون نیز اس کی تعلیم، کھیل کود، یار دوست وغیرہ کے حالات بھی اسی قسم کے بنتے گئے کہ اس کی سماجیت تیزی نہ پکڑ سکی اور اس کا باغیانہ مزاج تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ شیکھر میں دنیاوی عقل کی کمی نہیں تھی؛ لیکن اس عقل کے تیز دھارے کو پابند بنانے والی طاقت دنیا میں نہیں تھی۔ عقل اس کی اپنی تھی، اس کے اپنے استعمال کے لیے تھی۔ وہ اس کا من چاہا استعمال کرتا تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ جہاں اُس نے اپنی عقل کی تحریک کو تسلیم کیا، وہاں اس نے مناسب عمل

---

[1] جزیرے [2] ذریعہ وجود دریا [3] شکل [4] زاویے [5] ٹاپو [6] ٹیلے [7] ریت کا کنارا [8] لیکن [9] دائم سپردگی

کیا اور جہاں جہاں اس کی عقل کو دوسروں نے متاثر کیا، وہاں وہاں وہ لڑکھڑا گیا۔"

شیکھر کی یہ انا جہاں ایک طرف اس کے گھریلو ماحول، اس کے والدین اور بھائی بہنوں کی جانب سے کیے جانے والے سلوک سے مضبوط ہوتی، وہاں اسے سخت سے سخت تر بناتے رہنے کے لیے مدراس کے انٹی مونم کلب کے راگھون سداشیو وغیرہ ارا کین، جامعہ شبینہ کے طلبہ کانگریس کے اجلاس نیز محن، راجی، ودیا بھوشن وغیرہ جیل کے دیگر لوگوں کا ہاتھ اور حصہ بھی رہا ہے۔ ودیا بھوشن سے اسے نئی روشنی ملی کہ غرور تکبر، ایک سماجی فرض ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے شدید انقلابی رجحان کو بیدار کرنے میں باوا مدن سنگھ سے بھی پُر زور تحریک حاصل ہوئی۔ باوا سے اس نے سیکھا کہ "عدم تشدد پر مبنی خون خرابہ بھی ممکن ہے"، شیکھر کی شخصیت کے مسلسل ارتقا میں ان سب کا اہم رول رہا ہے۔ اپنی خالہ زاد بہن ششی سے بھی خاص تحریک حاصل ہوئی۔ ناول میں ششی کی اپنی شخصیت بھی اثر انگیز ہے، لیکن شیکھر کے نزدیک اس کی حیثیت اس سان جیسی ہے جس پر مسلسل چڑھائے جانے کے باعث شیکھر کی زندگی نکھرتی چلی گئی۔ شیکھر کی نظر میں وہ اس کے ارتقا کے لیے ایک ذریعہ ہے۔

"شیکھر — ایک جیونی کی طرح "ندی کے دویپ" بھی شخصی کردار کا ناول ہے۔ لیکن اس کا موضوع شخصی کردار کا سلسلہ وار ارتقا پیش نہیں کرتا بلکہ ارتقا یافتہ کردار کو بتدریج منکشف کرتا ہے گورا کے علاوہ ندی کے دویپ کے سبھی کردار اپنی ارتقائی شکل ہی میں ناول میں آتے ہیں۔ البتہ گورا کا کردار ناول میں تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کا سلسلہ وار ارتقا ناول کا مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ ناول نگار کی توجہ اس کے ارتقا کے مختلف مرحلوں کو ظاہر کرنے پر رہی ہے۔

'ندی کے دویپ' کے ہیرو کا نام بھون ہے وہ ویسے تو طبیعیات کا ڈاکٹر ہے، لیکن ناول کا موضوع سائنس داں بھون نہیں ہے بلکہ اس کی ذات میں نہاں وہ ہیجان ہے جو اس کے فکر و عمل کو راہ دکھاتی ہے۔ ریکھا اور گورا الگ الگ اس کی دو متضاد کیفیتوں کو بیدار کرتی ہیں: ریکھا اس کے جنسی رجحانات کو اکساتی ہے تو گورا سماجی اخلاقیات کی آواز بن کر اس کی عقل و آگہی کو بیدار کرتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ریکھا کی وساطت سے سائنس داں بھون کے اندر کا اصل ہوس پرست بھون ظاہر ہوتا ہے۔ ایک بار تو اس کی تحقیق دریائے ہوس کی تیز رو میں بہہ جاتی ہے۔ اسے ڈوبنے سے اگر کوئی بچا سکا تو وہ گورا کی شخصیت تھی۔ بھون ان لمحوں میں زبردست کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے جب ریکھا اس کی زندگی کے دھارے کو متاثر کر رہی ہوتی ہے تو لگتا ہے گورا کی یاد آکر اس پر روک لگانے کا کام کرتی ہے۔ اس طرح ریکھا کے اسقاط کے بعد جب وہ گورا کی طرف مائل ہوتا ہے تو بیچ بیچ میں ریکھا کا دھیان اُسے بے قرار کر دیتا ہے اور اُسے مکمل سپردگی پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ بھون کی زندگی میں لگاتار اس کے جنسی جذبات یعنی ریکھا ہی کا غلبہ رہا۔ مگر آخر میں اس نے گورا کو جب مکمل طور پر قبول کر لیا تو اس کے پیچھے جنسی خواہشات کی کارفرمائی نہیں تھی۔

شیکھر اور ششی کی طرح بھون اور ریکھا کے درون میں بھی جنسیات اور ضمیر میں زبردست کشمکش رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'شیکھر ـ ایک جیونی' کے اہم کرداروں کے تحت الشعور میں پہلے ضمیر کی ہوس پر فتح ہوتی ہے اور بعد میں ہوس فتحیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن 'ندی کے دویپ' میں پہلے ہوس کی جیت ہوتی ہے اور بعد میں ضمیر کی — توکچیا تالاب کے تنہا علاقہ میں بھون کے درون کی یہ کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ریکھا کی سپردگی کو وہ قبول نہیں کر پاتا۔ یہاں اس کا ضمیر فتحیاب ہوتا ہے اور وصل رک جاتا ہے، لیکن کشمیر کی بلندیوں پر اس کی جوان خواہشات زور مار کر فتحیاب ہو جاتی ہیں۔ وہ بھون کو مرد کے طور پر قبول کر لیتی ہے اور حاملہ ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پیٹ میں آنے والے بچے نے دونوں کی ہوسناکی کے ہوائی جہاز کو عملی زندگی کی دھرتی پر لا ٹیکا۔ حمل میں آنے والے اس بچے کے بارے میں بھون کا ریکھا کو یہ یقین دلانا کہ "ریکھا! جو ہوا ہے مجھے اس کا دُکھ نہیں ہے۔ وہ جو آئے گا — آئے گا یا آئے گی وہ تو محاورہ ہے۔ وہ میرا ہے۔ میرا چاہا ہوا۔ اس سے میں شرماؤں گا نہیں۔ وہ تم مجھے دوگی۔ بھولنا مت۔ تمہیں اور تمہاری دین کو میں وردان کر کے لیتا ہوں، اس کے دل میں چھُپے ہوئے محرم جذبے کو ہی ظاہر کرتا ہے — ریکھا بھون کے اندر بیٹھے ہوئے چور کو تاڑ لیتی ہے۔ اور اس پر ترس کھا کر آنے والے بچے کو ختم کرا دیتی ہے۔

"ندی کے دویپ" کو پڑھتے ہوئے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی یاد آجاتی ہے۔ لارنس کا نظریہ ہے کہ عورت اور مرد کی ذو جنسیات Bi-Sexuality سائنس دانوں کا محض ایک تصور ہے۔ وہ دونوں الگ الگ جنس ہیں۔ یعنی عورت سو فی صد عورت اور مرد سو فی صد مرد ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اسی لیے عورت اور مرد کا اگر میل ملاپ ہو سکتا ہے تو وصل ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وصل کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح وصل لارنس کے ناولوں کا ضروری حصہ بن جاتا ہے۔ وصل کو لارنس پاپ نہیں مانتا اگر دونوں میں ملن کی تڑپ اور اس کے لیے حوصلہ ہو — پھر وہ خواہش چاہے لمحہ بھر ہی کی کیوں نہ ہو۔ لارنس کا کہنا ہے کہ زندگی کے پُر ہوس پوشیدہ مقامات پر ہی ہماری حسیات بیدار ہو کر ہمارے دل کو پاک اور تازگی عطا کرتی ہوئی اُمڈ آتی ہیں۔ اس نظریے سے ریکھا کے حاملہ ہونے تک "ندی کے دویپ" اور لارنس کے "لیڈی چیٹرلیز لور" میں حیران کن یکسانیت ملتی ہے۔ ازاں بعد بھون کا مجرم جذبہ "ندی کے دویپ" کو

نیا موڑ دے دیتا ہے۔ اگیئے خود بھی اپنے آپ کو فکری طور پر لارنس کے نزدیک مانتے ہیں۔

اگیئے کے تیسرے اور آخری ناول "اپنے اپنے اجنبی" کا موضوع بھی وہی ہے۔ جو "شیکھر — ایک جیونی" کا یعنی موت کا سامنا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شیکھر کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یعنی اگر وہ مر جاتا ہے تو اس کی زندگی کا کُل ملا کر مقصد کیا ہوا جب کہ "اپنے اپنے اجنبی" زندگی کے نقشے میں محض موت کے مقام کی وضاحت کرتا ہے۔ کس طرح کچھ لوگوں کے لیے موت میں یگانگت ہوتی ہے اور کچھ ایک کے لیے اجنبیت۔ کس طرح موت کا سامنا اپنوں کو اجنبی بنا دیتا ہے اور اجنبیوں کو اپنا۔ اس سوال کو لے کر موت کے بارے میں مشرق کے مسلمات اور مغرب کے مخالفانہ رویّہ کا تقابلی مطالعہ بھی اس تخلیق میں ملتا ہے لیکن اپنے انجام تک پہنچتے پہنچتے یہ ناول لڑکھڑا جاتا ہے۔

برف میں دب جانے پر نیلما اور یوکے دونوں کی موت ہو جاتی ہے۔ نیلما کا نظریہ مشرقی ہے اور مغربی نظریے کی ترجمانی یوکے کرتی ہے۔ لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے دونوں ہی زندگی سے بے لاگ ہو جاتی ہیں۔

ان دونوں کے نظریات میں جو بنیادی فرق ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اگیئے کہتے ہیں : "دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ یا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کا سفر متوازی ہے۔ نیلما موت کو بے تردد قبول کر لیتی ہے۔ لیکن یوکے آخر تک اپنے دونوں نظریوں کو قائم رکھتی ہے۔ ایک تو موت کو تسلیم نہ کرنے کا اور دوسرا جسم کی آزادی کا، لیکن آخر میں انتخاب کرتی ہے وہ موت ہی کا۔ دوسرے یہ کہ جب وہ نیک آدمی کو گواہ بنا کر مرنا چاہتی ہے تو ایک طرح سے موت کو تسلیم کر لیتی ہے۔ کیوں کہ حق میں اس کا عقیدہ اور گواہ کی وساطت سے، اختلاف کے باوجود وہ موت سے اوپر اُٹھ جاتی ہے۔

اگیئے فطرتاً خاموش طبع تھے۔ وہ بولتے کم تھے اور سنا تا زیادہ سنتے تھے۔ ان کی ایک نظم بھی ہے جس کا عنوان ہے : "پہلے میں سنّاٹا بنتا ہوں" ایک بار وہ سنّاٹا بن لیں، خاموشی اختیار کر لیں تو اس کا پار پانا لگ بھگ ناممکن تھا۔ وہ جب بولتے بھی تھے تو بہت دھیمی آواز میں اور کم سے کم اور نپے تلے الفاظ میں۔ کھلتے تو وہ بہت کم تھے، لیکن جب کھلتے تھے تو اپنے دروں کے بیکراں میں غوطہ لگا کر بیش قیمت موتی نکال لاتے۔ مجھے کئی بار ان سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا اور ان سے ادبی گفتگو بھی ہوئی۔

ان کے ناول : "شیکھر — ایک جیونی" کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن وہ دونوں مل کر بھی ناول کے ہیرو شیکھر کی مکمل زندگی کو نہیں سمیٹ پاتیں۔ ہندی داں طبقہ برسوں اس ناول کی تیسری جلد کا منتظر رہا، لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ ایک بار میں نے اگیئے سے پوچھ ہی لیا۔ "شیکھر — ایک جیونی" کی تیسری جلد کے لیے اپنے قارئین کو کب تک ترساتے رہیں گے ؟" اس سوال سے وہ سیج گئے اور بولے —

"ان کو کیا ترساؤں گا۔ ان سے زیادہ تو میں خود ترستا ہوں "لیکن ترسنے سے کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ تیسری جلد ایک بار لکھی گئی تھی، تبھی وہ چھپ گئی ہوتی تو چھپ گئی ہوتی۔ اب وہ ترمیم چاہتی ہے اور میں تا بمقدور کوئی چیز ایسی حالت میں شائع ہونے کے لیے نہیں بھیجتا ہوں۔ جب کہ وہ مجھے ادھوری جان پڑتی ہو۔ شائع ہو جانے کے بعد اس کے بارے میں میرا نظریہ تبدیل ہو جائے یا ترمیم ضروری معلوم ہو تو دوسری بات ہے۔ یہ کام دوسرے ایڈیشن میں ہو سکتا ہے یا ایسا ہو سکتا ہے کہ دوسرا ایڈیشن شائع ہی نہ کرایا جائے "

ایک بار میں نے ان سے پوچھا : "ادبی تخلیقات کے ذریعے آپ زندگی اور دنیا کے متعلق بن چکے ، اپنے کسی نظریے کی عام طور پر تائید کرتے ہیں یا اس کی تحقیق کی طرف بھی مائل ہوتے ہیں ؟" میرا سوال سن کر اگیئے خاموش بیٹھے رہے کافی دیر تک اسی خاموشی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ گویا مجھے فراموش کر کے اپنے دروں کی گہرائیوں میں اُتر گئے ہوں۔ پھر ان کے لب پھڑکے اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگے " زلیست کرنا ہی زندگی کے نظریے کی جانچ کرنا ہے بشرطیکہ انسان زندگی کے تجربات کا دروازہ اپنے لیے بالکل ہی بند نہ کر لے۔ میں نے اپنے آپ کو اتنا بند نہیں کیا ہے، اتنا بند ہونا ممکن بھی نہیں ہے، اگر کوئی بند ہونا چاہے تو بھی۔

زندگی کا نظریہ زندگی کے تجرباتی نظام کو متاثر کرتا ہے۔ یہ خود تجربے کا حاصل بھی ہوتا ہے — ایسی صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ حاصل کرتے ہوئے یا اس کی قبولیت پر آمادہ رہتے ہوئے نظریہ میں لگاتار اجتہاد کیا جاتا رہے۔ تیقن اور کھوج اس اجتہاد کے جزو خاص ہیں۔ قائم شدہ تصورات کا جو حصہ ذاتی تجربے کی کسوٹی پر پورا اُترے اسے رہنے دیا جائے اور جہاں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو اسے تبدیل کر لیا جائے۔ یہی خاص نظریہ ہے۔

"ادبی تخلیقات ہمیشہ تو نہیں، بیشتر دریافت ذات کا ذریعہ بھی ہوتی ہیں۔ تخلیقی عمل کے دوران خالق خود اپنے آپ کو نئے طور یا صحیح طور پر پہچانتا ہے۔ اس طرح تخلیق جس قدر خالق کے ذریعہ خلق ہوتی ہے، اسی قدر وہ خالق کو رچتی بھی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار تخلیق کرنے سے پہلے اور بعد میں وہی کا وہی نہیں رہتا مجھے یقین ہے سبھی تخلیق کار اس بات کی تصدیق کریں گے۔"

اگیئے کے ناولوں کو اور خاص طور پر "شیکھر — ایک جیونی" نیز "ندی کے دویپ" پڑھتے ہوئے ایک ضمنی سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں ہیرو ہیروئن کے عمل و ردِ عمل کی شکل میں عورت اور مرد کا کون سا درجہ تعین ہوا ہے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ یا ایک دوسرے کا سبب ہیں یا ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ ان میں کئی جگہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مرد کے ارتقا کا عورت محض سبب ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان دونوں ناولوں میں

دیوندر اسّر

"آگ میرے بھیتر آگ میرے ہاتھ میں ہے" ـــــ اگیے

پیڑوں پر پرندے آشیانہ بناتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اور شکاری پیڑوں پر مچان بناتے ہیں اور کوئی شاعر کسی پیڑ پر اپنا گھروندا بناتا ہے۔ وہ شکاری نہیں لیکن اس معنی میں ضرور ہے کہ وہ شبدوں کو بیندھتا ہے۔ وہ پرندہ ہے، جس کے تخیل کی پرواز ستاروں سے بھی آگے بہت دُور نکل جاتی ہے۔ وہ ہر گاؤں کا بسیا ہے کہ اس کی جڑیں دھرتی میں بہت گہری، بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نیم کے پیڑ پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا گھر جس شاعر نے بنایا تھا اُس کا نام ہے سچدانند، ہیرانند واتسائن اگیے۔ اس گھر کی شکل کیا ہوگی، اس کی ہر تفصیل پر اگیے نے پوری طرح ہر پہلو سے غور کیا۔ اور کئی بار لکڑی کے کام میں بڑھئی بن کر مدد بھی کی۔ اس گھر میں شام ہونے وہ اپنے گھر میں دوستوں کی محفل میں وہ اپنی کویتائیں سنانے والے تھے۔ اور بچے اس گھر کے دروازے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی دن بچوں کے اصرار پر نیم کے پیڑ پر بنے اس ہوا محل کا افتتاح ہونا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنی کویتا "بالو کے گھروندے" پڑھنے والے تھے، جسے اگیے نے اپنے جنم دن ۷۔ مارچ کو اسی سال (۱۹۸۷ء) لکھا تھا۔

"بالو کے گھروندے بنائے ہیں تین بالکوں نے\
اُنہیں نہیں پتہ ہے کہ\
اسی بالو کا میں رہے کنکر ہیں\
جن کے وکرشتر سے آرنبھ ہوتی ہے\
پر کریا سنسار کے سبھی گھروندوں کے وناش کی\
بالو کا سے کھیلتے ہوئے تین مالک\
ساگر کا سور چل کے کہ ریت کے\
مانو ہی مانو کی تیسری آنکھ ہے\
تمہاری آنکھیں بند کیوں رہیں دیوتا؟"

لیکن بچے اس کویتا اس آواز سے محروم رہے کہ یہ آواز اُسی صبح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے؟ (شاید نہیں) اسی عنوان سے لکھی گئی اپنی ایک کویتا میں اگیے نے لکھا۔

"گھر\
میرا کوئی ہے ہی نہیں\
گھر مجھے چاہیے:\
گھر کے بھیتر پرکاش ہو\
اس کی بھی مجھے چنتا نہیں ہے\
پرکاش کے گھیرے کے بھیتر میرا گھر ہو\
اس کی مجھے تلاش ہے\
ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے؟\
دیکھا ہو\
تو مجھے بھی اس کا پتہ دیں\
نہ دیکھا ہو\
تو میں آپ کو بھی\
سہانو بھوتی تو دے ہی سکتا ہوں\
مانو ہو کر بھی ہم آپ\
اب ایسے گھروں میں نہیں رہ سکتے\
جو پرکاش کے گھیرے میں ہیں\
پر ہم\
بے گھروں کے پرسپر ہم دردی کے گھیرے میں تو رہ ہی سکتے ہیں۔

شاعر کا گھر کون سا ہے، کھلے، وسیع، بے کراں آسمان کے نیچے پھلے پھول پتیوں سے گھرا، ہوا کے دوش پر کھڑا، چاروں طرف سے کھلا۔

"میرا گھر\
جدھر سے بھی جھانکو\
تم دروازے سے باہر جھانک رہے ہوگے\
تمہیں پار کا درشیہ دیکھ جائے گا\
گھر نہیں دیکھے گا\
تمہارا گھر\
وہاں ہے\
جہاں سڑک سماپت ہوتی ہے\
پر مجھے جب\
سڑک پر چلتے ہی جانا ہے\
تب وہ سماپت کہاں ہوتی ہے؟\
تمہارا گھر...؟"

آنے والی نسلیں حیرت سے پوچھیں گی کہ کیا ایسا

۱۔ ذرّے ۲۔ بکھراؤ ۳۔ عمل ۴۔ ہمدردی ۵۔ باہمی ۶۔ منظر ۷۔ ختم

بھی کوئی شاعر تھا جس نے زندگی کو جیا تو اپنی شرط پر
اور جب کوئی اپنی شرط پر جیتا ہے تو لوگ پہلے اُسے
خوف پھر حیرت پھر رشک اور پھر تحسین سے دیکھنے
لگتے ہیں کہ پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں تھا اور جو ایسی
شخصیت کو قبول کرنے سے قاصر رہتے ہیں، وہ اُس
کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں، طرح طرح کی
افواہیں پھیلاتے ہیں کیوں کہ اُنہیں اپنے اِرد گِرد
تعمیر کیے ہوئے حصار منہدم ہوتے نظر آتے ہیں۔
اُن کی اپنی ذات اور تخلیقات کی فصیلیں اُس کی قد آور
شخصیت کے مقابلے پست نظر آتی ہیں۔ لیکن ایسے لوگ
اکثر بھول جاتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی شرط پر
جیتا ہے تو اس کا طرزِ زندگی، اندازِ فکر و احساس اور
پیرایۂ اظہار سب بدل جاتے ہیں اور وہ طرزِ نو کا موجد
بن کر اپنے عہد پر حاوی ہو جاتا ہے۔

اگیے طرزِ نو کا موجد تھا۔

اُن کے بارے میں اتنے مناقشے اور مباحثے ہوتے
رہے ہیں کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ
اُن کی تخلیقات پر جو بھی رائے دی جاتی ہے، اُس
کے پس منظر میں ان کی شخصیت اور طرزِ زندگی ہے۔ جس
کے باعث اُن کی تخلیقات کی اہمیت دُھندلا جاتی
ہے۔ لیکن اگیے نے نہ تو اپنا طرزِ زندگی بدلا اور نہ ہی
اپنے عقائد کو نظر انداز کرکے کوئی سمجھوتہ ہی کیا۔ وہ
خاموشی سے ان مباحثوں کے بیچ جیتے رہے، لکھتے رہے
اور کہا:

"اگر کوئی ڈھیلا بھی پھینکے تو عمارت تو ہونی
ہی چاہیے۔ ہندی میں کوئی ادبی پرچہ نہیں جسے آپ
کسی کے سامنے رکھ کر کہہ سکیں کہ یہ ہے اعلیٰ تخلیق کا نمونہ۔
جہاں کوئی ثبوت نہیں ہے اور سب چنوتی دینے والے
ہیں۔ وہ ادب صحت مند نہیں۔ آج ہندی کی حالت
مجھے بری لگتی ہے۔"

اگیے کو کس نے جانا ہے؟ اگیے اسم بامعنی
ہے۔ اگیے جسے جانا نہ گیا، جسے جانا نہ جا سکے اور یہ سچ
ہے کہ اس کی شخصیت ہمیشہ اسرار کے پردوں میں گھری
رہی۔ اگیے نے کئی مکان بدلے، کئی منزلیں طے کیں۔ انہیں
اس بات کا احساس بھی تھا۔ اُن کی ایک کتاب کا عنوان
بھی ہے۔ کتنی ناؤ میں کتنی بار جس پر ۱۹۷۸ء میں
بھارتیہ گیان پیٹھ پرسکار بھی ملا ہے۔ کم گو، دھیرے
بولنے والے اگیے جب اپنے عزیز دوستوں یا بچوں کی
محفل میں بیٹھتے ہیں تو خوب بولتے ہیں، ہنستے ہیں،
شعر و شاعری سنتے سناتے ہیں۔ ہم اس الزام کی تائید
نہیں کر سکتے کہ اگیے اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے
ہیں۔ اُن کے اور دوسروں کے درمیان ہمیشہ ایک
ادبی فاصلہ رہتا ہے:

"میں سبھی اور سے کُھلا ہوں
وَن سا وَن سا اپنے میں بند ہوں
شبد میں میری سمائی نہیں ہوتی
میں سناٹے کا چھند ہوں

اگیے کا جنم ۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو دیوریا ضلع (یوپی)
میں کسیا نگر کے آثارِ قدیمہ کے ایک کھدائی کیمپ میں
ہوا۔ اُن کے والد پنڈت ہیرانند شاستری محکمۂ آثارِ قدیمہ
میں قدیم رسم الخط کے ماہر کی حیثیت سے کام کرتے
تھے، جس کا گہرا اثر اگیے کی زندگی پر پڑا۔ اگیے نے
اپنی پہلی کہانی ۱۹۲۴ء میں پہلی نظم ۱۹۲۷ء میں لکھی۔
اگیے کی زندگی ایک انقلابی کی حیثیت سے شروع
ہوئی جس کے باعث اُنہوں نے ایم۔ اے انگریزی
کی تعلیم کو خیرباد کہا۔ ہندوستان ری پبلکن پارٹی
میں شامل ہوئے۔ بھگت سنگھ کے ساتھیوں چندر شیکھر
آزاد، سکھدیو اور بھگوتی چرن وہرا کے شانہ بشانہ
کام کیا۔ بھگت سنگھ کو جیل سے چھڑانے کی مہم میں حصہ
لیا اور امرتسر میں بم بنانے والی فیکٹری میں کام کرتے
ہوئے پکڑے گئے۔ قریب چھ سال تک پہلے جیل اور
پھر نظربندی کے مصائب کا شکار رہے۔ جیل ان کے
لیے سب سے بڑی درس گاہ ثابت ہوا۔ جیل ہی میں
اُنہوں نے فلسفہ، نفسیات، سیاسیات اور قانون
کا مطالعہ کیا، کئی کہانیاں لکھیں اور اپنا پہلا ناول "شیکھر
ایک جیونی" رقم کیا، وہ ناول جس نے ہندی ناول کی نوعیت
ہی بدل ڈالی اور ہندی افسانوی ادب میں جدید
حسّیت کا پیش خیمہ قرار دیا گیا۔

"شیکھر ایک جیونی" نے پریم چند کی سماجی آدرش
وادی حقیقت نگاری سے انحراف کرکے پہلی بار فرد
کی داخلی زندگی کی گہرائیوں کو بڑی باریک بینی اور چابکدستی
سے پیش کیا، لیکن یہ فرد اپنے ماحول سے کٹا ہوا نہیں
اُس سے متاثر ہوتا ہے اور کسی حد تک اُسے متاثر کرنے کی
کوشش بھی کرتا ہے۔ شیکھر میں جن سوالوں کو اگیے نے
اُٹھایا ہے اس میں وہ گہرے فکری اور نفسیاتی عوامل شامل
ہیں جن سے وہ خود ہو کر گزر رہے ہیں۔ اور قاری کو بھی
ان میں سے گزارا ہے۔ حالانکہ اس ناول میں ایک
گہری رومانی افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ پھر بھی یہ
اپنے دور کے نوجوانوں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش پر بھرپور
روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں داخلی زندگی، رومانیت
اور انفرادی احساسات کا حسین امتزاج ملتا ہے
"شیکھر سے ملاقات" میں اپنے خیالات کا اظہار
کرتے ہوئے اگیے نے لکھا ہے:

"شیکھر، ہاں بیٹا، کیوں پہچانو گے مجھے۔ تم
انقلابی مشہور ہو۔ بہت سے لوگ تمہیں نرا خود پسند
کہتے ہیں اور تمہاری انقلاب پسندی کو نری منفعیت
اور تخریب پسندی کہا گیا ہے۔ پھر بھی تمہیں سب
غیر معمولی تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے گالی کے روپ میں
ہی ...؟ اور میں۔ میں گالیاں تو تم سے کم نہیں
کھاتا رہا، لیکن آج جو نئی گالی مجھے ملتی ہے وہ یہ کہ
میں رجعت پرست ہوں۔ رجعت پسند تو ہیں ہوں۔
جمع کے صیغہ کا استعمال میں اپنے کو بڑھانے کے لیے
نہیں، اس لیے کر رہا ہوں کہ بہت سی بُرائیوں میں
سے ایک ہونے کا الزام صحیح ہے کہہ سکوں ...."

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ اگیے
پر رجعت پرستی کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کے بارے
میں وہ کیا رائے رکھتے ہیں۔ "شیکھر ایک جیونی" کا پہلا
حصہ ۱۹۴۱ء اور دوسرا ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔
اُنہوں نے اس کا تیسرا حصہ بھی لکھا تھا۔ لیکن لکھا
جا کر بھی اَن لکھا ہو گیا۔ کیوں کہ الگ ہو کر جسے لکھ
پایا، لکھ ڈال کر اس سے اور الگ ہو گیا اور میرا لگاؤ
اب اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ کتاب کو چھپنے دینے پر چکچاہٹ

ہوتی ہے۔ تبھی کا تبھی چھپ جاتا تو ایک بات تھی۔ اب دوسری بات ہے۔ تمہیں نے کہا کہ تخلیق اظہار بھر نہیں ہے، ترسیل ہے اور مجھے لگتا ہے کہ پہلے کا اظہار ادھورا ہے یعنی آج کی نظر سے اظہار نہیں ہے تو میں باذوق سماج کے سامنے کیا پیش کروں یہی آج کا میرا مسئلہ ہے میرے فن کا مسئلہ ——" (شیکھر سے ملاقات)، جب شیکھر پھانسی کا انتظار کر رہا ہے تو اُس نے کہا "میں ایک نئی چیز ہوں، ایک نیا عزم، جسے مستقبل پورا کرے گا۔ ایک سبق جو مستقبل کے لیے رہ جائے گا۔" اگیے کے بارے میں بھی یہی بات سچ ہے۔

اگیے کے دوسرے ناول "ندی کے دویپ" (۱۹۵۲ء) پر کافی بحث ہوئی۔ اس ناول کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ناول ایک وسیع کینوس پر منعکس کی جانے والی انسانی زندگی کے ایک محدود حصّے کی تفصیل ہے۔ یہ ناول شیکھر کی نسبت نئی حسیت کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں زبان اور اسلوب میں بھی نیا پن ہے۔ اس ناول سے ہندی کے ادبی شعور، جمالیاتی ذوق، نثر کی قوّتِ اظہار کو ایک بالکل نئی جہت ملتی ہے۔ کچھ نقادوں کی رائے میں "ندی کے دویپ" "شیکھر ایک جیونی" کی اگلی کڑی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ شیکھر کی اگلی کڑی اگیے نے مکمل کر لی تھی۔ حالانکہ وہ شائع نہیں ہوئی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوون کے کردار میں شیکھر اور ریکھا کے کردار میں ششی کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔

اپنے تیسرے اور آخری ناول "اپنے اپنے اجنبی" تک پہنچتے پہنچتے اگیے سماج سے جزیرے اور جزیرے سے گھر تک پہنچ گئے۔ ایک ضعیف عورت سیلما اور ایک نوجوان لڑکی یوکے برف سے گھرے ایک کمرے میں مقید ہو جاتے ہیں۔ اور سبھی برف باری کے باعث باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک طرح سے اس پر سارتر کی نو اگزٹ کا سا ماحول اور مسائل طاری ہیں۔ موت سے روبرو ہونے پر فرد اور اس کے باہمی تعلّق پر کیا گزرتی ہے۔ "اپنے اپنے اجنبی" اس کی وجودی داستان ہے، جس میں فرد اور سماج، حیات و کائنات اور موت کے مسائل کو فلسفیانی اور مابعد الطبیعیاتی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جہاں فرد کو ذاتی انتخاب کے آزادانہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پوری زندگی کو ایک لمحہ کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اسی لمحہ میں کیا پوشیدہ ہے۔ دہشت موت کی ہی نہیں، زندگی کی بھی دہشت۔ اور اس دہشت میں سے اُبھرتا ہوا فرد، اس کی ذات، اُس کا وجود، اور پھر اس ذات کا انتشار۔ زندگی لغویت وقت کے ایک ذرے پر مشیت کے رُک جانے کی کیفیت، خدا کے وجود پر تشکیک، اقرار، انکار اور پھر اقرار —— ناول میں وجودیت اور نفسیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وجودی فلسفہ نازک نفسیاتی عوامل سے ہو کر گزرا ہے۔ دراصل یہ ناول جدیدیت کا نہیں، جدیدیت کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ ایک مقام پر اگیے لکھتے ہیں کہ بودھ بھکشو نے ایک غار میں رہنے کا آزادانہ فیصلہ کیا۔ لیکن اپنے اکیلے پن سے تنگ آ کر اُس نے غار سے باہر نکلنے کے لیے سُرنگ کھودنا شروع کر دیا۔ کئی برسوں کی کڑی محنت کے بعد وہ سرنگ اُسے جس کھلی جگہ تک لائی وہ ایک اگلی غار کا راستہ تھا۔ ناول میں ضعیف سیلما نوجوان یوکے سے کہتی ہے "تم جو اپنے کو خود مختار اور آزاد مانتی ہو وہی سب مشکلات کی جڑ ہے۔ نہ تو ہم اکیلے ہیں نہ ہی ہم آزاد ہیں۔ بلکہ اکیلے نہیں ہیں۔ اس لیے آزاد نہیں۔"

اگیے کے ناولوں کے کردار دراصل باشعور، حسّاس اور باضمیر فرد کی شخصیت کی تکمیل کی تلاش کے ناول ہیں۔ ان میں نفسیاتی عوامل کی پیچیدگی اور خارجی حقائق اور سماجی عمل محض پس منظر کی صورت میں ہوتے ہیں۔ "شیکھر ایک جیونی" میں یہ مسئلہ سماج میں فرد کی حیثیت میں مظہر ہوتا ہے۔ "ندی کے دویپ" میں جزیروں کی تلاش میں اور "اپنے اپنے اجنبی" میں یہ فرد کی ذات کے انتشار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

اگیے نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُن کے اہم افسانوں میں "روز" (گینگرین) "پرم پرا" "بندول کا خدا" "جیون شکتی" "پگاد کی دھیرج" "سیسو" "تاج کی چھایا میں" "ہولی بون کی بطخیں" "شرن داتا" "گرہ تیاگ" "وپتھگا" وغیرہ شامل ہیں ان افسانوں میں کہیں فرد زندگی کی معنویت کی تلاش میں نظر آتا ہے اور کہیں اپنی خواہشات اور خیالات کی اصلی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ اگیے کے نزدیک ہر فرد لاثانی ہے ہر چہرہ ناقابلِ فراموش۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے مخصوص پہلو کو دیکھنے کی آنکھ ہے یا نہیں؟ اگیے پر الزام ہے کہ وہ حقیقت پرست نہیں خود اگیے نے "آتم نیپد" میں لکھا ہے کہ "میں بار بار سوچتا ہوں کہ "ہمارا ادب" ہماری تمام تر فنی تخلیقات حقیقت کی اس عقلیت پرستی کا شکار ہیں جس نے حقیقت کو اس کی جوہری شکل میں تسلیم کرنے کی صلاحیت کو مسخ کر دیا ہے۔" اسی طرح علامت پرستی کے بارے میں اُن کی رائے ہے:۔

"اہمیت یا قدر علامت کی یا علامت میں نہیں ہوتی وہ اس سے اخذ کیے ہوئے احساس کی کیفیت میں ہوتی ہے۔"

اگیے کی شہرت کا باعث افسانے یا ناول کی بجائے ان کی شاعری ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار کی گہرائی اور وسعت سب سے زیادہ شاعری میں ہی جھلکتی ہے۔ اگیے نے ہندوستانی کلچر میں ہندی زبان کے شیکسپیئر اور شاعری کی نزاکت و لطافت کو اس طرح سمو دیا ہے کہ اُن کی شاعری عہدِ حاضر کی داخلی دستاویز بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری کے محض معانی جان لینے سے ہی اس سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ہمیں ان الفاظ کے پیچھے چھپی تہہ در تہہ پرتوں کو کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے ——

دیکھو

بلّی

دھوپ کو ایک بار بے جھجک دیکھ لو

بیخبر ہے

پر من اسی میں سے اُبھرا ہے

جس کی
اُنت[1] لکھی آتما ہے

۱۷ شعری مجموعوں میں پھیلی ہوئی ان کی کرتیاں فطرت اور انسان کے ازلی رشتے کے از سر نو دریافت کرنے والی شاعری کے نمونے ہیں۔ اگیئے کی اوّلین دور کی شاعری میں رومانیت، دوسرے میں جدیدیت، تیسرے میں تو تصوف کی جھلک ملتی ہے۔ اگیئے نے ہندی شاعری کو چھایاواد کے بے جان رومان پرستی اور ترقی پسندی کی غیر ادبی نعرہ پرستی سے آزاد کر کے اُسے نیا محاورہ اور نئی نظر دی۔ اگیئے کی نظر میں تجربے کا کوئی ازم نہیں ہوتا۔ تجربہ اپنے آپ میں نہ مرغوب ہے نہ مقصد۔ ٹھیک اسی طرح شاعری کا کوئی ازم نہیں ہوتا۔ شاعری اپنے آپ میں مرغوب یا مقصد نہیں، اس لیے ہمیں تجربہ پسند کہنا اتنا ہی صحیح یا غلط ہے جتنا کہ ہمیں شاعری پسند کہنا۔ تارسپتک (۱۹۴۱ء) جسے اگیئے نے مرتب کیا ہے۔ نئی ہندی شاعری کی شروعات مانی جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا سپتک پھر تیسرا اور چوتھا سپتک ان مجموعوں نے نئی شاعری کی روایت کو نئی نسل سے جوڑ دیا۔ تارسپتک جس جدت اور تجربات کو لے کر منظرِ عام پر آیا، روایت پرستوں اور ترقی پسندوں نے اس کی سخت تنقید اور مخالفت کی حالانکہ تارسپتک کے زیادہ تر شاعر مارکسی تھے لیکن تارسپتک کی تمہید میں یہ صاف الفاظ میں کہا گیا کہ یہ شعرا کسی ازم کے نہیں بلکہ نئی راہوں کے متلاشی ہیں۔ اگیئے کی ادارت میں شائع ہونے والے 'پرتیک' اور بعد میں 'نیا پرتیک' نے بھی تجرباتی شاعری کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ تجرباتی شاعری اپنی تمام قوت اور نئے اظہار کے امکانات اگیئے کے وسیلے سے ہی حاصل کر سکی ہے۔

اگیئے نے ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کی تمام شاعری کو ایک شعری مجموعے "سدانیرا" میں جمع کر دیا تھا۔ ہر نظم کے ساتھ اس کی تخلیق کی تاریخ اور مقام کو بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے ان کی شاعری کے ارتقار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ عمل ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ اس کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس سفر میں بس تلاش ہی تلاش ہے، اس لیے وہ ہم عصر ہندی شاعری کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اس معنی میں وہ خاص شاعری ہے۔ اوپر سے لگے کہ آپ اس میں جھانک نہیں سکتے۔ لیکن ذرا غور سے اس کے اندر جھانکیے تو سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اپنے شاعرانہ عمل میں ایسا 'جذب' شاذ ہی کسی کو ودیعت ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو اپنے فکر و احساس کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے تخیل کی وسعتوں میں اُڑا کر اور وجدان کی گہرائی میں ڈبو کر اگیئے نے اپنی شاعری کو فنی چابکدستی سے ایک ایسا نیا اور اچھوتا لمس دیا ہے جو پھر کسی کو نصیب نہیں۔

جذبۂ بغاوت ہو یا جوشِ عشق، بندِ غم ہو یا قربِ نشاط اپنی زمین اپنے آسمان کی وسعتوں کی پہچان اور اس پہچان کی روشنی میں نوعِ انسانی کی مشیت اور مشغلے میں خود کو کھو دینے کی آرزو۔ یہ سب کچھ اگر کہیں یکجا ہو جاتا ہے تو وہ اگیئے کی شاعری میں ہے۔ "سدانیرا" کے نام سے ہی واضح ہے کہ اس میں اگیئے کی شاعری سمندر کی لہروں پر رقص کرتی، چاند کی طرف لپکتی، سورج کی پہلی کرن کو نمسکار کرتی ہے۔ "سدانیرا" کسی سرچشمے کی تلاش نہیں سرچشمے کے ساتھ اپنے کو جوڑ کر اپنی تکمیل کے عمل کا بیان ہے۔

" ندر دیکھ پھر مجھ کو
اکیلا
یہاں لایا
ندی کے بانک[2] پر
چھایا
اگیئے کے لیے شاعری عشقِ حقیقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو شعوری بھی ہے اور وجدانی بھی ہے۔ ٹھوس تجربات کو سیال الفاظ میں ڈھالنے کی تخلیقی قوت اگیئے میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ندی اور پر ستھل (ریگستان) پر ان کی نظمیں اس کی زندہ جاوید مثال ہیں۔ یوں تو لگاتار تجرباتی دور سے گزرنے والے اس شاعر کی تخلیقی اُپج نے اس کے ہر مجموعے کو ہندی شاعری کے سفر کی دستاویز بنا دیا، لیکن ان کا نیا شعری مجموعہ "ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے" جس میں ۱۹۸۱ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک کی شاعری شامل ہے کا نیاپن ان قارئین کے لیے بھی تحیر کا باعث ہے جو اُن کی شاعری کو پوری طرح قبول نہیں کرتے۔ بڑے ہی سہج انداز میں وہ قاری کو روشنی کے اس ہالے میں لے آتے ہیں جس میں وہ اپنا گھر چاہتا ہے۔ وہ گھر جس میں چاہے جدھر بھی دیکھو تمہیں باہر کا درشیہ دکھ جائے گا، مگر نہیں دیکھے گا یہ روشنی پاردرشی ہونے کی کیفیت ان کی نظم "ناچ" کو نئی جہتوں سے روشناس کرا دیتی ہے۔

" ایک تنی ہوئی رسّی ہے جس پر میں ناچتا ہوں۔
جس تنی ہوئی رسّی پر میں ناچتا ہوں
وہ دو کھمبوں کے بیچ ہے
رسّی پر میں ناچتا ہوں
وہ ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک کا ناچ ہے
دو کھمبوں کے بیچ جس تنی ہوئی رسّی پر میں ناچتا ہوں
اس پر تیکھی روشنی پڑتی ہے
جس میں لوگ میرا ناچ دیکھتے ہیں
نہ مجھے دیکھتے ہیں جو ناچتا ہے
نہ رسّی کو جس پر میں ناچتا ہوں
نہ کھمبوں کو جس پر رسّی لگی ہے
نہ روشنی کو ہی جس میں ناچ دکھتا ہے
پر میں جو ناچتا
جو جس رسّی پر ناچتا ہوں
جو جن کھمبوں کے بیچ ہے
جس پر جو روشنی پڑتی ہے
اُس روشنی میں ان کھمبوں کے بیچ اس رسّی پر

---

[1] نمو پائی ہوئی

[2] گھاؤ

اصل میں میں ناچتا نہیں ہوں
میں کیول اس کھمبے سے اس کھمبے تک دوڑتا ہوں۔
کہ اس یا اس کھمبے سے رسّی کھول دوں
کہ تناؤ چکے اور ڈھیل میں مجھے چھٹی ہو جائے
پر تناؤ ڈھیلتا نہیں
اور میں اس کھمبے تک دوڑتا ہوں
پر تناؤ ویسا ہی بنا رہتا ہے
سب کچھ ویسا ہی بنا رہتا ہے
اور وہی میرا ناچ ہے
جسے سب دیکھتے ہیں
مجھے نہیں
رسّی کو نہیں
کھمبے نہیں
روشنی نہیں
تناؤ بھی نہیں
دیکھتے ہیں ناچ

ادب کی کون سی ایسی صنف ہے جو اگیئے کے قلم سے اچھوتی رہ گئی ہو، جو ان کے قلم کے چھونے سے انفرادیت کی حامل نہ ہو گئی ہو۔ ناول، افسانہ، شاعری، مضامین، انشائیہ، سوانح، یادیں، خطوط، ڈائری، جرنل / سفرنامے، تنقید، ڈرامہ، ترجمہ کون سی ایسی صنف ہے جس میں اگیئے کی منفرد چھاپ نہ ہو۔ ان میں "اپنے اپنے اجنبی" اور "ندی کے دیپ" کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ اگیئے نے اخبارات اور رسائل کی ادارت بھی کی ہے۔ اور صحافت کو بھی تخلیق کا درجہ عطا کر دیا۔ ان میں بجلی، وشال بھارت، سینک، نو بھارت ٹائمز، دِن مان، پرتیک اور نیا پرتیک اور انگریزی میں واک اور الیوری میں شامل ہیں

اگیئے کے لیے قلم ہی اظہار کا ذریعہ نہیں تھا۔ گیلی چکنی مٹی سے ہاتھ برتنوں اور گلدانوں کی گولائیوں کو دہراتے ہوئے، رنگوں سے سنے ہاتھ کینوس پر مناظرِ قدرت کی رنگینیاں بکھیرتے ہوئے، کیاریاں بناتے، پودے لگاتے، پانی دیتے، لکڑی کاٹتے، تراشتے، کیلیں ٹھونکتے، چمڑے کا کام کرتے، سلائی کڑھائی کرتے ہاتھ ہر کام "اگیئے" کرتے تھے۔ اُن کا وشواس تھا کہ اہلِ دانش اور فن کاروں اور شاعروں کو ہاتھ کے کام کرنے چاہیئں۔ ذہنی عملی اور جسمانی مشقت کے بیچ جو مصنوعی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسے مٹا دینا ضروری ہے۔ اگیئے نے کہا تھا کہ میں اپنے سب کام خود کر لیتا ہوں کھانا بھی بنا لیتا ہوں۔ سلائی کڑھائی بُنائی سب آگئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے سلے ہوئے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ وہ کیمرہ لیے جنگل جنگل، صحرا صحرا، بستی بستی گھومتے تھے۔ ندی، سمندر، پہاڑ اُن کی تصویروں میں زندہ ہو جاتے تھے۔ بڑے شوق سے وہ اپنی سلائیڈز کو پروجیکٹ کرتے تھے۔ کمنٹری دیتے تھے۔ وہ ایسا انقلابی تھا جو بم بناتا تھا، ایسا فوجی جو اپنی خاکی وردی پر جھولا لٹکائے جنگل جنگل گھومتا تھا۔ اور جب وہ قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اعلیٰ ذوق، گہری جمالیاتی حس، ادبِ عالیہ اور علم و دانش کا پیکر بن جاتا ہے۔ اگیئے نے مکمل زندگی جی، اگیئے نے جس شعبے میں بھی کام کیا اُسے لافانی بنا دیا۔ اگیئے نے کہا: "معاشی مسئلہ ایک شہری کے لیے اہم سوال ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ شاعر بھوکا رہتا ہے۔ اگر رہتا ہے تو اُسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ تخلیق کار کو اپنے کو ایسی حالت میں بنائے رکھنا چاہیے کہ وہ سماج کو کچھ دے رہا ہے یہ نہیں کہ اُسے سماج سے کچھ پانا ہے جب کہ شہری کے لیے ہوتا یہ ہے کہ اُسے سماج سے کچھ پانا بھی ہے۔ اگیئے صحیح معنی میں Innovator تھے۔ محض ادب کے شعبے میں ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی فکر و احساس کے تخلیقی اظہار میں ہی نہیں، روزمرہ کی بات چیت میں بھی اگیئے میں نئے سوالات کو اٹھانے اور پرانے سوالات کی نئی تشریح کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ نصف صدی سے بھی زائد عرصے تک اگیئے کی شخصیت اور فن ہندی ادب پر حاوی رہے۔ اُن کی تخلیقات کے فنی اور فکری جوہر نے اُن کے تخلیقی وجود کو مستند اور لاثانی بنا دیا۔

اگیئے کو کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات ملے۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے لے کر بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ تک۔ اگیئے نے نوجوان ادیبوں کے لیے اُسی انعام سے وتسل ندھی قائم کی تاکہ آنے والی نسلیں اپنے بزرگ ادیبوں سے مل بیٹھ کر اپنی تہذیبی روایت کو آگے بڑھائیں نئے کی تشکیل کریں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لائیں۔ اس وتسل ندھی کے نو اہم اشاعتی پروگرام ہیں۔ ہیرانند شاستری سمارک ویاکھیان مالا اور وتسل ندھی پرکاشن مالا اس طرح اُنہوں نے نہ صرف اپنے دور میں ہندی ادب کو نئی راہوں سے آشنا کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے اپنی زمین خود تلاش کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔

فراق نے لکھا تھا کہ آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی کہ تم نے فراق کو دیکھا تھا۔ یہ بات اگیئے کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ایسا شخص اپنے دور میں Legend بن جاتا ہے، جس کے گرد قصے اور داستانیں بُنی جاتی ہیں اور جو جانی پہچانی دنیا کے باشندے کے بجائے کسی دور دراز پُراسرار دیش کا باسی بن جاتا ہے۔ اگیئے کے الفاظ ہیں: "میں ایک چیز میں لکھا گیا سا" ساری عمر شبد سے پیار کرتے رہے، سنوارتے رہے، لیکن شبد اُن کے تخلیقی اظہار کے لیے ناکافی ثابت ہوئے اور اُنہیں سنّاٹے کا احساس ہوا۔

" شبد میں میری سمائی نہیں ہوتی
میں سنّاٹے کا چھند ہوں "

لیکن کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ایک شاعر جس کا سارا سرمایہ الفاظ ہیں اور جس نے الفاظ کو بڑی تراش خراش کے بعد استعمال کیا ہو، لکھنے پر مجبور ہو جائے۔

" اپنے جیون کے بالو پر
اپنی سانسوں میں لکھا رہ جاؤں گا
میں سنّاٹے کا چھند ہوں
' ایشور آگ ہے آگ پہاڑ پر ہے' دھدک رہی ہے'
لیکن اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی جاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

کرشن دت پالیوال

اگیئے کی سرزمینِ شاعری

ایک بالغ نظر اور جدید شخص جب واتسائن اگیئے کی شاعری پر غور کرنے بیٹھتا ہے تب اُسے اس شاعری میں ایک خاص قسم کے تہذیبی تفکر کا احساس ہوتا ہے۔ اگیئے نے ہندوستانی شاعری کی قدیم روایات کے مخزن سے اس تہذیبی تفکر کو بڑی احتیاط سے حاصل کر کے اپنی تخلیقات کا جزو بنایا ہے۔ جب واتسائن اگیئے نے شاعری میں روایتی شاعری کی لگی بندھی اور غیر متعلق اہمیتوں کو توڑ کر اپنے مضامین اور دیباچوں کے ذریعے ایک نئی شاعری تخلیق کرنے کے امکانات کا راستہ بنایا تو وہ اپنی ہی نہیں، آگے آنے والی تخلیقیت کی سمت اور نظر کی طرف بھی اشارہ کر رہے تھے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ہماری توجہ شاعری کے بدلتے ہوئے رومانی رشتوں کی طرف بھی جاتی ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ نیا احساس اپنی حسیت میں نئے ڈھنگ سے ڈھلتا بنتا معلوم ہوتا ہے۔ وقار اور نئی نظر کی خوبیوں سے بھرپور یہ تخلیقیت جب سادگیٔ اظہار سے سامنے آتی ہے تو وہ ہمارے دل کو چھوتی اور متاثر کرتی ہے۔ نئی شاعری میں لفظی بازی گری' لے اور بناوٹ کا انداز اتنا ہٹ کر ہے کہ یہ شاعری' شاعری کے سفر سے الگ ہٹ کر اپنا الگ وجود بنانے لگتی ہے۔ اگیئے کے لفظوں میں کہیں تو یہ شاعری جانے پہچانے کو نیا اور اَن جانے کو جانا پہچانا بنا کر اپنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اگیئے کی شاعری میں قدرے گہرائی میں جانے سے یہ نظر آنے لگتا ہے کہ وہ پرساد، پنت' نرالا کیدار' ناگ ارجن، ترلوچن اور مکتی بودھ کی روایت سے الگ معلوم ہوتے ہوئے بھی اس سے کسی قدر جُڑی ہوئی ہے۔ مکتی بودھ کا شعری سفر اگیئے کے شعری احساس سے مختلف نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے لگتے ہیں اس تکمیل کے صحیح سیاق وسباق میں جائے بغیر نہ تو مکتی بودھ کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اگیئے کو۔ جن ناقدوں نے مکتی بودھ اور اگیئے کو ایک دوسرے کا مخالف دکھا کر اپنی اپنی رائے دی ہے' ان کے تنقیدی نکات پر پھر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مکتی بودھ اور اگیئے کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی نجات کی تلاش! اس تلاش کے لیے دونوں کے اپنے الگ وسیلے ہیں: جداگانہ اسلوب اور نگارش دونوں ہی انسانی وقار کو بتانے کے لیے لڑائی لڑتے ہیں۔ اگیئے محض رُوپ' فن' حُسن' چمتکار اور پیکر تراشی کے شاعر نہیں ہیں جیسا کہ ان کے مخالفین ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما کا یہ خیال کہ اگیئے جی وجودیت کے فلسفے سے متاثر شاعر ہیں (دیکھیں: نئی کویتا اور استتوواد) بحث مباحثے سے ثابت نہیں ہوتا۔ ہندوستانی مفکرین کی تو یہ خوبی رہی ہے کہ وہ ہر چیز پر پہلے شک ظاہر کرتے ہیں، پھر جواز پر جواز لاتے ہیں اور پھر ان جوازوں کی بنیاد پر ہی اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ مکمل استدلال سے لیس ہو کر اگیئے پر لوٹتے ہیں تو بھی پاتے ہیں کہ اگیئے کی شاعری دہریت' احساسِ شکست، کرب، موت اور المیے کی شاعری نہیں ہے۔ اس نظریے سے اس شاعری کا کوئی سیدھا تعلق ہی نہیں ہے کبھی بھی شاعر پر آس پاس کے ماحول کا جو بلا واسطہ اثر پڑتا ہے' ان حالات کو ڈھونڈنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس نئی دنیا میں کون سا ایسا شاعر ہے جو اپنے ماحول سے کٹ کر تخلیق کر سکتا ہے ـــــ بامعنی تخلیق! تخلیق اور تخلیق کار کا ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن ماحول کا یہ رشتہ ہر فن کار اپنے ڈھنگ سے اپناتا ہے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگیئے کے احساس شاعری کی تشکیل میں وجودیت پوری طرح شامل نہ ہو کر بس اُسے چھو گئی ہے۔

اگیئے جی دنیا بھر میں گھومتے رہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ دنیا بھر سے کوڑا کرکٹ جمع کر کے

ایف ۸/۹، ماڈل ٹاؤن' دہلی ۱۱۰۰۰۹

ہندی شاعری میں لاتے رہے۔ ہاں دنیا بھر کی نئی پرانی شاعری کی تحریکوں کو نزدیک سے سمجھنے کی انہوں نے کوشش ضرور کی۔ وہ جب کہتے ہیں: "اس لیے میں کوی ہوں، بنا ہوں — شعری مفہوم کی تلاش میں، میں کہاں نہیں گیا ہوں" تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا بھر سے شاعری کے اسلوب کو انہوں نے نقالی کی ذہنیت سے حاصل کیا ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ عصری شاعری کے رنگ ڈھنگ پر ان کی نگاہ جمی رہی ہے۔ تعارف کبھی تقلیدی نہیں ہوتا بلکہ معنی کو وسیع بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔ اس وسعت معنی میں ہی شاعروں کی داخلی ذہنیت میل کھا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اگییئے کا احساسِ شاعری ہندوستان کی روایات میں کالی داس اور پرساد سے اور مغربی ملکوں میں ٹی ایس ایلیٹ اور ازرا پاؤنڈ سے کافی ٹکراتا ہے۔ ایلیٹ سے کئی جہتوں میں متاثر ہو کر بھی اگییئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تقلیدی شاعر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری کا تاثر خالص ہندوستانی ہے۔ جو اپنے شعوری احساس میں کالی داس اور جے شنکر پرساد کی یاد دلاتا ہے۔ اگییئے کی پوری شاعری کالی داس کی لے اور جے شنکر پرساد کے عالمانہ رنگ کو ڈھونڈتے اور برتنے کا اظہار ہے اور یہ بات اگییئے کے تمام فنی شعور اور خوب صورتی کے احساس کی بنا پر بڑے یقین کے ساتھ ثابت کی جا سکتی ہے۔ اگییئے شاعری میں حسن، قوتِ گفتار کی بات کرتے ہیں۔ وہ انہیں براہِ راست کالی داس کے شعور کی رو سے جوڑتا ہے۔ انہیں ہمیشہ احساس رہا ہے کہ بڑا شاعر لطف و انبساط کا ماہر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا شاعر اظہار بیان کا ماہر ہوتا ہے۔

نئی شاعری کی تاریخ اگییئے کی تخلیقی مقبولیت کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔ جیسے جیسے اگییئے کی شاعرانہ عظمت بڑھتی رہی ہے ویسے ویسے ان کی تنقیدی صلاحیت میں جامعیت آتی رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ شاعری اور خاص طور سے اگییئے کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں اس تنقیدی شعور کا بس بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ 'تار سپتک' کے دیباچے کے تنقیدی عقیدے کی زمین اور دوسرے تیسرے اور چوتھے سپتک کے دیباچوں کی ٹکر میں اگییئے نے نئے شاعر اور نئی شاعری کی اہمیت اور رچاؤ کے لیے تاریخی جدوجہد کی ہے۔

اگییئے اپنی شاعری اور نثری تخلیقات میں ایک خاص طرح کی روایت کو ہمیشہ تلاش کرتے رہے ہیں۔ اور اس میں بھی خاص ہے اس عصرِ حاضر کی اُلجھی ہوئی زندگی کا شعوری ردِ عمل۔ شاعری کی ردیف قافیے اور لے کے جو اُلجھاؤ ہیں، ان سے اس عمل شاعر نے براہِ راست مقابلہ کیا اور انہیں تجربے کی آنچ سے تپا کر آسان شکل و صورت دے دی پھر بھی اگر اگییئے کی صلاحیت اور کارکردگی کو دیکھا جائے تو وہ ناقدوں کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج سے رہے ہیں۔ اور اس چیلنج کے اندر سے لگاتار ایک آواز اُٹھتی رہی ہے کہ ہندی کی نئی شاعری اگییئے جی کے شاعرانہ عمل سے بنی، سنوری اور سجی ہے۔ اگییئے جی نے خود اعتمادی کے ساتھ کہا ہے: "میں وہ دھنو ہوں، جسے سادھنے میں پرتیبنچی ٹوٹ گئی ہے۔ اسکھلت ہوا ہے بان یدیپ دُھنی دگ دگنت ہیں پھوٹ گئی ہے۔" (میں وہ کمان ہوں نشانہ لگانے میں جس کی ڈور ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا تیر جب خالی ہوا تو کمان کی آواز خلاؤں میں بکھر گئی ہے)

اگییئے ان گنے چنے فن کاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے نثر کے ساتھ نظم کو بھی اپنی تخلیقی فکر بنایا اور اپنے فلسفے کو اس کا خاص موضوع بنا رکھا۔ ٹیگور نے جس روایت کو اپنی اصل خود اعتمادی سے جوڑ کر نشاۃ ثانیہ میں بدل دیا تھا، جس میں نئے دانشوروں نے خود آگاہ ہونا شروع کیا تھا۔ روایت کے اسی تخلیقی رول کو اگییئے جی ٹھیک سے پہچانتے اور اسے اپنی شناخت بناتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگییئے نے چھایاواد یعنی رومانوی تحریک کے بعد والے دور میں جس ذہنی بلوغیت کے عناصر سے پُر تخلیقیت کا راستہ بنایا، اس میں علمی اور دیومالائی اثرات تحلیل ہو چکے تھے اور ایک کلاسیکل حسیت تخلیق میں ڈھل کر ظاہر ہونے لگی تھی۔ نو بیدار ہندوستانی دانشور طبقے اور خاص کر ہندی قارئین کو اگییئے نے نئے تخلیقی رول سے خوش گوار تحیر کا احساس کرایا۔ اگییئے کا قلم کار اپنے زمانے کے درد اور ستم ظریفیوں سے اُلجھتا ہے۔ زمانہ، ہم عصریت، جدیدیت، آزادی، احساسِ ذمہ داری، کارکردگی، روایت، ترقی، اخلاق جیسے سوال اندر سے جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظم اور نثر دونوں انہیں سوالوں کی تکرار کی زمین سے تکمیل پاتے ہیں۔

نثر میں کبھی پِٹی روایت کی غلامی اگییئے نے کبھی منظور نہیں کی۔ ان کا پورا نثری ادب دیکھ لیجیے۔ پہلی بار ہندی میں اتنا اُجلا نثری ادب اگییئے کے ہاتھوں پنپا ہے۔ یہ پریم چند کی نثری روایت کی ایک بڑی ترقی یافتہ شکل ہے۔ پریم چند کے بعد ہندی نثر اگییئے کے ہاتھوں کتنی جلدی جوان ہوئی، 'شیکھر' 'ایک جیوتی' سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری سے بھی زیادہ شیکھر کی نثر تخلیقی ہے۔ ادبی حسیت کا کھلاپن اور تخلیقی جوش ان کی نثر میں سویرے کی دھوپ بن کر پھیلا ہوا ہے — مرصع نگاری سے یہ چھوٹ حقیقی نثر کے لیے نئے امکانات پیدا کرتی ہے۔ اگییئے نے پریم چند کی نثری توانائی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ زندگی کی اُلجھنیں ان میں چھوٹے چھوٹے فرق اور دوسرے سوالات جو ہمارے ذہن میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، ان کے اور سنئے انسان کے زندہ مسائل کے بارے میں نثر ہی میں وضاحت سے بتایا جا سکتا ہے۔ شاعری کوشش کرنے پر بھی وہ سب ظاہر نہیں کر سکتی جو اچھی نثر کر سکتی ہے۔

کہیں نہ کہیں اگییئے نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ کن خاص حالات کے سبب ہندی کی شاعری اپنی بات کہہ سکنے میں پوری طرح کام یاب نہیں ہو پاتی ہے۔ اگییئے ہی کیوں، آج کے سب ہی ہندی کے قلم کار

شاعری لکھ کر بھی پوری طرح خود کو ایکسپریس کرنے کے لیے نثر کا ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنی ذات کے اظہار اور اپنے روبرو ہونے کے لیے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی اس دور میں ایک لازمی ضرورت بنی ہوئی ہے۔ اگیئے کے ساتھ مزیدار بات یہ ہے کہ ان کی نثر پڑھنے کے بعد ان کی شاعری کو پڑھنے کے لیے دل بہت چاہتا ہے اور شاعری پڑھنے کے بعد نثر کی ہڑک سی اٹھتی ہے۔ دونوں ذریعوں سے ان کی ذہنیت اور حسیت ایک کھلے ہوئے آدمی کی تصویر سامنے لاتی ہے۔ دل کے ساتھ ان کا ذہن بھی حرکت میں رہتا ہے — تخلیقیت پر محض شاعری سوار ہونے نہیں پاتی۔ رومانیت پسند تخلیق پر "شعریت" نے جس طرح سے تسلط جما رکھا ہے، وہ اسے کمزور بناتا ہے۔ پھر نرالا کو چھوڑ دیں تو پرساد، پنت اور مہادیوی کی شاعری میں شعری زبان اور شعریت کا ایک منتخب غرور دمکتا دکھائی دیتا ہے۔ صرف نرالا میں ہی بھارتیندو کی طرح عوامی رنگ اور آمرانہ رنگ کا ٹکراؤ ملتا ہے۔ پرساد جی کے ہاں ہندوستانی ثقافت کے اثرات آمرانہ انداز سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور یہ آمریت ہی پرساد کی طاقت اور حد بھی بنی گئی۔ اور آخر وہ اسی ہوس کا شکار بنتے گئے۔ لیکن پرساد کا تہذیبی قومی اور نو بیدار لہجہ ان کی فکر کا فطری نتیجہ تھا۔

پرساد اور اگیئے کے تہذیبی تفکر میں ایک گہری مماثلت ہے۔ ساتھ ہی پرساد اور اگیئے نے ہندوستانی لفظ و معنی کی روایت کو بار بار مانجھ کر سنوار کر جذب کیا ہے۔ دونوں ہی اپنے وقت کی زبانِ شاعری سے مطمئن نہیں ہیں اور انھوں نے زبانِ شاعری کے ساتھ اتنی تخلیقی محنت کی کہ ہندی شاعری کو پھر ممکن بنایا۔ شروع شروع میں اگیئے چھایا واد کے رومانی اثرات میں لپٹے نظر آتے ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے انھوں نے خود کو رومانی اثرات سے آزاد کیا۔ یہ بات 'ساگر مدار' اور 'ندی کی ناؤ' پر چھایا، جیسے شعری مجموعوں کی شاعرانہ زبان، لے، لہجہ، آواز وغیرہ کی بنیاد پر وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ پرساد کے ساتھ نرالا کی باغی شخصیت اگیئے میں جھانکتی نظر آتی ہے۔ نئے اشعار، ان کا ترنم، ان کی بناوٹ کے استعمال میں اگیئے جی — صحیح جائزہ لینے پر کم انقلابی [illegible] نہیں آتے۔ تجرباتی حدود میں وہ نرالا کی روایت شاعری کو بے خوف ہو کر سنوارتے ہیں اور اس کے سجے ہوئے روپ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور اس میں نئے امکانات کو اجاگر کرتے ہیں۔ پرساد اور نرالا دونوں ہی اپنے ڈھنگ سے اگیئے جی میں زندہ ہیں۔

رومانیت پسند شاعروں کو نئی شعری زمین توڑنے پر دویدی دور کے ادبی ناخداؤں کی زبردست مخالفت جھیلنی پڑی تھی، لیکن ان سے بھی زیادہ مخالفت اگیئے کو شعری سرزمین پر برداشت کرنی پڑی ہے۔ چھایا وادی یعنی رومانوی ناخداؤں نے خاص کر آچاریہ نند دلارے واجپئی نے بہت ہی سخت لفظوں میں انھیں نئے تجربوں کا حمایتی کہہ کر للکارا تھا۔ لیکن اگیئے ان مخالفتوں کے آگے جھکے نہیں — بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان مخالفتوں نے ہی انھیں بڑی طاقت دی ہے۔

بیسویں صدی کا جو آندولن 'جدیدیت' کی آڑ میں وکٹورین یقینیوں کو ڈھانے میں کامیاب رہا اور بعد میں جو خود ایک روڑی میں بدل گیا، اس کے پرکشش نعروں سے اگیئے متاثر نہ ہوئے۔ اگیئے نے جدیدیت کے فارمولوں پر شک ظاہر کیا اور اسے ایک آسان ڈھال کی شکل میں حاصل نہیں کیا۔ جدیدیت ان کے لیے نہ تو ترقی پسند معنوں میں تھی نہ قیمتی تفکر کے۔ وہ ان میں صرف ایک معنی خیز فکر بن کر ہی جگہ پا سکی۔ جدیدیت کیا ہے، کے چکر سے بچنا اگیئے کو پسند رہا ہے۔ مگر دوسروں کے ذریعے بار بار کریدے جانے پر انھوں نے اتنا ہی سوچا: "جدیدیت ہو تو کیا ہونی چاہیے؟" اور غور کرنے پر پایا کہ جدیدیت عہدِ رواں کے ساتھ ایک نئے انداز کا تعلق ہے یا ہونا چاہیے۔ جدیدیت بنیادی طور پر ایک نئے ڈھنگ کا احساسِ زمانہ ہے اور ہمارے شعور کا اس پر منحصر روپ' بڑے دوررس نتائج رکھتا ہے۔ زمانے کے ساتھ تعلقات بدلنے سے ہمارے بہت سے تعلقات لازمی طور پر بدل جاتے ہیں۔ تاریخ کے ساتھ، سماجی ماحول کے ساتھ، سسٹم اور محنت کے ساتھ نظم و ضبط، فن، ادب اور علوم و فنون کے ساتھ۔" (کیندرا اور پریدھی۔ ص: ۳۴۲)

جدیدیت پر ٹھیک سے غور نہ کرنے والے سماجیات اور اقتصادیات کے ماہرین نے اس سوال کو الجھا کر بھٹکا دیا ہے۔ اگیئے اس خطرے کو سمجھ کر ہی نئے وقتی شعور پر منحصر حسیت کو ہی جدیدیت کے مرکز میں رکھتے ہیں۔ جدیدیت حسیت کا نیا تاثر ہے، جسے وہ شہریت، جدت، مغربیت، مشینیت وغیرہ سے جوڑ کر نہیں دیکھتے۔ کوئی چاہے تو انھیں جدید تخلیق کار بھی کہہ سکتا ہے۔

اگیئے جی نے یہ بھی محسوس کیا کہ تخلیق ایک ترسیلی سلسلہ ہے اس لیے فنی اور ادبی دنیا میں ذرائع ابلاغ کو الگ رکھ کر حسیت پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اگیئے کے لیے فن کے تعلق سے مسئلہ یہ رہا ہے کہ کسی دور کا قلم کار دوسروں تک کیسے پہنچتا ہے۔ کیوں کہ حالات بدلنے کے ساتھ سماج بدلتا ہے، فن کا موضوع بدلتا ہے، حقیقت بدلتی ہے، پیار محبت کے رشتے بدلتے ہیں، طور طریقے بدلتے ہیں اور ابلاغ کے ذریعوں میں بہتری آتی ہے۔ جب انداز بدلتے ہیں تو تبدیلی سے فن اور فن کار کے سامنے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تب نیا دور 'ادب میں نئی حقیقت کی پہچان کراتا ہے۔ حقیقت سے زندگی کے نئے رشتے قائم کرتا ہے۔ اسی موڑ پر آ کر فن کار تخلیق کی مختلف شکلوں میں نئے اسلوبوں کا استعمال کرتا ہے اور تب فن کے پرانے جانے پہچانے ماڈل بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس معنی ہی میں تخلیقیت اپنی تیز رفتاری اور ملاعنت سے اصولوں کو پچھاڑتی چلتی ہے۔ تیز رفتار ندی کے بہاؤ کی طرح

تخلیقیت فالتو چیزوں کو اپنے درمیان سے ہٹا کر کنارے پر پھینکتی چلتی ہے۔ یہی ترقی کا تسلسل ہے۔ سمجھ دار اور باشعور نقاد بھی تخلیقیت کی تبدیلی کے ساتھ تخلیق کو پرکھنے، کسنے، جانچنے کے تنقیدی معیار بدلتے رہتے ہیں۔ اگر نہیں بدلتے تو حالت وہی ہوتی ہے جو نئی شاعری کی تخلیقی حسیت کو نہ سمجھنے والے رومانوی ترقی پسند نقادوں میں سے بہت سوں کی ہوئی۔

ادب میں روایت کا ماضی ہی زندہ نہیں تھا بلکہ حال اور مستقبل بھی زندہ رہتا ہے۔ ہر تخلیق کی بیش کش اس کے موضوع کو استحکام بخشتی ہے۔ اور موضوع بدلتی ہوئی حقیقت سے جڑا رہتا ہے۔ اور حقیقت گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ جڑی رہتی ہے۔ بدلنے پر بھی ہر چیز ہر چیز سے جڑی رہتی ہے۔ لفظ زبان سے، زبان تمثیل و استعاروں سے، تمثیل و استعارے نئے حوالوں سے اور معنی اظہار و ابلاغ سے جڑے رہتے ہیں۔ تخلیق تنہائی میں ہوتی ضرور ہے، مگر وہ خود اکیلی نہیں ہوتی۔ باہر کی حقیقت میں ڈھلنے سے پہلے وہ مجموعی یادداشتوں کے رنگوں میں تپتی ہے۔ ذاتی تجربات کو اجتماعی تجربوں اور یادداشتوں میں بدلنے کی کوشش تناؤ ہے اور تناؤ ہی فن کی سچی جدوجہد ہے۔ اس معنی میں دیکھیں تو انفرادی طور پر اپنی بات کہنے والے اگیئے بھی فن کی کسوٹی پر یہی ثابت کرتے ہیں کہ وہ چاہے تجربے میں تنہا ہوں، مگر مجموعی یادداشتوں میں اکیلے نہیں ہیں۔ ایک عظیم سی جہت ان کے ساتھ رہتی ہے اور وہ اس تسلسل میں بہتے رہتے ہیں —— وہ ایک تیز رفتار مسافر ہیں۔ اگیئے کی تخلیقیت انفرادی ہوتے ہوئے بھی سماجیت کے ساتھ بڑی مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک پل کی بات کہنے پر بھی لمحاتی نہیں ہیں۔ نہ وہ بھیڑ سے الگ 'ندی کے دویپ' ہیں۔ وہ تو لفظوں اور سچائی کو ملانے والے تخلیق کار ہیں۔ لفظوں اور سچائی کو ملانے سے شاعری میں مہامون یعنی انتہائی خامشی سمندر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اسی تجربے کا عکاس یہ مصرع ہے:

'اس وشال میں مجھ سے بہا نہ گیا
کیوں کہ یہ مہاشونیے کا سُتور
ایسے پھیلا رہا اوپر
نیچے یہ مہامون کی سریتا
دگ وہین بہتی ہے'
(یہ انتہائی خامشی کا کیمپ
لامحدود پھیلا رہا اوپر
نیچے یہ انتہائی خامشی کی ندی
بے سمت بہتی ہے)

وسعت آدمی کے غرور اور دکھاوے کو توڑ دیتی ہے تب شاعر یہی کہہ پاتا ہے:

'لفظ، یہ صحیح ہے، سب فضول ہیں
پر اس لیے کہ لفظوں سے پرے کچھ معنی ہیں
شاید صرف اتنا ہی جو درد ہے
وہ بڑا ہے مجھی سے
سہا نہیں گیا
تبھی تو جو
ابھی رہا وہ
کہا نہیں گیا'

اس نظم کو جس مٹی سے سنوارا گیا ہے وہ اندر کی حسیت ہے جسے بحث و مباحثہ سے نہیں پکڑا جا سکتا۔ اسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی معنی سے اگیئے کی شاعری بحث و مباحثے کی بجائے محسوس کرنے کی چیز ہے اسی سے وہ کھلتی ہے اور قاری کو کھولتی ہے۔ اسی لیے جو لوگ اگیئے کی شاعری سے کسی سیاسی وفاداری کی بات کرتے ہیں، چاہتے ہیں اور اسے نہ پا کر بگڑ جاتے ہیں، برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اگیئے کی وفاداری اس انسان کے درد کے ساتھ ہے جو مٹی کو ڑتا ہے

کودئی کھاتا ہے
گیہوں کھلاتا ہے
اس کی میں سادھنا ہوں
یہ جو گٹی پھوڑتا ہے
مڑھیا میں رہتا اور محلوں کو بناتا ہے
اس کی میں آستھا (عقیدہ) ہوں'

محنت کی جدوجہد میں مبتلا انسان ہی اگیئے کی اس تخلیق کا مرکز ہے۔ ایک ایسا فاتح انسان جو ہار کر بھی جیتا جاتا ہے۔

'یہ ہارتا نہیں، نہ مرتا ہے
مظلوم، محنت کش خالق ——
اس کی میں کہانی ہوں'
(میں وہاں ہوں) اگیئے کا یہ انسان آچاریہ ہزاری پرساد دویدی کے اس انسان جیسا ہے جس کے فاتحانہ سفر میں دویدی جی زندگی بھر یقین رکھتے رہے ہیں۔ وہ انسان جو خالق کا مظہر ہے، تاریخ بناتا اور بدلتا ہے وہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ انسان کے اسی تحریری اور غیر تحریری تاریخ کی کہانی اگیئے کی تخلیقات گاتی ہیں۔

یہ تخلیقیت انسان اور انسانیت کے بیچ پل کا کام کرتی ہے۔ یہ شاعر تجربے کے ایک ستون کو تجربے کے دوسرے ستون سے ملاتا ہے:

جو انسان کو ایک کرتا ہے
اجتماعیت جس کی محراب ہیں
اور عوامی زندگی کی ہمیشہ رہنے والی ندی اس کے
نیچے سے گزرتی ہے
مڑتی بل کھاتی
نئے راستے بناتی
نئے کنارے توڑتی'
ہمیشہ بدلنے والی'
سمندر کی طرف جاتی، جاتی، جاتی'

یہ ندی احساس وقت کے بہاؤ کی جدیدیت سے گھاٹ اور پاٹ توڑ کر نیا راستہ بدلتی ہے، مگر تاریخی حسیت کی بنیاد کو نہیں چھوڑتی ساگر میں سما جاتی ہے۔

اس لیے اگیئے کی شاعرانہ معنویت کو ان کی سب سے محبوب اشاریت 'ساگر' سے سمجھا

جاسکتا ہے۔ یہ ساگر ایک کھلی زندگی ہے، جس میں جاندار اپنی نجات تلاش کرتا ہے۔ وسیع معنوں میں کہا جائے تو انسانی نجات کی شدید خواہش اور اس کی تلاش ہی اگیئے کی شاعری کی بنیادی زمین ہے۔ اس زمین کی تلاش میں شاعری صرف اگیئے کا شاعر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پوری روایت کی تاریخی اور ثقافتی چھلنی میں چھنی ہوئی نئی حسیت اور اس کا ذریعہ بھی شاعری کرتا ہے۔

درست یہ ہے کہ شاعری کا وسیلہ اُلجھاؤ دار حسیت اور ثقافت کو ٹھیک سے کھول نہیں پاتا، لیکن ان کی نثر یہ کام بڑی آسانی سے کر لیتی ہے۔ شاعری آدمیت کی جڑوں سے جڑی رہتی ہے۔ اور اس پر ایک ایسی زبان کا پہرہ ہوتا ہے جو اُسے اُکھڑنے نہیں دیتی بلکہ بار بار اُسے سنوارتی ہے۔ اسی معنی میں شاعری زبان میں نئے ہونے کا عمل ہے۔ اس سچائی کو نئی شاعری میں اگیئے جتنی اچھی طرح جانتے ہیں، اُن کا کوئی اور ہم عصر شاعر نہیں جانتا۔ مکتی بودھ بھی نہیں — سرویشور، وجے دیو، نارائن ساہی اور دھومل بھی نہیں۔ اپنی اسی سمجھ کے بھروسے سے شعری اسلوب اور زبانِ شاعری میں اصل تبدیلی کے راستے اُنہوں نے کھولے ہیں۔ شاعرانہ زمین پر نرالا کے ساتھ نئی بحروں، نئی لَے اور نئے اوزان کا استعمال اگیئے نے ہی کیا ہے۔ ہندی شاعری کی اجتماعی روایت کا دباؤ اگیئے کی شاعری کی حسیت پر جس ڈھنگ سے پڑا ہے، وہ سوچنے کی بات ہے۔ چونکہ ایسی کوئی مالا مال نثری روایت ہزار سال تک نہیں تھی۔ اس لیے شاعری میں ہی اُسے بامعنی راستہ مل سکتا تھا۔ نثر میں زندگی براہِ راست داخل ہوتی ہے، مگر شاعری میں وہ دھیرے دھیرے گھستی ہے۔ اور پھر جب گھس جاتی ہے تو قاری کے ادراک کو اُس حد تک کستی ہے۔ اس کے اثرات جڑ تک پہنچتے ہیں۔ شاعری زبان کی بڑی تیاری چاہتی ہے۔ کیوں کہ نئی حسیت کی ترسیل اس کے ہی ذمہ ہے۔ اگیئے اور مکتی بودھ بہت ساری نثر لکھنے کے بعد ہی شاعری کی باریک، معنی خیز جھنکاروں کو منظم کر سکے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک آرکائی گہری اور مالا مال تخلیق کے لیے نثری اور نظمی حدوں کو توڑ کر چلنا پڑتا ہے۔

اگیئے فطری طور پر روادار شاعر ہیں۔ اور ذہن سے اسلوب کے متلاشی۔ یہ تضاد ان کی شاعری کے ایک باصلاحیت قاری کو اُلجھاتا ہے۔ اس مشکل کی وجہ سے اگیئے کی شاعری کی اپیل مکتی بودھ کی شاعری کی اپیل جیسی نہیں ہے حسی علامات کی شعری وسعت مکتی بودھ میں اگیئے سے زیادہ ہے۔ اور پھر مکتی بودھ اسلوب کو لے کر نہیں چونکتے بلکہ چونکا ہوا اسلوب ہی ان کی شاعری میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے — جس کا نہ مونہہ دھلا ہے اور نہ آنکھوں میں کاجل لگا ہے نہ بال سنوارے گئے ہیں — بس ایک دم سادہ! مکتی بودھ کی سادگی کے سامنے اگیئے کا بناوٹی اسلوب کھٹکتا ہے۔ مکتی بودھ میں عوامی حسیت نے آمرانہ حسیت کو بڑھ کر پٹک دیا ہے، اس کی طبیعت جھک کر دی ہے، لیکن اگیئے کے ہاں عوامی حسیت اور آمرانہ درد کی کشتی جاری ہے اور اس کا آخر تک فیصلہ نہیں ہو پاتا جب کہ اگیئے میں مکتی بودھ سے کم ایک پیدائشی شاعر کی حسیت، احساسِ حسن اور احساسِ زندگی نہیں ہے۔ ان کی ذہنی بلوغیت سے احساسِ زندگی کے عجیب و غریب اور قسم قسم کے اُلجھاؤ، سادگی اور سوچنے، غور کرنے کی عادت بھی مکتی بودھ سے میل کھاتی ہے۔ مگر اگیئے میں مکتی بودھ جیسی ماحول سے آگاہی نہیں۔ مکتی بودھ ہزار ہزار آنکھوں سے اپنے دَور کے حادثوں، حالات، تکلیفوں اور مشکلوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر اگیئے کی خود پسند شخصیت خاموش رہتی ہے۔ مکتی بودھ کی قوت ماحول کی عکاسی میں ہے۔ اور اگیئے کی خاموشی میں۔ ایک میں جو خوبی ہے، دوسرے میں نہیں اور دوسرے میں جو خوبی ہے وہ پہلے میں نہیں، اس لیے یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے ہیں۔ دونوں میں گہری یکسانیت یہ ہے کہ نسلی اثرات اور ہندوستانی حسیت کو لے کر دونوں کی تخلیقیت میں اتنی گہری کشمکش ہے کہ ان سے پہلے یہ صرف پرساد، نرالا اور پریم چند کے ہاں ہی ملتی ہے۔ جب کہ ان کے معاصرین میں کوئی ان دونوں کو چھو تک نہیں پاتا

دنیا بھر کی تحقیق سے اگیئے میں جس شاعری کی شروعات ہوئی ہے اس کی عہد بہ عہد تاریخ کا منظر چوطرفہ ہے۔ مکتی بودھ میں جو زبردست سیاسی شعور ہے وہ چاہے اگیئے میں نہ ہو، مگر تخلیقی زبان کی عوامی حسیت ان میں کافی جوان رہی ہے۔ یہ زبان جو اس قسم کی جدت پسندی اور تازگی کو ایجاد کرتی زبان ہے۔ روایتی شاعرانہ اسلوب اور مُردہ محاوروں کو توڑتی نئی شاعری اگیئے میں ہی نئی سمت و معنی پاتی ہے لیکن بعد میں نئی شاعری کی سب ہی خصوصیات اگیئے میں ہی اپنی خوبی بھی کھوتی گئی ہیں۔ جو شاعری کبھی تجرباتی اور ترقی پسند روایت کی نئی ایجاد تھی۔ وہی بعد کے اگیئے میں چکر کاٹ کر اپنی تاثیر کھوتی گئی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ یہ شاعری زندگی کے ماخذوں سے سیدھے مکتی بودھ کی شاعری کی طرح نہ جڑ کر ادبی یادداشتوں سے جڑتی گئی۔ ظاہر ہے کہ مکتی بودھ کی تخلیقیت کے مقابلے میں اگیئے کی تخلیقیت ادبی اور رسمی زیادہ ہے۔ حالانکہ یہ بات اگیئے کی نثر کے بارے میں سچ نہیں ہے۔ اگیئے کی نثر ان کی شاعری کے مقابلے میں زیادہ کھلی اور تازہ ہے۔ اگیئے جب نثر لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کا دل سے زیادہ دماغ متحرک رہتا ہے۔ ایک طرح کی جذباتیت نہ ہو کر شعوری رَو ان کے ہاں نثر کے ذریعے سے زیادہ کارگر ہے۔

اگیئے میں خارجی اور باطنی دنیا کا ٹکراؤ نہ ہو کر دونوں کا مکالمہ ملتا ہے۔ لفظوں کی شفافیت تمنا مسکان سے چھنتی، ان کی شعریت جگہ جگہ طنز میں جگمگا اُٹھتی ہے۔ پھر بھی نرالا اور مکتی بودھ طنز میں جتنے شدید اور نوکیلے ہیں، اگیئے اتنے نہیں ہو پاتے۔ دراصل یہ دونوں شاعروں کے شاعرانہ مزاج کا فرق ہے۔ مکتی بودھ اُلجھی ہوئی زندگی کی جدوجہد سے شاعری کو کھینچتے ہیں۔ حسیت کی

تپش سے پورے ماحول کو پگھلا دیتے ہیں لیکن یکسو نہیں ہو پاتے۔ اگیئے حسیت کی تپش کے دباؤ میں اندر ہی اندر رس جاتے ہیں۔ یک سو ہوتے رہتے ہیں اور لفظ (موتی کی آب میں) چمک اٹھتا ہے۔

اگیئے میں شخصیت کی باخبری شاعری کو گھیرے رہتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ ایک فن کار کا بڑا غرور اس کی شخصیت کو گھیرے رہتا ہے۔ اس 'شخصیت' سے آپ چڑ محسوس کریں۔ یہ الگ بات ہے مگر اس شخصیت کے شعری جادو سے بچ پانا ناممکن ہے۔ اس شخصیت میں ثقافتی آگہی کی ایک ٹھوس زمین ہے — ایک ایسا تاثراتی استحکام ہے جو حقائق کو لگاتار مانجھتا رہتا ہے۔ اگیئے میں جاننے کی بے روک ٹوک صلاحیت اور حقائق کے لیے حسیت پرساد اور مہادیوی کی یاد دلاتی ہے۔ اگیئے کی ہمدردی پرساد کی طرح لامحدود ہے۔ اس ہمدردی کے ستون ہیں زندگی کا ظاہر و باطن اور زندگی سے محبت۔ اگیئے کی نثر گدیہ' 'آتم پرک'، 'کیندر اور پریدھی'، 'سرجنا اور سندربھ'، 'سم وسر' 'سرود اور سیتو' وغیرہ میں گھومنے کے بعد شاعری میں گھسنے پر ایسا لگتا ہے جیسے میدان سے مکان میں آگئے ہوں۔ اس مکان میں جہاں سب کچھ ترتیب سے ہے، سجا ہوا ہے اور فنی لگاؤ سے اُسے جگمگا دیا گیا ہے۔ حالانکہ ان مکان نما محل کے اندرونی تہہ خانوں میں اُترنے پر ان حالات سے روبرو ہونا آسان ہو جاتا ہے، جن کی سیڑھیاں مجموعی لاشعور اور ابتدائی صنائع بدائع کی طرف لے جاتی ہیں۔

یہاں تال پرانا'
کو دامینڈک
گڑپ'

میں جو معنی ہیں وہ گہری گپھاؤں میں بیٹھا درویش شاعر ہے۔ اس درویش کی گہری مدراؤں کا مطلب سمجھنا پڑتا ہے، ایسا کیے بغیر معنی نہیں کھلتے۔ یہ مشکل اگیئے جی کی زیادہ تر شاعری کے ساتھ بالکل ایسی ہے۔ جیسے یوگی کی گہری نشست کی حسیت کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اسی طرح اگیئے کی شاعری سے قاری جھنجلاتا ہے۔ لیکن جب وہ مطلب سمجھ لیتا ہے تب وہ اس شاعر پر مر مٹتا ہے جیسے یہ نظم 'سون مچھلی' دیکھیے:

ہم نہارتے روپ
کانچ کے پیچھے
ہانپ رہی ہے مچھلی
روپ ترشا بھی
(اور کانچ کے پیچھے)
ہے جیجی وِشا
(اری او کروناپربھا مئے)

اپنی اس نظم کے سلسلے میں — 'آتم نے پد — ص: ۴۵ پر اگیئے نے لکھا ہے:

"زندگی خوابوں اور شکلوں کا ایک رنگین اور حیرت انگیز مجموعہ ہے۔ ہم چاہیں تو اس کے رُوپ میں ہی اُلجھے رہ سکتے ہیں، مگر روپ کی یہ کشش بھی اصل میں زندگی کے لیے ہماری کشش کا ہی ناتا ہے۔ زندگی کو سیدھے نہ دیکھ کر ہم اسے شیشے میں سے دیکھتے ہیں تو ہم ان نت نئی شکلوں میں ہی اٹک جاتے ہیں، جن کے ذریعے زندگی تشکیل پاتی ہے۔ کانچ کی ٹنکی میں پالی ہوئی سونے کی مچھلی پر ایک چھوٹی سی نظم میں یہی کہا گیا ہے۔"

اگیئے کی اس تحریر کا موضوع ہے: "پریتیک اور ستیہ الوَدرشن" اس میں کانچ کی ٹنکی میں پلی ہانپتی ہوئی مچھلی دراصل آج کی تکلیفوں اور پریشانیوں زدہ کا مظہر ہے۔ اور یہ شعری تجربہ اگر ٹھیک سے پرکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ چھایاوادی تجربے سے بالکل الگ ہے۔

اگیئے اور پرساد کے شعری تجربات پر غور کرتے ہوئے وجے دیو نارائن ساہی نے بڑی فکری بلندی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس طرح "کامائنی" میں جو تجربہ فلسفے میں بدل جاتا تھا، اسے اگیئے پھر فلسفے سے تجربے میں لے آتے ہیں۔ شاعری سے متعلق ہمارے عقیدوں میں اس سے زبردست تبدیلی آجاتی ہے خاص کر تجربے کی عالمیت کو لے کر۔ یہ عالمیت اپنے تجربے کو لے کر تخلیق کار کی غیر جانب داری یا اشتراک سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے 'نیچ کے حکم سچ" یا عقیدے ایک جیسے ہیں بلکہ اس لیے جن فکری 'حقائق' کے دباؤ میں ہم رہ رہے ہیں وہ فکری حقائق یکساں ہیں۔ شاعر اور قاری کو جوڑنے والی کڑی "عقیدہ" نہیں "حقیقت" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس "حقیقت" کو زمانے کی پہچان بدلتی ہے۔ اور اس سے حسیت بدلتی ہے۔ چھایاوادی شاعر پرساد اور نئی شاعری کے شاعر اگیئے کو صحیح معنی میں سمجھنے کے لیے ہم اس فرق کو بھلا کر صحیح نتیجوں کی طرف نہیں بڑھ سکتے۔ اگیئے تجربے سے زیادہ 'شعری تجربے کی تبدیلی' کے حالات کی حقیقتوں پر پوری طرح زور دیتے ہیں۔ انسان کے نئے شاعری میں بدلتے اور پیار محبت کے رشتوں کو اہمیت دیتے ہوئے اگیئے نے دوسرا سپتک (۱۹۵۱ء) کے ابتدائیے میں لکھا ہے:

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے بنیادی لگاؤ اور نفاق نہیں بدلتے۔ محبت اب بھی محبت ہے۔ نفرت اب بھی نفرت۔ یہ عام طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ لگاؤ وہی رہنے پر بھی جذباتی رشتوں کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ اور شاعر کی حد جذباتی رشتوں کی حد ہونے کی وجہ سے اس تبدیلی کا شعریت پر گہرا اثر پڑا ہے۔ جیسے جیسے ظاہری حقائق بدلتے ہیں ویسے ویسے ہمارے اس سے جذباتی رشتے جوڑنے کے طور طریقے بھی بدلتے ہیں اور اگر نہیں بدلتے تو ان باہری حقائق سے ہمارا

رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔"

نئی حقیقت سے ہمارے تاثرات کو جو دھچکا لگا ہے اس نے نئی شاعری کے اس سلسلے کو (اپنی چوٹ سے) برباد کر دیا ہے۔ ہم اس کے سکون میں نہ جی کر زندگی کے تناؤ، ٹکراؤ اور جد و جہد میں جیتے ہیں۔ نئے شاعر کا مسئلہ اس نئے عہد کی حسیت نے شاعری کی بناوٹ کے اجزا، معنی، صنائع بدائع وغیرہ کو اندر سے بدل دیا ہے۔ نئے ادب پر غور کرتے ہوئے اگیئے جی نے اس تبدیلی کو بار بار خط کشیدہ کیا ہے۔ اس تبدیلی نے سہولت کے تمام پرانے اصولوں اور نئے نظریے سے بنے سہولت کے اصولوں میں فرق کر دیا ہے۔ دور کے نئے مظاہر اور شاعر کی مشق کی مشکلوں نے سہولت کے لیے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ 'اسا دھیہ وینا' نام کی طویل نظم میں وینا اور "پریہ وند" کو ایک دوسرے میں ملا کر اور پھر ترنم کی لے میں اگیئے جی نے یہ حقیقت تخلیقیت سے ظاہر کر دی ہے کہ تخلیق کے متن میں خالق اور قاری کا تال میل ہونا چاہیے۔ یہ تال میل ہی فن کی غیر جانبدارانہ متوازن دنیا میں لے جاتا ہے۔ انفرادیت پسندی اصل میں اپنے پرائے کے فرق برائی اور ٹکراوٹ سے چھٹکارا ہے۔ اس سچائی سے روبرو ہونے والا اگیئے کا ادیب انفرادیت پسندی اور ابلاغ کے اصول میں اٹوٹ عقیدہ رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں آچاریہ نند دلارے باجپئی کی: "آدھونک ساہتیہ" نامی کتاب میں اجاگر کیے گئے خیالات کہ نئے شاعر انفرادیت پسندی کا اصول نہیں مانتے۔ اس نظریے کی اگیئے تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"تارسپتک" کے شاعروں پر یہ الزام
لگایا جاتا ہے کہ وہ انفرادیت پسندی
کا اصول نہیں مانتے یہ دوہری نااتفاقی
ہے کیوں کہ وہ نہ صرف اس اصول کو مانتے
ہیں بلکہ اس سے تجربوں کی ضرورت
بھی ثابت کرتے ہیں۔" (بھومیکا" ص۱۶)

لیکن شعری تجربوں کو بڑھاوا دینے سے جب کوئی تجربہ پسند کہہ کر جڑتا اور ہنستا ہے تو اگیئے بہت سے سوال اُٹھاتے ہیں کہ ــــ تجربے سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اسے اور بھی صاف کرنے کے لیے ایک بات ہم اور کہیں۔ تجربے برابر ہوتے آئے ہیں اور تجربوں کے ذریعے ہی شاعری یا کوئی بھی فن، کوئی بھی تخلیقی کام آگے بڑھ سکا ہے۔ جو کہتا ہے کہ میں نے زندگی بھر کوئی تجربہ نہیں کیا، وہ دراصل یہی کہتا ہے کہ میں نے زندگی بھر کوئی تخلیقی کام نہیں کرنا چاہا۔ ایسا آدمی اگر سچ کہتا ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس کی 'نظم' نظم نہیں ہے۔ وہ فن نہیں، اسلوب ہے، ہاتھ سے گڑھی ہوئی چیز ہے"۔ دھیان رکھنا ہوگا کہ صرف تجربات ہی کسی تخلیق کو شاعر نہیں بنا دیتے۔ تجربے تو صرف طاقت بخشنے والے نئے انفرادی سچ اور اجتماعی سچائیاں ہوتے ہیں جو حقائق سے سچائی کو اپنا کر شاعری تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے ہر تجربہ اپنے دور کی سچ کی تلاش کا سب سے طاقت ور تخلیقی وسیلہ ہے۔ اگیئے کو تجربہ پسند شاعر نہ کہنا چاہیے بلکہ وہ تو سچے معنوں میں نئے حقائق کو تجربوں کی بھٹی میں تپا کر شاعری میں ڈھالنے والے شاعر ہیں۔ دنیا بھر کے بڑے شاعروں میں اس طرح کی تجرباتی مشق ملتی ہے۔ چاہے کالی داس ہوں یا شیکسپیر، والٹ وھٹمین ہوں یا نرالا، رویندر ناتھ ہوں یا مکتی بودھ ہر کامیاب شاعر تجربوں سے ہی بڑا ہوتا ہے اور تجربوں سے ہی روایت شاعری آگے بڑھتی ہے۔

ہندوستانی روایت شاعری میں تجربوں سے پیدا ہوئی طاقت کو شروع سے سمجھ کر اُسے عزت دیتی رہی ہے۔ یہ سمجھ کر ہی کالی داس نے 'واک' میں معنی خیزی کے لیے دعا کی تھی، جو واک میں موجود ہے اسے پیدا کرنے کی دعا شاعر نہیں مانگتا۔ معنی کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ لفظ تو ایسا خام مال ہے جس سے تخلیق ہوتی ہے، ایسی تخلیق جس کے ذریعے وہ اپنے نئے معنی اس میں بھر سکے، اس میں جان ڈال سکے۔ تلاشِ معنی ہے، جس کے لیے شاعر پاربتی پرمیشور کی پوجا کرتا ہے۔" اس بات کو دھیان سے سمجھنے کی ضرورت برابر رہی تھی۔ "جب چمتکاری معنی مر جاتا ہے اور رمز بن جاتا ہے تب اس لفظ سے لگاؤ کی خواہش بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس معنی سے جذباتی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ شاعر تب وہ معنی پیدا کرتا ہے جس سے دوبارہ لگاؤ اور تعلق پیدا ہو۔ دوبارہ جذباتی رشتہ قائم ہو۔ Simplification کے یہی معنی ہیں۔

اگیئے جی اس سوال کے بارے میں شدت سے سوچتے رہے ہیں: "کیا ہے جو شاعری کو دوہرائے گا نہیں بلکہ تخلیق فخر دے سکتا ہے؟ شاعر نئے حقائق کو ان کے ساتھ نئے جذباتی رشتے جوڑ کر انہیں نئی سچائیوں کو روپ دے۔ ان نئی سچائیوں کو ترسیل کے قابل بنا کر ان کو منفرد بنائے۔ یہی نئی تخلیق ہے۔ یہ بات نئی شاعری کا شاعر نہیں بھولتا۔" خود اگیئے یہ سمجھ کر کہ انفرادیت آج مشکل ہو گئی ہے شاعری کی فکر ابلاغ میں ڈھیل نہیں ڈالتے۔

ملارمے کا یہ قول اگیئے پر صحیح اترتا ہے کہ شاعری خیالوں سے نہیں لفظوں سے تشکیل پاتی ہے۔ بہت سے خیالوں والا آدمی فلسفی ہو سکتا ہے۔ سیاست داں ہو سکتا ہے ماہر سماجیات یا ماہرِ معاشیات ہو سکتا ہے۔ مگر شاعر نہیں ہو سکتا۔ شاعری خیالوں سے لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ احساس اور تجربے کی حسیت میں سے اُسے گزرنا اور نچوڑنا پڑتا ہے۔ اس معنی میں شاعر کی ذمہ داری دوسرے کاموں سے الگ اور اہم ہے۔ اگیئے کو شاعر ہونے کا احساس ہر وقت رہتا ہے۔ وہ اکثر یہ یاد رکھتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں ــــ فن کار ہیں، خالق ہیں۔ اس لیے ان کے سوچنے کا ڈھنگ اور مسائل سے اُلجھنے کا انداز فلسفیوں اور ماہرینِ سماجیات سے الگ ہے۔ اس ڈھنگ کی فکر میں انہوں نے ایک منفرد یعنی اوروں سے ہٹ کر چلنے والا انفرادیت پسند پیدا کیا ہے۔ اگیئے میں یہ سب کچھ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے ملتا جلتا ہے۔ دو مختلف ملکوں اور تہذیبوں

کی یکسانیت کافی چونکا دینے والی ہے لیکن دونوں کی تخلیقیت میں انفرادیت کے تباہ کن رجحانات، دونوں کے زندگی جینے کے نظریے اور حالات میں پائے جاسکتے ہیں۔ ایلیٹ بھی اگییئے کی طرح زیادہ تر یہ کہتے ہیں کہ تخلیقی جدوجہد خیالوں سے نہیں لفظ اور لفظ سے جڑی رہتی ہے۔ دونوں کے ہاں احساس الفاظ ایک خاص ڈھنگ سے ایک خاص اسلوب اور طرز نگارش کے غیر معمولی فن میں بدل جاتے ہیں۔ اور شاعری میں حسن پسندی، فن پسندی کے رجحانات چھانے لگتے ہیں۔

ان کمیوں کے باوجود لفظ اور سچائی کے لیے جتنی باخبری اگییئے میں دکھائی دیتی ہے، اتنی ان کے کسی معاصر شاعر میں نہیں۔ اپنی اسی باخبری کا تعارف دیتے ہوئے اگییئے نے تار سپتک کے دوسرے ایڈیشن کے پس نوشت میں لکھا ہے "شاعری سب سے پہلے الفاظ ہیں اور سب سے آخر میں بھی یہی بات سچ جاتی ہے کہ شاعری محض الفاظ ہیں۔ سارے شعری کارنامے اسی تعریف پر انحصار کرتے ہیں۔ لفظ کا علم، لفظ کی معنویت کی صحیح پکڑ تخلیق کار کو خالق بناتی ہے۔ ترنم، لے، توازن وغیرہ کے سب سوال اسی میں سے نکلتے ہیں اور اسی میں غرق ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں سارے سماجی تعلقات بھی یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی میں اپنے دور سے جڑے ہونے کا اور سماج کے لیے تخلیق کار کی ذمہ داری کا عمل بھی مل سکتا ہے۔" اگییئے کے دماغ میں کالی داس، تلسی داس کی 'آکھر بل ساچا' کی بات ہی گونجتی رہی ہے۔ یہی بات انہوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح سے کہی ہے:

"کوی جو ہوں گے، ہوں، جو کرتے ہیں، کریں
یہ لو جن میرا بس اتنا ہے
یہ دونوں جو
سدا ایک دوسرے سے تن کر رہتے ہیں۔
کب، کیسے، کس آلوک سفرن میں میں انہیں ملا ہوں
دونوں جو ہیں بندھو، سکھا، چر سہ چر میرے"
(شبد اور شبد — اری او کرونا پربھامئے)

الفاظ اور سچائی کو روشنی میں ملانے کا اگییئے کا عہد دراصل ان کا تخلیقی اور تصوراتی تفکر ہے۔ اگییئے کی شاعری عقلیت سے بوجھل ہانپتی شاعری کبھی نہیں رہی۔ ایک فکری روشنی اس نے دی ہے۔

اپنی ذہنی ساخت میں اگییئے نشاۃ ثانیہ کی اس باخبری کے وارث تخلیق کار ہیں، جس کا رشتہ بنگال کی نشاۃ ثانیہ کی ذہانت سے جڑتا ہے، جو اُن میں اپنی نسلی شناخت اور روح کو بار بار ٹٹول چھان کر کھرا کرتی رہی ہے۔ ایم۔ این۔ رائے کا فطری انسان دوستی ان کی ابتدائی فکر کے تاثراتی دائرے میں رہی ہے شاید اس فکر سے جھنجھوڑے جاتے رہے ہیں، مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ گاندھی انہیں کبھی متاثر نہیں کر سکے۔ نہرو یگ کے جمہوری اقدار میں ان کا یقین جیا اور بکھرا اکھڑا بھی۔ نہرو یگ میں یقین کھو کر بھی ان کا یقین جمہوری قدروں میں قائم رہا۔ اس طرح وہ جمہوریت کی بنیادی قدروں میں یقین رکھنے والے تخلیق کار ہیں۔ مغربی فکر اور فلسفے کے لیے ان کے دل میں کھلی جگہ ہے، لیکن مغربی فلسفے کی کمی بیشی کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھ کر وہ ہندوستانی فلسفے، تہذیب، روایت اور تاریخ کی حدوں میں رہتے ہیں۔ روایت کو سمجھتے ہیں، ثقافت کو ٹٹولتے ہیں اور فلسفے کی سچائی کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ان کی فکر اسی ہندوستانی روایت کے اندر سے ہی نکلی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مغرب کی برائیوں، خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگییئے خاموشی سے رواداری اور حسن کی تخلیق کرتے ہیں۔ کالی داس اور بھاس کا حسن ان میں بولتا ہے، لبھاتا ہے۔ اسی معنی میں ایک پوری ہندوستانی روایت کا احساس ان میں پھر تشکیل پاتا ہے۔ اگییئے کی زبان میں ہمارے پُرکھے (اجداد) بولتے ہیں۔ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے ناقدین نے جسے اگییئے کا عزم مانا ہے وہ صرف اپنے تخلیق کار کو بچانے کا حفاظتی دائرہ ہے۔ یہ حفاظتی دائرہ ان قدروں کو بچانے کا ذریعہ بھی ہے جو قدرت کے ٹوٹنے کی وجہ سے پیدا ہوئے گھاؤوں کے سبب تباہ ہو رہے ہیں۔ ایک مشینی جدید تہذیب کے لیے اگییئے میں ایک گہری ناپسندیدگی اور تکلیف دہ ناراضگی ہے۔ اگییئے کا فطری احساس چھایاوادی احساس سے بالکل الگ زمین پر کھڑا ہے۔ وہ جنگلوں، میدانوں، سرنو جھرنوں اور سمندر کو دیکھ کر مٹتے ہیں تو جنگلوں کے کٹنے کے درد سے تڑپتے بھی ہیں۔ قدرت کے ساتھ کیا گیا آدمی کا انتہائی ظلم انہیں اندر سے چھیلتا ہے۔ جدید مشینی تہذیب سے پیدا ہوئی جدیدیت سے انہیں لاتعلقی ہے اور فطرت کی خوبصورتی کے لیے بے پناہ لگاؤ۔

اگییئے جب کبھی اپنی عقل سے اتر کر دل پر آتے ہیں تو ان کی شاعری میں آنکھ، ناک، کان وغیرہ کے ساتھ شاعری کا ایک حسین مجسمہ تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں پتے گیت گاتے ہیں۔ ابابیل کی لہراتی اُڑان، ہرن کی چھلانگ، سمندر کی گرج سب فطرت کی لے میں موسیقی کا ترنم اختیار کر لیتے ہیں۔ اچاریہ رام چندر شکل سے لفظ لے کر کہیں تو یہ شاعری فطرت کے ساتھ آدمی کی باطنی رواداری پیدا کرتی ہوئی، اس کی سچی جذباتیت کے پھیلاؤ کی کوشش کرتی ہے۔ یہ شاعر لہلہاتے کھیتوں، آسمان میں دوڑتے بادل کے ٹکڑوں، بجلی کی کوند، چٹانوں سے پھوٹتے جھرنوں، جھومتے جنگلوں، چہچہاتے پرندوں کو دیکھ کر خوشی سے بھر جاتا ہے۔ دنیا کے سب ہی جان داروں کے ساتھ دل ملاتے دیکھ کر ہمیں بالمیکی اور کالی داس کی اچانک یاد آجاتی ہے۔ لے اور بہاؤ، تھرکن، لرزش اور فطری رنگ کا یہ جدید شاعر بڑی چابکدستی سے عکاسی کر سکتا ہے۔ لیکن فطرت کی خوبصورتی کو گنوانے کا درد اور اس کا تیکھا اور درد بھرا اظہار بھی اس میں موجود ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ستاتا ہے کہ انسان قدرت کا قتل کر کے خود اپنا قتل کرتا جا رہا ہے۔

(ترجمہ: ایس اے۔ رحمن)
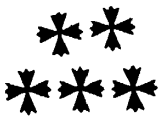
اگیئے کا افسانوی ادب
آزادی کی تلاش

نریندر موہن

پریم چند کے بعد ہندی ناول کو جدید معانی دینے اور اسے ایک نئی سمت پر گامزن کرنے میں افسانہ نگار واتسائن اگیئے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگیئے نے اپنے ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے ہندی ناول کی روایت کو آگے ہی نہیں بڑھایا، اُسے اور مالا مال کیا ہے۔ نہ صرف زبان، اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے بلکہ حسیت اور فکر کے اعتبار سے بھی۔ ان کے افسانوی ادب میں آزادی کی تلاش کی ایک زیریں لہر ہے۔ جو اُن کے تخلیقی رویّے کا لازمی جزو ہے۔ یہی ان کے تخلیقی عمل کا محور ہے۔ اس کا بنیادی عنصر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اپنی تخلیقات میں آزادی کی تلاش کس نقطۂ نظر سے اور کس سطح پر کرتے ہیں۔

پہلے ان کے ناولوں پر توجہ مرکوز کریں۔ اُنہوں نے صرف تین ناول لکھے ہیں ــــ "شیکھر: ایک جیونی" (حصہ اول ۱۹۴۱ء، حصہ دوم ۱۹۴۴ء) "ندی کے دویپ" (۱۹۵۱ء) اور "اپنے اپنے اجنبی" (۱۹۶۱ء) "شیکھر: ایک جیونی" نے شائع ہوتے ہی تعلیم یافتہ قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ نیمی چندر جین کے الفاظ میں: (اس کے ذریعے) ایک یکسر نئے ادبی بُعد کے حصول کا احساس ہندی کے قارئین اور نقادوں دونوں کو یکساں ہوا تھا۔ اور سارا ادبی ماحول ایک نئی تحریک سے دھڑک اُٹھا تھا۔ "ندی کے دویپ" اور "اپنے اپنے اجنبی" اگیئے کی ناول نگاری کے فن کے اگلے پڑاؤ ہیں۔ جنہیں ناول نگاری کے، ان کے مرکزی رویّے کے سبب ایک سلسلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ "شیکھر" کی طرح یہ ناول بھی اپنے نقطۂ نظر، حسیت، اسلوب، تکنیک کے لیے مشہور ہوئے۔ یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ اگیئے کے ناولوں نے ہندی ناول کو نیا موڑ دیا۔ ناول کے رائج تصورات کو بڑی حد تک متزلزل کیا اور ناولاتی ادب میں نئی فکر کو تحریک دی ہے۔

اگیئے سے قبل پریم چند نے سیاسی سماجی مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ان کی حسیت کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ خود اگیئے نے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے:

"جہاں تک انسانی رشتوں کا اور تخلیق کار کی بنی نوع انسان کے ساتھ ہم آہنگی کا سوال ہے پریم چند اس بات میں آگے تھے۔ ان کی نگاہ زیادہ وسیع تھی۔ مظلوم انسانوں کے جذبوں کے ساتھ ان کا رشتہ زیادہ جان دار اور متحرک تھا۔ بنی نوع انسان کو ترقی اور اصلاح کی کوشش میں بھی اکثر انسان سے محبت نہیں۔ انسان کے تئیں نفرت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ دانشوروں کے لیے ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ ان کے انسانی رشتوں کا سرچشمہ کہیں خشک نہ ہو جائے۔ اور انسان کے لیے ان کا درد محض ایک روکھی پھیکی ہمدردی کی شکل اختیار نہ کر لے۔ پریم چند کی اور ہماری فکر و نظر میں ایسا ہی فرق پایا جاتا ہے۔ پریم چند کو انسانیت سے محبت تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ انسانیت کی محض ترقی چاہتے ہیں۔" (اگیئے: جدید ہندی ادب، ص ۹۹)

اگیئے کا پریم چند کی اہمیت کو تسلیم کرنا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انہیں وراثت میں ملی بامعنی عناصر کی کتنی سمجھ تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُنہوں نے پریم چند کی پیروی کی۔ روایت کی ڈگر پر چلنا ان کی فطرت نہیں تھی۔ ان کا نقطۂ نظر اور راستہ مختلف تھا۔ اُنہوں نے فرد کے کردار و عمل کو اس کی مکمل شخصیت اور مجموعی کردار کے سیاق و سباق میں دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی راہ اختیار کی۔ حقیقت کے متعلق بھی ان کو اپنی فکر تھی۔ وہ پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری والی روایت سے ضرور ہٹے، لیکن کردار نگاری کے میدان میں پریم چند کی دین کو تسلیم کرتے اور اُنہیں آگے بڑھاتے ہوئے اگیئے

۲۳۹-ڈی، ایم۔ آئی۔ جی فلیٹس، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۲۷

نے انسانی کردار کو ہی اپنے ناولوں کی بنیاد بنایا اور اسی کے حوالے سے ذات کی تلاش میں مستغرق رہے۔ اس طرح ناول نگاری کے ایک نئے رویے اور روایت کو قائم کرتے ہوئے نئی تخلیقی زمینوں اور افکار کی جستجو کی راہ پر گامزن ہوئے۔

"شیکھر: ایک جیونی"، ہندی میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے جس میں نئی تکنیک کا اتنا جاندار استعمال اور جدیدیت کے شعور کا اتنا عمدہ اظہار ہوا ہے۔ اس ناول میں نئے اسلوب، نئی سائکلیاتی نظر، شعور کی رو کی تکنیک اور عصری حسیت کو تخلیقی ہم آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے جہاں "گئودان" میں سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے ایک بے رحم تخلیقی نگاہ حاصل کی (جس سے ناول کی ساخت میں خاص کر اختتام کی ساخت میں ردوبدل کے اشارے ملتے ہیں) وہاں اگیئے نے سماجی حقیقت نگاری کے بجائے انفرادی جمالیاتی موقف کا اظہار کیا اور اس عمل کے دوران ہندی ناول کو تکنیک و ساخت کے مختلف نئے ابعاد سے روشناس کرایا۔ پریم چند حالات کی مختلف صورتوں کا جال بننے اور مسائل کے ریشے ریشے کو ابھارنے میں ماہر ہیں —— اگیئے فرد اور کردار کی عمیق گہرائیوں میں اترتے ہیں حالات اور کردار کی نئی مساوات قائم کرتے ہوئے انسانی ذات کی جستجو میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ سماجی حقیقت کے نقطۂ نظر سے انفرادی حقیقت اور شخصیت کی پہچان میں مصروف ہونے کا موقف ہے۔ انقلاب اور بغاوت کو وسیع تر سماجی معنی میں پیش کرنے کی کوشش کے باوجود "شیکھر: ایک جیونی" میں بغاوت اور انقلاب کا عظیم تر انفرادی پہلو ہی ابھرا ہے۔

"شیکھر: ایک جیونی" یقیناً ایک نقطۂ آغاز ہے جس سے جدیدیت کے شعور کو قوت حاصل ہوئی۔ اور ناول کی ساخت اور اسلوب میں تبدیلی واقع ہوئی۔ مصنف نے سوانحی اسلوب کے ذریعے بڑی ژرف بینی سے چیزوں اور حالات کے آر پار دیکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس اسلوب کے ذریعے پرانے بیانیہ طرز سے گلو خلاصی کی کوشش نظر آتی ہے۔ ہندی ناول میں اس سے قبل شعور کی رو کی تکنیک کا اتنا بامعنی اور تخلیقی استعمال نہیں ہوا۔

اس نئی طرز تحریر سے تجربات کے تسلسل کو پیش کرنا ممکن ہوا ہے۔ اس سے ناول کا ہیئتی تصور بھی متاثر ہوا ہے اور ساخت میں تیز رفتار تبدیلی کا عمل بھی شروع ہوا ہے۔

"شیکھر: ایک جیونی" شدید ترین کرب کے صرف ایک رات میں دیکھے گئے "وژن" کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اگیئے لکھتے ہیں کہ "میری کیفیت جیسے حسی تجربات کے گھیرے سے نکل کر ایک مسئلے کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ اگر یہی میری زندگی کا انجام ہے تو اس زندگی کی قیمت کیا ہے، معنی کیا ہیں، حاصل کیا ہے۔ فرد کے لیے، سماج کے لیے، انسان کے لیے؟ .... اس تجسس کی سب سے لاتعلق بے رحمی اور کرب کی جاں گداز نگاہ کے آگے میری زندگی دھیرے دھیرے کھلنے لگی، ایک ذاتی اور بے جوڑ تضاد کی شکل میں نہیں، ایک حادثے کی شکل میں، ایک سماجی واقعے کی شکل میں —— اور دھیرے دھیرے سلسلۂ اسباب و علل کی گتھیاں سلجھ سلجھ کر ہاتھ میں آنے لگیں۔" ظاہر ہے کہ مصنف کی تخلیقی تحریک کا مرکز زندگی کے معانی کی جستجو اور اس کی سمجھ حاصل کرنی ہے۔ تخلیقی تحریک کے آغاز اور الفاظ میں اس کے اظہار تک کے عمل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "اس کے بعد تو برسوں سے زیادہ میں نے اس زندہ نور کو مجسم دینے میں لگائے ہیں۔ اسی کو جسم دینے کے لیے۔ اس لیے کہ ویسی شدت محض تخیل کے سہارے نہیں مل سکتی۔ وہ زندگی میں حاصل ہو جائے تو ہی تخیل کے ذریعے اسے منضبط کیا جا سکتا ہے، تجربے کا جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔" "شیکھر: ایک جیونی" کے توسط سے مصنف نے ان لمحوں کی پوری شدت کو گرفتار کرنا چاہا ہے جن میں زندگی کے معنی نہاں تھے۔ .... ہاں، انہیں قابل ترسیل بنانے کے لیے تخیل کے ذریعے منضبط ضرور کیا ہے۔ اس تخلیقی راز کو جان لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف زندگی کے معنی کی تلاش، آزادی کی تلاش، شخصیت کی تلاش کی شکل میں ہی کرتا ہے۔

چند نقاد "شیکھر" کے مواد اور تکنیک میں تضاد دیکھتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ناول میں نفسیاتی تکنیک کے حربے کہانی کے جزو بن کر نہیں آئے ہیں۔ ہمیں یہ خیال مناسب نہیں لگتا۔ ہمیں ناول کے موضوعاتی شعور اور نفسیاتی تکنیک میں کہیں کوئی علیحدگی یا تضاد نظر نہیں آتا۔ بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ نفسیاتی تکنیک اختیار کرنے سے سلسلۂ بیان ٹوٹتا ہے، لیکن غور کریں تو یہی مصنف کے ہیئتی نظام کی خاص بات ہے۔ وہ کوئی ایسی باقاعدہ کہانی کہنا نہیں چاہتا، جس کا آغاز وسط اور انجام ہو۔ "شیکھر" کی کہانی اس مشینی سلسلے کو توڑتی ہے اور یہ توڑنا "شیکھر" کے ہیئتی نظام کی کمی نہیں، اس کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے ہمیں لگتا ہے کہ "شیکھر" کی تکنیک بیرونی نہیں، اس کے ہیئتی نظام سے مربوط ہے۔ ساتھی محرکات، حافظے موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود ہونا اور داخلی منظر نامے کی جس نفسیاتی تکنیک کا استعمال ناول میں ہوا ہے، اس سے ہیئتی نظام مالا مال ہوا ہے اور اس کا اورجنل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سوال ہو سکتا ہے کہ "شیکھر" میں اگیئے حسیت اور ہیئت کے جن نئے کناروں کو چھوتے ہیں۔ کیا وہ انہیں اپنے اگلے ناولوں "ندی کے دویپ" اور "اپنے اپنے اجنبی" کے ذریعے آگے بڑھا پائے ہیں۔ کیا ان تین ناولوں کے تقابلی تجزیے سے ناول نگار اگیئے کے نقطۂ نظر میں، حسیت، تکنیک اور زبان میں ارتباط اور ارتقا کی بنیادوں کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تینوں ناولوں کو ایک ساتھ سامنے رکھ کر اگیئے کے ناولوں کے ارتقا کے عناصر کی پہچان کی جا سکتی ہے۔

افسانوی طریقۂ کار اور تصور کی جو شکل "شیکھر"

میں ہے اسے اگیئے نے "ندی کے دویپ" میں مہارت کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ تحریکِ اوّل، شعور کی رو اور رو قفے وغیرہ کے نفسیاتی طریقہ کا زیادہ استعمال "ندی کے دویپ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ساخت بھی کافی منجھ گئی ہے۔ تفصیلات رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی ہیں۔ یہ عناصر "شیکھر" میں سب سے زیادہ ہیں۔ "ندی کے دویپ" میں اس سے کم اور "اپنے اپنے اجنبی" میں اس سے بھی کم۔ یہ ساخت کے تئیں ان کی احتیاط کا نتیجہ ہے۔ "شیکھر" میں وہ اپنے خیالات کا بیان زیادہ کرتے ہیں، اس لیے تفصیلات بھی زیادہ ہیں، لیکن "ندی کے دویپ" اور "اپنے اپنے اجنبی" میں وہ فلسفیانہ تفکر میں جذب ہو گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ناول کی ساخت کا حصہ بنے ہیں یا نہیں۔

زبان کے لحاظ سے بھی اگیئے ارتقا کا ثبوت دیتے ہیں۔ پیچیدہ احساسات، اُلجھی ہوئی حسیات اور ذہنی کیفیات کے اظہار پر جس قدرت کا ثبوت اگیئے نے "شیکھر" میں دیا ہے، وہ "ندی کے دویپ" میں زیادہ ترقی یافتہ شکل میں نظر آتا ہے۔ "ندی کے دویپ" کی زبان میں کرداروں کی پیچیدہ ذہنی کیفیات اور لطیف حسیات کو اظہار دینے کی صلاحیت ہے تو "اپنے اپنے اجنبی" کی زبان میں اُلجھی ہوئی ذہنی کیفیات، بے شکل خیالات اور فلسفیانہ لہروں کو گویائی عطا کرنے کی صلاحیت ہے۔

یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ ہیئتی ساخت اور زبان کے لحاظ سے مسلسل پختگی حاصل کرتے ہوئے بھی کیا اگیئے اپنے ناولوں میں فکری اعتبار سے ارتقا پذیر ہو سکے ہیں۔ اس لحاظ سے نہیں لگتا ہے کہ وہ دھیرے دھیرے واہموں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس ادیب نے اپنے پہلے ناول میں اس یقین کا اظہار کیا ہو کہ "ادیب سماج کو بدلتا ہے" وہی آگے چل کر اس یقین کو عنفوانِ شباب کی رومانیت کا نام دے۔ جس مصنف نے انسان اور انسانی رشتوں کو ترجیح دی ہو، وہی آگے چل کر مجرد انسانیت پرستی کے تصورات میں اُلجھ جائے، جس نے خیالات اور حالات و تجربات کے باہمی تعلق کی بات کی، وہی حالات کی اہمیت کا منکر ہو، جس نے پہلے ناول میں مذہب اور الہیت کا شدت سے انکار کیا وہی آگے چل کر اپنے ناولوں میں ایک طرح کی فلسفیانہ اور سرّیت پسندانہ رویوں کی بنا تلاش کرے۔

"شیکھر" کے بعد کے ناولوں میں فن اور فکر کا بہتر توازن ٹوٹتا گیا ہے۔ بھگوت شرن اپادھیائے نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "شیکھر ایک جیونی" کے دونوں پہلو توانا ہیں، وہ عظیم تخلیق ہے، لیکن فکری بنائے فکر کی عدم موجودگی یا اس کے مسخ ہو جانے کے سبب "ندی کے دویپ" صرف یہی نہیں کہ عظیم تر نہیں ہو سکا ہے بلکہ اس کے معیار سے نیچے بھی ہو گیا ہے۔ (دوریک کے رنگ، ص ۱۸۲) تخلیقیت کو تقسیم کر کے فکر اور فن کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھنے اور اس کی بنیاد پر فن پارے کی تعیینِ قدر کرنے کے حق میں ہم نہیں ہیں۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرد اور سماج کے رشتے کی تشریح میں ہم اگیئے 'سماج ندی' سے پوری طرح کٹتے گئے اور 'فرد جزیرے' میں سمٹتے گئے ہیں۔ انفرادی اقدار و تصورات پر ان کا اصرار بڑھتا گیا ہے۔ "اپنے اپنے اجنبی" میں یہ رویّہ اپنی انتہا کو چھونے لگتا ہے۔ فلسفیانہ مزاج اور ذہنی اُدھیڑبُن کے ذریعے یہ ناول استحضارِ مرگ کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہاں لطیف اور فن کارانہ تفصیلات میں صورتِ حال کی بنیاد غائب ہو گئی ہے۔ کردار وجودی فلسفے کا بوجھ ڈھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں خیالات کا تحرک اور تجربات کی حرارت ممکن ہی کہاں ہے۔

ان تینوں ناولوں کے مطالعے سے ایک بات واضح ہے کہ اگیئے نے خود کو دوہرایا نہیں ہے۔ نہ ہی اپنے ناولوں کی کوئی منجمد روایت بننے دی ہے۔ وہ مسلسل اپنی صلاحیتوں کو صیقل اور نئے امکانات کی دریافت کرتے رہے ہیں۔ آزادی کی تلاش کو اپنے ناولوں میں الگ الگ سطحوں پر دیتے رہے ہیں۔

سرِ دست ان کی کچھ کہانیوں کا جائزہ بھی لیتے چلیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے زمانی اعتبار سے اس طرح ہیں: "وِپتھگا" (۱۹۳۷ء)؛ "پرمپرا" (۱۹۴۴ء) "کوٹھری کی بات" (۱۹۴۵ء) "شرنارتھی" (۱۹۴۸ء) "جے دول" (۱۹۵۱ء)، "امر ولّری" اور انیہ کہانیاں" (۱۹۵۴ء)، "کڑیاں اور انیہ کہانیاں" (۱۹۵۷ء) "یہ تیرے پرتی روپ" (۱۹۶۱ء) اگیئے کی کل کہانیاں دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ہیں اگیئے کی سمپورن کہانیاں۔ (جلد اوّل) (چھوڑا ہوا راستہ، ۱۹۷۵ء)، اگیئے کی سمپورن کہانیاں جلد دوم) (لوٹتی پگ ڈنڈیاں ۱۹۷۵ء) ناولوں کی طرح اگیئے کی کہانیوں میں بھی انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، رویوں اور ذہنی کیفیات کو تحلیل نفسی کے ذریعے گرفت میں لینے کی کوشش جھلکتی ہے۔ فرد اور سماج کے تجارب کو وہ اپنی کہانیوں میں نفسیاتی اور دانشورانہ سطح پر بڑی باریکی سے چھوتے ہیں۔ اس طرز کے کہانی کار کی دنیا عام طور پر بہت محدود ہوتی ہے۔ اس کا منظرنامہ چھوٹا ہوتا ہے اور اس سبب سے کہانیوں میں تکرار ہوتی ہے۔ لیکن اگیئے کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ان کی کہانیوں کی دنیا وسیع ہے اور موضوع ہی میں متنوع اس لیے تکرار نہیں۔

اگیئے نے خود اپنی کہانیوں کو چار کھیپوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی کھیپ کی کہانیاں ایک انقلابی کی تحریر کردہ "انقلاب پسند" کہانیاں ہیں۔ ان میں ایک واضح عینیت پسندانہ رجحان کارفرما ہے۔ دوسری کھیپ کی کہانیوں میں "پرانے خفیہ طور پر سرگرم، دہشت پسند کے سماج میں ایک معروف و مشہور فرد کی شکل میں جینے اور سماج سے حاصل شدہ توقیر کے بیچ اس سماج اور توقیر کے کھوکھلے پن کے تجربے" کی کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیوں میں لہجہ اکثر تلخ ہے۔ تیسری کھیپ کی کہانیاں فوجی زندگی اور جہاں جہاں یہ فوجی زندگی گزاری گئی ہے ان علاقوں کے

طرزِ حیات، سماج اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ چوتھے کھیپ کی کہانیاں ہندوستان کی تقسیم کے بحران اور اس سے وابستہ ذہنی کیفیات کی کہانیاں ہیں۔ بحیثیت کہانی کار اشکیئے کے ارتقا پر نظر کی جائے تو ان کی فنِ افسانہ نگاری کی مختلف منزلوں، رویّوں اور نوعیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن کے افسانوی ابعاد کی جانب اس سے اہم اشارے ملتے ہیں ہیئت و مواد دونوں کا تنوع تو صاف ظاہر ہے۔ ایک طرف ہے انقلابی زندگی اور اس سے اثر پذیر کہانیاں جیسے "ودیتھگا" "چھاپا" "ودیک سے بڑھ کر" اور "ابھیشاپت" وغیرہ۔ جو اپنے موضوع کے سبب پُرکشش ہیں۔ لیکن جن میں عینیت پسندانہ "رومانی بھولاپن" ہے۔) دوسری طرف سماجی رشتوں کے کھوکھلے پن یا شکستِ خواب کی کہانیاں جیسے "کڑیاں" "ہرسنگار" "سبھیتا کا ایک دن" "جی جی وشاما" "روز" وغیرہ جو اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر رومانی ہیں۔ ایک جانب فوجی زندگی اور ماحول سے متعلق کہانیاں ("میجر چودھری کی واپسی"، "جے دول" "ہیلی بون کی بطخیں" "پٹھار کا دھیرج") ہیں تو دوسری طرف تقسیم ہند کے کرب سے متعلق کیفیات کی کہانیاں (شرن داتا، لیٹر باکس، مسلم مسلم بھائی بھائی، بدلہ وغیرہ ہیں) کہیں کہیں فکری تحریک افسانوی تجربے کا حصہ نہیں بن پائی ہے اور فن پارہ بکھر گیا ہے۔ جیسے "پہاڑی جیون" اور "سوکتی اور سہاسپہ" وغیرہ کہانیوں میں کسی نتیجۂ فکر کو لے کر یا کسی مفروضے کے سہارے کہانی لکھنے کے رویّے نے کہانی کے فطری ارتقا کو متاثر کیا ہے اور "حقیقت" پس پردہ چلی گئی ہے۔ "شترو" "پٹھار کا دھیرج" "دیوی سنگھ" "سیو اور دیو" وغیرہ کہانیاں اس کا ثبوت ہیں۔

اشکیئے کی دو کہانیاں "شرن داتا" اور "روز" خاصی مقبول ہوئی ہیں۔ دونوں اہم کہانیاں ہیں اور اشکیئے کے فن کی ایک طرح سے نمائندگی کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس اشکیئے نے تقسیم کے المیے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا تھا۔ "شرن داتا" کہانی میں خارجی حالات کے دباؤ میں رشتوں اور اقدار کی پامالی کا پورا ردِعمل موجود ہے۔ ظاہری واقعات کو جزئیاتِ باطنی دنیا میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو اظہار دینے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ زہر میں بجھا ہوا ماحول، انتقامی جذبات، نفرت کی چابک سے متحرک تشدد کے کوڑے، زہر پھیلانے والی مختلف فرقہ پرست تنظیمیں اور اسے بھڑکانے کے لیے پولیس اور نوکر شاہی ان سب سے متعلق جزئیات ماحول کی ہولناکی کی جانب اشارہ کرتی ہیں، جہاں فرد کی خود اعتمادی لڑکھڑانے لگتی ہے۔ رفیق الدین اپنے پرانے گہرے دوست دیویندر لال کو فسادات کے دنوں میں بھی ہندوستان نہیں جانے دیتا اسے اپنے پاس رکھتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ماحول بوجھل اور پرتشدد ہوتا جاتا ہے، اس کے لہجے میں دیویندر لال کے تئیں بے تعلقی اور بے رخی جھلکنے لگتی ہے اور دیویندر لال کو شیخ صاحب کے احاطے میں بنے موٹر گیراج میں چلے جانا پڑتا ہے، وہاں انہیں کھانے میں زہر ملا کر دیا جاتا ہے، لیکن شیخ صاحب کی لڑکی زیب النساء کی وجہ سے وہ بچ جاتے ہیں۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کی جان بچانے کا فرض زیب پر ہی آ جاتی ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی اقلیت کے تئیں اس فرض کو یاد رکھا جائے۔ یہ کم اہم نہیں ہے کہ ان تاریک دنوں میں بھی انسانی دردمندی کی جھلک کہیں کہیں نظر آ جاتی تھی۔

"روز" یا "گینگرین" کہانی کو ان کے ہیئت تشکیل سے متعلق نقطۂ نظر کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی کسی دور کی کہانی کو اٹھا لیں، واقعات، سیاق و سباق اور ذہنی کیفیات کے انتخاب اور پیش کش میں ایک خاص قسم کی مہارت اور ہوش مندی نظر آتی ہے۔ چیخوف کے اس نظریے سے وہ صد فی صد متفق بے شک نہ ہوں کہ "کہانی کا کوئی آغاز، وسط اور انجام نہیں ہوتا" تب بھی ان کی کہانیاں اس نظریے سے قریب ہیں — کہانی کا باقاعدہ آغاز، وسط اور انجام کے نظریے کو انہوں نے اپنی کہانیوں میں ناقابلِ قبول قرار دیا۔ "روز" کہانی کو اس کا عمدہ ثبوت کہا جا سکتا ہے اس میں روایتی ڈھانچے سے انحراف بالکل واضح ہے۔ کہانی کو نقطۂ عروج اور انجام پر قائم کرنے والی ترکیب یہاں نہیں ہے۔ کیفیات، کردار اور ماحول ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں مالتی اور اس کے گھر کے چھوٹے چھوٹے معاملات کا پس منظر دے کر نفسیاتی طور پر ابھارا ہے۔ اس کی اداسی کی بے شمار پرچھائیوں کے ساتھ دھیرے دھیرے ماحول کی مانوس چیزوں اور حوالوں کے بیچ سے ایک کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور قاری اس کا حصہ بن جاتا ہے۔ کہیں بھی جذباتیت اور رومانیت نہیں ہے۔ قاری کی اس توقع کو کہ "اب کچھ ہوگا" فن کار، کرداروں کی ذہنی کیفیات کے ذریعے طرح دھچکا پہنچاتا ہے۔ کہانی کی آخری سطور لیں "گیارہ کے پہلے گھنٹے کی کھڑکن کے ساتھ ہی کی چھاتی یکایک پھپھولے کی طرح اٹھی اور دھیرے دھیرے بیٹھنے لگی اور گھنٹے کی آواز کی لرزش کے ساتھ ہی خاموش ہو جانے والی آواز میں اس نے کہا "گیارہ بج گئے۔ . . ." یہ سطور اشکیئے کے غیر جذباتی اور غیر رومانی رویّے کا احساس کراتی اس کا کہانی کا کوئی انجام نہیں ہے۔ اسے ایک غیر مختتم اختتام کہا جا سکتا ہے۔ کہانی کے روایتی ڈھانچے کو توڑ کر اور اسے نئے امکانات کے لیے کھلا چھوڑ کر کیفیات کے سہارے کیسے ایک بلند پایہ کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ "روز" اس کی شاندار مثال ہے۔

اشکیئے کے ناولوں میں آزادی کی تلاش کی زبردست خواہش نظر آتی ہے، اس کا احساس ان کی کہانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ دراصل ان کے تحت تجربات کبھی ناول کی شکل اختیار کرتے ہیں، کبھی کہانی اور شاعری کی اور کبھی سفرنامے، ڈرامے یا انشائیے کا روپ دھارتے ہیں — ان کی شخصیت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان

اگیئے اور شیکھر

نگیندر

"شیکھر" کی دوسری جلد ابھی کچھ دن ہوئے، تین چار برس کے وقفے کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اگرچہ پہلے اور دوسرے حصے میں 'شیکھر' مکمل نہیں ہے۔ ابھی کچھ اور بھی ہے، جو سامنے آئے گا۔ اور دراصل تبھی ہمارا زاویۂ نگاہ بھی حتمی اور دائمی ہو سکے گا۔ تاہم تیسرے (اور شاید چوتھے) حصے کی کمی 'شیکھر' کے اعجاز اور جمال کو پہنچنے میں مانع نہیں ہوتی۔

شیکھر ہندی کے اُن شاہکاروں میں سے ہے، جو ہر ایک کو پکار پکار کر کہتے ہیں: "آؤ، ہمارے توسط سے اپنی طاقت کا امتحان لو۔" اور سچ مچ اس میں اتنا کچھ ہے جو دل و دماغ کو متحرک کرتا ہے۔ اسے پڑھ کر خاموش ہو جانا اگر مصنف کی روح سے مطابقت پیدا کر لینا نہیں ہے تو یقیناً ادبی شعور کی کمی اور کوتاہی کا اشاریہ ہے۔

'شیکھر' ایک مضبوط توانا انسان کی زندگی کا عکس اور آئینہ ہے اور چونکہ اس انسان کو جلد ہی پھانسی کے تختے پر جھول جانے کا تقریباً یقین سا ہو گیا تھا، اس لیے اس کے مزاج میں ناگزیر طور پر ایک محبت کوشی، ایک جلد بازی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی کی بدولت اپنی زندگی کے آر پار دیکھ لینا اس کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔

موت کا سامنا "ہٹھ یوگ" کا ایسا کامیاب عمل ہے جو انسان کو اکثر داخلی بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ نگاہ صرف دیکھنے والی طاقت نہیں، اس کا ایک اپنا روپ ہے جو دیکھتا نہیں تاہم دکھائی دیتا ہے اسے ہی مصنف نے "وژن" کہا ہے۔ پہلے دو حصوں میں اس وژن کا ہیولیٰ سا نظر آتا ہے۔ مکمل فلسفہ شاید تیسرے میں ہوگا۔ اس توسط سے جو کچھ دیکھا گیا وہی ہمارا موضوعِ تنقید ہے۔ خیر۔ شیکھر کے پہلے حصے میں ایک مختصر لیکن بیش قیمت دیباچہ شامل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں شیکھر کے تخلیقی لمحات کی تشریح ہے۔ دوسرے میں ہندی کے ناسمجھ قاری اسے کہیں مصنف کی سوانح عمری نہ سمجھ بیٹھیں اس بات کا مدلل اور باثبوت ——— موجودہ زمانہ کے انگریزی مصنف ایلیٹ کی گواہی کے ساتھ انکار ہے اور تیسرے میں شیکھر کے پلان کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں پہلا اور تیسرا حصہ جتنا سچ اور قابلِ اعتبار ہے دوسرا حصہ اتنا ہی جھوٹ لگتا ہے۔ "لگتا ہے" میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں اس سے زیادہ موزوں الفاظ کا استعمال نہیں کر سکتا ——— اگر ایک بار پھر اس دیباچہ کے دوسرے حصے کو پڑھیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ بھی آسانی سے یہ پکڑ پائیں گے کہ اس میں ایک ایسا آدمی جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کا عادی نہیں ہے۔ اسی لیے اس کے منطقی ربط میں عدم مناسبت ہے، اس کے جملوں میں اُلجھن ہے۔ جیسے کوئی سچائی کا گلا گھونٹ رہا ہو اور وہ چھٹپٹا رہا ہو۔ ایلیٹ کے کلاسکی آدرش کی ایسی پُرزور دُہائی دینے سے پہلے اگیئے نے ایک بات نہیں سوچی کہ روایتی فکر کے شاعر ایلیٹ اور روایت کو کسی بھی صورت میں سچ نہ ماننے والے 'شیکھر' کے مصنف میں کم از کم فلسفۂ حیات کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ پھر کوئی بھی انسان اپنے بھی زرہ بکتروں کے باوجود اتنا اگیئے نہیں بن سکتا کہ دوسرے اُس کے بارے میں پورے طور پر اندھیرے میں رہیں اور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں اور جو وہ کہہ دے اُسے مان لیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ شیکھر اور اگیئے میں کردار اور فن کار کے فرق کو ماننا دونوں کے تئیں ناانصافی کرنا ہے۔ اس لیے ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ 'شیکھر' اگیئے کی اپنی ہی زندگی کا عکس ہے۔ اور اس کے واقعات اُس کی اپنی زندگی کے سچے واقعات ہیں اور جو نہیں ہیں، وہ زبردستی توڑے مروڑے اور گھڑے ہوئے صاف نظر آجاتے ہیں۔

شیکھر کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر دو طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک مرعوب کرنے کی طاقت کا اور دوسرا شدید غم کا۔ شدید

سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا غم سطحی نہیں ہے۔ اس میں دل کو فی الفور پاش پاش کر دینے والی کاٹ نہیں۔ دور پہنچ کر گہرے میں کچوٹنے والا غم ہی ملتا ہے۔ لیکن یہ دونوں عناصر الگ الگ نہیں ہیں۔ ان میں پہلے اور بعد کا۔ وجہ اور عمل کا رشتہ صاف نظر آتا ہے۔ یعنی یہ طاقت ہی آخر میں بالذات غم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شیکھر کی طاقت اس کی نا قابلِ تسخیر انا کی طاقت ہے، جو فلک میں بھی شگاف کر دینے والے ترشول کی طرح اوپر کو بڑھ رہی ہے۔ شیکھر کی زندگی کے جتنے واقعات ہیں اُن کی مثال مالا کے موتیوں جیسی ہے جن کے بیچ کا بڑا دانہ اُس کی انانیت ہے۔ وہ صرف پانا جانتا ہے دینا نہیں۔ اس بارے میں آپ بس اس کا ایک قول ہی سن لیجیے۔ "مجھے مورتی نہیں چاہیے، مجھے مورتی کا پرستار چاہیے۔ مجھے کوئی ایسا آسنا نہیں چاہیے جس کی طرف میں دیکھوں، مجھے وہ چاہیے جو میری طرف دیکھے۔ یہ نہیں کہ مجھے آدرش انسان نہیں چاہیے۔ لیکن میں اُنھیں خود بنا سکتا ہوں۔ مجھے چاہیے آدرش کا پرستار، کیوں کہ وہ میں نہیں بنا سکتا۔ اپنے لیے ایشور بنا لینا میرے بس میں ہے، لیکن میری اس خلاقی کا پرستار۔ وہ نہیں۔"

شروع ہی سے اس نے انانیت کو ایسی مکمل صورت میں اپنایا ہے کہ وہ اپنے رابطہ میں آنے والے سبھی لوگوں سے اُسے تقویت پہنچانے کی مانگ کرتا ہے۔ مردوں سے وہ عزت مانگتا ہے اور عورتوں سے پیار اور وہ جیسے جیسے اس کی مانگ کو پورا کرتے ہیں اسی کے مطابق اس کا ان کے تئیں ردِ عمل ہوتا ہے۔ باپ کی سنگدلی کو بھی اس نے خوب صورت شکل دی ہے۔ اس کی صرف ایک وجہ یہی ہے کہ اُن کے اپنے احساسِ برتری اور سختی کے نیچے ایسا کچھ اُسے ضرور مل جاتا ہے جو بڑے فخر سے اس کی انانیت کو دلارتا ہے۔ ماں کو اس کے تئیں پیار نہیں تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ بے چاری اس کی یہ مانگ پوری کرنے میں ناکام رہی —— اس لیے اُس نے زندگی بھر اُنھیں معاف نہیں کیا۔ اس بارے میں وہ اتنا بیدرد ہے کہ نفرت کا پہلا سبق پڑھانے کا افتخار بھی وہ ماں کو نہیں دے سکتا۔ اس کی زندگی میں کئی عورتیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے آتی ہیں پہلے اس کی بہن سرسوتی، پھر شیلا، پھر شاردا بیمار رشانی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ اسے پیار دیتی ہیں۔ جو کچھ باقی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہلکی سی دلی تحریک ہے۔ اس میں وہ مکمل جذباتی بالیدگی نہیں ہوتی، قربانی کا وہ جذبہ نہیں ہوتا جسے پیار کا پورا نام دیا جا سکے۔

اب دو اشخاص رہ جاتے ہیں، جن کے تئیں وہ جھکتا ہے۔ ایک بابا مدن سنگھ۔ دوسری ششی۔ یہاں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ کیا بابا مدن سنگھ کے تئیں وہ انکسار کا احساس نہیں رکھتا۔ اور کیا ششی کے تئیں بھی اس کا احساس قربانی کا نہیں ہے ؟ بابا مدن سنگھ کی اذیتوں سے نکھری شخصیت اس کو جھکا دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن آپ تھوڑی باریکی سے دیکھیں گے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ بابا کی عاجزی میں اور اُن کی باہمی قربت میں اس کی انانیت کو برابر تقویت ملتی رہی ہے۔ اپنے کو جھکا کر لوٹ دینے والے اس شخص کی قربت میں شیکھر کو اپنی انا کی جو تائید ملی ہے، وہ کسی اور جگہ ملنی دشوار تھی۔

اب ششی کو لیجیے، جس ششی کے لیے وہ اتنی جدّوجہد کرتا ہے، اتنی تکلیفات برداشت کرتا ہے، جس کے علاج میں وہ اپنی پوری طاقت لگا دیتا ہے۔ جس کے تئیں اس کا مکمل ظاہر و باطن برفانی پہاڑ کی چوٹی کی طرح پگھل اُٹھتا ہے۔ کیا اس کے تئیں بھی وہ اپنی روح کی قربانی نہیں دیتا ؟ دراصل ششی اور شیکھر کا آخری واقعہ روحانی لذّت سے اتنا شرابور ہے کہ یہاں تو 'ہاں' کہہ دینے کا لالچ جاگ اُٹھتا ہے، لیکن یہاں بھی شیکھر کے خود اپنے الفاظ پیش کر کے ہم اپنی رائے کو پختہ کریں گے۔

"تم وہ سان رہی ہو، جس پر میرا جیون برابر چڑھایا جا کر تیز ہوتا رہا جس پر منجھ منجھ کر میں کچھ بنا ہوں، جو دنیا کے آگے کھڑا ہونے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔۔۔ تم زندہ نہیں ہو۔ میرے۔ شیکھر کے۔ بنانے میں ہی تم ٹوٹ گئی ہو۔ شاید خود شیکھر کے ہاتھوں ہی ٹوٹ گئی ہو۔" آپ دیکھیے۔ ششی کی شخصیت شیکھر کے لیے ہے۔ شیکھر کی ششی کے لیے نہیں۔ اپنے نہایت خوب صورت لمحوں میں بھی شیکھر نہیں بھول پاتا کہ اس کا اور ششی کا رشتہ تلوار اور سان کا رشتہ ہے۔ سان کا وجود تلوار کے لیے ہے، اس لیے ششی ہی شیکھر کے لیے جیتی ہے۔ اسی کے لیے مر جاتی ہے۔ اتنی بھرپور انا اس سے کم خوراک پا کر کیا پروان چڑھتی۔

'شیکھر' اور اس کے مصنف کو ایک سمجھنے والا قاری یہاں آ کر اس واقعے پر چونک سکتا ہے لیکن یہ ایک بیدار عمل ہے۔ یہاں نہایت کوشش کے ساتھ اگیئے نے ایلیٹ کے نظریے کو اپناتے ہوئے 'خود فراری' سے کام لیا ہے۔ اس کی ضرورت اور تکلیف آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔ سوانح عمری لکھنے میں پوری سچائی کا نباہ شاید کوئی گاندھی ہی کر پاتا ہو۔

اتنی ہمہ گیر انا یقیناً اپنے ننگے پن میں اکیلی اور اکیلے پن میں غم کھلائے گی۔ یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے، اسی لیے تو میں نے کہا کہ شیکھر کی عظمت اور عاجزی میں اٹوٹ رشتہ ہے۔

میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ "شیکھر" زندگی کا ایک مطالعہ ہے۔ لیکن یہ زندگی ایک شخص کی زندگی ہے۔ سوسائٹی یا زمانے کی زندگی نہیں ہے۔ میری یہ رائے اگیئے کے اپنے استقرار سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شیکھر ایک شخص کے نجی دستاویز ہونے کے علاوہ ایک عہد کی جدوجہد کا بھی عکس ہے۔ اُن کا ادعا ہے کہ اس میں اُن کا معاشرہ اور اُن کا زمانہ بولتا ہے۔ بے شک "شیکھر" میں اس عہد کے سماج اور زمانے کی قومی اونچ نیچ۔ تشدّد عدم تشدّد، مستورات کی سماجی صورتِ حال وغیرہ جیسے مسئلوں

تجزیہ نہایت باریکی اور گہرائی سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں سماج اور زمانہ نہیں بولتے۔ شیکھر اکیلے بولتا ہے۔ یہ بھی سماج کی جاری و ساری زندگی کا حصہ نہیں ہے۔ "شیکھر" کی خود آگاہی۔ اس کے غور و فکر کا ہی حصہ ہے۔ یہ تشریح ان کی سماجی زندگی کے تحرک کا حاصل نہیں ہے۔ شیکھر کے اپنے شخصی ردِ اعمال کا آئینہ ہے اور صاف الفاظ میں کہیں تو ان سوالات کی تشریح زندگی سے عبارت نہیں، فقط افکار پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ تجزیہ پر ختم ہو جاتا ہے، کسی نتیجے اور کسی حل پر نہیں پہنچ پاتا۔ میں اپنی تائید کیلئے ایک بار پھر شیکھر ہی کے الفاظ کی پناہ لیتا ہوں۔ جو "فرد کے لیے اونچے سے اونچی چوٹی تک اور ٹیڑھا بڑی پگڈنڈی نہ کھانے کو تیار ہے۔ لیکن افراد کے لیے تھوڑی سی دُور تک بھی کشادہ راستہ بتلانے کے لیے رُک نہیں سکتا۔"

پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر فرد کے لیے ہی شیکھر کیا دیتا ہے تو دراصل جیسا کہ میں شروع ہی میں کہہ دیا ہے ——— ابھی اس کی دین، واضح طور پر ایک بندھے ہوئے پیغام کی صورت میں سامنے نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے تیسرے حصے میں آئے اور بہت ممکن ہے کہ نہ بھی آئے۔ کیوں کہ اگیئے خود ایسا کچھ پا سکے ہیں اس میں شبہ ہے اُن کے تجربات ابھی تو چل ہی رہے ہیں۔ پھر بھی شیکھر کا احساسِ ذات شدید اور سچا ہے اور اس کی فہم بھی اتنی ہی تیز ہے۔ چنانچہ تجربے میں آئی ہوئی سچائی کو اپنی فہم کے ذریعے جوڑ کر فارمولے میں پیش کر دینا اس کے لیے نہایت آسان ثابت ہوا۔ اور "شیکھر" ہمیں زندگی کے دیرینہ اور ابتدائی سوال ... میں ... سے پردہ اٹھانے والی خوب آزمودہ کلید دیتا ہے۔ "دُکھ اس کی روح کی تطہیر کرتا ہے۔ جو اُسے دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔"

"کسی کے خلاف لڑنا کافی نہیں ہے۔ کسی کے لیے لڑنا بھی ضروری ہے۔" پہلا نظریہ شستی نے دیا دوسرا اسی کی روشنی میں شیکھر نے حاصل کیا۔ پیغام کے نام پر "شیکھر" دو حصوں میں اتنا ہی ہے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ شیکھر کا اپنا کوئی فلسفہ زندگی نہیں ہے۔ بنیادی سطح پر وہ علت اور عمل کے رشتہ کو کافی مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔ زندگی اور دنیا کی سبھی حقیقتوں کی کارفرمار روایت میں اُس کا اٹوٹ اعتماد ہے۔ یہ بنیادی طور پر اسے اپنی انانیت اور پھر جدید سائنس خاص کر تحلیلِ نفسی کی دین ہے۔ علت اور عمل کا رشتہ ایک غیر اثباتی تلسفہ ہے۔ وہ زندگی کا تجزیہ کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا، اس لیے ہندوستان میں بہت پہلے اور ہندوستان سے باہر بھی کافی دنوں سے اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ اسی وجہ سے شیکھر اصلیت کو حیات لینے کی سطح پر ناستک ہے۔ اور معاشرتی سطح پر لامقصد انقلاب پسند۔ جو ایسے ماحول کو اُلٹنے کے لیے ٹکرا رہا ہے، جو فقط جیسا ہے وہ بس ویسا ہی ہے۔ یہ علت اور عمل کا رشتہ شیکھر کی زندگی کو کچھ دے پایا یا نہیں (اور دراصل "نہیں" کہنا سراسر جھوٹ ہوگا کیونکہ وہ شیکھر کے آرام و آسائش کی وجہ تو نہیں رہا۔ وہ اس کی طاقت کی وجہ ضرور رہا ہے) لیکن اس کے آرٹ کو اس نے ایک بیش قیمت خزانہ بھینٹ کیا ہے۔

یہ ہے اس کا عقلی غیر جانبداری جو اپنی سنگ دلی کی وجہ سے تحلیل و تجزیہ کے دائرے میں بے جوڑ ہے۔ دل کی گہرائیوں میں ایسا اُترنے والا فن کار ہندی نے ناول کی دنیا میں دوسرا پیدا نہیں کیا۔ آپ کہیں پر دیکھ لیجیے، مصنف کی نظر جیسے حقیقت کے اندر گھستی ہی چلی جاتی ہے۔ اندر اور اندر جہاں اُس کا سبب چھپا بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے وہ نہیں رُکتی، نہیں رُک سکتی۔ بس پرت پرت کے پرت کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ غیر جانب داری شیکھر کو کافی ایمان دار بنا دیتی ہے۔ دوسروں کے تئیں بھی اور اپنے تئیں بھی۔ دوسروں کے تجزیہ و تحلیل میں اس کا نقطۂ نظر معروضی ہے۔ اس کے اپنے تئیں بھی یہ کافی حد تک معروضی ہی ہے۔ اتنی خطرناک انانیت اور اس پر ٹکی ہوئی خودداری کے باوجود اس نے کرداروں کو اُجاگر کرنے میں دُور تک نظر کو معروضی بنائے رکھا ہے۔ یہ فن کار کی بہت بڑی جید[illegible] ہے۔

یہاں اپنی بات کو ذرا اور واضح کرنا ہوگا[illegible] انانیت و خودداری اور معروضی نقطۂ نظر کیا یہ دو[illegible] ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ جو خودداری کا[illegible] ہے وہ اپنی معروضی عکاسی کیسے کر سکتا ہے۔ لیک[illegible] ...... بات ایسی نہیں ہے۔ انانیت تو شیکھر[illegible] لیے ایک سچائی ہے۔ ایک ناگزیر سچائی ہے[illegible] وہ پورے طور پر قبول کر کے چلتا ہے۔ لیکن اُس[illegible] قبول کرنے کے بعد اس کو ناگزیر سچائی مان لینے[illegible] بعد وہ جیسے اس کے تئیں غیر جانب دار ہونے[illegible] پوری کوشش کرتا ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا وہ یقیناً یا تو اس سے دکھی ہو کر اُس کی مذمت کرتا یا اس میں کوئی افتخار محسوس کرتا، لیکن وہ ا[illegible] ذات یا جذبات سے منسلک ردِ اعمال کو کافی[illegible] تک بچاتا ہوا اپنے تجزیے و تحلیل کو عقلی اور سائنٹی[illegible] بنائے رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کا ثبوت ہے کہ اس کے رنگ اکثر چٹکیلے نہیں ہوئے۔

لہٰذا کم از کم جہاں تک کرداروں کو پیش[illegible] کرنے کا تعلق ہے وہاں تک شیکھر کی معروضی نقط[illegible] ٹکی رہی ہے خود اعتمادی ہے تو اس میں لازم[illegible] لیکن وہ ملفوف اور خفی ہے۔ مثال کے طور پر شر[illegible] کے اظہارِ جذبات میں شیکھر کو صاف طور پر بہت کچھ کانٹ چھانٹ کرنی پڑی ہے۔ اس میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں دیا گیا، جو اس کے ادنی پن کو ظاہر کرتا ہو، لیکن اتنی خود پسندی کا حق تو ادب[illegible] کی تصنیف کے لیے لازماً دینا ہی پڑے گا۔ خود امتی[illegible] کی اس باریک قاعدگی کے سبب شیکھر کا فن ہند[illegible] کی ایک عظیم حشمت بن گیا ہے۔ وہ اپنی کاری گر[illegible] اور نقاشی میں ایک دم مکمل ہے۔

آپ تصور کیجیے اُس لمحہ کا جو کہ موت سے سا[illegible] ہونے کی وجہ سے شیشے کی طرح چمک دمک رہا[illegible] اس میں نہایت قدرتی طور پر سابقہ زندگی کے عکس[illegible] اُبھر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ زندگی کے واقعات

...ہوئے چلے آتے ہیں ۔ پہلے وہ جن کا اُس شخص کے
...گہرائیوں پر سب سے زیادہ اثر ہے ، جو اس کی
...بت کی تشکیل کے بنیادی عناصر سے جڑے ہوئے
... پھر آہستہ آہستہ اُن کے ساتھ گُنتھے ہوئے سلسلۂ
...ات ۔ ان واقعات کے دائرے کا مرکز ہے
...نفس کا ہیں ۔ جو علت و عمل کے رشتہ میں ان
...کو پرو دیتا ہے ۔ واقعات فطری طور پر کچھ سے
...ے ہیں ۔ لیکن وہ اس کے بیں کی برقی لہروں سے
...تے مل جل گئے ہیں بلکہ ملا دیے گئے ہیں کہ ان
...ہیں یوں گُنتھ جاتا بالکل بےعیب بن گیا ہے ۔
پھر اس کے بعد اس کے باریک اجزا پر
...اری کی گئی ہے ۔ تصاویر کشی میں ربط اور
...وٹ دونوں کی خوب صورتی آ گئی ہے ۔ اجزا...
...اوٹ معاً شیکھر کی شاندار زبان کی طرف اشارہ
...ہے ۔ جو اپنی پختگی اور خوب صورتی میں لا ثانی
... وہ دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ اُلجھنوں
...تی صفائی سے نقاشی کرتی ہے اور دل و دماغ
...زک خیالات کو اتنی باریکی سے الفاظ میں باندھتی
...قاری کو دنگ رہ جانا پڑتا ہے ۔ اس میں تیز دھا...
...ں سے کھیلنے والی صفت ہے ۔ گرمجوشی کو چھونے
...ں بھڑک ہے اور مشرف و ممتاز لمحات میں رفعت
...اس تک اُٹھنے کی عظیم قوت ہے ۔ ہر جگہ آپ
...یسا محسوس ہو گا جیسے احساس پر تیز تند نقطہ
دھار نے سان رکھ دی ہو اور چمک اٹھی
... شیکھر کے معمولی معمولی جملے بھی اس چمک سے
...رم نہیں ملیں گے ۔ جذبات سے مملو مناظر میں
...رے گئے جملوں کی تو بات ہی کیا ۔ دراصل صرف
...زبان کے لحاظ سے بھی شیکھر ہندی نثر کے ارتقا
...ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ہندی نثر
...یا بڑوں میں چندر دھر شرما گلیری ، رام چند
...ل ، جے شنکر پرساد اور راہل سانکرتیاین کے
ساتھ اگیئے کا نام بھی لیا جائے گا ۔

شیکھر سے مجھے اور میری طرح ہندی کے بہت
...قارئین کو ایک شکایت رہی ہے ، اس کی گرفت
کمزور ہے یا یوں کہیں کہ اس میں مسحور رکھنے والے
لمحات از حد کم ہیں ۔ پہلی جلد کا آخری آدھا حصہ
شاردا کے واقعات کو چھوڑ کر ۔۔۔ اور دوسری
جلد کا پہلا آدھا حصہ پڑھنے میں کافی بوجھل لگتے ہیں
محض تفنن طبع کے طور پر پڑھنے والے قاری کے لیے
اس حصے کو پڑھ پانا دشوار تر ہو گا لیکن جیسا کہ میں
نے ایک اور جگہ پر کہا ہے : "شیکھر کا آنند عقلی آنند
ہے ۔۔۔ لاتعلقی کا آنند ۔۔۔ جذبات پر قابو پانے
کا آنند ہے ۔ اپنے تحفظ کے احساس کا آنند ہے ۔
جو اپنا آپ سمجھا اور کر دینے کے آنند سے مختلف
ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس آنند سے کمتر بھی ہے ۔
ذاتی پسند و ناپسند سے مبرا ہو کر کسی کردار کی
تصویر کشی کرنا ، کسی سچائی ، کسی امر کو اجاگر کرنا '
عام سے زیادہ ذہنی تربیت اور توازن و تناسب
کا متقاضی ہوتا ہے ۔ اس تربیت اور توازن میں
ایک خاص قسم کے ذہنی انضباط کا آنند ہے اور
یہ آنند شیکھر کے تجزیہ و تحلیل میں آپ کو ہر لحظہ
ملے گا ۔

دوسری طرح کا آنند بھی کچھ کم نہیں ہے ۔
جہاں جہاں شیکھر اپنے آپ کو ڈھیلا کر پایا ہے ،
وہاں وہاں دوسری طرح کے آنند کی لہریں اس
کے بطن سے پھوٹ پڑتی ہیں ۔ یہ لہریں بذات
خود وسیلہ نہیں ہیں ۔ لیکن ان میں تیز روی ضرور
ہے جیسی کہ باندھ کو توڑ کر اُچھلنے والی پتلی سے پتلی
دھاروں میں بھی ہوتی ہے ۔ یہ بات مناظر فطرت سے '
سروتی ، شیلا ، شانتی اور شاردا کے واقعات
سے اور منّن اور رام جی کے اشارتی نقوش سے
واضح ہے ۔ بیمار شانتی سے اس کے حلقوم کو چھونے
کی اجازت مانگنا کتنا اچھوتا احساس ہے ۔ ان
سب سے بڑھ کر شستی کا واقعہ ہے ۔ جہاں
شیکھر خود آگہی کو تقریباً ڈبو ہی دیتا ہے ۔ سال بھر
تک ٹھوس برف کے پہاڑوں کو گرم سورج کی شعاعوں کے
پہلے آہستہ آہستہ اور پھر آبشار کی صورت میں پگھلتے
ہوئے کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے نہ دیکھا ہو تو اس کا
تصور کر لیجیے ۔ تب آپ کو شستی اور شیکھر کے باہمی
رشتہ کے پاکیزہ حسن کا احساس ہو سکے گا تب آپ
آسانی سے سمجھ سکیں گے کہ مشرق اور مغرب کی نظر
میں جو گناہ کبیرہ ہے ۔۔۔ بہن کے تئیں جسمانی خواہش ۔
اُس کو پاک شکل دینے کے لیے دل میں کتنے روحانی اوصاف
کی ضرورت ہوتی ہو گی ۔

لطف و انبساط کے اس آخری مقام پر پہنچ
کر یہ ادراک سفر کی تمام تکان بھول کر مصنف کے
تئیں ایک نئے احساس مندی کے جذبے سے
معمور ہو جاتا ہے ۔ کیا آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں ؟

(ترجمہ : ستیہ دیو چودھری)

(بقیہ : آگ میرے بھیتر آگ میرے ہاتھ میں ہے)

اسٹو ! آگ ہے اور میرے اندر دھدک رہی ہے
میں جل رہا ہوں یہ جلنا یگیہ کے ذریعے شدھ ہونا ہے
اسٹو ! آگ ہے ، آگ میرے بھیتر ہے ، آگ میرے ہاتھ میں ہے
سب جگہ آگ لگاتا پھرتا ہوں ۔ بجھ رہا ہوں ، مجھے آگ
لگاتے پھرتے رہنا چاہیے کہ سارا عالم ہر کہیں دھدک
اُٹھے ۔
اسٹو آگ ہے
کون سا اسٹو ۔ کون سا ؟

یہ اسٹو ، یہ گھر ، یہ سنّاٹا ، یہ آگ ، یہ سب
سوال اب محض یاد بھر رہ گئے :
" ڈور ٹوٹی ، ٹوٹا ایک تارا
ٹوٹی کڑی
میری انت ہین کہانی کے ۔ ۔ ۔ ۔ " (اگنیئے)

۱ بے آواز

دوسرا سپتک کا دیباچہ

اِس سلسلۂ انتخابات کو ہندی شعری ادب میں بڑی قدر و منزلت حاصل ہوئی کہ یہ عہد ساز ثابت ہوا تھا۔ اسی اعتبار سے اگیئے کا یہ دیباچہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

"تار سپتک" جب منظرِ عام پر آئی تو دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ اسی طرح کی کتابوں کی ایک سیریز شائع کی جائے جس میں ان اُبھرتے ہوئے اور ہونہار شعرا کا کلام شامل ہو جن میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہو، مگر جو اتنے مشہور نہیں ہوئے کہ کوئی ناشر بہ آسانی ان کا مجموعۂ کلام چھاپ دے۔ "تار سپتک" کی طباعت کا خیال بھی بنیادی طور پر اسی جذبے کے تحت پیدا ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ نظریہ بھی کارفرما رہا تھا کہ مجموعہ کی اشاعت بنیادی طور پر باہمی اشتراک سے ہونی چاہیے (جن قارئین نے یہ مجموعہ دیکھا ہے، انہیں شاید یاد ہوگا کہ اس آدرش کا تحفظ اس وقت بھی نہیں ہو سکا تھا — "دوسرے سپتک" میں تو اسے نباہنے کی کوئی کوشش تک نہیں کی گئی)

"تار سپتک" کے شعرا ایسے شاعر تھے، جن کے بارے میں کم از کم مدیر کی یہ رائے تھی کہ ان میں "کچھ" ہے اور وہ قارئین کے سامنے پیش کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ نئے ہیں اور انہیں بحیثیت شاعر انہیں زیادہ شہرت نہیں ملی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے بھی بعد میں شاعری کے میدان میں آگے بڑھے۔ کم از کم ایک نے تو صرف اعلان کر کے شاعری ترک کر دی بلکہ شاعری کے ایسے نقاد ہو گئے کہ اُسے دنیائے ادب سے خارج کر دینے پر ہی تُل گئے اور باقی میں سے دو ایک ایسے ہیں جو شاعری سے بیزار نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ہم آج یہ سمجھتے ہیں کہ "تار سپتک" کی اشاعت اور صرف اشاعت ہی نہیں بلکہ اس کی ترتیب و تالیف، نہ صرف بروقت اور مفید تھی بلکہ اسے ہندی شاعری کی دنیا کا ایک اہم واقعہ بھی کہا جا سکتا ہے اور اس پر ناقدین کے تبصرے اس بات پر اشارہ کرتے ہیں کہ "سپتک" کتنی مؤثر کتاب ہے۔

"دوسرا سپتک" میں پھر سات نئے شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے — سات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہندی دنیا میں غیر متعارف ہو، لیکن کسی کا بھی اپنا الگ سے کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک مجموعۂ کلام کی اشاعت کا تعلق ہے۔ یہ شعرا اس کتاب کے ذریعے ہی اشاعت کی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آج ہندی میں جو شعری مجموعے چھپ رہے ہیں، ان میں کم ہی ایسے ہوں گے جن میں عمدہ اور اچھے کلام کی اتنی بڑی تعداد یکجا ملے، جتنی "دوسرے سپتک" میں ہے۔

کیا یہ تخلیقات "پرلوگ وادی" ہیں؟ کیا یہ شعرا کسی ایک طبقہ، کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا یہ کسی سیاسی یا ادبی عقیدہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چوں کہ ہم پر یہ بے بنیاد الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم "پرلوگ واد" نام کے نئے عقیدہ کے پیرو ہیں، اس لیے اس کے جواب میں ہمارا کچھ کہنا لازمی ہے اور کسی وجہ سے نہیں تو صرف اسی لیے کہ "دوسرا سپتک" کے شعرا شروع ہی سے کسی تعصب کا شکار نہ بن جائیں اور انہیں ان کی تخلیقات کی میزان پر ہی پرکھا جائے۔

تجربے کا کوئی 'واد' (ازم) نہیں ہے۔ ہم نہ 'وادی' رہے ہیں اور نہ ہیں اور نہ ہی تجربہ بذاتِ خود ایک منزل ہے یا ایسی شے جس کی سادھنا کی جائے۔ ٹھیک اسی طرح شاعری کا بھی کوئی واد نہیں ہے۔ اور شاعری بھی اپنے آپ میں منزل نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں پرلوگ وادی کہنا اتنا ہی بے معنی اور بامعنی ہے جتنا ہمیں کویتا وادی کہنا۔ کیوں کہ ہمارا کہنا ہے کہ جس طرح اپنی ذات اور خیال کے اظہار کا خواہش مند شاعر اس بات کا مستحق ہے کہ وہ اظہارِ خیال کے لیے شاعری کو وسیلہ کی حیثیت سے

اپنی ضرورت کے مطابق بھرپور استعمال کرے۔ اسی طرح سچ کے متلاشی شاعر کوئی تجربہ کرتے وقت اس وسیلے کی خصوصیات کو پرکھنے کا پورا حق ہے۔ اتنا ہی نہیں وسیلے کی خوبی، اس کی طاقت اور اس کی حدوں کا اندازہ لگائے بغیر اس کا بہترین استعمال ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ تجربے پر کیچڑ اچھالنے کے لیے روایت کی دُہائی دیتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ روایت کم از کم شاعر کے لیے پوٹلی میں بندھی الگ رکھی ہوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے وہ اُٹھا کر سر پر لادے اور چل نکلے۔ (کچھ ناقدین کے لیے ہو سکتا ہے ایسا ہو) شاعر کے لیے روایت کا کوئی مطلب نہیں؛ جب تک وہ اُسے ٹھوک بجا کر، توڑ مروڑ کر، پرکھ کر اطمینان نہیں کر لیتا۔ جب تک وہ قدر اتنی راسخ نہ ہو کہ اس کا اتباع ناگزیر ہو جائے۔

تجربہ اپنے آپ میں منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دوہرا ذریعہ کیونکہ ایک تو وہ اس سچ کو جاننے کا ذریعہ ہے جس کو شاعر پیش کرتا ہے۔ دوسرے وہ اس پیش کش کے عمل اور اس کے ذرائع جاننے کا بھی ذریعہ ہے۔ یعنی تجربے کے ذریعے شاعر اپنے سچ کو بخوبی جان سکتا ہے اور بہتر طور پر بیان کر سکتا ہے۔ اشیاء اور دستکاری دونوں شعبوں میں تجربہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ یہ اتنی سیدھی سی بات ہے کہ اس سے انکار کرنا محض ضد ہوگی اور ایسے ضدی متعدد ہیں اور یہ ایسے ایسے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ادب کی درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس سے ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ جس طبقہ کی اعلان کردہ پالیسی یہ ہے کہ کوئی شے یا تخلیق اس کے لیے قابلِ قبول تب ہوگی جب وہ شے یا تخلیق کم از کم تین سو برس پرانی ہو تو ایسے طبقہ سے آج کی شاعری پر بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ اس طبقہ سے تو تین سو برس بعد ہی بات کرنا بہتر ہوگا اور تب شاید یہ غیر ضروری ہوگا کیوں کہ آج کا تجربہ اُس وقت روایت بن چکا ہوگا۔ اُن کی روایت ــــ اچھا یا واد، جب ایک زندہ حقیقت تھی تو کچھ لوگوں نے اسے اس وقت قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، مگر آج وہی لوگ اس کی تائید کرتے ہیں جب کہ وہ بالکل فنا ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اس مُردہ چیز کو ان سے بچانا چاہتے ہیں جو آج کی زندہ حقیقت کے اظہار میں لگے ہوئے ہیں خواہ اٹ پٹے لفظوں میں۔

تجربے کے لیے ہم نے کوئی 'ازم' تلاش نہیں کیا۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے ہمیں ایک بات اور کہنے دیجیے۔ تجربات برابر ہوتے آئے ہیں اور نئے نئے تجربوں کے ذریعے ہی شاعری یا کوئی بھی فن، کوئی بھی تخلیقی عمل آگے بڑھ سکا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے زندگی بھر کوئی تجربہ نہیں کیا وہ درحقیقت یہی کہتا ہے کہ اس نے زندگی بھر کوئی تخلیقی کام کرنا ہی نہیں چاہا۔ ایسا آدمی اگر سچ کہتا ہے تو یہی پایا جائے گا کہ اس کی 'شاعری' نہیں ہے۔ وہ فن نہیں، بلکہ دستکاری ہے ــ جو اسی کو شاعری ماننا چاہتے ہیں ان سے ہمارا جھگڑا نہیں۔ جھگڑا ہو بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ ہماری زبانیں مختلف ہیں۔ اور جھگڑے کے لیے بھی جھگڑے کی جڑ کا مشترک ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس خیال کے باوجود ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ محض تجربہ برائے تجربہ کے تحت کہی گئی نظمیں شاعری کے زمرے میں نہیں آ سکتیں۔

ہمارے تجربے کی قارئین کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت اور افادیت ہے تو اس حقیقت کی جو تجربہ کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ ہم صرف یہ دعویٰ لے کر قارئین کے سامنے نہیں جا سکتے کہ ہم نے سیکڑوں نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں یہ دکھانا ہوگا کہ ہم نے تجربات کے بعد کیا حاصل کیا ہے۔ تجربے کرنے والے کے نزدیک تجربہ خواہ کتنی ہی اہمیت کا حامل ہو، اس میں سچ کی تلاش کے لیے خواہ کتنی ہی اُمنگیں ہوں، قارئین کے لیے یہ سب غیر ضروری اور غیر اہم ہیں۔ جوہری موتی پرکھتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس موتی کو حاصل کرنے کے لیے غوطہ خور نے کتنی ناکام کوششیں کی ہیں۔ اگر موتی کو پانے کی کوشش کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے تو صرف موتی کو سامنے رکھ کر یعنی کہ اس موتی کو پانے میں اتنی محنت لگی۔ بغیر موتی پائے موتی کو حاصل کرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس طرح تجربے کے ساتھ 'ازم' کا اطلاق اور بھی بے معنی ہو جاتا ہے جو سچ کی کھوج میں تجربات کرتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ اس کے تجربات خود اس کے لیے موت و زندگی کا سوال کیوں نہ ہوں۔ دوسروں کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت ہے تو حاصلِ تجربہ کی اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ وہ خود بھی اسی سچ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے ورنہ اس کھوج میں اتنا مصروف نہ ہوتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس تمہید کے بعد ان الزامات کا جوابات دینا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ جو 'پر یوگ وادی' کہہ کر ہم پر لگائے گئے ہیں ــــ کچھ الزامات کو پڑھ کر تو افسوس ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ان میں کچھ وزن ہے بلکہ اس لیے کہ الزام لگانے کے لیے بحث و مباحثہ کے ایسے طریقوں کو اپنایا گیا ہے جس کی ایک تنقید نگار سے اُمید نہیں کی جا سکتی۔ ناقد متعصب تو ہو سکتا ہے پر کم سے کم تنقید نگاری کے اصولوں کا علم تو اسے ہوگا ہی اور اس سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ کسی پر قلم اٹھاتے وقت ان اصولوں کو فراموش نہیں کرے گا۔ نند دلارے باجپئی کا مضمون "پریوگ وادی رچنائیں" تنقید نگاری کے سارے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا نظر آتا ہے۔ جس میں الزام لگاتے وقت کافی تعصب سے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش بے سود ہوگی۔ اور ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ بے سود تجربات کی عام طور پر کوئی اہمیت نہیں ہے، مگر عام فہمی کے سوال پر کچھ اظہار کرنا شاید مناسب ہوگا۔

"تار سپتک" کے شاعروں پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ وہ عام فہمی کے اصول کو نہیں مانتے۔ یہ دوہری

ناانصافی ہے۔ کیوں کہ وہ نہ صرف اس اصول کو مانتے ہیں بلکہ اسی سے تجربات کی ضرورت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔ یہ ماننا ہوگا کہ تہذیب کی ارتقا کے ساتھ ساتھ علم و فن کا میدان بھی وسیع ہوتا گیا ہے اور اسی لیے اُن کے اظہار کے لیے اسلوب بیان میں بھی تبدیلی آئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی بنیادی کیفیات و جذبات نہیں بدلے، یعنی پیار اب بھی پیار ہے اور نفرت اب بھی نفرت ہے یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے، لیکن یہ بھی دھیان میں رکھنا ہوگا کہ راگ وہی رہنے پر بھی راگ سے متعلق رشتوں کے نظام بدل گئے ہیں اور شاعر کا علاقہ چونکہ راگ سے متعلق رشتوں کا علاقہ ہے لہٰذا اس تبدیلی کا شاعری پر لامحالہ گہرا اثر پڑا ہے۔ حقیقت اور سچائی میں یا کہہ لیجیے کہ کسی شے کی سچائی اور کسی شخص کی سچائی میں ایک فرق ہے۔ سچائی وہ حقیقت ہے جس کے ساتھ ہمارا شاعرانہ رشتہ ہے۔ بغیر کسی رشتہ کے وہ ایک ظاہری حقیقت ہے تو شاعری میں جگہ نہیں پا سکتی۔ لیکن جیسے جیسے ظاہری حقیقت بدلتی ہے، ویسے ویسے اس سے شاعرانہ رشتہ جوڑنے کا طریقہ بھی بدلتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس ظاہری حقیقت سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کہنا ہوگا کہ جو ناقدین اس تبدیلی کو نہیں سمجھ پا رہے ہیں وہ اس حقیقت سے ٹوٹ گئے ہیں جو آج کی حقیقت ہے۔ اس سے شاعرانہ رشتہ جوڑنے سے قاصر یہ لوگ اسے صرف ظاہری حقیقت مانتے ہیں جب کہ ہم اس سے ویسا رشتہ قائم کر کے اسے داخلی سچائی بنا لیتے ہیں اور اس تبدیلی سے عام فہمی کے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ عہد قدیم میں جب علم کا میدان محدود تھا، جب شاعر، سائنسداں اور ادیب جیسے الگ الگ پتے غیر ضروری تھے اور جب ایک تعلیم یافتہ آدمی اگرچہ سبھی علوم کا ماہر نہیں ہوتا تھا، پھر بھی واقف ہوتا تھا۔ عام فہمیت کا مسئلہ دوسری طرح کا تھا، تب زبان کا صرف ایک محاورہ تھا۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک محاورہ تھا۔ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک دوسرا — یعنی ایک 'سنسکرت' کہلاتی تھی اور دوسری 'پراکرت' لیکن کیا آج وہی صورتِ حال ہے؟ خصوصی مہارت کے اس دور میں زبان ایک رہتے ہوئے بھی اس کے محاورے مختلف ہو گئے ہیں۔ زبان آج بھی اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اُس نے عمومیت کو ترک کر دیا ہے یا کر دے، لیکن اب وہ عادت ہے سچائی نہیں۔ ایسی کوئی زبان نہیں ہے' جسے سب سمجھتے اور بولتے ہوں۔ مثال کے طور پر انگریزی کو لیجیے، انگریزی کی بڑی بڑی لغات ہیں۔ جو کسی بھی لفظ کا ایک ہی مطلب دیتی ہیں اور وہ معنی سبھی مانتے ہیں، لیکن حساب داں کی انگریزی دوسری ہے۔ اقتصادیات کے ماہر کی دوسری۔ اور افسانہ نگار کی دوسری۔ ایسی صورت میں ایک ایسے شاعر کے لیے جو ایک شعبہ کا محدود سچ' اسی میدان میں نہیں بلکہ اس سے باہر بیان کرنا چاہتا ہے۔ بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں یا تو وہ یہ کوشش ہی چھوڑ دے اور محدود سچ کو محدود دائرے میں سمو کر محدود محاوروں کے میڈیم سے بیان کرنے یعنی عام فہمیت کی تاسی تو کرے مگر اس کا دائرہ محدود کر دے یا پھر وہ ایک وسیع تر دائرے تک پہنچنے کی کوشش نہ چھوڑے اور اس لیے ایک مخصوص میدان کے محاورے سے بندھا نہ رکھ کر اس سے باہر جا کر ایک نئی راہ تلاش کرنے کی جوکھم اٹھائے۔ اس طرح وہ عام فہمیت کے لیے ہی ایک محدود دائرے کا تمام محاورہ ترک کرنے پر مجبور ہوگا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان دو راستوں میں سے کون سا راستہ چُننا بہتر ہوگا۔ ہم تو صرف اتنا ہی کہیں گے کہ جو دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے کم از کم اس بات کا تو سہرا بندھتا ہے کہ اس نے چیزوں کو وسیع تر نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ہمت کو 'ہمت پن' کہہ لیجیے، لیکن اس کی نیت کو آپ بُرا کیسے کہہ سکتے ہیں۔

ذرا زبان کے بنیادی سوال' لفظ اور اُس کے معنی کے رشتہ پر دھیان دیجیے۔ لفظ میں معنی کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کون اور کیسے بدلتا ہے؟ الفاظ و معنی کے موضوع پر یہاں بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے اپنی بات واضح کرنا چاہوں گا۔ ہم کہتے ہیں 'گلابی' اور اس سے ایک مخصوص رنگ کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہے۔ بے شک اس کا مطلب ہے گلاب کے پھول کے رنگ جیسا رنگ یہ تشبیہ اس میں چھپی ہوئی ہے۔ شروع میں لفظ گلابی سے۔ اسے اس رنگ تک پہنچنے کے لیے گلاب کے پھول کی وساطت ضروری رہی ہوگی۔ تشبیہ کی وساطت سے ہی الفاظ کے معنی سمجھے جاتے رہے ہوں گے۔ اس وقت یہ تجربہ کسی معجزے سے کم نہ رہا ہوگا لیکن اب ایسا نہیں ہے اب ہم لفظ تک ہی نہیں رہتے رنگ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اب لفظ کے معنی سمجھنے کے لیے پھول کی وساطت غیر ضروری ہے اور اب اس حقیقت سے بھی مطلب میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں ہوتی کہ گلاب کئی رنگوں کا ہوتا ہے۔ سفید، پیلا، لال۔ یہاں تک کہ کالا بھی۔ یہ عمل زبان میں برابر جاری ہے جس کی وجہ سے زبان نشو و نما پاتی رہتی ہے۔ معجزات مرتے رہتے ہیں۔ مگر معجزہ کن معنی میں ایک مسلمہ حقیقت بنے رہتے ہیں — یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی زبان برابر نثر کی زبان ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح شاعر کے سامنے لفظوں کے نئے مفاہیم کی ترسیل کا مسئلہ ہمیشہ بنا رہتا ہے۔ وہ الفاظ کو مسلسل نئے معنی پہناتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ نئے معنی عام آدمی تک پہنچ کر اتنے گھس جاتے ہیں کہ وہ اس شکل میں شاعر کے استعمال کے لائق نہیں رہتے۔ "برتن زیادہ گھسنے سے ملمع چھوٹ جاتا ہے۔" کالی داس نے جب 'رگھو ونش' کے شروع میں کہا تھا:

تب اُنہوں نے اس بات کو سمجھا تھا اور اسی لیے بولی

میں معنی پیدا ہونے کی خواہش شاعر نہیں کرتا۔ مروّجہ الفاظ تو وہ مٹی، کچا مال ہے جس سے وہ تخلیق کرتا ہے۔ ایسی تخلیق جس کے ذریعے وہ اپنے نئے معنی اس میں بھر سکے، اس میں روح پھونک سکے۔ اور یہی وہ خواہش ہے جس کے پورا ہونے کے لیے وہ دست بہ دعا رہتا ہے اور اس خواہش کو محض جدیدیت کا نام دے کر شاعر کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کرنا بہت بڑی بھول ہے۔ جب معجزنما معنی مر جاتے ہیں اور ایک پرانی شے بن جاتے ہیں، تب ان الفاظ کی وہ طاقت بھی کمزور پڑ جاتی ہے جس کے تحت وہ شعر کہنے پر مجبور ہوا تھا اور تب شاعر ان معنی کا اظہار کرتا ہے جس سے دوبارہ راگ کی اشاعت ہو۔ عام فہمیت کا مطلب یہی ہے۔ ورنہ اگر خیالات بھی وہی پرانے سے ہیں اور جذبات بھی۔ نیز یہ کہ اچھے اور برے کی فہرست پہلے ہی بن چکی ہے تو پھر شاعر کے پاس کچھ نیا کر دکھانے کو رہ کیا گیا ہے؟ کیا ہے جو شاعری کو فرسودہ روایات نہیں، کائنات کی عظمت دے سکتا ہے؟ شاعر نئے حقائق کو شعر کا جامہ پہنا کر انہیں نئی سچائی کا روپ دے، ان نئی سچائیوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لائق بنائے یہی نئی تخلیق ہے۔ اس بات کو نئی شاعری کا شاعر کبھی فراموش نہیں کرتا۔ عام فہمیت کے لیے وہ زور نہ دیتا ہو، ایسا بھی نہیں ہے بلکہ یہ دیکھ کر کہ آج عام فہمیت زیادہ مشکل ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر ہے اور اس کی ترسیل کے لیے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ یہ کسی حد تک ٹھیک ہے کہ جہاں شاعر کے احساسات زیادہ الجھے ہوئے ہیں، وہاں قارئین میں بھی انہیں حالات کی وجہ سے ویسی ہی تبدیلی آئی ہے اور اس لیے شاعر کو اظہارِ خیال کے لیے کچھ آسانی بھی ملتی ہے — لیکن مندرجہ بالا سطور میں علم کی مخصوص تقسیم کی جو بات کہی گئی ہے۔ اس کا حل اس میں نہیں ہے بلکہ وہ سوال اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ علوم جدیدہ کی ترقی "خصوصی مہارت کی مقتضی ہے۔ یعنی دورِ جدید میں جن علوم کی ترقی ہوئی، ان سبھی کو ہر انسان نہیں سمجھ سکتا۔ ایک مخصوص علم کو اس علم میں دلچسپی رکھنے والا انسان ہی سمجھ سکتا ہے دوسرا نہیں یعنی حساب داں حساب بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ افسانہ نگار، افسانہ کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، حساب نہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ کر ہی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ عام فہمیت کا کام کتنا زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ سارے علوم کی Specialization تصوصی مہارت کی رمق کو نظر انداز کر کے، اس سے اوپر اٹھ کر شاعر کو ان علوم کی منقسم سچائیوں کو سموچا دیکھنا اور دکھانا ہے۔

اس ذمہ داری کو وہ بھولتا نہیں ہے، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس وقت تک کے لیے وہ شعر کہنا ہی ترک کر دے جب تک کہ سارے علوم ایک ہو کر سب کی رسائی میں نہ آ جائیں، سارے الگ الگ محاورے پھر ایک ہو کر "ایک زبان ایک محاورہ" کے پرچم تلے نہ آ جائیں۔ اسے ابھی کچھ کہنا ہے۔ وہ بات کہنی ہے جسے وہ اہم مانتا ہے، اس لیے وہ اسے ان کے لیے کہتا ہے جو اسے سمجھیں، جنہیں وہ سمجھا سکے۔ 'عام فہمیت' کو اس نے ترک نہیں کیا ہے، لیکن جتنوں تک وہ پہنچ سکے پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کے لیے بھی کوشاں رہتا ہے کہ اسے اس سے آگے جانا ہے، مگر ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں، ساتھ لے کر۔ اصل میں دیکھیں تو وہ روایت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ اسے کبھی اپنے عہد سے کٹ کر الگ ہونے نہیں دیتا جب کہ اس کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ "کل کے سچ کو سب سمجھتے تھے۔ آج کا سچ اگر سب کی سمجھ میں نہیں آتا تو ہم اسے چھوڑ کر کل ہی کا سچ کہیں۔" وہ یہ نہیں سوچتے کہ کل کے اس سچ کا آج کے دور سے کیا تعلق ہے اور آج کون اس کل کے سچ کے ساتھ اطمینان بخش شاعرانہ رشتہ جوڑ سکتا ہے!

یہاں تک ہم "تار سپتک" اور اس کے ناقدین سے الجھتے رہے ہیں۔ "دوسرا سپتک" کی تمہید کو اس سے آگے جانا چاہیے۔ بلکہ یہاں سے اسے شروع ہی کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایک کتاب کی صفائی دوسری کتاب کی تمہید میں دینا دونوں کے ساتھ ذرا نا انصافی ہوگی۔ ہم یہاں "تار سپتک" کا بیان کر کے ناقدین کی مندرجہ بالا جانبدارانہ رائے کی طرف متوجہ نہ کراتے اگر یہ محسوس کرتے کہ دونوں کتابوں کے ناموں کی یکسانیت اور دونوں کی ایک ہی شخص کے ذریعے کی گئی ادارت کافی ہوگی۔ اگر یہ جانبدارانہ اور متعصبانہ الزام لگنے ہی ہیں تو کیوں نہ ان کا جواب دیتے چلا جائے؟

"دوسرا سپتک" کے شاعروں میں مدیر خود شامل نہیں ہے اس سے اس کا کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔ شاعروں کے بارے میں کچھ کہنے میں ایک طرف تو ہمیں تامل ہوگا، دوسری طرف آپ بھی ہماری بات کو قابلِ اعتنا سمجھیں گے اور شاعروں کی تخلیقات پر خود اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔ ان نئے شعراء کو بھی شاید پرلوگ وادی کہہ کر نظر انداز کیا جائے یا جیسا کہ پہلے بھی ہوا ہے، نظر انداز کرنے کے لیے یہ کہا جائے کہ ان شاعروں نے جو تجربات کیے ہیں وہ دراصل نئے نہیں ہیں یعنی وہ تجربات نہیں ہیں۔ ایسا کہنا ان شاعروں کے بارے میں اتنا ہی مناسب یا نامناسب ہوگا جتنا کہ پہلے "سپتک" کے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی کم مناسب ہوگا اگرچہ سب شاعروں میں زبان کی صفائی اور اظہارِ خیال میں شگفتگی ایک سی نہیں ہے پھر بھی سبھی کے یہاں وہ باتیں ملیں گی جو تجربے کو بامعنی بناتی ہیں۔ 'تجربہ برائے تجربہ' ان میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ لیکن نئے مسائل اور نئی ذمہ داریوں کے تقاضوں کو سب نے محسوس کیا ہے۔ "دوسرا سپتک" یقیناً ہندی شاعری کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تخلیقیت کے نقطۂ نظر سے تقریباً سو فی صد آج کی ہندی دنیا میں امید کی ایک نئی کرن ہے۔ یہ شاعر

بھی منزل تک نہیں پہنچے ہیں۔ لیکن اُن کے سامنے ایک سیدھا راستہ ہے۔ اور ایک روشن افق کی حدیں صاف نظر آتی ہیں ــــ گپت ۔ پرساد۔ نرآلا۔ پنت، مہادیوی، بچن، دنکر اس فہرست کو ہم آگے بڑھائیں گے۔ "دوسرا سپتک" کے کچھ شعرار کا ذکر اس میں ضرور ملے گا۔ اور چھپٹ کر کلام کو لیں تو جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ایک جلد میں تعداد کے اعتبار سے اتنے عمدہ کلام ادھر کی مطبوعات میں کم نظر آئیں گے۔

یہ بات دُہرانا ضروری ہے کہ ان سات شاعروں کا ایک جلد میں یکجا ہونا کسی گروپ کے قیام کی نشانی نہیں ہے۔ پہلی بار ہم نے شاعروں کے آپسی اختلافات کی بات کی تھی۔ نند دلارے جی نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ پریوگ وادی شاعری ان شعرار کی شاعری ہے، جن میں آپس میں اختلاف ہو۔ اب اگر ہم کہیں کہ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے بھی شاعر ہیں جنہیں آج تک ہم نے دیکھا ہی نہیں تو شاید اُنہیں پریوگ وادکی ایک نئی تعریف مل جائے کہ پریوگ وادی وہ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کا منہہ دیکھے بغیر ایک جیسی شاعری کرتے ہیں۔ انہیں یہ موقع دینے میں ہمیں تاسف نہیں۔ ہم اُن کی دلیلوں کو پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سات شعرار بھی ہم خیالی یا کسی سیاسی یا ادبی عقیدے کی یکسانیت کی وجہ سے یک جا نہیں ہوئے ہیں یا کیے گئے ہیں۔ کچھ سے ہمارا ذاتی تعارف ضرور ہوا لیکن یہاں ان کی شمولیت کا جواز فقط اُن کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کی طاقت نے ہی ہمیں اُن کی طرف متوجہ کرایا۔ اور اسی کی خوب صورتی ہی اس "سپتک" کے وجود کی تحریک ہے۔ شعرار کی جانب سے اس مجموعہ میں بھی اتنی ہی کم اور اتنی ہی تاخیری مدد ملی۔ جتنی کہ پہلے سپتک میں ملی تھی ــ بلکہ اس بار مشکلات کچھ زیادہ تھیں ـــ کیوں کہ اس بار اُن کی نہیں بلکہ ہماری تجویز تھی کہ ایک ایسا انتخاب نکالا جائے جو کئی شعرار کی نمائندگی کر سکے۔ جو کتاب آپ کے سامنے ہے۔ آپ نظموں کو ان کی خوبی اور خامی کی میزان پر ہی پرکھیں انہیں سے شاعر کی کامیابی یا ناکامی اور اس کے عقائد کی پرکھ کریں۔ ہم نے جو کچھ کہا اس اُمید کے ساتھ کہ آپ شعرار کو متعصبانہ نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ اُن کو پرکھتے وقت آپ غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کریں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس مجموعہ سے آپ مطمئن ہوں گے۔ (ترجمہ: حسین ضامن)

بقیہ: جے دول

لڑھکتا پڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔

اب چولک فا کا ہاتھ ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔ ڈاؤ پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے۔ اب ـــ

لیفٹیننٹ ساگر نے وہیں پڑے پڑے کمر سے ریوالور کھینچا اور نشانہ باندھ کر داغ دیا۔۔۔

دھائیں!

دُھواں ہوگیا۔ ہٹے گا تو نظر آئے گا۔۔۔۔

لیکن دھواں ہٹتا کیوں نہیں۔ آگ لگ گئی ـــ رنگ محل جل رہا ہے۔ آگ کی لپٹیں اِدھر اُدھر پھیل رہی ہیں۔ کیا چولک فا جل گیا؟ اور کمار ـــ کیا یہ کمار کی فاتحانہ آواز ہے؟ پانچ متی کی۔ یہ عجیب و غریب دل چسپ گونج جس میں وہ گِرا یا ڈوبا جا رہا ہے۔ نہیں، اُسے سنبھلنا ہوگا۔

لیفٹیننٹ ساگر اچانک جاگ کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک بار ہکا بکا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کا منتشر شعور یک سو ہوگیا۔ دُور سے دو ٹرکوں کی دو جوڑی بتیاں پوری روشنی سے جگمگا رہی تھیں اور اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی سرچ لائٹ رنگ محل کی سیڑھیوں کو لمحہ بہ لمحہ یوں چمکا دیتی ہے جیسے بادلوں سے زمین تک کسی وجر (برق) دیوتا کے اُتارنے کا راستہ کھُل جاتا ہے۔ دونوں ٹرکوں کے ہارن پورے زور سے بجائے جا رہے تھے۔

بوچھار سے بھیگا ہوا بدن جھاڑ کر لیفٹیننٹ ساگر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیا وہ رنگ محل کی سیڑھیوں پر سو گیا تھا۔ ایک بار نظریں دوڑا کر اُس نے محراب کو دیکھا۔ چاند نکل آیا تھا۔ محراب کی اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا۔

نیچے سے آواز آئی۔ "صاب، دوسرا گارڈی آگیا۔ ٹو کر کے لے جائے گا!"

ساگر نے مُنہ اُٹھا کر سامنے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ دُور جوکو رتالاب چمک رہا تھا جس کے کنارے پر بنا مندر بھاگتے ہوئے بادلوں کے بیچ میں کانپتا ہوا نظر آیا گویا رو پہلی چاندنی سے ڈھکا ہوا ہنڈولا ـــ کیا ایک رانی کے افتخار کی علامت ہے۔ جس نے راجا کو بچایا، یا ایک عورت کی ہمت کی۔ جس نے ایک مرد کی راہ نمائی کی یا بنی نوع انسان کی آزادی کی ازلی خواہش کا بے خوف، ناقابلِ تسخیر جے دول؟ (ترجمہ: نریندر نشچل)

بقیہ: خاموشی کا پجاری

ہر کہیں تنہا، اپنے آس پاس سے کٹا ہوا، اپنے میں غرق، لہروں سے گھرے ہونے کے باوجود ریت کا تودہ۔ سب کے بیچ رہ کر بھی کسی کے بیچ رہنے کی تقدیر۔ ایسی شخصیت کے سکوت پر سوالیہ نشان لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس کے دل میں خاموشی کے پیغامبر بسے ہوں۔ جس کے دل کے اُفق پر قوسِ قزح تو ہو لیکن نظروں سے اوجھل ہو، جس کی اُنگلیاں ستار بنی ہوں، وہاں شور کے امکانات کہاں! اُن کا سارا اظہار خاموشی کا اظہار ہے۔ تخلیقات میں نہ بڑبولے پن کا اونچا لہجہ ہے نہ وعظ و پند کی لفظی توسیع پسندی اور نہ ہی لفظوں کی سمع خراش آوازیں۔

ایسے عالم میں شور و غل پیدا ہو تو کہاں سے؟

(ترجمہ: اختر الواسع)

اگیئے

ارے یایاور رہے گا یاد؟

اگیئے جی کی مہادیوی ورما کے ساتھ ایک یادگار تصویر

ناگ کیسر کے پھول کھلنے کو آئے تھے۔ پنکھڑیاں جھڑنے لگی تھیں اور کیسر کی دل و دماغ میں بس جانے والی مہک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو پھلانگتی ہوئی دُور دُور تک پھیلنے لگی تھیں۔ بسیرا پہر بھی ڈھلنے کو تھا۔ آسمان میں اُمڈتے کالے کالے بادلوں نے عجیب عجیب شکل اختیار کرلی تھی۔ یہ شکلیں جانوروں سے ملتی جلتی تھیں اور ان میں بچّوں کا عکس تھا، جیسے بچے، چھوٹی عمر میں شرارتیں کرتے وقت عجیب عجیب شکلیں بنا لیتے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی صاف صاف آسمان پر تیرتے بادلوں کا کارواں شرارتی بچوں کی طرح اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ مندر کے نیچے سرور کا نیل تھر تھرا رہا تھا۔ اشوک درخت کے کھلے ہوئے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی چھاتی پر گر رہے تھے۔

میں نے مدھومکھیوں سے بچتے ہوئے اشوک کے پھولوں کا ایک گچھّا توڑ لیا۔ تب سوچا بھی نہیں تھا کہ انجانے میں میرے قدم کہاں اُٹھ رہے ہیں۔ شاید اچانک یا انجانے طور پر میں نے اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی طرف نظر دوڑائی تو محسوس ہوا، یہ قدم شھرا کے گھر کی طرف بڑھ رہے ہیں .....

میں نے پھول شھرا کو دے دیے اور کہا۔

"شھرا! میں الوداع کہنے آیا ہوں۔"

شھرا نے ایک ادائے بے نیازی سے پھول اپنے جُوڑے میں کھوس لیا۔ میری طرف دیکھا۔ مسکرائی جیسے سفید بادل میں جان پڑ گئی ہو ——

میں نے پھر کہا —— "صبح ہوتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

اُس نے پُوچھا۔ "پھر کب آؤ گے؟"

"کب؟"

ایک تبسم میرے لب پر تھرتھرایا۔ ویسا ہی سفید بادل جیسا:۔ . . شاید مسکراتے ہوئے ہم تاثرات کی وادی سے باہر نکل آتے ہیں۔

پھر بھی میں نے جواب دیا "کب کا کیا پتہ شھرا۔" کب جانے پھر کب آئے گا۔ لیکن یہ اشوک تو ہر سال کھلے گا، میں نہ سہی کوئی دوسرا لادیا کرے گا تمہارے لیے۔"

شھرا نے منھ پھیر لیا۔ اشوک کے پھولوں سے سجا ہوا جوڑا اب میری طرف ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ شاید وہ اسی لیے مُڑی تھی کہ میں اُسے پورا پورا دیکھ سکوں۔ میں جلد ہی وہاں سے واپس ہو گیا۔

ابھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تین بجے ہوں گے۔ جب میری روانگی ہوئی تھی۔ سات بجے برہم پُتر کے تٹ پر پہنچ گیا۔ اپنا بوریا بستر اور دس دن کا راشن باقی ناؤ میں لادا "ناوریا" نے مست ہو کر ناؤ کو ندی کے بہاؤ میں ڈال دیا۔ ناؤ اب کچھار سے باہر تھی اور پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔

ناؤ اب ندی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ میں نے غور سے کنارے کا جائزہ لیا۔ "ہوا زوروں سے بہہ رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"ناوریا!" پال کھڑی کرو۔"

ناوریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

آسام کے لوگ خوب ہنستے ہیں۔ جب مشکل پڑتی ہے تو زیادہ ہنستے ہیں، اس لیے کہ وہ پریشانیاں اور تکالیف پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے کہ وہ صرف کام کرنا جانتے ہیں۔ اور ہنستے ہنستے کام انجام دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ ناوریا نے وہی کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ندی کا بہاؤ تو دکھن کا تھا، جدھر ہمیں جانا تھا، لیکن ہوا کا رخ اُلٹا تھا ہم اُلٹی دِشا میں اور زیادہ چلنے لگتے —— اور بغیر پال کے ہم اپنی جگہ اڑے ہوئے تھے۔

جس طرح کشمیریوں کی عادت ہے۔ "کچھ فکر نی" کہنے کی۔ اُسی طرح مشکل وقت آسامی کہتے ہیں ——

"بڑہ وکداری" میں نے ہوا کی طرف منھ اُٹھا کر کہا "بڑہ ڈکدڈاری"۔ . . . آسامی لوگ ڈال کا تلفظ زیادہ تر ڈال کے طور پر کرتے ہیں۔

ناوریا اب چُپ چاپ تمباکو چبا رہا تھا۔

یہ صرف سفرنامہ نہیں۔ یہ مصنف کی محسوسات، مناظر فطرت میں اس کی دلچسپی اس کے بھولے بھالے آسامیوں سے گھلنے ملنے کی کہانی بھی ہے۔ یہ اگیئے مرحوم کی زندگی کی متعدد جہات کا آئینہ بھی ہے۔

لگ بھگ تین گھنٹے بعد ہم لوگ جہاں سے چلے تھے، اس سے کچھ اور اُوپر ہی کنارے آلگے۔ میں گاؤں سے پھر بیل گاڑی منگوا کر سامان لادا اور دوسری دِشا سے اس جزیرے پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل پڑا۔

"میری نانی ہمیشہ کہا کرتی تھیں ـ یہ لڑکا، جانے کس گھڑی میں پیدا ہوا ہے ہمیشہ اُلٹی جانب چلتا ہے۔ اُلٹی گنگا بہائے گا۔"

میرے ساتھ وہ گورکھا بھی تھا۔ جس کی سب سے اچھی عادت تھی، جہاں جگہ ملے، نیند پوری کر لیتا۔ بیل گاڑی میں ہمیں نو گھنٹے ہو چکے تھے۔ رات ہو گئی تھی۔ میں نے سامنے کی جگہ اپنے لیے بنائی تھی۔ اس کے بعد میرے کپڑوں کا اور راشن کا بکس تھا پھر مندوج (گورکھا) کے بیٹھنے کی جگہ، پھر پیچھے کی جانب ہمارے دونوں کے بستر ے.... اس طرح گاڑی کا توازن بھی ٹھیک بیٹھا تھا۔ اور جگہ بھی ہمیں من پسند مل گئی تھی۔ مجھے کھلے کھلے مناظر اچھے لگتے تھے۔ اس لیے میں فطرتی مناظر سے لطف لیتے ہوئے چلتا تو مندوج کو ٹرنکوں کی دراز میں سر چھپا کر اور بستر پر ٹانگیں پھیلا کر سونا اچھا لگتا۔ ایک بار ہم لوگ کچھ کھا کر چلے تھے۔ مندوج نے ٹھہر کر کچھ چائے بھی بنائی تھی۔ اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مندوج کو نیند آ گئی تھی۔ اور اب اُسے صبح تک جگانے کا کچھ سوال نہ تھا۔ گاڑی بان بھی دو ایک گیت گنگناتا ہوا اب خاموش ہو گیا تھا اور شاید اب اونگھنے لگا تھا۔ بیل اپنی منزل کی جانب بڑھے جا رہے تھے۔

تارے تھے.... ہاں آسمان پر تارے روشن تھے.... گاڑی بان کے کندھے کے بیچ سے دو چار تارے نظر آ رہے تھے۔ جب کوئی موڑ آتا، گاڑی بان تھوڑا اور جھک جاتا اور ایک دو تارے زیادہ نظر آنے لگتے۔ میں بھی اُونگھنے لگا تھا۔ خمار میرے تھکے ہوئے اعضاء اور ٹوٹتی ہڈیوں میں جادو کی طرح داخل ہو رہا تھا۔ میں اچانک چونک اُٹھا۔

گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی بان کہہ رہا تھا۔

"ہم لوگ پہنچ گئے۔"

میں نے دیکھا۔ ایک سرو ور کے کنارے گاڑی کھڑی ہے۔ اشوک کا درخت شاید وہاں بھی ہوگا، لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ میں نے زور سے آواز لگائی۔ "مندوج، او مندوج۔"

نیند سے بھرائی ہوئی آواز آئی ــــ "جی ساب!"

"اُٹھو اب، سامان اُتارو۔ یہاں باہر ہی بستر لگا لیں گے۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

مندوج چُپ رہا۔

"کیوں کیا بات ہے مندوج؟"

مندوج نے کانپتے ہونٹوں سے بتایا ــــ

"ساب! بستر گر گیا۔"

راستے میں مندوج کی نیند [illegible] اور دونوں بستر گاڑی کے بار بار اُچھلنے سے راستے میں کہیں گر گئے تھے۔ دھچکوں کی وجہ سے اس کا احساس مجھے بھی نہیں ہو سکا اور مندوج تو گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔

میں نے مندوج کی شرم کو کم کرنے کے لیے کہنا شروع کیا... "کیوں مندوج! آسام تو بڑا خوب صورت شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے ہنس مکھ اور ملنسار ہیں۔ آسام سچ مچ کتنا خوب صورت ہے...."

لیکن مندوج شاید بستر کے گرنے کی چوٹ نہیں بھلا پایا تھا۔

"چائے بناؤ" میں نے آہستہ سے کہا ــــ پھر گاڑی بان سے مخاطب ہوا۔ "سامان اُتار کر گاڑی موڑ لو۔ ہم بستر کھوجنے چلیں گے۔"

مندوج نے جلدی سے کہا.... "جی ساب"

.... اور ٹرنک اُتار لیے۔

گاڑی بان آہستہ سے بڑبڑایا۔ "بڑے ڈھنڈاری"

خوش قسمتی سے بہت زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک اور اس سے آدھے میل کے فاصلے پر دوسرا بستر گرا ہوا نظر آ گیا۔ مزے کی بات یہ کہ گڑھے کے پاس کچرے میں بھی ایک بستر گرا ہوا تھا۔ مگر وہ بستر میرا نہیں تھا ــــ مندوج کا تھا۔

طبیعت میں بشاشت لوٹ آئی۔ تین گھنٹے بعد لوٹ کر دیکھا۔ آگ جل کر ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ کیتلی اس پر چڑھی ہے اور مندوج ٹرنک پر سر رکھے بے خبر سو رہا ہے۔

[illegible] ہو چلا تھا۔ موٹر میں سوار ہوا ڈھائی گھنٹے بعد گولپارا پہنچا۔ نام سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گولیا ندی یہیں کہیں گرتی ہو گی۔ وہاں دو تین چار جھونپڑے تھے ناؤ کے انتظار میں بیٹھنے والوں کے لیے ایک پھوس کا چھپر [illegible] بائیں جانب [illegible] بہہ رہا تھا۔ کہ گولیا ندی یہاں سے کچھ میل دُور ہے۔ [illegible] ہے ماضی میں کبھی اس کا رخ اس جانب رہا ہو۔

ہم نے [illegible] ناؤ کا زیادہ دیر انتظار نہیں کیا۔ ایک آدھ میل [illegible] ڈونگی آئی تو ہم اس میں بیٹھ گئے۔ [illegible] سامنے والے جزیرے کا درمیانی حصہ نظر آ رہا تھا۔ تقریباً تین میل کا فاصلہ تو ہوگا ہی۔ بیچ میں ایک اور چھوٹا جزیرہ پڑتا تھا۔ اس لیے چار میل سے زیادہ کہنا بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں جانے سے پہلے اس چھوٹے جزیرے کا چکر کاٹنا بھی ضروری تھا۔ پھر ہم جزیرے کے دریائی گھاٹ کملا باڑی پہنچ گئے۔

یہاں ضروری ہے کہ اس عجیب و غریب اور پُراسرار جزیرے کا میں آپ سے تعارف بھی کراتا چلوں۔ برہم پتر سمندر تک۔ اُتر، پچھم، پورب، دکھن چاروں دشاؤں میں بہتی ہے۔ اُتر پوربی آسام میں داخل ہوتے وقت اس کا بہاؤ برہم کُنڈ ہوتے ہوئے دکھن پچھم میں ہو جاتا ہے پھر گنگا (پدما) سے ملنے پر بہاؤ دکھن کی جانب ہو جاتا ہے۔ برہم کُنڈ

کے آس پاس اس کا رُخ اُسی طرح ہے جیسے لکشمن جھولا رشی کیش کی گنگا کا۔

برہم پُتر کے سیدھے راستے کے بیچ میں ماجھلی نام کا ایک جزیرہ ہے۔ ندیوں میں چھوٹے موٹے جزیروں کا ہونا معمولی بات ہے۔ لیکن ماجھلی اپنے طور پر انوکھا جزیرہ ہے۔ دنیا کی کسی ندی میں ۷۰ میل لمبا اور دس میل چوڑا لگ بھگ ۲۵ ہزار کی آبادی والا جزیرہ میں نے نہیں سُنا۔ بارش کے موسم میں جب ندیوں کا پانی چڑھتا ہے تو جزیرے کی لمبائی کبھی بیس ایک میل کم ہو جاتی ہے اور جگہ جگہ پانی بھر جاتا ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔"

ماجھلی کی اہمیت صرف اسی ایک بات سے نہیں ہے، آسامی تہذیب و تمدّن میں بھی اُسے خصوصی درجہ حاصل ہے۔ ویشنو سنت شنکر دیو اور اُن کے شاگرد مادھو دیو نے اسی جگہ ستر کی بنیاد ڈالی اور اُن کی پرم پرا کو چلانے والے ویشنوؤں کی کئی ستر اب بھی یہاں چل رہے۔ ایک خدا پر یقین کرنے والے آسامی ویشنو پورے آسام میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دوپہر ہوتے ہوئے کملا باڑی جا پہنچے۔ گھاٹ سے بڑھ کر میری ذات کے ایک گاؤں کے پاس سے ہو کر ڈاک بنگلے پر جا پہنچا۔ سامان رکھ کر ہاتھ منھ دھویا۔ مندوج کی منّت کی کہ کم از کم گھنٹہ بھر جاگ کر کچھ ڈیتے کا اور کچھ تازہ کھانا بنا کر مجھے دے۔ مندوج نے ہمیشہ کی طرح کہا "جی ساب"۔ میں آرام کرسی پر آرام سے بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی تو مندوج کو پینے کے لیے پانی اُبال کر رکھنے کی عادت ڈال دی تھی۔ لیکن ابھی فوراً اُس کا انتظام مشکل تھا۔ چوکیدار سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ولایتی فلٹر ہے۔ صاحب لوگ اُسی کا پانی پیتے ہیں۔ میں نے کہا ہاتھ پمپ سے مجھے تازہ پانی دے دے۔ دو منٹ کے اندر ہی گلاس بھر کر وہ پانی لے آیا۔

میں نے حیرت سے پُوچھا: "پانی اتنی جلدی چھن گیا۔ باسی تو نہیں ہے۔"

چوکیدار ذرا تیز آواز میں بولا۔ "نہیں ساب۔۔۔۔ ابھی تازہ لا رہا ہوں۔"

انسانیت کے مذہب میں میرا گہرا عقیدہ ہے لیکن آسام کی زندگی سے میں نے ایک بات سیکھی کہ پانی کے بارے میں آسامیوں پر آسانی سے یقین مت کرو۔ میں نے جا کر فلٹر دیکھا تو اُس کے اوپری حصّے میں پانی بالکل نہیں تھا۔ چھلنی کے نیچے پانی اب بھی بھرا ہوا تھا۔ میں نے نااُمیدی کے ساتھ کہا۔

"سارا پانی اتنی دیر میں چھن بھی گیا۔"

چوکیدار نے اُلجھن میں کہا۔ "نہیں، میں نے چھلنی اُٹھا کر بھر دیا تھا۔۔۔"

اور یہ سچائی تھی۔ اس لیے کہ فلٹر سے چھننے میں دیر لگتی ہے جو کہ بڑی ذکٹداری کی بات ہے۔

میں نے من مار کر کہا۔ "بھال۔۔۔"

وہ چلا گیا تو میں نے پانی نالی میں بہا دیا اور دو ایک کتابیں نکال کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ جب تک چائے نہیں آتی۔ کتاب سے پیاس کو بہلائے رکھوں۔

دو ایک بکریاں ٹہلتی ہوئی ڈاک بنگلے کے احاطے میں داخل ہو گئی تھیں۔ بغیر کسی جھجک کے وہ برآمدے کی طرف بڑھیں۔ سیڑھی چڑھ کر پھر کمرے میں چلی گئیں۔ ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ پھر مُنھ موڑ کر جیسے میری موجودگی پر مجھے معافی دے رہی ہوں اور تھوتھنی لگا کر میری کتابوں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

کچھ جانور ہوتے ہیں، جن میں بچوں کا سا عکس ہوتا ہے۔ جانوروں میں میری دلچسپی ہے۔ کبھی کبھی گھنٹوں بیٹھ کر میں نے گلہریوں کو بھی کندھے پر بیٹھ کر کھڑے اُڑنے کی عادت ڈلوائی ہے۔ کتے، طوطے، مور، چکور، کبوتر، تیتر کے علاوہ گلہری، بن بلار، لنگڑے کوّے اور چیل کے بچے تک میں نے پالے ہیں اور ان کا دوست بن کر میں نے سُکھ محسوس کیا ہے، لیکن ماجھلی کے جانوروں اور انسانوں میں جو یکسانیت دیکھی وہ مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ ڈاک بنگلے کی بات ہے۔ دو ایک بار ہاتھی اپنے آپ گھٹنے ٹیک کر اور سُونڈ اُٹھا کر سلام کر کے میرے ہاتھوں سے کیلے اور موسم پھلیاں کھا چکا تھا۔ یہ آس پاس کے علاقوں کے سدھائے ہوئے ہاتھی تھے، لیکن دوسری بار میں نے دیکھا کہ جزیرے کے دوسرے جانوروں کے ساتھ بھی جیسے انسانوں کا کوئی سمجھوتا ہوا ہو۔

کملا باڑی سے کوکیلا مُکھ لوٹتے ہوئے طوفان نے گھیر لیا۔ دن ڈھلنے پہنچا۔ ایکسپریس بس بھر چکی تھی۔ اور ایسی جگہوں میں ۲۴ سیٹ کی گاڑی تب بھرتی ہے جب ۳۲ بیٹھ چکے ہوں۔ کہنے سُننے پر ڈرائیور نے مجھے اندر داہنی طرف بٹھا لیا۔ مندوج کو سامان کے ساتھ (صرف اپنا بستہ میں نے ساتھ رکھ لیا) بیل گاڑی پر آنے کے لیے کہا — رات کٹ گئی۔ دوسرے دن سامان آ جانے پر دو قسطوں میں بس کے ذریعے نیما ٹھاٹ گیا۔ وہاں سے آگے بس نہیں تھی۔ آتی جاتی ملٹری لاریوں میں چڑھتے ہوئے رات تک لوگاؤں پہنچ گئے۔ یہاں اپنا ٹرک مجھے لینے کے لیے آنے والا تھا۔ یہاں تین ہفتے کی ڈاک اور اخبار دیکھنے کی اُمید تھی۔ سب مجھے مل گئے۔ اب ضرورت تھی تو صرف آرام کی —

(ترجمہ: مشرف عالم ذوقی)

لگ گئے

نظمیں

چھند :

میں سب طرف کھلتا ہوں
بن سا، بن سا اپنے میں بند ہوں
الفاظ میں، میں نہیں سما سکتا
میں سناٹے کا چھند ہوں !

کتبہ :

ایک سمندر، ایک ہوا، ایک کشتی
ایک خواہش، ایک یاد
جو سب تھے مجھے عزیز :
اُنہی کے لائے میں یہاں آیا
یعنی پاس تمہارے
لیکن تم کہاں ہو ؟ کون سے کنارے ؟

ہیرو :

سر سے کندھوں تک ڈھکے ہوئے
وہ کہتے رہے
کہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے ——
اور ہم اُن کی تعریف کرتے رہے

لیکن جب گرنے پر
اُن کے نقاب اُلٹے تو
اُن کے چہرے نہیں تھے !

نظم :

اُدھار کے وقت میں
خریدے ہوئے پیار پر
چُرائی ہوئی مسکراہٹیں

چلتی پھرتی مُرجھائی صورتیں
اشتہاری ننگی مورتیں
ایک میں دو سری
اور کیا پہچانیں ؟

تم کیا جانو

تم کیا جانو
کتنی لمبی ہوتی ہے رات
اکیلی
سسکی کی !

کیسا ہے یہ زمانہ

کیسا ہے یہ زمانہ
کہ لوگ
اسے بھی پیار کی کویتا
مانیں گے
لیکن کیسا ہے یہ زمانہ
کہ ہم بھی
ایسی ہی کویتا میں
اپنا پیار
پہچانیں گے !

ساگر :

یوں مت چھوڑ دو مجھے، ساگر
کہیں مجھے توڑ دو، ساگر
کہیں مجھے توڑ دو !
میری نظر کو اور میرے دل کو
میری خواہش اور میرے من کو
میرے عمل اور میری خودی کو
میرے سپنے اور میرے بیتے جیون کو
کہیں مجھ سے جوڑ دو !
یوں مت چھوڑ دو مجھے، ساگر
یوں مت چھوڑ دو !

کتبہ (۲) :

میں بہت اوپر اُٹھا تھا، مگر گرا
نیچے اندھیرا ہے —— بہت گہرا
لیکن دوست! پڑھ چکے تو آگے بڑھو، رُکو مت :
میرے پاس —— یا روشنی میں —— کوئی زیادہ نہیں ٹھہرا!

دُوج کا چاند :

میرے چھوٹے سے گھر کا چراغ
تمہارے مندر کے پچھلے آنگن میں

بہاسا رکھ دیا گیا!

صبح شام :

روز سویرے میں تھوڑا سا ماضی میں جی لیتا ہوں ——
کیوں کہ روز شام کو میں تھوڑا سا مستقبل میں مرجاتا ہوں!

کانچ کے پیچھے مچھلیاں :

ادھر اس کانچ کے پیچھے پانی میں
یہ جو کئی مچھلیاں
بے آواز تھرکتی ہیں
اُن میں سے کسی ایک کو
ابھی ہم میں سے کوئی کھا جائے گا
جلدی سے پیسے چکائے گا ——
چلا جائے گا

پھر ادھر اس کانچ کے پیچھے کوئی دوسرا آئے گا
پیسے کھنکھنائے گا
روپیوں کی پرچیاں گنے گا
اطمینان سے جیب میں سرکائے گا
دام دے گا نہیں، وصول کرے گا
اور پھر ہم سب کو —— ایک ایک کو —— ایک ساتھ
اور بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ کھائے گا۔
کھاتا چلا جائے گا
ویسے ہی ٹکٹکی باندھے آنکھوں سے دیکھتا ہوا۔
جیسے تاکتی ہوئی یہ مچھلیاں
خود کھائی جاتی ہیں

زندگی کے ریستوراں میں یہی کھائی چارہ ہے
رشتہ ناطہ ہے ——
کہ کون کس کو کھاتا ہے!

پھول ہر بار آتے ہیں :

پھول ہر بار آتے ہیں
ٹھیک ہے، ہم بار بار نہیں آتے
لیکن ہر بار
بہار کے ساتھ
وہاں پربت پر برف پگھلتی ہے
اور یہاں ندی بھرتی ہے۔
امراتی پر بور آتا ہے
اور کوئلیں کوکتی ہیں
ہوا گرماتی ہے
اور جنگل کی خوشبو سب کے لیے بکھرتی ہے

ہم نہیں آئیں گے
تو بھی، جب ہیں
تب کیوں نہیں گائیں گے
یا گائے ہوئے ہی گیت کی
کڑی نہیں دوہرائیں گے؟

ندی کا بہتا :

دیر تک دیکھا ہم نے
ندی کا بہنا
لیکن نہیں آیا ہمیں
کچھ بھی کہنا
پھر اُٹھے ہم، مڑے چلنے کو
تب نہیں ملے
ہوئے جیسے جلنے کو
ایک کو جو کہنا تھا
دوسرے نے سُن لیا

کسی مستقبل میں نہیں، ضم
نہ ہی ماضی میں کہیں
تم ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح
زمانۂ حال میں رہنا!

نشے میں سپنا :

نشے میں سپنا دیکھتا ہوں
سپنے میں دیکھتا ہوں
نشے میں سپنا دیکھنے والے کو
سپنے میں دیکھتا ہوا
نشے میں ڈگمگ سمندر کا بپھرنا

اتنے گہرے نشے میں
اتنے گہرے سپنے میں
اتنے گہرے نشے میں
سمندر اتنا گہرا، لامحدود
دیکھنے والا میں اتنا سطحی، اکیلا

اتنا بہت نشہ
اتنے بہت سپنے
اتنا بہت سمندر
کم
ہیں!

آج مجھے ہنسنا چاہیے :

ایک دن میں
راستے کے کنارے مُردہ پڑا پایا جاؤں گا
تب مُڑ مُڑ کر باعزت لوگ پوچھیں گے:
ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا گیا
کہ اس میں جان ہے؟
لیکن تب دیر ہو چکی ہوگی
تب میں ہنس نہ سکوں گا
اس بات کو لے کر
مجھے آج ہنسنا چاہیے

تاریخ کا کام
اتنے سے چل جائے گا کہ
ایک تھا جو —— تھا
اب نہیں ہے —— پایا گیا
لیکن میں جو زندہ رہا، جو میں زندہ رہا
جو رویا ہنسا
جو میں نے پایا، جو کیا
اُس کا کیا ہوگا؟

اس کے لیے بھی ہے ایک نام :
" آیا - گیا "
اس نام کو لے کر
مجھے آج ہنسنا چاہیے

میرے جیسے کروڑوں ہیں
جن سے تاریخ کا کام
اسی طرح چلتا ہے :
کہ ہے —— نہیں ہے
اُن کا سکھ دُکھ ، پانا کھونا
معنی نہیں رکھتا ، محض ہونا
—— یا آخر کار نہ ہونا
وہ نہیں جانتے تاریخ ، یا مفہوم
وہ ہنستے ہیں اور لیتے ہیں
بھگوان کا نام

اس بات کو لے کر
مجھے آج ہنسنا چاہیے ۔

اسی لیے تو
جن کی تاریخ ہوتی ہے
اُن کے دیوتا ہنستے ہوئے نہیں ہوتے :
کیسے ہنس سکتے ہیں ؟
اور جن کے دیوتا ہنستے ہوئے ہوتے ہیں
اُن کی تاریخ نہیں ہوتی :
کیسے ہو سکتی ہے ؟
اسی بات کو لے کر
مجھے آج ہنسنا چاہیے . . .

کتنی کشتیوں میں کتنی بار :

کتنی دُوریوں سے کتنی بار
کتنی ڈگمگ کشتیوں میں بیٹھ کر
میں تمہاری طرف آیا ہوں
اے مری ننھی روشنی !
کبھی کہرے میں تمہیں نہ دیکھتا بھی
لیکن کہرے کی ہی ننھی روپہلی جھلمل میں

آہستہ ، باعزم ، اَن تھک ، نڈر مسافر
اے میری اَن کہی صداقت ! کتنی بار . . .

اور کتنی بار کتنے ڈگمگ جہاز
مجھے کھینچ کر لے گئے ہیں کتنی دُور
کتنے اجنبی ملکوں کی بے درد ہواؤں میں
جہاں ننگے اندھیروں کو
اور بھی اُبھارتی رہی ہے
ایک ننگی ، تیکھی ، سنگ دل روشنی ——
جس میں کوئی ہالا نہیں بنتا
صرف چُندھیاتے ہیں
صداقت نہیں ، نہ ختم ہونے والی صداقتیں . . . .

کتنی بار
حیران ، پریشان ، بد حواس ——
کتنی بار !

(ترجمہ : کیدار ناتھ کومل)

ریت کے گھروندے :

(اگیئے کی آخری نظم[1])

بالو کے گھروندے بنائے ہیں تین بچوں نے
انہیں پتہ نہیں ہے
کہ بالو میں وہ ذرّے ہیں
جن کے بکھراؤ سے شروع ہوتا ہے عمل
دنیا کے سبھی گھروندوں کے زوال کا

بالو سے کھیلتے ہوئے تین بچے
اور سمندر کا شور : "پانی کا کہ بالو کا"
انسان ہی انسان کی تیسری آنکھ ہے

[1] ۴ اپریل ، درخت پر بنی ہوئی جھونپڑی کے افتتاح کے لیے اگیئے کو اپنی نظم سُنانی تھی ، جو انھوں نے اپنی پیدائش کے دن ، ۷ مارچ کے موقع پر لکھی تھی ۔

تمہاری آنکھ بند کیوں ہے دیوتا ؟

گزارش :

ابھی نہیں —— لمحہ بھر رُک جاؤ
محفل کے سننے والو !
مایوس مت ہو ،
سنگیت کے پھول تلاش کرنے والو
یہ آواز کبھی خاموش نہیں ہوگی
ٹوٹے گی نہیں تان ——
اور اگر بانسری ٹوٹ بھی گئی تو
بج اُٹھے گی رُوح
جھنجھنا جائیں گے تار روح کے ——"

ہم گھوم آئے شہر :

گاڑی ٹھہرانے کے لیے
جگہ کھوجتے کھوجتے
ہم گھوم آئے شہر
بیمہ کی قسطیں چکاتے چکاتے
بیت گئی زندگی

ماضی سے کٹ گئے
چڑھا کر پھول چندن
اب جس میں جیتے ہیں
اُس سے ملے تو کیا ملے
کھسیں نپورتا کتابی خیر مقدم !

گھر :

میرا کوئی گھر نہیں
مجھے گھر چاہیے
گھر کے اندر روشنی ہو
اس کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں
ہاں روشنی کے گھیرے میں گھر ہو
ایسے گھر کی مجھے تلاش ہے ——
ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے ؟

دیکھا ہو تو مجھے اس کا پتہ دیجئے۔
نہ دیکھا ہو
تو میرے پاس ہمدردی ہے آپ کے لیے ——

انسان ہو کر بھی
اب ہم آپ
ایسے گھروں میں نہیں رہ سکتے
جو روشنی کے گھیرے میں ہو
لیکن کیسی بات ہے
بے گھر والوں کی طرح
مدام ہمدردی کے گھیرے میں
رہ رہے ہیں ہم!

چٹان :

چٹان سے ٹکرا کر ہوا
اس کے پیروں میں لکھ جاتی ہے
لہرانے والے سو سو رُوپ

اور تمہارے رُوپ کی چٹان سے
ہرا کر، ٹکرا کر میں
اپنی زندگی کے بالو پر
اپنی سانسوں سے لکھا رہ جاؤں گا

ناچ :

ایک تنی ہوئی رسّی ہے جس پر میں ناچتا ہوں
جس تنی ہوئی رسّی پر میں ناچتا ہوں
وہ دو کھمبوں کے بیچ ہے
رسّی پر جہاں میں ناچتا ہوں
وہ ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک کا ناچ ہے
دو کھمبوں کے بیچ جس تنی ہوئی رسّی پر میں ناچتا ہوں
اُس پر تیکھی روشنی پڑتی ہے
لوگ ناچ دیکھتے ہیں
مجھے نہیں، جو ناچ رہا ہے
نہ رسّی کو جس پر میں ناچ رہا ہوں
نہ کھمبوں کو جس پر رسّی لگی ہے
نہ روشنی کو، جس سے ناچ دِکھتا ہے
لوگ صرف ناچ دیکھتے ہیں
اور دراصل میں ناچتا نہیں ہوں۔
میں صرف اس کھمبے سے اُس کھمبے تک دوڑتا ہوں
کہ یہاں سے اُس کھمبے تک کی رسّی کھول دوں
توازن بگڑے اور میری چھٹّی ہو جائے۔
لیکن توازن نہیں بگڑتا
اور میں دَوڑتا رہتا ہوں
اور وہی میرا ناچ ہے
جسے سب دیکھتے ہیں
مجھے نہیں
رسّی کو نہیں
کھمبے کو نہیں
روشنی کو نہیں
تناؤ کو نہیں
دیکھتے ہیں —— ناچ

گھر —— کچھ نظمیں

گھر
گھر کہاں ہے جس کی ہم باتیں کرتے ہیں
گھر کی باتیں سب کی اپنی ہیں
گھر کی باتیں
کوئی کسی سے نہیں کرتا
جن کی باتیں ہوتی ہیں
اُن کا تعلق گھر سے نہیں ہوتا ہے۔

●

دوسروں کے گھر
اندر کی طرف کھلتے ہیں
جہاں راز دفن ہیں
جن رازوں کو وہ نہیں کھولتے
شہر میں ہوتے ہیں
دوسروں کے گھر
دوسروں کے گھروں میں
دوسروں کے گھر،
دوسروں کے ہیں

●

تمہارا گھر وہاں ہے
جہاں تک سڑک جاتی ہے
لیکن مجھے تو بس چلتے جانا ہے
پھر سڑک کہاں ختم ہوگی
اور تمہارا گھر۔ . . (ترجمہ: بشرف عالم ذوقی)

گلِ لالہ :

لالہ کے اس
بھرے ہوئے دل سے بچے لال پھول کو دیکھو
جو وقتِ سحر کھل جائے گا
جو شام کو مرجھا جائے گا
اور (اگلے دن) پھر اک بار کھلے گا
پھر شام کو کمہلا جائے گا
اور پھر اک بار نکھر آئے گا
تب کمہلاتا ہوا کالا پڑ جائے گا

مگر میں —— وہ بھرا ہوا دل ——
کیا مجھے پھر کبھی کھلنا ہے؟
جس میں (اگر) ہنسنا ہے
وہ سحر ہی پھر کیا آئے گی
(ترجمہ: خورشید اکرم)

میتھلی شرن گپت

دڈا میرے گُرو تھے۔ حالانکہ دڈا کو آسانی سے یہ بات قبول نہ ہوتی۔ اس لیے کہ اس شاگرد کی بہت ساری عادتیں اُنہیں ناگوار خاطر گزرتی تھیں۔ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ جب سے میں نے ہندی بولنا اور پڑھنا سیکھا ہے اور اب جو کچھ بھی ہوں یہ سب اُنہیں کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ اُنہیں کی شاعری کی آغوش میں میرا بچپن گزرا ہے ؎

"سچ ماتر بھومی سو دیش کے گودی بھرے ہم لال ہیں"

یا

"تیرے گھر کے دوار بہت ہیں کس سے ہو کر جاؤں میں"

یا

"نیلا جر پریدھان ہرت پٹ پر سندر ہے"

وغیرہ پڑھ کر ہندی شاعری سے اور جذبۂ حب الوطنی سے میرا تعارف ہوا اس کے بعد "جے درتھ ودھ" یا "پنچ وتی" کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب اور رسم و رواج کے گرنتھوں سے قریب ہوا۔ اتنا سب تو کتابیں پڑھنے کی مشق سے پہلے ہی ہو گیا تھا کیوں کہ ایک تو میری تعلیم پرانے طرز کی ہوئی تھی۔ دوسرے کتابوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ پتا جی جب گھر پر ہوتے تو سنسکرت کے اشلوکوں کا اونچی آواز میں پاٹھ کرتے۔ اُن کی غیر موجودگی میں بڑی بہن کا فریضہ گرنتھ یا تو خود ہی اونچی آواز میں پڑھا کریں یا ہم بھائیوں کو بیٹھا کر سنایا کریں۔

گپت جی سے تعارف کی اصل رسم تو کئی سال بعد ہوئی، لیکن جب اُن سے ملاقات ہوئی تب تک میں اُن کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اُن سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی چلی تھی، اس لیے چر گاؤں میں (اُن کے گاؤں کے گھر) میں جب اُن سے آمنا سامنا ہوا تو پہلی بار میں یہ احساس ہوا گویا مدّت سے شناسائی ہو۔ اُن کی سادگی نے اس احساس کو اور بھی تقویت دی تھی۔ یہ ملاقات میرے جیل جاتے اور نظر بندی سے رہا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ہوئی تھی۔ میں اُن سے ملاقات کے لیے چر گاؤں گیا تھا اور ان دنوں میرا یہ حال تھا کہ لگاتار پانچ سات منٹ بھی بولنا پڑ جائے تو سچ مچ منھ دکھنے لگتا تھا۔

پھر بھی چر گاؤں میں قیام کے پہلے ہی دن ماحول میں وہ کھویا ہوا اپنا پن نظر آیا کہ "بیالو" کے بعد دڈا نے اپنے بھائیوں کو اور منشی اجمیری کو (جن کا اُن کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا) پاس بیٹھا کر مجھ سے جیل کی زندگی کی داستان سنانے کو کہا —— اور اُس سے پہلے کی میری انقلابی زندگی کی سرگرمیوں کو جاننا چاہا۔ میں رات کے دو بجے تک اُنہیں مختلف واقعات کے جنگل کی سیر کراتا رہا۔ دڈا اور سیارام شرن گپت' بابو کی یہ کوشش رہی تھی کہ اُن کا یہ نیا مہمان کوئی تکلیف محسوس نہ کرے۔ یہ ماحول مجھے پسند آ رہا تھا۔ رات کے دو بجے کے بعد دڈا نے کہا۔ "اب تم تھک گئے ہو گے آرام کر لو۔ ہمارا تو جی نہیں بھرا، لیکن اب تمہاری داستان کل سنیں گے۔"

چر گاؤں کا یہ پہلا سفر تھا۔ جب میں تین دن تک دڈا کے ساتھ رہا۔ اس درمیان اُن کے خاندان کے لوگوں سے بھی کافی گھل مل گیا تھا — چوتھے دن جب روانگی کا وقت ہوا دڈا، اُن کے بڑے بھائی، چھوٹے بھائی، اُن کا لڑکا اور بھتیجے سبھی مجھے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے۔ الوداعی ساعت نے ماحول کو سنجیدہ بنا دیا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں اپنا گاؤں چھوڑ کر کہیں پردیس جا رہا ہوں۔ آج بھی یہ یادیں (دشت ذہن میں) خیمہ زن ہیں اور تنہائی میں ذہن کے پردے پر نکل کر مجھے جھنجھوڑ دیتی ہیں۔

ڈیوڑھی کا بڑا پھاٹک زیادہ تر بند رہتا تھا۔ اُسی میں ایک کھڑکی سے آنا جانا ہوتا تھا اُسی راستے سے پہلے میں پھر دڈا پھر سیارام جی سے پہلے منشی اجمیری باہر نکلے۔ نکل کر اجمیری جی بھی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ باقی لوگ پھاٹک کے اندر ٹھہر گئے۔ رخصتی کی گھڑی آ گئی تھی۔ پھاٹک

سے کچھ آگے گلی کے نکڑ پر تانگہ کھڑا تھا، جسے مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے جانا تھا۔ میتھلی شرن جی کے بھتیجے سمترا چرن تانگے کے پاس کھڑے تھے۔ وہ میرے ساتھ اسٹیشن جانے والے تھے۔ اچانک ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ دّدا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اب تو آپ کے جیسے سنسکار ہیں، مسلمان بن کر بھی جانے آپ کیا کیا کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن ہمارے لیے آپ برہمن ہیں۔ اس لیے آپ عقیدت کے قابل ہیں۔"

اور یہ کہا۔۔۔ دّدا میرے پیروں پر جھک گئے تھے۔ اُن کے ہاتھ گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ میں نے تیزی سے اُن کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا اور انہیں کندھوں پر رکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں گویا ہوا۔

"آپ مجھے شرمندہ مت کیجیے۔ مجھے آشیرواد دیجیے۔ اگر آپ اس لائق سمجھیں۔"

دّدا نے مسکراتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر سیارام شرن جی سے گلے ملے — اور پھر دّدا نے منشی اجمیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اجمیری، اگینیے جی کو تانگے تک پہنچا آؤ۔"

چرگاؤں جانے سے پہلے دّدا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ چرگاؤں سے میں نے اُن کی لکھی ہوئی دو تین کتابیں بھی منگوائی تھیں — بھارت بھارتی، جے درتھ ودھ اور کچھ دوسری کتابیں۔ جب مجھے سزا ہوئی اور دلّی جیل سے ملتان جیل لایا گیا تو میں نے یہ کتابیں دلّی میں اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑ دیں۔ ملتان جیل سے میں نے ایک خط سیارام شرن جی کے نام لکھا — مہربانی کر کے دّدا کی اور کتابیں مجھے بھیج دیجیے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ سزا اور بدلی ہو جانے کے بعد میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں کتابوں کا آرڈر دے کر پبلشر سے منگوا سکتا۔ اس خط کے جواب میں چرگاؤں سے ایک بڑا سا پارسل آیا جس میں دونوں گپت بھائیوں کی تمام شائع شدہ کتابیں موجود تھیں۔ ساتھ ہی دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والے دونوں کے خطوط بھی تھے۔ اُسی وقت سے خط و کتابت کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ جیل کا قاعدہ یہ تھا کہ ہم ایک ماہ میں ایک ہی خط لکھ سکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ جیل کے سیاسی نوعیت کے قیدیوں کے ساتھ ہمیشہ ہوا ہے جیل کے افسر جھگڑے سے بچنے کے لیے دو چار سے بھی زیادہ خط لکھنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے۔ اس شرط پر کہ اس خرچ کا کوئی حساب نہیں رکھا جائے۔ اور اسے سرکاری خرچ سے الگ رکھا جائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، مہینے میں اوسطاً دو خط تو چرگاؤں جاتے ہی تھے۔ پھر جیل سے چھوٹ کر جب لاہور میں نظر بند ہوا تو خط و کتابت میں کوئی دشواری نہیں رہی۔ ہاں لاہور سے باہر نکلنے پر پابندی تھی۔

ملتان جیل سے چھوٹ کر جب میں لاہور آیا تھا تو چھوٹنا رہائی کی قانونی تعریف ہی تک محدود تھا۔ ہدایوں کہ ہائی کورٹ نے اپیل میں میری سزا رد کر دی۔ مگر جیل سے رہائی کے بدلے مجھے اُس پولیس دستے کو سونپ دیا گیا، جو قلعے میں نظر بندی کا حکم لے کر مجھے گرفتار کرنے آیا تھا — اِدھر قلعہ کی نظر بندی سے چھٹکارا ملا۔ اُدھر لاہور میں گھر پر میں نظر بند رہنے لگا۔

جب آگرے کے ہفتہ وار "سینک" کی ادارتی ذمہ داری میرے حصے میں آئی تو چرگاؤں جانے کا اتفاق کئی بار ہوا۔ اکثر رات کی گاڑی سے چرگاؤں جانے کا اتفاق ہوتا۔ تین چار گھنٹے پلیٹ فارم پر گزار کر علی الصباح گپت جی کے یہاں پہنچ جاتا اور دو تین دن گزار کر آگرہ لوٹ جاتا۔

دّدا کو نئی نئی باتیں سننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا شوق تھا، نئی مشین یا نیا پرانا کل پُرزہ دیکھنے اور اکٹھا کرنے کا جنون۔ چرگاؤں میں ساہتیہ سدن کا اپنا پریس تھا۔ دّدا بڑے پیار سے مشینیں دکھاتے اور اُن کی خوبیاں گناتے۔ ایک سفر کا ذکر ہے، دّدا نے کہیں سے ایک بڑی پرانی مشین منگوائی تھی۔ میرے چرگاؤں پہنچتے ہی پہلا حکم ہوا کہ میں مشین دیکھوں — چابی منگوا کر پریس کھلوایا گیا۔ ابھی پوری طرح صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔ دُھندلی روشنی میں ہم لوگ مشین دیکھنے گئے۔ مشین جما تو دی گئی تھی، لیکن ابھی چلتی نہیں تھی۔ دّدا نے بتایا مشین دن بھر میں تین لاکھ فارم چھاپ کر دے سکتی ہے۔ اور ساہتیہ سدن کا پورے سال کا کام بھی اتنا نہیں ہوتا تھا۔ اور سات مشینیں پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ مشین کا ایک ایک پُرزہ دکھانے کے بعد دّدا کے جوش میں کچھ کمی آ گئی۔ کیوں کہ مشین کے کئی دنوں سے بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے ایک بلّی نے سلنڈر کی اوٹ میں بچے دے دیے تھے — دّدا مجھے ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے۔ پھر اُنہوں نے دوسروں کو پریس کی صفائی کا حکم سنایا اور اس کے بعد پھر مشین کی خوبیاں لے کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا تین لاکھ کی چھپائی تو ٹھیک، لیکن اتنی بڑی مشین کا آپ کیا کریں گے۔ جب کہ آپ کے یہاں کام بھی زیادہ نہیں اور بہت سی مشینیں پہلے سے پڑی ہیں۔"

دّدا نے بہت غور سے میری طرف دیکھا جیسے میری بات میں تجربے کی کمی محسوس کر رہے ہوں پھر ٹالتے ہوئے بولے "آئیے، آپ کو اپنی فاؤنڈری دکھائیں۔"

مشینوں کے معاملے میں دّدا معلومات کا خزانہ تھے۔ نئے ڈھنگ کی جھرنا قلم سے لے کر موٹر، ہوائی جہاز ہر شے کا انہیں پورا پورا علم تھا۔

بچپن میں اسکول سے بھاگ کر وہ کرکٹ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ کرکٹ کے بلّے پر اُن کی جیسی بھی گرفت رہی ہو۔ لیکن مشینوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ کوئی مشین اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چلائی۔ اُنہوں نے نئی موٹر گاڑی بھی خرید لی تھی۔ سستے میں ایک پرانی گاڑی مل گئی تھی۔ جب اُسے لے کر دلّی جانے کی بات چلی (جہاں راجیہ سبھا کا ممبر ہونے کی وجہ سے وہ اکثر جاتے رہتے تھے) تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ گاڑی چلائے گا کون؟ اُن کے دو بھتیجے بھی گاڑی چلانا سیکھ چکے تھے۔ مگر دّدا کو اُن کی لیاقت

روز

دوپہر میں اس سُونے آنگن میں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس پر کسی بد دُعا کا سایہ منڈلا رہا ہو۔ ماحول میں عجیب قسم کا ناقابلِ بیان بوجھل پن سا تھا۔

میری آہٹ سنتے ہی مالتی باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر پہچان کر اس کے مُرجھائے ہوئے سے چہرے پر پل بھر کے لیے خوشی کی چمک پیدا ہوئی اور پھر بُجھ سی گئی۔ اُس نے کہا۔ "آجاؤ۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اندر پہنچ کر میں نے پُوچھا۔ "وہ یہاں نہیں ہیں؟"

"ابھی آئے ہیں۔ دفتر میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ کوئی ڈیڑھ دو بجے آیا کرتے ہیں۔"

"کب کے گئے ہوئے ہیں؟"

"سویرے اُٹھتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

"ہوں۔" میں نے پوچھنا چاہا: "اور تم اتنی دیر کیا کرتی ہو؟" لیکن خیال آیا کہ آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ ٹھیک نہیں ـــــ میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

مالتی ایک پنکھا اُٹھا لائی اور مجھے جھلنے لگی میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا: "رہنے دو، مجھے نہیں چاہیے۔" پر وہ نہیں مانی اور بولی: "واہ چاہیے کیسے نہیں۔ اتنی دھوپ میں چل کر تو آئے ہو یہاں . . ." میں نے کہا "اچھا لاؤ مجھے دے دو۔" وہ شاید نہ کرنے والی تھی کہ اُسی وقت دوسرے کمرے سے بچّے کے رونے کی آواز سُن کر اُس نے چُپ چاپ پنکھا مجھے تھما دیا اور اپنے گھٹنوں پر ہاتھوں کا زور دے کر "اونہہ" کر کے اُٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کے جاتے ہوئے دُبلے شریر کو دیکھ کر سوچتا رہا: "یہ کیا ہے، یہ کیا ان دیکھا بد سایا سا ہے، جو اس مکان کے مکینوں پر منڈلا رہا ہے۔"

مالتی میرے دُور کے رشتے کی بہن ہے۔ لیکن اس کو ساتھی یا دوست کہنا زیادہ ٹھیک لگتا ہے کیوں کہ سالہا سال سے ہم دونوں کا تعلق دوستوں جیسا رہا ہے۔ ہم دونوں بچپن سے ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے، ساتھ پٹے اور ایک ساتھ بڑے ہوئے۔ اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہمارا سلوک ہمجولیوں کا سا رہا ہے ـــــ میں آج کوئی چار برس بعد اسے دیکھنے آیا ہوں۔ چار برس قبل جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ایک لڑکی ہی تھی ـــ اب وہ نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ ایک بچّے کی ماں بھی ہے۔ اس عرصہ میں اس میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہوئی ہوگی اس کے بارے میں، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا، لیکن دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اس کی پُشت کو دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا سایہ سا اس گھر پر محیط ہے؟ خاص طور پر مالتی . . . ؟"

مالتی بچّے کو لے کر لوٹ آئی اور مجھ سے کچھ دور نیچے بچھی دری پر بیٹھ گئی، میں نے اپنی کرسی کا رُخ اس کی طرف موڑا اور پوچھا: "اس کا نام کیا ہے؟" مالتی نے بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "نام تو کوئی طے نہیں کیا۔ ویسے ہم اسے ٹٹّی کہتے ہیں۔"

میں نے اسے بلایا۔ "ٹٹّی، ٹٹّی آجا۔" پر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا اپنی ماں سے چمٹ گیا اور اوں اوں کرنے لگا۔ مالتی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر آنگن کی طرف دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مالتی نے مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کیسا ہوں، کیوں آیا ہوں؟ بالکل چُپ چاپ بیٹھی ہے۔ کیا شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ بیتے دنوں کو بھلا بیٹھی ہے یا اب وہ ایک فاصلہ درمیان میں رکھنا چاہتی ہے کیوں کہ وہ پہلی سی بے تکلفی تو اب ممکن نہیں۔ لیکن ایسی بھی کیا چُپ! اتنا چپ چاپ تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں رہا جاتا۔ میں نے کچھ کھسیانا سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا: "ایسا لگتا ہے تمہیں میرے آنے سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔"

اس نے چونک کر کہا: "ہوں۔" اس کی "ہوں" سے لگا کہ اس جواب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نے میری بات سُنی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے بھی سوال دُہرایا نہیں اور چُپ سادھ لی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس کی طرف دیکھا تو

وہ ایک ٹک مجھے گھورے جا رہی تھی، لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اُس نے نظریں جھکا لیں، پھر بھی میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں اور چہرے سے عجیب سی کشمکش کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے اس کے اندر سبھی کچھ اتھل پتھل سی، کچھ ٹوٹ پھوٹ سی ہو رہی ہو، جیسے ماضی کی کسی ٹوٹی ڈور کو پھر سے جوڑنے کی ناکام کوشش سی یا جیسے کوئی عضو بہت دیر تک ایک حالت میں رکھے رہنے پر سو گیا ہے اور اب چاہنے پر بھی حرکت نہ ہو پا رہی ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی زندہ شخص کے گلے میں مُردہ طوق ڈال دیا گیا ہو، وہ اُسے اُتار پھینکنا بھی چاہے تو نہ اُتار پائے.... تبھی کسی نے کواڑ کھٹکھٹائے۔ میں نے مالتی کی طرف دیکھا وہ ہلی نہیں۔ جب دوسری بار کواڑ کھٹکھٹائے گئے تو وہ بچے کو گود سے اُتار کر اُٹھی اور دروازہ کھولنے لگی۔ "وہ" یعنی مالتی کے پتی آئے، میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلے ان کا فوٹو دیکھ چکا تھا اس لیے پہچانتا تھا۔ تعارف ہوا۔ مالتی کھانا تیار کرنے چلی گئی۔ وہ اور میں اندر بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ ان کی نوکری کے بارے میں، ان کی زندگی کے بارے میں اور ایسی دوسری رسمی باتوں کے بارے میں ایسے موضوعات جن پر پہلی ملاقات میں عام طور پر بات چیت ہو سکتی ہے۔

مالتی کے پتی کا نام مہیشور ہے۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری میں ڈاکٹر ہیں۔ اسی حیثیت سے ان کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ صبح سویرے ڈسپنسری چلے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ دو بجے لوٹتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر بھر چھٹی رہتی ہے۔ پھر شام کو مریضوں کو دیکھنے اور ضروری ہدایات جاری کرنے ڈسپنسری چلے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک مخصوص ڈھرے پر چل رہی ہے۔ وہ نسخے، دوائیاں، مریض، روز کے ایک جیسے معمولات۔

کچھ معمولات کی یکسانیت اور کچھ اس سخت گرمی کی وجہ سے وہ عام طور پر سست دکھائی دیتے ہیں۔

مالتی ہم دونوں کے لیے کھانا لے آئی۔ میں نے پوچھا۔

"تم بھی کھاؤ گی یا کھا چکیں؟" مہیشور کچھ ہنس کر بولے۔

"یہ تو بعد میں ہی کھاتی ہیں، پتی ڈھائی بجے کھانا کھانے آتے ہیں۔ اس لیے پتنی تین بجے تک بھوکی بیٹھی رہے گی۔" اور مہیشور کھانا شروع کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ایسے بے وقت کھانے میں آپ کو تو کیا مزہ آئے گا؟" میں نے جواب دیا۔

"واہ، دیر سے کھانے پر تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔ بھوک زوروں پر ہوتی ہے۔"

"مگر شاید مالتی بہن کو دقت ہوگی۔"

مالتی لڑکتے ہوئے بولی۔

"اونہہ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں، روز ہی ایسا ہوتا ہے۔"

مالتی بچے کو گود میں لیے ہوئے تھی پھر بھی وہ روئے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ روتا کیوں ہے؟"

مالتی بولی۔ "ہو ہی گیا ہے چڑچڑا۔ روتا ہی رہتا ہے۔" اور پھر بچے کو ڈانٹنے لگی۔ "چپ کر۔"

وہ اور بھی رونے لگا۔ مالتی نے اُسے زمین پر بٹھا دیا اور بولی۔ "اچھا رو لے۔" اور روٹی لینے چلی گئی۔

کھانا ختم ہوا تو تین بج رہے تھے۔ مہیشور نے بتایا کہ انہیں آج جلدی اسپتال جانا ہے۔ وہاں تشویش ناک حالت میں کچھ مریض لائے گئے ہیں۔ جن کا شاید آپریشن کرنا پڑے۔ ایک دو کی شاید ٹانگ بھی کاٹنی پڑے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسپتال چلے گئے۔ مالتی دروازہ بند کر کے میرے پاس آ بیٹھی۔ میں نے کہا "اب تو کھانا کھا لو۔ میں اتنی دیر ٹٹی کو بہلاتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "کھا لوں گی۔ کون سی نئی بات ہے۔" لیکن چلی گئی۔ میں ٹٹی کو گود میں لے کر جھلانے لگا۔ جس سے وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔

دور کہیں شاید اسپتال میں تین کھڑکے۔ کلاک میں نے سنا۔ مالتی وہیں آنگن ہی میں بیٹھی اپنے آپ سے ہی لمبی سی سانس کھینچ کر کہہ رہی تھی:

"تین بج گئے۔" اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کڑی مشقت اور ریاضت کے بعد کوئی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہو۔ تھوڑی دیر میں مالتی پھر میرے پاس آ گئی، میں نے پوچھا: "تمہارے لیے کچھ بچا بھی تھا۔ سارا تو میں ہی کھا گیا۔ وہاں کچھ بچا تو ہوگا نہیں۔" مالتی موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "یہاں سبزی وبزی تو کچھ ہوتی نہیں، کوئی آتا ہے تو نیچے سے منگا لیتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ جو سبزی ساتھ لائے تھے، وہی اب تک استعمال ہو رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "نوکر کوئی نہیں ہے؟"

کوئی ٹھیک ملا نہیں، شاید دو ایک دن میں مل جائے۔"

"برتن بھی تم ہی مانجھتی ہو؟"

"اور کون؟" مالتی پل بھر کو آنگن میں گئی اور لوٹ آئی۔ میں نے پوچھا: "کہاں گئی تھیں"۔

"آج پانی ہی نہیں۔ برتن کیسے منجھیں گے۔"

"کیوں، پانی کو کیا ہوا؟"

"روز یہی ہوتا ہے۔ آج شام کو سات بجے آئے گا تبھی برتن منجھیں گے۔"

"چلو، تمہاری سات بجے تک تو چھٹی ہوئی۔"

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

"اب سے رات کے گیارہ بجے تک کام کرنا پڑے گا۔ چھٹی کیا خاک ملے گی۔"

ٹٹی یکایک پھر رونے لگا اور مالتی کے پاس جانے کی ضد کرنے لگا۔ تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور پڑھنے لگا۔

یکایک مالتی کو یاد آیا کہ اس نے میرے آنے کا سبب تو پوچھا ہی نہیں۔ وہ بولی: "یہاں کیسے آنا ہوا؟" میں نے کہا۔ "اچھا، اب یاد آیا۔ تم سے ملنے آیا تھا۔"

"تو دو ایک دن تو رہو گے نا؟" "میں کل چلا جاؤں گا

ضروری جانا ہے۔" مالتی کچھ نہیں بولی۔ میں نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے دھیان آیا کہ میں آیا تو ہوں۔ مالتی سے ملنے پر اس سے بات کرنے کے بجائے نوٹ بک پڑھے جا رہا ہوں۔ لیکن بات بھی کیا کی جائے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس گھر پر جو ان دیکھا سایہ سا منڈلا رہا تھا، وہ سامنے آکر مجھے ڈرا رہا ہے۔ میں خوف زدہ سا ہو گیا جیسے یہ گھر اور مالتی خوف زدہ سے تھے۔ میں نے پوچھا "تم کچھ پڑھتی لکھتی نہیں ہو؟" اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا کہ شاید گھر کے کسی حصے میں کتابیں نظر آجائیں۔ "ہاں" کہہ کر مالتی ہنس دی اور کہنے لگی۔ "یہاں پڑھنے کو ہے ہی کیا۔" میں نے کہا "اچھا، میں واپس جا کر کچھ کتابیں بھیج دوں گا۔" پھر بات ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد مالتی نے پوچھا: "آئے کیسے ہو؟ لاری میں؟"

"پیدل!"

"اتنی دور، بڑی ہمت کی۔"

"آخر تم سے ملنے آیا ہوں۔"

"ایسے ہی آئے ہو؟"

"نہیں، قلی سامان لے کر پیچھے آرہا ہے۔ میں نے سوچا بستر لے ہی چلوں۔"

"اچھا کیا، یہاں تو۔۔۔" مالتی چپ ہو گئی۔ "اچھا اب تم آرام کرو۔ سفر سے آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔"

"نہیں، میں نہیں تھکا۔"

"رہنے بھی دو، تھکے نہیں۔"

"اور تم کیا کرو گی؟"

"میں برتن مانجھ لیتی ہوں۔ پانی آئے گا تو دھل جائیں گے۔"

میں نے کہا "واہ" کیوں کہ مجھے اور کچھ سوجھا نہیں۔

مالتی ٹٹی کو لے کر چلی گئی۔ میں لیٹ گیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے خیالات میں ضم ہوتی ہوئی برتن مانجھنے کی آواز ایک تال میں ڈھلنے لگی اور میں اونگھنے لگا۔ یکایک وہ لے ٹوٹ گئی اور خاموشی سی چھا گئی۔ میں اس خاموشی کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔

چار بج رہے تھے اور اس کی پہلی گھنٹی سن کر مالتی رک گئی تھی۔ وہی تین بجے والی بات میں نے پھر دیکھی میں نے سنا مالتی بالکل ایک ناتجربہ کار اور بہت زیادہ تھکے اور اکتائے ہوئے شخص کی طرح کہہ رہی تھی۔ "چار بج گئے۔"

نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو چھ بج رہے تھے۔ کسی کی آہٹ پا کر میں نے آنکھیں کھولیں مہیشور آگئے تھے اور ان کے ساتھ ہی بستر لیے ہوئے میرا قلی۔ میں موتھ دھونے کو پانی مانگنے ہی والا تھا کہ یاد آیا کہ پانی تو ہے ہی نہیں۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے مہیشور سے پوچھا: "آپ نے بڑی دیر کی؟" انہوں نے کہا "ہاں، آج گینگرین کا ایک بڑا آپریشن کرنا پڑا۔ ایک کر آیا ہوں اور دوسرے کو ایمبولینس میں بڑے اسپتال بھجوا دیا ہے۔ گینگرین کیسے ہو گیا؟"

"ایک بڑا سا کانٹا چبھ گیا تھا، اسی سے ہو گیا۔ بڑے لاپرواہ ہوتے ہیں یہاں کے لوگ۔ یہاں اس کے کیس اچھے ملتے ہیں۔ آمدنی کے لحاظ سے نہیں ڈاکٹری کے لحاظ سے۔ ہاں ملتے ہی رہتے ہیں گینگرین کے ایک دو کیس۔ دوسرے تیسرے روز آتے ہی رہتے ہیں۔ مالتی جو یہ سب کچھ آنگن سے سن رہی تھی، بولی: "ہاں کیس بنانے میں کیا دیر لگتی ہے۔ کانٹا چبھا اس پر کاٹ چھانٹ کی، بن گیا کیس۔ یہ بھی کوئی ڈاکٹری ہے۔ ہر دوسرے تیسرے روز کسی کا ہاتھ کسی کی ٹانگ کاٹ آتے ہیں۔"

"اسی کا نام ہے پریکٹس۔" مہیشور ہنستے ہوئے بولے "نہ کاٹیں تو اس کی جان جائے۔"

"ہاں، پہلے تو دنیا میں کانٹے ہوتے ہی نہیں ہوں گے۔ آج تک تو سنا نہیں کہ کانٹے چبھنے سے مر جاتے ہوں گے۔"

مہیشور نے جواب نہیں دیا، بس مسکرا دیے۔

مالتی میری طرف متوجہ ہو کر "ایسے ہی ہوتے ہیں ڈاکٹر سرکاری اسپتالوں میں۔ کیا پروا ہے اگر کوئی مر جائے۔ میں تو روز ہی ایسی باتیں سنتی ہوں۔ پہلے تو رات بھر نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔"

تب ہی نل نے ٹپ ٹپ پانی ٹپکانا شروع کیا مالتی نے کہا "پانی" اور اٹھ کر چلی گئی۔ کھنکھناہٹ سے ہم نے جانا کہ برتن دھل رہے ہیں۔ ٹٹی مہیشور کی ٹانگیں پکڑے کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک اسے چھوڑ کر مالتی کی طرف چل دیا۔ مہیشور نے اسے منع کیا "ادھر مت جا" اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ ٹٹی مچلنے لگا۔ اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "اب رو رو کر سو جائے گا تب ہی گھر میں چین ہو گا۔" مہیشور بولے۔ "اندر مچھر بہت ہوتے ہیں، لیکن یہ لوہے کے بھاری پلنگ اٹھا کر باہر کون لے جائے۔ اب کے نیچے جائیں گے تو چارپائیاں لے آئیں گے۔" پھر کچھ رک کر بولے۔ "آج تو باہر ہی سوئیں گے۔ آپ کے آنے کا اتنا فائدہ تو ہونا ہی چاہیے۔"

ٹٹی ابھی تک روئے جا رہا تھا۔ مہیشور نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور پلنگ باہر کھینچنے لگے۔ میں نے کہا۔ میں مدد کرتا ہوں اور دوسری طرف سے پلنگ پکڑوا کر باہر لگوا دیے۔

مالتی برتن دھو چکی تھی، جب وہ برتن اٹھا آنگن کی طرف چلی تو مہیشور نے کہا "تھوڑے سے آم لایا ہوں۔ وہ بھی دھو لینا۔"

"کہاں ہیں؟"

"انگیٹھی پر رکھے ہیں۔ کاغذ میں لپیٹے ہوئے

مالتی نے اندر جا کر آم اٹھا لیے اور اپنے آنچل میں ڈال لیے۔ جس کاغذ میں آم لپٹے ہوئے تھے۔ وہ کسی پرانے اخبار کا ٹکڑا تھا۔ مالتی شام کے دھندلکے میں اس کو پڑھتی جا رہی تھی۔ نل کے پاس جا کر وہ کھڑی اس کو پڑھتی رہی۔ جب دونوں طرف سے پڑھ چکی ایک لمبی سانس کھینچ کر اسے پھینک دیا اور آم

ہونے لگی۔ مجھے اچانک یاد آیا : بہت دنوں
ے کی بات تھی، جب ہم ابھی اسکول میں داخل
، ہوئے تھے، جب ہماری سب سے بڑی خوشی،
ب سے بڑی جیت تھی۔ کلاس میں حاضری ہو چکنے
بعد بھاگ جانا اور اسکول سے کچھ فاصلے پر آم
، باغیچوں میں آم توڑ توڑ کر کھانا۔ میں کلاس
ے بھاگ آتا تو مالتی بھی بھاگ آتی۔ مالتی پڑھتی
کل نہیں تھی، اس کے ماں باپ تنگ تھے —
یک دن مالتی کے باپ نے اُسے ایک کتاب لاکر دی
ور کہا۔ اس کے بیس صفحے روز یاد کیا کرو۔ ہفتہ بھر
یں کتاب ختم ہو جانی چاہیے، نہیں تو مار مار کر چمڑی
ادھیڑ دوں گا۔ مالتی نے چپ چاپ کتاب لے لی۔
لیکن اس نے پڑھی نہیں۔ پھاڑ کر پھینک دی بھلا
کھیل میں فرق کیسے آسکتا تھا۔ باپ نے پوچھا۔ کتاب
پڑھ لی۔ جواب صحیح نہ دینے پر خوب پٹائی ہوئی۔ یہ
الگ بات ہے۔ اس وقت میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہی
شوخ لڑکی کتنی سنجیدہ ہو گئی ہے۔ تب کتاب پھاڑ کر
پھینک دیتی تھی۔ آج اخبار کے ٹکڑے کو ترستی ہے۔

تبھی مہیشور نے پوچھا۔ "روٹی کب بنے گی؟"

"بس ابھی بناتی ہوں۔" اور اب کی بار مالتی
جب رسوئی کی طرف چلی تو ٹٹی ہاتھ بڑھا کر رونے
لگا۔ مالتی اُسے بھی گود میں لیے باورچی خانے میں
گھس گئی۔ رسوئی میں بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اُسے
تھپکنے اور دوسرے ہاتھ سے کام کرنے لگی اور
ہم دونوں چپ چاپ رات، کھانا اور نہ جانے
کس کس چیز کا انتظار کرنے لگے۔

ٹٹی سو گیا تھا۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ
ہو کر بستروں پر لیٹ چکے تھے۔ مالتی پلنگ کے
ایک طرف موم جامہ بچھا کر لیٹ گئی تھی۔ آپ تو بہت
تھک گئے ہوں گے۔ سو جائیے۔ میں نے مہیشور سے
کہا۔ تھکے تو آپ زیادہ ہوں گے وہ بولے۔ اٹھارہ
میل پیدل چل کر آئے ہیں۔ میں چپ رہا۔ تھوڑی
دیر میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ اونگھ رہے ہیں۔
تب ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ مالتی کھانا کھا رہی
تھی۔ میں نے مالتی کی طرف دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں
گم چپ چاپ کھانا کھا رہی تھی۔ میں نے
آسمان کی طرف دیکھا۔ پورنیما تھی۔ چاندنی سے
گھر روشن تھا۔ چمگادڑ ادھر اُدھر بھٹک رہے
تھے اور چاندنی میں بھی عجیب اُداسی سی تھی۔ آس
پاس کے پہاڑ درخت سب اُداس اور سنسان تھے۔

مہیشور اونگھ رہے تھے اور مالتی کھانے
سے نپٹ کر برتن دھو رہی تھی اور بڑبڑائے جا رہی
تھی۔ ابھی چھٹی ہوئی جاتی ہے اور میرے کہنے
پر کہ گیارہ بجنے والے ہیں، وہ سر ہلا کر بولی :
روز اتنے ہی بجتے ہیں۔ مالتی بول رہی تھی اور
وہ سب کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھی، جو میں لیٹے لیٹے
آس پاس کے ماحول میں محسوس کر رہا تھا۔

چاندنی میں سوتا بچہ کیسے لگتا ہے۔ یہ دیکھنے
کے لیے میں نے ٹٹی کی طرف نگاہ کی اور وہ اچانک
جیسے کوئی دھکا کھا کر گرے، کروٹ لے کر پلنگ
سے گر پڑا اور زور زور سے رونے لگا۔ مہیشور نے
چونک کر کہا کیا ہوا۔ میں جھپٹ کر اُسے اُٹھانے
کے لیے دوڑا۔ مالتی رسوئی سے باہر نکل آئی۔ میں
نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور مالتی کو دیتے ہوئے
کہا۔ چوٹ زور سے لگ گئی ہے بے چارے کے۔

" اس کے چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ روز
گر پڑتا ہے۔" سپاٹ لہجے میں مالتی نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے میں مبہوت سا ہو گیا۔" ماں
.... یہ تمہارے دل کو کیا ہو گیا ہے' جو تم اپنے
اکلوتے بچے کے گرنے سے ایسی سرد مہری سے ایسی
بات کہہ پائی ہو اور ابھی سارا جیون تمہارے
سامنے ہے۔ کہاں ہے ممتا۔ اور مجھے لگا سچ مچ
اس نے اندر سے سب کچھ نکال کر پھینک دیا ہے۔
اور اب اس ڈیک زدہ مکان میں کوئی بد روح
بھٹک رہی ہے۔" اتنی دیر میں پھر حالات معمول
پر تھے۔ مہیشور اونگھ رہے تھے۔ ٹٹی مالتی کے جسم
سے لپٹ کر چپ ہو چکا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا
کہ بستر آرام دہ ہے۔

تب ہی گیارہ کا گھنٹہ بجا۔ میں نے نیند سے بوجھل
پلکوں کو اٹھا کر مخصوص انتظار کے انداز میں مالتی
کی طرف دیکھا۔ گیارہ کی پہلی ٹن کے ساتھ مالتی
کی چھاتی کسی پھپھولے کی طرح اُبھری اور دھیرے
دھیرے بیٹھنے لگی اور ٹن ٹن ختم ہو جانے کے ساتھ
مبہوت ہو جانے والے لہجے میں اُس نے کہا۔" گیارہ
بج گئے۔" (ترجمہ : انجم عثمانی)

بقیہ : میتھلی شرن گپت

جنہیں وہ اگلے دن کھائیں گے۔ ایک دن میں نے
ہنسی میں پوچھا۔ "آپ باسی پوریاں کیوں کھاتے
ہیں" ددّا مسکراتے ہوئے بولے۔ "آپ سے سچی بات
بتائیں۔ باسی پوری کا نام سن کر خون میں گرمی دوڑ
جاتی ہے۔"

میں ہنسی میں شریک ہوا چاہتا تھا کہ ددّا
کرتے کی آستین چڑھاتے ہوئے بولے۔" دیکھیے دیکھیے
باسی پوری کا نام آیا اور جسم میں جیسے گرمی آگئی۔"

ددّا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ایت
نہیں، بھوشیت بھی ہوں آج تمہارا ——"

پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک ہندی شاعری
کی دنیا میں اُن کی بے تاج و تخت حکومت رہی —
فکر نو کو لے کر وہ نئی نسل کے لیے ایک چنوتی بن گئے۔
ہر نئے تخلیق کار کے لیے یہ سمجھنے کا مقام ہے کہ بغیر
روایت کو توڑے کوئی جدید کیسے ہو سکتا ہے۔ اس
کا نمونہ 'ہندو' سے لے کر 'یشودھرا' تک کے' اُن کی
شاعری کے سفر میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ وہ ایک
نئی مثال قائم کرتے ہیں کہ روایت سے کنارہ کشی اختیار
کیے بغیر' اسے اپنا کر بھی اس سے کیسے آزاد ہوا جا سکتا
ہے۔ (ترجمہ : مشرف عالم ذوقی)

ہیلی-بون کی بطخیں

ہیلی۔ بون نے بُہارنے کا برش پچھواڑے کے برآمدے کے جنگلے سے ٹیک کر رکھا اور پیٹھ سیدھی کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی تھکی تھکی آنکھیں پچھواڑے کی گیلی لال مٹی پر جمی جھلی سے کچھ صاف نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔ ویسے ہی ہیلی۔ بون کی آنکھوں پر بھی کچھ چھا گیا جس کے پیچھے آنگن کے چاروں طرف ترتیب سے سجے ہوئے جریئنیم پھولوں کے گملوں، دو رنگ دار بید کی کرسیوں اور رسّی پر ٹنگے ہوئے تین چار دُھلے ہوئے کپڑوں کا سایہ نہ کے برابر تھا۔ کوئی دوسرا غور سے دیکھتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اچانک اُس کے دل پر بھی نقاہت اور استغراق چھا گیا ہے جس سے اس کی حسیات کا ادراک تو جوں کا توں ہے لیکن اُس نقش کو دل تک پہنچانے اور دل کو متحرک کرنے والی نسوں میں رُکاوٹ آ گئی ہے۔

لیکن اچانک اُس چہرے کا چکنا بُجھا ہوا جذبہ پھر دُرا ہو کر تن آیا۔ حسّیں مستعد ہو گئیں۔ نظر اور شعور ایک جگہ مرکوز، رغبت توانا ــــ ہیلی۔ بون کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ برآمدے میں سے دوڑتی ہوئی آنگن پار کر کے ایک جانب بنے ہوئے ایک چھوٹے سے باڑے کے پاس پہنچی۔ وہاں اُس نے باڑے کا کواڑ کھولا اور پھر ٹھٹھک گئی۔ ایک اور ہلکی سی چیخ اُس کے منھ سے نکل رہی تھی۔ لیکن وہ بے صدا ہو کر ایک سسکی سی لمبی سانس بن کر رہ گئی

پچھواڑے سے ذرا اوپر کی طرف پہاڑی راستہ تھا۔ اُس پر چڑھتے ہوئے ایک شخص نے وہ انوکھی چیخ سُنی اور رُک گیا۔ مُڑ کر اُس نے ہیلی۔ بون کی طرف دیکھا۔ قدرے جھجکا، ہچکچایا اور پھر ذرا آگے بڑھ کر باڑے کے بیچ کے چھوٹے سے بانس کے پھاٹک کو ٹھیلتا ہوا اندر آیا اور منکسرانہ لہجے میں بولا "کھو۔ بلائی!"

ہیلی۔ بون چونکی۔ "کھو بلائی" کھاسیا زبان میں تسلیمات کے مترادف ہے، لیکن تلفظ غیر اہلِ زبان کا سا ہے۔ اور لہجہ غیر مانوس ـــــ یہ شخص کون ہے۔ تاہم کھاسیا قبیلے کی خوش خلقی و خود اعتمادی کے ساتھ فوراً سنبھل کر اور مسکرا کر اُس نے جواب دیا "کھو۔ بلائی!" اور پل بھر رُک کر پھر استفہامیہ لہجے میں کہا "آیئے! آیئے!"

نووارد نے پوچھا "میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ ابھی چلتے چلتے ــــ شاید کچھ ــــ"

"نہیں، وہ کچھ نہیں ــــ" کہتے کہتے ہیلی۔ بون کا چہرہ پھر اُداس ہو گیا۔ "خیر، آیئے، دیکھیے!"

باڑے میں ایک طرف آٹھ دس بطخیں تھیں وسط میں فرش خون سے سیاہ ہو رہا تھا اور آس پاس ڈھیر سارے پنکھ بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر جا بجا پنجوں اور ناخنوں کے نشان تھے۔

اجنبی نے کہا "لومڑی!"

"ہاں، یہ چوتھی بار ہے۔ اتنے برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، لیکن اب دوسرے تیسرے روز ایک آدھ بطخ ماری جاتی ہے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ میری بطخوں پر سارے منڈل کے لوگ رشک کرتے تھے۔ خود "سیم" کے پاس بھی ایسی بڑھیا بطخیں نہیں تھیں پر اب ــــ" ہیلی چُپ ہو گئی۔

اجنبی بھی تھوڑی دیر چُپ چاپ فرش کو اور بطخوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ایک بار ہیلی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ گویا کچھ سوچنے لگا ہو پھر جیسے کچھ طے کرتے ہوئے بولا "اگر آپ بے جا مداخلت نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں؟"

"فرمایئے!"

"میں یہاں چھٹی پر آیا ہوں اور کچھ روز نانگ تھلیم میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ شکار کا مجھے شوق ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس قزاق کی گھات میں بیٹھوں ــــ" پھر ہیلی کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر سرعت سے "نہیں، نہیں مجھے کوئی دقت نہیں ہو گی۔ میں تو ایسا موقع چاہتا ہوں۔ آپ کے پہاڑ بہت خوب صورت ہیں، لیکن لڑائی سے لوٹ کر آئے ہوئے فوجی کو چھٹی میں کچھ شغل تو چاہیے۔"

"آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"بنگلے میں۔ کل آیا تھا۔ پانچ چھ دن رہوں گا۔ سویرے سویرے گھومنے نکلا تھا اِدھر اُوپر جا رہا تھا

کہ آپ کی آواز سنی - آپ کا مکان بڑا صاف ستھرا اور
اور خوبصورت ہے ۔"
ہیلی نے ایک رُوکھی مسکان سے کہا ــــ
" ہاں، کوئی کچرا پھیلانے والا جو نہیں ہے ۔ میں
یہاں اکیلی رہتی ہوں۔"
اجنبی نے پھر ہیلی کو سر سے پاؤں تک
دیکھا ۔ ایک سوال اُس کے چہرے پر جھلکا ۔ مگر
ہیلی کے شائستہ اور دیرآشنا انداز سے اُسے
کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا ۔ اُس نے بات بدلتے
ہوئے کہا ۔ " تو آپ کی اجازت ہے نہ ؟ میں
رات کو بندوق لے کر آؤں گا ۔ ابھی ادھر آس
پاس دیکھ لوں کہ کیسی جگہ ہے اور کدھر سے کدھر
گولی چلائی جاسکتی ہے ؟"
" آپ آنا چاہیں تو شوق سے آیئے ۔
میں ادھر کو کھلنے والا کمرہ آپ کو دے سکتی ہوں۔"
کہہ کر اُس نے گھر کی طرف اشارہ کیا ۔
" نہیں، نہیں ۔ میں برآمدے میں بیٹھ
لوں گا ۔"
" یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟ " رات کو آندھی
بارش آتی ہے ۔ تبھی میں کچھ سُن نہ پائی تھی رات!
ویسے آپ چاہیں تو برآمدے میں آرام کرسی
بھی رکھوا دوں گی ۔ کمرے میں سب سامان ہے ۔"
ہیلی کمرے کی جانب بڑھی ۔ گویا کہہ رہی ہو
" دیکھ لیجیے ۔"
" آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں میں ؟ "
" ہیلی ۔ لون پرنا ۔ میرے پتا سی یم کے
دیوان تھے ۔"
" میرا نام دیال ہے ۔ کیپٹن دیال ۔ فوجی
انجنیئر ہوں ۔"
" بڑی خوشی ہوئی ۔ آیئے اندر بیٹھیں گے ؟"
" شکریہ ۔ ابھی نہیں ۔ آپ کی اجازت
ہو تو شام کو آؤں گا ۔ کھو بلائی ۔"
ہیلی لون کچھ ٹھٹھکتے ہوئے لہجے میں بولی ــــ
" کھو بلائی ۔" اور مُڑ کر برآمدے میں کھڑی ہوگئی ۔

کیپٹن باڑے میں سے گزرتے ہوئے راستے پر آگئے اور
اوپر چڑھنے لگے جدھر تازہ دھوپ میں چیڑ کی ہریالی
دور تک ہو رہی تھی اور بیچ بیچ میں بروس کے پھول
کے گچھے سرخ شگوفے کو گویا کہہ رہے ہوں پہاڑ
کا بھی دل ہے، جنگل کا بھی دل ہے ۔ ۔ ۔ ۔
دن میں پہاڑ کی ہریالی کالی نظر آتی ہے ۔
سرخی آگ کی لو جیسی ۔ لیکن سانجھ کی روشنی
میں گویا لال ہی پہلے کالا پڑ جاتا ہے ۔ ہیلی دیکھ رہی
تھی ۔ بروس کے شگوفوں کے اکا دُکا گچھے نہ
جانے کہاں تاریکی میں کھو گئے ہیں جب کہ چیڑ
کے درختوں کے سائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی ایک دوسرے
سے صاف طور پر الگ پہچانے جاسکتے ہیں ۔ کیوں
رنگ ہی پہلے بجھتا ہے ۔ پھول ہی پہلے اوجھل
ہوتے ہیں ۔ جب کہ اردگرد کا منظر نظر آتا رہتا ہے ۔
ہیلی کا دل اُداس ہوگیا ۔ وہ خود میں سمٹ
گئی ۔ سامنے کے ناگ تھلیم کا پہاڑی حُسن گویا
بھاپ بن کر اُڑ گیا ۔ چیڑ اور بروس چٹانیں قدیم
مردوں اور عورتوں کے کفڑے اور پڑے یادگاری کتبے
گھاس کے ٹیلوں جیسی لہریں دُور نیچے پہاڑی
ندی کی تانبے جیسی پتلی مخملی چادر میں ریشمی ڈورے
سی جھلکتی ہوئی پگڈنڈی ۔ سارا منظر محو ہو گیا ــــ
ہیلی کی کھلی آنکھیں اُس کے اپنے اندر دیکھنے لگیں جہاں
جذبے ہی حقیقت تھے اور ذاتی تجربے ہی تصویریں ۔ ۔ ۔
ہیلی کے والد مانڈلک اس چھوٹی سی
ریاست کے دیوان ہوا کرتے تھے ۔ ہیلی اُس کے
تین بچوں میں سے سب سے بڑی تھی اور اپنی
دوسری دو بہنوں کی نسبت زیادہ خوبصورت
تھی ۔ کھاسیوں کے قبائلی نظام میں عورت کا اہم
درجہ ہے ۔ سماجی اقتدار عورت کے ہاتھوں میں
ہے ۔ وہ انتظامیہ کی زیرنگیں نہیں، انتظامیہ کی مختار
ہوتی ہے ۔ ہیلی بھی گویا ناگ تھلیم کی مختار کل
تھی ۔ ناگ کریم کی رقص و سرود کی تقریب میں
جب سبھی منڈلیوں کے مرد اور عورتیں کھاسیا قبیلے
کے ادھی دیوتا ناگا دیوتا کو بلی (قربانی) دیتے تھے ۔

اور اُس کے لاہوتی نمائندے اپنے سویم کا اعزاز کرتے تھے ۔
تب ناچ منڈلی میں ہیلی ہی خاموش اتفاق رائے سے
سالار بن جاتی تھی اور عورتیں اُس کی پیروی کرتے ہوئے
جھومتی تھیں ۔ اِدھر اور اُدھر آگے اور پیچھے ۔ ۔ ۔ ۔
ناچ میں اعضا کی حرکت نہ تو بہت دھیمی ہوتی اور
نہ بہت تیز ۔ لیکن لرزش ہی سہی ۔ تھرکن ہی سہی ۔ وہ
تھی تو اس کے پیچھے سارا سمندر اس کے اعضا کی تھرکن
کے ساتھ لہریں لیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔
ایک پھیکی سی مسکان ہیلی کے چہرے پر دوڑ
گئی ۔ وہ کئی برس پہلے کی بات تھی ۔ اب وہ چونتیسواں
برس گزار رہی ہے ۔ اس کی دونوں بہنیں شادی کرکے
اپنے اپنے گھر میں رہتی ہیں ۔ باپ نہیں رہے
اور نسوانی اقتدار کے ضابطے کے مطابق اُس کی
ساری جائیداد سب سے چھوٹی بہن کو مل گئی ہے ۔
ہیلی کے پاس ہے یہی ایک کٹیا اور چھوٹا سا باغیچہ ۔
دیکھنے میں جدید ڈھنگ کا بنگلہ، لیکن اُس کا رخ اور
پردوں والی نمائشی مگر توجہ طلب عمارت دراصل
کیا ہے ؟ ٹین کی چادر سے چھوتا ہوا ٹین کا جو کھوکھا
سرکنڈوں کی چٹائی پر گارے کا پلستر اور چاروں
طرف ہرے نیم جو گملے میں لگا لو تو پھول ہیں، نہیں تو
صرف جنگلی بوٹی ۔ ۔ ۔ ۔
یہ کیسے ہوا کہ وہ ناگ کریم کی رانی آج اپنے
چونتیسویں برس اس کوٹھری کے ہرے نیم کے گملے سنسانی
گزار رہی ہے ۔ اپنی زندگی میں ہی نہیں اپنے سارے
گاؤں میں اکیلی ہے ؟
غرور ؟ عورت کا کیا غرور اور اگر غرور کرے
ہی تو سب سے چھوٹی کرے جو وارث ہوتی ہے ــــ
وہ تو سب سے بڑی تھی صرف ذمہ دار ۔ ہیلی کے ہونٹ
ایک طنزیہ ہنسی سے ٹیڑھے ہوگئے ۔ جنگ کی افراتفری
کے ان تین چار برسوں میں کتنے ہی ناشناسا چہرے
دیکھے تھے ۔ انوکھے رُوپ، زندہ دل، فرخندہ کھلے ہوئے
بے قرار مغرور ملتجی گناہوں میں ملوث، آئینہ کی طرح
شفاف صفت اور وہ جانتی تھی کہ اُن چہروں اور
لب و لہجے کے ساتھ گاؤں کی بہت سی عورتوں کے دُکھ

سُکھ، آسودگی اور بے چینی، خواہشات اور کلفتیں اور عسرتیں وابستہ ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ماحول میں ایک پرایا اور مجرمانہ تناؤ سا آگیا تھا ـــــ لیکن وہ اُن سے ماورا رہی ـــــ یہ نہیں کہ اس کے لیے اُسے کچھ جان مارنا پڑی تھی یا کہ اُسے غرور تھا۔ نہیں، یہ حقیقت جیسے کبھی لباسِ مجاز میں اس کے سامنے آئی ہی نہ تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ ہیلی خوب صورت ہے۔ مگر وہ عورت نہیں ہے۔ وہ بانبی (سانپ کا بل) کیا جس میں سانپ نہیں بستا؟ ہیلی کی آنکھوں کے سامنے اچانک اور بھی اندھیرا چھا گیا۔ نہیں اس سے آگے وہ نہیں سوچنا چاہتی! درد مر کر بھی درد سے الگ کچھ اور ہو جاتا ہے؟ بنا سانپ کے بانبی ـــــ یعنی فضول مٹی کا ڈھیر۔ حالاں کہ وہ یاد کرنا چاہتی تو یاد کرنے کو کچھ تھا۔ بہت کچھ تھا ـــــ پیار اُس نے پایا تھا اور اُس نے سوچا بھی تھا کہ ـــــ

نہیں کچھ نہیں سوچا تھا۔ جو پیار کرتا ہے جو پیار پاتا ہے وہ کیا کچھ سوچتا ہے؟ سوچ سب بعد کی بات ہے۔ جب سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

اور اب بطخیں پالی ہیں۔ اتنی بڑی، اتنی خوب صورت بطخیں کھاسیا پردیش میں اور نہیں ہیں۔ اُسے خاص فکر نہیں۔ لڑائی کے دنوں میں بطخوں کے انڈوں سے چار پانچ روپے روزانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے اور اس کا اپنا خرچ ہی کیا ہے۔ وہ اچھی ہے، سُکھی ہے، بے فکری ہے۔

لومڑی ـــــ لیکن وہ تو کچھ دن کی بات ہے۔ اُس کا انتظام کرنا ہی ہوگا۔ وہ فوجی افسر ضرور اُسے مار دیتا ـــــ نہیں تو کچھ دن بعد تھینگ کیمر کے اِدھر آنے پر اُسے کہے گی کہ تیر سے مار دے یا جال لگا دے ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی ظالم ہے لومڑی ـــــ کیا روز دو ایک بطخ کھا سکتی ہے ـــــ فضول کا نقصان ـــــ سبھی جانور ضرورت سے زیادہ گھیر لیتے اور ضائع کرتے ہیں۔

برآمدے کے کاٹھ کے فرش پر قدموں کی چاپ سُن کر اس کا دھیان ٹوٹا۔ کیپٹن دیال نے ایک چھوٹا سا بیگ نیچے رکھتے ہوئے کہا: "لیجیے، میں آگیا" اور کندھے سے بندوق اُتارنے لگا۔

"آپ کا کمرہ تیار ہے۔ کھانا کھائیں گے؟"

"شکریہ۔ نہیں۔ میں کھا کر آیا ہوں۔ رات کاٹنے کے لیے کچھ لے بھی آیا بیگ میں۔ میں ذرا موقع دیکھ لوں۔ ابھی آتا ہوں۔ آپ کو ناحق تکلیف دے رہا ہوں لیکن ـــــ"

ہیلی نے طنزاً ہنس کر کہا۔ "اس گھر میں نہ سہی، مگر کھاسیا گھروں میں اکثر فوجی افسر آتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو بالکل معلوم نہ ہو۔"

کیپٹن دیال کھسیا سے گئے، پھر دھیرے دھیرے بولے: "میدان والوں نے ہمیشہ پہاڑ والوں کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ سمجھ لیجیے پاتال باسی شیطان دیوتاؤں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"ہم لوگ مانتے ہیں کہ پرتھوی اور آکاش پہلے ایک تھے۔ دونوں کے جوڑنے والی رگ انسان نے کاٹ دی تب سے دونوں الگ ہیں اور پرتھوی کا گھاؤ نہیں بھرا۔"

"ٹھیک تو ہے۔"

کیپٹن دیال باڑے کی طرف چلے گئے۔ ہیلی نے اندر جا کر لیمپ جلایا اور برآمدے میں لا کر رکھ دیا۔ پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

رات میں دو ڈھائی بجے بندوق کی دھائیں سُن کر ہیلی جاگی اور اُس نے سُنا کہ برآمدے میں کیپٹن دیال کچھ کھڑ بڑ کر رہے ہیں۔ آوازوں سے ہی اُس نے جانا کہ وہ باہر نکل گئے ہیں اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آئے ہیں۔ تب وہ اُٹھی نہیں۔ لومڑی ضرور مر گئی ہوگی اور اُسے سویرے بھی دیکھا جا سکتا ہے یہ سوچ کر وہ پھر سو گئی۔

مگر لو پھٹتے نہ پھٹتے وہ پھر جاگی۔ کھاسیا دیش کے بنگلوں کی دیواریں دراصل صرف کاٹھ کے پردے ہی ہوتے ہیں، ہیلی نے محسوس کیا کہ کیپٹن دیال دوسرے کمرے میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

تب وہ جلدی سے اُٹھی۔ آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا اور منھ ہاتھ دھو کر باہر نکلی۔ پل بھر کے تذبذب کے بعد وہ بطخوں کے باڑے کو جانے کو ہی تھی کہ کیپٹن دیال نے باہر نکلتے ہوئے کہا: "گُڈ مارننگ مس پروا، شکار زخمی تو ہو گیا پر ملا نہیں۔ اب کھوج میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا کیسے پتہ چلا؟"

"خون کے نشانوں سے۔ زخم گہرا ہی ہوا ہے گھسٹ کر چلنے کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں ـــــ اب تک بچا نہیں ہوگا۔" دیکھنا یہی ہے کہ کتنی دُور گیا ہوگا۔"

"میں بھی چلوں گی۔ اُس ڈاکو کو دیکھوں تو ـــــ" کہہ کر ہیلی لپک کر ایک بڑی 'ڈھاؤ' اُٹھا لائی اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

خون کے نشان چیڑ کے جنگل کو چھوڑ کر ایک طرف مُڑ گئے، جدھر ڈھلوان تھی اور آگے جرنیت کی جھاڑیاں، جن کے پیچھے ایک چھوٹا سا جھرنا بہتا تھا۔ ہیلی نے اُس کا پانی کبھی دیکھا نہیں تھا صرف قل قل کی آواز ہی سُنی تھی۔ جرنیت کا جھرمٹ اُسے بالکل چھپائے ہوئے تھا۔ نشان جھرمٹ تک آ کر غائب ہو گئے تھے۔

کیپٹن دیال نے کہا، "اس کے اندر گھسنا پڑے گا آپ یہیں ٹھہریے۔"

"اُدھر اوپر سے شاید کھلی جگہ مل جائے ـــــ وہاں سے پانی کے ساتھ ساتھ بڑھا جا سکے گا۔" کہہ کر ہیلی بائیں کو مُڑی اور کیپٹن دیال ساتھ ہو لیے۔

واقعی کچھ اوپر جا کر جھاڑیاں کچھ کم گھنی ہو گئی تھیں اور ان میں سے گزرنے کا راستہ نکالا جا سکتا تھا۔ یہاں کیپٹن دیال آگے ہو لیے۔ اپنی بندوق سے جھاڑیوں کو اِدھر اُدھر دھکیلتے ہوئے رستہ بناتے چلے۔ پیچھے پیچھے ہیلی ہٹائی ہوئی لچکیلی شاخوں کو

ڈھاؤ سے روکتی ہوئی چلتی گئی تاکہ وہ سدِ راہ نہ بنیں۔

تھوڑا سا آگے چل کر جھرنے کا پاٹ چوڑا ہو گیا۔ دونوں طرف اونچے اور آگے کو جھکے ہوئے ٹیلے تھے جن کے اوپر جڑ نیت اور ہالی کی جھاڑی اتنی گھنی چھائی ہوئی تھی کہ اندر اندھیرا تھا۔ لیکن پاٹ چوڑا ہونے کی وجہ سے اس ڈھکی ہوئی جگہ کے بیچ ایک سرنگ بن گئی تھی جس میں آگے بڑھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی تھی۔

کیپٹن دیال نے کہا۔ "یہاں پھر خون کے نشان ہیں — شکار پانی میں سے ادھر گھسٹ کر آیا ہے۔"

ہیلی نے منھ اُٹھا کر ہوا کو سونگھا۔ گویا سیلن اور جڑ نیت کی تیز بُو کے علاوہ کسی اور بُو کی شناخت کر رہی ہو۔ بولی۔ "یہاں تو جانور کی۔"

اچانک کیپٹن دیال نے تیکھی تراری پھسپھسی آواز میں کہا۔ "دیکھو — شش — شش۔"

ٹھٹکتے ہی اُنہوں نے بازو اٹھا کر ہیلی کو جہاں کا تہاں روک دیا۔

اندھیرے میں کئی جوڑے انگارے سے چمک رہے تھے۔

ہیلی نے ساکت نظر سے دیکھا۔ ٹیلے کی مٹی کو کھود کر بنائی ہوئی کھوہ (غار) میں — بلکہ کھوہ کی ڈیوڑھی پر — لومڑ کا بے جان وجود ڈھیلا پڑا تھا۔ کاس گھاس کے پھول کی جھاڑی سی پونچھ اُس کی رانوں کو ڈھکے ہوئے تھی۔ جہاں کوئی گھاؤ ہوگا۔ اندر سست بے جان سی لومڑی اُس مُردہ جسم پر جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ جسم کے پاس منھ لے جاکر گویا اُسے چاٹنا چاہتی ہو۔ اور پھر رک جاتی ہو۔ لومڑی کے پیروں میں اُلجھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے کنمنا رہے تھے۔ اُس کنمنانے میں بھوک کی بے چینی نہیں تھی۔ نہ وہ بچے لومڑی کے پیٹ کے نیچے گھسڑ پسڑ کرتے ہوئے اُس کے تھنوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ماں اور بچوں کو خبر نہ تھی کہ غیر اور دشمن کی آنکھیں اُس خفیہ گھریلو منظر کو دیکھ رہی ہیں۔

کیپٹن دیال نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ بھی تو ڈاکو ہوگی۔"

ہیلی کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ اُنہوں نے پھر کہا۔ "اسے بھی مار دیں — تو بچے پالے جاسکیں....."

پھر بھی کوئی جواب نہ پاکر دیال نے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گئے۔

پیچھے ہیلی نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد کچھ فطری سادگی سے اُنہوں نے کہا! "عجیب عورت ہے!" پھر کچھ دیر وہ لومڑی اور بچوں کو دیکھتے رہے۔ تب "ہونہہ مجھے کیا" کہہ کر وہ بادلِ ناخواستہ مُڑے اور جدھر سے آئے تھے ادھر ہی چلنے لگے۔

ہیلی ننگے پاؤں آئی، لیکن لوٹتی بار اُس نے قدموں کی آواز نہ ہونے کے لیے کوئی احتیاط کی ہو۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ جھرمٹ سے باہر نکل کر وہ دیوانہ وار تیزی سے گھر کی طرف دوڑی اور وہاں پہنچ کر سیدھی باڑے میں گھس گئی۔ اُس کے طوفانی رویّے سے چونک کر بطخیں پہلے تو بکھر گئیں۔ لیکن وہ جب ایک کونے میں جاکر باڑے کے سہارے ٹھہر کر کھڑی پتھرائی آنکھوں سے اُنہیں دیکھنے لگی تو وہ گردنیں لمبی کر کے اُچکتی ہوئی سی اُس کے چاروں طرف جمع ہو گئیں اور قیں قیں کرنے لگیں۔

وہ مانوس بے چینی ہیلی کو چھو نہ سکی۔ جیسے شعور کے باہر سے پھسل کر گر گئی ہو۔ بے دلی سے بطخوں کو تکتی رہی۔

ایک ڈھیٹ بطخ نے گردن سے اُس کا ہاتھ ٹھیلا۔ ہیلی نے اُسی بے دلی سے ہاتھ کی طرف دیکھا یکایک اُس کا ہاتھ سخت ہو گیا۔ اُس کی مٹھی ڈھاؤ کے دستے پر بھینچ گئی۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے بطخ کا گلا پکڑ لیا۔ اور دیوار کے پاس کھینچ کر ڈھاؤ کے ایک جھٹکے سے کاٹ ڈالا۔ اُسی غیر مرئی فیصلے کے زیرِ اثر اس نے دوسری بطخ کا گلا پکڑا اور دانت بھینچ کر کہا — "بدنصیب!" اور اس کا سر اُڑا دیا۔ پھر تیسری، پھر چوتھی، پانچویں.... گیارہ مرتبہ ڈھاؤ اُٹھی اور 'کھٹ' کی آواز کے ساتھ باڑے کا کھمبا کانپا، پھر ایک بار ہیلی نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور باہر نکل گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر گویا اُس نے خود کو سنبھالنے کی خاطر کھمبے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور لڑکھڑاتی ہوئی اُسی کے سہارے بیٹھ گئی۔

کیپٹن دیال نے آکر دیکھا۔ کھمبے کے سہارے ایک بے حس و حرکت مورت بیٹھی ہے جس کے ہاتھ لت پت ہیں اور پیروں کے پاس خون سے رنگی ڈھاؤ پڑی ہے۔ اُنہوں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیا مس پروا؟" اور پھر جواب نہ پاکر پتھرائی آنکھوں میں سمٹی گہری مایوسی کا احساس کر کے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پھر دھیمے سے کہا۔ "کیا ہوا ہیلی؟"

ہیلی کندھا جھٹک کر پرے ہٹتی ہوئی اور تیکھے پن سے تھرّاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "دُور رہو ہتیارے!"

کیپٹن دیال نے کچھ کہنا چاہا، لیکن وہ بے زبان ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ اُنہوں نے دیکھا ہیلی کی آنکھوں میں سمٹا ہوا اتھاہ سونا پن گھنا ہو گیا جو پربت کا دائمی و لافانی حسن ہے۔ (ترجمہ: نریندر نشچل)

بقیہ: آزادی کی تلاش

تخلیقیت کا مرکزی نقطہ انسانی تشخص کی تلاش اور پرکھ ہے۔ اور اس محدود معنی میں اُسے آزادی کی تلاش بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ تلاش تخلیقی سطح پر ہمیشہ کام یاب یا بامعنی رہی ہو، ایسا نہیں ہے۔ اگینئے کے ناولوں اور کہانیوں کے حوالے سے ہم اس جانب پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

(ترجمہ: اختر الواسع)

جے دول

لیفٹیننٹ ساگر نے اپنا کیچڑ سے بھرا ہوا چمڑے کا دستانہ اُتار کر ٹرک کے دروازے پر پٹکتے ہوئے کہا۔ "گورُنگ، تم گاڑی کے ساتھ ٹھہرو۔ ہم کچھ بندوبست کرے گا"

گورُنگ نے سڑک سے جوتوں کی ایڑیاں چٹکا کر بولا۔ "ٹھیک ہے صاحب!"

شام ہو رہی تھی۔ تین دن موسلا دھار بارش کے باعث نوگانو میں رُکے رہنے کے بعد دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے آسمان صاف ہوا تو لیفٹیننٹ ساگر نے مزید دیر کرنا ٹھیک نہ سمجھا۔ ٹھیک کیا نہ سمجھا۔ آگے جانے کے لیے وہ اتنا بے قرار ہو رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کے انتباہ کو غیر ضروری احتیاط مان کر اور یہ سوچ کر کہ وہ کم از کم شِوساگر تو جا ہی رہے گا رات تک وہ چل پڑا تھا۔ جورہاٹ پہنچنے تک شام ہو گئی تھی۔ لیکن شِوساگر کے مندر دیکھنے کا اُسے اتنا شوق تھا کہ وہ رُکا نہیں جلدی ہی چائے پی کر چل پڑا۔ رات جورہاٹ میں رہے تو سویرے چل کر سیدھا ڈبرو گڑھ جانا ہوگا۔ رات شِوساگر میں رہ کر سویرے وہ مندر اور تالاب کو دیکھ سکے گا۔ شِوساگر، رُدر ساگر، جے ساگر کیسے خوبصورت نام ہیں۔ ساگر کہلاتے ہیں تو بڑے بڑے تالاب ہوں گے —— اور ہر ایک تالاب کے کنارے بنا ہوا مندر کتنا خوبصورت لگتا ہوگا۔ آسامی لوگ ہیں بھی بڑے صاف ستھرے۔ اُن کے گانو جب اتنے صاف ہوتے ہیں تو مندروں کا کیا کہنا —— شِودول، رُدردول، جے دول۔ —— ساگر تٹ کے مندر کو دول کہنا کیسا خوبصورت شاعرانہ تخیل ہے۔ واقعی جب تالاب کے پانی میں مت روہرا سے کپکپاتی چاندنی میں مندر کی دھندلی پرچھائیں ڈولتی ہوگی تو مندر واقعی خوبصورت ہنڈولے سا نظر آتا ہوگا۔۔۔۔ اس جوش و جذبے کے ساتھ وہ بڑھتا جا رہا تھا۔ تیس پینتیس میل کی مسافت کیا ہے۔ گھنٹے بھر کی بات ہے۔ لیکن تقریباً سات میل باقی تھے کہ گاڑی کچی سڑک کی کیچڑ میں پھنس گئی۔ پہلے تو اسٹیرنگ ایسا مکھن سا نرم چلا جیسے گاڑی نہیں ناؤ کی پتوار ہو۔ اور ناؤ بڑے سے بھنور میں ہچکولے کھاتی ہوئی گھوم رہی ہو۔ پھر لیفٹیننٹ کے سنبھالتے سنبھالتے گاڑی دھیمی ہو کر رُک گئی۔ اگرچہ گھومتے ہوئے پہیوں کے ذریعے کیچڑ اُچھالنے کی آواز آتی رہی۔

ایسے حالات کے لیے عام طور پر تیار ہو کر ہی ٹرک چلتے تھے۔ فوراً بیلچہ نکالا گیا۔ کیچڑ ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کیچڑ گہری اور پتلی تھی۔ یہ بیلچے کا نہیں، پمپ کا کام تھا۔ پھر ٹائروں پر لوہے کی زنجیریں چڑھائی گئیں۔ پہیے گھومے لیکن اُنہیں گرفت کے لیے کچھ ملے تو وہ چلیں۔ چلنے کی کوشش سے لیک گہری ہوتی گئی اور ٹرک دھنستا گیا۔ یہاں تک کہ نیچے کا گیئر بکس بھی کیچڑ میں ڈوبنے لگا۔ گویا یہ کافی نہ تھا۔ تبھی انجن نے دو چار بار پھٹ پھٹ پھٹ کی آواز بلند کی۔ اور چُپ ہو گیا۔ پھر اسٹارٹ ہی نہ ہوا۔

اندھیرے میں گورُنگ کا چہرہ دکھائی نہ دے رہا تھا اور لیفٹیننٹ نے دل ہی دل میں اطمینان محسوس کیا کہ گورُنگ کو اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا ہوگا۔ گورُنگ گورکھا تھا اور فوجی گورکھوں کی زبان احساسات کے لحاظ سے کم از کم گونگی ہوتی ہے، لیکن آنکھیں اور چہرے کی شکنیں ہر وقت گونگی نہیں ہوتیں۔ اور اس وقت اگر اُن میں لیفٹیننٹ صاحب کے جوشیلے اقدام کے لیے تمسخر کا شائبہ بھی نظر آیا تو دونوں میں خاموش معاندت کی دیوار کھڑی ہو جائے گی۔۔۔۔

تبھی ساگر نے دستانے پھینک کر کہا —— "ہم کچھ بندوبست کرے گا" اور بیچ بیچ کیچڑ میں جما جما کر بوٹ رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

کہنے کو تو کہہ دیا، مگر وہ رات میں کیا بندوبست کرے گا؟ بادل پھر گھرنے لگے۔

شِوساگر سات میل ہے تو دوسرے ساگر بھی تین چار میل تو ہوں گے اور کیا جانے کوئی بستی بھی ہوگی کہ نہیں اور جے ساگر تو بڑا ناہموار میدان کے بیچ میں ہے۔۔۔ اُس نے پڑھا تھا کہ اُس میدان کے بیچ میں ہی رانی جے متی کو سخت اذیت پہنچائی گئی تھی کہ وہ اپنے پتی کا پتہ بتا دے۔ پانچ لاکھ آدمی اُسے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے اور کئی

دنوں تک رانی کو عوام کے سامنے ستایا گیا تھا۔ اُس کی بے عزتی کی گئی تھی۔

ایک بات ہو سکتی ہے کہ پیدل ہی شو ساگر چلا جائے۔ لیکن اس کیچڑ میں بیچ بیچ سات میل! اسی میں صبح ہو جائے گی پھر فوراً گاڑی کے لیے واپس جانا پڑے گا... پھر نہیں، وہ بے کار ہے۔ دوسری صورت ..... رات گاڑی میں ہی سویا جا سکتا ہے۔ لیکن گرم رنگ؟ وہ بھوکا ہی ہو گا۔ کچی رسد تو ہو گی مگر پکائے گا کیسے؟ ساگر نے لوڈٹ کر ناشتہ کیا تھا۔ اس کے پاس بسکٹ وغیرہ بھی ہیں۔ مگر افسری کا بڑا قاعدہ ہے کہ اپنے ماتحت کو کم از کم کھانا تو ٹھیک کھلائے۔ شاید آس پاس کوئی گاؤں ہو.....

کیچڑ میں کچھ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیچڑ کتنی ہے اور اغل بغل کا میدان کتنا۔ پہلے تو دو چار پیڑ بھی کنارے کنارے تھے، مگر اب وہ بھی نہیں... دونوں طرف سپاٹ سُونا میدان تھا اور دُور کے پیڑ بھی ایسے دُھندلے ہو گئے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ وہ چشمے پر نمی ہی کی کرامات نہ ہوں..... اب راستہ جاننے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ یہاں کیچڑ کم گہری ہو وہی سڑک ہے۔ اِدھر اُدھر ہٹنے تو پنڈلیاں تک پانی میں ڈوب جاتی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ پاؤں سے ٹٹول کر وسط میں آجاتے تھے۔

یہ کیا ہے؟ پل سا ہے — یہ ریلنگ ہے۔ مگر دو پل ہیں۔ برابر کا زاویہ بناتے ہوئے۔

..... کیا دو راستے ہیں؟ کون سا راستہ پکڑیں؟

لگتا تھا ایک راستہ کچھ اونچی زمین کی جانب جاتا ہے۔ اونچائی پر کیچڑ کم ہو گی۔ اس بات کی کشش کافی ہے۔ پھر اونچائی پر سے شاید کچھ نظر بھی آجائے — ساگر اوپر کی جانب ہی چل پڑا... پُل کے پار ہی سڑک ایک اونچی اٹھی ہوئی پٹری سی بن گئی۔ ذرا آگے اُس میں کئی موڑ سے آئے۔ پھر جیسے مکعب کھیت میں کہیں کہیں کئی ایک چھوٹے چھوٹے کھیت ایک ساتھ ملنے پر اُن کی مینڈھ گویا ایک ساتھ ہی کئی جانب کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ پٹری بھی کئی جانب جاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ساگر گویا ایک نقطے پر کھڑا ہے۔ جہاں سے کئی جانب کئی راستے نکلتے ہیں۔ اور ہر ایک کے دونوں طرف پانی۔ گویا بیکراں سمندر میں پٹریاں بچھا دی گئی ہوں۔

ساگر نے ایک بار چاروں جانب نظر دوڑائی۔ صفر — اُس نے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بادلوں کی لکیر میں کچھ زیادہ گہری ایک لکیر سے نظر آئی..... بادل ایسا مستطیل نہیں ہو سکتا۔ نہیں، یہ عمارت ہے.... ساگر اس کی جانب بڑھنے لگا۔ روشنی نظر نہیں آتی۔ مگر شاید اندر کوئی ہو۔

لیکن جوں جوں وہ نزدیک پہنچتا گیا، اس کی اُمید ماند پڑتی گئی۔ وہ آسامی گھر نہیں ہو سکتا۔ اتنے بڑے گھر اب کہاں ہیں — دیگر یہاں جہاں بانس اور پھوس کے جھونپڑے ہی ہو سکتے ہیں اینٹ کے گھر نہیں — اور یہ کوئی بڑی عمارت ہے — کیا ہو سکتی ہے؟

گویا اُس کے سوال کے جواب میں ہی اچانک آسمان میں بادل کچھ پھیکا پڑ گیا اور اچانک دھندلا سا چاند بھی جھلکا۔ اس کی نہایت مدھم روشنی میں ساگر نے دیکھا۔ ایک بڑی سی، اوپر سے چپٹی سی عمارت۔ — جیسے وہ دو منزلہ بارہ دری.... برآمدے سے جس میں کئی ایک محرابیں تھیں، ایک کے بیچ سے گویا آسمان جھانک گیا...

ساگر ٹھٹھک کر لمحہ بھر اُسے دیکھتا رہا اچانک اُس کے اندر کچھ جاگا، جس نے عمارت کو پہچان لیا... یہ تو اہوم راجاؤں کی تفریح گاہ ہے..... کیا نام ہے؟ رنگ محل نہیں۔ ہوا محل نہیں۔ ٹھیک یاد نہیں آتا۔ مگر یہ اُس بڑے پھٹار کے کنارے پر ہے جس میں جے متی....

یکایک ہوا کی سنسناہٹ ہوئی۔ آس پاس کے پانی میں جہاں جہاں سرکنڈوں کے جھنڈ تھے جھک کر پھسپھسانے لگے۔ جیسے راجا کے آنے پر نوکر چاکروں میں کھلبلی دوڑ جائے..... یکایک یہ محسوس کرکے کہ چاند پھر اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ ساگر نے گھوم کر اندازہ لگانا چاہا کہ ٹرک کدھر، کتنی دور ہے۔ مگر وہ ابھی یہ طے بھی نہیں کر سکا تھا کہ اُفق کہاں ہے، جس کے نیچے بیٹھا رہے اور اوپر آسمان یا بدلی، کہ چاند چھپ گیا۔ اور اگر اس نے خاکہ خوب اچھی طرح پہچان نہ رکھا ہوتا تو رنگ محل یا ہوا محل بھی کھو جاتا.......

محل کی چھت ہو گی۔ وہاں خشکی ہو گی۔ وہاں آگ بھی جل سکتی ہے۔ شاید بستر لگا کر سویا بھی جا سکتا ہے۔ ٹرک سے تو یہی بہتر رہے گا۔ گاڑی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ساگر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔

رنگ محل بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی کرسی ہی اتنی اونچی تھی کہ آسامی گھر اس کی اوٹ میں چھپ جائے۔ پکے فرش پر پاؤں پڑتے ہی ساگر نے اندازہ لگایا۔ تیس پینتیس سیڑھیاں ہوں گی..... سیڑھیاں چڑھ کر وہ اصلی ڈیوڑھی تک پہنچے گا۔

اوپر چڑھ رہا تھا کہ ہوا تیز اُٹھی۔ بہت سی محرابوں نے اُس سے گویا غرا کر کہا۔ کون ہو تم اتنی رات گئے میری تنہائی میں مخل ہونے والے۔ احتجاج کی جھنکار کا تھپیڑا اس قدر حقیقی تھا کہ ساگر گویا ہچکچا اُٹھا۔ "میں... میں ساگر آسرا ڈھونڈتا ہوں.... رین بسیرا..."

پوپلے منہ والا بوڑھا جیسے کھکھیا کر ہنسے ویسے ہی ہوا ہنس اُٹھی۔ "ہی — ہی — ہی — کھی — کھی — کھی — یہ ہوا محل ہے، ہوا محل۔ اہوم راجا کی تفریح گاہ..... اہوم راجا جا جا تیا تے بے بہرہ۔ بوالہوس، حواس سے زندگی کی لتھڑی ہوئی بوٹی کے چھوں رسوں کو چوس کر اُسے جھنجھوڑ کر پھینک دینے والے بے رحم ناہنجار عیش پرست شیطان کا — یہاں آسرا — یہاں بسیرا — ہی، ہی، ہی — کھی.... کھی.. کھی...."

سیڑھیوں کی چوٹی سے محرابوں کے نیچے کھڑے

ساگر نے نیچے باہر کی طرف دیکھا۔ خلا — بے کراں خلا بادلوں سے، بادلوں میں رچی بسی نمی اور آگ کے سیلاب سے، رعد اور بجلی سے بھرپور خلا۔ کیا اُسی کی غراہٹ ہوا میں ہے یا نیچے پھیلے ہوئے چٹانی میدان جس کے کوہوں پر دن بھر سٹر سٹر پانی کے کوڑوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ اُسی بوچھار کا کوسنا، سسکنا، رُوں رُوں کرنا۔ اسی جگہ، اسی محراب کے نیچے کھڑے کبھی نیم برہنہ اہوم راجہ نے اپنے گٹھیلے جسم کو تکبر سے اکڑا کر سارس کی گردن کی طرح موڑ کر بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو کمربند میں اٹکا کر سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر اس نے ضرب صریح کے شکار راج کماروں کو دیکھا ہوگا جیسے کوئی سانڈ خصی بیلوں کے جھنڈ کو دیکھے پھر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کو اٹھا کر داہنے جھکے حصے کو ذرا سا تان کر استالے سے حکم دیا ہوگا کہ اذیت رسانی کو مزید سنگین ہونے دو۔

لیفٹیننٹ کی ٹانگیں گویا نڈھال ہوگئی تھیں۔

وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ پاؤں اس نے نیچے لٹکا دیئے۔ پیٹھ محراب کے نچلے حصے کے ساتھ ٹیک دی۔ اُس کا جسم تھک گیا تھا۔ دن بھر اسٹیرنگ پر بیٹھے بیٹھے اور پونے دو سو میل تک کیچڑ کی سڑک میں بنی لیکوں پر آنکھیں جمائے رہنے سے آنکھوں میں بھی جلن ہو رہی تھی۔ گویا اُن میں بہت باریک پسی ہوئی ریت ڈال دی گئی ہو — آنکھیں بند بھی کرنا چاہے اور آنکھیں بند کرنے میں تکلیف بھی ہو۔ وہ آنکھیں کھلی رکھ کر ہی کسی طرح نظارے کو سمیٹ لے یا بند کر کے دیکھتا رہ سکے تو.....

اہوم راجہ چولک فا..... راجہ میں ایشور کا عنصر ہوتا ہے۔ اہوم قبیلے کے توہم پرست لوگوں کا یہ عقیدہ فطری تھا کہ شاہی خاندان کا وہی بشر راجہ ہو سکتا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو جس کے جسم میں کوئی کمی ہو وہ دیوتا کا عنصر کیسے ہو سکتا ہے؟ دیوتائیت..... اور مضروب.....؟ نہیں..... خدائیت غیر مضروب ہی ہوتی ہے اور راجہ کا جسم ضرب صریح سے پاک.....

اہوم روایت کے مطابق قبیلہ کشتی کے پل کو پار کر کے ہی چولک فا نے بھی شاہی تخت ہتیایا تھا، لیکن اس خیال سے کہ وہ پل ہمیشہ کھلا نہ رہے اُس نے ایک نہایت ہی بہیمانہ طریقہ سوچا۔ چونکہ وہی راج کمار راجہ ہو سکتا تھا جس کے سبھی اعضا سلامت ہوں۔ تمام راج کمار جن کے اعضا صحیح سلامت تھے اس کے حریف ہو سکتے تھے اور قاتل بھی۔ اُن سے گلو خلاصی کا ایک ہی طریقہ تھا: سب کا ایک کان یا ایک انگلی کٹوا دی جائے۔ خون بھی نہ بہانا پڑے اور راستے کے روڑے بھی ہٹ جائیں۔ لاٹھی نہ ٹوٹے سانپ بھی مرے نہیں۔ لیکن اُس کے زہریلے دانت اُکھڑ جائیں۔ ضرب صریح کا شکار راج کمار جن کا کان یا انگلی کٹی ہوئی ہوگی، راجہ نہیں بن سکیں گے تب انہیں تخت ہتیانے کی طمع بھی نہیں ستائے گی۔

چولک فا نے سیناپتی کو بلا کر خفیہ حکم دیا کہ رات کو چُپ چاپ شاہی قبیلے کے ہر فرد کے کان (یا انگلی) کاٹ کر سویرے صبح دربار میں شاہی قدموں میں پیش کیے جائیں۔

اور صبح سویرے وہیں رنگ محل کی سیڑھیوں پر اُس کے قدموں میں یہ گھناؤنا تحفہ پیش کیا گیا ہوگا۔

..... اور اُس نے اسی متکبرانہ اور اہانت آمیز انداز سے ہونٹوں پر پارہ سی تیرتی ہوئی باریک لکیر کو ذرا مروڑ کر کہا ہوگا ہونہہ اور خون سے بھرے تھال کو پاؤں سے ذرا ٹھکرا دیا ہوگا۔

چولک فا — تخت چھن جانے کے خوف سے بے خطر راجہ............... لیکن نہیں وہ سال کا تختہ تیر کی طرح کیسے غائب ہوا۔ ایک راج کمار بھاگ گیا صحیح سلامت۔

لیفٹیننٹ ساگر گویا چولک فا کی چیخ کو صاف صاف سُن رہا ہو۔ صحیح سلامت! بھاگ گیا؟

وہیں سامنے — لیفٹیننٹ ساگر پھر آنکھیں گڑا کر بادلوں کی دراڑ کو چیرنے کی کوشش کی — وہیں سامنے کہیں ناگا پربت کا سلسلۂ کوہ ہے جنگلوں میں رہنے والے ناگا قبائلیوں کی اہوم راجاؤں سے کبھی نہیں بنی۔ وہ اپنے پربتوں کے ناگا راجا تھے۔ وہ اپنی ہموار سرزمین کا دو شالہ پہن کر بھی نیم برہنہ رہنے والے مہاراجہ۔ پشت در پشت جنگ جوئی کے بعد دونوں نے اپنی اپنی سرحدیں قائم کر لی تھیں اور کوئی کسی سے نہیں اُلجھتا تھا — صرف سرحد کے پاس نمک کی جھیلوں کے لیے لڑائی ہوتی تھی۔ کیوں کہ نمک کی دونوں کو ضرورت تھی، لیکن اہوم راجا کا مخالف سرکش، ناگا قبیلے کے سردار کے ہاں پناہ پائے یہ ناقابلِ برداشت ہے! ناقابل برداشت!

ہوا کی سائیں سائیں نے دہرایا۔ ناقابل برداشت۔

گویا چولک فا کے بے انتہا غیظ و غضب کی گہری سانس ساگر کے جسم کو چھو گئی — یہیں کھڑے ہو کر اُس نے وہ سانس لی ہوگی۔ اس محراب کے آس پاس ہی تو اُس کی سلگتی ہوئی سانسوں کے اثرات مدغم ہوں گے۔

لیکن وہ جائے گا کہاں! اُس کی بیوی تو ہے؟ اُس کو معلوم ہے اُس کا خاوند کہاں ہے۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے! جے متی، اہوم سلطنت کی لاثانی حسینہ — عوام کی ہر دل عزیز — تو کیا۔ چولک فا راجہ ہے۔ وہ دشمنوں سے گلو خلاصی پا کر بے خطر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ جے متی کو اپنے خاوند کا پتہ بتانا ہوگا۔ اُسے پکڑوانا ہوگا۔ چولک فا اُس کی جان لینا نہیں چاہتا۔ وہ اُس کا صرف ایک کان چاہتا ہے یا ایک چھنگلی — خواہ بائیں ہاتھ ہی کی ہو! جے متی کیوں نہیں بتائے گی؟ وہ رعایا ہے۔ رعایا کی بوٹی بوٹی پر بھی راجہ کا حق ہے۔

چاند نے جھلک دکھائی بس آنکھ جھپکنے تو — ساگر کو سامنے وسیع، بے ہیئت، بے رُخ، تکبر سے بے نیاز۔ وسعتِ محض دکھائی دی، جس میں سرکنڈوں کی سائیں سائیں، ہوا کی بے شمار چیخیں اور آہ و زاری۔ اُسے گھیرے ہوئے محرابوں کی غضب ناک سانسوں کی سی پھنکار..... چاند پھر اوجھل ہوگیا اور پانی کی

تازہ بوچھاڑ کے ساتھ ساگر نے آنکھیں بند کرلیں۔
لاتعداد سہمی ہوئی کراہیں اور ریاں کا وار ننگے کولہوں
پر سُدیا' علاقے کے لچک دار بیدوں کی تراق تڑاق
جیسا سُدیا یعنی شُودیا۔ کب کسی کا شُو (نعش) وہاں
ملتا تھا۔ یاد نہیں آتا۔ مگر تھا شُو ضرور ——
کس کا شُو۔

نہیں۔ جے متی کا نہیں۔ وہ تو —— وہ تو
پانچ لاکھ لاچار تماشائیوں کے سامنے ایک لکڑی
کے اسٹیج پر کھڑی ہے' اپنی ہی اچھوتی شرم و حیا
میں' ناقابلِ تسخیر خاموشی میں۔ صدق و وفا کی ناقابلِ
چاک ردا میں اور ناقابلِ مغلوب مدافعت میں۔
سات دن کی بھوکی پیاسی گھاس اور خون کے کیچڑ
سے لت پت۔ لیکن ششیش ناگ کے ماتھے میں ٹھنکی
ہوئی کیلوں کی طرح ساکت' آسمان سے ہم کنار
ہونے والی صبح کی شعلہ صفت کرن کی طرح غیر متزلزل۔
لیکن وہ کیا؟ ساگر مضطرب ہوگیا ——
گویا اندھیرے میں ناقابلِ شناخت لکیر کی طرح نظر آنے والی
لاکھوں کی بھیڑ بھی لرز کر ساکت ہوگئی —— جے متی
کے گلے سے ایک نہایت دردناک چیخ نکلی اور
بوجھل فضا کو چیر گئی۔ جس طرح کچھوے کے پانی
میں ڈھلے ہوئے پیٹ میں مچھیرے کی برچھی
...... ساگر نے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔
...... کیا جے متی ٹوٹ گئی۔ نہیں۔ یہ نہیں
ہوسکتا؟ سرکنڈوں کی طرح بغیر ریڑھ کے گر
پڑنے والی لاکھوں کی بھیڑ میں وہی تو دیوار
سی تنی کھڑی ہے۔ انسانیت کی لو! ریڑھ ...
یکایک اس کے پیچھے سے ایک ناپاک،
روکھی، توہین آمیز ہنسی نے کہا، جو پیتل کی جھنجھناہٹ
کے مشابہ تھی۔ "میں راجا ہوں"
ساگر نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ سنہرا
ریشمی لباس، ریشمی صافہ، سونے کی کنٹھی اور بڑے
بڑے ناتراشیدہ زمرد کی مالا پہننے کے باوجود نیم
برہنہ ایک شخص اس کی طرف پُر ترحم مگر توہین آمیز
نظروں سے یوں دیکھ رہا تھا جس طرح کوئی سر راہ
کیڑے مکوڑے کو دیکھے۔ اس کا سڈول جسم چکنی
سے تراشے چکنے سپٹے، غرور و تکبر سے پھولے ہوئے
نتھنے تیل سے چمک رہے تھے۔ آنکھوں کی سرخی
الگ اپنی بات کہتی تھی —— میں عمار کی غماز بھی
ہوسکتی ہوں، متکبر بھی عیش و عشرت میں محو بھی اور
محض خون ریزی کی سفاکانہ تشنگی سے سرشار بھی۔
ساگر ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ نہ اٹھ سکا نہ
ہل جل سکا۔ وہ شخص پھر بولا۔ "جے متی؟ ہوں،
جے متی؟" انگوٹھے اور سیری انگلی سے چٹکی
بنا کر اس نے جھٹک دی جس طرح کوئی ہاتھ کا
میل مسل کر پھینک دے۔ بغیر مطلب کے جملے کی بھی
اہمیت ہوتی ہے' کم از کم راجا کے جملے کی ....
ساگر نے کہنا چاہا "سنگ دل! سفاک!"
لیکن اس کی آنکھوں کی سرخی میں مجبور کرنے والی
پُراسرارتا تھی۔

ساگر نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے
ہوئے دیکھا۔ جے متی واقعی لڑکھڑا گئی تھی۔ بھنجھنے کے
بعد اس کا جسم ڈھیلا ہو کر لٹک گیا تھا۔ کوڑوں کی
بوچھار رک گئی تھی۔ عوام سانس روکے ہوئے سُن سے
تھے ....

ساگر نے بھی سانس روک لی۔ تب گویا
غیر متحرک حالت میں اسے زیادہ واضح نظر آنے لگا۔
جے متی کے سامنے ایک ننگ دھڑنگ بانکا کھڑا
تھا۔ سر پر کلغی۔ گلے میں لکڑی کی کھوپڑیوں کی
مالا۔ چہرے پر شیر کی دھاریوں کے مشابہ رنگ
کی لکیریں۔ کمر میں گھاس کی بٹائی کا لنگوٹ' ہاتھ
میں برچھی، اور وہ جے متی سے کچھ کہہ رہا تھا۔
ساگر کے پیچھے ایک متکبرانہ آواز پھر
سنائی دی۔ "چولک فا کے قانون میں دخل اندازی
کرنے والا یہ بے شرم ننگا آدمی کون ہے، لیکن
اچانک اس ننگے آدمی کی آواز سنائی دینے لگی۔
اور سب چپ ہوگئے ...
"جے متی، تمہاری ہمت قابلِ داد
ہے۔ عوام تمہیں دیوی سمجھتے ہیں، لیکن مزید
بے عزتی کیوں برداشت کرو۔ راجا کی طاقت بے
پایاں ہے —— کمار کا پتہ بتادو اور آزاد
ہوجاؤ۔"
اس بار رانی چیخی نہیں۔ نڈھال جسم
پھر ایک بار کراہ کر رہ گئی۔
ناگا بہادر پھر بولا "چولک فا صرف
اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ کمار کی جان نہیں' ایک کان دے
دینے میں کیا ہے؟ یا جھنگلی؟ یہ تو کسی کھیل کشتی
دنگل میں بھی تلف ہوسکتا ہے"۔
رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔
"چولک فا ڈرپوک ہے"۔
تاہم تم کمار کا پتہ بتا کر اپنی آبرو اور اپنے خاوند
کی زندگی بچا سکتی ہو۔"
ساگر نے پیچھے سے آتی ہوئی آواز سنی ——
"ہوں۔" اور مڑ کر دیکھا۔ اس شخص کے چہرے
پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔
ساگر نے نڈر ہو کر کہا۔ "ہوں! کیا؟"
وہ شخص تن کر کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر دیکھتا
رہا۔ گویا سوچ رہا ہو۔ اسے کیا جواب دے؟ پھر
ہونٹوں کو اور ٹیڑھا کر کے بولا۔ "میں چولک فا
ڈرپوک! ابھی معلوم ہوجائے گا۔ لیکن ابھی تو
میرے کام کی کہہ رہا ہے"۔
ناگا ویر جے متی کے اور قریب جا کر دھیرے
دھیرے کچھ کہنے لگا۔
چولک فا نے بھنویں سکوڑ کر کہا۔ "کیا
کھسپھسا رہا ہے؟"
ساگر نے آگے بڑھ کر سُن لیا۔
"جے متی، کمار تو اپنے دوست ناگا سردار کے
پاس صحیح سلامت ہے۔ چولک فا تو اسے پکڑ بھی
نہیں سکتا۔ تم پتہ بتا کر اپنی جان کیوں نہ بچالو؟
دیکھو تمہارا نازک بدن ...."
جوش میں ساگر کھڑا ہوگیا۔ کیوں کہ اس
نازک بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی تھی اور اس
نے تن کر ناگا ویر کی طرف بے رخی سے دیکھ کر کہا:

"بزدل! نامرد! — تم ناگا کیسے ہو؟ کمار تو امر ہیں۔ کیڑا چولک فا انہیں کیسے چھوئے گا۔ مگر کیا لوگ نہیں کہیں گے کہ کمار کی رانی جے متی نے جسمانی اذیت سے گھبرا کر اُس کا پتہ بتا دیا۔ ہٹ جاؤ، اپنا کالا چہرہ میری آنکھوں سے دُور کرو۔"

لوگوں میں زبردست خوف کی لہر دوڑ گئی۔ سرکنڈے زور زور سے کانپے، گدلے پانی میں ایک ہلچل ہوئی اور اُس کے لہراتے ہی دائرہ در دائرہ حلقے بنتے چلے گئے۔ ہوا پھنکاری۔ بڑی شدت کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ بادل اور سیاہ ہو گئے۔ یہ محض رات ہے۔ شبِ لامتناہ یا شبِ عذاب.... ساتویں رات یا لزیں رات؟ اور جے متی۔ کیا اب بول بھی سکتی ہے؟ کیا یہ اُس کے پختہ حوصلے کی شکست کی خاموشی ہے یا بلا کی کمزوری۔ یہ وہی بھیڑ ہے یا نئی بھیڑ۔ وہی ناگا ویریا کوئی اور کہ بھیڑ میں بہت سے ناگا بکھرے ہیں....

چولک فا نے کرخت آواز میں کہا۔ "پھر آیا وہ ناگا؟"

ناگا ویر نے پکارا۔ "جے متی! رانی جے متی!"

رانی ہلی ڈولی نہیں۔

ویر پھر مخاطب ہوا۔ "رانی! میں اُسی ناگا سردار کا ایلچی ہوں۔ جس کے ہاں کمار نے پناہ لی ہے۔ میری بات سُنو۔"

رانی کا بدن کانپ اُٹھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگی۔ کچھ بولی نہیں — بول نہیں سکی۔

"تم کمار کا پتہ بتا دو۔ سردار اُس کی حفاظت کریں گے۔ وہ محفوظ ہے۔"

رانی کی آنکھوں میں کچھ اندھیرا سا چھا گیا۔ بڑی تکلیف سے اُس نے کہا۔ "سچ" ایک بار اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کچھ اور کہنا چاہا مگر کہہ نہ پائی۔

چولک فا نے وہیں سے حکم دیا۔ "پانی دو اسے۔ بولنے دو۔"

کسی نے رانی کے ہونٹوں کی طرف پانی بڑھایا۔ وہ کچھ دیر آب خورے کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آنکھ بھر کر ناگا ویر کی جانب دیکھا۔ پھر ایک گھونٹ پی لیا۔ اُسی وقت چولک فا نے کہا۔ "بس ایک ایک گھونٹ زیادہ نہیں۔"

رانی نے ایک بار اپنی نظر چاروں طرف تمام لاکھوں کی بھیڑ پر دوڑائی۔

پھر آنکھیں ناگا ویر پر گاڑ کر بولی۔ "کمار محفوظ ہیں — اور کمار کی یہ کئی لاکھ رعایا — جو اُن کے لیے آنکھیں بچھائے ہوئے ہے۔ ایک قائد کے لیے جس کی قیادت میں وہ ایک ظالم کا تختہ اُلٹ دے۔ جو ایک آدرش چاہتی ہے۔ میں اُس کی اُمید توڑ دوں — اسے ہرا دوں۔ کمار کو ہرا دوں۔"

وہ پل بھر کو چپ ہوئی۔ چولک فا نے نظر دوڑا کر ساری بھیڑ کو دیکھ لیا۔ اُس کی نگاہ کہیں ٹکی نہیں — گویا اس بھیڑ میں اُس کو ٹکنے کے قابل کچھ نہیں ملا۔ جیسے رینگتے کیڑوں پر نگاہ نہیں جمتی۔

ناگا نے کہا۔ "رعایا تو چولک فا کی ہی ہے نا؟"

رانی نے پھر نظریں ٹکا کر اُسے دیکھا — پھر آہستہ آہستہ کہا۔ "چولک —" اور پھر کچھ ایسے احساس کے ساتھ جملہ ادھورا رہنے دیا کہ جیسے اُس کا نام لینے سے منھ ناپاک ہو جائے گا۔ پھر کہا۔ "یہ رعایا کمار کی ہے — جا کر ناگا سردار سے کہنا کہ کمار —" پھر وہ رُک گئی — پر تُو تو ناگا نہیں، تُو تو اُس گدھ کی رعیت ہے۔ جا اُس کے غلیظ پنجے کو چاٹ۔"

رانی کی آنکھیں چولک فا کی طرف مڑیں۔ لیکن اُس کی نظر نے اُسے چھوا نہیں۔ جیسے کسی بوسیدہ گلی سڑی شے کے دیکھنے میں بھی گھن آتی ہے....

ناگا نے مسکرا کر کہا۔ "کہاں ہے میرا راجا!" چولک فا نے وہیں سے پکار کر کہا۔ "میں یہ ہوں — اہوم سلطنت کا مطلق العنان حکمراں!"

ناگا نوجوان جھٹ پٹ اُس کے پاس چلا گیا۔

ساگر نے دیکھا بھیڑ کا رنگ بدل گیا ہے۔ ویسی ہی تیرگی، ویسی ہی بے پایاں وسعت، اُس میں جیسے کوئی ضبط ہو۔ بھیڑ میں جگہ جگہ ناگا تماشائی بکھرے، لیکن بکھرنے پر بھی ایک سلیقہ۔

ناگا نے پاس سے کہا۔ "میرے راجا!"

یکایک بڑے زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ ساگر اُٹھ کھڑا ہوا.... اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ناگا نوجوان اچانک برچھی کے سہارے بہت سی سیڑھیاں پھاند کر چولک فا کے پاس پہنچ گیا۔ برچھی سیڑھی کی دراڑ میں پھنسی رہ گئی۔ لیکن ناگا نوجوان چولک فا کو دھکے سے گرا کر اُس کی چھاتی پر سوار ہو گیا ہے۔ اُدھر عوام میں ایک بجلی کوند گئی ہے۔ "کمار کی جے!" کسی نے پھاند کر منچ پر چڑھ کر کوڑا لیے جلاد وں کو گرا دیا ہے۔ کسی نے اپنا کپڑا جے متی پر ڈالا ہے۔ کوئی اُس کے بندھن کی رسّی ٹٹول رہا ہے....

لیکن چولک فا اور ناگا — ساگر مسحور سا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں چولک فا پر جمی ہوئی تھیں.... اچانک اُس نے دیکھا کہ ناگا تو نہتا ہے۔ لیکن نیچے پڑے چولک فا کے ہاتھ میں ایک چمکدار ڈاؤ ہے جس کی دھار کی نشست وہ ناگا کے کان کے پیچھے ٹھیک کر رہا ہے۔ ناگا کو اس کا پتہ نہیں۔ لیکن چولک فا کی آنکھوں نے پہچان لیا ہے کہ ناگا کوئی دوسرا نہیں۔ راج کمار خود ہے اور وہ ڈاؤ جما رہا ہے۔

کمار چھاتی پر ہے لیکن مر جائے گا....

یا عیب دار بھی ہو گیا تو........ چولک فا ہی مر گیا تو بھی..... اگر کمار کا کوئی عضو جاتا رہا تو — ساگر اُچھلا۔ وہ چولک فا کا ہاتھ پکڑ کے ڈاؤ چھین لے گا۔ لیکن وہ غیر محتاط ڈھنگ سے اُچھلا تھا۔ اُس کا کیچڑ میں لت پت بوٹ سیڑھی پر پھسل گیا اور وہ

اگیئے

داروغہ امیچند

جس ضلع کی یہ بات ہے، اس کا نام میں بتا تو دیتا مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ پھر داروغہ کا نام بھی بتانا پڑے گا یا پھر آپ خود اندازہ لگا لیں گے اور ایک کہانی کے نام پر کسی کو تکلیف دینا مجھے اچھا بھی نہیں لگتا پھر چاہے کہانی سچی ہی کیوں نہ ہو، اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے جب ملک بھر کی جیلیں دوسری مرتبہ کھچا کھچ بھر رہی تھیں اور اے بی سی کلاسوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ پارٹیوں کے بلے لگا کر بھی بہت سے ناخوش شورش پسند سیاست کے نام پر ایک برادری میں شامل ہو کر اپنے دن گزار رہے تھے۔

کہنے کو کہہ لیجئے کہ وہ ہزارا کی جیل تھی، کیونکہ ہزارا کی جیل پنجاب کی شاید سب سے بڑی جیل تھی ـــــ سچ کو اگر چھپانا ہی ہو تو اسے صرف جھوٹ بول کر نہیں بلکہ بڑائی مار کر چھپانا زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں ہزارا جیل میں نیا نیا آیا تھا۔ تب تک بی کلاس لے کر لاہور کی جیل میں تنہائی کے، مگر پرسکون دن کاٹ رہا تھا۔ ایک دن تنہائی سے اکتا کر کچھ جھگڑا کر بیٹھا تو سی کلاس ہو گئی اور مجھے ہری پور ہزارا کی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میں نے سوچا چلو اگر آرام گیا تو تنہائی بھی دور ہو جائے گی، زندگی میں کچھ تبدیلی آئے گی۔ ہزارا کی جیل میں کچھ رنگینی تو ہوگی ـــــ کہیں کالے سیاہ رنگ ہوں گے تو کہیں لال اجلا نورنگی رنگ بھی تو ابھرے گا اور اس میں مجھے مایوسی بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ رنگینی کی تو مجھے صرف امید تھی مگر تاریکی کا کامل یقین تھا، کیونکہ ہزارا کے نئے داروغہ صاحب جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک نمبر کے ظالم مشہور تھے۔ اٹک جیل میں مارشل لا کے پرانے قیدیوں کے ساتھ انھوں نے جو جو زیادتیاں کی تھیں، انھیں پنجاب بھر کی جیلوں میں لوگ اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں کی وجہ سے داروغہ کا نام داروغہ امیچند اٹو الا ہو گیا تھا۔ حالانکہ ان کی بدولت اب وہ داروغہ سے بڑھ کر ڈپٹی صاحب ہو گئے تھے اور رائے صاحب کا خطاب بھی انہیں مل چکا تھا۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ برٹش امپائر کا آرڈر بھی انہیں جلدی ہی ملنے والا ہے۔ انہی داروغہ صاحب کی بدولت اٹک جیل کی دہشت پورے ملک میں پھیل گئی تھی جس کو بھی اٹک بھیجا جاتا تھا وہ سمجھ جاتا کہ اسے کالے پانی بھیجا جا رہا ہے اور جو سنتا تھا وہ فوراً سمجھ جاتا کہ جسے بھیجا گیا ہے وہ یا تو کوئی دبنگ اور خطرناک سیاسی قیدی ہے جس کی خودسری کو سرکار ہر قیمت پر کچلنا چاہتی ہے یا کوئی ایسا لاعلاج اخلاقی مجرم ہے جسے ہر طرح کی سزا دے کر جیل والے ہار مان چکے ہوں یعنی جو جیل کی زبان میں "خلیفہ" ہو چکا ہو۔ اٹک جیل کی جن بیرکوں میں خلیفہ کو رکھا جاتا تھا، ان کے بارے میں طرح طرح کی خوفناک باتیں مشہور تھیں۔ ان سے داروغہ امیچند کی دہشت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

داروغہ امیچند کی ایک اور بات بھی مشہور تھی۔ وہ یہ کہ ان کا چہرہ ایسا رعب دار ہے کہ معمولی قیدی تو ان کی شکل دیکھ کر ہی تھر تھر کانپ اٹھے اور اگر کہیں وہ کسی کی طرف ایک نظر دیکھ لیں تو بس اس کے اوسان خطا ہو جائیں۔

امیچند معمولی ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ درمیانہ قد، مگر اکڑ کر چلتے تھے، جسم کچھ بھاری مگر چال میں کچھ ایسی کاٹ اور پھرتی تھی کہ جب وہ پریڈ پر معائنہ کے لیے آتے تھے تو قیدی خود بخود آدھا قدم پیچھے ہٹ جاتے۔

امیچند تھے تو ذات کے کھتری مگر اپنی گھنی مونچھوں کو ایسا تاؤ دیے رکھتے تھے کہ ٹھاکر اپنا ٹھاکر پن بھول جائے۔ موم لگا کر مونچھ کی نوک کچھ ایسی تیکھی رکھتے تھے گویا تارکشی کا کام کرنے والے کسی اچھے کاریگر نے لوہے کے تاروں کے لچھے بٹ کر ان کی نوک بنا دی ہو۔ یہ مشہور تھا کہ داروغہ اپنی مونچھوں کو بل دیے رہتے ہیں اور تب تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک مونچھوں کی نوک نیبو کے آر پار نہ ہو جائے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی جلاد کسی کو پھانسی پر چڑھا کر یہ اطمینان کر رہا ہو کہ وہ اچھی طرح جمی ہے یا نہیں بلکہ لوگ تو کہتے بھی تھے "داروغہ امیچند؟ وہ تو بالکل جلاد ہے .... اس کی مونچھیں نہیں دیکھیں تم نے"؟

قصہ مختصر، میں جب ہری پور پہنچا تو داروغہ امیچند وہاں نئے نئے تعینات ہوئے تھے۔ ان دنوں ہزارا جیل میں بہت سے اکالی قیدی تھے۔ بہت دنوں سے جیل والوں کے ساتھ ان کی کشمکش چل رہی تھی اور سب یہ بھی جانتے تھے کہ ان کو ٹھیک کرنے کے لیے ہی اٹک کے جلاد کو وہاں بھیجا گیا ہے اور اس چیلنج کو اکالیوں نے فوراً منظور بھی کر لیا کیونکہ جیل میں اکتاہٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی یہی ایک ترکیب ہے پھر اکالی تو اکالی ٹھہرے۔

حالانکہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ اکالی جب کھانا کھانے

بیٹھے تو کسی ایک قیدی کی دال کے نوالے میں کنکر نکل آیا۔ ویسے تو دال میں کنکر نکلنا ایک عام بات ہے اور وہ بھی جیل کی دال میں۔ مگر وہاں تو بات کا بتنگڑ بننے کے لیے کوئی حیلہ بہانہ چاہیئے تھا۔ اکالیوں نے کھانا چھوڑ دیا اور کہا کہ اب تو وہ کھانا تبھی کھائیں گے جب داروغہ امیچند آکر معائنہ کر لیں گے کہ کھانا کتنا خراب ہے اور اب جبکہ جھگڑا شروع ہی ہو گیا ہے تو کون واجب اور غیر واجب کو پوچھے گا۔ لڑائی میں تو عام سیدھا سادا انسان بھی کچھ زیادہ ہی نامعقول ہو جاتا ہے ـــــ پھر واہے گرو کا خالصہ ـــــ غرض انھوں نے ایک لمبی فہرست بنائی کہ ان کی کیا کیا شکایتیں یا یوں کہہ لیجیے کہ کیا کیا مانگیں ہیں اور جب تک ان کی مانگیں پوری نہیں ہوں گی، وہ لوگ جیل کا ڈسپلن نہیں مانیں گے۔ ان کی مانگیں یہ تھیں۔ ہر قیدی کو آدھا آدھا سیر دودھ ملے، رات کو ان کی کوٹھریاں کھلی رہیں، ان سے محنت مشقت نہ کرائی جائے، انہیں دال کی بجائے گوشت ملے۔ غرض اس طرح ان کی چھوٹی بڑی قریب قریب بیس مانگوں کی فہرست تیار ہو گئی۔

ادھر داروغہ بھی اپنا لوہا منوانے کے درپے تھا۔ اس نے کہلوا دیا کہ قیدی قیدی ہی ہیں۔ انہیں کوئی فریاد کرنی ہو تو پریڈ کے دن کریں۔ ان کی دھونس میں کوئی نہیں آئے گا اور ڈسپلن نہ ماننے والے کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

بات بڑھتی ہی گئی۔ قیدیوں کو پے درپے سزائیں ملنے لگیں۔ آہستہ آہستہ معاملہ جیل سے باہر چلا گیا۔ صوبے بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ امیچند اٹک والا ہزارا کے قیدیوں سے جھگڑا مول لے رہا ہے اور اگر کہیں اس بات نے طول پکڑ لیا تو شاید لوگ اسے امیچند نہ کہہ کر ہزارے والا کہنے لگیں گے۔ مگر داروغہ امیچند خوش تھے۔ ان کا مختصر سا جسم چلتے وقت کچھ اور اکڑ جاتا، پتلون کی کریز کٹار کی دھار سے زیادہ تیز نظر آتی اور مونچھوں کا تاؤ تو ایسا کہ نیبو تو کیا اگر بلّور کی گولیاں بھی ہو تو آر پار ہو جائے۔

لیکن اس بات کے پھیلنے کے کچھ ایسے اثرات ہوئے جن کے لیے داروغہ تیار نہ تھے۔ صوبے بھر میں ان کا رعب اور دبدبہ تھا اور اسی وجہ سے انہیں انسپکٹر جنرل بھی جانتے تھے۔ خاص بات یہ کہ اسے آئے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا مگر وہ ابھی تک بھی قیدیوں کی بغاوت (وغیرہ) کو کچل نہیں سکے تھے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ اپنے کام میں ڈھیل دے رہے ہیں یا پھر معاملہ کچھ زیادہ سنگین ہے اور وہ بھی ہڑتال کا نہیں فساد کا ہے۔ انسپکٹر جنرل نے طے کیا کہ وہ معائنہ کے لیے خود آئیں گے۔ اس کی اطلاع جیل میں دے دی گئی۔

ہم لوگوں کو اس کی اطلاع فوراً نہ مل سکی بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ اس بات کو ہم سے پوشیدہ رکھنے کی بھی کوئی خاص وجہ تھی۔ داروغہ صاحب نے سوچا، اگرچہ معائنہ ایک مصیبت ہے لیکن ایک سنہرا موقع بھی۔ اگر آئی۔ جی کے آنے پر وہ یہ اطلاع دے سکیں کہ انھوں نے امن و امان قائم کر دیا ہے تو ان کی کامیابی دوگنی ہو جائے گی، نہ صرف یہ بلکہ آئی جی پر ان کا رعب بھی کافی پڑے گا ـــــ سامنے کی بات کچھ اور ہوتی ہے اور کسی ضلع سے آئی ہوئی رپورٹ کی بات کچھ اور ـــ مگر فساد ختم ہو تب ہی تو نہ! انھوں نے قیدیوں پر ظلم تو بہت کیے مگر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے گینڈے کی پیٹھ پر کوڑے مارے جا رہے ہوں۔ سو پڑیں یا ہزار سب برابر ہیں۔

اچانک اعلان ہوا کہ صبح پریڈ ہو گی اور ڈپٹی صاحب اکالیوں کے وارڈ میں جائیں گے۔ اکالی قیدی تیار ہو گئے کہ شاید کوئی نیا ظلم ہونے والا ہے۔

مگر پریڈ میں جا کر ڈپٹی صاحب نے کہا "تم لوگ جھگڑا کرنے سے ابھی تک تھکے نہیں؟ کیا فائدہ ہے اور.... ... جیل تو جیل ہے۔ یہاں تو قانون مان کر ہی رہنا پڑے گا ـــــ کیوں مصیبت اٹھاتے ہو؟ ان کی نگاہ پوری قطار سے گزرتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

جس پر نظر ٹھہری، اس نے جواب دیا "مصیبت تو ایسے بھی ہے، ویسے بھی۔ پھر کیوں نہ اکڑ کر رہا جائے؟"

ڈپٹی صاحب کی آنکھیں غصّے کو دبانے کی کوشش میں چھوٹی چھوٹی ہو گئیں مگر انھوں نے نرمی سے کہا "اچھا چلو تم لوگوں نے بہت دکھا دیا کہ تم اکالی ہو اور میں بھی اٹک والا داروغہ امیچند۔ اب کام کی بات کرو ـــ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟

دو تین قیدیوں نے کہا، ہماری مانگیں آپ کو معلوم ہیں، بس آپ انہیں پورا کر دیجیے۔

پوری شرطیں تو خدا کی بھی نہیں مانی جاتیں۔ تم لوگ آپس میں بات کر کے طے کر لو اور پانچ آدمیوں کا ڈیپوٹیشن میرے دفتر میں بھیج دو۔ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا۔

ڈپٹی صاحب چلے گئے۔ پریڈ برخواست ہو گئی... ان کی مونچھوں کا چمکدار سیاہ تناؤ اکالیوں کے دل میں سوئی کی مانند چبھتا رہا مگر انھوں نے پانچ پنچوں کو چن کر بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھانے کا کام انہیں سونپ دیا۔

مثل مشہور ہے "ایک خالصہ سوا لاکھ" پھر پانچ پنچوں میں اگر پچیس لوگوں کی رائے ہو جائے تو کیا حیرانی؟ کافی دیر تک بحث جاری رہی۔ کچھ کی رائے تھی کہ اب داروغہ راہ راست پر آ رہا ہے یعنی مانگوں میں، اور نئی مانگیں جوڑ کر جانا چاہیئے۔ کسی کا خیال تھا کہ نہیں، اگر سمجھوتہ کرنا چاہتے ہو تو کچھ رعایت تو ہونی ہی چاہیئے۔ غرض یہ کہ مختلف لوگوں کی مختلف رائے تھی اور پھر یہ سوال بھی تھا کہ رعایت ہو تو کس یا کن شرطوں پر؟ اس کے بارے میں اتفاق رائے نہ تھا۔

آخرکار ایک بزرگ نے کہا "بھائیو، میری بات مانو تو میں ایک صلاح دوں۔"

سب نے پوچھا، "کیا؟"

بولا "وہ یہ کہ ہم لوگ اپنی سب مانگیں واپس لے لیں، داروغہ سے کہیں کہ جاؤ ہم نے تمہیں معاف کیا جو صلح کرنے آئے اس سے بنیے کی طرح مول تول نہیں کرنا چاہیئے۔"

سب لوگ ایک دم بوڑھے سردار کی طرف دیکھنے لگے یعنی مہینے کی ساری محنت اور کوشش بیکار جائے گی! جتنی سزائیں بے عزتیاں انھوں نے برداشت کی تھیں یکبارگی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔ ایک نے کہا "آپ سے اس کی توقع نہ تھی۔"

بوڑھے نے پرسکون لہجے میں کہا "ہمیں اپنی طرف سے صرف ایک بات رکھنی چاہیئے۔"

"وہ کیا؟"

وہ یہ کہ ہمارا داروغہ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے مگر وہ ہم پر رعب ڈالنا چاہتا ہے۔ بس ایک بار وہ ہمارے سامنے اپنی مونچھیں نیچی کر لے، ہم اس کے سارے قاعدے و قانون مان لیں گے۔

بات بالکل غیر متوقع تھی۔ سب تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر کسی نے کہا "ہم کو تو یہ بات جچتی نہیں ـــ لڑائی کو بیچ میں نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ داروغہ کا کیا ہے، کل اگر وہ اپنی بات سے پھر جائے تو از سر نو تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی۔

بوڑھے نے کہا، "وہ بات تو شرطیں منوانے سے بھی ہو سکتی ہے۔ آج مان لے اور کل مُکر جائے تو بھوک ہڑتال شروع کر دی جائے۔

"مگر لڑائی کو بیچ میں چھوڑنا تو خالصہ کا کام نہیں۔"

مگر بیناہ میں آئے دشمن کو دبانا بھی تو ٹھیک نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ایک بار آزما کر تو دیکھو۔"

آخر کار بات مان لی گئی۔ پانچ کا بھی ڈیپوٹیشن نہیں گیا، صرف بوڑھے سردار کو اکیلا بھیجا گیا۔ دفتر میں جا کر اس نے کہا "ڈپٹی صاحب آپ صلح کرنا چاہتے ہیں تو ہم بھی راضی ہیں۔ ہم اپنی سب مانگیں واپس لیتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب نے کچھ حیرانی سے مگر اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا "کیا؟ ویسے ہونا یہی چاہیئے کہ جو کام لڑنے جھگڑنے سے نہیں ہوتا وہ دب کر رہنے سے ہو جاتا ہے۔ تم رائے صاحب امیچند کو نہیں جانتے؟ میں قانون وغیرہ کی پروا نہیں کرتا۔ میں چاہوں تو تمھاری بیرک میں پیپے کے پیپے گھی کے بھجوا دوں، چندن کے باغ لگوا دوں ـــــ ہاں، چندن کے باغ۔"

ہماری درخواست صرف اتنی ہے کہ ہمارے سامنے ایک بار اپنی مونچھیں نیچی کر لیں۔"

"کیا"؟ داروغہ صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ مگر سامنے شاید آئی. جی کے دورے کا پروگرام رکھا ہوا تھا۔ فوراً ہی سنبھل کر بولے۔ "تم جا سکتے ہو، تمھاری درخواست پر غور کروں گا۔"

دوسرے دن صبح سویرے پو پھٹنے کے بعد جب جمعدار تالے کھڑکا کر دیکھ کر "سب اچھا" کہہ کر ابھی گئے ہی تھے ـــــ بیرکوں کی کوٹھریوں کے دروازے ابھی کھلے نہیں تھے ـــــ داروغہ امیچند فوراً اکالیوں کے بیرک کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ داروغہ کے ساتھ کوئی عملہ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ چابیاں لیے ہوئے چیف ہیڈوارڈ بھی نہیں۔ پھاٹک پر کھڑے ہوتے ہی اکالیوں کے پنچ ان کے سامنے آگئے۔

داروغہ نے کہا "تم لوگوں کی درخواست پر ہم نے غور کر لیا ہے۔ بہرحال ہمیں تمہارے ساتھ رہنا ہے ـــــ نہ تم جیل چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو اور نہ ہم سروس چھوڑ کر جا رہے ہیں، پھر یہ کڑی والی کیا بات؟ آپس میں رسہ کشی تو چلتی ہی رہتی ہے۔ اس سے کوئی چھوٹا تو ہو نہیں جاتا؟ کبھی ہم نے دبا لیا، تم دب گئے، کبھی تم نے زور مارا تو ہم نے پینترا بدل لیا۔ کبھی ہم نے تمہاری گردن ناپ لی، کبھی تمہارے سامنے مونچھیں نیچی کر لیں ـــ یہ کہتے کہتے انھوں نے ہاتھ اٹھایا، انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے مونچھوں کی نوکیں دبائیں اور گالوں پر مسلتے ہوئے نیچے کی جانب موڑ دیا۔ اینٹھن کے بل تو ڈھیلا کیا سکتے، مگر وہ موم تو تھا، ہاتھ لگتے ہی مونچھوں کے دائیں بائیں دونوں جانب ایسے گچھے ہو گئے جیسے چھوٹی سی کالی چڑیا کیڑا مکوڑا پکڑنے کے لیے چونچ کو جھکائے ہوئے ہے۔ داروغہ نے کہا، لو ـــ اس سے کیا جاتا ہے؟ بس، اب ہماری صلح ہو گئی۔ میں ابھی جمعدار کو بھیج رہا ہوں تاکہ بیرک کھول دے ـــ"

یہ کہتے ہوئے وہ واپس چلے گئے۔ احاطے کے پھاٹک تک پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے اپنی مونچھیں پہلے جیسی حالت میں کر لی تھیں، ہونٹوں پر پھیلی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ مونچھوں کی اینٹھن اور تناؤ کو دوبالا کر رہی تھی۔ دل ہی دل میں داروغہ صاحب خود اپنی پیٹھ ٹھونک رہے تھے کہ کس خوبصورتی اور صفائی سے انھوں نے ساری بات ہنسی ہنسی میں ٹال دی ـــ شرط بھی پوری ہو گئی اور کچھ بگڑا بھی نہیں۔ اب تین دن بعد آئی جی آکر دیکھے گا کہ جیل میں بالکل امن و امان ہے اور رائے صاحب امیچند کے دبدبے کے مطابق سارے کام قاعدے اور مستعدی سے انجام پذیر ہو رہے ہیں۔ جب پریڈ ہو گی اور دوسرے قیدیوں کی طرح اکالی بھی قطار میں کھڑے ہوئے ہوں گے تو وہ ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے آئی جی سے کہے گا کہ اب ان لوگوں کا معاملہ بھی Settle ہو گیا ہے۔ یہ سب جیل کا ڈسپلن مان رہے ہیں ـــ تب وہ کتنی زبردست کامیابی کا لمحہ ہو گا!

ادھر اکالیوں کی بیرک میں کچھ قیدی بوڑھے سردار کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سوالیہ نگاہیں پوچھ رہی تھیں ـــ کیا یہی بات تھی، بس؟ اس میں کہاں تھا کسی کامیابی کا سکھ اور سمجھوتے کا سکون! داروغہ امیچند تو انہیں بیوقوف بنا کر چلا گیا ـــــ

کہانی تو اتنی ہی ہے لیکن بات اس سے آگے بھی ہے۔ داروغہ ابھی ڈیوڑھی تک نہیں پہنچے ہوں گے کہ اس سے کافی فاصلے پر ایک دوسری سیاسی بیرک میں بھی اطلاع مل گئی کہ داروغہ امیچند نے اکالیوں کے سامنے مونچھیں نیچی کر لیں۔ یہی نہیں بلکہ تالے کھلنے سے پہلے جیل کے ساڑھے چھ ہزار قیدیوں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ داروغہ امیچند اٹک والے نے اکالیوں کے سامنے مونچھیں نیچی کر لیں۔ دوسرے دن آئی جی کے دورے کا اعلان ہوا اور ریہرسل پریڈ ہوئی ـــــ رائے صاحب امیچند قطار میں کھڑے قیدیوں کا معائنہ کرتے ہوئے گزر رہے تھے کہ ایک قیدی نے ہاتھ اٹھا کر ناک کی دونوں طرف انگوٹھا اور انگلی جما کر آہستہ آہستہ ہونٹوں کے کناروں تک اس طرح کھینچا جیسے پسینہ خشک کر رہا ہو۔ اس کی اس حرکت پر قطار میں کھڑے ہوئے سب قیدیوں کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

رائے صاحب امیچند نے ایک دم تن کر خشک لہجے میں پوچھا، "کیا ہے؟" یہ وہ جملہ تھا جسے سن کر اٹک کے خلیفاؤں کی روح کانپ جاتی تھی۔ مگر یہاں کسی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک دوسرے قیدی نے بھی وہی حرکت کی۔ اس مرتبہ سب کی ہنسی مزید واضح انداز میں تھی۔

داروغہ صاحب کے چہرے پر کرختگی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ فوراً معائنہ ختم کر کے واپس چلے گئے۔

لیکن تیسرے دن آئی. جی آئے اور پریڈ کی بالکل سیدھی قطاروں کے سامنے سے گزرنے لگے تو کئی قیدیوں نے ایک ساتھ ناک کے آس پاس سے پسینہ صاف کیا۔ اس حرکت کے ساتھ ہی کئی قطاروں میں کھڑے قیدیوں کے چہرے کھل گئے۔

آئی. جی نے پوچھا "رائے صاحب امیچند کیا بات ہے ـــــ آپ کی جیل کا نظام تو بڑا ڈھیلا ہے ـــ"

رائے صاحب نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "سر اس معاملے پر دفتر میں Confidential ـــــ مجھے کچھ ـــــ اور خاموش ہو گئے۔

آئی جی نے کہا "ہوں"۔ اور غالباً یہ سوچتے ہوئے کہ رائے صاحب کے نظام کو درست کرنا چاہیئے۔ انھوں نے پھر کہا Of Course ٹھیک ہے۔ وہیں باتیں ختم ہو گئیں۔

آئی جی کے جانے کے ایک ہفتہ بعد داروغہ امیچند کے تبادلے کا آرڈر آگیا کیونکہ ہزارا جیل کا نظام بہت بگڑ رہا تھا۔ انہیں ملتان بھیج دیا گیا۔ لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے

(بقیہ صفحہ ۷۲ پر)

بَدلہ

اندھیرے ڈبّے میں جلدی جلدی سامان دھکیل کر، گود کے عابد کو کھڑکی کے اندر سیٹ پر پٹک، بڑی لڑکی زبیدہ کو پکڑ کر ثریا نے خود اندر گھس کر گاڑی کے چلنے کے ساتھ لمبی سانس لے کر پاک پروردگار کو یاد کیا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ڈبّے کے دوسرے کونے میں چادر اوڑھے ہوئے دو سائے بیٹھے تھے، وہ اپنے مسلمان بھائی نہیں، سکھ تھے۔ چلتی گاڑی میں اسٹیشن کی بتیوں سے رہ رہ کر جو روشنی جھلک پڑتی تھی، اُس میں اُسے لگا، اُن سکھوں کی ٹھہری ہوئی کھُلی کھُلی آنکھوں میں غیر انسانی کچھ ہے۔ اُن کی نگاہیں جیسے اُسے دیکھتی ہیں، مگر اُس کی کایا پر رُکتی نہیں، سیدھی چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کوئی تیز دھار دار کٹار سی شے ہے۔ جسے کوئی چھو نہیں سکتا۔ چھوئے گا تو کٹ جائے گا! روشنی اس کے لیے کافی نہیں تھی۔ لیکن ثریا نے گویا تخیل کی نظروں سے دیکھا کہ اُن آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑے ہیں، اور... اور... وہ ڈر سے کانپ گئی۔ لیکن گاڑی تیز چل رہی تھی۔ اب دوسرے ڈبّے میں جانا ناممکن تھا۔ کود پڑنا ایک چارہ ہوتا، لیکن اتنی تیز رفتار گاڑی سے بچّے لے کر کود نے سے کسی دوسرے مسافر کے ہاتھوں اُٹھا کر باہر پھینک دیا جانا کیا زیادہ بدتر ہوگا؟ یہ سوچتی اور اوپر جھولتی ہوئی خطرے کی زنجیر کے ہینڈل کو دیکھتی ہوئی وہ بے ارادہ سی بیٹھ گئی... آگے اسٹیشن پر دیکھا جائے گا..... ایک اسٹیشن تک تو کوئی خطرہ نہیں ہے — کم از کم ابھی تک کوئی واردات اس حصّے میں ہوئی نہیں۔

"آپ کہاں تک جائیں گی؟"

ثریا چونکی۔ بڑا سکھ پوچھ رہا تھا، کتنی بھاری اُس کی آواز تھی! جو شاید دو اسٹیشن بعد اُسے مار کر ٹرین سے باہر پھینک دے گا — وہ یہاں اُس سے 'آپ' کہہ کر مخاطب ہو رہا تھا، اس ستم ظریفی پر وہ سوچتی رہ گئی، اور جواب میں دیر ہوگئی۔ سکھ نے پھر پوچھا۔ "آپ کتنی دُور جائیں گی؟"

ثریا نے برقعہ چہرے سے ہٹا کر پیچھے کر رکھا تھا، ایک دم چہرے پر کھینچتے ہوئے بولی — "اٹاوے جا رہی ہوں۔"

سکھ نے لمحہ بھر سوچ کر کہا۔ "ساتھ کوئی نہیں ہے؟"

اس تھوڑے سے توقف کے پس منظر پر غور کرتے ہوئے ثریا نے سوچا: حساب لگا رہا ہے کہ کتنا وقت ملے گا مجھے مارنے کے لیے..... یارب! اگلے اسٹیشن پر کوئی اور سواریاں آجائیں..... اور ساتھ کوئی ضرور بتانا چاہیے۔ اس سے شاید یہ ڈرا رہے۔ اگرچہ آج کل کے زمانے میں سفر میں وہ ساتھی کیسا جو ڈبّے میں ساتھ نہ بیٹھے — کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہونے دے تو اگلے اسٹیشن تک بیٹھی رہنا کہ کوئی آکر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر پوچھے گا۔ "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

اُس نے کہا۔ "میرے بھائی ہیں۔ دوسرے ڈبّے میں۔"

عابد نے چمک کر کہا؟ "کہاں ماں؟ ماموں تو لاہور گئے ہوئے ہیں؟"

ثریا نے اُسے بڑی زور سے ڈپٹ کر کہا "چپ رہ!"

تھوڑی دیر بعد سکھ نے پھر پوچھا۔ "اٹاوے میں آپ کے اپنے لوگ ہیں؟"

"ہاں!"

سکھ کچھ چپ رہا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "آپ کے بھائی کو آپ کے ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا، آج کل کے حالات میں کوئی اپنوں سے الگ بیٹھتا ہے؟"

ثریا من ہی من سوچنے لگی کہ کہیں کم بخت تاڑ تو نہیں گیا کہ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے!

سکھ نے گویا اپنے آپ سے ہی کہا۔ "یہ مصیبت میں کسی کا کوئی نہیں ہے۔ سب اپنے ہی اپنے ہیں...."

گاڑی کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ چھوٹا اسٹیشن تھا۔ ثریا تذبذب میں تھی کہ اُترے یا بیٹھی رہے۔ دو آدمی ڈبّے میں اور چڑھ آئے — ثریا کے من نے فوراً کہا۔ "ہندو" اور تب سچ مچ وہ اور بھی

ڈر گئی اور تھیلی پوٹلی سمیٹنے لگی۔

سکھ نے کہا "آپ کہاں اُتریں گی؟"

"سوچتی ہوں بھائی کے پاس جا بیٹھوں۔"

کیسا جاندار ہے انسان بھی کہ ایسے موقعے پر بھی جھوٹ کی ٹٹی کی آڑ بنائے رکھتا ہے اور آڑ بھی کس قدر کمزور اور چھلنی چھلنی۔ کیوں کہ ڈبہ بدلوانے بھائی خود نہ آتا۔ آتا کہاں سے۔ ہو تب نا۔۔۔

سکھ نے کہا "آپ بیٹھی رہیے۔ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں اور یہ ہیں اپنے بچے۔۔۔ آپ کو علی گڑھ تک ٹھیک ٹھیک میں پہنچا دوں گا۔ اس سے آگے خطرہ بھی نہیں ہے۔ اور وہاں سے آپ کے بھائی بند بھی گاڑی میں آ ہی جائیں گے۔"

ایک ہندو نے کہا "سردار جی، جاتی ہے تو جانے دو نا، آپ کو کیا؟"

ثریا سوچ نہ پائی کہ سکھ کی بات کو، اور اس ہندو کی رائے زنی کو کس معنی میں لے۔ پر گاڑی نے چل کر فیصلہ کر دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔

ہندو نے پوچھا "سردار جی! آپ پنجاب سے آئے ہیں؟"

"جی۔"

"کہاں گھر ہے آپ کا؟"

"شیخوپورے میں تھا۔ اب یہیں سمجھ لیجیے۔"

"یہاں کیا مطلب؟"

"جہاں میں ہوں، وہیں گھر ہے۔ ریل کے ڈبے کا کونا۔"

ہندو نے آواز کو قدرے سنبھالتے ہوئے جیسے گلاس میں تھوڑی سی ہمدردی انڈیل کر سکھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تب تو آپ شرنارتھی ہیں۔"

سکھ نے گویا گلاس کو جی میں نہیں پیتا کہہ کر ٹھیلتے ہوئے ایک سوکھی ہنسی ہنس کر کہا جس کی دھیمی آواز ہندو مہاشے کے کان میں نہ پڑ سکے۔ "جی۔"

ہندو مہاشے نے ذرا اور دلچسپی کے ساتھ کہا "آپ کے گھر کے لوگوں پر تو بہت بڑی بیتی ہوگی۔۔۔"

سکھ کی آنکھوں میں ایک رفتنی لمحے کے لیے انگارہ چمک اٹھا۔ پر وہ اس دانے کو بھی جھگنے نہ بڑھا۔ چپ رہا۔ ہندو نے ثریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دلی میں کچھ لوگ بتاتے تھے، وہاں انہوں نے کیا کیا ظلم کیے ہیں ہندوؤں اور سکھوں پر۔ کیسی کیسی باتیں وہ بتاتے تھے۔ کیا بتاؤں۔ زبان پر لاتے شرم آتی ہے۔ عورت کو ننگا کر کے۔۔۔"

سکھ نے اپنے ساتھ پوٹلی بن کر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا "کاکا، تم اوپر چڑھ کر سو رہو۔ ظاہر ہے وہ سکھ کا لڑکا تھا اور جب اس نے باپ کی ہدایت پر اٹھ کر اپنے سولہ سترہ برس کے چھریرے بدن کو انگڑائی میں سیدھا کر کے اوپر کی برتھ کی طرف دیکھا تب اس کی بھی آنکھوں میں باپ کی آنکھوں کی سی کیفیت منعکس تھی۔ وہ اوپر والی برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ نیچے سکھ نے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ہندو مہاشے کی بات چیت بیچ میں رک گئی تھی، انہوں نے پھر شروع کی۔ "باپ بھائیوں کے سامنے ہی بیٹیوں بہنوں کو ننگا کر کے۔۔۔"

سکھ نے کہا "بابو صاحب، ہم نے جو دیکھا ہے وہ آپ ہمیں کیا بتائیں گے۔" اس بار وہ دھیمی آواز پہلے سے ہی واضح تھی، لیکن ہندو مہاشے نے اب بھی نہیں سنی۔ گویا شہ پا کر بولے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ ہم لوگ بھلا آپ کا دکھ کیسے سمجھ سکتے ہیں ہمدردی ہم کر سکتے ہیں، مگر ہمدردی بھی کیسی۔ جب درد کتنا بڑا ہے یہی نہ سمجھ پائیں۔ بھلا بتائیے ہم کیسے پوری طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ان سکھوں کے دلوں پر کیا بیتی ہوگی، جن کی آنکھوں کے سامنے ان کی بہو بیٹیوں کو۔۔۔"

سکھ نے سنبھلتے ہوئے کانپتے لہجے میں کہا۔ "بہو بیٹیاں سب کی ہوتی ہیں بابو صاحب!"

ہندو مہاشے قدرے سست و سرد پڑ گئے کہ سردار کی بات کا اصلی مقصد ان کی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ بولے "اب تو ہندو سکھ بھی سنبھلے ہیں۔ بدلہ لینا پڑا ہے۔ لیکن کہاں تک کوئی سہے گا؟ ادھر دلی میں تو انہوں نے ڈٹ کر مورچے لیے ہیں اور کہیں کہیں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی مثل سچ کر دکھائی ہے۔ سچ پوچھیے تو علاج ہی یہی ہے۔ سنا ہے قرول باغ میں کسی مسلمان ڈاکٹر کی لڑکی کو۔۔۔"

اب کی مرتبہ سکھ کی آواز میں دھیما پن نہ تھا ایک واضح اور بے لاگ رُوکھا پن تھا۔ بولا "بابو صاحب عورت کی بے عزتی سب کے لیے شرم کی بات ہے۔ اور بہن۔۔۔ یہاں سکھ ثریا سے مخاطب ہوا۔ "آپ سے میں معافی مانگتا ہوں کہ آپ کو یہ سننا پڑ رہا ہے۔"

ہندو مہاشے نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ "کیا، کیا، کیا؟ میں نے ان سے کچھ تھوڑے ہی کہا ہے؟" پھر گویا خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے اور ڈھٹائی سے کہا "یہ آپ کے ساتھ ہیں؟"

سکھ نے اور بھی رُکھائی سے کہا۔ "جی، علی گڑھ تک میں پہنچا رہا ہوں۔"

ثریا کے من میں کسی نے کہا "یہ بے چارا شریف آدمی علی گڑھ جا رہا ہے۔ علی گڑھ، علی گڑھ۔۔۔" اُس نے ہمت کر کے پوچھا "آپ علی گڑھ اُتریں گے؟"

"ہاں!"

"وہاں کوئی ہیں آپ کے؟"

"میرا وہاں کون ہے؟ لڑکا تو میرے ساتھ ہے۔"

"وہاں کیسے جا رہے ہیں؟ رہیں گے؟"

"نہیں، کل لوٹ آؤں گا۔"

"تو۔۔۔ تفریحاً جا رہے ہیں؟"

"تفریح" سکھ نے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ "تفریح!" پھر سنبھل کر "نہیں، ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔۔۔ ابھی سوچ رہے ہیں کہ کہاں جائیں؟ اور جب ٹھکانہ کچھ نہ رہے، تب چلتی گاڑی میں ہی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔۔۔"

ثریا کے من میں پھر کسی نے کچوکے لگائے۔ "علی گڑھ۔۔۔ علی گڑھ۔۔۔ بے چارا شریف ہے۔۔۔"

اُس نے کہا "علی گڑھ۔۔۔ اچھی جگہ نہیں ہے۔

آپ کیوں جاتے ہیں ؟"
ہندو مہاشے نے بھی کہا ۔" جیسے کسی پاگل پر ترس کھا رہے ہوں' بھلا پوچھیے . . . . "
"مجھے کیا اچھی اور کیا بُری !"
"پھر بھی . . . . آپ کو ڈر نہیں لگتا ۔ کوئی چھُرا ہی مار دے رات میں !"
سِکھ نے مسکرا کر کہا ۔" اسے کوئی سنجات سمجھ سکتا ہے' یہ کبھی آپ نے سوچا ہے ؟"
"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ؟"
" اور کیا ! مارے گا بھی کون ؟ یا مسلمان یا ہندو ۔ مسلمان مارے گا تو جہاں گھر کے اور سب لوگ گئے ہیں وہیں میں بھی جا ملوں گا اور اگر ہندو مارے گا تو سوچ لوں گا کہ یہی کسر باقی تھی ۔ دیش میں جو بیماری پھیلی ہے وہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ اور اب تندرستی کا راستہ شروع ہوگا ۔"
" مگر بھلا ہندو کیوں مارے گا ؟ ہندو لاکھ بُرا ہو' ایسا کام نہیں کرے گا ۔"
سردار کو یکایک غصّہ آگیا ۔ اُس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ۔" رہنے دیجیے ۔ بابو صاحب' ابھی آپ ہی جیسے چٹخارے لے لے کر دلّی کی باتیں سُنا رہے تھے ۔ اگر آپ کے پاس چھُرا ہوتا اور آپ کو اپنے لیے کوئی خطرہ نہ ہوتا تو' آپ کیا —— اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی سواریوں کو بخش دیتے ؟ انہیں یا میں بیچ میں پڑتا تو مجھے ؟" ہندو مہاشے کچھ بولنے کو ہوئے پر ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے انہیں روکتے ہوئے سردار کہتا گیا ۔" آپ آپ سُننا ہی چاہتے ہیں تو سُن لیجیے کان کھول کر ۔ مجھ سے آپ ہمدردی دکھاتے ہیں کہ میں آپ کا شکر گزار رہوں ہمدردی بڑی شے ہے ۔ میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا' اگر آپ ہمدردی دینے کے قابل ہوتے ۔ لیکن آپ میرا درد کیسے جان سکتے ہیں ۔ جب اُسی سانس میں دلّی کی باتیں ایسے بے درد ڈھنگ سے کرتے ہیں ؟ مجھ سے آپ ہمدردی کر سکتے ہوتے ۔ اُتنا دل پہلے ہوتا تو جو باتیں آپ سُنانا چاہتے ہیں' اُن سے شرم کے مارے آپ کی زبان بند ہو گئی ہوتی —— سر نیچا ہو گیا ہوتا ! عورت کی بے عزتی عورت کی بے عزتی ہے' وہ ہندو یا مسلمان کی نہیں' یہ انسان کی ماں کی بے عزتی ہے ۔ شیخو پورے میں ہمارے ساتھ جو ہوا سو ہوا ۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اُس کا بدلہ میں کبھی نہیں لے سکتا ۔ کیوں کہ اس کا بدلہ ہو ہی نہیں سکتا ! میں بدلہ دے سکتا ہوں اور وہ یہی کہ میرے ساتھ جو ہوا ہے' وہ اور کسی کے ساتھ نہ ہو ۔ اسی لیے دلّی اور علی گڑھ کے درمیان اِدھر اُدھر لوگوں کو پہنچاتا ہوں میں' میرے دن بھی کٹتے ہیں اور کچھ بدلہ چکا بھی پاتا ہوں اور اسی طرح اگر کوئی کسی دن مار دے گا تو بدلہ پورا ہو جائے گا ۔ چاہے مسلمان مارے' چاہے ہندو ! میرا مقصد تو اتنا ہے کہ چاہے ہندو ہو' چاہے سکھ ہو' چاہے مسلمان ہو' جو میں نے دیکھا ہے وہ کسی کو نہ دیکھنا پڑے اور مرنے سے پہلے میرے گھر کے لوگوں کی جو حالت ہوئی' وہ پرماتما نہ کرے کسی کی بہو بیٹیوں کو دیکھنی پڑے ۔"
اس کے بعد بہت دیر تک گاڑی میں سناٹا رہا ۔ علی گڑھ کے پہلے جب گاڑی دھیمی ہوئی تب شرتیلے نے بہت چاہا کہ سردار سے دو لفظ شکریے کے کہہ دے پر اُس کے منھ سے کبھی آواز نہیں نکلی ۔
سردار نے ہی آدھا اُٹھ کر اوپر والی برتھ کی جانب پُکارا ۔" کاکا اُٹھو علی گڑھ آگیا ہے ۔"
پھر ہندو مہاشے کی طرف دیکھ کر بولا ۔" بابو صاحب کچھ کڑی بات کہہ گیا ہوں تو معاف کرنا ۔ ہم لوگ تو آپ کی شرن میں ہیں ۔"
ہندو مہاشے کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہاں وہ سکھ اُتر نہ رہا ہوتا' تو وہ خود اُتر کر دوسرے ڈبّے میں جا بیٹھتے ۔
(ترجمہ: نریندر شیخل)

اگئے : یایا ور رہے گا یاد

نام کتاب: خود نوشت سوانح حیات نساخ
مصنفہ: عبدالغفور نساخ
مرتبہ: پروفیسر عبدالسبحان
ناشر: ایشیاٹک سوسائٹی، پارک اسٹریٹ، کلکتہ
قیمت: ساٹھ روپے

یہ نساخ کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہے۔ ابو محمد عبدالغفور خان خالدی نساخ کی شخصیت کئی حیثیات سے اتنی اہم ہے کہ تاریخِ ادبِ اردو کا کوئی مورخ ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ وہ شاعر تھے، مصنف تھے، نقاد تھے اور سب سے زیادہ بنگال اور مشرقی ہندوستان میں اردو کی ترقی اور ترویج میں ان کا بہت ہاتھ رہا۔ اردو کے مراکز — دلّی، لکھنؤ وغیرہ سے دور رہتے ہوئے زبان کی جو خدمت وہ کر گئے ہیں۔ اسے کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نساخ عید الفطر کے دن یکم شوال ۱۲۴۹ھ (۱۱/۱۲ جنوری ۱۸۳۴ء) کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد چندے تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے اور مختلف معمولی ملازمتوں میں وقت گزارا۔ بالآخر ۱۸۶۰ء میں اپنے حقیقی بڑے بھائی (نواب) عبداللطیف خاں کے اثر و رسوخ کی بدولت انگریزی حکومت کے ملازم ہو گئے۔ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ یہیں سے یکم فروری ۱۸۸۹ء کو سبکدوش ہوئے۔ بلکہ ایک شہادت سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ ملازمت سے الگ نہیں ہوئے تھے اور اسی دوران میں ان کا ۱۴ جون ۱۸۸۹ء کو کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ انہیں بہت کم عمری میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ آغاز میں چند غزلوں پر حافظ رشید النبی وحشت رامپوری سے اصلاح لی، جو اس زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے، لیکن جلد ہی انہیں کے استاد حافظ اکرام احمد ضیغم کا تلمذ اختیار کر لیا اور پھر آخر تک انہیں سے مشورہ کرتے رہے۔

ان کا بیشتر کلامِ نظم و نثر ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ اس میں اردو کے چار دیوان (دفترِ بے مثال، اشعارِ نساخ، ارمغان، ارمغانی) اور فارسی رباعیات کا مجموعہ (مرغوبِ دل) ہے۔ گنج تواریخ اور کنز التواریخ میں تاریخی قطعات ہیں۔ مختلف شعرائے اردو کے قطعات کا ایک مجموعہ ان کے مختصر حالات کے ساتھ "قطعۂ منتخب" کے عنوان سے شائع کیا تھا اور بھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار ہیں۔

ان کا بیشتر کلام لکھنوی رنگ سے متاثر ہے۔ اور یہ بنگال اور بہار کے شعرا کی عام خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ جب ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ، معزولی کے بعد، مٹیا برج، کلکتہ میں مقیم ہو گئے تو ان کے دربار کے بعض مشہور اساتذہ مثلاً برق وغیرہ بھی ان کے ساتھ کلکتہ چلے گئے۔ واجد علی شاہ شعر و سخن کے دلدادہ تو تھے ہی، ان کے ساتھ کلکتہ میں بھی ایک چھوٹا سا لکھنؤ قائم ہو گیا۔ آئے دن مشاعرے اور ہنگامے ہونے لگے۔ لامحالہ اس کا اثر ادبی حلقوں پر ہونا ہی چاہیے تھا — اس سے اس خطے میں لکھنویت کا رواج ہوا اور یہ یہاں کے شعرا کا مقبول رنگِ کلام ٹھہرا۔ چنانچہ نساخ نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اسی لیے ان کے پہلے دو دیوانوں (دفترِ بے مثال اور اشعارِ نساخ) میں خارجیت کا رنگ چوکھا ہے۔ بعد کو جب انہیں دلّی جانے اور وہاں کے ممتاز اساتذہ سے ملنے اور ان کے کلام سے مزاولت کا موقع ملا تو اس کے نتیجے میں ان کے لہجے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے آخری دو دیوان (ارمغان اور ارمغانی) دہلوی داخلیت سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

لیکن ان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ ان کا تذکرہ شعرائے اردو "سخنِ شعرا" ہے، جس میں (۲۴۴۶) شعرا اور (۳۸) شاعرات کا ذکر ہے۔ بنگال اور مشرقی اضلاع کے شعرا کے لیے یہ بہترین ماخذ ہے۔

ان کی دو کتابیں ان کی زندگی میں غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ اول تذکرۃ المعاصرین جس میں انہوں نے ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کے حالات قلم بند کیے تھے۔ دوسری کتاب یہی ان کی اپنی سوانح عمری ہے جس کا واحد قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔ اسے اب پروفیسر عبدالسبحان (شعبۂ زبان و ادبیاتِ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ) نے مرتب کر کے اپنے انگریزی مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

علمی دنیا کو اس مخطوطے کی ایشیاٹک سوسائٹی میں موجودگی کا علم تھا۔ اور اب تک جن اصحاب نے نساخ پر کام کیا ہے، ان میں سے بیشتر نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ مثلاً سید مغیث الحسن (نگار، لکھنؤ: شمارہ: مارچ، ۱۹۵۹ء) سید لطیف الرحمٰن ("نساخ سے وحشت تک" کلکتہ: ستمبر ۱۹۵۹ء) ڈاکٹر محمد صدر الحق (نگ ...

کراچی : ۱۹۷۹ء) سب نے اس قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے بلکہ آخر الذکر نے اپنی کتاب میں اس کے ابتدائی دو صفحوں کا عکس بھی شامل کیا ہے۔

کسی واحد خطی نسخے سے متن مرتب کرنا کتنا مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے، اسے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں، جنہیں کبھی اس طرح کا کام کرنے کا تجربہ ہوا ہو۔ خوش قسمتی سے خطی نسخہ نہ صرف خوش خط نستعلیق میں لکھا ہے بلکہ بہت اچھی حالت میں ہے اور اس کے پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مرتب (پروفیسر عبدالسبحان) نے اس کے متعدد صفحات کے عکس کتاب میں بطور نمونہ شامل کیے ہیں۔

مرتب کا خیال ہے کہ مخطوطہ خود نساخ کا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے کتاب میں نساخ کے ایک خط کا عکس بھی شائع کیا ہے۔ جو انہوں نے (نوابی دربار والے) نواب سید محمد کو لکھا تھا اور حسن اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ عبدالسبحان صاحب لکھتے ہیں کہ اس خط کی اور مخطوطے کی روش تحریر ایک ہے۔ موصوف کو غلط فہمی ہوئی۔ میرے خیال میں دونوں تحریروں کی روش کتابت اتنی مختلف ہے کہ یہ ایک ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ تقابلی مطالعہ سے مثالیں آسانی سے دی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ تبصرہ طویل ہو جائے گا۔ لہٰذا میں اس سے گریز کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ نساخ نے اپنے مسودے کو کسی اور کاتب سے مبیضہ کرایا تھا۔ یوں بھی مخطوطے میں کہیں کاٹ چھانٹ اور تبدیلی نہیں ملتی۔ کوئی مسودہ اتنا صاف اور مکمل اور درست نہیں ہو سکتا کہ مصنف کو اس میں کسی تبدیلی یا حذف و اضافہ کی ضرورت نہ پڑے۔

مخطوطہ ۱۸۸۶ء تک کے حالات کو محیط ہے۔ جیسا کہ لکھا گیا، نساخ کا جون ۱۸۸۹ء میں انتقال ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جہاں تک خود نوشت کا تعلق ہے یہ تقریباً مکمل ہے ــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نساخ کے جو حالات ہمیں پہلے سے معلوم ہیں ــــ اس خود نوشت سے ان پر بہت ہی کم اضافہ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سے ملازمت کے دوران میں جن مقامات پر وہ تعینات رہے، ان کا سلسلہ اور وہاں قیام کی میعاد کا ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یوں دیکھا جائے تو ان کی پوری سوانح عمری ان کی ملازمت ہی پر مشتمل ہے۔ اس کے سوائے اس میں کوئی اور اہم واقعہ ہے بھی نہیں۔ لیکن جو کچھ نساخ نے لکھا ہے وہ بھی عبارت آرائی اور مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً اپنی ابتدائی تعلیم سے متعلق لکھتے ہیں :

> مجھ کو سلہٹ کے پرگنہ کی طرف کے مولوی ازہر مرحوم[۵] پڑھاتے تھے اور خواہ مخواہ بغیر قصور کے مارتے تھے۔ ایک دن بے قصور انہوں نے مجھ کو مارا تو میں عم بزرگوار قاضی محمد صابر مرحوم جس مکان میں تھے، وہاں روتا ہوا چلا گیا اور وہاں ایک شمشیر ایرانی لٹکی تھی اس کو پکڑ کر رونے لگا اور آہستہ آہستہ سب کی نظر بچا کر اس کو کھولا۔ میرے استاد مجھ کو بلاتے تھے، میں جاتا نہیں تھا۔ آخر وہ بید لے کر مجھ کو مارنے کو آئے۔ میں نے جلد شمشیر کو میان سے نکال کر ان پر حملہ کیا۔ وہ بھاگے، یہاں تک کہ مکان کے دروازے سے سڑک پر نکل گئے اور میں شمشیر عریاں بکف دھاوا کرتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دو تین سو قدم تک گیا بعد ازاں پھر آیا۔ استاد صرف ایک لنگی پہنے ہوئے تھے اور ننگے پاؤں اور ننگے سر تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ اس روز کے بعد میں نے انہیں دیکھا نہیں۔ (ص ۶۵)

انہوں نے اس زمانے کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر دس برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ سوال یہ ہے کہ دس برس کا بچہ تلوار نیام سے نکالے اور پھر اسے ہاتھ میں لیے دو تین سو قدم تک کسی بھاگتے شخص کا تعاقب کرے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ دوسرا واقعہ ان کی زندگی کے آخری دور کا ہے!

نساخ مختلف اوقات میں چار مرتبہ دہلی گئے۔ پہلی مرتبہ رمضان ۱۲۸۴ھ (جنوری ۱۸۶۸ء) میں علاج کے لیے گئے تھے۔ رستے میں پٹنہ، الہ آباد، علی گڑھ میں مختصر قیام کرتے ہوئے وہ دہلی پہنچے۔ یہاں حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم محمود خان کا علاج رہا اور بفضلہ شفایاب ہو کر وہ واپس گئے۔ دہلی میں قیام کے دوران میں ان کی اس دور کے تقریباً سبھی علمی، ادبی اور دیگر مشاہیر سے ملاقاتیں رہیں۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :

> مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہو گے! میں نے کہا کہ ہاں۔ عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی "ابر گہر بار" کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے۔ اس پر اہل دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تھا تو وہ خفا ہو جاتے تھے۔
>
> (ص ۹۴)

یہ واقعہ ۱۲۸۴ھ میں عید کے دن پیش آیا۔ جنتری کے مطابق رمضان ۲۷ دسمبر ۱۸۶۷ء کو شروع ہوا اور عید الفطر یعنی یکم شوال یکشنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۶۸ء کو ہوئی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کلکتہ سے رمضان کی کون سی تاریخ کو روانہ ہوئے تھے۔ لیکن اس زمانے میں نقل و حرکت کے وسائل پر نظر رکھتے ہوئے بہت کم

---

۵ سید لطیف الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد صدر الحق دونوں نے ان استاد کا نام "ازبر علی" لکھا ہے۔ غالباً یہ ٹھیک نہیں ہے؛ ٹھیک نام "ازہر" ہی ہوگا۔

امکان ہے کہ وہ رستے میں مندرجہ صدر مقامات پر رُکنے کے بعد رمضان ختم ہونے سے پہلے دہلی پہنچے ہوں۔ اس صورت میں ان کی غالب سے یہ ملاقات عید الفطر ۱۲۸۴ھ کے دن نہیں ہوئی ہوگی۔ عید الاضحیہ اس سال ۹/۱۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو پڑی تھی۔ نساخ نے خود لکھا ہے کہ میں دہلی میں تین مہینے مقیم رہا۔ (ص: ۹۶) میرا قیاس ہے کہ ان کی غالب سے یہ ملاقات عید الاضحیہ کے دن ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانے میں یعنی وفات سے نو دس مہینے قبل مرزا غالب کی صحت اس قابل تھی اور وہ بھی خاص طور پر عید کے دن جب عام دنوں کی بہ نسبت عید ملنے کے لیے آنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی کہ وہ کسی شخص کو دو تین گھنٹے تک اپنے تین چار سو شعر سناتے رہے ہوں گے؟ اس کتاب کی اشاعت اس لحاظ سے اطمینان بخش اور قابل ستائش ہے کہ نساخ کی ایک اور کتاب منظر عام پر آگئی اور اس سے ان کی نثر کا ایک اور نمونہ بھی دستیاب ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں اس سے خود نساخ کی زندگی کے معلوم کوائف پر بہت کم اضافہ ہوتا ہے البتہ اس سے اس زمانے کی سوسائٹی لوگوں کی بود و باش اور سرگرمیوں، ان کے معتقدات و توہمات اور اخلاقی حالت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس عہد کی سماجی اور ثقافتی تاریخ لکھنا چاہے تو اسے اس کتاب سے خاص طور پر ان اضلاع سے متعلق بیش بہا و ثوق معلومات حاصل ہوں گی۔

لیکن مرتب کو اور زیادہ محنت کرنی چاہیے تھی۔ کتاب میں بلا مبالغہ سینکڑوں اشخاص کے نام آئے ہیں۔ انہوں نے کسی ایک کے حالات بھی نہیں بتائے کہ وہ کون تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی! ظاہر ہے کہ نساخ کی سماج میں جو پوزیشن تھی اور اپنے عہدے کے لحاظ سے وہ جن لوگوں سے ملتے جلتے رہے وہ خود خاصی اہمیت کے حامل رہے ہوں گے یقیناً ان میں سے بیشتر نے کسی نہ کسی میدان میں قابل ذکر آثار چھوڑے ہوں گے۔ یہ سب باتیں توجہ طلب تھیں۔

آخر میں ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ نساخ نے لکھا ہے کہ میں منگل کے دن عید الفطر ۱۲۴۹ھ کو پیدا ہوا (ص: ۳) مرتب نے اپنے انگریزی مقدمے میں اسے ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ء کے مطابق بتایا ہے یہ غلط ہے۔ یکم شوال ۱۲۴۹ھ مطابق تھی (۱۱) یا (۱۲) جنوری ۱۸۳۴ء کے؛ ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ء کہیں (۲۰) شوال ۱۲۴۹ھ کے مقابل تھی۔

مالک رام

نام کتاب: ہمارے عہد کا ادب مستقبل کے روبرو
مصنف: دیوندر اسر
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرس، ۶-جے، کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
قیمت: ۳۰ روپے

دیوندر اسر مشہور ادیب، افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہندی، اردو اور پنجابی میں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن انہیں افسانے اور تنقید کے ساتھ جدید علوم سے بھی بے حد دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے ادب کو علم و آگہی کی بدلتی ہوئی قدروں کے منظر نامے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے انہوں نے ادب اور نفسیات کے موضوع پر کتاب لکھی ہے جس میں ادب کے نفسیاتی محرکات شعور اور لاشعور کا بڑی تفصیل اور محنت سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور فرائڈ، یونگ اور دوسرے ماہرین نفسیات کے نظریات اور ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح اپنی دوسری کتاب 'فکر و ادب' میں انہوں نے ادب میں نئے رجحانات اور ان کے اثرات کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ ان کی نئی کتاب مستقبل کے روبرو' انسانیت کے سامنے پیش ایک نئے چیلنج کا احساس ہیں اور چونکہ انسانیت کے سامنے پیش آنے والے تمام چیلنج کسی نہ کسی طرح ادب کے لیے بھی چیلنج ہیں، اس لیے دیوندر اسر نے موجودہ اور مستقبل میں وجود میں آنے والی ایجادات اور ان کے اثرات کے تحت ادب اور ادیب کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر اس بات کا احساس دلایا ہے کہ ہمارا آج کا ادب مستقبل کا سامنا کیوں کر کر سکے گا جب بیشتر بنیادی تصورات ہی تبدیل ہو چکے ہوں گے۔

"مستقبل کے روبرو" اسر کے ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ادب اور انسان کے تصور سے لے کر بھیانک مستقبل یا تیسری لہر کا انتظار تک مختلف موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان سب میں ایک اندرونی رشتہ ہے جو ادب کو آنے والے دنوں اور تبدیلیوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے دیوندر اسر نے ایک مضمون میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ انسان کی نجات کے بغیر ادب کی نجات ممکن نہیں اور اسی تصور کے تحت انہوں نے مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ کمپیوٹر، روبوٹ اور اس طرح کی نئی ایجادات انسان کے سارے تصور کو تبدیل کر سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں شعر و ادب کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس مجموعے کے آخری پانچ مضامین میں انہوں نے ٹکنالوجی، سماجی تبدیلی اور بھیانک مستقبل سے متعلق بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹکنالوجی میں تبدیلیاں سماجی تبدیلیوں کی رفتار کو بھی تیز کر دیتی ہیں۔ اور انسان کے سماجی رشتوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب سماج تیزی سے ٹکنالوجی کی طرف بڑھ رہا ہے اور مشینی اشاروں سے بڑے بڑے کام لینے لگا ہے۔ اکیسویں صدی کے انسان کے سماجی اور جذباتی رشتے کیا ہوں گے اور وہ ان کا اظہار شعر و ادب میں کس طرح کرے گا؟ اس میں شک نہیں کہ مستقبل کے لیے یہ بہت اہم سوال ہیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کا استعمال کیوں کر کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا استعمال انسان اور انسانیت کی ترقی، بقا اور اس کو بہتر بنانے کے لیے ہے تو مستقبل آج ہی کی طرح خوب صورت ہوگا، لیکن اگر اس نے انسانیت

وہی تباہ کر دیا تو ادب اس تباہ ہونے والی چیزوں میں
ایک ہوگا جس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے صرف
اس خیال سے خوف زدہ ہونا بے کار ہے۔ وہ ممالک
جو ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس میں ہم سے بہت آگے
ہیں۔ وہاں بھی سوسائٹی میں مستقبل کے لیے کوئی خوف و
ہراس نہیں ہے۔

نام کتاب: مثنوی نگاری
مصنف: علی جواد زیدی
ملنے کا پتہ: ۹/۳ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ
قیمت: ۷۵ روپے

علی جواد زیدی صاحب اردو کے مشہور محقق و
نقاد ہیں۔ وہ اردو کے ان مصنفین میں ہیں جنہوں نے
بہت لکھا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا
ہے کہ اب تک ان کی ۳۲ سے زیادہ کتابیں شائع
ہو چکی ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کی بھی کیا، اسے بڑی محنت
اور ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ ان کا شمار اردو کے معتبر محققوں اور نقادوں
میں ہوتا ہے۔ ان کی بعض کتابیں اردو تحقیق میں
سنگ میل کی حیثیت ہیں۔ مثلاً قصیدہ نگاران
اتر پردیش، انیس کے سلام، مرثیہ نگاران دہلی وغیرہ۔
ان کی انہیں کتابوں کی طرح مثنوی نگاری بھی ان کا
اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس لیے کہ اردو میں اس
صنفِ سخن پر جو مواد انہوں نے جمع کر دیا ہے وہ آج
تک کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔

مثنوی اردو شاعری کی ایک اہم صنف
ہے۔ دکن سے لے کر شمالی ہند تک مثنوی کے اہم نمونے
پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک زمانے تک یہ صنفِ شاعری
اردو کی مقبول صنفِ شاعری میں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ
یہ شعری منظر سے ہٹ گئی۔ اس کا سبب بعض مخصوص
سماجی تبدیلیاں تھیں اور پھر جس طرح کے قصوں
کو مثنوی میں نظم کیا جاتا تھا، ان میں اب کشش
باقی نہیں رہ گئی تھی۔ دوسرے طویل منظومات کو پڑھنے
اور لطف لینے کا وقت بھی نہیں رہ گیا تھا۔ کہانیوں
یا واقعات کے بیان کرنے کے لیے نثر کا اسلوب زیادہ
مقبول ہو گیا۔ اس طرح مثنوی کی مقبولیت کم
ہو گئی اور اگر کچھ لوگوں نے مثنوی لکھی بھی تو ان کی
اس طرح پذیرائی نہیں ہوئی۔

علی جواد زیدی صاحب نے مثنوی نگاری
کو بڑی تحقیق و جستجو اور محنت کے ساتھ مرتب کیا
ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ
اس میں تقریباً ۹۳۶ شعرا کا ذکر ہے۔ اتنی بڑی
تعداد میں شعرا کے بارے میں معلومات فراہم کرنا
اُن کے کلام کی مثالیں منتخب کرنا اور ان کے کلام
کا تنقیدی جائزہ لینا، وہ خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ
ہو، بہت بڑا کام ہے۔ اس تذکرے کی ایک خوبی
یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے مثنوی نگار ایسے
ہیں، جن کا کوئی ذکر اس سے پہلے مثنوی پر لکھی جانے
والی کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ مثنوی نگاری
یوں تو تذکرہ ہے اور صرف اتر پردیش کے شعرا
تک محدود ہے، لیکن اسے صرف اس لیے تذکرہ کہہ
کر گزر جانا درست نہیں ہے کہ وہ تذکروں کے
انداز پر مرتب کی گئی ہے۔ اردو مثنوی کے سلسلے
میں اس کی دستاویزی اہمیت ہے اور اتر پردیش
کی حد تک یہ تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اتر پردیش میں مثنوی نگاری
کی کیا صورت رہی ہے اور ان چند ناموں کے
علاوہ جن کا بار بار ذکر ہوتا رہا ہے اور کتنے اہم
اور صاحبِ طرز مثنوی نگار گزرے ہیں۔ شروع
میں ۸۰ صفحات میں مثنوی کے ارتقاء، اس کی
زبان، اس کے فکری عناصر، خیال آرائی اور اس
کے معیارِ نقد سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مثنوی
نگاری کا یہ حصہ مثنوی کی تنقید اور علی جواد زیدی
صاحب کے نظریۂ تنقید کے سلسلے میں بے حد اہم ہے
اس حصے میں انہوں نے حالی کی مثنوی پر تنقید سے
لے کر ڈاکٹر عقیل رضوی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
اور ڈاکٹر گیان چند جین کی تنقیدات کا بڑی خوبصورتی
سے تجزیہ کیا ہے۔ یہ حصہ مثنوی کی تنقید کے لیے ہمیشہ
توجہ سے پڑھا جائے گا۔ علی جواد زیدی صاحب کی یہ
کتاب صرف ہمارے ہی علم میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ
اردو کی اچھی تحقیقی و تنقیدی کتابوں میں ایک اضافہ
ہے۔

شارب ردولوی

نام کتاب: لفظوں کا آسمان (اڑیا نظموں کا اردو ترجمہ)
مصنف: سیتاکانت مہاپاتر
مترجم: پروفیسر کرامت علی کرامت
قیمت: بیس روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

ڈاکٹر سیتاکانت مہاپاتر اڑیا زبان کے صاحبِ
طرز شاعر ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والی شاعری
میں ان کی آواز بلند اور آہنگ سجیلا ہے۔ اب
تک ان کے اڑیا زبان میں چھ مجموعے شائع ہو چکے
ہیں اور زیر تبصرہ کتاب ان کی منتخب نظموں کا
اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۷۴ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی
ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور یہ گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی
کے بھی رکن ہیں۔ ان کی شاعری کے تراجم ہندوستان
کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی
اور جرمنی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ انہیں اڑیا زبان
کا دیوندر ستیارتھی بھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ
انہوں نے اڑیا زبان کے لوک گیتوں کو جمع کر کے کتابی شکل
میں شائع کیا۔ جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر سیتاکانت مہاپاتر کے قلم میں ۱۹۶۰ء
کے بعد ابھرنے والے اڑیا شاعروں کے مقابلے میں سب
سے زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ یہ اپنی شاعری میں فکر
اور جذبہ دونوں کو سمونے کے قائل نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر
مہاپاتر نے بھی ابتدا میں اپنی شاعری کا آغاز انگریزی
زبان سے کیا۔ لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی مادری
زبان کو اپنا لیا اور آج تو ان کی شاعری میں موجودہ
دور کا درد و کرب سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔

جدید اڑیا شاعری میں زندگی سے قریب تر ہونے
کا جو فطری جذبہ پایا جاتا ہے، اس کی بہترین مثال

ڈاکٹر مہاپاتر کی شاعری ہے جو اپنے ماحول سے زیادہ قریب ہے۔ ان کی نظموں میں شاعرانہ وارفتگی پائی جاتی ہے جو ساری کائنات کے غم کو اپنا غم سمجھتی ہے۔ ان کی نظموں کا خواب تاریخ سے بھی زیادہ حقیقت آمیز نظر آتا ہے۔ مہاپاتر کی شاعری زندگی، موت، محبت اور وقت کے محور کے اطراف گھومتی نظر آتی ہے۔

نادر قسم کی تشبیہوں کے استعمال میں ڈاکٹر مہاپاتر کو ملکہ حاصل ہے۔ اس ترجمے میں تلمیحات اور علامتوں کے علاوہ تشبیہات اور استعارات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً خوف کا قارونی خزانہ، صحرا کے قدموں کا جنم، انسان، صیقل کیا ہوا آسمان، دوری کا بانجھ پن اور آنسوؤں کی آسار ڈھ وغیرہ۔

اردو والوں کو پروفیسر کرامت علی کرامت کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اڑیا شاعری کے ایک ایسے نگینے سے اردو والوں کو روشناس کرایا ہے جس کی آب و تاب سے اب تک ہم محروم تھے۔ ترجمے کی افادیت کا ہر شخص قائل ہے۔ اس لیے کہ اس سے تہذیب اور ثقافت کے کارواں میں باہم رشتہ پیدا ہوتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے ادب سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کے اردو ترجمے کے لیے مترجم کو چھ سال تک محنت کرنی پڑی، اس لیے کہ ترجمہ کے ذریعہ دو الگ الگ تہذیبوں کو اس زبان میں سمویا جاتا ہے جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی مترجم نے اڑیا شاعری کا ترجمہ اردو شاعری کی روایات کے تحت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

سرینواس لاہوٹی

نام کتاب: اوتار
مصنف: دیپک قمر
ملنے کا پتہ: "فکر و آگہی" ایچ ۶۵- بی ۲۲ سیکٹر نوئیڈا یوپی ۲۰۱۳۰۱
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی
قیمت: ۴۰ روپے

ہندی لفظیات کو اصل خوب صورتی کے ساتھ برتنے کا سلیقہ دیپک قمر صاحب سے پہلے اور کسی اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔

دیپک قمر صاحب آزادہ روی سے بھی بیگانہ نہیں رہے کیوں کہ آزادہ روی تو غزل کی جان ہے، لیکن ان کی آزادہ روی فارسی شعراء کی جلا کر خاک کر دینے والی جوالا مکھی نہیں بلکہ چاندنی کی طرح نرم اور ٹھنڈی آگ کی طرح ہوتی ہے:

چگ رہا تھا موتیوں کو تٹ پہ بیٹھا راج ہنس
جھیل کی موجوں میں کیا دیکھا مچھیرا ہو گیا

اسلوب و بیان کے یہ شگفتہ استعارے اور لفظوں کے دمکتے موتی دیپک قمر نے الفاظ اور تجربوں کے سمندر میں ڈوب کر حاصل کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہر کسی کے بس سے باہر ہے، اسی لیے بہت کم شعراء نے استعارہ اور زبان میں ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

دیپک صاحب کی شاعری میں جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ صحیح جذبوں کی عکاسی ہے جو نہ حقیقی مسرتوں سے بیگانہ ہے اور نہ زندگی کے غم و آلام سے۔

دیپک قمر صاحب نے ایک حساس اور باشعور شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری میں سوال بہت اٹھائے ہیں۔ لیکن ایک شاعر کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ محض تحیر کا سوال نامہ ہی مرتب نہ کرے بلکہ اپنے تجربے اور احساس کو کام میں لا کر لوگوں کو ان کا حل بھی بتائے۔ کیوں کہ شاعری نور کی پیداوار ہے۔ وہ تیرگی، جبر و تشدد، ناانصافی اور موت کی ابدی دشمن ہے اسی لیے دیپک قمر صاحب نے اپنے اٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب نہایت جدید اور حسین اسلوب میں دے کر اپنی اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے جو ایک شاعر کی اس کے معاشرہ کے لیے ہوتی ہے۔

صحیح معنوں میں دیپک قمر صاحب کی شاعری سیدھی، سچی، عوامی اور سوز و خلوص سے بھری ہوئی ہے۔ اس شاعری میں بیک وقت فکر کی گہرائیاں بھی ہیں اور احساس کی رعنائیاں بھی۔ اس میں ہندی اور اردو کے میٹھے بولوں کا حسین امتزاج بھی ہے اور اپنی دھرتی کی خوشبوؤں کا لباس بھی۔ یہ شاعری نئی جہت کا احساس بھی ہے اور نئی غزل کا اعلان بھی۔

اب غزل کا لباس بدلے گا
اس کی چولی بہت پرانی ہے

وصی محمد

بقیہ: داروغہ امیچند

قیدیوں کو سب خبریں مل چکی تھیں ـــ وہ رائے صاحب امیچند اٹک والا کا نہیں بلکہ اس داروغہ کا انتظار کر رہے تھے جس نے ہزارا کی جیل میں قیدیوں کے آگے مونچھیں نیچی کر لی تھیں۔ لیکن جلدی ہی وہاں سے بھی ان کا تبادلہ ہو گیا۔ اب وہ جہاں بھی گئے، ان کی شہرت ان سے پہلے وہاں پہنچ جاتی۔ مگر وہ قیدیوں میں ڈسپلن قائم کرنے میں ناکام رہے۔ آخر کار ڈپٹی سے پھر داروغہ ہو کر وہ ایک چھوٹی سی جیل کے انچارج بنا دیے گئے لیکن پورے پنجاب میں کوئی جیل ایسی نہیں تھی جس میں مونچھوں والا قصہ مشہور نہ ہو۔ بالآخر تھک ہار کر داروغہ صاحب نے نوکری سے سبکدوشی کی درخواست دے دی اور داروغہ کے عہدے سے ہی پنشن پر چلے گئے۔

میں جب جیل سے رہا ہو کر آیا تب وہ نوکری چھوڑ چکے تھے۔ لیکن انھوں نے کہاں منہ چھپایا، کہاں گئے کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔ وہ بے چارے قیدیوں کے لیے چندن کے باغ تو نہ لگوا سکے لیکن نہ معلوم اپنے لیے ببول کی چھایا بھی حاصل کر سکے یا نہیں۔ جیلوں کے خلیفہ بھی جلد ہی ان کا نام تک بھول گئے۔ لیکن آج بھی اگر کوئی ایک دن کے قیدی سے پوچھے تو وہ مسکرا کر سر ہلا دے گا کہ ہاں اسے اس داروغہ کا وہ قصہ معلوم ہے کہ اس نے قیدیوں کے سامنے مونچھیں نیچی کر لی تھیں۔

ترجمہ: م۔ عثمانی

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد : ۴۶	شمارہ : ۱۱	جون ۱۹۸۸ء
قیمت : دو روپے	فون : ۳۸۷۰۶۹	جیٹھ۔ اساڑھ شک سمت ۱۹۱۰

ترتیب

سرورق : انوپ شرما

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منہاس

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرون ملک : زرِ سالانہ : ۲۰ روپے، دو سال کے لیے : ۳۶ روپے، تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

ملاحظات

گزشتہ چار دہوں میں صنعتی شعبے کی ترقی و فروغ بھارت کی اقتصادی ترقی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ملک میں صنعت کاری کی پالیسی پانچویں دہائی کی ابتدا میں بہت غور و خوض کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔ بڑے پیمانے پر صنعتوں کی بہتری و توسیع کے سبب بہت زیادہ سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اس مدت کے دوران صنعتی پیداوار ساڑھے چھ گنا سے بھی زیادہ ہو گئی ہے یعنی سالانہ شرح اضافہ تقریباً چھ فیصد رہی ہے۔ واضح ہو کہ ۱۹۰۱-۱۹۰۰ سے ۴۶-۱۹۴۵ تک کی مدت کے دوران سالانہ صنعتی شرح اضافہ ۲ فیصد تھی۔

بیشتر مصنوعات کے معاملے میں ابتدائی کوششوں کے ذریعہ ملک نے اندرونِ ملک معیشت کے اہم شعبوں میں مزید ترقی کو برقرار رکھنے کی صلاحیت فراہم کر کے بڑے پیمانے پر خود کفالت حاصل کر لی ہے۔ یہ خود کفالت ہماری بین الاقوامی تجارت میں اشیاء کی صورتِ حال سے جھلکتی ہے جس میں مصنوعات کی درآمدات میں مسلسل کمی واقع ہوئی ہے اور دوسری طرف صنعتی پیداوار ہماری برآمدات کا ایک بڑھتا ہوا جز بن گئی ہے۔ صنعت کاری میں تیز تر اضافہ کے ساتھ ساتھ ٹکنالوجی اور انتظام کی ہنرمندی میں بھی مساوی اضافہ ہوا ہے جو نہ صرف بہت زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ صنعتی اداروں کی مؤثر کارکردگی میں معاون ہے بلکہ ان کی منصوبہ بندی، ڈیزائن اور تعمیر کے لیے بھی مفید ہے۔ صنعتی تحقیق نیز ٹکنالوجی کے استعمال اور اس کی ترقی و فروغ میں قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر اندرونِ ملک مجموعی پیداوار میں اشیاء سازی کے ذریعہ اضافہ کردہ مالیت بھی ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱۰۵۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۰،۲۸۰ کروڑ روپیہ ہو گئی جس میں چھ گنا اضافہ ہوا ہے۔

پیداوار میں مقدار کے لحاظ سے اضافہ کے علاوہ صنعتی ڈھانچہ کو بڑے پیمانے پر گوناگوں بنا دیا گیا ہے جس میں ہر قسم کی اشیائے صرف، ساز و سامان اور بڑی بڑی مشینیں شامل ہو گئی ہیں۔

سرکاری دائرہ کار کے شعبہ میں آج بڑے پیمانے پر سرگرمیاں شامل ہیں۔ فولاد، معدنیات اور دھات، کوئلہ، بجلی، پیٹرولیم، کیمیاوی کھاد، کیمیاوی اشیاء اور ادویہ سازی جیسی بنیادی صنعتوں کے لیے سرکار کے زیرِ انتظام صنعتوں میں مرکزی حکومت کی آدھے سے زیادہ سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ سرکار کے زیرِ انتظام آج پیٹرولیم، لگنائیٹ، تانبہ اور سیسہ کی سو فیصد پیداوار ہوتی ہے۔ سرکار کے زیرِ انتظام صنعتوں میں کوئلہ کی تقریباً ۹۸ فیصد، فولاد کی تقریباً ۷۰ فیصد اور جست کی تقریباً ۸۳ فیصد پیداوار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سرکار کے زیرِ انتظام صنعتیں بھاری، درمیانہ، ہلکی انجینئرنگ، الیکٹرونکس، کپڑا، اشیائے صرف، تعمیرات اور مشاورتی خدمات، جہازرانی اور نقل و حمل، تجارتی سرگرمیاں وغیرہ کے معاملے میں بھی کافی خدمات انجام دیتی ہیں۔ سرکار کے زیرِ انتظام صنعتیں اب زیادہ سے زیادہ خالص منافع کما رہی ہیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی و فروغ گزشتہ تیرہ برسوں کے دوران بھارت کی معیشت کی ایک سب سے حوصلہ افزا خصوصیت رہی ہے۔ یہ امر اس حقیقت سے عیاں ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی تعداد ۷۳-۱۹۷۲ء میں ۱۶ر۴ لاکھ سے بڑھ کر تقریباً ۱۳ر۵۲ لاکھ ہو گئی ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعت کا شعبہ بھارتی معیشت کی ترقیاتی حکمتِ عملی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ شعبہ روزگار فراہم کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ یہ شعبہ صنعتی ترقی و فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری کل صنعتی پیداوار میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کا حصہ تقریباً ۳۵ فیصد ہے۔

۷۴-۱۹۷۳ء سے ۸۶-۱۹۸۵ء تک کی مدت کے دوران اس شعبے کی پیداوار کی مالیت ۷۲۰۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر تقریباً ۶۱۲۲۸ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ حالیہ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ۸۷-۱۹۸۶ء میں پیداوار کی مالیت کا تخمینہ عارضی طور پر ۷۲۲۵۰ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ اس شعبے میں روزگار بھی ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۳۹ر۷ لاکھ سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۹۶ لاکھ ہو گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران اس شعبہ میں روزگار ۱۰۰ لاکھ تک پہنچ گیا ہے جو کہ ۱۵۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہے۔

چھوٹے پیمانے کے شعبے میں اب ۵۰۰۰ سے زیادہ قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ یہ شعبہ بڑے پیمانے پر کھپت کی اشیاء مثلاً چمڑہ اور چمڑے کا سامان، دھات کی چادروں سے بنے سامان، دو پہیوں کی سائیکلوں اور ان کے کل پرزوں، پلاسٹک اور ربڑ کی اشیاء، اسٹیشنری، صابن، کپڑے دھونے کے صابن، گھریلو برتن، ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ پاؤڈر، محفوظ کیے گئے پھلوں اور سبزیوں، لکڑی اور اسٹیل کے فرنیچر، تیز روشنی والی ٹارچ، جوتے کی پالش، رنگ اور وارنش وغیرہ کے بڑے فراہم کنندہ کے طور پر ابھرا ہے۔ اعلیٰ اشیاء میں ٹیلی ویژن سیٹوں، الیکٹرونک کنٹرول کے آلے، ٹرانزسٹر ریڈیو، سماعتی آلات، ای سی جی کی مشینیں، ایئرکنڈیشننگ کے ساز و سامان، عینک کے شیشے، دوائیں اور دوا سازی کی اشیاء، بجلی کے موٹر وغیرہ جیسی متعدد اشیاء کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جو اشیاء پہلے درآمد کی جاتی تھیں انہیں اندرونِ ملک ہی تیار کر کے غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت کرنے میں چھوٹے پیمانے کے شعبے کی خدمات اتنی ہی نمایاں اور اہم ہیں۔

یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چھوٹے پیمانے کا شعبہ جدید ٹکنالوجیوں کو اپنا کر اپنی برتری کو پہلے ہی ثابت کر چکا ہے۔ یہ پہلا شعبہ تھا جس نے الیکٹرونک ٹائپ رائٹرز، سروے کے لیے الیکٹرونک ساز و سامان، سلامتی کے نظام اور آگ سے بچاؤ کے آلات جیسے اشیاء کی تیاری کے لیے اعلیٰ ٹکنالوجی سے

باقی صفحہ ۲۹ پر

شمس کنول

راج کپور

شہر بمبئی کے دامن میں چیمبور ہے اور چیمبور کے علاقے میں آر۔کے۔ اسٹوڈیوز واقع ہے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے اونچی چوکی پر بنی ہوئی ایک دو منزلہ لمبی سی عمارت ہے جو متعدد کمروں پر مشتمل ہے۔ ان کمروں میں آر۔کے۔ اسٹوڈیوز اور آر۔کے۔ پروڈکشنز کے دفاتر ہیں۔ اسی عمارت کا آخری بڑا کمرہ راج کپور اور ان کی فلموں کو ملے ہوئے اعزازات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کمرے میں وہ تمام میڈل مجسمے اور توصیفی اسناد سجا کر رکھی گئی ہیں جو آر۔کے کی فلموں کے سلسلے میں راج کو اپنے ملک میں اور غیر ممالک میں ایوارڈ کی صورت میں بخشے گئے ہیں۔ دفاتر کی اس عمارت کی پشت پر جنوب میں ہرا بھرا لان ہے۔ لان کے جنوب میں اسٹوڈیوز کے فلور ہیں اور فلور کے جنوب میں ایک بڑی سی روش کے بعد ایک بڑا سا مستطیل ایک منزلہ کمرہ ہے جو اونچائی میں نصف زمین کے اوپر اور نصف زمین کے نیچے ہے یعنی پچاس فیصد تہ خانہ۔ کمرے میں اترنے کے لیے سیڑھیاں نہیں ڈھلوان ہے۔

یہ مستطیل کمرہ راج کپور کی وہ مشہور کاٹیج ہے کہ

جہاں پہنچ کر بے جان کہانیاں متحرک ہوگئی ہیں جہاں کاغذی پیرہن کے ہر پیکر میں روح پڑ گئی ہے جہاں بڑی بڑی فلموں کے منصوبے بنے ہیں، جہاں سوئے ہوئے ساز بولنے لگے ہیں، جہاں بڑے بڑے زاہد خشک سرمایہ کاروں نے دلچسپ تماشوں کے سودے طے کیے ہیں، جہاں دیویوں کو مورتیوں میں بدل دیا گیا ہے اور ان کے حسین نام و چام پر فن اور بیوپار آئے بڑھا ہے، جہاں راج اور ان کی ہیروئنوں کے رومان پروان چڑھے ہیں، جہاں گیت کاروں کے شاعرانہ بولوں کو موسیقاروں کی مدد سے گلوکاروں نے ناقابلِ فراموش نغموں میں بدلا ہے، جہاں راج نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ عیش و طرب کے نغمے گائے ہیں اور تنہائی میں غم کو گلے بھی لگایا ہے ـــــ یہ کاٹیج راج کے لیے گوشۂ عافیت بنی رہی ہے اور اجنتا کی ایک گپھا بھی۔ دراصل راج جانتے تھے کہ فن کی تخلیق کے لیے فنکارانہ ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے!

کہتے ہیں کہ اداکاری نسلِ انسانی کا عظیم ترین آرٹ ہے اور ڈراما تمام فنونِ لطیفہ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اداکار عوام کے سامنے اس مجموعی فن کا واحد نمائندہ ہوتا ہے۔ ڈرامے کی دنیا کے استادوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اداکاری سیکھنے کی چیز نہیں ہے، اداکار پیدا ہوتا ہے، اداکار بنتا نہیں ہے۔ راج بھی پیدائشی اداکار تھے۔ راج کے باپ پرتھوی راج کپور اپنے وقت کے صفِ اوّل کے اداکار تھے۔ مگر انھوں نے اپنے بیٹے کے رجحان کو دیکھتے ہوئے بھی بیٹے کو اداکاری کی تربیت خود نہیں دی بلکہ ہدایتکاری کی تربیت کے لیے راج کو ہدایت کار کیدار شرما

نسلامہ، قاضی اسٹریٹ، بجنور، ۲۴۶۷۰۱

ا؎ راج کپور وہ واحد اداکار تھے جو غیر ممالک میں سب سے زیادہ جانے پہچانے جاتے تھے۔ روسی ان کو محبت سے تاورش بوروگیف کہتے تھے۔ روسیوں نے اپنی ایک بستی کا نام بھی راج کے نام پر رکھا ہے۔ ایرانیوں نے ان کو احترام سے ہمیشہ 'آغا راج کپور' کہہ کر پکارا۔ انھیں پتہ تھا کہ راج تعلیمی اعتبار سے سینیر کیمبرج فیل ہیں مگر ایران میں ان کو سینما نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا تھا۔ راج کی ایک ملاقات امریکا کے ایک سابق صدر ٹرومین سے بھی ہوئی تھی جب پہلا خلائی ہیرو یوری گاگارن بمبئی آیا تھا تو اس نے راج کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ 'میں آوارہ ہوں'۔ ان کی فلم 'جاگتے رہو' پہلی ہندوستانی فلم تھی کہ جس کو کارلووی فلمی میلے میں سب سے بڑا ایوارڈ 'گرانڈ پرکس' ملا تھا۔ حکومتِ ہند نے راج کو 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے نوازا تھا اور دادا بھائی پھالکے ایوارڈ بھی دیا تھا۔ راج متعدد بین اقوامی فلمی میلوں میں جیوری بن چکے تھے اور تین بار خیر سگالی وفد کے رکن و لیڈر بن کر وہ ہندوستان سے باہر گئے تھے۔

کے سپرد کر دیا۔ نتیجے میں اگرچہ راج کو ہدایت کار ہی ہونا چاہیے تھا مگر وہ ہدایت کار سے پہلے اداکار بن گئے۔ اداکار کی حیثیت سے راج کی پہلی اہم فلم "گوپی ناتھ" تھی جو مہیش کول کی ہدایت میں تیار ہوئی تھی۔ اس فلم نے یہ بتا دیا تھا کہ اس کے ہیرو راج کا مستقبل روشن ہے۔

دادا بھائی پھالکے کا نظریہ یہ تھا کہ اداکار کو ہمیشہ وہی کردار انجام دینا چاہیے کہ جس کے لیے وہ موزوں ہو۔ لیکن آج یہ خیال عام ہے کہ ایکٹر وہی ہے جو ہر ٹائپ کے رول کو بخوبی انجام دے سکے۔ اس اعتبار سے راج ہمہ صفت اداکار تھے۔ ان کے فن میں ہمہ گیری پائی جاتی تھی۔ "آگ"، "برسات"، "انداز" اور "تیسری قسم" اور "سنگم" میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ صف اول کے رومانی ہیرو ہیں۔ راج کی نیلی آنکھیں، ان کا سرخ و سفید رنگ اور ان کی سحر آمیز مسکراہٹ رومانی تاثر پیدا کرنے میں ان کے لیے اور زیادہ معاون ثابت ہوتی تھی۔ "سنگم" اور "داستان" میں وہ ایک کامیاب کامیڈین ہیرو ثابت ہوئے تھے۔ "جس دیش میں گنگا بہتی ہے" اور "جاگتے رہو" اور "میرا نام جوکر" میں انھوں نے ایک سیدھے سادے بے سہارا اور ایک معصوم دیہاتی انسان کے روپ میں اپنی انتہائی جذباتی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ "جاگتے رہو" میں بولے بغیر انھوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ جذبات کا بھرپور اظہار اس حد تک بھی ممکن ہے کہ فلم کے اکثر مناظر دیکھنے والوں کے لیے انتہائی حسرت ناک اور رقت آمیز بن جائیں۔ کرنے والی بات تو پردے پر کرکے آسانی سے دکھائی جا سکتی ہے مگر انسان پر جو گزرتی ہے، جو وہ محسوس کرتا ہے، جو اس کے دل پر گزرتی ہے اور جب اس کے احساسات مجروح ہوتے ہیں تو اس کو پردے پر دکھانا ہر اداکار کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر راج نے "جاگتے رہو" میں ایسا کر دکھایا تھا۔ "شری ۴۲۰" اور "آوارہ" میں وہ ایک آوارہ گرد بن کر نمودار ہوئے تھے۔ (جس میں دکھ و سکھ کا رنگ شامل ہو) کے ایسے کامیاب رول آج تک کسی دوسرے ہندوستانی اداکار نے ادا نہیں کیے ہیں۔ دراصل اداکاری کے سلسلے میں ہندوستان کی فلمی دنیا میں دو اسکول ہمیشہ قابلِ تقلید بنے رہے ہیں۔ ایک دلیپ کمار اسکول، دوسرا راجکپور اسکول۔ دلیپ کی طرز اداکاری کی نقل فلمی دنیا کے دوسرے اداکار کرتے ہیں جیسے منوج کمار اور راجندر کمار کی اداکاری میں دلیپ کمار کی فن اداکاری کی جھلک آج تک پائی جاتی ہے جب کہ راج کی فلمیں دیکھ کر راج کی نقل عوام کرتے ہیں۔ راج نے نوجوانوں کو مڑے ہوئے پائینچوں کی اونچی پتلون پہننا سکھائی تھی۔

اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ راج کپور کی اداکاری کا اسٹائل ان کا اپنا نہیں تھا بلکہ مستعار لیا تھا۔ انھوں نے ایک مغربی دانشور کے اس قول کو گرہ میں باندھ لیا تھا کہ "اپنی بڑائی بیان کرو گے تو سننے والوں کو برا معلوم ہوگا۔ اپنے آپ کو کمتر بتاؤ گے تو دوسرے آپ سے خوش ہوں گے۔" عوام کی اس نفسیات کو سمجھنے کے بعد راج اداکاری میں چارلی چیپلن کے پیروکار بن گئے تھے۔ چارلی چیپلن نے بھی اپنی فلمی زندگی میں اسی طلسم کو اپنا رکھا تھا۔ چنانچہ راج اپنی اکثر فلموں میں اپنے آپ کو انتہائی کمتر بنا کر پیش کرتے تھے۔ سڑک کے ایک مظلوم، لاچار، ٹھکرائے ہوئے، اونچے طبقے کی جانب سے نظرانداز کیے ہوئے ایک بھلے مانس کے روپ میں وہ پردے پر آتے تھے۔ جھونپڑ پٹی کے غریب محنت کش مزدوروں، ننگے بھوکے بچوں، فٹ پاتھ پر بیٹھے بیچنے والے خوانچہ فروشوں، پارک میں بیٹھے ہوئے بیروزگار مظلوم و مفکر نوجوانوں سے دو بات کرتے ہوئے، سڑک پر کھیلتے ہوئے ننھے بچوں کو اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے، کسی بوڑھے کو اپنی گٹھری اٹھانے میں مدد دیتے ہوئے، افسردہ راہگیروں کو اپنے گانے کے دلچسپ بول سناتے ہوئے اور کسی موٹے سیٹھ پر پھبتی کستے ہوئے وہ اپنے آپ کو دور دکھاتے تھے۔ "میں غریب آدمی ہوں، میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" ایسے مکالمے انھوں نے اپنی فلموں میں اکثر دہرائے ہیں۔ وہ جب غریبوں یا مزدوروں سے بات کرتے ہوئے اپنے آپ کو دکھاتے تھے تو ایسے مناظر میں وہ اکثر ایسے چبھتے ہوئے اور طنز آمیز مکالمے ادا کرتے تھے جن سے سماجی نابرابری واضح ہو جاتی تھی اور نتیجے میں وہ اپنے دیکھنے والوں کی پوری ہمدردی حاصل کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی فلمیں سوشلسٹ ممالک میں زیادہ پسند کی جاتی تھیں۔ راج نے فلم کی زبان میں یہ کہہ کر کہ سارا جہاں میرا وطن ہے، سچائی میرا مذہب ہے، چاہے کوئی ہندی ہو یا روسی، ایشیائی ہو یا یورپین، میں سب کا ہوں، ہر دل عزیزی حاصل کر لی تھی۔

کہتے ہیں کہ اصل زندگی میں جو — وہ نہیں ہے بلکہ جو بن کر دکھائے وہی ایکٹر ہے، اداکاری کی اس تعریف پر راج سو فی صد پورے اترتے تھے۔ ان کی نجی زندگی ان کی فلم کی زندگی سے قطعی طور پر بدلی ہوئی تھی۔ وہ سو بٹا سو ایک ارسٹوکریٹ انسان تھے۔ وہ فلم کے پردے پر جتنے سستے اور ارزاں دکھائی دیتے تھے۔ فلم کے باہر وہ اتنے ہی مہنگے بلکہ انمول تھے۔ انھوں نے (دلیپ کمار کی طرح) اخبارات اور ٹی وی کے کمرشیل اشتہارات کو اپنی آمدنی کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا اور اس طرح وہ اپنے اونچے معیار سے نیچے کبھی نہیں آئے۔ یہی نہیں بلکہ راج کی زندگی میں دور درشن کو آر۔ کے کی فلموں اور فلمی گانوں

ص٥ پکی باؤنڈری سے گھری ہوئی جگہ میں چند دفاتر ہوتے ہیں، ایک دو لان، ایک لیباریٹری، ایک منی تھیٹر، ایک آدھ کینٹین اور چند بہت لمبے چوڑے اور بہت اونچے ہال واقع ہوتے ہیں۔ ایسی جگہ کو اسٹوڈیو کہا جاتا ہے اور ایسے ساؤنڈ اور لائٹ پروف ہال کو فلور کہتے ہیں اور ایسے فلور ہی پر فلم کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ ایک اسٹوڈیو کے متعدد فلور پر بیک وقت متعدد فلموں کی شوٹنگ ہو سکتی ہے۔

کے حقوق حاصل کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ راج ہندوستان کی فلمی دنیا کے سب سے بڑے شومین تھے۔ شومین شپ ان کی خوبی بھی تھی اور خامی بھی۔ دراصل وہ اس سلسلے میں امریکی نظریے کے حامل تھے وہ ہر کام بڑے پیمانے پر انجام دیتے تھے۔ انھیں اپنے اسٹوڈیوز کے لان پر پارٹیاں دینا بہت پسند تھا۔ پارٹیاں دینا ان کا شوق بھی تھا اور کاروباری مصلحت بھی۔ راج نے غیر ملکی مہمانوں (خصوصی طور پر روسی مہمانوں) کے اعزاز میں جس شاہانہ انداز سے پارٹیاں دی ہیں۔ وہ آج بھی بمبئی کی فلمی دنیا میں یادگار ہیں۔

راج جو پارٹی بھی دیتے اس کے منتظم وہ خود ہی ہوتے تھے، ایک ایک چیز پر نظر رکھتے تھے۔ کھانے کے ذائقے سے میز کرسی کی ترتیب تک ان کی نظر دوڑتی رہتی تھی۔ اگر کسی سے پارٹی کے انتظام سے متعلق کوئی کوتاہی ہو جاتی یا کسی بات میں کوئی کمی رہ جاتی تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے کام کرنے والوں کو گالیاں بکتے، تھپڑوں سے ان کی پٹائی کرتے اور اگر کسی بن بلائے مہمان کو دیکھ لیتے تو وہ آگ بگولا ہو جاتے اور نتائج سے بے پروا ہو کر بُری طرح دھتکارتے اور پارٹی سے اسے باہر نکال دیتے۔ وہ اپنی کسی بھی تقریب کو عوامی بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ رندھیر اور رشی کی شادیوں کے ریسپشن کے موقعوں پر جب عوام اور بن بلائے مہمانوں کی بھیڑ گیٹ کے اندر آنے کی کوشش کرتی تھی تو راج کا موڈ بار بار خراب ہو جاتا دراصل راج کو غصہ جلد ہی آ جاتا تھا۔ آٹو گراف دینا انھیں پسند تو تھا لیکن آٹو گراف لینے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں اگر تمیز اور سلیقے کا ثبوت نہ دیتے تو راج ان پر بھی بھڑک پڑتے تھے۔ چنانچہ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی طبعی امارت پسندی کا کفارہ اپنی فلموں کے توسط سے ادا کرتے تھے۔

فلمی حلقوں میں یہ بات بہت مشہور رہی ہے کہ دلیپ کمار اچھے ایکٹر ہیں اور راج کپور اچھے ڈائرکٹر۔ دلیپ کمار کے ایک مثالی اور منفرد ایکٹر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر راج جہاں ایک بہت اچھے ڈائرکٹر تھے وہاں بہت اچھے ایکٹر بھی تھے۔ دراصل اداکاری اور ہدایت کاری دونوں باتوں سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ وہ ان دونوں باتوں کو انجام دینے میں کھو جاتے تھے۔ رائٹر کے مکان پر یا کسی بڑے ہوٹل کے بند کمرے میں یا پونے کے پاس لونی میں ان کے اپنے فارم ہاؤس پر یا پھر آر کے کی کاٹیج میں آنے والی فلم کے اسکرپٹ پر آخری مباحثہ ہو جاتا اور اسکرپٹ کی فائنل اور ماسٹر کاپی تیار ہو جاتی تو اسکرپٹ کو وہ گیتا یا رامائن جیسا مقدس اور عزیز جان کر ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ گھر میں ہوں یا اپنی کاٹیج میں، فارم پر ہو یا سفر میں، وہ اسکرپٹ ان کے ساتھ رہتا اور زیر مطالعہ رہتا۔ سلولائڈ پر منتقل ہونے سے پہلے کہانی کا ہر اہم حصہ، ہر موڑ، اور ہر کردار ان کے فنکارانہ ذہن میں رچ بس جاتا اور کہانی کے سیٹ پر جانے سے پہلے ہی وہ اپنی بننے والی فلم کے متعلق اس کے مختلف سین کے حوالے دے کر اس طرح بات کرتے تھے جیسے کوئی پردے پر دیکھنے کے بعد بات کرے۔ چنانچہ اس لگن، لگاؤ ریاض، تپسیا اور اپنے کام سے اس مثالی عشق کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جب فلم بن کر سب کے سامنے آتی تو مجھی سجھائی، نوک پلک سے درست، نہ کم نہ زیادہ، قطعی طور پر مکمل۔ نہ کہیں جھول اور نہ کہیں خم، نہ ترچھی نہ ٹیڑھی، نہ سست اور نہ تیز رفتار ہوتی۔ راج کپور کی اداکاری و ہدایتکاری کا فن اتنا ہی عمیق تھا جتنا ان کی نیلی آنکھوں کا گہراپن۔ یہی وجہ ہے کہ آر کے کی جو فلمیں کاروباری طور پر ناکام رہی ہیں ان کو بھی برا نہیں کہا جا سکتا!

راج کپور کو اپنی فلموں میں "میرا نام جوکر" پسند تھی مگر فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اداکاری کے اعتبار سے "جاگتے رہو" راج کی بہترین فلم ہے۔ ڈائرکشن کے لحاظ سے "آوارہ" راج کی مکمل طور پر ایک اچھی اور بے مثال فلم تھی۔ اس فلم کی کہانی سنیریو، مکالمات، تدوین، موسیقی، عکاسی، صدابندی، سیٹنگ، ٹائمنگ، اداکاری اور ہدایت کاری میں پورے طور پر ایک مناسب اور متوازن ربط و ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ "آوارہ" کا کوئی پہلو ہلکا نہیں اور نہ فلم کا کوئی فریم فالتو تھا، جبکہ "آوارہ" ایک کمرشیل فلم تھی اور "جاگتے رہو" ایک کلاسیک!

راج کپور بنیادی طور پر رومانی فلموں کے ہدایت کار تھے۔ اگرچہ وہ اپنا رول کامیڈی اور ٹریجڈی کے امتزاج سے تیار کرتے تھے مگر ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ ان کی فلم کا اختتام ٹریجڈی پر ہو (ایک عاشق مزاج انسان کا حرماں نصیب ہونا بھی ضروری ہے)۔ چنانچہ "آگ" ایک ٹریجڈی فلم تھی "برسات" نیم ٹریجڈی اور نیم کامیڈی، "آہ" مکمل طور پر "دیوداس" جیسی ٹریجڈی فلم تھی۔ مگر اس کے کاروباری طور پر ناکام ہونے پر بعد میں اس کا اختتام بدل کر کامیڈی کر دیا گیا تھا۔ "سنگم" بھی نیم ٹریجڈی اور نیم کامیڈی تھی اور "میرا نام جوکر" پورے طور پر ٹریجڈی فلم "بابی" کو بھی ابتدا میں ایک ٹریجڈی ہی فلم بنایا گیا تھا مگر بعد میں اس ڈر سے کہ کہیں "بابی" کا بھی "جوکر" جیسا حشر نہ ہو، اس کا خاتمہ بالخیر کر دیا گیا۔ راج نے اپنی کئی فلموں کی ناکامی اور خسارہ اٹھانے کے باوجود کبھی مار دھاڑ سے بھرپور کوئی ایکشن فلم بنانی پسند نہیں کی اور نہ انھوں نے کبھی اسٹار کاسٹ پر یقین کیا۔ انھیں اپنے فن پر اعتماد تھا اس لیے انھوں نے مرکزی رول میں اکثر نئے، نوخیز اور نومشق لڑکے اور لڑکیوں کو لیا اور ان ذرّوں کو اسٹار بنا دیا۔ جیسے نمی، ماسٹر رتن، ناز، رشی، ڈمپل، راجیو، مندا کنی اور پدمنی وغیرہ۔

جیسے کبھی پربھات فلم کمپنی میں شانتا رام کو فلمی صنعت کے چند ماہرین کی ایک ایسی اچھی ٹیم (بابو راؤ پینٹر، راجے نینے، داملے شیخ فتح لال وغیرہ) مل گئی تھی جو کسی بھی فلم کو ایک کلاسیک میں بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی، بالکل اسی طرح راج نے بھی شنکر جے کشن جیسے دو میوزک ڈائرکٹر، حسرت اور شیلندر جیسے دو گیت کاروں،

رادھوکرماکر جیسے کیمرامین، علاءالدین جیسے ساؤنڈ ریکارڈسٹ، اچرے کر جیسے آرٹ ڈائرکٹر اور ہریش برا (جو انگریزی ادب میں ایم اے ہیں اور انگریزی زبان کے شاعر ہیں) جیسے سکریٹری کو لے کر ایک ٹیم بنائی تھی جس نے راج کے فن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو انتخاب کرنے میں راج کی مردم شناسی کو بھی دخل تھا۔ اپنے لیے مکیش ان کی بڑی موزوں چوائس تھی۔ پردۂ فلم پر راج کو گاتا ہوا دیکھ کر کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ راج نہیں مکیش گا رہا ہے۔ راج صرف فلم ساز یا ہدایت کار ہی نہیں تھے بلکہ آرٹ، ایڈیٹنگ، ساؤنڈ، میوزک، فوٹوگرافی غرضیکہ فلم کے ہر شعبے میں وہ ایک معقول دخل رکھتے تھے یعنی وہ ڈائرکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ٹیکنیشین بھی تھے۔ زوم لینس کا استعمال وہ بڑے سے بڑے کیمرامین سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ سب سے پہلے انھوں ہی نے اپنی ایک فلم (آوارہ) میں مصنوعی بادل دکھائے تھے۔

راج کو فلم سے ہٹ کر کسی اور موضوع پر بولتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ سیاست سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات کرتے تھے تو صرف اپنی فلموں کے بارے میں، اپنی ہیروئنوں کے موضوع پر یا پھر اپنی ہدایت کاری کی تکنیک پر بولتے تھے۔ ان کا سارا علم فلم ہی کے گرد گھومتا تھا۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد یہ سوچنا پڑتا تھا کہ ان کی دنیا میں فلم کے سوا کچھ اور بھی ہے یا نہیں۔ مطالعے کا بھی انھیں کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ اخبار یا رسالہ یا کوئی کتاب پڑھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ شاید انھیں مطالعے سے زیادہ اپنے مشاہدے اور تجربے پر بھروسا تھا۔ اسی لیے وہ تنہائی میں ۱۶ ایم ایم کی غیر ملکی فلمیں اپنے پروجیکٹر پر اکثر دیکھتے تھے اور انہیں مغربی موسیقی سے متعلق آرکسٹرا کے گراموفون ریکارڈ سننے کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس ایسے ریکارڈوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ بہت کھاتے تھے اور بہت پیتے تھے۔ چینی کھانے اور جنوبی ہند کے پکوان انہیں بہت مرغوب تھے۔ بہت کھانا، بہت پینا اور فربہ ہو جانا کپور فیملی کی روایت ہے۔ کپور فیملی کا ہر بچہ عموماً ڈبو، ہر نوجوان چھریرا اور ہر بوڑھا موٹا اور تھیپس ہوتا ہے اور پھر اس کا موٹاپا ہی اس کے لیے جان لیوا بن جاتا ہے۔ یوں دولت مند فلمی مردوں میں جاتی ہوئی جوانی کو واپس لانے کے لیے جو جتن کیے جاتے ہیں، راج بھی کبھی کبھی ایسی کوشش کرتے تھے۔ بالآخر ایسا طریق علاج صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔

راج کا بچپن کلکتے میں نیو تھیٹرز کے ماحول میں گزرا تھا جہاں انھوں نے آرسی بورل، تمر برن اور پنکج ملک جیسے مایہ ناز میوزک ڈائرکٹروں کے آرکسٹرا سنے تھے اور سہگل، کانن اور اوماششی کی مدھر آوازیں ان کے کانوں میں پڑی تھیں جنھوں نے راج کو کن رسیا اور سنگیت کا پریمی بنا دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ راج کا سنگیت ودّیا سے لگاؤ بڑھتا ہی گیا۔ راج گانا بھی جانتے تھے۔ پرتھوی تھیٹرز کے ڈراموں میں کام کرتے ہوئے انھوں نے اپنے گانے خود گائے تھے۔ وہ طبلہ، پیانو، ستار، گٹار، ڈھولک، وائلن اور ہارمونیکا جیسے ساز بجانا جانتے تھے۔ راگوں میں راج کو بھیروی راگ پسند تھا۔ ساز سنگیت سے راج کی ایسی ہی واقفیت کی بنا پر فلمی حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ آر۔ کے کی فلم کے دو نہیں تین میوزک ڈائرکٹر ہوتے ہیں، شنکر جے کشن اور راج خود۔

معترضین کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ راج کی فلموں میں جمالیات سے زیادہ جنسیات کی آمیزش ہوتی ہے۔ دراصل وہ اس سلسلے میں ہدایت کار سے زیادہ فلم ساز کی حیثیت سے یہ خوب جانتے تھے کہ وہ کن لوگوں کے لیے فلم بنا رہے ہیں۔ انہیں پتہ تھا کہ ایسے ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ ہے جو بھوکے ہیں — روٹی اور [illegible] کے!

آگ، آوارہ، شری ۴۲۰، جاگتے رہو، سنگم، تیسری قسم اور میرا نام جوکر جیسی فلمیں دیکھ کر راج کی اعلا فنکارانہ صلاحیت اور ذہانت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی فلم میں اپنے مقابل کسی بھی اداکار کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ "سنگم" میں راج کے ساتھ دیوآنند بھی کام کرنا چاہتے تھے اور راجندر کمار بھی، مگر راج کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کی فلم "سنگم" میں ان کے ساتھ دلیپ کام کریں لیکن دلیپ راضی نہیں ہوئے۔ محبوب کی فلم "انداز" بھی "سنگم" ہی کی طرح ایک لڑکی اور دو لڑکے والی تکون کہانی تھی مگر محبوب کی ہدایت کاری کا یہ کمال تھا کہ آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ "انداز" میں نرگس کے مقابل ہیرو کون تھا راج یا دلیپ؟ لیکن دلیپ ایسی امید "سنگم" کے سلسلے میں راج سے نہیں رکھ سکتے تھے۔ دلیپ کے انکار کے بعد ہی راج نے راجندر کمار کو اپنے ساتھ "سنگم" میں لیا تھا۔

باسبے ٹاکیز کی فلم "مجبور" میں لتا منگیشکر کو سن کر راج نے ان کی آواز کو پسند کیا تھا۔ "برسات" سے لتا نے ابتدا کی اور راج کی تقریباً ہر فلم میں انھوں نے پلے بیک دیا۔ پلے بیک کے سلسلے میں مکیش کے بعد راج کی یہاں ضرورت ہمیشہ لتا ہی بنی رہیں۔ لیکن "میرا نام جوکر" کی تکمیل کے دنوں میں لتا نے فلمسازوں سے بھی اپنے گانوں کی رائلٹی کا مطالبہ کیا۔ دوسرے فلمساز تو مان گئے، مگر اس سلسلے میں راج نے فراخ دلی سے کام نہیں لیا اور لتا سے بات بگڑ گئی اور راج نے لتا کے بجائے آشا سے "میرا نام جوکر" میں گانے گوائے۔ "بابی" کی تیاری کے دوران میں لکشمی کانت پیارے لال کی کوشش سے لتا اور راج میں صلح ہو گئی اور لتا اپنی پوری جولانی کے ساتھ "میں میکے چلی جاؤں گی" کہتی ہوئی واپس آ گئیں۔

اگر کوئی انسان سو فیصد اچھا ہے تو وہ انسان نہیں رحمان ہے اور اگر وہ سو فیصد برا ہے تو وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ دراصل انسان تو اچھائی، برائی، نیکی و بدی اور خامی و خوبی ہی سے مل کر بنتا ہے اور راجکپور ایسے ہی ایک انسان تھے جو چند بشری خامیوں کے باوجود ہندوستان کی فلمی دنیا کے انتہائی غیر معمولی ذہین شخص، ایک حیرت انگیز باکمال شخصیت تھے۔ انھوں نے کئی یادگار، اصلاحی اور مفید فلمیں بنائیں۔ ان کی آنے والی فلم "حنا" ہند و پاک کی دوستی کی ضرورت کے موضوع پر مبنی ہے۔ کاش وہ اس کو خود ہی بنا پاتے ؎

وہ میکدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اڑانے والا
نہ جانے کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

ابو محمد سحر

کیونکے یا کیونکہ

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے ایک مشہور مضمون "اردو املا" (۱۹۳۱ء) میں میر و سودا وغیرہ کے کلام میں "کیونکر" کے معنوں میں "کیونکے" کے استعمال کا ذکر کیا ہے اور 'کیونکے' کے بجائے "کیونکہ" چھاپنے کو مرتبین کی اصلاح بلکہ تصحیف قرار دیا ہے۔ ان کو اس کا اعتراف ہے کہ تحریری زبان سے "کیونکے" خارج ہو چکا ہے لیکن یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض مقامات کے فصحا بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی رائے ہے کہ اگر "کہ" اردو لفظ "کر" کا قائم مقام ہو تو "کے" لکھا جائے۔ ان کے الفاظ میں :-

"کیونکر کی جگہ اگلے وقتوں میں 'کیونکے' بولتے تھے اور 'ے' کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے 'کیونکہ' یعنی 'کیوں کہ' جس میں 'کہ' فارسی کا کاف بیانیہ ہے، لوگوں نے 'کہ' اور 'کے' کے معنوں میں فرق نہ کرکے 'کیونکے' کو "کیونکہ" بنا دیا اور پرانے استادوں میر، سودا، درد وغیرہ کے دیوانوں میں اصلاح فرما دی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں تصحیف ہے 'کیونکر' کے معنی میں 'کیونکے' اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہو گیا ہے لیکن بعض مقامات کے فصحا بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اس لفظ سے کہیں نہ کہیں دو چار ہوں گے۔ اس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ 'اگر اردو لفظ 'کر' کا قائم مقام ہو تو 'کے' لکھا جائے۔ جیسے

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی

اور اگر فارسی لفظ ہے جیسے 'اس لیے کہ' اور 'کیوں کہ' وغیرہ میں تو 'کے' صحیح نہ ہوگا۔"[1]

بظاہر دلیل یہ ہے کہ 'کیونکے' میں 'کے'، 'کر' کا قائم مقام ہے لیکن یہاں تو اس کی صراحت کی گئی ہے اور نہ کوئی مثال پیش کی گئی ہے۔ اس کی نوبت دیباچہ کلیات ولی جدید (۱۹۴۵ء) میں آئی جب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنی رائے کو (غالباً مقبول نہ ہونے کی وجہ سے) کسی قدر شدت کے ساتھ دہرایا :-

" آخری دور کے شاعروں نے یہ الٹی گنگا بہائی کہ زبان کو رسم کتابت کا تابع کرکے زبان پر قیدیں لگائیں۔ اس میں لوگوں نے بعض ایسی غلطیاں کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی: ایک لفظ تھا: کیوں کر۔ کر کا بدل ہے کے۔ اس لیے 'کیونکر' کا بدل ہوا 'کیوں کے'۔ بالکل اسی طرح جیسے آکر، جاکر، کر کر کی جگہ آئے، جائے، کرکے بھی بولتے ہیں۔ پرانے زمانے میں 'کیونکے' لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ تھا 'کیوں کہ' (جس کا پہلا ٹکڑا ہندی، دوسرا فارسی ہے) اس کا بدل ہے 'کس لیے کہ' یا 'اس لیے کہ'۔ بھلا فارسی 'کہ' کو ہندی 'کے' سے جو 'کر' کا قائم مقام ہے کیا واسطہ۔ مگر اصرار ہے کہ 'کیونکے' غلط ہے 'کیونکہ' لکھو۔ اگر کوئی کہے کہ یہ لفظ اب بولا نہیں جاتا تو یہ دعوا بھی غلط ہے۔ دلی والے آج بھی بولتے ہیں اور اس کی صحیح کتابت کیونکے (یا کیوں کے) ہے . . . .

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ولی کے کلام میں اس کے علاوہ 'جیوں کر' اور 'جیوں کے' بھی ہے (مثلاً غزل ۱۵) اور معنے اس کے: 'جس طرح، جس ڈھنگ یا وجہ سے'۔"[2]

[1] : اردو املا۔ مقالات صدیقی، پہلا حصہ، مرتبہ مسلم صدیقی، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۱۰۱-۱۱۰۔ ہند ستانی 'الہ آباد' جنوری ۱۹۳۱ء اور اس سے ماخوذ اقتباسات اور اس اقتباس میں کچھ لفظی فرق ہے جسے مصنف کی نظرِ ثانی مان کر ترجیح دی گئی ہے۔

[2] مقالات صدیقی، ص ۲۳۵

۳۹۔ مالویہ نگر، بھوپال، ۴۶۲۰۰۳

اردو نے "کر" سے "کے" کی طرف سفر کیا لیکن یہ سفر بعد کا ہے۔ یہاں معاملہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ جب "کیونکے" لکھا گیا تو "کیونکر" بھی موجود تھا اور "کے" بمعنی "کر" کی مثالیں نہیں ملتیں۔ لیکن زیادہ قدیم زبان یعنی دکنی اردو میں "کے" کی ایک معنی "کر" ملتا ہے۔[1] ولی کے کلام میں "جیوں کر" کے ساتھ "جیوں کے" کی نشاندہی سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ دکنی اردو میں "کے" "کر" کا بدل تھا کیونکہ اس سے پہلے شیخ محمد اشرف اشرفی کی مثنوی نوسرہار میں "جیوں کر" موجود ہے:

آیا جیوں کر نھیں پر بہار رُتے

صوتی یعنی تلفظ کے اعتبار سے اردو میں "ک" چار طرح ہے: کَ، کِ، کُ اور کی یہی سبب ہے کہ قدیم مخطوطات میں "کہ" جا بجا "کے" اور "کی" بھی لکھا ہوا ملتا ہے اور سہو کتابت کی بنا پر آج بھی بعض اوقات "کہ" کو "کے" لکھ دیا جاتا ہے۔ "کہ" کے تلفظ کی مناسبت سے "کیونکہ" کے دو صحیح تلفظ یعنی "کیونکہ" اور "کیونکہ" بھی ہمیشہ سے زبانوں پر ہیں اور "کیونکے" اور "کیونکی" بھی۔ لہٰذا جہاں تک بول چال کا تلفظ اور نثر میں پڑھنے کا تعلق ہے "کیونکہ" اور "کیونکے" میں امتیاز کرنا ممکن نہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے زمانے کے بعض مقامات کے فصحا کے تلفظ میں یہ امتیاز کس طرح کر لیا تھا۔ نظم میں "کیونکے" کا تلفظ فارسی "کاشکے" کی طرح ہونا چاہیئے۔ جیسے ان شعروں میں:

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں (میر)

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لیے ہوتے (غالب)

لیکن "کیونکے" اس طرح نہیں آتا بلکہ ہمیشہ "کیونکہ" کے وزن پر آتا ہے مثلاً:

کیونکے ترا کھلے ہے کوئی اب فریب
حال مرا سب کو خبر کر گیا (سودا)

تھے اسباب مرنے کے سب تیرے غم میں
جیا کیونکے اب تک یہ حیرت ہے مجھ کو (میر)

فرہنگِ اردو الفاظ میں آخر کی "یے" کا تقطیع سے گرنا جائز ہے۔ لیکن "ن" کا گرنا جائز نہیں۔ اگر "کیونکے" کوئی علیحدہ لفظ ہوتا تو کہیں تو "کاشکے" کے وزن پر یعنی اپنے پورے تلفظ کے ساتھ نظم کیا جاتا۔ دراصل "کیونکے" کا مسئلہ صرف کتابت کا تھا جہاں وزن اجازت دیتا تھا

وہاں شعرا "کیونکر" ہی استعمال کرتے تھے مثلاً:

عمرِ دراز کیونکر تمت از خضر ہے ہاں
اک آدھ دن میں ہم تو جینے سے سیر آئے (میر)

کیونکر نہ چاک چاک گریباں [illegible]
دیکھوا ہوں تیری زلف کو میں دست دسانے میں (سودا)

ملے شراب جو انان باغ کو کیونکر
کہ آب پہ معدماں رنجش خمار میں ہے (انشا)

بلائے سامنے کیونکر مجھے وہ پردہ نشیں
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا (ذوق)

حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (مومن)

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز (غالب)

ان موقعوں پر "کیونکے" بھی آسکتا ہے لیکن لکھا ہوا نہیں ملتا سوا اس کے کہ غلطی سے لکھ دیا گیا ہو۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے ۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آچکی تھی لیکن مولوی عبدالحق نے قلمی نسخوں سے ترتیب دے کر ۱۹۳۵ء میں دیوانِ تاباں اور نکات الشعرا (دوسرا ایڈیشن) شائع کیا تو اس کی تقلید نہیں کی اور "کیونکہ" ہی چھاپا مثلاً:

تاباں فلک سے کیونکہ بھرے ساغر مراد ۔۔۔ رہتا ہے واژگوں یہ پیالہ حباب کا

کیونکہ پھوڑوں غم ہے اس کے سر طرح فرہاد ۔۔۔ یار میرا اور کا ہو جائے گا شیریں کی طرح

سر اپنا ان نے جیب [illegible] عاشقی میں ۔۔۔ کوئی فریاد سے بد کیونکہ سر [illegible][1]
تاباں

ترے اگو سحر آنکھوں سے آنسو کیونکہ چلتے ہیں ۔۔۔ جو تو دریا پہ گزرے ہے تو پانی بہہ نہیں سکتا
سودا

کیونکہ کہیئے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا ۔۔۔ گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی[2]
(میر)

---

[1] دیکھیئے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ از فخر دین نظامی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۲۶۰، دکھنی لغات مرتبہ سید ابو تراب خطاط کی ضامن، ص ۱۰۳ اور کلیاتِ شاہی مرتبہ سید مبارز الدین رفعت، ص ۲۳۱۔

[2] دکنی اردو کی لغت، مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں و ڈاکٹر غلام عمر خاں، ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۴

[1] دیوان تاباں مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) ص ۲۷، ۵۰، ۵۹

[2] نکات الشعرا مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) ص ۳۳، ۱۲۴

لیکن بعد کے کئی محققین نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے کے زیر اثر "کیونکر" کس طرح اور کیسے وغیرہ کے معنوں میں "کیونکہ" کو "کیونکے" سے بدل دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اسے املا کی اصلاح میں بھی داخل کر دیا ہے۔ "کیونکے" کو "کیونکہ" لکھنے کی غلطی کی اصلاح کو ضروری قرار دینے کے بعد ایک حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں پر نوراللغات کی ایک غلطی کی اصلاح ضروری ہے: "کیونکہ" کے ذیل میں اس میں لکھا ہوا ہے: "کیونکہ (دہلی)۔ اس لیے کہ، اس طرح پر کہ۔ لکھنؤ میں اس جگہ "کیونکر" بولتے ہیں۔ مومن: کیونکہ امید وفا سے ہو تسلی دل کو ؎ فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا۔" مؤلف نے "کیونکہ" اور "کیونکے" کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ مومن کے شعر میں "کیونکے" ہے۔ اگر کسی کاتب کم سواد نے یہاں "کیونکہ" لکھ دیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دہلی میں "کیونکہ" اس معنی میں بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے آصفیہ کے اندراج کو غور سے نہیں دیکھا۔ اس میں صحیح طور پر دونوں لفظوں کو الگ لکھا گیا ہے۔ "کیونکہ" کے ذیل میں اس میں یہ عبارت ہے: "کیونکہ" برائے علت، اس لیے کہ، اس واسطے کہ، اس طرح پر کہ، اس سبب سے کہ۔ اس کے بعد "کیونکے" کے ذیل میں لکھا ہے: "کیونکے" تابع فعل، دیکھو کیونکر۔ واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ "کیونکے" اور "کیونکر" ہم معنی ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ بہر صورت، مؤلف نور کا یہ لکھنا کہ دہلی میں "کیونکے" (د) کے معنی میں "کیونکہ" ہے صحیح نہیں۔"[1]

مؤلف نوراللغات سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انھوں نے دہلی میں "کیونکہ" کے ایک معنی "اس لیے کہ، اس طرح پر کہ" لکھے ہیں جبکہ ان کی مراد دوسرے معنی "کس لیے، کس طرح" سے ہے۔ جیسا کہ ان کے زمانے کے املا سے ظاہر تھا۔ ان کو یہ لکھنا چاہیے تھا کہ دہلی میں اس معنی کو کس لیے، کس طرح پر یعنی "کیونکر" کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ان سے مثال کا شعر اخذ کرنے میں بھی سہو ہوا ہے۔ مومن کے شعر میں "کیونکہ" کاتب کی کم سوادی پر دال ہے لیکن اس کا پہلو مختلف ہے۔ یہاں بحر میں "کیونکر" آسکتا تھا اس لیے کیونکہ اور کیونکے دونوں کے بجائے "کیونکر" لکھنا چاہیے تھا۔

کیونکر امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو

یہ مثال صحیح معنوں میں مؤلف نوراللغات کے کام کی نہ تھی۔ ان کی رائے میں "بھی" کی بھی کمی ہے۔ اگر وہ یوں لکھتے کہ لکھنؤ میں "کیونکہ" صرف مروج معنی میں اور دہلی میں مروج معنی کے ساتھ ساتھ "کیونکر" کے معنی میں بھی مستعمل ہے تو یہ واضح اور صحیح ہوتا۔ فرہنگ آصفیہ کا اندراج بھی کوتاہیوں سے خالی نہیں۔ اس میں "کیوں کے" کے تحت "(د) تابع فعل۔ دیکھو کیونکر" تو لکھا ہے لیکن معمول کے خلاف کوئی مثال نہیں دی گئی۔ ادھر "کیونکر" کے ذیل میں "کیونکے" کا کوئی ذکر نہیں۔ پورے لغت میں صرف مذکورہ مقام پر "کیونکے" لکھا گیا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ "کیونکہ" کے دوسرے معنی نہ لکھنے کے باوجود اشعار مثالیہ میں "کیونکر" کے مترادف کے طور پر ہر جگہ "کیونکہ" لکھا ہے۔ اتنے ضخیم لغت میں ایک لفظ کی تسوید کا جائزہ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے کہیں میری نظر چوک گئی ہو تو اور بات ہے ورنہ "کیونکے" ایک شعر میں بھی نہیں لکھا گیا۔ چند الفاظ و محاورات کے تحت فرہنگ آصفیہ کی چاروں جلدوں سے متعلقہ اشعار ملاحظہ ہوں:

۱۔ آ	کیونکہ واں جاؤں دلا تو مجھے بتلا تو سہی جو کہے دور ہی سے دیکھ کے یاں آ تو سہی
	معروف
۲۔ آثار	یہی روتا ہے تو طوفاں کا خطر کیونکہ نہ ہو اس کے بھی ہیں وہی آثار خدا خیر کرے
	جرأت
۳۔ چھڑا	فرہاد و قیس ساتھ تھے سب کب کے چل بسے دیکھیں نباہ کیونکہ ہو اب ہم چھڑے رہے
	میر
۴۔ فرشتے کا لگاؤ نہ ہونا	کیونکہ جرأت لگائیں ہم لگا کہ فرشتے کا واں لگاؤ نہیں
۵۔ قیامت برپا یا بپا ہونا	کیونکہ کہیے نہیں کوئی آگاہ اک قیامت بپا ہے یاں ہر راہ
	میر
۶۔ گھر کرنا	کہیں ہیں دل کو تو سب خانۂ خدا معروف بتوں نے اس میں کیا کیونکہ گھر خدا جانے
۷۔ مراد حاصل ہونا	فروغ مے سے نہ کیونکہ ہووے ایاغ روشن مراد حاصل مثل یہ مشہور ہے جہاں میں چراغ روشن مراد حاصل
	انشا

مؤلف فرہنگ آصفیہ سے یہ چوک تو ضرور ہوئی کہ انھوں نے "کیونکہ" بمعنی "کیونکر" نہیں لکھا لیکن دوسرے مناسب موقعوں پر اس مفہوم میں "کیونکے" کے بجائے "کیونکہ" لکھ کر انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ایک زمانے سے اس مفہوم میں بھی اس لفظ کا یہی املا متعین اور مروج ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے دیوانِ میر نسخۂ محمود آباد، مکتوبہ ۱۲۰۴ھ، بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور حواشی میں کئی اہم قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے اختلافات کی نشاندہی بھی کی ہے قطع نظر اس کے کہ انھوں نے دیوان کے متن میں قلمی نسخے کے مطابق "کیونکے" لکھنا ضروری تصور کیا ہے، ان کی اس محققانہ ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخے میں "کیونکر" کے معنی میں زیادہ تر "کیونکے" ہے لیکن کم سے کم دو موقعوں پر "کیونکہ" بھی ہے۔

[1] اردو املا از رشید حسن خاں، ۱۹۷۴ء ص ۳۱۰، ۳۱۱

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کا کیا　　　کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا

دل تجھ پہ جلے نہ کیوں کہ میرا بیتاب　　　یاں تجھ کو توقع ہے کہ لاتا ہے جواب
واں ان نے شراب پی کے مستی میں میرؔ　　　کر کھائے بھی نامہ بر کبوتر کے کباب

ایک اور مصرع میں متن میں "کیوں کہ" ہے۔ لیکن حاشیے میں لکھا ہے کہ قلمی نسخے میں "کیونکی" ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس لفظ کو "کیونکی" بھی لکھتے تھے "اس لیے کہ" کے معنی میں "کیونکہ" صرف ایک جگہ ہے :

تیری توجہ ہے ضروری ادھر　　　کیونکہ یہ ناکام کا اتنا ہے کام[1]

اس ترتیب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض پرانے مطبوعہ نسخوں میں زیادہ تر "کیونکے" کے بجائے "کیونکہ" ہے لیکن معدودے چند موقعوں پر "کیونکے" بھی ہے۔ "کیونکی" غالباً صرف ایک جگہ ہے۔

دیوان درد کا قدیم ترین مخطوطہ (مکتوبہ ۱۱۹۴ھ) ڈاکٹر فضل امام کی دریافت ہے جسے انھوں نے مخطوطے کے املا کے مطابق شائع کیا ہے۔ اس میں ایک شعر اس طرح ملتا ہے :۔

(کیوں کہ) تشبیہ ترے ساتھ اسے دے کوئی　　　شمع کو آتی نہیں طرح دل افروزی کی[2]

قدیم کتابت میں "کیونکے" لکھنے کا رجحان بہت حاوی تھا لیکن "کیونکہ" اور "کیونکی" لکھنے کی جو چند مثالیں ملتی ہیں، ان کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ کیونکی (اور کیونکی بھی) "کیونکہ" کے متبادل کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ اس کی تہ میں بول چال کا تلفظ تھا جو آج بھی کیا جاتا ہے ورنہ شعر میں یہ ہمیشہ "کیونکہ" کے وزن پر یعنی ہائے مختفی کی تخفیف کے ساتھ آتا تھا۔ یہ احتمال کہ "کے" بدل تھا "کر" کا، اس لحاظ سے اور بھی ضعیف ہے کہ شعرا نے "کیونکر" کے بعد "کے" اور "کہ" بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

کیونکر کے ہیں کوئی فریبندہ لبھالے　　　آخر ہیں تری آنکھوں کے ہم دیکھنے والے[3]
میرؔ

کیونکر کہ ہو خدایا اس بت کے بن گزارا　　　آنکھوں میں رات کاٹی مر مر کے دن گزارا[4]
مغفورؔ

ان مثالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ایک طرف تو "کے" "کر" کا متبادل نہیں تھا اور دوسری طرف "کے" (اور "کی" بھی) "کہ" کے بدل کے طور پر لکھ دیا جاتا تھا۔

قدیم قلمی نسخوں میں "کیونکے" اپنی صوتی اور صرفی کوتاہیوں کی وجہ سے کوئی معتبر املا نہ تھا۔ لہٰذا ہندوستانی چھاپے خانے، کلکتہ میں ۱۹۱۱ء/۱۲۲۶ھ میں نستعلیق ٹائپ میں پہلی بار کلیات میر طبع ہوا تو اس میں تقریباً سبھی موقعوں پر "کیونکہ" چھاپا گیا۔ یہ اس لفظ کے املا کی ایک نہایت مناسب اصلاح تھی جس پر میرؔ و سوداؔ کی زبان سے ناواقفیت کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس کلیات کی تصحیح کرنے والوں میں مرزا کاظم علی جوان دہلوی اور مرزا جان طپشؔ دہلوی (شاگرد خواجہ میر دردؔ) شامل تھے۔ اس کے بعد کی اہل دہلی کی قلمی اور مطبوعہ کتابوں میں بھی عام طور پر "کیونکے" کے بجائے "کیونکہ" ملتا ہے۔ مثلاً نسخۂ بھوپال بخط غالب (۱۸۱۶ء/۱۲۳۱ھ) میں "کیوں کہ" یا "کیونکہ" لکھا گیا ہے :۔

۱۔　جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
۲۔　چھپاؤں کیونکہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی
۳۔　نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی[1]

اوپر کا آخری مصرع وہی مصرع ہے جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے "کیونکہ" کے بجائے "کیونکے" لکھنے کی ہدایت کی ہے۔

دیوان غالب نسخۂ بھوپال (۱۸۲۱ء/۱۲۳۷ھ) کاتب کا لکھا ہوا تھا۔ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق (۱۹۲۱ء) متداول کلام کے اضافے کے ساتھ اسی قلمی نسخے سے شائع کیا گیا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے بھی ۱۹۳۸ء میں نسخۂ بھوپال کا مطالعہ کیا تھا اور نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق کے متن کو بنیاد بنا کر اختلافات نوٹ کر لیے تھے۔ انھوں نے صرف قلمی نسخے کے کلام کو اس کی انفرادیت کے ساتھ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ اگرچہ ان دونوں مرتبین نے قلمی نسخے کے املا کے اختلافات کی صراحت نہیں کی ہے لیکن گمان غالب ہے کہ دونوں مطبوعہ نسخوں، خصوصاً پروفیسر حمید احمد خاں کے نسخے میں اس لفظ کا وہی املا منتقل ہوا ہے جو قلمی نسخے میں تھا۔ دونوں مطبوعہ نسخوں میں "کیونکہ" ہی چھاپا گیا ہے۔[2] دیوان غالب نسخۂ شیرانی قیاساً ۱۸۲۶-۲۷ء کا ہے۔ اس میں بھی تینوں مصرعوں میں "کیونکہ" ہے۔[3]

آگے چل کر مطبوعہ کتابوں میں بھی بالعموم "کیونکہ" ہی ملتا ہے۔ مولوی کریم الدین کا تذکرہ "طبقاتِ شعرائے ہند" ۱۸۴۸ء میں دہلی میں طبع ہوا۔ مؤلف نے مومنؔ سے اپنے مراسم کا ذکر کیا ہے اور دو جگہ لکھا ہے کہ دیوان مومنؔ انھوں نے چھپوایا تھا۔ اتفاق سے

---

[1] نقوش، لاہور، میر نمبر (حصہ اوّل)، ۱۹۸۰ء، ص ۱۹۷، ۲۱۵، ۲۰۲ اور ۴۶۳۔ دیوان میر مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری علیحدہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔
[2] دیوان دردؔ کا نقش اوّل، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۲
[3] نقوش، لاہور، میر نمبر (حصہ اوّل)، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۴
[4] فرہنگ آصفیہ، جلد اوّل، ص ۲۸۳

---

[1] نقوش لاہور، غالب نمبر حصہ دوم مع بیاض غالب بخط غالب اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۱۴۸، ۱۹۸، ۲۰۱
[2] دیکھیے دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق، ۱۹۲۱ء، ص ۱۱۰، ۱۷۰ اور ۱۹۵ اور دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۳، ۲۰۴ اور ۲۵۱۔
[3] دیکھیے دیوان غالب، نسخۂ شیرانی (عکس)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ورق ۵۵-ب، ۷۵-الف اور ۹۴-الف

اس تذکرے میں کئی شعرا کے انتخاب کلام میں ایسے اشعار آگئے ہیں جن میں "کیونکر" کے معنی میں "کیونکہ" لکھا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہیں :-

کیونکہ گزرے گی بھلا دیکھو تو ∴ گر اسی طرح سے شرمائیے گا
درد

غیر سے مل کیونکہ ہم چشموں سے پھر ہوگے دوچار ∴ آئینہ تک منھ دکھاتا تجھ کو مشکل ہوئے گا
سوز

اشکوں سے نہ ہو کیونکہ حسن راز دل افشا ∴ پانی کے چھڑکنے ہی سے بو ہوتی ہے خس میں
میر حسن

چین سے کیونکہ میں سوؤں کہ شب ہجر مجھے ∴ یاد آتا ہے وہ راتوں کا جگانا تیرا
مصحفی

سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں ∴ نہ پایا محرم اپنے راز داں کو[1]
مومن

اس تذکرے میں انشا کا کوئی ایسا شعر نہیں آیا لیکن کلیات انشا مطبوعہ ۱۸۵۵ء میں ایسے چند شعر ہیں۔ مثلاً :-

کیونکہ میں جیسے کو تیسا ہی نہ پھر آؤں نظر ∴ یعنی کیا معنی نہ ہو آئینہ پن آئینہ میں

سیکڑوں آنکھیں کنہیا بن کے غوطہ کھا گئیں ∴ کیونکہ انشا نانو تیری نہ سمجھوں برمولئد[2]

انیسویں صدی کی مطبوعات میں یہ املا اتنا عام ہوگیا تھا کہ اسے کبھی کبھی ایسے شعروں میں بھی سہواً لکھ دیا جاتا تھا جن میں وزن کے مطابق "کیونکر" آسکتا تھا اور لکھا جانا چاہیے تھا۔ گلشن بے خار، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۴ء میں کئی شعروں میں یہ صحیح لکھا گیا ہے، مثلاً:-

جھپکے اجل سے کیونکہ مری آنکھ وقت نزع ∴ بسمل ہوا ہوں میں کسی بانکی نگاہ کا
جرأت

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ مجھ بغیر ∴ اس گفتگو سے فائدہ پیارے گزر گئی
سودا

بیداد گزشتہ کی کریں کیونکہ شکایت ∴ اس کو وہ مزا یاد دلانا نہیں اچھا
محمود

سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں ∴ نہ پایا محرم اپنے راز داں کو
مومن

لیکن ایک شعر میں جہاں اس مفہوم میں "کیونکر" آسکتا ہے "کیونکہ" لکھا ہے :-

کیونکہ اس بت کو یہ جان دل ناکام لکھوں ∴ کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھوں
زار

تاہم یہ سہو ہے، خواہ مؤلف کا ہو یا کاتب کا، جو "کیونکر" کے مفہوم میں "کیونکہ" کے مروج املا سے وارد ہوا ہے۔ دوسرے شعروں میں "کیونکر" صحیح لکھا گیا ہے :-

بیدار کیونکر آتش دل اشک سے مجھے ∴ ظاہر کی آگ ہووے تو پانی بجھا سکے
بیدار

دہاں ہے یہ بدگمانی جائے حجاب کیونکر ∴ دو دن کے واسطے ہو کوئی خراب کیونکر
جرأت

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجیے کیونکر ∴ ایک تو یار ہے اور تس پہ طرح دار بھی ہے
درد

کیونکر امید وفا سے ہو تسلی دل کو ∴ فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا[1]
مومن

میر و سودا وغیرہ کے کلام کے قلمی نسخوں میں جس لفظ کو "کیونکے" لکھا گیا ہے وہ "کیونکر" کے معنوں میں "کیونکہ" ہی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس املا کی اصلاح ہوئی اور "کیونکہ" لکھا جانے لگا۔ اس اعتبار سے اگر قدما کے کلام میں "کیونکے" کے بجائے "کیونکہ" لکھا یا چھاپا گیا ہے تو یہ محض املائی اصلاح تھی جسے قبول عام بھی حاصل ہوا جلن کے علاوہ صوتی اور صرفی پہلوؤں سے بھی یہ املا درست ہے۔ اسے کاتبوں یا مرتبوں کی تصحیف نہیں کہا جاسکتا۔ اب اسے بدل کر ایک بار پھر "کیونکے" لکھنا الٹی گنگا بہانے کے برابر ہے۔ افسوس ہے کہ یہ الٹی گنگا بہائی گئی ہے۔ میر و سودا وغیرہ کے کلام کے جدید مرتبین نے ایک بار پھر "کیونکے" شائع کر دیا ہے، یہاں تک کہ دیوان غالب کی بعض اشاعتوں میں یہ املا داخل کر دیا گیا ہے۔

تلفظ اور املا میں کوئی فرق نہ ہو تو قدیم متون کو ان کے اصل املا میں ترتیب دینا ضروری نہیں کسی خاص وجہ سے اس کی ضرورت ہو تو یہ طریقہ ایک لفظ یا چند لفظوں تک محدود نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اسے پورے متن پر حاوی ہونا چاہیے۔ قدیم متون کو عام طور سے مروجہ املا میں ترتیب دیا جاتا ہے اور بہت سے الفاظ کا املا بدل کر لکھا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختلاف املا کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ قدما کے کلام میں "کیونکہ" بمعنی "کیونکر" کے ذیل میں اس طرح کی صراحت کی جاسکتی ہے۔ ذوق، مومن او غالب کے کلام کی تدوین میں اس کی بھی حاجت نہیں، کیونکہ ان کے زمانے میں یہ املا متعین و مروج ہو چکا تھا۔ اس کے بعد خود اہل دہلی نے "کیونکہ" بمعنی "کیونکر" بالعموم ترک کر دیا اور یہ لفظ صرف "اس لیے کہ" "اس واسطے کہ" وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اب یہ پیرایۂ بیان کے آخر کے حصے کی ابتدا میں اظہار دلیل کے لیے آتا ہے مثلاً :-

"افسوس کرتا ہے کہ جادۂ راہ فنا تیز دم شمشیر نہیں، کیونکہ شمشیر دم بھر میں

باقی ص ۱۹ پر

---

[1] طبقات شعرائے ہند از کریم الدین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۸۲، ۱۴۵، ۲۱۵، ۳۵۱ اور ۴۴۵۔

[2] کلیات انشا مطبع دہلی اردو اخبار، ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱ھ، ص ۵۱، ۱۰۵

[1] عکس شائع کردہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، مثالوں کے لیے دیکھیے سلسلے وار ص ۴۷، ۴۷، ۱۰۳، ۱۷۳، ۲۰۳ - ۹۱ - ۳۷، ۴۸، ۷۱ اور ۱۹۷۔ زار کے شعر میں بظاہر "جان" کے بجائے "حال" ہونا چاہیے۔

رام لعل نابھوی

رام لعل نابھوی

منشی بھگونت رائے راحت کاکوروی

دُنیائے مثنوی کا درخشندہ ستارہ

منشی بھگونت رائے راحت قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ آپ کے والد منشی دین دیال وہاں کے رئیس تھے، کائستھ سری واستو تھے۔ سید امانت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی زبانوں پر دسترس تھی۔ فن سخن میں مہارت تھی۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ مثنوی سے گہرا لگاؤ تھا۔ بادشاہ واجد علی شاہ کے زمانۂ سلطنت میں بقید حیات تھے۔ مثنوی "بہارستان راحت" ترجمہ قصہ منوہر و مدھو مالت اور "نگارستان راحت۔ ترجمہ مثنوی غنیمت" میں اس بادشاہ کی تعریف لکھی ہے۔
۱۸۳۶ء / ۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور سال وفات ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۰ھ ہے۔

تذکرہ نگاروں نے راحت کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سخت اختلاف ہے سب سے پہلا تذکرہ منشی دیبی پرشاد بشاش کا "تذکرہ آثار الشعرائے ہنود" ستمبر ۱۸۸۵ء میں چھپا۔ اس میں راحت کی صرف دو مثنویوں، مثنوی "زہرہ و بہرام" اور "نل دمن" کا ذکر ہے۔ خواجہ عشرت لکھنوی کا تذکرہ "ہندو شعرا" ۱۹۳۱ء میں چھپا۔ اس میں راحت کی پانچ مثنویوں "نل دمن، غنیمت اردو، مدھو مالتی، زہرہ بہرام اور بوستان راحت کا ذکر ہے۔ کل ملا کر تذکروں میں ۶ مثنویوں کا بیان ہے۔ وہ ہیں:

۱۔ بہارستان راحت۔ ترجمہ قصہ منوہر و مدھو مالت
۲۔ نل دمن ہندی
۳۔ بہارستان کلام عرف قصہ زہرہ بہرام
۴۔ نگارستان راحت۔ ترجمہ مثنوی غنیمت
۵۔ مثنوی سوز عاشقانہ
۶۔ مثنوی بوستان راحت۔ قصہ شہزادہ ختن

ان چھ مثنویوں کے علاوہ رائے بہادر پریاگ دیال نے جو راحت کے چچا کے پرپوتے تھے، اپنے ایک خط میں جو محمد باقر کے خط کے جواب میں ۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لکھا، دو اور مثنویوں کا پتہ دیا۔ وہ ہیں:۔

۱۔ گلزار نسیم ۲۔ گلستان راحت

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ یہ نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کی تھیں۔

یہ قصہ بھی دلچسپ ہے۔ محمد باقر کو مثنوی زہرہ بہرام کا ایک عمدہ مخطوطہ نمبر .U.I.VI.20 جامعۂ پنجاب کے کتب خانے میں ملا۔ تلاش کرنے کے باوجود اس مخطوطہ کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کی نقل کا ذکر یا تفصیل کسی اور کتب خانے کی فہرست میں نہیں ملی۔ لکھتے ہیں:

"راحت آنجہانی کے سوانح حیات کی تحقیق کے سلسلے میں مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ان کے مکان پر کاکوری ایک خط بھیج دیا جائے تو ممکن ہے۔ یہ خط ان کی اولاد میں سے کسی کو مل جائے اور مجھے کچھ معلومات حاصل ہو جائیں ـــــ

چنانچہ میرا قیاس صحیح نکلا۔ راحت آنجہانی کی نسل تو ختم ہو چکی تھی لیکن میرا خط پھرتا پھراتا راحت کے چچا کے پرپوتے رائے بہادر پریاگ دیال کے پاس لکھنؤ پہنچ گیا۔ انھوں نے از راہ کرم جو جواب دیا، وہ درج ذیل ہے:

۸۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ

۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء

محترم بندہ،

آپ کا مسوری سے لکھا ہوا ۱۲ جولائی ۱۹۴۱ء کا وہ خط مجھے بہت دیر سے ملا۔ جو آپ نے بزرگان لالہ بھگونت رائے راحت کاکوری کے پتے پر بھیجا تھا۔

چونکہ منشی بھگونت رائے راحت آنجہانی میرے بزرگ تھے۔ اس لیے میں آپ کو ضروری معلومات بہم پہنچا کر بہت مسرت محسوس کرتا ہوں۔ ۶۵ سال کے قریب ہوئے کہ شاعر فوت ہوا تھا۔ ان کا صرف ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام امبیکا پرشاد تھا۔ یہ لڑکا جوان ہی فوت ہو گیا تھا اور ان کی صرف ایک ہی لڑکی تھی جس کی شادی ضلع اناؤ میں ہوئی ہے۔ شاعر مندرجہ ذیل کتب کا مصنف تھا۔ انھوں نے کچھ اور بھی کتابیں لکھی تھیں، جن کا مجھے علم نہیں:۔

۱۔ گلزار نسیم ۲۔ بوستان راحت ۳۔ گلستان راحت۔ یہ نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کی تھیں۔

میں ایک مختصر سا شجرہ بھیج رہا ہوں جس سے شاعر کے قریبی رشتہ داروں کا پتہ آپ کو مل سکتا ہے۔

مخلص پریاگ دیال

محلہ دیوان، نابھا۔ ۱۴۷۲۰۱، پنجاب

محمد باقر رقمطراز ہیں:

"میں نے رائے بہادر صاحب اور نول کشور پریس سے ان مثنویوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کتابیں نایاب ہونے کی وجہ سے مجھے نہیں مل سکیں۔"[۵]

اوپر کی بحث سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ راحتؔ کی کل ۸ مثنویاں تھیں۔

سری رام مؤلف "خمخانۂ جاوید" نے بھگونت رائے راحت کا ذکر کرتے ہوئے اتنا لکھا ہے:

"آپ نے ایک مثنوی "زہرہ و بہرام" اور مثنوی "نل دمن" لکھی تھیں، جو اب کمیاب ہیں، بعد تلاش ایک مثنوی "سوز عاشقانہ" دستیاب ہوئی جس کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانۂ سلطنت میں قید حیات تھے، بعد غدر انتقال کیا۔"[۶]

مختصر یوں کہ سری رام مؤلف "خمخانۂ جاوید" کو مثنوی "سوز عاشقانہ" اور محمد باقر کی مثنوی "زہرہ و بہرام" کے مخطوطہ کے علاوہ راحتؔ کی کوئی مثنوی بسیار تلاش پر نہیں ملی۔ غالباً کوئی مضمون راحتؔ کاکوری کی تصنیفات پر بھی نہیں لکھا گیا نہ کبھی ان کی شخصیت کا احاطہ کیا گیا۔

اس وقت میرے سامنے راحتؔ کی لکھی اور چھپی ۴ مثنویوں کے علاوہ "مثنوی سوزِ عاشقانہ" کا انتخاب مندرجہ "خمخانۂ جاوید" جلد سوئم اور محمد باقر کا مضمون "مثنوی زہرہ و بہرام" جو اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۴۳ء میں چھپا، رکھے ہیں۔ ہر ایک مثنوی کا مختصراً تجزیہ کرنے سے پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مثنوی بہارستان کلام عرف قصۂ زہرہ و بہرام

مطبع پنڈت بھگوان داس چھپی۔ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ طباعت درج نہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء بادشاہ غازی الدین حیدر خاں کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ مصنف نے مثنوی کے اختتام پر تاریخ تصنیف یوں درج کی ہے۔

جو یہ حال سب عشق کا لکھ چکا خیال آیا پھر مجھ کو تاریخ کا
تو یہ ہاتفِ غیب نے اس زماں کہا کیا ہی ہے خوب نو داستاں

مصنف آگے لکھتے ہیں:

ہیں اک لالۂ بے بدل رام دیں تخلص فرح شاعرِ نکتہ چیں
سنی جب کہ یہ داستانِ نگار خوشی سے کہا ہے یہ باغ و بہار

ان سے ۱۲۴۱ اعداد کا پتہ چل گیا۔

اس مثنوی کا قلمی نسخہ جامعۂ پنجاب میں موجود ہے۔ اس کا نمبر U.I.VI.20 ہے۔

مثنوی نل دمن ہندی

اس مثنوی کے دو نسخے ایک مطبع علوی لکھنو کا اور دوسرا مطبع ماہتاب ہند کا موجود ہے۔ پہلے نسخے کے ۴۸ صفحات ہیں اور دوسرے نسخے کے ۴۳ صفحات ہیں۔ پہلے نسخے کے آخری صفحہ کی دو لائنیں پھٹی ہوئی ہیں۔ اس لیے تاریخ طباعت کا پتہ نہیں لگ سکا۔ دوسرا نسخہ مئی ۱۸۶۶ء میں چھپا۔ اس مثنوی کے ۹ ایڈیشن ۱۸۸۸ء تک چھپ چکے تھے جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۵۶ء کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ہے۔ نشان نمبر ۵۵ ہے۔ مثنوی لکھنے کی تاریخ ۱۲۴۴ھ درج ہے جو یوں ہے:

مرے ہیں ایک مشفق کالی پرشاد ہوئے اس مثنوی کو سن کے جو شاد
عنایت کر اسی دم غور میں آ کہا یہ داستاں ہے راحت افزا
۱۲۴۴

نگارستان راحت۔ ترجمہ مثنوی غنیمت

مطبع گلزار اودھ لکھنؤ میں ۱۲۸۳ھ میں چھپی۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں تاریخ نامہ درج ہے۔ اس کی رو سے ۱۲۵۹ھ ـ ۱۲۶۸ھ اور ۱۲۶۴ھ کی تاریخیں درج ہیں۔ مثنوی غنیمت کا نام "نیرنگ عشق" ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اس مثنوی فارسی اور ترجمہ مثنوی غنیمت اردو کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خالص ترجمہ نہیں ہے۔

بہارستانِ راحت۔ ترجمہ قصہ منوہر مدھ مالت مصنفہ نواب عاقل خاں رازی

مطبع گلزار اودھ لکھنؤ میں چھپی۔ ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۲۸۶ھ میں چھپی۔ مثنوی لکھنے کی تاریخ ۱۲۶۶ھ درج ہے، جو یوں ہے۔

روئے دل سے عجب ہوئی تاریخ بزم عشرت کا یہ فسانہ ہے
۱۲۶۶

مثنوی سوز عاشقانہ

"خمخانۂ جاوید" جلد سوئم میں محض انتخاب درج ہے اور کوئی معلومات نہیں۔

مضمون محمد باقر بہ عنوان "مثنوی زہرہ و بہرام" اہم مضمون ہے۔ اس سے ایک تو یہ پتہ چلا کہ قلمی نسخہ جامعۂ پنجاب میں موجود ہے اور دوسرے یہ کہ اس عمدہ نسخے کی کتابت رام دین نے کی، جس نے مثنوی کے اختتام پر لکھا ہے:

"تمام شد مثنوی زہرہ و بہرام تصنیف بھگونت رائے ولد دین دیال ابن لالہ سنگھ قوم کایستھ سری باست ساکن قصبہ کاکوری کہ در عہد بادشاہ غازی الدین حیدر خاں بہادر دام ملکہ صورت انتظام یافتہ،

بدستخط رام دین

بمقام آگرہ کچہری برمٹ

بتاریخ دوئم جولائی ۱۸۲۴ء

موافق اسادہ بدی نومی روز شنبہ

سن ۱۸۹۹ صورت اتمام یافت"

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے "زہرہ و بہرام" پھر "نل دمن" پھر "نگارستان راحت" اور اس کے بعد "بہارستان راحت" لکھی گئی۔

بہارستانِ راحت میں مندرجہ ذیل اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ مثنویاں کی ترتیب یہی ہے۔

پہلے زیبِ سخن ہوا تھا تمام — قصۂ عشق زہرہ و بہرام
پھر خوشی آیا تھا نل دمن کا جو حال — طبع میں آگیا تمام و کمال
جوش باقی تھا جو طبیعت میں — فرصت اندک ملی غنیمت میں
آگیا دل عزیز و شاہد پر — شاہد نظم کو ملا زیور
بس کہ یہ فن ہے سب سے اعلیٰ تر — حسن زیور ہے بہرِ دانشور
بلبلِ نکتہ سنج عاقل خاں — عرف نواب آصفِ دوراں
دے کے طرز نوی سے زیب سخن — اس نے لکھی تھی داستانِ کہن
تھا جو خوبی سے اس میں سرتاپا — ذکر مدھ مالت اور منوہر کا

اس سے پہلے کہ ان چار مکمل مثنویوں پر کھل کر بات کی جائے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ ناقدینِ فن نے مسدس، مخمس، مثنوی کی طرف کم توجہ دی ہے، اور غزل، نظم، قصیدہ وغیرہ پر ہی پورا زور صرف کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منشی ٹوطارام شایاں پر جس نے مثنوی میں سب سے زیادہ یعنی ۷۵ ہزار شعر لکھے، کوئی مضمون دستیاب نہیں" نہ کتابیں آسانی سے ملتی ہیں۔ راحت کاکوری کی کل تصنیفات کا پتہ دیبی پرشاد بشاش جیسے محقق کو ایک سو سال پہلے بھی نہیں مل سکا۔ کوئی تجزیاتی مطالعہ دستیاب نہیں۔
شادی لال چمن شاگرد مرزا نسیم دہلوی نے ۱۲۸۵ھ میں جہازی سائز کے ۱۲۴۴ صفحات پر مشتمل مثنوی الف لیلیٰ جلد چہارم لکھی۔ مولچند لال منشی دہلوی نے ضخیم "شاہنامہ اردو" باتصویر لکھا جو ۱۸۸۳ء میں چھپا۔ اسی طرح مرزا نسیم دہلوی کی مثنوی "الف لیلیٰ" جلد اوّل کا ذکر محض تذکروں تک ہی محدود رہا۔ ظاہر ہے کہ جب ذکر ہی نہیں ہوگا تو فکر کیسے ہوگا اور کتابیں کیسے دستیاب ہوں گی۔"

صنفِ مثنوی کیا ہے؟ لیجئے مولانا شبلی کے خیالات سنیئے۔

"انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواعِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیل، ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔ عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ تاریخ میں مختلف اور گوناگوں واقعات پیش آتے ہیں اس لیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔ مناظرِ قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی صبح و شام یا جنگل و بیابان، کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں۔ اس لیے جس قدر وسعت دینا چاہیں، دے سکتے ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ، واقعہ نگاری جو مضمون چاہیں، مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں۔"

اب کچھ ذکر مثنویوں کا ہو جائے۔

ہر مثنوی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ اختتام پر تاریخ درج کی گئی ہے۔ حمد بھی ہے، نعت بھی ہے۔ عشق کا ذکر چھڑا تو بیسیوں شعر عشق کی تعریف یا قباحت میں لکھ ڈالے۔ بات محبت کی چھڑ گئی تو بیسیوں شعر محبت کے ضمن میں وقف کر دیے۔ کہیں باغ نظر آیا تو ادھر چل پڑے۔ قصیدہ اور غزل بھی کہیں کہیں درج کر دیے۔ سراپا بھی بیان کیا ہے۔ سببِ تالیفِ کتاب بھی کہیں کہیں ملتا ہے عنوانات بھی قائم کیے ہیں۔ مثنویوں میں تسلسل اور روانی ہے۔ اسلوب بیان دلکش اور سادہ ہے۔ بیجا طوالت نہیں۔ زبان لکھنوی ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

مثنوی زہرہ و بہرام

کروں حمد ذات الٰہی بیاں — کیا جس نے قدرت سے پیدا جہاں
دلوں میں غم عشق پیدا کیا — رخِ گل پہ بلبل کو شیدا کیا
بچھایا عجب یہ محبت کا دام — کہ ہے جس کا پابند عالم تمام
کیا عشق میں طوطیا طور کو — ملی عشق سے دار منصور کو
اسی عشق سے کوہکن بے خطر — گیا جان شیریں سے اپنی گزر
اسی عشق سے قیس مجنوں ہوا — اسی عشق سے دلیس مفتوں ہوا
اسی عشق سے رنج میں نل رہا — دمن کی جدائی سے بیکل رہا
اسی عشق ظالم کے ہاتھوں سے آہ — ہوا تنگ حال جہاندار شاہ
پریشان ہو عشق سے بے نظیر — رہا کس طرح چاہِ غم میں اسیر
نہ ہووے محبت میں کوئی خراب — کہ پھرتا ہے ہر دم گل آفتاب
محبت سے سنبل پریشاں رہے — محبت سے گل چاک داماں رہے
محبت سے ہے زرد نرگس کا رنگ — محبت سے ہے بس دل غنچہ تنگ
محبت سے تڑپے ہے عاشق کا دل — محبت سے ہر نخل ہے پا بہ گل
محبت سے بلبل کو ہے گل سے ذوق — محبت سے قمری کی گردن میں طوق
محبت سے ہے آسماں نیلگوں — محبت سے عالم میں شورِ جنوں
محبت سے سیماب بیتاب ہے — محبت سے ہر چشم پُر آب ہے
محبت سے شبنم زشب تا سحر — زمیں اپنے اشکوں سے کرتی ہے تر
محبت ہی دو تن کو یک دل کرے — ہر اک خانۂ دل میں منزل کرے
کتاں ماہ کو دیکھ بے اختیار — محبت سے فی الفور ہو تار تار
غرض ہے محبت ہر اک رنگ میں — شرر ہے محبت سے ہر سنگ میں
بلا مجھ کو ساقی محبت کا جام — رہوں یاد میں اس کی سرخوش مدام

غرض ہیں محبت میں پابند سب   لکھوں عشق بہرام و زہرہ کا اب

بہرام بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا. زہرہ بادشاہ کے وزیر کی بیٹی تھی. حسن کا سراپا دیکھئے :

تھی اس شہر میں ایک دخت وزیر   پری چہرہ و رشک ماہِ منیر
گل اندام رنگیں ادا زہرہ نام   جہاں مشتری اس کا رہتا مدام

مرے جی میں آتا ہے ایسا یہاں   سراپا کروں اس پری کا بیاں

وہ زلفِ سیہ غیرتِ شام تھی   قریبِ دل کفر و اسلام تھی
لٹوں میں لٹکتے تھے دل بے شمار   لٹیں جس طرح من کو ہوتے ہیں مار
جبیں پر نمودار تھی وہ دمک   کہ ہو برق میں جس طرح کی چمک
وہ چہرہ تھا یا شعلۂ طور تھا   تجلی تھی یا عالم نور تھا
عیاں یوں تھا رُخ زلفِ خم دار میں   کہ جیوں مہ ہو روشن شبِ تار میں
کروں کیا نزاکت میں اس کی بیاں   کہ تھے کان میں اس کے لولو گراں
نہ آتا تھا ابرو کا ہرگز خیال   سمجھتے تھے ہر ایک اس کو ہلال
غضب تیز مژگاں میں تھی اس کی آب   کہ ہو ملکِ دل ایک پل میں خراب
رہیں عین مستی میں آنکھیں مدام   نہ تھا دور میں ان کی تجز ذکر جام

نہ عارض مگر شمع کافور تھے   حقیقت میں جیوں شعلۂ طور تھے

حلاوت جو لعل شکر خند میں   نہ ہو مصری و شہد و گلقند میں
مسی میں چمکتے تھے دنداں عجب   کہ روشن ستارہ ہوں جیوں وقت شب
شکر گفتگو اور شیریں دہن   دلوں کا تھا آسیب سیب ذقن

کمر اس کی موہوم تھی اس قدر   تصور میں ہرگز نہ آتی نظر

کرشمہ قیامت، قیامت ادا   قیامت تھی وہ شوخ سرتاپا

زہرہ و بہرام چھپتے چھپاتے ایک باغ میں پہنچتے ہیں. وہاں کا نظارہ دیکھئے:

اٹھایا بہت جب کہ رنجِ سفر   تو پھر چشمۂ آب آیا نظر
وہ تھا آس پاس اس کے سبزہ لگا   زمرد جسے دیکھ شرمندہ تھا
جدا تھا وہ گلہائے رنگیں میں باغ   ہو خوشبو سے جس کی معطر دماغ
ہر یک طرح کے تھے وہاں پر چمن   کسی میں بنفشہ کسی میں سمن
کہیں لالہ تھا اور کہیں جعفری   کہیں رائی بیل اور رتن منجری
کہیں چاندنی تھی کہیں موگرا   کہیں تھا مدن بان اور موتیا
کہیں تھا گل و مخمل و زعفران   کہیں زرد پھولی چنبیلی وہاں
کہیں تھی بنواری کہیں سیوتی   کہیں عشق پیچاں کہیں کیتکی
کہیں تھا سدرشن کہیں مالتی   کہیں خوشنما تھا گلِ اشرفی
کہیں سوسن و گل کی تھی سب قطار   کہیں نرگسِ زرد کی تھی بہار
کہیں جوہی بیلا کہیں یاسمیں   کہیں نیلوفر اور چنبا کہیں
کہیں وہاں پہ داودی و نارون   کہیں وہاں پہ عباسی و نسترن
کہیں سنبل تر کی تھی وہاں بہار   کہیں سرو باندھے ہوئے تھے قطار
کہیں پھر رہا تھا گلِ آفتاب   کہیں تھا ہزارا بصد آب و تاب
کہیں سے جو آتی تھی شبّو کی بو   کہیں کھل رہا تھا گلِ نازبو
کہیں تھی وہ شبنم کی گل پُر بہار   کہ گوہر کرے ابر نیساں نثار
رواں خوب نہروں میں تھا اس کی آب   نہیں آب تھا (بلکہ) تھا وہ گلاب
غرض تھا وہ گلزار رشکِ جناں   تھیں ہر شاخ پر بلبلیں نغمہ خواں
جو تھی اس جگہ پر لطافت تمام   کیا شادمانی سے واں پر مقام

مثنوی نل دمن ہندی

قصہ نل دمن سنسکرت میں لکھی مہابھارت کے بن پرب میں درج ہے. یہ قصہ اتنا دلچسپ ہے کہ اس کا ترجمہ فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، سویڈش، پولش، یونانی، ہنگرین لاطینی، جرمنی اور کچھ دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے. یہ قصہ آج بھی تازہ ہے.

راحت کاکوری محبت کا قصہ پھر چھیڑتے ہیں :

کروں پہلے ادا حمد خدا کو   بنایا جس نے ہے ارض و سما کو
ہوا میں جس کے ہیں برگ درختاں   زبان بے زبانی سے ثنا خواں
جہاں تک مرغ رہتے ہیں نواساز   اسی کے عشق میں ہیں نغمہ پرداز
محبت کا عجب ہے گرم بازار   کہ ہیں سودے کے اس کے سب خریدار
محبت ہی سے مہر عالم افروز   پھرے ہے شرق سے تا غرب ہر روز
محبت ہی سے مقناطیس و آہن   بہم مل دونوں ہو جاتے ہیں یک تن
محبت سے سحر تک انجمن میں   سراپا شمع جلتی ہے لگن میں
محبت سے گل و خورشید تا شام   نہیں پاتا ہے ایک دم دن کو آرام
محبت سے بیاباں اور بیاباں   پھرا کرتا ہے آہو مست و حیراں
محبت سے زمیں اور تا بہ افلاک   کہ اک ذرہ نہیں ہے مہر سے پاک
محبت کا عجب محکم ستون ہے   تھما جس سے یہ قصر نیلگوں ہے
محبت کی دلوں میں بس کہ ہے لاگ   سمندر کو بجائے آب ہے آگ
محبت میں ہوا منصور سردار   کہا جس نے انا الحق تا سر دار
محبت سے پتنگا شمع پر آ   کرے ہے گل چراغ عمر اپنا

محبت سے کھڑا ہے سرو آزاد — محبت ہی سے ہے قمری کی فریاد
محبت ہی سے حیراں نرگس باغ — محبت سے دلِ لالہ پر ہے داغ
محبت نے برنگ طرۂ یار — رہی ہے پیچ میں سنبل گرفتار
بھرا ہے مہر سے بھی سینۂ سنگ — سدا نکلی ہے آتش لعل کے انگ
پھنسی ہے عشق کے پھندے میں بلبل — ہوا ہے دام اس کو رشتۂ گل

ملک ہندوستان اور اجین کی توصیف دیکھیے:

عجب نزہت فزا ہندوستاں ہے — کہ یہ شہر اس کا رنگیں بوستاں ہے
غضب ہیں بت وہاں کے شوخ و بیباک — کہ ہیں زاہد کا دل لینے میں چالاک

عجب یہ ملک ہے روئے زمیں پر — نہیں کوئی ولایت اوس کی ہمسر
نمونہ ہے مگر خلد بریں کا — کہ ہے رتبہ بلند اس سرزمیں کا
جو خوبی اس کی سب تحریر ہو جائے — تو کاغذ تختۂ تصویر ہو جائے
زبس ہے حسن میں یہ ملک نامی — بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی
اس خطہ میں ہے اک شہر معمور — جسے کرتے ہیں سب اُجین مشہور
کیا ایزد نے اس خوبی سے آباد — کہ رشک اس سے سدا کھاتا ہے نوشاد
نمایاں صف بہ صف ایسی عمارت — مسلسل جیسے ہو رنگیں عبارت
مصفا اوس میں کوئی خوشنماتر — عیاں ہو فرق جوں سطروں کے اندر
عجائب رنگ اور نقشے کا بازار — بھرے جس میں بہارِ خطّہ گلزار
دو رویہ سب دکانیں یوں برابر — کہ ہوں بیتوں کے مصرعے جوں برابر
کہوں میں شہر اس کو یا گلستاں — جسے ہو غنچۂ دل دیکھ خنداں
ہزاروں اس لطافت کے وہاں باغ — کہ کھاوے رشک سے باغِ ارم داغ
اگر دیکھے وہاں کا حوض خوشتر — عرق سے چشمۂ کوثر بھی ہو تر
موافق اس طرح آب و ہوا ہے — کہ دل ہر اک کا مثلِ گل کھلا ہے

نگارستانِ راحت ۔ ترجمہ مثنوی غنیمت

سراپا دیکھیے:

کیا زلف سیہ ہے لیلۃ القدر — پیشانی صاف مطلع البدر
وہ نامِ خدا جبیں ہے پُرنور — پیدا ہے جہاں تجلیِ طور
محراب حرم ہے طاق ابرو — لازم ہے طواف قبلہ رو
وہ آنکھ کہ جس سے ہوش ہو گم — آشوبِ جہاں بلائے مردم
وہ چشم سیہ ہے ساغرِ مُل — زاہد کا ہو جس سے دیکھ کر قُل
جاتی ہے جدھر نگاہِ مخمور — کرتی ہے جگر کو زخم سے چور
کس طور رہیں شکار سے باز — پلکیں ہیں جواب پنجۂ باز
بالی سی نہیں ہے پر گہر گوش — ہے حسن ازل سے حلقہ در گوش

وہ موتیوں سے ہیں خوشنما تر — ہوں جیسے بہر صدف میں گوہر
رخساروں پہ ہے وہ رونق گل — قرباں ہیں ہزار جاں سے بلبل
ہونٹ اس کے اگرچہ بے سخن ہیں — لعل یمنی پہ حرف زن ہیں
ہے خندہ گل سی خوش تبسم — بلبل سے فصیح تر تکلم
دانتوں کی چمک ہے بس کہ روشن — ہیں خندۂ [illegible] سے برق خرمن
پیدا ہے لبوں سے کیا شکر خند — گویا کہ دہن ہے کوزۂ قند
ہونٹوں کے تلے چہ زنخداں — یوسف کے لیے ہیں چاہِ کنعاں
وہ صاف بلور سی ہے گردن — ہو جس میں بیاض صبح روشن
موزوں ہے غرض ہر ایک اعضا — پُتلا ہے وہ نور کا سراپا

بہارستانِ راحت ۔ ترجمہ قصہ منوہر و مدھ مالت

عشق کیا ہے ۔ راحت پھر فرماتے ہیں:

عشق نیرنگ ساز عالم ہے — عشق سے یک زمانہ برہم ہے
عشق ہے موجد بلائے جاں — عشق ہے آفتِ زمیں و زماں
عشق ہے کان درد و حیرانی — عشق ہے مخزنِ پریشانی
عشق دریائے غم ہے بے پایاں — عشق ہے بحر درد کا طوفاں
عشق جیحون رنج و آفت ہے — عشق گرداب بحر کلفت ہے
عشق کا دخل آسماں تک ہے — عشق کا ذکر لامکاں تک ہے
عشق پرسوز برق رخشاں ہے — آفتِ خرمنِ دل و جاں ہے
جس جگہ اپنا نور چمکایا — عالمِ کوہِ طور دکھلایا

نہیں بجھتی ہے اس کی آگ کبھی — دل سے جاتی نہیں ہے لاگ کبھی
یہ وہ ہی درد سینہ و پرغم — جس سے عاجز ہے عیسیٰ مریم
خوں رلاتا ہے چشم گریاں سے — گل کھلاتا ہے زخم خنداں سے
قند دکھلا کے زہر دیتا ہے — میٹھی باتوں سے جان لیتا ہے

جس کے ہیں گوش ہوش عالم میں — وہ نہ آئے گا عشق کے دم میں

یہ قصے پرانے ہیں، بہت بار کہے جا چکے ہیں، اس لیے قصوں کو دہرایا نہیں گیا۔ مقصد بتانے کا یہ تھا کہ راحت کاکوری کو مضمون باندھنے میں کمال حاصل تھا۔ ایک مضمون کو کئی رنگوں میں باندھتے تھے۔ ہر مثنوی پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ فلم آنکھوں کے آگے چل رہی ہو۔ یہ ہنر راحت اور میر حسن میں مشترک ہے۔

حوالجات:

۱۔ مثنوی زہرہ و بہرام از محمد باقر، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۴۳ء
۲۔ خمخانۂ جاوید جلد سوئم از سری رام صفحہ ۳۱۰

گیان چند جین

کلامِ غالب کی تدوین کا دوسرا شاہکار *

اردو کے محتاط محققین میں کالی داس گپتا رضا ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ گہرے مطالعے کے بعد وہ کسی مسئلے پر جو تحقیقی فیصلے کرتے ہیں، وہ بالعموم پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ انھیں بدلنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پس پشت مضبوط دلائل کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ تجارت پیشگی کے باوجود وہ اپنے روز و شب کا بیشتر حصہ کاروبارِ تحقیق میں صرف کرتے ہیں۔ انھوں نے دو ادیبوں پر خاص توجہ کی ہے: چکبست اور غالب۔ چکبست پر شاید وہ مزید کچھ نہ لکھیں لیکن غالبیات ان کی عمر بھر کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ذیل کے کام سامنے آ چکے ہیں۔

۱۔ دعائے صباح، دسمبر ۱۹۷۷ء ۲۔ متعلقاتِ غالب، اگست ۷۸ء ۳۔ سہو و سراغ بہ جزو 'غالبیات'، جنوری ۸۰ء ۴۔ انتخاب آتش و غالب از چکبست، مارچ ۱۹۸۰ء ۵۔ غالبیات، چند عنوانات، جنوری ۱۹۸۲ء ۶۔ دیوانِ غالب، طبع اول ۱۸۴۱ء کی عکسی اشاعت مع پیش لفظ، ۱۹۸۶ء ۷۔ دیوانِ غالب چوتھے ایڈیشن، مطبع نظامی کانپور ۱۸۶۲ء کی عکسی اشاعت مع پیش لفظ ۱۹۸۷ء۔

لیکن اس سلسلے کا شاہکار اب "دیوانِ غالب کامل" کے نام سے آیا ہے۔ غالب کے اردو کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن نسخۂ رضا کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کلامِ غالب کو پہلی بار مکمل تاریخی ترتیب سے پیش کرتا ہے۔ پہلے دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مولانا عرشی دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی کے دیباچے میں مطلع کرتے ہیں کہ ڈاکٹر عبداللطیف حیدر آبادی نے "پورے دیوان کو تاریخ وار مرتب کیا مگر ان کا مرتبہ نسخہ آدھا چھپ کر رہ گیا۔ ۱۹۳۶ء میں شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی کلامِ غالب کو تاریخ وار مرتب کرنے کا کام انجام دیا اور اردو کلام کے ساتھ فارسی اشعار کو بھی مختلف ادوار پر مرتب کر کے آثارِ غالب کے نام سے ایک مجموعہ پیش کیا مگر اس میں متداول حصے کو ایک جگہ نہیں رکھا گیا تھا جس سے اصل دیوان میں انتشار پیدا ہو گیا:

(نسخۂ عرشی طبعِ اول، دیباچہ ص ۷۱)

متداول دیوان، غالب کے کسی خاص تاریخی دور کی تخلیق نہیں۔ اگر تاریخی ترتیب دینی ہے تو متداول دیوان تو منتشر ہوگا ہی۔ اگر اکرام نے اسے منتشر کیا تو جائے اعتراض نہیں، موجبِ ستائش ہے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ اپنے مضمون "ضمیمۂ نسخۂ عرشی" میں لکھتے ہیں۔

"اس کے ذریعے پہلی بار غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب اہلِ ذوق کے سامنے آئی جس سے غالب کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے میں بے حد مدد ملتی ہے۔

(نقوش، نومبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۶)

اس پر میں نے اپنے مضمون "نسخۂ عرشی، طبعِ ثانی سے متعلق کچھ معروضات" میں لکھا۔

"تاریخی ترتیب کا فائدہ یہی ہے کہ اس سے شاعر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں بصد ادب عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ تاریخی ترتیب کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا نہ کرنا ہی نسخۂ عرشی کی سب سے بڑی کمی ہے۔ [1]"

میں نے اس کمی کی وجوہ بیان کیں کہ تین وفاداریوں نے تاریخی ترتیب کو زائل کر دیا ہے:

۱۔ کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا: ۱۔ منسوخ ۲۔ متداول ۳۔ منتشر و مشکوک کلام۔
۲۔ مختلف اصنافِ سخن کے الگ الگ زمرے بنائے ہیں۔ ہر حصے میں اصناف کو جداگانہ

---

[1] "نسخۂ عرشی، طبعِ ثانی سے کچھ معروضات": نقوش لاہور غالب نمبر، شمارہ ۱۱۱۔ بازطباعت گیان چند، رموزِ غالب (مکتبہ جامعہ دلی ۱۹۷۶ء) ص ۵۳

---

* نام کتاب: "دیوانِ غالب کامل" تاریخی ترتیب سے
مرتبہ: کالی داس گپتا رضا
قیمت: ایک سو ساٹھ روپے
ناشر: ساکار پبلشرز، پرائیوٹ لمیٹڈ، ۱۰۷، اجولی بھون ملٹ، ۱۷ نیو میرین لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰

شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی، تھرلیش ہولڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

اریخ وار مرتب کیا ہے۔

۳۔ غزلوں میں ردیف وار ترتیب کو برقرار رکھا۔ ہر ردیف کی غزلوں کو الگ حصہ قرار دے کر انہیں تاریخی حیثیت سے آگے پیچھے رکھا۔

پھر میں نے مطالبہ کیا۔

" کلام کی تاریخی ترتیب ہی کافی نہیں سنین کے اظہار کے ساتھ ادوار بھی قائم کرنے چاہئیں مثلاً ۱۸۲۱ء تک کا کلام۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء یا ۱۸۲۸ء تک کا کلام علیٰ ہذا القیاس۔ جس نظم یا غزل کا صحیح سنہ معلوم ہو سکے۔ وہ سنہ اس کے فوراً بعد لکھ دیا جائے۔"

(رموزِ غالب ص ۶۲)

" میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا طریقے پر کلام کو ترتیب نہ دیا گیا تو نسخۂ عرشی کی طبع ثانی کے بعد بھی کلیاتِ غالب کو تاریخی ترتیب سے مدوّن کرنے کی ضرورت باقی رہے گی۔" (ایضاً، ص ۶۳)

رضا صاحب نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ عام طور سے تاریخی ترتیب کا یہ مقصد مانا جاتا ہے کہ اس سے شاعر کا ذہنی ارتقا آئینہ ہو جاتا ہے۔ رضا صاحب نے اپنے مقدمے کے باب "تاریخی ترتیب کیوں" میں اس سے ہٹ کر خالص تحقیقی حقائق کی بات کی ہے۔ انگریزی میں تحقیق کے موضوع پر لکھنے والا سب سے معتبر عالم رچرڈ ابلٹک ہے۔ دیکھئے وہ اپنی دو مشہور کتابوں میں کیا کہتا ہے۔

کوئی ایسا ادیب نہیں جس کی سوانح میں پہلے کے مصنفوں کی بیان کی ہوئی اور پھر بعد والوں کی دہرائی ہوئی کذب بیانیاں نہ بھری ہوں۔ ایک راوی سے دوسرے راوی تک حاشیہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔" [1]

"تحقیق ایسے افسانوں سے بھری ہوئی ہے جنھیں نیم حقیقت یا غیر حقیقت کہا جائے گا۔ تردید کے باوجود روایتی افسانے کے زندہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خشک حقیقت کے مقابلے میں زیادہ خوش رنگ ہوتا ہے۔" [2]

غالب کے کئی اشعار کے بارے میں ایسے ہی خوش رنگ افسانے رائج ہو گئے ہیں۔ رضا صاحب نے اشعار کی تاریخ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ مبینہ واقعات محض کذب بیانی اور حاشیہ آرائی تھے۔ رضا صاحب نے کئی اشعار سے منسوب واقعات کی قلعی کھولی۔ مثلاً

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

اور ان اشعار سے متعلق غلط واقعات گھڑنے والی کتابیں کون سی ہیں، یادگارِ غالب، آبِ حیات، تذکرۂ کاملان رام پور جیسی۔ یہ شعر دیکھئے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

اس شعر کا زمانہ متعین کرتے وقت خود شعر کے خالق کے حافظے نے دھوکا دیا ہے مگر رضا صاحب نے اسے پرکھ کر صحیح حدود طے کی ہیں۔ رضا صاحب ان واقعات کی تردید بھی کر سکے جب کہ ان کی غالب کے متعلقین کی سوانح پر نظر تھی۔ مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ کے دلّی کے صدرالصدور ہونے کا صحیح سنہ، مولوی عبدالقادر رام پوری کے بادشاہ کے دربار میں وکیل مقرر ہونے اور اس کے بعد انتقال کی تاریخ۔ یہ سب وہی جان سکتا ہے جس کی عصرِ غالب کے واقعات اور متعلقینِ غالب کی سوانح پر اچھی نظر ہو۔

ظاہر ہے کہ غالب کی ہر غزل اور نظم کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہو سکتی۔ اسی لیے میں نے اپنے محولۂ سابق اقتباس میں تجویز کی تھی کہ ادوار قائم کر لیے جائیں اور جس نظم یا غزل کا صحیح سنہ معلوم ہو سکے۔ وہ سنہ اس کے فوراً بعد لکھ دیا جائے۔ رضا صاحب نے بالکل یہی کیا ہے۔ میں نے اپنی کم نظری سے لکھا تھا کہ ایک دور ۱۸۲۱ء تک کا ہوگا، دوسرا ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء یا ۱۸۲۸ء تک کا، علیٰ ہذا القیاس۔ رضا صاحب زیادہ باریک بیں ہیں۔ انھوں نے ۲۸-۱۸۲۷ء تک چار ادوار بنائے ہیں جو جملہ ۱۱ ادوار کے حصے ہیں۔ ان کا یہ اصول بالکل درست ہے کہ اگر کسی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم ماخذ میں مل جائے تو پوری غزل اسی دور میں رکھ دی جائے گی، خواہ ترمیم و اضافہ کا عمل کتنی مدت بعد تک جاری رہا ہو۔ ص ۲۲-۲۱ پر ایک جدول میں وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کس دور میں کُل کتنے اشعار لکھے گئے اور ان میں سے کتنے متداول دیوان میں منتخب ہوئے جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، وہ حساب کتاب کے بہت چوکھے ہیں۔

انھوں نے یہ کام ۲۱ ماخذ کی بنا پر کیا ہے جن میں سے ۱۳ ان کے ذاتی کتب خانے میں ہیں، آٹھ کے لیے نسخۂ عرشی پر انحصار کیا ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تدوین نسخۂ عرشی کا بدل نہیں، بلکہ اس کا تکملہ ہے۔ نسخۂ عرشی کلامِ غالب کو تاریخی ترتیب سے پیش کرنے میں ناکام رہا ہے لیکن غالب کے جملہ کلام کو جس استناد کے ساتھ پیش کیا ہے ویسا نہ اس سے پہلے کسی نے کیا، نہ آئندہ کوئی کر سکے گا۔ پھر اس کا اختلافِ نسخ کا باب اتنا جامع ہے کہ اس کی وجہ سے غالب کے تمام اہم خطی اور مطبوعہ مجموعوں کے معمولات کے ایک ایک لفظ کا پتہ چل جاتا ہے۔ شرحِ غالب کے نام سے اس کے حواشی بھی بہت معلومات افزا ہیں۔ ان محاسن کی وجہ سے نسخۂ عرشی سدا بہار کام ہے جو زندۂ جاوید رہے گا۔ کلامِ غالب کا

1- Richard D.Altick, The Scholar Adventurers (Macmillon Company, New York,1960) P-87

2- Richard D.Altick, The Art of Literary Research (NORTON & Co., NewYork,1967) P-17

کوئی محقق یا مدوّن اس سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

نسخۂ عرشی کے بعد زیرِ نظر دیوانِ غالب کامل دوسرا تاریخ ساز کام ہے۔ اس کے بعد اردو کلامِ غالب کی تدوین میں کچھ نہیں بچتا۔ تدوینِ متن میں اختلافِ نسخ کا دینا ضروری مانا جاتا ہے لیکن رضا صاحب نے نسخۂ عرشی کے متن اور اختلافاتِ نسخ کو پوری طرح تسلیم کرلیا ہے اور کرلینا چاہیے تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نسخے میں اختلافِ نسخ کو تحصیلِ حاصل سمجھ کر قطع کردیا ہے۔ ان کی توجہ محض ایک پہلو یعنی تاریخی ترتیب پر مرکوز رہی ہے۔

انھوں نے غالب کے مجموعوں کے تعلق سے مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں جو مقدمے کی مختلف فصلوں میں بکھری پڑی ہیں، مثلاً اوّلیں شعری تخلیق کو لیجیے۔ میں نے کتاب 'حسنِ خیال' کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ رضا صاحب نے مثنوی پتنگ کے لیے اس اوّلیں ماخذ کو بہ چشمِ خود دیکھا۔ فارسی شعر ؎ رشتۂ در گردنم .... الخ کا مصنف جاننے کے لیے کیا کیا تحقیق و تدقیق نہ کی۔ ن۔م۔ راشد نے لکھ دیا تھا کہ یہ شعر مولانا روم کا ہے۔ رضا صاحب نے راتوں رات جاگ کر مثنوی کے جملہ دفتر چھان مارے، یہ شعر نہ ملا۔

حالی مثنوی پتنگ کو آٹھ نو سال کی عمر کی تخلیق قرار دیتے ہیں، رضا صاحب دس سال کی عمر کی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سے کچھ زیادہ عمر ہی کی ہونی چاہیے۔ سررشتۂ آزادگی اور ہوائے دلبراں، جیسی فارسی تراکیب، فارسی شعر کی تضمین اور پھر حسن کی طرف جنسی کشش ع گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر، نو دس سال کے لڑکے سے متوقع نہیں۔

عمدہ منتخبہ اور عیار الشعرا کے سلسلے میں رضا صاحب نے کسی 'ثقہ راوی' کا قول نقل کیا ہے کہ خوب چند ذکا نواب سرور کا ملازم تھا اور عیار الشعرا عمدۂ منتخبہ کا چربہ ہے۔ وہ اس ثقہ راوی کا نام ظاہر کردیتے تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا۔ بہر حال انھوں نے ثقہ راوی کے غیر ثقہ بیان کی شافی تردید کردی ہے۔

"غالب کے غیر متداول اردو اشعار کا زمانۂ فکر" بھی تحقیقی معلومات کا گنجینہ ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ یہ فصل اور بعض دوسرے مماثل مطالب مقدمے کے بجائے حواشی میں دیے جاتے۔ "غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر"، کی فصل میں جو اشعار اور مصرعے دیے ہیں وہ ہزار ہنگامی اور دل بہلاوے کے سہی، میری ناقص رائے میں انھیں بھی متن میں جگہ دینی چاہیے تھی تاکہ کلیات کی جامعیت مکمل ہوجاتی۔

غالب کی زندگی میں دیوانِ غالب کی اشاعت والے باب میں دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار کے بارے میں اسی گہری اور باریک تحقیق کا مظاہرہ کیا ہے جو ان جیسے صاحبِ نظر ہی سے ممکن تھا۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ دیوانِ غالب کی طبعِ دوم میں طبعِ اوّل پر محض ۱۶ شعروں کا اضافہ ہوا۔ مالک رام صاحب نے اس بیان کو بے چون و چرا تسلیم کرلیا لیکن غالب کے جملہ مجموعوں کے اشعار کی تعداد رضا صاحب کی نوکِ زبان پر رہتی ہے۔ انھوں نے چند گھنٹا کر حساب لگایا اور انکشاف کیا کہ دوسرے ایڈیشن میں دراصل ۶۷ شعروں کا اضافہ ہوا۔

توقیتِ غالب بہت مفصل ہے۔ اس سے غالب ہی کی نہیں، ان کے بعض معاصرین کی تاریخیں بھی معلوم ہوجاتی ہیں، لیکن بعض اندراجات کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ان کا سوانحِ غالب سے ایسا براہِ راست تعلق ہے کہ انھیں توقیتِ غالب میں جگہ دی جائے۔ مثلاً ٹیپو سلطان کی شہادت، جرأت، انشا، مصحفی، شاہ نصیر، آتش اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات، راجا رام موہن رائے کا سفرِ انگلستان، سکھوں اور انگریزوں کی پہلی اور دوسری لڑائی، پہلی ریلوے لائن، پہلی ٹیلی گراف لائن وغیرہ۔ رضا صاحب ابھی غالب پر مزید کام کرنے والے ہیں۔ شاید سوانحِ غالب پر ان واقعات کا اثر پڑا ہو، جیسے سرسید کی آئینِ اکبری کی تقریظ میں انھوں نے انگریزوں کی نئی ایجادات کو سراہا تھا۔ دوسرے اندراجات کا اثر میری کمزور نگاہ سے اوجھل ہے لیکن رضا صاحب ان کی معنویت نمایاں کرسکتے ہیں۔

مجھے ان کے اس اصول سے اتفاق ہے کہ کسی غزل کا ایک شعر بھی سب سے پہلے جس دور میں کہا گیا، پوری غزل کو اسی میں رکھ دینا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رائیہ قصیدے کے دو حصے کیوں الگ کیے ہیں۔ ع ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار، کا متداول حصہ پہلے دیا ہے (ص ۱۲-۲۱۱) اور منسوخ حصہ کچھ فصل کے ساتھ بعد میں (ص ۱۷-۲۱۴) دونوں اجزا کو ملا کر بھی نہ دیا جاتا تو پہلے منسوخ حصہ اور اس کے فوراً بعد متداول حصہ دیا جاسکتا تھا۔

اشاریہ بہت مفصل ہے۔ اس میں ہندوستانی طریقے سے اشخاص کے نام فطری ترتیب سے درج ہیں لیکن بعض اندراجات میں تخلص یا عائلی نام (سرنیم) پہلے دیا جاتا تو موجودہ رواج کے نزدیک تر ہوتا۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ اردو تدوین کی تاریخ میں آج تک کسی کے کلام کو اسی طرح تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا۔ اتفاق سے میں نے بھی اقبال کے ۱۹۰۸ء تک کے کلام کو اسی طرح مرتب کیا ہے لیکن اقبال کی بیشتر تخلیقات کی صحیح تاریخیں معلوم ہیں۔ ایک قدیم شاعر کے کلام کے نامعلوم زمانوں کو معلوم کرنا بے نظیر تحقیقی کارنامہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مناسب اعتراف کیا جائے گا۔ میری خواہش ہے کہ دوسرے محقق بھی حسبِ توفیق اردو کے دوسرے قدیم شعرا کے کلام کو اسی نہج پر مدوّن کریں۔

بقیہ: کیونکے یا کیونکہ

خاتمہ کردیتی ہے اور لذتِ آزار کی حسرت رہ جاتی ہے۔"

بعض اوقات اسے جملے کی ابتدا میں "چونکہ" کی جگہ استعمال کردیا جاتا ہے لیکن یہ صحیح محاورے کے خلاف ہے۔ اس لیے "کہ" پیش خیمہ کے طور پر جملے کی ابتدا میں چونکہ لانا چاہیے۔ جیسے :-

"آئینے کی تشبیہہ ورطے سے ظاہر ہے اور آرائش چونکہ اغیار کے دکھلانے کے لیے کی جاتی ہے۔ اس لیے اس سے بدعہدی لازم آتی ہے۔"[1]

---

[1] دیوانِ غالب (اردو) مع شرح دیوانِ غالب از حسرت موہانی، انتظامی پریس حیدرآباد، ص ۹۲ اور ۱۱۹

غزلیں

محسن زیدی

ہر چند اسے خود بھی ہم اچھا نہیں کہتے
تم جتنا بُرا کہتے ہو اتنا نہیں کہتے

ہے ڈوبنے والوں کو تو کشتی کی ضرورت
تنکے کے سہارے کو سہارا نہیں کہتے

ہم اور بھلا غیروں سے دُکھ اپنا کہیں گے
اپنوں سے بھی جب حال ہم اپنا نہیں کہتے

ہم حرفِ طلب لاتے نہیں لب پہ مکرّر
اک بار جو کہتے ہیں دوبارا نہیں کہتے

گُستاخ زبانی کی سزا شوق سے دیکھے
ڈرتے تو سرِعام ہم ایسا نہیں کہتے

ہے معرکۂ کرب و بلا اصل میں دنیا
بازیچۂ اطفال کو دنیا نہیں کہتے

جو ڈال دے مُردوں میں بھی جاں وہ ہے مسیحا
ہر ایک معالج کو مسیحا نہیں کہتے

مقصود تو شکوہ ہے ملامت نہیں اس کی
لو چُپ ہوئے جاتے ہیں زیادا نہیں کہتے

تم پاس ہوا کرتے ہو ہنگامِ سخن بھی
ہم شعر بھی کہتے ہیں تو تنہا نہیں کہتے

آنکھوں سے جو دیکھا ہے بیاں کرتے ہیں محسنؔ
ہم کوئی کہانی، کوئی قصّا نہیں کہتے

امید کوئی نہیں، آسرا بھی کوئی نہیں
دوا بھی کوئی نہیں، اب دعا بھی کوئی نہیں

کچھ اتنے ہوگئے بیزار اپنے حال سے لوگ
کہ اپنے حال پہ اب سوچتا بھی کوئی نہیں

بتائے کون وہاں کیا گزر گئی ان پر
کہ اس دیار سے آیا گیا بھی کوئی نہیں

حصارِ جاں کے وہ اس پار ہی تو رہتا ہے
فقط ہے شرطِ سفر، فاصلا بھی کوئی نہیں

گزر ہوا جو کبھی اس سے مل لیے ورنہ
سوال اس سے کجا، مدّعا بھی کوئی نہیں

مرے سخن نے مجھے روشناس سب سے کیا
وگرنہ چہرے سے پہچانتا بھی کوئی نہیں

ہمیں نے خود پہ کیے بند سارے در محسنؔ
نکلنا چاہیں تو اب راستا بھی کوئی نہیں

آئینے میں اب کچھ ہے نہ آئینہ گری میں
ہر شخص گرفتار ہوا کم نظری میں

اب کیوں ہے [illegible] شکوۂ بیداد کسی سے
تم خود بھی تو کچھ کم نہ تھے بیداد گری میں

گھر کے در و دیوار بھی شمشیر بکف ہیں
ہے جاں کی اماں اب تو فقط دربدری میں

اس پردۂ زرتار میں ہے کون سا معشوق
ہم آتی خبر رکھتے ہیں اس بےخبری میں

یہ رات ڈھلے گی تو بلا سر سے ٹلے گی
اک عمر رہے ہم اسی خوابِ سحری میں

دشمن کو بھی ہم نے کبھی دشمن نہیں سمجھا
ہم جاں سے گئے اپنی وسیع النظری میں

صد چاک ہوا جس کے سبب اپنا گریباں
کیا کیجے کہ ماہر ہے وہی بخیہ گری میں

انساں کی صورت میں وہ تھا ایک فرشتہ
اک نور کا پیکر تھا لباسِ بشری میں

اسرارِ مشیّت کے سبھی اس پہ عیاں تھے
اس کا کوئی ہمسر نہ ہوا دیدہ وری میں

محسنؔ ہے یہ کیوں مجھ سے شغف اہلِ ہنر کو
کیا بات نظر آئی مری بے ہنری میں

---

۱۷۷ - راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایم. قمرالدین

پھر اور ایک مرحلہ دشوار اور میں
پھر جیسے کوئی مجھ میں ہے سرشار اور میں

وہ ضد اٹھاؤں میں اسے، تصویر میں نہ آئی
ہے صرف وہ گری ہوئی دیوار اور میں

میں کیا کروں کہ علم کا عنار ایک بھی نہیں
ہیں سمت سمت علم کے بازار اور میں

کب کا "زمانہ چال قیامت کی چل گیا"
لیکن ہے میری "اک وہی رفتار" اور میں

سمجھا تھا یاد ہوگا اُسے ایک آدھ شعر
ہیں یاد میرے، ان گنت اشعار اور میں

ہر فرد اجنبی ہے مرے خاندان میں
رشتوں کا اب ہے اک یہی معیار اور میں

ہوتی ہے اپنی صبح کی تکمیل اس طرح
یعنی کہ صبح، صبح کا اخبار، اور میں

اک سانحہ کہ جس کا ہے امکان سامنے
دانا بھی بن کے آئیں گے نادان سامنے

آنکھوں کے موند لیتے ہی شاداب ہو گیا
منظر جو تھا ابھی ابھی، ویران سامنے

جس میں دکھائی دیں، مرے انداز ہو بہو
ایسا کبھی تو ہو، کوئی انجان سامنے

انصاف صرف ایک علامت ہے بیشتر
بالکل وہی، جو ہوتی ہے میزان سامنے

غالب کے ایک شعر سے یہ خوش ہے اور وہ
روتا ہے دھر کے میر کا دیوان سامنے

ہاں! اس کے باوجود بھی زندہ رہوں گا میں
ہے میرے پیچھے زلزلہ، طوفان سامنے

اس غار سے نکلنے کا امکان چاہیے
مشکل اک اور بھی ہے کہ آسان چاہیے

میں کر چکا ہوں اپنے قلم ہی سے خودکشی
کیوں اور کوئی موت کا سامان چاہیے

اک درد و غم کا ذائقہ چکھنے کے واسطے
سنتا ہوں ان کو میر کا دیوان چاہیے

رہتا ہے اپنے شہر میں، وہ ایک شخص بھی
ہر کاروبار میں جسے نقصان چاہیے

یہ اک شرر بجھا تو پھر اس کی نمود کو
اک تند و تیز شعلوں کا طوفان چاہیے

پہلے تھے بے نیاز گلوں ہی سے ہم مگر
اب گل جو مل گئے ہیں تو گلدان چاہیے

۱۲۰ - لائرس چیمبرز، سپریم کورٹ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۱

کشمیری لال ذاکر

آخری قسط

اپ ہیول

ماسٹر جگدیش رائے اسپتال سے تو گھر آ گئے تھے، لیکن اُن کی صحت بحال نہیں ہو رہی تھی۔ "ویژن" کے کارن سرجو شرما کو پی جی آئی کے بہت سے ڈاکٹر جاننے لگے تھے۔ حال ہی میں پی جی آئی کا سالانہ فنکشن تھا۔ جس کے سلسلے میں سرجو نے ایک بہت ہی معلوماتی آرٹیکل "ویژن" میں چھاپا تھا۔ فنکشن کی رپورٹنگ بھی اسی نے کی تھی۔ سرجو کی وجہ سے ماسٹر جی کو تسلی بخش ڈاکٹری امداد مل رہی تھی۔ لیکن بڑھاپا ایک ایسی بیماری ہے، جس میں ڈاکٹری سہولت بھی زیادہ رول ادا نہیں کر سکتی۔ اس لیے ماسٹر جگدیش رائے کسی نہ کسی جسمانی پریشانی میں اُلجھے ہی رہتے تھے —

ایک دن اچانک دوپہر کو اُنہیں ایسا لگا تھا کہ اُن کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں سُن ہونے لگی تھیں — شروعات پاؤں کی اُنگلیوں سے ہوئی تھی — دھیرے دھیرے اُن کی دائیں ٹانگ اور پھر دایاں بازو دونوں ہی سُن ہونے لگے تھے۔ جب تک ڈاکٹر کو بلایا گیا اُن کے جسم کے حصے پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ سرجو کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ نہ ملی اور نہ ہی آنند ملا۔ گوربخش کا تو کچھ علم ہی نہیں تھا کسی کو کہ اُسے کہاں تلاش کیا جائے۔ ماسٹر جی کے پڑوسیوں نے اُسے فوراً ہی پی۔جی۔آئی میں پہنچا دیا، جہاں اُنہیں فوراً ہی ڈاکٹری امداد مل گئی۔ جب تک سرجو وہاں پہنچی، ماسٹر جی کے ٹیسٹ وغیرہ ہو چکے تھے اور اُنہیں جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

آنند گھر پہنچا ہی تھا کہ سرجو کا ٹیلی فون آیا۔

"میں پی۔جی۔آئی سے بول رہی ہوں۔"

"خیریت تو ہے؟"

"پتا جی پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔"

"کیسے؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ پی جی آئی میں ایڈمٹ ہو چکے تھے۔"

"جسم کے کون سے حصے پر حملہ ہوا ہے؟"

"دایاں بازو اور دائیں ٹانگ دونوں پر حملے کا گہرا اثر ہوا ہے۔"

"میں آ رہا ہوں۔"

"آپ تو ابھی گھر لوٹے ہیں اب آرام کریں۔"

"ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں ماسٹر جی کو۔"

"تو آ جائیے۔"

آنند ورما صاحب کو ماسٹر جی کے اچانک بیمار ہو جانے کی خبر دے کر پی۔جی۔آئی چلا گیا۔ اس رات ورما صاحب بہت ڈسٹربڈ رہے۔

آنند بھی بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان کٹھن گھڑیوں میں کس طرح سرجو کے کام آ سکتا تھا۔

ماسٹر جی کے سنبھلنے کا پروسس بڑا دھیما تھا۔ ڈاکٹر مایوس تو نہیں تھے، لیکن ان کے جلدی صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بھی وہ سو فی صد پُر اُمید نہیں تھے۔ اس دوران ایک حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ گوربخش اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پی۔جی۔آئی میں اپنے پتا کے پاس گزارنے لگا۔ ماسٹر جی اس کے من میں اس تبدیلی کے لیے خوش تھے۔ اور اس کی ماں کو بھی اس سے خوشی ہوئی تھی، لیکن سرجو کو جانے کیوں شک تھا کہ اس میں گوربخش کی کوئی گہری چال تھی۔ بلکہ ایک دن اُس نے آنند سے بھی کہا،

"آج کل گوربخش ایک دم بدل گیا ہے۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے۔" آنند نے جواب دیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بیوقوف بنا رہا ہے۔"

"کیسے؟"

"پتا جی کی صحت میں امپروومینٹ بڑی دھیمی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ جلدی ٹھیک نہ بھی نہ ہو سکیں۔ وہ اس سچویشن کا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔"

"کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے وہ؟"

"وہ دونوں کو بڑی ہوشیاری سے میرے خلاف بھڑکائے گا اور پتا جی کو وصیت لکھوانے پر مجبور کرے گا۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ صحیح ہو۔"

سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی ہاؤس نمبر ۹۸، سیکٹر ۹
پنچکولا۔ ہریانہ

"آپ بھی تو روز جاتے ہیں اُنہیں دیکھنے۔ پتاجی سے کوئی بات کیجیے گا اس سمبندھ میں"۔

"میرا بات کرنا تو ٹھیک نہیں لگے گا، لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی جائے گا"۔

اُسی شام جب آنند ماسٹر جی کو دیکھ کر پی۔ جی۔ آئی سے واپس آنے کے لیے اسکوٹر اسٹینڈ سے اپنا اسکوٹر لینے گیا تو گوربخش وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اُسے دیکھتے ہی آنند نے کہا۔

"ہیلو گوربخش"۔

"ہیلو باسٹرڈ" اس کا یہ جواب سُن کر آنند سکتے میں آ گیا۔

گوربخش کے ساتھ دو چھوکرے اور بھی تھے۔

آنند جب اپنے اسکوٹر کو اسٹارٹ کرنے لگا تو گوربخش نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ بوٹی بوٹی نُچوا دوں گا۔ یہ میری آخری وارننگ ہے"۔

آنند نے کوئی جواب نہ دیا اور اسکوٹر اسٹارٹ کرنے لگا۔

"اس حرام زادی کا بھی انتظام کر رہا ہوں"۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ ایک طرف نکل گیا۔

آنند گھر پہنچا تو وہ بڑا اُداس سا تھا۔

ورما صاحب کے پاس بھی وہ زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔ اپنے فلیٹ میں آ کر وہ وہسکی پیتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ وہ اب کیا کرے۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کے ستاروں کے عروج کا زمانہ اب ختم ہو رہا تھا اور اس کی زندگی کا کلس ملس اب زوال پذیر تھا۔ جس جنگ کو وہ اب تک اکیلے ہی لڑتا رہا تھا۔ اب اس میں مخالف فریق کی مدد کے لیے کئی طاقتیں شامل ہونے لگی تھیں

اکیلا اور تنہا آنند!

اکیلی اور نہتی سرجو!

اور ادھر مخالف قوتوں کا ایک ہجوم — اپنے ہاتھوں میں پرانے لیکن خطرناک ہتھیار لیے!

آنند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

" اپنے لیے نہیں، سرجو کے لیے، وجینتی کے لیے، سادھنا دھر کے لیے"! ان سب کے لیے جو ایمان داری سے جینا چاہتے تھے اور زندگی سے سوائے انصاف کے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا زندگی سے صرف اتنا مطالبہ تھا کہ وہ اُنہیں امن اور وقار سے جینے دے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں چاہتے تھے وہ۔ ایسے لوگوں میں ماسٹر جگدیش رائے بھی شامل تھے اور ورما صاحب بھی۔ آنند دیر تک گیلی آنکھوں کے سامنے پھیلے دھندلکے میں آنے والے لمحوں کے دھندلے خاکوں میں زوال پذیر ستاروں کی روشنیاں بھرتا رہا۔

زندگی میں کبھی کبھی تو کوئی لا جک ہی نہیں رہتا۔ کبھی کبھی تو زندگی ایک دم اتنی غیر متوازن ہو چکی اور ناہموار ہو جاتی ہے کہ آدمی کا ہر قدم غیر محفوظ اور پُر خطر ہو جاتا ہے۔ وہ قدم کسی راہ پر نہ رکھتا ہے اور پہنچ کسی دوسری ہی راہ پر جاتا ہے۔

نہ راہیں اس کا ساتھ دیتی ہیں نہ منزلیں ہی۔

ایک غیر مختتم سفر رہ جاتا ہے اس کے سامنے۔ جس میں اس کا نہ کوئی ہمراہی رہتا ہے نہ ہم سفر۔

نہ کوئی چراغ اس کے ساتھ ہوتا ہے نہ ستارہ۔ اس کا سارا جہاں اس کی ذات میں سمٹ آتا ہے۔ اور اس کی ذات سارے جہاں سے الگ ہو جاتی ہے بڑی متضاد کیفیت ہو جاتی ہے اس کی تمام تر شخصیت کی۔ وہ جس کے اندر سنسار بھر کا گیان اکٹھا کیا ہوتا ہے، ایک ہی لمحے میں مٹی کے خالی برتن کی طرح ہو جاتا ہے۔ جس میں خالی اور کھوکھلی آواز کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ اس کی آواز جو چاروں طرف گونجا کرتی تھی کبھی، اب صرف اُس کے اپنے آپ تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ وہ آواز جسے سننے کے لیے لاکھوں آدمی بے تاب رہتے تھے کبھی، اب اسے وہ خود بھی پوری طرح نہیں سُن سکتا۔ سنتا ہے تو اُسے یقین نہیں آتا کہ وہ اُس کی اپنی آواز ہے۔ اب اُسے اپنی آواز پر بھی وشواس نہیں۔ اپنی ذات سے بھی بھروسہ اُٹھ گیا ہے اُس کا۔

آنند زندگی بھر اسی ایک لمحے سے ڈرتا رہا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ اب وہ لمحہ آ گیا تھا۔

صرف اس کی اپنی زندگی میں نہیں بلکہ ان سب لوگوں کی زندگیوں میں جو کسی نہ کسی رشتے سے اس سے وابستہ تھے۔

وہ سب بندھن ٹوٹ جائیں گے اب۔

وہ سب سمبندھ ٹوٹ جائیں گے جو اس نے اب تک بنائے تھے اور اُنہیں مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

رات کے گہرے سناٹے میں آنند کو لگ رہا تھا کہ سب دیواریں دھیرے دھیرے ڈھ رہی تھیں۔ اور وہ ان گرتی ہوئی دیواروں کی ہلکی ہلکی آواز سُن رہا تھا۔ اور خشک ریت اور دھول کے غبار دیکھ رہا تھا۔ اپنی دھندلی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے دھندلکے میں۔

یا خدا! میں کہاں پہنچ گیا ہوں اس لمحہ!

آنند نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کہے۔ اور پھر اس نے اپنا سر رائٹنگ ٹیبل پر ٹکا دیا۔ جس کے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ وہسکی پی رہا تھا۔

سرجو کا معمول تھا کہ صبح ایک بار ضرور وہ آنند کے گھر آتی تھی۔ ایک تو اُسے دن بھر کا شیڈول معلوم ہو جاتا تھا اور دوسرا یہ کہ کوئی ضروری ٹیلی فون کرنے ہوتے تو آنند کے ٹیلی فون سے کر لیتی۔

اگلی صبح جب سرجو آئی تو آنند نے گوربخش سے ہوئی گفتگو کے بارے میں اُسے کچھ نہیں بتایا لیکن اُسے اس بات کا اندازہ ضرور ہو گیا کہ سرجو خود بھی پریشان تھی۔

"بہت پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے؟"

"گوربخش نے کچھ کہا تھا آپ سے کل؟"

"ہاں"

"تو آپ پی جی۔ آئی میں مت آیا کریں"

"کیوں؟"

"اس سے حالات اور بگڑ سکتے ہیں؟"

"اور تمہارے یہاں آنے سے؟"

"اس سے بھی اور زیادہ بگڑ سکتے ہیں — پتاجی کی بیماری نے بہت سے نئے مسئلے کھڑے کر دیے ہیں"۔

"کون سے مسئلے؟"

"پھر بتاؤں گی۔ آپ "ویژن" کے دو ایشوع اگر خود سنبھال لیں تو میں دوسرے معاملوں سے نپٹ لوں"!

"سنبھال لوں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے"۔

"تھینکس — تو میں اب چلتی ہوں۔ پتاجی کے کچھ اور ٹیسٹ ہونے ہیں۔ شام کو مت آیئے ادھر"

آنند کا جواب سنے بغیر ہی سرجو سیڑھیاں اُتر گئی۔ آنند برآمدے میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

اگلے دو تین دنوں میں سرجو سے ملاقات نہیں ہوئی آنند کی۔

وقت بے وقت ٹیلی فون پر بات ضرور ہوتی رہی۔ آنند بیچ بیچ میں پی۔جی۔آئی ہو آتا رہا۔ لیکن گوربخش سے اس کی پھر ملاقات نہیں ہوئی۔

"ویژن" کا تازہ ایشوع خود آنند نے ہی دیکھا تھا۔ اس میں سا دھنا دھر کی بھی نظم چھاپی تھی اُس نے۔

"یہ سادھنا دھر کون ہے؟" سرجو نے ٹیلی فون پر پوچھا تھا۔

"سری نگر کی ایک نئی لاسٹر ہے"۔

"اس بار ملی تھی آپ سے؟"

"ہاں"۔

"بتایا نہیں آپ نے"؟

"خیال نہیں آیا"!

"اور تو سب خیال آجاتے ہیں آپ کو"۔

"کبھی نہیں بھی آتے"! آنند نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑی انٹیلی جنٹ ہے وہ"۔

"آپ کی چوائس غلط تھوڑی ہو سکتی ہے"۔

"کب آرہی ہو؟"

"ٹیل سی"!

اب سرجو نے ریسیور رکھ دیا تھا یا ٹیلی فون خود ہی کٹ گیا تھا۔ یہ آنند کو معلوم نہیں ہوا بہرحال بات آگے نہیں چلی۔

اس روز ماسٹر جگدیش رائے کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔

آنند صبح سویرے ہی پی۔جی۔آئی چلا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا اور ٹیسٹ کرواتا رہا تھا۔ دوپہر کے بعد سرجو اور اس کی ماں نے اسے مجبور کر کے گھر بھیجا تھا۔ تب اس نے ورما صاحب کے ساتھ لیا۔ اور پھر "ویژن" کے آفس چلا گیا۔ وہاں سے وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر رات کے نو بجے گھر پہنچا۔ اسی دوران وہ لمحہ آکر گزر بھی گیا تھا۔ سرجو جس کو ٹالنے کے لیے اتنا عرصہ سے لگاتار جدوجہد کرتی رہی تھی۔

ماسٹر جی کی ٹیسٹ رپورٹیں لے کر وہ اسپیشل وارڈ میں آئی تھی، جس میں آج ہی آنند انہیں شفٹ کروا کر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اسپیشل وارڈ کا بندوبست کرا سکا تھا۔

کمرے میں ایک اجنبی آدمی بیٹھا تھا۔ گوربخش اور اُس کی ماں مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔

"رپورٹیں مل گئیں؟" ماں نے پوچھا۔

"جی"۔

"میٹ کیپٹن دیپک شرما"۔ گوربخش نے اُسے مخاطب کیا۔ "مائی سسٹر، سرجو"۔ پھر وہ دیپک شرما سے مخاطب ہوا۔

دیپک شرما پل بھر کے لیے کرسی سے اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

سرجو نے رپورٹیں گوربخش کو پکڑائیں اور بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں ڈاکٹر سے مل کر"۔

اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل کر کاری ڈور میں آگئی۔ لمبے کاری ڈور کا فاصلہ طے کر کے وہ لفٹ تک گئی۔ لفٹ وہاں نہیں تھی۔ پھر وہ لفٹ کے بنا ہی پی۔جی۔آئی سے نیچے اُترنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے گوربخش جس ڈرامے کی ریہرسل کرتا آرہا تھا، یہ اُس کا کلائمکس تھا، جسے وہ دیکھ کر آئی تھی، وہ خود بھی تو غیر ارادی طور پر اس ڈرامے کی ریہرسل میں حصہ لیتی رہی تھی اور اب جب کہ آخری سین کھیلا جا چکا تھا، اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ سیدھی آنند کے گھر گئی۔ فلیٹ بند تھا۔ ایک چابی تو اس کے پاس ہوتی تھی۔ اُس نے تالا کھولا اور اندر آکر صوفے پہ گر گئی۔

"تمہاری کالی زبان کاٹ دینی چاہیے تھی اس دن مجھے"۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئی اور پھر زار و قطار رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے "ویژن" کے آفس ٹیلی فون کیا۔ آنند وہاں نہیں تھا۔ پھر اُس نے کئی اور جگہ ٹیلی فون کیے کہ آنند کا کچھ پتہ چلے، لیکن کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کسی کو بتا کر جاتا بھی تو نہیں تھا۔ جب وہ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ سے باہر نکلنے لگی تو ورما صاحب نے ٹوک دیا۔

"بنا سلام دعا کے ہی جا رہی ہو سرجو"۔

"ذرا جلدی میں تھی ورما صاحب"۔

"ہاؤ از یور فادر؟"

"ناٹ ان اے گڈ شیپ"۔

"ٹیک کیئر آف دی اولڈ چیپ"۔

"ڈوئنگ اور بیسٹ ورما صاحب"۔

پھر سرجو نے موپیڈ اسٹارٹ کیا اور "ویژن" کے دفتر میں گئی۔ کچھ دیر کاغذوں کو دیکھتی رہی۔ اس دن کے پیپر دیکھے۔ چائے کی پیالی پی۔ آنند کے بارے میں پوچھا تو اتنا معلوم ہوا کہ وہ آفس سے پریس گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔

وہ ٹوٹی ہاری گھر پہنچی۔ وہ ابھی گھر کے باہر ہی کھڑی تھی کہ ڈرائنگ روم سے گونجتا ہوا گوربخش کا

قہقہہ اس کے کانوں میں پڑا۔ پھر اس قہقہے میں نشے میں لتھڑا ہوا ایک اور قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔ نشے میں بھیگے ہوئے دو کرخت قہقہے اور خالی گھر۔

سرجو اپنے گھر سے لوٹ آئی۔

لگتا تھا اب اپنے گھر کے دروازے بھی دھیرے دھیرے اس پر بند ہونے لگے تھے۔ اب شاید اسے اپنا گھر اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہی پھرنا پڑے گا۔

رات نو بجے کے قریب جب آنند گھر لوٹا تو ورما صاحب اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

"تم شاید ذمہ داری کبھی نہیں سیکھو گے؟"

"سوری سر۔"

"سوری کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہاری مہمان چھ گھنٹوں سے انتظار کر رہی ہے۔"

"کون؟"

اسی لمحہ دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے کھڑی ہو گئی سادھنا دھر۔

"مجھے سادھنا دھر کہتے ہیں حضور۔"

"ارے تم — اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی؟"

"ٹیلی گرام تو دیا تھا۔"

"مجھے نہیں ملا تمہارا ٹیلی گرام۔"

"تار تو [illegible] آپ گھر میں ہوں گے۔"

"دیٹ از رائٹ۔" آنند زور سے ہنسا

"ہی از مائی کاربین۔" اس نے ورما صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے آپ ساری عمر کاربین کی تلاش کرتے رہیں گے۔" سادھنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹھو تو سہی اب۔" ورما صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

آنند بھی صوفے پر بیٹھ گیا اور سادھنا بھی۔

"گھر میں سب لوگ ٹھیک ہیں؟"

"آپ جن لوگوں کو جانتے ہیں وہ سب — ٹھیک ہیں۔" سادھنا نے جواب دیا۔

"میں نے سادھنا کے لیے ایک کمرہ ٹھیک کروا دیا ہے۔ وہ اسے استعمال کر سکتی ہے۔" ورما صاحب نے کہا۔

"ہاؤ گریٹ یو آر، ورما صاحب۔"

"بہت مسکا لگاتے ہو تم۔"

"کبھی کبھی تو لگانا ہی پڑتا ہے۔"

"کہاں لگاؤں؟" سادھنا دھر نے پوچھا۔

"آتے ہی گھر کی مالکن بن گئیں؟"

"نہیں۔ اے سرونٹ اونلی۔"

"میں اوپر فلیٹ سے ہو کر آتا ہوں ایک منٹ میں۔"

"وہاں پینے مت بیٹھ جانا۔"

"نہیں ورما صاحب، آپ کے بغیر کیسے پی سکتا ہوں۔"

"اب مجھے بھی بدنام کرو گے تم۔"

"بدنام تو ہم دونوں ہی ہیں۔ صرف ڈگری کا فرق ہے۔" آنند نے ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور پھر اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"اے سپائلڈ بٹ اے نوبل پرسن۔"

ورما صاحب نے سادھنا دھر کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کومینٹ کیا۔

آنند اپنی ڈاک دیکھنے کے لیے میز کی طرف بڑھا۔

سرجو کی ایک لائن لکھی پڑی تھی۔

"آئی ایم ان اے ویری ڈیپ کرائسس۔"

اس نے چٹ کو موڑتے ہوئے جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر بنا کہے میں رک کے نیچے چلا آیا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔

کھانے کی میز پر بیٹھ گیا وہ۔ کھانا ابھی شروع کر دیا اس نے۔ لیکن بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی منھ سے نہیں نکالا اس نے۔ سادھنا نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس کی کسی بات کا جواب دے، لیکن اس کے موڈ میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں ورما صاحب!"

جس شخص کی ساری زندگی کو اس کے موڈز کنٹرول کرتے ہوں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یو مسٹ امپروو یور سیلف۔"

"نہیں کر سکتا ورما صاحب۔ آئی ایم سوری۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری بیوی تم جیسے دلگر آدمی پر مرتی رہی۔"

"میں کیا جواب دوں اس کا؟"

"تم کیا جواب دے سکتے ہو۔ تم نہایت ہی ناقابل اعتبار آدمی ہو۔"

"آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔"

"اس لڑکی کو کیوں بلایا ہے تم نے یہاں؟"

"میں خود آئی ہوں ورما صاحب۔ انہوں نے نہیں بلایا۔"

"تو واپس چلی جاؤ۔ یہ شخص بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

"یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے موڈ کے مطابق اس کے سامنے ناچتے رہیں۔"

"یہ میں نے کبھی نہیں چاہا ورما صاحب۔"

"آئی ایم گوئنگ ٹو چینج مائی مائنڈ۔"

"وصیت کے بارے میں۔"

"ہاں۔"

"آئی شیل آلسو چینج مائی مائنڈ۔"

"تم کبھی نہیں بدلو گے۔ مجھے ہی بدلنا پڑے گا۔ ورما صاحب کی آواز بھر آگئی۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ آنند کے کندھے پر رکھ دیا۔

آنند نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔

ورما صاحب نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"آئی نیڈ یو ویری بیڈلی آنند۔"

"ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔" آنند نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے قریب

لاکر انہیں چوم لیا۔

سادھنا دھر نے انسانی رشتوں کی ایک نئی تصویر دیکھی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"آپ آرام کریں اب ورما صاحب۔"

آنند انہیں ان کے بیڈ روم کی طرف لے گیا۔ پھر وہ سادھنا سے بولا۔

"تم بھی تھکی ہوئی ہو۔ آرام کرو۔ صبح بیڈ ٹی کے لیے اُوپر آجانا۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔"

آنند نے جواب دیا اور پھر سادھنا کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اپنے فلیٹ میں جانے سے پہلے وہ کچھ لمحوں کے لیے گیٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور خاموش اور سنسان سڑک کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سگریٹ سُلگا لیا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلیٹ میں آگیا۔

سادھنا دھر کمرے کی بجلی بجھا کر اپنے بستر میں لیٹ گئی اور اپنے آپ کا تجزیہ کرنے لگی۔ اُس نے سری نگر چھوڑنے کا فیصلہ شاید جلدی میں کیا تھا۔ اگر اُسے اپنا گھر چھوڑنا ہی تھا تو اُسے چنڈی گڑھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ جس شخص کے بھروسے پر وہ یہاں آئی تھی، اس کا اصلی رُوپ تو اُس نے چند ہی گھنٹوں میں دیکھ لیا تھا۔ اسے تو اپنے آپ اور اپنی زندگی پر ہی کنٹرول نہیں۔ وہ زندگی کی [illegible] پر کیا کنٹرول رکھتا ہوگا۔ اُس کا [illegible] تو بس اُس کے موڈ کے مطابق ہی چلتا ہوگا۔ جس لڑکی کو اُس نے اپنے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر رکھا ہوا تھا وہ بھی تو واقف ہوگی اُس کے لائف پیٹرن سے۔ سادھنا کو لگا کہ اس کا چنڈی گڑھ آنے کا فیصلہ ٹھیک نہیں تھا۔

وہ آئی آنند کے بھروسے پر تھی اور اُس وقت سو رہی تھی اُس کے لینڈ لارڈ کے گھر میں جو خود اس سے خوش نہیں تھا۔ اس اجنبی گھر اور ایک اجنبی کمرے میں وہ اپنے آپ کو بڑا غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں ہی تو ورما صاحب سو رہے تھے، جن کے خراٹوں کی آواز سادھنا سُن رہی تھی۔ اور اپنی کھلی آنکھیں کمرے کے اندھیرے پر گاڑے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔ وہ کل ہی یہاں سے دہلی چلی جائے گی۔ اس کے پاس دو تین بہت ہی اچھے اور ذمہ دار لوگوں کے ایڈریس تھے۔ وہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔ کم سے کم چنڈی گڑھ جیسی پوزیشن تو نہیں ہوگی اس کی۔

اور لگ بھگ اسی طرح کی بات سوچ رہا تھا اُس وقت آنند بھی۔ اپنے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے اور گلاس سے دھیرے دھیرے وہسکی پیتے ہوئے اور سگریٹ کے دھوئیں کو فضا میں بکھیرتے ہوئے۔

جس نازک دور سے اس وقت وہ اور سرجو گزر رہے تھے۔ اس میں کسی بھی تیسرے شخص کا ان کے قریب آنا ان دونوں کے حق میں نہیں تھا ـــــ سادھنا دھر کا اس وقت اچانک آجانا تو کسی بھی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ اُسے آنند سے پوچھ کر آنا چاہیے تھا۔ یہ کرائسس تو اور بھی نازک صورت اختیار کر جائے گا اب۔ آنند بنا کپڑے بدلے ہی رات کے پچھلے پہر پلنگ پر گر گیا اور صبح اُس وقت جاگا جب دن نکل آیا تھا۔

سادھنا بھی دیر تک سوئی رہی۔

ورما صاحب اپنے لیے بیڈ ٹی خود ہی بناتے تھے۔ اُنہوں نے تو خود چائے پی ہی لی تھی۔ ساتھ میں ایک پیالی سادھنا کو بھی پلا دی تھی۔

جب سادھنا آنند کے فلیٹ میں آئی۔ آنند تیار ہو چکا تھا۔ اور اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ تو بہت جلدی تیار ہو گئے ہے"

"صبح میں جلدی ہی تیار ہو جاتا ہوں ـــ کہیں جانا ہو تو نکل جاتا ہوں۔ دیر سے جاؤ تو لوگ گھر پر نہیں ملتے۔"

"چائے تو آپ نے تیار رکھی ہے۔"

"ایک پیالی پی بھی چکا ہوں۔"

"ایک پیالی تو میں بھی پی کر آئی ہوں۔"

"ورما صاحب نے پلا دی؟"

"جی۔"

پھر آنند نے دو پیالیوں میں چائے بنائی اور ایک پیالی سادھنا دھر کو دی۔

"میں آپ کے لیے سماوار لاتی ہوں۔ سماوار کی نمکین چائے پلاؤں گی آپ کو۔"

"کب؟"

"جب آپ کہیں۔"

"تو کل سہی۔"

"کل تو میں دلّی جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"سوچتی ہوں وہیں کام کروں۔"

"مل گیا ہے کام؟"

"ملا تو نہیں۔ مل جائے گا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔"

"تو چلی جاؤں؟"

"دل مانتا ہے تو ضرور جاؤ۔"

"آپ دل ہی کی بات مانتے ہیں۔"

"زیادہ تو اسی کی بات مانتا ہوں۔"

عین اس وقت سرجو سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ بے حد پریشان لگ رہی تھی۔ آنند صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، جہاں وہ سادھنا کے پاس بیٹھا تھا۔

"آؤ سرجو، سادھنا دھر سے ملو۔"

"آپ ہیں سرجو شرما۔ آنند صاحب آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

"آنند صاحب تعریف کے علاوہ کچھ کرتے ہی نہیں۔"

"تمہاری چیٹ میں نے بہت رات گئے دیکھی تھی کیسے ہیں ماسٹر جی؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"کیا خاص بات تھی؟"

"جو تھی وہ اب عام بات بن چکی ہے۔"

"بیٹھو تو۔"
"نہیں، مجھے پی جی آئی جانا ہے۔"
"میں بھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔"
"آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔"
سرجو یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ آنند بھی اُٹھ کر اس کے پیچھے دروازے تک گیا۔
"آپ اپنی مہمان کو اٹینڈ کیجیے۔"
آنند اس کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ تک آیا۔
"اتنی پریشان کیوں ہو؟"
"پریشان تھی، اب نہیں ہوں۔"
"کچھ کہو تو سرجو۔"
"میرا نام "ویٹرن" سے ہٹا دیجیے — میں چنڈی گڑھ سے جا رہی ہوں۔"
"کہاں جا رہی ہو؟"
"آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"
سرجو چلی گئی۔
وہ گھر سے آئی تھی تو اُس نے سوچا تھا کہ وہ ناشتہ آنند کے ساتھ کرے گی۔ کل دوپہر سے وہ بھوکی تھی۔ اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ کل والا سارا قصہ آنند کو سنائے گی اور اس سے پوچھے گی کہ وہ اُس کرائسس کا کس طرح مقابلہ کرے۔ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی وہ۔ اس نے وہم و گمان میں بھی نہیں سوچا تھا کہ صبح سویرے اس کی ملاقات سادھنا سے ہوگی۔ ظاہر تھا کہ اُس نے رات آنند کے فلیٹ میں ہی گزاری ہوگی۔ وہاں رات گزارنے کا کیا مطلب تھا یہ بھی اُسے معلوم تھا۔ آنند زندگی میں کبھی کسی ایک عورت سے بندھ کر نہیں رہے گا۔ آج سرجو کا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ آنند نے اس سے اس وقت وشواس گھات کیا تھا۔ جب وہ بے حد کمزور اور بے سہارا ہو چکی تھی اور کوئی بھی چالاک شخص اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔
اس کا بھائی گورنجن چالاک اور شیطان تھا۔
اور وہ اس وقت بے حد مجبور تھی۔ اس کے بھائی نے اپنے ماں باپ کی مجبوری کا بھی پورا پورا فائدہ اُٹھا لیا تھا۔
سادھنا دھر کو بھی شاید حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے دہلی جانے کا خیال چھوڑ دیا۔
"میں چنڈی گڑھ میں ہی رہوں گی اور آپ کا اخبار سنبھالوں گی۔"
"ایک دم کیوں بدل لیا ارادہ تم نے؟"
"جواب طلبی مت کیجیے گا۔"
"نہیں کرتا۔"
"میرے لیے ورما صاحب والا کمرہ ٹھیک ہے۔ کہیں اور انتظام نہ کروائیے۔"
"آل رائٹ!"
"اب آپ پی جی آئی جائیے۔ دوپہر کو ملاقات ہوگی۔"
سادھنا نیچے چلی گئی اور آنند پی۔ جی۔ آئی جانے کے لیے گھر سے نکل گیا۔ لیکن راستے میں کئی جگہ رُکنا پڑا اُسے۔
جب وہ پی جی آئی پہنچا تو دوپہر ہو گئی تھی۔ وارڈ میں گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ ماسٹر جی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے تھے۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ وہ شام کو ان کے گھر جائے گا، لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ وہ ابھی اِدھر ہو آئے۔
اپنا اسکوٹر لین کے کنارے کھڑا کر کے جب وہ ماسٹر جگدیش رائے کے گھر کا گیٹ کھولنے لگا تو اُسے گورنجن سامنے کھڑا نظر آ گیا۔
"ماسٹر جی گھر آ گئے؟"
"ہاں!"
"میں اُنہیں دیکھنے آیا تھا۔"
"وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔"
"سرجو گھر پر ہے؟"
"نہیں وہ چلی گئی ہے۔"
"کب؟"
"یہ بتانا ضروری نہیں۔ آئندہ اِدھر آنا بھی نہ کبھی۔"
آنند گیٹ سے ہٹ کر سڑک پر آ گیا اور اسکوٹر اسٹارٹ کر کے "ویٹرن" کے آفس چلا گیا۔
زندگی میں جس لمحے کی آمد سے وہ اب تک ڈر رہا تھا۔ وہ اب آ گیا تھا اور ایک طاقت ور دشمن کی طرح اُس کے سامنے کھڑا اسے للکار رہا تھا۔
مقابلہ کرو یا شکست قبول کر لو۔
مقابلہ تو کرنا ہی ہوگا۔
شکست ماننا اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔
اگر وہ شکستیں مانتا رہتا اور سمجھوتے کرتا رہتا تو شاید یہ لمحہ بھی ٹلتا ہی رہتا اور شاید کبھی آتا بھی نہ۔
لنچ کے لیے وہ گھر نہیں آیا۔
ورما صاحب نے لنچ لے لیا تھا، لیکن سادھنا بھوکی ہی رہی تھی۔ اُسے یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ آنند کی غیر حاضری میں کھانا کھا لے۔
تین دن کے بعد "ٹریبیون" اور "انڈین ایکسپریس" میں خبر چھپی تھی۔ خبر پڑھی بھی سادھنا نے ہی تھی۔
۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر آف "ویٹرن" گیٹس میریڈ۔
"سرجو کی شادی کی بات کہیں چل رہی تھی؟" سادھنا نے پوچھا۔
"مجھے معلوم نہیں۔"
"اُس نے آپ کو بتایا بھی نہیں؟"
"نہیں۔"
"کوئی کارڈ وارڈ بھی نہیں بھیجا۔"
"نہیں۔"
"ویری اسٹرینج۔"
"وٹ از اسٹرینج اِن اِٹ۔" آنند نے غصے سے کہا۔
سادھنا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش ہو گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ آنند اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہ چاہتا تھا۔ ورما صاحب نے بھی آنند کو زیادہ نہیں کریدا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ اس خبر کا ردِ عمل آنند پر کیا ہوگا۔
آنند واقعی ذہنی طور پر لڑکھڑا گیا تھا۔
وہ خود ہی قصوروار تھا اس کے لیے۔ سرجو تو آئی

تھی اس کے پاس۔ چوٹ بھی چھوڑ گئی تھی۔ سادھنا غلط وقت پر آئی تھی۔ اسی کارن سرجو اس سازش کا شکار ہو گئی تھی، جس سے آنند اسے بچا سکتا تھا۔ اُسے لگا وہ زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکے گا۔

وقت اور حالات کی سازش سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

وہ خود بھی نہیں بچ سکے گا اور اسی طرح برباد ہوگا!!

دو دن کے بعد سرجو شرما کا ایک مختصر سا بیان بھی چھپا۔

"میں نے "ویژن" اخبار چھوڑ دیا ہے۔ میرا اس اخبار سے اب کوئی واسطہ نہیں" سرجو شرما۔

اس صدمے کے لیے تو آنند پہلے ہی سے تیار تھا۔

بیان پڑھنے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا۔

"میری کیلکولیشنز کے مطابق اُسے یہیں پہنچنا تھا۔"

"کہاں؟"

"جہاں وہ اب پہنچی ہے۔"

"میں کہاں پہنچوں گی؟" سادھنا دھر نے سوال کیا۔

"اس کا جواب سیرو ہی دے سکتا ہے۔ میں نہیں۔"

"سیرو کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارا طلاق کا معاملہ اس سے چل رہا ہے۔ میرے ساتھ نہیں۔"

"آپ مجھے آزاد دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"شاید نہیں۔"

وہ رات آنند کے لیے قیامت کی رات تھی — وہ بہت تڑپا رات بھر۔ بہت رویا بھی۔ اُس نے اپنے ہونٹ بھی کاٹے کئی بار۔ ہونٹوں سے نکلے خون کا ذائقہ بھی چکھا کئی دفعہ۔

اسے رہ رہ کر کوالم بیچ کی وہ شام یاد آ رہی تھی جب وہ سرجو اور اس کی دو فرینڈز کو تری وینڈرم سے کوالم بیچ کی ریت پر لایا تھا اور لہروں کا لطف لینے کے بعد اُنہیں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھنے کو کہا تھا اور خود الگ کھڑا رو پڑا تھا۔ سورج کو سمندر کے پانی میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر۔ اُس نے سرجو کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"کوالم بیچ کی ریت پر مرتے ہوئے سورج کو دیکھنے والا ہر انسان، اپنے آپ میں ایک ایسا سمندر ہے۔ لیکن وہ چھلکتا جب ہے جب اُسے کوئی گہرا ذاتی صدمہ ہو۔ دوسروں کے صدموں پر یہ سمندر بھرتا نہیں۔ ایک خاموش، چھوٹا سا پانی کا گڑھا بنا، روح کے اندھیروں میں سویا رہتا ہے۔ اس گڑھے کو سمندر بننے کے لیے ایک بڑے اپ ہیول کی ضرورت ہے۔ مائی فرینڈز!"

رات کے گہرے سناٹے میں اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہوئے آنند کو محسوس ہوا کہ اُس کی زندگی میں وہ اپ ہیول آ گیا تھا جس سے روح کے اندھیرے میں سویا پانی کا خاموش گڑھا بھرتا ہوا سمندر بن جاتا ہے!!!

بقیہ: ملاحظات

فیض اٹھایا۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں اور اداروں کو درکار ساز و سامان اور کل پرزوں کے لیے چھوٹے پیمانے کے شعبہ میں ضمنی پیداوار کی ترقی و فروغ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شعبہ نے نہایت اعلیٰ اشیاء کی تیاری میں کتنا زیادہ استحکام حاصل کر لیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کے ضمنی یونٹوں سے اصل خریداری میں ۱۹۶۹ اور ۱۹۸۵ء کے درمیان ۵ گنا اضافہ ہوا ہے۔

چھوٹے پیمانے کے شعبہ کی برآمداتی کارکردگی بھی یکساں طور پر قابل تعریف رہی ہے۔ مذکورہ برآمدات میں ۷۴-۱۹۷۳ء سے ۸۵-۱۹۸۴ء تک کی مدت کے دوران ۶۰۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے اور ملک کی کل برآمدات میں مذکورہ برآمدات کا حصہ تقریباً ۲۲ فیصد ہو گیا ہے۔ یہ بات نہایت اطمینان بخش ہے کہ چھوٹے پیمانے کی شعبہ کی برآمدات میں غیر روایتی برآمدات کا حصہ ۹۱ فیصد سے زیادہ ہے حقیقت یہ ہے کہ کل برآمدات میں چھوٹے پیمانے کے شعبہ کا حصہ اس صورت میں اور زیادہ ہو جائے گا اگر براہ راست برآمدات کی شکل میں اس کے حصے کو شامل کر لیا جاتا ہے کیونکہ چھوٹے پیمانے کے یونٹ بہت بڑی تعداد میں اپنے کل پرزے اور متعلقہ ساز و سامان سپلائی کرتے ہیں جو بڑے پیمانے کے شعبے کے تیار کردہ برآمداتی مال میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران کھیل کود کے سامان، ڈبہ بند تمباکو، نسوار، لاکھ اور پلاسٹک کی متعدد اشیاء کی برآمدات خاص طور سے چھوٹے پیمانے کے شعبے سے کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سمندری پیداوار، سلے سلائے کپڑوں، اونی کپڑوں، چمڑے اور چمڑے کی مصنوعات نیز انجینئرنگ سے متعلق سامان کی برآمدات میں چھوٹے پیمانے کے شعبے کا حصہ بالترتیب ۹۲ فیصد، ۸۴ فیصد، ۶۱ فیصد اور ۳۰ فیصد ہے۔ صنعت کاری کے دور رس اثرات برآمد ہوئے ہیں۔ کل درآمدات میں مشینوں کا حصہ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۳۶٫۲ فیصد سے کافی گھٹ کر ۸۶-۱۹۸۵ میں ۱۸٫۹ فیصد رہ گیا ہے۔ انجینئرنگ سے متعلق سامان کی برآمدات کی مالیت ۶۶-۱۹۶۵ میں ۲٫۲۶ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ میں ۶۷۰٫۲۹ کروڑ روپے ہو گئی جو کہ ۲۸ گنا زیادہ ہے اور ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ کل برآمدات میں انجینئرنگ کے سامان کا حصہ اسی مدت کے دوران ۱٫۲ فیصد سے بڑھ کر ۶٫۹ فیصد ہو گیا ہے۔ مذکورہ اعداد و شمار آج بھارت کے صنعتی شعبے کی مسلسل ترقی اور صنعتی استحکام کو نمایاں کرتے ہیں

گزشتہ چار دہوں کے دوران ہم نے ایک انتہائی مربوط اور تیز رفتار صنعتی شعبہ تیار کیا ہے جس کی وجہ سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ روزگار کے زیادہ مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ اور آمدنی میں عدم مساوات کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ متوازن علاقائی ترقی ہوئی ہے۔ ہم صحیح راستے پر گامزن ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ہمیں تیزی کے ساتھ اس راستے پر آگے بڑھنا چاہیئے تاکہ بھارت جیسے ہی ۲۱ویں صدی میں داخل ہو اس کا شمار دنیا کے بڑے صنعتی ممالک میں کیا جائے۔

جوگندر پال

انتم پاٹھ

موٹر سائیکل کک لگتے ہی جنگھاڑ جنگھاڑ کر دھواں چھوڑنے لگی اور وہ دونوں ابھی سیٹ پر جم کر بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک دم اچھل کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

پیچھے بیٹھا ہوا سنتا گھبرا کر کہنے لگا کہ چلنے سے پہلے بیٹھ تو لینے دیا کرو۔

"بیٹھ گیا سنتیا، تے پہنچے گا کس تراں؟"

سنتا اپنی پگڑی سنبھال رہا تھا۔ "کسے دی موت آجائے بنتیا، تے یم بیٹھیاں بیٹھیاں ہی سدھا جا پہنچدا اے۔"

بنتا اسے ہنس ہنس کر بتانے لگا کہ سیدھا راستہ ہے، پو پھٹنے سے پہلے ہی جا پہنچیں گے۔

سنتے کی آنکھیں اچانک بنتے کے کندھے سے لٹکی ہوئی اسٹین گن پر آ رکیں، جس کی نالی اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سراسیمہ سرعت سے اس کی گن کی بجائے کرتے کے اندر اپنی ہی کی پوزیشن بدل لی اور پھر بھی بنتے کی گن کو بدستور اپنی طرف اٹھتے ہوئے پا کر پریشان آواز سے پکار اٹھا کہ اس ماں کو میرے کلیجے کی طرف کیوں کیا ہوا ہے؟

بنتے نے اپنا دایاں ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل سے اٹھا کر گن کی نالی کا رُخ اپنے آگے کی جانب موڑ لیا۔ "ڈرنا کیوں ایں، سنتیا؟ ماواں ڈائنان بھی ہون، تے اپنی اولاد نوں نئیں کھاندیاں۔"

سنتا ڈھیلا ہو کر اسے بتانے لگا کہ ڈائنیں بے اولاد ہوتی ہیں۔ وہ مائیں ہوں تو ڈائنیں کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کی پیدائش پر یا تو اسے بچایا جا سکتا تھا یا اس کی ماں کو، اور اس کی ماں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر یہ فریاد کرتے ہوئے پران تیاگ دیے تھے، میری بھگونت کرو، کسی تراں میرے بچے نوں بچا لو۔ اپنی ماں کی طرف دھیان جاتے ہی چھ فٹا سنتا جی ہی جی میں منا سا نکل آتا اور اپنے ننھے منے ہاتھ مار مار کے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتا یا پھر ماں کے ہاتھوں میں اچھل اچھل کر ہنسنے لگتا —— نہیں وہ ماں کی شکل و صورت سے ناواقف تھا۔ کیسے واقف ہوتا؟ گھر میں اس کی کوئی تصویر ہی نہ تھی۔ وہ اپنے باپو سے سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ہر بار باپو کے ایک الگ بیان سے اس کی ماں کی ایک نئی تصویر ہی ابھر کر آتی۔

"ہد اے باپو! تیریاں باتاں سن کے بھابو ہر بار کوئی ہور مالوم ہندی اے۔"

"تینوں کی دساں، پُترا؟" اس کا رنڈوا باپ اسے جواب دیتا کہ اس کی بھابو ایک عجیب شے تھی۔ جو عورت بھی سوچ لو، وہ ویسی ہی لگتی تھی۔

سو سنتے سنتے کو بھی ہر عورت اپنی ماں ہی معلوم ہونے لگی، یہاں تک کہ اپنی بیوی سے گلے ملتے ہوئے بھی کئی دفعہ وہ اس طرح بے اختیار رونے لگتا جیسے اپنی کھوئی ہوئی ماں کی چھاتیوں پر اپنا پھٹا ہوا منہ رکھے ہوئے ہو۔

گاڑی سیدھی سڑک پر سرپٹ دوڑی جا رہی تھی کہ بنتے نے اچانک آگے سے اپنے ساتھی کو صدا لگائی اور کوئی جواب نہ پا کر بے صبری سے اور اونچا پکارا۔ "اوے سنتیا! اے ——"

"ہاں —— آں —— ں!"

"سو گیا سی؟ تینے تینے ایتھے کون رو ریا سی؟"

"ہور کوئی نئیں، تے میں ہی رو ریا ہوواں گا۔"

"پر توں تے سوں ریا سئیں، سنتیا۔"

"تے کیا خواباں وچ رونے واسطے تیرے حُکم دی جرورت ہے؟"

بنتا چڑھ سا گیا اور کہنے لگا کہ مجھے کیا؟ خوابوں میں روؤ یا ہوش میں۔ میں تو پوچھ رہا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کون رو رہا تھا۔

اسی اثنا میں موٹر سائیکل نے ایک پٹاخہ چھوڑا اور سنتے کو لگا کہ اس کے کرتے کے اندر اسی کی گن آپ ہی آپ چل گئی ہے اور وہ اچھل پڑا۔ "مینوں لگیا میری گن چل گئی اے۔" وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانس پر قابو پانے لگا

"گناں اپنے آپ تھوڑا ہی چلدیاں نیں، مورکھا؟"

"کجھ وی کہہ لے مورکھا، چلدیاں او اپنے آپ ہی نیں۔"

سنتا ذرا رک گیا کہ اپنے ساتھی کو کس طرح سمجھائے اور پھر اس سے پوچھنے لگا کہ سچ سچ بتاؤ، کیا ہم اپنی مرضی سے گنیں چلانے نکل پڑے ہیں؟

"تو بڑا گہرا آدمی ایں، سنتیا۔" بنتا اسے بتانے لگا۔ "ایسے لئی کسی کم دا نئیں۔ سدھی بات اے، جلاد حکم ادولی کرے گا تے آپ خد پھانسی چڑھے گا۔"

۲۰۴، منداکنی انکلیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۹

"ہاں، بنتا، ایسے لئی میں کہنداں، تُو میں کون کے واہگورو دی مرجی نوں ٹال جایئے؟" پریشان سا ہو کر حسبِ عادت وہ اپنی ڈاڑھی کھجانے لگا اور گویا اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کچھ یوں اضافہ کیا کہ اپنی گن کا منہ کھولتے ہوئے مجھے تو معلوم ہوتا ہے میری اپنی کوئی خواہش نہیں، مانو میری گن کی خواہش ہی میری خواہش بن گئی ہو۔

"تیرے بچے سلامت رہن"۔ بنتے نے خوش ہو کر کہا۔ "توں ٹوں سرخرو کر دتا اے۔ نئیں تے ہن تے سمجھداساں، جنوں وی مارنا، میں ہی مارنا واں۔"

مگر اسے سن کر سنتے نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر ہماری بندوقوں نے ہمارے ہی بچوں کی طرف اپنے منہ پھیر لیے تو ــــ تو ــــ

"اے کس تراں ہوسکدا اے؟ بنتے نے بوکھلا کر موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر لی۔ "تو بڑا اوکھا آدمی ایں۔"

اوکھے آدمی نے جواب میں اتنا بلند قہقہہ لگایا کہ سڑک کی دونوں طرف تاریک درختوں کی شاخوں میں سوئے ہوئے پرندے اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔

قہقہہ لگا کر سنتا سبک ہو گیا اور بڑی شردھا سے جپ جی صاحب کی اٹھارہویں پاوڑی اونچے اونچے دہرانے لگا۔

"اسنکھ مورکھ اندھ گھور
اسنکھ چور حرام کھور
اسنکھ امر کر جاہ جور
اسنکھ گل وڈھ ہتیا کماہ ــــ"

"سنتیا ــــ" بنتے نے نہ معلوم کیا کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن اس خوف سے کہ گوربانی میں ٹوکنا پاپ ہے، وہ "ست نام سری واہگورو" کہہ کر چپ ہو گیا۔

"اسنکھ پاپی پاپ کر جاہ
اسنکھ کوڑیار کوڑے پھراہ
اسنکھ ملیچھ مل بھکھ کھاہ
اسنکھ نندک سر کرہ بھار
نانک نیچ کہے ویچار
واریا نہ جاوا ایک وار

جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
سدا سلامت نرنکار ــــ"

"ست نام سری واہگورو!"

"بنتیا، سچا پادشاہ سانوں ضرور بخش دے گا۔"

"پر اسی کیتا کی اے، سنتیا؟"

سنتے کو بنتے پر ترس آنے لگا کہ بے چارہ اپنے دکھ کو بھی نہیں سمجھ پا رہا۔ وہ دل ہی دل میں پرارتھنا کرنے لگا کہ سچا پادشاہ اُن دونوں کو بخش دے، کہ وہ برے کام تو ضرور کرتے ہیں لیکن سچا پادشاہ تو جانتا ہی ہے کہ وہ برے آدمی نہیں ــــ "تو نئیں بھی جاندا، سچے پادشاہ، پھیر وی بخش دے ــــ تیری بخشش بے حساب ہے" ــــ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کو جھکا رہا تھا۔

کہ بنتے نے موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر دی اور وہ جھٹکا کھا کر گرنے سے بمشکل بچا۔ "توں میٹوں نے ڈبیں گا۔"

"نئیں سنتیا، تیرے کرکے میں بھی کنارے جا لگاں گا۔"

سنتا سوچنے لگا کہ اس کا یار بنتا اوپر سے سنگھاڑے کی طرح کانٹے دار اور کالا ہے مگر اسے ذرا چھیل لیا جائے تو سنگھاڑے کی میٹھی اور چٹی دودھ گری نکل آتی ہے جسے کھا لینے کے بعد بھی اس کا سواد منہ سے نہیں جاتا۔ اس کے بچپن کا بیشتر حصہ اپنی نانی کے گاؤں میں گزرا تھا۔ اس کی نانی اس کے سامنے سنگھاڑوں کا ڈھیر لگائے رکھتی تھی ــــ کھا پترا، کھوب جی بھر کے کھا! ــــ نانی نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں بھی سنگھاڑے کھا کھا کے کبھی نہ تھکتی تھی ــــ پتر، کل تو ڈھب وچ بال کھول کے سنگھاڑے کھا رہیا سی، میٹوں لگیا، ساکشات میری امرکور آگئی اے ــــ نانی نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا تھا اور اسے یہ معصوم سا خیال گزرا تھا کہ کیا پتہ ــــ ہاں، کیا پتہ، اسے جنم دیتے ہوئے، بھابو اسی لیے مری ہو کہ اس کی جان اس میں آ پڑے ــــ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو ہی ایک بھری پُری عورت کے روپ میں دیکھنے لگتا ــــ تو یہ ہے میری بھابو! ــــ بھابو! ــــ بھابو ــــ رات کو نانی اسے اپنی بانہوں میں کس کر سوتی، مانو بڑھیا کو ڈر ہو کہ وہ اپنے سپنے میں ہی کھیلتے کھیلتے کہیں نکل کر کھو جائے گا۔ حالانکہ سوتے ہوئے اس کی ساری کائنات اسی چارپائی پر سمٹ آئی ہوتی اور وہ آپ ہی اپنی ماں بنے آپ ہی ماں کے ہاتھوں میں بے قابو ہو ہو کر اچھل کود کر رہا ہوتا، کھکھلا کر ہنسے جا رہا ہوتا۔

"سنتیا! ــــ اوے سنتیا! ــــ"

"ہاں ــــ ں!"

"پھر سو گیا سیں"۔ بنتا ہنسنے لگا۔ "ہنسنے سے ایتھے ہنس کون ریا سی؟"

سنتے نے جواب دیا کہ اگر تو نہیں ہنس رہا تھا تو میں ہنس رہا ہوں گا۔ یہاں اور کون ہے؟

"نئیں سنتیا۔" وہ بڑی متانت سے اس سے پوچھنے لگا۔ "کی پتہ، کوئی چھلاوہ ساڈھے پچھے لگ پیا ہووے؟"

"چھلاوہ پچھے نئیں لگدا"۔ سنتا بنتے کو بتلانے لگا۔ "لوگ ہی اس دے پچھے لگ جاندے نیں"۔ اسے حیرت تھی کہ ابھی پکا راستہ ختم کیوں نہیں ہوا۔ انہیں اسی راستے پر ایک سیدھ میں چلتے جانا تھا جہاں چند ایک کوس پر گویا تارکول کے روڈ کے باطن سے ہی اسی سیدھ میں کچا راستہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ یہ کچا راستہ چند اور کوس پر سہج سہج ننگے پیروں ایک گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ ان دونوں کو یہیں کے نمبردار کے پورے کنبے کو اپنی سٹین گنوں کی گولیوں سے دھنا دھن بھون دینا تھا۔ سنتا بنتے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا نمبردار غریب کا پتہ کاٹنا ضروری ہے۔ وہ اس کے سارے کنبے کا ملیا میٹ کرنے جا رہے ہیں، کیوں؟ ان بیچاروں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے؟ ــــ

اسی دوران اُن کی موٹر سائیکل ایک بوڑھے کتے کو روند کر گزر گئی۔

"سنبھل کے، بنتیا، خوامخواہ بے زبانے دی جان لے لئی آ"۔

"جان پیاری ساؤ، تے سڑک دے وچوں وچ رستہ روک کے کیوں کھڑا سی؟"

سنتے کی سمجھ میں آنے لگا کہ یار متر اسے دور ہی سے دیکھ کر ادھر ادھر کیوں ہو جاتے ہیں۔ جانتے ہیں اسپیڈ میں اندھا دھند چلا آتا ہے، اس کا راستہ خالی ہی چھوڑ دو۔ جہاں جاتا ہے، جائے، ہمیں کیا؟ ــــ اور تو اور اس کا جگری دوست وچنا بھی اب اس سے بھاگنے لگا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ روز کی کھائی پی اشیا تک کے بارے میں بھی اس طرح سر جوڑ کر باتیں کیے جاتے جیسے اپنے کوئی گہرے راز اگل کر انہیں بڑا چین آ رہا ہو۔

"اوے وچنیا۔"

"ہاں، سنتیا۔"

"بتہ پھر کی ہویا؟"

وچنے کے کان کھڑے ہو جاتے۔ "کی ہویا؟"

"پھر میں مکھناں دی لسی دے دو گڑے والے گلاس پی گیا ——"

"اچھا؟"

"ہاں پھیر وی جی نہ بھریا تے میں تے چاچی دا حصہ وی چوری چوری پیٹ وچ روڑ دتا ——"

"اچھا؟" اس نے پوچھنا چاہا، پھر تو چاچی بھوکی رہ گئی ہوگی؟

"نئیں، چاچی چاچے دے مال تے جو ہاتھ صاف کر لیندی اے۔"

"ہہ ہہ ہاہہ ہا! ——"

ان دونوں کے قہقہے اس طرح گھل مل جاتے جیسے دو کی بجائے کوئی ایک ہی قہقہائے جا رہا ہو۔

"ہائے، اینی دھپ وچ بدل کیوں گجن لگ پئے نیں۔" اس کی چاچی دوڑ کر آنگن میں آنکلتی۔ "کدھرے میرے دلنے نہ ٹھبگ جان۔" وہاں وہ ان دونوں کو قہہ قہہ کرتے ہوئے پاکر خفا ہو جاتی۔ "اینے زور نال ہسو گے غرک جائیو، تے رستہ بھول جاؤ گے۔"

وہ دونوں اور زور سے ہنس ہنس کر چاچی کو بتاتے کہ ہمیں کہیں جانا ہی نہیں، پھر راستہ کیسے بھولیں گے؟

"اوے پاگل دے پُت۔" بنتا بیٹھے بیٹھے اچھلا اور سنتے سے پوچھنے لگا۔ "اک دم قہقہے کیوں مارن لگ پیاں؟" اور پھر سنتے کا کوئی جواب سنے بغیر اس نے بھی قہقہانا شروع کر دیا اور سوچنے لگا کہ کچھ بھی کہیں، اصل مزہ تو بے وجہ ٹھٹھا سے ہی آتا ہے۔

ان کے قہقہے ٹھاٹھا گولیاں برساتے ہوئے موٹر سائیکل کی روشنی کی لکیر سے آگے نکل گئے اور پوپھٹتے پھٹتے پھر خوف سے آس پاس کے جنگل میں چھپ گئے۔

"بنتیا، مینوں لگدا، اسی رستہ بھل گئے آں۔" سنتے کو اس کی گن پھر چبھنے لگی اور اس نے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر اسے پیٹھ پر ٹکالیا۔ "حالاں تک کچا رستہ بھی نئیں آیا۔"

بنتے نے اسے جواب دیا کہ آجائے گا، سیدھا تو راستہ ہے۔ مگر سنتے کو ڈر تھا کہ بھول بھٹک جائے تو بندہ سیدھے راستے پر بھی بھٹک جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا وہ تو ان بھلے لوگوں کی ٹولی میں اس لیے شامل ہو گیا تھا کہ دس بھائی ایک ہی بات کر رہے ہیں، جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے ہوں گے۔ سو جب انھوں نے نعرہ لگایا، جو بولے سو نہال۔ وہ سب سے اونچی آواز میں بول پڑا، ست سری اکال! پر اس نعرے کا بھاؤ تو یہ ہے کہ سب کا بھلا مانگو، سبھوں کے دکھ کو اپنا ہی دکھ سمجھو۔ سچے پادشاہ کو ماننے والوں میں کوئی بھی نہیں، جو غیر ہو۔ جنہیں تم نہیں بھی جانتے، وہ بھی تمہارے اپنے ہیں۔ سنتے نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں اور لہرا کر نعرہ بلند کیا، ست سری اکال!

"صبر کر سنتیا۔" بنتے نے ہنس کر اس سے کہا: "پہلے لمبر دار دا اتہ پتہ تے لگ لین دے۔"

"نئیں، بنتیا، ذرا غور کر ——"

"اوئے، پہلے جو کرنا کر لئی اے، پھر غور کراں گے۔"

مگر سنتے نے منہ میں آئی ہوئی یہ بات اگل ہی دی کہ ہماری ٹولی میں شامل ہونے سے پہلے سب لوگ مجھے اپنے ہی لگتے تھے پر اب ——

"ایس فانی سنسار وچ کسے دا اپنا کون اے؟ تو اپنی خیر منگ۔"

"اپنی خیر سوا تے میں منگاں، بنتیا۔" سنتے کی آواز رنج و غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ "جناں خالصے تیراں واسطے خیر منگنا جاناں، او بھی غیر بن گئے نیں۔" وہ سر جھٹک رہا تھا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اپنے ہی لوگ اتنے غیر بن گئے ہیں کہ کوئی ذرا سمجھانے بجھانے کے لیے بھی آگے نہیں بڑھتا۔

"اوئے، اینا دکھی کیوں ہو رہا ایں، سنتیا؟"

"دکھی ہون والی بات جو ہوئی۔ میرا یار وچنا ڈردا اے، کہ سنتے نوں سمجھایا بجھایا تے او گولی مار دے گا۔ تجھو میں کوئی راکش آں —— اووا ای تیرا یار سنتا واں یار۔ تھوڑا بھل بھٹک گیا تے پیار نال راہ تے ڈال دے —— پر توں ٹھیک کہنداں بنتیا، ایس فانی سنسار وچ کوئی کسے دا نئیں۔" موٹر سائیکل کسی گڑھے میں سے گزری تو وہ سنبھل کر اپنی پگڑی سنبھالنے لگا۔ "تو بھی تے کوئی غیر نئیں، بنتیا، تو ہی کوئی راہ لبھ دے، ویرا۔"

"راہ تے لبھ گئی اے، شیرا۔" بنتے نے اسے بڑی مسرور آواز میں بتایا کہ آگے کا کچا راستہ چند ہی گز پر شروع ہو رہا ہے۔

سنتا بھی سب کچھ فراموش کر کے خوش ہو گیا کہ چلو، راہ تو ملی۔ اس کے عہد طفلی میں اس کا باپ اکثر دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ دوسرے دن گجردم تک بھی گھر نہ لوٹا تو سنتا رونے لگا۔ اس کی نانی اسے کلیجے سے لگا کر سمجھانے لگی، روتے کیوں ہو؟ تمہارا بپو راستہ بھول گیا ہوگا۔ آؤ، ہاتھ جوڑ کر سچے پادشاہ کے حضور میں کھڑے ہو جاؤ اور پرارتھنا کرو کہ وہ تمہارے باپ کو گھر کی راہ پر لگا دے۔ نانی اسے پاس بٹھا کر اکثر گھنٹوں سمجھایا کرتی کہ ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرو، سیدھا راستہ سیدھا بیکنٹھ کو جاتا ہے۔

"سدھا رستہ سدھا بیکنٹھ نوں جاندا اے بنتیا!" اس نے نانی کے لہجے میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

"ہاں، تیار ہو جا شیرا۔ لمبر دار دے سارے کنبے نوں اساں اودھر ہی دھکنیا اے۔"

مگر بیکنٹھ کے تصور پر سنتا تو اپنی ماں کے پاس جا پہنچا تھا، جو سچے پادشاہ کے محلوں میں اس کے جھوٹے برتنوں کا ایک بہت بڑا انبار مانجھے جا رہی تھی۔ سنتے کو سچے پادشاہ پر غصہ آ رہا تھا کہ ہر روز خواہ مخواہ دیویوں دیوتاؤں کا لنگر کھولے رکھتا ہے

"نئیں، پتر سنتیا، ایسا بولنا پاپ اے۔ میرے تے دھنیہ بھاگ نیں کہ مہا پرکھاں دے جھوٹے برتن چمکانے دا کم کرنی آں۔"

"پر بھابو ——"

"نئیں، بھابو دے پترا، برتن بھانڈے نہ چمکن، تے بھکھیا دی بھکھ مر جاندی اے۔"

سنتا اپنی مرحوم ماں کے ساتھ جڑ کر بیٹھا تھا اور بالکل جڑ کر بھی اس کی طرف اور سرکتا جا رہا ہے اور سرکتے سرکتے اس کے عین دل میں آ داخل ہوا ہے اور یہاں سے وہ اپنی ماں کی کوکھ میں اتر گیا ہے اور کوکھ سے جنم لیتے ہوئے رونے لگا ہے۔

"سنتیا! —— اوے سنتیا! ——"

"ہاں —— آں ——!"

"بھنے بھنے ایتھے رہ کون رہا سی ؟"

مگر سنتا تو ابھی تک بلکے جا رہا تھا کیونکہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں مر گئی تھی۔

آس پاس کے جنگل میں چھپی ہوئی ہوا اب اپنے تجسس پر قابو نہ پا کر درختوں کے عقب سے باہر نکل آئی تھی اور ان کے ارادوں کو بھانپ کر ان کی موٹر سائیکل کے آگے آگے دوڑنے لگی تھی کہ ان سے پہلے گاؤں میں داخل ہو کر نمبردار کو خبردار کر دے مگر موٹر سائیکل اپنی تیز رفتاری کے باعث پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے سواروں کو کہیں پہنچنا نہیں ہے، وہ بس ہوا کا پیچھا کیے جانے کے لیے بے تحاشہ بھاگے جا رہے ہیں۔

بنتیا!" پیچھے پڑھا گتی ہوئی گاڑی بہت گرد اڑانے لگی تھی۔ اس لیے سنتا اپنی پگڑی کا لانگ منہ کی طرف لے جانے کے لیے ذرا رک گیا۔ "لمبردار نے ساڈھا کی بگاڑیا اے ؟"

"اوے سنتیا! او وچارہ ساڈھا بگاڑ بھی کی سکدا اے ؟" مگر سنتے کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ نمبردار کا صفایا کرنے کیوں جا رہے ہیں ؟ "نئیں بنتیا، ذرا غور کر ـــــ"

"تو غور بہت کرنا ایں، ایسے کر کے تیرے کولوں کچ وی نئیں ہوندا۔" بنتے کو اپنے سامنے صبح کے چند سفید پنچھی اڑتے ہوئے دکھائی دیے تو اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے موٹر سائیکل تھام کر دائیں سے گن ہاتھ میں لے لی۔ "ڈز ـــ ڈھا ـــ دھم ـــ م ـــ م ا ـــ"

دیکھتے ہی دیکھتے کئی پنچھی ایک ساتھ تڑپتے ہوئے نیچے آگرے اور موٹر سائیکل بدستور گرد اڑاتی ہوئی آگے ہی آگے دوڑتی چلی گئی۔

"اینا نوں کیوں گرایا ای، بنتیا ؟"

بنتے نے فاتحانہ قہقہوں کے درمیان اسے بتایا کہ بس ذرا نشانہ بنانے کے لیے، اور کس لیے ؟

"نئیں، ذرا سمجھ کے جواب دے۔"

بنتا اسے متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ زیادہ سمجھ والے ہی سب سے پہلے نشانے کی زد میں آتے ہیں۔ اس نے سر موڑ کر اس سے اپنی بات کہنا چاہی لیکن موٹر سائیکل کی نہایت تیز رفتار کے باعث آگے ہی دیکھتا رہا۔ "اے لمبردار بھی تیری تراں بڑا سمجھدار سی، سنتیا، ایسے لئی تو اونوں گولی نال اڑان جا رہیاں، ہاں۔"

مگر سنتا سوچ رہا تھا کہ نمبردار اس کے نانے جیسا گورو کا نیک سکھ ہے۔ اتنا سجن پرش ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بس اس کا قصور یہی ہے کہ اپنے سارے کام چھوڑ کے بگڑے ہوؤں کو سمجھاتا رہتا ہے۔ اس کا نانا اور نانی بھی تو ہر وقت اسے سمجھایا کرتے تھے، سبھوں کو بڑے چاؤ سے بھاتے تھے۔ ان کے راستے سے گزر کر کسی کو گویا جیلے سے نکلنے کا احساس ہوتا جیسے اس کا سارا کھوٹ بھین کر الگ ہو گیا ہو۔ ان کی باتیں سن سن کر ہی نے نو لڑکپن میں ہی گیرو سے لپٹے ہیتے کا طے کر لیا تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو کیا ہیں انہیں بھی اپنی گولیوں سے بھون دیتا ؟

"نئیں بنتیا، چل مڑ جایئے۔ میں نمبردار تے ہتھ نئیں اٹھا سکدا۔"

"کوئی فکر نئیں مور کھا۔" بنتے نے ہنس کر کہا۔ "تو ایدھر اودھر دیکھیں لئی کھڑا ریں۔ میں آپی کلا اے کم کرلاں گا۔ بچ تے لوک نیں۔ لمبردار، اودی جنانی، پت، نوں، پوتی ـــ بس ا ـــــ"

سنتے نے اسے یاد کروایا کہ نمبردار کی بہو کے پیٹ میں بھی تو ایک جیو پل رہا ہے۔

"اونوں چھڈ، او آپے اپنی ماں دے پیٹ وچ رو رو کے مر جائے گا۔"

"دھرم نال، تو بڑا ظالم اے، بنتیا۔"

"اسی ظالم کیوں ؟ اسی نے رب دی اچھا دا پالن کر رئے آں۔"

سنتے نے جب بنتے سے پوچھا، وہ کیسے ؟ تو بنتے نے اسے بتایا، ایسے کہ جو سارے لوٹے کی اچھا، وہی رب کی اچھا۔ اس پر سنتے نے اعتراض کیا کہ رب تو سب کا راکھا ہے۔ وہ کسی کو مارنے کی اچھا کیسے کر سکتا ہے ؟ بنتا جھلا گیا اور بولا کہ اب اپنا کیرتن بند کرو اور چپ چاپ مکھیوں کے آرڈر پر عمل کرو، نہیں تو تم جانتے ہی ہو کیا حشر ہو گا ؟

سنتا واقعی ڈر سا گیا، مگر کچھ اس طرح کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ ڈر گیا ہے، ورنہ وہ اپنے آپ کو ڈانٹ ڈپٹ کر سیدھا کر لیتا۔ تھوڑی دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اسی اثنا میں ان کی موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی ایک گوردوارے کے سامنے سے گزری جو نمبردار کے گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ گوردوارے سے اس بھجن کے بول سنائی دے رہے تھے ـــــ پو پھٹی تے چانن ہویا ـــــ پو پھٹی نے چانن ہویا ـــــ اپنے آس پاس دھیمے دھیمے چانن میں سنتے کو اچانک نامعلوم کیا نظر آگیا کہ وہ پھرتی کر بیٹھ گیا اور بنتے کو مخاطب کر کے اسے صاف صاف بتلانے لگا کہ نمبردار کا بال بھی بانکا نہ ہونے دے گا۔

بنتے کے کان لمبے ہو کر سنتے کی ڈاڑھی کو چھونے لگے اور اس نے اب کے بڑی غصیلی آواز میں جواب دیا۔

"سن او جنانیا، اپنی بکواس بند کر، نئیں تے لمبردار توں پہلوں تینوں تیرا صفایا کرنا پے جائے گا۔"

بنتے کی سخت کلامی سے سنتے کا پارہ یکلخت اس قدر چڑھ آیا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا، اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس اپنی گن نکال کر پیچھے سے بنتے پر فائر کر دیا اور وہ دونوں اڑتی ہوئی گاڑی پر ہی گتھم گتھا ہو کر نیچے زمین پر آگرے اور انہیں اپنی اپنی جگہ پر ہلنے سے قاصر پا کر عین اس وقت ایک بندر کسی درخت سے نیچے اترا اور ان کی بندوقوں کو کچے راستے سے اٹھا کر بھوت پریت کے مانند نہایت سبک قدموں سے کنارے کے گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

"نئیں، بنتیا، نئیں! ـــــ"

سنتا اپنی ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کو اپنے ساتھی کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب بھی اسے سمجھانا چاہ رہا تھا کہ وہ سیدھا راستہ اختیار نہیں کیے ہوئے تھے ـــ رب تو اک ہی رب ہے بنتیا، اک ہی سب سے بڑا رب، ساری دنیا دا رب، بنتیا ـــــ نئیں، بول نئیں، بس غور کر ا ـــــ

اور جب غور کرتے کرتے بنتے کے دموں کا تار ٹوٹنے لگا تو سنتے نے بڑی مشکل سے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں کو سمیٹ کر اس کے کانوں میں یہ بات اتاری ـــــ بنتیا، بھتیاں ریاں نے آدم جات نوں پچھی راہیں ڈال دتا اے۔

بقیہ:- فاختہ آئے گی

"اندر آ جاؤ ـــــ"

"کس سے باتیں کر رہے ہو" میری بیوی آگئی ہے۔ وہ بالکونی میں، گلی میں، ادھر ادھر دیکھتی ہے، پھر حیرت سے مجھے دیکھتی ہے۔ میں مسکرا دیتا ہوں۔

شرون کمار ورما

فاختہ آئے گی

پچھلے تقریباً بہتّر گھنٹوں سے میں اپنے کمرے میں ہوں۔ نہ بیمار ہوں، نہ مقروض۔ شہر میں کرفیو نافذ ہے۔ چاروں طرف پراسرار سناٹا چھایا ہوا ہے۔ فضا میں خوف کا احساس مسلط ہے۔ بیچ بیچ میں ایل۔ ایم۔ جی اور اے۔ کے۔ ۴۷ رائفلیں اس بھید بھری خاموشی کو چھلنی کر دیتی ہیں۔ جنگلی کبوتروں کا جھنڈ اب سورن مندر پریسر کی طرف نہیں جاتا۔ مہنتوں کے ڈیرے میں واقع سمادھ کے گنبد کا چکر لگا کر پرانے مکانوں کے پیچھے ڈوب جاتا ہے۔ میرے کمرے کے روشندان کے طاق میں گھونسلہ بنانے والا جوڑا دو دن سے لوٹ کر نہیں آیا۔ میری بیٹی کہتی ہے:

"پاپا — انہیں بھی تو گولی نہیں لگ گئی کہیں—"

میں سوچتا ہوں — ہو سکتا ہے — میں نے فائرنگ کے دوران کبوتر گرتے ہوئے دیکھے ہیں — یہ جوڑا بیٹوں سے فرش گندہ کرتا تھا، بالکونی اور کمرے میں تنکے، پر اور دیگر ایسی اشیا بکھیرتا تھا۔ پھر بھی ہم انہیں اڑاتے نہیں تھے۔ میری بیوی ان کے لیے دانہ بکھیر دیتی، بیٹی پانی کا برتن رکھ دیتی — وہ غٹرغوں غٹرغوں کرتے تو میری بیٹی بڑی توجہ سے سنتی، جیسے سچ مچ ان کی باتیں سمجھ رہی ہو۔

"پاپا — یہ باتیں کر رہے ہیں نا—"

لیکن وہ دو دن سے لوٹ کر نہیں آئے۔ پانی کا برتن بھرا رکھا ہے — میری بیوی کنگنی بکھیر کر سمیٹ چکی ہے۔ کمرہ اور بالکونی صاف ہے۔ نہ بیٹ ہے نہ تنکے — وہ جوڑا طاق میں ہوتا تو یہ خاموشی تو نہ ہوتی۔ وہ باتیں کرتے رہتے، ہم سنتے رہتے—

میں کھڑکی سے آسمان کو دیکھتا ہوں — وہی صدیوں پرانا، بے نیازی سے دور تک پھیلا ہوا آکاش ہے — ہے بھی کہ نہیں۔ صدیوں سے لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ ہے — میں بہتّر گھنٹے پہلے بھی اسے دیکھا تھا — روز دیکھتا آ رہا ہوں — لیکن اب یہ بالکل اجنبی اور ان دیکھا سا لگ رہا ہے — میری آنکھیں بھی وہی ہیں — پر ان کے بیچ میں کیا آگیا ہے۔

"تررڑ، تررڑ تڑاخ — تڑاخ،"

وسط مئی کا خالی آسمان، اداس۔ سورن مندر پریسر میں سر اٹھائے کھڑی پانی کی ٹنکی پر خالصتانی جھنڈا لہرا رہا ہے — دونوں برجوں پر ریت کی بوریاں لگا کر مورچے بنائے گئے ہیں۔ ان برجوں پر بھی خالصتانی جھنڈے جھول رہے ہیں۔ — اندر سے آنے والی ایک گولی نے ایک منڈیر کو چھلنی کر دیا ہے — ہم پریسر میں ہتھیار رکھ سکتے ہیں، مورچے بنا سکتے ہیں، قتل اور ریپ کر سکتے ہیں — حکومت دخل نہیں دے سکتی — مندر کی مریادا بھنگ نہیں کر سکتی — جب اچانک پولیس کا ایک بڑا افسر اندر سے آنے والی گولیوں سے زخمی ہوا تھا تو اس گولی نے کہا تھا — "ہمارا دھرم سیاست سے الگ نہیں"۔

"تم ایک لاکھ دو — کمرہ نمبر ۴۷ میں آؤ"

"تمہاری بیٹی ہمارے جرنیل کو پسند آگئی ہے"

"اس ملبہ میں کوئی لاش نہیں ہے"

"کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور دہلی کا نام ستونت نگر ہے —"

"پریسر میں کوئی آتنک وادی یا ہتھیار نہیں ہیں"۔

"مندر میں آنے والوں کی جامہ تلاشی لینا سکھ پرمپرا کو چنوتی دیتا ہے — پنتھ کے لیے خطرہ ہے"

میں اخبار پڑھنا چاہتا ہوں — اکتا کر رکھ دیتا ہوں، اخبار باقاعدگی سے آ رہے ہیں — پنجابی اخبار لکھتا ہے —

جسم میں خون کی آخری بوند تک دھرم کے لیے لڑائی جاری رہے گی — کھاڑکو[1] سنگھیوں کا عزم — یہ اخبار انہیں کبھی دہشت گرد نہیں کہتا، ہندی اخبار کی سرخی ہے۔

"آتنک وادیوں نے ایک ہی پریوار کے نو ویکتیوں کی نرمم ہتیا کر دی۔ مرنے والوں میں دو سال کی معصوم بچی بھی شامل۔ دیہاتوں سے ہندو پریوار پلائن کر گئے"۔

زیادہ مہذب لوگوں کے لیے ملک کا ایک کروڑپتی، انگریزی اخبار چھاپتا ہے۔ اس نے جرمنی سے جدید قسم کی مشینری امپورٹ کی ہے — اس کا ہر نامہ نگار ہر مراسلہ میں مرکزی حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے — سب اخبار دھڑا دھڑ بکتے ہیں۔

[1] کھاڑکو ——— لڑاکے، جنگجو

۱۱/۸۰ اکو چہ لمباں، امرتسر ۱۴۳۰۰۱

ہم سیکولر ہیں۔
ہم جمہوریت پسند ہیں
ہم امن پسند ہیں۔
اس دیش میں سب کو آئین کے گھیرے میں بولنے، لکھنے چلنے، رہنے کی آزادی ہے ——

میں بہتر گھنٹوں سے اپنے ہی گھر میں قید ہوں۔ یہ بھی امید نہیں کہ اس ہاؤس اریسٹ کے بعد کوئی الیکشن جیتنے لائق ہو جاؤں —— گلی کا دروازہ بند ہے۔ باہر پولیس کا پہرہ ہے۔ سرکاری وین اعلان کرتی پھرتی ہے کہ کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی کرنے والے سے سختی سے نپٹا جائے گا۔

"بات سنو، گھر میں صرف شام کے لیے سبزی بھاجی ہے۔ آلو، پیاز بھی نہیں ہے ——" میری بیوی بتاتی ہے۔

میں ٹنکی پر لہراتے خالصتانی جھنڈے کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ جیسے میری طرف سے مایوس ہو کر لوٹ جاتی ہے۔ میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ وہ فرش پر لیٹی ہے۔ ہماری بیٹی دیوار سے پیٹھ لگائے کتاب لیے بیٹھی ہے۔ میں کہتا ہوں۔

"پنکی، بتی تو جلا لو ——"

"میں پڑھ نہیں رہی پاپا ——"

میں پھر بالکونی میں آ جاتا ہوں۔ میری بیوی اندر سے پکار کر وقت پوچھتی ہے۔ میں کہتا ہوں —— اسے ٹرین تو نہیں پکڑنی —— وہ خاموش ہو جاتی ہے اور میں اپنے لہجے کے کھردرے پن پر حیران، پشیمان رہ جاتا ہوں —— میں اسے وقت بتا دیتا ہوں —— شاید اسے وقت نہ گزرنے کا احساس پریشان کر رہا ہے —— گھڑی کی سوئیاں چلر کاٹتے جا رہی ہیں —— پھر —— یعنی وقت تو اپنی رفتار سے گزر ہی رہا ہے۔

گلی میں پہلوان کی بھینسیں ٹکراتی ہیں۔ کالی کتیا اور اس کے پلے منہ اٹھا کر بھونکنے لگتے ہیں، بھونکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اینٹ کا ایک ٹکڑا کتیا کو آ کر لگتا ہے، وہ درد اور خوف سے چیاؤں چیاؤں کرتی بھاگ جاتی ہے، پیچھے اس کے پلے ہیں۔ ٹھیکیدار سرجن سنگھ کی کرخت آواز گونجتی ہے۔

"چپ کرو حرام زادو ——"

"سرجن سیہاں، جانوروں میں کون حرام زادہ نہیں ہوتا —— یہ تو انسانوں میں —— " رکھی دائی کنوئیں کے ٹھنڈے چبوترے سے گلی میں اتر آئی ہے۔ شاید خاموشی سے تنگ آ چکی تھی۔

"بی بی —— کتوں کی فیملی پلاننگ نہیں ہو سکتی ——!"

رکھی پرانے وقتوں کی دائی ہے۔ اسے شاید معلوم نہیں کہ اس قسم کے تجربات اب کتوں پر بھی کیے جا رہے ہیں۔ کتیا اور پلے پھر اپنے مورچے پر آ گئے ہیں اور ٹھیکیدار کے مکان کی طرف منہ اٹھا کر بے تحاشہ بھونک رہے ہیں۔ اس مرتبہ وہ انہیں گالی تو نہیں دیتا، دھمکی دیتا ہے۔

"داروغہ میری جان پہچان والا ہے، سب کو گولیاں دلوا دوں گا۔"

"آگے تھوڑی گولیاں چل رہی ہیں"۔ رکھی دائی کہتی ہے اور ایک پلے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہتی ہے —— "بھوکے ہو تم سب —— بشن کور نہیں آئی ناں —— وہی تمہیں ٹکڑ ڈالتی رہتی ہے"۔ ایک دم اسے جیسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔ ٹھیکیدار سے پوچھتی ہے۔

"سرجن سیہاں، کچھ پتہ چلا بشنو کا "

"دربار صاحب میں ہی نہ پھنسی ہو ——"

"منع کیا تھا، مت جایا کر آج کل متھا ٹیکنے —— کہتی تھی، نہ جائے تو چین نہیں پڑتا —— مجھے ڈر ہے کہیں ——"

میری بیوی دو باسی روٹیاں گلی میں پھینک دیتی ہے۔ دراصل یہ روٹیاں اس نے چھان بورہ کے عوض آلو، پیاز دینے والے کے لیے رکھی تھیں۔ اب شاید اس کی طرف سے مایوس ہو کر بنیہ کمانے کا خیال آ گیا تھا —— آدمی کتنا چالاک ہے —— ہر بات میں اپنا فائدہ تلاش کر لیتا ہے ——

کتیا روٹیاں لے کر کشمیری لال کے ٹھیلے کے نیچے بندھی بوریوں کے جھولے میں جا بیٹھتی ہے، پلے بھی چلے گئے ہیں کشمیری لال کا ٹھیلہ جس پر لاد کر وہ سبزی بھاجی اور پھل بیچا کرتا ہے بہتر گھنٹے سے بیکار کھڑا ہے —— وہ شاید کتیا اور پلوں کو نکالنے کے لیے آتا ہے، پھر کچھ سوچ کر لوٹ جاتا ہے —— شاید وہی بنیہ کمانے کا خیال۔ میری بیوی کہتی ہے —— کشمیری لال سے آلو، پیاز لے لو —— اس کے پاس ضرور اسٹاک ہو گا —— میں نیچے جاتا ہوں۔ وہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں اداس اور پریشان سا لیٹا ہے —— اس کی بیوی شانتی پھٹی ہوئی بوریاں سی رہی ہے۔

"آؤ وکیل صاحب ——" وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔

"آلو، پیاز ہوں گے ——"

"گلی والے کل پرسوں ہی لے گئے تھے —— آپ نے کہا ہی نہیں ——"

میرے اندر بہتر گھنٹوں سے سویا ہوا وکیل جاگ اٹھتا ہے۔ یہ شخص ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ پیسے چاہتا ہے۔ میں دھیمے لیکن پر اعتماد لہجے میں کہتا ہوں۔

"زیادہ بھاؤ لگا لو ——"

"کیسی بات کرتے ہیں جی —— ایک تو آپ پڑوسی، پھر ان حالات میں زیادہ پیسے لوں گا —— آپ اندر آ کر دیکھ لیں۔"

میں اندر نہیں جاتا۔ لوگ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہی آئے ہیں، کشمیری لال کون سا فرشتہ ہے۔ نہیں دینا چاہتا نہ سہی، دال اور اچار تو ہے —— مر نہیں جائیں گے ہم آلو، پیاز کے بغیر —— میں اپنے مکان میں داخل ہونے لگتا ہوں تو درشن سنگھ آواز دے لیتا ہے۔ میں اس کے پاس جا بیٹھتا ہوں۔ اس کے ہاتھ میں پرانے تاش کی گڈی ہے۔ وہ بنا مجھ سے کچھ پوچھے پتے بانٹتا ہے —— میں بھی بغیر کچھ کہے پتے اٹھا لیتا ہوں —— میں تاش کھیلنا، شطرنج میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے یہ کھیل اسپتالوں اور بوڑھوں کے لیے بنائے گھروں کے لیے ہی ہیں، جس آدمی کا ناس مارنا ہو اسے ان کھیلوں کی لت لگا دو۔

"بھاجی، یہ سیاپا کب ختم ہو گا ——" درشن سنگھ کی بیوی پوچھتی ہے۔

"سوموار کا دکان سے بھاگا ہوں —— دکان بند بھی نہیں کی —— نوکر سے کہہ آیا تھا —— اب پتہ نہیں —— آدمی تو وہ برا نہیں، پھر بھی کسی کی نیت کا کیا پتہ، کب بدل جائے —— مجھے تو سوچ سوچ کر نیند نہیں آتی۔

"کامپوز اور ویلیم کھاتے ہیں روز ——" اس کی بیوی بتاتی ہے —— "اگر دکان میں ہیرا پھیری ہو گئی تو ——"

"کچھ نہیں ہوتا ——" درشن سنگھ کہتا ہے۔ جیسے وہ خود کو تسلی دے رہا ہو —— "واہگورو سب ٹھیک کرے گا"

میں محسوس کرتا ہوں، اسے خود اپنے پر یقین نہیں آ رہا۔

"بھاجی، چا، لاؤں ——"

"نہیں —— چا پی پی کر زبان اکڑ گئی ہے۔ گرمی

بھی تو بہت ہے ـــ" میں پتّے رکھ دیتا ہوں ۔
درشن سنگھ نہ اعتراض کرتا ہے نہ کچھ کہتا ہے. وہ بھی پتے پھینک دیتا ہے ۔

"میں کہتا ہوں آگ لگ جائے سارے شہر میں بیڑہ غرق ہو جائے ۔ یہ صفتی کا گھر رہ گیا ہے، یہ گوروکی نگری ہے ـــ سالی کوئی زندگی ہے یہاں، چوتھے دن کرفیو ـــ"

"بھاجی، سال بھر سے اوپر ہو گیا ہمیں ہری مندر صاحب جا کر متھا ٹیکے، یہ تو ایک دن رو ہی دیے تھے. سب نے کہا 'چلو' دیکھا جائے گا جو ہو گا. لیکن یہ نہیں گئے، اندر تو وہ بڑھے بندوقیں لیے پھرتے ہیں"

مجھے یاد آیا کہ دو چار ماہ پیشتر ایک خبر سنی تھی کہ آتنک وادیوں نے درشن سنگھ سے ۲۵ ہزار روپیہ مانگا تھا ـــ کہ ہم جو سکھ دھرم، سکھ پنتھ کے لیے لڑ رہے ہیں، ہماری مدد کرو ـــ اور آخر دس ہزار پر سودا طے ہو گیا تھا ۔

گڈو رکشہ والا، ہاتھ ڈھیلے چھوڑے، گردن لٹکائے چلا آرہا ہے ۔ یہ کہاں جا رہا ہے ۔ گلی کا دروازہ تو بند ہے ـــ وہ ٹھیکیدار کے مکان کے باہر بندھے اپنے رکشہ تک گیا ہے ۔ کاٹھی کے نیچے سے کپڑا نکال کر رکشہ جھاڑ رہا ہے، رم، تاریں، گدی پونچھی ہے. بریکیں دبا کر دیکھی ہیں. گدی کے نیچے سے استعمال شدہ موبل آئل کی شیشی نکال کر بریکوں کو تیل دیا اور گدی پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ تلاش کر رہا ہے ـــ شاید کوئی بیڑی سگریٹ ۔ جیب سے کچھ نہیں نکلتا ۔ وہ اپنی خالی انگلیاں دیکھتا ہے اور آنکھیں موند لیتا ہے ۔

"ان روز کما کر کھانے والوں کا کیا ہو گا ـــ!" درشن سنگھ ہمدردی سے کہتا ہے ۔

میں کچھ نہیں کہتا ۔ شاید کچھ کہنے کے لیے ہے بھی نہیں میرے پاس ـــ میں سوچتا ہوں کیا ہم گڈو سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ اسے کسی چیز یا پیسوں کی ضرورت تو نہیں ـــ بس درشن سنگھ کی طرف دیکھتا ہوں ـــ وہ بھی میری طرح کچھ سوچ رہا ہے ـــ شاید اپنے دس ہزار روپیوں کے بارے میں، دکان میں پڑے مال کے بارے میں، ہری مندر جا کر متھا ٹیکنے یا پھر گڈو کی مدد کرنے کے بارے میں ـــ میں کریدتا ہوں ۔

"کیا سوچ رہے ہو سردار جی ـــ؟"

"کچھ نہیں ـــ"

گڈو ایک روڑہ اٹھا کر بجلی کے کھمبے پر زور سے مارتا ہے ۔ آواز گونجتی ہے تو کتیا اور پلّے پھر جھولے سے نکل کر بھونکنے لگتے ہیں. رکھی دائی اسے پیار سے سمجھاتی ہے کہ ٹھیکیدار ناراض ہو گا. کتیا اور پلّے اس کی پیار کی بھاشا سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ وہ گلی کے دروازے تک جاتے ہیں، کتیا دروازے کو سونگھ کر پنجوں سے کھودنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد پلّوں سمیت لوٹ آتی ہے اور گلی کے دوسرے سرے پر کھڑے نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں جا بیٹھتی ہے ۔

"چنخ بچنخ، چٹاخ ـــ تڑ تڑ، تڑ، تراڑ ـــ"

سناٹا ٹوٹ گیا ہے ۔ زوردار دھماکہ ـــ گیانی کی بیوی جیسے گھبرائی سی گلی میں آتی ہے ۔

"رام گڑھیا بنگے پر حملہ ہوا ہے ـــ" وہ رنجیدہ اور غصیلی آواز میں خبر دیتی ہے ـــ سکھ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے ۔"

کوئی اس کی بات کا جواب نہیں دیتا، وہ آگے بڑھ جاتی ہے ۔

"اب یہ ساری گلی کو بتائے گی ۔" درشن سنگھ کی بیوی کہتی ہے ـــ "اس کا کوئی رشتہ دار ۱۹۸۴ء کے دنگوں میں دہلی میں مارا گیا تھا ـــ"

"اوئے بِیّا ـــ آج گلی صاف نہیں کی ۔ جگہ جگہ گویا (گوبر) پڑا ہے ۔ تو نے کیا گند پھیلا رکھا ہے یہاں ـــ" گیانی کی بیوی اب پہلوان ڈیری والے کے پوربیے نوکر رام اوتار سے الجھ رہی ہے، وہ خاموشی سے بیڑی پی رہا ہے ۔

"سنا نہیں تو نے، پھینک یہ بیڑی ۔ بیڑی سگریٹ پینے ہوں تو اپنے دیس چلا جا ۔ آجاتے ہیں یہاں ہمیں کھانے"

"کیا ہو گیا بیجو" رکھی دائی آگئی ہے ـــ یہ لوگ یہاں مزدوری کرنے آگئے ہیں تو کیا ہوا، تمہارے دونوں بیٹے بھی تو دوبئی گئے ہوئے ہیں، میرا بیٹا کینیڈا میں ہے ـــ انہیں وہاں سے کوئی نکال دے تو ـــ یہ یہاں آکر کون سے لکھ پتی ہو گئے ہیں، مزدوری ہی کرتے ہیں نا ـــ مت اس بیچارے کے پیچھے پڑی رہا کر ـــ کیا کہتا ہے تجھے ـــ"

"گلی نہیں صاف کی آج اس نے ـــ"

"کر دے بیٹا، بدبو پھیلی ہے، تین دن سے صفائی کرنے والے بھی تو نہیں آرہے ـــ اٹھ ماں صدقے ـــ چل میرا بیٹا بیٹا ـــ"

"تو سب کی طرفدار بن کر آجاتی ہے ـــ" بیجو شاید لڑنا چاہتی ہے ـــ "میں تو اسے بیڑی نہیں پینے دوں گی"

رام اوتار بیڑی پھینک کر اٹھتا ہے ۔

"ہم چلے جائیں گے، کوئی مُصیبت کی نہیں کھاتے جانور کے ساتھ جانور ہونا پڑتا ہے، چلے جائیں گے ہم ـــ ہم تو مجبوری کرتے ہیں، وہاں سردار لوگوں کے بڑے بڑے پھارم ہیں، بلڈنگیں ہیں، ٹرک اور موٹریں ہیں، انہیں آنا پڑا تو ـــ وہ ایک بھینس کی دم مروڑتا ہے ۔ بچھڑے کو گالی دیتا ہے اور چھپر تلے سے پھاوڑا ڈھونڈ لاتا ہے

ایک دم فائرنگ شروع ہو جاتی ہے ۔ گیانی کی گھر والی اپنے مکان میں داخل ہو جاتی ہے ۔ رام اوتار پھاوڑا اٹھائے گلی میں بکھرے گوبر کو دیکھتا ہے ۔

"ماتا جی، صبح سے بجلی پانی نہیں ہے تو ہم کہاں سے گلی دھوویں"

میں گھر آجاتا ہوں ۔ فائرنگ تیز ہو گئی ہے ۔ ہنستوں کے ڈیرے میں کھڑے ایک یوکلپٹس کی شاخ پر ایک فاختہ آبیٹھی ہے کشمیری لال کی بیوی ہمارے یہاں آئی ہے ۔ وہ کچھ کہتے ہچکچا رہی ہے میری بیوی اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہی ہے ۔ وہ اداس اور پریشان ہے ۔

"کیا بات ہے؟" میری بیوی پوچھتی ہے ۔

"بہن جی، تھوڑی چا پتی اور شکر ـــ بچے چا مانگ رہے ہیں ـــ کرفیو کھلے گا تو واپس دے دوں گی ـــ"

میری بیوی میری طرف دیکھتی ہے ۔ مجھے خاموش پا کر کہتی ہے ۔

"کل سے ہی چا پتی اور چینی ختم ہے ۔"

میں سوچتا ہوں یہ کمینہ پن ہے ۔ ہمارے گھر میں ان چیزوں کی کمی نہیں ہے ۔ لیکن میری بیوی نے اچھا کیا ۔ کشمیری لال نے آلو، پیاز نہیں دیے تھے ـــ ہو سکتا ہے کرفیو کی مدت طویل ہو جائے ۔ کہاں سے آئے گا یہ سب کچھ ـــ یہ کمینگی نہیں، دور اندیشی ہے ۔

کشمیری لال کی بیوی جانے لگتی ہے تو میری بیوی ٹھنڈی بے جان سی آواز میں کہتی ہے ۔

"کچھ اور چاہیئے تو لے جاؤ"

"نہیں جی ـــ" کشمیری لال کی بیوی چلی گئی ہے ۔

وہ فاختہ اڑ کر روشندان کے طاق میں آگئی ہے

میں نہ جانے کیوں کہتا ہوں :

باقی ص۳۳ پر

ایس۔ ایس۔ چاولہ

آخری تمنا

بچپن میں بنگال کے متعلق بس میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام کا دیش ہے اور بنگالی ڈاکٹر، انجنیئر کافی تعداد میں ہندوستان کے سبھی حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں پھر بنگال کا سنیما میں بھی اپنا نام اور مقام ہے۔ مشرقی بنگال میں ڈھیر سے دریا اور ندیاں ہیں۔ وہاں چھوٹے بڑے جہاز اور چھوٹی بڑی کشتیاں چلتی ہیں۔ ہر سال وہاں پر ایک آدھ بار ان علاقوں میں طوفان ضرور آتا ہے جو بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان کا باعث بنتا ہے۔

یہ مقدر کا کھیل ہی تو ہے مجھے پہلی نوکری کلکتہ میں ملی۔ نوکری اچھی تھی۔ تنخواہ معقول تھی پاپا کے ایک دوست کی مدد سے چورنگی روڈ کی ایک بہت بڑی بلڈنگ میں ایک مناسب فلیٹ مل گیا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ آنے جانے کے لیے موٹر سائیکل تھی۔ زندگی کا یہ نیا دور مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ میں ایک اچھے کلب کا ممبر بن گیا تھا اب دفتر میں کام، سنیما، کلب، تفریح۔ بس اسی محور پر زندگی گھوم رہی تھی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ایسے ہی ایک سال گزر گیا۔

ایک روز لفٹ میں میری ملاقات شفالی سے ہوئی۔ اس کو میں نے پہلے کبھی کئی بار دیکھا تھا مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ کسی کالج میں لیکچرار ہے۔ صاف چہرہ، تیکھے نین نقش۔ گھنے لمبے کالے بال کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے بال، جنہیں وہ عموماً کھلا رکھتی تھی۔ وہ بہت جاذب نظر تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی تھی۔ وہ بولی تو محسوس ہوا: قریب ہی کہیں جل ترنگ بج رہا ہے۔ اس نے پوچھا "سنگھ بندھو تم اس بلڈنگ میں رہتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں"۔ اس نے پوچھا "کون سے فلور پر؟" "پانچویں پر" "کون سا نمبر ہے؟" میرا جواب تھا: "پانچ سو بارہ"۔ اُس کا سوال تھا گھر میں اور کون ہے؟ میں نے جواب دیا میں یہاں پر اکیلا ہوں۔ اتنے میں لفٹ نیچے آگئی۔ اور ہماری راہیں الگ ہو گئیں۔ وہ دو بار پھر ملی اور اُس نے پوچھا کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔ کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ لڑکی مجھ میں کچھ زیادہ ہی دل چسپی لینے لگی ہے۔ اگر مجھے بھی کوئی دل چسپی ہوتی تو میں یقیناً بہت خوش ہوا ہوتا۔ اوّل تو پردیس۔ دوسرے پاپا کے کئی دوست کلکتہ میں رہتے تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ میں پنجابی اور سکھ اور وہ بنگالی اور برہمن۔ پھر لڑکی کا معاملہ تھا۔ لغزش کسی کی ہو، کیسی بھی ہو، تمام قصور لڑکے کے سر آئے گا۔ سو میں بچ بچا کر چل رہا تھا۔ ایک شام کو میں دفتر سے نکلا تو دفتر کے باہر والے بس اسٹاپ پر شفالی کھڑی تھی۔ بس اسٹاپ کا تو نام ہی تھا۔ وہ بالکل دفتر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ میری موٹر سائیکل باہر نکلی تو اُس نے رُکنے کا اشارہ کیا اور بغیر یہ پوچھے کہ میں کہاں جا رہا ہوں مجھے حکم دیا: "آپ کہیں بھی جا رہے ہوں پہلے مجھے گھر چھوڑ دینا۔" اُس دن میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موٹر سائیکل بہت دھیمے چلایا تھا اور یہ کوشش بھی کی تھی کہ وہ آرام سے بیٹھی رہے اور ہمارے جسم خواہ مخواہ نہ ٹکراتے رہیں۔ میرے دل میں اُس کے لیے احترام تھا۔ نہ معلوم کیوں!

اس کے رویہ میں ایک تحکم تھا۔ اپنائیت کی بنا پر حق کی مانگ تھی اور اُسے یقین تھا کہ میں انکار نہ کر سکوں گا۔ ہم گھر پہنچے تو اُس نے کہا: آپ تھکے ہوئے آئے ہیں۔ چائے پی کر چلے جانا۔ میں نے کہا: آج نہیں، پھر کبھی سہی۔ اگر میں اُس کے گھر نہیں گیا تو وہ میرے گھر آنے لگی۔ سب سے پہلے تو وہ پانی کا گلاس لاتی۔ پھر چائے

سپریہ اپارٹمنٹس، A-19، پچھم وہار نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

بنا کر لے آتی تھی۔ باتیں کرتی رہتی اور پھر چلی جاتی تھی۔ لوگ ہمیں اکٹھا دیکھتے تو باتیں کرتے۔ کئی لوگ پوچھ بھی لیتے تھے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں کہتا خواہ مخواہ بلا گلے پڑی ہے۔ بتاؤ کیا کروں؟ دوست کہتے۔ درخت سے گرا پھل ہے۔ اگر خود ہی تمہاری جھولی میں آن گرا ہے تو حلال ہے۔ بس موج کرو۔ کسی بزرگ نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ بنگال کا جادو ہے، سر پہ چڑھ کر بولتا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اگر وہ تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے تو بس قسمت ہی تمہیں بچا سکتی ہے۔ اور میں ہندوستانی ذہنیت کے انوکھے اُتار چڑھاؤ پر تھا کیا یہاں لڑکی تبع لڑکا کا مطلب صرف جسمانی قربت ہے۔ خود شفالی کہتی: "سنگھ بندھو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا اور تمہارا کوئی روحانی رشتہ ہے، جو دنیا کے تمام رشتوں سے اونچا ہے اور پاک صاف ہے اور پھر پتہ نہیں میں تمہارے متعلق کوئی بات بھی اپنے دل میں نہیں رکھ پاتی۔ ایسی حالت میں اُسے کیا کہہ سکتا تھا!

ایک دن شفالی کے والدین میرے گھر آئے۔ نوکر کو اُنہوں نے کسی بہانے سے باہر بھیج دیا۔ شفالی کے والد نے کہا۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ہم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں۔ کچھ شہرت بھی ہمارے حصے میں آئی ہے۔ روپیہ پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ شفالی ہماری اکلوتی اولاد ہے بیٹا۔ ہم دونوں تمہارے پاس ایک غرض اور عرض لے کر آئے ہیں۔ یہ بات صرف اپنے تک رکھنا۔ شفالی کو کینسر ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا گیا ہے۔ ان سب کی ایک ہی رائے ہے: شفالی چھ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال اور جی پائے گی۔ ہم ایک عرصہ سے اس بلڈنگ میں رہ رہے ہیں اور شفالی نے ہم دونوں کے علاوہ کسی اور میں حد تو یہ ہے کہ رشتہ داروں میں بھی کوئی دلچسپی کبھی نہیں لی۔ مگر تمہارے ساتھ اس کے تعلق کا سبب کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کہتی ہے کہ سنگھ بندھو سے میرا کوئی دنیاوی رشتہ نہیں ہے بلکہ روحانی رشتہ ہے اور وہ میری کسی بھی بات کا کبھی بُرا نہیں مانتا۔ بیٹا، اس کی اتنی چھوٹی سی زندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ تم اس کا دل نہیں توڑو گے۔ ویسے تو قدرت کو کیا منظور ہے؟ انسان کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی کرشمہ ہو جائے۔ یہ ناممکن تو نہیں، مگر ہم کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہتے، لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے اچانک شفالی کے غائب ہو جانے کے تصور سے دل کانپ جاتا ہے۔ اُن دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں تھیں۔ شفالی کی اس کم عمری میں موت کے تصور سے خود میرا دل لرز اُٹھا تھا۔ میں نے کہا مجھے یہ سن کر دُکھ ہوا ہے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں شفالی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھوں گا۔

لیکن لوگ تو دنیا بھر کی باتیں بنائیں گے۔ شفالی کی ماں بولی۔ بیٹیا، شفالی کی زندگی اور خوشی کے مقابلے میں ان باتوں کا کیا وزن ہے؟

دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کرنا اور خاص طور پر شفالی سے۔

ایک دن میں اپنے دفتر کی ایک لڑکی کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے گیا تھا۔ شفالی نے مجھے دیکھا ہوگا۔ اگلی صبح وہ مجھے لیکچر دینے آگئی۔ اُس نے کہا کہ وہ کیسی بے شرم لڑکی تمہارے پیچھے بیٹھی تھی۔ ان لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ کیسے تمہاری کمر میں اپنی بانہہ دے کر چپک کر تمہارے ساتھ بیٹھی تھی! پہلے وہ پانی لائی اور پھر چائے بنا کر لائی تھی۔ میں نے کہا۔ باقی باتوں کو چھوڑ دو۔ دیکھو میں تمہیں اپنا ایک خواب سُناتا ہوں۔ تمہارا تو پتہ نہیں۔ مگر مجھے ایسے خوابوں پر پورا یقین ہے کہ وہ سچ ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ایک سنسان جنگل میں گھوم رہا ہوں اور تب میں انسان نہیں ہوں بلکہ ہرن کا ایک خوبصورت بچہ ہوں۔ بہت ہی چھوٹا اور بہت ہی خوبصورت ہوں۔ بالکل تمہاری ہی شکل کی ایک راج کماری بھی اس جنگل میں گھوم رہی ہے۔ مجھے بہت پیاس لگی ہے۔ اُدھر راج کماری مجھے بہت پیار سے بلاتی ہے۔ آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ سامنے تالاب ہے۔ جس کا پانی صاف شفاف ہے۔ میں تالاب کی طرف بڑھتا ہوں تو وہ ہنس کر کہتی ہے کہ میرے اچھے ساتھی کو پیاس لگی ہے۔ آؤ میں تمہیں خود پانی پلاؤں۔ وہ بیٹھ جاتی ہے بڑے پیار سے میرے گلے میں اپنا بازو ڈال دیتی ہے۔ اتنے میں دُور سے سنسناہٹ کی آواز آتی ہے اور اچانک ایک تیر میرے آکر لگتا ہے اور میں بے بس ہو کر تڑپنے لگتا ہوں۔ راج کماری پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی ہے۔ ایک خوں خوار قسم کا راج کمار تیر کمان لیے سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ راج کمار مجھے اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارتا ہے، کہتا ہے کہ یہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ راج کماری کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تمہیں اتنے چھوٹے سے ہرن پر تیر چلاتے شرم نہیں آئی۔ وہ کہتا ہے کہ راج کماری! یہ جنگل خدا کی دین ہے اور یہ جانور ہمارے شکار کے لیے ہیں۔ اور اگر مجھے تمہارے باپ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں بھی یہاں سے زبردستی اُٹھا کر لے جاتا اور پھر دیکھتا کہ تمہاری زبان کتنی تیز چلتی ہے۔ میں یعنی وہ ہرن کا بچہ راج کماری کی طرف تشکر کی نظر ڈالتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہوں۔

ہے تو یہ خواب۔ مگر مجھے یہ سچ لگتا ہے کیونکہ تم جب بھی آتی ہو تو سب سے پہلے مجھے پانی پلاتی ہو۔ پھر میرے لیے چائے لاتی ہو۔ شاید اُس وقت کی پیاس اب بجھا رہی ہو۔ کھانے کے لیے کبھی پوچھا تک نہیں اس نے کہا: سنگھ بندھو، ایک تو تمہیں بات ٹالنی خوب آتی ہے دوسرے کہانی اچھی بنا سکتے ہو اور پھر کھانا بنانا مجھے آتا کہاں ہے؟

ایک سال اور گزر گیا ایسا معلوم ہوتا تھا

شفالی میری زندگی کا اہم حصہ بن گئی ہے۔ ہر بات پر نصیحت اور اس پر اپنی بات منوانے کی دُھن میں نے دل میں یہی سوچا تھا کہ شفالی کا دل رکھنا بھی جیون دان دینے کے برابر ہے۔

اُس کو خوش دیکھ کر میں خوش ہوتا تھا۔

میری تبدیلی دہلی ہوگئی۔ بچھڑتے وقت وہ بہت روئی تھی۔ کچھ عرصہ تک خط و کتابت چلتی رہی پھر بند ہوگئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا؛ شاید اُسے کچھ ہوگیا ہوگا!

میری شادی ہوئی۔ بچے آئے۔ وہ بڑے ہوتے گئے اور آج کل تینوں بچے کالجوں میں ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک بار پھر کلکتہ بھیجا گیا۔ اس دفعہ بہت بڑا عہدہ تھا۔ فرصت ملی تو ایک اتوار صبح سویرے میں اپنے خاندان کے تمام افراد کو لے کر شفالی کو ملنے چلا گیا۔ دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھوں کون ملتا ہے؟ کیسی خبر ملتی ہے۔ اتنے برسوں میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہوں گی۔ دروازہ نوکرانی نے کھولا۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک آواز اُبھری۔ "سنگھ بندھو' آجاؤ۔ کیا تم اکیلے آئے ہو۔ میں نے کہا، نہیں۔ میرا پورا خاندان میرے ساتھ ہے۔ اس کے کمزور اور لاغر چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ہر ایک سے پیار، خلوص اور اپنائیت سے ملی۔ شفالی نے کہا "سنگھ بندھو' تم نے اچھا کیا کہ ان سب کو لے آئے ہو۔ پاپا ممی کو گئے تو کتنے سال ہوگئے ہیں۔ میں اکثر بیمار رہتی تھی۔ تمہاری شادی کا کارڈ آیا تھا۔ میں اُن دنوں بھی بہت بیمار تھی۔ اتنے برسوں میں بس میں سپنے بنتی اور اُدھیڑتی رہی ہوں۔ اب تمہاری شادی ہوگئی ہوگی۔ اب بچے آئے ہوں گے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ بچے تو تمہارے گھر میں جھگڑ رہے ہیں، مگر اُن کا شور میرے کانوں میں پڑ رہا ہے اور میں کہتی تھی، دیکھو اب جھگڑا مت کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ شور سے نیند ٹوٹ جائے گی۔ ہر روز میں نت نئے سپنے سجاتی اور بے حد خوش ہوتی کہ تمہاری گھر گرہستی خوب پھل پھول رہی ہے۔ میرا بیٹا آگے بڑھا اور اُس نے کہا کہ آنٹی، میں آپ کے لیے چاکلیٹ لایا ہوں۔ پاپا کہتے تھے کہ آپ کو چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔

شفالی نے اُسے لپٹا لیا۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے کہا: آنٹی، سُنا ہے کہ آپ پاپا کو ڈانٹ دیتی تھیں۔ ذرا ہمارے سامنے بھی ڈانٹ کر دکھائیے۔ شفالی بولی۔ بیٹا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں کیوں اُلٹے سیدھے سوالات کر کے یا طرح طرح کے حکم چلا کر سنگھ بندھو کو کیوں پریشان کیا کرتی تھی۔ مگر یہ اُس کی بڑائی ہے کہ یہ آج تک میرے سامنے بولا نہیں۔ اب اسے نہیں بلکہ تم لوگوں کو ڈانٹوں گی۔ میری بیوی اُٹھ کر اندر گئی اور نہیں سے ڈھونڈ کر چند تکیے لے آئی اور شفالی کے گرد رکھ دیے۔ وہ مسکرا کر بولی۔ میں نے آج پہلی مرتبہ مکمل طور پر گھر کا سُکھ دیکھا ہے۔ پاپا، ممی کے بعد اس بھری دنیا میں صرف تم ہی تو میرے رہ گئے ہو اور آج جب تم ان سب کو لے کر آگئے ہو تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ بس اب تو میری یہی پرارتھنا ہے کہ خوشی کی اس گھڑی میں مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے۔ میری بیٹی نے بڑھ کر اپنا ہاتھ شفالی کے مونہہ پر رکھ لیا۔ اور کہا کہ آنٹی اتنی گندی بات مونہہ سے نہیں نکالتے۔ شفالی کا قہقہہ بلند ہوا۔ شفالی نے ذرا سیریس ہو کر کہا کہ سنگھ بندھو میری چند باتیں یاد رکھنا۔ ایک تو یہ ضروری کاغذات اپنے پاس رکھ لو اور انہیں میری موت کے بعد ہی کھولنا، دوسرا میری بڑی تمنا تھی کہ میرے اپنے بچے مجھے اپنے کندھوں پر لے جا کر اپنے ہاتھوں سے اگنی دیں۔ اب یہ اگنی میرے ان دونوں بیٹوں ہی سے دلوا دینا۔ میری بیوی بول اُٹھی۔ دیدی' اب تو ہم سب لوگ یہاں آگئے ہیں۔ آپ کی ہر طرح سے دیکھ بھال کر سکیں گے بلکہ آپ کیوں ہمارے ساتھ آکر نہیں رہ جاتیں۔ بچے بولے: آنٹی، آپ کل شام تیار رہیے۔ ہم خود ہی آپ کو آکر لے جائیں گے۔

ضرورت کے لیے میں نے اپنا پتہ اور فون نمبر شفالی کے پاس چھوڑ دیا۔

اگلی صبح سات بجے کے قریب شفالی کی نوکرانی کا فون آیا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ بولی۔ "صاحب' آپ لوگ جلد آجایئے۔" فون بند ہوگیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔

ہم فوراً وہاں پہنچے۔ دیکھا شفالی اپنے خالق کے پاس واپس جا چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ خوشی، صبر، شانتی، سُکھ، اطمینان، سکون اور چین کی ست رنگی پینگ سے روشن تھا۔ شفالی کی نوکرانی نے ایک خط میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ خط میں لکھا تھا۔ سنگھ بندھو، تمہارے چلے جانے کے بعد پاپا ممی نے مجھے بتایا تھا کہ ایک تو مجھے کینسر ہے اور دوسرا یہ کہ سنگھ بندھو کا رویّہ اس لیے اور بھی نرم تھا کہ ہم نے اُسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

سنگھ بندھو' مجھے میرے ماں باپ نے بہت سُکھ دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے تمہارا سہارا ملا۔ بے حد پیارا، خوش گوار اور صحت مند۔ ایسے رشتہ کو میں کوئی اور نام نہ دے سکی تو اُسے روحانی رشتہ کا نام دے دیا۔

ویسے شاید میں جوانی میں مر جاتی۔ مگر میرے دل میں ایک یقین تھا کہ میں ایک مرتبہ بس ایک مرتبہ اپنے گھر کا سُکھ اور ساتھ دیکھ کر مروں گی۔ میں بہت دفعہ بیمار ہوئی تھی۔ ایک دفعہ تو جیسے یم راج ہی میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اُس سے صاف کہا تھا کہ اگر تم زبردستی لے جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ورنہ میں تو بس ایک دفعہ گھر کا سُکھ دیکھ کر مرنا چاہوں گی۔ وہ چلا گیا۔ پھر تم آکر ملے۔ خاندان کے ساتھ تمہاری بیوی' ایک بیٹی اور دو بیٹے مجھے آکر ملے اور میری خوشی کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اب خوشی ایک دن کی بھی اتنی ہے جتنی چند برسوں کی۔ آج رات پھر یم راج آیا تھا میں نے اس سے ایک سوال کیا تھا اور ایک عرض کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنے دن کیوں نہیں آیا۔ (بقیہ ۴۲ پر)

یوسف ناظم

مشاعروں میں ہوٹنگ کے فوائد

مشاعرے تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہر مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا اور صرف کامیابی بھی کافی نہیں ہوتی مشاعرہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہونا چاہیئے۔ ایسی ہی کامیابی سے مشاعروں کا مستقبل روشن ہوتا ہے۔ مشاعروں کی کامیابی کا انحصار اب ہوٹنگ پر ہے۔ ہوٹنگ معرکے کی ہوگی تو مشاعرہ بھی معرکۃ الآرا ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ بڑے شہروں میں جہاں تعلیم یافتہ لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں، ہوٹنگ کا معیار اچھا خاصا ہے لیکن اضلاع کے سامعین ہوٹنگ کے معاملے میں ابھی پسماندہ ہیں۔ بعض اضلاع میں اس کا معیار ٹھیک رہا ہے لیکن اس سلسلے میں ابھی انہیں بہت کام کرنا ہے۔ مشاعروں کے سیزن میں اضلاع کے کچھ مندوبین کو بڑے شہروں کے مشاعروں میں حاضر رہنا چاہیئے۔ مشاعرہ ورک شاپ میں حصہ لیے بغیر اچھی ہوٹنگ نہیں آتی۔ بڑے شہروں میں تو بعض مشاعرے ایسے بھی ہوئے ہیں کہ مشاعرے کے دوسرے دن مشاعرہ گاہ کی چھت کی مرمت کروانی پڑی ہے۔ اس لیے اب زیر سما مشاعروں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ زیر سما مشاعروں میں، شاعر تو نہیں لیکن سامعین سماں باندھ دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مشاعروں میں شاعروں کے کلام کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اب سامعین کے کمال کا مقابلہ ہوتا ہے۔ مشاعرے بھی ٹکٹ سے ہونے لگے ہیں جو ایک لحاظ سے اچھی بات ہے۔ لنگر اور مشاعرے میں کچھ فرق ہونا چاہیئے

لیکن افسوس اس کا ہوتا ہے کہ بڑی قیمت کے ٹکٹ خریدنے والے سامعین ہوٹنگ میں اتنے جوش و خروش سے حصہ نہیں لیتے جتنا کہ پیچھے کی صفوں میں بیٹھنے والے باذوق سامعین محنت اور مشقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کمزور طبقے پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ بعض منتظمین مشاعرہ جو تنہائی میں سنانا چاہتے ہیں یا جنہیں ہو کا عالم پسند ہوتا ہے وہ اونچی قیمت کے ٹکٹ کا مشاعرہ کرتے ہیں یا صرف شخصیات کے ذریعہ یہ کام کرتے ہیں۔ ایسے مشاعروں میں بھی ہال تو بھر جاتا ہے لیکن مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال ناقابل بیان ہوتا ہے۔ ان قیمتی مشاعروں کے سامعین مشاعرے میں اس طرح بیٹھتے ہیں گویا کسی ڈی لکس سنیما حال میں بیٹھ کر انگریزی فلم کے مکالمے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ مرد حضرات بار بار اپنے چشمے صاف کرنے اور خواتین اپنے اپنے آنچلوں کو پرچم بنانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہیں۔ یہ بھی کوئی مشاعرہ سننا ہوا۔ شاعر آتا ہے جاتا ہے۔ وہ پڑھتا ہے یا گاتا ہے کسی کو پروا نہیں ہوتی حتی کہ مزاح گو شاعر بھی بے باک سے بے باک شعر سنا کر یوں ناکام و نامراد لوٹتا ہے جیسے شب غم گزار کر جا رہا ہو۔ سامعین میں سے کسی کی بھی زبان پر جوں نہیں رینگتی، کسی کے دہن مبارک سے ایک آواز آہ یا واہ کی نہیں نکلتی۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ مشاعرہ ہے یا کوئی جلسۂ تعزیت۔ اس خاموش مشاعرے اور ایک تعزیتی جلسے میں ایک نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ سامعین احتراماً سر جھکا کر ۲ منٹ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔ کم سے کم یہی کریں۔ شاعروں کو پتہ تو چلے کہ ہال میں جو لوگ تشریف فرما ہیں زندہ ہیں اور زندہ ہیں تو بیمار و آزار نہیں ہیں۔ مدعوئین اور عطیہ دہندگان حضرات اتنے بے دم رہتے ہیں کہ ان کے پاس دینے کو کچھ ہوتا نہیں ہے۔ شعرا صاحبان تو تعزیتی کلمات کو کلمات خیر سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی شاعر عیادت طلبی نہیں ہوتا لیکن اگر سامعین شعرا سے خوفزدہ ہو کر دم سادھے بیٹھے رہیں تو مشاعرے کے اٹھنے کی بات تو دور رہی خود شاعروں کا اپنے آپ پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ شاعروں کے کانوں میں کوئی نہ کوئی آواز پڑنی ہی چاہیئے۔ آواز ہو یا آوازہ اس کے لیے ان کی سماعت کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

صحیح معنوں میں مشاعرہ وہ ہوتا ہے جب مشاعرہ گاہ میں زندگی رواں دواں ہو۔ مشاعرہ گاہ میں کیفیت کچھ ایسی ہونی چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو کہ شاعروں کو سننے سامعین نہیں آئے سامعین کا مورچہ آیا ہوا ہے۔ خوبصورت پنڈال جگمگاتا شامیانہ اور جگہ جگہ ایک ہزار کینڈل پاور کے قمقمے یہ سب بیکار ہیں اصل چیز ہے ہوٹنگ۔ مشاعروں میں یہ نہ ہو تو منتظمین مشاعرہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ جس طرح شاعر مشاعرے کی تیاری کرتے ہیں، اپنی غزل کی دھن بناتے ہیں اس کی کئی ریہرسل کرتے ہیں اسی طرح سامعین کو بھی باضابطہ تیاری کرنی چاہیئے۔ مشاعروں میں یک رخی طریقہ اختیار کرنا ادب دشمنی ہے۔

مشاعروں میں ہوٹنگ کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے

۱۹ - الہلال، ۱۳ - باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

(مشاعرہ خود اور مشاعرے کے دیگر لوازمات (جن میں ہوٹنگ شامل ہے) شمالی ہند کی دین ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہوٹنگ کی رسم ایجاد کہاں انجام دی گئی۔ تحقیق اس بات کی کرنی چاہیے کہ سب سے پہلا مشاعرہ کس جگہ منعقد ہوا؟ اسی مشاعرے میں سامعین نے شور مچایا ہوگا۔ ... تب جاکے ہوٹنگ نے شکل اختیار کی۔ جب یہ شروع ہوئی تو منظور نظر منتظمین ... توجہ کا مرکز شاعر ... تاہم اب بھی کہیں کہیں ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں سامعین نے شعرا کو نظر انداز کر دیا بلکہ ان کی قیمت ... اپنا کلام سناتے رہیے ... تو ان کی تلاش ہے تو آپ کو یہاں ... گے۔

ہوٹنگ ... یا ... ہیں ... در اصل ہیں ہی وہی مراثی مداح ہونے چاہئیں جو شاعری میں مسلسل ہیں۔ ہوٹنگ میں استقام کا پایا جانا معیوب ہے۔ کچھ لوگوں نے عملی تنقید کی طرح عملی ہوٹنگ کی بھی کوشش کی ہے اور بعض مقامات پر شاعروں کی سرکوبی کے لیے عملی ہوٹنگ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ان وارداتوں میں ایلڈرس نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ ان وارداتوں کو یہ تحقہ فیسٹول سمجھ کر شاعروں کی تاریخ سے حذف کر دینا چاہیے۔ ہوٹنگ دلچسپی کی چیز ہے۔ دل شکنی کا حربہ نہیں۔ اسی لیے عملی ہوٹنگ مقبول نہیں ہو سکی۔ مشاعروں میں آلات و ظروف استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ میونسپل کارپوریشن کے اجلاس کی بات اور ہوتی ہے

چند مشاعرے ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں مشاعرہ بعد میں شروع ہوتا ہے ہوٹنگ پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ ... ہوتی ہے کہ شاعروں اور سامعین کے درمیان صدر مشاعرہ حائل ہو جاتے ہیں۔ نثر کے جلسوں میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ صدر جلسہ سب سے آخر میں تقریر کرتا ہے لیکن مشاعروں کا قاعدہ مختلف ہے۔ یہاں صدر کو پہلے موقع دیا جاتا ہے اور جب صدر یہ بھول جاتا ہے کہ یہ محفل مشاعرہ ہے تو سامعین مجبور ہو جاتے ہیں کہ صدر کو زیادہ دیر کھڑا نہ رہنے دیں اور کچھ ہی دیر میں صدر مشاعرہ کو پسپا ہو کر بیٹھ جانا پڑتا ہے۔ صدر مشاعرہ کی پسپائی مشاعرے کی کارروائی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ صدر کئی منٹ تک بحال نہیں ہو پاتا اور جب شاعر اس سے کلام سنانے کی اجازت طلب کرتا ہے تو وہ اس طرح اجازت دیتا ہے جیسے اس کا بڑا بھاری مالی نقصان ہو رہا ہو۔ صدر مشاعرہ پر اگر ہوٹنگ ہو جائے تو ابتدائی دو تین شاعروں کو خالی ہاتھ واپس ہونا پڑتا ہے۔ ہال میں خاموشی تو نہیں ہوتی لیکن جو کچھ ہوتی ہے اسے ہوٹنگ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسے از سر نو شروع کرنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔

دو چار شاعر یوں ہی گزر جاتے ہیں اور مشاعرے کی تمہید اچھی نہیں ہوتی لیکن جب پانچواں شاعر میدان کارزار میں آتا ہے تو مشاعرہ اچانک جاگ پڑتا ہے اور سارے سامعین بہ اتفاق آرا اور بآواز بلند اس شاعر کی فرمائش کرتے ہیں جو اپنا ایک مصرع تحت میں اور ایک ترنم میں سناتا ہے۔ اب مقابلہ آرائی ہوتی ہے سامعین میں اور اناؤنسر میں۔ یہی اناؤنسر کی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اس کرائسس میں وہی اناؤنسر سرخرو ہوتا ہے جسے اچھے اچھے اشعار اور لطائف یاد ہوں۔ اناؤنسر ابھی آلات حرب سے سامعین کو زیر کرتا ہے اور مائیکروفون پر ایستادہ شاعر کو سنوا کر ہی دم لیتا ہے۔ شاعر مذکور کی روانگی کے بعد سامعین اس شاعرہ کی فرمائش کرتے ہیں۔ جو زر کے بارڈر کی ریشمی ساڑی میں ملفوف ڈائس پر کچھ اس طرح بیٹھی ہوتی ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی پہلو قرار نہیں آ رہا ہے۔ یہاں اناؤنسر بکمال ہوشیاری صلح جوئی سے کام لیتا ہے اور خیرسگالی کے طور پر زر کے بارڈر کی ریشمی ساڑی میں ملفوف شاعرہ ہی کو آواز دیتا ہے۔ جو اپنی مسکراہٹ کے گل اور ثمر تقسیم کرتی قدم رنجہ فرماتی ہیں اور آدھے سے زیادہ سامعین ریشہ خطمی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (یہ وہی سامعین ہوتے ہیں جنھوں نے اونچی قیمت کے ٹکٹ خریدے ہوتے ہیں) باقی کے نصف سامعین کو ہوٹنگ کا فرض نباہنا پڑتا ہے کیونکہ شاعرات بھی ہوٹنگ کی مستحق ہوتی ہیں۔ مردوں یا عورتوں کے مساویانہ حقوق کا مشاعروں میں بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن شاعرات کے حصے کی ہوٹنگ الگ نمونے کی ہوتی ہے۔ دبی دبی آوازیں بہتر مانی گئی ہیں۔ گھٹی گھٹی بھی، آہیں بھی سودمند ہوتی ہیں۔ یہ سارے انداز ہوٹنگ ہی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے ان دنوں خانہ برانداز چمن قسم کی شاعرات اہل سخن شاعرات کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ ہوٹنگ بھی سلیقے کی ہو رہی ہے۔ ان شاعرات کو مشاعرے سے واپسی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پروانوں کو یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ شمع جاتی کدھر ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ خود شاعر کو ہوٹنگ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ان کی ہوٹنگ دو قسم کی ہوتی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ایک مشاعرے میں کسی گوشے سے بچے کے رونے کی آواز آئی تو شاعر نے اپنا شعر درمیان ہی میں روک لیا اور فی البدیہہ یہ پوچھا کہ نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا۔ یہ بھی ایک طرح کی ہوٹنگ ہوئی لیکن بالواسطہ۔ شیر خوار بچہ درمیان میں تھا۔ بلاواسطہ ہوٹنگ کے بھی مواقع آئے ہیں لیکن ان مکالموں میں فلمی رنگ آ جاتا ہے اور شاعر کو اپنے اشعار کی ری ٹیک میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں شاعر بہت ناراض ہو جاتا ہے اور اناؤنسر کو سیز فائر کی تجویز پیش کرنی پڑتی ہے۔ اس موقع پر کوئی لطیفہ کارگر نہیں ہوتا — ہوٹنگ میں جارحانہ انداز مشاعرے کے آداب کے منافی ہے۔ شاعر اپنے آپ کو ہوٹ ہوتا تو دیکھ سکتا ہے لیکن شوٹ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔

ہوٹنگ کو ذہنیت کا نہیں، ذہانت کا مظاہرہ مانا گیا ہے۔ اگر شاعر مشاعرے میں اپنی کئی مرتبہ کی آزمودہ نظم سنانا چاہے تو سامعین کو حق ہے کہ وہ شاعر سے فرمائش کریں کہ وہ اپنی اس سے زیادہ کہنہ نظم سنائے۔ کوئی شاعر اگر اپنے اشعار ڈائس پر بیٹھے ہوئے مختلف شعرا کی نذر کر رہا ہو تو سامعین اس عمل پر بھی تحدید عائد کر سکتے ہیں۔ بلکہ خود شعرا صاحبان کو بھی اس قسم کے نذرانے قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ مصرعے اگر گر رہے ہوں تو سامعین شاعر سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ مصرعے نہیں اٹھائے جا سکتے۔ مصرع اگر نہ اٹھ سکے تو سامعین کو حق ہے کہ وہ شاعر ہی کو اٹھا دیں اور اگر شاعر کھڑا ہو تو اسے بٹھا دیں۔

اسے ایک لحاظ سے بدقسمتی ہی سمجھنا چاہیے کہ اعلیٰ درجے کی ہوٹنگ کرنے والے سامعین کو نام بنام شہرت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ انھوں نے دراصل کام چھوڑا ہے، کہیں نام نہیں چھوڑا ہے لیکن جہاں تک شاعروں کی طرف سے ہوٹنگ کا تعلق ہے، اس ضمن میں کئی نام لیے جاتے ہیں اور مولانا حسرت موہانی کا نام تو خاص طور پر بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ایک مشاعرے میں کلام سناتے وقت جب مولانا کو اپنے شروع کے دو تین اشعار پر داد نہیں ملی بلکہ سامعین نے چپ سادھ لی تو مولانا نے کاغذ تہہ کیا اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ باقی کے اشعار بھی ایسے ہی ہیں۔ یہ ایک طرح کی ہوٹنگ ہی تھی۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اچھی اور معیاری ہوٹنگ کسی بھی محاذ سے ہو سکتی ہے۔

یوں بھی مشاعروں میں نہ تو کوئی حزبِ مخالف ہوتا ہے نہ سرکاری بنچ۔ مشاعرہ گاہ میں صرف شاعروں اور سامعین کے درمیان شوخیٔ کلام اور اندازِ بیان کا دوستانہ مقابلہ ہوتا ہے۔ مقابلہ کتنا ہی کڑا کیوں نہ ہو، مشاعرہ تو شاعر ہی لوٹتے ہیں۔ سامعین بالعموم خالی ہاتھ لوٹتے ہیں۔ وہ ہوٹنگ بھی کرتے ہیں تو اپنی گرہ سے اس کی قیمت بھی ادا کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذوق کی نہ سہی، شوق کی تکمیل تو ہو جاتی ہے۔

بعض مشاعروں میں شاعر اور سامعین گھر بیٹھے ہوٹنگ کر لیتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں ان دونوں کے درمیان دیر سے آنے کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس میں فریقین کی عدم موجودگی ہی کو ان کہی ہوٹنگ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مشاعرے ہوتے ضرور ہیں لیکن اس وقت شروع ہوتے ہیں جب ان کے اختتام کا وقت طلوع ہوتا ہے۔ اس قسم کے مشاعرے منتظمین مشاعرہ کو روپوشی پر مجبور کرتے ہیں۔ منتظمین، انتخاب میں جیتنے والے امیدواروں کی طرح کئی سال تک اپنے حلقے میں نظر نہیں آتے۔

اچھا کلام، عمدہ انتظام اور مناسب ہوٹنگ کا اہتمام یہ تین عناصر ہیں جن سے مشاعرہ بنتا ہے۔ اچھے کلام کی ذمہ داری شاعروں کی ہوتی ہے (اس لیے بعض شاعر، دوسروں کا کلام لے آتے ہیں) عمدہ انتظام کا بار منتظمین پر ہوتا ہے (یہ ایسا گناہ ہوتا ہے جس میں لذت نہیں ہوتی صرف خفت ہوتی ہے) اور ہوٹنگ کا کارنامہ سامعین کو انجام دینا ہوتا ہے کبھی کبھی سامعین کی فوج بے قاعدہ واقعی کام کر جاتی ہے۔ یہ سہ جماعتی ٹیم ہوتی ہے اور اس اتحادِ ثلاثہ کا ایک فریق بھی کمزور پڑ جائے تو مشاعرہ بگڑتا نہیں اکھڑ جاتا ہے اور بے جڑ کے پودے کہیں پنپتے ہیں جو مشاعرہ پنپے گا۔

تین پاؤں کی دوڑ، ساری دوڑوں میں مشکل ترین دوڑ ہوتی ہے۔ کہنے کو پاؤں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اصل میں سر زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ ●●

غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

بقیہ: آخری تمنا

اُس کا جواب تھا کہ اُس نے میری گزارش میرے خالق تک پہنچا دی تھی اور اُنہوں نے یہ حکم صادر کیا تھا کہ آج کی میری اس دنیا میں بے غرض پیار کرنے والے کتنے انسان ہیں؟ میری یہ بیٹی ان بے غرض انسانوں میں آتی ہے، اس لیے اس کی آخری تمنا پوری کی جائے۔ پھر میں نے یہ خط مکمل کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔

وہ بھی مجھے مل گیا۔

آج میں اس دنیا سے بھرپور خوشیاں سمیٹے ہوئے رخصت ہو رہی ہوں۔ تمہارے پیار، سہارے، ہمدردی اور اپنائیت کا ایک بار پھر شکریہ۔ زندگی کسی کو سُکھ دے سکنے کا ہی — نام ... ... ہے ... ... □□

بقیہ: نئی کتابیں

لگانا مشکل ہے۔ چونکہ یہ تمام مضامین ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں، اس لیے ان میں وقت کی کمی بھی مانع رہی۔ ریڈیو کے لحاظ سے یہ تمام مضامین بہت معلوماتی ہیں اور ان میں بہت سی بکھری معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

کتاب میں تین مضمون 'امام المدرسین شہید'، 'دکن کی زیارت گاہیں' اور 'عہد عثمانی میں اردو کی ترقی' کا تعلق خاص حیدرآباد دکن سے ہے۔ امام المدرسین کے متعلق تو مصنف کو یہ شکایت ہے کہ دکن کے باہر ان کو وہ قدر و منزلت نہ مل سکی جو انہیں ملنی چاہیئے تھی۔ مورخین نے بھی جانب داری سے کام لیا ہے اور ان اکابرین کو نظر انداز کیا ہے۔ مصنف نے ان کو پورے عزت و احترام کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ "دکن کی زیارت گاہیں" معلوماتی مضمون ہے اور اس میں بہت سی شخصیات اور زیارت گاہوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ 'لہو کا رنگ ایک ہے'، قومی یک جہتی پر بہت ہی خوبصورت تاریخی حوالوں اور مثالوں سے پُر ایک دلچسپ مضمون ہے۔

(جمیل اختر)

بقیہ: ڈائن

پھینک دوں؟ آخر وہ میری ماں ہے!"

ماں! آدمی بچوں سے کیا کیا امیدیں لگاتا ہے۔ میں نے کئی بار اپنے آپ کو سمجھایا بھی، کیکئی، چھوڑ یہ موہ مایا کا چکر اور جا بس ہردوار، رشی کیش کے کسی ڈیرے میں۔ میری عمر کے لوگوں کو گھر گرہستی میں پھنسے رہنے کا حق کس نے دیا ہے؟ بھئی چار آشرم ہیں، انہیں کا پالن کرو۔ وان پرستھی تو اب ختم ہونے کو آئی۔ سیدھے سنیاس آشرم کو اپناؤ اور ایشور کی راہ پکڑو۔ ایک ایک سیڑھی بھی اس کی طرف بڑھتے رہے تو ایک نہ ایک دن وہاں تک پہنچ ہی جاؤں گی۔ ویسے تو کہتے ہیں بناست گرو کے اس تک پہنچ پانا مشکل ہے کئی طرح کی منزلیں پار کرنی ہوتی ہیں اس تک پہنچنے کے لیے! پہلے ریت کے میدان آتے ہیں، پھر میلوں میل دور تک پھیلے ہوئے دریا، سمندر پھر اونچے اونچے پہاڑ اور پھر کہیں روشنی دکھائی دیتی ہے۔ بس وہ روشنی ہی ایشور ہے۔ ہے میرے ایشور، مجھے وہ روشنی دو۔ مجھے روشنی چاہیئے۔

اچھا ہے رمن خوب کھاتا کماتا ہے کسی چیز کی گھر میں کمی نہیں۔ اب کار بھی کچھ دنوں بعد آ جائے گی۔ نہ جانے دلہن کس موڈ میں تھی ایک دن کہ بڑے چاؤ سے بولی۔ "بدھائی ہو ماتا جی، ہم کار لے رہے ہیں۔"

کار لو بیٹے، جگ جگ جیو، بھگوان تمہیں اور خوشیاں دے۔ پر تھوڑی سی خوشی میرے ساتھ بھی بانٹ لیا کرو۔ کالی ڈائن ہی سہی میں، پر ڈائن بھی نو گھر چھوڑ کر وار کرتی ہے۔ □□

شرون کمار

ڈائن

مٹنے پر ایک ایسی کھروینچ ہے جو جاتی ہی نہیں سالہا سال بیت گئے لیکن یہ نامراد ہے کہ وہیں کی وہیں ہی ہوئی ہے۔

اب بتاؤ، اس کے بارے میں سوچ کر فائدہ بھی کیا ہوگا! جہاں اتنے سال بیت گئے اور بھی بیت جائیں گے۔ اب تو زندگی کی دوڑ ختم ہوئی سمجھو۔ شریر میں اب رہا کیا ہے! ویسے بھی شریر میں ہوتا ہی کیا ہے! پھونک ہی ہے نہ! نکل گئی تو سب ختم! پھر شریر یوں ہی پڑا رہ جائے گا۔ پھونک نہ کہو، دم حیات کہہ لو۔ آدمی تو یوں ہی ناپتا ہے۔ ٹپانے والا تو وہی ہے۔ جب تک ٹپانا چاہتا ہے، ٹپاتا ہے۔ جس وقت بند کرنا چاہتا ہے، بند کر دیتا ہے۔ سب کچھ پہلے ہی طے رہتا ہے۔ ماتھے کی پاٹی پر لکھا ہوتا ہے۔ پڑھنے والے اسے ایک ہی نظر میں پڑھ لیتے ہیں۔ ان کو یہ شکتی دینے والا بھی وہ ہے ... کو الگ الگ طرح کی شکتی دے رکھی ہے۔ اس نے جتنا ... برہمانڈ اتنی ہی طرح کی شکتی۔ سائنس والے الٹ بازیاں لگا رہے ہیں، اور لگا لیں۔ کافی کچھ تو کھوج نکالا ہے انھوں نے۔ لیکن کیا وہ اس کا پار پا سکیں گے؟ میرے جیتے جی تو شاید ہونے سے رہا جہاں ایک بھید کا پتہ لگاتے ہیں، وہاں دوسرا منھ کھولے پہلی ہی کھڑا ہوتا ہے۔ جیسے ایک غار کے اندر دوسری غار کھلتی جائے۔

اُس دن اخبار میں کیا پڑھ رہی تھی؟ اب یہ مُوئی آنکھیں بھی تو ساتھ نہیں دیتیں۔ سوچا تھا انھیں بنوالوں گی لیکن اب انہیں کون بنوائے۔ اب یہ موتیا بند میرے ساتھ ہی جائے گا۔ ایسا تو ہے نہیں کہ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کام تو چلتا ہی ہے۔ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتی ہوں۔ کبھی کبھی اخباروں میں بڑی مزے دار خبریں رہتی ہیں۔ کچھ کچھ اخبار والے تو انہیں مزے دار بنا بھی دیتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کی چاشنی چڑھاتے ہیں کہ بس، پوچھو نہیں۔ سرخیوں پر تو اور بھی رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ اس دن ویڈیو پر وہ فلم بھی تو چلی تھی ــ سرخیاں۔ اگر اخبار والے اسی طرح کے لوگ ہیں تو بھگوان ہی بچائے ان سے۔ آدمی نہ ہوئے، شیطان ہوئے۔ خود ہی گھات لگائیں اور خود ہی ان کے بارے میں لکھیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ ہو بھی سکتا ہے۔ کیا کیا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں کلپنا سے پرے کی چیزیں ہو جاتی ہیں۔ اس دن اخبار میں جانے کیا کیا چھپا تھا! اخبار بھی روز کہاں پڑھ پاتی ہوں! چھٹی کے دن پڑوس والوں سے منگوا لیتی ہوں۔ وہ بھی خالی ہوتا ہے تو دیتے ہیں، ورنہ چپ لگا جاتے ہیں۔ ایک دن پٹاک سے کہہ دیا تھا نتو کے ڈیڈی نے ــ اتنے بڑے بیٹے کی ماں ہے، ایک اخبار کی جگاڑ نہیں ہو سکتی اس کے لیے! اس کر ایک بار تو زبردست جھنجھناہٹ ہوئی تھی لیکن پھر دم سادھے رہ جانا پڑا۔ اب ان کا بھی کیا قصور! جب کام ہی لکھنے پڑھنے کا ہے تو اخبار کیسے دے دیں۔ ویسے اور کوئی چیز مانگو تو جھٹ سے دے دیں گے۔ گھر جیسی تو بات ہے۔ پر گھر، گھر ہی ہوتا ہے۔ اپنے گھر میں روز اخبار آئے تو کیا بُرا ہے، جہاں ہزاروں کا خرچہ ہے، وہاں کیا پندرہ بیس کا اور برداشت نہیں ہو سکتا؟ لیکن وہ خرچہ تو صرف میرے ہی لیے ہوگا! صرف میرے لیے کوئی خرچہ کیوں کرے؟ سُرین کو اخبار پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ صبح صبح تو کام پر بھاگتا ہے۔ رہ گئی پیچھے دلہن، تو اسے پڑھنے لکھنے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ویسے کہنے کو ایم۔ اے پاس ہے۔ بہت ہوا تو ریڈیو سن لیا۔ ویڈیو ہر دوسرے تیسرے روز چلتا ہی ہے۔ سُرین پچھلی بار لندن سے لایا تھا اور بھی بہت کچھ سامان آتا ہے گھر میں رہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا! بس، اپنے دو وقت کی روٹی کھاؤ اور مست رہو۔ ذرا سا منہ کھولا نہیں، اور طوفان پیدا ہوا نہیں۔ پہلے کتنا کلیش ہو جاتا تھا گھر میں! بابا، ہم نے تو لگائے کانوں کو ہاتھ! ہماری بلا سے! رتی سا کچھ ہو گیا تو جھٹ ساس بہو کا قصہ بن جائے گا۔ پہلے ہی قصے کیا کم ہیں! پر میں رہی بڈھی کھوسٹ۔ بھلا میں اس کا کیا بگاڑ سکتی ہوں! میں تو اپنے ہی کو کسی طرح ڈھوتی رہوں تو کافی ہے۔

دلہن نے پھر کٹ لگا دی ہے۔ بھئی، خالی بیٹھے بیٹھے یا اِدھر اُدھر ڈانواڈول چکر لگانے سے تنگ آ گئی اور پانی سے بھگو بھگو کر کسی طرح سبزی والا لفافہ کھول لیا اور پھر پنے سیدھے کر کے انہیں پڑھنے کے لیے جوڑ لیا تو کون سی آفت آ گئی۔ اب وقت تو کسی طرح کاٹنا ہی ہے نہ! اگر میں کہتی ہوں کہ بھئی، ٹی وی ہی کھول دو تاکہ میں بیٹھی بیٹھی دیکھتی رہوں تو تڑاک سے جواب ملتا ہے، "بجلی کا اتنا بل کون دے گا؟" یا "ماتا جی، ریپیر بہت مہنگی پڑتی ہے۔" اب بتاؤ، خود دیکھیں گے تو ریپیر کی ضرورت نہیں پڑے گی،

سی-۴۴، پاکٹ بی، میور وہار II
دہلی-۱۱۰۰۹۱

میں دیکھوں گی تو ریپیر کروانی پڑے گی۔ جیسے میری آنکھیں نہ ہوئیں ترشول ہو گئیں ـــ اور پھر ایک نہیں، دو دو ٹی وی ہیں گھر میں۔ ایک رنگین اور دوسرا بلیک اینڈ وہائٹ۔ اب میرے سکرے میں اگر بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی پڑا رہے تو کیا ہرج ہے، پڑوسی بھی ہنستے ہیں جب اپنا گھر چھوڑ کر میں دوسروں کے گھر دیکھنے جاتی ہوں۔ اپنے گھر میں تو ٹی وی تبھی کھلے گا جب سرین گھر پر ہوگا۔ ویڈیو بھی تبھی چلے گا جب اپنا موڈ ہوگا۔ نہ بابا، یہ بڑھاپا بہت بُرا۔ کہنے کو ماں ہوں، لیکن حق کسی چیز پر نہیں۔ حق بیٹے پر بھی نہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی پیاسے کے پیاسے۔ بچّہ نہیں ہے تو اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں۔ علاج بھی بہتیرے کرائے۔ قسمت میں اپنا نہیں ہے تو کسی سے گود لے لو۔ سسرال والوں سے نہیں لینا تو میکے والوں سے لے لو۔ بھئی ہم تو یہی کہیں گے کہ کسی طرح خوش رہو۔ ہمیں رونی صورت تو اچھی لگتی نہیں۔ اب ہم اگر رونا شروع کر دیں تو روتے ہی رہیں۔ رونے کے لیے کئی بہانے ہیں۔ پاکستان کو لے کر روئیں تو یہ رونا کبھی ختم ہی نہ ہو۔ کہنے کو پاکستان بنے چالیس سال ہونے کو آئے۔ آدمی کے اندر شیطان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ شیطان ہے تو فرشتوں کی بھی اہمیت ہے۔ شیطان تو تباہی پر تُلے رہتے ہیں۔ مارنے والا بلوان ہے تو بچانے والا اس سے بھی بڑا بلوان ہے۔ عورتوں نے تو اپنی عزّت بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دی تھیں۔ پتہ نہیں کتنی مری ہوں گی لیکن میں تو بچ ہی گئی۔ پتہ نہیں کیسے بچی، آنکھ کھلی تو شرنارتھی کیمپ میں تھی۔ سرین تب پیٹ میں تھا۔ سرین کے پتا میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ "غم مت کرو بچو، غم مت کرو۔ ایشور مہربان ہے۔"

ایشور واقعی مہربان ہے۔ اس کی طاقت کا احساس تو ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ بار بار آدمی کو خبردار کرتا ہے لیکن آدمی پھر بھی ہوش میں نہیں آتا۔ اسی کی کائنات، اور اسی سے دغا کرتی ہے۔ ایشور برداشت تو بہت کرتا ہے لیکن برداشت کی حد جب پار ہو جاتی ہے، تب اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک جھٹکا دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں، لاکھوں ڈھیر ہو جاتے ہیں لیکن اس چوطرفی تباہی میں بھی دیکھو، اسے جسے بچانا ہوتا ہے، بچا لیتا ہے۔ ہے میرے ایشور تو اپرمپار ہے۔

سرین کا جنم شرنارتھی کیمپ میں ہوا تھا۔ میں تب تیس پار کر چکی تھی۔ میں دوسری جگہ جو تھی۔ سرین کے پتا پچاس کو چھو رہے تھے۔ پہلی کے بچے کافی بڑے تھے اور اپنے اپنے دھندے میں لگے تھے۔ ایک طرح سے میری عمر کے تھے۔ لیکن افراتفری میں سب ادھر ادھر بکھر گیا۔ شادی بھی ہماری مجبوری میں ہوئی تھی۔ مجبوری ادھر بھی تھی اور اُدھر بھی۔ اِدھر یہ کہ میں ایک دم کالی اور اس پر چیچک کے داغ۔ ادھر یہ کہ پچاس کی عمر میں اب انہیں اپنی جوان اور خوبصورت لڑکی کون دیتا۔ ایسے کوئی رئیس تو تھے نہیں وہ۔ پر بھئی، خوب نبھایا انھوں نے میرے ساتھ۔ اب تک سرین بھی سر اٹھانے لگا تھا بس، پوچھو نہیں کیسے کیسے دن دیکھے۔ پاکستان کیا بنا، ان کے جسم کی ساری طاقت کھینچ لے گیا۔ دن بہ دن سوکھتے گئے وہ۔ پھر طرح طرح کی بیماریاں بھی آدبوچنے لگیں۔ سرین خود کیا تھا، اک دم پتلا۔ ایشور سے برابر یہی خیر مناتی رہتی کہ کب یہ بڑا ہو اور کب ہمارے دن پھریں۔

دیکھو، پھر گئے نہ وہ دن۔ بچھڑے بچے بھی مل گئے۔ سرین کو بھی ایک چھوٹی موٹی نوکری مل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے پڑھنا جاری رکھا۔ سرین کے پتا پر اب اور بھی بڑھاپا چھا گیا تھا۔ ہمیشہ یہی ڈر لگا رہتا کہ پتہ نہیں کب یہ لیلا ختم ہو جائے۔ ہوا بھی یہی۔ بیٹھے بیٹھے ہی ایک دن آنکھیں بند کر لیں۔ حالانکہ ہمیں ہمیشہ اس کا خدشہ رہتا تھا۔ پھر بھی میں سُن رہ گئی۔ بالکل سِل ہو گئی تھی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ چار دن تک میں جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی رہی۔ آنکھیں خشک اور پتھرائی ہوئی، ان میں ایک بوند تک پانی نہ تھا۔ ویسے کچھ واقعات بس سنتے ہی آنکھوں میں پانی چھلا چھلا آتا ہے۔ کئی بار کسی کی بے حد فراخ دلی یا خاص ادا بھی اسی گدگد حالت میں لے آتی ہے۔ لیکن جانے تب مجھے کیا ہوا تھا! میں آج تک سمجھ نہیں پائی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ مجھے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن صدمہ کیسا! جو سامنے دکھائی دے رہا تھا، اس کے لیے تو ہم تیار بھی تھے! بڑے بچے ہمارے ساتھ تو نہیں رہتے تھے، لیکن ان کا سہارا بہت تھا۔ ویسے ان کی اپنی بھری پوری گرستی تھی۔ بڑا لڑکا تو نانا بن چکا تھا۔ چھوٹی لڑکی بھی اپنے بیٹے کے لیے رشتے کی تلاش میں تھی۔ ہم پاکستان سے جو بچا کر لائے تھے، وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بس، اب سرین کی کمائی سے گاڑی کھنچ رہی تھی۔ اپنی کمائی پر سرین اب پہلے جیسا دُبلا پتلا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اب اچھا خاصا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

سرین کے لیے رشتہ آیا تو میں کتنی خوش تھی۔ سرین لینے دینے کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ اسے کچھ نہیں چاہیے تو میں کیوں فضول کے پچڑے میں پڑوں! سرین کہتا تھا کہ وہ آدرش شادی کرے گا۔ کرو آدرش شادی، کون روکتا ہے تمہیں! بس تین کپڑوں میں لڑکی آنی چاہیے۔ آ گئی تین کپڑوں میں لڑکی۔ سرین تو جیسے اس میں کھو سا گیا۔ جب دیکھو دروازے کی اندر سے چٹخنی چڑھی ہے۔ اب میں ہنسوں نہیں تو کیا کروں۔ بیٹا یہ بھی تو سمجھو کہ تمہاری ماں باہر اکیلی بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ چلو، بھگوان تمہیں خوش رکھے۔ تمہاری دلہن کی جلد سے جلد گود بھرے۔ گھر میں ہریالی آئے، مجھے اور کیا چاہیے۔

لیکن شادی کے چار سال گزر جانے پر بھی دلہن کی گود خالی رہی۔ پہلے میں نے سوچا، آج کل کے نوجوان ہیں جلدی بچہ نہیں چاہتے ہوں گے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ نہیں مجبوری کے شکار ہیں۔ دلہن کے بس میں ہوتا تو کب کی جن چکی ہوتی۔ پر یہ کیا، وہ تو مجھ سے ہی کٹی کٹی رہنے لگی۔ اور۔ تو اور سرین کو بھی جلی کٹی سنانے لگی۔ ایک دن اس سے بولی، "جہاں ایسی کالی ڈائن ہوگی، وہاں کچھ بھی ہرا نہیں رہ سکتا سب کچھ سوکھ جائے گا۔"

ہے ایشور! ایسا زہر۔ کہیں تو امرت برساتا ہے اور کہیں ...... ! میرے اندر، باہر ایسے نشتر چبھے کہ سب زخم زخم ہو گیا۔ رہ رہ کر ان سے ٹیسیں اٹھتیں۔ کبھی خیال آتا ان کا جو مجھے بیچ منجھدار چھوڑ کر چل بسے۔ لیکن وہ زندہ رہتے تو ان پر نہ جانے کیسی بیتتی۔ چلو، اور کچھ نہیں تو ہم دونوں کہیں الگ سے ساتھ ساتھ رہ لیتے۔ اب بڑے بچوں کے پاس جاؤں تو سرین کی بدنامی۔ جھٹ کہنے والے کہہ دیں گے ـــ دیکھا، ماں کو چار دن نہ رکھ سکے! زیادہ پڑھ لکھ بھی نہ پائے کہ اپنا کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر لیتے۔ پر اپنا دھندا کرتے بھی کیا! زیادہ سے زیادہ کسی کے یہاں آیا بن کر رہ لیتی۔ پھر بھی ایشور تو بڑا مہربان ہے۔ سرین اگر پوری طرح جورو کا غلام بن جاتا تو کب کا اٹھا کر مجھے باہر پھینک دیتا۔ ایک بار وہ بڑی جھلّائی تھی تو اس نے کہہ بھی دیا تھا، "کیا اسے چھت سے نیچے

باقی صفحہ ۴۲ پر

نام کتاب : "نمود سحر"
مصنف : نیر قریشی گنگوہی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

"نمود سحر" اپنے نام کی طرح ایک پرکشش شعری مجموعہ ہے۔ پرکشش اپنی سادگی کے اعتبار سے بھی اور اپنی پرکاری کے اعتبار سے بھی! اس شعری مجموعہ کے شاعر نیر قریشی گنگوہی ہیں جو زبان و بیان پر اپنی قدرت اور غزل گویانہ انداز و اسلوب پر اپنی دسترس کے لحاظ سے کافی کہنہ مشق نظر آتے ہیں۔

انھوں نے شعر و شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور مشاعروں اور شہرت طلبی کے دوسرے ہنگاموں سے الگ رہ کر گویا لوح و قلم کی پرورش کی ہے۔ اس معنی میں فکر و فن سے ان کا یہ ذہنی رشتہ لائق ستائش اور قابلِ تحسین ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے پچھلے تیس چالیس برس کے دوران اردو شعر و ادب میں جو تحریکات شدت سے ابھری ہیں وہ ان سے تمام تر نہیں تو بہت کچھ بے نیاز رہے ہیں اور خود ان کا اپنا مشاہدہ اور مطالعہ ہی ان کے شعر گوئی کے لیے ایک خاص تحریک عمل پیدا کرتا رہا ہے۔ گزشتہ تقریباً ایک ثلث صدی میں ہماری معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے وہ تاثر قبول کرتے رہے ہیں اور ان کی شاعری ایک خاموش احتجاج کی زیریں لہر کے طور پر برابر آگے بڑھتی رہی ہے۔ اس معاملے میں ان کے یہاں اگر ایک ہلکی سی نشتریت پیدا ہوتی ہے تو وہ بھی شعری لے اور ان کے اپنے رنگ تغزل میں ڈوبی رہتی ہے۔

ایک قومی کارکن ہونے کے باوصف وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کبھی للکارتے نہیں ہیں۔ باتوں باتوں میں فکر انگیز اشارے کرتے جاتے ہیں اور بس کچھ ایسا ہی رنگ ان کی عاشقانہ شاعری کا بھی ہے وہ عشق کی پردہ دری کے نہیں تہذیب عاشقی کے قائل ہیں۔ بات سماج کی ہو یا سیاست کی، حسن کی دل آسائیوں کی ہو یا عشق کی ہنگامہ آرائیوں کی، ان کا لہجہ ہمیشہ متین اور سنجیدہ رہتا ہے۔ غالب نے جسے بے خودی و ہشیاری اور سادگی و پرکاری کہا تھا اس کا ایک دل آویز نمونہ نیر صاحب کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کی زبان سادہ بیان سلیس اور لہجہ سنجیدہ ہے جس سے ان کے اپنے کردار کی شائستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شاعری میں کوئی باقاعدہ استاد بھی شاید نہیں ہے لیکن جگر، حسرت اور اصغر کی شاعری کا مطالعہ انھوں نے اچھا خاصا کیا ہے۔

وہ گنگوہ کے رہنے والے ہیں جو ایک مردم خیز خطہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی سے لے کر موجودہ زمانہ تک کہ چار ساڑھے چار سو برس کا عرصہ ہوتا ہے اس خطہ سے برابر ارباب علم اور اصحاب فکر جنم لیتے اور شعر و سخن کی خدمت کرتے رہے ہیں، اتنا ہی نہیں اردو زبان کی ابتدائی شعری تخلیقات اسی خطہ یا سرکار سہارنپور سے تعلق رکھتی ہیں۔

میرا روئے سخن، بکٹ کہانی اور عاشور نامے جیسی قدیم شعری تخلیقات کی طرف ہے۔ اس علاقے کے علاقائی ادب کی مختلف اکائیوں میں اس علاقہ کی ادبی و شعری تالیفات فنی اور تخلیقی اعتبار سے ایک خاص امتیاز اور درجہ اعتبار رکھتی ہیں۔ نیر قریشی صاحب کا زیر تبصرہ شعری مجموعہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو اس کے ماضی و موجود کے درمیان ایک زندہ رشتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل غزلوں کے شعری رنگ و آہنگ کی کچھ مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں جو اس کی اپنی انفرادیت کی شناخت بھی ہیں:۔

ایک دنیا ہوں اک جہاں ہوں میں
آسماں زیر آسماں ہوں میں

پرنور زندگی کی سحر کھو رہے ہیں لوگ
سورج چڑھا ہوا ہے مگر سو رہے ہیں لوگ

آرام کی اک سانس بھی دشوار بہت ہے
اس دور کا ہر شخص دل آزار بہت ہے

کچھ تو غیروں نے اڑایا مری غربت کا مذاق
کچھ رفیقوں کی عنایات نے سونے نہ دیا

ان کا حسن بیان ان کے ہلکے پھلکے رنگ تغزل میں زیادہ نکھرتا اور سنورتا ہے۔ اور ان کے اسلوب میں ایک نئی شگفتگی آجاتی ہے۔

غرض کہ نیر صاحب کی شاعری ایک سنجیدہ طبیعت اور شگفتہ مزاج شخص کے یہاں سلیقہ طریقہ سے کہی جانے والی اس کی اپنی بات کی خوبصورت مثالیں پیش کرتی ہے۔

تنویر احمد علوی

نام کتاب : قلق میرٹھی "حیات اور کارنامے"
مصنف : ڈاکٹر جلال انجم
قیمت : ۷۰ روپے
ملنے کا پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲

انیسویں صدی نے اردو ادب کو بڑی بڑی قد آور شخصیتیں عطا کی ہیں تاہم یہ ہر دور کا المیہ رہا ہے کہ

بعض شخصیتیں اہم ہوتے ہوئے بھی صحیح تناظر میں ابھر کر نہیں آپاتیں یا انہیں وہ شہرت نہیں مل پاتی جو ان کا بجا طور پر حصہ ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت قلق میرٹھی کی ہے۔ انہیں غالب اور مومن سے قربت حاصل تھی۔ کام اور کلام کے اعتبار سے بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود ہماری تحقیقی نگاہیں قلق میرٹھی پر نہیں رکتیں۔

نوجوان نسل میں تیزی سے جس طرح تحقیق کا رجحان بڑھ رہا ہے، یہ کتاب خود اس بات کی دلیل ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب حیات کا ہے۔ اس میں ان کی زندگی اور شخصیت سے بحث کرتے ہوئے تاریخ پیدائش سے قبر کی دریافت تک بہت سی منزلیں موجود ہیں۔ ساتھ ہی ان کی تحریریں، دستخط نیز دیگر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دوسرے باب میں کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف غزل بلکہ رباعیات، مسدس، مرثیہ اور دیگر تمام اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں قلق کی نثری کاوشوں کے ذریعہ ان کے عظیم المرتبت ہونے کی وکالت کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں قلق کے قصائد کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں معاصرین قلق کے حالات یکجا کیے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں انگریزی نظموں کے تراجم سے بحث کرتے ہوئے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ قلق نے حالی، اسماعیل اور آزاد سے قبل اردو میں موضوعاتی نظمیں لکھنے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ قلق کے اس کام کو واقعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ساتویں باب میں قلق کی زبان و بیان سے بحث کی گئی ہے اور آخری باب بعنوان "اردو شعر و ادب میں قلق کا مقام" میں قلق کو جدید نظم نگاری کا بانی ثابت کیا ہے۔

ڈاکٹر جلال انجم نے قلق کی شاعری اور کارناموں کا بہت منصفانہ ڈھنگ سے جائزہ لیا ہے۔ جلال انجم کا یہ تحقیقی مقالہ اردو تحقیق میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔ ساتھ ساتھ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادب کی ابھی بہت سی ایسی ناقابل فراموش کڑیاں اور موجود ہیں جن کے ساتھ اب بھی بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہ مقالہ نئے گوشوں پر کام کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ (نگار عظیم)

نام کتاب : **نئی غزل نئی آوازیں**
مصنف : اسعد بدایونی
قیمت : ۲۰ روپے
ملنے کے پتے : مکتبہ جامعہ دہلی، علی گڑھ، بمبئی

'نئی غزل نئی آوازیں' جدید نسل کے نمائندہ شاعر اسعد بدایونی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جستہ جستہ ان کے مضامین رسائل میں شائع ہوتے تھے مگر اب اس مجموعے نے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو ادبی منظرنامے پر ثبت کر دیا ہے۔

اس کتاب میں، مختلف مضامین کی شکل میں، ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ یوں تو یہ تمام مضامین اپنی الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک چیز جو تمام مضامین میں مشترک ہے، وہ یہ کہ یہ تمام مضامین جدید غزل کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ پہلا باب "جدید اردو غزل اور اس کی روایت" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں روایتی شعرا کے زبان و اسلوب کی نشاندہی ان کے اشعار کے ذریعہ کی گئی ہے اور جدید شعرا کے زبان و اسلوب سے ان کے روایتی رشتے کو جدید غزل کے اشعار کو پیش کر کے اور ان پر بحث کر کے استوار کیا گیا ہے۔

دوسرا باب "نئی غزل کا مزاج" ہے۔ اس میں نئی غزل کے مزاج کی نشاندہی نئے اور بالکل نئے شعرا کے زبان و اسلوب اور موضوعات سے بحث کر کے کی گئی ہے۔

تیسرا باب "نئی غزل میں اسالیب کا تنوع" ہے۔ چوتھا باب "آٹھویں دہائی کی غزل" اور پانچواں باب ہے "نئی غزل نئی آوازیں"۔ اس کے بعد کے دونوں ابواب میں دو مخصوص شعرا "وزیر آغا" اور "عرفان صدیقی" کی غزل گوئی کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کا پانچواں باب "نئی غزل نئی آوازیں" اس مجموعۂ مضامین کا کلیدی مقالہ ہے جس میں مصنف نے ایسے نئے شعرا کے کلام سے بحث کی ہے جو گزشتہ دس برسوں میں ہند و پاک کی لوح ادب پر اپنا نام بھی روشنائی سے لکھ چکے ہیں۔ ہر شاعر کے پانچ پانچ اشعار اس مضمون میں پیش کر کے ان سے پُرمغز انداز میں بحث کی گئی ہے اور شاعر کی انفرادیت کو اس کے اسلوب، مزاج اور زبان و بیان کے ذریعہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اپنے انداز کی بہترین اور منفرد کوشش ہے۔ اس مضمون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان نسبتاً نئے شعرا پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے جو ابھی تک بزرگ ناقدین کے ضابطۂ تحریر سے باہر تھے۔ اسعد بدایونی نے اس کتاب کے دیباچے میں بھی اپنے اس نظریے کو پُرزور اور پُر احتجاج انداز میں تحریر کیا ہے کہ بزرگ ناقدین نئے فنکاروں پر قلم اٹھانا توہین کے مترادف تصور کرتے ہیں۔

آخری دو مضامین میں وزیر آغا اور عرفان صدیقی کی شعری صلاحیتیں اور مخصوص اسلوب کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے اور بڑے علمی انداز میں ان کے شعری انداز کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ (عمران عظیم)

نام کتاب : **"تمنا پنچ"**
مصنف : تمنا مظفرپوری
قیمت ڈیلکس ایڈیشن : ۲۰ روپے
" عام ایڈیشن : ۱۰ روپے
ملنے کے پتے : تمنا مظفرپوری مقام و پوسٹ گورار دلس گیا ۸۲۴۱۱۸ (بہار)

تمنا پنچ، تمنا مظفرپوری کے انشائیوں، طنزیہ و مزاحیہ مضامین، ایک افسانہ، ایک ڈرامہ، ایک غزل اور ایک نظم کا مجموعہ ہے۔ تمنا مظفرپوری کا نام دنیائے طنز و مزاح میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ ۱۹۵۹ء سے ہند و پاک کے مؤقر جریدوں میں برابر شائع ہوتے اور خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔

طنز و مزاح کا فن مشکل فن ہے کیونکہ اس میں توازن اور احتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ قاری کو ہنسانے، زعفران زار بنانے والی تخلیقات تو عام طور سے پسند کی جاتی ہیں لیکن سنجیدہ یا غور طلب ہوں تو عام قاری کا ذہن انہیں قبول کرنے سے بدکتا ہے۔ بہرحال طنز و مزاح نگار کی نگاہ بہت تیز ہونی چاہیے کہ وہ گرد و پیش میں ہونے والے سارے واقعات و حوادث کا بہ نظر غائر مطالعہ کر سکے اور فرد، ذات یا سماج کی کمزوریوں پر کڑھنے کے بجائے اپنے قلم سے نشتر کا کام لے اور ماحول کے ناسور کے مفسد مواد باہر نکال کر اسے پھر سے صحت مند بنا دے اور ساتھ ہی ساتھ قاری کو محظوظ بھی کرتا رہے یعنی وہ اصلاح بھی کرتا ہے اور خوش بھی۔

"تمنا پنچ" میں کچھ ایسی ہی کیفیت کا احساس "ہندی کا پرسدھ کوی گالب"، "غالب کی یاد میں"، "گلوریاں"، "مشاعرہ"، "لیڈر"، "گھر سے لیڈر تک"، "تواریخ"، "گائیڈ اور سیاح"، "ایک مردے کی آپ بیتی"، "انٹرویو بورڈ"، "ادارۂ کفن دفن"، "ٹیگور نہیں شرمیلا ٹیگور" اور "گرام پنچایت" میں ہوتا ہے۔

"ہندی کے پرسدھ کوی گالب" میں تمنا مظفر پوری کا فن نہایت عروج پر ہے اور طنز بہت گہرا ہے۔ انھوں نے ہندی کے الفاظ سے طنز و ظرافت کا ایسا اچھوتا ماحول پیش کیا ہے کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے محقق اور ناقد جس انداز سے شاعر و ادیب کی سوانح مرتب کرتے ہیں یا اس کی ذاتی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہیں اور فن کا محاکمہ کرتے ہیں، ان پہلوؤں پر تمنا مظفر پوری نے بھرپور وار کیا ہے، پیدائش، ابتدائی تعلیم، معاشقہ اور مالی حالت کے بارے میں انھوں نے کافی روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے اشعار کی ہندی کے الفاظ سے بھی پیروڈی کی ہے۔ "غالب کی یاد میں" اردو کے ساتھ برتی جانے والی ناانصافیوں کی جانب بلیغ اشارہ ہے۔ "گلوریاں" ایک مطالعہ - ایک تعارف "کتابوں کے عام مبصرین اور مصنفین پر بھرپور طنز ہے۔ اسی طرح "مشاعرہ" میں انھوں نے پیش کیا ہے کہ یہ ایک مرض ہے جو صرف پڑھے لکھے لوگوں کو ہوتا ہے۔

اسی طرح "ٹیگور نہیں، شرمیلا ٹیگور" میں انھوں نے دکھایا ہے کہ لوگ شرمیلا ٹیگور کے واسطے سے ٹیگور کو جانتے ہیں اور جب ان کی شہرۂ آفاق کتاب "گیتانجلی" کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ دریافت کرتے ہیں یہ کون سی فلم ہے؟

"لیڈر" میں آج کے بیشتر لیڈروں کی زندگی کے وہ تمام پہلو اجاگر کیے ہیں جو قابل گرفت ہیں۔

مصنف نے "تاریخ، گائیڈ اور سیاح" میں چند ایسے مؤرخین کو ہدف ملامت بنایا ہے جو ہر فن تعمیر اور فنون لطیفہ کے شاہکار کو عہد قدیم سے کسی نہ کسی طرح من گڑھت قصے داستان بنا کر منسوب کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ "ایک مردے کی آپ بیتی" میں عام لوگوں کی قیاس آرائیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے ریلوے سوئیپر سے نیتا صاحب کے طرز عمل اور ان کی خود غرضیوں کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ "انٹرویو بورڈ" میں بورڈ کے ممبران اور چیئرمین امیدوار کا انتخاب کرتے وقت کن کن باتوں، اور ذاتی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں ان کی نقاب کشائی کی ہے۔

"تمنا پنچ" کے مضامین زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر گہری ضرب لگاتے ہیں۔

تمنا مظفر پوری کہیں کہیں حالات کی سنگینی اور ستم ظریفی سے اس قدر دل برداشتہ نظر آتے ہیں کہ طنز کا تیر اتنا زہریلا ہو جاتا ہے کہ مزاح و ظرافت کی روح مجروح ہو جاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ عام قاری جو طنز و مزاح کو تفنن طبع کے لیے پڑھتا ہے، ان کی تحریر سے وہ انبساط و مسرت حاصل نہیں کر پاتا جس کی اسے توقع ہوتی ہے۔

(م۔ ق۔ خان)

نام کتاب : **لب گویا**
شاعر : علی عباس امید
قیمت : پچاس ۵۰ روپے
ناشر : کل ہند حلقۂ ادب، عابدی منزل، غازی پور

اس شعری مجموعہ میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان شعری کاوشوں پر ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے "مقدمات" بھی ہیں جو پندرہ صفحات پر محیط ہیں۔ راہی معصوم رضا نے "بات بنانے" کی اگر سعی کامیابی کی ہے تو وزیر آغا نے جدیدیت کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے "مختلف اخبارات" کے تراشے جوڑ کر کتاب کے بالکل آغاز میں شامل کیے ہیں جن سے اس کی مقبولیت اور شعری صلاحیت مستند ہوئی ہے۔

فنکار کا فن ہی براہ راست پڑھنے والے یا فن شناس کو اس کی برتری یا کمتری کا احساس دلاتا ہے۔ جانے کیوں ان کی شخصیت اور شاعری پر "ناامیدی" کا سایہ کچھ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ زیاں کا احساس ان میں بے اعتباری کو جنم دیتا ہے۔

اس مجموعہ کی آخری نظم "علی عباس امید" کے عنوان سے ہے۔ اس کا عنوان "فنکار" بھی ہو سکتا تھا یا اقبال کی طرح "شاعر" بھی تجویز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن امید کا مقصد اپنی شخصیت اور نام کو Highlight کرنا ہے، اس لیے انھوں نے ایسا عنوان دیا ـــــ اگر وہ خود اپنے خیال کی پیروی کریں کہ

لفظوں کی آنچ پر احساس کو سینکنا
اور
پھر وقت، جو میرا کاغذ ہے، اس پر
اپنے عہد کے اور
آنے والے زمانے کے
تمام انسانوں کے لیے
اپنے معصوم خوابوں کے منشور تحریر کرنا ہی
میری زندگی ہے

تو ان کی شاعری میں امید کی اتنی کرنیں ہیں اور ان کرنوں میں فکر اور شعور، سماجی آگہی اور فن کی ایسی بصیرت ہے جو انہیں جہان شعر میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

غزلوں میں عصری حسیت بھی ہے اور رنگ تغزل بھی۔ اس پورے شعری مجموعے کی روشنی میں ان کے تخلیقی سفر کے ارتقا کا اگر اندازہ کیا جائے تو انہیں رومان سے حقیقت کی جانب بڑھتا ہوا مسافر کہا جا سکتا ہے۔ غزلوں میں اگر رومانی کیفیت کی لے تیز ہو گئی ہے تو نظمیں عصری حسیت کی سرد و گرم لہروں سے قریب ہیں۔

امید کی شاعری اپنے قاری کو ناامید نہیں کرتی۔ نئی شاعری "لب گویا" کے تخلیق کار سے اچھی توقعات وابستہ کر سکتی ہے۔ اس لیے ؎

آپ امید سے ملیں تو سہی
فی زمانہ بہت غنیمت ہے

نام کتاب : **اندھے رشتے** (ڈراما)
مصنف : انل ٹھکر
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی
اشاعت : ۱۹۸۶ء

فلموں کے باقاعدہ رواج کے بعد ڈراما کے فن کو نقصان ہوا تھا۔ حالانکہ فلم ڈراما کی ہی ارتقائی شکل ہے اور یہ عین فطرت ہے کہ ارتقا پذیر شے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈراما کے افراد اور سامعین ہر دو کا تعلق ڈراما سے کم اور فلم سے زیادہ ہوتا گیا ـــــ لیکن سائنسی ترقیات نے جب ٹی وی کا چلن عام کر دیا اور یہ عوام کی زندگی میں روزمرہ

کی ضروریات کی طرح داخل ہوگیا تو ڈرامہ کے فن میں ایک بار پھر نئی زندگی آئی، یا دوسرے لفظوں میں اس کا احیاء ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو، ہندی اور دوسری زبانوں میں نئے زمانہ اچھے ڈرامے لکھے جا رہے تھے۔

انل ٹھکر معروف ڈرامہ نگار ہیں۔ "اندھے رشتے" ان کا تازہ ترین ڈرامہ ہے۔ اس سے قبل "خالی خانے" اور "آپ کیوں روئے" وغیرہ ڈرامے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اندھے رشتے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انل ٹھکر فنِ ڈرامہ نگاری کے رمز شناس ہیں۔ تصادم اور کشمکش جو ڈرامہ میں دلچسپی پیدا کرتی ہے، اس ڈرامے میں بھی موجود ہے۔ کبھی یہ تصادم سلمہ اور کلیم کے درمیان، کبھی کلیم اور افرادِ خاندان کے بیچ، کبھی سلمہ اور اہلِ خاندان کے درمیان نظر آتا ہے۔ ایک کشمکش ہے جو پورے ڈرامے میں جاری و ساری ہے اس کشمکش میں سلمہ، کلیم، امّی سبھی برابر کے شریک ہیں۔ امّی پر تو یہ واقعہ بیتا ہی ہے اور سلمہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو خوبصورتی سے پورا کر دے جسے اس کا باپ اپنی نااہلی اور بے جا عیاشیوں کے باعث فراموش کر چکا تھا۔ مگر سلمہ کی اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود شہناز ہوں یا رفیق، یا نوری، نہ تو ڈاکٹر بنتے ہیں نہ انجینئر بلکہ اپنی پسند کی راہ منتخب کرتے ہیں اور سلمہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا ہے یہ ایک طرف امّی کی محرومیوں کی بھی داستان ہے اور دوسری طرف سلمہ کی شکست خوردگی کی کہانی بھی، کیونکہ سماج میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا رجحان عام ہو گیا ہے ——— جو کلیم کے یہاں بھی ہے اور شہناز اور رفیق کے یہاں بھی۔ مگر الگ الگ سطح پر اس لعنت کا ذکر ڈرامہ میں کرداروں کی زبان سے کئی مقام پر کیا گیا ہے۔ انل ٹھکر نے پورے ماحول میں ڈرامائیت پیدا کرنے کی خاطر مکالموں سے خوب خوب کام لیا ہے۔ انھوں نے نہایت خوبصورت اور فنکارانہ انداز میں سماج کے بعض اہم مسائل کی طرف اشارے کیے ہیں، جن میں سب سے اہم مسئلہ دوسری تیسری شادی کا ہے جن کے باعث "اندھے رشتے" جیسے ڈرامے کسی خاندان میں جنم لیتے ہیں۔

انل ٹھکر نے عموماً سلیس زبان استعمال کی ہے مگر کہیں کہیں مکالمہ عام محاورے سے ہٹ گیا ہے۔ آج جبکہ دوسرے اصناف کے مقابلے میں اردو میں ڈرامے کم لکھے جا رہے ہیں۔ "اندھے رشتے" ایک اچھی کوشش ہے۔

(ارتضیٰ کریم)

کتاب کا نام : "درد کا گلاب"
مصنف : صبوحی طارق
قیمت : ۲۰ روپے
ناشر : نیو تیواری ٹینک روڈ، رانچی (بہار)

"درد کا گلاب" صبوحی طارق کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں بارہ کہانیاں شامل ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے زندگی کے گوناگوں مسائل پر مبنی ہیں اور پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ درج ذیل کہانیوں کو ان کی اہم کہانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "اپنا گھر اپنا دکھ" ایک نازک موضوع پر لکھی گئی خوبصورت کہانی ہے۔ صبوحی طارق کی احتیاط اور سلیقہ دیدنی ہیں۔ اس سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دو اور اہم کہانیاں "یہ اذانوں کے پہرے" اور "کندھوں کا کتبہ" ہیں۔ ان میں اساطیرِ مذہب کے ذریعے انسان کے ذہنی کرب، درد، اس کی ذہنی اور فکری تنہائی انسانی اقدار کے زوال اور معاشرہ کے المناک حقائق کی طرف رمزیہ انداز میں اشارے کیے گئے ہیں۔

والدین کی محبتوں، شفقتوں اور روحانی رشتوں پر مشتمل تاثرات سے معمور ان کی ایک کہانی "درد کا گلاب" ہے جو صبوحی طارق کی زندگی کا ایک بڑا سچ ہے۔ اس کہانی میں والدین کی محبت کی اس انتہا کو دکھایا گیا ہے جس سے والدین اپنی بیٹی کی شادی کے وقت دوچار ہوتے ہیں اور ایک انجانے خوف کے احساس سے وہ سہمے رہتے ہیں معاشرے کی اس بدنصیبی پر اظہارِ افسوس ضروری ہے جس نے یقین و اعتبار کی صحت مند روایت ہندوستانی سماج کو ہنوز نہیں دی جس سے کہ کوئی والدین اپنی لڑکی کو کسی انجان شخص کے حوالے بے خوف و خطر کر سکے جو اس کا شریکِ سفر بن رہا ہے۔

صبوحی طارق کا انداز صاف، ستھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ اسلوب شگفتہ اور زبان سادہ اور روزمرّہ کی استعمال کی ہے بیان پر قدرت حاصل ہے۔

نام کتاب : "خوشبو کا سفر"
مصنف : صلاح الدین نیّر
صفحات : ۱۲۴
قیمت : ۱۶ روپے
ناشر : مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد

"خوشبو کا سفر" صلاح الدین نیّر کا پانچواں مجموعۂ کلام ہے۔ صلاح الدین نیّر جدید شعرا میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے اپنا خاص مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اس نے روایتی مضامین اور اسالیبِ اظہار سے دامن بچاتے ہوئے سماجی اور سیاسی شعور کو غزل کے پیمانے میں ڈھال کر غزل کو عصری آگہی کا ترجمان بنا دیا ہے۔ اس کے لہجے میں خاص طرح کی متانت، نرمی اور دل پذیری کی کیفیت محسوس ہوتی ہے جو انسان دوستی اور خلوص و وفا سے عبارت ہے۔ غم ذات ہو، نشاط و وصل ہر طرح کی کیفیات کو انھوں نے شائستگی اور وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ طہارت اور تقدس کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔

"خوشبو کا سفر" غزل اور نظم کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ اس میں دس نظمیں اور بقیہ غزلیں ہیں۔ نظموں میں "یہ کیسا رشتہ"، "شناعت"، "ہمیشہ کی جدائی"، "اتنا بھرم تو رہنے دے"، "میرا حاصل میرا گھر"، "گفتگو"، "ہمیشہ کوئی بھی موسم ہو گنگناتی جا" عمدہ نظمیں ہیں۔ نیّر کی شاعری کا یہ مجموعہ ایک ایسے سفر کی ابتدا ہے جس کی آخری منزل کوئی نہیں۔ یہ خوشبو کا سفر ہے اور یہ سفر خوشبو کی جستجو میں جاری رہے گا۔

نام کتاب : "تعارف"
مصنفہ : شفیعہ قادری
قیمت : ۱۲ روپے
ناشر : مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد

یہ شفیعہ قادری کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں دس مضامین اور ایک تبصرہ شامل ہے۔ تمام مضامین تاثراتی زیادہ اور تنقیدی کم ہیں۔ مومن، داغ، مجاز، ساحر اور جاں نثار اختر پر جو مضامین شامل ہیں ان سے ان کی شخصی اہمیت کا اندازہ تو بخوبی لگایا جا سکتا ہے لیکن ادبی اہمیت کا اندازہ

باقی صفحہ ۴۲ پر

پنجابی کہانی نمبر

ترتیب

آجکل

ایڈیٹر راج نرائن راز

سب ایڈیٹر خورشید اکرم

شمارہ : ۱۲

جولائی ۱۹۸۸ء اساڑھ شراون شک سمت ۱۹۱۰

قیمت : چار روپے فون : ۳۸۷۰۶۹

قومی یکجہتی

بھارت ۸۰ کروڑ سے زیادہ فعال اور سرگرم شہریوں کی جمہوریت کا نام ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ اس کا ہر حصہ تہذیب، آب و ہوا، رسم و رواج، جغرافیائی حالات، مذاہب اور زبانوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ کثرت میں وحدت ہی بھارت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ہمارے دوسرے پڑوسی ملکوں کے برعکس۔ ہماری ایک سیکولر جمہوریت ہے۔ ملک میں تمام مذاہب کو پروان چڑھنے کی مکمل آزادی ہے۔ لوگوں میں مذہب، زبان اور دوسری تفریقوں کے باوجود انہیں مکمل طور پر جمہوریت سے مستفیض ہونے کے مواقع فراہم ہیں۔ پھر بھی فرقہ وارانہ فسادات وقتاً فوقتاً ہماری قوم کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ جیسے کہ وہ ہمارے جمہوری ڈھانچے اور سیکولر نظام کا ایک طرح سے امتحان لے رہے ہوں۔

قوم کے اتحاد کو تباہ کرنے والی اس خطرناک بیماری سے ملک کے تحفظ کا واحد ذریعہ قومی یکجہتی ہے۔ قومی یکجہتی مضبوط اور متحد ملک کے استحکام کے لیے بہت اہم ہے اور اقتصادی سماجی ترقی کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔ ہمارے جیسے ملک کے لیے قومی یکجہتی جمہوریت کی تکمیل کے لیے صرف ایک طرزِ حکومت کے طور پر ہی نہیں بلکہ بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے بھی ضروری ہے۔ اس لیے ہماری تمام کوششیں قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے ہونی چاہئیں۔ قومی یکجہتی کا مطلب دوسرے لوگوں کی طرزِ زندگی اور ان کے رسم و رواج کے سلسلے میں روا داری برتنا ہے، جس میں ہم آہنگی ختم کرنے اور انتشار پیدا کرنے والے تعصب کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرنا بھی شامل ہے۔ ہم نے ملک کے بعض حصوں میں اتحاد ختم کرنے والے رجحانات کو دیکھا ہی نہیں بلکہ اس سے نقصان بھی اٹھایا ہے۔ ایسے تفرقہ پیدا کرنے والے رجحانات کو سر اٹھانے نہیں دینا چاہیے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب ہم ملک میں مختلف مذاہب اور جدا جدا زبانوں والے گروہوں کے درمیان جذباتی احساسات پیدا کریں اور انہیں ملک کی ترقی کے لیے یک جا کریں۔ مذہب اور زبان دونوں اہم ہیں۔ لیکن اُن کو ایک قومی دھارے میں آنا چاہیے۔

حقیقی تعلیم نسل، مذہب، ذات یا فرقے کی تمام بندشوں سے آزاد ہے۔ اور یہ ایک نئے سماجی نظام کے قیام کے لیے ذرائع فراہم کرتی ہے۔ تعلیم، سماجی تبدیلی کے ایک ذریعے کی حیثیت سے نہ صرف لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتی ہے، اور خود اعتماد بناتی ہے بلکہ اُن کو قومی یکجہتی کی اہم ضرورت سے بھی روشناس کراتی ہے۔ اس طرح تمام محبانِ وطن شہریوں کو عوام کی ناخواندگی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو سماجی یکجہتی پیدا کرنے کا ایک بنیادی سبب بن سکتی ہے۔ سماجی بھائی چارے سے متعلق مسائل قومی یکجہتی کے مسائل بھی ہیں۔

قومی یکجہتی کا مطلب ایک خوش اور خوشحال ملک کی تعمیر کے لیے مختلف سماجی گروہوں مثلاً فرقوں، لسانی اور نسلی طبقوں کو قومی وسائل کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے، ان میں ہم آہنگی اور قومی جذبہ پیدا کرنا ہے۔ بنیادی طور پر بھارت میں قومی یکجہتی تعمیری اور باہمی تعاون کی زندگی گزارنے کے لیے زبان، رسوم، مذاہب اور نسلوں وغیرہ کو خطرے میں ڈالے بغیر ملک کی اقتصادی، ثقافتی، سماجی، سیاسی، انتظامی اور بھارت کی سلامتی کی فکر مندی کے بارے میں مشترکہ جذبات، فکر و عمل، احساس و سلوک پیدا کر کے گوناگونی میں اتحاد پیدا کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی شخص کو اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے کہا جائے یا کہ وہ اس جگہ کی ان عظیم شخصیتوں پر فخر نہ کرے جہاں سے اس کا تعلق ہے۔ قومی یکجہتی کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ پورے ملک میں تمام چیزوں میں بے کیف اور بے رنگ یکسانیت لائی جائے۔

قومی یکجہتی ہمارے ملک کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آزادی کی تحریک کے دوران اور اس دور میں جب کہ بھارت پر حملہ کیا گیا، ہم نے اپنے قومی اتحاد کے جذبے کی شاندار مثال قائم کی۔ بہت سے ہندو مسلمان صوفیوں کے تئیں اور اس کے برعکس مسلمان ہندو سنتوں کے تئیں عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور آپس میں ایک دوسرے کی قدر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اشوک کی عظیم الشان سلطنت پیار، سخاوت اور رحمدلی پر قائم ہوئی تھی۔ کسی بھی شخص کا پیدائشی مذہب اُس کے مندروں، مسجدوں، گرجا گھروں اور گوردواروں میں عبادت کرنے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اس وسیع و

سوندر سنگھ اُپل

پنجابی کہانی

آزادی سے پہلے انگریز نے ایک چالاک سیاست دان کی طرح ہمیں دھرم، بولی، جاتی، علاقے اپنے نجی اور نسلی فائدے کے لیے پھاڑ دیا اور جی بھر کر استعمال کیا جس کے سبب وہ کئی صدیوں تک یہاں امن چین سے حکومت کرتا رہا۔ اس نے ہم ہندوستانیوں کے اندر قومی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیا، جس کے سبب ہم کبھی فرقہ وارانہ فسادات میں الجھے رہے اور کبھی لسانی جھگڑوں کو طول دیتے رہے۔ اس پوری چالاکی کا نتیجہ تب نکلا جب وہ بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بھارت کو چھوڑتے وقت اس عظیم ملک کو مذہب کی بنا پر تقسیم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا اور یہاں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ جلا گیا تاکہ ہم قومی ایکتا کا خواب نہ دیکھ سکیں۔

ایسے میں کئی سوالات اٹھتے ہیں۔ یہ حالات پیدا کیوں ہوئے؟ ان کو بدلنے میں صرف بھارت کے لوگوں کا ہاتھ تھا یا کسی بدیسی چال کے ہم مہرے بن گئے تھے؟ کیا ہمارے ادیبوں نے پنجابی قارئین کو ان دردناک واقعات سے بچنے کے لیے آگاہ کیا تھا یا نہیں؟ اس کا جواب شائد نفی میں دینا ہوگا۔

پہلی وجہ تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ پنجابی مزاج جذباتی زیادہ ہے جس کے سبب رومانی رجحان ہماری کہانی پر غالب تھا۔ پنجابی کہانی جوانی میں قدم رکھ رہی تھی اور اس کے بہت سے ادیب (موہن سنگھ سیکھوں، دگل، ستیارتھی، گوربخش سنگھ، نانک سنگھ، سجان سنگھ وغیرہ) بھی جوان تھے۔ موہن سنگھ ”نکی نکی واشنا“ کے زیر اثر تھا۔ سیکھوں کی بھی زیادہ تر کہانیاں رومان کا پتہ دینے والی تھیں۔ دگل صبح سویرے ہی پیپل پتوں کی علامت کے ذریعہ ”آئے نتیاں لوالے پتیاں“ کے سامنے بات نہ کی بس پیار کا اشارہ ہی کر رہا تھا۔ ستیارتھی لوک بان کے جادو میں مست کنگ پوش (کیسر دا پھل) کے ذریعے ایک کشمیری طوائف کی کہانی سناتا ہے۔ گوربخش سنگھ پیار کا پیغمبر جس نے عمر بھر محبت کے فلسفے کا پرچار کیا۔ سجان سنگھ اور نانک سنگھ بھی پیار محبت کے دکھ سکھ بیان کرتے رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ دگل جیسے کئی افسانہ نگار فن برائے فن کے متوالے تھے۔ کچھ مغربی ادیبوں کے زیر اثر کرتار سنگھ دگل نے اس اصول کو اپنایا تھا لیکن جلد ہی اس کے کھوکھلے پن کا علم ہو جانے پر اس نے لکھا تھا۔ ”فن برائے فن ایک پرانا قصہ ہے۔ فن زندگی کے لیے ہوتا ہے اور فن ہمیشہ ایک قسم کا پراپیگنڈہ کرتا ہے“۔ لیکن اگر قدرے غور سے دیکھا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ اس بیماری کے جراثیم بہت دیر تک دگل کی کہانی کے فن میں موجود رہے ہیں۔

نام: سوندر سنگھ اُپل
ولادت: ۸ر اپریل ۱۹۲۴ء
شغل: تدریس
تصانیف: پنجابی، انگریزی اور ہندی میں بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کڑی پوٹھوہار دی، ڈھیندے منارے بھرا بھراواں، مہکیں (افسانوی مجموعے)، لکشمن ریکھا (ناول)

Punjabi Short Story— Its Origin and Development

(پی ایچ ڈی کا مقالہ)

انعام و اعزاز: پنجابی ساہتیہ سمیکھشا بورڈ، جالندھر (۱۹۷۹ء)

پتہ: پشپ کلا، 26/ II ال، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۲۷

ہیئت پر زیادہ زور دینا تیسری وجہ تھی جس کے سبب پنجابی کہانی پنجابیوں کی زندگی کی تلخ حقیقتوں اور ان کی زندگی میں چھپی ہوئی بیماریوں سے بروقت آگاہ نہیں کر سکی۔ ہیئت پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ اس بات کی بہت ضرورت تھی کیونکہ پنجابی کہانی کے خد وخال ابھی متعین نہیں ہوئے تھے۔

چوتھی اور بڑی وجہ سماجی اور سیاسی شعور کی کمی ہے جو ہمارے زیادہ تر افسانہ نگاروں کے یہاں پائی جاتی تھی (گورمکھ سنگھ مسافر اور سکھوں مستثنات میں سے ہیں) اس لیے وہ پنجابیوں کو آنے والی قیامت سے بچنے کے لیے تیار ہی نہیں کر سکے۔ کرتار سنگھ دگل پنجاب پر آئی اس تباہی اور فسادوں کی آندھی کے بارے میں اپنے ردعمل یوں ظاہر کرتے ہیں: "ملک کی تقسیم کے وقت ہمارے اندر کا حیوان جیسے باہر آیا۔ جو کھیل ہمارے آزاد ہوئے لوگوں نے کھیلا، اسے دیکھ کر میرے اندر کا فن کار خوف زدہ ہو گیا مجھے اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ سب وہ قدریں جنہیں میں نے سینے سے لگا رکھا تھا، میرے ہاتھوں سے کھسکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کی تباہی مجھے ہمارے اندر کے انسان کی بہت بڑی شکست دکھائی دی۔ ہمارے فنکاروں، شاعروں، افسانہ نگاروں کی بےبسی پر مجھے انتہائی افسوس ہوا۔"

اس تقسیم اور فسادات نے پنجابیوں کے لیے مشکلات اور مسائل کا پٹارہ کھول دیا۔ پنجابیوں نے یہ سب مشکلات اپنے جسم و جان پر جھیلی ہیں۔ اس سے پنجابی کہانی بہت ہی متاثر ہوئی ہے۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۰ء کے بعد پنجابی کہانیوں کا بڑا موضوع ملک کی تقسیم اور اس سے پیدا مصائب ہی رہے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک سے پہلے حالات آزادی کے بعد کی پنجابی کہانی کے لیے بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان زمین کی تقسیم سے سیکڑوں مسئلے کھڑے ہو گئے۔ دھرم کے نام پر ہوئی غارت گری اور لوٹ مار پنجابی کہانی کا خاص موضوع رہے کرتار سنگھ دگل نے انسانیت (دڑائی نہیں) میں اس بات پر بہت تیکھا طنز کیا ہے کہ فسادات کے دنوں میں مذہب کے نشے میں بدمست متعصب بلوچی مسلمان سپاہی جو امرتسر کے عدت میں سے مسلمان مہاجروں کو نکال کر پاکستان پہنچانے کے لیے آئے ہوئے ہیں دوسرے دھرم کے لوگوں کو بےدردی سے مارنا ثواب سمجھتے ہیں۔ مگر ٹرک کے نیچے آنے والے جانوروں کو بچانا انسانیت کا تقاضا خیال کرتے ہیں۔ دگل نے یہاں اپنا نظریہ اور غصہ 'شاعرانہ انصاف' کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔ جلگاؤں کی حسینہ مہاجا نہیں تو یاد مہاجا نہیں مرا ۱۹۷۰ میں انجے ہندؤں کو مسلمانوں کے مکان جلاتے اور انہیں بےدردی سے قتل کرتے دکھایا ہے۔ ایسے بے وقوف لوگوں کے بارے میں وہ مزید لکھتا ہے، کیا اس میں مہاتما گاندھی کی ہار نہیں؟ کیا گاندھی نے اپنی جان بیکار نہیں گنوائی؟ اس طرح کے خون کے آنسو گربخش سنگھ نے "سبنہ تے سکینہ" میں بہائے ہیں۔ مہندر سنگھ سرنا کی کہانی "چھویاں دی رت" اس وقت کا دردناک اور خوفناک نظارہ پیش کرتی ہے۔

ایسے پُرآشوب دور میں ہزاروں عورتوں کی آبرو لوٹی گئی۔ نفسانی خواہشات میں اندھے لوگوں کو موضوع بنا کر لکھی گئی کہانیوں میں "ایک چھٹ چانن دی (ایک کرن روشنی کی)" مہندر سنگھ سرنا کی "لوہے والا دڑا یچ" کرتار سنگھ دگل کی "توں کھا" (تو کھا) "چڑیاں"، "پانچ ورہے لعد (پانچ برس بعد)"، "نواں آدمی (نیا آدمی)"، گورمکھ سنگھ مسافر کی "کھمان کھانے"، "چنگیاں مندیاں یاداں (اچھی بری یادیں)" مہوندر سنگھ اپل کی "نان بھیئن ناں" (نہیں بھائی نہیں)، سجان سنگھ کی "خوشی دا دن (خوشی کا دن)"، کلونت سنگھ ورک کی "کھیل"، لوچن بخشی کی "دھوڑ چرخاں دی"، رام سروپ انکھی کی "اپنے گھڑے کا پانی"، بوٹا سنگھ کی "رستے ناسور" شرنارتھیوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور نقل مکانی کے نتیجے میں پیدا شخصی مصائب، مالی مشکلات، معاشی بےبسی، تنگ نظری، اخلاقی گراوٹ، نفسانی خواہش کی تکمیل کے لیے بےبس عورتوں کا استحصال، انسان کی باطنی نیکی غرض کہ حالات و کوائف کے حسن و قبح کا بڑے موثر انداز میں احاطہ کرتی ہیں۔

تقسیم ملک سے وابستہ فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم کے بعد ملے اپنے ہم وطنوں کے بارے میں لکھی گئی کہانیوں سے متعدد فنکارانہ نتیجے نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس اہم اور دردناک واقعہ نے پنجابیوں کی روح اور شعور کو اتنا جھنجوڑا کہ پنجابی افسانہ نگار پندرہ بیس برس تک اس کی ٹیس اور درد نہیں بھول سکے۔ نتیجتاً یہ پندرہ بیس سال کی پنجابی کہانی کا سب سے اہم موضوع بنا رہا ہے۔ دوسرا نتیجہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ اس موضوع کے بارے میں زیادہ تر کہانیاں ان مغربی پنجاب سے بےگھر ہو کر آئے افسانہ نگاروں نے لکھی ہیں، جنھوں نے یہ سب مصائب اپنی جان پر جھیلے تھے۔ سرفہرست کرتار سنگھ دگل ہے۔ تیسری بات یہ ابھرتی ہے کہ سیکولر نظریہ کے سبب غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ انھوں نے جہاں مسلمان کرداروں کی باز پرس کی ہے وہاں ہندو اور سکھ کرداروں کو ملامت کا نشانہ بنایا ہے۔ چوتھا اور شاید سب سے اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اچانک افتاد نے کئی اعتبارات سے پنجابی کہانی کی شکل ہی تبدیل کر ڈالی۔ رومانس اور اصول پرستی کا اثر کم ہوا اور حقیقت پسندی و ترقی پسندی کا چلن عام ہونے لگا۔ ڈاکٹر نریندر سنگھ کے کہنے کے مطابق "تقسیم ملک کے سلسلے میں لکھی گئی پنجابی کہانیوں کی صداقت اور زمان و مکان میں پیوستگی اس معنی میں آج کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے درد نے کہانی کی داخلی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی اور اس نے بنے بنائے سانچے کو توڑ دیا تھا۔

آزادی سے پہلے کی کہانی ایک اور اعتبار سے بھی بعد میں لکھی جانے والی پنجابی کہانی کی بنیاد بنی ہے۔ ترقی پسندی کا چرچا آزادی سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا۔ روس کے انقلاب (۱۹۱۷ء) اور لینن کے پرچار سے ادیب مارکس واد سے اثر قبول کرنے لگے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسندوں کی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوئی تھی اس کے بعد ترقی پسندی کا اعلانیہ جاری کیا گیا تھا جو ادیبوں کے لیے تھا۔ سنت سنگھ سیکھوں کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سماچار" آزادی سے پہلے ۱۹۴۳ء میں چھپ چکا تھا جس کی کئی کہانیاں ترقی پسندی کے نظریہ کے تحت لکھی گئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کتاب کا دیباچہ سوہن سنگھ جوش نے لکھا تھا جو ترقی پسندی کے زبردست حامی تھے۔ اس دیباچے میں وہ اس وقت بھی سیکھوں کے ترقی پسند ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "ہر ایک ادیب اپنے فلسفہ کے دائرے میں رہ کر کوئی نہ کوئی پیغام دیتا ہے اس لیے ہمارے پاس ترقی پسند اور رجعت پسند ادیبوں کے لیے کسوٹی یہ ہے کہ اگر ادیب کا پیغام موجودہ طبقاتی سماج کو برقرار رکھنا یا اس میں معمولی سی ردّ و بدل کے ساتھ اسے درست کرنا ہے تو وہ رجعت پسند ادیب ہے لیکن اگر اس کا پیغام اس طبقاتی سماج کو لگے گھن کو آشکار کرتے اور اس کے آہستہ آہستہ ٹوٹنے اور پرانے سماج کی کوکھ سے نئے سماج کو پیدا ہونے کی بشارت دینا ہے تو وہ ترقی پسند ادیب ہے کیونکہ وہ موجودہ سماج سے مطمئن نہیں اور وہ اس میں تیزی سے بنیادی تبدیلیاں لانا چاہتا ہے۔

پروفیسر سنت سنگھ موجودہ طبقاتی سماج سے مطمئن نہیں اور اس میں بہت سی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ وہ اس سماج میں ہو رہی بے انصافیوں اور نابرابریوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور وہ اس احتجاج کو اپنے فن کی طاقت کے توسط سے الفاظ کا جامہ دے کر ادب کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور ہمیں اپنے ارادوں، تجربے اور جذبات کی لہر کا حصے دار بنا تا ہے ..... پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں سماج کی از سر نو تنظیم چاہتا ہے" (سماچار ص ۱۰-۱۱)

سنت سنگھ سیکھوں کی ترقی پسندی شروع ہی سے علمی قسم کی ہے۔ اس نے اس خصوصیت کی ہمیشہ اپنے اسلوب کے ذریعہ آبیاری کی ہے۔ اس نموضوع میں اس قسم کی کہانیاں ہیں: پاتال دا بندہ (پاتال کا بندہ)، "آس دا جنم" (امید کا جنم)، کیٹاں اندر کیٹ وغیرہ۔ "پاتال دا بندہ" کہانی کا ایک کردار کہتا ہے: "اس قسم کا راج بھی ہو سکتا ہے جس میں کوئی ساہوکار نہ ہو اور نہ کوئی زمیندار اور ہمارا کھانا پینا، تعلیم اور شادی کسی کا مقروض ہوئے بغیر ہو سکے۔" اسی طرح "آس دا جنم" میں ایک کردار یقین دلاتا ہے: "وہ خوفناک طاقت جو سینکڑوں پشتوں سے انھیں قسمت کے جیسی ہوئی تھی جس نے ان کا لہو اور چربی دونوں چوس لیے تھے، سوشلزم کے مقابلے میں ناکارہ ہو جائے گی۔

سیکھوں کی شعوری حقیقت پسندی کا خمیر مالوے کی دیہی زندگی سے اٹھا ہے جو وہاں پیدائش اور پرورش کے سبب اس کے جسم کے رواں رواں میں بسی ہوئی ہے۔ اس کے شعور کی تربیت مارکس واد کے زیر اثر ہوئی ہے اور وہ کارکنوں کو مجاہدوں کا مقام دیتا ہے (کامے تے یودھے) وچ نگھ مجاہد کے انتقال کو وہ ایک مجاہد کی موت کہتا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق دیہات کے دکاندار، ساہوکار اور شہروں کے آڑھتی جونکوں کی مانند کسانوں کا خون چوستے ہیں (نمک حرام) اس طرح وہ محنت کشوں کا ایک دانشمند وکیل سمجھا جاتا ہے۔

اس کی بہت سی کہانیاں حقیقت پسندی کے گرد گھومتی ہیں کیونکہ پیسے کی کمی ہی پریمی جوڑوں کی زندگی کو المیے میں تبدیل کر کے انہیں آپس میں لڑنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ (دیکھتا وا)

دوسرا طبقہ عورتوں کا ہے جو اس کی ہمدردی حاصل کر سکا ہے۔ اس کے نسوانی کردار قومی اور انقلابی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں (ایٹم بم ورودھ) اور وہ انھیں اقتصادی لحاظ سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے (کم کرچم ـ کام [illegible])

لیکن خواتین کے مسائل پر ترقی پسندانہ نظریہ سے جس ہمدردی اور شدت کے ساتھ کہانیاں سجان سنگھ نے لکھی ہیں، اس کی اور کوئی مثال پنجابی کہانی میں نہیں ملتی۔ عورت کی بری حالت کو دیکھ کر وہ خون کے آنسو بہاتے ہوئے کہتا ہے "کون جانے کس مصیبت کی ماری وہ طوائفیں بنتی ہیں۔ بہت ساری تو سماج کے مجبور کر دینے کے بعد ہی یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ روٹی کہاں سے کھائیں؟ اسکول کی استانیاں، نرس اور دائیاں بن کر بھی جب مردوں کی مہربانی سے انھیں یہ دھندا کرنا پڑتا ہے تو براہ راست وہ کام کر لینا ہی کھرا سودا ہے۔" "پچھان" (پہچان) کی ہیروئن خود کو بیسوا بننے سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے لیکن سماج کے ٹھیکیدار اسے ایسا نہیں کرنے دیتے۔ "رب دی موت" (خدا کی موت) کی رتیمو بڑی مشکل سے مل مالک سے اپنی آبرو بچاتی ہے۔ "ڈیڑھ آدمی" اس کی بیسوا کے مسئلے کے بارے میں سب سے عمدہ اور فنکارانہ کہانی ہے کیونکہ یہاں وہ جذباتی ہو کر نہیں بلکہ عالم بن کر خطیب کے طور پر بات کرتا ہے۔

وہ عورت کی تخلیقی قوت (عورت کی کرامات) صدق دلی (دہاں کوی، سورگ کی جھلک، خوشی دا دن) کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورت اس وقت تک سماجی تعمیر اور انسانی بہبود میں پورے طور پر معاون نہیں بن سکتی جب تک وہ اقتصادی طور پر پوری طرح آزاد نہیں۔ "تیاری"، "سوال جواب"، اور "نواں رنگ" (نیا رنگ) کتابوں کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں کچھ جذباتی نہیں ہے۔

اپنے ذاتی تجربات کو کہانی کی بنیاد بنانے

۱؎ ڈاکٹر نرنیدر سنگھ، کھوئی ہوئی خوشبو، کھوئی ہوئی خوشبو کی دستاویزات — ص ۹

کے سبب سجان سنگھ شروع ہی سے حقیقت پسند رہا ہے۔ "میریاں کہانیاں" (میری کہانیاں) میں آپ کوئی ایک جگہ زندگی کے ایسے حقائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اصلیت اور حقیقت پسندی کے فرق کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے ذاتی تجربے کی اصلیت کو ادب میں برتنے کے لیے فن اور تخیل کی مدد سے حقیقت پسندانہ بنا لیتا ہے۔

ترقی پسندانہ نظریہ اس نے مارکسزم کے مطالعہ کی روشنی میں بنایا ہے اور وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں ایملی برنز کی کتاب "وہٹ از مارکسزم" نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

آہستہ آہستہ وہ مارکسواد کا عقیدت مند افسانہ نگار بن گیا۔ "مہاتما کا ہیرو اگرچہ اصلی مہاتما (مہان آتما) نہیں بن سکا کیونکہ ابھی وہ جات پات کے چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ "مہانوی" کے ہیرو کو وہ عوام میں سے عوام کے لیے اور عوام کی آسان زبان میں لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس ترقی پسندانہ نظریہ کی بدولت سجان سنگھ اپنی کہانیوں میں سماج وادی حقیقت پسندی کا اظہار کر سکا ہے۔ سماج واد حقیقت پسندی اس بات کا مقتضیٰ ہے کہ ادبی دنیا کی عکاسی کے وقت طبقاتی جدوجہد کو اس طرح پیش کیا جائے کہ تعمیری طاقتوں کی حوصلہ افزائی ہو اور تخریبی طاقتوں کی حوصلہ شکنی اور بدنامی ہو۔ سجان سنگھ کی کہانی "پروہنا" (مہمان) اس لحاظ سے بہت کامیاب ہے کیونکہ یہاں اس نے سماجی حالات کے بارے میں اپنی عدم قبولیت کا اظہار کیا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے تیکھے طنز سے کام لیا ہے۔ اس کی دیگر کامیاب طنزیہ کہانیاں ہیں "گئو ماتا"، "رب دی موت"، "سکیاں بھیناں" (سگی بہنیں)، "شہر تے گراں" (شہر اور گاؤں)۔

ترقی پسند نظریہ کے تحت لکھنے والے دیگر افسانہ نگار ہیں سنتوکھ سنگھ دھیر، نوتیج سنگھ، دیویندر ستیارتھی، گورمکھ سنگھ جیت، جسونت سنگھ کنول اور گوردیال سنگھ۔ ایسے کہانی کار، ناول میں زیادہ چمکے ہیں، کہانی میں کم۔

لیکن اس رجحان کی چمک دمک پندرہ بیس برس میں ماند پڑ گئی۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ تھا کہ اس کے بڑے علمبردار (سیکھوں سجان سنگھ دھیر) اپنے فن کے کمال کو عروج تک پہنچ چکے تھے اور ان کی کہانی اب ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف چل پڑی تھی۔ سیکھوں اپنی کہانیوں کے مجموعے "تیسرا پہر" کے پیش لفظ میں لکھتا ہے۔ "مجھے یہ احساس ہو گیا ہے کہ میری کہانی ایک موڑ پر آ پہنچی ہے جہاں یا تو اسے آگے چلنا بند کر دینا چاہیئے یا کوئی بامعنی راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔"

ممکن ہے اسے غلط فہمی ہوئی ہو کہ "تیجا پہر" (تیسرا پہر) میں اس کی کہانی کے فن نے بامعنی سمت اختیار کر لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ بعد میں اسے اس ناکامی کا بخوبی احساس ہو گیا۔ اب اس نے کہانیاں لکھنی قریب قریب بند کر دی ہیں۔ ڈاکٹر عطر سنگھ کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ "سیکھوں کی کہانی کے فن کا اعلیٰ پڑاؤ پہلا تھا آخری نہیں"۔ یہی چیز سجان سنگھ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس کی کہانیوں کا آخری مجموعہ "شہر تے گراں" (خواہ اس کے لیے اسے نئی دہلی کی ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا ہے) فن کے لحاظ سے کمزور رہے۔ اسی طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنتوکھ سنگھ دھیر کی کہانی فن کے ترازو میں لٹکائی گئی ہے۔ اس طرح یہ ادیب خود ہی بوڑھے یا کمزور نہیں ہوئے، ان کی کہانی کا فن بھی کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اس رجحان کو بڑھاوا دینے والے ملکوں (روس اور چین) میں باہمی مخاصمت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

بعض ادیبوں کا انتقال یا روش کی تبدیلی بھی تیسرا سبب سمجھا جا سکتا ہے۔ گوربخش سنگھ اور نوتیج کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد "پریت لڑی" میں وہ چمک نہیں رہی۔ جسونت سنگھ کنول جیسے مارکسزم کے پختہ عقیدت مند ادیب نہ صرف اس میلان کو خیر باد کہہ چکے ہیں بلکہ اس کے شدید مخالف ہو گئے ہیں۔

اس رجحان کے زوال کا بڑا سبب اس کی داخلی تنگ نظری تھی۔ اس رجحان کو چلانے والے افسانہ نگار عام طور سے زندگی کے ایک ہی پہلو یعنی اقتصادیات کے بارے میں بات کرتے تھے بے شک اقتصادیات زندگی کا ایک بڑا پہلو ہے لیکن یہ پوری زندگی نہیں۔ زندگی کے دیگر لاتعداد پہلو ہیں جنہیں ترقی پسندانہ ڈھنگ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہندی ادیبوں نے جو ایسا کرنے کے لیے ایک نیا لفظ ترقی پذیر وضع کر لیا ہے۔ ترقی پسندی ایک معین حقیقت ہے اور مارکسی نظریات کی جانب اشارہ کرتی ہے لیکن ترقی پذیر لفظ ہمہ گیر ہے۔ ترقی پذیری کے لفظ کی تشکیل ہمہ گیر انسانی نظریہ سے ہوئی جب کہ ترقی پسندی مارکسزم کے نظریہ سے وابستہ ہے۔ ترقی پذیر ادب ہندوستانی سوچ اور روایات پر مبنی ہے اور انتہا پسندی کی قید سے دور ہے۔ پنجابی کا باشعور ناقد سنت سنگھ سیکھوں اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ "کسی ادیب کو واہ واہ کی عزت حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مارکسزم کا نظریہ اختیار کرے۔ پنجابی میں ترقی پذیر نظریہ کے تحت لکھنے والے افسانہ نگار کرتار سنگھ دگل، گورمکھ سنگھ مسافر، پروفیسر موہن سنگھ، کلونت سنگھ ورک، مہندر سنگھ سرنا، لوچن بخشی، سویندر سنگھ اپل، جسونت سنگھ وردی، اجیت کور وغیرہ ہیں۔

کہانی کو روپ یا شکل کے لحاظ سے دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ آزادی سے قبل لکھی گئی پنجابی کہانی اس اعتبار سے بھی بعد میں لکھی گئی کہانی کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے۔ چرن سنگھ شہید نے "ہسدے ہنجو" (۱۹۳۳) کے ذریعہ پنجابی افسانہ نگاروں کو مغربی کہانی کی جانب متوجہ ہونے کا بڑا دانشمندانہ مشورہ دیا تھا۔ اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کرتار سنگھ دگل نے سویر سار (۱۹۴۱) بیسل بیتیاں، کڑوی کہانی شائع کر دی گئی۔ پروفیسر موہن سنگھ نے نکی نکی واشنا

اور سنت سنگھ سیکھوں نے سماچار (۱۹۴۳) جیسی کتابیں ملکی تقسیم سے قبل ہی شائع کر دی تھیں۔
دگل کی پہلی کتاب "سویر سار" کی پہلی کہانی "وڈّھ وچ اک سویر" دگل کی اب تک کی عمدہ ترین کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پروفیسر موہن سنگھ کی کتاب "نکی نکی واشنا" (۱۹۴۲) کے دیباچے میں سنت سنگھ سیکھوں لکھتے ہیں کہ "موہن سنگھ کی ایک کہانی "پیر بخش" تو میں کہوں گا کہ چوٹی کی کہانی ہے - - - - - جو مشہور پنجابی اردو ادیب کرشن چندر کے مرتب کیے گئے نئے زاویے میں درج کی گئی ہے۔ دہلی اور لاہور دونوں جگہ اس کہانی کی بہت تعریف ہوئی ہے جس کے معنی میں نے تو یہ لیے ہیں کہ پنجابی کہانی کا مرتبہ موجودہ دیگر ہندوستانی زبانوں کی کہانیوں سے کم نہیں۔" سنت سنگھ سیکھوں کے کہانیوں کے پہلے مجموعے سماچار" (۱۹۴۳) کو تو پنجابی کہانی کی تاریخ میں وہ اہمیت حاصل ہے جو کسی وقت ورڈز ورتھ اور کالرج کے پہلے مشترکہ نظموں کے مجموعے لریکل بیلڈز Lyrical Ballads کو انگریزی نظم کی تاریخ میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کتاب کے آخر میں دیے گئے مختصر افسانے کے بارے میں ایک نوٹ نے پنجابی کے افسانہ نگاروں کو صحیح سمت عطا کی تھی۔ اس کتاب کی کچھ کہانیاں (پیمی دے نیانے - مڑ ودھوا) اب بھی سیکھوں کی عظیم کہانیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

اس کتاب "سماچار" میں سیکھوں نے نئے تجربے کیے، ساتھ ہی نئی کہانیوں کی نئے نئے تجربات کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس نے یہاں کلوز اپ کی فلمی تکنیک کو "کیناں اندر کیٹ"، "انوکھ سنگھ دی ووہٹی" اور "زنیا" نام کی کہانیوں میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ رپورتاژ کا تجربہ اس نے "پاتال دا بندہ" اور "آس دا جنم" عنوان کی کہانیوں میں کیا ہے۔ ایک کامیاب رپورتاژ جنت نظیر لکھتا ہے۔ لیکن پنجابی ادیبوں نے اس اسلوب میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ جن پنجابی کہانی کاروں نے کامیاب خاکے لکھے، ان میں دگل، دیوندر ستیارتھی، بلونت گارگی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شعور کی رو کا تجربہ کرتار سنگھ دگل، نوتیج سنگھ اور امرتا پریتم نے کیا ہے لیکن ان تینوں میں سے زیادہ کامیاب دگل ہی ہے۔

مضمون یا مقالہ کہانی کی شروعات پرنسپل تیجا سنگھ نے کی تھی جب اس نے "گنگا دین"، "شہر دا ندکا اور" پریتم سنگھ داشتا" جیسے کہانی نما مضمون لکھے تھے۔ اس کے بعد ایشور چتر کار، پیارا سنگھ داتا، دیوندر ستیارتھی، سنت سنگھ سیکھوں وغیرہ نے اس اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ کہانی پر ڈرامے کا اثر بڑھ جانے سے ڈرامائی (یک آواز) اسلوب کی حامل کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ فینٹسی کے تجربے میں جسونت سنگھ وردی سب سے آگے ہے۔ آج کل پنجابی میں منی کہانی لکھنے کا بہت رواج چل نکلا ہے ہر پنجابی اخبار میں ایک دو منی کہانیاں پڑھنے کے لیے مل جاتی ہیں۔ اس اسلوب میں طبع آزمائی کرنے والے ہیں کرتار سنگھ دگل، کھوبیندر سنگھ، روشن لال کھیلوی، اوم پرکاش گاجو، دلیپ سنگھ بھوپال، ترن ملکہ، انونت کور، کے۔ سنجیت وغیرہ۔ مہتاب الدین نے تو پنجابی کی منی کہانی کی کامیابیاں اور امکانات کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھ دی ہے۔

پہاڑی دامن کی زندگی کے بارے میں بھی آزادی سے پہلے لکھی گئی پنجابی کہانی آزادی کے بعد لکھی گئی کہانیوں کے لیے بنیاد اور سمت نما کا کام دیتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پنجابی میں ایسی بے شمار کہانیاں لکھی گئیں جن پر پوٹھوہاری کی چھاپ گہری ہے اس نوع کی کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگار ہیں موہن سنگھ، گورمکھ سنگھ مسافر، سوبیندر سنگھ اپّل، مہندر سنگھ سرنا، لوچن بخشی وغیرہ پنجابی کہانی کا ایک دوسرا حاوی رجحان مالوہ کی گہری چھاپ لیے ہوئے ہے سنت سنگھ سیکھوں اس رجحان کا نمائندہ افسانہ نگار رہے۔ جہاں پوٹھوہار کا دامن آزادی سے پہلے پنجابی کہانی پر غالب تھا اب وہ مقام مالوا کو نصیب ہو گیا ہے۔ سیکھوں کے علاوہ مالوے کے علاقے کے بارے میں لکھنے والے افسانہ نگار ہیں گوردیال سنگھ، گورچرن سنگھ بھلّر، ردیانا، بچنت کور، گلزار سنگھ سندھو اور انکھی وغیرہ۔

ترقی پسندی کے رجحان کے ساتھ عقلیت اور انسانی ہمدردی کا رجحان غالب رہا ہے اس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں پروفیسر موہن سنگھ کرتار سنگھ دگل وغیرہ ہیں اور ان کے بعد کلونت سنگھ ورک، مہندر سنگھ سرنا، سوبیندر سنگھ اپّل، لوچن بخشی، دیوندر ستیارتھی، اجنت کور، امرتا پریتم، جسونت سنگھ وردی، بوٹا سنگھ وغیرہ نے اس رجحان کے تحت کہانیاں لکھی ہیں۔ پنجابی کہانی میں کرتار سنگھ دگل عقلیت پرستی کا سب سے بڑا داعی ہے۔

دگل نے کہانی جیسے ملے جلے فن کے لیے ملا جلا اسلوب بھی تیار کیا ہے۔ یہی اس کی کہانی کے فن کا اصل راز ہے۔ اس کی کہانی میں نفسیاتی موضوع کا جوش، شاعرانہ اظہار کی نزاکت اور ڈرامائی کیفیت ملتی ہے۔ فرائڈ، لارنس اور موپساں کے زیر اثر اس نے پنجابی کہانی میں پہلی بار نفسانی خواہشات کا کھل کر اظہار کیا ہے جیسے کہ اردو میں منٹو کر رہا تھا۔ اس پر بھی فحش نگاری کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو پتہ لگے گا کہ ان کہانیوں میں نفس اور ہوس رالی موضوع نہیں بیان کا ذریعہ ہے۔

دگل اپنی کہانیوں کے لیے نہ صرف موضوعات ہی نفسیاتی منتخب کرتا ہے بلکہ انھیں پیش بھی نفسیاتی طریقۂ کار سے کرتا ہے۔ "کرامات" میں اس نے ماضی، حال اور مستقبل کو منطقی دلچسپی کے تحت جوڑ کر نئے معنی عطا کیے ہیں۔ وہ ہمیشہ نئے موضوعات پر توجہ مرکوز کرتا رہتا ہے۔ پنجابی کہانی میں سب سے زیادہ کامیاب تجربے کرتار سنگھ دگل نے کیے ہیں۔

اس نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا

ہے۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ اب دگل کی کہانی کا فن ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

گوربخش سنگھ اپنی عقلیت پرستی اور انسانیت پرستی ہمیشہ محبت کے موضوعات کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ محبت کا پیغام تھا۔ اس نے "پیار قبضہ نہیں پہچان ہے" کے فلسفے کا پرچار کیا ہے جو اس نے افلاطون کے خیالات سے متاثر ہو کر وضع کیا تھا۔

دگل کی مانند گوربخش سنگھ بھی نفسیاتی موضوعات منتخب کرتا ہے اور انھیں نفسیاتی نظریہ سے ہی نبھاتا ہے (کھال آتما، کیسری دی گڈی، مامولا)۔ گوربخش سنگھ اصول پرستی اور حقیقت پسندی کو ملا جلا کر پیش کرتا ہے۔ کانت Kant کا کہنا ہے کہ عقلیت کسی چیز میں نہیں بلکہ دیکھنے والی آنکھ میں پنہاں ہوتی ہے۔ "کہیرو دس نمبریا" میں ہیرو اپنی بیوی سمیت اس ڈاکو کے گھر میں رات بسر کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کے اندر پنہاں نفاست، شرافت اور فرض شناسی کو پہچان لیتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اتنے عظیم افسانہ نگار نے تکنیک کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

کلونت سنگھ ورک ایک اور ترقی پسند افسانہ نگار ہے جس نے دیہی اور شہری زندگی دونوں کے بارے میں کئی کامیاب کہانیاں لکھی ہیں۔

ورک ایک انسانیت ہمدرد ادیب ہے۔ اور سکھوں اس کی اس انسان دوستی کو ترقی پسندانہ انسانی ہمدردی کہتا ہے۔ (کھبل، "دھرتی ہیٹھلا بلد") کے ہیرو کے انسانی رویے کے ذریعہ مخلصانہ انسان دوستی سامنے آتی ہے۔ انسانیت کے جذبے کی کارفرمائی ہم دونوں قومی اور بین الاقوامی سطحوں پہ دیکھتے ہیں۔ اسی مخلصانہ انسان دوستی کے ذریعہ ہی وہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا افسانہ نگار بن جاتا ہے۔ اس نے دگل، چیخوف اور گورکی کے اثرات قبول کیے ہیں۔ اسی رجحان کے تحت نفسانی خواہشات کے بارے میں اس کی کامیاب کہانیاں ہیں۔

داخلی شعور اور سوجھ اور اسے موڑ دینے کی تکنیک اس کی کہانیوں کو گہرائی اور چمک عطا کرتی ہیں۔ پروفیسر موہن سنگھ کی طرح ورک نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ بھی لکھا ہے، عمدہ اور اچھا لکھا ہے۔

شعور اور انسان دوستی کے نظریہ کا ایک اور افسانہ نگار مہندر سنگھ سرنا ہے جو گزشتہ ۴۰ برس سے کہانیاں لکھ رہا ہے۔ وہ خود دگل، پروفیسر موہن سنگھ، راجندر سنگھ بیدی اور کرپال چندر سے متاثر ہونے کی بات کو قبول کرتا ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے: "اگر میری کہانیوں میں کوئی ازم نظر آجاتا ہے کہ وہ صرف انسان دوستی ہے۔ میں نے ہمیشہ سرمایہ داری نظام، مادہ پرستی کے نظریہ اور مہاجنی قدروں کی مذمت کی ہے۔ ہمیشہ ان لوگوں کے لیے لکھنا چاہا ہے جنھیں زندگی نے کچھ نہیں دیا۔"

سرنا کا ترقی پسندانہ نظریہ "میری بجی میری بجی" اور "جوالا مکھی" میں ملتا ہے۔ "پتھر دے (کے) آدمی" اور "سپنیاں دی سیما" (خوابوں کی سرحد) نفسانی خواہشات کی تفصیل سے متعلق ہوتے پر بھی فحش نگاری سے پاک ہیں۔ یہ ترقی پسندی اس کی فسادات سے متعلقہ کہانیوں (لوہے والا ورتیج، چھریاں دی رت) میں بھی قائم رہی ہے کیونکہ وہ غیر جانبداری جیسے وصف کو قائم رکھتا ہے اور جذباتیت جیسی کمزوری کو نزدیک نہیں آنے دیتا۔

سرنا ایک کامیاب نفسیاتی افسانہ نگار ہے۔ (پتھر دے آدمی، میں تے اوہ)۔ وہ جزئیات کا بادشاہ ہے۔ اس کی کہانیاں حشو و زوائد سے پاک صاف ہیں۔

دیویندر ستیارتھی ایک باشعور انسانی ہمدردی رکھنے والا افسانہ نگار ہے۔ ستیارتھی کا عوام کے ساتھ زیادہ تعلق اس وقت ہوا جب وہ لوک گیت اکٹھے کرنے کے لیے صوبے صوبے میں گھومتا رہتا۔ اس ذاتی تجربے کو جہاں اس نے اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا ہے وہاں مقامی مواد کا کھل کر استعمال بھی کیا ہے۔

اسی انسان دوستی کو شدت اور خلوص سے پیش کرنے والا ایک اور افسانہ نگار جسونت سنگھ وردی ہے۔ وہ "پرائی پیڑ" کو اپنا درد سمجھتا ہے۔ وہ "غم دا ساک" (غم کا رشتہ) بناتا ہے اور "سڑکاں دا درد" تلاش کرتا ہے۔ اپنے ترقی پسندانہ نظریہ کے سبب وہ عورت کو اقتصادی طور پر آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ (اپنی اپنی سیما) اور مرد کی جانب سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں سے آگاہ بھی ہے۔ (میں ایک پتی) اپنے منتخب کردہ نفسیاتی موضوعات کو وہ نفسیاتی نظریہ ہی سے پیش کرتا ہے۔

ہندی کی پیروی کرتے ہوئے ۱۹۷۰ء کے بعد پنجابی میں بھی شعور یا آگاہی پر مبنی کہانی لکھی جانے لگی۔ اس تکنیک یا اسلوب کی شروعات مہیپ سنگھ (اجالے دے الو) نے جو ہندی سے پنجابی کہانی کی جانب لوٹا۔ اس قسم کی کہانی لکھنے والے دیگر افسانہ نگار ہیں بوٹا سنگھ، سویندر سنگھ اُپّل، کرتار سنگھ دگل وغیرہ۔ لیکن اس قسم کی کہانی فیشن کی مانند آئی اور فیشن کی طرح ہی جلد آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

بڑی صنعتوں کی تعمیر اور ملک کی اقتصادی ترقی کے سبب چار بڑے شہر وجود میں آئے لیکن جن دو شہروں نے پنجابی زندگی اور پنجابی کہانی پر اثر ڈالا، وہ دہلی اور بمبئی ہیں۔ امرجیت سنگھ نے دہلی کے عظیم شہر ہونے کی زندگی کے بارے میں کہانیاں "کافی ہاؤس کے باہر کھڑا آدمی" کتاب میں لکھی ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق بے مقصدیت میں بھی کوئی مقصد ہوتا ہے۔ خالی رہ کر بھی شہری انسان اپنے آپ کو مصروف محسوس کرتا ہے۔ کچھ کر کے بھی کچھ نہیں کر رہا ہوتا۔ مہیپ سنگھ کی کہانی "موت دا دکا، اک دن" کا ہیرو ہر وقت موت سے ڈرتا ہے۔

پنجابی کہانی میں جدید احساس کا رنگ بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ اس میں سائنسی سوجھ کی ترقی اور مغربی طرز زندگی کا بہت حصہ ہے۔ روایتی خیالات کے مطابق بلی سو بھا درب تے ریڈیو۔ دگل، ریڈیو پر بنی بارش کے بارے میں پیشین گوئی کو کفر سمجھتی ہے۔

'اے سنڈے اِن یورڈم - دگل) کی ہیروئن اپنی کے پاس اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے. یہ رنگ پیش کرتی ہیں ورک کی کہانیاں "رس بھریاں' ' امبد دودھ تیرا"، "علی بابا نے قاسم ' وغیرہ — بیگانگی کا جذبہ دھیر کی کہانی سانجھی کندھ اور ورک کی کہانی "دودھ دا چھپر" میں تلاش کیا جاسکتا ہے. مہیپ سنگھ کی کہانی 'بلاٹنگ پیپر' کی ہیروئن مردوں کے فریب کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جیسے بلاٹنگ پیپر سیاہی جذب کر لیتا ہے. ڈاکٹر گوپال سنگھ کی غیر ملکی، ہیروئن کے مزاج میں بے قراری' عدم یقین اور عجلت بہت آجاتی ہے (سورج مشرق سے چڑھتا ہے)

اردو میں خواہ کرشن چندر، غلام عباس، عزیز احمد، ممتاز شیریں کئی افسانہ نگار کئی برسوں سے لمبی کہانی لکھ رہے تھے لیکن پنجابی میں طویل کہانی کے بارے میں تذکرہ رسالہ سنکیت کے خصوصی کہانی نمبر سے شروع ہوا اور اس کے بعد جگجیت سنگھ چھابڑہ نے طویل کہانیوں کا مجموعہ بھی ۱۹۶۵ء میں شائع کیا. پنجابی میں طویل کہانی لکھنے والے ہیں' دیویندر ستیارتھی گلزار سندھو، لوچن بخشی، راج گل، بوٹا سنگھ' گوردیال سنگھ، امرسنگھ، گورمکھ سنگھ جیت وغیرہ۔

ہندی میں کچھ برس غیر کہانی کا تذکرہ ہوا تھا. اس کا کچھ اثر پنجابی کہانی پر ہونا قدرتی امر تھا۔ کیونکہ پنجابی کے لیے آزادی سے قبل جو اہمیت اردو کہانی کو حاصل تھی وہ مقام اب ہندی کہانی لینے لگی تھی. اس کے کئی اسباب تھے. کچھ ادیب ایسے تھے جو ہندی اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے جیسے کہ دیویندر ستیارتھی۔ ہندی کہانی کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا جس کے سبب وہ کئی زبانوں کے لیے مشعل راہ بنی۔ اردو میں غیر کہانی کی شروعات کرشن چندر نے پہلے ہی کر دی تھی جس کا کچھ اثر سکھوں نے اپنی کتابوں 'آدھی واٹ' اور 'تیجا پیر' کی کہانیوں میں قبول کیا ہے. پنجاب کے کچھ افسانہ نگاروں نے غیر کہانی کے بارے میں ایک نیا اسلوب بیان تیار کیا ہے جسے بکھرا اسلوب کہا جاتا ہے. اس اسلوب کو استعمال کرتے ہیں ترسیم نیلگری کیول سود وغیرہ. ہاں ان سب کا سردار دیویندر ستیارتھی ہے. لیکن پنجابی میں کہانی کا یہ ڈھنگ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

آج کل کہانی لکھنے کا ایک رجحان بین الریاستی اور بین الاقوامی بہت زور پکڑ رہا ہے کیونکہ آمد و رفت کے ذرائع بڑھ جانے کے سبب لوگوں کا زندگی کے بارے میں نظریہ بہت وسیع ہو رہا ہے. جب دیویندر ستیارتھی نے لوک گیت اکٹھے کرنے کی غرض سے اپنے الگ الگ صوبوں کے تاثرات کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا تو اس کی کہانیوں میں الگ الگ صوبوں (کشمیر، آندھرا پردیش، بنگال، اترپردیش، بہار) کے کرداروں اور زندگی کے واقعات کا ذکر آیا۔ اس طرح کی بین الصوبائیت سجان سنگھ، گورمکھ سنگھ جیت، ہربخش ہنس پال، ترپندر سنگھ رتن وغیرہ کی کہانیوں میں ملتا ہے. لیکن ان میں سے گورمکھ سنگھ جیت اس پہلو سے آگاہ ہو کر لکھتا ہے. اس کے کہنے کے مطابق "اس کے کردار پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے ذاتی تجربے کا حصہ ہیں۔ اس طرح کی کہانیاں ثقافتی یکجہتی کے حصول میں معاون ہوتی ہیں۔

کچھ افسانہ نگار غیر ملکی کردار، غیر ملکی ثقافت اور غیر ملکی مسائل بھی کہانیوں میں لاتے ہیں. اس لیے ان کی کہانیوں میں بین الاقوامی رنگ جھلکتا ہے۔ اس قسم کے افسانہ نگار ہیں' گوربخش سنگھ، نوتیج سنگھ، سویندر سنگھ اپل، کرتار سنگھ دگل وغیرہ. لیکن پنجابی کے غیر ملکوں میں جا بسے کہانی لکھنے والوں نے اس رنگ کو گہرا کرنے میں بہت حصہ ادا کیا ہے۔ "سات سمندر پار" ڈاکٹر مہیندر ڈھینگڑا کا مرتب کیا ہوا کہانیوں کا وہ مجموعہ ہے جس میں صرف غیر ملکوں میں آباد افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے، "غیر ملکوں میں آباد پنجابی ادیبوں نے بھارت اور ایشیا اور انگلینڈ و کینیڈا آگئے غیر ملکیوں کو ہی اپنی کہانیوں کا خاص مرکزی کردار بنایا ہے. یہ ادیب وہاں جا بسے لوگوں کی زندگی کے تضاد اور مسائل کو محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کے خاص کہانی لکھنے والے ہیں' امرجیت چاہل، اوتار سنگھ صادق، این. براڑ، اقبال ارپن، سورن چندن، ساتھی لدھیانوی، سریندر دہلوی، شوچرن گل، ہرجیت اٹھوال، گورنام گل، جگجیت براڑ، درشن سنگھ دھیر، ترسیم سنگھ نیلگری، پریتم سدھو، مختار سنگھ، رگھبیر ڈھنڈ، رویندر روی، کیلاش پوری وغیرہ۔ "واگھ کے پار" پنجابی کے افسانہ نگاروں کی چیدہ چیدہ کہانیاں اکٹھی کی گئی ہیں۔

پنجابی کہانی کو خواتین افسانہ نگاروں کی بھی بہت دین ہے۔ آزادی سے پہلے امرتا پریتم اور پربھ جوت ہی کہانیاں لکھ رہی تھیں لیکن آزادی کے بعد خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد بڑھنے لگی. ان افسانہ نگاروں نے خواتین کے ذہن کو عورت کی نظر سے پیش کیا ہے. خواتین سے ہوئی بے انصافیوں کے بارے میں امرتا پریتم نے بہت کہانیاں لکھی ہیں. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفسانی خواہشات کے بارے میں بے خوف ہو کر لکھنے کی ترغیب امرتا پریتم نے عصمت چغتائی (دلی) سے حاصل کی۔ چنانچہ ہم اسے اس اعتبار سے اس رجحان کی داغ بیل ڈالنے والی کہہ سکتے ہیں. اس کی راہ پر چلتے ہوئے اجیت کور، چندن نیگی، بچنت کور، وغیرہ کئی خواتین افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر کھل کر کہانیاں لکھیں۔ امرتا پریتم کی کہانی کے فن کی دو خاص خوبیاں ہیں' نفسیاتی تجزیہ، فنکارانہ تمسخر، الفاظ کی تزئین، جذباتیت، شاعرانہ انداز وغیرہ.

پربھ جوت نے امرتا کا اثر بالکل قبول نہیں کیا. وہ صرف جذبات کے زیر اثر کہانی نہیں لکھتی. یکسوئی ہونے کے سبب اس کی عالمانہ پختگی، فنکارانہ سوجھ بوجھ، اور خیالات کی گہرائی اسے اس پھسلن سے بچائے رکھتے ہیں. وہ دلیل کی بنا پر بات کرتی ہے۔ "امن دے ناں تے" اور "زندگی دے کچھ پل" کی کہانیوں میں شاعرانہ

رنگ بھی ملتا ہے اور جدید حسیت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

دلیپ کور ٹوانہ نے بہت تیزی سے کہانیاں لکھیں۔ جلد بازی اور جذباتیت نے اس کی کہانیوں میں کمزوری کا پہلو داخل کیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تجربے کو تجربے کی شکل میں ہی پیش کرتی ہے، اسے عام احساس کا رنگ نہیں دیتی۔ اس کی کہانیاں عورت کے المناک مسائل تک محدود رہتی ہیں اور اس کا زندگی کے تئیں نظریہ یاسیت سے بھرپور ہے۔ اپنے علاقے کی بولی میں لکھے موزوں مکالمے اور لوک گیت ہی اس کی کامیابیاں ہیں۔

امرتا پریتم کی حقیقی مرید اجیت کور ہے، جس نے زندگی اور ادب کے بارے میں ترغیب امرتا سے حاصل کی ہے۔ نفسانی خواہشات کا بیان اس کی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ہربھجن سنگھ لکھتے ہیں: "تمہاری تحریریں انسانی روپ عورت اور ادبی روپ کہانی دونوں کو لگاتار یکجا کرتی گئی ہیں ...... تمھاری تحریروں میں بار بار ایک ہی عورت کی ایک ہی کہانی کا بیان ہے ...... جدید دور میں لکھی تمھاری کہانیاں دورِ وسطیٰ کی کی بجی کبھی ایک سے زیادہ بیویوں اور ایک سے زیادہ شوہروں کی روایت سے آگاہی کے ساتھ اپنا کام چلائے جارہی ہیں ...... تمھاری عورت اور تمھاری کہانی کا سفر مادہ سے مادہ تک کا ہے (اک خط تیرے ناں)

کلونت سنگھ ورک کا یہ خیال درست ہے کہ بیباکی سے جنسی بھوک کا بیان کرنے کی دلیری نے اس کے کہانی کے فن کی دیگر جداگانہ خوبیوں کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے (سنمان تے سمیکھیا) اس کا اس قسم کا ادب بکتا ہے اور تذکروں کا موضوع بھی بنتا ہے۔ لیکن فروخت، شہرت اور مقبولیت فن کی عمدگی کی دلیل نہیں ہیں۔

پھر بھی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ موجودہ دور کی خواتین پنجابی افسانہ نگاروں میں وہ سب سے آگے ہی ہے۔

اور اسے شہرت بھی حاصل ہے اس کی کہانی کے فن کی ایک بنیادی خوبی طنز ہے جو پختگی ناکامی سے پیدا شدہ جھنجھلاہٹ اور طنز بہ تمسخر سے حاصل ہوئی ہے۔ اس قسم کا طنز بت شکن، موت علی بابے دی، نیوبیٹر، طوطا چشم، داد دین والے وغیرہ کہانیوں میں ملتا ہے۔

دلکش انداز بیان، تضاد اور ٹکراؤ کی تکنیک کا مناسب استعمال، اچھے بیان سے جلد حاصل کردہ حمایت، موزوں اور مناسب سوال و جواب، اشارات اور علامات کا استعمال، بجھے الفاظ کو آتش گیر کرنے کی جانچ (امرتا) پنجابی بولی پر مکمل گرفت اور تیکھا طنز وغیرہ اس کے فن کی منجملہ خوبیاں اور خصوصیات ہیں۔

مذکورہ بالا بالتفصیل تذکرے میں سے کچھ دلچسپ نتائج بھی نکلتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ آزادی سے پہلے کی پنجابی کہانی کافی دیر تک چلتی رہی دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آزادی کے وقت چلی فرقہ وارانہ آندھی نے دس پندرہ برس پنجابی کہانی کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ لوگوں نے آزادی سے پہلے آزادی کے جو رنگین سپنے دیکھتے تھے وہ آزادی کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد پنجابیوں کو معدوم ہوتے دکھائی دیے۔ خاص طور پر مغربی پنجاب سے اجڑ کر آئے افسانہ نگاروں کو اپنے وجود اپنی روزی روٹی اور اپنے جگہ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ اس مصیبت اور دلی کرب سے بچانے والا کوئی رجحان تھا تو وہ ترقی پسندی یا ترقی پسندانہ سوچ تھی۔ یہ رجحان اگلے دس برس میں زور پکڑتا گیا اور اس نے پنجابیوں کو جذباتی طور پر لڑکھڑانے سے بچالیا۔ اس سے آگے یہ تبدیلی نظر آئی کہ پنجابی کہانی نے رومانی، اصول پرستی کے رجحان کو ترک کرکے حقیقت پسندی کے راستے کی جانب منہ موڑ لیا۔ پنجابی کے قریب قریب سبھی افسانہ نگار ان بیس برسوں میں منظر پر آئے ہیں۔ قبل از آزادی کی کہانی ایک ایسی بنیاد بنی جس پر ان بیس برسوں کی کہانی عمارت کی طرح تعمیر ہوتی چلی گئی۔ پھر اس نے تعمیر شدہ عمارت پر اور منزلیں تعمیر کرنے کے لیے پنجابی کہانی کے افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمارا سب سے اہم اور سنہری دور یہی ہے۔

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب)

بقیہ: بوا

پتر! یہ صورتیں کوئی نت روز ملتی ہیں؟" اور پھر میرا چہرہ چومنے لگی۔

میرے کان بوا کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ مگر دھیان دروازے کی طرف تھا۔

بھابی آگئی اور میں نے رب کا لاکھ لاکھ شکر کیا۔ خالی کٹورا اس کے ہاتھ میں تھا۔

اور ساس کو بڑے مایوس لہجے میں کہنے لگی۔ —"ان کی تو آج بچھڑی دودھ پی گئی ہے۔"

سنتے ہوئے بوا بے تحاشا بول پڑی —"بس لگ گئی آگ اب سارے گاؤں کو۔" لعنت ہو ایسے دودھ پر جسے کتے بھی قبول نہیں کرتے، آج اس کا کال پڑ گیا ہے۔ بیٹا کہے گا، اچھے گھر آیا ہوں جہاں دودھ کا چھینٹا تک نہیں۔

اور وہ شرمساری سی شفقت بھرے انداز میں میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی —"تو بیٹا، بھوکا ہی سوئے گا اب؟ ہائے ماں صدقے! افسوس ہے مجھے۔

مگر میں نیچے گرے ہوئے دودھ کی طرف دیکھتا ہوا، دل میں کہنے لگا —"بھلا ہوا میرا چرخہ ٹوٹا، جان عذابوں چھوٹی۔ ●●

(ترجمہ: نریندر شیل)

غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

ستیندر سنگھ نور

۱۹۶۵ء کے بعد پنجابی کہانی

۱۹۶۵ء تک پنجابی کہانی کی ترقی میں ان پنجابی کہانی لکھنے والوں کا ذکر زیادہ رہا، جو کئی برس پہلے تسلیم کیے جا چکے تھے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے کہانی لکھنے والے تھے جو ۱۹۴۷ء کی پنجاب کی تقسیم سے پہلے افسانہ نویس مانے جا چکے تھے جنہوں نے جدید دور کی پنجابی کہانی کے چہرے کو سنوارا تھا۔ اُن کہانی لکھنے والوں میں سجان سنگھ، سنت سنگھ سیکھوں، کرتار سنگھ دُگّل کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ سنت سنگھ سیکھوں اور سجان سنگھ نے حقیقت پسندانہ اور سماج وادی نظریہ پنجابی کہانی میں خاص طور پر شامل کر دیا تھا۔ بے شک اُنہوں نے ہم عصر انسان کی نفسیاتی اُلجھنوں کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا تھا، لیکن نفسیاتی مسئلوں کو خاص طور پر کرتار سنگھ دُگّل نے اپنی کہانیوں کی بنیاد بنایا۔ ترقی پسندی کی لہر کے سامنے آ جانے سے ان کہانی لکھنے والوں میں ایک حدِ فاصل کھنچ گئی۔ سنت سنگھ سیکھوں اور سجان سنگھ مارکسی نظریہ سے ترقی پسندی کی تحریک کے ساتھ تھے۔ کرتار سنگھ دُگّل اس شکل میں مارکسی نظریے کے حامی نہیں تھے۔ اسی لیے کچھ ناقدوں نے فن برائے فن کا لیبل بھی لگایا یا اُسے حقیقت پسند کہانی لکھے جانے کی بجائے ترقی پسند افسانہ نویس بھی کہا۔ ۱۹۶۵ء تک اور بہت سے کہانی لکھنے والے بھی منظرِ عام پر آ گئے، لیکن یہ خاص کہانی کار رنگا رنگ پنجابی کہانی کے آسمان پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو فرق پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ سنت سنگھ سیکھوں اور سجان سنگھ اس دور میں گنتی کی کہانیاں لکھنے والے کہانی کار رہے اور کرتار سنگھ دُگّل نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی گزشتہ بیس پچیس برسوں میں سیکڑوں کہانیاں لکھیں۔ اور اُن کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اس دوران دُگّل نے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ اس کا فن برائے فن یا صرف ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی حقیقت سے ہے۔ وہ کہانی کے فنی پہلوؤں سے ضرور آگاہ رہتا ہے۔

۱۹۶۵ء کے آتے آتے پنجابی کہانی اس قسم کی اصول پرستانہ اور نا قدانہ بحث کو پار کر چکی تھی اور ان پرانے کہانی لکھنے والوں کے ساتھ کئی نئے کہانی لکھنے والے بھی آ ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ پنجابی کہانی کے کئی اور میلان اور رجحان سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں کرتار سنگھ دُگّل کی کہانیوں کا مجموعہ ہے "جیسے ساتھی حال سدا نہیں" شائع ہوا۔ ہم اس مجموعے میں ہم اس کے فنِ افسانہ میں ایک نیا موڑ دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد اُس کی کہانیوں کے اور مجموعے شائع ہوئے: "ماجھا نہیں مویا" "سونار بنگلہ" "پیار بے میر" "ڈھوریا ہو یا لوہا" "اقراراں والی رات" "ویسا آدمی" ظاہر ہے کہ کرتار سنگھ دُگّل مسلسل کہانیاں لکھنے میں مصروف ہے۔ اس دور میں اُس نے جو کہانیاں لکھی ہیں، اُن میں نفسیاتی رجحان کی جبلت کی کہانیاں ہیں، لیکن اُس کی متعدد کہانیاں قوم پرستی کے نظریہ سے متعلق ہیں۔ خاص طور پر "جیسے ساتھی والے سدا نت" یا سونار بنگلہ کی کہانیاں۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے سامنے ایسی مشکلات آئی ہیں جنہوں نے ملک کی یکجہتی اور قومی ایکتا کے عہد کے لیے ایک چیلنج پیش کیا۔ اس شکل میں کرتار سنگھ دُگّل نے دیگر انسانی مسائل کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کے نظریہ کو اُبھارا۔ اس دور میں اس قوم پرستی کے نظریہ اور ترقی پسندی کے مابین ایک تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۸ء تک کے عرصے میں بھی دُگّل ایک منکردہ افسانہ نویس کے طور پر فعال اور معتبر معلوم ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد ۱۹۶۵ء کے برس تک جو دیگر افسانہ نویس اپنی شناخت قائم کر چکے تھے، اُن میں ایک اور خاص نام کلونت سنگھ ورک کا ہے — ۱۹۶۵ء کے بعد اس کا مقبول مجموعہ "نویں لوک" شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اُس کی کہانی کا اسلوب

کم و بیش وہی تھا جو اُس کے ۱۹۶۵ء کے پہلے کے مجموعے "چھاہ ویلا" "دھرتی تے آکاش" یا "توڑی دی پنڈ" میں ہم دیکھ چکے ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد وہ کچھ گنتی کی کہانیاں ہی لکھ سکا۔ اور اُس نے جن کہانیوں کی بنا پر اپنی جداگانہ حیثیت قائم کی تھی، ۱۹۶۵ء کے بعد بھی وہی تذکرے کا موضوع رہیں۔ ورک ایسا کہانی لکھنے والا تھا جو اس بحث مباحثہ میں نہیں پڑتا تھا کہ کہانی کتنی ترقی پسندانہ ہو، کتنی اصلاح پسندانہ ہو یا انقلابی ہو۔ وہ تو انسان کے کچھ انتہائی لطیف اور انوکھے واقعات کا انتخاب کرتا تھا اور ان کی نفسیاتی بنیادوں کو واضح کرتا تھا۔ اُس کے کردار تھکے ہارے نہیں ہوئے بلکہ زندگی بہادری کے ساتھ بسر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح ورک اپنی کہانیوں میں حقیقت پسندی کو اور کہانی کے فن کو مکمل شکل میں پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اُس نے کہانی کی شکل کو زیادہ پھیلایا نہیں بلکہ سادگی اور اختصار سے لکھا اور بہت موثر طور پر لکھا۔

اس سے پہلے تسلیم کیے جا چکے کہانی لکھنے والوں میں سے ۱۹۷۰ء میں دلیپ سنگھ رستیبار تھی کی کہانیوں کا مجموعہ "پیرس دا آدمی" شائع ہوا جو کئی اسباب سے تذکرے کا موضوع بنا۔ ستیبارتھی نے اس مجموعے کے شروع میں اپنی کہانی کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اپنی لمبی کتھا کے سفر میں میں نے کئی بار کہانی لکھنے والوں کو آندھی کی مانند اُبھرتے اور بگولے کی مانند جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ آزادی کے بعد بہت کم ادیب سامنے آئے جنھوں نے طبع زاد لکھنے کی مصیبت مول لی۔"

ستیبارتھی نے یہاں طبع زاد تخلیق کا جو سوال اٹھایا ہے وہ قابلِ غور ہے، جہاں تک سماجی موضوعات کا سوال ہے، گزشتہ کہانی لکھنے والوں میں وہ بہت قریب قریب تھے کیوں کہ ان کی سوچ کا ذریعہ ہمعصر انسان کی حقیقت حال تھی اور بیشتر کہانی لکھنے والوں نے کہانی کی جس شکل اور فن کو اپنایا تھا، اُس میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ چاہے کہانی لکھنے والے کا تعلق نقل Imitation سے ہو یا اصلیت سے یا پرچھائیں سے وہ سماجی واقعات کو اسی شکل میں پیش کرنے کے اصول کے قریب قریب تھے۔ اسی لیے کہانی تکنیک کے لحاظ سے بھی بندھی ٹکی شکل میں پیش ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس تکنیک میں سرجیت سنگھ سیٹھی یا کچھ اور افسانہ نویسوں نے تجربے بھی کیے۔ تاہم بات شعور کی رو سے Stream of Consciousness آگے نہیں بڑھ سکی۔ ستیارتھی نے ۱۹۷۰ء میں "طبع زاد" کا نام دیا تھا۔ اس کا تعلق کہانی کی مکمل نئی ساخت Structure سے تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے "پیرس دا آدمی" میں اس روایتی طریقے کو نہیں اپنایا جو اُس نے اپنی پہلی کہانیوں میں اپنایا تھا۔ اُس نے ان کہانیوں میں ایک نیا طریقہ اپنایا۔ جس میں اُس نے کہانی کی مروج تکنیک کو توڑ دیا۔ کسی سوریلسٹ تصویر کی مانند اس کی کہانی ٹیڑھے عکسوں اور استعاروں کے ذریعے بات کرتی دکھائی دی۔ اس کی زبان بدل گئی۔ واقعات میں ترتیب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس نے اس طرز پر جو کہانیاں لکھیں اُس میں "راون دا دسواں سر"، "مہوا" "کنچن ماٹی سمجھان کتھا" خاص طور پر تذکروں کا موضوع بنیں۔ ستیارتھی کی ان کہانیوں میں صرف استعارے اور علامتیں ہی نہیں تھیں جنھوں نے ان کہانیوں کی زبان کو تبدیل کر دیا بلکہ ان کہانیوں میں پورانوں کے حوالے بھی گہری طرح سموئے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ کہانیاں مشکل ہو گئیں۔ ستیبارتھی نے اس کے بعد بھی اسی نئی تکنیک کو اپنائے رکھا ہے۔ لیکن اس تکنیک میں ان کی جس کہانی کا سب سے زیادہ چرچا ہے وہ "راون کا دسواں سر" ہی ہے۔ اس کہانی کے بارے میں پنجابی کے ایک ماہنامے میں کہا گیا ہے:

"اس کہانی کو سمجھنے کے لیے گیارہواں سر چاہیے۔ جس کہانی کو لکھنے کے لیے افسانہ نگار نے گیارہ سو اکیس دن اور بائیس سو بیالیس راتیں، نو سو ننانوے چہروں کی چھان بین کی ہو۔ گہرے حوالوں کی بال کی کھال اُتاری ہو، اُس کو کون سا مائی کا لال پندرہ منٹ میں پڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔"

لیکن ان کہانیوں نے ہمعصر پنجابی کہانیوں کے اُس دور کو سامنے لا دیا ہے جس میں مشکل اور نئے تجربات کی حالت پیدا ہوئی اور کہانی ان نئے طریقوں کے سبب پہلے جیسی آسان نہیں رہی۔

۱۹۶۵ء کے بعد جو پنجابی کہانی سامنے آئی ہے وہ ایک جیسے اصولوں یا ایک جیسی تکنیک سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ کئی اقسام کی پنجابی کہانی سامنے آئی ہے۔ اس کے بعد کا دور یکساں پنجابی کہانی کا دور ہے خواہ ساتھ ساتھ کئی نئی تکنیکوں سے بھی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد پنجابی کہانی میں جس نام کا سب سے زیادہ چرچا ہے۔ وہ اجیت کور ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اُس کی کہانیوں کا مجموعہ "مہک دی موت" شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کی کہانیوں کے مجموعے "فالتو عورت" "موت علی بابا دی" منظرِ عام پر آئے۔ اس دور میں اور کئی افسانہ نگاروں کے مجموعے بھی شائع ہوئے، جن میں امرتا پریتم اور کلیپ کور گوانہ جیسے تسلیم شدہ نام بھی شامل ہیں اور ۱۹۶۵ء کے بعد کے پنجابی افسانہ نگاروں میں شرن مکڑ، چندن نیگی، بچنت کور، بھگونت کور، جسونت کور ڈھلوں راجندر کور وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اپنی کہانیوں کی ادائیگی اور موثر زبان کے سبب اور اس لیے بھی کہ اُس نے عورت اور مرد کے باہمی رشتوں کے صرف نفسیاتی مسائل کو ہی نہیں پیش کیا بلکہ ان رشتوں کا مجموعی سماجی تعمیر سے کتنا تعلق ہے، اُسے بار بار اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کی کہانیوں میں ایک موضوع بار بار اُبھرتا ہے کہ کس طرح ہمارے متوسط طبقہ یا اعلیٰ متوسط طبقہ میں مرد عورت کو فالتو سمجھتا ہے۔ اُس کا گھر میں بیوی سے تعلق ہے تو باہر

کسی دوسری عورت سے یا عورتوں سے ۔ جب باہر والی عورت کے ساتھ تعلقات خوش گوار رہتے ہیں وہ اُسے استعمال کرتا ہے اور جب تعلقات خوش گوار نہیں رہتے تو اُسے صرف ایک چیز کی مانند فالتو سمجھ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے ۔ اور وہ عورت اس انتظار میں رہتی ہے کہ کب اُس مرد کے اندر محبت کو تلاش کر سکے ۔ وہ اپنی حالت سے آگاہ بھی ہوتی ہے لیکن مرد سے زیادہ جذباتی ہونے کے سبب اُس میں گرتی چلی جاتی ہے ۔ اجیت کور کی یہ عورتیں آخر میں بغاوت بھی کرتی ہیں ، لیکن پوری کہانی میں اس درد کو برداشت بھی کرتی ہیں ۔ اجیت کور ان تمام سختیوں کو نڈر ہو کر بیان کرتی ہے ، لیکن یہ کہانیاں صرف بیان تک ہی محدود نہیں بلکہ مرد کے بالادستی والے پنجابی سماج پر ایک تیکھا طنز بھی ہیں ۔ اُس کی کہانیاں : "فالتو عورت" "ایک اور فالتو عورت" "ہاف واٹر لیتھل" ایسی ہی کہانیاں ہیں ، لیکن اجیت کور صرف ایسی ہی کہانیوں کی خالق نہیں ۔ اُس کی کہانیوں کا مجموعہ "موت علی بابا دی" جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ۔ کچھ کہانیاں بالکل الگ قسم کی ہیں ۔ "موت علی بابے دی" ہماری سماجک بدعنوانیوں کو بے نقاب کرتی ہے جس میں گھرا ہوا عام انسان خودکشی کر لیتا ہے ۔ جس کا اس سماجی واقتصادی زندگی میں کوئی وجود نہیں ۔ اس طرح کہانی "نہیں ہمیں کوئی تکلیف نہیں" مزدور طبقے کی کہانی ہے جس کا اب بھی سرمایہ دار طبقہ لگاتار استعمال کر رہا ہے ۔ ——— اس طرح ان کہانیوں میں آ کر اجیت کور ہمارے سماج میں چل رہی جدوجہد کو بھی اپنا موضوع بنا لیتی ہے کئی جگہ وہ ایسے بہاؤ میں نظر آتی ہے کہ سیدھے قارئین سے مخاطب ہو جاتی ہے ۔ اس طرح وہ ترقی پسند کہانی کے رجحان کو اپنا کر "موت علی بابے دی" کے مجموعے میں ایک نیا موڑ کاٹتی ہے ۔ لیکن سب کہانیوں میں آسان طریقے کو نہیں اپناتی ۔ بلکہ سخت مشکل تکنیک کا استعمال کرتی ہے ۔ کہانیوں کے مجموعے "موت علی بابے دی" میں اُس کی کہانی "کالے مفہ" اس نظریہ سے نہایت موثر کہانی ہے ۔ جس میں ایک جنگلی دلدل میں سے اندھیری رات کے وقت ایک بھینسا کھینچا جا رہا ہے ۔ کھینچنے والے بھی اندھے ہیں ۔ وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہے اور خوف چاروں طرف پھیلا ہوا ہے ۔ اس کہانی کو اجیت کور نے جس مہارت سے بیان کیا ہے ویسی کہانیاں اس دور میں کم ہی لکھی گئی ہیں ۔ اس کہانی کے بہت گہرے سماجی اور سیاسی اثرات پیدا ہوتے ہیں اور اس کہانی کی تکنیک بھی حقیقت پسندانہ کہانی سے بالکل مختلف ہے ۔

۱۹۶۵ء کے بعد کی پنجابی کہانی کے ترقی کے سفر کو ہم مندرجہ بالا سطور میں یکساں ترقی کہہ چکے ہیں ۔ خواہ ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ کئی رجحانات ترقی کرتے رہے ہیں ۔ لیکن ۱۹۶۵ء سے پہلے سنت سنگھ سیکھوں اور سجان سنگھ نے پنجابی کہانی کو جس طرح ترقی پسند لائنوں اور مارکس وادی نظریہ کے ساتھ جوڑا تھا ۔ اُس کی ترقی ۱۹۶۵ء کے بعد بھی اور بہت سے افسانہ نگاروں میں ہوئی ہے ۔ یہ بات تو اس دور کے سب کہانی لکھنے والوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ اُس کے خیالات بنیادی طور پر ترقی پسندانہ ہیں ، لیکن سابقہ ترقی پسندانہ کہانی کی نسبت موجودہ ترقی پسندانہ کہانی میں کچھ فرق ہے ۔ نئی ترقی پسندانہ کہانی میں پرولتاری طبقہ یا عام لوگوں کی حقیقت زیادہ ابھرتی ہے ۔ جب کہ ۱۹۶۵ء سے پہلے کی کہانی میں متوسط طبقے کی سماجی اور اقتصادی حقیقت کو زیادہ پیش کیا گیا تھا ۔ نئی ترقی پسند کہانی کے جس پہلو کی ہم یہاں بات کر رہے ہیں اس میں دو نئی کتابوں کا خاص طور پر ذکر کرنا مناسب ہے ۔ عطرجیت کی ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی کتاب "ادنیٰ انسان" اور سکھبیر کی ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی کتاب "مکھ تے جڑاں" یہ کتابیں خواہ گزشتہ دو برسوں میں شائع ہوئی ہیں ۔ لیکن ان میں جو کہانیاں ہیں وہ ۱۹۶۵ء کے بعد کے دور میں لکھی گئی ہیں ۔ اُن کے سن کہانی کے آخر میں درج ہیں ۔ اور یہ کہانیاں پہلے ماہ ناموں میں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ ان کہانیوں میں اُن سماجی و اقتصادی مشکلات کا جائزہ ہے ۔ جن میں عام لوگ یا مزدور گھرے رہتے ہیں یا جن کو عطرجیت نے "ادنیٰ انسان" کا نام دیا ہے ۔ خواہ یہ کہانیاں کئی جگہ اصولی اور سبق آموز شکل اختیار کر لیتی ہیں یا ان کا پیغام کہیں کہیں ابلاغ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ، لیکن ان کہانیوں کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ یہ ٹھیک اُس نظریے کی کہانیاں ہیں جن کو ہم اب عوامی کہانی کا نام دینے لگے ہیں ۔

مذکورہ بالا یکساں کہانی میں ہی ستیندر سندھا والیہ کی کہانیوں کے مجموعے "اودہ میں آیا" کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ کیوں کہ اس کی کہانیاں تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے دیگر پنجابی کہانیوں سے بالکل الگ ہیں ۔ اُس کی کہانیوں کا کہانی پن بہت پھیلا ہوتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی بیشتر کہانیاں اُس کے اپنے اُن تجربات پر مبنی ہیں جو اُس نے اُس وقت حاصل کیے ۔ جب وہ برما اور دیگر ممالک میں فوجی جنگ میں شامل تھا ۔ اس لیے وہ اپنی ان کہانیوں کے ان ملکوں کے کرداروں ، اُن کے سماجی تعلقات اور وہاں کے سماجی اختلافات کو بیان کرتا ہے ۔ جنگ اور جنگلوں کا وضاحت سے بیان کرتا ہے لیکن اس کی ان کہانیوں کی خصوصیت اس لحاظ سے بھی بنتی ہے کہ اس کی کہانیوں کے کردار جنگوں اور جنگلوں وغیرہ میں بھاری مصائب برداشت کرنے کے باوجود ہارتے نہیں بلکہ جوں جوں وہ مشکل میں پھنستے جاتے ہیں توں توں وہ زندگی سے اور محبت کرنے لگتے ہیں ۔ اس کی جداگانہ حقیقت کا سبب یہ بھی ہے کہ پنجابی قارئین کے لیے وہ جانی پہچانی حقیقت کا کہانی کہنے والا نہیں بلکہ ایک نئی دنیا کو ہمارے سامنے لا کر قاری کے لیے ایک نئی دنیا کو سمجھنے کی دلچسپی پیدا کرتا ہے ۔ گزشتہ دس پندرہ برس میں بہت سے نئے افسانہ نگاروں کا ذکر ہوا ہے ۔ جن میں سے خاص طور پر پریم پرکاش ، رگھبیر ڈھنڈ ، ورپام سنگھ سندھو ، گلزار سنگھ سندھو ، گربچن سنگھ بھلر ، گوردیو سنگھ روپانا ، رام سروپ انکھی ،

کرپال قزاق، دلبیر چیتن، پریم گورگی، جگندر سنگھ کیروں، جبیر سنگھ بھلر، جسونت سنگھ وردی، موہن لال ایسے کہانی لکھنے والے ہیں، جنہیں اس دور کے مستند کہانی لکھنے والوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور اُن کی کچھ کہانیاں ایسی ہیں جنہیں پنجابی میں خاص طور پر ذکر کا موضوع بنایا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ چرچا پریم پرکاش کی کہانیوں کا ہوا ہے۔ خاص طور پر اُس کی وہ کہانیاں جو اس کی کتابوں مکتی اور شوبیتا گھر نے کہیاسی کے ذریعے سامنے آئیں — ان کہانیوں میں پریم پرکاش کی کہانی کی مجموعی تعمیر میں ہی کئی تبدیلیاں لاتا ہے۔ کئی بار وہ ایک ہی واقعہ یا موضوع کو الگ الگ کرداروں کی نگاہ سے اُبھارتا ہے جیسے کہ اُس کی کہانی "منڈی" لیکن اُس کی سب سے زیادہ چرچا کا موضوع بنی کہانی ہے "شکتی"۔ اسے عام حقیقت کی سطح پر نہیں لکھا گیا بلکہ اس کہانی کا واقعہ خصوصی ہے۔ اس میں اُس عورت کی کہانی ہے جو کینسر سے مر رہی ہے اپنے دیور کے لیے قربانی دے رہی ہے، اس کا علاج بھی کروا رہی ہے اور اُسے جب پتہ لگتا ہے کہ اُس نے مرجانا ہے تو اس کی ہر مانگ بھی پوری کرتی ہے۔ اُس کے ساتھ سو بھی جاتی ہے یوں اُسے پتہ نہیں لگ رہا کہ وہ اس کی بھاوج ہے، ماں ہے، محبوبہ ہے یا اُس کی بیوی ہے۔ اس طرح یہ کہانی ایک الگ نوعیت کی ہے۔ جب اُس کے دیور کی موت ہوجاتی ہے تو وہ سوچ رہی ہے کہ دوزخ سے کون لوٹ کر آیا ہے۔ اُس کا دیور یا وہ خود اور وہ اس کی مکتی یا نجات کے لیے سب رسم و رواج پورے کر رہی ہے۔ اس کہانی میں یہ عورت ہماری ہمدردی کے قابل بن جاتی ہے۔ جس ذہنی کرب کو وہ برداشت کرتی ہے۔ اُس کے سبب وہ ہمیں ایک عظیم عورت دکھائی دیتی ہے۔ پریم پرکاش نے جس خوب صورتی کے ساتھ اس کہانی کو بیان کیا ہے، اُس لحاظ سے بھی یہ کہانی بہت متاثر کرتی ہے۔

پریم پرکاش کے ساتھ جسونت سنگھ وردی کی کہانیوں کا چرچا عام ہوا۔ اُس کی کہانیوں کے مجموعوں میں سے اس دور میں خاص طور سے "پاور ہاؤس" "کھلے آکاش وِچ" "پاسٹر کال دا درد" کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ وردی نے کچھ تو نئی قسم کی کہانیاں لکھیں، لیکن سب سے زیادہ ذکر اُس کی اُن کہانیوں کا ہوا جن میں وہ تخیل کی تکنیک کو استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہ تکنیک ایسی نہیں ہے کہ اس کی کہانی کو بنا کسی جھجک کے تخیل سے ملا دے۔ وہ ایک فنٹاسی کی تہہ میں کتنے بڑے نازک مسئلہ کو رکھتا ہے اور اس خیال کے ذریعے اُس پر ایک طنز کرتا ہے۔ وردی نے تخیل اور حقیقت کی آمیزش والی اتنی زوردار کہانیاں لکھیں کہ کافی دیر تک یہ کہانیاں اُس کی کہانی کے فن کی پہچان بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ اُس نے اس کے بعد ہر تکنیک پر کہانیاں لکھیں لیکن اس کی ان نئی کہانیوں کا اتنا ذکر نہیں ہوا۔

ان کہانیوں کے ساتھ ہی گلزار سنگھ سندھو کا ذکر آتا ہے۔ اُس کی کہانیوں کے مجموعے "امرکتھا" کو اس کا نمائندہ مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اُس نے ایک کتاب شائع کی۔ "گملے دی دیل" اس میں اُس کی اُس دور کی چیدہ چیدہ کہانیاں شامل ہیں — گلزار سنگھ سندھو کہانیوں کی جو تکنیک بناتا ہے، اُس میں وہ کلونت سنگھ ورک کی کہانی سے کافی متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مانند ہی وہ کرداروں کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے تعمیر کرتا ہے اور اُسی کی مانند وہ کرداروں کے جھکاؤ بھی بیان کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ورک انسانی زندگی سے پکڑ کر اپنی کہانی کی خاص بنیاد بناتا ہے، لیکن گلزار سندھو کرداروں کی جن مشکلات کو سامنے لاتا ہے اُن میں ایک طنز چھپا ہوا ہے۔ لیکن یہ طنز بہت معمولی ہوتا ہے اور تیکھا ہو کر کسی کردار کا مضحکہ نہیں اُڑاتا۔

اس دور میں جو افسانہ نگار سامنے آئے اُن میں کہانی کے فن یا اسلوب کی پہچان گہری ہوتی گئی ہے۔ اس لیے جو نئے افسانہ نگار اس دور میں منظرِ عام پر آئے وہ کہانی کے فن کے لحاظ سے ہماری خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ اور گزشتہ دور کی نسبت اُن کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ مذکورہ بالا کہانی لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کہانی کے فن کی شناخت والا ایک اور افسانہ نگار گوربچن سنگھ بھلر ہے جس کی اس دور کی چیدہ چیدہ کہانیاں اُس کی کتاب "دیوے وانگ بلدی اکھ" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بھلر زیادہ تر پنجاب کے کسانوں کے اہم مسائل اور ان کے سماجی تضاد کو اپنی کہانی کی بنیاد بناتا ہے۔ ایسے موضوع کی اُسے بہت گہری واقفیت ہے اور اس لیے وہ بار بار اسی موضوع کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بناتا ہے۔ اس کے مذکورہ بالا مجموعے میں اُس کی کہانی "دیوے وانگ بلدی اکھ" ہی اس کی نمائندہ مثال ہے جس میں ایک کسان کنبے میں زمین کی تقسیم کا مسئلہ درپیش ہے۔ دو بھائی شادی شدہ ہیں اور ایک کنوارا ہے — دونوں بھائیوں کی کوشش ہے کہ کنوارے کی زمین نہیں ملے۔ یا وہ اُن کے ساتھ ہی رہے۔ لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ کنوارے بھائی کی ایک بھاوج ہے جو آہستہ آہستہ اُس سے محبت کا اظہار بھی کرتی ہے اور آخر میں پنچایت کے روبرو اپنا لڑکا لے کر کھڑی ہوجاتی ہے کہ اگر وہ کنوارا بھائی یہ کہہ دے کہ یہ لڑکا اُس کا نہیں ہے تو وہ اپنا حق نہیں جتائے گی۔ اس طرح چھوٹے کسان جو اقتصادی مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، اُن کی اس حالت کا اثر سماجی رشتوں اور سماجی تقاضوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ اس مسئلے کا اثر نفسیات تک کیسے گہرا اُتر گیا ہے۔ اس حقیقت کو ایسی کہانیاں نمایاں کرتی ہیں۔ اس طرح پنجابی کہانی سماجی حقیقت کی صرف ظاہر شکل کو ہی بیان نہیں کرتی بلکہ اس کی داخلی سطحوں کو بھی پیش کرتی ہے۔

پنجاب کی دیہی زندگی کے ایسے مسائل بہت وسیع ہیں۔ پنجاب بنیادی طور پر ایک زراعتی ریاست ہے اور گزشتہ دور میں جتنے بھی افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے اُن کی جڑیں پنجاب کی دیہی زندگی میں ہیں، اس لیے اُن کی زیادہ تر کہانیوں کا تعلق پنجاب کے دیہی سماج سے ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پنجاب کے دیہات کے معاشرے میں جو تبدیلیاں گزشتہ دس پندرہ

برس میں آئی ہیں وہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اور چرچا کا موضوع بھی بنی ہیں اور اب تک پنجاب کا جو بحران سامنے آیا ہے، اُن کا تعلق خاص طور پران، سائل سے رہا ہے۔ پنجاب میں سبز انقلاب کی آمد اور اس کے لیے کھیتی کی نئی مشینوں کی آمد آہستہ آہستہ زمین کی تقسیم میں اضافہ اور سبز انقلاب کے خیال کا لوٹنا نئے سماجی اور اقتصادی مسائل کا سامنے آجانا اور اُس میں سے نئے شعور کا پیدا ہونا، یہ سب کچھ اُن نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی بنیاد بنا جو اس دور میں منظرِ عام پر آئے اور جن کی جڑیں دیہات کے معاشرے میں تھیں۔

ان میں سے کرپال قزاق کی کہانیوں کا مجموعہ "سورج مکھی پوچھتے ہیں" اور "ادھا پل" کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ قزاق نے صرف دیہی زندگی کے تضادات اور حقیقت کی کہانی ہی نہیں لکھی بلکہ اُس کے عوامی کردار سماجی زندگی کی تبدیلیوں کو سمجھتے ہوئے اور جدوجہد کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کئی بار بھیڑ میں ایک کردار اس انقلاب کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے اور باقی لوگوں کو اس بارے میں آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ قزاق نے صرف دیہی زندگی کی داستان ہی بیان نہیں کی بلکہ اُس نے مالوہ کی ضمنی زبان کا اپنی کہانیوں میں خوب استعمال کیا ہے۔ اس لیے شہروں یا بڑے بڑے شہروں کے قارئین کے لیے اُس کی زبان کئی بار سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے۔

دراصل گزشتہ کئی برسوں میں صرف کرپال قزاق کی کہانیوں کے بارے میں ہی یہ مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ بلکہ دیگر افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی یہ بات بحث مباحثے کا سبب بنی ہے۔ خاص طور پر گردیال سنگھ کی کہانیوں میں استعمال کی ہوئی مالوی اپبھاشا کے متعلق (اس کا تعلق اس کے سے بھی ہے) مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا ہے لیکن اس تنقیدی بحث کے بعد بھی یہ افسانہ نگار ویسے ہی مالوی زبان کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا اس بارے میں اصولی نقطہ یہ ہے کہ تب تک ان دیہات اور ان کرداروں کی حقیقت کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک انہیں اُن کی زبان میں ہی پیش نہ کیا جائے۔ ضمنی زبان سے زبان تک پہنچتے پہنچتے حقیقت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن دوسری جانب ہم ایسے افسانہ نگار بھی دیکھتے ہیں، جنہوں نے دیہات کی اس حقیقت کی بہت موثر کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بڑے پیمانے پر اس بولی کا استعمال نہیں کیا۔ جیسے کہ دلبیر کی کہانیوں کا مجموعہ۔

رشتیاں دے آرپار۔ گوردیو سنگھ روپانا کی کہانیوں کا مجموعہ "اک ٹوٹا عورت" اور "اپنی اکھ دا جادو" دیکھے جا سکتے ہیں۔ یا توتیج کے کہانیوں کے مجموعے "گیؤ تے شراب" میں بھی دیہی پس منظر کی کئی کہانیاں ہیں۔ اس بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دیہی زندگی سے متعلق وہی کہانیاں زیادہ تذکرے کا موضوع بنی ہیں۔ جن میں مقامی بولی کا بڑے پیمانے پر استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ مقامی بولی کا زیادہ اہمیت دینے کی بجائے اُن میں زیادہ توجہ دیہات کی حقیقتوں کے تجزیہ پر دی گئی ہے۔ جیسے کہ پریم گورکی کہانیوں میں زیادہ توجہ اس استحصال پر دی گئی ہے جو دیہات میں عوام میں سے بھی پسماندہ اور دبے ہوئے لوگوں کا ہوتا ہے

جیسے کہ ہم نے پہلے اس بات کی جانب اشارہ کیا تھا کہ ۱۹۶۵ء کے بعد یکساں شکل میں پنجابی کہانی کی ترقی ہوئی ہے۔ اس کی بجائے ہم اُن اسلوبوں کو بھی ان برسوں میں خاص طور پر پہچان سکتے ہیں جو جدید دور کی شروعات کے بعد لکھی گئی ہیں۔ کہانی میں تکنیک کے لحاظ سے تجربے کرنے والے اور کئی افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے۔ ان میں سے خاص طور پر دو افسانہ نگاروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں: جگندر سنگھ کیروں اور دیو بھار دواج۔ جوگندر کیروں کی کہانیوں کا مجموعہ آخری لڑائی دا ناٹک اور دیو بھار دواج کی کہانیوں کا مجموعہ "اوپرے بندے" جدیدیت کے بعد خاص طور پر مضحکہ خیز وجودیت اور دیگر اسلوبوں کا ذکر سامنے آیا تھا۔ جن میں کہانی کی روایتی شکل کو توڑا گیا تھا۔ جوگندر کیروں کہانیوں کے اپنے اس مجموعے میں سوریلسٹ تکنیک سے بھی متاثر ہے۔ یہیں وہ کاڑکا کی کہانی میٹا مارفسز سے متاثر ہے اور وہ ان طریقوں میں سے کہانی کی تکنیک کی تلاش کرتے ہوئے عام آدمی کا بیان کرتا ہے۔ جو سماجی اڈنبر اور استحصال میں گھرا ہوا ہے اور اپنی شناخت کی تلاش میں ہے۔ آخری لڑائی دا ناٹک اور "ہر برڈ کر بیب" اس تکنیک کی اُس کی خاص کہانیاں ہیں۔ دیو بھار دواج "اوپرے بندے" کی کہانیوں میں ایبسرڈ تکنیک سے زیادہ متاثر ہے، لیکن وہ جس شکل میں اپنی کہانی کی تعمیر کرتا ہے، اُس میں اُس کا کردار آخر تک بے آس بے اُمید نہیں بلکہ اس ماحول میں وہ معنی تلاش کر رہا ہے۔ اس میں شعور سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح وہ مروج ایبسرڈ تکنیک سے کچھ الگ عکس قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پنجاب کی تاریخ میں گزشتہ دس برس بڑی اتھل پتھل کے برس رہے ہیں۔ کچھ الگ قسم کے تاریخی واقعات ہوئے ہیں جسے پنجاب کا موجودہ مسئلہ کہا جاتا ہے وہ گزشتہ دس برس میں ہی سامنے آیا ہے اس طرح پنجابیوں نے جن مسائل کا سامنا کیا ہے ان میں پنجاب کے مطالبات کے لیے شروع کیے گئے مورچے بھی شامل ہیں اور بلیو سٹار آپریشن بھی شامل ہے۔ دہلی کے فسادات بھی اور اُس کے بعد سامنے آئی انتہاپسندی یا دہشت پسندی۔ اس طرح پنجاب گزشتہ کچھ برسوں میں ایک اندھیری سرنگ میں سے گزر رہا ہے۔ جس نے پنجابیوں کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ اور اُنہوں نے بڑے تکلیف دہ حالات کا سامنا کیا ہے۔ ایک دم گھٹنے والا ماحول جس میں کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ ایک ایسا ماحول جس نے اس نظریاتی نقطۂ نگاہ کو بھی جھنجھوڑا ہے، جسے ہم ترقی پسندی اور مارکس واد سے متعلق کرتے ہیں۔ اس لیے گزشتہ پندرہ برسوں میں پنجابی کہانی پر ان سماجی ثقافتی سیاسی حالات کی گہری پرچھائیں ہے۔ بہت سی کہانیاں تو براہِ راست شکل میں لکھی گئی ہیں۔ جو ان مسائل کے بارے میں ہیں۔ لیکن بہت سی دیگر کہانیاں ایسی ہیں جن پر ان

گوربخش سنگھ

بھابی مینا

شہر کی ایک گلی کے سامنے واقع دو مکانوں کے درمیان مشکل سے تین ساڑھے تین گز کا فاصلہ تھا۔ پہلی منزل پہ دو کھڑکیاں بھی آمنے سامنے ہی کھلتی تھیں۔ ایک میں سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑا آئینہ لٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ باقی چیزیں اس کمرے میں کچھ کم ہی تھیں۔ ایک چارپائی، ایک مونڈھا، ایک طاقچے میں دو چار کتابیں، کنگھی، تیل۔ دیوار پر ایک دو تصویریں۔ ٹوکری میں دو چار کپڑے۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور اس میں ایک عورت کے سوا کوئی اور صورت بہت کم دیکھی گئی تھی۔ وہ کبھی کشیدہ کاڑھتی کبھی کتاب پڑھتی کبھی یوں ہی بیٹھی ہوتی اور کبھی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں دیر تک کنگھی کرتی رہتی اور وہ بالوں میں کنگھی کئی بار کیا کرتی تھی۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ اُسے کنگھی کرنے کا جنون تھا۔

اس کے بال بہت لمبے تھے۔ جب وہ انہیں کھول کر اُن کی لمبائی خود دیکھتی تو وہ اُس کے ٹخنے چھونے لگتے۔ اگر کسی نے ان کو روشنی میں دیکھا ہوتا تو ان کی چمک کا اُسے اندازہ ہوتا۔ لیکن اس میں ذرا سا بھی شک نہیں تھا کہ اُسے اپنے بالوں پر بہت ناز تھا۔

وہ جوان تھی — دل کش اور لمبی — اُس کی آنکھوں کا رنگ سامنے کی کھڑکی میں سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن ان کا پرتو رسیلا اور افسردہ تھا۔

وہ دیر تک اپنی کھڑکی میں بیٹھی آنسو بہاتی تھی۔ کبھی کسی نے اُسے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر جھانکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن گلی والوں کو اس کی موجودگی کا احساس ضرور رہتا تھا اور کبھی کوئی قریب سے آتی جاتی عورت اُسے آواز بھی دے دیتی تھی اور وہ بہت ہی میٹھے لہجے میں ذرا سی جھک کر جواب دیا کرتی تھی۔

جب وہ کمرے میں نہیں ہوتی تھی تو کھڑکی بند رہا کرتی تھی، لیکن سردیوں میں شام کو اور گرمیوں میں دوپہر کے بارہ بجے وہ ضرور کھلا کرتی تھی۔ اور اُس کھڑکی میں ذرا سی کروٹ لے کر وہ بیٹھی ہوتی تھی اور کبھی کبھی گلی میں جھانک لیا کرتی تھی۔

اُس وقت ایک لڑکا جو بچہ معلوم ہوتا تھا۔ گلی کا موڑ مڑتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ کام چھوڑ کر کھڑکی کی سلاخوں میں سے اُدھر دیکھتی رہتی۔ وہ لڑکا بھی کبھی کبھی اوپر دیکھتا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہو جاتا۔ اس کی سیڑھیاں چڑھنے کی کھٹ کھٹ اس عورت کے کانوں میں بجتی رہتی۔ وہ کبھی اس گھر میں نہیں گئی تھی، لیکن اُسے ان کی سیڑھی کے چبوتروں کی گنتی

نام : گوربخش سنگھ

ولادت : ۱۹ اپریل ۱۸۹۵ء

وفات : ۲۰ اگست ۱۹۷۷

تصانیف : پریت کہانیاں، انو کھے تے اکلّے، ونیڑاں ولوند، ناگ پریت دا جادو، بھابی مینا تے ہور کہانیاں، پریتاں دے پہریدار، شبنم وغیرہ۔

عہد ساز رسالہ، پریت لڑی کا اجرا و ادارت۔

یا بھی۔ سیڑھی کے ہر چبوترے پر پڑتے ہوئے قدموں اور ان کی آواز کو اُس نے کئی بار اپنے سینے سے لگایا تھا۔

دوسرے مکان میں جب کوئی دروازہ کھلتا تو اس طرف دیکھے بغیر وہ محسوس کر لیتی تھی کہ سامنے کی بیٹھک میں کون داخل ہوا ہے۔

وہ لڑکا بستہ ایک طرف رکھ کر اور کچھ دیر کے لیے اپنی کھڑکی میں کھڑا ہو کر سامنے کی کھڑکی کی طرف دیکھتا۔ وہ عورت اُدھر نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن اُسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ایک طرف وہ آنکھیں لگی رہتی ہیں جن کی راہ وہ ہر روز تکتی رہتی تھی۔ اور اگر کسی دن اُس کو اسکول سے آتے ہوئے دیر ہو جاتی تو وہ دوسرے آنے والے لڑکوں سے یہ پوچھنا چاہتی — "کاکا کیوں نہیں آیا" — لیکن اُس نے کبھی یہ پوچھا نہیں تھا۔

کاکا (پیار سے چھوٹے لڑکے کو کہتے ہیں) بیٹھک کا دروازہ بند کر کے کوٹھے پر چڑھ جایا کرتا تھا۔

کتنا ہی عرصہ اس طرح گزر گیا۔ کاکا اب تیرہ برس کا ہو رہا تھا۔ سامنے کی کھڑکی میں اُس کی دلچسپی اُسے زیادہ لطف انگیز محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک دن اُس نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"ہمارے یہاں سب آتے ہیں۔ لیکن سامنے کے گھر سے کبھی کوئی کیوں نہیں آیا؟"

"کاکا — ہماری گلی میں بھاپڑوں (جینیوں) کا یہ واحد مکان ہے۔ یہ لوگ ماس (گوشت) سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے یہ سکھوں سے کوئی میل جول نہیں رکھتے۔"

"لیکن ماں — ہم تو ماس نہیں کھاتے۔"

"یہ سمجھتے ہیں کہ سارے سکھ ماس کھاتے ہیں۔"

"کیا یہ گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے؟"

"نکلتے ہیں . . . مگر یہ ایک دُکھیارا سا گھر ہے۔ موت نے اس گھر میں تباہی مچادی ہے۔ ایک ہی بیٹا رہ گیا تھا، اس کا بیاہ کر دیا گیا، مگر دو برس ہوئے وہ بھی مر گیا۔ اس کی موت کے بعد ایک بچہ ہوا لیکن وہ بھی سال بھر زندہ نہ رہا — اب تینوں رانڈیں رونے دھونے کے لیے رہ گئی ہیں۔"

"وہ بچہ کس کا تھا؟"

"مینا کا — جسے تو نے کئی بار کھڑکی میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہوگا۔"

"ماں وہ ہر وقت کھڑکی میں کیوں بیٹھی رہتی ہے؟"

"وہ لوگ جوان اور بیوہ بہوؤں کی بڑی رکھوالی کرتے ہیں ... اور گھر میں کام کوئی زیادہ نہیں ہے۔"

"وہ رکھوالی کیوں کرتے ہیں؟"

"یوں ہی — کسی سے گھر کی کوئی بات کہہ دیں گی۔ وہ خوش جو نہیں رہتی ہیں۔"

"ماں — گھر میں جتنی عورتیں آتی ہیں تم مجھ سے کہتی ہو کہ میں کسی کو چچی کہوں، کسی کو موسی، اور کسی کو بھابھی کہوں۔ اگر وہ مجھ سے کبھی ملے تو میں اُسے کیا کہوں؟"

"کون — مینا؟"

"ہاں — جو کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہے۔"

"وہ تیری بھابی ہے — اس کا شوہر تیری گلی کا بھائی ہوتا تھا۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔"

"یہ مینا بھلا کیسا نام ہوا؟"

"کیا تجھے اچھا نہیں لگتا؟"

"نہیں — بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن میں نے پہلے کبھی ایسا نام نہیں سُنا۔ مینا وہی ہوتی ہے تاجو ماما جی کے گھر پنجرے میں سے بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔ طوطا اتنی خوب صورتی سے نہیں بولتا۔"

"ہاں — وہی —"

"ماں — کیا تم مجھے ایک مینا لے دو گی؟"

"بیٹا تم اپنے ماما جی سے ہی کہنا۔"

چند دنوں کے بعد اس کی بیٹھک میں ایک پنجرہ ٹنگا ہوا تھا۔ جب وہ کوٹھے پر جاتا تو یہ پنجرہ اپنے ساتھ لے جاتا۔

لڑکے نے اپنی مینا سے کہا۔ "بھابی مینا کھڑکی میں بیٹھی ہے!"

کھڑکی والی مینا نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی اُسے بہت ہی اچھا لگتا تھا جب مینا کہتی تھی "بھابی مینا کھڑکی میں بیٹھی ہے!"

جاڑے کی راتوں میں بھابی مینا اپنے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ امتحان نزدیک آجانے پر وہ بھی کچھ دنوں سے اپنی بیٹھک میں سونے لگا تھا۔ بھابی مینا کو کئی بار سوئے پڑے لڑکے کے سانسوں کی آواز آیا کرتی تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھ کر بڑی دیر تک وہ آواز سنتی رہتی تھی —

اب اُس کی عمر پچیس برس کی ہونے لگی تھی۔ کاکا ابھی پورے تیرہ برس کا نہیں ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچا کرتی تھی کہ کاش مجھے اس بچے سے بات کرنے کی آزادی ہو۔ میں اس کے اسکول سے واپس آنے پر اُسے کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھ سکوں۔ میں اُس سے بات کر سکوں اور جب کبھی وہ بیمار پڑے، اُس کے گھر جا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ سکوں۔ بیماری میں کسی قسم کی خرابی کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

پھر وہ خود ہی کہہ اُٹھتی — مجھے اتنی آزادی کون دے گا۔ میں اس کمرے میں بوڑھی ہو جاؤں گی — میرے بال میری ساس کی طرح کھچڑی ہو جائیں گے۔ 'کاکے' کی شادی ہو جائے گی۔ پھر یہ کھڑکی یوں کھلی نہیں رہا کرے گی۔ پھر میں کس انتظار میں اس تاریک زندگی کے لمبے دن اور لمبی راتیں کاٹ سکوں گی۔

یہ سوچ کر اس کے کلیجے پر چھری سی چلنے لگی۔ وہ بستر پر سے اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ چاندنی رات تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی کاکے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ کاکا گہری نیند سویا پڑا تھا۔ وہ لمبے سانس لے رہا تھا۔ مینا کے دل میں ایک اُبال سا اُٹھا۔ اُس نے یہ اندازہ لگایا کہ دونوں گھروں کے درمیان فاصلہ کتنا تھا۔ کاش کھڑکی کی دونوں چوکھٹوں پر چارپائی ڈال کر ایک پل بنا سکوں۔ میں کاکے کے

"تم جہاں جاؤگی، میں وہاں تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔"

"نہیں کاکا ـــــ جہاں میں جا رہی ہوں وہاں کوئی مرد مجھ سے بات نہیں کر سکے گا۔"

"تم وہاں نہ جاؤ۔"

"میرے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ گیا۔ میں نے "پوجنی" بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"پوجنی کیا ہوتی ہے؟"

"بھابڑوں کی سادھو عورتیں، جن کا سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ جن کے منہ پر پٹی ہوتی ہے۔ اور جو ننگے پاؤں رہتی ہیں۔"

"نہیں بھابی مینا ـــــ تم یہ نہ بننا۔ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں کچھ اور ہی دکھائی دیتی ہیں۔"

"کاکا ـــ میرے لیے کوئی اور چارہ نہیں۔"

اور اُس نے کوئی گیند جیسی چیز کھڑکی میں سے بیٹھک کے اندر پھینکی۔ "میری یہ نشانی اپنے پاس رکھنا، صبح ڈھونڈ لینا۔ آہٹ پاکر کہیں کوئی جاگ نہ پڑے۔"

اور مینا کی کھڑکی بند ہوگئی۔ کاکے نے تالے میں چابی گھومتی ہوئی سنی۔ وہ رات بھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو اس کی ماں نے اسے بتایا کہ مینا بہت دکھی تھی۔ ساس روز لڑتی اور طعنے دیتی تھی۔ وہ تنگ آکر گھر سے نکل گئی ہے اور یہ لکھ کر چھوڑ گئی ہے کہ وہ پجارن بننے کے لیے جا رہی ہے۔

"لیکن ماں کیا وہ یہاں پجارن نہیں بن سکتی؟"

"نہیں، جو عورت پجارن بننا چاہتی ہے وہ اپنا شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کے آشرم میں جاکر رہنے لگتی ہے۔ وہ لوگ بڑی پوچھ گچھ اور پڑتال کرتے ہیں اور جب ان کو اس کی نیت اور ارادے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ اس کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔ اچھا کھلاتے پلاتے ہیں۔ اچھے کپڑے پہناتے ہیں اور چند روز تک اُسے من مانی کرنے دیتے ہیں۔ اور پھر وہ اُسے پجارن بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نہ اچھا کھا سکتی ہے نہ اچھا پہن سکتی ہے اور نہ وہ مردوں کے ساتھ بات کر سکتی ہے۔"

"بھابی مینا کہاں گئی ہوگی؟"

"پتہ چل جائے گا۔"

"اگر وہ کوئی آس پاس کا شہر ہوا تو کیا تم مجھے دکھا لاؤگی ماں؟"

"گاؤں میں ان کا بہت بڑا آشرم ہے۔ وہاں تیری موسی بھی رہتی ہے۔ اگر وہ وہاں ہوئی تو دو دن کے بعد پتہ چل جاتا۔ تیری موسی تجھے دکھا لائے گی۔ جب کوئی پجارن بنتی ہے تو شہر میں بڑی رونق ہوتی ہے۔"

کاکے نے موسی کو خط لکھ دیا کہ وہ اس بات کا پتہ رکھے۔

دو ہفتوں میں سب کو پتہ چل گیا۔ ساری گلی میں مینا کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بڑی نیک عورت تھی۔ کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بال کتنے خوبصورت تھے۔ انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اُسے ٹنڈ منڈ بنا دیا جائے گا۔ انگلیوں سے ایک ایک کرکے تمام بال اُکھاڑ دیے جائیں گے۔

بے چاری!

کاکا موسی کے یہاں پہنچ گیا۔ اُس کی موسی آج مینا کو دیکھ کر آئی تھی۔ اُس نے بہت ہی دل آویز کپڑے پہن رکھے تھے۔ زیور رکھی۔ یہ زیور لوگوں نے مستعار دیے تھے۔ گیت گانے والے بلائے گئے تھے۔ وہ چونکہ کاکے کی گلی کی رہنے والی تھی۔ اس لیے موسی کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر رسم میں شامل ہوتی تھی وہ کاکے کو بتایا کرتی کہ اُس کے رنگ روپ پر نکھار آگیا تھا۔ کل اُسے ڈولی میں بٹھا کر شہر میں گھمایا جائے گا۔ اُس پر پھول برسائے جائیں گے۔ گلاب چھڑکا جائے گا۔

کاکا اپنی بھابی کو دیکھنے کے لیے بہت بے قرار تھا۔ اُس نے ہمیشہ اُسے ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اُن کپڑوں میں بھی بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے زیورات اُسے کیسے پھبتے ہوں گے۔ اُس نے کبھی اُسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی موسی یہ ذکر کیا کرتی تھی کہ اُس کی مسکراہٹ بڑے بڑوں کا دل موہ لیتی تھی۔

اُس کی نشانی یعنی اُس کا دیا ہوا رومال کاکے کی اندرونی جیب میں تھا۔ اُس کے بارے میں اُس نے کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا لیکن وہ اُسے روز دیکھا کرتا تھا۔ اُس نے ہندی کے حروف سیکھ لیے تھے کیوں کہ اُس پر یہ الفاظ کڑھے ہوئے تھے۔ "پیارے پیارے کاکے کو ـــ اُس کی بھابی کی طرف سے!"

اُس کی موسی نے اُسے بتایا کہ دوسرے دن دوپہر کے بعد مینا کی ڈولی نکلے گی۔ اس ڈولی کو تمام بازاروں میں گھمایا جائے گا۔ ہر کوئی دیکھ سکے گا۔

کاکے نے دوسرے دن موسی کے باغ میں سے بہت سے پھول توڑ کر رومال میں باندھ لیے۔ جب ڈولی اُن کے چوک کے قریب آئی تو وہ جان بوجھ کر گھر والوں سے الگ ہوگیا۔ وہ ڈولی دیکھ کر لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تمام راستے پر ڈولی کے ساتھ ساتھ رہنا چاہتا تھا۔

باجے والوں نے وردی پہن رکھی تھی ـــ جلوس میں شامل جینی ڈولی پر روپیوں پیسوں کی بارش کر رہے تھے۔ ڈولی میں اس کی بھابی گہنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کی صورت کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھی، لیکن اُس میں پہلی صورت کی جھلک بھی موجود تھی۔ اُس متبسم صورت کے مقابلے میں کاکے کو اُس کی افسردہ اور اداس آنکھیں بہت پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس پجارن پر بے پناہ حسن و شباب اُمڈ آیا تھا۔ لیکن کاکے کو اس کے بناؤ سنگار میں اس کے پیارے پیارے خدوخال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کا دھیان اس کی

ف ہے تو وہ پھول ڈولی کے اوپر پھینک دیتا تھا۔
ہ ہاتھ جوڑ دیتی تھی۔ لیکن وہ ہاتھ اس کے لیے
ہیں جوڑتی تھی۔ اُس ہجوم میں اُسے چھوٹا سا کاکا
ہوں کر دکھائی دے سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے ڈولی اچانک اُس
ے بہت نزدیک آ گئی۔ پھولوں کی بارش ہوئی تو
ینا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ کاکا اس وقت پھول پھینکنے
ں لگا تھا۔ مینا نے اُسے پہچان لیا۔ اس کی نیم وا
کھیں پھیل گئیں۔ اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُس کی
ف دیکھا۔ پھر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا
اس کی ڈولی روک دی جائے۔

"یہ لڑکا ہماری گلی کا ہے۔ مجھ پر پھول پھینکنا
اہتا ہے۔ لیکن پھول مجھ تک پہنچتے نہیں ہیں۔ اُسے
یک منٹ کے لیے میرے پاس لے آؤ۔"

یہ ایک انوکھا وطیرہ تھا، لیکن پجارن بن
بلنے والی عورت کا کہا ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

"لاؤ — تمہارے یہ پھول میں لے لوں —
م بڑی دُور سے آئے ہو — میری گلی کے کاکا۔"

کاکا بہت خوش ہوا۔ مینا بھابی نے اُسے
ھر لیا۔ پاس بلایا۔ ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اُس
ے پھول لے لیے۔ رومال بھی نہیں لوٹایا۔ شاید
ھابی اُس کی نشانی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔

جلوس آشرم پر پہنچ گیا۔ لوگ رخصت ہونے
لگا اور چند عورتیں سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ سیڑھی
پاؤں رکھنے سے پہلے مینا نے مڑ کر دیکھا۔ کاکا
ک دوکان کے تختے پر کھڑا تھا۔

مینا کو بڑے پجاری کے سامنے بٹھا دیا گیا۔
"کیا تم ارادہ باندھ چکی ہو؟" بڑے پجاری
پوچھا۔

"جی مہاراج — میں ارادہ باندھ چکی
ں۔"

"تمہیں یہ کپڑے اور یہ زیور اُتارنے پڑیں گے۔
ر کبھی تم زندگی بھر ان کو نہیں پہن سکو گی —"
"جی مہاراج — مجھے ان کی کوئی خواہش
نہیں۔"

"تمہیں وہی کچھ کھانا اور پہننا ہوگا جو ہمارے
اس حلقے کے قاعدے کے مطابق ہوگا۔"

"جی مہاراج — مجھے ابھی خوراک کی
ضرورت نہیں۔"

"مُردوں کو چھونا تو ایک طرف رہا، ان کا
خیال تک اس دھرم کو ناپاک کر دے گا جسے تم آج
چُن رہی ہو۔"

مینا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کی جیب
میں رکھا ہوا کاکے کا رومال اُسے کھُلتا ہوا محسوس
ہوا اور رومال کے سرے چھوٹے چھوٹے بازو بن کر
اُس کی کمر کے گرد لپٹ گئے۔ اچانک اُس نے سنبھلتے
ہوئے جواب دیا۔

"جی مہاراج — مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

"اب تم اس کمرے میں چلی جاؤ۔ یہ کپڑے
اُتار دو۔ وہاں جو کپڑے تمہیں پہننے کے لیے دیے
جائیں، پہن لو۔ اس کے بعد تمہیں اپنے یہ بال کٹوا دینے
ہوں گے۔ اور اس کے بعد تمہیں پجارن ماتا یہ بتلائے
گی کہ کس طرح انگلیوں سے یہ بال اُکھاڑے جا سکتے
ہیں۔"

بالوں کے کاٹنے اور اُکھاڑنے کی بات سن کر
وہ اپنے ہونٹوں میں دل سے اُٹھی ہوئی آہ نہ
روک سکی تو بڑی ہمت سے کام لے کر اُس نے کہا۔

"پوجیہ پتا جی — کیا آپ مجھے بال رکھنے
کی اجازت نہیں دے سکتے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بڑے پجاری نے
حیران ہو کر کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ میری یہ مانگ انوکھی ہے۔"
مینا کے دل میں ایک نامعلوم سی طاقت پیدا
ہو رہی تھی۔ "اگر آپ مان جائیں تو میں آپ
کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ معلوم نہیں
میرے اندر کیا گرہ بندھی ہوئی ہے۔ میں آپ کی
ایسی خادمہ بنوں گی کہ ساری قوم حیران و ششدر
رہ جائے گی۔ میرے بال نہ کاٹے جائیں۔"

"یہ بات کبھی ہو نہیں سکتی۔ کیا تمہیں پہلے یہ
بات معلوم نہیں تھی؟"

"مجھے معلوم تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں
بال کٹوا لوں گی۔ لیکن اب جب کہ بال کاٹنے کا وقت
آیا ہے، مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے یہ بال زندہ
ہیں — میرے وجود سے لگے ہیں۔ ان میں زندگی
کا لمس ہے۔ میں نے کئی سال تک ان کے سوا کسی سے
بات نہیں کی (اور پھر ماتھا ٹیکتے ہوئے) اے
دھرماتما —! ایک بار ایسا بھی کر دیکھیے —
آپ اپنے فیصلے پر کبھی نہیں پچھتائیں گے۔"

بڑے پجاری کا دل پسیج گیا۔ وہ سوچنے
لگا — "پجارن کے بال دیکھ کر لوگ کیا
کہیں گے؟"

"نہیں — تمہاری یہ بات مانی نہیں جا سکتی۔"

"تو پھر مجھے پانچ منٹ کے لیے اپنے دل
کو سمجھا لینے دیجیے۔" مینا نے دل کو مضبوط کرتے
ہوئے کہا۔

"ہاں — جاؤ — سامنے چبوترے پر
بیٹھ کر سوچ لو۔"

مینا دھیرے دھیرے اُٹھی مگر دھرتی پر مضبوطی
سے پاؤں جماتے ہوئے چبوترے پر جا بیٹھی۔ اس چبوترے
سے نیچے بازار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مینا اُٹھ
کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کوئی نرالی عورت ہے۔ میں نے کئی عورتوں
کو پجارن بنانے کی رسم ادا کی ہے، لیکن اس کی ہر
بات سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر یہ پجارن بن
گئی تو بڑی شہرت حاصل کرے گی!" بڑے پجاری
نے کہا۔

"لیکن اُٹھ کر کھڑی کیوں ہو گئی؟" دوسرے
پجاری نے کہا۔

بڑے پجاری نے اُس طرف دیکھا۔ مینا
چبوترے پر کھڑی تھی۔ مینا نے اپنی انگلیاں اپنے جوڑے
میں پھیریں۔ اس کا جوڑا کھُل گیا۔ اس کے بال اس کی
کمر سے نیچے لٹکنے لگے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا میں اس

بُوا سے ملے دس سے زیادہ برس بیت گئے تھے۔ میرے بڑے بزرگوں میں یہی عمر ہستی تھی۔ آج بھی اس کی سپنوں جیسی ذرا سی یاد باقی ہے، جب بچپن میں مجھے انگلی سے پکڑ کر، پیار پچکار کر اسکول چھوڑنے جاتی تھی اور آدھی چھٹی کے وقت میرے لیے ملائی والے دودھ کی کٹوری لایا کرتی تھی۔

اس بات کو تیس پینتیس برس ہو گئے ہوں گے۔ وہ تمام جو مجھے 'کاکا'، 'پتر' کہنے کا حق رکھتے تھے، موت کا کھاجا (خوراک)، بن چکے تھے، پر میری بُوا 'کندھی آتے رُکھڑا' بنی رہی۔

ہاں، تو میں اس بار جب اپنے ایک رشتے دار کے لڑکے کی شادی میں گیا تو بُوا سے ملنے کی خواہش کو نہ دبا پایا۔ چاہے کچی سڑک پر پورے پانچ میل جاتے ہوئے اور اتنے ہی آتے ہوئے مجھے طے کرنا تھے۔

گرمی کا موسم اور دیہات میں شادی۔ شہر میں رہنے والے شخص کو جو دو چار وقت ایسی شادی کی ضیافت کھانا پڑے تو چار ضرب چار سولہ وقت ہاضمے کے چورن اور سفوف استعمال کیے بغیر خلاصی نہیں ہوتی۔

چاروں وقت گھی میں تر پوریوں اور ایسے ہی دوسرے پکوانوں سے جی بھر گیا، تو محسوس ہونے لگا جیسے توے کے پھلکے کھائے زمانہ بیت گیا ہے۔ بہت کوشش کی کہ اور نہیں تو ایک آدھ وقت ہی پوریوں سے چھٹکارا ملے، کہیں سے دو پھلکے اور دال مل جائے، مگر ایسا سسرالیوں کی ناک کٹوائی کے مترادف تھا۔

شکر شکر کر کے دو راتیں کٹیں تو تیسرے دن میں براتیوں سے بمشکل پنڈ چھڑا کر بُوا کے گاؤں کو چل پڑا۔ مجھے یاد تھا کہ میرے بچپن میں میری بُوا پتلے پتلے پھلکے چولہے میں پھُلا کر کتنے پیار کے ساتھ کھلایا کرتی تھی۔

سواری کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ دوپہر کا چلا میں سارا راستہ دھول پھانکتا کبھی کھیتوں میں سے اور کبھی سڑک پر چلتا سونے کے وقت بُوا کے گاؤں پہنچا۔ جان میں جان آئی۔

پہنچتے ہی میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ بُوا کو بالاگن کیا۔ اس نے سو سو بلائیں لیتے ہوئے (جی آیاں صدقے آیاں کہتے ہوئے) میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا لیکن اس میں مجھے بُوا کے پیار کی حدّت نہ ملی۔ اصل بات یہ تھی کہ بُوا نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ اسے رتوندھی کی شکایت تھی۔

جب اس کے "کاکا کہاں سے ہو؟" کے جواب میں اپنا نام بتایا تو بُوا کے انگ انگ نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ چوم چوم کر اس نے میرا چہرہ گیلا کر دیا اور اونچی آواز سے پکارنے لگی' "اری چانن کور، دوڑ کر ری، دوڑ کر ۔۔۔ نی میرا ۔۔۔ سنگھ آیا ہے خیریت سے، ارے لڑکو، لڑکیو! تمھارا تاؤ آیا ہے۔"

نام:	نانک سنگھ
ولادت:	۱۸۹۷ء
وفات:	۲۸ر دسمبر ۱۹۷۱ء
تصانیف:	افسانوی مجموعے: ہنجواں دے ہار، مِتّھے ہوئے پھُل، ناش دی عادت، سنہری جلد ناول: چِٹا لہو، ادھ کھِڑیا پھُل، منجدھار، چِترکار۔
انعام و اعزاز:	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔

پیمی کے بچّے

یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں سات سال
ھا اور میری بہن گیارہ برس کی تھی۔ ہمارا کھیت گھر سے
ایک میل دور تھا۔ آدھ بیچ جرنیلی سڑک گزرتی تھی جس
لیوں، پٹھانوں، اُچکّوں اور اجنبیوں کی کافی آمدورفت
ی۔ ہم سب بچے جن کو گھر بیٹھے پٹھانوں سے بہت خوف آیا
تھا کسی بڑے آدمی کو ساتھ لیے بغیر اس سڑک پر سے گزرتے
ئے ڈر کے مارے کپکپا اٹھتے تھے۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ
دن میں دو بار اپنے والد اور کھیت مزدور کے لیے روٹی
نی پڑتی تھی اور ہر روز ہماری حالت ایک دشوار گھاٹی
رنے والے لوگوں کی طرح ہوتی تھی۔

ہم عام طور پر گھر سے بڑی ہمت باندھ کر نکل کھڑے
نے تھے لیکن ابھی سڑک پر تین فرلانگ کا فاصلہ ہی طے
تے تھے کہ نہر کا معاون نالہ پار کرتے ہوئے ہم پر سکتہ
ی ہو جاتا اور ہم کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگتے کہ
بد گاؤں کا کوئی بڑی عمر کا آدمی آتا جاتا نظر آجائے اور
کا سہارا لے کر ہم اس بھیانک سمندر کو پار کرنے کے
ب ہو جائیں۔

ہمیں مذہبی تعلیم ہی کچھ اس قسم کی مل رہی تھی کہ
طرح کے خوف ہمارے مزاج کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ ہر
شام کو ہم گھر میں بڑے بوڑھوں سے جنّت اور جہنم کے
انے سنا کرتے تھے۔ جنّت تو ہمیں کھیت کے سوا کہیں اور میسر
ں لیکن جہنم قدم قدم پر ملتا۔ سب سے بڑا جہنم تو مدرسہ
اس سے اگر کسی دن نجات مل جاتی تو کھیت پر روٹی لے جانے
کے جہنم سے واسطہ پڑتا۔ قصّہ کوتاہ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ جہنم
ہمارے ہر راستے میں گھات لگائے بیٹھا رہتا تھا۔

نہ جانے اس سڑک کا سمندر پار کر کے کھیت پر جانا
ہمیں جہنم معلوم ہوتا تھا یا کھیت پر روٹی لے جاتے ہوئے
اس سڑک سے گزرنے کے خیال نے اسے ایک بھیانک سمندر
بنا دیا تھا۔ میں اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔
میں یہ جانتا ہوں کہ کھیت جنّت تھا، روٹی لے جانے کی زحمت
جہنم تھی اور درمیان کی سڑک بھیانک سمندر تھی۔

سردی کے دن تھے۔ ہم دونوں بھائی بہن دوپہر کا
کھانا لے کر کھیت کی طرف چل پڑے۔ بڑی سہانی دھوپ پھیلی
ہوئی تھی اور ہم سردی کی اس دھوپ میں نیند کا سا مزہ لے
رہے تھے۔ لیکن سڑک پر سے گزرنے کا ڈر دل کو چوہے کی طرح
کتر رہا تھا۔

ہم نے خوف کو دبانے کا ایک عام طریقہ استعمال کرنا چاہا۔
بہن مجھے ایک کہانی سنانے لگی۔ "ایک تھا راجہ — اس کی رانی
مر گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے راجہ سے کہا: "مجھ سے ایک وعدہ
کرو۔" راجہ نے پوچھا۔ "کیسا وعدہ؟"

میں نے کہانی کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر پیچھے مڑ کر
گاؤں کی طرف دیکھا کہ شاید کوئی آدمی ہمارے ہی راستے پر آرہا ہو۔

"تم سن نہیں رہے ہو؟" بہن نے میرا کندھا جھنجھوڑتے
ہوئے کہا۔

"نہیں — میں نہیں سنتا۔" میں نے ایک بچکانہ سی
گستاخی سے جواب دیا۔

نام : سنت سنگھ سیکھوں
ولادت : ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء
شغل : کاشت اور تحریر تصنیف
تصانیف : ۲۵ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لہو مٹی (ناول)
کلاکار، موئیاں سار نہ کی دمنتی، متر پیارا
انعام اعزاز : ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۷۲ء)
پنجاب سرکار نے انعام و اعزاز سے نوازا۔
پتہ : موضع و ڈاکخانہ دالھا، ضلع لدھیانہ (پنجاب)

"وہ رانی جب مرنے لگی تو اس نے راجہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "مجھ سے ایک اقرار کرو۔" راجہ نے پوچھا: "کیسا اقرار؟" رانی نے کہا۔ "دوسری شادی نہ کرنا؟" اور میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ رانی کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی تھی۔

ہمیں راجہ اور رانی اپنے ماں باپ جیسے دکھائی دیئے۔ ہماری ماں مرنے لگے گی تو وہ ہمارے باپ سے یہی قول مانگے گی۔ شاید یہ خیال ہمارے دل میں کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن رانی کی بیٹی معلوم ہوئی اور میں اپنے آپ کو اس کا بیٹا محسوس کرنے لگا۔

میری بہن گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اب آگے بھی تو سناؤ۔" میں نے پہلے کی طرح کرخت لہجے میں اس سے کہا۔

"رانی نے سوچا کہ میرے بیٹوں اور بیٹی کو سوتیلی ماں ستائے گی۔" بہن نے کچھ زیادہ شیریں اور کچھ زیادہ نسوانیت کا روپ بھرتے ہوئے کہا۔ "یہی وجہ تھی کہ رانی نے راجہ سے یہ قول مانگا تھا۔ راجہ نے کہا: "اچھی بات ہے میں یہ اقرار کرتا ہوں۔"

جیسے راجہ اگر یہ اقرار نہ کرتا تو رانی مرنے سے انکار کر دیتی۔

"ہونہہ۔"

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ دن کو کہانی کہی جائے تو راہگیر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں لیکن ہم نے ایک دوسرے کو اس سے خبردار نہ کیا اور ہم نے اپنے اس علم کو اپنے دل اور اپنے خیالات پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔

"ہونہہ۔"

پچھلے موڑ پر ہمیں ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑے ہو گئے تاکہ وہ ہم سے آملے۔ کہانی بھی رک گئی۔ وہ آدمی کسی اور سمت میں جا رہا تھا۔ وہ ہماری طرف نہ مڑا۔

ہم نے جس مقصد کے لیے یہ کہانی چھیڑی تھی وہ پورا نہ ہوا۔ ہمارا خیال تھا کہ کہانی میں محو ہو کر ہم اچانک سڑک پار کر لیں گے۔ سڑک ایک فرلانگ اور باقی رہ گئی تھی اور ہماری کہانی دم بخود ہو کر رک گئی تھی۔ بڑی عمر کے کسی آدمی کے آملنے کی امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ہم دونوں سہمے ہوئے کھڑے رہے۔

دس بیس قدم اور آگے بڑھے تو ہمارا خوف بھی کچھ اور بڑھ گیا۔ سڑک پر کالی مخمل کی واسکٹ اور پٹھانوں جیسی کھلے پائنچوں کی شلوار پہنے ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔

"... یہ کوئی پٹھان سویا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

اس آدمی نے کروٹ بدلی۔

"یہ تو ہل رہا ہے، جاگ رہا ہے۔" میری بہن نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "اب کیا کریں؟"

"کیا یہ ہمیں پکڑ لے گا؟"

"اور نہیں تو کیا ---" اس نے جواب دیا۔

ہم رات کو گھر سے بہت کم باہر نکلا کرتے تھے لیکن ہم نے یہ سن رکھا تھا کہ اگر ڈر لگے تو واہگورو کا نام لینا چاہیئے۔ ڈر جاتا رہتا ہے۔ ہماری ماں ہمارے ماموں کی بات سنایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ہمارے ماموں اور ایک برہمن رات کو کسی گاؤں کی گلیوں میں سے گزر رہے تھے کہ ان کے قدموں میں بڑے بڑے انگارے آکر گرنے لگے۔ برہمن نے ہمارے ماموں سے پوچھا۔ "کیا کریں؟" اس نے کہا۔ "پنڈت جی رام کا نام لو" ہمارا ماموں "واہگورو، واہگورو" کرنے لگا اور پنڈت "رام رام"۔ انگارے گرتے رہے لیکن ان سے دور۔ اس بات کے لیے ہم اپنے ماموں پر بہت نازاں تھے۔

"ہم بھی 'واہگورو، واہگورو' کہیں۔"

"واہگورو سے تو بھوت پریت ڈرتے ہیں آدمی نہیں۔" میری بہن نے کہا۔

میں مان گیا۔ سڑک پر پڑا پٹھان آدمی تھا۔ وہ خدا سے کیسے ڈر سکتا تھا۔

"تو پھر اب کیا کریں؟"

ہم پانچ سات منٹ تک دم بخود کھڑے رہے ہم اب بھی اپنے دل میں یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ کوئی آدمی اس پٹھان کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہم سے آملے گا۔ لیکن ہماری یہ امید پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے لیکن اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں ڈھونڈ ہی کیا سکتے تھے۔

ہماری معصومیت اور ہماری رفاقت بے چین اور مضطرب تھی۔ چند منٹ کے بعد میں رو پڑا۔

میری بہن نے اپنے پلو سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کیوں بھیا، کیوں میرے چاند، ہم یہیں کھڑے رہیں گے اور گاؤں سے ابھی کوئی آجائے گا۔"

ہم نے ٹنگے کی طرف چند قدم اٹھائے اور پھر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد چند قدم پیچھے ہٹ آئے۔

آخر کار میری بہن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم کہیں گے کہ ہم بیبی کے بچے ہیں۔ ہمیں نہ پکڑو۔"

اس کے منہ سے جب بھی بیبی کا لفظ نکلا کرتا تھا وہ بہت میٹھا ہوا کرتا تھا اور اب جبکہ وہ میری طرف جھک کر مجھے دلاسا دے رہی تھی تو خود بھی بیبی بن گئی تھی۔

میری ڈھارس بندھ گئی۔ پٹھان کو جب یہ پتہ چلے گا کہ ہم بیبی کے بچے ہیں تو وہ ہم سے کچھ نہیں کہے گا --- اور ہمیں پکڑ کر بھی نہیں لے جائے گا۔

جس طرح کانپتا ہوا دل اور ڈگمگاتے ہوئے قدم واہگورو، واہگورو کہتے شمشان بھومی میں سے گزر جاتے ہیں اور جس طرح ہندو گائے کی دُم پکڑ کر دنیا کے بھیانک سمندر کے پار جا اترتے ہیں بالکل اسی طرح ہم بیبی کا نام لے کر سڑک پار کر گئے۔ پٹھان اسی طرح وہاں پڑا رہا۔

(ترجمہ: محمود جالندھری)

دسوندھا سنگھ

دسوندھا سنگھ اس راستے سے آگاہ تھا۔ بانہال سے دس میل آگے کی چڑھائی پر آنے والے موڑ کا ذکر وہ اپنے کلینر سے پٹھان کوٹ ہی سے چھیڑ دیا کرتا۔ سڑک کا وہ خربوزے کی پھانک کی طرح ٹکڑا بہت ہی بدنام تھا۔ برفباری کے موسم میں وہاں کچھ ایسی ہوا چلتی تھی کہ برف پہاڑی کی بلندی سے پھسلنے لگتی اور سڑک مسدود ہو جاتی۔ ان دنوں سرکاری طور پر برف ہٹانے کا کام جاری رہتا تاکہ ٹریفک جام نہ ہونے پائے۔

آج موسم صاف تھا۔ بٹوت میں رات بسر کرنے کے بعد دسوندھا سنگھ اسٹیرنگ وہیل پکڑ کر بیٹھ گیا اور اس نے کہا — "واہ — واہ — آج تو گھبرانے کی ضرورت نہیں بچہ۔" اور پھر اس نے اپنے کلینر کو ہاتھ بھر لمبی گالی دیکر نہ جانے کس کس جانور سے اس کا رشتہ جوڑ دیا اور پھر ارداس (دعا) کے لہجے میں بولا۔ "واہگورو — سچے بادشاہ — تیرا ہی سہارا —"

گاڑی میں تین مسافر تھے۔ بہت سا سامان لادا جا چکا تھا۔ دسوندھا سنگھ نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر کہا۔ "آپ لوگ — واہگورو سچے بادشاہ کے صرف ڈھائی لوگ ہو۔ دو مرد اک عورت۔"

سواریوں میں سے ایک نے کہا۔ "سردار جی عورت کو آدھی سواری گن رہے ہو؟"

"پھر تو ٹکٹ بھی آدھا ہونا چاہیئے۔" عورت بلبل کی طرح چہکی۔

نام: دیوندر ستیارتھی

ولادت: ۲۸ مئی ۱۹۰۸ء

شغل: سیر و سیاحت، تصنیف و تالیف

تصانیف و تالیف: اردو، پنجابی، ہندی اور انگریزی میں تقریباً پچاس کتابیں — ناول، افسانوی اور شعری مجموعے وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ میں ہوں خانہ بدوش، گاتا جائے ہندوستان، نئے دیوتا اور بنسری بجتی رہی (اردو — افسانوی مجموعے) کنگ پوش، سوناگاچھی، دیوتا ڈگ پیا، تن تو ئیاں والا گھر، پیرس دا آدمی (پنجابی — افسانوی مجموعے) چٹان سے پوچھ لو، چائے کا رنگ، نئے دھان سے پہلے، سڑک نہیں بندوق (ہندی۔ افسانوی مجموعے)

پتہ: سی ۔ ۵/۴۶، نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

بانہال کے گیٹ پر گاڑیاں رک گئیں۔ گیٹ کھلنے میں بیس منٹ تھے۔

دسوندھا سنگھ نے کہا "بس گاڑیاں ہم سے آگے ہیں اور پانچ پیچھے ہیں۔ کل ۲۶ ہوئیں۔ یا ایک ساتھ مریں گے یا پار اتر جائیں گے۔ موسم تو برا نہیں۔"

اور پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اپنی بات صرف تو ہی جانتا ہے واہگورو جی۔ ایک دن تو ٹکٹ کٹانا ہی پڑے گا۔ ہم تو وہاں بھی تیرے ڈرائیور بنیں گے۔"

"ادھ ہم کلینری نہیں کرے گا استاد!" کلینر نے ٹوکا۔

"چپ رہ آلو بخارے —" دسوندھا سنگھ نے زبان کی فصاحت اور بلاغت دکھائی۔

"استاد — یہ کلینری کب تک کراؤ گے؟" کلینر نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہلے مڑ کر سواریوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں دسوندھا سنگھ پر جما دیں۔

"چپ رہ — جانی چور کے کچھڑے (جانگیے)" دسوندھا سنگھ نے اس کی گت بنائی۔ "ابھی تجھے آتا ہی کیا ہے — ہینڈل مارا — باتیں بنائیں من من بھر کی۔"

"جانی چور کے کچھڑے کا کیا مطلب ہوتا ہے سردار جی۔" عورت نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

دسوندھا سنگھ نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر اس پتلی دبلی لڑکی کے کبوتر سے چہرے پر بڑی بڑی آنکھوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "دسویں بادشاہ (گرو گوبند سنگھ) کہہ گئے بی بی — پانچ چیزیں اپناؤ — کرپا، کیس (بال)،

لنگھا، کرپان ــــ یہ ہوئیں چار ــــ پانچویں کھیرا (جانگیہ) ایک دفعہ شیطان گلی میں بیلچے سے برف ہٹاتے ہوئے اس کا کچھرا گم ہو گیا تھا۔ ہم نے اسے اپنا کچھرا جو ہم نے جموں سے سلوایا تھا، نکال کے دیا۔ اس دن سے واہگورو کی قسم یہ ہمارا جانی چور اپنی تنخواہ میں سے کبھی کچھرا نہیں سلاتا اور جب کچھرے کے چیتھڑے لٹکنے لگتے ہیں تو پھر استاد ہی نہیں چاچا کہہ کر ہاتھ جوڑتا ہے۔"

پتلی دبلی لڑکی نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ "کیا ہی اچھا ہو اگر ہم سردار جی کو بھی اپنے کسی ڈرامہ میں پارٹ دیں۔"

"ہمیں ڈرامہ میں پارٹ بعد میں دینا ــــ"

دسوندھا سنگھ نے گیٹ کھلنے کی خبر سن کر کہا۔ "سچے بادشاہ ــــ شیطان گلی سے بچا نا بچ گئے تو ڈرامہ میں پارٹ بھی کریں گے۔"

اگلی گاڑیاں تیزی سے گیٹ پار کر رہی تھیں۔ دسوندھا سنگھ نے بھی گیٹ پار کیا۔ پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے پہاڑ کی بلندی کی طرف دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے دونوں کان چھو کر کہا۔ "ست نام سری واہگورو ــــ اکال پرکھ تیرا ہی آسرا" اور دوبارہ کان چھو کر گاڑی چلاتے ہوئے بولا "سچے بادشاہ تیرا ہی سہارا ــــ پانچ تت (عناصر) کا پتلا بنایا۔ کوئی ڈرائیور ہے، کوئی کلینر ــــ کوئی ڈرامہ کا ایکٹر بھی ہے۔" اور پھر اس نے پتلی دبلی لڑکی کے چہرے کی مسوتری ٹھوڑی کے تل پر اپنی پلکیں بچھاتے ہوئے کہا۔ "بی بی ــــ کیا تم ڈرامہ کرتی ہو؟ تمہیں کون سا پارٹ ملتا ہے؟"

پتلی دبلی لڑکی کے ایک ساتھی نے سردار جی کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری گل ہما ہیروئن سے کم تو کوئی پارٹ کرتی ہی نہیں۔"

گل ہما بولی "سردار جی یہ ہمارے ڈائریکٹر ہیں اور یہ ان کی نوازش ہے کہ مجھے ہیروئن بنا لیتے ہیں۔ ویسے سیٹھ جی کو بھی میرا کام پسند ہے۔"

ڈائریکٹر نے مرغ کی طرح اپنی گردن تان کر کہا۔ "گل ہما تو پیدا ہی ہیروئن بننے کے لیے ہوئی ہے۔ یہ بات سیٹھ جی کئی بار کہہ چکے ہیں۔ آخر یہ ان کی دولت کا ہی سارا کھیل ہے۔"

تیسرے ساتھی نے بڑی نرمی سے کہا۔ "گل ہما کے مکالمے مجھے ہی لکھنے پڑتے ہیں سردار جی۔"

"اچھا ــــ اچھا تو آپ ڈرامہ لکھتے ہیں۔" سردار جی نے تیزی سے گاڑی کا اسٹیرنگ گھماتے ہوئے کہا۔ "واہ واہ ــــ سچے بادشاہ ــــ ہمارے دسویں بادشاہ نے بھی 'بچتر ناٹک' لکھا تھا۔ باپو جی کہا کرتے تھے کہ دسویں گرو نے عورت کے تمام چرتر کھول کر دکھائے ہیں۔ ایک دن ہماری دادی نے پوچھا۔ "بیٹا ــــ کیا مجھ میں بھی عورت جیسے چرتر ہیں؟" باپو جی بولے ــــ "تم ہماری ماں ہو۔ اس لیے دو چار کم ہوں گے یا دو چار زیادہ ــــ" اور پھر دسوندھا سنگھ نے پہاڑ کی بلندی کا خیال کرتے ہوئے کہا "اب شیطان گلی دور نہیں۔ ہمارے ڈھائی ٹوٹروں کی ذمہ داری تجھ پر ہے سچے بادشاہ ــــ آج شیطان گلی کے ناٹک میں سے صحیح و سلامت نکال کر لے چل۔ برف سے کیسی دوستی ــــ واہ ــــ واہ ــــ ہماری دوستی تو آگ سے ہے۔ جو پانچ تت کے پتلے کی ماں بھی ہے اور اسے کھا جانے والی بھی ہے۔"

سڑک کے کنارے ایک جگہ دسوندھا سنگھ نے گاڑی روک لی۔

جو گاڑیاں پیچھے تھیں وہ آگے نکل گئیں۔

"کیوں ــــ رک کیوں گئے سردار جی ــــ" گل ہما نے حیران ہو کر پوچھا۔

دسوندھا سنگھ نے گاڑی سے باہر نکل کر کہا۔ "ابے او جانی چور کے کچھرے ــــ باہر آ کر دیکھ، ہوا کی نبض کیا کہہ رہی ہے؟"

جانی چور باہر نکلا تو کھڑکی میں پھنس کر اس کی پگڑی سڑک پر جا گری۔ اس نے بالوں کا جوڑا دوبارہ باندھا اور چنکبری پگڑی کس کر سر پہ باندھتے ہوئے کہا۔ "ہوا کیا کہتی ہے استاد؟ تیرا یہ وہم خدا ہی دور کرے گا۔"

گل ہما بولی۔ "مہیش جی ہمارے اگلے ڈرامہ میں ایک دو مکالمے جانی چور کے بھی آنے چاہئیں۔" اور پھر اس نے ڈائریکٹر کی طرف آنکھیں گھما کر کہا۔ "اختر صاحب ــــ کمال ہو جائے اگر ہمارے اگلے ڈرامہ میں جانی چور صابن کی جھاگ کی طرح اٹھے اور ایک لمحہ کے لیے اپنا رنگ دکھا کر بیٹھ جائے۔ بس مزہ ہی آ جائے۔"

"میں تو سردار جی کے لیے ایک اچھا رول سوچ رہا تھا۔" اختر کی آواز بلند ہوتی گئی اور پھر اس نے گاڑی کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے آواز کو ایک خاص تال پر لا کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے گل ہما۔" ہدایت کاری کرتے ہوئے اسے کئی آوازیں بدلنے کی مشق ہو چکی تھی۔

"یہ مہیش جی سے پوچھیے ــــ مکالموں کے مالک یہ ہیں۔" گل ہما کے ہونٹوں پر تبسم آیا جیسے گیت کے بول میں کوئی نئی تشبیہ لہرا جائے۔

"میں تو مکالمہ فٹ کر رہا تھا گل ہما۔" مہیش نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تیری ماں تجھے چنار کے سوکھے پتوں کے ڈھیر میں سے اٹھا لائی تھی۔ مزہ آ جائے اگر اسٹیج پر تم یہ بات اپنے منہ سے ادا کر دو۔"

اختر نے کہا ــــ "کیا سب بچے یوں ہی ملا کرتے ہیں! کوئی چنار کے سوکھے پتوں کے ڈھیر میں سے اور کوئی چارے کے کمرے میں؟ شکنتلا بھی کنو رشی کو جنگل کے ایک گوشہ میں لیٹی ہوئی ملی تھی۔"

جانی چور بولا۔ "یہ سب تیرا وہم ہے استاد۔ سڑک پر کہیں برف کا نام و نشان نہیں۔ ہوا ٹھیک چل رہی ہے۔ اب تک تو ہم سرنگ پار کر چکے ہوتے۔"

"جانی چور ٹھیک کہہ رہا ہے سردار جی۔" گل ہما نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھیں مٹکائیں۔ "اب چلنا چاہیے۔ ہمارا ایڈوانس سکواڈ سری نگر میں ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"بی بی ــــ تم نہیں جانتیں۔" دسوندھا سنگھ نے اپنے ہاتھوں سے دونوں کان چھو کر کہا ــــ "ہواؤں سے آواز آ رہی ہے، جیسے کوئی 'جپ جی' کا پاٹھ کر رہا ہو۔ پچھلے سال اسی جگہ پر میرا دوست ڈرائیور اجیت برف میں دب کر مر گیا تھا۔ تین تولے سونے کے جھمکے بنوا کر لایا تھا۔ اسی دن اس کی سورنا کا جنم دن تھا۔ اجیت 'جپ جی' کا پاٹھ کرتے ہوئے مرا تھا۔ کیا تم اجیت کی آواز نہیں سن رہے؟"

"میں یہ سب باتیں اپنے ڈرامہ میں فٹ کر سکتا ہوں۔" مہیش نے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

جانی چور اور اختر سردار جی پر زور ڈال رہے تھے کہ گاڑی چلانی چاہیے۔

"ڈھائی ٹوٹرو ــــ تالیاں بجاؤ ــــ" دسوندھا سنگھ نے ضد چھوڑتے ہوئے کہا اور گاڑی کو آگے لے چلا۔

گل ہما نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "سردار جی آنکھ جھپکتے ہی شیطان گلی پار کر جائیں گے۔"

شیطان گلی کے وسطی نقطہ پر پہنچ کر گل ہما چلائی۔
" سردار جی ۔۔۔ گاڑی روک لو۔"

گاڑی رکتے ہی گل ہما باہر نکل کر بولی: "پہاڑ کا یہ منظر بھی خوب ہے۔ آئندہ ہم سیٹھ جی کو بھی ساتھ لائیں گے۔"

اختر بولا: "ایک آرٹسٹ بھی ہونا چاہیئے جو پردے پر اس منظر کو ابھار سکے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کی چٹان سے برف کے تودے گرنے لگے۔ دسوندھا سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ "موسم خراب ہو گیا۔ ہوا شرارت پر اتر آئی ہے۔ آج خیر نہیں۔ سچے پادشاہ ۔۔۔ تیری رضا میٹھی لگتی ہے۔ آج تو برف کے نیچے ہی بستر لگے گا۔" اور وہ گاڑی چلانے کی بیکار کوشش کرنے لگا۔ جانی چور ہینڈل مار رہا تھا۔

دسوندھا سنگھ گاڑی پر پھبتیوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ "سالی تیرے کباڑ خانہ جانے کے دن آ گئے ہیں۔ تیرے نزلے اور زکام کا علاج ہمارے پاس تو ہے نہیں۔"

جانی چور بیلچے سے برف ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دسوندھا سنگھ کہہ رہا تھا: "اب کیا کیا جائے بی بی۔ اگر انجن کا کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا تو قسم واہگورو کی اپنا دانت نکال کر وہاں فٹ کر دیتا۔ اگر ٹائر پھٹ جاتا تو ٹائر کے بغیر ہی گاڑی سرنگ کے منہ پر لے جاتا۔" اور پھر اس نے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "سچے پادشاہ ۔۔۔ تو نے تو برف سے انجن ہی کو ٹھنڈا کر دیا۔"

گل ہما بولی: "میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میری موت پہاڑ کی کسی تلہٹی پر ہو اور اپنے کچھ لمحے میرے پاس ہوں ۔۔۔ اختر ۔۔۔ وہ گھڑی آ پہنچی ہے۔"

دسوندھا سنگھ نیچے اتر آیا اور جانی چور کو گلے لگا کر بولا: "جانی ۔۔۔ تو میری جان ہے ۔۔۔ وہ سامنے موت کھڑی ہے بیٹا۔"

مہیش نے دسوندھا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے ۔۔۔ وہ بولا: "دیکھ رہی ہو گل ہما؟ لیکن مجھے تو موت کو گلے لگانے کا ذرا بھی غم نہیں ہوگا۔ میری ہیروئن میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

"مہیش کبھی تو سنبھل کر بات کیا کرو۔" اختر نے نصیحت کے پردے کے پیچھے حسد کی آگ چھپاتے ہوئے کہا: "کچھ تو سوچو کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔"

دسوندھا سنگھ کہے جا رہا تھا: "سچے پادشاہ ۔۔۔ میرا ڈرامہ پورا ہو لینے دو ۔۔۔ پھر چاہے پردہ گرا دینا۔"

مہیش بولا: "سردار جی ۔۔۔ تم ہی ہمارے ڈرامہ کے ہیرو ہو۔"

دسوندھا سنگھ اداس صورت بنا کر بولا: "داڑھی والا بھی کیا کبھی ہیرو ہوا ہے ۔۔۔ یارو ۔۔۔ یہ حسرت ہی رہ گئی۔" اور پھر وہ حیران ہو کے بولا: "یہ کیا ۔۔۔ یہاں بھی اجیت کے "جپ جی" پڑھنے کی آواز آنے لگی۔"

مہیش نے سردار جی کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ "گل ہما ۔۔۔ کیا گاڑی کے پہیوں کے جام ہو جانے پر تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی جم کر رہ جائے گی؟"

اختر بولا: "ہمارے مرنے کے بعد یہاں سے گزرنے والوں کو ہمارے مکالمے سنائی دیا کریں گے۔ اس لیے سنبھل کر مکالمے فٹ کرو بیٹا۔"

"جینے کو ملے تو مرنا کون چاہتا ہے ۔۔۔" مہیش بولا۔ "کیوں گل ہما۔"

دسوندھا سنگھ کہے جا رہا تھا: "اے جانی ۔۔۔ پڑھ لے تھوڑا سا جپ جی ۔۔۔ سدھار لے اپنی عاقبت۔" اور پھر اس نے سامنے کی طرف دیکھ کر کہا ۔۔۔ "واہگورو جی ۔۔۔ بندہ بھول جاتا ہے ۔۔۔ ہم سے تیرا جپ جی نہیں پڑھا جاتا ۔۔۔"

جانی چور اب بھی بیلچہ لیے ہوئے برف پر دانت پیستا ہوا ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا "ایک ہماری بات بھی سن لو استاد ۔۔۔ آگ میں جل کر مرنے سے برف کے نیچے دب کر مرنا بہت اچھا ہے۔"

گل ہما نے مہیش کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ مکالمہ بھی نوٹ کر لو۔"

"اسے کہتے ہیں ڈرامہ ۔۔۔" اختر نے فلسفہ بگھارتے ہوئے کہا۔ "چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ موت اچھی ہے ۔۔۔ کیوں گل ہما ۔۔۔ تمہارا نام نوش لب کیسا رہتا؟"

دسوندھا سنگھ کہہ رہا تھا: "اجیت ۔۔۔ جپ جی کا پاٹھ بند کر دے۔ ہمیں گل ہما کی باتیں سننے دے۔"

اختر بولا: "میری بیوی اور بچی کا کیا ہوگا؟ یہ شیطان گلی ۔۔۔ یہ طوفانی شام ۔۔۔ یہ گل ہما جس کا نام نوش لب ہونا چاہیئے تھا۔"

"کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم ریہرسل کے لیے بیٹھے ہیں۔ جب مجھے ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے۔" گل ہما کا قہقہہ طنز کی حدیں چھو گیا۔

مہیش بھی خاموش نہ رہ سکا: "گل ہما! نہ میری بیوی ہے اور نہ کوئی اولاد ہے ۔۔۔ میں تو مرنے کے بعد بھی یہی کہوں گا کہ شیکسپیئر کی طرح کوئی ہملیٹ نہ لکھ سکا۔"

گل ہما بولی: "سردار جی ہیرو ہیں۔ بہت بڑے ہیرو، جن سے زندگی نے بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ جن کو ہیرو بننا چاہیئے۔ وہ بی کلاس بس کے ڈرائیور ہیں اور جو ڈرائیور بھی نہیں اور کلینر ہیں وہ ہیرو بنے بیٹھے ہیں۔ یہ دنیا بھی عجیب مقام ہے۔"

ہوا کے ساتھ ساتھ نہ جانے اتنی دھند کہاں سے چلی آئی تھی۔ راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ برف پڑنے لگی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ڈھائی ٹوٹروؤں کی طرح دسوندھا سنگھ اور جانی چور بھی بس میں دبک کر بیٹھ جائیں۔

اختر کچھ ایسا خاموش ہوا کہ گل ہما کے بار بار بلانے پر بھی راضی نہ ہوا۔ وہ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

مہیش نے گل ہما کے اور نزدیک ہو کر کہا: "زندگی اور موت کے درمیان چند ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ شام کے اندھیرے ڈھل گئے۔ گلابو گجری کیوں یاد آ رہی ہے؟ وہ مولے حلوائی کو دودھ دینے آیا کرتی تھی اور میں اپنے مکالمے فٹ کرنے کے لیے ایک پاؤ دودھ کے لیے مولے کی دوکان پر کھڑا رہتا تھا ۔۔۔ اس دن اور آج کے درمیان دس سال کی خلیج ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے گل ہما کہ تمہارے تبسم میں گلابو کے سانسوں کی مہک رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ گلابو جہاں کھڑی ہو جاتی، میلہ لگ جاتا۔ مجھے یاد ہے گل ہما تم نے ایک دفعہ کہا تھا: مہیش! میں آگ ہوں آگ ۔۔۔ جو بھی میرے نزدیک آئے گا بھسم ہو جائے گا ۔۔۔ اور آج میں اس آگ میں بھسم ہو جانا چاہتا ہوں۔"

گل ہمانے ہنستے ہوئے کہا "نام ہے گل ہما — جس کا مطلب ہے — برف کا پھول — لیکن میں نے سچ مچ اپنے سینے میں ایک آگ چھپا رکھی ہے۔"

مہیش نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ برف کا مقابلہ آگ ہی کر سکتی ہے؟"

باہر برف پڑ رہی تھی۔ دسوندھا اور جانی جیسے کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اختر بھی سگریٹ بجھائے بیٹھا تھا۔

مہیش بولا "گل ہما — تم نے میرے ساتھ فلم "وار اینڈ پیس" (جنگ اور امن) دیکھتے ہوئے کہا تھا — "تم پیئر سے کتنے ملتے جلتے ہو مہیش۔ کاش تم پیئر کی طرح لمبے بھی ہوتے اور تمہاری آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک بھی ہوتی"۔

"اب اگر اس طوفان سے بچ گئے تو میں اپنی آنکھوں پر ایک عینک بھی چڑھا لوں گا۔ اب رہا سوال لمبے ہونے کا۔ میں ایک اونچے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنی نتاشا سے باتیں کر لیا کروں گا۔"

گل ہما ہنس پڑی جیسے بانسری کا گیت سم سے پنچم تک اٹھ جائے۔

باہر برف گر رہی تھی۔ دسوندھا سنگھ خاموشی کا راستہ چھوڑ کر کبھی کبھی "اکال پرکھ" کو بھی پکار لیتا تھا۔

اختر نے بالآخر ایک نیا سگریٹ سلگایا اور لمبے کش لگانے کے بعد بجھا کر رکھ لیا۔

دسوندھا سنگھ نے اعلان کیا — اپنے اپنے دیوی دیوتا اور پیر و مرشد کو یاد کرو یارو — موت سے مڈبھیڑ ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔"

گل ہما بولی "تم تو ہمارے ہیرو ہو"۔

مہیش نے گل ہما کے نزدیک جھک کر کہا "تمہاری آواز میں لوچ کے ساتھ ساتھ جو تیکھا پن ہے میں اسے کہاں سے لاؤں؟"

"کالچرل ڈیلیگیشن کے ساتھ سمندر پار جاتے ہوئے مجھے اپنے پیار کا زرتار رومال نہ دے کر جانا۔ میں تو پیار کے تحفے کو بھی سری نگر کے لال چوک میں کھڑا ہو کر گولڈ فلیک کی ایک ڈبیہ کے لیے بیچ سکتا ہوں۔"

گل ہما نے سنجیدہ ہو کر کہا "یہ سری نگر کے لال چوک میں کسی کا لال رومال کون بیچتا ہے۔ ایک رومال کی آرزو میں تو شاید ساری زندگی تڑپتا رہا ہے۔"

مہیش نے گولڈ فلیک کی ڈبیہ میں سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا "میں شاید اتنا اچھا آدمی نہیں ہوں جتنا دکھائی دیتا ہوں گل ہما! میں نے زندگی میں تیرہ بار عشق کیا ہے۔ جب تم سمندر پار جاؤ اور ملہنو اور قہقہے تقسیم کرو تو مجھے بھی یاد کر لیا کرنا۔"

دسوندھا سنگھ نے یاد کی گاڑی پیچھے کی طرف گھماتے ہوئے کہا "تمہارے مولے شاہ کو بات نہیں کرنی آتی ہوگی۔ سچے پادشاہ — واہگورو جی نے گلابو گجری کو ضرور برف کا پھول بنایا ہوگا۔ دیکھئے صاحب عشق کی گلی تو آگ کی گلی ہے۔ ہم نے بھی کبھی کسی سے پیار کیا تھا اور اسی کی یاد میں ان راہوں پر گاڑی چلا رہے ہیں اور اے سچے پادشاہ اب ہمارا عشق "نگر سنگھی" (شراب) سے ہو گیا ہے۔ ہم یہ شغل ضرور کر لیتے ہیں۔ "نگر سنگھی" آگ ہے اور برف میں آگ کی ضرورت رہتی ہے۔"

اور پھر جیسے یاد کے الاؤ میں اس نے سوکھی لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہا — "وہ بھی اس سڑک پر ملی تھی گلو کی جان! اس کا نام تھا لالہ رخ۔ جیسے وہ بٹوت کے ڈاک بنگلہ میں آرام کرسی پر بیٹھی بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔"

گل ہما بولی "ہم سب اپنا اپنا ڈرامہ کھیل رہے ہیں"۔

"اور ایک دوسرے کے کرداروں کے ساتھ ہنس سکتے ہیں، رو سکتے ہیں" مہیش نے ہاں میں ہاں ملائی۔

لیکن ایک ڈرامہ کی ہیروئن کو سردار جی دوسرے ڈرامہ کی ہیروئن سے ملا رہے ہیں" اختر خاموش نہ رہ سکا۔

"واہ سردار جی — تمہاری کیا بات ہے"

دسوندھا سنگھ نے دیکھا کہ پہاڑ پر سے جتنی برف ڈھلک سکتی تھی، ڈھلک چکی تھی۔ برف گرنی بند ہو چکی تھی۔ اچانک تلہٹی کی طرف سے ایک روشنی سی نظر آئی۔ اس نے اپنے منجمد ہاتھوں کو جھٹکاتے ہوئے اور اپنے حلق کا پورا زور لگا کر کہا "آگ — آگ — ہم بچ گئے — گلو کی جان — مبارک ہو — مبارک ہو"

اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ برف گرنی بند ہو چکی تھی۔ اور دھند بھی کم ہو گئی تھی۔ برف پر کھڑے کھڑے وہ گنگنانے لگا۔

"کڑیئے بنگال دیئے" (اے بنگال کی دوشیزہ!)
"نی دکھ تینوں کیہڑی گل دا" (تجھے دکھ کس بات کا ہے؟)

پھر وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا "اے او بلبل کی لالٹین — لیڈی اور جنٹلمین — جان بچ گئی گلفامو۔"

اب ڈھائی نوٹرو گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ گل ہما ہنستے ہوئے بولی "سردار جی — ذرا اپنے مکالمے دوہرا لیجیے"۔

دسوندھا سنگھ نے مسرت سے شرابور آواز میں کہا۔

"اے کچی کوار گندل! گلو کی جان — بلبل کی لالٹین — ذرا آگ کے پاس تو پہنچ جائیں۔ پھر وہ باتیں سناؤں گا۔ وہ گھنگھرو بجاؤں گا کہ تمہارے یہ ڈائریکٹر اور یہ ڈرامہ نویس مٹی کے مادھو نہ بن جائیں تو نام بدل دینا — گلو کی جان!"

گل ہما کی ہنسی روکے سے رک نہیں رہی تھی۔

اختر نے سگریٹ سلگایا اور کش لگا کر مہیش کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "مجھے انکریمنٹ مل جائے گی"۔

جانی نے بیلچہ اٹھایا اور سڑک چھوڑ کر پہاڑ کی تلہٹی پر راستہ بنانے لگا۔ کسی پتھر پر پاؤں پڑ جانے سے وہ کچھ ایسا پھسلا کہ دو ہاتھ آگے جا کر گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا۔ وہ بڑی مشکل سے سنبھلا۔ اختر اور مہیش تین چار ڈبے اٹھا کر جانی کے پیچھے چل پڑے — مشکل تھی تو گل ہما کے لیے۔ آگ جتنی نزدیک تھی، راستہ اتنا ہی دشوار تھا۔

دسوندھا سنگھ نے "نگر سنگھی" (شراب کی بوتل) اپنی انٹی میں دبالی اور پھر گل ہما سے کہا "پرسبزی روٹیاں کھانے والے تمہیں کیسے اٹھا سکتے ہیں — گلو کی جان — واہگورو کی قسم — تمہیں اٹھا کر لے چلنے کا کام تو تندوری روٹیاں کھانے والا ہی کر سکتا ہے۔ ڈرو گی تو نہیں — گلو کی جان۔"

اب گل ہما دسوندھا سنگھ کی باہوں میں تھی۔ وہ کہتا جا رہا تھا "تمہیں پھول کی طرح وہاں جا کر رکھ دوں گا او بلبل کی لالٹین — لیڈی اور جنٹلمین۔"

دونوں کے بدن کی آگ نے نہ جانے کتنی برف پگھلا دی۔

الاؤ والے بوڑھے نے اپنا نام رحیمو بتایا۔ اس کا گت پھونک پھونک کر آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

دسوندھا سنگھ سے برف میں گاڑی پھنس جانے کی کہانی سن کر رحیمو نے کہا "برف سے بچاؤ کے لیے آگ سب

سجان سنگھ

راسے لیلا

میں اس وقت نو دس سال کا ہوں گا جس کوٹھی میں ہم رہتے تھے' اس میں تین خاندانوں کیلئے کھلی جگہ تھی. ایک حصّے میں ہم رہتے تھے اور دوسرے حصے میں امرت سر کے مشہور ٹھیکیدار سردار۔ تیسرا بھی ایک ہندو بیوپاری تھا، جس کی عمر میرے آج کے شعور کے مطابق ساٹھ پینسٹھ سال کی تھی. وہ میری پیدائش ہی سے وہاں رہتا تھا اور مجھے بہت پیار کرتا تھا. میں نے سنا تھا کہ اس کا اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا. شاید اسی لیے اس نے اپنا بیاہ وہاں کے ایک غریب گھرانے کو پیسے دے کر کیا تھا. تین چار مہینے سے میں بوڑھے کا دروازہ ہمیشہ بند دیکھ رہا تھا' اگرچہ باہر تالا نہیں پڑا ہوتا تھا اور کنڈی نہیں چڑھی ہوتی تھی.

ایک دن جب میں اسکول سے واپس آیا تو وہ دروازہ کھلا تھا اور میں اسے دیکھ کر جوں ہی "بابا۔ بابا" کہتے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے تیوری چڑھا کر اور مجھے تھپیڑ دکھا کر اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے مجھے باہر جانے کو کہا. میں حیران تھا اور "بابے" (بوڑھے) نے بھی حیرت کے آثار میرے چہرے پر ضرور پڑھے ہوں گے. میں الٹے پاؤں مڑا ہی تھا کہ "بابے" نے مجھے بستے سمیت گود میں اٹھا لیا اور باہر لا کر ایک اکنی میری ہتھیلی پر رکھ دی. "کرشن ــــ اب مجھے چاچا کہا کرو ــــ کہو گے نا؟" اپنے سوال کا جواب میرے اثبات میں سر ہلانے میں پا کر اس نے بڑے پیار سے مجھے نیچے اتار دیا.

گھر پہنچتے ہی ماں نے مجھے دودھ کا گلاس دیا اور کہا کہ وہ ابھی ایک چھوٹا سا پراٹھا پکا کے دیتی ہے. اتنے میں بابے کی نوکرانی مجھے بلانے کے لیے آگئی۔ ماں نے کہا۔ "جا بیٹا تیرے تاؤ نے تجھے بلایا ہوگا." میں نے حیران ہو کر پوچھا' کون سا تاؤ ــــ ٹھیکیدار تاؤ؟" ماں نے جواب دیا' "پرلے والا تاؤ۔"

میں نے کہا۔ "بابا تو کہتا تھا کہ میں تیرا چاچا ہوں".

ماں ہنس پڑی اور بولی۔ "اوہ ــ اسی نے بلایا ہے. یہ اس کی نئی نوکرانی ہے ــــ بیٹا ــ تیری تائی نے بلایا ہوگا."

میں یہ باتیں سن کر جھکا سا گیا اور پراٹھا واپس آکر کھانے کے خیال سے نوکرانی کے ساتھ چل پڑا.

میں جب چچا کے مکان میں داخل ہوا تو اس نے مجھے پہلے کی طرح گود میں اٹھا لیا اور اسی طرح مجھے پاس کے کمرے میں لے گیا. لوہے کی الماری کے ایک قد آدم آئینے کے سامنے گندمی رنگ کی ایک پتلی دبلی نازک اندام سی عورت اپنے گھٹنوں تک لمبے اور کالے بال سنوار رہی تھی. آئینے میں ہمیں آتا ہوا دیکھ کر اس نے ہماری طرف رخ کرنے سے پہلے پنجاب کے رواج کے مطابق اپنی ساڑی کا پلّو اپنے سر پر لے لیا. چچا نے کہا۔ "کرشن ــ تیری چاچی"

میں گھر کے آداب کے مطابق چچی کے پاؤں پر ماتھا ٹیکنے کے لیے اترا تو چچی نے پاؤں پیچھے کھینچ لیے اور مجھے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا. میرے بازو بمشکل اس کی کمر تک پہنچتے تھے اس نے میرے سر کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا. "یہ لڑکا کتنا پیارا ہے."

"رام پیاری." چچا نے کہا' "یہ مجھے بھی بہت پیارا لگتا

نام :	سجان سنگھ
ولادت :	۱۹۰۹ء
شغل :	تدریس (سابق)، تحریر تصنیف (حال
تصانیف :	دُکھ سُکھ، دکھ سکھ توں پچھوں، سب رنگ، انسان تے حیوان، نواں رنگ.
انعام/اعزاز :	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، بھاشا وبھاگ، پنجاب سرکار.
پتہ :	سبزی منڈی، گورداسپور، پنجاب.

ہے۔ میں نے انگلیوں سے ناپ کر پالا ہے۔
مجھے یاد ہے کہ جب میں نے چچی کے گرد سے اپنے بازو ہٹائے تھے تو چچی نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔
چچا نے پوچھا "کیوں ۔ کیا بات ہے پیاری ؟"
"کچھ نہیں ؟" اس نے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور مجھ سے بڑے پیار کے ساتھ پوچھا "تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟"
میرے بتانے پر اس نے غیر پنجابیوں کی طرح دہرایا۔
"کرشن چندر ۔
بال سنوارے بغیر اس نے صابن سے ہاتھ دھوئے اور ایک پلیٹ میں بالائی اور چاول ڈال کر مجھے کھانے کے لیے دیے۔ میں نے وہ بڑے مزے سے کھائے اور پراٹھے کا خیال بھول کر کھیلنے کے لیے باہر نکل گیا۔
تین دن بعد کی بات ہے جب میں اسکول سے واپس آ رہا تھا تو چچی کے تھوڑے سے کھلے دروازے میں سے ایک جانی پہچانی آواز مجھے بلاتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ میں بستے سمیت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں ــــ میں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا اور اس دن کے کمرے کی طرف بڑھا۔ چچی پھر اسی طرح بال سنوار رہی تھی۔ اس نے آئینہ میں مجھے آتا ہوا دیکھ کر اپنا منہ میری طرف کر دیا لیکن کل کی طرح اس نے سر پر ساڑی کا پلو نہ لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ ہچکچائی اور پھر اس نے اپنے بازو میری طرف پھیلا دیے۔ میں وہیں کھڑا اس کے گول اور حسین چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آگئے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ بانہیں پھیلا کر جیسے ہی آگے بڑھا، وہ گھٹنوں کے بل ہو گئی۔ میرے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد لپٹ گئے اور اس نے مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اس نے دن پہلی بار میں نے نرمی اور ملائمت کو محسوس کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ چچی نے اپنا دایاں بازو ڈھیلا کر کے میرا گال اپنے بائیں گال سے لگا لیا اور ہم بڑی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت رہے۔
آخر کار اس کے آنسو میرے گال پر بہنے لگے۔ وہ آنسو ٹھنڈے بھی تھے اور نیم گرم بھی۔ میں ہوش میں آ رہا تھا۔ جب میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آخر کار اس کا دوسرا بازو بھی ڈھیلا پڑ گیا اور اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آج کے شعور کے مطابق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سو کر اٹھنے والی آنکھوں کی طرح بوجھل اور غنودگی آلود تھیں میں نے پوچھنا چاہا "چاچی ......" اس نے بیچ ہی میں ملی جلی بنگلہ اور ہندی زبان میں کہا "کرشن چندر ــــ میرا نام رادھا ہے۔ مجھے رادھا کہہ کر بلایا کرو۔"
میں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے پہلے سوال کو بھولتے ہوئے کہا "چاچا ــ کہاں ہیں ؟"
رادھا نے کہا ــــ "وہ دکان لے کر منگلا ہاٹ گیا ہے۔ اور اس کے سوا اسے اس وقت کبھی فرصت نہیں ہوتی۔"
"نوکرانی ؟" میں نے پوچھا
"اسے نکال دیا ہے ــــ" اس نے جواب دیا۔ "وہ اچھی عورت نہیں تھی اور اب سارا کام میں خود کروں گی۔"
اچانک ــ نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس نے میرے بستے کو جو ابھی تک میرے بائیں پہلو سے لٹک رہا تھا، اتار دیا۔ میرا کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ تسمے کھول کر میرے بوٹ اتار دیے۔ اس نے میری دائیں ٹانگ کو آگے کی طرف بڑھا کر گھٹنے پر سے جھکا دیا اور پیر کو پنجے کے بل رہنے دیا۔ بائیں ٹانگ ویسی کی ویسی رہنے دی۔ پھر وہ چاروں طرف آنکھوں سے کچھ ٹٹولتی ہوئی دکھائی دی۔ تیزی سے وہ ایک کھونٹی پر سے لکڑی اتار لائی اور میرے دونوں ہاتھوں میں لمبی کر کے تھما دی۔ اور اس کا ایک سرا میرے ہونٹوں پر رکھ دیا اور پھر وہ پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے ایک لمبی "ہونہہ" کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سنگار میز کی دراز میں سے ایک گلاب اور ریشمی فیتہ نکال لائی اور اس نے میرے سنہرے بالوں کو پیچھے کی طرف ہٹا کر وہ فیتہ میرے سر پر باندھ دیا اور کان کے نزدیک پھول سا بنا دیا۔ آئینے والی الماری کھول کر اس نے ایک پیلی بنارسی ساڑی نکالی۔ اسے کھولتے کھولتے وہ دوسری دیوار پر ٹنگی ایک تصویر پر گئی جس پر ایک سہرا چڑھا ہوا تھا۔ اسے بڑے غور سے دیکھتی ہوئی وہ میری طرف مڑی اور اس تصویر کو دیکھتی دیکھتی وہ دھوتی میری کمر سے باندھنے لگی۔ دھوتی باندھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور مستی میں ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ٹھیکیدار سرداروں کی چھوٹی بیٹی نئے کھلونے کو اپنے بڑے بھائی سے لے کر یوں ہی کیا کرتی تھی ــــ مجھے رادھا اس جیسی معلوم ہوئی۔
تھوڑی دیر بعد اس نے تیزی سے وہ چھڑی چھین کر بستے پر دے ماری۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں کس کر پانچ سات دس بار چکر کاٹ کر کھڑا کر دیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ اس نے میرے گرم گرم محسوس ہوتے ہوئے رخساروں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے دبا لیا اور میرا ماتھا اور میرے بال چوم لیے۔
آہستہ آہستہ اس نے وہ کپڑے اتار کر اور میرے کپڑے مجھے دوبارہ پہنا کر مجھے پہلے جیسا بنا دیا۔ رسوئی میں سے دودھ کا ایک چاندی کا گلاس اور ایک چھوٹی سی چاندی کی تھالی میں انگور لا کر اس نے میرے آگے رکھ دیے اور میں پہلے کی طرح اپنے والدین کے حکم کے خلاف سب کچھ کھا پی گیا۔ اس نے غسل خانہ میں میرے ہاتھ اور میرا منہ دھلوایا۔ میں برف جیسے سفید تولیے سے منہ صاف کر کے باہر نکلا۔ رادھا میرے پیچھے تھی۔ وہ سرداروں کی لڑکی کی طرح یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ کل بھی کھیلنے آنا تو میں تمہیں ایک سندر ناچ ناچ کر دکھاؤں گی۔
دروازے کے باہر مینہ برس رہا تھا۔ تیز ہوا ناریل کے پیڑ کو دوہرا کر رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا موڑ مڑ کر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ماں گھبرائی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے پیار سے اپنی آغوش میں بھینچتے ہوئے اس نے ظاہری غصے سے پوچھا "اتنی دیر تک تم کہاں رہے ؟"
میں نے والدین اور کتابوں کی تعلیم کے خلاف پہلی بار جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔ "اوندر کے گھر تھا۔ وہ نیا مشینی لٹو لایا ہے ماں۔"
ماں مطمئن ہو گئی۔
دوسرے دن اسکول میں میرا جی بالکل نہ لگا۔ بڑی مشکل سے چھٹی کی گھنٹی بجی۔ بپن خود بخود چلنے والی موٹر بستے میں ڈال کر لایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سڑک کے کنارے پٹڑی پر اسے چلا چلا کر کھیلیں لیکن آج میں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ میں رادھا سے کھیلنا چاہتا تھا اور وہ ناچ دیکھنا چاہتا تھا۔
میں نے گھر جا کر دودھ نہ پینے کا بہانہ بنایا۔ اوندر کے گھر کھیلنے کا جھوٹ بول کر میں رادھا کے گھر میں داخل ہوا۔ رادھا پہلے ہی کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کبھی کسی عورت کو اتنی

خوبصورت ساڑی میں اور ایسے بناؤ سنگار میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنی انگلی تھما کر رسوئی میں لے گئی۔ مجھے ایک آسن پر بٹھا کر خود نیچے بیٹھ گئی۔ سامنے رکھے برتنوں میں دودھ، بالائی، چاول اور روٹیاں اور ترکاریاں تھیں مکھن بھی تھا۔ میرے انکار کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے چمچوں سے اور نوالے بنا بنا کر مجھے کھلانا شروع کر دیا۔ میرا پیٹ جلدی بھر گیا۔ رادھا نے غسل خانہ میں میرا منہ ہاتھ دھلایا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ اگربتی سے مہکا ہوا تھا۔ سنگار میز پر ایک چاندی کی تھالی میں سہرے، پھول اور گھی کے ان جلے دیے پڑے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے چابیوں کے گچھے والے پلّو سے ایک چابی چن کر کپڑوں کی الماری کھولی گئی۔ رادھا نے اس میں سے ایک پیلی ریشمی دھوتی نکال کر پلنگ پر رکھ دی۔ ایک کھونٹی سے مور کے پنکھوں کا ایک مکٹ لاتے ہوئے کہا "کرشن چندر ـــ یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے بنایا ہے!"

میں ابھی تک حیران کھڑا تھا۔ رادھا سنگار میز کی دراز میں سے ایک بانسری نکال لائی۔ دس منٹ کے اندر مکٹ، دھوتی، سہرے اور بانسری کے ساتھ مجھے آراستہ کر دیا گیا اور پھر مجھے کل کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ ایک سہرا سامنے کی تصویر پر ڈالا گیا۔ جب میں نے اپنا چہرہ سامنے کے آئینے میں دیکھا تو میں ہو بہو سامنے کی تصویر جیسا لگ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "وہ کس کی صورت ہے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں خبر ہی نہیں ـــ کرشن چندر کی۔"

"میری؟" میں نے پوچھا

"ہاں ـ ہاں ـ کرشن چندر کی۔"

دیا سلائی جلا کر تھالی میں پڑے ہوئے پانچوں دیے جلائے گئے اور رادھا اس تھالی کو دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے آ گئی ـــ اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھول کر اس نے تھالی کے ایک گوشے میں گھولے ہوئے کیسر اور چاولوں کا ایک تلک اپنی چھنگلیا کے پاس والی انگلی سے میرے ماتھے پر لگا دیا۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھا ـــ میں نے بھی اپنی اسی انگلی سے کیسر لگا کر اس کے ماتھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ماتھا جھکا دیا۔ میری انگلی لگتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ دیوں کی لَویں کانپ اٹھیں۔ لوبان کا دھواں لرز اٹھا اور گھنگھروؤں جیسی چھنکتی آواز نہ جانے کیسے اس کے پیروں میں کانپ اٹھی۔ ایک دم وہ اپنی جگہ سے ہلی اور وہ اس طرح آگے بڑھی جیسے پھسل کر گرنے لگی ہو۔ لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے پھسلنے اور سنبھلنے کی چال تیز ہوتی چلی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ ناچ شروع ہو چکا ہے۔ جب وہ اپنی کمر کو بل دے کر جھکاتی تھی تو اس کے لمبے بال فرش کو چھونے لگتے تھے۔ گھنگھروؤں کی چھنا چھن سے کمرے میں ایک ہم آہنگی سی پیدا ہو گئی۔ چال اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ میرے اردگرد چکر کاٹنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ مجھے اپنے گرد بہت ساری رادھائیں دکھائی دینے لگیں۔ مجھ جیسے کئی لڑکے میری موجودہ پوشاک میں ان کے آس پاس تھے۔ اپنے آپ پر میرا قابو کم ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میری انگلیاں زبردستی بانسری کے سوراخوں پر رکھ دی تھیں۔ میں نے بڑے سوراخ کو چھوڑ کر نچلے سوراخ پر ہونٹ رکھ دیے اور پھونک ماری۔ میری چھوٹی چھوٹی انگلیاں نہ جانے کب ان سوراخوں پر ناچنے لگیں۔ میں نے بانسری نہیں بجائی تھی اور اب بھی میں کوئی ساز نہیں بجا سکتا ہوں لیکن اس دن جیسی بانسری میں کبھی کسی استاد سے بھی نہیں سن پایا۔

آہستہ آہستہ میری انگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ ناچ کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ رادھا صرف ایک رہ گئی۔ میں خود بھی ایک رہ گیا۔ کمرے میں قبر جیسی خاموشی چھا گئی۔ رادھا شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ لیکن وہ دیوں والی تھالی ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھا۔ میں نے تھالی اس کے ہاتھ سے لے کر سنگار میز پر رکھی ہی تھی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ میں نے بانسری میز پر پھینک دی اور اسے سنبھالنے کے لیے بڑھا۔ نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آ گئی تھی۔ میں ہر حالت میں اپنے آپ کو مکمل مرد سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنی دھوتی کے پلّو سے پنکھا کیا اور اسے ہوش میں لایا۔ اس نے اٹھ کر میرا رخسار چوم لیا۔ میری رگوں میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بھی ایک لمحہ کے لیے کانپی اور پھر اس نے مجھے اپنی باہوں میں بھینچ لیا اور پھر بے حس ہو کر اس نے اپنے آپ کو میری آغوش میں گرا دیا۔ میں نے اس کے رخسار چومے، اس کے ہونٹ چومے، آنکھیں چومیں، بال چومے ـــ مگر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی نیم بیہوش آنکھیں کھول دیں اور فوراً بند کر لیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کوئی آواز نہ آئی ـ میں پھر پہلا کرشن بن گیا۔ کافی دیر ہو چکی تھی جب میں اپنے گھر پہنچا۔

ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے بتایا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔

"اسے بھوک کیوں نہیں لگتی؟" میرے والد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہاضمہ تو درست ہے ـــ" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اسکول کے امتحان کی رپورٹ اچھی تھی لیکن اس کے باوجود میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں روز رادھا کے یہاں جاتا تھا۔ اس بات پر کبھی کسی کو شک ہی نہیں ہوا تھا۔ لیکن میری ماں جسے میرے رات کے کھانا نہ کھانے کی بڑی فکر ہو رہی تھی۔ خفیہ پولیس کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک دن جب میں رادھا کے یہاں گیا تو اس نے دبے پاؤں میرا تعاقب کیا۔ دروازہ بند تھا اس لیے وہ اندر نہ آ سکی لیکن باہر دروازے کے پاس نہ جانے وہ کتنی دیر تک کھڑی رہی ہو گی۔ ناچ ختم ہو جانے کے بعد اس کی بلند آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی "رام پیاری ـــ رام پیاری! رام پیاری!!"

میں تو ڈر گیا۔ لیکن رادھا نے وہ کپڑے جلدی سے اتار دیے اور مجھے میرے کپڑے پہنا دیے۔ منہ ہاتھ بھی دھلایا۔ اور مجھے پھر اسی کمرے میں چھپا کر وہ باہر نکلی اور اس نے دروازہ کھول کر میری ماں سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

ماں نے قہر آلود آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "کرشن کہاں ہے؟"

رادھا نے کہا "یہیں کہیں ہو گا۔"

"میں نے اپنی آنکھوں سے اسے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔" ماں نے کڑک کر کہا۔

"میں اندر دیکھتی ہوں۔" رادھا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "میرے سسر صاحب کئی بار اندر کا دروازہ بند کر کے اکیلا

باقی صفحہ

بلونت گارگی

کرڑاکا سنگھ

کرڑاکا سنگھ کو پہلے پہل صرف بھنگ پینے کا شوق تھا۔ نہنگوں کے ڈیرے پر وہ بھنگ رگڑنے کے ڈنڈے سے جس کے ساتھ گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں، وہ چار چار گھنٹے بھنگ گھوٹتا۔ باریک ململ کی چھلنی سے بھنگ چھانتا۔ بھنگ رگڑنے سے پہلے اُس میں باداموں کی گریاں، کیسر کی پتیاں، خربوزے کے مغز، الائچیاں اور دھنیے کے پتے بھی ڈالتا۔ نہنگوں کو بھنگ پلاتے وقت جب کوئی سُورما اُسے خود بھی امرت کا یہ گھونٹ پینے کے لیے کہتا تب وہ جواب دیتا۔ "نہیں، نہنگ سنگھ جی، میں نہیں پیوں گا۔"

"ابے! تو اس امرت سے انکار کرتا ہے۔ لڑے گا کیسے؟ دو گھونٹ پی کر دیکھ، جنت کے نظارے نہ آجائیں تو کہنا۔"

دو گھونٹ پھر چار گھونٹ اور آخر میں وہ کٹورے کے کٹورے چڑھانے لگا۔ بھنگ پی کر وہ بڑا سا ڈکار لیتا۔ اور کہتا "گورو کا سنگھ اب کچھ دیر کے لیے سورگ پوری جا رہا ہے۔"

وہ پتلا اور اکہرے جسم کا تو تھا ہی، لیکن جب وہ چھوٹا تھا تو ایک بار کھیلتے ہوئے گمینچر لوہار نے اُس سے بے ایمانی کی اور اس نے اس کے منھ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ اُس کے منھ پر پانچوں اُنگلیوں کے نشان پڑ گئے۔ لڑکے کہنے لگے۔

"دھنے کے لڑکے نے کرڑاکا نکال دیا ہے۔"

اس کے بعد یہی اُس کا نام پڑ گیا۔

کرڑاکا سنگھ کے والد کو وفات پائے بہت مدت ہو گئی تھی۔ ماں کی موت کے بعد وہ اور بھی آزاد ہو گیا۔ جو چیز اُس کو گھر سے جوڑے ہوئے تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ کئی بار گوردوارے میں ہی سو جاتا۔

جب کبھی نہنگ گوردوارے میں آکر ٹھہرتے تو رات بھر وہاں بھنگ رگڑی جاتی۔ ایک بار نہنگوں کی فوج وہاں اُتری۔ اُن کے سردار کی ایک آنکھ دبی ہوئی تھی۔ اس لیے اُن کے سردار کا نام لکھو نیترا سنگھ تھا۔ سردار نے کرڑاکا سنگھ کے بھنگ رگڑنے کے کمال کو دیکھ کر اُسے اپنا مُرید بنالیا۔ پیلا دوشالہ اور سیس کرڑا دے کر کہا "تم نے آج ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ لے آج سے تُو اس طرف کا گرداور ہے۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ ہماری بات یاد رکھنا واہگورو تمہارا بھلا کرے گا۔"

یہ کہہ کر لکھو نیترا سنگھ نے زور سے نعرہ لگایا جب نہنگ فوج روانہ ہوئی تو کرڑاکا سنگھ پورا نہنگ بن گیا تھا۔

سفید گھوڑی پر سوار جب کرڑاکا سنگھ گاؤں کی گرداوری کے لیے نکلتا تو سب کہتے "واہ بھئی واہ"

نام: بلونت گارگی

ولادت: ۴ ردسمبر ۱۹۱۶ء

شغل: تصنیف و تالیف (حال)

تصانیف: لوہا کٹ، کنک دی بلی (ایک بابی ڈرامے) نم دے پتے (خاکے) رنگ منچ، کرڑاکا سنگھ۔
پنجابی و انگریزی میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

انعام اعزاز: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۱۹۶۲ء

پتہ: ۲-۷ کستوربا گاندھی مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

کوئی کرڑاکا سنگھ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

ایک دن اُس نے نیزہ تان کر کہا "ہم چڑھائی کے لیے جا رہے ہیں۔ یہاں ترکوں نے دخل اندازی کی ہے۔ ہم جلد اُن کی خبر لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ گاؤں چلا گیا اور آٹھ برس تک لوٹ کر نہیں آیا۔

جب وہ آیا تو بھنگ زیادہ پینے لگا تھا۔ اس سبب اُس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور گال پچک گئے تھے۔ دوشالہ، کمربند اور دیگر کپڑے بارش اور دھوپ سے پھیکے پڑ گئے تھے۔ اس کی بھوسلی داڑھی یوں تھی جیسے ملیٹھی کے پتوں کو سوکھا مار گیا ہو۔ اُس کی گھوڑی کیلی کہیں راستے ہی میں مر گئی تھی۔ شاید وہ راستے میں کسی سے لڑ پڑا تھا۔ کیوں کہ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک گہرا بینگنی رنگ کا گڑھا تھا۔ اس سے بائیں آنکھ کچھ بند سی تھی، لیکن دائیں آنکھ لال تھی۔ غصے میں یہ سرخ انگارہ بن جاتی اور اس کی شکل عجیب دکھائی دینے لگتی۔ اب وہ گاؤں ہی میں رہتا اور گوردوارے میں اندھے بھائی کے پاس ہی سو جاتا۔

وہ بڑے دعوے سے کہتا۔ "جب تک فوج گاؤں میں ہے کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ترک اِدھر نگاہ بھی اُٹھائیں تو اُن میں بھگدڑ مچا دیں۔ کہیں آگ لگ جائے، چوری ہو جائے یا نقب لگ جائے تو کرڑاکا سنگھ ڈھال تلوار اُٹھائے نیزہ تانے وہاں پہنچ جاتا۔

جب گوردوارے کا اندھا بھائی مر گیا تو کرڑاکا سنگھ نے اُس کی جگہ سنبھال لی۔ موسم آئے اور چلے گئے، سردی آئی اور گئی۔ کرڑاکا سنگھ اسی گوردوارے میں رہا۔ نوخیز لڑکے اُسے سنگھ جی صاحب کا پاٹھ کہتے سُن کر ہی جوان ہوئے۔ وہ شادی شدہ اور بال بچوں والے ہو گئے؛ لیکن کرڑاکا سنگھ کنوئیں کی مُنڈیر پر جنڈ کے پرانے درخت کی مانند کھڑا رہا۔ گوردوارے میں جو کچھ نذر آتی اُس سے بھنگ اور افیون آ جاتی یا بھنگ میں ڈالنے کے لیے عمدہ اشیاء۔ اگر پھلکاری یا رومال چڑھائے جاتے تو اُن کی قیمت بھی وہ کمہار کے ذریعے جگو ٹھیکیدار سے وصول کر لیتا۔

گوردوارے کی دیواریں بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ کرڑاکا سنگھ کے دانت گر گئے تھے۔ جب وہ ہنستا تو اُس کا منھ ایک خالی جگہ کی مانند کھل جاتا تھا۔ جب پاٹھ کرتا تو آواز یوں آتی تھی۔ جیسے آدھے چبائے چاول۔ اُس کے منھ کے الفاظ پہلے بھی صاف سُنائی نہیں دیتے تھے، اب اور بھی [illegible] تھوڑے اور نامانوس معلوم ہوتے تھے۔ بس اس کی چوں چوں سے پتہ چلتا تھا کہ گوردوارے میں پاٹھ ہو رہا ہے۔ جب کوئی عقیدت مند آتا تو وہ اس سے پوچھتا۔ "کیا لائے ہو؟" عقیدت مند کہتا۔ "نہنگ سنگھ جی، رومال چڑھانے آیا ہوں۔ آج میری نوکری لگی ہے۔ میں نے یہ منت مانی تھی۔" جو آتا ہے رومال ہی لے کر آتا ہے۔ ملنگوں کا گاؤں ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دودھ کا گھونٹ ہی پلا دے یا مرغے کی بوٹی ہی لے آئے۔"

آئے دن گاؤں میں کوئی نہ کوئی واردات ہوا کرتی۔ شہر میں اگر کوئی لڑکی گھر سے بھاگ جائے تو اس سے زیادہ ذکر نہیں ہوتا کہ ایک چڑیا اُڑ کر دوسرے درخت پر جا بیٹھی ہے۔ لیکن گاؤں سے کوئی لڑکی بھاگ جائے تو یوں ہوتا ہے گویا کسان کی فصل کو کیڑے چاٹ گئے ہوں یا ساہوکار کی تجوری سے کسی نے تھیلی اُڑا لی ہو۔ جب اندر سنگھ جاٹ کی لڑکی رتنی نائیوں کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ رتنی شام کو گھر سے نکلی تھی پھر لوٹ کر نہیں آئی۔ بھٹیاری نے نائیوں کے لڑکے پتّے کو دوسری گلی میں جاتے دیکھا تھا۔ اُن کی عشق کی خبر کچھ دن سے اُڑ رہی تھی۔

پتیا فوج میں لانس نائک تھا۔ مہینے کی چھٹی آیا تھا۔ باہر جا کر بے شک اُس نے وردی پہن لی تھی۔ لیکن گاؤں میں وہ نائیوں کا لڑکا ہی کہلاتا تھا۔ گاؤں میں وردی نہیں پہنتا تھا۔ سال بھر وہ خاکی وردی اور بوٹ پہنے پہنے اوب جاتا تھا۔ لٹھے کی چادر اور مونگیا رنگ کی پگڑی کے خواب دیکھتا رہتا تھا جو گاؤں آ کر ہی پورے ہوتے۔

رتنی اس کی اس مونگیا رنگ کے طرّے پر ہی مر مٹی تھی۔

رتنی کے بھائی بھلر نے رو کا تھا۔ "ٹکوے سے ٹانگیں کاٹ دوں گا اور کوٹھے کے اندر پھینک دوں گا۔" لیکن رتنی نے ایک نہیں سُنی تھی۔

بھلر اور اس کا بھائی گھر کے پیچھے چوگردے میں کئی دنوں سے دبائی ہوئی شراب تیار کر رہے تھے اور گڑ و کیکر کی چھال کی خوشبو سے پتہ لگا رہے تھے کہ شراب تیار ہو گئی ہے یا نہیں۔ اُن کے والد نے آ کر کہا "بے حیاؤ، تم یہاں شراب تیار کر رہے ہو۔ نائیوں کا لڑکا تمہاری بہن نکال کر لے گیا۔"

بھلر نے گھڑے کو وہیں چھوڑ کر کھونٹی پر لٹکا ہوا گنڈاسا اُتار لیا۔ دونوں بھائیوں نے چھویاں تیز کر لیں۔ چچا زاد بھائیوں نے بھی ٹکوے سنبھال لیے اور گھوڑیوں پر سوار ہو کر رتنی کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ گاؤں کے تین اطراف کچی سڑکیں تھیں۔ سیاہ رات میں ان کی گھوڑیوں کے گلے کے گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی اور چھویاں چمک رہی تھیں، لیکن وہ دونوں کہیں نہیں ملے۔

رتنی اور پتیا ابھی گاؤں سے ایک کوس ہی گئے تھے کہ اُنہوں نے گھوڑیوں کے گھنگھروؤں کی آوازیں سُنیں۔ اور ہتھیاروں کی چمک کی جھلک دیکھی۔ پتیا جنگ میں بے شک بندوق اُٹھا کر لڑ سکتا تھا۔ لیکن گاؤں کے جوانوں کی چھویوں کے مقابلے میں اُس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ نزدیک ہی مکّی کا کھیت تھا وہ دونوں اُس میں چلے گئے۔

جب آدھی رات ہو گئی تو پتّے کو ہوش آیا۔ رات کے اندھیرے میں اُبلتا ہوا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے چھویاں اور گنڈاسے گھومنے لگے۔ منھ اندھیرے اُس نے اپنی کِٹ سنبھالی اور رتنی کو وہیں سوتا ہوا چھوڑ کر بٹھنڈے کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھیتوں کے اندر میں سے ہوتا ہوا وہ بڑے اسٹیشن پر پہنچ گیا، جہاں سات اطراف سے گاڑیاں آتی تھیں۔ مکّی کے کھیت میں جب رتنی کی آنکھ کھلی تو پتیا

جاچکا تھا۔ سر پہ تارے چمک رہے تھے۔ کھیت میں مکمل خاموشی تھی۔ جب ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو مکی کا کوئی پودا ٹوٹ کر آواز دیتا۔ رتنی ڈر کے مارے سہم جاتی۔

اُسے اپنے والد اور بھائیوں کے غصّے کا پتہ تھا۔ وہ اُسے قتل کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ اب تو ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ننگے پاؤں چلتی وہ گوردوارے کے دروازے پر آگئی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر کے قریب بیٹھ کر اُس نے نیچے دیکھا۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کالا گول چکر اور نکلتا ہوا گہرا اندھیرا۔ اس کا سر بھی چکرا رہا تھا۔ گوردوارے کے اندر کرڑا کا سنگھ کا پاٹھ سُنائی دے رہا تھا۔

رتنی کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے آنکھیں صاف کیں اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گوردوارے کے دروازے پر آگئی۔

"کون ہو تم؟" کرڑا کا سنگھ نے پاٹھ کرتے کرتے پوچھا۔

"بولتے کیوں نہیں؟" اُس نے پھر زور سے کہا۔

"میں ہوں رتنی ... بابا۔۔۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"دُور ہی بیٹھی رہ۔" اُس کی بھنویں تن گئیں۔

"ترلو آئی ہو گُٹ؟" اُس نے غصّے میں کہا۔

رتنی کھڑے کھڑے لسورنے لگی۔

کرڑا کا سنگھ کا غصّہ بڑھ گیا۔

وہ بولا۔ "کُتیا کہیں کی۔ صبح صبح کوئی کچھ لائے کوئی کچھ۔ یہ آگئی ہے مورچہ ترلو اکر۔ چل جا یہاں سے ---"

کرڑا کا سنگھ نے گورو گرنتھ صاحب کو رومال سے ڈھانپ دیا اور غصّے میں لڑکھڑاتا باہر آگیا۔

اُس کی ڈانٹ ڈپٹ سُن کر رتنی نے منّت سماجت کی۔ "سنگھ جی، مجھے بچائیے۔ میں مر گئی۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔"

"ہٹ ہٹ بڑی آئی ہے۔ براہمن زادی۔"

کرڑا کا سنگھ غصّے سے کانپ رہا تھا۔

"تمہیں قتل نہ کریں تو اور کیا کریں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ تیرا تیا پانچہ کر دوں۔ ہٹ دور ہو جا یہاں سے۔" اُس نے نیزہ اٹھالیا۔ خبردار جو اندر آئی۔ چل دُور ہو جا یہاں سے۔"

"نہنگ سنگھ جی مجھے بچائیے۔" رتنی اُس کے پاؤں پڑ گئی۔ "میں آپ کی پناہ میں آئی ہوں --- مجھے بچائیے، میں آپ کی منّت کرتی ہوں۔"

پناہ اور بچاؤ کے الفاظ سُن کر کرڑا کا سنگھ نے اپنا نیزہ دیوار کے کونے میں رکھ دیا۔ رتنی کے الفاظ نے اس کا غصّہ نرم کر دیا تھا۔ اُس کو عمر بھر لڑائیاں لڑنی تھیں۔ خواہ اُسے کوئی اس کے لیے بُلائے یا نہ بلائے۔ اُس کو صرف خبر ملنی چاہیے تھی، وہ خود بخود وہاں پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس طرح منّت خوشامد کر کے کبھی کسی نے اُسے دہائی نہیں دی تھی۔ کبھی کوئی اُس کے پاؤں نہیں پڑا تھا۔ رتنی کی آنکھوں کے گرم گرم آنسو کرڑا کا سنگھ کے پاؤں پر گرے۔ رتنی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا۔ "مجھے بچالو۔"

بہادری کی ایک لہر کرڑا کا سنگھ کی رگوں میں دوڑ گئی۔ اس کی ٹھوڑی پر تھوڑی سی داڑھی ہل رہی تھی۔ اور اس کی بھوری آنکھیں بھڑک رہی تھیں۔

"اچھا بیٹھ جا۔ دروازے کے پاس۔ تیرا بھائی اور باپ خود آ کر لے جائیں گے۔"

"وہ تو مجھے مار ڈالیں گے۔ میں اُن کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"مجال ہے وہ تمہارا بال بھی بانکا کر سکیں۔ تم ہماری پناہ میں ہو۔ کیا مجال ہے اُن ملنگوں کی اور کہا کیا ہے تم نے؟ وہ تمہیں لے کر نہیں جائیں گے --- دیکھیں گے کون تمہیں لے کر نہیں جاتا۔ ہمارے گھوڑے کہاں ہیں؟" اور یہ کہہ کر اس نے پھر نیزہ اٹھالیا اور اپنا جوتا تلاش کرنے لگا۔

جوتا پہن کر، دوشالہ اوڑھ کر، ڈھال تلوار اور کھنڈے سے لیس ہو کر اُس نے کہا۔ "تم گوردوارے میں بیٹھو۔ یہاں، جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اس گدّی پر۔ تمہیں ہاتھ لگانے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ خبردار جو یہاں سے اِدھر اُدھر ہوئی تو۔ سنگھ چڑھائی پر جا رہے ہیں۔ ابھی لوٹ آئیں گے۔" یہ کہہ کر وہ اونٹ کی طرح لمبے لمبے قدم اُٹھاتا گاؤں کی طرف چل دیا۔

وہ دھرم شالہ اور سرداروں کی حویلی کے سامنے سے گزرا۔ گلی مڑ کر آگے اِندر سنگھ کا بڑے بڑے تختوں والا دروازہ تھا جس میں سے بیل گاڑی اور اونٹ بھی گزر سکتے تھے۔ اس دروازے پر پیتل کے کُنڈے اور میخیں لگی ہوئی تھیں۔ کُنڈے میں نیزے سے ضرب لگا کر اُس نے آواز دی۔

"اب اُٹھو۔ ابھی سو رہے ہو۔ اُٹھو۔"

اندر دالان میں ایک اونٹ کے حلق سے آواز آنے لگی۔ گائے کی آواز آئی اور کتے بھونکنے لگے۔

اندر سنگھ اور اُس کے بیٹے رات بھر شراب پینے کے بعد صبح تین بجے لوٹے تھے۔ اب صبح کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا میں گھر کے پچھواڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ رتنی کی بوڑھی ماں جاگ رہی تھی۔ اُس نے دروازے پر دستک سُن کر اندر سنگھ کو بیدار کیا۔ اندر سنگھ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ کھڑ کا سُن کر لڑکے بھی جاگ اُٹھے۔

"آپ یہاں لمبی تانیں سو رہے ہیں۔" کرڑا کا سنگھ کڑک کر بولا۔ "تمہاری لڑکی کو کنویں میں سے گری کو نکالا ہے۔"

"رتنی"۔ ماں بولی۔ "اب کہاں ہے وہ ہمارا خون پینے والی۔"

کرڑا کا سنگھ نے بتایا کہ رات کو کھیت میں سے گوردوارے کی جانب متھا ٹیکنے آئی تھی۔ ٹھوکر لگی اور وہ کنویں میں گر گئی۔ چرخی کے رسّے کے ساتھ نیچے لٹک رہی تھی۔ پانی کم تھا اور کنواں زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس لیے وہ رسّے کے ساتھ ہی چپک گئی۔ رات کو اُس کی آواز سُن کر ہم نے اُسے کنویں میں سے نکالا۔

"کنویں میں کیسے جا گری؟" بھیلر نے پوچھا۔

"جیسے لڑکیاں جا گرتی ہیں۔ کھیل میں کسی نے اُسے کچھ کہہ دیا ہوگا۔"

بوڑھی ماں کا دل بھر آیا۔ "اب کہاں ہے میری لڑکی؟"

"گوردوارے میں۔"

"ٹھیک تو ہے۔"

"ہاں پہلے تو ہم سمجھے کہ مر گئی ہے، لیکن جسم کی مضبوط

تھی۔ واہگورو نے بچالی۔"

اندر سنگھ سوچنے لگا۔ وہ یونہی کھیتوں میں ڈھونڈتے پھرے۔ شاید وہ گھر سے ناراض ہو کر گئی ہو۔ اُس نے چھوٹے لڑکے سے پوچھا۔

"ابے کُتّے تو نے تو اُسے کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں بابو، کیا میں نے اُسے لٹھ مارنی تھی۔ میں تو کھاد کے ڈھیر میں سے گھڑا نکال کر اُبال رہا تھا۔ مجھے ... بدبو آتی ہے۔ میرا جی متلاتا ہے۔" میں نے کہا "پھر یہاں کیا کرنے آئی ہے ___ کہیں اور رجا مر۔ میں نے ایک آدھ فقرہ اُونچی آواز میں ضرور کہہ دیا تھا۔"

اندر سنگھ کی نیند اُڑ گئی۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دونوں بھائیوں کا غصّہ اُتر گیا۔

کرڑاکا سنگھ نے بنیرہ دالان میں گاڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اب آپ لڑکی پولیس سے ہی لانا۔"

"پولیس سے کیوں، باباجی؟"

"خبردار! جو اُس کو ہاتھ لگایا۔ ہم جاکر اُسے تھانے دار کے حوالے کر دیں گے۔ ہم ملنگوں کو بتاؤ پتہ گھر میں کے گھڑے دبانے کا۔ مجھے بھی بدبو آ رہی ہے۔ سر کو چڑھ رہی ہے۔"

ماں کہہ رہی تھی "باباجی معاف کرو ان لڑکوں بالوں کی باتیں۔ میں پٹکا پکڑ کر آپ کے سامنے اردا س کرتی ہوں۔ میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

کرڑاکا سنگھ نے ان تینوں باپ بیٹوں کو وہ لعن طعن کی کہ تاؤ اور چچا بھی جاگ اُٹھے۔ دالان میں جمگھٹا لگ گیا۔ پڑوسیوں نے بھی لڑکوں کے شراب نکالنے اور پینے کے لیے ڈانٹ پھٹکار کی اور مشورہ دیا کہ گلے میں کپڑا ڈال کر عاجزی کے ساتھ باباجی کے ساتھ گوردوارے جاؤ اور لڑکی کو لے آؤ۔"

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اندر سنگھ اور اُس کے دونوں لڑکے ننگے پاؤں گوردوارے گئے۔ اندر سنجیا کیے تنی گوروگرنتھ صاحب کے سامنے بیٹھی تھی ___ اندر سنگھ نے دو رومال اور ایک پھلکاری نذر میں دی۔

اور گلے میں کپڑا ڈال کر ارداس کی۔

بھلّر نے کھیس کی بکل میں افیم کا گولہ چھپائے رکھا ہوا تھا۔ کرڑاکا سنگھ نے یہ افیم کا گولہ لے کر اپنی جھونپڑی میں ایک جانب رکھ دیا اور دُعا دے کر لڑکی اُن کے ساتھ روانہ کر دی۔

سورج کی پہلی گلابی کرنیں درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھیں۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر لوٹ آئی تھیں۔ ماشکی اُونٹوں پہ پانی کے مشکیزے لاد رہے تھے، جب اندر سنگھ اور اُس کے لڑکے رتی کو واپس لے کر آئے۔

دُور گوردوارے میں سے کرڑاکا سنگھ کی پھٹی ہوئی آواز کا پاٹھ سُنائی دے رہا تھا اور اب اُس میں افیون کا نشہ تھا۔

●●

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب)

بقیہ

تل چولی

خود بخود جل رہا تھا۔ وہ چین و سکون تلاش کر رہا تھا۔ ایسے چین جو کبھی اُسے گاؤں گاؤں گز گز کپڑا بیچ کر تھکا ماندہ گھر لوٹنے پر چولہے کے سامنے بیٹھ کر رُوکھی سوکھی کھاتے نصیب ہوتا تھا۔ کتنا سکون کتنا چین تھا اس زندگی میں؟ کبھی کبھی وہ سوچتا۔

پھر اُسے ایک خدا رسیدہ سنت مہاراج کے درشن ہوئے۔ ساری داستانِ درد اُس نے سنت مہاراج کو کہہ سُنائی۔ ایک بار تو وہ سنت جی کے آگے چودھری رونق مل سے حقیر ناچیز رونقی بن گیا۔ سنت جی کو ترس آگیا اُس کی یہ حالت دیکھ کر مسکین، خاموش، گلے میں کھدر کا انگوچھا ڈالے ننگے پاؤں شہر کا چودھری اُن کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔

سنتوں نے یگ کروایا۔ اُنھوں نے اس کا ہاتھ لگوا کر غریبوں میں کپڑا کروا دیا۔ برہمنوں کو کئی کپیلا گائیں دان کروائیں۔ وہ اُس کے پاس سوا ماہ رہے۔ جاتے ہوئے اُسے وہ دعائے خیر دے گئے اور کہہ گئے: "دیکھ .... رونق مل ... کل منگلوار ہے۔ کل سے ہی ڈوبتے سورج کے وقت چیونٹیوں کے دمکوڑا پہ تل چولی ڈال کر آیا کر۔ سوا سال تل چولی ڈالتے رہنا۔ یہ بے زبان کیڑے تیرا بھلا کریں گے۔ کہیں بھول نہ جانا ...."

یہ کہتے ہوئے سنت جی نگری سے چلے گئے۔ اب ہر روز سورج غروب ہوتے ہی چودھری رونق مل چیونٹیوں کے دمکوڑے پہ تل چولی ڈالنے جاتا۔ بڑے سے بڑا کام چھوڑ وہ اپنے ہاتھوں سے تل چولی ڈال کر آتا۔ کئی کئی منٹ وہ چیونٹیوں کے دمکوڑے پہ بیٹھا رہتا۔

روز چاول کے دانوں کے لیے چیونٹیوں کی لڑائی دیکھتا مزہ لیتا رہتا۔ اپنی زندگی اُسے دوبارہ متوازن ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

کئی دن سے ایک عجیب تماشا وہ چیونٹیوں کا دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں سے ایک بہت بڑا چیونٹا تل لگی گڑ کی ڈلی چھین کر لے جاتا تھا۔ اس کا یہ حملہ دیکھ کر چودھری کھل اُٹھتا... "کتنا دلیر ہے .... صدقے تیرے۔" اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا۔

آج شہر میں کُشتیاں تھیں۔ علاقے سے آئے ہوئے اُس کے مقروض چادر باندھے، شراب میں دھت۔ اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ کامریڈ بچیا لوگوں کے سیلاب میں اس مستعدی سے چل پھر رہا تھا۔ جیسے بیاہ والے گھر میں نائی آج کشتیاں دیکھنے میں چودھری رونق مل کا دل نہ لگا۔

وہ تو اپنے پہلوان چیونٹے کے داؤ پیچ ہی دیکھے گا۔ یہ سوچتا آرام سے چلتا، اٹھکیلیاں کرتا وہ چیونٹیوں کے دمکوڑے پہ پہنچ گیا۔ تل چولی ڈالنے سے پہلے اُس نے تل لگی گڑ کی ایک چھوٹی ڈلی دمکوڑے پہ پھینک دی۔

تماشا دیکھنے کو تیار ہو گیا۔ اس بار اُس کے منہ سے "صدقے تیرے" نہ نکلا۔ وہ کانپ اٹھا۔

بڑے چیونٹے گُڑ کی چھوٹی سی ڈلی چھین کر چھوٹے چھوٹے پانچ چھ چیونٹے اُسے اپنے سوراخ کی طرف لے جا رہے تھے۔

(ترجمہ: نریندر نشچل)

کرتار سنگھ دگل

مہاجا نہیں مرا

مہاجا اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا ہے۔

چل بیٹا! تیرا ساز فٹ ہو گیا ہے۔ آج ایک چھید اور تیرے تنگ میں کسنا پڑا ہے۔ تیرا یہ ساز ڈھیلا ہو رہا ہے۔ کیا تو کمزور ہو رہا ہے، یار! یوں دغا نہ دے جانا کہیں۔ پچھلے سال "کرمی" اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اور میں نے ذرا پروا نہیں کی تھی میں نے سوچا جب تک تیرا ساتھ ہے، مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ کم ذات ہر چوتھے روز بہو بیٹے کے پاس چل دیتی تھی۔ کوئی بات بھی ہوئی "چل بیٹا! تیرے چارے دانے کی بھی فکر کرنی ہے۔ انشاء اللہ آج تجھے مسالہ ضرور کھلانا ہے۔ کل بھی وعدہ کیا تھا مجھے یاد ہے۔ کل جھوٹا ہونا پڑا تھا۔ پرسوں ترسوں تو میں نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ اور اس سے پہلے دن بھی نہیں۔ پر آج وعدہ ضرور پورا کر دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو۔ اس سبزے میں کچھ جان وان ہے نہیں۔ مٹی زیادہ چارہ کم۔ آج تو تجھے مسالہ کھلانا ہے۔ مسالہ بھی چاہے آج کل خاک ہی ہوتا ہے۔ مسالہ تو ان دنوں کا ہوتا تھا۔

ان دنوں کی بات ہے، بیٹا! تیری ماں کے زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ ان دنوں کی کیا بات ہے۔ تیری ماں کو مسالہ کھلاتے ہوئے کئی بار میں خود اس میں سے پھنکی مار لیتا تھا۔ مسالہ تیری ماں کھاتی تھی اور اس کی خوشبو سونگھ کر میری بھوک چمک

نام: کرتار سنگھ دگل۔ ولادت: یکم مارچ ۱۹۱۷ء
شغل: تصنیف و تالیف (حال)
تصانیف: ۵۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔
حال مریداں دا، ماں پیو جائے
(ناول)؛ ایک چھٹ چانن دا،
مہاجا نہیں مویا افسانوی مجموعے)
متعدد کتابوں کے تراجم ہندی اور دیگر
ہندوستانی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔
انعام اعزاز: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۱۹۶۵ء
یوپی وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود کا ایوارڈ
یوپی سرکار، مہاراشٹر ساہتیہ پریشد
ساہتیہ کلا پریشد، دہلی کے انعام اعزاز
پتہ: پی - ۷ - حوض خاص انکلیو،
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

اٹھتی تھی۔ سارا دن تیری ماں کے پسینے میں سے کھٹی کھٹی خوشبو آتی رہتی تھی۔ اور شام کو اس کی مالش کرتے کرتے میں اس کی پسلیوں میں ناک لگا کر سونگھا کرتا تھا۔ میری نیلم پری! نیلم پری نام تھا تیری ماں کا! تجھے پہلے بھی بتایا ہوگا شاید۔ بدن پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور اب مکھیاں صبح سے تجھے سانس نہیں لینے دے رہی ہیں۔

"چل بیٹا، اللہ کا نام لے کر چل پڑ۔ سنا ہے آج بڑے بڑے فرنگی باہر سے آئے ہیں۔ دیکھ میں نے گدیوں پر صاف ستھرے دھلے ہوئے غلاف چڑھائے ہیں۔ اور تانگے کا رنگ دیکھ کیسا چم چم کر رہا ہے۔ کل پہلوان کہہ رہا تھا کہ تیرا نخرہ ویسے کا ویسا ہے۔ باقی سب کی پھونک نکل گئی۔ تیرے تانگے کی چال ڈھال ویسی کی ویسی ہے۔ دیکھ بیٹا، گھنٹی ہی دیکھ۔ کیسے بجتی ہے۔ ایک دفعہ تو آدمی بدک کر اوندھا جا گرتا ہے۔

دیکھا تو نے سردار جی کیسے ٹھٹھک کر ٹک ٹک اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ بھئی آج کل بھی اپنا ربڑ ٹائر پشاوری تانگہ ہوا سے باتیں کرتا اڑتا چلا جا رہا ہے۔ سائیکل رکشا والوں کو تو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ بے چارے ٹانگیں مار مار کر بے حال ہوتے رہتے ہیں۔ میں تو بڑے بڑے اسکوٹروں

کو پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔ کالی سڑک پر کوئی میرے ساتھ اسکوٹر دوڑا کر تو دیکھے۔

لے بیٹا۔ چوک پہ لال بتی ہے۔ ذرا ٹھہر جا۔ یہ لال بتیاں بھی سرکار کا نیا چونچلا ہیں۔ چاہے کوئی اُدھر سے آ رہا ہو نہ آ رہا ہو، لال بتی اِدھر جلتی ہی رہے گی۔ کوئی بات بھی ہوئی۔ رُک جا بیٹا۔ جلدی مت کر۔ لال بتی، پیلی بتی پھر ہری بتی۔ تب ہم چلیں گے۔

بنگلہ صاحب کے سامنے سے ہو کر تکیہ والے پیر کے مزار پر سلام کے بعد پھر کرزن روڈ۔ گورے لوگوں کو تانگے پر بیٹھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ خاص کر میموں کو۔

آج میں تیرے سب گلے دھو دوں گا۔ میرا کیا ہے ملنگ کے ملنگ۔ ایک میں اور ایک تو بیٹا۔ آج میں تجھے نہیں ٹوکوں گا چاہے تو دو ٹوکری بھر مسالہ کھا لے۔

پیلی بتی ہو گئی۔ اب تو نکل چل۔ نہیں تو موٹروں والے شروع ہو گئے تو باری نہیں آئے گی۔ نکل چل بیٹا نکل چل! بجانے دے ان کو ہارن۔ یہ تانگہ نہیں رولز رائس ہے۔ لو ہو گئے پار۔ تو آلس کر جاتا تو وہیں ٹاپتے رہ جاتے اور پھر لال بتی ہو جاتی۔ کئی بار ایسے ہوا ہے کہ ایک طرف کی لائن ابھی ختم نہیں ہوتی کہ پھر لال بتی ہو جاتی ہے۔ کناٹ پلیس میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے اسی لیے تو میں اِدھر جاتا نہیں۔ کون ان لال بتیوں کو منہ لگائے۔

بنگلہ صاحب کو سلام کر۔ ہاں! یوں! بڑی برکت ہے یہاں پر سلام میں۔ اس در پہ آیا ہوا کوئی خالی نہیں جاتا۔ شام کو دیکھا ہے کتنی موٹریں یہاں کھڑی ہوتی ہیں۔ جہاز جتنی بڑی موٹریں اور ان میں سونے سے لدی سردارنیاں نکل کر اندر ماتھا رگڑتی ہیں۔ جھولیاں بھر بھر کے جاتی ہیں۔

لے اب تکیہ والے پیر کے مزار پر بھی سلام کر لے۔ شاباش!

کوئی کہتا ہے بنگلہ صاحب میں بڑی برکت ہے۔ کوئی کہتا ہے پیر صاحب کے مزار میں بڑی کرامت ہے۔ ہم تو بیٹا آج دونوں جگہ ہو آئے۔ لے بیٹا! اب تو دیکھ [illegible] ننگی ٹانگوں والی میم تیرا راستہ دیکھ رہی ہے۔

"تجھے پتا ہے بیٹا؟" ایک بار ... ہائے وہ دن! یہ بات میں نے تجھے کبھی نہیں بتائی ہوگی۔ بہت دنوں کی بات ہے تب لام لگی ہوئی تھی۔ تُو تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں کی بات ہے۔ رات کو میں گھر لوٹ رہا تھا۔ گھپ اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جاڑے کی گھُپ اندھیری رات۔ یہاں اس موڑ پر۔ جہاں جے سنگھ اور اشوک روڈ ملتی ہیں۔ ایک کرسٹن نے میرا تانگہ روک لیا۔ ننگی ٹانگیں، شراب میں بدمست سگریٹ کے کش پہ کش لگائے جا رہی تھی۔ کہنے لگی تم مجھے لے چلو۔ میں نے کہا۔ میں تھکا ہارا اپنے ڈیرے جا رہا ہوں۔ پھر تو وہ کود کر تانگے میں آ بیٹھی اور وہ بھی اگلی سیٹ پر۔ اور پھر اُس نے گھوڑے کی لگام مجھ سے چھین لی۔ کمبخت غضب کا تانگہ چلا رہی تھی۔ جیسے ساری عمر اس کا یہی پیشہ رہا ہو۔ اور وہ تانگہ کو برلا مندر کے پیچھے پہاڑی پر چڑھا کر لے گئی۔ توبہ توبہ، کس طرح کی عورت تھی اور فجر کو جب میں اُسے اُتار کر اپنے ڈیرے پہ پہنچا تو چھوٹو کی ماں ایک جوتی اُتارے ایک پہنے بار بار کہتی۔ تمہارے کپڑوں میں سے خوشبو کیسی آ رہی ہے؟ میں اتنی باتیں بناتا ہوں۔ پر اس دن جیسے میرے منہ میں زبان نہ ہو۔ وہ جوتیاں مارتی رہی اور میں جوتیاں کھاتا رہا۔

چل بیٹا چل، یہ پھر آج تانگے میں نہیں بیٹھے گی۔ یونہی دیکھے جا رہی ہے۔ یہ لوگ گھنٹہ گھنٹہ بھر بس کا انتظار کر لیں گے۔ لیکن تانگے میں نہیں بیٹھیں گے۔ یوں کفایت کر کے چار پیسے بچاتے ہیں اور پھر چاندنی چوک میں جا کر سرخی پاؤڈر پہ پھینک آتے ہیں۔ انہوں نے تانگے کا کبھی منہ نہیں دیکھا یا پھر فیشن کے مارے اسکوٹر پر بیٹھیں گے۔ کبھی بیوی اچھل کر خاوند کی گود میں کبھی خاوند اُچھل کر بیوی کی جھولی میں۔ بُرا حال کرتا ہے یہ اسکوٹر۔ آنتیں تک ہلا دیتا ہے۔ ایک بار میں بھی بیٹھا تھا۔ دس قدموں کے بعد میں اسکوٹر کو روک کر نیچے اُتر آیا۔ پیدل چلنا منظور، لیکن اسکوٹر کی سواری نہ بابا، نہ .....!

پرانی دلّی میں سائیکل رکشائیں بھی چلتی ہیں۔ توبہ توبہ۔ رکشا پر بیٹھنا تو یوں ہے جیسے آدمی آدمی کے کندھے پر چڑھ جائے۔ اگلے کا پسینہ نچڑ رہا ہوتا ہے اور سواری تن کر بیٹھی رہتی ہے۔ میں تو کبھی سائیکل رکشا پر نہ بیٹھ سکوں۔ اس سے بہتر تو آدمی پیدل چل لے۔

"بے چارے رکشا چلانے والوں کا پھر کس نکل جاتا ہے۔ چار پیسے کمانے کے لیے آدمی کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"

سُنا ہے رکشا چلانے والوں کو اکثر بواسیر ہو جاتی ہے۔ بواسیر نہ ہو تو کیا ہو۔ بے چارے ٹانگیں کیسے چلاتے ہیں۔ سائیکل کی کاٹھی پر کولہے چھل جاتے ہیں۔

سواری تو بس تانگے کی ہے۔ شاہی سواری۔ تیری ماں کے زمانے کی بات ہے۔ ایک بار بالو زنڈی میری تانگے پر بیٹھ کر باہر نکلی۔ لوگ سڑک پر اوندھے جا کر گرنے لگے، تو ہی بتا..... ٹیکسی میں کبھی ایسے ہو سکتا ہے۔ اسکوٹر میں کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ شام کو جب سیر کر کے لوٹی تو بولی، چاچا! تیرے تانگے سے اُترنے کو جی نہیں چاہتا اور میری مٹھی میں دس کا نوٹ تھما کر چلی گئی۔

"تو بیٹا، باتیں کرتے کرتے ہم ٹھکانے پر آن پہنچے۔ میں تجھ سے باتیں نہ کروں تو میرا جی نہیں لگتا۔ باتیں تو میں تیری ماں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ بات ابھی میرے ہونٹوں پر ہوتی کہ وہ میرا مطلب جان لیتی۔ میرے اشارے کو سمجھ لیتی۔ میں اُداس ہوتا تو وہ اداس ہو جاتی۔ میں خوش تو وہ خوش۔ ایک بار میں بیمار پڑا، ایک دن، دو دن۔ اُس نے چارے کو منہ لگانا چھوڑ دیا۔ میں بھی اس پر جان دیتا تھا۔ مالش تیری بھی کرتا ہوں، مگر اس کی جیسی مالش ہوتی تھی کچھ نہ پوچھ۔ چھوٹو کی ماں کہا کرتی تھی کہ یہ گھوڑی نہیں، میری سوت ہے۔ ہمیشہ اسے سوت ہی کہہ کر بلاتی — چھوٹو کی ماں اور تیری ماں کی کبھی نہیں بنی۔

"دیکھ سامنے سواری آ رہی ہے۔ میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ آج تو تُم نہیں رہ پائے گا۔ دس دن

یہ فرنگی جو یہاں پہ ہیں، تو چاہے تو سال بھر کی روٹیاں بنا لیں! لے اس نے تو اشارہ کر کے ٹیکسی روک لی۔ ایک تو یہ ٹیکسی والے چین نہیں لینے دیتے۔ لیکن ٹیکسی سے میرا کوئی بیر نہیں۔ ٹیکسی کی سواری شریفانہ سواری ہے۔ ٹیکسی والے آدمی کے کپڑے بھی اچھی طرح اُتارتے ہیں۔ جو اس طرح اپنی کھال اُتروانا چاہے، بے شک ٹیکسی میں بیٹھے۔

اس نیم کے نیچے رُکتے ہیں جب تک کوئی سنتری نہیں آتا تو اس نیم تلے ستالے۔ سنتری بھی کیا کرے گا۔ چار پیسے اس کی مٹھی میں رکھ دیے۔ تو اس کا منھ بند ہو جائے گا۔ بڑے بڑے سنتری مہاجا نے دیکھ رکھے ہیں بیٹا! ہر کسی کا بھاڑا ہوتا ہے۔ بھاڑا چکایا چاہے کوئی دن دہاڑے ڈاکہ مار کر چلتا بنے۔ سنتری کی بات ہی کی، اور وہ سامنے آن دھمکا۔ آنے دو اسے۔ مہاجا نے کبھی نگوڑے سنتری کی پروا نہیں کی۔ لیکن بیٹا، تو نے یہ پاؤں کیوں ٹیڑھا رکھا ہوا ہے۔ کہیں تیرا نعل تو نہیں تجھے تنگ کر رہا ہے۔ لو، نعل تو تیرا اُتر ہی گیا ہے۔ پتہ نہیں کہاں پھینک آیا ہے۔ چل، پہلے تیرا نعل ہی لگوا لیں۔ نہیں تو تیرے کھُر میں چوٹ آ جائے گی۔ چل بیٹا تیرا نعل لگوا آئیں۔

"کیوں مہاجا، ہمیں دیکھ کر مونہہ موڑ لیا؟"

"نہیں حولدار جی۔ گھوڑے کا نعل پتہ نہیں کہاں گم ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا میری نگاہ پڑ گئی۔ نہیں تو بیچارے کا سُم ضرب کھا جاتا۔"

"یار، تو کبھی کام نہیں آیا۔ میں نے سوچا تھا تجھ سے کہوں گا کہ چونگی تک چھوڑ آ۔"

"ادھر ہی سے تو آ رہا ہوں حولدار جی۔ گھوڑا کس کی اور رکھنے کس کے۔ میں تو کبھی انکار نہ کرتا۔ اب تو میں اس کی نعل لگوانے جا رہا ہوں۔ صبح صبح ہی یہ فالتو خرچ آن پڑا ہے۔"

"نعل تو پہاڑ گنج ہی جا کر لگے گی۔ راستے میں مجھے بھی اُتار دینا۔ بیچ ہی میں تو تھانہ پڑتا ہے۔"

"تو پھر بیٹھ جاؤ سنتری جی۔ ہولے ہولے چلیں گے۔ کیوں کہ میرا گھوڑا آج کل ذرا ڈھیلا ہو رہا ہے۔ آج یونہی آپ ہی کی سہی۔"

"مہاجا، تو انگشت بازی سے باز نہیں آتا۔ اگر ہم بھی تیرے چالان سے یونہی کرتے ——— تو! ..... نیم کے نیچے اڈا بنا کر تو کھڑا ہوتا۔"

"اوہ .... بادشاہو! آپ تو ناراض ہی ہو گئے۔ میں آپ سے ٹھٹھا نہ کروں تو اور کس سے کروں؟ ان اسکوٹر والوں سے کروں گا جو ٹیڈی کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں؟"

"سب کو ہم نے سیدھا کر رکھا ہے۔"

"حولدار جی، یہ بتاؤ یہ ٹیکسی والے بھی کبھی آپ کے قابو آتے ہیں۔"

"میرے ہتھے جو بھی چڑھ جائے کپڑے اُتروا کر جاتا ہے۔ چاہے ٹیکسی والا ہو چاہے تانگے والا۔"

"تانگے والے تو بیچارے اب رہے ہی نہیں۔"

"ایک ہزار اور ٹیکسی کے لائسنس منظور ہوئے ہیں۔ دلّی شہر کے لیے۔ ہزاروں آدمی باہر سے اس میٹنگ کے لیے آ رہے ہیں۔ جن کے لیے کرزن روڈ پہ سات منزلہ عمارتیں بنی ہیں۔ اپنی تو ڈیوٹی کرزن روڈ پر لگی ہے۔"

"پھر تو چاندی ہی چاندی ہے آپ کی۔ ایک تو ننگی ٹانگیں دیکھو دوسرے ٹیکسی والوں کا چالان کرو۔"

"اپن کے لیے ٹیکسی تانگہ برابر ہے۔"

"مہاجا! ہمیں یہیں اُتار دے۔ میں سامنے چوکی تک پیدل چلا جاؤں گا۔"

"جیسی مرضی آپ کی۔"

"لیکن مہاجا، یہ تجھے ہو کیا گیا ہے۔ آج بیڑی تک نہیں پلائی تو نے؟"

"معاف کرنا حولدار جی۔ میری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ لو بیڑی پیو۔ آپ لوگوں کے لیے ہی تو ہے کر سکتے ہیں۔"

"اچھا مہاجا، خوش رہو۔ ہاں دیکھو سڑک پر تانگہ نہ کھڑا کیا کرو۔ آج کل، انسپکٹر لوگ چاروں طرف پھر رہے ہیں۔"

"دیکھا بیٹا، چڈّھی مُفت کی لے گیا۔ بیڑی بھی پی گیا اور احسان بھی رکھ گیا کہ نیم کے نیچے تانگہ نہ کھڑا کیا کرو۔ نیم کے نیچے نہیں تو کیا بیچ سڑک میں تانگہ کھڑا کرے کوئی؟ ٹیکسی والوں کے لیے اسٹینڈ بناتے ہیں، ٹیلی فون لگوا کر دیتے ہیں۔ تانگہ والوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اسی لیے نا کہ آج کل تانگہ میں بیٹھنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ تانگہ میں بیٹھنا لوگ اپنے وقت کو برباد کرنا سمجھتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں بیٹا، آج کل لوگ اتنا بھاگ بھاگ کر وقت بچاتے ہیں، تو پھر کیا کرتے ہیں اپنے وقت کا؟ سینما کا ٹکٹ لینے کے لیے گھنٹوں لائن میں لگے رہتے ہیں، ڈاک خانہ میں ٹکٹ لینے کے لیے لائن لگتی ہے۔ صبح دودھ لینے جاؤ لائن میں کھڑا ہونا پڑتا ہے، چھوٹے بڑے سب لائن میں لگتے ہیں۔ اِدھر وقت بچاتے ہیں، اُدھر لائن میں کھڑے ہو کر وقت کی بربادی کرتے ہیں۔ سارا دن دوڑتے ہیں۔ اور ساری شام ہوٹل و کلبوں میں بیٹھ کر وقت برباد کرتے ہیں۔ میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ شہر کی فکر قاضی کو۔ چل بیٹا۔ پہلوان کی دوکان آ گئی۔ تیرا نعل لگوا لیں۔

"سلام پہلوان جی۔"

"وعلیکم مہاجا!" کیوں میری بات سچی نکلی نا۔"

"پہلوان جی۔ آپ کو اُستاد جو مانا ہے۔ اس لیے تو بات آپ ہی کی سچی ہو گی۔"

"میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ ایک نعل اُکھڑتے ہی سارے نعل بدلوا لو۔"

"آپ کی مان لی پہلوان جی۔"

"آدمی کی عمر بندھی ہوتی ہے۔ ایک نعل گیا تو سمجھو باقی بھی سب جائیں گے۔"

"پچھلے ہفتے ایک اُترا، آج دوسرا اُتر گیا۔"

"اب باقی دو بھی نئے لگوا لو۔"

"سواری تو کوئی تانگہ کی طرف منھ نہیں دیتی۔

صرف نعل گھستے رہتے ہیں۔"
"ہماری بھی تو روزی چلانی ہے اللہ کو۔"
"ایک مہاجانے پتہ نہیں کیا لگا رکھا ہے۔ پروردگار کا۔"
"ارے مہاجا، تجھے کون سی پروا ہے۔ تیرا بیٹا جیتا رہے۔ تجھے کیا فکر!

کہتا تھا۔ "مہاجا تجھے کیا پروا ہے؟"—
مہاجا پھر اپنے گھوڑے سے باتیں کرنے لگا ہے —
"کیوں بیٹا مجھے پروا نہیں، آج کتنے دنوں سے تجھے مسالہ نہیں ملا۔ پہلوان نے نعل لگاتے لگاتے دوپہر کر دی۔ لیکن کام پکا کرتا ہے۔ مزا آجاتا ہے۔"
"لے بیٹا، سامنے بس کے اڈے پر کھڑی سواریوں کے پاس سے گزرتے ہیں۔ شاید کوئی اوب کر تیرے تانگے میں ہی آن بیٹھے۔ نعل لگوائی ہے، کھری ہو جائے شاید — نہیں — ٹس سے مس نہیں ہوتی سواری آج کل۔ یہ ہوائیں چاہے کھڑی کھڑی سوکھ جائیں، آنکھ اٹھا کر تانگے کی طرف دیکھیں گی بھی نہیں۔ اب مجھ سے آواز نہیں لگائی جاتی۔ گھنٹی تو میں نے بجائی تھی۔ تیری گھنٹی سن کر بھی جب کوئی نہیں آیا، تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ تو چلتا چل۔ گول مارکیٹ میں کبھی کبھی کوئی سواری مل جاتی ہے۔ اس وقت امیر لوگوں کی بیویاں سودا سلف خرید کر لوٹ رہی ہوتی ہیں۔ اکثر بنگالنیں رس گلوں اور گلاب جامنوں کے دونے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ جتنا میٹھا کھاتی ہیں، اتنا ہی میٹھا بولتی ہیں۔ جیسے کوئی مصری گھول رہا ہو۔ اس پیڑ کے نیچے مجھے ایک بار ایک بنگالن ملی — تو یہ تو یہ کتنی موٹی تھی۔ کوئی ڈھائی من کی لاش ہوگی، کہنے لگی کہ اشوک روڈ کی میں اٹھنی دوں گی۔ میں کبھی اس کی لاش کی طرف دیکھوں۔ کبھی اپنے تانگے کی طرف۔ اور وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔ میں تو ہمیشہ اٹھنی ہی دیتی ہوں۔ پھر میں نے اس سے دھیرے سے کہا۔ "بائی، میری گھوڑی سے آنکھ بچا کر چپکے سے بیٹھ جا۔ اس نے تانگے میں پاؤں ہی رکھا تھا کہ تانگہ اُلار ہو گیا اور مجھے سارا وقت بم پر ہی بیٹھنا پڑا۔ بم پر ٹنگا ٹنگا میں اشوک روڈ تک گیا۔ سواریوں کے لیے کبھی کبھی بڑی جان مارنی پڑتی ہے۔"
"لے، یہاں تو ہر پیڑ کے نیچے اسکوٹر کھڑے ہیں۔ اسکوٹر اور ٹوکریاں اٹھائے چھوکرے، چار پیسے دو اور کمبخت کو بس بھر پورے مہینے کا راشن اٹھا کر لے جاتے ہیں۔"
"بیٹا، یہاں تیری دال نہیں گلنے کی۔ وہ دیکھ سامنے سے سواری نکلی اور سیدھی اسکوٹر میں جا بیٹھی ہے۔ میٹر کا نمبر دیکھ رہا ہے۔ ایک طرح سے تو یہ لوگ سچے ہیں، میٹر دیکھا اور پیسے گن کر دے دیے۔ میٹر دیکھا اور چل دیے۔ تانگے والوں سے تو کتنی کتنی دیر لوگ بھاڑا طے کرتے ہیں۔
"چل بیٹا، یہاں سے چلتا بن۔ اپنے اڈے پر ہی چلتے ہیں۔ دیکھ ایک اور بابو نکلا ہے — اور اسکوٹر کو اشارہ کرکے بلا رہا ہے۔ تانگے میں بیٹھنا تو یہ لوگ اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ جہنم میں جائیں ہماری روزی تو کوئی نہیں مار سکتا۔ چل بیٹا اپنے اڈے کی طرف چلا چل۔
"میں بھاڑا طے کرنے کی بات کر رہا تھا۔ آج کل تو یہ بھی کسی کو نہیں آتا۔ بات کرتے ہیں جیسے کوئی لٹھ مار رہا ہو۔ ڈیڑھ روپیہ ملے گا۔ چلنا ہے تو چلو۔ کوئی بات بھی ہوئی، ان دنوں جسے ڈیڑھ روپیہ دینا ہوتا وہ ایک سے شروع کرتا، ہمیں بھی پتہ ہوتا تھا کہ اُسے آخر ڈیڑھ روپیہ تک دینا ہے۔ ہم دو روپیہ سے بات چلاتے، اور پھر کرتے کرتے فیصلہ ڈیڑھ روپیہ پر ہو جاتا، اور یوں اُدھر ایک روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ تک چڑھتے ہیں اور ادھر دو روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ تک آنے میں زمانے بھر کی باتیں ہوتیں۔ منڈی کے بھاؤ، اخباروں میں چھپی خبریں، موسم کا حال، ہندو مسلم اتحاد کا ذکر، بھاؤ طے کرنے کے بھی لوگوں کے الگ الگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ کئی سواریاں تو اپنی جگہ کھڑی دور سے ہی بات کرتی ہیں۔ کئی تانگے کے پاس آکر، چھت کی کمان پکڑ کر بات کرتی ہیں۔ کئی تانگے کی سیٹ پر بیٹھ کر بھاڑا طے کرتی ہیں۔ کئی تانگہ چلنے پر سودا شروع کرتے ہیں۔ کئی ٹھکانے پر پہنچ کر اپنی من مرضی کے پیسے تانگے والے کی ہتھیلی پر رکھتے ہیں اور پھر پانچ پانچ دس دس پیسے جیب سے نکالتے جاتے ہیں۔ تانگے والے کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ چار پیسے زیادہ بٹور لے سواری کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ چار پیسے بچا لے۔
"کیوں بیٹا، پانی پیو گے؟ تجھے پیاس لگ رہی ہوگی۔ آج کل حوض ڈھونڈنے کے لیے بھی کوسوں بھر چکر لگانا پڑتا ہے، پہلے تو ہر سڑک پر، ہر کونے میں حوض بنے رہتے تھے۔ انگریزوں کے راج میں تو تانگے والوں کے لیے کوارٹر بھی بنے تھے۔ سب کے لیے نہ سہی، پر انگریز کو ہماری فکر تو تھی، اب تو تانگے کی کوئی پوچھ ہی نہیں۔ ان اسکوٹر والوں نے ستیاناس کر دیا ہے۔ راولپنڈی کے بھاپے، موج میں آجائیں تو سواری کو مفت بٹھا کر لے جاتے ہیں اور راستے میں پرائی عورت سے میٹھی میٹھی باتیں کر لیتے ہیں یا پھر سامان اتار رہی سواری کی کوئی چیز کھسکا لیں گے۔"
اللہ جھوٹ نہ بلوائے مہاجانے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ایک سواری نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ میری پچھلی سیٹ پر چھوڑ گئی تھی۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ اگلی فجر کو پہلی بات۔ میں نے اس کا بٹوا اُسے جا لوٹایا۔ بابو جیسے گھوڑا بیچ کر سو رہا تھا۔ یہ جان کر کہ اس کا بٹوہ گم ہو گیا ہے، بابو کو غش آگیا تھا۔ بابو سامنے بے ہوش پڑا تھا اور میری ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ ایک مولانا اپنی صندوقچی میرے تانگے میں بھول گئے۔ اس کی بیٹی کا بیاہ ہو رہا تھا نئے کپڑے کے تھان، آٹے دال کی بوریاں، جہیز کے برتن، کٹورے، لوٹے اور تھالیاں سارا سامان اتار کر لے گئے۔ بس گہنوں کی صندوقچی چھوڑ گئے۔ رات ہی رات جا کر میں نے صندوقچی ان کے حوالے کی۔ میں نے سوچا جب مولانا کو پتہ چلے گا کہ گہنوں کی صندوقچی وہ کھو بیٹھے ہیں، تو ان کے گھر کہرام مچ جائے گا اور وہی بات ہوئی۔ جب میں

اب کے یہاں پہنچا تو وہاں ماتم چھایا ہوا تھا۔ مولا کے دست چھوٹ رہے۔ اور تو اور ایک بار ایک کرانٹن میرے تانگے میں بیٹھی۔ شام کا وقت تھا۔ ڈھیر سارے اس کے بچے تھے۔ پلوں کی طرح چوں چوں کر رہے تھے۔ تانگے میں بیٹھتے ہی کرانٹن نے گود کے بچے کو اگلی سیٹ پر سلا دیا۔ اترتے وقت اپنے سارے بچوں کو لے گئی۔ پر گود والے بچے کو بھول کر چلی گئی۔ میں نے تانگے سے اتر کر پیسے لیے اور پھر پان بیڑی لینے سامنے پوربیا کے ہاں جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر پان کھا کر بیڑی پیتا رہا۔ جب لوٹا تو دیکھا کہ کرانٹن کا بچہ مزے سے اگلی سیٹ پر سویا ہوا تھا۔

لے بیٹیا باتیں کرتے کرتے ہم اڈے پر آن پہنچے۔ سواری بس آئی کہ اب آئی۔ اتنی دیر تو چارے میں ذرا منھ مارلے مسالہ آج شام سے پہلے پہلے تجھے ضرور کھلانا ہے۔ یہ وعدہ ہے۔ مرد کی زبان ہوتی ہے، تو گھاس میں منھ مارلے، تجھے بھوک لگی ہوگی تیسرا پہر ہونے کو ہے۔ میں تب تک بیڑی پی لیتا ہوں۔

"...... نہیں کوئی سواری آئی۔ بیٹھے بیٹھے شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ آج کل موسم ہی کچھ ایسا ہے۔ گرمی جا رہی ہے۔ جاڑا ابھی آیا نہیں — نیند بہت آتی ہے۔ چاہے کوئی سواری آئی ہی ہو — اور مجھے سوتا دیکھ کر نکل گئی ہو۔ ضرور کوئی سواری آئی ہوگی — اتنی دیر ہمیں انتظار کرتے ہو گئی۔ سواری ضرور آئی ہوگی!"

"اگر پہلے آئی تھی تو اب بھی آئے گی۔ دیکھ سامنے کچہری میں سے کئی لوگ نکلے ہیں، تانگے کی سواریاں لگتی ہیں۔ سالم تانگہ کریں گے۔ یہ تو شاہدرہ یا مہرولی کی سواریاں ہیں۔ ایک چکر اور سمجھ کہ سارے دن کی بوہنی نکل آئی۔ سنار کی کھٹ کھٹ اور لوہار کی ایک ہی چوٹ۔ لو یہ تو بس کے اڈے کی طرف ہو لیے اور بس بھی سامنے آ رکی ہے۔ دوڑ کر بس میں جا بیٹھے ہیں۔ کیسے سواریاں لدی ہوئی ہیں۔ بس میں آدمی پر آدمی چڑھا ہوا ہے، لیکن یہ لوگ بس میں ضرور بیٹھیں گے۔

میں کہتا ہوں اتنے پیسے مجھے دیتے تو میں آرام سے ٹھکانے پر پہنچا آتا۔ بس تو اڈے سے لیتی ہے اور اڈے پر چھوڑ دیتی ہے۔ تانگہ تو تنگ سے تنگ گلی میں چلا جاتا ہے۔ سواری کو گھر کے سامنے جا کر اتارتا ہے۔"

"...... کھڑے کھڑے تم اوب گئے ہو، بیٹا؟ تم بھی سچے ہو۔ پرچھائیاں ڈھل رہی ہیں۔ آج بھی کوئی سواری نہیں آئی — کالے لوگ آج کل تانگہ میں نہیں بیٹھتے۔ کوئی گوری چمڑی والا ہی آئے گا اور ساری کسر پوری کر دے گا۔"

"دیکھا تو نے یہ بسیں کیسے دھواں چھوڑتی ہیں؟ جیسے کہ پچکاری چھوڑ کر گئی ہو۔ بیٹا! تیری ماں نے کبھی کالی سڑک پر لید نہیں کی تھی۔ تانگے کی ان بے قدروں کو کیا خبر؟ میں اب کسی کالے آدمی کو اپنے تانگے میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔ کوئی کالا آدمی اس تانگے میں نہیں بیٹھ سکے گا۔

"پرچھائیاں ڈھل رہی ہیں۔"

"آج میں تھکا تھکا کیوں لگ رہا ہوں بیٹا! تم بھی مجھے اداس اداس لگ رہے ہو۔ کھڑے کھڑے تمہاری ٹانگیں دکھنے لگی ہوں گی؟ چلتے چلتے، دوڑتے دوڑتے کوئی اتنا نہیں تھکتا۔ جتنا کھڑے کھڑے انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ تم سوچ رہے ہو بیٹا کہ میں بیڑی پر بیڑی پیے جا رہا ہوں۔ یہ بری لت مجھے لگی ہوئی ہے، لیکن میں باقی کوچوانوں کی طرح سلفہ تو نہیں پیتا۔ گانجا تو نہیں پیتا۔ تجھے پتہ ہے کہ تانگے والے کیا کیا نشہ کرتے ہیں۔ تجھ سے کون سی بات چھپی ہے؟ میں نے کبھی بھانگ کو نہیں چھوا، دارو کو منھ نہیں لگایا، افیم سے مجھے نفرت ہے۔ بس ایک بیڑی پیتا ہوں۔ وہ سب سے سستی۔ جو بھی سستی بیڑی بازار میں آتی ہے وہی پینا شروع کر دیتا ہوں۔ پہلوان کہہ رہا تھا کہ اس بیڑی میں گھوڑے کی لید بھری ہوتی ہے۔ ہوتی رہے گھوڑے کی لید تانگے والے نہیں پیئیں گے تو اور کون پیے گا۔ ٹیکسی والے تو دارو پیتے ہیں، جس میں بکرے کا خون نچوڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے بھی دارو پیا تھا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ بس ایک ہی بار۔ تب میں جوان تھا۔ نوجوان لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک دن میں نے بوتل چڑھائی تھی۔ تیری ماں کے زمانے کی بات ہے بٹیا۔ خود بھی چسکی لگائی تھی اور روئی کے پھاہے سے تیری ماں کے نتھنوں کو بھی گیلا کیا تھا۔ پہلے تو جیسے وہ بدک ہی گئی۔ پھر نشے میں اس نے آنکھیں موند لیں۔ تیری ماں کی کیا بات تھی۔ اپنے مالک کی رضا میں راضی۔

"لو پرچھائیاں بھی ڈھل گئیں۔ آج کل ادھر پرچھائیاں ڈھلتی ہیں ادھر رات ہو جاتی ہے۔ بتی کی فکر کر دوں؟ تیل تو ابھی کل ہی میں نے ڈلوایا تھا۔ جب سواری آئے تو بتی جلانے میں وقت برباد ہوتا ہے۔ سواری اور موت کا کچھ پتہ نہیں؟ کب آ جائے۔

"دیکھ سواری آ رہی ہے!"

"نہیں۔ ٹیکسی والے نے اسے اڑا لیا۔"

"وہ میم آئے گی!

"نہیں، اسے تو پیچھے سے آ رہے صاحب" نے اپنی کار میں بٹھا لیا۔

"ہجوم در ہجوم سامنے گیٹ سے نکل رہے ہیں۔ ہر کوئی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتا ہے یا ان کی اپنی موٹریں انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔"

"وہ آئیں گے۔ ماں بیٹے اکیلے نکلے ہیں۔ ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

"نہیں، انہوں نے تو اسکوٹر روک لیا ہے گورے بھی آج کل کنگال ہو رہے ہیں۔

جب منھ اٹھا کر انتظار کرو تو سواری کبھی نہیں آتی۔

بیٹا آج تو اداس ہے۔ آج تو خفا خفا سا لگتا ہے۔ روہانسا روہانسا —! تجھے مسالہ ضرور کھلانا ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے، آج تجھے مسالہ......"

"لے سواریاں آ بیٹھی ہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ ادھر دیکھنا بند کروں گا تو سواری آ جائے گی۔"

"چل بیٹیا —!"

"کیوں صاحب، کناٹ پلیس؟"

"نہیں، ہمیں تو دھی گارڈن جانا ہے!"

"چل بیٹا! اڑ کر لے چل صاحب کو....

....

"ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ بے شک مزے مزے سے چل، تانگے والے۔ صاحب تو بولی نہیں جانتا تھا۔ اس کے ساتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی لڑکی تانگے والے کو ہدایت دے رہی تھی۔"

" تانگہ ابھی چار قدم ہی چلا ہوگا کہ تانگے والے نے مڑ کر سواریوں کی طرف دیکھا۔ یوں اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اُسے لگا جیسے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔

نہیں آج کل، کٹے بال، سب لڑکیاں ایک جیسی لگتی ہیں، ہونٹوں پہ ایک جیسی سرخی، گالوں پہ ایک جیسی لالی۔ گھوڑا اڈے پہ کھڑا تھا۔ یہ صبح سے پہلی سواری آئی تھی۔ اندھیرا تھا تو کیا؟ تانگہ اپنی پوری شان سے گھنٹی بجاتا ہوا تیز ہو رہا تھا۔

"بھئی تانگے والے بھائی، ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے رات اپنی ہے...."

یہ آواز تو اس کی پہچانی ہوئی تھی۔ تانگے والے نے کنکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ فرنگی نے اُسے اپنی بانہوں میں بھینچا ہوا تھا۔ کجراری آنکھیں ترچھی بھنویں، گالوں پہ زلفوں کے سوالیہ نشان!

مہاجا سوچتا یہ آواز تو اس کی پہچانی ہوئی تھی۔

اور پھر وہ چونک گیا۔ ہائے اللہ! کہیں یہ رائے صاحب کی بیٹی تو نہیں ہے۔ اتنے میں وہ لڑکی بولی ——" تانگے والے بھائی تانگہ بے شک آرام سے چلاؤ —— ہمیں تانگہ ساری رات رکھنا ہے۔ جو مانگو گے سو کرایہ ملے گا۔"

یہ تو وہی ہے اور تانگے والے کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی۔ مہاجا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور کانپتے ہونٹوں سے اس نے لڑکی سے پوچھا —— بیٹی، تم دہلی کی رہنے والی ہو؟

"ہاں تو!"

"ہیلی روڈ میں تو نہیں رہتے؟"

" ہاں تو!"

" تم رائے صاحب کشوری لال کی.... ؟"

" ہاں، میں رائے صاحب کی بیٹی ہوں۔"

شراب میں بدمست لڑکی اپنے انگریز ساتھی کا سگریٹ لے کر کش لگا رہی تھی۔ مہاجا نے لگام کھینچ کر تانگہ ایک دم روک لیا۔

" آپ اُتر جائیے تانگے میں سے۔"

" کیوں؟"

" شرافت اسی میں ہے کہ آپ اُتر جائیں میرے تانگے میں سے۔" مہاجا کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

" اس ویران سڑک پر ——؟"

" میں کہتا ہوں میں تمہیں اپنے تانگے میں نہیں لے جاؤں گا۔"

اور اس سے پہلے کہ مہاجا کچھ اور بولتا وہ لڑکی اپنے انگریز ساتھی کے ساتھ گٹ مٹ کرتی ہوئی تانگے میں سے اُتر گئی۔ بانہوں میں بانہہ ڈالے وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ دیر، اور اندھیرے میں ان دونوں کے بُت کھو گئے۔

مہاجا کتنی دیر ویسے کا ویسا بھونچکا سا اندھیرے میں اس طرف دیکھتا رہا۔ پھر گھوڑے کی باگ موڑ کر اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

مہاجا پھر اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا ہے:

" بیٹا، تجھے معلوم ہے کہ یہ لڑکی کون تھی؟"

" تجھے کیا معلوم! تیری ماں ہوتی تو ایک دم پہچان جاتی۔ رائے صاحب کشوری لال کی بیٹی —— پولیس کپتان ہوتے تھے۔ اسے میں اسکول لے جایا کرتا تھا۔ صبح اسکول چھوڑ آتا، شام کو لے آتا۔ اسکول بھی کون سا نزدیک تھا۔ برلا مندر والے اسکول میں یہ پڑھتی تھی۔ کچی کونپل سی۔ مجال ہے ایک سے دوسری بات کر جائے۔ کبھی آنکھ اُٹھا کر اس نے آگے یا پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو رائے صاحب نے کہا۔ "مہاجا تو تانگے میں پردہ لگوا لے"۔ میں نے کہا "رائے صاحب! کس کی مجال جو مہاجا کے تانگے کی طرف آنکھ اُٹھائے۔

" ہائے کمبخت یہ شکنتلا تھی۔"

" زمانے کو کیا سے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آگ لگ گئی ہے۔ آگ لگ گئی ہے...."

اور یوں تڑپتے ہوئے مہاجا نے تانگے کو اپنے ڈیرے پر لا کھڑا کیا۔ خالی ہاتھ۔ بھوکا پیاسا۔

" بیٹا آج بھی وعدہ پورا نہیں ہوا۔ آج بھی مہاجا کو جھوٹا ہونا پڑا۔ گھوڑے کا ساز اُتارتے ہوئے مہاجا نے اپنا ہاتھ گھوڑے کے دانتوں میں دے دیا۔

اور گھوڑا آہستہ آہستہ اپنے مالک کا ہاتھ چاٹنے لگا۔

(ترجمہ: از مصنف)

بقیہ: گائے کا مالک

آٹے کا پیڑا! منگلوار! کیا آج منگلوار نہیں؟ موہنا اُس کا مالک نہیں؟.... اُس کا کوئی مالک نہیں؟

کپیلا کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو ایک متحرک شے کا گمان ہوا۔ شاید موہنا آگیا ہے.... اپنی مرتی ہوئی گائے کے جسم پہ ایک بار ہاتھ پھیرنے کے لیے آگیا ہے۔

اُس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے پہچاننے کی کوشش کی۔ کوئی چھو رہا تھا.... بہت نرم.... مشفقانہ.... موہنا کے ہاتھوں سے بھی نرم... اور اس نے آنکھوں سے گرتی پانی کی آخری بوند سے پہچانا۔ اُس کا بچھڑا پتہ نہیں کیسے وہاں آ پہنچا تھا اور اپنی زبان سے اپنی مرتی ہوئی ماں کا جسم چاٹ رہا تھا۔

(ترجمہ: نریندر شیل)

بوٹا سنگھ

سرداری

حویلی گاؤں کے بیچوں بیچ تھی اور چوک والے کنوئیں کے پاس جہاں تمام گاؤں پانی بھرنے آتا تھا۔ کنوئیں سے تھوڑی دوری پر ایک بڑا سا پیپل کا پیڑ تھا جسے گاؤں والے برہمنوں کا پیپل کہتے تھے۔ یہ کنواں اور پیپل بھی کبھی اس حویلی کی شان تھے۔ کوئی وقت تھا جب یہ حویلی ذیلداروں کی حویلی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ پھر نمبرداروں کی حویلی بن گئی۔ اب اس حویلی کے یہ دونوں نام مٹتے جارہے ہیں۔ کبھی کبھی لوگ اسے 'شاہوکاروں' کی حویلی بھی کہتے تھے۔

نام ہوتے ہیں شخصیتوں کے تعلق سے، جن کے قدموں سے دھرتی تھرا جاتی ہے، نیچی ہو جاتی ہے۔ جب وہ ذیلدار اور نمبردار ہی نہ رہے تو لوگوں کا پرانے ناموں کو بھول جانا کوئی ایسی بات نہیں۔ کنوئیں کی منڈیر کی اینٹیں، رسیوں سے گھستے گھستے جیسے بدشکل اور پیلے پن کا شکار ہو جاتی ہیں، ویسے ہی حویلی کے درخشاں ناموں پر بھی مٹی کی تہیں جمتی چلی جاتی ہیں۔

شاہوکاروں کی حویلی؟

ارے جب کبھی شاہوکار ہوئے ہیں، خربوزے کی پھانکوں کی طرح تمام گھر پھٹ گیا ہے اور باقی بچی ہے شاہوکاری صرف تین مکانوں کے ساتھ۔ مانگنے نکلے فقیر کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ حویلی میں آباد تینوں گھروں میں سے کسی ایک سے بھی کچھ ملے گا کہ نہیں۔ بڑے آئے شاہوکار!

نام:	بوٹا سنگھ
ولادت:	۱۹۱۸ء
وفات:	۱۹۸۳ء
تصانیف	اسی کون ہاں، اقرار بدھے چھین، جیوندا آدمی، راتاں کالیاں (ناول) سپنیاں دی شام، میریاں سریشٹھ کہانیاں (افسانوی مجموعے)

پرانے لوگ جانتے تھے، کبھی حویلی کی تمام گاؤں پر ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ اب تین بھائی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ وہ ایک ہی دالان میں رہتے ہیں۔ لیکن سبھی منہ پھلائے رہتے ہیں۔ تمام زمین تقسیم ہو چکی ہے۔ مویشی بانٹے جا چکے ہیں۔ بستر اور چادریں بھی تقسیم ہو چکی ہیں۔ کسی دن دالان میں دیواریں بھی کھڑی ہو جائیں گی ــ اور رہ جائے گی تین مکانوں میں بٹی شاہوکاروں کی حویلی!

چھوٹے، اچھر سنگھ اور سادھو سنگھ کی بیویوں نے پوری کوشش کی تھی کہ پوری زمین اور برتن کپڑا تقسیم ہو چکا ہے۔ ان چار کوٹھریوں کی تقسیم سے خدائی قہر نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ روز روز کا جھگڑا ختم کرو۔ زبان تک تو سانجھی نہیں رہی۔ ان چار پرانی اینٹوں میں سانجھ کیسی!

سبھی کے لڑکے جوان ہو چلے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن سانجھے کھونٹے پر بھینس باندھنے پر سر پھٹ جائیں اور فساد ہو جائے۔ بول چال تو پہلے ہی ختم ہے۔ اب کیا سانجھ! کیسی سانجھ!

چھوٹی دونوں منہ جوڑ کر باتیں کرتیں۔ لیکن نہ ہی انھیں اور نہ ان کے شوہروں (اچھر سنگھ اور سادھو سنگھ) کو اس کی ہمت پڑتی کہ بڑی بھابی تیج کور کے سامنے کچھ کہہ سکیں۔

تیج کور گھر کی بڑی بہو تھی۔ اونچی لمبی، دوہرا

بدن، گندمی رنگ۔ جب جوش میں آتی، بھرے بھرے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر سچی و سمت بات کرتی تو بڑے بڑے شیروں کے دل کانپ جاتے۔ کسی کو کوئی جواب نہ سوجھتا۔ وہ بڑی تھی۔ دونوں دیور اسے بھابی کہہ کر بلاتے تھے۔ لیکن باقی پورا گاؤں آہستہ آہستہ اسے تیج کور کہنے لگا۔ اس کے پاس گاؤں کا کوئی نہ کوئی جھگڑا آتا ہی رہتا۔ گاؤں کے کمین تو ایک طرف رہے، اپنی برادری کی بہوؤں اور ساسوں کے جھگڑے بھی وہی نمٹاتی۔ روتے آتے، ہنستے اور خوش خوش جاتے۔

چھوٹے دونوں بھائیوں کے دلوں میں ایک جھجک تھی۔ بھئی ماں جیسی بھابی کے سامنے کیسے کھڑے ہوں؟ اپنے ہاتھوں سے اس نے ان کی شادیاں کیں۔ ڈولیاں لائی۔ صدقے اتارے، پانی وارے۔ اب کیسے چھوٹی سی بات سے انکار کر دیں۔ سب کچھ تقسیم ہو گیا ہے۔ باقی رہ گئی ہے حویلی۔

تیج کور کی دیورانیوں سے کوئی بات چیت نہیں تھی۔ کوئی بچہ کوئی چیز مانگتا۔ اس کے منہ پر تھپڑ پڑتا۔ ہمیں تائی کے گھر سے کوئی چیز نہیں لینی ہے۔ ہمارا تو مرنے جینے کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ مرد ایسے نصیب ہوئے ہیں جیسے رضائیاں، بھابی سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کوا گلیل سے۔ معلوم نہیں، چار اینٹوں کا بٹوارہ پرماتما کب کرے گا۔

مہینے گزر جاتے ہیں ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے بات کیے ہوئے، جبکہ حویلی سانجھی تھی۔

تیج کور کی ایک ہی بات تھی۔ زمین تقسیم ہو گئی۔ مویشی بٹ گئے۔ لیکن میرے جیتے ہوئے حویلی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ذیلداروں کی حویلی، نمبرداروں کی حویلی، شاہوکاروں کی حویلی گوپال سنگھ، سادھو سنگھ اور اچھر سنگھ کے مکان نہیں بن سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ قلعے جیسی حویلی ہے۔ دو بیری کے درخت ہیں۔ ایک شہتوت کا، ایک پیپل کا۔ جہاں تمہاری مرضی ہو، چارپائیاں ڈالو، جہاں تم چاہو، اپنے مویشی باندھو۔ لیکن حویلی کی تقسیم میری موت کے بعد ہوگی۔

میری گردن پر کلہاڑی چلا کر ہی کوئی درمیان میں دیوار کھڑی کرے گا۔ اگر تم سندھوؤں کے بیٹے ہو تو میں گل سرداروں کی بیٹی ہوں جو گردن اتارتے وقت بالکل خیال نہیں کرتے کہ سامنے بھتیجا ہے یا بھانجا۔

تیج کور کو یاد آ رہا تھا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو تائے اور چاچے کے بیٹوں میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ ایسی لاٹھی چلی کہ دونوں گھرانوں کے کتنے ہی آدمی زخمی ہو کر سرکاری اسپتال میں جا پڑے۔ اسپتال ایک اور زخمی دو گھرانوں کے۔ اس کے منجھلے بھائی سرجیت سنگھ کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ایک بازو۔ کئی لوگوں کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ لیکن اس کی ماں نے ذرا بھی افسوس نہیں کیا تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ ٹانگیں اور بازو تڑوا کر بھی لوگ بچ گئے تھے۔ اگر ایک آدھ قتل ہو جاتا تو پھر وہ کیا کرتی؟

بے بے رادھو کہار کی بہنگی پر دودھ کی گاگریں اور گھی کے کنستر رکھوا کر اسپتال لے گئی تھی۔ دونوں گھرانوں کی چارپائیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔ بے بے نے دودھ گرم کروا کے اور اس میں گھی ڈال کر پہلے تاؤ کے لڑکوں کو پلایا تھا۔ اور کہا — "اٹھو میرے شیرو، دودھ گھی پی کر طاقتور بنو۔ ابھی کون سی بات ختم ہو گئی ہے — جب تک دو چار بیوہ نہیں ہوتیں — یہ جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔" بے بے تاؤ کے لڑکوں شبدیو سنگھ اور ہرہنس سنگھ کو دودھ پلاتی اور سینے سے لگا لیتی — اور آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے کہتی۔ "شبو گدھیا — ماں سے کہو کہ تمہیں دودھ گھی پلائے، تم تو لاٹھیوں کو کھا کر اسپتال میں پڑے ہو۔" بے بے شبو کو اپنے سینے سے زور سے لگاتی اور باتیں کرتی جاتی۔ چاچے تاؤ کے بیٹے آمنے سامنے چارپائیوں پر پڑے، بے بے کی باتیں سنتے خاموش پڑے رہتے اور کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ اس کی بات کا جواب دیتا۔

"میں بھی اسی کی بیٹی ہوں۔ اچھر سنگھ اور سادھو سنگھ جی — تم عورتوں کے کہنے پر حویلی کے ٹکڑے کرو۔ لیکن یاد رکھنا کہ گرتی ہوئی ہر اینٹ کے ساتھ میرے جسم کا ایک ایک انگ بھی ضرور گرے گا۔"

شیرنی کے سامنے کون آتا؟ سارے اپنے اپنے کاموں میں مصروف خاموشی سے دن کاٹ رہے تھے۔

سب سے چھوٹے سادھو سنگھ کے دماغ میں ایک بات گھر کر گئی تھی کہ تین بیٹے ہیں اور تینوں اونچی جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی کوئی نہیں ہے۔ بیٹوں والا انسان تو بادشاہ ہوتا ہے۔ مجھے اس بوسیدہ حویلی کو چاٹنا ہے سنبھال لے، تمام نفع و نقصان، یہ بڑے رسالو کی بیٹی۔

سادھو سنگھ کا سب سے بڑا شوق تھا خوبصورت بیلوں کی جوڑیاں رکھنے کا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، لائق بیٹے اور خوبصورت بیلوں کی جوڑیاں تو جاٹ کی حویلی کا شنگار ہوتے ہیں۔ زمین تو سب کے پاس ہوتی ہے۔ کسی کے پاس تھوڑی کسی کے پاس زیادہ۔

سادھو سنگھ کے پاس نگوری بیلوں کی جوڑی تھی۔ اونچے جسم، لمبے سینگ اور چمکتے گورے بدن۔ شادیوں کے دنوں میں سادھو سنگھ کو بیگار پڑی ہی رہتی تھی۔ سجی سنواری بیل گاڑی میں نئی دلہن کو لے کر جانا ہوتا تو بیل گاڑی کے سامنے جتے ہوئے سادھو سنگھ کے نگوری بیل، جن کی پیٹھ پر کاڑھی ہوئی جھولیں جھولتیں۔ انھیں دیکھ کر لوگ نئی دلہن کو دیکھنا بھول جاتے۔

وہ اکثر سوچا کرتا۔ اگر ایک جوڑی کا اور انتظام ہو جاتا تو سارا کام آسانی سے ہو جاتا۔ کسی کو انکار نہ کرنا پڑے۔ ساتھ ہی حویلی میں رونق لگی رہی۔

نئی جوڑی کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے سادھو سنگھ کو کئی مہینے گزر گئے تھے۔ ایک دن ساہیوال نسل کا سرخی مائل بھورے رنگ کا ایک بچھڑا لے آیا۔ بچھڑا صرف سال سوا سال کی عمر کا تھا۔ گھر کی دولت سا، چمکتا رنگ، چاروں کھر دودھ سے دھلے سے، — ماتھے پر پھول سا، گٹھا ہوا جسم، جسے حویلی کے کھونٹے پر بندھا ہوا دیکھ کر سادھو سنگھ کا دل

خوشی سے کھل اٹھتا۔ وہ اندر سے گڑ کی بھیلی لے آتا۔ اس کے ٹکڑے کرتا، بچھڑے کے منہ میں دیتا۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا، "قربان جاؤں، تجھے جنم دینے والی پر۔"

تیج کور نے اپنی دہلیز پر کھڑے ہوکر بچھڑے کو گڑ کھلاتے سادھو سنگھ کو دیکھا۔ اس کا دل چاہا کہ چھوٹے بھائی جیسے دیور کو جسے خود پالا، بڑا کیا ہے، اسے مبارکباد دے۔ گھروں میں جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر ایسا سوچتی رہی۔ لیکن اس کے پاؤں آگے نہیں بڑھے بلکہ اس نے دل میں یہ سوچ لیا کہ یہ تو بے وقوف آدمی ہے۔ ایک بچھڑے کو کیا کرے گا۔ خواہ مخواہ اسے لاکر اس نے فضول کا خرچ بڑھا لیا ہے۔

تیج کور کے بڑے بیٹے کا سالا شنگارہ سنگھ آیا ہوا تھا۔ وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔ بولا "موسی، خاموش کیوں کھڑی ہو؟"

"شنگاریا، سادھو سنگھ بچھڑا لے آیا ہے۔ دالان میں رونق و بہار آگئی ہے۔ ذرا جوان ہو جائے۔ پھر دیکھنا بچھڑے کا روپ رنگ۔" یہ کہتے ہی تیج کور اندر چلی گئی۔ اور شنگارہ سوچنے لگا۔ بی بی پہلے تو کہتی تھی کہ چاچے کے گھر نہ جانا۔ ہماری ان سے بول چال نہیں ہے۔ اگر بے بے نے کہیں دیکھ لیا تو وہ لڑنے لگے گی۔ لیکن بی بی تو دیور کا بچھڑا دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی۔ ایسے لگتا ہے، جیسے اس نے خود بچھڑے کو لاکر کھونٹے پر باندھ دیا ہو۔

شنگارے کو بچھڑا بڑا پیارا لگا۔ لاکھ جیسا رنگ، جو گردن کے نیچے تھوڑا سیاہی مائل معلوم ہوتا تھا۔ ماتھے پر پھول سا، چاروں کُھر دودھ سے دُھلے ہوئے۔

"موساجی، ماتھا ٹیکتا ہوں۔" بری کے نیچے چارپائی پر بیٹھے سادھو سنگھ کے پاس شنگارے نے کہا۔

"آؤ بھئی ورک سردار، کیسے حال چال ہیں۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔ کب آئے ہو؟"

"پرسوں آیا تھا، موساجی۔ آپ کے بچھڑے کی پورے گاؤں میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ آپ نے جیسے قلعہ سر کرلیا ہو۔ بڑی موسی کہتی تھی دالان میں رونق و بہار آگئی ہے۔" بچھڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شنگارے نے کہا۔

شنگارے کے پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے سے بچھڑے کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تو سادھو سنگھ نے کہا، "جھجکتے کیوں ہو، ہم بھی اسی خاندان کے لوگ ہیں۔"

شنگارے نے بچھڑے کی پیٹھ کو سہلایا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرا، پونچھ کو سیدھا کرکے کھینچا تو بچھڑے نے محسوس کیا۔ کہ گھر کا آدمی ہے۔ کوئی بیگانہ نہیں۔

سادھو سنگھ بچھڑے کی بڑی خدمت کرتا۔ دن میں پانچ چھ بار اس کے گرد چکر کاٹتا۔ کتنی کتنی دیر چارپائی پر بیٹھا سادھو سنگھ بچھڑے کے ساتھ پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا رہتا۔ تو شنگارہ بھی آجاتا، وہ بھی بچھڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ اپنی ہتھیلی اسے سونگھاتا رہتا۔ اور عجیب سی نظر سے بچھڑے کو دیکھتا رہتا۔

خدا کے حکم سے بارش کی چند بوندیں آپڑیں۔ بھاگ دوڑ مچ گئی اور ساتھ ہی معمولی سی ٹھنڈک ہوگئی۔ سادھو سنگھ چارپائی اندر لے گیا۔ اور پھر گرمی کی وجہ سے گہری نیند میں سو گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بچھڑا کھونٹے پر نہیں تھا۔ سادھو سنگھ کی جان نکل گئی۔ پھر سوچا۔ شاید کھل کر باہر نکل گیا ہو۔ لیکن حویلی کا بیرونی بڑا دروازہ تو اس نے خود بند کیا تھا۔ اور پھر وہ سویا تھا اور ارل (دروازے کے پیچھے والی لکڑی) بھی اس نے چڑھا دی تھی۔

سادھو سنگھ حویلی سے باہر نکل گیا۔ بڑی دوڑ بھاگ کی لیکن بچھڑے کا کچھ پتہ نہ چلا جیسے جیسے دن چڑھتا گیا، دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ سادھو سنگھ کی بدنامی بھی بڑھتی گئی۔ حویلی میں شور و غل سنائی دینے لگا کہ بچھڑا چوری ہوگیا ہے۔ گاؤں کے لوگ منہ جوڑ کر باتیں کرتے۔ شاہوں کے گھر چوری ہوگئی ہے لیکن بچھڑے کے علاوہ سوئی سلائی تک کا نقصان نہیں ہوا ہے۔ چور صرف بچھڑا ہی کھول کر لے گئے ہیں۔

جب بھابی تیج کور کو پتہ چلا تو وہ بھڑک کر تیزی سے باہر نکلی۔ دالان میں اوندھی ڈلے سادھو سنگھ کو بیٹھا دیکھ کر اس کے کندھے کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "سادھیا، کیا ہوگیا؟"

"بھابی بچھڑا چوری ہوگیا۔" سادھو سنگھ نے تیج کور کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں مرے پڑے تھے؟..... بڑے سندھو سردار۔ جلاہوں سے بھی بدتر۔ تیرے پاس پڑے ہونے پر بھی چور بچھڑا لے گئے۔"

تیج کور حویلی کے بیچوں بیچ کھڑی گرج رہی تھی۔

تیج کور کی گرجتی آواز سن کر اس کا شوہر گوپال سنگھ بھی آگیا۔ منجھلا دیور اور اس کے بیٹے بھی آگئے۔ تیج کور نے سب کی طرف منہ کرکے اور تیکھی آواز میں کہا۔ "تم سارا خاندان جولاہے ہو جولاہے۔ تم میں سندھو سرداروں والی کون سی بات ہے؟ بچھڑا کھولنے آئے کو یہیں ڈھیر کردیتے تو میں سمجھتی کہ ذیلداروں کا گھرانا ہے۔"

تیج کور کی بہو پورو نے جب اس کی گرجتی آواز کو سنا، تو وہ کانپ سی گئی اور یہ الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے، "بچھڑا کھولنے آئے کو وہیں ڈھیر کردیتے، تو سمجھتی کہ سندھو سرداروں کی اولاد ہو...... جاؤ اسے جولاہو۔"

پورو نے اپنے ہوش و حواس کو درست کیا اور اپنی ڈیڑھ سال کی بیٹی کو سینے سے لگاکر اسے تھپتھپانے لگی۔ لیکن بے بے کے کہے ہوئے الفاظ اسکی چھاتی میں گولی کی طرح چبھنے لگے۔

پھر تیج کور نے اپنے سردار (شوہر) کی طرف منہ گھماتے ہوئے کہا۔ "تمام خاندان میرے منہ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے بندری کا تماشا ہو۔ سادھے کو ساتھ لے کر تھانے جاؤ۔"

تینوں بھائی، تیج کور کا بڑا بیٹا دلیپ سنگھ تھانے پہنچے۔ تھانے دار جانتا تھا، یہ گھرانہ پورے گاؤں میں کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ لیکن یہ تینوں بھائی آج اکٹھے کیسے ہو گئے؟

تھانیدار کے دل کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے گوپال سنگھ نے کچھ غصّے سے کہا۔ "چودھری صاحب، بات صرف بچھڑے کی نہیں ہے، سوال ہماری غیرت کا ہے۔ اتنی بڑی حویلی اور بیس آدمیوں کے ہوتے ہوئے، کوئی آدمی ہمارا بچھڑا کھول کر لے جائے۔ ہمیں اس آدمی کا نام و پتہ بتایئے۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ آج ہم تمام اُلّو کے چرخے بن گئے ہیں۔"

"سردار گوپال سنگھ یہ تھانہ ہے، بنیے کی دکان نہیں۔ آپ ہمارے پاس آئے ہیں تو تمام قانونی کارروائی کریں گے۔ پوری کوشش کریں گے۔ ہمارے تھانے میں ہوئی چوری کا پتہ لگ جائے۔"

رپورٹ لکھی گئی۔ سارے بھائی اور بھتیجے اس طرح نظریں نیچی کیے ہوئے گھر پہنچے جیسے کسی نزدیکی رشتے دار کے دسویں کی رسم ادا کر کے آئے ہوں۔

چوتھے پانچویں دن سردار گوپال سنگھ اور سادھو سنگھ تھانے پہنچے اور پوچھا، "چودھری صاحب، ہمارے چور کا کچھ پتہ چلا؟"

"گوپال سنگھ، تمہارا بچھڑا تمہارے گھرانے ہی میں ہے۔" تھانیدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سردار صاحب، اگر بچھڑا تمہارے گھرانے میں نہ ہوتا تو ہم چور کی مشکیں کس کر لے آتے۔ ہم سے آپنے گاؤں کے لنڈروں کے چوتڑ خواہ مخواہ پٹوائیے؟"

"ہمارے گھرانے میں ہے، بچھڑا؟"

"ہاں، آپ کے گھرانے میں۔"

"چودھری صاحب، ہمیں پہیلیاں نہ بجھائیے۔۔۔۔۔۔ ہمیں صاف صاف سب بات بتائیے۔" گوپال سنگھ نے اپنی بے چینی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا بچھڑا تمہارے سمدھیوں کے گھر میں ہے۔ دلیپ سنگھ کا سالا اسے لے کر نکل گیا تھا۔ ۔۔ تمہاری رشتہ داری ہے سمدھیانے کی۔ کل آپ پھر ایک ہو جاؤ گے۔ اگر آپ کی رشتہ داری نہ ہوتی تو۔ خدا کی قسم، ہم جوتوں سے چور کی چمڑی اُدھیڑ دیتے۔۔ پتہ چل جاتا ورک سرداروں کی اوقات کا۔"

تھانیدار کی کرخت آواز سن کر گوپال سنگھ اور سادھو سنگھ کی گردنیں جھک گئیں ۔۔۔ اور بیٹھ پیچھے ہاتھ باندھے وہ گھر لوٹ آئے۔ تیج کور حویلی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے پوچھا، "کچھ پتہ چلا؟"

"ہوں۔ پتہ چل گیا ہے۔ بغل میں لڑکی اور ڈھنڈورہ شہر میں۔"

"سردارا، بات سیدھی کر، خواہ مخواہ اندر آگ کیوں لگاتا ہے؟" تیج کور نے سختی سے کہا۔

"بھاگوان کیا بتاؤں ۔۔ بات منہ سے نہیں نکلتی۔۔ اپنی ناک اور اپنی چھری۔ بچھڑے کو لے گیا ہے دلیپ کا سالا شنگارا۔۔۔۔۔۔"

"شنگارا۔۔۔۔۔؟" تیج کور نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔ شنگارا بچھڑے کو لے گیا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا، جس کی تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔" گوپال سنگھ نے غصیل آواز میں کہا۔

یہ سن کر تیج کور گرجی۔ "گھوڑے پر زین و کاٹھی رکھو اور گھنی روانہ ہو جاؤ۔ مرد کا بچہ بن کر بچھڑا ساتھ لے کر واپس آنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تو ایک طرف ہو کر بچ جائیں اور تمہاری جان میرے قابو میں آ جائے۔ شام تک واپس لوٹ آنا۔ گھوڑی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ دس کوس کا تو سفر ہے۔"

بھابھی تیج کور کی کڑکتی آواز کو سن کر سادھو سنگھ نے جلدی جلدی دو تین نوالے نگلے اور لسّی کا گھونٹ اندر پھینکا اور گھنی کی طرف چل دیا۔

راستے میں سادھو سنگھ سوچتا جا رہا تھا۔ "جا اوئے ماں کے شنگارے ۔ تمہیں کوئی اور گھر نہیں ملا۔ اپنی بہن کے گھر ہی ڈاکہ ڈال دیا۔ اب سو دو سو کی بات نہیں رہی۔ بھابی نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا۔ ایسے ہی وسوسوں میں اُلجھے سادھو سنگھ نے ورک سرداروں کی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر گھوڑی کھڑی کر دی۔ اندر شنگارے کا والد جیت سنگھ اور چچا جاگر سنگھ بیٹھے تھے۔

جیت سنگھ نے آنکھ کے اشارے سے کہا ۔" لو بھئی آ گئے ہیں بچھڑے کے مالک۔"

" بھائی صاحب، آپ فکر نہ کریں۔ آنے دیں بیوقوف و نادان کو۔" جاگر سنگھ نے آہستہ سے کہا اور ساتھ ہی ساتھ سادھو سنگھ کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

چارپائی پر کھیس بچھا۔ پھولوں والا سرہانہ رکھا، اندر کی طرف گردن گھما کر آواز لگائی۔ "بڑیئے (بڑی بھابی)، دودھ کا گلاس اور ساتھ ہی کچھ کھانے کو بھیجنا۔۔ سردار سادھو سنگھ آئے ہیں ۔۔ اور پھر انھوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

وہ دونوں بھائی سادھو سنگھ کو بات ہی نہیں کرنے دے رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے: "بھائی، آپ کھاتے کیوں نہیں ہیں۔ بنیوں کی طرح تم ذرا ذرا سا منہ میں رکھ لیتے ہو۔ مٹھائی کے یہ چند ٹکڑے ہی تم سے کھائے نہیں جاتے۔"

سادھو سنگھ کی نظروں کے سامنے تو بھابی تیج کور، کولہوں پر ہاتھ رکھے چنگھاڑتی کھڑی تھی اور گرجتی آواز میں کہتی سنائی دے رہی تھی: "تم سندھو سردار ہو اور لڑکے کے چچا، بات ٹھوک کر کرنا۔" اس نظارے کے سامنے آتے ہی سادھو سنگھ کو جیسے حوصلہ نصیب ہو گیا اور اسے وقت مل گیا ہو۔ اس نے کہا۔ "بھائی صاحب، بات بہت معمولی ہے اور اسے کہتے شرمندگی سی بھی محسوس ہوتی ہے شنگارا بچہ ہی تو ہے، اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ بچھڑا کھول کر لے آیا ہے۔ اس سے اس کا دل لگ گیا ہوگا۔ مجھے وہ بچھڑا واپس کر دیجیے گا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے واپس گھر پہنچنا ہے۔ سب لوگ میرا انتظار

ے ہوں گے ۔"

" سادھا سنگھا، بچھڑا کتنے کا خریدا تھا ؟"
رے کے چچا نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"یہی کوئی اسّی نبّے روپوں کا ہوگا ۔"

" دوستا، تم ہم سے سَوا سو روپے لے جاؤ۔
کو وہ اچھا لگا ۔ پسند آگیا ۔ وہ اُسے لے آیا ۔ تم
ھائی صاحب بتاؤ، لڑکے کا دل کیسے توڑ دیں ؟
ارا سنگھ ہمارا بیٹا ہے اور تمہارا ابھی بچہ ہے۔"

جاگر کی دھیرج اور پیار بھری بات سن کر
ھو سنگھ نے چاہا، سوا سو روپے لے کر واپس
جائے ۔ کیا ضرورت ہے سمدھیوں کے ساتھ
ا کرنے کی ۔ لیکن اسی وقت اسے بھابی تیج کور کی
یاد آگئی ۔ اس نے کہا تھا ۔" ارے تم سندھو ہو
لا ہے ۔ سَو سوا لے کر واپس نہ ہونا ۔ اس روپے
لڑ کر ماتھے پر تلک نکا لینا یا بڑے بھائی کے
فے پر لگا دینا ۔ کہاں مجھے دیکھ رہا تھا ۔ جولاہوں
رخاندان ۔" اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم
جھرجھری سی پھیل گئی ۔ پھر اس نے کہا " بھائی صاحب
۔ کی مہربانی سے روپوں کی کوئی کمی نہیں ہے ۔
ں بچھڑا چاہیئے ۔"

چیت سنگھ اور اس کی بیوی بال کور نے
ت کوشش کی کہ سادھو سنگھ روپے لے کر
ں چلا جائے ۔ لیکن یہ بات انھیں بنتی نظر نہیں
۔ اور سادھو سنگھ خالی ہاتھ منہ لٹکا کر
س چلا گیا ۔

سادھو سنگھ کے آنے سے پہلے تیج کور کئی چکر
ٹ گئی تھی ۔ اس کا کلیجہ جل رہا تھا اور دل چاہتا
کہ گھوڑی پر زین کسے اور سمدھیوں کے گھر پہنچ جائے ۔
ن مردوں کے کام مرد کرتے ہی اچھے لگتے ہیں ۔ ہن
کرتے اکثر بدنامی ہی ملتی ہے ۔ اس خیال کے پیشِ نظر
دالان میں چارپائی ڈال کر دروازے کی طرف منہ
ے بیٹھ گئی ۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی گردن
ٹی ہو ۔

سادھو سنگھ نے آکر تمام بات چیت کہہ سنائی ۔

تیج کور اپنے دیور کی بات سن کر گرج اٹھی ۔" ایک چور، دوسرے چتّر ۔ یہ ہمارے سمدھی ہیں ۔ بے شرموں کو حیا نہیں آئی کہ وہ کس سے بات کر رہے ہیں ۔ کنجروں نے دیدے ماتھے پر لگا لیے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ نٹنی رسّے پر چڑھی ناچ رہی تھی ۔ اس کا سمدھی آگیا اور وہ آنکھیں نیچی کر کے نیچے اتر آئی ۔" لیکن ان بڑے سرداروں کو شرم نہیں آئی کہ سمدھی خاص طور پر دس کوس سفر کر کے آیا ہے ۔ بڑا بھائی گیا اور چھوٹا گیا ۔ لڑکی تو اسی حویلی والوں کو بیاہی ہے ۔ ۔ ذیلداروں کی حویلی ہیں ۔"

بے بے کی گرجتی آواز سن کر پورو سہم گئی ۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سامنے والے کنوئیں میں کود پڑے اور جان دے دے ...... جا اُدے شنگاریا، تیرا بیڑا غرق ہو جائے ۔ عزّت اور آبرو سے زندگی بسر کرتی ہوئی بہن کے راستے میں کانٹے بو گیا ...... اتنے میں بے بے کی غصیل آواز آئی ۔ "اَلاَّ الصبح میں اور دلیپا گھنی جائیں گے، دیکھیں گے کہ بچھڑا کیسے نہیں دیتے ۔"

صبح سویرے ماں اور بیٹا گھوڑیوں پر سوار ہو کر چل دیے اور دوپہر ہونے سے پہلے سمدھیوں کی حویلی کے سامنے پہنچ کر گھوڑیوں کی لگامیں کھینچیں ۔

تیج کور کو دیکھ کر شنگارے کی ماں کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا ۔ سمدھن کے ساتھ اپنے داماد دلیپ سنگھ کو دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا ۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی، دل ہی دل میں کہا ۔" ہے تو چندری بگھیاڑی (مادہ بھیڑیا) ساتھ میں بیٹا ہے ۔ شاید اس کی کچھ شرم کرلے ۔ لحاظ برتے ۔

شنگارے کی ماں بھاگ کر سمدھن کے گلے لگ کر ملی ۔ اور پھر اس کے پاؤں کو اپنے ہاتھوں سے چھوا ۔

گھر میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ۔ دالان میں چارپائیاں بچھائی گئیں ۔ انسان اپنے گھر میں کتنا ہی دلیر کیوں نہ ہو ۔ اگر اچانک دشمن سے سامنا ہو جائے تو ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں ۔

اس سے پیشتر کہ شنگارے کی ماں سمدھن سے خیر و عافیت کے بارے میں پوچھتی، تیج کور نے غصیل آواز میں کہا ۔" دیکھو بہن جی، ہمارے گھر والوں کا یہ دوسرا چکر ہے ۔ سمدھیوں کا رشتہ پھولوں کی خوشبو جیسا ہوتا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ خوشبو، بدبو میں تبدیل ہو جائے ۔ ہمارا بچھڑا واپس کر دو ۔ اسی میں سب کا بھلا ہے ۔"

" بیبی (بہن جی) آپ کیسی بات کرتی ہیں ۔ نہ ہم کہیں چلے جا رہے ہیں، نہ ہی بچھڑا ۔ دونوں طرف ایک ہی گھرانہ ہے ۔ پہلے جل پان کرو، پھر بات کرتے ہیں ۔"

" سردارنی، بات ختم ہو گی بچھڑے پر ۔ پہلے اس کی بات کرو ...... ؟" تیج کور نے دھیرج سے کہا ۔

" بیبی، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں ۔ میں نے سادھو سنگھ سے کہا تھا کہ گنگا گئی ہڈیاں کبھی واپس نہیں آتیں ۔ ہم سے دُگنے دام لے لیجیے ۔ اگر ہم مُنکر ہوں تو ہم قصوروار ہیں ۔ لڑکا نادان تھا ۔ کم عقل تھا ۔ اس سے غلطی ہو گئی ہے، اس کو معافی دے دو ۔ دُگنی رقم لے جاؤ، آپ ہمارے سر کے صاحب ہیں ۔"

بھائی صاحب، اگر آپ کو ہزار، دو ہزار کی ضرورت ہو، ایک بار اشارہ کرو، اگر اسی وقت حاضر نہ کر دوں تو کہنا کہ میں گل سرداروں کی بیٹی نہیں تھی ۔ ہم گنگا میں سے ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آئے ۔ ہم اپنا بچھڑا، وہی بچھڑا لینے آئے ہیں ۔ ایسا نہ ہو کہ جس گنگا میں ہڈیاں گئی ہیں، ہمیں اس کا منبع ہی ہمیشہ کے لیے بند کرنا پڑے ۔"

بھائی صاحب، سرداری وہیں چلی گئی، جہاں سے آئی تھی ۔ آپ نے سمجھا ہے کہ تمام سندھو بھائی الگ الگ رہ رہے ہیں، باری باری ان سے نمٹ لیں گے ۔ ہم ختم کر دیں گے ، اگر ہمارا بچھڑا ہمیں نہیں ملا ۔" دلیپ سنگھ نے غصہ میں آکر بازو کو اس طرح ہلایا کہ اس کی ساس کے ہاتھ میں

پکڑا ہوا دُودھ کا کٹورہ فرش پر گر پڑا۔

دودھ کا اس طرح گرنا، ورک سرداروں کی بے عزّتی کا معاملہ تھا اور وہ بھی ان کے اپنے گھر میں، جہاں کھونٹی پر ایک تلوار ٹنگی رہتی ہے سردار چیت سنگھ نے گھور کر اپنے داماد کی طرف دیکھا اور اس کے دل میں آیا کہ اس کتے کی گردن ابھی اتار دوں۔ کیا ہماری کوئی عزت آبرو نہیں ہے۔ کیسے دودھ کا کٹورہ دالان میں پھینک دیا ہے۔ اگر ہماری ایک بیٹی بیوہ ہو گی تو ان کی چار ہوں گی۔ ایک پل میں ہی چیت سنگھ کے ذہن میں یہ پورے نقشے گھوم گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور بات منہ سے نکالتا، سردارنی تیج کور نے اٹھ کر اپنی ریشمی چادر سے سمدھن کا بازو صاف کر دیا اور پھر فرش پر بیٹھ کر اپنی اسی چادر سے فرش صاف کرنے لگی۔ اور کہا۔

"سردارنی! غصہ نہ کرنا، لڑکے سے غلطی ہو گئی ہے اور کٹورے کو ہاتھ جا لگا ہے۔"

"بیبی، کوئی بات نہیں ہے، جیسا شنگارا، ویسا ہی دلیپ سنگھ۔ آپ فرش کیوں صاف کرتی ہیں۔" تیج کور کا بازو پکڑ کر شنگارے کی ماں نے آواز دی۔ "اری رُکّو، یہاں آؤ اور جگہ صاف کر دو۔" اس کے ساتھ ہی تیج کور کی چادر لے کر نکلے پرے جا کر صاف کرنے لگی۔

سامنے بیٹھا چیت سنگھ ورک حیران تھا کہ اتنی جابر عورت کو بیٹے کی اتنی معمولی سی غلطی نے پشیمان کر دیا، پگھلا دیا ہے اور موم کر دیا ہے۔ اگر کچھ انٹ شنٹ بولتی تو دونوں ماں بیٹے کی گردنیں کاٹ دی جاتیں — پھر دیکھی جاتیں سندھوؤں کی سرداریاں۔ اتنی دیر میں تیج کور نے سمدھن سے چادر لی اور دلیپے سے کہا۔ "اٹھو، بیٹھ کیوں گئے ہو۔ ابھی اور بے عزتی کروانی باقی ہے۔"

شنگارے کی ماں نے لاکھ بار منت کی اور چیت سنگھ بھی کہتا رہا۔ "بہن جی غصہ چھوڑیے۔ لڑکے سے دُودھ گر گیا ہے تو کیا ہوا، پانی تو پیجیے۔" بھائی صاحب، ہم نے آپ کا دودھ بھی پی لیا ہے اور ساتھ میں بہت کچھ کھا بھی لیا ہے۔" یہ کہہ کر لال سرخ آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے اس نے لڑکے کو بازو سے پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی حویلی سے باہر نکل گئی۔

تیج کور صبح سے بھوکی تھی۔ اس کی آنتیں کُلبلا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ سامنے کھڑے ہوؤں کو پھاڑ کر کھا جائے۔ لیکن معاملہ ہاتھ سے نکلتا اسے محسوس ہوا۔ اس نے سوچا— اس کی بے عزتی ہوئی ہے، پھر بھی اسے عزت کو قائم رکھنا چاہیے۔ نیچ لوگوں کی طرح سمدھیوں سے لعن طعن نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھا پائی سے بچنا چاہیے۔

بے موسمی گرجتی کالی گھٹائیں آسمان پر گھر آئیں اور ہوا کے تیز جھونکوں نے انہیں اڑا دیا۔

گہری شام کو ماں بیٹا گھر واپس پہنچے۔ حویلی کے تمام لوگ سانس روک کر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ پُورو کا دل گھبراہٹ سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بیبی واپس آنے ہی کون سا بم داغے گی۔

"بھابی، کیا کر کے آئی ہو—" سادھو سنگھ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

تیج کور نے ایک بار سب کو گھورتے ہوئے دیکھا اور ناک چڑھا کر کہا۔ "بنا کر آئی ہوں ان کنجروں کا سر۔ دُہائی پرماتما کی، ان جیسی کُتی ذات کہیں دیکھی سُنی نہیں۔ تمام خاندان کی آنکھوں میں سُوّر کا بال ہے۔ بے شرم اور بدلحاظ ہیں۔ بات کرتے ہوتے کتنا سینہ پھلا کر چپڑ چپڑ باتیں کرتے ہیں۔ — "ہم سے دُگنی رقم لے جاؤ، ہم سے تگنی رقم لے جاؤ...... جیسے میں بھیک مانگنے ان کی حویلی کے دروازے پر آئی ہوں، کتے بھڑے کا نام ہی نہیں لیتے تھے...... سادھیا، ہمیں ان کی حویلی میں جانا تھا تاکہ ان کی اوقات اور حیثیت کا پتہ چل جائے — گھر آئی سمدھن کی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایک طرح سے اسے مار ہی دیا —" تیج کور ایک پل کو سانس درست کرنے کے لیے رکی — اور بولی، "اٹھا لاتے ان کی لاشیں، تمہارے بازوؤں میں اتنی طاقت ہوتی تو بھابی اور بھتیجے کا بدلہ لے لیتے۔" اس طرح کہہ کر ایک بار پھر تیج کور رُکی اور بولی "سادھیا خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ عزت آبرو کو بچاؤ۔ اچھا ہوتا کہ ہم دونوں کے مرنے سے معاملہ نمٹ جاتا۔ اب معلوم نہیں کون بلی کا بکرا بنے گا۔ تیرے بھائی کو میں نے سو بار کہا تھا کہ ورکوں کے گھر کا رشتہ ہمیں نہیں لینا چاہیے — وہ زمانے بھر کے بدلحاظ ہیں۔"

حویلی میں قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پورو چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے پوچھے کہ وہاں بات کیا ہوئی ہے۔ لیکن وہ جرأت نہیں کر پا رہی تھی کہ آگے بڑھ کر وہ کچھ پوچھے۔ وہ سوچتی، "واہ رے شنگاریا! خوب مزے سے دن گزارتی ہوئی چھوٹی بہن کی زندگی کو آگ لگا دی۔ اب ایک دو کی موت ہی سے فیصلہ ہو گا۔ بی بی کی کھینچی ہوئی لکیر کو کوئی لانگھ نہیں سکے گا۔" پھر اس نے پرماتما سے دعا کی کہ وہ اسے ہی اٹھا لے۔ اس سے یہ تمام مصیبتیں برداشت نہیں کی جا سکیں گی۔ ایک طرف شوہر ہے دوسری طرف بھابی۔ جس کا بھی قتل ہو گا صدمہ اسے ہی برداشت کرنا ہو گا— وہ کیسے یہ کر پائے گی۔ یہ خیال آتے ہی پورو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ نکلی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیوار سے سر ٹکرایا جس کی آواز تیج کور نے سن لی اور پھر وہ پورے غصّے میں بولی۔ "کیوں ہمارے سر پر چڑھ کر مرتی ہو۔ وہاں مائیکے جا کر بھڑوؤں کے سر پر چڑھ کر مر، جنہیں بہن کے گھر سے چوری کرتے شرم نہیں آئی۔"

"بی بی جی، اب میری موت مائیکے میں ہو گی۔ معلوم نہیں پرماتما میری گلوخلاصی کب کرے گا۔ میں نے برے عمل کر کے جنم لیا ہے۔" یہ کہتے کہتے پورو چیخ کر رو پڑی۔

ایک آدمی کے کیے بداعمال سے تمام کنبہ گرفت میں آ جاتا ہے۔ اگر تم ورکوں کی بیٹی ہو تو ہم بھی گل ہیں۔ اپنی ہار کو دیکھ کر ہم موت کو بیاہ سکتے

ہیں۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ تمہارے باپ کی نظروں کو میں پہچان چکی ہوں۔ وہ تو داماد کو قتل کرنے کی قسم کھائے بیٹھا تھا۔ بیٹی آگ تو لگ ہی چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ باقی ہے کہ قتل دلیپے کا ہوتا ہے یا سنگارے کا۔"

"بی بی جی، آپ بڑی ہیں۔ ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔ پرماتما سے پرارتھنا کریں کہ میں مرجاؤں۔ دونوں طرف صلح وصفائی ہوجائے۔"

تیج کور بہو کو اسی طرح لعن طعن کرتی اور جلی کٹی سناتی رہی اور سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اس کے ترکش کے سارے تیر ختم ہوگئے ہیں اور وہ نہتی ہوگئی ہے اور ورکوں کی مار برداشت کر رہی ہے۔ اتنے میں اس نے دلیپے کو آواز دی۔

"اوئے دلیپا، میں پورو کو تیار کرنے لگی ہوں۔ اس کے مائیکے والوں کے یہاں چھوڑ آ۔ یہ ہمارے گھر میں نہیں سما سکتی۔ دیکھ لوں گی بڑے جتھے والوں کو۔"

"بیٹی تو اپنا سامان تیار کر، جو تمہارا دل چاہتا ہے اسے باندھ لے۔ تمہارے مائیکے والے یہ نہ کہیں کہ ہماری بیٹی کو ننگا کرکے بھیج آئے۔"

"بی بی جی، جب میرے اپنے آدمی بیگانے ہوگئے تو زیورات میرے کس کام کے۔" اور پھر پورو نے دلیپ کے نزدیک سرکتے ہوئے کہا۔ "سردارا، مجھے بری طرح پریشان و تباہ حال کرکے کیوں مارنے پر آمادہ ہے۔ اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ دے۔ میں کورے کاغذ پر لکھ دیتی ہوں کہ میں خود پھانسی لگا کر مری ہوں۔" یہ کہتے ہوئے پورو ساس کے پاؤں پر جاگری۔

تیج کور نے پاؤں پیچھے کھینچ لیے اور گرجتی ہوئی آواز میں بولی۔" ظلم سائیں کا، چوروں کی بیٹی کو گھر میں رکھ لوں۔" یہ کہتی ہوئی تیج کور باہر نکل گئی۔

سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔ گھر گھر میں تیج کور اور ورک سرداروں کی باتیں ہونے لگیں۔ براہمنوں کے پیپل کے نیچے ٹھٹ سا لگ جاتا کہ کوئی نئی خبر پتہ لگے۔ سبھی کے کان خبریں سننے پر ہی لگے رہتے۔

"کیوں جوان، سنا ہے کہ سردارنی تیج کور کو سمدھیوں نے خالی ہاتھ واپس کر دیا ہے۔"

"اور ہاتھی پر چڑھا کے بھیجتے۔" بیلی براہمن نے حقہ کا سوٹا مارتے ہوئے کہا۔

"گئی تھی چوڑی ہوکر۔ بیٹے کو ساتھ لے کر۔ بھئی میں پوت والی ہوں۔"

"ارے پنڈتا، بیٹی جنم لے لے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ سمدھیوں کے غلام ہوگئے۔ بیٹے والے سینے پر چڑھ کر ناچیں اور بیٹی والا دم تک نہ مارے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ گئی تھی توپ بن کر ورکوں کا قلعہ سر کرنے۔ انھوں نے منہ موڑ کر رکھ دیا۔" دلو میراثی نے چلم میں آنچ کو کریدتے ہوئے کہا۔

"بھائی بیلی رام جی، اگر یہ سندھو ہیں تو وہ بھی ورک سردار ہیں جنھوں نے جنگ میں جنگلیوں کے منہ موڑ دیے تھے۔ یہ سب عزت اور نام ناموس کا معاملہ ہے۔"

"سنا ہے، دلیپے کا سسر کہتا تھا، چار گنے پیسے لے لو۔ ہماری سردارنی بھی تو اڑیل گھوڑی ہے جو کھڑی کھڑی دولتیاں چلاتی رہتی ہے۔"

"ہے تو خود دار عورت، پردادا ہر جگہ خودداری کا معاملہ اٹھا کر مورچہ لگا دینا تو عقل مندی نہیں۔"

"دادا، بات اچھی نہیں ہوئی۔ ورک پھر بھی لڑکی والے تھے۔ جھڑا واپس کر دیتے۔ کون سی گولی چل جاتی۔ لڑکی والے سر خم ہی کرتے آئے ہیں۔" کھیڑے نائی نے دلو میراثی کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا۔

"جا اوئے، کسی کا منہ سر چھیل رہا ہے۔ یہ باتیں ہیں بڑے گھرانوں کی۔ وہ نائی و میراثی نہیں جو چھوٹی موٹی بات پر سرداریاں قائم رہنے کے ترانے گاتے پھریں۔ سننے میں آیا ہے کہ دلیپے کا سسر اسے قتل کرنے لگا تھا۔ سردارنی آڑے آگئی تو بچاؤ ہوگیا۔ جاکر ذیلداروں کی حویلی میں دیکھ، کیسے مہا بھارت مچا ہوا ہے۔ سردارنی جھاگ اگل رہی ہے:

"ہم ہیں میراثی۔ گھر باہر کی خبریں رکھنے والے ہماری آنکھ کبھی ناکام نہیں پلٹتی۔ یاد رکھنا۔ دونوں اطراف میں ایک آدھ موت ضرور ہوگی۔ ...... ورک بڑے سخت جان اور طاقتور ہیں۔ یہ سندھو بھی اب بنیے ہوگئے ہیں۔ پیسے کے پوت۔ ہری مرچ اور پیاز بیچنے والے۔"

"اچھا دادا، جو پرماتما کو اچھا لگے۔ شام ہوچلی ہے۔ چل کر روٹی پانی کا بندوبست کریں۔"

بیلی براہمن اپنی حقہ سنبھالتے ہوئے اٹھا اور اس کے بعد ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔

سورج نکلنے سے پہلے تیج کور نے بیٹے اور بہو کو تیار کر دیا۔ دو گھوڑیوں میں سے ایک پر دلیپا اور دوسری پر روتی ہوئی پورو تھی جس نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا رکھا تھا... اور جاتے ہوئے اس نے اونچی اور چیختی ہوئی آواز میں کہا۔" بی بی میری بھول چوک معاف کر دینا۔ اس بھرے پورے گھر سے میرا دانہ پانی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔"

پورو کی منت بھری اس بات کا مذاق اڑاتے اور منہ چڑاتے ہوئے تیج کور نے کہا۔" بھول چوک اپنے ماں باپ سے جاکر معاف کرانا۔ تم انھیں کے پاس جا رہی ہو۔"

گھر میں شور وغل مچ گیا کہ جیت سنگھ کا داماد اس کی بیٹی کو واپس چھوڑنے آیا ہے۔ لڑکی سر پر بازو رکھے زار وقطار رو رہی ہے اور حویلی کے دالان میں کھڑی ہے۔ پرماتما..... تیرے رنگ نیارے ہیں۔ معمولی سی بات کا بتنگڑ بن گیا اور دونوں خاندانوں میں اتنی بڑی دوری پیدا ہوگئی۔

دلیپ سنگھ کو اس کی ساس نے بازو سے

پکڑ کر حویلی کے اندر لے جانے کے لیے کھینچتے ہوئے کہا۔ "آ میرا بھلا مانس بیٹا۔ پانی دھانی پی کر جانا۔ اتنی دور کا سفر کرکے آیا ہے۔" لیکن وہ دونوں گھوڑیوں کی لگامیں پکڑے حویلی کے دروازے پر کھڑا رہا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

پورو اپنی لڑکی کو سینے سے لگائے ہوئے کبھی اپنے باپ کی طرف دیکھتی، کبھی اپنے شوہر کی طرف۔ لیکن وہ دونوں چپ تھے۔ کسی کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ اتنے میں جیت سنگھ کا والد بوڑ سنگھ آگیا جس کی سیدھی و سفید داڑھی سیدھے رُخ کاڑھی ہوئی تھی۔ موچنے کے استعمال سے خم دار اور تیکھی بنائی ہوئی مونچھیں، پگڑی کے بیچ میں سے ننگا جوڑا، وہ تھا اصلی ورک کا جیتا جاگتا نمونہ۔ اس نے ساری حالت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی لاٹھی کو فرش پر زور سے مارا اور اپنی بہو سے کہا، "او ئے لڑکیے، کیوں ان جیسے بے شرم آدمیوں کی منتیں کرتی ہو۔ جا او ئے لڑکیا۔ بھاگ جا یہاں سے۔ جو کچھ تم نے ہم سے کیا ہے، اچھا ہی کیا ہے۔ تم نے ہماری پگڑی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ہم سمجھیں گے کہ ہماری پوتی بیوہ ہو گئی ہے اور ہمارے دروازے پر آ بیٹھی ہے جہاں پہلے اتنے لوگ پرورش پا رہے ہیں وہاں یہ ماں بیٹی بھی پرورش پالیں گی۔ تم میری بیٹی کو میرے دروازے کے اندر چھوڑ چلے ہو۔ دیکھنا تمہیں اس کی کتنی قیمت چکانی ہوگی۔ تم نے میری داڑھی کو نوچا ہے۔"

پاس کھڑے ہوئے سبھی لوگ ڈرے ڈرے سے تھے۔ بات تو پہلے ہی بگڑ چکی تھی۔ اگر باپو نے لاٹھی دلیپے کے کندھوں پر ماردی تو برادری اور رشتہ داروں میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جیت سنگھ نے دلیپے کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بھلے مانس کا بیٹا بن کر یہاں سے چلا جا۔ ہمارے ساتھ بہت ہوگئی ہے۔"

پورو کو مائیکے آئے ہوئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ دونوں گھرانوں کا تناؤ اور کھچاؤ کم ہو گیا تھا۔ دونوں طرف حالات پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ سوچ بچار ہو رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی شخص ورکوں کو سندھوؤں کی بات بتا جاتا اور سندھوؤں کو ورکوں کی۔ دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بھرے بیٹھے تھے۔ واہی تباہی بکنے لگتے۔ اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ لیکن کوئی بھی اپنی غلطی کو ماننے پر تیار نہیں۔ بات بچھڑے کی تھی اور بچھڑا بن گیا تھا دونوں گھر کی عزت و ناموس کا اہم سوال۔

باپو بوڑ سنگھ کا بڑا بھائی باپو جگت سنگھ حال چال کی جانکاری لینے آیا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس لیے بستر اندر بچھائے گئے تھے۔ تاؤ جگت سنگھ نے ساری بات سن کر اور تمام لوگوں کی طرف منہ کرکے کہا۔ "ارے بوڑ سنگھ، تم سمجھدار اور تجربہ کار ہوتے ہوئے بھی دونوں گھرانوں کو جلتی آگ میں جھونکنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ تمہاری ضد اور غلطیاں بچاری پورو کو مار کے رکھ دیں گی۔ انسان بنو اور بیبی پورو کو میرے ساتھ بھیج دو۔ میں اسے سسرال پہنچا آتا ہوں بیٹیاں ہمیشہ سسرال میں اچھی لگتی ہیں۔ مائیکے میں ان کی گزر نہیں ہوسکتی۔ مائیکے والے بھلے راجے مہاراجے ہوں۔"

"بھاؤ جی، آپ ہم پر جو بھی جرمانہ کریں، ہم اسے ادا کریں گے۔ لیکن ہم بچھڑا واپس نہیں کر پائیں گے۔" بوڑ سنگھ نے کچھ جھک کر کہا۔

اگلے دن باپو جگت سنگھ اور پورو کو شنگارے کے خاندان والوں نے تیار کر دیا۔ بیل گاڑی بھر کیا کیا کچھ ساتھ بھیجا۔ چھ مہینے بعد بیٹی سسرال جا رہی تھی۔ ساتھ دو نوکر بھی گئے۔ ایک لڑکی کو اٹھانے کے لیے اور دوسرا واپسی پر پورو کی گھوڑی لانے کیلئے۔

سردارنی تیج کور نے گھر آئے سمدھی کا اچھا استقبال کیا۔ احترام کیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بہو کو اندر لے گئی۔ جگت سنگھ دوسرے دن گھنی واپس چلا گیا اور ایک بار پھر دونوں طرف سکون ہو گیا۔

تیج کور کو ساری ساری رات نیند نہیں آتی تھی۔ اس کی پیٹی میں سے تمام گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ خیال کرتی کہ اگر پورو کو سردار جگت سنگھ کے ساتھ واپس بھیج دیتی تو بڑی بے عزتی ہوتی اور بات بہت بڑھ جاتی۔ لیکن اصل بات وہیں کی وہیں رہی۔ جیت تو ورکوں کی ہی ہوئی جنھوں نے لڑکی بھی سسرال بھیج دی اور بچھڑا بھی واپس نہیں کیا۔ اس خیال کے آتے ہی تیج کور کے سینے میں آگ لگ جاتی اور اسے چاروں طرف سب کچھ جلتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسی حالت میں نیند کیسے آتی ہے؟

پورو کو سسرال آئے دو مہینے گزر گئے۔ ورک خوش تھے کہ ہر طرح عزت رہ گئی۔ لڑکی سکھ شانتی سے رہ رہی ہے۔ لیکن تیج کور کا اندر جل جل اٹھتا۔ اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ پورو کی کوکھ میں اب بچہ ہے۔ بچہ ہے تو کیا؟ عزت توقیر والی سردارنی کے راستے میں یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کی نظروں میں ہی نہیں، علاقے بھر کی نظروں میں ذیلداروں کی حویلی کھنڈر بن چکی ہے۔

ایک دن صبح سویرے تیج کور کو پھر جوش آگیا اور اس کے گرجنے کی آواز آنے لگی۔ وہ دلیپے سے کہہ رہی تھی۔ "پورو کو مائیکے چھوڑ آ۔ ہمیں اسے نہیں رکھنا ہے۔"

بھابی کی تیکھی اور غصے بھری آواز سن کر سادھو سنگھ بھاگا ہوا آیا۔ اس وقت وہ کہہ رہی تھی۔ "دلیپیا، کہنا مان اور بیوی کو مائیکے چھوڑ آ۔ ہمیں ورکوں کی بیٹی نہیں رکھنی۔" وہ بیٹے کو اس طرح سمجھا رہی تھی جیسے لڑکا دکان پر سے کوئی غلط شے لے آیا ہو اور وہ اسے غلط شے لوٹانے کے لیے کہہ رہی ہو۔

سادھو سنگھ بھابی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کی۔ "بھابی، تجھے گورو نانک کا واسطہ ہے۔ میرے سر میں اور راکھ نہ ڈال۔ میرے سر پر گناہوں کی گٹھڑی نہ رکھ۔ ہماری بہت بے عزتی ہو چکی ہے۔ ہمیں چھاج میں رکھ کر اور مت چھانٹو۔ پورے علاقے میں ہم پر تھو تھو ہو رہی ہے۔ میں ساٹھ روپوں کا بچھڑا کیا لے آیا۔ وہ دونوں گھرانوں کے لیے بم بن گیا ہے۔ پورو کو اپنے ہی گھر رہنے دو۔۔۔ ہائے او ربا، میں کہاں ڈوب مروں۔"

"سادھیا، تم جہاں بیٹھے ہو، وہیں بیٹھے رہو۔ ڈوب کر عورتیں مرتی ہیں۔ معمولی سی بات پر جالوں کا بیٹا ہو کر مرنے چل پڑا ہے۔ کلہاڑی اٹھا اور ورکوں کے گھر سے بھیڑا کھول کر لے آ۔ سمجھوں گی سندھوؤں کے گھر ایک تو شیر بیٹا پیدا ہوا ہے..... بھلے حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ میرے گھر چوروں کی بیٹی نہیں رہ سکتی۔ لوگ تو کتوں کی طرح بھونکتے رہتے ہیں۔ ان کی کون پرواکرتا ہے۔ وہ اپنے آپ بھونک کر چپ ہو جائیں گے۔ میرے بیٹوں، میرے دیوروں اور میرے بھتیجوں نے چوری کی ہے یا سیندھ لگائی ہے۔ باعزت گھروں کے بیٹے، باعزت زندگی گزارتے ہیں۔ بستنگارے جیسی بات دلیپا کرتا تو میں اس کی کھال نہ کھینچ لیتی تو مجھے گل سرداروں کی بیٹی نہ سمجھتے۔ لوگ کہتے ہیں چور کو نہ مارو، چور کی ماں کو مارو تاکہ کسی چور کو پیدا نہ کرے۔ سب لگے ہو میرے سامنے ہاتھ جوڑنے ــ میراثیوں کی طرح۔ بڑا سندھو سردار ــ"۔

دلیپے نے پورو کے ساتھ سسرال جانے سے انکار کر دیا تو پورو کا چھوٹا دیور جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ دلیپے سے دو بالشت بھر اونچا تھا اور دوہرے جسم کا بھی۔

روتی چلاتی پورو پھر مائیکے والوں کے دروازے پر آ بیٹھی۔ بیٹی کی حالت دیکھ ماں دوبارہ سر پیٹنے لگی۔ اپنے سینے پر مکّے مارتے ہوئے بولی۔ ارے لوگو، میری پھول جیسی بیٹی کو بھیڑیوں کا خاندان رُلا رُلا کر مار ڈالے ہے ــ"

پورو کی چیخیں سن کر گھر بھر کے لوگ باہر نکل آئے۔ دلیپے کے بھائی نے ایک گھوڑی پر چھلانگ لگائی اور دوسری کی لگام پکڑ کر یہ جا، وہ جا ہو گیا۔

گھر میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ باپو پوڑ سنگھ بار بار اپنے دانتوں سے اپنے ہاتھوں کو کاٹتا اور پھنکارتا ــ " ارے کتو، تم نے لڑکے کو بچ نکلنے کیسے دیا۔ گھوڑیوں کو چھین لیتے ــ اور کنجر کے بیٹے کو گھونسے مار کر اندر ڈال دیتے، جو چھڑانے آتا اسے دیکھ لیتے۔ پہلے انھوں نے ہماری کون سی ٹانگ توڑ دی ہے۔ ان کنجر کے بیٹوں نے جو بڑی چوٹ کرنی تھی، کر دی ہے۔"

بوڑ سنگھ کو بار بار اپنے بھائی جگت سنگھ پر غصہ آتا۔ وہ چلا اٹھتا "جگتیا، تم بیچ میں نہیں آتے تو ہمارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ دو ہزار روپیہ لگا کر دو مہینہ پہلے لڑکی کو سسرال بھیجا تھا۔ وہ بھی انھوں نے ڈکار لیا ــ اور پھر جلا دی چتا ہمارے دروازے پر ــ"

جیت سنگھ لاٹھی کھٹکھٹاتے باپو پوڑ سنگھ کو بڑی مشکل سے اندر لایا۔ کچھ دیر بعد اپنے آپ خاموشی چھا گئی۔ پورو بے ہوش سی لڑکی کو سینے سے لگا کر زمین پر ہی لیٹ گئی۔ گھر کے تمام لوگ شمشان گھاٹ میں جل رہی لاشوں کی طرح خاموشی سے اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خاندان کے فنا ہونے کے دن نزدیک آ رہے ہیں۔

ایک بار پھر دونوں طرف ماحول پُرامن ہو گیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے لمبی بیماری سے پریشان و بے حال کوئی انسان موت کے منہ میں جا پڑا ہو۔

کچھ مہینوں کے بعد گہری شام کو دودھ کو سمیٹ کر تیج کور اندر پہنچی ہی تھی کہ کسی نے حویلی کا باہر کا بڑا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گوپال سنگھ اور تیج کور بھاگ کر باہر آئے۔ گھوڑے پر کوئی اجنبی سوار انھیں اندھیرے میں دکھائی دیا۔ اس نے گھوڑے سے اترے بغیر کہا۔ "سردار جی، میں گھمنی سے آیا ہوں۔ بی بی پورو نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ لیکن پرماتما کی ایسی کرنی ہوئی کہ دونوں چل بسے ہیں۔ صبح سنسکار کرنا ہے۔"

یہ سن کر تیج کور کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس نے واپس لوٹتے ہوئے آدمی کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "سوہنیاں، دیکھ میرے ہاتھوں کی طرف۔ ورک سرداروں کو ہاتھ جوڑ کر میری طرف سے عرض کرنا کہ میرے پہنچنے سے پہلے میری بہو اور پوتے کا سنسکار نہ کریں۔ ہم پہنچے کہ پہنچے۔"

نوکر نے پیٹھ پھیری تو سردارنی اونچی آواز میں بین کرنے لگی۔ "ہائے اوے لوگو، چلا گیا میرا چاند سا پوتا، اپنی ماں کے ساتھ...... بنا مجھے منہ دکھائے۔"

حویلی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ گاؤں کے لوگ بھی پہنچ گئے۔ تیج کور سر پر بازو رکھ کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ دوپٹہ زمین پر جا گرا تھا ــ بال کھل گئے تھے اور اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "ہائے میں کیوں نہ مر گئی۔ ہنستا کھیلتا گھر اُجڑ گیا ہے۔"

کچھ لمحوں کے لیے سردارنی تیج کور بالکل چپ ہو گئی۔ اس نے بوڑھی نائین اور جیوا میراثی سے کہا۔ "ابھی گاؤں کے لوگ جاگ رہے ہیں۔ میری برادری اور میرے سگے سمبندھیوں کو اطلاع کر دو کہ ہم صبح سویرے گھمنی کو چل دیں گے۔ تم دونوں جلدی تیار ہو جاؤ۔ ارے سادھیا، اوئے دلیپا، تم دونوں جلدی تیار ہو کر آؤ ــ گھوڑیوں کو تیار کرو۔ میں ایک پل بھی اب نہیں رُک سکتی۔" سردارنی حکم چلا رہی تھی۔ حویلی میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ برادری کے لوگ گھوڑیوں اور سائیکلوں پر آ کر حویلی کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔

رشتے اور برادری کے لوگ سر جوڑ کے باتیں کرتے۔ لیکن سردارنی کے سامنے اُف تک کرنے کی کوئی جرأت نہ رکھتا۔

پینتالیس پچاس لوگوں کا یہ قافلہ سورج نکلتے ہی ورکوں کے گاؤں میں جا پہنچا۔ گھوڑیاں گھوڑے اور سائیکل ملازموں کے پاس کھڑے کر دیے۔ سردارنی تیج کور اپنی ریشمی چادر کو سنبھالتے ہوئے آگے آگے چل رہی تھی۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی بازو کو اونچا اٹھا کر چیختی ہوئی آواز میں بلبلائی۔ "ہائے لوگو، میں چھتے دن لوٹی گئی۔ چلا گیا ہے سندھوؤں کا شیر ــ بنا کچھ دیکھے ــ مار دیا میرا شیر پوتا ان کی ضدوں نے۔"

بین کرتی روتی سردارنی تیج کور کے منہ سے یہ سچائی پھوٹ پڑی ــ چادر سرک کر اس کے کندھوں پر آ گری۔ ڈیوڑھی میں چارپائی پر دونوں ماں بیٹے کی لاشیں سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھیں۔ سردارنی نے پورو کا منہ ننگا کر کے کئی بار چوما ــ اور کہا،

"اوے لوگو، بس ہیں کرلی میری چندن کی گیلی — اوے بیٹا، دیکھ تو سہی، کون آیا ہے؟ تیری جگہ تیری دادی مرتی۔ تیرے چاچے اور تاؤ۔" اس کے ساتھ ہی پورو کی چارپائی کے پائے پر سردارنی تیج کور نے سر دے مارا۔ سردارنی کے سر سے نکلی لہو کی تیز دھار پورو کی چادر پر پھیل گئی۔ سردارنی کو پکڑ کر، سہارا دے کر چارپائی پر لٹا دیا۔ اور وہ کہتی جاتی تھی "مجھے کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ پیچھے رہ گئی ہیں دکھوں کے واسطے۔ چلی گئی میرے گھر کی رانی اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر۔"

سردارنی کے ماتھے کی پٹی میں سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ اس نے چوکڑی ماری اور پوتی کو سینے سے لگائے اس وقت تک بیٹھی رہی جب تک شمشان گھاٹ سے سب لوگ واپس نہیں آ گئے۔

نہریاں اور گھر میں کام کرنے والی دوسری عورتیں کھانے کے انتظام میں مصروف تھیں۔ پورو کی ماں نے تیج کور کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "بی بی جی، جو کچھ ہونا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ ایشور کا حکم ایسا ہی تھا۔ اٹھو، گھونٹ پانی کا پی۔ رات سے بھوکے اور اس پر سفر دس کوس کا۔"

سردارنی تیج کور نے پورو کی چاچی کی منت بھری عرض سن کر اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور پوتی کو کندھے سے لگا کر اٹھی اور قدرے غصے بھرے لہجے میں بولی "میری طرف کیا دیکھتے ہو۔ چلو گھر کو سندھو سردارو۔ ان کے گھر میں ہمارا دانہ پانی پچھلے سال کا ہی ختم ہو چکا ہے۔"

گھوڑیاں اور گھوڑے ڈیوڑھی کے سامنے پہنچ گئے۔ تیج کور نے لاکھی گھوڑی کے پاس کھڑے لڑکے سے کہا، "میری بیٹی کو ذرا پکڑنا۔" اور خود رکاب میں پاؤں رکھ کر گھوڑی پر سوار ہو گئی اور دونوں بازو آگے بڑھا کر کہا "میری بچی کو مجھے پکڑانا۔"

سردارنی نے پوتی کو سینے کے ساتھ مضبوطی سے لگاتے ہوئے گھوڑی کو ایڑی لگائی اور ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے گھوم کر نہیں دیکھا کہ کون کون وہاں کھڑا ہے۔

گھوڑیوں، گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی ہوئی گرد میں سردارنی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور لوگ سردار بجھتی ہوئی مٹی کو دیکھتے رہ گئے۔ ●●

(ترجمہ: راجونت سنگھ رانا)

بقیہ: ملاحظات

کرنے اور اتحاد کو مستحکم بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بھارت جیسے کثیر المذاہب ملک میں مذہب ایک تخریبی کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔ اگر اسے ذاتی اغراض، مثلاً سیاسی طاقت حاصل کرنے یا اقتصادی فوائد کے لیے استعمال کیا جائے اس سے بڑی کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی کہ بھارت صرف ہندوؤں یا مسلمانوں یا عیسائیوں یا سکھوں کا ملک بن جائے۔ تبھی یہاں مستقل امن بحال ہوگا۔ اور قوم متحد ہو کر آگے بڑھے گی۔ اور ملک اپنی منتخبہ منزل کو حاصل کر سکے گا۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ہندو ہندوؤں کے خلاف، عیسائی عیسائیوں کے خلاف اور مسلمان مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہیں۔ موجودہ دور میں ہمیں ایران، عراق، آئرلینڈ، جنوبی افریقہ اور دنیا کے دیگر ممالک پر نظر ڈالنی چاہیے جہاں ایک ہی مذہب کے لوگ سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے اپنے ہی مذہب کے لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔

ملک کو متحد رکھنے کا واحد حل سیکولرازم ہی ہے۔ مختلف مذاہب کی بقائے باہم ہی ملک کے سیکولرازم کے رشتے کو استحکام بخشتی ہے۔ ہر محب وطن کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ وہ تمام لوگوں کو یہ ذہن نشین کرائے کہ تمام مذاہب کا پیغام بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور تمام مذاہب کی بقائے باہم ہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ لوگوں میں یہ بیداری پیدا کرنی چاہیے کہ سیکولرازم کا مطلب لوگوں میں لامذہبیت پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب کے تئیں ان کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ لوگوں میں مذہبی کٹرپن کا مقابلہ کرنے کے لیے بیداری تعمیری کاموں کے ذریعے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔

قومی یک جہتی کا مطلب قومی سطح پر مکمل طریقے سے وقار اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ یہ صرف یوم آزادی یا یوم جمہوریہ منانے سے ہی پوری نہیں ہوگی بلکہ ایک مسلسل تعلیمی عمل ہے جو سماجی، ثقافتی، مذہبی اور بھارت کے مختلف علاقوں میں دیگر سرگرمیوں میں وہاں کے ہر فرد کی شرکت سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

قومی یک جہتی دل و دماغ کا عمل ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو یہ محسوس کرنا ہوگا کہ اس کا تعلق ثقافتی اور تہذیبی گوناگونی والے ایک قدیم ملک سے ہے۔ یہ احساس اس کے اس خیال کو تقویت دے گا کہ وہ پہلے بھارتی ہے اور بعد میں کچھ اور ہے۔ اس احساس کے بغیر قومی یک جہتی صرف ایک خواب ہی ہوگی۔

قومی یک جہتی کے ساتھ ہی ہمارا وجود ہے اس کے بغیر ہم دشمن کے آگے کمزور پڑ جائیں گے اور مٹ جائیں گے۔

امرتا پریتم

گائے کا مالک

اُس کے جسم کا رنگ بھورا تھا، بھتن ایکدم سیاہ نہیں تھے، لیکن سیاہ جھلک مارتے تھے، اس لیے گاؤں والوں نے اُس کا نام 'کپیلا گائے' رکھا تھا۔

کپیلا نے جتنی بار اپنی ٹوٹی ٹانگوں پر بوجھ ڈال کر اُٹھنے کی کوشش کی، اتنی ہی بار زور سے چیخ کر زمین پر گر پڑی تھی۔ اب اس میں اور ہمت نہیں تھی۔ ہانپتے ہوئے اُس نے گھاس کی سلین کو چاٹنے کے لیے زبان نکالی لیکن گھاس میں پانی کی تراوٹ کی جگہ کچھ گرم نمکین لہو سا لگا۔

اُس نے رات کو اپنے ساتھ گھاس چرنے کے لیے آئی ہوئی باقی تو چتکبری گاؤں کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ڈھونڈنے کی کوشش کی، مگر آس پاس اُسے دُور سے، بہت دُور سے صرف کچھ آوازیں سنائی دیں۔

ایک گرجتی ہوئی آواز تھی، "گائے ماتا پر یہ ظلم! یہ ہتیا کرنے والے پاپی، ہتیارے ....!"

دوسری چیختی ہوئی آواز تھی "جس دیش میں اس طرح پاپ ہوتا ہے، جہاں کوئی دھرم کرم نہیں رہا، وہ دیش ڈوب جائے گا ...."

اور پھر نا معلوم کتنی آوازیں تھیں جنہوں نے اُگتے ہوئے سورج کی روشنی پر جیسے دھاوا بول دیا تھا .... آوازیں قریب بھی ہوئیں، دُور بھی اور

نام: امرتا پریتم ۔ ولادت: ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء

شغل: تحریر و تصنیف

تصانیف: ۷۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ناول، شعری، افسانوی مجموعے اور سفرنامے شامل ہیں۔ بعض کے تراجم ہندی، اردو، انگریزی، بنگالی، ملیالم، کنڑ، گجراتی، مراٹھی، روسی، بلغارین، ڈینش، چیک، جاپانی، فرانسیسی اور متعدد دوسری زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد ناول فلمائے جا چکے ہیں۔

انعام اعزاز: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، پدم شری، گیان پیٹھ ایوارڈ (۱۹۸۲ء)

حال ممبر راجیہ سبھا (نامزد)

ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی اسناد پیش کیں۔

فرانس اور بلغاریہ نے اعزازات سے نوازا۔

پتہ: کے۔۲۵ حوض خاص انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

پھر خاموشی چھا گئی۔

کپیلا کا جسم سُن ہوتا جا رہا تھا اور پاؤں اُس کے آس پاس بہہ رہے خون میں ڈوب چلے تھے۔ اُسے لگا جیسے کچھ لوگ فوجی وردیوں میں اُس کے پاس گھوم رہے ہیں۔

وہ جدھر دیکھ رہے تھے، کپیلا نے بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُدھر دیکھا ـــ دُور ایک ہوائی جہاز پڑا ہوا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا: سر، میری دوسری ڈارک نائٹ ایکسرسائز تھی۔ نیا لینڈنگ کے لائٹس ٹیک آف کرنے کی بریفنگ کی تھی۔

"پھر ـــ؟" کسی نے پوچھا۔

وہ کہہ رہا تھا: "سر، میں نے ٹیک آف کرنے سے پہلے کے وائٹل ایکشن کیے اور جہاز کو رن وے پر لائن اَپ کر لیا۔ بریکوں پر چھ ہزار آر۔ پی۔ ایم تک کھولی، اور بریک چھوڑ دیے اور انجن پاور ٹیک آف آر۔ پی۔ ایم تک کھول دی۔ باہر دیکھا تو رن وے لائٹس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"پھر؟" کسی نے پوچھا۔

"سر! ہوائی جہاز رول کرتا گیا۔ اسپیڈ بڑھ رہی تھی۔ مڈل مارک پر اسپیڈ ایک سو پینتیس ۱۳۵ ناٹس پر پہنچ گئی۔ میں نے کنٹرول اسٹک کو اپنی طرف کھینچا۔

میں اس وقت انسٹرومینٹ کی طرف دیکھ رہا تھا — ہوائی جہاز کا نوز وہیل اوپر کو اٹھا۔ اچانک بہت زور کے جھٹکے محسوس ہوئے۔

"میں نے انجن ایک دم بند کر دیے اور بریک لگا دیے۔ اس طرح لگا جیسے کوئی زور سے ہوائی جہاز کو جھنجھوڑ رہا ہو۔

"مجھے خیال آیا کہیں جہاز کا ٹائر نہ پھٹ گیا ہو..... جہاز رن وے سے ایک طرف اتر کر درختوں کی طرف یا گڈھوں میں جا گرا تھا۔ لیکن میں رن وے کی لائٹس دونوں طرف دیکھ سکتا تھا۔

اتنے میں جہاز کا دایاں پہیہ ٹوٹ گیا۔ اور جہاز ایک دم دائیں طرف مڑ کر رن وے سے نیچے اتر گیا۔ رگڑ کے باعث جہاز میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔"

"اس وقت نیوی گیٹر کہاں تھا؟" کوئی پوچھ رہا تھا۔

کسی نے جواب دیا۔ "سر، میں اس کا نیوی گیٹر ہوں۔ ٹیک آف کے وقت میں کریش سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جہاز رک گیا تو میں نے (ایمرجنسی) ڈور کو کھولنے کی کوشش کی۔ پر وہ ڈور جام ہو چکا تھا۔ پھر میں نے دیکھا۔ جہاز کا نوز کون ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں ایک بڑا چھید ہو گیا تھا میں اسی چھید سے باہر نکل گیا۔

"تم باہر کس طرح نکلے؟"

"سر، میرے پاس ایک ہی طریقہ تھا کہ میں باہر نکلنے کے لیے اپنی سیٹ کینوپی کو جیٹیسن کرتا۔ کینوپی کو کھولنے کے لیے میں نے بٹن دبایا۔ وہ کچھ اوپر ہوئی پھر اپنی جگہ آ گئی۔ ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ اس لیے نیچے ہوا کا دباؤ نہیں تھا۔ میں جہاز میں قید تھا، — میں نے ہاتھوں سے کینوپی کو اٹھانے کی کوشش کی، پر اٹھائی نہیں گئی پھر میں نے کھڑے ہو کر سر کے زور سے کینوپی کو اٹھانے کی کوشش کی وہ اوپر ہوئی تو ہاتھوں کے زور سے میں نے اسے آگے کر کے باہر چھلانگ لگا دی۔ باہر آ کر دیکھا ہوائی جہاز کے داہنے ونگ کا ایک حصہ ٹوٹ کر ایک طرف پڑا ہے۔ رن وے کے ارد گرد خون ہی خون تھا اور گائیں مری پڑی تھیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ شاید جہاز کو آگ لگ جائے گی۔ اس لیے ہم یہاں سے دوڑ کر دور جا کھڑے ہوئے۔

پھر آواز آئی: "پر یہ گائیں یہاں ائیر فیلڈ میں آئیں کس طرح؟"

"سر ہمیں کچھ پتہ نہیں۔"

"یہ تفتیش ہوتی رہے گی۔ لیکن اس وقت تمہیں باہر خطرہ ہے۔ تم دونوں اپنی حد سے باہر نہ جانا — گاؤں میں ہمارے خلاف جلوس نکل رہے ہیں۔ مظاہرے ہو رہے ہیں۔"

کپیلا کی جان ٹوٹ رہی تھی پر ابھی نکلی نہ تھی۔ آنکھیں کبھی پل بھر کو کھلتیں پر مُند جاتیں۔

روشنی اندھیرے میں بدل رہی تھی۔ اُسے لگا جیسے اس کے قریب کئی لوگ جمع ہو گئے ہیں — کئی آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں.....

"ان مری ہوئی گایوں کے مالک کون ہیں؟"

کپیلا کو لگا — پھر خاموشی چھا گئی۔ کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

"تم لوگ جن کی بھی گائیں ہیں اپنے اپنے نام لکھوا دو۔ تمہیں تمہاری مری ہوئی گایوں کا معاوضہ دیا جائے گا۔"

پھر بڑی آوازیں آئیں۔ جیسے تمام لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں.....

"ایک گائے میری تھی حضور!" گوری گائے میرا نام شیرا ہے۔"

"ایک گائے میری تھی حضور! تین تھی نام رکھا۔"

"ایک میری تھی حضور! کُڑھی گائے!"

بہت سی آوازیں تھیں بہت سے نام تھے۔

اور پھر کوئی گرجتی ہوئی آواز آئی: "تم نے بیس نام لکھوا دیے ہیں پر گائیں تو صرف دس ہیں۔ تم جھوٹ بک رہے ہو۔"

کپیلا نے بجھتی آنکھوں کو کھول کر اپنے ساتھ ہی گایوں کے مالک کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کچھ چہرے پہچانے ہوئے بھی لگے پر کچھ ایک دم اجنبی تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ گئے تھے۔ کپیلا نے اپنے مالک موہنا کا چہرہ پہچانا۔ اُسے اپنے بچھڑے کی بڑی یاد آئی اور اس نے گلے کا سارا زور جمع کر کے کچھ کہنا چاہا پر گلے میں سے آواز نہ نکل سکی۔

کڑکتی آواز میں کوئی کہہ رہا تھا: "تم اس لیے اپنے کو گایوں کا مالک بتا رہے ہو کہ تمہیں معاوضہ ملے گا۔ پر تم مری ہوئی گایوں کے جھوٹے مالک ہو۔"

پھر پتہ نہیں سب کہاں چلے گئے۔ تمام آوازیں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ پتہ نہیں یہ رات کا اندھیرا تھا یا کپیلا کی آنکھوں میں پھیلا موت کا اندھیرا...

پتہ نہیں کب کتنی دیر بعد پھر کچھ آوازیں اُبھریں: "بول چوکیدار! یہ گائیں یہاں ائیر فیلڈ میں کس طرح آئیں۔ پتہ لگا ہے کہ گھاس چرنے کے لیے یہاں روز رات کو آتی تھیں۔ ان کے مالک تجھے ہر مہینے رشوت دیتے تھے۔ تجھ پر رشوت کا کیس..."

کپیلا کے حواس ڈوب رہے تھے۔ کوئی بات کانوں میں پڑتی تھی کوئی نہیں۔ جسم سے مکھیاں اڑانے کے لیے اس نے پونچھ کو ہلانا چاہا، مگر پونچھ اب ہلتی نہ تھی۔

پھر ایک آواز آئی: "وہ تمام شیرا، رکو اور بیس لوگ کہاں چلے گئے۔ اب کوئی کسی گائے مالک نہیں بنتا۔ سب کہہ رہے ہیں حضور! یہ گائیں ہماری نہیں ہیں"..... صرف اس لیے کہ انہیں یہ لگ گیا تھا کہ ہمارا جو پینتیس لاکھ کا ہوائی جہاز تباہ ہو گیا ہے۔ یہ نقصان گایوں کے مالک کو ادا کرنا پڑ

کپیلا نے اپنے مالک موہنا کو یاد کیا۔ پر وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔

کپیلا کو یاد آیا.... ایک بار موہنا بیمار پڑ صحت یاب نہیں ہو رہا تھا تب ایک سیانے نے اسے تھا کہ منگلوار کو آٹے کا ایک پیڑا اپنی گائے کو اپنے سے کھلایا کرے۔

کپیلا کے مرنے مرنے انگوں کو بھوک کا احساس

سنتوکھ سنگھ دھیر

کوئی ایک سوار

دن نکلتے ہی تانگہ جوت کر اڈے میں لگاتے ہوئے بارو تانگے والے نے اونچی آواز لگائی، "چاندا کوئی اک سوار کھنے دایئی او....!"

سردیوں میں اتنی صبح سویرے اتفاق سے پہلے کوئی سوار آجائے، نہیں تو ناشتہ پانی کرکے دھوپ چڑھنے پر ہی گھر سے نکلتا ہے آدمی. لیکن بارو اس اتفاق سے کو کیوں گنوائے؟ ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے وہ سب سے پہلے اپنا تانگہ اڈے میں لگانے کی سوچا۔

بارو نے بازار کی جانب منہ کرکے یوں زور سے آواز دی. جیسے اسے کل ایک ہی سواری چاہیے ہو. لیکن بازار کی طرف سے ایک بھی سوار نہ آیا. پھر اس نے ادھر ادھر کے گاؤں سے آتی ہوئی الگ الگ پگڈنڈیوں کی جانب پُرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے زور زور سے اونچی آوازیں لگائیں. نہ جانے سواریوں کو کبھی سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے؟ بارو سڑک کے کنارے پان بیڑی والے کے پاس بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔

بارو کا چست گھوڑا نچلا نہیں رہ سکتا تھا. دو تین بار گھوڑے نے نتھنے پھلا کر فراٹے مارے. دُم ہلائی اور پھر خود بخود دو تین قدم چل پڑا. "بس وئے بس پترا. کاہلا کیوں پیناں چلدے آں آلین دے کسے اکھاں دے انھے تے گنڈھ دے پورے نوں." موج میں ہنستے ہوئے بارو نے دوڑ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کس کر تانگے کے بمب کے ساتھ باندھ دیا.

اسٹیشن پر گاڑی نے چیخ ماری. ریل کی چیخ بارو کے دل میں اتر گئی. اس نے ریل گاڑی کو ماں کی گالی دی اور ساتھ ہی ریل گاڑی بنانے والے کو بھی پہلے جنتا گئی تھی اب ڈبہ "سالیاں گھنٹے گھنٹے بعد گاڑیاں چلنے لگ پڑی ہیں"؛ اور پھر بارو نے بڑے زور سے سوار کے لیے آواز لگائی ــــ ایک بیڑی اس نے اور سلگائی اور اتنا لمبا کش کھینچا کہ آدھی بیڑی پھونک دی. بارو نے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے بیڑی کو گالی نکال کر پھینک دیا. مرچوں کی مانند دھواں اس کے منہ میں چبھنے لگا تھا۔

گھوڑا ٹک نہیں پا رہا تھا اس نے ایک دو بار کھر اٹھا اٹھا کر دھرتی پر ٹپکائے. منہ میں لوہے کی لگام چبا چبا کر تھوتھنی گھمائی. تانگے کی چولیں ہلیں. ساز کڑکا. پروں کی بنی رنگ برنگی کلغی ہوا میں لہرائی اور گلے میں لٹکتے ہوئے ریشمی رول ہلنے لگے. بارو کو اپنے گھوڑے کی چستی پر فخر محسوس ہوا. اس نے پچکارتے ہوئے کہا. "بس اوئے ویلیا، کردے آں ہنے ہوا نال گلاں .....!"

"گھوڑا تیرا ہوشیار ہے بڑا بارو ــــ ٹپ ٹپ کرتا رہتا ہے." پان بیڑی والے نے کہا.

"کیا بات ہے." بارو فخر سے پھول کر بولا.

"جلد تو دیکھ جسم پر سے مکھی پھسلی پڑتی ہے. بیٹوں کی

نام: سنتوکھ سنگھ دھیر (دھیر تخلص)

پیدائش: ۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء بمقام بسی پٹھاناں (پٹیالہ)

شغل: تصنیف و تالیف

تصانیف: شراب دا گلاس، سانجھی کند، سویر ہون تک، سِٹّیاں دی چھاؤں، میری سرشٹھ کہانیاں، افسانوی مجموعے یادگار، شرابی (ناول)، میری انگلینڈ یاترا (سفرنامہ)
کبیر رچناولی (کبیر کی منتخب بانیوں کا پنجابی میں ترجمہ).
دس شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں.

پتہ: ۶۸۹، فیز ۷، موہالی۔ ۱۶۰۰۶۱ (چنڈی گڑھ)

ح خدمت کرتا ہوں۔"

"پشو بچتا بھی تجھی ہے۔" نتھو نے یقین کے اتھ کہا۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لیکن کھنے جانے والا ک بھی سوار ابھی تک نہیں آیا تھا اور بھی دو تین انگے آکر اڈے میں کھڑے ہو گئے تھے اور کندن بھی ڑک کی دوسری طرف کھنے کی جانب تانگہ کھڑا کرکے سواریوں کے لیے آوازیں لگا رہا تھا۔

ہاتھ میں تھیلا پکڑے ایک شوقین سا بابو بازار کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ بارو اس کی چال پہچاننے لگا۔ بابو اڈے کے اور نزدیک آگیا۔ لیکن ابھی تک اس کے قدموں سے کسی خاص سمت کا ندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

"چل اک سوار سرہند کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ملوہ جاندا بھئی او ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!" آوازیں اونچی ہونے لگیں۔ لیکن سوار کی مرضی کا پتہ نہ لگا۔ بارو نے کھنے کی آواز لگائی۔ سوار نے سر نہ اٹھایا۔ "کس لیے بولتے نہیں جلدی سے جینٹلمین آدمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" بارو نے دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ بابو کھنے کا رخ کیے ہوئے تانگے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ "ہور ہے بئی کوئی سواری ۔۔؟" اس نے بہ مشکل پوچھا۔

بارو نے بڑے ادب کے ساتھ تھیلا پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ بیٹھو بابو میرے نزدیک' ابھی چل پڑیں گے ـــــ اک سوار لے لیں۔"

لیکن بابو نے تھیلا نہ پکڑایا اور خلا میں دیکھتے ہوئے خاموش کھڑا رہا۔ یوں ہی گھنٹہ بھر تانگے میں بیٹھے رہنے کا کیا مطلب؟

بارو نے زور سے ایک سوار کے لیے آواز لگائی۔ جیسے اسے بس ایک ہی سوار کی ضرورت ہو۔ بابو تھوڑا سا ادھر ادھر ٹہل کر تانگے کے اگلے پائیدان کے ذرا سا قریب ہو گیا۔ بارو نے حوصلے سے ایک آواز اور لگائی۔

بابو نے اپنا تھیلا تانگے کی اگلی گدی پر رکھ دیا۔ اور خود پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگا۔

بارو نے گھوڑے کی پیٹھ پر پیار سے تھپکی دی اور پھر تانگے کی پچھلی گدیوں کو یوں ہی ذرا ٹھیک ٹھاک کرنے لگا۔ اتنے میں ایک سائیکل آکر تانگے کے پاس رکی۔ کوئی بات سائیکل والے نے سائیکل پر چڑھے چڑھے ہی بابو کے ساتھ کی، تو وہ گدی پر سے اپنا تھیلا اٹھانے لگا۔ بارو نے مایوس ہو کر کہا۔ "ہوا سامنے کی ہے بابو جی۔ ۔ ۔ ۔!" لیکن سائیکل والا بابو کو لے کر چلتا بنا۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔

کھسیانا سا ہو کر بارو پھر سڑک کے ایک کنارے پان بیڑی والے کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا جی قینچی کی سگریٹ پینے کا ہوا۔ لیکن دو پیسے والی سگریٹ وہ کس آس پر پیئے؟ چکر آج صرف ایک ہی لگتا نظر آرہا تھا "چار آنے سواری کھنے دی ـــــ چھ سواریوں سے زیادہ کا حکم نہیں۔ تین روپے تو گھوڑے کے پیٹ میں چلے جائیں گے۔" اس کے دل میں خلش سی ہوئی۔ وہ یوں ہی یہاں کیوں بیٹھے؟ وہ اٹھ کر تانگے میں پچھلی گدی پر بیٹھ گیا تاکہ پہلی نظر میں سوار کو تانگا بالکل خالی نہ لگے۔

تانگے میں بیٹھا ہوا وہ "لارالپا۔ لارالپا"۔ ۔ ۔' گنگنانے لگا اور پھر ہیر کا ٹپا۔ لیکن جلدی اس کے دل میں ایک تذبذب سا پیدا ہوا۔ اس کے ہونٹوں کو ٹپے بھول گئے۔ وہ دور فصلوں کی جانب دیکھنے لگا۔ کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر کچھ مسافر چلے آرہے تھے۔ بارو نے قریب آرہے مسافروں کی طرف بغور دیکھا۔ سفید اور چیکبرے کھیس لپیٹے چار پانچ جاٹ سے تھے۔ بارو نے سوچا۔ "پیشی پر جانے والے ہوتے ہیں ایسے چودھری۔" اس نے تانگے کو موڑ کر ان کی جانب جاتے ہوئے آواز دی۔ "کھنے جانا ہے لمبڑدارو؟ آؤ، بیٹھو، چلیں۔"

سواریوں نے کچھ پس و پیش کی۔ پھر بیچ میں سے کسی نے کہا۔ "جانا تو ہے اگر ابھی چل دو۔"

"بس آپ کے بیٹھنے کی دیر ہے۔" بارو نے گھوڑے کے منہ کے پاس سے لگام پکڑ کر تانگے کا منہ اڈے کی طرف گھما دیا۔

"تحصیل پہنچنا ہے۔ پیشی پر سمراے۔"

"مکھاں بیٹھو تو سہی۔"

سواریاں تانگے میں بیٹھ گئیں۔ ایک سوار کی اونچی آواز لگاتے ہوئے بارو نے تانگے کو اڈے کی جانب ہانک لیا۔

"ابھی اور چاہیئے اک سواری؟" بیچ ہی میں سے ایک سواری نے تانگے والے کو "آخر تانگے والا ہی نکلا" کہہ کر جملہ کسا۔

"چل کر لینے دے اس کو بھی اپنا گھر پورا۔ ۔ ۔ ۔" بیچ میں سے کسی نے کہہ دیا۔ "ہم کچھ دیر بعد میں پہنچ جائیں گے۔"

بارو نے اڈے سے تانگا باہر نکال لیا۔ بڑی تیزی سے۔ بازار کے بیچ اس نے تانگے کے 'بمب' پر تن کر۔ اونچی آواز لگائی۔ "کوئی ایک سوار کھنے بھئی او ۔ ۔ ۔!"

"اکیلی سواری کو لوٹنا ہے راستے میں؟" بازار میں سے کسی نے اونچی آواز میں ٹوک کر بارو سے مذاق کیا۔

بازار میں قہقہہ بلند ہوا۔ بارو کے سفید دانت اور لال ہونٹ دکھائی دینے لگے۔ اس کے رخسار پھول کر چمکنے لگے اور وہ بھی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ سوار کے لیے آواز لگاتے ہوئے اس نے گھوڑا موڑ لیا۔ اڈے میں آکر سڑک کے ایک کنارے کھنے کے رخ تانگا لگایا اور خود پان بیڑی والے کے پاس بیٹھ گیا۔

"کی نا پھر وہی بات!" تانگے والے کو دیکھ کر ایک سوار بولا۔

"او بھئی تانگے والے، ہمیں خوامخواہ پریشان کر رہا ہے۔" ایک اور نے کہا۔

"مجھے رکنا نہیں ہے لمبڑدارو۔ بس اک سوار دی اور ـــــ آگیا تو ٹھیک ہے نہیں تو یوں ہی چل پڑیں گے۔" بارو نے سواریوں کو یقین دلایا۔

سواریوں کو اکتایا ہوا دیکھ کر کندن نے اپنے تانگے کو ایک قدم اور آگے کرتے ہوئے آواز دی۔ "چل، چار سوار لے کر چل پڑوں گا کھنے کو۔ ۔ ۔ ۔" اور وہ چڑانے کے لیے بارو کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔

"ٹل جا اوئے، ٹل جا نائیا ـــــ باز آجا ایسی کرتوتوں سے!" بارو نے کندن کی طرف آنکھیں نکالیں اور سواریوں کو ورغلائے جانے سے بچانے کے لیے اس

نے عورتوں اور لڑکیوں کی آرہی رنگ برنگی ٹولی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، "چلتے ہیں سردارو، ہم ابھی بس وہ آگئیں سواریاں!"

سواریاں اس ٹولی کی جانب دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

ٹولی کی طرف دیکھتا ہوا بارو سوچنے لگا، "کسی بیاہ شادی کی بنی سجی سواریاں ہیں ...... بے شک دو تانگے ہی بھر جائیں ___ اور دام بھی اچھے دے جاتی ہیں ایسی سواریاں ___"

ٹولی قریب آگئی۔

کچھ بوڑھی عورتوں اور لڑکیوں نے ہاتھوں پر کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھال، تھالیاں اور گوہلے اٹھائے ہوئے تھے۔ پیچھے کچھ گھونگھٹ نکالے دلہنیں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ بارو نے آگے بڑھ کر، بیٹیوں جیسا بیٹا بنتے ہوئے ایک بوڑھی مائی سے کہا۔ "آؤ مائی جی تیار ہے تانگا۔ بس آپ ہی کا انتظار تھا... بیٹھو بچے کو۔"

"ارے نہیں بھیا... !" مائی نے سرسری طور پر کہا۔ "ہم تو ماتا کے مندر میں درشنوں کو جارہی ہیں!"

"چنگا مائی جنگا ما!" بارو ہنس کر کھسیانا سا ہوگیا۔

"او بھئی چلوگے کہ نہیں؟" سواریوں کو بھلا کہاں صبر ہوتا ہے اور ہر گھڑی بارو بھی انھیں کوئی ترکیبوں سے ٹالے جاتا۔ آخر ہار کر اس نے صاف صاف بات کہہ دی۔ چلتے ہیں بابا ___ بینے دے اک سوار ___ کچھ بھاڑا تو بن جاوے...!"

"تو اپنا بھاڑا بنا... چاہے ہماری تاریخ نکل جائے۔" سواریاں بھی سچی تھیں۔

کندن نے پھر چھیڑا کرتے ہوئے کہا: "بعض لوگ بھولے ہوتے ہیں، کہاں پھنس گئے ___ اوّل تو چلے گا نہیں اور اگر چل پڑا، اور الٹا بڑا ہوگا۔ قدم قدم پر رکتا ہوا گھوڑا اور اگر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو درمیان میں رک جائے گا۔ منزل پر پہنچے گا نہیں ___!"

سواریاں کانوں کی کچی ہوتی ہیں۔ بارو سخت الجھن میں تھا۔ لیکن وہ چھیڑ چھاڑ کو برداشت کرتے ہوئے کندن کی جانب غصے میں دیکھ کر بولا، "نائیا، نائیا۔

"موت تجھ سے یوں باتیں کروا رہی ہے۔ تانگا ٹھیک تو کروالو، ماں کے پاس جاکر ڈھیچکوں ڈھیچکوں کرتی ہے اور یہاں کھڑا بھونکتا جا رہا ہے... گٹارجات۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن جو حالت بارو کی تھی، وہی کندن اور دیگر تانگے والوں کی تھی۔ کیسے نہیں چاہئیں سواریاں؟ کس نے گھوڑے اور بال بچوں کا پیٹ نہیں پالنا؟ نہ بارو بیچ میں سے چلے اور نہ ہی کسی دوسرے کو چلنے دے ...... صبر بھی کوئی چیز ہے! ... اپنی اپنی قسمت ہے۔ اچھا برا تو بنا ہوا ہے .... چار ہی لے کر چل دے۔ ...... کسی اور کو بھی روزی کمانے دے ..... کیا بیچ میں پھنسا کھڑا ہے ...... ! کندن نے اپنی جڑ پر خود ہی تک لگاتے ہوئے غصے میں آکر زور سے آواز دی، "چلو، چار سواریاں لے کے چل پڑوں گا، گھنٹے کو منٹوں سیکنڈوں میں کھتے پہنچا دوں گا۔ کرایہ بھی تین تین آنے۔" اور تانگا اس نے ایک قدم اور آگے بڑھالیا۔

بارو کی سواریاں پہلے ہی ادبی ہوئی تھیں۔ ان کے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا اور پھر سواریاں کسی کی بندھی ہوئی بھی تو نہیں ہوتیں۔ بارو کی سواریاں بگڑ کر تانگے میں سے اترنے لگیں۔

بارو نے غصے میں للکار کر کندن کو ماں کی گالی نکالی اور اپنی دھوتی کا لانگڑ مار کر کہا، "اتر بیٹیا نیچے تانگے سے!"

کندن بارو کو طیش میں تنا ہوا دیکھ کر کچھ ڈر سا گیا۔ لیکن وہ تانگے پر سے نیچے اتر آیا اور بولا۔

"اوئے منہ سنبھال کر گالی بک۔"

بارو نے ایک گالی اور نکال دی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھانٹے پر انگلی جوڑ کر کہا، "تین تہیں بنا کر پہیئے کے ڈنڈوں سے نکال دوں گا۔"

"تو ہاتھ لگا کر تو دیکھ۔" کندن اندر سے ڈر رہا تھا لیکن اوپر سے اچھل رہا تھا۔

"او - ہٹ جا تو - ہٹ جا نائیا! لہو کا قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دوں گا ___ میں پی جاؤں!"

بارو کو غصہ تھا کہ کندن کیوں اسے برابر گالی نہیں نکال رہا تھا!

سواریاں ارد گرد کھڑی دونوں کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔ خواہ مخواہ نتھنے پھلا رہے ہو۔" کندن نے ذرا ڈٹ کر کہا۔

"سواریاں بگاڑ دیں میری!"

"آوازیں تو میں لگاؤں ___ اور سواریاں تم لے جاؤ۔"

"میں صبح سے تمہارا منہ دیکھ رہا ہوں۔ بال نوچ لوں گا۔"

"تم بال نوچ لوگے ___!" کندن بھی برابر ڈٹ گیا۔

"سواریاں بٹھائے گا تو میری؟"

"ہاں، بٹھاؤں گا ....!"

"بٹھا کے دیکھ۔" بارو نے مُکّا ہوا میں لہرایا۔

"آبابا ......" کندن نے ایک سوار کو کندھے سے پکڑ کر کہا۔

بارو نے جھٹ کندن کو گریبان سے پکڑ لیا۔ کندن نے بھی بارو کو ہاتھ ڈال لیا۔ دونوں آپس میں الجھ پڑے۔ پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ آخر کچھ اور تانگے والوں اور سواریوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اڈے کے ٹھیکیدار نے دونوں کو لعن طعن کی۔ سبھی لوگوں نے یہی کہا کہ سواریاں بارو کے تانگے میں بیٹھیں۔ تین تین آنے یوں ہی فالتو بات ہے ...... نہ کسی نے لینے ہیں نہ کسی نے دینے .....

کندن کو سبھی نے لعنت ملامت کی اور سواریاں پھر سے بارو کے تانگے میں بیٹھ گئیں۔

بارو کو تھکا ہارا اور دکھی دیکھ سبھی کو اب اس سے ہمدردی سی ہو چلی تھی۔ سبھی مل جل کر اس کا تانگا بھروا کر اسے وہاں سے روانہ کرنا چاہتے تھے۔ سواریوں نے بھی کہہ دیا کہ وہ ایک آدھ گھڑی اور ٹھہر لیں گے۔

"یہ اپنا گھر پورا کرلے ___ اس غریب نے بھی تو مویشی کا پیٹ پہلے بھرنا اور پھر خود کھانا ہے۔"

اتنے میں بازار کی طرف سے پولیس کے حوالدار نے قریب آکر پوچھا، "اوئے تانگا ہے تیار کوئی کھنے کا لڑکو؟"

پل بھر کے لیے بارو نے سوچا، "آگئی مفت کی بگار ـــــ دو پیسہ نہ دھیلا ـــــ" لیکن جھٹ ہی اس نے سوچا، "نہ تو پلس کو کر نہیں سکتے، سواریاں تو دو اور بٹھالوں گا اس کی وجہ سے ـــــ نہ بھاڑا دے گا نہ ہی۔" اور بارو نے کہا، "آؤ، حولدار جی، تیار ای کھڑا تانگا، بیٹھو میرے پاس!"

حولدار تانگے میں بیٹھ گیا۔ بارو نے ایک سوار کے لیے ایک دو اونچی اونچی آوازیں لگائیں۔ ایک لالہ جی بازار کی طرف سے آئے اور بغیر پوچھے بارو کے تانگے میں آبیٹھے۔ دو تین بوڑھی سی عورتیں اڈے کی جانب سڑک میں سے آرہی تھیں۔ بارو نے جلدی جلدی آواز لگا کر پوچھا، "مائی کتھے جانا ہے؟" بوڑھی عورتوں نے جلدی جلدی قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ اور ایک نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا، "بھئی رک جا۔"

"جلدی کر مائی جلدی!" بارو کے جیسے پاؤں تپ رہے تھے۔

وہ عورتیں تیزی سے آکر تانگے میں بیٹھنے لگیں۔

"او بھائی۔ کرایہ کیا لوگے؟"

"جلدی سے بیٹھ جاؤ مائی، تم سے زیادہ تو نہیں مانگ رہا۔"

آٹھ سواریوں سے تانگا بھر گیا۔ دو روپے بن گئے تھے۔ چلتے چلتے کوئی اور بھیج دے گا مالک ـــــ دو پھیرے لگ جائیں اسی طرح ـــــ بارو نے ٹھیکیدار کو محصول ادا کر دیا۔

"لے بھائی، اب تو چل...." پہلی سواریوں میں سے ایک نے کہا۔

"لو جی بس رب کا نام لے کے چلتے ہیں...."

بارو گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بمب سے راسیں کھولنے لگا۔

پھر اسے یاد آیا، ایک سگریٹ بھی لے لی جائے۔

پل بھر میں اس نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو ٹپ ٹپ کر کے چلتے تانگے کے بمب پر تن کر بیٹھے ہوئے دھوئیں کے مرغولے بناتے دیکھا اور وہ بھرے ہوئے تانگے کو چھوڑ کر قینچی کی سگریٹ خریدنے کے لیے پان بیڑی والے کے پاس چلا گیا۔

بھوکی ڈائن کی طرح جھٹ انبالہ سے لدھیانہ جانے والی بس تانگے کے پاس آکھڑی ہوئی۔ آن کی آن میں تانگے پر سے سواریاں اتر کر بس کے پیٹ میں سما گئیں۔ اڈے پر جیسے جھاڑو پھر گیا ہو۔ ڈائن کی طرح بس چیختی چنگھاڑتی ہوئی آگے چلی گئی۔ دھوئیں کی بو اور اڑتی ہوئی دھول اس کے منہ پر پڑ رہی تھی۔

بارو نے اڈے کے عین بیچ چھانٹا اونچا کر کے پورے زور کے ساتھ ایک بار پھر آواز لگائی، "جاندا کوئی اک سوار کھنے دا ہئی او.....!" ●●

(ترجمہ: گلونت فارغ)

بقیہ:-

راس لیلا

کھیلتا رہتا ہے۔

اندر آکر اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رادھا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میرے کرشن ـــــ ڈرو نہیں۔ ہم نے کوئی چوری نہیں کی۔ کوئی پاپ نہیں کیا۔"

میں ہمت کر کے اس کے ساتھ باہر آگیا۔ اس نے میرا بازو میری ماں کو جا کر تھما دیا اور کہا۔ "یہ لو اپنا مکھن چور ـــــ اندر کے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔"

میری ماں مجھے چھوڑ کر مکان میں داخل ہو گئی۔ برابر کے کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں اور دیے روشن دیکھ کر اس نے بلند آواز میں ـــــ "اوہ ـــــ یہ ـــــ یہ ـــــ" کہا اور ایک مشکوک نظر ڈال کر تمکنت کے ساتھ واپس آگئی ـــــ آتے ہی مجھ پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ رادھا مجھے بچانے کے لیے باہر آئی لیکن پھر واپس ہو گئی۔ وہ دوبارہ آئی اور پھر واپس چلی گئی۔ میرے رخسار پر طمانچہ پڑتے ہی وہ اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔

مجھے کمرے میں بند کر دیا گیا اور میری ماں میرے والد کا انتظار کرتی رہی۔ میں جان بوجھ کر خراٹے لینے لگا۔ میری ماں نے بڑے پیار سے میرے والد کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر تک برآمدے میں ٹہلنے کے بعد جب وہ اپنے پلنگ پر آکر لیٹ گئے تو ماں بھی باقی کام ختم کرنے کے بعد اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ماں نے آہستہ سے کہا۔ "کیا آپ جاگ رہے ہیں؟"

میرے والد نے کروٹ بدل کر کہا۔ "ہاں۔"

"مجھے ایک بات کرنی ہے۔" ماں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے بات بہت ضروری ہو۔

"کیا بات ہے؟"

ماں نے جو کچھ دیکھا سنا تھا سب کچھ بتا دیا اور آخر میں کہا۔ "میرے جگر کے ٹکڑے کو اندر لے جا کر بنگالن نہ جانے کیا جادو ٹونا کرتی رہتی ہے۔"

والد نے جواب دیا۔ "کیوں پاگل ہوئی جاتی ہو۔"

ماں کے زور دینے پر والد نے کہا۔ "اچھا کل صبح اس بوڑھے سے ملوں گا۔"

تیسرے دن جب میں اسکول سے لوٹا تو میں اپنے گھر جانے کے بجائے رادھا کے گھر کی طرف ہو گیا۔ دروازہ پوری طرح کھلا تھا۔ اندر کوئی سامان نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے غور سے دیکھا۔ اب بھی اندر کوئی سامان نہیں تھا۔ میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ اس میں بھی کوئی نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن کا کوئی انگ کاٹ لیا گیا ہے۔ میں بستے سمیت کمرے کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں پاتال میں اتر رہا تھا۔ اچانک کسی نے آکر میرا بازو پکڑ لیا۔ پہلے یہ سمجھا کہ رادھا ہو گی لیکن کسی نے بازو بہت زور سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا ـــــ ماں ـــــ میں رو رہا تھا ماں مجھے گھسیٹ کر واپس لے جا رہی تھی۔

کلونت سنگھ ورک

دھرتی تلے کا بَیل

ٹھٹھی کھارا گاؤں پکی سڑک پر امرتسر کے نزدیک واقع تھا۔ اور جس مستی کے عالم میں مان سنگھ جا رہا تھا، اُس میں تو دُور دراز کے .... دیہات بھی نزدیک دکھائی دیتے ہیں۔ گو شام ڈھل رہی تھی؛ تانگے کے تھکے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ بھی مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔

مان سنگھ چھٹی پر آیا ہوا ایک فوجی تھا۔ ٹھٹھی کھارا اُس کے دوست کرم سنگھ کا گاؤں تھا۔ جتنی گہری دوستی فوج میں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔ پہلے تو وہ دونوں اپنے ریجمینٹل سینٹر میں اکٹھے رہے اور اب ایک بٹالین میں برما کے محاذ پر اکٹھے لڑ رہے تھے۔ کرم سنگھ پہلے بھرتی ہوا تھا، اس لیے اب حوالدار ہو گیا تھا۔ مگر مان سنگھ ابھی بہ مشکل نائک ہی بن سکا تھا۔

کرم سنگھ کے بارے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اُس کی زبان بہت شیریں تھی۔ گاؤں کے کئی اور لڑکے بھی فوج میں تھے۔ جب وہ چھٹی پر آتے تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ اُن کی بات چیت سلام دعا سے آگے نہیں بڑھتی تھی، لیکن جب کرم سنگھ چھٹی پر آتا تو کنوئیں پر نہانے والوں کی بھیڑ بڑھ جاتی۔ سردیوں کی نصف شب تک لوگ بھڑ بھونجے کی سرد ہوتی ہوئی بھٹی کی تپش کے سہارے بیٹھے کرم سنگھ کی باتیں سنا کرتے۔ ریجمنٹ میں اُس کی بندوق کے نشانے کی بہت

نام : کلونت سنگھ ورک
ولادت : ۲۰ رمئی ۱۹۲۰ء
وفات : ۱۹۸۷ء
تصانیف : چھ ویلا، دھرتی تے آکاش
تو ڑی دی پنڈ، ندھ دا چھیر،
نویں لوک وغیرہ۔
انعام و اعزاز : ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۶۸ء)

دھاک تھی۔ نشانہ لگانے کے مقابلے میں اُس کی گولی نشانے کے درمیان میں سے اس طرح گزرتی جیسے ہاتھ سے پکڑ کر نکالی گئی ہو۔ اب لڑائی میں اُس کے نشانے نے دُور درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے جاپانی مار گرائے تھے۔ اس طرح وہ جاپانی نشانہ بازوں کی گولیوں سے مرے اپنے آدمیوں کا بدلہ چکاتا اور اپنی بلیٹن کے دل کو تسکین دیتا رہا۔

جہاں مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑیں ناکام رہتی تھیں، وہاں کرم سنگھ کی ایک گولی کام دے جاتی تھی۔ بے شک اب کرم سنگھ کی ہڈیاں سخت ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن جب وہ جمناسٹک کے ڈنڈوں پر کھیل دکھاتا تو دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا گویا ڈنڈے کے ساتھ کوئی بھوت چپک گیا ہو۔

خیر یہاں لڑائی میں تو یہ سب کھیل تماشے بند تھے اور بھی بہت سی سرگرمیاں بند تھیں۔ کبھی چُست وردی پہن کے بینڈ کے ساتھ پریڈ نہیں کی تھی۔ کوئی بازار بھی نزدیک نہیں تھا۔ جہاں شہری لباس میں کوئی جا سکے کبھی کوئی گاؤں یا علاقے کا آدمی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے جب مان سنگھ کی چھٹی کی باری آتی تو کرم سنگھ کو بہت مشکل پیش آتی۔ اگر دونوں کو چھٹی مل جاتی تو وہ دونوں اکٹھے ہی چھٹی گزارتے اور اکٹھے ہی واپس آتے۔ امرتسر سے چوہڑکانہ کوئی سا دور تھا۔ پچاس کوس

سا فرق نہیں تھا۔ خواہ پہلے کو ماجھہ اور دوسرے کو بار کہتے تھے۔ خواہ امرتسر قدیم زمانے سے آباد تھا۔ اور دوسرے کو اچھی طرح آباد ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی، مگر ان دونوں چھٹی بہت مشکل سے ملتی تھی۔ کبھی کبھار کسی کسی کو مل جاتی تھی جیسے لڑائی میں بہادری کے تمغے کبھی کبھار کسی کو مل جاتے ہیں۔

اور جب مان سنگھ واپس جانے والے فوجی ٹرک میں بیٹھنے لگا تو کرم سنگھ نے کہا کہ ہمارے گھر بھی ہوتے آنا۔ جب وہ تمہیں میرے پاس سے آگے دیکھیں گے تو نصف ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ جب اُن سے مل کر آئے۔ تمہیں میں دیکھوں گا اور تم سے اُن کی بات چیت اور حال احوال سنوں گا تو نصف ملاقات میری بھی ہو جائے گی۔"

پھر اپنے علاقے میں اُن کی دلچسپی بڑھانے کے لیے اُس نے پوچھا۔

"کیا پہلے تم اُدھر گئے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔ امرتسر میں سے گزرا ہوں۔ آگے کبھی نہیں گیا۔"

"وہاں بہت سے گوردوارے ہیں۔ ترن تارن کھڈور صاحب گوئندوال۔ سب جگہ متھا ٹیک آنا۔ اور ساتھ ہی ہمارے گھر سے ہوتے آنا۔ میں انہیں خط سے اطلاع دے دوں گا۔"

اور اسی لیے اپنی چھٹی ختم ہونے کے قریب وہ آج تانگے میں سوار کرم سنگھ کے گاؤں جا رہا تھا۔

"بابو جی میں مان سنگھ ہوں۔ جوہڑ کلاں سے۔" اُس نے کرم سنگھ کے گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھے بزرگ کو ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"آیئے۔ بیٹھیے۔"

مان سنگھ اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی آمد سے وہ بزرگ کچھ تکلیف سی محسوس کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر بعد میں اُس نے چپ چاپ گردن جھکالی۔

مان سنگھ تیز طبع تو نہیں تھا، لیکن جس قسم کا اس کا خیر مقدم ہوا اس سے اُسے بہت حیرانی ہوئی — ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی ہو

"کیا آپ کرم سنگھ کے والد ہیں؟" اُس نے بہت آؤ بھگت کے تقاضے کے طور پر کہا۔

"ہاں، یہ اُسی کا گھر ہے۔"

"کیا اُس نے میرے متعلق آپ کو کوئی خط لکھا تھا؟"

"ہاں، اُس نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے پاس آئیں گے۔" اور یہ کہہ کر وہ بوڑھا آنگن کی طرف چل دیا۔ اُس نے ایک کٹیا کو ایک کھونٹی سے نکال کر دوسری کھونٹی پر باندھا۔ اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اپنا ہاتھ چاٹنے کے لیے اُس کے منھ کے قریب رکھ دیا۔ پھر اندر جا کر مان سنگھ کی آمد کی اطلاع دی اور چائے لانے کے لیے کہا۔ اور گویا وہ پھر ڈیوڑھی میں آنے سے ڈرتا ہو وہ پھر آنگن میں بندھی گھوڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے رکھے ہوئے کھوسے کو ہلایا اور کچھ چنے لا کر اس میں ڈالے اور پھر ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اب وہ قدرے زیادہ خود اعتمادی سے بات کر رہا تھا۔ وہ مان سنگھ کے دائیں بائیں بھی جھانک رہا تھا۔

"جسونت سنگھ کہاں ہے؟" مان سنگھ کو علم تھا کہ کرم سنگھ کے چھوٹے بھائی کا نام جسونت سنگھ ہے۔

"ابھی آ جاتا ہے چری کا گٹھڑ لے کر۔"

اتنے میں کرم سنگھ کی والدہ چائے لے کر آ گئی

"بے بے جی ست سری اکال!" مان سنگھ نے ہنستی آنکھوں سے بڑھیا کی طرف دیکھا۔

بڑھیا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑکے لیکن کوئی بات نہیں کہہ سکی۔

مان سنگھ نے چائے کی گڑوی اور کٹوری اس کے ہاتھ سے پکڑی اور وہ واپس چلی گئی۔

یہ بھی کس طرح کے لوگ ہیں۔ مان سنگھ حیران ہو رہا تھا۔ وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اب ایک گھر آ کر وہ واپس کیسے جا سکتا تھا۔

"چلو، ایک رات رہ کر واپس چلا جاؤں گا۔" اُس نے فیصلہ کیا۔

رات کو جب جسونت سنگھ آیا تو اس رونق میں کچھ کھل کر بات چیت ہونے لگی۔

"بڑی مشہور ہوئی ہے کرم سنگھ کی گولی برما کی لڑائی میں۔ بس گھوڑا دبانے کی دیر ہوتی ہے کہ ایک جاپانی زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُس نے اُسے کہاں سے ڈھونڈ لیا ہے"

مان سنگھ یہ کہہ کر رُک گیا۔ اس اُمید پر کہ وہ سب برما کی لڑائی کے بارے میں بہت کچھ پوچھیں گے۔ اُس کے دل میں وہاں کی بہت سی باتیں بھر رہی تھیں لیکن یہاں تو کوئی سننے والا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی رہی۔

پھر بوڑھے نے جسونت سنگھ سے کہا۔

"اپنی پانی کی باری کب ہے؟"

"پرسوں صبح تین بجے باری آئے گی۔"

صبح تین بجے کا نام سن کر مان سنگھ نے پھر بات شروع کی۔ "وہ اپنے دوستوں کی خوب باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اور تو اور رہی کرم سنگھ علی الصبح اٹھنے سے بچ گیا۔ اُسے فوج میں سویرے اُٹھنے سے بہت اکتاہٹ ہوتی ہے۔ وہ سب کے بعد اُٹھتا ہے۔"

اس سے بھی کسی کی بات کرنے کے لیے حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ پھر کھانا آیا۔ انہوں نے کھانے کا بہت اہتمام کیا ہوا تھا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ جسونت اُسے پنکھا جھل رہا تھا۔ اُس کے دل سے یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ اُس کی جانب توجہ نہیں دی جا رہی۔

کھانا کھاتے وقت کرم سنگھ کا چھوٹا سا بچہ چلتے چلتے مان سنگھ کی چارپائی کے پاس آ گیا۔ اگر وہ اور کسی سے کرم سنگھ کے بارے میں بات نہیں کر سکتا تھا تو اس بچے کے ساتھ تو کر سکتا تھا۔ مان سنگھ نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

"ارے اپنے باپ کے پاس چلے گا؟ چلنا ہے تو چل میرے ساتھ۔ وہاں بہت بارش ہوتی ہے۔ پانی میں کھیلتے رہنا۔" مان سنگھ کی یہ بات بالو کو کانٹے کی طرح چبھی اور وہ بولا۔

"پکڑ بھی لو لڑکے کو۔ کھانا تو آرام سے کھا لینے دیا کرو۔"

بزرگ نے کچھ تیکھے پن سے کہا اور بڑھیا بچے کو اٹھا کر لے گئی۔

اب تو گھر کی فضا میں مان سنگھ کے لیے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ سفر ختم کر کے وہ جلد از جلد واپس چلا جانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے اگلے دن کے سفر کے بارے میں پوچھ تاچھ شروع کی۔ "یہاں سے ترن تارن کتنی دور ہے ؟"

"چار کوس کا سفر ہے !"

"صبح صبح تانگہ تو مل جاتا ہوگا ؟"

"تم تانگے کی فکر مت کرنا۔ دونوں بھائی اکٹھے ہی ساتھا ٹیک آنا!"

اس تجویز سے مان سنگھ متفق تھا جسونت سنگھ ایسا سنجیدہ آدمی نہیں تھا۔

لیکن مان سنگھ کے ساتھ چلتے ہوئے تو وہ بھی کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ جو بھی ہنستا سا لوگ اُسے راستے میں ملتے وہ اُنہیں دور سے ہی ست سری اکال کہہ کر آگے چل دیتا۔ حالانکہ مان سنگھ چاہتا تھا کہ وہ راستے میں کھڑا ہو کر لوگوں سے باتیں کرے۔ اس نے کون سا روز روز ادھر آنا تھا۔

"کرم سنگھ نے تو فوج میں خوب شہرت حاصل کی ہے۔ تم فوج میں کیوں نہیں گئے ؟" مان سنگھ نے پھر جسونت سنگھ سے بات شروع کی۔

جسونت سنگھ ایک دم گم سم ہو گیا۔ گویا کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ کچھ رک کر اُس نے کہا "ایک کم ہے فوج میں کیا ؟"

"چری اور گنے کی فصل اس طرف کتنی اونچی ہو گئی ہے !" چری کے کھیت دیکھ کر جسونت سنگھ نے بات شروع کی۔

"قدِ آدم جتنی ہو گئی ہے فصل ——" مان سنگھ نے ہاں میں ہاں ملائی، لیکن اس کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے دوست کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔

گاؤں لوٹ کر مان سنگھ واپسی کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ امرتسر سے رات کی گاڑی میں وہ سوار ہو کر صبح کے وقت پھر گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ بے شک سب نے اپنی اپنی جگہ اس کے لیے کافی تکلف کیا تھا۔ لیکن اُسے اس دورے کا اُمید سے کم لطف آیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے لیے اندر چائے تیار ہو رہی تھی، لیکن ڈیوڑھی میں وہ اکیلا ہی تھا۔

سامنے گلی میں ڈاکیہ تھیلا لٹکائے چلا آ رہا تھا۔ پہلے تو یوں محسوس ہوا گویا وہ چلتے چلتے سیدھا نکل جائے گا لیکن پھر وہ ڈیوڑھی میں آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لائے ہو ؟"

"لانا کیا ہے۔ یہ پنشن آئی ہے۔ بے چارے کرم سنگھ کی !"

"کرم سنگھ کی پنشن . . . ؟ کرم سنگھ مارا گیا ہے ؟"

"بادشاہو۔ پورا علاقہ آہیں بھر رہا ہے اور آپ اس کے گھر میں بیٹھے پوچھ رہے ہو کہ کیا کرم سنگھ مارا گیا ہے ؟ اطلاع آئے تو آج پندرہ دن ہو گئے ہیں !"

دو تین بار مان سنگھ کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ سر سے ناک تک اوپر کا حصہ ایک بار تو گویا بند سا ہو گیا۔ اس کے بعد آنکھوں سے آنسو بہہ نکلنے سے جیسے یہ گانٹھ کھلنے لگی۔ کرم سنگھ کا گھر کے اندر گیا والد اور اس کا چھوٹا سا بچہ مان سنگھ کو رلانے کے لیے بہت تھے۔

باپ نے باہر سے ہی ڈاکیے کو بیٹھے دیکھ کر سمجھ لیا کہ راز کھل گیا ہے اور اب یہ بوجھ دل پر اُٹھائے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ آٹھ پہر کا یہ تناؤ اور بوجھ کم ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے اپنے اپنے غم کو ہلکا کرتے رہے۔

پھر مان سنگھ کہنے لگا۔

"آپ نے مجھے آتے ہی کیوں نہیں بتایا ؟"

"یوں ہی ہم نے سوچا لڑکا چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ چھٹی خراب نہ کرو۔ خود ہی جب چھٹی کاٹ کر واپس پلٹن میں جائے گا تو اپنے آپ سُن لے گا۔ فوجی کو چھٹی بہت عزیز ہوتی ہے جیسی کرم سنگھ کو چھٹی پیاری تھی ویسے ہی تمہیں بھی ہوگی بلکہ زیادہ ہی ہوگی۔ بار کے علاقے کے رہنے والے لوگ تو ہریالی اور خوشحالی کے عادی ہیں۔ نہیں تو تھوڑی تکلیف بھی زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ہم بات چھپانے میں بالکل ناکام رہتے ہیں۔ یوں ہی بدمزگی ہی پیدا کی ہے۔

واپسی پر مان سنگھ نے ماجھے کے وہ گاؤں دیکھے، یہ بزرگ جن کا پوت سپوت تھا۔ اُن دیہات کے گرد حفاظت کے لیے فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ قبرستان اور شمشان تھے۔ جو گزشتہ نسلوں کی ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کے خلاف لڑنے مرنے کی کہانی بتاتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس بزرگ میں اتنی زیادہ قوتِ برداشت تھی —— وہ دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے خود مزید بوجھ اُٹھانا جانتا تھا۔ مان سنگھ نے سُن رکھا تھا کہ ایک بیل ہے جو اپنے سینگوں پر اس دھرتی کا بوجھ سنبھالے کھڑا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوا گویا کرم سنگھ کا والد ہی وہ بیل ہے جو بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے، لیکن لوگوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے خود مزید بوجھ اُٹھانا چاہتا ہے۔

(ترجمہ : م۔ ک۔ مہتاب)

مہندر سنگھ سرنا

چھولیوں کی رُت

نام: مہندر سنگھ سرنا
ولادت: ۲۵ ستمبر ۱۹۲۳ء
شغل: ۱۹۸۱ء میں انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس
سروس، وظیفہ یابی و سبکدوشی
حال: تصنیف و تالیف
تصانیف: چار ناول، طویل رزمیہ نظموں کے
چار مجموعے، ۹ افسانوی مجموعے:
پتھر دے آدمی، شگناں بھری سویر
سپنیاں دی سیما، ونجالی تے دلکتی
چھولیوں دی رُت، کالنگا، سندر گھاٹی دی سوہنیہ
سوہا سالو سوہا گلاب، کالا بدل کھلی دھپ
انعام و اعزاز: مجموعی ادبی خدمات کے لیے
ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ - ۱۹۸۱ء
پتہ: ۸۸/ایس، گریٹر کیلاش II نئی دہلی
۱۱۰۰۴۸

دھکتے انگاروں سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی
ی پر جھکا ہوا نینے لوہار کا لوہے کے رنگ جیسا
ن کالنسی کی طرح دہکنے لگا تھا۔ اُس کا پیکر
ی میں ڈھلے ہوئے ایک تندرست مزدور کا بُت
وم ہوتا تھا۔ اُس نے بازوؤں کے ایک مضبوط
ھٹکے سے اپنے گرد ہتھوڑا گھمایا.......
.... اس کے بدن کی مچھلیاں اُبھر
یں اور لوہے پر رکھے ہوئے سُرخ انگارے سے
سے لوہے پر بلا کی ضرب پڑی۔
ضرب لگاتار گونجتی رہی۔ کام کے انہماک
، دینا دین دنیا کو بھول گیا اور اس وقت تک
یلا رہا جب تک کہ کھڑکی میں سے آتی ہوئی بھادوں
چلچلاتی دھوپ اس کی ہڈیوں کو چاٹنے نہ لگی۔ اس
چونک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ سورج اپنے
رج پر تھا۔ اس قدر جلد دوپہر ہوگئی تھی اور اس کا
کام ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ دھوپ کی آنچ
بچنے کے لیے اس نے کھڑکی بند کر دی، لیکن
کی بند کر دینے سے اُس کا دم گھٹنے لگا اور اس
ماتھے پر چمچماتا ہوا پسینہ آگیا۔ رات کو بہت
ش ہوئی تھی۔ چھاجوں مینہ برستا رہا تھا۔ صبح
بوندا باندی ہوتی رہی تھی۔ لیکن اب سورج
نکل آنے کے بعد بڑا حبس ہوگیا تھا۔ اُس نے کھڑکی
ل دی اور دوبارہ بھٹی پر جھک گیا۔ اب پسینہ
اُس کے کالوں سے ہوتا ہوا اُس کی گردن پر لکیر سی
بناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے خوب تنے ہوئے
بازو سے اپنے ماتھے سے پسینہ الگ کیا۔ موٹے موٹے
قطرے انگیٹھی میں گرے۔ "سُوں" کی ایک آواز آئی اور
ایک لمحہ کے لیے ایک انگارے کو کچھ آرام ملا۔

دھوپ اور بھٹی کی آنچ نے اس کے بدن کو
کچھ زیادہ ہی تپا دیا تھا۔ یہ آگ' ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ اس کے خون میں جذب ہو چکی تھی۔ یہ تپش
اُس کی ہڈیوں کے گودے کو بھون رہی تھی۔ بھٹی
کے تیز اور لپکتے ہوئے شعلے اُس کی آنکھوں میں جل
اُٹھے۔ اپنے بدن کا ایک ایک رُواں فلیتہ محسوس
ہو رہا تھا۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ابھی کوئی
فلیتہ آگ پکڑ لے گا اور اس کا بدن ایک چٹان کی
طرح بھک سے ریزے ریزے ہو جائے گا۔

اچانک اُس نے اپنے ہاتھ روک لیے اور
کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ باہر تمام آسمان بھادوں
کی چلچلاتی دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کی غیر
مانوس آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب اس کی بینائی
ذرا صاف ہوئی تو اُس نے اپنے سامنے دُور دُور تک
پھیلے ہوئے کھیتوں اور پھر ریتلی پگڈنڈی کی طرف
دیکھا جو کھیتوں کے درمیان ایک روشن لکیر کی طرح
اُفق کو چھو رہی تھی۔ پگڈنڈی کے دائیں طرف کپاس
کے کھیت تھے اور کہیں کہیں گنّوں کے کھیت میں پانی

چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔ پگڈنڈی کے بائیں طرف چنے اور سہاگا پھرے کھیت بوائی کے انتظار میں تھے۔ تازہ بارش سے نم آلود زمین کی سوندھی خوشبو اس کی ناک تک پہنچی تو اسے بہت پیاری لگی اور ایکا ایکی وہ بہت مسرور ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کھلی کھڑکی میں سے باہر کود جائے۔ کھیتوں میں جاکر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ اور نم آلود زمین کی مہک اپنے انگ انگ میں بھر لے۔

کھیت اسے بہت عزیز تھے۔ بوائی اور فصل کی کٹائی کے دنوں میں اس کے لہو میں ایک ترنگ اٹھتی تھی اور اس کا جسم پھیلنے لگتا تھا۔ وہ گاؤں کا لوہار تھا۔ لیکن گاؤں میں لوہار کے لیے کام نکلتا ہی کتنا تھا۔ زیادہ عرصہ تک وہ کھیتوں میں جاٹوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ اس کے جیسی فصل کی کٹائی سات دیہات میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ درانتی کے لیے تڑپنے لگے۔

درانتیاں ـــــ فصل کی کٹائی، چاندنی میں جھومتے ہوئے گنے کے کھیت، میلوں تک سنہری بالیوں کی سرسراہٹ اور دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے گیتوں کی تانیں۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیٹھ کے پیچھے جہنم کی طرح جلتی ہوئی بھٹی تھی اور گزشتہ بیس دن سے اس نے چھویاں (پنجابی جاٹوں کا خاص ہتھیار) گنڈاسے اور بلم بنانے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ وہ چھویوں اور بلموں کا زمانہ تھا۔ اس دفعہ فصل کی کٹائی کچھ اس قسم کی ہوئی تھی کہ اس کے دوران گندم کی جگہ گندم بیجنے والے کٹ مرے تھے۔

وہ یہ کیا آفت مول لے بیٹھا تھا۔ یہ کیسی بیگار اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نئے نئے قائم ہونے والے پاکستان کے تمام مجاہدوں کے لیے ہتھیار تیار کرنے کی ذمہ داری اس کے سر آپڑی تھی ـــــ پاکستان تو قائم ہو چکا تھا، لیکن پاکستان کی تکمیل کے لیے پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں قلع قمع کرنا ضروری تھا۔ اگرچہ ابھی تک یہ بات دینے کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن ہر کوئی یہی بات کہہ رہا تھا۔ یہ جہاد صرف اسی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا کہ اس کی بھٹی جلتی رہے اور چھویوں اور بلموں کی صورت میں وہ موت کی زبان اگلتی رہے۔

اس نے مڑ کر بھٹی کی طرف دیکھا۔ کوئلوں میں رکھے ہوئے لوہے کے تیز ٹکڑے انگاروں سے زیادہ سرخ ہو گئے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے نفرت سی ہونے لگی اور اس نے اپنی ایک پسلی کو زور سے دبایا۔ کوئی تیکھی اور تیز چیز اس کی پسلی کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ صبح سے اس نے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا۔ اور اب بھوک اس کی انتڑیاں جلا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر لکڑی بن گئے تھے۔

"بشیر کی ماں!" اس نے گھر کے اندر جھانکتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "ذرا جلدی سے پانی دینا!"

پینتالیس سال کی ایک عورت کانسی کے کٹورے میں پانی ڈال کر لائی۔ اس کی ناک میں نتھ تھی اور کانوں میں چاندی کی بالیاں لہرا رہی تھیں۔ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو پانی پیتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ وہ صبح سے تین چار بار اس سے پوچھ چکی تھی کہ وہ کیا اس کے لیے کھانے اور پینے کو کچھ لائے۔ لیکن اس نے اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی اور بھٹی ہونکتی رہی تھی اور اب نہ جانے کیسے اسے بھوک اور پیاس کا خیال آگیا تھا۔ اس عورت نے بھٹی کی دوزخی آگ کی طرف دیکھا۔ لوہے کے ٹکڑوں کی طرف دیکھا جو کالے پتھروں کی طرح فرش پر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کونے میں پڑی کلموہی چھویوں اور بلموں کی طرف دیکھا اور پھر کافی دیر تک اس کی نظریں اپنے شوہر کے چہرے پر جمی رہیں جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور اسے پہچان نہ رہی ہو۔

دینا پانی کا کٹورا ایک سانس میں پی گیا۔

"اور..." اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

وہ عورت اور پانی لے آئی اور اسے پانی پیتا ہوا دیکھنے لگی۔

"بس ــــ" اس نے کہا۔ اس کی گردن اور اس کی پیشانی پر رگیں پھول گئیں۔ اس کا ہانپنا کم ہو گیا اور عین اس وقت اس کے چہرے پر ایک خفت اور ایک بے کلی سی نمایاں ہوئی اور اس نے کہا۔

"میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ تم مجھ سے بولتی کیوں نہیں ہو اور کس طرح دور ہٹ کر کھڑی ہو۔ جیسے مجھے پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہو۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر سے کھانا پروس لائی۔

"میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔" دینے نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔ "تم مجھ سے بولتی کیوں نہیں ہو؟ تم نے منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال رکھی ہیں؟"

وہ عورت اب بھی خاموش رہی۔

دینے نے روٹی مروڑ کر منہ میں کچھ نوالے ڈالے اور پھر ان نوالوں نے اس کے حلق سے نیچے اترنے سے انکار کر دیا۔ اس نے پانی کے کچھ کڑوے گھونٹ پیے۔ اور روٹیوں کی چنگیر پاؤں سے ایک طرف سرکاتے ہوئے بولا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو تم مجھ سے۔ بس دیکھے جا رہی ہو۔ جیسے مجھ سے بھوت چمٹ گیا ہو۔"

"خدا نہ کرے" عورت بول اٹھی "لیکن مجھے تو یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔"

دینے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ بشیر کی ماں بول اٹھے گی اور اتنے دن کی ہٹیلی خاموشی کو آج وہ اچانک توڑ ڈالے گی۔

تھوڑی دیر کے لیے حیرت نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ تمہارے بیٹے ہی مجھے جینے نہیں دیتے ہیں۔ ابھی بشیر یہ کہہ گیا

ہے کہ کل شام تک پچاس چھریاں تیار ملنی چاہئیں۔ اگر میں ذرا سا بھی چوک گیا تو وہ میری جان کو آجائے گا۔ تم کہتی تو ہو یہ اور وہ ۔۔۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا سا بھی انکار کیا تو وہ میرے ٹکڑے اُڑا دیں گے۔ میرا خون پی جائیں گے۔"

"وہ بیٹے تمہارے ہیں یا کسی اور کے؟" بشیر کی ماں نے پوچھا اور پھر دل ہی دل میں وہ اپنے اس سوال پہ شرمندہ ہو گئی۔

"میرے ہی ہیں۔" دینے نے احمقوں کی طرح کہا۔

"پھر ان کو تم سے ڈرنا چاہیے یا تمہیں اُن سے؟"

"تمہارے لیے باتیں بنانا بہت آسان ہے۔" وہ بولا۔ "کیا تم اپنے بیٹوں کو جانتی نہیں ہو۔۔۔ وہ کیسے مسٹنڈے ہیں۔ میری کیا مجال کہ میں اُن کے آگے اپنے کان بھی ہلا سکوں۔ وہ تو میری کھال اُدھیڑ دیں۔"

"بیٹے تو وہ میرے بھی ہیں۔" اس عورت کے لب و لہجہ میں کچھ نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ "تم دیکھتے ہو کہ وہ کیسے ہر وقت مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کیسے بات بات میں مجھ پہ جھپٹتے ہیں۔ لیکن میں ان کے لیے چھریاں تیار نہیں کرتی ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" اُس نے کہا۔ "میں صرف چھریاں بناتا ہوں۔ لوگوں کا گلا تو نہیں کاٹتا۔"

"یہ گلا کاٹنے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔" عورت بولی۔ "قاتل ایک دو یا پچاس کا گلا کاٹتا ہے۔ لیکن تمہارے ہاتھ کی تیار کی ہوئی چھری کئی بیسی بے گناہوں کو کاٹتی ہے۔"

ایک کپکپی سی دینے کے تمام جسم میں سے گزر گئی۔ اور پھر اس کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ کافی دیر تک وہ کچھ نہ بول سکا۔ جب اُس کے مُنھ میں آواز پیدا ہوئی تو اُس نے کہا۔

"مجھ سے کہتی ہو ۔۔۔ لیکن بیٹوں کو منع نہیں کرتی ہو۔ جو سپہ سالار بنے پھرتے ہیں۔ ایک ایک رات میں دو دو گاؤں خاک سیاہ کر دیتے ہیں۔"

"وہ میری سنتے ہیں اور کیا تم سنتے ہو؟" عورت کا لب و لہجہ اب اور بھی نرم پڑ گیا تھا۔ "میں بھلا کسی سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہر کسی کو اپنے اپنے گناہ کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی سے کچھ کہوں۔"

کچھ دیر کے لیے وہ چُپ چاپ فرش کی طرف دیکھتے رہے۔

اچانک عورت بولی۔ "تم روٹی کیوں نہیں کھا رہے ہو؟ کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے؟" اُس نے روٹیوں کی چنگیر کھینچ کر دینے کے آگے رکھ دی۔

باہر کے دروازے پر ہلکی سی آہٹ نے دینے کو چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بشیر یا اُس کے ساتھیوں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ اسے یاد دلانے آئے تھے۔ دروازے کی کُنڈی پر پڑا ہوا اس کا ہاتھ پس و پیش میں تھا۔ اُس نے بھٹی کی طرف دیکھا۔ وہ دہک رہی تھی۔ ہر چیز ٹھیک اور اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اُس نے کُنڈی کھول دی۔ ساون بھادوں کی بارشوں سے نم آلود دروازہ چرچرایا۔

دینا گھبرا کر اندر کی طرف دوڑا اور بھٹی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس کی بیوی کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ دروازے میں سندر کی بوڑھی برہمن عورت کھڑی تھی۔ اُس کے ہلدی جیسے زرد رنگ پر جھُرّیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور اس کا سفید بالوں سے اٹا ہوا سر کانپ رہا تھا۔ دینا اور اس کی بیوی خوف زدہ آنکھوں سے اس بڑھیا کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ بالکل ویسی تھی جیسی اپنے زندہ ہونے کے دوران ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب تو وہ بھوت بن چکی تھی۔

آخر دینے کی بیوی نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"چاچی! کیا تم ابھی تک زندہ ہو؟"

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت دینے کی بیوی کو یاد آیا کہ برہمن عورت بہری تھی۔ شاید مرنے کے بعد بھی اُس کا بہرہ پن ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اُس نے بڑھیا کے اور نزدیک جا کر بلند آواز میں اپنی بات دُہرائی۔

بڑھیا کی آنکھوں میں شعور کی چمک پیدا ہوئی اور بولی۔ "کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ سات دن تک مجھے میعادی بخار آتا رہا۔ میں اندر کوٹھری میں پڑی رہی۔ اکیلی بخار میں بھُنتی رہی۔ کسی نے مجھے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ پلایا۔ تلسی کو باہر گئے ہوئے کتنے ہی دن ہو چکے ہیں۔ چاہے میں اس کے پیچھے بیت ہی جاتی۔ آدمی کا ہے کیا۔ آج میرا بخار اُتر گیا ہے۔ مجھ سے اُٹھ کر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ لیکن میں نے دل کی ڈھارس بندھائی اور یہاں تک چلی آئی ہوں لیکن تم دونوں اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟"

بولتے بولتے وہ بُڑھیا پسینے میں نہا گئی۔ اس کے دم میں دم نہیں آ رہا تھا۔ اپنی کنپٹیوں کو دباتی ہوئی وہ اپنے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے حس ہوتی جا رہی تھیں اور اس کا ہر سانس آخری سانس معلوم ہوتا تھا۔ ایک انوکھے اطمینان سے دینے اور اُس کی بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ برہمن عورت ہی تھی اور میعادی بخار نے اُسے اس ہونی سے بچا لیا تھا جو گاؤں کے لوگوں پر گزر چکی تھی۔ اس کے بہرے پن نے اس کے کانوں میں اُس مصیبت کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی جو پرسوں جمعرات کو اُس گاؤں میں ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا گاؤں پاکستان میں آ گیا تھا۔ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتی تھی کہ پاکستان اُس کے گاؤں میں چلا آیا تھا۔ اور گاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا ۔۔۔ چھوٹی لڑکیاں فسادیوں نے سنبھال لی تھیں۔ اچانک وہ برہمن عورت بولی: "اے دینے! تُو نے کہیں میری بکری تو نہیں دیکھی؟"

بکری ۔۔۔ دینا سوچنے لگا کہ اُن دنوں جب

فسادیوں کے ہجوم مویشیوں کو اُن کے بچھڑے اور بچھڑیوں کے ہمراہ ہڑپ کر چکے ہیں تو براہمنی کی بکری کس گنتی میں تھی۔

دینا بولا — " مائی ! — تیری بکری کہیں بھی نہیں ہے۔ لوگ اسے کھا پی چکے ہیں " لیکن بڑھیا کو کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ اپنی بات بلند آواز میں دہرانے ہی لگا تھا کہ اُس کی بیوی نے اشارے سے منع کر دیا۔

" دیکھونا " براہمنی بولی " یہ زنجیر مجھے مندر کی دہلیز پر ملی ہے۔ نہ جانے کس سسری نے زنجیر کیسے توڑ لی۔ ذرا دیکھو تو سہی — وہ چھلا ہی کاٹ دیا گیا ہے، جس میں کنڈی پھنسائی جاتی ہے میں نے سوچا چل کر دینے سے جا کر کہوں کہ وہ اس زنجیر کو جوڑ دے "

دینے نے دیکھا کہ بڑھیا نے اپنے ہاتھ میں بکری کو باندھنے والی زنجیر تھام رکھی تھی جو بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ بکری کی گردن پر کسی تیز دھار والے ہتھیار کے وار نے زنجیر کے بھی ٹکڑے کر دیے تھے۔ دینے کی بیوی دیر سے بڑھیا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ آخر اس کے خیالوں کے خاتمے پر ایک کھڑکی سی کھلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بولی " چاچی۔ تم ہمارے یہاں رہ جاؤ — تم مندر میں اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ اور آج تو تمہارا بخار اُترا ہے۔ یہیں کھانا بنا لینا۔ اپنے برتن لے آؤ۔ تم جنم کی ہندو جو ہو۔ تلسی باہر سے آجائے تو پھر چلی جانا۔

براہمنی کچھ زیادہ ہی بہری ہو گئی تھی۔ شاید میعادی بخار نے اس کے کانوں پر پھوہے چڑھا دیے تھے۔ اتنی لمبی بات میں سے وہ صرف تلسی کا نام سن پائی۔

" میں تمہیں بتا تو چکی ہوں کہ تلسی باہر گیا ہوا ہے۔ رامے شاہ کی بیٹی کا شگن لے کر نئے چک اس کے سمدھیوں کے گھر گیا ہے۔ اساڑھ کی پہلی تاریخ کو پرتیو کے بیاہ کا ساہا نکلا ہے۔ میں نے شاہ سے کہا ہے کہ وہ اس دفعہ ایک گائے مجھے دان میں

دے دے اور شاہوں کے گھر شادی آئے دن تو ہوتی نہیں ہے۔ اور تم خود سیانی ہو — تلسی کا مزاج خشک ہے۔ گھر میں دودھ اور دہی کی بہار رہے گی "

بڑھیا کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے دینے کی بیوی دینے کی نظروں کا مفہوم بھانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کچھ مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن دینا اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

" میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے بس کی نہیں۔ مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ لیکن اس کو کس جگہ چھپا کر رکھیں گے۔ ابھی وہ تیری کوکھ سے نکلے ہوئے ماس گندھ ماس گندھ کرتے ہوئے آجائیں گے "

اور تم جانتی ہو کہ اُن سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ ان کو پتہ لگ جائے گا تو ہماری وہ شامت آجائے گی جیسی کسی کی نہ آئی ہو "

" بوڑھی جان ہے " دینے کی بیوی نے التجا کی " ہمارے گاؤں کے کھتریوں کی واحد نشانی ہے۔ برہمنی اللہ کا نام لینے والی ہے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ اس کا بیٹا واپس آجائے گا۔ پھر ان کو کسی اور گاؤں میں بھیج دیں گے "

" کس گاؤں میں بھیج دیں گے ؟ " دینے نے چلا کر کہا " کون سا ایسا گاؤں ہے جہاں یہ بچی رہے گی۔ اور رہا اس کا بیٹا۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ وہ اس دفعہ ایسی جگہ گیا ہے، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ نئے چک کے سب کھتری مارے گئے ہیں۔ ان کا بیج ناس ہو گیا ہے "

عورت کا منہ اُتر گیا۔ اُس نے کانپتی ہوئی اُنگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ لی اور بولی " کیا تم سے دھیمی آواز میں نہیں بولا جاتا۔ کیا تم اسے سُنا کر ہی رہو گے کہ اس کا بیٹا مارا گیا ہے "

ابھی تک اُنہوں نے زیادہ باتیں سرگوشیوں کے انداز میں کی تھیں۔ مگر وہ سرگوشیاں بلند تھیں۔ خیر وہ چاہے کتنی ہی بلند آواز میں باتیں کرتے۔ بڑھیا ان کو سُن نہیں سکتی تھی۔

بڑھیا نے اپنی بخار زدہ آنکھیں اُن دو کے چہروں پر گاڑ دیں اور جھلا کر بولی " تم دو نے کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے ؟ دینے ! تو میر طرف تو دیکھتا ہی نہیں۔ ذرا یہ زنجیر جوڑ دینا بھی کیا بہت بڑا کام ہے ؟ "

" مائی کل آنا " دینے نے اپنا منھ بڑ کے کان کے قریب لے جا کر کہا " آج مجھے فرص نہیں۔ اب تم گھر جاؤ "

" اچھا " — گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ اُٹھتے ہوئے بڑھیا کراہی " چلو — تو کل ہے تو کل ہی سہی۔ لیکن میری بکری کا خیال میں کہہ چلی ہوں۔ اگر دکھائی دے تو باندھ رکھنا۔ نہ جانے کو کھ جلی کہاں کہاں گھومتی ہ

اس سے پہلے کہ دینے کی بیوی اُسے رو لڑکھڑاتی ہوئی بڑھیا باہر گلی میں نکل گئی۔ اُ بڑھیا نے کتنا وقت ضائع کر دیا تھا۔ کام ہرجا ہوا تھا اور دینے کو یہ بات بُری لگ تھی۔ اتنے میں وہ پانچ چھوریاں تیار کر سکت بشیر یہ تو پوچھے گا نہیں کہ وہ کس سے دماغ کرتا رہا تھا۔ وہ پوری پچاس چھوریاں گن کر لے گا "

اُس نے کام میں مشغول ہونے کی کوش کی، لیکن وہ ایسا کر نہ سکا۔ اس کے دل میں ایک کسک سی تھی۔ کانپتے ہوئے سفید بالوں کے پیچھے بخار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کی یا بار اُس کے دل میں چلی آتی تھی۔ آگ کے دو شعلوں کی طرح وہ آنکھیں اس کے دماغ میں چلی جا رہی تھیں۔

سب سے زیادہ جو بات اسے مضطر تھی وہ اس بڑھیا کی لاعلمی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ تلسی اب کبھی نہیں آئے گا۔ اور نہ پرتیو کے بیاہ کا ساہا پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ پرتیو پر تو بشیر نے اس کی حویلی سمیت قبضہ کر لیا تھا۔

یہ بات بشیر نے بہت بُری کی تھی۔ بہو بیٹیوں کی عزّت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ پرائی بیٹیوں کی عزّت اپنی بیٹیوں جیسی ہوتی ہے۔ کون ایسا ہے جو اپنی بیٹی کی بے عزّتی کو برداشت کر سکتا ہے ؟

اچانک ایک بھیانک منظر دینے کے ذہن میں اُبھر آیا۔ پرتیو ڈھائیں مار مار کر اپنے باپ کی لاش سے چمٹی رہی تھی اور بشیر اس کو اس کی زلف سے گھسیٹتا ہوا لے آیا تھا۔ ڈھائیں مارتی واسطے دیتی پرتیو اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور پھر اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ جیسے ذبح ہونے سے پہلے بھیڑ خاموش ہو جاتی ہے۔

اور وہ — بشیر کا باپ دروازے میں چپ چاپ کھڑا یہ جہنّم آفریں منظر دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے بشیر کو روکا نہیں تھا۔ اُس کو گردن سے پکڑ کر زمین پر نہیں پٹکا تھا۔ اپنی بیٹی کی عزت بچانے کے لیے اُس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

پرتیو کے زرد اور معصوم چہرے کے پرتو دینے کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور اُس کی ڈھائیں اور کراہیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایکا ایکی وہ کپکپا اُٹھا۔ اس کے بدن میں شدید کپکپی چھڑ گئی۔ ایسی کپکپی کہ وہ ٹھنڈی موت کا پیغام معلوم ہوتی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کپکپی کو روکنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ وہ بھٹی میں دہکتے ہوئے لوہے کے ٹکڑے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لے لیکن اُس کا سر جل رہا تھا۔ ساری کی ساری بھٹی اُس کے سر میں گر گئی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبایا۔ اُس کی ہتھیلیاں آنچ سے جھلس گئیں۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ کچھ کر بیٹھے گا۔ اُسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ دُور — ان سب باتوں سے بہت دُور — اُس نے خیال میں کھڑکی کھول دی اور باہر کُود گیا۔ بڑی دیر تک وہ بے تحاشا کھیتوں میں گھومتا رہا۔ سہ پہر شام میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُفق پر کسی نے سورج کو قتل کر دیا تھا۔ معصوموں کے خون سے تمام آسمان رنگا گیا تھا، وہ مہوندی نالوں کے پانی میں بھی گھُل رہا تھا۔ وہ گنت کون جوسے گا جس پر لہو کے چھینٹے تھے۔ وہ کپاس کون استعمال کرے گا، جس کی سینچائی خون سے ہوئی تھی اور لہو سے سیراب ان کھیتوں میں کیسی گندم اُگے گی ؟

چاروں طرف لہو کا چھڑکاؤ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چھُریوں سے کیا گیا تھا۔ یہ گوشت اور ہڈیوں کی فصل اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے گنڈاسوں اور بلّموں سے بچی گئی تھی اور جو دو چار بچ رہے تھے، ان کے لیے وہ چھُریاں بنا چکا تھا — کل رات تک ان کا بھی صفایا کر دیا جائے گا۔

وہ گناہگار تھا — بہت بڑا گناہ گار تھا۔

بشیر کی ماں نے سچ ہی کہا تھا — اُسے کم سے کم نئی چھُریاں بشیر اور اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ نہیں لگنے دینی چاہئیں۔ ایسا کرنے سے اس کے گناہوں کا کفّارہ ادا ہونے سے رہا۔ لیکن اب وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ بے تحاشا گاؤں کی طرف دوڑا — بشیر کے آدمیوں کے پہنچنے سے پہلے وہ گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ چھُریوں کو کسی خندق یا کنوئیں میں پھینک دینا چاہتا تھا؛ جہاں سے ان کا کوئی سُراغ نہ مل سکے۔

جب وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ ڈھلتے چاند کی دُھندلی روشنی گلی میں مکانوں کی دھندلی پرچھائیاں ڈال رہی تھی۔ رات کی بارش سے گلی میں کیچڑ ہو گئی۔ اس کے پاؤں بار بار کیچڑ میں پھنس جاتے تھے۔ لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر آوازیں سُنائی دیں۔ یہ آوازیں اس کے گھر ہی سے آ رہی تھیں۔ کیا وہ آ پہنچے تھے ؟ وہ دیر سے پہنچا تھا۔ بشیر کی لغو اور بیہودہ ہنسی صاف سُنائی دے رہی تھی۔

گھر کے باہر کسی بھاری چیز سے اس کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ کوئی ٹھنڈی سخ چیز اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے پاؤں چھڑانے کا جتن کیا۔ لیکن وہ اور بھی زیادہ جکڑے گئے۔ ایکا ایکی وہ بہت گھبرا گیا۔ ایک خوف ناک وہم اُس کے دل میں سرایت کر گیا اور اُسے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ اپنے جسم کے پُر زور جھٹکے سے اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا — چاندنی میں بالوں کی کچھ زرد لٹیں ہل رہی تھیں۔ چھُری کا ایک لمبا زخم اُس بڑھیا کے ماتھے پر تھا اور اس کی ٹیڑھی اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اُسے پھٹکار رہی تھیں۔ اُس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کے بازوؤں میں اُلجھی ہوئی زنجیر نے اُس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔

اُس کے مُنھ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بیہوش ہو گیا۔ اُس رات اسے شدید بخار ہو گیا۔ رات بھر وہ چارپائی پر گرز گرز بھر اُچھلتا رہا۔ رات بھر اُس کے بڑبڑانے کی آواز گاؤں کی سنسان خاموشی میں گونجتی رہی۔ "مجھے نہ مارو — مجھے چھُریاں نہ مارو۔ یہ زنجیر میری گردن پر سے اُتار دو — اوہ میری بیٹی — میری بیٹی کو کچھ نہ کہو۔ پرتیو کو کچھ نہ کہو۔ آہ یہ زنجیریں — خدا کے واسطے مجھے چھُریاں نہ مارو — نہ مارو — !"

(ترجمہ : مخمور جالندھری)

نوتیج سنگھ

دیس واپسی

لانچ میں تیسرے درجے کے مسافروں کا خانہ پوری طرح پُر تھا۔ بالائی منزل پر درجہ اوّل کے کشادہ حصّے میں بیٹھے انگریز فوجی افسر نیچے تیسرے درجے کی کلبلاہٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"یہ پینانگ سے ہندوستان کے لیے جہاز پر سوار ہونے جا رہے ہیں۔"

"میں حیران ہوں کہ یہ آج کل وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر یہ ایک دوسرے کا گلا ہی کاٹیں گے۔" اور باقی بات چیت ہنسی میں ہی گُم ہو کر رہ گئی تھی۔

نیچے تیسرے درجے کے مسافروں میں سے سنت سنگھ نے مغرب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس جانب ہے اپنا دیش، قدرے پہاڑ کی جانب۔"

مہتاب دین غور سے اُس جانب دیکھنے لگا اور دیکھتا ہی رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا اُسے آہستہ آہستہ کسی آرام کا احساس ہو رہا ہو — پینانگ میں اُتر کر مہتاب دین سوچنے لگا کہ وہ یہاں کہاں رہے گا؟ بے شک اُس کے پاس ایک چھوٹی صندوقچی اور دری سے زیادہ سامان نہیں تھا۔ پھر وہ اس بدیسی شہر میں رات

نام : نوتیج سنگھ
ولادت : ۸ جنوری ۱۹۲۵ء
وفات : ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء
تصانیف : دیس واپسی، نویں رُت، باسمتی دی مہک اور چانن دی بیل
(افسانوی مجموعے)
انعام/اعزاز : بین الاقوامی اعزاز (بلغاریہ)

کو سر چھپانے کے لیے جگہ تو چاہیے تھی اور ملایا میں بارش کا بھی کیا بھروسا ہے۔ ہر موسم میں بارش کی بوچھاڑیں پڑنے لگتی ہیں۔

سنت سنگھ ایک چینی کے رکشا میں اپنا سامان رکھوا چکا اور اپنی بیوی کو چلنے کے لیے کہہ کر لڑکی کو بغل میں لے لیا تھا۔ سنت سنگھ اور مہتاب دین کا تعارف گاڑی اور لانچ میں ہی ہوا تھا۔ اتفاقاً اپنے مُلک میں دونوں کا تعلق ایک ہی ضلع سے تھا اور دونوں کے دیہات بھی کچھ کوس کے فاصلے پر ہی تھے۔

سنت سنگھ نے روانہ ہوتے وقت مہتاب دین سے کہا: "اچھا بھائی، اگر خوش قسمتی ہوئی تو دونوں کو ایک ہی جہاز کا ٹکٹ مل جائے گا اور ہم اکٹھے ہی سمندر کی مسافت طے کر کے گاؤں پہنچیں گے — لیکن تم یہاں پینانگ میں کہاں ٹھہرو گے؟"

"میں تو یہاں بالکل پردیسی ہوں۔ کوئی بھائی بند نہیں اور نہ ہی کسی سرائے کا پتہ ہے، لیکن یہاں کون زیادہ دیر رُکتا ہے۔ دو تین دن میں تو جہاز جائے گا۔ کہیں کسی دُوکان کے برآمدے میں رات بسر کر لیں گے۔"

"یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ ہم نے تو گوردوارے میں رہنا ہے۔ وہاں مسافروں کے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔ میں کہوں گا کہ تم بھی وہیں چلے چلو۔"

مہتاب دین نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا "بھائی، تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہوگی؟"

"مجھے دقت کیسی ہوگی۔ یہ تو گورو کا گھر ہے"۔ اور سنت سنگھ نے اس کا ٹرنک اور بستر رکشا میں لدوا دیا۔

گوردوارے پہنچ کر دونوں نے ایک ہی کوٹھری میں سامان ٹکا لیا۔ دالان میں ہندوستانی برگد کا ایک پیڑ لگا ہوا تھا۔ دونوں اس کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سے مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے بچے نزدیک ہی گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ایک طرف کچھ نوجوان ہیر گا رہے تھے۔ ہیر، گلی ڈنڈا اور دیس سے لاکر لگائے ہوئے برگد میں مہتاب دین یوں محسوس کر رہا تھا، گویا وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا ہو۔

جب اگلا دن نکلا تو پورے گوردوارے میں ایک انوکھی چہل پہل شروع ہو گئی۔ خبر آئی تھی کہ ہندوستان جانے والا جہاز چار دن بعد پیناتگ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگا۔ یہاں ٹھہرے ہوئے مسافر تو جہاز آنے کی اُمید پر ہی بیٹھے تھے۔ کئی مسافر اپنے کام سمیٹ کر جو رقوم اکٹھی کر سکے تھے لے کر دو دو ماہ سے یہاں جہاز کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی اُمید کا دامن ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دینے لگتا تھا اور کئی بال بچوں والے لوگ جن کی کفایت شعاری سے جمع کردہ پونجی، یہاں بے کار بیٹھے بیٹھے ختم ہونے لگی تھی۔ مایوس ہو کر دیس کی شکل دیکھنے کی تمنا لیے پھر اس پردیس میں ان مقامات کو ہی لوٹ جاتے تھے جہاں وہ جان توڑ محنت کرتے تھے۔ ملایا کے جنگلوں میں گاڑیوں میں ربڑ لادنے یا ٹین کے گڑھے کھودنے یا کسی امیر آدمی کی دکان پر پہرہ دینے گئے تھے۔ لیکن آج سب کے چہروں پر اُمید کی چمک تھی۔ جہازوں کی کمپنی کا ایجنٹ صبح ہی موٹر میں آیا تھا اور سب کے نام لکھ کر لے گیا تھا۔

دو چار دن تو سب کو پختہ اُمید رہی۔ کچھ جہاز میں کھانے پینے کے لیے بازار سے اشیا بھی خرید لائے۔ اکثر لوگوں نے اپنا سامان باندھ لیا۔ عورتوں نے راستے میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا پکانے کی بات بھی طے کر لی۔ سنت سنگھ اور مہتاب دین نے بھی مل کر ایک چولہا خریدا اور جا کر رسد بھی خرید لائے۔

لیکن جب یہ جہاز پیناتگ سے روانہ ہوا تو گوردوارے میں ٹھہرے مسافروں میں سے صرف تین ہی اس میں سوار ہو سکے۔ یہ تینوں سیام میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اور بہت دنوں سے گوردوارے میں مقیم تھے۔ انہوں نے تگنی رقم دے کر بلیک میں ٹکٹ خرید لیے تھے۔

پورے گوردوارے میں مایوسی چھا گئی۔ آج بچوں نے برگد کے نیچے گلی ڈنڈا نہیں کھیلا۔ اور جوانوں نے ہیر بھی نہیں گائی۔ برگد کے نیچے چبوترے پر بیٹھا صرف ایک بوڑھا باتیں کرتا رہا —— "بھائی! ٹکٹ ہمیں کیسے مل سکتا تھا؟ ٹکٹ تو اُن نرم و نازک سرداروں کو ملتا ہے جو دن بھر گوردوارے کی کوٹھری میں پڑے رہتے ہیں۔ گویا ان کے پیٹ میں کیڑے پڑے ہوں —— اور بعد میں تین گنا رقم دے کر ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ ہم تو دو ماہ سے یہی کھیل دیکھ رہے ہیں۔"

مہتاب دین اور سنت سنگھ ہر روز سویرے گوردوارے کے لنگر کے لیے لکڑی پھاڑتے اور نل سے پانی بھر کر لاتے۔ جب لانگری نے چپاتیاں پکانے کی خدمت کے لیے دوسرے لوگوں کو بلانا ہوتا تو کبھی سنت سنگھ اور کبھی مہتاب دین ہی لوگوں کو بلانے کے لیے جاتے۔ مہتاب خود بھی سر پہ رومال باندھے رکھتا اور کسی دوسرے شخص کو بھی لنگر خانے میں نہ جانے دیتا۔ لنگر تقسیم کرتے وقت بھی دونوں خدمت کرتے اور خود آخر میں کھانا کھاتے۔

بچی ہوئی ایک آدھ روٹی شام کو مہتاب دین ٹکڑے ٹکڑے کر کے کبوتروں کو کھلا دیتا۔ گوردوارے کے آنگن میں بہت سے کبوتر جمع ہو جاتے۔ ایک دن کبوتروں کو یہ بچی کھچی روٹیاں ڈالتے ہوئے اُس نے سنا کہ ایک عورت گوردوارے کے بھائی کو اس کے بارے میں کہہ رہی تھی "یہ مولوی کیسا اچھا آدمی ہے"۔ بھائی نے جواب دیا "اللہ لوک ہے"۔

مہتاب دین اور سنت سنگھ کو یہاں بیٹھے یوں ایک ماہ گزر گیا تھا۔ اُنہیں جہاز کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ دونوں سنت سنگھ کے کینے سمیت روٹی تو لنگر سے کھا لیتے تھے۔ لیکن خالی اناج کھا کھا کر دل اوبنے لگا تھا۔ اس لیے کبھی ایک گھونٹ دودھ اور چٹکی چینی لے کر چائے بنا لیتے۔ کبھی ایک ایک ٹکڑا ڈبل روٹی کھا لیتے۔ کبھی تھوڑی سی مٹھائی سے بچی کا دل بہلا لیتے۔ کچھ رقم وہ پہلے ہی جہاز میں کھانے کی غرض سے رسد خریدنے پر خرچ کر چکے تھے —— اس طرح وہ کرائے کے لیے جو رقم جمع کر کے رکھے ہوئے تھے وہ بھی ختم ہونے لگی۔

بہت تشویش ہونے لگی کہ اگر رقم کم ہو گئی تو کہیں دیس کا منہ دیکھنے کی بجائے مہتاب دین کو پھر ٹین کے گڑھے کھودنے کے لیے اور سنت سنگھ کو گورے کے گودام پر پہرہ دینے کے لیے نہ جانا پڑے؟ واپس جانے کے لیے کتنی رقم بے کار خرچ ہو جائے گی اور یہ بھی علم نہیں کہ اس گورے نے سنت سنگھ کی جگہ کسی اور کو ملازم نہ رکھ لیا ہو اور ٹین کے کھدان پہ بھی کہیں بہت زیادہ مزدور نہ آ گئے ہوں۔

سنت سنگھ سے زیادہ فکر مہتاب دین کو تھی صبح ہی اُسے اپنے بھائی کا خط ملا تھا کہ وہ خط پاتے ہی دیس لوٹ آئے۔ اُس کی بوڑھی ماں اُس کی راہ دیکھتی دیکھتی چل بسی ہے۔ مہتاب کو اچانک خیال آیا کہ والدہ بچپن سے ہی اُسے بڑے بھائی کی نسبت زیادہ پیار کرتی تھی۔ جب وہ اس جزیرے پر آنے کے لیے گھر سے چلا تھا۔ تب ہی والدہ کی حالت بہت خراب تھی۔ پورا جسم درد کرتا تھا۔ آنکھوں کی بینائی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ اور رخصت ہوتے وقت اُس کی ماں نے جب اُسے اپنے سوکھے، کمزور اور جھریوں زدہ جسم سے لگایا تھا تو اُس نے یوں محسوس کیا تھا گویا والدہ کے جسم کی کپکپی اُس کے اپنے جسم میں

داخل ہو گئی ہو۔ اندھی غم زدہ آنکھوں کی نمی گویا اُس کے رخساروں پر آ گئی ہو۔ اتنے برس بعد بھی یہ سب کچھ اُسے جوں کا توں محسوس ہو رہا تھا۔ اور آج پھر اُس کے کان والدہ کے کہے ہوئے مختصر الفاظ سن رہے تھے ــــ
"میرے جگر کا ٹکڑا الگ ہو کر سمندر پار جا رہا ہے۔"
لیکن مہتاب کو سمندر پار کر کے تب آنا ہی پڑا تھا حالانکہ وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے گھر کی گزر بسر نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ تو وہ پہلے ہی اقتصادی طور پر کمزور تھے۔ باپ کے وقت ہی کچھ زمین رہن رکھی گئی تھی اور جس بچی کھچی زمین پر انحصار تھا۔ اسے دریا کے پانی نے ویران کر دیا تھا۔ مہتاب نے بڑے بھائی کو یہ کہہ کر ملایا جانے سے روک دیا تھا:
"تمہارے پیچھے کوئی نہیں۔ کہتے ہیں ملایا کی زمین بہت ظالم ہے۔ کم ہی کوئی واپس آتا ہے۔ میں چلا جاتا ہوں۔ میرے تو پیچھے کئی رشتے ہیں۔ بیوی ہے، لڑکی ہے۔ رہن رکھی زمین واگزار کرانے کے لیے رقم کماتے ہی میں لوٹ آؤں گا۔"
جب وہ ملایا پہنچا تو اس کا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم وقت کر کے اور لہو پسینہ ایک کر کے آٹھ نو ماہ میں وہ اتنی رقم واپس بھیج سکے گا۔ یہاں پہنچتے ہی لڑائی شروع ہو گئی اور جاپانیوں نے چند دنوں میں ہی پورے ملایا کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بھونچکا مہتاب دین کئی دن اس گولی باری میں اپنا سر چھپاتا رہا۔ آخر ایک دن ایک جاپانی سپاہی نے اُسے پکڑ ہی لیا اور کہیں ریل کی پٹڑی بنانے کے لیے بیگار پر لگا دیا۔
خدا خدا کر کے جاپانیوں کا یہ سیاہ جہنم ختم ہوا اور مہتاب تین ڈالر یومیہ پر ٹین کے کھدان کھودنے کے کام پر لگ گیا۔ شام کے وقت وہ کسی مویشیوں والے کے لیے کھیت سے چارہ کاٹ کر لاتا، جس کے عوض اُسے کچھ دودھ مل جاتا۔ دودھ بہت مہنگا تھا، لہٰذا مہتاب دودھ فروخت کر کے بھی کچھ پیسے کما لیتا تھا۔ جاپانیوں کے دور میں اور اس کے بعد کی جان توڑ محنت نے تو اُسے پانچ برسوں میں ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور آنکھوں کے نیچے کالی جھرّیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ پہلے تو اُسے یوں لگا گویا اُس کی محنت رائیگاں جائے گی، لیکن آخر وہ قرضہ اُتارنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔
اُس نے سنت سنگھ کو بڑے فخر کے ساتھ بتایا تھا۔ رب نے مہربانی کی ہے اور میں نے رہن رکھی ہوئی زمین واگزار کرا لی ہے۔ اور سنا ہے کہ ویران زمین بھی اب اچھی ہو گئی ہے۔ دریا وہاں سے ہٹ گیا ہے۔ لوٹ کر دو دیگ چاول برادری کو کھلاؤں گا... کہتے ہیں مُلک میں چاول بہت مہنگا ہو رہا ہے۔ لیکن میری یہ تمنا ضروری پوری کرنی ہے۔
مہتاب اب کسی بھی طرح دیس پہنچنا چاہتا تھا۔ سمندر چیر کر بھی۔ لیکن اُسے یہاں رُکنا پڑ رہا ہے۔ کیوں کہ وہ تین گنا داموں پر ٹکٹ نہیں خرید سکتا تھا۔ اُس کی اُمید نا اُمیدی میں تبدیل ہوئی جا رہی تھی۔ دو دیگ چاولوں کے لیے پیسے تو کیا، جہاز اور ریل کے کرائے کی رقم بھی کم ہوتی شروع ہو گئی تھی۔
ایک دن سنت سنگھ بازار میں جیب کٹوا آیا اور اس طرح اُس کے قریب بیس ڈالر ختم ہو گئے ــــ دونوں کو یوں محسوس ہوا گویا اُن کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔
دونوں نے کرائے پر رکشا لے کر چلانی شروع کر دی۔ روز پانچ ڈالر کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جو کچھ بچ جاتا اُسے دونوں جمع کر کے رکھ لیتے ــــ دونوں کے لیے یہ ایک نیا کام تھا۔ اس کے ساتھ ہی لنگر کا خالی اناج کھا کر یہ کام کرنا اور بھی مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس خدشے کے تحت کہ کہیں اُن کے پاس ٹھیک داموں پر ملنے والے ٹکٹ خریدنے کے لیے بھی پیسے نہ بچیں۔ اُنہوں نے اپنے خورد و نوش پر کچھ بھی صرف نہ کیا۔
کبھی جب وہ کہیں رکشا کھڑی کر کے اپنا پسینہ صاف کر رہے ہوتے اور قریب سے کوئی کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرنے والا گزرتا تو وہ اُسے دیکھتے رہتے۔ بھوک اُن کی انتڑیوں میں بلبلا جاتی لیکن بس وہ دیکھتے ہی رہتے۔
کبھی سنت سنگھ کہتا: "اپنے ملک کے آٹے کا کیا مقابلہ ہے۔ صرف روٹی ہی بہت بڑی نعمت ہے۔ اتنے برس سے وہ اعلیٰ قسم کی گندم کبھی خواب میں بھی نہیں چکھی۔ یہ آسٹریلوی خاک ہی کھاتے رہتے ہیں۔"
کبھی قریب سے امریکہ سے آئے ہوئے مالٹے سے لدے ٹھیلے گزرتے: "ہمارے مُلک کے آموں جیسا پورے جہاں میں کوئی پھل نہیں ہے۔"
کچھ پل کے لیے رکشا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا اور وہ آموں کے باغوں میں جا پہنچتے، جہاں کوئل کوک رہی ہے۔ چولہے کے پاس بیٹھے بچوں کو ماں عمدہ گندم کی روٹی میں گھی ڈال کر دے رہی ہے....۔
"رکشا.... اے رکشا.... دو سواریاں اور سامان بھی ہے۔"
اور رکشا پھر چل دیتا۔ موٹروں، ٹراموں، بسوں کی بھیڑ میں سے راستہ بناتے وہ کشاں کشاں نکلنے لگتے۔
دیس سے آئے ہوئے جہاز میں سے سواریاں اُتر رہی تھیں۔ دو مردوں اور تین بچوں کو مہتاب نے اپنی رکشا میں بٹھایا۔ مہتاب نے سُنا ایک خوب صورت سا بچہ کہہ رہا تھا۔ "بابو یہاں مسلمان تو نہیں ہوں گے؟ اُنہوں نے میرے جیسے بچوں کو بھی نہیں بخشا۔" اور بچہ اچانک رونے لگا۔
جہاز سے اُتری دو مسلمان سواریوں نے سنت سنگھ کی رکشا میں بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ابھی بہت دُور نہیں گیا تھا کہ اُس نے ان میں سے ایک کو بات کہتے سُنا: "سکھ یا ہندو کو پیسے دینا حرام ہے۔ انہوں نے کلکتے میں ہمارے ہزاروں بھائی مارے ہیں۔" اور وہ دونوں ایک چینی کی رکشا میں بیٹھ گئیں تھیں۔
رات کو سنت سنگھ اور مہتاب دین دن کو سنی ہوئی باتیں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اتنے

میں قریب سے دو سکھ گزرے۔ یہ دونوں آج ہی جہاز میں سے اُترے تھے۔ اور گوردوارے میں آئے تھے اُنہوں نے سنت سنگھ کو اپنے پاس بلایا اور اس سے باتیں کرتے رہے۔ سنت سنگھ جب لوٹ کر مہتاب کے پاس آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

مہتاب نے پوچھا۔ "کیا کہتے تھے وہ؟"

"نہیں۔ کچھ نہیں کہتے۔ یوں ہی ..."

"کوئی اتہ پتہ بتاؤ بھی تو...."

سنت سنگھ نے مہتاب دین کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔

"کہتے تھے۔ تم مسلمان ہو"

مہتاب دین نے حیران ہو کر کہا۔ "تو پھر کیا ہے؟ یہ کیا کوئی نئی بات ہے؟"

"کہتے تھے مسلمان سانپ ہیں سانپ۔ لاکھ دودھ پلاؤ۔ یہ بالآخر ڈس ہی لیں گے۔"

مہتاب پتھر کی طرح ساکن ہوا سر نیچا کیے بیٹھا رہا — سنت سنگھ اُس کے اور قریب آ کر بولا۔ "بے وقوف نہ بنو۔ یہ تو اُن کی باتیں ہیں۔ تم نے پوچھا اور میں نے بتا دیں۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آئیں۔ ان لوگوں کو خراب کرنے والے تو انگریز ہیں انگریز۔"

اتنے میں خاموشی سے سنت سنگھ کی بیٹی بچنو مہتاب کی گود میں آ بیٹھی۔ "چاچا، کیا آج کبوتروں کو روٹی نہیں ڈالو گے؟ وہ کب سے انتظار کر رہے ہیں۔" مہتاب نے بچنو کو گلے سے لگا لیا۔

"چاچا، تم تو رو رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں گیلی کیوں ہیں؟"

"اری کبوتری مجھے کیوں رونا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مہتاب نے اُسے اور بھی زور سے گلے سے بھینچ لیا۔ بچنو نے اپنے چھوٹے چھوٹے بازو اُس کے گلے میں ڈال دیے۔

سنت سنگھ کی نگاہ میں ایک بھری گرمی گھلی ہوئی تھی۔

آخر پورے دو ماہ بعد مہتاب دین اور سنت سنگھ کے لیے کو جہاز کے ٹکٹ مل گئے۔ اس بار گوردوارے میں ٹھہرے ہوئے سبھی مسافروں کو ہی ٹکٹ مل گئے تھے۔ پرسوں جہاز روانہ ہونا تھا۔

دونوں رستا واپس کر کے جتنے پیسے اُنہوں نے آج تک جمع کیے تھے، اُنہیں شمار کرنے لگے۔ حساب کر کے اُنہیں بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ ضروری اخراجات کے علاوہ بھی اُن کے پاس کچھ بچ رہا تھا۔ بچنو کو لے کر دونوں بازار چلے گئے۔ سنت سنگھ نے بچنو کے لیے بہت خوب صورت ربڑ کا جوتا خریدا۔ اور اپنی بیوی کی شلوار کے لیے ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا۔ مہتاب نے بھی اپنی بیوی کے لیے ایسا ہی کپڑے کا ٹکڑا خرید لیا۔ اپنی لڑکی تاجو کے لیے اُس نے بچنو کے ناپ کا ربڑ کا جوتا خرید لیا۔ کیوں کہ دونوں ہم عمر ہی تھیں۔

سمندر آج کل بہت طوفانی ہوتا ہے۔ جہاز میں عرشے کے مسافر تو بہت ہی تکلیف میں تھے۔ جہاز نے دوسرے دن سے ہی بہت ڈولنا شروع کر دیا تھا۔ سمندر میں اتنی اتنی اونچی لہر اُٹھتی کہ جہاز کو پار کر جاتی۔

تیسرے دن بچنو نے قے کرنی شروع کر دی۔ سنت سنگھ اور اس کی بیوی کا جی تو دوسرے دن سے ہی متلانے لگا تھا۔ صرف مہتاب نے ہی قدرے ہمت سے کام لیا تھا۔ اور وہ ہی بچنو کو گود میں لیے رہتا۔ اور لہروں کی مارے بچاتا تھا۔ اور جب وہ قے کرتی تو اُسے کلی کرا کے اس کا منھ دُھلا دیتا۔ بغل میں لیٹی بچنو اسے بارہا تاجو دکھائی دینے لگتی۔ کبوتری۔ وہ اپنی چھوٹی سی تاجو کو پیار سے یوں ہی پکارتا تھا — اور اب تو خدا کے فضل سے وہ بچنو جیسی ہی ہو گئی ہو گی۔ جب وہ دیس سے آیا تھا تو اس وقت کے بارے میں تاجو کو کچھ یاد نہیں ہو گا۔ اب جب وہ اس کے گورے پاؤں میں (اُس کا رنگ اپنی ماں جیسا تھا) ربڑ کے جوتے ڈالے گا تو وہ فخر سے سارے گاؤں کے بچوں کو اپنا جوتا دکھاتی پھرے گی، لیکن وہ اُسے پہچان تو نہیں پائے گی۔ شرما کر اپنی ماں کے ساتھ جا چپکے گی اور اس کی ماں اُسے بتائے گی "تاجی، یہ تمہارا ابا ہے۔" اور اس کی ماں ریشمی کی شلوار پہن کر کتنی خوش ہو گی، لیکن نرم نرم شلوار۔ جب وہ آیا تھا تو اس نے آنسو بھری آنکھوں میں سے دیکھتے ہوئے اُسے کہا تھا۔ "دیکھنا، کہیں وہاں کے ہی ہو کر نہ رہ جانا۔ آپ کو میری قسم۔ تاجو کی قسم۔" اور اب وہ اس کے پاس جا رہا تھا — اور وہ اس کی قسم پر قائم رہا تھا۔ وہ تو شادی کے ابتدائی دنوں کی مانند ابھی دوشیزہ ہی دکھائی دے گی۔ اس کی آنکھوں کا سُرما ویسا ہی سیاہ ہو گا اور جسم ویسا ہی گورا۔ اسی بے خبری کے عالم میں اُس نے اپنے مُرجھائے ہوئے چہرے پر اُنگلیاں گھمائیں۔ اَدھ مُنڈی داڑھی چبھی۔ آنکھوں کے قریب گالوں پر چھائیاں کچھ گرم گرم سی ہوتی محسوس ہوئیں۔

سمندر میں سے ایک بہت بڑی لہر اُٹھی اور جہاز کے پورے عرشے پر پھیل گئی۔

طوفانوں کے سبب جہاز دو دن تاخیر سے کلکتہ پہنچا۔ یہاں فسادات کا زور تھا۔ سنت سنگھ، اُس کا کنبہ اور مہتاب اُس رات گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کا سفر بھی جہاز جیسا ہی مشکل تھا۔ مسافت بھی اتنی ہی تھی، لیکن اب اُنہیں کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے دیس کی دھرتی پر جو تھے۔ راستے میں اُنہوں نے کچھ آم خریدے۔ کچھ کھا لیے۔ اور کچھ سوغات کے طور پر گھر لے جانے کے لیے باندھ لیے۔

بچنو کی ولادت ملایا میں ہی ہوئی تھی۔ وہ پہلی بار وطن آ رہی تھی۔ اُس نے آج پہلی بار آم چکھا تھا۔ اُسے یہ بہت ہی لذیذ لگا۔ اُس نے مہتاب سے کہا "چاچا، ہمارا وطن بہت ہی اچھا ہے۔ ویسا ہی جیسا تم کہا کرتے تھے۔"

مہتاب نے اُسے چوم لیا۔ اُس کے منھ سے آم کی خوشبو آ رہی تھی۔ مہتاب کو یہ سوچ کر عجیب سی راحت ہوئی کہ تاجو کو بھی یہ ایسا ہی اچھا لگے گا اور اس کی ماں کو بھی۔ اور اُن دہانوں میں سے بھی اسی قسم کی خوشبو آئے گی۔

آخر گاڑی یہ سفر طے کرتی ہوئی اُس اسٹیشن پر پہنچ گئی، جہاں مہتاب اور سنت سنگھ کو اُترنا تھا۔

اسٹیشن کی فضا عجیب گھٹی گھٹی سی تھی۔ سکھ اور ہندو مسافروں کی ٹولیاں الگ بیٹھی تھیں اور مسلمان سواریاں الگ بیٹھی تھیں۔ پولیس کے لوگ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ مہتاب اور سنت سنگھ نے پہلے اتنی پولیس کو کبھی اسٹیشن پر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ بھیک مانگنے والے بھکاری بھی ٹیڑھی نگاہ سے پہلے جانچ کر لیتے تھے کہ کہیں وہ غیر مذہب کے آدمی سے بھیک تو نہیں مانگ رہے۔

اسٹیشن سے باہر آکر سنت سنگھ نے ایک تانگے والے کو بلایا۔ ایک سکھ تانگے والا آگیا۔

"بھئی موٹروں کے اڈے پر چلنا ہے۔ تین سواریاں اور ایک بچہ ہے۔ کیا لوگے؟"

تانگے والے نے مہتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیا یہ مسلمان ہے؟"

"ہاں!" حیران سنت سنگھ نے ہاں میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اس تانگے میں نہ بٹھاؤ۔ جس طرف مجھے جانا ہے، وہ اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آپ بڑے شوق سے چلو!"

اتنے میں ایک مسلمان تانگے والا بھی مہتاب دین کے پاس آگیا۔

"موٹروں کے اڈے پر چلوگے؟ تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ سردار کے تانگے نے جس طرف سے جانا ہے اُدھر بہت ہندو رہتے ہیں۔ میں مسلمان محلے میں سے گزر جاؤں گا۔ خواہ اس طرح چکر تو پڑے گا لیکن بچاؤ اسی میں ہے۔"

بے بسی میں وہ دونوں الگ الگ تانگوں میں بیٹھ گئے۔

بچنو اپنے تانگے میں رونے لگی۔ "چچا تم کدھر جا رہے ہو؟ تم تو کہتے تھے تم مجھے تاجو کے پاس لے جاؤگے اور تاجو اور میں پکی سہیلیاں بن جائیں گی!"

سکھ تانگے والے نے گھوڑے کو چابک ماری۔ تانگہ چل پڑا۔ بچنو اب بھی مہتاب دین کو بُلا رہی تھی۔

خواہ مہتاب دین کے تانگے کو بڑا چکر لگا کر پہنچنا پڑا تھا، لیکن وہ سنت سنگھ کے تانگے سے پہلے ہی اڈے پر پہنچ گیا تھا اور لاری میں اُن کے لیے جگہ مخصوص کر کے اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ سامنے ہی ایک خوردہ فروش کی دوکان تھی۔ مہتاب دین نے سوچا۔ دو دیگ چاول پکانا ہے۔ بھاؤ ہی پوچھ لوں لیکن دکان دار نے اس سے بات بھی نہیں کی صرف سر کی جنبش سے کہہ دیا کہ چاول نہیں ہے۔

مہتاب پھر لاری میں آکر بیٹھ گیا۔ اب تاجو اور اس کی والدہ سمندروں کے فاصلے پر نہیں تھیں۔ اس کا قرض اُتر چکا تھا۔ اب وہ پہلے کی نسبت گاؤں میں زیادہ آرام سے رہ سکیں گے۔ دریا بھی اُن کی زمین سے اُتر گیا تھا۔ زمین بہت اچھی ہوگئی ہوگی اور ساتھ ہی لوگ کہتے ہیں اب آزادی ملنے والی ہے۔ انگریزوں نے ماہ ڈیڑھ ماہ میں چلے جانا ہے۔

کافی دیر ہوگئی تھی لیکن سنت سنگھ کا تانگہ ابھی بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لاری والے نے کہا کہ وہ ایک گھنٹہ بعد چلے گا۔ وہ کچھ آگے جاکر بڑی سڑک تک پتہ کر آئے۔

اگلی سڑک پر جاکر دُور موڑ کے قریب اُسے پہلے ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی پھر اُسے ایک تانگہ گرا ہوا دکھائی دیا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ وہ تیزی سے اوپر کی جانب چلنے لگا۔ اُس کا دل ڈر سے بند ہوتا جا رہا تھا۔

قریب جاکر اُس نے دیکھا کہ سنت سنگھ اور اس کی بیوی کی لاشیں بری طرح کٹی پھٹی پڑی تھیں۔ سنت سنگھ کی ٹانگیں کچھ دُور جا گری تھیں۔ بچنو کی ماں کی چھاتی میں لوہے کا ایک ٹکڑا گھسا ہوا تھا۔ اُس کے چاروں طرف خون کا تالاب سا بنا ہوا تھا اور اس کے بازو ایک طرف کو گرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بچنو بے ہوش پڑی تھی۔ اُس کے بازوؤں اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ مہتاب نے جھٹ سے بچنو کو اٹھا لیا۔ اس کا جسم ابھی گرم تھا۔ اور اُس کی سانس چل رہی تھی۔

مہتاب بے ہوش بچنو کو اٹھا کر تیزی سے اڈے کی طرف لے آیا۔ ماں باپ مری بچنو پر مہتاب کے آنسو بے اختیار گر رہے تھے۔ وہ پہلی بار اپنے دیس آئی تھی۔ مہتاب نے سوچا کس طرح وہ اور سنت سنگھ دیس آنے کی تمنا میں اکٹھے رکشا چلاتے رہے تھے۔ کیسے سنت سنگھ اپنے دیس کی گندم کی روٹی کھانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بچنو کی ماں کو ابھی وہ ریشمی شلوار سلوانی تھی۔ کیسے وہ برسوں سے بچھڑے دیس کی ہر چیز کو اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دونوں زندہ تھے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی اُمیدوں سے دھڑکتے تھے اور اب صرف بچنو اس سب کچھ کی قبر پر زندگی کی ایک چنگاری رہ گئی تھی۔ وہ اُسے کبھی بجھنے نہیں دے گا۔ کبھی نہیں . . . !"

"بچنو! میں مہتاب تمہاری پرورش کروں گا۔ اپنی تاجو کی مانند۔ تم پکی سہیلیاں نہیں، بہنیں ہوگی!" مہتاب اونچی آواز میں بے ہوش بچنو کو سنا رہا تھا۔ جب بچنو نے سن لیا تو اس کی آنکھیں پھڑکیں۔

"چاچا . . . تم . . .!"

اچانک کسی نے پیچھے سے مہتاب کو چھُرا گھونپ دیا۔ بے ہوش بچنو اس کے بازوؤں میں سے گر گئی۔ "اس چھوٹے سانپ کو بھی جھٹکا دو!" مہتاب کے مر رہے کانوں نے سُنا اور ایک بچی کی سی چیخ۔

مہتاب نے انتہائی درد برداشت کرکے بھی بچنو کی طرف بازو بڑھانے کی کوشش کی، لیکن یہ اُس کی ہمت سے باہر تھا۔ "بچنو . . . . تاجو . . .!" اور اُس کے بازو اس جانب گر گئے۔

کرفیو کا سائرن چیخ رہا تھا اُس گاؤں کے کتوں کے رونے کی مانند جس پر موت آنے والی ہو۔ سڑک پر گوری فوج کے سوا کوئی نہیں تھا۔

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب)

■■

پریم پرکاش

ڈیڈلائن

ست پال، ایس پی آنند، ستی یا پالی۔
مرنے والے ہی کے نام تھے۔ جب میں اس گھر میں بیاہی آئی تھی تو سماجی رشتے میں وہ میرا دیور تھا — آنگن میں گیند کھیلنے والا، ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جانے والا اور جو سبزی پکتی، وہی نہ کھانے والا۔ لیکن قدرت کے رشتے میں وہ میرا بیٹا بھی تھا، بھائی بھی اور پریمی بھی۔

آج اس کی پہلی برسی تھی۔ برہمنوں کو کھانا کھلایا گیا۔ دان پُن کیے گئے اور گھر میں جو بھی اس کی نشانی رہ گئی تھی، وہ دان کر دی گئی۔ تاکہ اس یتیم کی ماں جیسی بھابی، دیوتا جیسے بھائی اور ادھر نگ سے فریش باپ کی آتما کو شانتی مل سکے۔ مرنے والے کی روح کا کیا پتا کہاں نیا جنم لے چکی ہو یا ابھی تک اسی گھر میں یا اپنی منگیتر کے گھر میں بھٹکتی پھرتی ہو یا ہو سکتا ہے، اپنے تاؤ زاد بھائی کی بیوی سنتوش کے چوبارے کی چھت پر آ بیٹھتی ہو، آنند صاحب سے کہوں گی، چلو پہوے جا کر ایک بار گتی کرا آئیں۔ پتاجی کی آتما تو چین سے رہے گی۔

دن بھر رشتہ داروں، سگے سمبندھیوں کی فضول باتیں سن سنا کر، انھیں چائے پانی پلا کر بمشکل فرصت پائی ہے۔ تھکی ٹوٹی سی پڑی سوچ رہی ہوں — پرماتما نے پچھلے نو مہینوں میں کیا کیا لیلا دکھائی ہے۔ ستی اپنی عمر کے آخری نو مہینے پچھلے تئیس برس سے زیادہ لمبا کر کے جی گیا۔

گلے کے کینسر سے متعلق ڈاکٹر پوری کی رپورٹ ملنے کے بعد زندگی کیسے بتائی، یہ مرنے والا ہی جانتا تھا یا کچھ میں — کینسر کے مریضوں کے بارے میں میں نے جو پڑھا سنا تھا، وہ آدھا جھوٹ تھا۔ سچ وہ ہے جو ہم پر بیتی ہے۔

بی۔اے کر چکنے پر ایک سال کی بیکاری کے بعد ستی کو نوکری ملی تھی۔ اس کی سگائی کو ابھی پورا برس بھی نہیں ہوا تھا کہ گلے میں خراش کینسر بن گئی۔ اس کی رپورٹ دیتے ہوئے رشتہ میں میرے ماموں ڈاکٹر پوری کے مکمل طور پر گنجے سر پر پسینے کی بوندیں آ گئیں تھیں۔ انھوں نے میرے اور آنند صاحب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا — بیٹا، یہ چھ مہینوں کے بعد اپنا نہیں رہے گا۔ علاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر خرچ کرنا ہی ہے تو کسی دھرم کے کھاتے میں کر دو۔ نام کی دوائی مجھ سے لیتے رہنا۔

مگر ڈاکٹر پوری کو کیا معلوم کہ چارہ کیے بغیر جینا کس قدر مشکل ہے۔ میں نے شام کو جوائنٹ اکاؤنٹ والی پاس بک اس کے بھائی صاحب کے آگے رکھ کر کہا — ہم نے یہ پیسہ کس لیے بچانا ہے۔

شادی کے ایک سال بعد میری آپریشن سے بچی ہوئی تھی۔ میں اسے پورے چھ ماہ بھی دودھ نہ پلا پائی، جس کی بخشش تھی، وہ لے گیا — تب میں نے

نام:	پریم پرکاش
ولادت:	۷، اپریل ۱۹۳۲ء
شغل	صحافت
تصانیف:	ڈیڈلائن — مکتی (افسانوی مجموعے)
پتہ:	۵۹۳ – موتا سنگھ نگر، جالندھر (پنجاب)

سروس چھوڑ دی۔ کس کے لیے اتنا دھن اکٹھا کرنا تھا۔ آنند صاحب بینک سے معقول تنخواہ پاتے ہیں اور ستی ابھی چھوٹا تھا، وہ اپنے کپڑے کتابیں بھی نہیں سنبھالتا تھا اور پتا جی کی دیکھ بھال کون کرتا! وہ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ چار پائی سے اتر کر لیٹرن تک چلے جاتے ہیں، گھسٹتے ہوئے اور اس کے بعد چار پائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ قمیض بدلنے کے لیے بھی انہیں دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تو بول بھی نہیں سکتے۔ ہونٹوں میں پھسپھساتے ہیں۔ ان کی بات مجھ سے پہلے میری ساس سمجھتی تھی اور بعد میں میرا دھرم ہو گیا تھا۔

ستی کی رپورٹ لا کر ہم پتا جی کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو گئے، ہاتھ میں کاغذ لیے ہوئے۔ وہ ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم شاپنگ کر کے آئے ہوں اور ان کے لیے پھل لائے ہوں۔ ہم ان کا اس طرح دیکھنا نہ دیکھ سکے۔ تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ستی ابھی دفتر سے نہیں لوٹا تھا — اسے کیسے بتائیں گے؟ یہ سوال آنند صاحب نے مجھ سے کیا اور پھر آپ ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑے۔ میرے بھی آنسو نکل پڑے۔ میں نے جلدی سے آنسو پونچھ کر پتی کو دلاسا دیا کہ یہ کام میں کروں گی۔ مجھے لگا گویا ساس کے بعد یہ ذمہ داری بھی میری ہے۔ میں اس گھر کی ماں ہوں۔ سوچا، اگر میں بھی رو پڑی تو پھر ستی روئے گا، پتا جی روئیں گے۔ یہ گھر کیسے چلے گا؟

رات آنند صاحب سیر کرنے چلے گئے۔ پتا جی کھا پی کر سو گئے تو میں ستی کے ساتھ کینسر کی باتیں کرنے لگی۔ ہم مریضوں کی باتیں کرتے رہے۔ آخر ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مریض باقی ماندہ زندگی کو سکھی بنانے کی خاطر جدوجہد کرتے ہیں اور دکھی ہوئے بغیر موت قبول کر لیتے ہیں — اور پھر میں نے ڈاکٹر پوری کا فیصلہ 'شک ہے' کہہ کر بتا دیا۔

سُن کر وہ ڈرا نہیں، لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ رہی۔ کہنے لگا — میں ڈاکٹر پوری سے خود پوچھ کر آؤں گا۔ میں نے رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ اس میں 'کینسر' نہیں لکھا تھا۔ ڈاکٹروں کی زبان میں کچھ اور ہی تھا۔ اس نے ایک بار دیکھ کر رپورٹ اسی طرح تہہ کر کے رکھ دی۔ ایک بار کھانسا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ دو تین منٹ میز پر پڑی چیزوں کو ادھر ادھر کرتا رہا اور پھر باہر نکل کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے گیٹ کے پاس بنی کیاری میں لگے پھولوں کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے لگا — لو موت کا چکر شروع ہو گیا۔

رات کو آنند صاحب آئے تو پلنگ پر لیٹ کر سگریٹ سلگا کر کہنے لگے "ہم علاج کروائیں گے۔ کئی مریض دس دس برس نکال جاتے ہیں"۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مشورہ کر کے آئے تھے۔

"ہاں، کیا ہرج ہے؟" — مجھے بھی خیال آیا کہ کئی پرانے مریض سادھوؤں کی چٹکی سے ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

میں نے دو ہزار کے نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ وہ دیکھ کر جھنجلا اٹھے، غصے میں بولے تو مجھے خیال آیا کہ خرچ تو مجھے کرنا ہے۔ علاج بھی مجھے ہی کرانا ہے۔ پتی سے معافی مانگ کر ستی کے کمرے میں گئی تو وہ سویا ہوا تھا۔

صبح ستی کے لیے چائے لے کر گئی تو وہ جاگا نہیں تھا۔ اس کے لمبے گھنگرالے بال اس کی سنہری پیشانی پر آئے ہوئے تھے۔ کشادہ پیشانی، گھنی چھوٹے بالوں والی بھویں اور ان کے درمیان باریک باریک روئیں — مجھے شروع ہی سے پیاری لگتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ پرماتما جسے بہت حسن دیتا ہے، اسے جلدی اٹھا لیتا ہے۔ جی میں آیا بال ہٹا کر پیاری پیشانی چوم لوں۔

جب میں اس گھر میں بیاہی آئی تھی تو وہ گیند کھیلنے والا لڑکا تھا۔ انبالے والی موسی نے اسے پکڑ کر میری گود میں بٹھا دیا تھا۔ یہ کوئی رسم تھی یا دعا کہ پرماتما اس گود میں لڑکے بٹھائے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے یاد کرایا گیا تھا کہ میں اس کی ماں بھی ہوں۔

اپنے گھر میں اپنے چھوٹے بھائی سبھاش کو جانے کے لیے تیار کیا کرتی تھی۔ یہاں ستی کو تیار کرنے لگی تھی۔

ستی جاگا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ مگر فوراً ہی اداس ہو گیا۔ شاید اسے میرے مسکراتے ہوئے چہرے کے پیچھے پوشیدہ اداسی نظر آ گئی تھی۔ آنند صاحب بھی آ کر پاس کھڑے ہو گئے تھے، مگر کھڑکی کی جانب منہ کیے۔ کہنے لگے "ستی تم فکر مت کرو، اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ ہم آج کرسچین اسپتال جائیں گے۔"

اسپتال میں ڈاکٹر جوزف نے کہا — شفا دینا خدا کا کام ہے، علاج کرنا بندے کا، آؤ خدا کا نام لے کر شروع کریں — اس سے ہمیں کوئی تسلی نہ ہوئی۔ پھر بھی علاج چلتا رہا۔ نوٹ کاغذ کے پرزوں کی طرح اڑتے رہے۔ ایک ماہ کے کورس کے بعد جب مرض خاصا بڑھ گیا تو فیروزپور کے ایک سادھو کا علاج چلا، پھر ایک اشتہاری حکیم کی ہلدی سے بنائی دوا چلی۔ پھر کورو کشیتر کے وید کی اور پھر پی۔ جی۔ آئی ۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی کہ ستی اکیلا نہ رہے ہم تاش، کیرم بورڈ اور دوسری کھیلیں کھیلتے یا فلم دیکھنے چلے جاتے۔ تاش کھیلتے ہوئے وہ انگوٹھا اور انگلی کو تھوک لگا کر پتے بانٹتا۔ کھانا کھاتے وقت وہ میری کٹوری میں سے لقمہ لے لیتا تھا۔ شرط لگاتے ہوئے وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا۔ میں ڈر جاتی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر پوری کے پاس گئی۔ انھوں نے کہا — کینسر چھوت تو نہیں لیکن پرہیز کرنے میں کیا حرج ہے۔

میں اوپر سے ہنستی لیکن اندر سے ڈرتی لیکن کبھی کبھی میرا پیار اتنے جوش میں آتا کہ میں سب کچھ بھول جاتی۔

ایک دن ہم ایک انگریزی فلم دیکھ کر آئے۔

چوبارے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ستی نے فلمی اسٹائل میں سہارے کے لیے اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔ میں بھی فلمی اسٹائل میں سہارا لے کر آخری اسٹیپ پر جاکر اس کا ہاتھ چوم لیا تو وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں بے پرواسی کرسی پر بیٹھ کر الماری کے آئینے میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتی رہی۔ وہ سرخ ہو کر زرد پڑنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے، اداس کیوں ہو؟" میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پیار سے پوچھا، تو وہ میری گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔ میں نے اس کے سر پر اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنی دونوں باہوں میں بھینچ کر کہا "تو تو میری جان ہے پیاری، پیاری"۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے انگریزی میں کہا "میں زندگی گنوا بیٹھا ہوں"۔

اس کی ذراسی بات نے تو میری جان ہی نکال لی۔ موت کے بارے میں یہ پہلی بات تھی جو اس نے منہ سے نکالی تھی۔ میں نے اس کا ماتھا چوم کر انگریزی میں کہا، "میرا سب کچھ تیری نذر ہے، میرے پیارے"۔

ڈر سے ستی کی نیند اڑ گئی۔ وہ رات کو بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ یہی بات ہماری نیندیں اڑانے کے لیے کافی تھی۔

ایک رات لگ بھگ ڈیڑھ بجے آواز آئی، جیسے ستی نے پانی مانگا ہو، میں نے جلدی سے بیچ کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ستی سرہانے میں منہ گاڑھے ہوئے اوندھا پڑا تھا۔ اس کے جسم کا بہت سا حصہ رضائی سے باہر تھا۔ اتنی سردی میں بھی پیاس لگ سکتی ہے — معلوم نہیں اندر کیسا زبردست طوفان برپا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں اس کے پاس گئی۔ سرہانے بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا، "کیا بات ہے، نیند نہیں آتی؟"

"نہیں — دو گھنٹے سے جاگ رہا ہوں۔"

میں نے اسے کاموزکی گولی دی، جو اب آنند صاحب کو اور کبھی کبھی مجھے بھی لینے کی عادت ہو گئی تھی۔

"بھابی جی! شراب پینے کو دل کرتا ہے۔" اس نے آنکھیں اوپر کیے بغیر ہی آہستگی سے کہا کہ اس کے بھائی صاحب نہ سن لیں۔

"اچھا، ڈاکٹر سے پوچھوں گی۔ اب تو سو جا" کہہ کر میں اس پر رضائی ڈال کر اپنے بستر پر پہلو بدلنے لگی۔

صبح کام سے فارغ ہو کر میں ڈاکٹر پوری کے پاس گئی۔ انھوں نے جھٹ کہہ دیا۔ "وہ جو کچھ مانگتا ہے، دو۔ اس کی روح کو مطمئن رکھو اور یہ سمجھو، یہ ہونی ہو گئی۔ جتنا اس کی کیجیے۔۔۔۔"

ڈاکٹر پوری کا محض دھیان دوسروں کے لیے ہے — سوچتے ہوئے میں تیزی سے کلینک سے باہر آ گئی۔ انھیں کیا معلوم کہ نوجوان کی موت کس طرح اندر کھاتی ہے۔ کس طرح موت کا ڈر ہمارے گھر کے چپے چپے پر چھا گیا تھا۔ ہر چہرے پر ماتمی رنگ چڑھ گیا تھا۔۔۔۔ صرف پتاجی نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہمارے چہروں کو دیکھ کر وہ بھی ڈرے رہتے تھے۔ میں ان کے ان سوالوں کا جواب کیسے دیتی — تم اداس کیوں رہتی ہو؟ ستی دفتر کیوں نہیں جاتا؟ تم اسے لے کر کہاں جایا کرتی ہو؟

ایک دن جی میں آیا، بتا دوں کہ پتاجی آپ کے لاڈلے کے مرنے میں اب تھوڑا وقت باقی ہے۔ ہم اسے ہر اس جگہ لے کر جاتے ہیں، جہاں کینسر کے علاج کی بات سنتے ہیں۔

ایک شام ستی پی کر آیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دہلیز پر گر پڑا۔ میں نے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال لیں اور بستر پر گرتے ہوئے میرا دوپٹا کھینچ کر اپنے چہرے پر لپیٹ لیا۔ آدھا دوپٹا میرے سر پر تھا اور آدھا اس کے چہرے پر۔ وہ رو رہا تھا — موت کے خوف سے شاید!

موت کے اس پار آدمی اپنی ناکامیوں کے بارے میں کیا سوچتا ہے، میں اس خیال ہی سے ڈر گئی۔

لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کے بھائی صاحب دیکھنے گئے، تو وہ قے کر رہا تھا۔ اس میں خون کے چھینٹے تھے، جو میں نے آنند صاحب کی نظر بچا کر جلدی جلدی صاف کر دیے۔

اگلے دن اتوار تھا۔ ہم معمول کی طرح ہون کرنے لگے تو ستی کا دل نہیں ٹک رہا تھا۔ پہلے وہ بڑی شردھا کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ شام کو سندھیا بھی کرتا تھا، آچمن بھی کرتا تھا۔ اس کے بھائی صاحب اور میں بڑی عقیدت کے ساتھ منتر بولتے تھے — جی ایم سردھا ستم۔ پتاجی پلنگ کے سہارے بیٹھے صرف سنتے تھے۔

ستی نے بے دلی سے ہون کنڈ کی اگنی پر چیڑ کی اور ہر منتر کے بعد سواہا کہہ کر آہوتی ڈالتا ڈالتا تھک گیا اور پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

شام کو وہ فلم دیکھ کر آیا۔ ذرا سا بیٹھا اور دوا کھا کر باہر جانے لگا۔ میں نے روک لیا۔ الماری میں سے انگریزی شراب کا کوارٹر نکال کر میز پر رکھ دیا۔ وہ مسکرا دیا۔ میں نے کہا — "پی لو، گھر میں بیٹھ کر۔ تائی جی کے گھر نہیں جانا۔ نا معلوم کیا الم غلم کھا آتے ہو۔"

سچ، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ سمبندھیوں کے گھر میں کھائے پیے، ان کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ شراب پیے اور بعد میں طعنے سننے پڑیں۔ ان کی بہو سنتوش کی زبان گز بھر کی ہے اور ویسے بھی اس کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ نا معلوم کیسے چوبارے میں لیے بیٹھی رہتی ہے۔ میں رسوئی کا کام ختم کر کے آئی، تو وہ ساری ختم کر چکا تھا۔ اس نے پوچھا "بھابی جی! بھائی صاحب کتنے بجے آئیں گے؟" شاید صبح کو آئیں، راستے میں انھیں انبالہ بھی جانا ہے، موسی جی کے پاس۔" "اور بھی ہے؟" اس نے نظر گلاس کی طرف کر کے تامل سے پوچھا۔

دل میں آیا، جواب دے دوں، زیادہ نقصان

کرے گی پھر خیال آیا اب دو اڑھائی مہینوں میں کیا ہونے ہولنے کا ہے!

"یہ انگریزی نہیں،" میں نے ہنستے ہوئے کہا ــــ وہ ناراض سا ہوا تو مجھے اس پر پیار آگیا۔ مرنے والے کے سامنے جھوٹ بولنا اسے دھوکا دینا مجھے گناہ معلوم ہوا۔ اس کی پیشانی پر اور بھوؤں کے درمیان لوئیں والے حصے پر بھی بل آگئے تھے۔

میں نے اٹھ کر الماری کھول لی۔ وہ میرے پاس آکھڑا ہوا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے اسے وہ بھی دے دی جو کوارٹر میں سے نکال کے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بوتل تھام کر میرے کندھے کو چوم لیا اور رسماً شکریہ ادا کیا۔ شاید کچھ اور بھی کہا تھا، مگر وہ مجھے سنائی نہیں دیا۔ میرے جسم میں سے ایک لہر سی تھرکتی ہوئی دوڑ گئی تھی۔

میں سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے دوسرا گلاس پاس رکھ کے اس میں بھی ڈال دی۔ پتہ نہیں اسے میرے دل کی بات کا پتہ کیسے لگ گیا۔ آدمی جوں جوں موت کے قریب پہنچتا ہے' اس کی چھٹی حس تیز ہو جاتی ہے، شاید۔

میرے انکار کرنے کے باوجود اس نے مجھے بازوؤں میں کس کر دوا جیسی وہ کڑوی شے پلا دی۔ زندگی میں دو بار پہلے بھی میں نے یہ پی تھی۔ ایک بار جب میں کنواری تھی ــــ ایک سہیلی کے گھر پر، تب تو کچھ پتہ نہیں تھا ــــ اور پھر دوسری مرتبہ آنند صاحب کے ساتھ کافی پی لی تھی ــــ خاصی چڑھ گئی تھی۔ بڑے تلخ شیریں تجربے ہوئے تھے۔ لیکن صبح کو اٹھنے پر میری طبیعت اتنی خراب رہی کہ پھر منہ سے لگانے سے ڈرتی رہی۔ اس روز پیارے ستی کا کہنا کیسے ٹالتی۔ ایسا معلوم ہوا تھا میں اس کی کسی بھی بات سے انکار کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ کہہ کر تو دیکھتا۔

میں کھانا پروس کر لائی تو اس کا ہاتھ لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے غلطی کر رہا تھا۔ دراصل لقمہ توڑتے ہوئے سبزی لیتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے کھانا کھانا بند کر دیا۔ چونکانے والی آواز میں "بھابی جی" کہہ کر میز پر بازوؤں کے اوپر سر رکھ کر بہہ گیا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا، "اٹھو، چلو لیٹ جاؤ"

اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا تھا۔ میرا دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہندو دھرم اس آتما کے بارے میں کیا کہتا ہے جو عورت پریم کے لیے بھٹکتی ہوئی جسم چھوڑ جائے۔

میں سہارا دے کر اٹھا کر اس کے بستر تک لے گئی۔ مجھے لگا، میرے پاؤں بھی ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے ــــ

رضائی اوپر ڈال کر میں پرے ہونے لگی، تو اس نے میری ساڑی پکڑ لی۔ کہنے لگا، "بھابی جی، مجھے ایک بار نرمل سے ملا دو۔"

میرے اندر سے ایک ہوک اٹھی ــــ "میں کہاں سے لاؤں، میری جان تیری نرمل۔ وہ تو ایک بار تجھے دیکھنے بھی نہیں آئی۔"

بے بس دل پر بوجھ لے کر میں اس کی چارپائی پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کو چوما اور پیار سے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں کر لیا۔ اس نے بے بسی میں بازو لہرائے اور مجھے بازوؤں کی سخت پکڑ میں لے لیا، جس طرح ڈرا ہوا بچہ اپنی ماں سے چپک جاتا ہے۔

میں ایک بار تو ساکت ہو گئی اور پھر نہ اسے سُدھ بُدھ رہی اور نہ مجھے کہ ہم کون تھے۔ میں اس کی بھابی تھی، بہن تھی، ماں تھی یا پتنی۔

ــــ میرے روبرو اس کا دمکتا ہوا ماتھا' گھنی بھوؤں اور باریک لبوں والا چہرہ تھا' یا چہرہ بھی نہیں، صرف جسم تھا ــــ آگ میں تپے لال لوہے جیسا ــــ یا صرف آتما تھی ــــ بے ریا بے ہوس اور پتہ نہیں کیا کیا، جس کا کوئی بھیس نہ تھا۔ کوئی پردہ نہیں تھا۔ روحانی برہنگی تھی، کپڑے تو جسم پر تھے ــــ... بس ہون ہو رہا تھا۔ آہوتی ڈالی جا رہی تھی ــــ ہر آہوتی پر اگنی پرچنڈ ہوتی تھی۔ سواہا کی آواز اٹھ رہی تھی۔

شانتی پاٹھ ہو چکا۔ وہ تھکا ٹوٹا سا سونے لگا۔ میں اس کے ساتھ لیٹی ہوئی اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ مجھے تب یاد آیا' اس کے نقوش اس لڑکے سے ملتے جلتے تھے جسے میں ایک جھلک دیکھنے کے لیے کتنی کتنی دیر تک کوٹھے پر کھڑی رہتی تھی۔ میں نے اٹھ کر بھوؤں کے درمیان اس کی پیشانی چومی اور اس پر رضائی ڈال کر اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ سوچتی رہی، ہم نے کیا کیا! کیا ہم دھرم کی نظر میں گمراہ ہو گئے ہیں؟ نرک کے سزاوار ہو گئے ہیں؟ مجھے لگا، میں نے دھرم گرنتھوں میں جو پڑھا تھا' وہ جھوٹ ہے۔ سچ وہ ہے جو حالات ہمیں ودیعت کرتے ہیں' جن میں برہم ہتیا بھی پاپ نہیں ہو سکتی۔

اگلے روز اتوار تھا۔ آنند صاحب سات بجے ہی آگئے۔ شاید وہ ہر اتوار کو ہون کرنے کا عمل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ان کا کوئی وہم وابستہ ہوگا۔ میں نے ستی کو جگایا کہ غسل کر لے۔

ہون کنڈ کے گرد آنند صاحب میرے دائیں ہاتھ بیٹھے تھے اور ستی بائیں ہاتھ۔ سامنے پتا جی بیٹھے تھے ــــ پلنگ کا سہارا لے کر۔ ہون کنڈ کے گرد چاروں اطراف میں پانی ڈال کر جسم کے سارے اعضا کے لیے طاقت کی پرارتھنا کر کے میں نے پانی کے چھینٹے اپنے اوپر پھینکنے کے ساتھ ستی کے اوپر بھی پھینک دیے۔ تب مجھے لگا ــــ ہم کتنی امیدیں لگاتے ہیں اعضا کے طاقتور ہونے کی، سو برس جینے کی۔ ستی کے اب تیس دن بھی باقی نہیں رہے۔

دوسرے کمرے میں جا کر میں نے آنند صاحب سے پوچھا، "کوروکشیتر والے وید نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہنا تھا؟" کہنے لگا' "بیماری پرانی ہو چکی ہے۔ دوا لے جانا چاہو تو لے جاؤ' نہیں تو نہ سہی ــــ میں پندرہ دن کی لے آیا ہوں۔"

برآمدے میں ہون کنڈ میں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ پتا جی پلنگ کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہ کبھی ستی کی جانب جاتی، کبھی اگنی کی طرف اور آسمان کی

جانب —— میں نے مشکل سے سانس لی تو آنند صاحب نے پوچھا، "کیوں نا پی جی آئی چنڈی گڑھ لے چلیں۔ ایک نیا علاج ہونے لگا ہے وہاں۔ ران کو کھر ونچ کر دوا پینٹ کر دیتے ہیں۔ ایک ہفتہ اس کا اثر دیکھتے ہیں، ساتھ ہی بجلی بھی لگاتے ہیں۔ کتنے روپے بچے ہیں؟

"بہت ہیں۔ جیسے آپ کی مرضی، کہہ کر میں رسوئی میں چلی گئی۔ سوچتی رہی —— پتہ نہیں اسے کہاں کہاں کی دوا کھا کر کہاں کس بستر پر مرنا ہے! چنڈی گڑھ میں کیا ہونا ہے! خیر، کیا مضائقہ ہے؟"

شام کو ستی گھوم پھر کر آیا تو وہ بیکل سا تھا۔ وہ مجھے اشارے سے بلا کر چوبارے میں لے گیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں بنانے لگا۔ میں سمجھ گئی، اس کی طبیعت پینے کی تھی، مگر اپنے بھائی صاحب کا ڈر تھا۔ میں اسے وہیں سب کچھ دے آئی۔

آنند صاحب ساگو دانہ لینے مارکیٹ تک گئے تو ستی فی الفور نیچے اتر آیا۔ رسوئی گھر میں میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں پیشانی دمک رہی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا "پلیز کس می۔"

میں نے اس کی پیشانی کے بال ہٹائے اور بازوؤں میں لے کر اسے چوم لیا اور کچھ دیر اسے اسی طرح چھاتی سے لگائے کھڑی رہی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہاں سے پاپ شروع ہوتا ہے جب انسان اپنی غرض کے لیے کچھ کرتا ہے۔ میں ایک دم پیچھے ہٹ گئی، مگر وہ مجھ سے الگ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا، آنند صاحب کا خوف دلایا اور لارا لیری کی تو وہ برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اسی وجہ سے میں نے صفائی اور برتن صاف کرنے والی لڑکی کو جواب دے دیا تھا اسی ڈر سے اسے تائی جی کی بہو کے پاس نہیں جانے دیتی۔

کھانا کھانے کے بعد آنند صاحب سیر کرنے گئے تو ستی پھر بچوں کی طرح ہٹ کرنے لگا میرے منع کرنے کے باوجود اس نے بیڈروم کی بتی بجھا دی۔

وہ مطمئن ہو کر اونگھنے لگا تو مجھے محسوس ہوا —— میرا مرنے والا بچہ میرے ساتھ پڑا ہے۔ میں دودھ سے بھری چھاتی اس کے منہ میں دیتی ہوں مگر اس میں دودھ پینے کی طاقت نہیں —— مجھے ہوش آیا تو میں ستی کو اسی طرح لیے بیٹھی تھی جس طرح ماں اپنے ساتھ لیٹے بچے کو دودھ پلاتی سو چلی ہو اور پھر بچہ بھی۔

اٹھ کر جلدی سے میں باتھ روم میں گئی۔ برش کیا، غرارہ کیا۔ میرے اندر ڈر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں اپنے لبوں کو بچانے کے لیے میں ان پر کپڑا رکھتی تھی، مگر کچھ اس کے اصرار کرنے پر اور کچھ اپنی بے بسی میں بھول ہی گئی کہ وہ کینسر کا مریض تھا۔

دوپہر میں عجلت میں ڈاکٹر پوری کے پاس گئی۔ انہیں نئی نوکرانی سے ستی کی بات جوڑ کر بتائی تو انھوں نے کہا —— بات یہ کوئی نہیں۔ نو انفیکشن —— مگر میرا وہم پوری طرح دور نہ ہوا۔

چنڈی گڑھ میں ہمارے بہت سے رشتہ دار ہیں، مگر ہم کسی کے یہاں نہیں گئے۔ مریض کو لے کر جانا کیا اچھا لگتا۔ اسپتال کے قریب پندرہ سیکٹر میں کمرہ رسوئی لے کر رہنے لگے۔ اسپتال سے فارغ ہو کر ہم دیور بھابی پکاتے کھاتے، تاش کھیلتے، شام کو سیر کے لیے نکل جاتے یا شاپنگ سنٹروں کو۔ لوگوں کی بھیڑ میں ستی کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ جو کچھ پسند کرتا، میں خرید لیتی، کئی کاسمیٹکس وہ میرے لیے بھی پسند کرتا، میں خرید لیتی۔ ایک دن اسے ایک اسکارف بھا گیا۔ اتنے گہرے رنگ، لال، نیلے، پیلے رنگوں والا اسکارف مجھے کیا اچھا لگتا تھا مگر ستی کی خواہش تھی یا ضد کہ مجھے دکان سے باندھ کر اس کے ساتھ چل کر گھر تک جانا پڑا —— باندھ کر ہی بستر پر لیٹنا پڑا۔

سردی نہیں رہی تھی مگر پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ رات کو دروازے کھڑکیاں بند رہیں۔ عورت کو دیکھنے کی اس کی بھوک مٹتی نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے دیکھتا دیکھتا، سوچتا سوچتا میری چھاتیوں میں منہ چھپا کر رونے لگتا۔

اسپتال میں کوئی مجھ سے پوچھتا —— کیوں بی بی، یہ تمھارا بھائی ہے —— میں ہاں کہہ دیتی۔ اگر کوئی پوچھتی —— تمھارا بیٹا ہے —— تب بھی ہاں ہی کہتی —— کیا بتاتی —— چنڈی گڑھ میں وہ میرا پتی بن کر رہ رہا تھا —— میرے جسم کا

اب عورت اس کے لیے کوئی راز نہیں، معمول بن گئی تھی۔ اس کا اپنا جسم دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا، بجلی کے علاج کے باعث یا اس کی نفسیاتی حالت کے سبب، کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا اس کی ہٹ اور رمانگ بھی گھٹنے لگی تھی اور کھانے پینے سے بھی جی اچاٹ ہونے لگا تھا۔ وہ کبھی شراب پیتا، کبھی سمادھی لگاتا اور کبھی گیتوں کے اشلوک بلند آواز میں پڑھتا رہتا۔ میں سوچتی، اس کا بار بار یہ اشلوک پڑھنا —— نئی نم چھندیا نتی شسترانی —— کسی کو سہارا کس طرح دے سکتا ہے۔ بندہ روتا تو شریر کو ہے۔ آتما کے امر ہونے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔

پی جی آئی کا کورس کر کے ہم گھر آئے تو اسے دلیا کھانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی حالت یکدم بگڑ جاتی۔ سانس لینی مشکل ہو جاتی۔ وہ صبح سے شام تک برآمدے میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا گیٹ کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی اچانک ڈر جاتا۔ اس کا بازو ٹانگ یا پھر سارا جسم کانپ جاتا، جیسے بچے خواب میں ڈر جاتے ہیں۔ کبھی اس کے ہاتھ اور ہونٹ کانپنے لگتے۔ میں اسے چائے کافی پلاتی، اس کے پاس بیٹھتی —— اس کے ہاتھ دباتی رہتی۔ وہ شانت ہو جاتا مگر اس کا گیٹ کی طرف دیکھنے کا عمل نہ ختم ہوتا۔

ایک دن پتا جی نے پوچھ لیا، "ستی کا کیا حال ہے؟ پی جی آئی کا ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟"

میں سمجھ گئی۔ میری عدم موجودگی میں تائی آئی ہو گی، سب کچھ بتا گئی ہو گی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی تو پتا جی برہم ہو گئے۔ ان کے ہونٹ تھرکنے لگے، یہ علامت ہے سارے آنند خاندان کے برہم یا دکھی ہونے کی۔ میں ڈر گئی۔ بتا دیا کہ ستی نے اب زیادہ

دن نہیں رہنا۔" یہ کہہ کر میں برتن اٹھا کر جلدی جلدی رسوئی گھر میں چلی گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ پتاجی میرے آنسو دیکھیں یا مجھے ان کے آنسو دیکھنے پڑیں۔ ان کی اتنی بات پھسکتی پیچھے آئی تھی — "گاؤں والی زمین بیچ دو۔"

شام کی چائے کے وقت پتاجی نے ستی کو بلایا۔ وہ سامنے کرسی پر آبیٹھا۔ پتاجی دیکھتے رہے۔ پھر کچھ بھیسا کر ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ستی کو اشارے سے اٹھ جانے کو کہا۔

ایک دن برآمدے میں ستی کو سگریٹ پیتا ہوا چھوڑ کر رسوئی میں گئی تو چیخ سنائی دی۔ میں دوڑ کر آئی۔ وہ آرام کرسی سے گر پڑا تھا۔ سگریٹ فرش پر پڑا سلگ رہا تھا۔ ذرا سے سہارے سے وہ اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا — "بھابی جی، میری سانس رکنے لگی تھی۔"

میں دیسی گھی اس کے گلے پر ملتی رہی۔

آخر ڈیڈ لائن بھی آگئی۔ وہ آخری رات تھی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ آنند صاحب گائیتری کا پاٹھ کر رہے تھے۔ لیکن ستی سویا ہوا تھا۔ میں اس بیچ میں اسے دو بار دیکھ آئی تھی۔

اچانک اس کے مشکل سے سانس لینے کی آواز رک گئی۔ میں چند لمحے سانس روکے پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی۔ آہستہ سے کھیس اٹھا کر دیکھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی، مگر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ جھکی ہوئی میں اس چہرے کو نہارتی رہی جو کبھی لال گلاب تھا۔

اپنے کمرے میں آکر میں نے ٹائم دیکھا۔ پونے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے آنند صاحب کو نیند آور گولی دی تو انھوں نے انکار کر دیا۔

وہ رات گزر گئی — ڈاکٹر پوری کی ڈیڈ لائن۔

صبح اٹھ کر آنند صاحب نے پھر ہون کیا۔ پتاجی کے حکم کے مطابق بہت سا اناج اور کپڑے ستی کے ہاتھ سے دان کرائے گئے۔

لگ بھگ تیسرے پہر ستی آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا گر پڑا۔ آنند صاحب گھر پر ہی تھے۔ ہم جلدی جلدی اٹھا کر ڈاکٹر پوری کی کلینک لے گئے۔ انھوں نے پتہ نہیں کس طرح کیا کیا، سانس ٹھیک ہو گئی — پھر دس دنوں میں پورا صحت مند ہو کے اس نے ڈاکٹر پوری کو بھی حیران کر دیا۔

وہ صحت یاب ہو کر گھوڑے سا چاک و چوبند ہو گیا۔ سب کچھ کھاتا پیتا اور آوارہ گردی کرتا۔ پھر وہ وہی سارے کام کرنے لگا جو مجھے اچھے نہیں لگتے تھے، جن کی وجہ سے مجھے اس سے اور اپنے آپ سے شرم آتی۔ وہ اکثر سنتوش کے پاس چوبارے میں بیٹھا رہتا۔ تائی جی کے بدمعاش لڑکوں کے ساتھ پیتا اور فحش حرکتیں کرتا۔ زبردستی میرے پرس میں سے پیسے نکال کر لے جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کبھی میں اس سے پیار کرتی تو وہ اس کی نگاہ میں پیار ہی نہ ہوتا، لگتا جیسے کوئی بدمعاش دیکھ رہا ہو۔ جیسے مجھے پکڑنا اس کا حق ہے۔ گویا کسی سے کوئی چیز مانگ کر یا ادھار لے لینا اس کا حق بن گیا تھا۔ وہ دوسروں کے سہارے پلنے والا بدمعاش بن گیا تھا — جس کی بدمعاشی کا سبب اس کی طاقت نہیں — کینسر تھا۔ کینسر اسے مار رہا تھا اور وہ کینسر سے ہمیں مار رہا تھا۔

لگ بھگ ڈیڑھ مہینے بعد اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ تھوک میں خون سا کچھ آتا تو وہ ڈر جاتا، آنند صاحب گھبرا جاتے، میں پھر دوائیوں پر زور ڈال دیتی۔

ایک شام آنند صاحب سوچتے سوچتے بولے "پتہ نہیں اور کتنی دیر یہ — نرک — ؟"

"پرماتما کا نام لیجئے، سب مصیبت کٹ جائے گی۔" ان کی بات کا جواب میں نے دے تو دیا مگر میں یہ بات سمجھ نہ پائی، وہ کس کے نرک کا ذکر کر رہے تھے۔ — ستی، پتاجی یا اپنے نرک کا — جی میں آیا کہ کہہ ڈالوں کہ بھئی جو کچھ تم بھگت رہے ہو، اگر وہ نرک ہے، تو وہ کیا ہے جو میں بھگت رہی ہوں۔

ستی دن میں نہ جانے کہاں پھرتا لیکن اندھیرا ہوتے ہی گھر آجاتا۔ وہ خوف زدہ سا ہوتا۔ دن میں تو بیٹھتا ہی برآمدے میں گیٹ کی طرف منہ کر کے تھا۔

کئی بار اس کے چہرے پر وہ طمانیت ہوتی جو بھگتوں کے چہرے پر کبھی شاذ ہی ملتی ہو، مگر کبھی کبھی اتنی بے قراری ہوتی کہ لگتا وہ عجلت میں ہے، وہ کسی کا منتظر ہے، جس طرح کوئی پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہو یا جیسے گاڑی نکل گئی ہو اور پلیٹ فارم سونا ہو گیا ہو۔

ایک دن آلتی پالتی مارے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ میں سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کر کے ہاتھ جوڑے اور سر جھکا دیا۔

مرنے سے ایک رات پہلے نہ جانے اسے کیسے پتہ چل گیا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں بیچ والے دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس کے کہنے پر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ پھر اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں آنسو آگئے — ایک دم میں نے اس کا چہرہ اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "کیا بات ہے میرے بچے" — میرے منہ سے از خود نکل گیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں، گویا دھیان میں کھو گیا ہو۔

اگلے دن اس نے بیڈ ٹی نہیں پی۔ نہا کر یکسوئی سے پاٹھ کرنے لگا۔ ابھی پہلے منتر ہی پڑھے ہوں گے کہ اس کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں رسوئی میں سے دوڑ کر آئی، اسے اٹھایا تو میری چیخ نکل گئی۔ آنند صاحب کانپتے ہوئے بھاگ کر آئے — مگر وہ کچھ ہو چکا تھا جس کا انتظار ستی کو تھا، آنند صاحب کو اور مجھے بھی۔

آج اس ہونی کو ہوئے سال بیت گیا مگر آج بھی مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا کہ وہ میرا کیا تھا؟

●●

(ترجمہ: نریندر تشیل)

رگھبیر ڈھنڈ

شانِ پنجاب

پھر شانِ پنجاب امرتسر اسٹیشن سے چل دی۔ دوسرے لوگوں کی مانند میں بھی ایک مسافر تھا۔ وہ تاحدِ نظر ہاتھ ہلاتا رہا اور میں بھی۔ پھر ہاتھ ہلنے بند ہو گئے۔ لیکن وہ چھت کے نیچے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اور شانِ پنجاب کھلے آسمان تلے بھاگی جا رہی تھی۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں روشنی ہی روشنی تھی۔

میں نے شیشہ نیچے گرا کے نوٹوں کی دستی بیگ میں ڈال لی۔

باہر گھٹنے گھٹنے جتنی گندم کی فصل اُگی تو خوب تھی، لیکن سورج بادلوں میں گھر گیا تھا۔ اس لیے گندم کے پودے اداس اُداس سے دکھائی دے رہے تھے۔ گویا کوئی ایسے گھر میں رہائش رکھے ہوئے ہو، جو اُس کا اپنا نہ ہو۔

دل چاہا کہ بادلوں میں گھرے سورج کی مدھم روشنی میں اداس گندم کی جانب دیکھتا جاؤں اور کوئی نظم کہنے جیسی چیز کے بارے میں سوچوں۔ لیکن وہ میرے دماغ سے نکل نہیں رہا تھا۔ وہ جو ابھی مجھے الوداع کہنے کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ جو ایسی جگہ کھڑا تھا، جہاں روشنی ہی روشنی تھی۔ چاہے پلیٹ فارم پر چھت کا سائبان ہی تھا۔

کل شام میں اُس کے پاس آیا تھا اور رات ٹھہرا تھا۔ حسبِ خواہش نہیں، مجبوری میں۔ ہم ولایتی انڈین ہیں۔ مرضی سے تو وہیں رات رہتے ہیں جہاں ولایتی شراب اور ہندوستانی مرغ ہو اور گدگدا نرم بستر ہو۔ جس پر تکیہ لگا کر ہم ولایت کی نعمتوں اور آسائشوں کے قصے خوب نمک مرچ لگا کر سنا سکیں ——

امرتسر میں کوئی ایسا ٹھکانا نہ ہونے کے سبب مجھے اُس کے پاس ہی جانا اور ٹھہرنا پڑا تھا۔ جیسے جیسے گلی محلوں سے رکشا گزر رہی تھی اور رکشا والا "بس پہنچے ہی سمجھیے" کہہ رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ شراب، مرغ اور نرم بیڈ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اگرچہ وہ میرے سگے چچا کا لڑکا تھا، لیکن وہ میرے لیے ایک اجنبی ہی تھا کیوں کہ بیس برس پہلے جب میں انگلینڈ آیا تھا تو وہ نو برس کا تھا۔ اس دوران میں جب میں ہندوستان آیا تو وہ قید تھا۔ زمین خریدنے کے چکر میں اُسے ملنے کا وقت نہیں نکال سکا۔ ملاقات ہوتی بھی کیسے۔ کیوں کہ نہ تو اُس سے مجھے کوئی کام ہی تھا اور نہ ہی کوئی دلی محبت۔ بس بابو جی یونہی سرسری لکھ دیتے تھے . . . تمہارے چچا سے بول چال قریب ختم ہی سمجھو۔ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ لوگوں سے کہتا رہتا ہے اپنا لڑکا تو ولایت بھیج دیا، میری باری تو بالکل سو ہی گیا۔ مجھ سے ہل چلواتا رہا اور خود بڑا سردار بہادر بن کے سامنے

نام : رگھبیر ڈھنڈ ولادت : یکم نومبر ۱۹۳۴ء

تصانیف : پیلی دھرتی، اس پار، کایا کلپ، کرسی (افسانوی مجموعے) کالی ندی دا ایک (ناول) لودا لہو، ہمینگوے دا بڈھا تے سمندر (تنقید) (احمد ندیم قاسمی اور کملیشور کی منتخب کہانیوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں)

انعام اعزاز : محکمۂ السنہ پنجاب کا انعام (۱۹۷۵ء)
سورن سنگھ جوش ٹرسٹ (یو کے) ایوارڈ (۱۹۸۵ء)
انٹرنیشنل پنجابی لٹریری ٹرسٹ (کینیڈا)
کامن جیت میموریل ایوارڈ (۱۹۸۷ء)
متعدد اداروں نے انعامات و اعزازات سے نوازا

پتہ : ۲۲ - بنٹن روڈ، آل ووڈلے، لیڈز
ویسٹ شارک سائر ایل ایس ۱۷
۸ کیو کیو (یو۔ کے)

چھڑکاؤ کرا آرام کرسی پر لیٹ کر روپ لبنت کا قصہ پڑھتا رہا اور جب انگلستان سے پیسے آنے لگے تو تھوڑے پیسے دے کر مجھے الگ کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
لڑکوں کا ذکر کرتے ہوئے باؤجی کا ایک خاص انداز ہوتا تھا، جس میں کچھ رحم بھری بالائی ہمدردی اور کچھ اپنے بڑے پن کا گمان اور مزا شامل ہوتا تھا۔ لکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تمہارے چچا کے لڑکے تو سب نالائق ہی نکلے۔ بڑا بھجن تو دسویں سے آگے نہیں نکل سکا۔ گاؤں میں کھیتی کرتا ہے۔ چھوٹے کی ویسے ہی عادات ٹھیک نہیں۔ نکسلیوں کے ساتھ دھکے کھاتا رہا۔ پھر سزا پا گیا۔ اب تو خیر دہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ایک قیدی ستاری کے ساتھ شادی کر کے سوڈھی خاندان کو ہی داغ لگا دیا۔ ماں کے خصم نے ۔ ۔ ۔ ۔
باؤجی پنچایت میں اُٹھنے بیٹھنے والے انسان تھے۔ وہ ایک تیر سے دو نشانے کرنا چاہتے تھے ــ اسی لیے انہوں نے آخری جملہ بہت بنا سنوار کے خوش خط لکھا تھا تاکہ مجھے بھی تنبیہہ ہو جائے کہ تمہارے چچا کے لڑکے نے تو جو کچھ کرنا تھا کر دکھایا ہے۔ تم شادی بیاہ کے معاملے میں اپنے اونچے خاندان کا خیال رکھنا۔ کیونکہ تب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔
"بس باؤجی۔ اس سے آگے رکشا نہیں جاتا!" ایک تنگ گلی اور چوڑی نالی کے قریب رکشا روک کر رکشا والے نے کہا۔
پیسے دے کر میں گلی میں آگیا۔ تنگ اور اینٹوں والی گلی۔ نالی میں اتنی گندگی کہ کیچڑ اور گندگی نکل کر باہر آرہی تھی۔
"بہن جی! میں تے جسونت سنگھ سوڈھی کے گھر جانا ہے۔" میں نے ایک راہ گیر ادھیڑ عمر عورت سے پوچھا۔
" اوہ تھڑے پر ماسٹر جی کی لڑکی ہی کھیل رہی ہے۔"
میں تھڑے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہی کوئی سات برس کی بچی فرش پر چاک سے لکھتے لکھتے رُک گئی۔ میونسپل کمیٹی کے کھمبے کی روشنی حسب دستور بجھی ہوئی تھی۔ تھڑے کے ساتھ والے کمرے کے شیشوں میں سے روشنی اس بچی اور اُس کے کھینچے الفاظ پر پڑ رہی تھی، جس سے چاک کے لکھے الفاظ اور بھی چمک رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بچی کھڑی ہو گئی اور مجھے بہت غور سے دیکھنے لگی۔ میرے کچھ پوچھنے یا کہنے سے پہلے ہی بول اُٹھی۔
" انکل کیا آپ نے میرے پاپا سے ملنا ہے؟"
"کیا نام ہے تمہارے پاپا کا؟"
" مسٹر جسونت سنگھ سوڈھی۔ پاپا دا گریٹ۔ ممی کا بھی بتاؤں؟"
" بتا دے!"
" مسز سیما سوڈھی۔ اپنا بھی بتاؤں؟"
" ضرور۔"
" مس رمونا سوڈھی۔ پاپا کی سکہ بند وڈ!"
میں دم بخود رہ گیا۔ حیرانی کے سبب مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ ایسے ماحول میں ایسے ذہین اور اچھے طور طریقوں والے بچے بھی پیدا ہو کر پرورش پا سکتے ہیں۔ کیچڑ میں کنول! میں نے سوچا۔
میں نے تھڑے پر جا کر اس کے کندھوں تک تراشیدہ بالوں پر ہاتھ پھیرا اس کی پیشانی کو چوما اور چومتے ہوئے دیکھا کہ اُس کا چہرہ کافی زرد تھا۔ جب میں کھڑا ہوا تو دیکھا کہ میرے سامنے اٹھائیس اُنتیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے بہ نظرِ غور دیکھا۔
"جسونت"، میں نے کہا۔
اُس نے ایک دم میرے گھٹنوں کو چھو کر مجھے گلے سے لگا لیا پھر میرا بیگ پکڑتے ہوئے بولا "بھئی آپ مجھے خط لکھ دیتے۔ میں اسٹیشن پر آجاتا۔ آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔"
بچی کے ساتھ ہم اندر چلے گئے۔
چھتی ہوئی ڈیوڑھی سے آگے ایک لمبا چوڑا دالان تھا جس کے ایک جانب بہت سے کمرے تھے جیسے ریلوے کے چوتھے درجے کے کوارٹر ہوں۔ جن میں کئی ایک کنبے رہتے تھے۔ چھوٹی سی رسوئی کے سامنے سے گزرتے ہوئے جسونت نے آواز دی "سیما دیکھ کون آئے ہیں؟"
ہم اندر چلے گئے۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے یا یوں کہیے کہ کمرہ تو ایک ہی تھا جسے مالک مکان نے دو کمروں کا سیٹ بنانے کے لیے دو کمروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میں نے اوور کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔
اتنے میں سیما آئی اور ہاتھ جوڑ کر مسکرائی ــ وہی سیما جس نے سوڈھی خاندان کو کلنک لگا کر جسونت کو بے دیونے کر دیا تھا۔ کیسی تاریخ ہمیشہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی پھر بھی وہ مسکرا رہی تھی۔
"سیما یہ انگلینڈ والے بھائی ہیں۔"
اس کے قدم میری جانب اُٹھے اور وہ میرے پاؤں چھونے کے لیے بڑھی۔ میں نے اُسے روک دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جیتی رہو بھئی۔ لڑکیاں تو دیویاں ہوتی ہیں اور تم تو سچ مچ دیوی ہو۔"
"کیوں شرمندہ کرتے ہیں بھا پاجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
اُس نے آنکھیں جھکا لیں۔ اس سے اس کے ہلکے رنگ کی شال کا پلڑا کھُل گیا اور اُس کی لمبی موٹی چوٹی اس کی گردن سے نیچے ڈھلک گئی۔
"نہیں سیما، تم نے یہ چھوٹا سا گھر اتنے قرینے سے سجا رکھا ہے۔ اتنی پیاری اور من موہنی باتیں کرنے والی تمہاری بچی ہے۔ یہ سب تمہاری خوبیوں کا ہی تو ثبوت ہے۔"
"بہت باتیں کرتی ہے۔ بنا رُکے بولے چلی جاتی ہے۔ اگر میں اُنہیں نہ بھیجتی تو نہ جانے آپ کو وہاں کتنی دیر روکے رکھتی۔"
رمونا جسونت کی گود میں چلی گئی۔ جسونت دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سیما میرے سامنے بیٹھی میرے کنبے کے افراد کا حال پوچھنے لگی۔ وہ اپنی عمر سے قریب پانچ برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ کافی خوب صورت بھی تھی۔ کبھی بہت خوب صورت ہو گی۔ لیکن زمانے کے گرم سرد نے چہرہ سنجیدہ کر دیا تھا۔

اُس میں ایک خود اعتمادی تھی جو اپنی لڑائیاں خود لڑنے سے ہی حاصل ہوسکتی ہے ۔ البتہ مجھے اس کی عینک اس کے چہرے کی نسبت بہت بری دکھائی دیتی تھی جس کے گھٹیا فریم نے اُس کی ناک پر نشان ڈال دیا تھا۔ میں کل ہی سیما کو نیا فریم خرید کر دوں گا خواہ کتنے ہی دام کیوں نہ لگ جائیں۔ لڑکیوں کو جتنا بھی دیا جائے کم ہوتا ہے۔ دادا جی کہا کرتے تھے ۔ اس سے گھر کی شان بڑھتی ہے۔

سیما کھانے کی تیاری کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔

جسونت چمچ سے بچی کو کوئی دوائی پلا رہا تھا۔

میں نے پوچھا "یہ کس روگ کی دوا ہے؟"

"سانس اور کھانسی کی" جسونت نے جواب دیا۔

کھانسی تو چلو ہوئی ۔ مگر سانس کی بات سے میں فکر مند ہو گیا۔ کچھ لمحے انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ کھل کر بات کرے گا، لیکن وہ خاموش رہا۔ مجھے یہ گھر اپنا محسوس ہونے لگا گویا میں کئی برسوں سے ان کے پاس رہتا آیا ہوں اور میں اُن سے ہر بات بے جھجک پوچھ سکتا ہوں۔ میں نے پھر پوچھا تو جسونت نے بتایا کہ پیدائش کے وقت زہرا بہت تندرست اور صحت مند بچی تھی۔ سردیوں میں اسے نمونیا ہو گیا۔ میں اور سیما دونوں بے روزگار تھے ۔ اچھے ڈاکٹروں سے مشورہ نہ کر سکے ۔ بچی زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی رہنے کے بعد ٹھیک تو ہو گئی، لیکن دمہ ہو گیا۔ بات کہتے کہتے اُس کے چہرے پر اداسی چھا گئی ۔ اُس نے بچی کو اپنے ساتھ چپکا لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"چاچا جی کے پاس چلے جاتے گاؤں" میں نے اُسے گویا ملامت کی۔

گیا تو تھا لیکن باپو بہت غصے میں تھا۔ وہ کمینے، کمینہ، حرامی کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔۔۔ تو نے کیسے ایک سنار کی لڑکی سے شادی کر کے سوڈھی خاندان کو شرمسار کر دیا ہے۔ میری نظروں سے دور ہو جا نہیں تو بھاوڑے سے تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ میں تو کب سے تجھے فارغ خطی دے چکا ہوں۔۔۔۔ اب یہاں کیا لینے آیا ہے ۔۔۔ ؟ اس کے بعد میری بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

"لیکن جسونت، تمہیں چچا کو کچھ سمجھانا تو تھا تحمل سے۔"

وہ ہنسا ۔ میرے خیال میں وہ میری سمجھ پر ہی ہنسا تھا۔ میں جو انگلستان سے آ کر سادھوؤں کی زبان میں بات کر رہا تھا۔

بھائی صاحب ۔ کبھی باپ بیٹوں سے بھی بات سمجھے ہیں ۔ خاص طور پر ان پڑھ اور وہ باپ جن کے دماغ میں سوڈھی سرداروں اور اونچے خاندان کی بات سمائی ہوئی ہو۔ ویسے میں نے پتاجی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے دسویں گورو کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ ہم دسویں گورو کے خاندان سے ہیں جنہوں نے ذات پات کا بھید مٹانے کا سبق سکھایا تھا۔ لیکن باپو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔ پھر مجھے بتا دے اگر دسویں گورو کی کوئی شادی کسی اور ذات میں ہوئی ہو۔

"تو میرے پتا کے پاس چلے جاتے۔ تاؤ جی تو بڑا باپ ہی ہوتا ہے۔"

"تاؤ جی کو میں صرف پرنام کرنے گیا تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ بیتی باتوں سے کیا وقت ضائع کرنا ہے۔ آپ بتاؤ بھائی جی کیسے ہیں۔ میرے بھتیجے بھتیجیاں کتنی بڑی ہو گئی ہیں۔۔۔۔ انہیں کیوں نہیں لائے؟"

میں نے اُس کی جانب بہت پیار سے دیکھا۔ اس کی موٹی اور سنجیدہ آنکھیں ویسی کی ویسی زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ میرے باپ کو پرنام کرنے کے لیے جانے والی بات نے مجھے اُس کے سامنے بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ کاش! مجھے پتہ لگ جاتا۔۔۔ کاش! کیا انداز تھا اُس کے بات کہنے کا۔ اور بات سبھی اس کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہی تھی۔ نہ کوئی تمہید نہ بناوٹ نہ توڑ مروڑ۔۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا بالکل فضول معلوم ہوا۔ صرف اتنا ہی کہا۔ تمہاری بھابی اور بچے بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔ تمہاری بھابی ڈائٹنگ کر رہی ہے کہ کہیں موٹی نہ ہو جائے۔

جسونت نے رسوئی کی جانب دیکھا اور بولا۔

"بازار سے کچھ لانا تو نہیں سیما؟"

رسوئی میں سے آواز آئی "نہیں جی ۔۔۔ آپ بھائی صاحب کا من لگائے رہو۔"

"کیا اس واقعے کے بعد بھی گاؤں گئے؟"

"کئی بار ۔۔۔ میں قریب ہر ماہ گاؤں جاتا ہوں۔"

"اب چچا کا رویہ کیسا ہے؟"

"میں پہلے وہاں ہی جاتا ہوں جہاں والد صاحب ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر کھیت ہی میں ہوتے ہیں۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو رہے ہیں۔ پہلے پہل تو بات بھی نہیں کرتے تھے۔ میں گھٹنوں کو ہاتھ لگاتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتے، لیکن جب سے والدہ کی وفات ہوئی ہے۔ اب مجھے ترڑ تو نہیں پھینکتے۔ خواہ چند ہی باتیں کرتے ہیں۔ رات کو میں اُن کے پاس ہی بیٹھک میں سو جاتا ہوں۔ چار بجے والی گاڑی کے ساتھ جمائی لے کر پوچھ لیتے ہیں۔ کیا وقت ہوا ہے ۔۔۔ میں کہوں گا چار بجے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں اس وقت تمہاری ماں چائے بنا دیا کرتی تھی۔ میں چائے بنا کر دیتا ہوں۔ جب میں آنے لگتا ہوں تو کہتا ہوں اچھا باپو، اب میں چلتا ہوں۔

"اچھا" بس اتنا سا ہی جواب دیتے ہیں۔ لیکن پچھلی دفعہ جب میں آنے لگا تو باپو آم کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ "اچھا" کہہ کر بولے "لڑکی کو بھی ساتھ لے آیا کر۔ میں "اچھا" کہہ کر دس قدم ہی چلا ہوں گا تو کہنے لگے "لڑکی کا مطلب کہیں وہ سناری نہ سمجھ لینا۔۔۔ میرے ٹھیک دائیں جانب شہتوت کا درخت تھا۔ جی چاہا کہ باپو کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ درخت سے ٹکر مار کر اپنا ہی ماتھا پھوڑ لوں۔ لیکن سب کچھ پی گیا اور کہا۔۔۔ نہیں باپو۔۔۔ پھر وہ چپ چاپ

میرے پاس آیا۔ جیب میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا..... سردیاں آ گئی ہیں۔ لڑکی کو کپڑے سلا دینا۔ میں پیسے لیے بنا وہاں سے چل دیا۔ چند قدم آگے جا کر میں نے قدرے مڑ کر دیکھا۔ باپو پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا "سالے میں زہر ابھی ویسا ہی ہے۔"

جسونت چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے کافی حیرانی ہوئی کہ اتنی ٹیس بھری، چبھتی اور درد سے بھرپور باتوں سے جن کا تعلق اسی کی ذات سے تھا، نہ تو اس کے چہرے پہ کوئی تلخی نمودار ہوئی تھی نہ ہی کوئی ناامیدی پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی اپنے آپ پر رحم۔ اس کے چہرے پر تو یہی لکھا تھا کہ مسافر ابھی تھکے نہیں۔

"چاچی کا رویہ کیسا تھا؟"

"شادی سے تو ماں بھی بہت ناراض تھی لیکن باپ کی طرح گالیاں نہیں دیتی تھی۔ سیما سے وہ قدرے دوری رکھتی تھی۔ لیکن میں اور سیما دونوں ماں کی قدر و قیمت کو سمجھتے تھے، لیکن ماں کی خاموشی ہمیں بہت پریشان کرتی تھی، لیکن ماں تو آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ جب باپو نے مجھے بے دعوے لکھوایا تو والدہ بہت تڑپی۔ ماموں کو بھی بلایا تھا لیکن باپو مانا نہیں۔ اس کے بعد ماں کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ رامونا کی پیدائش پر اپنی پراہسمنی کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔ پنجیری کا کنستر رامونا کے لیے سونے کی زنجیر۔ اور سیما کے لیے دس بارہ تولے کا سونے کا ہار۔ گھر میں ایک خاص قسم کی مایوسی چھائی رہتی تھی۔ مجھ سے بھی کم ہی بات کرتی تھی، لیکن قیام کے آخری روز کہنے لگی۔

"کوئی کام دھندا تو کرتے ہو نا ٹیوشن پہ مغز پچی کرتے ہو۔ گاؤں میں آ کر مرغی خانہ کھول لو یا منڈی آ کر اپنا اسکول کھول لو۔ تم یہاں دڑبے میں جہنم کی زندگی گزار رہے ہو اور گاؤں میں حویلیوں میں کبوتر خانے بنے ہوئے ہیں۔ کاکا کچھ ہوش سے کام لے"

میں جھنجھلا گیا۔ "ان مکانوں اور حویلیوں میں تو میرے لیے ایک کونہ بھی نہیں تھا۔ اپنے پاس ہی رکھو یہ مکانات اور زمینیں....." میں غصے میں جل اٹھا۔ اور کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ ماں بھی صلواتیں سناتے سناتے سو گئی۔ لیکن آدھی رات کے وقت وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ والدہ کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں، گویا رات بھر روتی رہی ہو۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ مجھے اپنے سینے سے لگاتی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی....

"تم بھوکے ہی سو گئے تھے۔ پھر میرے لیے دودھ گرم کر کے لائی اور میرے منہ میں نشاستے کے نوالے دیتی رہی۔ اور کہتی رہی تمہیں میری قسم ہے گاؤں میں آ جاؤ۔ اگر تم نہ آئے تو میرا موت پر ہی منہ دیکھو گے....."

"لیکن سیما کو کہاں دفع کر آؤں" میں نے قدرے غصے میں کہا۔

والدہ میرے سر اور منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"میں رکھوں گی سیما کو.... تمہارا باپ بے شک بڑے بھائی کے ساتھ رہے۔ کیا اس کے کہنے پر میں بیٹا گنوا لوں۔ تو رتی بھر پروا نہ کر" پھر وہ میرے پاس ہی سو گئی۔

سیما اندر آئی اور جسونت سے کہنے لگی——

بھائی صاحب کے لیے باتھ روم میں گرم پانی رکھ دو۔ ہاتھ منہ دھو لیں۔ کھانا قریب قریب تیار ہو گیا ہے۔

جب وہ مڑنے لگی تو رامونا نے اس کی لمبی چوٹی پکڑ لی۔ سیما نے غصے میں اسے گھور کر دیکھا لیکن رامونا نے پیچھے کو گھما کر کہا۔ ذرا مسکرائیے سٹریسی جی۔ سیما نے غصے میں مسکراہٹ بکھیر دی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کتنا خوش کنبہ ہے۔ آیا تو میں اس لیے تھا کہ کہیں اور رات بسر کرنے کا ٹھکانا نہیں تھا۔ لیکن یہاں آ کر مجھے اپنا آپ بھول گیا۔ اور یہ کنبہ مجھے بہت ہی اپنا سا دکھائی دینے لگا۔ جب میں غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا تو مجھے اونچی آواز میں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اندر آیا تو رامونا کی بہت بری حالت تھی۔ وہ بے دم ہوئی پڑی تڑپ رہی تھی۔ آنکھوں اور ناک میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ سیما اس کی چھاتی، ہاتھ اور پاؤں کی مالش کر رہی تھی۔ بچی تڑپتی رہی، لیکن نہ وہ روئی نہ چیخی اور نہ ہی کوئی منت سماجت کی۔ بس اس نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور حملہ گزر گیا۔ سیما نے اس کے منہ میں شہد کا چمچ ڈالا اور رامونا مسکرانے لگی۔ پھر وہ اپنی مٹھی ہوا میں لہراتی ہوئی بولی.....

"پاپا... میں نے کیسے مقابلہ کیا؟"

"رانی جھانسی کی طرح....." جسونت کی بجائے میں نے کہا اور اسے بار بار چوم کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ پھر میں نے جسونت اور سیما سے کہا۔ بڑی بہادر بچی ہے۔ ایسی بھیانک بیماری بھی اسے ڈرا نہیں سکی۔ بارہ برس کی عمر میں یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ دمہ ذہین لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

جسونت اور سیما کچھ نہیں بولے اور نہ ہی انہوں نے بچی کی تعریف کے پل باندھے۔

"سیما لاؤ روٹی۔ بھائی صاحب کو بھوک لگی ہو گی۔ روٹی آ گئی۔ آلو گوبھی، دال دیکھ دینے کی پلیٹ۔ میں انتظار کرتا رہا کہ جسونت کسی الماری میں سے بوتل نکال کر لائے گا۔ لیکن میری امید بر نہیں آئی۔ ویسے بھی مرغ کی جگہ آلو گوبھی دیکھ کر میں جل بھن گیا۔ تھک کر میں نے کہا۔

"جسونت میرے بیگ میں سے برانڈی کی بوتل نکال لا۔ میز پہ کھانے لگاتے ہوئے سیما کے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ جسونت نے مجھے دوسرے کمرے میں بلایا اور بڑی عاجزی و پختہ قدمی سے کہا "بھائی صاحب آپ برا نہ مانیے۔ شادی کے وقت سیما نے مجھ سے ایک ہی مطالبہ کیا تھا کہ نہ آپ شراب پئیں اور نہ گھر میں کسی کو پلائیں۔ اب یہ اس گھر کی روایت بن گئی ہے۔ آپ محسوس نہ کریں"

"نو۔ ناٹ ایٹ آل" میں نے انگریزی میں جواب

دیا۔ تاکہ اپنی شرمندگی پر بھی قابو پا سکوں اور یہ بھی ظاہر کر سکوں کہ محسوس تو میں نے کیا ہی ہے۔ پھر نیم دلی سے لقمہ توڑا۔ ایک دو نوالوں کے بعد روٹی مجھے لذیذ لگنے لگی۔ پلیٹ میں سے چپاتی اُٹھانے لگا تو سیما نے گرم چپاتی لا کر رکھ دی۔ پھر دوسری اور اس کے بعد تیسری اور پھر میں نے اتنی چپاتیاں کھائیں گویا ولایت میں تو میں بھوکا ہی رہتا تھا۔

"سیما! یوں محسوس ہوتا ہے گویا تم نے کھانا بنانے میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے۔ اگر میں نے ایک ہفتہ تمہارے ہاتھ کی روٹی کھالی تو میری عادت ہی خراب ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"بھائی صاحب مجھے شرمندہ نہ کیجیے —— انگلستان میں تو آپ اچھے سے اچھا پکوان کھاتے ہوں گے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"وہاں کھانا کھانے کی کسے فرصت ہے۔ ہم تو پونڈوں کی قیمت پر بنا صاف کی گئی ہڈیاں ہی چوستے رہتے ہیں۔"

"کیا وہ بہت ذائقہ دار ہوتی ہیں تاؤ جی!" رامونا نے بہت حیرانی سے پوچھا۔

میں نے رمونا کے گال پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "اس سے لذیذ نہیں ہوتیں، لیکن عادت ہو جاتی ہے۔"

پھر میرے سینے میں ایک سمندر اُبلنے لگا —— محبت کا سمندر۔ کیوں کہ نہ جانے کتنے برسوں بعد میں نے کسی کی زبان سے تاؤ جی کے الفاظ سُنے تھے۔ میرا بھائی۔ میری چھوٹی بہنوں جیسی بھاوج اور میری بھتیجی۔ میری بچی۔ میرا خون۔ جی چاہا کہ تینوں کو ہی گلے لگا لوں اور بھینچ لوں اور تب تک گلے سے لگائے رکھوں جب تک کہ جسم کے رواں رواں میں بسی ہوئی ولایت کی سردی نہ نکل جائے۔

میں چاہتا تھا کہ نائٹ سوٹ پہن کر رضائی اوڑھ کر بیٹھ جاؤں اور بہت سی باتیں کروں کیوں کہ کل تو میں نے چلے جانا تھا۔ لیکن جسونت کی زندگی میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ باتیں کرنے کی بجائے سننا چاہتا تھا۔ گلی کی بتی ابھی بھی سوئی ہوئی سی تھی ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ میں دوسرے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت نہ کے برابر تھی۔

دوسرے کمرے میں جسونت رامونا کو کہانی سُنا رہا تھا۔

دشمنوں نے شیرو اور بسنتی کو قلعے میں قید کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ یا تو ہمارے راجا کی غلامی قبول کر لو نہیں تو تمہارا روٹی پانی بند کر دیا جائے گا۔ قید خانے میں ہی بھوکے پیاسے تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے۔ قید خانے کے سب دروازے بڑے بڑے تالے لگا کر بند کیے ہوئے تھے۔ سب دروازوں کے سامنے پہرے دار بندوقیں لیے ہوئے کھڑے تھے۔ بسنتی بہت گھبرا گئی، لیکن شیرو اگرچہ دکھائی تو کمزور دیتا تھا، لیکن ہنستا رہا۔ بسنتی کو بہت غصہ آیا۔ موت سر پر کھڑی ہے اور تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔ شیرو کہنے لگا .... دیکھ بسنتی۔ رات کے بعد طلوعِ آفتاب ضرور ہوتا ہے۔ اور ہم باہر ہوں گے۔ یہ کہہ کر شیرو نے بسنتی کو ساتھ لیا اور پہلا دروازہ دھکیلنے لگا، لیکن دروازہ نہیں کھُلا۔ وہ ایسے ہی کرتا رہا۔ بیس دھکے لگانے کے بعد بسنتی کو غصہ آ گیا اور وہ بولی۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ لے میں تو یہاں بیٹھی ہوں۔ تم لگاتے جاؤ دھکے۔ لیکن شیرو اسی لگن کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا دروازہ دھکیلتا رہا، ننانوے دروازوں کو دھکے لگائے، لیکن ایک بھی نہیں کھُلا۔ قید خانے کے اندر اندھیرا تھا۔ اور شیرو سوویں دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور بسنتی سے کہنے لگا۔ دیکھ بسنتی پو پھٹ رہی ہے .... یہ کہہ کر اُس نے دھکا لگایا اور دروازہ چوپٹ کھُل گیا۔

"دروازہ کیسے کھُل گیا؟" رامونا نیم باز آنکھیں کھول کر بولی۔

"زندگی میں کبھی سب دروازے بند نہیں ہوتے۔ حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے" جسونت نے رامونا کی پیشانی چوم لی اور رامونا سو گئی۔

سیما رسوئی سنبھال کر چائے کے تین پیالے بنا کر لے آئی۔ ہم رضائیاں لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ سیما جسونت کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا شاید یہ پتہ لگانے کے لیے کہ ہماری ذات برادری میں اس کی نسبت کون سی چیز الگ ہے۔ جس کو لے کر اُسے سُناری سُناری کہہ کر ایسا بکھیڑا کھڑا کر دیا گیا کہ گاؤں کے جدی پشتینی مکان میں اس سے کمین ذات لوگوں سے بھی گھٹیا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے کچھ بھی الگ دکھائی نہیں دیا۔ ہاں دو فرق ضرور تھے۔ ایک تو اس کی ناک میں پڑی لونگ اُسے بہت زیب دیتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُس کے پاس بیٹھا میرا بھائی پورا مرد دکھائی دیتا تھا۔ "سیما اب ہم گھر کے لوگ ہی بیٹھے ہیں۔ اب کچھ آپ بیتی باتیں کریں۔ تم جسونت کو کیسے ملیں؟ کیا جیل میں ملے تھے؟"

سیما کچھ شرما گئی اور اُس نے جسونت کی طرف دیکھا۔ جسونت نے پوری کہانی سنا دی۔ اُس نے اپنی سچائی کا کوئی ثبوت نہیں دکھایا۔ لیکن کئی لوگ جب بات کرتے ہیں تو الفاظ اُن کے دل سے اجازت لیے بغیر ہی نکلے چلے آتے ہیں جیسے اُن کی روح پگھل کر باہر چلی آ رہی ہو۔ نکسل وادی دور میں وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ تب محبت جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ جب جسونت کے وارنٹ جاری ہوئے تو وہ ایک رات سیما کے پاس ٹھہرا تھا۔ پولیس سیما کو پکڑ کر لے گئی اور تین دن اُس سے پوچھ پڑتال کرتی رہی۔

"تم سے کیا پوچھتے تھے؟" میں نے سیما سے کہا۔

"بس معمول کی باتیں ہی کرتے تھے۔ ڈراتے زیادہ تھے۔ بدتمیز بہت تھے۔ مجھے مار پیٹ نہیں کی۔ کیوں کہ میرے چچا ایس پی تھے۔

پھر جسونت بتاتا رہا کہ وہ پکڑا گیا۔ ممکن تھا کہ اُسے پولیس حراست میں سے۔ بھاگنے کے الزام میں گولی ماردی جاتی، لیکن اُس کے تاؤ (میرے باپ) نے نہ جانے کیسے دخل اندازی کر کے سفارش کر دی۔ اُن کے اچھے مشورے سے ہی چچا نے جسونت کو بے دعویٰ لکھوا دیا۔ ہائی کورٹ نے بری کر دیا۔ اسکول پرائیویٹ تھا۔ دونوں کی ملازمت جاتی رہی۔ نکسل وادی لہر کی پھلجھڑی بھی بجھ کے رہ گئی۔

"یہ لہر چل کیوں نہیں سکی؟" میں نے پوچھا

یہ لہر لوک لہر نہیں تھی۔ یہ لہر نیم بورژوا لوگوں تک

ہی محدود رہی۔ لوگوں کی سرگرم حمائت کے بغیر حکمران جماعت کی سرداری چھیننا ممکن نہیں۔ ویسے بھی اس تحریک کے چلانے والوں کے سر چینی تھے، دھڑ ہندوستانی۔

"پھر تم اس میں کیوں شامل ہوگئے؟"

"نہ جانے کیوں؟ ایک دھارے میں بہہ گیا، لیکن کوئی افسوس نہیں۔ چلو یہ تو پتہ چل گیا کہ انقلاب جرنیلی سڑک کی مانند کوئی سیدھا اور ہموار راستہ نہیں ہے۔

"آپ کی تعلیم کتنی ہے اور اب کیا کام کرتے ہو؟"

سیما نے جسونت کی طرف دیکھا۔ جسونت بتا رہا تھا۔ میں پنجابی میں اعلیٰ سیکنڈ کلاس ایم اے ہوں۔ اور سیما ہندی میں فرسٹ کلاس ایم اے ہے، لیکن ہمیں نہ تو کوئی سرکاری اسکول ملازم رکھتا ہے نہ پرائیویٹ۔ اب میں ایک دوکان نما اسکول میں پانچ سو روپے پر پڑھاتا ہوں۔ اور سیما ڈھائی سو روپے کی ٹیوشن کر لیتی ہے۔

"اتنی رقم سے تو روٹی بھی نہیں چلتی ہوگی"

یہاں سے سات آٹھ میل پر فتح گڑھ شکر چک میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ سال بھر کے لیے گندم اور چاول بھیج دیتا ہے۔ اُن کی نجی کھیتی ہے۔

"مفت؟"

"بالکل مفت!"

عجیب بات تھی۔ میرے سامنے بیٹھا میرا بھائی یوں باتیں کر رہا تھا۔ جیسے جیٹھ اساڑھ کے مہینے میں ہمارے گاؤں کی نہر لگاتار بہے جا رہی ہو۔ کناروں تک بھری ہوئی نہ پانی گدلا نہ کوئی اُتار چڑھاؤ۔ یہ کیا وہی جسونت ہے جو کبھی نو برس کا تھا جب میں انگلینڈ گیا تھا۔ تب ہم نہر کے کنارے بابا جیت رام کی باغیچی میں تاش کھیلا کرتے تھے۔ تب جسونت بھگت سنار کے کھوکھے سے چائے اور سگریٹ لاکر دیا کرتا تھا۔ کیا تب بھی اُس میں ایسا سنجیدہ اور ثابت قدم آدمی بننے کے آثار تھے؟ میں نے اس پہلو سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور یاد آیا کہ جس دن اُسے آموں کی رکھوالی کے لیے بٹھا دیتے تھے۔ اُس روز چاروں کے آنگن میں اکثر گھروں میں آموں کی چٹنی بنا کرتی تھی، لیکن اب میرے سامنے جسونت نہیں، جسونت بیٹھا ہوا ہے۔ بیچارے پولیس کے ڈر سے اور سُنار لڑکی سے شادی کرنے، خاندان کو داغ لگانے کی پاداش میں جائیداد سے بے دخل کر دیا تھا، جس کی بیٹی دمہ کی مریض تھی، جو ایسے زندگی بسر کر رہا تھا، جیسے کوئی کیمپ میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ جس کی سیما سمیت اتنی آمدنی تھی جتنا میں اپنی کار میں پٹرول ڈال لیتا ہوں، جس کی وہ تحریک بھی ناکام ہوگئی تھی، جو اُس کا خواب بن کر اُسے ثابت قدمی سے چلائے جا رہی تھی اور جس ڈر کے بہت سے بہادر بھاگ کر انگلستان اور کنیڈا چلے گئے تھے یا وقت کی سرکاری مشینری کے پُرزے بن گئے تھے یا ناامیدی کے کنویں میں گر کر نشہ کرنے لگے تھے، لیکن جسونت ان سب باتوں سے خبردار ہوتے ہوئے بھی کیسے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور کوئی بُری زندگی بھی بسر نہیں کر رہا ہے اُسے درختوں کی جڑوں کی مانند یقین ہے کہ سوداں دروازہ ضرور کھلے گا۔

"تم بھی دوسروں کی مانند انگلستان یا کنیڈا چلے جاتے" میں نے اپنا پن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

جسونت نے کسی کشیدگی کا اظہار نہیں کیا، لیکن اُس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آئی جو مجھے چھوٹا کر گئی۔

"بھائی صاحب۔ میں نے کبھی ایسا کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ پتہ نہیں پیسے کے لیے اپنا ملک چھوڑ جانا مجھے (اُس نے کل لفظ کہا اور میری جانب دیکھا وہ شاید کلنک کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا) غلط کیوں لگتا ہے۔ جب بھی دوسروں کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا مجھے اپنی روح مرتی ہوئی دکھائی دی۔"

"کیا مایوسی نہیں ہوئی؟"

"کبھی کبھی ہوئی تو ہے۔ لیکن اُسے میں نے کبھی غالب نہیں ہونے دیا۔"

"کیوں؟"

"تاریخ مجھے بہت حوصلہ عطا کرتی ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ نیکی کی طاقتیں بدی کی طاقتوں کو پچھاڑ دیں گی۔"

"لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان تو نہیں۔ تمہارے ہی الفاظ میں جرنیلی سڑک تو نہیں۔"

"میں نے سیدھا تو نہیں کہا۔ پکا وشواس لیا ہے۔ ایک جنگ ہے کوئی کھیل تو نہیں۔ شکستیں بھی ہوں گی، لیکن فتح آخر نیکی کی ہی ہوگی۔

میں نے سیما کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ وہ رشتے میں میری چھوٹی بھاوج اور میں اُس کا جیٹھ تھا لیکن اس مختصر ملاقات میں ہی وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن جیسی دکھائی دینے لگی تھی۔ جس کے ساتھ روایتی قسم کی شرم کا کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔ جب جسونت چائے بنانے چلا گیا تو میں نے سیما سے پوچھا۔ جس رات پولیس کے ڈر سے جسونت تمہارے گھر آیا کیا تب تک تم لوگ شادی کرنے کا ارادہ کر چکے تھے؟"

"نہیں بھائی صاحب، میں ان کی ایک نیک اور قابل انسان کے طور پر عزت کرتی تھی۔ یہ بھی مجھے ایک اچھی لڑکی سمجھتے تھے۔ اُس رات کے بعد مجھے ان سے محبت ہوگئی۔"

"کیا اس پر رحم کھا کر؟"

"نہیں بھائی صاحب ہمارے گھر میں لفظ رحم سے ہی نفرت کی جاتی ہے۔ جس وقت اُنہوں نے ہمارے چوبارے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو رات کے گیارہ بجے تھے دسمبر کا مہینہ تھا۔ اُنہوں نے چائے کا پیالہ مانگا اور پیا۔ اور میرا کمبل اُٹھا کر کہنے لگے آپ دروازہ اندر سے بند کرلیں میں برآمدے میں ہی سو جاؤں گا۔ پوری رات برآمدے میں ہی بیٹھے رہے ہوں گے۔ میرے جاگ جانے سے پہلے ہی وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ اُس دن میں اُٹھی بھی کافی دیر سے تھی۔

جسونت چائے لے کر آ گیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ جہاں جسونت بیٹھا تھا اُس کے عین اوپر روشن دان تھا۔ چاند روشن دان میں سے نکل کر اُس کے چہرے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، وہاں بہت روشنی تھی۔

اتنے میں راموناں نے پہلو بدلا۔ سیما نے رضائی ایک طرف کرکے اس کا منھ ننگا کر دیا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ نیند میں وہ مسکرا تو نہیں رہی تھی، لیکن ایک کومل مدھم مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارا بس ایک ہی بچہ ہے؟"

حالانکہ مجھے علم تھا کہ اُن کے بس ایک ہی بچی ہے دراصل میں پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ آپ کے ہاں اور بچہ کیوں نہیں ہوا؟ ہونا چاہیے تھا یا جلد ہونا چاہیے۔

جسونت چپ ہو گیا۔ بہت ہی خاموش ـــــ

راموناں کے چہرے پر ایک دم اُداسی چھا گئی۔ جب میں نے پھر پوچھا تو جسونت نے سب کچھ یوں بیان کر دیا۔

ایمرجنسی کے دنوں میں پولیس والوں نے زبردستی آپریشن کر دیا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر ایسی خاموشی تھی کہ اُس چاندنی چاندنی میں بھی مجھے جسونت کے چہرے سے تپش سی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جسونت کے چہرے پر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی ثابت قدمی وہی سنجیدگی۔ شاید کوئی حساس آدمی اُس کے چہرے پر اُداسی اور غصہ کی لکیروں کو پڑھ سکتا ہو۔ لیکن ملکہ کے چہرے والے پونڈوں نے میرے اندر سے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ ہاں سیما کے چہرے پر خواہشوں اور اُمیدوں کی آمیزش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی سوئی ہوئی بچی کو پیار کر رہی تھی۔ عورت اتنی کمزور تو نہیں ہوتی لیکن وہ ماں ہوتی ہے۔ سیما کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

میں دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا ـــــ نصف شب گزر رہی تھی۔ گلی کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں گویا وہاں بجھا کر ہی لگائی گئی ہو۔ گلی کی چپ میں سے ایک بُو سی آ رہی تھی جیسی انگریزوں کی خاموشی میں سے آیا کرتی تھی۔ دوسرے کمرے میں راموناں سو رہی تھی اور اس کی چھاتی میں سے آ رہی آواز مجھے بھی سُنائی دے رہی تھی۔ سیما کو بھی آج اچھی نیند نہیں آئے گی۔ آج اس کا خوابیدہ شعور جاگتا رہے گا۔ وہ ماں ہے اور جسونت . . . . اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے مجھے اپنے گاؤں میں ہوتے والے وہ کام کیوں یاد آ رہے تھے، جو مجھے بہت بُرے لگتے تھے۔ ایک تو بیلوں کی نعل بندی۔ بیل کو باندھ کر نیچے لٹا دینا، نعل لگانے والے کا ماس میں کیل گاڑنا اور بیل کا تڑپنا اور دوسرا وہ جب گھر میں پالے گئے بچھڑے کو آختہ (خصی) کرنے کے لیے مویشیوں کو ہسپتال میں لے جایا جاتا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ جسونت کو کیسے پکڑا گیا ہوگا اور اُسے ہسپتال لے جا کر اُس کا آپریشن کر دیا گیا ہوگا۔ میں یہ سوچتے سوچتے سو گیا کہ میرے ملک میں مویشی اور انسان میں کتنا فرق ہے۔

صبح جب راموناں نے مجھے جگایا تو دن کافی نکل چکا تھا۔ گلی میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ پھیری والے آوازیں لگا رہے تھے۔

"تاؤ جی! ممی چائے لے آئے ہیں" میری ہاں سنتے ہی راموناں نے اپنی ماں کو آواز دے دی۔ میں نے اُسے گود میں بٹھا لیا۔ اُس کے زرد چہرے پر کل کے دمکتے جلوے کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ اگر بیماری کو بچوں کی طرح سوچا جائے تو کافی کچھ آسانی سے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ سیما چائے دے کر آ گئی۔ وہ مسکرائی تو اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے۔ اُس نے مجھے کچھ دیر اور رُک جانے کے لیے کہا۔ راموناں بھی ضد کرنے لگی لیکن مجھے آج لدھیانہ پہنچ کر ایک لاکھ روپیہ فکسڈ ڈپازٹ کروانا تھا۔ اور چنڈی گڑھ میں پلاٹ خریدنے کے لیے کسی شخص سے ملنا تھا۔ جو سفارش کر سکتا تھا۔ اس لیے میں رُک نہیں سکتا تھا۔ جسونت رکشا لے آیا۔ اسٹیشن کے راستے میں جسونت کے چہرے کی جانب میں نے دیکھ کر کہا۔

"جسنتی، تُو نے اتنی تکلیفیں برداشت کیں اور مجھے پتہ تک نہیں لگا۔"

"نہیں بھائی صاحب، میری تکلیفات کوئی غیر دنیاوی تو نہیں۔ مجھے تو کسی چیز کا افسوس ہے نہ پچھتاوا۔" وہ ایک پورے انسان کی مانند مسکرایا۔

"اب انگلستان میں بہت پابندیاں ہیں نہیں تو میں تمہیں وہاں بُلا لیتا۔ سیما اور راموناں بعد میں آ جاتے۔"

"نہیں بھائی صاحب نہیں۔ میں یہاں بہت اچھا ہوں۔ میں پنجاب سے باہر کہیں نہیں رہ سکتا۔ دو ماہ گاؤں نہ جاؤں تو مدت جیسا احساس ہوتا ہے۔"

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"مستقبل روشن ہوگا۔ تاریخ آگے بڑھے گی نیکی کی طاقتیں مضبوط ہو کر لڑیں گی۔ میں سرگرمی سے اُن کا ساتھ دوں گا۔ سیما پی ایچ ڈی کرے گی اور شاید میں بھی کروں گا۔ راموناں کو ہر لحاظ سے بہت اچھی لڑکی بنائیں گے۔"

اسٹیشن آ گیا۔ ٹکٹ خرید کر شانِ پنجاب میں میں آ بیٹھا۔ جب گارڈ نے پہلی سیٹی بجائی تو میں نے سو سو کے دس نوٹ جسونت کو پکڑاتے ہوئے کہا: "یہ رکھ لے۔ کوئی ضرورت پوری ہو جائے گی۔"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا نوٹوں والا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔ بہت طاقت تھی اُس کے ہاتھوں میں۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ مجھے سیما کا شال، راموناں کا سوئٹر بہت گھِسے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ جسونت کا کوٹ بھی پرانے کپڑوں میں سے خریدا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آیا تھا۔

"نہیں بھائی صاحب شکریہ۔ ہماری ضروریات بہت کم ہیں اور وہ ٹھیک طور سے پوری ہو رہی ہیں۔ پیسے زیادہ آنے سے عادت بگڑ جاتی ہے۔ دوسرے میں خود ترسی کے احساس سے مر جاؤں گا. . . . گستاخی معاف کرنا۔"

میرا نوٹوں والا ہاتھ وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس پر اتنا پختہ انکار تھا کہ مجھے پھر ہاتھ آگے بڑھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

شانِ پنجاب چل پڑی تھی اور جسونت تا حدِ نظر ہاتھ ہلاتا رہا۔ پھر نوٹوں کی دستی میں نے بیگ میں رکھ لی۔ شانِ پنجاب نے جب نہر کا پُل پار کرتے ہوئے دھماکے کی سی آواز نکالی تب مجھے پتہ چلا کہ یہ تو گاڑی ہے۔ شانِ پنجاب کو تو میں پلیٹ فارم پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب)

اجیت کور

طوطا چشم

گوئل ہمارے پڑوسی تھے۔

مسٹر گوئل بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ دلی میں کہیں نہ کہیں ان کے ٹھیکے چل رہے ہوتے یا تعمیر کا کام جاری رہتا۔

ان کی بڑی لڑکی شادی شدہ تھی۔ اس کے سسرال والوں کی بدرپور یا شاید سورج کنڈ کی طرف کانیں تھیں۔ انھوں نے ان کانوں کا ٹھیکہ نہایت معمولی داموں پر لیا تھا اور اب یہ کانیں سونا ہی نہیں، ہیرے اگل رہی تھیں۔ جب بھی وہ لڑکی میکے آتی تو مسز گوئل یعنی اس کی والدہ اس کے ہیرے اور چمکتے زیورات دیکھ دیکھ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ اس کی لڑکی بہت آرام سے ہے اور راج کر رہی ہے۔

لڑکی سے چھوٹا ایک لڑکا تھا جس کی شادی کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ ویسے وہ بی۔ اے میں فیل ہو جانے کے بعد بہت دنوں سے اپنے والد کے ٹھیکوں کے کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا اور اب تک ہیرا پھیری کے سبھی طریقے سیکھ کر ایک کامیاب کاروباری شخص بن چکا تھا۔

سب سے چھوٹے لڑکے کا نام انل تھا۔ وہ حال ہی میں شکاگو سے ہوٹل مینجمنٹ کا نصاب پورا کر کے آیا تھا۔ ویسے تو اس کی والدہ کو اڑوس پڑوس کے ساتھ زیادہ بات چیت کرنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی پھر بھی جب انل شکاگو میں تھا تو وہ جب کبھی مجھے ملتی

نام: اجیت کور

ولادت: ۱۶ر نومبر ۱۹۳۴ء

شغل: ادب، صحافت

تصانیف: گل بانو، مہک دی موت، بت شکن، فالتو عورت، ساویاں چڑیاں، موت علی بابے دی (افسانوی مجموعے)، دھپ والا شہر، پوسٹ مارٹم (ناولٹ) تکیے دا پیر (خاکے)، کچے رنگاں دا شہر لندن (سفرنامہ)، خانہ بدوش۔ جلد اوّل (خودنوشت سوانح حیات) متعدد کہانیوں کے تراجم ہندوستانی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

انعام واعزاز: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۸۶ء)

پنجاب سرکار، پنجابی ساہتیہ سبھا، شرومنی بورڈ، پنجاب آرٹس کونسل پنجابی اکادمی دہلی نے انعام واعزاز سے نوازا۔ انٹرنیشنل آئی اے پی اے ایوارڈ (۱۹۸۴ء)، بلونت ایوارڈ ۱۹۸۴ء

پتہ: ۱۶۶۔ ماؤنٹ کیلاش، ایس ایف ایس فلیٹس، بالمقابل دہلی پبلک اسکول، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۵

تو مایوسی کی حالت میں افسوس کے ساتھ کہتی، "ہمارا ٹھیکوں کا اتنا بڑا کاروبار ہے، لیکن نہ جانے اس لڑکے کے سر پر کون سا بھوت سوار تھا! کہنے لگا میں اپنے والد کا کاروبار نہیں کروں گا۔ پہلے ایم۔ ایس سی کیا اور اب امریکہ چلا گیا ہے۔ کہاں سائنس اور کہاں ہوٹل مینجمنٹ۔ کیا میل ہے ان میں۔"

"جانے دیجیے، کوئی بات نہیں۔ جوان بچے آج کل اپنی من مرضی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ واپس آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں اس کا دل بہلانے کے لیے کہتی۔

مجھے کئی بار حیرانی ہوتی کہ مسز گوئل کو اپنے چھوٹے لڑکے کے بارے میں اداس ہونے کا وقت کہاں سے مل جاتا تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ کوئی کام کاج نہیں کرتی تھی۔ نہ ملازمت نہ تجارت اور نہ ہی اسے کوئی کام دھندا کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ ایک دانا عورت تھی اور دانا عورتیں خوب جانتی ہیں کہ عورت یا تو مشکل کے وقت کام کرتی ہے یعنی بیوہ ہو جانے پر یا شادی کے انتظار میں چار دن دل بہلانے کے لیے یا جہیز کے لیے چار پیسے جمع کرنے کے لیے۔

کملا تو صرف سماجی خدمت کے کام کرتی تھی جلسے، تقریریں، مظاہرے اور دیگر مصروفیات۔ کملا کے طبقے کی عورتیں یہی کچھ کرتی ہیں جناب عالی یا کٹی پارٹیوں میں مصروف رہتی ہیں۔ سہیلیوں کے ساتھ

جا کر کافی پیتی ہیں، فلاش کھیلتی ہیں، نئی ساڑیوں کے مظاہرے کرتی ہیں اور ہیرے چمکاتی ہیں — اور اس طرح بے حد مصروف رہتی ہیں۔

خیر...... انل جب گھر لوٹا تو افرادِ کنبہ کو یوں محسوس ہوا گویا ردیوں کے ایک تھیلے کے اوپر چلتا ہوا گھر آیا ہو۔ گھر کے لوگ سوچ رہے تھے کہ اب وہ کسی اعلیٰ فائیو اسٹار ہوٹل کا منیجر بنے گا اور ترقی کرتا ہوا کہیں سے کہیں جا پہنچے گا۔

لیکن انل کو ملازمت کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ گویا وہ بدیس سے بہت تھک کر آیا تھا اور اب آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس نے بالائی منزل پر برساتی والا کمرہ اپنے لیے صاف کرایا اور اس کی آرائش کرنے لگا۔ امریکہ سے لایا ہوا موسیقی کا نظام کمرے میں لگا دیا۔ موسیقی کا یہ نظام لاتے وقت سب نے اسے خبردار کیا تھا کہ اس پر اتنا درآمدی محصول لگ جائے گا کہ اسے نانی یاد آجائے گی۔ لیکن مسٹر گوئل کی کسٹم حکام سے اچھی شناسائی تھی۔ اس لیے انل کے دونوں بکسے سفید چاک کے کراس والے نشان لگ کر کسٹمز ہاؤس سے باہر آ گئے تھے۔

اس نے فرش پر گدّے بچھا کر ان پر بہت سی گجراتی گدّیاں رکھیں۔ کتابوں کی الماری میں نئی پرانی کتابیں سیدھی کر کے رکھیں۔ ایزل پر کینوس لگایا اور قریب ہی اسٹول پر رنگوں کا بکس اور تیل و برش رکھ دیے۔

کمرے سے باہر کھلی چھت پر بہت سے گملے لاکر رکھ دیے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ دن بھر یہ گملے کھلی چھت کی دھوپ سے سیراب ہوتے رہتے۔ انل موسیقی سنتا، بیئر پیتا اور دھوپ تاپتا۔

کبھی تصویریں بھی بناتا۔ تصویر کشی کا یہ شوق وہ شکاگو کی گلیوں ہی سے لایا تھا۔ گھر کے لوگ انتظار کرتے رہتے کہ انل کب تھکاوٹ دور کر کے کہیں ملازمت کے لیے عرضی بھیجے لیکن انل کو تو گویا روز تھکاوٹ ہوتی اور روز دور ہو جاتی تھی۔

آخر اس کے والد نے اس کے تعلیم و تجربے کا حال ٹائپ کرا کے انل کے دستخطوں کے ساتھ پانچ سات فائیو اسٹار ہوٹلوں کو درخواستیں ارسال کر دیں۔

ایک جگہ سے بلاوا بھی آیا۔

وہ بڑی بے دلی سے انٹرویو کے لیے گیا اور منتخب ہو گیا۔ پانچ سات روز ملازمت کی اور اس کے بعد استعفیٰ دے کر لوٹ آیا۔ مجھے کہنے لگا:

"جب مجھے پتہ چلا کہ میرے والد نے سفارش کے ذریعہ مجھے یہ نوکری لے کر دی ہے تو میں نے اسے اٹھا پھینکا۔ مجھے ایسی ملازمت نہیں چاہیئے جو مسٹر گوئل کے بیٹے کو دی گئی ہو اور مجھے یعنی انل کو نہیں۔"

گھر کے لوگ بہت سٹپٹائے۔ ناراض ہوئے۔ لیکن انل خاموش اور اپنے آپ میں مست تھا۔

اس کا زیادہ تر وقت چھت پر ہی بسر ہونے لگا۔

وہ ایک بہت بڑا پنجرہ لایا — بہت لمبا۔ چھت کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک اور اپنے قد جتنا اونچا — اس نے قریب پچاس ساٹھ رنگ برنگ کے طوطے لاکر اس پنجرے میں ڈال دیے۔ پنجرے کے اندر رنگین کوزے لٹکا دیے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں جیسے جہاں طوطے آہستہ آہستہ اپنے گھونسلے بناتے اور بچے دینے لگے اور چار پانچ مہینے ہی میں جب طوطوں کی گنتی بہت زیادہ ہو گئی تو اس نے ویسا ہی بڑا ایک اور پنجرہ لاکر سامنے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

سیکڑوں طوطے طلوعِ آفتاب کی پہلی کرن سے بھی پہلے گانے لگتے اور دن بھر گایا کرتے۔

انل دن بھر انہیں دانہ ڈالتا، ان کے کٹوروں میں پانی بھرتا اور سبز مرچیں ڈنڈی توڑ کر انھیں کھلاتا رہتا۔

اس نے طوطوں کے علاوہ دو بلیاں بھی پال رکھی تھیں اور ایک کتیا بھی جسے وہ پیار سے میری بٹیا کہہ کر پکارتا۔

افرادِ کنبہ اس کے اس وطیرے سے بہت پریشان تھے۔

انل کسی صوفی فقیر کی مانند چھت پر اپنی دھونی رمائے بیٹھا تھا اور مست تھا۔

سارے اڑوس پڑوس میں اگر اس کا کہیں آنا جانا تھا تو صرف ہمارے گھر۔ مجھے اور میری لڑکی اربنا کو ملنے کے لیے وہ کئی بار شام کو آجایا کرتا۔ بٹیا یعنی کتیا کو سیر کراتے کراتے۔ وہ کئی بار گپیں ہانکتے ہوئے کہتا۔

"ہم تخلیق کار لوگوں کو یہ دنیا کیسے سمجھے گی"۔

تخلیق کار لوگ — کیونکہ میری لڑکی ایک آرٹسٹ ہے اور میں، جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں، کہانیاں لکھتی ہوں — اور وہ بھی ایزل پر رکھے کینوس اور رنگوں کی بکھری ہوئی ٹیوبوں کے سبب ایک تخلیق کار تھا۔ آرٹسٹ۔

اس کے علاوہ اسے دنیا بھر کے شعرا کی خوبصورت لائنیں یاد تھیں جو وہ سنایا کرتا۔ یونان، نیویارک، اٹلی اور پیرس کی گلیوں کی باتیں سنایا کرتا۔

"وہ آپ کے پاس آکر بہت پیار سے باتیں کرتا ہے، آپ ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ آخر کب تک ایسا چلے گا۔"

چنانچہ اگلے روز شام کو وہ جب ہمارے یہاں آیا تو میں نے بات شروع کی۔

وہ قدرے ٹھٹھکا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا، "لیکن آنٹی، کیا میں فارغ یا بیکار ہوں؟ آپ کو معلوم ہے میرے پاس کتنے طوطے ہو گئے ہیں؟ دو سو تریسٹھ، اور آپ کو معلوم ہے میری بٹیا حاملہ ہے اور ساتھ ہی میں پینٹ بھی کرتا ہوں"۔

"اگر تم کہیں ملازمت نہیں کرنا چاہتے تو تھوڑی دیر کے لیے گوئل صاحب کے دفتر ہی چلے جایا کرو۔"

"لیکن وہاں جا کر کیا کروں؟" اس نے سیدھے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ تھی، زہر تھا۔ (یہ زہر میں نے آج تک اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا) کیا ہیرا پھیری کروں ان کی مانند؟ اور ٹنڈر بھرتے وقت اوپر سے نیچے تک سب کو رشوت دوں؟ اور پھر رشوت کا نقصان پورا کرنے کے لیے سیمنٹ میں مٹی اور ریت ملاؤں؟ سڑکیں بناؤں جن پہ پہلی بارش کے بعد ہی گڑھے پڑ جائیں؟ مکان بناؤں، جن

کی دیواریں سال بھر بعد ہی تڑخ جائیں؟ پُل بناؤں
جو میرے بیٹھے موڑتے ہی کھڑکھڑانے لگیں؟ نہیں مجھ
سے یہ نہیں ہو سکتا۔"

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں
تھا۔ پھر بھی میں نے کہا "تمہیں علم ہے کہ تمہارے گھر
کے افراد تمھیں کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمھیں ان کا دل
دکھانے سے بھی گریز کرنے کے لیے کم از کم ۔۔۔۔"

"پیار مائی فٹ ۔۔ آنٹی کوئی مجھے پیار وغیرہ نہیں
کرتا! اور نہ ہی پیار کرنے کے لیے ان کے پاس کبھی
فرصت ہوتی ہے۔ انھوں نے تو مجھ پر جو سرمایہ لگایا
ہے، میری پرورش اور تعلیم میں وہ انہیں ضائع
ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ بس انھیں صرف اس بات کی
تکلیف ہے۔"

کچھ دیر کمرے میں بہت بے چین خاموشی
محسوس ہوتی رہی۔

پھر وہ سنبھلا۔ اس نے کتیا کو بغل میں اٹھایا
اور اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا "پیار ۔ پیار تو
صرف میری بٹیا کرتی ہے مجھے ۔۔ دن بھر بھوکی رہتی ہے
لیکن جب تک میں اپنے ہاتھ سے دودھ نہ پلاؤں،
نہیں پیتی ۔۔ اور میرے طوطے آپ کو علم ہے کہ اب تو
میں دن کے وقت پنجروں کے دروازے کھول دیتا ہوں۔
چھت پر دانہ بکھیر دیتا ہوں۔ طوطے کھا پی کر، ناچ گا کر
واپس اپنے گھونسلوں والے پنجروں میں چلے جاتے ہیں۔"

کچھ دن بعد بٹیا نے تین خوبصورت پلّوں
کو جنم دیا۔ انل نے خود دایہ کے فرائض ادا کیے۔ اس کی
تکلیف کے تمام لمحوں میں اسے اپنی گود میں لے کر بیٹھا
رہا۔ ڈاکٹر کو بلا کر ٹیکے لگواتا رہا اور پھر دو چار دن بعد
ان پلّوں کو ٹوکری میں ڈال کر اور بٹیا کو ساتھ لے کر
بڑے پیار اور فخر کے ساتھ انہیں سیر کے لیے لے جانے لگا۔

گوئل صاحب اور کملا تو شاید تھوڑا بہت
بڑبڑا کر چپ ہو رہتے لیکن نئی بھاوج نے کہا "میں
اسے سیدھا کروں گی۔"

ایک دن جب انل اپنے کتے یعنی بٹیا اور اس
کے پلّوں کو سیر کرا کے لوٹا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ دونوں
پنجروں کے دروازے کھلے تھے اور سب طوطے
غائب تھے۔

وہ کتنے ہی دن روتا رہا۔

ایک روز شام کے جھٹپٹے میں ہمارے گھر آیا
اور کہنے لگا ۔۔ "آنٹی مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اگر پنجروں
کے دروازے کھلے بھی رہ گئے تھے، تو وہ سب کے سب
اڑ کیسے گئے؟ انہیں تو مجھ سے بہت انس تھا۔ وہ
انسانوں کی مانند بے مروت کیسے ہو سکتے تھے؟"

اس کی آواز ایک مردہ مچھلی کی مانند حیرانی
کے پانی میں تیر رہی تھی۔

بھاوج اس کے پاس جا کر چھت پر بیٹھی رہتی
اور اسے بہلانے کے لیے کہتی۔ "اے ناسمجھ، یوں ہی تو
نہیں کہتے "طوطا چشم" طوطوں کی بے وفائی سے ہی یہ
محاورہ بنا ہوگا۔ بے وفا تم کیوں اپنی جان کو روگ
لگا رہے ہو؟ ہم جو ہیں تمہارے پاس۔ کچھ ادھر ادھر
آ جا۔ دفتر ہی چلا جایا کر، دل بہل جائے گا۔ ساتھ
ہی سب خوش ہو جائیں گے۔ چل آج تمھیں کوئی
فلم دکھا لاؤں۔"

تین دن اداس رہنے کے بعد انل نے آہستہ
آہستہ اپنے باپ کے دفتر میں جانا شروع کر دیا۔

لیکن میں جب بھی اسے دیکھتی، مجھے یوں دکھائی
دیتا گویا کسی نے اس کے جسم میں سے زندگی کی سب
شگفتگی، تازگی اور معصومیت نچوڑ کر باہر نکال لی ہو۔

ارینا کہتی۔ "انل خود تو نہیں روتا۔ اس کے
گرد و پیش کی ہوا روتی دکھائی دیتی ہے۔"

وہ اداس اور خاموش کام سے لوٹتا اور
چھت پر اپنے کمرہ میں بیٹھا موسیقی سنا کرتا۔ بیڑی کے
علاوہ اس نے وسکی بھی پینا شروع کر دی تھی اور
سگریٹ بھی۔

طوطوں کے جانے کے بعد نہ اس کی بلیوں سے
وہ محبت رہ گئی تھی نہ بٹیا کے ساتھ اور نہ ہی اس
کے پلّوں کے ساتھ جو اب پوری چھت پر پھدکتے
پھرتے تھے اور جوان ہو رہے تھے۔ طوطوں کی
بے وفائی سے گویا باقی کائنات کے ساتھ اس کی
محبت منقطع ہو گئی ہو۔

وقت گزرتے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چار پانچ
برس بیت گئے۔

گوئل صاحب نے اپنا ایک اور مکان بنوایا۔
پنچ شیل کالونی میں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مکان موجودہ
مکان کی نسبت دوگنا بڑا تھا اور خوبصورت بھی۔
اس لیے انھوں نے نئے گھر میں جا کر رہنے اور یہ مکان
کرائے پر اٹھا دیے جانے کا فیصلہ کیا۔

گھر کا سامان باندھا جانے لگا۔

گوئل صاحب معروف آدمی تھے اور مسز گوئل
کی کوئی کانفرنس چل رہی تھی۔ انل کی بھاوج اپنے
تیسرے بچے کو جنم دینے کے لیے مائیکے گئی ہوئی تھی۔
اس لیے انل اور اس کا بھائی ہی سامان باندھ رہے
تھے اور سامان بھی اس روز انل کے بھائی کے کمرے
کا باندھا جا رہا تھا۔

اچانک انل نے ایک تکیے کو ہاتھ لگایا تو اسے
یوں محسوس ہوا کہ تکیہ بے حد نرم اور گدگدا تھا جیسے
گوندھے ہوئے میدے کی مانند ہاتھوں میں سے پھسلا
جا رہا ہو۔

اس نے تکیہ تھپتھپایا۔ "بڑا نرم ہے۔"

تب اسے تکیے کے ایک ادھڑے ہوئے کونے
میں سے کوئی سبز سی باریک چیز جھانکتی نظر آئی۔

اس نے ادھڑے ہوئے کونے میں ناخن
ڈال کر ایک دھاگہ کھینچ کر توڑ دیا اور وہ خوف
سے بھونچکا رہ گیا۔ ہکا بکا وہ وہیں بیٹھ گیا۔

تکیے میں سبز، پیلے، نیلے، عنابی چھوٹے چھوٹے
مہین پر بھرے ہوئے تھے ۔۔ اس کے طوطوں کے پر۔

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب) ●●

چندن نیگی

ناسور

رات بہت تاریک ہے۔ کالی گھنگھور گھٹا گھر آئی ہے۔ تارے چھُپ گئے ہیں۔ سلسا تا پسینہ ہے، جسموں کی بدبو ہے۔ پیڑ پودے گھاس سبھی آسمان کی طرف نظریں ٹکائے خاموش کھڑے ہیں۔ نہ گھاس کی مسکراہٹ ہے نہ پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ۔

رات آدھی بیت چکی ہے۔ چاروں طرف محیط خاموشی کو پوش کالونی کے پچھواڑے اوبڑ کھابڑ زمین پر بنی لاتعداد جھونپڑیوں میں مچے شور نے توڑ دیا ہے۔

خاموش، علیحدہ ٹھہرے ہوئے گردو پیش کی بھی ایک اپنی خاصیت ہوتی ہے۔ معمولی ارتعاش کی آواز دُور دُور تک پہنچ جاتی ہے۔ جھگیوں میں شور بڑھ رہا ہے۔ آوازوں کے ساتھ اور آوازیں مل رہی ہیں۔ راہ کے کتّوں کے بھونکنے کی آواز بھی اور بلند ہو گئی ہے۔ بے شمار سر گھاس پھوس کی چھتوں والی جھگیوں کے نیچے نیچے چھوٹے چھوٹے دروازوں میں سے باہر نکل آئے ہیں۔ سب حیران ہیں۔ مُنھ کھُلے رہ گئے ہیں، آنکھیں پھیل گئی ہیں۔ بھنویں چڑھی ہوئی ہیں۔

مُکھیا کی عورت رام کلی گھنیا کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی جھگی سے باہر لے آئی ہے اور کسی پھٹے پرانے کپڑے کی طرح گھنیا کو جھگی سے باہر پھینک دیا ہے۔

نام: چندن نیگی

ولادت: ۲۶۔ جون ۱۹۳۷ء

تصانیف: بار پرائے، مرا آیا موئی دے، چت گپت، کرڑا سار، گندھ کستوری (افسانوی مجموعے)، جل بن کمبھ (ناول)، ڈوگری کہانیوں کے تین انتخابات و تراجم بھی شائع کر چکی ہیں۔

انعام اعزاز: پنجابی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، (۱۹۸۵ء)

پتہ: C ۸۹/A ۲ B، ایم۔ آئی۔ جی۔ پشچم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

گھنیا دھرتی کی چھاتی کی پیوست لوگوں کی آوازیں سُن رہی ہے۔ وہ اُٹھنا چاہتی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتی ہے، لیکن نہ تو اس کے تن پر کوئی کپڑا سلامت ہے۔ اور نہ ہی ہڈیوں میں اُٹھنے کا دم۔ رام کلی نے تو پیٹ پیٹ کر اس کی ہڈیاں چٹخا دی ہیں۔ کپڑے تار تار کر دیے ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو گھنیا ایک تو کیا بہتوں کو دھرتی پر گرا لیتی۔ لیکن اب وہ چُپ ہے۔ لٹے ہوئے تنکے کی طرح دھرتی کے سینے سے چپٹی ہوئی لوگوں کی باتیں سُن رہی ہے۔

کس قدر کوس رہے ہیں اس بستی کے تمام مرد، کس قدر بُرا بھلا کہہ رہی ہیں اُس کی پڑوسنیں۔ چھوٹے چھوٹے تنگ دروازوں میں کھڑی پُر شباب جوان لڑکیاں۔ وہ چُپ ہے۔ لوگوں کی باتیں سُن رہی ہے، ہر ایک کی آواز پہچانتی ہے، سب کی کرتوتیں جانتی ہے۔ وہ سوچتی ہے اگر اس میں ہمت ہو تو وہ ایک ایک کو ننگا کر کے رکھ دے۔ تب سبھی کی زبان فالج زدہ ہو جائے گی، سب کی آنکھیں پتھرا جائیں گی، جسموں کا خون سُوکھ جائے گا۔ یہ تمام عورتیں یہ تمام مرد اپنے اپنے پیٹ ڈھانپتے ہوئے اندر دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ مگر وہ چُپ ہے۔ دھرتی کے سینے سے ہٹنے کی اُس میں طاقت نہیں رہی۔

گھنیا اور رام کلی کی جھگی کی دیوار سانجھی ہے۔ جگی جھونپڑیوں کی یہ بستی گھنیا کی جھگی سے ہی بسی ہے۔ یہاں تو اونچے اونچے ابرق کے ٹیلے تھے، کھائیاں تھیں، ناہموار راستے، پتھریلے پتھر، دودھ دُھلی راتوں میں ہیروں کی طرح چمکتے تھے۔ پتھروں جڑے ابرق کے ٹکڑے۔

یہیں گھنیا اور اس کا مہاویر کیٹری میں کام کرتے تھے۔ مہاویر مائینز لگا کر پتھروں کے سینوں کو پھاڑتا تھا۔ پتھروں کو کوٹ کوٹ کر گھنیا اور ساتھنیں روڑی بناتیں...... ٹک...... ٹک...... ٹک۔ سارا دن ہتھوڑیاں چلتیں۔

ایک دن مہاویر کے بھاگنے سے پہلے ہی مائن بلاسٹ ہو گئی اور وہ بھی پتھر مٹی کے ساتھ ہوا میں اُچھل کر دُور جا گرا۔ اس کی ٹانگ...... اور بانہہ کے لوتھڑے لٹک گئے۔ تب اُن کا پہلا بچہ کچھ ہی مہینوں کا تھا۔

کوٹھیوں کے پچھواڑے کی دھرتی بالکل پتھریلی ہو گئی تھی۔ ٹیلے گڈھوں میں سما گئے تھے۔ ٹیلوں نے کھائیاں بھر دی۔ پتھر، روڑی، دیواروں، سڑکوں میں چُنے گئے اور مہاویر آدھا ادھورا مرد نکما ہو گیا۔

گھنیا نے اسی دھرتی کے ایک حصے کے کونے میں گھاس پھوس کی...... چھت بنائی، گارا مٹی کی دیواریں کھڑی کریں۔ آدھا ادھورا مہاویر جھگی کے باہر چارپائی پر پڑا بیڑیاں پھونکتا رہتا۔ دیکھتے دیکھتے اور جھگیاں بن گئیں۔ کیٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُن کے سنگی ساتھیوں کی، سگے سمبندھیوں کی اور گھنیا کی جھگی کے آس پاس پورا گاؤں بس گیا۔

گھنیا کا پہلا بچہ سوا ایک سال کا تھا کہ اُس کے پاؤں پھر بھاری ہو گئے۔ سارا دن پتھر کوٹ کوٹ کر بھی تینوں کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔

گھنیا کی یادداشت کی ایک کڑی کاٹھ ہو گئی ہے۔ پہلی بار اُس عورت کے ساتھ اس کی ملاقات کیسے ہوئی جو اُس کا بچہ لے گئی تھی۔ اُس عورت کا بھی عجیب دھندا تھا۔ مزدوری کرنے والی عورتوں کے بچے کرائے پر لے جاتی تھی۔ جتنا بچہ چھوٹا ہوتا اتنا ہی اُس کا دن کا کرایہ زیادہ دیتی تھی۔ گھنیا کو بڑا سکھ ملا تھا۔ بچہ کا کھانا، خوراک سب کچھ اس عورت کے ذمہ ہوتا تھا پھر گھنیا پورا دن کام بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ ہانپ ہانپ جاتی تھی۔ پسلیاں چٹخنے لگتی تھیں۔ کمر ٹوٹنے لگتی تھی۔ آدھے دن کی اُجرت اور بچے کے پیسوں سے دونوں وقت نکل جاتے۔

ابھی پَو بھی نہیں پھٹی تھی۔ چڑیاں، کوے اور دوسرے پنکھ پکھیرو نے اپنے اپنے گھونسلوں سے باہر آ کر صبح کی آمد کے گیت بھی نہیں شروع کیے تھے کہ وہ عورت گھنیا کی جھگی کے باہر آ بیٹھی تھی۔ میلے کچیلے کپڑے، بوائیاں پھٹی ہوئی، ٹخنے سے اوپر دھوتی اور کمر میں دھوتی پر لٹکتی میلی سی تھیلی جس میں سے ٹین کی ڈبیا میں سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر مسلتی اور پھر ہونٹوں کے بیچ ایک طرف رکھ لیتی۔ کاغذ کی پڑیا کو کھولتی ہے۔ کچھ حساب لگاتی ہے پھر پڑیا کو تھیلی میں رکھ لیتی ہے۔

گھنیا کا دوسرا بچہ کچھ دنوں کا ہوا ہے۔ وہ دوسرے بچے کو بھی لے گئی ہے۔

گھنیا کا مرد مہاویر ہڈیوں کا ڈھانچہ سوکھا مریل جیسے کھیتوں میں ٹنگا، ڈراوتا' سارا دن بیٹھا رہتا۔ دو بار تو گھنیا نے دوسری بستی کے سرکاری اسکول کے پاس چھابڑی بھی لگوا دی، لیکن اُس کی طبیعت ہی اُدرن گئی ہے۔ کام کرنے کمانے سے وہ بے پرواہ ہو گیا ہے۔ دو پیسے کما لیے تو جوئے کی منڈلی میں جا پہنچا۔ جیت جاتا تو شراب پی لیتا ہارتا تو گھنیا کی خیر نہ ہوتی۔ لڑائی، جھگڑا مار پیٹ گھنیا کی بوٹی بوٹی دھن دیتا۔ یہ سوکھا کمزور آدھا ادھورا مرد۔ شروع شروع میں جھگیوں والے بیچ بچاؤ کرتے رہے۔ گھنیا کو چھڑاتے رہے پھر تو ہر روز کا یہی دھندا ہو گیا۔ اُس عورت کے جاتے ہی جھپٹا مار کر پیسے چھین لیتا۔ اس کی بلبلاہٹ کی ٹک ٹک دُور تک سنائی دیتی۔

کئی برسوں سے یہی سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ کئی بار وہ بچے لے کر جانے والی عورت کے پیچھے بھی جاتی تھی۔ بچہ اس عورت کی جھولی میں روتا بلکتا تھا۔ دور سے دیکھتی ہوئی گھنیا کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہے۔

بچہ تڑپتا جیسے اُس کی گود میں پڑے کانٹے نکیلے یا نوکیلے پتھر اُسے چُبھ رہے ہوں۔ بچہ جس قدر زور سے روتا تڑپتا، وہ اسی قدر زیادہ منت سماجت کرتی، دُہائی دیتی، پیسے مانگتی "میرا بچہ بھوک سے بلک رہا ہے...... بھگوان کے نام.... اس کے دودھ کے لیے پیسے...." وہ ماتھا بھی ٹیکتی، لوگوں کے پیچھے بھی دوڑتی، پاؤں پڑتی، کبھی ایک چوراہے پر کھڑی ہو جاتی کبھی دوسرے چوراہے پر۔ بچے کو گود میں لے کر مانگنے سے اُس کی دہاڑی اچھی بن جاتی ہے۔ بچے کی آنکھیں سوج جاتی ہیں۔ آواز بھاری ہو جاتی ہے۔

گھنیا اب چار بچوں کی ماں بن گئی ہے۔ وہ عورت گھنیا کے بچے کرائے پر دینے لگ گئی تھی۔ گھنیا نے پتھر کوٹنا بند کر دیے۔ نہ پوری دہاڑی لگا سکتی تھی نہ پورے پیسے ملتے تھے۔ اب اُس سے پورا دن ہتھوڑی نہیں چلتی تھی۔ ایک طرح کا لین دین شروع ہو گیا تھا دونوں عورتوں میں۔ کیسا سمجھوتہ تھا کیسی ساجھے داری تھی؟ بچوں کے جسموں کا بیوپار۔ ایک بچے کا جسم اپنے لہو ماس سے گھڑتی ہے، اُسے اپنے پیٹ میں پالتی ہے دوسری اُسی جسم کے ذریعے پیسے مانگ کر کتنے ہی پیٹ بھرتی ہے۔

گھنیا کے پاؤں جب بھاری ہوتے، مہاویر اور گھنیا کے چہرے کھل جاتے۔ ہنستے ہنستے چہرے، گھر میں ایک فرد کی آمد اور آمدنی کے بڑھنے کی خوشی ہوتی ہے۔

گھنیا اب نہ مہاویر کی شراب سے برہم ہوتی ہے اور نہ ہی مار پیٹ سے اپنے کو بچاتی ہے۔ اونچی، لمبی، سڈول گھنیا تو مہاویر جیسے دو آدمیوں کو مٹھیوں میں بھینچ لے۔ اس آدھے ادھورے مہاویر کی دُبلی گردن ایک ہی جھٹکے

میں مروڑ کر دُور پھینک دے، لیکن وہ تھوڑی دیر بعد ہی مہاویر کے پاس لیٹ جاتی ہے۔ اُس کو معلوم ہے وہ اُس کو بہت پیار کرتا ہے اور اُس کا پاؤں بھاری ہو جاتا ہے۔

پھر پوری گھنیا کی چال میں مٹک آجاتی ہے۔ قدموں کے نیچے کی زمین کو کپکپی آجاتی ہے۔ گھنیا ہر سال بچہ پیدا کرنے لگی۔ یہی تھا اُس کا دھندہ۔ اسی دھندے سے روٹی چلتی۔ مہاویر شراب، جوا۔ ...... اور گھنیا جیسے بچے پیدا کرنے والی مشین بن گئی ہو۔ یہی اُن کی روزی تھی، یہی کمائی، یہی بیوپار، یہی کام۔

کیا دیتی تھی وہ عورت بچوں کو؟ رات کو آدھے بے ہوش سے بچے گھر لوٹتے۔ باہوں ٹانگوں کے رستے زخموں کی اُن کو نہ پروا ہوتی نہ درد، ادھ ڈھکے نیم برہنہ بچے جھگی میں صرف رات ہی کاٹتے۔ سوتے سوتے بھی بڑبڑاتے۔ "ماں بھوک لگی ہے ...... ماں بھوک لگی ہے ...... باپ مر گیا ......" گھنیا کے دل میں درد اُٹھتا، کیسی روزی روٹی کا بھی بہت بڑا سوال تھا۔ پیٹ کی بھوک کا، آدھے آدمی کی دیکھ بھال کا ...... ضرورتوں کا ....

گھنیا کو موہ بھی نہیں آتا اپنی کوکھ سے جنمے بچوں پر۔ پیسے کی خاطر اُس نے بچے جنے۔ پیسے کی خاطر ہی وہ اُن کے چہرے صرف رات کے اندھیرے میں دیکھتی۔ جیسے مہمان ہوں صرف رات کاٹنے آتے ہوں۔

جھگیوں کے اور بچوں کو بے فکری سے کھیلتے، ناچتے کودتے دیکھ کر اُس کی آنتوں میں بل پڑتے، لیکن وہ خود ہی منہ پھیر کر ممتا کے احساس کا گلا گھونٹ لیتی۔

جو بچے ذرا بڑے ہو گئے تھے، اس عورت نے اسپتالوں، مندروں اور چوراہوں پر اُن کے لیے جگہ روک دی تھی۔ وہ ٹھوکریں کھاتے، نشیلی گولیاں پھانکتے، مانگتے جانے کہاں کہاں دھکے کھاتے چلے گئے۔ کبھی رات کو گھر نہیں لوٹتے ...... اُن کے ذہن سے ماں باپ، جھگی، بستی، گھاس پھوس کی چھتیں سب معدوم ہو گئے۔ اُن کے اپنے ہی اڈے بن گئے ہیں۔ اپنے ہی ساتھی مل گئے ہیں۔

اب گھنیا کے پاس صرف دو بچے رہ گئے ہیں۔ جتنے پیسے وہ عورت ان بچوں کے دیتی ہے اُن سے تو پیٹ کی بھٹی کی آگ نہیں بجھتی۔ مہاویر تو بیڑیاں پھونک پھونک کر، شراب پی پی کر نحیف و نزار ہو گیا ہے۔ کبھی وہ روتا ہے، اُن بچوں کو آوازیں دیتا ہے، جن کے نام بھی اُسے بھول گئے ہیں۔ گھنیا کبھی سوچتی ہے اگر اُس کے بچے گھر میں ہوں تو جھگی میں بیٹھ بھی نہ سکیں۔ اُسے گنتی بھی بھول جاتی ہے۔ پوروں پر گنتے ہوئے کبھی ایک بچہ بھول جاتی ہے، کبھی دوسرا۔ اور دونوں لڑکیوں کے آگے پیچھے جنے لڑکوں کو پوروں پر گنتی ہے۔ لڑکے ـــ جن کی شکلیں بھی اب اس کو یاد نہیں۔

گھنیا کا سب سے چھوٹا لڑکا تین برس کا ہو گیا ہے۔ آٹھ برس کی بچی کو کیٹری پتھر ڈھونے کوٹنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ بچوں کے ریٹ بہت کم ہیں۔ تین برس کے بچے پر نہ کوئی ترس کھاتا ہے نہ وہ خود مانگ سکتا ہے۔

اب وہ کیا کرے؟ اُس عورت کا اُسے کتنا ڈر ہے۔ وہ ہر روز دروازے پر آ بیٹھتی ہے ...... کام کا مندا پڑ گئی رے ...... گھنیا ...... اور کتنی ہی دھمکیاں دے گئی تھی ـــ ماتھے کی چوٹ میں ٹیس اُٹھتی ہے۔ وہ صرف اُس کی آواز سن رہی ہے، چپ چاپ لیٹی ہے ...... گھنیا کے للنا ...... مندر کا بیلا بھائی جاوت ......"

پہلے تو گھنیا اُس کی آواز کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتی تھی سوتے، ریں ریں کرتے، ادھ سوئے، ادھ جاگے بچوں کو اُس کے ہاتھ پکڑا دیتی تھی اور وہ گھسیٹتے گھسیٹتے بچوں کو لے جاتی تھی۔ آج اُس کا جی چاہا کہ اُس عورت کا گریبان پکڑ لے اور دھکے مار مار کر جھگیوں سے دُور نالے کے پاس گھسیٹ کر لے جائے اور پھر کبھی اُس کا منہ نہ دیکھے۔ پر وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی اور اپنے تین سال کے سوئے ہوئے بچے کو اس کی اُنگلی سے لگا دیا تھا۔ روتا بچہ، ننگے پاؤں ...... ننگے بدن ...... ریں ریں کرتا بھوکا پیاسا اُس نے بھیج دیا تھا۔

مہاویر کو کتنی بار اُس نے مارنے کے لیے اُکسایا شراب کی بوتل توڑی، تاش آگ میں پھینک دی۔ پر مہاویر تو صرف گالیاں بکتا رہا تھا۔ مارنے کو ہوا، لیکن ہلا ہی نہیں گیا۔ اُس کے تو ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں۔ بیساکھی ڈگمگاتی ہے، ہاتھوں میں گھونسہ کسنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ جو ہاتھ لگا اُسے ہی پھینک مارتا ہے۔ گھنیا کا ماتھا پھٹ گیا۔

گھنیا کے جسم میں عجیب طرح کی بے چینی ہے۔ رگ رگ میں سوئیوں کی چبھن ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی سی جمی ہے۔ آدھی رات ہے۔ اُس نے اُٹھ کر مٹکے میں سے پانی پیا۔ گلاس میں کافی دیر تک ہونٹ ڈبوئے رکھے۔ ایک سوچ اُس کی بے خواب آنکھوں میں ٹھہر گئی۔ دماغ میں پتھر کی چوٹ لگنے جیسا درد ہوا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس کی زبان کٹ گئی ...... وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس قدر ناتواں تو وہ پتھر ڈھوتے ڈھوتے بھی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اتنی نڈھال تو وہ دس بچے پیدا کر کے بھی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار آدھی رات کو گھنیا اب اپنی جھونپڑی کے تنگ چھوٹے سے دروازے سے اکڑوں ہو کر نکلنے کو ہوئی تو اُس کے سر کی رگڑ سے گھاس پھوس کی چھت سے کچھ تنکے نیچے زمین پر گرے۔ وہ پرانے سے ٹوٹے پھوٹے پٹوں کے در کھول کر باہر نکل آئی۔ تختے کانپے، کچی دیواروں سے مٹی گری، دھرتی کی چھاتی کانپی، گھنیا نے اپنا نچلا ہونٹ زور سے چبایا اور ساتھ والی جھونپڑی کے ٹین کو سرکا کر اندر چلی گئی۔ کل ہی اُس جھونپڑی والی عورت اپنے گھر گاؤں گئی تھی۔

پھر ایک سلسلہ یوں ہی چل پڑا تھا جیسے در در مانگتی گھنیا بھی اُس عورت کی طرح بھکارن ہو جھگی جھگی سے پتہ لگاتی، مُردوں کے پیچھے دوڑتی، بچے کی بھیک مانگتی، اُس عورت کی طرح جو بھوکے

پیٹ کی خاطر جھوٹے آنسو بہاتی، منت سماجت کرتی۔ کئی بار آدمیوں کی باہیں پکڑ لیتی ہے، کپڑے پکڑ لیتی ہے۔ بچے کو آگے کر کے منت کرتی ہوئی دُہائی دیتی ہے۔

مہاویر نے بھی ننگے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر سمجھوتا کر لیا۔ وہ نہ گھنیا کو بارتا نہ گالی بکتا، دونوں کے بیچ ایک سرد خاموشی چھائی ہوئی ہے دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہیں —

اُس کے سینے پر جیسے سانپ لوٹ جاتا ہے اور وہ آنکھیں بند کر کے دیدہ و دانستہ انجان بن جاتا ہے بہت سی جھگیوں میں وہ جسم پھیلاتی ہے۔ در در بھٹک کر، اپنا مقصد کھو کر، تن بیچ کر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اب سُکھی رام کی عورت رام کلی نے گھنیا کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹا ہے۔ مار مار کر اُس کی ہڈیاں توڑ دی ہیں، کپڑے تار تار کر دیے ہیں۔ اپنی سانجھی دیوار سے اُس نے گھنیا کا کھپریل بھی نیچے گرا دیا ہے۔ اپنے آدمی کو بھی گھسیٹتے گھسیٹتے باہر لے آئی ہے۔ چاروں طرف شور مچا ہے۔ ہر کوئی اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مرد آوازے کستے ہیں۔ عورتیں لعنتیں بھیجتی ہیں۔ لڑکیاں دُبک کر جھگیوں میں گھس گھس جاتی ہیں — لڑکے سُکھی رام کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ وہ گھٹنوں کے بل آنکھیں جھکائے چُپ بیٹھا ہے۔

گھنیا دھرتی کے سینے کے ساتھ چپٹی ہوئی ہے۔ نہ کسی نے اُٹھایا نہ کسی نے بٹھایا نہ کسی نے ہمدردی جتائی نہ کسی نے اپناپن دکھایا۔

گھنیا کو ہر آدمی ہر عورت کے بارے میں معلوم ہے۔ کوئی کتنا ننگا ہے؟ کتنے کپڑوں کی تہوں کے نیچے اُس نے اپنا آپا چھپا رکھا ہے۔ وہ سرِعام ایک ایک کا پردہ فاش کر سکتی ہے، لیکن اُس نے ایک ہی بار چاروں طرف سے خود کو گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ جیسے بلّیوں کی اندھیرے میں چمکتی، گھورتی ہوئی آنکھیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے نظر پڑ دو دھاری تیز کٹاریں ہوں جو اُس کے جسم کا تکا بوٹی کرنے میں لگی ہوں۔ لیکن نہیں۔ .... نہیں، اُس کے سُن دماغ میں سے ایک چنگاری نکلی.... یہ تو اُلوؤں کی آنکھیں ہیں .... عجیب قسم کے اُلو ہیں؟ اُن کی یہ نظر اپنی بار رات کو پھرا جاتی ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ لاتعداد دھڑوں کی بھنبھناہٹ اُس کے کانوں میں پڑی اور وہ دور کھائیوں، گڑھوں کی طرف نکل گئی، جہاں کبھی اُونچے اُونچے ٹیلے سر اُٹھائے ہوئے آکاش کی نیلاہٹ کو سمیٹتے تھے، چاند تاروں کی روشنی میں بھرپور نہلاتے تھے۔

گھنیا سارا دن بھٹکتی رہتی ہے۔ اسپتال دھارمک استھان، بھیڑ بھاڑ، جہاں بھی وہ ادھ ننگے، نیم برہنہ، نیم بے ہوش بچے کو مانگتے ہوئے دیکھتی ہے۔ اُس کی طرف لپکتی ہے گلے سے لگانا چاہتی ہے، چھاتی سے چپٹانا چاہتی ہے ...... بچے مانگنے کے رٹے رٹائے جملے بھول کر دُور بھاگ جاتے ہیں۔ اُسے محسوس ہوتا ہے یہ ہزاروں بچے ہزاروں بھوکے ننگے پیٹ اُسی نے جنے ہیں — اُس کی اپنی اُنگلیوں کے ناخن ہیں، جن کا درد ناقابل برداشت ہے۔ ایک بھی بچہ اپنا نہیں بنتا۔ سب اپنے لگتے ہیں۔ وہ کیا کرے؟ اُس کا دماغ چکرا گیا ہے۔ کسی ایک سوچ پر ٹکتا ہی نہیں۔

وہ چوراہوں کی طرف دوڑتی ہے۔ چوک میں لال بتی کی وجہ سے کھڑے موٹر، اسکوٹر والوں سے مانگتی عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے اور بچوں کی خاطر جھوٹی منت سماجت کرتی عورتیں دیکھ کر اُس کی چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ مانگتی ہوئی عورتوں کی بانہوں سے بچے چھینتی ہے، بھاگتی ہے، گرتی ہے۔ چیختی ہے ....."یہ بچے میرے ہیں .... یہ بچے میرے ہیں ...."

تھکی ماندی آ کر جھگّی کی چھت کے نیچے لیٹ جاتی ہے۔ اپنی جھُرّیوں بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرتی ہوئی چھت کو گھورتی ہے کہ اُس کے پیٹ کو لگی آگ کہیں اس چھت کو نہ لگ جائے۔ وہ ڈرتی ہے .... ناخنوں سے دھرتی کُریدنے لگتی ہے۔ جھگّی کے نیچے کی زمین اُس نے کُرید کُرید کر نرسری کی اُس کیاری کی طرح سوراخوں میں بدل دی ہے، جس کی ساری پود سر اُٹھاتے ہی مول بک گئی ہو۔ (ترجمہ: نریندر نشچل)

بقیہ: بھابی مینا

کے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹیں لہرا رہی تھیں۔

"کتنے لمبے —"

"اوہ —" سب اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ چبوترے پر کوئی عورت کھڑی نہیں تھی۔

سب نیچے پہنچے۔ بازار میں کہرام بپا تھا۔ ایک لڑکا کچلی اور مسلی مینا کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اُس نے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال ایک طرف ہٹا کر اُس کے بالوں کی مانگ سیدھی کر دی تھی۔ کالے بالوں میں کہیں کہیں لہو سیندور کی طرح چمک رہا تھا۔ لڑکے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ رہا تھا۔ اور وہ نیچے گری پڑی عورت کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لڑکے نے اس سے پہلے ان کا رنگ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں اُس کالی رات جیسی تھیں، جس آخری رات کو اُس نے آ کر اُسے جگایا تھا، لیکن اس رات کی گہرائیوں میں سورج نکل آیا تھا۔ جبھی تو وہ رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی — وہ آنکھیں اب بھی اُتنی ہی کالی اور اُتنی ہی روشن تھیں — اور وہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

لیکن اُن میں اس وقت کوئی سورج روشن نہیں تھا۔

●●

(ترجمہ: مخمور جالندھری)

گوربچن سنگھ بھلّر

جھوم کے ناچی ڈالی ڈالی

آج کھیت میں پانی دینے کی باری آسو کی تھی۔ پانی دس بجے ملنا تھا۔ سورج کافی اونچا ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے گوردیو کو گڑ، چائے کی پتّی اور دودھ تیار رکھنے کے لیے کہا اور خود گھڑی کا وقت میرآب کی گھڑی سے ملانے چلی گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ گوردیو تو ابھی بچّہ ہے اور میرآب اُس سے پانچ چار منٹ کا ہیر پھیر کر سکتا ہے۔

گوردیو اب جوان تھا۔ داڑھی مونچھوں کا پیغام لے کر بھورے بال اُگ آئے تھے، جو اس بات کی .... نشانی تھے کہ اس کا بچپن جوانی سے گلے مل رہا ہے اور وہ دن بدن زیادہ سے زیادہ گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ مگر آسو کے لیے وہ ابھی چھوٹا سا بچّہ ہی تھا۔ گھر کا، کھیت کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جو آسو اس کے بھروسے پر چھوڑ دیتی ہو۔ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتی کہ گوردیو ابھی اس قابل نہیں ہے کہ چھوٹے موٹے کام بھی اپنے طور پر کر سکے۔

گاؤں کے لوگ کہتے "گوردیو، تیری ماں پندرہ سال سے بیل کی طرح مٹّی میں مٹّی ہو کر کام کر رہی ہے۔ اب اُسے آرام کرنے دے۔"

اور گوردیو خود بھی ماں کی سخت زندگی کا خیال کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اب وہ آرام سے

نام : گوربچن سنگھ بھلّر

ولادت : ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء

شغل : ملازمت : صحافت

تصانیف : افسانوی مجموعے : اوپرا مرد۔ نہ خشاں مارے۔ میں غزنوی نہیں، دیوے وانگ بلدی اکھ (منتخب افسانے) صبح کتنی خوبصورت ہے (اردو)

مون کہانی (نظم)

پتہ : این۔ ڈی۔ ۵۰

پیتم پورہ، دہلی ۱۱۰۰۳۴

بیٹھے اور چار دن سُکھ کے گزارے۔ مگر جب وہ ماں سے ایسا کہتا تو وہ ہنس پڑتی "بیٹا، تو ننھا سا پھول۔ دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں اکیلا برداشت کر سکنے کے قابل تو ابھی کہاں ہے اور مجھے تھکاوٹ کہاں۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میں تو ہوا میں اُڑتی رہتی ہوں۔ تھوڑا اور بڑا ہو لے۔ جوان ہو لے۔ پھر خود ہی کرنا سب کام۔"

کبھی کبھی آسو جب کھیت میں درخت کے نیچے سانس لینے کے لیے بیٹھتی تو اُداس ہو جاتی۔ جب وہ سنتپا سنگھ کی روٹی لے کر آیا کرتی تھی وہ اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ پھر جب گوردیو پیدا ہوا تو وہ کھیت پر اُسے بھی ساتھ ہی لانے لگی تھی۔ اسی درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے کتنی کتنی دیر تک وہ دونوں اُسے گھاس پر کھیلتے دیکھا کرتے تھے۔ وہ خوشی سے باغ باغ ہوتے رہتے تھے اور اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بس وہی دن تھے جو آسو کی شادی کے بعد کی زندگی میں ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھے۔ باقی زندگی تو چلچلاتی دھوپ کی مانند تھی۔ مگر اب جب وہ ٹھنڈی چھاؤں جیسے دن یاد آتے تھے تو آسو کو دھوپ سے بھی زیادہ جلاتے تھے۔

وہ ابھی تیس برس کی بھی نہیں تھی اور گوردیو کو ساتواں سال ہی لگا تھا کہ سنتپا سنگھ بانہہ چھوڑ

کر چلا گیا۔ بخار رہا اور کھیل ختم ہو گیا۔ بھلا کبھی کوئی بخار سے بھی مرا ہے! مگر سنتا سنگھ کے سب علاج جھوٹے پڑتے رہے۔ اور وہ آسو کو منجدھار میں چھوڑ گیا۔

آسو کے لیے چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔ کالی سیاہ رات جس میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سر کے بال اُس نے نوچ ڈالے۔ چھاتیاں پیٹ پیٹ کر اُس نے سجا لیں۔ آنکھوں کے کنویں اُس نے پانی نکال نکال کر خالی کر دیے۔ فریاد کر کے ساتوں آسمان ہلا ڈالے۔ سارا گاؤں افسوس میں ڈوبا ہوا تھا۔ خدا نے بہت قہر کیا تھا۔ ہار سنگار کی عمر میں آسو اور کھیلنے کودنے کی عمر میں گوردیو بے سہارا رہ گئے تھے۔

رشتہ دار دو دو بار ہمدردی کے لیے آئے اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ آسو کا بھائی جگر سنگھ اپنے گھر کا کام کاج چھوڑ کر سوا مہینے اس کے پاس رہا۔ مگر وہ بھی کب تک وہاں رہ سکتا تھا۔ سر سے ننگی ہو گئی بہن کو وہ دلاسا دیتا رہا۔ سنبھلنے کے لیے منتیں کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا۔ مگر وہ تو جیسے ہوش کھو بیٹھی تھی۔ سر کے نیچے اور اُلجھے ہوئے بال، میلے کپڑے، چہرے پر آنسوؤں کے نشان اور خالی خالی آنکھیں۔ وہ جدھر دیکھتی بس دیکھتی ہی رہتی۔ مگر دکھائی اُسے پھر بھی کچھ نہیں دے رہا تھا۔

سنتا سنگھ کی موت کو سوا مہینہ ہوا تو آسو گھر کے کام دھندے میں ہاتھ لگانے لگی۔ جگر سنگھ گاؤں جانے لگا تو اُس نے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد واپس آ کر بیل منڈی میں بیچ دے گا اور زمین ٹھیکے پر دے دے گا۔

اس کے جانے کے بعد آسو کشمکش و پیچ میں پڑی رہی۔ رات کو گوردیو کو چھاتی سے لگا کر لیٹی ہوئی سوچتی رہی اور مُرغے بانگ دینے لگے۔ آخر وہ نتیجہ پر پہنچ گئی اور جب جگر سنگھ واپس آیا تو اس نے بیل بیچنے اور زمین ٹھیکے پر دینے سے انکار کر دیا۔ وہ بھائی کو سمجھاتی رہی کہ کل جب گوردیو جوان ہوگا تو کھیتی کا سارا ڈھانچہ دوبارہ کھڑا کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ کیا ہوا جو سنتا سنگھ چھوڑ کر چلا گیا تھا، مگر وہ اس کے گھر کو جس کے بارے میں وہ آسو کے ساتھ مل کر سیکڑوں خواب بُنا کرتا تھا، برباد نہیں ہونے دے گی۔ وہ اس کی نشانی گوردیو کو جسے اپنی چھاتی پر لٹا کر کھیت سے تھکا ہارا لوٹنے پر سنتا سنگھ اپنی ساری تھکاوٹ اتار لیتا تھا، تباہ نہیں ہونے دے گی۔ جگر سنگھ بہن کے سر پر ہمیشہ کے لیے ہاتھ رکھنے کی قسم کھا کر اپنے گاؤں چلا گیا۔

آسو کی زمین ان مصیبت کے دنوں میں پڑوس والوں نے بو دی تھی۔ اس کی ربیع کی فصل، جسے سنتا سنگھ اپنے ہاتھوں بو گیا تھا مگر کاٹنے سے پہلے چلا گیا تھا، لوگوں نے کاٹ کر اس کے گھر ڈھیر لگا دیا تھا۔ سب کو آسو سے ہمدردی تھی۔

جس دن آسو گوردیو کا ہاتھ تھام کر کھیت لے گئی، کپاس کے پودے بارہ بارہ پتے نکال چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ مزدور لگا کر گھاس پھوس نکالنا شروع کر دے۔ مگر وہ روز روز کام کے لیے مزدور کہاں سے رکھے گی۔ اگلے دن اس نے روٹی پکائی۔ اس میں اچار رکھا اور کھیت پہنچ گئی۔ گوردیو درخت کے نیچے پانی کے گڑھے سے کھیلنے لگا اور وہ خدا کا نام لے کر کام میں لگ گئی۔

ایک دفعہ تو اس کی آہ نکل گئی۔ خدا نے کیسے دن دکھائے تھے! مگر روتے کا راستہ تو اس کا راستہ نہیں تھا۔ اس نے دل کو سنبھالا اور دوپہر تک کافی کام ختم کر لیا۔ جب وہ گھر آئی تو چاہے سنتا سنگھ اُسے بہت یاد آ رہا تھا، پھر بھی وہ اپنے آپ کو کافی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

بس اُس دن کام میں ہاتھ ڈالا تھا اور اب آسو ہل چلاتی تھی، نلائی کرتی تھی، کھیت کو پانی دیتی تھی، فصل کاٹتی تھی اور دانے نکالتی تھی۔ وہ دوپٹہ کمر سے باندھ لیتی اور کام پر ٹوٹ پڑتی۔ گوردیو اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ وہ فصل کو پانی دیتی تو گوردیو بتاتا کہ پانی دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہے یا نہیں۔ بیج ڈالتے وقت اس کی جھولی خالی ہونے لگتی تو گوردیو درخت کے نیچے رکھی ہوئی بوری میں سے بیج لا دیتا۔ وہ نلائی کرتی تو گوردیو کٹی ہوئی گھاس پھوس اکٹھا کر کے ڈھیر لگا دیتا۔ وہ اناج اور بھوسا علیحدہ کرنے کے لیے کٹی ہوئی فصل بیلوں کے پاؤں کے نیچے ڈالتی تو گوردیو بیلوں کو ہانکتا۔

ایک یہ گاؤں کیا اردگرد کے گاؤں میں بھی باتیں ہونے لگیں۔ لوگ چوپالوں میں بیٹھ کر آسو کی کمائی کو آفرین کہتے اور اس کی ہمت کی اس کی دلیری کی داد دیتے۔ اس کی محنت کی کہانیاں لوگوں کی زبانوں پر چڑھنے لگیں۔ اگر وہ کبھی کسی کو کوئی کام کہتی تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی مدد کرتا۔

آسو عورت سے مرد بن گئی تھی۔ آسو گوردیو کا باپ بن گئی تھی۔ آسو اپنا خاوند آپ بن گئی تھی۔

زندگی کے گھنے اندھیرے میں آسو ٹٹول ٹٹول کر چلتی رہی اور اب تو اس کی آنکھوں کو اندھیرے کی عادت سی پڑ گئی تھی اور کچھ رات بھی گزر چلی تھی۔ گوردیو بڑا ہونے لگا اور آسو کو جیسے پگڈنڈی نظر آنے لگی تھی۔ وہ گوردیو کو دہی پلاتی، مکھن اور بادام کھلاتی اور ہر بلا سے بچانے کے لیے اُسے مرغی کی طرح اپنے پروں کے نیچے کر سو جاتی۔ قد و قامت کا سنتا سنگھ بھی مضبوط تھا اور خود آسو بھی مردوں جیسی جوان تھی۔ اس لیے گوردیو پر بھی آئے دن نیا ماس چڑھ رہا تھا۔ جوں جوں بیٹا بڑا ہو رہا تھا، وہ اور بھی زیادہ سخت محنت کر رہی تھی!

گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ یہ عورت ہے یا دیوی، تھکاوٹ کا نام تک نہیں جانتی۔ اس کے تو صبح دیدار ہو جائیں تو پاپ کٹ جائیں۔

گاؤں کی عورتیں کہتی تھیں۔ یہ آسو ہی تھی جو اتنی بڑی چوٹ اس طرح برداشت کر گئی اور کالی رات اس طرح پار کر گئی۔ کوئی اور ہوتی تو مر جاتی اور بچہ تباہ ہو جاتا۔

گاؤں کے نوجوان کہتے تھے ۔ "چچی، کوئی کام ہو تو بتانا۔ تیرا کام کرنا تو ثواب ہے . . .

اب بھی جب آسو کھیت میں درخت کے نیچے بیٹھتی تو سچا سنگھ کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آتیں ۔ مگر وہ پلّو سے انہیں پونچھ ڈالتی ۔ اگر اس نے رونے کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو سب چوپٹ ہو جاتا ۔ کئی دفعہ وہ سوچتی کہ اگر سچا سنگھ آ جائے، بس ایک بار . . . . ایک لمحہ کے لیے ہی سہی وہ اس کو دکھلائے کہ اس کی نشانی کو، اس کی امانت کو اس نے کس طرح سنبھال کر رکھا ہے ۔ اس نے سب کچھ اپنے پر برداشت کیا مگر گوردیو کو گرم ہوا تک نہیں لگنے دی ۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں دیکھتی ۔ وہ اب جیسے عورت نہیں رہ گئی تھی ۔ چالیس برس کی وہ ابھی ہوئی نہیں تھی اور اس کے بدن میں کوئی لچک باقی نہ رہی تھی ۔ اس نے اپنے بدن کو مار لیا تھا ۔ دکھوں اور غموں کی بھٹی میں پگھل کر ڈھل کر وہ فولاد بن گئی تھی ۔

جب سے گوردیو کے چہرے پر بال آنے لگے تھے، گاؤں کے بزرگ آسو کو کام کرنے سے روکتے ۔ "بٹیا! تم نے بہت ریاضت کر لی ۔ تمہاری واہگورو نے سن لی ہے ۔ لڑکا جوان ہو گیا ہے ۔ تمہارے برسوں کی تھکاوٹ اتارنے کے دن آ گئے ہیں ۔ اب تو گھر بیٹھ ۔"

آسو گھونگھٹ میں بھی نظریں نیچی کر کے جواب دیتی ۔ "بس آپ لوگوں کا ہاتھ میرے سر پر رہے ۔ مجھے کوئی تھکاوٹ نہیں، کوئی مشکل نہیں ۔"

عورتیں زور دیتیں ۔ "تم مٹی میں مٹی ہو گئی ہو تیرا بیٹا بہت نیک نکلا ہے ۔ تیری محنت کو ہی یہ پھل لگا ہے ۔ اب تو دھرتی ماں کو سلام کر اور بیٹے کی باپ والی زندگی سے نکل کر پھر ماں بن جا ۔"

آسو ٹال مٹول کر جاتی ۔ "بہن کام کی کیا تھکاوٹ اور اب میں کرتی بھی کیا ہوں ۔ اب تو لڑکا ہی سب کرتا ہے ۔"

لڑکے کہتے ۔ "چچی، بیٹیا چاہے بوڑھا ہو جائے ماں کے لیے بچہ ہی رہتا ہے ۔ اب تیرا گوردیو وہ نہیں رہا ۔ سب ہم عمر کام میں اس کے مقابلے پر آنے سے ہچکچاتے ہیں ۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے ۔ اب تو گھر بیٹھ ۔"

آسو خوشی سے باغ باغ ہو جاتی ۔ "تم سب ہی تو اس کے بھائی ہو اور بھائی ہی آدمی کے بازو ہوتے ہیں ۔"

ایسے موقع پر آسو سوچتی کہ یہ سب لوگ اسے تھکاوٹ کی باتیں کہتے ہیں ۔ مگر یہ تھکاوٹ اسے خود محسوس کیوں نہیں ہو رہی تھی ۔ تھکاوٹ تھی کہاں ۔ وہ اپنے بازو اپنی ٹانگیں دبا کر تھکاوٹ ڈھونڈتی، وہ کہیں نہیں تھی ۔

وہ سوچتی ۔ میں اب لہو ماس کی کہاں ہوں جو تھک جاؤں ۔ میں تو پتھر بن گئی ہوں ۔ میں تو فولاد بن گئی ہوں ۔ اور اسے پتہ نہ چلتا کہ وہ اپنی اس حالت پر روئے یا ہنسے ۔ وہ ایک لمبا سانس کھینچتی اور ہوا میں چھوڑ دیتی ۔

آج کھیت میں پانی دینے کی باری ان کی تھی گوردیو نے اسے کہا کہ آج وہ اکیلا ہی کھیت جائے گا ۔ آسو ہنس پڑی ۔ "تیری عمر کے بچے تو اپنی ناک بھی خود صاف نہیں کر سکتے ۔ تو فصل کو پانی اکیلا کیا دے گا ۔"

"اچھا ماں، آج موہن کو کوئی کام نہیں ہے ۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور پھر کسی دن میں اس کے ساتھ کام کروا دوں گا ۔ تو ماں آج گھر بیٹھا کر ۔" گوردیو نے زور دیا ۔

"نہیں نہیں ۔ کسی دوسرے کا سہارا کیا لینا ۔ میرے بہادر بیٹے ۔ فصل کو پانی ہم خود دیں گے ۔" آسو نے جواب دیا ۔ اس نے گوردیو کو چائے کی پتی، گڑ اور دودھ تیار کرنے کو کہا اور خود گھڑی کا وقت میر آب کی گھڑی سے ملانے چلی گئی ۔

آسو گھڑی ملا کر واپس آئی تو پڑوسیوں کی بھورو ستی لے کر ان کے گھر سے نکل رہی تھی ۔ آسو کو دیکھ کر ایک بار تو وہ بھونچکا سی رہ گئی اور پھر سنبھل کر بولی ۔

"چچی، میں لسی لینے آئی تھی ۔ تم کہاں گئی تھیں؟ ابھی ابھی آئی تھی میں ۔ بابو لسی مانگ رہا تھا ۔"

"میں گھڑی ملانے گئی تھی بٹیا ۔ میر آب کی گھڑی کے ساتھ ۔ آج فصل کو پانی دینا ہے ۔" آسو نے جواب دیا ۔ اسے بھورو کا بھونچکا رہ جانا کچھ عجیب سا لگا ۔ وہ پہلے بھی لسی لینے آتی تھی، مگر آج کی طرح تو اس کا رنگ کبھی نہیں اڑا تھا ۔ پھر اس نے اس خیال کو بے مطلب جان کر ایک طرف ڈال دیا ۔

وہ اندر گئی تو کھڑکی میں سے اس کی نظر گوردیو پر پڑی ۔ وہ ہاتھ کا کاڑھا ہوا ایک رومال لیے کھڑا تھا ۔ آسو نے مدھم سا کھانس دیا تو اس نے ٹھٹھک کر فوراً رومال جیب میں چھپا لیا اور دودھ والی بوتل کا ڈھکنا ایسے ہی کھولتے اور بند کرتے ہوئے بولا ۔ "چلو ماں چلیں ۔ دیر نہ ہو جائے ۔"

آسو کو محسوس ہوا کہ جس فصل کو اس نے بے تمام مصیبتیں برداشت کر کے سنبھالا ہے وہ اب دودھیے دانوں کی بھری ہوئی بالیوں سے لد گئی ہے اور اٹکھیلیاں کرتی ہوا میں جھوم جھوم کر ناچ رہی ہے ۔

"بیٹا، آج تو ہی جا ۔ اب خود ہی سنبھال سب ۔" آسو نے حوصلے سے بھری ہوئی آواز میں کہا اور میٹھی میٹھی تھکاوٹ کے نشے میں چارپائی پر لیٹ گئی!!

(ترجمہ: از مصنف)

موہن بھنڈاری

تل چولی

چودھری رونق مل حواس باختہ ہو گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ پسینہ اُس کے پھوڑے ہوئے پیٹ پر اس طرح پھیل گیا، جس طرح خوب تر زمین کے اوپر سے کھال کا پہلا پانی گزرتا ہے۔

اُسے شام کے جھٹپٹے میں ڈر لگ رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی موت جیسی خاموشی نے اُسے اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے ارد گرد دیکھا، چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خوب سلگتی ہوئی بھٹی میں سے نکلتے ہوئے پگھلے لوہے کی طرح بھیانک خیالوں نے اُس کے خون کا دوران تیز کر دیا۔ بھیانک اور عجیب عجیب خیال اُس کے دماغ میں آنے لگے اور بھوت جیسے کئی خیال۔ وہ ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔ "جو بھلا اس اندھیری رات میں مجھے کوئی مار جائے۔ میرا گلا دبا دے۔ یا رسیوں سے باندھ کر مجھے چیونٹیوں کے دھوڑا پر پھینک جائے اور چیونٹے میری بوٹی بوٹی نوچ لیں۔" پھر اُسے یاد آیا کہ کس طرح پندرہ روز پہلے ایک ایسی ہی شام میں تین ڈاکوؤں نے پاس کے گاؤں کو جاتے ہوئے کسی باپ بیٹے کو گھیر لیا تھا۔ باپ کے دیکھتے دیکھتے بیٹے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اس کے بعد باپ کو بھی شیشم کے تنے کی آڑ میں چھپا کوئی راہی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور بھاگ لیا تھا۔ بھاگتے ہوئے اُس کے کانوں کے پاس سے کتنی ہی گولیاں شائیں شائیں کرتی ہوئی گزر گئی تھیں مگر وہ بچ گیا۔ یہ سارا ماجرا چودھری رونق مل نے آپ اپنے کانوں اُس آدمی سے سنا تھا۔

وہ تو اُس سنسان علاقے میں اکیلا تھا..... بالکل اکیلا.... ایک بار پھر اُس کا سارا جسم کانپ اٹھا۔

دُور.... سامنے چوراہے میں کسی بے پوت کے جلائے ہوئے دیے کی لو تھرک رہی تھی۔

جلدی جلدی وہ اپنے گھر کو چل پڑا۔ چیونٹیوں کے دھوڑے پر تل چولی ڈالنے آیا تھا وہ بڑی ثابت قدمی سے ہوا کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا ہوا آیا تھا۔ گھر کو لوٹتے وقت اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔

اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ جیسے اس کے بالکل ساتھ ساتھ کوئی چل رہا ہے۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس کا سایہ ہی تھا جو شاید اُس سے بھی زیادہ خوف زدہ تھا اور اُس سے زیادہ لرز رہا تھا۔

اس ڈر سے کہ آہٹ ہو گی اُس نے پانچ گزی دھوتی کا پلو ایک ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا وہ اپنے گھر میں یوں داخل ہوا جس طرح کوئی سانپ چاندنی کی مستی میں کھیلتا ہوا کسی نادیدہ نیولے کی نظر

نام : موہن بھنڈاری

ولادت : ۱۴ر فروری ۱۹۳۷ء

شغل : سرکاری ملازمت، محکمۂ تعلیم، پنجاب، چنڈی گڑھ

تصانیف: تل چولی، سُکھ دی پیڑ، کتھ دی لٹ اور پہچان (افسانوی مجموعے)

انعام اعزاز : ساہتیہ اکادمی (چنڈی گڑھ) ایوارڈ

پتہ : ۱۳۸۵ - اے / سیکٹر ۲۰ - بی

چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۲۰

ہن آنے کے ڈر سے اپنے سوراخ میں سرک جاتا ہے۔

اندر سے اُس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔

لگوں کا سیلاب شہر کی طرف آ رہا تھا۔

اگلے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے

دادڑی پلنگ پر گر پڑا۔ پڑا پڑا وہ اپنی پہلی زندگی

کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے وہ اس مقام

پر پہنچ گیا، جہاں چودھری رونق مل نہیں ہوتا

تھا بس رونقی ہوتا تھا۔ اکیلا ماں کا لاڈلا رونقی۔

تب وہ دیہات میں پھیری لگا کر کپڑا بیچا

کرتا تھا۔ چھوٹی سی کپڑے سے بھری گٹھڑی جو کسی بازیگر

کی بیٹھ پر اُس کے کی طرح اُس کے پہلو میں دھنستی

جاتی۔

گاؤں کی عورتوں میں گز گز کپڑا بیچ کر وہ

بمشکل گزارہ چلاتا تھا۔ تھکا ماندہ گھر آ کے جب وہ،

اپنی عورت کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھاتا تو اُس

کی ساری تھکان دُور ہو جاتی۔ دو وقت ملی رُوکھی

سوکھی بہت مزیدار معلوم ہوتی اور وہ اس کے

لیے رب کا سو سو بار شکر ادا کرتا۔ زندگی اُس کی

متوازن چل رہی تھی۔

ایک دن اُس کا کپڑا خوب بکا، کچھ

روپے اُسے اُدھار کے مل گئے۔ اُس نے گھر آ کے

جب سارے نوٹ گِنے تو وہ پورے سَو کے تھے۔

سَو سَو کے نوٹ تو اُس نے بہت دیکھے

تھے۔ شہر کے بڑے دُکان دار کی دُکان کا گلہ تو سَو سَو

کے نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ اُسے پتہ نہیں کیا سوجھی

کہ اُس نے وہ چھوٹے نوٹ بدل لیے۔ گاؤں کے

شراب کے ٹھیکے پر اور سَو کا ایک اکیلا نوٹ بدلے میں

لے لیا۔ اُس کی تو چال ہی بدل گئی۔ گھر میں پہلی بار

سَو کا نوٹ آیا تھا۔

کورے کوزے میں سو کا نوٹ رکھ کر اس نے

نئے تھان سے لیر (کپڑے کی لمبی اور پتلی پٹی) پھاڑ کر

اس کا منھ باندھ دیا۔ کوزہ وہ کچی کوٹھڑی میں رکھ کر

لیٹ گیا۔ تمام رات وہ پہلو بدلتا رہا۔ اُسے نیند

نہیں آ رہی تھی۔ وہ گھنٹے گھنٹے بعد کوزے کا منھ

کھول کر سَو کے نوٹ کو ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا

پھر کوٹھڑی میں رکھ دیتا۔

اُس رات اُس کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔

اُس کی بیوی اُس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا

رہی تھی۔ اُس پر کیا پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ وہ اب

بھی کبھی سوچنے لگتا تھا۔

پھر اُس نے اپنے گاؤں میں بزازی کی دُکان

کھول لی اور رونقی کی بجائے رونق مل بن گیا۔

گاؤں میں اُس کا بیوپار خوب چلا۔ دو چار

دو چار سے بڑھتی ہوئی آسامیاں اب سارے گاؤں

میں پھیل گئیں۔

کپڑے پر کنٹرول نے اُس کو بلیک کرنی سکھائی

نت روز کے نئے ٹیکسوں نے اُسے دوہرا کھاتہ

رکھنا سکھا دیا۔ گاؤں کا بال بال اُس کا مقروض

تھا۔ سارے علاقے میں اب "رونق مل، رونق مل"

ہو رہا تھا۔

پھر اُسے اپنا گاؤں چھوٹا چھوٹا لگنے لگا

تھا۔ گویا اُس کا دل بہ دن پھولتا ہوا مٹکے جیسا پیٹ

اس گاؤں میں نہیں سما سکتا تھا۔

ایک رات وہ ٹرک میں سامان رکھ کر پاس

کے شہر میں جا گھسا۔ آسامیاں گاؤں سے شہر کے چکر کاٹنے

لگیں۔ جس کی بیٹی یا بہن کی شادی طے ہو جاتی وہ

رونق مل کے پاس ضرور پہنچتا۔ زمین رہن رکھ کر اپنی

ضرورت پوری کرتا۔ رونق مل کے گُن گاتا ہوا وہ تھکتا

نہ تھا۔

اب رونق مل کے نو پیسے چل رہے تھے ـــ

اُس کے اپنے کئی ٹرک چلتے تھے۔ کئی کمپنیوں کا وہ حصہ دار

تھا۔ اتنا کاروبار ہونے کے باوجود اُسے اب کوئی کام

نہ تھا۔ بس مٹکے جیسے پیٹ پر بار بار ہاتھ پھیرتا رہتا۔

کبھی کبھی مستی میں آ کر وہ اپنی بیوی پر رعب ڈالتا۔ وہ

کہتا: "بھاگوان، کیا سمجھتی ہے، جو رونقی کو گھر میں

سَو کا نوٹ رکھا دیکھ کر اُس رات نیند نہیں آئی تھی

آج چار قدم پر پیشاب کے لیے جاتا ہوا اتنا کما لیتا ہے۔

بڑھے ہوئے مٹکے جیسے پیٹ پر اس کا ہاتھ از خود

چلا جاتا۔

اس برس کے الیکشن میں وہ شہر کا مکھیا منتخب

ہوا۔ رونق مل سے اب وہ چودھری رونق مل

بن گیا۔

اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی اُسے چین میسر نہیں

تھا۔ کام دھندوں میں اُلجھا ہوا وہ دن رات ـــ

بھٹکتا رہتا۔ اُس کی بہت سی آسامیاں اُسے

آنکھیں دکھانے لگتیں۔ کئی آسامیاں مُکر جاتیں۔

اُس کے اپنے گاؤں کا بجنا کا مرید برملا اُس کے خلاف

پرچار کرتا پھرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اُس کے منھ پر

کھری کھری سُناتا جاتا۔ بھرے بازار میں بازو لہرا کر

اُس کی دُکانوں کی قطار کی طرف اشارہ کر کے وہ

کہتا: "ارے رونق، کس کے لیے جمع کر رہا ہے۔ وقت

آنے پر لوگوں نے اس پر خود قبضہ کر لینا ہے۔"

یہ سُن کر چودھری رونق مل بظاہر تو ہنس دیتا

تھا۔ مگر اندر ہی اندر گویا اُسے کپکپی لگ جاتی ـــ

اسے محسوس ہوتا کہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے لوگ

اس کی چغلیاں کر رہے ہیں، اُس کے خلاف سازش

کر رہے ہیں۔

کیسے کیسے بھرم، کیسے کیسے وہم اُسے پریشان

رکھتے۔ اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ کبھی وہ ہڑبڑا

کر اُٹھ بیٹھتا۔ بُرے بُرے خواب اُسے آتے رہتے۔

پھر اُس نے ان باتوں کی طرف دھیان دینا ہی

چھوڑ دیا۔ پنڈتوں بھائیوں کو وہ پوجنے لگا۔ علاقے

کے بڑے سنت کو کار میں بٹھا کر اپنے شہر میں لے آیا۔

سال میں کئی بار اُس نے ست سنگ کرائے۔ اسکولوں،

مندروں اور گورودواروں کو اُس نے ہزاروں روپے

بطور امداد دیے۔ سیلاب زدوں میں اُس نے ہزاروں

کمبل بانٹے۔ الیکشن فنڈ کے لیے اُس نے اتنی بڑی رقم

کی تھیلی بھینٹ کی کہ بڑے بڑے ساہوکار انگشت

بدنداں رہ گئے۔

مگر پھر بھی ایک بے چینی، ایک نامعلوم

پریشانی اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ وہ

اپنے کاروبار کی طرف سے بے فکر تھا۔ کاروبار جواب

گوردیو سنگھ روپانا

روٹی

پانچ برس بعد بختاور نے قسم توڑ دی۔ اُس نے پانچ برس شراب کو چھوا تک نہیں۔ دوستوں نے طعنے دیے۔ دوستی کا واسطہ دیا، لیکن اُس نے اسے منھ نہیں لگایا۔ کسی مہمان کو بھی لاکر نہیں دی۔ کچھ مہمان ناراض بھی ہوگئے اور ایک نے تو یہاں تک کہا کہ بختاور کنجوس ہوگیا ہے۔

لیکن اب وہ دن رات یہ شغل جاری رکھتا ہے۔ ہاتھ نہیں ہٹاتا۔ خود پیتا ہے، دوسروں کو پلاتا ہے۔ سب حیران تھے کہ اُسے کیا ہوگیا ہے۔ کوئی دُکھ نہیں کوئی صدمہ نہیں بیٹیاں بیٹے ٹھرماں بطار تھے فصل اچھی آرہی تھی۔ بڑے لڑکے مکھن کی شادی کر دی گئی۔ کسی قسم کی قلت نہیں تھی۔ چار پیسے جمع ہوگئے تھے۔ اور مکھن ٹریکٹر خریدنے کے لیے صلاح مشورے کر رہا تھا کہ اچانک بختاور نے پینی شروع کر دی۔

جس دن سے قسم توڑی گھر نہیں آیا۔ کھیت میں بنے کمرے ہی میں ڈیرہ ڈالے رکھا۔ جیسو ڈوتا خدمت کے لیے ملازم رکھ لیا۔ چار پانچ مطلبی دوست ہمیشہ اُس کے پاس بیٹھے رہتے۔ اُس کے پینے کے سلیقے کی تعریفیں کرکے اُس کا دماغ آسمان پر چڑھائے رکھتے۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے۔ بڑا کمرہ مُرغیوں کا دڑبہ بنا دیا۔ ڈوتے نے وہاں مرغ لاکر رکھ دیے۔ جتنے مرغ روز کھالیے جاتے۔ ڈوتے کو حکم

نام: گوردیو سنگھ روپانا
ولادت: ۱۳ر اپریل ۱۹۴۳ء
شغل: تدریس
تصانیف: ایک ٹوٹا صورت، اپنی اکھ دا جادو، ڈیفینس لائن (افسانوی مجموعے)
گوری، جل دیو، آسو دا ٹبّر (ناول)
انعام/اعزاز: فکشن ایوارڈ، پنجابی اکادمی دہلی (۱۹۸۳-۸۴ء)

پتہ: سی۔ ۲۸۸، ڈی۔ اے اسٹاف فلیٹس
تیمارپور، دہلی ۷ ۰۰ ۱۱۰

تھا کہ اتنے مرغ وہاں اور لاکر رکھ دیے جائیں۔ گھر والے کہتے: بختاور نے گھر کو دیمک لگا دی ہے۔

گھر والوں کو جب فکرمند دیکھا تو اُس نے ہاتھ اور بھی کشادہ کر دیا۔ انواع و اقسام کے نئے نئے کپڑے سلوالیے۔ کوٹ پتلون اور اچکنیں جو اُس کے باپ دادا نے بھی کبھی دیکھی نہیں تھیں اور جنہیں بختاور پہننا بھی نہیں جانتا تھا۔ نئے فیشن تجویز کرنے والے آجمع ہوئے۔ پٹیالہ شاہی، نوکیلی پگڑیاں بندھوانے والے آگئے۔ بختاور کو مشورے دیے جانے لگے جن کے نتیجے کے طور پر بختاور نے کالے اور بھورے بوٹ خرید لیے۔ گرگابیاں لے لیں اور انواع و اقسام کی تِلے دار جوتیاں۔ قصوری کھسّے، مکتسر کی گھونیاں اور فاضلکا کے کنیاں والے جوتے خرید لیے۔

کسی نے خوشبودار تیل کا کیا ذکر کر دیا کہ جو شیشی بھی کسی دُکان پر دیکھی خرید لی۔ کریم، پاؤڈر، شیمپو، بختاور ریوڑے نوابی ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ اُس کا روپیہ شراب پر جاتا اور بوتلیں چلی آتیں۔ کچھ تو پی لی جاتیں اور کچھ لوگ پلّے باندھ کر لے جاتے۔ یہی حال اُس کے دوسرے سامان کا تھا۔ جن لوگوں نے نہانے کا صابن کبھی سونگھ کر نہیں دیکھا تھا، وہ دن میں تین تین بار غسل کرتے تھے۔ اُس کے مطلبی دوستوں نے افواہ پھیلا دی کہ مکھن بختاور کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔

اُنہوں نے اسے خود اپنے دوستوں کے ساتھ اس بارے میں مشورے کرتے سُنا ہے۔

ہمدرد دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ رشتہ دار آئے۔ بڑی بہن نے منت سماجت کی — سالے نے پگڑی اُتار کر پاؤں میں رکھ دی۔ لیکن بختاور نے ایک نہ مانی۔ سب کو یہی جواب دیتا "میں نے بھی تو بہت سمجھایا تھا، لیکن میری تو کسی نے نہ سُنی۔"

اُس سے پوچھا جاتا کہ کون نہیں سمجھا۔

"اپنے آپ ہی آئے گا جس کو سمجھ آ گئی" وہ یہ کہتا اور بات کرنے والے کو مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے اونچی آواز میں کہتا۔ "چپ۔" کوئی ایک مہینے میں ٹریکٹر کے لیے بچا کر رکھی ہوئی رقم ختم ہو گئی۔ اور پھر اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی پختہ نہر والی زمین فروخت کرنے کو تیار ہے۔ اگر کوئی خریدار ہے تو سامنے آ جائے۔"

یہ بات سن کر گھر والوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ مکھن کھانا پینا ترک کر کے بیٹھ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ والد کو کیا ہو گیا ہے۔ پیتا تو پہلے بھی تھا، مگر زمین کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی ایسے نوابی طور طریقے اپنائے تھے۔ کیا کیا جائے۔ جب بھی وہ اُسے ملنے گیا تو اُسے دور سے ہی دیکھ کر بختاور نے چلّانا شروع کر دیا۔ آ گیا مکھن، مجھے قتل کرنے کے لیے آ گیا۔ اور مکھن بنا بات کیے ہی واپس آ جاتا۔

اور جب اگلے روز ایک نئی خبر سنی تو پورے کنبے کے ہوش اُڑ گئے کہ بختاور نے رلیا چوکیدار کی بیوہ رکھ لی تھی۔ گھر میں جوان لڑکی تھی، نئی نویلی بہو آئی تھی۔ یہ کیا سوجھی اُسے؟ مکھن نے سوچا کہ اب اس گھر کا خدا ہی حافظ ہے۔ کچھ زمین فروخت کر کے شراب پی جائے گا اور کچھ اس چماری کے نام کر دے گا اور وہ لوگوں کے سہارے زندہ رہنے کے لیے باقی رہ جائیں گے۔ شرم کے مارے اُن کے لیے گھر سے باہر آنا مشکل ہو گیا تھا۔

"اپنے آپ آئے گی" مکھن نے اپنے والد کی بات یاد کی۔ "کون آئے گی؟" اور اب بیماری لے آیا ہے۔ ہو نہ ہو جھگڑا ضرور اُس کی والدہ سے ہے۔" مکھن نے سوچا۔

مکھن اور بختاور اکٹھے ہی کھیت میں کام کیا کرتے تھے۔ وہ بھائی دکھائی دیتے تھے اور دوستوں کی مانند مل کر رہتے تھے۔

کام چھوڑنے سے قبل بختاور نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ ایک گمشدہ گائے کی طرح چپ چاپ گھومتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا — دن بھر کھیت میں نہیں گیا اور اگلے دن پتہ چلا کہ اُس نے شراب پینی شروع کر دی ہے۔ مکھن نے یاد کیا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مکھن کی بیوی دوسری بار اپنے مائکے سے آئی تھی۔ سارا کنبہ بہت خوش تھا۔ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر اُس کی عزت و احترام کر رہے تھے۔ چھوٹے بچے بھابی کی آمد کی خوشی میں سب کام ہنسی ہنسی کر رہے تھے۔ نہ اسکول جاتے وقت تنگ کرتے اور نہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے۔ بختاور نئی دلہن کو بڑی پیار بھری نظروں سے چلتے پھرتے دیکھتا۔ اُن دنوں وہ مکھن کی والدہ کو بھی صاف ستھرے کپڑے پہننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتا "تم بھی کبھی ڈھب کی شلوار قمیض پہن لیا کرو۔" وہ صبح سویرے سب کو داتن لا کر دیتا اور مکھن کی ماں کو بھی داتن کرنے کے لیے کہتا۔

اُن دنوں میں گھر میں ایک اور تبدیلی بھی ہوئی تھی۔ کھیتوں سے آ کر بختاور بیٹھک میں بیٹھ جاتا — اُس کے غسل کے لیے پانی آ جاتا۔ اُسے دُھلے ہوئے کپڑے دیے جاتے۔ نہا کر اور لباس تبدیل کر کے لیٹے لیٹے وہ روٹی کا انتظار کرتا۔ سب کو کھانا کھلا کر مکھن کی والدہ بختاور کو کھانا کھلانے جایا کرتی تھی۔ وہ کھانا کھاتا رہتا اور قریب بیٹھی مکھن کی والدہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیے جاتی۔ گاؤں کی خبریں بتاتی۔ گھر کے متعلق صلاح مشورہ بھی اُسی وقت ہوتا۔ ایک دن مکھن کی والدہ روٹی کھلانے نہیں گئی۔ اُس نے بختاور کے چھوٹے لڑکے کو کہا "لے بیٹا، اپنے باپو کو روٹی دے آ۔"

دودھ گرم کیا تو مکھن کی ماں نے گڑوی بھر دودھ بیرے کے ہاتھ بھیج دیا۔

"کیا تیری والدہ کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے" بختاور نے بیرے سے پوچھا۔

"نہیں، وہ تو ٹھیک ہے۔"

بختاور خاموش رہا۔

مکھن کو یاد تھا پہلے دودھ بھی اُس کی والدہ ہی دینے جایا کرتی تھی۔ اور دیر گئے لوٹا کرتی تھی اور لوٹ کر بنا کسی کے پوچھے کہا کرتی تھی۔

"میں نے سوچا دودھ کا خالی گڑوا لے کر ہی جاؤں۔ رات کو دودھ آلودہ گڑوا کتے چاٹتے پھرتے ہیں"

اس کے بعد کبھی کوئی اور کبھی کوئی بختاور کے لیے روٹی اور دودھ لے جاتا۔ اُن کی والدہ خود نہیں جاتی تھی۔

ایک رات بختاور نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مکھن کی والدہ نے خود جا کر اُسے دودھ پینے کے لیے رضامند نہیں کیا۔ اگلی شب اور اس کے بعد ہر رات وہ دودھ واپس بھیج دیتا اور خاموش ادھر اُدھر ایک گمشدہ گائے کی طرح گھوما کرتا۔

انہی دنوں میں مکھن نے دو تین بار والد اور والدہ کو کھسر پھسر کرتے ہوئے بھی سُنا۔ اُسے دیکھ کر وہ خاموش ہو جاتے۔ گویا کسی راز کی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ جہاں بختاور اکیلا ہوتا، وہ وہاں جانے سے کتراتی۔

قریب دو ہفتے خاموش رہنے کے بعد بختاور نے قسم توڑ کر شراب پینی شروع کر دی۔ دن رات پیتا رہتا پلاتا رہتا۔ جھیوروں کا لڑکا دُتا خدمت گزاری کے لیے رکھ لیا۔ وہ اس کے سب کام کرتا۔ کھانا پکاتا۔ کپڑے دھوتا اور شراب لا کر دیتا۔ بوقت ضرورت گا تا بھی سُناتا۔

اب جب وہ رلیے چوکیدار کی بیوہ کو لے آیا تو مکھن کو گھر کی بربادی کے آثار دکھائی دینے لگے جب ٹریکٹر کے لیے جمع رقم ختم ہو گئی تو وہ زمین فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

"ماں میری عمر کیا ہے؟" مکھن نے اچانک پوچھا۔

"آئندہ بھادوں میں تو بیس کا ہو جائے گا۔"

"بیس اور بیس چالیس۔" مکھن نے والدہ کو سناتے ہوئے کہا۔ "بیس اور بیس چالیس یا آدھا برس زیادہ ہوگا۔"

"ماں تمہیں آئے ہوئے کتنے برس ہو گئے ہیں؟" مکھن نے دوسرا سوال کیا۔

"میں نے کوئی بہی کھاتہ کھول رکھا ہے۔ جا۔ جاکر پوچھ لے اُس سے جو لایا تھا۔" ماں نے چڑ کر جواب دیا۔

"اب تو بہی کھاتے بھی دیکھنے ہی پڑیں گے اور ایک اور لائے بیٹھا ہے۔"

"ایک کی جگہ دس لے آئے۔ میری جوتی کو..."
غصے میں وہ کہہ تو گئی۔ مگر اُس کی جان نکل گئی۔

"تمہاری جوتی کو کیوں؟ میں پوچھتا ہوں تمہاری جوتی کو کیوں؟" مکھن نے جھنجھلا کے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا اُسے لانے کو۔" وہ رُک کر بولی۔ "میرا دل جانتا ہے یا بھگوان۔ جو میرا کلیجہ جلایا ہے اس آدمی نے۔ کہیں باہر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دیا —"

مکھن کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر خاموش رہا۔

رات کو مکھن نے بیوی سے بات کی۔ اُس سے پتہ لگا کہ ابھی ماں کو حیض آتا ہے۔ وہ ڈرتی ہے۔ والد کی نسبت والدہ کو سمجھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن وہ تو ابھی خود دلنوار دہے ساس کو کیا سمجھائے۔ ماں باپ کا رشتہ ہی ایسا ہے بیٹا کیسے بے حیا ہو جائے۔

پانی سر سے گزرتا دیکھ کر مکھن نے چوتھے روز کچھ رشتہ دار اکٹھے کیے۔ جن میں سے کچھ والد کے نزدیکی تھے اور کچھ والدہ کے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ بختاور کو سب کے سامنے کیسے لایا جائے۔ وہ تو ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔ اُس سے کوئی عقل کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن مکھن نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا۔

آدھی رات کو مکھن کا ماموں، پھوپھا اور چھوٹا بھائی مکھن کے ساتھ کھیتوں میں گئے۔ بختاور بے سُدھ پڑا تھا۔ مکھن نے چوکیدار کی گردن پر دو جما دیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ڈونا موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموش رہا۔ چاروں نے بختاور کی چارپائی اُٹھائی اور گھر کے آنگن میں لا رکھی۔

جب بختاور کی آنکھ کھُلی تو کافی دھوپ نکل آئی تھی۔ ارد گرد دیکھ کر اُس نے رضائی اُٹھا پھینکی اور فرش پر کھڑا ہو گیا۔ وہاں جمع لوگوں کو دیکھ کر ڈر گیا۔

"آج مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" وہ کانپ رہا تھا۔

"بیٹھ جا بیٹے۔" مکھن کی نانی نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر آواز دی: "اری لڑکیو! بختاور سنگھ کے لیے چائے لاؤ۔"

چائے اور پانی کے گلاس آ گئے۔ لیکن بختاور نے پینے سے انکار کر دیا۔ اس ڈھنگ سے مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے سوچا۔

"لے میرے کہنے پر پی لے۔" نانی نے کہا۔ "تو مجھے اپنے بیٹوں سے بھی پیارا ہے۔ بیٹی دے کر تجھے میں نے اپنا بیٹا بنایا ہے۔" نانی کا گلا بھر آیا۔

"بنایا ہوگا۔ وہ بیٹھی ہے تمہاری بیٹی۔ لے جاؤ اُسے۔" بختاور نے دل مضبوط کر کے کہا۔

مکھن نے نانی کی جانب دیکھ کر اُسے مزید بات کرنے سے روک دیا۔

"لاؤ مجھے دے دو دونوں گلاس۔" مکھن نے دونوں گلاس پکڑ لیے۔ آدھا پانی اور آدھی چائے پی کر بولا: "لے باپو، اب تو پی لے۔ اگر اس میں کچھ ڈالا ہوگا تو دونوں مر جائیں گے۔" مکھن کی آواز بھرا گئی۔ "اب زندہ رہ کر کرنا بھی کیا ہے؟"

"مریں تمہارے دشمن۔ ایسی بدشگون بات کیوں نکالتے ہو۔" نانی نے کہا۔ اور پھر بختاور سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"لے پی لے نامراد پی لے۔ کیا تمہارا اپنا خون تمہاری جان لے گا۔ تمہاری فکر میں تو اس لڑکے نے کئی دن سے کچھ کھایا نہیں ہے۔"

سب چپ ہو گئے۔ بختاور بیٹھ گیا۔ پہلے پانی اور پھر چائے پینے لگا۔

مکھن نے ارد گرد دیکھا۔ اُس کی ماں نظر نہیں آئی۔

"اب اور کہاں جا بیٹھی ہو ماں۔ کیا اندر نہیں آسکتیں۔" مکھن نے اس ڈھنگ سے کہا گویا یہ سارا مسئلہ اس کی والدہ کے آنے سے ہی حل ہونا تھا۔

"لے آ گئی ہوں۔" مکھن کی والدہ دروازے کی اوٹ میں سے منہ اندر کرتے ہوئے بولی۔ "بول، مجھے کیا کرنا ہے۔ کیوں آوازیں لگا رہا ہے۔" مکھن کی ماں نے یوں کہا گویا اُسے پتہ ہی نہ ہو کہ معاملہ کیا ہے۔

"تمہیں نہیں معلوم تمہیں کیا کرنا ہے۔" مکھن بولا۔ "یہ سب جھگڑے تمہارے ہی تو پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اب کہتی ہو کیا کرنا ہے مجھے۔" مکھن نے بات کے آغاز سے ہی باپ کی طرف داری شروع کر دی۔ گویا اُسے بتانا چاہتا ہو کہ اس نے اس حالت میں جو کچھ بھی کیا ہے، ٹھیک ہی کیا ہے۔ ٹریکٹر کی رقم کی نسبت اُسے زمین کی زیادہ تشویش تھی۔

"چپ کر کے بیٹھا رہ۔" ماں بولی۔ "میں نے یہ قضیہ کھڑا کیا ہے کیا۔"

"تو کیا ان سب کو چُپ کر کے بیٹھنے کے لیے اکٹھا کیا ہے۔" مکھن نے سب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بس چُپ رہ۔ چھت پر جا کر ڈھول پیٹ۔"

"ڈھول بجنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا۔ جواب اور پیٹنے کے لیے کہہ رہی ہو۔" مکھن نے کہا۔

"تو باپ سے بات کر مکھن۔ اس بے سہارا پر کیوں چڑھ دوڑ رہا ہے۔" مکھن کے ماموں نے اپنی بہن کی سرزنش ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بات تو دونوں سے ہی کرنی ہوگی۔ مگر زیادہ ماں سے۔" مکھن نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہاں کر بیٹے۔" نانی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ اب تو

خوش قسمتی سے سمجھدار ہے۔ دونوں کو سمجھا سکتا ہے۔"

پھر رُک کر بولی: "یہ تو ٹھنڈے دودھ کو پھونک پھونک کر پیتے ہیں۔ تو ہی کچھ کام کا بیٹا نکلا ہے جس نے سارا دھندا سنبھال لیا ہے اور آپ کو لڑنے کے لیے فارغ کر دیا۔ ماں باپ تو اولاد کو سمجھاتے دیکھے تھے۔ یہاں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔"

ایک بار پھر سب خاموش ہو گئے۔

"کیا جھگڑا ہے تمہارا؟" مکھن کے پھوپھا نے خاموشی توڑی۔

"کیا جھگڑا ہونا ہے بھائی صاحب۔ یوں ہی فضول میں روٹی ہضم نہیں ہوتی۔" مکھن کی ماں بولی۔

"ماں ذرا سمجھ داری سے کام لے کر بات سنو۔" مکھن کو اپنے بزرگ لوگوں کی موجودگی میں سوجھ نہیں رہا تھا کہ کس طرح بات کرے۔

"تم ہمیں لوگوں کی چاکری کرتے دیکھنا چاہتی ہو یا سرداری کرتے۔۔۔"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ماں اگر ڈائن بھی ہو گی تو اولاد کے لیے نہیں۔" ماں نے کہا۔

"پھر تو باپو کو روٹی دینے کیوں نہیں جاتی؟ کیوں آرام سے چر رہے مویشیوں کو اڑنگا لگاتی ہو۔" مکھن نے جو بات کبھی بہت مشکل خیال کی تھی، بڑی آسانی سے کہہ دی گئی۔

"میں نے اڑنگا لگایا ہے کیا؟" مکھن کی ماں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہی تمام کام خراب کیا ہے۔" مکھن نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔ "لے بے بیرے باپ کو روٹی دے آ۔ لے بے چھندرے باپ کو دودھ دے آ۔" مکھن نے ماں کی نقل اُتارتے ہوئے اور اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے سب کے سامنے کھل کر کہا۔

"کیا اب تم روٹی دینے نہیں جا سکتیں؟ کہتی ہے بہو آ گئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا بہو آ جانے سے باپو ایک دن میں بوڑھا کھوسٹ ہو گیا ہے؟ ٹھمکتی پھر رہی ہے جیسے کوئی دوشیزہ ہو۔" مکھن نے دوردار آواز میں کہا۔

مکھن کی ماں کے آنسو بہہ نکلے اور سب چُپ ہو گئے۔

نانی نے کہا: "بیٹی بالڑ کا ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ گھر گرستو اگر خواہ کسی گلی گھومتی پھرتا، کوئی گھاس نہیں ڈالے گا۔"

"مرد کے سہارے عورت راج کرتی ہے اور مرد کو تو نے دُور کر دیا۔ ایسے کیسے بات بن سکتی ہے۔"

مکھن کی والدہ اُٹھ کر باہر جانے لگی تو مکھن نے روک لیا: "اب بات کسی کنارے ہی لگا کر باہر جانا۔ ۔۔۔ تمہیں کوئی عقل آئی ہے یا نہیں۔۔۔"

وہ شرمسار ہو کر سر نیچا کیے بیٹھی رہی۔

"اسے کیا اعتراض ہو گا۔" نانی نے لڑکی کی طرف سے یقین دلاتے ہوئے کہا: "اس کا خوف میں دُور کر دوں گی۔ اس کا ڈر بھی حق بجانب ہے۔ بھائی بی بی اپنا گھر سنبھالے۔ جگ ہنسائی نہ کرائے گی۔۔۔۔۔ بختاور سنگھ کی عمر کے لوگ تو کسی کے کہنے کے مطابق ابھی تک کنوارے ہی پھرتے ہیں۔"

"لیکن یہ بولتی کیوں نہیں۔" مکھن نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بولوں کیا۔ تم تو بے شرم ہو گئے ہو۔ مجھ سے تمہاری طرح زبان نہیں چلائی جاتی۔" مکھن کی والدہ نے انکار میں بھی اقرار کر لیا: "میں جن کی خیر چاہتی تھی وہی آنکھیں دکھا رہے ہیں۔۔۔۔"

ایک بار پھر سب چپ ہو گئے۔ شاید یہ سوچنے کے لیے کہ مکھن کی والدہ کس طرح اُن کی بھلائی چاہتی ہے۔

مکھن کو اپنی ماں پر رحم آ رہا تھا۔ پھر وہ والد پر برس پڑا۔ اُس نے والد پر تیکھی طنز کرتے ہوئے کہا۔

"میرا دوست بیٹا۔ میرا بھائیوں جیسا بیٹا کہتے ہوئے آپ کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ میں پوچھتا ہوں یار بیٹے کے ساتھ ایک بار بھی بات نہیں کی گئی۔ بیوی خرید کر لائے اور لوگوں کو دولہا بن بن کے دکھایا، مگر اپنی بیوی سے روٹی نہیں مانگی گئی۔"

مکھن اُبل رہی کول تار میں سے اُٹھتے ہوئے بلبلوں کی مانند دھدھک رہا تھا۔ "اگر بہت ہی مشکل میں ہو تو تمہاری دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ سیدھی طرح اُس کو گھر میں لا کر بساؤ۔ ساتھ ہی اس (ماں) کو بھی ہوش آ جائے۔"

بختاور رضائی لے کر لیٹ گیا۔

خاموشی بہت گہری ہو گئی۔ مکھن کی نانی نے اُسے نرمی اختیار کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ کشیدگی کم کرنے کے لیے مکھن نے چھوٹے بھائی سے کہا۔

"جا بیرے! کھیت میں سے صاحب کے کوٹ اُٹھا لا۔ صندوق میں سنبھال کر رکھ دو۔ اگر ماں نے روٹی نہ پہنچائی تو پھر کام آئیں گے۔"

سب ہنس دیے۔ نانی بھی ہنسنے لگی۔ بختاور کی رضائی میں بھی حرکت ہوئی۔ رسوئی میں سے مکھن کی بیوی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔

"کیسی باتیں کرنی آتی ہیں اس بے شرم کو۔۔۔" مکھن کی ماں کا منہ شرم سے لال ہو گیا۔ "بہت ہی سمجھدار سمجھنے لگا ہے اپنے آپ کو۔" وہ مسکرا دی۔

بختاور رضائی میں لیٹا رہا۔

"لے پکڑ لے۔" مکھن کی ماں باہر سے تھالی میں روٹی لا کر دیتے ہوئے بولی: "لے کھا لے۔ اگر میرے ہاتھوں کی زیادہ میٹھی لگتی ہے تو میں ہی کھلا دیا کروں گی۔"

بختاور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھالی تپائی پر رکھ دی۔

"لقمہ تو خود توڑ کر منہ میں ڈال لو گے یا وہ بھی ماں ہی ڈالے۔۔۔" مکھن نے طنزاً کہا۔

سب نے ہنستے ہوئے بختاور کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے۔ وہ رو رہا تھا۔

(ترجمہ: م۔ک۔ مہتاب)

نام کتاب : صورت و پیکر
مصنف : سید علی رضوی
قیمت : ۲۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ نیا ادب، ۲۰۔ نیا اردو بازار متصل نوشین سنٹر، کراچی ۱۔ پاکستان۔

اس کرۂ ارض پر انسان نے اپنا پہلا قدم کب رکھا اس کے بارے میں قطعی طور پر کوئی بات آج تک نہیں کہی جا سکی بعض قیاسات ہیں جن کے تحت اس کا اندازہ کیا جاتا ہے اور وجود انسانی کو انہیں قیاسات کے تحت مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وجود انسانی کے بارے میں ہماری معلومات مذہبی اور تاریخی بیانات کے تحت سات آٹھ ہزار سال پر جاکر رک جاتی ہے۔ سائنس اور علم بشریات اسے بیس لاکھ سال بتاتے ہیں۔ لیکن ان کا بھی انحصار بعض مفروضات پر ہے۔ بہر حال انسان جب بھی وجود میں آیا ہو اسے اپنے اظہار کے وسائل پیدا کرنے میں بہت وقت نہیں لگا ہو گا۔ اس لیے کہ اگر مشاہدے اور فکر کی طاقت اسے جبلی طور پر ملی تھی تو غذا کی فراہمی اور جنسی تشفی کے بعد اس کا سوچنا اور کچھ کرتے رہنا ضروری تھا۔ خواہ اس کی فکر کا محور وہی چیزیں کیوں نہ رہی ہوں جن سے اس نے تسکین کی لذت حاصل کی اور یہی صورت و پیکر کے پہلے نقوش ہوں گے جو اس کے ذہن کے ورق سادہ پر پہلی بار بنے ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ یہی نقوش فرش خاک پر آڑی ترچھی لکیروں کی شکل میں نمایاں ہوئے ہوں گے۔ لیکن ہماری معلومات کا احاطہ اس قدر محدود ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بات کہنی مشکل ہے۔ مذاہب کا باقاعدہ تصور بہت بعد کی بات ہے لیکن ہر مذہب میں تخیل آرائی کی جو صورت ہے اس سے یا شکلوں کی پرستش کی وجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصوری یا سنگ تراشی یا مجسمہ سازی ہماری معلومات سے بہت پرے کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کھدائی میں کہیں نہ کہیں صورت و پیکر کے ایسے آثار ضرور مل جاتے ہیں جو ہماری معلومات سے ہزار دو ہزار سال پہلے کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ان کھدائیوں میں ملنے والی بیشتر چیزوں کا تعلق صورت گری صناعی اور تعمیر سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے اظہار کے وسائل میں مصوری، مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کو سب سے پہلے استعمال کیا اور تحریر میں آنے والے لفظ کا وجود سب سے بعد میں ہوا۔ اس لیے انسانی تہذیب کے مطالعہ کا سب سے اہم وسیلہ مصوری اور مجسمہ سازی ہی ہو سکتا ہے۔

یہ ہماری کم مائیگی ہے کہ اردو میں اسی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ مصوری اور مجسمہ سازی پر اردو میں کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ترجموں کی شکل میں فن مصوری و مجسمہ سازی کی تاریخ اور ارتقا پر یا عہد وسطیٰ کی مصوری پر بعض کتابیں ضرور مل جاتی ہیں لیکن ایسی کوئی کتاب جس میں آرٹ اور مجسمہ سازی کے ذریعے انسانی تہذیب اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا مطالعہ کیا گیا ہو، نایاب ہے۔

سید علی رضوی کی کتاب 'صورت و پیکر' اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں دنیا کی تہذیب کا مطالعہ آرٹ اور مجسمہ سازی کے حوالے سے کیا گیا ہے اور علم بشریات کی روشنی میں انسان اور انسانی تہذیب کے ارتقا کے متوازی مصوری اور مجسمہ سازی کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سید علی رضوی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ ادبیات، آرٹ، مجسمہ سازی اور علم بشریات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ دشوار منزلوں سے آسانی سے گزر گئے ہیں، انھوں نے مصوری اور مجسمہ سازی کے ارتقا، تجریدیت، حقیقت پسندی اور پھر اس میں شکست و ریخت یا شکلوں کے مسخ ہونے کی کہانی کو جس طرح سے بشری ارتقا اور انسانی تہذیب سے جوڑا ہے' وہ بہت اہم ہے۔ اس نے 'صورت و پیکر' کو انسانی تہذیب کی ایک ایسی دستاویزی شکل دے دی ہے جس کی کوئی دوسری مثال اردو زبان میں نہیں ہے۔ 'صورت و پیکر' بلاشبہ اردو کے علمی سرمایے میں ایک گراں بہا اضافہ ہے جس کے لیے سید علی رضوی ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

'صورت و پیکر' کا کاغذ بے حد نفیس، کتابت بہت اعلیٰ درجے کی ہے اور ہر عہد کے نمائندہ مجسموں اور شہ پاروں کی تصویروں سے مزین ہے۔ اپنی طباعت اور خوبصورتی کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اردو کی چند کتابوں میں شمار ہوگی۔ تصاویر اگر رنگین ہوتیں تو کچھ اور ہی لطف ہوتا۔

(شارب ردولوی)

دیہات کے غریبوں کے لیے کم لاگت مکانات بنانے کی کئی اسکیموں پر عمل درآمد ہو رہا ہے

R.N. 948/57 (Delhi Post) NDPSO New Delhi

Vol. 46 No.12 Ajkal (Urdu) JULY 1988